ایک روپیہ

ٹ ۸۷-۱۹۸۶ غریبی دُور
ے طرف ایک بڑا قدم

(پریم اروڑہ)

نوجوانوں کے مسائل اور
امکاناتِ ترقی

(این پی. سنگھ)

محمد یونس صدیقی

۱۹۸۶-۸۷ کے سالانہ منصوبے کی چند خاص باتیں

۱۹۸۶-۸۷ کا مرکزی بجٹ پبلک سیکٹر کو مستحکم بنانا چاہتا ہے۔ اس میں غریبی دور کرنے کے پروگراموں کو مضبوط اور مستحکم بنانے پر زور ہے۔ اس کے ذریعے معیشت کو خود کفیل بنانا اور عام آدمی کو راحت پہونچانا مقصود ہے۔

۱۹۸۶-۸۷ کے سالانہ بجٹ کے لیے ۲۲۳۰۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ جبکہ ۱۹۸۵-۸۶ میں ۱۸۵۰۰ کروڑ روپے ہی تھے۔ اس طرح اس سال کے سالانہ منصوبے میں ۲۰٫۵ فیصد کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس سے پبلک سیکٹر کے اداروں میں بہت سے پراجیکٹوں کو آگے بڑھایا جا سکے گا۔

ریاستوں کے لیے ۱۹۸۶-۸۷ میں ۱۵۸۸۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں جو ایک سال قبل کے مقابلے ۲۱ فیصد زیادہ رقم ہے۔ مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے لیے ۲۰۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ جبکہ ۱۹۸۵-۸۶ میں ۱۶۰ کروڑ روپے رکھے گئے تھے۔ اس طرح اس مد میں اس سال ۲۵ فیصد اضافہ کیا گیا ہے۔ مختلف مدات کے تحت ریاستوں کو منتقل کی جانے والی جملہ رقومات ۲۰۰۰۸ کروڑ روپے ہوں گی گویا کہ ۱۹۸۵-۸۶ کے بجٹ تخمینوں سے ۱۵٫۴ فیصد زیادہ۔

کلیدی سیکٹر

کوئلے، بجلی، پٹرولیم، ریلویز اور خشکی کے راستے ذرائع نقل و حمل جیسے کلیدی شعبوں کے لیے ۱۹۸۶-۸۷ میں ۱۰۸۰۵ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ سال زیر تبصرہ میں بجلی کے محکمے کے لیے ۲۵۷۵ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں جب کہ ۱۹۸۵-۸۶ کے لیے یہ رقم ۲۰۹۰ کروڑ روپے تھی۔ اس سے ۴ ہزار میگا واٹ بجلی تیار کی جا سکے گی۔ اس میں سے ۸۶۵ میگا واٹ بجلی مرکزی سیکٹر کے تحت تیار کی جائے گی۔ ۱۹۸۵-۸۶ کے دوران مرکزی تھرمل بجلی پلانٹ ۶۷٫۹ فیصد لوڈ اٹھا رہے تھے جبکہ ملک گیر سطح پر ان کے لوڈ کا اوسط ۵۱٫۳ فیصد تھا۔ ایک بڑا تھرمل پاور پراجیکٹ ہے، میجا تھرمل اسٹیشن جس کا تعلق دامودر ویلی کارپوریشن سے ہے اور جو مغربی بنگال کے ضلع بنکورا میں واقع ہے، اس پر ۵۶۶ کروڑ روپے کی لاگت کا اندازہ ہے۔ اس کی صلاحیت ۶۳۰ میگاواٹ ہے گجرات میں کواس، اتر پردیش میں اور یہ اور راجستھان میں اتنا بھی بڑے بجلی پراجیکٹوں میں شمار ہوتے ہیں۔

بجلی پراجیکٹوں کے لیے مالیات فراہم کرنیوالی ایک کارپوریشن قائم کی جا رہی ہے۔ اس کے لیے ۷۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ اس میں ۳۰ کروڑ روپے سے قدیم بجلی پلانٹوں کی مرمت اور جدید کاری کا کام لیا جائے گا۔

ایٹمی توانائی کے اخراجات ۱۹۸۵-۸۶ کے ۴۹۵ کروڑ روپے سے بڑھا کر ۱۹۸۶-۸۷ میں ۵۵۰ کروڑ روپے کر دیئے گئے ہیں۔

پٹرولیم اور قدرتی گیس کی وزارت کو ۳۳۰۰ کروڑ روپے دیئے گئے ہیں تاکہ ۳ کروڑ ۲ لاکھ ٹن تیل حاصل کیا جا سکے جس کا منصوبہ بند پیمانے پر اندازہ لگایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی گیس کی حصولی میں ۲۸ فیصد اضافہ کیا جا سکے گا۔ کوئلے کے محکمے کو ۱۹۸۶-۸۷ کے لیے ۱۳۵۰ کروڑ روپے دئے گئے جبکہ ۱۹۸۵-۸۶ء میں ۱۱۰۲ کروڑ روپے دئے گئے تھے۔ کوئلہ انرجی کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ چنانچہ ۱۶ کروڑ ۲۸ لاکھ ٹن کوئلہ حاصل کرنے کا نشانہ متعین کیا گیا ہے۔

فولاد کے شعبے میں مزید ۶۵۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں، وشاکھاپٹنم کے لیے ۷۰۰ کروڑ روپے کی جو رقم دی گئی ہے، یہ اس کے علاوہ ہے۔

ٹیلی کمیونیکیشن کے لیے ۹۱۵ کروڑ روپے دئے گئے ہیں۔ ٹرانسپورٹ کے لیے ۳۸۸۵ کروڑ روپے بحیثیت مجموعی دیئے گئے ہیں۔ اس میں سے ۲۶۵۰ کروڑ روپے ریلوں کے لیے، ۲۹۵ کروڑ روپے فضائی نقل و حمل کے لیے، اور باقی ۹۴۰ کروڑ روپے سڑکوں اور پانی کے ذریعے نقل و حمل کے لیے ہوں گے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے ۱۹۸۶-۸۷ میں ۴۹۴ کروڑ ۸۳ لاکھ روپے دئے گئے جب کہ ۱۹۸۵-۸۶ میں ۴۱۷ کروڑ ۵۴ لاکھ روپے دئے گئے تھے۔ یہ رقم نظر ثانی شدہ تخمینوں کے تحت ۴۰۵ کروڑ ۴۸ لاکھ روپے بنتی ہے۔ سماجی خدمات کے لیے ۱۹۸۷ کروڑ ۹۴ لاکھ روپے دئے گئے جبکہ ۱۹۸۵-۸۶ میں ۱۶۴۶ کروڑ ۷۴ لاکھ روپے کی رقم دی گئی تھی۔ دیگر مدات کے لیے ۳۹ کروڑ ۱۲ لاکھ روپے دئے گئے جبکہ ۱۹۸۵-۸۶ میں ۳۹ کروڑ ۶۶ لاکھ روپے دئے گئے تھے۔

۱۹۸۵-۸۶ کے نظر ثانی شدہ تخمینوں کے مطابق یہ رقم ۳۴ کروڑ ۵۶ لاکھ روپے بنتی ہے۔ اس سال شہری ترقی کے لیے ۴۸ کروڑ روپے دئے گئے جبکہ ایک سال پہلے اس کے لیے صرف ۳۹۸ کروڑ روپے تھے۔
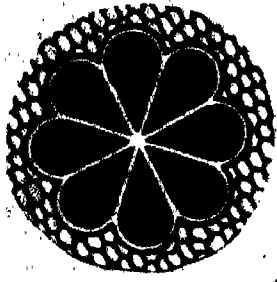
چیف ایڈیٹر • آر. ٹھکرال

اسسٹنٹ ایڈیٹر • محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر • وسیم حیدر

جلد ۶ | یکم تا ۱۵ اپریل ۱۹۸۶ | شمارہ ۱

۱۱ تا ۲۵ چیتر، شک ۱۹۰۸ ٹیلیفون ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سالہ ۳۵ روپے، سہ سالہ ۵۰ روپے

فی کاپی :۔ ایک روپیہ

طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

یوجنا، منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :۔

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵ آر. کے. پورم (مین)
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر. ایس. منچال

ترسیل زر کا پتہ :۔ بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

۱۹۸۶ ـ ۸۷ کا بجٹ

غریبی دُور کرنے میں معاون

اس سال کے بجٹ کو متوازن تو کہا ہی جاسکتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس میں غریبوں کو راحت دینے کے لیے جو متعدد تجاویز پیش کی گئی ہیں، وہ بڑی حد تک عام انسان کی زندگی کو آرام دہ اور پُر سکون بنانے میں معاون ثابت ہوں گی۔ دیہی علاقوں میں غریبی دُور کرنے کے پروگراموں کے لیے اخراجات میں ۶۵ فیصد اضافہ، شہری علاقوں کے غریبوں کی امداد کے لیے قرضہ اسکیم، میونسپل بورڈوں کے خاکروبوں، ریلوے کے قلیوں، موچیوں، دھوبیوں، ہاکروں اور رکشا چلانے والوں کے لیے حادثہ بیمہ اسکیم، محنت کشوں کے مکانات کے لیے ٹوٹ پھوٹ کی دفعات میں نرمی، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے مالی امداد کی غرض سے خصوصی فنڈ، درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے لیے 'اندرا آواس یوجنا' چھوٹے سرمایہ کاروں کے لیے فنڈ اور متعدد دیگر تجاویز سے دیہی اور شہری علاقوں کے غریبوں کو راحت ملے گی۔ متوسط درجے کے تنخواہ دار لوگوں کی راحت کیلئے آمدنی پر معیاری چھوٹ کی حد بڑھادی گئی ہے۔ جان بچانے والی اہم دواؤں کو ایکسائز ڈیوٹی سے مستثنیٰ کردیا گیا ہے۔ مٹی کے تیل کے چولہوں پر سے ایکسائز محصول ختم کردیا گیا ہے۔ اس طرح موڈوٹ اسکیم یعنی Modified Value Added Tax اسکیم طویل المدتی مالی پالیسی کو آگے بڑھانے میں نہ صرف معاون ہوگی بلکہ صنعتی حلقوں کی طرف سے جس بڑے پیمانے پر اس کا خیر مقدم کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے اشیاء کی تیاری کی لاگت کم ہو سکے گی۔ اس بجٹ میں ۲۶۷ کروڑ ۲۲ لاکھ روپے کے مزید وسائل مُہیا کیے گئے ہیں اور ۳۶۵۰ کروڑ روپے کا خسارہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ حکومت نے پچھلے سال کے بجٹ میں جس طویل المدتی مالی پالیسی وضع کرنے کا وعدہ کیا تھا، وہ اس نے پورا کردکھایا۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ بجٹ سے متعلق قیاس آرائی اور روائتی ڈرامہ کم ہو سکے گا اور مضبوط معاشی ڈھانچے کی تشکیل میں مدد ملے گی۔ یہ حوصلہ افزا امر ہے کہ اس بجٹ میں غریبی دُور کرنے کے پروگراموں، کیمیاوی کھادوں اور انسانی وسائل نیز زراعت اور متعلقہ معاشی سیکٹروں کو آگے بڑھانے پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ کوئلہ، بجلی، ریلویز، پٹرولیم، خشکی کے راستے نقل و حمل میں بنیادی سہولتوں کو توسیع دینے اور اس کے ڈھانچے کو مضبوط بنانے کی بہت سی کوششیں اس بجٹ سے واضح ہوتی ہیں۔ مرکزی منصوبے میں بیس نکاتی پروگرام کے لیے رقم بڑھاکر ۵۹۹۸ کروڑ روپے کردی گئی ہے جو سال رواں کی رقم کے مقابلے ایک ہزار کروڑ روپے زیادہ ہے۔

پبلک سیکٹر کے کلیدی شعبوں میں سرمایہ کاری کی رفتار برقرار رکھنے کے لیے مرکزی منصوبے کے لیے ۲۲۳۰۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ اس سے غریبی کے پروگراموں کو تیز رفتاری سے آگے بڑھانے میں مدد مل سکے گی۔ ۱۹۸۶ ـ ۸۷ میں ریاستوں کے مجموعی پلان مصارف سالِ رواں کے مقابلے ۲۱ فیصد زیادہ ہیں۔ یعنی کہ ۱۵۸۸۰ کروڑ روپے مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے لیے یہ مصارف ۸۰۷ کروڑ روپے ہیں۔ مدت زیر تبصرہ میں ریاستوں کو منتقل کی جانے والی رقومات ۸۰۷۰ کروڑ روپے کے بقدر ہوں گی۔ جو ۸۶ ـ ۱۹۸۵ء کے بجٹ کے تخمینوں سے ۱۵٫۴ فیصد زیادہ ہے۔ آئندہ سال ۴۸۷۶۴ کروڑ روپے کی وصولیابی کا اندازہ ہے جبکہ اخراجات ۵۲۸۶۲ کروڑ روپے ہوں گے اس طرح ٹیکسوں کی موجودہ سطح پر ۴۰۹۵ کروڑ روپے کا خسارہ رہ جائے گا۔ اسی سال مرکز ۴۴۵ کروڑ روپے کے بقدر ٹیکسوں سے آمدنی حاصل کرسکے گا اور یہ خسارہ مرکزی بجٹ میں ۳۶۵۰ کروڑ روپے رہ جائے گا۔ معیشت کے حجم کو دیکھتے ہوئے اور ہندوستانی معیشت کی خصوصیات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ خسارہ معقول حد تک ہی کہا جاسکتا ہے۔

سُوت کی کتائی سے متعلق ہندوستانی ایسوسی ایشن کے صدر شری ایم کے. مہتہ نے مرکب پولی یسٹر دھاگے اور وِسکوز دھاگے کو ایکسائز ڈیوٹی سے مستثنیٰ کردینے کا خیر مقدم کیا ہے۔ یہ دھاگہ ہینڈلوم کی چند تنظیموں کو فراہم کیا جاتا ہے۔ البتہ پولیسٹر وِسکوز دھاگے پر ڈیوٹی میں اضافے پر تشویش ظاہر کی ہے۔ مشہور ماہرِ اقتصادیات ڈاکٹر مالکم ایس ادی سیشیہ نے اس بجٹ کو غریبی دُور کرنے اور روزگار کے مواقع پیدا کرنے کی جانب ایک مثبت قدم بتایا ہے۔

البتہ منصوبہ بندی کمیشن کی طرف سے مقرر کردہ ایک کمیٹی نے خبردار کیا ہے کہ غریبی دُور کرنے کے پروگراموں کو محض چند ایک اسکیموں تک محدود کردینے سے مطلوبہ فوائد حاصل نہ ہوں گے۔ دیہی ترقی کا کوئی بھی پروگرام شروع کیا جائے، اس میں غریبی دُور کرنے کا پروگرام ایک اہم جزو کے طور پر شامل کیا جانا ضروری ہوگا۔ ●

(اسسٹنٹ ایڈیٹر)

پریم اروڑہ

بجٹ ۸۷-۱۹۸۶

غریبی دُور کرنے کی طرف ایک بڑا قدم

ہندوستان کے عوام سرکار کے بجٹ سے متعلق رائے قائم کرنے کے لیے بالعموم یہ دیکھتے ہیں کہ اس نے کیسا بجٹ پیش کیا اور اس نے کن کن ذرائع سے آمدنی کی اور پھر اس رقم کو کس کس مَد پر خرچ کیا، اسی لیے بجٹ تجاویز سے یہاں کے عوام کی غیر معمولی دلچسپی کا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں ان تجاویز کے اعلان کے فوراً بعد ان تجاویز پر خیال آرائی اور غور و خوض کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ عوام کی ایک بڑی تعداد وہ ہے جو بجا طور پر یہ خیال کرتی ہے کہ بجٹ ایک ایسی دستاویز ہے جو آمدنی حاصل کرنے اور پھر اسے خرچ کرنے پر زور دیتی ہے اور ان کی مدات کا تعین کرتی ہے۔ لیکن موجودہ وزیر خزانہ شری وی۔ پی۔ سنگھ کا نظریہ اس بارے میں اپنے پچھلے وزرائے خزانہ سے مختلف ہے۔ وہ اسے محض ٹیکس لگانے کا ایک ذریعہ ہی خیال نہیں کرتے بلکہ بجٹ ایسی دستاویز ہے جس سے پتہ چلے کہ وسائل کس مَد پر خرچ کیا جارہا ہے۔ گویا یہ سرکار کے اقتصادی نقطۂ نظر کو واضح کرنے والی ایک دستاویز ہے۔ اس کے ذریعے یہ پتہ لگانا مقصود ہے کہ رقم کیسے حاصل کی جائے، اور اسے کیسے خرچ کیا جائے۔ کس کس مد پر اسے خرچ کرنا مفادِ عامہ کے حق میں ہے اور کس کس کو اس خرچ سے فائدہ پہونچنے کا امکان ہے۔ اب تک بجٹ ایک رازدارانہ دستاویز یا خفیہ تحریر سمجھا جاتا تھا مگر موجودہ وزیر خزانہ کا نظریہ اس بارے میں بھی جدا ہے۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں بجٹ تجاویز کو جب انھوں نے وقت مقررہ اور اس کی مقررہ تاریخ پر پیش کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا تو اس سے سبھی حیرانی میں پڑ گئے۔ وہ کھلے بجٹ کے حق میں ہیں۔ اس سال کا بجٹ پیش کرتے ہوئے انھوں نے طویل المدتی اقتصادی پالیسی کو بڑی حد تک سامنے رکھا۔ بجٹ تجاویز مرتب کرتے وقت انھوں نے پلان کے اندازوں کو پیش نظر رکھا۔

شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے بجٹ کے موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ بجٹ میں غریبی دُور کرنے کے پروگراموں پر زیادہ زور ہے۔ اس بجٹ میں غریبی دُور کرنے کے پروگراموں کے لیے جو رقومات رکھی گئی ہیں، وہ ۸۷-۱۹۸۶ کے لیے ساتویں منصوبے میں مجوزہ رقوم سے ۶۵ فیصد زیادہ ہیں۔ اپنی بجٹ تقریر کے پہلے جملے میں انھوں نے کہا کہ سماجی اور اقتصادی مقاصد کے حصول کیلئے بجٹ ایک موثر ذریعہ ہے اور یہی بات منصوبے میں بھی بتائی گئی ہے۔ انھوں نے وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کا یہ قول بھی دہرایا کہ مساوات اور سماجی انصاف کے ذریعے نیز کمزور کو ستانے والے سماجی بندھنوں کو توڑ کر ہی ترقی کا عمل آگے بڑھ سکتا ہے۔ سماجوادی نظریات کا یہی ماحصل ہے۔

چونکہ غریبی کا مسئلہ دیہات میں گہری جڑیں رکھتا ہے، اسی لیے دیہی ترقی کے محکمے کے لیے اخراجات میں تقریباً ۵۰ فیصد اضافہ کیا گیا ہے۔ ۸۷-۱۹۸۶ کے مصارف ۱۸۵۱ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں، جبکہ ایک سال قبل یہ ۱۲۳۹ کروڑ روپے تھے۔ چونکہ سرکار نے دیہی غربت کے خاتمے کے کام کا بیڑا اٹھایا ہے، لہٰذا ایسے پروگراموں کے شروع کرنے اور انھیں مضبوط بنانے پر زور ہے جو سماج کے کمزور طبقوں کے لیے براہِ راست سود مند ہیں اور جن سے شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کے افراد خاص طور پر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ۸۷-۱۹۸۶ میں دیہات میں روزگار کے قومی پروگرام کے لیے ایک سال قبل کے مقابلے، ۹۳ فیصد زیادہ رقم رکھی گئی ہے۔ اس بجٹ میں اس مَد کے اخراجات ۴۴۳ کروڑ روپے کے بقدر ہوں گے جبکہ ایک سال قبل یہ ۲۳۰ کروڑ روپے تھے۔ اس سے سالِ رواں میں ۳۰ کروڑ افرادی دنوں کا روزگار مل سکے گا۔ جب کہ سال گذشتہ ۲۵ کروڑ ۳۰ لاکھ افرادی دنوں کا روزگار ہی مہیا کیا جا سکا تھا۔ اس سلسلے کی ایک اور کڑی ہے۔ دیہات میں بے زمین افراد کے لیے روزگار کی ضمانت کا پروگرام۔ اس مَد پر مرکزی اخراجات بڑھا کر ۶۳۳ کروڑ روپے کر دئے گئے ہیں جبکہ

ایک سال قبل یہ اخراجات ۴۰۰ کروڑ روپے تھے۔ اس سے سالِ رواں میں ۲۶ کروڑ ۴۰ لاکھ افرادی دنوں کا روزگار مل سکے گا جب کہ پچھلے مالی سال کے دوران ۲۵ کروڑ ۳۰ لاکھ افرادی دنوں کا روزگار مہیا کیا گیا تھا۔ دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام کے لیے ۸۷-۱۹۸۶ میں ۴۲۸ کروڑ روپے خرچ کئے جانے ہیں جبکہ ۸۶-۱۹۸۵ء کی بجٹ تجاویز میں یہ رقم ۲۸۳ کروڑ روپے تھی۔ اسی طرح اس سال اخراجات میں ۵۱ فیصد اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ۸۶-۱۹۸۵ کے پہلے نو ماہ میں اس پروگرام سے ۱۵ لاکھ ۳۰ ہزار کنبوں کو فائدہ پہنچایا گیا۔ ان میں سے ۶ لاکھ ۳۰ ہزار کنبے شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کے تھے۔ ساتویں منصوبے میں اس پروگرام سے ۲ کروڑ کنبوں کو فائدہ پہونچایا جائے گا۔

اندرا آواس یوجنا

بجٹ میں شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کے لیے تعمیر مکانات کی ایک نئی اسکیم کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس کا نام اندرا آواس یوجنا ہے۔ ان طبقات کے لیے تعمیر مکانات کے واسطے ۱۲۵ کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے جبکہ اس سے قبل یہ رقم ۱۰۰ کروڑ روپے تھی۔

پینے کا پانی

چھٹے منصوبے کے شروع میں ۲ لاکھ ۳۱ ہزار گاؤں ایسے تھے جہاں پینے کے پانی کی فراہمی ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک لاکھ ۹۲ ہزار دیہات کو چھٹے منصوبے میں پینے کے پانی کی فراہمی کا کوئی نہ کوئی کم سے کم ایک محفوظ وسیلہ فراہم کر دیا گیا ہے۔ ساتویں منصوبے میں باقی ۳۹ ہزار دیہات میں بھی پینے کا محفوظ اور صاف پانی فراہم کر دیا جائے گا۔ اس سال اس مد پر ۵۱۰ کروڑ روپے صرف کئے جائیں گے۔ ۸۸-۱۹۸۷ تک اس طرح کے تمام دیہات میں پینے کا پانی پہنچایا جا چکا ہے۔

زراعت اور متعلقہ سرگرمیوں کے لیے ۲۸۳۸ کروڑ روپے صرف کئے جاتے ہیں۔ جبکہ پچھلے بجٹ میں اس مد پر ۲۲۰۷ کروڑ روپے رکھے گئے تھے۔ گویا اس سال پچھلے سال کے مقابلے ۲۹ فیصد زیادہ رقم رکھی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ زراعت غریبی دور کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ لہٰذا زرعی اشیاء کی قیمتوں کے استحکام کے لیے ایک طویل المدتی پالیسی تیار کی جا رہی ہے۔ یہ پالیسی زراعت کے ماہرین کے مشوروں کی بنیاد پر تیار کی جا رہی ہے۔ اس پالیسی کی روشنی میں کسانوں کو فصلوں کے انتخاب میں آسانی رہے گی۔ اس سلسلے میں بجٹ سے اگلے روز ایک وضاحتی بیان میں وزیر خزانہ نے کہا کہ ہم ایسی صورتِ حال سے بچنا چاہتے ہیں جس میں گندم کی برآمدات کے لیے فاضل گندم رہے۔ لیکن ملک کو خوردنی تیل درآمد کرنے پڑیں گے۔

بینک شہری غریب کی مدد پر

بینکوں کے ذریعے قرضوں کی فراہمی کی ایک نئی اسکیم زیرِ تشکیل ہے۔ اس کے ذریعے اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے والوں کو قرضوں کی واپسی میں آسانی رہے گی۔ از خود روزگار کے خواہشمند افراد ان قرضوں سے استفادہ کر کے مشینری وغیرہ خرید سکیں گے۔ رکشا چلانے والے، موچی، دھوبی، ہاکر اور بیل گاڑی اور ٹھیلہ چلانے والے اس اسکیم سے فائدہ اٹھائیں گے۔

میونسپل خاکروبوں اور ریلوے قلیوں کے حادثات کے بیمہ کے لیے ایک اور اسکیم شروع کرنے کا پروگرام ہے۔ زندگی بیمہ کارپوریشن اس کی تفاصیل کا اعلان کرے گی۔ یہ ورکروں کی یونین کے ذریعے گروپ انشورنس کا اہتمام کرے گی۔ اس اسکیم کے تحت ۵ ہزار روپے کا بیمہ کیا جائے گا اور حادثے کی صورت میں فائدہ دیا جائے گا۔ بشرطیکہ یہ مزدور کسی یونین کا ممبر بننا منظور کریں اور ۷۵ فیصد ممبر اس اسکیم میں شرکت کریں۔ شخصی حادثے سے متعلق سماجی تحفظ بیمہ اسکیم کو ایک سو اضلاع میں رواں سال میں لاگو کیا جائیگا اس اسکیم کو سال ۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران دو سو اضلاع میں لاگو کیا جائے گا۔ اس اسکیم کا تمام تر خرچ بھارت سرکار کے ذمہ ہوگا۔ اس اسکیم سے بے زمین مزدور، چھوٹے اور حاشیائی کسان، روایتی انداز کی دستکاری کرنے والے، چھوٹے تاجر اور دیگر لوگ فائدہ اٹھائیں گے۔

از خود روزگار کیلئے مزید رقم

۸۷-۱۹۸۶ میں از خود روزگار سے متعلق اسکیموں کے لیے ۱۰۴ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں جبکہ پچھلے مالی سال میں اس مد پر ۶۵ کروڑ روپے کے اخراجات کئے جانے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سال اس مد پر ۵۸ کروڑ مزید اخراجات ہوں گے۔

کھادی اور دیہی صنعتوں کے لیے ۸۷-۱۹۸۶ میں ننو کروڑ روپے کے اخراجات رکھے گئے ہیں۔ ساتویں منصوبے میں اس سیکٹر میں باروزگار افراد کی تعداد ۳۷ لاکھ سے بڑھ کر ۰ لاکھ ہو جائے گی۔

خوردنی تیلوں کی درآمد سے غیر ملکی زرِمبادلہ پر بوجھ پڑ رہا ہے، چنانچہ وزیر خزانہ نے کئی قسم کے خوردنی تیلوں مثلاً چاول کی بھوسی سے نکلنے والے تیل، مہوے کے تیل، سال کے بیج سے نکلے ہوئے تیل اور آم کی گٹھلی سے نکلنے والے تیل کے بناسپتی کی صنعت میں استعمال کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ غیر مصفّیٰ بناسپتی تیل جو

غریب طبقے استعمال کرتے ہیں، ایکسائز سے مستثنیٰ ہوں گے۔ متمول طبقوں کے استعمال میں آنے والے قیمتی معطر تیلوں پر ۱۵۰۰ روپے فی ٹن کا ایکسائز محصول لیا جائے گا۔ ان اقدامات سے تیلوں کی پیداوار بڑھے گی اور ادنیٰ اتسیل کی تیاری میں مصروف افراد ان رعائتوں سے فائدہ اٹھائیں گے۔ وناسپتی تیار کرنے والوں کی انجمن کے صدر نے کہا ہے کہ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ وزیر خزانہ نے غیر معروف وناسپتی تیلوں کے استعمال کو بڑھانے کے لیے مالی ترغیبات اور رعائتیں دی ہیں۔ چنانچہ قبائلی آبادی والے اور اقتصادی طور پر کمزور طبقات کے استعمال میں آنے والے تیلوں کی تیاری بڑھے گی۔

چھوٹے پیمانے کی صنعت نے از خود روزگار کے بہت سے مواقع فراہم کئے ہیں ایکسائز محصولات میں بہت سی رعائتوں کا اعلان کر کے ان مواقع کو وسعت دی گئی ہے۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں ایکسائز کی مختلف رعائتوں سے نوجوان ادھر آ سکیں گے۔ ملک میں چھوٹے پیمانے کے صنعتی اداروں میں تقریباً ۸۵ فیصد ایسے ادارے ہیں جو ساڑھے سات لاکھ روپے تک کا سال میں کاروبار کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے لیے ایک نئی اسکیم کے ذریعے مکمل استثنیٰ کی رعایت بدستور جاری رہے گی۔ اب ڈیڑھ کروڑ روپے تک کا سالانہ کاروبار کرنے والے اداروں کو تدریجی پیمانے سے ڈیوٹی میں تخفیف کی اسکیم سے فائدہ پہونچ سکے گا۔ اس اسکیم سے چھوٹے پیمانے کے صنعتی کارخانے بڑی حد تک فائدہ اٹھا سکیں گے۔ چھوٹے پیمانے کی صنعت کے لیے ایکسائز میں تخفیف کی اسکیم کو مزید نرم بنایا جا رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ادھر آنے کا موقع ملے اور وہ روزگار کے مواقع پا سکیں۔

ایکسائز محصولات کے دائرے میں اکثر ایک پریشان کن سوال یہ رہا ہے کہ مصنوعات کے معاون عمل پر ٹیکس لگانے سے مصنوعات کی لاگت بہت بڑھ جاتی ہے۔ طویل المدت پالیسی نے اس مسئلے کا حل بتایا ہے کہ ایکسائز محصول لگائی جانے والی تمام اشیا پر چند ایک کو چھوڑ کر جن کے کچھ خاص مسئلے ہیں۔ پروفورما قرضے دئے جائیں۔ اس اسکیم کو Modified Value Added Tax (MODVAT) یا موڈوٹ کی اسکیم کا نام دیا گیا ہے۔ صنعتوں میں اس پالیسی اور اس اسکیم کا بڑے پیمانے پر خیر مقدم کیا گیا ہے۔ اس کے تحت اب صرف حتمی طور پر تیار کردہ مصنوعات پر ہی ڈیوٹی لگے گی۔ ہر انفرادی معاون حصے پر ڈیوٹی نہ لگے گی۔ اس عمل سے مصنوعات کی لاگت میں کمی آ سکے گی۔ اس سے مال تیار کرنے والے کو خام سامان اور پرزوں پر ادا کئے ہوئے ایکسائز محصول کی پوری رقم فوراً حاصل ہو جائے گی۔

اس بجٹ نے متوسط تنخواہ دار طبقے کو راحت پہونچائی ہے اور ان سے لیے جانے والے آمدن ٹیکسوں کے لیے اسٹینڈرڈ چھوٹ ۲۵ فیصد سے بڑھا کر ۳۰ فیصد کی جا رہی ہے اس کے ساتھ ہی پراویڈنٹ فنڈ کی شرح سود میں اضافہ کیا گیا ہے۔ اس سے بندھی ہوئی آمدنی والوں کے زمرے میں ساڑھے تین لاکھ ٹیکس دہندگان کو فائدہ پہنچے گا۔ تنخواہ پانے والوں، از خود روزگار والوں کے لیے علاج معالجہ کے اخراجات میں مدد دینے کے لیے انکم ٹیکس میں کل آمدنی میں سے کچھ چھوٹ دی جائے گی۔

بچتوں کو پیداواری سرمایہ کاری کے طور پر لگانے کے لیے سرکار پبلک سیکٹر بانڈز کی ایک اور سیریز جاری کرے گی جس کی آمدنی ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگی۔

ریاستوں کے حصے میں اضافہ

رواں سال کے بجٹ میں ریاستوں کے حصے میں ۳۰ فیصد اضافہ کیا گیا ہے۔ اس اضافہ کے پس پردہ دو اسباب کارفرما ہیں۔ ریونیو کی وصولیابی میں اضافہ نیز منصوبہ بندی کمیشن کی طرف سے ریاستوں کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ حصہ دئے جانے کی سفارش۔

غریبی دور کرنے کے پروگراموں، کیمیاوی کھادوں اور انسانی وسائل نیز زراعت اور متعلقہ سیکٹروں کو آگے بڑھانے کے کام کو اعلیٰ ترین ترجیح دی گئی ہے۔ پبلک سیکٹر کے کلیدی شعبوں مثلاً کوئلہ، بجلی، ریلویز، پٹرولیم، خشکی کے راستے، نقل و حمل میں بنیادی سہولتوں اور ڈھانچے کو مضبوط بنانے اور زور دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سرکار کے اس عہد کو دہرایا گیا ہے کہ وہ اندرون ملک مشینوں وغیرہ سے متعلق صنعت کو پوری طرح امداد دے گی۔ صنعتوں کے فروغ کے ہندوستانی بینک میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے فروغ سے متعلق ایک فنڈ الگ سے قائم کیا گیا ہے تاکہ چوٹی کی سطح پر اس سیکٹر کو دی جانے والی مالی امداد کے کاموں میں تال میل کے لیے ایک کلیدی مرکز مل سکے۔ مرکزی منصوبے میں بیس نکاتی پروگرام کے لیے رقم بڑھا کر ۵۹۹۸ کروڑ روپے کر دی گئی ہے۔ جو سالِ رواں کی رقم کے مقابلے میں ایک ہزار کروڑ روپے زیادہ ہے۔

بجٹ میں ۸۷-۱۹۸۶ کے مرکزی منصوبے کے لیے ۲۲۳۰۰ کروڑ روپے مختص کئے گئے ہیں تاکہ پبلک سیکٹر کے کلیدی شعبوں میں سرمایہ کاری کی رفتار بدستور قائم رہ سکے اور غریبی دور کرنے کے پروگراموں پر عمل درآمد کی رفتار تیز ہو سکے۔ یہ ۸۶-۱۹۸۵ کے بجٹ کے تخمینوں سے ۲۰.۵ فیصد

کا اضافہ ظاہر کرتے ہیں۔ ریاستوں کے مجموعی پلان مصارف ۸۰۸۸ کروڑ روپے ہیں جو سال رواں کے مقابلے ۲۱ فیصد زیادہ ہیں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے لیے پلان کے مصارف ۸۷۲ کروڑ روپے ہیں۔

۸۷-۱۹۸۶ میں مختلف مدات کے تحت ریاستوں کو رقوم کی مجموعی منتقلی ۲۰،۰۰۸ کروڑ روپے ہوگی جو ۸۶-۱۹۸۵ کے بجٹ تخمینوں سے ۱۵،۴۳ فیصد زیادہ ہے۔ آئندہ سال ۴۲۸۷۴ کروڑ روپے کی وصولیوں کا اندازہ ہے جبکہ اخراجات ۵۲۸۴۲ کروڑ روپے کے بقدر ہونگے۔ اس طرح ٹیکسوں کی موجودہ سطحوں پر ۴۹۵ کروڑ روپے کا خسارہ رہ جائے گا۔ خوراک کی مد پر ۱۷۵۰ کروڑ روپے کی امدادی رقوم فراہم کی جائیں گی۔ کیمیاوی کھادوں کے لیے ۱۹۵۰ کروڑ روپوں کی اور سود کی ادائگیوں کے لیے ۸۷۵۰ کروڑ روپے کی سبسڈی کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ بجٹ کی تجاویز میں غیر منصوبہ جاتی اخراجات کو کم سے کم رکھنے کے لیے کہا گیا ہے۔ ٹیکس سے ہونے والی آمدنیوں میں رواں سال کے بجٹ کے تخمینوں سے ۱۰ فیصد اضافہ کیا جائے گا۔ چھوٹے پیمانے کی بچتوں سے ہونے والی وصولیابیوں سے سال رواں کے بجٹ تخمینوں کے مقابلے ۳۶ فیصد اضافے کی توقع ہے۔

ان پروگراموں پر جن کے ذریعے غریبی دور کرنے پر زور دیا گیا ہے، ایک اعتراض کیا گیا ہے کہ ان سے ہونیوالے فائدے مستحق افراد کو ٹھیک ڈھنگ سے اور خاطر خواہ انداز میں نہیں مل پائے۔ اس کا سبب اشیاء کی تقسیم کے نظام کی خرابی ہے۔ چنانچہ اس نظام کے استحکام پر زور دیا جا رہا ہے۔ ان پروگراموں پر عمل درآمد کے ذمہ دار افراد کے درمیان تال میل کی کوشش کی جارہی ہے۔ ایسے شبہات بھی ظاہر کئے جارہے ہیں کہ غریبی دور کرنے کے پروگراموں کے لیے جالانکہ مختص کردہ رقومات میں ۶۵ فیصد اضافہ ظاہر کیا گیا ہے مگر یہ مسئلہ کی نزاکت اور اس کی وسعت کو دیکھتے ہوئے پھر بھی ناکافی ہے۔

بہرصورت رواں سال کا بجٹ کافی متوازن ہے۔ یہ سرکار کے اقتصادی فلسفے کے عین مطابق ہے۔ پچھلے سال کے بجٹ سے اقتصادی اصلاحات کا عمل شروع کیا گیا تھا مگر اس سال کے بجٹ میں غریبوں اور سماج کے کمزور طبقوں کی بہبود پر کافی زور دیا گیا ہے۔ اس بجٹ کے ذریعے ساتویں منصوبے کے نشانوں کی تکمیل کے لیے بنیادیں استوار کی گئی ہیں۔ اس کے ذریعے ۹۰-۱۹۸۹ تک غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والوں کا تناسب گھٹا کر ۲۶ فیصد کیا جاسکے گا۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ ملک میں طویل المدتی اقتصادی پالیسی کے ذریعے غریبی دور کرنے کا جو پروگرام شروع کیا گیا ہے، اسے آگے بڑھانے میں یہ بجٹ معاون ثابت ہوگا۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے افراط زر کا دباؤ بڑھے گا، ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس سال بجٹ کا خسارہ ۳۲۵۰ کروڑ روپے ہے۔ جو پچھلے سال کے نظرثانی شدہ تخمینوں سے کم ہے۔ ہندوستان کی معیشت کی نوعیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ معقول حدوں کے اندر ہے۔ اس سے ملک کی صورت حال اور ملک کے معاشی حالات کا مستقبل روشن ہے۔

●

بقیہ ۸۷-۱۹۸۶ کے سالانہ منصوبے کی چند خاص خاص باتیں

ٹیکس کی بنیادی حد استثنیٰ موجودہ ۵ ہزار روپے سے بڑھا کر ۲۰ ہزار روپے تک کردی گئی ہے۔ رفائنڈ شدہ مونگ پھلی اور سرسوں کے تیل کی قیمتیں بڑھ جائیں گی۔ ادنیٰ قسم کے تیلوں کی قیمتیں کم ہوں گی۔ رنگین ٹی وی، ایئر کنڈیشنرز اور کاروں کی قیمتیں بڑھ جائیں گی۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو بڑھاوا ملے گا۔ پلانٹ اور مشینری میں سرمایہ کاری کی بالائی حد موجودہ ۳۵ لاکھ روپے سے بڑھا کر ۳۵ لاکھ روپے کی جارہی ہے۔ ایکسائز محصولات میں نرمی لانے کی ایک نئی اسکیم کے تحت چھوٹے پیمانے کے صنعتی اداروں کا ۸۵ فیصد حصہ ایکسائز محصول سے مطلق مستثنیٰ کر دیا جائے گا۔

یکم مارچ ۱۹۸۶ سے ایکسائز محصولات کی ایک نئی اسکیم چلائی گئی ہے، اس کا نام ہے
Modified Value Added Tax
اسے مختصراً موڈوٹ MODVAT کہتے ہیں۔ اس کے ذریعے مینوفیکچرروں کو معاون پرزوں اور خام مال پر ادا شدہ ایکسائز محصول کی فوری اور مکمل باز ادائیگی ممکن ہوسکے گی۔ اس سہولت سے کیمیاوی اجزا اور متعلقہ صنعتیں پلاسٹک کی اشیاء، شیشہ، ربڑ کی مصنوعات، پینٹ اور پیکیجنگ میٹریل اور دیگر متعلقہ صنعتیں فائدہ اٹھا سکیں گی۔

دواؤں کی تیاری میں کام آنیوالے ۲۳ اجزا پر سے فاضل کسٹمز محصول ہٹا لیا گیا ہے۔ انسانی زندگی کو بچانے والی مزید ۱۴ دواؤں پر سے بھی ایکسائز محصول ہٹا لیے جانے کی تجویز ہے۔ مٹی کے تیل اور لکڑی کے ذریعے جلائے جانے والے چولہوں کو ایکسائز ڈیوٹی سے معاف کر دیا گیا ہے۔ اب تک ۳۰ روپے فی جوڑی جوتے تک ایکسائز ڈیوٹی نہیں لگتی تھی مگر اب ۴۵ روپے فی جوڑی جوتے تک ڈیوٹی نہیں لگے گی۔

اس بجٹ کے تئیں اخبارات اور عوام کا ردعمل بالعموم موافق رہا ہے۔ اسے عملی، سوجھ بوجھ والا، اور جرأت مندانہ بجٹ کہا گیا ہے، اسے ترقی کے عمل کو آگے بڑھانے میں معاون بتایا گیا ہے۔ البتہ ایک حلقہ کی رائے یہ بھی ہے کہ اس سے افراط زر کو تقویت ملے گی۔ ●

اقتصادی جائزہ

برائے ۸۶-۱۹۸۵ کی ایک جھلک

۸۶-۱۹۸۵ء کے قبل از بجٹ اقتصادی جائزہ میں، جو فروری میں پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا، کہا گیا ہے کہ سال ۸۶-۱۹۸۵ میں ساتویں پنجسالہ منصوبے کا کامیاب آغاز ہوا ہے۔ جائزے نے اُن بڑے پالیسی اقدامات کو اُجاگر کیا ہے جو اقتصادی ترقی میں ایک نئی روح پھونکنے، غریبی دُور کرنے کے پروگراموں کو مضبوط کرنے، ملک کی صنعتوں میں ایک نئی جان ڈالنے اور مالی پالیسی کو ایک نیا رُخ دینے کے لیے کئے گئے ہیں۔

جائزہ کے مطابق ملک کی مجموعی قومی پیداوار میں ۵ء۴ اور ۵ فیصد کے درمیان اضافہ ہوگا جو ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۷ء۳ فیصد کی شرح اضافہ سے کافی بہتر اور ساتویں پلان کے ۵ فیصد کے نشانہ کے بہت قریب ہوگا۔ جائزہ میں ٹیکسوں سے حاصل شدہ آمدنی میں بحالی اور اضافہ نیز موجودہ مالی سال کے پہلے دس مہینوں میں افراط زر کی شرح میں کمی کی طرف خاص طور پر توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔

زراعتی پیداوار

جائزہ میں بتایا گیا ہے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں سوکھا پڑنے کے باوجود توقع کی جاتی ہے کہ اگلے سال کے دوران زراعتی پیداوار میں ۸۵-۱۹۸۴ء کی گھٹی ہوئی پیداوار کے مقابلے میں نمایاں بحالی ہوگی۔ بوائی سے پہلے اور ربیع فصل کے شروع میں بڑی اچھی بارش ہونے کی وجہ سے مانسون کے دوران ناکافی بارش کی کسی حد تک تلافی ہو گئی ہے۔ نتیجتاً اگرچہ خریف کی پیداوار میں اضافہ کی اُمید نہیں ہے تاہم توقع کی جاتی ہے کہ ربیع کی پیداوار میں بڑا اضافہ ہوگا۔ اس وجہ سے جائزہ میں توقع کی گئی ہے کہ زراعتی پیداوار میں ۸۶-۱۹۸۵ء میں تقریباً تین فیصد کا مجموعی اضافہ ہوگا اور اس طرح اناج کی پیداوار ۱۵ کروڑ ٹن ہو جائے گی جب کہ ۸۰-۱۹۸۴ کی مجموعی پیداوار اُس سے پہلے کے سال کے مقابلے میں ۹ فیصد گھٹ جانے کی وجہ سے چودہ کروڑ ۶۰ لاکھ ٹن تھی۔

جون ۱۹۸۵ میں اناج کے ذخیروں کی مقدار دو کروڑ ۶۰ لاکھ ٹن تھی جو کہ اُس سے قبل کبھی نہیں تھی اور اُمید کی جاتی ہے کہ ربیع کی اچھی فصل کے ساتھ یہ ذخیرے زیادہ ہی رہیں گے۔ جائزہ سال کے دوران تقسیم کو بہتر بنانے کے لیے بہت بڑی کوشش کی گئی۔ غریب ترین طبقوں کو بہت زیادہ امدادی قیمتوں پر گیہوں مہیا کر کے اور دیہی بے زمین کسانوں کے لیے روزگار کی ضمانت پروگرام شروع کر کے، اور قومی دیہی روزگار کے پروگراموں کا دائرہ وسیع کر کے عام آدمی کی روزمرہ کی اشیاء کی کھپت میں بہتری لائی جا سکی ہے۔

جائزے میں کہا گیا ہے کہ فراہمی کے محاذ پر گیہوں اور چاول کے بڑھتے ہوئے ذخیروں سے فصل اُگانے کے طرز میں شاید کچھ عدم توازن ظاہر ہو یعنی کچھ فصلوں، خاص کر تلہنوں والی

اور گنے کے بدلے جن کی پیداوار کھپت سے کم ہو گئی ہے، گیہوں اور چاول کے زیرِ کاشت رقبہ میں اضافہ ہو۔ جائزے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ۸۶ - ۱۹۸۵ء کے دوران شکر اور خوردنی تیلوں کی زیادہ درآمدات کے پیشِ نظر اس بات کی ضرورت ہے کہ گنا اور تلہنوں کی اندرونِ ملک پیداوار کے لیے ترغیبات کو بہتر بنایا جائے۔

جائزے میں کہا گیا ہے کہ چینی سے متعلق دو سالہ پالیسی اور تلہنوں کی پیداوار کو فروغ دینے کے لیے متعدد اقدامات کے اعلان کے ساتھ اس سلسلے میں اہم اقدامات کئے جا چکے ہیں۔ ان اقدامات سے فصل اُگانے کے مجموعی طرز کو بہتر بنانے اور ملک میں ادائیگیوں کے توازن کو مستحکم بنانے کے علاوہ غریب کسانوں کی آمدنی کے مواقع بڑھنے میں بھی مدد ملنی چاہیئے۔

بنیادی ڈھانچہ

بنیادی ڈھانچے کے بیشتر کلیدی شعبوں میں شرحِ ترقی ۸۶ - ۱۹۸۵ء میں اس سے پہلے کے سال کی نسبت زیادہ تھی اور چھٹے پنجسالہ منصوبہ کی اوسط سالانہ شرحِ ترقی کے مقابلہ میں کافی زیادہ تھی۔ نیز کلیائی بجلی سمیت حرارتی بجلی کی پیداوار اپریل تا دسمبر ۱۹۸۵ میں ۱۹۸۴ کی اسی مدت کے مقابلے میں ۱۵٫۵ فیصد زیادہ ہوئی۔ یہ اضافہ ۸۵ - ۱۹۸۴ء میں ۲٫۴ فی صد کے شاندار اضافہ سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ ریلوں کے ذریعے مال کے نقل و حمل میں اس سال غیر معمولی اضافہ ہوا جب کہ اپریل تا دسمبر ۱۹۸۵ کے دوران مالیہ کمانے والے مال کی نقل و حمل میں ۱۹۸۴ء کی اسی مدت کے مقابلہ میں ۱۰٫۹ فیصد کا اضافہ ہوا۔ لیکن پن بجلی کی پیداوار کے سلسلہ میں کافی مایوسی رہی جن کی پیداوار میں سالِ رواں کے پہلے نو مہینوں میں گذشتہ سال کی اسی مدت کے مقابلے میں ۸٫۴ فیصد کی کمی واقع ہوئی۔ جیسا کہ توقع تھی خام تیل کی پیداوار میں شرحِ اضافہ سالِ رواں کے پہلے نو مہینوں میں گھٹ کر تقریباً ۳٫۴ فیصد ہو گیا۔ حالانکہ تیل صاف کرنے کی صلاحیت میں تقریباً ۲۲ فیصد کا اضافہ ہوا۔

جائزے میں کہا گیا ہے کہ ۸۶ - ۱۹۸۵ء میں خام تیل اور پیٹرولیم مصنوعات کی درآمدات میں تیز اضافہ اس شعبہ کا ایک پریشان کن پہلو ہے جس کی وجہ سے ادائیگیوں کے توازن پر کافی دباؤ پڑا۔ جائزے میں خبردار کیا گیا ہے کہ پیٹرولیم مصنوعات کی درآمدات میں اضافہ کی موجودہ شرح قابلِ برداشت نہیں ہے۔

قیمتیں

جائزے میں کہا گیا ہے کہ تھوک قیمتوں کے عدد اشاریہ میں مارچ ۱۹۸۵ کے آخر سے ۲۵ جنوری ۱۹۸۶ کے درمیانی عرصہ میں ۳٫۱ فیصد کا اضافہ ہوا جو کہ گذشتہ سات برسوں میں مذکورہ مدت کا سب سے کم اضافہ ہے۔ جنوری اور فروری ۱۹۸۶ کے دوران کچھ بندوبست شدہ قیمتوں میں اضافہ کیا گیا۔

مصنوعات کی قیمتوں میں ۸۶ - ۱۹۸۵ میں کافی ٹھہراؤ رہا لیکن زرعی قیمتوں میں اتھل پتھل رہا۔ کچھ چیزوں کی قیمتیں گریں اور کچھ کی بڑھیں۔ ان میں پٹ سن، کپاس، چائے اور ناریل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ زرعی اشیاء میں جن کی قیمتوں میں اضافہ ہوا وہ خاص طور سے گیہوں، سبزیاں اور چینی ہیں۔ غذائی اشیاء کی ایک بہت بڑی تعداد کی قیمتوں میں ٹھہراؤ رہا یا اُن میں قدرے کمی واقع ہوئی۔ اندرونِ ملک تیار کردہ خوردنی تیل خوراک کی اہم اشیاء ہیں جن کی قیمتوں میں سالِ رواں کے دوران ٹھہراؤ رہا۔ اس سال گیہوں کی قیمت میں اضافہ گذشتہ سال اُس کی قیمت میں کافی کمی ہونے کے بعد ہوا لیکن سبزیوں کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ ہوا۔ گنے کی پیداوار کم ہو جانے کی وجہ سے چینی کی قیمتوں میں اضافہ ہوا۔ گذشتہ کچھ برسوں میں گنے کا زیرِ کاشت رقبہ تیزی سے کم ہوا ہے۔ چینی سے متعلق حالیہ دو سالہ پالیسی کا مقصد گنے کی پیداوار کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔

زرعی اشیاء خاص طور سے غذائی اشیاء کی قیمتوں میں اضافے کا اثر اشیائے صارفین کی قیمتوں کے عدد اشاریہ پر کافی زیادہ پڑتا ہے جہاں ان اشیاء کو زیادہ وزن دیا جاتا ہے۔ نتیجتہً اشیائے صارفین کی قیمتوں کے عدد اشاریہ میں تھوک قیمتوں کے عدد اشاریہ کے مقابلہ میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا۔ اول الذکر میں مارچ اور نومبر ۱۹۸۵ کے درمیان ۵٫۷ فیصد کا اضافہ ہوا۔ اس اضافہ کا بیشتر حصہ عام نوعیت کے موسمی اضافہ کی وجہ سے ہے جو ہر سال اپریل اور اکتوبر کے درمیان ہوتا ہے —— البتہ ۸۶ - ۱۹۸۵ کے بقیہ مہینوں میں صارفین کی قیمتوں کے عدد اشاریہ میں کمی متوقع ہے۔

ادائیگیوں میں توازن

جائزے میں کہا گیا ہے کہ گذشتہ برسوں میں ادائیگیوں کے توازن میں کمی معیشت کا ایک پریشان کن پہلو ہے۔ عبوری اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ۸۶ - ۱۹۸۵ کے پہلے چھ ماہ کے

دوران پچھلے برس کی اس مدت کے مقابلے میں درآمدات میں تقریباً ۲۵ فیصد کا اضافہ ہوا، برآمدات میں صرف ۰٫۷ فیصد کی معمولی کمی واقع ہوئی اور یہ خصوصاً اس وجہ سے ہوئی کہ ملک میں تیل صاف کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہو جانے سے ۸۶-۱۹۸۵ میں خام تیل کی برآمدات میں کمی ہو گئی۔ خام تیل کی خالص برآمدات میں تقریباً ۶٫۷ فیصد کا اضافہ ہوا۔ تاہم پہلے چھ مہینوں میں تجارتی خسارہ ۴۰۰۰ کروڑ روپے بڑھ گیا۔

جائزے میں کہا گیا ہے کہ سال کے پہلے چھ مہینوں میں درآمدات میں زیادہ تر اضافہ تیل، کیمیاوی کھادوں اور چینی جیسی اشیاء نیز سرکاری پراجیکٹوں اور پروگراموں کے لیے آلات اور ساز و سامان کی درآمدات کی وجہ سے ہوا۔

جائزے میں پیش گوئی کی گئی ہے کہ بہ حالتِ مجموعی سالِ رواں کے دوران درآمدات میں مجموعی اضافہ ابتدائی رجحانات کے مقابلہ میں کافی کم ہونا چاہیئے۔

جائزے میں بتایا گیا ہے کہ غیر ممالک میں کام کر رہے ہندوستانیوں کی بھیجی گئی کثیر رقموں اور سرمایہ کی کافی درآمد، بشمول غیر مقیم جمع کھاتوں میں اضافوں کی وجہ سے بھارت کی ادائیگیوں کے توازن کو مسلسل فائدہ ہو رہا ہے۔ جائزے کے مطابق موجودہ مالی سال کے دوران جنوری ۱۹۸۶ کے خاتمے تک غیر ملکی زرِ مبادلہ کے ریزرو میں مجموعی طور پر ۳۲۴ کروڑ روپے کی کمی واقع ہوئی ہے۔

مسائل اور امکانات

مستقبل کا ذکر کرتے ہوئے جائزے میں کہا گیا ہے کہ ساتویں پنجسالہ منصوبے کی ترقیاتی حکمتِ عمل میں روزگار کے مواقع بڑھانے اور غریبی کے تناسب میں کمی لانے پر زور دیا گیا ہے۔ منصوبے کی ترقیاتی حکمتِ عمل سے توقع ہے کہ غریبی کا تناسب جو ۸۵-۱۹۸۴ میں ۳۷ فیصد تھا کم ہو کر ۹۰-۱۹۸۹ میں ۲۶ فیصد سے بھی کم رہ جائے گا۔

جائزے میں بتایا گیا ہے کہ ملک کی تین چوتھائی آبادی اب بھی گاؤں میں رہتی ہے اور ان کے رہن سہن کا سب سے زیادہ انحصار زرعی کارکردگی پر ہے۔ پچھڑے ہوئے علاقوں میں زرعی پیداوار میں سدھار لانا بہت ضروری ہے یہ صرف مجموعی پیداوار کے مفاد کے لیے ہی نہیں بلکہ ترقیات میں توازن اور دیہی غریبی کے شدید مسائل کو حل کرنے کے لیے ضروری ہے۔

جن علاقوں میں ابھی تک زراعت کو جدید نہیں بنایا جا سکا وہاں سبز انقلاب نہیں آ سکا، وہاں زرعی اصلاحات پر خصوصی توجہ کی ضرورت بتائی گئی ہے۔ ملک کے مشرقی خطے میں گیہوں اور چاول کی زیادہ پیداوار دینے والی نئی اقسام کی ترویج میں اضافہ کی تلقین کرتا ہے جہاں کہ اس وقت پیداوار شمال اور شمالی مغربی خطے سے بہت کم ہے۔ علاوہ بریں دالوں اور تلہن کی پیداوار بہتر ٹیکنالوجی کل طریقوں سے بڑھانی ہوگی۔ جائزے کے مطابق ان فصلوں کی پیداوار قیمتوں سے متعلق بہتر پالیسی کے ذریعے بھی بڑھائی جا سکتی ہے۔

جائزے میں کہا گیا ہے کہ اگرچہ وسیع البنیاد زرعی ترقی دیہات میں پھیلی ہوئی غریبی کو دور کرنے کے لیے کلیدی حیثیت کی حامل ہے تاہم اس کے ساتھ غریبی ہٹانے کے پروگراموں پر سختی کے ساتھ عمل درآمد کرنا بھی اشد ضروری ہے۔ چونکہ ہمارے زرعی اجناس کے بفر (فاضل) اسٹاک ضروریات سے کافی زیادہ مقدار میں رہنے کی توقع ہے اس لیے جائزے میں کہا گیا ہے کہ کام کے بدلے اناج کی فراہمی کو غریبی ہٹاؤ پروگراموں کا ایک حصہ تصور کیا جائے گا۔

مصنوعات کے میدان میں سروے میں امید ظاہر کی گئی ہے کہ حال ہی میں صنعتی پالیسی میں جو اقدامات کئے گئے ہیں ان کی بدولت جہاں پیداوار میں اضافہ ہوگا وہاں روزگار کے مواقع میں بھی بہتری آئے گی۔ سروے میں کہا گیا ہے کہ کہیں کہیں لاگتوں میں کمی یا اضافہ ناگزیر ہے۔ اس لیے پالیسی بناتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ لاگتیں کم سے کم رہیں اور صنعتوں کو بھی حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے کے لیے کافی وقت ملے۔ سروے میں مشین سازی کی صنعت کی ترقیاتی ضروریات کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

سروے میں اس حقیقت کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی گئی ہے کہ بنیادی ڈھانچے کی تسلی بخش کارکردگی ہی پر زراعت و صنعت کی ترقی کا دار و مدار ہے۔ توانائی کے سیکٹر میں بہتر کارکردگی کی اہمیت پر بھی سروے میں زور دیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ قومی پی ایل ایف اوسط میں ایک فیصد اضافہ کا مطلب ۵۰۰ میگاواٹ نئی صلاحیت کا اضافہ کرنا ہے جس کی قیمت ۵۰۰ کروڑ روپے ہے۔ اسی طرح تقسیم اور ترسیل میں ضائع ہونے والی توانائی میں ایک فیصد پوائنٹ کمی کا مطلب ہر برس ۴۵۰ کروڑ روپے کی زائد آمدنی ہے۔

جائزے میں رواں دہے کے آخری نصف حصہ کے دوران ادائیگیوں میں توازن کی مشکل صورتِ حال سے متعلق گزشتہ دو

جیسس کے اقتصادی جائزوں کی مانند احتیاط برتی گئی ہے۔ اس کے پیچھے بہت سے حقائق کارفرما ہیں۔ مثلاً اندرونِ ملک تیل کی پیداوار کی شرح اضافہ میں متوقع کمی، بین الاقوامی تجارت میں تحفظاتی رجحانات، گزشتہ بیرونی قرضہ جات کی ادائیگی کا بوجھ، رعائتی امداد کے ممکنات میں کمی اور غیر ملکوں سے آنے والی رقوم کی غیر یقینی صورتِ حال۔

جائزے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ خود اعتمادی، مسلسل ترقی اور ادائیگیوں میں توازن کا دارومدار، درآمدات کے بدل کے حصول اور برآمدات کو بڑھانے میں ہے۔ سروے میں کہا گیا ہے کہ برآمدات میں اضافہ کا بدل ملک کے ضروری اشیاء کے درآمداتی بل میں کمی لانا ہے لیکن اس سے اقتصادی ترقی پر بُرا اثر پڑ سکتا ہے یا پھر غیر ملکی قرضہ جات میں اضافہ جس سے قرضوں کی ادائیگی کی ذمہ داریاں ناقابلِ برداشت ہو جائیں گی۔ لہذا سروے میں دونوں ہی صورتوں کو ناقابلِ قبول ٹھہرایا گیا ہے۔

سروے میں کلیدی بھاری درآمدات کے لیے ملک کے اندر منتخبہ متبادلات تیار کرنے پر بھی زور دیا گیا ہے۔ سروے کے مطابق اندرونِ ملک پٹرولیم کی پیداوار میں اضافہ کرکے اس کی درآمدات کو آخر کار کم کرنا ہوگا۔

درمیانہ مدت میں سروے کے مطابق پٹرولیم کی مانگ کو پورا کرنے کی غرض سے دو رُخی پالیسی اختیار کرنا پڑے گی۔ جہاں ایک طرف توانائی میں اس کے استعمال کو کم سے کم کرنا ہوگا وہاں اس کی پیداوار کو بھی بڑھانا ہوگا اور پٹرولیم کے علاوہ دوسرے وسائل ڈھونڈ نکالنے ہوں گے۔ سروے رپورٹ میں ایسے اقدامات پر زور دیا گیا ہے جن کی بدولت چینی اور خوردنی تیلوں جیسی اشیاء کی پیداوار میں اضافہ کیا جا سکے کیونکہ ایسی زرعی اجناس کی درآمد ہم بہت زیادہ مقدار میں کرتے ہیں۔

سروے میں بتایا گیا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے زرعی اجناس کی قیمتیں مقرر کرنے کی ایک منظم اور طویل المدت حکمتِ عملی اختیار کرنی ہوگی۔ اور متعلقہ فصلوں اور متعلقہ علاقوں میں ضروری زرعی بنیادی ڈھانچے کو تیار کرنا ہوگا۔

مالی معاملات کا جہاں تک تعلق ہے۔ سروے میں غیر منصوبہ جاتی مالی اخراجات پر محتاط کنٹرول کرنے کو کہا گیا ہے اور ساتھ ہی رواں مالی پالیسی پر کاربند رہنے کی تلقین کی گئی ہے تاکہ آمدنی میں اضافہ کیا جا سکے۔ سروے میں کہا گیا ہے کہ مالی پالیسی کا ایک اہم کام متوازی اقتصادیات کے مسئلے سے نمٹنا ہے اس کے لیے ہمیں متوازی اقتصادیات کی تہہ میں کارفرما اقتصادی وجوہات کو ختم کرنے کی اپنی موجودہ پالیسی پر گامزن رہنا ہوگا اور اس کے ساتھ ہی اقتصادی اور مالی قوانین پر مضبوطی کے ساتھ عمل درآمد کرنا ہوگا۔ سروے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ساتویں پنجسالہ منصوبے کی تکمیل کے لیے افراطِ زر کے بغیر سرکاری اداروں کی بہتر کارکردگی سے طے کردہ نشانوں کو پورا کرنا ہوگا۔ سروے میں کہا گیا ہے کہ سرکاری اداروں میں تعین کی جانے والی قیمتیں قابلِ قبول کارکردگی کے ساتھ معیاری لاگتوں کی مظہر ہونی چاہئیں لہٰذا پوری معاشیات کے ساتھ سرکاری زمرہ کی کارکردگی میں بہتری لانے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

بقیہ: دیہی بینک کاری اور اس کی چنوتیاں

یہ وقت ہے کہ حکومت بینکنگ سہولیات میں تال میل کے علاوہ ٹرانسپورٹ، مواصلات اور مارکیٹنگ وغیرہ جیسی بنیادی سہولیات کا اہتمام کرے۔

دیہی علاقوں میں بینکوں کے پاس اس قدر عملہ نہیں ہوتا جو ہر قرضے کی تفصیل کے ساتھ نگرانی کرے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مسئلہ پر کیوں کر قابو پایا جائے کہ اس کا ظاہرا حل یہ ہے کہ ہر دیہی شاخ میں کافی عملہ رکھا جائے اور کام نپٹانے پر آنے والی لاگت میں معمولی کمیشن کا اضافہ کیا جائے یا حکومت اپنے بجٹ کے وسائل میں سے زیادہ تربیت دینے کا اہتمام کرے۔ بینکوں یا حکومت کو قرضے کی نگرانی کی کارروائی کے لیے خصوصی تربیت فراہم کرنا ہوگی۔

لیکن بینک یا حکومت کی طرف سے ایسی سرمایہ کاری کا فیصلہ کئے جانے سے پہلے چند رہنما پراجیکٹوں میں اس تجویز کو آزمانا اور یہ معلوم کرنا قابلِ قدر ہو سکتا ہے کہ کھاتوں کی متواتر دیکھ بھال کر کے قرضے اور پیداوار کا تناسب کیونکر بڑھایا جا سکتا ہے۔ قرضے کے بغیر کام کرنے والے نواحی کاشتکاروں کی بہتر تکنیکوں کے نتائج کو دیکھ کر ہر قرضے کی پیداواریت میں قدرے اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح قرضوں کے غیر مؤثر استعمال سے ہونے والے نقصانات کا نہ صرف کسانوں کے لیے بلکہ مجموعی طور پر تمام ملک کے لیے بھی حساب لگایا جا سکتا ہے۔ بعد ازاں کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے لاگت سے ہونے والے فائدے کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ قرضوں کے بعد کی جانے والی ایسی مفصل کارروائی سے قرضہ دینے کے سسٹم کی کارکردگی میں مدد ملے گی۔ اور اس سے شائد قرضوں کے ضابطوں میں بھی تبدیلی ہو سکتی ہے۔

این۔ پی۔ سنگھ[1]

نوجوانوں کے مسائل اور امکاناتِ ترقی

ہندوستان کی کُل آبادی کا تقریباً ۸۰ فیصد حصہ دیہات میں رہتا ہے۔ دیہی آبادی میں نوجوانوں کی تعداد کافی زیادہ ہے اور وہ گاؤں کے ترقیاتی پروگراموں اور دیگر تمام سرگرمیوں کے بارے میں فیصلے کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ نوجوان قوم کی اُمید اور ملک کا مستقبل ہیں۔ ملک کے تمام باشندوں کی اُمیدیں اور اُمنگیں نوجوانوں کے اندر چھپی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں پر مرکوز ہیں۔ اگر دیہی نوجوانوں کو مناسب تعلیم و تربیت اور تحریکِ عمل عطا کی جائے تو ان کی قوتوں اور صلاحیتوں کو قومی ترقی کے لیے زیادہ موثر اور نتیجہ خیز انداز میں بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔

دیہی نوجوان قوم کی طاقت کا ایک اہم حصہ ہیں۔ ملک کی کُل آبادی میں اُن کی تعداد ایک چوتھائی کے برابر یا دوسرے الفاظ میں چودہ کروڑ سے زیادہ ہے۔ طاقت کے اس اہم سرچشمہ کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ چوں کہ دیہی نوجوان ملک کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ اس لیے ان پر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہی دیہی عوام کا رُخ اقتصادی، سماجی اور زرعی ترقی کی جانب موڑ سکتے ہیں۔ اس کام کے لیے انھیں زندگی کے تئیں ترقی پسندانہ رُجحان پیدا کرنا ہوگا اور ہمہ جہت ترقی کی جدید تکنیکوں کو سیکھنا ہوگا۔

دیہی نوجوانوں کو دو زمروں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک زمرے میں طالب علم یا اسکول جانے والے نوجوان شامل ہیں اور دوسرے زمرے میں غیر طالب علم نوجوان یا وہ نوجوان جو بیچ میں ہی تعلیم چھوڑ چکے ہیں۔

دیہی نوجوان کچھ اہم خصوصیات کے حامل ہیں۔ انھیں بآسانی تبدیلی کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے۔ ان کے اندر ایثار اور قربانی اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کا بھلا کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں خواہ وہ اسکول جاتے ہوں یا نہ جاتے ہوں، ایسے پروگراموں کو جلد قبول کرتے ہیں جو اُن کی عمر کے مطابق ہوں۔ اس لیے اگر ان کی خدمات کو استعمال میں نہ لایا جائے اور ان کی اُمنگوں اور آرزوؤں کو پورا نہ کیا جائے تو ملک کی تعمیر و ترقی ممکن نہ ہوگی۔

ملک میں ۱۵ سے ۲۵ سال تک کی عمر کے اَن پڑھ بالغوں کی تعداد گیارہ کروڑ ہے۔ غریبی، جہالت اور بیماری کو ختم کرنے کے لیے انھیں تعلیم دینا بہت ضروری ہے۔

مختلف پروگرام

آزادی سے پہلے کے زمانے میں دیہی نوجوانوں کی فلاح و بہبود کے لیے سرکاری ایجنسیوں اور رضا کارانہ اداروں نے بہت کم کام کیا۔ برطانوی اقتدار کے عہد میں سرکار نے دیہی یا شہری نوجوانوں کو منظم کرنے اور انھیں کلاس روم سے باہر کی تعلیم یا عملی تربیت پر کوئی توجہ نہیں دی۔ البتہ کچھ غیر سرکاری

---

[1] موصوف کرشی وگیان کیندر، انڈین کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ، نئی دہلی میں سائنٹسٹ ہیں۔

تنظیموں نے ضرور اس طرف دھیان دیا اور کہیں کہیں اس ضمن میں تھوڑی بہت کوششیں بھی ہوئیں۔ لیکن دیہی نوجوانوں کو منظم کرنے کا خیال پہلی مرتبہ ۱۹۲۴ء میں مارتنڈم (مدراس) میں ڈاکٹر ایس ڈی۔ ہیچ کے ذہن میں آیا۔ انھوں نے اس کی شروعات کی اور مختلف سماجی، ثقافتی، تفریحی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ معاشی پراجیکٹ شروع کیے گئے اور انھیں اولیت دی گئی۔

حصولِ آزادی کے بعد حکومتِ ہند نے دیہات کے نوجوانوں کی بہتری کے لیے مختلف پروگرام شروع کیے۔ وزارتِ اجتماعی ترقی نے ۱۹۶۰ء میں نوجوانوں کی تربیت اور ان کی تنظیموں کی حوصلہ افزائی کی سفارش کی۔ اس کے نتیجے میں ملک میں دیہی نوجوانوں کے کچھ کلب قائم ہوئے جن کا مقصد نہ صرف نوجوانوں کو بہتر کسان بنانا تھا بلکہ اُن کے اندر زندگی کی اعلیٰ اقدار، بہتر عادات و رجحانات اور ہنرمندیاں پیدا کر کے انھیں دیہی سماج، ریاست اور قوم کا بہتر، باخبر اور کارآمد شہری بنانا تھا۔

چوتھے پنجسالہ منصوبے کی مدت میں دیہات کے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کے لیے "یووک منڈلوں" کو محرکات فراہم کرنے کی نئی اسکیمیں شروع کی گئیں۔ گرام سیوک ٹریننگ سینٹر قائم کیے گئے جہاں گاؤں کے نوجوانوں کو گھریلو باغبانی، پھل دار درخت لگانے، مرغیاں پالنے، شہد کی مکھیاں پالنے، بھینسوں اور بچھڑوں کی پرورش اور خوراکی اشیا کو آئندہ استعمال کے لیے محفوظ رکھنے کی تربیت دی جاتی تھی۔

لیکن کثیر النوع کوششوں کے باوجود "یووک منڈلوں" یا نوجوانوں کے کلبوں کی کارکردگی تسلی بخش نہیں پائی گئی۔ اس کی کئی وجوہ تھیں مثلاً ابتدائی سرمایے کی ناکافی بہم رسانی، زرعی اراضی کا گروپ پراجیکٹوں کے لائق نہ ہونا، حکومت سے مالی امداد کی کمی، دیہی یووک منڈلوں کی سرگرمیوں کے لیے جگہ اور سہولیات کی کمی، دیہی اداروں اور یووک منڈلوں کے درمیان تال میل کی کمی، بلاک کے عملے سے زیادہ مدد یا تعاون نہ ملنا، یووک منڈلوں کے پاس مختلف سرگرمیوں کے لیے وقت کی کمی، یووک منڈلوں کے تئیں والدین کی بے حسی، گھریلو دشواریاں، خراب معاشی حالات، گھرانوں کے لوگوں کی گروہ بندیاں، رہنمائی کی کمی وغیرہ۔

لہٰذا حکومت نے ہر ضلع میں "نہرو یووک کیندر" شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جن کا مقصد نوجوانوں کی سرگرمیوں کے لیے بنیاد فراہم کرنا تھا۔ یہ کیندر نوجوانوں میں تحریکِ عمل پیدا کریں گے اور نوجوانوں کی ہمہ جہت ترقی کے لیے مختلف سرکاری ایجنسیوں کی سرگرمیوں میں تال میل پیدا کریں گے۔

چوں کہ دیہی علاقوں میں روزگار کے مواقع محدود ہوتے ہیں اور محنت مزدوری کا جو کام ملتا ہے وہ کھیتی باڑی ہی کا ہوتا ہے۔ اس لیے وہاں پر کام کے مواقع پیدا کرنے کے لیے خصوصی کوششوں کی ضرورت ہے۔ اسی بات کو دھیان میں رکھتے ہوئے۔ وزارتِ دیہی ترقی نے سال ۱۹۷۹ میں دیہی نوجوانوں کی تربیت کی ایک قومی اسکیم (TRYSEM) شروع کی تاکہ اس تربیت کے بعد وہ اپنے لیے خود روزگار پیدا کر سکیں۔ اس پروگرام کے تحت ۱۸ سال سے ۲۵ سال تک کے نوجوانوں کو مختلف کام دھندوں کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔

سال ۸۱-۱۹۸۰ میں حکومتِ ہند کی وزارتِ دیہی ترقی نے کام کے بدلے خوراک کے پروگرام (FFWP) کا نام بدل کر "قومی دیہی روزگار پروگرام (NREP)" رکھا۔ اس پروگرام کا مقصد دیہات کے بے روزگار نوجوانوں کو سال کے اُن مہینوں میں فائدہ مند روزگار مہیا کرنا ہے جب کھیتی باڑی کا کام نہیں ہوتا۔ اس پروگرام کے تحت مرکزی حکومت جو امداد دیتی ہے اس میں صرف خوراک ہی نہیں نقدی بھی شامل ہوتی ہے۔ قومی دیہی روزگار پروگرام (NREP) کے تحت چھٹے پنجسالہ منصوبے میں دیہات میں کام نہ ہونے کے مہینوں میں ایک سال میں روزگار کے ۳۰ کروڑ تا ۴۰ کروڑ نفری ایام کا اہتمام کرنے کا نشانہ پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔ اس پروگرام کے اثرات کا پتہ لگانے کے لیے آندھرا پردیش میں ایک جائزہ لیا گیا جس سے معلوم ہوا کہ لوگوں کی اکثریت اس پروگرام کو فائدہ مند سمجھتی ہے کیوں کہ اس سے بے روزگاروں کو مقامی طور پر ہی روزگار مل جاتا ہے اور انھیں اپنا گھر چھوڑ کر شہروں کا رخ نہیں کرنا پڑتا۔

اس پروگرام میں "نقدی یا جنس" کی صورت میں ادائیگی کا جو اہتمام ہے اسے بھی بہت سے مزدوروں نے پسند کیا۔ ان کی ایک ہی شکایت تھی کہ کام کی مدت بہت مختصر ہوتی ہے۔

ملک بھر میں اس پروگرام پر عمل درآمد کی ذمہ داری ڈسٹرکٹ رورل ڈیولپمنٹ ایجنسیوں کو سونپی گئی ہے۔

وزارتِ تعلیم نے رہنمائی کی صلاحیت پیدا کرنے کی غرض سے نوجوانوں کے لیے ایک تربیتی نصاب کی اسکیم شروع کی۔ تاکہ نوجوانوں،

خاص کر غیر طالب علم نوجوانوں میں رہنمائی کی صلاحیت پیدا کی جا سکے جس سے کہ وہ اپنے اپنے علاقے میں نوجوانوں کی بہبود و بہتری کی سرگرمیاں شروع کر سکیں۔ وزارتِ اطلاعات و نشریات نے بھی ریڈیو پر نوجوانوں کے لیے "یُووانی" کے نام سے ایک خاص پروگرام شروع کیا۔

مذکورہ بالا پروگراموں کی روشنی میں اس بات کی ضرورت ہے کہ مرکزی حکومت ایک وسیع، جامع اور مربوط پروگرام شروع کرے جس کے ذریعے دیہات کے نوجوانوں کے مسائل وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی بے روزگاری، ناخواندگی، غریبی اور جہالت کو حل کیا جا سکے۔ دیہی نوجوانوں کی مدد کرنے اور ان کے لیے ایسے حقیقت پسندانہ اور قابلِ عمل پراجیکٹ اور پروگرام بنانے اور زیرِ عمل لانے کے لیے سنجیدہ غور و خوض کی ضرورت ہے، جن سے نوجوانوں کو سماج کی ترقی کے لیے زیادہ کارآمد اور پیداواری بنایا جا سکے۔

نئی ٹیکنالوجی، صنعت کاری اور تعلیم کی توسیع و اشاعت کی بدولت دیہی عوام کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ اس کے نتیجے میں دیہی نوجوانوں کی آرزوئیں اور امنگیں بھی کافی بدل گئی ہیں اور وہ اپنے آبائی پیشوں کو چھوڑ کر بہتر روزگار اور بہتر زندگی کی تلاش میں شہری علاقوں کا رُخ کرنے پر آمادہ ہیں۔ دیہی علاقوں سے شہری علاقوں میں اُن کی نقل مکانی کو روکنے کے لیے اپنا روزگار خود شروع کرنے کے لیے دیہی نوجوانوں کی تربیت (TRYSEM) اور "قومی دیہی روزگار پروگرام" (NREP) کو مزید مستحکم بنانے کی ضرورت ہے۔

ان پروگراموں پر عمل درآمد میں کیا دشواریاں ہیں، اس کا پتہ لگانے کے لیے تحقیقی جائزوں کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دشواریوں اور رکاوٹوں کو دُور کرکے انھیں اور موثر اور با معنی بنایا جا سکے۔ خود روزگاری کے لیے دیہی نوجوانوں کی تربیت کی اسکیم میں پہلے تو اس بات کا پتہ لگایا جانا چاہیئے کہ دیہی نوجوانوں کی ضرورت کے مطابق کون سے کاموں اور پیشوں کی تربیت دی جانی چاہیئے نیز یہ کہ ان مختلف توسیعی طریقوں کے ذریعے انھیں کس قدر وسائل دستیاب ہیں دوسری اہم بات خاص خاص پیشوں کی تربیت کے لیے موزوں تربیتی اداروں کی شناخت کرنا ہے۔ جیسے آئی ٹی آئی کی پرائیویٹ تنظیمیں، رضاکارانہ تنظیمیں، دوسرے پبلک ادارے، کاشتکاروں کی ٹریننگ کے مراکز اور کرشی وگیان کیندر وغیرہ۔ خود روزگاری کے لیے دیہی نوجوانوں کو تربیت دینے کی ایک اسکیم کے لیے منظوریاں عطا کرنے کے طریقِ کار کو سادہ بنانا چاہیئے۔ بجائے اس کے کہ نیچے سے اوپر تک مختلف مراحل سے گزر کر کوئی اسکیم مرکز تک منظوری کے لیے پہونچے، مرکز کو اپنی منظوری براہِ راست اچھی ساکھ رکھنے والی رضاکارانہ تنظیموں اور آئی ٹی آئی، کرشی وگیان کیندر اور ایف ٹی سی جیسے اہم تربیتی اداروں کو دینی چاہیئے۔ دیہات میں روزگار کے قومی پروگرام کو بڑے پیمانے پر سارے ملک میں توسیع دینی چاہیئے۔ کام کے ایام کو بھی بڑھانا چاہیئے۔ تاکہ کھیتوں میں کام نہ ہونے کے موسم میں دیہی نوجوانوں کو زیادہ دنوں تک دوسرے کام کرنے کا موقع ملے۔

تجاویز

دیہی نوجوان کلبوں کو صحیح معنوں میں بنانا چاہیئے۔ اور اگر گاؤں کی سطح پر ایسے کلب منظم کرنے میں کچھ مشکلات ہوں تو انھیں کرنا چاہیئے تاکہ یہ کلب زیادہ موثر انداز کام کر سکیں۔ یہ کلب قومی پروگرام کا اہم حصّہ تصور کئے جاتے ہیں کیوں کہ ان نہ صرف زرعی پیداوار بڑھانے میں ملکہ نو میں تیارت کی صلاحیت پیدا کرنے اور روزگار کے مواقع بہم پہونچانے میں مدد ہے۔

۲۔ نوجوانوں کے طرزِ زندگی کو بہ بنانے کے لیے باضابطہ اور بے ضابطہ تربیت کے پروگرام لازمی تصور کئے جا چاہیئے۔

۳۔ ملک کے سماجی و معاشی ڈھا میں مناسب تبدیلیاں لانے اور ہر شہری معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کے مشترکہ مق کو پورا کرنے کے لیے دیہی نوجوانوں کو ت کے عمل میں شریک کرنا ضروری ہے۔ جس کہ وہ سماج کے دوسرے طبقوں کے شانے سے شانہ ملا کر کام کر سکیں۔

۴۔ نوجوان کلبوں کا پروگرام، دو سماجی پروگراموں کی طرح اجتماعی ترقی کے پروگرام کا ہی ایک حصّہ ہے۔ وقت آگیا ہمارے رہنما، پالیسی ساز اور اربابِ کشاد دیہی نوجوانوں کی ترقی کے پروگرام کو ترجیح دیں اور انھیں نہ صرف دیہی ہندوستا بلکہ تمام ملک کا نقشہ بدل ڈالنے کے لیے مضبوط طاقت بنائیں۔

۵۔ دیہی نوجوان کلبوں کے مالیہ

پر، ان کے ڈھانچے سے متعلق امور کی بہ نسبت زیادہ زور دیا جانا چاہیئے۔ مقامی تنظیموں جیسے گاؤں پنچایتوں، کوآپریٹو اداروں اور اسکولوں کو بھی پروگرام میں سرگرم انداز میں شامل کرنا چاہیئے اور جو کام ہو چکے ہوں انھیں مزید مستحکم کرنے کا کام بلاک اور دیگر ایجنسیوں کو کرنا چاہیئے۔

۶۔ دیہی نوجوانوں میں وسیع پیمانے پر ناخواندگی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تعلیم بالغان کے قومی پروگرام کو مندرجہ ذیل امور پر زور دیتے ہوئے توسیع دی جانی چاہیئے۔

(ا) چھ سے چودہ برس تک کی عمر کے اسکول نہ جانے والے بچوں کی بے ضابطہ یا غیر رسمی تعلیم۔

(ب) ۱۵ سے ۲۵ سال تک کے نوجوانوں کے لیے تعلیم بالغان اور

(ج) کام چلانے لائق خواندگی کو ترقیاتی اسکیموں سے جوڑنا۔

۷۔ دیہات میں رہنے والے نوجوانوں میں اکثریت ان نوجوانوں کی ہے جو بیچ بیچ میں اسکول جانا چھوڑ دیتے ہیں۔ کرناٹک کی ریاستی کونسل برائے تعلیم بالغان نے ۱۹۷۰ء میں ایک تحقیقی جائزے کا اہتمام کیا جس سے نوجوانوں کے بیچ میں اسکول چھوڑ دینے کی مندرجہ ذیل وجوہات کا پتہ چلا:-

۱۔ بالغوں سے پوچھے بغیر جماعتوں میں ان کا داخل کیا جانا۔

۲۔ جماعت میں نہ جانے کے لیے سماجی دباؤ۔

۳۔ گھر پر بہت زیادہ کام ہونے کی وجہ سے اسکول جانے کا وقت نہ ملنا۔

۴۔ زراعتی کاموں کا، اسکول میں حاضری کی راہ میں حائل ہونا۔

۵۔ اساتذہ کا باقاعدگی سے اسکول نہ آنا۔

۶۔ کلاسوں میں ہم جماعتوں کی بے قاعدہ حاضری۔

طالب علم بڑی تعداد میں بیچ بیچ میں اسکول جانا چھوڑ دیتے ہیں، اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہمارے منصوبہ سازوں، سیاستدانوں اور اربابِ بست و کشاد کو ان کی سماجی و اقتصادی ترقی کے لیے ایک خصوصی پروگرام بنانا چاہیئے۔ اس سلسلے میں صفِ اوّل کے توسیعی پروگرام، فارم سائنس سینٹروں کے ذریعے جنھیں کرشی وگیان کیندر بھی کہا جاتا ہے، کچھ کوششیں بھی کی گئی ہیں۔ ایسے سینٹر زرعی تحقیق کی بھارتی کونسل نے ملک کے مختلف حصوں میں دیہی نوجوانوں میں بیداری پیدا کرنے اور انھیں موجودہ ضرورتوں کے مطابق ٹریننگ دینے کے لیے قائم کئے ہیں۔ ملک کی ۲۳ ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں میں اس وقت تک ۸، کرشی وگیان کیندر قائم کئے جا چکے ہیں۔ ان کیندروں کا بڑا مقصد نہ صرف اپنے کیمپس میں بلکہ گاؤوں میں بھی کسانوں، بیچ میں تعلیم چھوڑ دینے والوں، کسان عورتوں، ماہی گیروں اور توسیعی کارکنوں کو مقامی ضرورت کے مطابق ایسی تربیت دینا ہے جس سے پیداوار میں اضافہ ہو سکے۔ کرشی وگیان کیندروں نے بیچ میں اسکول چھوڑ دینے والے نوجوانوں کے لیے مختصر اور طویل المدت نصابات کا ایک خاص تربیتی پروگرام بنایا ہے جس سے اپنا روزگار آپ شروع کرنے میں نوجوانوں کی مدد کی جا سکے۔ یہ کیندر گاؤوں کے اسکولوں میں فارم سائنس کلب بھی چلا رہے ہیں جن کے ذریعے نوجوان نسل میں زرعی اور زراعت سے متعلق سائنسوں اور سائنٹفک ڈھنگ سے کھیتی باڑی کرنے میں دلچسپی پیدا کی جاتی ہے۔

ہماری تجویز ہے کہ ساتویں پنجسالہ منصوبے کے دوران متعلقہ محکمے دیہی نوجوانوں کے فائدے کے لیے ملک بھر میں کم از کم ایک ہزار فارم سائنس کلب قائم کریں۔

کرشی وگیان کیندروں کو ایک مناسب مدت کے بعد کرشی اور اُدیوگ وگیان کیندروں میں بدلا جا سکتا ہے اور ان میں مربوط دیہی ترقی کے پروگرام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے گھریلو دستکاریوں نیز گھریلو صنعتوں کی تربیت کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے کچھ کرشی اور اُدیوگ وگیان کیندر فوری طور پر شروع کئے جا سکتے ہیں اور بعد میں ان کی تعداد بڑھا کر ملک کے ہر ضلع میں کم از کم تین کی جا سکتی ہے۔ موجودہ کرشی وگیان کیندروں میں صنعتی تربیت کو شامل کرنے میں سائنسی اور صنعتی تحقیق کی بھارتی کونسل کی مدد لی جا سکتی ہے۔

ان کیندروں کی اہمیت اور دائرہ عمل کو تسلیم کرتے ہوئے زراعت سے متعلق قومی کمیشن (۱۹۷۱-۷۳ء) نے بھی یہ سفارش کی تھی کہ چھٹے پنجسالہ منصوبے کے اختتام تک ملک کے ہر ضلع میں ایک کرشی وگیان کیندر اور سن ۲۰۰۰ء تک ہر ضلع میں تین کرشی وگیان کیندر قائم کر دئے جانے چاہئیں۔

ایکسٹنشن کے بارے میں ریسرچ سے متعلق دوسرے کل ہند سیمینار (۱۹۷۹ء) نے مرکزی سطح پر ایک نیشنل یوتھ کمیشن (نوجوانوں سے متعلق قومی کمیشن) اور ریاستوں کی سطح پر یوتھ بورڈ (نوجوانوں کے بورڈ) قائم کرنے کی سفارش کی تھی۔ دیہی نوجوانوں کی تربیت کی ایک طویل المدتی حکمتِ عملی کے طور پر اس سفارش کو جلد عملی جامہ پہنایا جانا چاہیئے۔ تاکہ ملک میں دیہی نوجوانوں کے پروگراموں کو بڑھایا اور مستحکم کیا جا سکے اور قوم کو زیادہ خوشحال بنایا جا سکے۔

●

راجیندر سنگھ اور وی. کے. جین

دیہی بینک کاری اور اس کی چنوتیاں

گو دیہات میں بینک ترقیاتی سرگرمیوں میں حصہ لے رہے ہیں تاہم ایک مسئلہ ہے قرضوں کی وصولی کا، فاضل مصنفین نے تمام تر مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے بعض اقدامات کا سجھاؤ دیا ہے اور حکومت سے بعض بنیادی سہولیات فراہم کرنے کو کہا ہے۔

کمرشل بینکوں کو جب ۱۹۶۹ میں قومی ملکیت میں لیا گیا تھا تب اُن کی ۸۲۶۲ شاخیں تھیں۔ اُن کے پاس ۴۶۶۵ کروڑ روپے کے ڈیپازٹ جمع تھے اور انھوں نے ۳۶۰۹ کروڑ روپے کے قرضے دے رکھے تھے۔ لیکن ان کے مقابلے میں ان کی شاخوں، ڈیپازٹوں اور قرضوں میں بھاری اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ ۲۹ رجولائی ۱۹۸۳ تک ان کی شاخوں کی تعداد تقریباً ۴۱ ہزار تک پہونچ چکی تھی۔ اُن کے پاس ۵۵۲۰۲ کروڑ روپے کے ڈیپازٹ تھے اور وہ ۴۱۶۵۳ کروڑ روپے کے قرضے تقسیم کر چکے تھے۔ مارچ ۱۹۸۳ تک اُن کی شاخوں کی تعداد ۴۱۱۸۲ ہوگئی تھی جن میں سے تقریباً ۵۰ فیصد یعنی کوئی ۲۱۹۳۲ شاخیں دیہی علاقوں میں کام کر رہی تھیں۔

خامیاں

اب بینکوں کی سرگرمیوں کی ہیئت ہی بدل گئی ہے اور اُن کی طرف سے زیادہ تر دیہات میں اقتصادی لحاظ سے پسماندہ لوگوں کو قرضے دئے جا رہے ہیں تاکہ زرعی پیداوار میں اضافہ کیا جا سکے۔ اس طرح گذشتہ ۱۵ برس سے بینکوں کی طرف سے ترجیحی سیکٹروں کو بھاری قرضے دئے جانے لگے ہیں۔ لیکن قرضوں کی تقسیم میں بعض ایسی خامیاں سرائت کر گئی ہیں جن سے پلاننگ میں سوچے گئے سماجی مقاصد پورے نہیں ہو سکے۔

بعض بڑی بڑی خامیاں درج ذیل ہیں:-

۱۔ قرضوں کے معاملے میں تال میل نہ ہونے اور بعد میں نگرانی کے فقدان سے شائد قرضہ غیر پیداواری مقاصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا ہے۔

۲۔ قرضوں کے بڑے پیمانے پر زائدالمیعاد ہو جانے سے بینکوں کو تشویش ہو گئی ہے۔ کمرشل بینکوں کی طرف سے زرعی سیکٹر کو دیے گئے تقریباً ۵۰ فیصد براہِ راست قرضوں کی میعاد پوری ہو چکی ہے۔ دیہی علاقوں میں قرضوں کی توسیع اور لوگوں کی بھاری تعداد کو اُن سے فیضیاب کرنے کے لیے اس امر کا یقین کرنا ضروری ہے کہ زائدالمیعاد ہونے والے اور ناقابلِ وصولی قرضوں کو کم از کم سطح پر رکھا جائے۔ لہٰذا قرضوں

کے صحیح استعمال کی مؤثر نگرانی بھاری اہمیت کی حامل ہے۔

۳۔ دیہی شاخوں کے دھڑا دھڑ کھلنے سے بینکوں کے منافعوں میں کمی ہو گئی ہے۔ چونکہ ترجیحی سیکٹر میں فی قرضدار قرضہ کی رقم کم ہے اور قرضوں کی واپسی کو یقینی بنانے کے لیے بعد کی کارروائی اور نگرانی درکار ہے اس لیے کمرشل بینکوں کے قرضوں پر بھاری لاگت آتی ہے۔ گو سردست ترجیحی سیکٹروں کو دئے جانے والے قرضوں میں جو نقصان ہو رہا ہے اُسے بینک دیگر سیکٹروں کے بڑے بڑے قرضداروں سے ہونے والے بھاری منافع کے باعث جذب کر رہے ہیں تاہم یہ مسئلہ آنے والے برسوں میں بھاری اہمیت اختیار کرے گا۔ جب ریزرو بینک آف انڈیا کے رہبرانہ خطوط کے مطابق ترجیحی سیکٹر کے قرضوں میں بھاری اضافہ ہونے کی اُمید ہے۔

تال میل ضروری

کمرشل بینک کسانوں کی قرضوں سے متعلق ضروریات کو کیسے کر پورا کریں؟ اور اس امر کا یقین کیونکر کیا جائے کہ بینکوں کی طرف سے دئے جانے والے قرضوں سے کسان اپنی آمدنی کو زیادہ سے زیادہ بڑھاتے ہیں؟ ان اہم سوالات کا ماہرین کے ایک گروپ نے تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا جسے ریزرو بینک نے مقرر کیا تھا اور جس کے صدر تھے ڈاکٹر گنونت ایم ڈیسائی ڈپروفیسر انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ احمدآباد)۔ اس گروپ نے سفارش کی کہ جن ریاستی اور مرکزی منتظمہ علاقوں کی حکومتوں نے ابھی تک ڈائرکٹر آف انسٹی ٹیوشنل فائننس کا آفس قائم نہیں کیا انھیں بلاتاخیر اُس کا قیام کرنا چاہیئے۔ ضلع ایڈمنسٹریشن، زمینی پانی کے محکموں، ڈائریکٹوریٹ آف ایگریکلچر اور دیگر متعلقہ محکموں کو لازمی ہدایات دی جائیں کہ وہ زرعی قرضے کی اسکیمیں بنانے والے اداروں کو معلومات فراہم کریں۔ ریاستی حکومتوں کو اُن اسکیموں کے سلسلے میں قرضوں کی وصولی کی ذمہ داری لینی چاہیئے جن کا اہتمام اُن کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ بلاک میں کام کرنے والے بینکوں کے مینیجروں کو بلاک ترقیاتی کمیٹیوں کی اُن میٹنگوں میں مدعو کیا جائے جو اداراتی قرضوں کے معاملوں پر غور کرنے کے لیے بلائی جاتی ہیں۔ لیکن حقیقی عمل میں ریاستی حکومتوں کی طرف سے تال میل نہیں کیا جارہا ہے۔ انھیں صرف اُن مطلوبہ گروپوں میں دلچسپی ہے جن میں امداد بانٹتی ہیں۔ یہ صحیح وقت ہے جب سرکاری محکموں اور بینکوں کو خصوصاً اُن مطلوبہ گروپوں کی نشاندہی اور بلاک سطح کے پلانوں کی تیاری کے لیے بھی مل کر کام کرنا چاہیئے۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کے تصور کو مناسب طور پر سمجھا جائے اور مختلف اہل کاروں کی ذمہ داری کے لیے اُن کے رول کا تعین کیا جائے۔ حکومت اور بینکوں کی طرف سے تمام سطحوں پر کافی عملہ فراہم کیا جانا چاہیئے۔ بلاک سطح پر مختلف محکموں میں کام کرنے والے اہل کاروں کو بلاک ڈیولپمنٹ افسروں کے انتظامیہ کنٹرول کے تحت لازمًا لایا جائے۔ سردست وہ بیشتر ریاستوں میں اپنے محکموں کے لیے آزادانہ طور پر کام کر رہے ہیں۔

عدم وصولی

ترجیحی سیکٹروں خصوصاً زراعت کے لیے دئے گئے قرضوں کی وصولی کا مسئلہ بینکوں کے لیے متواتر باعث تشویش بنا ہوا ہے۔ اور بینکوں کے فنڈوں کی بہت بڑی رقم کی گردش رُکی ہوئی ہے۔ عام طور پر بینکوں کو زائدالمیعاد زرعی قرضوں کا تقریباً ۵۰ فیصد بوجھ اُٹھانا پڑ رہا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں فنڈوں کی گردش رُک گئی ہے۔ جس سے نئے کئی مستحق کسان اداراتی قرضوں میں اپنے حق سے محروم ہو رہے ہیں۔

اپریل ۱۹۷۹ میں قائم کی گئی کمیٹی، کال کوب Cal Cob کی رپورٹ سے انکشاف ہوا ہے کہ قرضوں کی زیادہ تر عدم وصولی کے چھ اسباب ہیں:-

(ا) قرضداروں کی نشاندہی اور انتخاب کے بارے میں ناقص سسٹم اور ضابطے۔

(ب) قرضوں کی درخواستوں کو نپٹانے اور قرضوں کی تقسیم کے ضابطوں میں خامیاں۔

(ج) قرضوں کے استعمال کی نگرانی کا فقدان۔

(د) ارادتاً نادہندگی۔

(س) قدرتی آفات یا (س) بے سوچی سمجھی سرمایہ کاریاں۔

گو بینکنگ نظام چھوٹے قرضداروں کی مشکلات کے تئیں جو اقتصادی ماحول سے پیدا ہوتی ہیں بے اعتنائی اختیار نہیں کر سکتا تاہم وصولی میں نرمی برتنے سے اس کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ بینکوں کو کافی عملہ فراہم کرنا چاہیئے جو قرضوں کے بعد کی کارروائی کر سکیں اور اس امر کا یقین کر سکیں کہ ان قرضوں کا صحیح استعمال ہو رہا ہے اور ان کی وصولی ہو رہی ہے۔

اگرچہ بیشتر ریاستوں نے تلواڑ کمیٹی کی سفارشات کی بنا پر قانون بنائے ہیں بعض حالتوں میں جہاں ایسے قانون بنائے گئے ہیں وہاں کوئی قواعد مرتب نہیں کئے گئے ہیں یا قواعد

کی تعمیل کے لیے مشینری کا قیام نہیں کیا گیا۔

پبلک سیکٹر کے بینکوں کی طرف سے دئے گئے قرضوں کے بڑھتے ہوئے بقایا جات سے نپٹنے کے لیے برطانیہ اور فرانس کی طرز پر بازیابی ٹریبونلوں کے قیام کا بڑا زور شور سے چرچا ہوا ہے لیکن ابھی تک اس تجویز کو عمل میں نہیں لایا گیا۔ اس تجویز کا مقصد یہ ہے کہ ضلعی سطح پر ایڈجوڈیکیشن آفس، ریاستی سطح پر ٹریبونل اور ایک بالائی (ایپکس) کمیٹی کا قیام کیا جائے جس کا نام رکھا جائے "بینک بقایا جات کی بازیابی سے متعلق مرکزی بورڈ" یہ تین سطحی ڈھانچہ تلواڑ کمیٹی کی سفارشات سے بھی آگے چلا جائے گا جس نے زور دیا تھا کہ بینک بقایا جات کو سرٹیفکیٹ کارروائی کے ذریعے لگان سے اراضی کے بقایا جات کے طور پر وصول کیا جائے اگرچہ خیال کیا جاتا ہے کہ تقریباً ۱۰ ہزار روپے کا بینک قرضہ ایک کروڑ ۳۰ لاکھ کھاتوں میں دیا گیا ہے جو اُدھار کھاتوں کی کل تعداد کا ۹۳ فیصد ہے۔ جسے سماجی بینک کاری کی جانب ایک بڑا قدم بتایا جاتا ہے تاہم ترجیحی سیکٹر اور سماج کے کمزور طبقوں کو دئے گئے ہر ۱۰۰ روپے میں سے کم از کم ۱۵ روپے وصول نہیں کئے گئے۔

یہاں اس امر کا ذکر کرنا برمحل ہوگا۔ I.B.A. بنکوں کی بھارتی تنظیم نے ریزرو بنک کے سامنے کئی تجاویز رکھی ہیں جن کا مقصد بقایا جات کے فیصد کو کم کرنا ہے۔ ان میں "پبلک ڈیمانڈز ریکوری ایکٹ" کے تحت زرعی قرضوں کی وصولی، کمرشل بینک قرضوں کی وصولی کی خصوصی طور پر دیکھ بھال کرنے کے لیے خاص افسروں کی تقرری اور وصولی کے لیے تین سال کی میعاد کو سات سال تک بڑھانے کو کہا گیا ہے۔

شرح منافع: منافعوں میں مرکزی کمی کے موضوع پر حالیہ برسوں میں بڑی بحث ہوئی ہے۔ بعض حلقوں میں یہ تاثر زور پکڑ رہا ہے کہ منافع کا تصور سماجی بینک کاری کے کردار سے لگا نہیں کھاتا۔ لیکن یہ قابل عمل حل نہیں ہے۔ نہ ہی ہم "نہ منافع نہ خسارہ" کی بنیاد پر کام کرنے کے بارے میں سوچ سکتے ہیں جس کا مطلب ہوگا اندرونی وسائل کی تخلیق اور اس سے ہونے والی امکانی ترقی کو قربان کرنا۔ اگر بینکوں نے آئندہ نقصانات کو جذب کرنے کے لیے کافی ریزرو فنڈ قائم نہ کئے تو نقصانات انجام کار سماج کو پورے کرنے ہونگے کیونکہ بینکوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سماج کی اقتصادی بہبود کے لیے کام کر رہے ہیں۔

کام کاج پر بڑھتی ہوئی لاگت، ترجیحی سیکٹروں کے لیے قرضے دئے جانے والے فنڈوں میں سے ۴۰ فیصد کی تخصیص "ڈی آئی آر" مختلف شرح ہائے سود پر دیے جانے والے قرضوں کے لیے ایک فیصد کی تخصیص، بے سوچے سمجھے قرضوں اور دیہی علاقوں میں بیشتر فائدہ نہ دینے والی شاخوں کے کھولے جانے سے بینکوں کے منافع میں بڑی کمی ہوگئی ہے۔ نارسیمان کمیٹی نے دیہی علاقوں میں بہت بھاری تعداد میں بینک شاخوں کے کھولے جانے کے خلاف انتباہ کیا تھا۔

حالیہ برسوں میں دیہی علاقوں میں جو شاخیں بڑی تعداد میں کھولی گئی تھیں وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے میں پچھڑ گئی ہیں کیوں کہ انھوں نے ابتدائی مرحلوں میں ضروری توجہ اور احتیاط سے کام نہیں لیا۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ ایک شاخ کو خصوصاً دیہی علاقوں میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے ۵ سے ۶ برس لگتے ہیں۔ بینکوں کو شاخ کے نظام کے بارے میں ایک واضح حکمت عملی اختیار کرنی چاہیئے جو کام کاج کے علاقے، شاخ سے مستفید ہونے والے علاقوں اور اس سے مستفید ہونے والی آبادی کے تعین پر مبنی ہو اور جس میں آبادی (شہری آبادی اور کام کرنے والی آبادی) خواندگی کی شرح اور زرعی مزدوروں وغیرہ کے عناصر پر غور کرکے ڈیپازٹوں کے امکانات کا پتہ لگایا گیا ہو۔

بینک کے منافع بخش کردار کا جائزہ لینے کے لیے اس شرح سود پر بہت زیادہ انحصار کرنا ہوگا ہے جس پر فنڈ شاخوں سے ہیڈ آفس کو منتقل کئے جاتے ہیں تاکہ وہ اُن دیگر شاخوں کی طرف سے قرض دئے جانے کے لیے استعمال کئے جا سکیں جو اُن سے واقعی منافع حاصل کر سکیں اور وہ منافع محض "کتابی اندراج" Book Entry نہ ہو جیسا کہ اکثر کمزور بازائد المیعاد کھاتوں کے معاملوں میں ہوتا ہے۔

دیہی قرضوں کی نوعیت

پہلے بینکنگ کے تصور میں سلامتی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ اب اسے سماجی بینکنگ تصور کے طور پر وسعت دی گئی ہے جو ترقی کے لیے دئے جانے والے قرضے کے مقصد پر مبنی ہے۔ سماجی بینکنگ کا مقصد یہ تصور ہونا چاہیئے "گاؤں کو بہتر بناؤ، ملک بہتر ہو جائیگا" لیکن دیہی علاقوں میں موزوں توسیعی منصوبہ بندی اور قرضوں کے استعمال کی موزوں نگرانی کے بغیر اور بنیادی سہولیات قائم کئے بغیر شاخوں کا کھولنا ایسا ہی ہے جیسے برساتی کھنبیوں کی مانند پیدا ہونے دیا جائے اور اس طرح سفید ہاتھی بننے دیا جائے۔

(باقی صفحہ ... پر)

سی۔ ایس۔ ویدانت

جنگلات کا تحفّظ

مربُوط اور ہمہ گیر پالیسی کی ضرورت

صاحبِ مضمون کا کہنا ہے کہ جنگلات کی بربادی کے سبب ملک کو ہونے والے عظیم نقصانات سے بچانے کے لیے حکومت کو متبادل انتظامات کے ذریعے جنگلات پر دیہی عوام کے حد سے زیادہ انحصار کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ہماری تمام تر کوشش اس نصب العین کو حاصل اور جنگلات کی مزید بربادی کو روکنے پر مرکوز ہونی چاہیئے۔

کہا جاتا ہے کہ ایتھوپیا پر حال ہی میں جو تباہی نازل ہوئی ہے اس کی بڑی وجوہات میں سے ایک وہاں کے جنگلات کی گذشتہ پچاس سالوں میں وسیع پیمانے پر بربادی ہے۔ اس دَوران میں وہاں جنگلات کا رقبہ کل جغرافیائی رقبے کے پچاس فیصد سے گھٹ کر تین فیصد سے بھی کم رہ گیا ہے! ایتھوپیا میں زرعی اراضی کی پیداواری صلاحیت زمین کے کٹاؤ کے سبب بہت کم ہوگئی ہے۔ یہ تمام ترقی پذیر ملکوں کے لیے اس بات کی سخت تنبیہہ ہے کہ اگر وہ اس قسم کی تباہی سے بچنا چاہتے ہیں تو انھیں جنگلات پر اُس سے کہیں زیادہ توجہ دینی ہوگی جتنی کہ وہ اس وقت دے رہے ہیں۔ جنگلات سے بے توجہی کے لیے جو بھاری قیمت دینی پڑتی ہے اس سے ہر شخص کو ہوشیار و خبردار ہوجانا چاہیئے۔

ہندوستان کو بھی ایسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑ سکتا ہے، کیوں کہ یہاں بھی گذشتہ کئی دہائیوں میں بہت بڑی تعداد میں نئے نئے کارخانوں کے کھلنے، زراعت کی توسیع ہونے اور آبادی میں اضافے سے جنگلات کی وسیع پیمانے پر بربادی ہوئی ہے۔ جنگلوں کے بچے کھچے نشانات پر بھی مقامی باشندوں کے حقوق کا بار ہے۔ بہرکیف اب ایسا نظر آتا ہے کہ حکّام اور عوام دونوں جنگلات کی بربادی کے خطرات سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ آج گاؤں کے ایک عام آدمی کو بھی جنگلات کی تباہی کے نتائج کا پہلے سے کہیں زیادہ احساس ہے۔ یہ بات اور ہے کہ وہ اس تباہی کو روکنے کے لیے زیادہ کچھ نہ پا رہا ہو۔ آج وہ بے بس ہے کیونکہ اسے اپنے مویشیوں کے لیے چارہ اور گھر کے لیے ایندھن جُٹانا ہوتا ہے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ ان چیزوں کے لیے متبادل انتظامات کرکے دیہی عوام کے، جنگلات پر حد سے زیادہ انحصار کو ختم کرے۔ ملک کو اپنے وسائل اس نصب العین کو حاصل کرنے پر لگانے ہوں گے۔ جب تک ایسا نہیں کیا جاتا، ہمارے

جنگلات کی تباہی و بربادی بلا کم و کاست جاری رہے گی۔

مویشی پروری اور چراگاہوں کی ترقی

دیہات کے لوگوں کو خاص کر چارے اور ایندھن کی ضروریات پوری کرنے کے لیے جنگلات کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ جنگلوں اور عام زمینوں پر چرنے والے مویشیوں کی تعداد، جتنا چارہ دستیاب ہے اُس سے کہیں زیادہ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان زمینوں پر چرنے والے مویشیوں کو دستیاب چارے کی قسم اور مقدار دونوں گھٹتی جا رہی ہیں۔ اس کی وجہ سے مویشیوں کا پیٹ نہیں بھرتا اور ان کی پیداواری صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ اس سے کسان کو اپنی پیداوار کو برقرار رکھنے کے لیے زیادہ بڑا گلّہ رکھنا پڑتا ہے۔ اس طرح ایک مذموم سا چکّر شروع ہو جاتا ہے جسے توڑنا بہت مشکل ہے۔

ہمارے ملک میں کسان مویشیوں کے بڑے گلّے خاص کر کھاد کے لیے رکھتے ہیں۔ یہ مویشی یا تو دودھ بالکل نہیں دیتے یا دیتے ہیں تو بہت کم۔ جنگلات کے بندوبست سے متعلق منصوبوں میں حد سے زیادہ چرائی کے مسئلے پر بارہا غور و خوض ہوا ہے اور اکثر یہ تجویز کیا گیا ہے کہ مویشی چرانے کے لیے بھاری فیس مقرر کر دی جانی چاہیئے جس سے کہ غیر پیداواری مویشی رکھنے میں کسانوں کی حوصلہ شکنی ہو۔ لیکن اس قسم کے اقدامات کو عوام پسند نہیں کرتے۔ لہٰذا وہ اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے حکومت پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ وہ ایسی کارروائی کرنے سے باز رہے۔ کچھ ریاستوں میں چرائی کی فیس بالکل ختم کر دی گئی ہے جس سے افسر جنگلات اتنا بے بس ہو گیا ہے کہ وہ جنگل میں یا دوسری چراگاہوں میں چرائی کو منضبط بھی نہیں کر سکتا ہے۔

کرناٹک میں مغربی گھاٹ پر جانوروں کے پیروں تلے مسلسل روندے جانے اور ایندھن اور ماضی میں عمارتی لکڑی کے لیے درختوں کے اندھا دھند گرائے جانے کے سبب سدا بہار اور نیم سدا بہار جنگلوں کی کایا بدل گئی ہے۔ آج وہاں کچھ مفید اور سدا بہار نسلوں کے درختوں کا اُگنا بند ہو گیا ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ان نسلوں کے درخت ناپید ہو جائیں گے۔ کرناٹک کے محکمۂ جنگلات نے اس قسم کی نایاب نسلوں کے درختوں کی قلمیں پَود گھروں میں تیار کرنے اور پھر انھیں ایسے سدا بہار و نیم سدا بہار جنگلوں میں لگانے کی اسکیمیں بنائی ہیں، جہاں ان کا خود بخود اُگنا بہت کم ہو گیا ہے لیکن جب تک چارے، ایندھن اور عمارتی لکڑی کا حق رکھنے والوں کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا جاتا، ان اسکیموں سے زیادہ کامیابی حاصل ہونے والی نہیں ہے۔

صورتِ حالات کی درستی کے لیے ضروری ہے کہ بہتر طریقوں سے مویشی پروری اور گھاس والی زمینوں اور چراگاہوں کے سائنٹفک بندوبست کی تعلیم کے پروگرام وضع کئے جائیں اور ان دونوں پروگراموں کو باہم مربوط کیا جائے تاکہ نکمّے اور غیر پیداواری مویشیوں کی تعداد گھٹائی جا سکے، گھاس والی زمینوں پر گھاس کی پیداوار بڑھائی جا سکے اور مویشیوں کی نسل بہتر بنائی جا سکے۔ غیر پیداواری نسلوں کے بڑھنے کو روکنے کے لیے گھٹیا مویشیوں کو خصّی کر دینا چاہیئے۔

مربوط دیہی ترقی کے پروگرام (IRDP) اور خشک سالی والے علاقوں سے متعلق پروگرام (DPAP) کے تحت ملک میں مویشیوں کی نسل بہتر بنانے اور بگڑی ہوئی چراگاہوں اور سبزہ زاروں کی پیداوار بڑھانے کے لیے متعدد اسکیمیں چل رہی ہیں۔ لیکن قباحت یہ ہے کہ یہ پروگرام الگ الگ چل رہے ہیں اور ان کے درمیان تال میل نہیں ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کوئی ایجنسی بعض اسکیموں کے تحت جنگلات کے علاقوں میں بھیڑ بکریاں تقسیم کرتی ہے اور یہ جانور جنگلوں کے دشمن ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ہر وہ ایجنسی جو دیہی ترقی کے پروگرام میں شامل ہے خود کو اپنے میدان میں خود مختار سمجھتی ہے۔ ان مسائل کو حل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ تمام متعلقہ ایجنسیوں کے عمیق غور و خوض کے بعد ہر ضلع کے لیے ایک ماسٹر پلان بنایا جائے۔

چرائی کی ضابطہ بندی

چراگاہوں اور سبزہ زاروں کے اچھے بندوبست کے لیے زمین کی مویشیوں کو چارہ مہیا کرنے کی صلاحیت کے مطابق چرائی کو کچھ ضابطوں کے تحت لانا ضروری ہے۔ چراگاہوں میں غذائیت بخش اور خوش مزہ گھاس کے بجائے رُوکھی اور بے ذائقہ قسموں کی گھاس نہ اُگنے لگے اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک چراگاہ میں کچھ وقت کے لیے چرائی بند کر دی جائے اور مختلف چراگاہوں میں باری باری سے مویشیوں کو چرایا جائے۔ لیکن جب تک خود لوگوں کو چراگاہوں یا سبزہ زاروں میں حد سے زیادہ چرائی کے نقصانات کا علم نہ ہوگا اس وقت تک ایسا کرنا مشکل ہوگا۔ لہٰذا کسان کو ان نقصانات سے آگاہ کرنے کے لیے تحریک عمل فراہم کرنے والے توسیعی ورکروں کی ایک بڑی جمعیت درکار ہوگی۔ پھر بھی یہ بات یقینی

ہوگی کہ گاؤں والے منضبط چرائی کا کوئی طریقہ اختیار کریں گے۔ اس پر انھیں آمادہ کرنے کے لیے بعض ترغیبی محرکات کی ضرورت ہوگی۔

ان بنیادی مسائل کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ چراگاہوں اور سبزہ زاروں کی زمین دھیرے دھیرے کم ہوتی جارہی ہے۔ حکومت پر اس بات کے لیے کافی دباؤ ہے کہ وہ چراگاہوں کی زمین بے زمین کسانوں کو کھیتی باڑی کے لیے الاٹ کردے۔ زرعی مقاصد کے علاوہ چراگاہوں کی زمینوں کو ترقیاتی پراجیکٹ وغیرہ کے لیے بھی استعمال کیا جارہا ہے۔ لیکن یہ دیکھنا ضروری ہے کہ عوام کی فوری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے قوم کے طویل المدت مفاد کو قربان نہ کیا جائے۔ اس بارے میں جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں تو قوم کو قدرتی و جغرافیائی حالات میں ہونے والی تباہ کن تبدیلیوں سے بچانا ہے۔

بے دھواں چولہے

ایندھن کی صلاحیت کو بہتر بنانے کے لیے بے دھواں چولہے بنائے گئے ہیں۔ (ایندھن کی صلاحیت سے مراد پیدا شدہ حرارت کا وہ فیصد تناسب ہے جسے مفید طور پر کام میں لایا جائے) بے دھواں چولہے ایندھن کی صلاحیت کو ۵۰ فیصد تک بڑھا دیتے ہیں جبکہ عام چولہوں کی ایندھن کی صلاحیت صرف ۱۵ فیصد ہوتی ہے۔ چنانچہ موزوں ڈیزائن والے بے دھواں چولہوں سے ایندھن کی پچاس فیصد بچت ہوئی ہے۔ یہ چولہا ۴۰۰ روپے سے بھی کم لاگت سے بنایا جاسکتا ہے۔

ملک میں ایک سال میں ایک گھر میں تقریباً ۳۰۰۰ کیلو لکڑی ایندھن کے طور پر جلائی جاتی ہے۔ اگر بے دھواں چولہوں کے استعمال کے ذریعے پچاس فیصد ایندھن کی لکڑی بچائی جاسکے تو ایک گھر ہر سال ۱۹۰۰ کیلو لکڑی بچا لیگا جو درمیانہ سائز کے چالیس درختوں کے برابر ہوگی۔ جنگلات ملک کے مختلف حصوں میں یکساں انداز میں پھیلے ہوئے نہیں ہیں جہاں جنگل موجود ہیں وہاں ایندھن حاصل کرنے کا بڑا ذریعہ جنگلوں کی لکڑی ہی ہے۔ لیکن جن خطوں میں جنگل نہیں ہیں وہاں خشک جھاڑ جھنکار، نیزے، سرکنڈے اور گوبر وغیرہ کو بطور ایندھن استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو دیہی آبادی کا ایک حصہ ہی ایندھن کے لیے جنگلوں سے ملنے والی لکڑی پر انحصار رکھتا ہے۔ جنگلات پر ایندھن کی لکڑی مہیا کرنے کا بوجھ ختم ہوسکتا ہے اور عورتوں کا وہ وقت جو لکڑی جمع کرنے پر خرچ ہوتا ہے بچ سکتا ہے بشرطیکہ جنگلات کی نواحی بستیوں کے لوگوں میں بے دھواں چولہے مفت تقسیم کرنے کا پروگرام بنایا اور زیر عمل لایا جائے۔

گوبر گیس پلانٹ

کھیتوں کی گلی سڑی اور بے کار اشیاء کو نہ صرف ٹھکانے لگانے بلکہ ان کا فائدہ مند استعمال کرنے میں گوبر گیس پلانٹوں نے ایک انقلاب برپا کردیا ہے۔ حکومت کے زیر سرپرستی چلائے جانے والے اس پروگرام کے تحت امدادی رقوم بھی دی جاتی ہیں مگر اس کا کیا جائے کہ اوسط درجے کا کسان پلانٹ کے لیے دو تین ہزار روپے لگانے کی بھی استطاعت نہیں رکھتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ گوبر گیس پلانٹ گاؤں میں عام نہیں ہوسکے ہیں گو عام گاؤں والا گوبر گیس پلانٹ کے فوائد سے باخبر ہے۔

بھارت میں بجلی کے پراجیکٹوں پر عظیم سرمایہ کاری ہوئی ہے لیکن خام مال کے دستیاب نہ ہونے، کارکنان اور منیجروں کی نااہلیت اور آلات کے گھسے پٹے ہونے کے سبب ان پراجیکٹوں کو دشواریاں پیش آرہی ہیں جن کا نتیجہ بھاری نقصانوں کی شکل میں نکل رہا ہے۔ ان نقصانات کو پورا کرنے کے لیے ملک کو اپنے قیمتی وسائل کا ایک بڑا حصہ صرف کرنا پڑ رہا ہے۔

اس قسم کی سرمایہ کاری کے بارے میں ہمارا جو تجربہ ہے اس کی روشنی میں ضروری ہو سکتا ہے کہ گاؤں کے کسانوں کو پوری کی پوری امدادی قیمت پر گوبر گیس پلانٹ مہیا کرنے کے لیے اور زیادہ روپیہ فراہم کیا جائے۔ گوبر گیس پلانٹوں کے موثر استعمال سے ملک بہت کچھ بچا سکے گا۔ اور گاندھیائی فلسفے کے مطابق حقیقی خود مختاری کی طرف بڑھ سکے گا۔

سبھی متعلقہ شعبوں میں تال میل کی ضرورت

افسر جنگلات کی فنی قابلیت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ یہ تو اس کے قابو سے باہر دوسرے عناصر ہیں جو جنگلات پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ جنگلات کا فروغ دوسرے شعبوں سے الگ تھلگ بے تعلق رہ کر نہیں ہوسکتا۔ اگر جنگلات کے فروغ کاروں کی کوششوں میں کامیابی مقصود ہے تو ہمیں جنگل بانی کو درپیش بنیادی مسائل کے تئیں ایک ایسا نقطۂ نگاہ اختیار کرنا ہوگا جس میں سبھی متعلقہ شعبوں کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ ورنہ جنگلات پر مسلسل زد پڑتی رہے گی جو ہم سب کے لیے سب سے زیادہ افسوسناک بات ہوگی۔

●

غریبی دُور کرنے کے پروگرام

صنعتوں اور معدنیات کے لیے ۴۲۰۵ کروڑ ۸۳ لاکھ روپے رکھے گئے جبکہ پچھلے سال ان مدّات پر ۲۳۰۴ کروڑ ۴ لاکھ روپے خرچ کئے جانے تھے۔

غریبی دُور کرنے کے پروگراموں کے تحت ایک بڑی جست لگائی گئی اور ان پروگراموں کے اخراجات میں ۶۵ فیصد اضافہ کیا گیا۔ اس طرح یہ رقم ۸۶-۱۹۸۵ کی ۹ ۳۹ ۱۲ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۸۷-۱۹۸۶ میں ۱۸۵۱ کروڑ روپے تک پہونچ گئی۔ اس سلسلے کے تحت شروع کئے گئے پروگراموں میں دیہات میں روزگار کے قومی پروگرام کے تحت سب سے زیادہ رقومات رکھی گئی ہیں یعنی اس مد کے اخراجات میں ۹۳ فیصد اضافہ کیا گیا ہے اور ۸۶-۱۹۸۵ میں اس پر ۲۳۰ کروڑ روپے کے اخراجات ہونے تھے جو بڑھ کر ۸۷-۱۹۸۶ میں ۴۴۸ کروڑ روپے کے بقدر ہو جائیں گے۔ اسی طرح دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام کے تحت اور دیہات کے بے زمین افراد کے لیے روزگار کی ضمانت کے پروگرام کے تحت رقومات بڑھا دی گئی ہیں۔ دیہات میں پانی کی فراہمی کی اسکیموں کے لیے ۱۷۳ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں، زراعت اور متعلقہ سیکٹر کی سرگرمیوں میں اضافے کے ذریعے بھی غریبی دُور کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ زراعت کے لیے مجموعی مرکزی اخراجات میں ۲۹ فیصد اضافہ کیا گیا ہے۔ اور یہ رقم ۸۶-۱۹۸۵ کی ۲۲۰۷ کروڑ روپے سے بڑھ کر ۸۷-۱۹۸۶ میں ۲۸۳۸ کروڑ روپے ہو گئی۔ دیہی ترقی کے سیکٹر میں اس سال ۱۵۰۹ کروڑ روپے کے اخراجات رکھے گئے جب کہ پچھلے سال یہ ۱۱۰۹ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے تھے اور نظرثانی شدہ اخراجات ۱۲۳۳ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے تھے۔

بیس نکاتی پروگرام

مرکزی منصوبے میں ۸۷-۱۹۸۶ کے لیے بیس نکاتی پروگرام کو بروئے کار لانے کے واسطے ۵۹۹۸ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں جو ایک سال قبل کے مقابلے ایک ہزار کروڑ روپے زیادہ ہیں۔ شیڈولڈ کاسٹ، شیڈولڈ ٹرائب اور بندھوا مزدوروں کے لیے ایک نئی اسکیم کے تحت جسے "اندرا آواس یوجنا" کا نام دیا گیا ہے، تعمیر مکانات کے واسطے ۱۲۵ کروڑ روپے کے اخراجات رکھے گئے ہیں۔

انسانی وسائل کا فروغ

انسانی وسائل کے فروغ کے لیے ۸۷-۱۹۸۶ میں ۱۷۳۳ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ جو ۸۶-۱۹۸۵ کے مقابلے ۴۰ فیصد زیادہ رقم ہے۔ جبکہ صرف ۱۲۳۶ کروڑ روپے اس مد کے لیے رکھے گئے تھے اس سیکٹر کے تحت کئے جانیوالے اخراجات تعلیم، کھیلوں، نوجوانوں کے معاملات، صحت، خاندانی بہبود، عورتوں کی بہبود، ماحولیات، فنونِ لطیفہ اور براڈ کاسٹنگ کے لیے ہیں۔ ساتویں منصوبے میں انسانی وسائل کے فروغ پر زبردست زور دیا گیا ہے۔ تعلیم کے لیے پچھلے سال کے مقابلے ۵۹ فیصد زیادہ رقم رکھی گئی ہے، ۸۷-۱۹۸۶ میں اس مد پر ۳۵۲ کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے، جبکہ پچھلے سال ۲۲۱ کروڑ روپے رکھے گئے تھے۔ نیشنل اوپن یونیورسٹی کے لیے ساڑھے سات کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ ہر ضلع میں ماڈل اسکول کھولنے کے لیے ۲۵ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ ۸۷-۱۹۸۶ میں اس طرح کے ۵۰ اسکول کھولے جائیں گے۔ ساتویں منصوبے میں ہر ضلع میں اس طرح کا ایک اسکول قائم کیا جا چکا ہوگا۔ ہندوستان کے مشترک کلچر کو بڑھاوا دینے کے لیے علاقائی ثقافتی مراکز کھولنے کی تجویز ہے۔ اس مقصد کے لیے اس سال فنونِ لطیفہ و ثقافت کے محکمے کو ۵۹ کروڑ روپے دئے جائیں گے جبکہ پچھلے سال ۱۹ کروڑ روپے دئے گئے تھے۔ اس مد پر اخراجات میں ۲۰۰ فیصد سے بھی زیادہ اضافہ کر دیا گیا ہے۔

گنگا کی صفائی کے پروگرام کیلئے ۸۷-۱۹۸۶ میں ۵۲ کروڑ روپے دئے جائیں گے جبکہ ۸۶-۱۹۸۵ میں ۱۰ کروڑ روپے دئے گئے تھے۔ بے کار پڑی اراضی کے فروغ کے لیے ۱۵ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ اب تک اس سلسلے میں کئے گئے کام کو سُست رفتار سمجھ کر ایسا قدم اٹھایا گیا ہے۔ سماجی جنگل بانی کے لیے ۲۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

دیگر اخراجات

دفاعی اخراجات میں ۱۱ فیصد اضافہ کیا گیا ہے اور ۸۷-۱۹۸۶ کے لیے ۸۷۲۰ کروڑ روپے رکھے ہیں جبکہ ۸۶-۱۹۸۵ کے لیے ۷۸۶۲ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ خوراک اور کیمیاوی کھادوں پر سبسڈی ۸۶-۱۹۸۵ کی سطح پر رہے گی اور اس کے لیے ۳۷۰۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

بجٹ کا فرق

۸۷-۱۹۸۶ میں ٹیکسوں کی نئی تجاویز کے زیر اثر ۴۸۸ کروڑ روپے مل سکیں گے۔ ان میں سے ریاستوں کا حصہ ۴۳ کروڑ روپے ہوگا اور باقی ۴۴۵ کروڑ روپے مرکز کو جانے ہونگے۔ اس سے بجٹ کا خسارہ ۳۶۵۰ کروڑ روپے تک پہونچ جائے گا جو ۸۶-۱۹۸۵ کے خسارے سے کم ہے۔ معیشت کے حجم کے تعلق سے یہ خسارہ معقول حد تک ہے۔ اس سے افراطِ زر کو تقویت نہیں ملے گی۔

دیگر اہم باتیں

پبلک سیکٹر میں چھوٹی سرمایہ کاری کرنے والوں کی مدد کے لیے ایک نیا فنڈ کھولا جائے گا۔ یہ یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا کی معاونت سے کام کرے گا۔ مجوزہ فنڈ کی یونٹوں میں سرمایہ کاری انکم ٹیکس ایکٹ کے تحت سرمائے کے منافعوں سے مستثنیٰ ہوگی۔ اس کے علاوہ پراویڈنٹ فنڈ پر سود کی شرح میں بڑھا کر ۱۲ فیصد کر دی گئی ہیں۔ ختم

(باقی صفحہ پر)

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without prepayment
at NDPSO, New Delhi.

Vol. 6 No. 1 YOJANA (URDU) 1-15th April 1985

ہمارے ملک کے معاشی نظام کا انحصار پنجسالہ منصوبوں پر ہے، چھٹا پنجسالہ منصوبہ کچھ عرصہ ہوا مکمل ہو چکا ہے اور اس نے ۱۹۸۰ سے ۱۹۸۵ تک ملک کی معاشی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کی کارکردگی کو ماہرین اقتصادیات نے تسلی بخش کہا ہے۔ اس عرصے میں ملک میں مجموعی قومی پیداوار کی شرح کا اوسط ۵ فیصد کے لگ بھگ رہا۔ ۸۰-۱۹۷۹ میں ملک میں خوراکی اجناس کی پیداوار ۱۰ کروڑ ۹۰ لاکھ ٹن تک تھی مگر ۸۵-۱۹۸۴ میں یہ بڑھ کر ۱۵ کروڑ ٹن تک پہنچ گئی۔ گویا تقریباً ۵ سال میں ۴۰ فیصد کے لگ بھگ اضافہ ہو سکا۔ ہمارے ملک میں سرمایہ کاری کی شرح بھی کافی تسلی بخش ہے اور زراعت، آبرسانی، ازجی، ٹرانسپورٹ، کمیونیکیشن وغیرہ میں کافی سرمایہ کاری کی جا رہی ہے۔ ان معاشی شعبوں کی کارگزاری کے سبب ہمارے ملک کی اقتصادیات پر خاطر خواہ اثر مرتب ہونے شروع ہو رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں افراط زر کی شرح بھی مقابلتہً کم ہے۔ اداشیوں کے توازن کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہمیں ایسے بہت سے مسائل کا سامنا نہیں جیسا کہ اکثر ترقی پذیر ملکوں کو۔ منصوبہ بند ترقی کے نتیجے میں ہمارے ملک کا اقتصادی ڈھانچہ خود کفیل بنتا جا رہا ہے۔ ساتویں پنجسالہ منصوبے میں خود کفیلی کے استحکام اور غریبی دور کرنے کے پروگراموں پر خصوصی زور ہے۔ ہمارے ملک میں ترقیاتی پروگراموں کا مقصد محض اقتصادی خوشحالی ہی نہیں بلکہ ان کے ذریعے مساوات اور سماجی انصاف کو ٹھوس بنیادوں پر پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یوم آزادی سے آج تک ہمارے ملک میں ترقی کے سلسلے میں جو رہنمایانہ اصول اپنائے گئے تھے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ساتویں منصوبے میں سالانہ شرح ترقی کو ۵ فیصد یقینی بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام کے لیے رضاکارانہ کوششیں جاری ہیں تاکہ ان کے ذریعے نہ صرف اقتصادی خوشحالی کا دور دورہ ہو بلکہ ملک کے عوام کی صحت کا معیار بھی بڑھے۔ گزشتہ منصوبوں کی کارگزاری پر نگاہ دوڑانے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کے غریب ترین عوام میں اشیائے ضروری کی کھپت کی شرح بڑھی ہے۔ البتہ امیر گھرانوں میں اشیا کی کھپت کا معیار پہلے جیسا ہی ہے۔ اس سے یہ اندازہ تو ہوتا ہے کہ منصوبہ بند ترقیاتی پروگرام غریب کی حالت سدھارنے کے لیے اپنا کام کر رہے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ کام اور تیزی سے انجام دینے کی ضرورت باقی ہے۔ ملک کے معاشی نظام میں کھیتی باڑی کا نظام کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ زراعتوں اور صنعتوں میں تال میل کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے اس کام میں پیش رفت دیکھنے کو ملی ہے۔ زرعی محاذ پر کئی فصلوں کی پیداوار میں اگرچہ انقلاب آیا ہے لیکن ہر خطے میں ہر فصل کی پیداوار کا اوسط جدا جدا ہے۔ بہر صورت زراعت اور صنعتوں میں قریبی تعلق قائم کیے بغیر عوام کو زیادہ سے زیادہ حد تک فائدہ [illegible] جا سکتا۔ زراعت کی ترقی کے لیے آبرسانی کا نظام کیمیاوی کھادوں کی تیاری اور کسانوں کو ان کی پیداوار کے نفع بخش دام کو یقینی بنانا ضروری ہے۔ ان کے ذریعے سے ہی زرعی اشیا کی پیداوار بڑھ سکتی ہے۔ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ ہندوستان میں قحط جیسی صورت حالات سے مکمل نجات حاصل کر لی گئی ہے جبکہ یہ لعنت بہت سے ترقی پذیر ملکوں میں ابھی تک باقی ہے۔ آج ہندوستان میں نہ صرف گھریلو ضرورتوں کو پورا کر لیا جاتا ہے بلکہ بوقت ضرورت یہ دوسروں کو بھی خوراک فراہم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں نہ صرف زرعی ترقی پر زور دیا گیا ہے بلکہ ان سے متعلق غریب عوام، مثلاً چھوٹے کسان، بے زمین کھیت مزدوروں وغیرہ کی حالت کو سدھارنے کے عظیم مقاصد بھی پیش نظر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک میں پبلک سیکٹر کو خود کفیل بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ پبلک سیکٹر ملک کی صنعتی ترقی میں کلیدی رول ادا کرتا ہے۔ اس کے ذریعے پسماندہ علاقوں اور ایسے علاقوں کی ترقی پر زور ہے جہاں اب تک صنعتی نظام نے وہاں کے عوام کی حالت سدھارنے میں اپنا رول ادا نہیں کیا تھا۔ ہمارے ملک کے اقتصادی ڈھانچے کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج ملک نے ایک سوئی سے لے کر اعلیٰ ترین ٹکنالوجی مثلاً نیوکلیر انجینیرنگ، خلائی سائنس اور صنعتی ٹکنالوجی وغیرہ میں نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔ ●

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers 5, Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002

یوجنا

۱۶ تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۶

ایک روپیہ

سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی پر طائرانہ نگاہ

(نریندر جوشی)

پبلک نظامِ تقسیم کیسے بہتر بنایا جائے

(ڈاکٹر بی۔ کے۔ سنگھ)

ڈاکٹر ستیندر سروپ

قلبی امراض پر کیونکر قابو پایا جائے

بھارت میں قلبی امراض بڑھ رہے ہیں۔ مصنف نے جو قلب کے علاج کے ماہر ہیں ان امراض کے اسباب اور ان سے بچنے کے طریقے بیان کئے ہیں جن میں تدارکی اقدامات شامل ہیں۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ انھوں نے قلبی امراض کو دور کرنے کے لیے یوگا اور باقاعدہ ورزش کا مشورہ دیا ہے۔

بھارت گذشتہ چند دہائیوں سے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہو رہا ہے۔ وہ اقتصادی اور صنعتی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں بھارت ترقی کے خطرات کا بھی سامنا کر رہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بھارت میں قلبی امراض موت کا ایسا ہی بڑا سبب بن گئے ہیں جس طرح دوسرے کسی ترقی پذیر ملک میں۔ اس سے پہلے بھارت میں چھوت کے امراض موت کا اہم ترین سبب تھے۔ لیکن گذشتہ کئی برسوں میں قلبی مرض زیادہ عام ہو گیا ہے۔

قلبی امراض کے کئی زمرے ہیں۔ ان میں ایک کو ہم پیدائشی کہتے ہیں جس کا مطلب ہے پیدائش سے ہونے والا مرض، اور دوسرا قلبی مرض وہ ہے جسے اکتسابی کہا جاتا ہے۔ اختیاری کا مطلب ہے کہ لوگ پیدا ہونے کے بعد اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔

قلبی امراض کی اقسام: جہاں تک قلبی مرض کا تعلق ہے پیدائش سے قلبی مرض کی مثال کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا کہ کوئی بچہ ایسا پیدا ہوا جس کے دل میں سوراخ تھا یا وہ نیلا تھا۔ اکثر حالتوں میں ایسے بچے ہوتے ہیں جن کا پیدائشی وزن بہت کم ہوتا ہے۔ بھارت میں یہ باتیں بہت عام ہیں۔ ان تمام باتوں کی روک تھام کی جا سکتی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر کو قدرے آسان طریقوں سے روکا جا سکتا ہے اور یہ تمام اب بھارت میں دستیاب ہیں۔ اس کے لیے نہایت اعلیٰ قسم کے علاج کی ضرورت نہیں ہے۔ ان میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ جب مائیں حاملہ ہوں تو ان کی موزوں دیکھ بھال کی جائے اور اگر ماؤں کو چھوٹی چیچک کے ٹیکے لگا دئے جائیں جو دنیا بھر میں دستیاب ہیں تو یہ دیکھا گیا ہے کہ اس سے پیدا ہونے والے بچوں میں قلبی امراض کی کمی ہو جائیگی، خصوصاً یہ ایک ایسی حالت ہے جس میں پیدا ہونے والے بچے کے دل میں زائد شریانیں ہوتی ہیں۔

اور جب بچہ پیدا ہو جائے تو بچپن میں دیکھ بھال ضروری ہوتی ہے۔ اور پھر اس دیکھ بھال کے لیے کسی خاص مشینری یا آلات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ کام بھارت میں موجودہ دستیاب وسائل کے ساتھ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اگر پیدا ہونے کے بعد ان بچوں کے دلوں میں سوراخ اور دیگر غیر معمولی باتیں ہوں اور اگر انھیں اینٹی بایوٹک ادویات جیسے کہ پنسلین وغیرہ دی جائے جو بھارت میں با آسانی دستیاب ہے تو ان کی دیکھ بھال میں مدد مل سکتی ہے۔ اگر ان بچوں کی موزوں دیکھ بھال کی جائے خصوصاً اس وقت جبکہ ان کے دانتوں کا علاج ہو رہا ہو اور اگر ان کے دانتوں کو صاف ستھرا رکھا جائے اور انھیں چھوت کی بیماریوں سے دور رکھا جائے تو وہ صحتمندی کے ساتھ بلوغت کو پہنچ سکتے ہیں اور معمول کی صحتمندانہ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

اکتسابی قلبی مرض

قلبی مرض کی دوسری قسم جس پر ہمیں بحث کرنے کی ضرورت ہے وہ ہے اکتسابی قلبی مرض۔ یہ بیماری اس وقت ہوتی ہے جب بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اس میں یہ بیماری نشو و نما کے وقت فروغ پاتی ہے۔ اس وقت بھارت میں سب سے عام پائی جانے والی بیماری جو ابھی تک معذوری کا بڑا باعث بنی ہوئی ہے۔ ریاحی قلبی مرض یا ریاحی بخار ہے۔ اس بیماری میں مریض کو بخار ہوتا ہے جو کئی مہینے جاری رہتا ہے۔ ان کے گھٹنوں اور ٹخنوں میں سوزش آجاتی ہے۔ بلا شبہ اس بیماری کی بھی بڑے آسان طریقوں سے روک تھام کی جا سکتی ہے۔ بچپن کے ایام میں جب انھیں چھوت لگ جائے خصوصاً جب ان کے گلے میں سوزش آجائے جو کہ بھارت میں بہت عام ہے تو اس کا علاج بھی فوری طور پر اینٹی بایوٹک ادویات سے کیا جا سکتا ہے۔

(باقی کور صفحہ پر)

اس شمارے میں

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر • آر. ٹھکرال

اسسٹنٹ ایڈیٹر • محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر • وسیم حیدر

شمارہ ۲	۱۶ تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۶	جلد ۶

۲۶ر چیتر تا ۱۰ر ویشاکھ، شک ۱۹۰۸ ÷ ٹیلیفون ۶۰۱۸۱۸

شرحِ چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سالہ ۳۵ روپے، سہ سالہ ۵۰ روپے

فی کاپی: ایک روپیہ

طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صدی کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:

ایڈیٹر یوجنا (اردو)، پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر. کے. پورم (مین)

نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر. ایس. منجال

ترسیلِ زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

ریزرو بنک آف انڈیا اور اشیاء کی قیمتیں

ریزرو بنک آف انڈیا نے ملک کی اقتصادی صورت حالات کے بارے میں سال کے وسط کا ایک جائزہ پیش کیا جو کافی حوصلہ افزا ہے۔ لیکن اس رپورٹ میں ان خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جن کی اصلاح اگر بروقت نہ کی گئی تو اس سے بحیثیت مجموعی ترقی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ جائزہ اپریل ۱۹۸۵ سے ستمبر ۱۹۸۵ کے درمیان مختلف معاشی سیکٹروں اور شعبوں کی کارگزاری کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔ ریزرو بنک جیسے خود مختار ادارے نے اس صورت حال کا جائزہ ایسے وقت لیا جبکہ بجٹ زیر تشکیل تھا۔ بہرصورت یہ جائزہ چونکہ معروضی نوعیت کا ہے، لہٰذا اس سے پالیسیوں کی ترتیب و تشکیل میں مدد مل سکے گی۔ اس رپورٹ میں زراعت، صنعت، قرضوں اور زر کی فراہمی اور بیرونی ملکوں کے ساتھ تجارت نیز ادائیگی کے توازن کی صورت حال کو خاص طور پر مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ گذشتہ برس بروقت بارشوں کے ہونے اور کیمیاوی کھادوں کی کھپت بڑھ جانے سے خریف کی فصل کے اچھے ہونے کو خوش آیند کہا گیا ہے۔ اندازہ ہے کہ اس خریف میں دھان اور موٹے اناجوں کی پیداوار ایک سال قبل کے مقابلے بڑھی ہے۔ دالوں کی پیداوار میں دس فیصد اضافے کی توقع ہے۔ آبرسانی کی سہولتوں میں اضافے اور زیادہ پیداوار دینے والی اقسام کی کاشت سے اس سال ربیع کی فصل میں نیا ریکارڈ قائم ہوگا۔ آیندہ پانچ برسوں میں ایسے علاقوں میں سبز انقلاب لانا ہے جہاں کھیتی باڑی تمام تر بارشوں پر انحصار رکھتی ہے۔ خیال ہے کہ اس سال ربیع کی پیداوار ۱۵ کروڑ ۶۰ لاکھ سے بھی تجاوز کر جائے گی۔ حالانکہ یہ پیداوار ۸۶-۱۹۸۵ کے لیے خوراکی اجناس کی پیداوار کے مقررہ نشانوں سے قدرے کم ہوگی۔ پٹ سن اور میستا کی پیداوار میں اضافے کے امکانات ہیں۔ چینی کی پیداوار پچھلے سال کی سطح پر رہی ہوگی۔ البتہ خشک سالی کے حالات نے تلہنوں کی پیداوار میں اضافے کے امکانات کو تاریک کر دیا ہے۔ صنعتی پیداوار میں ۸۶-۱۹۸۵ کی پہلی سہ ماہی میں ۶ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ حالانکہ اس سے ایک سال قبل اس مدت میں یہ اضافہ ۸،۶ فیصد تھا مگر اس سے دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس مدت کے بعد صنعتی ڈھانچے کو جس طرح سے مستقل بنیادوں پر مضبوط بنانے کی کوشش کی گئی ہے اس سے صنعتی محاذ پر بہتر کارروائی کے امکانات یقینی ہو گئے ہیں۔ چنانچہ بجلی کی تیاری اور کوئلے کی پیداوار میں اضافہ ہو رہا ہے۔ خام تیل کی پیداوار بھی بڑھی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت نے مالی پالیسی میں جن بڑی تبدیلیوں کا اعلان کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی صنعتی لائسنسوں کے اجراء کے ضمن میں جو رعائتیں اور سہولتیں دی گئی ہیں نیز اجرائے سرمایہ کے قواعد و ضوابط کو جس طرح سہل بنانے کی کوشش کی گئی ہے، ان سب اقدامات سے دستیاب صنعتی صلاحیت سے بھرپور استفادہ کیا جا سکے گا، سرمایہ کاری بڑھے گی اور اس سے پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ روزمرّہ کی اشیا کی قیمتیں اور افراطِ زر کے مسائل ایسے ہیں جن سے نہ صرف خانگی امور میں مصروف عورت ہی پریشان ہوتی ہے بلکہ یہ منصوبہ سازوں کے لیے بھی تشویش کا موجب بنتے ہیں۔ پیداواری اقتصادی سرگرمیوں میں مصروف انسانوں کے لیے یہ پریشان کن مسائل ہیں۔ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ ریزرو بنک آف انڈیا نے یہ پیشین گوئی کی ہے کہ آئندہ ماہ میں افراطِ زر کی شرح کم ہوگی یہ پچھلے سال کے ۷،۴ فیصد اضافے کے مقابلے کم ہوگی۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ رواں مالی سال کی پہلی ششماہی میں زر کی توسیع کی شرح مقابلتہً کم رہی۔ دوسرے ریزرو بنک آف انڈیا نے قرضہ دینے کی پالیسی میں جو احتیاط برتی اُس سے بھی افراطِ زر کم ہونے میں مدد ملی۔ اپریل سے ستمبر ۱۹۸۵ تک زر کی توسیع ۷،۷۰۶ کروڑ روپے کے بقدر تھی جو کہ ۶ فیصد اضافہ ظاہر کرتی ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ کے مماثل عرصے میں یہ اضافہ ۸،۱۱ فیصد تھا۔ اس طرح ظاہر ہے کہ زر کی توسیع مدت زیر تبصرہ میں کم ہوئی۔ اس عرصے میں تجارتی شعبوں کے لیے بنکوں کے قرضے مقابلتاً کم رہے اور غیر ملکی زرِ مبادلہ کی ترسیل بھی مقابلتہً کم رہی۔ ریزرو بنک آف انڈیا نے قرضوں کے سلسلے میں جو سخت پالیسی اپنائی ہے، اس کے سبب یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اس سال زر کی توسیع محدود ہوگی۔ یہ گذشتہ تین برسوں کے دوران سالانہ اوسط اضافے سے بھی کم ہوگی۔ قیمتوں میں استحکام ایک حوصلہ افزا امر ہے جو کہ زر کی فراہمی میں کمی کے سبب ہے۔ البتہ اس محاذ پر پوری چوکسی درکار ہے۔ ورنہ کہیں کہیں اشیا کی قیمتوں میں اضافہ ناگزیر ہو جائے گا۔ مثلاً اناج کی قیمتوں میں اضافہ دیکھنے کو ملا جبکہ ملک میں اناج کے کافی ذخیرے موجود ہیں۔ اسی طرح چینی کی درآمدات کے باوجود چینی کی قیمتیں بڑھیں، ریزرو بنک ملک کی معیشت پر نگاہ رکھنے کے لیے ذمہ دار ہے۔ اُمید ہے کہ اس کی دور اندیشی اور سوجھ بوجھ کی پالیسیاں ملک میں معاشی استحکام لانے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

(اسسٹنٹ ایڈیٹر)

نریندر جوشی

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی پر طائرانہ نگاہ

کوئی ۳۶ برس قبل، ۴ مارچ ۱۹۵۰ کو پارلیمنٹ نے سائنسی پالیسی سے متعلق قرارداد منظور کی تھی جس کے ذریعے بھارت کی سائنسی پالیسی کے فلسفے اور نظری ڈھانچے کی وضاحت کی گئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ملک کو توقع ہے کہ "سائنس کے ذریعے ملک کے عوام کے لیے وہ تمام فوائد حاصل کئے جائیں گے جو سائنسی علوم کو اپنانے اور عمل میں لانے سے حاصل کئے جا سکتے ہیں"۔ اس سلسلے میں آگے چل کر حکومت کی طرف سے ۱۹۷۱ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے محکمے کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا مقصد سائنس اور ٹیکنالوجی کے پروگراموں کی دیکھ بھال اور تعمیل کرنا تھا۔ اس محکمے نے متعدد ذرائع سے دُنیائے سائنس میں فنڈوں، افرادی قوت اور صلاحیتوں کے فروغ، بنیادی سہولیات کی تخلیق اور سائنس و ٹیکنالوجی کی اہمیت کی آگاہی پیدا کرنے کے لحاظ سے اپنا اہتمام بنا لیا ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کو ترقی دینے کے لیے حکومت کی طرف سے متعدد اقدامات کئے گئے ہیں اور کئے جا رہے ہیں۔ چنانچہ سائنسی پالیسی کی قرارداد کی تعمیل کرتے ہوئے حکومت نے سائنسی علوم کو فروغ دینے اور تحقیق و مطالعہ کے نتائج کو عملی صورت میں لانے کے لیے بیشتر ادارے قائم کئے ہیں۔ اُس نے معاشرے کے بعض ایسے دقیق مسائل کی جانب سائنسدانوں کی توجہ دلا کر رہنمائی بھی کی ہے جنھیں صرف سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اُس نے سائنسدانوں کو مدعو کیا کہ وہ پالیسیوں کی ترقی اور تعمیل کا جائزہ لیں اور مستقبل میں امکانی ترقی کے خطوط وضع کریں۔

ترقی کے ہر مرحلے پر سائنسی شعبے میں خاص مقاصد کا تعین کیا گیا۔ جب وہ جُزوی یا کُلی طور پر پورے ہوئے یا جب اُن سے نئے مسائل پیدا ہوئے تو اُن پر نظرِ ثانی کی گئی اور اُنھیں نئی سمت دی گئی اور رفتہ رفتہ ایٹمی توانائی، برقیات اور خلاء کے شعبوں میں بھی سائنس و ٹیکنالوجی نے اپنے قدم رکھے۔

سائنسی پالیسی

سائنسی پالیسی پانچ مرحلوں میں سے گذری ہے جنھیں "آر اینڈ ڈی" یعنی تحقیق اور ترقیات" کے ذریعے ملک میں فروغ دیا گیا ہے۔ یہ ہیں:۔

۱۔ سائنسی تحقیق کے لیے بنیادی ڈھانچے کی تخلیق۔

۲۔ تحقیق و مطالعہ کا فروغ جس سے مراد درآمدات کے نعم البدل کی تیاری اور برآمدات کو بڑھاوا دینا تھا۔

۳۔ خود کفالت کا حصول۔

۴۔ سائنس برائے عوام اور

۵۔ بنیادی تحقیق و مطالعہ کا فروغ۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا پہلا مرحلہ تھا۔ تحقیق و ترقی (آر اینڈ ڈی) کے لیے ایک

بنیادی ڈھانچے کا قیام۔ اس سلسلے میں سائنس، انجینئرنگ اور صنعت کے خاص خاص شعبوں میں تحقیق کرنے کے لیے متعدد نیشنل ریسرچ لیبارٹریوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس مقصد کے تحت ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامنٹل ریسرچ اور انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا۔ یہ انسٹی ٹیوٹ امریکہ کی ایم۔ آئی۔ ٹی کی طرز پر بنائے گئے تھے۔ ان کے علاوہ یونیورسٹیوں میں ترقی یافتہ ریسرچ کے مرکزوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔

درآمدی نعم البدل

۵۰ کی دہائی کے اواخر اور ۶۰ کی دہائی کے شروع میں بھارت کو زرمبادلہ کی سخت قلت کا سامنا ہوا۔ غیر ممالک سے مشینری، پرزے اور دیگر سروسیں بھاری تعداد میں منگوائی جا رہی تھیں اور برآمدات میں کمی ہو رہی تھی۔ اس صورتِ حال کا ایک ہی علاج تھا یعنی درآمدات کو کم کیا جانا، لیکن ایسا کرنا ملکی مفاد میں نہیں تھا کیوں کہ زراعت کے لیے فرٹیلائزر کیمیکلوں اور صنعتوں کے لیے مشینوں اور خام مال کی ضرورت تھی جن کی عدم دستیابی سے ملکی ترقی رک سکتی تھی۔ چنانچہ درآمدات کے لیے نعم البدل تیار کرنے اور برآمدات کو بڑھاوا دینے کی پالیسی عمل میں لائی گئی۔ سائنسدانوں نے اس معاملے میں بڑی مدد دی اور معیشت کی ضروریات اور ریسرچ کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بعد میں انہی خطوط پر مزید ترقی سے خودکفالت کی ایک واضح پالیسی مرتب کی گئی۔

اس اثنا میں ایک نئی صورتِ حالات پیدا ہو گئی۔ پانچویں پانچسالہ منصوبے کے دوران سائنس کے رول پر بہت زیادہ بحث ہونے لگی اور اس کے بارے میں متعدد سوالات کیئے جانے لگے۔

سائنس کو کس قیمت پر ترقی دی جائے؟ کس کے فائدے اور کس مقصد کے لیے فروغ دیا جائے؟

اس کے نتیجے میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے کردار اور نوعیت پر کافی بحث و مباحثہ ہونے لگا۔ مرحومہ وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی تجویز اور پہل کاری پر ۱۹۷۶ میں انڈین سائنس کانگریس کا جو اجلاس ہوا اس میں زیادہ تر توجہ دیہی ٹیکنالوجی کے مسئلوں پر دی گئی۔

دیہی ترقی اور پسماندہ عوام کی حالت بہتر بنانے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کو بروئے کار لانے کا جو تجربہ کیا گیا اس سے پتہ چلا کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی فرسودہ ہو چکی ہے۔ چنانچہ چھٹے پانچسالہ منصوبے کے سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلق تناظر میں بنیادی ریسرچ پر زیادہ زور دیا گیا اور اس کے علاوہ فوری مسائل اور دستیاب جانکاری سے اُن کے حل تلاش کرنے کی جانب زیادہ توجہ دی گئی۔ چھٹے پانچسالہ منصوبے میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو اہم مقام دیا گیا تھا اور اس میں جدید کاری، خودکفالت اور سماجی انصاف پر زور دیا گیا تھا۔

تحقیقی اداروں کی تنظیمی ساخت کو دو ضروریات پوری کرنے کے لیے فروغ دیا گیا تھا۔ اوّل، انھیں کارکردگی کے لیے خودمختاری فراہم کرنا تاکہ انھیں بیوروکریسی کے کنٹرول سے آزاد کیا جائے اور تحقیق و مطالعہ کے نئے نئے اور دلیرانہ پروگرام عمل میں لانے کے قابل بنایا جا سکے۔ اور دوئم، انھیں وسائل کو استعمال کرنے اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا جا سکے۔

ان مقاصد اور پالیسیوں کے ضمن میں چھ طرز کے اداروں کو فروغ دیا گیا۔

۱۔ خودمختار اداروں کی تشکیل سوسائٹیوں کے طور پر کی گئی۔ گو یہ ایجنسیاں اپنے تمام فنڈ حکومت سے حاصل کرتی ہیں۔ تاہم اُن کی رہنمائی اُن کی انتظامیہ جماعتیں کرتی ہیں۔ جو سرکردہ سائنسدانوں اور بڑے بڑے افسران پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس زمرے کے ادارے ہیں:۔ کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ اور انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ۔

۲۔ سرکردہ سائنسدانوں کی قیادت میں خصوصی کمیٹیوں کا قیام کیا گیا تاکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے نئے اور ابھرتے ہوئے شعبوں میں کام کیا جا سکے۔ ان میں ایٹمی توانائی، برقیات (الیکٹرانکس)، خلاء، ماحولیات اور بحری ترقی کے شعبے شامل ہیں۔ یہ کمیشن وسیع پالیسیوں اور پروگراموں کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں۔ ہر کمیشن کا چیئرمین وزارت کا سیکریٹری ہوتا ہے اور وہ براہِ راست متعلقہ وزیر کے روبرو جوابدہ ہوتا ہے۔

۳۔ وزارتوں کے تحت ادارے، آبپاشی، بجلی، ریلوے، ٹیلی کمیونیکیشن، براڈکاسٹنگ، موسمیات، شہری ہوابازی، پٹرولیم جیسے شعبوں میں کافی ریسرچ کی جا رہی ہے اور ان کے ادارے براہِ راست وزارتوں کے کنٹرول میں ہیں۔ نباتات، حیوانات، ارضیات اور نشریات میں ریسرچ متعلقہ سائنسی سروے اداروں کی ذمہ داری ہے۔ جو مختلف وزارتوں کے تحت آتے ہیں۔

علاوہ ازیں مختلف ایجنسیوں اور محکموں تک پھیلی ہوئی تحقیقی سرگرمیوں میں تال میل پیدا

کرنے اور جہاں کہیں ضروری ہو وہاں پبلکاری
کرنے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کا محکمہ
قائم کیا گیا۔

۴۔ صنعتی تحقیقی و ترقیاتی ادارے۔
صنعتوں کی اس امر کے لیے حوصلہ افزائی کی گئی
کہ وہ پیداوار اور ٹیکنالوجی کی بہتری سے متعلق روزمرہ
کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تحقیقی ادارے
قائم کریں۔ اس کے لیے پبلک سیکٹر کے اداروں
کو عطیات اور پرائیویٹ سیکٹر کی صنعتوں کو ٹیکس
مراعات دی گئیں۔

۵۔ کوآپریٹو ریسرچ ادارے۔ ان کا
آغاز کپڑا سازی کے شعبوں میں کیا گیا۔ صنعت
کی طرف سے حکومت کی حوصلہ افزائی اور امداد
کے ساتھ چار کوآپریٹو ریسرچ ادارے قائم کئے
گئے۔ اس سلسلے میں ۵۰ فیصد اخراجات کا
بوجھ حکومت اٹھاتی ہے۔

۶۔ پرائیویٹ ادارے۔ حکومت کی
طرف سے اس امر کی ترغیب دی گئی کہ اگر تعلیمی
مقاصد یا ریسرچ کے لیے سرمایہ لگایا جائیگا تو اس
کے لیے ٹیکسوں میں رعایت دی جائے گی۔ اس کے
نتیجے میں متعدد سوسائٹیاں، فاؤنڈیشن اور
ٹرسٹ قیام عمل میں آگئے۔

۷۔ ریاستی حکومتوں کی طرف سے ابتدائی
طور پر زراعت، پشوپالن، صحت عامہ، آبپاشی
اور جنگل بانی وغیرہ پر بھی زور دیا جارہا ہے۔
یونیورسٹیوں میں جو ریسرچ ہوتی ہے اس کے
لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے امداد
دی جاتی ہے۔

شاندار کامیابی

زوردار تحقیق و ترقی اور توسیعی
پروگراموں کی بدولت غذائی پیداوار میں بھاری
اضافہ ہوا ہے۔ کوئی ۳۰ برس پہلے اناج کی
پیداوار جو تقریباً ۵ کروڑ ٹن تھی وہ اب ساڑھے
۱۳ کروڑ ٹن سے بھی بڑھ چکی ہے۔ گیہوں اور
پیوندی فصلوں کی پیداوار میں تو کافی ترقی ہو
چکی ہے اور اب چاول، دالوں، تلہن اور دیگر
منافع بخش فصلوں کی پیداوار بڑھانے کے
پروگرام بنائے جارہے ہیں۔

جہاں تک دیہی ترقی کا تعلق ہے بے زمین
مزدوروں، کاریگروں، چھوٹے اور مارجینل کسانوں
اور قبائلی فرقوں کی ترقی سے متعلق متعدد سکیمیں
شروع کی گئی ہیں۔ جن شعبوں میں موزوں
ٹیکنالوجیوں کو فروغ دیا گیا ہے وہ ہیں۔ چمڑا
صنعت، جس میں چمڑا کمانا وغیرہ شامل ہے۔
مٹی کے برتن بنانا، اناج کو پراسیس کرنا، دالیں،
تیل صنعت، گھریلو صنعت کے طور پر دیا سلائی
بنانا، آتش بازی کا سامان تیار کرنا، صابن
سازی جس میں غیر خوردنی تیل شامل کیا جاتا ہے
ہاتھ سے کاغذ تیار کرنا، شہد کی مکھیاں پالنا،
ناریل کی چھال اور دیگر ریشوں پر مبنی صنعتیں،
بائیو گیس، چونہ سازی، لوہار اور بڑھئی
کے ہنر۔

ایٹمی توانائی

بھارت نے بارہا اپنے اس مقصد کا
اعلان کیا ہے کہ وہ پُرامن مقاصد کے لیے ایٹمی
توانائی کا استعمال کرے گا۔ چنانچہ ایٹمی بجلی گھر
تاراپور، کلپاکم اور کوٹا میں قائم کئے گئے ہیں اور
چوتھا ملکی مساعی سے نرورا میں لگایا جارہا ہے۔
طب، زراعت، خوراک کی تحفظ اور دیگر شعبوں
میں ایٹمی توانائی کے استعمال میں بھی بڑی
پیش رفت ہوئی ہے۔

جہاں تک خلائی شعبے کا تعلق ہے اس
میں بھی سائنس اور ٹیکنالوجی کے استعمال سے
بڑی پیش قدمی ہوئی ہے۔ گذشتہ دہائی میں
"آریہ بھٹ" بھاسکر اول اور "بھاسکر دوئم" مصنوعی
سیارے سوویت یونین کی مدد سے، "روہنی" اپنے
ہی ملک میں بنے ہوئے ایس۔ ایل۔ وی۔۳ راکٹ
کے ذریعے شری ہری کوٹہ کے اڈے سے اور ایپل
مصنوعی سیارہ یورپی راکٹ ایرین سے داغا گیا
ہے۔ اگرچہ ۱۹۸۲ء میں انسیٹ ون بی کو رانچ کر
کافی ضروری تجربہ حاصل ہوا، تاہم اگست ۱۹۸۳ء
میں متعدد مقاصدی مصنوعی سیارہ انسیٹ ون بی
داغا گیا جو ٹیلی ویژن، ریڈیو اور ٹیلی کمیونیکیشن کے
لیے سروسیں مہیا کر رہا ہے اور موسمیات کا دور سے
سراغ لگانے میں مدد دے رہا ہے۔ یہ تمام
مصنوعی سیارے بھارت میں تیار کئے گئے ہیں۔

بھارتی خلائی سائنسدانوں نے مدار میں
چھوٹے مصنوعی سیارے پہنچانے میں کامیابی
حاصل کی ہے اور اب وہ زمین گردش سے
مطابقت رکھنے والے مداروں میں بھاری
مصنوعی سیارے پہنچانے کے سسٹموں کو فروغ
دے رہے ہیں۔ ان سے ٹیلی کمیونیکیشنز، براڈ
کاسٹنگ اور موسموں کا سراغ لگانے کے
شعبوں میں باقاعدہ سروس شروع ہو سکے گی۔

صنعتی تحقیق

کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل
ریسرچ اور ڈیفنس ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ
آرگنائزیشن شہری و فوجی مقاصد کے لیے سائنس
اور ٹیکنالوجی کی ریسرچ کے وسیع میدان پر
چھائی ہوئی ہیں۔ صنعتی پیداوار سے متعلق
کونسل ہذا کی لیبارٹریوں سے ریسرچ کی بدولت
متعدد اشیاء ظہور میں آئی ہیں جیسے ملکی زرعی
مشینری، کیمیکلوں، دوائیوں اور کیڑے مار
دواؤں کا وسیع سلسلہ، غذائی ٹیکنالوجی کے
شعبے میں مصنوعات، کملائے ہوئے چمڑے
کا سامان، شیشے اور کوزہ گری کی اشیاء،

ٹنگے اور کمرشیل ویڈیو ریسیور سیٹوں سے متعلق ٹیکنالوجیاں۔

طبّی اور صحتی سائنس

طب کے شعبے میں بھی بڑی بڑی کامیابیاں ہوئی ہیں جیسے چیچک کا انسداد، تپ دق کا گھریلو علاج اور غذائیت کی کمی کو دور کرنے سے متعلق پیش قدمی۔ آبادی کو مستحکم رکھنے، ملیریا اور فیلریا، جگری امراض اور کوڑھ جیسی بیماریوں پر قابو پانے کے سلسلے میں ریسرچ کی جا رہی ہے۔ ریسرچ کے نتیجے کے طور پر متوقع عمر بڑھ گئی ہے۔ شرح اموات میں گراوٹ آگئی ہے اور بچوں کی موت بھی کم ہونے لگی ہے۔

ماحولیات اور برقیات

اس شعبے کی اہمیت پر غور کرتے ہوئے ۱۹۸۰ میں ماحولیات کا ایک الگ محکمہ قائم کر لیا گیا تاکہ اس شعبے میں زور شور سے کام کیا جائے۔ ماحولی آلودگی کو روکنے اور ماحولیات کی موزوں دیکھ بھال کے لیے متعدد پروگرام زیر عمل ہیں ــــ اس سلسلے میں ماحولی منصوبہ بندی سے متعلق ایک ملکی کمیٹی کی تشکیل کی گئی ہے جس کا مقصد پالیسی کے بارے میں ترجیحات متعین کرنا اور اُن شعبوں کی نشاندہی کرنا ہے جن پر زور دیا جاتا ہے۔

جہاں تک برقیات کا تعلق ہے بھارت نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن سیٹوں، براڈ کاسٹنگ مشینوں، سوئچنگ اور ٹرانسمیشن کے آلات، راڈار، زمینی سٹیشنوں، نیوکلیئر ری ایکٹر کنٹرول پاور الیکٹرانکس اور انڈر واٹر سسٹموں کی تیاری کی بھی صلاحیت حاصل کر لی ہے۔ گذشتہ دہائی میں برقیات ساز و سامان کی تیاری ۱۸ فیصد سالانہ کی شرح سے بڑھ گئی ہے۔

انٹارکٹیکا کی مہمیں: بحریات کے شعبے میں بھارت کے بڑے مفادات ہیں۔ جیسے ساحل سمندر میں ہائڈرو کاربن، خوراکی سپلائی، خصوصاً پروٹین کی پیداوار بڑھانے کے لیے ماہی گیری کے وسائل، موسم کی جانکاری، وسائل کی کانکنی اور آلودگی وغیرہ۔ بحریات میں "آرانیڈ ڈی" پر بڑا زور دیا جا رہا ہے۔ گذشتہ ۳ برس کے دوران سمندر کی تہہ سے ملی جلی دھاتوں کے گولے نکالنے میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اور اس کے لیے تحقیق جہاز "گوتیشنی" استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قطب جنوبی کو مہمیں بھیجی گئی ہیں۔ جن کی بدولت قطب جنوبی میں ایک تحقیقی اڈّے کا قیام عمل میں آیا ہے۔ میں پانچویں مہم جو ٹیم وہاں سے واپس آئی ہے۔

ساتواں پانچسالہ منصوبہ

ساتویں پانچسالہ منصوبے میں تحقیق اور مطالعے کے لیے جو بڑے شعبے تجویز کیے گئے ہیں وہ ہیں۔ بنیادی اور عملی شعبوں میں طبیعیاتی، کیمیاوی، حیاتیاتی اور انجنیئری سائنسوں میں سائنسی ترقیاتی پروگرام۔ اس کے علاوہ ان امور پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔ جیسے دیہی ترقی کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کا اطلاق، نوجوانوں میں سائنسی دلچسپی کا فروغ، ٹیکنالوجی کا فروغ، ترقی اور استعمال، ارضیاتی و فضائی سائنسوں کا پروگرام انجنیئری سائنسوں پر خاص زور، افرادی قوت کی منصوبہ بندی اور ترقی، آلات کا فروغ، جانچ پڑتال کی سہولیات میں تال میل، اطلاعاتی نظاموں میں سائنس اور ٹیکنالوجی، ریشوں، مرکبات، دھاتوں کے سفوف انرجی عمل، شیشے کے شعبوں میں نئی ٹیکنالوجی کے ترقیاتی پراجیکٹ وغیرہ وغیرہ۔ ساتویں پانچسالہ منصوبے میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے محکمے کے لیے ۱۴ ارب ۹۵ کروڑ روپے خرچ کرنے کا منصوبہ ہے۔ ●

بقیہ: زراعتی مزدور اور ان کے مسائل

۱۹۷۶ء میں پاس کیا گیا۔ بعد میں ان مزدوروں کو آزاد کرا کر انھیں دوبارہ بسانے کے انتظامات بھی کیے گئے۔ مختلف کوآپریٹو سوسائٹیاں قائم کی گئیں جو کسانوں کی مختلف طریقے سے خدمت کرتی ہیں۔ مثلاً قرض، بیج، کھاد وغیرہ مہیا کراتی ہیں۔ اس کے علاوہ پیداوار کو صحیح داموں پر فروخت کرنے میں بھی کسان کی مدد کرتی ہیں۔ اب تقریباً سبھی ریاستوں میں زمین کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر دی گئی ہے۔ ضرورت سے زیادہ زمین کو حکومت نے اپنے قبضے میں لے کر غریب کسانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس طرح وہ زمین ان غریب مزدور کسانوں کو بخش دی گئی ہے جو بیگار پر دوسرے کی زمین پر برسوں سے محنت کر رہے تھے اور نصف یا تین چوتھائی زمین کے مالک کو دیتے تھے۔

نئے بیس نکاتی پروگرام کے تحت کھیت مزدوروں کی حالت سدھارنے اور دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام کے تحت ان کے لیے سال بھر روزگار کی ضمانت دینے کی اسکیموں نے ان کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھانے میں کافی اہم رول ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر بی. کے. سنگھ

پبلک نظامِ تقسیم

کیسے بہتر بنایا جائے؟

اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ چھٹے منصوبے کی مدت میں اشیائے ضروریہ کی تقسیم کے پبلک نظام سے ضروری استعمال کی چیزوں کی قیمتوں میں اضافے اور افراطِ زر کو روکنے میں مدد ملی۔ لیکن مضمون نگار کی رائے میں سب سے زیادہ اہم بات ہے۔ منتخب ضروری اشیاء کے مؤثر حصول اور تقسیم کے ذریعے اس نظام کو کارگر ڈھنگ سے اس طرح چلانا کہ ملک کے دشوار گذار علاقوں میں بھی صارفین کو اشیائے ضروریہ کی بلا رکاوٹ بہم رسانی کو یقینی بنایا جاسکے۔ ان کے خیال میں صارفین کے مفاد کے تحفظ کے لیے مختلف اقدامات کو زیادہ سختی سے لاگو کرنے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان میں اشیائے ضروریہ کی تقسیم کا پبلک نظام ۱۹۳۹ء سے کام کر رہا ہے اور خوراکی اجناس کے علاوہ دوسری بہت سی چیزیں اس نظام کے تحت تقسیم کی جا رہی ہیں۔ اشیائے ضروریہ کی تقسیم کا پبلک نظام (جسے اس مضمون میں مختصراً پبلک نظامِ تقسیم کہا جائے گا)، قومی پیمانے پر کام کرتا ہے اور اس کا بڑا مقصد صارفین اور بالخصوص معاشی اعتبار سے کمزور عوام کو مناسب قیمتوں پر ضروری اشیاء مہیا کرنا ہے۔ اس نظام کے تحت خوراکی اجناس (کچھ ریاستوں میں دالیں بھی)، مٹی کا تیل، پتھر کا کوئلہ، چینی، کپڑا، نمک اور چائے تقسیم کی جاتی ہے۔ یہ چیزیں پھٹکر دکانداروں، کوآپریٹو سوسائٹیوں اور سپر بازاروں کے ذریعے فروخت کی جاتی ہیں۔ پبلک نظامِ تقسیم کے چھٹے منصوبے کے دوران افراطِ زر کو روکنے میں مدد ملی ہے۔ ضروری استعمال کی اشیاء کی سپلائی اور فروخت کا کام کرنے والے سیلز مینوں کو تربیت دی جاتی ہے۔ پبلک نظامِ تقسیم دالوں کو چھوڑ کر، غلہ، چینی اور خوردنی تیلوں کی قیمتوں میں اضافے کو روکنے میں کامیاب رہا ہے۔ حکومت نے نظامِ تقسیم کو بہتر بنانے، سستے داموں والی دکانوں کی تعداد بڑھانے اور مزید علاقوں کو اس نظام کے تحت لانے کے لئے کافی کوششیں کی ہیں۔

قیمتوں میں استحکام کی اہمیت

قیمتوں میں استحکام رکھنے کیلئے اشیائے ضروریہ کی سپلائی کے اہل بندوبست کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں ہے۔ چوں کہ ان چیزوں کی مانگ میں لچک نہیں ہوتی اور وہ قریب قریب یکساں ہی رہتی ہے۔ اس لیے اگر ان کی پیداوار یا دستیابی میں ذرا سی بھی کمی واقع ہوتی ہے تو قیمتوں میں غیر متناسب اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسکے علاوہ، چونکہ ان میں سے بہت سی چیزیں زراعت سے حاصل ہوتی ہیں اس لیے قیمتوں کا انحصار موسمی تبدیلیوں پر بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا پبلک نظامِ تقسیم کو، عوام کو، خاص کر کمزور طبقات کو استعمال کے

ضروری اشیاء کی معقول قیمتوں پر بہم رسانی کو یقینی بنانے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔

زرعی پیداوار، غلّہ اور صنعتی خام مال کی ایک بڑی مقدار عام طور پر فصل کے کٹنے کے فوراً بعد ہی بازار میں آتی ہے جبکہ قیمتیں کم ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس قسم کی چیزیں ایسی قیمتوں پر جن سے پیداوار کنندگان کو مناسب منافع مل سکے، خرید کر رکھ لینے اور بعد میں انھیں پبلک نظامِ تقسیم کے ذریعے تقسیم کرنے سے غریب عوام کا دوطرفہ تحفظ ہوتا ہے۔ مقابلتاً سہل اوقات میں انھیں اتنا منافع ملنا یقینی ہو جائے گا جتنا کم سے کم انھیں ملنا ہی چاہیے۔ دوسری طرف مشکل اوقات میں انھیں ضروری اشیاء معقول قیمتوں پر دستیاب ہو سکیں گی۔ لہٰذا ہمیں پبلک نظامِ تقسیم کو اس طرح ترقی دینی ہوگی کہ وہ قیمتوں پر کنٹرول رکھے، اُن کے اُتار چڑھاؤ کو روکے، اور اشیائے ضروریہ کی منصفانہ تقسیم کی ہماری حکمتِ عملی ایک مستقل و مستحکم خصوصیت بن جائے۔

دو دو قیمتیں رکھنے کا طریقہ

بعض اشیاء کے ضمن میں دو دو قیمتیں رکھنے کے طریقے کو جاری رکھنے کے لیے بھی پبلک نظامِ تقسیم کی ضرورت ہوگی۔ دو دو قیمتوں کے طریقے کے تحت پیداوار کی ایک مقررہ مقدار پبلک نظام کے ذریعے تقسیم کے لیے سرکاری ایجنسیاں یا سرکار کی نامزد کی ہوئی تنظیمیں معقول قیمتوں پر خریدتی ہیں۔ پیداوار کی باقی مقدار پیداوار کنندگان بازار بھاؤ پر فروخت کرتے ہیں۔ اس طریقے سے منتخب ضروری اشیاء کی ایک خاص مقدار کی عوام کو۔ بالخصوص کمزور طبقوں کو، معقول قیمتوں پر بہم رسانی یقینی ہو جاتی ہے۔ اور پیداوار کنندگان بھی اپنی پیداوار کے لیے کُل مِلا کر ایک مناسب قیمت حاصل کر سکتے ہیں۔

عمدہ نظامِ تقسیم - ایک ضرورت

ایک اعلیٰ نظامِ تقسیم کے لیے منتخب اشیاء کی پیداوار، سرکاری خرید، نقل و حمل، اسٹوریج اور تقسیم کے درمیان قریبی رابطہ ضروری ہے۔

ماضی میں ان تمام کاموں کی ذمہ داریوں کو الگ الگ ایجنسیوں میں بانٹ دیا گیا تھا جس کی وجہ سے ان کے درمیان تال میل کی کمی پیدا ہو گئی جبکہ ان تمام کاموں کا ایک مربوط نظام کا ہونا ایک اعلیٰ پبلک نظامِ تقسیم کے لیے اشد ضروری ہے۔ ساتویں منصوبے میں اس سلسلے میں زیادہ توجہ دینے کی تجویز ہے۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی متعلقہ ایجنسیوں، پبلک اداروں اور کوآپریٹو تنظیموں کے درمیان مختلف سطحوں پر تال میل قائم کیا جائے گا

اور ایک انتخابی اندازِ نظر

مسائل کی پیچیدگی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس معاملے پر ایک انتخابی اندازِ نظر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ کون کون سی چیزوں کو اس کے تحت لایا جائے۔ اس بات کا فیصلہ عام آدمی کی ضرورتوں کے مطابق کیا جانا چاہیے۔ اس طرح غلّہ، چینی، خوردنی تیل، مٹی کا تیل، پتھر کا کوئلہ، کنٹرول کا کپڑا، چائے، کافی (قہوہ)، نہانے کا صابن، کپڑا دھونے کا صابن، ماچس اور بچوں کے لیے کاپیاں وغیرہ کو پبلک نظام کے ذریعے تقسیم کے لیے ضروری استعمال کی چیزیں تصور کیا جا سکتا ہے۔ زور اس بات پر ہونا چاہیے کہ نظامِ تقسیم کو ملک کے تمام حصوں پر لاگو کیا جائے۔ چاہے تقسیم کی جانے والی اشیائے ضروریہ کی تعداد گھٹانی ہی کیوں نہ پڑے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ملک بھر کے نظام ہائے تقسیم کی فہرست اشیائے ایک ہی ہو۔ مختلف خطوں میں مختلف ترجیحات ہو سکتی ہیں۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ مختلف وقتوں میں نظامِ تقسیم میں مختلف اشیاء کی اہمیت ہو سکتی ہے۔ لیکن ملک کے لوگوں کی وسیع اکثریت کے معیارِ زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیشتر جن اشیا کو پبلک نظام کے تحت تقسیم کرنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ وہ سارے ملک میں مشترک ہوں گی۔ جلد خراب ہو جانے والی کچھ چیزوں کو بھی، بشرطیکہ مقامی طور پر ان کے اسٹوریج کی سہولیات دستیاب ہوں، مقامی ضرورتوں کے مطابق پبلک نظامِ تقسیم کے دائرے میں لایا جا سکتا ہے۔

بے رکاوٹ سپلائی

پبلک نظامِ تقسیم کی کامیابی کے لیے بہت ضروری ہے کہ جو اشیا تقسیم کے لیے چُنی گئی ہیں ان کی سپلائی بلا کسی رکاوٹ کے برقرار رکھی جائے۔ رسد میں کوئی عارضی رکاوٹ بھی لوگوں کے لیے سخت پریشانی کا باعث بن سکتی ہے۔ منصوبے میں عوامی استعمال کی ضروری چیزوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے موزوں پروگرام شامل کئے گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی الگ الگ چیزوں کے ضمن میں پیشگی منصوبہ بندی ضروری ہوگی تاکہ جب کبھی مقامی رسد کم ہو اور اس کا بڑھایا جانا مشکل ہو تو حتی الامکان غیر ملکوں سے درآمدات کے لیے سپلائی کو بڑھایا جا سکے۔ مرکزی ریاستوں اور مقامی سطحوں پر اشیائے تقسیم کی سرکاری

خرید، نقل و حمل، اسٹوریج اور تقسیم کے لیے کافی انتظامات کئے جانے چاہئیں۔ بعض اشیاء کے فاضل اسٹاک رکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ غلّے کے ضمن میں منصوبے میں ڈیڑھ کروڑ ٹن غلّے کے فاضل اسٹاک بنانے کی تجویز ہے، جسے غلّے کی دستیابی اور قیمتوں پر موسم کی تبدیلیوں کے اثرات کو کم کرنے کے لیے استعمال کیا جائے گا۔

پبلک نظامِ تقسیم کو بطریقِ احسن چلانے کے لیے اس کے ڈھانچے کو مضبوط بنانا اور اسے ملک کے تمام علاقوں میں لاگو کرنا ضروری ہوگا۔ خاص کر پسماندہ، دور دراز اور دشوار گذار علاقوں میں۔

سرکاری خرید

قومی اور ریاستی سطحوں پر اشیائے ضروریہ کی سرکاری خرید اور بعد میں نظامِ تقسیم کی ایجنسیوں کے ذریعے عوام کو ان کی بہم رسانی کے انتظامات موجود ہیں۔ غلّے کے ضمن میں تمام ضروری کارروائی فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کرتی ہے۔ چینی کے معاملے میں کچھ ریاستوں میں فوڈ کارپوریشن آف انڈیا اور کچھ میں سول سپلائی کارپوریشنیں یا کوآپریٹو ادارے یہ کام کرتے ہیں۔ خوردنی تیلوں کی درآمد اور تقسیم کی ذمہ داری خاص کر اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن آف انڈیا کو سونپی گئی ہے۔ سافٹ کوک یا پتھر کے کوئلے کی خرید اور بہم رسانی کا کام کوئلے کے محکمے اور کول انڈیا لمیٹڈ کرتے ہیں۔ مٹی کے تیل کا کام انڈین آئل کارپوریشن، ہندوستان پٹرولیم، بھارت پٹرولیم جیسے پبلک سیکٹر کے اداروں کے ہاتھ میں ہے۔ کنٹرول کے کپڑے کی تیاری کا کام

عام طور پر نیشنل ٹیکسٹائل کارپوریشن اور اس کی تقسیم کا کام نیشنل کنزیومرز کوآپریٹو فیڈریشن کرتی ہے۔ چائے کی سرکاری خریداری اور تقسیم کی ذمہ داری نیشنل کنزیومرز کوآپریٹو فیڈریشن کو اور قہوہ (یعنی کافی) کی کافی بورڈ کو سونپی گئی ہے۔ ماچس کی سپلائی کا کام کھادی اور دیہی دستکاریوں کا کمیشن کرتا ہے۔ اسکولی کاپیوں کے لیے کاغذ ریاستی حکومتیں کنٹرول کی قیمتیں پر خریدتی ہیں۔ اور وہی خود اپنی تنظیموں کے ذریعے ان کی کاپیاں بنواتی ہیں۔ نہانے کے صابن کی سپلائی کا کام، کسی پبلک سیکٹر ادارے کی عدم موجودگی میں، انڈین سوپ اینڈ ٹوائلٹریز مینوفیکچررز ایسوسی ایشن کرتی ہے۔ ان تمام انتظامات پر لگاتار نگاہ رکھی جانی چاہیئے۔ اور جب کبھی ضروری ہو ان کی اصلاح کی جانی چاہیئے۔ یا انھیں بڑھانا چاہیئے۔

تقسیم

ریاستوں میں مرکزی ایجنسیوں سے حاصل شدہ اشیائے ضروریہ کی تقسیم کا کام عام طور پر ریاستی سول سپلائیز کارپوریشن، اشیائے ضروریہ کی ریاستی کارپوریشنیں، ریاستی کنزیومرز کوآپریٹو فیڈریشنیں اور دیگر مقررہ ایجنسیاں کرتی ہیں۔ کچھ ریاستوں، مثلاً تمل ناڈو، پنجاب اور کیرالا میں سول سپلائیز کارپوریشنوں نے خود اپنی خوردہ دکانیں کھول رکھی ہیں۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں غلّے کی پیداوار میں اضافہ اور کھلے بازار میں اس کی سپلائی بہتر ہونے کی وجہ سے پبلک تقسیم کی ایجنسیوں سے غلّے کی فروخت میں کمی ہوئی۔ ۱۹۸۴ء میں کل ۱۶۰۹ لاکھ ٹن غلّہ ریلیز کیا گیا تھا۔ جو ۱۹۸۳ء میں ریلیز کی گئی ۱۶۲.۱ لاکھ ٹن کی مقدار سے ۱۰ فیصدی کم تھا۔ ۱۹۸۴ء میں غلّے کی کل مقدار جو فروخت

ہوئی اُس میں چاول کی مقدار ۵۰ لاکھ ٹن اور گیہوں کی ۴۷ لاکھ ٹن تھی۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں کل فروخت کا تخمینہ ۱۲۰ لاکھ ٹن تھا۔ (اکنامک سروے ۸۵-۱۹۸۴ء)۔

اکتوبر ۱۹۸۳ء میں ریاستوں کو فراہم کی گئی چینی کا ماہانہ کوٹہ ۳.۱۳ لاکھ ٹن تھا جو ۱۹۸۴ء میں اسی سطح پر برقرار رکھا گیا۔ ۱۹۸۴ء میں تہواروں کے موسم میں چینی کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے مزید پچاس ہزار ٹن چینی راشن کی دکانوں سے فروخت کے لیے جاری کی گئی۔ اس طرح ۸۵-۱۹۸۴ء میں راشن کی دکانوں سے اور عام بازار میں فروخت کے لیے کل ۸۲ لاکھ ٹن چینی جاری کی گئی جب کہ گذشتہ مالی سال میں کل ۷۱ لاکھ ٹن چینی جاری کی گئی تھی۔ ۱۹۸۵ء میں ماہانہ ۹۳ لاکھ ٹن اور ۱۹۸۴ء میں ۳.۴۸ لاکھ ٹن چینی جاری کی گئی تھی۔

۱۹۸۵ء میں ۸۵ لاکھ ٹن چاول سرکاری طور پر خریدا گیا جب کہ ۱۹۸۴ء میں صرف ۶۹ لاکھ ٹن چاول خریدا گیا تھا۔ سرکاری گوداموں میں چاول کا کل ذخیرہ ۱۹۸۳ء میں ۴۷ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۱۹۸۴ء میں ۷۴ لاکھ ٹن ہو گیا۔ سرکاری طور پر خریدے گئے گیہوں کی مقدار ۱۹۸۴ء میں ۸۳ لاکھ ٹن کے مقابلے میں ۱۹۸۵ء میں ۹۳ لاکھ ٹن ہو گئی۔

مشکلات

پبلک نظامِ تقسیم کو تین قسموں کی مشکلات پیش آتی ہیں۔

۱۔ تنظیمی مشکلات۔
۲۔ بازار میں کارفرما عناصر سے پیدا ہونے والی مشکلیں اور
۳۔ مالی مشکلات۔

کوالٹی کنٹرول ضروری

تھوک اور خردہ بیوپار کی تنظیم میں اور زیادہ تال میل ہونا چاہیے۔ صارفین کو خاص اشیا پوری تول میں بہم پہنچانے کی طرف بہت کم توجہ دی جارہی ہے۔ صارفین کی کوآپریٹو سوسائٹیاں اور پرچون دکاندار جو سامان بیچتے ہیں اس کی کوالٹی کو بہتر بنانا ضروری ہے۔ اگر صارفین کوالٹی کی قدر پیدا کی جائے تو وہ بھی دکاندار کے بہکاوے میں نہیں آئیں گے اور ملاوٹ کی بدعت کو کم کیا جاسکے گا۔

پبلک نظام تقسیم کو کوالٹی کنٹرول کو ترجیح دینی چاہیے اور صارفین کو مظاہروں اور تشہیر و اشاعت کے ذریعے کوالٹی کی اہمیت بتانی چاہیے۔ اس سلسلے میں تشہیر و اشاعت کے ذرائع موثر رول ادا کرسکتے ہیں۔

پبلک نظام تقسیم کی سرگرمیوں کو زیادہ مضبوط بنا کر اس کی اکائیوں کی افادیت کو بڑھایا اور انھیں مالی استحکام عطا کیا جاسکتا ہے۔ رکنیت، سرمایۂ حصص، کاروباری سرمایے اور مجموعی فروخت کے لیے جو ضوابط وضع کیے گئے ہیں انھیں سختی سے لاگو کیا جانا چاہیے۔ قرضوں پر انحصار کو کم کرنے کے لیے کوآپریٹو سوسائٹیوں کو خود اپنے فنڈ بنانے چاہئیں اور اپنے ارکان سے پرکشش شرح سود پر زیادہ امانتیں حاصل کرنے چاہئیں۔ ریزرو بینک اور حکومت کو چاہیے کہ وہ مرکزی کوآپریٹو تنظیموں کو رقوم کی فراہمی کے لیے اعانتی امداد کی حوصلہ افزائی کریں۔ ریاستی حکومتیں کوآپریٹو سوسائٹیوں کے سرمایۂ حصص میں حصہ دار بننے کے بارے میں غور کرسکتی ہیں۔ ارکان کو ان کی کل سالانہ خرید کی بنا پر سوسائٹیوں کے منافع میں سے حصہ ملنا چاہیے۔ حکومت ان سوسائٹیوں کو امپورٹ لائسنس بھی دے سکتی ہے جس سے کہ وہ اعلیٰ درجے کا کشش انگیز سامان رکھ سکیں۔ مالی دشواریوں پر قابو پانے کے لیے ایک ذخیرۂ ادائی یا Sinking Fund قائم کیا جانا چاہیے۔ کوآپریٹو سوسائٹیاں قائم کرنے والوں کو امداد باہمی کے اصولوں کے مختلف پہلوؤں اور انتظامی امور کی تربیت دی جانی چاہیے۔ صارفین کی کوآپریٹو سوسائٹیوں کی کامیابی کے لیے بڑی تعداد میں عورتوں کو بھی اُن میں شامل کیا جانا چاہیے۔ پبلک نظام تقسیم کی اکائیوں کی فروخت بڑھانے کے لیے مال کی فروخت پر چھوٹ دینے کا طریقہ کارگر ثابت ہوسکتا ہے۔ گوداموں کی صلاحیت بھی بڑھائی جانی چاہیے۔ ملازمین کی خدمات کو اُن کے بیچے ہوئے مال پر کمیشن دے کر زیادہ موثر بنایا جاسکتا ہے۔

قیمتوں کا تعین

پبلک نظام تقسیم کی اکائیوں کے لیے خرید اور فروخت کے لیے مناسب پالیسیاں بنانا ضروری ہے۔ قیمتیں اس طرح مقرر کی جانی چاہئیں کہ اکائیاں معقول منافع کماسکیں اور اپنا سرمایہ بڑھاسکیں۔ چونکہ پبلک نظام تقسیم کا ایک مقصد قیمتوں کو قابو میں رکھنا ہے اس لیے چھ سے دس فیصد کی شرح منافع کافی رہے گی۔ نظام تقسیم کی اکائیوں کے ذریعے فروخت کی جانے والی اشیا کی قیمتیں کھلے بازار سے کچھ کم ہونی چاہئیں۔ یہ اکائیاں رہائشی علاقوں کے قریب ہونی چاہئیں۔ کاؤنٹر پر مال کی نمائش اور شاندار پیکنگ بھی کوآپریٹو سوسائٹیوں کی شبیہہ کو بہتر بنانے میں کافی معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ تجربے کے طور پر "سیلف سروس" کاؤنٹر بھی کھولے جاسکتے ہیں۔ خریداروں کے گھروں پر مال پہونچانے کی سروس بھی شروع کی جاسکتی ہے۔ چیزوں کی قیمتیں، اُن پر لکھی ہونی چاہئیں۔

کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ذریعے خرید

یہ بات امید افزا ہے کہ کریڈٹ، مارکیٹنگ اور زرعی محکموں کو ایک ہی سوسائٹی میں ملانے کے لیے کوششیں کی جارہی ہیں۔ زرعی پیداوار کی درجہ بندی Grading سے کسانوں کو فائدہ ہوگا اور انھیں زراعت کے بہتر طریقے اختیار کرنے کی ترغیب ملے گی۔ کوآپریٹو سوسائٹیوں کا ایک اہم کام دلال یا بیچ کے آدمی کو ہٹانا اور آلاتِ زراعت، بیج، کیمیاوی کھاد وغیرہ براہ راست کاشتکاروں کو فروخت کرنا ہے۔ غلے کو خراب ہونے سے بچانے اور کاشتکاروں کو بنیوں کے چنگل سے محفوظ رکھنے کے لیے دیہی علاقوں میں گودام قائم کئے جانے چاہئیں۔ اس کام کے لیے اسٹیٹ بنک آف انڈیا کو کوآپریٹو سوسائٹیوں کو قرضے دینے چاہئیں۔ فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کو غلے کوآپریٹو سوسائٹیوں سے خریدنا چاہیے۔ اور پیداوار کو منڈیوں میں پہونچانے میں ان کی مدد کرنی چاہیے۔ کوآپریٹو سوسائٹیاں دیہی دستکاروں کی مدد کرسکتی ہیں۔ اور دیہی دستکاروں کی مصنوعات کی فروخت بڑھا سکتی ہیں۔

شہری اور دیہی دونوں علاقوں میں کوآپریٹو سوسائٹیاں تقریباً ۱۹۰۰ کروڑ روپے سالانہ کی اشیائے صارفین فروخت کررہی ہیں۔ لیکن سول سپلائز کارپوریشن کی سرگرمیاں تھوک بکری کی سطح پر تقریباً محدود ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ

یوجنا، نئی دہلی

کوآپریٹو تنظیمیں اور سول سپلائز کارپوریشنیں دونوں مل کر صارفین کی اشیائے ضروریہ کی ضرورتوں کو صرف جزوی طور پر ہی پورا کر پا رہی ہیں۔ اشیائے ضروریہ کی تجارت میں اُن کے حصّے کو ساتویں منصوبے کے دَوران کافی زیادہ بڑھانے کی ضرورت ہے۔

پبلک نظامِ تقسیم مستحکم بنائیے!

پبلک نظامِ تقسیم کی کامیاب کارکردگی کے لیے موجودہ انتظامات کو بہتر اور مضبوط تر بنانا ہوگا۔ اُن ریاستوں میں جہاں ایک قومی کوآپریٹو تحریک موجود ہے، کنزیومر کوآپریٹو سوسائٹیوں اور مارکیٹنگ سوسائٹیوں کی چوٹی کی جماعت اشیائے ضروریہ کی خرید، اسٹوریج، نقل و حمل اور تقسیم کی ذمہ داری سنبھال سکتی ہے۔ لیکن دوسری ریاستوں میں موجودہ سول سپلائز کارپوریشن یا اشیائے ضروریہ کی کارپوریشن کو مضبوط تر بنانا ہوگا۔

جن مقامات پر مرکزی اور ریاستی ویر ہاؤسنگ کارپوریشنوں اور کوآپریٹو تنظیموں وغیرہ کے گوداموں میں مال رکھنے کے لیے کافی جگہ دستیاب نہیں ہے، وہاں پر سول سپلائز کارپوریشنوں کو اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے کچھ گودام بھی بنوانے پڑ سکتے ہیں۔ کارپوریشنوں کو تربیت یافتہ عملے کی ایک جمعیت یا کیڈر Cadre بھی بنانا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے مؤثر تربیت ضروری ہوگی۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ پرائیویٹ سیکٹر اور کوآپریٹو تنظیموں کے والنٹیئر دشوار گزار علاقوں میں جانا پسند نہیں کرتے خاص کر ان علاقوں میں جہاں قبائل اور کمزور طبقوں کے لوگ آباد ہیں۔ اس لیے اس بوجھ کو ریاستی حکومتوں کو اپنی سول سپلائز کارپوریشنوں یا دوسری موزوں ایجنسیوں کے ذریعے خود اٹھانا ہوگا۔ ایسے علاقوں میں پُھٹکر دکانداروں یا ایجنسیوں کو کام شروع کرنے کے بعد کچھ سالوں تک امدادی رقوم بھی دی جا سکتی ہیں۔

مارکیٹنگ کی نئی تکنکیں اپنائیے!

مال کی تقسیم کے اخراجات کو کم کرنے کے لیے مارکیٹنگ کی جدید اور عمدہ تکنیکوں کو اپنانا ضروری ہے۔ پیداوار کو کم خرچ پر داروں میں پہنچانے کے لیے بڑی مقدار میں پیداوار کو منڈیوں تک بھیجنا چاہیئے۔ دیہات میں بڑی تعداد میں گودام تعمیر کئے جانے چاہیئں اور جہاں تک ہو سکے ان گوداموں سے صارفین کے مراکز تک پیداوار کو پہنچانے کے لیے غیر مشینی ذرائع نقل و حمل کا استعمال کرنا چاہیئے۔ پبلک اور پرائیویٹ سیکٹروں میں سستے داموں والی دکانوں کو جلد بکنے والی کچھ اشیاء بیچنے کی بھی اجازت دی جانی چاہیئے جس سے کہ ان کی مالی حالت مضبوط ہو سکے۔ اشیاء ڈاک اور خاندانی منصوبہ بندی کی چیزیں فروخت کرنے کے لیے بھی ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے۔

کنزیومر اور مارکیٹنگ کوآپریٹو سوسائٹیوں کے درمیان رابطہ اور تال میل بڑھانا چاہیئے جس سے اول الذکر کو کھیتوں کی پیداوار براہِ راست کسانوں ہی سے حاصل ہو سکے۔ ساتویں منصوبے میں کوآپریٹو سوسائٹیوں کی ذخیرہ رکھنے (اسٹوریج) کی صلاحیت میں کافی زیادہ توسیع کرنے کا ارادہ ہے۔ تاکہ کوآپریٹو تنظیمیں شہری اور دیہی علاقوں میں پبلک نظامِ تقسیم کی کارکردگی کو بہتر بنانے میں مدد دے سکیں۔

منصوبے کے پروگراموں کے ساتھ رابطہ

پبلک نظامِ تقسیم کو منصوبے کے پروگراموں سے مربوط کرکے نظامِ تقسیم کی افادیت کو بڑھایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایسے مراکز پر جہاں دیہی ترقی کے پروگرام زیرِ عمل ہوں، وہاں سستے داموں پر اشیائے ضروریہ فروخت کرنے والی چلتی پھرتی دکانوں کا انتظام کیا جا سکتا ہے اور جن علاقوں میں منصوبے کے تحت شروع کئے گئے پراجیکٹوں کی بدولت بڑے پیمانے پر لوگوں کو روزگار مل رہا ہو، وہاں سستے داموں والی باقاعدہ دُکانیں کھول جا سکتی ہیں، موزوں مقامات پر لاگت کو کم کرنے کے لیے جزوقتی عملہ رکھنے کے امکانات پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔

کم از کم اشیائے ضروریہ کی قیمتوں کا لینے اور صحیح تول کے ضمن میں صارفین کے مفادات کے تحفظ کے اقدامات کرنا بھی ضروری ہیں۔ اس قسم کے تحفظ کے لیے بنیادی قوانین پہلے ہی سے موجود ہیں۔ لیکن ان پر نظرِثانی کرنے اور مضبوط تر بنانے کی ضرورت ہے۔

ان قوانین اور تحفظِ صارفین کے مختلف طریقوں کو زیادہ سختی سے نافذ کرنے کے لیے اقدامات کئے جانے چاہیئں۔ اہم اشیائے صارفین کی قیمتیں معقول رکھنے کے لیے قیمتوں کے بارے میں ایک مربوط پالیسی وضع کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

اے رنگاناتھن

نہرو کا سائنسی انسان نوازی کا فلسفہ

مصنف نے ذیل کے مضمون میں سائنسی انسان نوازی کا فلسفہ پیش کیا ہے جس کا تصور جواہر لال نہرو نے دیا تھا۔ اُن کا بیان ہے کہ یہ دانشورانہ طور پر تحریک انگیز ہے کیونکہ یہ کسی اصول یا نظریہ کی قطعیت میں اعتقاد نہیں رکھتا۔ یہ فلسفیانہ طور پر "ایک دنیا" کی تجویز کا ہم معنی ہے۔ یہ ہمیں اس امر کا بھی احساس دلاتا ہے کہ انسان کا مستقبل اُس کے اپنے ہاتھوں میں ہے اور ستاروں میں نہیں۔

مسٹر جولین ہکسلے نے اپنے ایک اعلیٰ دنیا کے لیے یہ تجویز کیا تھا کہ یونیسکو کا فلسفہ سائنسی بنیاد پر عالمی انسان نوازی ہونا چاہیئے جو وسعت کے لحاظ سے آفاقی اور اپنے منظر کے لحاظ سے ارتقائی ہونا چاہیئے۔ انسان نوازی کا فلسفہ وسعت کے اعتبار سے آفاقی ہے کیونکہ یہ نوع انسانی کی تمام تر انسان دوستانہ میراث کو سمیٹے ہوئے ہے۔ (یہ روایت جس کا سراغ کنفیوشس، بدھ، ایپی کیورس اور سوکریٹس کے خیالات میں ملتا ہے۔ دہریت پسندوں، عقلیت پسندوں اور رچرڈ شیلے اور بریڈلا جیسے سرکردہ آزاد مفکروں کی نسلوں سے ہم تک پہنچی ہے)۔ اور یہ ارتقائی ہے کیونکہ یہ ایک طبیعی اعتقاد ہے جو اس عقیدے پر مبنی ہے کہ انسان کو اس کرہ پر مزید ارتقائی منزلیں طے کرنا ہے۔ یہ اے آئی اوپیرن کی اس عہد آفریں تصنیف "کرۂ ارض پر زندگی کی ابتدا" کے اس مرکزی نظریہ کے عین مطابق ہے کہ زندگی کائنات کے مختلف مقامات پر ہو سکتی ہے اور وہ محض کرۂ ارض پر ہی نہیں۔ یہ کائنات سے متعلق طبیعی نظریہ ہے جو اس عقیدے کو جنم دیتا ہے کہ انسان اس کرۂ ارض پر زندگی سے زیادہ سے زیادہ مسرت حاصل کر سکتا ہے۔ یہ امر کافی دلچسپ ہے کہ اس طبیعی تخیل کی اولیت میں اس عقیدے کی تاویل جارج سنتایانا کی کتاب (REASON IN RELIGION) میں کی گئی ہے۔ اسے شاعرانہ طور پر جارج میریڈتھ کی کتاب (MEDITATION UNDER THE STARS) میں دیکھا گیا ہے اور فنی طور پر اس کا اظہار نہرو کی "ہندوستان کی دریافت" میں ہوا ہے۔

نہرو کا انسان نوازی کا نظریہ

نہرو کے فلسفے کو خواہ ہم اب گاندھی جی کی اخلاقیات، بھارتی نشودھن اور مغرب کی آزاد خیالی کا سنگم تصور کریں یا ثقافتی اقدار میں تغیر کے طور پر دیکھیں یا اسے گاندھی جی کی ٹرسٹی شپ کی تھیوری کے خلاف جانیں یا اُسے راجہ رام موہن رائے کی سائنسی انسان نوازی کی روایت کا تسلسل سمجھیں یا اُسے

اتصال سے تخلیق نَو کے عمل کا حصہ خیال کریں۔ یہ سب اُس نظریہ سے کم اہمیت رکھتا ہے جو اس کی تحریک دیتا ہے۔ یہ نظریہ نہرو کی نگارشات میں سرائت کئے ہوئے ہے اور وہ تین شکلوں میں بار بار دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ بڑے عظیم ہیں اور آج ہم سے تعلق رکھتے ہیں۔

اوّل، معاشیات کے مقاصد کی انسان نوازانہ تشخیص نَو جس سے زندگی کی بہتر قسم کو اُجاگر کیا جا سکے۔

" جب آدمؑ کھیتی کرتے تھے اور حوّا کاتتی تھیں، تو پھر ان سے بڑھ کر دوسرا کون انسان ہو سکتا تھا"

قرونِ وسطیٰ کے اس عوامی شعر کے کثیرالسطحی لمعانی کی کھوج گزشتہ صدیوں میں متعدد ادبی، فنی اور عمرانی تخلیقات میں کی گئی ہے۔ جیسے شیلی کی MOSQUE OF ANARCHY گولڈ اسمتھ کی DESERTED VILLAGE چارلس ڈکنس کی OLIVER TWIST مارکھم کی THE MAN WITH THE HOE زولا کی LATERRE وان گوگھ کی THE NIGHT CAFE اور ویبلن کی THE THEORY OF THE LEISURE CLASS ہیں۔ آج انسان نوازانہ معاشیات کے نئے دَور میں اس دستورِ کار کو زیادہ سے زیادہ اہمیت حاصل ہو رہی ہے۔ بلاشبہ اس امر کو دانشورانہ آزادی کی تاریخ کا ایک چھوٹا سا تبصرہ کہا جاتا ہے جس کی بنیاد پر بیسویں صدی کے انتہائی طبع زاد اقتصادی مفکر، مینارڈ کینز نے سیاسی معیشت کے طریقِ کار کی انسان نوازانہ تاویل کو ترتیب دیا۔ مینارڈ کینز نے اپنے ایک مضمون "ہمارے پوتوں کے لیے اقتصادی امکانات" میں لکھا تھا "جب دولت کے اجتماع کی اعلیٰ سماجی اہمیت نہیں رہے گی تب ضابطۂ اخلاق میں حقیقی تبدیلیاں آئیں گی۔ ہم خود اُن بیشتر جھوٹے اخلاقی اصولوں سے نجات پا سکیں گے جنھوں نے دو سو سال سے ہمیں اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور جن کی وجہ سے ہم نے بعض نہایت ناپسندیدہ انسانی باتوں کو اعلیٰ ترین اوصاف کا درجہ دے رکھا ہے"۔ اسی طرح نہرو نے جو گاندھی سے متاثر ہوئے تھے 'عوام کی بھلائی کے لیے سماجی خدمت پر زور دیا تھا اور اُسے محض ایک مقصد کے طور پر روپیہ کے حصول کی کوشش کا توڑ قرار دیا تھا۔ انھوں نے "ہندوستان کی دریافت" میں اس موضوعِ خیال کا اعادہ کرتے ہوئے کہا تھا "میرے لیے حقیقی مسائل فرد اور سماجی زندگی کے مسائل، ہم آہنگ زندگی، ایک فرد کی باطنی اور باہری زندگی میں موزوں توازن لانے، افراد اور گروہوں کے درمیان تعلقات میں مطابقت پیدا کرنے، متواتر قدرے بہتر اور اعلیٰ تر بننے، سماجی ترقی اور انسان کی نہ ختم ہونے والی مہم کے مسائل متواتر بنے ہوئے ہیں"۔

اُن کا عملی سوشلزم

منافع کی نامناسب طمع زندگی کے اوصاف میں بگاڑ پیدا کرتی ہے اور اس کے نتیجے میں کسی ملک کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی املاک کے وسائل کی تصویر مسخ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک طرفہ کُل ملکی پیداوار "جی این پی" کی جانب بہت زیادہ توجہ دینے سے آزادی کا جمالیاتی منشا نظرانداز ہو جاتا ہے اور اس سے ملک کی شرحِ افزائش کا جائزہ نادرست ہو جاتا ہے جو دراصل مادی اشیاء اور غیر مادی ضروریات کے نازک متعدد رُخی توازن سے کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ یاد کرنا باعثِ دلچسپی ہو گا کہ نارڈوس اور ٹوبن اقتصادی بہبود کے تناظری جائزے کو سمجھنے سے پہلے کُل ملکی پیداوار (جی این پی) کی بھول بھلیاں میں بھٹکتے رہے تھے۔ کینز کے انسان نوازانہ معاشیات کے فلسفے کا نہرو کے عملی سوشلزم سے موازنہ کرنا مساوی طور پر دلچسپ ہے۔ دونوں نے "متعدد رُخی انسانی اقدار" کے تصور کی پیش بینی کی تھی جسے عصرِ حاضر کے سرکردہ ماہرینِ اقتصادیات نے فروغ دیا تھا جیسے کہ جے کے گالبرتھ، گنار میرڈل، رابرٹ ہیلبرونر، والٹ ویٹمین، روسٹو، والیٹرا سے وسکوف اور کینتھ بولڈنگ۔ دونوں بڑی دلچسپی کے ساتھ ایک ایسا سماج دیکھنا چاہتے تھے جو روپیہ کے پیچھے نہ بھاگتا ہو۔ اور یہی موضوعِ خیال گالبرتھ جیسے ماہرینِ اقتصادیات کی تصانیف THE NEW INDUSTRIAL STATE (ECONOMICS AND THE PUBLIC PURPOSE) میں نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے۔

انسانی ترقی سے متعلق اُن کا نظریہ

ٹیکنالوجی کا موضوعِ خیال نہرو کی تقریروں اور تحریروں میں بار بار آتا ہے۔ ہم ایک ایسے عہد میں رہ رہے ہیں جب آج کے بنے بنائے انفرادی آزادی کے تصور کو چنوتی دے رہے ہیں اور یہ نہرو کی خاصیت تھی کہ انھوں نے انسان کے کُلی وجود سے متعلق انسانی ضروریات پر غور کئے جانے کا امکان دیکھا تھا کیونکہ انھوں نے اپنے آزاد میموریل لیکچروں میں کہا تھا: ایٹمی دَور کے مسئلوں کو کل کے روائتی دستورِ کار سے حل کرنا ممکن نہیں ہے۔ نہ سیاسیات میں اور نہ ہی اقتصادیات میں اُن روائتی خیالات

سے تسلی بخش نتائج برآمد ہو سکتے ہیں"۔

قدامت پسندی میں اُن کا عدم اعتقاد

نہرو نے ادارتی قدامت پسندی میں اعتقاد کا جو استرداد کیا تھا اُسے نہرو کے ضمنی تعلیم سے تقویت ملی تھی۔ لیکن نہرو نے اپنے طبیعی رُجحان کو اپنے اخلاقی فیصلے پر اثر انداز نہیں ہونے دیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک مثال کا حوالہ دیا جا سکتا ہے کہ "نہرو بلا کوشش وہ کر سکتے تھے جسے کولرج نے "عدم اعتقاد کا رضاکارانہ تعطل" قرار دیا تھا۔ بُدھ دھرم کی اخلاقی بنیادوں کی جانب رُخ کرتے ہوئے اور زیادہ اہم طور پر نہرو کی "ہندوستان کی دریافت" کی خوبی اس امر میں ہے کہ انھوں نے قدامت پسندانہ تبصروں کے لوازم سے احتراز کیا اور بھارتی فلسفے پر بحث میں روشنی اور ہوا یعنی آزادیٔ خیال کو آنے دیا۔ مثال کے طور پر قدیم بھارت کی نظری دلالت کے سلسلے پر نہرو نے اپنی تجزیاتی فطرت سے جو تبصرہ کیا ہے اُس سے نہایت خوبصورت خیالات کا اظہار ہوا ہے" کس کے حکم پر ذہن اپنی بلندیوں پر روشنی ڈالتا ہے؟ کس کے حکم پر زندگی رواں ہوتی ہے؟ کس کے حکم پر انسان بولتے ہیں؟ کون سے معبود در حقیقت آنکھ اور کان کو اپنا کام کرنے کی ہدایت دی تھی اور پھر... کیوں اور کس کی تلاش میں پانی بہتا ہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اُس کی روانی نہیں رُک سکتی؟... ایسی کھوج کرنا کوئی انکساری نہیں ہے۔ ایک ہمہ گیر طاقتور معبود کے روبرو انکساری اکثر مذہب سے وابستہ ہے"۔ یہ ماحول پر ذہن کی فتح ہے۔ صبح کی دُعا میں سورج کو یوں مخاطب کیا جاتا ہے۔ اسے روشنی کا سیلاب اُمنڈانے والے سورج! میں وہی شخص ہوں جس نے تجھے وہ کچھ بنایا ہے جو تو ہے"۔ کیا اعلیٰ اعتماد کا اظہار ہوا ہے"۔

تاریخی تناظر پر دیکھا جائے تو دانشورانہ آزادی کا تصور سائنسی آزادی کے تصور سے لیا گیا ہے۔ ہیرلڈ لاسکی نے اپنی کتاب

LIBERTY IN THE MODERN STATE

میں لکھا تھا کہ "جن لوگوں نے دینیات یا قدرتی سائنسوں میں آزادی سے سوچنے کے لیے لڑائی لڑی ہے وہ یقیناً سیاسی آزادی کے بزرگ مجاہدوں سے یقیناً کم نہیں تھے"۔ اور انھوں نے مزید لکھا کہ "برونو اور گیلیلو نہ ہوتے تو روسو اور والٹیر بھی نہ ہوتے"۔ یہ امر بھی دلچسپ ہے کہ آرتھر کوسلر نے اپنی کتاب THE STEEP WALKERS میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ہمارے دَور کا معمہ مذہب اور سائنس کے بیچ کشمکش میں سمایا ہوا ہے۔ لیکن حتمی تجزیہ میں یہ انسان نوازی اور توہمات پرستی کی مذہبی اور نظریاتی صورتوں کے درمیان تصادم ہے۔ آج کلیت پسند مملکت نے قرونِ وسطیٰ کے مذہبی قائدین کی جگہ لے لی ہے۔ جنھوں نے گیلیلو پر مقدمہ چلایا تھا۔ بلا شبہ ڈاکٹر ہرمن جے ملر، این ایل نے اپنی اس سوچی سمجھی رائے کا اظہار کیا تھا کہ لائی سینکوزم کو ایسی ہی توہم پرستی تصور کیا جانا ضروری ہے جیسی کہ یہ اعتقاد کہ زمین چپٹی ہے اس کے علاوہ خصوصی نظریہ اضافیت اور نظریہ مقادیر برقیات آزاد خیال مغرب کے سائنسدانوں کی برادری میں بھی قدرے قدامت پسندی کے باعث فوراً قبول نہیں کیا گیا تھا۔

اُن کی سائنسی انسان نوازی

نہرو کے مطابق سائنسی انسان نوازی کا فلسفہ دُنیا کی بیشتر ضروریات۔ تعلیمی، اقتصادی، سائنسی، ثقافتی اور سیاسی کا جواب ہے۔ جہاں تک فلسفے کا تعلق ہے یہ دانشورانہ طور پر فکر انگیز ہے کیونکہ یہ کسی نظریئے یا اصول کی قطعیت میں یقین نہیں رکھتا۔ یہ روحانی طور پر اطمینان بخش ہے کیونکہ یہ کسی فوق الطبعی عقیدے میں یقین نہیں رکھتا اور قوموں کو جوڑنے کا کام کرتا ہے۔ یہ "ایک دُنیا" کی تجویز کا فلسفیائی ہم معنی ہے جسے کھوج کرنیوالوں اور خلابازوں کی اس تیزی سے پھیلتی ہوئی کائنات میں مسلسل ارتقا کے سائنسی عمل کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ یہ ہمیں اس امر کا احساس بھی دلا سکتا ہے کہ انسان کا مستقبل اُس کے اپنے ہاتھوں میں ہے اور ستاروں میں نہیں جو بہر حال بھاری عناصر پیدا کرتے ہیں جس سے ہم بنے ہوئے ہیں۔

اُس سائنسی انسان نوازی کے فلسفے کی وضاحت کرنے کے لیے جس کے گرد انسان کے ساتھ نہرو کی ذاتی یگانگت ہی گھومتی ہے سائنسی مزاج سے اُن کی آگاہی کی جانب پھر لوٹنا ضروری ہے اور انھوں نے "ہندوستان کی دریافت" میں اس آگاہی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا "سائنسی رسائی اور مزاج ایک طرزِ زندگی ہے۔ یہ ایک سوچنے کا عمل ہے اور کام کرنے اور ہمارے رفیقوں کیساتھ وابستہ ہونے کا ایک طریقہ ہے اور انھیں ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ یہ سائنسی مزاج اُس راستے کا اشارہ کرتا ہے جس پر انسان کو سفر کرنا چاہیئے۔ یہ ایک آزاد انسان کا مزاج ہے۔ یہ وہ آگاہی ہے جو نوعِ انسانی کے لیے نہرو کی گہری محبت کا اظہار کرتی ہے۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جو اُن کی زندگی کے مختلف مراحل اور اُن کی مساعی میں تلاش کی جا سکتی ہے۔

ایم۔ ایل۔ بجاج

بھارت میں اسکوٹر سازی کی صنعت

یوں تو بھارت حصولِ آزادی کے بعد سے ہی صنعتی ترقی کی راہ پر گامزن ہے تاہم رواں مالی سال کے بجٹ میں صنعت کاروں کو دی گئی مراعات اور ترغیبات کی بدولت اُس کی ترقی کی رفتار تیز تر ہو گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرائیویٹ سیکٹر بھی پوری طاقت کے ساتھ اپنا رول ادا کرنے کو تیار ہو گیا ہے۔ بھارت کی دو پہیہ گاڑی صنعت زیادہ تر پرائیویٹ سیکٹر کے ہاتھ میں ہے اور اس میں غیر معمولی سرگرمی دکھائی دینے لگی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ دو پہیہ گاڑی صنعت خوشحال مستقبل کی جانب سرپٹ دوڑنے لگی ہے۔ تو یہ کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔

دو پہیہ گاڑی صنعت اسکوٹروں، موٹر سائیکلوں اور موپیڈوں پر مشتمل ہے۔ جو یونٹ اس کی تیاری میں حصہ لے رہے ہیں اُن میں بجاج آٹو لمیٹڈ پیش پیش ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے بڑے یونٹ ہیں۔ مہاراشٹر اسکوٹرز، اسکوٹرز انڈیا، آٹوموبائل پراڈکٹس آف انڈیا اور آندھرا پردیش اسکوٹرز۔ ان کی بڑھتی ہوئی مانگ کے پیشِ نظر اور بجاج آٹو (جس کا اسکوٹر سازی میں تقریباً ۶۵ فیصد حصہ ہے) جس کے مقابلے پر دیگر یونٹوں کو کھڑا کرنے کی لیے حکومت کی طرف سے پبلک سیکٹر اور مشترکہ سیکٹر کے متعدد یونٹوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ اسکوٹر سازی کے یونٹ قائم کریں۔ اس سلسلے میں موجود یونٹوں کو نہ صرف اپنی پیداواری صلاحیت بڑھانے کی اجازت دی گئی ہے بلکہ بیشتر یونٹوں کو جاپان، اٹلی، فرانس، مغربی جرمنی اور دوسرے ملکوں کے ساتھ تکنیکی تعاون کرنے کے لیے لائسنس بھی دیئے گئے ہیں۔ غیر ملکی کمپنیاں ہیں۔ ویسپا، ہونڈا، یماہا، سوزوکی، کاواساکی، پیوگوٹ اور زونڈاپ۔ یہ یونٹ بجاج، لمبریٹا، کبٹا، ٹی وی ایس، راجدوت اور بی ایس اے کے ماڈل تیار کریں گے۔

حکومت کی پالیسیوں سے اس صنعت کی ٹکنالوجی اور افزائش میں ایک انقلاب سا آگیا ہے۔ ۷۶-۱۹۷۵ میں کل ۱٫۰۷٫۰۰۰ اسکوٹر، ۷۰٫۰۰۰ موٹر سائیکل اور ۳۶٫۰۰۰ موپیڈ تیار ہوئے تھے جن کی تعداد ۸۴-۱۹۸۳ میں بڑھ کر بالترتیب ۴٫۴۷٫۰۰۰ اسکوٹر، ۱٫۹۰٫۰۰۰ موٹر سائیکل اور ۶٫۸۷٫۰۰۰ اسکوٹر، ۴٫۴۴٫۰۰۰ موٹر سائیکل اور ۲٫۳۰٫۰۰۰ موپیڈ تیار کئے جائیں گے۔

اگرچہ ملک میں دو پہیہ گاڑی صنعت ۱۹۶۰ میں شروع ہوئی تھی، جب بجاج آٹو لمیٹڈ نے پونے کے نزدیک اکورڈی میں ایک چھوٹے سے اسمبلی پلانٹ کے ساتھ اس کا آغاز کیا تھا تاہم اس صنعت نے حالیہ برسوں میں بڑی ترقی کی ہے۔ خصوصاً ۱۹۷۳ کے بعد سے تو یہ ترقی کے میدان میں سرپٹ دوڑنے لگی ہے۔ جب پہلی بار اس کی مانگ میں اس لیے بھاری اضافہ ہوا تھا کیونکہ تیل کی بین الاقوامی قیمتوں نے آسمان کو چھونا شروع کردیا تھا۔ اس کی پیداوار میں کس قدر اضافہ ہوا ہے اس کا اندازہ ذیل کے گوشوارے سے لگایا جا سکتا ہے۔

دو پہیہ گاڑی کی پیداوار ۸۴-۱۹۷۰ (سیکڑوں میں)

	۱۹۷۰	۱۹۷۵	۱۹۷۸	۱۹۷۹	۱۹۸۰	۱۹۸۱	۱۹۸۲	۱۹۸۳	۱۹۸۴
اسکوٹر	۸۵٫۴	۱۰۳٫۱	۱۶۸٫۰	۱۵۳٫۵	۲۰۶٫۵	۲۰۱٫۴	۳۴۵٫۰	۲۷۰٫۷	۲۸۳٫۲
	(۵۱٫۹)	(۴۹٫۸)	(۵۶٫۳)	(۵۰٫۱)	(۵۰٫۴)	(۴۰٫۳)	(۴۲٫۰)	(۳۶٫۲)	(۳۴٫۵)
موٹر سائیکل	۴۳٫۰	۶۹٫۷	۸۶٫۸	۸۷٫۰	۱۰۰٫۰	۱۱۰٫۴	۱۲۸٫۰	۱۵۵٫۳	۱۶۶٫۹
	(۳۸٫۰)	(۳۳٫۷)	(۲۹٫۰)	(۲۸٫۴)	(۲۴٫۴)	(۲۲٫۱)	(۲۱٫۹)	(۲۰٫۸)	(۳۰٫۴)
موپیڈ	۱۱٫۷	۳۴٫۲	۴۳٫۸	۶۵٫۷	۱۰۳٫۲	۱۸۸٫۴	۲۱۱٫۰	۳۲۲٫۳	۳۶۹٫۷
	(۱۰٫۴)	(۱۶٫۵)	(۱۴٫۷)	(۲۱٫۵)	(۲۵٫۲)	(۳۷٫۸)	۳۶٫۱)	(۴۳٫۰)	(۴۵٫۱)
میزان	۱۰۳٫۱	۲۰۷٫۰	۲۹۸٫۶	۳۰۶٫۲	۴۰۹٫۰	۵۰۰٫۲	۵۸۴٫۰	۷۴۸٫۳	۸۱۹٫۸
	(۱۰۰٫۰)	(۱۰۰٫۰)	(۱۰۰٫۰)	(۱۰۰٫۰)	(۱۰۰٫۰)	(۱۰۰٫۰)	(۱۰۰٫۰)	(۱۰۰٫۰)	(۱۰۰٫۰)

بریکٹ کے اعداد میزان کے فیصد کے مظہر ہیں جبکہ ۱۹۸۴ کے اعداد جزوی سال کے ہیں۔

اسکوٹر

خوشحالی کے مظہر

آج بڑے بڑے شہروں میں علاوہ چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی دو پہیہ گاڑیاں (سہ پہیہ اسکوٹر بھی اس زمرے میں آتے ہیں) روز افزوں نظر آتی ہیں۔ یہ گاڑیاں جہاں بڑھتی ہوئی خوشحالی کی مظہر ہیں وہاں وہ بعض ضرورتوں اور مجبوریوں کا بھی پیداواری نتیجہ ہیں۔ موٹر گاڑی رکھنے پر بہت زیادہ خرچ اٹھتا ہے۔ کیونکہ جہاں اس کی قیمت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے وہاں تیل کی قیمت بھی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ چونکہ دو پہیہ گاڑی میں تیل کی کھپت مقابلتاً کم ہوتی ہے۔ اسلیے متوسط طبقے کا رجحان اس گاڑی کی جانب چلا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شہروں میں پبلک ٹرانسپورٹ کی حالت دگرگوں ہو گئی ہے۔ آبادی میں بے تحاشہ اضافہ ہونے اور کام دھندوں کے بڑھنے سے بسیں مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہیں۔ ٹیکسیوں کے کرائے ناقابلِ برداشت حد تک پہونچ گئے ہیں۔ لمبے فاصلے طے کرنا، تانگوں اور رکشاؤں کے بس کا روگ نہیں رہا۔ حالات میں زیادہ سے زیادہ لوگ اپنی نجی ٹرانسپورٹ رکھنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور ان کی نظرِ انتخاب خواہ مخواہ دو پہیہ گاڑی پر پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ سماجی و اقتصادی حالات نے کنبے کی جسامت کو کم کرنے پر مجبور کر دیا ہے اور چھوٹے کنبے کے لیے چھوٹی گاڑی موزوں ثابت ہوئی ہے۔ لہذا اسکوٹروں، موٹر سائیکلوں اور موپیڈوں کی جانب زیادہ سے زیادہ لوگوں کا جھکاؤ ہونا قدرتی امر ہے۔

دو پہیہ گاڑیوں کی پیداوار بڑھائی جائے اور وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی قوتِ خرید کے اندر آجائیں اس کے لیے حکومت نے ۱۰۰ سی سی انجنوں تک دو پہیہ گاڑیوں کی تیاری کے لیے غیر ملکی اشتراک کار کی اجازت دیدی ہے ـــ ۱۹۸۳ء میں لائسنس جاری کرنے کی پالیسی کو زیادہ نرم بنایا گیا جس سے ان گاڑیوں کو تیار کرنے والے یونٹوں کی تعداد بڑھ کر ۱۴ ہو گئی۔ ۱۰۰ سی سی انجنوں تک والی دو پہیہ گاڑی پر پیداواری ٹیکس کم کر کے ساڑھے دس فیصد کر دیا گیا۔ کمپنیوں کو نہ صرف غیر ملکی اشتراک کار کی اجازت دی گئی بلکہ ان یونٹوں کو شیئر (حصص) جاری کرنے کے لیے بھی لائسنس دئے گئے۔ اس کے علاوہ ان کے حصوں پرزوں کی درآمد کے لیے ڈیوٹی میں بھی کمی کر دی گئی۔

بعض بڑے بڑے یونٹوں کی طرف سے گزشتہ دو برس میں دو پہیہ والی گاڑیاں مارکیٹ میں لائی گئیں، اُن کی تفصیل مندرجہ ذیل گوشوارے سے ظاہر ہے :۔

اس شعبے میں چند نئی کمپنیوں کو بھی لائسنس دیئے گئے ہیں۔ یہ نئی کمپنیاں ہیں: لوہیا مشینز (کانپور) اے پی اسکوٹر (حیدر آباد) ان دونوں کمپنیوں نے اٹلی کی فرم پیاگیو سے اشتراک کار کا معاہدہ کیا ہے۔ نائیک ہونڈا لمیٹڈ (یہ نائیک انجینئرنگ کا ایک امدادی ادارہ ہے جو موپیڈ کی تیاری میں مصروف ہے) اس نے جاپان کی فرم ہونڈا موٹرز سے اشتراک کار کیا ہے۔ لوہیا مشینز اور اے پی اسکوٹرز کو شروع میں ایک لاکھ اسکوٹروں کی تیاری کے لیے لائسنس دئے گئے تھے لیکن حال ہی میں حکومت کی طرف سے لوہیا مشینز کی پیداواری صلاحیت میں مزید ۲ لاکھ کا اضافہ کرنے کے لیے لائسنس جاری کر دئے گئے ہیں۔ ان اداروں کے علاوہ حکومت نے موجودہ یونٹوں کی پیداواری صلاحیت بڑھانے کی بھی اجازت دیدی ہے۔ بجاج آٹو کو اپنی پیداوار ۴ لاکھ ۶۰ ہزار کرناٹک اسکوٹرز اور اے پی اسکوٹرز کو اپنی پیداوار ۲۴ ہزار اور ۴۸ ہزار

نام کمپنی	۱۹۸۴	فیصد	۱۹۸۳	فیصد
بجاج آٹو	۲۱۴۲۹۳	۲۵٫۷	۱۹۲۳۱۱	۲۵٫۳
نائٹک ہونڈا	۱۵۷۴۹۰	۱۸٫۹	۱۳۲۹۳۸	۱۷٫۵
سُندرم کلیٹن	۹۹۵۸۸	۱۲٫۰	۷۰۱۸۱	۹٫۳
میجسٹک آٹو	۹۵۳۲۳	۱۱٫۵	۱۰۹۲۶۴	۱۴٫۴
اسکارٹس	۸۱۱۴۲	۹٫۷	۶۸۵۲۲	۹٫۰
مہاراشٹر اسکوٹرز	۵۵۲۴۷	۶٫۶	۵۳۴۱۴	۷٫۰
اینفیلڈ انڈیا	۳۹۲۹۹	۴٫۷	۲۷۸۵۵	۳٫۷
اسکوٹرز انڈیا	۳۰۷۵۸	۳٫۷	۳۰۶۶۰	۳٫۶
آئیڈیل جاوا	۲۷۶۴۷	۳٫۳	۳۳۴۲۴	۴٫۴
آٹوموبائل پراڈکٹس	۹۹۰۹	۱٫۲	۱۴۳۱۹	۱٫۹
میزان	۸۳۲۹۵۲	۱۰۰٫۰	۷۵۹۰۱۰	۱۰۰٫۰

موٹر سائیکلوں کی تیاری

سے ۷۰ ہزار تک بڑھانے کی اجازت دی گئی ہے۔ اور لوہیا اور آندھرا پردیش اسکوٹرز کا دعویٰ ہے کہ اُس کی اسکوٹر ٹکنالوجی جدید ترین ہوگی۔ (کیونکہ انھوں نے دُنیا کے سب سے بڑے اسکوٹر ساز کارخانے پیاگو سے اشتراکِ کار کا معاہدہ کیا ہے)۔ اور اس لیے اُن کی گاڑی مارکیٹ میں افضل ترین ہوگی۔ اسکوٹروں اور موپیڈوں کے مقابلے میں موٹر سائیکلوں کی پیداوار کم رہی ہے۔ اس صنعت کی طرف سے ۱۹۷۰ میں تیار کیے گئے ۴۳ ہزار کے مقابلے میں ۱۹۸۴ میں ایک لاکھ ۶۷ ہزار موٹر سائیکل تیار کیے گئے ہیں اور اس طرح اس کی سالانہ شرح افزائش تقریباً ۲۰ فیصد رہی ہے۔ تاہم ان دونوں کے مقابلے میں مستقبل قریب میں موٹر سائیکلوں کی تیاری میں بھاری اضافہ ہوگا۔

سردست پانچ یونٹوں کی طرف سے موٹر سائیکل تیار کیے جا رہے ہیں جن میں تین پُرانے اور دو نئے ہیں۔ اسکارٹس لمیٹڈ (راجدوت) کا موٹر سائیکلوں کی کل فروختگی میں ۴۹ فیصد حصہ ہے اس کے بعد اینفیلڈ انڈیا (بلٹ) کا نمبر ہے جس کا کل فروختگی میں ۱۸ فیصد حصہ ہے اور نمبر ۳ آئیڈیل جاوا (یزدی) کا حصہ تقریباً ۱۰ فیصد ہے۔ اس شعبے کے دو نئے یونٹوں نے بجاج آٹو اور (بجاج ایم ۵۰) کا حصہ تقریباً ۱۶ فیصد ہے۔ جب کہ کرناٹک اسکوٹرز (بی ایس اے فاکس) کا حصہ برائے نام ہے۔ مدراس کے اینفیلڈ انڈیا لمیٹڈ کی طرف سے مغربی جرمنی کے زونڈاپ لائش کے تکنیکی اشتراکِ کار کے ساتھ ہلکے موٹر سائیکل اور منی موٹر سائیکل بنانے کا پلان بنایا گیا ہے۔ اس کمپنی نے اپنی سالانہ پیداواری صلاحیت ۳۰ ہزار سے ایک لاکھ ۲۰ ہزار تک بڑھانے کے لیے لائسنس حاصل کیا ہے۔

اسکارٹس کی طرف سے جاپان کی یاماہا موٹر کمپنی کے تکنیکی اشتراکِ کار کے ساتھ ۳۵۰ سی سی اور ۱۰۰ سی سی کے موٹر سائیکل تیار کیے جائیں گے۔ کرناٹک اسکوٹرز نے جو برطانیہ کی بی ایس اے سائیکلز کے تکنیکی اشتراکِ کار کے ساتھ ۵۰ سی سی کے ہلکے موٹر سائیکل بناتا ہے، اپنی سالانہ پیداواری صلاحیت ۲۴ ہزار سے ۶۰ ہزار تک بڑھانے کے لیے لائسنس حاصل کر لیا ہے۔

بجاج آٹو جو بجاج ایم ۵۰ تیار کرتا ہے۔ ۱۰۰ سی سی کے موٹر سائیکل بنانے کے لیے جاپان کے کاواساکی کے ساتھ گفت و شنید کر رہا ہے۔

موپیڈ

سردست موپیڈ ذاتی گاڑی خریدنے والوں میں سب سے زیادہ مقبول ہو رہا ہے کیوں کہ اس کی قیمت کم ہے اور اس میں پیٹرول کی کھپت بھی کم ہوتی ہے یعنی یہ ایک لیٹر میں تقریباً ۶۵-۷۰ کلومیٹر تک چلا جاتا ہے۔ جیسا کہ گوشوارے سے ظاہر ہے۔ ۱۹۷۰ میں اس کی پیداوار ۱۲ ہزار تھی جو ۱۹۸۴ میں بڑھ کر ۳ لاکھ ۷۰ ہزار ہوگئی۔ گویا اس میں ۲۹۷۵ فیصد اضافہ ہوا۔

گو ۱۲ یونٹوں کو موپیڈ تیار کرنے کے لیے لائسنس دیے گئے ہیں تاہم چند بڑے بڑے کارخانے جو سردست ان کی تیاری میں مصروف ہیں، وہ ہیں نائیک انجینیئرنگ (لونا - ۱۹۸۴ میں کل فروختگی کا حصہ ۴۲ فیصد)، سُندرم کلیٹن (ٹی وی ایس ۵۰ - کل فروختگی کا حصہ تقریباً ۲۶ فیصد)، میجسٹک آٹو (ہیرو میجسٹک کل فروختگی کا تقریباً ۲۵ فیصد حصہ)، موپیڈ انڈیا (سوویگا کل فروختگی کا تقریباً ۲ فیصد حصہ) اور باقیماندہ کارخانے کوئی ۵ فیصد موپیڈ تیار کرتے ہیں۔

نائیک انجینیئرنگ نے جوائٹی کے موٹو فرانکو کے تکنیکی اشتراکِ کار سے موپیڈ تیار کرنے کے لیے اپنی پیداواری صلاحیت ۲۴ ہزار سے ایک لاکھ تک بڑھانے کے لیے لائسنس کی درخواست دی ہے۔ اس نے فرانس کے "موٹو بی کین" کے انجینیئر ایسوسی ایشن کی تکنیکی جانکاری کے ساتھ موپیڈ پورا رینج تیار کرنے کا بھی پلان بنایا ہے۔ موجودہ یونٹوں کے علاوہ چند مزید یونٹ اس لائن میں داخل ہونے کا پلان بنا رہے ہیں جیسے نئی دلی کے شری ہریش جین (سویڈن کے مونارک کریسنٹ اے بی کے تکنیکی اشتراکِ کار کے ساتھ) مشرا چھنڈی موپیڈز (فرانس کے سائیکل پیوگیٹ کے ساتھ)۔ اور اینفیلڈ انڈیا (مغربی جرمنی کے زونڈاپ ورک کے ساتھ)۔ مستقبل قریب میں موپیڈ کی مانگ بڑھنے کا بھی بڑا امکان ہے۔ ۱۹۸۳-۸۴ میں ۳ لاکھ ۲۵ ہزار موپیڈ تیار ہوئے تھے۔ توقع ہے ۱۹۸۴-۸۵ میں اس کی پیداوار سوا چار لاکھ تک اور ۱۹۸۹-۹۰ میں ساڑھے آٹھ لاکھ تک بڑھ جائے گی۔ ●

ساجد علی ٹونکی

زراعتی مزدور اور انکے مسائل

ہمارے ملک میں زراعتی مزدوروں Agrioultural Labour کے مسائل صنعتی مزدوروں Industrial Labour کے مسائل سے کسی بھی حالت میں کم نوعیت کے حامل نہیں ہیں۔ ایک وجہ تو اس کی یہ ہے کہ بھارت کی تقریباً ۷۰ فیصد آبادی دیہاتوں میں رہ کر کھیتی باڑی یا اس سے متعلق دھندے کرتی ہے۔ لہٰذا اس کثیر آبادی کے مسائل پر غور کرنا ہمارے لیے لازمی ہو گیا ہے۔ اس مضمون کے ذریعے انہی کے مسائل پر غور و خوض کیا گیا ہے۔

کاشتکار مزدوروں کی پوچھ تاچھ سے متعلق پہلی کمیٹی کے مطابق جس کی تشکیل ۵۱-۱۹۵۰ میں ہوئی تھی، وہ لوگ زراعتی مزدور کہلاتے ہیں جو مزدوری کی پر کاشتکاری کرتے ہیں۔ اسی قسم کی دوسری کمیٹی جس کا قیام ۵۷-۱۹۵۶ میں ہوا تھا۔ اس نے زراعتی مزدوری کے بارے میں کہا تھا کہ یہ وہ مزدور ہیں جو مزدوری پر کاشتکاری، ڈیری، مرغی پالن، جانوروں کی دیکھ بھال وغیرہ کرتے ہیں۔ عام طور سے یہ مانا جاتا ہے کہ وہ مزدور جو اپنے سال بھر کے کل کام کے گھنٹوں میں سے نصف گھنٹوں کا استعمال کرایہ کی مزدوری کی مانند کرتا ہے اسے زراعتی مزدور یا مزدور کسان کہتے ہیں۔ زراعتی مزدور عام طور سے دوسرے کے کھیت پر ہل جوت کر، پود سے لگا کر، بوائی یا نرائی، یا آبپاشی یا کٹائی وغیرہ کر کے مزدوری حاصل کرتا ہے۔

۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں زراعتی مزدوروں کی کل تعداد ۴٫۷۵ کروڑ تھی جو مزدوروں کی کل تعداد کا ۲۶٫۳۳ فیصد تھی جب کہ ۱۹۶۱ء میں اس قسم کے مزدوروں کی تعداد ۳٫۱۵ کروڑ تھی جو کل مزدوروں کی تعداد کا ۱۶٫۷۱ فیصد تھی۔ ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان مزدوروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ حکومت کی کافی کوششوں کے بعد موجودہ زمانے میں ضرور اس تناسب میں کچھ کمی واقع ہوئی ہے۔ ملک کی آبادی میں اس طرح بڑھتے ہوئے مزدور کسان کے تناسب سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ فراہم ہونے والے مواقع غیر مساوی ہیں۔ اس خطرے کو وقت سے پہلے ٹالا جانا چاہیئے۔ ہندوستان میں زراعتی مزدوروں کی تعداد کا اندازہ حسبِ ذیل گوشوارے سے لگایا جا سکتا ہے، ملاحظہ فرمائیں :-

سال مردم شماری	ملک کی کل آبادی (کروڑ میں)	کل زراعتی مزدوروں کی تعداد (کروڑ میں)	ملک کے کل مزدوروں کی تعداد (کروڑ میں)	کل مزدوروں میں زراعتی مزدوروں کا تناسب
۱۹۰۱	۲۳٫۶۲	۱٫۷۳	۱۱٫۰۷	۱۵٫۵۹ فیصد
۱۹۱۱	۲۵٫۲۱	۲٫۴۱	۱۲٫۱۳	۱۹٫۸۴ "
۱۹۲۱	۲۵٫۱۳	۱٫۹۶۵	۱۱٫۷۷۵	۱۶٫۶۹ "
۱۹۳۱	۲۷٫۹۰	۲٫۲۱	۱۲٫۰۷	۱۸٫۳۳ "
۱۹۴۱	۳۱٫۸۵	دستیاب نہیں	دستیاب نہیں	دستیاب نہیں "
۱۹۵۱	۳۶٫۱۱	۲٫۷۵	۱۳٫۹۴	۱۹٫۷۲ "
۱۹۶۱	۴۳٫۹۲	۳٫۱۵	۱۸٫۸۶۸	۱۶٫۷۱ "
۱۹۷۱	۵۴٫۷۹	۴٫۷۵	۱۸٫۰۴	۲۶٫۳۳ "
۱۹۸۱	۶۸٫۳۸	۴٫۶۰	۲۵٫۵۰	۱۹٫۲۱ "

زراعتی مزدوروں کی تعداد میں ہو رہے اس اضافے کی متعدد وجوہات ہیں۔ سب سے اہم مسئلہ تو مسلسل بڑھتی ہوئی آبادی اور بے روزگاری کا ہے۔ جب یہ دیہاتوں کے اَن پڑھ کسان کہیں روزگار تلاش نہیں کر پاتے ہیں وہ آخر کار اپنا خاندانی پیشہ کھیتی باڑی کا اختیار کر لیتے ہیں۔ یا تو اپنے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر کئی کئی لوگ کام کرنے لگتے ہیں۔ ورنہ دوسرے کی زمین پر محنت کر کے مزدوری حاصل کرتے ہیں۔ تعلیم کی کمی سے کسان مزدور میں بُری عادتیں گھر کر جاتی ہیں۔ نیز وہ احساسِ کمتری میں مُبتلا رہتا ہے۔ جس سے اس پر جمود طاری ہو جاتا ہے اور کسان شہری زندگی میں اپنے کو بہت پچھڑا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔ لہذا وہ کچھ کرنے کے مقابلے قناعت اختیار کر لیتا ہے یہی کاہلی اسے پستی کی عمیق گہرائیوں میں لے جاتی ہے۔

کبھی کبھی دیہاتوں میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی کھیت پر خاندان کے کئی افراد کام کرتے ہیں۔ اگرچہ کھیت چھوٹا ہی کیوں نہ ہو جب کہ لوگ اس عمل کو محبّت اور اتحاد و اتفاق سے موسوم کرتے ہیں حالانکہ یہ بے روزگاری کی ایک قسم ہے۔ اِسے چھُپی بے روزگاری Disguised unemployment کہتے ہیں۔ بھارت میں یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ جس کام کو چار افراد کر سکتے ہیں اس کو پورا کرنے کے لیے بیسؔ آدمی تک لگے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مزدور کو ملنے والی مزدوری کی شرح کم ہو جاتی ہے۔

وزارتِ محنت کے ایک سروے کے مطابق ہمارے ملک کی مختلف ریاستوں میں پورے سال میں زراعتی مزدوروں میں کام کے دنوں کی میعاد حسبِ ذیل ہے۔

مغربی بنگال	۲۰۰	دن
تامل ناڈو	۲۰۰	دن
بہار	۱۵۱	دن
کرناٹک	۱۲۱	دن

ایک تو کام کے دن یہی کم ہیں دوسرے اس پر ملنے والی قلیل مزدوری، یہ دونوں غریب اور امیر کے فرق کو بڑھانے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ جہاں تک مزدور کو ملنے والی مزدوری کا تعلق ہے تو مزدوروں کے لیے یہ اُجرت ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۱٫۰۹ روپے تھی جو ۱۹۵۶-۵۷ء میں گھٹ کر ۰٫۹۰ روپیہ یومیہ ہی رہ گئی۔ بعد میں ۱۹۶۴-۶۵ میں بڑھ کر ۱٫۳ روپے ہو گئی۔ جبکہ خواتین زراعتی مزدور کو ملنے والی یہ مزدوری ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۰٫۶۸ روپیہ تھی جو ۱۹۵۶-۵۷ء میں تو ۰٫۵۹ روپیہ یومیہ رہ گئی اور بعد میں ۱۹۶۴-۶۵ء میں بڑھ کر ۰٫۹۵ روپے یومیہ رہ گئی۔ حالاں کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس مزدوری میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے لیکن قیمتوں کے اضافے نے معیارِ زندگی کو واپس دھکیل دیا ہے۔

علم کی کمی، غربت اور غلط سلط رسم و رواج یہی عناصر مِل کر مزدور کسان کے اخراجات تو بڑھا دیتے ہیں لیکن آمدنی میں رکاوٹ بنتے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی قدرتی مصائب یعنی قحط، سیلاب وغیرہ اس مزدور کسان کے نانِ شبینہ کو بھی چھین لیتے ہیں۔ جس سے مجبوراً اس کو ساہوکار یا مہاجن کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے۔ اور ان کے چنگل میں پھنس کر نسلاً بعد نسلٍ وہ قرض کی ادائیگی میں لگا رہتا ہے۔ تبھی تو کسی نے کہا ہے کہ ہندوستانی زراعتی مزدور مقروض ہی پیدا ہوتا ہے، مقروض ہی زندگی بسر کرتا ہے اور مقروض ہی یہاں سے رُخصت ہو جاتا ہے۔"

کبھی کبھی کسان کو اپنی زمین گروی رکھ کر بھی قرض لینا پڑتا ہے۔ اس طرح وہ زمین کا مالک ہوتے ہوئے بھی اس سے محروم ہو جاتا ہے اور گذر بسر کرنے کے لیے اسی زمین پر یا کہیں اور دوسرے کی زمین پر محنت مزدوری کرنے لگتا ہے۔

ڈاکٹر پی۔ وی۔ نارائن کے مطابق جنگ کے موقعوں پر بغیر زمین والے مزدوروں میں قرض کی شرح تقریباً ۵۴٫۶۰ فیصد تھی۔ کاشتکاروں سے متعلق پوچھ تاچھ کمیٹی کے مطابق زراعتی مزدوروں پر کُل قرض کی رقم ۱۹۵۰-۵۱ میں ۸۰ کروڑ روپے تھی جو بعد میں بڑھ کر ۱۹۵۶-۵۷ء میں ۱۴۳ کروڑ ہو گئی۔ قرض کی رقم بحساب فی کنبہ جو پہلے ۱۰۵ روپے تھی بعد میں ۱۳۸ روپے ہو گئی۔ اسی کمیشن کے مطابق ۱۹۵۰-۵۱ء میں کُل ۴۵ فیصد خاندان مقروض تھے، جو ۱۹۵۶-۵۷ء میں ۶۸ فیصد ہو گئے۔ قرض کی اسی عادت کی وجہ سے بندھوا مزدوروں کی تعداد بڑھتی ہے۔ بھارت ایک آزاد جمہوری مُلک ہے۔ بندھوا مزدور کا مسئلہ ہمارے نام پر کلنک ہے۔ جب زراعتی مزدور پر قرض اور اخراجات کا بوجھ حد سے تجاوز کرنے لگتا ہے تو وہ مجبور ہو کر بندھوا مزدور بن کر غلامی کی زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اس قسم کے مزدور ہر جانب سے کمزور ہوتے ہیں ذہنی طور پر تو مفلوج ہوتے ہی ہیں اس پر مستقل بیماری، پھر صحیح معنی میں علاج نہیں کر سکتے۔ غذا متوازن نہیں مل پاتی جس سے مختلف بیماریوں کا مزید خدشہ رہتا ہے۔ بیمار رہنے سے ایک تو جسم کمزور رہتا ہے اس پر مالک کی

طرف سے کام کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ اس طرح مزدور کا ہر جانب سے ناجائز استعمال Exploitation ہوتا رہتا ہے۔ اس حالت میں اگر اس کی موت واقع ہو جائے تو عورت بیوہ اور بچّے یتیم ہو جاتے ہیں۔ اُمید کی ایک کرن بھی خاموش ہو جاتی ہے اور سماج پر مزید بوجھ بڑھ جاتا ہے

زراعتی مزدوروں میں صنعتی مزدوروں کی مانند یونین یعنی اتحاد کی کمی ہوتی ہے۔ ان کی کوئی ٹریڈ یونین نہیں ہوتی۔ اس کی ایک وجہ تو کسان کی لاعلمی، دوسرے دُور دُور پھیلے ہوئے کھیت۔ کسی کارخانے یا فیکٹری کی طرح تمام کسان ایک مقام پر جمع بھی نہیں ہو سکتے تاکہ اپنی مانگیں یا مسائل حکومت تک پہونچا سکیں۔

آزادی کے بعد مسلسل ہماری حکومت اس جدوجہد میں لگی ہوئی ہے کہ ہندوستانی کسان کے مسائل حل ہو جائیں۔ گاندھی جی نے کہا تھا کہ حقیقی بھارت اگر دیکھنا ہے تو گاؤں کو دیکھو۔" اگر اسی بات کو یُوں کہیں کہ حقیقی بھارت اگر دیکھنا ہے تو کسان کو دیکھو، تو یہ بھی غلط نہیں ہوگا۔ اور ہم اس بات کو اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت میں اگر ملک کی ترقی کو دیکھنا ہے تو ہندوستان کے کسان کی ترقی کو دیکھو۔ لہٰذا ہماری موجودہ حکومت اس جانب بہت کچھ کوششیں کر رہی ہے۔

اس سلسلے میں ۱۹۴۸ء میں مرکزی حکومت نے کم سے کم مزدوری کے تعیّن سے متعلق قانون بنایا تھا۔ جس کے تحت تقریباً تمام مُلک کی ریاستوں میں کم سے کم مزدوری جو زندگی گذارنے کے لیے درکار ہو مقرر کر دی گئی تھی۔ اس طرح بندھوا مزدوروں کے خاتمے سے متعلق قانون

(باقی صفحہ ۶ پر)

بقیہ: قلبی امراض پر کیونکر قابو پایا جائے

چربی کا بڑھنا ہے۔ اس کے لیے آپ کو کسی ڈاکٹر سے مشورہ لینا ہوگا کیوں کہ وہی بتا سکتا ہے کہ کیا آپ کا کولیسٹرول بڑھا ہوا ہے اس کے لیے آپ کو خون کا معائنہ کرانا ہوگا۔ خون میں چربی کو کم کرنے کا طریقہ دراصل بھارت کی دیہی غذا کو اختیار کرنا ہے جس میں گوشت نہیں ہوتا یا اگر ہوتا ہے تو بہت کم۔ انڈوں میں کمی کی جانی چاہیے۔ اور ہفتے میں دو سے زیادہ انڈے نہیں لینے چاہئیں۔ جہاں تک پنیر کا تعلق ہے وہ بھارتی طریقے سے بنا ہوا ہونا چاہیئے کیونکہ بھارتی پنیر میں زیادہ کولیسٹرول نہیں ہوتا۔ ایک اور خطرے کا سبب ذیابیطس ہے اور پھر اس کے لیے خاندانی وجوہ ہوں گی۔ یا اُس شخص کو بار بار باتھ روم جانے کی حاجت ہو سکتی ہے۔ اس کی روک تھام صرف خون میں شکر کے معائنے یا پیشاب میں شکر کے معائنے کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔

اور ذیابیطس پر غذا سے قابو پایا جا سکتا ہے اور ادویات بھی قلبی مرض کے اسباب کو کم کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

ایک اور سبب ہے تناؤ۔ اور بلاشبہ جوں جوں سماج زیادہ ترقی یافتہ ہو رہا ہے تناؤ بھی زیادہ عام ہوتا جا رہا ہے اور تناؤ کو دُور کرنے کا بہترین طریقہ ورزش ہے کیونکہ ہم عموماً دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص زیادہ تناؤ والا کام کرتا ہے وہ گھر آنے پر تھکا ماندہ ہوتا ہے وہ اُس کے بعد کچھ نہیں کر سکتا۔ ورزش کر کے عضویاتی تناؤ کو بھی دُور کیا جا سکتا ہے۔ ورزش نہ کرنا بھی قلبی مرض کا بڑا سبب ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ورزش کرتا ہے اور اُسے برقرار رکھتا ہے تو وہ دل کے حملے کے امکانات کو بہت حد تک دُور کر سکے گا سب سے پہلے اُس کے خون کا کولیسٹرول کم ہو جائے گا اُس کے خون کی شکر بھی صحیح ہو جائیگی اور اُسکے خون کی آکسیجن کھینچنے کی صلاحیت بھی بڑھ جائے گی۔ اس سے خون کا دباؤ بھی بہتر ہو جائیگا

بھارت میں بلاشبہ قدیمی غذا یا وہ غذا جو بعض دیہات میں ابھی تک کھائی جا رہی ہے اور جسے ہمارے بزرگ بھی کھا رہے ہیں۔ بہترین غذا ہے۔ مغربی اثر سے ہم میں بُری عادتیں پیدا ہوئی ہیں۔ گوشت خوری، مکھن اور مرغن غذاؤں کا رواج مغرب کے اثر سے بڑھا ہے۔ دراصل غذا میں ریشے یعنی دلیا ہونا چاہیئے۔ ایسی چیزیں قلبی امراض کی روک تھام کے لیے مثالی ہیں۔

اگر لوگ واقعی اپنے قلبی امراض پر قابو پانے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو میں کہوں گا کہ وہ جب صبح کو بیدار ہوں تو وہ یوگا کریں، جس سے وہ ہلکا پھلکا محسوس کریں گے۔ وہ پہلے ورزش کریں اور اُس کے بعد ناشتہ لیں جس میں انڈے اور گوشت نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ دلیا اور چکنائی سے پاک دُودھ ہونا چاہیئے۔ وہ اپنا کام باقاعدگی کے ساتھ کریں اور پھر چند ماہ کے بعد اپنے خون کے دباؤ کی جانچ کرائیں۔ غذا میں نمک کی مقدار کم کر دیں۔ اور وہ شام کو بھی یوگا، دھیان اور ورزش کر سکتے ہیں لیکن اس کے ساتھ اُنھیں سگریٹ نوشی اور مرغن غذاؤں سے دُور رہنا چاہیئے۔ اور اپنے وزن کو بڑھنے نہیں دینا چاہیئے۔ اس سے قلبی امراض کی روک تھام کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ ●

ریاحی بخار

جب انھیں گلے کی سوزش چھوت کی بیماری سے ہو اور اُس کا فوراً علاج کیا جائے تو انھیں ریاحی بخار نہیں ہوگا۔ لہٰذا ان بچوں اور نوعمر بالغوں کی مناسب دیکھ بھال کر کے ریاحی بخار کی روک تھام کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح اُن افراد کی جنھیں ریاحی بخار ہو گیا ہو یا انھیں دوبارہ یہ بخار ہو گیا ہو جن کا مطلب ہے کہ اُن پر ریاحی بخار کا دوسرا حملہ ہوا ہے تو مناسب دیکھ بھال اور ایسے طریقوں سے جو دستیاب ہیں اُس کی روک تھام کی جاسکتی ہے۔ پنسلین کے علاج سے جس میں ایک گولی روزانہ دی جاتی ہے ریاحی بخار کے اعادہ کو روکا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ایک بار ایک مریض کو ریاحی بخار ہو جائے اور اُس کا حملہ جاری رہے تو اُسے شدید مرض ہو جائے گا اور اُس کے (قلبی) والو معزوب ہو سکتے ہیں اور اُس وقت اُسے انتہائی سوفسطائی علاج معالجے کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ اس کی روک تھام کرنے کے لیے اگر ان لوگوں کا ابتدائی مرحلے پر پنسلین سے علاج کیا جائے جیسے معالج عموماً تجویز کرتے ہیں تو قلبی مرض سے ہونے والی ایک بڑی معذوری سے بچا جاسکتا ہے۔

قوت بخش غذا کی ضرورت

ایک اور امر جس سے قلبی مرض کی روک تھام کی جاسکتی ہے وہ ہے کافی قوت بخش غذا۔ اگر اُن بچوں کو وٹامن سے بھرپور غذائیں دی جائیں اور بالغوں کی حالت میں غذا کو بہتر بنایا جاسکے اور ایسے اسباب کو کم کیا جاسکے جن سے دل کو نقصان پہنچ سکتا ہے تو قلبی مرض کی روک تھام ہوسکتی ہے۔ بلاشبہ قلبی مرض کی نمایاں ترین مثال دل کا حملہ ہے۔ یہ بہت ڈرامائی ہے۔ آپ کسی شخص کی بابت سُنتے ہیں جو ایک نوعمر ناظم ہے۔ جس نے تعلیم حاصل کرنے میں کئی برس گزارے ہیں۔ کالجوں میں تعلیم پائی ہے یا کاروبار شروع کیا ہے، وہ ۴۰ یا ۴۲ برس کا ہے۔ وہ بھرپور جوانی میں ہوتا ہے کہ اس پر اچانک دل کا حملہ ہوتا ہے۔ یہ بڑی ڈرامائی بات ہے۔ اسے عالم جدید پر قدرت کی لعنت بیان کیا گیا ہے۔ گذشتہ صدیوں میں پلیگ اور اُس جیسے وبائی امراض ہوتے تھے جو پھیلتے تھے، قحط پڑتا تھا اور ساری آبادی کا صفایا ہو جاتا تھا۔ لیکن اب جدید علم کی بدولت ان باتوں کی روک تھام کی جاسکتی ہے۔ قلبی مرض جوانی میں ہوتا ہے اور وہ افراد، کنبے اور ملک کو نقصان پہنچاتا ہے۔

علاج سے پرہیز بہتر

قلبی مرض سے بہترین بچاؤ پرہیز ہے۔ پرہیز بہتر ہے اور علاج سے ارزاں تر ہے اور وہ قلبی مرض یا دل کے حملوں کے بارے میں یقیناً سچ ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کچھ ایسی باتیں ہیں جو خطرہ پیدا کرتی ہیں۔ خطرے سے مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مریض یا شخص میں یہ باتیں ہوں تو اُس پر دل کا حملہ ہونے کے زیادہ امکانات ہیں اور خطرے کی باتیں جنکی نشاندہی متعدد ڈاکٹروں کی طرف سے کی گئی ہے وہ ہیں خون کا اعلیٰ دباؤ، سگریٹ نوشی، شریانوں میں زیادہ چربی کا جمع ہونا، ذیابیطس، زیادہ تناؤ، ورزش کی کمی، موٹاپا اور بلاشبہ بعض موروثی اسباب۔ اب بعض باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ آپ موروثی اسباب میں تبدیلی نہیں کرسکتے لیکن دوسری باتوں میں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔

شروع میں دل کے حملے کا اہم ترین سبب خون کا اعلیٰ دباؤ ہے اور پھر خون کے اعلیٰ دباؤ کو آسانی سے روکا جاسکتا ہے یا کنٹرول کیا جاسکتا ہے تقریباً ہر شخص چند منٹ کی تربیت سے جان سکتا ہے کہ خون کے اعلیٰ دباؤ کو کیوں کر روکا جاسکتا ہے۔ اگر خون کا دباؤ بڑھا ہوا ہو تو اسے محض خوراک میں تبدیلی کر کے کنٹرول کیا جاسکتا ہے اور اہم ترین بات یہ ہوگی کہ کھانے میں نمک کی مقدار کو کم کیا جائے اور کیلوریوں (حرارتوں) کو بھی گھٹایا جائے جس کا مطلب ہے مثالی وزن۔ جسم کا مثالی وزن ہے ۵ فٹ لمبی عورتوں کے لیے ۱۰۰ پونڈ اور اتنے ہی لمبے مردوں کے لیے ۱۰۶ پونڈ۔ اور اس کے بعد ہر انچ کے لیے ۶ پونڈ کا اضافہ کرتے جائیے۔ دوسرے الفاظ میں اگر کوئی شخص ۵ فٹ ۴ انچ لمبا ہے تو مرد ہونے کی صورت میں اُس کا وزن ۱۳۰ پونڈ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے اگر ایسے شخص کا وزن ۱۳۰ پونڈ سے زیادہ ہے تو اُسے یقیناً اپنے وزن میں کمی کرنی چاہیے۔

باقاعدہ ورزش کی ضرورت

اور بلاشبہ باقاعدہ ورزش کا پروگرام ہونا چاہیے۔ یہ پروگرام تیز چلنے جیسی ورزش سے ہمیشہ شروع کیا جانا چاہیے اور پھر اسے بڑھایا جاسکتا ہے اس کے بعد تقریباً ۱۵ منٹ تک ورزش کی جائے اور تقریباً ۵ منٹ تک دماغ کو آرام دیا جائے۔ بلاشبہ ہم بھارت میں ایک اور بات یعنی مراقبے (دھیان لگانے) سے واقف ہیں۔ اب دھیان مختلف صورتوں میں لگایا جاسکتا ہے جو مذہبی یا غیر مذہبی بھی ہوسکتا ہے۔ اس سے تناؤ میں کمی ہوتی ہے، اور خون کے دباؤ میں بھی کمی آتی ہے۔ سگریٹ نوشی ایک اور سبب ہے جو بھارت میں نسبتاً بہت عام ہے۔ سگریٹ نوشی میں کمی کی جانی چاہیے کیونکہ سگریٹ نوشی سے نہ صرف کینسر ہوتا ہے بلکہ دل کے حملے بھی ہوتے ہیں اور خون کا دباؤ بھی بڑھتا ہے لیکن اسے بند کرنا آسان ہے بشرطیکہ آپ ایسا کرنے کی کوشش کریں۔ دوسرا خطرے کا سبب کولیسٹرول یعنی شریانوں میں

(باقی صفحہ ۲۰ میں)

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81
Licensed U (DN) 65 to post without prepayment at NDPSO, New Delhi.
Vol. 6 No. 2
YOJANA (URDU)
16-30th April 1986

• پبلک سیکٹر کے کچھ اہم اداروں کی کارکردگی میں قابلِ ذکر اضافہ ہوا ہے۔ ان اداروں کی پیداوار، صلاحیت کے استعمال اور نشانے کے حصول میں اپریل تا دسمبر ۱۹۸۵ کے دوران ۱۹۸۴ کی اسی مدت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ ان میں سے کچھ صنعتیں، فولاد، اسفنج لوہے، المونیم، جست، خام تیل، نائٹروجن، کیمیاوی کھاد، طبعی کیمیات، انجنیئرنگ کے سامان، اخباری کاغذ، جوتوں اور کاغذ وغیرہ کی ہیں۔ مذکورہ مصنوعات تیار کرنے والے اداروں کے نام ہیں:

بھارت ہیوی الیکٹریکلز لمیٹڈ، برن اسٹینڈرڈ، بھارت ہیوی پلیٹ اینڈ ویسلز، ہندوستان مشین ٹولز لمیٹڈ، ہیوی انجنیئرنگ کارپوریشن لمیٹڈ، ماروتی اُدیوگ، اینڈریو لولے، بھارت الیکٹرانکس لمیٹڈ، بھارت پمپس اینڈ کمپریسرز وغیرہ۔

اسٹیل اتھارٹی آف انڈیا لمیٹڈ کے مربوط فولاد ساز کارخانوں میں فولاد کے ڈلوں کی پیداوار مذکورہ مدت میں ۵۰ لاکھ ۴۰ ہزار ٹن ہوئی۔ پیداواری صلاحیت کا استعمال ۶۳ فیصد سے بڑھ کر ۷۰ فیصد ہو گیا۔ قابلِ فروخت فولاد کی تیاری میں پیداواری صلاحیت کا استعمال ۶۷ فیصد سے بڑھ کر ۷۰ فیصد ہو گیا۔ ۸۵-۱۹۸۴ میں فولاد کے ڈلوں اور قابلِ فروخت فولاد کے لیے صلاحیت کا استعمال بالترتیب ۶۲ فیصد اور ۶۳ فیصد تھا۔

• قدرتی طریقۂ علاج کی تحقیق و تربیت اور علاج معالجے کی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی غرض سے پونے کے قدرتی طریقۂ علاج کے قومی ادارے کو سب سے بڑے ادارے کی حیثیت سے فروغ دیا جائیگا۔ اس غرض سے ساتویں منصوبے میں ایک کروڑ روپے کی رقم منظور کی گئی ہے۔

• گذشتہ برسوں میں ریاستوں کے فاضل اخراجات کی وجہ سے اُن کے وسائل پر پڑنے والے دباؤ کو کم کرنے کے پیشِ نظر مرکز نے موجودہ سال (۸۶-۱۹۸۵) میں ریاستوں کو ۱۶۲۸ کروڑ روپے کا ایک وسط مدتی قرضہ مُہیا کیا ہے۔ مرکز نے ریاستوں سے کہا ہے کہ وہ ٹیکس کی وصولیوں کو بہتر بنائیں اور غیر منصوبہ جاتی اخراجات کی روک تھام کریں۔

• ریلوے نے مال اور مسافر گاڑیوں کو بہتر رفتار، پابندی وقت اور سلامتی سے چلانے کے لیے متعدد نئے آلات اور انتظامات رائج کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان میں چلتی گاڑیوں میں انجن ڈرائیور اور گارڈ کے درمیان مائکرو ویو اور وائرلیس کے ذریعے بات چیت کے آلات کا استعمال بھی شامل ہے۔

• راکٹ ایندھن کے لیے خلا کے شعبہ نے ملک میں ہی اہم کیمیاوی اشیا تیار کی ہیں۔

• الیکٹرانکس کے محکمے نے افرادی قوت کے فروغ کے لیے کئی پروگرام تجویز کئے ہیں۔ ان میں افرادی قوت کے فروغ، تعلیم میں الیکٹرانکس کے اطلاق اور خاص طور پر کمپیوٹر یا اس سے وابستہ شعبوں میں افرادی قوت کے فروغ کے پروگرام شامل ہیں۔

• دلی انتظامیہ کے جانب سے مقرر کردہ ایک کمیٹی نے دلی اور اس کے آس پاس جمنا ندی میں آلودگی کی روک تھام کے لیے ایک طویل مدتی منصوبہ تیار کیا ہے۔ یہ منصوبہ جس پر تقریباً ۱۹۹ کروڑ روپے خرچ ہونے کا تخمینہ لگایا گیا ہے باڑھ کی روک تھام اور آبپاشی، پانی کی فراہمی اور گندے پانی کی نکاسی نیز صنعتی مقامات میں آلودگی کی روک تھام کی تدابیر وغیرہ پر مشتمل ہے۔

• ساتویں منصوبے کے دوران دور درشن پر ۷۰۰ کروڑ روپے خرچ کیے جائیں گے جس میں ایک کلوواٹ تک کی طاقت کے نئے ٹی وی ٹرانسمیٹروں کی تنصیب اور مرمت کا کام دیکھنے والے ملحقہ مراکز پر خرچ ہونے والے ۵۳۰.۵ کروڑ روپے کے اخراجات بھی شامل ہیں۔

• اڑیسہ میں چندا کا تحفظ گاہ کی ترقی اور توسیع پر کُل ۸.۰۵ لاکھ روپے خرچ کئے جانے ہیں۔

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5, Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یوجنا

ایک روپیہ

صنعتی مزدوروں کے مسائل

(ایس دھرم راجن)

کینسر کے مختلف پہلو

(خواجہ شاہجہاں)

محمد رضی الدین معظم

باغبانی کا پروگرام

درختوں کی اہمیت اور اس کی افادیت کے بارے میں تاریخی پس منظر میں مطالعہ کریں تو عہدِ عتیق سے ہی ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا درختوں سے گہرا تعلق رہا ہے۔ درختوں کے پھل پھول اور ترکاریاں انسان کی روزی رہی ہے۔ آج کے سائنسی دور میں درختوں کی بے پناہ مقبولیت اور اہمیت سے کوئی بشر انکار نہیں کرسکتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سال کے بارہ مہینوں میں پھل، پھول، ترکاریاں مہینوں کے لحاظ سے بلحاظ آب و ہوا سرسبز و شاداب ہوتی ہیں۔ لہٰذا درختوں کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کا تھوڑا گہرائی سے مطالعہ کریں تو ہم اس کے گوناگوں فوائد سے نہ صرف آگاہی حاصل کرسکتے ہیں بلکہ یہ ہماری مصروف زندگی میں ایک نعمت ثابت ہوں گے۔

چنانچہ ایک نقشہ ذیل میں درج ہے جس میں سال کے ہر مہینے کے لحاظ سے باغبانی کے عمل کو تقسیم کرکے دکھایا گیا ہے۔

جنوری

پھل: گلِ داؤدی میں پھول آنا قریب الختم ہوتا ہے۔ اُسے ذخیرے میں آئندہ کے لیے لگانا چاہیئے۔ گلاب میں کھاد دینے کے لیے بھی یہ مہینہ مناسب ہے۔

پھل:۔ انجیر، شفتالو اور انگور کو چھانٹنا اور لوکاٹ میں خوب پانی دینا چاہیئے۔ کینڈی ٹفٹ، ایسٹر اور اسٹرابری میں بھی پھول آنے کا یہی زمانہ ہے اس لیے ان کو بھی اس ماہ میں پانی دینا چاہیئے۔ امرود، شریفہ، لیمو، سنترہ اور گنّے کی فصل تیار ہوتی ہے۔ کیلا پال ڈالنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

ترکاریاں:۔

ترکاریوں کا یہ خاص زمانہ ہے۔ گاجر، مُولی، شلجم، گوبھی، کرم کلا، چقندر، پیاز، سلاد، سویا، میتھی، پالک، مٹر، ٹماٹر وغیرہ سب تیاری پر ہوتے ہیں ان کو سینچائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پانی دینا چاہیئے۔

فروری

پھول: پٹونیا، نلاکس، وائلٹ (بنفشہ) اور نرگس میں پانی دینا چاہیئے۔ گلاب کا داب اس ماہ میں اچھا لگتا ہے اور نومبر کی لگائی ہوئی قلمیں گملوں میں لگا کر سایہ میں رکھی جاتی ہیں۔ آرکڈ کو گملوں وغیرہ میں لگانے کا بہت اچھا موسم ہے۔

پھل:۔ آم، بیر اور ناشپاتی میں پھل آجانے پر پانی دینا چاہیئے۔ اناس میں بھی گوڑائی اور سینچائی کی جاتی ہے۔

ترکاریاں:۔

اس زمانے میں بہت کم ترکاریاں بوئی جاتی ہیں بلکہ جو بوئی ہوئی ہوتی ہیں اُن کی نگہداشت اور سینچائی کی جاتی ہے۔ اگر کسی چیز کے بونے میں دیر ہو جاتی ہے تو اس کی بُوائی بھی کرلیتے ہیں۔

مارچ

پھول:۔ یہ پھولوں کی بہار کم ہونے اور بیج اور گانٹھ جمع کرنے کا زمانہ ہے۔ ڈھلیا کی سینچائی بند کرکے اس کی پوٹلیاں بالو میں رکھنی چاہیئے

پھل:۔ کیلے کی مٹی بدلی جاتی ہے اور پانی دیا جاتا ہے۔ خربوزہ کی کاشت شروع ہو جاتی ہے۔ آڑو، ناشپاتی، آم، انگور، وغیرہ کو پانی دیتے ہیں اور الائچی تیاری کے قریب آجاتی ہے۔ ارنڈ خربوزہ تیزی سے پکنے لگتا ہے۔ انگور، انجیر اور رس بھری میں پھل آجاتے ہیں۔ آم نگرانی کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

ترکاریاں: شلجم، گاجر اور چقندر ختم ہونے کے قریب آجاتے ہیں بھنڈی اور خرفہ بویا جاتا ہے

اپریل

پھول:۔ ایک مہینہ میں پالیدگی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ گملے میں بھرے جاتے ہیں اور جب اوپر نکل آتے ہیں تو پانی دیا جاتا ہے۔ کروٹن اور اسی قسم کے پودوں کو جو دھوپ کو برداشت کرسکتے ہیں سائے میں رکھ دینا چاہیئے۔

پھل:۔ اسٹرابری کی سینچائی کا زمانہ ہے۔

ترکاریاں: پیاز اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کا بیج جمع کیا جاتا ہے۔

(باقی کورصـ۳ پر)

چیف ایڈیٹر — آر۔ ٹھکرال

اسسٹنٹ ایڈیٹر — محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر — وسیم حیدر

جلد ۶	یکم تا ۱۵ مئی ۱۹۸۶	شمارہ ۳

۱۱ ویشاکھ تا ۲۵ ویشاکھ، شک ۱۹۰۸ ؛ ٹیلیفون : ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سال ۳۵ روپے، ۳ سال ۵۰ روپے

فی کاپی ——— ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فیصد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منجالے

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴ لیول ۵ آر۔ کے۔ پورم (مین)

نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

ترسیل زر کا پتہ : بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

دیہی صنعت کاری

دیہات میں صنعت کاری کے عمل کو فروغ دینا اس لیے ضروری ہے کہ اس سے زراعت کو فروغ ملتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی شہری علاقوں میں صنعتوں کا دائرہ پھیلتا ہے۔ اس بنیادی نظریہ پر کاربند ہوئے بغیر زرعی مزدوروں وغیرہ کی بیروزگاری کے مسئلہ کو حل نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ اس عمل سے ایسے لوگوں کو بھی روزگار مل سکتا ہے جو پورے وقت کا روزگار نہیں کرتے ہیں، اس لحاظ سے بھی دیہی صنعت کاری بہت نفع بخش ہے۔ دیہی صنعت کاری سے زراعت کی ترقی ہوتی ہے اور زرعی ترقی سے دیہی صنعتوں کو فروغ ملتا ہے۔ اس کے نتیجے میں دیہی عوام کی آمدنی بڑھتی ہے۔ اس کے سبب نوجوانوں، عورتوں اور کام کرنے کے لائق سبھی افراد کو کام کا موقع ملتا ہے۔ اس کا ایک اور فائدہ یہ بھی ہے کہ دیہی عوام شہروں کی طرف نہیں بھاگیں گے۔ انھیں گھر پر رہ کر ہی نفع بخش روزگار مل جانے سے بالواسطہ طور پر شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے بہت سے مسائل کے حل ہونے میں مدد ملے گی۔ یہ عمل ہندوستان کی معاشی ترقی میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ دیہی ترقی کے عمل سے وہاں کے عوام کی اقتصادی اور سماجی حالت میں سدھار آ سکے گا۔ حکومت نے ۹۵-۱۹۹۴ تک ملک کی آبادی کی غریبی کی سطح میں کمی لانے کا جو پلان بنایا ہے، اس کے مطابق یہ گھٹ کر دس فیصد رہ جائے گی۔ دیہی صنعت کاری کے عمل کو بڑھاوا دے کر زراعت اور جدید صنعت میں عدم توازن کو دور کیا جا سکتا ہے۔ زراعت کی ترقی سے بہت سی ضمنی صنعتیں فروغ پا سکتی ہیں۔ ترقیاتی پروگراموں کے نتیجے میں جو فائدے سامنے آئے ہیں، اُن سے دیہی اور شہری آبادی کو یکساں طور پر فائدہ نہیں ہو سکا ہے۔ حصول آزادی کے بعد دیہی آبادی میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ اور غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی تعداد اب بھی کافی ہے۔ اس کا حل دیہی صنعتوں کی توسیع میں ہی پوشیدہ ہے۔ یہ صنعتیں مقامی مہارت، تکنیکی تجربے اور دستیاب خام مال پر مبنی ہونی چاہئیں۔ چنانچہ ایسے بہت سے اقدامات کئے جا رہے ہیں جن سے دیہات کی گھریلو صنعتوں کو تیزی سے آگے بڑھایا جا سکے۔ دیہی علاقوں میں بسنے والوں کی سماجی اور اقتصادی کایا پلٹ کے بغیر بحیثیت مجموعی ملک کی اقتصادی ترقی دشوار ہے۔ یہ ترقی محض اقتصادی محاذ پر خوشحالی سے ہی وابستہ نہیں ہونی چاہیئے بلکہ دیہی عوام کا معیارِ زندگی بلند کر کے نیز ان کے ثقافتی ورثے کو مالامال کئے بغیر اور اس سے دیہی عوام کو روشناس کرائے بغیر اس سلسلے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکتی۔ دیہی صنعتوں کا فروغ ملک کی طویل المدتی صنعتی ترقی کے پروگرام کا ہی ایک جزو سمجھا گیا ہے۔ ہمارے یہاں معیاری سامان کی تیاری بھی توجہ چاہتی ہے، چنانچہ دیہات میں قائم شدہ صنعتوں کے ذریعے جو مال تیار کیا جائے، وہ اتنا معیاری ہو کہ اسے باہر سے منگائے گئے سامان کی جگہ بآسانی استعمال کیا جا سکے۔ اس پروگرام کو عوامی تحریک کی صورت میں آگے بڑھانے پر زور دیا جا رہا ہے۔ دیہات میں تیار شدہ اشیاء کی فروخت کے لیے منڈی کا ملنا بھی ضروری ہے۔

دیہی صنعتوں کے فروغ سے ممکن اقدامات کے ساتھ ساتھ ایسے اقدامات کا بحیثیت مجموعی جائزہ لینا بھی ضروری ہے جس سے اس عمل کو آگے بڑھانے میں کسی طرح کی کوئی رکاوٹ نہ پیش آئے، مثلاً دیہی عوام کی تربیت کا مسئلہ، خام مال کی فراہمی کا مسئلہ اور اشیاء کی فروخت کا مسئلہ اور دیگر طرح کی قانونی اڑچنیں۔ ان سب پر نظر رکھنی ہوگی۔ اُن خامیوں اور دشواریوں کی نشاندہی بھی ضروری ہے۔ جن سے اب تک ہر عمل بسرعت آگے نہیں بڑھ سکا ہو۔ یہ سیکٹر بجا طور پر ترجیحی سلوک کا مستحق ہے۔ اس سے جڑا ہوا مسئلہ پسماندہ اور پچھڑے ہوئے علاقوں میں صنعتوں کے لگانے کا ہے اس طرح پسماندہ طبقات کو ان کاموں کی طرف راغب کرنا بھی اہم ہے۔ یہ کام اگرچہ بہت مشکل ہیں لیکن اس سمت میں مسلسل کوششیں راستے کی مشکلات کو دُور کر کے غریب عوام کی حالت بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔

(اسسٹنٹ ایڈیٹر)

سید اطہر رضا بلگرامی

زرعی سیکٹر میں اضافی محنت کش اور پوشیدہ بیروزگاری

ایک نظریاتی اقتصادی بحث

مغربی ماہرینِ اقتصادیات ترقی پذیر و پسماندہ ممالک کے معاشی مسائل اور ترقی میں گہری دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ انھوں نے مغربی ممالک میں کامیابی کے ساتھ اپنائے گئے "ماڈلوں" کو ان ممالک پر تھوپنے کے بجائے اُن کے معاشی مسائل میں ہی کوئی نہ کوئی حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسے ہی گرانقدر نظریات میں سے ایک نظریہ اضافی محنت کش اور پوشیدہ بے روزگاری کا ہے جو آج بھی مفکرین کے درمیان بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اس مضمون میں نظریہ کی وضاحت اور تنقیدی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اضافی محنت کش و پوشیدہ بیروزگاری

آرتھر ڈبلو لویس (A.W. LEWIS)
آر نرکسے (R. NURKSE)
فائی اور رینیس (FEI AND BANIS)
اور جارگنسن (JORGENSON) جیسے ماہرینِ اقتصادیات نے ترقی پذیر ممالک کے معاشی مسائل کا انتہائی فکر انگیز مطالعہ کیا ہے اور انھیں کے مسائل سے ہی حل بھی پیش کیا۔ ان مفکرین کی نظر میں ایسے ممالک کے تمام معاشی مسائل کا مرکز بڑھتی ہوئی آبادی ہے، اس لیے انھوں نے الگ الگ جو نظریات پیش کیے ہیں اُن میں مرکزی خیال آبادی سے متعلق ہی پایا جاتا ہے۔ اُن کی نظر میں اُن ممالک میں وافر مقدار میں زائد یا اضافی محنت کش موجود ہیں اس لیے اگر اُن کو کسی دوسری جگہ پیدا آور کاموں پر لگانے کے لیے منتقل کردیا جائے تو بڑی حد تک مسائل کا حل تلاش کرلیا جائے گا۔

اُن کا خیال ہے کہ زرعی سیکٹر میں سب سے زیادہ اضافی محنت کشوں کی تعداد موجود ہے اور اس کی پہچان یہ بتلائی گئی کہ اگر زرعی سیکٹر سے اُن کی ایک مقررہ تعداد کو ہٹا لیا جائے تو بھی زرعی پیداوار متاثر نہیں ہوگی۔ گویا اُس ہٹی ہوئی تعداد کا پیداوار سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور اسی لیے اُن کو اضافی اور غیر پیداوار بتلایا گیا۔ یہاں ہر ایسے اضافی محنت کش کی حاشیائی پیداوار/Marginal PRODUCTION تقریباً صفر ہوگی۔ یہ محنت کش زرعی سرگرمیوں میں اپنے آپ کو مصروف تو رکھتے ہیں اور مجموعی پیداوار کی کارروائیوں میں اپنے آپکو لگائے رکھتے ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو دراصل ابتدا سے آخیر تک ایک خاندان میں صرف چند افراد ہی ایسے ہوں گے جو واقعی پیداوار کے ذمہ دار ہیں باقی سب غیر پیدا آور طور پر لگے ہوئے اور مصروف نظر آتے ہیں۔ اسی کو اِن مفکرین نے (DISGUISED Unemployment) یا پوشیدہ بیروزگاری کا نام دیا ہے جو انھیں اضافی محنت کشوں کی طرف اشارہ ہے۔ یہ لوگ بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کھیتی باڑی کے بہت سے کاموں سے منسلک ہیں لیکن غور کیا جائے تو اصل پیداوار میں اُن کا کوئی کنٹری بیوشن نہیں ہے۔ ایسے افراد محض صارفین (CONSUMERS)، کے دائرہ میں آتے ہیں۔ پیدا کرنے والوں کے دائرہ میں نہیں۔ اسی لیے یہ خیال پیش کیا گیا کہ اگر ایسے افراد کو منتقل کرکے کسی دیگر سیکٹر میں پیدا آور کاموں میں لگا دیا جائے یا زرعی سیکٹر میں ہی رہ کر غیر زرعی پیدا آور کام، مثلاً سڑکیں بنانا، تالاب و کنویں کھودنا، جانوروں کے باڑے تیار

کرنا، چھوٹی موٹی لوکل صنعتوں میں کام کرنا وغیرہ کاموں میں معروف کردیا جائے تو ترقی کا انتہائی سستا ذریعہ مل جائے گا۔ چونکہ یہ اضافی ہیں، زائد ہیں اس لیے یہ سستی مزدوری پر مل جائیں گے۔ اور چونکہ بافراط ہیں اس لیے منعریب ہی مزدوری بڑھنے کا بھی خطرہ نہیں ہے، غیر منظم ہیں اس لیے مزدور یونین جیسی طاقتوں کا استعمال بھی نہیں جانتے۔ یہ اضافی محنت کش ان ممالک میں انتہائی اہم بشری قوت ہیں جو سرمائے کے فقدان، پست تکنیکی سطح، پست بچت رانویسٹمنٹ کی سطح، تنگ زرِمبادلہ کے ذخیروں اور دیگر وسائل کی کمی کے باوجود ملک کو اقتصادی ترقی کی راہ پر لگا سکتے ہیں۔ ان اضافی محنت کشوں کو کس طرح کارآمد بنا کر ملک کی ترقی کا ذریعہ بنایا جائے، اس کی تفصیلات کچھ اس طرح ہیں:

ایک دیہی خاندان کی مثال لیجئے۔

یہ خاندان ۱۰ افراد پر مشتمل ہے جو دس ایکڑ زمین پر کاشت کاری کر رہا ہے۔ بظاہر اس خاندان کے سبھی افراد کھیتی باڑی کے کام پر لگے ہیں لیکن دراصل ۷ افراد ایسے ہیں جن پر کاشتکاری کی اصل ذمہ داری ہے۔ یعنی یہ افراد زمین جوتتے ہیں، بیج ڈالتے ہیں، نرائی و گھاس پھوس صاف کرتے ہیں۔ کھیتوں میں پانی لگاتے ہیں، دوا چھڑکتے ہیں، فصل کی کٹائی، چھٹائی اور اناج کی بھرائی کا کام کرتے ہیں اور یہاں تک کہ بازاروں و منڈیوں میں اناج کو فروخت کرنے اور حاصل شدہ رقوم کی شرکار کے درمیان تقسیم کا بھی کام انجام دیتے ہیں۔ اس طرح یہ ۷ افراد ہی ابتدا تا آخر تک پیدا آور کاموں میں لگے نظر آتے ہیں۔ باقی تین افراد ایسے ہیں جو کچھ اس طرح کے کاموں میں لگے ہیں جیسے ہل بیل لے کر کھیتوں میں پہونچ جانا، بیلوں و دیگر جانوروں کا چارہ پانی کرنا، فصل کی دیکھ ریکھ کے لیے صبح شام ایک دو بار چکر لگانا، کھیتوں پر کام کرنے والوں کے لیے کھانا پہونچانا یا اگر کوئی دوڑ دھوپ کا کام ہوا تو وہ کام انجام دینا۔ فصل کی تیاری پر کھلیان پر رہنا اور اناج کے ہمراہ منڈی چلے جانا، جانوروں کے باڑے کی صفائی ستھرائی کرتے رہنا وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تینوں افراد بھی کھیتی باڑی کی سرگرمیوں میں لگے ہیں، لیکن دراصل اگر دیکھا جائے تو پیداوار کی ذمہ داری ان پر نہیں ہے۔ ایسے افراد اضافی ہیں۔ کیونکہ اگر ان کو ہٹا بھی لیا جائے تو پیداوار پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یعنی وہ اتنی ہی ہوگی جتنی پہلے ہوتی تھی۔

اب ان تین اضافی افراد کو کسی صنعتی مرکز، شہر و دیگر تجارتی سیکٹر میں لے جائیے۔ وہاں چونکہ ترقیاتی سرگرمیاں، پیداوار کا ماحول اور کام کے مواقع زیادہ ہیں اس لیے یہ تین افراد آسانی سے کسی کام پر لگ سکتے ہیں اور ملازمت اختیار کر سکتے ہیں۔ یا اگر دوسرے سیکٹروں میں نہ جائیں تو اپنے ہی گاؤں میں زراعت کے علاوہ دوسری پیداواری سرگرمیوں میں معروف ہوجائیں اب زراعت سے ہٹ کر یہ تین افراد جہاں معروف ہوں گے وہاں پیداوار میں اضافے کا باعث ہوں گے۔ کمائیں گے اور گویا اصل معنی میں ملازم ہوں گے۔ جب یہ لوگ کمائیں گے تو اپنی بنیادی ضرورتوں کی مانگ بھی کریں گے، کھانا، کپڑا، مکان، دوا، علاج۔ سب سے پہلے طلب کریں گے۔ اس طرح اضافی محنت کشوں کی منتقلی اور ان کا برسرِ روزگار ہونا یا پیدا آور بن جانا طلب میں اضافے کا باعث ہوگا۔ اس بڑھتی ہوئی طلب کو کس طرح پورا کیا جائے۔ کیا یہ بڑھتی ہوئی طلب زراعت پر مزید بوجھ نہیں ڈالے گی۔ مفکرین نے اس کا یہ جواب دیا کہ جب یہ اضافی اشخاص منتقل ہو کر صنعتی سیکٹر میں کام کی تلاش میں پہنچیں گے تو یقیناً وہاں کی آبادی میں اضافہ کریں گے، جگہ کی قلت پیدا ہوگی۔ بنیادی اشیاء کی طلب میں مزید اضافہ ہوگا لیکن اس بڑھتی ہوئی طلب کو زرعی سیکٹر سے ہی، مزید بوجھ ڈالے بغیر، پورا کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ ان افراد کے ہٹنے سے زرعی سیکٹر کی پیداوار پر تو کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ مزید اگر صرف Cunsumption کے رُخ سے دیکھا جائے تو اُن کی منتقلی پیداوار میں بچت کا ذریعہ بن جائے گی۔ مثلاً اگر کُل ۱۰ افراد مل کر ۸۰ کوئنٹل سالانہ اناج اپنے مصرف میں لاتے تھے تو گویا ہر شخص ۸ کوئنٹل اناج استعمال کرتا تھا۔ اب تین افراد کے ہٹ جانے سے ۲۴ کوئنٹل کی بچت ہوتی ہے۔ اس ۲۴ کوئنٹل اناج کو ان افراد کی منتقلی کے ساتھ اگر منتقل کر دیا جائے تو صنعتی مرکز یا شہروں میں جہاں وہ کام کر رہے ہیں، اناج کی کمی اور قیمتوں کے بڑھنے کا اندیشہ باقی نہیں رہے گا اور اُن کی بنیادی ضرورت بغیر بوجھ بنے پوری ہوتی رہے گی۔

اس طرح اگر غور کیا جائے تو ایک طرف اضافی محنت کش جو اب تک غیر پیدا آور تھے وہ قومی پیداوار کا حصہ بن جائیں گے اور یہ کارنامہ بغیر بڑے پیمانے پر انویسٹمنٹ کئے ہوئے انجام پائے گا، زرعی سیکٹر پر بغیر مزید بوجھ ڈالے پورا ہوگا، اور معیشت کے وسائل کا بہتر سے بہتر استعمال کر کے پورا ہوگا۔ اس طرح ملک کی معاشی ترقی [illegible] انسانی اشخاص کی بہتر منصوبہ بندی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ اور یہ فارمولہ اُن ممالک کے لیے اور بھی کارآمد ثابت ہو سکتا ہے جہاں آبادی کا بیشتر حصہ زرعی

سیکٹر میں لبا ہو اور زراعت پر روز بروز دباؤ بڑھتا جارہا ہو، جہاں سرمایہ کی کمی ہو اور ملک کی ترقی کے لیے باہری ممالک سے سرمایہ فراہم کرنے کے لیے زرمبادلہ بھی وافر نہ ہو، جہاں باہری ممالک کے قرضے میں معیشت کو دبانا مناسب نہ سمجھا جارہا ہو اور جہاں ٹیکنالوجی کی سطح بھی پست ہو ایسی اقتصادی تنگ دستی میں اگر کوئی بہتر صورتِ حال نِکل سکتی ہے تو یہی کہ ہم بڑھتی ہوئی آبادی کو سرمایہ کاری کا ذریعہ بنالیں۔

چند اندیشے وخدشات

اس نظریہ پر مفکرین کے درمیان اختلافِ رائے ہے۔ عرصہ تک بڑی تفصیلی بحث ومباحثہ، جانچ وپرکھ، اور عملی آزمائشوں سے گذرکر یہ نظریہ جزوی طور پر ہی صحیح ثابت ہوسکا۔ اس کا مکمل اطلاق نہ تو ممکن ہے اور نہ دُور رس وطویل مُدتی ترقی کا ماڈل بن سکتا ہے۔ میں یہاں سب سے پہلے چند اندیشوں اور خدشات کی طرف اشارہ کروں گا اور پھر اس کے اطلاق کے متعلق مسائل پر بعد میں روشنی ڈالوں گا۔

سب سے بڑا اندیشہ Leaka- ges کا ہے جو اس پورے نظریے کی افادیت کو ختم کرسکتا ہے۔ یہ کہا گیا کہ ماڈل کی عمارت اس یقین پر کھڑی ہے کہ اضافی اشخاص کی منتقلی سے زرعی سیکٹر میں پیداوار میں بچت ہوگی جو اُن کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے استعمال میں لے آئی جائے گی اور اس طرح اُن کے لیے کسی مزید پیداوار کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس طرح کی پیداواری بچت کو اُن اضافی اشخاص کی ضرورت کی تکمیل پر لگایا جائیگا۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ اس طرح کی بچت خاندان کے جو باقی افراد ہیں اِن کے معیارِ صرف کو بڑھانے پر ہی خرچ کرلی جائے اور یہ عین فطری ردِّ عمل ہوگا۔ کیونکہ یہ افراد پہلے سے ہی ایک پست معیارِ صرف پر زندگی گزار رہے ہیں اور اب کچھ افراد کے ہٹ جانے سے ان کو جو راحت کا احساس ہوگا تو وہ کیوں نہ اپنے صرف کے معیار کو تھوڑا اور بلند کرلیں۔ اگر ایسا ہوا، جو یقین کے بہت قریب ہے، تو پھر ان اضافی اشخاص کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا مسئلہ اہم بن جائیگا جس کی تکمیل پیداوار کے موجودہ سطح کے ذریعہ ممکن نہیں۔ اس کے لیے یا تو پیداوار کو بڑھانا ہوگا یا پھر باہر سے اناج درآمد کرنا ہوگا اور یہ دونوں ہی صورتِ حال ترقی پر بوجھ ہوں گے جس کے لیے معیشت ابتدائی دَور میں اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہ کرسکے گی۔

دوسرا خدشہ ٹرانسپورٹ لاگت کا ہے۔ جب ہم زرعی سیکٹر سے پیداواری بچت کو اضافی اشخاص کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے دوسرے سیکٹر جہاں وہ کام پر لگے ہیں بھیجیں گے تو ٹرانسپورٹ لاگت آئے گی اور نتیجے میں اناج گراں ملے گا، یا اس لاگت کو حکومت (Subsidies) کی شکل میں برداشت کرے گی۔ اس طرح اضافی بشری قوت کی منتقلی کے ساتھ پیداواری بچت کی منتقلی اوّل تو ملک بھر میں منظم، سستے اور انتہائی چُست ٹرانسپورٹ کی ضرورت کا احساس دلاتی ہے جس کا فقدان ملے گا اور دوم اگر حکومت (Subsidies) کی شکل میں اس کو برداشت کرتی ہے تو گویا حکومت کو ان کی منتقلی کی قیمت چکانا ہوگی اور اس طرح اس سطح پر بھی اس ماڈل میں جھول ملتا ہے۔ جغرافیائی حالات، موسم، اور سیاسی وانتظامیہ بدنظمی کے تحت پیدا ہونے والی صورتِ حال پُرامن منتقلی میں روڑے اٹکا سکتی ہے اور وقتی طور پر ہی سہی لیکن شدید کمیابی، تنگی اور کرپشن پیدا کرسکتی ہے۔

ایک اور خطرے کا احساس کرایا گیا اور وہ یہ کہ جب بڑی تعداد میں لوگ روزگار کی خاطر گاؤں سے شہر کی طرف آئیں گے تو شہری زندگی کی رعنائیوں سے متاثر ہوکر دوسرے لوگ جن کی یقیناً ضرورت نہیں ہوگی اور جو اضافی ضمن کے نہ ہوں گے۔ شہر وصنعتی مراکز کی طرف آئیں گے اور نتیجتاً شہر گنجان بنیں گے جہاں رہنے کے لیے مکان، روشنی، پانی، علاج، تعلیم اور دیگر سہولتیں عنقا ہوتی جائیں گی۔ یہ صورتِ حال جھگی جھونپڑی "Slum" کو بڑھائے گی اور پھر اس کے پیچیدہ مسائل بڑھتے ہی جائیں گے۔ اس لیے اس کی کیا ضمانت ہے کہ صرف اضافی اشخاص کی منتقلی تک یہ سلسلہ قائم رہے اور دوسرے افراد متاثر نہ ہوں۔

یہ بھی اعتراض ہوا کہ اس نظریہ کی بنیاد ہی کمزور اور غیر مستحکم معلوم ہوتی ہے۔ اس نظریہ کی تفصیلات میں جاکر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مفکرین یہ تسلیم کرکے اپنے نظریہ کو پیش کر رہے ہیں کہ زرعی پیداوار میں کوئی فرق نہیں آئے گا جب کہ تمام ترقی پذیر ممالک میں زرعی حالات قطعی مختلف ہیں۔ یہاں پیداوار انتہائی غیر یقینی اور قدرتی حالات کے زیرِ اثر رہتی ہے۔ خشک سالی، سیلاب، بارش کی زیادتی وکمی ایسے مضبوط عوامل ہیں

جو پیداوار کو غیر یقینی بنائے ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ کیسے یقین کر لیا جائے کہ منتقل شدہ افراد کی کفالت کا بوجھ پونک ذمہ داری کے ساتھ اٹھایا جاتا رہے گا۔

ایک اعتراض یہ بھی ہوا کہ اضافی سمجھ کر زرعی سیکٹر سے ہٹائے جانے والے بیشتر افراد غیر ہنرمند ہوں گے جب کہ صنعت، تجارت، تعمیر جیسے سیکٹر میں زیادہ تر ہنرمند افراد کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے اضافی شکل میں منتقل ہونے والے افراد میں بیشتر کی تعداد غیر ہنرمند ہوگی جو جسمانی محنت و مشقت کا ہی کام کر سکتے ہیں۔ ایسے افراد کی آمد اور کھپت مسائل کو بڑھا تو سکتی ہے، مجموعی ترقی پائدار ذریعہ نہیں بن سکتی۔

اضافی محنت کشوں کی پیمائش کے مسائل

اس نظریہ پر سب سے زیادہ اعتراض اور بحث اضافی محنت کشوں کی تعداد کے تعین اور اُس کی پیمائش کے طریق کار کے سلسلے میں ہوئی۔ زرعی سیکٹر میں کون افراد اضافی اور کون غیر اضافی ہیں معلوم کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ چند افراد جو کاشت کاری سے منسلک ہیں غیر پیداآور ہو سکتے ہیں۔ اضافی ہو سکتے ہیں لیکن اگر یہی افراد مقامی طور پر، وقتی طور سے ہی سہی کسی گھریلو صنعت سے منسلک ہیں تو غیر پیداآور یا اضافی نہیں کہلائیں گے۔ چونکہ دیہی سماج میں کاشت کاری گھریلو صنعتیں ایسی مشترک و مخلوط ہیں کہ دو کے درمیان کوئی نمایاں خلیج قائم نہیں کی جا سکتی، یہ بتلانا بہت مشکل ہوگا کہ کون پیداآور اور کون غیر پیداآور یا اضافی ہے۔

دوسری اہم مشکل یہ ہے کہ کاشتکاری فصلوں میں منقسم ہے۔ مثلاً ہندوستان میں کاشت کاری ربیع و خریف دو اہم فصلوں کے درمیان بٹی ہوئی ہے۔ اِن دو فصلوں کے اوقات جداگانہ ہیں جن میں کسان بیحد مصروف رہتا ہے۔ دو فصلوں کی درمیانی مدّت میں کسان خالی رہتا ہے اور اس خالی وقت میں بہت سے غیر پیداآور کاموں میں مصروف رہتا ہے۔ اب فصلوں کے مصروف دَور میں جبکہ نہ صرف گھر کا ہر فرد کام پر لگا ہے بلکہ باہر سے مزدور بُلا کر بطور مدد بھی کام پورا کیا جا رہا ہے، اضافی اشخاص کا تصوّر کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ہاں وہ مدّت جو فصلوں کی درمیانی مدّت ہے اور جہاں مصروفیت کم ہو گئی ہے، یہ کہا جا سکتا ہے اس مدّت میں خاندان کے چند افراد زائد ہیں۔ مصروفیت کے زمانے میں اگر کسی کسان نے ایک بھی مزدور مزدوری پر لگا لیا تو اُسی مقام سے اضافی اشخاص کا تصوّر ختم ہو جائے گا۔ اور یہ معلوم کرنا آسان ہے کہ فصلوں کی تیاری سے لے کر کٹائی اور منڈیوں تک پہنچانے میں زرعی سیکٹر میں کتنے کرایہ کے مزدور رکھے گئے۔ جہاں کرایہ کے مزدور رکھنے کی ضرورت پڑتی ہو، وہاں اضافی مزدوروں کا تصوّر کیا؟ اس طرح اضافی اشخاص کی موجودگی محض عارضی ہو سکتی ہے مستقل نہیں۔

کاشت کاری کے جملہ کاموں کے لیے کتنے محنت کشوں کی ضرورت ہوتی ہے اس کو ہم یا تو پیداوار کی فی اکائی یا پیداوار میں لگے وسائل کی اکائیوں کی نسبت سے معلوم کر سکتے ہیں۔ چونکہ محنت کشوں کی ضرورت ایک کاشت سے دوسری کاشت، ایک علاقے سے دوسرے علاقے، فارم کے رقبے، فصل کی اقسام، مٹّی کی صلاحیت، پیداوار کے طریق کار، اور آبپاشی کی سہولتوں کے بموجب بدلتی رہتی ہے۔ اس لیے، صحیح محنت کشوں کی تعداد کا معلوم کرنا اور بھی پیچیدہ مسئلہ بن جاتا ہے۔

پیداوار کی سمت سے محنت کشوں کی مطلوبہ تعداد کو ناپئے تو یہاں سب سے پہلی مشکل یہ آئے گی کہ ہر پیداوار کے لیے ایک جیسی تعداد مطلوب نہیں ہوتی۔ گیہوں کے لیے کچھ اور تعداد مطلوب ہوگی جبکہ دھان کے لیے کوئی دوسری۔ گنّے کے لیے ایک تعداد تو کپاس، تمباکو یا تلہن کی پیداوار کے لیے کوئی دوسری۔ اور پھر آبپاشی کی مہیا سہولتوں کی سطح کے بموجب مطلوبہ تعداد یقیناً دوسری ہوگی۔ بڑے میکانکی فارم پر یہ تعداد دوسری ہوگی اور خالص انسانی ہاتھوں اور جانور کی مدد سے کی جانے والی کھیتی کے لیے یہ تعداد دوسری۔ ایسی مختلف اور پیچیدہ صورتِ حال میں یہ پیمائش کرنا کتنا مشکل ہے کہ اضافی محنت کشوں کی تعداد کتنی ہے اگر ان تمام صورتِ حال پر نظر رکھے بغیر اضافی محنت کشوں کی تعداد کے تعین کی کوشش کی جائے تو یقیناً کوئی صحیح تخمینہ کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر ایک مشکل اور سامنے ہے اور وہ یہ کہ پیداوار کا تخمینہ بھی صحیح نہیں ہوتا۔ ہندوستان جیسے ملک کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں زرعی پیداوار کے تخمینہ میں ۲۰ تا ۲۵ فیصد تک غلطی کے امکان رہتے ہیں اور اس حد تک غلطی کے امکان نیشنل سیمپل سروے (NATIONAL SAMPLE SURVEY) کے ذریعے قبول کئے

گئے ہیں۔ اس لیے پیداوار کے رُخ سے اگر اضافی اشخاص کی موجودگی کا تخمینہ لگایا جائے تو تقریباً ۲۰ فیصد غلطی کا امکان باقی رہتا ہے۔

اگر پیداوار کے موجودہ وسائل کی سمت سے اضافی اشخاص کا تخمینہ لگایا جائے تو یہاں بھی بہت سی مشکلات درپیش ہیں۔ ہر شخص پر کام کا بار وسائل کی نوعیت کے اعتبار سے جداگانہ ہوگا۔ مثلاً مشین استعمال کرنے والا کسان کم انسانی ہاتھوں و جانوروں کی طاقت کو طلب کرے گا جبکہ مشین نہ استعمال کرنے والا زیادہ۔ اس طرح بڑے مشینی فارم پر زائد بشری قوت کا امکان زیادہ ہے اور بغیر مشینی فارم پر کم۔ یہی صورت حال کاشت کی زمین کے رقبہ کے سلسلے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ کاشت کے بڑے رقبے پر زائد انسانی طاقت کے استعمال کا امکان ہے اور کاشت کے چھوٹے رقبے پر کم۔ پہلی صورت میں بڑھتی ہوئی بشری قوت کا امکان زیادہ اور دوسری صورت میں کم امکان نظر آتا ہے۔ پھر اگر محنت کشوں کی ساخت پر نظر ڈالی جاتے تو وہ بھی خاندانوں اور علاقوں کے درمیان جداگانہ پائی جاتی ہے۔ کسی خاندان میں ۲ مرد ۳ عورتیں اور ۳ بچے ہیں تو کسی خاندان میں صرف ایک عورت اور باقی ۲ یا ۵ مرد موجود ہیں۔ اس طرح محنت کشوں کی تشکیل مختلف ہے اور اس کی وجہ سے اضافی محنت کشوں کا تخمینہ لگانا مشکل امر ہے۔

ترقی پذیر ممالک کی آبادی کا سائز اور سرمایہ کی کمی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس نظریہ کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ تصور بڑا حقیقی سا لگتا ہے کہ ایک ملک جہاں آبادی کثیر ہو اور جس میں بیشتر آبادی دیہی سیکٹر میں فرسودہ نظام کے تحت کاشتکاری سے منسلک ہو اور سرمایہ کاری کے لیے سرمایہ کی کمی ہو وہاں بشری قوت کا بھرپور استعمال نہیں ہو رہا ہوگا۔ گویا وسائل کی موجودگی میں یا اُن کے مکمل استعمال کے مقابلہ میں آبادی زیادہ ہے اس لیے اضافی بشری قوت موجود ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بشری قوت کا کچھ حصہ بظاہر مصروفِ کار نظر آتا ہے لیکن دراصل وہ پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں کر رہا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر کچھ افراد کو ہٹا لیا جائے تو بھی پیداوار کی سطح پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس نظریہ کی سچائی کو پرکھنے کے لیے ٹھوس بنیادیں قائم نہیں کی جا سکتیں۔ ہر ملک کے جغرافیائی، سماجی، مذہبی اور معاشی حالات مختلف ہیں۔ اس نظریہ پر بہت سے اعتراض ہوئے ہیں اور بہت حد تک یہ اعتراضات صحیح بھی ہیں۔ ہندوستان کے دیہی سیکٹر کے اپنے مسائل ہیں۔ جو نوعیت، تنظیم اور مجموعی ملکی معاشی ڈھانچے کی رُو سے مختلف ہیں۔ اس لیے اس نظریہ کی سچائی کو پرکھنے کے لیے ہم کو یہاں کے مخصوص حالات و مسائل پر بھی نظر رکھنی ہوگی۔ لیکن ان تمام خامیوں، کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود اس نظریہ کی سب سے بڑی خوبی یہ نظر آتی ہے کہ اس میں اپنے وسائل کے بھرپور استعمال کے ذریعے معاشی ترقی کی جد نمائی کی گئی ہے اور وہ راہ دکھائی گئی ہے جہاں ایک ملک دوسروں پر کم سے کم منحصر رہ کر خود کفیل ترقی کی سمت کا تعین کر سکتا ہے ●

بقیہ معذور افراد کی بحالی

کی جگہ آرٹس کے مضامین لے سکتے ہیں۔

۸۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے یونیورسٹیوں کو دیے جانے والے فیلوشپ میں ایک فیصد معذور افراد کے لیے یا کم سے کم سال میں ایک ایوارڈ معذور شخص کے لیے۔

۹۔ جسمانی طور پر معذور افراد کی آمدنی کو آمدنی ٹیکس کی خاطر محسوب کرتے وقت مزید دس ہزار روپے کی چھوٹ۔

جسمانی طور پر معذور افراد کو جو ادارے تربیت دے رہے ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:۔

۱۔ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف فزیکل میڈیسن اینڈ ری ہیبی لیٹیشن (Rehabilitation) بمبئی۔

۲۔ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف اسپیچ اینڈ ہیئرنگ، میسور۔

۳۔ بصارت سے محروم افراد کے لیے قومی ادارہ۔ (نیشنل انسٹی ٹیوٹ فار دی ہینڈی کیپڈ) دہرہ دون۔

۴۔ سماعت سے محروم بالغوں کے لیے حیدرآباد میں واقع مرکز (Training for Adult Deaf Hyderabad)

۵۔ جسمانی طور پر معذور افراد کی تربیت کے لیے قومی ادارہ واقع کلکتہ۔

۶۔ جسمانی طور پر معذور افراد کا ادارہ واقع نئی دہلی۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ معذور افراد جسم کے کسی نہ کسی حصے کو کام کا اہل نہیں پاتے ہیں اور وہ بدرجہ مجبوری بہت سے کام نہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ سماج کا ایک اہم حصہ ہیں۔ انھیں مناسب تربیت کے بعد اگر کوئی موزوں کام سونپا جائے تو وہ اسے حسن و خوبی انجام دے لیتے ہیں۔ ان کا کام تندرست افراد کی طرح سے ہی سماج کے لیے مفید ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اکثر حالتوں میں ان کی کارکردگی مکمل طور پر تندرست آدمی سے بھی زیادہ ہو ●

ایس۔ دھرم۔ راجن

صنعتی مزدوروں کے مسائل

۱۹۸۵ کی صورتِ حال کا جائزہ

گذشتہ برسوں کی طرح ۱۹۸۵ میں بھی تالا بندیوں کی بہ نسبت ہڑتالوں سے مقابلتہً زیادہ نفری ایام کا نقصان ہوا۔ صاحبِ مضمون کے مطابق دستیاب اعداد و شمار لیبر پالیسی کی کوتاہیوں کو ظاہر کرتے ہیں جنھیں دُور کرنا ساتویں منصوبے کے نصب العینوں کی تکمیل کی جانب کسی بھی بامعنی پیش رفت کے لیے اشد ضروری ہے۔ اُن کی رائے ہے کہ کسی لیبر پالیسی، جس کا مقصد کام بند ہونے کی وجوہات کو دور کرنا ہو، کی کامیابی کے لیے لازم ہے کہ وہ عام اتفاقِ رائے سے وضع کی گئی ہو۔

نیک ارادوں کے اعلانات اور نصب العینوں کی تشریحات کے لحاظ سے گذشتہ سال اس بات کی اُمید پیدا ہو گئی تھی کہ مزدوروں کے جو مسائل ایک عرصے سے دشواریوں کا باعث بنے ہوئے ہیں ان کا حل تلاش کر لیا جائے گا۔ لیکن سال ختم ہو گیا اور اس کی علامات ابھی نظر نہیں آ رہیں۔

صحیح اعداد و شمار کی عدم موجودگی شرمیں حصولیابیوں کو مبہم بنا دیتی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اعتدال پسندانہ رویے نیز پیداواری صلاحیت اور بلند تر ٹکنالوجی پر زور، جیسے نئی قیادت کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد سے اقتصادی پالیسی کے اعلانات میں مرکزی اہمیت دی گئی ہے، کی وجہ سے کتنی نوکریاں پیدا ہوئی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ سرکاری ایجنسیوں کے مرتب کردہ اعداد لیبر پالیسی کی کوتاہیوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں، جنھیں دُور کرنا ساتویں منصوبے کے نصب العینوں کی تکمیل کی جانب کسی بھی بامعنی پیش رفت کے لیے اشد ضروری ہے۔

ہڑتالیں اور تالا بندیاں

عارضی سرکاری اعداد و شمار کے مطابق گذشتہ سال ہڑتالوں اور تالا بندیوں کی وجہ سے ۲۹،۲ ملین نفری ایام کا نقصان ہوا۔ اگرچہ یہ نقصان سال ۱۹۸۴ کے نقصان سے کم تھا جبکہ ۵۵،۱۲ ملین نفری ایام ضائع ہوئے تھے، تاہم یہ مسئلہ باعثِ تشویش تو ہے ہی خاص کر اس صورت میں جبکہ ہم مسلسل صنعتوں کو جدید سے جدید بنانے کی بات کرتے ہیں تاکہ انھیں عالمی چیلنجوں اور مقابلے کا سامنا کرنے کے قابل بنایا جا سکے۔

یہ بات بھی باعثِ فکر ہے کہ کُل ضائع شدہ نفری ایام میں سے ۶۴،۷ فیصد ایام تالا بندیوں کے سبب ضائع ہوئے جبکہ ہڑتالوں کی وجہ سے صرف ۳۵،۳ فیصد نفری ایام ہی ضائع ہوئے۔ ۱۷ فیصد تالا بندیاں ہڑتالوں کے نتیجے ہی میں ہوئیں۔ ہاں یہ بات کسی قدر تسکین کا باعث ہو سکتی ہے کہ ۱۹۸۰ سے ۱۹۸۵ تک کے پانچ سالوں میں گذشتہ سال کا نفری ایام کا نقصان صرف ۱۹۸۰ سے ہی زیادہ تھا۔ ۱۹۸۰ء میں ۲۱،۹۲ ملین نفری ایام کا نقصان

ہوا تھا)۔ پھر بھی ۱۹۸۴ میں ہڑتالوں اور تالا بندیوں کے تناسب (ہڑتالیں ۸،۱۷ فیصد اور تالا بندیاں ۲،۸۲ فیصد)۔ کا یکایک الٹ جانا صنعتوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور کام کے نئے ضابطۂ اخلاق کے دعووں کی محدود نوعیت کو ظاہر کرتا ہے۔

۱۹۸۵ کے اعداد و شمار کی پوری تفاصیل ابھی دستیاب نہیں ہیں لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ گذشتہ کئی برسوں میں تالا بندیوں کی بہ نسبت ہڑتالوں کی وجہ سے زیادہ نفری ایام کا نقصان ہوا ہے۔ مگر ۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۳ میں ہڑتالوں کے مقابلے میں تالا بندیوں سے ضائع ہونے والے نفری ایام کی تعداد زیادہ تھی۔ ۱۹۸۲ میں یہ کل نقصان کا ۶۸ فیصد اور ۱۹۸۳ میں ۶۶ فیصد تھی۔ ۱۹۸۴ کے دوران صورتِ حال اُلٹی ہوگئی یعنی تالا بندیوں سے ضائع ہونے والے نفری ایام کا تناسب کل نقصان کا ۲۸ فیصد ہوگیا اور اب صورتِ حال پھر اُلٹ گئی ہے۔ (دیکھئے ضمیمہ نمبر۱) سالِ گذشتہ برسوں میں کچھ ریاستوں میں، کل ضائع شدہ نفری ایام کا حصّہ کافی زیادہ تھا۔ ۱۹۸۵ میں بھی یہی صورتِ حال رہی۔ چار ایسی ریاستیں جن میں بار بار سب سے زیادہ نفری ایام کا نقصان ہوا وہ ہیں مغربی بنگال، مہاراشٹرا، آندھرا پردیش اور تمل ناڈو، یعنی ۱۹۸۲ میں ۶۷ فیصد، ۱۹۸۳ میں ۶۵ فیصد، ۱۹۸۴ میں ۴۷،۷ فیصد اور ۱۹۸۵ میں ماہ جولائی تک ۴،۱۷ فیصد۔ ۱۹۸۲ میں ضائع شدہ کل نفری ایام کا لگ بھگ ۸،۴۵ فیصد، ۱۹۸۳ میں ۲،۶۲ فیصد اور ۱۹۸۴ میں ۵،۵۵ فیصد صرف بنگال میں ہی ضائع ہوا۔ اگر ان ریاستوں میں زیادہ نقصان ہوا تو یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ صنعتی اداروں کی زیادہ تعداد انہی ریاستوں میں ہی واقع ہے۔ ان صنعتی اکائیوں میں بیماری وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے۔ بیمار اکائیوں میں برسرِ ملازمت مزدوروں کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں ہے۔ اگرچہ اتنا ضرور معلوم ہے کہ ۱۹۸۵ میں صنعتی اکائیوں کے بند ہونے سے ۴۵،۴ فیصد مزدور متاثر ہوئے۔ یہاں جن چار ریاستوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے سلسلے میں یہ بھی بتا دینا چاہیئے کہ بیمار صنعتی اکائیوں کے بند ہونے کے لیے صرف مقامی انتظامیہ ہی کو موردِ الزام نہیں قرار دیا جا سکتا۔

تقریباً ۵ تا ۵۵ فیصد ہڑتالیں اور لگ بھگ ۲۰ تا ۲۵ فیصد تالا بندیاں اُجرتوں، بھتّوں اور تخفیفِ عملہ سے متعلق تنازعات کا نتیجہ ہیں۔ انھیں طویل المدّت معاہدات اور خود بخود ہونے والی نظرِ ثانی کا اہتمام کرکے کم کیا جا سکتا ہے۔ تالا بندیوں کی بڑی وجہ ڈسپلن کے فقدان اور تشدّد کو بتایا جاتا ہے، چاہے اس کی وجوہات کے بارے میں اختلاف رائے کیوں نہ ہو۔

پیداوار کا نقصان

۱۹۸۰ تا ۱۹۸۵ کے دوران ہڑتالوں اور تالا بندیوں سے ہونے والا پیداوار کا نقصان یکساں نہیں رہا۔ پیداوار میں بمبئی کی ٹیکسٹائل ہڑتال سے ہونے والے نقصان سے قطع نظر، ۱۹۸۲ میں پیداواری نقصان گھٹ کر ۶۷،۲۸۲ کروڑ روپے رہ گیا تھا جبکہ ۱۹۸۱ میں یہ ۶۷،۶۲۸ کروڑ روپے تھا۔ اس کے بعد یہ ۱۹۸۳ میں بڑھ کر ۳۹،۴۱۲ کروڑ روپے ہوگیا، لیکن پھر ۱۹۸۴ میں یہ گھٹ کر ۶۵،۳۸۶ کروڑ روپے ہوگیا۔

یونینوں کے درمیان مقابلہ آرائی سے صنعتی تعلقات میں خلل واقع ہوتا ہے جب وہ کسی حساس صنعتی علاقے یا اہم صنعتی شعبوں میں مزدوروں میں اپنا دائرہ اثر بڑھانے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتی ہیں، کبھی کبھی ایسی یونینیں وجود میں آجاتی ہیں جو صنعتی تنازعات کو حل کرنے کے مسلّمہ طریق عمل کا احترام نہیں کرتیں اور جنگجویانہ رویّہ اختیار کرلیتی ہیں۔

صنعتی بیماری

جیساکہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ خلل اور اس سے مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کے لیے پیدا ہونے والی مشکلات کی ایک بڑی وجہ صنعتی بیماری ہے یعنی کسی صنعت کا صحتمندانہ انداز میں دُرست طریقے سے نہ چلنا۔ کارخانوں میں صنعتی بیماری کے بڑھنے کا رُجحان فزوں تر ہوتا جا رہا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً نوّے ہزار صنعتی اکائیاں، جن میں سے بیشتر چھوٹی صنعتوں کے شعبے میں ہیں، بیمار ہیں۔ ان میں سے ۳۶۰۰ کروڑ روپے سے زائد کے بنک قرضے لگے ہوئے ہیں۔ ریزرو بنک آف انڈیا کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ یکم جنوری ۱۹۸۵ کو (جب تک کی عارضی اطلاعات دستیاب ہیں)، ۵۴۵ بڑی صنعتی اکائیاں اور ۱۲۸۷ درمیانی صنعتی اکائیاں بیمار تھیں۔ صنعتی بیماری مالی دشواریوں، خام مال کی قلّت، بجلی کی کمی، مشینری کی ٹوٹ پھوٹ یا تیار کئے جانے والے مال کی مانگ میں کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ان میں سے دو یا دو سے زائد وجوہ مِل کر صنعتی اکائی کی زندگی دوبھر بنا دیتی ہیں۔

اور علاج

صنعتی بیماری کا سدِّباب کرنے کے لیے حکومت نے کچھ رہنمایانہ خطوط متعین کئے

ہیں جن کے تحت بینکوں اور مالیاتی اداروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ صورت حال پر مسلسل نظر رکھتے رہیں اور ضروری اصلاحی اقدامات کرتے رہیں۔ مرکزی اور ریاستی حکومتیں بینکوں اور مالیاتی اداروں کے وضع کردہ بحالیاتی پروگرام کے ایک حصے کے طور پر بیمار اکائیوں کو رعایت دیتی ہیں۔ اس مسئلے اور اسے حل کرنے کے اقدامات پر مرکزی وزیر محنت نے گذشتہ سال کے اوائل میں مرکزی ٹریڈ یونینوں کے نمائندوں کے ساتھ تبادلۂ خیالات کیا۔ بعد میں گذشتہ نومبر میں منعقدہ انڈین لیبر کانفرنس کے اٹھائیسویں اجلاس میں بیمار صنعتی اکائیوں کی بحالی اور ان میں نئی زندگی پھونکنے کے لیے تیز رفتار پروگراموں کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ اجلاس نے سفارش کی کہ موثر اور اصلاحی اقدامات کرنے کے لیے ایک اسٹینڈنگ کمیٹی بنائی جائے جو بند ہونے والی صنعتی اکائیوں کے حالات و مسائل کا انفرادی طور پر عمیق مطالعہ کرے۔

صنعتی اکائیوں کی بڑھتی ہوئی بیماری کے باوجود بند ہو جانے والی اکائیوں کی تعداد میں بتدریج کمی واقع ہوئی ہے۔ جو اس بات سے ظاہر ہے کہ ۱۹۸۴ میں ۱۰۸۸ اکائیاں بند ہوئیں جب کہ ۱۹۸۳ میں ۲۲۶، ۱۹۸۲ میں ۲۸۶ اور ۱۹۸۱ میں ۳۴۹، اکائیاں بند ہوئی تھیں۔ لیکن اکائیوں کے بند ہو جانے کی وجہ سے متاثر ہونے والے مزدوروں کی تعداد ۱۹۸۲ میں ۲۶۰۰۲ سے بڑھ کر ۱۹۸۳ میں ۳۴۲۳۳۴، ۱۹۸۴ میں ۱۹۳۷۶ اور ۱۹۸۵ میں گھٹ کر ۵۴۴۲ ہو گئی۔ (دیکھئے ضمیمہ نمبر ۲)۔

اتفاقِ رائے اور تعاون

۱۹۸۵ کے اعداد سے لگتا ہے کہ اندھیرا کچھ چھٹا ہے۔ اس کے علاوہ ایک امید افزا بات یہ ہے کہ گذشتہ سال صنعتی اقدامات میں تصادم کے رویے کے بجائے تعاون کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش ہوئی جس سے معاملات کے تصفیئے کے لیے اتفاقِ رائے ہو سکے۔ ان کوششوں کی بدولت ہی انڈین لیبر کانفرنس کا اجلاس چودہ سال کے وقفے کے بعد بلایا جا سکا۔ کسی بھی لیبر پالیسی جس کا مقصد کام بند ہونے کی وجوہات کو دور کرنا ہو اُس کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اتفاق رائے پر مبنی ہو۔ یہ وہ اصول ہے جسے گذشتہ چار دہائیوں میں روایت نے تقدس عطا کیا ہے اور جو فائدہ مند بھی ثابت ہوا ہے۔ اتفاق رائے سہ فریقی فورموں میں ہو سکتا ہے جن میں یونینوں، مالکان اور حکومت کے نمائندے شریک ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں گذشتہ سال کے آغاز سے جبکہ نئی حکومت قائم ہوئی تھی، کوششیں کی جا رہی ہیں۔ نشانے بھی مقرر کیے جا چکے ہیں یہ ہیں پیداواری صلاحیت میں موزوں اضافہ، پیداوار میں معاون ثابت ہونے والا روزگار اور صنعتی امن و امان۔ وزارتِ محنت کے اُس وقت کے سکریٹری نے یہ واضح کر دیا تھا کہ درست طریقے سے مالکان اور ٹریڈ یونینوں کے درمیان ہونے والے سمجھوتوں کا تقدس برقرار رکھا جائے گا۔ حکومت کی خواہش تھی کہ اس قسم کے سمجھوتوں میں خلل نہ پڑنے دیا جائے۔ اس کے علاوہ حکومت لیبر پالیسی کے تحت یہ چاہتی تھی کہ رضاکارانہ ثالثی فیصلے کے لیے ایک مشینری قائم کی جائے جس کا استعمال مالکان اور مزدور دونوں کریں۔ پیداواری صلاحیت بڑھانے کے لیے لیبر سکریٹری نے یہ تجویز کیا کہ مالکان یا صنعتی ادارے بونس کے سوال پر غور کریں، اور یہ دیکھیں کہ کیا موجودہ قانون سے وہ مقصد پورا ہوا ہے جس کے لیے وہ بنایا گیا تھا اور پیداواری صلاحیت کو بہتر بنانے کے لیے قانون کو بدلنے کی ضرورت تو نہیں ہے۔ اور قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں سکریٹری موصوف کی یہ رائے تھی کہ مالکان کی تنظیموں کو دیکھنا چاہیئے کہ کیا وہ قوانین کے نفاذ کے لیے کچھ ذمہ داری سنبھال سکتی ہیں۔

اگر ضروری ہو تو انھیں مناسب اختیارات بھی دیے جا سکتے ہیں تاکہ وہ اپنے اراکین سے قوانین پر عمل درآمد کروا سکیں۔ پیشہ ورانہ تربیت میں نئی ٹیکنالوجی کا استعمال شروع کرنے پر زور دیتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ نجی یا غیر سرکاری سیکٹر اس سلسلے میں موثر رول ادا کر سکتا ہے۔ مالکان صنعت کی نئی ضروریات کے مطابق نوجوانوں کو صحیح تربیت دینے کے لیے جدید ترین پیشہ ورانہ تربیتی مراکز قائم کر سکتے ہیں۔

ان تجاویز پر اتفاقِ رائے حاصل کرنے کے لیے یونینوں اور مالکان کے نمائندوں کے ساتھ اور وزرائے محنت اور لیبر سکریٹریوں کے درمیان تبادلۂ خیالات اور غور و خوض کا سلسلہ شروع کیا گیا اور اس کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ باہمی اتفاق رائے سے ایک مسودہ تیار کیا گیا۔

انڈین لیبر کانفرنس

انڈین لیبر کانفرنس کو اہم ترین سہ فریقی مشینری سمجھا جاتا ہے جس میں مالکان اور مزدوروں کے گروپوں کے درمیان برابری رکھی جاتی ہے۔ چوں کہ گذشتہ پندرہ برسوں میں ایک بڑی تعداد میں ٹریڈ یونین مراکز کی

تنظیم عمل میں آئی۔ اس لیے مزدوروں کی تنظیموں کو کانفرنس میں نمائندگی دینے میں مشکل پیش آئی۔ لیکن اس مشکل کو حکومت نے یہ فیصلہ کر کے حل کیا کہ جن مزدور تنظیموں کے اراکین کی تعداد پانچ لاکھ سے زیادہ اور چار ریاستوں اور چار صنعتوں میں پھیلی ہوئی ہو ان کے علاوہ اُن مزدور تنظیموں کو بھی کانفرنس میں کچھ نمائندگی دی جا سکتی ہے جن کے اراکین کی تصدیق شدہ تعداد ۳۱ دسمبر ۱۹۸۰ کو کم از کم ایک لاکھ تھی۔ اس فیصلے کے مطابق پانچ لاکھ سے کم لیکن کم از کم ایک لاکھ کی تصدیق شدہ رکنیت رکھنے والی تنظیموں کو ایک ایک ڈیلی گیٹ (مندوب) بھیجنے کا حق دیا گیا۔

کانفرنس نے اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ نمائندگی کے لیے اصول طے کرنے کا کام مرکزی ٹریڈ یونین آرگنائزیشن پر چھوڑ دیا جائے اور اختلاف رائے کی صورت میں حکومت فیصلہ کرے۔

اتفاق رائے سے تیار کئے گئے مسودے میں صنعتی بیماری پر نظر رکھنے کے لیے ایک اسٹینڈنگ کمیٹی مقرر کرنے کی تجویز کے علاوہ ایک قومی لیبر پالیسی کے دیگر پہلوؤں مثلاً صنعتی اداروں کو چلانے میں مزدوروں کی فزوں تر شرکت، مزدوروں کی صحت اور سلامتی کے اقدامات بہتر بنانے اور گریجوئٹی، ایمپلائمنٹ پراویڈنٹ فنڈ آرگنائزیشنوں اور ایمپلائمنٹ اسٹیٹ انشورنس کارپوریشن وغیرہ سے متعلق سماجی تحفظ کی اسکیموں کے دائرہ عمل کو بڑھانے وغیرہ کا بھی ذکر کیا گیا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس میں معاملات

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

ضمیمہ نمبر ۱: ہڑتالوں اور تالا بندیوں کے سبب ضائع ہونیوالے نفری ایام کی فیصد تقسیم (۸۵ —— ۱۹۸۰)

سال		ہڑتالیں	تالا بندیاں	میزان
۱۹۸۰		۵۴٫۸	۴۵٫۲	۱۰۰٫۰۰
۱۹۸۱		۵۷٫۹	۴۲٫۱	۱۰۰٫۰۰
۱۹۸۲		۳۲٫۲	۶۷٫۸	۱۰۰٫۰۰
۱۹۸۳	(ع)	۳۴٫۵	۶۵٫۵	۱۰۰٫۰۰
۱۹۸۴	(ع)	۷۱٫۸	۲۸٫۲	۱۰۰٫۰۰
۱۹۸۵	(ع)	۳۵٫۳	۶۴٫۷	۱۰۰٫۰۰

(ع) = عارضی۔

ضمیمہ نمبر ۲: صنعتی تنازعات کو چھوڑ کر دوسری وجوہات کے سبب بند ہونے والی صنعتی اکائیوں کی تعداد، مع وجہ (۸۵—۱۹۸۰)

وجوہات	بند ہونے والی صنعتی اکائیوں کی تعداد				
	۱۹۸۰(ع)	۱۹۸۱(ع)	۱۹۸۲(ع)	۱۹۸۳(ع)	۱۹۸۴(ع)
۱	۲	۳	۴	۵	۶
۱۔ مالی مجبوریاں	۸۷	۷۹	۷۳	۱۰۹	۹۲
۲۔ خام مال کی قلت	۲۷	۱۵	۱۵	۱۶	۱۹
۳۔ بجلی کی قلت	۵	۵	۳	۵	۱۱
۴۔ مشینری کا ٹوٹنا یا خراب ہونا	۲	۱	۶	۱	-
۵۔ مانگ کی کمی / اسٹاک کا جمع ہونا	۲۴	۵	۵	۹	۱۴
۶۔ دیگر	۱۹۱	۲۳۹	۱۶۶	۷۹	۴۷
۷۔ نامعلوم	۲	۴	۱۸	۷	۵
میزان	۳۳۸	۳۴۹	۲۸۶	۲۲۶	۱۸۸
	(۱۸۰۵۲)	(۳۷۳۷۷)	(۲۶۹۰۲)	(۴۳۲۳۴)	(۷۰۱۹۳۷)

(ع) = عارضی۔ نوٹ: بریکیٹ میں دئے ہوئے اعداد اُن مزدوروں کی تعداد ظاہر کرتے ہیں جو اکائی کے بند ہو جانے سے متاثر ہوئے۔

عزیز مراد آبادی

بھارت میں بیروزگاری

کا مسئلہ اور اس کا حل

بغور تجزیہ کیا جائے تو بیروزگاری اور غریبی ایک ہی سکّے کے دو پہلو نظر آتے ہیں۔ کسی بھی ملک سے غریبی کی لعنت کو دُور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر شہری کو روزگار مہیا ہو! روزگار کی فراہمی ہی سے ملک سے غریبی کا قلع قمع کر سکنے کی اہل ہے۔ جُوں جُوں روزگار کے مناسب مواقع بڑھتے جاتے ہیں، ملک سے غریبی کم ہوتی جاتی ہے ۔ جہاں تک بھارت میں بیروزگاری اور غریبی کا مسئلہ ہے تو وہ کافی شدید ہے۔ اسی وجہ سے ہر پنجسالہ منصوبے میں اس مسئلہ کو حل کرنے یا کم از کم شدّت کو کم کرنے کے لیے خصوصی توجہ دی جاتی ہے اور اس کے بہتر نتائج بھی سامنے آتے ہیں۔ لیکن بے لگام بڑھتی ہوئی آبادی کے سائے میں ہر نتیجہ گُم سا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آبادی کی رفتار پر قابو پانے کی جدوجہد بھی زور و شور سے مسلسل جاری ہے بہتر نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں۔ ہو رہے ہیں اور مستقبل قریب میں نتائج میں مزید بہتری کی توقعات بھی روشن ہیں۔

بیروزگاری کا مفہوم

کوئی آدمی کام کرنے کا خواہشمند ہے، اور وہ دماغی و جسمانی طور پر کام کرنے کے لائق بھی ہے، لیکن اسے کوئی کام نہیں ملتا جس سے وہ اپنی روزی کما سکے تو اس طرح کا مسئلہ بے روزگاری کا مسئلہ کہلاتا ہے۔ بیروزگاری کا مفہوم اقتصادی نظام کی اس غیر متوازن صورت سے لگایا جاتا ہے، جب مروّجہ مزدوری کی دروں پر بھی کام کرنے کے خواہشمند افراد کو کام نہیں مل پاتا ہے۔ اگر مروّجہ مزدوری کی دروں پر کوئی شخص کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہے تو اس صورتِ حال کو بے روزگاری کی حالت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح :

"ایک شخص کو بے روزگار تبھی کہا جا سکتا ہے جب کام کرنے کی خواہش کے باوجود اسے کام نہیں مل پاتا۔" دوسرے الفاظ میں :

"ایک بے روزگار آدمی وہ ہے جو مزدوری کے لیے کام کی تلاش میں ہو اور اپنی صلاحیت اور لیاقت کے مطابق کام حاصل کرنے میں ناکام رہا ہو!"

بے روزگاری کی قسمیں

یہاں پر ہم بے روزگاری کی اقسام کا صرف مختصراً تذکرہ کرنے پر ہی اکتفا کریں گے۔ بے روزگاری کو مندرجہ ذیل قسموں کے تحت لایا جا سکتا ہے۔

پوشیدہ بیروزگاری

یہ وہ بے روزگاری ہوتی ہے، جو براہِ راست نظر نہیں آتی۔ ہمارے ملک میں اس قسم کی بے روزگاری شعبۂ زراعت میں پائی جاتی ہے۔ جس میں ضرورت سے زیادہ افراد لگے ہوئے ہیں۔ اگر کھیتی باڑی میں لگے ہوئے لوگوں میں سے کچھ کو ہٹا دیا جائے تو پیداوار پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس طرح کے لوگ پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں کرتے ہیں۔ انھیں فاضل افراد بھی کہا جا سکتا ہے، جو زرعی پیداوار کے

یے تقریباً بے سُود ہیں۔ اور ایسے ہی لوگ خفیہ طور پر بے روزگار ہوتے ہیں۔ بھارت میں ایسے بے روزگاروں کی صحیح تعداد کا پتہ لگانا آسان کام نہیں ہے۔

۲۔ ظاہری بے روزگاری

ہم مکمل بے روزگاری کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ جب افراد کام کرنا چاہتے ہوں اور اس کام کے لیے وہ اہلیت و صلاحیت بھی رکھتے ہوں اور ایسی صورت میں بھی انھیں کام نہ مل پائے تو ایسی صورتِ حال کو ظاہری یا مکمل بے روزگاری کہیں گے۔ بھارت میں اس قسم کی بے روزگاری بھی موجود ہے۔ یہاں لاکھوں افراد ایسے ہیں جو تعلیم یافتہ ہیں اور تکنیکی صلاحیت سے بھی آراستہ ہیں، لیکن ان کو کام کرنے کے مواقع میسّر نہیں آ رہے ہیں۔

۳۔ موسمی بیروزگاری

اس طرح کی بے روزگاری سال کے کچھ مہینوں میں ہی ہوتی ہے اور یہ زراعت یا اس سے متعلق صنعتوں میں پائی جاتی ہے۔ فصل بونے کے دنوں میں دن رات کام ہوتا ہے۔ اسی طرح فصل کاٹنے کے دنوں میں بھی خوب کام ہوتا ہے۔ لیکن فصل بونے اور کاٹنے کی درمیانی مدّت میں اتنا کام نہیں ہوتا۔ کسان یا مزدور کچھ دنوں یا مہینوں کے لیے بے روزگار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کا بے روزگاری کو جزوی بیروزگاری بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کی بیروزگاری چینی یا گُڑ کے موسمی دھندے میں کام کرنے والے مزدوروں کو بھی پیش آتی ہے، جو گنّے کا سیزن ختم ہونے پر کئی مہینے خالی رہتے ہیں۔

۴۔ رضاکارانہ بیروزگاری

جب کوئی شخص کسی کام کرنے کی صلاحیت اور قابلیت رکھنے کے باوجود کام نہ کرے تو ایسی صورتِ حال کو رضاکارانہ بیروزگاری کی قسم سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اور ایسے لوگ سماج میں ہر دَور میں کسی نہ کسی تعداد میں ضرور موجود رہتے ہیں۔ رضاکارانہ بیروزگاری ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا کوئی حل ممکن نہیں ہے۔

۵۔ صنعتی بیروزگاری

صنعتی بیروزگاری سے مراد وہ بیروزگاری ہے، جو صنعتوں میں تجارتی نشیب و فراز کی وجہ سے کساد بازاری کے نتیجے میں سامنے آتی ہے۔ بھارت میں اس قسم کی بیروزگاری بہت کم نظر آتی ہے، کیوں کہ بھارت ہنوز صنعتی طور پر بہت ترقی یافتہ نہیں ہے۔ ہاں تقریباً تیرہ سال پہلے اس طرح کی بیروزگاری قلیل مدّت کے لیے ضرور نظر آئی تھی۔

بھارت میں بیروزگاری کا مسئلہ

سرکار کی بھرپور جدّوجہد کے باوجود دیش میں بے روزگار افراد (تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ) کی تعداد میں ہر سال مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ یہ انتہائی افسوسناک صورتِ حال ہے۔ ہر سال جتنے افراد کو روزگار مُہیا کیا جاتا ہے، اس سے کہیں زیادہ روزگار کے خواہشمند افراد کی فوج تیار ہوجاتی ہے، جس کی وجہ سے ترقی کی ساری کوششیں بے اثر محسوس ہوتی ہیں۔ اور نتیجتاً بے روزگاری کا مسئلہ بدستور شدید بنا رہتا ہے۔ روزگار کی بہترین کوششوں کا اندازہ ہمیں پنجسالہ منصوبوں کی کارکردگی پر نظر ڈالنے سے بہ آسانی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا مندرجہ ذیل جدول پر غور کیا جائے۔

بھارت میں بیروزگاری کی صورتِ حال کا جائزہ

(تعداد لاکھوں میں)

منصوبہ جات	بیروزگاروں کی بقایا تعداد	نئے بیروزگار	کُل تعداد	دی گئی نوکریاں	منصوبے کے آخر میں بیروزگاری
پہلا پنجسالہ منصوبہ	۳۳	۹۰	۱۲۳	۷۰	۵۳
دوسرا پنجسالہ منصوبہ	۵۳	۱۱۸	۱۷۱	۱۰۰	۷۱
تیسرا پنجسالہ منصوبہ	۷۱	۱۷۰	۲۴۱	۱۴۵	۹۶
سالانہ منصوبے	۹۶	۱۴۰	۲۳۶	۱۱۰	۱۲۶
چوتھا پنجسالہ منصوبہ	۱۲۶	۲۳۰	۳۵۶	۱۸۵	۱۷۱
پانچواں پنجسالہ منصوبہ	۱۷۱	۲۷۰	۴۴۱	۲۲۰	۲۲۱
چھٹا پنجسالہ منصوبہ	۲۲۱	۲۵۰	۴۷۱	۲۲۰	۲۴۱

مندرجہ جدول سے ظاہر ہے کہ دیش میں بیروزگار افراد کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے۔ پہلی یوجنا کے اختتام پر ان کی تعداد ۵۳ لاکھ تھی جو پانچویں منصوبے کے آخر میں بڑھ کر ۲۲۱ لاکھ ہو گئی تھی۔ اب چھٹی یوجنا کے اختتام تک یہ تعداد ڈھائی کروڑ سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔ اصل میں بیروزگاروں کی صحیح تعداد کا پتہ لگانے نہ صرف مشکل کام ہے، بلکہ کچھ ماہرین کے نزدیک ناممکن بھی ہے اور یہ درست بھی ہے۔ کیونکہ گزشتہ صفحے پر دی گئی جدول روزگار دفاتر کے ریکارڈوں کے مطابق تیار کی گئی ہے، جبکہ دیہاتوں میں عام طور پر تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ افراد (بے روزگار) اپنا نام روزگار دفاتر Employment Exchange میں رجسٹرڈ بھی نہیں کراتے۔ اور یہ حقیقت بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ بھارت کی آبادی کا ۸۰٫۳ حصہ دیہاتوں میں ہی آباد ہے۔ دیہاتوں میں تقریباً ہر قسم کی بیروزگاری کے شکار افراد ناقابلِ یقین حد تک موجود ہوں گے۔۔۔!! سرسری جائزوں کے مطابق، ماہرین کا اندازہ ہے کہ چھٹی یوجنا کے اختتام پر بیروزگاروں کی فوج ملک بھر میں پانچ کروڑ سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔

بھارت میں بیروزگاری کے اہم اسباب

۱۔ آبادی میں روز افزوں اضافہ :۔

ہمارے ملک میں بیروزگاری کے مسئلے کو شدت بخشنے والی روز افزوں آبادی ہے۔ ہر سال ایک کروڑ بیس لاکھ افراد جنم لیتے ہیں، یعنی ۲٫۵ فیصد سالانہ شرح سے آبادی بڑھ رہی ہے۔ جب کہ روزگار کے مواقع اس شرح سے نہیں بڑھ رہے ہیں۔ اس لیے ایک اندازے کے مطابق ہر سال پچاس لاکھ نئے روزگاروں کے مواقع کی ضرورت ہے، بشرطیکہ آبادی کی تیز رفتاری پر قابو پا لیا جائے۔

۲۔ پیشہ ورانہ تعلیم کا فقدان

ملک میں اب بھی روزگار مہیا کرانے والی تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے جس کی وجہ سے تعلیم یافتہ افراد بیروزگاری کا شکار زیادہ ہو رہے ہیں۔ یہاں عموماً تعلیم کتابی شکل میں ہی دی جاتی ہے، جبکہ تعلیم عملی ہونی چاہیئے تاکہ روزگار کے مواقع زیادہ سے زیادہ میسر آ سکیں۔ ہر سال تقریباً دس لاکھ پڑھے لکھے افراد بیروزگاروں کی فوج میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۸۰ کے آخر تک ۲۹ لاکھ تعلیم یافتہ بیروزگار تھے اور اب ۱۹۸۵ کے اختتام پر ۵۰ لاکھ سے بھی زیادہ تعلیم یافتہ بیروزگار کام JOB کے متلاشی ہیں، اور یہ افراد ہائی اسکول یا اس سے زیادہ تعلیم حاصل کئے ہوئے ہیں۔ لیکن ان میں ڈاکٹروں، انجینیروں اور سپیروں۔۔۔ جیسے ٹرینڈ افراد کی تعداد شامل نہیں ہے۔

۳۔ ناقص نظامِ تعلیم

ملک کے نظامِ تعلیم میں خامیاں ہونے کی وجہ سے بھی بیروزگاری کے مسئلے نے شدت اختیار کی ہے۔ نظامِ تعلیم میں اہم نقص وہی ہے جو اوپر بیان بھی کیا جا چکا ہے۔ ہمارا نظامِ تعلیم Job oriented نہ ہو کر Degree Oriented ہے۔ جس سے تعلیم یافتہ افراد اسکول یا کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود کو بے کار محسوس کرتے ہیں۔

۴۔ ناقص منصوبہ بندی

بھارت میں پانچویں پنجسالہ منصوبے تک روزگار کو اولیت نہیں دی گئی تھی۔ صرف بیروزگاروں کے تئیں زبانی ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا۔ جبکہ چھٹی یوجنا میں ہمت افزا اقدامات کئے گئے ہیں، مگر وہ بھی ہنوز ناکافی اور خوش فہمی پر مبنی ہیں۔ البتہ وزیر اعظم کے بیس نکاتی پروگرام نے روزگار فراہمی کے وافر مواقع پیدا کرنے میں قابلِ ستائش کردار ادا کیا ہے۔

۵۔ دستکاری اور چھوٹی صنعتوں کا سست رفتاری کے ساتھ ارتقاء

اقتصادی ترقی کے لیے صنعتوں کے ڈھانچے کو جب سے مشینوں کے کاندھوں پر کھڑا کیا گیا ہے، تب سے دستکاروں اور گھریلو صنعتوں کو برے دن دیکھنے پڑ رہے ہیں۔ چھوٹی صنعتوں (Small Scale Industries) کے تنزل سے لاکھوں کاریگروں کو بیروزگاری کا سامنا کرنا پڑا ہے، حالانکہ عام طور پر یہ بیروزگاری جزوی بیروزگاری کے خانے میں آتی ہے۔

۶۔ قدرتی وسائل کا جزوی طور پر استعمال

ہمارے ملک میں قدرتی وسائل وافر مقدار میں موجود ہیں، لیکن دکھ کی بات ہے کہ ابھی تک ان وسائل کا پوری طرح استعمال کر پانا ہمارے لیے ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ نتیجے کے طور پر بڑھتی ہوئی آبادی کو صنعتوں اور پیشوں میں پوری طرح کھپایا نہیں جا سکا ہے۔

۷۔ ناقص نظریہ

ملک میں پائی جانے والی بیروزگاری کا اہم وجہ یہ بھی ہے کہ بھارت کا بیشتر تعلیم یافتہ بیروزگار طبقہ تعلیم ختم کرنے کے بعد نوکری (White Collar Job) کرنا چاہتا ہے۔ اس میں خود کسی روزگار میں ضم ہونے کا جذبہ تقریباً مفقود ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس ایسے افراد دوسروں کو جو Self Employment یا کسی بیوپار میں لگے ہوتے ہیں، حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جملہ تعلیم یافتہ افراد کو سرکاری نوکریاں نہیں لگایا جاسکتا، اس لیے پڑھے لکھے طبقے میں بیروزگاری کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔

۸۔ زراعت، جزوقتی دھندا

ہمارے یہاں کھیتی باڑی کا دھندا بہت سے علاقوں میں ابھی تک جز وقتی ہی ہے۔ اس دھندے میں لگے زیادہ تر افراد سال میں تقریباً چار سے چھ ماہ تک بیکار رہتے ہیں۔ لیکن یہ موسمی بیروزگاری کے زمرے میں آتی ہے۔

۹۔ کاشتکاری میں غیر یقینی صورتِ حال

بھارت میں زیادہ تر آبادی کے گاؤں میں رہنے اور کم زرعی پیداوار و غیر یقینی پن کی وجہ سے (قدرت پر انحصار) دیہاتی علاقوں میں پوشیدہ بیروزگاری، موسمی بیروزگاری یا جزوی بیروزگاری وسیع پیمانے پر پائی جاتی ہے۔ ہر سال سوکھا، باڑھ اور دیگر قدرتی آفاتِ ناگہانی کی وجہ سے لاکھوں مزدوروں کو روزگار سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ لہذا زراعتی کاموں میں غیر یقینی صورتِ حال کے باعث روزگار بھی غیر یقینی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔

۱۰۔ مہاجرین کی بڑی تعداد میں بھارت کو ہجرت

متعدد مواقع پر، جیسے تقسیم ہند کے وقت، بنگلہ دیش میں جنگ کے وقت، موجودہ سری لنکا بحران کے وقت بھاری تعداد میں مہاجرین بھارت آئے۔ اس کے علاوہ پچھلے کچھ سالوں سے بھارت نژاد لوگوں کو چند ملکوں سے خارج کیا جا رہا ہے۔ مثلاً برطانیہ، سری لنکا، یوگنڈا اور کینیا وغیرہ ممالک سرفہرست ہیں۔ اس طرح مہاجرین کی آمد اور دیگر افراد کا اپنے وطن لوٹنا بھی بے روزگاری میں اضافے کا سبب بنا ہے۔

بھارت کی اقتصادی ترقی پر بیروزگاری کے مضر اثرات

بے روزگاری کا مسئلہ ملک کی خوشحالی اور ترقی کے نقطۂ نظر سے انتہائی گمبھیر مسئلہ ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل مضر اثرات کا مختصراً جائزہ پیش خدمت ہے:

۱۔ افرادی قوت کا ضیاع

کسی بھی ملک کے افراد وہاں کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ لیکن بیروزگاری کے موجودگی میں افرادی قوت کا مناسب مصرف نہیں ہو پاتا۔ اس لیے یہ قوت ضائع ہو جاتی ہے۔ ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے مطابق بھارت کی آبادی ۶۸٫۴۳ کروڑ (۶۸، ۳۸، ۵۱۰) تھی۔ ظاہر ہے کہ اب یہ تعداد ۸۰ کروڑ سے بھی تجاوز کر چکی ہوگی۔ ان میں ۵ کروڑ افراد سے بھی بہت زیادہ بیروزگار ہیں۔ اگر ان سب بیروزگاروں کو بھی کام مل جائے تو ان کی محنت ملک کی خوشحالی اور ترقی میں ممد و معاون ثابت ہوسکتی ہے۔

۲۔ سماجی مسائل کی بہتات

کسی ملک میں صالح معاشرے کی موجودگی اس ملک کی ترقی اور خوشحالی کی ضامن ہوتی ہے۔ لیکن بیروزگاری کا مسئلہ معاشرہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ بے شمار مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بے ایمانی، رشوت خوری، کام چوری، چوری، ڈکیتی، شراب خوری، بد اخلاقی اور اقربا پروری وغیرہ۔ بھارت میں بھی بے روزگاری کی سنگینی کی وجہ سے مذکورہ سماجی مسائل کی کمی نہیں ہے۔ کسی بھی مثالی ملک کے لیے ایسے مسائل کا کثرت کے ساتھ ہونا باعث ننگ ہے۔

۳۔ اقتصادی مسائل کا ظہور

بیروزگاری کی وجہ سے فی کس انکم گھٹ جاتی ہے، جس کے سبب معیار زندگی بھی گر جاتا ہے۔ لوگوں پر قرض اور غریبی کا بوجھ بڑھ جاتا ہے .... یہ ایسے عوامل ہیں، جو نت نئے اقتصادی مسائل کو جنم دیتے رہتے ہیں۔ بیروزگاری کی شدت کی وجہ سے چھٹی یوجنا کے اختتام پر بھارت کے ۴۸ فیصد لوگوں کی فی کس ماہانہ آمدنی باسٹھ روپے کے قریب تھی۔ اسی وجہ سے ۴۶ فیصد (۳۲ کروڑ) آبادی غریبی کی سطح Poverty Line سے نیچے تھی جسے چھٹی یوجنا کے خاتمے تک گھٹ کر ۴۰ فیصد کر لیا گیا ہے

(باقی آئندہ)

بلقیس جہاں کامٹوی

مہاراشٹر میں خواتین کی کوآپریٹو سوسائٹیاں

صوبہ مہاراشٹر میں کوآپریٹو تحریک اہم عروج پر پہونچ چکی ہے مگر خواتین کی کوآپریٹو سوسائٹیوں کے تعلق سے یہاں کوئی خاص پیش رفت نظر نہیں آتی اس کی کئی وجوہات ہیں۔ منجملہ اور وجوہات کے ایک وجہ اس کی یہ بھی ہے کہ حکومت کی جانب سے خواتین کی کوآپریٹو سوسائٹیوں کو نہ تو کوئی خاص مراعات حاصل ہیں اور نہ خاطر خواہ حوصلہ افزائی! پورے مہاراشٹر میں خواتین کی کوآپریٹو سوسائٹیوں کی کل تعداد دو سَو سے زیادہ نہیں ہے اور جو سوسائٹیاں ہیں ان کا دائرہ کار بہت محدود ہے۔ عورتوں کی کوآپریٹو سوسائٹیوں کو ان کی نوعیت اور طریق کار کی مناسبت سے تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ انڈسٹریل کوآپریٹو سوسائٹیاں۔

۲۔ کریڈٹ سوسائٹیاں۔

۳۔ مختلف اقسام کی بچت سوسائٹیاں نیز کنزیومر اور سوشل ویلفیر قسم کی سوسائٹیاں وغیرہ۔

عورتوں کی کوآپریٹو سوسائٹیوں کی تعداد خاطر خواہ نہ بڑھنے اور خواتین کے اس تحریک سے دُور رہنے کے بہت سے اسباب ہیں۔ ہم یہاں مختصراً ان کا جائزہ لیں گے۔

اس کی سب سے اوّل اور بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں متوسط طبقہ کی جو خواتین ہیں، ان میں ناخواندگی کی شرح بہت زیادہ ہے اور جو پڑھی لکھی شمار کی جاتی ہیں تو ان میں بھی بس معمولی شُد بُد ہوتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتوں میں بھی ان مطلوبہ استطاعت و صلاحیتوں کا فقدان ہوتا ہے جو اس مقصد کے لیے درکار ہیں۔ اور ان میں غایت درجہ شوق و لگن بھی نہیں ہوتی۔ حالانکہ اگر عورتیں اس میں دلچسپی لیں تو یہ بجائے خود ان کے لیے بھی جزوی طور پر معاشی مسائل کا حل ثابت ہوگا پھر چونکہ کم علمی، ناتجربہ کاری کی بنا پر انھیں اس بات کا کما حقہٗ شعور نہیں ہوتا کہ سوسائٹی کا کاروبار کس طرح سے چلایا جائے۔ سوسائٹی کا حساب کتاب کس طرح سے لکھا جائے اور اس کے لیے کیا کیا چیزیں ضروری ہوتی ہیں، وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ کوآپریٹو تحریک کو قبولیت عام حاصل ہونے کے باوجود خواتین اس تحریک و تنظیم سے دُور ہیں۔

سوسائٹی کی نوعیت کے اعتبار سے اُس سے متعلق بیوپاریوں اور بڑی بڑی فرموں سے ان کا سابقہ پڑتا ہے مگر ان کی کم فہمی اور ناتجربہ کاری کا وہ بیوپاری اور فرمیں بھرپور فائدہ اٹھا لیتی ہیں جس سے سوسائٹی کو کبھی کبھی نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔

اس نوع کی سوسائٹیوں کا دوسرا سب سے بڑا مسئلہ سرمایہ کی فراہمی ہے اور یہ مسئلہ مردوں کی بہ نسبت عورتوں کے لیے زیادہ سنگین ثابت ہوتا ہے اور پھر کوآپریٹو اداروں کے کاروبار کی نوعیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ انھیں وقت پر مالی امداد مل گئی تو ٹھیک ورنہ اس کی

وجہ سے بے شمار رکاوٹیں اور مشکلات پیدا ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے جس سے کبھی کبھی سوسائٹیاں خسارے میں بھی آجاتی ہیں اور پھر فوری توجہ نہ دی گئی تو بند بھی ہو جاتی ہیں۔ خواتین کی سوسائٹیوں کا یہ مسئلہ فکر انگیز بھی ہے اور توجہ طلب بھی۔ یہ مسئلہ اس وقت اور بھی پریشان کن بن جاتا ہے کہ جب ایسے مالی بحران میں انھیں مالی امداد تو کجا بلکہ اس کے حاصل کرنے کے لیے صحیح رہنمائی بھی نہیں مل پاتی اور نتیجتاً سوسائٹی کے کام کاج کو بند کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ خاص طور سے اس معاملہ میں خواتین کی سوسائٹیاں توجہ کی مستحق ہیں۔

ان سوسائٹیوں کو تیسری رکاوٹ جو پیش آتی ہے وہ اس میدان کی باصلاحیت اور تجربہ کار خواتین کی عدم موجودگی ہے۔ ان سوسائٹیوں کی رکن خواتین میں کاروبار کے باریکیوں کو سمجھنے اور اس کے اونچ نیچ اور معاملے کو سلجھانے کی صلاحیت بہت کم ہے۔ نیز وہ اس تحریک کے قوانین وضوابط سے بھی کماحقہٗ واقف نہیں ہوتیں اور چونکہ انھیں کوآپریٹو تعلیمی اداروں میں بھی باقاعدہ تعلیم کا موقع نہیں مل پاتا اور پھر اس کی سہولتیں بھی ہر جگہ میسّر نہیں ہوتیں، اس لیے ان میں کم علمی اور ناتجربے کاری بدستور قائم رہتی ہے۔ اور اس سے سوسائٹی کی ترقی پر بہت خراب اثرات پڑتے ہیں۔

چوتھی وجہ ان سوسائٹیوں کی زبوں حالی کی یہ ہے کہ آج کل بازار میں تیار مال کی جو زبردست مقابلہ آرائی بلکہ معرکہ آرائی ہے اُس کے داؤ پیچ سے بھی یہ بھولی بھالی عورتیں چونکہ ناواقف ہوتی ہیں اس لیے اکثر نقصان اٹھاتی ہیں۔ تیار شدہ مال معیار کے اعتبار سے بھی بازار کی ضرورتوں کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اور قیمتیں بھی دوسروں کے مقابلے میں نہایت مناسب ہونی چاہئیں۔ تب کہیں سوسائٹی کی تیار کردہ اشیاء کی بازار میں کھپت ممکن ہے۔ بالعموم سوسائٹی کی تیار کردہ مصنوعات بازار سے کم قیمت تو ہوتی ہیں مگر مطلوبہ معیار برقرار نہ ہونے کی بنا پر آج بازاروں میں سوسائٹی کی تیار کردہ چیزوں کو خریدار دوسرے درجے کی چیز سمجھتے ہیں اور وہ اس میں بہت حد تک حق بجانب بھی ہیں۔

پانچویں چیز جو اس کی ترویج و ترقی میں سدِّ راہ بنی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اس نوع کے دوسرے ادارے یا اس سے متعلقہ اپیکس ادارے و سرکاری محکموں سے ان سوسائٹیوں کی بے تعلقی و عدم ارتباط ہے۔ اور خاص طور پر دیہی قسم کی سوسائٹیوں میں یہ بات بہت عام ہے۔ حالانکہ اس میدان میں رسوخ و تعلقات کی افادیت اور ضرورت بنیادی حیثیت رکھتی ہے کیوں کہ یہ سوسائٹیاں اپنے اراکین کی ذاتی لگن اور محنت کے ساتھ ساتھ مختلف اداروں کے باہمی تعاون سے ہی پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہیں۔

مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر خواتین کی بہت سی کوآپریٹو سوسائٹیاں بند ہو گئیں اور جو چالو ہیں اُن میں بھی کئی ایسی ہیں جو مسلسل خسارے میں چل رہی ہیں اور معدودے چند سوسائٹیاں جو تھوڑی بہت کامیابی کے ساتھ چل رہی ہیں ان میں بھی اکثر ایسی ہیں کہ جن پر اگر خاطر خواہ توجہ نہ دی گئی تو وہ بھی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکیں گی۔ اس ضمن میں چند تجاویز و مشورے پیش ہیں جنھیں روبعمل لانے پر اس بات کی توقع ہے جا سکتی ہے کہ اگر کوآپریٹو تحریک میں خواتین کا مستقبل روشن و تابناک ہے وگرنہ موجودہ صورت حال تو بڑی حوصلہ شکن اور قابلِ رحم نظر آتی ہے۔

۱۔ حکومت ایسی بند سوسائٹیوں کو دوبارہ مالی امداد دے کر ان کے احیاء کی کوشش کرے ان کا نظم ونسق متعلقہ محکمے کے افسران کے حوالے کر دیا جائے یعنی ان افسران کو سوسائٹی میں ڈیپوٹ کر دیا جائے تاکہ اس طرح نظم و نسق میں اصلاح ہو اور صحیح طور پر رہنمائی مل سکے۔

۲۔ سوسائٹی کی رُکنیت کے لیے کوئی نہ کوئی بنیادی تعلیمی معیار مقرر ہونا چاہیئے اور کوشش اس بات کی کی جانی چاہیئے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ اور باشعور خواتین شامل ہو سکیں۔ نیز اراکین سوسائٹی میں جو ناخواندہ و کم تعلیم یافتہ خواتین ہیں ان کے لیے سوسائٹی کی جانب سے تعلیم و تربیت کا مناسب انتظام کیا جانا چاہیئے۔

۳۔ جس نوع کی بھی سوسائٹی ہو اس سے متعلق محکمہ جات نیز نیم سرکاری و غیر سرکاری اداروں سے سوسائٹی کے تعلقات کو مستحکم و مربوط کیا جانا چاہیئے۔ تاکہ کام کاج میں پوری طرح رہنمائی و تعاون حاصل ہو سکے۔

۴۔ بازار میں سوسائٹی کے تیار شدہ مال کا معیار بڑھانے اور مال کی کھپت میں اضافے کے پیشِ نظر تجربہ کار اور فنی مہارت سے مزین کاریگروں نیز تعلیم یافتہ ٹیکنیکل عملہ کا سوسائٹی کی جانب سے تقرر کیا جانا ضروری ہے۔

۵۔ خواتین کے جو بڑے بڑے کوآپریٹو ادارے قائم ہیں خواہ وہ کسی نوع کے ہوں ان سے ربط و تعلق قائم کیا جائے اور حتی المقدور

یا تعاون حاصل کرنے نیز ان کے ذریعے متعارف لوگوں کو اپنی کارکردگی و صنعت سے متعارف کرانے کی سعی و کوشش کی جانی چاہیے۔

خواتین کی سوسائٹیوں میں بالخصوص کنزیومر اور سوشل ویلفیر سوسائٹیاں زیادہ کامیابی کے ساتھ چل سکتی ہیں، نیز روزانہ استعمال ہونے والی چھوٹی موٹی چیزوں کی تیاری کے لیے انڈسٹریل سوسائٹیاں بھی اچھی طرح چلائی جاسکتی ہیں کیوں کہ ان چھوٹی موٹی گھریلو قسم کی چیزوں کا اندازہ عورتوں کو ہی اچھی طرح سے ہو سکتا ہے اور ان اشیاء کی فروخت کے لیے خواتین کی کنزیومر سوسائٹیوں کا بھی سہارا لیا جا سکتا ہے۔ کنزیومر سوسائٹیوں کا طریق کار صرف یہ نہ ہو کہ بڑے بڑے کنزیومر اسٹورس کھول دیے جائیں بلکہ اپنی مصنوعات کو گھر گھر پہنچانے کے لیے ہر ممکن ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔ مثلاً اس علاقہ میں جو ملازمت پیشہ خواتین ہیں ان سے ربط پیدا کیا جائے اور پھر ان سے ملاقاتیں کر کے ان کی گھریلو ضرورت کی چیزوں کا آرڈر لیا جائے اور پھر اپنے کنزیومر اسٹورس سے انھیں مطلوبہ چیزیں فراہم کی جائیں۔ اس طرح سے جب ان ملازمت پیشہ مشغول عورتوں کے اوقات کی بچت ہوگی اور انھیں گھر بیٹھے اچھی اور سستی چیزیں ملنے لگیں گی تو سوسائٹی پر خود بخود ان کا اعتماد بڑھتا جائے گا اور ان کے ذریعے دیگر لوگوں کی توجہ بھی سوسائٹی کی جانب مبذول ہوگی۔

اسی طرح انڈسٹریل سوسائٹیوں میں چھوٹے بچوں کے سوتی و اونی کپڑے، ہوزیری، بچوں کی پوشاک، الیکٹرک کمپوننٹس، مشینوں میں لگنے والے چھوٹے پُرزے، پیکنگ کے لوازمات، ادویات و مصنوعات کے ... تے فائلیں اور پاکیٹس وغیرہ وغیرہ جیسی عام ضرورت کی بے شمار چیزیں تیار کی جاسکتی ہیں۔

انڈسٹریل سوسائٹیوں میں ابھی تک عورتوں نے صرف پاپڑ اور اچار تیار کرنے اور سلائی و کڑھائی کا کام کرنے اور اسی نوع کے دوسرے چھوٹے موٹے گھریلو کام والی ہی سوسائٹیاں بنائی ہیں، حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ خواتین کی سوسائٹیوں کا دائرہ کار وسیع کیا جائے اور وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ایسی سوسائٹیاں تشکیل دی جائیں جن سے بالواسطہ یا بلاواسطہ خواتین بھرپور فائدہ اٹھا سکیں اور ان کے گھریلو کام کاج میں اس سے سہولت اور مدد مل سکے۔

●

بقیہ: باغبانی کا پروگرام

دسمبر

پھول:۔ گل داؤدی خوب پھولتی ہے۔ فلاکس، کینڈی ٹفٹ، اسٹاک، نیسٹرٹیم، لالہ، جرنوم، کوایلس اور سیلویا سے پھول اترتے ہیں اور بعض پوٹیاں لگائی جاتی ہیں۔

پھل:۔ شفتالو، انجیر، آلو بخارا وغیرہ کے درخت چھانٹے جاسکتے ہیں۔ جن درختوں کی جڑیں کھلی ہوں ان میں تازہ مٹی دی جاتی ہے۔ اگر درخت اس ماہ میں نہ چھانٹے جا سکیں تو یہی کام جنوری میں ہوتا ہے۔

ترکاریاں:۔ متعدد ترکاریاں تیار ہو جاتی ہیں۔

●

بقیہ، صنعتی مزدوروں کے مسائل ۱۹۸۵ کی صورتِ حال کا جائزہ

طے کرنے والے اجتماعی ایجنٹ کے انتخاب کے بارے میں کوئی سفارش پیش نہیں کی گئی۔ اگرچہ یہ ایک بنیادی سوال تھا اور کئی برسوں سے حل ہونے میں نہیں آرہا تھا۔

صنعت مہتہ کمیٹی کی سفارشات کو، جو دو سال قبل مرتب کی گئی تھیں، گرد کھانے کے لیے طاق پر رکھ دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ شرکائے کانفرنس ان کے بارے میں متفق نہیں ہو سکے۔

کوئی بھی یہ کہنا چاہے گا کہ وزراء کو اس کانفرنس کو زیادہ سنجیدگی سے لینا تھا کیوں کہ اس کا موضوع ایسا تھا جو ان کے دائرہ اختیار میں آتا تھا۔ مہاراشٹرا اور مغربی بنگال کے سوا بیشتر وزراء نے صرف اپنی تقریریں پڑھنے پر ہی اکتفا کی۔

بہرحال ایسی کانفرنسوں کی کامیابی کا ثبوت تو صرف اسی بات سے مل سکتا ہے کہ ان کے کیے ہوئے فیصلوں اور سفارشوں پر کس طرح عمل کیا جاتا ہے۔ کانفرنس کے انعقاد کو چار ماہ گذر چکے ہیں لیکن عمل پیرائی کے آثار ابھی آنکھ سے اوجھل ہیں اور لیبر کا محاذ امیدوں اور مایوسیوں کا ایک ملا جلا منظر پیش کر رہا ہے۔

●

مضمون نگار حضرات سے درخواست

براہ کرم مضمون صفحہ کے ایک جانب خوشخط لکھیں۔ سطروں کے درمیان کافی فاصلہ دیں۔ کٹے پھٹے اور غیر صاف شدہ مضامین مسترد کر دیے جاتے ہیں، ان کی اطلاع دینا بھی ادارے کی ذمہ داری نہیں ہے۔

مستقبل میں ہندوستان میں کینسر کا مسئلہ زیادہ شدت سے سامنے آسکتا ہے۔ اس کا سبب ایک تو یہ ہے کہ ہمارا طرز معاشرت بدل رہا ہے اور دوسرے یہ کہ انسان روزمرہ کی زندگی میں کینسر کا مرض پیدا کرنے والے مادّوں سے خود کو دور نہیں رکھ پا رہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر صحت محترمہ محسنہ قدوائی نے ۱۱ اپریل کو نئی دلی میں رسولی اور اس کے علاج سے متعلق روسی کوششوں کے موضوع پر ایک نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ہر سال ایک ہزار کی آبادی میں سے ۷ افراد کینسر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ہر سال ۵ لاکھ نئے مریض کینسر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مردوں میں بالعموم منہ، جگر، اور پھیپھڑے کا کینسر ہوتا ہے جبکہ عورتوں میں چھاتی اور رحم کا کینسر عام ہے۔ دنیا بھر میں جس قدر عورتیں کینسر کا شکار ہوتی ہیں، ان میں سے تقریباً ۱۶ فیصد ہندوستان کی عورتیں ہوتی ہیں۔ حکومت اس کی روک تھام کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔ قومی سطح پر کینسر کی روک تھام کے ایک پروگرام کی منظوری دی جا چکی ہے۔ علاقائی مراکز کے ذریعے کینسر کے مرض کا جلد سے جلد پتہ چلانے کی کوششیں کی جائیں گی۔

انسان کی صحت سے امراض کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل ہمہ وقت صف آرا رہتے ہیں۔ انسان ان سے بچاؤ کی ہر ممکن کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس میں خاطر خواہ کامیابی بھی ملی ہے اور خطرناک وبائی امراض مثلاً ہیضہ، چیچک، ملیریا وغیرہ پر قابو پایا جا چکا ہے تاہم کینسر، دل کا دورہ، سوزاک اور ریبیز وغیرہ بیماریاں ابھی لاعلاج ہیں۔ ان میں کینسر سرفہرست ہے اور اس کا کامیاب علاج ڈھونڈھنا بلاشبہ میڈیکل سائنس کے لیے ایک چیلنج ہے۔

کینسر، جو انگریزی کے لفظ CRAB سے بنا ہے اور جس کے لفظی معنی کیکڑا ہے انیسویں صدی کی دریافت نہیں بلکہ تقریباً ۲۵۰۰ قبل مسیح مصریوں میں زخم کی شکل کا ایک لاعلاج مرض موجود تھا جس کی تصدیق "غراب پیرامیڈ" سے دستیاب مسالہ دار لاشوں اور کھدائی سے ملی ہڈیوں کے تجزیے سے ہوتی ہے۔ اسی مرض کو دورِ جدید میں کینسر کہتے ہیں۔ یونانیوں نے اس مرض کا سبب دریافت کیا اور علمِ طب کے عروج کے ساتھ ساتھ اس کی ماہیت پر حاوی ہوتے گئے۔ پھر جب عربوں اور یونانیوں کا تمدن خلط ملط ہوا تو عربی فنِ جراحت یونانیوں کے ترقی یافتہ فنِ طب کے ساتھ کسی حد تک مرض پر قابو پانے میں کامیاب رہا۔ مگر گردشِ زمانہ کے ساتھ ساتھ جب یونانی تہذیب فنا ہوئی اور عربوں پر بھی انحطاط طاری ہوا تو یہ معلومات کسمپرسی کے عالم میں رفتہ رفتہ معدوم ہو گئیں۔

کینسر کے حالیہ غیر معمولی پھیلاؤ کا سبب برق رفتار صنعتی ترقی اور شہری حدود کی وسعت ہے اور یہی وجہ ہے کہ پچھلی صدی میں کینسر انسانی موت کی ساتویں بڑی وجہ تھا جبکہ آج دوسری بڑی وجہ ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق آج امریکہ کا تقریباً ہر خاندان کینسر سے متاثر ہے۔ اس سے اس مرض کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آیئے اس مرض کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیں۔

انسانی جسم کی تشکیل لاتعداد چھوٹی چھوٹی اکائیوں سے مل کر ہوئی ہے۔ جنھیں خلیہ (Cell) کہتے ہیں۔ خلیہ جسم کا واحدہ ہے۔ یہ مختلف قسم کا ہوتا ہے مثلاً خون کا خلیہ، ہڈی کا خلیہ، گوشت کا خلیہ وغیرہ وغیرہ۔ ایک ہی طرح کے خلیوں کے ایک خاص مجموعے کو نسیج کہتے ہیں اور مختلف نسیج مل کر اعضا کی تشکیل کرتے ہیں۔ خلیے جسم میں ہر وقت مخصوص تناسب سے بنتے ہیں اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ خلیوں کے ٹوٹنے کی رفتار کا بننے کی رفتار سے زیادہ ہو جانا ہی کینسر کی ابتدا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نسیجوں کی بے قاعدہ بالیدگی ظہور پذیر ہوتی ہے جو کہ کینسر کی بنیاد ہے۔ ٹوٹے ہوئے خلیے انتہائی سُرعت سے اپنے گرد صحت مند خلیوں پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اس طرح جسم میں کینسر کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے اور مریض موت کے قریب سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔

کینسر بلا تفریق رنگ و نسل، عمر، جنس، بود و باش اور خورد و نوش دنیا کے تمام انسانوں کو یکساں طور پر متاثر کرتا ہے اور جسم کے کسی بھی حصہ سے پھیل سکتا ہے۔ لیکن مختلف ملکوں میں اس کی نوعیت الگ الگ ہوتی ہے۔ منہ، گال، زبان اور گردن کا کینسر ہندوستان میں عام ہے، جگر کا کینسر افریقہ میں، جبکہ پھیپھڑے اور پیٹ کے کینسر کے مریض امریکہ اور برطانیہ میں زیادہ ہیں۔ عورتوں اور بچوں میں کینسر بڑی تیزی سے پھیلتا ہے اور اپنی گرفت مضبوط کرتا ہے لیکن بچے

پھیپھڑے، سینے اور گوہنی کے کینسر سے محفوظ رہتے ہیں۔ خواتین میں گردن، رحم اور پستان کینسر کا مخصوص نشانہ ہے اور موٹاپا معاون۔ رحم کا کینسر عمر دراز عورتوں کو ۴۰ سال سے نیچے عموماً اور ۴۰ سال سے اوپر خصوصاً متاثر کرتا ہے۔ گردن کا کینسر ۴۰ سال سے ساٹھ سال کی عمر میں ہوتا ہے۔ پستان کا کینسر بھی ۴۰ سے ۶۰ سال کے درمیان ہی حملہ آور ہوتا ہے۔ لیکن جوان اور حاملہ عورتیں اس کا شکار نہیں ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں پارسی اور سندھی عورتیں اکثر پستان کے کینسر کا شکار ہوتی ہیں جس کی وجہ شاید دو فرقوں کا آپسی شادی بیاہ ہے۔

کینسر ایک خاموش اور شاطر مرض ہے۔ دوسرے مرض کی طرح اس کا پتہ ابتدائی ایام میں نہیں لگتا بلکہ مہینوں، سالوں اور کبھی کبھی دس سال بعد بھی بیرونی طور پر کینسر ایک معمولی پھوڑے کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے جس سے ریم، پیپ تو کافی نکلتا ہے لیکن نہ سوزش ہوتی ہے اور نہ جلد ہی ٹھیک ہوتا ہے۔ بعض اوقات کینسر مستقل تکلیف دہ کھانسی، گھونٹ لینے و نگلنے میں دقت، آنت، نظام ہضم میں بگاڑ کے ذریعہ بھی اپنی اطلاع دیتا ہے۔ جسم کے اکثر حصے مثلاً پستان، حلق، معدہ، زودزبل وغیرہ کا غیر معمولی طور پر سخت اور دبیز ہو جانا بھی بلاشبہ کینسر کی علامت ہے۔ ان صورتوں میں فوراً ڈاکٹر کی صلاح لینی چاہیئے اور طبی جانچوں سے ہرگز گریز نہ کرنا چاہیئے۔

اکثر معاشی پیشے کینسر کی وجہ ہوتے ہیں۔ چمنیوں کے نزدیک کام کرنے والے مزدوروں کو دھوئیں کی وجہ سے SCROTAL کینسر ہوتا ہے۔ رنگسازی کے کارخانے میں ڈائی بنانے والے مزدور عموماً بلڈ کینسر کا شکار ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں کچھ عادتیں بھی مہلک ہیں مثلاً بطور منجن کوئلہ اور گڑاکو کا استعمال، پان اور سگریٹ نوشی وغیرہ۔ ان سے گال، ہونٹ، جبڑہ اور ٹیٹوہ کا کینسر ہوتا ہے۔ عام خیال کے مطابق بیڑی، چونکہ پتوں سے بنتی ہے لہذا یہ سگریٹ سے کم نقصان دہ ہے مگر ایسا سوچنا قطعی غلط ہے بلکہ بیڑی سگریٹ سے دوگنا مضر ہے۔ گرم اور مصالحہ دار کھانے پیٹ کی نرم و نازک نلیوں میں سوجن پیدا کرتے ہیں جس سے پیٹ کا کینسر ہوتا ہے X-RAY اور U-V-RAY کا انسانی جسم سے تعارف بھی کینسر کو جنم دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آسٹریلیا میں (Sun Bath) کی وجہ سے جلد کا کینسر عام ہے۔ اسبسٹس، آرسینک اور تار وغیرہ کیمیاوی مادے اگر جسم کے کسی حصے سے ایک خاص مدت تک متصل رہے تو کینسر لاحق ہوتا ہے۔

سائنس دانوں کے ایک طبقے کا خیال ہے کہ کینسر ایک موروثی مرض ہے اور نسلاً بعد نسلٍ بذریعۂ (Genes) منتقل ہوتا ہے۔ ایک دوسرے نظریے کے مطابق VIRUS چونکہ جانوروں میں کینسر کی وجہ ہے لہذا انسانوں میں بھی یقیناً VIRUS ہی کینسر پیدا کرتا ہے۔ بہرحال وجوہات جو بھی ہوں اگر کینسر کا پتہ ابتدائی ایام میں لگ جائے جبکہ اس کا دائرۂ اثر وسیع نہ ہوا ہو تو پھر علاج ممکن ہوتا ہے اور مریض ٹھیک ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ماہرین فنِ جراحی نے اس کا مکمل علاج OPERATION THEATRE سے باہر قرار دیا ہے۔

آج دنیا کی تقریباً تمام ترقی یافتہ اور نیم ترقی یافتہ حکومتیں کینسر کا علاج ڈھونڈنے میں کوشاں ہیں اور برسوں سے بے شمار سرمائے خرچ کر رہی ہیں لیکن اب تک کی کامیابی سے کینسر کے مریض کے بارے میں طویل اور تکلیف دہ علاج کے بعد صرف یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ کچھ دن اور زندہ رہ لے گا۔ پچھلے برسوں میں علم کیمیا، حیاتیاتی کیمیا اور علم تولید و تناسل میں زبردست تحقیقات ہوئیں۔ اور اب یہ امید بندھ چلی ہے کہ کینسر کا علاج کبھی نہ کبھی ضرور ممکن ہو سکے گا۔ اس سلسلے میں امریکن کینسر سوسائٹی کا رول انتہائی نمایاں ہو رہا ہے اور اس کی پیش رفت بھی قابلِ تحسین ہے۔ ان دنوں یہاں ایک بہت ہی قیمتی دوا انٹرفیران بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جس سے اُمید ہے کہ کینسر کا علاج ہو سکے گا۔ انٹرفیران کو سائنس کی اصطلاح میں اِف IF کہا جائے گا۔ اِف کے معنی اگر ہوتے ہیں۔ لہذا اگر یہ کوشش کامیاب رہی اور انٹرفیران کم لاگت سے وافر مقدار میں بنایا جا سکا اور پھر اس کے منفی پہلو سے بھی بچا جا سکا تو کینسر لاعلاج مرضوں کی فہرست میں آئندہ نہ رہے گا۔ انٹرفیران بنانے کے لیے اسرائیل کے ویزمن انسٹی ٹیوٹ آف سائنس نے بچوں کے ختنے کے وقت کاٹی جانے والی کھال کے استعمال کا اعلان کیا ہے۔ انٹرفیران کے استعمال سے صحت مند خلیوں پر کوئی مضر اثر مرتب نہیں ہوتا، لیکن مریض کو تھکن اور بخار کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ سردست امریکن کینسر سوسائٹی کے زیر نگرانی انٹرفیران کے چار طرح کے کینسر کے مریضوں پر تجربہ کیا جا رہا ہے اور آئندہ ایسا ارادہ ہے تا وقتیکہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو۔ سائنس کی گذشتہ حیرت انگیز دریافتوں اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے بعد کینسر کا کامیاب علاج ڈھونڈھ لینا میڈیکل سائنس کا بیسویں صدی کا عظیم کارنامہ ہوگا۔ ●

پھل، پھول، ترکاریاں

مئی

پھل:۔ انناس کی سیرابی اور دوسرے پھل دار درختوں کے پیوند اور گوٹی اور رد ابہ کرنے کا مناسب زمانہ ہے۔

ترکاریاں: سیم، کھیرا، ککڑی، کدو، مکا، بھنڈی، بیگن وغیرہ کے بیج جہاں سینچائی کا انتظام ہو بوئے جاتے ہیں اور ادرک لگایا جاتا ہے۔ چولائی کا ساگ شروع ہو جاتا ہے۔

جون

پھول:۔ فرن ہاؤس کی سینچائی اور گل مہندی، اشرفی اور گیندے کا ذخیرہ کرنا چاہیئے۔ دھلیا اور عقیق بھی اسی زمانے میں لگایا جاتا ہے۔ مئی اور جون میں بیکار زمین کو جوت اور گوڑ کر چھوڑ دینا بہت مفید ہوتا ہے۔ آخر ماہ تک نکاس کی نالیوں کی درستی ہو جانا چاہیئے۔ گل داؤدی گملوں میں لگایا جاتا ہے اور کچھ قلمیں بھی لگائی جاتی ہیں۔

پھل: تخمی پھلوں کے لیے آم کی گٹھلیاں بوئی جاتی ہیں اور پیوند قلم اور داب بھی لگایا جاتا ہے۔ آڑو اور انگور کا پھل اترنے لگتا ہے۔

ترکاریاں: دیسی ترکاریاں بوئی جاتی ہیں اور موجودہ فصلوں کی سینچائی ہوتی ہے۔

جولائی

پھول: سرو اور شمشاد کے داب تیار کئے جاتے ہیں۔ ورمنیا کے جوڑے کونڈیوں میں لگائے جاتے ہیں۔ فرن خانہ کی سینچائی بند کر دی جاتی ہے اور کونڈیوں کی مٹی عام طور پر بدلی جاتی ہے۔ گل مہندی، مرغ کیس، دوپہریا، سورج مکھی وغیرہ کے بیج بوئے جاتے ہیں۔ دھلیا کے پوٹیوں میں جڑیں پھوٹ آتی ہیں اور گملوں سے نکال کر نئے گملوں میں لگائے جاتے ہیں۔ گلاب میں قلم اور چشمہ بھی لگایا جاتا ہے۔

پھل:۔ انناس کا سر بو کر نیا درخت تیار کیا جاتا ہے۔ شفتالو، نارنگی اور لیمو کے چشمے تیار کئے جاتے ہیں۔

ترکاریاں:۔ بیگن، پرول، کھیرا، سیم، کرو اور اسی قسم کی ترکاریاں بوئی جاتی ہیں۔ مرچ کا پودا لگایا جاتا ہے۔

اگست

پھول:۔ گل مہندی، گل شبو اور عقیق وغیرہ سے پھول آتے ہیں۔ عشق پیچاں کا بیج بویا جاتا ہے۔ گلاب کا چشمہ اور داب تیار ہو سکتا ہے۔ دھلیا میں بھی پھول آتا ہے۔ بیل دار گلاب کی قلمیں لگتی ہیں۔

پھل:۔ شفتالو، بیر، ناشپاتی، نارنگی اور لیمو کا چشمہ لگایا جاتا ہے۔ شریفہ، امرود، انار کے پھلوں کی نگرانی کا وقت ہے۔ انناس کے جڑوے لگائے جاتے ہیں۔

ستمبر

پھول:۔ پھول بڑا کرنے کے لیے گل داؤدی کی شاخیں تراشی جاتی ہیں۔ ایسا کرنے سے پھول بہت آتے ہیں۔
مصنوعی پہاڑیوں پر تازہ مٹی ڈالی جاتی ہے۔ کیچوے اور دوسرے برساتی کیڑوں سے گملوں کی مٹی کو صاف رکھنے کا خیال رکھنا چاہیئے۔

پھل:۔ تخمی درخت تیار کرنے کے لیے شفتالو کا بیج بویا جاتا ہے جو آئندہ اگست تک چشمہ باندھنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ترکاریاں:۔ گوبھی، کرم کلا، ہاتھی چک وغیرہ کی پود بوئی اور سنبھالی جاتی ہے۔ مٹر اس مہینے میں بوئی جا سکتی ہے۔

اکتوبر

پھول:۔ یہ مہینہ کام کرنے کا خاص زمانہ ہے۔ اس کے وسط میں بہت زیادہ پھولوں کے بیج بوئے جاتے ہیں۔ فرن ہاؤس اور گل داؤدی کے گملوں میں تازہ کھاد دی جاتی ہے۔ گلاب کے پودے تراشے جاتے ہیں۔

پھل:۔ الائچی، بادام، شریفہ، امرود، شفتالو، آلو بخارا، اخروٹ، چکوترا، بیر، کھرنی اور داچینی کے بیج بوئے جاتے ہیں اور اسٹرابری کے لیے زمین تیار کی جاتی ہے۔ کمرکھ پکنے لگتے ہیں۔

ترکاریاں:۔ پیٹھا کے پھل توڑ دئے جاتے ہیں۔ شلجم، گاجر، آلو، مٹر، سیم، چقندر، پالک، اور سلاد بوئے جاتے ہیں۔ اور گوبھی، کرم کلا، مرچ وغیرہ کی پود لگائی جاتی ہے۔

نومبر

پھول:۔ گلاب کی جڑوں کو ہوا دی جاتی ہے۔ اور اس کی صفائی اور سینچائی ہوتی ہے۔ ہر طرح کے گلاب کے قلم لگانے کے لیے یہ زمانہ مناسب ہے۔ گل داؤدی پھولنے لگتی ہے۔ اکثر بیج بھی بوئے جاتے ہیں۔

پھل:۔ شفتالو، آم، انگور، ناشپاتی وغیرہ کی جڑیں کھولنی چاہئیں اور سینچائی روک دینی چاہیئے۔ انگور کی بیل جڑیں کھودنے سے پہلے چھانٹنا اچھا ہوتا ہے۔ شفتالو میں نئی مٹی بھری جاتی ہے۔

ترکاریاں:۔ اکتوبر کی بوئی ہوئی بہت سی ترکاریاں اس مہینے میں تیاری کے قریب ہوتی ہیں۔ اور بعض ترکاریاں اس قابل ہو جاتی ہیں کہ ان کے بیج نکال لیے جاتے ہیں۔ لہسن کی کاشت بھی ہوتی ہے۔ ترکاریوں کے لیے از سر نو بوائی کے لیے زمین تیار کی جاتی ہے۔

(باقی صفحہ [illegible] پر)

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81
Vol. 6 No. 3

YOJANA (URDU)

License U (DN) 65 to post without prepayment at NDPSO, New Delhi.
1-15th May 1986

محمد معیز الدین

معذور افراد کی بحالی

پبلک سیکٹر میں ۲۲ ایسے خصوصی دفاتر روزگار ہیں جو معذور افراد کی بحالی کے لیے کام میں مصروف ہیں۔ ۱۴ پیشہ ورانہ تربیت کے مراکز اس کے علاوہ ہیں۔ خصوصی نوعیت کے دفاتر روزگار بھی ان کی بحالی کے کام میں لگے ہیں۔ ۱۹۸۳ کے آخر تک ایک لاکھ ۱۵ ہزار چار سو جسمانی طور پر معذور افراد کو کام درکار تھا۔ ان میں سے ۱٬۴۴٬۱۷۰ ایسے معذور افراد شامل ہیں جن کے جسم کا کوئی ایک حصہ خراب ہو گیا ہے۔ ۱۹۸۳ میں ۲٬۴۰۰ معذور افراد کو دفاتر روزگار کے توسط سے کام دلایا گیا۔ ان میں سے ۲۴۰۰ معذور افراد وہ ہیں جن کو روزگار دلانے کے خصوصی دفاتر روزگار نے مدد کی۔ ان کو ملک کے مختلف حصوں میں کام پر لگا دیا گیا۔ ۱۹۸۳ میں ۴٬۲۰۰ اندھے، تین ہزار بہرے اور گونگے، اور ۹۰۰ ۴ جسمانی طور پر معذور افراد کو خصوصی دفاتر روزگار میں درج کیا جا چکا تھا۔ تاکہ ان کو روزگار دلانے کی کوششیں کی جا سکیں۔

ان کے علاوہ ملک کے اہم شہروں اور حصوں میں ۱۴ پیشہ ورانہ بحالیاتی مراکز واقع تھے جو پیشہ ورانہ نوعیت کی تربیت دے رہے تھے۔ یہ اس بات کا اندازہ لگا رہے تھے کہ ملک میں کس کس طرح کے معذوروں کو کس کس طرح کے کام میں لگایا جا سکتا ہے۔ اس جائزے سے معذور افراد کی ٹھوس امداد کے امکانات روشن ہو رہے ہیں۔ کام کے لیے تربیت، ازخود روزگار کے پروگرام اور کسی کارخانے وغیرہ میں رہ کر تربیت کا حصول معذور افراد کی بحالی میں بیحد معاون ہو سکتا ہے۔ معذور افراد کو با تنخواہ اور با اُجرت روزگار بھی دلایا جا سکتا ہے اور ان کو ازخود روزگار کی طرف بھی راغب کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۸۴ کے دوران پیشہ ورانہ بحالیاتی کے مراکز کے توسط سے ۲۲،۴ افراد کو کام دلایا جا سکا۔ یہ بات یقینی بنانے کے لیے کہ جسمانی طور پر معذور افراد کو جلد سے جلد بحال کیا جا سکے، بمبئی، بنگلور، احمد آباد، مدراس، ترلویندرم اور حیدر آباد میں واقع پیشہ ورانہ بحالیاتی مراکز میں سے ۶ مرکزوں پر ہنرمندی اور دستکاریوں کے سکھانے کے مراکز بھی قائم کر دئے گئے ہیں۔ چونکہ یہ مراکز زیادہ تر شہروں میں واقع ہیں، لہذا یہ شہری آبادی کے لیے زیادہ کارآمد ہیں۔ ضرورت محسوس کی گئی ہے کہ دیہی آبادی کو بھی ان فائدوں سے زیادہ سے زیادہ اور جلد سے جلد مالا مال کیا جا سکے۔ لہذا گیارہ بلاکوں میں دیہی بحالیاتی توسیعی مراکز قائم کئے گئے ہیں۔ یہ بلاک بمبئی، کلکتہ، کانپور، لدھیانہ اور مدراس میں واقع پیشہ ورانہ بحالیاتی مراکز سے ملحق کر دئے گئے ہیں۔

دفاتر روزگار مرکزی سرکار میں گروپ "سی" اور گروپ "ڈی" کی خالی آسامیوں پر جسمانی طور پر معذور افراد کو رکھنے میں ترجیح دیتے ہیں۔ ان زمروں کی ۳ فیصد آسامیاں اور پبلک سیکٹر کی ۳ فیصد آسامیاں جسمانی طور پر معذور افراد کے لیے ہیں۔ اگر ان آسامیوں پر جسمانی طور پر معذور افراد نہ مل سکیں تو بھرتی کے تین برسوں تک ان کو خالی رکھا جاتا ہے۔ جسمانی طور پر معذور افراد اندھے اور بہرے، گونگے لوگوں کو رہائشی مکانات کی الاٹ منٹ کی جاتی ہے اور انھیں "جنرل پول" نامی زمرے کے رہائشی کوارٹروں کی الاٹ منٹ کے لیے مستحق سمجھا جاتا ہے۔ دوکانوں، ریذیڈنشیل، پلاٹ اور فلیٹ وغیرہ کی الاٹ منٹ کے لیے بھی وہ زیر غور ہوتے ہیں۔

اس زمرے کے افراد کے لیے کچھ رعائتیں اور سہولتیں درج ذیل ہیں:۔

۱۔ پبلک سیکٹر آئل کمپنیوں کی ڈیلر شپ ایجنسیوں کا ۱۵ فیصد جسمانی طور پر معذور افراد کے لیے مخصوص۔ ان میں جنگ میں ہوئے معذور افراد بھی شامل ہیں۔

۲۔ میرٹ کی بنیاد پر سفری بھتہ یا بس کا مفت پاس دیا جاتا ہے۔

۳۔ روڈ ٹیکس کی ادائیگی سے مستثنیٰ۔ پیٹرول اور ڈیزل رعایتی نرخ پر دستیاب۔

۴۔ مرکزی سرکار کی گروپ "سی اور ڈی" کی آسامیوں پر تقرری کے لیے عمر کی بالائی حد میں دس سال کی رعایت۔ یہی رعایت قومی ملکیت کے بنکوں کی آسامیوں پر تقرریوں کے لیے بھی دی جاتی ہے۔ یہ وہ آسامیاں ہوتی ہیں جو دفاتر روزگار کی معرفت پُر کی جاتی ہیں۔

۵۔ کلرک کی جگہوں پر ٹائپ کے امتحان سے مستثنیٰ۔ بشرطیکہ دوسری شرائط پوری کرتے ہوں۔

۶۔ نان ٹیکنیکل امتحانات میں پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے شریک ہونے کی اجازت، جہاں کہ عملی تربیت کی ضرورت نہ ہو۔

۷۔ اندھے طلبا میٹرک میں ریاضی یا سائنس

(باقی صفحہ پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.

ایک روپیہ

کتابوں کے متعلق واضح پالیسی کی ضرورت

(داکرشن شرما)

گھریلو و دیہی صنعتوں میں تحقیق و ترقی

(اے۔ آتما راؤ)

کے۔ آر۔ نیر

بھارتی مواصلاتی نظام میں نئی سمتیں

بھارت میں ٹیلی کمیونیکیشن سروسوں کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔ اِن سروسوں یعنی ٹیل گراف، ٹیلی فون اور ریڈیو کا بھارت میں اجراء تقریباً اُسی وقت ہوگیا تھا جب ان کی ایجاد کی گئی تھی۔ بھارت کے محکمہ ڈاک و تار نے ٹیلی کمیونیکیشنز کے ابتدائی مرحلوں میں ہی ان کی جدید ٹیکنالوجی کو تیز رفتاری سے رائج کر دیا تھا۔ بھارت کے ٹیلی کمیونیکیشن نظام میں خودکار سوئچنگ سسٹم، لمبے فاصلے کی نشریات کے لیے کمپیوٹر کمیونیکیشن، ٹیلی پرنٹر کے ذریعے مشین ٹیل گرافی، ٹیلی فون سوئچنگ کے کامن کنٹرول سسٹم، الیکٹرانک سوئچنگ سسٹم سٹیلائٹ کمیونیکیشن سروسز، ڈیجیٹیل ٹرانسمیشن لنکس، آپٹیکل فائبر کمیونیکیشن جیسی ٹیکنالوجی کا اجراء اس امر کا ثبوت ہے کہ بھارت کے محکمہ ڈاک اور تار کے انجینئر، ٹیلی کمیونیکیشن کے شعبے کی ٹیکنالوجی سے ملک کو مستفید کرنے کی صد قدرانہ کوشش کر رہے ہیں۔

ہمیں یہاں جدید ٹیکنالوجی کو رائج کرنے اور بڑے پیمانے پر ٹیکنالوجی سے استفادہ کرنے کے درمیان امتیاز کرنا ہے۔ اول الذکر کا انحصار علم کی ترقی پر ہے جبکہ موخر الذکر ملک کے وسائل پر انحصار رکھتا ہے۔ ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ہی اُس کے اجراء کی اہلیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ محکمہ ڈاک و تار کے انجینئر نہایت ترقی یافتہ ملکوں کی مصنوعات کو بھارتی حالات کے مطابق رائج کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ ہمارے ٹیلی کمیونیکیشن سسٹموں کی کامیاب کارکردگی کی بنیاد پیغامات کی ترسیل اور سوئچنگ پر ہے۔ باہمی طور پر پیوستہ کنکشنوں کی بھاری تعداد پر غور کر کے اس نظام کی پیچیدگی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ٹیلی فون کے پُرانے نظام میں سوئچنگ برقی۔ میکانکی طور پر دو قسم کے سوئچوں سے کی گئی ہے یہ ہیں سٹروجر اور زیادہ جدید کراس بار۔ ڈیجیٹل لاجک سرکٹوں کی صلاحیتوں کے ساتھ ٹیلی فون سسٹم میں برقی۔ میکانکی سوئچوں کی جگہ برقیاتی سوئچ لگائے جا سکتے ہیں اور اس کے لیے آئی سی کا استعمال کرنا ہوتا ہے۔ یہ واقعی مشکل کام ہے اور اس کی وُسعت کا احساس اُس وقت کیا جا سکتا ہے جب ٹیلی فون ایکسچینجوں میں بھاری بھرکم سرکٹوں کو سالڈ اسٹیٹ سے بدلا جاتا ہے تاکہ اُن کی کارکردگی قابلِ اعتماد ہو جائے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بڑی بڑی ٹیلی فون سروسوں میں سالڈ اسٹیٹ سوئچنگ کا کام بڑی سُست رفتاری سے ہو رہا ہے۔

بڑے بڑے ٹیلی فون نظاموں کے لیے ضروری ہے کہ وہ مقامی ایکسچینجوں کے درمیان آسانی سے تیز رفتاری سے رابطہ قائم کر سکیں اور اس کے علاوہ انھیں دنیا کے کسی بھی ایکسچینج کے ساتھ طویل فاصلے کی رسائی حاصل ہو۔ اس سلسلے میں ہمیں ایکسچینجوں تک رسائی کے لیے معیار بندی کے عظیم مسئلہ کا خیال کرنا چاہیئے جہاں نہ تو دُور افتادہ ملکوں کی بولی جانے والی زبان اور نہ ہی اُن کی ٹیکنالوجی میں کوئی باہمی تعلق ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے بین الاقوامی معیار موجود ہیں جیسے کہ عالمگیر ٹیلی فونی پیغام رسانی کے لیے انٹرنیشنل ٹیلی کمیونیکیشن یونین (آئی۔ ٹی۔ او)۔ دراصل ان معیاروں سے نمبروں کے کوڈ کو ڈائل کرنا ممکن ہوگیا ہے جو تقریباً کسی بھی ملک کے ٹیلی فونی سسٹم تک پہونچ جاتے ہیں۔

چیف ایڈیٹر • آر. ٹھکرال
اسسٹنٹ ایڈیٹر • محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر • وسیم حیدر

جلد ۶ | ۱۶ تا ۳۱ مئی ۱۹۸۶ء | شمارہ ۴

۲۶ ویشاکھ تا ۱۰ جیسٹھ شک ۱۹۰۸ ٹیلیفون ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سالہ ۳۵ روپے، سہ سالہ ۵۰ روپے

فی کاپی :- ایک روپیہ

طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :-
ایڈیٹر یوجنا (اُردو)، پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴ لیول ۵ آر. کے. پورم (مین)
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر. ایس. منجال

ترسیلِ زر کا پتہ :- بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

زرعی اور اقتصادی ترقی ایک چیلنج

ہندوستان کی اقتصادی ترقی کا دارومدار زراعت پر ہے۔ ہمارے ملک کی لگ بھگ ۷۰ فیصد آبادی زراعت سے ہی اپنا گزارا کرتی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ ہماری صنعتیں بھی زراعت سے ہی جڑی ہوئی ہیں۔ ہمارے ملک میں زراعت میں تیزی سے ترقی دیکھنے کو ملی ہے، لیکن فصلوں کو قدرتی آفات سے بچانے اور ان کی پیداوار بڑھانے کے سلسلے میں ابھی اور بہت کچھ کیا جانا ہے۔ زرعی ترقی اور صنعتی ترقی کے درمیان توازن قائم کرنا بھی ضروری ہے تاکہ دونوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جاسکے۔ زراعت کی ترقی کے لیے سینچائی پر زور دینا ہے اور اس کے ساتھ ہی کیمیاوی کھادوں کا استعمال بڑھانا ہے زرعی فصلوں کے اگانے والوں کے لیے نفع بخش قیمتوں کو یقینی بنانا بھی ضروری ہے۔ یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ ہمارا ملک ان تینوں شعبوں میں اچھی کارگزاری دکھا رہا ہے۔ حالانکہ دوسرے ممالک قحط اور سوکھے کی لپیٹ میں آئے ہیں مگر ہمارے یہاں ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں زرعی مزدوروں اور چھوٹے کسانوں کی بہبود پر برابر زور دیا جا رہا ہے۔ گاؤں کی ترقی کے لیے بہت سے پروگرام تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ غریبی سے نپٹنے کے لیے شروع کیے گئے مختلف پروگرام اچھا اثر دکھا رہے ہیں۔ لیکن ابھی دیکھنا باقی ہے کہ غریبی دور کرنے کے پروگراموں [illegible] سے اور زیادہ موثر ڈھنگ سے کام لیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ملک [illegible] سیکٹر کو تشکیل بنانے پر زور دیا جا رہا ہے۔ ملک کی [illegible] کے لیے اس کی عمل کی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سیکٹر [illegible] استعمال کی اشیاء کی تیاری سے لے کر اونچی ٹیکنالوجی کے [illegible] کی حکمت عملی، انجینئری، خلائی [illegible] ٹیکنالوجی جیسی میں قابل ذکر کام ہو رہا ہے۔

ہمارے ملک میں اقتصادی ترقی کے لیے جو حکمتِ عملی اپنائی گئی ہے، وہ پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر گویا کہ دونوں کا امتزاج پیش کرتی ہے۔ ملک کے وسیع تر مفاد میں دونوں کے فروغ کے لیے کوششیں جاری ہیں۔ پبلک سیکٹر کی صنعتوں کی خرابی اور ان کی خامیوں کی اکثر نشاندہی کی جاتی ہے اور ان پر عدم اہلیت کا الزام لگایا جاتا ہے۔ لیکن ایسا کرتے وقت یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ وہ ایسے گوشوں میں کام کر رہے ہیں جہاں پر اب تک پرائیویٹ سیکٹر نہیں پہنچ سکا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ جہاں کہیں خامیاں اور کمزوریاں ہیں، ان کو دور کرنا ضروری ہے۔ ہمیں اپنی اشیاء کا معیار، کام کرنے کی صلاحیت اور پیداوار دیگر ترقی یافتہ ملکوں کی طرح سے ہی آگے بڑھانی ہے۔ جدید ترین ٹکنالوجی کو اپنا کر صلاحیت کار بڑھانا ضروری ہوتا جا رہا ہے۔ یہ وہ چیلنج ہیں جہاں ہمیں دورِ حاضر میں مقابلہ کرنا ہے۔

فولاد کی پیداوار میں اضافہ

فولاد ہماری معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی تیاری پر برابر زور دیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ ملک کے بڑے اور چھوٹے فولاد ساز کارخانوں کی قابلِ فروخت فولاد کی پیداوار ۸۶-۱۹۸۵ء کی مدت کے لیے ایک کروڑ ٹن کی بے مثال سطح تک پہونچ جانے کا امکان ہے۔ یہ پیداوار ۸۵-۱۹۸۴ء کی ۸۸ لاکھ ٹن پیداوار سے ۱۲ لاکھ ٹن زیادہ ہے۔

محکمہ فولاد کی ۸۶-۱۹۸۵ء کی رپورٹ میں مذکور ہے کہ اس سال اس قدر اضافہ کئی برس کے بعد دیکھنے کو ملا ہے۔ اس سال سرکاری دائرہ کار کے کارخانوں کی پیداوار گذشتہ سال کے مقابلے میں ساٹھ سات لاکھ ٹن بڑھ کر پہلی بار ۸۰ لاکھ ٹن سے بڑھ جانے کا امکان ہے۔ پیداوار میں اضافہ کی یہ شرح تقریباً ۱۴ فیصد ہوگی۔ ۸۷-۱۹۸۶ء میں اضافے کا تناسب زائد از ۲۰ فیصد ہو جائے گا۔

۱۵۰ چھوٹے فولاد ساز کارخانوں کی پیداوار میں بجلی اور سکریپ کی دستیابی میں اصلاح کی بدولت نمایاں اضافہ ہوا ہے ان کارخانوں سے نرم فولاد کی پیداوار ۲۳ لاکھ ٹن ہو جانے کی توقع ہے۔ ان کارخانوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے سکریپ اور اسفنج کی درآمد [illegible] سے بڑھا کر اس سال ۱۳ لاکھ ٹن کر دیے جانے کا امکان ہے۔ اس درآمد کو کم کرنے کے لیے ملک میں اسفنج لوہے کے پلانٹ لگانے پر زور دیا جا رہا ہے۔

۱۲۰ چھوٹے فولاد ساز کارخانے لگانے کے لائسنس جاری [illegible] ہیں جن میں سے ۴۷ لاکھ ٹن کی صلاحیت کے ۱۵۹ [illegible]

اسسٹنٹ ایڈیٹر

محمد یونس صدیقی

ہندوستان کی دیہی ترقی

ایک غیر ملکی ماہرِ اقتصادیات کی نظر میں

"آج ہندوستان میں غریبی دور کرنے کے پروگراموں پر سب سے زیادہ زور ہے۔ اس مقصد کے تحت عوام دیہات کی مربوط ترقی اور روزگار کے دیگر پروگراموں سے برابر استفادہ کر رہے ہیں۔ دس سال قبل کے مقابلے آج کی صورتِ حال کہیں زیادہ بہتر ہے۔ آج دیہات کے اکثر لوگ جس طرح ان پروگراموں کی بدولت اپنی کایا پلٹ کی کوششوں میں کامیاب ہوتے ہیں، ان کے قصے کافی مشہور ہو گئے ہیں اور ان کی اطلاعات برابر پڑھنے کو ملتی ہیں۔ لیکن ان پروگراموں پر عمل درآمد کے دوران اکثر نقصانات اور خامیوں سے بھی سابقہ پڑا ہے، اس کا پتہ متعدد سرکاری رپورٹوں کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ بہت سے دیہات والے بھی اس طرح کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔"

مذکورہ بالا خیالات کا اظہار ترقیاتی معاشیات کے پروفیسر گلبرٹ ایٹنے نے جنیوا میں کیا جہاں وہ ترقیاتی مطالعوں کے ادارے (Institute of Developmental Studies) اور گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل اسٹڈیز میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں، اضلاع اور دیہات کا سروے کرنے کے بعد تقریر کر رہے تھے۔ موصوف نے اکتوبر ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۲ء کے درمیان عرصے میں دیہات کی دیہی زندگی کا بطور خاص مطالعہ کیا ہے۔ موصوف نے ترقیاتی عوامل اور دیہی ترقی کے چند گوشوں پر اس کے اثرات اور اس کے نتیجے میں عوام کے معیارِ زندگی پر اثرات کا جائزہ لیا۔

پروفیسر گلبرٹ نے اس سے قبل ۱۹۶۳ء اس کے بعد ۱۹۶۷ء اور پھر ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۸ء سے ۱۹۷۹ء تک ہندوستان کا دورہ کیا اور ہندوستان کے دیہی عوام کی بہبود کے لیے کیے گئے مختلف اقدامات کا جائزہ لیا۔ انھوں نے اس بات کا پتہ لگانا چاہا کہ ان مختلف بہبودی پروگراموں سے ملک کی غریبی دور کرنے میں کیا مدد ملی۔ اس مطالعے کی بنیاد پر انھوں نے ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا "ترقیاتی عمل اور دیہی ترقی کے چند گوشوں میں معیارِ زندگی پر اس کے اثرات" اس میں انھوں نے مختلف طرح کے عوامل کا تجزیہ کیا اور ان کی بنیاد پر چند نتائج اخذ کیے۔

پروفیسر گلبرٹ نے ایک گاؤں میں کسانوں سے انٹرویو لیا۔ اس میں ہر زمرے کے کسان شامل تھے انھوں نے مختلف زمروں کے کسانوں کے مسائل کو سمجھنا چاہا اور یہ بھی جاننا چاہا کہ وہ اپنے مسائل کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے مختلف سرکاری اداروں اور ایجنسیوں کے ذمہ داروں سے بات چیت کی۔ وہ ایڈمنسٹریشن کے خیالات بھی جاننا چاہتے تھے اور اس میدان میں کام کرنے والے مختلف اداروں کے ذمہ داروں سے بھی بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کچھ دن تبادلۂ خیال کیا اور انھیں گذشتہ مختلف حلقوں کے خیالات

گئیں۔ انھوں نے بلند شہر، وارانسی، مظفر پور، گنتور، تھنجور اور ستارہ وغیرہ کا دورہ کیا — ۷۹ - ۱۹۷۸ء کے سروے میں آسام میں نوگانگ، اڑیسہ میں پوری اور راجستھان میں جودھ پور شامل تھے۔

دیہات میں بیداری :-

۷۹ - ۱۹۷۸ء کی سروے رپورٹ میں پروفیسر گلبرٹ نے کہا کہ "اب ہندوستان سے وہ قدیم تصور جاتا رہا کہ یہاں کے دیہات ایک جامد اور ساکت زندگی گزاریں گے۔ حتیٰ کہ دور دراز اور پسماندہ علاقوں میں جن میں ضلع گیا کے جنوبی حصے اور اڑیسہ کے قبائلی آبادی والے علاقے وغیرہ شامل ہیں، اقتصادی اور سماجی زندگی میں تبدیلی آئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ تکنیک کے استعمال کے ضمن میں" بھی نمایاں تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ البتہ ملک میں ترقی کی رفتار یکساں دیکھنے کو نہیں ملتی اور اس محاذ پر مختلف علاقوں میں رفتار ترقی کی شرح مختلف ہے۔

انکشافات

۸۶ - ۱۹۸۵ء میں بھی کچھ دیہات کا سروے کیا گیا۔ ان مطالعوں کا تعلق ایسے دیہات سے تھا جو پمپ استعمال کر رہے ہیں "بہتر قسم کے بیجوں کی مدد سے کھیتی کر رہے ہیں، کیمیاوی کھادوں کا استعمال کرتے ہیں۔ جراثیم کش دوائیں استعمال کرتے ہیں، یہ سب کام جہاں تقریباً بیس برسوں سے جاری ہے" ان گاؤں کا سروے کیا گیا۔ ان دیہات کی مستقبل کی ترقی کے امکانات کا جائزہ لیا گیا اور یہ اندازہ کرنے کی کوشش کی گئی کہ اب تک ان گاؤں نے جو ترقی کی ہے، اس کے مقابلے آئندہ کی ترقی کے کیا امکانات ہیں۔ آئندہ وہاں کے بسنے والوں کے معیار زندگی میں کیا کیا تبدیلی آنے کے امکانات ہیں۔ پروفیسر گلبرٹ نے ہندوستان کو تین گروپوں میں بانٹا ہے۔

۱۔ ترقی یافتہ علاقے جو زیادہ تر شمال مغربی اور جنوب مشرقی حصے میں ہیں۔

۲۔ غریب علاقے لیکن جہاں وسائل کی کمی نہیں، البتہ وہاں پانی کے نظم و نسق وغیرہ کے مسائل ہیں، جو زیادہ تر مشرقی خطے میں ہیں۔

۳۔ ایسے خطے جہاں پانی کی قلت ہے، مٹی وغیرہ کے نقصانات کا سامنا ہے جو زیادہ تر جزیرہ نما بھارت کے حصے ہیں۔

شمال مغربی بھارت کے ترقی یافتہ اضلاع میں خوراکی اجناس کی پیداوار میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ گندم کی پیداوار بحساب فی ہیکٹر ۱۵۰۰ — ۱۲۰۰ کلوگرام سے بڑھ کر ۳۵۰۰ - ۲۵۰۰ کلوگرام تک پہونچ گئی۔ دھان کی پیداوار بحساب فی ہیکٹر ۲۰۰۰ کلوگرام سے بڑھ کر ۴۵۰۰ - ۳۵۰۰ کلوگرام تک پہونچ گئی۔ سبز انقلاب نے ملک کو قومی سطح پر خود کفیل بنا دیا ہے۔ اس سے ترقی یافتہ اضلاع کے غریب عوام کو فائدہ ہوا ہے۔ یہاں سبھی کسان حتیٰ کہ چھوٹے کسان بھی نئے قسم کے بیج، کیمیاوی کھاد اور جراثیم کش دواؤں کا استعمال کرتے ہیں اگر وہ خود ٹیوب ویل نہیں لگا سکتے تو برابر کے کسان سے پانی مول لیتے ہیں۔ سبز انقلاب کی پٹی میں آبادی کا دباؤ ۵۰۰ تا ۷۰۰ فی مربع کلومیٹر ہے قطعات اراضی چھوٹے ہوتے جا رہے ہیں اور بے زمین مزدوروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔

آج ملک میں جگہ جگہ نل کنوؤں کا جال پھیلا ہے۔ اس سے نہ صرف آبرسانی کی سہولتوں میں اضافہ ہوا ہے بلکہ بہ یک وقت دو دو فصلوں کو اگانے میں مدد ملی ہے — ۱۹۶۵ء میں چک بندی کے پروگرام کے آغاز کے بعد مغربی اتر پردیش میں پرائیویٹ نل کنوؤں کی تعداد بڑھی ہے۔ مثال کے طور پر بلند شہر کے کھنڈولی گاؤں میں ایک کنبہ ایک یا سوا ہیکٹر اراضی پر گندم، گنا، مکئی، باجرہ وغیرہ اگا کر اپنا گزارہ بخوبی کر لیتا ہے جبکہ ۱۹۶۴ء میں پونے دو تا دو ہیکٹر اراضی پر کاشت سے بھی مشکل سے ہی گزارہ ہوتا تھا۔

پروفیسر گلبرٹ کی دیگر تحقیقی کوششوں سے یہ بات سامنے آسکی کہ شمال مغرب اور جنوب مشرق کے ترقی یافتہ اضلاع میں چھوٹے کسان اپنے کھیتوں سے پہلے سے کہیں زیادہ پیداوار لیتے ہیں۔ بے زمین مزدوروں کو آجکل دس روپے یومیہ ملتے ہیں جبکہ ۷۹ - ۱۹۷۸ء میں صرف ۵ روپے ملتے تھے۔ فصل کے ایام میں انھیں روزانہ دس کلو گندم ملتا ہے جبکہ بیس برس پہلے صرف ۵ کلوگرام گندم ملتا تھا۔ ۱۸۰۰ کی آبادی میں سے ۱۶۰ افراد کو باہر روزگار ملا ہوا ہے۔

آندھرا پردیش میں گنتور اور تمل ناڈو میں تھنجور کے اضلاع میں دھان کی کاشت کے ذریعے پیداوار میں اضافہ ہوا ہے، اجرتیں بڑھی ہیں اور روزگار کے مواقع پہلے کے مقابلے زیادہ ہیں۔

ملک میں بجلی کی فراہمی میں اضافے کے سبب بہت سے حصوں میں نمایاں ترقی ہوئی ہے البتہ بجلی کی فراہمی کے نظام میں بہت سی خامیاں بھی ہیں۔

بہار میں ترقی کی رفتار سست ہے۔ وہاں غریبوں کی حالت میں بہتری لانے کے معاملے میں حقیقی مثبت نتائج بہت سست رہے ہیں۔ مثال کے طور پر مظفر پور میں اجرتیں حقیقی طور پر کم و بیش پہلے جیسی ہی ہیں۔ یعنی ۵ تا ۶ روپے یومیہ یا دو تا تین کلوگرام غلہ یومیہ۔

پروفیسر گلبرٹ نے مشرقی اتر پردیش

میں بہت سی تبدیلیاں دیکھیں۔ ضلع وارانسی میں ناہیان گاؤں میں بہت سے کھیتوں پر نل کنوئیں نجی کوششوں سے لگائے گئے ہیں۔ گندم کی فی ہیکٹیر پیداوار ۱۹۶۴ء کی ۹۰۰ کلوگرام سے بڑھ کر ۲ ہزار کلوگرام فی ہیکٹیر ہوگئی۔ دھان کی فی ہیکٹیر پیداوار ایک، ڈیڑھ ہزار کلوگرام سے بڑھ کر ڈھائی ہزار تا ۳۲۰۰ کلوگرام ہوگئی۔ ۱۹۴۸ء میں ۳ روپے یومیہ اُجرت ملتی تھی جبکہ ۱۹۸۵ء میں یہ دس روپے یومیہ ہوگئی۔ غریبوں کی حالت میں سدھار دیکھنے کو ملا ہے۔

ضلع پوری میں بھی صورت حال اچھی ہے دھان کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے پانی کی البتہ کمی ہے۔ یہاں کی اجرتیں سات روپے تا آٹھ روپے یومیہ ہیں۔

مشورے

پروفیسر گلبرٹ نے مشورہ دیا کہ اگلا مرحلہ ہے اعلیٰ پیداواری صلاحیت کو برقرار رکھنا۔ یعنی گندم کی پیداواری صلاحیت ۴ تا ۵ ہزار کلوگرام فی ہیکٹیر برقرار رکھنا۔ اور دھان کی ۶ ہزار کلوگرام فی ہیکٹیر صلاحیت برقرار رکھنا۔ ان کے خیال میں یہ ایک مشکل کام ہوگا۔ اس کے لیے آبرسانی اور پانی کے نظام کو بہتر بنانا ہوگا، کیمیاوی کھادوں کے استعمال کو بہتر بنانا ہوگا، جراثیم کش دواؤں کا بہتر استعمال کرنا ہوگا۔ بارانی کھیتی کو بہتر بنانا ہوگا۔ ان تمام امور پر توجہ دئیے بغیر پیداوار کے اضافے کو برقرار رکھنا دشوار ہو جائے گا۔

• انھوں نے روزگار کے نئے مواقع کھولنے کا مشورہ دیا اور اقتصادی سرگرمیوں کو نئے نئے رُخ دینے کی ضرورت بتائی۔ ان کے خیال میں زراعت کا مستقبل مشرقی ہندوستان کے بڑے بڑے میدانوں سے وابستہ ہے۔ ان علاقوں میں پیداوار میں اضافہ اور بہ یک وقت کئی کئی فصلوں کے اُگانے کے امکانات روشن ہیں۔ اس سے غریبی کافی حد تک کم ہو سکے گی۔ پانی کے نکاس کا بندوبست کر کے سیلابوں کی روک تھام پر توجہ دینی ہوگی۔

پروفیسر گلبرٹ نے ایسے پراجیکٹوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کو اہم بتایا جن پر پہلے سے کام ہو رہا ہے بھلے ہی اس کام کے لیے نئے پراجیکٹ سردست ترک کرنے پڑیں۔ انھوں نے بارانی کھیتی پر توجہ کی ضرورت بتائی۔ دکن کے علاقے میں اس کی ضرورت و اہمیت کو واضح کیا۔ کیوں کہ دکن میں زیادہ تر علاقہ آبرسانی کی سہولتوں سے محروم ہے۔ وہاں سطح زمین اور سطح زمین کے نیچے پانی کی فراہمی کی کمی ہے۔

پروفیسر گلبرٹ نے محسوس کیا کہ خوراک کی محاذ پر قومی سطح پر استحکام حاصل کیا جا چکا ہے۔ اب بارانی کھیتی کی تکنیک پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ آبرسانی اور زراعت کے محاذ پر مکمل سہولتوں کی فراہمی کے لیے ابھی کئی سال درکار ہوں گے۔ البتہ مشرقی اتر پردیش میں زیادہ متحرک اقدامات کی فوری ضرورت ہے۔ مختلف طرح کی دشواریوں کی موجودگی میں اس علاقے کی ترقی ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔

ترقی کے بظاہر آثار

ترقی کے عمل میں جو کچھ بھی پیش رفت دیکھنے میں آسکی ہے، اس سے سبھی غریب عوام کو یکساں طور پر فائدہ نہیں ملا ہے۔ ان تبدیلیوں سے محض یہ تو مراد نہیں کہ عوام کے معیارِ زندگی میں بے ترتیب تبدیلی دیکھنے کو ملے۔ یہ ضرور ہے کہ چھوٹے کسان کی حالت پہلے کے مقابلے اچھی ہے، وہ پہلے کے مقابلے کم غریب ہیں۔ ان کے پیمانے میں بہتری آسکی ہے اور ان میں پہلے کے مقابلے زیادہ خود اعتمادی آئی ہے۔ ان آثار کا احساس ۱۹۷۰ء کے بعد سے ہونے لگا تھا۔

پروفیسر گلبرٹ نے مختلف اضلاع، ریاستوں اور نئی دلی کا دورہ کرنے کے بعد اور مختلف ریاستوں اور اضلاع کے حکام سے بات چیت کرنے کے بعد، اس بات پر زور دیا کہ زراعت اور دیہی ترقی کے سلسلے میں آئندہ اقدامات زیادہ دشوار ہیں اور اب تک کی کامیابیوں میں جس قدر مشکلات سے گزرنا پڑا ہے، آئندہ کی مشکلات اُن سے کسی طرح کم نہیں۔ ●

بقیہ: گھریلو دیہی صنعتوں میں تحقیق و ترقی

روپے کا اہتمام کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ نیشنل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کو تقویت دینے کے لیے ۳۵ لاکھ روپے رکھے گئے ہیں۔ الیپی میں "نیشنل کوئر ٹریننگ اینڈ ڈیزائن سینٹر" کوئر کی مصنوعات سے متعلق تربیت دینے کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ کوئر کی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی سے متعلق طویل مدتی تربیتی نصابوں کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

گھریلو اور دیہی صنعتوں میں کیے جانے والے تحقیق و ترقیاتی کام کی بدولت دیہی کاریگروں کو جدید تکنیکی جانکاری دی جا رہی ہے توقع ہے کہ آنے والے برسوں میں اس سے بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔ اس کے علاوہ دستیاب دیہی ٹیکنالوجی کی نشاندہی کی جا سکتی ہے اور مختلف پروگراموں کے تحت اس سے دیہی علاقوں کے لوگوں کو مستفید کیا جا سکتا ہے جس سے گھریلو اور دیہی صنعتوں کی پیداوار بڑھ سکتی ہے۔ ●

راجیو کمار

قومی ترقی کے سنگ میل

ساتویں پنجسالہ منصوبے میں اُن جگہوں پر جہاں تیل کی کھوج کا زیادہ کام نہیں ہوا ہے، زیادہ سرگرم کوششیں کی جائیں گی۔ منصوبے کے اختتام تک ہر سال ۴۰ ملین ٹن خام تیل اندرون ملک پیدا کرنے کی غرض سے تیل کی تلاش کی کوششوں میں تین گنا اضافہ کیا جائے گا۔

چھٹے پنجسالہ منصوبے میں ۹۳٫۴ ملین ٹن تیل کی پیداوار کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا، لیکن یہ نشانہ نہ صرف پورا کر لیا گیا بلکہ اس سے زیادہ پیداوار حاصل کی گئی۔ ۱۹۸۰ تا ۱۹۸۵ء کی مدت میں ملک کے ساحلی اور ساحل سے کچھ دُور واقع کنوؤں سے کُل ۱۰۲٫۰۰ ملین ٹن خام تیل حاصل کیا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ چھٹے منصوبے کی مدت میں خام تیل کی سالانہ شرح پیداوار قریب قریب تین گنا ہو گئی اور وہ اس طرح کہ ۱۹۸۴-۸۵ء میں ۲۹٫۹۹ ملین ٹن تیل نکالا گیا جب کہ ۱۹۸۰-۸۱ء میں صرف ۱۰٫۵ ملین ٹن تیل نکالا گیا تھا۔

اندازہ ہے کہ ساتویں منصوبے کے اختتام پر ملک میں پٹرولیم مصنوعات کی مانگ بڑھ کر ۴۵ ملین ٹن ہو جائے گی جسے پورا کرنے کے لیے ۱۴ ملین ٹن خام تیل غیر ممالک سے درآمد کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ لہٰذا درآمدات پر انحصار کو کم کرنے کے لیے توانائی کی کفایت شعارانہ استعمال کرنے اور اسے مستقبل کے لیے بچا کر رکھنے کی ضرورت ہے۔

تیل کی دریافت اور پیداوار کے لیے درکار ساز و سامان جہاں تک ہو سکے ملک کے اندر ہی تیار کرنے کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے اور کچھ بڑا ساز و سامان مثلاً تیل کنوؤں کے پلیٹ فارم، پروسیس پلیٹ فارم، جیک اَپ رِگس، برمائی کا سامان اور سپلائی کے برتن وغیرہ ملک کے اندر ہی بنائے جا رہے ہیں۔ جن علاقوں میں اعلیٰ ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے وہاں بھی ہندوستانی کمپنیوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے تاکہ وہ نامور غیر ملکی کمپنیوں کے تعاون سے اپنی خدمات پیش کریں۔

آجکل ملک میں ۱۶۹۵ ملین مکعب میٹر ایسوسی ایٹڈ گیس پیدا کی جا رہی ہے۔ گجرات کے الگ تھلگ واقع علاقوں میں جو گیس ضائع ہو رہی ہے اسے جمع کرنے کی تجویز ہے۔ مشرقی خطے میں گیس صرف اس لیے ضائع کی جا رہی ہے کہ وہاں اس کی مانگ اور اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے کے لیے پائپ لائنیں نہیں ہیں البتہ آسام میں ایک گیس گرڈ بنانے کے لیے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔

قدرتی گیس کی پروسیسنگ، نقل و حمل اور فروخت کے لیے گیس اتھارٹی آف انڈیا لمیٹڈ کے نام سے ایک علیحدہ کارپوریشن قائم کی گئی ہے۔ اسے ۱۰۰٫۷۱ کروڑ روپے کی مالیت کا ایچ۔ بی۔ جے گیس پائپ لائن پروجیکٹ زیر عمل

نے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

چھٹے منصوبے میں متھرا ریفائنری کے
ٗو ہو جانے اور وشاکھاپٹنم، مدراس اور بمبئی
تیل صاف کرنے کے کارخانوں کی توسیع
مل ہونے کے بعد اب ملک میں بارہ ریفائنریاں
ئی ہیں۔ ان کی نصب شدہ صلاحیت ۴۵ء۵۵
یُن ٹن ہے۔ اس کے برعکس چھٹے منصوبے
ے شروع میں ملک میں گیارہ ریفائنریاں تھیں
ران کی نصب شدہ صلاحیت ۳۱٫۸۰ ملین
ن تھی۔

حکومت نے ہریانہ میں کرنال کے مقام پر
۶ ملین ٹن کی صلاحیت والی ایک نئی ریفائنری
م کرنے کی تجویز کو بھی منظوری دے دی
ہے۔ اس کے علاوہ کرناٹک میں منگلور میں بھی
۶ ملین ٹن کی صلاحیت والی ایک ریفائنری
ائم کرنے کی تجویز اصولی طور پر منظور کرلی گئی
ہے۔ علاوہ ازیں موجودہ ریفائنری کی اصلاح و
سیع کی کئی تجاویز زیر غور ہیں۔ ان تجاویز
ے زیر عمل لائے جانے پر ساتویں منصوبے
ے اختتام تک ملک میں تیل صاف کرنے
ا کل صلاحیت ۵۸ ملین ٹن ہو جائے گی۔

۸۵-۱۹۸۴ء میں ملک میں کھانا پکانے
ا گیس کی پیداوار ...۸۶۳ ٹن تک پہونچ
انے سے گذشتہ پانچ برسوں میں کھانا
پکانے کی گیس کی دستیابی دوگنی سے زیادہ ہوچکی
ہے۔ امید ہے کہ ساتویں منصوبے میں مزید
۱۶٫۰۰۰ ٹن کھانا پکانے کی گیس دستیاب
گی جسے زیادہ تر گھریلو سیکٹر کے استعمال میں
یا جائے گا۔

سال ۸۱-۱۹۸۰ء اور ۸۵-۱۹۸۴ء
کے درمیان تیل کمپنیوں نے کھانا پکانے کی
گیس کے ۲٫۶ لاکھ سے زائد نئے کنکشن جاری

کئے۔ آئندہ پانچ برسوں میں ملک بھر میں تقریباً
۹۶ لاکھ نئے کنکشن جاری کرنے کی تجویز ہے۔

پیٹرولیم کی صنعت

ہندوستان میں پیٹرولیم کی صنعت نے
چھٹے پنجسالہ منصوبے کی مدت میں نمایاں ترقی
کی۔ بالخصوص ۱۹۸۵ء میں اس نے نہایت عمدہ
کارگذاری کا مظاہرہ کیا۔

۱۹۸۵ء کے آخر تک خام تیل کی پیداوار
۲۹٫۷ ملین ٹن ہونے کی توقع تھی جبکہ اس
سے پچھلے سال یہ ۲۷٫۹۳ ملین ٹن تھی۔ ۱۹۸۵ء
میں قدرتی گیس کی پیداوار کا تخمینہ ۱۹۸۴ء کی
۶۸۲۰ ملین مکعب میٹر پیداوار کے مقابلے
میں ۷۷۹۰ ملین مکعب میٹر تھا۔

چھٹے منصوبے میں تیل کی دریافت کے
کام کو نہایت اعلیٰ ترجیح دی گئی تھی۔ ۱۹۸۰ء
سے ۱۹۸۵ء تک کی مدت میں تیل اور قدرتی
گیس کمیشن نے گجرات، راجستھان، آسام،
آندھرا پردیش، ناگالینڈ، تری پورہ، بمبئی کے
مغربی ساحل کے قریبی علاقوں، گوداوری کے
ساحل کے قریبی علاقوں، کاویری اور آبنائے
پاک میں ہائیڈرو کاربن والے علاقوں کا پتہ
لگایا۔ آئل انڈیا لمیٹڈ نے بھی، جو اکتوبر
۱۹۸۱ء میں مکمل طور پر پبلک سیکٹر کا ایک ادارہ
بن گئی تھی، اروناچل میں تیل کے ذخائر کا پتہ
لگایا اور راجستھان، تری پورہ نیز مہاندی
کے ساحل کے قریب تیل کی کھوج کا کام لیا۔
اب یہ ادارہ جزائر انڈمان اور نکوبار میں تیل
کی دریافت کا کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

سال کے شروع میں ہندوستان
میں ۴۷۹ ملین مکعب میٹر گیس کے ذخائر موجود
تھے جن سے گیس حاصل کی جا سکتی تھی ساتھ

آٹھ بلین مکعب میٹر سالانہ کی موجودہ پیداوار
کے ساتھ ملک میں ذخائر اور پیداوار کے درمیان
موافق تناسب قائم ہوگیا ہے۔ آئندہ پانچ
سے دس برسوں میں گیس کا استعمال اتنا بڑھ
جائے گا کہ پیداوار ۱۵ بلین مکعب میٹر فی سال
تک بڑھ سکتی ہے۔

سال زیر تبصرہ میں تیل صاف کرنے
کے کام کے لیے بھی کچھ اہم اقدامات کئے
گئے۔ چار نئے یونٹوں میں کام شروع ہوگیا
ہے جن کی مجموعی صلاحیت ۲۸ لاکھ ٹن سالانہ
ہے۔ مدراس ریفائنریوں، کوچین ریفائنریوں،
وشاکھاپٹنم کی ہندوستان پیٹرولیم ریفائنری اور
بمبئی کی بھارت پیٹرولیم ریفائنری کے توسیعی
پروجیکٹوں کے چالو ہو جانے سے تیل صاف
کرنے کی صلاحیت میں ۷٫۷۵ ملین ٹن کا اضافہ
ہوا ہے اور یہ ۳۷٫۸ ملین ٹن سے بڑھ کر
۴۵٫۵۵ ملین ٹن ہوگئی ہے۔ اب پہلی بار
بمبئی ہائی کے ساحلی علاقوں سے حاصل
ہونے والا تمام کا تمام خام تیل ملک کے تیل
صاف کرنے کے کارخانوں میں ہی صاف کیا جا
رہا ہے۔

ملک میں پیٹرولیم کی مصنوعات کی کھپت
پیداوار سے ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ چھٹے
منصوبے کے دوران درآمدات کو کم کرنے
کی غرض سے قیمتوں کے تعین اور مالی اقدامات
کے علاوہ پیٹرولیم کی مصنوعات کو بچانے اور
ان کے متبادل استعمال کرنے کے لیے کئی قدم
اٹھائے گئے۔ ان کی بدولت ۱۹۸۵ء میں
۱۲٫۹۴ ملین ٹن کی مجموعی درآمدات ہونے کی
توقع تھی جبکہ گذشتہ برس ۲۰٫۴۴ ملین ٹن کی
درآمدات ہوئی تھیں۔

ملک میں کھانے پکانے کی گیس کے

استعمال میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اندازہ ہے کہ ۸۲-۱۹۸۱ء کے آخر تک ۱۲٫۵ لاکھ ٹن کھانا پکانے کی گیس استعمال ہوئی جبکہ گذشتہ مالی سال کے دوران ۹٫۴۵ ٹن گیس استعمال ہوئی تھی۔

پٹرولیم کنزرویشن ریسرچ ایسوسی ایشن صنعت، زراعت، نقل و حمل اور خانگی شعبے میں پٹرولیم کے استعمال میں کفایت کی ضرورت کی مسلسل پبلسٹی کرتی رہی تھی تاکہ مستقبل کے لیے پٹرولیم بچائی جا سکے۔ اس کے نتیجے میں تقریباً ایک کروڑ روپے سالانہ کی مالیت کی پٹرولیم کی مصنوعات کو مکرر الوقوع بنیاد پر بچا رکھنا ممکن ہو گیا۔ امید ہے کہ پٹرولیم کی مصنوعات کی بچت رواں مالی سال میں تقریباً ۸۰ کروڑ روپے کے بقدر ہو گئی اور ساتویں منصوبے کے دوران کل ۶۵۰ کروڑ روپے کی مالیت کی پٹرولیم مصنوعات بچائی جا سکیں گی۔

الیکٹرانکس

حکومت نے ملک میں الیکٹرانکس کی ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لیے متعدد اقدامات کئے ہیں۔ نئی پالیسی کی بنیادی باتیں درج ذیل ہیں:

اجرائے لائسنس کی پالیسی کو نرم بنایا جائے اور پیداوار بڑھانے پر زور دیا جائے۔ جہاں کہیں کنٹرول نافذ کرنا ضروری ہو وہاں مادی کنٹرول کے بجائے مالی کنٹرول نافذ کرنے کو ترجیح دی جائے۔

بالعموم پیداواری صلاحیت کے لیے کوئی بالائی حد نہ ہوگی۔ شعبہ جاتی نوعیت مثلاً بڑے پیمانے کے سیکٹر، چھوٹے پیمانے کے سیکٹر، پرائیویٹ سیکٹر، پبلک سیکٹر وغیرہ کی طرز کی کوئی پابندی نہ ہوگی، سوائے نہایت خصوصی بنیادوں پر کچھ خاص تحفظات کے۔

بنیادی طور پر اس اصول کو مدنظر رکھا جائے گا کہ جدید ٹیکنالوجی سے استفادہ کرتے ہوئے کفایتی طریقوں سے زیادہ پیداوار حاصل کی جائے۔

کچھ خصوصی اقدامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض زمروں کی اشیا کے لیے وسیع البنیاد لائسنس جاری کئے جائیں گے۔ الیکٹرانک اجزا تیار کرنے کی صنعت پر سے لائسنس ختم کر دیا گیا ہے۔ الیکٹرانکس کے تمام شعبوں میں ٹیکنالوجی کی درآمد اور غیر ملکی اشتراک عمل کی اجازت دی جائے گی۔ ایسی اکائیاں قائم کرنے کی اجازت دی جائے گی جن میں غیر ملکی سرمایہ حصص ۴۰ فیصد سے کم ہو۔

ٹیلی فون کے آلات، الیکٹرانک پی اے بی ایکس سسٹموں اور دیہی آٹومیٹک ایکسچنجوں کے لیے ٹیکنالوجی مرکزی بنیاد پر حاصل کی جائیگی۔ چھوٹے پیمانے کی صنعت کو بڑھاوا دیا جائیگا۔

لاگت پیداوار میں بڑے پیمانے سے حاصل ہونے والی کفایت حاصل کرنے کے لیے کچھ اجزاء کی تیاری کو جو چھوٹے پیمانے کے سیکٹر کے لیے مخصوص ہے غیر مخصوص کرنے کی تجویز ہے۔ الیکٹرانکس کے کارخانے کسی بھی قابل اجازت مقام پر قائم کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ ٹیلی کمیونیکیشنز کے میدان میں ٹیلی فون ای۔ پی۔ اے۔ بی۔ ایکس، ٹیلی پرنٹر وغیرہ تیار کرنے کی اجازت پرائیویٹ سیکٹر کو دی گئی ہے۔ دوسری چیزیں بھی پرائیویٹ سیکٹر کے کارخانوں میں تیار کی جا سکتی ہیں بشرطیکہ ان میں مرکزی، ریاستی حکومتوں کا سرمایہ حصص کم از کم ۵۱ فیصد ہو۔

ایک نئی کمپیوٹر پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ملک میں جدید ترین ٹیکنالوجی کے استعمال سے ایسے کمپیوٹر تیار کئے جائیں جن کی قیمتیں بین الاقوامی قیمتوں کا مقابلہ کر سکیں۔ کمپیوٹروں کے اجزا رفتہ رفتہ اندرون ملک تیار کرنے کی بھی حوصلہ افزائی کی جا سکے گی۔

خام مال، حصوں پرزوں اور بڑے سازوسامان کی درآمد پر امپورٹ ڈیوٹی کم کر دی گئی ہے۔ ۳۶ انچ اسکرین والا سیاہ و سفید ٹیلی ویژن سیٹ ایکسائز ڈیوٹی سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے۔ پیداوار میں اضافے کی غرض سے درآمدی پالیسی کو زیادہ معقولیت پسندانہ بنایا گیا ہے۔

ماحول اور معیشت حیوانات کا تحفظ

ساتویں پنجسالہ منصوبے میں ماحول اور معیشت حیوانات کے تحفظ کے لیے ۴۲۷٫۹۱ کروڑ روپے مختص کئے گئے ہیں۔

پروگراموں کا مقصد ماحول سے متعلق منصوبہ بندی کے موجودہ طریقے کی خامیوں کو دور کرنا ہے۔ ترقی کے نشانے مقرر کرنے اور منصوبے کی، تمام شعبوں میں کارکردگی کا جائزہ لینے کے کام سے تعلق رکھنے والے اصولوں میں ماحول سے متعلق امور کافی اہمیت رکھتے ہیں۔

منصوبے کے دوران دریائے گنگا کی آلودگی کی روک تھام اور صفائی کے لیے ایک بڑا پروگرام سائنس اور ٹیکنالوجی کے ایک مشن کے طور پر شروع کیا گیا ہے۔ معیشت حیوانات کی ترقی کے تحت منصوبے کا مقصد

بگڑے ہوئے حالات کو زمین کو دوبارہ قابلِ کاشت بنانے، جنگل بانی اور پانی کی ذخیرہ گاہوں کی صفائی وغیرہ کی عمل اسکیموں کے ذریعے سدھارنا، معیشت حیوانات کو مزید نقصان سے بچانا اور تحفظ پر مبنی ترتیبات حکمتِ عملی کو بڑھاوا دینا ہے۔

اب یہ بات اور زیادہ بڑے پیمانے پر تسلیم کی جانے لگی ہے کہ اگر ترقی کو مسلسل جاری رکھنے اور دیرپا بنانے کے طویل المدت نصب العین کو حاصل کرنا ہے تو اس کے لیے ماحولی عناصر اور معیشت حیوانات کے لوازمات کو منصوبہ بندی کے پورے عمل کا جزو بنانا ضروری ہے۔ اس لیے ماحول کی دوستی و بہتری ساتویں منصوبے میں قومی ترقی کا ایک اہم حصّہ ہے۔

بچّوں اور دودھ پلانے والی ماؤں کی بہبود

گذشتہ برسوں میں تجرباتی پروجیکٹوں اور چھوٹے پیمانے کے سرکاری پروگراموں میں بچّوں کی صحت بہتر بنانے کی اسکیمیں شامل کی جاتی رہی ہیں۔ لیکن اب حکومت مسئلے کے حجم کی مناسبت سے کافی بڑے پیمانے پر بچّوں کی بنیادی صحت کی حکمتِ عملی وضع کر رہی ہے اور زیرِ عمل لا رہی ہے۔

کامیاب مقامی مہموں کے بعد جن کی بدولت ۸۰ فیصد بچّوں کو متعدد بیماریوں سے محفوظ بنایا جا چکا ہے، کئی ریاستوں کی حکومتیں تمام بچّوں کو بیماریوں سے محفوظ بنانے کے پروگرام شروع کرنے والی ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے بچّوں سے متعلق ہنگامی فنڈ کے نئی دہلی میں واقع علاقائی دفتر کا اندازہ ہے اگر تمام ریاستی حکومتیں اس پر عمل پیرا ہوں تو ہندستان میں ۱۹۹۰ تک ۸۵ فیصد شیر خوار بچّوں کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے ٹیکے لگائے جا سکتے ہیں۔

ماں کے دودھ کے متبادلات کی فروخت کے بارے میں قومی ضابطۂ اخلاق کو جلد ہی قانون کی شکل دی جانے والی ہے۔

بچّوں کو جسمانی معذوری سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک قومی پروگرام شروع کیا گیا ہے جس میں بچّوں میں اندھے پن کے تدارک کے لیے بہت بڑے پیمانے پر وٹامن اے کی تقسیم کا پروگرام بھی شامل ہے۔

حکومت کی طرف سے صاف پانی فراہم کرنے کے بندوبست اور صفائی پر خرچ کی جانے والی رقم آئندہ پانچ برسوں میں چوگنی ہو جائے گی۔

ملک کے دیہی علاقوں میں بچّوں کی نشو و نما کے لیے مربوط خدمات کا ایک پروگرام بہت بڑے پیمانے پر شروع کیا گیا ہے۔ جس کا ایک اہم حصّہ "آنگن واڑی" یعنی بچّوں کی دیکھ بھال کا آنگن ہے۔ آنگن واڑی تقریباً ایک ہزار کی آبادی کو خدمات بہم پہونچاتی ہے۔ ●

(باقی آئندہ)

بقیہ، بھارتی مواصلاتی نظام میں نئی سمتیں

ہوئے معلوماتی سماج میں لے جائیں۔ مشینری اور سازوسامان کی اقسام کی معیاربندی، سروس کی اعلیٰ قسم اور عالمی پیمانے پر سروس کی اقسام اور سہولیات مستقبل کی چنوتیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ انٹرنیشنل ٹیلی کمیونیکیشن یونین (آئی۔ٹی۔یو) اس سمت میں ترقی پذیر ممالک کو سہولیات اور مالی امداد فراہم کرکے بڑا اچھا رول ادا کر رہی ہے۔ جس سے اُن ملکوں کی ٹیلی کمیونیکیشن تربیت کا معیار بلند ہو رہا ہے اور کوالٹی اور سروس کے بین الاقوامی معیار قائم ہو رہے ہیں بھارت نے ان مساعی میں کافی حصّہ لیا ہے۔ اب ہم ایسے مرحلے پر پہنچ چکے ہیں جب مستقبل کے معلوماتی سماج کی چنوتیاں کا سامنا کرنے کے لیے سرگرم شرکت نہایت ضروری ہے۔ اس عمل میں الیکٹرانک صنعتیں، ٹیلی کمیونیکیشن نظامتیں اور ٹیلی کمیونیکیشن نظامتوں، صنعتی اداروں اور یونیورسیٹوں میں آر اینڈ ڈی (تحقیقی و ترقیاتی) تنظیموں کو قریبی تال میل کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔

بیشتر قومی ٹیلی فونی نظاموں میں ڈیجیٹل ٹیلی فونوں کی آمد سے ٹیلی کمیونیکیشنز کا مستقبل یقینی طور پر متاثر ہو کر رہے گا۔ ایسی منتقلی اور انتہائی ترقی یافتہ ارضیاتی و خلائی نشریاتی سلسلے کے بین الاقوامی ٹیلی فونی نظام پر چھا جانے سے کمپیوٹری مواصلات سے بڑا فائدہ ہونے لگے گا۔ جیسا کہ بیشتر ملکوں کے دفتروں اور کارخانوں میں اُن کے اجراء سے فائدہ ہو رہا ہے۔ متعدد حلقوں، ویڈیو، آڈیو، فیسمل سے برقیاتی سگنلوں کو کئی گنا بڑھایا جا سکتا ہے اور انھیں مروّجہ اور اعلیٰ اسکارری ریڈیو لہروں یا دیگر ذریعوں پر نشر کیا جا سکتا ہے۔

چونکہ سیمی کنڈکٹر ٹیکنالوجی کی لاگت میں متواتر کمی ہو رہی ہے یہ خیال کیا جانے لگا ہے کہ ۲۱ ویں صدی کا عام ٹیلی فون معاون کمپیوٹری سروس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے گا۔ ●

اے. آتما راؤ

گھریلو و دیہی صنعتوں میں تحقیق و ترقی

کھادی و دیہی صنعتی کمیشن کی طرف سے ملک میں ترقیاتی سرگرمیاں زور شور سے انجام دی جارہی ہیں۔ ہینڈلوم، ریشمی کیڑے پالنے، شہد کو صاف کرنے اور متعدد شعبوں میں کاریگروں کو تربیت دے کر دیہات کو خوشحالی کی جانب لے جایا جارہا ہے۔

کھادی اور گرام اُدیوگ کمیشن

یعنی کھادی اور دیہی صنعتی کمیشن نے ملک کے مختلف حصوں میں تحقیقی سرگرمیوں کے لیے ضروری بنیادی ڈھانچے کو فروغ دیا ہے۔ ۱۹۵۵ میں واردھا میں دیہی صنعتوں سے متعلق جمنالال بجاج سینٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا تھا تاکہ وہ دیہی صنعتوں میں تحقیق و ترقیات سے متعلق قومی مرکز کے طور پر کام کرے اور کھادی اور دیہی صنعتوں کے شعبے میں قومی لیباریٹریوں اور تحقیقی مرکزوں کو جوڑنے والی کڑیوں کو مضبوط کرسکے۔ سُوتی کھادی کے تحت تحقیق اور ترقیاتی آر اینڈ ڈی سرگرمیاں پریوگ سمتی، احمد آباد میں انجام دی جارہی ہیں۔ جبکہ ریشم اور ململ میں تحقیقی کام مالدہ (مغربی بنگال) اور تریچور (کیرل) میں بالترتیب انجام دیا جارہا ہے۔ متذکرہ صدر کمیشن کی طرف سے ریجنل ریسرچ لیبارٹری (حیدرآباد) سینٹرل لیدر (چمڑا) ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (مدراس) انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (دلی اور کانپور) سری رام انسٹی ٹیوٹ فار انڈسٹریل ریسرچ (نئی دلی) اور یونیورسٹی کالج آف سائنس (کلکتہ) میں بھی تحقیقی و ترقیاتی پراجیکٹوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔

سینٹرل بی۔ کیپنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (پُونے) ۱۹۶۲ء میں قائم کیا گیا تھا۔ وہ نہ صرف بھارت میں شہد کی مکھیوں کو پالنے سے متعلق دقیق مسئلوں پر تحقیق کررہا ہے بلکہ اُس نے گرم ملکوں میں شہد کی مکھیاں پالنے کی صنعت میں جو اہم حصہ لیا ہے اُس کے لیے اُس نے عالمی شہرت بھی حاصل کی ہے۔ اس میں بھارتی اور غیر ملکی طلبا کے لیے تربیتی سہولیات بھی دستیاب ہیں۔ یہاں شہد اور مکھیوں کی دیگر پیداوار سے متعلق بُنیادی تحقیق، کوالٹی کنٹرول اور معائنے کے لیے آلات سے لیس لیبارٹریاں ہیں اور ملک کے مختلف حصوں میں توسیعی فیلڈ اسٹیشن بھی ہیں۔

بائیو گیس ریسرچ سینٹر کورا کیندر (بمبئی) میں متذکرہ صدر کمیشن کی طرف سے قائم کیا گیا تھا اور وہ سردست اسٹووؤں اور برنروں وغیرہ کے ڈیزائنوں کے ترقیاتی اور توسیعی پروگرام میں بنیادی تحقیق اور عملی مسئلوں سے متعلق تحقیقی و ترقیاتی پراجیکٹوں میں مصروف ہے۔

متذکرہ صدر کمیشن کی طرف سے جو اہم کام کیا گیا ہے اُس کے پیش نظر سے سامنے ممالک کے فائدے کے لیے تربیتی پروگرامو

کی تنظیم کرنے والے مرکز کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ بایوگیس سے متعلق چھ سے زیادہ بین الاقوامی تربیتی نصابوں کا اہتمام کھادی اور دیہی صنعتوں کے کمیشن (بمبئی) کی طرف سے کیا گیا تھا۔

سینٹرل ویلیج پوٹری ٹریننگ اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ خان پور (کرناٹک)، کمہاروں کے مختلف قسم کے پہیوں کو بہتر بنانے کے لیے تحقیقی و ترقیاتی سرگرمیوں اور کم ایندھن خرچ کرنے والے بھٹوں کے لیے ڈیزائنوں کو فروغ دینے میں مصروف ہے۔ اس کے علاوہ اس کی طرف سے کمہاروں اور نگرانوں کے لیے شدید تربیتی نصابوں کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

تاڑ گڑ صنعت میں ایک مکمل تحقیقی اور تربیتی مرکز مدراس میں قائم کیا گیا ہے جس میں (تاڑ کے شربت) نیرا کو محفوظ رکھنے اور تاڑ کے گڑ، تاڑ کی چینی، تاڑ کے کولا اور تاڑ کی دیگر اشیاء کی تیاری میں تحقیقی اور ترقیاتی سرگرمیاں انجام دی جا رہی ہیں۔ واضح رہے کہ ان تمام اشیاء کی بڑی مانگ ہے۔ تاڑ کا ریشہ بھی برآمد کیا جا رہا ہے۔ اس مرکز میں جو تحقیقی و تربیتی سہولیات دستیاب ہیں ان سے وہ ترقی پذیر ممالک فائدے اٹھا سکتے ہیں جن کے ترقیاتی پروگرام تاڑ کی وافر سپلائی پر مبنی ہیں۔

غیر خوردنی تیلوں اور صابن سے متعلق ناسک کا سنٹرل ریسرچ اینڈ ٹریننگ سنٹر ان تیلوں سے نہانے و دھونے کے صابن کی تیاری کے بارے میں تربیت دے رہا ہے جو جنگلوں کی معمولی جڑی بوٹیوں اور خوردنی تلہنوں سے تیار کئے جاتے ہیں۔ نہانے کا صابن بڑے پیمانے پر تیار کیا جاتا ہے اور وہ ان اداروں کی طرف سے فروخت کر دیا جاتا ہے جو کھادی اور دیہی صنعتوں کے پروگراموں کو عمل میں لا رہے ہیں۔

مذکورہ صدر کمیشن اپنے تحقیقی و تربیتی پروگرام زیادہ تر ان مرکزی تحقیقی / تربیتی اداروں میں عمل میں لا رہا ہے جو اس کی طرف سے یا اس کی امداد سے اس مقصد کے لیے قائم کئے گئے ہیں تاکہ تحقیق کے فوائد تربیت یافتہ عملے کی وساطت سے پیداواری مرکزوں اور کاریگروں تک پہونچ جائیں۔ ٹیکنالوجیوں کے فروغ اور ان کی تشہیر میں حسب ذیل مقاصد پیش نظر رکھے جاتے ہیں۔

۱۔ ٹیکنالوجیوں سے کاریگر اپنی روزی کمانے کے قابل ہو جائیں۔

۲۔ ٹیکنالوجی سے پیداوار کی صلاحیت اور کوالٹی میں بہتری آنی چاہیئے۔

۳۔ ٹیکنالوجی کو زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک مقامی خام مال کا استعمال کرنا چاہیئے۔

۴۔ ٹیکنالوجی کو توانائی کے غیر مروجہ وسائل کا استعمال کرنا چاہیئے۔

۵۔ ٹیکنالوجی اگر کر توڑ محنت کو ختم نہ کرے تو اسے اس میں کمی لانی چاہیئے

مندرجہ بالا مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے کھادی و دیہی صنعتی کمیشن اور اس کے امدادی اداروں نے گزشتہ دہائی کے دوران حسب ذیل ٹیکنالوجیوں کو فروغ دیا ہے۔

۱۔ شہد کو صاف کرنا اور بوتلوں میں بند کرنا۔

۲۔ شمسی توانائی سے شہد نکالنا۔

۳۔ گھریلو ماچس صنعت کے لیے دیاسلائی تیار کرنے والی چھوٹی چھوٹی مشینیں۔

۴۔ کمہار کے بال بیرنگوں والے بہتر پہیئے۔

۶۔ چھوٹی آبپاشی کے لیے مٹی کے پائپ تیار کرنے والی پائپ مل۔

۷۔ عام جنگلی جڑی بوٹیوں اور غیر خوردنی تیلوں سے تیل نکالنے کے چھوٹے چھوٹے کولہو۔

۸۔ نہانے کا صابن تیار کرنے والے یونٹ۔

۹۔ سیال صابن اور ہاتھ دھونے والے صابن کی تیاری کے لیے بجلی سے چلنے والی کڑاہی۔

۱۰۔ کمائے ہوئے چمڑے کی سطح پر فنش کرنے کے لیے ہاٹ پلیٹنگ اور ایمبوسنگ مشین۔

۱۱۔ آہنی پتریاں کاٹنے والی مشین اور سکننگ مشین۔

۱۲۔ جوتے کے تلے کے چمڑے کو کاٹنے والی مشین۔

۱۳۔ بجلی سے چلنے والی تیل کی گھانیاں۔

۱۴۔ مونگ پھلی سے دانے الگ کرنے والی مشین۔

۱۵۔ گڑ بنانے کے لیے بیل سے چلنے والا کولہو۔

۱۶۔ تاڑ کے ریشے سے برش تیار کرنے والا یونٹ۔

۱۷۔ دال کو ربڑ رولز پیڈی شیلر۔

۱۸۔ بجلی سے چلنے والی متعدد مقصدی چکی۔

۱۹۔ سیسل، انناس کے پتوں اور کیلے کے تنوں سے ریشہ نکالنے کے لیے راسپوڈار مشین۔

۲۰۔ ۱۲ تکلوں کا نیا ماڈل چرخہ۔

۲۱۔ ٹسر اور شہتوت کے کیڑوں کے ریشم کے لیے چھ تکلوں کا چرخہ۔

۲۲۔ دھاگے کو مرسرائز کرنے والی مشین۔

مندرجہ بالا مشین، اوزار اور ساز و سامان کھادی اور دیہی صنعتی کمیشن کے وسیع نظام کی طرف سے جو ایک لاکھ سے زیادہ دیہات میں پھیلا ہوا ہے۔ ترقیاتی پروگراموں کے حصے کے طور پر رائج کیا گیا تھا۔ ان مشینوں اور ساز و سامان کی خرید کے لیے مالی امداد آسان شرح سود پر (۱ سے ۴ فیصد تک) فراہم کی [illegible]

مال کی خرید اور اسے پراسس کرنے کے لیے
پیداواری اور کام کے لیے سرمایہ بھی مہیا کیا
گیا تھا۔ بہتر مشینوں اور اوزاروں کی خرید
سے مصنوعات کی فروخت کے حتمی مرحلے
تک امداد دینا بھی متذکرہ صدر کمیشن کے
ترقیاتی سرمایے کا خصوصی پہلو ہے۔ لہذا یہ
بہتر اور موزوں ساز و سامان اور پراسس
میں عملوں کے اجرا و میں بہت حد تک کامیاب
ہو سکا جو تحقیق اور ترقیاتی مساعی کی حتمی پیداوار
ہیں۔

ہینڈلوم سیکٹر

ہینڈلوم ٹیکنالوجی کے تین بھارتی انسٹی ٹیوٹ
ہیں جو سیلم، تامل ناڈو، وارانسی (یو۔پی) اور
گوہاٹی (آسام) میں واقع ہیں۔ ۲۴ ویورز سروس
سینٹر بھی ہیں جو مختلف ریاستوں میں پھیلے
ہوئے ہیں۔ یہ ادارے تکنیکی ماہروں کی طرف
سے چلائے جا رہے ہیں، اور وہ نئے نئے ڈیزائن
ملے جلے رنگوں کے کپڑے تیار کرنے، بنائی کے
نئے نئے طریقوں پراسیسنگ تکنیکوں اور کرگھوں
کو فروغ دینے میں مصروف ہیں۔ وہ ابتدائی طور
پر ایسے ذریعہ کے طور پر کام کر رہے ہیں جس سے
ہینڈلوم یونٹ کرگھوں سے قبل کے پراسیسنگ
عمل، بنائی اور کرگھوں کے بعد کے پراسیسنگ عمل
میں تکنیکی امداد اور رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ بھارت
کی شمال مشرقی ریاستوں کی خصوصی ضروریات
پوری کرنے کے لیے ہینڈلوم ٹیکنالوجی کا ایک
مکمل یونٹ ستمبر ۱۹۸۲ میں گوہاٹی میں قائم کیا گیا
تھا۔ ایک "نیشنل ہینڈلوم ڈیزائن سینٹر" کم
ہینڈلوم میوزیم کے قیام کی بھی منظوری دی گئی
تھی تاکہ کپڑوں کے روایاتی نمونوں اور ہینڈلوم کی بنائی،
رنگائی اور چھپائی کی تکنیکوں کو تحقیق و تربیت اور
مصنوعات کے فروغ کے لیے جمع کیا جا سکے۔

ریشم کے کیڑے پالنا

سینٹرل سلک بورڈ نے لشر کے لیے
دو تحقیقی اور تربیتی ادارے ریشم کے کیڑے
پالنے کے لیے ایک علاقائی تحقیقی ادارہ قائم
کیا ہے اور ان کے علاوہ متعدد ذیلی علاقائی
تحقیقی اداروں کا قیام کیا ہے جو ہر بڑے
تحقیقی اداروں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس
تحقیق کے نتیجے میں کرناٹک، تامل ناڈو، آندھرا
پردیش اور مغربی بنگال کے ریشم تیار
کرنے والے روایاتی علاقوں میں نئی قسم کے
کیڑے پالنا ممکن ہوا ہے جن سے اعلیٰ قسم
کا ریشم بڑی مقدار میں تیار کیا جانے لگا ہے۔
بورڈ کے ذمہ یہ کام بھی لگایا گیا، تاکہ وہ عالمی
بینک کی امداد سے چلنے والے کرناٹک سیری
کلچر پراجیکٹ کے لیے تین سال تک ۱۴ کروڑ
۴۲ لاکھ روپے کی لاگت کے ساتھ تحقیق و ترقی
دینے کا اہتمام کرے۔ بھارت کے سائنسدانوں
اور ٹیکنالوجسٹوں کو ترقی یافتہ تربیت کے لیے
مقرر کرنے اور غیر ملکی ماہرین کو بھارت میں مدعو
کرنے کا بھی پروگرام زیر عمل ہے۔ ۸۳-۱۹۸۲
کے دوران کوئی ۷ سائنسی اور تکنیکی ماہروں
کو تربیت دی گئی اور ۵ جاپانی ماہروں کی خدمات
حاصل کی گئیں۔ بھارت سوئٹزرلینڈ تکنیکی
تعاونی پروگرام کے تحت سلک بورڈ نے
میسور میں ٹراپیکل سیری کلچر میں تحقیق و تربیت
کے لیے ایک بین الاقوامی مرکز کا قیام کیا۔

ناریل کے ریشے (کوئر)

بھارت میں تحقیق، ترقیاتی سرگرمیوں
کو عمل میں لانے کے لیے ایک کروڑ ۵۵ لاکھ

(باقی صفحہ ۳ پر)

اکرام اشرف

کیا آپ جانتے ہیں؟

ارجن ایوارڈ

یہ ایوارڈ ملک کے کھلاڑیوں کو نمایاں
کارکردگی کے لیے ہر سال دئے جاتے ہیں۔ یہ ۱۹۶۱ء
سے دئے جا رہے ہیں۔

۸۴-۱۹۸۳ء میں ارجن ایوارڈ پانے والوں کے
نام مندرجہ ذیل ہیں:-

ایتھلیٹکس : پی۔ ٹی۔ اوشا اور سریش یادو۔
بلیرڈ : سبھاش اگروال۔
باسکٹ بال: سوسن شرما اور رادھے شیام۔
باکسنگ : جسپال پردھان۔
شطرنج : دیبندر بروا۔
کرکٹ (خواتین): دینا اڈلجی۔
سائیکلنگ : ارمن روہنٹن
فٹ بال (خواتین): شانتی ملک۔
ہاکی (مرد) ظفر اقبال۔
کبڈی : مایا کاشی ناتھ۔
پولو : لیفٹیننٹ کرنل آر۔ ایس۔ سودھی۔
بادبانی (rowing) میجر پروین کمار اوبرائے۔
تیراندازی : مہیندر لال۔
تیراکی : انیتا سود۔
والی بال : آر۔ کے۔ پروہت۔
وزن اٹھانا (ویٹ لفٹنگ) : کے۔ داروغہ۔
کوہ پیمائی : کرنل بی۔ کے۔ کھلر۔

۱۹۸۴ء

ایتھلیٹکس : شنی ابراہم اور راجکمار۔
بیڈمنٹن : ڈی۔ راجارمن۔

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

یوجنا، نئی دہلی

کرشن شرما

کتابوں کے متعلق واضح پالیسی کی ضرورت

کتب اور رسائل کی اشاعت کے اعتبار سے ہندوستان تیسری دنیا کے ممالک میں اوّل مانا جاتا ہے اور دُنیا بھر کے ممالک میں آٹھویں نمبر پر آتا ہے۔ اس کے باوجود ابھی ہمیں بہت مسافت طے کرنی ہے۔ ہندوستان میں زبانوں کی بھرمار ہے اور لوگ ہیں، کہ ہر سال لاکھوں کی تعداد میں پڑھ کر اسکولوں اور کالجوں سے نکل رہے ہیں۔ ان کے لیے عمدہ کتابوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے واضح قومی پالیسی کی ضرورت لاحق ہے۔ قوم میں گفتار کے غازی بہت ملیں گے، کردار کے غازی خال خال نظر آتے ہیں۔ "اوم شانتی شانتی" کہنے والوں کی کمی نہیں، لیکن دنیا میں امن و امان کہیں نہیں ہے۔ لوگ چٹ پٹی خبروں کی خاطر اخبار خرید کر یا دوسروں سے مانگ کر پڑھ لیں گے، فلمی رسائل اور منوہر کہانیاں، بھی اپنے پاس رکھ لیں گے لیکن سنجیدہ کتب کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا اور انکی اشاعت بہت محدود رہتی ہے۔ آجکل کے امیرزادے ویڈیو فلم پر روپیہ خرچ کر دیتے ہیں لیکن کتابوں کی دوکان میں داخل ہونا گوارا نہیں کرتے حالانکہ کتابیں وہ تھرمامیٹر ہیں جن سے قوم اور سماج کی ذہنی حرارت کو ماپا جا سکتا ہے۔

ہندوستانی معاشرے میں پچھلے چالیس برسوں میں زبردست تبدیلیاں آئی ہیں، لیکن کتابوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ زبانوں، مذاہب، رواجوں اور طرز زندگی کی کلچرل گوناگونی کے باوجود ایسی کتابوں کا فقدان رہا ہے جو باہمی بدگمانیوں کو دُور کرتی ہوں اور بچے کو سکھاتی ہوں کہ اس ملک میں رنگا رنگ تمدن ملتا ہے۔ بچے کا سب سے پہلا معلّم اس کی ماں ہوتی ہے۔ دو سے سات سال کی عمر کے درمیان جب بچہ سوال کرنے لگتا ہے تو کونسی ماں ہے جو بچے کو سکھاتی ہو کہ تم ہندوستانی ہو، تمھارا تمدن ہندوستانی ہے۔ اور تمھاری زبان ہندوستان کی زبان ہے۔ اُسے صرف یہی سکھایا جاتا ہے کہ تم ہندو ہو، مسلمان ہو، سکھ ہو یا عیسائی ہو اور تمھاری زبان ہندی یا اُردو یا کوئی اور علاقائی زبان ہے۔ اُسے یہ کوئی نہیں سکھاتا کہ تمھاری کوئی مشترک زبان بھی ہے۔ بچے کتابیں پڑھتے ہیں مگر ان میں بچوں کو اپنی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ اپنے ارد گرد کے ماحول میں بچے گوناگونی ضرور دیکھتے ہیں لیکن یہی گوناگونی انھیں کتابوں میں نظر نہیں آتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بچوں کے لیے کتابیں ان کی ذہنی نشو و نما کو دھیان میں رکھتے ہوئے لکھی جائیں اور اپنی علمیت ان پر ٹھونسنے کی کوشش کرنے سے گریز کیا جائے۔ مصنفوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ کتابوں میں اپنے خیالات دیانتداری سے پیش کریں۔ چونکہ ایسا نہیں ہو رہا ہے اس لیے آجکل اچھی کتابیں کوئی نہیں پڑھتا، بُری اور واہیات کتابیں پڑھنے کا رُجحان بڑھتا جا رہا ہے دوسری طرف لاکھوں بچے ایسے ہیں جنھیں کتابیں پڑھنے کو محض اس لیے نہیں ملتیں کہ وہ صرف اقلیتی یا قبائلی زبانیں جانتے ہیں۔

ہندوستان میں آجکل جتنی کتابیں چھپ رہی ہیں ان میں سے نصف انگریزی زبان کی ہوتی ہیں حالانکہ محض دو تا چار فیصد لوگ ہی انگریزی پڑھے ہوئے ہیں۔ باقی نصف کتابیں ہندوستان کی تمام زبانوں پر مشتمل ہیں۔ اس مسئلے کی جانب بھی زیادہ دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

کتابوں کی اشاعت کی راہ میں جو مشکلات

حائل ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ کتاب چھاپنے کی لاگت بڑھتی جا رہی ہے اور پرنٹ آرڈر بہت کم ہوتا ہے۔ دوسرے سرمایہ لگانے والے نہیں ملتے۔ تیسرے کتابوں کی تقسیم کا انتظام معقول نہیں ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی وضع کرتے وقت یہ تمام باتیں ابھر کر سامنے آئی ہیں اور انھیں سامنے رکھ کر کتابوں کے متعلق نئی پالیسی کا ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے۔ اسی پالیسی کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ تعلیم کی ہر سطح پر عمدہ قسم کی کتابوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ایسا بندوبست کیا جائے کہ ایسی کتابیں لوگوں کو بہ آسانی مل سکیں۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں اور خصوصاً بچوں میں پڑھنے کی عادت ڈالی جائے۔ معروف ڈرامہ نگار آغا حشر کے متعلق مشہور ہے کہ جو کاغذ بھی ان کے ہاتھ لگ جاتا تھا اُسے پڑھے بغیر پھینکتے نہیں تھے۔ حتیٰ کہ کاغذ کے جن ٹکڑے میں ان کا پان لپیٹ کر آتا تھا اُسے بھی پڑھا کرتے تھے۔ کتابوں کے متعلق نئی پالیسی کا تیسرا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اچھی اور تخلیقی کتابیں لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور پھر کتابوں کی اشاعت، تقسیم اور فروخت کے لیے ضروری سہولیات مُہیا کی جائیں۔

یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں ایک ہزار چھ سو باون مادری زبانیں موجود ہیں۔ اہم رسم الخط دس کے قریب ہیں ان کے علاوہ اور بھی بہت سے رسم الخط ہیں۔ لیکن اسکولوں میں صرف ۵۸ زبانیں ہی دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ سرکاری فارمولے کے مطابق ہر بچے کے لیے تین زبانیں سیکھنا لازم تھا لیکن اس فارمولے پر پابندی سے عمل نہیں کیا گیا۔ بچوں کی کتابوں پر دھیان نہیں دیا جا رہا۔ صرف شہروں میں اس ضمن میں کچھ کام ہو رہا ہے۔ دیہات میں کچھ نہیں ہو رہا۔ بچوں کے لیے مختلف زبانوں میں کتابیں شائع کرنے کا پروگرام شروع کیا جانا چاہیے اور ان کتابوں میں عمدہ تصویریں بھی ہونی چاہئیں۔

اچھی کتابوں کی راہ میں ایک بڑی مشکل یہ بھی حائل ہے کہ کاغذ نہیں ملتا۔ اور کاغذ کی قیمت برابر چڑھتی جا رہی ہے۔ چنانچہ کتابوں کے متعلق نئی پالیسی میں تجویز کیا گیا ہے کہ موجودہ تجارتی معاہدوں کے تحت جو کتابیں برآمد کی جائیں ان سے ہونے والی نصف آمدنی سے کاغذ کا سوکھا گودا درآمد کیا جائے۔ نیز غیر ضروری کتابوں کی درآمد بند کی جائے۔ آجکل ایک درآمد کنندہ کو ایک عنوان کی ایک ہزار کتابیں منگانے کی اجازت ہے۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ لوگ ایک ہی کتاب کا عنوان بدل بدل کر وہی کتاب ہزاروں کی تعداد میں درآمد کر رہے ہیں۔ یہ بدعنوانی ختم ہونی چاہیے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ملک میں وہ کتابیں درآمد کی جا رہی ہیں جن کی ہمیں ہرگز ضرورت نہیں بلکہ جو کتابیں باہر کے ملک ہمیں بھیجنا چاہتے ہیں۔

کتابوں کے متعلق نئی قومی پالیسی میں تسلیم کیا کیا گیا ہے کہ انگریزی ہندوستان کی اہم زبان ہے۔ اور بین الاقوامی روابط کے لیے نہایت ضروری ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبانوں کو بھی بڑھاوا دینے کی ضرورت ہے اور ایک زبان کی کتاب کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی بھی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ ہندوستانی زبانوں کے ادب کا باہر کی زبانوں مثلاً جرمنی، فرانسیسی وغیرہ میں بھی ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کتابوں کی فروخت کو بڑھاوا دینے کے لیے کتابوں کی خرید پر ٹیکس میں چھوٹ دی جانی چاہیے۔

اب اس پالیسی کا مسودہ حکومت کے پاس ہے جو اس پر غور کرنے کے بعد اسے نئی تعلیمی پالیسی کا جزو بنا کر اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے گی۔ ●

بقیہ: کیا آپ جانتے ہیں؟

شطرنج : پروین تھیپے۔
کرکٹ (مرد) : روی شاستری۔
گھوڑ سواری : کیپٹن غلام محمد۔
ہاکی (خواتین) : راجبیر کور۔
کھو کھو : ایس۔ پرکاش۔
بادبانی : کیپٹن محمد امین نائک۔
تیراکی : خزان سنگھ۔
والی بال : سیل جوزف۔
کوہ پیمائی : بچھندری پال۔

دُنیا کے چند مشہور کھلاڑی

کرکٹ : کپل دیو۔ ہندوستانی ٹیم کے کپتان۔
ایلن بورڈر : آسٹریلیا کی ٹیم کے کپتان۔
ویوین رچرڈ : ویسٹ انڈیز ٹیم کے کپتان۔
ڈیوڈ گاور : انگلینڈ کی ٹیم کے کپتان۔
عمران خان : پاکستان کی ٹیم کے کپتان۔
ورلڈ چیمپئن : ہندوستان۔
ایشیائی چیمپئن : شری لنکا۔
آسٹرل ایشیا چیمپئن ۱۹۸۶ء : پاکستان۔

ٹینس :
نیشنل لان ٹینس چیمپئن : نندن بال (مرد) ننداینی رنگا راجن (خواتین)
وجے امرت راج : بین الاقوامی شہرت کے ہندوستانی لان ٹینس کھلاڑی، انھوں نے گنزے ورلڈ ٹینس ٹورنامنٹ (Gunze World Tennis Tournament) کا خطاب جیتا۔ یہ ٹورنامنٹ کوبے (جاپان) میں ہوا تھا۔ ●

ریکھا شرما

ہندوستان میں چھوٹی صنعتوں کی ترقی

ہندوستان میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی نشو ونما ملک کی صنعتی ترقی کا ایک اہم پہلو ہے۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں نے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں روزمرہ کے استعمال کی اشیاء تیار کرنا شروع کی تھیں لیکن اب یہ صنعتیں کافی بڑی تعداد میں نفیس اشیاء بھی تیار کرنے لگی ہیں۔ اس عظیم ترقی کا راز اُن بامقصد پالیسیوں میں مضمر ہے جو مرکزی اور ریاستی سرکاروں نے اختیار کر رکھی ہیں۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ فقط پچھلے دس برس میں چھوٹی صنعتوں کی تعداد تین گنی ہوگئی ہے۔ جہاں دس سال پہلے ملک میں چھوٹے پیمانے کی چار لاکھ صنعتیں ہوا کرتی تھیں، وہاں اب ان کی تعداد تیرہ لاکھ تک جا پہنچی ہے۔ ان کی پیداوار سات گنا ہوگئی ہے یعنی جہاں پہلے سات ہزار دو سو کروڑ روپے کا مال یہ صنعتیں تیار کیا کرتی تھیں وہاں اب یہی صنعتیں دس سال بعد پچاس ہزار کروڑ روپے کی مالیت کا سامان تیار کر کے دکھاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہندوستان کی کل صنعتی پیداوار کا تقریباً نصف حصہ چھوٹی صنعتیں تیار کرتی ہیں اور ترقی کی رفتار برابر جاری ہے۔ ۱۹۸۴ء ـ ۸۵ کے دوران چھوٹی صنعتوں کی ترقی کی رفتار اس سے پہلے سال کے مقابلے میں ۲۱ فیصدی زیادہ رہی۔

یہ اعداد و شمار ثابت کرتے ہیں کہ ملک میں چھوٹی صنعتوں کی ترقی کی رفتار بہت تیز رہی ہے۔ اور کیوں نہ ہوتی؟ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جو بنیادی طور پر زراعتی ملک ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی صنعتی ترقی کی طرف بھی بہت توجہ دے رہا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ ملک میں بڑی صنعتیں قائم کرنے کے ساتھ ساتھ چھوٹی صنعتوں کا قیام بھی لازم ہے۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں مصروف افراد کی تعداد پچھلے دس برسوں میں دوگنا سے بھی زیادہ یعنی ۴۰ لاکھ سے بڑھ کر نوے لاکھ کے لگ بھگ ہو چکی ہے۔ امید ہے کہ ۱۹۹۰ء تک اس سیکٹر میں ان افراد کی تعداد ایک کروڑ ۹۰ لاکھ ہو چکی ہوگی۔ پچھلے سال چھوٹے پیمانے کے سیکٹر نے ۲۳۵۰ کروڑ روپے کی مالیت کا مال باہر کے ملکوں کو بھیجا جو ملک کی کل برآمد کے ۲۴ فیصدی کے برابر تھا۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے سلسلے میں ہندوستان نے جو تجربہ حاصل کیا ہے اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ بہت سے بین الاقوامی ادارے ہندوستانی ماہرین کی خدمات حاصل کرنے کے خواہاں رہتے ہیں تاکہ ان کی مدد سے بعض ترقی پذیر ملکوں کی صنعتوں کو بڑھاوا دے سکیں۔

خود ہندوستان کے اندر چھوٹی صنعتوں کو بڑھاوا دینے کے لیے جو قدم اٹھائے گئے ہیں ان میں سے ایک اہم قدم یہ ہے کہ بعض اشیاء کی تیاری صرف چھوٹی صنعتوں کے لیے مخصوص کردی گئی ہے۔ یہ پالیسی ۱۹۶۰ء کی دہائی کے آخری حصہ میں شروع کی گئی تھی تاکہ

چھوٹی صنعتوں کا تحفظ کیا جا سکے۔ آجکل ۸۷۲ چیزیں ایسی ہیں جو فقط چھوٹی صنعتیں ہی تیار کر سکتی ہیں۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتیں جو چیزیں تیار کرنے کا حق رکھتی ہیں ان چیزوں کی تیاری کے لائسنس بڑی یا درمیانہ درجے کی صنعتوں کے نام جاری نہیں کیے جاتے۔ لیکن اگر بڑے یا درمیانی درجے کی صنعت گارنٹی دے کہ وہ اپنی پیداوار کا کم سے کم ۷۵ فیصدی حصہ ضرور برآمد کرے گا تو انھیں بھی لائسنس مل سکتا ہے۔ چھوٹی صنعتوں کو ایک اور سہولت مال کی فروخت کے سلسلے میں دی گئی ہے۔ ۴۰۰ سے زیادہ چیزیں ایسی ہیں جن کی کل پیداوار (چھوٹی صنعتوں کی) سرکار خرید لیتی ہے۔ بہت سی صنعتوں کو قیمت کا تحفظ بھی حاصل ہے۔

اس سیکٹر کو بڑھاوا دینے کے لیے ایک اور اہم قدم یہ اٹھایا گیا ہے کہ چھوٹے پیمانے کی اور ضمنی صنعتوں کی تعریف بدل دی گئی ہے۔ حال ہی میں چھوٹی صنعتوں میں سرمایہ کاری کی حد ۲۰ لاکھ سے بڑھا کر ۳۵ لاکھ روپے کر دی گئی ہے۔

اب حکومت اس بات پر توجہ دے رہی ہے کہ چھوٹے پیمانے کے کارخانے نئی نئی تکنیک اختیار کریں۔ تکنیک صرف وہی اختیار کرنے دی جائے گی جو ترقی یافتہ ملکوں میں جدید ترین ہو اور ان صنعتوں کے لیے خاص طور سے مفید اور اہم ہو جہاں مزدوروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں ملک کے اندر پہلے ہی کچھ کام انجام دیا جا چکا ہے اور مزدور کو کام کرنے میں پہلے سے زیادہ سہولت محسوس ہوتی ہے اور اس کی پیداواری صلاحیت بھی بڑھی ہے۔ یہ بات دیگر ترقی پذیر ملکوں کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہوگی۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو جدید ڈھنگ کا بنانے میں مدد دینے کے لیے ٹیکنالوجی درآمد کرنے کے قواعد نرم کر دئے گئے ہیں۔ ۵۰۰ قسم کے "خام مال"، پرزوں اور مشینری کی کھلے عام لائسنس کے تحت درآمد کی اجازت دے دی گئی ہے۔

ملک میں اس مقصد سے مالی اداروں کا جال بچھا دیا گیا ہے کہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو بروقت معقول قرضہ مل سکے۔ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ چھوٹی صنعتیں ترجیحی سلوک کی مستحق ہیں۔ بنک ان یونٹوں کو مالی امداد دینے کو تیار رہتے ہیں۔ سرکار نے ایک ایسا ادارہ بھی قائم کیا ہے جو اپنا کام خود شروع کرنے کی تحریک کو بڑھاوا دیتا ہے اور اس سلسلے میں لوگوں کو ٹریننگ مہیا کرتا ہے۔ بہت سے مرکزی اور ریاستی ادارے بلند حوصلہ لوگوں کو تربیت مہیا کر رہے ہیں تاکہ پڑھے لکھے لوگ جو محض کلرکی کا پیشہ اختیار کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں خود اپنا دھندا شروع کر سکیں۔

چھوٹے صنعت کاروں کی امداد کے لیے ضلعوں میں صنعتی مرکز قائم کر دئے گئے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دیہاتی علاقوں میں بھی چھوٹے پیمانے کی صنعتیں قائم ہونے لگی ہیں۔ جو صنعتیں مال برآمد کرنے کے خیال سے قائم کی جا رہی ہیں، انھیں کئی طرح کی مالی اور دوسری امداد مہیا کی جا رہی ہیں۔ ہندوستان سے باہر رہنے والے ہندوستانی اگر یہاں بعض قسم کی الیکٹرانک صنعتیں قائم کرنا چاہتے ہوں تو وہ اس کے لیے کل مشینری درآمد کر سکتے ہیں اور مزید برآں پہلے ایک سال تک خام مال بھی درآمد کر سکتے ہیں۔

خواتین کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے کہ وہ چھوٹی صنعتوں کا کام شروع کریں۔ اس سیکٹر میں عورتوں کی شمولیت کی کامیابی کی ایک عمدہ مثال سلے سلائے کپڑوں کی برآمد ہے۔ اب عورتیں الیکٹرانکس جیسی صنعتوں کے قیام میں بھی آگے بڑھنے لگی ہیں۔ عام استعمال کی الیکٹرانکس اشیاء کی تیاری میں بھی چھوٹے پیمانے کی صنعتوں نے کافی ترقی کر لی ہے۔ ان اشیاء میں سیاہ و سفید تصویر دکھانے والا ٹیلی ویژن، ٹیپ ریکارڈر، ٹو اِن وَن اور چھوٹے کمپیوٹر وغیرہ شامل ہیں۔ ہندوستان اب یہ نہیں چاہتا ہے کہ محض پیچ کس کر تیار کرنے کے دور میں ہی بیٹھا رہے۔

اب ہندوستان میں مختلف قسم کے ۶ سو سے زیادہ صنعتی علاقے قائم ہیں اور ملک نے ایسے علاقوں کی منصوبہ بندی اور تیاری وغیرہ کے کام میں کافی مہارت اور تجربہ حاصل کیا ہے۔ ہندوستان بہت سے ترقی پذیر ملکوں کو تکنیکی امداد مہیا کر رہا ہے۔ جس میں تکنیکی و اقتصادی سروے کرنا، تربیت مہیا کرنا، صنعتی علاقے قائم کرنا اور مکمل پراجیکٹ تیار کر کے دینا بھی شامل ہے۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے میدان میں ہندوستان نے جو مہارت حاصل کی ہے اس کا فائدہ بہت سے بین الاقوامی ادارے اٹھا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اقوام متحدہ کی صنعتی ترقیاتی جماعت۔ ایشیا و بحرالکاہل سے متعلق سائنسی کمیشن اور بین الاقوامی ادارہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ افریقہ، ایشیا اور دیگر برّاعظموں کے ترقی پذیر ممالک اعلیٰ سطح کے وفد ہندوستان بھیج رہے ہیں تاکہ خود ملاحظہ کر سکیں کہ اس میدان میں ہندوستان نے کتنی ترقی کر لی ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں نے ملک سے غربت کو دور کرنے، آمدنی کے فرق کو ختم کرنے، علاقائی توازن کو بحال کرنے اور عوام کو روزگار مہیا کرنے کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے شاندار کام کر کے دکھایا ہے۔ اس بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو مستقبل میں اور بڑھاوا ملے گا۔ ●

۱۴ تا ۳۱ مئی ۱۹۸۷

عزیز مرادآبادی

گزشتہ سے پیوستہ

بھارت میں بیروزگاری اور اس کا حل

(دوسری اور آخری قسط)

۴۔ سیاسی عدمِ استحکام

بے روزگاری کی وجہ سے دیس میں سیاسی استحکام قائم نہیں ہو پاتا۔ بیروزگار شخص نئی نئی اسکیمیں سوچتا رہتاہے۔ اپنے مفاد کے لیے سیاسی پارٹیاں بناتا ہے، یا ان سے گٹھ جوڑ میں مصروف رہتاہے۔ اس طرح ہلچل مچی رہتی ہے۔ ایسے بیروزگار لوگ بھارت میں بھی بے شمار ہیں، جو انتظامیہ کو فیل کرکے سیاسی بحران پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ حکومت کو ناکام بنانے کے لیے ایسے لوگ فرقہ وارانہ فسادات تک برپا کرا ڈالتے ہیں، جس سے حکومت کی بدنامی ہوتی ہے۔

۵۔ لاء اینڈ آرڈر میں بگاڑ

ہمارے ملک میں ہر سال لاکھوں بیروزگاروں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ جب انھیں زندگی بسر کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ملتا تو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے یہ لوگ غلط راستوں پر چل پڑتے ہیں۔ ان میں سے متعدد افراد راہزنی، قتل و غارت گری، لوٹ پاٹ اور غیر اخلاقی حرکات کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے دیش میں اس قسم کی وارداتوں کے بڑھنے کی ایک وجہ بڑھتی ہوئی بیروزگاری بھی ہے۔ اس طرح لا اینڈ آرڈر کے لیے بھی رکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہمارے ملک میں بھی کئی بار ہوا ہے اور اس وسیع و عریض ملک میں کہیں نہ کہیں لا اینڈ آرڈر میں بگاڑ ہوتا ہی رہتا ہے۔ کسی بھی ملک میں قوانین کی مٹی پلید ہونا بہت خطرناک معاملہ ہے۔

۶۔ دیگر مضر اثرات

بیروزگاری کے دیگر مضر اثرات میں صنعتی تصادم، مِل مالکان کے ذریعے مزدوروں کا استحصال، کم مزدوری پر کام کرنے سے جسمانی صحت میں بگاڑ، زیادہ جنم اور موت کی دَر اور دولت کی غیر مساویانہ تقسیم وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ بھارت میں بھی بیروزگاری کے ان مضر اثرات کا رنگ جا بجا نظر آتا ہے۔ بندھوا مزدور کی اصطلاح بھی بیروزگاری کی ہی مرہونِ منت ہے

بیروزگاری دور کرنیکی اہم تدابیر اور خصوصاً پنجسالہ منصوبوں کے تحت سرکاری اقدامات

اب ہمیں ان تدابیر کا جائزہ لینا ہے جن کی مدد سے بیروزگاری کو کم یا ختم کیا جا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ سرکار کے ان اقدامات اور مساعی کا بھی جائزہ لیتے چلنا ہے، جو اس نے جملہ پنجسالہ منصوبوں کے سہارے اب تک کئے ہیں اور جو اہم ترین ترقیاتی حکمتِ عمل سے کسی نہ کسی طرح ہم آہنگ رہے ہیں۔

۱۔ تیز رفتار آبادی پر مؤثر قابو

بیروزگاری کے مسئلے کی شدت کو کم کرنے یا اسے مکمل طور پر حل کرنے کے لیے سب سے پہلے آبادی کی رفتار کو روکنا پڑے گا۔ اس مقصد کے لیے بھارت میں بھی قومی سطح پر فیملی پلاننگ وغیرہ کے متعدد پروگراموں کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔

ہمارے ملک میں ہر سال ایک کروڑ ۱۰ لاکھ افراد آبادی کے سیلاب میں ضم ہو

جاتے ہیں۔ مشہور ماہر ڈاکٹر ایس چندر شیکھر کے الفاظ میں "بھارت میں بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے ہمیں ہر سال ۲۵ لاکھ نئے مکانوں کی ۱۲۰ کروڑ کوئنٹل فاضل اناج اور ۴۳ لاکھ نئے روزگار کی سہولیات یا مواقع کی ضرورت پڑے گی۔" بھارت [illegible] ملک کے لیے یہ بوجھ بہت [illegible] لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ آبادی کو قابو میں رکھنے کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ ہم نے سبھی منصوبوں میں آبادی کی رفتار کو کم کرنے کے لیے اقدامات کیے ہیں۔ کم سنی کی شادی کو جرم قرار دیا گیا ہے۔ شادی کے لیے لڑکی، لڑکے کی عمروں (بالترتیب ۱۸ سال، ۲۱ سال) کا تعین بھی کر دیا گیا ہے۔ ۱۹۷۷ سے فیملی پلاننگ کا محکمہ خاندانی بہبود کے نام سے سرگرم عمل ہے۔ اس مد پر چھٹی یوجنا میں (۸۵-۱۹۸۰) ۲۸۳۱ کروڑ روپے خرچ کیے گئے ہیں۔ ۲۰ فیصد سے ۳۰ فیصد تک آبادی کی رفتار میں کمی بھی واقع ہوئی ہے۔ لیکن دیہاتوں تک اس محکمہ کے اثرات حسب منشا نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اب ساتویں یوجنا میں اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے خصوصی اقدامات کرنے کا پروگرام ہے۔

۲۔ زرعی صنعت کو ترقی اور وسعت

بے روزگاری کا مسئلہ حل کرنے کے لیے زرعی صنعت کو پوری طرح ترقی دے دی جائے تاکہ کھیتی باڑی میں لگے ہوئے ہر آدمی کو مستقل کام ملتا رہے۔ یہی ہمارا مقصد ہونا چاہیے۔ بھارت میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اہم اقدامات کیے جاتے رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ سابق وزیر اعظم شری پنڈت جواہر لال نہرو نے زراعت کی اہمیت کو سراہتے ہوئے فرمایا تھا:

"زراعت کو سب سے زیادہ اولیت دینے کی ضرورت ہے۔ اگر بھارت میں زراعت کو کامیابی نہیں ملتی ہے تو سرکار اور ملک دونوں ہی ناکام رہیں گے۔" فی الواقعی زراعت ہمارے ملک کی اقتصادیات و خوشحالی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہماری قومی آمدنی کا لگ بھگ نصف حصہ اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا زراعت کی وسعت اور ترقی کے لیے سب سے پہلے (آزادی ملتے ہی) گویا کہ ۱۹۴۸-۵۲ کے درمیان میں دیش کے لگ بھگ سبھی صوبوں سے زمینداری کو ختم کر دیا گیا تھا۔ نتیجتاً دو کروڑ کاشتکاروں کو مستقل روزگار یعنی زمینوں پر حقِ ملکیت مل گیا۔ اب تک تقریباً ۵۰ لاکھ ہیکٹیئر زمین بے زمین کسانوں کو تقسیم کی جا چکی ہے۔ بیواؤں، نابالغوں، فوجیوں یا معذور لوگوں کو یہ آزادی دی گئی ہے کہ وہ اپنی زمین کاشت کے لیے اوروں کو دے سکتے ہیں جسے "پٹہ داری نظام" کہتے ہیں۔ کاشتکاری کو ترقی دینے کے لیے بہت سے قوانین و ضوابط بھی وضع کیے گئے ہیں۔ زمینی اصلاحات کے تحت چک بندی، سینچائی کا بہتر بندوبست اور زمین کے کٹاؤ پر قابو وغیرہ اقدامات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اب تک لگ بھگ ۵ کروڑ ہیکٹیئر کی چکبندی ہو چکی ہے۔ ۱۹۵۲ میں اچاریہ ونوبا بھاوے جی نے بھودان آندولن شروع کر کے ۱۹۷۰ء تک گرام دان کے تحت ۱۸۷۰۴ ہزار گاؤں دان میں حاصل کیے تھے۔ اس کے علاوہ سبز انقلاب کے ذریعہ بھی کاشتکاروں کو راحت، دیش کو مسرت اور بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرنے کے نتیجہ خیز اقدامات کیے جا چکے ہیں۔

۳۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی نشو و نما

چھوٹی، گھریلو صنعتوں کو ترقی اور وسعت دے کر بے روزگاری کے مسئلے سے نمٹا جا سکتا ہے۔ ایک موقع پر گاندھی جی نے کہا تھا: "بھارت کی نجات گھریلو چھوٹی صنعتوں میں پوشیدہ ہے۔" ان صنعتوں کو وسعت دے کر کروڑوں لوگوں کو روزگار دلایا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے بھارتی سرکار نے بھی مذکورہ صنعتوں کو ترقی دی ہے۔ چھوٹی صنعتوں کے لیے محفوظ اشیاء کی تعداد ۱۸۰ سے بڑھا کر ۸۳۴ کر دی گئی ہے اور دستکاروں کو صلاح و مشورہ دینے کے لیے ۴۰۰ ضلع کیندر کھولے گئے ہیں۔ اس وقت ہمارے ملک میں لگ بھگ تین لاکھ چھوٹی اور گھریلو صنعتیں چل رہی ہیں۔ لہٰذا ان کے نشو و نما پر دیش میں سالانہ ۸۰ کروڑ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ ساتویں پلان کے تحت زراعت پر سے دباؤ کم کر کے صنعتوں کو روزگار کی بنیاد بنایا جائے گا۔

۴۔ پیشہ ورانہ تعلیم کا بندوبست

بے روزگاری دور کرنے کے لیے موجودہ نظامِ تعلیم میں ایسی تبدیلی کی جائے گی کہ تعلیم سے فارغ ہو کر ہر نوجوان اپنا نجی کاروبار شروع کر سکے۔ اتر پردیش سرکار نے اس ضمن میں خصوصی کوششیں کی ہیں۔ جولائی ۱۹۸۲ سے ہائی اسکول میں نئی تعلیمی پالیسی نافذ کی گئی ہے جس میں طلباء کے لیے کسی ایک چھوٹی صنعت کو سیکھنے کا انتظام ہے۔ ساتویں یوجنا کے دوران نئی تعلیمی پالیسی کو ملک بھر میں نافذ کرنے کے ارادے سے

موجودہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے خاص دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے۔ نئی پالیسی میں اس مقصد کے حصول پر زور دیا گیا ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد تعلیم یافتہ نوجوان خود کو با روزگار محسوس کرے، وہ روزگار یا JOB کے لیے کسی کا دست نگر نہ رہے۔ فی الحال اس نئی پالیسی کے لیے رائے عامہ اور تجاویز جمع کی جا رہی ہیں اور اس کے ہر پہلو کا بغور جائزہ لیا جا رہا ہے۔ یقین ہے کہ مذکورہ نئی تعلیمی پالیسی کے لاگو ہونے کے چند سالوں بعد بیروزگاری کی دنیا میں انقلاب آجائے گا۔

۵۔ دیہاتوں تک بجلی کی رسائی

جتنے زیادہ دیہاتوں تک بجلی پہنچے گی اتنی ہی زیادہ بیروزگاری کا مسئلہ حل ہوگا۔ نئے نئے چھوٹے اُدیوگ شروع ہوں گے۔ لوگوں کو روزگار ملیں گے۔ ہمارے ملک میں بھی اس سمت خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔ بہت کم گاؤں پورے بھارت میں ایسے رہ گئے ہیں، جو بجلی کے فیوض سے ہنوز محروم ہیں۔ پہلی یوجنا سے چھٹی یوجنا کے خاتمہ تک سرکار نے اس جانب خاصی توجہ دی ہے اور یقین ظاہر کیا ہے کہ ساتویں منصوبے کے دوران بھارت کے ہر گاؤں کو بجلی مہیا کر دی جائے گی۔

۶۔ بیروزگاری بھتہ دینے کا بندوبست

بیروزگاروں کو مایوسی و محرومی کا مسلسل شکار بننے سے بچانے کے لیے انھیں بیروزگاری الاؤنس دے کر بھی غلط راہوں پر چلنے سے روکا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں بھارت میں بھی کچھ کام ہو رہا ہے، مثلاً مغربی بنگال، پنجاب، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر اور بہار صوبوں میں رجسٹرڈ بیروزگاروں کو بے روزگاری بھتہ دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ صرف مسئلے کا وقتی حل ہے۔ اسے مستقل طور پر بیروزگاری کا حل مان لینا بہت خطرناک ہے۔

۷۔ روزگار دفاتر کا قیام

روزگار دلانے اور روزگار کی رسائی کرنے کے لیے روزگار دفاتر (employment exchange) کا قیام بھی بہت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ہماری سرکار نے ایسے دفتروں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ ۱۹۵۰ میں یہ صرف ۱۴۳ تھے جو ۱۹۸۰ میں بڑھ کر ۶۱۵ تک پہنچ گئے ہیں۔ جو بیروزگار نوجوانوں کے لیے کسی نہ کسی حد تک آسودگی کے ذرائع فراہم کرتے ہیں۔ ساتویں منصوبے کے شروع ہوتے ہی مذکورہ دفاتر کو یہ ذمہ داری بھی سونپی گئی ہے کہ وہ اپنے کرمچاریوں کو تعلیمی اداروں وغیرہ میں وقتاً فوقتاً بھیج کر نوجوانوں کو نئے روزگاروں اور نوکریاں حاصل کرنے کی تیاریوں کے بارے میں بتایا کریں۔

۸۔ روزگار سے متعلق معلومات کا پرچار

دیش بھر میں لوگوں کو نوکریوں اور نئے نئے روزگاروں کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرنے کا بندوبست ہو تو بہت سے نوجوان بیکاری سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ یہ مسرت کا مقام ہے کہ بھارت سرکار اس سلسلے میں برسوں سے روزگار کا پارٹروں، اخباروں، ریڈیو، دور درشن وغیرہ کے ذریعے مطلوبہ معلومات دیش کے کونے کونے میں پہنچاتی جاتی ہے۔ سرکاری دفتر کار کے ذریعے "روزگار سماچار" اور ٹی وی کے ذریعے "روزگار پتریکا" وغیرہ کی اشاعت قابلِ ستائش ہے۔

۹۔ بیروزگاری بیمہ کا اہتمام

بیروزگاری بیمہ بھی بیکاری کے کٹھے نتائج کو کم کر سکتا ہے۔ اس قسم کے بیمہ اسکیم کے تحت دورانِ ملازمت معذور ہو جانے یا مر جانے کی صورت میں مالی امداد حاصل کر کے اپنے بال بچوں کی پرورش بہ آسانی کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں بھارت سرکار نے بھی ملازمین کو لازمی بیمہ اسکیم کے تحت لا کر ان کے مستقبل کو امید افزا بنانے کی کوشش کی ہے۔

۱۰۔ اعلیٰ تعلیم کی حد کا تعین

ہائر سیکنڈری پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم (گریجویشن ..... وغیرہ) صرف انھیں نوجوانوں کو حاصل کرنے کا حق ہو جو واقعی ذہین طالب علم ہوں۔ معمولی اور ذہن رکھنے والوں کو پیشہ ورانہ تعلیم دے کر روزگار میں مصروف کر دیا جانا چاہیے۔ ہمارے دیش میں ابھی تو اس سلسلے میں باقاعدہ کوئی قانون یا ضابطہ نافذ نہیں ہوا ہے۔ البتہ تعلیمی اداروں میں سخت مقابلے (competition) کی وجہ سے ذہین طلبا کو ہی ہائر ایجوکیشن کے لیے داخلہ ملتا ہے۔ ہاں نئی تعلیمی پالیسی کے نفاذ کے بعد خود بخود تعلیم کی حد کا تعین ہو سکتا ہے۔ ساتویں منصوبے میں اس کی توقع کی جانی چاہیے۔

۱۱۔ تعمیری کاموں میں اضافہ

تعمیری کاموں میں اضافہ کرکے بھی بیروزگاری کے مسئلے کو حل کرنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ ہمارے ملک میں ہر ایک منصوبے کے دوران سڑکوں، مکانوں، شجرکاری، تحفظِ زمین اور ٹیلوں وغیرہ کے سلسلے میں تعمیری کاموں پر کروڑہا روپے صرف کئے جاتے ہیں۔ یہ کام ساتویں منصوبے کے دوران اور بھی بڑھ جائیں گے اور افرادی قوت کا صحیح استعمال ہوسکے گا۔

ساتویں منصوبے میں بیروزگاری دور کرنے کے اقدامات

۱۹۸۵ – ۸۶ ساتویں منصوبے کا پہلا سال ہے۔ اپنے روایتی مقاصد کی تلاش کے ساتھ ساتھ یہ منصوبہ "غذا" کام اور پیداوار میں اضافہ" پر مشتمل ہے۔ کمیشن کے مطابق اس منصوبے میں (۱) زرعی پیداوار (خصوصاً غذائی اجناس) میں تیزی سے اضافہ (۲) روزگار فراہم کرنے والے پروگراموں اور اسکیموں پر خاص توجہ نیز (۳) زراعت اور صنعتی پیداوار میں مزید اصلاح ... کے مقاصد سب سے زیادہ توجہ کے لائق ہوں گے۔

ساتویں منصوبے کی مدت (۱۹۸۵ – ۹۰) میں کل ۱۸۰۰۰ ۴۸ کروڑ روپے (۱۹۸۴ – ۸۵ کی قیمتوں پر) خرچ کرنے کا تخمینہ ہے۔ یہ خرچ چھٹے منصوبے کے مقابلے میں ۵۵ فیصد زیادہ ہے۔ جہاں ترقیاتی پروگراموں میں اخراجات کی رقوم میں اضافہ ہوا ہے، وہیں منصوبے کے آخر تک غریبی کے خط سے نیچے زندگی گذارنے والوں کی تعداد کو ۳۰ کروڑ (چھٹے منصوبے) سے گھٹا کر ۱۰ کروڑ پر لے آنے کا نشانہ بھی ہے۔ اس طرح دیش کا یہ منصوبہ اپنے سے پہلے کسی بھی منصوبے کے مقابلے میں زیادہ امید افزا ہے۔

روزگار اسکیموں کے تحت مزدوروں، خصوصاً موسمی بیروزگاروں، تعلیم یافتہ بیروزگاروں اور خواتین کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کرائے جائیں گے۔

اس یوجنا سے پہلے تک ہمارے دیش میں سرکاری اندازے کے مطابق تقریباً ۳۷،۰۰۰ کروڑ روپے کا کالا دھن موجود تھا، جسے مختلف تدابیر سے قومی ترقی کے لیے ظاہر کرانے کا بھی بڑے پیمانے پر بندوبست اسی یوجنا میں کیا گیا ہے۔ الغرض ہمہ گیر ترقیاتی پروگراموں اور اسکیموں پر توجہ سے مراد یہی ہے کہ سرکار بیروزگاری کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے ساتویں پلان میں پوری طرح مستعد اور پُرعزم ہے۔

مشہور و معروف ماہرِ اقتصادیات شری وی۔ کے۔ آر۔ وی راؤ کے الفاظ میں:

"ہمارے منصوبہ کاراُن بہت سے گمبھیر اور مختلف اقسام کے مسائل سے نمٹنے کی کوشش کر رہے ہیں، جو ہمارے متعدد اور اکثر باہمی اختلافات کے ذریعہ پیدا کیے گئے ہیں۔ وہ ایسے مسائل کو تھوڑا تھوڑا کرکے نمٹا رہے ہیں، کیوں کہ اس کے لیے ضروری معلومات کی کافی کمی ہے اور اس سے ان میں ترقی پذیر اصولوں کے لیے قومی بیداری پیدا کرنا ہے۔"

ہماری ذمہ داری

کسی بھی قومی مسئلے کو حل کرنے کے لیے صرف سرکاری کوششوں سے ہی کام نہیں چلتا، جب تک عوام بھی سرکار کی کوششوں میں اپنی جدوجہد شامل نہ کریں۔ اس لیے بے روزگاری سے نمٹنے کے لیے ہمیں سرکاری اقدامات کا خود بھی علم ہونا چاہیئے اور دیگر افراد کو بھی اس سے روشناس کرانا چاہیئے تاکہ بیروزگار نوجوان سرکاری سہولیات و مراعات سے فائدہ اٹھاکر روزگار حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکیں۔ ہمیں عام جنتا میں اس جذبے کو بیدار کرنا چاہیئے کہ بیروزگار افراد (SELF EMPLOYMENT) کی طرف راغب ہوں۔ سرکاری نوکریوں کے پیچھے نہ بھاگیں، جن لوگوں کے ہاں کوئی آبائی پیشہ چلا آرہا ہو تو وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسی پیشے سے منسلک ہوجائیں اور اپنے علم کے زور پر اسے اس نہج پر ترقی دیں کہ دیگر بے روزگاروں کو بھی وہ روزگار سے لگا سکیں۔ فعال اور مثالی شہری وہی ہے، جو قومی مسائل کو حل کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوسکے!

اس فرض سے ہمیں روگردانی نہیں کرنی چاہیئے۔ ہر شہری اگر اپنے اس فرض کو نبھانے لگے تو ہمارے ملک سے بہت جلد بیروزگاری کے مسئلے کا صفایا ہوسکتا ہے۔ ●

جدید ٹیکنالوجی

بھارتی ڈاک و تار نے یہاں کے ٹیلی کمیونیکیشن نظام میں جدید ٹیکنالوجیاں رائج کرنے میں بڑی پیش رفت کی ہے۔ اب الیکٹرانک ایکسچینج ٹیلی فون سروس اور ٹیلیکس کے لیے بڑے بڑے شہروں میں نصب کئے جارہے ہیں۔ ڈیجیٹل الیکٹرانک ایکسچینج کے کل پرزے تیار کرنے والی فیکٹریوں کے لگائے جانے سے بھارتی ٹیلی کمیونیکیشن نظام میں جدید ٹیکنالوجی کے اجزاء پر بڑا زور ڈالنا ممکن ہو جائیگا۔

پیغام رساں مصنوعی سیّارے

نشریاتی شعبے میں پیغام رساں مصنوعی سیّارے تیزی کے ساتھ دنیا بھر میں ریڈیو سگنل نشر کرنے کا اہم ترین ذریعہ بن رہے ہیں۔ یہ مصنوعی سیّارے علامتی طور پر پست تر فریکوئنسیوں (FREQUENCIES) پر کام کرتے ہیں اور مائکرو ویو فریکوئنسیوں پر پیغام موصول کرنے اور انھیں زمین پر واپس بھیجنے والے ٹرانسپونڈروں کا کام دیتے ہیں۔ مصنوعی سیّارے متعلقہ ٹرانسپونڈر سسٹم کی کل نشریاتی صلاحیت کا تعین کرتے ہیں۔ انٹیلسیٹ پنجم میں جو اب کام کر رہا ہے ۵۰ ٹرانسپونڈر ہیں جو مصنوعی سیّارے کی پیغام رسانی کے لیے ۶۰ ہزار صوتی چینلوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ پیغام رساں مصنوعی سیّارے کے ذریعے فی صوتی چینل کی لاگت پر بھاری کمی ہوئی ہے۔ ٹیکنالوجی میں جو پیش قدمی ہوئی ہے اس کے نتیجے میں ہم امید کر سکتے ہیں کہ پیغام رساں مصنوعی سیّارے مستقبل کی پیغام رسانی کے نظام میں نشریات کا اہم ترین ذریعہ بن جائینگے۔

کمپیوٹری مواصلات

۱۹۵۰ کی دہائی میں کمپیوٹر کی آمد سے انتہائی مختلف اقسام کی بے شمار معلومات کا ناقابلِ یقین حد تک تیز رفتاری کے ساتھ تجزیہ اور ترسیل کرنا ممکن ہو گیا۔ اس کام کے لیے کمپیوٹر نے بے مثل طاقت فراہم کی۔ معلومات کی بے پناہ مقدار کو اتنی ہی تیز رفتاری سے نپٹانے سے متعلق کمپیوٹر کی صلاحیت نے نوعِ انسانی کو ایک کلیتہً نئے سماج کے ابتدائی مرحلوں میں لا کھڑا کیا ہے۔ یہ ایک معلوماتی سماج ہے۔ ایک ایسا سماج جو تہذیب کی ہیئت کو بدل رہا ہے۔ جس طرح صنعتی انقلاب نے دو صدی سے زیادہ عرصہ پہلے ترقی کی ایک بڑی بلندی پر چڑھنا شروع کیا تھا۔

مواصلاتی صنعت میں ٹیکنالوجی میں ہونے والی تبدیلی ایک ایسی تبدیلی ہے جو کسی واحد ٹیکنالوجیکل ترقی پر انحصار نہیں رکھتی۔ یہ تبدیلی تمام تر ٹیکنالوجی کو چند برسوں میں ہی اوپر سے نیچے پھینک سکتی ہے۔ یہ چند امور کی ترقی کے ملے جلے سلسلے سے پیدا ہوتی ہے یعنی کمپیوٹروں کی لاگت، پیداوار میں کمی، کمپیوٹری طاقت کی نت نئی بڑھتی ہوئی ضرورت، کم لاگتی مواصلاتی تکنیکوں کی دستیابی۔ معلومات کی منتقلی اب ایک بڑا اور تیزی سے بڑھتا ہوا کاروبار بن گئی ہے۔ اب کمپیوٹر ٹیلی فون پر کسی دوسری مشین کو جس کے ساتھ اسے منسلک کیا جاتا ہے، پیغامات نشر کر سکتا ہے اور اس سے ایک نیا صنعتی انقلاب تشکیل پا رہا ہے۔

اب کمپیوٹر سازی تعیش نہیں رہیگا، جو بڑی صنعتی پارٹیوں یا بڑے دولت مندوں کے لیے محفوظ ہو۔ اب کوئی بھی شخص جو ایک ٹیلی فون کی استطاعت رکھ سکتا ہے، کمپیوٹر سروس سے بھی فیضیاب ہو سکتا ہے۔ ہم ایسے وقت سے جبکہ کمپیوٹر ایک ایئر کنڈیشنڈ روم میں ایک بہت بڑی الماری بنا ہوا ہے ایک ایسے وقت کی جانب بڑھ رہے ہیں جبکہ وہ دیوار میں برقی سوئچوں اور بٹنوں کے ساتھ ایک پلگ سے جڑا ہوا ہوگا۔ اب کسی کمپنی کے لیے تیزی سے ممکن ہو رہا ہے کہ وہ معلومات کو ترتیب دینے، جمع اور موصول کرنے اور منتقل کرنے سے متعلق سرگرمیوں کے لیے ایک دور افتادہ کمپیوٹر کا استعمال کرے جن کے لیے کمپنی کی مشینوں سے کام لیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ میٹر پڑھنے، خطرے کا سگنل دینے، بکنگ، ٹکٹ جاری کرنے اور نشستیں محفوظ کرنے سے متعلق کام کیا جا سکتا ہے۔ اگر کافی تعداد میں گاہک مل کر ایک طاقتور کمپیوٹر اور اس کے پروگراموں کے اخراجات برداشت کریں تو معلومات کی خود بخود ترتیب اور منتقلی کا کام چھوٹی اور بڑی تنظیموں کی بہت بھاری تعداد کی پہنچ کے اندر آسکتا ہے۔ بلاشبہ ایک ایسی ٹیکنالوجی پر مبنی کاروبار شروع کرنے کے لیے متعدد حکمت عملیاں ہیں جن میں کمپیوٹری سروس مختلف اوقات پر باہمی طور پر بانٹی جا سکتی ہے۔ اور اس ٹیکنالوجی کے گرد ایک کمپنی کی تنظیم کرنے کے کئی طریقے ہیں جن سے وہ ایک منافع بخش اور مضبوط ادارہ بن سکتی ہے۔

اب ایک ایسا مرحلہ آگیا ہے جب ٹیلی کمیونیکیشنز نظاموں کے لیے ایک [illegible]ظیم بنانا ضروری ہے جس سے وہ قریبی طور پر منسلک ہوں اور کمپیوٹری کارخانوں کے لیے ضروری ہوگیا ہے کہ وہ ملک کو مستقبل کے تیز تر سے ابھرتے

(باقی صفحہ [illegible] پر)

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi.

Vol. 6 No. 4

YOJANA (URDU)

16-31 May 1986

راحت پروین

جراثیم کُش دواؤں کا استعمال احتیاط سے کریں

ہمارے ملک میں ۵۱ ـ ۱۹۵۰ء میں ۲۰۰۰ ٹن جراثیم کُش دواؤں کا استعمال ہوتا تھا جو ۷۹ ـ ۱۹۷۸ء تک بڑھ کر ۵۶ ہزار ٹن ہو گیا اور اس کی کھپت دن بدن بڑھتی گئی۔

ہمارے ملک میں کھیتی میں جو انقلاب آیا اس میں کیمیاوی کھاد اور پودوں کی حفاظت کے لیے جراثیم کش دواؤں کا اہم رول رہا ہے۔ ہمارے ملک میں جو جراثیم کُش دوائیں استعمال کی جاتی ہیں ان میں ڈی۔ ڈی۔ ٹی، بی۔ ایچ۔ سی، ایلڈرن، انڈرس، ہپٹا کلور، انڈوسلفین، میلاتھئین، لنڈین اور کلورڈین اہم ہیں۔ جراثیم کُش دواؤں کو بے احتیاطی سے چھڑکنے والوں کے لیے یہ جان لیوا ہو سکتا ہے۔ اس لیے جراثیم کُش دواؤں کو چھڑکنے کے لیے احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔

- جراثیم کُش دواؤں کی بوتلوں، ڈبوں اور پیکٹ پر استعمال کے طریقے لکھے ہوتے ہیں۔ ہمیں ان طریقوں کا پورا پورا لحاظ رکھنا چاہیئے۔
- دوا جس کنٹینر میں ہو اس میں رکھی رہنے دینا چاہیئے تاکہ دوبارہ استعمال کرتے وقت دی گئی ہدایتوں کو دوبارہ سے دیکھا جاسکے۔
- جراثیم کش دواؤں کا چھڑکاؤ کرتے وقت ناک پر کپڑا باندھ لینا چاہیئے تاکہ دوا کا زہریلا اثر سانس کے ذریعے اندر نہ جاسکے۔
- جراثیم کُش دواؤں کا چھڑکاؤ کرتے وقت چشمہ لگا لینا چاہیئے تاکہ دوائیں آنکھوں میں نہ جاسکیں۔
- جراثیم کُش دواؤں کو اپنے جسم پر نہ لگنے دیں۔ یہ احتیاط ایسی دواؤں کے استعمال میں اور بھی زیادہ ضروری ہے جن میں پانی نہ ملایا گیا ہو۔
- دواؤں کے چھڑکاؤ کے بعد ہاتھ، مُنہ، پیر اچھی طرح دھو لینا چاہیئے، بہتر یہی ہے کہ غسل کر لیا جائے۔
- دوا چھڑکتے وقت کچھ بھی کھانا پینا نہیں چاہیئے۔ یہاں تک کہ اس وقت پان بھی نہیں کھانا چاہیئے۔
- دوائیں چھڑکنے کا کام صبح کے وقت اور شام کے وقت کرنا چاہیئے۔ جب ہوا تیز چل رہی ہو اس وقت دوا کا چھڑکاؤ نہیں کرنا چاہیئے۔
- جراثیم کُش دوا چھڑکنے کے بعد آلہ کو اچھی طرح دھولیں اور اس کو اس طرح سُکھانا چاہیئے کہ سارا پانی نکل جائے۔ اس کو کھانے پینے کے سامان سے دُور رکھنا چاہیئے۔ یہاں تک کہ جانوروں کے چارے سے بھی دُور رکھیں۔
- دواؤں کو ایسی جگہ رکھیں جہاں بچے نہ پہونچ پائیں۔ ممکن ہو تو ایسی دواؤں کو تالہ میں بند کر کے رکھنا چاہیئے۔
- جراثیم کُش دواؤں کے خالی ڈبے اور لفافے فوراً جلا دینے چاہئیں۔
- جس آدمی کے جسم پر کوئی زخم ہو تو چھڑکاؤ کرتے وقت خیال رکھے کہ دوا زخم تک نہ پہنچ پائے۔ بہتر ہوگا کہ ایسے آدمی چھڑکاؤ کا کام نہ کریں۔

ان تمام احتیاط کو برتنے کے بعد اگر کسی آدمی کو دوا کا اثر محسوس ہو تو فوراً (First Aid) کروانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور ڈاکٹر سے مشورہ لینا چاہیئے۔

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5, Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یکم تا ۱۵ جون ۱۹۸۶

ایک روپیہ

ماحول کا تحفظ
ایک پیچیدہ مسئلہ
(بمن بیسو)

اتر پردیش میں اعلیٰ
تعلیم کی ترقی
(محمد مرتضیٰ)

حمیرہ سلطانہ

مدھیہ پردیش میں سرکاری دفتروں کو گاؤں کے ہاٹ بازار تک لے جانے کا انوکھا تجربہ

مدھیہ پردیش میں جنوب مغرب میں جھابوآ ضلع ہے۔ اس میں ۸۰ فیصدی سے بھی زیادہ قبائلی لوگ (بھیل) رہتے ہیں۔ بھیل لوگوں کے بسنے کا ایک الگ ہی طریقہ ہے۔ ہر بھیل خاندان اپنی جھونپڑی یا مکان دوسروں سے الگ فاصلے پر بناتا ہے۔ جو اپنے کھیت کے قریب ہوتا ہے اس طرح دور دور تک بھیلوں کے مکان یا جھونپڑے پھیلے ہوتے ہیں۔ اور ان سب کو ملا کر جب ایک مکمل گاؤں کہا جاتا ہے تو وہ تقریباً چھ سات کلومیٹر (مربع) میں پھیلا ہوتا ہے۔ جھابوآ ضلع کی جغرافیائی بناوٹ بھی ایسی ہے کہ زمین پتھریلی اور ناہموار ہے، چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور لاتعداد قطاروں میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ بیشمار چھوٹے بڑے ندی نالے ہیں اور جنگل گھنے ہیں۔ ایسی صورت میں غریب اور ناخواندہ لوگوں کے لیے نہ صرف نقل و حرکت مشکل ہے بلکہ وہ ان سرکاری دفتروں تک بھی نہیں پہونچ پاتے جن سے ان کو اپنی زمین جائداد کے سلسلے میں کام پڑتا ہے۔ ساتھ ہی جو سرکاری اہل کار مختلف قسم کے رفاہِ عام کے کاموں کے لیے مامور کئے جاتے ہیں۔ وہ بھی ہر گاؤں تک جانے کی ہمت نہیں کرتے۔

اس پس منظر میں مدھیہ پردیش سرکار نے ایک انوکھا تجربہ کیا۔ جو ۱۹؍ نومبر ۱۹۸۵ء سے شروع کیا گیا۔ بھارت کے دیہاتی علاقوں میں جس طرح ہفتہ وار بازار ہاٹ لگتے ہیں، اسی طرح جھابوآ ضلع کے قبائلی علاقوں میں بھی ہاٹ لگتے ہیں۔ یہ ہاٹ بھیلوں کے سماجی اور معاشرتی زندگی کے مرکز ہیں۔ ہر بھیل اپنے گاؤں کے نزدیک ترین ہاٹ والے گاؤں ضرور جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہاٹ کی اجتماعی اہمیت بھی بہت ہے۔ اس کا ضلع انتظامیہ نے فائدہ اٹھانے کے لیے ہفتہ میں ایک بار لگنے والے ۹۴ ہاٹوں میں سے ۲۰ کو چنا۔ ان بیس ہاٹوں میں ضلع کے اُن اہل کاروں کے کیمپ لگانے کا انتظام کیا گیا جن سے دیہاتی لوگوں کو کام پڑتا ہے۔ ہر کیمپ کا ذمہ دار ایک افسر ہوتا ہے جو تحصیل دار، نائب تحصیل دار، بی۔ ڈی۔ او وغیرہ کی حیثیت کا ہوتا ہے۔ اس کیمپ میں اُن سب ہی محکموں کے اہل کار بیٹھتے ہیں جن کا براہِ راست تعلق گاؤں سے ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اُس علاقے کے پٹواری، گرام سیوک وغیرہ بھی موجود رہتے ہیں۔

کیمپ کا طریقۂ کار یہ ہے کہ وہاں جو بھی درخواست پیش کی جاتی ہے اُسے ایک رجسٹر میں درج کیا جاتا ہے۔ درخواست دینے کے لیے ایک ٹوکن تیار کیا جاتا ہے۔ اس کی تین کاپیاں بنائی جاتی ہیں جن میں سے ایک درخواست دینے والے کو دی جاتی ہے۔ دوسری متعلقہ محکمہ کو بھیجی جاتی ہے اور تیسری ریکارڈ کے لیے رکھی جاتی ہے — درخواست پر متعلقہ محکمہ کا اہل کار اسی وقت عمل کرتا ہے اور اگر مسئلہ فوراً حل ہو سکتا ہے تو اسی وقت کارروائی کر دی جاتی ہے، لیکن اگر اس سلسلے میں صدر مقام کے ریکارڈ دیکھنے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے تو درخواست وہاں روانہ کر دی جاتی ہے اور درخواست دینے والے کو ایک ہاٹ چھوڑ کر اگلے ہاٹ کی تاریخ دیدی جاتی ہے اور طے شدہ تاریخ پر درخواست دینے والے کو فیصلہ بتا دیا جاتا ہے۔

اس منصوبے کا ایک اہم فائدہ یہ ہوا ہے کہ اپنے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے گاؤں کے لوگوں کو مختلف دفتروں کے چکر نہیں کاٹنا پڑتے اور ساتھ ہی ان کا اِن محکموں سے رابطہ قائم ہو جاتا ہے جس سے ان کو مختلف ترقیاتی اسکیموں سے فائدہ

(باقی صـ۱۳ پر)

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

• چیف ایڈیٹر — آر۔ ٹھکرال
• اسسٹنٹ ایڈیٹر — محمد عادل صدیقی
• سب ایڈیٹر — وسیم حیدر

جلد ۶	یکم تا ۱۵ جون ۱۹۸۶	شمارہ ۵

۱۱ جیشٹھ تا ۲۵ جیشٹھ شک ۱۹۰۸ ÷ ٹیلیفون ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سالہ ۳۵ روپے، سہ سالہ ۵۰ روپے

فی کاپی :- ایک روپیہ

طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :-

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منجال

ترسیل زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

نئی تعلیمی پالیسی

نئی تعلیمی پالیسی میں تعلیم کو مرکز اور ریاستوں کی ملی جلی ذمّے داری میں رکھا جا رہا ہے۔ اس سے قومی سطح پر نظامِ تعلیم کو رائج کرنے میں آسانی رہے گی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ریاستی سرکار کی تعلیم کے بارے میں ذمہ داری کو کسی بھی طرح کم کیا جا رہا ہے۔ بلکہ اس محاذ پر ریاستی حکومت کی پیش قدمیاں بدستور چلتی رہیں گی۔ تعلیم کو مشترکہ فہرست میں رکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ قومی سطح پر ایک ایسا نظامِ تعلیم رائج کیا جا سکے جس سے ہندوستان بھر کے طالب علموں کو یکساں نوعیت اور یکساں معیار کی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع بآسانی حاصل ہو سکیں۔ یہ صحیح سمت میں ایک قدم ہے۔ اس کا کھلے دل سے خیر مقدم کیا جانا چاہیئے۔ پارلیمنٹ کی طرف سے اس نئی تعلیمی پالیسی کو منظوری حاصل ہو جانے کے بعد سب سے پہلے اسکولوں میں درکار بنیادی نوعیت کے سامان کی فراہمی پر زور دیا جائے گا۔ اس کے لیے بھی ملک گیر پیمانے پر پروگرام شروع کیا جائے گا۔ اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ پرائمری تعلیم پورے زور و شور سے ملک گیر پیمانے پر آگے بڑھے اور ۱۴ سال تک کی عمر کے سبھی بچے تعلیم کے مواقع پا سکیں اور وہ درمیان میں تعلیم نہ چھوڑیں۔ البتہ اس عظیم کام کو پوری طرح انجام دینا مشکل ہے، لہٰذا قومی سطح پر غیر رسمی تعلیم کا نظام کارگر رہے گا۔ اس طریقے سے وہ لوگ فائدے اٹھا سکیں گے جو کسی وجہ سے درمیان میں ہی تعلیم ترک کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس سے ایسے طلبا اور طالبات مستفید ہو سکیں گے جو پورے دن اسکول کے لیے وقت نہیں کر سکتے۔ محنت کش بچے اس پروگرام سے خاص طور سے مستفید ہوں گے۔ لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے مربوط کوششیں درکار ہوں گی اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے قابلِ عمل پروگرام وضع کرنے ہوں گے۔ تعلیم کے ذریعے طلبا اور طالبات میں "بھارتی" ہونے کا جذبہ پروان چڑھانے پر زور دینا بہت ضروری سمجھا گیا ہے۔ اس کے ذریعے سیکولرازم اور جمہوریت کی اقدار کو فروغ دیا جائے گا نیز مبنی بر انصاف سماج کے قیام کے لیے کوششیں کی جائیں گی۔ یہی نہیں بلکہ مشترکہ بنیادی نصاب کی مدد سے تنگ نظری، توہمات اور تعصبات کو دور کرنے کے لیے کام کرنا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک عظیم کام ہے مگر اس کی کامیابی کے لیے اخبارات، والدین، مختلف برادریوں کے رہنماؤں اور رضاکار اداروں کا تعاون بیحد ضروری ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی اس طرح سے نئی کوششوں کی نقیب ہے۔ اس میں بہت سے خیالات تو وہی ہیں جو ۶۶-۱۹۶۴ء کے تعلیمی کمیشن کی رپورٹ میں مذکور ہیں۔ نئی تعلیمی پالیسی وضع کرتے وقت ان کو سامنے ضرور رکھا گیا ہے۔ البتّہ ان پر مکمل طور پر عمل درآمد نہیں ہو سکا تھا۔ ہندوستان میں تعلیمی اصلاحات کے سلسلے میں بہت سے کمیشنوں اور کمیٹیوں کی رپورٹیں سامنے ضرور رہی ہیں۔ مگر عمل درآمد ہی وہ واحد کسوٹی ہے جس کی بنیاد پر اُن کی کامیابی یا ناکامی کو پرکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ نئی تعلیمی پالیسی پر عمل درآمد کے لیے جو عزم دیکھنے کو ملتا ہے، وہ اس پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں استادوں کا رول خاص طور پر اہم ہے۔ تعلیم کے شعبے میں استادوں کی ذمّہ داریاں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ پالیسی پر عمل درآمد کے لیے اُستاد ہی ذمّہ دار ہوں گے۔ اس لحاظ سے استادوں کی تربیت اور عصری تقاضوں سے اُن کی مناسبت بیحد ضروری ہے۔ ان کو اعتماد میں لینا اور سماج میں جائز مقام دلانا بہت ضروری ہے۔ اسکولوں میں جو استاد پڑھا رہے ہیں، ان کی تربیت کے لیے ایک پروگرام بنایا بھی گیا ہے جس کے تحت ۵ لاکھ استادوں کو تربیت دی جائے گی۔ یہ پروگرام انسانی وسیلہ کے فروغ کی مرکزی وزارت اور تعلیمی تحقیق و تربیت کی قومی کونسل نے مرتب کیا ہے تاکہ نئی تعلیمی پالیسی پر مؤثر انداز سے عمل درآمد ہو سکے۔ ایک مرحلہ وار پروگرام کے تحت ملک بھر کے ۳۵ لاکھ استادوں کو اس پروگرام سے فائدہ پہونچایا جائے گا۔ اس طرح کے مختلف پروگراموں کا آغاز ہو چکا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سینکڑوں اسکول آج بھی ایسے ہیں جہاں تختۂ سیاہ، سیاہ نہیں ہیں، کرسیوں کے چار پائے نہیں ہیں۔ استادوں پر زبردست دباؤ ہے اور طلبا کی کثیر تعداد کو ایک ہی وقت میں پڑھانا پڑتا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اسکولوں میں بنیادی نوعیت کی سہولتیں فراہم کی جائیں اور صاف ستھری اور کھلی فضا میں طلبا اور طالبات کو پڑھنے کا موقع دیا جائے تاکہ اُن کی شخصیت ابھر کر سامنے آسکے۔

(اسسٹنٹ ایڈیٹر)

ہمنت لبو

ماحولیات کا عالمی دن

ماحول کا تحفظ
ایک پیچیدہ مسئلہ

ماحول کے بگڑنے اور اس میں آلودگی کے عناصر بڑھ جانے کے مسائل انتہائی پیچیدہ ہیں۔ مصنف کی رائے میں اس کا کوئی ایک واحد حل نہیں ہے۔ اس کے حل سے متعلق کسی بھی موثر حکمتِ عملی کو اپنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس مسئلہ کی عمل نوعیت کی دشواریوں پر غور کیا جائے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس کا تعلق چونکہ انسانوں سے ہے، لہٰذا انسانی عادتوں اور خصلتوں کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ اس سلسلے میں محض قانون سازی کا عمل ناکافی ہوگا، قانون سازی کے عمل کے ساتھ ساتھ ضرورت اس کی ہے کہ اس پر موثر نفاذ عمل ہو۔ اس سلسلے میں عمل درآمد کے محاذ پر پائی جانے والی خامیوں کو دور کیا جانا بہت ضروری ہے ورنہ بصورتِ دیگر چند ناعاقبت اندیش لوگوں کے غلط کاموں کی قیمت بدستور پوری ہی ادا کی جاتی رہے گی۔

ھر سال ۵ جون کو عالمی سطح پر ماحول کے تحفظ کا دن منایا جاتا ہے۔ اس کا مقصد پوری دنیا کی توجہ اس مسئلہ کی سنگینی کی طرف مبذول کرانا ہوتا ہے۔ اس وقت پوری دنیا میں ماحول کا تحفظ اور اسے آلودگی سے پاک وصاف کرنا وقت کی بڑی ضرورت ہے۔ اس موقع پر سیمینار منعقد کیے جاتے ہیں، نمائشیں ہوتی ہیں، اخبارات میں خصوصی مضامین کی اشاعت ہوتی ہے۔ ریڈیو اور ٹی۔وی سے خاص خاص پروگرام اس مسئلہ کی شدت کو واضح کرتے ہیں۔ مگر ان سب کوششوں کا مقصد ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ماحول کے تحفظ اور اسے آلودگی سے بچانے کے کام کی اہمیت بتائی جائے۔ حالانکہ ہر سال اس طرح کی کوششیں کی جاتی ہیں لیکن ماحول کا تحفظ زیادہ تر ایک ایسا موضوع ہے جس کے بارے میں عوام الناس کم ہی جانتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس کی سنگینی، اس کے مختلف پہلوؤں اور اس کی مختلف شکلوں سے ناواقف ہیں۔ اس کا مقصد محض چند جانوروں، پودوں، پرندوں وغیرہ کا تحفظ ہی نہیں، اس کا تعلق محض شجرکاری سے ہی نہیں۔ آلودگی پھیلانے والی بڑی بڑی صنعتوں پر پابندی عائد کرنا ہی نہیں، یا اس کا مقصد محض ماحول کو صاف ستھرا بنانا ہی نہیں بلکہ ماحول کے تحفظ کے تحت مذکورہ جملہ امور کو انجام دینا ہے۔ اس کا معاملہ بالکل ہاتھی اور اندھے آدمی والا ہے، جب تک اندھے آدمی کو ہاتھی نہ دکھا دیا جائے، اس وقت تک وہ اس بڑے جانور کی وسعت اور اس کے پھیلاؤ کو کم ہی سمجھ سکتا ہے۔

بایوڈائیورسٹی کا تحفظ

ماحول کے تحفظ کے مسئلے سے دلچسپی رکھنے والے کو جس پریشان کن مسئلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ ہے بایوڈائیورسٹی کا تحفظ۔ بائیوڈائیور

کیا ہے؟

یہ زمین کی سطح پر مٹی، پانی اور ہوا کی نرم و نازک پرت ہے، روئے زمین پر عام جاندار مخلوق انھیں کی مرہونِ منت ہے۔ یہ تینوں چیزیں بائیواسفیر کا ہی حصہ ہیں۔ بائیواسفیر میں ہوا، پانی اور مٹی کی نوعیت مسلسل بدلتی رہتی ہے۔ جاندار مخلوق اور ان کے درمیان عمل اور ردِ عمل کا سلسلہ مختلف شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ جاندار مخلوق بذاتِ خود طبیعاتی ماحول پر منحصر ہے اور اس ماحول کو خود انسان بناتا اور بگاڑتا ہے۔ ان دونوں میں ایسا ربط قائم ہے کہ کسی ایک میں بنیادی تبدیلی، دوسرے میں بنیادی اور دُور رس تبدیلیوں کا موجب بنتی ہے۔ اور کبھی کبھی اس تبدیلی سے دونوں کو نقصان پہونچتا ہے۔

انسان کی سرگرمیاں مختلف طرح سے اس کے ماحول پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر کان کنی، معدنیات کی کھوج، درختوں کا کاٹنا، انھیں تعمیراتی اور ایندھن کے لیے کام میں لانا، جنگلات کا کاٹنا یہ سب کام مٹی کو خراب کرتے ہیں اور اسے نقصان پہونچاتے ہیں۔ صنعتوں میں استعمال کیا جانے والا ایندھن اور گھروں میں جلائی جانیوالی لکڑی اور گوبر وغیرہ فضا کو مکدّر کرتے ہیں۔ زرعی کیمیاوی اجزا کا بڑے پیمانے پر استعمال، جراثیم کش دواؤں کا استعمال، صنعتی کارخانوں سے باہر آنے والا کچرا، دھواں اور فاضل مادّہ، آبی وسائل کو گندا کرتے ہیں، جنگلی جانوروں پر اندھا دھند گولی چلانا، ان کا شکار کرنا، توازنِ قدرت کو بگاڑتا ہے اور اکثر مفید جانوروں کی نسلیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔

مٹی کا نقصان

بائیواسفیر میں سب سے زیادہ نقصان مٹی کو پہونچا ہے، حالانکہ یہی وہ اہم حصّہ ہے جس سے پودے خوراک لیتے ہیں۔ اور اسی پر بالآخر تمام مخلوق کا انحصار ہے۔ ہزاروں ٹن زرخیز مٹی ہر سال خراب ہو جاتی ہے۔ مٹی کے کٹاؤ کا عمل اس کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان نے زمین کے استعمال میں احتیاط نہیں برتی۔ ایک اندازے کے مطابق ہندوستان میں کم سے کم ۱۷۵ لاکھ ہیکٹیر گویا کہ ہندوستان کے کل خشکی کے رقبے کا ۵۳ فیصد، مٹی کے کٹاؤ اور زمین کے غیر محتاط استعمال کی زد میں آتا ہے۔ ہندوستان میں ۱۴ کروڑ اراضی پر کاشت ہوتی ہے، اس کا ۶۰ فیصد حصہ چھ ماہ میں مٹی کے تحفظ کے اقدامات کا فوری طور پر طالب ہو جاتا ہے۔ ایک اور اندازے کے مطابق ہر چھ ماہ میں اس سے کہیں زیادہ مٹی بہہ جاتی ہے، جتنی کہ کشمیر سے کنیا کماری اور کچھ سے کوہیما تک تعمیرِ مکانات میں لگائی گئی اینٹوں میں مٹی درکار ہوتی ہے۔

ہندوستان میں مٹی کا تحفظ نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں آبرسانی نظام ناقص ہے۔ زرعی پیداوار میں اضافے کی غرض سے آبرسانی کی غرض سے استعمال کی جانے والی نہریں بے حد اہم ہیں۔ لیکن ان کا ایک نقصان بھی ہے اور وہ یہ کہ ہرے بھرے میدان پانی کو روک کر شور زمین یا کھاری زمین بناتے ہیں اور وہ زمین بے کار پڑی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں تقریباً ۷۰ لاکھ ہیکٹیر اراضی گزشتہ چند برسوں میں ناقابلِ کاشت ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ زمین کھاری بن گئی اور کھیتی کے مطلب کی نہ رہی۔ مزید ۶۰ لاکھ ہیکٹیر اراضی وہ ہے جہاں پانی رُکا ہوا ہے۔

زمین کا ریگستان میں تبدیل ہونا

آج دنیا کے بیشتر حصے ریگستان میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں، انسان خوراک، مکان اور ایندھن کے لیے زمین پر جو اختیار رکھتا ہے اس کے زیرِ اثر ہی زمین ریگستان بنتی ہے۔ عام خیال یہی ہے کہ زرخیز زمین ریتیلی زمین میں بدل جانے سے وہ ناقابلِ کاشت بن جاتی ہے لیکن زمین کی ہیئت بھی آہستہ آہستہ بدلتی ہے۔ اس کے زیرِ اثر زرخیز اراضی جاتی یا اپنی پیداواری صلاحیت کھو دیتی ہے۔ اس کا سبب درختوں کا کاٹنا، مویشیوں کے لیے زمین کو چراگاہ کے طور پر استعمال کرانا، اور زمین کو اینٹوں وغیرہ کی تیاری کے لیے بھٹّہ کی صورت میں استعمال کرنا۔ کبھی کبھی اصل ریگستانوں سے ہزاروں میل دوری پر بھی ریگستان بننے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ زمین کی پیداواری صلاحیت محض پانی کی کمی کے سبب ہی نہیں بلکہ پانی کی زیادتی کے سبب بھی جاتی رہی ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ دنیا کے دوسرے ریگستانی علاقوں کے مقابلے ہندوستان کے بنجر علاقے اپنے لیے بیحد مسائل رکھتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ ہندوستان میں آبادی کا دباؤ ۷۰ فی مربع کلو میٹر سے زیادہ ہی ہے، لہٰذا ہندوستان کے ریگستانی علاقوں کا شمار دُنیا کے اُن چند علاقوں میں ہوتا ہے جہاں کی آبادی بہت زیادہ ہے۔

قانون اس کا علاج نہیں

بہت سے لوگ جنگلات کے تحفظ کے قانون پر سختی سے عمل درآمد کو ہی درختوں کے کاٹنے کے عمل کو روکنے کا موثر علاج جانتے ہیں۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام کی بنیادی ضرورتوں کا بھی جائزہ لیا جائے۔ انسان کی خوراک، مویشیوں کے لیے چارے نیز ایندھن وغیرہ کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ دُور دراز علاقوں میں لوگ درخت دو وجہ سے کاٹتے ہیں۔ درختوں سے وہ ایندھن حاصل کرتے ہیں، دوسرے درختوں سے

زمین کو خالی کر کے اس پر مکان بناتے ہیں یا پھر اس پر کھیتی کرتے ہیں یا چارہ اُگاتے ہیں۔ ان کے پاس ایندھن کا متبادل نہیں ہے۔ اگر ان ضرورتوں کے متبادلات انھیں مل سکیں تو وہ اس کارروائی سے رُک سکتے ہیں۔

حیوانات کو متحرک بنانا ضروری ہے اور عوام کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل پر توجہ دینی ضروری ہے۔

آبی آلودگی

بائیواسفیر کا ایک اہم حصّہ پانی ہے۔ ہندوستان میں پانی کے ذخیروں کی کمی نہیں لیکن وہ زیادہ تر آلودہ ہے۔ نیشنل انوائرنمنٹ انجینیرنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سروے کے مطابق ہندوستان میں دستیاب پانی کا ۷۰ فیصد حصّہ آلودہ ہے۔ انسانی آبادیوں کے ذریعے جسقدر پانی گندہ کیا جاتا ہے، وہ صنعتی کارخانوں سے نکلنے والے فضلے کے سبب گندے پانی کے مقابلے چار یا پانچ گنا ہوتا ہے۔ یہ زیادہ تر اچھے پانی کے ساتھ مل جاتا ہے، اُسے صاف بنانے یا کیمیاوی عمل کے ذریعے اس کے ٹریٹمنٹ کا کوئی بندوبست نہیں ہے بلکہ ۳۱۱۹ شہروں اور قصبات میں سے صرف ۲۱۷ میں جزوی سیوریج یا مکمل سیوریج نظام ہے۔

گویا کل شہری آبادی میں ایک تہائی سے بھی کم آبادی سیوریج ٹریٹمنٹ کی سہولتوں سے فائدہ اُٹھا رہی ہے۔ اس حالت میں اس کے مُضر اثرات کا جو ملک کے عوام کی صحت پر مرتب ہوں گے، اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہندوستان میں تمام بیماریوں کا دو تہائی حصہ پانی کے سبب پیدا شدہ بیماریوں سے ہے۔ یعنی میعادی بخار، دستاں، پیچش وغیرہ کی بیماریاں گندے پانی کے سبب ہی ہوتی ہیں۔

آبی آلودگی سے آبی جانوروں پر بھی مُضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے سبب بڑے پیمانے پر مچھلیاں مرتی ہیں۔ صنعتی کارخانوں سے نکلنے والا گندہ اور کیمیاوی اثرات رکھنے والا پانی جب پانی کے ذخیروں میں ملتا ہے تو اس سے پانی کے جانوروں پر مُضر اثرات پڑتے ہیں۔ یہ بیماری اور خامی ہندوستان کے مختلف خطّوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اسی وجہ سے اکثر دریاؤں سے ملنے والی مچھلیوں کی تعداد روز بروز کم ہو رہی ہے۔

حال ہی میں دریائے گنگا کی صفائی کے لیے سنٹرل گنگا اتھارٹی قائم کی گئی ہے، اس اقدام کا بڑے پیمانے پر خیر مقدم کیا گیا ہے مگر یہ اس بڑے مسئلے کا صرف ایک چھوٹا سا حصّہ ہے۔ یہ اس بڑے مسئلے کے حل میں تھوڑی سی مدد ضرور کرے گا۔ دریائے گنگا کے طاس میں بیشمار معاون دریا ہیں۔ یہ دریا اس بڑے دریا میں گرتے ہیں۔ یہ دریا گنگا میں آلودگی کو بڑھاتے ہیں۔ طاس کے علاقے میں مٹی کے کٹاؤ سے دریا کے پانی کے نیچے اور آس پاس ریت کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ اس مسئلے کے حل کے سلسلے میں ان تمام باتوں پر نگاہ رکھنی ضروری ہے، ورنہ تو صفائی کا یہ عمل جزوی ہو کر رہ جائے گا۔ اس پلان میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ اس میں صنعتی آلودگی کو کم کرنے کی کوئی ٹھوس اسکیم شامل نہیں کی جا سکی ہے۔ انسداد آلودگی کے موجودہ قوانین میں بہت سی خامیاں ہیں۔ اگر صنعتی کارخانوں سے نکلنے والی آلودگی کو نہ روکا گیا تو پلان بے سُود ہو کر رہ جائے گا۔

فضائی آلودگی

بائیواسفیر کا ایک تیسرا جزو ہوا ہے، جس کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے، اس لیے چند معمولی قسم کے بیکٹیریا اس کلیے سے مستثنیٰ ہیں۔ اچھی، کھلی اور صاف ہوا کے بغیر صحت اچھی نہیں رہ سکتی۔ لیکن آج صاف شفاف اور کھلی ہوا نایاب اور کمیاب ہے۔ بڑے شہروں میں تو اس کا ملنا اور بھی دشوار ہے۔ صنعتی پیداوار کا عمل، موٹر ٹرانسپورٹ اور مختلف طرح کے ایندھنوں کا استعمال فضائی آلودگی کو اور بڑھاتے ہیں۔

فضائی آلودگی سے ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگر پانی گندہ ہو تو اسے پینے سے بچا جا سکتا ہے۔ یا اسے صاف بنا کر پیا جا سکتا ہے لیکن گندی ہوا میں سانس لیے بغیر گزر ممکن نہیں۔ جیسی بھی ہوا ہوگی، اسی میں سانس لینا ضروری ہوگا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ فضائی آلودگی کے خطرات نظر نہیں آتے۔ فیکٹری کی چمنی سے نکلنے والا کالا دھواں یا موٹر گاڑیوں سے نکلنے والا دھواں نظر آ جاتا ہے اور اس پر قابو پانا آسان ہے۔ لیکن یہ فضائی آلودگی کا ایک معمولی سا حصہ ہے۔ اور مقابلتہً کم نقصان دہ ہے۔ لیکن بہت سی ایسی گیسیں ہیں جو بہت زیادہ خطرناک ہیں اور جو عام فضائی حالات میں نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ ان میں کاربن مونو آکسائڈ، سلفر ڈائی آکسائڈ، نائٹروجن آکسائڈ اور کینسر پیدا کرنے والے کاربن وغیرہ خصوصی معائنوں اور آلات کی مدد سے ہی پرکھی جا سکتی ہیں۔

دھواں

ہندوستان کے شہروں میں فضائی آلودگی سے متعلق ایک حیران کن حقیقت یہ ہے کہ ان میں موٹر گاڑیوں کی تعداد مغربی ممالک سے زیادہ نہیں بلکہ بہت کم ہے لیکن اس کے باوجود آلودگی کی سطح یہاں وہی ہے جو مغربی ممالک میں۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ یہاں موٹر گاڑیوں کی دیکھ ریکھ کم ہے، پھر ان کو سڑکوں پر لانے کے لیے کسی قسم کی کوئی روک تھام نہیں۔ انڈین اسٹینڈرڈز انسٹی ٹیوشن کے معیار اور ہدایت

کے بموجب اسپارک اگنیشن انجن سے چلنے والی موٹر گاڑیوں میں جو کاربن مونو آکسائڈ باہر آتی ہے، وہ اگیز اسٹ گیسز کے حجم کے ۲ فیصد سے زیادہ نہ ہونی چاہیئے۔ ایسی گاڑیوں کو جو پانچ سال سے زیادہ کی نہیں ہیں، بلحاظ حجم ۵ء۴ فیصد سے زیادہ مونو آکسائڈ نہیں پھینکنی چاہیئے لیکن دلی میں آبی آلودگی کی روک تھام سے متعلق مرکزی بورڈ کی طرف سے کیے گئے ٹیسٹ کے مطابق (یہی بورڈ دلی میں آلودگی کی روک تھام کرتا ہے)۔ ۵۰ فیصد کے لگ بھگ دو پہیہ گاڑیاں، ۳۰ فیصد تین پہیہ گاڑیاں اور ۴۲ فیصد چار پہیہ گاڑیاں اس معیار پر پوری اُترتی ہیں۔ باقی گاڑیوں سے باہر آنے والا کاربن مونو آکسائڈ بہت زیادہ ہے۔

دلی میں کیے گئے مطالعوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس شہر میں بہت زیادہ ٹریفک والے بہت سے مقام اتصال اور چوراہے گاڑیوں سے نکلنے والے دھوئیں سے بہت زیادہ آلودگی کا شکار ہیں۔ اس طرح کے مطالعے آٹھ چوراہوں پر کیے گئے اور وہاں آلودگی کی سطح مجوزہ حدود سے بہت زیادہ پائی گئی۔ بسوں اور ٹرکوں سے نکلنے والا دھواں مجوزہ حدود سے بہت زیادہ رہا۔

تھرمل پلانٹ

ہندوستانی شہروں میں تھرمل بجلی تیار کرنے والے پلانٹ بھی فضائی آلودگی بڑھاتے ہیں۔ یہ بڑے بڑے شہروں کے وسط میں ہیں۔ ان میں کوئلہ استعمال ہوتا ہے۔ اس میں اگرچہ گندھک کم ہوتا ہے لیکن راکھ زیادہ ہوتی ہے۔ کبھی کبھی راکھ کا تناسب ۴۰ فیصد ہوتا ہے۔ فلائی ایش کی صورت میں آلودگی بڑھتی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ سلفر ڈائی آکسائڈ بھی کافی مقدار میں نکلتا ہے۔ دلی میں بجلی تیار کرنے والے دو بڑے بجلی گھر ہیں۔ ان سے ہر روز ۵۰۰ ٹن فلائی ایش نکلتی ہے۔ اس کے علاوہ ۷۰ ٹن سلفر ڈائی آکسائڈ باہر آتی ہے۔ اس کی روک تھام کے لیے جدید آلات کی تنصیب کے باوجود اس کی کافی مقدار فضا میں پھیل جاتی ہے۔ الیکٹرو اسٹیٹک پرکاسی پی ٹیٹرز (electro-static Precipitators) بھی اس پر کُلّی طور پر قابو نہیں پا سکے۔

ہندوستانی شہروں میں اس مسئلے کی سنگینی اور اس کی روک تھام پر پوری توجہ نہیں کی جا سکی ہے۔ اس وجہ سے اکثر صحت کے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ سے سانس کی بیماریاں ہونے لگی ہیں اور ٹی۔ بی بھی ہو جاتی ہے۔ موٹر سواروں کو اس کی مُطلق فکر نہیں کہ اس سے کتنا دھواں نکلتا ہے اور اس سے دوسروں کی صحت پر کتنے مُضر اثرات پڑتے ہیں۔ اس طرح کی گاڑیاں چلانے والوں کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہیں کی جاتی، مقدمات نہیں چلائے جاتے۔ فضائی آلودگی کی روک تھام سے متعلق مرکزی ایکٹ ۱۹۸۱ء بن جانے کے باوجود ہندوستانی شہروں میں آج بھی بہت زیادہ آلودگی ہے اور یہ دُنیا کے اُن شہروں میں شمار ہوتے ہیں جو اپنی آلودگی کی زیادتی کے باعث مشہور ہیں۔

انرجی کی ضرورتیں

انرجی اور ماحول کی آلودگی کے مسائل ہر جگہ ایک دوسرے سے جُڑے ہیں۔ تیسری دنیا کے ترقی پذیر ملکوں کی صورتِ حال ترقی یافتہ ملکوں سے مختلف ہے۔ فضائی آلودگی کے ایسے مسائل دونوں جگہ یکساں طور پر ہیں جیسا کہ ایندھن کے سبب ہیں یا جو گاڑیوں سے باہر نکلنے والے دھوئیں کے سبب ہیں۔ لیکن ترقی پذیر ممالک کو دیہات میں بسنے والی آبادی کے لیے انرجی کے وسائل بھی فراہم کرنے ہیں۔ آج کل دیہات میں ایندھن زیادہ جلتا ہے، لیکن جنگلات کے صفائے اور درختوں کے اندھا دھند کاٹنے سے زمین اور مٹی کے نقصانات بڑھ گئے ہیں۔ لہذا دیہات میں انرجی کے متبادل وسائل تلاش کرنے پر زور دینا ہے۔ پھر اُن کو عوام میں مقبول بنانا ہے۔ عوام کو بدلتے ہوئے حالات سے واقف کرانا ہے۔ اس کے تئیں بیداری لائے بغیر جنگلات کی کٹائی کو نہیں روکا جا سکتا۔

قدرتی حالات کی جانچ اور پرکھ پر نظر رکھنے میں نمایاں مقام رکھنے والے ڈاکٹر سالم علی نے کہا ہے کہ ہندوستان میں قدرتی ماحول کے تحفظ کے لیے جامع انداز کے قوانین موجود ہیں۔ "ہندوستان دنیا کے اُن ملکوں میں ہے جہاں بہتر سے بہتر قانون موجود ہے لیکن ان پر عمل درآمد کے لیے نظام موثر نہیں ہے۔"

ہندوستان میں قدرتی ماحول کو بگڑنے سے بچانے کے لیے ان خامیوں پر قابو پانا ضروری ہے۔ ●

ہرسکھ شاہ

ماحولیات کا عالمی دن

بھارت کا پہلا بحری نیشنل پارک

بھارت کا پہلا بحری نیشنل پارک جام نگر کے نزدیک خلیج کچھ میں قائم کیا گیا ہے تاکہ ماحولیاتی تحفظ کے پروگرام کے حصے کے طور پر اس علاقے میں مرجانی جزائر کا تحفظ کیا جا سکے۔ مصنف نے جس نے حال ہی میں اس نیشنل پارک کا دورہ کیا تھا اس علاقے میں پائی جانے والی نباتاتی اور حیوانی زندگی اور مرجانوں کی وسیع اقسام کا واضح ذکر کیا ہے۔

گجرات نے جام نگر اور اوکھا کے نزدیک خلیج کچھ میں ایک بحری نیشنل پارک کا قیام کرکے ایک اور پہل کی ہے۔ اس کے قیام کا مقصد اس علاقے میں پائے جانے والے مرجانی جزائر کا تحفظ کرنا ہے۔ یہ ملک میں اپنی قسم کا پہلا پارک ہے۔

خلیج کے اس حصے میں جہاں مدّو جزر آتے رہتے ہیں، آبی زندگی اور پرندوں کی عجیب و غریب اقسام پائی جاتی ہیں جو مرجانی پتھریلے ساحلوں اور چمرنگ درختوں کے جنگلات میں سکون کے ساتھ سکونت پذیر ہیں۔ یہ اُس وقت کی نکالکے سرویئر جنرل ہورنیل تھے جو سابقہ ریاست جام نگر کی دعوت پر آئے تھے اور جنھوں نے انکشاف کیا تھا کہ خلیج کے اس حصے میں آبی اور ارضی جانور بہت بھاری تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے تمام تر اوکھا منڈل ساحل (ضلع جام نگر) کا سروے کیا تھا اور کہا تھا کہ انھوں نے اس قدر محدود مقام میں اتنی زیادہ آبی زندگی کبھی نہیں دیکھی۔ درحقیقت اُس وقت کی جام نگر ریاست نے اس علاقے میں موتی نکالنے کی صنعت کو بھی فروغ دیا تھا۔

برسوں تک اس علاقے میں پرائیویٹ پارٹیوں کی طرف سے زندہ اور بے جان مرجان اعلیٰ قسم کا سیمنٹ تیار کرنے کے لیے نکالا جاتا تھا۔ کسی وقت تمام ساحل کے ساتھ ساتھ چمرنگ درختوں کے گھنے جنگل پائے جاتے تھے۔ یہ درخت ۱۵ سے ۲۰ میٹر تک بلند تھے۔ چمرنگ میں عجیب خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اپنی زیادہ بلندی کے باعث وہ بھیانک سمندری طوفانوں اور مدّو جزر کی رفتار اور اثر کو کم کرنے میں مفید ثابت ہوئے ہیں۔ جس سے ساحلی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی جائداد اور زمین کو بہت کم نقصان پہنچتا ہے۔ یہ اس حقیقت کے پیش نظر بالخصوص مفید ہیں کہ آج بھی اس علاقے میں سمندری طوفان آتے رہتے ہیں۔ اس علاقے اور نواحی سوراشٹر کے خطّے کے دیگر ساحلی علاقوں میں ہر دو یا تین برس کے بعد شدید سمندری طوفانوں سے بھاری تباہی ہوتی رہتی ہے۔

چمرنگ درختوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ سمندری نمک کو جذب کرنے اور زرخیز زمینوں میں شوریت کے دخول کو روکنے کی سکت رکھتے ہیں۔ آج سوراشٹر، کچھ کے تمام تر سمندری ساحل کو شوریت کے خطرے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو نباتات اور زرخیز زرعی اراضیات میں سموئی جا رہی ہے۔

بحری نیشنل پارک کے ۴۲ جزائر میں دوسرا بڑا جزیرہ "پیروتان" ہے حال ہی میں یہاں کا دورہ کرنے سے انکشاف ہوا کہ ساحل پر صرف ایک ہی درخت علامتی طور پر استادہ ہے جہاں کبھی گھنا جنگل ہوتا تھا۔

چمرنگ درخت

اس جزیرے کے تمام تر ساحل پر اب چھوٹے چھوٹے چمرنگ درخت پائے جاتے ہیں یہ جاننا باعث دلچسپی ہوگا کہ یہ لفظ "پیروتان" کیونکر مقبول عام ہوگیا ہے۔ دراصل سمندری ساحل کے بالکل قریب ایک "پیر کا مزار ہے جس کی عبادت واگھیر لوگ کرتے ہیں۔ واگھیر اس علاقے کا ایک مسلم فرقہ ہے۔ اصل لفظ ہے" پیر۔ جو۔ تھان" جس کا مقامی کچھی بولی میں مطلب ہے "پیر کی نشست گاہ"۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ یہ جزیرہ "پیروتان" کے نام سے مشہور ہو گیا یہ علاقہ ہندوستان کے جنگلات کے ایک محافظ، شری سنت چوان کے مطابق کاشت کار ایندھن اور واگھیر لوگ اپنے مویشیوں کے لیے چارہ حاصل کرنے کے لیے ان درختوں کو کاٹ لیا کرتے تھے۔

جب حکومت گجرات کو یقین ہو گیا کہ اس علاقے میں مرجان کی وسیع اقسام کے علاوہ اعلیٰ نباتاتی اور حیوانی زندگی موجود ہے تو اس نے بحری زندگی کی تیزی سے ختم ہو رہی انواع کا موثر تحفظ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے جس چیز کی فوری ضرورت تھی وہ تھی علاقے کی ترقی کے بجائے اس کی حفاظت۔ کافی غور و خوض کے بعد حکومت کی طرف سے ۱۶۲٫۸۹ مربع کیلومیٹر علاقے کا بحری نیشنل پارک اور ۴۵۷٫۹۲ مربع کیلومیٹر علاقے کا بحری پناہ گاہ کے طور پر اعلان کیا گیا۔ حکومت کی طرف سے پہلے ان پانچ پٹوں کو منسوخ کر دیا گیا جو پرائیویٹ سیمنٹ پلانٹوں کو چونے کے پتھر کو کھودنے کیلئے دیئے گئے تھے جن میں اس علاقے کے مرجان بھی شامل تھے۔

دوسرے مرحلے میں بحری نیشنل پارک کے جزائر کے اردگرد کے تمام تر ساحل کے ساتھ ساتھ چمرنگ درخت بہت بھاری تعداد میں اگانے کے لیے زبردست کوششیں کی جا رہی ہیں بسردست حکام اس امر کے حق میں نہیں ہیں کہ زیادہ سیاحوں کو اس پارک میں آنے کی اجازت دی جائے۔ صرف ملک کے مختلف حصوں کے پرستاران فطرت کی انجمنوں کے اراکین اور طلبا کے گروپوں کو پارک میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی ہے۔ وہ بھی پیروتان جزائر میں۔ جب سمندر اتر جاتا ہے تو انھیں سمندر کے اندر لے جایا جاتا ہے اور اس علاقے کی نباتاتی و حیوانی زندگی کے بارے میں براہ راست معلومات فراہم کی جاتی ہیں اور اس کے علاوہ اس امر کے لیے بھی ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ چند روز کے لیے کیمپ لگائیں اور رضاکارانہ طور پر چمرنگ کے پودے لگائیں۔

پیروتان جزیرہ جام نگر سے ۱۸ کیلومیٹر دور ہے اور وہاں ایک چھوٹی کشتی سے پہنچا جا سکتا ہے۔ جب حالات سازگار ہوں مرجانی ساحلوں پر زندگی کی صورت اور رنگوں میں جو گوناگونی پائی جاتی ہے ویسی کہیں اور نہیں پائی جاتی۔ مرجانی ساحل ازخود جاندار مخلوق کا کام ہے۔ مرجانی ساحل بعض نامیات کی جانب سے مسلسل تعمیری عمل ہے۔ مرجانی ساحل نہ صرف اپنی حیوانی زندگی بلکہ چھوٹے چھوٹے نباتاتی پلانٹوں کو بھی جائے امن مہیا کرتے ہیں۔ ان کی موجودگی باہمی طور پر دونوں کے لیے مفید ہے۔ دراصل مرجانی ساحل کے ساتھ ساتھ چمرنگ دلدل جہاں نباتاتی اور حیوانی زندگی کے لیے بہترین جائے پناہ ہیں وہاں وہ نسل بڑھانے کے لیے اچھی خوراک، پناہ گاہ اور سہولیات بھی فراہم کرتے ہیں۔ یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ مرجان ساحل پر زندہ مادے کا تقریباً ۱۰ فیصد ہوتے ہیں جب کہ باقیماندہ ۹۰ فیصد حصہ بحری زندگی، اسفنج، اینی مون، جھینگا مچھلیوں، لوبسٹروں کیکڑوں، اوکٹوپس، اسٹار فش اور دیگر غیر معمولی گوناگوں بحری زندگی پر مشتمل ہوتا ہے۔ اوکٹوپس مردہ اور زندہ مرجانی سنگلاخ کا سرگرم مکین ہے جس کا زیر سمندر مرجانی دنیا کا اولین شہری کے طور پر خصوصی ذکر کرنے کی ضرورت ہے۔

پیروتان جانے کے لیے بہترین دن ہیں ہر قمری مہینے کے ہر پکھواڑے میں ششم اور دو کے آٹھویں نویں، دسویں اور گیارہویں دن۔ پارک میں مانسونی ایام کے علاوہ تمام سال جا سکتے ہیں۔

سمندر کے اترنے کے بعد جب پانی کم ہو جاتا ہے تو آٹھ کیلومیٹر بڑی مشکل سے چلنا پڑتا ہے چند میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد آنکھوں کے سامنے ایک نئی اور رنگا رنگ بحری زندگی کا خوشنما منظر آ جاتا ہے۔ سمندر کی تہہ دلدلی ہوتی ہے اس لیے پانی کی ایک چھوٹی ندی میں سے مرجانیہ تک جانا ہوتا ہے اور اس طرح رنگا رنگ مچھلیاں اور دیگر مخلوق دکھائی دیتی ہے۔ اسفنج کی تقریباً ۷۰ انواع (نرم اور سخت قسم کی) کا کچھ کی خلیج میں اندراج کیا گیا ہے۔ وہ عجیب و غریب رنگوں جیسے گلابی، سرخ، نیلگوں، ہلکے نیلے، بھورے، بسنتی اور نارنجی رنگوں میں پائی جاتی ہیں۔

اوکٹوپس (ہشت نیش صدفہ) زیر سمندر مرجانی دنیا کے اولین شہری کے طور پر پانی کو اچھالتی ہوئی تیزی سے حرکت کرتی ہے اور اپنے گرد و پیش کے مطابق رنگ بدلتی ہوئی فوراً ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

مختلف رنگوں، صورتوں اور جسامتوں کی تقریباً ۱۵۰ سے ۲۰۰ تک اقسام ہیں جن میں کوئی ۱۸ قسم کی شارک اور مرجانی سنگلاخ ہیں، اس علاقے میں پائی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی بٹر فلائی مچھلی، ننھی ٹائیگر شارک اور ڈولفن بھی دیکھنے کو ملتے

ہیں۔ دوسری اہم بحری مخلوق ہیں سانپ اور کچھوے۔ یہ ایک اہم بات ہے کہ بڑی تعداد میں سمندری سبز کچھوے، دُور دراز کے نسل بڑھانے کے بحری علاقوں سے ستاروں سے رہنمائی پاتے ہوئے اور سمندری رودوں سے ہوتے ہوئے ایک ایسے طریقے سے جس سے انسان ابھی تک ناآشنا ہے، ہجرت کرکے ان مرجانی جزائر میں آتے ہیں۔

شری جے آر پرمار کے مطابق جو بحری نیشنل پارک کے انچارج ہیں اگرچہ وسائل کی کمی کے باعث کوئی بڑا ترقیاتی پروگرام عمل میں نہیں لایا جا سکا تاہم حکام مرجانوں اور چمرنگ درختوں کی بھی مزید تباہی روکنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ تاہم پیردتان جزیرے پر ایک لاکھ روپے کی لاگت سے ایک بلاک کی تعمیر کرنے اور جام نگر میں ایک بحری زندگی کا عجائب گھر قائم کرنے کی تجویز ہے۔ علاوہ ازیں بھارت کو اُن انڈوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے بین الاقوامی ذمہ داری، کو نباہنا ہے جو بحری نیشنل پارک میں سے گذرتے ہوئے کچھوے چھوڑ جاتے ہیں۔ کچھوؤں کی نسل بڑھانے کے مرکز منگرول، سلایا، پیرامبٹ اور مانڈوی میں قائم کئے جارہے ہیں۔ انڈوں کو ان مرکزوں میں سیتے ہیں اور کچھوؤں کے بچوں کو کھلے سمندروں میں چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ آگے کی جانب چلے جائیں۔

توقع کی جاتی ہے کہ فطری توازن اور ماحولیاتی تحفظ کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہوئے عالمی بینک جیسے بین الاقوامی ادارے تحفظاتی اسکیموں اور چھوٹے پیمانے کے ترقیاتی پلانوں میں مدد کرنے کے لیے آگے آئیں گے۔ یہ ایک بہت بڑی میراث ہے جسے ہم نے آنے والی نسلوں کے لیے بطور امانت رکھا ہے۔

بقیہ، صنعتی ترقی کے لیے بائیوٹیکنالوجی

استعمال کے سلسلے میں بمشکل آغاز کیا ہے۔ الیکٹرانک اور کمپیوٹروں کے مواقع کے بارے میں بہت کچھ سیکھا اور کیا جارہا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ بائیوٹیکنالوجی اور تولیدی انجینئرنگ کے مواقع سے آگاہ نہیں ہیں۔ حال ہی میں وزیراعظم جناب راجیو گاندھی نے ان ٹیکنالوجیوں کا ذکر کیا ہے اور انھیں فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

ساتویں منصوبے میں بائیوٹیکنالوجی

ساتویں منصوبے کے عرصے کے دوران بائیوٹیکنالوجی کو زبردست ترقی دی جائے گی حکومت نے بڑی فصلوں کی پیداوار میں روکاوٹوں کو دور کرنے اور توانائی کے قابلِ تجدید وسائل پر انحصار کم کرنے کے لیے بائیوٹیکنالوجی کے شعبے میں بنیادی تحقیقی پروگراموں کو تیزی سے عمل میں لانے کا پلان بنایا ہے۔

اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے کہ یہ نئی ٹیکنالوجی ناگزیر ہے حکومت کی طرف سے ۱۹۸۲ء کے اواخر میں نیشنل بائیوٹیکنالوجی بورڈ کا قیام کیا گیا۔ بورڈ نے فوری دلچسپی کے شعبوں کے طور پر تولیدی انجینئرنگ فوٹوسنتھیسس، ٹشو کلچر، انیزائم، الکوحل کی تیاری اور امیونوٹیکنالوجی کا انتخاب کیا ہے۔

بائیوٹیکنالوجی کے تجارتی امکان کے بارے میں بیداری پیدا ہو رہی ہے اور ملکی مصنوعات کو فروغ دینے کے لیے وسیع محاذ پر کوششیں کی جارہی ہیں اور تحقیقی اداروں کی بڑی تعداد نے سرگرم بائیوٹیکنالوجی تحقیقی پروگرام تیار کئے ہیں۔ سرسری طور پر ۶۰ سے زیادہ تحقیقی اور ترقیاتی ادارے اس وقت تحقیق و مطالعہ میں مصروف ہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور حوصلہ افزا امر دلی کے قریب پہلے "سینٹر فار جنیٹک انجینئرنگ اینڈ بائیوٹیکنالوجی کا قیام ہے جس کی تیاری میں یونیڈو (اقوام متحدہ کی صنعتی ترقیاتی تنظیم) نے مدد دی ہے۔

بقیہ، انرجی کے متبادل ذرائع کی تلاش

ہوائی طاقت اس جگہ ہی پیدا کی جا سکتی ہے جہاں ہوا کی رفتار کم از کم دس سے لے کر پندرہ ناٹ ہو۔ ہوا کی رفتار کم اور زیادہ ہونے سے بھی پلانٹ پر بہت اثر پڑتا ہے جس سے بجلی پیدا کرنے میں کافی پریشانی ہو جاتی ہے۔ ونڈ پاور کے پلانٹ کو حالات کے مطابق ڈھالنے کے لیے تجربے کر رہے ہیں لیکن ابھی تک کی تحقیقات سے جو بجلی پیدا کی گئی ہے اس کی لاگت بہت زیادہ آتی ہے۔

اس سلسلے میں سائنسدانوں کی ایک بڑی کامیابی یہ رہی ہے کہ وہ ۱۲۵ میگاواٹ کا یونٹ لگانے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن پلانٹ کی تنصیب کی لاگت میں کمی کی ضرورت ابھی بہت زیادہ ہے۔ پلانٹ کی تنصیب کی لاگت زیادہ ہونے کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ایک میگاواٹ پلانٹ کے لیے روٹر ڈسک ROTOR DISC کا قطر ۶۰ میٹر رکھنا پڑتا ہے۔

ہندوستان میں ونڈ پاور کی طرف خاص دھیان نہیں دیا گیا ہے۔ لیکن راجستھان کے مغربی علاقے میں ونڈ پاور سے خاصی بجلی پیدا کی جا سکتی ہے جہاں ہوا کی رفتار ۲۰ سے ۳۰ ناٹ تک رہتی ہے لیکن ابھی مزید تحقیق درکار ہے۔

محمد مزمل

اترپردیش میں اعلیٰ تعلیم کی ترقی

یونیورسٹیوں اور ڈگری کالجوں کے ذریعے فراہم کی جانے والی تعلیم کو اعلیٰ تعلیم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس میں گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ، مختلف اقسام کے ڈپلوما اور ڈاکٹریٹ ڈگری کی تعلیم و تحقیق شامل ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کی فراہمی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی فراہمی کے مقابلے زیادہ مہنگی ہے۔ اس لیے اعلیٰ تعلیم کا فروغ اتنی آسانی سے ممکن نہیں ہے جتنا کہ ابتدائی تعلیم وغیرہ کا۔ لندن اسکول آف اکنامکس ہائر ایجوکیشن ریسرچ یونٹ نے ترقی پذیر ممالک کے سربراہانِ تعلیم کو متنبہ کیا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینے کے پہلے اور اسے عمومی طور پر فراہم کرنے کی پلاننگ کے وقت اس بات کو ضرور مدِ نظر رکھا جانا چاہیے کہ اعلیٰ تعلیم میں کتنا سرمایہ خرچ ہوگا اور اس سے ملک کو کیا فائدہ حاصل ہوگا۔

ماہرینِ معاشیات اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ اعلیٰ تعلیم ہر ملک کی معاشی ترقی کے لیے ضروری شرط ہے۔ انگلینڈ کے مشہور و معروف ماہرِ تعلیم اور معاشیات لارڈ رابنس کا خیال ہے کہ اعلیٰ تعلیم تعلیم کی وہ قسم ہے جسے صرف ترقی یافتہ معیشت میں ہی فروغ دیا جانا چاہیے اس کا معاشی ترقی میں امدادی کردار بہت معمولی ہے۔ لیکن ایسے ترقی پذیر ملک میں جو ہر اعتبار سے خودکفیل ہونا چاہتا ہے، اعلیٰ تعلیم کے فروغ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل سائنس اور ٹیکنالوجی کی بنیاد اعلیٰ تعلیم ہی فراہم کرتی ہے اور جیسے جیسے معاشی ترقی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا کردار بڑھتا جا رہا ہے، اعلیٰ تعلیم کی طلب بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی لیے پورے ملک میں اور اترپردیش میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ پر سرکار نے اپنا دھیان مرکوز کیا ہے اور شروع سے ہی اس طرف کوششیں جاری ہیں۔ اس سے اعلیٰ تعلیم کی ترقی میں نمایاں مدد بھی ملی ہے۔

اس مضمون میں منصوبہ بندی کے دوران اترپردیش میں اعلیٰ تعلیم کی ترقی کا ایک جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں یونیورسٹیوں اور ڈگری کالجوں دونوں کے ذریعے دی جانے والی تعلیم پر گفتگو کی گئی ہے۔

آزادی کے وقت جتنی یونیورسٹیاں پورے ملک میں تھیں، آج صرف اترپردیش میں اتنی یونیورسٹیاں پائی جاتی ہیں۔ ۱۹۵۰ – ۵۱ء میں پورے صوبے میں کل ملا کر چھ یونیورسٹیاں تھیں۔ ان میں دو (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور بنارس ہندو یونیورسٹی) مرکزی سرکار کے زیرِ انتظام تھیں۔ باقی چار یونیورسٹیاں الہ آباد، لکھنؤ، آگرہ اور روڑکی کی تھیں۔ ۱۸۸۷ء میں قائم شدہ الہ آباد یونیورسٹی اترپردیش کی پہلی اور ملک کی چوتھی[1] سب سے پرانی یونیورسٹی ہے۔ اس کی تاریخ کے ایک سَو سال مکمل ہونے جا رہے ہیں۔ ۱۹۶۵-۶۶ء تک صوبے میں کل ملا کر نو یونیورسٹیاں تھیں۔ جن کی تعداد اب تقریباً دوگنی ہو چکی ہے۔ اِس وقت

---

[1] بمبئی، مدراس اور کلکتہ کی یونیورسٹیاں ملک میں سب سے پرانی ہیں۔ یہ تینوں ۱۸۵۷ء میں قائم ہوئی تھیں۔

اتر پردیش میں ۱۹ یونیورسٹیاں اعلیٰ تعلیم فراہم کر رہی ہیں۔ (دیکھئے گوشوارہ نمبر ۱) ان کے علاوہ دو ایسے

دیال باغ ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ، آگرہ۔ اتر پردیش میں یونیورسٹی تعلیم کی ترقی کر

گوشوارہ نمبر ۱-

اتر پردیش میں یونیورسٹیوں کی فہرست

نمبر شمار	نام یونیورسٹی	جگہ کا نام	قیام کا سال	(قسم جیسا کہ ان کے ایکٹ میں دیا ہے)
۱۔	الہ آباد یونیورسٹی	الہ آباد	۱۸۸۷ء	رزیڈنشل اور ٹیچنگ
۲۔	بنارس ہندو یونیورسٹی	وارانسی	۱۹۱۵ء	ٹیچنگ اور رزیڈنشل
۳۔	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	علی گڑھ	۱۹۲۰ء	رزیڈنشل
۴۔	لکھنؤ یونیورسٹی	لکھنؤ	۱۹۲۱ء	رزیڈنشل
۵۔	آگرہ یونیورسٹی	آگرہ	۱۹۲۶ء	ایفلیئیٹنگ
۶۔	روڑکی یونیورسٹی	روڑکی	۱۹۴۸ء	یونیٹری
۷۔	گورکھپور یونیورسٹی	گورکھپور	۱۹۵۶ء	ٹیچنگ اور ایفلیئیٹنگ
۸۔	سمپورنانند سنسکرت یونیورسٹی	وارانسی	۱۹۵۸ء	رزیڈنشل، ایفلیئیٹنگ اور اکزامنگ
۹۔	گووند بلبھ پنت یونیورسٹی آف اگریکلچر اینڈ ٹیکنالوجی	پنت نگر	۱۹۵۸ء	رزیڈنشل
۱۰۔	میرٹھ یونیورسٹی	میرٹھ	۱۹۶۵ء	ایفلیئیٹنگ
۱۱۔	کانپور یونیورسٹی	کانپور	۱۹۶۵ء	ایفلیئیٹنگ
۱۲۔	کماؤں یونیورسٹی	نینی تال	۱۹۷۳ء	ایفلیئیٹنگ کم ٹیچنگ
۱۳۔	گڑھوال یونیورسٹی	سری نگر	۱۹۷۴ء	ایفلیئیٹنگ
۱۴۔	کاشی ودیا پیٹھ	وارانسی	۱۹۷۴ء	چارٹرڈ پراونشل یونیورسٹی، ۱۵ جنوری ۱۹۷۴ء سے
۱۵۔	چندر شیکھر آزاد یونیورسٹی آف اگریکلچر اینڈ ٹیکنالوجی	کانپور	۱۹۷۴ء	رزیڈنشل
۱۶۔	نرندر دیو یونیورسٹی آف اگریکلچر اینڈ ٹیکنالوجی	فیض آباد	۱۹۷۴ء	یونیٹری
۱۷۔	اودھ یونیورسٹی	فیض آباد	۱۹۷۵ء	ایفلیئیٹنگ
۱۸۔	روہیل کھنڈ یونیورسٹی	بریلی	۱۹۷۵ء	ایفلیئیٹنگ
۱۹۔	بندیل کھنڈ یونیورسٹی	جھانسی	۱۹۷۵ء	ایفلیئیٹنگ

ادارے ہیں جنھیں یونیورسٹی تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ہیں گروکل کانگڑی یونیورسٹی ہردوار ضلع سہارنپور اور

گوشوارہ نمبر ۲ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں صوبے میں یونیورسٹی

اساتذہ کی کل تعداد ۲۷۲ تھی جو ۸۳-۱۹۸۲ء میں بڑھ کر ۶۰۷۸ ہوگئی۔ اس دوران یونیورسٹی طلبا کی تعداد ۶۰۰۷ سے بڑھ کر ۴۳۴۲۰ ہوگئی۔ ان میں سے ۸۷۷۲ لڑکیاں تھیں۔ اس طرح گذشتہ ۳۲ برسوں کی مدت میں اساتذہ کی تعداد میں تقریباً ساڑھے پانچ گنا اور طلبا کی تعداد میں چھ گنا کا اضافہ ہوا ہے۔ فی استاد طلبا کی اوسط تعداد ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۱۹ سے بڑھ کر ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۱۸ ہوگئی۔ (دیکھئے گوشوارہ نمبر ۲)

اعلیٰ تعلیم کی فراہمی کے لیے ۱۹ یونیورسٹیوں کے علاوہ اس وقت اتر پردیش میں ڈگری کالجوں کی بھی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ ان کالجوں میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ سطح کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ڈگری کالجوں کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کے فروغ کا ایک جائزہ گوشوارہ نمبر ۳ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں اتر پردیش میں کل ۵۰ ڈگری کالج تھے جن میں سے ۷ کالج لڑکیوں کے لیے مخصوص تھے۔ ڈگری کالجوں کی تعداد میں منصوبہ بندی کے دوران بہت تیزی سے اضافہ ہوا اور سال ۸۳-۱۹۸۲ء تک صوبے میں ۳۹۷ ڈگری کالج کھل چکے تھے ان میں سے ۳۱۴ لڑکوں کے اور ۸۳ لڑکیوں کے کالج ہیں۔ اس طرح ڈگری کالجوں کی تعداد میں گذشتہ ۳۲ برسوں میں دس گنا کا اضافہ ہوا ہے۔ ڈگری کالجوں میں اساتذہ کی تعداد جو ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۱۲۴۹ تھی ۸۳-۱۹۸۲ء میں بڑھ کر ۱۲۶۱۱ ہوگئی۔ اس طرح اساتذہ کی تعداد میں بھی گذشتہ ۳۲ برسوں میں تقریباً دس گنا کا اضافہ ہوا ہے۔ اسی دوران ڈگری کالجوں میں طلبا کی مجموعی تعداد ۲۹۷۹۸ سے بڑھ کر ۳۶۵۱۸۸ ہوگئی۔ اس طرح طلبا کی تعداد میں ۱۴ گنا سے بھی زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ڈگری کالج

ڈھائی ہزار لڑکیاں زیر تعلیم تھیں۔ سال ۸۳-۱۹۸۲ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۲۸ ہزار ہو گئی ہے۔ ڈگری کالجوں میں فی استاد طلبا کی اوسط تعداد جو ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۲۴ تھی، ۸۳-۱۹۸۲ء میں بڑھ کر ۲۹ ہو گئی ہے۔

اتر پردیش کے تقریباً ۹۰ فیصد ڈگری کالج پرائیویٹ انتظامیہ کے زیر اثر ہیں صرف ۳۴ ڈگری کالج سرکاری ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ پرائیویٹ ڈگری کالجوں میں اساتذہ کی تنخواہ اور دوسرے مختلف اخراجات اتر پردیش سرکار مالی امداد کے ذریعے فراہم کرتی ہے۔ ان کالجوں میں اساتذہ کی تقرری کیلئے اب ایک اعلیٰ تعلیم بورڈ کا انعقاد کر دیا گیا ہے جس کے ذریعے پورے صوبے کے ڈگری کالجوں میں لکچرار اور پرنسپل مقرر ہوتے ہیں سب سے زیادہ ڈگری کالجوں کی تعداد کانپور میں ہے۔ یہاں ۲۱ ڈگری کالج چل رہے ہیں۔ لکھنؤ اور وارانسی میں ہر جگہ ۱۹ ڈگری کالج ہیں۔ الہ آباد اور میرٹھ میں ہر جگہ ۱۷، اعظم گڑھ اور جونپور میں ۱۴، گورکھپور میں ۱۳، اور غازی آباد میں ۱۲ ڈگری کالج ہیں۔ دیوریا، بلیا، آگرہ، مرادآباد اور سہارنپور میں ہر جگہ ۱۱ ڈگری کالج ہیں۔ بلند شہر میں یہ تعداد دس ہے۔ باقی اضلاع میں ڈگری کالجوں کی تعداد ۱۰ سے کم ہے۔ اُتر کاشی اور ٹہری گڑھوال میں صرف ایک ایک ڈگری کالج ہیں۔ پیلی بھیت، رامپور، شاہجہاں پور، اناؤ، فتح پور اور بارہ بنکی میں دو دو ڈگری کالج ہیں۔

جہاں تک یونیورسٹیوں، کالجوں، اساتذہ اور طلبا کے اعداد و شمار کا تعلق ہے، اتر پردیش میں اعلیٰ تعلیم کا نظام بُرا نہیں ہے۔ لیکن محض ان اعداد و شمار میں اضافہ ہو جانے یا اضافہ کر دینے سے اعلیٰ تعلیم کے وہ اہم مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے جن کی اس وقت صوبے کو اور پورے ملک کو ضرورت ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا گرتا ہوا معیار عام تجربے کی چیز ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اعلیٰ تعلیم کی درس گاہوں میں وہ فضا اور وہ ماحول قائم کیا جائے جس سے اعلیٰ تعلیم کا معیار بلند کیا جا سکے۔

اس ضمن میں سب سے بڑی ذمہ داری اساتذہ پر عائد ہوتی ہے۔ تمام طرح کی معاشرتی اور انتظامی خرابیوں اور کمزوریوں کے باوجود اساتذہ محض اپنی انفرادی قوت و صلاحیت کے بل بوتے پر اعلیٰ تعلیم کے معیار کو بہت اونچا اٹھا سکتے ہیں۔ اُن کے اس پختہ عزم اور استحکام کے آگے انتظامیہ کو مجبوراً اُن کے ساتھ شامل ہونا پڑیگا ورنہ تمام سنجیدہ طلبا خود انتظامیہ کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے۔

گوشوارہ نمبر ۲۔
اُتر پردیش میں یونیورسٹی تعلیم کی ترقی

سال	یونیورسٹیوں کی تعداد	اشاریہ	اساتذہ کی تعداد	اشاریہ	طلبا کی تعداد	اشاریہ
۵۱-۱۹۵۰	۲	۱۰۰	۱۲۷۲	۱۰۰	۲۰۷۷۶	۱۰۰
۵۶-۱۹۵۵	۶	۱۰۰	۱۴۴۵	۱۱۴	۲۷۴۱۸	۱۳۲
۶۱-۱۹۶۰	۹	۱۵۰	۲۲۴۸	۱۷۷	۳۳۸۱۸	۱۶۳
۶۶-۱۹۶۵	۹	۱۵۰	۳۰۳۱	۲۳۸	۴۵۸۳۶	۲۲۱
۶۹-۱۹۶۸	۱۱	۱۸۳	۳۷۶۳	۲۹۶	۵۸۶۵۷	۲۸۲
۷۴-۱۹۷۳	۱۴	۲۳۳	۴۲۹۵	۳۳۸	۸۴۰۵۷	۴۰۵
۷۸-۱۹۷۷	۱۹	۳۱۶	۵۹۴۱	۴۶۷	۱۰۵۹۹۴	۵۱۰
۸۱-۱۹۸۰	۱۹	۳۱۶	۶۲۳۲	۴۹۰	۱۱۶۶۹۷	۵۶۲
۸۳-۱۹۸۲	۱۹ [۱]	۳۱۶	۶۸۶۰	۵۴۱	۱۲۳۷۰۴	۵۹۴

[۱] اس میں یونیورسٹی تسلیم کئے گئے ادارے شامل نہیں ہیں۔

گوشوارہ نمبر ۳۔
اُتر پردیش میں ڈگری کالج سطح کی تعلیم کی ترقی

سال	ڈگری کالجوں کی تعداد	اشاریہ	اساتذہ کی تعداد	اشاریہ	طلبا کی تعداد	اشاریہ
۵۱-۱۹۵۰	۴۰	۱۰۰	۱۲۴۹	۱۰۰	۲۹۷۹۸	۱۰۰
۵۶-۱۹۵۵	۶۵	۱۶۳	۲۳۲۷	۱۸۶	۵۰۵۹۹	۱۷۰
۶۱-۱۹۶۰	۱۲۸	۳۲۰	۳۴۴۴	۲۷۶	۶۷۷۰۲	۲۲۷
۶۶-۱۹۶۵	۱۸۳	۴۵۸	۵۴۳۳	۴۳۵	۹۴۵۵۸	۳۱۷

۱۹۶۸-۶۹	۲۱۷	۵۴۳	۶۹۸۲	۵۵۱	۱۴۸۴۹۷	۴۹۸
۱۹۷۳-۷۴	۳۰۴	۷۶۰	۱۰۲۸۴	۸۲۳	۲۴۵۹۳۱	۸۲۵
۱۹۷۷-۷۸	۳۵۲	۸۸۰	۱۲۰۴۹	۹۶۶	۳۱۶۹۶۶	۱۰۶۴
۱۹۸۰-۸۱	۳۸۴	۹۶۰	۱۲۱۷۱	۹۷۴	۳۳۴۶۲۱	۱۱۲۳
۱۹۸۲-۸۳	۳۹۷	۹۹۰	۱۲۶۱۱	۱۰۱۰	۳۴۵۸۸۱	۱۲۲۸

گوشوارہ نمبر ۴
فی اُستاد طلباء کی تعداد

سال	ڈگری کالجوں میں	یونیورسٹیوں میں
۱۹۵۰-۵۱	۲۴	۱۲
۱۹۵۵-۵۶	۲۲	۱۹
۱۹۶۰-۶۱	۲۰	۱۵
۱۹۶۵-۶۶	۱۷	۱۵
۱۹۶۸-۶۹	۲۱	۱۶
۱۹۷۳-۷۴	۲۵	۲۰
۱۹۷۷-۷۸	۲۶	۱۸
۱۹۸۰-۸۱	۲۵	۱۹
۱۹۸۲-۸۳	۲۹	۱۸

بقیہ کتابوں سے متعلق قومی پالیسی کی ضرورت

ہے اور اس میں دُنیا کی تقریباً ۱۵ فیصد آبادی رہائش پذیر ہے تاہم وہ بمشکل دُنیا میں شائع ہونے والی کُل کتابوں کے تین یا چار فیصد پر انحصار رکھتا ہے۔ اسے ستم ظریفی ہی کہا جاسکتا ہے کہ ملک میں انگریزی داں آبادی تو ۲ سے ۴ فیصد ہے لیکن اُن کے لیے تقریباً ۵۰ فیصد کتابیں شائع ہوتی ہیں اور باقیماندہ ۵۰ فیصد کتابیں دیگر بھارتی زبانوں کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ جب کہ ملک کی ۱۲ سے زیادہ زبانوں کی تاریخ کم از کم ۱۰۰۰ برس پرانی ہے اور اُن میں اعلیٰ علم و ادب موجود ہے۔ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ انگریزی کتابوں کی اشاعت میں امریکہ اور برطانیہ کے بعد بھارت کا نمبر تیسرا ہے اور پھر وہ زیادہ تر غیر افسانوی ہیں جبکہ بھارتی زبانیں زیادہ تر ادبی نوعیت کی ہیں۔ "نیشنل بک پالیسی" سے متعلق ورکنگ گروپ کی رپورٹ کے مسودے میں بجا طور پر کہا گیا ہے کہ تمام تر ملک میں، خصوصاً ہندی، اُردو، پنجابی کے خطے میں منڈی میں ارزاں مقبولِ عام کاغذی جلدوں کی کتابوں کا سیلاب آیا ہوا ہے جو کتب بینی کی عادت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ گھٹیا غیر پسندیدہ مواد سے لے کر کم پسندیدہ مواد پیش کر رہی ہیں۔

رپورٹ میں درآمد کنندگان اور ناشروں پر بھی نکتہ چینی کی گئی ہے جو اوپن جنرل لائسنس کے تحت سائنس اور ٹیکنالوجی کے نام پہ "محشر" کتابیں درآمد کرتے ہیں۔

صنعت کا درجہ دیا جائے

شاید بہترین لائحہ عمل یہ ہوگا کہ حکومت نشرو اشاعت کی تجارت کو صنعت کا رتبہ دے تاکہ ارزاں لیکن معیاری کتابوں کی اشاعت میں مالی رکاوٹیں پیدا نہ ہوں۔ ترغیبات اور وظائف کے ذریعے نئے مصنفوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ جیسا کہ نیشنل ورکشاپ میں تجویز کیا گیا تھا۔ کاغذی جلدوں کی کتابوں پر زور دیا جائے جو کہ ارزاں ہوں جیسا کہ ورکنگ گروپ کی طرف سے کہا گیا ہے۔ حکومت موجودہ تجارتی معاہدوں کے تحت کتابوں کی برآمد سے جو زرِ مبادلہ کماتی ہے اُس کے عوض میں خشک کاغذی گودہ درآمد کیا جائے۔ اِن تجاویز پر جلد عمل ہونا چاہیئے، تاکہ ملک کی کتابوں کی دُنیا کا مایوس کن منظر بہتر بن جائے۔ ●

بقیہ مدھیہ پردیش میں سرکاری دفتروں کو گاؤں کے ہاٹ بازار تک لیجانے کا انوکھا تجربہ

اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ ان کیمپوں میں زمین کا بٹوارہ، خسرہ کی نقل، راشن کارڈ بنوانا، گاؤں کے روزانہ کے مسائل، کھیتی اور مویشیوں سے متعلق تکالیف وغیرہ پر غور کر کے فوری عمل درآمد کیے جاتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً اعلیٰ افسر کیمپوں کا معائنہ بھی کرتے رہتے ہیں اور پوری اسکیم کس طرح کام کر رہی ہے اُس کا جائزہ لیتے ہیں۔

مارچ ۱۹۸۴ء کے آخر تک ان کیمپوں کے چار ماہ مکمل ہو گئے۔ اس سلسلے میں جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اب ضلع کے صدر مقام پر مختلف قسم کی درخواستیں لیے دیہی لوگ نظر نہیں آتے۔ وہ تمام بھیڑ اب اپنے اپنے اسٹال میں سمٹ گئی ہے۔ پیشہ ور لیڈروں کو اب یہ موقع ہی نہیں مل رہا ہے کہ وہ سرکاری دفتروں میں اپنی ٹانگ اڑائیں اور غریب دیہاتیوں سے روپیہ اینٹھیں۔ ●

راجیو کمار

قسط - (۲)

قومی ترقی کے سنگ میل

بچوں اور دودھ پلانے والی ماؤں کی بہبود

آنگن واڑی میں اسکول جانے سے پہلے کی عمر یعنی چھ سال تک کے بچوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ یہ حاملہ عورتوں اور دودھ پلانے والی ماؤں اور غریب بچوں کے لیے اضافی خوراکی مراکز کا کام کرتی ہے۔ اس میں بچوں کو تمام ضروری ٹیکے لگاکر بیماریوں سے محفوظ بنایا جاتا ہے اور ان کی صحت کا باقاعدہ معائنہ کیا جاتا ہے اور ماؤں کے لیے خواندگی، صحت کی دیکھ بھال اور غذائیت سے متعلق نصابات چلائے جاتے ہیں۔ آنگن واڑی میں کام کرنے والی عورتوں کو چھ ماہ تک تربیت دی جاتی ہے۔ یہ خواتین اور گاؤں کے ہیلتھ گائیڈ ایک طرف عوام اور دوسری طرف صحتی مراکز اور چھوٹے بچوں کے لیے دوسری تمام خدمات کے درمیان ایک بنیادی کڑی ہوتے ہیں۔

بچوں کی نشو و نما کے لیے مربوط خدمات کا پروگرام بھی بہت اہم ہے۔ اس کا تجربہ دس سال پہلے ہندوستان کے پانچ ہزار انتظامیہ بلاکوں میں سے ۳۳ بلاکوں میں شروع کیا گیا تھا۔ اندازہ ہے کہ ۱۹۸۵ء کے وسط تک یہ پروگرام ایک ہزار بلاکوں میں شروع ہو گیا۔

آنگن واڑی کے کارکنان کی تعداد اس وقت ۶۰ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ یہ ۱۳ لاکھ بچوں کے طبی معائنے اور انھیں ضروری ٹیکے لگانے کے علاوہ ۳۴ لاکھ ماؤں کے لیے تعلیمی کلاسیں لگانے اور ۶۱ لاکھ بچوں اور ۱۱ لاکھ عورتوں کو امدادی خوراک مہیا کرنے کا اہتمام کریں گے۔ یہ پروگرام ۱۹۹۰ء تک مزید ایک ہزار بلاکوں میں شروع ہو جائے گا۔ اُمید ہے کہ موجودہ صدی کے اختتام تک یہ پروگرام چھ سال تک کی عمر کے ہر بچے تک پہونچ جائے گا۔

اس وقت تک جو کام ہوا ہے اس کے نتیجے میں بچوں کی نشو و نما کی مربوط خدمات والے بلاکوں میں بچوں کو ٹیکے لگاکر بیماریوں سے محفوظ کرنے کی شرح دوگنی اور تین گنی ہو چکی ہے۔ پندرہ بلاکوں میں کئے گئے ایک سروے سے معلوم ہوا ہے کہ اکیس ۲۱ مہینوں میں تغذیہ بخش خوراک کی سخت کمی ۱۹ء۲ فیصد سے گھٹ کر ۵ء۴ فیصد رہ گئی۔ تین سال تک کی عمر کے بچوں میں، جن تک پہونچنا سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ تغذیہ کی کمی ۲۹ء۲ فیصد سے گھٹ کر صرف ۶ فیصد رہ گئی۔ اگرچہ بچوں کی صحت کی مربوط خدمات والے بلاکوں کے بچے ملک کے محروم ترین بچوں میں سے ہیں۔ تاہم ان میں شیر خوار بچوں کی شرح اموات رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ مربوط صحتی خدمات والے دوسو بلاکوں میں ایک سروے سے معلوم ہوا ہے کہ ۸۳-۱۹۸۲ء میں وہاں شیر خوار بچوں کی شرح اموات ایک ہزار زندہ پیدائشوں پر ۸۹ تھی جب کہ دیگر دیہی علاقوں میں یہ ۱۲۴ فی ہزار تھی۔

کینسر، ملیریا اور برص کے علاج کی سہولیات میں توسیع

رواں مالی سال میں ۲۰ اور میڈیکل کالجوں میں کینسر کے علاج کی سہولیات فراہم کی جا رہی ہیں۔ اس سال کینسر کے علاج کی سہولیات کی فراہمی کے لیے پہلے سے دوگنی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ کینسر کے مختلف علاقائی مراکز کے لیے جدید اور پیچیدہ نوعیت کا ساز و سامان خریدا جائے گا۔

کینسر کے مریضوں کے اندراج کے لیے انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ کے تحت چھ ادارے کام کر رہے ہیں جن کے محدود اعداد شمار کینسر کے کیسوں میں تقریباً ۱۴ لاکھ کا اضافہ ظاہر کرتے ہیں۔ ہر سال لگ بھگ پانچ لاکھ نئے کیسوں کا اضافہ ہوتا ہے اور آنے والی دہائیوں میں بڑھتی ہوئی جدید کاری و صنعت کاری کے ساتھ اس رجحان کے جاری رہنے کا امکان ہے۔ طرز بود و باش میں تبدیلیوں اور تمباکو نوشی، شراب نوشی وغیرہ بدعادات کی وجہ سے صورت حال اور سنگین ہو گئی ہے۔

ہندوستان میں ایک اور عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ ترقی یافتہ مغربی ممالک کے بہ نسبت یہاں کینسر کافی کم عمر میں ہوتا ہے۔ یعنی دس یا پندرہ سال پہلے ہندوستان کے مردوں میں منھ کا کینسر اور عورتوں میں بچہ دانی کا کینسر عام ہے۔ ان کینسروں کی تعداد ملک میں کینسر کے تمام کیسوں میں چالیس فیصد کے لگ بھگ ہے لیکن ان کی روک تھام کی جا سکتی ہے۔ طبی تعلیم اور ذرائع تشہیر و اشاعت کے ذریعے اس مرض کی علامات کی تشہیر کر کے اور عوام کی ابتدا ہی میں علاج کرنے کی ترغیب دے کر اس مرض کو روکا جا سکتا ہے۔

ملیریا کے مریضوں کا جلد پتہ لگانے اور ان کا علاج کرنے کے لیے ۱۲۸۳۲۶ بخار کے علاج کے ڈپو اور دوا کی تقسیم کے ۳۵۴۵۲۳ مراکز قائم کئے جا چکے ہیں۔

بمبئی کے انڈین کینسر ریسرچ سینٹر نے برص کا ٹیکہ تیار کیا ہے جسے انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ کے زیر سرپرستی ۸۶ ـ ۱۹۸۵ء میں انسانوں پر آزمایا جائے گا۔ سال کے دوران تیس ماہی (بہار)، پاگیری (آندھرا پردیش)، ماگدی (کرناٹک) اور بڑودہ (گجرات) میں برص کے بارے میں تحقیق و تربیت کے علاقائی ادارے قائم کئے جائیں گے۔ تین مراکز نے کام بھی شروع کر دیا ہے۔ برص کے مریضوں کو ایک خاص طریق علاج (MnItk Drug ReGiMelP Therapy) سے دو تین برسوں کے اندر مستقلاً شفا دی جا چکی ہے۔ اس طریق علاج کے لیے بارہ اضلاع کا انتخاب کیا گیا ہے اور جلد ہی تین اور ضلعوں میں یہ طریق علاج شروع کیا جائے گا۔

ساتویں منصوبے کے دوران ملک کے اُن تمام ۲۰۱ اضلاع میں جہاں برص کی بیماری عام ہے یہ طریق علاج شروع کر دیا جائے گا۔ اس سے برص کے ۲۰ فیصد معلوم کیسوں میں مرض کی روک تھام میں مدد ملے گی۔ ●

بقیہ کوالور رصد گاہ

ایک ایشیائی سنگ میل

کوالور کی بصری دوربین کے بعد ایک بڑی ریڈیائی دوربین شاید پونے میں نصب کی جائے گی۔ یہ اوٹاکمنڈ کی ریڈیائی دوربین کے علاوہ ہوگی۔ بھارت ایسی فلکیاتی تحقیق کے لیے خصوصی طور پر موزوں ہے۔ کیونکہ وہ خط استوا کے نزدیک تر ہے۔ اور سال کے زیادہ تر حصے میں آسمان صاف رہتا ہے۔ اوٹاکمنڈ کی رصدگاہ زمین کے محور کا مطالعہ کرتی ہے جس سے زمین کے گھومنے کی وجہ سے فلکیات مشاہدات میں آسانی ہو جاتی ہے۔

ایک اور متعلقہ کام بھی بھاری اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کام ہے نئی نسل میں ہیئت دانی کے لیے دلچسپی پیدا کرنا۔ اس کے لیے اب کئی مقامات پر بچوں کے سائنسی مرکزوں کے ساتھ ساتھ تارا منڈل قائم کئے گئے ہیں۔ نقشوں، رات کو کئے جانے والے آسمانی مشاہدات اور ماڈلوں کی مدد سے یہ تارا منڈل اس کائنات کے دلکش اسراروں کے بارے میں نوجوانوں کے ذہن میں دلچسپی جگاتے ہیں جو ہماری زمین کی سرحدوں سے بہت دور ہے۔ یہ فلکیات اور ہیئت دانی سے متعلق آسان درس اب تمام اسکولوں کے نصاب کا جزو بن گئے ہیں۔ اعلیٰ تر سطح پر گریجویٹ سے ڈاکٹوریٹ سطح پر فلکیات کے نصاب رائج ہیں۔ اس کے نتیجے میں متعدد طلباء ہیئت دانی کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں۔ بیشتر نوعمر بھارتی ہیئت دانوں کی تحقیق سے یہ مفروضہ عمل میں آیا ہے کہ دُم دار تارا کی دو دُمیں ہوتی ہیں۔

خود کفالت کی جانب

یہ امر قابل ذکر ہے کہ مرحوم ڈاکٹر باپو نے خود ایک نئے دُمدار تارا کی دریافت کی تھی جس کا نام اُن کے نام پر رکھا گیا ہے۔ ہمارے ہیئت دانوں نے بصری اور ریڈیائی قسم کی دوربینوں کی تیاری میں بھی کافی مہارت حاصل کر لی ہے۔ یہ سائنسی مساعی میں خود کفالت کی جانب ایک اور قدم ہے۔ کوئی بھی شخص یاد کر سکتا ہے کہ بھارت نے اپنی کوششوں سے ہی بڑے بڑے ایٹمی بجلی گھر قائم کئے ہیں، چار مرحلوں کے راکٹ تیار کئے ہیں۔ دور سے نگرانی کرنے والے مصنوعی سیارے بنائے ہیں، سمندری گہرائیوں سے دھات کے گولے نکالے ہیں اور قطب جنوبی میں تمام موسموں میں کام کرنے والے اسٹیشن نصب کئے ہیں۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھارتی سائنسدان ان امور میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ ●

م۔ فرقان غاں

انرجی کے متبادل ذرائع کی تلاش

پتھر کے زمانے سے لے کر اس تحقیقی دور تک انرجی کے جو وسائل دریافت ہوئے ہیں وہ ایک اندازے کے مطابق ان وسائل کا ایک چوتھائی بھی نہیں ہیں جو قدرت نے پوشیدہ رکھے ہوئے ہیں۔ آج ٹیکنالوجی اور صنعت کی ترقی کے ساتھ انرجی کے غیر روایتی ذرائع کی تلاش بھی کی جانے لگی ہے۔ انسان انرجی کے جن مسائل پر اب تک اکتفا کئے ہوئے تھا وہ دھیرے دھیرے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک سائنسی اندازے کے مطابق تمام ممالک کے تیل اور کوئلے کے ذخائر ۲۰۵۰ء تک کام میں آ جائینگے، تب صورت حال کیا ہوگی اور صنعتوں کو انرجی کن وسائل سے مہیا کرائی جائے گی۔ اس امر کی طرف سائنسدانوں اور دنیا کے ممالک کا ذہن منتقل ہوا ہے اور یہ کوشش کی جانے لگی ہے کہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے انرجی کے ایسے وسائل جو کہ نہ صرف غیر روایتی ہوں بلکہ جنھیں بار بار کام میں لایا جا سکے۔ تلاش کئے جائیں۔

بھارت میں تجارتی (COMMERCIAL) انرجی مہیا کرانے کے خاص وسائل ہیں۔ کوئلہ، تیل پانی اور جوہری انرجی جن سے تقریباً ۶۰ فیصدی انرجی حاصل ہوتی ہے۔ ۵۴-۱۹۵۳ء میں یہی تناسب ۳۳ فیصد تھا۔ بھارت میں انرجی کے استعمال کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ یہاں غیر تجارتی (NON-COMMERCIAL) انرجی کل انرجی استعمال کا ۶۰ فیصد ہے جو کہ بہت زیادہ ہے۔ غیر تجارتی انرجی میں لکڑی، گوبر، مینگنی وغیرہ شامل ہیں۔ حالانکہ ہمارے تجارتی انرجی استعمال میں پچھلے سالوں میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ لیکن اب بھی یہ ترقی یافتہ ممالک سے کافی پیچھے ہے۔ جہاں ترقی یافتہ ممالک میں کمرشل و نان کمرشل انرجی کا استعمال ۶۰۳۶ اور ۲۴۹ کلو واٹ ہے۔ وہیں بھارت میں یہ ۱۰۸ اور ۱۳۳ کلو واٹ ہے۔ ظاہر ہے یہ حالت ہماری ترقی پذیری کو ظاہر کرتی ہے۔ لیکن اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ سرکار اس طرف تیزی سے متوجہ ہوئی ہے اور آج غیر تجارتی انرجی کے محکمے کے تحت نئے وسائل تلاش کرنے کی کوشش تیزی سے جاری ہے اس محکمے کے تعاون سے دیگر مختلف محکمات جیسے ریلوے، زراعت، دفاع، ڈاک و تار وغیرہ بھی نئے نئے وسائل تلاش کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔ یہی نہیں ۵۰ سے زائد بڑی بڑی کمپنیاں بھی انرجی کے نئے وسائل تلاش کرنے میں اپنے بہت سے وسائل صرف کئے ہوئے ہیں۔

بھارت کی حکومت نے بھی آئندہ پیش آنے والی دقتوں کو دور کرنے کے لیے یہ کوشش کی ہے کہ ایسے وسائل ابھی سے ہی پوری طرح کھوج لیے جائیں جن کے ختم ہونے کا کوئی خدشہ نہ ہو۔ ۱۹۸۲ء میں کمیشن فار ایڈیشنل سورسز آف انرجی (COMMISSION FOR ADDITIONAL SOURCES OF ENERGY) اور ڈیپارٹمنٹ آف نان کنونشنل انرجی سورسز (DEPTT OF NON-CONVENTIONAL ENERGY SOURCES) کا قیام اس بات کا ضامن ہے کہ بھارت سرکار کے نزدیک انرجی

ہے نئے وسائل تلاش کرنے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ نئے بیس نکاتی پروگرام کے نکتہ نمبر ۱۲ میں بھی اس امر پر زور دیا گیا ہے۔

پچھلے سالوں کی سرکاری اور غیر سرکاری کوششوں کے باعث کئی وسائل سامنے آئے ہیں جو نہ صرف سستے ہو سکتے ہیں بلکہ ان کا بار بار استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔ آیئے دیکھیں یہ وسائل کون کون سے ہیں اور ابھی کس سطح پر ہیں۔

۱۔ شمسی توانائی (SOLAR ENERGY)

ہندو دیو مالا کے حساب سے سورج کو طاقت عطا کرنے والا مانا گیا ہے۔ اسی لیے اس کی پوجا بھی کی جاتی ہے۔ صبح اٹھتے ہی سوریہ نمسکار کے ساتھ روزمرہ کی زندگی شروع کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہماری زندگی میں شمسی توانائی کا بھرپور حصہ رہتا ہے۔ غذا، لباس، پانی اور روشنی تو ہمیشہ سے ہی سورج کی وجہ سے ملتے رہے ہیں مگر موجودہ ہائیڈرو پاور (HYDRO POWER) کو بھی ہم سورج کی ہی عطا کردہ قوت مان سکتے ہیں۔ سورج کی گرمی سے پانی بخارات میں تبدیل ہو کر بادل بن جاتا ہے۔ یہی بادل بارش برساتے ہیں اور ہمارے دریا اور جھیلیں پانی سے بھرے رہتے ہیں اور اسی پانی سے پن چکی کے ذریعے بجلی پیدا کی جاتی ہے جو ہمارے گھروں کو روشن اور منور رکھنے کے علاوہ ہمیں دیگر سہولتیں بھی مہیا کرتی ہے۔

دنیا کے ہر ملک میں صدیوں سے شمسی توانائی، فصلوں کو خشک کرنے، پانی گرم کرنے اور دیگر چھوٹے موٹے کام میں استعمال کی جاتی رہی ہے اور کی جاتی ہے۔ مگر اس کا استعمال بہت محدود ہے۔ تحقیق و تدریج کا کام بیشتر ممالک میں تیزی سے جاری ہے۔ ایک اندازے کے مطابق سورج میں موجود حرارتی توانائی کا اگر ہم ایک فیصد بھی استعمال کرنے کے قابل ہو گئے تو ساری دنیا کی انرجی کی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں۔ فی الحال شمسی توانائی کا استعمال مکانات کو گرم اور ٹھنڈا رکھنے، پانی گرم کرنے، ڈی سیلینیشن، ریفریجریشن، ٹیلی کمیونیکیشن، اریگیشن اور بجلی پیدا کرنے کے کام تجرباتی (EXPERI-MENTAL) شکل میں کئے جا رہے ہیں۔

بھارت میں شمسی توانائی کو تجرباتی طور پر پانی گرم کرنے میں اور فصل کو سکھانے میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی شمسی ہیٹر اور شمسی چولہے بھی بنائے گئے ہیں۔ مختلف ایجنسیاں تحقیق و تدریج کے کام میں مصروف ہیں۔ کھادی اینڈ ویلیج انڈسٹریز کمیشن نے ایک شمسی چولہے کا ڈیزائن تیار کیا ہے جو بہت کفائتی انرجی مہیا کرا سکتا ہے۔ کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ اس چولہے کی قیمت کم سے کم ہو۔ ہوٹل جن پتھ میں بھی تجرباتی طور پر ۶۰۰۰ لیٹر فی دن پانی گرم کرنے کا شمسی ہیٹر لگایا گیا ہے۔

شمسی توانائی یوں تو کافی مقدار میں موجود ہے لیکن اس کو بہتر طریقے سے استعمال کرنے کے لیے مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ مزید تحقیق کی ضرورت اس لیے بھی درکار ہے کہ تجرباتی شکل میں اس کی لاگت کافی زیادہ آتی ہے۔ جسے کم کرنے کے لیے تحقیق ضروری ہے۔ اب تک سائنسدانوں نے شمسی توانائی استعمال کرنے کے مندرجہ ذیل طریقے پیش کئے ہیں:-

۱۔ شمسی سیل SOLAR CELL

۱۹۵۴ء میں بیل ٹیلیفون (BELL TELEPHONE) لیبوریٹریز نے سلی کون شمسی سیل بنانا شروع کیا جس کی مدد سے شمسی توانائی سے براہ راست بجلی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ بعض خبر ہے عام سیل کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ بجلی حاصل ہوتی ہے۔ شمسی سیل کا پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ اس میں حرکت کرنے والے پارٹس کچھ بھی نہیں ہیں۔ جن کے گھسنے کا خدشہ ہو۔ دوم یہ کہ اس کے دیر تک استعمال کے بعد بھی بریک ڈاؤن (BREAK-DOWN) نہیں ہوتا اور اس کے لیے کسی قسم کی دیکھ بھال کی ضرورت نہیں ہوتی۔

لیکن موجودہ مشکلات میں ایک یہ بھی ہے کہ شمسی سیل سے بجلی بہت بڑے پیمانے پر نہیں بنائی جا سکتی اور زیادہ بجلی پیدا کرنے کے لیے بہت بڑا رقبہ درکار ہے جس کی وجہ سے لاگت بہت بڑھ جاتی ہے اور خام مال کی قیمت کچھ بھی نہیں ہونے پر بھی شمسی سیل بہت مہنگے پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ شمسی سیل خراب موسم میں غیر موثر ہو جاتے ہیں۔ ان مشکلات کو دور کرنے کے لیے مستقبل میں بہت زیادہ کاوش درکار ہے۔ اگر اس سمت میں نمایاں کامیابی حاصل ہو گئی تو بڑے پیمانے پر بجلی فراہم کرنے کے لئے شمسی سیل توانائی کا بہت بڑا ذریعہ ہو سکتے ہیں۔

۲۔ شمسی کلیکٹر SOLAR COLLECTOR

شمسی کلیکٹر کو براہ راست استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ زیادہ تر پانی گرم کرنے اور مکانات کو گرم کرنے میں استعمال میں آتا ہے ان کی مختلف قسمیں ہیں۔

(الف) فریزنل لنس (FRESNEL LENSE)

اس طریقے میں شمسی شعاعوں کے انعکاس کے لیے فریزنل لینس استعمال کئے جاتے ہیں اور اسٹینلیس اسٹیل (STAINLESS STEEL) یا المونیم سے بنے پائپ پر ان کو منعکس کر کے مرکوز کر کے درجہ حرارت بڑھا لیا جاتا ہے۔ پھر پائپ میں اندر رقیق گزاری جاتی ہے جو حرارت جذب کر لیتی ہے۔ پائپ ایک مخصوص کوٹنگ کے ذریعے [illegible]

تاکہ جذب شدہ حرارت محفوظ کی جا سکے۔

(ب) پیراسالک ایفلکٹرس

(PARASOLIC EFLECTORS)

اس کو حرارتی پائپ پر فوکس کر لیا جاتا ہے اور ہر پائپ کے ساتھ چھوٹا سائفنک ہوتا ہے، جس میں حرارت کو اکٹھا کیا جا سکے۔ ہیٹ کے ذرائع کے طور پر پانی یا پھر سوڈیم نائٹریٹ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

۳۔ بائیو گیس (BIO GAS)

انرجی کے متبادل ذرائع میں بائیو گیس کی اہمیت کو اب بڑے وثوق کے ساتھ تسلیم کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں بائیو گیس سے انرجی پیداوار کے لیے نہ صرف سرکاری امداد نقد دی جاتی ہے بلکہ بائیو گیس پلانٹ اچھی طرح کام کرے یہ دیکھنے کے لیے تکنیکی ایکسپرٹ بھی مہیا کرائے جاتے ہیں۔ اس وسیلے کی ایک خاص اہمیت یہ ہے کہ دیہات کے دور دراز علاقوں میں انرجی کی ضروریات بآسانی پوری کر سکتا ہے جبکہ دیہات میں بجلی پہنچانے میں کافی سرمائے کی ضرورت کے ساتھ ہی بجلی کی کمی کا احساس بھی برابر بنا رہتا ہے۔ بائیو گیس کی اہمیت اس طرح اور بھی دیکھی جا سکتی ہے کہ اس کے استعمال سے نہ صرف سستی انرجی مہیا ہو سکتی ہے بلکہ دیہات کی صفائی ستھرائی کا انتظام بھی خود بہ خود ہو جاتا ہے۔ اس کے فائدے یہیں تک محدود نہیں ہیں بلکہ بائیو گیس پلانٹ سے بہت اچھی قدرتی کھاد بھی ملتی ہے۔

بائیو گیس کا استعمال روشنی، کھانا پکانے پانی پمپ کرنے میں ہونے لگا ہے۔ اس کے لیے ۱۹۸۱ء میں نیشنل پروجیکٹ فار بائیو گیس ڈیولپمنٹ شروع کیا گیا جس کے لیے مرکز، ریاستی حکومتوں کو امداد دیتا ہے۔ اس امداد کو ریاستیں بھی پلانٹ اور کمیونٹی پلانٹ بنانے میں سبسڈی (SUBSIDY) کے طور پر بانٹتی ہیں۔ اس پروگرام کو کامیابی سے پورا کرنے کے لیے نقد امداد کو ہی کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ ٹرینڈ اسٹاف کی ایک فوج تیار کرنے کے لیے متفرق کورس شروع کئے گئے ہیں۔

اس پروگرام کے تحت پچھلے سالوں میں کافی تیزی سے کام ہوا ہے اور اس کے بہت اچھے نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ دیہات میں لوگوں نے اس پروگرام میں بڑی دلچسپی دکھائی ہے۔

پچھلے سالوں میں بائیو گیس پلانٹ لگانے میں جو ترقی ہوئی ہے اس کو اس طرح دیکھا جا سکتا ہے:-

۸۲-۱۹۸۱ء میں ۲۵۳۶۹ پلانٹس
۸۳-۱۹۸۲ء میں ۵،۵۰۰ ″
۸۴-۱۹۸۳ء میں ۷۵۰۰۰ ″

۳۔ جیو تھرمل انرجی

(GEO THERMAL ENERGY)

اس انرجی کو زمین کی حرارت بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ زمین کا حجم تقریباً ۱۲ کیلومیٹر ہے اور زمین کی اندرونی تہوں میں حرارت کہیں ۲۰۰۰ C° ہے اور کہیں ۱۰۰۰ C° حرارت تو عام ہے اور فی ایک کیلومیٹر گہرائی میں ۳۰ C° حرارت کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس کی تہوں میں موجود اس حرارت کے ذخیرے کو استعمال کے قابل بنا لیا جائے تو ہم بہت بڑی مقدار میں انرجی حاصل کر سکتے ہیں۔ جیو تھرمل انرجی چار صورتوں میں دستیاب ہے۔

(الف) ڈرائی اسٹیم (DRY STEAM)

زمین کی اندرونی تہوں میں موجود پانی کے ذخائر بہت زیادہ درجہ حرارت پا کر DRY STEAM بن کر سطح زمین کو پھاڑ کر خارج ہوتے ہوئے چند ایک ممالک میں نظر آتے ہیں۔ توجہ اس بات پر دی جا رہی ہے کہ اس کی بھاپ کو جو کہ خاصے درجے حرارت کی حامل ہوتی ہے کسی اسپریر سے گزارا جائے تاکہ اس میں موجود مٹی کے ذرات اور گندگی علیحدہ ہو سکے اور پھر کسی ٹربائن پر سے گزار کر بجلی پیدا کی جا سکے۔ ان ذخائر کی لامحدود وسعتوں کے پیش نظر انرجی حاصل کرنے کا یہ ذریعہ اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ ہمیں کوئی ایندھن جلائے بغیر سپر ہیٹڈ اسٹیم بہت بڑی مقدار میں ملتی ہے۔

(ب) ویٹ اسٹیم

(WET STEAM)

دنیا کے تقریباً ہر ملک میں گرم پانی کے چشمے ویٹ اسٹیم موجود ہیں۔ اور یہ چشمے (WET STREAM) انرجی حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے جا سکتے ہیں۔ دنیا کے بعض حصوں میں اس سے بجلی پیدا کرنے کے کچھ آزمائشی یونٹ لگائے تو گئے ہیں لیکن دشواری یہ ہے کہ اس کا پانی معدنی پانی ہوتا ہے جس میں تقریباً ۶۰ فیصد معدنی اجزا ہوتے ہیں جو کہ ڈرلنگ اور پائپنگ کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوئے ہیں۔ اس طرح اسٹیم کی لاگت بہت بڑھ جاتی ہے۔ جبکہ بعض جگہوں پر پریشر کم ہونے کی وجہ سے پمپنگ بھی لازماً درکار ہے۔ اگر کسی طرح ایسے اسپریرز بنا لیے گئے جو کہ ویٹ اسٹیم کو بآسانی معدنی اجزا سے علیحدہ کر سکیں تو آئندہ برسوں میں نمایاں کامیابی حاصل ہو سکے گی۔

(س) سوکھی گرم چٹانیں

(HOT DRY ROCKS)

اندازہ لگایا گیا ہے کہ ارتھ کرسٹ (EARTH CRUST) سے وجود میں آنے والی چٹانیں بھی بے پناہ حرارت کا خزینہ ہیں۔ اگر کوئی ایسا آسان طریقہ ایجاد کیا جائے کہ

پانی کو اوپر سے چٹانوں میں پمپ کرکے گذارا جائے تو حرارت کی وجہ سے پانی گرم ہو کر اُبلنے لگے گا اس حرارت سے بھاپ بنا کر ٹربائن چلائی جا سکتی ہے۔

(د) جیو پریشرائزڈ زون

(GEO PRESSURISED ZONE)

بعض ممالک میں ایسے ذخائر کا بھی پتہ چلا ہے جہاں زمین کی گہرائیوں میں موجود گرم پانی حل شدہ قدرتی گیسوں کے ساتھ بہت ہائی پریشر پر موجود ہے۔ اس طرح اس خزینے سے انرجی کے تین قیمتی ذرائع حاصل ہوتے ہیں۔ گرم پانی قدرتی گیس اور ہائی پریشر۔ لیکن ان کو استعمال کے لیے ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ کی ضرورت ہے۔

ہندوستان میں جیو تھرمل انرجی کے سلسلے میں تحقیقات ۷۰ کی دہائی میں شروع کی گئی تھی اور یہ قریب ۳۰۰ ظاہری چشموں پر ہی مرکوز تھیں۔ ہندوستان میں آتش فشاں (VOLCANIC) پہاڑ یا علاقے کہیں نہیں ملتے لیکن گرم پانی کے مخصوص چشمے لداخ، ہماچل پردیش، یو۔پی، ہمالیہ، گجرات و مہاراشٹر کے مغربی کنارے اور کچھ مغربی بنگال، اُڑیسہ اور آندھرا پردیش میں ملتے ہیں۔ تحقیقات اور سروے کا کام جیولوجیکل سروے آف انڈیا (GSI) کے ہاتھ میں ہے۔ حال ہی میں اس نے آئل اینڈ نیچرل گیس کمیشن (ONGC) اور ریجنل ریسرچ لیبورٹریز جموں کی یونیورسٹی کے تعاون سے پوگا ویلی میں کام شروع کیا ہے۔ اقوام متحدہ کے ترقیاتی فنڈ کی امداد سے ہماچل پردیش کی پاروتی ویلی و مہاراشٹر کے کونکن کنارے پر ایک اہم پروجیکٹ شروع کیا گیا ہے۔

۴۔ اوشین تھرمل انرجی

(OCEAN THERMAL ENERGY)

سمندر کی اوپری اور نچلی تہوں میں موجود درجہ حرارت کے فرق کو استعمال کرکے بھی انرجی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس طریقے میں سمندر کا گرم پانی جس کا درجہ حرارت ۸۰ فارن ہیٹ ہو، ہیٹ ایکسچینجر (HEAT EXCHANGER) کی ٹیوبوں کے باہر سے گزارا جاتا ہے۔ ٹیوبوں کے اندر سے امونیا جس کا درجہ اُبال بہت کم ہوتا ہے، گزاری جاتی ہے۔ حرارت پاکر امونیا پھیلتی ہے جسے ایک ٹربائن سے گزارا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک کنڈینسر میں اسے ۴۰ فارن ہیٹ درجہ حرارت والے پانی کو گزار کر اسے کنڈینسڈ کر لیا جاتا ہے۔ ہیٹ ایکسچینجر میں فی الوقت اسٹیل اور المونیم استعمال کیا جاتا ہے۔ سمندری پانی میں حل شدہ کثافتوں کی وجہ سے اس کا بھاری پن زیادہ ہوتا ہے جو ہیٹ ایکسچینجر اور پائپ کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ اگر کسی طرح کی خاص کوٹنگ (COATING) کرکے ہیٹ ایکسچینجر کی میعاد بڑھائی جا سکے تو یہ طریقہ دنیا کے اُن تمام ممالک میں رائج ہو جائے گا جو سمندر کی دولت سے مالا مال ہیں۔

جاپان حالانکہ ایسا ملک ہے جہاں زمین کا حصہ کم ہے وہاں اس نے اس قسم کی انرجی پیدا کرنے کے لیے ایک تجرباتی پلانٹ قائم کیا ہے۔ مستقبل میں گرم دھارا کوروشیو کو بھی اس مقصد کے لیے استعمال کرنے کا ارادہ ہے۔ فرانس میں بھی اس قسم کا پلانٹ زیر تعمیر ہے۔ جو ۱۹۸۶ میں شروع ہو جائے گا۔

۵۔ ٹائیڈل انرجی

(TIDAL ENERGY)

بحری موجوں کی حرکتی توانائی دنیا کے بعض ممالک میں خاصی زیادہ پائی جاتی ہے۔ اگر سمندر سے آنے والی لہروں کی توانائی کے ذریعہ کوئی رولر گھمایا جائے تو بجلی بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس مقصد کے تحت ایڈنبرا یونیورسٹی (برطانیہ) میں ریسرچ کا کام شروع کیا گیا ہے۔ اگر اس سے خاطر خواہ نتیجے برآمد ہوئے تو اُمید ہے کہ اس سے بہت زیادہ مقدار میں بجلی کی پیداوار کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ موجوں کی قوت سال کے سبھی موسموں میں یکساں نہیں رہتی اور بجلی پیدا کرنے کا طریقہ بھی ابھی خاصا مہنگا ہے۔ اگر مستقبل میں اسے مزید تحقیقات کے ذریعے سستا بنا لیا گیا تو بحری ممالک اس کو فوراً اپنا لیں گے۔ اس طریقے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس میں سردی کے موسم میں جب کہ زیادہ بجلی کی کھپت ہوتی ہے۔ زیادہ بجلی کی پیدا کی جا سکتی ہے کیوں کہ سردی میں موجوں کی قوت بھی زیادہ ہوتی ہے۔

ہندوستان میں کچھ کی کھاڑی میں اس طرح کی تحقیقات اقوام متحدہ کے ترقیاتی فنڈ کے تحت شروع کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مغربی بنگال کے سندربن علاقے میں بھی اس طرح کی انرجی ملنے کی خاصی اُمید ہے۔ بھارت سرکار نے ۱۹۷۹ء میں سینٹرل الیکٹریسٹی اتھارٹی (CEA) کے چیرمین کی صدارت میں ایک کوآرڈی نیشن کمیٹی کی تقرری کی ہے جو اس سلسلے میں تحقیقات کر رہی ہے۔

۶۔ ونڈ پاور

(WIND POWER)

ہوا کی طاقت کا استعمال کئی برس پرانا ہے کافی وقت پہلے سے ہوا کی رفتار سے ہوا چکیوں کے چلانے کا کام لیا جاتا رہا ہے۔ آج جب کہ دنیا میں انرجی کی ضرورت اور کھپت بڑھی ہے پھر سے ہوا کی طاقت کی طرف سائنسدانوں کا دھیان مبذول ہوا ہے۔

(باقی صفحہ ۹ پر)

ایم. کے. کول

کتابوں سے متعلق قومی پالیسی کی ضرورت

موہنجودارو کے دنوں سے لے کر موجودہ بھارت تک — دنیا میں صنعتی طور پر دسواں ترقی یافتہ ملک ہونا اور تیسری دنیا کے ملکوں میں طباعت اور اشاعت میں پہلا ملک بننا، واقعی ایک شاندار کارنامہ ہے۔ تاہم یہ زیادہ تر ستم ظریفی معلوم ہو سکتی ہے کہ بھارت کی تحریری الفاظ کی فی کس کھپت محض ۳۲ صفحات ہے جب کہ اس کے مقابلے میں سرکردہ اشاعت کنندہ ممالک کی کھپت ۲۰۰۰ الفاظ فی کس ہے۔ ہمیں اپنے لکھے ہوئے تعلیم یافتہ لوگوں کی کتابوں کی بھوک کو مطمئن کرنے کے لیے میلوں میل چلنا ہے جو سینکڑوں مختلف بولیاں بولتے ہیں۔

سوال جو کوئی دریافت کر سکتا ہے، یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ سوال بلاشبہ ایسا ہی آسان ہے جیسا کہ پیچیدہ ... اور صحیح طور پر اس کا جواب پانے کے لیے یا کم از کم اس سلسلے میں کوشش کرنے کے لیے راجدھانی میں حال ہی میں نیشنل بک ٹرسٹ کے اہتمام میں "نیشنل بک پالیسی" سے متعلق ایک "قومی ورکشاپ" کا انعقاد کیا گیا۔

اگرچہ اس ورکشاپ میں اتنے ہی سوالات پیدا ہوئے جتنے کہ جوابات دیے گئے، تاہم اس سے یقیناً تعلیمی منصوبہ سازوں، ماہرینِ تعلیم، پبلشروں اور متعدد متعلقہ لوگوں میں یہ بیداری پیدا کرنے میں مدد ملی کہ "قومی کتاب پالیسی" اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ وہ "قومی تعلیمی پالیسی" جس کی بڑی تلاش اور تشہیر کی جا رہی ہے۔

مسائل

اس موقع پر بعض مسائل کا جائزہ لینا موزوں ہوگا جو ملک میں ارزاں تر قیمتوں پر اعلیٰ قسم کی کتابیں، کتب بین عوام کو مہیا کرنے میں پیش آ رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سنجیدہ ادب میں ان کی دلچسپی ختم ہو رہی ہے۔ آج بھارت میں کتابوں کے اشاعتی منظر پر سرسری نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ بڑھتی ہوئی قیمتوں، محدود اشاعت اور سنجیدہ نوعمر مصنفوں اور قارئین کی کمی کے ساتھ ساتھ سرمایہ کی عدم دستیابی اور تقسیم کے محدود ذرائع کے باعث ناشرین اور قارئین دونوں کی کمی ہوتی جا رہی ہے۔

علمی منظر پر نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ آج اسکول جانے والی عمر کے بچوں کی تعداد ۱۶ کروڑ ۹۰ لاکھ ہے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھیں کس زبان میں تعلیم دی جائے؟ نیشنل کتاب پالیسی سے متعلق مرکز کے ورکنگ گروپ کی جانب سے کیے گئے ایک حالیہ سروے کے مطابق ملک میں ۵۸ زبانوں میں تعلیم دی جا رہی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ گو ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں مادری زبانوں کی تعداد ۱۶۵۲ بتائی گئی ہے، تاہم زبانوں کی تعداد ۲۰۰ اور ۷۰۰ کے درمیان ہے جس کا انحصار اُس معیار پر ہے جو ایک زبان کے تعین کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ لیکن جوں جوں نظامِ تعلیم بلندی کی طرف جا رہا ہے ذریعۂ تعلیم سکڑتا جا رہا ہے۔

علاقائی زبانوں کی پسماندگی

آج گو بھارت دوسرا زیادہ آبادی والا ملک

(باقی صفحہ پر)

راجیندر پربھو

کوالور رصدگاہ ایک ایشیائی سنگِ میل

بھارت نے ۶؍جنوری ۱۹۸۶ء کو ایک اور سائنسی سنگِ میل قائم کیا ـــــ جب وزیراعظم جناب راجیوگاندھی نے کوالور، تامل ناڈو میں ۲ء۳۴ میٹر لمبی دُوربین کا افتتاح کیا جو بھارت کے ہیئت دانوں کے ادارے (انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایسٹرو فزکس) کی طرف سے نصب کی گئی تھی۔ اس موقع پر وزیراعظم نے اس توقع کا اظہار کیا کہ بھارت کے ہیئت دان اُس شان و عظمت کو بحال کریں گے جو ملک کو صدیوں پہلے فلکیات میں حاصل تھی۔ وہ جس امر کی طرف اشارہ کر رہے تھے وہ تھا فلکیات میں وہ بیشتر دیانہ کام جو وراہ مہر، آریہ بھٹ اور بھاسکر جیسے عظیم بھارتی ہیئت دانوں نے انجام دیا تھا جنھوں نے کیپلر اور گیلیلو، سے سینکڑوں برس پہلے کہا تھا کہ زمین گول ہے اور یہ کہ سیارے سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔ یہ انھوں نے اُس وقت کہا تھا جب یورپ کے لوگ جن میں دانشور بھی شامل تھے ابھی تک یہ یقین کر رہے تھے کہ یہ سورج ہے جو زمین کے گرد گھومتا ہے۔

اس کے بعد بھارت کی ہیئت دانی زوال پذیر ہوگئی اور انگریزی تعلیم کے پہلے رابطے سے ہی اس علم میں دوبارہ دلچسپی پیدا ہوسکی۔ چنانچہ کوئی ۲۰۰ برس پہلے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایسٹرو فزکس کا قیام عمل میں آیا جب پہلی رصدگاہ مدراس میں تعمیر کی گئی۔ حال ہی میں نامور بھارتی ہیئت دانوں جیسے مرحوم ڈاکٹر وینو باپو، منصوبہ بندی کمیشن کے سائنس کے موجودہ ممبر پروفیسر ایم۔ جی۔ کے مینن اور پروفیسر چندر شیکھر نے اس شعبے میں جو تحقیق و مطالعہ کیا ہے اُسے وسیع طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ کہکشانوں سے متعلق اس تمام تر تحقیق و مطالعہ سے کائنات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

سنگِ میل

کوالور کی دُوربین اور رصدگاہ ملک کی ایسی ہی رصدگاہوں کی صف میں شامل ہوگئی ہے جو کوڈئی کنال، اوٹاکمنڈ، پُونے اور نینی تال وغیرہ میں موجود ہیں۔ یہ رصدگاہیں محض ستاروں کی کھوج ہی نہیں کر رہیں بلکہ اُن کے آغاز، نشوونما اور انحطاط کے بارے میں بھی اہم دریافتیں کر رہی ہیں۔ بصری دُوربینوں کے علاوہ ریڈیو ٹیلی اسکوپ بھی نصب کی جا رہی ہیں جیسی کہ اوٹاکمنڈ میں ہے۔ ان رصدگاہوں سے ریڈیائی ستاروں یا ایسے ستاروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے جنھیں محض اُن ریڈیائی لہروں سے ہی پہچانا جاسکتا ہے۔ جن کا اُن سے اخراج ہوتا ہے۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ ستارے کروڑوں برس میں پیدا ہوتے، نشوونما پاتے اور انحطاط کو پہنچتے ہیں۔ وہ سُرخ دیوقامت ہوجاتے ہیں اور بعد میں سفید بَونے بن جاتے ہیں اور انجام کار وہ ریڈیائی ستارے اور سیاہ سُوراخ بن کر ختم ہوجاتے ہیں۔ یہ ایک دلکش مظہرِ قدرت ہے جس سے کائنات کی نوعیت اور اُن بنیادی قوتوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو مادّہ اور توانائی کی پُشت پر سرگرم عمل ہیں۔ لہٰذا جب ہیئت دان اُن کہکشاؤں کی گہرائیوں میں جھانکتے ہیں جو اربوں میل کی دُوری پر ہیں تو وہ اُن بنیادی قوتوں کے بارے میں ایسا علم حاصل کرتے ہیں جو ہماری سمجھ کے قریب تر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بھارت جیسا ایک بڑا ملک جو عظیم سائنسی اور ٹیکنالوجیکل افرادی قوت کا مالک ہے اس شعبے میں پیچھے کیسے رہ سکتا تھا۔

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi.

Vol. 6 No. 5 YOJANA (URDU) 1-15th June 1985

صنعتی ترقی کے لیے بائیو ٹیکنالوجی

بائیو ٹیکنالوجی (حیاتیاتی ٹیکنالوجی) اور تولیدی انجینئرنگ انقلاب جو دنیا پر، خصوصاً صنعتی طور پر ترقی یافتہ تکنیکی ممالک پر چھایا ہوا ہے حالیہ تاریخ میں اس کی کم مثالیں ملتی ہیں۔ بائیو ٹیکنالوجی شائد نہایت تیزی سے ترقی پانے والی ٹیکنالوجی ہے۔ دراصل یہ دریافتوں کا مجموعہ ہے جو آئندہ چند دہائیوں میں صنعت کا نقشہ ہی بدل سکتا ہے اور انھیں بھاری منافع دلا سکتا ہے۔ جو قطعی تجارت کے حامی ہیں۔ یہ اُس ٹیکنالوجی کا ایک پہلو ہے جو انسانی مسائل پر حیاتیاتی اور انجینئرنگ معلومات کے اطلاق سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ ہے نئی یا بہتر مصنوعات یا سروس کی تیاری کے لیے مکمل زندہ خلیوں کے حصوں کا استعمال۔ اس سے سائنسدانوں کو اعلیٰ درجے کی فصلیں اور حیوانات پیدا کرنے کے لیے عام جنسی اختلاط کی ضرورت نہیں رہی۔ ماہرین تولید و تناسل کا یقین ہے کہ آئندہ پندرہ برس میں ان تکنیکوں سے ایسی نئی نسلیں پیدا کرنے کے لیے راستہ کھل جائے گا جو مختلف طرح کی بیماریوں سے محفوظ رہ سکیں گی۔

[illegible] : ایک دہائی کے مختصر عرصے میں جاپان ٹیکنالوجیوں کی بدولت تصورات اور تجاویز کے وسیع سلسلے کو ممکنات کی صورت دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر حیاتیاتی، ایندھن یا توانائی کی فصلوں کو تیار کیا گیا ہے جو تیز رفتاری سے بڑے بڑے حیاتیاتی نامیات پیدا کرتی ہیں جنھیں بلا واسطہ طور پر جلانے والی لکڑی کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے یا الکوحل یا دیگر ایندھنوں میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ بائیو ٹیکنالوجی اور تولیدی انجینئرنگ کی ٹیکنالوجیوں کو چھوت کی بیماریوں کے پریشان کن مسئلے کو حل کرنے، انسان کی پیداواری صلاحیت کو کنٹرول اور منضبط کرنے، انسانی نسلوں، زمین کی زرخیزی اور فصلوں کی پیداواری صلاحیت کو بہتر بنانے اور انسانی ماحول کا بہتر کنٹرول کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ تولیدی انجینئرنگ ایک طاقتور ترین اور تعجب انگیز ہنر ہے جو ایٹم کو توڑنے کے بعد سے انسان کے ہاتھ میں آیا ہے۔

تمام ملکوں میں جاپان بائیو ٹیکنالوجی کو اس صدی کا آخری بڑا ٹیکنالوجیکل انقلاب تصور کرتا ہے۔ سو فیصد بائیو ٹیکنالوجی اور تولیدی انجینئرنگ میں برسوں تک پچھڑا رہنے کے بعد اب وہ اس توسیع پذیر شعبے میں صنعتی قیادت کے لیے سنجیدہ مساعی کر رہا ہے۔ سردست امریکہ اس شعبے میں پیش پیش ہے۔ اُس نے ۵۰ کروڑ ڈالر سے زیادہ سرمایہ اس میں لگایا ہے۔ جس کے بعد جاپان نے ۵ کروڑ ۳۰ لاکھ ڈالر اور برطانیہ نے ۴ کروڑ ۸۰ لاکھ ڈالر کا سرمایہ مخصوص کیا ہے۔

بھارت کی پوزیشن

بھارت میں بائیو ٹیکنالوجی کی پیش رفت کیسی ہے؟ کیا بائیو ٹیکنالوجی انقلاب ہمارے ملک کے پاس سے نکل گیا ہے؟ ہمارے جیسے ایک بڑے ملک کے لیے جہاں بے پناہ تولیدی وسائل ہیں۔ بائیو ٹیکنالوجی اور تولیدی انجینئرنگ ترقی کے لیے پُرجوش مواقع فراہم کرتی ہے۔ ڈائرکٹر آف دی سینٹر آف سیلولر اینڈ مولیکیولر بائیولوجی حیدرآباد، ڈاکٹر پی ایم بھارگو کا بیان ہے کہ گو اس ملک نے بائیو ٹیکنالوجی کو فروغ دینے کی اشد ضرورت کو تسلیم کیا ہے تاہم اس نے اس کے

(باقی صفحہ ۹ پر)

Published by the Director, Publications Division, PatialaHouse, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.

۱۶ تا ۳۰ جون ۱۹۸۶

ہندوستان میں تلہنوں کی کاشت

(ابوسعد)

ایک روپیہ

گاؤں کے غریبوں کے سماجی اور اقتصادی حالات

(اوڑے بھاسکر ریڈی)

بہاری لال پٹیل

بائیو گیس ٹیکنالوجی اور بھارت کے دیہات

ہمارے پنجسالہ منصوبوں میں زراعت اور دیہی ترقی کو اعلیٰ ترین اولیت دی گئی ہے۔ تاہم توانائی کے یقینی اور بھروسہ مند وسائل زراعت اور دیہی ترقی کی رفتار کو بڑھانے میں نہایت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ہمارے دیہات کو آبپاشی کے پمپ سیٹ اور چھوٹے صنعتی یونٹ چلانے، پینے لائق پانی فراہم کرنے، روشنی حاصل کرنے اور کھانا بنانے وغیرہ کے لیے ارزاں الیقینی اور بھروسہ مند توانائی کے وسیلہ کی ضرورت ہے۔ ڈیزل اور بجلی کی بڑھتی ہوئی قیمت کے باعث فصلوں کی پیداوار پر زیادہ لاگت آتی ہے اور اس کے علاوہ توانائی کے ان وسائل کی عدم دستیابی آبپاشی کے صحیح وقت پر اثر انداز ہوتی ہے جس سے انجام کار فصلوں کی پیداوار میں کمی ہوجاتی ہے۔ ہمیں اپنے سائنس دانوں پر فخر ہے جنھوں نے اس موزوں ٹیکنالوجی کو فروغ دیا ہے جس سے مقامی طور پر دستیاب نامیاتی وسائل کو بار بار استعمال میں لاکر دیہی عوام کی ایندھن کی ضروریات کو پورا کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا بائیو گیس ٹیکنالوجی ملک میں سبز انقلاب لاکر دیہی عوام کی اقتصادی ترقی کو بڑھاوا دینے میں مدد دے سکتی ہے۔

فوائد

بائیو گیس ٹیکنالوجی حسب ذیل طریقوں سے اپنی افادیت سے فائدہ پہنچاتی ہے:-

۱۔ بائیو گیس سے چلنے والی حرارتی توانائی بائیوماس (گوبر) سے حاصل ہونے والی توانائی سے تقریباً ۲۰ گنا زیادہ ہوتی ہے۔

۲۔ بائیو گیس پلانٹوں سے اچھی قسم کی کھاد بھی دستیاب ہوتی ہے کیوں کہ اس میں خام مال سے بنائی گئی کمپوسٹ کھاد کے مقابلے میں ۴۳ فیصد نائٹروجن جزو ہوتا ہے۔

۳۔ جب گیس کو ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو دھوئیں کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

۴۔ پلانٹ دور افتادہ علاقوں میں آسانی سے نصب کیا جاسکتا ہے جہاں بجلی دستیاب نہیں ہے۔

۵۔ بائیو گیس توانائی ڈیزل، بجلی اور مٹی کے تیل سے ارزاں تر ہے۔

۶۔ یہ ارزاں تر اور بہتر ایندھن ہے جو متعدد مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے جیسے کھانا بنانا، روشنی حاصل کرنا، آبپاشی اور پمپنگ وغیرہ کے لیے ڈیزل انجن چلانا۔

۷۔ یہ ایندھن کے لیے بے تحاشہ گرائے جانے والے درختوں میں کمی کرتی ہے اور اس کے نتیجے میں جنگلوں کے بچاؤ میں مدد دیتی ہے۔

۸۔ یہ دیہات میں صحت و صفائی کو بہتر بنانے اور عورتوں اور بچوں میں امراض چشم کو کم کرنے میں مدد دیتی ہے اور

۹۔ اگر پلانٹ دیہی علاقوں میں بڑے پیمانے پر نصب کئے جائیں تو کم ہنر مند دیہی عوام کو وافر روزگار مہیا کرتی ہے۔

آبپاشی کے لیے توانائی کی ضرورت

دیہات میں آبپاشی کے لیے لاکھوں پمپ سیٹ لگائے گئے ہیں جو بجلی اور ڈیزل سے چلتے ہیں۔ ان سے فصلوں کی پیداوار بڑھانے میں بڑی مدد مل رہی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ملک کے کئی حصوں میں بجلی کی کمی ہونا ایک عام بات بن گئی ہے۔ برقی پیداوار کی شرح نصب شدہ صلاحیت سے بہت کم ہے اور بجلی کی فراہمی سے بڑا نقصان ہو رہا ہے۔ ان باتوں سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لیے کسانوں کو وقت پر اپنی فصلوں کو پانی مہیا کرنے میں بڑی مشکل آرہی ہے، لیکن بائیو گیس ٹیکنالوجی ان مسئلوں کو حل کرسکتی ہے بشرطیکہ اُس کا موزوں استعمال کیا جائے۔

(باقی کور صد ۳ پر)

● منصوبہ بندی سے متعلق ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر :- آر۔ ٹھکرال

اسسٹنٹ ایڈیٹر :- محمد عادل صدیقی

جلد ۶ | ۱۶ تا ۳۰ جون ۱۹۸۶ | شمارہ ۶

۲۶ جیسٹھ تا ۹ آساڑھ، شک ۱۹۰۸ ۔ ٹیلیفون : ۷۰۱۸۱۸

شرح چندہ

● سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سالہ ۳۵ روپے، سہ سالہ ۵۰ روپے

فی کاپی :- ایک روپیہ

طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ :-

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین)

نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۶۶

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس منچال

ترسیل زر کا پتہ :- بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ادارئیہ

دیہات کی چھوٹی صنعتیں اور ان کی افادیت

حالیہ اقتصادی ادب اور اقتصادی انداز فکر میں صنعت کاری کے عمل کو تیزی سے آگے بڑھانے پر زور دیا جاتا ہے تاکہ اقتصادی ترقی کا عمل تیز رفتار ہو سکے۔ اس کے ذریعے روزگار کے مواقع بڑھانے اور ملک میں توازن ادائیگی کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ صنعت کاری کے لیے جدید تکنیک اپنانا اور اس کے ساتھ ہی انتظامی صلاحیتوں کو فروغ دینا بھی ضروری سمجھا گیا ہے جس سے پیداواری صلاحیت بڑھے۔ ہندوستان کی آبادی کا ۷۶ فیصد حصہ بلکہ اس سے بھی زیادہ دیہات میں آباد ہے۔ ۲۰۰۰ء تک ۸۰ فیصد سے زیادہ آبادی ملک کے تین لاکھ ۷۵ ہزار دیہات میں آباد رہے گی۔ اندازہ ہے کہ مستقبل میں اراضی پر دباؤ اور بڑھے گا۔ دیہات کی نصف سے زیادہ آبادی غریبی کے خط سے نیچے زندگی گزارتی ہے۔ یہ اندازہ ۷۹-۱۹۷۸ء میں لگایا گیا تھا، چونکہ اس عرصے میں اخراجات زندگی میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اس لحاظ سے ملک کے دیہات میں ۴۶ فیصد سے بھی زیادہ لوگ غریبی کے خط سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ راشٹر پتا کا کہنا تھا کہ دیہات کے عوام کا معیار زندگی شہری آبادی سے اگر اچھا نہیں تو کم سے کم اُن کے برابر ضرور ہونا چاہیئے۔ ان کی رائے میں دیہی عوام کو خود کفیل ہونا چاہیئے اور اپنی ترقی کے عمل میں انھیں اپنے پیروں پر خود کھڑا ہونا چاہیئے۔ اس لحاظ سے دیہات میں صنعتوں کے فروغ کی بڑی اہمیت ہے، سوال یہ ہے کہ ہم دیہی صنعت کسے کہتے ہیں؟ دیہی صنعت وہ ہے جو گاؤں یا دیہات کے حدود میں واقع ہو۔ گویا کہ یہ بالعموم دس ہزار تا ۵۰ ہزار آبادی کے درمیان ہو۔ اس کے لیے مالیاتی اداروں کی طویل المدتی اور مختصر المدتی قرضوں کی پالیسی نظر ثانی کی محتاج ہے۔ ایک اندازے کے مطابق یہ قرض مشینری اور چالو سرمایہ کے لیے کم سے کم دس ہزار روپے اور زیادہ سے زیادہ ۱۵ ہزار روپے ہو سکتا ہے۔ زیادہ بڑی صنعت کے لیے یہ رقم کم سے کم ۵۰ ہزار روپے سے لے کر ایک لاکھ روپے تک ہو سکتی ہے۔ دیہی صنعتوں میں سرمایہ کاری کئی لحاظ سے مفید ہے، اس سے پیداوار بڑھتی ہے، روزگار کے مواقع بڑھتے ہیں اور دیہات کے عوام کی حالت سدھرتی ہے۔

دیہی صنعتوں میں محنت کش طبقے کی کھپت کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ ان سے عورتیں اور مرد دونوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ دونوں کو ہی روزگار ملتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس طرح اقتصادی ترقی کا عمل اجارہ داری کی حدود سے نکل کر لا مرکزی سیکٹر میں آجاتا ہے۔ اس سے شہروں کی ترقی پر بھی اثر پڑتا ہے۔ گاؤں کے لوگ شہروں کی طرف نہیں بھاگتے اور شہروں میں گندی بستیوں کے مسائل کم ہوتے ہیں۔ ماحول کی آلودگی کے مسائل کم سے کم ہوتے ہیں۔ انسانی وسیلے کے فروغ کا بہترین ذریعہ یہی صنعتیں ہیں۔

دیہات کے عوام کی ذہنی صلاحیتوں اور تخلیقی قوتوں سے پوری طرح کام لیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ زراعت دیہی معیشت کی کلید ہے تاہم دیہی صنعتیں بھی معیشت کو مختلف طرح سے مضبوط بناتی ہیں۔ چونکہ اراضی پر آبادی کا دباؤ بڑھ رہا ہے اور اس کے نتیجے میں دیہات میں محنت کشوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ان میں تعلیم یافتہ افراد بھی ہیں اور غیر تعلیم یافتہ بھی زراعت میں سبھی کو کھپانا ممکن نہیں، اسی لیے دیہی صنعتوں کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے۔ دیہی صنعتوں کے لیے زراعت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ دیہی صنعت کاری کے عمل سے مقامی وسائل کی مدد سے پیداوار بڑھتی ہے اور معاون روزگار ملتا ہے۔ روایتی ہنر مندیوں اور صنعتوں کو فروغ ملتا ہے نیز دیہات میں زرعی اور صنعتی ترقی کا عمل شانہ بشانہ آگے بڑھتا ہے۔ اس سے مقامی طور پر خوشحالی دیکھنے کو ملتی ہے اور شہری و دیہی طبقوں کی آمدنیوں کا فرق کم ہوتا ہے دیہی آبادی خود کفیل کی طرف تیزی سے قدم بڑھاتی ہے۔ ہندوستان کے پچھڑے علاقوں میں صنعت کاری کے عمل سے کافی ترقی دیکھنے کو ملی ہے۔ ہندوستان میں صنعتی پالیسی کی قرارداد مجریہ ۱۹۴۸ء میں مقامی وسائل کے زیادہ سے زیادہ استعمال اور اشیائے صارفین کے ضمن میں خود کفیل کے حصول پر کافی زور دیا گیا تھا۔ اسی واسطے گھریلو صنعتوں اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی۔ روزگار، پیداوار اور برآمدات کے نقطۂ نظر سے بھی دیہی

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

ابو سعد

ہندوستان میں

ہندوستان دنیا میں تلہن پیدا کرنے والا ایک اہم ملک ہے۔ یہاں دنیا کی تقریباً ۳۰ فیصد مونگ پھلی، ۲۵ فیصد تل، ۲۰ فیصد انڈی اور ۱۷ فیصد سرسوں پیدا کی جاتی ہے۔ تلہن خریف اور ربیع دونوں کی پیداوار ہے، اس کی کاشت ملک کے کُل زرعی رقبے کے تقریباً ۹ فیصد حصّے پر کی جاتی ہے۔ یہ ملک کی اہم تجارتی فصل ہے اس سے کافی غیر ملکی زرِ مبادلہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں تلہنوں کے تحت مونگ پھلی، سرسوں، تل، اَلسی، ارنڈا، سویابین اور سورج مُکھی وغیرہ فصلوں کی کاشت ہوتی ہے۔ خوردنی اجناس کی ان سالانہ فصلوں کے علاوہ بعض درخت بھی ہیں جن سے خوردنی تیل بڑی مقدار میں حاصل کیا جاتا ہے۔ ان میں ناریل، پام اور آملہ وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

سبھی طرح کے تلہنوں کے لیے مختلف قسم کی مٹیاں، درجۂ حرارت اور بارش کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے ہمارے ملک میں تلہنوں کی کاشت کا علاقہ بہت زیادہ بکھرا ہوا ہے۔ سبھی صوبوں میں تھوڑی بہت مقدار میں تلہنوں کی پیداوار ہوتی ہے۔ پچھلے ۳۰ سالوں میں ملک میں سبھی طرح کے تلہنوں کی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ میں تلہنوں کی پیداوار ۷ء۶۱ لاکھ ٹن تھی جو بڑھ کر ۶۱-۱۹۶۰ میں ۴ء۸۸ لاکھ ٹن، اور ۷۹-۱۹۷۸ میں ۵ء۹۵ لاکھ ٹن، ۸۲-۱۹۸۱ میں ۱۰۹ لاکھ ٹن اور ۸۴-۱۹۸۳ کے دوران ۱ء۱۲۸ لاکھ ٹن پہنچ گئی جوکہ ایک ریکارڈ ہے، جبکہ ۸۴-۱۹۸۳ کے لیے تلہنوں کی پیداوار کا نشانہ صرف ۱۲۵ لاکھ ٹن مقرر کیا گیا تھا۔ توقع ہے کہ ۸۵-۱۹۸۴ کے دوران خراب موسم کے باوجود تلہنوں کی پیداوار ۱۳۰ لاکھ ٹن سے زیادہ ہوگی۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ ساتویں پنجسالہ منصوبے کے لیے تلہنوں کی پیداوار کا نشانہ ۱۸۰ لاکھ ٹن بھی آسانی سے پورا کر لیا جائے گا، اگر موسم سازگار رہا تو ساتویں پنجسالہ منصوبے کے دوران تلہنوں کی پیداوار ۲۰۰ لاکھ ٹن تک پہنچ سکتی ہے۔

تلہنوں کی پیداوار میں اضافے کے ساتھ اس کی کاشت کے رقبے میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ ۷۸-۱۹۷۷ میں ۱۵۵ لاکھ ہیکٹیئر زمین پر تلہنوں کی کاشت کی گئی تھی جبکہ ۸۴-۱۹۸۳ میں ۱۸۷ لاکھ ہیکٹیئر زمین پر اس کی کاشت ہوئی۔ پچھلے کچھ سالوں میں تلہنوں کی پیداوار اور رقبے میں اضافے کے ساتھ اس کی فی ہیکٹیئر پیداواری صلاحیت میں بھی بڑا نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ ۸۰-۱۹۷۹ میں تلہنوں کی فی ہیکٹیئر پیداوار ۵۱۶ کلوگرام تھی جو بڑھ کر ۸۴-۱۹۸۳ میں ۶۸۵ کلوگرام فی ہیکٹیئر ہوگئی۔

خوردنی تیل اور تلہنوں کی مانگ کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ساتویں پنجسالہ منصوبے کے

دوران تلہنوں کی کاشت کو خاص اولیت دی گئی ہے تاکہ خوردنی تیل کی پیداوار میں خود کفالت حاصل کی جا سکے اور اُس قیمتی زر مبادلہ کو بچایا جا سکے جو ہر سال خوردنی تیلوں کی درآمد پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ تلہنوں کی پیداوار میں اضافہ اور خوردنی تیلوں کی درآمد میں کمی بہت ضروری ہے۔ آبادی میں مسلسل اضافے سے خوردنی تیل کی کھپت میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ساتویں پنجسالہ منصوبے کے دوران تلہن کی پیداوار میں ۲۰۰ لاکھ ٹن تک اضافہ کیا جائے۔ چنانچہ یہ کام ہمارے زرعی ماہرین کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج بن گیا ہے۔ زرعی ماہروں کو ایسی پالیسی مرتب کرنی ہوگی جس کے تحت تلہنوں کی کاشت میں جدید ٹیکنالوجی کو استعمال کیا جا سکے اور کم لاگت پر زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جا سکے۔ تلہن کی پیداوار میں اضافہ صرف تلہن کے زیر کاشت رقبے کو ہی بڑھا کر نہیں کیا جا سکتا بلکہ فی ہیکٹر پیداوار میں بھی اضافہ کرنا ضروری ہے۔ کسی دوسری فصل یعنی گندم، کپاس یا گنے کا زیر کاشت رقبہ کم کر کے اُس پر تلہن کاشت کرنے کا کوئی حقیقی فائدہ حاصل نہیں ہوگا کیوں کہ ایسی صورت میں دوسری فصلوں کی پیداوار پر اثر پڑے گا۔ گندم، چاول، کپاس اور گنے کی طرح تلہن کی فصلوں کی بھی قیمتیں ایک ایسی سطح پر مقرر کی جائیں کہ اُن میں کاشت کار کی دلچسپی میں اضافہ ہو اور کاشت کاروں کو یہ بھی یقین دلانا ضروری ہے کہ تلہن کی پیداوار خرید لی جائے گی۔ تلہنوں کو ذخیرہ کرنے کے لیے باقاعدہ انتظامات بھی ضروری ہیں کیوں کہ گرمی اور نمی سے تلہنیں خراب ہو جاتی ہیں، اور تیل بدبودار ہو جاتا ہے۔

خوردنی تیل اور تلہنوں کی پیداوار میں اضافے کے لیے حکومتی سطح پر کوششیں کی جا رہی ہیں۔ سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی مرحومہ نے اپنے بیس نکاتی پروگرام کے تحت تلہنوں کی کاشت اور اس کی پیداوار میں اضافے کے لیے خاص توجہ دی۔ انھیں کے بیس نکاتی پروگرام کے تحت ۸۴-۱۹۸۳ میں تلہنوں کی ریکارڈ پیداوار ہوئی۔ ۲۳ ستمبر کو اس وقت کے وزیر زراعت شری بوٹا سنگھ کی صدارت میں نیشنل تلہن اور خوردنی تیل کے ترقیاتی بورڈ (National Oil Jeeds and Vegetable Oil Development Board) کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں انھوں نے تلہنوں کی پیداوار بڑھانے پر زور دیا۔ انھوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ تلہن اور خوردنی تیل کے بارے میں جلد ہی ایک ٹیکنالوجی کمیشن قائم کیا جائے گا یہ کمیشن ٹیکنالوجی کی خلیج پُر کرے گا اور لاگت کم کرنے کے لیے تیل پیرنے والے یونٹوں کو جدید رنگ میں ڈھالے گا۔

ہندوستان میں تلہنوں کے تحت مونگ پھلی، تِل، سرسوں اور اُلسی وغیرہ کی کاشت خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں ان کے علاوہ سویا بین اور سورج مکھی کی کاشت بھی کی جا رہی ہے۔ ان فصلوں کا مختصر جائزہ حسب ذیل ہے:-

مونگ پھلی

مونگ پھلی (Groundnut) ہندوستان کی اہم فصل ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ مونگ پھلی ہمارے ملک میں ہی پیدا کی جاتی ہے۔ یہاں دنیا کی تقریباً ۳۰ فیصد مونگ پھلی پیدا کی جاتی ہے۔ اس سے ہر سال کروڑوں روپے کا غیر ملکی زرمبادلہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ مونگ پھلی عام طور پر خریف کی فصل ہے جو مئی سے اگست تک بوئی جاتی ہے اور نومبر سے جنوری تک کھودی جاتی ہے۔ جنوبی ہند میں یہ گرمی کی فصل ہے۔ گرمی کی فصل کو جنوری، فروری میں بویا جاتا ہے اور جون، جولائی میں کھود لیا جاتا ہے۔

مونگ پھلی ایک حرائی پودا ہے اس کے لیے ۷۵ سے ۱۵۰ سینٹی میٹر تک بارش کی ضرورت ہوتی ہے اس سے کم بارش ہونے پر سینچائی کے ذریعے اس کی کاشت کی جاتی ہے۔ مونگ پھلی زیادہ بارش والے علاقوں میں بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ مونگ پھلی کا پودا اتنا ملائم و نازک ہوتا ہے کہ ٹھنڈے علاقوں میں اس کی فصل اچھی نہیں ہوتی ہے۔ اسے ۱۵ ڈگری سینٹی گریڈ سے ۲۵ ڈگری سینٹی گریڈ درجۂ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مونگ پھلی کی کاشت ہلکی بالودار دومٹ مٹی میں اچھی ہوتی ہے۔ سخت و بھاری مٹیار زمین میں اس کی کاشت اچھی نہیں ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اس کی کاشت مہاراشٹر، کرناٹک، گجرات اور تامل ناڈو کی کالی مٹی اور بہار کی لال مٹی والے علاقوں میں ہوتی ہے۔ گنگا کی کچھاری بالو مٹی میں بھی اس کی اچھی کاشت ہوتی ہے۔

گجرات، تامل ناڈو، آندھرا پردیش، کرناٹک اور اتر پردیش وغیرہ صوبوں میں تقریباً ۷۲ لاکھ ہیکٹر زمین پر مونگ پھلی کی کاشت کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں زیادہ تر مونگ پھلی آندھرا پردیش، تامل ناڈو، گجرات، مہاراشٹر اور کرناٹک وغیرہ صوبوں میں پیدا ہوتی ہے۔ ملک کی تقریباً ۷۵ فیصد مونگ پھلی انھیں صوبوں میں پیدا ہوتی ہے۔ پچھلے

تیس سالوں میں مونگ پھلی کی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء اس کی پیداوار ۳۴ء۸۰ لاکھ ٹن تھی جو بڑھ کر ۷۱-۱۹۷۰ء میں ۶۰ء۶۰ لاکھ ٹن اور ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۶۸ لاکھ ٹن ہو گئی۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں خریف کی مونگ پھلی کی پیداوار ۴۸ لاکھ ٹن اور ربیع کی مونگ پھلی کی پیداوار ۲۰ لاکھ ٹن تھی۔

ہندوستان میں مونگ پھلی کی فی ہیکٹیر اوسط پیداوار ۸۰۵ کلو گرام ہے۔ یہ پیداوار دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کم ہے۔ زرعی تحقیق کی انڈین کونسل نے مونگ پھلی کی نئی قسمیں دریافت کی ہیں جن سے فی ہیکٹیر ۲۵۰۰ کلوگرام تک پیداوار حاصل کی جا سکے گی۔ شمالی ہندوستان میں مونگ پھلی کی کاشت کو بہت زیادہ فروغ دیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس علاقے میں گنّا ہی نقدی فصل (Cash Crop) ہے۔ زرعی ماہرین کے مطابق مونگ پھلی کی کاشت کو شمالی ہندوستان میں اور گنّے کی فصل کو جنوبی ہندوستان میں فروغ دیا جانا زیادہ سود مند ثابت ہوگا۔ کیونکہ شمالی ہندوستان میں مونگ پھلی اور جنوبی ہندوستان میں گنّے کی فی ہیکٹیر پیداوار زیادہ ہے۔

مونگ پھلی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ پہلے اس کے پودوں کو زمین کھود کر نکالنا پڑتا ہے اور پھر پھلی الگ کرنی پڑتی ہے مگر اتنی محنت کے باوجود اس کی خاصی مقدار زمین کے اندر ہی چھوٹ جاتی ہے۔ زمین سے نکالنے کے بعد پھلی سے دانے کو الگ کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مونگ پھلی کو زمین سے نکالنے اور پھلی سے دانے نکالنے کے لیے کسانوں کو مشینیں دستیاب ہوں۔ دیگر اجناس کی طرح چوہا اس فصل کو بھی بہت نقصان پہونچاتا ہے۔ اس لیے چوہوں سے محفوظ رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔

ہندوستان سے بڑی مقدار میں مونگ پھلی دوسرے ملکوں کو برآمد کی جاتی ہے جس سے کروڑوں روپے کا زرِمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ ہندوستان سے مونگ پھلی درآمد کرنے والے ممالک کناڈا، بلجیم، فرانس، مغربی جرمنی، اٹلی اور انگلینڈ وغیرہ ہیں۔ ملک میں بناسپتی گھی کی مانگ بڑھنے سے دوسرے ملکوں کو مونگ پھلی کی برآمدات میں کمی واقع ہوئی ہے۔

پچھلے کچھ سالوں سے مونگ پھلی کا تیل بھی برآمد کیا جانے لگا ہے۔

تِل :-

تِل (Sesamum) ربیع اور خریف دونوں کی فصل ہے۔ یہ ہندوستان کے تمام علاقوں میں پیدا کی جاتی ہے۔ اترپردیش، بہار، مغربی بنگال اور مہاراشٹر وغیرہ ہیں۔ یہ خریف کی فصل ہے یہاں اس کے بونے کا وقت مئی سے اگست تک ہے اور کٹائی کا وقت ستمبر سے دسمبر تک ہے۔ تِل، ارہر، جوار، باجرے اور اُرد وغیرہ کے ساتھ بوئی جاتی ہے۔ اس کی کاشت مختلف آب و ہوا اور مٹی والے علاقوں میں کی جاتی ہے۔ تِل کے لیے ۲۰ ڈگری سینٹی گریڈ سے ۲۵ ڈگری سینٹی گریڈ یا اس سے کچھ زیادہ درجہ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ۵۰ سے ۱۰۰ سینٹی میٹر بارش اس فصل کے لیے کافی ہوتی ہے۔ تِل کے لیے ہلکی بالو دار مٹی کی ضرورت ہوتی ہے جس میں زیادہ دیر تک پانی نہیں ٹھہرنا چاہیئے۔ کالی مٹی میں بھی کئی طرح کے تِلوں کی کاشت ہوتی ہے۔

ہندوستان میں تِل کی کاشت قدیم زمانے سے ہو رہی ہے آج بھی اس ملک کو تِل کی پیداوار میں عالمی سطح پر دوسرا مقام حاصل ہے۔ دنیا کی تقریباً ۲۵ فیصد تِل یہاں پیدا کی جاتی ہے۔ اترپردیش، راجستھان، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش، گجرات، مہاراشٹر اور تامل ناڈو وغیرہ زیادہ تِل پیدا کرنے والے خاص صوبے ہیں۔ ان صوبوں میں پورے ملک کا تقریباً ۹۰ فیصد تِل کا علاقہ پایا جاتا ہے۔ تِل کی پیداوار کے سلسلے میں اترپردیش ہی ملک کی ایک تہائی تِل پیدا کرتا ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں تِل کی پیداوار تین لاکھ ۵۵ ہزار ٹن ہو گئی تھی۔ تِل کی فی ہیکٹیر پیداوار ۲،۵ کلو گرام ہے جو دوسرے ملکوں کے مقابلے کم ہے۔ ملک میں حاصل ہونے والی کُل تِل کا ۸۰ء۴ فیصد تیل نکالنے کے لیے، ۱۵ء۴ فیصد کھانے کے طور پر اور ۰ء۵ فیصد بیج کے طور پر استعمال میں لائی جاتی ہے۔ پچھلے کچھ سالوں سے تِل کے بیج کی برآمدات میں کمی آئی ہے۔ اس کا تیل زیادہ تر برآمد کیا جاتا ہے۔ انگلینڈ، فرانس، اٹلی، مصر، مغربی جرمنی وغیرہ ملکوں کو تِل اور اس کا تیل برآمد کیا جاتا ہے۔

اَلسی :-

ہندوستان میں اَلسی (Linseed) کی کاشت خاص طور سے تیل حاصل کرنے کے لیے کی جاتی ہے جبکہ معتدل خطے کے ممالک اس سے ریشے حاصل کرتے ہیں جس سے ایک قسم کا کپڑا بُنا جاتا ہے۔ السی کے لیے ٹھنڈی آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے اور اوسط درجۂ حرارت ۱۵ سینٹی گریڈ سے ۲۲ سینٹی گریڈ تک مناسب ہوتی ہے جب کہ ۵، سے ۱۵۰ سینٹی میٹر بارش کی ضرورت ہوتی ہے۔ السی کی کاشت سبھی طرح کی مٹیوں میں ممکن ہے۔ لیکن مٹی میں نمی ہونا ضروری ہے۔ اَلسی ربیع کی فصل ہے۔ ملک کے مختلف حصّوں میں اس کے بونے اور کاٹنے کا وقت بھی الگ الگ ہے عام

طور پر یہ اگست سے نومبر تک بوئی جاتی ہے اور جنوری سے اپریل تک کاٹی جاتی ہے۔

دوسری تلہنوں کے ساتھ السی کی پیداوار میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں یہاں ۴ لاکھ ۶۷ ہزار ٹن السی پیدا ہوئی تھی جو بڑھ کر ۸۱-۱۹۸۰ء میں چار لاکھ ۲۸ ہزار ٹن تک پہونچ گئی تھی۔ السی کی کاشت ۱۸ لاکھ ہیکٹیر زمین پر کی جاتی ہے۔ السی کی پیداوار کی جاتی ہے۔ السی کی پیداوار میں اترپردیش اور مدھیہ پردیش کو اہم مقام حاصل ہے۔ یہ دونوں صوبے پورے ملک کی تقریباً ۷۰ فیصد السی پیدا کرتے ہیں۔ بہار، اڑیسہ، راجستھان، گجرات، مہاراشٹرا اور مغربی بنگال وغیرہ صوبوں میں بھی اس کی کاشت ہوتی ہے۔ ملک میں السی کی فی ہیکٹیر پیداوار ۲۵۰ کلوگرام ہے۔ جبکہ دوسرے ملکوں میں اس کی فی ہیکٹیر پیداوار ہمارے ملک سے کہیں زیادہ ہے۔ ہندوستان میں السی کی کل پیداوار کے ۴۰ فیصد سے تیل حاصل کیا جاتا ہے۔ اس سے حاصل تیل کا ۱/۲ حصہ صنعتی کاموں اور ۱/۲ حصہ خوردنی تیل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ السی کی کل پیداوار کا تقریباً ۳۴ فیصد بیج دوسرے ملکوں کو برآمد کر دیا جاتا ہے۔ آسٹریلیا اور برطانیہ السی درآمد کرنے والے اہم ممالک میں پچھلے کچھ سالوں کے دوران السی کے تیل کی برآمدات میں اضافہ ہوا ہے۔

ارنڈ یا انڈی :-

انڈی (Castor Seeds) ربیع اور خریف دونوں کی فصل ہے اس کی کاشت ملک کے مختلف علاقوں میں کی جاتی ہے۔ انڈی کی پیداوار میں ہندوستان کو عالمی سطح پر برازیل کے بعد دوسرا مقام حاصل ہے۔ یہاں دنیا کی تقریباً ۲۷ فیصد انڈی پیدا کی جاتی ہے۔ انڈی کے پودے کو گرم آب و ہوا کی ضرورت پڑتی ہے۔ بیج کو کھیتوں میں بونے کے بعد مختصر بارش کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن پودے کے اُگ جانے کے بعد نمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پالے سے فصل کو نقصان پہونچتا ہے۔ اس کی کاشت کے لیے ہلکی خشک بالودار مٹی یا کانپ کی مٹی موزوں ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں انڈی عام طور پر جولائی کے مہینے میں پہلی بارش ہونے پر بوئی جاتی ہے اور دسمبر سے مارچ تک اس کی فصل کاٹ لی جاتی ہے۔

انڈی کی کاشت زیادہ تر آندھرا پردیش، گجرات اور مہاراشٹر میں کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تامل ناڈو، کرناٹک اور مدھیہ پردیش وغیرہ صوبوں میں بھی اس کی کاشت کامیابی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں انڈی کی پیداوار ایک لاکھ تین ہزار ٹن تھی جو بڑھ کر ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۵.۰ لاکھ ٹن اور ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۵.۵ لاکھ ٹن ہو گئی تھی۔ اس کی کاشت تقریباً ۵.۷ لاکھ ہیکٹیر زمین پر کی جاتی ہے۔ یہاں انڈی کی فی ہیکٹیر پیداوار ۵.۳ کلوگرام ہے۔ آئی۔ سی۔ اے۔ آر۔ نے کم وقت میں تیار ہونے والی انڈی کی کئی قسمیں تیار کی ہیں۔ ان میں ارونا (Aruna) بھاگیہ (Bhagya) سوبھاگیہ (Sowbhagya) اور دوغلی قسمیں ہیں، جی۔ اے۔ یو۔ ۱ (G.A.U-1) اور جی۔ اے۔ یو۔ ۳ (G.A.U-3) اہم ہیں۔ ان نئی قسموں سے فی ہیکٹیر ۲.۱ ٹن انڈی پیدا کی جاسکتی ہے۔ انڈی سے بڑی مقدار میں تیل حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کے تیل کا استعمال مشینوں کو چکنا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چمڑے کی صنعت، کپڑے کی صنعت، رنگ و روغن اور دوائیں بنانے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی کھلی جانوروں کو کھلائی جاتی ہے۔ اور کھیتوں میں کھاد کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ بھارت سے انڈی کے تیل کی برآمد امریکہ، اٹلی، فرانس، انگلینڈ اور ہالینڈ وغیرہ ممالک کو ہوتی ہے۔

سرسوں اور رائی (Mustard Seeds and Rye)

سرسوں اور رائی ہمارے ملک کی بہت سی اہم فصلیں ہیں۔ ان کا استعمال خوردنی تیل کے طور پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہ زیادہ تر گندم، جو، چنا، مٹر وغیرہ ربیع کی فصلوں کے ساتھ مخلوط طور پر بوئی جاتی ہے۔ اس لیے اس فصل کے لیے بھی ویسی ہی آب و ہوا اور مٹی کی ضرورت ہوتی ہے جیسی گندم اور جو کے لیے ضرورت پڑتی ہے۔ سرسوں اور رائی کے لیے اوسط ۲۰ ڈگری سینٹی گریڈ درجۂ حرارت اور ۲۵ سے ۱۲۵ سینٹی میٹر بارش کی ضرورت ہوتی ہے۔ پانی کی زیادتی سے پودے خراب ہو جاتے ہیں۔ زرخیز دومٹ مٹی میں اس کی اچھی کاشت کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کئی قسم کی مٹیوں میں اس کی کھیتی ہو سکتی ہے۔ ہندوستان میں یہ اگست سے اکتوبر تک بوئی جاتی ہے۔ اور جنوری سے اپریل تک کاٹ لی جاتی ہے۔

ہمارے ملک میں سرسوں اور رائی کی کاشت زیادہ تر شمالی علاقوں میں کی جاتی ہے۔ اترپردیش، مغربی بنگال، بہار، اڑیسہ اور پنجاب وغیرہ صوبوں میں اس کی کاشت کامیابی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اترپردیش میں ملک کی ۶۰ فیصد سرسوں اور رائی پیدا کی جاتی ہے۔ پچھلے تیس سالوں کے دوران سرسوں کی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں سرسوں اور رائی کی پیداوار ۷ لاکھ ۶۲ ہزار ٹن تھی۔ جو بڑھ کر ۶۱-۱۹۶۰ء میں ۱۴.۰ لاکھ ٹن اور ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۲۲.۰ لاکھ ٹن تک پہنچ گئی تھی۔ دنیا کی ۵.۰ فیصد سرسوں ہندوستان میں ہی

پیدا کی جاتی ہے۔ ہمارے ملک کی تقریباً ۴۲ لاکھ ہیکٹیئر زمین پر سرسوں اور رائی کی کاشت کی جاتی ہے۔ یہاں سرسوں اور رائی کی فی ہیکٹیئر پیداوار ۵۰۸ کلوگرام ہے۔ اگر اس فصل کے لیے زمین بہتر طور پر استعمال کی جائے اور سینچائی کا مناسب انتظام کیا جائے تو موجودہ فی ہیکٹیئر پیداوار میں تین گنا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ زرعی تحقیق کی انڈین کونسل کے مطابق آئندہ چند سالوں میں ایسے بیج تیار کر لیے جائیں گے جس سے فی ہیکٹیئر ۲٫۵ سے ۳ ٹن تک سرسوں کی پیداوار حاصل ہو سکے گی۔ اچھے قسم کے بیج تیار کرنے کے لیے تحقیق جاری ہے۔ ملک میں پیدا ہونے والی سرسوں اور رائی کا ۱۲ فیصد تیل نکالنے کے لیے ۔ ۱ فی صد کھانے کے لیے اور ۵ فیصد بیج کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جب کہ ۳ فیصد سرسوں اور رائی غیر ملکوں کو برآمد کر دی جاتی ہے۔

سویابین (Soyabean)

دنیا میں اس وقت تیل کی فصلوں میں سویابین سر فہرست ہے۔ سویابین میں پروٹین ۴۰ فیصد تک ہوتی ہے۔ زیادہ تر ممالک سویابین کی کاشت پروٹین کے لیے کرتے ہیں۔ امریکہ، چین اور دوسرے کئی ممالک سویابین کو جانوروں، مُرغیوں اور انسانوں کی خوراک میں استعمال کرتے ہیں۔ سویابین سے تقریباً ۱۸ فیصد تیل نکلتا ہے۔ اس لحاظ سے تیل اور اجناس میں سب سے کم تیل دینے والی فصل ہے۔ سویابین سے تیل ضمنی پیداوار (By products) کی شکل میں حاصل ہوتا ہے۔ سویابین کا تیل مختلف طرح سے استعمال کیا جاتا ہے اس کے تیل کا استعمال صابن، پینٹ، وارنش، گریس، انسیکٹیسائڈ (Insecticide) پرنٹنگ سیاہی، واٹر پروفنگس (Water Proofings) مصنوعی ربڑ اور پلاسٹک وغیرہ بنانے میں کیا جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں اس کی کاشت شروع کی گئی ہے۔ ہمارے کسان اس کی کاشت میں بہت دلچسپی لے رہے ہیں۔ یہاں سویابین کی کئی نئی قسمیں تیار کی گئی ہیں۔ ان نئی قسموں سے فی ہیکٹیئر پیداوار میں کافی اضافہ ہو سکتا ہے۔ یہ فصل زمین کو زرخیز بناتی ہے اور ملک کے ہر علاقے میں پیدا ہو سکتی ہے۔ ۸۱-۱۹۸۰ء میں یہاں تقریباً ایک لاکھ ہیکٹیئر زمین پر سویابین کی کاشت ہوئی تھی جس سے ۲ لاکھ ۱۰ ہزار ٹن سویابین کی پیداوار حاصل ہوئی تھی۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں سویابین کی پیداوار ۹ لاکھ ٹن تھی۔ اُمید ہے کہ اس سال اس کی پیداوار ۱۱ لاکھ ٹن تک پہونچ جائے گی۔

بنولے (Cotton Seeds)

بنولا کپاس سے حاصل ہوتا ہے۔ کپاس کا ریشہ بنولے کے گرد لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ بنولے سے تیل اور کھلی حاصل ہوتی ہے۔ تیل کے متعدد استعمال ہیں جبکہ کھلی کو جانوروں کے چارے اور کھاد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بنولا جانوروں کو کھلانے کے کام بھی آتا ہے۔ اس کو کھلانے سے دودھ دینے والے جانوروں کے دودھ میں مکھن کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ بنولے کا استعمال بناسپتی گھی بنانے کے لیے زیادہ ہوتا ہے بنولے سے کچھ دوائیں بھی تیار کی جاتی ہیں مارگرین اور لارڈ مکھن بھی تیار کیا جاتا ہے۔ بنولے کی پیداوار انھیں علاقوں میں ہوتی ہے جہاں کپاس پیدا کی جاتی ہے۔ مہاراشٹر، گجرات، مدھیہ پردیش، تامل ناڈو، مہاراشٹر، پنجاب وغیرہ صوبوں میں کپاس کی اچھی کاشت ہوتی ہے۔ ۱۹۸۳ء میں کپاس کی کاشت تقریباً ۸۰ لاکھ ہیکٹیئر زمین پر کی گئی تھی۔ ہمارے ملک میں بنولے کی فی ہیکٹیئر پیداوار ۲۳۵ کلوگرام ہے جبکہ اس کی سالانہ اوسط پیداوار ۲۰ لاکھ میٹرک ٹن ہے۔

سُورج مُکھی (Sun Flower)

خوردنی تیل کی فصلوں میں سُورج مکھی ایک اہم فصل ہے۔ سورج مکھی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی فصل کم مدت میں تیار ہوتی ہے۔ اس سے ایک سال میں دو فصلیں آسانی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ سورج مکھی بنیادی طور پر ٹھنڈے علاقے کی فصل ہے۔ اس لیے اپنے حالات کے مطابق اس کی نئی اقسام تیار کی گئی ہیں۔ سورج مکھی کی نئی قسمیں تقریباً ۸۰ دن میں تیار ہو جاتی ہیں۔ سورج مکھی میں خوردنی تیل کی مقدار تقریباً ۴۰ سے ۵۰ فیصد تک ہوتی ہے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے تجارتی طور پر اس کی کاشت ۱۹۶۵ء میں شروع کی گئی تھی۔ تب سے اس کی پیداوار اور رقبے میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ مہاراشٹر، کرناٹک اور تامل ناڈو میں اس کی کاشت کو زیادہ فروغ ملا ہے۔ آندھرا پردیش اور اترپردیش میں بھی اس کی کاشت پر خاص توجہ دی جارہی ہے۔ زرعی ماہرین کے مطابق اس کی کاشت مختلف قسم کی مٹیوں میں کی جاسکتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی کھیتی نمکین، شورہ آلود مٹی اور دلدلی مٹی میں بھی کی جاسکتی ہے۔ دھان کی پرتی زمین (Paddy Fallows) میں اس کی کاشت کامیابی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ ملک کی وہ زمینیں جو شوریت والقلی کی زد میں آگئی ہیں، اُن میں گندم کی کاشت کے بجائے سورج مکھی کی کاشت زیادہ سودمند ثابت ہوگی۔ کرناٹک میں گلبرگہ، بیدر، رائے چور اور بیلاری اضلاع، مہاراشٹر میں شولاپور، عثمان آباد اور پربھنی ضلعوں میں سورج مکھی کی فصل زیادہ منافع بخش ثابت

پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں سورج مکھی کی فی ہیکٹیئر پیداوار ۸۰۰ سے ۱۰۰۰ کلوگرام ہے۔ یہ پیداوار سوویت روس، رومانیہ اور جنوبی افریقہ کے مقابلے میں بہت کم ہے تاہم اس کی فی ہیکٹیئر پیداوار میں اضافے کی گنجائش ہے۔ کیمیاوی کھادوں کے استعمال اور سینچائی کا مناسب انتظام کرکے اس کی فی ہیکٹیئر پیداوار میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

ناریل (Cooonut)

ناریل ایک بہت اہم درخت ہے جس سے بہت بڑی مقدار میں تیل حاصل ہوتا ہے۔ ناریل حارّی اور ذیلی حارّی آب وہوا والے علاقوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس درخت کے لیے عام طور پر ۲۰ ڈگری سینٹی گریڈ سے ۲۵ ڈگری سینٹی گریڈ درجۂ حرارت اور ۱۵۰ سینٹی میٹر سے زیادہ بارش کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ زیادہ تر سمندری ساحلوں پر ندیوں کے ڈیلٹاؤں میں اور جزیروں میں کانپ کی مٹی میں خوب فروغ پاتا ہے۔ گو کہ اسے سمندری ہواؤں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن سمندر سے دور والے علاقوں میں بھی پیدا کیا جاتا ہے۔ ناریل کے درخت دس سال میں پھل دینے لگتے ہیں اور تقریباً سو سال تک پھل دیتے ہیں۔ ایک درخت سے ہر سال تقریباً ۱۰۰ ناریل حاصل ہوتے ہیں۔

انڈونیشیا اور فلپائن کے بعد ناریل کی عالمی پیداوار میں ہندوستان کو تیسرا مقام حاصل ہے۔ یہاں ۱۱ لاکھ ۱۰ ہزار ہیکٹیئر زمین پر ناریل کے باغ لگائے گئے ہیں۔ جب کہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں یہ رقبہ صرف ۶.۲۶ لاکھ ہیکٹیئر تھا۔ ۱۹۵۰-۵۱ء میں ناریل کی پیداوار ۳ ارب ۵۸ کروڑ تھی جو بڑھ کر ۱۹۸۴-۸۵ء میں پندرہ ارب ۶۴ کروڑ ناریل ہوگئی۔ ملک کا تقریباً ۵۰ فیصد ناریل کیرل میں اور ۱۹ فیصد تامل ناڈو میں پیدا ہوتا ہے۔ یہاں سے ناریل اور ناریل کا تیل خاص طور سے

فرانس، مغربی جرمنی، امریکہ اور برطانیہ وغیرہ کو برآمد کیا جاتا ہے۔

روغنی اجناس ہوں یا روغن دار درخت، ملک کے زرعی ماہرین اور زرعی تحقیقی ادارے دونوں سے بہتر نتائج حاصل کرنے کے لیے شب و روز تحقیق میں معروف ہیں۔ ان کوششوں میں ہمارے ملک کو کئی دوست ممالک اور بین الاقوامی اداروں کا بھی تعاون حاصل ہے۔ ان تمام کوششوں کا مقصد تلہن کی پیداوار میں اضافہ کرکے خود کفالت حاصل کرنا ہے تاکہ تلہن اور خوردنی تیل کے اس درآمدی اخراجات پر قابو پایا جاسکے جن میں گزشتہ چند سالوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۸۳-۸۴ء میں کل ۱۶.۳۴ لاکھ ٹن خوردنی تیل درآمد کیا گیا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ آنے والے چند سالوں میں تلہن کی پیداوار میں دوگنا اضافہ کیا جائے۔ ●

بقیہ ہندوستان کی اہم انڈسٹریز

- ہندوستان ٹیلی پرنٹرس — بنگلور اور مدراس۔
- انٹگرل کوچ فیکٹری — پیرامبور (تامل ناڈو)۔
- ٹیلی فون انڈسٹری — بنگلور (کرناٹک)۔

ہندوستان کے چند مشہور ادارے

ادارے کا نام	ادارے جہاں قائم ہیں
● ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج	حیدرآباد (اے۔پی)
● ایئر فورس فلائنگ کالج	جودھ پور
● آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا	کلکتہ
● کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ	نئی دہلی
● فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا	پونے
● گارڈن ریچ شپ بلڈرز اینڈ انجینیرس لمیٹیڈ	کلکتہ
● ہندوستان ایرو ناٹکس لمیٹیڈ	بنگلور، کانپور
● انڈین اسٹنڈرڈ انسٹی ٹیوٹ	نئی دہلی
● انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی	کھڑگ پور، کانپور، مدراس، بمبئی اور دہلی
● انڈین اسکول آف مائنس اینڈ اپلائیڈ جیولوجی	دھنباد (بہار)
● انڈین ملٹری اکیڈمی	دہرہ دون
● انڈین سیکوریٹی پریس	ناسک روڈ (مہاراشٹر)
● جواہر لال نہرو یونیورسٹی	نئی دہلی
● مزگاؤن گودی	بمبئی
● میٹرولوجیکل آبزرویٹری	پونے، دہلی
● نیشنل ڈیفنس کالج	نئی دہلی
● نیشنل ڈیفنس اکیڈمی	کھڑک واسلہ (مہاراشٹر)

کے. کے. کھلر

تعلیم

پُر امن اقتصادی اور سماجی تبدیلی کا واحد وسیلہ

حکومتِ ہند کی طرف سے شائع کردہ کتابچہ "تعلیم کی چُنوتی — ایک حکمتِ عملی تناظر" میں یہ واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ شخصی اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی نشو و نما کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم کے مربوط پروگراموں کے لیے مناسب سہولتیں فراہم کی جائیں۔ آرٹیکل ۴۵ اور ۴۶ دستورِ ہند کو اگر اکٹھا پڑھا جائے تو صاف ہے کہ آئین بنانے والوں کے دماغ میں کیا تھا۔ چودہ سال تک ہر بچے کو تعلیم لازمی اور مفت دی جانی قرار پایا تھا اور یہ سارا پروگرام ۱۹۶۰ء تک ختم کرنا تھا۔ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی نے اس پروگرام کو آگے ہی آگے بڑھایا اور آج یہ عالم ہے کہ یہ لازمی پروگرام جو بیس نکاتی پروگرام کا اٹوٹ حصہ ہے۔ ۱۹۹۰ء تک بھی پایہ تکمیل تک پہونچتا نظر نہیں آتا۔ کُل ملاکر صرف ۳۶،۲۰ فیصد لوگ پڑھے لکھے ہیں۔

اسکولوں کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے۔ بیشتر جگہ پر نہ بلیک بورڈ ہیں اور نہ پینے کا پانی۔ وسائل کی کمی اور عوامی شعور کی خامی کے سبب تعلیم کے میدان میں خاطر خواہ ترقی نہیں کی جا سکی۔ کثرت میں وحدت ہندوستانی تہذیب کی ایک علامت ہے۔ نصاب ایسا ہو جو ملک کو ایک کونے سے دوسرے کونے تک جوڑے، نہ کہ توڑے۔ وزیرِ اعظم کوشاں ہیں کہ نئی تعلیمی پالیسی ایسی ہو جو ہماری کلچر کی جڑوں سے جڑی ہوئی ہو۔ جو خالص ہندوستانی ہو اور جس کا فائدہ سب سے زیادہ اس ملک کے نوجوانوں اور عورتوں کو ہو۔ ایک ایسی تعلیم جو ملازمت سے جُڑی ہوئی ہو اور جس کو حاصل کرنے کے بعد طالب علم آپ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔

تعلیمی ترقی کے عمل میں جمہوری خطوط پر تعلیمی نظام کو اپنا کردار موثر طور پر ادا کرنا ہوگا۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ نہ صرف تمام لوگ تعلیم کا فائدہ اُٹھائیں بلکہ اس امر کا بھی لحاظ ہو کہ مردوں اور عورتوں کے مختلف سماجی گروہوں اور جغرافیائی علاقوں کے درمیان تعلیمی فصیل زیادہ بڑی یا گہری نہ ہو۔ اس سلسلے میں اگر اقدام نہ اُٹھائے گئے تو اقتصادی ناہمواری علاقائی عدم توازن اور سماجی ناانصافی بڑھ جائے گی۔ جس کے نتیجے میں انتشار و تضاد پیدا ہوگا۔ تعلیم اگر موزوں اور مناسب ہو تو اقتصادی اور سماجی ترقی کے حصول میں تیزی آ سکتی ہے۔ انسانی وسائل کی ترقی سے تمام دوسرے وسائل کا استعمال کئی گنا بڑھ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے اس تصور کو زیادہ قبول کیا جا رہا ہے کہ تعلیم کی سرمایہ کاری ترقی کی ہی سرمایہ کاری ہے اسی وجہ سے وزیرِ اعظم نے تعلیم کو پُر امن سماجی

نیادی واحد وسیلہ قرار دیا ہے۔

ابتدائی تعلیم دراصل تعلیم کی سب سے اہم اور کڑی منزل ہے۔ انسان کی تمام عادات اسی عمر میں بن جاتی ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو انسان کا سارا کردار اس عمر میں بن جاتا ہے۔ اچھے بُرے کا فیصلہ بھی یہیں ہو جاتا ہے اسکول کے پہلے آٹھ سال انسان کی زندگی کے فیصلہ کن سال ہیں۔ اس دوران بچوں کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے، رجحانات تشکیل پاتے ہیں۔ اقدار کو جذب کیا جاتا ہے اور ماحول کا شعور تیز ہوتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں جسمانی نشو و نما کو تقویت پہنچائی جاتی ہے۔ کھیل میں دلچسپی کو بڑھایا جاتا ہے اور جسمانی مشقت کا مزاج بنایا جاتا ہے۔ خود کام کرنے کی عادت ڈالی جا سکتی ہے۔ جو بچے ان آٹھ سالوں میں اچھی تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ زندگی بھر کبھی پیچھے نہیں رہتے، ہمیشہ آگے بڑھتے ہیں۔ مشکلات پر قابو پانا بھی اسی عمر میں سکھا جاتا ہے۔ جو بچہ ان سالوں میں پٹری سے اتر گیا، وہ دوبارہ پٹری پر مشکل سے ہی چڑھ سکتا ہے۔ لہٰذا ابتدائی تعلیم پر جتنا بھی خرچ کیا جائے کم ہے۔ ویسے بھی عام ابتدائی تعلیم جمہوریت کو اور مضبوط بناتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ تعلیم بالغان بھی بیس نکاتی پروگرام کا حصہ ہے۔ ان ممالک میں جہاں آج کوئی شخص ان پڑھ نہیں ہے اس امر کو تسلیم کیا گیا ہے کہ سو فیصد ابتدائی تعلیم کے نشانے کو حاصل کرنے کے لیے صرف گورنمنٹ کے پروگرام یقینی طور پر کامیابی حاصل نہیں کر سکتے اس پروگرام کو ایک عوامی تحریک کی شکل میں اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔ اس تحریک میں تمام انتظامیہ، سیاسی نظام اور رضاکارانہ تنظیموں کی خدمات حاصل کرنی ہوں گی۔ روسی انقلاب کے بعد وہاں کے ہر پڑھے لکھے بالغ نے اس پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہندوستان ایک شاندار اور وسیع جمہوریت ہے یہاں کام پیار و محبت سے ہوتا ہے۔ ہر ایک کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔ بالغوں کی تعلیم میں پڑھے لکھے بالغ جتنی دیر تک خود آگے نہیں آئیں گے کام نہیں بنے گا۔

زراعت اور زرعی ترقی کے لیے تعلیم کا ہونا اشد ضروری ہے۔ زراعت اور تعلیم کا ہندوستان میں پرانے زمانے سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ نصاب میں اسکول کے ماحول کو جوڑنے کے بھی منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ یہ گواہی دیتی ہے کہ زراعتی تعلیم نے اقتصادی ترقی کا رُخ بدل دیا ہے۔

آج ملک کی ہر ریاست اور یونین ٹیریٹری میں یا تو ایک زراعتی یونیورسٹی ہے یا پھر زراعتی کالج۔ آئی ٹی آئی اداروں اور پالی ٹیکنیک کی تعداد میں بھی بھاری اضافہ ہوا ہے۔ پالی ٹکنیک اداروں کی تعداد سب سے زیادہ تامل ناڈو میں ہے۔ اس کے بعد مہاراشٹر کا نمبر آتا ہے۔ ان دونوں ریاستوں نے پیشہ ورانہ تعلیم دینے میں خاصی پیش رفت دکھائی ہے۔ ملک میں انجنیئرنگ اور میڈیکل کالجوں کی تعداد بھی تیزی سے بڑھی ہے۔ سب سے زیادہ انجنیئرنگ کالج آندھرا پردیش میں ہیں اس کے بعد کرناٹک میں۔ پیشہ ورانہ تعلیم میں انسانی وسائل شامل ہیں۔ قوموں کی ترقی میں انسانی وسائل سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ انسان کی خوشحالی آج تعلیم ہی پر مبنی ہے۔ تعلیم ہی معیار اونچا کرتی ہے۔ ساتویں یوجنا میں تعلیم کے لیے ۶۳۸۲،۵ کروڑ روپیہ مہیا کیا گیا ہے جب کہ چھٹے پلان میں ۲۵۲۳ کروڑ تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ منصوبے میں تعلیم کی اہمیت پہلے کے مقابلے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ پھر تعلیم کو انسانی وسائل کے ساتھ اس طرح جوڑا جا رہا ہے کہ اس کو روایتی ڈھانچوں سے نکال کر باہر لایا جائے۔ کھلی یونیورسٹی، کھلا اسکول، توسیع علم کے لیے نئی کوشش۔ نوکری کے لیے ڈگری کی شرط ہٹانا۔ یہ سب کام انسانی وسائل کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ انسانی وسائل، مادی وسائل سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ مساوات قائم کرنے کے لیے بھی انسانی وسائل کی تربیت اور ان کا فروغ ضروری ہے۔

یہ فیصلہ شدہ بات ہے کہ ملک اکیسویں صدی میں "کشکول در دست" کی ذہنیت سے ہرگز داخل نہیں ہونا چاہتا۔ بلکہ خود اعتمادی اور افتخار کے ساتھ داخل ہونا چاہتا ہے۔

کہتے ہیں اُستاد اچھا ہو تو ہر سوسائٹی اس کی عزت کرتی ہے۔ اُستاد کی کارکردگی کی ویسے بھی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ پالیسی چاہے جو بھی ہو بالآخر اُستادوں کو ہی اس پالیسی کو لاگو کرنا ہے۔ اُستاد اپنی ذات کو مثال بناتا ہوا انقلاب لا سکتا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ کیا انقلاب لانے والا مدرس آج ہے جب کہ اسے غمِ روزگار نے کچل کر رکھ دیا ہے۔ جس سماج میں استاد کا رُتبہ اور منصب گر گیا، وہ سوسائٹی زوال پذیر ہے۔ ابراہیم لنکن نے اپنے فرزند کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو ایک خط لکھا تھا جس میں انھوں نے لکھا "میرے بچے کو یہ سکھاؤ کہ ہر خود غرض سیاست دان کے پیچھے ایک سچا اور دیانت دار لیڈر ہوتا ہے۔ ہر دشمن کے پیچھے ایک دوست چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو یہ پڑھاؤ کہ گاڑھے پسینے کی کمائی کا ایک ڈالر چوری کے پانچ ڈالروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس کو ہارنے دو تاکہ وہ جیت کی اہمیت سمجھ سکے۔ اس کو ہنسنے دو تاکہ وہ رونے سے نہ کترائے۔ اسکو پرندوں کی بولی سمجھنا سکھاؤ تاکہ وہ اُن کی طرح اُڑ سکے۔ اس کو نقل کرنے سے فیل ہونا بہتر ہے۔ اس کو یہ

پڑھاؤ کہ شریف آدمیوں سے شرافت اور بدمعاش آدمیوں سے سختی سے پیش آئے۔ اپنی غلطی خود نکالنے میں وہ فخر محسوس کرے۔ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھے تاکہ اس کا اپنا عزم مضبوط ہو۔ اپنے کام کی قیمت تو لے لیکن اپنے دل اور روح پر کوئی بندش اور پابندی نہ لگائے۔ اس کو ایسا پڑھاؤ کہ اس میں انسانیت کی قندیل بجھنے نہ پائے۔ وہ انسان بنے اور نیک انسان۔"

اگر ہر اُستاد یہی پڑھاتا جو لنکن نے اپنے خط میں لکھا ہے، تو آج دنیا بھر میں امن ہوتا۔ خوشی خوشحالی اور انسانیت کا بول بالا ہوتا۔ اس بدلتی ہوئی دنیا میں تعلیم ہی ایک ایسی چیز ہے کہ تبدیلی کو صحیح تقویت اور صحیح شکل دے سکے۔

ہر پُرامن انقلاب دیہات سے اُٹھتا ہے۔ ہمارے دیہات میں تعلیمی وسائل شہری علاقوں کی بہ نسبت بہت کم پہونچ رہے ہیں۔ ہماری دیہی آبادی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ تعلیم کو ترک کرنے والے بچوں کی تعداد دیہی علاقے میں مقابلتاً بہت زیادہ ہے۔ جہاں تک لڑکیوں کی تعلیم کا سوال ہے۔ شہروں کے مقابلے میں دیہات کی لڑکیوں میں بہت کم تعلیم ہے۔

درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کی حالت سُدھری تو ہے لیکن سُدھرنے کے باوجود کافی خستہ ہے۔ ان کے لیے گورنمنٹ نے علیحدہ پلان بنائے ہیں اور علیحدہ اسکیمیں تیار کی ہیں۔ اُمید ہے کہ ساتویں پلان میں ان لوگوں کی تعلیمی حالت کافی ٹھیک ہو جائے گی۔ نئی تعلیمی پالیسی ان طبقوں کا خاص خیال رکھے گی۔ ہندوستان میں پوری طرح سے مساوات اور جمہوریت تبھی آ سکتی ہے۔ جب تعلیم کے ذریعے انسانی اقدار کو فروغ دیا جائے ــــ گاندھی جی نے کہا تھا کہ آزاد ہندوستان کے اسکول بچوں کے لیے جنت ہوں گے۔ اب وقت آن پہنچا ہے کہ اب ان اسکولوں کو واضح جنت میں بدل دیا جائے۔ ●

وسیم حیدر

ہندوستان کی اہم انڈسٹریز

انڈسٹری کا نام	مقام
● کاٹن ٹیکسٹائل انڈسٹری	مہاراشٹر، گجرات، تامل ناڈو، یو۔پی، مغربی بنگال، مدھیہ پردیش، کرناٹک، کیرالہ اور دہلی۔
● جُوٹ انڈسٹری	مغربی بنگال، بہار، آسام، یو۔پی، آندھرا پردیش اور مدھیہ پردیش،
● چینی کی انڈسٹری	یو۔پی اور بہار۔
● سِلک انڈسٹری	کرناٹک، مرشدآباد (مغربی بنگال) سری نگر اور آسام۔
● وولن انڈسٹری	امرت سر، لدھیانہ، دھاریوال، کانپور، پانی پت۔
● کاغذ کی انڈسٹری	کلکتہ، لکھنؤ، بمبئی، سہارنپور، جگادھری، ڈالمیانگر اور پونالور (کیرالہ)۔
● کیمیکل انڈسٹری	بمبئی، کلکتہ، دہلی، کانپور، امرت سر، مدراس اور بنگلور۔
● اینٹی بائیوٹک فیکٹریز	پمپری (Pimpri) (مہاراشٹر) رشی کیش (یو۔پی)۔
● گلاس انڈسٹری	فیروز آباد اور بہجوئی (یو۔پی)، بمبئی، مغربی بنگال، امرت سر۔
● المونیم انڈسٹری	کیرالہ، مغربی بنگال، بہار، مہاراشٹر اور مدھیہ پردیش۔
● ایرکرافٹ انڈسٹری	بنگلور اور کانپور۔
● اوٹوموبائل انڈسٹری	کلکتہ، بمبئی، مدراس، برن پور اور جمشید پور۔
● شِپ بلڈنگ انڈسٹری	ویشاکھاپٹنم، بمبئی اور کلکتہ۔
● سیمنٹ انڈسٹری	پوربندر (گجرات)، کٹنی (مدھیہ پردیش)، لکھیری (راجستھان) ڈالمیانگر (بہار)، وجے واڑہ (آندھرا پردیش) الہ آباد (یو۔پی)۔
● ماچس کی فیکٹری	بریلی، کلکتہ، مدراس اور امبرناتھ۔
● لوکوموٹیو انڈسٹری	چترنجن لوکوموٹو ورکس (مغربی بنگال) اور ڈیزل لوکوموٹو ورکس، وارانسی (یو۔پی)۔
● نیوز پرنٹ فیکٹری	نیپانگر (مدھیہ پردیش)۔
● بھارت الیکٹرانکس لمیٹڈ	جلاہلی (بنگلور)۔
● ہیوی انجینئرنگ	رانچی (بہار)۔
● ہیوی الیکٹریکلس	بھوپال (مدھیہ پردیش)، ہردوار (یو۔پی)، حیدرآباد (آندھرا پردیش)۔
● ہیوی وہیکلس فیکٹری	اوادی (تامل ناڈو)۔
● ہندوستان مشین ٹولس (H.M.T)	جلاہلی (بنگلور) پنجور (چنڈی گڑھ)، کالامیسری (کیرالہ)، کوکٹ پلی (حیدرآباد)، زینوکوٹ (جموں وکشمیر)۔

(باقی ص پر)

سید مسعود حسین جعفری

نیشکر (گنّا) کی بیماریاں اور حفاظتی اقدام

ہندوستان دنیا کے اُن دس ممالک میں سرِفہرست ہے جہاں نیشکر (گنّا) کی پیداوار سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ ممالک علی الترتیب اس طرح سے ہیں:-
۱۔ ہندوستان۔ ۲۔ برازیل۔ ۳۔ کیوبا۔ ۴۔ چین۔ ۵۔ میکسیکو۔ ۶۔ پاکستان۔ ۷۔ ممالک متحدہ امریکہ۔ ۸۔ جنوبی افریقہ۔ ۹۔ کولمبیا۔ ۱۰۔ آسٹریلیا۔ لیکن فی ہیکٹیر شکر کی پیداوار کے اعتبار سے برازیل سرِفہرست ہے، اور ہندوستان کا تیسرا درجہ ہے۔ چونکہ نیشکر کو گرم اور مرطوب آب و ہوا موافق ہے اس لیے اس کی کاشت گرم اور معتدل گرم خطوں میں کی جاتی ہے۔ بہتر پیداوار اور شکر کی معیاری بازیابی (Recovery) کے لیے بارش اور شمسی حرارت دونوں ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ فصل کو مختلف بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے مناسب وقت پر حفاظتی اقدام بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اب تک تقریباً ۱۲۷ بیماریوں کو معلوم کیا جا چکا ہے جو فصل کو نقصان پہونچاتی ہیں۔ مختلف کیڑے مکوڑے بھی ہیں جو فصل کو نقصان پہونچاتے رہتے ہیں۔ اُن کی بھی روک تھام ضروری ہے۔
جراثیم سے پھیلنے والی بیماریوں کا تعلق پھپھوندی (Fungus) وائرس (Virus) اور بیکٹریا (Bacteria) سے ہے۔ ان میں مہلک بیماریاں یہ ہیں:-

۱۔ پھپھوندی سے متعلق بیماریاں:-
پھپھوندی سے تعلق رکھنے والی تین خاص بیماریاں ہیں۔ ریڈ راٹ (Red rot) اسمٹ (Smut) اور پتّوں کی زردی جیسی والی بیماری۔

الف۔ ریڈ راٹ (Red Rot)
اس بیماری کی علامت یہ ہے کہ فصل کے ابتدائی دور میں نیشکر کے پتّوں کا رنگ ہلکا زرد ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ یہ سوکھ کر گر جاتے ہیں۔ تنوں کی باہری سطح پر عمودی سلوٹیں پڑ جاتی ہیں۔ تنوں کے اندر گودے میں سرخ دھاریاں گودے کو سڑا دیتی ہیں۔ بیماری کے انتہائی دور میں سرخ دھاریاں بھوری ہو جاتی ہیں اور تنے خشک ہو کر کھوکھلے ہو جاتے ہیں۔ اس بیماری کا جرثومہ فیسیلو اسپورہ (Physalospora) کہلاتا ہے۔ حفاظتی اقدام۔ اس بیماری کی روک تھام کے لیے ضروری ہے کہ بونے کے لیے صحت مند بیج کا استعمال کیا جائے۔ بیج کے لیے جو گنّا استعمال کیا جائے اس کو گرم ہوا یا بھاپ کے ذریعے صاف کریں۔ اس عمل کو ہیٹ تھریپی (Heat therapy) کہتے ہیں۔ ہیٹ تھریپی کا آلہ ایک قسم کا بڑا صندوق جیسا بنایا گیا ہے۔ جس کے اندر بیج کے ٹکڑے بنڈلوں کی صورت میں رکھے جاتے ہیں۔ اس میں پانی بھی رہتا ہے۔ جس وقت اس کو بذریعہ بجلی گرم کرتے ہیں، پانی بھاپ بن کر بند صندوق میں بھر جاتی ہے۔ ایک معین درجہ حرارت پر جراثیم ختم ہو جاتے ہیں۔
جس کھیت میں اس بیماری کی علامات ظاہر ہو جائیں اس میں پیڑی فصل (Ratoon Crop)

کو نہ لگائیں۔ کچھ مفید جراثیم کش دوائیں بھی ہیں جیسے بائی لوکس (Biolox) یا پرینوکس (Perenox)۔ ان کا ۰۱ فیصد محلول متاثرہ فصل پر چھڑکنا چاہیئے۔ دراصل یہ ادویات اتنی موثر نہیں ہیں جتنا کہ بیماری سے قبل احتیاطی اقدام۔ نیشکر کی کچھ خاص قسمیں بھی ہیں جن پر اس بیماری کا اثر کم ہوتا ہے لہذا نیشکر کے زراعتی محکموں سے ان کی معلومات حاصل کرلی جائے۔

ب۔ اسمٹ (Smut)

اس بیماری کا جرثومہ (Ustilago) کہلاتا ہے۔ اس بیماری کی وجہ سے پودوں کے تنے پتلے ہوجاتے ہیں۔ کلّے (Tillers) معمول سے زیادہ نکلتے ہیں۔ پتّوں کی چوڑائی کم ہوجاتی ہے اور وہ نمی کی کمی سے مُرجھا جاتے ہیں۔ پودوں کے سِروں سے ایک سیاہ رنگ کا چابک جیسا دھاگا نکلتا ہے۔ دراصل یہ اس بیماری کے ننھے ننھے بیجوں کا مجموعہ ہے۔ ان بیجوں کو اسپورس (Spores) کہتے ہیں۔ یہ اسپورس ہوا اور پانی کے ذریعے دور دور تک پھیل جاتے ہیں۔

اس بیماری کو روکنے کیلئے ضروری ہے کہ جس کھیت میں یہ بیماری پائی جائے اس کی فصل کو آئندہ بیج کے لیے استعمال نہ کریں۔ اس کے علاوہ اس کھیت میں آئندہ پیڑی فصل (Ratoon Crop) بھی نہ اُگائیں۔ بُوائی سے پیشتر بیج کے ٹکڑوں کو بورڈکس مکسر (Bordeaux Mixer) کے محلول میں پانچ منٹ تک بھگو دیں۔ اس کی جگہ پر مرکیورک کلورائیڈ (Mercuric Chloride) کا ۱ر۰ فیصد محلول، پرینوکس (Perenox) یا ایگروسن (Agrosan) دوا کا ۲۵ر۰ یا ۰ر۱ فیصد محلول بھی استعمال کرسکتے ہیں کسانوں کو چاہیئے کہ وہ وقتاً فوقتاً کھیتوں میں گھوم پھر کر بیماری کا جائزہ لیں۔ اگر پودوں میں سیاہ چابک نظر آئے تو ان پودوں کو اکھاڑ کر کسی دوسری جگہ گڑھے میں دفن کردیں۔ بیج کے لیے مخصوص قسموں کا انتخاب کریں جن پر اس بیماری کا اثر کم ہوتا ہے۔ اس کے لیے مقامی طور پر تحقیقی مرکز یا نیشکر کے زراعتی محکموں سے مشورہ کرلیا جائے۔

ولٹ (Wilt)

اس بیماری کا جرثومہ ایکرومونیم اور سفلو اسپوریم (Acromonium Sp Cephalosporium Sp) کہلاتا ہے

اس بیماری کی علامت ریڈراٹ سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ شروع میں تنوں کی گانٹھوں پر خاکستری یا بھورے دھبّے نظر آتے ہیں۔ پتّوں کے کنارے اور کلّے سکڑ کر خشک ہوجاتے ہیں۔

حفاظتی اقدام :-

فصل کو بیماری سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اچھے بیج کا استعمال کیا جائے۔ متاثرہ فصل کو بطور بیج استعمال نہ کریں۔ بونے سے قبل بیج کے ٹکڑوں کو اگلول (Agallol) کے ۱ر۰ فیصد محلول میں بھگو دیں۔

گراسی شوٹ بیماری (Grassy Shoot Disease)

اس کو (G.S.D) بھی کہتے ہیں جو انگریزی لفظ کا مخفف ہے۔ اس بیماری کا جرثومہ مائیکو پلازما (Mycoplasma) کہلاتا ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ متاثرہ پودوں سے کلّے بڑی تعداد میں نکلتے ہیں جس کی وجہ سے پودے جھاڑیوں کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ ان کلّوں کے تنے پتلے اور کمزور ہوتے ہیں۔ پتّوں کی رنگت سفید یا خفیف کریم ہوجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ پتّوں میں کلوروفل (سبز مادّہ) کی غیر موجودگی میں شعاعی ترکیب عمل نہیں ہوسکتا، لہذا پودوں کی بالیدگی ختم ہوجاتی ہے۔

حفاظتی اقدام :-

اس بیماری سے فصل کو بچانے کا موثر طریقہ یہ ہے کہ نیشکر کے بیج سے (بونے سے قبل) ابخراتی حرارت کے ذریعے جراثیم کو دور کردیا جائے۔

آر۔ایس۔ڈی (Ratoon Stunting Disease)

اس بیماری کا جرثومہ پودوں کی بالیدگی کو مسدود کردیتا ہے۔ پودوں سے کلّے کم نکلتے ہیں۔ نوخیز کلّوں میں اگر عمودی شگاف لگا کر دیکھیں تو اندر کے گودے میں اوپری سطح کے خلیوں کا رنگ گلابی ہوگا۔ چونکہ یہ بیماری عموماً پیڑی فصل (Ratoon) کو متاثر کرتی ہے لہذا علامات کے ظاہر ہوتے ہی فصل کو جلد سے جلد کاٹ لیں اور آئندہ اس کی پیڑی فصل نہ اُگائیں۔ بونے سے قبل بیج کو حرارتی عمل کے ذریعے جراثیم سے صاف کرلیا جائے۔

نیمیٹوڈس (Nematodes)

یہ طفیلی کیڑے نہایت باریک ہوتے ہیں اور بغیر خوردبین کے نظر نہیں آتے۔ ان کی شکل و شباہت دھاگے جیسی یا چھلّے دار ہوتی ہے۔ یہ مٹّی کے اندر پودوں کی جڑوں سے لپٹے رہتے ہیں یا جڑوں کے چاروں طرف اپنی خوراک کی تلاش میں بکھرے رہتے ہیں۔ ان کا گزر بسر پودوں کی خوراک پر منحصر ہے۔ مٹّی میں ان کی کثرت سے پودوں کو اپنی پوری خوراک ملنے نہیں پاتی لہذا پودے کمزور اور زرد پڑجاتے ہیں۔ یہ علامت پتّوں کی رنگت سے پہچانی جاسکتی ہے۔ جڑوں میں موٹی گانٹھیں یا گال (Gall) بن جاتی ہیں۔

حفاظتی اقدام :-

نیشکر کے پودوں کو ان کیڑوں سے محفوظ

...یے کئی کیمیاوی مرکبات تجویز کئے گئے ہیں جن میں ڈائی کلورو پروپین (Dich-loropropane) ویپام، (Vapam) اور نیمیگان (Nemagon) قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ کھیتوں میں مخصوص فصلوں کے اگانے سے نیمیٹوڈس کا اثر کم ہوجاتا ہے۔ جیسے گیندا، ایک قسم کا پھول (Mari Gold) اور سرسوں آ دویات کا استعمال مٹی میں کیا جاتا ہے۔ اور ان فصلوں کو نیشکر کے بونے سے بیشتر کھیتوں میں اگاتے ہیں۔

نیشکر کی فصل کو برباد کرنیوالے کیڑے مکوڑے

ایک اندازے کے مطابق نیشکر کی پیداوار کا تقریباً ۱۰ فیصد جز سالانہ کیڑے مکوڑوں کی وجہ سے برباد ہوجاتا ہے۔ اس ۱۰ فیصد جز کی قیمت ایک سو کروڑ تک ہوتی ہے۔ لہٰذا فصل کے لیے حفاظتی اقدام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

فصل کے ابتدائی موسم یعنی بونے سے لے کر انتہائی بالیدگی کے دور تک مختلف کیڑے مکوڑوں سے نقصان پہونچتا ہے۔ اکثر کیڑے مکوڑے فصل کے تیار ہونے تک بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ لہٰذا اس وقت اگر حفاظتی اقدام نہ کئے جائیں تو آئندہ کی فصلوں کو بھی نقصان پہونچتا رہے گا۔ عام طور پر ان کیڑے مکوڑوں کو تین درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ تنوں میں سوراخ کرنے والے کیڑے جنھیں بوررس (Borers) کہتے ہیں۔

۲۔ گنّے کا عرق چوسنے والے کیڑے مکوڑے (Sucking Pets) اور

۳۔ مٹی کے اندر پرورش پانے والے کیڑے مکوڑے۔ (Soil Pets)

اوّل الذکر درجہ میں آنے والے کیڑے نیشکر کی فصل کے لیے نہایت مضر ثابت ہوئے ہیں۔ چونکہ یہ کیڑے پودے کے مختلف حصوں پر حملہ کرتے ہیں لہٰذا ان حصوں کی نسبت سے انھیں ذیلی درجات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اختصار سے ان کا ذکر ذیل میں کیا جارہا ہے۔

الف۔ تنہ میں سوراخ کرنے والے کیڑے:-

یہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ٹاپ بورر، اور اسٹاک بورر۔

۱۔ ٹاپ بورر (Top Borer)

اس کیڑے کا نام ٹرپیوریزا نیویلا ایف (Tryporyza nivella F) ہے۔

چونکہ یہ کیڑا پودے کے اوپری سرے کو نقصان پہونچاتا ہے اس نسبت سے اس کو یہ نام دیا گیا ہے۔ یہ کیڑا ہندوستان کے ان سبھی خطوں میں پایا جاتا ہے جہاں نیشکر کی کاشت ہوتی ہے۔ ابتدائی دور میں جب فصل دو تین ماہ کی ہو جاتی ہے اس وقت پودوں کے بالائی سروں اور درمیانی پتّوں پر چھوٹے چھوٹے سوراخ نظر آتے ہیں۔ یہی کیڑے کا پہلا حملہ ہے۔ یہ علامت کھیتوں میں گھوم پھر کر دیکھی جاسکتی ہے۔ دوسرے حملے میں یہ کیڑا پتّوں کے درمیانی نس کے سہارے رینگ کر تنہ کے بالائی سرے پر پہونچ جاتا ہے۔ چونکہ سرا اس وقت نہایت ملائم ہوتا ہے لہٰذا اس کو کاٹنے میں کیڑے (لاروا) کو کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ وہ آسانی سے تنہ کے اوپری سرے میں داخل ہوجاتا ہے اور پتّوں پر رینگتے وقت ایک سرخ دھاری بھی بنا جاتا ہے۔ مشاہدہ کرکے اس کی رہائش کو تلاش کرسکتے ہیں۔ پودے کا سرا کٹتے ہی یہ خشک ہونے لگتا ہے اور اس کی بالیدگی ختم ہوجاتی ہے۔ تنے کے بالائی سرے پر جو آنکھیں یا کلیاں (Eye Buds) ہوتی ہیں ان سے نئے سکّے نکلنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ پودے کا اوپری سرا شاخدار بن جاتا ہے۔ یہ ایک پودے کو نقصان پہنچا کر وہ تنہ میں سوراخ بناکر باہر نکل آتا ہے اور رینگ کر دوسرے پودے تک پہونچ جاتا ہے۔ اس طرح وہ نئے پودوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔

حفاظتی اقدام:-

ابتدائی دور میں پتّوں کی نچلی سطح پر ہلکے نارنجی رنگ کے ننھے ننھے انڈے ملتے ہیں۔ انھیں سے لاروے نکل کر پودوں پر پھیلتے ہیں۔ ایسے پتّوں کو یا تو الگ کردیں یا ان انڈوں کو صاف کردیں۔ کھیتوں سے متاثرہ پودوں کو کاٹ کر ضائع کردیں۔ یہ عمل ابتدائی دور میں آسان ہے۔ کھیتوں میں عرصہ تک پانی کو ٹھہرنے نہ دیں۔ بونے کے بعد ۴۰ سے ۹۰ دن کے اندر پودوں کی قطاروں پر مٹی چڑھا دیں۔ بوتے وقت نالیوں میں بی۔ ایچ۔ سی (BHC) کاربوفیوران، (Carbofuran) یا فوریٹ (Phorate) کا پاؤڈر استعمال کیا جائے۔

۲۔ اسٹاک بورر

(Stalk borer)

اس کیڑے کو کیلو آریسلیس (Chilo-auricilius) کہتے ہیں۔ مانسون کے بعد اُن کھیتوں میں جہاں پانی ٹھہرا رہتا ہے اور پودے گرجاتے ہیں۔ اس کیڑے کا اثر زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہ تنوں میں سوراخ کرکے داخل ہوتا ہے اور گودے کو کھاکر تنوں کو کھوکھلا کردیتا ہے۔ اترپردیش، بہار، ہریانہ اور پنجاب کی ریاستوں میں اس کا اثر

زیادہ ہے۔

حفاظتی اقدام :-

جب پودے تناور ہو جائیں تو خشک پتوں کو تنوں سے الگ کردیں۔ یہ عمل ستمبر میں اور دوسری مرتبہ اکتوبر میں کیا جائے۔ چونکہ یہ کیڑا اگست کے بعد دیکھا گیا ہے لہذا اگست سے دواؤں کا چھڑکاؤ کیا جائے۔ ہر بار چھڑکاؤ کا وقفہ ۱۵ دن مناسب ہے۔ ڈی ڈی ٹی (D.D.T) اور مانوکروٹو فاس (Monocrotophos) اس کیڑے کے لیے موثر دوائیں ہیں۔

شوٹ بورر (Shoot borer)

یہ کیڑا ملک کی تقریباً سبھی ریاستوں میں ملتا ہے۔ نیشکر کے ابتدائی دور میں چار مہینوں تک اس کا اثر زیادہ رہتا ہے۔ یہ کلّوں کے تنوں میں سوراخ کرکے داخل ہو جاتا ہے اور ان کے گودے کو کھا کر کھوکھلا کر دیتا ہے۔

حفاظتی اقدام :-

متاثرہ پودوں کو کھیتوں سے علیحدہ کر دیں۔ نیشکر کی بوائی گہری نالیوں میں کی جائے۔ جڑوں پر مٹی کی ہلکی پرت چڑھا دیں۔ نیشکر کی بوائی تاخیر سے نہ کی جائے۔ اس کے علاوہ بوتے وقت بی۔ ایچ۔ سی (BHC) ہیپٹا کلور (Heptachlor) اور گاما بی۔ ایچ۔ سی۔ (GBHC) ادویات میں سے کسی ایک کا چھڑکاؤ مٹی پر کیا جائے۔

پائیریلا (Pyrilla)

یہ نیشکر کی فصل کو نقصان پہنچانے والا معروف پتنگا ہے۔ فصل پر اس کا حملہ نہایت وبائی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کے انڈے اور پیوپا (Pupa) پتوں پر کثرت سے ملتے ہیں۔ یہ گنے کے پودوں سے اس کو چوستا ہے جس کی وجہ سے اس میں شکر کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔ ان علاقوں میں جہاں اس پتنگے کی کثرت ہے گڑ کی صنعت کو بھی نقصان پہونچتا ہے کیوں کہ متاثرہ پودوں کے رس سے گڑ بنانا مشکل ہوتا ہے۔

حفاظتی اقدام :-

اس پتنگے کے انڈے اپریل اور مئی کے مہینوں میں پتوں پر نظر آتے ہیں۔ لہذا اسی وقت ان کو ضائع کر دیا جائے۔ عموماً پیڑی فصل (Ratoon Crop) پر سب سے پہلے اس کا حملہ ہوتا ہے۔ لہذا کم از کم ایک بار کھیتوں میں پیڑی فصل کو نہ اگائیں۔ پانی میں مٹی کا تیل ملا کر پتنگوں پر چھڑکا جائے۔ اس کے علاوہ بی۔ ایچ۔ سی کا سفوف (BHC Powder) میلاتھیان (Malathion) ڈی ڈی ٹی ایملشن (D.D.T. Emulsion) یا (BHC Emulsion) کا چھڑکاؤ بھی بہت موثر ہے۔ بی ایچ سی کا سفوف بشرح ۲۰ سے ۳۰ پونڈ فی ایکڑ اپریل سے جون تک چھڑکا جائے۔ اس کے بعد اس کی مقدار بتدریج بڑھا دیں۔ جولائی اور اگست میں ۳۰ سے ۵۰ پونڈ فی ایکڑ، اکتوبر اور نومبر میں ۵۰ سے ۶۰ پونڈ فی ایکڑ۔ ڈی۔ ڈی۔ ٹی ایملشن یا بی۔ ایچ۔ سی ایملشن کی بشرح ۲۵ فیصد محلول کی شکل میں تجویز کی گئی ہے جبکہ میلاتھیان کی شرح ۰۱ء فیصد ہے۔

اسکیل پتنگا (Scale Insect)

یہ بھی تنوں سے رس چوستا ہے جس کی وجہ سے تنوں پر سلوٹیں پڑ جاتی ہیں اور پودوں کی بالیدگی ختم ہو جاتی ہے۔ اس میں شکر کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔

حفاظتی اقدام :-

بونے سے قبل بیج کے ٹکڑوں کو میلاتھیان کے ۱ء۰ فیصد محلول میں بھگو دیں۔ متاثرہ فصل کو کاٹنے کے بعد اس کی پیڑی فصل کو نہ اگائیں۔ اگر پیڑی فصل پر اس کا حملہ ہو تو اسی محلول کا چھڑکاؤ کیا جائے۔

میلی بگ (Mealy bug)

یہ بھی رس چوسنے والا کیڑا ہے۔ اس کا رنگ گلابی، اوپری سطح چکنی اور یہ گول شکل کا ہوتا ہے۔ پتوں اور میانوں (Sheath) میں اس کے جھنڈ دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ تنوں سے مسلسل رس چوستے رہتے ہیں جس کی وجہ سے پودوں کی بالیدگی رک جاتی ہے۔ ان کیڑوں کے جسم سے ایک سفید رقیق نکلتا رہتا ہے جو ان کے جسم کے اوپر جم جاتا ہے۔ یہ کیڑے تقریباً پورے سال فصل کو نقصان پہونچاتے ہیں۔ تنے کے جس حصہ پر ان کا جھنڈ رہتا ہے قریب کے پتے سروں سے خشک ہونے لگتے ہیں۔ یہاں تک پتے مکمل طور پر خشک ہو جاتے ہیں۔

حفاظتی اقدام :-

متاثرہ نیشکر کو بیج کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ خشک پتوں کو تنوں سے علیحدہ کر دیا جائے۔ جراثیم کش ادویات جیسے میلاتھیان فولی ڈول (Folidol) کا محلول بنا کر پودوں پر اس طرح چھڑکا جائے کہ یہ پودوں کو اس جگہ تک پہنچ جائے جہاں پتے تنوں سے نکلتے ہیں۔ چونکہ یہ کیڑے تنوں پر بڑی مضبوطی سے چپکے رہتے ہیں لہذا چھڑکاؤ کے لیے فوارے کا استعمال کیا جائے۔

مٹی میں پرورش پانے والے کیڑے :-

۱۔ سفید گرب (White grub)

یہ کیڑا مٹی میں پرورش پاتا ہے اور نیشکر کی جڑوں کو نقصان پہونچاتا ہے۔ جڑوں کو نقصان پہونچتے ہی پودا خشک ہونے لگتا ہے۔

حفاظتی اقدام :-

ادویات کے ذریعے کیڑوں کو مسلسل ختم کرنا چاہیے۔ نیشکر کے علاوہ جن درختوں پر یہ پرورش پاتے ہیں۔ انھیں کاٹ دیا جائے۔

(باقی صفحہ پر)

اُدے بھاسکر ریڈی

گاؤں کے غریبوں کے سماجی و اقتصادی حالات

ایک مطالعہ

حکومتِ ہند نے دیہی زندگی کا معیار بلند کرنے کے لیے جو عظیم فلاحی پروگرام شروع کئے ہیں اُن کے ضمن میں دیہی مفلسوں سے متعلق مطالعہ نے بڑی اہمیت حاصل کرلی ہے۔ اگر ان پروگراموں سے دیہی مفلسوں کا معیار زندگی بلند کیا جاسکا تو اس سے بھارت کے دیہی مفلسوں کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں مطلوبہ تبدیلی لانے میں بڑی مدد ملے گی۔ گو صورتِ حال کو بہتر بنانے اور ضروری تبدیلیاں لانے کے سلسلے میں حکومت نے ترقیاتی منصوبہ بندی، وسائل کی شیرازہ بندی، افرادی قوت اور ہُنروں کی بہتر زمرہ بندی اور ترقی کے لیے سازگار تربیت کو فروغ دینے کے لیے اہم اقدامات کئے ہیں اور متعدد پروگراموں اور پراجیکٹوں کو عملی صورت دینا شروع کیا ہے لیکن ان کا بہت کم اثر پڑا ہے۔ ہماری منصوبہ بندی کا ایک نہایت مایوس کُن پہلو یہ ہے کہ افلاس ختم ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی۔ ہمارے مفلس ترین عوام کی بھاری تعداد نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر افلاس کو اپنی تقدیر تسلیم کرلیا ہے۔ تازہ ترین اندازے کے مطابق دیہات کی ۵۰ فیصد سے زیادہ آبادی خطِ افلاس کے نیچے زندگی بسر کر رہی ہے۔ چنانچہ بھارتی سیاق و سباق میں دیہی مفلسوں سے متعلق مطالعہ نے بھاری اہمیت اختیار کرلی ہے۔

جس علاقے کے مفلس ترین عوام کے بارے میں تحقیق و مطالعہ کیا گیا ہے وہ ہے اُڑیسہ کے ضلع کوراپُٹ کا سیمیلی گُڑا بلاک۔ اس میں ۸۲ دیہات شامل ہیں۔ اس کی ۶۵ فیصد آبادی شیڈولڈ ذاتوں اور قبیلوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ تمام بلاک کو "شیڈولڈ علاقہ" قرار دیا گیا ہے۔

طریقِ کار

بلاک میں سے تقریباً ۴۰ فیصد دیہاتیوں اور ہر چُنے ہوئے گاؤں میں ۱۰ فیصد گھروں کو منتخب کیا گیا۔ اس طرح کُل ۳۵۰ گھروں کا سروے کیا گیا۔ ۳۵۰ گھروں میں سے ۱۱۷ یعنی ۳۳ر۵ فیصد کا تعلق قبائلی کنبوں سے تھا۔ ۱۰۳ یا ۲۹ر۴ فیصد گھر شیڈولڈ ذاتوں اور باقیماندہ ۱۳۰ یعنی ۳۷ر۱ فیصد گھر دوسری ذاتوں کے لوگوں کے تھے۔ موجودہ مطالعہ مُفید ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جہاں تک سماجی پہلو کا تعلق ہے آبادی، عمر اور جنس، تعلیم، پیشے، مکانوں کے حالات، ماحول، روایات اور عقائد سے متعلق معلومات کا اندراج کیا گیا ہے اور جہاں تک اقتصادی پہلو کا تعلق ہے مطالعہ میں آمدنی، اخراجات، قرضہ، گھروں اور اثاثہ وغیرہ سے متعلق معلومات کو شامل کیا گیا ہے۔

معلومات

سیمیلی گُڑا بلاک کی آبادی ۴۰۲۳۹ ہے۔ ان میں سے ۵۷ر۳ فیصد قبائل، ۸ر۵ فیصد شیڈولڈ کاسٹ اور باقیماندہ ۳۴ر۲ فیصد دوسری ذاتوں کے لوگ ہیں۔ ان کے مقابلے میں ضلع کوراپُٹ میں ۵۵ر۲ فیصد شیڈولڈ قبائل اور ۱۴ر۱ فیصد شیڈولڈ کاسٹ لوگ ہیں جب کہ اُڑیسہ میں ۲۲ر۴ فیصد شیڈولڈ قبائل اور ۱۴ر۶ فیصد شیڈولڈ

کاسٹ لوگ ہیں۔ لہٰذا عوام کی اکثریت سماج کے نادار طبقوں سے تعلق رکھتی ہے جو شیڈولڈ قبائل اور شیڈولڈ کاسٹ لوگوں پر مشتمل ہیں۔ بلاک کے عمر و جنس کے ڈھانچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکول جانے والوں کی عمر کے گروپ میں ۲۶ر۹ فیصد ۵ تا ۱۴ برس کی عمر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۶۲ فیصد ۱۵ تا ۵۹ برس کے لوگ ہیں جو کام کرنے والے گروپ سے تعلق رکھتے ہیں جو کہ مستقبل کی ترقی کے لیے ایک صحتمندانہ رجحان کا مظہر ہے کوئی ۲ فیصد آبادی ۶۰ برس سے زیادہ عمر کے لوگوں پر مشتمل ہے۔

خواندگی کی سطح جو ملک کی اقتصادی و سماجی ترقی کا اظہار کرنے والا اہم ذریعہ ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری میں بہت کم اعداد میں ریکارڈ کی گئی۔ بلاک میں خواندگی کی شرح محض ۸ر۹ فیصد مندرج کی گئی جو کہ ضلع کے ۸ر۱۵ فیصد اور ریاست کے ۱ر۴۳ فیصد اعداد کے مقابلے میں بہت کم تھی۔

بلاک کے لوگوں کی اقتصادی زندگی زراعت اور متعلقہ سرگرمیوں پر مرکوز ہے۔ ۶۲ فیصد لوگ کاشت کار یا زرعی مزدور ہیں صرف ۱ر۴ فیصد آبادی گھریلو صنعتوں میں مصروف ہے جبکہ باقیماندہ لوگوں کا انحصار دیگر سرگرمیوں جیسے ٹرانسپورٹ، تجارت، جنگلاتی پیداوار اور تعمیری سرگرمیوں وغیرہ سے ہے۔

مکانات اور ماحول

مکانات کو دیہی عوام کے فلاحی کاموں میں اہم ترین مقام حاصل ہے۔ دیہی تعمیر و ترقی کے لیے مکانات کو بہت زیادہ اہمیت دی جانی چاہیے۔ سیمیلی گڈا بلاک میں مکانات غیر صحتمند اور بے ڈھنگے ہیں اور ان کی تعمیر غیر تسلی بخش ہے۔ مکانات جیسے تیسے کھڑے کئے گئے ہیں اور ان میں سے زیادہ تر (۸۰ر۱۵ فیصد) کچے ہیں۔ دراچھی نالیاں مفقود ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیہات میں غیر موزوں اور ناقص مکانات کی بڑی وجہ ناخواندگی ہے، افلاس نہیں۔ کمرے میں روشندان اور کھڑکیاں لگانے پر زیادہ لاگت نہیں آتی۔ مکانات کے اردگرد کے علاقے گرد آلود اور غلیظ ہیں۔ بیشتر کمروں میں دھوئیں کے نکلنے کے لیے جگہ نہیں ہے اس کے نتیجے میں آلودگی پیدا ہوتی ہے جس سے ماحول خراب ہو جاتا ہے۔ اس سے دیہات میں بیماریاں پھیلتی ہیں۔ برسات کے موسم میں مکانات عملاً ناقابلِ استعمال ہو جاتے ہیں ان میں سے پانی ٹپکتا ہے اور دیواریں بیٹھ جاتی ہیں۔

آمدنی اور اخراجات

جن مددوں کے بارے میں پوچھ تاچھ کی گئی ان میں سے آمدنی اور اخراجات کے بارے میں معلومات حاصل کرنا بہت مشکل تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ کچھ بتانے کو تیار نہیں تھے بلکہ اس لیے کہ اکثر حالتوں میں انھیں کوئی صحیح علم ہی نہیں تھا۔ ان کی روزانہ آمدنی سال کے دوران وقت وقت پر مختلف ہو جاتی ہے تاہم جن گھروں کا سروے کیا گیا ان کی اوسط سالانہ کنبہ جاتی آمدنی ۳۲۸۰٫۶۸ روپے ہے۔ قبائلی کنبوں کی اوسط آمدنی ۳۵۴۲ر۵۳ روپے اور شیڈولڈ کاسٹ کنبوں کی اوسط آمدنی ۳۸۵۳ر۲۴ روپے ہے جبکہ دوسری ذاتوں کے لوگوں کی آمدنی ۳۷۶۶ر۸۸ روپے ہے۔ مالی پکے ذاتوں کے لوگوں کی آمدنی ۴۵۰۰ روپے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ منافع بخش فصلیں اگاتے ہیں جس سے ان کی آمدنی میں قدرتاً اضافہ ہو جاتا ہے۔ اخراجات کے نقطۂ نگاہ سے بلاک کے لوگ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے نہایت چند اشیاء پر گذر کر رہے ہیں۔ دراصل یہ بات اس بلاک پر ہی نہیں بلکہ ملک کے بیشتر دیہی عوام پر صادق آتی ہے۔

اخراجات کا زیادہ تر حصہ خوراک اور اس کے بعد کپڑے کے لیے وقف ہے تعلیم، سفر اور علاج معالجہ پر بہت کم خرچ کیا جاتا ہے۔ آمدنی اور اخراجات کے درمیان نسبتی پوزیشن کا جائزہ لینے کے لیے جو کوشش کی گئی اس سے معلوم ہوا کہ ۵۹ر۲ فیصد کنبے اپنی آمدنی سے بڑھ کر خرچ کرتے ہیں۔ جبکہ باقیماندہ ۴۰ر۸ فیصد کا خرچ آمدنی سے کم ہے۔

قرضے

بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ان میں سے اکثر لوگوں کو قرضے لینے پڑتے ہیں۔ عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ دیہی عوام میں سے بیشتر لوگ کم آمدنی کے باعث نہیں بلکہ رسم و رواج شراب اور جوئے وغیرہ جیسی باتوں پر خرچ کرنے کے لیے قرضے لیتے ہیں۔ چنانچہ کوئی ۲۹ر۱ فیصد مقروض ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں اڑیسہ میں ۳۷ر۱۱ فیصد لوگ مقروض ہیں۔

اثاثوں کی قیمت

مادی اثاثوں کی قیمت سے دیہی عوام کے رتبے کا اظہار ہوتا ہے۔ اثاثوں کی اوسط قیمت ۱۱۷۰ر۴۳ روپے ہے جن میں سے ۵۷ر۵ فیصد زیورات سے ہے جبکہ دیگر اثاثہ جات مساوی طور پر منقسم ہیں۔ جن گھروں کا سروے کیا گیا ان کے کل اثاثہ جات کوئی ۲۴۹۰۰۰ روپے کے ہیں۔ ان میں ۳۸ر۱۳ فیصد کے مالک قبائلی، ۲۶ر۴ فیصد کے مالک شیڈولڈ کاسٹ لوگ ہیں جبکہ باقیماندہ ۳۵ر۱۳ فیصد اثاثہ جات دوسری ذات کے لوگوں کی ملکیت ہیں۔

ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سیمیلی گڈا بلاک کے لوگوں کے سماجی و اقتصادی

حالات سے کسی اُمید افزا زندگی کا اظہار نہیں ہوتا۔ حصولِ آزادی کے بعد متعدد فلاحی پروگرام عمل میں لائے گئے ہیں لیکن انھوں نے دیہی مفلسوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے میں بہت کم مدد دی ہے۔

تجاویز

۱۔ متعدد فلاحی پروگراموں کی کامیاب تعمیل کے لیے یہ ضروری ہے کہ بلاک اور ضلع سطح کے افسر اُن کی تعمیل کی نگرانی کریں تاکہ دیہی عوام کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچ سکے۔

۲۔ دیہی عوام کو تربیت دینے اور جدید زرعی تکنیکیں رائج کرنے کے لیے متعدد ماڈل زرعی فارم قائم کئے جانے چاہیئں۔ اس سے پیداوار بڑھانے میں مدد ملے گی۔

۳۔ بنجر زمینوں کو زیرِ کاشت لایا جائے۔

۴۔ دیہی مفلسوں کی آمدنی کو بڑھانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ڈیری، مرغبانی، ماہی گیری اور بکری وغیرہ کے دھندوں کو رائج کیا جائے جن سے زیادہ آمدنی پیدا ہونے کا امکان ہے۔ ان کے لیے کم سرمایہ درکار ہے اور ان سے تھوڑے ہی عرصے میں فائدہ ہونے لگتا ہے۔

۵۔ کاجو، بیل، شہتوت، کافی وغیرہ کے باغات بڑے پیمانے پر لگائے جائیں جن سے قبائل کی اقتصادی حالت بہتر ہوگی اور انھیں کاشت کاری چھوڑ کر مزدوری نہیں کرنی پڑیگی۔

۶۔ مختلف موزوں اسمال اسکیل اور گھریلو صنعتوں کو بڑے پیمانے پر فروغ دیا جائے تاکہ ان سے بیروزگاری اور افلاس دونوں کا خاتمہ ہوگا کیونکہ ان کے لیے لیبر درکار ہوگی اور ان سے آمدنی اور روزگار پیدا ہوگا اور فی یونٹ زیادہ سرمایہ کاری ہوگی۔

۷۔ دیہی دست کاروں کے موجودہ اوزاروں اور طریقوں کو بہتر بنانے کے لیے تکنیکی مہارت فراہم کی جائے اور اس مقصد کے لیے سائنسداں اور ماہرین ٹیکنالوجی کی خدمات حاصل کی جائیں۔

۸۔ متعدد بنیادی اور حلقہ جاتی سہولیات جیسے ٹرانسپورٹ، بجلی، منڈی کی جانکاری اور صحت وغیرہ کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے تاکہ دیہی عوام کو معیشت کے بڑے دھارے میں شامل کیا جا سکے۔

ان اقدامات کی موثر تعمیل کی ضرورت ہے۔ ان سے دیہی مفلسوں کی سماجی و اقتصادی حالت کو بہتر بنانے میں بڑی حد تک مدد ملیگی۔ ●

بقیہ: نابینا لڑکے، لڑکیوں کے کارہائے نمایاں

بریل پڑھنے اور لکھنے کی رفتار میں اضافہ ہوگا۔ اندھوں کی تعلیمی ضروریات کی تکمیل کی خاطر ادارے نے نصابی کتابوں اور دیگر معلومات کو کیسیٹوں پر ریکارڈ کرکے انھیں کے ذریعے پڑھنے پڑھانے کی اسکیم بھی شروع کی ہے۔

نومبر ۱۹۸۵ء سے یہ ادارہ ملک بھر میں اپنے طرز کی پہلی ریکارڈنگ میگزین بھی شائع کر رہا ہے جس میں منتخب اور چیدہ مضامین، کہانیاں اور نظمیں، غزلیں شامل ہیں۔ اسی ادارے کے ایک طالب علم کو ہائی اسکول میں خصوصی قابلیت حاصل کرنے پر آئل اینڈ نیچرل گیس کمیشن کے ذریعہ یوم جمہوریہ کے موقع پر ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ اس لڑکے نے ۵ مضامین میں سے ۲ میں اعلیٰ قابلیت یعنی ڈسٹنکشن اور ۲ مضامین میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔

یہ بات بھی خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے کہ کئی موضوعات جو اندھوں کی دسترس سے باہر سمجھے جاتے تھے، انھیں بھی اب اندھوں کے لیے ممکن کر دیا گیا ہے۔ اس کے لیے اس ادارے نے کافی اشیاء فراہم کرائی ہیں، جن میں حساب کے لیے وزن ناپنے، تولنے کے لیے ترازو، رقیق اشیاء کی جانکاری کے لیے سازوسامان وغیرہ شامل ہیں۔

اسی طرح یہ ادارہ اندھوں کے لیے خصوصی طور پر خدمات انجام دے رہا ہے، جو انسانی نقطۂ نظر سے بہت عظیم و مفید کام ہے۔ اس پیش رفت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب تک قوتِ بصارت سے محروم جو لوگ بینائی کے بغیر سماج اور معاشرے پر اپنے کو ایک بوجھ سمجھتے تھے اب انھیں اپنی بے بصارتی پر افسوس نہیں کرنا پڑیگا۔ ●

بقیہ: اداریہ

صنعتوں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ دو لاکھ روپے سے کم سرمایہ کاری والے صنعتی سیکٹر کو بڑھانے کی کوششیں وقت کی بڑی ضرورت ہے۔ اسے کو بڑھانے کے لیے تحقیقی اور ترقیاتی امور کو خاص طور پر ضروری سمجھا گیا ہے۔ ان صنعتوں کے فروغ کے لیے بنیادی ڈھانچے کی فراہمی اور بھی اہم ثابت ہوگی۔ ناریل کے ریشے کی صنعت، ہینڈلوم سیکٹر کی توسیع اور کھادی وغیرہ کی تیاری اس سلسلے سے تعلق رکھتی ہے۔ ساتویں منصوبے میں اس سلسلے کی حکمت عملی کا منشا یہ ہے کہ ان تمام صنعتوں سے ایک طرف پیداوار بڑھے اور دوسری طرف زیادہ سے زیادہ لوگوں کو نفع بخش روزگار ملے۔ ●

ایم ایم ریڈی اور بی آرناٹڈو

دیہی نوجوانوں کی دلچسپیاں اور سرگرمیاں

نوعمروں کی بھاری تعداد ایک عظیم قومی اثاثہ ہے اور اُن کی مناسب تربیت کی ضرورت ہے تاکہ وہ ملک کی ترقی میں اہم رول ادا کرسکیں۔ اکتوبر ۱۹۵۲ میں قومی توسیعی سروس اور حلقہ جاتی (کمیونٹی) ترقیاتی پروگرام کے شروع ہونے کے ساتھ دیہی نوجوانوں کے لیے ملک گیر پروگرام پہلی بار شروع کیا گیا تھا۔ ان مساعی کے نتیجے کے طور پر پنچایت سمیتیوں کی طرف سے دیہی نوجوانوں کے کلب بڑی تعداد میں قائم کئے گئے ہیں۔ اگرچہ نوجوانوں کے کلبوں کے کام کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے تاہم ان کلبوں کی کارکردگی مجموعی طور پر تسلی بخش نہیں ہے اور تقریباً تمام کلب غیر مؤثر اور ناکارہ پائے گئے ہیں۔ اس صورتِ حال کا ایک سبب یہ ہوسکتا ہے کہ نوجوانوں کے کلبوں کے پروگرام نوجوانوں کی دلچسپی پر مبنی نہیں تھے۔ لہٰذا اُن سرگرمیوں، دلچسپیوں اور امور کا پتہ لگانے کے لیے تحقیق و مطالعہ کا ایک منصوبہ بنایا گیا۔ اس پر عمل درآمد کی ذمہ داری نوجوانوں کو ہی سونپی گئی ہے۔ اس تحقیق و مطالعہ کا مقصد تھا :-

۱۔ دیہی نوجوانوں کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا پتہ لگانا اور

۲۔ یہ معلوم کرنا کہ کتنی شدت کے ساتھ دیہی نوجوان دلچسپیوں اور سرگرمیوں کو عمل میں لارہے ہیں۔

لکشمن (۱۹۷۵) نے بتایا کہ نوجوان اپنے فرصت کے اوقات گھر میں آرام کرکے، دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرکے، ریڈیو سن کر، فلمیں دیکھ کر بڑوں کے ساتھ بات چیت کرکے اور کتابوں کا مطالعہ کرکے گذارتے ہیں۔ تھیا اور جین نے بتایا کہ وہ سب سے زیادہ دلچسپی زراعت میں لیتے ہیں اور اس کے بعد وہ کھیل کود میں حصہ لیتے ہیں، ریڈیو سنتے، مقبولِ عام رسائل پڑھتے اور فلمیں دیکھتے ہیں۔

شگیتاں (۱۹۸۰) نے معلوم کیا کہ ۶۲ فیصد اسکول جانے والے دیہی طلبا نام کو وہ کام کرتے ہیں جو ٹیچر اُنھیں گھر میں کرنے کے لیے دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ درسی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ۲۵ فیصد کھیتوں میں جاکر اپنے والدین اور بھائیوں کی امداد کرتے ہیں، گپ شپ کرتے ہیں، کھیل کھیلتے اور لمبی سیر پر جاتے ہیں۔

۱۲۰ طلبا کو بے ربطی کے ساتھ چھ بے ربط طور پر چُنے ہوئے دیہات سے منتخب کیا گیا۔ یہ دیہات ضلع چتور کے چندرہ گری بلاک میں واقع ہیں۔ اس بلاک کا انتخاب اس لیے کیا گیا کیونکہ اس میں نوجوانوں کے زیادہ کلب ہیں اور مواصلات کی اچھی سہولیات ہیں۔ فروری ۱۹۸۲ میں نوجوانوں سے انٹرویو کرکے معلومات فراہم کی گئیں۔ اس سے پتہ چلا کہ جہاں تک نوجوانوں کی سماجی دلچسپیوں کا تعلق ہے نوجوانوں کو کلبوں کا ممبر بننے، نئے نئے دوست بنانے، سماجی خدمات انجام دینے اور دوسروں کی اصلاح کرنے میں زیادہ دلچسپی ہے۔

اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ نوجوان والدین سے آزاد رہنا، کھیتی باڑی میں حصہ لینا، اچھی جسمانی قوت برقرار رکھنا، مقبولیت حاصل کرنا اور اپنے پاس چیزیں رکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

جہاں تک دیہی نوجوانوں کی ذاتی سرگرمیوں کا تعلق ہے اُن کے بارے میں پتہ چلا کہ اُنھیں سب سے زیادہ سائیکل چلانے، اُس کے بعد فلمیں دیکھنے اور اس کے بعد زرعی سرگرمیوں میں حصہ لینے میں زیادہ دلچسپی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ریڈیو سننے، کتابیں پڑھنے، تیرنے، آرام کرنے، ڈرائنگ کرنے، پائیں باغ لگانے اور موسیقی کا بھی شوق رکھتے ہیں۔

جہاں تک دیہی نوجوانوں کی گروہی اور ثقافتی سرگرمیوں کا تعلق ہے۔ اُن کے بارے میں معلوم ہوا کہ انھیں دیہات میں صفائی، گپ شپ اور توسیعی سرگرمیوں میں شرکت سے دلچسپی ہے۔ وہ کھیتوں میں بھی کام کرتے ہیں اور اس سلسلے میں زرعی اطلاعاتی مرکز چلاتے ہیں۔ انھیں تعلیم بالغان کے پروگراموں، کیمپوں اور پکنکوں، چھوٹی چھوٹی سڑکیں بنانے، کھیل کود میں حصہ لینے اور ثقافتی پروگراموں میں شرکت کرنے کا بھی شوق ہے۔

نتائج اور تجاویز

۱۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ دیہی نوجوانوں کا گوناگوں دلچسپیوں اور سرگرمیوں سے تعلق ہے۔ لہٰذا دیہی نوجوان کلبوں کے پروگرام بہتر بنائے جا سکتے ہیں اور وہ انکی دلچسپیوں اور سرگرمیوں پر مبنی ہونے چاہئیں۔

۲۔ نوجوانوں نے سماجی خدمت اور نوجوان کلبوں میں شمولیت جیسی بعض صحتمندانہ اور سماجی طور پر مفید دلچسپیوں کا اظہار کیا۔ نوجوانوں کو سماجی خدمت میں جو دلچسپی ہے اُس سے فائدہ اٹھا کر انھیں ایک صاف ستھرے گاؤں کی تعمیر میں لگایا جا سکتا ہے۔ دیہی نوجوانوں کی اکثریت نے نوجوانوں کے کلبوں میں شمولیت کے لیے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ لہٰذا اگر اسکولوں میں نوجوانوں کے کلبوں کو غیر نصابی سرگرمیوں کا لازمی حصہ بنا دیا جائے تو اس سے نوجوانوں کو بیش قیمت تربیت حاصل ہو سکتی ہے جو اسکول چھوڑنے کے بعد نوجوانوں کے کلبوں کے موثر ممبروں یا اپنے دیہات میں لیڈروں کے طور پر کام کر سکتے ہیں۔ کلبوں کے تئیں اس موافقانہ رجحان کا پورے طور پر استعمال کر کے نوجوانوں کے کلبوں کی تنظیم کی جا سکتی ہے، نوجوانوں کے تمام تر ترقیاتی پروگرام کا احیاء کیا جا سکتا ہے اور اسے ایک نئی سمت دی جا سکتی ہے۔

۳۔ والدین سے خود مختار ہونے، مقبولیت حاصل کرنے اور نئے نئے دوست بنانے میں دلچسپی لینا ایک حوصلہ افزا علامت ہے کیوں کہ وہ خود مختار اور سماجی شخصیت کو فروغ دینے کے لیے بہت ضروری ہیں۔ لیکن ان دلچسپیوں پر گہری نگاہ رکھنا ہوگی، مبادا وہ سماج دشمن صورت اختیار کر لیں۔ لہٰذا نوجوانوں میں کام کرنے کے سلسلے میں پیشہ ور اور حوصلہ مند لیڈروں کا انتخاب کرنے کے لیے اُن دانشوراں پختہ کار اشخاص کی خدمات حاصل کی جائیں جو جمہوریت میں اعتقاد رکھتے ہوں۔

۴۔ دیہی نوجوانوں کو مطالعہ، زراعت، دیہی صحت و صفائی جیسی صحتمندانہ سرگرمیوں میں دلچسپی ہے اور وہ کھیتوں میں جاتے ہیں، اطلاعاتی مرکز چلاتے ہیں اور وہ لائبریری سروسوں اور تعلیم بالغان کے پروگراموں کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جائے اور ایسا اہتمام کیا جائے جس سے وہ نوجوانوں کے کلبوں میں ان سرگرمیوں کو جاری رکھ سکیں۔

۵۔ نوجوانوں کو کاہلی سے بچانا ضروری ہے۔ لہٰذا نوجوانوں کے پروگراموں کا اس طرح پلان بنایا جائے اور عمل میں لایا جائے جس سے اُنکے جذبات اور محنت کا بے ضرر ڈھنگ سے اظہار ہو سکے اور اُن کی خواہشات کی تکمیل ہو سکے۔

بقیہ، نیشکر (گنّا) کی بیماریاں اور حفاظتی اقدام

دیمک (Termite)

یہ معروف کیڑا ہے۔ نیشکر کی جڑوں کو متاثر کرتا ہے۔ اگر پودوں پر ان کے جھنڈ نظر آئیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کھیت کی زمین میں دیمک ضرور ہے۔

حفاظتی اقدام :-

بونے سے پیشتر بیج کی نالیوں میں بی ایچ سی، بشرح ایک کلو فی ہیکٹیر، محلول کی صورت میں، ہیپٹاکلور (Heptachlor) کلوروڈین (Cnloradane) یا ٹیلوڈرین (Telo-drin) کا محلول بھی اسی شرح سے بیج میں ملا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ نئی جراثیم کش دوائیں بھی دستیاب ہیں لہٰذا ان کے صحیح استعمال اور شرح کے لیے مقامی زراعتی محکموں سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

بقیہ، بائیو گیس ٹیکنالوجی اور بھارت کے دیہات

مغربی خطے میں دیہی زندگی کو بہت حد تک متاثر کیا ہے۔ اس لیے یہ امر پسند کیا جائے گا کہ اُن سے درخواست کی جائے کہ وہ بائیو گیس پلانٹوں کی تعمیر میں مدد دیں۔

۵۔ زرعی یونیورسٹیوں، تحقیقی مرکزوں، سرکاری فارموں اور کرشی گیان کیندروں کو بھی ایسے پلانٹ نصب کرنے چاہئیں جن سے دکھایا جا سکے کہ بائیو گیس پلانٹ کیوں کر کام کرتے ہیں۔

۶۔ پلانٹ کی تعمیر کی ابتدائی لاگت میں کمی کرنے کے لیے کمزور طبقوں کو مالی امداد دی جا سکتی ہے۔

۷۔ ہر ریاست میں توسیعی ایجنسیوں کی جانب سے کمیونٹی بائیو گیس پلانٹ نصب کئے جائیں تاکہ دیہی مفلسوں کی بھاری تعداد کے فائدے کے لیے محدود اثاثہ جات کے موثر استعمال کا مظاہرہ کیا جا سکے۔

گھریلو استعمال کے لیے بائیو گیس

بائیو گیس پلانٹ دیہات کی توانائی سے متعلقہ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دیہی علاقوں میں نصب کئے جا سکتے ہیں اور ان سے حرارت اور روشنی حاصل کی جا سکتی ہے اور کھانا بنایا جا سکتا ہے۔ اس سے مروجہ توانائی (ڈیزل اور مٹی کے تیل وغیرہ) کی بھاری مقدار میں بچت کی جا سکتی ہے۔

آبپاشی کے پمپوں کیلئے

وقت کی اشد ضرورت کسانوں کو کم لاگت کا ایندھن مہیا کرنا ہے تاکہ وہ ڈیزل، پٹرول اور مٹی کے تیل جیسی پیٹرولیم پیداوار کی بہت زیادہ بڑھتی ہوئی قیمتوں کے پیش نظر اپنے آبپاشی کے پمپ سیٹ چلا سکیں۔ اس مسئلہ پر قابو پانے کے لیے بائیو گیس انجن پمپ سیٹ درست طریقہ ہو سکتا ہے۔ ان انجنوں سے آٹا مل، تھریشر اور گھاس کاٹنے والی مشین بھی چلائی جا سکتی ہے۔

زمین کی زرخیزی کی برقراری کیلئے

حالیہ برسوں میں گھروں میں کھانا پکانے اور روشنی کے لیے مٹی کے تیل کی قلت ہونے اور اُس کے دام میں بھاری اضافہ ہونے سے دیہی علاقوں میں ایندھن کی لکڑی کی کھپت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس سے جنگلاتی ذخائر میں کمی ہوئی ہے جس سے دیہات میں عملاً ایندھنی لکڑی کی کمی ہو گئی ہے۔ مٹی کے تیل کی قیمتیں بڑھنے اور ایندھنی لکڑی کی بڑھتی ہوئی کمی کے باعث گوبر کا ایندھن کے طور پر استعمال بڑھ گیا ہے اور اُسے کھیتوں میں کھاد کی صورت میں استعمال نہیں کیا جا رہا۔ اس کے نتیجے میں ہماری اراضیات کی زرخیزی اور پیداواری قوت میں بھاری کمی ہو رہی ہے۔ بائیو گیس ٹیکنالوجی جنگلات کو اُجڑنے سے بچانے اور آلودگی پر قابو پانے میں مدد دیتی ہے۔ کیونکہ وہ کھانا بنانے اور روشنی کے لیے اعلیٰ حرارتی صلاحیت کی گیس اور طاقتور کچرا (جس میں ۴۳ فیصد زیادہ نائٹروجن ہوتا ہے) کھاد کے لیے مہیا کرتی ہے جس سے زمین کی زرخیزی اور پیداواری صلاحیت بڑھتی ہے۔

کیمیاوی کھاد کی پیداوار کیلئے

پروفیسر کے۔ این ریڈی نے انسٹی ٹیوٹ آف سائنس، بنگلور میں جو تحقیق و مطالعہ کیا ہے اُس کے نتیجے سے پتہ چلا ہے کہ کُنبے کی جسامت کے تقریباً ۲۶ ہزار بائیو گیس پلانٹوں سے اس قدر فرٹیلائزر پیدا ہو گا جتنا کوئلے سے چلنے والے ایک واحد ۱۴ کروڑ پونڈ اسٹرلنگ کے پلانٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بائیو گیس پلانٹوں کی تعمیر پر ایک کروڑ ۲۰ لاکھ پونڈ کی کم لاگت آئیگی اور ۱۳۰ گنا زیادہ روزگار پیدا ہو گا۔ ملک میں ایک کروڑ سے زیادہ بائیو گیس پلانٹ لگائے جانے کے امکانات موجود ہیں۔ اس لیے فرٹیلائزر کی پیداوار کا مسئلہ بہت حد تک حل ہو جائے گا۔ ایک بات اور ہے۔ فرٹیلائزر پیداوار کے مقامات کے قریب استعمال کیا جائیگا لہذا پیکنگ، ٹرانسپورٹ اور گوداموں کا بھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو گا۔ اس سے جہاں سرمایہ اور غیر ملکی زرمبادلہ کی بچت ہوگی اور فرٹیلائزر ارزاں قیمتوں پر دستیاب ہو گا وہاں کم ہنرمند کارکنوں کو بھی روزگار ملے گا۔ اس کے علاوہ فرٹیلائزر کے ساتھ ساتھ گیس کی توانائی بھی حاصل ہو گی۔

عملاً صغیر ترین 2M³ جسامت کے بائیو گیس پلانٹ کے لیے دو سے تین بیل وغیرہ درکار ہیں جو ہر دیہاتی کے پاس نہیں ہیں۔ دراصل کُنبے کی جسامت کے بائیو گیس پلانٹ ۵۰ فیصد سے زیادہ دیہی کنبوں کی پہنچ کے باہر ہیں۔ اس مسئلہ کو حل کرنے اور بائیو گیس توانائی ہر دیہی کُنبے کو دستیاب کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ حلقہ جاتی (کمیونٹی) بائیو گیس پلانٹ لگائے جائیں۔

تجاویز

ہمارے دیہات کو خوشحال اور ترقی یافتہ بنانے کے لیے بعض عملی بامقصد اقدامات کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دیہی علاقوں میں بائیو گیس تحریک کو فروغ دیا جائے اور مقبولِ عام بنایا جائے۔ ان میں بعض اقدامات درج ذیل ہو سکتے ہیں۔

۱۔ ہر ریاست میں بائیو گیس پلانٹوں کو فروغ دینے کے لیے ایک ادارہ ہونا چاہیئے، جسے اس پروگرام پر پورا کنٹرول ہو۔

۲۔ بائیو گیس پروگرام کی ترقی کا جائزہ لینے اور اُس میں تال میل پیدا کرنے کے لیے ضلعی سطح پر ایک بائیو گیس سیل قائم کیا جائے۔

۳۔ بائیو گیس پلانٹ اُن علاقوں میں نصب کئے جانے چاہئیں جہاں آپریشن فلڈ (دودھ کی پیداوار بڑھانے کا پروگرام) کا پہلا مرحلہ کامیابی سے عمل میں لایا جا چکا ہے اور دوسرا مرحلہ عمل میں لایا جا رہا ہے اور مال مویشی کی ترقی کے شدید پروگرام زیرِ عمل ہیں۔

۴۔ ڈیری ڈویلپمنٹ کارپوریشن، ڈیری یونینوں، کوآپریٹو شوگر ملوں اور کتائی ملوں نے

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi.

Vol. 6 No. 6

YOJANA (URDU)

16-30 June 1986

سید اختر الاسلام

نابینا لڑکے لڑکیوں کے کارہائے نمایاں

دھرہ دون مغربی یو۔پی کا ایک بہت مشہور اور پہاڑی تفریحی مقام ہے جسین فطری مناظر سے متاثر ہوکر سرکار نے یہاں اپنے کئی ادارے، دفاتر اور مراکز قائم کئے ہیں جن میں فارلیسٹ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، تیل اور قدرتی گیس کمیشن، سروے آف انڈیا، آئی آئی پی آرڈیننس فیکٹری وغیرہ خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں ایک نیا نام نیشنل ہانڈی کیپڈ انسٹی ٹیوٹ ہے جو سماجی بہبود کی وزارت کے زیر نگرانی راج پور میں حیرت انگیز ترقی کرکے بصارت سے محروم نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کو خود کفالت کی زندگی گذارنے اور ان کی مدد کرنے میں پیش پیش ہے۔ سال ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران ہی سماجی بہبود کے اس ادارے نے اندھوں کے روزگار اور ان کی بحالی کے ضمن میں نئے ریکارڈ قائم کئے ہیں۔ اس ادارے نے پنجاب نیشنل بنک کی مختلف شاخوں میں اسٹینوگرافروں اور اسسٹنٹوں کی خدمات انجام دینے کے لیے تربیت یافتہ اندھی لڑکیوں اور خواتین کی تقرریاں کرائی ہیں۔ اندھوں کو اسٹینوگرافرز کے روپ میں مکمل طور پر تسلیم کرانے اور اس طریقہ کار کو آسان اور عام فہم بنانے کے لیے یہ ادارہ اپنی بریل فیکٹری کے ذریعے بریل شارٹ ہینڈ مشین تیار کرنے میں کوشاں ہے۔ ویسے آجکل یہ مشین غیر ممالک سے منگائی جارہی ہے۔ اپنے ملک میں ہی اس قسم کی مشین سازی سے غیر ملکی زرمبادلہ میں زبردست فرق پڑے گا، ساتھ ہی اس مشین کا حصول بھی عام اور آسان ہو جائیگا اور تب سماج کے اندھے لوگوں کو روزگار دلانے کے لیے بڑے پیمانے پر تربیت دی جا سکے گی۔

بریل فیکٹری اندھوں کے لیے بڑے پیمانے پر تعلیم و تربیت کا ساز و سامان تیار کرتی ہے، جو ایسے لوگوں اور اداروں کو جو ان کے مفاد کی خاطر کوشاں ہیں، رعایتی دروں پر فراہم کیا جاتا ہے۔ اپریل ۱۹۸۵ء سے دسمبر ۱۹۸۵ء کے چند مہینوں میں اس ادارے نے بریل رائٹنگ سلیٹوں کی تیاری کی۔ ان سلیٹوں پر ہی اندھوں کو تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ اس مختصر سی مدت میں ان سلیٹوں کی تعداد ۲۴۰۶ ہے جب کہ گذشتہ تین سالوں میں ان کی تعداد کل ۲۲۱۴ تھی

اس فیکٹری نے اندھی خواتین کے لیے سلائی کڑھائی سے متعلق ساز و سامان بھی تیار کیا ہے جس میں ناپ لینے، کپڑا کاٹنے اور سلائی کرنے والے کپڑوں کو مناسب طور پر پکڑنے اور انھیں سینے کے لیے بہت سے اوزار اور آلات تیار کئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تفریح اور کھیلوں کے لیے بھی کچھ اشیاء اس فیکٹری نے تیار کی ہیں۔ جن میں اندھوں کے کھیلنے کے لیے تاش، شطرنج، جیسے کھیلوں کے کمروں کی تیاری شامل ہے۔

پیشہ ورانہ تربیت کی طرف بھی اس ادارے نے خصوصی توجہ دی ہے۔ ان میں فزیو تھیراپی الیکٹرانکس میں اسمبلی کا کام، لکڑی کا کام اور خود روزگار تربیت خاص ہیں۔

علاوہ ازیں اس ادارے نے ہندی بریل سسٹم میں شارٹ ہینڈ رائٹنگ کو مزید آسان، عام فہم اور مفید بنانے میں بھی حیرت انگیز پیش رفت کی ہے جس کے استعمال سے بریل رائٹنگ میں ۲۵ فیصد جگہ کی بچت کے ساتھ ہی

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 adur

یکم تا ۱۵ جولائی ۱۹۸۶

ترقی میں حصہ دار کارکن عورتوں کا ماضی، حال اور مستقبل
(بینا گپتا)

ایک روپیہ

بچوں کی بہبود کے پروگرام کیسے مؤثر بنائے جائیں
(سمن سیمن کے، جی نارائن ریڈی)

پی. ایل. ملہوترا

اسکولوں میں کمپیوٹر کا استعمال

کمپیوٹر کو مغرب کی اسکولی تعلیم میں آئے ہوئے اب کوئی دو دہائیاں ہو چکی ہیں اور ان دو دہائیوں کے دوران ان کے استعمال کا ارتقا جس ڈھنگ سے ہوا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

اس ارتقا کا ایک اہم ترین عنصر خورد بہ مشین ہے۔ مائکرو پروسیسر پر مبنی کمپیوٹروں کی تخلیق اور ان کی تیز رفتار ترقی نے انھیں ایک ہمہ گیر آلہ بنا دیا ہے جس سے بیشتر کام انجام دیئے جا سکتے ہیں۔ کمپیوٹر جس تیز رفتاری سے کام کرتا ہے جس اہلیت سے نقشوں کی صورت میں معلومات بہم پہنچاتا ہے اس کے ردعمل میں جو لچک پائی جاتی ہے، جتنی آسانی سے حرکت میں آ جاتا ہے اور وقت پر کام کرتے ہوئے جتنی مستعدی سے بے لاگ نتائج حاصل کرنے کے لیے بے ربطی سے مدوں کا انتخاب کرتا ہے۔ ان تمام باتوں نے اسے ایک ایسا بے مثل ذریعہ بنا دیا ہے جسے اگر سوجھ بوجھ کے ساتھ استعمال کیا جائے تو اس سے تعلیم دینے اور تعلیم حاصل کرنے کے روائتی عوامل میں اعلیٰ تبدیلیاں آنے کی امید پیدا ہو سکتی ہے۔ ٹیچر اپنے موجودہ ساز و سامان اور طور طریقوں سے مؤثر طور پر اپنا رول ادا کر سکتا ہے۔

تیز رفتار مشین

کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے شعبے میں نمایاں پیش قدمیاں ہو رہی ہیں۔ یہ مائکرو پروسیسر آلہ ٹیکنالوجی میں ایک لمبی چھلانگ کا نقیب ثابت ہوا ہے۔ اس آلے کے فروغ میں ایسی طاقت اور اہمیت ہے جسے ہم انسان کی ارتقائی تاریخ کے اہم سنگ میلوں کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے نے اس برقیاتی جزو کی بدولت جو اس کے ساتھ وابستہ ہے اب تک کسی بھی دوسرے واحد آلے کی نسبت ہماری زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ذاتی کمپیوٹروں نے گزشتہ چند برسوں میں ویڈیو کھیلوں اور "ورڈ پروسیسرز" کے ذریعے سے ایسی مشینوں کی صورت میں ترقی کی ہے جو حساب لگانے کی طاقت میں انسانی ذہنوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ اب استعمال کنندہ ایک "کی بورڈ" کے ذریعہ خفیہ کوڈ الفاظ ٹائپ کر کے ہی حساب نہیں لگاتا بلکہ اب وہ ایک اسکرین پر نشانات بنا کر ایسا کر سکتا ہے۔

ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ کیا کمپیوٹر کی بڑھتی ہوئی صلاحیتوں کو اسکولی تعلیم کے شعبے میں استعمال کیا جا سکتا ہے اور کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ بعض مغربی ملکوں میں اسکولوں میں کمپیوٹری تعلیم کی نوعیت اور وسعت اور ٹیکنالوجیکل تبدیلیوں اور تعلیمی ترقی کے مابین وسیع تر امور کے بارے میں متعدد مطالعات کئے گئے ہیں۔

اسکولوں میں مائکرو کمپیوٹروں کے استعمال کی تجویز کوئی نئی نہیں ہے البتہ اسے عملی صورت میں حال ہی میں کام لیا جا رہا ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں کمپیوٹروں سے مدد لی گئی۔ ملک کے دانشوروں نے اسے تعلیمی پالیسی میں شامل کیا اور اس کی افادیت کے باعث ملک کا اہل علم طبقہ اس سے متاثر ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ مائکرو کمپیوٹر نے اپنی وسعت اور افادیت کے پیش نظر کمپیوٹر کی جگہ لے لی جو صرف درس دینے والے آلے کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔

دراصل کمپیوٹروں نے گزشتہ پانچ چھ برس میں اتنی زبردست ترقی کی ہے کہ اس امر کے واضح آثار دکھائی دے سکتے ہیں کہ مائکرو کمپیوٹر نوعمر طلبا کے فکری عمل کو بڑھانے میں بے نظیر کردار ادا کرنے والے ہیں۔

کمپیوٹر کی مدد سے کلاس میں تعلیم دینے کا پراجیکٹ پہلے پہل ۱۹۸۴ء میں ملک کے ۲۵۰ اسکولوں میں شروع کیا گیا تھا۔ آج ایسے اسکولوں کی تعداد ۵۰۰ تک پہنچ گئی ہے۔ ساتویں پانچسالہ منصوبے کے آخر میں شائد ایسے اسکولوں کی تعداد ۱۰ ہزار یا اس سے زیادہ

(باقی کور صفحہ ۳ پر)

● منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر :. آر. ٹھکرال
اسسٹنٹ ایڈیٹر :. محمدّ عادل صدیقی

جلد ۶ | یکم تا ۱۵ جولائی ۱۹۸۶ شمارہ ۷

۱۰ تا ۲۴ آساڑھ شک ۱۹۰۸ : ٹیلیفون :. ۶۰۱۸۱۸

اس شمارے میں

شرح چندہ

سالانہ، ۲۰ روپے۔ دو سال، ۳۵ روپے۔ سہ سالہ، ۵۰ روپے
فی کاپی :- ایک روپیہ
طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

اداریہ

صنعتی ترقّی کی رفتار

حکومتِ ہند نے معیشت کو مختلف طرح کے کنٹرول سے آزاد کرنے کے لیے متعدد اقدامات کئے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ عملی انداز نظر اپنا کر معیشت کو متحرک بنایا جا سکے۔ اور ترقی کے عمل کو تیزی سے آگے بڑھایا جا سکے۔ اس لحاظ سے ۸۶ - ۱۹۸۵ء کا سال صنعتی سرگرمیوں میں نئے جوش و خروش کا سال ہے۔ رواں سال میں بھی تدریجی ترقی کی رفتار بنی ہوئی ہے۔ پچھلے سال سرمایہ منڈی میں بے مثال ترقی دیکھنے کو ملی۔ کارپوریٹ سیکٹر نے بھی وسائل کو جمع کرنے میں نئی پیش رفت دکھائی۔ سرمایہ کاری نے ایک نیا رُخ دکھایا اور کامیابی کے ساتھ پہلے کے مقابلے بڑھی۔ حکومت کی پالیسیوں کے تحت بجٹ میں بہت سی راحتیں فراہم کی گئیں۔ ٹیکسوں کے نظام کو معقول بنیادوں پر لانے کی کوشش کی گئی۔ ان اقدامات سے ۱۹۸۵ء میں سرمایہ منڈی میں خوشگوار حالات دیکھنے کو ملے۔ بیرونی امداد سے حاصل ہونے والی امداد میں اگرچہ اضافے کا امکان ہے تاہم انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ سے سابق میں جو قرضے لیے گئے ہیں، ان پر قرضے کی سروس کی بڑھی ہوئی رقوم سے یہ بیرونی امداد بے اثر ہو جانے کا امکان ہے۔ چنانچہ درآمدات کو معقول بنیادوں پر لانے کے لیے یہ اقدامات ضروری سمجھے گئے تھا۔ پیداوار میں اضافے کے ذریعے برآمدات میں اضافہ کر کے ایسا ماحول پیدا کرنا ضروری سمجھا گیا جس سے کہ درآمدات کے لیے گنجائش نکل سکے۔ پٹرولیم، فولاد اور کوئلے کی قیمتوں میں اضافے سے صنعتی سیکٹر میں تیار کی جانے والی اشیاء کی لاگت میں اضافے کا خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ دستیاب صلاحیت کا بھرپور فائدہ اٹھا کر اس اضافے کے ازالے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ ریاستی بجلی بورڈوں کے پلانٹ لوڈ میں بہتری آئی ہے۔ اس سے بجلی کی کمی دور کر کے صنعتی پیداوار کو بڑھایا جا سکے گا۔ اب تک صلاحیت سے بھرپور استفادہ نہ کرنے میں بجلی کی کمی سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی ہے چنانچہ ٹرانسپورٹ کی خامی دور کر کے، مزدوروں کی شکایات کا ازالہ کر کے اور خام مال کی فراہمی کو یقینی بنا کر بجلی کی کمی پر قابو پانے کی کوششیں جاری ہیں۔

محنت کش بچّے

ہندوستان میں محنت کش بچوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملک میں ایک کروڑ سے زیادہ بچّے محنت مزدوری کر رہے تھے۔ اس کے بعد سے اس تعداد میں اور اضافہ ہوا ہے۔ نیشنل سیمپل سروے (۷۳ - ۱۹۷۲ء) میں مذکور ہے کہ ملک میں ایک کروڑ ۶۳ لاکھ مزدور ۵ سال سے ۱۵ سال تک کی عمر کے ہیں۔ بچّوں سے محنت اور کام لینے کی ممانعت کے قانون کی خلاف ورزی سب سے زیادہ غیر منظم اور غیر رسمی سیکٹر میں ہوتی ہے اور پھر وہ بچّوں کی محنت کے عوض معمولی اُجرتیں دیتے ہیں۔ ماچس بنانے کی صنعت، آتش بازی کی صنعت، قالین سازی کی صنعت، پیتل کے برتنوں کی صنعت، پتھروں اور ہیروں پر پالش کرنے کی صنعت، چمڑے کی رنگائی کی صنعت، بیڑی بنانے کی صنعت، اینٹیں بنانے کی صنعت، چوڑیاں بنانے کی صنعت اور زری کے کام کی صنعت، ان سب جگہ بچّے معمولی اُجرتوں پر کام کرتے ہیں، جن حالات میں یہ کام کرتے ہیں وہ بھی ناگفتہ بہ ہے،

(باقی ص۱۳ پر)

مینا گپتا

ترقی میں حصہ دار

کارکن عورتوں کا ماضی حال اور مستقبل

انسانی یادداشت جہاں تک پہونچ سکتی ہے اُس وقت سے عورتیں گھر کے رکھ رکھاؤ، کھانا پکانے اور دیگر گھریلو کاموں کو انجام دینے کے علاوہ اپنے کنبے کی آمدنی بڑھانے کے لیے بھی کام کرتی رہی ہیں۔ لیکن روزی کمانے والے فرد کی حیثیت سے عورت کی اہمیت اس بات سے قدرے کم ہوگئی ہے کہ عورت کو بالعموم بچّوں کو پالنے والا ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہ تو پچھلی کچھ دہائیوں میں ہی ہوا ہے کہ عورت کو اقتصادی اصطلاح میں "ورکر" یا کارکن سمجھا جانے لگا ہے۔ اس سے پہلے اگرچہ مردم شماریوں میں کارکن عورتوں کی تھوڑی بہت تعداد نظر آتی تھی لیکن اُن پر، اُن کی ضرورتوں اور اُن کے حقوق پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ عام رائے یہ تھی کہ کام کاجی عورتیں کنبے کی آمدنی میں تھوڑا سا اضافہ ہی کرتی ہیں ورنہ بنیادی طور پر روزی کمانے والا مرد ہی ہوتا ہے۔ لیکن حالیہ مطالعات اور اعداد و شمار نے اس مفروضہ کا پردہ فاش کردیا ہے۔ کچھ اندازوں کے مطابق ملک میں تقریباً بیس فیصد گھرانوں کی مکھیا عورتیں ہی ہیں قدرتی طور پر عورتوں کی آمدنی ہی ان کی بنیادی آمدنی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور گھرانے ایسے ہیں جن کی مکھیا عورتیں نہیں ہیں لیکن جو عورتوں کی آمدنی پر اتنا ہی انحصار رکھتے ہیں جتنا مردوں کی آمدنی پر۔ ایسا اس لیے بھی ہے کہ محنت کش طبقوں میں عورت کی آمدنی کا بہت بڑا حصہ کنبے کی ضرورتوں پر خرچ ہوتا ہے جبکہ مرد اپنی آمدنی کا بڑا حصہ خود پر خرچ کرتا ہے۔

اسکیمیں اور پروگرام

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے عورت کے کام کی اہمیت تو صرف حالیہ برسوں میں ہی تسلیم کی جانے لگی ہے۔ اور یہ بیداری کئی اقدامات کی مرہونِ منت ہے۔ عورتوں کے مسائل پر توجہ مرکوز کرانے میں خاص کر نسوانی تحریک کا بڑا ہاتھ ہے جو دنیا بھر میں زور پکڑتی جا رہی ہے۔ اقوام متحدہ کی طرف سے ۱۹۷۵ء کو "عورتوں کا بین الاقوامی سال" اور ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۵ء کی دہائی کو "عورتوں کی دہائی" قرار دئے جانے سے بھی عورتوں کے مسائل پر توجہ مرکوز کرانے میں بڑی مدد ملی۔ ہندوستان میں بھی ایسے متعدد اقدامات کئے گئے جن سے معلوم ہوا کہ حکومت کو عورتوں کے کام کی اہمیت کا روز افزوں احساس ہے۔ ۱۹۷۱ء میں حکومت نے عورتوں کے درجے کے بارے میں سماجی، قانونی، تعلیمی اور اقتصادی تمام مسئلوں پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی نے کافی تحقیق کے بعد دسمبر ۱۹۷۴ء کے آخری دن "برابری کی جانب" کے عنوان سے ایک جامع کتاب پیش کی۔ اس کتاب کی تدوین اور پیشکش ۱۹۷۵ء کے "عورتوں کے بین الاقوامی سال" اور عورتوں کی بین الاقوامی دہائی" کے لیے کافی بروقت رہا۔ ۱۹۷۵ء میں ہی مساوی اُجرت کا آرڈی نینس

پاس کیا گیا جس نے ۱۹۷۶ء میں مساوی اُجرت کے قانون کی شکل اختیار کی۔ اس قانون میں نہ صرف ہندوستانی آئین کے آرٹیکل ۳۹ (ڈی) بلکہ بین الاقوامی تنظیم محنت کی کنونشن نمبر ۱۰۰ کی "مساوی کام کے لیے مساوی اُجرت" کی دفعات کو شامل کیا گیا۔ اس قانون میں لازم قرار دیا گیا کہ ایک ہی نوعیت کا کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کو مساوی اُجرت دی جائے۔ اس میں ملازمت میں عورتوں کے خلاف امتیاز برتنے کی ممانعت بھی کی گئی۔ ۱۹۷۵ء کے بعد چھٹے پنجسالہ منصوبے میں "عورت اور ترقی" کے عنوان سے ایک علیحدہ باب میں شامل کیا گیا جو عورتوں کے بارے میں روایتی انداز نظر میں تبدیلی کا مظہر تھا۔ ساتویں پنجسالہ منصوبے میں بھی "عورتوں کے لیے سماجی و اقتصادی پروگرام" کے عنوان سے ایک علیحدہ باب شامل کیا گیا ہے۔

۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۵ء تک کے دس برسوں میں عورتوں کی ملازمت سے متعلق کئی اہم اسکیمیں شروع کی گئیں۔ بین الاقوامی تنظیم محنت اور سویڈش انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ ایجنسی کی مدد سے عورتوں کی پیشہ ورانہ تربیت اور ان کی مہارتوں کو بلند تر بنانے کے لیے ایک پروجیکٹ شروع کیا گیا۔ اس کے تحت عورتوں کے لیے ایک نیشنل ووکیشنل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ اور کئی علاقائی ووکیشنل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ نیز پیشہ ورانہ تربیت کے ادارے قائم کئے گئے۔

بھارت سرکار کی مختلف وزارتوں اور محکموں میں علیحدہ شعبے اور ڈویژنیں قائم کی گئیں جن کا کام یہ دیکھنا ہے کہ عورتوں کو متعلقہ وزارت یا محکمے کی پالیسیوں اور پروگراموں کے دائرے سے باہر نہ رہنے دیا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ عورتوں کی شمولیت محض اتفاقی امر نہ ہو کر ارادی ہو۔ عورتوں کو روزگار کی فراہمی کی حوصلہ افزائی کے لیے کئی ریاستوں میں عورتوں کی ترقیاتی کارپوریشنیں قائم کی گئیں، اس کے علاوہ کئی رضاکار تنظیمیں بھی وجود میں آئیں مثلاً احمد آباد میں سیلف ایمپلائیڈ ویمنز ایسوسی ایشن (SEWA) اور تمل ناڈو میں ورکنگ ویمنز فورم۔ ان تنظیموں نے کارکن عورتوں کے حقوق کے لیے سرگرم تحریکیں چلائی اور ان کی خدمات کو قومی اور بین الاقوامی طور پر سراہا گیا۔

یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ سرکاری پالیسیوں میں یہ رُجحان بدستور جاری ہے۔ عورتوں کی معاشی بہتری کے لیے نئے پروگرام بھی شروع کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر دیہی علاقوں میں عورتوں اور بچّوں کی ترقی و بہبود کا پروگرام (DWCRA)، ساتویں منصوبے میں عورتوں سے متعلق پروگراموں کے لیے زیادہ رقومات مختص کی گئی ہیں اور عام پروگراموں میں بھی جو مزدوروں اور عورتوں دونوں کے لیے ہیں، عورتوں کی بڑی تعداد کو فائدہ پہنچانے پر زور دیا گیا ہے۔ عورتوں کے فائدے کے پروگرام صرف مرکزی حکومت نے ہی شروع نہیں کئے ہیں، کچھ ریاستی حکومتوں نے بھی ان کے لیے ترقی پسندانہ اسکیمیں شروع کی ہیں۔ مثال کے طور پر گجرات سرکار نے پہلی بار ایک ایسی اسکیم شروع کی ہے جس کے تحت دیہات میں کھیتوں پر کام کرنے والی عورتوں کو ایّام زچگی میں ملنے والے فائدے فراہم کئے جاتے ہیں۔

لیکن یہ سمجھنا سادہ دلی ہوگی کہ عورتوں کی بہبود کے بارے میں قومی تر احساس اور عورتوں کی بھلائی کے لیے کئے گئے اقدامات کے نتیجے میں کارکن عورتوں کی حالت میں بہت زیادہ بہتری رونما ہوئی ہے۔ ہاں کچھ بہتری ضرور ہوئی ہے۔ اور یہ محنت کش عورتوں کے اعداد و شمار سے ظاہر ہے۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مقابلے میں ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار کارکن عورتوں کی تعداد میں یقینی اضافے کا پتہ دیتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری میں کارکن عورتوں کی تعداد ۳۱٫۲۹ ملین تھی یعنی ملک میں کارکنان یا محنت کشوں کی کُل تعداد کا ۱۷٫۳۵ فیصد۔ اس کے مقابلے میں ۱۹۸۱ء کی مردم شماری میں کارکن عورتوں کی تعداد بڑھ کر ۴۵ ملین ہوگئی، یعنی کارکنان اور محنت کشوں کی کُل تعداد کا بیس فیصد۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اقتصادی سرگرمیوں میں عورتوں کی شرکت میں حقیقی اضافہ ہوا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ عورتوں کی ملازمت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۷۶ء میں ۱۹۸۳ء کے دوران کارکن عورتوں کی تعداد ۲٫۳۹۷ ملین سے بڑھ کر ۲٫۹۹۲ ملین ہوگئی اور منظم سیکٹر میں کُل کارکنان کی تعداد میں کارکن عورتوں کا فیصد تناسب ۱۱ فیصد سے بڑھ کر ۱۲٫۵ فیصد ہوگیا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کُل کارکنان عورتوں میں منظم سیکٹر میں کارکن عورتوں کا فیصد تناسب بہت کم ہے۔ اس لیے منظم سیکٹر میں عورتوں کی تعداد میں اضافے سے مجموعی صورتِ حال میں زیادہ فرق نہیں پڑتا۔

کارکن عورتوں کے مسائل

آج کارکن عورتوں کو سب سے بڑا مسئلہ یہ درپیش ہے کہ زیادہ تر عورتیں کم مہارت

کے یا محنت مزدوری کے کام کرتی ہیں۔ اس لیے نہ صرف انھیں کم اُجرت ملتی ہے بلکہ انھیں آسانی سے ہٹایا یا بدلا بھی جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ مشینری کے روزافزوں استعمال سے بھی اُن کا کام چھن جاتا ہے۔ کپڑے کی صنعت اور کانوں میں، بیڑی بنانے اور تمباکو صاف کرنے کے کارخانوں میں اور ایسی ہی دیگر صنعتوں میں جہاں عورتیں پہلے بہت بڑی تعداد میں کام کرتی تھیں وہاں اب مشینوں کا استعمال شروع ہو جانے سے ان کی تعداد کافی کم ہو گئی ہے۔ کام سے ہٹائی گئی یہ عورتیں عام طور پر ان پڑھ ہوتی ہیں اس لیے اُن کے لیے دوسرے کاموں کی تربیت حاصل کرنا اور متبادل ذریعہ روزگار حاصل کرنا بہت مشکل بلکہ زیادہ تر ناممکن ہوتا ہے۔ نتیجتاً یہ ہوتا ہے کہ ان کی گذر بسر مشکل ہو جاتی ہے۔ اس مسئلے کو کئی محاذوں پر حل کرنا ہوگا۔ ایک راستہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ اُن کے لیے ایسے کام ڈھونڈے جائیں جن کی انھیں بآسانی تربیت دی جا سکے اور وہ بڑے پیمانے پر یہ تربیت حاصل کریں۔ ساتویں منصوبے کے دوران دیہی عورتوں کی تربیت کا ایک بہت بڑا پروگرام شروع کرنے کی تجویز ہے۔ دیہی عورتوں کی پیشہ ورانہ تربیت اور حصول روزگار میں امداد کے لیے ۵۰ء۴ ملین روپے مختص کیے گئے ہیں۔

دوسرا مسئلہ جو کارکن عورتوں کو درپیش ہے، یہ ہے کہ ان کے فائدے کے لیے بنائے گئے قوانین۔ زچگی کے دوران ملنے والے فائدوں کے قانون، مساوی اجرت کے قانون اور رات کو عورتوں کو ڈیوٹی پر بلانے کی ممانعت وغیرہ پر یا تو بہت کم عمل ہو رہا ہے یا ان قوانین کی وجہ سے عورتوں کو کام پر نہیں رکھا جاتا لیبر قوانین اور دیگر قانونی دفعات پر بھی پوری طرح عمل نہیں کیا جاتا جس کی ایک وجہ کارکن عورتوں میں تنظیم کی کمی اور قوانین کے بارے میں لاعلمی اور دوسری وجہ قوانین کے نفاذ کے لیے ذمہ دار حکام کی ڈھیل ہے۔ اس مسئلے کو دو اقدامات کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایک طرف تو مزدور عورتوں کو منظم کرنے اور انھیں اپنے حقوق کی جانکاری دینے کے لیے رضاکار تنظیموں کو رقوم مہیا کی جا رہی ہیں اور دوسری طرف محنت کش عورتوں کے متعلق قوانین کے موثر نفاذ کے لیے تجرباتی بنیاد پر ایک علیحدہ انفورسمنٹ مشینری قائم کی جا رہی ہے۔ یہ دونوں اسکیمیں ساتویں منصوبے میں شامل ہیں۔

اگر گھر سے باہر کام کرنے کے لیے عورتوں کی حوصلہ افزائی کی جانی ہے تو ایک سوال جس پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے یہ ہے ایام زچگی کے فوائد اور بچوں کی دیکھ بھال کی خدمات کا یقینی اہتمام کیا جائے اس وقت کارکن عورتوں کو ایام زچگی کے فوائد صرف منظم سیکٹر میں ہی حاصل ہیں اور وہ بھی خاص خاص ملازمتوں میں۔ اسی طرح اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ مالکان اپنی فیکٹریوں میں جہاں تیس یا تیس سے زیادہ عورتیں کام کرتی ہوں چھوٹے بچوں کو رکھنے کے لیے جھولوں وغیرہ کا انتظام کریں۔ اسی طرح جن باغات یا کانوں میں پچاس یا پچاس سے زیادہ عورتیں کام کرتی ہیں وہاں شیر خوار بچوں کے لیے جھولوں وغیرہ کا انتظام ضروری ہے۔ دوسری جگہوں پر مالکان کے لیے ایسا انتظام کرنے کی کوئی قانونی ذمہ داری نہیں ہے۔

موجودہ قانونی دفعات میں کچھ کمیاں بھی ہیں۔ چونکہ ایام زچگی کے دوران کارکن عورتوں کو قانونی فائدوں اور بعد میں شیر خوار بچوں کے لیے جھولوں وغیرہ کا انتظام کرنے پر مالکان کو روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے اس لیے بیشتر مالکان عورتوں کو، بالخصوص شادی شدہ عورتوں کو ملازمت دینے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ تاکہ انھیں اضافی اخراجات کا بوجھ نہ برداشت کرنا پڑے۔ اگر مالکان عورتوں کو ملازمت دیتے بھی ہیں تو وہ قانونی دفعات کی پوری طرح پابندی نہیں کرتے۔ اگر ان دفعات پر پوری طرح عمل ہو تو بھی مزدور عورتوں کی اکثریت (تقریباً نوّے فیصد جو غیر منظم سیکٹر میں ہے) ان دفعات کے دائرے سے باہر رہ جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ کوئی ایسا انتظام کیا جائے جس سے ایام زچگی کے فوائد اور چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کی خدمات مزدور یا کارکن عورتوں کی ایک بڑی اکثریت کو حاصل ہو سکیں۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ مسئلہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ لیکن گجرات سرکار نے زرعی اور دیہی مزدور عورتوں کو ایام زچگی کے فوائد بہم پہنچانے کے لیے دس لاکھ روپے کی رقم مختص کر کے قابلِ تعریف پہل کی ہے۔ وزارتِ محنت بھی بیڑیاں بنانے کا کام کرنے والی عورتوں کو بیڑی مزدور ویلفیئر فنڈ میں سے ایام زچگی کے فوائد بہم پہنچانے کے لیے ایک اسکیم مرتب کر رہی ہے۔

المختصر ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۵ء تک کے دس برسوں میں مزدور اور کارکن عورتوں کے حالات کو بہتر بنانے کے سلسلے میں بہت سی مثبت

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

سمن سومین۔ کے، جی۔ نارائن ریڈی

بچوں کی بہبود کے پروگرام کیسے مؤثر بنائے جائیں؟

ہندوستان میں بچوں سے متعلق پالیسی اور منصوبہ بندی اپنے جذبات کے اعتبار سے عمدہ اور نصب العین کے اعتبار سے قابلِ ستائش ہے لیکن آبادی جس پر اسے لاگو کرنا ہے، اس کا حجم بہت بڑا ہے۔ لہٰذا ہمارے سامنے کام بھی بہت بڑا ہے۔ بچوں کے لیے قومی پالیسی کا ریزولیوشن جو ۱۹۷۴ء میں لاگو کیا گیا تھا ہندوستان میں بچوں کی فلاح و بہبود کو بڑھانے کا ایک اہم اقدام ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ناکافی وسائل، نا اہل عمل درآمد اور افرادی قوت کے غیر مؤثر استعمال کا پرانا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ پالیسی، منصوبہ سازی اور اسے ٹھوس پروگراموں کی شکل دینے کی مساعی میں ربط کیسے پیدا کیا جائے۔ خدمات کا موجودہ ماڈل ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ اس لیے ہمیں طریقۂ عمل کے لیے ایک متبادل ماڈل کی ضرورت ہے۔

بڑی دشواریاں

بچوں کی فلاح و بہبود کے پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کی راہ میں بہت سی دشواریاں حائل ہیں۔ انھیں مختلف زمروں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ جیسے شرحِ پیدائش و اموات، سماجی و اقتصادی دباؤ اور انتظامیہ اور تنظیمی کمزوریاں۔

شرحِ پیدائش و اموات

شرحِ پیدائش کا نوزائیدہ بچوں کی شرحِ اموات سے قریبی تعلق ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں نوزائیدہ بچوں کی شرحِ اموات کو کم کرنے میں نمایاں پیش رفت ہوئی ہے! ۱۹۴۱ تا ۱۹۵۰ کے دوران نوزائیدہ بچوں کی شرحِ اموات ایک ہزار زندہ پیدائشوں پر ۱۸۳ تھی لیکن ۱۹۷۱ء میں یہ گھٹ کر ۱۲۲ ہو گئی۔ تاہم ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ عالمی ادارۂ صحت کے ایک اندازے کے مطابق جب تک نوزائیدہ بچوں کی شرحِ اموات گھٹ کر ۵۰ فی ہزار نہیں ہو جاتی شرحِ پیدائش کو کنٹرول کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اگرچہ اس ادارہ کے لیے نوزائیدہ بچوں کی اونچی شرحِ اموات کی وجوہات کا پتہ لگانے یا ان پر قابو پانے کے طریقوں کا پتہ لگانا ممکن نہ ہو سکا تاہم عام طور پر یہ رائے ظاہر کی گئی کہ نوزائیدہ بچوں کی موتیں زیادہ تر پیدائش سے قبل یا پیدائش کے بعد پیدا ہونے والے اثرات کی وجہ سے ہوتی ہیں اور یہ عناصر جن کا تعلق ماحول سے ہے، قابلِ تدارک ہیں۔ (یونائٹیڈ نیشنز چلڈرنز ایمرجنسی فنڈ ۱۹۷۸ء اور ۱۹۸۱ء) ملک میں جو ادارہ جاتی خدمات دستیاب ہیں وہ زیادہ تر شہری علاقوں میں محدود ہیں۔ جس کی وجہ سے دیہی آبادی کا بہت بڑا حصہ ان سے مستفید نہیں ہو پاتا۔ اس کے علاوہ جہاں خدمات دستیاب بھی ہیں، وہاں وہ ناکافی یا ناموزوں ہیں۔ یہی وجہ

ہے کہ نوزائدہ بچوں کی شرح اموات کو کم کرنے میں ان کی کوششوں کو زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اس یقین کی ناموجودگی میں کہ نوزائدہ بچے زندہ رہیں گے اور لمبی عمر پائیں گے بہت سے ہندوستانی والدین خاندانی منصوبہ بندی یا کم شرح پیدائش کے اصول کو قبول کرنے میں ہچکچاتے ہیں۔

سماجی و اقتصادی دباؤ

آبادی میں اضافے کی شرح زیادہ ہونے کی وجہ سے اسکولوں اور تعلیمی اداروں میں داخلے کے متلاشیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سماجی بہبود کی خدمات کے طلبگاروں کی تعداد بھی بہت بڑھ جاتی ہے جس کے نتیجے میں ضرورتوں اور وسائل کے درمیان توازن بگڑ جاتا ہے اس سے ناکام اُمنگوں کا بحران پیدا ہو جاتا ہے جس سے سارے ترقیاتی عمل پر اثر پڑتا ہے۔

خدمات کے درمیان، ایک کے مقابلے میں دوسری خدمت کا چناؤ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ تمام خدمات ایک دوسرے سے متعلق ہوتی ہیں۔ اسی طرح عمر کے مختلف زمروں میں سے کسی ایک کو نہیں چُنا جا سکتا کیونکہ ترقی کے تمام مرحلے ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں اور ہر مرحلے پر بچوں کو اُتنا کچھ ضرور ملنا چاہیے جو اُس مرحلے کے لیے ضروری ہو اور جو اگلے مرحلے سے تعلق رکھتی ہو۔ ہاں بعض معاملوں میں کسی خدمت کے کسی خاص پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے اُس کا چناؤ کیا جا سکتا ہے۔

تغذیہ کے معاملے میں عمر کے ایک زمرے اور دوسرے زمرے کے درمیان اور شہروں اور دیہات کے مختلف زمروں کے بچوں کے لیے، غریب اور امیر بچوں کے لیے، اور معذور اور نارمل بچوں کے لیے تغذیاتی امداد کی قسم اور نوعیت میں فرق ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے کلکرنی (۱۹۷۹ء) نے ایک اچھا ماڈل تجویز کیا ہے جس میں ترجیحات اس طرح متعین کی جا سکتی ہیں کہ جتنا روپیہ اور کوششیں صرف کی جائیں ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچے۔ ایسا کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ نارمل بچوں کے لیے تو ٹیکس کی امداد والی خدمات مخصوص کی جائیں اور جسمانی طور پر معذور بچوں کے لیے رضاکارانہ کوششیں کی جائیں کیوں کہ معذور بچوں کے لیے سماج کی مدد حاصل کرنا آسان ہے۔

غلط ڈیلیوری سسٹم

کسی خدمت سے جن لوگوں کو فائدہ پہونچتا ہے ان کی تعداد ہزاروں میں ہوتی ہے لیکن ضرورتمندوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ بچوں کی بہبود پر فی کس اخراجات اُس سے بہت کم ہیں جتنے کہ کم از کم ہونے چاہئیں اس کے علاوہ مہیا کی جانے والی خدمات کے ڈیزائن، جزئیات اور ڈھانچے میں بھی کمیاں رہ جاتی ہیں اور جہاں خدمات موزوں بھی ہوتی ہیں وہاں انھیں اچھی طرح سے چلایا نہیں جاتا۔ ایسی خامیوں کی کچھ نمایاں مثالیں ہیں تعلیم کے میدان میں ایک بھاری اور رسمی تعلیمی نظام پر انحصار، سماجی عمل کے بجائے ادارہ جاتی عمل پر زور، بچوں کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے پروگرام کا نااہل طریق پر چلایا جانا، خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کے بارے میں معلومات کی فراہمی میں کمی، ساز و سامان کی قلت اور ٹیچروں کی ناکافی تربیت وغیرہ ان مسائل کی وجہ سے دیہات میں صحت و سماجی بہبود اور دوسرے شعبوں کی موبائل (چلتی پھرتی) خدمات میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔

تال میل کی کمی

تنظیمی ڈھانچے میں ہم آہنگی اور تال میل کی کمی تنظیمی رکاوٹوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ خود مرکزی حکومت کی سطح پر بچوں کی بہبود کا موضوع مختلف وزارتوں اور محکموں میں بٹا ہوا ہے۔ وزارتِ صحت، وزارتِ تعلیم و سماجی بہبود، وزارتِ خوراک و زراعت اور وزارتِ داخلہ (ڈائرکٹوریٹ آف شیڈولڈ کاسٹس اینڈ ٹرائبس)، بچوں کی بہبود کے الگ الگ پہلوؤں کو دیکھتی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ دو الگ الگ ایجنسیوں ــ ایک سرکاری اور دوسری نیم سرکاری یعنی پلاننگ کمیشن اور سینٹرل سوشل ویلفیئر بورڈ ــ کے وجود سے بھی نظام میں کچھ ابتری پیدا ہوئی ہے۔ یہ دونوں ادارے فلاحی خدمات کی منصوبہ بندی، پروگرام سازی اور بہم رسانی میں حصّہ لیتے ہیں۔ ان دونوں کے علیحدہ علیحدہ کام کرنے سے عملے، بجٹ سازی، افرادی قوت کی تربیت، تحقیقی سرگرمیوں وغیرہ کے بارے میں دوہرا دوہرا کام ہو رہا ہے اور اس طرح پیسہ اور محنت دونوں کی تضیع ہوتی ہے۔ ابھی تک دائرۂ عمل، سرگرمیوں، مالی ذمّہ داریوں، تنظیمی معاملات اور دیگر تفصیلات کی کوئی قومی فہرست مرتب نہیں کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ہم آہنگ تنظیمی پلان بھی نہیں ہے۔ جس کے ذریعے یہ ایجنسیاں مشترکہ نشانوں اور مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے تعاون سے مل کر کام کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے نیشنل چلڈرنز بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اس بورڈ کو چاہیے کہ وہ دونوں ایجنسیوں کے درمیان خلیج کو

پیدا کرنے تاکہ بچوں کی بہبود کا مشترکہ مقصد حاصل کرنے کے لیے زیادہ مؤثر کوششیں کی جاسکیں۔

مناسب منصوبہ بندی اور پروگرام سازی کی کمی

خواہ یہ بچوں کی بہبود کا یا خاندانی منصوبہ بندی، دیہی ترقی ہو یا بہبود خواتین، مغربی امداد والے پروگراموں کو، یہ دیکھے بغیر کہ وہ ہماری ثقافت کے لیے کہاں تک موزوں ہیں، جوں کا توں اختیار کرنے اور زیرِ عمل لانے سے بھی عمل درآمد میں کچھ خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر جب کوئی خاص پروگرام ضروری ساز وسامان وغیرہ کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے تو اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ ملک میں اس ساز وسامان کے استعمال، مرمت اور رکھ رکھاؤ کے لیے ملک میں کیا تکنیکی سہولتیں دستیاب ہیں اور غیر ملکی ساز وسامان سے کہاں تک فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ نیز غیر ملکی اقدار اور طریقِ عمل سے مقامی اقدار وغیرہ کو کیا نقصان پہونچ سکتا ہے۔ اس بات کی ایک مثال وہ اثر ہے جو مصنوعی دودھ اور بے بی فوڈس کی تشہیر و اشاعت پر غیر ضروری زور دیئے جانے سے شہروں میں پڑا اور بچوں کو اپنی ماں کا دودھ ملنا کم ہو گیا۔ یہ تو حال ہی کی بات ہے کہ بچوں کو زیادہ عرصے تک ماں کا دودھ پلانے کے فائدوں کا پرچار ایک بار پھر ہونے لگا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ پروگرام مقامی حالات و ضروریات پر زیادہ دھیان دیئے بغیر یکساں انداز میں مرتب کر لیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر باقاعدہ اسکولی تعلیم ہی کو لیجیے، اگر ہم سب بچوں کے لیے اسکولوں میں لازمی داخلوں کا اصول تسلیم کرتے ہیں تو پھر نقل پذیر مزدوروں اور راہ گیروں وغیرہ کے بچوں کے اسکولوں میں داخلے کے لیے کیا قاعدہ رکھا جائے گا؟ آج تعلیم اور سماجی بہبود دونوں ہی شعبوں میں پیشہ ورانہ ماہرین کے لیے یہ امر پریشان کن بنا ہوا ہے کہ کیا ان کے لیے ایک مختلف نصب العین مقرر کیا جائے (جس کا مطلب امتیاز و مرفع الحال اور مفلوک الحال کے درمیان خلیج کو بڑھانا ہوگا) یا نصابات وغیرہ کو اس قدر وسعت دی جائے کہ ان نقل پذیر طبقوں کی ضروریات کی تکمیل ہو سکے۔

اصلاحی اقدامات

اوپر کی بحث سے ظاہر ہے کہ خدمات کی بہم رسانی کا موجودہ ماڈل اصل مقامی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے نا اہل اور ناکافی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ فکر و عمل کے لیے ایک متبادل ماڈل فوری طور پر تیار کیا جائے۔ اس کے کچھ پہلوؤں پر ذیل میں روشنی ڈالی جارہی ہے۔

مقامی وسائل کے استعمال کی ضرورت

مجموعی سیاسی و سماجی پس منظر جس میں بچوں کی بہبود سے متعلق سرگرمیاں چلائی جارہی ہیں یا چلائی جانی چاہئیں، بہت خراب ہے۔ عمل درآمد کی راہ میں دو بڑی رکاوٹیں ہیں، ایک قومی سطح پر اور دوسری خاندان کی سطح پر۔ قومی سطح کی دشواری یہ ہے کہ آبادی میں سریع اضافہ اور اس کے مقابلے میں کم رفتار ترقی، وسائل کی قلت اور رئی کس خدمات میں کمی پیدا کر رہی ہے اور انتظامیہ خامیوں کی وجہ سے مسئلے کی شدت میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ پہلا اہم قدم یہ ہونا چاہیے کہ اکائیوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے بجائے زیادہ سے زیادہ افراد کو پروگرام سے مستفید کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہمیں ایک ایسے متبادل ماڈل کی ضرورت ہے جس میں منصوبہ بندی اور پروگرام سازی میں مقامی لوگوں کو شریک کیا جائے۔

جہاں کہیں پروگراموں کو مقامی پس منظر سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہاں پروگراموں کو کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ پنجاب میں نور پور بیدی بلاک میں حال ہی میں ایک تجربہ کیا گیا جو نوزائیدہ بچوں کی شرح اموات کو ۱۰۸ء۹۳ سے گھٹا کر ۷۲ء۲ پر لانے میں کامیاب رہا۔ یہ تجربہ دور دراز غریب علاقوں میں غذائیت کی کمی کا مقابلہ کرنے اور بچوں کی شرح اموات کو کم کرنے میں کم لاگت مقامی تعاون اور موزوں ٹکنالوجی پر مبنی حکمتِ عملی کی کامیابی کی مثال پیش کرتا ہے۔

اقوام متحدہ کے بچوں سے متعلق ہنگامی فنڈس ۱۹۸۱ء کی رپورٹ میں کچھ اور مثالیں بھی دی گئی ہیں کہ مہاراشٹر کے "کاساپال گھر پروجیکٹ" میں مقامی سماج کی ہی کم پڑھی لکھی عورتوں کو تربیت دے کر کس طرح گھریلو طور پر ہی تغذیہ کی کمی کے مسئلے کا مقابلہ کیا گیا۔ تمل ناڈو میں ڈاکٹر وینکٹ سوامی نے بھی ایسا ہی تجربہ کیا ہے انھوں نے مقامی طور پر ملنے والی کم قیمت خوراک کا استعمال کرایا جس میں وٹامن 'اے' کافی زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے ماؤں کو سستا اور غذائیت بخش کھانا پکانے وغیرہ کی تربیت بھی دی۔ اس کا بہت اہم اور مفید نتیجہ برآمد ہوا اور وہ یہ کہ پیدائش سے پانچ برس تک کے بچوں میں وٹامن 'اے' کی کمی سے جو اندھاپن پیدا ہوتا تھا اس کی شرح بہت کم ہوگئی۔

پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین

بلگڑ والا نے بھی شاید ان ہی تجربات کی روشنی میں خدمات کو لامرکزی بنانے، مقامی عوام کی شمولیت اور تعاون حاصل کرنے، مقامی طور پر ہی خدمات کی نگرانی کا انتظام کرنے، مقامی افرادی قوت اور قدرتی وسائل کا بھرپور استعمال کرنے وغیرہ کی اہمیت اور فائدوں پر زور دیا ہے۔

بہتر نظام کی ضرورت

ملک بھر میں بچوں کی ضرورتیں اتنی مختلف النوع اور وسعت پذیر ہیں کہ کسی ایک تنظیم کے لیے ان کی تکمیل کا انتظام کرنا ممکن نہیں ہے۔ لہذا مختلف خدمات کا ایسا انضمام ضروری ہے جو زیادہ کارگر ہو اور پیدائش و اموات کی شرحوں کو کم کیا جا سکے۔ اس کے لیے پیکیج پروگرام میں حصہ لینے والے محکموں کی بلاک کی سطح کی تنظیموں کا یہ دیکھنے کے لیے بغور معائنہ کرنا ہوگا کہ ان کے پاس مؤثر انداز میں خدمات کی فراہمی کے لیے عملہ اور ساز و سامان موجود ہے یا نہیں۔ اگر نہ ہو یا کم ہو تو متبادل اقدامات کیے جانے چاہئیں۔

خصوصی ایجنسی کی ضرورت

عام نگرانی اور انضمام کے کام کے لیے ایک خصوصی ایجنسی کی بڑی ضرورت ہے تمام پروگراموں کے مربوط معائنے اور نگرانی کے لیے مختلف خدمات کا انتظام کیا جانا چاہیے تھا۔ موجودہ انتظامی ڈھانچوں میں اس بات کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف محکموں اور وزارتوں کے تحت جو رابطہ کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں وہ دوسرے سیکٹروں (جیسے صحت کے کاموں اور خاندانی منصوبہ بندی و بہبود بچگان وغیرہ) کے بارے میں محدود خیالات رکھتی ہیں۔

تربیتی عملہ

بچوں کی بہبود سے متعلق کاموں میں کمی رہ جانے کی ایک وجہ تربیت یافتہ اور اہل عملے کی سخت قلت ہے۔ اس کے لیے مختلف تربیتی پروگرام وضع کیے جانے چاہئیں اور موجودہ پروگراموں کو بڑھانا چاہیے مرکزی یا "کور" آرگنائزیشن کو یہ ذمہ داری بھی سونپی جانی چاہیے کہ وہ تھوڑے تھوڑے وقت بعد اسکیموں کی افادیت کا پتہ لگانے کے لیے تحقیقی جائزوں کا انتظام کرے اور ان جائزوں کے نتائج سے متعلقہ حکام کو آگاہ کرے تاکہ ان کی روشنی میں بروقت اصلاحات اور تبدیلیاں کی جاسکیں۔ مادی ترقی کے مقابلے میں انسانی وسائل کی ترقی ایک زیادہ مشکل اور پیچیدہ معاملہ ہے۔ اس کے لیے سماجی ترقی کی تکنیکوں، سماجی قیادت، اجتماعی عمل اور مقامی وسائل کے استعمال کے بارے میں تحقیق کی ضرورت ہے۔ بچوں کی بہبود کے پروگراموں پر کامیاب عمل درآمد کے لیے پنچایتی راج کے نظام، اسکول ٹیچروں، مقامی کوآپریٹو تنظیم کے ممبروں اور دوسرے اہم رہنماؤں، والنٹیروں، بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوانوں اور بلاک اور گاؤں کی سطح کی دوسری رضاکار ایجنسیوں کا مکمل تعاون اور اشتراک عمل حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

خاندانوں کی شمولیت

سب سے زیادہ اہم بات "فیملی یونٹ" کا رول ہے۔ غریبی سے متاثر سماج میں، جیسا کہ ہمارا ہے، بہبود کے کاموں کی ذمہ داری ساری کی ساری حکومت پر ہی نہیں چھوڑی جاسکتی کیونکہ جن لوگوں کو فائدہ پہنچانا ہے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ فیملی یا خاندان نہ صرف تبدیلی کے لیے ایک اکائی (یونٹ) کے طور پر بلکہ تبدیلی کے ایجنٹ کے طور پر کام کرے۔ خاندان کو بچوں کی بہبود کا لازمی جزو بنانا چاہیے۔ خاندان کے اونچا اٹھانے کے لیے جو اقدامات کیے جائیں گے ان سے بچوں کی بہبود کے لیے بہتر ماحول پیدا ہوگا۔ بچے میں لائی گئی بہتری کو برقرار رکھنے کے لیے خاندان کا ایک اکائی کے طور پر کام کرنا ضروری ہے۔ بچوں کی بہبود کی خدمات کی بہم رسانی میں بھی خاندان افرادی قوت کا ایک اضافی ذریعہ بن سکتا ہے اور کارکنان اور استفادہ کنندگان کے درمیان ایک کڑی کا کام دے سکتا ہے۔ اگرچہ ان تمام باتوں کو منصوبہ ساز پوری طرح تسلیم کرتے ہیں اور ان پر توجہ بھی دیتے ہیں لیکن ان پر شاذ ہی عمل ہوتا ہے۔ بہرحال اس ضمن میں مطلوبہ کارروائی کے طریقے اور دائرۂ عمل کی نشاندہی پہلے ہی کی جا چکی ہے (آئی سی ڈی ایس۔ اسکیم، چھٹا پنجسالہ منصوبہ وغیرہ) اب تو اس پر محرکات وغیرہ کے ذریعے عمل درآمد کی رفتار تیز کرنے کی ضرورت ہے۔

بچے اور خاندان کی بہبود کی پالیسی

آگے چل کر بچوں سے متعلق قومی پالیسی کی تشکیل نو کے ذریعے ایک جامع اور مربوط پالیسی مرتب کرنی ہوگی جس میں بچوں کی بہبود اور خاندان کی بہبود کی پالیسیاں ایک مرکب فیملی پالیسی میں شامل ہوں۔ اس کے لیے بھی والدین کی بیداری اور عوام کا اشتراک عمل حاصل کرنے کے لیے حکومت کی اہلیت کافی اہم ہوگی۔

منصوبہ بندی

منصوبہ بندی حقیقی اعداد و شمار

کی بنیاد پر کی جانی چاہیے۔ مثلاً یہ کہ آبادی کا نشانہ کیا ہے۔ موجودہ ضروریات کیا ہیں اور مستقبل میں کیا ہوں گی اور ان کو دیکھتے ہوئے کس قسم کی خدمات بہم پہنچائی جائیں اور کس طرح، وغیرہ وغیرہ۔ جہاں تک پیدائش اور اموات سے متعلق تفاصیل کا تعلق ہے ہمارے منصوبہ سازوں کے لیے بنیاد موجود ہے جس کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ دانشمندی کے ساتھ منصوبے بنا سکتے ہیں۔ چھٹا پنجسالہ منصوبہ اس کی پوری عکاسی کرتا ہے۔

مانیٹرنگ کے ایسے انتظامات کے بارے میں، جو سرکاری قومی پلان کے ڈھانچے سے باہر ہوں، ٹکلکرنی کی تجویز قابلِ عمل اور نہایت فائدہ مند نظر آتی ہے۔ اگر منصوبہ ساز اسے قبول کریں تو۔ انھوں نے یہ "ساکن مدتی پلان" کے مقابلے میں ایک متحرک "رولنگ پلان" کی تجویز بھی پیش کی ہے جو بچوں کی آبادی، شرحِ پیدائش و اموات میں تبدیلی کے مطابق ترجیحات میں ہر زمرۂ عمر کی ضرورتوں کے مطابق تبدیلی کرے۔ بچوں کی ترقی کے لیے ۱۹۸۰ء سے ۲۰۰۰ء تک کے لیے جو "تناظری پلان" NIPCCD نے تیار کیا ہے اس میں پیش کی گئیں تجاویز اس سلسلے میں ایک راست اور امید افزا اقدام ہیں۔ اس میں مختلف پہلوؤں مثلاً صحتِ بچگان، تغذیہ، تعلیم، بہبودِ بچگان، ماں اور بچے کی دیکھ بھال اور بچوں کے لیے قانون سازی وغیرہ کو موجودہ حالات کی روشنی میں دیکھا گیا ہے۔

انتظامیہ ڈھانچے کی تنظیم نو

اس کے معنی مرکوزی انداز کے انتظامیہ ڈھانچے اور عمودی انداز کی منصوبہ بندی کے طریقے میں تبدیلی لانا ہے۔ یہ سب سے نچلی سطح سے اوپر کی جانب اٹھنا اور افقی انداز میں آس پاس پھیلنا چاہیے۔ بنیاد گاؤں، بلاک یا شہر مع آبادی ہو سکتی ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ موجودہ بیوروکریٹک ماڈل کو بالکل مسمار کر دیا جائے اس کے برعکس اس کو جاری رہنا چاہیے لیکن کوئی ایسی ترکیب ڈھونڈنی چاہیے جس سے عوام اور سرکاری بیوروکریسی سے باہر کے پیشہ ور لوگ مثلاً ڈاکٹروں، نرسوں، ٹیچروں اور سماجی کارکنوں وغیرہ کا زیادہ اشتراکِ عمل حاصل ہو سکے۔

مختلف تنظیمی اکائیوں کے درمیان تال میل، رپورٹنگ اور احساسِ ذمہ داری، باقاعدہ رہنمایانہ خطوط متعین کرکے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ "خصوصی پلاننگ ایجنسی" یا "کور گروپ" (Core Groups) جو حکومت ہر ضلع کی سطح پر قائم کرے ان میں سرکاری اور غیر سرکاری ایجنسیوں، الگ الگ پیشوں کے لوگوں، اور فیلڈ میں کام کرنے والے افراد کو مناسب نمائندگی دی جانی چاہیے۔ چاہے یہ ادارے ریاست کی سطح پر کام کریں، ان کے نامزدگار تمام نچلی انتظامیہ سطحوں پر ہونے چاہئیں اس کے ساتھ ساتھ منصوبہ بندی کے ریاستی اور مرکزی اداروں کے ساتھ رابطے اور تال میل کے انتظامات بھی ہونے چاہئیں۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترقی کے لیے منصوبہ بندی کا مطلب محدود مقاصد کا حصول ہونا چاہیے جس کے لیے کی جانے والی کوششوں میں عوام کو زیادہ بڑے پیمانے پر شامل کیا جانا چاہیے۔ اس نقطۂ نظر کے تحت عوام کی بیداری، ان کا شعور اور ان کا اشتراکِ عمل منصوبہ بندی، پروگرام سازی اور عمل درآمد کا ایک بڑا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ●

سابق فوجیوں کی بحالی

ہمارے دیش کی آبادی بہت زیادہ ہے بلکہ ہمارے دیش میں ہر چیز کی زیادتی ہے اور اسی اعتبار سے مسلح افواج سے ہر سال سبکدوش ہونے والے فوجی عملے کی تعداد بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ہر سال ۵۵ سے ۶۰ ہزار تک فوجی اپنی ملازمت کی میعاد ختم کرکے فوج سے الگ ہو جاتے ہیں۔ دیکھنے میں یہ تعداد بہت زیادہ ہے۔ لیکن دیش کی کُل آبادی کو سامنے رکھتے ہوئے اگر غور کیا جائے تو فوجی ملازمت سے سبکدوش ہونے والے افراد کی تعداد مقابلتاً زیادہ نہیں ہے۔ سابق فوجیوں کی بحالی کا کام کرنے والے محکمے نے ۱۹۸۴ء سے نمایاں ۳۶,۰۰۰ افراد کو کام مہیا کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود ہر سال ۲۰,۰۰۰ افراد ایسے رہ جائیں گے جن کے لیے روزگار مہیا کرنا ہوگا۔ اب ۲۰,۰۰۰ تو ہر سال ہو ہی لگے ہی لیکن پچھلے برسوں کے بچے ہوئے لوگ اس تعداد میں کافی اضافہ کرتے رہیں گے۔ ساتویں پنج سالہ منصوبے میں (۱۹۸۵-۹۰ء) کُل ملا کر چار کروڑ لوگوں کے لیے روزگار مہیا کرنے کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ اس طرح منصوبے کے پانچ برسوں میں ہر برس اوسطاً ۸۰ لاکھ افراد کے لیے کام ڈھونڈ لیا جائے گا۔ اگر ہر برس ۲۰,۰۰۰ سابق فوجیوں کے لیے کام تلاش کرنا پڑے تو یہ اتنی چنتا کا معاملہ نہیں ہونا چاہیے۔ انھیں روزگار مل سکتا ہے۔ سابق فوجیوں کی بحالی کے محکمے نے اپنے طور پر ایسے بہت سے اقدامات کئے ہیں جن کی بدولت سرکاری اور پرائیویٹ ہر طرح کی ایجنسیوں کے ذریعے ریٹائر ہونے والے نیز ریٹائرڈ لوگوں کی بحالی کا کام جلد سے جلد ہو سکے۔ اس محکمے نے ریٹائر ہونے والے فوجیوں کے لیے مناسب ٹریننگ کا بھی انتظام کیا ہے جس سے ان لوگوں کی فوجی زندگی سے غیر فوجی زندگی میں منتقل ہونے میں دشواری پیش نہ آئے۔ ٹریننگ کے لیے کئی طرح کے کام سوچے گئے ہیں۔ ●

وی۔ آر۔ ایم۔ دیسائی

دیہی ترقی کے لیے عملے کی تربیت

دیہات کے ۲۶ ،۲۸ کروڑ افراد کو غریبی کی سطح سے اوپر اُٹھانے، زیادہ دیہی اثاثے پیدا کرنے اور غیر استعمال شدہ وسائل کو دیہی علاقوں کے فائدے کے لیے استعمال کرنے کی غرض سے آزادی کے بعد ہندوستان میں بہت سے پروگرام شروع کئے گئے ہیں۔ بالخصوص ۱۹۷۰ء کی دہائی میں حکومت نے غریبی کو ختم کرنے کے پروگراموں پر کافی زیادہ زور دیا ہے۔

اس وقت بھی سارے ملک میں غریبوں کی آمدنی بڑھانے اور بیروزگاری و کم روزگاری کو کم کرنے کے لیے کئی خصوصی پروگرام زیرِ عمل ہیں۔ مثلاً

۱۔ مربوط دیہی ترقی کا پروگرام، جس میں دیہی نوجوانوں کو اپنا روزگار خود شروع کرنے کی تربیت دینے کی قومی اسکیم بھی شامل ہے۔

۲۔ قومی دیہی روزگار پروگرام / بے زمین دیہی افراد کے لیے روزگار کی گارنٹی کا پروگرام اور

۳۔ کھادی اور دیہی دستکاریوں کے کمیشن کا گھریلو اور دیہی دستکاریوں کا پروگرام۔

مربوط دیہی ترقی کا مطلب ہے مقامی وسائل (افراد، سامان، زمین اور پانی) کے بہترین استعمال کے ذریعے دیہی معیشت کی ہمہ جہت ترقی۔ اس نظریے کی تجویز پہلے پہل ۷۷۔۱۹۷۶ء کے مرکزی بجٹ میں پیش کی گئی تھی۔ اس کے خاص خاص پہلو یہ ہیں:۔

۱۔ زراعت کے شعبے میں اصلاحاتِ اراضی، کھیتی کے لیے ضروری چیزوں کی بہم رسانی، زرخیز مٹی کا تحفظ، پانی کا بندوبست، ماہی پروری، مرغبانی، ڈیری فارمنگ اور توانائی کے لیے وسائل کو استعمال میں لانے پر زور۔

۲۔ گھریلو اور چھوٹی دستکاریاں اور ان کی مصنوعات کی مارکیٹنگ۔

۳۔ صحت اور خاندانی بہبود نیز ماحول کو بہتر بنانے کے پروگرام۔

۴۔ تعلیم، سماجی تعلیم، ثقافتی سرگرمیاں۔

۵۔ بچوں، عورتوں اور کمزور طبقوں کے سماجی بہبود کے پروگرام۔

یہ ضروری ہے کہ مربوط ترقی کا کوئی بھی منصوبہ مقامی وسائل، مقامی حالات، مقامی ضروریات اور امکانات کو مدِنظر رکھتے ہوئے تیار کیا جائے۔ تیز تر دیہی ترقی کے لیے مندرجہ ذیل حکمتِ عملی اختیار کرنی ہوگی :۔

۱۔ زراعت اور ملحقہ شعبوں میں پیداوار اور پیداواری صلاحیت میں اضافہ۔

۲۔ دیہی آبادی کے کمزور طبقوں کے وسائل اور آمدنی بڑھانا۔

۳۔ دیہی افراد میں الگ الگ کاموں کی مہارت پیدا کرنا جس سے وہ اپنا روزگار خود شروع کر سکیں یا کہیں اُجرت پر کام کر سکیں۔

۴۔ دیہات کے غریب افراد کے لیے شروع کئے گئے پروگراموں کو تقویت دینے کے لیے قرضوں کی سہولیات فراہم کرنا۔

۵۔ پیداوار کی مارکیٹنگ کی سہولیات فراہم

جس سے کہ پیداوار کی فروخت میں غریبوں کا
استحصال نہ ہونے پائے۔

۶۔ کم کام کے زرعی موسم کے دوران قومی دیہی روزگار پروگرام کے ذریعے روزگار کے اضافی مواقع کی بہم رسانی جس سے کہ دیہی افراد کو فائدہ مند کام مل سکے۔

۷۔ جن ضروریات کو پورا کرنا اشد ضروری ہے، انھیں پورا کرنے کا انتظام۔

۸۔ از خود روزگار اور قومی دیہی روزگار پروگرام کے لیے نیز مقامی وسائل کے سائنٹفک استعمال کے واسطے پراجیکٹ تیار کرنے کے کام میں یونیورسٹیوں، تحقیقی اداروں اور ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹوں کو شریک کرنا۔

بیروزگاری کے خلاف جنگ

بیروزگاری اور غریبی کے بھاری مسئلوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے دیہی سیکٹر میں روز افزوں سرمایہ کاری کی جا رہی ہے۔ عوام کے خاص خاص طبقوں اور جغرافیائی علاقوں کی ضروریات کے مطابق ملک میں دیہی ترقی کے متعدد پراجیکٹ زیر عمل ہیں۔ دیہات میں کوآپریٹو اور پبلک سیکٹروں کے اداروں کی تعداد میں گزشتہ چند برسوں سے تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ان تمام اداروں اور پراجیکٹوں کے لیے پیشہ ورانہ تربیت پائے ہوئے دیہی منتظموں کی فوری ضرورت ہے۔

صرف آپریشنل فلڈ نمبر ۲ (Operation Flood II) کے پراجیکٹ کے لیے ہی ہر سال دیہی بندوبست کے کیڈروں میں ۴۰۰ نئے گریجویٹوں کی ضرورت ہوگی۔ اس پراجیکٹ پر سات سال کے عرصے میں تقریباً ۴۸۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی جائے گی۔ اس پروگرام کا مقصد ملک کے ۱۵۰ اضلاع میں دیہات کے ایک کروڑ دودھ کا کام کرنے والے کسانوں کو اپنے کوآپریٹو ادارے قائم کرنے میں مدد دینا ہے۔ اسی طرح تلہن کی کاشت کرنے والے کوآپریٹو اداروں کے لیے کم سے کم ۱۹۸۰ کی دہائی کے وسط تک ۲ سال مزید ۲۰۰ منیجروں کی ضرورت ہوگی۔ پروگرام کے تحت پھلوں، سبزیوں، کپاس اور ماہی پروری کی کوآپریٹو انجمنیں بھی قائم کی جائیں گی۔

ہندوستان کی مینجمنٹ انسٹی ٹیوشنوں سے گریجویٹوں کی موجودہ سپلائی اس مانگ کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ جو بھی گریجویٹ ان انسٹی ٹیوشنوں سے نکلتے ہیں وہ صنعتی سیکٹر ہی میں جذب ہو جاتے ہیں۔ اور دیہی سیکٹر میں پیشہ ورانہ منیجروں کی کمی بدستور بنی رہتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک قابل توجہ امر یہ بھی ہے کہ مختلف دیہی علاقوں میں جنھیں ہمارے پنجسالہ منصوبوں میں اتنا اہم مقام دیا گیا ہے، مختلف سماجی، ثقافتی اور ادارہ جاتی مسائل کا سامنا ہونے کی وجہ سے خصوصی تربیت یافتہ منیجروں کی ضرورت ہے۔

تربیت

تربیت کے معنی ہیں وہ علم، وہ مہارت جو کسی منیجر کو دیہی ترقی سے متعلق کسی خاص کام کو بحسن و خوبی انجام دینے کے قابل بنائے۔ تربیت کا بڑا مقصد "موجودہ صلاحیت کارکردگی اور مطلوبہ صلاحیت کے درمیان خلیج کو پاٹنا ہے"۔

تربیت کے خاص خاص مقاصد درج ذیل ہیں:۔

۱۔ نئے داخل ہونے والوں کو، مفوضہ کاموں کو بہتر طریقے سے انجام دینے کے لیے درکار علم و مہارت عطا کرنا۔

۲۔ ملازمین کو تازہ ترین اطلاعات اور تکنیکوں کی جانکاری فراہم کرکے اور اُن کی مہارت کو بہتر بنا کر، موجودہ عہدوں پر زیادہ اہل اور مؤثر انداز میں کام کرنے میں مدد دینا۔

۳۔ اہل اور لائق افسروں کی دوسری صف تیار کرنا اور انھیں زیادہ ذمہ دار عہدوں پر کام کرنے کے لیے تیار کرنا۔

۴۔ سینئر منیجروں کے دماغوں کو روشن خیال بنانا تاکہ وہ اُس تنگ نظری کی اصلاح کر سکیں جو حد سے زیادہ مہارت کے حصول سے پیدا ہوتی ہو۔

ہمارے اوّلین وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو ٹیکنالوجی کی دیہی علاقوں کو منتقلی کی اکثر حمایت کیا کرتے تھے۔ یہ ضروری ہے کہ علم دیہی عوام کو منتقل کیا جائے۔

ہندوستان میں ۴۸۵ تربیتی ادارے کام کر رہے ہیں جو دیہی ترقی کے عمل میں ضروری مہارتیں پیدا کرتے ہیں۔ اُتر پردیش میں ایسے ۲۲۱ ادارے ہیں۔ کرناٹک میں ایسے اداروں کی تعداد ۱۳۱، بہار میں ۱۲۹ اور مہاراشٹر میں ۱۲۶ ہے۔

دیہی ترقی کے لیے عمل کی تربیت میں دیہی ترقی کا قومی انسٹی ٹیوٹ، دیہی ٹیکنالوجی کی ترقی کی کونسل، انسٹی ٹیوٹ فار رورل مینجمنٹ، بینکرز انسٹی ٹیوٹ فار رورل ڈیولپمنٹ اور زرعی بینکنگ کا کالج اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

دیہی ترقی کا قومی انسٹی ٹیوٹ

حیدرآباد میں دیہی ترقی کا قومی انسٹی ٹیوٹ تحقیق و تربیت کا عمدہ کام کر رہا ہے۔ یہ ملک بھر میں مربوط دیہی ترقی کے بارے میں تحقیقی جائزے مرتب کرتا رہا ہے۔ اس کے تربیتی پروگراموں میں سرکاری محکموں، رضاکارانہ ایجنسیوں، بینکوں اور دیہی ترقی کے پروگراموں

میں دلچسپی رکھنے والی تنظیموں کا عملہ حصہ لیتا رہا ہے۔ اور تربیتی نصابات کو استفادہ کنندگان کی مانگوں اور ضرورتوں کے مطابق مرتب کیا جاتا رہا ہے۔ دیہی ترقی کے مسائل کو حل کرنے کے نقطۂ نگاہ سے کی جانے والی تحقیق و تربیت کی وجہ سے یہ ادارہ اتنا مشہور ہو گیا ہے کہ بین الاقوامی تنظیمیں بھی اس کی خدمات سے استفادہ کر رہی ہیں۔

زرعی تحقیق و تربیت کی کونسل

ہندوستان میں معیشت کے مختلف شعبوں میں موزوں ٹکنالوجی کی نشو و نما کے لیے کافی زیادہ کام کیا گیا ہے۔ دیہی ترقی کے بہت سے مسائل کے بارے میں متعدد اداروں میں تحقیق کی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر سائنسی و صنعتی تحقیق کی کونسل سے ملحقہ قومی تحقیقی انسٹی ٹیوٹ، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی، کھادی اور دیہی دستکاریوں کا کمیشن، زرعی تحقیق کی ہندوستانی کونسل اور اس سے ملحقہ ادارے مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔ زرعی تحقیق و تربیت کی کونسل کا رجسٹریشن سوسائیٹیوں کی رجسٹریشن سے متعلق قانون ۱۸۶۰ء کے تحت کیا گیا ہے اور موزوں ٹکنالوجی کے استعمال کے بارے میں تحقیقی جائزے مرتب کر رہی ہے، سرکاری محکموں، پبلک سیکٹر کے اداروں اور عوام کو موزوں ٹکنالوجی منتقل کر رہی ہے اور مشینری، آلات، ساز و سامان، فاضل حصوں پرزوں کی تیاری کے لیے نجی، کوآپریٹو اور پبلک سیکٹر اداروں کی رہنمائی کر رہی ہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف رورل مینجمنٹ

گجرات کے کیرہ ضلع میں آنند میں واقع انسٹی ٹیوٹ آف رورل مینجمنٹ ۱۹۷۹ء میں حکومتِ ہند کی سرگرم حمایت سے قائم کیا گیا تھا۔ یہ ہندوستان میں نوجوان گریجویٹوں کو دیہی بندوبست کی پیشہ ورانہ تعلیم دینے والا پہلا ادارہ ہے۔ اس کا قیام اس اعتقاد کے ساتھ عمل میں لایا گیا ہے کہ ہمہ جہت اور مسلسل ترقی کے لیے پیداوار کنندگان کی تنظیموں کے واسطے خصوصی تربیت پائے ہوئے مینیجروں کی ضرورت ہے۔ یہ ادارہ مینجمنٹ کی تعلیم تربیت کے ذریعے موزوں تربیت یافتہ مینیجر تیار کرتا ہے۔ یہ تحقیق کا کام بھی کرتا ہے اور مشاورتی خدمات فراہم کرتا ہے۔

زراعت اور دیہی ترقی کا قومی بینک

زراعت اور دیہی ترقی کا قومی بینک، بینکوں، ریاستی حکومتوں اور متعلقہ اداروں کے کارکنان کو تربیتی سہولیات فراہم کرنے کو اعلیٰ ترجیح دیتا ہے تاکہ انسانی وسائل اور اداروں کی صلاحیتوں کو بہتر بنایا جا سکے۔

تربیتی پروگراموں کا اہتمام بینکرز انسٹی ٹیوٹ فار رورل ڈیولپمنٹ (جو لکھنؤ میں ستمبر ۱۹۸۳ء میں قائم کیا گیا تھا)، کالج آف اگریکلچرل بینکس اور ریزرو بینک آف انڈیا پونے میں کیا جاتا ہے۔

زراعت اور دیہی ترقی کا قومی بینک، جو ستمبر ۱۹۶۹ء میں قائم کیا گیا تھا، اب تک ۴۷۱۲۲ افراد کو تربیت دے چکا ہے۔ یہ ۵۸ باقاعدہ تربیتی پروگرام پروگرام چلا رہا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں دیہی ترقی کے لیے عملہ کو تربیت دینے کے لیے متعدد تربیتی ادارے موجود ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دیہات کے لیے موزوں ترین مہارتوں کی تربیت دینے کے کام میں تال میل پیدا کیا جائے۔ حکومت اور متعلقہ اداروں کو گاؤں کی سطح کے دیہی مینیجروں کو تربیت دینے کے لیے مربوط کوششیں کرنی چاہئیں۔ یہ دیہی مینیجر بے غرض اور مصمم قیادت فراہم کر کے دیہات کے سماجی و معاشی حالات کی کایا پلٹ سکتے ہیں۔

●

بقیہ اداریہ

نہ چھت ٹھیک ہے، نہ شیڈ ٹھیک طرح بنا ہوا ہے، بس ان کی حالت جانوروں سے بھی بدتر ہے۔

۱۹۷۳ء میں امور محنت کی عالمی تنظیم نے کام کرنے کے لیے کم سے کم عمر ۱۵ برس تجویز کی تھی۔ گذشتہ دس بارہ برسوں میں اس تنظیم کے ۱۵۰ ممبر ممالک میں سے صرف ۲۷ ملکوں نے اس کنونشن کی توثیق کی ہے۔ اس طرح یہ بیماری اور برائی عالمی سطح پر پائی جاتی ہے۔ ہندوستان میں تمل ناڈو کے قصبہ سیواکاسی میں یہ برائی عام ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق یہاں کم سے کم ۴۵ ہزار بچے ماچس بنانے اور آتش بازی اور متعلقہ کاموں میں مصروف ہیں۔ ۴ سال سے سات سال کے بچوں کو ۲ روپے یومیہ اجرت ملتی ہے۔ بڑوں کو سات روپے یومیہ۔ بچوں کو کام پر لگانے میں ایک فائدہ تو کام کرانے والوں کو یہ نظر آتا ہے کہ وہ کم داموں پر مل جاتے ہیں، دوسرے یہ کہ اُن سے کام بھی جس قدر چاہے لے لیا جائے تو وہ شکایت نہیں کرتے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس برائی کا پوری طرح خاتمہ بہت مشکل نظر آتا ہے، البتہ بچوں کے لیے اگر تعلیم لازمی کی جائے اور اس پر سختی سے عمل درآمد ہو سکے تو یہ برائی کسی حد تک کم ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں رضاکار اداروں کا رول بیحد اہم ہے۔ ان میں یہ شعور پیدا کرانا ضروری ہے کہ تعلیم کے ذریعے ہی وہ اپنے مستقبل کو تابناک بنا سکتے ہیں، انھیں یہ سمجھانا ہوگا کہ وہ چند روپوں کے فوری لالچ کو ترک کریں اور مستقبل کو روشن کرنے کے لیے تعلیم پر توجہ دیں۔

●

(اسسٹنٹ ایڈیٹر)

ایم. پرساد

دیہات میں بجلی کی فراہمی کا پروگرام

بجلی کو اب دیہی علاقوں میں سماجی اقتصادی تبدیلی کے ایک بڑے ذریعہ کی صورت میں عالمگیر طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ بھارت کی زرعی معیشت کے فروغ کے لیے ایک کلیدی بنیادی ڈھانچے کا کام دیتی ہے۔ ایک اہم قوتِ محرکہ کے طور پر اس نے دیہات کو زیادہ قابلِ رہائش اور دیہی پیشوں کو زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ زمینی پانی کے وسائل کا زیادہ سے زیادہ استفادہ کرتے ہوئے پیداوار اور زمین کی پیداواری قوت میں اضافہ کرنے کے علاوہ بجلی نے دیہات کو متعدد فائدے پہنچائے ہیں اور بہتر قسم کی زندگی کے لیے راستہ ہموار کیا ہے۔

دیہات کو بجلی کی فراہمی کا کام پچاس کی دہائی سے اب بہت دُور آ چکا ہے جب اسے ایک منصوبہ بند پروگرام کے طور پر شروع کیا گیا تھا۔ حالیہ برسوں میں اس سلسلے میں حیرت انگیز پیش قدمی ہوئی ہے۔ گو اس اہم شعبے میں جو بڑی بڑی پیش قدمیاں ہوئی ہیں اُن سے عام لوگ آگاہ ہیں تاہم یہ کوئی نہیں جانتا کہ اس نے زرعی سیکٹر کو وہ قوت عطا کی ہے جس سے وہ خشک سالی جیسی پس رویوں کا مقابلہ کرسکتا ہے جو بھارت میں اکثر رونما ہوتی ہیں۔

دراصل یہ ۶۷-۱۹۶۵ء کا خشک سالی کا دَور تھا جب منصوبہ سازوں نے دیہات میں بجلی پہنچانے کو اعلیٰ اولیت دی تاکہ آبپاشی کے پمپ سیٹوں کو توانائی بہم پہنچا کر زرعی پیداوار کو بڑھایا جائے۔ اس کام پر جو زور دیا جا رہا ہے اُس کا اظہار پلان کے اخراجات میں بھاری اضافے سے ہوتا ہے جو پہلے پانچسالہ پلان میں ۸ کروڑ روپے سے بڑھ کر چوتھے پانچسالہ پلان میں ۸' ارب روپے ہو گیا۔ ساتویں پانچ سالہ پلان (۹۰-۱۹۸۵) کے لیے اخراجات ۲۱ ارب ۸ کروڑ روپے ہیں۔ بڑھتی ہوئی سرمایہ کاری سے بھارت کے ۵ لاکھ دیہات کے تقریباً ۶۵ فیصد میں بجلی پہنچانا ممکن ہو گیا ہے۔ جس سے ۷۷ فیصد سے زیادہ دیہی آبادی مستفید ہو رہی ہے۔ آج بجلی سے چلنے والے کوئی ۵۹ لاکھ پمپ سیٹ زمین سے پانی نکال رہے ہیں جس سے مزید لکھوکھا ایکڑ زمین سیراب ہو رہی ہے۔

آج مربوط دیہی ترقی و بہبود پر جو زور دیا جا رہا ہے اُس کے پیشِ نظر دیہات کو بجلی کی فراہمی کے پروگرام نے دیہی صنعتوں کے تیز رفتار فروغ اور دیہات میں روزگار کے مواقع کی تخلیق پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ اور اس کے علاوہ پینے کے لائق پانی جیسی ابتدائی سہولیات بھی فراہم کی ہیں۔

اس سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو بھارت میں دیہات کو بجلی کی فراہمی کے پروگرام سے اب تک جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ کسی بھی طرح غیر اہم نہیں۔ اس کا طریقِ کار، رفتار اور ترقی کسی بھی ترقی پذیر ملک کے لیے باعثِ فخر ہو سکتی ہے۔ ایک نیا زرعی تکنیکی اور صنعتی کلچر رفتہ رفتہ دیہات میں سرایت کر رہا ہے جس کے نتیجے میں گوناگوں اور زیادہ منافع بخش اقتصادی سرگرمیاں عمل میں آ رہی ہیں۔

گذشتہ برسوں میں ملک میں دیہات

کو بجلی کی فراہمی کے پروگرام کے اثر کا جائزہ لینے کے لیے متعدد سائنسی مطالعات کئے گئے ہیں۔ ان مطالعات کے نتائج کی بناء پر اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس پروگرام کی بدولت آبپاشی کئے جانے والے رقبوں میں ۵۰ لاکھ سے زیادہ ہیکٹیر کا اضافہ ہوا ہے اور اناج کی پیداوار ۲ کروڑ ۷۰ لاکھ ٹن سے زیادہ بڑھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک ارب ۷۰ کروڑ سے زیادہ انسانی دِنوں کا مستقل روزگار پیدا ہوا ہے۔ زراعت اور صنعت کے شعبوں میں ٹھوس فوائد کے علاوہ دیہاتیوں کے طرزِ زندگی میں گرانقدر بہتری ہوئی ہے اور کمر توڑ مشقت میں کمی ہوئی ہے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ بات ہوئی ہے کہ اُن کے سماجی عمل، ذہنی جھکاؤ اور ثقافتی رجحانات میں مفید تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔

بھارتی دیہات کی اس خاموش کایا پلٹ کی پُشت پر ملک کا رورل الیکٹری فیکیشن کارپوریشن (آر ای سی) ہے جس نے دیہی ترقی کے اس وسیع کام میں غیر معمولی رول ادا کیا ہے۔ یہ کارپوریشن گُل ہند رُورل کریڈٹ ریویو کمیٹی کی سفارش پر قائم کیا گیا تھا جس کا قیام ریزرو بنک آف انڈیا کی طرف سے کیا گیا تھا۔ مقصد تھا منصوبہ بند اور سائنسی طریقے سے دیہات کو برقیانے کے پروگرام کو فروغ دینا اور اُس کے لیے سرمایہ فراہم کرنا۔ آر ای سی نے چیلنج قبول کیا اور اُسکے منشور کے مطابق دیہات کو بجلی کی فراہمی کا پروگرام ہمہ جہت ترقی کے لیے اہم سماجی۔ اقتصادی ترقی کے طور پر تیار کیا اور پسماندہ علاقوں پر زور دیا گیا تاکہ مقابلتاً تیز تر ترقی میں اُن کی مدد کی جا سکے۔ ایک بڑا فیصلہ جو کیا گیا وہ تھا برقیانے کی اسکیموں سے متعلق پراجیکٹ کا دستور کار، تاکہ مربوط شعبوں کی ترقی کو بڑھاوا دینے کے لیے دوسرے ترقیاتی پروگراموں کے ساتھ اسے ملا دیا جائے۔ کارپوریشن نے اس امر کا یقین دلانے کے لیے پالیسیاں اور ضابطے وضع کئے ہیں کہ اسکیمیں اقتصادی پائیداری اور ٹھوس تکنیکوں کے مطابق موزوں طور پر مرتب کی جاتی ہے۔

اس تمام تر عرصے میں "آر ای سی" ترقی کی مختلف سطحوں والے نیز مختلف سماجی اور ماحولیاتی حالات والے علاقوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اور مختلف سماجی اور اقتصادی مقاصد کے لیے قرضہ جاتی اسکیموں کے نئے زُمرے معیّن کر رہا ہے۔ حتیٰ کہ ایسے چھوٹے علاقوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا جہاں فوری پیداوار کا امکان ہے۔ صحت اور افزائش کے مرکزوں کو فروغ دینے کے لیے خاص احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ سماج کے کمزور طبقوں اور خصوصاً ہریجنوں اور قبائل کی جانب خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

"آر ای سی" ان مانگوں کو پورا کرنے کے لیے فراخدلی سے مالی امداد دے رہا ہے۔ اس کی طرف سے پہلے ہی ملک کے طول و عرض میں ۱۰ ہزار سے زیادہ پراجیکٹوں کے لیے ۳۰ ارب ۹۴ کروڑ روپے کی منظوری دی جا چکی ہے۔ ان پراجیکٹوں کے مکمل ہونے پر ۲ لاکھ ۹۸ ہزار نئے دیہات میں بجلی پہونچ جائے گی اور ۳۰ لاکھ سے زیادہ پمپ سیٹ برقی قوّت حاصل کریں گے۔ ان کے علاوہ ہزاروں چھوٹے پیمانے کی زراعت پر مبنی صنعتوں اور لکھوکھا اسٹریٹ لائٹوں اور گھریلو اور تجارتی کنکشنوں کا بھی پلان بنایا گیا ہے۔

"آر ای سی" کے سرمایہ سے چلنے والے پراجیکٹوں کے تحت سال بہ سال حوصلہ افزا ترقی ہو رہی ہے۔ ان پراجیکٹوں کے تحت ایک لاکھ ۸۰ ہزار دیہات میں بجلی پہنچائی گئی ہے اور ۲۰ لاکھ پمپ سیٹ چلائے گئے ہیں۔ آج ۴۸ فیصد نئے پمپ سیٹوں کو بجلی دی جا رہی ہے اور ہر برس ۷۰ فیصد نئے دیہات میں بجلی پہنچائی جا رہی ہے۔

کوآپریٹو ادارے

"آر ای سی" کی طرف سے اُس کے منشور کے مطابق مختلف ریاستوں میں دیہی برقی کوآپریٹو اداروں کو تیزی کے ساتھ فروغ اور سرمایہ دیا جا رہا ہے۔ اب تک تمام ملک میں ۴۷ کوآپریٹو ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ یہ کوآپریٹو ادارے دیہی علاقوں میں برقی قوّت کی تقسیم کے لیے غیر مرکوز اداروں کے طور پر کام کر رہے ہیں اور اپنے ممبروں کی سرگرم شرکت کے باعث انھوں نے دیہات کو بجلی کی فراہمی کے کام میں گہری چھاپ چھوڑی ہے۔ یہ کوآپریٹو ادارے چونکہ مقامی، غیر مرکوز اور جمہوری یونٹ ہیں اس لیے وہ صارفین کی ضروریات اور مفادات کو پورا کرنے اور بجلی کی زیادہ پیداواری افادیت کو یقینی بنانے میں موزوں ثابت ہوئے ہیں۔

دیہات کو بجلی کی فراہمی کے پروگرام کی تعمیل میں زیادہ سے زیادہ کفایت شعاری اور مُستعدی لانے کے لیے سازوسامان اور مال مسالوں کی معیار بندی اور تعمیراتی سرگرمیاں بھی عمل میں لائی گئی ہیں۔ اس پروگرام کے متعدد پہلوؤں میں کافی علم و مہارت حاصل کرنے کے بعد کارپوریشن نے اپنی سرگرمیوں کی توسیع کرتے ہوئے ملک کے اندر اور سمندر پار ممالک میں پیشہ ورانہ مشاورت فراہم کرنا شروع کر دی ہے۔ الجزائر کی بجلی اور گیس تقسیم کرنے والی قومی ایجنسی (SONELGAZ) کے ساتھ تکنیکی امداد کا ایک معاہدہ ہوا تھا جس کے تحت "آر ای سی" انجینیروں نے دیہات کو بجلی کی فراہمی کے پراجیکٹوں کی منصوبہ بندی اور تعمیل میں

امدادی : "آر ای سی" انجینئروں نے مصر کے لیے دو علاقوں میں دیہات کو بجلی کی فراہمی کے پراجیکٹوں کی تشکیل کی جن کے لیے بھارت کا ساز و سامان اور مال مسالہ فراہم کیا گیا۔ متحدہ عرب امارات میں بھی ۸۵ - ۱۹۸۴ء میں ایک بڑے پراجیکٹ کی تکمیل کی گئی۔

تربیت :-

کارپوریشن نے دیہات کو بجلی کی فراہمی کے پروگراموں میں لگے ہوئے انجینئروں کے لیے باقاعدہ تربیتی نصاب جاری کئے ہیں۔ دیہات کو بجلی کی فراہمی سے متعلق اس کا مرکزی ادارہ جو حیدر آباد دکن میں واقع ہے عالمی بنک جیسے اداروں کی امداد کے ساتھ اپنے دائرہ کار کو توسیع دے کر اور سہولیات پا کر بین الاقوامی شہرت حاصل کر رہا ہے اس کی طرف سے پہلے ہی دوسرے ترقی پذیر ممالک کے انجینئروں کے لیے تربیتی نصاب جاری کا ہے اور اب یہ ایک ایسے مرکز کی صورت اختیار کر رہا ہے جس میں بھارت ترقی پذیر وابستہ ممالک کو اپنے تجربات اور مہارت میں شریک کرے گا۔

توانائی کے متبادل وسائل

پہاڑی، قبائلی اور صحرائی علاقوں میں دور افتادہ اور دشوار گذار دیہات میں بجلی کی فراہمی کے پروگرام نے بعض مسائل پیدا کر دئے ہیں۔ یہ برقی یونٹ کی بھاری پیداواری لاگت اور ترسیل بار برداری اخراجات سب سے زیادہ خصوصاً ابتدائی برسوں میں دیہات کو بجلی کی فراہمی کے پروگراموں کے غیر منافع بخش ہونے سے تعلق رکھتے ہیں اندازہ کیا گیا ہے کہ ایسے کوئی ۱۰ ہزار دیہات ہیں جو دور افتادہ علاقوں میں واقع ہیں جہاں برقی گرڈ سسٹم سے بجلی پہنچانا تکنیکی اور اقتصادی طور پر ممکن نہیں ہے اور جنھیں توانائی کے غیر مروجہ وسائل سے بجلی فراہم کی جا سکتی ہے۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کارپوریشن ان علاقوں میں "بائیوماس"۔ "بائیو گیس"، شمسی اور ہوائی توانائی کو فروغ دے رہی ہے اور وہاں بجلی پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے۔

بھارت میں ابھی تک ۲ لاکھ سے زیادہ دیہات ایسے ہیں جہاں بجلی پہنچائی جانی ہے۔ پمپ سیٹوں کو بجلی سے چلانے کے کام کی بھی بڑی گنجائش ہے کیوں کہ اب تک دستیاب زمینی پانی کے امکان کے محض ۵۰ فیصد حصے کا استفادہ کیا گیا ہے۔ آئندہ تجاویز میں موجودہ دہائی کے آخیر تک سارے ملک کو بجلی فراہم کی جائیگی اس پروگرام کی اہمیت کا پورے طور پر احساس کر لیا گیا ہے۔ یہ اقتصادی سرگرمیوں کے تمام تر سلسلے کا ایک سیکٹر ہے جو وقت پا کر کسی دوسری واحد اقتصادی سرگرمی کی نسبت زیادہ شعبوں میں زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ ●

بقیہ، جنت نشاں ہو زندگی

ہونا چاہیئے بلکہ "سلو پائزن" دے کر یا کسی اور طریقے سے مار ڈالنا چاہیئے ...

یہ کچھ اشارے تھے جو آج کے نام نہاد (ترقی یافتہ) انسان کے انتہائی افسوسناک طرز عمل کی طرف کئے گئے۔

اس طرح کے 'بیمار طرز فکر' یا بھونڈے اور بڑی حد تک بربریت بھرے طرز عمل کے خلاف آواز بلند کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اور ضرورت ہے ایک ٹھوس و مؤثر منصوبے کی۔ ایک ایسے منصوبے کو ترتیب دیا جانا چاہیئے جو خوشحال اور حسین ترین ضابطۂ حیات کا متقاضی ہو۔

اسباب و علل پر غور کیا جائے سنجیدگی سے، تو سب سے بڑا سبب نظر آئے گا — انتہائی تیز رفتاری سے بڑھنے والی آبادی!

خود ہم اپنے ملک ہندوستان کی مثال دیکھیں، صورت حال پر ایک نظر ڈالیں تو ایک خطرناک ترین نتیجے کا انکشاف ہوتا ہے — ۱۹۰۱ء میں ہندوستان کی آبادی تھی ۲۳ کروڑ ۸۳ لاکھ، ۹۶ ہزار، ۳۲۰، لیکن ۸۰ سال بعد ہی ۱۹۸۱ میں یہ ہو گئی ۶۸ کروڑ، ۳۸ لاکھ، ۱۰ ہزار، ۵۱۔

اصل مسئلہ یہی ہے۔ توجہ ہر حال میں اس سمت مرکوز و مبذول کی جانی چاہیئے۔ حکومت ہند نے خاندانی بہبود کے پروگرام کو اپنی منصوبہ بند ترقی میں کافی اولیت دی ہے۔

یہ قطعی نا انصافی ہے بلکہ ظلم و جہالت ہے کہ ہم بچے تو جیٹ کی رفتار سے پیدا کرتے چلے جائیں لیکن ان کی نشو و نما، پرورش و پرداخت فلاح و بہبود کی راہ میں ہماری رفتار، بیل گاڑی کی رفتار سے بھی مدھم ہو۔!

جہاں ہمارے ملک کی حکومت کا یہ فرض ہے کہ کئی اہم منصوبہ بندیوں کی طرح "بہبودیٔ اطفال" سے متعلق منصوبہ بندی کو بھی ایک ٹھوس اور صحت مند شکل میں، مستحکم و منظم روپ میں تشکیل دے، وہاں ہمارے ملک کے عوام بھی یہ اولین فریضہ ہے کہ حکومت سے بھرپور تعاون کریں نیز اپنے طور پر بھی بچوں کی بہتری کے لیے ہر ممکن طریقے اپنائیں، ہر ممکن کوشش کریں۔ ایک ایسا لائحہ عمل اپنائیں جس سے ہمارے بچے، ہماری قوم کی امانت، قوم کے سنہرے مستقبل کے ضامن نونہال کسی بھی طرح نظر انداز نہ کئے جا سکیں۔ ●

ہرش اروڑہ

آندھرا پردیش کی ہینڈلوم صنعت

ہینڈلوم صنعت ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ اپنے شاندار اور رنگین پارچہ جات کے لیے دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہ اپنی جسامت اور روزگار کے مواقع کے لحاظ سے زراعت کے بعد دوسرا مقام رکھتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق کوئی ایک کروڑ افراد براہِ راست اس صنعت میں کام کر رہے ہیں اور تقریباً اتنے ہی افراد بالواسطہ طور پر کھڈی کے چلنے سے پہلے اور کھڈی کے چلنے کے بعد کی سرگرمیوں سے وابستہ ہیں۔ اس صنعت کو ایک طرف سُوت کی نت بڑھتی ہوئی قیمتوں اور دیگر استعمال ہونے والی اشیاء سے اور دوسری طرف مِلوں کے بنے کپڑے سے سخت مقابلے کا شدید خطرہ رہتا ہے۔ گوداموں میں جو مال کے انبار جمع ہوتے جا رہے ہیں وہ صنعت کی خوشحالی میں سدِراہ بنے ہوئے ہیں۔ اس صنعت پر نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ ہینڈلوم ملک کی اقتصادی زندگی میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یہ کہنا نادرست نہیں ہے کہ بمشکل کوئی اہم قصبہ یا گاؤں ہوگا جہاں اُس کے اپنے ہی ہینڈلوم کاریگر نہ ہوں۔

ایک اندازے کے مطابق ملک میں کپڑے کی برآمد میں ۱۰ برس کے عرصے میں (۱۹۶۸-۶۹ سے ۱۹۷۸-۷۹ کے عرصے کے دوران) ۲۰ گنا اضافہ ہوا ہے۔ اتنی اہم پوزیشن رکھنے کے باوجود صنعت کو متعدد مسائل کا سامنا ہے۔ پیداواری صلاحیت کے معاملے میں صنعت بہت پچھڑی ہوئی ہے جس کے نتیجے میں پیداواری لاگت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ مارکیٹنگ کی ناکافی سہولیات اس کی ترقی میں بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے کیونکہ پیداوار کا معمولی حصّہ منظّم اداروں اور ذرائع سے فروخت ہوتا ہے اور زیادہ تر بُنکروں کو اپنی مصنوعات کی فروختگی کے لیے مجبوراً پرائیویٹ ذرائع پر انحصار رکھنا پڑتا ہے۔ چونکہ بچولیے زیادہ تر منافع ہڑپ کر جاتے ہیں۔ اس لیے اس کے نتیجے میں بُنکروں کی بڑی تعداد اس روایاتی پیشے میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہی لیکن وہ اپنی موجودہ سرگرمیوں کو اس لیے جاری رکھے ہوئے ہے، کیوں کہ اُن کے پاس روزگار کا کوئی دوسرا وسیلہ نہیں ہے۔ ملک مِلوں کے ساتھ مقابلے میں اس صنعت کو پچھڑنے اور بے رحمی سے اور دم توڑنے کی اجازت نہیں دیگا کیوں کہ اس سے دیہات میں بیروزگاری کا اضافہ ہوگا۔ پس روایاتی بنکروں کے لیے پورے روزگار کا اہتمام اقتصادی ضرورت سے زیادہ ایک سماجی ذمہ داری ثابت ہو رہا ہے۔

اس پس منظر میں حسبِ ذیل مقاصد کے ساتھ موجودہ مطالعہ کیا گیا ہے۔

۱۔ ہینڈلوم بُنکروں کے سماجی، اقتصادی حالات کا مطالعہ۔

۲۔ اس امر کا مطالعہ کرنا کہ پیداوار/مارکیٹنگ کے لیے بُنکروں کو کس حد تک (دوسروں پر) انحصار رکھنا پڑتا ہے۔

وقت اور مالی وسائل کی کمی کے باعث ہم نے ضلع پرکاشم کے پانچ مرکزوں، چیرالہ پیرالہ، ایپورو پلیم، ویٹاپلیم اور اموداگری پلیم کا سروے کیا۔ ان مرکزوں کا انتخاب اس لیے کیا گیا کیونکہ کئی دہائیوں سے صنعت ضلع پرکاشم کے ان علاقوں میں جمع ہوئی ہے۔

تعلیم، آمدنی اور اخراجات

کسی بھی صنعت کے مستقبل اور خوشحالی کا انحصار اس امر پر ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ کس حد تک اس میں شریک ہیں۔ بُنکروں کے ساتھ بات چیت کرنے سے معلوم ہوا کہ بُنکروں کے بچے آبائی پیشے

کو رضا مندی سے نہیں بلکہ مجبوری سے اختیار کرتے ہیں۔ افلاس کے باعث وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرتے اور اُن کی تعلیم زیادہ تر پرائمری سطح تک ہی محدود رہتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اُن کے رُجحان کو بدلنے کے لیے انھیں تکنیکی تعلیم دی جائے اور ابتدائی قدم کے طور پر کچھ سرمایہ دیا جائے تاکہ وہ روایتی پیشے کے بجائے کوئی دوسری تجارت شروع کر سکیں۔

سروے سے یہ بھی انکشاف ہوا کہ بُنکروں کی آمدنی میں بڑا فرق ہے۔ اُن میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی آمدنی ۱۲۰ روپے ماہوار ہے اور ایسے بھی ہیں جو مہینے میں ۹۵۰ روپے کماتے ہیں اور اُن کی اوسط ماہوار آمدنی ۴۴۰ روپے کے قریب ہے۔

اس مطالعہ سے یہ انکشاف بھی ہوا کہ تین کنبے اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ مہینے میں خوراک پر ۱۰۰ روپے سے زیادہ خرچ کر سکیں تاہم اُن میں سے تقریباً ۴۰ فیصد خوراک پر مہینے میں ۱۰۰ روپے سے ۳۰۰ روپے تک خرچ کر رہے تھے۔ یہ جاننا باعث دلچسپی ہوگا کہ جن لوگوں سے سوال کیا گیا تھا اُن میں صرف ۴ کنبے ۲۰ روپے سے ۵۰ روپے ماہوار کرایہ کے مکانوں میں رہ رہے تھے، بلا شُبہ زیادہ بُنکر اپنے نجی مکانوں میں سکونت پذیر تھے جن میں سے بیشتر اینٹوں کے ساتھ ساتھ گھاس پھوس سے بنے ہوئے تھے۔ یہ مکانات جدید تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہینڈلوم کی موجودہ داستان المناک ہوتی۔ کوئی ۷۰ کنبے ذاتی اشیا جیسے سگریٹوں، سگاروں اور شراب وغیرہ پر بھی روپیہ خرچ کر رہے تھے۔

تنظیمی ڈھانچہ

تنظیمی ڈھانچے کا جائزہ لینے سے انکشاف ہوا کہ چیدہ مرکزوں میں ۹۴ فیصد لوگ تجارتی یونٹوں کے واحد مالک تھے جب کہ باقیماندہ ۱۴ فیصد ادارے مشترکہ کنبوں کے یونٹ تھے ۱۳۸ کنبے جو ۹۴ فیصد کی نمائندگی کر رہے تھے "ماسٹر ویوروں" پر انحصار کرتے ہیں جو خام مال فراہم کرتے ہیں، ڈیزائن مہیا کرتے ہیں جن پر کام کیا جاتا ہے۔ اور ایسی شرائط پیش کرتے ہیں جن پر انفرادی بُنکروں کو عمل کرنا چاہیئے جن کی اپنی رائے کوئی نہیں ہوتی۔ صرف ۸۴ یونٹ ہینڈلوم کوآپریٹو اداروں کے لیے کام کر رہے ہیں جبکہ ۱۴ کنبے آزادانہ طور پر کام کر رہے ہیں۔

آزادانہ کاروبار کرنے والے بُنکروں میں سے بیشتر نے انکشاف کیا ہے کہ انھوں نے کاروبار کے اس طریقے کو اس لیے اختیار کیا ہے تاکہ وہ بچولیوں کے بغیر تمام منافع خود حاصل کر سکیں۔ نہ ہی وہ خرید کے وقت اور نہ ہی تیار مال کی فروختگی کے وقت بچولیوں کو کچھ دیں۔ ۱۳۸ کنبوں میں سے جو "ماسٹر ویور" کے لیے کام کرتے ہیں ۵۲ نے بتایا کہ وہ قرضہ میں ڈوبے ہونے کے باعث "ماسٹر ویوروں" کے لیے کام کرتے ہیں۔ جو ۸۴ کنبے کوآپریٹو اداروں کے لیے کام کر رہے ہیں اُن میں سے ۴۶ نے انکشاف کیا کہ اچھی اُجرتیں اور متواتر روزگار ملنے کے باعث وہ کوآپریٹو اداروں کے لیے کام کر رہے ہیں۔

کسی بھی تجارتی ادارے کو اپنا کاروبار چلانے کے لیے سرمایہ کی بنیادی ضرورت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ قرضے طویل مُدتی اخراجات اور پیشگیاں چالو اخراجات پورے کرنے کے لیے دی جاتی ہیں۔ بد قسمتی سے تمام بُنکر پیداواری مقاصد کے لیے نہیں بلکہ گھریلو ضروریات پوری کرنے کے لیے قرضوں کا استعمال کر رہے ہیں۔ اُجرتیں اتنی زیادہ نہیں ہیں جن سے وہ خوراک، کپڑے اور مکانوں سے متعلق اپنی کم از کم ضروریات کو پورا کر سکیں۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں انھیں لازماً کسی بھی قیمت پر بیرونی وسائل سے قرضہ لینا ہوتا ہے وہ مہاجنوں کا بھی شکار بن جاتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرضے اور پیشگیاں دینے کے باوجود بُنائی کی سرگرمیوں میں کوئی ترقی عمل میں نہیں آ رہی۔

ہینڈلوم کی بکری پر دی جانے والی کٹوتی کے بارے میں انھوں نے کہا کہ اگر کٹوتی کے بجائے مال تیار کرنے والے کو مالی امداد دی جائے تو اس سے پیداواری لاگت میں کمی ہو سکتی ہے اور منڈی میں بہتری آ سکتی ہے۔

لہٰذا اُن بُنکروں کے مفادات کا تحفظ نہایت ضروری ہے جو بچولیوں کے لیے کام کر رہے ہیں۔ بُنکروں کے لیے کم از کم اُجرتوں کا سختی سے نفاذ کیا جانا ضروری ہے۔ پرائیویٹ اور کوآپریٹو سیکٹروں میں پراویڈنٹ فنڈ جیسی کوئی اسکیم کی جانی چاہیئے اور اگر ضروری ہو تو اس مقصد کے لیے قانون بھی بنایا جانا چاہیئے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ "ماسٹر ویور" کے لوٹ کھسوٹ کے ہتھکنڈوں کو ختم کرے۔ اس کے علاوہ حکومت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بُنکروں کے کوآپریٹو اداروں کو مالی اور انتظامی طور پر تقویت دے

مضمون نگار حضرات سے درخواست

براہِ کرم مضمون صفحہ کے ایک جانب خوشخط لکھیں، سطروں کے درمیان کافی فاصلہ دیں۔

کٹے پھٹے اور غیر صاف شدہ مضامین مسترد کر دیے جاتے ہیں، ان کی اطلاع دینا ادارے کی ذمہ داری نہیں ہے۔

- ایڈیٹر -

راجیو کمار

قومی ترقّی کے سنگِ میل

قسط : (۳)

پانی کا بہتر بندوبست

ساتویں پنجسالہ منصوبے میں زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے آبپاشی کے واسطے پانی کی بہتر بہم رسانی پر اور زیادہ زور دیا جائے گا۔ زمین کے کٹاؤ کو، جس کے سبب زرخیز مٹی بہہ جاتی ہے اور زمین کی زرخیزی بتدریج کم ہوتی جاتی ہے، روکنے کے لیے زرخیز مٹی کے تحفظ اور پانی کے ذخیرے بنانے پر بھی خصوصی توجہ دی جائے گی تاکہ زمین کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کیا جا سکے۔ اس کے لیے چھٹے منصوبے کے دوران مکمل کی گئی تعمیرات کی مناسب دیکھ بھال پر بھی زور دیا جائے گا۔

چھٹے منصوبے کے دوران تقریباً ساٹھ لاکھ ہیکٹیئر اراضی پر پانی کی فراہمی اور زرخیز مٹی کے تحفظ کے اقدامات کیے گئے، چنانچہ چھٹے منصوبے کے آخر تک کل ۴۹ء۲۹ ملین ہیکٹیئر اراضی ان اقدامات کے تحت لائی جا چکی تھی۔ جن دریاؤں میں اکثر باڑھ آیا کرتی ہے ان کے طاس کے علاقوں میں واٹر شیڈوں کے مربوط بندوبست کے لیے مرکز کی سرپرستی میں ایک اسکیم چلائی جا رہی ہے جس کے تحت گنگا کے طاس کے علاقے میں آٹھ مقامات پر ۲۰۰ واٹر شیڈ بنائے جا چکے ہیں۔ ساتویں منصوبے کے دوران اس اسکیم کو نہ صرف جاری رکھا جائے گا بلکہ بڑھایا بھی جائے گا۔ پانی کے بہتر بندوبست کے لیے لنک نہریں بنائی جائیں گی اور پروگرام اس طرح روبہ عمل لایا جائے گا کہ آبپاشی، انجنیئر، زرعی سائنس داں اور آبپاشی پر مبنی زراعت میں مصروف لوگوں کی سرگرمیوں میں مناسب تال میل پیدا کیا جا سکے۔ اس کے نتیجے میں پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔

پانی کے بندوبست میں کسانوں کا تعاون

ملک میں پانی کے سائنٹفک بندوبست میں کسانوں کو بھی شامل کیا جائے گا۔ آبی وسائل کی وزارت نے ایک منصوبہ شروع کیا ہے جس کے تحت آبپاشی کے پانی کی تقسیم اور کھیتوں میں پانی پہنچانے والی نالیوں کی دیکھ بھال کے لیے کاشتکاروں کی ایسوسی ایشنیں بنانے کی تجویز ہے۔ اس سے آبپاشی کے لیے پیدا کی گئی کل صلاحیت کا پورا پورا استعمال ہو سکے گا اور آبپاشی کی سہولتوں کا کسانوں تک پہنچنا یقینی ہو جائے گا۔

ریاستی حکومتوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی اپنی ریاست میں تجرباتی بنیاد پر ہر کمانڈ ایریا ڈویلپمنٹ پراجیکٹ میں ایک تجرباتی اسکیم شروع کریں۔ اس اسکیم کے تحت کاشتکاروں کو کمیٹیوں میں منظم کیا جائے گا اور یہ کمیٹیاں آگے چل کر چھوٹی چھوٹی ایسوسی ایشنیں تیار کریں گی۔ پانی کی مقدار کی بنیاد پر ان کمیٹیوں اور چھوٹی چھوٹی ایسوسی ایشنوں کو فروخت کیا جائے گا۔ پانی کی منصفانہ تقسیم کو یقینی بنانے کے لیے کمیٹیاں اپنے ممبروں کو رقبے کی بجائے مقدار کے حساب سے پانی تقسیم کریں گی۔ ابتدائی سرمایہ اور انتظامیہ امداد مرکزی اور ریاستی حکومتیں فراہم کریں گی۔

اس قسم کی ایسوسی ایشنیں قائم کرنے کے لیے قانونی گنجائش مہاراشٹر اور آندھرا پردیش کی ریاستوں میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ جن ریاستوں میں آب پاشی سے متعلق قوانین میں اس بات کا اہتمام نہیں ہے وہاں قانون میں مناسب ترمیم کی جا سکتی ہے۔

اس وقت پانی کی تقسیم استفادہ کنندگان سے پوری طرح مشورہ کئے بغیر کی جاتی ہے یہ محسوس کیا گیا ہے کہ کمانڈ ایریا ڈویلپمنٹ پروگرام میں کسانوں کے پوری طرح شریک نہ ہونے کی وجہ سے پیدا شدہ صلاحیت کا پورا استعمال نہیں ہو پاتا۔

اس اسکیم کا مقصد کسانوں کے اندر پروگرام میں شراکت کا قوی تر جذبہ پیدا کرنا، پانی کے نظام تقسیم کو برقرار رکھنا اور پانی کے داموں کی بروقت ادائیگی کو یقینی بنانا ہے۔ اس سے پانی کے بندوبست کا نظام بہتر ہوگا اور پیدا شدہ صلاحیت کا بھرپور استعمال ہو سکے گا۔

ساتویں منصوبے کی لیبر پالیسی

ساتویں منصوبے میں افرادی قوت کی منصوبہ بندی اور لیبر پالیسی پر عمل درآمد کے لیے کل ۳۳۴ کروڑ روپے مخصوص کئے گئے ہیں۔ اس میں سے ۹۴ر۴۴ کروڑ روپے مرکز کے تحت، ۲۱۹ر۷۵ کروڑ روپے ریاستی حکومتوں کے تحت اور ۱۸ر۵۳ کروڑ روپے مرکزی نظم ونسق کے علاقوں کے انتظامیہ کے تحت خرچ کئے جائیں گے۔

اس رقم سے دیگر باتوں کے علاوہ مرکز کی سرپرستی میں کچھ نئی اسکیمیں شروع کی جائیں گی جن کے مقاصد درج ذیل ہیں :-

۱۔ تربیت کا معیار بہتر بنانے اور گھسی پٹی مشینوں کو بدلنے کے لیے ریاستی حکومتوں کے انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹوں کا درجہ بڑھانا۔

۲۔ ریاستوں حکومتوں کو خواتین کی تربیت و بہبود کے لیے انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کے لیے امدادی عطیات دینا۔

۳۔ جن علاقوں میں آقلیتیں زیادہ تعداد میں آباد ہوں وہاں انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹوں کا درجہ بڑھانے کے لیے امداد دینا۔

۴۔ ریاستوں اور مرکزی نظم ونسق کے علاقوں میں خطرناک کیمیاوی صنعتوں میں ماحول کیفیات پر نظر رکھنا۔

۵۔ بندھوا مزدوروں کا پتہ لگانے کے لیے رضاکارانہ ایجنسیوں کو امدادی عطیات فراہم کرنا اور

۶۔ غیر رسمی تعلیم، صحت کی دیکھ بھال، تغذیہ بخش اور تفریح وغیرہ کے انتظامات کے ذریعے بچہ مزدوروں کی حالت بہتر بنانے کے پراجیکٹوں کے لیے امدادی رقوم مہیا کرنا۔

لیبر پالیسی میں دستیاب کارکنان کے بھرپور استعمال، صلاحیت کارکردگی اور پیداواریت پر زور دیا جائے گا۔ لیبر پالیسی کی کامیابی کا اندازہ معیشت کے اس پیداواری معیار سے لگایا جائے گا جو وہ اس پالیسی کی بدولت حاصل کرے گی۔ ساتویں منصوبے میں لیبر پالیسی میں زیادہ تر زور تکنیکی عناصر کے علاوہ کارکنان کے ڈسپلن، تحریک عمل، حصول مہارت، صنعتی تعلقات، کام کے ماحول، کارخانوں میں کارکنان کی شرکت، سلامتی کے انتظامات وغیرہ پر زور دیا جائے گا۔

ساتویں منصوبے کے دوران ۴۰ ملین افراد کے لیے روزگار پیدا کرنے کی تجویز ہے۔ بڑے صنعتی شعبوں میں جدید ترین ٹیکنالوجی اختیار کر کے مزدوروں کی صلاحیت کارکردگی کو بہتر بنایا جائے گا۔ اور بیمار صنعتی اداروں کی بیماری دور کرنے کے لیے اصلاحی اقدامات کئے جائیں گے۔ بیمار صنعتی اداروں کے بارے میں ایک ٹھوس پالیسی تیار کی جائے گی۔ جس میں مزدوروں کے مفادات کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی ملحوظ رکھا جائے گا کہ حکومت نقصانات کا بھاری بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔

صنعتی تعلقات کو بہتر بنایا جائے گا تاکہ ہڑتالوں یا تالہ بندی کی نوبت نہ آنے پائے۔ صنعتی تعلقات کو بہتر بنانے میں یونینوں اور ملازمین کی ذمہ داری بھی متعین کی جائے گی تاکہ یونین کے اندر یا یونینوں کے درمیان رقابتیں اور پھوٹ نہ پیدا ہونے پائے۔ ●

بقیہ ترقی میں حصہ دار کارکن عورتوں کا ماضی حال اور مستقبل

اور یقینی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اہم قوانین وضع کئے گئے ہیں۔ عورتوں کی ملازمت میں اضافہ ہوا ہے اور ان کے سماجی تحفظ میں بھی توسیع اور بہتری آئی ہے۔ اگرچہ بہت کچھ کیا جانا باقی ہے لیکن اس وقت تک کی کارگذاریوں اور موجودہ رجحانات کی روشنی میں مستقبل پر امید نظر آتا ہے۔ ●

کلاس پراجیکٹ

ہو جائے گی۔

کلاس پراجیکٹ کا مقصد بچوں کو مؤثر طریقے سے ٹیکنالوجی اور معاشرے پر اُس کے اثرات کو سمجھنے میں مدد دینا اور تدریس کو زیادہ مؤثر بنانے میں ٹیکنالوجی کے استعمال کے لیے ٹیچروں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ ہم اُس کے ساتھ ہی یہ توقع کرتے ہیں کہ اہم ترین فائدہ کلاس روم میں ٹیچروں اور طلبا کے عمل میں تبدیلی کی صورت میں دیکھا جائے گا جو اسباق کی منصوبہ بندی اور خود تعلیم میں زیادہ لچک اور جدت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ ٹیلی ٹیکسٹ سہولیات کے ساتھ جو ہمارے ٹیلی ویژن کی اضافی خصوصیات بن جائیں گی کمپیوٹر امدادی تعلیم لکھوکھا اسکولوں تک پہنچ سکتی ہے۔

ہم نے لوگوں کی بڑی بڑی ٹیمیں ایسے پروگراموں کو فروغ دینے میں لگا دی ہیں جو ہمارے اسکولی ماحول کے لیے موزوں ہوں تاکہ اُن کمپیوٹروں سے بہترین نتائج حاصل کئے جا سکیں جو اسکولوں کو مہیا کئے گئے ہیں۔ ملک میں کمپیوٹروں کے ماہرین اور ٹیچر مل کر کام کر رہے ہیں۔ کلاس پراجیکٹ کی وسعتیں اس قدر بڑی ہیں کہ جوں جوں اُس کا ارتقا ہو رہا ہے ملک کے اندر کمپیوٹر اور اُن کے پروگرام بڑے پیمانے پر تیار ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ اب ہم اپنی تعلیمی مساعی کے ایک نئے باب کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔

تعلیم پر زور

بھارت ایسے وسیع ملک میں ٹیلی ویژن کی نت نئی بڑھتی ہوئی پہنچ سے ٹیلی ویژن اور ریڈیو اسکولی بچوں اور بالغوں کو تعلیم دینے کا ایک شاندار ذریعہ بن گیا ہے۔ سیٹلائٹ انسٹرکشنل ٹیلی ویژن ایکسپیریمنٹ (SITE) اسی مقصد کے لیے بنایا گیا تھا۔

اسکول ایجوکیشنل ٹیلی ویژن (ETV) پروگرام اب ہفتے میں پانچ روز دکھائے جا رہے ہیں۔ ہر سنیچر وار کو پرائمری اسکول ٹیچروں کے لیے پروگرام ہوتا ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے اعلیٰ تر تعلیم کے لیے یعنی کالج اور یونیورسٹی طلبا کے لیے پروگرام تیار کئے جاتے ہیں جو دوپہر کے بعد دکھائے جاتے ہیں۔

مستقبل کے امکانات

اسکولوں میں کمپیوٹروں کے مؤثر کام کا زیادہ تر تعلق اُس سیاق و سباق سے ہے جس میں وہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اطلاعاتی ٹیکنالوجیوں میں عالمی منڈی ناقابلِ یقین حد تک توسیع پانے والی ہے۔ اس منڈی کا حقدار بننے کے لیے کسی بھی ملک کی اہلیت کا دار و مدار ایسی موزوں افرادی قوت کی تیاری اور صلاحیت پر ہے جو معلوماتی ٹیکنالوجیوں میں تربیت یافتہ ہو۔ لہٰذا تعلیم کی متعدد سطحوں پر۔ جن میں اسکولی تعلیم شامل ہے۔ مختلف اقسام کے کمپیوٹری نظاموں اور کمپیوٹروں پر مبنی نصابوں کے اجرا کے لیے ایک وسیع میدان صاف دکھائی دے رہا ہے۔

جوں جوں کام اسی کی دہائی میں بڑھتا جا رہا وسیع تر سیاق و سباق میں ہمارے لیے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ بالعموم الیکٹرانک اور تعلیماتی ٹیکنالوجی اور بالخصوص کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے بدلتے ہوئے منظر کے معانی کو سمجھا جائے۔ یہ ہمارے قومی مفاد میں ہوگا کہ اُن چنوتیوں کا مل کر سامنا کیا جائے جو کمپیوٹر کے ساتھ اُبھر کر آئی ہیں۔ صنعتی ممالک اپنے طریقے سے اسی مسئلہ کا حل کرتے ہیں۔ ہمارے سامنے جو پیچیدگیاں آئی ہیں وہ اس لیے اہمیت رکھتی ہیں کہ ہمیں ان پر سوچ سمجھ کر غور کرنا چاہیے اور سوچ کر انھیں حل کرنا چاہیے۔ ہم سر فنطائی ٹیکنالوجی میں اپنی شرکت سے احتراز نہیں کر سکتے ۔ ہم خود کو سائنسی اور ٹیکنالوجی میں ہونے والی پیش قدمیوں کے بڑے دھارے سے الگ تھلگ رکھنا نہ چاہیں گے۔ اگر ہم ایک نہایت تقابلی دنیا میں قوموں کی برادری کے ایک طاقتور رکن کے طور پر زندہ رہ سکتے ہیں تو اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ سر فنطائی ٹیکنالوجی کا علم حاصل کیا جائے اور اُس پر آزادانہ طور پر کنٹرول پانے کے لیے اقدامات کئے جائیں گے۔ ہمیں جو وسائل دستیاب ہیں ہم اُن کا بہترین استعمال کریں گے اور اپنی تحریک کو اُن راستوں پر لے جائیں گے جو ہمیں ہماری طے شدہ منزل کی طرف لے جائیں گے۔ ہم تعلیم یا انتظام کے شعبے یا کسی دوسرے معاملے میں اپنے مسائل پر جب تک قابو نہیں پا سکتے جب تک کہ ہم جدید تصورات، معقول ضابطوں اور ترقی یافتہ کمپیوٹری اور دور مواصلاتی تکنیکوں کا استعمال نہیں کریں گے۔

ہم کمپیوٹری ٹیکنالوجی اور تعلیمی پروگراموں کے شعبے میں نواحی ملکوں کی ساتھ بین الاقوامی تعاون کے امکانات کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ دراصل غیر ثقافتی پروگرام جو اسکولی نصاب کو آسان بنا دیتے ہیں۔ ایشیائی خطے کے دوسرے ملکوں میں بچوں کے لیے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

Regd. No. D(DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U(DN) 65 to post without
prepayment at NDPSO, New Delhi

Vol. 6 No. 7 YOJANA (URDU) 1-15th July, 1986

بچے قوم کا سرمایہ ہیں، قوم کی امانت اور قوم کا مستقبل! قوم کے بیش قیمتی سرمایے کی پامالی نہ ہو، قوم کی انمول امانت میں خیانت نہ ہو اور بچے قوم کے سنہرے مستقبل کے ضامن ہو سکیں، یہی کوشش ہونی چاہیئے ہماری۔ اس کوشش میں ذرا سی بھی غفلت و کوتاہی نہ ہو — یہی ہے ہمارا قومی فریضہ!

ذرا ایک تجزیاتی نظر ڈالیں کہ بچوں کی عالمی برادری کس طرح جی رہی ہے، کس طرح زندگی گزار رہی ہے۔

بین الاقوامی ادارے "اقوام متحدہ" نے ایک طویل مدت سے بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک عالمی ادارہ (فنڈ) قائم کر رکھا ہے نام ہے "یونیسیف" (UNICEF) بچوں کے اس فنڈ (بیت المال برائے فلاحِ اطفال) کی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۱ء میں پیدا ہونے والے (دنیا بھر میں) ۱۷ کروڑ بچوں کو موت کے بے رحم پنجوں نے جکڑ لیا۔ ان کی اس بے رحمانہ موت کی وجہ تھی — علاج کا فقدان اور غذائی قلت! اندیشہ ہے کہ تقریباً اتنی ہی بڑی تعداد میں ۱۹۸۲ء میں بچے پیدا ہوتے ہی لقمۂ اجل بن گئے ہوں گے! — وجہ وہی — نہ ان کے علاج کی طرف توجہ دی جا سکی ہوگی اور نہ انھیں مناسب اور ضروری غذا مہیا کی گئی ہوگی! (توجہ دینے کے لیے نہ لوگوں کے پاس وقت ہے اور نہ وافر مقدار میں غذا کی فراہمی کے ذرائع!)

انسانی سماج کی اس سے بڑی ٹریجڈی کیا ہوگی کہ ہر دو سکنڈ میں ایک بچہ اس دنیا میں آنکھیں کھولتے ہی دم توڑ دیتا ہے! ۵۰ **ہزار بچے ہر روز مر جاتے ہیں۔** (پیدا ہونے سے ۵ سال تک کی درمیانی عمر کے بچے)۔ اگر فی بچہ دو روپے یومیہ بھی رقم میسر ہو تو انھیں موت کے منہ میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے یعنی اگر ایک لاکھ کی رقم بھی صرف کرنے کی گنجائش ہو تو ہر روز ۵۰ ہزار بچوں کی جانیں بہ آسانی بچائی جا سکتی ہیں۔ اور یہ ایک لاکھ کی رقم تو بیحد معمولی، بیحد حقیر ہے جبکہ انسان خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے خاتمے، اپنی تباہی و بربادی کی مد میں فی سیکنڈ ڈیڑھ لاکھ روپے کی خطیر رقم خرچ کرتا ہے۔ ۵۴ ارب روپے تو صرف **جنگی ہتیاروں پر خرچ ہوتے ہیں ہر سال!** اگر اس میں بھاری بھرکم رقم کا محض آٹھواں حصہ بھی بچوں کے لیے صرف کیا جائے تو بھی ایک بڑی بات ہو۔

دنیا بھر میں ہر رات بیس کروڑ بچے، بھوکے پیٹ ہی سو جاتے ہیں، تھک ہار کر، رو رو کر، سسک سسک کر! اور اس حقیقت کے انکشاف کے بعد بھی کیا ہم "اشرف المخلوقات" کہلانے کے حقدار ہیں؟۔

غریبی اور ناداری کی انتہائی کربناک شکل افریقہ اور ایشیا میں تو دیکھنے میں آتی ہی ہے، یورپ اور امریکہ بھی اس لعنت سے پاک نہیں ہے۔ "خوشحال" کہے جانے والے یورپ" میں کم از کم تین کروڑ خاندان ایسے ہیں جو کسی بھی طرح خوشحال نہیں کہے جا سکتے۔ بلکہ بدحال ہیں۔ بدحالی کی یہ بدعت بچوں کے لیے خوفناک ثابت ہوئی ہے۔ بدحالی کے علاوہ بے توجہی سے بھی بچے دنیا بھر میں اتنی بڑی تعداد میں یا تو پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں، یا بیمار رہتے ہیں اور یا پھر ناقص غذا یا مناسب مقدار میں نہ ملنے والی غذا کے باعث زندہ درگور نظر آتے ہیں۔ "یونیسیف" (UNICEF) کی اس رپورٹ کی تصدیق کئی اور رپورٹوں سے بھی ہوتی ہے واشنگٹن (امریکہ) سے شائع ہونے والے جریدے "کیتھلین نیولینڈ" نے تو اس حقیقت کا بھی انکشاف کیا ہے کہ برازیل (لاطینی امریکہ)، روس اور امریکہ جیسے ممالک میں بھی اب پہلے کے مقابلے کہیں زیادہ بڑی تعداد میں بچوں کی اموات واقع ہونے لگی ہیں۔ ایک بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ معذور افراد کی طرح معذور بچوں کے بارے میں کچھ نام نہاد ترقی یافتہ و مہذب ملکوں میں یہ اندازِ فکر پنپتا نظر آرہا ہے کہ جو زندہ رہ کر کسی لائق نہیں بن سکتے، ٹھیک سے جی نہیں سکتے انھیں زندہ رہنے کا حق ہی نہیں۔

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5, Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002

۱۶ تا ۳۱ جولائی ۱۹۸۶ء

قومی ملکیت کے بنک اور سماجی مقاصد

(جے۔ ایس۔ وارشنی)

ایک روپیہ

سمندر معدنیات اور ادویات کا خزانہ

(اقبال محی الدین)

عزیز اندوری

اقلیت کی آبادی میں اضافہ

گذشتہ برسوں میں جہاں ایک طرف ہندوستان کی مجموعی آبادی میں اضافہ ہوا ہے وہیں اس ملک میں آباد اقلیتی فرقے کی آبادی بھی اکثریتی فرقے کی آبادی کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ بڑھی ہے۔

اگر ہم رجسٹرار جنرل اور سینسس کمشنر آف انڈیا کے شائع کردہ مختلف گوشواروں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۸۱ء تک اقلیتی فرقوں کی آبادی میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً اگر ۶۱-۱۹۵۱ء کے درمیان ہندو آبادی ۲۰،۲۹ فیصد بڑھی تو اسی بیچ مسلم آبادی میں ۲۵،۶۱ فیصد، عیسائی آبادی میں ۲۷،۳۸ فیصد، سکھ آبادی میں ۲۵،۱۵ فیصد، بودھ آبادی میں ۱۶،۷۰ فیصد اور جین آبادی میں ۲۵،۱۷ فیصد اضافہ ہوا۔ اسی طرح ۷۱-۱۹۶۱ء کے درمیان ہندو آبادی ۲۳،۶۹ فیصد بڑھی جب کہ دیگر اقلیتی فرقوں کی آبادی میں جو فیصد اضافہ ہوا وہ اس طرح ہے۔ مسلم ۳۰،۸۵ فیصد، عیسائی ۳۲،۶۰ فیصد، سکھ ۳۲،۲۸ فیصد، بودھ ۱۷،۲۰ فیصد اور جین ۲۸،۴۸ فیصد۔

۸۱-۱۹۷۱ء کے درمیان ہندو آبادی میں ۲۴،۱۵ فیصد اضافہ ہوا، جب کہ مسلم آبادی ۳۰،۸۵ فیصد، عیسائی آبادی ۱۶،۷۷ فیصد، سکھ آبادی ۲۶،۱۵ فیصد، بودھ آبادی ۲۲،۵۲ فیصد اور جین آبادی ۲۳،۶۹ فیصد کے حساب سے بڑھی ہے۔

اس فیصد اضافے کو مندرجہ ذیل گوشوارے کے ذریعے اور بھی آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے:-

مندرجہ ذیل گوشوارے کے تحت مختلف طبقوں کی آبادی کا اگر جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ۶۱-۱۹۵۱ء کے درمیان عیسائی طبقے کی آبادی میں سب سے زیادہ فیصد اضافہ ہوا ہے اس کے بعد علی الترتیب مسلم، جین، سکھ اور بودھ طبقوں کی آبادی میں فیصد اضافہ ہوا۔ یہ اضافہ تقریباً اسی ترتیب کے ساتھ ۷۱-۱۹۶۱ء کے درمیان بھی نظر آتا ہے۔ لیکن ۸۱-۱۹۷۱ء کے درمیان اس ترتیب میں حیرت انگیز تبدیلی نظر آتی ہے۔

خاص مذہب سے متعلق طبقے	اضافہ فیصد ۶۱-۱۹۵۱ء	اضافہ فیصد ۷۱-۱۹۶۱ء	اضافہ فیصد ۸۱-۱۹۷۱ء
کل آبادی میں اضافہ	۲۱،۵۱ فیصد	۲۴،۸۰ فیصد	۲۴،۶۹ فیصد
ہندو	۲۰،۲۹ "	۲۳،۶۹ "	۲۴،۱۵ "
مسلم	۲۵،۶۱ "	۳۰،۸۵ "	۳۰،۵۹ "
عیسائی	۲۷،۳۸ "	۳۲،۶۰ "	۱۶،۷۷ "
سکھ	۲۵،۱۵ "	۳۲،۲۸ "	۲۶،۱۵ "
بودھ	۱۶،۷۰ "	۱۷،۲۰ "	۲۲،۵۲ "
جین	۲۵،۱۷ "	۲۸،۴۸ "	۲۳،۶۹ "

(باقی ٹائٹل کور صفحہ ۳ پر)

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

چیف ایڈیٹر • سید ظفیر الحسن

اسسٹنٹ ایڈیٹر • محمد عادل صدیقی

جلد ۶ | ۱۶ تا ۳۱ جولائی ۱۹۸۶ | شمارہ ۸

۲۵ جیشٹھ تا ۹ شراون شک ۱۹۰۸ :: ٹیلیفون ۳۰۱۸۱۸

چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سالہ ۳۵ روپے، سہ سالہ ۵۰ روپے

فی کاپی :- ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صدی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :-

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر. کے. پورم (مین)
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن)، آر. ایس. منجال

ترسیل زر کا پتہ :- بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

سنٹرل گنگا اتھارٹی

دریائے گنگا نہ صرف اپنے تقدس کی وجہ سے مشہور ہے بلکہ یہ کروڑوں عوام کی زندگی کا ذریعہ بھی ہے۔ سالہا سال سے اس سے پانی حاصل کیا جا رہا ہے اور اس پانی سے مختلف کام لیے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کے کنارے پر جو بڑے شہر آباد ہیں، ان سے نکلنے والا کچرا اور فضلہ بھی اس کے پانی میں پھینکا جا رہا ہے، اس میں مُردہ لاشیں اور جانوروں نیز مویشیوں کے پنجر پھینکے جا رہے ہیں، لاکھوں اور کروڑوں انسان اس میں نہا رہے ہیں، ان سب وجوہات سے اس کا پانی آلودہ ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے علاقوں سے جنگلات کٹ جانے کے سبب یہ آلودگی اور بڑھ رہی ہے۔ اب سیلاب آنے کی ایک بڑی وجہ بھی یہی ہے۔ اس میں جہاز رانی کے لیے پانی بھی چھچھلا رہ گیا ہے۔ آبی آلودگی کی روک تھام سے متعلق مرکزی بورڈ نے یہ واضح کیا کہ دریائے گنگا کا پانی بہت زیادہ آلودہ ہو چکا ہے اور اس کو صاف بنانے کے لیے فوری اقدامات درکار ہیں۔ یہ کام اس لیے بھی ضروری ہے کہ ۸۰ فیصد بیماریاں پانی کی آلودگی کے باعث ہی ہیں۔ اس وجہ سے فروری ۱۹۸۵ میں سنٹرل گنگا اتھارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ مقصد یہ تھا کہ اس دریا کے پانی کو صاف ستھرا بنانے کے لیے ایک طویل المدتی پروگرام شروع کیا جا سکے۔

یہ دریا آٹھ ریاستوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس وقت پوری دنیا گنگا کی صفائی کے پراجیکٹ کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی ہے۔ شہروں سے نکلنے والا کچرا اور فضلہ اس کے پانی کو سب سے زیادہ گندا کرتا ہے۔ شہری اور صنعتی علاقوں سے باہر آنے والا کچرا اس میں ڈالا جا رہا ہے جس سے ایک لاکھ سے زیادہ آبادی والے ۲۹ شہروں، ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ کی آبادی والے ۲۳ شہروں اور ۵۰ ہزار سے کم آبادی والے تقریباً ۴۸ شہروں کا کچرا اس میں پھینکا جا رہا ہے۔ یہ سب شہر دریا کے ۲۵۲۵ کلو میٹر لمبے فاصلے پر آباد ہیں۔ یہ گنگوتری سے لے کر گنگا ساگر تک مختلف فاصلوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان شہروں سے جو غلاظت نکلتی ہے، اسے کیمیاوی عمل سے صاف بنانے کے انتظامات نہ ہونے سے ان کو دریا برد کر دیا جاتا ہے، اگر اس غلاظت کے کیمیاوی ٹریٹمنٹ کا بندوبست صرف ایک لاکھ سے زیادہ آبادی والے شہروں میں ہی کر دیا جائے تو آبی آلودگی کا بڑا حصہ کم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس پس منظر میں ایک عملی پلان مرتب کیا جا چکا ہے جس کی رُو سے موجودہ ٹرنک سیوروں کی مرمت کا کام ترجیحی بنیادوں پر شروع کیا جاتا ہے، کہیں کہیں سیوروں کے رُخ کو موڑنے کے انتظامات کئے جاتے ہیں۔ موجودہ سیوریج پمپنگ اسٹیشنوں کی مرمت پر توجہ کی جا رہی ہے۔ غلاظت کو کیمیاوی عمل سے صاف کرنے کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ اس سے بایو انرجی وغیرہ میں مدد لے کر اس کو کار آمد بنانے پر زور دیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس کو صاف ستھرا بنانے کے لیے بہت سی اسکیمیں ہیں۔ اس منصوبے میں گھریلو وسائل سے ہونے والی آلودگی کی روک تھام پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی صنعتی کچرے وغیرہ کی آلودگی کی روک تھام کے لیے بھی ضروری اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ صنعتی کچرے سے پیدا شدہ آلودگی کی روک تھام کے لیے ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔ اس نے اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال میں ۲۶۴ صنعتی کارخانوں کی نشاندہی کی ہے۔ ان تینوں ریاستوں میں ۶۸ صنعتی کارخانوں میں غلاظت اور گندگی نیز کچرے وغیرہ کی ٹریٹمنٹ کے لیے فوری پلانٹ لگانے کی سفارش کی گئی ہے چنانچہ ہر ریاست کے انسدادِ آلودگی بورڈ نے اس سلسلے میں ضروری اقدامات شروع کر دئے ہیں، جو کارخانے یہ پلانٹ نہیں لگائیں گے یا اس کام میں تاخیر کریں گے، ان کے خلاف کارروائی ہو سکتی ہے۔ سنٹرل گنگا اتھارٹی نے اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال میں انسدادِ آلودگی اور ٹریٹمنٹ سے متعلق مختلف اسکیموں کے اخراجات کے لیے ۲۹۲ کروڑ ۳۱ لاکھ روپے کی رقم پہلے ہی مختص کر دی ہے۔ وارانسی شہر میں ۲۳ کروڑ روپے سے زیادہ کے اخراجات سے صفائی کا خصوصی پروگرام شروع کیا جا چکا ہے۔

(اسسٹنٹ ایڈیٹر) ●

جے۔ ایس۔ وارشنی

قومی ملکیت کے بنک اور سماجی مقاصد

۱۹۶۹ء میں چودہ بڑے بنکوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا تھا، اس کے بعد سے بنکنگ کے نظام کے فروغ اور اس کے کاموں میں بے پناہ اضافہ دیکھنے کو ملا۔ اس کے بعد سے ملک میں بنکوں کی شاخوں میں چھ گنا اضافہ ہوا ہے۔ بنکوں میں جمع کی جانے والی رقوم کی میزان ۱۹۶۹ء کے مقابلے ۱۸ گنی ہے۔ بنکوں کی طرف سے دئے جانے والے قرضوں میں ۱۵ گنا اضافہ ہوا ہے۔ اس مضمون کے فاضل مصنف نے اس کامیابی کو سراہا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ بنکنگ کے لیے درکار بنیادی سہولتیں کافی نہیں تھیں لیکن ان مشکلات کے باوجود انھوں نے جو کارگزاری دکھائی وہ قابلِ تحسین ہے۔ تربیتی افراد کی کمی نیز دیہی علاقوں میں مناسب جگہ کی قلت جیسی دشواریوں کے باوجود بنکوں کی یہ کارگزاری تعریف کی مستحق ہے۔ اس مضمون میں مختلف معاشی شعبوں میں بنکوں کی اعلیٰ کارگزاری کا ایک مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

روایتی طور پر ہندوستان کے تجارتی بنک شہروں میں قائم تھے، ان کا مقصد نفع کمانا تھا وہ سماج کے تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرنا اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتے تھے۔ اس کی شاخیں شہروں ہی میں تھیں۔ دیہی علاقوں میں بنکوں کا نظام خال خال ہی تھا۔ بنکوں میں جمع شدہ رقوم میں اضافہ ضرور ہوا مگر وہ اضافہ زیادہ تر ترقی یافتہ ریاستوں میں ہوا۔ بنکوں کی طرف سے دئے جانے والے قرضے بھی شہری علاقوں تک محدود تھے۔ یہ زیادہ تر منظم صنعتوں کو ہی قرض دیتے تھے۔ چنانچہ دیگر معاشی شعبوں کو اپنی ضرورت کی رقم غیر ادارہ جاتی ایجنسیوں سے لینی پڑتی تھی۔ سماج کے کمزور اور غریب طبقے تو بنک سے آشنا ہی نہ تھے۔ چنانچہ بنکنگ کا نظام معقول بنیادوں پر نہ تھا۔ جس کے سبب انھیں قومی ملکیت میں لینے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

بنکوں کو قومی ملکیت میں لینا

۱۹ر جولائی ۱۹۶۹ء کو ہندوستان کے ۱۴ بڑے شیڈولڈ تجارتی بنک، جو کہ پرائیویٹ سیکٹر میں تھے اور جن میں سے ہر ایک کی جمع شدہ رقم ۵۰ کروڑ روپے تھی، قومی ملکیت میں لے لیے گئے۔ یہ ہندوستان کی بنکنگ کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ تھا۔ اس کے ذریعے معیشت کو کنٹرول میں رکھنے کی اس انداز کی کوشش کی گئی جس سے معاشی نظام اور قومی مقاصد کو ایک سطح پر لاکر اقتصادی ترقی کا عمل آگے بڑھایا جا سکے۔ چنانچہ اُس وقت کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اپنی نشری تقریر میں مقاصد واضح کئے جو یہ تھے۔

۱۔ اقتصادی نظام چند ہاتھوں میں مرکوز نہ رہے۔

۲۔ عوام میں بنکنگ کا مذاق اور اس کا

خوبی پرورش پا سکے۔

۳۔ علاقائی نابرابری دور کی جا سکے، ترقی کا عمل مربوط طریقے پر آگے بڑھ سکے۔

۴۔ ایسے علاقوں میں بنکنگ کا نظام پھیلایا جا سکے جہاں ابھی تک اسے نہیں پھیلایا جا سکا تھا۔

۵۔ بنکنگ کے انتظامیہ کو پیشہ ورانہ مہارت سے لیس کیا جائے۔

۶۔ نئے صنعت کاروں کی حوصلہ افزائی کی جا سکے۔

۷۔ معیشت کے ایسے سیکٹروں کی امداد کی جا سکے جن پر ابھی تک توجہ نہیں کی جا سکی تھی مثلاً زراعت، چھوٹے پیمانے کی صنعت، چھوٹا کاروبار، ٹرانسپورٹ وغیرہ۔

۱۵ر اپریل ۱۹۸۰ء کو پرائیویٹ سیکٹر کے چھ مزید بنکوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا، ان میں سے ہر ایک کی جمع شدہ رقومات ۲۰۰ کروڑ روپے سے کم نہ تھیں۔

سریع ترقی

۱۹۷۰ء کے بعد سے بنکنگ کے نظام نے تیزی سے ترقی کی اور قومی مقاصد کی تکمیل میں انھوں نے اہم پارٹ ادا کیا۔ ان کے ذریعے ملک میں سماجی اور اقتصادی ترقی کا عمل آگے بڑھ سکا۔ بنکنگ کے نظام میں خاص تبدیلی یہ آئی کہ یہ محض چند مخصوص لوگوں یا طبقات کے لیے نہ رہ کر ملک کے بحیثیت مجموعی عوام کی بھلائی کے لیے کام کرنے لگے۔ اب ان کا مقصد محض نفع کمانا نہیں، اور اب ان کی سرگرمیوں کا دائرہ کار محض شہروں تک ہی محدود نہیں رہا۔ اس کی شاخیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں کھولی گئیں اور ترجیحی سیکٹروں کے لیے اس نے قرضے دیے۔ اس نے دیہی علاقوں اور نیم شہری علاقوں میں قرضے تقسیم کیے۔ دیہی معیشت کے استحکام میں بنکوں نے اہم رول ادا کیا۔ بنکوں کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ بنکوں کی ترقی کا مختصر جائزہ درج ذیل ہے۔

شاخوں کی تعداد میں اضافہ

قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد اس کی شاخوں کے کھولنے کے عمل کو تیز کیا گیا۔ ان علاقوں میں اس کی شاخیں کھولی گئیں جہاں ابھی تک بنک قائم نہیں ہوئے تھے۔ اس کے ذریعے علاقائی عدم توازن کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ جون ۱۹۶۹ء میں بنکوں کی شاخیں ۸۲۶۲ تھیں۔ ستمبر ۱۹۸۵ء میں ان کی تعداد بڑھ کر ۵۲۰۱۳ ہو گئی۔ کل ۴۳۷۵۱ نئے دفاتر کھولے گئے۔ ان میں سے ۶۰ فی صد گویا کہ ۲۶۲۰۰ دفاتر ان علاقوں میں کھولے گئے جہاں پہلے سے کوئی بنک نہیں تھا۔ نئے دفاتر کی تعداد کا ۸۰ فیصد یعنی ۳۵۳۶۵ دفاتر دیہی اور نیم شہری علاقوں میں کھولے گئے۔ شیڈولڈ تجارتی بنکوں کا ۵۹ فیصد دیہی عوام کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے جبکہ جون ۱۹۶۹ء میں صرف ۲۲ و ۲ فیصد ہی عوام کی ضرورتوں کو پورا کر رہا تھا۔ شاخوں کی تعداد میں اضافے سے ہر شاخ کے دائرۂ کار میں پہلے کے مقابلے کم افراد ہیں۔ جون ۱۹۶۹ء میں ۶۵ ہزار افراد کے لیے ایک بنک تھا۔ مگر ستمبر ۱۹۸۵ء میں ۱۳ ہزار افراد کے لیے ایک بنک ہے۔

شیڈولڈ تجارتی بنکوں کے دفاتر کی تعداد اور متعلقہ تفاصیل درج ذیل گوشوارے سے واضح ہوتی ہے۔

اوسط آبادی فی شاخ جون ۱۹۶۹ء میں ۶۵ فی ہزار تھی جو گھٹ کر ستمبر ۱۹۸۵ء میں ۱۳ فی ہزار رہ گئی۔

تجارتی بنکوں نے دیہی علاقوں میں شاخیں کھولیں، لیکن ایک تاثر یہ ہے کہ دیہات میں بنکوں کی خدمات خاطر خواہ نہیں ہیں۔ چنانچہ دیہی بنکوں کے طریق کار کا جائزہ لینے کے لیے مسٹر نرسمہم کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی جس نے یہ مشورہ دیا کہ پبلک سیکٹر کے بنک دیہی علاقوں کے لیے ایک نیا نظام اپنائیں۔ چنانچہ مختلف علاقوں میں علاقائی دیہی بنک قائم کیے گئے جن کا دائرۂ کار محض ایک یا دو اضلاع تک ہی محدود رہتا ہے۔ ان کو مقامی حالات سے پوری طرح واقفیت ہوتی ہے۔ اور وہ مقامی مسائل سے باخبر ہوتے ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کاروباری اداروں میں بنکوں میں رقوم جمع کرانے کی کتنی سکت ہے۔ پبلک سیکٹر بنک ہر ایک علاقائی دیہی بنک کو قرض اور دیگر بہت سی سہولتیں دیتا ہے جس سے مارجنل اور چھوٹے کسانوں کی مدد کی جا سکے۔ یہ بنک کاشتکاروں، دستکاروں اور چھوٹے صنعت کاروں کو رقم فراہم کرتے ہیں۔ اپریل ۱۹۸۵ء کے آخر میں ۱۸۳ علاقائی دیہی بنک ملک کے ۳۲۲ اضلاع میں کام کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے کاروبار کی توسیع سے دیہی عوام کو مختلف

شہری و دیہی آبادی کے لیے تجارتی بینکوں کی توسیع

	جون ۱۹۶۹ء		ستمبر ۱۹۸۵ء		اضافہ	
	تعداد	میزان کا فیصد تناسب	تعداد	میزان کا فیصد تناسب	تعداد	میزان کا فیصد تناسب
دیہی	۱۸۳۲	۲۲٫۲	۳۰۶۶۴	۵۹٫۰	۲۸۸۳۲	۶۵٫۹
نیم شہری	۳۳۲۲	۴۰٫۲	۹۸۲۵	۱۸٫۹	۶۵۰۳	۱۴٫۹
شہری	۱۲۷۷	۱۵٫۵	۶۲۳۰	۱۲٫۰	۴۹۵۳	۱۰٫۹
میٹروپولیٹن	۱۶۹۱	۲۰٫۱	۵۲۷۴	۱۰٫۱	۳۶۱۳	۸٫۳
میزان	۸۲۶۲	۱۰۰٫۰	۵۲۰۱۳	۱۰۰٫۰	۴۳۷۵۱	۱۰۰٫۰

طرح فائدہ پہنچایا ہے۔ دسمبر ۱۹۸۴ کے خاتمے پر ۱۷۳ علاقائی دیہی بنکوں کی ۴۵۰۲ شاخیں کام کر رہی تھیں۔ ان میں ۹۶۰ کروڑ روپیہ جمع تھا اور ان کے ذریعے ۱۰۸۱ کروڑ روپے کے قرضے دئے جا چکے تھے۔

جمع شدہ رقومات میں اضافہ:۔

شیڈولڈ تجارتی بنکوں میں جون ۱۹۶۹ میں جمع شدہ رقوم کی میزان ۴۶۶۵ کروڑ روپے تھی جو بڑھ کر دسمبر ۱۹۸۵ء میں ۸۳۷۲۱ کروڑ روپے ہو گئی۔ یہ رقم ۱۸ گنا اضافہ ظاہر کرتی ہے۔ جمع شدہ رقوم کے کھاتوں کی تعداد دسمبر ۱۹۷۲ء میں ۳ کروڑ ۶۹ لاکھ تھی جو بڑھ کر دسمبر ۱۹۸۵ء میں ۲۴ کروڑ ہو گئی۔ مجموعی میزان میں دیہات کے علاقوں میں جمع شدہ رقوم میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ جون ۱۹۶۱ء اور مارچ ۱۹۸۵ء کے درمیان دیہی بنکوں میں جمع کی جانے والی رقوم میں ۶۸ گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ اضافہ ہوا۔ اس کے نتیجے میں جمع شدہ کل رقوم میں دیہات کے بنکوں میں جمع کی گئی رقومات کا حصہ جون ۱۹۶۹ء کے ۳٫۱ فیصد سے بڑھ کر مارچ ۱۹۸۵ء میں ۱۳٫۶ فیصد ہو گیا۔ بنکوں میں جمع شدہ رقوم میں اضافہ ہوا۔ یہ رقم ۸۵-۱۹۸۴ء میں قومی آمدنی کے ۴۲ فیصد کے بقدر تھی جبکہ ۶۹-۱۹۶۸ء میں یہ صرف ۱۵٫۷ فیصد تھی۔

قرضے کی مختلف سمتیں

جون ۱۹۶۹ء میں بنکوں کی طرف سے دئے گئے قرضوں کی رقوم ۳۰۶۹ کروڑ روپے تھی جو بڑھ کر دسمبر ۱۹۸۵ء میں ۵۳۲۳۱ کروڑ روپے ہو گئیں۔ یہ ۱۵ گنا اضافہ ہے۔ سرکار میں سرمایہ کاری میں اضافہ کے ذریعے ترقیاتی منصوبوں کو بھی ان سے بڑے پیمانے پر مدد ملی۔ جون ۱۹۶۹ء میں سرکار میں سرمایہ کاری نیز دیگر منظور شدہ کفالتوں میں سرمایہ کاری ۱۳۵۹ کروڑ روپے تھی جو بڑھ کر دسمبر ۱۹۸۵ء میں ۲۳۹۹۲ کروڑ روپے ہو گئی۔ دیہات میں سرمایہ کاری بڑھانے پر زور دیا گیا۔ شروع میں بنکوں میں جمع شدہ رقوم کا صرف ۱٫۵ فیصد ہی دیہات میں سرمایہ کاری کے طور پر لگایا گیا تھا مگر اس عرصے میں یہ سرمایہ کاری بڑھ کر ۱۳٫۱ فیصد ہو گئی۔ اب سرمایہ کاری ایسے معاشی شعبوں میں ترجیحی طور پر کی گئی جن میں اب تک سرمایہ کاری نہیں کی جا رہی تھی۔ اس کی تفصیل درجِ ذیل گوشوارے سے واضح ہے۔

چھوٹے پیمانے کے صنعت کاروں، ٹرانسپورٹ آپریٹروں، خوردہ فروشوں، چھوٹے کاروباری افراد، پیشہ ورانہ ماہروں/ از خود روزگار کے خواہشمندوں کو منظم پیمانے پر مالی امداد دی جا سکی۔ بنکوں نے ترجیحی زمروں کے لیے قرضے دیے اور یہ رقم جون ۱۹۶۹ء میں صرف ۴۴۱ کروڑ روپے تھی جو بڑھ کر ستمبر ۱۹۸۵ء میں ۱۹۲۰۸ کروڑ روپے ہو گئی۔ بنکوں کی طرف سے دیے گئے کل قرضوں کے تناسب سے بھی یہ رقم بڑھی۔ اس عرصے میں یہ تناسب ۱۴٫۳ فیصد سے بڑھ کر ۴۲٫۷ فیصد ہو گیا۔ ترجیحی زمروں کے لیے دیے جانے والے قرضوں کے کھاتوں کی تعداد بھی اس مدت میں ۲٫۶ لاکھ

بنکوں کے قرضوں کی سیکٹر وار تقسیم

کروڑ روپے میں

سیکٹر	مارچ ۱۹۶۹: رقم	مارچ ۱۹۶۹: میزان کے مقابلے تناسب	مارچ ۱۹۸۵ء: رقم	مارچ ۱۹۸۵ء: میزان کے مقابلے تناسب
۱۔ صنعت	۲۰۶۸	۶۷٫۵	۲۲۵۵۶	۴۷٫۰
بڑی اور متوسط	۱۸۵۷	۶۰٫۶	۱۵۹۴۸	۳۳٫۲
چھوٹے پیمانے کی صنعت	۲۱۱	۶٫۹	۶۶۰۸	۱۳٫۸
۲۔ زراعت اور متعلقہ سرگرمیاں	۶۷	۲٫۲	۷۶۵۷	۱۶٫۰
۳۔ تجارت	۵۸۸	۱۹٫۲	۸۴۷۸	۱۷٫۷
خوراک	۱۰۹	۳٫۵	۵۸۲۷	۱۲٫۲
دیگر	۴۷۹	۱۵٫۷	۲۶۵۱	۵٫۵
۴۔ دیگر	۳۴۱	۱۱٫۱	۹۲۶۲	۱۹٫۳
میزان	۳۰۶۴	۱۰۰٫۰	۴۷۹۵۳	۱۰۰٫۰

سے بڑھ کر ستمبر ۱۹۸۵ء میں ۲۲۹ لاکھ ۲۷ ہزار تک پہنچ گئی۔ اگلے صفحہ پر دیے گئے گوشوارے سے یہ ترقی واضح ہو جاتی ہے۔

ترجیحی زمروں کے لیے قرضے

بنکوں کو قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد زراعت پیشہ لوگوں کی بڑی تعداد،

پبلک سیکٹر بنکوں کی طرف سے زراعت اور دیگر ترجیحی زمروں کو دیئے گئے قرضے

کھاتوں کی تعداد (ہزار میں) رقم کروڑ روپوں میں

	جون ۱۹۶۹ء		ستمبر ۱۹۸۵ء	
	کھاتے	رقم	کھاتے	رقم
۱۔ زراعت	۱۶۴	۱۶۲٫۳۳ (۵٫۴)	۱۵۱۷۲	۸۱۷۴٫۳۰ (۱۸٫۲)
۲۔ براہ راست	۱۶۰	۴۰٫۲۱ (۱٫۳)	۱۴۱۶۸	۶۷۹۹٫۳۵ (۱۵٫۱)
بالواسطہ	۴	۱۲۲٫۱۲ (۴٫۱)	۱۰۰۸	۱۳۷۴٫۹۵ (۳٫۱)
۳۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتیں	۵۱	۲۵۱٫۰۷ (۸٫۳)	۱۴۸۸	۶۸۰۳٫۲۴ (۱۵٫۱)
۴۔ دیگر	۴۵	۲۷٫۵۷ (۰٫۹۱)	۶۲۶۳	۴۲۳۰٫۶۶ (۹٫۳)
میزان	۲۶۰	۴۴۰٫۹۷ ۱۴٫۶	۲۹۲۷	۱۹۲۰۸٫۲۰ ۴۲٫۷

قوسین میں دیئے گئے اعداد و شمار کل قرضوں سے ان کا تناسب ظاہر کرتے ہیں۔

نئی اسکیمیں

قومی ملکیت کے مقاصد کی تکمیل کے لیے بنکنگ کے نظام نے قرضہ دینے کی نئی نئی اسکیمیں تیار کیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

لیڈ بنک اسکیم

لیڈ بنک اسکیم کے ذریعے میٹروپولیٹن شہروں کو چھوڑ کر تمام اضلاع کو مختلف بنکوں کو سونپ دیا گیا۔ اس کا مقصد بنکنگ کی سہولتوں میں اضافے کی غرض سے انفرادی بنکوں کی ذمہ داریوں کی نشاندہی کرنا تھا۔ اس اقدام کو بنکنگ کاروبار میں اجارہ داری کی غرض سے نہیں اٹھایا گیا بلکہ اس کا مقصد چند بنکوں کے کنسورشیم کی رہنمائی کرنا تھا تاکہ مرکزی اور ریاستی سرکاروں کی مختلف ترقیاتی اسکیموں کے ساتھ تال میل کو بڑھایا جا سکے۔

دیہات کی ترقی سے متعلق اسکیم

بنکوں کی طرف سے دیہاتیوں کو قرضے دیئے جانے کے خصوصی پروگرام کو بروئے کار لانے کی غرض سے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ جون ۱۹۸۳ء کے آخر میں بنکوں نے یہ اسکیم ۱۴۱۰۴۲ دیہات میں پہونچا دی تھی اور براہ راست زرعی قرضے کھاتوں کی تعداد ۵۰ لاکھ ہو گئی تھی جن کے تحت ۱۵۵۷ کروڑ روپے کی رقم بطور قرض دی گئی۔

تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے لیے ازخود روزگار کی اسکیمیں:۔ ۱۹۸۳ء میں تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے لیے خود روزگاری کے لیے ایک اسکیم چالو کی گئی۔ بھارت سرکار نے یہ اسکیم ریزرو بنک آف انڈیا کے مشورے سے تیار کی۔ اس اسکیم سے تعلیم یافتہ بے روزگار افراد کو روزگار دلانے کی کوششیں کی گئیں۔ امداد کے لیے مربوط طریقے پر رعایتوں اور امداد کا ایک خاکہ تیار کیا گیا۔

۱۹۸۳-۸۴ء میں اندازہ ہے کہ ۲ لاکھ ۴۲ ہزار افراد نے اس اسکیم سے فائدہ اٹھایا اور انھیں ۴۰۱٫۵۴ کروڑ روپے کی رقم تقسیم کی گئی۔ ۱۹۸۴-۸۵ء کے اعداد و شمار کی روشنی میں بنکوں نے ۴۲۸٫۵۳ کروڑ روپے کے قرضے منظور کئے اور ان سے ۲ لاکھ ۲۹ ہزار افراد نے فائدہ اٹھایا۔ پبلک سیکٹر بنکوں نے منظور شدہ مجموعی رقم کا ۹۵ فیصد حصہ تقسیم کیا۔

نئے صنعت کاروں کی حوصلہ افزائی کا پروگرام

پسماندہ اضلاع میں کوئی بھی رقم لگانے کو تیار نہیں ہوتا کیوں کہ وہ نقصان اور گھاٹے کا سودا ہوتا ہے۔ اسٹیٹ بنک آف انڈیا نے پسماندہ اضلاع میں نئے صنعت کاروں کی حوصلہ افزائی کے پروگرام شروع کئے۔ ۱۹۸۴ء تک اس بنک نے اس طرح کے ۹۵ پروگرام شروع کئے اور ان سے ۲۲۰۰ نئے صنعت کار وابستہ تھے۔ تربیت یافتہ امیدواروں کے ۲۲ فیصد نے صنعتی کارخانے لگائے جبکہ ۱۷ فیصد پروجیکٹ رپورٹیں تیار کر رہے ہیں۔ ہر تین مہینے بعد ان کارروائیوں اور پروگراموں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

غریبی دور کرنے کا پروگرام

بنکوں نے غریبی دور کرنے کے بہت سے پروگراموں کو مالی امداد دی، مثلاً دیہات

کی مربوط ترقی کا پروگرام، رعایتی شرح سود کے قرضوں کی اسکیم وغیرہ۔ ان قرضوں سے پیداوار بڑھانے میں معاون اسکیموں کی ہمت افزائی کی گئی۔

دیہات کی ترقی کا مربوط پروگرام

یہ پروگرام ۷۹-۱۹۷۸ء سے چل رہا ہے۔ اس کا مقصد خطِ افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی مدد کرنا ہے۔ شروع میں یہ ۲۳۰۰ بلاکوں میں شروع کیا گیا تھا لیکن ۲ اکتوبر ۱۹۸۰ء سے یہ ملک کے ۵۰۱۱ بلاکوں میں پھیلا دیا گیا۔ اس کے تحت غریب کنبوں کو قرضے، تکنیکی امداد بشمول تربیت اور ضروری سامان فراہم کیا جاتا ہے تاکہ وہ کوئی ایسا کام شروع کر سکیں جس سے ان کی آمدنی مستقل ہو سکے۔ خط افلاس کی تعریف خاندان کی سالانہ آمدنی کے تعلق سے اب بدل گئی ہے۔ یہ ۳۵۰۰ روپے سے ۶۴۰۰ روپے سالانہ آمدنی تک کے کنبے ہیں۔ البتہ ابھی تک صرف ایسے کنبوں کو ہی اس زمرے میں شامل کیا جاتا ہے جن کی سالانہ آمدنی ۴۸۰۰ روپے ہے۔ ان کو مدد دے کر ان کی آمدنی ۶۴۰۰ روپے سالانہ تک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

چھٹے منصوبے میں ۱۶٫۵۵ ملین کنبوں کو مدد دی گئی جب کہ اس مدت کے لیے ۱۵ ملین کنبوں کو مدد دینے کا نشانہ رکھا گیا تھا۔ اس پروگرام کے تحت ۳۱۰۰ کروڑ روپے بانٹے گئے جبکہ صرف ۳ ہزار کروڑ روپے بانٹنے کا نشانہ تھا۔ پروگرام کی کل سرمایہ کاری ۴۷۶۲ کروڑ روپے ہے۔ جب کہ ۴۵۰۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کا نشانہ رکھا گیا تھا۔

رعایتی شرح سود پر قرضے

پبلک سیکٹر بنکوں نے ۱۹۷۳ء میں غریب عوام کو رعایتی شرح سود پر قرض دینے کی اسکیم چالو کی۔ اس کے تحت ۴ فیصد شرح سود سے رقم لے کر آمدنی بڑھانے والا کوئی پراجیکٹ شروع کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس شخص کی آمدنی دیہی علاقوں میں ۲ ہزار روپے سالانہ سے اور شہری علاقوں میں ۳ ہزار رو[illegible]لانہ سے زیادہ نہ ہو۔ شروع میں بنک کُل قرضوں کا اعشاریہ ۵ فیصد اس اسکیم کے تحت دے رہے تھے جو بعد میں ایک فیصد ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۷۲ء سے ستمبر ۱۹۸۵ء تک اس اسکیم کے تحت کھاتوں کی تعداد ۲۶ ہزار سے بڑھ کر ۴۲٫۹۶ لاکھ ہو گئی۔ اس اسکیم کے تحت دئے گئے قرضوں کی رقوم اس عرصے میں ۳٫۸ لاکھ سے بڑھ کر ۴۶۵٫۲۷ کروڑ روپے ہو گئی۔ فی کھاتہ قرضے کا اوسط ۳۳۵ روپے سے بڑھ کر ۱۰۸۴ روپے ہو گیا۔ اس اسکیم کے تحت دئے گئے قرضوں کا ۷۳ فیصد دیہی اور نیم شہری علاقوں میں بانٹا گیا جب کہ ان کے لیے ۶۶٫۶۷ فیصد کا نشانہ تھا، شیڈولڈ کاسٹ/ٹرائب نے اس سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا۔

سماج کے کمزور طبقات کیلئے قرضے

چھوٹے اور مارجنل کسان، بے زمین مزدور، شکمی کسان۔ سماج کے کمزور طبقات میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دستکار، دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں سے فائدہ اٹھانے والے دیہات کی مربوط ترقی سے فیض پانے والے وغیرہ بھی اس زمرے میں آتے ہیں۔

ستمبر ۱۹۸۵ء کے آخر تک پبلک سیکٹر بنکوں نے سماج کے کمزور طبقات کو ۴۱۴۴ کروڑ ۳۳ لاکھ روپے کے قرضے دئے جو ۱۵۹ لاکھ ۵۸ ہزار افراد کو دئے گئے۔ اس طرح سے بنکوں کو قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد ترقی پذیر معیشت کے مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مدد ملی۔ ●

بقیہ، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن

یہ سیل یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UNIVERSITY GRANTS COMMISSION) پونے یونیورسٹی (PUNE UNIVERSITY) نیشنل فلم آرکائیوز آف انڈیا (NATIONAL FILM ARCHIVES OF INDIA). اور پونے کے فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ (FILM & TELEVISION INSTITUTE OF PUNE) کے اشتراک اور تعاون سے کام کرنے گا۔ یہ مرکزی سیل فلم اسٹڈی سنٹروں اور علاقائی سنٹروں کے طریقۂ کار پر قومی سطح پر رابطہ برقرار رکھے گا۔ طلبار کی تعلیم و تربیت کے لیے خصوصی تعلیمی یعنی (EDUCATIONAL) فلمیں تیار کرے گا اور اس کے ساتھ ہی تربیتی پروگرام، کانفرنسوں اور مذاکروں کا اہتمام بھی کرے گا۔

اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے پچھلے سال ماہ مئی، جون کے دوران پونے یونیورسٹی یو۔جی۔سی۔ آر۔ آئی پونے، نیشنل فلم آرکائیوز کے اشتراک سے چار ہفتے کا ایک فلم اپری سی ایشن (FILM APPRECIATION) ورکشاپ کا اہتمام کیا تھا۔ اس تربیتی پروگرام میں ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں کے ۲۴ اساتذہ نے شرکت کی تھی۔

یہ تمام اقدامات اس امر کے ترجمان ہیں کہ ہماری دانش گاہیں بھی اب سینما کی مقبولیت کے ساتھ اس کے صحت مند اثرات کی اہمیت اور افادیت محسوس کر رہی ہیں۔ ●

کمل نین کابرا

پبلک سیکٹر کے بینک اور ان کے مسائل

مصنف کا بیان ہے کہ ہمارے سسٹم میں جو عدم توازن پیدا ہو گئے ہیں اور آسے مسخ کر رہے ہیں، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بینکوں کے کام کاج نے بامقصد طور پر نہ سہی، واقعاتی طور پر سرمایہ داروں کو فروغ دینے میں مدد دی ہے۔ پبلک سیکٹر کے بینک نوعیت کے لحاظ سے پرائیویٹ بینکوں سے مختلف نہیں ہیں۔ اُن کے مطابق آج ان بینکوں کے سامنے بڑا چیلنج افراطِ زر پر قابو پانا اور سماجی مقاصد کے مطابق سرمایہ کاری کے طریق کا تعین کرنا ہے۔

کمرشل بینکوں کو قومیانے کے معاملے کو متعدد مختلف تناظروں میں دیکھا گیا ہے۔ کمرشل بینکوں نے ایک چوتھائی صدی سے زیادہ عرصے تک حکومت کی براہِ راست نگرانی اور ملکیت کے تحت کام کیا ہے جس کے نتیجے میں کئی اہم تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تبدیلیاں ازخود بینکنگ نظام میں تبدیلی کے باعث عمل میں آئی ہیں۔ پُر زور الفاظ میں کہا جائے تو یہ ایک سادہ سا خیال ہو سکتا ہے۔ اسی عرصے کے دوران بیشتر دیگر عوامل سرگرم کار رہے ہیں۔ متعدد دیگر امور زیادہ اہم رہے ہیں جو بعض لحاظ سے بینکنگ کے دائرہ میں تبدیلیوں سے آزاد ہیں۔ سماجی دائرہ میں یہ امر ہمیشہ آسان نہیں ہوتا کہ علت کی ابتدا اور سمت کا تعین کیا جائے۔ جو بات اہم اور بظاہر قابلِ قبول ہے وہ یہ ہے کہ قومی ملکیت کے بینک تبدیلیوں سے وابستہ رہے ہیں اور یہ بخوبی دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان تبدیلیوں کو لانے میں ان کا ہاتھ ہے۔ یہ بات ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۹ء تک اور ۱۹۶۹ء سے ۱۹۸۶ء کے عرصوں کے دوران ملکی معیشت کے تعلق سے بینکوں کی کارکردگی کے مطالعے کی بنا پر واضح ہو جائے گی۔

بینکوں کی قومی ملکیت کیوں؟ قومی ملکیت میں جانے کے بعد بینکنگ نظام نے تبدیلیاں لانے میں جو حصہ ادا کیا ہے اُس کی طرف کچھ توجہ دینے سے پہلے ایک بات کو واضح کرنا اہم ہے۔ وقت کے کسی خاص حصے میں کوئی بھی اہم فیصلہ، مثال کے طور پر بینکوں کو قومیانے کا فیصلہ ازخود متعدد سماجی اور اقتصادی امور کا مرہونِ منت ہے۔ ایسے امور جمع ہو جاتے ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اُن مقاصد کا تعین کرتے ہیں جنھیں فیصلہ ساز حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ایسے تاریخی فیصلے کے فوراً بعد کے عرصے میں کچھ وقت تک یہ مقاصد ایک قسم کی برتر قدر و قیمت کے حامل ہو سکتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خصوصاً اس حقیقت کے پیشِ نظر طویل عرصے تک ان امور کا کوئی جواز ہے جبکہ نہ صرف واقعاتی حالات بدل جاتے ہیں بلکہ دیگر متعدد سماجی عوامل کے سرگرم ہونے سے بھی نئی ضروریات، دباؤ، ذرائع اور سوجھ بوجھ عمل میں آتی ہے۔

بینکوں کو قومیانے کے ارادے کے ضمن میں

صرف اسی طور پر یہ استدلال دیا جا سکتا ہے کہ سبز انقلاب کی آمد کے ساتھ بھارتی زراعت کا قرضہ سے متعلق ضروریات کے لیے سرمایہ کی ابھی کی مجبوری ایک بڑا سبب تھا جس سے بینکوں کا قومیایا جانا ممکن ہوا۔ جن علاقوں میں بینک نہیں تھے وہاں بڑی تعداد میں بینکوں کے ذریعہ معیشت کی بچتوں کو جمع کرنے کے لیے یہ لازمی تھا کہ ملک کے بہت بھاری حصے میں بینکوں کا جال پھیلایا جائے۔ بینکوں کی شاخوں کی اس توسیع کا مقصد یہ تھا کہ توسیع پذیر صنعت، تجارت اور تیسرے شعبے کی دیگر سرگرمیوں کے لیے قرضہ کے وسائل کو کم کیے بغیر ایسے وسائل کی شیرازہ بندی کی جائے جن سے زراعت کی مالی ضروریات پوری کرنے کے لیے قرضہ کا انتظام کیا جا سکے۔ بینکوں کو سرکاری ملکیت میں لینے کا یہی صرف مقصد نہیں تھا بلکہ اجارہ داریوں پر کنٹرول کرنا، ملک کے قرضہ جاتی نظام پر چند صنعتی گھرانوں کے غلبہ کو کم کرنا اور چھوٹے چھوٹے لوگوں کی قرضہ کی ضروریات کو پورا کرنا بھی ان کے مساوی طور پر اہم مقاصد تھے۔ آج جب کوئی بینکنگ نظام کی کارکردگی کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ جانکاری کے دائرہ کو محض ان ابتدائی مقاصد تک ہی محدود نہیں کر سکتا۔ ایک بات ہے کہ سبز انقلاب مضبوطی سے جم گیا ہے گو بینکنگ اداروں پر کنٹرول نہ رہنے سے بڑے بڑے صنعتی گھرانوں کے کنٹرول کے تحت اثاثہ جات اور لین دین کی رقوم کی شرح ترقی رک نہیں سکی۔

قیمتوں میں استحکام کے لیے

پس، صنعت کاری کے بعد بینکنگ نظام کا جائزہ اس کی عام کارکردگی اور اقتصادی منصوبہ بندی اور پالیسی کے بنیادی مقاصد کے سیاق و سباق میں لیا جانا چاہیے۔ جیسا کہ مالی نظام کی کارکردگی پر نظر ثانی کرنے والی کمیٹی نے بتایا ہے۔ پلان کی ترجیحات کے مطابق معیشت کے مختلف سیکٹروں میں بچتوں کی شیرازہ بندی اور ان وسائل کی تقسیم ترقیاتی منصوبہ بندی کے عمل کے کلیدی عناصر ہیں۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے پنجسالہ منصوبہ میں واضح کیا گیا ہے، مالی اور قرضہ جاتی پالیسی اور بینکنگ نظام کے رول کو قیمتوں میں استحکام برقرار رکھنے اور ترقیاتی منصوبہ بندی کی ضروریات کے مطابق سرمایہ کاری اور تجارتی سرگرمیوں کو منضبط کرنے کے رول کے طور پر دیکھنا ہوگا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قومی ملکیت کے بینک وسائل کی شیرازہ بندی کرتے ہیں اور قرضہ فراہم کرنے کا اہم ذریعہ ہیں۔ اس حیثیت سے انھیں بچتوں کو جمع کرنا اور پھر انھیں بامقصد طریقے پر کام میں لانا ہے اور وہ بھی اس ڈھنگ سے کہ اشیا کی قیمتوں میں استحکام پیدا ہو سکے۔ جو اعداد و شمار دستیاب ہیں اُن کی بنیاد پر آئیے ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ بینکنگ نظام ان مقاصد کو کس حد تک پورا کر سکا ہے۔

اقتصادی ترقی کے لیے

اس عرصے کے دوران جی ڈی پی (کل گھریلو پیداوار) میں پبلک سیکٹر کا حصہ تقریباً ۱۵ فیصد سے بڑھ کر تقریباً ۲۵ فیصد ہو گیا ہے۔ ۷۱-۱۹۷۰ء سے ۸۴-۱۹۸۳ء تک کے عرصے کے دوران زرعی پیداوار اوسطاً ۲ء۴ فیصد کی سالانہ شرح سے بڑھی ہے اسی عرصے کے دوران صنعتی پیداوار کا اعشاریہ ۴ء۷ فیصد اوسطاً سالانہ کی شرح سے بڑھا ہے۔ اسی عرصے کے دوران تھوک قیمتیں ۵ء۹ فیصد سالانہ شرح سے بڑھ گئیں لیکن ابتدائی اشیا کی قیمتیں ۹ر۱ فیصد سالانہ کی شرح سے بڑھیں جبکہ مصنوعات کی قیمتوں میں ۸ء۹ فیصد سالانہ کی شرح سے اضافہ ہوا۔ جس طرح خوراک اور غیر خوراک زرعی اجناس کی پیداوار میں سال بہ سال بھاری اتار چڑھاؤ ہوا اُسی طرح بالعموم اور زرعی اجناس کی قیمتوں کی سطح میں بالخصوص سال بہ سال بھاری اتار چڑھاؤ ہوا۔ مثال کے طور پر اس عرصے کے دوران بنیادی اشیا کی قیمتوں میں دو برس میں ۲۵ فیصد اضافہ ہوا۔ مصنوعات کی پیداوار کی افزائش کی راہ استحکام سے بہت دور رہی۔ ایندھن، برقی قوت، بجلی اور تیلوں کی قیمتوں میں سب سے زیادہ تیزی سے اضافہ ہوا۔ سالانہ اوسط شرح افزائش ۱۳ء۱ فیصد رہی۔ اس عرصے کے دوران جی ڈی پی میں ثانوی سیکٹر کا حصہ ۲۱ فیصد سے کچھ زیادہ بڑھا جبکہ تیسرے سیکٹر میں ۴۰ء۷ فیصد تک بھاری اضافہ ہوا اور زرعی سیکٹر میں گراوٹ آئی اور وہ ۳۸ء۲ فیصد تک پہنچ گیا۔

قومی ملکیت اور اُس کے بعد

اقتصادی کارکردگی کے اس ماحول میں آئیے، ہم بینکنگ کے سیکٹر کی کارکردگی کی بعض علامتوں پر نگاہ ڈالیں۔ قومی ملکیت میں جانے کے فوراً بعد بینکوں کی توسیع میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور اُن کی کارکردگی میں دسیوں گونا گوں آئی۔ پہلے جہاں ۶۵ ہزار آبادی کے پیچھے ایک بینک تھا وہاں اب ۱۵ ہزار کی آبادی کے لیے ایک بینک کا قیام ہو گیا۔ بینکوں کے گاہکوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اور لین دین اور بینکوں کے مابین روپے پیسے وغیرہ کی منتقلیاں بھی بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ جیسا کہ

مالی نظام کی کارکردگی پر نظرثانی کرنے والی کمیٹی نے بتایا ہے۔ ۱۹۸۰ء کے آخر میں بینکوں کے گاہک ایک کروڑ سے زیادہ تھے جو روزانہ اندازاً ۴۰ لاکھ لین دین کرتے تھے اور بینکوں کے مابین ۱۰ لاکھ مالی منتقلیاں ہوتی تھیں۔ بینک شاخوں کی کل تعداد میں دیہی شاخوں کی تعداد ۱۹۶۹ء میں ۲۲ فیصد کے مقابلے میں بڑھ کر ۵۶ فیصد ہوگئی۔

مجموعی توسیع

بینکنگ کی عادت عوام میں بڑھی اس کے نتیجے میں بینکوں کے کل ڈپازٹ جون ۱۹۸۴ء کے آخر میں تقریباً ۶۴ ہزار کروڑ روپے تک بڑھ گئے جبکہ ان کے مقابلے میں جون ۱۹۶۹ء میں ڈپازٹ ۴۶۴۲ کروڑ روپے کے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں بینکوں میں ۳ کروڑ ۸۰ لاکھ اکاؤنٹ تھے جو جون ۱۹۸۱ء کے آخر میں بڑھ کر ساڑھے ۱۴ کروڑ ہوگئے اس کا مطلب یہ ہے کہ بینک اکاؤنٹوں کی تعداد ملک کے عوام کی تعداد کے کم و بیش پانچویں حصے کے برابر ہے۔ یہ ڈپازٹ قومی آمدنی کے فیصد کے طور پر ۱۹۶۹ء میں ۱۵ فیصد سے بڑھ کر ۱۹۸۴ء میں ۳۸ فیصد ہوگئے۔ کرنسی اور ڈپازٹ کا تناسب جو مارچ ۱۹۵۱ء میں ۵۳ء۱ تھا وہ مارچ ۱۹۸۴ء میں گر کر ۳۰ء۵ فیصد رہ گیا۔ یہ بھاری گراوٹ ملک میں ڈپازٹوں کی ترقی کو نمایاں کرتی ہے جو بینکنگ نظام کی تیز رفتار ترقی کے باعث قابل ذکر ہے۔ یقینی طور پر قیمتوں کی شرح افزائش اور کالے دھن کی شرح افزائش نے بھی بینکوں میں ڈپازٹوں کو بڑھانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔

طویل المیعادی سرمایہ کاری میں اضافہ

بینکوں اور ڈپازٹوں کی اس توسیع کے ساتھ ساتھ ترجیحی سیکٹر کو دیا جانے والا قرضہ ۱۴ فیصد سے ۳۶ء۷ فیصد بڑھ گیا ہے، جس کا مطلب ہے کہ اس قرضے کے حصے میں متناسب کمی ہوئی ہے جو بڑے بڑے اور درمیانہ صنعتی اور تجارتی اداروں کی اجارہ داری میں جاتا تھا۔ بلاشبہ پرائیویٹ بینکوں کے روایتی گاہکوں کو دیے جانے والی کل رقم کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۳ء تک کے عرصے کے دوران دیہی شاخوں کے قرضہ ڈپازٹ کا تناسب ۴۷ء۲ فیصد سے ۵۹ء۱ فیصد بڑھ گیا ہے۔ ترجیحی سیکٹر کو بینکوں کا کل قرضہ ۱۹۸۴ء کے آخر میں ۱۵ ہزار کروڑ روپے کی سطح تک پہونچ گیا۔ ایک اور حوصلہ مندانہ پہلو یہ ہے کہ میعادی قرضوں کا حصہ ۷۰ کی ابتدائی دہائی میں تقریباً ۱۴ فیصد سے ۱۹۸۱ء میں تقریباً ۲۴ فیصد تک بڑھ گیا۔ ۱۹۸۱ء کے آخر میں میعادی قرضہ جاتی کھاتے کل کھاتوں کے ۴۱ فیصد تھے اس طرح بلوں کی ادائیگی پر خود بخود ختم ہو جانیوالے قلیل المیعادی قرضوں سے — جو انگریزی حکومت کے دنوں میں رائج تھے — طویل المیعادی قرضوں تک پہنچنے میں ہم نے لمبا فاصلہ طے کیا ہے۔ ۵ برس سے زیادہ میعاد کے ڈپازٹوں کے تناسب میں بھی اضافہ ہوا ہے جو تمام میعادی ڈپازٹوں کے ۶۲ فیصد ہوگئے ہیں۔ یہ تناسب ۶ء۲ فیصد تک کم ہوتا تھا۔ بینکوں کا وسیع جال پھیل جانے سے بچتوں کا تناسب کل گھریلو بچتوں کے مالی اثاثہ جات کی صورت میں ۱۹۵۵-۵۶ء کے دوران ۳۶ فیصد سے ۱۹۸۳-۸۴ء کے دوران ۵۴ء۱ فیصد تک بڑھ گیا ہے۔

بڑھتے ہوئے واجب الادا قرضے

قومیائے ہوئے کمرشل بینکوں کی کارکردگی کے بارے میں بعض پریشان کن پہلوؤں کو اکثر نمایاں کیا جاتا ہے۔ ایک بات ہے کہ کچھ عرصے سے ڈپازٹوں کی توسیع کی رفتار قدرے سست پڑ گئی ہے۔ اگرچہ دیہی اور زرعی سیکٹر کو بینک قرضوں سے بڑا فائدہ پہنچا ہے (چھوٹی اور بڑی زمینوں کے کسانوں کے درمیان قرضہ کی تقسیم کے سوال تو درکنار) بینکوں پر واجب الادا قرضوں کا بھاری بوجھ پڑ گیا ہے۔ جون ۱۹۸۲ء کے آخر میں دیہی قرضوں کے سلسلے میں مانگ کے مقابلے میں وصولی کا تناسب ۵۲ء۲ فی صد تھا۔ اس سے نہ صرف فنڈوں کی گردش محدود ہوگئی ہے بلکہ بینکوں کے منافع اور استحکام پر بھی برا اثر پڑا ہے۔ یہ بات اور بھی زیادہ ناقابلِ معافی ہو جاتی ہے کیونکہ نادہندگان کی بڑی تعداد ایسے بڑے بڑے کاشت کاروں پر مشتمل ہے جو قرضے لوٹانے کی بہتر صلاحیت رکھتے ہیں۔ غیر منتظم اور جوکھم والے زرعی قرضوں کے معاملے میں نادہندگی کی بلند شرح کی وجہ جاننے کے لیے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے جبکہ صنعتی سیکٹر میں کم وصولی کا برا اثر ایک لاکھ یونٹوں پر پڑا ہے جو تمام جماعتوں، گروپوں اور تالہ بندیوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جنکے اثاثہ جات ۳ ہزار کروڑ روپے سے زیادہ ہیں۔ جون ۱۹۸۳ء کے آخر میں ایسے صنعتی یونٹوں (یعنی ایسے یونٹ جو سر دست قرضہ لوٹانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں) کے قرضے کا حصہ صنعتی سیکٹر کے کل قرضے کا تقریباً ۱۴ فیصد کے برابر تھا۔

قرضوں کی کم وصولی

خیال کیا جاتا ہے کہ ڈپازٹوں اور قرضوں کی بھاری مقدار سے بینکوں کی آمدنی کم ہوگئی ہے۔ کم آمدنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ کارکردگی پر بہت زیادہ لاگت آتی ہے چونکہ بینکوں کو کم سود والی سرکاری ہنڈیوں پر سرمایہ لگانا ہوتا ہے اسلیے اُن کی آمدنی ایک خاص حد تک کم رہتی ہے۔ زیادہ سود والے میعادی ڈپازٹوں کے بڑھنے سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ نئی

شاخوں کو کھولنے سے بھی ابتدائی مرحلوں میں نسبتاً زیادہ لاگت آتی ہے۔ قرضوں کی وصولی میں کمی سے بھی منافع جات کم ہو جاتے ہیں۔ ان امور کے باوجود جن پر بینکوں کا نسبتاً کم کنٹرول ہو سکتا ہے یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ عملے، خراب لیبر تعلقات، کارکردگی کے معیار اور منتظمین کے غیر جدت طرازانہ طریقوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم بینکوں کے کل اخراجات میں ادارتی لاگت کا حصہ بہت کم ہو گیا ہے۔

بڑے صنعتی گھرانوں کو بھاری قرضے

کل قرضے میں بڑے بڑے صنعتی گھرانوں کے قرضوں کا حصہ غیر متناسب طور پر بہت زیادہ ہے۔ اگر ترجیحی سیکٹر کے قرضوں کو اس میں سے نکال دیا جائے تو پھر بھی اُن کا قرضہ بینکوں کے قرضے کا بہت بڑا حصہ ہوگا۔ یہ بینکوں کی قومی ملکیت کے اجارہ داری شکن کردار پر ایک بہت بڑا سمجھوتہ ہے۔ کیا ۶۰ کی دہائی کے وسط کے بعد سے جو صنعتی ترقی ہوئی ہے اُس کے سلسلے میں بڑھتے ہوئے مارکیٹ اور پرائیویٹ سیکٹر پر مبنی دستور کار کے ساتھ یہ کردار قطعی ممکن ہے۔ یہ ایک سنگین مفروضہ ہے۔ آخر کار ۲۵ بڑے بڑے صنعتی گھرانوں کو جن اثاثہ جات پر کنٹرول حاصل ہے وہ ۸۳-۱۹۸۰ کے دوران محض تین برسوں میں تقریباً ۶۰ فیصد بڑھ گئے۔ اگرچہ بینکوں کی قرضہ دینے کی پالیسیوں سے جن میں اجارہ داری کے خلاف زور دیا گیا ہے "ایم آر ٹی پی" (تجارتی سرگرمیوں کی اجارہ داری اور محدودیت) اور "فیرا" (غیر ملکی زرمبادلہ کو منضبط کرنے والے قانون)، گروپوں کے کنٹرول کے تحت اثاثہ جات اور بکری کی توسیع میں رکاوٹیں پڑ سکتی تھیں تاہم یہ ناممکن ہے کہ یہ پالیسیاں اس صورت میں خصوصاً مؤثر ثابت ہو سکتی تھیں جس صورت میں کہ اتنے زیادہ میعادی قرضے دینے والے ادارے ایسے صنعتی پراجیکٹوں کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کے لیے قائم کیے گئے ہیں جن پر بڑے بڑے گھرانوں کو کنٹرول حاصل ہے۔ بڑے بڑے تجارتی گھرانوں کے براہ راست کنٹرول کے باہر ان بینکوں کی محض موجودگی سے اجارہ داریوں کی افزائش کو روکا نہیں جا سکتا جب تک اس مقصد کے لیے ایسی پالیسیاں وضع نہ کی جائیں جن پر عمل کیا جا سکے۔ ہم نے بینکوں کی کارکردگی کے بعض پہلو اور بھارتی معیشت سے متعلق بعض بڑی بڑی اقتصادی تبدیلیوں کی کارکردگی بھی دیکھی ہے۔ بینکوں کی پالیسیوں اور کام کاج کا تعلق شرح ترقی کی نسبت زیادہ تر سرمایہ کی فراہمی اور قیمتوں کی سطح کے عمل سے ہے۔ اس کے نتیجے میں بینکوں کی کارروائیاں ترقی کے سیکٹر کی تشکیل اور آمدنی و دولت کی علاقائی، بین طبقاتی اور بین شخصی تقسیم پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بینکوں کی کارروائیوں سے پیدا ہونے والے اثرات کے علاوہ دیگر بیشتر اثرات معیشت کے طرز افزائش اور استحکام سے تعلق رکھتے ہیں۔ بھارت میں معاشی استحکام کے ماحول میں افزائش کی شرح و طرز کو سماجی صورت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مارکیٹ کے نظام میں تبدیلی لانے کے کام کے لیے منصوبہ بندی بڑا ذریعہ بنی ہے۔ ہمارے سسٹم میں جو بنیادی عدم توازن پیدا ہو گئے ہیں اور بگاڑ پیدا کر رہے ہیں (جن کا اظہار نسبتاً "جی ڈی پی" میں صنعت کے کم حصے، تیسرے سیکٹر کی ضرورت سے زیادہ توسیع، خصوصاً اس کے غیر پیداواری، غیر منتظم عنصر اور مختلف سیکٹروں کے آمدنی اور روزگار کے حصوں کے درمیان عدم تناسب، عام قیمتوں کی سطح کے غیر منصوبہ بند اور کنٹرول سے بے نیاز افزائش اور روزگار اور مالیات وغیرہ کے منظر کے بگاڑ کی صورت میں موجود ہے) ان سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ مارکیٹ کی قوتوں نے جو رجحانات پیدا کیے ہیں انھیں درست کرنے میں بالعموم منصوبہ بندی اور بالخصوص بینک کا طریق کار غیر مؤثر ثابت ہوا ہے۔

سرمایہ داری کی نشو و نما

اس کے ساتھ ہی یہ ضرور کہا جائے گا کہ ان پالیسیوں اور منصوبوں نے واقعاتی طور پر (با مقصد طور پر، نہ سہی)، بھارت میں سرمایہ داری کے فروغ کو بڑھاوا دینے میں مدد دی ہے۔ ایسی ترقی کے لیے بڑی مالی ترقی کی ضرورت ہے۔ مالی نظام کی کارکردگی پر نظر ثانی کرنے والی کمیٹی کی رپورٹ کی طرف سے فراہم کردہ مالی ترقی کی متعدد علامتوں سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ مالی نظام نے سرمایہ داری کی ترقی میں مدد دی ہے اور اس کے بدلے میں اس سے ثبات پایا ہے۔ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ مالی ڈھانچہ قومی آمدنی کے مقابلے میں تیزی سے بڑھا ہے۔ گذشتہ برسوں میں خالص سرمایہ سے مالی کلیمز کا تناسب بڑھ گیا ہے۔ مختلف یونٹوں میں بچتوں اور سرمایہ کاری کے عوامل بہت حد تک الگ الگ ہو گئے ہیں۔ بچتوں نے بڑے پیمانے پر ادارتی صورت اختیار کرلی ہے جیسا کہ معیشت میں مالی اثاثہ جات کی بڑھتی ہوئی ملکیت سے ظاہر ہے۔ تمام مالی کلیمز میں بینکوں کا حصہ بھی رفتہ رفتہ بڑھتا ہے۔ معیشت میں اقتصادی سرگرمیوں کے لیے سرمایہ کاری میں غیر ملکی سیکٹر کا رول ملکی سرمایہ کاری کے رول کے مقابلے پر کم ہو رہا ہے۔ ملکی بچتوں کے کنٹرول میں حکومت کا حصہ کافی بڑھ گیا ہے چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مالیاتی ترقی، ملکی بچتوں کے کنٹرول میں پبلک سیکٹر کے بینکوں کی بھاری امداد کے ساتھ بھارت میں ایک نئی بلندی پر پہنچ گئی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ چونکہ اس عمل میں پبلک سیکٹر کے بینک اور حکومت شامل ہوئی ہے اس لیے یہ نتیجہ اُس نتیجے سے کیونکر مختلف

جو خالصتاً یا زیادہ تر مارکیٹ کے عوامل سے پیدا ہو سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی مداخلت یا شرکت کے بغیر اتنی بڑی مالیاتی ترقی اُس حد تک عمل میں نہیں آ سکتی تھی جس حد تک وہ آئی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مالی سیکٹر کو ترقی دینے کے عمل میں پبلک سیکٹر کے بینک ترقی کی طرز اور سمت میں ایسی کوئی تبدیلی نہیں لائے جسے مارکیٹ نہیں لا سکتی تھی یا اُسے قابلِ قبول نہیں پا سکتی تھی۔

بھارت میں پبلک سیکٹر کے بینک کالٹی کے لحاظ سے پرائیویٹ بینکوں سے مختلف نہیں بن سکے اس نے بعض مروجہ طریقوں میں ردّو بدل کیا تاکہ قرضہ کی بعض ایسی زائد مانگوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ترقی کی رفتار کو تیز کیا جا سکے جنھیں پرائیویٹ بینکوں نے زیادہ امکانی طور پر نظر انداز کر دیا ہوتا۔ یہ امر سماجی بینکنگ سے بہت دور ہے۔ معیشت کو جو بنیادی ڈھانچہ دیا جانا چاہیئے تھا وہ نہیں دیا گیا۔ لیکن ممکنہ سرگرمیوں کی درمیانی راہ کو جو مارکیٹ کے متعینہ نتائج کو سماجی لحاظ سے پسندیدہ بنا سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ محض ضمنی طور پر آزمایا جانا چاہیئے تھا۔ اس شعبے میں ہمارے بینک بڑی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں اگر اُن کے امور اور مقاصد کی موزوں طور پر از سرِ نو تشریح کی جائے بینک کے کارکنوں پر پیش آنے والی مشکلات اور مروت سے نا آشنا سلوک یا شاخوں کی کارکردگی یا صدر دفاتر کے معمول کے کام کاج کے بارے میں شکایات نسبتاً معمولی نوعیت کی ہیں۔ بڑا چیلنج یہ ہے کہ افراطِ زر پر قابو پانے اور سماجی مقاصد کے مطابق سرمایہ کاری کے طریقے کا تعین کرنے کے لیے بینکوں کا بڑے اقتصادی انتظام کے ذرائع کے طور پر موثر استعمال کیا جائے۔ یہ کام محض انتظامیہ بورڈوں کے کمروں میں بیٹھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ اسے تو موزوں رہبرانہ خطوط فیصلہ جاتی اصولوں اور معلومات کی ترسیل کو فروغ دے کر اور اُن کا نفاذ کر کے انجام دیا جا سکتا ہے، جس سے ہر شاخ سماجی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کام کر سکے۔

●

بقیہ، اقلیت کی آبادی میں اضافہ

لکشدیپ	٤٫٧٤	٩٤٫٨٤	٠٫٦٦	—	—	—
میزورم	٧٫٤١	٠٫٤٥	٨٣٫٨١	٠٫٠٩	٨٫١٩	—
پانڈیچری	٨٥٫٥٧	٦٫٠٦	٨٫٢٦	—	٠٫٠١	٠٫٠٥

مندرجہ بالا گوشوارے کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اکثریتی فرقے کی آبادی ملک کے چند ریاستوں کو چھوڑ کر آج بھی کثیر تعداد میں ہے اب ایک نظر اس گوشوارے پر بھی ڈالیں جس سے ملک کی کُل آبادی مختلف طبقوں کی روشنی میں نمایاں ہوتی ہے۔ اس گوشوارے سے مختلف طبقوں کی فیصد آبادی کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

ان گوشواروں کے پیشِ نظر مختلف اقلیتی طبقوں کے فیصد اضافے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اقلیتی طبقے چاہے وہ مسلم ہوں یا عیسائی، سکھ ہوں یا بدھ اور جین۔ اس ملک میں ان کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور یہ اضافہ ان کے استحقاق اور خوشگوار زندگی کے تقاضوں کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔

●

طبقوں کی فیصد آبادی

اقوام	آبادی	اضافہ
ہندو	٥٤,٩٧,٧٩,٤٨١	٨٢٫٦٤
مسلم	٧,٥٥,١٢,٤٣٩	١١٫٣٥
عیسائی	١,٦١,٦٥,٤٤٧	٢٫٤٣
سکھ	١,٣٠,٧٨,١٤٦	١٫٩٦
بدھ	٤٧,١٩,٧٩٦	٠٫٧١
جین	٣٢,٠٦,٠٣٨	٠٫٤٨
دیگر	٢٧,٦٦,٢٨٥	٠٫٤٢
لامذہب	٦٠,٢١٧	٠٫٠١
کُل	٦٦,٥٢,٨٧,٨٤٩	١٠٠٫٠٠

اقبال محی الدین

سمندر

معدنیات اور ادویات کا خزانہ

آج ہندوستان سائنس کی منزلوں کی بلندیوں پر پہونچ رہا ہے۔ اس نے زمین کی معدنیاتی دولت تو تلاش کر ہی لی ہے، اور ساتھ ساتھ سمندر کی تہوں اور گہرائیوں میں جو بیش بہا دولت اور خزانہ چھپا ہے اس کو تلاش کرنے میں دن رات لگا ہوا ہے۔ اب تک ۲ ملین مربع کلومیٹر سمندری رقبہ کی تلاش کا کام مکمل ہو چکا ہے۔ اس سروے کا مقصد سمندر کی گہرائیوں میں مائننگ سائٹ، مائننگ ٹیکنولوجی اور سمندری ترقیات سے متعلق سائنسی تجربات کرنے کا ہے۔

زور اس بات پر دیا جا رہا ہے کہ سمندری مچھلیوں، آبی پودوں اور بجلی کو کس طرح سمندر سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تجربات اس بات پر بھی کئے جا رہے ہیں کہ سمندر کے کھارے پانی کو تجارتی پیمانے پر پینے کا پانی کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔

شعبہ بحری ترقیات نے پہلا سروے کا کام اس سلسلے میں مکمل کر لیا ہے۔ سمندری پودوں پر سائنسی تحقیق کا کام بھی شروع کیا جا چکا ہے۔ ۲۵ ہزار پودوں کے نمونوں پر یہ تجربات لیبوریٹری میں کئے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بحری معدنیات کو تجارتی پیمانے پر لانے کا کام بھی یہ شعبہ انجام دے رہا ہے۔

سمندری پانی کے نیچے تقریباً ۵۰۰ میٹر کی گہرائی میں انڈر واٹر مائننگ سسٹم کس طرح قائم کیا جائے اور اس کو کس طرح برقرار رکھا جائے حکومت ہند کا شعبہ بحری ترقیات اس پہلو پر بھی کام کر رہا ہے۔ معدنیات کو سمندر کی گہرائی سے حاصل کرنے کا کام بھی ہو رہا ہے۔ ان سب کاموں کو انجام دینے میں شعبہ بحری ترقیات کے لیے چند شعبے معاون ثابت ہو رہے ہیں مثلاً آئل اینڈ نیچرل گیس کمیشن، منسٹری آف شپنگ اینڈ ٹرانسپورٹ، میرین کیمیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی۔ تحقیقی کام تعلیمی اداروں کی مدد سے کیا جا رہا ہے۔

جاپان کی ایجاد کردہ میمبرین ٹیکنیک کے ذریعے سمندری پانی سے یورینیم حاصل کرنے کی بھی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہندوستان کا ایٹومک منرل ڈویژن سمندری پانی سے مونازائٹ اور المینائٹ حاصل کر رہا ہے۔ سائنس دانوں کا یہ خیال ہے کہ بحریات کے سارے پانی میں 6x10⁶ ٹن سونا موجود ہے۔ یہ سونا کس طرح حاصل کیا جائے، سائنس داں تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔ ۸۰ کھرب ٹن پانی سمندروں میں موجود ہے۔ اگر اس میں سے سونا نکالنے کی ترکیب معلوم ہو جائے تو سمندروں سے اتنا زیادہ سونا پیدا ہو سکتا ہے کہ دنیا کا ہر آدمی لکھ پتی بن جائے۔

• اوشن تھرمل اینرجی کنورزن کا پروگرام مدراس کا انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی کر رہا ہے جس کو شعبہ بحری ترقیات، نئی دہلی کی پوری امداد حاصل ہے۔ یہ تجربہ بھی کیا جا رہا ہے کہ سمندری لہروں کے ذریعے بجلی کیسے پیدا کی جائے۔ گجرات اور ویسٹ بنگال کے ساحلی علاقوں پر سمندری لہروں سے بجلی پیدا کرنے کے تجربات کئے جا رہے ہیں۔

شعبہ بحری ترقیات نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی مدد سے بہت سی یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام شروع کروا دیا ہے۔ اور ایسے نصاب بھی متعارف کرائے ہیں جن سے سمندری پودوں، معدنیات اور پانی وغیرہ پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ سمندری سائنس اور ٹیکنولوجی کے ذریعے یہ بھی تعلیم دی جا رہی ہے کہ سمندر کی لہروں، مدوجزر اور سمندری پانی کی حرارت کے تفرقہ سے بجلی کیسے پیدا کی جا سکتی ہے۔

آئیے اب تفصیل سے سمندری دولت کا مطالعہ کریں تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو سکے کہ سمندر ہمارے لیے کس قدر مفید ہے۔ معدنیات کے علاوہ سمندر ادویات کا خزانہ بھی ہے۔ اس کی تفصیل کا بھی مطالعہ ضروری ہے۔

سمندری دولت

سمندر کی گہرائیوں میں جاندار اور نباتات ملتے ہیں جو انسان کی ضرورت کے لیے مفید ہیں۔ مختلف قسم کی مچھلیوں کے علاوہ کچھ ایسے بھی جاندار سمندر کے اندر ملتے ہیں جن کو غذا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

سمندر کے پانی میں مختلف قسم کے معدنیات ملتے ہیں جن کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ بڑے اجزا۔

۲۔ چھوٹے اجزا۔ اور ۳۔ عام طور پر ملنے والے اجزا۔

۱۔ بڑے اجزا میں سوڈیم، میگنیشیم، کیلشیم، پوٹاشیم، کلورین اور سلفر شامل ہیں۔ یہ اجزا سمندری پانی کے ۹۰ فیصد اجزا کو بناتے ہیں۔ یہ ایک لیٹر سمندری پانی میں (100mg) ہوتے ہیں۔ یا فی ملین میں ۱۰۰ حصے۔

۲۔ چھوٹے اجزا میں برومائن۔ کاربن، بورون۔ اسٹرونیشیم، سلی کون اور فلورین شامل ہیں۔ یہ سمندری پانی میں 1mg کی مقدار میں ملتے ہیں یا ایک لیٹر سمندری پانی میں 100mg ہوتے ہیں یعنی IPPM سے زیادہ اور 100 PPM سے کم

۳۔ سمندری پانی میں عام طور پر ملنے والے اجزا میں نائٹروجن۔ لیتھیم، روبی ڈی ام، آیوڈین، آئرن، زنک اور مولیبڈنیم شامل ہیں۔ یہ سمندری پانی میں اس طرح ملتے ہیں کہ ایک بلین حصے پانی میں دس حصہ یہ اجزا شامل ہوتے ہیں۔

تجارتی پیمانے پر سمندری پانی سے حاصل ہونے والی معدنیات میں شامل ہیں برومین، سوڈیم، کلورین اور میگنیشیم۔

سمندر کی تہ سے حاصل ہونے والا کروڈ تیل مختلف شکلوں میں حاصل کیے جاتے ہیں۔ مثلاً پیٹرو کیمیکل، کوکنگ گیس، گیسولین، کیروسین، ڈیزل آئل۔ نیپتھا، پیٹرو کیمیکل، پیچ اور تارکول، لبریکیٹنگ آئل یہ سب اشیا خام مال میں نکالی جاتی ہیں اور ان کو کیمیائی تجزیہ کے ذریعے کارآمد بنایا جاتا ہے۔

۴۵۴ کلوگرام سمندری پانی سے حاصل ہونے والے نمکیات ۳ سے ۱۸ کلو تک ہوتے ہیں۔ جن میں کیلشیم سلفیٹ، میگنیشیم سلفیٹ، پوٹیشیم سلفیٹ، کیلشیم کاربونیٹ اور میگنیشیم برومیٹ پائے جاتے ہیں۔ منگنیز نوڈولس میں ۳۱ء۷ فیصد منگنیز ہوتا ہے۔

سمندر ادویات کا خزانہ

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سمندری پانی بھی ہمارے لیے کتنا مفید ہے جس میں معدنیات کی بہتات ہے۔ اب آئیے یہ دیکھیں کہ سمندر کس طرح ادویات کا خزانہ ہے اور مختلف انسانی بیماریوں کو ٹھیک کرنے کے لیے سمندری ادویات کہاں تک مفید ثابت ہوتی ہیں۔

۱۔ چھوت چھات کی بیماری کا سمندری ادویات سے علاج

سمندر کے اندر ایک ایسا اینٹی وائرل ایجنٹ پایا جاتا ہے جس کو (Caphalo - sporium) کہتے ہیں جو مسل آف ایبالون میں ہوتا ہے۔ یہ سمندری فنگس (Capha- losporium acromonium) بہت تیز اینٹی بائیوٹک کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جس سے انفکشن سے ہونے والی بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔

۲۔ کنٹرا سیپٹیو (برتھ کنٹرول)

سمندر میں پائی جانے والی مچھلی (Plexaura homomalla) سے (Prostaglandin) حاصل کیا جاتا ہے جس کو کیمیائی طور سے متحرک آئی سومر میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اس کو دافع حمل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

۳۔ سینے میں جلن اور گیس بننے کی تکلیف کا سمندری ادویات سے علاج

سمندر کے پانی سے حاصل کی ہوئی منرل میگنیشیا سے ملک آف میگنیشیا تیار کی جاتی ہے جس سے سینے میں جلن اور گیس بننے کی تکلیف کا علاج کیا جاتا ہے۔

۴۔ کینسر کا علاج سمندری ادویات سے

سمندری اسپنج سے (Cytarabin) نامی دوا حاصل کی جاتی ہے جو خون کے کینسر میں استعمال کی جاتی ہے۔ سمندر میں ملنے والے اس اسپنج کو Clarabino Furanosil Cytocine

کہتے ہیں۔ اس سے (Cytarabin) نامی دوا تیار کی جاتی ہے۔

۵۔ شکر آنیکی بیماری (Diabetes)

سمندر میں پائی جانے والی ٹوڈا مچھلی کے زہر سے Diabetes کی بیماری کو ختم کیا جاتا ہے۔

۶۔ پٹھوں کی خرابی کا علاج سمندری ادویات سے

اگر انسانی جسم میں پٹھوں کی خرابی سے خون کے دوران میں رکاوٹ پڑ رہی ہو تو اس بیماری کا علاج بھی سمندر میں پائی جانے والی جاندار نُزلس اور میکرو سسٹک الجی سے الجینک ایسڈ حاصل کر کے اینٹی کو گولینٹ، ہوموا سٹیٹک اور فارماسیوٹیکل ایڈجو وینٹ ایجنٹ کے ذریعہ علاج کیا جاتا ہے۔

۷۔ گھینگے کی بیماری (Goitre)

سمندر میں پائی جانے والی ساری مچھلیاں اور ہر طرح کی سمندری غذا آئی اوڈین سے لبریز ہوتی ہیں۔ اُن کے استعمال سے گھینگے یا گلہڑ کی بیماری کا علاج ہو سکتا ہے۔

۸۔ رات کا اندھاپن (Night Blindness)

رات کے اندھے پن کا علاج بھی سمندری ادویات سے ممکن ہے۔ کوڈ فش لیور آئل جو وٹامن "اے" سے بھرا ہوتا ہے۔ رات کے اندھے پن کو دُور کرتا ہے۔ آنکھ کی روشنی کو برقرار رکھنے کے لیے وٹامن "اے" کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ اس وٹامن کی کمی سے آنکھ کی روشنی کمزور ہو جاتی ہے اور مریض کو رات میں دکھائی نہیں دیتا۔

۹۔ بلڈ پریشر

سمندر میں پائی جانے والی براؤن الجی سے "الجی نون" نامی دوا نکالی جاتی ہے جس کو بلڈ پریشر کے مریضوں کو دیا جاتا ہے۔ اس دوا سے مریضوں کو بہت آرام ملتا ہے۔ اس کے علاوہ (Eledeisin) نامی دوا سمندری (Octopus) سے حاصل کی جاتی ہے جس کو (Hypertension) اعصابی تناؤ کے مریضوں کو دینے سے اُن کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔

۱۰۔ دل کی بیماریاں

کوڈ لیور آئل دل میں چربی کی زیادتی کو روکتا ہے جس سے دل کے مریضوں کو بہت آرام ملتا ہے۔ کوڈ مچھلی سمندر سے ہی حاصل کی جاتی ہے۔ اس مچھلی کے تیل کے استعمال سے (Cholestrol) کی زیادتی میں کمی ہو کر دل کی بیماری سے انسان محفوظ رہتا ہے۔

۱۱۔ پیٹ کے پھوڑے کا علاج

بہت سی سمندری نباتات اور گھاس (Peptic Ulcer) کو ختم کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ سائنس دانوں نے ان (Sea Weeds) کا تجزیہ تجربہ گاہ میں کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے۔

۱۲۔ کوڑھ کی بیماری اور پٹھوں کے کھنچاؤ کی بیماری

سمندری مچھلی پیٹر فش سے (Tetro-dotaxin) نامی دوا تیار کی جاتی ہے جو کھنچے ہوئے پٹھوں کو نرم کر کے اپنی اصلی جگہ پر لاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ دوا درد بھی ختم کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ دوا کوڑھ کی بیماری جس کو (Neurogenic Leprosy) کہتے ہیں اور (Terminal Cancer) کی تکالیف میں بھی راحت پہنچاتی ہے۔

۱۳۔ ورم انفکشن

سمندری لال الجی سے (Kanic Acid) تیار کیا جاتا ہے جو بطور (Anti - helminitic) استعمال کر کے ورم انفکشن کو ختم کیا جاتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سمندر کے پانی سے لے کر اس میں پائی جانے والی نباتات، حیوانات، کیڑے مکوڑے اور اسپنج وغیرہ سے ہم کس طرح مختلف بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ دراصل سمندر ہمارے لیے ایک بیش بہا خزانہ ہے جس سے بنی نوع انسان ہر طرح سے مستفید ہو سکتا ہے۔ سمندر سے معدنیات برآمد کرنے اور سمندری اشیاء سے ادویات تیار کرنے میں ہمارے سائنس داں دل جوئی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ حکومت ہند کا شعبہ بحری ترقیات ہر طرح سے اُن کی امداد کرتا تھا۔

شعبہ بحری ترقیات نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی مدد سے بہت سی یونیورسٹیوں میں سمندری ریسرچ کا کام شروع کرا دیا ہے۔ اس طرح کے تعلیمی نصاب دہلی، کانپور، بنگلور، ناگپور اور مدراس کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنولوجی میں رکھے گئے ہیں۔ اسی طرح کی کوشش دہلی، کوچین، کلکتہ، انامالائی، کرناٹک، آندھرا، برہام پور، مدراس، کوکن، مرہٹواڑہ، کیرالہ اور مدورائی یونیورسٹیوں میں بھی کی جا رہی ہے تاکہ تعلیمی نصاب کے ذریعے سمندری سائنس اور ٹیکنولوجی کی ترقیات ہوتی رہے۔

ڈاکٹر کے۔ بھکتہ وتسل راؤ

نئی تعلیمی پالیسی

اعلیٰ تعلیم کا مقام

ہر ایک قوم میں معاشی، تہذیبی اور سماجی تبدیلیوں کے لیے اعلیٰ تعلیم ایک ذریعہ ہے۔ ایک ہتھیار ہے۔ ایک دانشمندانہ اقدام کے لیے اس کی اہمیت ہے۔ امداد باہمی کا بنیادی حل ہے۔ عوام میں شعور پیدا کرنے کے لیے، ایک نئے تمدن کے لیے اعلیٰ تعلیم کی پرورش ضروری ہے۔ ہمارے ملک میں آزادی کے بعد کے دور کو اعلیٰ تعلیم کا عہد کہہ سکتے ہیں۔ رادھا کرشنن کمیٹی ۱۹۴۸ء کے مطابق یونیورسٹی تعلیم میں سدھار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یو. جی. سی کا قیام عمل میں آیا۔ پندرہ سال کے بعد ۱۹۶۴-۶۶ء میں کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ ہاتھوں میں آگئی۔ اس رپورٹ کا نصب العین قومی ترقی میں تعلیم کو اہم مقام دلوانا تھا۔ موجودہ تعلیمی نظام کے نقائص کو سمجھتے ہوئے تبدیلیاں لانے کے لیے کمی سفارشات اس کمیشن نے کی ہیں۔ کئی اقسام کے نقائص مثلاً بڑے پیمانے پر تعلیمی اداروں میں بھرتی طلباء کی، طلباء کی تعلیمی احاطہ میں عدم دلچسپی، ناقص تعلیمی طور وطریق، غیر منظم امتحانات، طلباء میں بدنظمی وغیرہ منظر عام پر لائے گئے۔

کوٹھاری کمیشن نے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے چند اہم سفارشات کی ہیں۔ ان کا مقصد تعلیمی اداروں میں صرف باصلاحیت طلباء کو داخل کرنا ہی نہیں ہے بلکہ ان کے ذریعے سماجی انصاف لانا بھی ہے۔

چند سفارشات یہ ہیں:-

۱۔ ۱۰+۲+۳ نظام تعلیم شروع کرنا۔
۲۔ حصولِ تعلیم کے مراکز میں منتخب داخلے۔
۳۔ نئے جامعات کی ابتدا پر پابندی۔
۴۔ خود مختار تعلیمی اداروں کا فروغ اور منظوری۔
۵۔ نصاب میں ہندوستانی قومیت، تہذیب، وراثت، آزادی کی جدوجہد جیسے امور کا شمول۔
۶۔ کمزور طبقات کے لیے وظیفوں کی منظوری تاکہ مساوی حقوق مل جائیں۔
۷۔ تعلیم کے نظم ونسق میں نمو لانے کے لیے وسائل کی فراہمی۔

مندرجہ بالا امور کو سامنے رکھ کر مرکزی حکومت وریاستی حکومتوں نے تعلیم کے احاطہ میں کئی تبدیلیاں لانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ پہلی قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۶۸ء کے لحاظ سے اچھے کردار کے شہری کو بنانا ہی ایک بنیادی مقصد تھا۔ مساوی حقوق دلوانا، قومی ترقیاتی کاموں میں طلباء کو شامل کرنا، اشاعتی پروگراموں میں ایک مقام دلوانا بھی اسی پالیسی کے تحت تھا۔ جز وقتی تعلیم، مراسلاتی تعلیم کو بھی فروغ دیا گیا۔ تکنیکی تعلیم کے لیے دس جمع دو کا درجہ اہم قرار دیا گیا، خواہ وہ مرحلہ کالج میں رہے یا اسکول میں۔ مثلاً آندھرا پردیش میں یہ مرحلہ جونیئر کالجوں کی شکل میں ہے۔ تامل ناڈو میں اسکول میں شامل ہے۔

۱۹۷۹ء کی تعلیمی پالیسی کے مطابق جامعہ، کالج اور سماج کے درمیان ربط پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے نتیجہ کی بنا پر نیشنل سروس اسکیم کی ابتدا ہوئی۔ پورے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے احاطہ میں جو کامیابیاں ہوئی ہیں۔ ایک نظر میں ملاحظہ کیجیے:-

۱۔ یونیورسٹی کے احاطہ میں چالیس سال کے دوران طلباء کی تعداد میں اضافہ ہوا اور وہ ۳ لاکھ سے بڑھ کر ۳۱ لاکھ ہو گئی۔

۲۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں صرف ۲۷ جامعات اور ۶۹۵ کالج تھے لیکن ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۱۳۳ جامعات اور ۵۰۱۲ کالج ہو گئے۔

۳۔ پہلے پنجسالہ پلان میں پندرہ کروڑ روپے کی رقم خرچ کی گئی تھی۔ چھٹے پنجسالہ پلان میں یہ رقم بڑھ کر ۴۸۶ کروڑ روپے ہو گئی۔

ہر ایک طالب علم پر حکومت اوسطاً ہمارے ملک میں اجو رقم خرچ کر رہی ہے اسکی تفصیل یہ ہے:

	۱۹۵۰-۵۱ء	۷۶-۱۹۷۵ء
۱۔ جامعاتی سطح پر	۴.۱۱ روپیہ	۳۶۶۴ روپیہ
۲۔ کالج کی سطح پر (عام تعلیم)	۴۸۶ روپیہ	۲۳۰ روپیہ

ہمارے ملک میں اعلیٰ تعلیم کی اشاعت بڑے پیمانے پر کئے جانے کے باوجود ۲۳-۱۷ سال کے زمرے میں تعلیم پانے والے طلبا کے تناسب میں بیحد کمی ہے جب ہم دوسرے ممالک سے مقابلہ کرتے ہیں۔

ہندوستان	۴ر۸ فیصد
فلپائن	۲۵ فیصد
متحدہ امریکہ	۵۵ فیصد
جاپان	۳۰ فیصد

۱۹۴۷ء میں چین میں ۲۰۷ اعلیٰ تعلیمی ادارے تھے۔ ۱۹۸۳ء میں ۷۰۵ ادارے ہو گئے۔ طلبار کی تعداد ایک لاکھ چوالیس ہزار سے بڑھ کر دو لاکھ انچاس ہزار ہو گئی۔ اعلیٰ تعلیم کے وسائل کی پرکھ کی گئی، نظم و ضبط، استحکام کی کوشش کی گئی۔ جاپان میں ۱۹۸۰ء میں خاص تربیتی اداروں کی تعداد ۲۰۳۳ تھی۔ طلبار کی تعداد کا صرف ۴۰ فیصد ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے مستحق قرار دیا گیا۔ ہمارے ملک میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ثانوی سطح سے ۷۰ فیصد اہل قرار دیئے گئے ہیں۔

ہر ایک شہری، ماہر تعلیم، ٹکنیشین، تنظیمی اداروں کے صدور، حکومت کے سربراہ کسی نہ کسی تشہیر میں، جلسہ میں، بیٹھک میں، سیمنار میں، نشست میں، گفتگو میں، تشہیری پروگرام میں، دوردرشن کے انٹرویو میں کچھ حد تک اقرار کرتے ہیں کہ موجودہ تعلیمی نظام مشکلات سے دوچار ہے۔ وہ معاشی بہتری لانے میں ناکام رہا ہے۔

جس کے نتیجے میں بیروزگاروں کی بڑی بھیڑ ہے۔ مراحل تعلیم میں خواہ وہ ثانوی تعلیم ہو یا جامعاتی تعلیم، سب اس رائے سے متفق ہیں کہ اس ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی ضروری ہے۔ ملک کے وسائل کو ازسرِ نو سامنے رکھ کر نصاب کو اپنانا ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی کے ذریعے ماہرینِ تعلیم اور تعلیمی اداروں کے صدور کو ایک اور موقع حاصل ہو سکا ہے اور دانشوروں اور تعلیم کے شعبے کے تجربہ کاروں کے مشورہ سے تعلیم کے چیلنجوں اور چنوتیوں سے نپٹنے کا پلان سامنے آنے والا ہے۔ فروری ۱۹۸۵ء کے لے کر اب تک حکومت ہند کو ایک ہزار سے زیادہ خطوط مشوروں کی صورت میں موصول ہوئے ہیں۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن نے ان کا تجزیہ کیا۔ اس طرح یہ نئی تعلیمی پالیسی ایک ایسی دستاویز بن سکے گی جو ملک کے نوجوانوں کو ترقی کی طرف لے سکے گی اور اس طرح ملک کے وسائل میں اضافہ ہوگا نیز ملک سے بیروزگاری دور ہو سکے گی۔

تفصیلی جانچ کے بعد مندرجہ ذیل امور پر ہماری نگاہیں مرکوز ہونا ضروری ہے۔

۱۔ انسانی قابلیت کی منصوبہ بندی۔
۲۔ وسائل کا بھرپور استعمال۔
۳۔ امتحانی تربیت۔
۴۔ اساتذہ کی تربیت۔
۵۔ افراد کی پرکھ۔
۶۔ افراد کو اعزازات عطا کرنا۔
۷۔ شکایات و تکالیف کو حل کرنا۔

حکومت کے منصوبوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اساتذہ بھی طلبا کی تعلیم میں کافی دلچسپی لیں۔ ہڑتالوں سے، دھرنوں سے کئی اقسام کے احتجاجات سے دور رہنے کی کوشش کریں۔ حصول تعلیم میں منہمک رہیں۔ ہر پانچ سال کو ایک مرتبہ ہر سطح پر اپنے سروس اداروں کی طرف سے نصابی ریفریشر کورس منعقد کریں اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

ان تجدیدی نصابات کے ذریعے علم کی روزافزوں ترقی کے تقاضے پورے ہو سکیں گے اور استاد، پروفیسر، طلبا سبھی کا علم عصری تقاضوں کو پورا کر سکے گا۔ ہر لمحہ ہر ادارے میں کوئی نہ کوئی نئی تحقیقی کوشش جاری و ساری نظر آتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عصرِ حاضر میں طلبار دھرنا دینے، ہڑتال کرنے اور بددلی سے تعلیم حاصل کرنے کے رجحان سے خود کو محفوظ کریں اور یکسوئی سے تعلیم حاصل کریں۔

اعلیٰ تعلیم کے تین بنیادی مقاصد ہیں۔ ایک تعلیم کی اشاعت، دوسرا تحقیق، تیسرا وسعت دینا۔ اس کے علاوہ طلبار میں سماج کی خدمت کے جذبے کو پیدا کرنا ضروری ہے۔ اس کے تحت تعلیم بالغان کے پروگرام کو تیزی سے آگے بڑھانا ہے۔ طلبار کی دشواریوں کو ہمدردی سے سمجھنے اور دور کئے جانے کی ضرورت اپنی جگہ بہت ہے۔ ایک اور اہم بات یہ کہ عورتوں کی تعلیم عدم توجہی کا شکار ہے۔ شروع میں اسکول میں داخلہ لینے والی لڑکیوں کی تعداد تو خاصی ہوتی ہے لیکن بیچ میں پڑھائی چھوڑنے والی طالبات کی تعداد زیادہ ہے۔ بہر صورت ٹیچر کا رول ہر جگہ اپنا اثر دکھا سکتا ہے۔

ٹیگور نے فرمایا تھا:

"ہر ایک استاد اچھی طرح
پڑھا سکتا ہے، جب کہ وہ خود
حصول تعلیم میں منہمک ہو۔
ایک چراغ دوسرے چراغ
کو روشن کر سکتا ہے جب کہ وہ
شعلہ ساز ہو"

حقیقت یہ ہے کہ کسی شخص کو محض حرف شناس کرانا ہی تعلیم نہیں ہے بلکہ حقیقی تعلیم وہ ہے جس میں بچے کی دماغی، قلبی اور جسمانی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا جائے اور بچہ ایک مکمل، کامیاب اور حقیقی انسان بن کر ملک و قوم کی ترقی میں معاون ہو۔ اسی تعلیم کے ذریعے بچے کی سیرت میں اچھی باتوں کو اجاگر کیا جاتا ہے اور بری باتوں کو پروان چڑھنے سے روکا جاتا ہے۔ یہی تعلیم بچے میں ایک طرف دماغی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتی ہے تو دوسری طرف اس کے دل میں پسندیدہ جذبات، عادات اور دلچسپیوں کو جنم دیتی ہے اس میں خلوص، ایمانداری، حب الوطنی، احساس ذمہ داری، اپنے ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو قربان کرنے کا جذبہ، قوت ارادی اور قوت برداشت اور اسی طرح کی دیگر خصوصیات کو پروان چڑھاتی ہے۔

اچھی تعلیم کا تیسرا اہم ترین پہلو جس کی ہمارے ملک کو موجودہ دور میں سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہے بچے میں ہاتھ سے کام کرنے کا شوق پیدا کرنا، اس میں ایسے جذبات پیدا کرنا جس سے بچہ نہ صرف ہاتھ سے کام کرنے میں خوشی اور فخر محسوس کرے بلکہ ہاتھ سے کام کرنے والوں کو گری ہوئی نظر سے نہ دیکھے اس کے دل میں محنت اور محنت کرنے والوں کے لیے عزت و احترام کے جذبات پیدا ہوں۔ انسانی سیرت کے ان تینوں پہلوؤں کی تعمیر ہی حقیقی تعلیم کا کام ہے۔ ان تینوں حصوں کو انگریزی میں Affective- Psychomotor اور Cognitive Domain کہا جاتا ہے جن سے بالترتیب دماغ، دل اور ہاتھوں کی تربیت مقصود ہے۔

موجودہ تعلیمی ڈھانچے میں تعلیم محض کتاب کے اسباق یاد کر کے امتحان میں اچھے نمبر لانے کی حد تک رہ گئی ہے۔ جو طالب علم جس قدر بھی کتاب پڑھ، سمجھ، یا رٹ کر جس قدر زیادہ نمبر لے آتا ہے وہ اسی قدر کامیاب تصور کیا جاتا ہے اسی قدر اچھے اداروں میں داخلہ مل جاتا ہے اور وہ اتنی ہی کامیاب زندگی گزارنے اور اسی قدر ذمہ دار عہدوں پر فائز ہونے کا اہل بن جاتا ہے کتاب سے یاد کی ہوئی معلومات کو امتحان میں سوالوں کے ذریعے جانچ لیا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر بچے کے 'پاس یا فیل' ہونے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اس دوران اس کی شخصیت میں ہونے والی تبدیلیوں پر نہ نظر ڈالی جاتی ہے اور نہ ان کی جانچ کی جاتی ہے اور نہ ہی انھیں پروان چڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے اور چونکہ ہم تعلیم کے محض انھیں پہلوؤں پر عام طور پر زور دیتے ہیں جن کا نتیجہ امتحان کے ذریعے سامنے آتا ہے اس لیے جانچ کا خیال نہ رکھنے کی شکل میں اس کی سیرت کی ترقی پر بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ رہا تیسرا مسئلہ ہاتھ سے کام کرنے کا تو اس کا تو اس کتابی کورس میں تکنیکی کورسوں کے علاوہ کم ہی ذکر ملتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم تعلیم سے فارغ ہو کر کسی نہ کسی ایسی ملازمت کی تلاش میں سرگرداں رہنا شروع کر دیتا ہے جس میں اسے ہاتھ سے کام نہ کرنا پڑے۔ مثال کے طور پر ہمارا ملک دیہاتوں اور کسانوں کا ملک ہے اور اس کی بڑی شدید ضرورت ہے کہ کھیتی کرنے والے بھی تعلیم سے محروم نہ ہوں لیکن تعلیم پانے کے بعد کم ہی لوگ کھیتی کے پیشے کو اپنانا پسند کریں گے بلکہ زیادہ تر لوگ اس بات کو ترجیح دیں گے کہ انھیں کہیں کرسی پر بیٹھ کر کرنے والا کام مل جائے۔ یہ صورتِ حال تعلیمی بیروزگاری میں روز افزوں اضافے کا باعث بنی ہوئی ہے۔

تعلیم کا یہ تصور اصل میں کافی پرانا اور اس دور کی دین ہے۔ جب تعلیم کو معاش سے الگ رکھا جاتا تھا اسی علم کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ "عالم کے قلم کی روشنائی شہید کے خون کی بوند سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے"۔ اسی علم کی روشنی کو پھیلانا، نہ صرف ایک عظیم کام بلکہ عبادت سے بھی برتر تصور کیا گیا ہے اسی علم کے مقابلے میں دولت کی اہمیت کو کمتر ثابت کرنے کے لیے کہا گیا ہے کہ "علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے جبکہ دولت خرچ کرنے سے گھٹتی ہے علم کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا جبکہ دولت اور دنیا کی ہر مادی چیز قابلِ تقسیم ہے"۔ یہی علم سماج کی بنیادی قدروں کا محافظ اور امین ہے اسی علم کے حصول کا کام ساری زندگی جاری رہتا رہتا ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں لائف لانگ

ایجوکیشن کہا جاتا ہے علم کی یہی وہ لگن ہے اور پیاس ہے جس کے سبب ہر مذہب و ملت کے لوگوں نے علم کی اہمیت کو پہچانا ہے، شیخ سعدی نے تو یہاں تک کہا کہ علم کے بغیر خدا کو نہیں پہچان سکتے۔ علم کے حصول کے لیے دانشوروں کے متعدد اقوال روزانہ ہی دہرائے جاتے ہیں۔

موجودہ دَور کے پیچیدہ مسائل، سماجی ماحول اور پچھلے زمانے سے مختلف انسانی ضروریات کے پیشِ نظر تعلیم کا رول، تعلیم سے متعلق توقعات اور سماجی تقاضے مختلف ہو کر رہ گئے ہیں آج کی تعلیم چند مخصوص افراد یا طبقات کے لیے نہیں بلکہ بلا لحاظ مذہب و ملت و سماجی مرتبہ ہر شہری کے لیے ضروری ہو گئی ہے — موجودہ دَور میں تعلیم حکومت کی ذمہ داری ہے جو ہر بچے کو اس کے رُجحان کے مطابق ملنی چاہیئے۔ ظاہر ہے ہر انسان کے ذہنی تقاضے اور ضروریات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اس لیے ہر بچے کو اس کے شوق، توجہ، ذہانت، دلچسپی نیز ذہنی، جسمانی اور سماجی تقاضوں کے پیشِ نظر ہی تعلیم دی جائے۔ قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء میں بھی اس کا خصوصی طور پر ذکر ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ اہتمام نہ صرف رسمی تعلیم کے لیے بلکہ غیر رسمی تعلیم کے لیے بھی اسی قدر اہمیت کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ اسی لیے پرائمری سطح کی تعلیم کو خصوصاً عملی رُخ دینے یعنی Activity Oriented بنانے پر زور ہے تاکہ بچوں میں بالکل ابتدا ہی سے ترقی کی موجودہ دَوڑ میں عملی حصہ لینے کے لیے ضروری رجحانات پیدا ہو جائیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے استعمال کی طرف توجہ بڑھے اور ان کی ہمہ جہتی نشو و نما ہو۔ قومی تعلیمی پالیسی میں اس بات پر بھی اعتماد کا اظہار کیا گیا ہے کہ ہم تعلیم کے ذریعے ہی ان مقاصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔

بلاشبہ معاش کا مسئلہ انسانی زندگی میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ہر انسان کو کسی نہ کسی شکل میں معاش کی فکر میں سرگرداں رہنا پڑتا ہے اور زندگی کو بہتر طریقے پر گذارنے نیز اپنے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اپنی ضروریات کی تکمیل کے ذرائع تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ ہندوستان میں عام تصور یہ بن گیا ہے کہ تعلیم محض روٹی کمانے کا ذریعہ ہے اور اگر تعلیم پانے کے بعد انسان کو ملازمت نہ کرنی ہو تو بہتر یہ ہے کہ وہ سرے سے تعلیم ہی نہ پائے اور یہ تصور چند اعلیٰ اور اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگوں کو چھوڑ کر اکثریت میں پایا جاتا ہے اور چونکہ اکثریت پر کُل کا حکم لگایا جاتا ہے اس لیے تعلیم کے بارے میں عام لوگوں کا یہ تصور کچھ بہت خوش آئند نہیں ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کی ہمہ جہتی ترقی، سماجی برابری کے تصور کو کامیاب بنانے اور جمہوری قدروں کی کامیابی کے لیے ملک کے ہر فرد کو تعلیم سے روشناس کرایا جائے نیز یہ تعلیم بھی اس طرح کی ہو کہ جس کے ذریعہ بچوں کو محض کتابوں سے دی ہوئی معلومات بہم پہنچا کر معلومات کا خزانہ ہی نہ بنا دیں بلکہ ان میں صحیح طرزِ فکر پیدا کریں اور زندگی کے مسائل کو کامیابی کے ساتھ حل کرنے کی صلاحیت بھی ان میں پیدا ہو جائے یعنی ایک طرف تعلیم کے ذریعے ان کی شخصیت کی مکمل نشو و نما ہو اور دوسری طرف وہ اپنے معاش کے مسئلہ کو بھی جائز اور صحیح طریقے سے حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں لیکن پوری زندگی مکمل طور پر معاش کے ماتحت ہو کر نہ رہ جائے اور انسان اخلاقی، سماجی قدروں سے دُور ہو کر محض روپیہ کمانے کی مشین نہ بن جائے جس کا نقصان بقول اقبال یہ

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش

لہٰذا اگر ایک طرف معاش کے مسئلہ کو ... ہے بڑھتی ہوئی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کر ... معیارِ زندگی کو بلند کرنا ہے تو دوسری طرف ... کو محض معاش کے ماتحت نہیں رہنے ... تعلیم کے ذریعہ بچوں میں وہ قدریں بھی ... پروان چڑھانی ہیں جو ہمارے عظیم ملک کی تہذیب و تمدن اور اس کے سماجی استحکام کی ضامن ... اس لیے تعلیم کے مقاصد کے تعین اور ... ڈھانچے کی تشکیل کے وقت ہمیں ملک ... سماجی، تہذیبی، معاشی اور سیاسی حالات ... ضروریات کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہے یہ بھی ذہن ... رکھنا ہے کہ تعلیم کو محض ہم ایک ایسا آئینہ ... بنا کر نہ رکھ دیں جس تک ایک عام انسان کا ... ہاتھ نہ پہونچ سکیں بلکہ ہم تعلیم کے ڈھانچے ... طرح تشکیل دیں کہ ملک کا ہر فرد اس سے ... طرح مستفید ہو سکے۔ یہ بھی ذہن نشین ... ہے کہ اس تعلیم کے پانے کے بعد ہمارے ... محض صاف ستھرے کاموں کی تلاش میں ... ملک پر مزید بوجھ نہ بن جائیں اور تعلیم ... بیروزگاری میں اضافہ نہ کریں بلکہ ہاتھوں ... کرنے کی صلاحیت پیدا کر کے ملک کی ... روزگاری کو کم اور معاشی مسئلہ کو حل کرنے ... معاون ثابت ہوں اور ملک میں خوش ... رفتار کو تیز تر کر سکیں۔ اسی طرح کی تعلیم ... ملک کے لیے خصوصاً ضروری ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ میں تعلیم ... پہلوؤں کے ساتھ ساتھ تعلیم کی معاشی ... پر خصوصاً زور دیا گیا ہے اور یہیں آزاد ... کی تعلیمی تاریخ میں پہلا اساسی کر ...

Positive Asset یعنی مثبت اثاثہ اور Precious National Resource یعنی بیش قیمتی قومی وسیلہ تسلیم کیا گیا ہے دیہات اور شہروں کے درمیان موجود نابرابری کو کم سے کم تر کرنے کی توجہ دی گئی ہے اور تعلیم کے مقاصد میں قومی خود کفالت National Self-Reliance پر اہم توجہ دی گئی ہے۔ ملک کے ہر فرد کے لیے تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ اسے Functional Skills اور Knowledge یعنی دستکاریوں اور ہنر مندیوں وغیرہ) سے روشناس کرانا ہے تاکہ وہ ملک کے سماجی اور معاشی حقائق سے روشناس ہو جائے اور اسی کے مطابق ملک کی تعمیر اور ترقی میں ہاتھ بٹائے۔

قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء کی ان توقعات اور ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے سماجی وسائل یعنی کمیونٹی ریسورسز کا استعمال اسکول کی تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے کریں۔ چونکہ ان وسائل کے استعمال میں خرچ بہت کم یا نہیں کے برابر ہے اور یہ وسائل ہر مقام پر خصوصاً دیہات میں بڑی تعداد میں موجود ہیں اس لیے ملک کی معاشی صورت حال اور پیش نظر عظیم مقصد کی تکمیل کے لیے ان کا استعمال نہایت ضروری ہے۔ ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے جس میں تعلیم کو محض اساتذہ کی ذمہ داری ہی تصور کیا جائے بلکہ سماج کا ہر فرد اس کو اپنی ذمہ داری کا ایک حصہ محسوس کرے بلاشبہ اس میں اہم ترین اور مؤثر ترین اکائی تو استاد کا ہی ہوگا۔ لیکن اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ صحیح طریقے کی تعلیم میں سماج کی طرف سے پیدا ہونے والی رکاوٹیں کم ہو جائیں گی اور چونکہ سماجی وسائل ہر شہر اور گاؤں میں افراط سے موجود ہیں اور انھیں اپنے فنون میں مکمل عملی مہارت حاصل ہے اس لیے انھیں اگر اسکول کی تعلیم کو زیادہ موثر اور عملی بنانے کے لیے استعمال کیا جائے تو نہ صرف ہماری، ہمارے بچوں کے لیے زیادہ مفید، دلچسپ اور مؤثر بن جائے گی، بلکہ یہ قدم ہمارے سماجی اور معاشی مسائل کو حل کرنے میں زیادہ معاون ہوگا اور ہم اپنے جملہ قومی مقاصد کے حصول میں زیادہ کامیاب ہوں گے۔

بلاشبہ ہم اپنے موجودہ تعلیمی ڈھانچے اور اس سے متاثر ہونے والی سماجی، معاشی اور تعلیمی صورت حال پر خود تنقید کر لیتے ہیں۔ جو ہماری زندگی کا ایک صحت مند پہلو ہے اسی کے ساتھ ساتھ بلاشبہ اسی نقائص سے بھرے ہوئے تعلیمی نظام کے باوجود ہم نے گذشتہ ۳۸ سال میں ہر میدان میں حیرت انگیز ترقی کی تعلیم عام ہوئی ہے اسکول جانے والے بچوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے تعلیم اداروں کی تعداد اور تعلیم پر خرچ ہونے والے وسائل میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اسی کے ساتھ ساتھ غیر رسمی تعلیم کو نیا رُخ ملا ہے اسی طرح ہماری معاشی اور صنعتی جد و جہد کے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے ہیں جس کے لیے ہمیں بین الاقوامی میدان میں ستائش حاصل ہوئی ہے دوسرے ملکوں میں ہندوستان کا وقار بہت بلند ہوا ہے۔ سیاسی نظام اور جمہوریت کی جڑیں نہ صرف بہت مضبوط بلکہ بہت گہری ہیں۔ تقریباً زندگی کے ہر میدان میں ہماری مجموعی کامیابی نئے آزاد شدہ ممالک میں شاید سب سے زیادہ نمایاں اور اہم ہے۔ ہم بڑی سے بڑی ضرورت کی تکمیل کے لیے خود کفیل ہوئے ہیں سماجی نابرابری حیرت انگیز حد تک کم ہوئی ہے عوام میں غیر معمولی شعور اور بیداری پیدا ہوئی ہے اور حکومت نے ملک کے دور دراز حصول میں ہر طبقہ تک موجودہ ترقی کے فائدوں کو پہنچانے کی کوشش کی ہے اور ہمارا موجودہ سیاسی نظام بھی بلاشبہ ساری خامیوں کے باوجود نئے آزاد شدہ ممالک کے مقابلے میں بہت مضبوط ہے۔

لیکن چند مسائل ہیں جنھیں ہمیں حل کرنا ہے اور یہ مسائل اچھی تعلیم کے ذریعے ہی حل کئے جا سکتے ہیں اگر ہم اس بات پر متفق ہیں تو پھر ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم ابتدائی درجات سے ہی اپنے بچوں کو ملک کی ترقی میں حصہ لینے کے لیے تیار کریں ان میں نہ صرف قوت فکر و عمل کو جلا دینی ہے بلکہ ان کی ہمہ جہتی ترقی کا انتظام کرنا ہے تاکہ وہ حال کو بہتر بنانے کی طرف توجہ دیں اور جب حال بہتر بنا جائے گا تو مستقبل کے مسائل زیادہ آسانی سے حل ہوتے جائیں گے اور حال کو بہتر بنانے کی یہ فکر تعلیم اور معاش دونوں کے مسائل کو سلجھانے میں ہماری مدد کرے گی اور ہم دونوں کو ان کا جائز مقام دے سکیں گے۔ اس طرح انسانی زندگی کی اعلیٰ اقدار کی حفاظت بھی ہو جائے گی۔ انسانی سیرت و شخصیت کی بہتر نشو و نما بھی ہو جائے گی اور ہم معاش کے پہلو پر توجہ دے کر ملک کی بیروزگاری کو کم کرنے میں کامیاب ہوں گے اور مادی ترقی کی اس تیز بین الاقوامی دوڑ میں ہم اپنے ملک کو دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے شانہ بشانہ لے جا سکیں گے اور اگر اس تعلیم کے ذریعہ ہم اپنی قدروں کو بچا کر پروان چڑھا سکے اور ملک کے تہذیبی ورثہ کی حفاظت کر سکے تو ہم ملک کے شاندار ماضی کو اسی قدر روشن رکھ سکیں گے۔

ابتدائی بیس سال میں عیسائی آبادی جس فیصد کے ساتھ بڑھی تھی بعد کے دس سال میں اس کا اضافہ فیصد تقریباً نصف رہ گیا۔ جب کہ مسلم، سکھ، جین اور بدھ آبادی کا فیصد اضافہ ان دس برسوں میں کافی تیز رہا۔ ہندو فیصد آبادی بھی ابتدائی بیس برسوں کے مقابلے میں آخری دس برسوں میں کافی بڑھی ہے۔

اب آیئے ذرا مختلف ریاستوں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ دیکھیں کہ ایسی کتنی ریاستیں یا یونین ٹیریٹریز ہیں جہاں اقلیت کی تعداد فیصد (مجموعی طور پر) اکثریت سے زیادہ ہے۔ مسلم اقلیت جموں کشمیر میں ۶۴٫۱۹ فیصد ہے اور لکش دیپ میں ۹۴٫۸۴ فیصد۔ عیسائی اقلیت ناگالینڈ میں ۸۰٫۲۱ فیصد اور میزورم میں ۸۳٫۸۱ فیصد ہے۔ سکھ اقلیت پنجاب میں ۶۰٫۷۵ فیصد ہے۔ جین اور بودھ اقلیتی فرقے کی کہیں اکثریت نہیں ہے۔ ان کی سب سے زیادہ فیصد آبادی سکم میں ۲۸٫۷۱ فیصد (بودھ) اور راجستھان میں ۱٫۸۲ فیصد (جین) ہے بعض صوبے تو ایسے ہیں جہاں بودھ اور جین طبقے کے افراد یا تو بالکل ہی نہیں ہیں یا پھر ان کی آبادی قابلِ ذکر نہیں ہے۔ اس کے برعکس ہندو، مسلم، عیسائی اور سکھ آبادی (لکش دیپ کو چھوڑ کر) سارے دیش میں پھیلی ہوئی ہے۔

ہندو آبادی سب سے کم لکش دیپ میں (۴٫۵۲ فیصد)، مسلم آبادی سب سے کم میزورم میں (۰٫۴۵ فیصد) عیسائی آبادی سب سے کم (ہماچل پردیش اور ہریانہ میں ۰٫۰۹ فیصد) سکھ آبادی سب سے کم کیرالا، تامل ناڈو، تری پورہ دادرا میں (۰٫۰۱۵ فیصد)۔ بودھ آبادی سب سے کم پانڈیچری، ہریانہ،

راجستھان میں (۰٫۰۱ فیصد) اور جین آبادی سب سے کم اروناچل پردیش (۰٫۰۱ فیصد) ہے۔

ذیل میں مختلف صوبوں اور یونین ٹیریٹریز کی فیصد آبادی کا گوشوارہ دیا جا رہا ہے۔

(لاکھ میں)

ریاست	ہندو	مسلم	عیسائی	سکھ	بودھ	جین
آندھرا پردیش	۸۸٫۷۵	۸٫۴۷	۲٫۶۸	۰٫۰۳	۰٫۰۲	۰٫۰۳
بہار	۸۲٫۹۷	۱۴٫۱۳	۱٫۰۶	۰٫۱۱	۰ —	٫۰۶
گجرات	۸۹٫۵۳	۸٫۵۳	۰٫۳۹	۰٫۰۷	۰٫۰۲	۱٫۳۷
ہماچل پردیش	۹۵٫۷۷	۱٫۶۳	۰٫۰۹	۱٫۲۲	۱٫۲۳	۰٫۰۲
ہریانہ	۸۹٫۳۶	۴٫۰۵	۰٫۰۹	۶٫۲۱	۰٫۰۱	۰٫۲۷
جموں کشمیر	۳۲٫۲۴	۶۴٫۱۹	۰٫۱۴	۲٫۲۳	۱٫۱۷	۰٫۰۳
کرناٹک	۸۵٫۹۲	۱۱٫۰۵	۲٫۰۶	۰٫۰۲	۰٫۱۱	۰٫۸۰
کیرالا	۵۸٫۱۵	۲۱٫۲۵	۲۰٫۵۶	۰٫۰۱	—	۰٫۰۲
مدھیہ پردیش	۹۲٫۹۶	۴٫۸۰	۰٫۶۸	۰٫۲۷	۰٫۱۴	۰٫۸۵
مہاراشٹر	۸۱٫۸۰	۹٫۲۵	۱٫۲۷	۰٫۱۷	۶٫۲۸	۱٫۵۰
منی پور	۶۰٫۰۴	۶٫۹۹	۲۹٫۶۸	۰٫۰۷	۰٫۰۳	۰٫۰۷
میگھالیہ	۱۸٫۰۳	۳٫۱۰	۵۲٫۶۲	۰٫۱۳	۰٫۲۰	۰٫۰۴
ناگالینڈ	۱۴٫۳۶	۱٫۵۲	۸۰٫۲۱	۰٫۱۰	۰٫۰۷	۰٫۱۵
اڑیسہ	۹۵٫۴۲	۱٫۶۰	۱٫۸۲	۰٫۰۵	۰٫۰۳	۰٫۰۳
پنجاب	۳۶٫۹۳	۱٫۰۰	۱٫۱۰	۶۰٫۷۵	—	۰٫۱۶
راجستھان	۸۹٫۳۲	۷٫۲۸	۰٫۱۲	۱٫۴۴	۰٫۰۱	۱٫۸۲
سکم	۶۷٫۲۵	۱٫۰۳	۲٫۲۲	۰٫۱۵	۲۸٫۷۱	۰٫۰۳
تامل ناڈو	۸۸٫۸۶	۵٫۲۱	۵٫۷۸	۰٫۰۱	—	۰٫۱۰
تری پورہ	۸۹٫۳۴	۶٫۷۵	۱٫۲۱	۰٫۰۱	۲٫۶۷	۰٫۰۲
اتر پردیش	۸۳٫۳۱	۱۵٫۹۳	۰٫۱۵	۰٫۴۱	۰٫۰۵	۰٫۱۳
ویسٹ بنگال	۷۶٫۹۶	۲۱٫۵۱	۰٫۵۹	۰٫۰۹	۰٫۲۹	۰٫۰۷
یونین ٹریٹریز						
انڈمان نکوبار	۶۴٫۵۳	۸٫۵۸	۲۵٫۵۸	۰٫۵۲	۰٫۰۷	—
اروناچل پردیش	۲۹٫۲۴	۰٫۸۰	۴٫۳۲	۰٫۱۹	۱۳٫۶۹	۰٫۰۱
چنڈی گڑھ	۷۵٫۲۷	۲٫۰۲	۰٫۹۹	۲۱٫۱۱	۰٫۱۰	۰٫۴۲
دادرا نگر حویلی	۹۵٫۵۶	۱٫۸۶	۱٫۹۵	۰٫۰۱	۰٫۱۸	۰٫۳۶
دہلی	۸۳٫۲۰	۷٫۷۵	۰٫۹۹	۶٫۳۳	۰٫۱۱	۱٫۱۹
گوا دمن دیو	۶۵٫۹۰	۴٫۴۶	۲۹٫۲۸	۰٫۱۳	۰٫۰۳	۰٫۰۳

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi.

پریم پال اشک

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور فلم اسٹڈی سنٹر

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ سینما اس صدی کا مقبول ترین ہی نہیں بلکہ سب سے زیادہ موثر ذریعۂ اظہار ہے۔ ایک فلم کو بیک وقت ہزاروں افراد دیکھ سکتے ہیں۔ اور اس کے صحتمند یا مضر اثرات دل و دماغ پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ جبکہ بیک وقت کسی ناول یا افسانے کا ایک ہی قاری اس قلمی شہ پارے سے محظوظ ہوتا ہے اور اس کا اثر بھی کسی حد تک محدود ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک فلم کا خمیر کئی فنونِ لطیفہ سے اٹھتا ہے۔ جن میں دل نشین شاعری اور رقص کے علاوہ عمدہ اداکاری، چابکدست ہدایت کاری، چست منظر نامہ، دلفریب نغمے، دل نواز موسیقی، جدت پذیر کہانی، پُر اثر مکالمہ نگاری، صاف و شفاف عکاسی اور بے داغ صدا بندی جیسے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ اور صحت مند موضوع کے ذریعے ایک اچھی اور معیاری فلم کی تخلیق ہوتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑھی جانے والی چیز کی نسبت دیکھی جانے والی چیز کا اثر زیادہ گہرا اور دیرپا ہوا کرتا ہے۔ اور ایک اچھی فلم ہی سماج میں انقلاب لا سکتی ہے اور جو مسائل بڑے بڑے رہنما حل نہیں کر سکتے، ایک فلم اس مسئلے کو آنِ واحد میں حل کر سکتی ہے، اور ایسی کئی مثالیں دیکھنے میں بھی آئی ہیں۔

دوسری طرف فلمیں واقعی ثقافتی روابط بڑھانے کا کام کرتی ہیں۔ انھیں فلموں کے ذریعے پوری دنیا ایک کُنبے کی شکل میں نظر آنے لگی ہے۔ ہم ایک فلم کے ذریعے دنیا کے ہر حلقے کے عوام کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کے ساتھ ثقافتی ترقی کا جائزہ بھی لے سکتے ہیں۔ ہم ان کے عوام کے سُکھ دُکھ بانٹ سکتے ہیں اور اُن کے غموں اور مسرتوں میں شریک ہو سکتے ہیں۔

غالبًا انھیں پہلوؤں کے پیشِ نظر ہمارے دانشوروں اور ماہرینِ تعلیم کے ساتھ ساتھ حکومت کو بھی سینما کی اہمیت اور افادیت کا احساس ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UNIVERSITY GRANTS COMMISSION) کی طرف سے فلم اسٹڈی سنٹروں کے قیام کے منصوبے کو عملی جامہ پہنائے جانے کے قدم اٹھائے جا رہے ہیں۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے یونیورسٹیوں اور کالجوں میں فلم اسٹڈی سنٹروں کے قیام کے لیے ۲۵ ہزار ایک سو ۵۰ روپے غیر مکرر الوقوع گرانٹ اور ۹۱ ہزار چار سو روپے سالانہ کی مکرر الوقوع گرانٹ عطا کی جانے کی منظوری دی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد سماجی اور ثقافتی مواصلات اور تعلیم کی ترقی کے لیے سینما کے بہتر استعمال اور فلم کو جدید ترین فن کے طور پر قبول کئے جانے کے احساس کو بیدار کرانا ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اس سلسلے میں اپنے ترمیم شدہ رہنمایانہ خطوط وضع کئے ہیں۔ اور انھیں منظور بھی کیا جا چکا ہے، ان کے مطابق مجوزہ فلم اسٹڈی سنٹروں میں ملکی اور غیر ملکی کلاسیکی فلموں کی نمائش، مباحثوں، مذاکروں، تقریروں اور نصابات کا اہتمام اور فلم کلچر کی ترقی اور فروغ کے لیے سینما کے کسی بھی پہلو پر کتابوں کی اشاعت، کے پروگرام شامل ہیں، یہ سنٹر یونیورسٹی کیمپس میں پڑھائے جانے والے دیگر فنونِ لطیفہ کے حامل مضامین کی طرح فلم کو بھی ایک مضمون کے طور پر شامل کئے جانے کے اقدامات کریں گے۔

اس کے بعد جب فلم سنٹروں کو کافی تجربہ ہو جائے گا تو انھیں حقیقی فلم سنٹروں کی شکل دی جائے گی، وہاں فلم سنٹروں کو فراہم کئے جانیوالے مختلف فلموں کے پرنٹوں کا اسٹاک رکھا جائیگا۔ اور فلم اسٹڈی سنٹروں کے انچارج اساتذہ کے لیے تربیتی پروگرام کے ساتھ سینما کے موضوع پر کتب کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ وہاں فلموں میں استعمال کئے جانے والے آڈیو ویژول AUDIO VISUAL یعنی صوتی اور بصری آلات بھی تیار کئے جائیں گے۔ یونیورسٹیوں میں فلم اسٹڈی کے کام کی ترقی اور فروغ کے لیے ملکی اور غیر ملکی اداروں کا تعاون بھی حاصل کیا جائے گا۔

یہ امر بھی باعثِ توجہ ہے کہ ایک مرکزی سیل CELL پونے PUNE میں قائم کیا جائے گا۔

(باقی صفحہ پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.

خصوصی شمارہ ۱۵ اگست ۱۹۸۶ء

جلد ۶
شمارہ ۱۰،۹
قیمت ۲ روپے

2001

۱۵ اگست ۲۰۰۱

سیاسی اور اقتصادی نظام

جسٹس وی۔ آر۔ کرشنا ایر
ڈاکٹر ایل۔ کے۔ جھا
ڈاکٹر بھباتوش دتّہ
ڈاکٹر مالکم ایس ادی سیشیہ

موہت سین
ڈاکٹر کمل نین کابرا
ایس۔ کے۔ ڈے
بُنکر رائے

سماجی اور اقتصادی حالات

رومیش تھاپر
جیوتی بسو
وسنتھا سُوریہ
کے۔ اے۔ عبّاس

سماجی ترجیحات

ڈاکٹر جمال قدوائی
نِرمل مُکرجی
کے۔ ایف۔ رستم جی

جب فرشتے شجرِ ممنوعہ کھا لیتے ہیں، تو فرقہ وارانہ سیاسیات کی بیماری کی علامات اور اقتدار کی ہوس کا مرض مختلف افسوسناک شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے مثلاً آبسی تنازعات، تعصب، تنگ نظری، عقائد جدیدہ کی مخالفت اور دیرینہ عقائد پر قائم رہنے کی خواہش، بھونڈے طریقوں پر اصرار، اور قرونِ وسطیٰ کے نظام پر کاربند رہنا۔ ان کے نتیجے میں عدم استحکام، انتشار، علیحدگی پسندی کے خطرات سامنے آتے ہیں۔ تمل ناڈو، آسام، خالصتان، گورکھستان کے تاریخی تجربے کی روشنی میں جو سبق ملتا ہے، وہ بہت تلخ اور بھیانک ہے۔ ہندوستان کی تقسیم اسی طرح کے عوامل کی دین تھی اور اس طرح کے اسباب بھارت کی ذیلی تقسیم کے لیے فالِ بد ہیں۔ اگر ہندوستانی عوام متحد رہتے ہیں، تو اس کے نتیجے میں پرولتاری یا عوامی استحکام ظاہر ہو سکتا ہے اور ایک اَن دیکھا انقلاب ۲۰۰۱ء سے قبل معرضِ وجود میں آسکتا ہے۔ عوام کو آپس میں لڑانا اور سماج وادی جمہوریہ کو کمزور کرنا، اندرونِ ملک اُن لوگوں کے حق میں تو ہو سکتا ہے جو کہ پہلے ہی سے حقوق کے مالک ہیں یا پھر یہ حالت غیر ملکوں میں اُن حکومتوں کے لیے سازگار ہو سکتی ہے جو نئے نوآبادیاتی نظام کو باقی رکھنے کے حق میں ہیں۔ کیا مسلم لیگ یا اس کے مقابلے ہندو مہاسبھائی یا عیسائی جماعتیں فی الواقعی اپنے کمزور و ادنیٰ طبقے کے لوگوں وغیرہ کے لیے آنسو بہاتی ہیں یا اپنے چیدہ چیدہ طبقات کے مفادات کے تحفظ کے لیے آلۂ کار ہیں؟ فرقہ واریت کا رول ہے سوشلزم یا سماج واد کو طلاق دینا اور سرمایہ کاری کو تلک کرنا اور اُسے ماتھے پر بٹھانا۔ سیکولرازم کی فتح اُسی وقت ہو سکتی ہے، اور مذہبی جنون سے اُسی وقت پیچھا چھوٹ سکتا ہے، جبکہ نوعِ انسانی سے محبت کی تحریک، سائنسی مزاج بنانے کے شعور، جذبۂ تفحص و تلاش کی بیداری، اصلاح کے جذبۂ مخلوقِ خدا سے پریم، عورتوں کے وقار کے منافی طریقوں سے پرہیز کے لیے انسان کا ذہن تیار ہو اور مذکورہ بالا اقدار کی پرورش کے لیے فضا ہموار ہو اور ان کی تحریک پورے زوروں پر ہو۔ کیا اس طرح کی علامات آسمان پر نظر آرہی ہیں؟۔

جسٹس وی۔ آر کرشنا ایّر

سماجی اور اقتصادی منظرنامہ

دیہات کی منظر کشی

سماجی اور اقتصادی حالات

سماجی طرز حیات

چیف ایڈیٹر : سید ظفیر الحسن

اسسٹنٹ ایڈیٹر : محمد عادل صدیقی

شمارہ ۱۰۹	یکم تا ۳۱ اگست ۱۹۸۶	جلد ۶

۱۰ ر خراودن تا ۹ ر بھادر شک ۱۹۰۸ : ٹیلیفون : ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے۔ دو سالہ ۳۵ روپے۔ سہ سالہ ۵۰ روپے

خصوصی شمارہ :- دو روپے

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

آکیسویں صدی کے آغاز میں اب بہت زیادہ عرصہ نہیں رہ گیا ہے، گویا کہ دس برس سے بھی کم۔ بیسویں صدی کے ان ۱۵ برسوں میں رنج و غم کے بادل بھی چھا سکتے ہیں اور مسرتوں کی بارشیں بھی ہو سکتی ہیں۔ اس کا مدار عالمی دانشوروں کے انداز فکر اور طریق کار پر ہے۔ ہم سب اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ مستقبل، حال کے تسلسل کا نام ہے، بالکل اسی طرح جیسا کہ حال، ماضی کے تسلسل کے نتیجے میں وجود میں آسکا ہے۔ گویا سلسلۂ روز و شب کا ایک لامتناہی سلسلہ اپنے کیف و کم سے اس دُنیا کے قیام اور اس کے تسلسل کا سبب بنا ہوا ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وقت ناقابلِ تقسیم ہے۔ رہی یہ تقسیم جو ہم گھنٹہ، منٹ کی صورت میں دیکھتے ہیں تو حضرتِ انسان نے اپنی سہولت کی خاطر کرلی ہے۔ زمان و مکان کا تصور اور اس کی تقسیم انسان کا پیدا کردہ ہے۔ یہ ظاہری تقسیم اور تصورات، ہمارے چند مقاصد اور ضرورتوں کی تکمیل کی خاطر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقاصد کے حصول اور نشانوں کی تکمیل کے لیے وقت کو پیمانہ بنا کر ایک لائحۂ عمل مرتب کیا جاتا ہے۔

بہر صورت وقت کے آہنی پنجوں سے کس کو رستگاری مل سکتی ہے۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ ہمیں بحیثیت ایک قوم وقت کے ساتھ ساتھ قدم ملا کر چلنا ہے۔ ہمیں ترقی کے اس سفر کو جاری رکھنا ہے [illegible] اس طرح کہ مایوسی اور قنوطیت پسندی سدِّراہ نہ بن سکے۔ بلاشبہ مسائل کی ایک یلغار ہے، مگر وسائل کا سمندر اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ غریبی، بے روزگاری، ناخواندگی اور بیماری کوئی نئی بات تو نہیں۔ دیگر ترقی پذیر ملکوں کے مقابلے یہ مسائل ہمارے یہاں پھر بھی بڑی حد تک قابو میں ہیں۔ ان مسائل کے حل کے سلسلے میں یہاں بہت کچھ کیا جا چکا ہے۔ اور آنے والے برسوں میں ان مسائل کو حل کرنے اور ان خامیوں پر قابو پانے کے لیے سنجیدگی سے بہت سی حکمت عملیاں منصوبہ بند طریقے پر اپنائی گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ملک اتنا وسیع و عریض ہے کہ یہاں ہر وہ منظر پیش کیا جا سکتا ہے جس کو پیش کرنے کی ہماری اپنی نیت ہو۔ یہاں ایک طرف امارت کے مناظر ہیں تو دوسری طرف غریبی کے بے پناہ آثار بھی۔ اس کا انحصار محض اس امر پر ہے کہ ہم کون سا چشمہ اپنی آنکھوں پر لگاتے ہیں۔

ذرا بڑے بڑے شہروں پر نظر دوڑائیے، سر بفلک عمارتیں جدید ترین سہولتوں سے آراستہ و پیراستہ دکھائی دیتی ہیں۔ ایک طرف فنِ تعمیر کے جدید سے جدید نمونے آنکھوں کو خیرہ کر رہے ہیں تو دوسری طرف ایسی ایسی گندی بستیوں کی بھی کمی نہیں جہاں پھٹے پرانے حال میں لوگ زندگی گزارتے ہیں۔ مگر اس نابرابری کا علاج یہ تو نہیں کہ ان بلند و بالا عمارتوں کو گرا دیا جائے، بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے [illegible] عوام کے لیے کم لاگت والے مکانات تیار کرائے جائیں تاکہ ان گندی بستیوں کا صفایا ہو سکے۔

بیشک ہندوستان ترقی کی منزلوں پر گامزن ہے، دُور دراز مقامات تک سڑکیں پھیلی ہوئی ہیں۔ وطن کی سرزمین پر ٹریکٹروں کا دندنانا ہر ایک کی نظروں کے سامنے ہے۔ جہاں کبھی بیلوں سے کاشت ہوتی تھی اور جہاں انسان بیلوں کو ہانک کر کھیتوں کی جُتائی کیا کرتا تھا، اب وہاں ٹریکٹروں کا ہی راج ہے، خوش آیند بات یہ ہے کہ ہندوستانی کسان کبھی بھی اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے غافل نہیں رہا۔ اور اب تو وہ اپنے حقوق سے بھی آگاہ ہے، کسان برادری کا یہ شعور اور اس میں یہ بیداری بڑی حد تک اطلاعاتی اور مواصلاتی نظام، ذرائع ابلاغ اور نشر و اشاعت کی کوششوں نیز نظام کی جدید کاری اور توسیع کی مرہونِ منت ہے۔

صنعتی محاذ کی ترقیوں پر نظر دوڑائیے تو معلوم ہوگا کہ سائنس اور ٹکنالوجی نے اس میں نئے نئے اُفق اور نئے نئے گوشے نکالے ہیں۔ چنانچہ ہندوستانی مصنوعات نہ صرف ترقی پذیر ملکوں میں اپنے لیے منڈی بنا چکی ہیں بلکہ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی اور یہ عمل بدستور ترقی کی طرف ہے۔ مختصر یہ کہ ایک طرف ناکامیوں کی فہرست طویل ہے تو دوسری طرف ہماری کارگزاریوں، کامرانیوں اور کامیابیوں کی فہرست اس سے کہیں زیادہ طویل ہے۔

بات یہ ہے کہ یہ ملک اپنی وسعتوں کے لحاظ سے اتنا بڑا ہے کہ یہاں کسی چیز کو بھی کافی نہیں کہا جاسکتا۔ یہاں کیا کچھ کافی وشافی ہو سکتا ہے، اس کی کوئی حد نہیں، البتہ اگر ہم مخلصانہ طور پر دل کو ٹٹولیں اور اپنے اندر جھانک کر دیکھیں، تو ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ایک بھارتی ہونے کے ناطے ہمیں زیادہ ایمانداری سے کام کرنا ہوگا۔ ذاتی مفادات سے دست کش ہونا پڑے گا، ہمیں ذات کے حصار سے نکلنا ہوگا۔ اور ریاکاری نیز دکھاوے اور حیلہ جوئی سے خود کو بچانا ہوگا۔ قول و عمل کے تضاد سے گریز کرنا ہوگا، شاید زندگی کا یہی وہ ڈھب ہوگا جس سے ہم شکست خوردگی اور دل شکستگی کے اس لبادے کو اُتار پھینکنے میں کامیاب ہوسکیں جو ہم نے اوڑھ رکھا ہے۔ ہم نے دوسروں کے ذریعے کیے گئے اپنی ناکامیوں اور کامیابیوں کے تجزیئے اور اندازے کو زیادہ اہمیت دی ہے، اب تک یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔

۱۵ راگست یومِ آزادی ہے، ہمیں آج کے دن یہ پختہ عہد کرنا ہے کہ ہم اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کا صحیح صحیح ایمانداری سے خود تجزیہ کریں اور ایک پُرعزم اور پُراُمید مستقبل میں یقین و اعتماد رکھتے ہوئے آگے بڑھنے پر کمربستہ ہوں۔

اس حقیقت کو تسلیم کرلینا چاہیے کہ رونے پیٹنے، محض نکتہ چینی کرنے، مذمت کرنے، عیب جوئی کرنے، کیڑے نکالنے یا اُمید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینے اور فرضی اور بے بُنیاد خدشات کو دل میں جگہ دینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

تہذیبِ انسانی کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ تحقیق و تفحص اور فتحمندی اور کامرانی کے ہر شعبے میں اُمید نے کلیدی کردار ادا کیا ہے، اور یہی سرزمین خاور کی اُمیدوں کا محرک رہی۔ یہی اُمید روشن اور بہتر مستقبل کی ضامن ہے۔ آئیے ہم اسی اُمید کو ساتھ لے کر عزم و اعتماد کے ساتھ کام پر جٹ جائیں۔

(لطیف الحسن)

[illegible]
[illegible]
سے کام لیں گے ... طور پر آئین یہ ہدایت
دیتا ہے کہ "مملکت آمدنی میں نابرابری کو کم از
کم کرنے کے لیے جدوجہد کرے گی اور نہ صرف
افراد میں بلکہ مختلف علاقوں میں رہنے والے
یا مختلف پیشوں میں مصروف لوگوں کے گروہوں
میں بھی ... سہولیات اور مواقع میں عدم
مساوات کو ختم کرنے کی کوشش کرے گی۔" جب

... پیش کیا جاتا ہے ... کو پورا کرنا
ہے ... داخلی
ہوتا ہے جو آزادی پسندانہ اقدار کے انقلاب
کی پابند ہو اور جو اپنے انقلاب پسندانہ مقاصد
تک پہنچنے کے لیے باشعور طور پر پُرجوش
عوامل کی تقلید کر رہی ہو تو مستقبل تابناک ہے
لیکن ماضی وحال پیچھے کو کھینچتے ہیں۔ سماجی و
اقتصادی مقاصد کی جانب پیش قدمی کرتے
ہوئے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اُن
عالمی قوتوں کا خیال رکھیں جو سرگرم کار ہیں۔
کوئی بھی ملک الگ تھلگ رہ کر

تاریخ کو ہمیں قصوروار نہیں ٹھہرانا" اگر
آپ اکیسویں صدی کے تئیں صادق نہیں ہیں،
تو آپ پر اکیسویں صدی کی عدالت میں اعتماد
شکنی کا الزام عائد کیا جائے گا۔ قومی اور
بین الاقوامی قول وقرار میں لازمی ملاپ ہونا
چاہیئے۔ آپ ایک ساتھ ملک کے باہر سامراج
دشمن اور ملک کے اندر سوشلسٹ دشمن
نہیں ہو سکتے۔ آپ ایک ساتھ افریقہ میں
نسلی امتیاز کے دشمن اور بھارت میں ہریجن
دشمن نہیں ہو سکتے۔ آپ کو آزادی اور ترقی،
سوشلسٹ راہ اور جمہوری طرزِ فکر کو
قربان کئے بغیر اپنے دوستوں کا انتخاب کرنا
ہوگا اور اپنا فیصلہ کرنا ہوگا۔ ہماری

سماجی واقتصادی مقاصد کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے ہمارے
لیے ضروری ہے کہ ہم اُن عالمی قوتوں کا خیال رکھیں جو سرگرم
کار ہیں۔ کوئی بھی ملک الگ تھلگ رہ کر آگے نہیں بڑھ سکتا
اور نہ ہی وہ سامراجی طاقتوں اور اُن کے گرگوں، حاشیہ برداروں
اور دلالوں کے دباؤ اور زور زبردستی کو نظرانداز کرسکتا ہے۔

ہم نئی صدی کی جانب جا رہے ہیں کیا ہم اس
بنیادی حلف کے تئیں صادق ہیں یا ہم مہلک
تساہل یا غافل تغافل سے کام لے رہے ہیں؟
آئیے ہم سرگرم کار سماجی قوتوں کا معائنہ
کریں جن کا منطقی نقطۂ نگاہ سے تجزیہ کیا گیا
ہو اور انھیں یکجا کرکے ایک ایسی نئی قوت کی
تخلیق کریں جس سے بڑھتی ہوئی مایوسیوں کو
ایک ایسے انقلاب میں منتقل کیا جا سکے جس سے
ہماری آرزوئیں پوری ہو سکیں۔

میلوں جانا ہے

آج بھارت آزاد ہے لیکن آج کے
بھارتی عوام مکمل طور پر آزاد نہیں ہیں۔ انھیں

آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ ہی وہ سامراجی
طاقتوں اور اُن کے گرگوں، حاشیہ برداروں
اور دلالوں کے دباؤ اور زور زبردستی کو نظرانداز
کرسکتا ہے۔ لیکن دوسرے وہ ممالک جو ہماری
اپنی جدوجہد آزادی کے بنیادی اصولوں اور ہمارے
سماجی اور اقتصادی مقاصد کے لازمی
عناصر کو مضبوطی سے اپنائے ہوئے ہیں۔
اُن کے ساتھ تعلقات میں اصول پسندانہ
پالیسیوں کو ترک نہیں کیا جا سکتا اور نہ
ہی اُن میں کوئی آمیزش کی جا سکتی ہے اگر

خاموش دھرتی پر تیسری
دنیا ہے جہاں اُس کے قدرتی اور انسانی وسائل
کو جدید طرز پر مکمل طور پر بروئے کار لانے
سے ترقی کا بڑا امکان پایا جاتا ہے لیکن
جو ابھی تک غیرمکمل حالوں سے ان وسائل
سے محروم ہو رہا ہے۔ یہاں تیسری دنیا کے
اندر چوتھی دنیا بھی ہے جو سماجی طور پر پسماندہ
طبقوں اور ایسے پسماندہ ... پر مشتمل ہے جو
بدترین قسم کی استحصال پسندی کا شکار ہے۔

اگر بھارت کے سماجی و اقتصادی ڈھانچے کو ایک جمہوری سوشلسٹ سماج کی صورت دینا مقصود ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ترقی پذیر دنیا کے ساتھ سرگرمی سے اتحاد کے رشتوں کو استوار کرے۔ نا وابستہ ممالک کی تحریک میں سرگرم رول ادا کرے اور سوشلسٹ ملکوں کے ساتھ مراسم پیدا کرے۔ بھارتی عوام حقیقی آزادی صرف اس صورت میں حاصل کر سکتے ہیں جس صورت میں کہ وہ اُن ملکوں اور عوام کے ساتھ سرگرمی سے یگانگت پیدا کریں جو ایک ایسے ترقیاتی نظام کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں یا اُس کی حمایت کر رہے ہیں۔ جس میں سماجی نظام کے حصے کے طور پر اُس کے تمام شہری انصاف کے مستحق ہوں۔ اس تناظر میں بھارت خوش قسمت ہے کیونکہ ہم ایک بڑے ملک کے طور پر پُر امن ہم وجودیت کے بین الاقوامی نظام کے حامی ہیں اور سرد جنگ کے تناؤ کے خلاف ہیں۔ ہم نیم کلیاتی حملے کے خوف اور ہتھیاروں کی دوڑ کی سیاست کے خلاف لڑ رہے

دہائی میں اکثر ملکی کارپوریشنوں کے آگے نہیں جھک رہے۔ ہم نے ملکی معیشت کو پرائیویٹ ہاتھوں میں دینے کے اصول اور مغرب کی ہر شے "بہترین ہے" کے لا یعنی عمل، اقدام اور پروپیگنڈے کو ٹھکرا دیا ہے موجودہ

کی خارجہ پالیسی کی کامیابی کا کریڈٹ لیں جو ملک کے اندر ہمارے سماجی و اقتصادی مقاصد کی عکاسی کرتی ہے۔ جنتا پارٹی کے مختصر دور حکومت کو چھوڑ کر جس کے دوران ہم کسی حد تک اِدھر اُدھر بھٹکے تھے ہماری قومی قیادت دنیا کی بائیں بازو کی قوتوں کے زیادہ قریب رہی ہے۔ خارجہ پالیسی سے متعلق راجیو گاندھی کا نظریہ کم و بیش اُن بنیادی عقائد پر مستحکم ہوا ہے جو نہرو جی کی میراث ہیں۔ ۲۰ صدی کا آخری مرحلہ ہم پر اکیسویں صدی کے دروازے کھول دیگا جس میں دیگر باتیں تو مساوی طور پر ہوں گی لیکن ان کے علاوہ ہم سامراجی دہشت پسندی کے زیادہ خلاف ہوں گے اور نادار دنیا کے لیے امن اور خود اعتمادی کے کیمپ کے قیام کے زیادہ حق میں ہوں گے۔ لیکن ایک غلط خیال یہ پیدا ہو گیا ہے کہ سامراجی طاقتوں کے ساتھ ٹیکنالوجیکل دوستی کرنے سے ہمارے عوام میں اعلیٰ سطح کی خوشحالی اور انصاف آ جائے گا۔ ہمارے برسر اقتدار لوگوں کے ایک طبقے کی یہ خود فریبی ملک کے لیے مہلک خطرہ ثابت ہوگی۔

سامراجی قوتوں سے دور رہو!

امریکہ کے تیئں کوئی بھی نرم خارجہ پالیسی جس میں ہائی ٹیکنالوجی کے حصول کو بروئے کار لایا جاتا

اگر آپ اکیسویں صدی کے تیئں صادق نہیں ہیں تو آپ پر اکیسویں صدی کی عدالت میں اعتماد شکنی کا الزام عائد کیا جائے گا۔ قومی اور بین الاقوامی قول و قرار میں لازمی ملاپ ہونا چاہیئے۔ آپ ایک ساتھ ملک کے باہر سامراج دشمن اور ملک کے اندر سوشلسٹ دشمن نہیں ہو سکتے آپ ایک ساتھ افریقہ میں نسلی امتیاز کے دشمن اور بھارت میں ہریجن دشمن نہیں ہو سکتے آپ کو آزادی اور ترقی، سوشلسٹ راہ اور جمہوری طرز حکومت کو قربان کئے بغیر اپنے دستور کا انتخاب کرنا ہوگا اور اپنا فیصلہ کرنا ہوگا

ہیں۔ ہم اپنی خود مختاری کی حفاظت سے نگرانی کر رہے ہیں۔ فوجی معاہدوں کی جنگ بندی سے انکار کر رہے ہیں [illegible] میں نہیں پھنس رہے اور

صورت حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم نہرو جی

برقیاتی رفتار سے ورغلانے والی ٹرانس نیشنل
کارپوریشنوں کو چور دروازے سے داخل ہونے کا موقع دیگی
جو ہماری سوشلسٹ پالیسی کو تباہ کر دیں گی

کے پیداواری عوامل کے لیے سائنس پر قابو
پانا ضروری ہے لیکن ٹرانس نیشنل کارپوریشنوں
کے ساتھ ناجائز اختلاط کے نتیجے میں ایک ایسی
کلیدی انجینئرنگ پیدا ہوگی جس پر سرمایہ داری
کا رنگ غالب ہوگا۔ ہمارے قومی

"اعلیٰ دماغوں" کو باہر بھیجنے کی سرگرمیاں انجام
دیں گی۔ اور ہماری اجارہ دارانہ صنعتیں جنھیں
"ترقی" کے لیے نئی آزادی حاصل ہوگی اور جن
میں امریکہ (Unlimited) اور بھارت
(Limited) ہوگا کئی صورتوں میں ماحولی آلودگی
سے ہماری آبادی کو کیمیاوی طور پر کنٹرول
کریں گی۔ ہماری آزادی

اگر بھارت کے سماجی و اقتصادی ڈھانچے کو ایک جمہوری سوشلسٹ سماج کی صورت دینا مقصود ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ترقی پذیر دنیا کے ساتھ سرگرمی سے اتحاد کے رشتوں کو استوار کرے۔ ناوابستہ ممالک کی تحریک میں سرکردہ رول ادا کرے اور سوشلسٹ ملکوں کے ساتھ گہرے مراسم پیدا کرے۔

اگر بھارت کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں تو بھارتی عوام تباہ ہو جائیں گے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جسمیں بیرونی دشمنوں کیطرف سے تیزی لائی جائے گی جو ہمارے ملک کو مضبوط اور ہمارے عوام کو اٹوٹ دیکھ کر خوش نہیں ہوتے۔ انتشار پسندی کے عوامل کا حب الوطنی ہونیکے جذبے کے ساتھ مقابلہ کیا جلئے۔

پاکستان کے ذریعہ ہماری سرحدوں
پر دباؤ ڈال کر دہشت گردوں کو انگیخت کر کے
اور انتشار پسند عناصر کو خفیہ طور پر ترغیب
دے کر ہمارے ملک کو مجبور کرنا کہ وہ اپنی توجہ
اور وسائل دوسری طرف منتقل کر دے اصلاح کی
دکھاوے کے سوائے کچھ نہیں ہو سکتا کہ خود انحصاری،
خودمختاری، اقتصادی جمہوریت اور سماجی
انصاف کی جانب ہماری ترقیاتی پیش قدمی
کو نقصان پہنچے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سامراج

منصوبے ڈالری سلیباؤں کی زیارتی
مہمیں بن جائیں گے، ہماری سائنسی ترقیات
واشنگٹن کی خیرات کے ذریعہ ٹیکنالوجیکل گداگری
کے سوائے کچھ نہیں ہوں گی۔ ہمارے شہریوں کی
صحت دواساز ٹرانس نیشنل کارپوریشنوں کا کھلونا
بن جائے گی اور ہماری اعلیٰ تعلیم کی یونیورسٹیاں
محض ایسے پاسپورٹ دفاتر بن جائیں گی، جو

تب تک آزاد ہوگی جب تک
امریکہ خوش رہے گا اور ہماری ترقی عالمی
بینک کی محتاجی کے ساتھ اپنے پاؤں پکڑے رہی
ہوگی۔ حتیٰ کہ ہمارا دانشورانہ تخلیق پسندی،
تنقیدی قابلیت اور سوراج کی حساسیت ختم ہو

یکم تا ۱۴ اگست ۱۹۸۷

جائے گی تب یقینی طور پر مستقبل میں ہمیں صدمہ ہوگا۔ اگر ۲۰۰۱ء میں سودیشی سائنس اور ٹیکنالوجی امریکی نوآبادیاتی نظام کے خلاف ڈٹ کر کھڑی نہ ہوئی اور اعلیٰ ٹیکنالوجی کے اشتراک کار سے ایک نادار بھارت وجود میں آسکا تو وہ امریکہ کا ریوڑیہ"

لاتا ہے۔ کثیر ملکی کارپوریشنیں ڈرا دھمکا کر، بلیک میل اور خوشامد کر کے منافع پر مبنی ایسے صنعتی عقائد کی تخلیق کی کوشش کرتے ہیں جو سماجی انسان نوازی کے خلاف ہوتے ہیں۔ خبر دار یہ غلط خارجہ پالیسی کا نتیجہ ہے۔

بنیادی اُصول

پھر ایک اور متعلق امر ہے

نہیں ہے اور اس کی تشکیل متعدد انسانی امور سے ہوتی ہے۔ یہ نظریہ سائنسی ہے اور اس امر کا متقضی ہے کہ وسیع تر سیاسیات کی ایک ایسی بنیاد کے طور پر حقیقت پسندانہ جائزکاری حاصل کی جائے جس پر مستقبل کے قصر تعمیر کئے جاسکیں لیکن اگر بھارتی تشخص کی ہیئت کو بدلنا نہیں ہے تو اقتدار کے عمل کو ایسے بعض بنیادی اصول فراموش نہیں کرنے ہونگے جو اس قدر عزیز ہیں کہ اُن کے بارے میں کوئی سمجھوتہ یا گفت وشنید

سیکولرزم ایک لازمی شرط ہے جو اقلیتوں پر بھی اُسی طرح لاگو ہوتی ہے جس طرح اکثریت پر۔ ہر مذہب کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک خاص ڈسپلن کی پابندی کرے اور دنیاوی اُمور کو غیر مذہبی دائرۂ اثر سے پاک کردے جیسا کہ آرٹیکل ۲۵ میں کہا گیا ہے جو مذہب وضمیر کی آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔
مذہب اور سیاست کی واضح سرحدیں ہیں اور قومی منشور رُوحانی اُمور اور انسان اور اُسکے خالق کے درمیان تعلقات کی سرحدوں کے آگے مذہبی یورش کی ممانعت کرتا ہے۔ ان سرحدوں کے پار مذہبی فرقوں کیطرف سے آجانیوالی کسی بھی زیادتی سے سیکولرزم کا توازن بگڑ جاتا ہے، شدید تعصّب وجود میں آتا ہے اور غم وغصہ، نفاق اور رقابت پیدا ہوتی ہے۔

دکھاوے کی اساس سے چلنے والا ایک ادارہ بن جائے گا۔ جب مستعار شدہ ٹیکنالوجی ثقافتی افیون بن جائے گی تو بڑے بڑے سرمایہ دار ہماری قوم پرستی کو "سبوتاژ" کریں گے۔ ہم ایک ایسے سماجی نظام کی کمی محسوس کرتے ہیں جہاں انسان کو اہمیت دی جاتی ہے اور جو اس مقصد کے لیے ٹیکنالوجی کو بروئے کار

اور وہ ہے اقتدار کی سیاسیات اور اقتصادیات نے ایک خاص سماج میں آزادی اور انصاف کی داستان میں اُن تمام حالات کا مشاہدہ کیا جانا ضروری ہے جو اُس کے مالی تعلقات کی تشکیل کرتے ہیں۔ ثقافت خودمختار

نہیں کی جاسکتی۔ اُن بنیادی اصولوں کا مجموعہ کیا ہے؟ اول، بھارت گوناگونی کا مجموعہ ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے

نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں نسلی، لسانی، مذہبی، ثقافتی، علاقائی اور دیگر گوناگوں گروہ موجود ہیں جن کا سوجھ بوجھ کے ساتھ ایک لچکدار وفاقی نظام میں میل جول کر رہنا ضروری ہے۔ کشمکش، تشدد، دھماکوں اور علیٰحدگی پسندی کو روکنے اور ایک مسرت انگیز کنبے کا ماحول پیدا کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم کیونکر عمل کریں؟ زبردست طاقت سے یکسانیت نہیں برپا ہو

چڑھانا ہے جیسے سماجی اتحاد، رواداری، مساوات اور انصاف کی دستیابی کے ساتھ جوڑا گیا ہو۔

سیکولرزم — ہماری بنیاد

بلاشبہ بیشتر فرقوں کی اجتماعی شخصیت کا تحفظ کیا جانا ضروری ہے اگر بھارت کو ساوی ثقافتی سربکار کا ایک مشترکہ کنبہ بننا ہے۔ اس کے لیے سیکولرزم ایک لازمی شرط ہے جو اقلیتوں پر بھی اسی طرح لاگو ہوتی ہے جس طرح اکثریت پر۔ ہر مذہب کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک خاص ڈسپلن کی پابندی کرے اور بنیادی امور کو غیر مذہبی دائرہ

تاریخ سے وابستہ ہو اس میں یقیناً غیر مہذب بانہ بربریت پسندانہ رواج زور پکڑ لیتے ہیں ایسے سماج کو عوام کے ترقی پسندانہ شعور سے پاک اور صاف کیا جاتا ہے۔ سماجی بہبود اور اصلاحات اور حتیٰ کہ مذہبی اداروں میں بھی حسن انتظام مملکت کی عملداری سے تعلق رکھتا ہے۔ بلاشبہ ہر گروہ کو مذہبی اور فلاح عامہ کے مقاصد اور اپنے مذہبی امور کا انتظام کرنے کے لیے جن میں جائداد کا حصول اور انتظام بھی شامل ہے ادارے قائم کرنے اور انھیں برقرار رکھنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن کسی مذہبی گروہ کا یہ بنیادی حق اُن موزوں اعمال کے تابع ہے جو آئین کے آرٹیکل ۲۵

> **تامل ناڈو، آسام، خالصتان اور گورکھستان کی تحریکوں سے جو ہمیں تاریخی تجربہ ہوا ہے اُس کا درس بھیانک ہے۔ ہندوستان کا بٹوارہ ان قوتوں کی پیداوار تھا۔ ہندوستان جو بھارت ہے کی ضمنی تقسیم بہت حد تک انھیں اسباب سے ایک بدشگونی بنی ہوئی ہے۔**

اختلافات رہنے دیں یا لاابالی کے ساتھ انحراف کی اجازت دیں؟ دوسرا بنیادی اصول ہے عاشقانہ جوش کے ساتھ اتحاد و یکجہتی کا احساس محض نظری طور پر نہیں بلکہ عملی صورت میں بھی ہو۔ اگر بھارت کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں تو بھارتی عوام تباہ ہو جائیں گے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں بیرونی دشمنوں کی طرف سے تیزی لائی جائے گی جو ہمارے ملک کو مضبوط اور ہمارے عوام کو اُٹھتے دیکھ کر خوش نہیں ہوتے۔ انتشار پسندی کے عوامل کا جو اس وقت سرگرم ہیں ایک سالک مرض کے طور پر حب الوطنی ہونے کے جذبہ کے ساتھ مقابلہ کیا جائے جو ہمارے خون میں موجود ہے۔ تیسرا بنیادی اصول ایک ایسے کلچر کو پروان

اثر سے پاک کر دے جیسا کہ آرٹیکل ۲۵ میں کہا گیا ہے جو مذہب و ضمیر کی آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔ "جو کچھ بادشاہ کا ہے وہ بادشاہ کو دو اور جو کچھ خدا کا ہے وہ خدا کو دو۔" یہ سیکولرزم کی پرانی آزمائش ہے جس کے درمیان جیفرسن کی دیوار ہے جو انھیں الگ کرتی ہے۔ امن عامہ، اخلاق، صحت، مساوات، انسانی وقار اور دیگر بنیادی حقوق سیکولر ہیں۔ متبرک نہیں ہیں، اسی طرح منضبط، مالی، سیاسی اور دیگر سیکولر سرگرمیاں گو وہ مذہبی رسوم سے وابستہ یا ملی ہوئی ہیں مملکت کی "پولیس طاقت" کا حصہ ہیں۔ ایک جاگیردارانہ سماج جو مذہبی مطلق العنانیت کی

اور ۲۶ میں بیان کیے گئے ہیں اور جن میں مذہبی گروہوں کے خواہ وہ اکثریتی ہوں یا "اقلیتی" مادی اثاثہ جات کی بدنظمی یا دھوکہ دہی کی روک تھام کرنے کی ضرورت شامل ہے۔ بلاشبہ بھارتی آئین شہریوں کے اُن فرقوں کے جو زبان اور ثقافت کے رشتوں سے بندھے ہوئے ہیں ثقافتی اور تعلیمی حقوق کی ضمانت دیتا رہتا ہے اور اس حد تک چلا گیا ہے کہ اُس نے اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کے لیے بھی خصوصی حقوق دیئے ہیں۔ یہ دیکھا جانا ضروری ہے کہ ان اقلیتوں کو اپنے

ثقافتی تشخص کا جہاں تک وہ مذہب اور زبان پر انحصار رکھتا ہے تحفظ کرنے اور اُسے فروغ دینے کے لیے زیادہ تر حقوق دیئے گئے ہیں۔ اگرچہ عدالتوں نے اقلیتوں کو دی گئی ان ضمانتوں کو تاویلوں اور غیر شعوری تعصبات کے ذریعہ بڑھایا چڑھایا ہے اور مسخ کیا ہے۔ تاہم زیادہ زور اسی امر پر دیا گیا ہے کہ مذہب (اور لامذہب) کے تئیں حق ناقابلِ خلاف ورزی ہے' ثقافتی تشخص کے تئیں حق غیر متزلزل ہے اور سیکولر اصول کا محدود کیا جانا مساوی طور پر ناقابلِ تسیخر ہے۔ یعنی یہ کہ اُسے محدود نہیں کیا جا سکتا۔

واضح حد بندی

مذہب اور سیاست کی واضح سرحدیں ہیں اور قومی منشور روحانی امور اور انسان اور اُس کے خالق کے درمیان تعلقات کی سرحدوں کے آگے مذہبی پرورش کی ضمانت دیتا ہے۔ ان سرحدوں کے پار مذہبی فرقوں کی طرف سے کی جانے والی کسی بھی زیادتی سے سیکولرزم کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ شدید تعصب وجود میں آتا ہے اور غم و غصہ نفاق اور رقابت پیدا ہوتی ہے۔ جب فرشتے شجرِ ممنوعہ کا پھل کھاتے ہیں تو فرقہ وارانہ سیاسیات اور اقتدار ہتھیانے کی بیماری کا خوفناک طور پر اظہار ہوتا ہے جس کے نتیجے میں تصادم اور کشیدگی، تعصب، مذہبی کٹرپن اور قدیم ترین دور اور قرونِ وسطیٰ کی بربریت پیدا ہوتی ہے۔ تامل ناڈو، آسام، خالصتان اور گورکھستان کی تحریکوں سے جو ہمیں تاریخی تجربہ ہوا ہے اُس بس بھیانک ہے۔ ہندوستان کا بٹوارہ ان قوتوں کی پیداوار تھا۔ ہندوستان' جو بھارت ہے کی ضمنی تقسیم بہت حد تک انہی اسباب سے ایک بدشگونی بنی ہوئی ہے۔ اگر بھارت کے عوام متحد ہو جائیں تو پرولتاری اتحاد عمل میں آسکتا ہے اور غیر پیدا شدہ انقلاب ۲۰۰۱ء سے پہلے جنم لے سکتا ہے۔

عوام میں علیحدگی پیدا کرنا اور سوشلسٹ ری پبلک کو کمزور کرنا ملک کے بڑے بڑے سرمایہ داروں اور سمندر پار کے نئے سامراجیوں کے لیے ایک اچھی سرمایہ داری ہے۔ کیا مسلم لیگ اور اس کے مدِمقابل ہندو یا عیسائی فرقہ پرست اپنے ناداروں کے لیے آنسو بہاتے ہیں یا وہ اپنے اعلیٰ ترین طبقوں کے آلۂ کار ہیں؟ سوشلزم کو طلاق دینا اور سرمایہ داری کو گلے لگانا فرقہ پرستی کا رول ہے۔ سوشلزم اُس صورت میں فتحیاب ہو سکتا ہے اور علاقہ پرستی پسپائی اختیار کر سکتی ہے — اگر انسان نوازی، سائنسی مزاج، تحقیق اور اصلاح کی اسپرٹ جاندار مخلوق کے لیے رحمدلی، خواتین کے وقار کے خلاف رسوم کے ترک کی تحریک اُن عوام کے تعاون سے عمل میں آئے جوانِ افراد کی عزت افزائی کرتے ہیں۔ کیا ایسی علامتیں نظر آتی ہیں؟

عصر حاضر کے حقائق :۔ آؤ ہم عصر حاضر

سوشلزم کو طلاق دینا اور سرمایہ داری کو گلے لگانا فرقہ پرستی کا رول ہے۔ سوشلزم اُس صورت میں فتحیاب ہو سکتا ہے اور علاقہ پرستی پسپائی اختیار کر سکتی ہے۔ اگر انسان نوازی، سائنسی مزاج، تحقیق اور اصلاح کی اسپرٹ جاندار مخلوق کے لیے رحم دلی، خواتین کے وقار کے منافی رسوم کو ترک کرنے کی تحریک اُن عوام کے تعاون سے عمل میں آئے جوان افراد کی عزت افزائی کرتے ہیں۔

کی حقیقتوں پر ایک قریبی نگاہ ڈالیں۔ ذات پات کا نظام بہت زیادہ پھیلا ہوا ہے۔ مذاہب چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھڑک اُٹھتے ہیں اور الہائیات نے اپنا آلودگی کا جال اسکولوں اور کالجوں پر پھیلا رکھا ہے اور میڈیکل ریسرچ یونٹ، یتیم خانے اور بوڑھوں کے آشرم سرکاری امداد، غیر ملکی فنڈوں اور فرقہ وارانہ چندوں سے چلتے ہیں۔ عیسائیوں (۲ر۳ فیصد) کا ان اداروں میں بڑا ہاتھ ہے اور مسلمان (۳۵ر۱۱ فیصد) مُغلوں کی یاد اور خلیجی ممالک کے روپے کے ساتھ ساتھ تیزی سے یہی کچھ کر رہے ہیں۔ ہندو (۶ر۸۲ فیصد) جو ذاتوں میں بٹے ہوئے ہیں، افلاس کے ستائے ہوئے ہیں اور مشنریوں کی زور زبردستی اور بڑھتی ہوئی اسلامی تبلیغی سرگرمیوں سے دبے ہوئے ہیں۔ پرانے دھرم استھانوں کی نئی دریافت سے احیاء پسند اور فرقہ پرست بن رہے ہیں اور اقلیت نوازی کی پالیسی سے نالاں ہو کر خون بہانے کو تیار رہتے ہیں۔ اب پیغام یہ ہے کہ سیکولر بنو ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ برسوں پہلے وویکانند نے کیرل کو پاگل خانہ بیان کیا تھا کیوں کہ اُنھیں وہاں ذات پات کے شدید بٹوارے اور فرقہ وارانہ سرگرمیوں پر صدمہ ہوا تھا۔ آج بھارت مجموعی طور پر اس بیان پر پورا اُترتا ہے۔

مشترکہ سول کوڈ، ایک علاج؟

سیاسی پارٹیاں ــــ مذہب پرستی، قدامت پسندی، اقتدار کی ہوس، عہدوں سے پیدا ہونے والی خویش پروری اور غلیظ کارروائیوں کے لیے فرقہ وارانہ آڑ کی بہت حمایت کرتی ہیں۔ وزراء اور سرکاری افسران، سیاستدان اور پارٹیاں، کچھ ایک کو چھوڑ کر، طلباء کی تنظیمیں، مزدور یونینیں، عورتوں کی جماعتیں، کھیلوں کے کلب، آرٹ کے کلب، اخبارات اور ثقافتی مرکز، حتیٰ کہ تمام یونیورسٹیاں اپنا فرقہ وارانہ رنگ اور ذات کے زیر اثر رہتے ہیں۔ ہم ایسے ماحول میں رہتے ہیں جہاں گوناگوں پرسنل قوانین اور علیحدگی کا احساس پایا جاتا ہے۔ آئین نے اتحاد کو صحیح طور پر پروان چڑھانے کے لیے کہا تھا کہ ایک مشترکہ سول کوڈ بنایا جائے۔ ایک شہریت ہو۔ ایک قسم کا قانون ہو۔ لیکن کوتاہ بین عملیت پسندی نے جو دوسروں کے مفاداتِ خصوصی کے نشہ سے سرشار ہے۔ آئین کے بانی بزرگوں کی دانشمندی کو پسِ پشت ڈال دیا ہے اور مسلم کوڈ، سکھ کوڈ، عیسائی کوڈ وغیرہ کے دعاوی پیش کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ لیکن کچھ اُمید ابھی باقی ہے۔ تمام مذاہب کی خواتین اور عظیم مسلم دانشور جو سیکولر رنگ میں رنگے ہیں۔ اب اپنے انسانی حقوق کے لیے ڈٹ گئے ہیں اور مسلم بہنوں کے خلاف امتیازی قوانین کے خلاف مشترکہ محاذ بنا رہے ہیں۔ حال ہی میں محنت کش طبقہ کا ایک ٹریڈ یونین کنونشن فرقہ پرستی اور تخریبی قوتوں کے خلاف منعقد ہوا۔ جس میں پنجاب کے مسئلے اور قومی یکجہتی جیسے مسئلوں کو زیرِ بحث لایا گیا اور

آؤ ہم عصرِ حاضر کی حقیقتوں پر ایک قریبی نگاہ ڈالیں۔ ذات
پات کا نظام بہت زیادہ پھیلا ہوا ہے، مذاہب چھوٹی چھوٹی باتوں
پر بھڑک اُٹھتے ہیں اور الہائیات نے اپنا آلودگی کا جال اسکولوں
اور کالجوں پر پھیلا رکھا ہے اور میڈیکل ریسرچ یونٹ، یتیم خانے
اور بوڑھوں کے آشرم سرکاری امداد، غیر ملکی فنڈوں اور فرقہ وارانہ
چندوں سے چلتے ہیں۔

مذہبی اور لسانی انتشار پسند قوتوں کا
مقابلہ کرنے کے بارے میں غور کیا گیا۔ یہ
احساس بہت دور رس معانی رکھتا ہے ایک
اور حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ وزیر اعظم نے
ذاتی طور پر ہر سیکولرسٹ کو ذاتی
طور پر یقین دلایا ہے کہ ایک مشترکہ
سول کوڈ کے لیے جلد ہی ایک قانون
بنایا جائے گا جو شروع میں اختیاری
ہوگا۔ پھر بھارت کے اندر ایک نیا
چرچ (مذہب) پنپ رہا ہے جس
کی دینیات آزادی پسندانہ اور
نظریات جمہوریت نواز ہیں۔ دو
فرقوں کے درمیان شادیوں کی اب
زیادہ مخالفت نہیں ہوتی گو یہ شادیاں
بہت کم ہو رہی ہیں۔ مصیبت یہ ہے
کہ سرکاری تقاریب، ریڈیو اسٹیشن
پارٹی نشانات، اعلیٰ ترین عہدوں
کے لیے انتخاب، مذہبی اداروں
کو چندے، چھٹیوں کی تقسیم۔ یہ
سب پبلک طور پر فرقہ وارانہ ہیں۔
مارکس وادی بنگال اور تریپورہ میں
جانوروں کی قربانی، کرناٹک کے جینا
راج میں بھگتی جلوسوں میں برہنہ
عورتوں کی شمولیت اور اس کے
ساتھ ہی خلیجی ممالک کے روپے
سے مسجدوں کا دھڑا دھڑ بننا، غیر
ملکی فنڈوں سے کلیساؤں کی تعمیر
اور ہندو دھنا سیٹھوں کی طرف سے مندروں
اور دھرم استھانوں کا بنایا جانا خطرناک
باتیں ہیں جن سے یقینی طور پر کشیدگی اور
خونریزی ہوگی اور مملکت (حکومت) مذہبی
خیراتوں، مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں پر

ایک مشترکہ سول کوڈ کے ذریعے کنٹرول کرنے
میں ناکام رہی ہے۔

عظیم تقسیم

ایک چھوٹا لیکن اہم نکتہ ہے۔ آئین
مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو اپنے ادارے قائم
کرنے کے حقوق عطا کرتا ہے۔

> ۲۰۰۱ء کوئی جیوتشیوں کا بنایا
> ہوا ہزار سالہ وقت نہیں ہے اور
> کسی مسکن دوائی کا نام رجائیت
> پسندی نہیں ہے۔ جدلی طور پر بات
> کرتے ہوئے بھارت کے سماجی نظام
> کے لیے ایک سنہری انسانی نظام
> کی جانب بڑی چھلانگ لگانے کے
> لیے وقت موزوں ہے اور تاریخ کسی
> پُراسرار طاقت کیساتھ نعروں اور
> پارٹی میلوں کو نظرانداز کرکے درست
> قیادت پالے گی۔

تاکہ وہ ظاہرا زبان اور مذہب
کے دو ستونوں پر بنائے گئے ثقافتی تشخص
کا تحفظ کر سکیں۔ لیکن اس ملک کی اعلیٰ تر
عدلیہ نے اس کے معانی کو توڑ مروڑ کر اس

محدود بنیادی حق کے گرد چھوٹی قلعہ بندیاں بنا دی
ہیں۔ کیا وہ اپنی اس غیر پسندیدہ غلطی کا ازالہ
کرے گی؟)۔ اقلیت کون ہے؟ کیا ایک صنعتی
منیجر گویا کالا دھن جمع کرنے والا یا فرقہ پرست
سرمایہ دار جو ایک تعلیمی کاروبار میں سرمایہ
لگاتا ہے؟ کیا اُسے اس اقلیتی فرقے کے نمائندوں
کی صورت میں جمہوری طور پر منتخب کیا جائے
جس کے نام پر وہ اسکول بناتا ہے اور مراعات
طلب کرتا ہے؟ دوسرے کیا کوئی
کالج یا ادارہ جو اس فرقہ کے
خاص کلچر، زبان یا مذہب سے
قطعاً غیر وابستہ ہو ایک اقلیت
کا حق کہلا سکتا ہے۔ ہم ایک ایسے
میڈیکل کالج یا ٹیکنالوجیکل اسکول
۔۔۔ اسکول یا (اقلیتی) لسانی مرکز
کو ایک اقلیت کا ایسا خصوصی
ادارہ کیونکر تصور کر سکتے ہیں
جو اکثریتی یا پبلک سیکٹر کے اداروں
پر لاگو ہونے والے سرکاری قواعد سے
محض اس لیے مستثنیٰ ہو کیونکہ
محض اس کا پرائیویٹ مالک ایک
خاص فرقہ سے تعلق رکھتا ہے جس
میں تعلیمی سوداگروں کی تمام تجارتی
برائیاں موجود ہیں۔ ایک اور بیماری
ہے۔ ۳ برس کی عمر سے جب بچہ
ایک "ایل کے جی" اسکول یا
بچوں کے ایک بیش قیمت حفاظتی
گھر میں داخل ہوتا ہے جہاں
بہت زیادہ فیس اور دیگر اخراجات
ہوتے ہیں۔ بڑی عمر میں اعلیٰ
کالجوں میں پڑھائی تک یہ شعور پیدا کیا جاتا ہے
کہ وہ اونچے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ پسندیدہ

طبقے کے لوگ اپنے بچوں کو "شودروں" کے اداروں میں بھیجتے ہیں جبکہ اعلیٰ طبقے کے لوگ اپنے لڑکوں کو امیروں کی درس گاہوں میں بھیجتے ہیں۔ سوشلسٹ ری پبلک میں یہ کیسی عظیم تقسیم ہے۔

سماجی انصاف کو دھکا

جیسا کہ گنار مرڈال نے زور دے کر کہا ہے کہ بیسویں صدی کا بھارت ایک نرم مملکت ہے اور اس کی ترقیاتی اور انتظامیہ مشینری جامد اور بدعنوان ہے۔ یہ پرانا احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ یہاں سیاسی دباؤ کے لیے روپے کا استعمال کیا جاتا ہے اور "لوٹ کا سسٹم" پھیلا ہوا ہے۔ گو بعض پارٹیاں دوسروں کو مات کر رہی ہیں۔ تاہم تمام سیاست جو بیش قیمت انتخابی مہموں کو حرکت دیتی ہے۔ تجارتی حلقوں سے فنڈ جمع کرنے کے لالچ سے چلتی ہے لوگوں کو یقین دلایا جاتا ہے کہ سرمایہ داری ہی سوشلزم ہے اور یہ کہ پرائیوٹ سیکٹر ہی کامیاب ہوگا اور پبلک سیکٹر تباہ ہو جائے گا۔ گو "کوکا کولا" ماہرین معاشیات آرٹیکل ۳۹ (ب) کے باوجود پرائیویٹ اجارہ داری کو زیادہ طاقت دینے کے لیے سرکاری عدم مداخلت کے زبردست حامی ہیں تاہم سماجی انصاف کو اس لیے نقصان پہنچا ہے کہ بدقسمت کروڑوں افراد کے ساتھ ساتھ چند کروڑپتی موجود ہیں۔ سبز اور سفید انقلاب بڑے بڑے زمینداروں کی مدد سے وسعت پا رہے ہیں۔ یہ ترقیاتی مایا ہے۔ پریس کے بڑے بڑے سیٹھوں اور دور درشن کی بدولت اچھا برا بن گیا ہے اور برا اچھا بن گیا ہے۔

جاننے کا حق

ہماری کمل حکومت سرکاری رازداری اور اطلاعات کی عدم دستیابی یا گھڑے ہوئے سچ کے ساتھ پھل پھول رہی ہے۔ اطلاعات کی آزادی یا اطلاعاتی قانون کیوں نہیں ہیں جبکہ سرکاری رازداری کا قانون موجود ہے؟ حتیٰ کہ پارلیمنٹ بھی جو سنجیدہ طور پر محب وطن ہے شاذ و نادر ہی تنقیدی امور پر بحث کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پارلیمنٹ کو ان رازوں کا علم ہی نہ ہو۔ تب یقیناً ملک کو خود علم ہی نہیں ہوگا۔ تب کس کو علم ہوگا؟ صرف جرنیلوں کو؟ نیوکلیائی سائنس کے لوپوں کو؟ سرکار کے محافظان ضمیر کو جن کا خفیہ کام کاج عوام کی تقدیر کو بنا یا بگاڑ سکتا ہے؟ جیمز میڈیسن نے جو کچھ کہا ہے وہ بھارتی آئین کے تحت جائز ہے۔

"عوامی اطلاعات یا اُن کے حصول کے ذریعے بغیر ایک عوامی حکومت کے ایک تماشے یا ایک ٹریجڈی یا شاید دونوں کا ایک دیباچہ ہے۔ علم ہمیشہ لاعلمی پر غلبہ پائے گا اور ایک قوم جو اپنی حاکم بننا چاہتی ہے اُس کے لیے خود کو ایسی طاقت سے لیس کرنا ضروری ہے جو علم سے ملتی ہے۔"

اس سے پہلے کہ اکیسویں صدی ہم پر چھا جائے ہمیں اپنے بنیادی حقوق کے بارے میں یقین حاصل کرنا ضروری ہے
حقوق میں جو امر بنیادی ہے وہ ہے "جاننے کا حق"۔ جب صداقت کی گہرائی سے محض الفاظ باہر آتے ہیں" علم آزاد ہوتا" ہے اور "عقل و دلائل کا واضح بہاؤ ہوتا ہے" جس سے ہماری ری پبلک کو تقویت حاصل ہوگی۔

سماجی انصاف کی اقدار

ہم عوام اس صدی کی حد کو پار کرنے سے پہلے اس خطرناک عمل کو اُلٹ دیں گے۔ گاندھی جی نے "سورِیشی" کے لیے تحریک شروع کی تھی اور وہ طاقت کے عمل کو غیر مرکوز کرنا چاہتے تھے۔ نہرو جی نے سوشلسٹ تبدیلی کی امداد میں ایک قدم کے طور پر پبلک سیکٹر کے لیے تحریک دی تھی۔ اندرا گاندھی نے اس عقیدے کو ترک نہیں کیا گو وہ عمل میں دائیں اور بائیں دونوں بازوؤں سے مفاہمت کرتی تھیں۔ اور انھوں نے نیشنلائزیشن کیا اور افلاس اور ماحول کی آلودگی کے خلاف قوانین بنائے۔ صرف عوام کی سرگرم اور باشعور حمایت سے ہی یہ تبدیلی آ سکتی ہے۔ "بائیں بازو" کی پارٹیاں راستے میں ہی رہ گئیں اور محض باتوں میں ہی بھٹک گئیں اور اب وہ فاتحہ پڑھنے میں مصروف ہیں۔ لہٰذا سماجی انصاف کا ایک بڑا طوفان ہی جو سیاسی لیبلوں کو نظرانداز کر دے اس مسئلہ کا حل ہے۔ بھارت بیدار ہوگا اور اس کی علامتیں موجود ہیں۔ جھگی جھونپڑیوں والوں کے باسیوں اور پٹریوں پر رہنے والوں کی جارحانہ تحریک اس کی شہادت ہے۔ انتہائی اعلیٰ طبقہ غیر ملکی امداد سے زیادہ دور نہیں جا سکے گا۔

جب جمہوریت کے رنگ ڈھنگ اور ہمارے سماجی نظام کی نوعیت کا جائزہ لیا جائے تو ہماری اُن ناکامیوں کا ضرور خیال رکھا جائے جنھیں اگر دور نہ کیا گیا تو ہم مطلق العنانیت، بے حسی اور تاریکی کے دوزخ کی جانب جا سکتے ہیں۔

یہ سنگین ناکامیاں ہمارے مستقبل پر اثرانداز ہوتی ہیں اور وہ ہیں (الف) رشوت خوری کی دیمک۔ (ب) طاقت کے عوامل میں لامرکزیت کا نہ ہونا اور اس کا بڑھتے جانا۔ (ج) گھٹنے ٹیک اور دست برداری کا کلچر اور (د) انسانی حقوق کے تئیں گہری بے حسی اور ہر جگہ غیر مہذبانہ طور پر مسرت کے حصول کو ہی مقصد بنانا۔ بلا شبہ سماجی انصاف، ہماری ری پبلک کی

جاتا ہے۔ یہ ہمارے گئے ہوئے بھائیوں کو اُن سے کئے گئے دیرینہ قانونًا عملی فریب کے لیے چینوتی ہے اور پارلی منٹ خود بھوپال قسم کے قانونی مسودوں اور الفاری تقریروں کے جوڈیشری کو بدنام کر رہا ہے۔

بد شگونیاں

سوشلزم کے تاجروں کی طرف سے کارپوریٹ سیکٹر (بڑی بڑی کمپنیوں) سے بھاری فنڈ جمع کرنا، کالے دھن کو عملًا قانونی صورت دینا، بے نامی سودوں کے ذریعے بلیک مارکیٹنگ کرنا، بیرئیر بانڈ اسکیمیں اور کمپنی قانون میں ترامیم بدشگونیاں ہیں۔ انسدادِ رشوت خوری کے بڑے بڑے قوانین اور چھاپے بمشکل اعتماد پیدا کرتے ہیں کیونکہ ہر کوئی جانتا ہے کہ قانون اُس وقت بے جان یا مہمل ہو جاتا ہے جب اُسے اقتدار کا سامنا کرنا ہوتا ہے جو پوری طاقت سے لیس ہوتا ہے۔

اور اب حکومت کی باگ ڈور ایک نو عمر وزیر اعظم نے سنبھال لی ہے۔ انھوں نے آسام اور پنجاب جیسے نازک معاملوں پر بعض دلیرانہ فیصلے سوجھ بوجھ کے ساتھ کئے ہیں جس کے لیے اُن کی بڑی تعریف ہوئی ہے (اس کے ساتھ ہی مُسلم بِل جیسی بعض فحش غلطیاں بھی ہوئی ہیں)، اُن کی خارجہ پالیسی اور ناوابستہ ممالک کی تحریک کی قیادت نے بھارتی عوام کے حوصلے کو بھی بلند کیا ہے لیکن اُن کی شبیہ بہترین طور پر ایک سوشلسٹ اور بدترین طور پر اعلیٰ ٹیکنالوجی یا کمی "نوتریا" کے ایک سیلز مین کی ہے۔ انھوں نے خود اتنا گناہ نہیں کیا جتنا اُن کے ساتھ کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کا گروہ حقیقی انحراف پسندوں کا ہے وہ عوام کے شکوہ کو محسوس کرنے کے لیے اُٹھ سکتے ہیں کوئی ایک آدمی توجہ کا مرکز نہیں ہے۔ ملک کو اجتماعی قیادت اور اپنے آپ پر تنقید پر انحصار رکھنا ضروری ہے۔ بد قسمتی سے برسرِ اقتدار پارٹی بمشکل اندرونی جمہوریت کو عمل میں لاتی ہے جب کہ دیگر پارٹیاں انتشار پیدا کر رہی ہیں۔ آؤ ہم حقائق کا سامنا کریں۔ معاشیات کی پرائیویٹ کاری، نظامت کی پارٹی بازی اور صنعتوں کے لیے کثیر الملکی کارپوریشنوں کے غلبے کے سیاسی دلال ۲۰۰۱ء تک مکمل جوابی انقلاب کے لیے پُر امید ہیں۔ کیونکر؟ — اس سلسلے میں انھیں جن سے اُمیدیں وابستہ ہیں، وہ یہ ہیں:-

۱۔ مذہبی کٹر پنتھیوں سے جو عوام کو فرقہ وارانہ لائنوں پر لڑاتے ہیں۔

۲۔ پبلک سیکٹر کو ٹھیک کرنے کی کوششوں سے کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ٹھیک نہیں ہوگا اور اس پر نقصان میں چلنے کے الزامات اس کو مزید کمزور کر دیں گے۔

۳۔ حساس سول افسروں کی کمزوریوں سے جس سے کہ وہ وزیروں کے غلام بنے رہیں۔

۴۔ نوجوانوں سے جنھیں نشہ آور گولیاں گمراہ کرتی رہیں گی۔

۵۔ ڈالر کی چکا چوند سے جو گاندھی۔ نہرو میراث اور وویکا نند کی تعلیمات کو بے اثر کر دے گی۔

۶۔ بائیں بازو کی سیاسیات کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے جس سے کہ وہ بے اثر ہو جائے اور اس کی کوئی قیمت نہ رہے۔ اور وہ صرف انتشار کا سبب بنا رہے۔

۸۔ اکیسویں صدی کے بارے میں یہ پروپیگنڈہ کہ کمپیوٹر ٹکنالوجی جادو کی چھڑی ہے اور نئی درآمداتی پالیسی کے لیے مفید ہے جس سے کہ سب کو کھانا ملے گا، سب کو کام ملے گا اور سب کو خوشی ملے گی۔

مسلسل علاقائی تنازعوں سے انتشار اور ایجی ٹیشنوں سے ملک کو غیر مستحکم بنانے کی پالیسیاں ملک پار کے دشمنوں کی طرف سے بنائی جا رہی ہیں جس میں ملک کے غدار، پڑوس کے ایجنٹ اور دوستانہ نقاب اوڑھے ہوئے سازشی حصہ لے رہے ہیں اور جس میں غیر ملکی سرمایہ اہم حصہ ادا کر رہا ہے۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ اندر کی جمہوری طاقت اور باہر سے سیاسی نگرانی کے ذریعے نیشنل کانگرس کی قیادت اور تمام پارٹیوں اور باہر کے دانشوروں کی اجتماعی مساعی سے ۲۰۰۱ء میں بھارت کی قسمت کو عوام کی سمت اور سوشلسٹ شعور کے ساتھ ڈھال لیا جائے گا۔

کوئی بھی انقلاب ایک عمل اور حقیقت پسندانہ نظریئے کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وہ کہاں ہے؟ ۲۰۰۱ء کوئی جیوتشیوں کا بنایا ہوا ہزار سالہ وقت نہیں ہے اور کسی مسکن دوائی کا نام رجائیت پسندی نہیں ہے۔ منطقی طور پر بات کرتے ہوئے بھارت کے سماجی نظام کے لیے ایک سنہری انسانی نظام کی جانب بڑی چھلانگ لگانے کے لیے وقت موزوں ہے اور تاریخ کسی پُر اسرار طاقت کے ساتھ نعروں اور پارٹی لیبلوں کو نظر انداز کر کے دُرست قیادت پالے گی۔

جب میں اکیسویں صدی کی صبح کا تصور باندھتا ہوں تو مجھے وکٹر ہیوگو کی یاد آجاتی ہے جس نے کہا تھا "دنیا میں تمام افواج سے ایک چیز زیادہ طاقتور ہے اور وہ ہے ایک خیال، جس کا وقت آگیا ہے"۔ ●

ڈاکٹر ایل. کے. جھا

آغاز تو اچھا ہے

آیئے اسے آگے بڑھائیں

مضمون نگار کا کہنا ہے کہ ہماری کارکردگی کافی اچھی رہی ہے اور ہمیں اپنی کامیابیوں پر فخر ہونا چاہیئے لیکن معیشت کی حیاتِ نو کے لیے اصلاحات کے اس عمل کو اور زیادہ طاقت اور پختہ ارادے سے جاری رکھنا چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اپنی کاہلی، نااہلیت اور فرسودہ عقیدوں کو خیرباد کہنا چاہیئے تاکہ ہم ۱۵ اگست سنہ۲۰۰۰ء کو ایک جدید ترقی یافتہ معیشت کے طور پر نہ کہ غیر ملکی مدد کے محتاج ترقی پذیر ملک کے طور پر منانے کے لیے تیار ہو سکیں۔

ہم پینتیس ۳۵ برسوں سے منصوبہ بند ترقی کے عمل میں مصروف ہیں۔ مزید پندرہ برس میں ہم اکیسویں صدی میں پہنچ جائیں گے۔ جب وزیراعظم ۱۵ اگست سنہ۲۰۰۰ء کو لال قلعے سے قومی جھنڈا لہرائیں گے تو ہندوستان کیسا ہوگا۔

اس سوال کا جواب دینے کے لیے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مستقبل کی تصویر پیش کرنے کے لیے ماضی کی کارکردگی کو نمایاں طور پر پیش کرنے کی کوشش کی جائے اور دوسرا یہ کہ آئندہ جس قسم کی صورتِ حال ہوگی اُس کی پرواہ نہ کی جائے بلکہ یہ دیکھا جائے کہ ہم لوگوں کی اُمیدوں اور تمناؤں کو پورا کرنے کی غرض سے حالات کو اپنی مرضی کے مطابق کس طرح ڈھالیں۔ پہلا طریقہ خارجی قوتوں کے تابع ہوگا اور دوسرا ثابت قدمی کا۔ جو لوگ منصوبہ بندی میں یقین رکھتے ہیں انھیں موخرالذکر راہ اختیار کرنی چاہیئے۔

تاہم اگر ہم پہلی راہ بھی اختیار کریں تو مجھے اس دلیل کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی جیسے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان دو قوموں امیر اور غریب کا ملک بن جائے گا۔ جو لوگ یہ دکھانے کے لیے کہ کتنے زیادہ لوگ اب بھی غریب ہیں، غربت کا خط کھینچتے ہیں وہ موجودہ صدی کے وسط کے مقابلے میں لوگوں کے مجموعی معیارِ زندگی میں بھاری تبدیلی یا بہتری کی شہادت کو نظرانداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جب ہم آزاد ہوئے تھے تو ہندوستان خوردنی تیل برآمد کرنے والا سب سے بڑا ملک تھا کیونکہ اُس وقت بہت تھوڑی تعداد میں لوگ اپنی روزمرہ خوراک میں کوئی تیل یا چکنائی شامل کرنے کی استطاعت رکھتے تھے۔ لیکن آج

یہ دنیا میں سب سے زیادہ خوردنی تیل درآمد کرنے والا ملک ہے اس لیے نہیں کہ امیر لوگوں کی خوردنی تیلوں کی کھپت میں اضافہ ہو گیا ہے، بلکہ اس لیے کہ اُن لوگوں کی تعداد میں بھاری اضافہ ہو گیا ہے جو ہر روز خوردنی تیل اپنی خوراک میں استعمال کرنے لگے ہیں۔ کچھ ایسی ہی بات چینی، جوتوں، بائیسکلوں، بجلی کے پنکھوں اور یہاں تک کہ اسکوٹروں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ یہ کہنا کہ ترقی کے فائدے غریبوں تک نہیں پہنچے حقیقتوں سے چشم پوشی کرنا ہوگا۔

کچھ ایسی ہی غلط فہمی اُن لوگوں میں پائی جاتی ہے جو شہری اور دیہی علاقوں کے تضاد کو نمایاں کرکے پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اکثر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب تک ہندوستان کے صرف ۸۰ فیصد دیہات کو بجلی مہیا کی جا سکی ہے۔ بہت سے لوگوں کو یہ علم نہیں ہے کہ دیہات میں بجلی پہنچانے کی سطح امریکہ میں دوسری جنگ عظیم کے کئی برس بعد جا کر حاصل ہو سکی تھی اور ۱۹۴۴ء میں امریکہ کے ۹۱ فیصد دیہات میں بجلی نہیں تھی۔ لہٰذا ہم نے دیہات میں بجلی پہنچانے کے معاملے میں اب تک جو کچھ کیا ہے، وہ یقیناً اپنے آپ پر جاتا بننے کے لیے کوئی وجہ نہیں ہے۔

یہ کہتے ہوئے میں یہ تجویز نہیں کر رہا کہ غربت دُور کرنے کے لیے خصوصی کوششوں کی ضرورت نہیں ہے جو لوگ اس مسئلے کو صرف (نام نہاد) غریبوں اور امیروں کے درمیان فرق کو کم کرنے کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ اکثر پالیسیوں کی صورت میں ناقص نسخے تجویز کرتے ہیں۔ وہ غریبوں کی حالت بہتر بنانے کے طریقے تجویز کرنے کی بجائے، اُن لوگوں پر پابندیاں لگانا چاہتے ہیں جو بہتر حالت میں ہیں۔ وہ غربت پر حملہ کرنے کی بجائے دولت پر حملہ کرتے ہیں۔

ہمیں سب سے زیادہ کس چیز کی ضرورت ہے!

سب سے اہم چیز جس کی ہمیں اکیسویں صدی میں غریبی پر ایک زوردار ضرب لگانے اور ملک کو اکیسویں صدی میں لے جانے کے لیے ضرورت ہے خود اعتمادی کا احساس ہے۔ ہمیں اپنی کامیابیوں پر فخر ہونا چاہیے اور محض اپنی خامیوں پر ہی نظر نہیں رکھنی چاہیے۔ یہ کوئی چھوٹی کامیابی نہیں ہے کہ موجودہ صدی کے پہلے نصف حصے میں رفتار ترقی کی حالت تقریباً جامد تھی اس کے بعد ہم نے منصوبہ بند ترقی پر کام شروع کیا چنانچہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۰ء تک ہماری رفتار ترقی کی مجموعی شرح ترقی ۳۰۵ فیصد ہی ہے۔ راج کرشن اسے ہندو رفتار ترقی کا نام دیا کرتے تھے کیونکہ وہ بجا طور پر چاہتے تھے کہ ہم بہتر طور پر کام کریں۔ پھر بھی ترقی کی یہ رفتار ترقی یافتہ ملکوں کے ابتدائی برسوں کے مقابلے میں بُری نہیں ہے۔ ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ اس ترقی کے لیے ۹۰ فیصد سالانہ سرمایہ بھی ملکوں کی طرح دوسرے ملکوں کی لوٹ کھسوٹ یا غیر ملکوں سے بڑے پیمانے پر سرمائے کی آمد سے نہیں بلکہ ملک کے اندر ہی مہیا کیا گئے۔ مزید برآں ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ہم نے ...

جو لوگ اس مسئلے کو صرف نام نہاد غریبوں اور امیروں کے درمیان فرق کو کم کرنے کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ اکثر پالیسیوں کی صورت میں ناقص نسخے تجویز کرتے ہیں۔ وہ غریبوں کی حالت بہتر بنانے کے طریقے تجویز کرنے کی بجائے، اُن لوگوں پر پابندیاں لگانا چاہتے ہیں جو بہتر حالت میں ہیں۔ وہ غربت پر حملہ کرنے کی بجائے دولت پر حملہ کرتے ہیں۔

ترقی کی شرح میں ایسے وقت پر نمایاں اضافہ کیا جب باقی دنیا میں ترقی یافتہ ملکوں کی ترقی کی رفتار میں نہ صرف کمی آئی بلکہ جو اکثر منفی بھی ہوگئی اور یہ ترقی ایسے وقت ہوئی جبکہ بہت سے ترقی پذیر ملک جنکی آمدنی ہم سے کہیں زیادہ ہے قرضے کے پھندے میں پھنسے ہوئے تھے۔

ہے حالانکہ مون سون کی بارشیں نہ ہونے اور خشک سالی سے ملک کی کئی ریاستوں میں فصل پر ناموافق اثر پڑا ہے۔

جہاں ہمیں کامیابیوں کے بارے میں کم اندازہ نہیں لگانا چاہیئے وہاں ہم خوش فہمی میں بھی مبتلا نہیں رہ سکتے۔ قبل اس کے کہ ہم دعویٰ کر سکیں کہ ہم نے ملک نے قوم کے سامنے غریبی کو اس صدی کے آخر تک ختم کرنے کا نشانہ رکھا ہے۔ عہدہ سنبھالنے کے بعد اپنے پہلے نشریہ پیغام میں انھوں نے اعلان کیا تھا "ہم سب مل کر اکیسویں صدی کا ہندوستان تعمیر کریں گے"۔ ایک اور موقع پر انھوں نے کہا "جس غریبی کو ہم جانتے ہیں وہ اکیسویں صدی کے شروع میں زمانہ ماضی کی ایک چیز بن جائے گی"۔

کمزوریوں کو دور کرنا

اس نشانے کو پورا کرنے کے لیے ماضی میں ترقی کے لیے تیاری کی قوت پر انحصار رکھنا ہی کافی نہیں ہوگا۔ ہمیں ترقی کی رفتار کو لازماً تیز کرنا ہوگا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ہماری مجموعی کارکردگی اچھی بلکہ قابل تعریف رہی ہے البتہ بہت سی خامیاں اور کمزوریاں ایسی ہیں جن سے ہمیں چھٹکارہ حاصل کرنا ہے اور میں اب ان کمزوریوں کا ذکر کرتا ہوں۔

ہم نے جب منصوبہ بندی شروع کی تھی بچتوں کی کمی کو ہماری راہ کا سب سے بڑا روڑا سمجھا گیا تھا۔ کم آمدنی والے لوگ بچا سکتے تھے لیکن بہت معمولی مقدار میں۔ بچتوں کی سطح مجموعی قومی

۱۹۸۰ء کی دہائی میں ہم نے اپنی ترقی کی شرح میں ایسے وقت پر نمایاں اضافہ کیا جب باقی دنیا میں ترقی یافتہ ملکوں کی ترقی کی رفتار میں نہ صرف کمی آئی بلکہ جو اکثر منفی بھی ہوگئی اور یہ ترقی ایسے وقت میں ہوئی جبکہ بہت سے ترقی پذیر ملک جنکی آمدنی ہم سے کہیں زیادہ ہے قرضے کے پھندے میں پھنسے ہوئے تھے

ہندوستان کو اس وقت صنعتی ممالک میں ایک باعزت مقام حاصل ہے۔ ہماری صنعتیں کم و بیش تمام ایسی اشیاء ضروری تیار کر رہی ہیں جن کی ہمیں ضرورت ہے۔ ہمارے کارخانے ہر قسم کا بنیادی سامان، بھاری مشینیں، بجلی تیار کرنے کے پلانٹ، روائتی اور نیوکلیائی۔ ہوائی جہاز اور سمندروں میں سفر کرنے والے جہاز بھی تیار کر رہے ہیں۔ زراعت کے شعبے میں بڑے پیمانے پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ آبادی کی تعداد خوراک کی بہم رسانی سے بڑھ جانے کے بارے میں مالتھس کی پیش گوئی ہندوستان کی حالت میں درست ثابت ہوگی۔ لیکن آج بھارت میں فاضل غلہ

یہ انحطاط سرمایہ کے غیر دانشمندانہ استعمال کا نتیجہ تھا جس کے کئی اسباب تھے۔ ان میں سے ایک اہم وجہ ملک میں رائے عامہ کی فضا تھی جو ہر پانچسالہ منصوبے کو ان پراجیکٹوں اور پروگراموں کی تعداد کے لحاظ سے دیکھتی تھی۔ جو منصوبے میں شامل کئے جاتے تھے

کو قدیم غریبی سے آزاد کرالیا ہے

ہمیں ایک طویل سفر طے کرنا ہوگا۔ وزیراعظم

پیداوار کے دس فی صد سے بھی کم تھی۔ زوردار کوششوں کے نتیجے کے طور پر ۱۹۷۰ کی دہائی کے وسط میں، بچتوں کی شرح دوگنی کر کے مجموعی قومی پیداوار کے ۲۰ فیصد کے برابر لائی گئی لیکن ترقی کی رفتار دوگنی نہیں ہوسکی۔ اس کی بجائے سرمائے کے قیام کا تناسب بلند ہوگیا۔

یہ انحطاط سرمایہ کے غیر دانشمندانہ استعمال کا نتیجہ تھا جس کے کئی اسباب تھے۔ ان میں سے ایک اہم وجہ حکمت عملی بنانے والوں کی سوچ تھی جو ہر پانچسالہ منصوبے کو اُن پراجیکٹوں اور پروگراموں کی تعداد کے لحاظ سے دیکھتی تھی جو منصوبے میں شامل کئے گئے تھے وہ یہ دیکھتی تھی کہ اُن پر کتنا سرمایہ لگانے کی تجویز ہے پہلے جو سرمایہ لگایا جا چکا تھا اُس سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ دوسرے الفاظ میں زیادہ زور تخصیص زر پر تھا، زیادہ پیداوار پر نہیں۔ منصوبوں کے نشانوں اور مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جو انتظامی اقدامات کئے گئے تھے وہ نا اہلیت اور سرمایہ سے کم پیداواری صلاحیت کے لیے کم ذمہ دار نہیں تھے۔ اگرچہ صنعتوں کی ترقی اور قاعدہ بندی کے لیے قانون کمیاب سرمائے کو بچا کر رکھنے اور اس امر کا یقینی انتظام کرنے کے لیے بنایا گیا تھا کہ سرمایہ ترجیحی سیکٹروں پر استعمال کیا جائے لیکن اس پر عمل درآمد سے دیکھا گیا کہ اس قانون کے تحت اُن کی پیداوار پر جو پابندیاں لگائی گئیں اس سے نصب شدہ صلاحیت سے پیداوار میں رکاوٹ پڑنے لگی ہے۔

اجارہ داری کے طریقوں کو روکنے کے قانون کا مقصد اجارہ داری کے رجحانات کو باز رکھنا اور تجارت میں رکاوٹیں ڈالنے والے طریقوں کو ختم کرنا تھا لیکن اس قانون سے یہ طریقے اور بھی مضبوط ہوگئے۔ اس قانون نے بڑے بڑے تجارتی اداروں کو مقابلے سے محفوظ کر دیا جو کہ چھوٹے اداروں سے نہیں بلکہ دیگر بڑے تجارتی اداروں سے ہی پیش آسکتا تھا۔

اجارہ داری کے طریقوں کو روکنے کے قانون کا مقصد اجارہ داری کے رجحانات کو باز رکھنا اور تجارت میں رکاوٹیں ڈالنے والے طریقوں کو ختم کرنا تھا لیکن اس قانون سے یہ طریقے اور بھی مضبوط ہوگئے۔ اس قانون نے بڑے بڑے تجارتی اداروں کو مقابلے سے محفوظ کر دیا جو کہ چھوٹے اداروں سے نہیں بلکہ دیگر بڑے تجارتی اداروں سے ہی پیش آسکتا تھا۔

بلکہ سرکاری دائرہ کار کے بہت سے کارخانے منافع کمانے کی بجائے خسارے میں جانے لگے ہیں جن وزارتوں کے زیر اہتمام یہ کارخانے قائم کئے گئے تھے اُن کی طرف سے زیادہ کڑی نگرانی اور پابندیاں لاگو کرنے سے اُن کی اہلیت کار میں مزید کمی ہوئی ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر وسیلوں کا خلا اور چوڑا ہوگیا ہے۔ اُن پراجیکٹوں کی نہ صرف ہر منصوبے میں بلکہ ہر سال بڑھوتی جا رہی ہے۔

انھوں نے منافع بڑھانے کے لیے پیداوار کم کرنے کے اجارہ دارانہ طریقوں کی قانونی منظوری دے دی۔

غیر ملکی زرِ مبادلہ کو بچانے کے لیے درآمدات پر جو پابندیاں عائد کی گئیں اُن سے گھریلو مال کے اخراجات اور قیمتوں میں اضافہ ہو گیا اور ہندوستانی مصنوعات عالمی منڈیوں میں دوسرے ملکوں کی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ رہیں۔ ایک طرف تو بھارتی مصنوعات مقابلے کی سکت سے عاری ہوئیں، دوسری طرف ان کی اندرونِ ملک پہلے ہی سے کمی دیکھنے کو مل رہی تھی، ان دونوں اسباب کے ساتھ ہی درآمدات پر کنٹرول اور اس طرح کے متعدد اقدامات نے تجارتی توازن پر مثبت نہیں بلکہ منفی اثرات چھوڑے، مگر اب ان میں مسلسل کمی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔

بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بے حساب کنٹرولوں اور قاعدہ بندی کے طریقوں کا خواہ وہ کتنی ہی نیک نیتی سے عائد کئے گئے تھے۔ سرمائے کے قیام کے تناسب پر مخالفانہ اثر پڑا ہے۔ اگر اور کچھ نہیں تو اتنا ضرور ہوا ہے کہ نجی یا سرکاری دائرہ کار کے کسی بھی اچھے پروجیکٹ کو تمام کنٹرولوں اور متعلقہ محکموں سے منظور کرانے میں جو وقت لگتا ہے اس سے اُن پروجیکٹوں کی تکمیل میں بہت دیر ہو جاتی اور جتنی زیادہ دیر ہوتی ہے اتنی ہی اُن کی لاگت بڑھ جاتی ہے۔

سرکاری سیکٹر کا کالا دھن

سرمائے کے استعمال کی اہلیت میں زوال کا سرمائے کے قیام پر بھی "ناموافق" اثر پڑا ہے۔ سرکاری دائرہ کار میں بھاری سرمایہ کاری سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ وسائل کے ذخیرے میں نمایاں حصہ ادا کرے گی لیکن یہ توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ بلکہ سرکاری دائرہ کار کے بہت سے کارخانے منافع کمانے کی بجائے خسارے میں جانے لگے ہیں۔ جن وزارتوں کے زیرِ اہتمام یہ کارخانے قائم کئے گئے تھے اُن کی طرف سے زیادہ کڑی نگرانی اور پابندیاں لاگو کرنے سے اُن کی اہلیت کارمیں مزید کمی ہوئی ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر وسیلوں کا خلا اور چوڑا ہو گیا ہے۔ اُن پر ٹیکسوں کی نہ صرف منصوبے میں بلکہ ہر سال چھوٹ دی جاتی رہی ہے لیکن جلد ہی یہ کوشش بھی غیر نتیجہ بخش ثابت ہونے لگی۔

بلا واسطہ ٹیکسوں کی اونچی شرحیں جہاں ایماندار، تنخواہ دار طبقے اور خود ساختہ پیشہ وروں کے لیے گھاٹے کا سودا رہی ہیں وہاں خوشحال اور با رسوخ طبقے نے بڑے پیمانے پر ان ٹیکسوں سے بچنے اور ٹیکس نہ دینے کی کوشش کی ہے۔ ایک متوازی معیشت وجود میں آگئی ہے جہاں وہ مالی وسیلے زیادہ سے زیادہ تعداد میں پہنچنے لگے ہیں جو ترقی کے لیے معاون ثابت ہونے چاہئیں تھے۔ ملک کی معیشت میں کالے دھن کی موجودگی کے متعلق مہیب اندازے لگائے گئے ہیں۔ بالواسطہ ٹیکس لگانے کے بھی اپنے مخالفانہ اثرات ہوئے ہیں۔ یہ ٹیکس زیادہ سے زیادہ رجعت پسندانہ ہوتے جا رہے ہیں جن سے امیروں کی بجائے غریبوں کو زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے۔ یہ ٹیکس منصوبوں کے اُن پراجیکٹوں اور پروگراموں کے اخراجات میں اضافہ کر رہے ہیں جن کے لیے ان ٹیکسوں سے مالی وسائل مہیا کرنے کی اُمید تھی۔ ان سے برآمدات کی منڈیوں میں ہندوستانی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت مفلوج ہو رہی ہے۔ ایسے

اگر ہم ترقی کی شرح کو بڑھا کر ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ۶ فی صد کرنا چاہتے ہیں تو ہم یہ مقصد سرمایہ کاری میں اضافے سے نہیں بلکہ اس سے ہونے والی پیداوار میں اضافہ کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔ ساتویں منصوبے میں سرمائے اور پیداوار میں اضافے کا تناسب ۵ اور ایک کے قریب ہوگا ہمیں اسے لازمی طور پر کم کرنا چاہیئے۔

ٹیکس نہ دینے یا ٹیکس چوری کرنے کی ترغیب اور مواقع مل رہے ہیں۔

اس لیے اگر ان مخالفانہ رجحانات اور کمزوریوں کے باوجود ہندوستان کی اقتصادی کارکردگی اچھی چل آرہی ہے تو یہ یقینی طور پر باعثِ اطمینان امر ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس سے اس امکان کا احساس ہوتا

دوسرے نشری پیغام میں انھوں نے اعلان کیا "پیداوارِیت میں اضافے، جدید ٹیکنالوجی کے استعمال اور پیداوار کی صلاحیت کے بھرپور استعمال کو ایک قومی مہم کی شکل اختیار کرنی چاہیئے"۔ انھوں نے بتایا کہ فیصلے کے عمل کو تیز کرنے کے لیے قواعد اور ضابطہ کار کو بہت آسان کیا جائے گا۔ انھوں نے فیصلہ کرنے کے عمل کو غیر مرکوز کرنے کی اہمیت پر بھی زور دیا ہے۔
تب سے بہت سے کنٹرول نرم

کا عمل شروع کیا گیا ہے۔

ہمیں ان اقدامات پہ الگ طور پر نہیں بلکہ ایک نئے ترقیاتی فلسفے کے لاینفک جزو کے طور پر نگاہ ڈالنی چاہیئے جس میں ترقی کے وسیلے کے طور پر سرمائے اور بجٹ کی تخصیص زر کی نسبت کارکنوں اور منتظموں ٹیکنیشینوں اور سائنس دانوں جیسے انسانی عنصر پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اگر ہمیں شرح ترقی کو تیز کرنا ہے اور اُن مالی مجبوریوں سے عہدہ برآ ہونا ہے جن کا ہمیں سامنا ہے تو ترجیحات میں یہ تبدیلی لازمی ہے۔ ساتویں منصوبے میں ہم پہلے ہی بجٹ کے وسائل کی چادر سے پاؤں باہر پھیلا رہے ہیں اور خساروں سے افراطِ زر کے امکانات کے بارے میں تشویش پیدا ہو رہی ہے۔ اگر ہم ترقی کی شرح

> **اب ہمیں اِس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ ہمارے پاس صنعتی اور زراعتی پیداوار میں اضافہ کرنے کی بھاری غیر استعمال شدہ صلاحیت موجود ہے جسے بڑے پیمانے پر نئی سرمایہ کاری سے نہیں بلکہ بنیادی طور پر انسانی کوششوں جیسے کہ کارکنوں کو ترغیبِ عمل دیکر انتظام کو بہتر بناکر اور سائنسی و ٹیکنالوجی کے ہنروں کا پورا استعمال کرکے کام میں لایا جانا چاہیئے۔**

ہے کہ اگر یہ خامیاں دور کر دی جائیں تو ہماری ترقی کی رفتار کافی تیز ہو سکتی ہے۔

اصلاحات کا عمل

اس مقصد کے لیے وزیراعظم اندرا گاندھی نے اقتصادی نظم و نسق میں اصلاحات کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس میں پیداوارِیت پر خصوصی زور دیا گیا تھا۔ اُن کے بعد شری راجیو گاندھی نے اس کوشش میں اور اضافہ کیا ہے اور بعض دُور رس تبدیلیوں کے لیے اپیل کی ہے۔

قوم کے نام پہلے نشریہ میں انھوں نے کہا کہ سرکاری دائرہ کار کو سرمایہ کاری کے واسطے فاضل وسیلے پیدا کرنے کے لیے اور زیادہ اہلیت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ اور نجی سیکٹر کو لاگت کے اخراجات کم کرکے اور نئی ٹیکنالوجی کا استعمال کرکے وہ قوت حاصل کرنی چاہیئے۔ جو مقابلے سے حاصل ہوتی ہے۔ ۵ جنوری ۱۹۸۵ء کو اپنے

کر دئے گئے ہیں۔ درآمدی پالیسی کی پابندیاں کم کر دی گئی ہیں۔ سرکاری دائرہ کار کو اور زیادہ انتظامیہ اختیارات دئے جا رہے ہیں۔ اعلیٰ ٹیکنالوجی والی صنعتیں شروع کی گئی ہیں۔ مجموعی صنعتی پیداوار کے معیار اور ٹیکنالوجی کو بہتر بنانے کی کوششیں کی گئی ہیں گذشتہ دو بجٹوں میں بلاواسطہ ٹیکسوں کی شرحیں کم کی گئی ہیں اور گراوسط کے اثرات کو ختم کرنے کے لیے بالواسطہ ٹیکسوں میں اصلاحات

کو بڑھا کر ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ۶ فیصد کرنا چاہتے ہیں تو ہم یہ مقصد سرمایہ کاری میں اضافے سے نہیں بلکہ اس سے ہونے والی پیداوار میں اضافہ کرکے حاصل کر سکتے ہیں۔ ساتویں منصوبے میں سرمائے اور پیداوار میں اضافے کا تناسب ۵ اور ایک کے قریب ہوگا۔ ہمیں اسے لازمی طور پر کم کرنا چاہیئے

یہ کوئی غیر ممکن کام نہیں ہے۔ پہلے دو منصوبوں میں اور پھر پانچویں منصوبے میں یہ تناسب چار اور ایک سے بھی کم تھا۔ چوں کہ معیشت میں نصب شدہ صلاحیت سے پورا پورا کام نہیں لیا جارہا ہے، لہٰذا اس بات کے امکانات روشن ہیں کہ نئی سرمایہ کاری کے اخراجات کو کم سے کم سطح پر لا کر شرح ترقی تیز کر دی جائے۔ اگر ہم بنیادی سہولیات کے دو اہم سیکٹروں پر نگاہ ڈالیں تو ترقی کی شرح میں اضافے کا یہ امکان صاف طور پر دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہ سیکٹر ہیں صنعت اور زراعت۔

امکان موجود ہے

بجلی کے شعبے میں مشینوں کی صلاحیت کے استعمال کا تناسب بہت کم ہے اور اس سے بھی خراب بات یہ ہے کہ یہ تناسب گر رہا ہے۔ چھٹے منصوبے کے آخر میں یہ تناسب صرف ۵۰ فیصد کے قریب تھا جب کہ ۷۷-۱۹۷۶ء میں زائد از ۵۵ فیصد تھا۔ ایک اور حوصلہ افزا فرق کا پتہ اس بات سے لگتا ہے کہ حرارتی بجلی کی قومی کارپوریشن نے ۱۹۸۵ء میں بجلی کی مشینوں کی ۶۶ فیصد صلاحیت کا استعمال کیا۔

لہٰذا یہ دلیل نہیں دی جا سکتی کہ مشینوں کی صلاحیت کا بہتر استعمال ممکن نہیں ہے۔ مشینوں کی صلاحیت کے استعمال میں یہ ایک فیصد کا اضافہ ۵۰۰ میگاواٹ کی نئی صلاحیت نصب کرنے کے برابر ہوگا جس پر ۵۰۰ کروڑ روپے کی لاگت آسکتی ہے۔ اسی طرح ہمارے ملک میں ۲۱ فیصد بجلی ترسیل اور تقسیم کے دوران ضائع ہو جاتی ہے جبکہ ترقی یافتہ ملکوں میں نقصان کا یہ تناسب ۶ سے ۷ فیصد تک کا ہے۔ اس نقصان میں ایک فیصد کمی سے ہر سال تقریباً ۴۵ کروڑ روپے کی مزید آمدنی ہو سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ بجلی کے شعبے میں نصب شدہ صلاحیت کے بہتر استعمال سے ہزاروں کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی بچت کا امکان موجود ہے جس کا انحصار بنیادی طور پر بہتر انتظام، ٹیکنالوجی میں اصلاح اور دیگر انسانی وسیلوں کے استعمال پر ہے اور اس کے لیے دیکھ بھال اور مرمت کی غرض سے تخصیص زر میں صرف معمولی اضافے کی ضرورت ہے۔

اس کے علاوہ توانائی کی بچت کا بھاری امکان موجود ہے جس کا اندازہ نقل و حمل میں بیس فیصد، صنعت میں ۲۵ فیصد اور زراعت میں ۳۰ فیصد لگایا گیا ہے۔ دُنیا بھر میں معیشت میں تیل کا استعمال کم ہو رہا ہے جبکہ ہندوستان میں تیل پر انحصار بڑھ رہا ہے۔ بہتر ٹیکنالوجی کے استعمال سے ہم زرمبادلہ کی بھاری بچت کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ سورج، ہوا اور لہروں وغیرہ سے توانائی کے دیگر غیر روایتی ذرائع کے استعمال کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ اگر ہم اپنی سائنسی اور ٹیکنالوجی کی صلاحیتوں کو کام میں لائیں تو ان ذرائع سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔

آبپاشی کے شعبے میں بڑے اور درمیانہ پراجیکٹوں سے آبپاشی کی جو صلاحیت پیدا ہوئی ہے، چھٹے منصوبے کے شروع میں اس میں سے ۴۰ لاکھ ہیکٹیئر زمین کو سیراب کرنے کی صلاحیت کے امکانات تھے۔ لیکن منصوبے کے آخر میں یہ امکانی صلاحیت بڑھ کر ۷۵ لاکھ ہیکٹیئر ہو گئی۔ پانی مُہیا کرنے والے کارکنوں اور توسیعی خدمات و زراعت کے لیے درکار دیگر سہولیات مُہیا کرنے والے افراد کے درمیان میں تال میل سے کمان رقبے میں آبپاشی کی پوری صلاحیت کے استعمال میں مدد مل سکتی ہے اگر ہم ندیوں اور نالوں سے پمپ سیٹوں کے ذریعے بڑے پیمانے پر پانی اُٹھائیں، اپنے آبپاشی کے نظام کی جدید کاری کریں، فصلیں اُگانے کے مناسب ڈھانچے بنائیں اور بنیادی سہولیات مہیا کریں تو ہم خوراک کی بھرپور اور فاضل بہم رسانی کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل ہو سکتے ہیں۔

اب ہمیں اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ ہمارے پاس صنعتی اور زراعتی پیداوار میں اضافہ کرنے کی بھاری غیر استعمال شدہ صلاحیت موجود ہے جسے بڑے پیمانے پر نئی سرمایہ کاری سے نہیں بلکہ بنیادی طور پر ان کی کوششوں جیسے کہ کارکنوں کو ترغیب عمل دیکر انتظام کو بہتر بنا کر اور ہمارے سائنسی و ٹیکنالوجی کے ہنروں کا پورا استعمال کرکے کام میں لایا جانا چاہیئے۔ طریقہ کار میں یہ تبدیلی اسی صورت میں ممکن ہے۔ اگر ہر سطح پر اندازِ فکر میں انقلابی تبدیلی آئے۔ ملک بھر میں نئے پراجیکٹوں میں مزید سرمایہ کاری کے لیے مانگ تو بہت ہوئی ہے۔ لیکن موجودہ پراجیکٹوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ لہٰذا اب ہمیں اپنا اندازِ فکر بدلنا چاہیئے۔

ٹیکنالوجی کا استعمال

ایک اور شعبہ جہاں رویئے میں تبدیلی کی ضرورت ہے ٹیکنالوجی کا ہے۔ گزشتہ پیراگرافوں میں بارہا اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ ٹیکنالوجی ہندوستانی معیشت کو تبدیل کرنے میں کیا حصہ ادا کر سکتی ہے۔ جواہر لال نہرو نے اس صلاحیت کا اندازہ منصوبہ بند ترقی کے آغاز میں ہی کر لیا تھا جب کہ انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ ملک کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی اعلیٰ ترین سطح تک رسائی حاصل کرنی چاہیئے اور ایٹمی توانائی کے میدان میں اپنی صلاحیتیں پیدا کرنی چاہئیں۔ جدید ٹکنالوجی کے استعمال اور اسے مقبول بنانے

کی راہ میں یہ تصور حارج ہے کہ یہ محنت کشوں کی تعداد گھٹا دے گی۔ چنانچہ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ نئی ٹیکنالوجی کے استعمال سے بیروزگاری کا پہلے سے موجود سنگین مسئلہ جو بڑھ رہی آبادی سے بدتر ہوتا جا رہا ہے اور شدید صورت اختیار کرے گا۔ اس لیے بار بار یہ کہا جا رہا ہے کہ گذشتہ برسوں کی قدیم ٹیکنالوجی کو برقرار یا پھر سے استعمال کیا جائے جس کا مطلب اکیسویں صدی کی طرف نہیں بلکہ ۱۹ویں صدی کی جانب لوٹ جانا ہوگا۔

تاہم اس بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ ہم اکیسویں صدی میں داخل ہونے اور ہندوستان کی معیشت کی جدید کاری کے لیے بیروزگاری میں اضافے کی صورت میں قیمت ادا کریں۔ میرے خیال میں ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کا استعمال نہ صرف موزوں اور مناسب ہے بلکہ روزگار کے ایسے مواقع پیدا کرنے کے لیے ضروری بھی ہے جہاں اُجرتیں اچھی ہوں اور جن سے لوگوں کا معیارِ زندگی بلند ہو سکے۔ میرا یہ خیال تجرباتی ثبوتوں کے جائزے، امکانات کے نظریاتی تجزیے اور جو رجحانات میں دیکھ رہا ہوں اُن پر مبنی ہے۔

ہندوستان میں آج آبادی کے گھنے پن کا تناسب فی مربع کلو میٹر پر ۲۲۳، افراد کا ہے۔ کچھ دیگر ملکوں کے مقابلتاً اعداد و شمار حسب ذیل ہیں :۔

برطانیہ ۔ ۲۲۹، مغربی جرمنی ۔ ۲۵۰، بلجیم ۔ ۳۱۹، جاپان ۔ ۳۲۰، نیدرلینڈ۔ ۳۵۱، ۔ اگر یہ سب ممالک ہم سے کئی گنا زیادہ فی کس کی آمدنی کی سطح کو حاصل کرنے، روزگار اور اُجرتوں کی اعلیٰ سطح کو برقرار رکھنے بلکہ اپنے بیروزگار لوگوں کو بھی ہمارے ملک کے درمیانی آمدنی والے طبقوں سے بہتر معیارِ زندگی مہیا کرنے کے قابل ہو سکے ہیں تو اس کا سبب ہے کہ انھوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کا استعمال کیا ہے۔ برطانیہ میں صنعتی انقلاب کے بعد بیروزگاری میں اضافے کے ڈر سے جو حقیقی بھی تھے فسادات ہوئے تھے لیکن پختہ اقتصادی پالیسیوں کے ذریعہ بیروزگاری کی سطح میں نہیں بلکہ اُجرتوں کی سطح میں اضافہ ہوا۔ آج جاپان میں مزدور یونینیں مشینی انسان کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس کے مقابلے میں جن ممالک میں ٹیکنالوجی کی سطحیں کم ہیں انھیں کم اُجرتوں اور بھاری بیکاری کا سامنا ہے۔

ہمارے ملک میں بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ خوشحال اور پسماندہ علاقوں کا فرق کس طرح ٹیکنالوجی کی سطح پر منحصر ہے۔ زراعتی شعبے میں جدید ٹیکنالوجی نے سبز انقلاب کو ممکن بنایا ہے۔ اس انقلاب سے فائدہ اُٹھانے والے علاقے خاص طور پر فصل اُٹھانے کے موسم میں دوسرے علاقوں سے محنت کشوں کو منگوانے لگے ہیں۔ لیکن جن علاقوں میں اب بھی روایتی ٹیکنالوجی سے کام ہو رہا ہے، وہاں بیروزگاری کا سامنا ہے اور وہاں سے لوگ بمبئی اور کلکتہ جیسے مقامات کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔ جہاں ٹیکنالوجی کی ترقی کی بدولت روزگار کے مواقع زیادہ فیض رساں خیال کئے جاتے ہیں۔

اور یہ تصویر کا دوسرا رُخ ہے

لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں سکے کے دوسری جانب بھی دیکھنا چاہیئے۔ خاص طور پر صنعتوں میں محنت کشوں کی بچت کرنے والے آلات کے فروغ سے یقینی طور پر بیروزگاری پیدا ہو سکتی ہے بشرطیکہ بازار میں زیادہ پیداوار کو اٹھانے کی صلاحیت موجود نہ ہو۔ ٹیکنالوجی کے لحاظ سے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی ایسے مرحلے آتے ہیں جیسے کہ ۱۹۳۰ء کی دہائی اور اب پھر حالیہ برسوں میں، جب دیر سے چلی آ رہی بیروزگاری کے حالات پائے گئے۔ نئی ٹیکنالوجی کے اجراء سے بیروزگاری پیدا نہ ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ نئی ٹیکنالوجی کے اثرات کا احتیاط سے تجزیہ کیا جائے۔

ٹیکنالوجی سے مُراد یہ ہے کہ وہ پیداواریت میں اضافہ کرنے کے لیے سائنسی علم کو کام میں لاتی ہے۔ جب تک یہ ٹیکنالوجی سرمائے اور زمین سے فائدہ اُٹھانے کی حد میں اضافہ کرتی ہے اُس وقت تک اس کے مُضر اثرات نہیں ہوتے۔ لیکن جب محنت کشوں کی پیداوار کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے تو روزگار کے مواقع کم ہو سکتے ہیں۔

البتہ روزگار کی حالت کو اس حالت میں کوئی نقصان نہ پہونچے گا۔ جب بازار میں توسیع ہو، صنعت اور محنت کشوں کی پیداواری صلاحیت کم سے کم دوگنی ہو اور پیداوار اور فروخت بھی دوگنی ہو۔

ایسا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ زیادہ پیداوار کی کھپت کے لیے کافی مانگ پیدا ہو۔ یہ مانگ کارکنوں کی طرف سے اُن کی پیداواری صلاحیت میں اضافے سے حاصل ہونے والے زیادہ اُجرتوں یا درمیانی اور اعلیٰ آمدنی والے طبقوں کی کھپت کی سطح میں اضافے یا سرمایہ کاری یا سرکار کی طرف سے ترقیاتی کاموں، فلاح و بہبود کے کاموں، دفاع اور امن و قانون پہ مزید سرمایہ لگانے یا اگر اُس پیداوار کو برآمد کرنے کے امکانات ہیں تو غیر ملکوں کی آمدنی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

جو ملک روزگار کے محاذ پر کسی مخالفانہ اثر کے بغیر ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی کرتے

بتے پیداوار کا تجربہ شاہد ہے کہ مختلف ملکوں نے مختلف طریقوں سے مانگ کو پیداواری صلاحیت کے ترقی کس اضافے کی رفتار کے برابر رکھا گیا ہے۔ مغربی ممالک میں شروع میں اعلیٰ آمدنی والے طبقوں کی طرف سے کھپت پر زیادہ مصارف اور سرمایہ کاری کے ذریعہ مانگ میں اضافہ ہوتا رہا۔ تب اُجرتوں میں اضافے کے ذریعہ کھپت اور مانگ کی تحریک ملی۔ اور آخر کار تعمیراتِ عامہ، مالیاتی پھیلاؤ اور دوسرے اقدامات سب کے لیے روزگار کے نشانے کو حاصل کرنے کا طریقہ کار بن گئے۔ جاپان اور کچھ دوسرے ممالک نے برآمدات کی مانگ پر زیادہ انحصار رکھا۔ روس اور چین میں بھی شروع میں عوام کی بڑھتے پھیلنے کی کھپت پر سخت پابندیاں لگائی گئیں اور سرکاری ترقی کا بڑا آلہ کار بنی اور افراد اور مشینوں کی پیداواری صلاحیت کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کے لیے ضروری مانگ مُہیا کرتی تھی۔ لیکن روس میں اسٹالن اور چین میں ماؤ کے بعد نجی کھپت میں اضافے کے امکانات کو ہر لحاظ سے بڑھنے کی اجازت دی گئی۔

اور اہم نکتہ

یاد رکھنے کی اہم بات یہ ہے کہ اگر محنت کشوں کی پیداواریت میں اضافے کے ساتھ ساتھ پیداوار کے حجم اور کھپت کی سطح اور خاص طور پر کارکن طبقے کی کھپت کی سطح میں اضافے کے اقدام بھی کیے جائیں تو اس کے نتیجے کے طور پر پورا روزگار اور حقیقی ترقی حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر مانگ کی کمی یا کسی اور وجہ سے زیادہ پیداوار کی صلاحیت بے کار ہو جائے تو اس سے مندہ آئے گا اور بیروزگاری پیدا ہوگی۔

نئی ٹیکنالوجی سے روزگار پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نت نئی اشیاء اور مصنوعات کی مانگ میں اضافے کی کوششیں کی جائیں۔ الیکٹرانکس کی صنعت میں ٹیکنالوجی کی پیش رفت سے دنیا بھر میں بے حساب نیا روزگار پیدا ہوا ہے۔ یہ صنعت نئی اشیائے صرف مُہیا کرتی ہے۔ ٹیلی کمیونیکیشنز کے دائرے کو وسیع کرتی ہے۔ انتظامیہ آلات کو جدید شکل دیتی ہے اور اس طرح جنگی ہتھیاروں کی تجدید کرتی ہے۔

ہندوستان میں چونکہ بچتوں کو بڑھانے کے لیے کھپت پر پابندیاں ضروری خیال کی گئی تھیں اس لیے عام رُجحان یہی رہا ہے کہ کھپت میں اضافے کی حوصلہ شکنی کی جائے جہاں بھی پیداوار کا کھپت سے بڑھ جانے کا امکان تھا وہاں کھپت میں اضافہ کرنے کی بجائے پیداوار پر نئی صلاحیت کی تنصیب پر، نصب کردہ صلاحیت کے پورے استعمال پر اور پیداوار کو نئی شکل دینے پر پابندیاں لگائی گئی ہیں تاکہ اعلیٰ ترین ممکن سطح پر نہیں بلکہ اس سے کافی نیچے توازن قائم کیا جا سکے۔ بیروزگاری سے بچنے کے لیے اس امر کے اقدامات پر انحصار رکھا گیا کہ فاضل محنت کشوں کو کام سے الگ نہ کیا جائے، غیر منافع بخش کارخانوں کو بند نہ کیا جائے اور اس مقصد کے لیے سرکاری خزانے یا عوام سے کسی نہ کسی طور پر مالی مدد کا استعمال کیا گیا۔

ہم کفایت شعاری کے لیے خود کو پابند بنائے ہوئے ہیں اور اسے ضرورت نہیں بلکہ ایک خوبی یا وصف کے طور پر اہمیت دیتے ہیں چنانچہ ہمارے یہاں نئی نئی اشیاء کا استعمال اور اس طرح ٹیلی ویژن وغیرہ ایک فضول خرچ مانا جاتا ہے اور ہمارے یہاں اس طرح کے اخراجات کو پسندیدہ نہیں خیال کیا جاتا بلکہ اس پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے اسی طرح پوشاک میں کیمیاوی دھاگے وغیرہ کو بھی فضول خرچی کی ایک مد تصور کیا جاتا ہے۔

ایسی حالت میں ماسوائے خوش حال طبقوں کے سماج کے اکثر حصوں کا معیارِ زندگی اُس صلاحیت کے برابر نہیں رہا ہے جو منصوبہ بند ترقیات کے اتنے برسوں میں بھاری اخراجات اور کوششوں سے پیدا کی گئی ہے۔

نئے ترقیاتی فلسفے کا مزاج اور نظریہ مختلف ہونا چاہیئے۔ ہمیں لوگوں کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی اہمیت کو سمجھنا چاہیئے جو اُسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ جن اشیاء کی انھیں ضرورت ہے اُن کی بہم رسانی میں اضافہ کیا جائے اور اُن کے پاس اُن چیزوں کو خریدنے کے لیے آمدنی ہو۔

میں آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ترقی کوئی سیدھا عمل نہیں ہے۔ اسے تو منصوبہ قدم اُٹھانے چاہئیں۔ ہم اس مفروضے کے ساتھ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی نہیں کر سکتے کہ چونکہ ہم غریب ہیں اس لیے ہم غریب ہی رہیں گے۔ جگدیش بھگوتی نے عظیم جاپانی ناول نگار رنت سومے سوسیکی کا ذکر کیا ہے جسے سو برس پہلے مشورہ دیا گیا کہ وہ فنِ تعمیرات کا مطالعہ نہ کرے کیونکہ جاپان جیسے غریب ملک میں سینٹ پال کے گرجا گھر جیسی عمارتیں بنانے کا کبھی موقع پیدا نہیں ہوگا۔ ہم ایسے شکست خوردگی کے جذبے کے ساتھ اکیسویں صدی میں نہیں پہونچ سکتے۔

ہندوستان جب اکیسویں صدی میں اپنا پہلا یومِ آزادی منائے تو اسے یہ کام ایک جدید ترقی یافتہ ملک کے طور پر کرنا چاہیئے۔ نہ کہ خارجی امداد کے محتاج ایک ترقی پذیر ملک کی طرح۔

ڈاکٹر بھباتوش دتّہ

کیا ہم ۲۰۰۱ء میں غُربت کی فراوانی کے ساتھ داخل ہونگے؟

مضمون نگار کا خیال ہے کہ "ہم ۲۰۰۱ء میں دو ہندوستان دیکھیں گے۔ ایک ہندوستان تو بہت امیر ہوگا اور اُن تمام فائدوں اور آسائشوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوگا، جو باہر کی امیر دنیا کو حاصل ہیں۔ دوسرا ہندوستان نہ صرف غریب ہوگا بلکہ امیروں کے امیر بننے کی قیمت بھی چکا رہا ہوگا۔" مصنف کے اس خیال کی بنیاد یہ احساس ہے کہ "اس وقت اعلیٰ ترین سطح پر جو اقتصادی فلسفہ ذہنوں پر حاوی ہے وہ بازار میں کارفرما قوتوں پر روزافزوں انحصار کا ہے!" جس کے معنی، مصنف کے نزدیک، کنٹرول اور لائسنسوں کے طریقوں کو خیرباد کہنا، درآمدات کے سلسلے میں نرم رویّہ اختیار کرنا، سرکاری سیکٹر کا دائرہ کم کرنا اور نجی سیکٹر کو بڑھانا ہے۔

ہندوستانی تجزیہ کار گذشتہ پینتیس برسوں میں منصوبہ بندی کے عمل اور کارگذاریوں کا تجزیہ کرنے کے بعد اس بات کا پختہ یقین نہیں ہے کہ ملک میں ایک نیا دَور شروع ہو چکا ہے۔ صنعت اور حکومت دونوں کی اعلیٰ ترین سطحوں سے اقتصادی اداروں اور سیاسی ترقی کے بارے میں ایک نئے فلسفے اور طرزِ فکر کی ایک پُرزور دھارا پھوٹ نکلی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ۱۹۸۵ء کے شروع میں جو نمایاں جوش و خروش نظر آیا تھا، ایک سال بعد وہ اب کسی حد تک اعتدال پسندانہ ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا ہونے کی ایک وجہ اس امر کا احساس ہو کہ ایک بڑی معیشت جس میں آبادی کا ایک بڑا اور وسعت پذیر حصّہ غریبی میں زندگی گذار رہا ہو، اس کا بندوبست چلانا، مغربی نمونے کے ایک پانچ ستارہ بزنس ہاؤس کا انتظام چلانے جیسا نہیں ہے۔ ایک اور اہم وجہ شاید سیاسی ہے، جیسا کہ حالیہ تجربات سے ظاہر ہوتا ہے، کیونکہ ایک حکومت کو ایسے وقت میں جبکہ اگلے انتخابات بہت دُور نہ ہوں، اُن پالیسیوں کے بارے میں محتاط ہونا پڑتا ہے جو آبادی کی بہت بڑی اکثریت پر مخالفانہ طور پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

منصوبہ بندی کی خوبیاں اور نقائص

ہندوستان کے اقتصادی منظر کو دیکھنے والے کسی بھی حقیقت پسند مبصر کو دو نمایاں باتیں نظر آئیں گی۔ ایک یہ کہ منصوبہ بندی کے گذشتہ ۳۵ سالوں میں ہماری حصولیابیاں عظیم رہی ہیں اور دوسری یہ کہ اس دوران ہماری ناکامیاں بھی عظیم تھیں۔ گو بظاہر یہ دونوں باتیں متضاد نظر

دوران ہوئیں۔ ان حصولیابیوں کے گوشوارے پیش کرنے کے لیے صفحے پر صفحے بھرے جا سکتے ہیں لیکن ہم یہاں صرف چند مثالوں پر ہی اکتفا کریں گے۔ ۵۱ ـ ۱۹۵۰ء میں فولاد کی پیداوار ۹۸۰,۰۰۰ ٹن تھی لیکن ۸۵ ـ ۱۹۸۴ء میں صاف شدہ فولاد کی پیداوار ۸٫۷ ملین ٹن تھی۔ اسی مدت میں سیمنٹ کی پیداوار ۲٫۶۹ ملین ٹن سے بڑھ کر ۲۹٫۵ ملین ٹن ہوگئی اور المونیم کی پیداوار ۳۷۰۰ ٹن سے ۲۷۶,۰۰۰ ٹن پر پہنچ گئی۔ میکنیکل انجنیرنگ الیکٹریکل

تاہم اس نے ملک کو کم از کم ایک ایسے مقام پر پہونچا دیا ہے جہاں ایک مکمل نظام تقسیم کے ذریعے سب کو کافی خوراک میسر ہونی چاہیئے۔ آبادی میں دوگنا سے زیادہ اضافہ ہوا۔ ۱۹۵۱ء میں ملک کی آبادی ۳۶۱ ملین تھی لیکن ۱۹۸۶ء میں یہ ۷۵۰ ملین ہو گئی۔

لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رُخ ہے۔ دوسرا رُخ کچھ ناگوار حقیقتیں پیش کرتا ہے جن میں اہم ترین حقیقت یہ ہے کہ پیداوار میں عظیم اضافے کے باوجود ہم اپنے مقرر کردہ نشانوں کو پورا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اپنی ترقی کا اندازہ لگانے کے لیے ہمارے پاس دو طریقے ہیں ایک تو ماضی کا حال

> سب سے اہم بات یہ ہے کہ اقتصادی اور سماجی انصاف اور استحکام کے ساتھ ترقی کے متفقہ مقاصد کے حصول تک اپنی معیشت کو لے جانے کے لیے اس وقت اور قریب مستقبل میں کیا اقدامات کیے جانے چاہئیں۔

> ہندوستان کو بنیادی طور پر یک نکاتی پروگرام کی ضرورت ہے غریبی دور کرنے کے پروگرام کی۔ ترقی کے تمام پروگراموں کی کسوٹی یہ ہے کہ وہ اس ایک نصب العین کے حصول میں کہاں تک مدد کرتے ہیں۔

آتی ہیں لیکن ایک وسیع اور پیچیدہ معیشت میں، جس کی بہت بڑی اکثریت غربت میں دن گذار رہی ہو، یہ دونوں ممکن ہیں ـ ۱۹۵۱ء (جبکہ منصوبہ بندی کا عمل شروع ہوا) سے پہلے کبھی اتنی حصولیابیاں نہیں ہوئیں جتنی کہ ۳۵ سال کی منصوبہ بندی کے

انجنیرنگ اور کیمیکلز جیسی صنعتوں میں ایک پُر راز مرہ صفر سے کافی بلند رفعتوں تک پہنچ گیا۔ بجلی کی پیداوار میں تقریباً بیس فی صد اضافہ ہوا۔ غلہ کی پیداوار تین گنی ہوگئی۔ گو یہ اضافہ کم نظر آتا ہے۔

سے مقابلہ کریں جس سے ہمارے سامنے ایک خوبصورت تصویر اُبھرتی ہے دوسرے حال کا اپنے نصب العین، یا کم سے کم جتنی کارگذاری

ن ہو سکتی ہے اُس سے مقابلہ کریں ہو خواندگر
ا دوسری طرح کا مقابلہ کرنے سے پتہ چلتا ہے
ندرون ملک مجموعی پیداوار GDP
سالانہ شرح اوسطاً ۵ء۳ فیصد رہی جبکہ
انہ ہمیشہ سے لگ بھگ پانچ فیصد سالانہ
رہا ہے۔ اس نشانے کے حصول میں کمی اور
واضح ہو جاتی ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں
پانچ فیصد سالانہ کی شرح سے شمار کئے
نے پر ہماری مجموعی قومی پیداوار GNP
۔ ۱۹۷۰ء کی قیمتوں کی بنیاد پر ۸۵-۱۹۸۴ء
ں ۶۱۲۰۱ کروڑ روپے کی بجائے ۹۶۴۳۰
ڑ روپے ہوتی اور فی کس آمدنی ۷۸۲ روپے
بجائے ۱۲۸۶ روپے ہوتی۔ ساکن قیمتوں کی
اد پر شمار کی گئی۔ ۱۲۸۶ روپے
ا فی کس آمدنی ۸۵-۱۹۸۴ء
ء موجودہ
توں کی بنیاد
۳۸۷۰

ہے۔ فیلڈ میں جا کر کئے گئے کچھ مطالعات سے معلوم ہوا ہے کہ اعداد و شمار میں جو بہتری دکھائی دیتی ہے وہ خطِ غریبی سے نیچے ہے لیکن خطِ مذکور کے نزدیک ترین غریبوں میں سے امیر ترین کو خطِ غریبی سے اوپر دکھا کر لائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ غریبی دُور کرنے کے پروگراموں کے "فائدوں" کا جو اندازہ لگایا گیا ہے وہ کافی نہیں ہے۔ غریبی دُور کرنے کے پروگراموں پر خرچ کی گئی رقوم سے مندرجہ ذیل نتائج میں سے اگر زیادہ نہیں تو کم سے کم ایک نتیجہ تو ضرور برآمد

ضرورت کی کھپت کا بڑھنا۔ خبر ہے کہ منصوبہ بندی کمیشن نے غریبوں کو چار طرح کے زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی ایسے گھرانوں میں جن کی سالانہ آمدنی اوپر کی سطح پر ۵۰۰۱ روپے اور ۶۴۰۰ روپے کے درمیان ہے اور نچلی سطح پر وہ جن کی آمدنی ۲۲۶۶ روپے سالانہ سے کم ہے۔ یہ نچلی سطح ہے جو سب سے پہلے توجہ چاہتی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خطِ غریبی سے نیچے کے لوگوں کا فیصد تناسب گھٹ کر ۳۸ ہو گیا ہے تو بھی تشویش کی بات یہ ہے کہ خطِ غریبی سے نیچے کے لوگوں کی کُل تعداد ۲۸۵ ملین کے لگ بھگ ہے۔ بیروزگاری سے متعلق اعداد و شمار کو ایک تشریح سے ہٹ کر دوسری تشریح کر کے گنجلک بنا دیا گیا ہے۔ واضح حقیقت یہ ہے کہ دفاتر روزگار کے رجسٹروں پر ۲۷۰ لاکھ افراد کے نام درج ہیں۔ لیکن اس فہرست میں بھی کچھ افراد

> اب اعلیٰ ترین سطح پر جو اقتصادی فلسفہ ذہنوں پر حاوی ہے وہ بازار میں کار فرما قوتوں پر دارومدار رکھنے کا ہے جو ہماری منصوبہ بندی کی ناقابلِ تردید خامیوں سے قوت اخذ کرتا ہے۔ اس فلسفہ میں کنٹرول اور لائسنس ختم کرنا، درآمدات کے بارے میں نرم رویّہ اختیار کرنا، سرکاری سیکٹر کے دائرے کو کم کرنا اور جہاں ممکن ہو نجی سیکٹر کو فروغ دینا، غیر ملکی سرمایہ اور ٹیکنالوجی کا زیادہ آزادانہ داخلہ اور کمتر ٹیکس شامل ہیں۔

پے ہوتی۔

خطِ غریبی کا معمّہ

اب یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ خطِ غریبی سے نیچے گزر بسر کرنے والی آبادی کا فیصد تناسب ۷۹-۱۹۷۸ء اور ۸۵-۱۹۸۴ء کے درمیان ۴۸ سے کم ہو کر ۳۸ کے لگ بھگ ہو گیا

ہونا چاہیئے تھا۔ اور وہ ہے مستقل پیداواری اثاثہ کا بننا، ایک مستقل پیداوار اور آمدنی کا ذریعہ پیدا ہونا، لوگوں کی کثیر تعداد کے لیے سارا سال روزگار اور حقیقی معنوں میں غریب و نادار لوگوں کو اشیائے

ایسے ہو سکتے ہیں جو باروزگار ہیں لیکن بہتر نوکریاں تلاش کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دیہات کا بہت بڑا علاقہ ایسا ہے

جہاں روزگار دفاتر کام نہیں کر رہے ہیں۔

سیاست پر دباؤ

ہندوستانی معیشت کے بنیادی مسائل کا پورا احساس اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اقتصادی انصاف کو اوّلین اہمیت نہ دی جائے اور کمترین سطحوں پر وسیع پیمانے پر مستقل روزگار اور ذریعۂ آمدن پیدا کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اس بات پر تو جلدی نظر جاتی ہے کہ زراعت چار فیصد سے اور صنعت آٹھ فیصد سے زیادہ کی سالانہ شرح ترقی حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے، لیکن غریبی؛ بھر پیٹ خوراک کا میسّر نہ ہونا، ناقص تغذیہ وغیرہ بہتوں کی نظر سے مستور رہتے ہیں اور بہت سے انھیں مسلّمہ حقیقتوں کے طور پر تسلیم کر لیتے ہیں۔ ان کا ذکر تو بس تقریروں اور یہاں وہاں دستاویزوں میں ہوتا ہے اور پالیسی بناتے یا پالیسی سے متعلق بڑے فیصلے کرتے وقت انھیں فراموش کر دیا جاتا ہے۔ یہ فیصلے دباؤ میں کئے جاتے ہیں۔ جو بڑے بڑے صنعت کاروں، ایکسپورٹ ہاؤسوں (برآمداتی اداروں) اور امیر کاشتکاروں سے آتا ہے اور کبھی کبھی تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ دباؤ ڈالنے والے یہ گروہ، حکومت کے سیاسی رہنما اور پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے کے ذمّہ دار افسران سب ایک ہی انداز سے سوچ رہے ہیں۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سلسلہ بدلنا چاہیئے، باوجود اس بات کے کہ کرۂ زمین کی پندرہ مزید گردشوں میں، جو ہندوستان کو (اور دُنیا کے ہر ملک کو) اکیسویں صدی میں لے جائیں گی، کوئی جادو نہیں ہے۔ اس وقت اگر کوئی پیشن گوئی کی جا سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ پندرہ برسوں میں آبادی بڑھ کر ۱۰۰۰ ملین ہو جائے گی اور تھوک قیمتوں کا عدد اشاریہ (موجودہ سال کو بنیاد مانتے ہوئے) کم از کم ۵۰۰ ہو گا۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اقتصادی اور سماجی انصاف اور استحکام کے ساتھ ترقی کے متفقہ مقاصد کے حصول تک اپنی معیشت کو لے جانے کے لیے اس وقت اور قریب مستقبل میں کیا اقدامات کئے جانے چاہیئیں؟

درآمدات کے بارے میں اعتدال پسندی کی پالیسی سے اس وقت تک تو سوسائٹی کو بڑے پیمانے پر کوئی مرئی فائدہ نہیں پہنچا ہے۔ اُلٹے اس سے توازن ادائیگی کے تعلق سے ایک نازک صورتحال پیدا ہوگئی ہے۔

یہ بات اکثر بُھلا دی جاتی ہے کہ چوں کہ ہمارے آئین میں "انصاف" کو ہمارا اوّلین نصب العین قرار دیا گیا ہے، اس لیے اقتصادی انصاف کو اوّلین اہمیت دی جانی چاہیئے۔ جو لوگ بہ بانگِ دہل "بیس نکات" سے وفاداری کا اعلان کرتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ ہندوستان کو بنیادی طور پر ایک نکاتی پروگرام کی ضرورت ہے — غریبی دُور کرنے کے پروگرام کی۔ ترقی کے تمام پروگراموں کی کسوٹی یہ ہے کہ وہ اس ایک نصب العین کے حصول میں کہاں تک مدد کرتے ہیں۔

کیا یہ سب ترقی ہے؟

اُمید کی جانی چاہیئے کہ اس پر عام اتفاق رائے ہو جائے گا کہ ہمیں کن راہوں پر چلنا ہے اور ہمارا نقطۂ نگاہ کیا ہونا چاہیئے۔ اس بارے میں شدید اختلافات دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ فرسودہ خیالات کو، مثلاً یہ کہ انصاف حاصل کرنے کے لیے پہلے ترقی ہونی چاہیئے، فوراً مسترد کیا جا سکتا ہے۔ یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ اعداد و شمار کی روشنی میں جسے ترقی سمجھا جاتا ہے اس کا ترقی کی جزئیات سے تعلق نہیں ہوتا۔ زیادہ قیمت والے عیش و عشرت کے سامان کی پیداوار میں اضافہ ترقی ہے، اونچی اونچی عمارتوں میں بھاری قیمتوں والے

فلیٹوں کی تعمیر ترقی ہے۔ وزارتوں اور سرکاری محکموں میں توسیع ترقی ہے۔ جب غلّہ کی پیداوار یا سستے کپڑے کی پیداوار بڑھتی ہے، جب غریبوں کو مکان دیئے جاتے ہیں یا جب بھوک اور پیاس کے شکار بے شمار گاؤں میں پینے کے پانی کی فراہمی کا بندوبست کیا جاتا ہے تو وہ بھی ترقی ہوتی ہے۔ اس طرح ترقی کئی اقسام کی ہوتی ہے لیکن ہم کس قسم کی ترقی چاہتے ہیں اس بارے میں ہمارا ذہن صاف اور ہمارا انتخاب غیر مبہم ہونا چاہیئے۔

بازار میں کارفرما قوتیں

اب اعلیٰ ترین سطح پر جو اقتصادی فلسفہ ذہنوں پر حاوی ہے وہ بازار میں کارفرما قوتوں پر دارومدار رکھنے کا ہے جو ہماری

لیکن کوئی بھی اس سوال کا جواب دینے کی زحمت نہیں کرتا کہ ایسا ہونے میں کتنی صدیاں لگیں گی۔

اس فلسفہ کو حقیقی اور تجزیاتی دو انداز سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اعتدال پسندی کا رجحان درحقیقت گذشتہ چھ برسوں سے کام کر رہا ہے لیکن ابھی تک پیداوار پر اس کا کوئی دکھائی دینے والا اثر نہیں پڑا ہے۔ صنعت کو رعائتوں پر رعائتیں ملتی جا رہی ہیں لیکن پھر بھی صنعتی پیداوار کا اشاریہ

یہ بتا سکتا ہے کہ صنعت کار اور حکومت میں ان کے حامی بازار کی جو قوتیں چاہتے ہیں وہ پورے معنوں میں نصابی کتابوں میں مندرج "مقابلے کی قوتیں" نہیں ہیں۔ ان کا اصل زندگی میں کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ تو بازار میں کارفرما وہ قوتیں ہیں جن میں طاقتور اور کمزور کے درمیان مقابلہ ہوگا اور جن میں اجارہ دارانہ اور نیم اجارہ دارانہ دباؤ سرکاری کنٹرول کی جگہ لے لیں گے۔

اگر کوئی شخص انصاف کے ساتھ اقتصادی ترقی کی جمہوری (اصول) چاہتا ہے تو اسے نصابی کتابوں کے انکشافی ماڈلوں سے باہر نکلنا ہوگا کیونکہ یہ ماڈل تشریحی

۲۰۰۱ء تک ہم دو ہندوستان دیکھیں گے۔ ایک ہندوستان بہت امیر لوگوں کا ہوگا جوان تمام فائدوں اور آسائشوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے جو باہر کی دنیا کو حاصل ہیں۔ دوسرا ہندوستان نہ صرف غریب رہیگا بلکہ امیروں کے امیر بننے کی قیمت بھی چکا رہا ہوگا۔

منصوبہ بندی کی ناقابلِ تردید خامیوں سے قوت اخذ کرتا ہے۔ اس فلسفہ میں کنٹرول اور لائسنس ختم کرنا، درآمدات کے بارے میں نرم رویہ اختیار کرنا، سرکاری سیکٹر کے دائرے کو کم کرنا اور جہاں ممکن ہو نجی سیکٹر کو فروغ دینا، غیر ملکی سرمایہ اور ٹیکنالوجی کا زیادہ آزادانہ داخلہ اور کمتر ٹیکس شامل ہیں۔ جو لوگ ان کی سفارش کرتے ہوئے تھوڑی بہت جھجک محسوس کرتے ہیں وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ منافع پر نظر رکھنے والی اقتصادی سرگرمیوں سے جو ترقی ہوگی اس کے فائدے چھن چھن کر غریبوں تک پہنچیں گے

متوقع شرح سے نہیں بڑھا ہے اور رعائتوں کا فائدہ صارفین تک نہیں پہونچایا گیا ہے درآمدات کے بارے میں اعتدال پسندی کی پالیسی سے اس وقت تک تو سوسائٹی کو بڑے پیمانے پر کوئی مرئی فائدہ نہیں پہونچا ہے الٹے اس سے توازنِ ادائیگی کے تعلق سے ایک نازک صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔

سماجی فلسفے کے بغیر ترقی

ہندوستان کے معاشی منظر کا تجزیہ کیسا ہو

مقاصد کے لیے ہی عمدہ ہیں)۔ ایک اقتصادی فلسفہ تو سماجی فلسفے کی لونڈی ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن "ترقی کے نئے فلسفے" میں کوئی سماجی فلسفہ نظر نہیں آتا۔ نام نہاد نئے فلسفے کے پوری طرح اختیار کئے جانے سے کیا نتائج برآمد ہوں گے، اس کا تصور کوئی بھی کر سکتا ہے۔ ماہرینِ اقتصادیات ہندوستان جیسے ملک میں "ایک دوہری معیشت" کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس کے معنی صرف ایک ابتدائی حقیقت کو تسلیم کرنا ہیں۔ نیا فلسفہ ہمارے نظام میں دوہری معیشت کی جڑیں مضبوط کرے گا۔ ۲۰۰۱ء تک ہم دو ہندوستان دیکھیں گے۔ ایک ہندوستان بہت امیر لوگوں کا ہوگا جو ان تمام فائدوں

آسائشوں سے لطف اندوز ہو رہے ہونگے جو باہر کی دنیا کو حاصل ہیں۔ دوسرا ہندوستان نہ صرف غریب رہے گا بلکہ امیروں کے امیر بننے کی قیمت بھی چکا رہا ہوگا۔ اپنی ٹیکسوں سے متعلق پالیسی میں حکومت امیر گھرانوں کی

عورتوں کو بہت سے ریلیف دیتی ہے جو اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ وہ پیٹرول، مٹی کے تیل یا گیس سلینڈروں کی قیمت میں اضافے کی تلافی کر دیتے ہیں۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی دے دیتے ہیں۔ لیکن غریبوں کی بیویاں ہمیشہ ادا کرتی رہینگی۔

یہ اس بات کی صرف ایک مثال ہے کہ ترقی کا خرچ کیسے تقسیم کیا جاتا ہے۔

اور اس کے اثرات

اس اسکیم کے تحت اندرونِ ملک مجموعی پیداوار شائد پانچ فیصد سالانہ کی شرح سے بڑھے گی۔ لیکن پیداوار ایسی اشیاء اور ایسی خدمات پر مشتمل ہوگی جن کا استعمال دس فیصد بالائی طبقہ کرتا ہے۔ اگر صنعتی پیداوار بڑھتی ہے تو اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ دس فیصد بالائی

طبقہ دس فیصد بالائی طبقے کے لیے یہ پیداوار کر رہا ہے۔ اعلیٰ ٹیکنالوجی کی فراخدلانہ درآمد سے روزگار کی شرح میں مطلوبہ تیزی نہ

اضافے ستاد کا وٹ پڑے گی۔ جب ٹیکس کم کر دیئے جائینگے اور کنٹرول ہٹا دیئے جائینگے تو کوئی کالا دھن نہ ہوگا۔ جو بھی منافعے ہونگے وہ قانوناً سفید دھن ہوں گے۔ معیشت پر صنعت کاروں، اُن کے غیر ملکی سرپرستوں اور امیر زمینداروں کا کنٹرول ہوگا، سیاستداں ان کے ہاتھوں کی کٹھ پُتلی ہوں گے اور سِول سروِنٹس ان کے آلۂ کار۔ حکومت زراعتی لابی کو خوش کرنے کے لیے اونچی قیمتوں پر غلّہ خریدیگی لیکن اس کے لیے غریبوں کے لیے اسٹاک ریلیز کرنا ممکن نہ ہوگا۔

نہ صرف ترقی یافتہ ملکوں کی بلکہ جنوبی کوریا اور تائیوان، ہانگ کانگ اور سنگاپور کی مثالیں دی جاتی ہیں اور یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ ہندوستان کوئی چھوٹا سا ملک نہیں ہے جس کا قریب قریب کوئی دفاعی بجٹ نہ ہو اور ہندوستان یک شہری ریاست بھی نہیں ہے۔ یہ بات بُھلا دی جاتی ہے کہ جنوبی کوریا یا تائیوان میں (بلکہ جاپان میں بھی) سرکاری کنٹرول اس سے کہیں زیادہ ہیں جتنے کہ سمجھے جاتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ برطانیہ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بیروزگاروں کو کافی زیادہ امداد (بیروزگاری بھتّہ) دی جاتی ہے۔ جس سے وہاں تکلیف دہ بے اطمینانی اور

اس لیے پبلک یا سرکاری سیکٹر کو برقرار رہنا اور پھلنا پھولنا ہے۔ لیکن اس بندوبست کو ہر قسم کے سیاسی دباؤ، اقربا پروری اور کورپشن سے پاک ہونا چاہیئے۔ سرکاری سیکٹر کی بچتوں کو بڑھانے کے لیے آسان طریقہ یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ قیمتیں بڑھا دی جاتی ہیں۔ لیکن عموماً اس کا اثر سرکاری سیکٹر کی دوسری اکائیوں پر پڑتا ہے جس کے نتیجے میں متوقع بچت کالعدم ہو جاتی ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اپنا کام جاننے والے افراد کے خود مختارانہ کنٹرول کے تحت زیادہ اچھی کارکردگی کے ذریعے لاگتوں کو کم کیا جائے۔

بے چینی نہیں پھیلتی۔
ایک اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ جب
شکاگو کا مالی امور کا ماہر خود اپنے ملک کے
لیے کوئی علاج تجویز کرتا ہے تو وہاں کے لیے اس
کی خوبیاں کچھ بھی کیوں نہ ہوں لیکن جب
وہی ماہر چلی جیسے ملک کو مشورہ دیتا ہے تو
اس کا مشورہ اس کے لیے تباہ کن ثابت ہو
سکتا ہے۔

اور یہ نقلی رویّہ

شاید حکومت موجودہ صدی کے اختتام
سے کافی پہلے نئے
فلسفے کی کمزوریاں
محسوس کرسکیگی
جیسا کہ اس

کروڑ روپے کی کمی کا اعلان کیا گیا۔ ان اقدامات
کے نتیجے میں "آخری خسارہ" ۳۶۵۰ کروڑ روپے
سے زائد کا رہے گا اور کچھ ریاستی حکومتوں
پر اس کا اثر پڑے گا۔ یہ ایک اچھی علامت
ہے کہ حکومت بعض معاملوں پر لچکدار رویّہ
اختیار کرتی ہے لیکن بہتر ہوتا اگر بجٹ پیش
کیے جانے سے پہلے ضروری "ہوم ورک" کر لیا
جاتا۔
اس طرح اگر

دوُر نہ ہوگی۔ کوئی یہ تجویز پیش کرسکتا ہے
کہ ہم اپنے تسلیم کردہ طریقوں کو کچھ ترمیموں
کے ساتھ جاری رکھیں۔ ساتویں منصوبے
میں یہی کچھ کرنے کی کوشش کی گئی ہے،
لیکن ضروری تبدیلیوں کے بارے میں
اس کے دعوے، منصوبے کے حجم یا مفصل
تخصیصِ رقوم

جب تک جامع اصلاحاتِ اراضی کے اقدامات کو ہمارے منصوبوں کا ایک مقررہ وقت میں زیرِ عمل لایا جانے والا حصہ نہیں بنایا جاتا زراعت کی اصلاح و ترقی صرف چند علاقوں تک محدود رہے گی۔ اگر سرکاری خرید سے غلّہ کا بہت بڑا اسٹاک جمع ہو جاتا ہے تو اس اسٹاک کو براہِ راست روزگار پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔

مضمون کے شروع میں کہا جا چکا
ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کو اپریل
۱۹۸۵ء میں اعلان کردہ درآمدی برآمدی پالیسی
(ایکسپورٹ امپورٹ پالیسی) کے بارے میں
شبہات پیدا ہو چکے ہیں۔ بعد میں دسمبر ۱۹۸۵ء
میں اختیار کی گئی طویل المدتی مالی پالیسی کے
بارے میں بھی حکومت کے ذہن میں تشکیک
پیدا ہو گئے ہیں۔ بجٹ سے قبل، منضبط قیمتوں
میں جو اضافے کیے گئے تھے حکومت کو انھیں
داخلی و خارجی سخت دباؤ کے تحت کم کرنا پڑا۔
چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے بارے میں نئے
تجاویز میں بھی ترامیم کرنی پڑیں۔ بجٹ پر ہونے
والی بحث کے دوران ایکسائز ڈیوٹیوں میں
۱۷ کروڑ روپے اور امپورٹ ڈیوٹیوں میں ۱۲

نئے فلسفے کے نتیجے ہیں، جو کوئی بالکل
نئی چیز نہیں ہے بلکہ جو کچھ دوسرے ملکوں
نے کیا ہے یا جو کچھ بزنس اسکولوں میں پڑھایا
جاتا ہے، اُس کی بے سوچی سمجھی نقل ہے، رؤ
ہندوستانیوں کو مزید تقسیم کرنا پڑے تو اگلا سوال
یہ ہوگا کہ "متبادل راستہ کیا ہے؟"

متبادل راستے

ایک متبادل راستہ تو یہ ہے کہ ہم ماضی
میں جس طرح کام کرتے رہے ہیں اسی طرح کرتے
جائیں۔ لیکن ان ہی صفحات میں پہلے یہ کہا جا چکا
ہے کہ ایسا کرنے سے قومی آمدنی میں حسبِ منشاء
اضافہ نہ ہوگا اور غریبی قابلِ لحاظ حد تک

سے ظاہر نہ ہوتے۔ منصوبہ بندی
کمیشن نے ابتدائی ابواب میں جو کچھ لکھا
ہے اس میں بے چینی کا احساس نظر آتا ہے
جس سے لگتا ہے کہ کمیشن جو کچھ کہہ رہا ہے
وہ پورے وثوق سے نہیں کہہ رہا ہے۔
اگر چھٹے اور ساتویں منصوبے میں رقوم
کی تخصیص کو آمنے سامنے رکھا جائے تو دونوں
میں زیادہ فرق نہیں نظر آئے گا۔ کسی کو بھی
یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ "خوراک، کام اور
پیداواریت" پر جو زور دیا گیا ہے اس

کے باوجود ترقی کی مجوزہ شرحیں وہی ہیں جن سے ہم ایک طویل مدت سے متعارف رہے ہیں یعنی زراعت میں چار فیصد سالانہ، صنعت میں آٹھ فیصد سالانہ اور مجموعی طور پر پانچ فیصد سالانہ۔ لیکن اگر ان شرحوں کے ساتھ ساتھ سب سے نچلی سطح کے غریبوں کے لیے مؤثر اقدامات کئے جائیں تو بھی کچھ اُمید ہو سکتی ہے۔ لیکن رقوم کی جو تخفیف کی گئی ہے اس سے اُمید نہیں بندھتی۔ اور جو تھوڑی بہت اُمید ہے وہ بھی شاید اُس وقت دم توڑ دیگی جب سرکاری سیکٹر کی بچتوں سے وابستہ توقعات پوری نہ ہوں گی۔ اس سے سارا منصوبہ خطرے میں پڑ جائے گا اور افراطِ زر کا دباؤ پیدا ہو جائے گا۔ اگر تجربہ کچھ بتاتا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ تخفیف کی کلہاڑی سماجی خدمات اور غریبی دُور کرنے کے پروگراموں پر پڑے گی۔

> **معیشت کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ ترقی کی مطلوبہ شرح کو برقرار رکھ سکے اور ساتھ ساتھ بہتر انصاف حاصل کر سکے۔ نااہل منصوبہ بندی کا بدل اہل منصوبہ بندی ہے جس میں سماجی نشانوں کو واضح اور مسلسل طور پر نظر کے سامنے رکھا جائے۔**

اشاراتی منصوبہ بندی

اگر ترکِ منصوبہ بندی (جس کے لیے بعض اوقات "اشاراتی منصوبہ بندی" کی شائستہ اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے) سے وسیع تر نابرابریاں پیدا ہوں گی تو جس طرح کی منصوبہ بندی کے ہم عادی ہیں اس سے بھی مقاصد حاصل نہ ہوں گے۔ اب کیا کوئی تیسرا طریقہ ہے؟ شاید اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ "ہاں کوئی تیسرا طریقہ ضرور ہوگا جو ہماری منصوبہ بندی کو حقیقتاً بامقصد بنائے گا۔" اس کے لیے نقطۂ نگاہ میں تبدیلی اور عزم میں پختگی لانی ہوگی لیکن اس کا مطلب کوئی ایسی چیز نہ ہوگا جو فوراً شروع کی جا سکے "اشاراتی منصوبہ بندی" ہندوستان میں بالکل ناکام رہے گی۔ جب صنعت کار اور تاجر قانونی سرکاری احکام سے روگردانی کا ہر ممکن طریقہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ تو "اشارات" کے لیے ان کے دلوں میں کتنا احترام ہوگا۔ ہم نے بہت سے "شریفانہ معاہدات" کو نہایت غیر شریفانہ طریقے سے ختم ہوتے دیکھا ہے۔ صنعتی اداروں کو نجی ملکیت میں دینے کی جس حکمتِ عملی پر مارگریٹ تھیچر عمل کر رہی ہیں وہ ہندوستان میں ناکام رہے گی کیونکہ حکومت جن اکائیوں کو فروخت کرنا چاہے گی انھیں نجی سرمایہ خریدنے کو تیار نہ ہوگا۔ پھر اس قسم کی نجی ملکیت سازی (Privatisation) میں سیاسی خطرات مستور ہیں۔ درحقیقت ہندوستان میں تو بالعموم یہ مانگ دیکھنے میں آئی ہے کہ حکومت ہر اُس صنعتی اکائی کو اپنی تحویل میں لے لے، جو بیمار ہے یا ٹھیک طرح سے نہیں چل رہی ہے یا جسے کسی قانونی جھگڑے کی وجہ سے مشکلات کا سامنا ہے۔

سرکاری سیکٹر ضروری

اس لیے پبلک یا سرکاری سیکٹر کو برقرار رہنا اور پھلنا پھولنا ہے۔ لیکن اس بندوبست کو ہر قسم کے سیاسی دباؤ، اقربا پروری اور کورپشن سے پاک ہونا چاہیئے۔ سرکاری سیکٹر کی بچتوں کو بڑھانے کے لیے آسان طریقہ یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ قیمتیں بڑھا دی جاتی ہیں۔ لیکن عموماً اس کا اثر سرکاری سیکٹر کی دوسری اکائیوں پر پڑتا ہے جس کے نتیجے میں متوقع بچت کالعدم ہو جاتی ہے سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اپنا کام جاننے والے افراد کے خود مختارانہ کنٹرول کے تحت زیادہ اچھی کارکردگی کے ذریعے لاگتوں کو کم کیا جائے۔ نجی سیکٹر میں چھوٹی اور درمیانہ سائز کی صنعتوں پر اور زیادہ زور دیا جانا چاہیے۔ خاص کر ان صنعتوں پر جو [illegible] علاقوں میں واقع ہیں۔ جب کہ [illegible]

ڈاکٹر مالکم الیس ادی سیشیہ

اکیسویں صدی میں قدم رکھنے کے لیے دو متبادل راستے

فاضل مصنف کا کہنا ہے کہ ہمارے ملک اور اس کے صاحبِ اقتدار لوگوں کے سامنے اس وقت دو واضح اور متبادل راستے ہیں۔ یہ اس قدر واضح ہیں کہ انھیں الفاظ کی شعبدہ گری سے دھندلا نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی یا تو سماج اپنے موجودہ بنیادی ڈھانچے کو لے کر ہی آگے بڑھے جس سے پیداوار بڑھے۔ سرمایہ بندی ہو اور ملک کے غریب عوام کی اکثریت کی حالت بدتر رہے۔ مگر یہ راستہ اقتصادی نابرابری کا ہے"۔

اس کے برعکس ملک کے سامنے دوسرا راستہ وہ ہے جس کے لیے قومی اور انفرادی سطح پر سیاسی فیصلے کی ضرورت ہے۔ اس سے ملک کے شہریوں کے لیے مساوات کی آئینی دفعات کے مطابق مقابلتہً کم غیر منصفانہ سماجی نظام کی طرف بڑھا جاسکے گا۔"

۱۵ اگست ۲۰۰۰ء کو ہندوستانی معیشت کی صورتِ حال کیا ہوگی؟"

اس سوال کا جواب دو ممکن حالتوں کو بیان کیا جاسکتا ہے۔

ایک تو جواب یہ ہے کہ یہ وہی صورت ہوگی جو کہ ہمارے اعمال و افعال کے منطقی نتیجے کی صورت میں سامنے آئے گی جیسا

اس موضوع پر اظہارِ خیال کرنے والوں کو بھیجے گئے رہنمایانہ خطوط میں کہا گیا ہے کہ وہ زیرِ عمل ترقیاتی فلسفہ کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد اس کے منطقی نتائج کو واضح کریں۔ گویا یہ وہ طریق کار ہوگا جس سے مستقبل کا اندازہ لگایا جاسکے اور یہ دیکھا جاسکے کہ موجودہ مقاصد اور ان کو حاصل کرنے کے لیے اختیار

کیے گئے ذرائع کی روشنی میں ۲۰۰۰ء میں کیا حالت بنے گی۔ مثال کے طور پر آج گویا کہ ۱۹۸۶ء میں ہم ایکس X طرز کی سوسائٹی سے شروع کرتے ہیں اور نتیجہ نکالتے ہیں تو اسی شرح اور انھیں ذرائع سے آئندہ چودہ برسوں میں ہم جہاں جا سکتے ہیں جبکہ سماج بھی ایکس X ہے یہ منطقی استدلال ہے۔ رہنمایانہ خطوط میں یہ کہا گیا

ہے کہ بہتر حکمت عملی سے نشانہ مکمل ہوسکتا ہے یعنی کہ نشانہ تو ابھی تک ۱۵ ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے پالیسیوں اور عمل درآمد کے طریقوں میں اصلاح و بہتری لائی ہے۔

دوسرا منظرنامہ یہ ہے کہ مستقبل کے لیے مطلوبہ مقاصد مقرر کردیں۔ اور سنہ ۲۰۰۰ء تک ان کے حصول کے لیے نئے ذرائع تلاش کریں۔ دوسری حالت میں سماج اور سماجی تعلقات کو والی Y ، اور اس کے پیداواری نتیجہ کو ۱۱۲ مان سکتے ہیں۔ اس صورت میں ایکس کے ذریعے ظاہر کئے گئے موجودہ سماجی تعلقات کو والی Y سے ظاہر کئے گئے مطلوبہ سماجی تعلقات کی حد تک بدلنا ہوگا۔ اور پیداوار کو موجودہ سو کے درجے سے اوپر اٹھا کر ۱۱۲ تک لے جانا ہوگا۔ مستقبل کے اندازے میں یہی طریق کار اپنانا ہوگا۔ مستقبل کے اندازے سماجی طور پر پسندیدہ طریقوں کے ضابطے کے تحت لگائے گئے ہیں۔ اس کی روشنی میں فیصلے کئے جارہے ہیں۔ تاکہ مطلوبہ مقاصد کی تکمیل عمل میں آسکے۔

منطقی صورتِ حال

سنہ ۲۰۰۰ء میں معیشت کی صورتِ حال کے بارے میں بیان کیا گیا پہلا نقشہ موجودہ سماجی تعلقات کے ساتھ منظرِ عام پر آتا ہے اس کے تحت ملک کے ذرائع پیداوار کسی حد تک یا تو ریاست کی ملکیت میں ہیں (یعنی کہ ریاست کی سرمایہ کاری میں) یا پھر وہ زیادہ تر نجی افراد کے ہاتھوں میں ہے (جیساکہ سرمایہ دار کسان، مال تیار کرنے والی صنعتیں)۔ اثاثہ جات کے مالک خواہ وہ ریاست ہو یا نجی افراد ملکیت سے روپیہ کماتے ہیں یہ آمدنی کرایہ، سود، منافع، اُجرتوں اور تنخواہوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ جبکہ ملک کی وہ اکثریت جو اثاثہ جات سے محروم ہے، اثاثہ جات کے مالکوں کے یہاں ملازمت کرتی ہے، ان کو کام دلانے کے لیے خصوصی نوعیت کے پروگرام چلائے جاتے ہیں۔ جن کو روزگار نہیں ملتا، ان کے لیے جز وقتی کام فراہم کرنے کے اقدامات عمل میں لائے جاتے ہیں اور اس کے بعد صرف اس قدر اُجرت ملتی ہے جس سے افراطِ زر کا مقابلہ کرنے کے لیے سخت کوشش اور جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ معیشت میں بچتوں کا اہم مقام ہے۔ سرمایہ بندی کے ذریعے یہ آگے بڑھتی ہے۔ یہ سرمایہ بندی ۲۰ فیصد کے بقدر ریاست اور اس کے اثاثہ جات کی ملکیت نیز پیداواری نظام سے ہوتی ہے جبکہ ۸۰ فیصد پرائیویٹ سیکٹر میں ہوتی ہے۔ امیر گھرانے اور کارپوریٹ سیکٹر سے یہ سرمایہ بندی ہوتی ہے۔ سرمایہ پیداوار میں لگایا جاتا ہے اور سرمائے کے وسیلوں کو بڑھانے پر توجہ مرکوز رہتی ہے جبکہ انسانی وسیلے کے فروغ سے اتنی دلچسپی نہیں ہوتی۔ سرمایہ ہی پیداوار، آمدنی، منافع اور سود کا اہم وسیلہ ہے۔

آج ہمارے یہاں بچتوں اور پیداواری معیشت کا جو نظام رائج ہے، وہ سنہ ۲۰۰۱ء تک پیداوار اور تقسیم کی ایک خاص سطح پر آسکے گا۔ جیساکہ ساتویں منصوبے کی دستاویز کے باب ۲ میں مذکور ہے۔ اس صدی کے اختتام پر موجودہ صورتِ حال کے مطابق ملک کی معیشت جدید تکنیک سے آراستہ ترقی پسندی کے راستے پر گامزن ہوگی۔ اس میں توسیعی صلاحیت ہوگی جس سے بنیادی سامان مل سکے اور تمام لوگوں کی بھلائی کے تقاضے پورے ہوسکیں۔ اس کا تعلق مسئلہ آبادی سے ہوگا نہ کہ سماجی تعلقات سے۔ اضافہ آبادی کے سبب ترقی کے عمل میں رکاوٹ پڑے گی جس کی وجہ سے اضافہ آبادی کی روک تھام ضروری ہوگی۔ اس کے لیے مختلف ترغیبات دی جائیں گی۔ مقصد یہ کہ آبادی سنہ ۲۰۰۰ء تک ۱۰۵۰ ملین نہ ہوکر صرف ۹۷۲ ملین تک رہ سکے۔ اس بنیاد پر آئندہ پندرہ برسوں میں پیداوار کو ۳ فیصد بڑھنا ہے۔ زراعت کا حصہ قومی آمدنی میں ۳۴ فیصد سے گھٹ کر ۲۵ فیصد رہ جائے گا۔ اس میں آئندہ پندرہ برسوں میں سالانہ ۵ء۴ فیصد شرح ترقی درکار ہوگی۔ سنہ ۲۰۰۰ء تک خوراکی اجناس کی پیداوار ۲۴۳ کروڑ ٹن تک پہنچ جائے گی۔ کان کنی اور مینوفیکچرنگ کے شعبوں میں ۸ء۶ فیصد سالانہ کے حساب سے ترقی مطلوب ہوگی۔ مجموعی گھریلو پیداوار کا ۲۶ فی صد ایسی صنعتوں میں لگایا جائے گا جو زراعت میں معاون ہیں۔ اس میں سے ۵ء۹۵ فیصد اندرونِ ملک کی گئی بچتوں سے حاصل کیا جائیگا۔ زرعی پیداوار میں ۸۰ فیصد اضافے کے لیے جدید سے جدید تر سائنس درکار ہوگی۔ اسے صنعتوں سے مربوط کیا جائے گا۔ اس ضمن میں بائیو ٹکنالوجی کی بڑی اہمیت ہوگی۔ علمِ افزائشِ نسل (Genetic Engineering) فوٹو سنتھیسیس (Photo Synthesis) ٹشو کلچر (Tissue Culture) بائیو انسیکٹی سائڈس کی مدد سے خوراک اور کپڑے میں خود کفالت حاصل کی جائے گی، روزگار کے مواقع بڑھائے جائیں گے۔ بائیو اسفیر کا تحفظ کیا جائے گا صنعتوں کی از سرِ نو زمرہ بندی درکار ہوگی۔ ترقی کے عمل کو آگے بڑھانے کے لیے صنعتوں کو نئی نئی سمتوں میں آگے بڑھانا ہوگا۔ اس کے لیے

ٹکنالوجی اور نظم و نسق کا معیار بڑھانا ہوگا تاکہ وہ بین الاقوامی منڈیوں میں مقابلے پر آسکے
سنہ ۲۰۰۱ء تک صنعتوں کا معیار قطعی بدل گیا ہوگا اور وہ ۱۹۸۵ء سے بالکل مختلف ہوگا۔

انرجی کے غیر تجارتی وسیلوں کو فروغ ملا ہوگا اس کے استعمال میں کفایت لانے کے طریقوں سے کام لیا جا رہا ہوگا۔ دیہی علاقوں کا منظر نامہ انرجی کے تعلق سے یکسر بدل رہا ہوگا۔ پیداوار اور بچت کے اس پس منظر میں سنہ ۲۰۰۱ء تک اشیاء کی تقسیم کا نظام ایسا ہوگا جس سے فی کس اوسط کھپت بڑھے گی۔ اوسط کھپت فی الحال ۱۹۷۹ء روپے ہے جو بڑھ کر ۳۱۲۴ روپے ہو گیا ہوگا۔ خوراکی اجناس کی کھپت کا اوسط ۱۸۷ کلو گرام سے بڑھ کر ۲۱۵ کلو گرام، کپڑے کی کھپت کا اوسط ۱۶٫۱۶ میٹر سے بڑھ کر ۲۳٫۳۶ میٹر، معیاری روزگار کا اوسط بحساب فی کس فی سال ۱۸۷ ملین سے بڑھ کر ۳۸۷ ملین افراد ہو چکا ہوگا۔ اوسط عمر ۵۶ سال سے بڑھ کر ۶۳ سال ہو گئی ہوگی۔ بالغوں کی خواندگی کے پروگرام کے تحت سبھی لوگ پرائمری تعلیم پا رہے ہوں گے۔ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والوں کا فیصد آج کے ۳۷ فیصد سے گھٹ کر صرف ۵ فیصد رہ گیا ہوگا۔

متبادل منظر نامہ

دوسرا راستہ یہ ہے کہ مقاصد کا تعین کر لیا جائے، جن کا مقصد سماجی تعلقات کا تعین ہو اور جس کا مقصد یہ بھی ہو کہ سماج میں سب سے اوپر کے ۳۰ فیصد افراد جن کی آمدنی کا بڑا حصہ اثاثہ جات کی ملکیت کی آمدنی سے ہے، اور نیچے کے ۷۰ فیصد افراد جن کی آمدنی کا بڑا حصہ تنخواہ یا اُجرت کی شکل میں ہے، دونوں کا فرق کم کیا جائے۔

مقصد یہ کہ اس سمت میں کی گئی کوششوں سے ۲۰۱۵ تک اثاثہ جات کی ملکیت کے سہارے زندگی بسر کرنے اور اُجرتوں وغیرہ سے زندگی گزارنے والوں کے درمیان فرق زیادہ نہ رہے۔ سماجی اور اقتصادی مساوات کی جانب قدم بڑھاتی ہوئی سوسائٹی کے قیام کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ اس سلسلے کے اقدامات اور اس سلسلے کا عمل فوری طور پر شروع کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں اراضی کی بالائی حد کے قانون کی نئے سرے سے زمرہ بندی ضروری ہوگی تاکہ سنہ ۲۰۱۰ء تک تمام اراضی کی ملکیت ریاست کے پاس ہو اور وہ انسے تقسیم کرے اس طرح کسی کنبے کے پاس آبپاشی والی پانچ ہیکٹر اراضی سے زیادہ نہ ہوگی جب کہ آبپاشی کے لیے بارشوں پر انحصار رکھنے والی زمین کی بالائی حد دس ہیکٹر ہوگی۔

فاضل اراضی کو بے زمین افراد اور کسانوں کو بانٹ دی جائے گی۔ مویشیوں، آلات اور دیگر پائیدار اثاثہ جات ایسے کنبوں کو دے جائیں گے جن کے پاس یہ اثاثہ جات نہیں ہیں۔ دیہی ترقی کے مربوط پروگرام کے پس پردہ یہی مقصد کارفرما ہے حالانکہ اس کا نظم و نسق ٹھیک طرح نہیں چل پا رہا ہے شہری اراضی کی بالائی حد کے قانون کو مؤثر ڈھنگ سے لاگو کیا جانا ہے۔ املاک اور مکانات پر بھی بالائی حد کے قانون کا نفاذ ہونا ہے۔ پبلک سیکٹر کو توسیع دینا ہے۔ تاکہ تمام کارخانے ایک مخصوص سرمایہ کی حیثیت سے اوپر، مثال کے طور پر، ۵ کروڑ روپے سے اوپر پبلک سیکٹر کی ملکیت میں ہوں گے۔ براہ راست ٹیکسوں، شخصی انکم ٹیکس، کارپوریٹ انکم ٹیکس، دولت ٹیکس، اسٹیٹ ڈیوٹی اور وراثت ٹیکس تحفہ ٹیکس، سرمائے کے منافع پر ٹیکس وغیرہ کے نظام لاگو کئے جائیں گے۔

اس کے ذریعے سماج کو اقتصادی طور پر دس حصوں میں تقسیم کر کے، اوپر کی سطح کے دو حصوں کے وسائل (جو سب سے زیادہ ہیں) نچلی سطح تک لے آنے کی کوشش کی جائے گی۔

اس منظر نامے کے تحت پیداوار اور تقسیم کا نظام چند مستثنیات کو چھوڑ کر پہلے کی طرح ہی ہوگا۔ مستثنیات یہ ہیں:-

(الف) بچتوں میں ۸۰ فیصد تک کی حد تک اور گھریلو سیکٹر سے حاصل کرنے کی بجائے ریاست اور پبلک سیکٹر سے حاصل کی جائے گی۔

(ب) آبادی کے نچلے سات درجوں کے بڑھتے ہوئے معیار زندگی اور اضافہ آبادی کے درمیان تطبیق پیدا کی جائے گی۔

(ج) اشیاء کی تقسیم کے عوامل، مثلاً فی کس خوراکی اجناس کی اوسط کھپت، کپڑے کی کھپت، اور تعمیر مکانات کے تناسب کو نچلی سطحوں پر پہلے منظر نامے کے مقابلے بلحاظ ۵۰ فیصد اوپر رکھنا ہوگا۔

(د) ہمارا نشانہ سب کے لیے صحت زندگی فراہم کرنا ہے، اس کے لیے تعلیم کو عام اور غیر رسمی تعلیم کو پھیلانا ہے کیوں کہ تعلیم حصول پوری زندگی کے ساتھ چلنے والا عمل ہے اس کے لیے ایسا تمام مواد ضروری ہے جس سے از خود سبق لیا جا سکے مثلاً کتابیں، ویڈیو ٹکنالوجی اور کمپیوٹر۔ ان کے استعمال کو فروغ دے کر تعلیم کو عام کیا جائے گا۔ آئندہ برسوں میں یہ کام ہونا ہے کیوں کہ یہ وہ وقت ہے جو حال کو سنہ ۲۰۰۱ء سے الگ کرتا ہے۔

(س) پہلے منظر نامے کے مقابلے روزگار کے مواقع میں مزید دس فیصد اضافہ کرنا

اور خود روزگار پر زیادہ زور رہے گا، اُجرتوں کے نظام کو معقول بنیادوں پر لاکر دیگر افراد کے لیے نفع بخش روزگار فراہم کرنا ہوگا۔ مناسب اُجرتوں کی ادائیگی کے قوانین پر موثر نفاذِ عمل درکار ہوگا۔ اس کے علاوہ سنہ ۲۰۰۱ء تک غریبی کو دُور کرنے میں کافی مدد مل سکیگی۔

طریقِ عمل اور اس پر عمل درآمد

اکیسویں صدی میں قدم رکھنے سے قبل اگر ہم پہلے منظر نامے کو عملی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں، تو اس کے لیے بیشتر اور مشق اور نشانہ و نتائج، قانون اور اس پر عمل درآمد وغیرہ کے فرق کو دُور کرنا ہوگا۔ اس کے لیے کوئی نئی حکمتِ عملی درکار نہ ہوگی بلکہ مضبوط اور واضح سیاسی عزم کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لیے فیصلہ کن انتظامی ڈھانچہ، وضع کرنا ہوگا جو کہ پروگراموں پر عمل درآمد کر سکے۔ پہلے منظر نامے کے مطابق آئندہ کے تین پنج سالہ منصوبوں پر عمل درآمد کے لیے کام کرنا ہوگا۔

دوسرے منظر نامے کے مطابق سماجی تعلقات اور رشتوں میں تبدیلی درکار ہوگی۔ اثاثہ جات کی کھپت، غیر محسوب آمدنیاں جو کہ زرعی ملکیت وغیرہ سے یا مینوفیکچرنگ صنعتوں سے حاصل ہوتی ہے، ان کے رشتوں کو نیا رُخ دینا ہوگا۔ بالواسطہ ٹیکسوں پر بڑھتے ہوئے انحصار کو کم کرنا ہوگا کیوں کہ یہ زیادہ تر غریب عوام اور متوسط آئی والے طبقے ادا کرتے ہیں۔ گویا کہ سماج کے نچلے سطح کے اُن سات مراتب کے افراد ان کو ادا کرتے ہیں جو غریب طبقوں میں آتے ہیں۔ بڑی بڑی زرعی آمدنیاں براہ راست ٹیکسوں سے مستثنیٰ ہیں۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ طویل المدتی مالی پالیسی میں یہ کہا گیا ہے کہ براہ راست ٹیکسوں کی یہ کمتر سطح ساتویں پنجسالہ منصوبے کی بقیہ مدت میں بھی ملے گی۔ اگر اس پالیسی پر بھی عمل درآمد جاری رہا تو دُوسرے منظر نامہ پر عمل درآمد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور وہ خارج از بحث ہو جاتا ہے۔ پہلے منظر نامے کے مطابق "اشیاء کی تقسیم کے مقاصد ۔ یعنی ۵ فیصد غریبی کا تناسب کم بیروزگاری" حاصل ہو تو جائیں گے لیکن اس سے سماجی اور اقتصادی سطح پر نابرابری اور عدم مساوات بڑھ جائے گی۔

اب راستہ کا انتخاب کرنا ہے۔ یعنی یا تو ایسا راستہ اپنا لیا جائے جس کے تحت سماج موجودہ بنیادی ڈھانچہ پر ہی چلے اور پیداوار بڑھائے، سرمایہ بندی کرے اور غریبوں کی اکثریت کی حالت سدھارے، مگر یہ راستہ اقتصادی نابرابری کا ہے۔ سماج میں اس سے تفاوت بڑھے گا اور جو فیصلے کیئے جائیں گے وہ ایسے سماجی نظام کی طرف لے جائیں گے جن سے غیر منصفانہ سماجی نظام پنپے۔ اس کے برعکس ملک کے سامنے دوسرا راستہ بھی ہے جس کے لیے قومی اور انفرادی سطح پر سیاسی فیصلے کی ضرورت ہوگی۔ یہ مسئلہ ملک اور ملک کے صاحبِ اقتدار لوگوں کے سامنے ہے جس پر انھیں غور کرنا ہے۔ اس سے مُلک کے شہریوں کے لیے مساوات کی آئینی دفعات کے مطابق مقابلتہً کم غیر منصفانہ سماجی نظام کی طرف بڑھا جا سکیگا۔ ●

بقیہ کیا ہم ۲۰۰۱ء میں غربت کی فراوانی کے ساتھ داخل ہونگے؟

کے اقدامات کو ہمارے منصوبوں کا ایک مقررہ وقت میں زیرِ عمل لایا جانے والا حصہ نہیں بنایا جاتا۔ زراعت کی اصلاح اور ترقی صرف چند علاقوں تک محدود رہی۔ اگر سرکاری خرید سے غلّہ کا بہت بڑا اسٹاک جمع ہو جاتا ہے تو اس اسٹاک کو براہِ راست روزگار پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جانا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک یکساں اور ملک گیر پبلک نظامِ تقسیم کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ادائیگیوں کے توازن کے بارے میں ایک واضح پالیسی وضع کی جانی چاہیئے۔

صحیح منصوبہ غریبی، قیمتوں اور ادائیگیوں کے توازن کے مسئلوں سے شروع ہونا چاہیئے۔ اور ان مسائل کو ضمنی مسائل سمجھتے ہوئے یہ اُمید نہیں رکھنی چاہیئے کہ کچھ نہ کچھ ہو رہے گا۔ اگر ان تمام اقدامات کے ساتھ مالی پوزیشن یعنی ٹیکسوں، اخراجات اور سرکاری خساروں کے بارے میں ایک مصمم پالیسی اختیار کی جائے اور ٹیکس اُن پر لگائے جائیں جو انھیں برداشت کر سکیں۔ نیز ہر مد کے تحت تمام غیر ضروری اخراجات میں کمی کی جائے تو تشویش کی کوئی وجہ نہ رہیگی۔ معیشت کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ وہ ترقی کی مطلوبہ شرح کو برقرار رکھ سکے اور ساتھ ساتھ بہتر انصاف حاصل کر سکے۔ نااہل منصوبہ بندی کا بدل اہل منصوبہ بندی ہے۔ جس میں سماجی نشانوں کو واضح اور مسلسل طور پر نظر کے سامنے رکھا جائے۔ ●

(اِس شمارے کی پشت پر وزیراعظم ہند شری راجیو گاندھی کی اُس تقریر کا اقتباس درج ہے جو آپ نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی میں کی تھی۔)

دیہات کی منظر کشی

موہت سین

کام کو کام کے ڈھنگ سے کیا جائے

مضمون نگار کا خیال ہے کہ آج ہم جس ڈھنگ سے دیہی منظر کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں اُس سے سن ۲۰۰۰ء سے وابستہ اُمیدیں پوری نہیں ہو سکیں گی یہ اُمیدیں بنیادی سہولیات کے نظام میں اصلاحات کی عدم موجودگی میں کیسے پوری ہو سکتی ہیں جو کہ دیہی غربت کی بیڑیوں کو کاٹنے کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ یہ کام انجام دینے کے لیے "زمین کاشتکار کی ہو" کا عہد پورا کیا جائے اور دیہات کی تعمیرِ نَو امدادِ باہمی کی بنیادوں پر کی جائے جو کہ "سن ۲۰۰۰ء اور اُس کے بعد کے ہندوستان ہمارا" کی نقیب ہوگی۔"

ہمیں اُمید رکھنی چاہیئے بلکہ اس کے لیے کام اور کوشش کرنی چاہیئے کہ دنیا اور ہندوستان دونوں سن ۲۰۰۰ء تک پہونچ پائیں گے۔ امریکہ کی موجودہ سرکار نے جو اندھا دھند نیا جہاں گیری کھیل شروع کر رکھا ہے اُس سے ممکن ہے کہ ایٹمی ہتھیار ہم سب کو روئے زمین سے ملیامیٹ کر کے رکھ دیں۔ آئے دن ایسے اقدامات کئے جا رہے ہیں جو انسانی تہذیب کی مکمل تباہی کے امکان کو یقینی بناتے جا رہے ہیں۔ آج سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ ہم تمام انسانی حقوق میں سے سب سے اہم حق یعنی جینے کے حق کو منوانے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں کریں۔

نخوت پسند اور بڑے انقلاب پسند یہ سمجھتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں کہ اعلیٰ سیاست کے یہ مسائل اُن کروڑوں عوام کی دسترس سے بالاتر ہیں جو ہمارے لاکھوں دیہات میں محض کسی بھی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ ان دبے کچلے لوگوں کو صرف پیٹ بھرنا ہے اور نسلِ انسانی کی افزائش کے فطری تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ یہ صرف اس حد تک درست ہے کہ مادی محرومی کے ساتھ ساتھ انھیں علم اور اطلاعات سے بے بہرہ رکھا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک انھیں علم اور معلومات حاصل ہیں وہ اپنی محنت اور مشکلات سے حاصل عقل سے جوابی عمل کرتے ہیں۔ اور ہمارے ملک کے بہت سے حصوں

میں جن کے بارے میں دیہات والوں کو علم ہے
اور خود دیہات میں اندر تک ان کا وجود ہی
خطرے میں ہے اور جس ڈھنگ سے نحوست پسند
اور بڑے انقلاب پرست سوچتے ہیں اس
کے برعکس وہ چاہتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں اور

نئی زندگی جس طرح چلتی ہے

اس بحث کے لیے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ہم
کہاں ہیں اور ہمارے دیہات میں کیا ہے؟
ہم ایک آزاد اور بڑی طاقت بننے کے سفر کے
نازک درمیانے حصے تک پہنچ گئے ہیں اور جمہوری
عمل بھی ہمارے عوام کی طاقت پر مبنی ہونے
کی درمیانی منزل تک آ پہنچا ہے۔ اسی طرح

ہم اور ہمارا ملک مغلوب ہو سکتا ہے۔
ہماری حیثیت اور قومی وجود کو جتنا
خطرہ دیہات میں ہے اتنا کہیں اور نہیں۔ اس میں
بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ ترقی کے عمل میں دیہات کا
استحصال ہوا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ
ہمارے دیہات میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ اور یہ بھی
نہیں کہ وہاں آبادی کے ایسے طبقے نہیں ہیں
جنھوں نے ترقی نہ کی ہو۔ دیہی ہندوستان کو فائدہ

لیکن اس محاصرے، حملے اور پاؤں اکھاڑ دینے کی کوشش نے جو دھمکی آمیز شکل اور جسامت اختیار کر لی ہے وہ ہمارے ترقیاتی عمل کی کوتاہیوں اور بڑے وغلط طور پر کیے گئے کاموں کا ہی نتیجہ ہے۔ غریبی، نابرابری اور شعور کی دنیا میں قدیم تعصبات کے متعلقہ نتائج کے ساتھ موجود رہنے سے ایک ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے جہاں ہم اور ہمارا ملک مغلوب ہو سکتا ہے۔

دیہی ہندوستان میں ہوا یہ ہے کہ ملک کے بڑے حصوں میں جہاں کھلا جاگیردارانہ استحصال یا تو ختم ہو گیا ہے یا کم ہو گیا ہے وہاں نیم جاگیردارانہ استحصال یا تو قائم ہے یا اور زور پکڑ گیا ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ تبدیلی کی ایک نہایت رجعت پسندانہ قسم ہے۔

اُن کے بچے اور پوتے بھی زندہ رہیں۔ زندگی
کی اس لیے ضرورت ہے تاکہ زندگی کو بہتر
بنایا جا سکے۔
چنانچہ ہم سب لوگوں کی طرح دیہات
کے لوگوں کا اکیسویں صدی کے بارے میں پہلا
خیال یہی ہے کہ وہ اور اُن کے بچے اکیسویں صدی
تک زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ جس چیز کا اُن
میں سے بہت سے لوگوں کو، ہم میں سے بہت
سے لوگوں کی طرح علم نہیں ہے وہ ہے کرمنڈلا
رہی تباہی کے بارے میں کیا کیا جائے؟
تاہم ہمیں آئندہ بحث کے لیے فرض کرنا
پڑے گا کہ ہمیں ایسے اندازے لگانے کا کوئی
حق حاصل نہیں ہے۔

ہماری قوم اُس مقام پر آ پہنچی ہے جہاں اس
کا اتحاد تحفظ کا نصف سفر طے کر پایا ہے۔
یہی سبب ہے کہ ہم اس وقت ایسے
محاصرے اور حملے کی زد میں ہیں اور یہی سبب
ہے کہ اتنا نپا تلا اور پاؤں اکھاڑ دینے والا حملہ ہو
رہا ہے۔ لیکن اس محاصرے، حملے اور پاؤں اکھاڑ
دینے کی کوشش نے جو دھمکی آمیز شکل اور جسامت
اختیار کر لی ہے وہ ہمارے ترقیاتی عمل کی کوتاہیوں
اور بڑے وغلط طور پر کیے گئے کاموں کا ہی نتیجہ
ہے۔ غریبی، نابرابری اور شعور کی دنیا میں قدیم
تعصبات اور اسکے متعلقہ نتائج کے ساتھ چپکے رہنے
سے ایک ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے جہاں

پہنچا ہے اور دیہات کے صاحبِ اقتدار اور
املاک لوگوں نے دیہات میں بھی اتنی ہی طاقت
حاصل کی ہے جتنی کہ اُن کے ہم پلہ لوگوں نے شہروں
میں حاصل کی ہے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ
ہمارے دیہات مقابلتاً کم خوشحال ہیں یا شہری
بستیوں کے مقابلے میں کمتر اچھی حالت میں ہیں۔
اس کا سبب یہ نہیں کہ دیہی ترقی کو نظرانداز
کیا گیا ہے یا ہمارے منصوبہ بندی کے عمل میں شہروں

کی طرف توجہ دی گئی ہے اور صنعت کاری کی
طرف جھکاؤ رہا ہے۔ صنعت اور زراعت
کے باہمی لین دین کی شرائط ہمیشہ زراعت
کے خلاف نہیں رہیں اور صنعتی ترقی کو "سبز
انقلاب" میں پیش کرنے کے لیے ضروری

نہایت رجعت پسندانہ قسم ہے۔ علاوہ ازیں
روائتی قدیم طور طریقوں کو سرمایہ دارانہ قالب
میں نہیں ڈھالا گیا حالانکہ انھیں منڈی یا
بازار سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ بیگانگی سے اتنا
ناجائز فائدہ شہر نے نہیں اٹھایا جتنا خود گاؤں
کے اندر اٹھایا گیا ہے۔ بنیادی انقلابی اصلاحات
کی عدم موجودگی کے نتیجے کے طور پر دیہات

دیہات میں نہ تو پیداوار میں ٹھوس بنیادوں
پر اضافہ ممکن ہے اور نہ ہی سماجی انصاف کا
حصول، خواہ یہ محدود پیمانے پر ہی کیوں نہ ہو جہاں
تک پرائیویٹ اداروں یا انٹرپرائزز کا تعلق ہے ان
میں ایسی صلاحیت نہیں جس سے انکے بنیادی طریق کار
بدلا جا سکے۔ اس عمل کے پیچھے کوئی ایسی قوت نہیں جو اس
عمل کو خود بخود ابھار سکے۔ اس طرح نجی اداروں کو
اس ضمن میں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔
بہار میں بے زمین ہریجن مزدوروں کا قتل
عام جاگیردارانہ بربریت کی موجودگی

بنیادی انقلابی اصلاحات کی عدم موجودگی کے نتیجے کے طور پر دیہات کے کارکن مرد اور عورتیں جو پیداواری عمل کی بڑی قوت ہیں، شہروں سے بھی زیادہ پابند اور مجبور ہیں۔

دیہی ہندوستان کو کم و بیش ہر چیز کی ضرورت ہے کیونکہ دیہات میں آباد عوام کی وسیع اکثریت شہروں کے امیر اور اوسط طبقے بلکہ خود دیہات کے خوشحال لوگوں کے مقابلے میں بھاری محرومی کا شکار ہے۔

اور اہم سمجھا گیا ہے۔ دیہی
علاقوں کی پسماندگی کا بڑا سبب اصلاحات
اراضی کی ناکامی ہے۔
شری شرد جوشی اور کچھ اور لوگوں کا یہ قول
کہ قصباتی ہندوستان دیہاتی بھارت کا استحصال
کرتا رہا ہے۔ دیہات کے استحصال کی حقیقت
کو چھپانے کی ملمع بازی ہے۔ دیہی ہندوستان
میں ہوا یہ ہے کہ ملک کے بڑے حصوں میں جہاں
کھلا جاگیردارانہ استحصال یا تو ختم ہو گیا ہے یا کم،
وہاں جاگیردارانہ استحصال یا تو قائم ہے یا اور
زور پکڑ گیا ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ تبدیلی کی ایک

کے کارکن مرد اور عورتیں جو
پیداواری عمل کی بڑی قوت ہیں شہروں سے
بھی زیادہ پابند اور مجبور ہیں۔
اس صورتِ حال کا ہی یہ حقیقی نتیجہ ہے
کہ آج دیہی علاقوں میں برائے نام بھی کوئی سرکاری
دائرہ کار نہیں ہے۔ سرکاری دائرۂ کار سے
ہماری مراد سرکاری ملکیت کے ادارے ہی نہیں،
امداد باہمی ادارے بھی ہیں۔ وسیع البنیاد سرکاری
سیکٹر کی اختراعی اور تلاش کرنے والی قوت کے بغیر

کی گھناؤنی یاد دلاتا ہے۔ لیکن
آندھرا پردیش کے ڈیلٹا کے اضلاع اور تامل ناڈو
کے تنجور ضلع میں ایسے طبقے کے لوگوں پر حملے کے
بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ علاقے ہیں
جنھیں زرعی سرمایہ داری کا نام دیا جا سکتا ہے۔
پنجاب، ہریانہ اور مغربی اتر پردیش کے دیہات
میں آپ جاٹوں کے غلبے کے بارے میں کیا کہیں گے

دیہی ہندوستان کے وسیع علاقوں میں سرمایہ داری کے اس استحصال کو ذات پات کے جاگیر دارانہ تصور سے مدد ملتی ہے اور شرد جوشی اس کے بارے میں خاموش ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ خود ہی مریض ہیں تو وہ ڈاکٹر کیسے بن سکتے ہیں۔

اب اگر ہم اِس پس منظر میں اکیسویں صدی کے دیہی ہندوستان کا تصور کریں تو ہمیں دو مختلف سطحوں پر کام کرنا ہوگا یعنی قرارداد کو عملی جامہ پہنایا جائے جسے پنڈت نہرو نے پیش کیا تھا۔ اور جسے اُن کی اپنی ہی پارٹی کے آدمیوں نے بےکار کر دیا تھا۔

دیہی ہندوستان کو کم و بیش ہر چیز کی ضرورت ہے کیونکہ دیہات میں آباد عوام کی وسیع اکثریت شہروں کے امیر اور متوسط طبقے بلکہ خود دیہات کے خوشحال لوگوں کے مقابلے میں بھاری محرومی کا شکار ہے۔ مکانات پینے کا پانی، حفظانِ صحت کی ابتدائی خدمتیں اور وہ سب کچھ جو انسانی خدمتوں کے لیے درکار ہے۔ تعلیم اور وہ سب کچھ مزدور طبقوں کے اقتدار کی بجائے مفلسی اور ناداری اُن کا مقدر ہے۔ اور دیہات کے روائتی کاریگر ہنرمندوں کی حالت بھی ویسی ہی ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ گاندھی جی زمین کی نجی ملکیت کو مکمل طور پر ختم کرنے کے حامی تھے۔ اُن کے ٹرسٹی شپ (امین) کے نظریہ کے اس پہلو کو اکثر بھلا دیا جاتا ہے۔ گاندھی جی ہی اکثر اس شلوک کا حوالہ دیا کرتے تھے کہ "سبھی بھومی گوپال کی" ہے۔ اور وہ کہا کرتے تھے کہ اگر پوری زمین گوپال کی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ کسی کی نہیں اور سب کی ہے۔ یہی نظریۂ تحریک امدادِ باہمی کی روح ہے

بے حسی کی موجودہ قوتیں، دیہات کے اعلیٰ طبقوں کی طاقت نیز موجودہ ہندوستان میں سرکاری اختیارات سے اُن کا میل جول چند مہیب رکاوٹیں ہیں جو ہمارے امدادِ باہمی کے خواب کی تعبیر کی راہ میں حائل ہیں۔

ضرورت کس چیز کی ہے اور ممکن کیا ہو سکتا ہے۔

ہمیں کس طرح آگے بڑھنے کی ضرورت ہے؟

ضرورت کی سطح پر آئندہ ہزار برس میں دیہی ہندوستان کو گاندھی جی کے گرام سوراج کے تصور کے قریب آنا چاہیئے لیکن ایسا جدید ٹیکنالوجی سے ہونا چاہیئے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ جدید کاری جو چیدہ چیدہ افراد کی نہیں بلکہ عوامی نوعیت کی ہو، حقیقی چیلنج ہے اور ہونی چاہیئے اس کا مطلب یہ ہے کہ پیداوار کے عمل میں تحریک امدادِ باہمی کی زیادہ سے زیادہ ترقی ہو اور اس کا مطلب ہے کہ دیہی اداروں کے متعلق انڈین نیشنل کانگرس کی ناگپور جس کی انسانی حالات کے لیے ضرورت ہے ہمارے اکثر دیہی عوام کے یے موجود نہیں ہیں۔

لیکن ضرورت مند لوگوں کی سب سے بڑی ضرورت، زمین ہے جس کی ہمیں سب سے زیادہ فراوانی دکھائی دیتی ہے۔ زمین کی ملکیت چند ہاتھوں میں مرکوز ہونے کا تناسب اب بھی بہت زیادہ ہے حالانکہ کافی بڑا درمیانی طبقہ ہمیشہ موجود رہا ہے بلکہ مضبوط بھی ہوا ہے بے زمین مزدوروں اور غریبوں کا تناسب کل دیہی آبادی کے نصف سے بھی زیادہ ہوگا۔ در پردہ مزدوری اور نیم روزگاری ہمارے عوام کے ان طبقوں کی اذیت کا باعث ہے زمین اُسی کی ہے جو اُسے کاشت کرتا ہو کے نعرے کے عقب میں بھی یہی خیال چھپا ہوا ہے۔ اور یہی نعرہ جدوجہد آزادی کا گونجتا ہوا اعلان تھا۔

اگر ان دونوں پہلوؤں یعنی زمین کسی کی ملکیت نہیں اور تحریک امدادِ باہمی کو اصلاحات اراضی کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے جس کے نتیجے کے طور پر کارگر دیہی عوام کے کوآپریٹو ادارے قائم ہوں تو یہ اکیسویں صدی کے ہندوستان کے مطلوبہ یا پسندیدہ گاؤں کے بنیادی پہلو ہوں گے۔

زمین بے زمینوں اور امدادِ باہمی اداروں کے لیے

۱۹۵۰ء کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں جے سی کمارآپا کمیٹی کی سفارشات کی بنا پر کیرالہ میں ۱۹۷۰ء کی دہائی میں کانگرس اور کمیونسٹ پارٹی کی ملی جلی سرکار نے وزیراعلیٰ شری سی اچھوتا مینن کی وزارت اعلیٰ کے دوران جو انقلابی اصلاحاتِ اراضی کیں اُس کے بعد پورے طور پر ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اصلاحات سے مستفید ہونے والے لوگوں کی امدادِ باہمی انجمنیں بنائی جائیں۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ امدادِ باہمی ذرائع سے مال کی خرید و فروخت اور دیہات کی پیداوار کی فروخت اور صفائی ستھرائی کے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ یہاں ہمارے پاس امول ڈیری کی بیش قیمت مثال موجود ہے جہاں خریدار خود کوآپریٹو اداروں کے ذریعے مال پیدا کرنے والا بھی ہے۔ اس مثال کا اطلاق اناج پر بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں کوآپریٹو ادارے فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے فرائض خود انجام دیں۔ قرضے کے مسائل بھی اسی ڈھنگ سے حل کیے جا سکتے ہیں۔

اکیسویں[۲۱] صدی میں ہندوستانی دیہات کی تصویر کیسی ہوگی اُس کے بارے میں کچھ لوگ ناک بھوں چڑھا سکتے ہیں کیونکہ ہر ملک کے بڑے بڑے حصوں میں امدادِ باہمی تحریک کا حشر دیکھ چکے ہیں۔ وہاں مہاراشٹر کی یہ تحریک یا تو امدادِ باہمی سرمایہ داری" کی شکل میں اپنے آپ کو دھوکہ دے رہی ہے یا زوال پذیر ہو کر دیوالیہ پن اور بدعنوانیوں کے بدر رو میں تبدیل ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں امول ڈیری کی کامیابی کی کہانی بھی سنائی دیتی ہے جس کی کامیابی کا راز جمہوری طرزِ عمل اور عوامی اشتراکِ عمل کی ٹیکنالوجی کی مہارت سے وابستہ ہے۔ تاہم زیادہ بنیادی بات وہ فرق ہے جو زمینی اصلاحات سے مستفید ہونے والی مجوزہ امدادِ باہمی انجمنوں اور دوسری امدادِ باہمی انجمنوں میں ہوگا۔ یہ انجمنیں انقلابی زمینی اصلاحات کی قطعی شکل ہوں گی جنھیں زمین کی مساوی ملکیت کی بنیادوں پر قائم کیا جائے گا۔ یہ ہمارے ملک میں جمہوری انقلاب کی تکمیل کا قطعی نتیجہ بھی ہو سکتی ہیں۔

اس مرحلے پر یہ بات واضح کر دی جانی چاہیے کہ جن امدادِ باہمی اداروں کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے وہ شروع میں زمین کی نجی ملکیت کے استقرار اور امدادِ باہمی انجمنوں میں شامل ہونے والے افراد کی ملکیت کی تمام زمین یکجا کرنے پر مبنی ہوں گے۔ اس حقیقت کے متلازم کے طور پر ان امدادِ باہمی اداروں سے آمدنی زیادہ تر ان اداروں کی طرف سے انجام دیے گئے کام پر مبنی ہوگی لیکن آمدنی کا ایک حصہ زمین کی مقدار پر بھی دیا جائے گا جو ان انجمنوں نے پول میں جمع کی تھیں۔ زمین کا کرایہ ادا کرنے کا سلسلہ اُس وقت تک جاری رکھنا پڑے گا جب تک کہ کام کے عوض ادائگی اتنی نہ ہو جائے جس سے اچھے معیارِ زندگی کی ضمانت دی جا سکے اور مل کر کام کرنے کا تجربہ نجی ملکیت کی ذہنیت کو ختم نہ کر دے۔ اسی ڈھنگ سے کوآپریٹو تحریک نے مثال کے طور پر بلغاریہ میں ترقی کی ہے، جہاں دیہی ترقی کا کام غیر معمولی طور پر کامیاب ہوا ہے۔ اور اسی ڈھنگ سے ۱۹۵۰ء کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں چین میں دیہی سماج ماؤ کے "بڑی چھلانگ" اور عوامی کمیونز کے تباہ کن تجربوں سے پہلے آگے بڑھا تھا۔

امدادِ باہمی پر گاؤں

امدادِ باہمی خطوط پر مبنی جس گاؤں کا یہاں تصور کیا گیا ہے وہ کوئی خود کفیل یا اپنے ہی خول میں بند معاشرہ نہیں ہوگا۔ یہ پیداوار کے قدیم ایشیائی طریقہ کی مانند دیہی جمہوریتوں کے تصور کی جانب واپسی بھی نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ ہمارے جدید سماج وادی شہری اور دیہی تسلسل کا ایک حصہ ہوگا جو غالباً سنہ ۲۰۰۱ء یا اس کے بعد کا ہندوستان ہمارا ہوگا۔

لیکن کیا یہی وہ چیز ہے جو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ کیا یہی وہ چیز ہے جو آخرکار ہمیں ملنے کا امکان ہے؟ لیکن جیسی موجودہ صورتحال ہے ان چودہ برسوں سے بھی کم مدت میں جو ہمیں اکیسویں صدی کے آغاز سے الگ کرتی ہے ایسا نہیں ہو سکے گا۔ بے حسی کی موجودہ قوتیں، دیہات کے اعلیٰ طبقوں کی طاقت نیز موجودہ ہندوستان میں سرکاری اختیارات سے اُن کا میل جول چند مہیب رکاوٹیں ہیں جو ہمارے امدادِ باہمی کے خواب کی تعبیر کی راہ میں حائل ہیں۔ بے زمین اور زمین رکھنے والے غریب لوگوں میں نہ کافی بیداری ہے اور نہ ہی وہ منظم ہیں۔ اُن کا شہروں کے کارکن طبقے اور روشن دماغ کارکنوں سے بھی کافی رابطہ نہیں ہے۔ وہ آج بھی تاریخی عمل کا نتیجہ ہی ہیں اور اُن سے نہایت بری طرح ناجائز فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ بیشک وہ اب ویسے کچلے اور خوفزدہ لوگ نہیں ہیں جیسے وہ قریب چالیس برس پہلے تھے۔ انھوں نے اپنی بات پر اصرار کرنا شروع کر دیا ہے۔ بعض مقامات پر اور بعض مواقع پر شورش بھی ہو جاتی ہے لیکن یہ واقعات موسم گرما کی بجلی کی چمک کی طرح ہوتے ہیں جو طوفان کا پیش خیمہ نہیں ہوتی۔ اُن میں اُمیدیں پیدا ہوئی ہیں لیکن کبھی اور

(باقی صفحہ پر)

ڈاکٹر کمل نین کابرا

یہی حالات رہے تو خلیج اور بڑھے گی

مضمون نگار نے اس مضمون میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۶ء تک کی ترقی، بالخصوص زراعت اور دیہی سیکٹروں کی پیش رفت کا تجزیہ کرتے ہوئے ۲۰۰۱ء سے وابستہ ہماری اُمیدوں کی اصل بنیاد کے بارے میں شک ظاہر کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ صدیوں سے محرومیوں کا شکار لوگوں کو واقعتاً یا تمثیلاً اکیسویں صدی میں مجوزہ چھلانگ لگانے کا موقع دینے کے لیے موجودہ پالیسی یا منصوبہ بندی میں کوئی سمت متعین نہیں کی گئی ہے۔

عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ حال کو ماضی کی توسیع کے روپ میں ہی دیکھا جاسکتا ہے اُس سے الگ کرکے نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مستقبل حال سے پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسانوں، سماجوں اور ان کے خوابوں اور اُمنگوں کا مستقبل کو بنانے میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اس وقت جو حالات ہیں مستقبل اُن ہی کی راست توسیع ہوگا اور فرق صرف سائز کا ہوگا۔ دراصل مقدار یا حجم کے اعتبار سے ہونے والی وسیع تبدیلی ایک مرحلے پر پہنچ کر ماہیتی تبدیلی بن جاتی ہے۔ سماج کے مختلف طبقے مستقبل کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں اور ذہن میں اس کی تصویر بناتے رہتے ہیں۔ یہی بات سماج کے مستقبل کا ڈھانچہ طے کرنے میں معاون بنتی ہے۔ مستقبل کی تشکیل بے عمل تجسس کا کھیل نہیں ہے۔ انسان کی آنے والے ایام میں غیر یقینیوں کو کم کرنے کی خواہش اور دوسری طرف اس بات کا فیصلہ کرنا کہ ایک پسندیدہ سمت میں سماجی تبدیلی لانے کے لیے کسی قسم کی، کس نوعیت اور کس پیمانے کی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے تشکیلِ مستقبل کی مساعی کا ایک حصہ ہیں۔

اگر ہم یہ مان کر چلیں تو کہا جاسکتا ہے کہ مستقبل کے مطالعات میں، آجکل جو رجحانات ہم دیکھتے ہیں، اُن سے قطع نظر مستقبل کی تصویر تیار کرنے کی کوشش سادہ لوحی پر مبنی ہے اور گمراہ کُن ہوسکتی ہے۔ بعض اوقات تو ترقی

...بادل راستوں اور کلیدی عوامل کی بنیاد
...رو متبادل تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔
زیادہ تعداد میں متبادل تصویریں یا منظر
تیار کرنے کی مشقیں ماہرینِ اعداد و شمار
...ہرینِ اقتصادیات کے لیے باعثِ
...ت ہو سکتی ہیں لیکن اگر ان مشقوں میں
...ں حرکیات کی اہمیت کے بارے میں دانستہ
...یا اپنے یقین و اعتقاد کو شامل نہیں کیا
تو یہ مشقیں مستقبل کی منصوبہ بندی
...کے لیے زیادہ رہنمائی فراہم نہیں کر سکتیں
کیوں کہ وہ نئی مشکلات
...رکاوٹوں کا تصور نہیں کر سکتیں۔ اس
...ے ان سے مستقبل کو زیادہ پسندیدہ بنانے
...کوششوں میں کوئی مدد یا رہنمائی ملنے والی
...یما ہے۔

...سیاسی معیشت

ہندوستان کے معاشی نظام میں
۱۹۴... سے ۱۹۸۶ء کے دوران کیا خاص
...تبدیلیاں ہوئی ہیں، خاص کر زراعت کے
شعبے اور دیہی سیکٹروں میں؟ ان تبدیلیوں
...پر ایک طائرانہ نظر ہمیں یہ سوچنے کے لیے
ایک بنیاد فراہم کرے گی کہ ہم ان شعبوں
میں مزید کن تبدیلیوں کی توقع کر سکتے ہیں۔
اسی بنیاد پر ہندوستان کی وہ تصویر کھینچنے کی
کوشش کی جا سکتی ہے جو آزادی کے بعد کے
نصف صدی سے زائد مدت کے بعد اُبھر سکتی
ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ حصولِ آزادی
کے بعد دیہی ہندوستان میں بے شمار سماجی،
اقتصادی، تکنیکی، سیاسی اور ثقافتی تبدیلیاں
رونما ہوئی ہیں۔ کیونکہ ہندوستان اب
سامراجی طاقتوں کی زراعت گاہ نہیں ہے،
اس لیے اس کی زرعی معیشت بھی ایسی نہیں
رہی جس کا مقصد بیرونی طاقتوں کے مفادات
کی خدمت ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے
کہ ہماری زراعت کا عالمی معیشت سے کوئی
تعلق نہیں ہے۔ دراصل زراعت میں استعمال
ہونے والی چیزوں، ٹکنالوجی، درآمدات اور
برآمدات کے ذریعے ہندوستانی زراعت
کے بین الاقوامی معیشت کے ساتھ کافی مضبوط
رشتے قائم ہیں۔ یہ رشتے زراعت کی ترقی اور
زرعی تعلقات پر کیا اثر چھوڑتے ہیں اس کا
دارومدار خود ان رشتوں کی نوعیت کے علاوہ،
ہماری زراعت کی پیداواری قوتوں کی ترقی و
نوعیت نیز ہندوستانی معیشت میں زراعت
کے مقام پر ہے۔

گراس ڈومیسٹک پروڈکٹ (GDP)
یعنی اندرونِ ملک مجموعی پیداوار میں اپنے
حصّے کے اعتبار سے زراعت اور اس سے متعلقہ
سرگرمیوں کا نسبتی حجم کم ہو کر تیس پینتیس فیصد
ہو گیا ہے۔ اگرچہ بڑے ورکروں کی ستّر فیصد
تعداد بدستور پیشۂ زراعت میں ہی مصروف
ہے۔ معیشت کے ڈھانچے کے اس 'زوال' کے
معنی، علاوہ دیگر باتوں کے، یہ ہیں کہ زراعتی شعبے
میں اوسط آمدنی دوسرے شعبوں کی اوسط
آمدنی کے مقابلے میں گھٹ گئی ہے۔ دوسرے
شعبوں میں فی کس آمدنی زراعت کے مقابلے
میں پہلے ہی سے زیادہ تھی۔ ایک اور غور طلب
بات یہ ہے کہ گذر بسر کے لیے زراعت پر
انحصار رکھنے والے لوگوں کی تعداد میں عظیم
اضافے کے نتیجے میں قابلِ کاشت زمین کی

گراس ڈومیسٹک پروڈکٹ (GDP) یعنی اندرونِ ملک مجموعی
پیداوار میں اپنے حصّے کے اعتبار سے زراعت اور اس سے متعلقہ
سرگرمیوں کا نسبتی حجم کم ہو کر تیس پینتیس فیصد ہو گیا ہے۔ اگرچہ
بڑے ورکروں کی ستّر فیصد تعداد بدستور پیشۂ زراعت میں ہی
مصروف ہے۔

فی کس دستیابی بھی کم ہو گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زراعت پر بہت زیادہ نفوس کے انحصار کے اثرات کو ہماری زراعت میں ہونے والی نمایاں تکنیکی تبدیلیاں، فی ایکڑ پیداواری صلاحیت اور مجموعی پیداوار میں قابل ذکر اضافے مکمل طور پر زائل نہیں کر پائے ہیں۔ اس لیے اس کی

میں چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں۔ اکثر وہ مزدوری اور حمالی کرتے دیکھے جاتے ہیں۔

پیداوار کا ڈھانچہ

زرعی پیداوار میں، خاص کر گیہوں اور چاول کی پیداوار میں ایسی ریاستوں اور اضلاع میں ہونے والے انقلابات نے دوسرے ممالک سے باقاعدہ طور پر خوراکی اجناس درآمد کرنے کی ضرورت ختم کر دی ہے

کی پیداوار میں اضافہ نہیں ہو سکا جتنا کہ آبادی میں ہوا ہے، جو ہماری زرعی ترقی کی ایک خاصیت ہے، بہت سی نابرابریاں پیدا کر دیں۔

ترقی کے عمل کے، بڑے "ترقی پسند" کاشتکاروں کے ہاتھوں میں ارتکاز سے کاشتکار طبقے کے اندر نابرابریاں پیدا ہو گئیں۔ خوراکی اجناس کو منڈیوں تک پہنچانے کا کام کاشتکاروں کے ایک چھوٹے سے طبقے کے ہاتھوں میں مرکوز ہو گیا۔

غلّہ کی سرکاری خرید کا توسے

> **ترقّی کے عمل کے، بڑے "ترقّی پسند" کاشتکاروں کے ہاتھوں میں ارتکاز سے کاشتکار طبقے کے اندر نابرابریاں پیدا ہو گئیں۔ خوراکی اجناس کو منڈیوں تک پہونچانے کا کام کاشتکاروں کے ایک چھوٹے سے طبقے کے ہاتھوں میں مرکوز ہو گیا۔**

نسبتی شرح ترقی کم ہو رہی ہے۔

کچھ بھی ہو دیہی آبادی کا تناسب گھٹا ہے۔ شرح ناخواندگی اور شرح اموات میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔ اگرچہ عورتوں میں ناخواندگی اور بچوں میں شرح اموات تشویشناک طور پر زیادہ ہیں۔ دیہات میں پیش آنے والی مشکلات اور شہری سہولیات کی کشش کی وجہ سے دیہی آبادی بدستور شہروں کا رخ کر رہی ہے چونکہ شہروں میں ان کے لیے باقاعدہ ملازمت کے مواقع میسر نہیں ہوتے، ان میں مہارت والے کام کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور ان کے پاس اپنا کام شروع کرنے کے لیے سرمایہ نہیں ہوتا اس لیے دیہات سے آنے والے لوگ شہروں میں گندی بستیاں اور جھگی جھونپڑیاں آباد کرتے ہیں اور غیر منظم شعبوں

جہاں آبپاشی کی بہتر سہولیات موجود ہیں، کاشتکار مرفع الحال ہیں اور بہتر طریقوں سے کاشت کرتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی تک مجبوراً باہر سے اتنے بڑے پیمانے پر خوراکی اجناس درآمد کرنی پڑتی تھی کہ اس کے لیے رعایتی شرائط کی درخواست کرنی پڑتی تھی۔ جس سے قومی وقار اور اقتصادی مفادات دونوں کو ٹھیس پہونچتی تھی۔ اگرچہ اس مدت میں زرعی ترقی کی لگ بھگ تین فیصد سالانہ کی شرح، اضافۂ آبادی سے آگے رہی تاہم فصلی اور علاقائی عدم توازن نے دالوں، تلہن اور موٹے اناج کی پیداوار میں نسبتاً کمی واقع ہوئی اور بہت سے اضلاع میں، بالخصوص مشرق اور جنوب میں اور بارانی علاقوں میں خوراک

فیصد حصہ پنجاب، ہریانہ، مغربی اتر پردیش اور ساحلی آندھرا پردیش سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ "تکنیکی" ترقی" جس کی بدولت خوراک کی پیداوار میں اضافہ ہوا، اوسط لاگت پیداوار میں اضافے کا بھی سبب بنی۔ اس حقیقت اور متحرک قیمت کی پالیسی کی وجہ سے خوراک بہت مہنگی ہو گئی۔ جب کہ ترقی کی معمولی شرح اور زراعت میں مزدوروں کی کھپت کی مقابلتاً کم شرح کی وجہ سے بے زمین مزدوروں، چھوٹے اور کمترین کاشتکاروں اور دیہی دستکاروں کی قوت خرید محدود ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خوراک کی زیادہ مقدار میں

بستیابی کے باوجود دیہی ہندوستان میں کم
ور ناقص تغذیہ اور بھوک کی مصیبت
بدستور موجود ہے ۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں فی کس
لاگت موجودہ قیمتوں کی بنیاد پر ۲۷۴ روپے
تھی ۔ وسیع نابرابریوں کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا
ہے کہ ملک کی ایک بہت بڑی اکثریت کو
موثر روزگار یا کام کے ایسے مواقع میسر نہیں
ہیں جو انھیں اتنا کچھ دے سکیں جس سے وہ فی
کس کم از کم کھپت جتنی ہونی چاہیئے اتنی کرنے
کے قابل بن سکیں ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ملک
اور خاص کر دیہی علاقوں میں لوگوں کی ایک بڑی
اکثریت کو موثر روزگار دستیاب نہیں ہے ۔

ناکافی روزگار

یہ امر غور طلب ہے

رہا ہے اسے بھی صنعت اپنے اندر پوری
طرح جذب کرنے میں ناکام رہی ہے ۔ دیہی
صنعتوں اور دستکاریوں کی ترقی کی کوشش
بھی اُجرت پر تیار ہونے والے مال کی
سپلائی بڑھانے، تکنیکی اصلاحات رائج کرنے
پیداواری صلاحیت بڑھانے، نئی نئی مصنوعات
کی پیداوار شروع کرنے اور دیہات
کے عوام کی اتنے بڑے پیمانے پر
مستزاد با تکمیل روزگار
فراہم کرنے میں

کے درمیان نوآبادیاتی نظام نے جو بے تعلقی
پیدا کردی ہے وہ آج بھی موجود ہے سابق
راجائی ریاستوں میں رجواڑوں کے خاتمے،
ملک میں عام بالغ حق رائے دہندگی کی
بنیاد پر ایک ری پبلکن
جمہوریت کے

وسیع نابرابریوں کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ملک کی ایک بہت بڑی اکثریت کو موثر روزگار یا کام کے ایسے مواقع میسر نہیں ہیں جو انھیں اتنا کچھ دے سکیں جس سے وہ فی کس کم از کم کھپت جتنی ہونی چاہیئے اتنی کرنے کے قابل بن سکیں ۔

قیام، دیہی علاقوں میں جمہوری
لامرکزیت سے متعلق اداروں کی تشکیل،

کہ ۱۹۴۷ء کے مقابلے میں صنعتی پیداوار میں
ساڑھے پانچ گنا اضافہ ہونے اور صنعتی
پیداوار کے زیادہ متوازن اور مختلف النوع
ہونے کے باوجود روزگار کی دستیابی میں خاص کر
نجی سیکٹر، میں بہت معمولی فرق ہوا ہے ۔
ظاہر ہے کہ صنعت اتنی بڑی
تعداد میں لوگوں کو

زیادہ کامیاب نہیں ہو
سکیں کہ زراعت اور
صنعت کے

منصوبہ سازوں کا اصل منشا یہ تھا کہ گاؤوں کو کوآپریٹو دیہی کامن ویلتھ کی صورت میں منظم کیا جائے اور دہقان اس کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے کاشتکاری کریں ۔ لیکن اس کے برخلاف زمین ابھی تک چند ہاتھوں میں مجتمع ہے ۔

روزگار مہیا نہیں کرسکی ہے کہ
انھیں گذر بسر کرنے کے لیے زمین پر انحصار
نہ رکھنا پڑے ۔ نہ صرف یہ بلکہ خود غیر زرعی سیکٹر
میں لیبر سپلائی میں قدرتی طور پر جو اضافہ ہو

درمیان ایک علامتی رشتہ
یا تعلق قائم ہو جائے ۔ زراعت اور صنعت

انتخابات کے دوران اور دوسرے موقعوں پر وسیع پیمانے پر عوام کی سیاسی حرکت پذیری، صحت اور تعلیمی سہولیات کے بندوبست، چھوت چھات کے خاتمے اور درج فہرست ذاتوں اور قبائل کے حق میں

دیہی ترقی کا ادھورا کام بہت بڑا، مشکل اور پیچیدہ ہے کیونکہ اب تک جو ترقی ہوئی ہے اس میں سیاسی انصاف نہیں ہے۔

ترجیحی امتیاز کی پالیسی سے دور رس سماجی تبدیلیاں ظہور میں آئیں جو بہت سی اقتصادی تبدیلیوں کی پیش رو بنیں۔ زمین پر بچولیوں کے حقوق کے خاتمے، لگان داری میں اصلاحات، زراعت اور اس سے متعلق سرگرمیوں وغیرہ میں حکومت کے ذریعے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری، دور رس تکنیکی اختراعات کے استعمال، کمرشل بنکوں، کوآپریٹو اور لینڈ امپروومنٹ بنکوں کے ذریعے مالی امداد کی فراہمی، غلہ اور دیگر اجناس کی بڑے پیمانے پر سرکار کے ذریعے سے تجارت وغیرہ کی بدولت پیداوار سے متعلق سماجی تعلقات میں نہایت اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

بڑے کاشتکاروں کا تسلط

منصوبہ سازوں کا اصل منشا یہ تھا کہ گاؤں کو کوآپریٹو دیہی کامن ویلتھ کی صورت میں منظم کیا جائے اور دہقان اس کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے کاشت کاری کریں۔ لیکن اس کے برخلاف زمین ابھی تک چند ہاتھوں میں مجتمع ہے۔ چنانچہ دیہی اور زرعی معیشت میں بڑے اور امیر کاشتکاروں کا ہی تسلط ہے۔ مختلف علاقوں میں کافی بڑے پیمانے پر سرمایہ دارانہ کاشت ہونے لگی ہے (جس میں ایک بڑی اور بڑھتی ہوئی حد تک خریدی ہوئی لیبر وغیرہ کے ذریعے کھیتی کی جاتی ہے۔

دیہی منظر کا سب سے افسوسناک پہلو سماجی تناؤ اور اس کا پُرتشدد اظہار ہے جو اکثر افراد کے درمیان، گروہوں کے درمیان، فرقوں کے درمیان، یا ذاتوں کے درمیان اور طبقوں کے درمیان ہوتا رہتا ہے۔

قطعات اراضی کے بارے میں سرکاری اعداد و شمار جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اس سے زمین کی اجارہ داری کی عکاسی ملتی ہے۔ یہ اور پیداوار کے معاملے میں مارکیٹ اور منافع پر نظر رکھی جاتی ہے جبکہ اُن کسانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو دوسروں کی زمین پر لگان پر کھیتی کرتے ہیں۔ چھوٹے اور کمترین قطعات اراضی کی تعداد ۱۹۷۰ـ۷۱ء میں ۳۶٫۲۰ ملین تھی جبکہ ۱۹۸۰ـ۸۱ء میں یہ بڑھ کر ۵۰٫۵۲ ملین ہو گئی۔ بہت سے بے زمین کسان چھپائی ہوئی لگان داری یا زبانی پٹے پر کھیتی کرتے ہیں۔ خود اپنی زمین پر کاشت کرنے والوں اور دوسروں کی زمین جوتنے والوں کی تعداد میں کافی زیادہ فرق ہے جو اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ "زمین جوتنے والے کی ہو" کا کام ابھی ادھورا ہے۔ زمین کے یہ رشتے زرعی اصلاحات کی راہ میں حائل ہیں اور لیبر کے استعمال کو محدود کرتے ہیں۔

جائیداداری قانونی اور غیر قانونی طریقوں سے
زمین کی اصل ملکیت کے، جو سیاسی سماجی
اور اقتصادی طاقت کے ارتکاز کی بنیاد ہے
بچائے جانے سے پہنچتی ہے۔
مختصر یہ کہ دیہی ہندوستان

(جو سماجی و اقتصادی پروسیسوں کے بارے
میں بعض مفروضات پر مبنی ہیں) خارج از
بحث رکھنے کی بجائے یہ فرض کرتے ہوئے
کہ موجودہ سماجی و اقتصادی ڈھانچہ اور اس
کے طریق ہائے عمل اور سرکاری مداخلتیں اپنی
موجودہ نوعیت اور حجم کے ساتھ جاری رہیں گی،
یہ قیاس کرنے کی کوشش

کی خاطر بایو ٹکنالوجی Bio-Techno-
logy اور جینیٹک انجینئرنگ
Genetic Engineering یعنی علم
توالد و تناسل سے متعلق انجینئرنگ) وغیرہ
شعبوں میں ہونے والی ڈرامائی اور عہدساز
پیش رفتوں کے اثر کو نظر انداز کر رہے ہیں
اس لیے نہیں کہ ایسی چیزوں کے ہونے کا امکان
نہیں ہے یا یہ کہ ان سے کوئی نمایاں نتائج
برآمد نہ ہوں گے،

چونکہ زراعتی حکمت عملی سچ مچ بڑے پیمانے پر مؤثر روزگار پیدا کرنے کے لیے زمین کی از سر نو تقسیم کی کوئی کوشش نہیں کرتی اس لیے خوراک کی پیداوار اور غریب و نادار لوگوں کی قوت خرید کے درمیان فرق اور بڑھ جائے گا۔

ے بڑی نابرابریاں
اور دیگر خامیاں پائی جاتی ہیں مثلاً
ناکافی خوراک، ناقص تغذیہ، ناکافی سماجی اور
اقتصادی ڈھانچے، زراعت، صنعت اور
دیگر منظم سیکٹروں کے درمیان ناکافی الحاق،
بہت سی باتوں کے لیے سرکار پر حد سے
زیادہ انحصار، انسانی، مادی اور ٹیکنالوجیکل
وسائل کی بڑے پیمانے پر تضییع اور ناموزوں
ٹکنالوجی کا استعمال۔

دیہی ترقی کا ادھورا کام بہت بڑا،
مشکل اور پیچیدہ ہے کیونکہ اب تک جو
ترقی ہوئی ہے اس میں سماجی انصاف شامل
نہیں ہے۔ ہمارے آئین، قوانین، پالیسیوں
اور پلانوں میں مندرج خطوط پر زرعی ڈھانچے
کو از سر نو ترتیب دینے کا کام قریب قریب
بالکل چھوڑ دیا گیا ہے۔ دیہی منظر کا سب سے
افسوسناک پہلو سماجی تناؤ اور اس کا پرتشدد
اظہار ہے جو اکثر افراد کے درمیان، گروہوں
کے درمیان، فرقوں کے درمیان، ذاتوں کے
درمیان اور طبقوں کے درمیان ہوتا رہتا ہے۔
اور سنہ ۲۰۰۱ء [illegible] ہم کچھ اعداد کو

کر دیں گے کہ ۲۰۰۱ء میں حالات کی
شکل کیا ہوگی۔ ایسا اس لیے نہیں کیا جا رہا ہے
کہ اسے لازمی طور پر ترقی و نشوونما کا سب سے
زیادہ امکانی راستہ سمجھا جاتا ہے بلکہ اس
لیے کیا جا رہا ہے کہ "اسی چیز کو زیادہ مقدار
میں اور زیادہ اہلیت کے ساتھ حاصل کرنے"
کے راستے کے بالواسطہ اثرات کی تصویر کھینچی جا
جاسکے۔ موجودہ پالیسیوں اور منصوبوں سے
یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ زیادہ زور ترجیحات
پسندیں، ٹکنالوجی کا درجہ بلند تر کرنے، پیداوار
کا استعمال بڑھانے، بندوبست کو بہتر بنانے
اور نظم و نسق کی اصلاح کرنے پر ہوگا اور اس
کے ساتھ ساتھ غریبی کو کم کرنے کے پروگراموں
کو جاری رکھا جائے گا جن سے یہ توقع کی جاتی
ہے کہ وہ صدی کے آخر تک ہر شخص کو نام نہاد
"خط غریبی" سے اوپر لے آئیں گے۔ ہم ایسی

بلکہ اس لیے کہ اگر سائنس
اور ٹکنالوجی کے ایسے ثمرات کو موجودہ سماجی
اور معاشی ڈھانچے کے اندر کامیابی کے
ساتھ رائج کیا جا سکتا ہے تو جہاں ان سے
تھوڑا سا فائدہ حاصل ہوگا وہاں بہت سے
پیچیدہ اور متضاد مسائل بھی پیدا ہوں گے۔
بڑھتی ہوئی آبادی کا پیٹ بھرنے کے
لیے کھیتوں کی پیداوار میں اضافہ کرنا، صنعتی
خام مال کی بہم رسانی اور ایسے کاشتکاروں
کی آمدنی بڑھانا جن کے پاس زندہ رہنے کے
لائق زمین ہے، ناممکن باتیں نہیں ہیں۔
اگر کچھ نئی ٹکنالوجیکل پیش رفتیں
ہوسکیں، جن کا کہ خاصا امکان نظر آتا ہے،
تو شرح ترقی میں اضافہ ہو سکتا ہے، خاص کر
ان فصلوں اور خطوں کی شرح ترقی میں جو

ہنوز سبز انقلاب کے تحت نہیں آئے ہیں۔
لیکن زراعت میں سائنس کا استعمال بڑھنے کے ساتھ ساتھ انتظامیہ مشکلات بھی بڑھیں گی۔ اس میں شک ہے کہ امیر اور سرمایہ دار کسان سائنٹیفک زراعت کے لیے ضروری انتظامیہ صلاحیتیں حاصل کر سکیں گے۔

اس کے علاوہ کچھ اور باتوں (مثلاً زراعت کے لیے تجارت کی شرائط میں بگاڑ) کے سبب کاشتکاروں میں یہ احساس پیدا ہوگیا ہے کہ صنعت کاروں کے مقابلے میں ان کے ساتھ بھید بھاؤ برتا جارہا ہے۔ بڑے کسانوں کو اپنی بچتوں کی غیر زرعی سیکٹروں میں کافی منافع دینے والی سرمایہ کاری میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان کی وجہ سے وہ بھی خوش اور مطمئن نہ ہوں گے اور منافع بخش سرمایہ کاری کے لیے ان کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا۔

غریب عوام کی قوّت خرید

چوں کہ زراعتی حکمتِ عملی سچے مچے بڑے پیمانے پر مؤثر روزگار پیدا کرنے کے لیے زمین کی از سرِ نو تقسیم کی کوئی کوشش نہیں کرتی اس لیے خوراک کی پیداوار اور غریب و نادار لوگوں کی قوتِ خرید کے درمیان فرق اور بڑھ جائے گا۔

درآمدات پر مبنی نئی ٹکنالوجی/جدید کاری اور ٹکنالوجی کا درجہ بلند تر بنانے سے ایسی قوتوں کے ریلیز ہونے کا امکان نہیں ہے جو صنعت کو روزگار کا ایسا ذریعہ بنا سکیں جو زراعت پر لیبر فورس کے دباؤ کو کم کر کے فاضل لیبر کو اپنے اندر جذب کر سکے۔ چنانچہ اس امر کا غالب امکان ہے کہ دیہات کے امیروں اور دیہات کے غریبوں کے درمیان کشیدگی زیادہ بڑھ جائے گی۔ یہ امر اور دیہات کے غریبوں کا منظم دباؤ امیر کسانوں کی وسیع تر مثبت انتظامیہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کی خواہش کو کمزور کر دے گا اور حکومت کے لیے سماجی امن و امان برقرار رکھنے کی ذمہ داری بڑھ جائے گی۔

دیہات کے غریبوں کا منظّم دباؤ امیر کسانوں کی وسیع تر مثبت انتظامیہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کی خواہش کو کمزور کردے گا اور حکومت کے لیے سماجی امن و امان برقرار رکھنے کی ذمّہ داری بڑھ جائے گی۔

ایک حد تک امیر کسانوں میں سے کچھ صنعت، تجارت یا دیگر سروسوں میں داخل ہوسکتے ہیں اور چھوٹے یا درمیانی درجے کے سرمایہ دار بن سکتے ہیں۔ دہقانی اور سوداگری سرمائے کا چھوٹے اور درمیانی درجے کے صنعتی اداروں میں داخلہ اور عام استعمال کی چیزوں کی مارکیٹ میں سست توسیع کی وجہ سے دستکاروں کے چھوٹے درجے کے پروڈیوسر اور کارخانہ دار بننے کے امکانات محدود ہو جائیں گے چنانچہ عام استعمال کی اشیاء کی فروخت میں سست رفتار اضافہ جن مشترکہ عناصر کا نتیجہ ہے وہ ہیں زمین کی از سرِ نو تقسیم میں ناکامی کا، شہری اور دیہی علاقوں میں صنعت، زراعت اور دیگر پیداواری سروسوں میں کافی زیادہ تعداد میں نوکریاں پیدا نہ کیا جاتا۔ (کچھ اندازوں کے مطابق مکمل روزگار کی سطح پر پہونچنے کے لیے اگلے پندرہ سالوں میں روزانہ ۳۵ ہزار نوکریاں پیدا کرنی ہوں گی) اور غریبی کم کرنے کے پروگرام کے دائرۂ عمل اور اثر کا کافی نہ ہونا۔

عدم توازن کے خطرات

سبز انقلاب کو مشرقی اور جنوبی ریاستوں میں لے جانے کی کوششوں کو، حکومت کے پاس وسائل کی کمی اور طبقوں، خطوں اور فصلوں کے درمیان عدم توازن کی وجہ سے دھکا پہنچنے کا امکان ہے۔ اس کے علاوہ توانائی، زر مبادلہ اور مارکیٹنگ کی مشکلات بھی ان کوششوں کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ دراصل ہم نے اس چھوٹی سی مشق میں دوسری قسموں

کے عدم توازن کا ذکر نہیں کیا ہے مثلاً جنگلات کی بربادی، مٹی کی زرخیزی میں کمی کثرت آبادی آلودگی، کھاری پن یا شوریت، قدرت کے کاموں میں مداخلت وغیرہ جن کا سوسائٹی پہ اثر سرمایہ، تحفظ اور موزوں ٹکنالوجی کی کمی کے باعث زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

نتیجتاً دیہی منظر میں بہت سے نئے رجحانات پیدا ہو

بہرہ ور ہونے کے لیے شدید تر جدو جہد ہو۔ چونکہ دیہات کے کافی لوگ اپنے حالات سے مجبور ہو کر شہروں کا رُخ کرتے ہیں اس لیے شہروں میں جا کر بسنے کے بعد اُن کی اُمیدیں پوری نہ ہونے سے غیر یقینی صورتوں سے بھری ایک عجیب صورتِ حال پیدا ہو سکتی ہے۔

کلیدی نوعیت کا کام

دیہی ہندوستان بلکہ یوں کہئے کہ سارے ہندوستانی سماج میں ایک نئی جان ڈالنے کے سلسلے میں کلیدی کام ہمارے لاکھوں

غیر زرعی اراضی میں بدل دیے جانے نیز پیدائش اور اموات کے قدرتی عمل کے نتیجے میں بے زمین افراد کی تعداد میں اضافہ ہونے کی وجہ سے دیہی افراد کو غیر زرعی شعبوں میں اُجرت پر روزگار مُہیا کرنے یا اُن کے خود اپنا روزگار شروع کرنے کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ لہٰذا اقتصادی توسیع اور بڑے پیمانے پر نوکریاں پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی۔

ترقی کی متبادل راہیں، ٹکنالوجی کے متبادلات اور سماجی طرزِ عمل جو غریبوں، بیماروں اور اَن پڑھ لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں، اُن ماڈلوں اور متبادلات سے

> سبز انقلاب کو مشرقی اور جنوبی ریاستوں میں لے جانے کی کوششوں کو، حکومت کے پاس وسائل کی کمی اور طبقوں، خطوں اور فصلوں کے درمیان عدم توازن کی وجہ سے دھکّا پہونچنے کا امکان ہے۔

سکتے ہیں۔ اس کا امکان ہے کہ قوم جو عوام کی وسیع خواندگی اور بیچ میں پڑھائی چھوڑ دینے والے طالب علموں کی تعداد بہت زیادہ ہونے پر منحصر ہے، سب کے لیے عام تعلیم کا مقصد حاصل کرنے کے قریب پہونچ جائے۔ سیاسی دباؤ بڑھتی ہوئی تنظیمی طاقت اور مقامی سطح کے عوام میں بیداری کے نتیجے میں دیہات میں صحت و صفائی پینے کے پانی بجلی اور شہری آسائشوں وغیرہ کی سہولیات میں یقینی اضافہ ہوگا۔ لیکن چونکہ [illegible] فائدہ [illegible] لوگوں [illegible] ہے [illegible] حاصل [illegible]

افراد کو مؤثر روزگار فراہم کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں ایک پتی والی گھاس پیدا ہوتی تھی وہاں دو پتیوں والی گھاس اُگانے، مقامی وسائل کے استعمال، عوام کی قوتِ خرید کے مطابق نئی مصنوعات تیار کرنے اور موجودہ مصنوعات کو بہتر بنانے کے لیے نئی ٹکنالوجی کا استعمال کیا جائے۔ ٹکنالوجی کو ان تمام آزمائشوں پر پورا اُترنا ہے۔ قرضوں کی ادائیگی نہ ہو سکنے پر قرض خواہوں کے ذریعے زمین ہڑپ کر لیے جانے، امیروں کے ذریعے زمین کی خریداری، زرعی اراضی کے

بہت مختلف ہوں گے جو اُن لوگوں کی ضرورتیں پورا کرنے کے لیے اختیار کیے جاتے رہیں جن کی حالت بین الاقوامی تناظر میں بھی اتنی زیادہ خراب نہیں ہے۔ ہم اور دیگر بہت سوں نے موجودہ سیاسی سماجی اور اقتصادی ڈھانچوں کے اندر رہتے ہوئے مختلف ٹکنالوجیوں، انتظامیہ کے مختلف طریقوں، مختلف طرزہائے زندگی، وغیرہ کے ذریعے ایک ساتھ ہر شخص کے مفادات

[illegible] لیکن اس کے نتیجے متضاد
[illegible] نکلے ہیں۔

اب جبکہ ایک نیا عہد شروع ہونے میں پندرہ سال سے بھی کم وقت رہ گیا ہے، ہمیں مستقبل میں جھانکنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کم از کم ایک ایسی کسوٹی ہمارے ہاتھ آسکے، جس سے معلوم ہو سکے کہ ہمارے گذشتہ اور موجودہ طریقہ ہائے عمل ہمیں کس سمت میں لے جائیں گے۔ اس تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری موجودہ پالیسی اور منصوبہ بندی میں اُن سمتوں کی نشاندہی ہی نہیں کی گئی ہے جن میں چلتے ہوئے ہمارے اُن عوام کو، جو بیسویں صدی میں رہنے کے باوجود اقتصادی اور سماجی اعتبار سے بہت پُرانی صدیوں کے معلوم ہوتے ہیں، واقعتاً یا تمثیلاً اکیسویں صدی میں مجوزہ چھلانگ لگانے کا موقع مل سکے۔

افسوس کی بات ہے کہ جو تیاریاں کی جا رہی ہیں ان میں سماجی زندگی اور اس کی حرکیات کو مدِ نظر نہیں رکھا جا رہا ہے چونکہ

میں نہیں جانتا کہ بہت خراب حالات میں زندگی گذارنے والے لوگ از خود یا اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر کیا کریں گے اس لیے میں نے اپنی اس مشق میں اس بارے میں اظہارِ خیال نہیں کیا ہے۔ یہ تو شاید ایک ایسا میدان ہے جس میں کوئی شخص اپنے "فکر و عمل کی رجائیت اور خوش امیدی" پر ہی بھروسہ کر سکتا ہے۔ ●

کھُلا ہے۔ اب ہوا پر منحصر ہے کہ وہ کس طور حرکت میں آسکتی ہے۔

کیا ردِ عمل کا ردِ عمل ہوگا جس سے انسان سیاست کے نام پر چلائے گئے جادو اور مذاق سے بیدار ہو کر زندگی کے حقیقی خطرے سے آگاہ ہوگا؟ صرف یہی ایک خیال ہمیشہ پریشان کرتا رہتا ہے۔ اگر زندگی کا کتبہ "انسان کی منزلِ مقصود" ہے تو کیا یہ راستہ چاند اور اس کے آگے خلاؤں میں سے ہو کر جائیگا۔ اس لیے میں چیف ایڈیٹر اور قارئین سے پوری معذرت چاہتے ہوئے کہوں گا کہ میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ ہوا کا رُخ کیا ہوگا۔ ●

قرضوں کی ادائیگی نہ
ہونے پر قرض خواہوں کے ذریعے
زمین ہڑپ کر لیے جانے، امیروں کے
ذریعے زمین کی خرید اور زرعی اراضی کے غیر زرعی اراضی
میں بدل دیے جانے نیز پیدائش و اموات کے قدرتی عمل کے
نتیجے میں بے زمین افراد کی تعداد میں اضافہ ہونے کی وجہ سے دیہی
افراد کو غیر زرعی شعبوں میں اُجرت پر روزگار مہیا کرنے یا اُن کے خود اپنا
روزگار شروع کرنے کی اہمیت بڑھ جائے گی۔

بقیہ: یہ بحران اور وقت کا تقاضا

صدیوں پُرانے ماضی میں سے بہت تیزی سے اُڑ رہی ہے۔ امکانات برابر برابر ہیں۔ راستہ

ایس۔کے۔ڈے

یہ بحران اور وقت کا تقاضا

مضمون نگار کا کہنا ہے کہ اس نصف شب کی "تقدیر سے ملاقات" کی پکار کو یاد کیجیے جس کے بعد آئین ساز اسمبلی میں حلف لیا گیا اور ایمانداری سے اپنے آپ سے سوال کیجیے کہ کیا ہم نے وہ کچھ کیا ہے جو ہمیں پابندیِ عہد کے لیے کرنا چاہیئے تھا۔ بلکہ کیا ہم نے دانستہ یا نادانستہ اس کے بالکل برعکس عمل نہیں کیا جس کے سبب آج ہمیں دو ہندوستانوں اور قوم کے اندر دو قوموں کے افسوسناک منظر کا سامنا ہے۔ کیا ہم اب بھی اس عمل کا رُخ پلٹ سکتے ہیں اور "انسانی تدبیر" کی راہ اختیار کر سکتے ہیں۔

اس مطالعے میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا کوئی جواز یا معنی اسی صورت میں ہو سکتے ہیں اگر دو بنیادی سوالوں کا جواب دیا جائے۔ یہ سمجھا گیا ہے کہ ہندوستان میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا دن ماضی، حال، مستقبل کا ایک چوراہا تھا۔ اور اس رسالے کے [illegible] جو پوچھتے ہیں اس سے دوسرا سوال [illegible] ہے کہ سنہ ۲۰۰۰ء تک دیہات کی حالت کیا ہوگی؟ یہ چیز اس حقیقت سے عیاں ہے کہ زندگی کا ظہور اسی زمین کی مٹی سے ہوا۔ اس لیے آسمانی بلندی کی عمارتوں اور خلا کی غارت گریوں کے امکانات کے قطع نظر اگر زندگی کو محفوظ رہنا ہے تو اس کی خبریں زمین میں رہنی چاہئیں۔ اور ایسا ہونا خاص طور پر اس لیے بھی ضروری ہے کیوں کہ یہاں کے باسی خارجی نہیں رہتا • غیر ہیں۔ اس مطالعہ کے خدوخال کے لیے ایسے مفروضے یا بے دلیل دعوے کی ضرورت ہے جو مضمون کے مندرجات کے لیے پس منظر کا کام دے سکے۔

کائنات کا آغاز بہت اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن انسانی ذہن اب تک کی ترقی یافتہ شکل میں بھی اس میدان میں کچھ کہنے کے قابل نہیں ہے۔ اس لیے بہشت، دوزخ یا حشر کے مبلغوں کو اُن کے رحم وکرم پر ہی چھوڑ دینا چاہیئے۔ خدا یا بھگوانوں سے بھی، جا ہے۔ مذاہب، مذہبی کتابیں یا قصے کہانیاں [illegible]

کچھ بھی تشریح کرتی ہوں، ایسا ہی سلوک کیا جانا چاہیے۔ زرخیز اور اختراعی ذہن اس معاملے میں محض ایک مشق کے طور پر یا مختلف بنیادوں میں پیشہ ورانہ کے طور پر جس مناسب ڈھنگ میں سوچنا چاہیں، سوچ سکتے ہیں۔ تاہم اگر قوانین انسان کے مزاج اور اس کے مزاج کی خاصیتوں سے مکمل طور پر آزاد ہو کر مروج ہونگے تو زندگی، مادہ یا رُوح کی کوئی بامعنی وضاحت نہ ہو سکیگی اور زندگی سے انکی مطابقت پیدا نہ کی جاسکیگی نیز انسانی بقا اور انسان کی خدمت کیلئے کسی بھی طرح انکی افادیت باقی نہیں رہیگی۔ اس لیے اس مضمون میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ کائنات اور زندگی کے

۱۹۴۷ء پر نگاہ ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جواہر لال نہرو کا کوئی ثانی نہیں ہے حالانکہ اُن کی عظمت کا تصوّر آئندہ کئی دہائیوں کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اعلان کیا تھا "آدھی رات کا گھنٹہ بجنے پر جب دنیا سوتی ہے ہندوستان میں ایک نئی زندگی اور آزادی پیدا ہوگی ۔۔۔ یہ ایک ایسا لمحہ ہوگا "جب ہم قدیم سے نکل کر جدید میں قدم رکھیں گے ۔۔۔" ماضی بیت چُکا ہے اور اب مستقبل ہمیں آواز دے رہا ہے۔ ہندوستان کی خدمت کا مطلب لاکھوں مصائب زدگان کی خدمت ہے اِس

کر سکے اور عالمی امن و بنی نوع انسان کے فلاح و بہبود کے فروغ کے لیے صدقدلی سے پورا پورا حصہ ادا کر سکے۔" سال ٢٠٠١٠ء کو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے نہرو کے بیان اور آئین ساز اسمبلی میں آدھی رات کے حلف کے ایک ردّ عمل یا نتیجے کے طور پر دیکھا جاسکے گا۔

جب گاندھی جی نہیں رہے تو نہرو جی یارک روڈ پر اپنے معمولی سی کوٹھی سے "تین مورتی" منتقل ہوگئے۔ لیکن اس کوٹھی کی شان وشوکت کے باوجود وہ وہاں ایک عام آدمی کی مانند ہی رہے۔ یہ کوٹھی جہاں کوئی شہری نہیں جاسکتا تھا عوام کے لیے کھول دی گئی۔ شری نہرو آخری وقت تک

> **پنچائتی راج کے ادارے ماسوائے انتخابی سرگرمی کے، ملک بھر میں خاموش مورتیوں کی طرح کھڑے ہیں اور گاندھی و نہرو کے خوابوں کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ یہ ادارے آج پتلیوں کی مانند کام کر رہے ہیں۔**

تسلسل کے دعوے پر مبنی ہے۔ ہمارے حواس ہمیں ایسے ہی آزمائشی نتیجے تک پہنچاتے ہیں۔ وہ یہ کہ کائنات اور زندگی کا ایک چکر ہے جو پھیلتا اور سکڑتا رہتا ہے۔ انسان اسے خواہ کسی بھی نظر سے دیکھے اس بظاہر نزدان گنج یا بقائے دوام میں نہ کوئی اضافہ ہوتا ہے نہ کمی ۔ آدمی جو زندگی کی جدید ترین شکل ہے ایک پُرپیچ وجود ہے۔ ایسے لگےگا گویا اُس نے مادے ذہن اور رُوح میں ایک توازن قائم کرنے کی جانب ترقی کی ہے۔ صرف اس قسم کا نظریہ اپنانے سے ہی زندگی کی ایک اولوالعزمانہ کوشش اور انسان کے کائناتی اسٹیج پر ایک مسافر ہونے کے خیال کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔

تقدیر سے مُلاقات : جب ہم ۱۵ اگست

کا مطلب ہے غربت، جہالت، بیماری اور مواقع کی نابرابری کو ختم کرنا۔۔۔۔ جس طرح امن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دکھائی نہیں دیتا۔ وہی بات آزادی خوشحالی بلکہ اس واحد دُنیا میں تباہی کے بارے میں کہی جاسکتی ہے جسے اب ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے بعد آئین ساز اسمبلی میں موجود ہر رُکن نے حلف لیا کہ" وہ پُورے انکسار کے ساتھ اپنے آپ کو ہندوستان اور اس کے عوام کی خدمت کے لیے وقف کریگا تاکہ یہ قدیم سرزمین دُنیا میں اپنا صحیح مقام حاصل

"مقدّر سے ملاقات" کے اپنے عقیدے پر چلنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ انھوں نے گذشتہ برسوں جو ہندوستان بنانے کی کوشش کی اُس کی ہر خصوصیت پر اُس کی شخصیت، اُن کے وجود، ذہن اور رُوح کی انمٹ چھاپ ہے۔ ترقی کے تمام شعبوں بالخصوص وسیع تر ذہنی منظر میں تال میل کو ایک نئے معنی ملے۔ "اجتماعی ترقی" کا خیال ایک دوسرے کی مخالف جنسیوں کے درمیان ترقی کے تئیں اُن کی ناپرواہی کے باوجود ایک دوسرے کے درمیان ربط اور اتحاد

پیدا کرنے والی ایک قوت تھی۔ اس ترقیاتی عمل کے ایک لازمی جزو کے طور پر لوگوں کو بنیادی سطح سے مرکزی اداروں تک لایا گیا۔ مطلب یہ تھا کہ خلاء کی معیشت حیوانات کے مطابق انسانوں میں ذرائع اور مقصد ہر دو لحاظ سے تبدیلی لائی جائے۔

نہرو کا تصور

شری نہرو نے کہا کہ صرف جمہوریت ہی ہندوستان قبل از بدھ تاریخ سے لے کر بعد تک صدیوں کے ڈراؤنے بھوتوں کا خاتمہ کر سکتی ہے۔ نچلی سطح تک پنچائتی راج ملک کی سیاسی جمہوریت کو نہرو کا عطیہ ہے۔ "سہکاری سماج" کو گاؤں سے لے کر مرکز تک اقتصادی جمہوریت کا زندہ نشان بننا تھا۔ اس کا تصور نجی اور سرکاری سیکٹروں میں توازن پیدا کرنے والی ایک قوت کے طور پر کیا گیا تھا۔ سماجی جمہوریت کو تشدد سے مبرا رہنا تھا ایسا ایک طرف "چند چالباز" اور دوسری طرف "بے حساب" خاموش لوگوں کے درمیان جمہوری قوتوں کے باہمی عمل کے ذریعہ ہی ممکن ہو سکتا تھا۔ لوک سبھا سے لے کر گرام سبھا تک کئی ادارے قائم ہوئے۔ یہ لازمی بات تھی کہ جب ہم میں سے اکثر لوگوں میں بھوت سرگرم تھا یا خوابیدہ ہیں تو طریق کار کے نشیب و فراز کی موجودگی میں اس مقصد کو حاصل کرنے میں وقت لگے گا۔ طلسمات کا دور دفن ہو گیا تھا۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے تمام عقیدوں اور رسوم کو چنوتی دینی شروع کر دی تھی۔ نہرو کو تاریخ پر وسیع اور صحیح عبور حاصل تھا جو اُن کی جیل کی چار دیواری میں طویل قید کا مرہونِ منت تھا۔ وہ مطالعہ تحریر اور تیز فہم مشاہدہ نفس کے ذریعہ ہی بطور خود زندہ رہ سکتے تھے۔

اگر وسیع تر منظر میں دیکھا جائے تو اُن کا اس تیزی رفتار کے بارے میں جب سے یہ دنیا سکڑ کر ایک گاؤں بنتی جارہی ہے، بے مثال تصور اور اعتقاد تھا۔ شمال، جنوب، مشرق، مغرب کے جغرافیائی معنی تو ہو سکتے تھے سیاسی نہیں۔ نئی دنیا امریکہ بڑی تیزی سے پھر اسی خول میں واپس جارہی تھی جس میں سے وہ بغاوت کے بعد بچ کر نکلی تھی۔ روس اور اُس کے اشتراکی ساتھی ایک مختلف قسم کی بغاوت میں اُلجھے ہوئے تھے۔

دوسری جنگِ عظیم نے اس دنیا کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یہ دونوں حصّے ایک دوسرے کے مخالف بن گئے تھے اور ان کے درمیان زبردست خلیج حائل ہو گئی تھی اختلاف کے اسباب کو اس سے زیادہ بے رحمانہ ڈھنگ سے اور کوئی بیان نہیں کر سکتا تھا۔ امریکہ اجتماعی ترقی کے پروگرام میں مدد دینے کے لیے پیش پیش تھا لیکن جب پروگرام کے ذریعہ پنچائتی راج اور سہکاری سماج کے عقائد کے نصب العین کو شامل کیا گیا تو امریکہ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ سرکاری دائرہ کار کی صنعتوں کی امداد سے انکار کر دیا گیا۔ ہندوستان کو زیادہ تر سماج وادی ملکوں پر انحصار کرنا پڑا۔ پھر بھی اُس کے دل میں امریکہ کے لیے کوئی کدورت نہیں تھی۔ ہندوستان کے دوستوں کے ساتھ دشمنوں جیسا سلوک کیا گیا اور ہندوستان کے دشمنوں کو بے حساب مدد دے کر گلے لگایا گیا۔ اس کھلم کھلا اختلاف کے باوجود نہرو نے دونوں بلاکوں کے درمیان توازن کو برقرار رکھا۔ انھوں نے ایسی صورتِ حال میں ملک کے نا وابستگی کے موقف کی حفاظت کی جس میں بڑے سے بڑا شخص بھی حیران و پریشان ہوجاتا

> دیہی ہندوستان کی جو نئی حلقہ بندی کی گئی ہے اُس کے مطابق بلاک کے صدر مقام زیادہ تر اُن لوگوں کے لیے تعلقاتِ عامہ کے ادارے ہیں جو برسرِ اقتدار ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والے محکموں میں کوئی تال میل پیدا نہیں کرتے جو کہ نہرو کی اجتماعی ترقی کی تحریک کی سب سے اہم کامیابی تھی۔

اب ہم ایشیا، افریقہ، وسط مشرق اور خاص طور پر لاطینی امریکہ میں "نہرو کے عقیدے کی کھلی خلاف ورزی میں امریکی کارروائی پر نگاہ ڈال سکتے ہیں۔ موجودہ منظر کا یہ ایک مرحلہ ہے۔ دوسرے سرے پر سماج وادی کیمپ ہے۔ جس کی قیادت ایک جانب روس اور دوسری جانب چین کر رہا ہے۔ یہ صورتِ حال بھی کم و بیش ویسی ہی ہے ہاں اس میں کچھ نفاست پائی جاتی ہے۔ اسلحہ جات اور اُن کی مار کرنے کی صلاحیت میں یہ اضافہ نہ صرف زمین پر ہے بلکہ خلا میں بھی ہے۔

سنہ ۲۰۰۱ء اس عجیب و غریب حالت کے درمیان پھنسا ہوا ہے۔ ایک عالمی پیمانے کی جنگ جس میں ایک کائناتی دور کے لیے زندگی معدوم ہو جائے گی، امکانات کی دنیا سے خارج نہیں کی جا سکتی۔ کیا ایسی حالت میں ہندوستان اپنے آپ کو اس عالمی گاؤں سے الگ تھلگ رکھ سکتا ہے۔ کیا ایسا سیاسی فلسفے کے طور پر بھی ممکن ہے؟ آج دنیا بھر میں جس کرب کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ کائناتی تکلیف ہے۔ جو ناگزیر ہے اور جس سے ہم بچ نہیں سکتے۔

اور جیسے کہ زندگی کا عمل جاری ہے

اب ہمیں ہندوستان کے منظر کو دیکھنا چاہیے جس کا خواب نہرو نے دیکھا تھا۔ ہمیں مہاتما گاندھی کے خوابوں کو بھی یاد کرنا چاہیے انھیں اُمید تھی کہ آزاد ہندوستان نوآبادیاتی حکومت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی اقوام کو اوپر اٹھانے کے لیے ایک ہادی کے طور پر کام کرے گا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ آزادی اور بنیادی سطح سے تعمیرِ نو کا ایک خاکہ تیار کرے گا اور یہ نمونے دوسروں کو ترغیبِ عمل دینے میں مدد دیں گے۔ مہاتما کو قتل کر دیا گیا۔ نہرو جی جا چکے ہیں۔ وہ اب آثارِ قدیمہ میں موجود ہیں۔ سب لوگ انھیں آزادی کے بعد کھوئے گئے مواقع اور اُس کے بعد جو کچھ ہوا اُس کے لیے ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ نئے روشن خیال لوگوں اور خوشحال طبقوں کا ایک بڑا حصہ اپنے بے چین ضمیر کی تشفی کے لیے اس صورتِ حال پر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ نہرو کی قائم کی گئی سرکاری دائرہ کار کی صنعتیں جن کی تعداد آج کافی زیادہ ہو چکی ہے۔ سابق برطانوی دور کی دیسی ریاستوں کی طرح سے ہیں۔ وہ حکومت جو برطانوی دور میں دہلی کے بڑے دفتر کے شمالی اور جنوبی بلاکوں تک محدود تھی۔ وہ آج راج پتھ کے دونوں طرف پھیلتی ہوئی انڈیا گیٹ تک چلی گئی ہے اور وہاں سے وہ بڑھتی ہوئی اس روز افزوں شہر البلاد کے تمام حصوں میں پھیل گئی ہے۔ دہلی کی آبادی ۱۹۴۷ء کے آغاز میں ۴ لاکھ تھی جو ۱۹۶۸ء میں ۴۰ لاکھ ہو گئی اور ۱۹۸۶ء میں تقریباً ۸۰ لاکھ ہو گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت شہر میں دس لاکھ گاڑیاں ہیں۔ یہاں پیدل، لڑکوں، ہاتھ سے چلائی جانے والی گاڑیوں سائیکلوں، کاروں، بسوں، ٹرکوں کی آمد و رفت اُتنی ہی ہے جتنی امریکہ کے بڑے بڑے شہروں میں ہے ماسوائے اس کے کہ یہاں وہ نظم و ضبط نہیں ہے۔ شہر اتنی تیزی سے پھیل رہا ہے کہ ۲۰۰۱ء تک اس کی آبادی ایک کروڑ ۲۰ لاکھ سے تجاوز کر جانے کا خدشہ ہے۔ مرکز صرف ریاستوں کے اختیارات، ذمہ داریوں اور وسیلوں کو غصب کر کے ہی پھیل سکتا ہے۔ پھر بھی ریاستوں کی شان و شوکت کا اظہار انیٹوں، مسالے اور فولاد کی صورت میں ہونا چاہیے۔ چنانچہ سب ریاستوں کی راجدھانیوں اور بڑے بڑے علاقائی علاقوں میں شہروں کا پھیلاؤ ہو رہا ہے جیسے

ایک رنگدار ماروتی کار، ایک رنگدار ٹیلی ویژن سیٹ، ویڈیو کیسٹو
کی لائبریری، جدید ترین آرائش اور فرنیچر وقار کی
نئی علامتیں بن رہے ہیں۔ ٹیلی ویژن یا کوئی
بھی اخبار یا رسالہ آپ اٹھا کر دیکھ لیجیے تو
آپ کو اندازِ فکر اور اسلوب
کا انوکھا پن نظر
آئے گا۔

ے عروج کی شکل دہلی کی راجدھانی میں نظر آتی ہے۔ سائنس، ٹیکنالوجی صنعتوں اور ترقیات کے عمل میں جو نابرابری پائی جاتی ہے اُس کا اظہار کتابوں اور حکومت کی مطبوعات میں ملتا ہے۔ پنچائتی راج کے ادارے ماسوائے انتخابی سرگرمی کے ملک بھر میں خاموش مورتیوں کی طرح کھڑے ہیں اور گاندھی و نہرو کے خوابوں کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ یہ ادارے آج کٹھ پتلیوں کی مانند کام کرتے ہیں۔ امدادِ باہمی کی دولتِ مشترکہ سیاست میں موسیقی کے ساتھ کرسیوں کے کھیل کی صورت اختیار کر کے رہ گئی ہے۔ سماجی جمہوریت ایک مضمون ہے جسے نصابی کتابوں کی بنا پر ایسے پروفیسر پڑھاتے ہیں جن کی جڑیں مغربی لائبریریوں اور مصنفوں میں ہیں۔

یہ گہری بوسیدگی

دیہی ہندوستان کی جو نئی حلقہ بندی کی گئی ہے اُس کے مطابق بلاک کے صدر مقام زیادہ تر اُن لوگوں کے لیے تعلقاتِ عامہ کے ادارے ہیں جو برسر اقتدار ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والے محکموں میں کوئی تال میل پیدا نہیں کرتے جو کہ نہرو کی اجتماعی ترقی کی تحریک کی سب سے اہم کامیابی تھی۔ تعلقے کے صدر دفاتر نے پھیل کر [illegible] شکل اختیار کر لی ہے جو پولیس اور اُس کی

امدادی تنظیموں کے روز افزوں عملے کو ٹھہرانے کے کام آ رہے ہیں۔ سب ڈویژن اور تحصیل کے صدر مقامات کے ملک بھر میں دیہات کے ساتھ گہرے اور فطری تعلقات ہوا کرتے تھے۔ اِن میں زوال آ رہا ہے کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ وسیلوں کی کمی ہے۔ دیسی گھریلو صنعتیں اور حرفتیں جو کبھی ہندوستانی زندگی اور ثقافت کا سرمایۂ افتخار ہوا کرتی تھیں اُن کی نمائش آج زیادہ تر بین الاقوامی میلوں میں ہی کی جا رہی ہے۔ افراد سامان وسیلوں اور آب بیج کا یکطرفہ عمل مرکوز صنعتوں کا پیٹ بھرنے کے لیے بہت خطرناک رفتار سے جاری ہے اور اس عمل میں غیر ملکی تعاون میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آج تمام شہر نئے فارغ البال طبقوں اور جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے طبقوں کی بڑھ رہی تعداد میں تقسیم

ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک قوم میں فطری یا منطقی ترقی کے لیے وسیلے جیسا کہ گاندھی اور نہرو نے سوچا تھا، شہروں سے دیہات کی جانب منتقل ہونے چاہئیں جس سے ہندوستان کی سوکھی جڑوں کو غذا مل سکے۔ لیکن یہ جھگیاں، جھونپڑیاں شہروں میں مقامی سرداروں کے لیے ووٹ بنک بنتی جا رہی ہیں۔

۱۹۶۷ء میں ایک مصنف نے اپنی کتاب "عوام کے لیے اقتدار" میں جو کچھ لکھا وہ اس صورت کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔ اُس کا کہنا ہے: "گاندھی جی نے سیاست، اختیارات، پیداوار، اشیاء کی تقسیم اور ثقافت کو لامرکوز کرنے کے لیے کہا تھا لیکن ہم چیز کو مرکوز کرنے کے تیز رفتار اُلٹے چکر میں چل پڑے ہیں۔ ہم ہندوستان میں تہذیب کا ایک ستون بنتے جا رہے ہیں جس کی چوٹی سیمنٹ اور فولاد کی بنی ہوئی ہے۔ لیکن جس کی بنیاد اور درمیانی حصہ بانسوں پر کھڑا ہے اور جو کھوکھلا ہے۔ ایک سیلاب آخرکار ضرور آ کے رہے گا اور جب سیلاب آئے گا تو دوسری نامعلوم طاقتیں بھی اس میں شامل ہو جائیں گی اور ایسا ہونا ممکنات سے خارج نہیں ہے۔ کوروکشیتر کی جنگ شاید پھر سے ہندوستان کی سرزمین پر لڑنی پڑے۔"

مسلسل تغیراتی حالت

ہندوستان کی نئی سرکار آج مسلسل تغیراتی حالت میں ہے۔ سب سے چھوٹی عمر کا وزیراعظم اس کا قائد ہے جس کے ادارے

ہم تاریخ کے ایک بڑے بحران کے کنارے پر کھڑے ہیں۔ لاطینی امریکہ میں ایک قوم کے اندر دو قوموں کی جو موجودگی پائی جاتی ہے وہ امریکہ کی مہربانی سے ہندوستان میں بھی بڑی تیزی سے بڑھتی دکھائی دیتی ہے۔

نیک اور انقلابی ہیں۔ وہ اپنے گرد ایسے پنڈٹ وگ جمع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو پبلک اسکولوں کے تعلیم یافتہ ہیں جن کی انتظامیہ صلاحیتیں، جنھیں جدید اصطلاح میں "سسٹم اپروچ" کہا جاتا ہے، کے بارے میں واقفیت نہایت عمدہ ہے۔ غریبی مٹانے کا نشانہ موجود ہے۔ لیکن اکیسویں صدی اور ہماری وہاں جلد از جلد آمد اور مغربی اقوام کی جدتوں کی دنیا سے پوری طرح قدم ملا کر چلنے کی خواہش سب سے بڑی نئی اُمنگ ہے جو مواصلاتی ذرائع پر چھائی ہوئی ہے۔ ایک

خوشحال لوگ شہروں میں چلے گئے ہیں لیکن شہروں سے دیہات کا رُخ کوئی نہیں کرتا۔ بے زمین یا تھوڑی زمین رکھنے والے

رنگ دار ماروتی کار، ایک رنگ دار ٹیلی ویژن سیٹ، ویڈیو کیسٹوں کی لائبریری، جدید ترین آرائش اور فرنیچر رفتار کی نئی علامتیں بن رہے ہیں۔ ٹیلی ویژن یا کوئی بھی اخبار یا رسالہ آپ اٹھا کر دیکھ لیجیے تو آپ کو اندازِ فکر اور اسلوب کا انوکھا پن نظر آئے گا۔

نئے وزیر اعظم ریاستوں کے وزرا اعلیٰ سے پنچایتی راج، اخبارات، رسائل، ذمہ داری کو غیر مرکوز کرنے اور انتخابات کے موضوع پر سخت الفاظ میں خطاب کرتے ہیں۔ آدمی یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہے کہ وہ مسکرائے یا چیخے کہ مدھیہ پردیش جس نے اجتماعی پراجیکٹوں کو ایک پروگرام اور نظریے ہر دو لحاظ سے ترک کر دیا تھا پہلا صوبہ ہے جس نے وزیر اعظم کی

پکار کے جواب میں اس پر عمل کیا ہے۔ امدادِ باہمی ادارے جو کبھی مختلف وزارتوں کی ایما پر شروع ہوئے تھے آج انھیں اپنی حالت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ہمارے صنعت کار کبھی کبھی بے چین ہونے کے باوجود بہت خوش نظر آتے ہیں۔ دیہات کی آبادی کا تناسب ملک میں اب بھی ۷۵ فیصد ہے۔ اس کی اکثریت اب بھی غریب ہے۔ اُن میں سے خوشحال لوگ شہروں میں چلے گئے ہیں لیکن شہروں سے دیہات کا رُخ کوئی نہیں کرتا۔ بے زمین یا تھوڑی زمین رکھنے والے عوام کا دیہات سے شہروں کی جانب مستقل بہاؤ اب بھی اُسی بلکہ زیادہ رفتار سے جاری ہے کیونکہ انھیں ان خوشحال بستیوں میں اُمید کی جھلک نظر آتی ہے۔ نو آبادی نظام جو کبھی مغربی اقوام میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے سبب نابرابریوں کو جذب کرنے والا ایک ذریعہ بن گیا اُس کا اب کوئی روشن مستقبل نظر نہیں آتا۔ نو آبادی نظام کی نئی شقوں کو فروغ دینے کے لیے ترقی پذیر ملکوں کے درمیان کشیدگیوں اور جھگڑوں کو پیدا کیا

عوام کا دیہات سے شہروں کی جانب مستقل بہاؤ اب بھی اُسی بلکہ زیادہ رفتار سے جاری ہے۔

جا رہا ہے۔ نام نہاد اعلیٰ ٹکنالوجی مقامی خوشحال اور روشن خیال طبقے اور ماہرین کے گلے لگ رہی ہے۔ جو جنگی ہتھیار مغرب میں متروک ہو چکے ہیں اُن کی مانگ ہمسایہ ملکوں کے مابین جنگوں کی منڈی میں بڑھ رہی ہے۔ اقوامِ متحدہ جو امن اور آزادی کے لیے افراد اور اقوام کے واسطے ایک عالمی مجلس کی اُمیدگاہ تھی اُس پر متوقع حلقوں سے نکتہ چینی میں اضافہ ہو رہا ہے چنانچہ وسیع تر اُفق کا منظر تاریک ہے۔

دو ہندوستان

اپنے ہی ملک کے اندر ہم دو ہندوستانوں کے درمیان عارضی جنگ بندی کی تکلیف دہ حالت میں پہونچ چکے ہیں۔ ہندوستان میں ایک نئے نظریے کے طور پر سماج وادی کا جو ڈھانچہ شروع کیا گیا تھا مخالف سمت میں چلنے کے لیے کارآمد ثابت ہوا ہے۔ بیوروکریسی کے حامیوں کی بڑی دلچسپی یہ ہے کہ وہ ایک جماعت کے طور پر زندہ رہیں۔ سیاست میں ہجوم یا اکثریت کی برتری کو اختیارات کے بٹوارے کے ان پڑھ علمبردار مل گئے ہیں۔ مالداروں کی حالت پہلے کبھی اتنی اچھی نہیں رہی۔

کیوں کہ گلّے کا دُودھ پوری طرح چوس لینے کے بعد وہ اسے سرکاری دائرہ کار کے سپرد کر دیتے ہیں۔ جو سماج وادکا علمبردار ہے۔ ہم تاریخ کے ایک بہت بڑے بحران کے

کنارے پر کھڑے ہیں۔ لاطینی امریکہ میں ایک قوم کے اندر دو قوموں کی جو موجودگی پائی جاتی ہے، وہ امریکہ کی مہربانی سے ہندوستان میں بھی بڑی تیزی سے بڑھتی دکھائی دیتی ہے۔

دو قطبوں والی یہ دُنیا جو مصالحت کی تمام کوششوں کی مخالف ہے اس آتش فشاں میں جو پھٹنے ہی والا ہے اور بھی اضافہ کر رہا ہے جیسے خود بلایا ہوا دیو باہر آگیا ہو اور اردگرد منڈلا رہا ہو۔ ایک کتاب کے حوالے کے مطابق "دُور نزدیک آگیا ہے اور نزدیک دُور چلا گیا ہے"۔ دورِ حاضر میں دُنیا بھر میں جو ایک گاؤں بن گئی ہے، کیا احیائے علوم کی ایک نئی تاریخی تبدیلی آرہی ہے؟ یا یہ پاداشِ عمل کا فطری تقاضہ ہے؟ بہرحال یہ کافی یاس انگیز ہے۔ لیکن تاریخ ہمیشہ اختلافات اور انحراف کی رزمیہ داستان اور دو طرفہ عمل رہی ہے۔ کیا اس عمل میں کوئی موڑ دکھائی دیتا ہے؟ "آج" کے بحران کا ہمیشہ تقاضہ رہا ہے کہ اگر ہمیں کل یعنی مستقبل کے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے تو ہم ماضی پر نگاہ ڈال کر دیکھیں۔ ہندوستان کو ہر لحاظ سے ماضی سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ کیا ہم اس سلسلے میں نہرو کے خیالات اور اعمال کا ذہنی اور جذباتی طور پر جائزہ لے سکتے ہیں جو اپنے گرد رہا تھا اور ماضی کے دیگر افراد کے افکار میں سے راستہ تلاش کرنے والا تھا؟ کیا ہم موجودہ منظر میں اس راستے کی تلاش کر سکتے ہیں؟ کیا دہشت پسندی انسانی اخلاق کی کوئی ایسی چیز ہے جس کی مثال پہلے نہیں ملتی یا یہ ہمارے ہی بوئے ہوئے بیجوں میں سے ایک منطق کے طور پر ابھرتی ہے۔ ہم ضمیر کے بارے میں دانشورانہ طور پر بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کہیں یہ [illegible] ہے؟

خود نگاہی کی ضرورت

ایک بھوکے شخص کو جسے سر چھپانے کی جگہ کا بھروسہ نہیں یا دن کی خوراک بلکہ پینے کے صاف پانی کا یقین نہیں وہ آزادی یا ضمیر کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ بھوک داخلی ہو یا خارجی، زندگی کی سب سے بڑی معلم ہے۔ ہمارے رہنماؤں کو جنہوں نے کبھی بھوک کے صدمے برداشت نہیں کئے، اپنے اندر قلب کی گہرائی تک نگاہ ڈال کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے جیسے دوسرے لوگوں سے مشورہ لے سکتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ انھوں نے سیاست میں اپنے ساتھیوں کی توند کو جھانک کر دیکھا ہو جو اُن کی پیشقدمی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی ہے جو ہضم نہ ہونے والی زائد خوراک کی زندہ علامت ہے اور بازار کے سیٹھوں کو بھی مات دیتی ہے۔ برسرِ اقتدار سیاست دانوں میں سے اکثر اس جسمانی حالت کے مظہر ہیں۔

آج تبدیلی کے لیے زوردار مانگ بلند ہو رہی ہے۔ عام آدمی داخلی غربت کے سبب کراہ رہا ہے۔ اُس کے بارے میں اب جس طرح چاہو فرض نہیں کیا جا سکتا۔ نہرو کا جسم، دل اور ذہن اس سرزمین کے مطابق تھا جو کچھ اُس نے دکھایا اور جس کی اُس نے پیروی کی اُسے اب بھی وقت کی ضروریات کے مطابق ردّ و بدل کے ساتھ پھر سے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ جہاں تک طبعی، اقتصادی اور سماجی پہلو کا تعلق ہے مغرب سے ہم اب کچھ زیادہ نہیں سیکھ سکتے۔ البتّہ ہم چین اور جاپان سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

پُکار کا سامنا

وقت کی بنیادی مانگ "انسان کی تعمیر ہے" نہرو جی ہمیشہ ہی کہتے تھے کہ انسان کی خوبیاں ہی قوم کو عظیم بناتی ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کوششوں کے ہر میدان جیسے کہ سائنس ٹکنالوجی اور ہندوستان کی گوناگوں سرگرمیوں سے تعلق رکھنے والے اداروں میں جو بڑے بڑے قدم اٹھائے گئے ہیں اُن کی ابتدا اس واحد شخصیت نے کی۔ راقم نے جو کبھی ایک پیشہ ور انجینیر تھا اپنے تمام جذبوں سے جو ابھی بھی قائم ہیں زیادہ سے زیادہ زور "انسانی کی تعمیر" پر دینا چاہتا ہے۔ جو ہندوستان کے موجودہ رہنماؤں کے اندازِ فکر اور عمل سے مختلف ہے۔ طبعی علوم نے جن میں الیکٹرانکس اور بٹن دبانے کے عمل شامل ہیں، اپنا ہی حرکت کا ایک زور پیدا کیا ہے۔ وہ دنیا بھر میں ایک خودکار چھلانگ کا زور پیدا کریں گے لیکن ان علوم کو اُس آرے کا کام نہیں کرنا چاہئے جو بندر کے ہاتھ میں تھا اور جس سے وہ اُس شاخ کو ہی کاٹ رہا تھا جس پر وہ بیٹھا تھا۔ کیا "انسانی تعمیر" کے عمل میں معیار کی یہ چھلانگ اب بھی ممکن ہے؟۔

اب ہم چیف ایڈیٹر کی طرف سے ۱۵ اگست [illegible] کے بارے میں پیش کئے گئے سوال کے اختتام پر آرہے ہیں۔ کیا "انسانی تعمیر" آنکی مجوزہ تاریخ کی راہ میں رکاوٹ بنے گی؟ یا انسان شکستہ بندر کا کردار ادا کرے گا؟ اس بارے میں کوئی پیشگوئی صرف کوئی پیغمبر یا غیب داں مفکر ہی کر سکتا ہے۔ لیکن پیغمبر کبھی کبھار ہی دُنیا میں ظاہر ہوتے ہیں جبکہ نجومی غیب داں خطیبوں کی صورت میں اس دنیا میں پھل پھول رہے ہیں۔ قریب ایک صدی پہلے ایک مفکر نے انسان کو خلا کے قلب میں چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ قرار دیا تھا جو "کچھ نہ ہو کر بھی کچھ تھا"۔

وقت کی ضرورت احیائے علوم کے لیے [illegible]

بی۔ این۔ کے۔ رائے

گہرے صدمے سے بچنے کے لیے فوری عمل کی ضرورت

فاضل مصنف کا بیان ہے کہ دیہی حقائق کو صحیح طور پر نہ سمجھنے، زمین کے المناک انداز ملکیت بدلیسی تجاویز اور ماڈلوں کو مستعار لینے کے رجحانات اور دیہی کنبوں کو خطِ افلاس سے اوپر اٹھانے کے نام نہاد حکمتِ عملی سے ہم ایسے مقام کی طرف بڑھ رہے ہیں جہاں ہمیں گہرا صدمہ کے سوائے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اگر ہم نے فوری کارروائی نہ کی اور جلدی سے اس عمل کا رخ نہ پلٹا تو ہمارے دیہی منظر میں تبدیلی تو آئے گی۔ البتہ وہ بدتر قسم کی ہوگی۔

اگر موجودہ رجحان جاری رہا تو دیہی منظر بدتر ہوکر اس قدر بدل جائے گا کہ اس کی پہچان بھی نہیں ہو پائے گی۔ دیہی علاقوں کی شہرکاری جو شہری بنیاد رکھنے والے تمام ماہرین کو دیہی علاقوں کے تمام انسانی مسئلوں کا حل معلوم ہوتی ہے اس صدی کے موڑ پر تباہ کن نتائج پیدا کرے گی۔ اگر ہم اسے بنیادی طور پر اقتصادی مسئلہ تصور کرتے رہے۔ جیسا کہ ہم کر رہے ہیں۔ اس امر کو اہمیت دیتے رہے کہ حساب کتاب کو متوازن رکھا جائے، عارضی طور پر کنبوں کو خطِ افلاس سے اوپر اٹھانے کی اسکیمیں بناتے رہے اور پھر یہ امید کرتے رہے کہ وہ لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے تو ہمیں گہرا صدمہ پہنچے گا۔ ہم میں ابھی تک اتنی خود اعتمادی پیدا نہیں ہوئی کہ ہم ایسے بھارتی ماڈلوں (نمونوں) کو تیار کر سکیں جو مثالی اور بے نظیر طور پر ہمارے ہوں۔ اہل مغرب جو کہتے ہیں ہم اسے آنکھیں موند کر قبول کر لیتے ہیں اور ایسا ہوکر ہی رہنا ہے جس صورت میں کہ ہم نے خود کو رضاکارانہ طور پر مغرب، عالمی بینک، اسکولوں اور کالجوں اور پہلی اور دوسری دنیا کے نظری پروپیگنڈوں کے حوالے کر دیا ہے۔ جنھیں بنیادی طور پر بھارتی دیہات کے بارے میں حقائق کا علم ہی نہیں۔ نقصان کو محسوس کرنے میں بہت وقت لگتا ہے کیونکہ یہ ملک بہت بڑا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں ۲۰۱۰ تک اپنی غلطیوں کا احساس ہو جائے گا مگر تب تک بہت تاخیر ہو چکی ہوگی۔

مہاتما گاندھی اور انھوں نے دیہی علاقوں کی ترقی کے بارے میں جو تمام معقول باتیں کہی تھیں وہ کب کی فراموش ہو چکی ہیں گی۔ [illegible] دیہی خود اعتمادی، دیہی علاقوں کا ایک دوسرے پر انحصار رکھنے، کارخانوں کے بجائے [illegible]

طرف سے مال تیار کرنے کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اُس کی طرف پہلے ہی کوئی توجہ نہیں دی جا رہی، گویا کہ وہ ناکارہ ہو چکے ہیں۔

> **میں نے ۱۹۶۷ء میں جب دیہات میں کام کرنا شروع کیا تھا تو میں خیال کرتا تھا کہ گاندھی جی قدرے سنکی تھے اور لاعلمی میں اُن کی باتوں کو حقارت سے دیکھتا تھا گویا وہ بدیسی باتیں ہوں۔ میں اب ۱۹۸۶ء میں اُس آدمی کی غیر معمولی سوجھ بوجھ پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اُن کی باتیں ۲۰۰۱ء میں بھی قابلِ عمل رہیں گی**

میں نے ۱۹۶۷ء میں جب دیہات میں کام کرنا شروع کیا تھا تو میں خیال کرتا تھا کہ وہ قدرے سنکی تھے اور لاعلمی میں اُن کی باتوں کو حقارت سے دیکھتا تھا گویا وہ بدیسی باتیں ہوں۔ میں اب ۱۹۸۶ء میں اُس آدمی کی غیر معمولی سوجھ بوجھ پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اُن کی باتیں ۲۰۰۱ء میں بھی قابلِ عمل رہیں گی۔ لیکن محض ان لوگوں کے لیے جو ان باتوں کا علم رکھتے ہیں کہ دیہی بھارت کیسا ہے، عوام کیسی زندگی بسر کرتے ہیں، انھیں کون سے مسائل درپیش ہیں اور اُن کے حل کہاں موجود ہیں۔ لیکن اُن لوگوں کی تعداد بہت کم ہوگی جو محسوس کریں گے کہ گاندھی جی کے خیالات ۲۰۰۱ء میں بھی قابلِ عمل ہیں۔ اگر وہ لوگ، ماہرین، پالیسی ساز اور دوسرے کارکن جو خیال کرتے ہیں کہ انھیں علم ہے کہ دیہی علاقوں میں واقعی کیونکر ترقی لائی جائے۔ عوام کے درمیان رہنا اور وہاں کے حالات خود دیکھنا شروع نہیں کریں گے تو اُن کے حل تلاش کرنا مشکل ہوگا۔ ۱۹۸۶ء میں آپ ایسے بہت کم لوگ پائیں گے جو دیہی علاقوں میں رہتے اور کام کر رہے ہوں گے۔ ۲۰۰۱ء تک تو وہ عنقا ہو جائیں گے کیوں کہ دور سے منصوبہ بندی کرنا پہلے ہی ایک رواج بن چکا ہے۔

غیر مقصدی ماحول میں دیہی مفلسوں کے لیے اسکیمیں بنانا اور مشینوں پر کام کرنا اب حقیقی زندگی کا جزو بن گیا ہے۔ کیچڑ، گوبر، خشک زمین پر اچھی خاصی بارش، گرد اور چائے کی دکانوں کی گھریلو غلاظت کی بو، اذیت، عدم سلامتی اور استحصال پسندی کا ماحول، خیالات، نظریوں اور طریقوں میں کشمکش، تجربوں، زندگی کے اسلوبوں اور سوچنے و عمل کرنے کے طریقوں کا تبادلہ کرنا، تبدیلی کے پہلے ہونے والا تناؤ اور تبدیلی کے نتیجے میں ہونیوالا آزادی کا احساس۔ یہ تمام باتیں ایک ایسے عمل کا حصہ ہیں جس سے بلاشبہ احتراز نہیں کیا جا سکتا اور لازمی طور پر نہیں کرنا چاہیے۔ ذاتی لگاؤ نہ رکھنے والے ماہر کی آمد جو اس طرح سیکھنے اور سکھلانے کے عمل میں یقین نہیں رکھتا، جو اس رفتار پر زور دیتا ہے جس کے دیہی علاقے عادی نہیں ہیں۔ جو ایسے تکبر اور اعتماد کا اظہار کرتا ہے جو ایک غیر ملکی یونیورسٹی سے دیہی ترقیات کی ڈگری حاصل کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور جو محسوس کرتا ہے کہ وہ (اپنے ماحول سے) "آیا" ہے۔ ایسے لوگوں کو ہم زیادہ سے زیادہ دیکھیں گے کہ جوں جوں ہم ۲۰۰۱ء کے زیادہ قریب جائیں گے، یہ لوگ ہماری موت کا سامان بنیں گے۔

ٹی۔ وی۔ کا یہ حملہ

ایک علامت ہے ٹیلی ویژن کی ترقی، ذاتی لگاؤ نہ رکھنے والا ذریعہ جو اپنی ہی کہے جاتا ہے، خیالات کے تبادلے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور نہ ہی اُن معلومات پر اعتراض کی اجازت دیتا ہے جو اس کی طرف سے پیش کی جا رہی ہیں۔ ۲۰۰۱ء تک دیہی علاقوں میں ۲ کروڑ سے زیادہ افراد ایسے پروگراموں کو دیکھنے پر مجبور ہوں گے جن کا اُن کی روزمرہ کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ یہ متوسط طبقہ ہے جسے اس ذریعہ اطلاعات پر کنٹرول حاصل ہوگا۔ اور جو پہلے ہی دیہی مفلسوں کے لیے منصوبہ بندی

کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ چاہیں گے کہ ۲۰۰۱ء تک دیہی مفلسی بالکل ختم ہو جائے۔ ایسے پروگرام جن پر ۳۰ ہزار روپیہ فی گھنٹہ سے ۱۵ لاکھ روپیہ فی گھنٹہ کی لاگت آتی ہے اُن سامعین کے لیے وضع کیے جا رہے ہیں جن کی کل آمدنی ۳۵۰۰ روپیہ سالانہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس ایک گھنٹے کی تفریح پر جو لاگت آتی ہے وہ خالص پینے لائق پانی فراہم کرنیوالے

مالی امداد اور پروگراموں سے اُن کی مدد کر رہی ہے لیکن دوسری طرف وہ اس نظام کے اس قدر محتاج بنا دیئے گئے ہیں کہ مجھے شبہ ہونے لگا ہے کہ کیا کبھی یہ ارادہ تھا کہ اُن لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے دیا جائے (۲۰۰۱ء تک وہ مکمل طور پر محتاج ہو جائیں گے وہ بھی مٹھی بھر لوگوں کے۔ دیہات کے تین فیصد دولتمند جو کل قابلِ کاشت زمین کے ۳۰ فیصد کے مالک ہیں دیکھیں گے کہ ٹکنالوجی استحصال پسندی کا ذریعہ بن جائے۔ پہلے ہی

اُن کے حالات بہتر ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ میں سرکاری اعداد کا حوالہ دے رہا ہوں، اس لیے صورتِ حالات اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہونی چاہیئے۔ جو پیش کی گئی ہے۔

ناقص تقسیمی نظام

آج تقسیمی نظام کہیں بھی دیہی علاقوں کے لیے بہتر جگہ بنانے کی سمت میں کام نہیں کر رہا۔ نظامِ تعلیم نے اس امر کو یقینی بنا دیا ہے کہ یونیورسٹیوں سے نکلنے والے ۸۰ فیصد ڈاکٹر شہری علاقوں میں رہیں جہاں ۵ فیصد لوگ آباد ہیں اور دیہی علاقوں میں ۵۰ لاکھ افراد ہر برس کھانسی، دمہ، کم غذائیت، چھوت سے سے بچاؤ نہ ہونے

> سنہ ۲۰۰۱ء تک وہ مکمل طور پر محتاج ہو جائیں گے وہ بھی مٹھی بھر لوگوں کے دیہات کے تین فیصد دولتمند جو کل قابلِ کاشت زمین کے ۳۰ فیصد کے مالک ہیں دیکھیں گے کہ ٹیکنالوجی استحصال پسندی کا ذریعہ بن جائے۔

تین ہینڈ پمپوں یا ایک سال کے لیے چلائے جانے والے ۹۰ پرائمری اسکولوں پر آنیوالی لاگت کے برابر ہے۔ وہ فرضی طور پر دیہی سامعین کے لیے بنائے گئے جن پروگراموں کو تعلیم، خاندانی بہبود، دیہی ترقی اور خواتین کی بہبود کے پروگراموں کا نام دیتے ہیں وہ اس قدر بے معنی ہیں کہ ان کا مقصد محض کسی کے ایسے رشتہ دار کو روزگار فراہم کرنا ہے جو غیر ملک سے دیہی مواصلات سے متعلق ڈگری لے کر لوٹا ہو۔

میں دیہی مفلسوں کے لیے ایک آزمائشی وقت دیکھتا ہوں۔ پہلے ہی ایسی قوتیں سرگرم عمل ہیں جو نہیں چاہتیں کہ وہ لوگ خود ترقی کریں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ حکومت اسکیموں،

اس امر کی علامتیں پائی جاتی ہیں کہ دیہات میں امن و قانون کی مشینری امیروں کے حق میں استعمال کی جا رہی ہے اور زمین ہتھیانے کے معاملے بڑھتے جا رہے ہیں لیکن پولیس ان معاملوں کا اندراج نہیں کر رہی۔

اگر ساڑھے تین کروڑ کنبوں یا دیہی کنبوں کی کل تعداد کے لگ بھگ ۵۴ فیصد کے پاس نجی زمین بالکل نہیں ہوگی یا ۱/۲ ہیکٹیئر سے بھی کم ہوگی تو ۲۰۰۱ء تک اُن کا مستقبل بلاشبہ تاریک ہوگا۔ اس ملک کے دو تہائی زرعی مزدور پہلے ہی قرض میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جو صورت نظر آتی ہے اُس سے

اور موزوں طبی سہولیات کے فقدان سے دم توڑ دیتے ہیں۔ نظامِ تعلیم نے اس امر کو یقینی بنا دیا ہے کہ خواندہ، زیادہ خواندہ اور اُن سے بھی زیادہ خواندہ لوگ (جنہیں ہم غلطی سے اعلیٰ تر تعلیم کہتے ہیں)، دیہات میں لوٹ کر کبھی نہیں آئیں۔ دوسری طرف ــــ بے پور، دلی اور نیویارک ــــ کی طرف دیکھنا آگے کی جانب دیکھنا خیال کیا جاتا ہے۔ ڈگری (تعلیم نہیں) حاصل کرنے کے بعد سرکاری ملازمت کے بغیر دیہات میں واپس آنا کوئی برا کام خیال کیا جاتا ہے۔ اگر

آپ یقینی تنخواہوں کے بغیر دیہات کی
ترقی میں مدد کرنا چاہتے ہیں تو اس کا مطلب
یہ ہے کہ آپ نے اچھی تعلیم نہیں پائی۔ نئی
تعلیمی پالیسی (۱۹۸۶ء) میں ملازمتوں کو
ڈگری سے الگ کرنے کا سمجھاؤ دیا گیا ہے
لیکن لوگ پھر تنگ، مروجہ اور محدود معانی
میں اس کی تشریح کر رہے ہیں اور اسے
ملازمت کے ہم پلہ بنا رہے ہیں۔

میں کبھی بھی کسی دیہی علاقے میں نہیں
رہا اور نہ میں نے وہاں کام کیا ہے اس لیے
میرا خیال نہیں کہ تعلیمی منصوبہ سازوں کو
ایسی پالیسی کی تعمیل کی اہمیت کا
احساس ہے۔ اگر اس پر عمل ہوا
جیساکہ اس پر ہونا چاہیے تو اس
کا دیہی علاقوں میں ۲۰۰۱ء
تک دوررس ردعمل
ہوگا۔ اس سے پہلی
بار ترقیاتی مقاصد
کے لیے سروسیں
مہیا کرنے کے
لیے دیہی وسائل، دیہی ہنروں اور دیہی
علم کا استعمال کیا جاسکے گا۔ اس سے دیہات
کے نیم پیشہ ور، دائیاں، دیہی سطح کے
صحتی کارکن، حکیم، وید بارش کی پیشگوئی کرنے
والے، ہڈیاں جوڑنے والے اور ہینڈپمپوں کے
مستری سروسیں فراہم کرسکیں گے اور انھیں
کاغذی ڈگری لینے کی ضرورت نہیں رہے گی
جس میں اس امر کی تصدیق کی گئی ہو کہ وہ ایسی
سروسیں فراہم کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔

جیساکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، ترقی کو سب
سے بڑا خطرہ تعلیم یافتہ شخص سے ہے جو کہ تنگ نظر
سے اپنی ڈگریوں کا مظاہرہ کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ
وہ دیہی علاقوں کی ترقی کے لیے ناگزیر ہے لیکن
یہ ڈاکٹر، انجینئر اور ٹیچر ہے جو دیہی علاقے سے
ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے اپنی ڈگری کا استعمال
کرتا ہے، بدعنوانیوں کے لیے اپنی تعلیمی قابلیت
کا ناجائز استعمال کرتا ہے اور سماج کی قیمت
پر اپنی نجی ترقی کے لیے اپنے علم کو ناجائز
طور پر بروئے کار لاتا ہے۔ جس
وقت ملازمتوں کو ڈگریوں

پہلے ہی اس امر کی علامتیں پائی جاتی ہیں کہ دیہات میں امن وقانون کی مشینری امیروں کے حق میں استعمال کی جا رہی ہے۔ اور زمین ہتھیانے کے معاملے بڑھتے جا رہے ہیں لیکن پولیس ان معاملوں کا اندراج نہیں کر رہی ہے۔

سے الگ کر دیا جائے گا
دیہی علاقے پر افسر کا غلبہ ختم ہو جائے گا۔ دیہی
علاقے میں جو مقام اس نے اپنے لیے بنایا ہے،
اس کی وقعت کم ہو جائے گی اور حقیقی دیہی شرکت
عمل میں آسکے گی جس میں لوگ ایک دوسرے
پر انحصار رکھ سکتے ہیں۔ دیہی حلقوں کے وسیلوں
اور ہنروں کو اب تک سرکاری منصوبہ بندی
اور اس کی تعمیل میں مقام نہیں ملا۔ دیہی علاقے
محض وصول کنندہ تصور کیے جاتے ہیں۔ وہ
لینے والے ہیں اور دینے والے نہیں ہیں اور ایسا
کیا جانا نظام انجام کار ان سب کو گداگر بنادیگا۔

اگر ہم یہ چرچا کرتے ہیں کہ دیہی حلقوں میں خود انحصاری
پیدا کی جائے کہ وہ اپنے ہنروں کا استعمال
کریں، ان کے پاس جو وسائل ہیں ان کی شیرازہ
بندی کریں اور ان کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے۔
یہ تمام نیک جذبات ہیں جن کا اظہار
وضاحت کے ساتھ سرکاری منصوبوں اور دستاویزات
میں کیا گیا ہے۔ تو آیئے ہم کم از کم ان باتوں
کو عمل میں لانے کی کوشش کریں جن کا ہم پرچار
کرتے ہیں۔ جو کچھ ہم کہتے ہیں اور اصل میں ہم
جو کچھ کرتے ہیں، ۱۹۸۶ء میں اس کے درمیان
فرق کبھی بھی زیادہ وسیع نہیں رہا۔ ۲۰۰۱ء میں اس
فرق کو دیہی علاقوں میں بڑھنے سے روکنے کے
لیے زبردست اقدامات کرنے ہوں گے
اور میرا خیال ہے کہ بعض مشکل
فیصلے کرنے کے لیے وقت
آگیا ہے۔

مشکل امور
متنازعہ فیہ
مسئلہ ہے

حکومت کی مداخلت اور شمولیت کو محدود
کرنا۔ ایک ایسی حد کا ہونا ضروری ہے جس
کے باہر لوگوں کو آسامیوں پر مامور کرنا یا ملازمت
فراہم کرنا، حکومت کے لیے غیر کفائتی ہو جائے
مرحوم راج کرشن کے مطابق سروسوں اور مال
کی ایک روپے کی سرمایہ کاری پر حکومت کو ۵
روپے خرچ کرنے پڑ رہے ہیں۔ یہ نہ صرف
انتہائی مضحکہ خیز بن رہی ہے لیکن غیر موثر ثابت
ہو رہی ہے اور [illegible] کی تعداد [illegible] تو قطعاً

[illegible] قبول کرچکی ہے۔ لیکن دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ دیہی علاقہ چال بازوں کا گروہ ہے اور پبلک سرمایہ کی بہتر جوابدہی کے لیے سرکاری ملازمین کی بھرتی لازمی ہے۔ چنانچہ دیہی حلقہ کی طرف سے روپیہ بنانے کے بجائے یہ سرکاری اہلکار ہے جو بہتر جوابدہی کے نام پر روپیہ بنا رہا ہے۔ ایک مشکل فیصلہ یہ کرنا ہوگا کہ ایک خاص مقام کے باہر منصوبہ بندی اور تعمیل، وسائل کی شیرازہ بندی اور سروس کی فراہمی کی ذمہ داری پورے طور پر دیہی حلقے پر ہو اور حکومت تربیت، ساز و سامان اور آلات وغیرہ کی فراہمی جیسا ضمنی کردار ادا کرلے۔

آپسے ضبط میں رکھنے اور نقصان کو روکنے سے قاصر ہے، چوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت کی مداخلت اور شمولیت سے دیہی حلقے اپنے پروگراموں کی منصوبہ بندی اور تعمیل میں بہت کم حصہ لے رہے ہیں۔ چوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ نظام کے اندر دیہی حلقے یا حکومت کے تئیں جوابدہی بہت کم ہے یا ہے ہی نہیں اس لیے رضا کار اداروں کے رول نے بہت زیادہ اہمیت

قبول کریں گے۔

اگر ۲۰۰۱ء تک دیہی علاقوں کی ترقی میں ترقی پسندانہ تجاویز شامل کرنے کی کوئی امید ہے تو اس کا انحصار اس حد پر ہوگا جس حد تک سماجی ادارے اس میں شامل ہونا چاہیں گے۔ ان غلط فہمیوں

اگر ساڑھے تین کروڑ کنبوں یا دیہی کنبوں کی کُل تعداد کے لگ بھگ ۴۵ فیصد کے پاس بجی زمین بالکل نہیں ہوگی یا ۱۴ء ہیکٹیر سے بھی کم ہوگی تو ۲۰۰۱ء تک اُن کا مستقبل بلاشبہ تاریک ہوگا۔ اس ملک کے دو تہائی زرعی مزدور پہلے ہی قرض میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جو صورتِ حال نظر آتی ہے اُس سے اُن کے حالات بہتر ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

سرکاری مشینری ایک بے قابو دیو بن گئی ہے۔ اسی لیے رضا کار اداروں کا رول بے حد اہم ہو گیا ہے — اور مجھے یقین ہے کہ ۲۰۰۱ء میں وہ دیہی علاقوں میں ایک ایسی قوت بن جائیں گے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا۔ آج تمام ملک کے دیہات میں سماجی اداروں کو جب مجموعی طور پر دیکھا جائے تو وہ اب سمندر میں قطرہ نہیں رہے۔ چوں کہ یہ دیکھنا حکومت کا کام ہے کہ پبلک سرمایہ زیادہ موثر طور پر استعمال کیا جاتا ہے چوں کہ ہم حکومت کی کمزوری کو دیکھتے ہیں کہ وہ نیچے سے نظام کو کنٹرول کرنے اور

اختیار کرلیا ہے۔ حکومت نے انسدادِ افلاس اور کم از کم ضروریات کے پروگراموں کے لیے رضا کار اداروں کو فنڈوں کی منتقلی کو زیادہ اہمیت دینی شروع کردی ہے۔ لیکن رضا کار ادارے اتنے طویل عرصہ تک حکومت کے اداروں کے بارے میں شاکی رہے ہیں۔۔۔ اور ان کی شکایت بجا بھی ہے — بلاشبہ ان میں تبدیلی آنے میں وقت لگے گا — لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اب ماحول اچھا ہے کہ وہ میز کے گرد بیٹھیں اور اپنی شرائط پر ایک معاہدے کے لیے بات چیت کریں جس کی بنا پر وہ حکومت سے فنڈ

کو دور کرنے کے لیے فورم قائم کرنے ہوں گے جن کی جڑیں نہایت گہری ہیں۔ ضابطوں کو آسان بنانا ہوگا جن کے چھوٹے چھوٹے گروپوں کو فنڈوں تک زیادہ رسائی حاصل [illegible] ترقی جائے۔ [illegible] پسندانہ تجاویز [illegible] خصوصی [illegible] مدد آسان [illegible] کے [illegible] ایسے [illegible] کے [illegible]

رومیش تھاپر

۲۰۰۱ء میں زندگی کا ڈھب

بھیڑ بھاڑ والا اور اُلجھا ہُوا مُستقبل

حکمراں سیاستدانوں اور اُن کے لواحقین اور متعلقین کی طرف سے یہ بات بڑے زور و شور سے کہی جا رہی ہے کہ ملک کی سو کروڑ آبادی اکیسویں صدی میں قدم رکھ رہی ہے، — اس صدی میں جس کے آنے میں صرف ۱۴ سال باقی رہ گئے ہیں۔ اس خبر کی تشہیر اس لیے زوروں پر ہے کیوں کہ یہ اس بات کی پردہ پوشی کرتی ہے کہ آج بھارت میں ۳۵ کروڑ افراد بھوکے سوتے ہیں اور کل یعنی آنے والی مدت میں یہ تعداد بڑھ کر ۵۰ کروڑ تک پہونچ جائیگی۔ ہم نے جس طرز کی ترقی کی ہے اور جو راستہ اپنایا ہے، یہ اسی کی ایک افسوسناک منطق ہے۔ یہ شاہی انداز کا ایک فیصلہ ہے، خواہ آپ یقین کریں یا نہ کریں۔

ہمیں آزادی ملے تقریباً ۴۰ برس ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں ہم بہت کچھ بدلے ہیں۔ لیکن جدید کاری کے عمل سے ترقی کا جو راستہ اپنایا گیا ہے، اس نے غریبی کے ڈھنگ کو بہت کم بدلا ہے۔ اس عرصے میں ملک میں تقریباً دس کروڑ دولت مند اور امیر لوگوں کی ایک فوج ضرور تیار ہوئی ہے جن کی پشت پناہی اور مدد کے لیے تقریباً ۲۰ کروڑ افراد ترقی کی مختلف منزلوں میں ہیں اور دیہات کے غریب کسان جو کہ دو وقت روٹی نہیں کھا سکتے، شہری خوشحالی پر رشک کیا کرتے ہیں۔ لیکن یہ بدلتا ہوا ڈھانچہ جو کہ بالائی طبقے کے حق میں جاتا ہے، غریبی کے مارے ہوؤں کو اور غریب کرتا جا رہا ہے۔

بیسویں صدی کے بھارت میں مالدار طبقوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اگر ذرا غور سے دیکھیں اور فکر سے کام لیں تو معلوم ہوگا کہ بس سروس ضرورت کے مقابلے بہت کم پایا گیا ہے۔ اسی طرح ہمارے ہسپتال بدنظمی کا شکار ہیں، بنکوں کی کارکردگی غیر تسلی بخش ہے، خوراکی ذخیروں کے اندازے غیر مستحکم اور غیر تصدیق شدہ ہیں۔ بجلی کی تیاری، فولاد، کوئلہ، سیمنٹ، کیمیاوی کھادوں، دواؤں اور کیمیاوی اجزا کی تیاری سے متعلق پراجیکٹوں میں عملہ ضرورت سے کہیں زیادہ ہے اس کے علاوہ حال ہی میں جنگلات کا صفایا ہو رہا ہے جس سے معیشت پر بھاری بوجھ ہے اور سیلاب ہر سال آ رہے ہیں یا پھر ان کے نہ ہونے سے کہیں کہیں خشک سالی کا سامنا ہے۔ ترقی کے عمل کے نتیجے میں ملک میں بچوں کی پیدائش کی شرح کم ہونی چاہیے تھی لیکن گھٹنے کی بجائے یہ بڑھی ہے۔ کیوں کہ ترقی کے ذریعے غریبی کم نہیں ہو سکی ہے۔ غریب عوام بچوں کو روٹی کمانے کے لیے کام پر لگا دیتے ہیں، خواہ اس کے عوض ان بچوں کو کتنی ہی معمولی اُجرت کیوں نہ ملے۔

سیاسی سطح پر خاندانی منصوبہ بندی کے

[illegible] سکتی ہے جب تک [illegible] نہ ہو، اور [illegible] کے ساتھ بچوں کی [illegible] نہ دبا جائے، بچوں کی پیدائش کا عمل رکے گا نہیں۔ غریب عوام شرحِ ثلاث میں گرفتار رہ جاتے ہیں۔ کوئی بھی 'ریڈیکل اس' کی اس طبی مہم کا خیال نہیں رکھتا جو کہ بچوں کی تعداد کو گھٹانے سے متعلق ہے۔ ملک کے بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں عورتوں کے لیے بنیادی نوعیت کی طبی سہولتیں نہیں ہیں۔ یہ عورتیں مجبوراً استقاطِ حمل کے لیے غیر آزمودہ نسخے استعمال کیا کرتی ہیں۔ مردوں کی حیوانی خواہشات بدستور بنی رہتی ہیں اور وہ اپنی جنسی بھوک مٹانے کے درپے رہتے ہیں، انھیں اس کا مطلق خیال نہیں کہ مستقبل کے لیے وہ کیا بوجھ پیدا کر رہے ہیں۔ سلسلوں کے درمیان کی کڑیاں آنکھوں سے اوجھل رہتی ہیں اور بے چہرہ نکھوکھا عوام بے چہرہ ہی رہتے ہیں۔

دورِ حاضر کی ترقی کا قانون یہ ہے کہ شہری علاقے اپنی طرف کھینچتے ہیں، دیہات کے نکھوکھا عوام شہروں کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ غریب دیہی عوام شہروں کی طرف بھاگتے ہیں۔ ان کی اولاد زیادہ ہوتی ہے اور چوں کہ وہ سب کھانے کو مانگتے ہیں، لہٰذا یہ غریب مجبوراً شہروں کی جانب رُخ کرتے ہیں۔ اس رُجحان میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اکیسویں صدی میں داخل [illegible] وقت شہروں کی آبادی دوگنی ہو جائے گی۔ جب ہم آج [illegible] دوبارہ نظر ڈالیں گے تو کلکتہ [illegible] عالم [illegible] کا ایک شہر [illegible]

برصغیر کو صرف ایک ہی طریقے سے بچایا جا سکتا ہے اور وہ ہے ترجیحات میں بنیادی نوعیت کی تبدیلی — جس سے کہ شکستہ دیہات کو بچایا جا سکے اور ان کو کشش کا مرکز بنایا جا سکے — ایسا مرکز جہاں ملک کے غریب عوام کی گزر بسر کا سامان ہو اور وہ اپنی زندگی گزار سکیں۔

میں اس طرح کی کسی بھی اصلاح سے مایوس ہوں، بدعنوان پولیس، نااہل افسروں، حریص سیاستدانوں اور بے حس کارکنوں سے عوام میں مایوسی کا جذبہ پہلے ہی سے ہے۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ آج کے دور میں ماحول ہی ایسا بنا ہوا ہے کہ بہت کم لوگ جذبۂ انسانیت اور ایمانداری سے زندگی گزار سکتے ہیں۔ بلاشبہ ایمانداری کے لیے ضروری ہے کہ سادہ زندگی یا نجی دولت۔ لیکن اقتدار اور استحقاق کی جستجو میں رہنے والے ان دونوں کے مخالف ہیں۔ حکمراں چیدہ طبقہ چھوٹے چھوٹے حلقوں میں اپنے مستقبل کی تعمیر کیا کرتا ہے جسے بلاشبہ نجی حلقوں کی طرف سے تحفظ ملتا ہے۔

ہم اکیسویں صدی پر توجہ مبذول کرا رہے ہیں۔ یہ دراصل ایک ایسی مہم ہے جو بتدریج ترقی کی داستان ہے۔ شماریات اور اعداد و شمار سے ہندوستان کی جواں مردی اور ترقی کی داستان کا اندازہ لگانے کی کوشش کی جاتی ہے مگر یہ اعداد و شمار کسی بھی انفرادی ہندوستانی سے مطابقت نہیں رکھتے خاص کر اُن لوگوں سے جو نچلی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں، اس لیے سماج میں جو جوش و خروش اور حرکت پائی جاتی ہے، اسے کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ خطرہ ہے کہ یہی جوش و خروش سماج کو پارہ پارہ نہ کردے۔ دہشت پسند نوجوان کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہے۔ اس لیے مجبوراً وہ اسمگلنگ کو اپناتا ہے۔ ہیروئن کی تجارت کرتا ہے، مجرمانہ حرکتیں کرتا ہے، اور مذہب کا لبادہ اوڑھتا ہے اور اس میں مسرت محسوس کرتا ہے، ایسے بھی فرقے اور قبائل ہیں جو ازمنۂ وسطیٰ کے قوانین اپنائے ہوئے ہیں۔ وہ چند مقامات کو "مقدس" مانتے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس نہ تحقیقی مواد ہے اور نہ سچ جھوٹ کے درمیان فرق کرنے کے واسطے مطالعہ ہے۔ آبادی سے بھرپور اور بے وثوقی کے ساتھ حکومت کی جانے والی اس سرزمین پر عوام کا لیڈر ہی سب سے بڑا ہوتا ہے۔ وہ ان لوگوں کو خاموش کر دیتا ہے جو عقل کی بات بتانا چاہتے ہیں۔ وہ طاقت کا استعمال کرتا ہے گویا اسے ووٹ کی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ جمہوریت بھی انتشار پسندی کا سبب بنتی ہے۔ یہ ایک ایسے آدمی کے گرد منظم رہتی ہے جو اسے اس انتشار سے بچا سکے، لیکن اُسے جو ملتا ہے وہ نتائج کی صورت میں ہوتا ہے۔

تعلیم کی بات نہ کیجیے۔ خواندگی کو عام کرنے کے نام پر مذہبی احیاء دیکھنے کو ملا ہے۔ زبانوں میں کتابوں کا فقدان ہے۔ مذہبی درسی کتب کا مطالعہ ہی پڑھائی سمجھی جاتی ہے۔

علم کی تلاش اور تحقیق کی کوشش کا فقدان ہے۔ ذہین طالب علم [illegible] ملکوں میں کمانے کی غرض سے [illegible] جاتے ہیں، انھیں [illegible] ہے۔ کمپیوٹر سائنس [illegible] میں جو گندگی بھر [illegible]

لوٹ کر آئے گی۔ اقتدار کی دنیا گندگی کے انبار سے پٹی پڑی ہے۔ تبدیلی کا منظر نامہ نظر ہی کہاں آسکتا ہے۔ سنہ۲۰۰۰ء میں ہم کیا دیکھ سکتے ہیں؟ اس میں سہولتوں کی بڑے پیمانے پر کمی کے آثار ہیں۔ اس سے منظم اور مہذب زندگی مسمار ہوسکتی ہے۔ ملک کے بڑے حصوں میں خشک سالی کا سامنا ہے، جنگلات کے صفائے سے خشک سالی عام ہوچکی ہے۔ بارشوں کی کمی ہے۔ ریگستان بننے کے امکانات اس قدر مستحکم ہیں کہ شجرکاری کی کوئی بھی مہم انھیں نہیں روک سکتی۔ قحط سالی سے موت واقع ہوتی ہے، غریب لوگ چراگاہوں کی تلاش میں ادھر سے ادھر گھومتے نظر آتے ہیں مگر وہ کہیں دکھائی نہیں پڑتیں۔ امیر آدمی غیر ملکوں میں جا رہے ہیں۔ ملک میں محرومیوں کے شکار لاکھوں افراد ہیں جن کی تعداد میں روزانہ اضافہ ہو رہا ہے اور وہ روشن مستقبل کے انتظار میں ہیں۔ لیکن محض مستقبل کو اس نگاہ سے دیکھنا دانشمندی نہیں کہی جا سکتی۔ ہم میں سے بہت لوگ جدوجہد کے لیے خود کو تیار پاتے ہیں۔ جو لوگ تبدیلی لانے کی قوت رکھتے ہیں، انکو سمجھانے بہلانے اور پھسلانے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ سماج کو اس ابتری سے بچایا جا سکے جیساکہ اوپر بتائی گئی ہے۔ سو کروڑ کی آبادی والے ملک میں ان لوگوں پر توجہ کرنا اور ان کے لیے منصوبہ بندی ضروری ہے جو کہ اب تک مقابلتہً کم خوش نصیب ہیں۔ اس عمل سے شاید ہم کامیاب ہوسکیں۔ بیس برس پہلے یونیسکو (تعلیم، سائنس اور ثقافت سے متعلق اقوام متحدہ کی تنظیم) کے زیر اہتمام جواہر لال نہرو پر ایک بین الاقوامی گول میز کانفرنس میں ہم نے انتہائی زود حس اور احساس و ادراک کے مالک ایک اجتماع میں ایک پراجیکٹ تجویز کیا تھا۔ جس سے زندگی گذارنے کے ایک نئے طرز اور ترقی کے عمل کو آگے بڑھانے کے ایک نئے ڈھنگ کے لیے راستہ ہموار ہو سکے۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اس پراجیکٹ کی حمایت کی تھی۔ ۱۹۶۶ء کی یونیسکو کے عام اجلاس میں اسے اتفاق رائے سے منظور کیا گیا تھا۔ اس کے چند ضروری حصے درج ذیل ہیں:-

سب سے پہلے سرکاری کنٹرول سے مبرا صنعتی، زراعتی اور دیگر طرح کے کاروبار اور کوششوں اور ان کے برعکس مرکز کے زیر اہتمام منصوبہ بندی کے تصورات کا ذکر کیا جاتا ہے، دونوں ہی تصورات کے حامی یکساں مقاصد کے حصول کے لیے دوڑ میں لگے ہیں۔ ترقی پذیر سماج ان کی نقل کے لیے کوشاں ہیں۔ سماجی ترقی کو نظرانداز کر کے مادی وسائل کے حصول پر زیادہ زور ہے۔

منصوبہ بندی کے مذکورہ دونوں طریقوں میں اقتدار کی شکست و ریخت واضح ہے دونوں طرح کے طریقوں کے تئیں زبردست حمایت کا جو انداز نظر اپنایا گیا ہے اس نے نظام کو غیر واضح بنا دیا ہے۔ چنانچہ سائنس اور ٹکنالوجی سے انسانی مفاد کیلئے اس طرح کام نہیں لیا جا سکا جس طرح کہ لیا جانا چاہیئے تھا۔ مگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہیں یا ماضی کے تجربات کی روشنی میں موجودہ رجحانات کو ٹھیک ٹھیک پہچاننا ہے۔ عوام کو نئے اقداری نظام کی طرف راغب کرنا ہے۔ یہ نیا نظام ہی ان ضوابط کو ہمارے فروغ کا باعث بنا سکے گا۔ آج اس نظام کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کے ترقی پذیر سماج کو اس کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے، وسائل محدود ہیں، لہٰذا ان کے ضمن میں ترجیحات کا تعین اور ان سے بھرپور استفادے کا مسئلہ بیحد پیچیدہ ہے۔ اگرچہ ترقی یافتہ ممالک میں صنعتی انقلاب کا عمل مکمل ہوچکا ہے اب وہاں سائنس اور ٹکنالوجی کے انقلاب کے ابتدائی ردعمل سے ہل چل کی کیفیت ہے ہندوستان ایسے ترقی پذیر ملک میں صنعتی ترقی کے عمل اور اس کے ردعمل دونوں کا سامنا ہے آج ذرائع ابلاغ اور نشر و اشاعت کے اداروں نے ہمارے ذہنوں کی کھڑکیاں کھول دی ہیں۔ ان کے اثرات سے ہم خود کو نہیں بچا سکتے۔ پچھلے دو برسوں سے انسانی علوم کو بے پناہ فروغ حاصل ہے۔ ہم چوں کہ ابھی ارتقائی منزل طے کر رہے ہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ انسانی سرگرمیوں سے پوری طرح باخبر ہوکر بصیرت کو جلا دینا ضروری ہے۔ تبدیلی اس انداز کی ہو جس سے انسان میں جذبۂ انسانیت فروغ پا سکے۔ اسی طرح کی تبدیلی کے لیے ہمیں کوششیں کرنی ہیں اور انھیں انسان کے شعور کا ایک ضروری جزو بنا لینا چاہیئے۔

ہمارے چاروں طرف جو مختلف طرز حیات دکھائی دیتے ہیں ان کی گوناگونی دیکھ کر انسان حیران ہو جاتا ہے، اس کے ساتھ دلچسپ بات یہ ہے کہ انسان نے جس تیزی سے سائنسی اور تکنیکی ترقی کی ہے، اس کی انجام دہی میں انسان کے سامنے یکساں طرز کے مسائل سامنے آئے ہیں۔ اس سے جڑی ہوئی ایک اور بات یہ کہ مختلف خطوں میں ترقی کا عمل مختلف سطحوں پر ہے اور مختلف رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس سے یہ ضرورت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اولین حقیقی عالمی تہذیب کے بنیادی خط و خال کی ترتیب و تشکیل اپنی جگہ بیحد اہم ہے۔ یہ ایک ایسا چیلنج ہے جسے حل کر کے ہی مشرق۔ مغرب اور شمال۔ جنوب کی تقسیم کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر بنیادی ڈھانچہ غیر متوازن یا ناقص ہے تو وہ عمارت ڈھے جائیگی جو ہم تعمیر کر رہے ہیں۔ ماضی اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ انسانی سماج کبھی

طرح سے اپنی ٹکنالوجی کا غلام ہو کر رہ گیا تھا۔

ٹکنالوجی انسان کے ہاتھ میں ایک ایسا اوزار ہے جس سے روئے زمین پر اس کی زندگی بہتر بنائی جا سکتی ہے۔ مگر اس کے لیے دنیا کے دانشور کارکنوں کی تخلیقی صلاحیتوں اور اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہے۔ آج کے دور میں اقداری نظام کی شکست کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انسان کے سماجی مرتبہ کو کار، ریفریجریٹر اور ریڈیو وغیرہ کے ذریعے پرکھا جاتا ہے۔ حالاں کہ یہ تو وہ سامان ہے جو انسان کی مدد کے لیے ہے مگر کچھ ایسے سماج بھی ہیں جنھوں نے ان کی حصولی کو ہی مقصدِ حیات سمجھ لیا ہے، ہم مستقبل کی طرف بغیر کسی واضح تصور کے بڑھ رہے ہیں مگر ہمیں نہیں معلوم کہ ہم عوام کو کس معیارِ زندگی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ مقصد کے عدم تعین کا یہ نقص سبھی سماجوں میں ملتا ہے، خواہ وہ ترقی پذیر معاشرہ ہو یا ترقی یافتہ۔ مالدار قومیں فضول خرچیوں کا شکار ہیں، حالانکہ ان کے یہاں بھی پسماندہ علاقے ہیں۔ جو قومیں مالداری اور خوشحالی کے گوشوں کی طرف بڑھ رہی ہیں، وہ نقالی کرکے فضول خرچیوں کے ذریعے محدود وسائل کی تضیع میں مصروف ہیں۔ انسان کو بامعنی زندگی عطا کرنے کے لیے مختلف ثقافتی طرزِ حیات کے نام نہاد مالدار خوشحال معیارات کی دورِ حاضر سے مطابقت کو پرکھنا ہوگا۔ اور ان بنیادی اقدار کی نشاندہی کرنی ہوگی جن کے سہارے انسان کو آگے بڑھنا چاہیے۔

ترقی کا بنیادی مقصد نہ صرف کایا پلٹ ہے بلکہ انسان کی زندگی سے اس کے تناؤ کو دور کرنا ہے لیکن عملاً یہ تناؤ سائنس اور ٹکنالوجی کی بے پناہ دوڑ اور تبدیلی کے عمل کے دوران بڑھا ہے۔ اس سے انسان کو بنیادی مقصد یعنی سکون اور آرام نہیں حاصل ہو سکا ہے۔ اس سے ترقی کے عمل غیر انسانی حرکتوں کے موجب بن گئے ہیں۔ دنیا میں یہ شعور بیدار ہو رہا ہے کہ وہ کون سے دباؤ ہیں جن کے باعث سماجی تناؤ پیدا ہو رہا ہے اس کے سبب گزشتہ برسوں کی ترقیاتی کوششیں بے سود ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہم نے اچھی زندگی کے متعلق جو مسلمہ تصورات قائم کیے ہیں ان کے خلاف ہم کو متنبہ کیا جا رہا ہے اور اس سلسلے میں آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ انسان کی بنیادی ضرورتوں کے لیے وضع کردہ معیار کی جانچ پڑتال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا دائرہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے۔ اگر ماضی ہمارے لیے سبق فراہم کر سکتی ہے تو ہمیں اس سے ضرور سیکھنا چاہیئے۔

اس کرۂ ارض پر جو بڑی بڑی تہذیبیں ابھریں، ان کے زوال کے مختلف اسباب سامنے آئے۔ جو تہذیب اپنے زمانہ میں خوشحالی کے نصف النہار پر پہونچی، وہیں سے اس کا زوال شروع ہوا۔ جب کسی تہذیب میں طاؤس و رباب کو غیر معمولی دخل حاصل ہوا تو اس نے اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا۔ آج کے دور میں بھی کچھ اسی طرح کے مناظر ہمارے سامنے ہیں، حالانکہ اس کے بالمقابل ہمارے سامنے ان لکھوکھا عوام کی زندگی بھی ہے جو کہ انتہائی پسماندہ معیارِ زندگی رکھتے ہیں۔ زیادہ تر نوعِ انسانی اس سلسلے سے تعلق رکھتی ہے۔ فضول خرچی کا عمل دخل ہر جگہ کارفرما ہے۔ اقدار کی شکست ہر جگہ دیکھی جاتی ہے، انسانی تعلقات زوال پذیر ہیں، بین الاقوامی سیاحت آج عالمی صنعت کے طور پر ابھری ہے اور... اس سلسلے میں نمایاں اثرات رکھتی ہے، حالانکہ اس کے ثقافتی اثرات بھی ہیں۔ ہر ایک سروے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مالدار ملکوں کی ترجیحات پوری دنیا میں سیاحوں کے لیے بنیادی ضرورتوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

ان حالات میں جبکہ آبادی میں اضافے کی رفتار وسائل میں اضافے کی رفتار سے کہیں زیادہ ہو، اس بات کی ضرورت ہے کہ مہذب طرز کے نئے اصولوں کی ترویج اور اشاعت کی جائے اور ایسا بنیادی مواد فراہم کیا جائے جو اس نئی تہذیب کا بنیادی عنصر ہو۔ یہ نیا طرزِ حیات ایک طرح سے انسان کی باوقار زندگی کے قیام کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اس طرح کے اندازِ نظر کے لیے جو معیار اپنایا جائے وہ اردگرد کی حقیقتوں کے مطابق ہو، اس کے ذریعے زندگی کو سادہ بنانے اور غیر ضروری اخراجات سے گریز کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے قول و عمل کے تضاد کو دور کیا جانا ہے، اس نے ہی تو ہماری تہذیب کے دعووں کو کھوکھلا کر رکھا ہے۔ ایک طرف ہم تضیع اور فضول خرچیوں سے بھرپور زندگی گزار رہے ہیں اور دوسری طرف اس کے لیے ضروری مواد مہیا کر رہے ہیں، ہم اوور ٹائم پر کام کرتے ہیں مقصد یہ کہ فضول خرچیوں کے لیے وسائل جمع کیے جا سکیں کیوں کہ سماجی مرتبے کی انفرادی اور قومی سطح کی نشانیاں مہیا کی جا سکیں۔ فرد اور قوم کے درمیان یہ مساوات غیر سائنسی نہیں ہے

شکست خوردہ لکھوکھا عوام کو بامقصد زندگی سے ہمکنار کرنے کے لیے ہمیں اپنے وسائل اور جرائد کے مواد کو از سرِ نو ترتیب دینا ہوگا۔ شکست خوردگی کے شکار عوام پوری دنیا کی آبادی کا دو تہائی ہیں اور آسمان کے نیچے اپنا حق مانگنے کے لیے اوپر اٹھ رہے ہیں۔ جس قدر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان تکنیکی ترقی کے محاذ پر فرق رہے گا، اس قدر عوام کے معیارِ زندگی میں فرق نظر آئے گا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ بھی ہے

کہ ترقی پذیر ممالک کے عوام کی خواہشات اور اُمنگیں خوشحال اور مالدار ملکوں کے عوام کی طرح سے ہی آگے بڑھیں گی۔ اگر یہ خواہشات پوری نہ ہوں گی تو اس سے پائیدار امن کی راہ میں رکاوٹ پڑے گی۔ اس لیے انسانی ذہن کو اس مسئلے پر توجہ کرنی چاہیئے۔ چنانچہ مستقبل کے لیے جو بھی لائحہ عمل ہو، وہ ایسا ہو جو دونوں سماجوں کے تقاضوں کو پورا کرسکے۔

دنیا سُکڑتی جارہی ہے، اس میں امن کا بھیانک بحران بھی ہے اور انسانی ذہن کے ردِّ عمل کا بحران بھی۔ ان دونوں کا قریب سے مطالعہ ضروری ہے۔ ان دونوں کا گہرا تعلق ہے ایک پہلو کی کمزوری سے دوسرا متاثر ہوگا۔ پوری صورتِ حال کو سامنے نہ رکھنے سے ہمیں اُن قوتوں کا شکار ہونا پڑتا ہے، جنکے خالق ہم خود ہیں۔ اگر ہم ذہن کی بات کرتے ہیں تو ہمیں یہ بھی سمجھنا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی میں انتہائی کامیابیوں سے یہ ذہن ماؤف ہوکر رہ گیا ہے۔ پچھلے ۵۰ برسوں میں علم کی زبردست ترقی ہوئی ہے، لیکن انسانی ذہن کی ترقی کا موقع نہ مل سکا اور اسی لیے وہ تبدیلی کے ساتھ خود کو ہم آہنگ نہ کر سکا۔ اسے عام انسانوں کی بھلائی کے لیے منضبط نہ کرسکا۔ یہ ترقی اس قدر تیز رفتار تھی کہ انسان اس کے مضمرات کو سمجھ ہی نہیں سکا اس کے انسانی رشتوں پر تعلقات اور اس کے مصلحات پر غور ہی نہ کرسکا۔

ہم نے صرف اس خیال پر اکتفا کی ہے کہ انسانوں کے ذہنوں میں امن کے قلعوں کو مضبوط کرنے کے لیے تبادلۂ باہم، باہمی مفاہمت اور ثقافتی تبادلے کافی ہیں۔ ہم ایسا کہتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارا تعلق ان سرگرمیوں سے ہے جو کہ سیاسی، اقتصادی، سماجی اور ثقافتی، گروہ بندی کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہ گروہ بندی اور دُنیا میں گُٹ بندی ہی مہذّب زندگی کے لیے خطرہ ہے سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی چونکہ ترقی یافتہ ملکوں کے حصے میں آئی ہے، لہٰذا دُنیا کے ترقی پذیر اور ترقی یافتہ، خطوں کے درمیان اس طرح کی گروہ بندی کو تقویت ملی ہے مستقبل کے سماجی ڈھانچے کو سائنس اور ٹکنالوجی کے جدید پیش رفتوں کے ضمن میں دیکھنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں یہ دیکھنا بہت ضروری ہے کہ کیا ہم اب بھی وہی اقدار اپنائے ہوئے ہیں، جو دَورِ حاضر میں اپنی افادیت کھو چکی ہیں، اسی طرح کے بحران ماضی کی تہذیبوں کو بھی پیش آئے ہیں۔ کیا ہماری تہذیب بھی اسی طرح کے بحران سے دوچار ہے۔ یہ وہ سوالات ہیں جن کا تعلق انسان کے ذہنی ارتقاء سے بھی ہے اور وہ روئے زمین پر انسان کی بہبود سے بھی متعلق ہیں۔

سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے انسان کے بنیادی مفادات سے دُور رہ کر کام کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نے نوعِ انسانی کی اتفاقی طور پر خدمت کی ہے۔ ہمیں اُس علم و دانش پر عبور ہونا ضروری ہے جو اُس انسان کی کوششوں سے معرضِ وجود میں آئی ہے۔ مستقبل میں طرزِ حیات اور طرزِ عمل کے لیے ماڈل وضع کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ان کے استعمال سے موجودہ طریقِ کار میں نظم و ضبط لانے کی کوشش بھی ضروری ہے۔ لیکن ترقی پذیر معاشرے اس جانب کم ہی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی خواہش زیادہ تر ان عادات اور فضائل کا تحفظ ہوتی ہے جن کے وہ عادی بن چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے دیہی سماج کی بنیادی سرشت۔ اس کے شہروں کی طرف منتقل ہونے کی کوششوں سے پارہ پارہ ہو چکی ہے۔

ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کی ملی جلی کوششوں سے ترقی یافتہ ٹکنالوجی کو علاقائی ضرورتوں کے مطابق ڈھالا جاسکتا ہے۔ اس سے موجودہ سماج جدید کاری کے عمل کو زود ہضم بنا سکتا ہے۔ اس سے بہت زیادہ ترقی یافتہ اور بہت کم ترقی یافتہ کے درمیان فرق دور ہو سکے گا اور اس سے تصنع کے عمل کو روکا جا سکے گا۔ جدید شہری ترقی سے انسان معاشرے میں نہ صرف خود کو تنہا پاتا ہے بلکہ وہ شکست و خوردگی سے بھی دوچار ہے۔ انسان ترقی کے جدید دور میں اس سے بھی ناآشنا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے اور وہ خود اپنے لیے کیا کچھ کر چکا ہے۔

ہمارے بڑے بڑے شہروں میں ٹریفک بڑے پھیلنے پر ہے۔ شہری ترقی کے نتیجے میں اس میں بھی اضافہ ہوا ہے، جو گاڑیاں فاصلہ کو تیزی سے طے کرانا چاہتی تھیں، وہی گاڑیاں اب راستے کی رکاوٹ بن گئی ہیں، مگر ہم ہیں کہ ٹریفک کو اور زیادہ مشکل بنانے میں معاون گاڑیوں کے بنانے میں مستقل لگے ہیں۔ اسے اچھی زندگی کا اصول سمجھا گیا ہے۔

مالدار اور خوشحال ملکوں میں معیارِ زندگی کو اتنی وقعت دی جارہی ہے گویا کہ یہی کچھ ان کی زندگی کا مقصد ہے اور یہی کچھ وہ ہے جس کی انھیں پرستش کرنی ہے، ہم کو جس کی ضرورت نہیں، اس کے لیے ہم شب و روز کوشاں نظر آتے ہیں اور اسی کو ترقی کا محور سمجھتے ہیں، اور یہ سب وہ کوششیں ہیں جن سے نفسیاتی تناؤ بڑھتا ہے اور تخلیق کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں دھوم دھڑکے سے کاموں کو انجام دینا اور فضول خرچیوں میں آپسی مقابلہ کے اندر ہی وقت ضائع ہو رہا ہے۔

جو سماج دیگر اقدار سے ہمکنار ہو کر زندگی گزارتے ہیں، ان کی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں، سماج وادی نظریۂ حیات کے ملکوں میں

سماجی کنٹرول کی موجودگی کے باوجود شہروں کی پُرشور اور جنگلات کی طرح سے ہے، یہاں کے مختلف معیارات بھی فضول خرچیوں کے مظہر ہیں۔ اس کا کوئی متبادل بھی سامنے نہیں ہے۔ ہمارے یہاں بمبئی ایسے شہر میں اس طرح کی تمام باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ ۵۵ تا ۶۵ لاکھ افراد کے مستقبل کی علامت ہے۔ ہمارے منصوبہ ساز جانتے ہیں کہ اس راستے پر چلنا حماقت ہے، مگر ہم بھی کہ اسی پر کاربند نظر آتے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے لنغرول سے شکست نہیں دی جاسکتی۔ میں نے بحران کی ماہیت پر تفصیل سے بحث کرنے کی کوشش کی ہے، ہم شاید اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ آج ترقی کا جو عمل ہمارے پیشِ نظر ہے، وہ دنیا کو دو واضح رتبوں میں تقسیم کر دے گا۔ ان میں سے ایک وہ ہوگا جو انتہائی جدید اور ترقی یافتہ ہوگا، دوسرا صرف ترقی یافتہ ہوگا، دونوں کے پیچھے چلنے والے بھی چند ممالک ہوں گے۔ ایشیا اور افریقہ کے لکھوکھا عوام جلد ہی یہ حقیقت جان لیں گے کہ سائنسی اور تکنیکی انقلاب کے ڈھانچے میں وہ صدیوں کی خامیوں پر قابو نہیں پاسکیں گے تا وقتیکہ وہ ڈرامائی طور پر مختلف متبادل راستہ نہ اپنائیں اور اس کی راہیں متعین نہ کریں اور بطور مہم اس پر آگے بڑھنے کی کوشش نہ کریں۔ بصورت دیگر بھوک، شکست خوردگی، ظلمت پسندی وغیرہ کے مہیب حالات سے واسطہ پڑے گا جس سے بالآخر دنیا نیستی اور تباہی کی طرف جاسکتی ہے۔

اگر آپ اس بیان کو مبالغہ آمیز خیال کریں تو پھر آپ کا فرض ہے کہ آپ بتائیں کہ ترقی اُس عمل کے نتیجے میں جو ہم آج دیکھ رہے ہیں، دوسرا کون سا ثمر ہے ایک برائی کے چکر سے برائی کا دوسرا چکر اُبھا ہوا ہے۔ اگر بیماری پر فتح پالی گئی تو آبادی میں اضافہ کا مسئلہ سامنے آتا ہے، انسانوں کے اس ہجوم کی اُمیدیں ذرائع نشر و اشاعت کی مدد سے منظرِ عام پر آئیں گی اور ہر چیز کی مانگ بڑھے گی جب کہ وسائل اس کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔ ترقی کے پروگراموں کے لیے وسائل مالدار ملکوں سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ روئے زمین کے کم خوش نصیب ملکوں کو وسائل کی منتقلی پر آمادہ ہیں۔

ہم دنیا پر آج اس انداز سے نظر نہیں دوڑا سکتے جس طرح کہ ماضی میں۔ قوموں سے معاملہ کرنے میں یقیناً پیچیدگیاں حائل ہیں لیکن بنیادی اصولوں کی طرف لوٹنے کا عمل شروع ہو جانا ضروری ہے۔ جن ملکوں کے پاس اقتدار بھی ہے اور دولت بھی، وہ اس پیش قدمی کی ابتدا کر رہے ہیں۔ یہ عمل ان ملکوں کی طرف سے شروع ہونا ہے جو اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ انھوں نے جس کلچر یا ثقافت کو جنم دیا ہے، اسی میں سب کی نجات ہے۔ روئے زمین کی دو تہائی آبادی ایسی زندگی گزارتی ہے جو نہ صرف ترقی یافتہ ملکوں کے عوام سے الگ تھلگ ہے بلکہ جو ترقی یافتہ ملکوں کے چیدہ طبقات کے سپوتوں کی طرف سے مسترد کی جارہی ہے۔ افریقہ اور لاطینی امریکہ نیز ایشیا کے ممالک میں ثقافتی انتشار آپس کی تفریق کو تیز کر رہا ہے۔ یہ وہی انتشار ہے جو اکثر سماجوں میں آج بھی ہے اور جو سماجی نابرابری کے مسائل کو حل کرنے کے لیے آج بھی کوشاں نظر آتے ہیں۔ دنیا میں اس وقت گٹ بندی اور الگ تھلگ رہنے کا جو رُجحان شدت سے چل رہا ہے، اس کا ایک سبب نوجوانوں کی بغاوت بھی ہے یہ نوجوان مسلمہ اصولوں سے منحرف ہیں۔ انسان کی آگے بڑھنے کی کوششوں کے موجودہ امکانات کو یہ مسترد کرتے ہیں۔ اور اس راستہ کو منزل کا راستہ سمجھتے ہیں اور اسے انسان کی رُوح کی آزادی کے منافی جانتے ہیں۔ اس بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمہ سماجوں کے اقداری نظام اور سائنسی مستقبل کے درمیان جیسے ہم چاہتے ہیں، زبردست تضاد ہے۔ یہ صورتِ حال کسی بھی وقت آتش فشاں بن کر پھٹ سکتی ہے۔ اس صورتِ حال سے تباہی، نیستی، شکست خوردگی اور غصہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے متبادل ایسا اقداری نظام درکار ہے جو سوچ سمجھ کر بنایا گیا ہو، جو جذبۂ انسانیت کے نقطۂ نظر سے اپنا جائزہ رکھتا ہے اور جو سائنس اور جدید ٹکنالوجی کے عصری تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل ہو۔ مگر ہم اس دَور میں ایسا نظام قائم کرنے یا وضع کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

روشن خیال طبقہ اس بات میں یقین رکھتا ہے کہ مالدار ملکوں کی نقالی اپنے اندر بے پناہ صدمے رکھتی ہے اور آج کے پیچیدہ سماجی نظام میں ان کو برداشت کرنے کی قوت نہیں ہے۔ ترقی پذیر ملکوں کو ترقی یافتہ ملکوں سے سبق لینا چاہیئے۔ ہم حالات کو جوں کا توں رہنے کی ضرورت کی حمایت نہیں کر سکتے۔ یہ بے معنی اور آتش گیر مادے کی صورت میں کسی بھی وقت پھٹنے والی صورتِ حال ہے۔ ہمیں روشن خیالی لانے کے لیے کوششیں کرنی ہیں۔ انسان کے سامنے نئے امکانات واضح کرنے ہیں۔ میں سماجی اندازِ فکر میں ایک انقلاب لانے کی بات کہہ رہا ہوں — ایک ایسے اندازِ فکر کی بات کر رہا ہوں جو سائنس اور ٹکنالوجی کے انقلاب سے ہم آہنگ ہو سکے۔ دو انقلابوں کو ایک انقلاب میں بدل کر جو صورتِ حال سامنے آرہی ہے، ہمارا اسی سے واسطہ ہے۔ اگر اس صدی کے پہلے پچاس برسوں میں اقتصادی تھیوریوں کا بول بالا رہا تو دوسرے پچاس برسوں میں سماجی انقلاب کو اپنا موثر رول ادا کرنا پڑا ہے۔ سائنسی طریقوں سے زراعت کے ذریعے کئی باتوں کی ضرورت ہے۔ پہلے تو یہ کہ قطعات اراضی بڑے بڑے ہوں، بڑے بڑے فارم ہوں، ان میں مستقل

(باقی صفحہ ۰۰ پر)

جیوتی بسو

پلان تیار کرنیکا متبادل طریقہ

مکمل اور منصوبہ بند ترقی کے دو واضح راستے ہیں ۔ ایک وہ جس پر ہم آجکل چل رہے ہیں اور جو اپنے پیچھے سماجی تناؤ، وسیع پیمانے پر بیروزگاری، واضح نابرابری اور دیہات میں بیروزگاری چھوڑتا چلا گیا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اس راستے پر چل کر آئندہ مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ دوسرا راستہ جو مصنف نے بتایا ہے بڑا حقیقت پسندانہ ہے اور اسی پر چل کر بقول مصنف ہم اکیسویں صدی کے خواب پورے کر پائیں گے۔

ہمارے دیش میں سن ۲۰۰۰ء میں سماجی و سیاسی منظر کیسی طرح کا ہوگا اس کا انحصار بہت حد تک اس بات پر ہے کہ بڑے سیکٹروں مثلاً زراعت، صنعت اور تعلیم کی منصوبہ بندی کے لیے کونسا راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ پیداوار اور خدمات کی منصوبہ بندی کے لیے ان دو میں سے ایک راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے :-

ایک راستہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ پیداواری اثاثوں کی ملکیت کی موجودہ غیر مساوی تقسیم کو تسلیم کر لیا جائے بلکہ زراعت اور صنعت میں پہلے سے بھی زیادہ غیر مساوی تقسیم کو قبول کیا جائے اور پھر اس عدم مساوات کی بنا پر پیداوار کے پروگراموں کے خواب دیکھے جائیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ زراعت میں ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان کے ہر اوسط گاؤں میں ۵۰ فیصدی سے زیادہ زمین کے مالک وہاں کے دس فیصدی بڑے بڑے زمیندار ہوں گے۔ اور باقی ۹۰ فیصدی گھرانوں کے ہاتھ میں باقیماندہ ۵۰ فیصدی سے بھی کم زمین رہے گی جن میں سے نچلے طبقے کے ۲۰ فیصدی گھر بے زمین ہوں گے یا پھر ان کے پاس برائے نام زمین ہوگی۔ اس کے نتیجہ ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بعض اوقات غریب گھرانوں کی اکثریت قرضوں کے لیے امیر زمینداروں کا منہ تکا کرے گی اور نتیجتاً اپنی محنت کا کم معاوضہ قبول کرنے پر مجبور اور اپنی پیداوار مالکوں کے ہاتھ کم پر بیچا کرے گی۔

موجودہ قومی منصوبہ بندی میں زمین
کی اس غیر مساوی ملکیت کو تسلیم کیا جا چکا
ہے۔ صرف قومی سطح پر تھوڑی سی زراعتی زمین
گاؤں کے غربا میں پھر سے تقسیم کی گئی ہے۔
معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں پلان کی تیاری
میں قومی سطح پر زمینی سُدھار نہ لانے اور
زمین کی غیر مساوی تقسیم کے عمل کو جاری
رکھا گیا ہے۔

کا حوالہ دے کر بہت تعریف کی جاتی ہے۔
تاہم، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ٹکنالوجی اختیار
کرنے سے مزدوروں کی کھپت کم ہو جائیگی،
بیروزگاری بڑھے گی اور لوگوں کی قوتِ
خرید گھٹے گی۔

ہندوستان کی زراعت میں حال ہی
میں جو تضاد پیدا ہوا ہے اس کی وجہ یہی ہے۔
مثال کے طور پر ایک طرف تو اناج کے انبار
لگ گئے ہیں اور اناج کی پیداوار ۱۳ کروڑ ٹن
سے بھی زیادہ تک جا پہونچی ہے اور دوسری

زراعتی اُجرتوں کی شرح میں اضافہ ہو جائے
اور نتیجتہً زراعتی مزدوروں کی اور دیگر غریب
گھرانوں کی قوت میں اضافہ ہو جائے۔ اگر
اناج کے انبار کا ملک کے اندر اس طرح سے
استعمال نہیں کیا گیا تو یہ ہو سکتا ہے کہ اناج
برآمد کیا جانے لگے۔ میری رائے میں ایسا ہونا
بڑا افسوسناک امر ہوگا کیوں کہ اس سے غلط
قسم کی ٹکنالوجی کا انتخاب ہونے لگے گا، کم
مزدوروں سے کام لیا جائے گا، لوگوں کے
ہاتھ میں قوتِ خرید کم ہونے لگے گی اور کمزور
طبقے کے ہندوستانیوں سے اناج چھین کر،
برآمد کیا جانے لگے گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں پلان کی تیاری میں قومی سطح پر زمینی سُدھار نہ لانے اور زمین کی غیر مساوی تقسیم کے عمل کو جاری رکھا گیا ہے۔

طبقاتی مفاد

اس طرح کی صورتِ حال میں چوں کہ
پیداوار کے متعلق فیصلے بنیادی طور پر امیر
زمیندار گھرانے ہی کرتے ہیں، لہٰذا زراعت اور
دیگر متعلقہ سیکٹروں میں بھی پیداوار بڑھانے
کی منصوبہ بندی اس طبقے کے مفاد کو
مدِ نظر رکھ کر کی جائے گی۔ چوں کہ سرمایہ اسی
طبقے کے لوگوں کو مل سکتا ہے۔ اور چوں کہ
وہ یہ نہیں چاہیں گے کہ زرعی مزدوروں اور
دیگر غربا کی محنت کے مقابلے میں اپنی پوزیشن
کو کمزور ہونے دیں، یہ زمیندار ایسی ٹکنالوجی
اختیار کرنے لگیں گے جس میں محنت کی بجائے
سرمایہ کا استعمال زیادہ ہوتا ہو۔ درحقیقت
ساتویں پلان کے ضمن میں یہ ٹکنالوجی درآمد پر
بھی زیادہ انحصار رکھنے لگی ہے۔ حالاں کہ
اس ٹکنالوجی کی بعض اوقات اکیسویں صدی

طرف زراعت میں دیہاتی مزدوروں
کی کھپت کم ہوئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ
بہت سے دیہاتی گھرانے خطِ ناداری سے
نیچے رہیں گے۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر میں نے
نومبر ۱۹۸۵ء میں قومی ترقیاتی کونسل کے
ساتویں پلان سے متعلق اجلاس میں زور دار
لفظوں میں کہا تھا کہ اناج کے اس انبار کا
معقول حصہ لے کر دیہات میں اور شہروں میں
روزگار کے پروگرام چلائے جائیں۔ ابھی اس
مقصد کے لیے اناج کا مناسب استعمال نہیں
ہو پایا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس
سلسلے میں اناج کے استعمال پر زمینداروں کو
اعتراض ہے۔ کیوں کہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے

نتائج

لوگوں کی قوتِ خرید گھٹنے سے صنعتوں
کی ترقی پر بھی اثر پڑے گا۔ اگر صنعتی سرمایہ کے
مالک چند لوگوں ہی کو رہنے دیا گیا تو پھر زراعت
کی طرح صنعتی ٹیکنالوجی بھی وہی اختیار کی جانے
لگے گی۔ جس میں سرمایہ زیادہ لگے گا اور
مزدوروں کی ضرورت کم ہوگی۔ دیکھا جائے تو
حالیہ برسوں میں منظم صنعتی سیکٹر میں مزدوروں
کی تعداد فی کارخانہ کافی گھٹی ہے۔ اگر یہ رُجحان
جاری رہا تو اس سے صنعتی بیروزگاری بڑھے
گی اور مزدوروں کی قوتِ خرید کم ہوگی۔
گھریلو منڈی کی مجبوری اور عوام کے لیے

میں ناکافی قوتِ خرید ہونے کے اس مسئلے کے پیشِ نظر ممکن ہے کہ صنعتی سیکٹر ایسی مصنوعات کی تیاری کم کردے جو عوام کے ہاتھ بکتی ہیں اور ایسی اشیاء بنانے لگے جو امیر لوگ خرید سکتے ہیں۔ لیکن چوں کہ اس قسم کی چیزوں کے خریدار بھی بہت کم ہوں گے اس لیے اس کا علاج یہ ڈھونڈا جائے گا کہ گھریلو آبادی کو نظر انداز کرکے صنعتی اشیاء کی برآمد شروع کردی جائے گی۔

قرضے لینے پڑے جو اس غلط پالیسی کے پیشِ نظر ادا کرنے مشکل ہو جائیں گے تو ہماری ساری معیشت بین الاقوامی قرضوں کے شکنجے میں پھنس جائے گی۔ اس سے خود انحصاری کا مقصد متزلزل ہو جائے گا۔ جس کی ہم منصوبہ بندی کے آغاز سے ہی اُمید لگائے بیٹھے ہیں۔

ہندوستان کی منظم اقتصادی ترقی میں پبلک سیکٹر کے کردار میں حال ہی میں جو تبدیلیاں دیکھنے میں آئی ہیں اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ہم اپنے چہیتے مقصد سے دور

کے فوائد کو عوام تک پہنچایا جاتا لیکن جو پالیسی حال ہی میں اختیار کی گئی ہے وہ ہے اس سیکٹر کو مقابلتاً چھوٹا کرنے کی اور اس میں روزگار کے مواقع کو کم کرنے کی۔ اس کی مثال وہ حقیر رقم ہے جو پلان میں پبلک سیکٹر صنعتوں کے لیے رکھی گئی ہے۔ ساتویں پلان کے دوران سرمائے کی کُل پیدائش کا ۵۰ فیصدی سے زیادہ حصہ پرائیویٹ سیکٹر کے لیے رکھ دیا گیا ہے اور چند ایک ایسی پالیسیاں وضع کی گئی ہیں جو نجی صنعتوں کو فائدہ پہنچائیں گی۔ اگر یہ رُحجان جاری رہا تو ہم دیکھیں گے کہ اکیسویں صدی شروع ہونے پر صنعتی سرمائے کی

اگر غلط ترجیحات کا انتخاب کرکے ہندوستان نے اس ڈھنگ سے اکیسویں صدی میں داخل ہوا کہ عوام کی اکثریت ناخواندہ ہو یا ابتدائی تعلیم بھی حاصل نہ کرسکے تو یہ قوم کے لیے بڑی شرم کی بات ہوگی۔

لیکن کیا یہ پالیسی کامیاب رہے گی؟

بدیشی تجارت سے متعلق اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ برآمد ابھی زیادہ نہیں بڑھ پائی ہے۔ دوسری طرف صنعتوں میں اختیار کی جانے والی ٹکنالوجی پر اس قدر زیادہ سرمایہ لگانا پڑتا ہے اور اس قدر زیادہ مال باہر سے منگانا پڑتا ہے کہ درآمد بیحد بڑھ جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ بدیشی تجارت میں گھاٹے کا مسئلہ عارضی طور پر اس بات سے دب کر رہ جائے گا کہ قدرتی تیل مِل جانے سے ملک کو بہت منافع ہو رہا ہے۔ لیکن کب تک؟ آخر ملک کو بحران کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ اگر بعض بدیشی یا گھریلو حلقوں کی صلاح سے ملک کو بین الاقوامی ایجنسیوں سے

ہوتے جارہے ہیں۔ بنیادی صنعتوں کو پبلک سیکٹر میں لانے کی پالیسی دوسرے پانچسالہ پلان میں شروع کی گئی تھی۔ ان پبلک سیکٹر صنعتوں کی نشو و نما اور ان کے ساتھ ہی بعض پبلک سیکٹر لوازماتی سہولتوں مثلاً سینچائی، ٹرانسپورٹ وغیرہ میں اضافے سے ہندوستان میں چند ایک صنعتوں نے بہت ترقی کی ہے اور زراعت بھی بڑھی ہے اس تجربے کی بنا پر پالیسی تو یہ ہونی چاہیئے تھی کہ پبلک سیکٹر کا دائرہ وسیع تر کیا جاتا، اس کے انتظام میں ورکروں کو شامل کرکے اس کی کارگزاری بہتر بنائی جاتی اور اس سیکٹر

ملکیت پہلے سے بھی زیادہ غیر مساوی ہوگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسی ٹکنالوجی اختیار کی جائے گی جس میں مزدور کم رکھنے پڑیں اور سرمایہ کاری زیادہ کرنی پڑے، روزگار کے مواقع کم پیدا ہوں اور لوگوں کی قوتِ خرید محدود ہوکر رہ جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی پالیسی کے متعلق مرکزی سرکار کی حالیہ دستاویز اسی حکمتِ عملی کو سامنے رکھ کر تیار کی گئی ہے۔ اس حکمتِ عملی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس ٹکنالوجی کو چلانے کے لیے استعمال

اقلیت کو خاص طور سے تربیت دی جائیگی اور عوام کی طرف بے توجہی برتی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی پالیسی میں نام نہاد ماڈل اسکولوں پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔ نتیجتہً گنے چُنے شرفاء کے طبقے کے لیے تعلیم کے خاص مرکز قائم ہوں گے اور حالیہ برسوں میں پہلی بار عوام کے لیے ابتدائی تعلیم کو عام کرنے کی طرف بے توجہی برتی جائے گی۔

ہندوستان کے اکیسویں صدی میں داخل ہونے کا تذکرہ کرنا آجکل فیشن سا ہو گیا ہے۔ لیکن جب تک پرائمری تعلیم عام نہیں کی جاتی اور چند ایک طلباء کے لیے مخصوص اسکول کھولنے کی تجویز زیر غور ہے۔ یہ ناہموار تعلیمی پالیسی ہمیں کہاں لے جائے گی اور اس سے ناخواندگی کہاں تک دُور ہوگی؟

اگر غلط ترجیحات کا انتخاب کر کے ہندوستان اس ڈھنگ سے اکیسویں صدی میں داخل ہوا کہ عوام کی اکثریت ناخواندہ ہو یا ابتدائی تعلیم بھی حاصل نہ کر سکے تو یہ قوم کے لیے بڑی شرم کی بات ہوگی۔ چونکہ پیداوار اور خدمات کے تئیں پلاننگ کا یہ ڈھب عوام کی اُمنگوں اور امیر طبقے کے خلاف ہوگا، اس لیے اس میں یہ خرابی مُضمر ہے کہ لوگ منصوبہ بندی کے عمل میں شرکت نہیں کر سکیں گے اور تمام اقتصادی قوت اور فیصلے کرنے کی طاقت مرکزی سرکار کے ہاتھوں میں مرکوز ہو جائیں گی۔

مرکز کے اسٹیٹوں کے ساتھ اقتصادی تعلقات میں مرکزیت کے یہ رُحجان میری رائے میں اس پالیسی کا اظہار ہیں۔ نئی تعلیمی پالیسی کی دستاویز میں بھی تعلیمی پالیسی تیار کرنے اور اس پر کڑی نظر رکھنے کے سلسلے میں اختیارات مرکز کے ہاتھ میں رکھنے کا ارادہ صاف جھلک رہا ہے۔

جب اختیارات مرکزی حکومت کے ہاتھ میں دینے کی ایسی کوششیں کی جائیں تو مختلف اسٹیٹوں کے عوام میں یہ احساس ختم ہونے لگتا ہے کہ پلاننگ کے عمل میں وہ بھی ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ جب یہ احساس ختم ہو جاتا ہے اور غلط طریقے اختیار کرنے کے ماتحت بیروزگاری کا مسئلہ بڑھ جاتا ہے تو مذہبی جنون، ذات پات، ظلمت پسندی کے نام پر تفرقہ ڈالنے والی قوتوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جس سے ملک کی سالمیت اور اتحاد کو خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمیں واضح الفاظ میں ان تمام تفرقہ پیدا کرنے والی قوتوں کی مخالفت کرنی ہے۔ ہمیں ایک مضبوط اور متحد ہندوستان کی تعمیر کرنا ہے۔ اس کی خاطر اسٹیٹوں کی اقتصادی اساس کو مضبوط بنانا ہوگا۔ تب کہیں جاکر مرکز اور تمام اسٹیٹیں یعنی سارا ہندوستان مضبوط بنا رہ سکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان ان تمام دیواروں کو توڑتے ہوئے جو مذہب، ذات پات وغیرہ کے نام پر لوگوں میں پھوٹ پیدا کرتی ہیں۔ اکیسویں صدی میں داخل ہوں۔ اس کے لیے ہمیں جدوجہد کرنی ہوگی۔ تاکہ ایسی اساس تیار ہو سکے جس میں پیداواری ڈھانچے تک سب کی رسائی برابر ہو۔ چنانچہ ضروری ہوگا کہ ہم پیداوار اور خدمات کی منصوبہ بندی کے لیے ایک متبادل راستہ اختیار کریں۔

متبادل راستہ

موجودہ سماجی و اقتصادی ڈھانچے کی حدود کے اندر رہتے ہوئے یہ متبادل راستہ اس بات کا متقاضی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے زراعت اور صنعت کی پیداواری

> جب اختیارات مرکزی حکومت کے ہاتھ میں دینے کی کوششیں کی جائیں تو مختلف اسٹیٹوں کے عوام میں یہ احساس ختم ہونے لگتا ہے کہ وہ بھی پلاننگ کے عمل میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

اثاثوں کی موجودہ تقسیم کو زیادہ مساوی بنایا جائے۔ چنانچہ زراعت میں یہ کرنا ہوگا کہ

ہونے لگتا ہے کہ پیداوار اور طلب میں توازن قائم رہتا ہے۔ قوتِ خرید بڑھنے سے ایسی صنعتوں کے پھیلاؤ کی اساس تیار ہو

سکے اور روزگار کے مواقع بڑھ سکیں۔ ساتھ ہی سماجی کنٹرول کے تحت بڑے بڑے صنعتی علاقے قائم کرنے کی ضرورت پیدا ہو جاتی ہے۔ مارکیٹنگ اور اشیائے ضروریہ کی عوامی تقسیم کے میدان میں بھی سماجی کنٹرول

ہمیں ایک مضبوط اور متحد ہندوستان کی تعمیر کرنا ہے۔ اس کے لیے اسٹیٹوں کی اقتصادی اساس کو مضبوط بنانا ہوگا۔ تب کہیں جاکر مرکز اور تمام اسٹیٹیں یعنی سارا ہندوستان مضبوط بنا رہ سکتا ہے۔

زمینوں کی پھر سے تقسیم کرکے زمینی سدھار لائے جائیں، کسی کو خیرات دینے کے ڈھنگ سے نہیں بلکہ کسانوں کی محنت کی بنا پر اور ایک بار آور تحریک کی بنا پر۔ ان زمینی سدھاروں کے ساتھ ساتھ سینچائی کی سہولتیں اور آلات بھی مہیا کرنے ہوں گے اور اجناس کی ضرورت کے لیے منڈیاں بہم پہونچانی ہوں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زراعتی سدھاروں کا فیصلہ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ غریب کسانوں کے پاس محنت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ دیہاتی علاقوں میں ابھی ایسے مقامی وسائل موجود ہیں جن سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔ نیا راستہ اختیار کرتے وقت ٹیکنالوجی بھی جدید ڈھنگ کی اختیار کرنی ہوگی۔ مگر اس میں اس بات کو مدِنظر رکھا جائے گا کہ محنت اور مقامی وسائل کا بہتر استعمال کیا جائے۔ اس قسم کی ٹکنالوجی سے نہ صرف بیروزگاری کا مسئلہ دور کرنے میں مدد ملتی ہے بلکہ عوام کی قوتِ خرید بھی بڑھتی ہے۔ قوتِ خرید بڑھنے سے پیداوار کا پروگرام اس ڈھنگ سے تیار

ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان ان تمام دیواروں کو توڑتے ہوئے جو مذہب، ذات پات وغیرہ کے نام پر لوگوں میں پھوٹ پیدا کرتی ہیں، اکیسویں صدی میں داخل ہوں۔

جاتی ہے جو عام استعمال کی اشیاء تیار کرتی ہوں یا ان اشیاء کو تیار کرنے والی مشینیں بناتی ہوں۔ ان میں سے کچھ صنعتیں چھوٹے پیمانے کے سیکٹر میں رکھی جاسکتی ہیں تاکہ سرمائے کی ملکیت کی تقسیم زیادہ بہتر ڈھنگ سے ہو

کا عمل دخل بڑھانا بہت ضروری ہے۔

اس متبادل پلاننگ سے متعلق پالیسی میں ہر لحاظ سے سب سے زیادہ زور اس

بات پر دیا جائے گا کہ پرائمری تعلیم عام کی جائے اور کسی مخصوص طبقے کے طلبا کے لیے ماڈل اسکول قائم کرنے کی بجائے اعلیٰ تعلیم کا حصول ہر کسی کے بس میں ہو۔

پیداوار اور خدمات کی منصوبہ بندی کے اس طریقے میں (کیونکہ وہ عوام کی اُمنگوں سے میل کھاتا ہے) نچلی سطح ہی سے عوام کو بھی شامل کار کیا جا سکتا ہے۔

مغربی بنگال کا تجربہ

مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ پچھلے نو برسوں سے مغربی بنگال میں اسی متبادل طریقے پر عمل کیا جا رہا ہے۔ پلان پراجیکٹوں کی تیاری اور ان پر عمل درآمد کرانے میں عوام کو منظم ڈھنگ سے شامل کار کیا جا رہا ہے اور وہ اس طرح کہ دیہاتی علاقوں میں عوام کی چُنی ہوئی پنچایتوں اور شہری علاقوں میں میونسپل کمیٹیوں سے مدد لی جا رہی ہے۔ حال ہی میں ضلع پلاننگ کمیٹیاں اور بلاک پلاننگ کمیٹیاں بنا کر اور پنچایتوں وغیرہ کے نمائندوں اور متعلقہ سرکاری افسروں کو یکجا کر کے اس طریقے کو اور بھی وسعت دی گئی ہے۔ پلان کے فنڈ ہر محکمہ کے ضمن میں ضلع اور بلاک کی سطح تک بانٹ دیے جاتے ہیں اور ہر سیکٹر کے لیے پہلے بلاک پلاننگ کمیٹیوں کے ذریعے اسکیمیں تیار کی جاتی ہیں اور پھر ان اسکیموں کو ضلع پلاننگ کمیٹیاں، ضلع پلانوں میں ضم کر دیتی ہیں۔ پچھلے سال کے آغاز سے اس طرح کے جامع ضلع پلان اسٹیٹ کے ہر ضلع کے لیے تیار کر لیے گئے تھے اور اب انھیں عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔

صرف اسی طریقے پر چل کر عوام میں یہ احساس پیدا کیا جا سکتا ہے کہ وہ بھی ترقی کے عمل میں برابر کے شریک ہیں تبھی عوام کے بیچ میں سے تفرقہ کی دیواریں گرائی جا سکتی ہیں اور آج کل کے نوجوان قومی اتحاد اور یکجہتی کا شعور لے کر اکیسویں صدی میں داخل ہو سکتے ہیں۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے سماج میں ایسے مفاد پرست طبقے موجود ہیں جو نہیں چاہتے کہ سال سنہ ۲۰۰۱ء کے اس متبادل سماجی اور اقتصادی منظر پر ہم اس ڈھنگ سے نمودار ہوں۔ ان رکاوٹوں کو عوام کی منظم جمہوری جد و جہد ہی کے ذریعے سے دُور کیا جا سکتا ہے۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے سماج میں ایسے مفاد پرست طبقے موجود ہیں جو نہیں چاہتے کہ سال سنہ ۲۰۰۱ء میں اس متبادل سماجی اور اقتصادی منظر پر ہم اس ڈھنگ سے نمودار ہوں۔ ان رکاوٹوں کو عوام کی منظم جمہوری جدّوجہد ہی کے ذریعے سے دُور کیا جا سکتا ہے۔

بقیہ: کام کو کام کے ڈھنگ سے کیا جائے

چیز کی نہیں بلکہ اعلیٰ طبقے کی طرف سے نوازشات کی۔ انھیں اپنی طاقت کی صلاحیت کا تو کیا ابھی اپنی شخصیت کا بھی احساس نہیں ہے۔ قدیم اور روائتی انتظامات اُن کو دبلتے ہیں اور قدیم احساسات اُن کے دماغ کو مختلے کر دیتے ہیں۔

ان لوگوں کی بیداری اور تنظیم کے بغیر ہمارا امداد باہمی کا خواب زیادہ سے زیادہ ایک سراب بلکہ ایک بھونڈا مذاق ہی بنا رہے گا۔

پیشتر ازیں کہ سماجی انقلاب اور قومی احیاء نو کی طاقتیں آگے بڑھیں۔ ہندوستانی دیہات رجعت پسندی کا آخری قلعہ ہیں اس رجعت پسندی کا خاتمہ کرنا ہوگا۔

وسنتھا سوریہ

جواب نمبر ایک، جواب نمبر ۲ اور جواب نمبر ۳

۱۵ اگست ۲۰۰۱ء کو ہندوستانی معاشرہ کس طرح کا ہوگا؟ ہمارے سماجی اداروں کی حالت کیا ہوگی، ہمارے سیاسی ادارے کس طرح کے ہوں گے۔ ہمیں ایک دوسرے سے مربوط رکھنے کے لیے جو نظام رائج ہے اور جس کے ذریعے سے ہم اپنی اجتماعی خواہش کا اظہار کرتے ہیں، وہ کس انداز کا ہوگا اور اس نظام کے درپردہ کس طرح کے محرکات اور کس طرح کا کلچر کارفرما ہوگا؟ اس مضمون میں اس کے مختصر جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اگر ہم اپنے ذہن کو اکیسویں صدی کے بلند و بالا مناظر کی طرف لے جائیں اور اُس دَور کے تصورات سے ذہن کو پُر کرنے کی کوشش کریں اور اس طرح ہم یہ چاہیں کہ مذکورہ بالا سوالات کا جواب ہمیں مل سکے تو یہ بالکل ایسا ہی ہوگا کہ ہم کاغذ کا ایک جہاز بنائیں اور اسے چاند کی طرف اُڑا دیں۔ جہاز کے بنانے کے لیے استعمال کیے گئے کاغذ پر شماریات، حسابات اور اندازوں کا کسقدر بھی اندراج کیوں نہ کر دیں، پھر بھی یہ کاغذی جہاز بہت دُور تک نہ جا سکے گا۔

اس طرح کی غیر یقینی حالت اور آرام دہ نیز خوش کن باتیں ہر دَور میں کی جا سکتی ہیں۔ موجودہ دَور میں بھی اس طرح کی باتوں سے مفر نہیں۔ آج کے دَور میں ۲۰۰۱ء کی باتیں کرنا پیش گوئی کہی جا سکتی ہے۔ اس کا یہ دائرہ سماجی سائنس اور عمرانیات سے جا ملتا ہے۔

مستقبل کے بارے میں کوئی بات کہنا اور اسے اگر اور مگر سے مربوط کرنا اور اسے مشروط کر کے بیان کرنا، انسانی ذہن کے فکر کا پتہ دیتا ہے۔ مگر ان سب باتوں کا ہوا میں ڈوب جانا اور کاغذی جہاز کا زمین پر آ دھمکنا ایک قدرتی فعل ہے، چنانچہ اس سے غلط سوجھ بوجھ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس پرانے انداز کی پیشگوئی جو کہ عقیدے اور یقین کے ساتھ کی گئی ہوگی، ناکامی کی حالت میں بھی شاندار دکھائی پڑتی ہے۔

جدید سائنسی طریقوں کی ان مجبوریوں اور پابندیوں کے تصور سے اُوپر اُٹھ کر ذہن اس سوال کو پوچھنے پر آمادہ ہوتا ہے کہ "۲۰۰۱ء میں حالات کس طرح کے ہوں گے۔ اُس وقت موجودہ صدی اپنا عہد ختم کر چکی ہوگی۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس وقت ہندوستانی سماج میں کیا کیا تبدیلیاں آ چکی ہوں گی۔ کیا موجودہ صورتِ حال بالکل پلٹ چکی ہوگی۔

جواب نمبر ایک

اس سوال کا پہلا جواب گو شعوری طور پر بین براعظمی میزائلز (ICBM) کی قوت کیساتھ اُبھرتا ہے۔ یقین کہ ۲۰۰۱ء میں کسی بھی ہندوستانی کا وجود نہیں رہے گا۔ دراصل دُنیا رہیگی ہی نہیں، ہتھیاروں کی دَوڑ کا جو نقشہ ہمارے سامنے ہے، اس کے پیشِ نظر یہ بات کہی جاسکتی ہے۔

ذہن میں یہ ناخوشگوار جواب اس لیے جگہ پالیتا ہے کیونکہ قیامت کے روز کی بہت سی پیشین گوئیاں اس سے جُڑی ہوئی ہیں۔ (حتیٰ کہ وہ بھی جو سچ ہوگئی ہیں) وقت کے پنجرے اور حصار میں گھری ہوئی مینا کی طرح سے یہ وہی سوال دُہراتا ہے "۲۰۰۱ء میں حالات کس طرح کے ہوں گے"۔

جواب نمبر دو

کوئی اوتار دنیا میں آ ٹپکتا ہے اور غریبی اور عدم استحکام کے راکھشسوں کا خاتمہ کرسکتا ہے۔ اس صورت میں ہندوستانی سماج حیرت انگیز طور پر اشتراکی بن سکتا ہے اور اس کے دامن میں خوشحالی آسکتی ہے۔

.... بادل ناخواستہ ذہن اس تصور کو قبول نہیں کرتا اور دوبارہ یہ سوال کرتا ہے؛

"۲۰۰۱ء میں ہماری زندگی کس طرح کی ہوجائے گی؟"

جواب نمبر تین

آج سے بہت زیادہ مختلف نہیں۔ سنہ ۲۰۰۱ء کے حالات ۱۹۸۶ء کے حالات سے قریبی مطابقت رکھتے ہوں گے۔

اس جواب کوشش کردل و دماغ اور ذہن کی طنابیں سست پڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں کسی طرح کا جوش وخروش دیکھنے کو نہیں ملتا۔ لیکن یہ صرف اس لیے کہ ہم نے دَورِ حاضر کے واقعات اور رُجحانات کے مکمل امکانات کو نہیں سمجھا ہے۔ سنہ ۲۰۰۱ء پہلے ہی یہاں موجود ہے اسے دَورِ حاضر سے جُدا نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ہمارے موجودہ سماجی اور اقتصادی وسائل اور گتھیاں مضبوط نظام کے ڈھانچے میں تبدیل نہ ہو پائیں جس کے لیے آج کے دَور میں مینجمنٹ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے، تو سنہ ۲۰۰۱ء کے گلے میں مسائل کا ایک ایسا رسہ پڑا ہوگا جس کو سُلجھانا یا جسے کھولنا انتہائی مشکل ہوگا۔

کایا پلٹ یا تبدیلی کا تعلق محسوسات سے ہے۔ گنار میرڈل نے کہا تھا کہ "انتشار اور گڑبڑی کا سموس (کائنات) میں ترتیب و تشکیل نہیں پاتی اور وہاں یہ منظم نہیں ہوتی"۔ چنانچہ ہم گنار میرڈل کے مذکورہ قول کو غلط ثابت کرنے کے لیے معقول موقع رکھتے ہیں۔

اس ضمن میں احساس و ادراک کی بڑی اہمیت ہے، اس ملک کے سبھی طبقوں کے زیادہ سے زیادہ عوام کے لیے یہ ایک ناقابلِ گریز تجربہ ہے۔ ہمارے ادارے اس کے سبب بڑی مصیبت میں ہیں۔ ہماری جدّوجہد آزادی کو آگے بڑھانے کے لیے جس طرح کے جذبات کی پرورش ہوئی تھی، وہ سبھی اقدار شکست وریخت کی منزل سے گزر رہی ہیں۔ ان اداروں میں سُست روی اور زوال کے آثار نمایاں ہیں۔ اس سلسلے کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ اس سلسلے میں دو سماجی اداروں کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک ہے کُنبہ اور دُوسرا ہے مذہب۔

مذہب مافوق الفطرت قوتوں اور عناصر کا نام نہیں ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے لفظ ریلیجن (Religion) ہے، یہ لاطینی زبان کا لفظ ہے، یہ جس لاطینی لفظ سے مشتق ہے، اس کے معنی ہیں دوبارہ سے جوڑنا۔ دوبارہ سے ربط قائم کرنا۔ یعنی انسان کا کائنات سے دوبارہ رشتہ قائم کرنا یا انسان کا انسان سے تعلق قائم کرنا۔ ہندی میں اس کے لیے لفظ دھرم ہے۔ یہ سنسکرت سے لیا گیا ہے، سنسکرت کے جس لفظ سے یہ مشتق ہے، اس کا مطلب ہے برداشت کرنا، سہارا دینا، بوجھ اُٹھانا، زندہ رکھنا، مقابلہ کرنا وغیرہ۔ آج اس سے متعلق ڈھانچے کی ابتدائی حالت اور بنیادی اصولوں کی طرف رجعت کا تصور فروغ پارہا ہے۔ اس کی فروعات پر زور دیا جاتا ہے جبکہ اس کی اُن اقدار کو پسِ پُشت ڈال دیا جاتا ہے جو انسانوں کو آپس میں جوڑنے والی ہیں۔ اس طرح اس ملک میں کثرت میں وحدت کے تصور کو نقصان پہونچ رہا ہے۔ اس طرح سے ہندوستانی عوام کا بنیادی سرشت پر مبنی نظام کھوکھلا ہوتا جارہا ہے۔ ہندوستان میں کنبہ پر مبنی نظام کی بنیادی خصوصیات زوال پذیر ہیں۔ کُنبہ کے نظام کی شکست کی علامات ٹی۔وی کے بہت سے پروگراموں سے واضح ہوجاتی ہیں۔ غریبی اور نابرابری نے کنبہ کے نظام کی اقدار کو ختم کرکے رکھ دیا ہے۔ اس کی ایک مثال کم سن بچوں کی محنت مزدوری کا منظر نامہ ہے۔ بچے محنت کرکے کنبوں کی آمدنی بڑھاتے ہیں۔ ہاتھ بٹاتے ہیں۔ ہم لوگ بچوں سے محنت کرانے کی طرف مائل ہوتے جارہے ہیں۔ پھر یہ بچے جس طرح کے کام کرتے ہیں، وہ انتہائی خطرناک قسم کے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۸۶ء میں ۵ سال سے لے کر ۱۵ سال تک

کی عمر کے بچے فرید آباد کے کانچ کے برتن بنانے کے کارخانوں میں، کانچ کے ٹکڑوں کو پیروں سے کچلتے اور روندتے ہیں۔ یہ بچے دیوالی کی آتش بازی تیار کرتے ہیں۔ آتش بازی بنانے میں خطرناک قسم کے مادّوں کو استعمال کرتے ہیں، کوڈی کینال میں تیز دھار کے چاقو سے نرسلوں کو کاٹتے ہیں۔ ہوزری کے تنگ و تاریک کارخانوں میں موزہ، بنیان بُنتے ہیں اور پسینے پسینے ہو جاتے ہیں۔ بیڑیاں بناتے ہیں، یہ بہت سے وہ کام ہیں جن کے کرنے میں بچوں کی صحت کو خطرہ لاحق ہوتا ہے، اکثر ان میں سے ٹی۔ بی کے مریض ہو جاتے ہیں۔ گھریلو کاموں کو انجام دیتے ہیں، گندے سے گندہ کام کرتے ہیں۔ سنہ ۲۰۰۰ء میں یہ بچے اپنی صحت کے لیے درکار فطری تقاضوں سے محروم ہوں گے، ان کی پرورش ٹھیک طرح کی نہ ہوگی، ان کی صحت کے لیے ہر طرف خطرناک کام پھیلے ہوں گے۔ اس حالت میں وہ بالغ ہو جائیں گے۔

جہاں تک سیاسی اداروں کا تعلق ہے، سب کی شرکت سے چلنے والے موجودہ جمہوری نظام سے بڑھتی ہوئی سیاسی اُمنگوں کی عکاسی نہیں ہوتی۔ محض ووٹ حاصل کرنے کے مواقع اور اس کی کوششوں یا سودے بازی سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے جو کہ بحث و مباحثہ اور تبادلۂ خیال کے بعد اتفاقِ رائے کے ذریعے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ ۱۹۸۶ء کی پالیسیاں اکثر موقع پرستانہ ردِّ عمل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ جمہوریت کے انداز مخالفوں کو پرچانے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ جبکہ عوام کی حقیقی ضرورتیں نظر انداز کی جاتی ہیں۔ سرکاری کاروبارِ حیات اور ڈھانچے ٹکراتے اور پھیلتے رہتے ہیں اور ان کی آپس میں ادل بدل کا عمل جاری رہتا ہے۔ اور سیاسی فلسفہ کے ذریعے عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی رہتی ہے۔

دَورِ حاضر کے ایک مخصوص شعبے کے مطالعے سے ہی اندازہ ہو جائے گا کہ سماجی اور سیاسی سطح پر کس قدر دشواریاں اور اختلافات ہیں۔ یہ ہے آبادی کا پھیلاؤ۔ ایسا نہیں کہ یہ محض دیہات سے شہروں کی طرف آنے کا ایک طرفہ عمل ہو۔ زراعت کے شعبے کی تکالیف کسانوں کو گھروں سے نکالتی ہے اور یہ وہ عمل ہے جو انھیں زیادہ متاثر کرتا ہے۔ جب کہ عام خیال یہ ہے کہ وہ صرف صنعتوں کے لالچ میں گھروں سے نکلتے ہیں۔ ہندستان کے دیہات میں بالائی سطح کی دس فیصد آبادی ۵۰ فیصد اثاثہ جات پر قابض ہے اور تقریباً ۴۰ فیصد آبادی غریبی کے خط سے نیچے زندگی گزارتی ہے۔

آج عوام ایک ہی جگہ خود کو محصور کر کے بھوک کی تکلیف برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ باہر نکلتے ہیں اور اُسی وقت واپس آتے ہیں جبکہ وہ ایسا کرنے کی حالت میں ہوتے ہیں اور پھر باہر جاتے ہیں۔ سرمایہ اور صنعت کے تعلق سے بڑے پیمانے پر جو مرحلہ وار نظام تحریک کی صورت میں اُبھرا ہے، کچھ لوگ اسی کے زیرِ اثر اِدھر سے اُدھر جاتے ہیں، کچھ لوگ صرف اس خیال سے جاتے ہیں کہ انھیں شہروں میں عارضی نوعیت کا کام مل جائے یا زرعی پیداوار کے مراکز پر کچھ کام مل جائے۔ آبادی کا اِدھر سے اُدھر یہ بہاؤ صنعت کے لیے فاضل تعداد میں آدمی مہیا کرتا ہے۔ اس سے شہری آبادی کو سستے نرخ پر خدمات مُہیا ہو جاتی ہیں اور زرعی کاموں کے لیے محنت کش طبقے کی عارضی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔

مدراس میں ترقیاتی کاموں کے مطالعوں سے جو ادارہ وابستہ ہے، اس کے رکن ڈاکٹر ملکے ناگ راج نے جنوبی ریاستوں میں خشک علاقوں میں نقلِ مکانی کے اسباب کا مطالعہ کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ نقلِ مکانی کی غیر مستحکم نوعیت ایسی ہے کہ شہر اور گاؤں بستے اور اُجڑتے رہتے ہیں۔ ایک بار کی مردم شماری میں ان کا پتہ ملتا ہے۔ دوسری بار کی مردم شماری کے وقت ان کا پتہ نہیں ملتا۔ شہروں میں دھرنا دینے والوں کی بستیاں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں، اس طرح کے بسنے اور اُجڑنے میں سیاسی آقاؤں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔

ان دیہات میں بسنے والوں کی زندگی یا شہروں میں دھرنا دیکر بستیوں کو بنانے والوں کی زندگی خانہ بدوشوں کی سی ہوتی ہے۔ ان کے ذریعے مستحکم ادارے وجود میں آنے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ اگر وہ کہیں بس بھی جاتے ہیں اور اُن کو کسی نظام میں جگہ بھی مل جاتی ہے، تو بھی انھیں اخراج کا خطرہ بنا رہتا ہے، حال ہی میں بمبئی کی گندی بستیوں کو جس طرح سے ڈھا دیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیہات اور شہروں کے درمیان نقلِ مکانی اپنے منطقی نتیجے کی صورت میں اُبھر رہی ہے۔ شہروں میں اب کھپت کی گنجائش کم ہے، گاؤں کو چھوڑ کر شہروں میں آنے کے لیے مجبور ہونے والا شخص، شہر میں آکر ناجائز قبضے کا مجرم گردانا گیا ہے۔ اس کا خاندان بھی بٹ گیا ہے اور ٹکڑوں ٹکڑوں میں کہیں کہیں چلا گیا ہے۔ اس کی گروہی شناخت اب بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ اب خود کو کسی گروہ سے وابستہ نہیں کر پاتا۔ البتّہ ووٹ حاصل کرنے

کی غرض سے مختلف طرح کے گروہ وضع ضرور کئے جاتے ہیں۔ ان لوگوں سے ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے ان کو کسی نہ کسی گروہ سے وابستہ کر دیا جاتا ہے اور اس طرح ان کے ووٹوں پر انحصار کیا جاتا ہے۔ عوام کی بے چینی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ہر طبقے اور ہر گروہ میں یہ ردِ عمل کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ سماج میں پھیلی ہوئی بدعنوانی اور فرقہ وارانہ دہشت گردی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ عوام اب ظلمت پسندی اور پیچھے کی طرف لوٹ رہے ہیں اور معقولیت پسندی کا راستہ ترک کر رہے ہیں۔ اس سے عوام میں ایک خاص قسم کی بددلی اور نفسیاتی کیفیت پیدا ہوتی جا رہی ہے جس کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ "مجھے پروا نہیں" والا رجحان ہے۔ پہلے زمانہ میں لوگ تقدیر پر شاکر ہوتے تھے، مگر یہ اس طرح کی بات نہیں، اس سے یہ حالت مختلف ہے۔ اس پر قنوطیت یا پچھڑے پن کا لیبل لگا ہے۔ اسے تہذیب کی پسماندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ہندوستانیوں کی سیاسی مسائل سے مبینہ لاپرواہی بتائی جاتی ہے تمل کی ضرب المثل ہے کہ کیا فرق پڑتا ہے چاہے رام راجہ ہو، یا راون راجہ ہو۔ اس سے اس رجحان کا اندازہ ہوتا ہے کہ عوام کے دلوں میں اختیارات اور اقتدار سے محرومی کا ایک جذبہ کارفرما ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں ایک کشمکش اور تناؤ ہو۔ جو مسائل کے تئیں بیداری کے سبب بڑھ گیا ہو۔ دراصل سماج دشمن سرگرمیوں کے پسِ پشت یہی ذہن کام کرتا ہے کالجوں میں داخلے کے دن نئے طلبا یا طالبات کو پریشان کرنے کی بات ہو، خوراک میں ملاوٹ کا مسئلہ ہو، یا کسی بھی طرح کی غنڈہ گردی ہو، وہ اسی ذہن کے سبب زور پکڑتی ہیں۔ یہی نہیں اگر تنخواہ یا اجرت کم ہے، یا کسی آدمی کو اس کے حسبِ مراتب کام نہیں ملا ہے تو بھی اس کے ذہن کو جس طرح کے تناؤ سے گزرنا پڑتا ہے، وہ ان لوگوں کو بھی خراب کرتا ہے جو اس سے قریب ہوتے ہیں۔ جہیز کی مانگ، ظالم ساس کا رویّہ بھی اسی طرح کی مثالیں ہیں۔ جو لوگ صاحبِ اقتدار ہیں، ان کے ذہن کے تناؤ کو مختلف صورتوں میں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر پولیس کی بربریت، دفتر شاہی سنگدلی، اور سیاسی حیلہ جوئی وغیرہ۔ پالیسی ساز جب اس تناؤ کا شکار ہوتے ہیں تو سماجی اور اقتصادی عدم توازن کا سامنا ہوتا ہے مثال کے طور پر سب کے لیے ملک گیر سطح پر مفت پرائمری تعلیم کے لیے آئینی طور پر پابندی قبول کی گئی ہے۔ لیکن تعلیم کے محاذ پر غیر منصفانہ تقسیم ایک حقیقت کی صورت میں سامنے آرہی ہے۔ یہ کچھ کے لیے غیر رسمی نظام تعلیم کی صورت میں ہے جبکہ دوسروں کے لیے یہ ماڈل اسکول کی صورت میں ہے۔ محنت کش بچوں کو باقاعدگی سے ملازمت دینے یا انھیں ضابطہ میں کام دینے سے متعلق حالیہ بل یا مطلقہ مسلمان عورتوں کے نان نفقہ کے حقوق کو محدود کرنا، نئے سماجی اور اقتصادی حقائق کی مزید مثالیں ہیں:

آج بھی یہ تناؤ ہمارے روزمرہ کے تجربے میں ہے، جہاں ہم کام کرتے ہیں، وہاں بھی یہی تناؤ کارفرما نظر آتا ہے، بازار جاتے ہیں، وہاں بھی اس سے سابقہ پڑتا ہے، گھر پر رہتے ہیں، وہاں بھی اس طرح کے مختلف تناؤ سے فرد کی شخصیت کا ابھار رک جاتا ہے اور یہی حال اداروں کا ہوتا ہے۔

کبھی کبھی مثبت اجتماعی کوششوں کے ذریعے اس کے مقابلے کے لیے کوشش کی جاتی ہے۔ یہ کوششیں دراصل لکھو کھا عوام کی زندگیوں کا جزو بن چکی ہیں۔ مختلف مخصوص مسائل کے چاروں طرف عوام کی بھیڑ نظر آتی ہے۔ اس شعور کی بالیدگی کے ساتھ کہ ہمارے ادارے مشکلات میں پھنسے ہیں، ایسی قوت بھی پیدا ہوئی ہے جس کے سہارے آپس میں جوڑنے والا ایک نیا نظام معرضِ وجود میں آیا ہے جس سے ایک نیا کلچر ابھرا۔ ملک گیر پیمانے پر شہریوں کی یہ کوششیں آج حقیر یا معمولی نظر آسکتی ہیں اور وہ کسی نظریاتی ڈھانچے میں بھلے ہی موزوں نہ ہو سکی ہوں لیکن یہی وہ کوششیں ہیں جس سے بھارتی سماج کی کایا پلٹ کے خیالات اور عوامل ایک ساتھ مل کر کام کریں گے۔

حالانکہ میری اندرونی خواہش ہے کہ سنہ ۲۰۰۰ء میں سماج کے محروم افراد ان افراد پر قابو پا سکیں جو آج ہر طرح کے وسائل سے مالا مال ہیں اور یہ محروم افراد متحد ہو کر یہ کام کریں تاہم میں اپنی اس پیشین گوئی کو ایک باعزت جدید نجومی کی طرح سے ہی منہ میں رکھتا ہوں اور دو شرائط کے ساتھ۔ بھارتی سماج سنہ ۲۰۰۰ء میں آج کی بہ نسبت کایا پلٹ کے نزدیک ہوگا بشرطیکہ جواب مندرجہ بالا بیان میں نمبر ایک دیا ہو۔ یعنی اگر دنیا تباہ و برباد نہ ہوئی۔ لیکن اگر جواب مندرجہ بالا بیان میں نمبر ۲ والا ہے یعنی ہم نے فرار والا ذہن اختیار نہ کیا اور ان فرضی تصورات کے چکر میں ہم اندھے [illegible] کے راستے پر آگے بڑھ سکیں گے۔

خواجہ احمد عبّاس

اگرچہ کئی برسوں سے نئے سال سے پہلے دن کی شامیں کہرآلود ہوا کرتی تھیں لیکن یکم جنوری ۲۰۰۱ء کی صبح کوئی کہر یا دھند نہیں تھی۔ راجدھانی میں کہرا صاف کر دیا گیا تھا کیوں کہ یہ موٹروں کے ٹریفک کی طرح ہوائی جہازوں کے لیے بھی خطرناک تھا۔

یہ کام وزارتِ انسانی وسائل نے اپنے "دہلی کی دھند صاف کرنے کے پروجیکٹ" کے تحت کیا تھا۔ بڑی بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنیوں نے اونچے اونچے میناروں پر اپنے اشتہارات کے ساتھ درجنوں مصنوعی سورج لگا دیئے تھے۔

آٹھ بجے صبح جب مصنوعی سورجوں نے دھند دُور کر دی تھی اور ہوائی جہازوں کے رن وے صاف ہو گئے تھے، مَیں اپنے ہوائی جہاز سے باہر نکلا اور خود کو ایک دائرے کی شکل کے ایئرپورٹ پر پایا جہاں چھ پلیٹ فارم چھ انگلیوں والے ہاتھ کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ میرا ہوائی جہاز ایروپلین پلیٹ فارم نمبر ۳ پر اُترا۔ ہمارا سامان ڈھیر ڈھیرے گھومنے والی ایک ریمپ پر رکھا جا چکا تھا۔ جو کمپیوٹر اور بجلی سے چلنے والے ایسکیلیٹر کے سرے پر تھی۔

اپنا بیگ اُٹھا کر مَیں ہوائی اڈّے سے باہر نکلا۔ اپنے ہوٹل تک مَیں ہیلی کاپٹر سے نہیں جا سکتا تھا کیوں کہ اس میں ایک سیٹ کے لیے ۵۰۰ روپے لگتے تھے اس لیے مَیں نے جن سیَجہ وشرام گرہ (آرام گاہ) تک جانے کے لیے ایک ماروتی منی ٹیکسی کی جو پانچ روپے فی کلومیٹر کی خاص رعائتی شرح پر چلتی تھی۔

ایئرپورٹ کی طرح جن سیَجہ وشرام گرہ میں مَیں نے ۴۵۰ روپے میں ایک چھوٹا سا کمرہ چوبیس گھنٹوں کے لیے بُک کروا لیا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر مَیں نے جھپکی لینے کی کوشش کی تو اُن ہیلی کاپٹروں کا شور سنائی دیا جو میری ٹیکسی کے ساتھ ہی روانہ ہوئے تھے لیکن جو ایک ایک کرکے اس سے آگے نکلتے جا رہے تھے۔ جلد ہی وہ بہت دُور چلے گئے۔ اب روشنیوں سے جگمگاتی وزیراعظم کی بڑے سائز کی تصویر دکھائی دی۔

"اچھے بنو۔ اچھے طرزِ عمل کا ثبوت دو۔ وزیراعظم کی نگاہیں آپ کو دیکھ رہی ہیں"۔ سڑک پر آویزاں وزیراعظم کی ہر تصویر کے اوپر یہی جملہ ایک تختی پر لکھا ہوا تھا جو روشنیوں سے منوّر تھی۔

مَیں نے تصویر کو دیکھا ...... اس میں سَر نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ پیشانی کے اوپر سر کے بال بہت پیچھے ہٹ گئے تھے۔ اس لیے نئی تصویروں میں پیشانی کے وسط تک کا حصّہ ہی نظر آتا تھا۔

"اکیسویں صدی کا خیرمقدم" یہ موضوع تھا وزیراعظم کی ٹیلی ویژن پر نشر ہونے والی تقریر کا جو ملکی پیمانے پر نشر ہو رہی تھی اور

تمام بڑے بڑے قصبوں اور شہروں میں سُنی جارہی تھی۔

یہ ٹیلی کاسٹ اسی نعرے کے ساتھ شروع اور ختم ہوا۔ "اچھے بنو۔ اچھے طرزِ عمل کا ثبوت دو۔ وزیرِ اعظم کی نگاہیں آپ کو دیکھ رہی ہیں۔"

جب میں ہوٹل میں پہونچا تو کمپیوٹر کے ذریعے میری بکنگ ہو چکی تھی اور کمپیوٹر نے مجھے ۱۶۶ نمبر کمرہ الاٹ کیا تھا۔ اگرچہ تالا کمپیوٹری تھا لیکن چابی کمپیوٹری نہیں تھی۔ اس لیے نصف گھنٹے کی کوشش کے باوجود اس چابی سے تالا نہیں کھلا۔

"ماسٹر کی" (ہر قفل کو کھول دینے والی کنجی)۔ کہاں ہے جس سے ہوٹلوں کے منیجر جو کمرہ چاہیں اُسے کھول سکتے ہیں؟"

مجھے بتایا گیا کہ ہر قفلی کنجی کو کمپیوٹر نگل گیا ہے اور اسے اس کے اندر سے نکالنے میں وقت لگے گا۔ لہٰذا دوسرے روایتی طریقوں کا سہارا لینا آسان ہوگا۔ مثلاً یہ کہ ہوٹل کا کوئی ملازم غسل خانے کی کھڑکی سے اندر داخل ہوجائے۔ چنانچہ ایک شخص کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اندر داخل ہوا۔ بند ائر کنڈیشنڈ کمرے کے اندر کی ہوا ایک لمبی سی آواز کے ساتھ باہر نکلی۔ جب تازہ ہوا کمرے کے اندر داخل ہوگئی تو مجھے کمرے میں جانے دیا گیا۔

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ یہ ایک آراستہ پیراستہ شاندار کمرہ تھا جس میں ہر دیوار سے دوسری دیوار تک تمام فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور چاروں طرف اوپر سے نیچے تک پردے آویزاں تھے۔ غسل خانے کا دروازہ، کھڑکیاں، الماریاں، لاکر سبھی ان پردوں میں نہاں تھے۔ اس لیے یہ سمجھنے میں مشکل ہو رہی تھی کہ کون سی چیز کہاں ہے۔ مجھے غسل خانے کا دروازہ ڈھونڈھنے میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ غسل خانے میں کمپیوٹری تولیے، کمپیوٹری نلکے، کمپیوٹری شاور اور کمپیوٹری صابن تھا۔ جب کمپیوٹر نے صابن میری پیٹھ پر مل دیا تو اس کے اندر ایک ہلکی سی کھٹ کی آواز ہوئی اور اس کے دھات سے بنے ہوئے بازو نے صابن میرے مُنہ میں رکھنے کی کوشش کی۔

لیکن کمپیوٹری تولیے بہت عمدہ تھے۔ انھوں نے میری پیٹھ اور پیروں کو رگڑا اور حیرت ناک انداز میں انھیں خشک کردیا۔ میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ "شکریہ کمپیوٹر!" لیکن جب لاؤڈ اسپیکر سے آواز آئی کہ "آپ کا خیر مقدم ہے" تو میری حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ میں نے یہیں پرسش نہ کی۔ میں نے کہا "آپ اسے ہٹا سکتے ہیں" اس کے بعد میں نے سوچ بند کردیا کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ آگے کچھ بکواس کرے۔

خوش نصیبی سے میں ٹی۔ وی تک پہنچ گیا۔ میں نے خبریں سُننے کے لیے سوراخ میں ایک روپے کا سِکّہ ڈالا۔

"دُور درشن آپ کا سواگت کرتا ہے"۔ ٹیلی ویژن سے آواز آئی۔

"اب پیش ہیں آج کی خبریں...."

ٹی۔ وی۔ اناؤنسر۔ ایک خوبصورت انداز میں سنوارے ہوئے بالوں والی نوجوان خاتون پردے پر نمودار ہوئی جو اجنتا کی مورتیوں کے اسٹائل میں ساری زیب تن کئے ہوئے تھی۔ اس اسٹائل کا انتخاب، فیسٹیول آف انڈیا کے ختم ہونے اور ہندوستانی پوشاکوں کی ایک جامع نمائش کے بعد واشنگٹن، ماسکو، لندن، پیرس اور بیجنگ میں منعقدہ کمپیوٹری استصواب رائے کے بعد ایک کمپیوٹر کے ذریعے کیا گیا تھا۔ (مجھے یاد آیا کہ ہوائی جہاز پر ایئر ہوسٹیس بھی اجنتا اسٹائل کی پوشاکیں زیب تن کئے ہوئے تھیں اور ان کے ہونٹوں پر اجنتا کی مورتیوں کی سی مسکراہٹ تھی!)

"اب وزیرِ اعظم "اکیسویں صدی" پر اظہارِ خیال کریں گے۔"

اس کے بعد کیمرے نے وزیرِ اعظم کی کوٹھی کا منظر پیش کیا جو ایک چھوٹے سے قلعہ کی طرح نظر آرہی تھی۔ کیمرہ سامنے کے ۳۲۰ سیکیورٹی گارڈوں کی ایک جھلک پیش کرتا ہوا اُس بیحد محبوب چہرے پر آکر ٹک گیا جو شیشے کے بُلیٹ پروف ہیلمٹ (گولی روک ٹوپ) میں پوری طرح محفوظ تھا، اور اپنے ہاتھوں میں اسٹین گن لیے ۳۲۰ سیکیورٹی گارڈ اُن کے پیچھے تعینات تھے۔

وزیرِ اعظم کہہ رہے تھے۔ "آپ کا اکیسویں صدی میں خیر مقدم ہے جس میں ہم سب سے پہلے پہونچ رہے ہیں۔ اگر ہم چاہتے تو اسے اپنی اجارہ داری میں لے لیتے اور کالونیاں بنانے والی کچھ مغربی طاقتوں کی مانند اسے اپنی کالونی بنا لیتے۔ لیکن ہم وہ نہیں ہیں اس لیے ہم اس اکیسویں صدی میں سب کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ یہ صدی امن اور خیر سگالی کی صدی ہوگی!

اس کے بعد بینڈ نے قومی ترانے کی جانی پہچانی دھن بجائی اور وزیرِ اعظم اپنی نشست پر سے اٹھتے ہوئے دکھائی دئے اور چونکہ ٹی۔ وی۔ دونوں طرف کی تصویر پیش کرتا تھا اس لیے مجھے بھی کھڑا ہونا پڑا تھا اور میرا خیال ہے کہ ہر ٹی۔ وی۔ دیکھنے والے کو بھی

سیاسے اُن کے جو قوم دشمن کہلانا چاہتے ہوں؟
ٹی۔ وی۔ کے پردے پر اگلی چیز "ٹیلی
یژن ٹائمز" تھی جو ایک روزنامہ کی خبروں
کے کلوز اپ پر مشتمل تھی اور دو خبریں پڑھنے
والے۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ کیمرہ
کے نیچے میں خبریں پڑھ رہے تھے۔ ایک مرد
اور ایک عورت اس لیے کہ جنسی جمہوریت
کی مثال پیش کی جا سکے۔

اس کے بعد، گویہ ایک جدت تھی، کچھ
مختلف النوع اور حیرت انگیز مناظر پیش کیے گئے:
ناٹ ٹی۔ وی۔ کے لیے آزادانہ طور پر کام
کرنے والے کیمرہ مینوں نے لیے تھے، جو
کوئی خبر آنے پر اسے قلمبند کر کے ٹی۔ وی۔ کے
افسران کو پیش کر دیتے ہیں۔ اگرچہ ان کی
لی ہوئی خبروں وغیرہ کو ٹی۔ وی۔ پر دکھانے
میں وقت لگتا ہے لیکن وہ لائن میں لگا لی
جاتی ہیں اور متعلقہ کیمرہ مینوں کو یقین ہوتا
ہے کہ اسکرین پر دکھائی ضرور جائیں گی۔

پہلا شاٹ سوراشٹر کے ایک گاؤں
کا تھا۔ زمین تپ کر خشک ہو چکی تھی اور
اس پر مویشی بے پروائی کے ساتھ گھوم رہے
تھے۔ اس کے بعد ایک واٹر پمپ کا کلوز اپ
دکھایا گیا جس سے پانی کا ایک قطرہ باہر آیا۔
بتایا گیا کہ اسے اسول مکھن بنانے والی گجرات
فیڈریشن آف ملک کو آپریٹیوز نے تیار کیا ہے۔

اگلا شاٹ بھوکے اور فاقہ کش
لوگوں کے ایک جلوس کا تھا، جن کے پیٹ
اندر دھنسے ہوئے تھے۔ جلوس میں شامل بچوں
کے تن دبلے اور پیٹ باہر نکلے ہوئے تھے۔
کیونکہ ان میں گیس اور گیسٹرائٹس بھری ہوئی
تھی۔ یہ ایک خاموش جلوس تھا لیکن یہ لوگ
دلتوں پر چسپاں لیے پوسٹر لیے ہوئے تھے

جن پر لکھا تھا "ہمیں چاول دو"۔۔۔۔ "اپنے
پیٹ کو ضرورت سے زیادہ بھرنے سے پہلے
ہمارے خالی پیٹ بھرو"۔۔۔۔ "ہمیں کھانا
دو یا پھر زہر ہی دے دو"۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد ایک خبر کی سُرخی آئی ــ
" پنجاب کی پچیس سالہ لڑائی کی سلور جوبلی منائی
جائے گی "۔ سُرخی کے بعد تین دہشت گردوں کے
کلوز اپ پیش کیے گئے۔ ان کی تنی ہوئی مونچھوں
کی نوکیں بچھو کے ڈنکوں کی طرح نظر آرہی تھیں اور
وہ بھڑی ناٹ بھڑی کی رائفلیں لیے ہوئے تھے۔
اس کے بعد کیمرہ مین نے نہایت ہوشیاری کے
ساتھ اُن تین افراد کو دکھایا جو ان کی گولیوں کا
شکار ہونے کے بعد دَم توڑ رہے تھے۔ پس منظر
میں ایک موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہونے کا
شور سُنائی دیا۔ یہ منظر یہیں پر کٹ ہو گیا اور پھر
موٹر سائیکل دُور جاتی ہوئی دکھائی دی۔ دھیرے
دھیرے وہ چھوٹی سے چھوٹی ہوتی گئی اور بالآخر
آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اعلان میں بتایا گیا کہ
یہ پروگرام پانچ ستارہ ہوٹلوں کے راج محل
گروپ کی طرف سے پیش کیا گیا۔

آسام میں اقلیت کا مسئلہ اتنا ہی شدید
تھا جتنا پہلے تھا۔ پہاڑی قبیلوں کے لوگ اپنے
دلفریب ناچ، ناچ رہے تھے اور دیکھنے والے
اپنے ہاتھوں میں رائفلیں لیے ہوئے انھیں دیکھ
رہے تھے۔ یہ بھی ایک پُرانی ــ کافی پرانی اسٹوری
تھی۔

بنگالی بھدر لوگ بھی تھے لیکن اب وہ
نکسل وادی بن چکے تھے اور اکیسویں صدی میں
اپنی بندوقیں ہاتھ میں لے کر بات کرتے تھے۔

یہ سب بہت سوناک تھا۔ اسی لیے
انھوں نے مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے "اکیسویں
صدی کا رقص" پھر دکھایا، جو کہ پچھلی رات اشوک

(دیا اشوکا ہوٹل) وِشرام گرہ میں لوگوں کی دلچسپی کا
خاص موضوع تھا۔

اسے۔ پدمسی اور شرن پربھاکر کی پُرجوش
لڑکی پرمیلا پدمسی کے رقص نے اس کی عمر رسیدہ
ماں کے رقصوں کی یاد تازہ کر دی جو پچاس کی حد
پار کر چکی تھی۔ رقص میں اس کا ساتھی عظیم فنکار
اُدے شنکر کا پوتا بابلا شنکر تھا۔ دونوں نے "اکیسویں
صدی کا رقص" پیش کیا جو پنجابی بھنگڑہ ناچ اور
مہاراشٹر کے تماشہ کا امتزاج تھا۔ اس کے لیے
لباس بھارت ناٹیم سے اور نقلی چہرے آسام
کے قبائل اور کیرل کے کتھا کلی سے لیے گئے تھے۔
ایسا کرنے کا مقصد شاید قومی اتحاد و یکجہتی
کی مثال پیش کرنا تھا لیکن تریوینڈرم
میں ایک فٹ بال میچ میں بنگالیوں اور ملیالیوں
کے جھگڑے کی خبر نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔

میں موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے جمنا
پار کی گندی بستیاں دیکھنے گیا۔ وہاں بھی اکیسویں
صدی کا خیر مقدم کرنے کے لیے روشنی کی گئی
تھی کیوں کہ وہاں کے لوگوں کی اُمید تھی کہ
صدی کی تبدیلی انھیں بھوک اور غریبی سے
نجات دلائے گی۔ وہاں ایک پُرانا (کم سے کم
بیس برس پُرانا) سائن بورڈ بھی تھا جس میں
اسکول، مکان، نل، بچوں کے لیے کھیل کے میدان،
اسپتال، بیت الخلا اور صحت و صفائی کی
سہولیات کی فراہمی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اور یہ
کافی اونچائی پر نیون لائٹس میں جلی برقی
حروف میں ایک سادہ سا جملہ بھی لکھا ہوا تھا۔
" ہم یہاں ۱۹۷۱ء سے ۲۰۰۱ء تک انتظار
کرتے رہے ہیں "۔

میں اپنے ہوٹل واپس آگیا جہاں اکیسویں
صدی کے اسپیشل ڈنر کا وعدہ تھا لیکن جب
میں نے اس کی قیمت ــ ۵۰۰ روپے دیکھی

تو جیسے میری بھوک غائب ہوگئی۔
میں رات کی فلائٹ سے نئی بمبئی روانہ ہو گیا۔
میں امریکہ سے درآمد کیے گئے ہوائی جہاز میں بیٹھا تھا۔
ایئر ہوسٹیس نے اکیسویں صدی کی مسکراہٹ سے میرا خیر مقدم کیا اور میرے سامنے اکیسویں صدی کا اسپیشل ڈنر لگا دیا جو مٹر پلاؤ، مرغ، آلو کے پرانٹھے اور گاجر کے حلوے پر مشتمل تھا۔
"اس میں اسپیشل کیا ہے؟" میں نے ایئر ہوسٹیس سے پوچھا۔
"قیمت" اور اس نے سنّو روپے کا بل پیش کر دیا۔
"ہوائی کمپنیاں کب سے ناشتے اور کھانے کی قیمت لینے لگی ہیں؟"
"آج سے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ یہ اکیسویں صدی ہے؟"
کھانا میرے حلق سے نیچے نہیں اُترا۔
ہوائی جہاز کے بمبئی پہونچنے کے بارے میں کوئی اعلان نہیں ہوا۔
پوچھنے پر معلوم ہوا کہ جو کمپیوٹر یہ اعلان کرتا ہے اس نے ہڑتال کر دی ہے۔
"کیا کمپیوٹر بھی ہڑتال کرتے ہیں؟"
"آخر وہ ایک آدمی کا پورا کام کر رہے ہیں۔"
جب ہوائی جہاز نیچے اُترا تو میں سامان لانے والی مشین (ریمپ) کے پاس لائن میں کھڑا ہو گیا۔
سامان ابھی تک نہیں پہونچا تھا۔ کمپیوٹر سے چلنے والے مشینی انسان (Robot) نے بھی، جو سب کا سامان دھرتا اُٹھاتا تھا، اعلان کرنے والے کمپیوٹر کی ہمدردی میں ہڑتال کر دی تھی۔
اس لیے ہم سب کو اپنا اپنا سامان اٹھا کر لانے کے لیے پھر ہوائی جہاز تک جانا پڑا۔
نئی ٹیکسیاں آر۔ٹی۔او بمبئی نے پاس نہیں کی تھیں۔ اس لیے مجھے چھ روپے فی کلومیٹر کی شرح سے ایک اسکوٹر کرنا پڑا۔
گھر پہونچنے پر میں نے ڈرائیور کو میٹر کے حساب سے کرایہ دیا۔ کرایہ لینے کے بعد اس نے پھر ہاتھ پھیلا دیا ——
"بخشش صاحب!"
"بخشش کس لیے؟"
"اکیسویں صدی کے لیے" اس نے جواب دیا۔
"یہ ملعون اکیسویں صدی کہاں ہے؟"
"وہاں" اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا جہاں کافی اونچائی پر نیون لائٹس (برقی حروف) میں لکھا ہوا تھا — "ہم اکیسویں صدی میں ہیں۔
"اچھے بنو۔ اچھے طرزِ عمل کا ثبوت دو۔ وزیر اعظم کی نگاہیں آپ کو دیکھ رہی ہیں۔"
میں نے آسمان سے نظریں ہٹائیں تو زمین پر ایک درخت دیکھا جس کے نیچے ایک نحیف و نزار فقیر اکیسویں صدی میں کانپ رہا تھا۔
"بھائی! کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ اکیسویں صدی ہے۔؟"
"میں نہیں جانتا۔ نہ ہی میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کون سی صدی کا دن یا رات ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "کیا آپ مجھے دو روپے دیں گے جس سے میں ایک پیالہ چائے پی کر اپنے بوڑھے جسم کو گرمی پہنچا سکوں جو ہمیشہ کی طرح ٹھنڈا ہے، چاہے یہ کوئی بھی صدی ہو۔"

●

ضروری اعلان

ہم بہت ہی دُکھ اور تکلیف کے ساتھ قارئین کو یہ اطلاع دینے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ یکم ستمبر ۱۹۸۶ء سے یوجنا (اردو) کی قیمتوں پر نظر ثانی کے نتیجے میں قدرے اضافہ کرنا پڑا ہے۔ اس اضافے کا سبب کاغذ کی گرانی اور چھپائی کے اخراجات میں غیر معمولی بڑھوتری ہے۔ نظر ثانی شدہ قیمتیں اب اس طرح سے ہیں:-

۱۔	فی کاپی	ڈیڑھ روپیہ
۲۔	ایک سال کے لیے چندہ	۳۰ روپے
۳۔	دو سال کے لیے	۵۴ 〃
۴۔	تین سال کے لیے	۷۲ 〃

اُمید ہے کہ قارئین اس سلسلے میں ہمارے ساتھ تعاون کریں گے اور اس زحمت کو بخوشی گوارا کرلیں گے۔

البتہ اگر آپ صرف اسی ماہ یعنی اگست میں یوجنا کے خریدار بننا چاہیں گے تو پُرانے نرخ پر ہی آپ اس کے خریدار بن سکتے ہیں۔

سماجی طرزِ حیات

جمال قدوائی

ایک روشن اور تابناک اکیسویں صدی ہمارا استقبال کرسکتی ہے، بشرطیکہ ہمارے ملک میں سیکولر اور اشتراکی پارٹیاں اشتراکِ عمل کرکے برسرِ اقتدار آجائیں۔ جو ابتداً تمام مذہبی اور فرقہ پرست جماعتوں پر مکمل پابندی لگا دیں۔ جو تمام مذہبوں سے یکساں دُور رہیں اور جن کے وزیر مسجدوں، مندروں اور کلیساؤں اور گردواروں میں معتقدوں کی سرپرستی کرتے نظر نہ آئیں۔ اس کام کو اوّلیت اہمیت دیں اور اس کے حصول کو اپنا بُنیادی مقصد بنا لیں۔

اکیسویں صدی میں ہندوستان کے حالات کیا ہوں گے اس کا اندازہ اس امید پر لگایا گیا ہے کہ اس صدی کے بقیہ برسوں میں اُن تمام مشکلات پر قابو پا لیا جائیگا جن کا ہمیں سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور جو مذہبی کٹرپن، مندروں، مسجدوں، گردواروں، مٹھوں، مکتبوں اور شاکھاؤں سے اُبل رہا ہے وہ ہندوستان کی سیکولر ریاست کو نقصان نہیں پہو نچا سکے گا اور بدترین علاقہ پرستی ہندوستان کے ٹکڑے کرنے میں ناکام رہیگی۔

ہندوستان کے سرمایہ دار سرکاری حلقے کی صنعتوں کو اپنے دام میں نہیں پھنسا سکیں گے، ان کے نو آبادکار غیر ملکی حلیف ہندوستان کے بیش قیمت اشتراکی ڈھانچے اور ٹکنالوجی کے میدان میں خود کفالت کو نقصان نہیں پہنچا سکیں گے بڑے زمین داروں، سیاست دانوں اور مقامی افسروں کا گٹھ جوڑ اصلاحاتِ اراضی اور اس کی ا[illegible] تقسیم کو ناکام نہ کر سکے گا۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی دہشت پسندی، سماجی انصاف اور انسانی وقار کے لیے ہریجنوں کی جدوجہد کو کچل نہیں سکے گی۔ مردوں کا احساسِ برتری، جسے ہر ہندوستانی مذہب نے تسلیم کیا ہے، ہندوستان کی کچلی ہوئی اور ستائی ہوئی عورتوں کو مردوں کے برابر حق حاصل کرانے سے نہیں روک سکے گا۔ ہندوستانی عوام جو فرقہ پرستی، علاقہ پرستی سے عاجز آچکے ہیں اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اس صدی کے آخری پانچ برسوں میں سیکولر اور اشتراکی خیالات کی حامل پارٹیوں کو برسرِ اقتدار لے آئیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ

[illegible] جنگ [illegible] مکمل [illegible] ہوگا۔ یہ سب کیسے ممکن ہوگا اس کے لیے ایک طویل سیاسی مقالے کی ضرورت ہے جو اس مضمون کے دائرے سے باہر ہے۔

سب سے اہم کام

نئی حکومت کا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ تمام مذہبی اور فرقہ وارانہ پارٹیوں پر پابندی لگا دے اور انھیں انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت نہ دے۔ افراد اور جماعتوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ عدالتوں میں جاکر یہ دعویٰ کر سکیں کہ فلاں پارٹی مذہبی اور تہذیبی سرگرمیوں کے پس پردہ سیاسی اغراض اور مفاد حاصل کر رہی ہے لہذا اس پر پابندی لگائی جائے۔

اس کے ساتھ ساتھ حکومتِ ہند تمام مذاہب، ان کے رسوم و رواج اور تقریبات سے یکساں دوری برقرار رکھے گی۔ مسجدوں، مندروں اور گوردواروں میں وزرا عقیدت مندوں کے ساتھ مذہبی تقریبات میں شرکت کرتے ہوئے نظر نہیں آنے چاہئیں۔ جہازوں کو پانی میں اتارنے یا نئے ہوائی جہازوں کے اڑان بھرنے سے پہلے ناریل نہیں توڑے جائیں گے۔ سیکولر اداروں اور سائنسی لیبارٹریوں کے افتتاح کے موقع پر مذہبی کتابوں کا پاٹھ نہیں ہوگا۔ تمام سرکاری تقریبات سیکولر ہوں گی۔ اور اس موقع پر کسی بھی مذہب کی کوئی رسم ادا نہیں کی جائے گی۔

ایسی مذہبی تعلیم جو کسی خاص مذہب سے متعلق ہو، سرکاری اور غیر سرکاری امداد پانے والے اسکولوں میں نہیں دی جائے گی۔ اس کے برعکس اسکولوں کے لیے ایسی پرائمر تیار کی جائے جو انسانوں کی برابری، بھائی چارہ، سماجی انصاف، اخلاق، ہندوستان کی ایکتا، ہندوستانی شہری اور دنیا کے شہری کی حیثیت سے عائد ذمہ داریوں کا درس دے۔

ریاستوں کی خود مختاری، لیکن

مرکزی حکومت ریاستوں کی خود مختاری اور علاقائی خصوصیات کو اس حد تک تسلیم کرے کہ وہ ہندوستان کی سالمیت اور وحدت سے متصادم نہ ہوں، بلکہ مرکز کو چاہیئے کہ وہ ریاستوں کو زیادہ سے زیادہ انتظامی اور سیاسی ذمہ داریاں سپرد کرے۔ بڑی بڑی ریاستوں میں کچھ علاقے علاقائی خود مختاری چاہتے ہیں ان کے اس مطالبے کو مان لینا چاہیئے۔ اتر پردیش اور بہار بڑی ریاستیں ہیں اور ان کا انتظام کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ ان کو چھوٹی ریاستوں میں بانٹ دینا چاہیئے جو لسانی، تہذیبی اور معاشی یکسانیت کی بنیاد پر تشکیل دی جائیں۔ یہی کام آندھرا، کرناٹک اور کیرالہ میں بھی کرنا چاہیئے۔

ہندوستان کو ایک ایسا ملک ہونا چاہیئے جو بہت سی اقلیتوں پر مشتمل ہو ایسا ملک نہیں جو شمالی ہند کے ہندی علاقے کی وجہ سے واحد اکثریت کا ملک بن جائے۔ چھوٹے چھوٹی ریاستوں میں لوگ حکومت کے کاموں میں بھرپور حصہ لیں گے جس کی وجہ سے خوشحالی آئے گی۔ اس کی مثال ہریانہ، پنجاب اور ہماچل پردیش ہیں جو پنجاب کے بڑے صوبے کے توڑنے کے بعد وجود میں آئیں۔

مرکزی حکومت ان خود مختار ریاستوں کو ہر طرح کا تعاون دے اور ان کے معاشی، لسانی اور تہذیبی ارتقا کے لیے قومی وسائل میں سے حصہ دے۔ اس کے عوض میں مرکزی حکومت یہ چاہے گی کہ ہندوستان کی وحدت اور سالمیت کو کسی طرح کا خطرہ پیدا نہ ہو اور کبھی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو اس کی روک تھام کے لیے فوری اور مؤثر قدم اٹھائے گی۔ گورنروں کو ایسے معاملوں کے لیے، خصوصی اختیار دئے جائیں گے۔ دستور میں ترمیم کے ذریعے گورنروں کو یہ اختیار دیا جا سکتا ہے جیسا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں گورنروں کو خصوصی اختیارات دئے گئے تھے۔ ہندوستان کی وحدت اور سالمیت کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری کل ہند سول سروس کے ارکان پر ہوگی جو ہر ریاست میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوں گے یہ ذمہ داری فوج کو بھی دی جائے۔ ہندوستان کی وحدت اور سالمیت کا تصور اچھی طرح ان کے ذہن نشین کر دیا جائے۔ یہ کام ان کی ٹریننگ کے دوران کیا جائے۔

کوئی بھی شخصی قانون نہیں

ایک مشترکہ سول کوڈ بنایا جائے جس میں عورت اور مرد کو برابر کا درجہ حاصل ہو۔ اس کوڈ کے تحت شادی، حقوق زوجیت، طلاق، علیحدگی، اور وراثت کا قانون سبھی شہریوں کے لیے ایک جیسا ہو۔ کسی بھی فرقے کا پرسنل لا جسے مذہب کی حمایت حاصل ہے، مشترکہ سول کوڈ کے مقابلے میں قابلِ نفاذ نہ ہوگا۔ مذہبی فرقوں کو حق حاصل ہوگا کہ وہ شادی کی رسمیں اپنے طور پر انجام دیں۔ مگر قانون کی نظروں میں وہی شادی قابلِ تسلیم ہوگی جو سول کوڈ کے تحت رجسٹر کرائی گئی ہو۔ ایک ایسے سماج میں جہاں مرد اور عورتیں ساتھ کام کر رہے ہیں۔ محبت محض ایک رومانی [illegible] جس کا ڈھنڈورا [illegible]

یا شادی محض جنسی کشش کا نتیجہ نہیں ہو گی
دفتر، کارخانوں اور کھیتوں میں ایک ساتھ کام
کرنے کی وجہ سے باہمی ربط اور پسند کی دوسری
بہت سی بنیادیں ہوں گی۔ جو رفاقت،
مزاجوں کی یکسانیت، منافع بخش شراکت
پر مبنی ہوں گی۔ محبت رومانی بنیادوں پر
یا ماں باپ کی پسند کے مطابق کی گئی شادیوں
کے مقابلے میں یہ شادیاں زیادہ دیرپا ثابت
ہوں گی۔ مختلف ذاتوں، مذہبوں اور علاقوں
کے لوگوں کے درمیان شادیاں عام ہوں گی۔
طلاق کے لیے یہ ضروری نہیں ہوگا کہ ایک دوسرے
پر بد چلنی کے گندے الزامات لگائے
جائیں۔ علیحدگی اور طلاق کی صورت میں بچے
ماں کی تولیت میں ہوں گے کیوں کہ وہی ان کو
جنم دیتی ہے۔ ماں اگر چاہے تو اپنی خوشی
سے اپنے حق سے دست بردار ہو سکتی ہے یا
عدالت میں یہ ثابت ہو جائے کہ ماں، بچوں کی
پرورش اور پرداخت کے لیے نا اہل ہے۔
طلاق کے بعد جو سمجھوتہ ہو اس میں عورت
اور مرد کو یکساں حقوق حاصل ہوں۔ ایسے سمجھوتے
میں اس خدمت کا حساب لگایا جائے جو حیثیت
امور خانہ داری عورت نے انجام دی ہے اور جس
کا کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا اور اس خدمت
کے دوران جو مشترکہ جائداد بنائی گئی ہے اس
میں سے شوہر کی جائداد میں سے عورت کو حصہ
دیا جائے۔ اسی طرح اگر معاشی لحاظ سے
عورت بہتر ہے اور شوہر بیمار، معذور یا
ضرورت مند ہے تو قانون شوہر کے ساتھ
انصاف کرے۔

عورت اور مرد کو یہ حق حاصل ہو کہ
وہ بغیر شادی کے ایک ساتھ رہ سکیں اور اس
رشتے کے درمیان جو بچے پیدا ہوں انھیں قانون
جائز تسلیم کرے اور انھیں ماں اور باپ
دونوں کی جائداد کا وارث تسلیم کرے۔
سارے ملک میں فیملی پلاننگ کے مرکزوں
کا جال بچھایا جائے۔ مانع حمل طریقوں
پر وسیع پیمانے پر عمل کیا جائے۔ حمل کی
روک تھام کے علاوہ مرکز بچوں کی دیکھ
بھال اور ان کی نشوونما کے متعلق مفید
مشورے دیں۔

نیا معاشی ڈھانچہ

نئی ٹکنالوجی کی بدولت یہ ممکن ہو سکے گا کہ
شہروں میں بڑے بڑے کارخانوں کی بجائے
قصبوں اور گاؤں تک چھوٹے چھوٹے کارخانے
لگ جائیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ توانائی کے
متبادل ذرائع، جیسے سورج کی روشنی، پون
چکی، اور بائیو گیس کی وجہ سے صنعتیں اور
کارخانے شہروں سے دیہی علاقوں کی طرف
منتقل ہوں گے۔ بہت سے کارخانے گھریلو
قسم کے ہوں گے جس میں خاندان کے افراد
اور دوست وغیرہ مل جل کر کام کریں گے جہاں
وہ مال کو آخری شکل دیں گے یا ایسے کل
پرزے بنائیں گے جو شہر کے بڑے کارخانوں
میں اکٹھے ہو کر جوڑے جائیں گے۔ اسی
طرح ٹرانسپورٹ اور رسل و رسائل میں زبردست
ترقی کی وجہ سے کام بڑے بڑے دفتروں
میں مرکوز ہونے کے بجائے چھوٹے چھوٹے
ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔ آفس کا زیادہ تر
کام جیسے حساب کتاب، نقل، چھپائی
اور ڈسپیچ وغیرہ ورکروں کو ان کے گھروں
تک پہنچا دیا جائے گا۔ جہاں چھوٹے کمپیوٹر
یا کمپیوٹر ٹرمینل، ورڈ پروسیسر اور چھپائی کی
چھوٹی مشینیں موجود ہوں گی۔ شہروں میں کام
کے جو نئے طریقے ہیں اور روزگار کے جو
مواقع ہیں وہی قصبوں اور گاؤں کو بھی
حاصل ہو جائیں گے اس وقت لوگ شہروں
کی طرف آنے کے لیے مجبور ہیں کیوں کہ کام
نہیں ملتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ گھٹی گھٹی
جھونپڑیوں، اور انتہائی غیر تسلی بخش حالات
میں زندگی گزارتے ہیں۔ جس کی وجہ سے غنڈہ
گردی، مارپیٹ اور جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔

تعلیم کا نیا طریقہ

تعلیم کا موجودہ طریقہ جو بڑے دفتروں
اور کارخانوں کی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے
ہوئے بنایا گیا ہے اس کی بھیڑ کو بھی کم
کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ یونیورسٹیوں
اور کالجوں کو ادنیٰ تعلیم یافتہ افراد تیار
کرنے کا کارخانہ نہیں رہنا چاہیے۔ ان میں
داخلہ کم لوگوں کو دیا جائے۔ داخلہ کا معیار
اونچا اور مسابقتی ہو۔ بقیہ افراد کو جو اعلیٰ
تعلیم حاصل کرنا چاہیں انھیں اوپن یونیورسٹی
کے ذریعے تعلیم دی جائے۔ ہر ریاست
میں کم از کم ایک اوپن یونیورسٹی ضرور ہو۔
جو ہر قسم کی تعلیم، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور
مواصلاتی کورسوں کے ذریعے دے۔ ٹیوٹوریل
مرکزوں کا جال بچھایا جائے جہاں اوپن
یونیورسٹی کے طالب علم نام لکھا کر براڈکاسٹ
کے ذریعے حاصل کردہ تعلیم کی تکمیل استادوں
کی مدد سے کر سکیں۔ [illegible]
ریڈیو، ریکارڈر موجود ہوں جہاں براڈکاسٹ
یا ٹیلی کاسٹ ہونے والے اسباق کے کیسٹ
موجود ہوں تاکہ طالب علم انھیں دوبارہ سن
یا دیکھ سکیں۔ ان کی لائبریریوں میں منتخب
کورسوں کے لیے دوسرے ملکوں کے کیسٹ
بھی موجود ہوں۔
[illegible]

لیے دستیاب ہو مگر لازمی نہ ہو۔ کیوں کہ گھروں میں گھر یلو سنڈ سے شروع ہو چکے ہونگے اور بچوں کو ان کی مہارتیں حاصل کرنے کی ضرورت ہوگی۔ نزدیکی گاؤں کی ضرورتوں کے لیے ہائر سکنڈری اسکول موجود ہوں ان اسکولوں میں خاص طور سے سائنسی اور میکنیکل تعلیم دی جائے۔ ہر ضلع میں ایک اوپن اسکول ہو تاکہ جو بچے اسکولوں میں باضابطہ داخلہ لے کر نہ پڑھ سکیں وہ الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں

کرپشن کے خلاف سخت قدم

یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبا، اور اساتذہ میں جو کاہلی، غیر ذمہ داری اور کرپشن کی وبا آگئی ہے اس کو سختی سے کچلنے کی ضرورت ہے۔ اس کا خاتمہ اس طرح کیا جائے۔ ابھی جو یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ ایک بار ملازمت مل جائے تو کوئی نکالا نہیں جا سکتا، اس کے علاوہ اساتذہ اپنے نکمے پن کے لیے کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہیں۔ ان کو ملازمت دینے یا برخاست کرنے کا طریقہ سول سروس کے لوگوں کے طریقے سے مختلف اور لچکدار ہو۔ جو استاد رکھے جائیں نھیں پروبیشن پر رکھا جائے اور پانچ سال کے بعد ان کے پڑھانے کے طریقے اور ریسرچ کی بنیاد پر ان کی کارگزاری جانچی جائے۔ عادتاً غیر حاضری، بے ایمانی اور امتحان میں جانب داری دکھانے پر سخت سزا دی جائے۔ ایک ہی یونیورسٹی یا کالج کے فارغ التحصیل طلبا کو وہیں ملازمت دینے کی ہمت شکنی کی جائے۔ ترقی اس بنیاد پر نہ دی جائے کہ ملازمت کتنے سال کی ہے یا کون سینیر ہے بلکہ مسابقت کی بنیاد پر دی جائے جس میں دوسرے اُمیدوار بھی شامل ہوں اور اس موقع پر سختی سے جانچ کی جائے کہ کوئی بھی اُستاد تعلیم دینے کے معاملے میں کس حد تک کامیاب رہا ہے اور اس کے ریسرچ کا معیار کیا ہے۔ یہی طریقہ اسکول کے ماسٹروں کے لیے بھی اپنایا جائے۔

تہذیبی برتری کے احساس سے حکومت اور ہندوستان کے عوام کا دل بھر چکا ہوگا۔ اور انگریزی زبان کے خلاف ان کا رویّہ بدلے گا۔ اس بات کے اعتراف کی ضرورت ہے کہ انگریزی ہندوستانی زبانوں میں سے ایک ہے اور لوگوں کے درمیان رابطے کا کام دیتی ہے اور ہماری ایکتا کا ایک وسیلہ اور اعلےٰ تعلیم کے حصول کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ دوسری زبان کی حیثیت سے یہ ہندوستان میں باقی رہے گی لیکن اصل میں یہ پہلی زبان بنی رہے گی۔ ہندی کو پہلی زبان کے درجے سے ہٹانے کی کوشش نہیں کی جائیگی لیکن اسے جنوبی ریاستوں پر زبردستی لادا نہیں جائے گا۔ ہندی کو سارے ہندوستان میں مقبولیت حاصل ہو اور اس کا چلن ہو، اس کا انحصار اس امر پر ہوگا کہ فطری اور سماجی علوم کا کتنا خزانہ اس کے پاس ہے اور یہ کس حد تک ملک کی دوسری زبانوں سے متاثر ہونے کے لیے تیار ہے۔ انگریزی میڈیم اسکول چھوٹے چھوٹے شہروں تک میں بھی دھڑا دھڑ کھل رہے ہیں اور یہ ایک منافع بخش کاروبار بن گیا ہے۔ حکومت کو چاہیئے کہ انھیں ملک کے عام تعلیمی دھارے میں پوری طرح جذب کرلے۔

ہندی کے علاقے میں اکثریت کے دلوں میں اُردو کے خلاف جو تعصّب ہے وہ ختم ہو چکا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ فرقہ پرستی کا جذبہ اور تہذیبی برتری کا احساس بھی ماند ہو چکا ہوگا اور اُردو کو ہندی کی ایک دوسری دھارا کے طور پر دل سے قبول کیا جائے گا۔ اور اس کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کیا جائے گا اور ہندی کے علاقے میں اختیاری ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے گا۔ عوام اور ریڈیو کی زبان کی حیثیت سے اُردو اور ہندی ایک دوسرے کے نزدیک آئیں گی۔

پسماندگی نہیں

حکومت اقلیتوں کی تعلیم کی ہمت افزائی اور حمایت کرے۔ لیکن وہ اس بات کی اجازت نہیں دیگی کہ اقلیتوں کے ذریعے چلائے گئے کالج اور اسکول پسماندہ رہ جائیں۔ انھیں مالی امداد دینے کی شرط یہ ہو کہ ان اداروں میں اساتذہ مختلف مذہبوں کے ہوں گے اور ان کا معیار وہی ہوگا جو عام کالجوں کا ہوتا ہے اور ان کے طالب علموں میں دوسرے مذہبوں کے طالب علموں کی قابلِ لحاظ تعداد ہوگی۔

حکومت نے سائنسی اور ٹکنالوجی کے ریسرچ میں جو زبردست سرمایہ کاری کی ہے ان کی ایسی کمیٹیوں کے ذریعے جانچ کرائی جائے جس میں ہندوستان اور بیرونی ماہرین شامل ہوں تاکہ یہ پتہ لگایا جاسکے کہ یہ تحقیق کس حد تک ہندوستان کی ترجیحی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہے اور اس کی بدولت ملک کو کیا فائدہ پہونچا ہے۔ ریسرچ کا ایسے لوگوں کو موقع دیا جائے جن میں خدمت کا جذبہ ہو اور یہ بھی ذہن میں رکھا جائے گا کہ فائدے کے مقابلے میں اخراجات کیا ہوں گے۔ ریسرچ سے جو نتائج حاصل ہوں، ان کی سختی سے جانچ پڑتال کی جائے تاکہ وہ ان کی افادیت واضح ہوسکے۔ وقت

تقررہ یا سینیارٹی کی بنیاد پر ترقی کی ایک طرح کا دھوکا ہے اس کو فوراً ختم کیا جائے۔ اس کی جگہ با صلاحیت افراد کو ترقی دی جائے اور اس کے لیے ماہرین کی کمیٹی بنائی جائے اور اشتہار دے کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو موقع دیا جائے۔

جب کسی صنعت کے لیے باہر کی کوئی نئی ٹکنالوجی اپنائی جائے تو متعلقہ لیبارٹری کے سائنس داں اور انجنیئر اس سے منسلک کئے جائیں تاکہ منصوبوں کی پلاننگ اور ان پر عمل آوری صحیح ڈھنگ سے ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ مقامی ماہرین اس درآمد شدہ طریقہ کار کو اپنے حالات کے مطابق بنائیں۔ اس میں ردوبدل کریں تاکہ بار بار اس کے درآمد کی ضرورت نہ رہے۔ ان کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ اس سے ماحول کی کثافت میں اضافہ نہ ہو اور صحت عامہ کو کوئی خطرہ نہ پیدا ہو۔

منصفانہ تقرر اور برخاستگی

حکومت سرکاری ملازمین کی بدنیتی نا اہلی اور کام چوری کو روکنے کے لیے سخت اور مؤثر کارروائی کرے گی اور ایسے لوگوں کو ملازمت سے برخاست کردے گی یا وقت سے پہلے ریٹائر کردے گی۔ ایسے فیصلوں کے خلاف اپیل انتظامی عدالتوں میں کی جائے گی جن کا طریقہ کار عام عدالتوں کے مقابلے میں زیادہ آسان ہوگا اور جہاں فیصلے جلد ہو سکیں گے۔ سرکاری عہدیداروں نے جو یونین بنا رکھی ہے ایسے معاملوں میں انھیں مزاحم نہیں ہونے دیا جائے گا۔ سینیارٹی کی بنیاد پر اندھا دھند ترقی بالکل روک دی جائے گی۔ اس کے بجائے مقابلے کے امتحان کا طریقہ رائج کیا جائے، جو درمیانی درجے کے افسروں کے لیے ہوگا۔ اعلیٰ افسروں کی کارکردگی کی جانچ کے لیے ماہرین کا بورڈ بنایا جائے۔

سرکاری صنعتوں میں تقرر اور برخاستگی کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو نجی صنعتوں میں رائج ہے۔ سرکاری حلقے میں تنخواہیں اور اُجرتیں وہی ہیں جو نجی حلقے میں ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہو کہ سرکاری حلقے کی اُجرتیں بڑھائی جائیں اور نجی حلقے میں تنخواہ کی اوپری حد مقرر کر دی جائے۔ سرکاری حلقے میں کارگزاری کی جانچ پڑتال سختی سے کی جائے۔ سرکاری حلقے کے گھاٹے کو کم کرنے کے لیے ضروری ہوگا کہ حسب ضرورت پورے انتظامی بورڈ کو بدل دیا جائے یا غیر منافع بخش کارخانے کو بند کر دیا جائے۔ اس طرح سرکاری حلقے کی صنعتیں محض گھاٹے کا سودا نہیں رہ جائیں گی بلکہ حکومت کی آمدنی میں اضافے کا باعث ہوں گی۔ سماجی خدمات میں تیزی سے اضافہ ہوگا۔ مکان بنانے کے لیے قرض کی سہولتوں کی وجہ سے کمانے والے افراد نسبتاً کم عمری میں مکان کے مالک بن جائیں گے۔ حکومت اپنے عملے کے لیے جو کوارٹر تیار کرتی ہے اس پر خرچ کا بڑا حصہ ایسے مکانوں کی تعمیر پر لگایا جا سکتا ہے۔ پنشن مہنگائی اور اخراجات زندگی کے مطابق دیے جائیں۔ ایسی پنشن اسکیم جس میں افراد بھی رقمیں جمع کریں، ملک کے سارے شہریوں، بشمول کسان اور کھیت مزدور کے لیے ہو۔ ملک کے سارے شہریوں کے لیے ہیلتھ انشورنس اسکیم شروع کی جائے۔ اس کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کا طریقہ یہ ہو کہ منظم حلقے میں کام کرنے والے کی تنخواہ اور اُجرتوں سے ایک مقررہ رقم کاٹ لی جائے۔ جو لوگ اپنا کاروبار کرتے ہیں ان سے مقررہ رقمیں وصول کی جائیں۔ اور کسانوں سے مالیہ اور لگان کے ساتھ ساتھ ہیلتھ انشورنس کی مقررہ رقم بھی وصول کرلی جائے۔ پرائیویٹ پریکٹس پر مکمل پابندی عائد ہو۔ تمام ڈاکٹر نیشنل ہیلتھ انشورنس اسکیم کا حصہ ہوں گے اور ان کی تنخواہ اور ان کا اسکیل ہیلتھ انشورنس کے بڑھتے ہوئے مالی وسائل کے ساتھ ساتھ بڑھنا چاہیے۔ ڈاکٹروں اور دوسرے عملوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ کرنا ہوگا تاکہ پورے ملک کے لوگوں کی صحت کی دیکھ بھال کی جا سکے۔

ریڈیو اور ٹی وی کا بہتر استعمال

سیٹے لائٹ ٹرانس میشن کے ذریعہ نشریات ملک کے اتحاد کا باعث ہوں گی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضرور ہوگا کہ ضلعوں اور دیہی مرکزوں میں مقامی ریڈیو اسٹیشن اور ٹی۔ وی سنٹر ہوں تاکہ وہ اس علاقے کی تہذیبی اور ترقیاتی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ ترقیاتی کاموں سے متعلق مرکزی وزارتیں مل جل کر اس کا خرچ برداشت کریں اور ان مرکزوں کو چلائیں۔ ان کا زیادہ تر وقت تعلیمی اور ترقیاتی پروگراموں کو نشر کرنے پر صرف ہو، اور اسی کے ساتھ ساتھ تفریح، معلومات اور ترغیب کا بھی خیال رکھا جائے۔ مقامی زبان یا بولی استعمال کی جائے گی تاکہ ان کی تہذیبی سرگرمیوں میں اضافہ ہو اور لوک سنگیت اور لوک ناچ وغیرہ کو بڑھاوا ملے۔

ایسے کالجوں اور اسکولوں کی تعداد بہت بڑھ جائے گی جن کے نصاب میں کمیونکیشن (ترسیل) کی پڑھائی شامل ہوگی۔ یہ منظر

(باقی صفحہ ۹۶ پر)

نرمل منکر جی

اگر ہم نہ بدلے تو ہوسکتا ہے کہ ۲۰۱۱ء تک بھی ایسے ہی رہیں

فاضل مصنف کی رائے میں اگر اب کچھ سخت اقدامات نہیں کئے جاتے تو ہو سکتا ہے کہ سن ۲۰۱۱ء میں حکومت کی شکل اس کی آجکل کی شکل سے زیادہ مختلف نہ ہو۔ موصوف کے مطابق ان اقدامات میں جو باتیں شامل ہوں، وہ یہ ہیں، جمہور نیز ملک کے مفلس طبقوں کی غربت کا خاتمہ، سرکاری مشینری کے ساتھ اعلیٰ ٹکنالوجی کا تال میل، کمپیوٹروں کے ذریعے محکمۂ مال کے ریکارڈز کی بسُرعت تیاری، حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ریاستوں اور اضلاع کی تنظیم نو، مرکزی اور صوبجاتی، سیاسی اور معاشی اقتدار کو کم کرنے کے لیے انتخابی عمل کی اصلاح، نیز لوک پال جیسے مؤثر نگران ادارے کا قیام۔

آج کل اکیسویں صدی کے بارے میں بہت سی حوصلہ افزا باتوں کا چرچا ہے مگر اس کے ساتھ ہی عوام کے دلوں میں یہ احساس چھپا ہے کہ ۲۰۱۱ء میں بھی سرکار اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوگی، جیسی کہ وہ آج ہے۔ آخرکار ۲۰۱۱ء کے آنے میں فقط ۱۵ سال کی مختصر مدت ہی تو باقی ہے۔ جہاں تک کارگزاری کا تعلق ہے۔ یہ وقت بھی اتنی ہی جلدی اور بغیر کسی تغیر و تبدل اسی طرح گزر سکتا ہے، جیسے کہ گذشتہ ۱۵ سال یا اسی طرح گذشتہ تیس برس۔ اس بات کا خدشہ ہے کہ موجودہ نظام کی بے حرکتی حالات کو زیادہ تر جوں کا توں ہی رہنے دے گی۔

خاطر خواہ اور مطلوبہ نتائج اور مقاصد کے حصول کے لیے ہمیں آج کیا کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

خاطر خواہ تبدیلی

یہی بات دوسرے لفظوں میں یوں کہی جا سکتی ہے کہ سرکار کے یہ سنہ ۲۰۱۱ء میں لائحہ عمل کیا ہو۔

اس تعلق میں "خاطر خواہ" کا لفظ کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ ایک تبدیلی جو کچھ لوگوں کو نمایاں طور پر خاطر خواہ لگتی ہے، دوسرے اُسے اس کے بالکل برعکس سمجھتے ہیں۔ ہر جماعت کا ایک نظریہ ہے اور اس کے لیے خاطر خواہ مستقبل اس کے اپنے مفاد سے وابستہ ہے۔ ملک کے چیدہ طبقے لازماً ایسے مستقبل کی خواہش

کرتے ہیں، جو اُن کی غالب حیثیت کی حفاظت
کرے اور اُسے مستحکم بنائے ۔ جمہور (یعنی
باقیماندہ بھارت) کے لیے اس نوع کا مستقبل
خاطر خواہ نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ وہ طبقاتی فرق
کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ یا کم از کم عمودی نابرابریوں
میں کسی حد تک ہمواریت کے حق میں ہیں۔ —
اقتصادی نابرابری کے نتیجے میں ملک میں جو
مختلف طبقے پائے جاتے ہیں، ان میں سے ہر
ایک کے مفادات الگ الگ ہیں۔ شمال میں
بسنے والے ہندی بھاشی 'ہندو' جس مستقبل کا
تصور کرتے ہیں، وہ باقیماندہ بھارت کے
تصور سے یکسر جُدا ہے۔
سرکار کے دائرہ کار میں جو کچھ خاطر خواہ
ہے، اس لحاظ سے مقاصد کا سوال فوری توجہ
کا طالب ہے۔

مرکزی چیدہ بین بنام جمہور

اس موضوع کی بابت موٹے طور پر دو
نظریے ہیں، پہلا ایک طرح کا برہمنی نظریہ ہے،
جو بھولپن کی حد تک سادہ ہے۔ اس کے لیے
دلیل یہ ہے کہ بھارت کا مستقبل اس کے
متوسط طبقے اور اعلیٰ متوسط طبقے سے
وابستہ ہے۔ کیوں کہ یہ وہی طبقات ہیں جو
ثقافت کا مرکز ہیں۔ لہٰذا ہر کام ایسے کرنا
چاہیئے کہ یہ طبقہ پھلے پھولے۔ اگر اس مقصد کے
حصول کے لیے یکسوئی سے کام لیا جائے تو دیگر
فوائد ضمنی مصنوعات کی طرح وقت آنے پر
خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔ یہ نظریہ کھلم کھلا
چیدہ طبقات کا حامی ہے۔ اس کے لیے کس
نوع کا ملک مضبوط ہونا چاہیئے۔ تاکہ ان کے حق
میں جانے والی پالیسیوں اور پروگراموں پر
عملدرآمد ہو سکے۔ اس طرح مرکزیت پسندی
کا نظریہ اس کا جزو بن جاتا ہے۔ مزید برآں
چوں کہ ترقی کا مطلب ترقی یافتہ دُنیا کے
خوشحال باشندوں کے دوش بدوش رہنا
سمجھا جاتا ہے، اس لیے جدید انتظامیہ اور
اعلیٰ ٹکنالوجی قطعی اہمیت کی حامل بن گئی
ہے۔ یُوں کہا جانے لگا ہے کہ انھیں اوصاف
نے ان متموّل باشندوں کو وہاں تک پہنچایا
ہے، جہاں وہ آج ہیں۔ لہٰذا ہر میدان، یہاں
تک کہ حکومت کے شعبوں میں بھی، تکنیکی و
انتظامی حلوں کی کھوج ہو رہی ہے۔
دوسرا نظریہ اصلاً جمہوری ہے۔ اس
کا انحصار دو باتوں پر ہے۔ پہلی یہ کہ اس
ملک کا مرکزی مسئلہ افلاس ہے، اور نتیجتاً
اس کی دونوں صورتوں یعنی غریب عوام اور
مفلس خطوں میں اس کا قلع قمع کرنے کو اولیت
دینا ضروری ہے۔ دوسری یہ کہ چلائے جانے
والے وائسرائی نظام حکومت کے لیے بھارت
ایک بہت بڑا اور متنوع ملک ہے۔ لہٰذا
یہ بہت ضروری ہے کہ آئین میں درج وفاقی
جمہوریت کے نظریئے کو وُسعت اور معنی
دیئے جائیں۔ ان دونوں باتوں کا زور عوام
کے حق میں ہے۔ اس نظریئے کی رُو سے
بھارت میں ہونے والے حالات کا انحصار
اس بات پر ہوگا کہ اس کے عوام کو اپنے
اور اپنے ملک کے مستقبل کو صورت دینے
کا اہل بنانے کے لیے انھیں سماجی، اقتصادی
اور سیاسی طور پر کونسا مقام دیا جاتا ہے۔
یہ ہے منزلِ مقصود۔
گورنمنٹ کا مسئلہ بنیادی طور پر سیاسی
اور انتظامی نوع ہی کا سمجھا جاتا ہے، جس
میں انتظامی، کے بجائے "سیاسی" پہلو زیادہ
اہم ہوتا ہے۔

تکنیکی و انتظامی انداز نظر: منزلِ مقصود

کے اعتبار سے یہ دونوں نظریئے ایک دوسرے
کے متناقض ہیں۔ لیکن کئے جانے والے امور
کے ضمن میں ہر لحاظ سے لازماً ایسا نہیں ہے۔
جمہوری طرز کی تقریریں جھاڑنا کہ ہم غریبی کا
خاتمہ کر دیں گے، ہم بنیادی سطحوں پر جمہوریت
کو فروغ دیں گے، مگر دراصل برہمنی راہ پر
چلنا، دو متضاد راستے ہیں۔ سیدھا راستہ یہ
ہوگا کہ تکنیکی انتظامی انداز نظر سے ایسے اجزا
کو قبول کرنا جن سے سرکاری مشینری بہتر طور
پر کام کر پائے، لیکن ویسے ۲۰۰۱ء کی سرکار
کے لیے خاص لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے جمہوری
طرز فکر پر تکیہ کیا جائے۔ مثال کے طور پر اراضی
کے ریکارڈز کے کام کو بسُرعت انجام دینے
کے لیے کمپیوٹروں کا استعمال ہر حالت میں
ضروری ہے کیوں کہ ایسا ہو جانے پر محکمۂ مال
کا نظم ونسق زیادہ کارگزار ہو جائے گا۔ اس
سے اس کے بدعنوان ہونے کے امکانات کم
ہو جائیں گے، لیکن اس مشق کا پُورا فائدہ تبھی
مل پائے گا، جب جمہوری انداز فکر کی منطق
پر عمل کرتے ہوئے زمینی اصلاحات کو، پالیسی
کے طور پر اولیت دی جائے گی۔ ملک بھر میں
کمپیوٹر کی مدد سے چلایا ہوا زمینی اصلاحات
کا پروگرام دیہی منظر میں، تبدیلی کا موجب ہوگا
یہ ہے ٹکنالوجی اور معاشرتی انجنیئرنگ کا
وہ مرکّب جس کی جانب ہمیں کام کرنے کی ضرورت
ہے۔
تکنیکی و انتظامی انداز نظر زیادہ سے
زیادہ سرکاری آلاتِ کار کو سُدھار سکتا ہے۔
جن میں بہتر تربیت یافتہ سول حکام کار آمد
اور موثر اطلاعاتی نظام، تیز تر فیصلہ کن عمل انگیز
سریع اور زیادہ بامروّت براہ راست خدمت
وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن ۲۰۰۱ء کی سرکار کے

لیے بنیادی لائحہ عمل تو ایک وسیع تر سیاسی و انتظامی تناظر میں ہی تیار کیا جا سکے گا۔

ریاستی تنظیم نو کا معاملہ

آیئے سب سے پہلے اس بات پر نظر ڈالیں کہ آبادی میں اضافہ علاقائی اکائیوں کے انتظام پر کیسے اثر انداز ہو رہا ہے۔ ۱۹۸۱ء میں ختم ہونے والے دہے میں آبادی میں ۲۵ فیصد اضافہ ہوا۔ اگر ہم اسی شرح کو اس سطح تک کم رکھ پائیں تو ایسی حالت میں بھی ۲۰۰۱ء تک آبادی میں لگ بھگ ۵۶ فیصد کا مزید اضافہ ہو جائے گا۔ تب تین صوبے دس کروڑ والے زمرے میں آ جائیں گے۔ اتر پردیش کی آبادی ۱۷ کروڑ ۴۰ لاکھ ہو گی۔ چار دیگر صوبے لگ بھگ ۸ کروڑ آبادی والے ہوں گے۔ مغربی بنگال کی آبادی ۸ کروڑ ۴۰ لاکھ، بہار کی ۱۰ کروڑ ۹۰ لاکھ، مہاراشٹر کی ۹ کروڑ ۵۰ لاکھ، آندھرا پردیش کی ۸ کروڑ ۲۰ لاکھ، مدھیہ پردیش کی ۸ کروڑ دس لاکھ اور تامل ناڈو کی ۷ کروڑ ۵۰ لاکھ ہو گی۔ مزید صوبے ۵ کروڑ سے کچھ اوپر آبادی والے ہوں گے، یعنی کرناٹک کی آبادی ۵ کروڑ ۷۰ لاکھ، راجستھان کی ۵ کروڑ ۳۰ لاکھ اور گجرات کی بھی ۵ کروڑ ۳۰ لاکھ ہو گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیا یہ قابو میں رہ سکنے والی جسامتیں ہیں؟ کیا اس امر میں جواز نہیں کہ لسانی و ثقافتی اصول کو توڑے بغیر دوسرا صوباتی تنظیم نو کمیشن قائم کیا جائے؟ موجودہ دو یا اس سے زیادہ صوبوں کے ثقافتی طور پر یکساں ملحقہ علاقوں کو آپس میں ملا کر نئے صوبوں کی تشکیل خارج از امکان نہیں ہونی چاہیئے۔ مثلاً بھوج پوری بولنے والوں کا ایک صوبہ، جو مشرقی اتر پردیش اور مغربی بہار کے ان اضلاع پر مشتمل ہو جو ثقافتی اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوں اور جس کی راجدھانی وارانسی ہو۔ اس ضمن میں آبادی کی پسندیدہ حد ۳ تا ۴ کروڑ ہو سکتی ہے۔ حالاں کہ اس کا فیصلہ بھی خود یہی کمیشن کرے گا۔ ممکن ہے کہ ۲۱ ویں صدی کے اوائل میں آبادی میں اضافے کی رفتار میں استحکام آ جائے اور اس حالت میں کسی مزید تنظیم نو کی ضرورت نہ پڑے۔

اضلاع کی تنظیم نو بھی ضروری

اگر بڑھتی ہوئی آبادی صوبوں کو ناقابل حکومت بنا رہی ہے تو اضلاع بھی اس کے باعث قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں کچھ صوبوں کو بہت بڑے اضلاع ورثے میں ملے تھے۔ جنھیں کچھ چھوٹا کرنے پر وہ ابتداً مائل نہیں تھے۔ لیکن یہ خیال اب زور پکڑتا جا رہا ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ ساتویں دہے کے دوران ملک میں اضلاع کی تعداد ۳۶۰ سے بڑھ کر ۴۱۲ ہو گئی۔ لیکن حالیہ ترین مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ چوبیس پرگنہ (آبادی ایک کروڑ ۷ لاکھ) اور مدناپور (آبادی ۶۷ لاکھ) جو ہر دو مغربی بنگال میں ہیں؛ نیز کم از کم مزید تین درجن اضلاع جن کی آبادی ۳۰ لاکھ سے زیادہ ہے، جیسے بڑے بڑے ضلع بھی موجود ہیں۔ لیکن اگر یہ خیال ہو کہ ۲۰۰۱ء میں کسی بھی ضلع کی آبادی عام طور پر ۱۵ تا ۲۰ لاکھ سے زائد نہیں ہونی چاہیئے تو غالباً اضلاع کی موجودہ تعداد کے نصف حصے کو توڑ کر چھوٹا کرنا ہو گا۔ اب تک اِکّا دُکّا اضلاع ہی کی تنظیم نو ہوئی ہے۔ لیکن اس عمل کو اب منظم طور پر تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ضروری ہو تو اس سلسلے میں مرکز سے خاص مالی امداد بھی لی جائے۔

حد سے زیادہ مرکزیت کی حماقت

کافی پرانا ہونے کے باعث، غیر مرکزی حکومت کا نظریہ بھی واماندہ اذہان کو دق کرنے لگا ہے۔ تاہم یہ آج اتنا موزوں ہے، جتنا کہ پہلے کبھی نہ تھا نیز مستقبل میں تو شائد اس کی موزونیت بڑھتی ہی جائے۔ لہذا ۲۰۰۱ء کے لائحہ عمل میں اس کی شمولیت غور و خوض کی مستحق ہے۔ ایک بالکل صحیح اصول یہ تھا کہ بھارت کو ایک مضبوط مرکز کی ضرورت تھی، لیکن اس کی یہ تاویل کہ اس امر کے لیے سرکاری اختیارات مرکزی وزارتوں میں مجتمع ہونے چاہیئں، یکسر غلط تھی۔ دوسری عالمگیر جنگ سے چلے آ رہے معاشی رکاوٹوں کے دور کو جاری رکھنے نیز قومی منصوبہ بندی کو اختیار کرنے سے مرکز کو ہر کام میں ٹانگ اڑانے کا موقع مل گیا۔ سیاسی سمت میں، یونینی سرکار کی اندرونی قیادت اور کانگرس ہائی کمان دونوں ایک ہی ہونے کی وجہ سے، اُن صوبوں نے جو ابتدائی دہوں میں زیادہ تر کانگرس کے ہاتھوں میں تھے، حد سے زیادہ مرکزی یونین کی ماتحت تنظیموں کے طور پر کام کرنے لگ گئے۔ اسی کے نتیجے میں لمبی چوڑی وزارتوں کے ساتھ بے پناہ طور پر پھیلی ہوئی مرکزی نوکر شاہی وجود میں آئی۔ جن کے لیے بڑے بڑے بھون تعمیر کرنے پڑے۔ حالاں کہ زراعت ایک صوبائی موضوع ہے، لیکن نئی دہلی میں واقع کرشی بھون اکثر صوبوں کے سیکریٹریٹوں سے بڑی عمارت ہے۔

اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ اب حد سے زیادہ مرکزیت کی حماقت کو تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ خاص کر وہ صوبے، جن میں غیر کانگرسی سرکاریں ہیں، غیر مرکزیت کے لیے دباؤ ڈال رہے ہیں۔ ساتویں منصوبے میں منصوبہ بندی اور تعمیر و ترقی کے انتظامیے کی غیر مرکزیت کے لیے مؤثر اقدام کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن مرکزیت کا اصول کئی پھنوں والا سانپ ہے۔ خواہ منصوبہ بندی کمیشن کچھ ہی کہے، یونین وزارتیں مرکز کے

زیرِ سرپرستی اسکیموں کی فہرست بڑھاتی جاتی ہیں۔ نیز ہر نئی صورت احوال سے وزارتِ داخلہ کا ردِّ عمل مزید نیم فوجی بٹالینوں کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس امر کی مخلصانہ اُمید کی جاتی ہے کہ سرکاریا کمیشن یونین اور صوبوں کے مابین تعلقات میں کچھ ہوش مندی لے آئے گا۔ لیکن امکان یہ ہے کہ اس کمیشن کی رپورٹ، لامرکزیت پر بحث ختم کرنے کے بجائے اسے دوبارہ سے چھیڑ دے گی۔

وفاقیت کے حق میں جو آواز زور پکڑ رہی ہے، اس کے اثر اور اس کے نتیجے سے پیدا ہوتے والے جھگڑے کو نپٹانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے کافی حد تک لامرکزی نظام۔ مگر اس کا انحصار مرکزی قیادت کی بصیرت پر ہے چنانچہ مرکزی حکومت کس حد تک اپنے دائرہ اختیار کو مختصر کرسکتی ہے، یہی بات اس کا حتمی امتحان ہوگی۔

صوبوں میں بھی

کیا صوبے اضلاع کی حد تک معاملات میں غیر مرکزیت پسند کریں گے؟ سچ تو یہ ہے کہ مرکزیت کے ضمن میں صوبے بھی اُتنے ہی قصوروار ہیں جتنا کہ یونین — اگر یونین نے صوبوں کا کام کرنے کی کوشش میں خود کو دلدل میں پھنسا لیا ہے، تو مؤخرالذکر بھی اُن اختیارات کے مالک بن بیٹھے ہیں جو صحیح طور پر مقامی حکومتوں سے تعلق رکھتے ہیں، مرکز کی طرف سے ان غصب کردہ اختیارات کی صوبوں کو واپسی کا عمل شروع ہونا چاہیئے اور پھر صوبوں کی جانب سے بھی اضلاع کو اس طرح کی منتقلی کی کوشش کی جانی چاہیئے۔ بڑا سوال یہ ہے کہ آیا صوبوں کی جانب سے اضلاع کو اختیارات کی منتقلی کے سلسلے میں ضلع کلکٹروں کو ضروری اختیارات دینے ہوں گے۔ جمہوری طریقے سے چُنی ہوئی ضلعی سرکاروں کو یہ اختیارات منتقل کرنے ہوں گے۔ تیس سال قبل غلطی سے ہم نے مغربی علماء کے اقوال کی تقلید میں، ضلعی سرکاروں کو دو حصّوں میں بانٹ دیا تھا۔ ایک ترقی و تعمیر کا شعبہ اور دُوسرا انتظامی شعبہ۔ اس سے ایک سمجھوتہ ہو پایا، یعنی تعمیر و ترقی کا شعبہ منتخب جماعتوں کے پاس چلا گیا اور تنظیمی شعبہ کلکٹروں کے پاس رہا۔ یہ امتیاز مصنوعی اور بودا ہے کیوں کہ اگر تعمیر و ترقی کا شعبہ دبے ہوئے نچلے طبقوں کو اوپر اٹھانے میں کامیاب ہوتا ہے تو تنظیمی شعبے کو بھی اُن کی مدد کرنا ہوگی۔ لیکن اپنے سوچ بچار میں ہم لکیر کے فقیر رہے ہیں، اور موجودہ آثار کے مطابق ہم اکیسویں صدی میں تنظیمی پرچم اٹھائے اُنیسویں صدی کے کلکٹروں کے ساتھ داخل ہوں گے۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ اضلاع میں کامل طور پر نمائندہ اور چُنی ہوئی مقامی گورنمنٹوں کو فروغ دینے کے لیے سنجیدہ غور و فکر سے کام لیا جائے۔ اور یہ سرکاریں تعمیر و ترقی اور انتظامی اختیارات دونوں کا احاطہ کرسکیں۔

تال میل کے لیے حکمتِ عملیاں

جب تک تال میل کی حکمتِ عملیوں سے اُن کا جوابی توڑ نہیں کیا جائے گا، غیرمرکزیت کی حکمت عملیاں تنہا انتشار کا ایک نسخہ بن سکتی ہیں، آیئے، کچھ اُن حکمت عملیوں پر نگاہ دَوڑائیں، جو تال میل کے فروغ میں معاون ہوسکتی ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ کسی مُلک کا ایک تہائی سے لے کر نصف حصّہ، صوبائی سطح پر، اُن جماعتوں کی حکمرانی میں آسکتا ہے، جو مرکز میں صاحبِ اقتدار پارٹی سے الگ ہوں۔ اُن صوبوں میں بھی جہاں کہ منتخب ضلعی سرکاریں اقتدار میں آئیں گی، زیادہ تر ویسی ہی صورتِ حال ہوگی، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک صوبے میں، تقریباً آدھے ضلع اُس جماعت کے ساتھ ہوسکتے ہیں جو صوبے کی برسرِاقتدار پارٹی سے مختلف ہو۔ ان حالات میں اتفاق رائے تیار کرنے کے لیے نیز جھگڑے نپٹانے کے لیے فورموں یا منچوں کا ہونا ضروری ہے۔

دو طرح کے منچوں پر غور کیا جاسکتا ہے۔ راجیہ سبھا دراصل ریاستوں کی کونسل تھی لیکن عملاً اس کی حیثیت ایک دوسرے نمبر کے ایوان سے بڑھ کر نہیں رہی۔ اس کی ساخت اور فرائض پر نظرِ ثانی ہوسکتی ہے تاکہ یہ قومی سطح پر ایک وفاقی فورم کی صورت میں کام کرسکے۔ صوبائی سطح پر تشکیل شدہ قانون ساز کونسلیں ایسا ہی کردار ادا کرسکتی ہیں۔ آرٹیکل ۲۶۳ سے استفادہ کرتے ہوئے اس کا متبادل بین ریاستی کونسل ہے، جس کی بہت وکالت کی جاتی ہے۔ اگر قومی سطح پر ایسی کونسل کا معاملہ درخورِ اعتنا ہے تو مختلف اضلاع کے مابین بھی کونسلوں کے قیام کا جواز بنتا ہے۔

مُشترک سول کوڈ ضروری ہے

بھارت ایک مشترک منڈی اور ایک مشترک نظام سیاست رکھتا ہے یہ ہم اصل نہ ہوتے ہوئے بھی باہمی ربط پیدا کرنے والی قوتیں ہیں۔ لیکن اب تک ہمارا سول کوڈ مشترک نہیں ہے۔ شاہ بانو فیصلے کے بعد ہونیوالے مباحثے نے روشنی کی بہ نسبت زیادہ گرما گرمی پیدا کی۔ اس سب شور و غوغا کے بعد جو ایک خیال پہلے سے زیادہ ہماری توجہ کھینچے ہوئے ہے، وہ یہ ہے کہ ہمیں ایک موزوں شہری ضابطے کو قانونی شکل دینے کے کام میں جُٹ جانا چاہیئے۔ ہندو کوڈ بل آگے کی طرف لیجانے والا ایک دلیرانہ قدم تھا، مگر یہ کوڈ فقط ہندوؤں پر لاگو ہوتا ہے، دوسرے یہ نقائص سے بھی

پاک نہیں ہے، خواتین کی تنظیموں نے اس پر نکتہ چینی کی ہے کہ یہ مرد اور عورت کو برابر کا درجہ نہیں دیتا۔ ہندو خاندان مشترکہ کا تصور ٹیکس بچانے کی ایک ایسی ترکیب کے طور پر دیکھا جاتا رہا ہے جو ایک مذہب والوں کے لیے تو تسلیم کرلی گئی ہے مگر دوسروں کو اس سے محروم رکھا گیا ہے۔ نئے ضابطے کو ان سب سے پرے رہنا ہوگا۔ مذہبی زُود حسی کی وجہ سے یہ قرین مصلحت ہوگا کہ اس ضابطے کو سبھی شہریوں کے لیے رضاکارانہ طور پر ایک سہولت کے طور پر پیش کیا جائے تاکہ وہ سبھی لوگ جو ایسا چاہیں اس سے استفادہ کرسکیں۔ مگر اس میں بنیادی طور پر کسی کو کوئی کشش نظر آئے گی تو وہ خود بخود اُس سے استفادہ کرے گا۔ یہ بات ہر شخص کی صواب دید پر چھوڑ دینی چاہیئے۔ ہمیں قومی منصوبہ بندی کو مُلک کی معاشرتی اور اقتصادی ترقی کا ایک مؤثر ذریعہ سمجھنا چاہیئے اور اس خیال سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ قومی تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے منصوبہ بندی میں وفاقیت پر زور دینا ضروری ہے۔ یہ امر اہم ترین ہے کہ ہر سطح پر منصوبہ بندی غریبی ہٹانے اور علاقائی نابرابریوں کو صحیح کرنے کے ہردو مقاصد کو نظر انداز نہ کرے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدانوں میں وزیر اعظم نے مشنوں کی تنظیم کا ذکر کیا ہے جس سے مختلف معاشی کاموں کو پوری توجہ سے انجام دیا جاسکے۔ اوّل غریبی کے خلاف جنگ، زمینی اصلاحات، بارانی کھیتی، پینے کا پانی اور غریبوں کے لیے امدادی قیمت پر خوراک کے سلسلے میں اس طرح کے مشن بنائے جانے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ مظلوموں کا تحفظ بھی ضروری ہے تاکہ کہیں پولیس یا زمینداروں کے ہاتھوں ظلم و ستم کی داستانیں نہ دہرائی جاسکیں۔

اخیر میں کسی بھی کام کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اگر ہماری سیاسیات پاک و صاف نہیں ہوں گی، اس مقصد کی کنجی اس میں مضمر ہے کہ سیاسی زندگی کے لیے اچھے لوگوں کو لُبھایا جائے اس کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ انتخابی عمل کی ایسی اصلاح کی جائے کہ اگر دولت کی طاقت کا کردار اس سے قطعاً خارج نہ ہو پائے تو کم از کم گھٹ ضرور جائے۔ نیز جماعتی نظام میں صحتمندی بحال کی جائے۔ پارٹی کے اُمیدواروں کو سرکار کی طرف سے خرچ دیئے جانے کے سوال پر سنجیدگی سے غور ہونا چاہیئے۔ ایسے ہی جماعتی فنڈوں کی آڈٹ کے طریقے پر جانچ پڑتال ہو۔ دوسرے یہ کہ ضلعی سطح پر منتخب مقامی گورنمنٹوں کو سیاست میں با صلاحیت نوجوانوں کو داخل کرنے اور ہونہار عہدہ داروں کو صوبے اور یونین کی سطح پر اعلیٰ ترین ذمہ داریوں کے لیے تیار کرنے کے لیے تربیت گاہ کے طور پر استعمال کیا جائے۔ ●

بقیہ ۲۰۰۱ میں زندگی کا ڈھب
بھیڑ بھاڑ والا اور اُلجھا ہوا مستقبل

نوعیت کی فصلیں بھی اُگائی جائیں اور اضافی خوراک کے لیے بھی چھوٹے پیمانے پر کاشت ہو۔ صنعتی ترقی کے عمل کو اس طرح آگے بڑھانے کی ضرورت ہوگی کہ اس سے شہروں کے مسائل حل ہوسکیں۔ پیداواری مقامات کی ترتیب و تشکیل ضروری ہے۔ بڑے پیمانے کی صنعتوں اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو یکساں طور پر فروغ دینا ضروری ہوگا۔ قدرتی طور پر دیہات کے لکھو کھا عوام کی شہروں کی طرف منتقلی کا سوال آتا ہے لہٰذا اقتصادی ترقی کے عمل کو اس انداز پر آگے بڑھانا ہوگا جس سے یہ منتقلی رُک سکے۔ شہروں میں مکانات کی قلت اور شہری آبادی کا اس سلسلے میں تناؤ اس وقت تک دُور نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ عوام کے لیے بڑے پیمانے پر تعمیرِ مکانات کے پروگرام عملی صورت میں سامنے نہ آسکیں، اس کے ساتھ ہی عوامی سہولتوں کے پیشِ نظر ٹرانسپورٹ کے وسیع و عریض انتظام کی ضرورت ہوگی۔ معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے عوامی ضرورت کی جملہ اشیاء فراہم کرنی ہوں گی۔ ہماری پرورش جن نظریات کے تحت ہوئی ہے، وہ "دو انقلاب ایک انقلاب کی صورت میں" کے نعرے سے لگا نہیں کھاتی۔ اس لیے ایک نئے نظریۂ حیات کی ضرورت ہوگی۔ اس کی بنیاد مرکزی منصوبہ بندی میں ہوگی لیکن اس کے عمل درآمد میں لامرکزی نظام سے کام لینا ہوگا۔ ترقی پذیر ملکوں کو صدی کے اس دوسرے حصے میں ان چیلنجوں کا اور بھی سامنا ہے۔

یہ سب کام مختصر سے وقت میں کرنے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک صنعتی انقلاب کے اثرات کے ساتھ گزشتہ برسوں میں مطابقت پیدا کرسکے اور اس کے لیے انھیں کافی وقت ملا۔ ہمیں یہ کام بہت کم وقت میں کرنا ہے، پھر سیاسی اور سماجی طور پر بھی مؤثر عمل درآمد کے لیے ادارہ جاتی امداد نہیں ہے۔ اس سے ہم اپنے کام اور اپنی راہ کی دشواریوں کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ سماجی غصہ اچھا ہے لیکن یہ اسی وقت، اگر یہ سماجی تناظر میں ہو۔

یہ وہ خیالات تھے جو میں نے بیس سال پہلے ظاہر کیے تھے۔ اب سنہ ۲۰۰۱ کی بات ہے تو یہ پھر پسند اور ناپسند کا معاملہ ہے۔ اگر ہم اجتماعی مفاد کے تصور سے کام کریں گے اور بعض چیدہ طبقات کے مفادات کے لیے سوچنا بند کردیں گے تو ہم بڑھتی ہوئی پراگندگی کو دُور کرسکیں گے۔ ہمارے پاس بہتر صلاحیتیں ہیں، وسائل ہیں۔ لہٰذا ہم اپنے [illegible] کوششوں کو بروئے کار [illegible] ●

ے۔ ایف۔ رستم جی

منصوبہ بندی کی کسوٹی

غیر متوقّع حالات سے نپٹنے کی صلاحیت

زیرِ نظر مضمون میں مصنّف نے منصوبہ بندی کے لیے ایک کسوٹی یہ بتائی ہے کہ ہمیں کبھی بھی حالات سے شکست نہیں ماننی چاہیے۔ اور خواہ کتنے بھی ناخوشگوار واقعات کیوں نہ پیش آئیں ہمیں بددل نہ ہونا چاہیے، یہی وصف دراصل منصوبہ بندی کا حقیقی امتحان ہے۔ منصوبہ بندی کی خوبی یہ ہے کہ حالات کے رُخ پر نظر رہے اور حالات کو بگڑنے دینے سے بہت پہلے ان کے لیے اصلاحی اور تدارکی اقدامات کیے جائیں۔ مصنّف نے کچھ ایسے امور کی نشاندہی کی ہے جن کا ملک کو خطرہ ہے۔ ان خطرات کے پیشِ نظر انھوں نے مشورہ دیا ہے کہ منصوبہ بندی کمیشن میں ایک ایسا طبقہ ہونا چاہیے جو ہم کو سخت سے سخت حالات کے لیے تیار کرے اور اس کے پاس ہر ایک سائنسی بحران کا حل ہو۔ نیز ماحول کی آلودگی، اسٹار وارز، بیرونی خلا سے آنیوالے جراثیم اور حیاتیاتی انجینئرنگ اور جین کی انجینئرنگ سے پیدا شدہ مسائل کے حل کے لیے واضح خطوط ہوں۔

ہمارے سرکاری نظام میں بڑی
ا ہے کہ ہماری ترقی کے لیے مکمل منصوبہ
رہا تصور پیش نہیں کرتا۔ منصوبہ بندی
یشن کی کوششیں صرف ایک حصے کی طرف

توجہ دیتی ہیں۔ جن کا تعلق خاص کر مسائل سے ہے۔ قانون سازی کے ماہرین وقت کی لہروں کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں۔ جمہوریت میں بحث و مباحثہ، مذاکرہ اور تبادلۂ خیال کی

بڑی اہمیت ہے۔ لیکن ان تمام بحثوں نے سیاسی دشنام طرازی پر زور دیا ہے جس سے وہ اپنی افادیت کھو رہی ہیں۔ سیاسی پارٹیوں کے مینی فیسٹو اور لائحۂ عمل کی دستاویزوں کو پڑھ کر یہ تو ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں واضح کردہ اعلانات اور دعوے بڑے بڑے ہیں، لیکن ان کو بہت جلد بھلا دیا جاتا ہے۔ اخبارات اور مبصرین یا غلطیوں اور برائیوں کی نشاندہی پر بڑی حد تک انحصار کرتے ہیں اور وہ بلاشبہ مطابق حالات بھی ہوتی ہیں، اس کے ساتھ ہی وہ کبھی کبھی منصوبہ بندی پر ایک زوردار مضمون بھی شائع کرتے ہیں۔ ایسے سائنسداں، سیاستداں، مصنفین موجود ہیں جو صاحبِ الرائے ہیں، لیکن ان کے مشوروں اور باتوں سے فائدہ نہیں اُٹھایا جاتا۔ جمہوریت ایک ایسا طریقہ ہے جو لوٹنے کی آزادی دیتا ہے۔

اس کے ذریعے مستقبل کے متعلق تمام لوگوں کے خدشات اور نظریات کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ لیکن ابھی تک ہم نے صرف ایسے لوگوں کی باتوں کو ہی قابلِ اعتناء سمجھا ہے جو منصوبہ بندی کے اس نظام کو مکمل سمجھتے ہیں۔

لیکن یہی وہ لوگ ہیں جو غیر متوقع اور ہنگامی بوجھ کے سبب سب سے پہلے سٹ پٹا بھی جاتے ہیں۔

منصوبہ بندی کی کسوٹی

منصوبہ بندی کی کسوٹی یہ ہے کہ ہم حالات کے آگے ہتھیار نہ ڈالیں، اور ناخوشگوار واقعات سے بددل نہ ہوں بلکہ ہم مستقبل کے رجحانات کا پہلے ہی سے اندازہ لگا سکیں قبل اس کے کہ حالات ناگفتہ بہ ہو جائیں۔ منصوبہ بندی کا تقاضہ یہ ہے کہ تکنیکی ترقیوں کا بہت پہلے سے اندازہ کرلیں اور ان کو اپنانے میں ذرا بھی وقت ضائع نہ کریں، سائنسی امور سے عدم واقفیت، یا دفتر شاہی نظام کو اس راہ میں مانع نہ ہونے دیں۔ مستقبل پر ہماری نظر ہونی چاہیئے اور مستقبل کے تقاضے اگر ہم پوری طرح نہ سہی البتہ کافی حد تک سمجھ سکیں۔ مستقبل کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی ذمہ داریوں پر ہماری نظر ہونا ضروری ہے۔

منصوبہ بندی کے ماہرین اور منتظمین ساتویں منصوبے پر بڑی گہرائی سے غور کرتے ہیں۔ وہ اس پلان کے نشانوں کے بارے میں ٹھوس تجاویز دیتے ہیں، ان کی ترجیحات کا تعین کرتے ہیں۔ اس کے مقاصد اور تقاضوں کا تعین کرتے ہیں۔ اس کی پالیسیوں کا ڈھانچہ بناتے ہیں اور اس پر تبصرہ کرتے ہیں اور غیر مانوس اصلاحات کے ذریعے اس کے مفاہیم مزہ لے لے کر بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ سب کام وہ ایسی ہی دلچسپی سے مزہ لے لے کر کرتے ہیں جیسا کہ کسی غزل کے پڑھنے سے لطف اٹھایا جاتا ہے۔ وہ یہاں تک اظہارِ خیال کر دیتے ہیں کہ فلاں تاریخ تک ملک سے غریبی دور ہو سکے گی لیکن وہ یہی بات اگلے سال بھول جاتے ہیں۔

صدمے ہی صدمے

میں چند ایسے گوشوں کی نشاندہی کروں گا جہاں ہمیں غیر متوقع طور پر شدید تکلیف کا سامنا کرنا ہوگا۔ کیا ہم نے خود کو مستقبل کے ان صدموں کو اٹھانے کے لیے خود کو تیار کیا ہے۔ حصولِ آزادی کے فوراً بعد کیا ہم نے یہ سوچا کہ اضافہ آبادی ملک میں سب سے زیادہ گمبھیر مسئلہ بنے گا۔ ۱۹۶۰ کے بعد جاکر ہم نے یہ محسوس کیا کہ اضافہ آبادی ایک خطرناک مسئلہ بن سکتا ہے لیکن اس وقت بھی کم ہی لوگ تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے وجود کے لیے خطرہ ہے۔ اگر اس مسئلے پر شروع ہی سے قابو پالیا گیا ہوتا اور اگر لڑکیوں کی شادی کی کم سے کم عمر ۱۹۴۷ء سے ۱۸ سال کردی ہوتی اور پھر اس قانون پر پنچایتوں اور عدالتوں کے ذریعے عمل درآمد کرانے پر زور دیا ہوتا (اگرچہ اس بارے میں ہم آج بھی ناکام ہیں) تو ہم آج اس حال میں خود کو نہ پاتے۔ صرف اسی ایک غلطی سے منصوبہ بندی پر مرتب ہونے والے مضر اثرات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ہم نے ہر مسئلے کے میں ہمیشہ غلط تاریخ، غلط نشانہ، غلط حکمتِ عملی اپنائی۔ ہمارے شہر اور قصبات قلت کا شکار ہیں۔ ٹیلی فون، پانی، گندے پانی کا نکاس، اسکول، ٹرانسپورٹ ہر ایک جگہ قلت کی شکایت ہے منصوبہ بندی میں دیہات کی ضرورتوں کو نظر انداز کیا گیا۔ ان کو پسِ پشت ڈال دیا گیا اور تمام رونقیں شہروں کے لیے وقف کر دی گئیں۔

لیکن اگر ہم دانش مندی سے کام لیں تو ہم اس آبادی کو، جسے ہم اپنی کمزوری سمجھتے ہیں، طاقت کا عظیم سرچشمہ بنا سکتے ہیں۔ ذرا ایک ایسے ہندوستان کا تصور کیجیے جس کی آبادی . . اکروڑ ہے، مگر جہاں امن ہی امن ہے، جہاں مربوط ڈھنگ سے کام ہوتا ہے، جہاں کے عوام فعال اور متحرک ہیں اور پیداوار بڑھانے میں لگے ہیں اور جہاں دفاعی اخراجات آج کی سطح پر محدود کر دیئے گئے ہوں۔ کیا یہ ایک قوت نہیں ہوگی؟

جس وقت ملک آزاد ہوا اس وقت ہمیں سب سے زیادہ ڈر اس بات کا تھا کہ ملک میں اناج کی پیداوار یہاں کی کثیر آبادی کے لیے ناکافی ہوگی۔ ہم اسی وقت قحطِ بنگال کے ہولناک مناظر دیکھ چکے تھے جہاں ہزارہا افراد بھوک سے مر گئے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ خوراک کی پیداوار بڑھانا آسان کام نہیں۔ ۱۹۵۰ء کے دہے میں ہم نے خوراکی اجناس باہر ملکوں سے منگائے۔ بڑی ضرورت کا خوراکی اجناس باہر سے منگانے میں بہت سی اقوام کا احسان مند ہونا پڑا۔ لیکن ہم نے اناج کی پیداوار بڑھانے کے لیے دل و جان سے کام کیا۔ اس محاذ پر سیاسی، سائنسی اور زرعی انداز کی کوشش کو بڑھایا۔ چنانچہ ہم نے اس دشوار مسئلہ کو حل کر لیا۔ چنانچہ آج ہمارے

ملک میں اناج کی پیداوار حصولِ آزادی کے وقت کی پیداوار کے مقابلے تین گنی ہے۔ اور اب ہم موجودہ پیداوار کے دگنے کے بقدر اجناس پیدا کر سکیں گے ممکن ہے کہ یہ پیداوار اور بھی آگے بڑھے اور ہم خوراکی اجناس باہر ملکوں کو بھیجنے لگیں۔

سبق سیکھنا ضروری ہے

اس سے ہمیں یہ سبق سیکھنا ضروری ہے کہ اگر ہم پوری طرح سے کام لیں تو ہم اپنے مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم مسائل سے ہر وقت آگاہ ہو جائیں۔ ہمارے پاس وسائل کی کمی نہیں۔ ہم کوئی بھی مسئلہ ہو، اسے حل کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم اُن کی بات پر دھیان دیں۔ جو دانش اور بینش رکھتے ہیں اور ہم ان کی باتوں کو سرکار کے خلاف نہ سمجھیں۔ کیا ہم اپنے ناقدوں اور نکتہ چینی کرنے والوں کو سُن سکتے ہیں کیوں کہ وہ حالات کا رُخ کچھ اور ہی دیکھتے ہیں اور اس بارے میں اُنھیں اُن سے اختلاف ہے جو یوجنا بھون میں بیٹھ کر حالات کا اندازہ کرتے ہیں۔

یہ بات ہمارے ذہن میں کیوں نہیں آئی کہ بدعنوانی ہمیں بُری طرح تباہ کر دیگی؟ اگر ہم نے واقعات و حالات کا صحیح صحیح مطالعہ کیا ہوتا تو کیا ہم نے تنخواہوں کو اتنا کم رکھا ہوتا۔ کیا ہم نے اُجرتوں کے بارے میں قومی پالیسی کی تشکیل سے گریز کیا ہوتا۔ کیا ہم نے الیکشن کے سلسلے میں رقوم کی فراہمی کے معاملے میں اتنی معمولی سی کوششیں کی ہوتیں۔ کیا ہم نے ایسی صورت میں یہ معاملہ ان خود غرض تجارت کاروں پر چھوڑا ہوتا جو صرف لائسنسوں کے طلبگار ہوتے ہیں۔ کیا ہم توہمات کا اسی قدر شکار ہوئے ہوتے۔ صاحبِ اقتدار لوگوں کے گھروں میں نجومیوں اور جیوتشیوں کا کیا اسی قدر عمل دخل ہوتا۔ آج کے دَور میں ہم نے دیکھا کہ فرقہ واریت نے اور تنگ نظری نے پوری دُنیا کو نقصان پہونچایا، کیا ایسی صورت میں ہم نے اس سے اپنی حفاظت نہ کی ہوتی۔

سیاست میں دائیں بازو کی جھکاؤ والی ایسی سیاست کے لیے ہم نے خود کو تیار کیا ہوتا جس کا تعلق فرقہ داری سیاست اور مسلمانوں پارٹیوں کے فروغ سے ہوتا ہے۔ اگر وفاق پر مبنی نظام ہمارا مدعا ہے تو اس صورت میں یہ پسندیدہ صورت میں اُبھرتا اسطرح اتحاد و یکجہتی وہ نقطہ ہے جس میں ہماری تمام خواہشات کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔

کیا ہم نے کبھی متوسط طبقے کے حجم کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے؟ سیاست میں سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والا اور رائے عامہ کو توڑنے والا یہی طبقہ رہا ہے۔ بائیں بازو والے جن کی بھارت ایسے غریب ملک میں بیحد ضرورت ہے، بالکل نہیں اُبھر پائے، مگر اس کی وجہ کیا ہے۔ کیا کبھی ان باتوں پر غور ہوا ہے۔ ملک کی نصف آبادی غریبی کی سطح سے نیچے ہے۔ دیہی عوام کی آواز کہیں مشکل ہی سے سنائی دیتی ہے۔ وہ کسی بھی فیصلہ میں شریک نہیں دکھائی دیتے۔ تعاون ساز اداروں میں ان کے نمائندے مسائل پر اظہار خیال کرتے وقت ہچکچاتے ہیں یا ذرائع نشر و اشاعت ان کے مسائل کو دُور سے ہی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان ترقیاتی کوششوں میں ہر طبقہ زیادہ سے زیادہ پانے کے لیے اپنی تکلیف کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔

محنت کش طبقے کے تعلقات کے سلسلے کی ہماری سیاست اکیسویں صدی کے لیے بالکل غیر موزوں ہے۔ کیا ہم ماضی کے فرسودہ فلسفوں سے خود کو نجات دلا سکتے ہیں محنت کش طبقہ ہر طرف ایجی ٹیشن کی طرف مائل ہے، کہیں کہیں یہ ایجی ٹیشن تشدد آمیز ہیں ان سے ہر ایک صنعت، ہر ایک کمپنی حتّٰی کہ سرکار کو واسطہ پڑتا ہے۔ اسی لیے ایسے پراجیکٹ لیے جا رہے ہیں جن میں محنت کش طبقہ کم سے کم کھپ سکے۔ پرائیویٹ سیکٹر اور پبلک سیکٹر میں کارکنوں کی تعداد کم سے کم کرنے کی کوشش ہے۔ یہ کمی محض روپیہ پیسہ بچانے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کی جا رہی ہے تاکہ محنت کش طبقہ کے مسائل کم سے کم رہیں۔ کیا یہ ایک ایسا جرم نہیں ہے جو اس ملک کے نوجوانوں کے خلاف کیا گیا ہے۔

کیا ہم یہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ درآمد شدہ مشینری اور خام مال پر ڈیوٹی بہت بڑھی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے غیر ملکی منڈیوں میں مقابلہ پر آنا دشوار ہو گیا ہے۔ حتّٰی کہ ان چھوٹے چھوٹے روایتی قسم کی مصنوعات کی فروخت میں بھی یہ دشواری پیش آ رہی ہے جس کے لیے ہمارا ملک مشہور رہا ہے۔ تیوان اور کوریا کے مقابلے ہماری برآمدات گھٹ جاتی ہیں۔

جو لوگ پاکستان اور ہندوستان کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، انھوں نے ہم دونوں کو ہی برباد کر دیا ہے۔ کسی نہ کسی دن جنوب مشرقی ایشیا کا تمام علاقہ تنظیم نو کی آزمائش میں پڑ جائے گا۔ اس وقت کس طرح کی کوششوں کی ضرورت ہوگی۔ کیا ہم محض مشترکہ منڈی کے تصور سے مطمئن ہو لیں گے، یا اس سے بھی آگے جائیں گے؟

[illegible] کی کیا نیت کو دیکھیں گے۔ کیا ملکوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں عورتیں [illegible] ادا کریں گی؟۔

ہماری کارگزاری میں کچھ حیرت انگیز کامیابیاں بھی دیکھنے کو ملی ہیں۔ ہم ایک روزہ کرکٹ میں عالمی چیمپئن شپ کے مالک ہو گئے، خواہ چند ماہ کے لیے ہی سہی۔ گواسکر نے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے، ہندوستان کی ایک لڑکی مس ورلڈ بن گئی، ہمیں ایک اچھے وزیراعظم ملے جنھوں نے ناوابستہ ملکوں کی تحریک سے وابستہ ملکوں کی بڑی قدر و منزلت کے ساتھ قیادت کی۔ ہمیں چند نوبل پرائز بھی ملے۔ ہم نے باہر ملکوں میں سائنسی شعبوں میں بہت سی دریافتیں کیں۔ کھیلوں میں ہم آہستہ آہستہ اوپر اٹھے۔

صدمے جو ہمیں اٹھانے پڑ سکتے ہیں

ہم بہت سے صدموں اور مشکلات سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ ایک صدمہ اور تکلیف تو منشیات اور ڈرگس کی [illegible] ہے جو ہمارے سامنے ہے۔ اس کے رواج اور مضر اثرات سے ہم ابھی تک غافل ہیں۔ یہ برائی اس قدر بڑے پیمانے پر پھیل رہی ہے کہ ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں صرف اس قدر معلوم رہتا ہے کہ ہر ہفتے کتنے مالیت کی دوائیں اور ڈرگس پکڑی گئیں۔ جگہ جگہ، سڑکوں پر ہمیں ایسے نوجوان ملتے ہیں جو اس برائی کے چکر میں ہیں۔ عورتیں بھی اس کی عادی ہوتی جا رہی ہیں۔ لڑکے اس طرح کی ڈرگس بیچتے پھرتے ہیں جن سے پوری نسل تباہ ہو سکتی ہے۔

ہمارے ملک میں مجرموں کو سزا دلانے کا نظام ناقص ہونے کے سبب معصوم اور بے گناہ لوگوں کی حفاظت سے قاصر ہے۔ بہت سے ایسے آدمی بھی نظر آتے ہیں جو اس برائی پر قابو پا سکیں۔ اس لیے ملک میں جرائم کی رفتار بڑھ رہی ہے۔ فسادات اور دہشت گردی کی رفتار تیز ہے۔ ملک کے حالات پر نظر رکھنے والے ہر شخص کو ان باتوں کا علم ہے۔ لیکن کچھ غیر متوقع باتیں بھی ہیں۔

ملک میں خشک سالی سے پورا ملک متاثر ہوتا ہے۔ پانی کی قلت سے سینکڑوں افراد لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ پوری دنیا میں قحط پھیل جاتا ہے۔ اتھوپیا اور ہر ایک جگہ۔ کرنسی کی ساکھ متاثر ہونے سے اور مسلسل اس عمل کے جاری رہنے سے دنیا کا مالی استحکام ختم ہو رہا ہے اس طرح کوئی بھی زلزلہ کلکتہ یا بمبئی میں سان فرانسکو کی طرح سے ہی آسکتا ہے جو کہ ہزارہا افراد کو زمین کے تلے دبا سکتا ہے۔

بیکٹریا کی غیر معمولی اقسام ایڈز سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں اور ان سے ہزارہا افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو سکتے ہیں۔

نیوکلیر طاقت کا اخراج جس نے ناگپور میں لوگوں کو سانس لینا مشکل کر دیا، ہوا میں آلودگی، ہمالیہ سے پیدا ہونے والا سیلاب، درختوں کا اندھا دھند کٹاؤ، ایندھن کی کمی، یہ سب وہ مشکلات ہیں جن کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔

ان پر کیسے قابو پائیں

منصوبہ بند کمیشن میں ایک ایسے سیکشن کی ضرورت ہے جو اس طرح کے غیر متوقع حالات اور مشکلات سے نپٹنے کے لیے تیاریاں کرے۔ جس سے کسی بھی مشکل یا آفت ناگہانی کا مقابلہ کرتے وقت سوچنا نہ پڑے۔ ان کے پاس ہر سائنسی بحران کا حل ہونا چاہیے۔ انھیں آلودگی، اسٹار وارز، بیرونی خلا سے جراثیم کی آمد اور حیاتیاتی اور جنیٹک انجینئرنگ سے متعلقہ مسائل کے حل کے لیے خود کو تیار کرنا ہے۔

●

بقیہ، نیا لائحہ عمل

عام ہوگا کہ نوجوان لڑکے، لڑکیاں ہاتھوں میں ہاف انچ کا ٹیلی ویژن کیمرہ اور کیسٹ ریکارڈ لیے گھومتے نظر آئیں گے اور دلچسپ پروگراموں کو ریکارڈ کریں گے اور پھر انھیں مقامی ریڈیو یا ٹی وی اسٹیشنوں کو مہیا کریں گے۔ جس طرح اخباروں کو خبریں اور مضامین بھیجے جاتے ہیں اسی طرح ان مقامی اسٹیشنوں کو ایسے بہت سے پروگرام دستیاب ہوں گے جو باہر کے با صلاحیت افراد کے تیار کردہ ہوں گے جن سے وہ بہتر انتخاب کر سکتے ہیں۔

اس بات کو تسلیم کیا جائے گا کہ الیکٹرانک میڈیا کا کام تعلیمی اور ترقیاتی پروگراموں کو بطور خاص پیش کرنا ہے اور تجارتی اشتہار بازی کے ذریعے بے محابا خریداری کا جو رجحان پیدا کیا جا رہا ہے وہ اصل مقصد سے انحراف ہے لہٰذا کمرشیل اشتہار بازی کو بند کر دیا جائے۔

چھوٹے چھوٹے آفسیٹ پریس کی وجہ اخبارات کی صنعت بھی متاثر ہوگی اور بڑے بڑے اخباروں کی جگہ بہت سے چھوٹے اخبارات شائع ہوں گے جو ضلع صدر مقام یا بڑے قصبوں سے نکلیں گے اور دیہی علاقوں کی تفریحی اور معلوماتی ضرورتوں کو پورا کریں گے۔

خوشحالی، ترقی اور سماجی تبدیلیوں پر مبنی ایک درخشاں مستقبل ہمارا منتظر ہے۔ ہمارے سامنے جو اگلے پندرہ برس ہیں اگر ان میں تفرقہ پسندی اور فرقہ پرستی کی طاقتوں نے غلبہ پالیا تو ہمارا مستقبل ایک سوالیہ نشان بن کر رہ جائے گا۔

"**قومی** سطح پر غلط ترجیحات کے باعث اگر بھارت اکیسویں صدی میں ایسی حالت میں قدم رکھتا ہے کہ یہاں کی آبادی اور یہاں کے بیشتر عوام ناخواندہ ہوں اور ان کو پرائمری اسکولوں کی تعلیم تک سے استفادے کا موقع نہ ملا ہو، تو یہ بات قوم کے لیے باعثِ شرم ہوگی۔ چوں کہ پیداوار اور خدمات سے متعلق منصوبہ بندی کے تئیں مکمل اندازِ نظر ملک کے عوام کی بھاری اکثریت کی امنگوں سے بے جوڑ ہے، لہٰذا اس میں ایک بنیادی کمزوری یہ ہے کہ منصوبہ بندی کے اس عمل میں عوام کی جمہوری انداز پر شرکت کے دروازے بند ہو جائیں گے اور اقتصادی قوتیں اور اختیارات مرکوز ہو کر رہیں گے نیز فیصلہ سازی کے اختیارات مرکزی حکومت کے ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائیں گے..... جب مرکزی حکومت کے ہاتھ میں اقتدار کو مرکوز کرنے کی اس طرح کی کوششیں کی جاتی ہیں، تو ایسی صورت میں مختلف ریاستوں کے عوام کے دلوں سے منصوبہ بندی کے عمل میں شرکت کا جذبہ مفقود ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ جذبہ جاتا رہتا ہے اور غلط حکمتِ عملی کے سبب بے روزگاری کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو مذہبی جنون، ذات پات اور ظلمت پسندی وغیرہ کے نام پر ملک کو منقسم کرنے والی قوتوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ جس سے ہمارے ملک کی سالمیت اور اس کے اتحاد کی اساس کو خطرہ درپیش ہو جاتا ہے۔ ہمیں دو ٹوک انداز میں ان تمام انتشار پسندانہ قوتوں کی مخالفت کرنی ہے۔ ہمیں ایک مضبوط اور متحد بھارت کی تعمیر میں سرگرمِ عمل رہنا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہر ریاست کے اقتصادی ڈھانچے کو مستحکم کرنا ہے۔ تبھی پورا بھارت — مرکز اور تمام ریاستیں — ایک ساتھ طاقتور رہ سکتا ہے۔ ہماری خواہش یہی ہے کہ ہمارے ملک کے نوجوان ان تمام دیواروں کو توڑ کر جو مذہب، ذات پات وغیرہ کے نام پر عوام کو ایک دوسرے سے دور کرتی ہیں اور انھیں آپس میں لڑاتی ہیں، اکیسویں صدی میں داخل ہوں۔

(جیوتی بسو)

at NDPSO, New Delhi.
Vo. 6 No. 9 & 10 YOJANA (URDU) 1-31 August 1986 Special Issue

آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ اس بھارت کی کیا شکل بنے گی؟ میرے نزدیک یہ ایک ایسا ملک ہوگا جس کی جڑیں مضبوطی سے اس کی روایات کے ساتھ پیوست ہوں گی۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ نئے سائنسی علوم کے تقاضے پورے کرے گا اور ان کی اشاعت و ترویج میں سرگرم ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ایسا بھارت ہوگا کہ اس کے اتحاد کے استحکام کے ساتھ ساتھ اس کی گوناگونی اور بوقلمونی برابر پھلتی پھولتی رہے گی۔ میری نظریں یہ کہتی ہیں کہ بھارت جب اکیسویں صدی میں قدم رکھ رہا ہوگا، اُس وقت وہ غریبی کے بندھنوں سے آزاد ہو چکا ہوگا اور صنعتی و اقتصادی طور پر ترقی یافتہ دُنیا کے ایک عظیم ملک کی حیثیت سے اپنا جائز مقام حاصل کر چکا ہوگا۔ ہماری ترقیاتی کوششوں کے میدان میں یہ ایک نیا اور جوشِ عمل سے بھرپور تجربہ ہوگا۔ اس سلسلے میں کچھ تو وہی تجربے جاری رہیں گے اور انھیں کو زیادہ مستحکم بنانے پر زور رہے گا جو کہ پہلے سے چلے آرہے ہیں، جیسا کہ زرعی شعبوں میں بڑے تجربات۔ ہندوستان میں زراعت کو جدید سے جدید ترین بنانے کے ضمن میں ابھی بہت کافی گنجائش ہے کیونکہ ابھی ایسے بہت سے معاشی شعبے ہیں جو زراعت کی نئی ٹکنالوجی سے استفادہ کر سکتے ہیں اور جدید زرعی طریقوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں... ہمارے ملک کے مستقبل کی ترقی زراعت کی ترقی میں مُضمر ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں ہماری کوششیں جاری ہیں۔

ہمارے ملک میں غریب عوام کی بڑی تعداد کو ترقی کی راہ پر جمانے کے لیے کافی کام کیا جا چکا ہے۔ ان کے لیے بنیادی ضرورتوں کی فراہمی کو یقینی بنانے کے سلسلے میں بہت کچھ کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ مستقبل میں ہم ان کوششوں کو جاری رکھنے کو ہی قابلِ ترجیح سمجھیں گے۔ اس صدی کے اختتام تک اس عظیم کام کو پورا کرنا ہے۔ غریبی، جیسا کہ ہم اس سے واقف ہیں، داستانِ پارینہ بن جائے گی۔ بھارت کے ہر گاؤں میں بجلی کے قمقمے دمک رہے ہوں گے۔ پینے کا صاف پانی ہر گاؤں میں میسّر آچکا ہوگا اور صحت و صفائی کی خدمات کو یقینی بنایا جا چکا ہوگا۔ ملک کی پوری آبادی کو خاندانی منصوبہ بندی کے پروگراموں سے فائدہ پہنچایا جا رہا ہوگا۔ اضافہ آبادی کے سبب ہماری ترقی بے اثر ہو کر رہ گئی تھی مگر اس محاذ پر کامیابی حاصل کر کے اس اضافے کو کم کر کے تقریباً ایک فیصد تک کر دیا جائیگا۔

راجیو گاندھی

ہندوستان میں گنّے کی
کاشت اور چینی کی صنعت

(ابو سعد خاں)

۱

دیہی امیروں پر ٹیکس
لگانے کی ضرورت

(کامتا پرشاد)
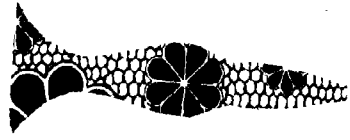
خورجہ مٹی کے برتن بنانے کا ایشیا کا سب سے بڑا مرکز

خورجہ ایک چھوٹا سا گرم مرطوب اور گرد آلود قصبہ ہے۔ یہ مغربی یو۔پی کے ایک کونے میں دھنسا [illegible] غیر ترقی یافتہ، جس کا کوئی پُرسان حال [illegible] لیکن اس کے باوجود عظمت سے ہمکنار ہے [illegible] قابلِ یقین معلوم نہیں ہوتی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ خورجہ پر بھارت کو ناز ہے [illegible] یہ بھارت سے ہمدردی کا بھی طالب ہے۔ یہ تاریخ کا المیہ ہے کہ اتنی بڑی عظمت والا قصبہ سینکڑوں بھٹیوں کے دھوئیں میں گمنامی کی زندگی گزار رہا ہے۔

بہت سے لوگ اسے خالص دیسی گھی کے لیے ایک مشہور قصبے کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اس نے مٹی کے برتنوں کی اپنی صنعت کی بدولت نام پیدا کیا ہے۔ بالخصوص نیلے رنگ کے مٹی کے برتنوں اور گلدان وغیرہ کے لیے۔ یہ ملک کا واحد مرکز ہے۔ لیکن خورجہ کی اہمیت اس بات میں ہے کہ یہ ایشیا میں ظروف سازی کا سب سے بڑا قصبہ ہے۔ اس صنعت میں دنیا میں اس کا مقام تیسرا ہے۔ اس کی مصنوعات، برتن اور پوٹری کے دیگر نمونے یورپ، مغربی ایشیا، وسط مشرق، جاپان اور آسٹریلیا کے عجائب گھروں اور فنونِ لطیفہ کے نجی عجائب گھروں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ شاہ ایڈورڈ کی تاج پوشی کے وقت خصوصی گلدان یہاں سے بھیجے گئے تھے۔ سالار جنگ عجائب گھر نے خورجہ کے گلدانوں کو بڑے شوق سے اپنے یہاں جگہ دی ہے۔

یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ خورجہ نے بین الاقوامی شہرت حاصل کرلی ہے۔ یہ جان کر مزید خوشی ہوتی ہے کہ خورجہ میں ایسے فنکار ہیں جو مروجہ نمونوں، ڈیزائنوں کی اندھی تقلید نہیں کرتے۔ وہ اپنا کام آزادروی سے کرتے ہیں اور جدھر موڈ آتا ہے ادھر ہی مڑ جاتے ہیں۔ کھلے میں یا درختوں یا دیواروں کے سایہ میں یا کمروں میں بیٹھ کر وہ کام کرتے ہیں خوبصورت ڈیزائنوں اور رنگوں کو ملا کر نئے نئے نمونوں کے مال تیار کرتے ہیں اور پرانی لکیروں کو نہیں پیٹتے۔ خورجہ کی ظروف سازی اور طرح طرح کے مٹی کی مصنوعات اور اس کے نمونے "ٹائل پوٹری اور دادو پوٹری" کے درمیان اپنی صناعی کے فن کے مظہر ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے انسو لیٹروں میں مہارت حاصل کی اور نیلے گلدانوں سے [illegible] زمانے میں نام پایا ہے۔ لیکن یہ فن اپنے اندر رنج، مصائب کی بہت سی داستانوں کو چھپائے ہوئے ہے۔ ان کا تعلق فاقہ مستی سے ہے۔ اور انھیں ہمیشہ یہ خوف ستاتا رہتا ہے کہ اُن کا یونٹ بند نہ ہو جائے۔ کیونکہ یونٹ زیادہ تر چند کنبوں کی ملکیت ہیں اور جو شخص اُجرت پر کام کرتا ہے وہ فنکار یا دستکار ہے۔ دوسرے لوگ کنبے کے ممبر ہیں اور تمام لوگوں کو یہ خوف رہتا ہے کہ کوئی بھی دن اُن کے لیے قیامت بن کر آ سکتا ہے۔

(باقی کور صفحہ پر)

اس شمارے میں

● منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر : سید ظفیر الحسن

ایڈیٹر : جگندر سنگھ

اسسٹنٹ ایڈیٹر : محمد عادل صدیقی

جلد ۶	یکم تا ۱۵ ستمبر ۱۹۸۶	شمارہ ۱۱

۱۰ تا ۲۴ آساڑھ شک ۱۹۰۸ ؛ ٹیلیفون : ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۳۰ روپے۔ دو سالہ ۵۴ روپے۔ سہ سالہ ۷۶ روپے

فی کاپی :۔ ایک روپیہ ۵۰ پیسے

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

اداریہ

کوآپریٹو ادارے اور دیہی ترقی

بلاشبہ بھارت تیسری دنیا کے اُن ملکوں میں سے ایک ہے جہاں غریبی کے مسئلے کا سامنا ہے اور جہاں اس کے حل کے لیے متواتر کوششیں جاری ہیں۔ کسی بھی ملک میں ترقیاتی پروگراموں کی کامیابی جانچنے کے لیے اصل پیمانہ یہ ہے کہ وہاں بھوک، غریبی، بے روزگاری اور نابرابریوں کو دُور کرنے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی جا سکی ہے۔ ترقی کا عمل ایک پیچیدہ عمل ہے اس کے ذریعے معیشت کے مختلف شعبوں میں پیداوار بڑھانے پر زور دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ترقی کے پروگراموں کا زور سماج کے ہر فرد کی بھلائی پر ہوتا ہے۔ اس لیے ہندوستان میں دیہی ترقی کے پروگراموں کو دیہی عوام کی بھلائی کے پروگرام کے طور پر ہی آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ پچھلے تیس پینتیس برس سے برابر چل رہا ہے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد سے دیہی ترقی کے پروگراموں اور نیشنل ایکسٹنشن سروس نے نمایاں رول ادا کیا۔ لیکن ہر بلاک میں ترقی کے جو مختلف پروگرام شروع کئے گئے، ان کو مقامی مسائل سے نہیں جوڑا جا سکا۔ پنچایتی راج کے اداروں کے قیام کا مقصد بھی یہی تھا کہ دیہی ترقی میں مقامی لوگوں کی شرکت تقویت پائے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد منتخبہ اضلاع میں بھرپور کاشت کے پروگرام، علاقہ وار کاشت کے جامع پروگرام، اور زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں سے کاشت کے پروگرام خاص طور پر ضروری خیال کئے گئے۔ ان کے ذریعے پیداواری صلاحیت بڑھانے پر زور دیا گیا۔ چونکہ ہر خطّے میں دیہی عوام کی آمدنی کی سطح مختلف تھی، اس لیے ان پروگراموں سے مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان پروگراموں سے بڑے کسانوں کو ہی فائدہ ہو سکا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد سے دیہی ترقی کی حکمتِ عملی میں تبدیلی آئی۔ اس کے بعد ترقیاتی حکمتِ عملی میں یہ فرق دیکھنے کو ملا کہ علاقہ وار کاشت کے پروگرام پر زور دینے سے زیادہ سماج کے کمزور طبقوں کی حالت سدھاری گئی۔ مرکز کے زیرِ اہتمام ایسی بہت سی اسکیمیں شروع کی گئیں جن سے چھوٹے کسانوں کو فائدہ پہنچے۔ ان اسکیموں سے مارجنل کسانوں اور زرعی مزدوروں نے بھی خوب فائدہ اُٹھایا۔ قبائلی آبادی والے علاقوں، پسماندہ علاقوں اور خشک سالی کی زد میں آنے والے علاقوں، پہاڑی علاقوں وغیرہ میں چھوٹے کسانوں، مارجنل کسانوں، کھیت مزدوروں کی مدد کرنے کے لیے مرکز کے زیرِ اہتمام مختلف اسکیمیں شروع کی گئیں۔ ۱۹۷۶ء میں دیہات کی مربوط ترقی کا اندازِ نظر اپنایا گیا۔ سابق مرکزی وزیرِ خزانہ شری سی۔ سبرامنیم نے آل انڈیا سائنس کانگریس میں دیہات کی مربوط ترقی کا نظریہ پیش کیا تھا۔ گاؤں کی ترقی میں بنیادی سطح پر پنچایتیں اور کوآپریٹو ادارے گاؤں کی ترقی کو چار چاند لگاتے ہیں۔ ان کے ذریعے دیہی عوام میں قیادت کا جذبہ اُبھرتا ہے۔ عوامی ذرائع ابلاغ سے ان کا سیاسی شعور پختہ ہوتا ہے اور وہ حق رائے دہندگی بالغان کا سوچ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں۔ یوں تو ایک گروہ وہ بھی ہے جو ان اداروں پر مختلف طرح کے اعتراضات کرتا ہے۔ اس کے خیال میں یہ ادارے اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کو بجا لانے میں ناکام رہے ہیں اور ان کے ذریعے آپسی جھگڑوں کو ہوا ملتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کوآپریٹو ادارے ہی دیہی ترقی میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ جو کام دیگر اداروں کے ذریعے انجام نہیں پا سکا، وہ ان اداروں نے بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔ سورگیہ پروفیسر گیڈگل کا خیال تھا کہ دیہی ترقی کے لیے یہ بہترین تنظیم ہے۔ دراصل کوآپریٹو ادارے ہی دنیا بھر میں سماجی، اقتصادی، سیاسی اور تکنیکی انقلاب لانے کا سبب بنے ہیں۔ خوراک و زراعت کی عالمی تنظیم نے بھی ان اداروں کی افادیت سے اتفاق کیا ہے۔ ان کے قیام کی بنیاد ہر فرد کی بہبود پر ہے۔ ہمارے ملک میں ۳ لاکھ ۳۰ ہزار کے لگ بھگ کوآپریٹو ادارے ہیں۔ ان سے تقریباً دس کروڑ عوام فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ ملک میں قرضے کی ضرورت کا ۴۰ فیصد سے بھی زیادہ حصہ انھیں اداروں کے توسط سے پورا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ ان اداروں کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے اور ملک کی معیشت کو تیز رفتار بنانے اور ترقیاتی پروگراموں کے فوائد عام کرنے میں ان اداروں کا کردار بنیادی ہے۔

(باقی صفحہ ۹ پر)

ابوسعد خاں

ہندوستان میں گنّے کی کاشت اور چینی کی صنعت

ہندوستان دنیا میں گنّا پیدا کرنے والا سب سے اہم ملک ہے۔ گنّا یہاں عیسیٰؑ کی پیدائش سے بھی صدیوں پہلے ہوتا تھا۔ وادیٔ گنگا گنّے کا گھر کہی جاتی ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں مور Moor لوگوں کے ذریعے گنّے کے بیج مراکش و اسپین وغیرہ ممالک میں لے جائے گئے۔ اس طرح دنیا کے دوسرے خطّے بھی اس پودے سے آشنا ہوئے۔ ۱۴۹۲ء میں کولمبس نے نئی دنیا دریافت کی تو پرتگالیوں کے ذریعے گنّا بھی نئی دنیا میں پہنچا۔ جہاں اس کی کاشت نے خوب فروغ پایا آج بھی کیوبا، پورٹوریکو، برازیل، میکسیکو، ہوائی اور پیرو وغیرہ گنّے کی کاشت اور گنّے کی شکر کی صنعت میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

گنّا نباتاتی علوم کی اصطلاح میں موٹے تنے والی گھاس ہے جو بڑی حد تک جوار کے پودے سے مماثلت رکھتی ہے اس کی بلندی تقریباً ۶ فٹ سے ۴ فٹ تک ہوتی ہے۔ گنّے کے تنے سے حاصل ہونے والے رس سے شکر نکالی جاتی ہے۔ گنّے کی پتیاں اور چھوئی ایندھن کے طور پر یا پھر سستے کاغذ اور گتّے بنانے میں استعمال ہوتی ہے۔ گنّے کے رس اور شیرے کو سرکے، شراب اور کئی دوسرے کیمیکلس بنانے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

نشوونما کے طبّی عوامل

ہندوستان میں گنّے کی کاشت ۸ سے ۳۲ درجہ طول البلد کے درمیان کی جاتی ہے اس کی بہتر کاشت کے لیے بلند درجۂ حرارت اور خاصی بارش درکار ہوتی ہے۔ گنّے کی فصل کو تیار ہونے میں تقریباً ایک سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اس کے لیے ۲۰ ڈگری سینٹی گریڈ سے ۳۰ ڈگری سینٹی گریڈ درجۂ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ۳۰ ڈگری سینٹی گریڈ سے زیادہ اور ۱۸ ڈگری سینٹی گریڈ سے کم درجۂ حرارت والے علاقوں میں اس کی فصل اچھی نہیں ہوتی ہے۔ زیادہ سرد موسم میں پالا سے فصل کو نقصان پہنچتا ہے۔ گنّے میں شکر کے تناسب کو بڑھانے کے لیے سمندری ہوائیں بڑی معاون ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں گنّا پیدا کرنے والے زیادہ تر علاقے سمندر سے زیادہ دور نہیں ہیں۔

گنّے کے لیے بارش کا سالانہ اوسط ۱۰۰ سینٹی میٹر سے ۲۰۰ سینٹی میٹر تک ہونا ضروری ہے۔ جہاں ۱۰۰ سینٹی میٹر سے کم بارش ہوتی ہے وہاں سینچائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں تقریباً ہر جگہ مصنوعی ذریعہ آبپاشی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں گرمی کی فصل کو کم سے کم پانچ یا چھ بار سینچائی کی ضرورت ہوتی ہے فصل کی تیاری اور کٹائی کے وقت گنّے کے کھیتوں میں زیادہ نمی ہوجانے سے اس کا

رس پتلا ہو جاتا ہے اور نتیجے کے طور پر
گنے میں شکر کا تناسب بھی کم رہ جاتا ہے۔
ہندوستان میں گنے کی ۸۰ فیصد پیداوار
شمالی ہندوستان میں ہوتی ہے جہاں اس
کی پیداوار کے لیے مناسب جغرافیائی/طبعی
عوامل موجود نہیں ہیں۔ اس پورے علاقے
میں بارش تین یا چار مہینے ہوتی ہے اس
لیے گنے کو کئی بار پانی کی ضرورت پڑتی ہے۔
فروری سے مئی تک ملک کے مختلف
علاقوں میں گنے کی بُوائی ہوتی ہے جب کہ
ان مہینوں میں بارش نہیں ہوتی ہے۔ مئی،
جون میں جبکہ پودا اُگ گیا ہے۔ بہت تیز گرمی
پڑتی ہے اور کھیتوں میں نمی قائم رکھنا بہت
دشوار ہو جاتا ہے اس لیے فصلوں کو کئی
بار سینچائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہمارے ملک میں گنے کی فصل
مختلف قسم کی مٹیوں میں اُگائی جاتی ہے۔ اس
کے لیے گہری دومٹ مٹی جس میں نمی کی
مقدار زیادہ ہو مفید سمجھی جاتی ہے۔ کیوں کہ
اس مٹی میں گنے کی جڑیں کافی اندر تک داخل
ہو جاتی ہیں۔ گنے کی اچھی پیداوار کے لیے
ضروری ہے کہ مٹی میں نمک اور چونے کا عنصر
شامل ہو۔ کالی یا لال مٹی میں گنے کی پیداوار
زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ جنوب کی لاوے والی
مٹی میں بھی اس کی فصل اُگائی جاتی ہے۔
کم زرخیز زمین میں نائٹروجن، فاسفیٹ،
فاسفورس، چونا اور پوٹاش جیسی کیمیاوی
کھادوں کا استعمال بہت ضروری ہے، ان
کھادوں کے استعمال سے نیشکر کے رس میں
شکر کی مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ گوبر، ہری
کھاد یا کمپوسٹ کا استعمال گنے کی فصل
کے لیے نہایت مفید ہوتا ہے۔

معاشی عوامل

چونکہ عام طور پر گنے کی بُوائی،
نرائی، گُڑائی اور کٹائی ہاتھوں سے کی جاتی
ہے۔ لہذا اس کے لیے محنت کی وافر رسد
کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایک وزن دار فصل
ہے اس لیے اس کی کامیاب کاشت کے لیے
کارگر نظام حمل و نقل کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہندوستان میں گنے کے اہم ترین علاقے

اگرچہ گنے کی کاشت کے لیے جنوبی
ہندوستان جغرافیائی عوامل کے لحاظ سے
زیادہ موزوں ہے لیکن ملک کا تقریباً ۸۰
فیصد گنا شمالی ہندوستان میں پیدا کیا جاتا
ہے۔ اُتر پردیش میں ملک کی پیداوار کا تقریباً
۵۰ فیصد، پنجاب و ہریانہ میں ۱۵ فیصد
اور بہار میں ۱۲ فیصد گنا پیدا کیا جاتا ہے۔
اُتر پردیش میں گنے کے دو اہم علاقے ہیں۔
پہلا علاقہ ترائی سے ملا ہوا ہے جو کہ بجنور سے
شروع ہو کر گورکھپور ہوتا ہوا بہار کے سارن
اور چمپارن تک پھیلا ہوا ہے جس میں مرادآباد،
رام پور، بریلی، شاہجہاں پور، پیلی بھیت،
سیتاپور، لکھیم پور، گونڈا، فیض آباد، اعظم
گڑھ، جونپور، بستی، دیوریا اور گورکھپور وغیرہ
اہم اضلاع ہیں۔ دوسرا علاقہ گنگا، جمنا دوآب
میں پھیلا ہوا ہے جس میں سہارن پور، مظفر نگر،
میرٹھ، بلند شہر، فتحپور، الہ آباد اور بنارس
وغیرہ خاص طور سے گنا پیدا کرنے والے اہم
اضلاع ہیں۔ میرٹھ اور مظفر نگر کا گنا اچھے قسم
کا موٹا اور زیادہ رس والا ہوتا ہے اس سے
گڑ بہت بنایا جاتا ہے۔ بہار، پنجاب، ہریانہ،
آندھرا پردیش، تامل ناڈو، مہاراشٹر، مدھیہ
پردیش اور گجرات وغیرہ اہم صوبے ہیں جہاں
گنے کی اچھی کاشت ہوتی ہے۔

گنے کی پیداوار

ہندوستان کو گنے کی پیداوار میں عالمی
سطح پر دوسرا مقام حاصل ہے۔ ۱۹۵۰-۵۱
میں ملک میں گنے کی کل پیداوار ۵۷٫۰۰ ملین
ٹن تھی جبکہ ۱۹۸۲-۸۳ میں یہی پیداوار بڑھ
کر ۱۸۹٫۱۰ ملین ٹن ہو گئی۔ اس طرح گذشتہ
تیس سالوں میں گنے کی پیداوار میں ۲۳۲ فیصد
اضافہ ہوا ہے۔ پچھلے دو تین سالوں میں گنے
کی پیداوار میں کمی واقع ہوئی ہے جیسا کہ مندرجہ
ذیل جدول سے ظاہر ہوتا ہے۔

ہندوستان میں گنے کی پیداوار میں اضافہ

سال	پیداوار (ملین ٹن)
۱۹۵۰-۵۱	۵۷٫۰۰
۱۹۶۰-۶۱	۱۱۰٫۰۰
۱۹۷۰-۷۱	۱۲۶٫۴۰
۱۹۸۰-۸۱	۱۵۴٫۲۵
۱۹۸۲-۸۳	۱۸۹٫۱۰
۱۹۸۴-۸۵	۱۷۵٫۰۰

گنے کی فی ہیکٹیر پیداوار دنیا کے گنا پیدا
کرنے والے سبھی ملکوں میں مختلف ہے۔
اگرچہ ہندوستان میں ۱۹۵۰-۵۱
کے مقابلے میں گنے کی فی ہیکٹیر پیداوار
تیزی سے اضافہ ہوا ہے تاہم اس کی پیداوار
کو بہتر بنانے کی ابھی کافی گنجائش ہے دوسرے
گنا پیدا کرنے والے ممالک سے اگر موازنہ
کیا جائے تو ہمارے ملک کی گنے کی فی ہیکٹیر
پیداوار کم ہے جس کی تفصیل اگلے صفحہ
پر ہے:-

گنے کی فی ہیکٹر پیداوار

ممالک	پیداوار (میٹرک ٹن)
ہوائی	۸۸٫۶۰
مصر	۸۱٫۳۰
انڈونیشیا	۸۱٫۰۰
آسٹریلیا	۷۹٫۷۰
پورٹوریکو	۶۵٫۰۰
ہندوستان	۵۷٫۵۴
کیوبا	۳۷٫۵۰
پاکستان	۳۷٫۰۰

ہمارے ملک میں نہ صرف گنے کی فی ہیکٹر پیداوار ہی کم ہے بلکہ گنے میں رس کا تناسب بھی بہت کم ہے۔ یہاں گنے میں رس کا تناسب ۱۲ فیصد سے ۲۰ فیصد تک ہے جبکہ کیوبا، جمیکا، پیرو اور برازیل وغیرہ میں گنے میں رس کا تناسب اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ کیمیاوی کھادوں کا موزوں و مناسب استعمال کیا جائے، آبپاشی کے وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے، مشینی طریقے استعمال کیے جائیں۔ قرضہ جات کی سہولیات کا بھرپور فائدہ اٹھایا جائے اور پیداوار رس اقسام کے تصدیق شدہ گنے کے بیج استعمال کیے جائیں۔ اگر ان باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے گنے کی کاشت کی جائے تو یقیناً گنے کی فی ہیکٹر پیداوار میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے اور گنے کے رس کے تناسب میں بھی بہتری لائی جا سکتی ہے۔

گنے میں لگنے والی بیماریاں

کبھی کبھی گنے کی فصل کو بیماریوں سے نقصان پہنچتا ہے۔ ریڈ راٹ Red Rot ایک نباتاتی بیماری ہے جس سے گنے کی فصل خراب ہو جاتی ہے۔ اس سے گنا لال ہو جاتا ہے اور جڑوں میں کیڑے لگ جاتے ہیں۔ پائریلا (Pyrilla) ایک قسم کا کیڑا ہے جو گنے کی فصل کو بہت نقصان پہنچاتا ہے۔ امسال مغربی یو۔پی میں پائریلا سے ہزاروں ہیکٹر گنے کی فصل تباہ ہو گئی ہے۔ ریڈ راٹ، موزائیک (Mosaic) ولٹ (Wilt) اور اسمٹ Smut جیسی نباتاتی بیماریوں، پائریلا اور سوراخ کرنے والے کیڑوں (Borer) سے محفوظ رکھنے کے لیے کوئمبٹور ریسرچ سینٹر نے گنے کی نئی قسمیں تیار کی ہیں، ان نئی قسموں کو ملک کے مختلف صوبوں کی آب و ہوا اور مٹی کو دھیان میں رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔ ان نئی قسموں سے فی ہیکٹر پیداوار میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔ ان قسموں میں CO - ۲۹۰، CO - ۳۱۵، CO - ۳۵۶، CO - ۴۹۹، CO - ۲۵۴، POJ - ۲۸۷۸، BO - ۱۰ وغیرہ۔ اہم ہیں۔ زرعی یونیورسٹی پنت نگر نے بھی ملک کے مختلف علاقوں کے لیے گنے کی نئی قسمیں تیار کی ہیں۔ ان قسموں میں Bo - ۱۷، BO - ۳۴، BO - ۴۷، BO.۵۴، CO - ۹۷۵، CO - ۵۱۰، CO ۱۱۴۸، CO - ۱۱۵۸، CO - ۱۳۳۶، CO ۶۲۴۵ اور CO - ۶۱۱ وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔
ان نئی قسموں میں بیماریوں سے محفوظ رہنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے جس سے بیماری کے پھیلنے اور نقصانات کے کم چانسز رہتے ہیں۔

حکومت کی سطح پر کیجانیوالی کوششیں

ہماری حکومت نے گنے کی کاشت کو فروغ دینے کے لیے کئی کامیاب قدم اٹھائے ہیں۔ کوئمبٹور، مدراس اور پنت نگر میں گنے کی نئی قسمیں تیار کرنے کی مسلسل کوششیں ہو رہی ہیں۔ کانپور میں واقع انڈین انسٹی ٹیوٹ آف شوگر ٹیکنالوجی میں طالب علموں اور کسانوں کو گنے کی کامیاب کاشت اور چینی کی صنعت کے متعلق تعلیم و ٹریننگ دی جاتی ہے۔ گنا وکاس وبھاگ اور گنا سہکاری سنگھ قائم کیے گئے ہیں جو اپنے علاقوں میں گنے کی بہتر کاشت کے لیے اچھے قسم کے بیج، کیمیاوی کھادیں، سینچائی کا مناسب انتظام، جراثیم کش ادویات اور جدید مشینوں و اوزاروں کو مناسب وقت پر مہیا کراتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے یہ بھی کوششیں کی گئیں کہ کھانڈ اور گڑ کی جگہ زیادہ تر چینی ہی بنائی جائے اس کے لیے ضروری تھا کہ گنا پیدا کرنے والے کسانوں کو گنے کی اچھی قیمت کے لیے لالچ دیا جائے۔ اس لیے چینی کے کارخانوں کے ذریعے زیادہ قیمتوں پر کسانوں سے گنا خریدا گیا اس کا بہت اچھا اثر ہوا اور چینی کی پیداوار میں کافی اضافہ ہوا۔ جنوبی ہند میں گنے کی پیداوار میں کافی اضافہ ہوا ہے جہاں گنے کی فصل کے لیے تمام طبعی حالات موزوں ہیں اور اچھے قسم کا گنا پیدا ہوتا ہے۔ حکومت کا یہ بھی منصوبہ ہے کہ ملک کے ساحلی علاقوں میں گنے کے بڑے بڑے فارم قائم کیے جائیں۔ جن کے نزدیک چینی کے کارخانے قائم کرنے کی اسکیم ہے تاکہ برآمد کے لیے چینی کی پیداوار میں مزید اضافہ ہو سکے۔

چینی کی صنعت

ہندوستان میں جتنا گنا پیدا ہوتا ہے اس کا ۱۵ فیصد گڑ بنانے، ۳۰ فیصد سفید چینی بنانے اور ۲۰ فیصد کھانے اور بیج کے

طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پارچہ بافی کی صنعت کے بعد چینی کی صنعت سب سے اہم صنعت ہے۔ اس وقت ملک میں چینی کے کارخانوں کی تعداد ۳۳۹ ہے۔ ۱۲۶ کارخانے کوآپریٹو سیکٹر میں، ۱۰۳ کارخانے جوائنٹ سیکٹر میں اور ۱۰۰ کارخانے پبلک سیکٹر میں ہیں۔ اس صنعت میں لاکھوں مزدور لگے ہوئے ہیں اور ہزاروں انجینئرس کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ گنّے کی کاشت کرنے والے تقریباً ۲ کروڑ کسانوں کو بھی اس سے فائدہ پہونچ رہا ہے۔ اس صنعت سے الکوحل، کیمیکل اور کاغذ گتے کی صنعت کے لیے بھی بہت ضروری خام مال حاصل ہوتا ہے۔

ملک کے تقریباً ۷۵ فیصد چینی کے کارخانے اُتر پردیش، مہاراشٹر اور بہار میں مرتکز ہو گئے ہیں۔ ان صوبوں میں چینی کی صنعت کے ارتکاز کے عوامل میں گنّے کی زیادہ پیداوار، پانی کی وافر رسد، بہتر ریلوے اور سڑکوں کا نظام، کوئلہ اور پن بجلی کی رسد، وسیع مقامی بازار اور سستی محنت کا حصول شامل ہے۔ ہندوستان میں چینی پیدا کرنے والے صوبوں میں اُتر پردیش کو اوّل مقام حاصل ہے یہاں چینی کے ۹۰ کارخانے ہیں۔ زیادہ تر چینی کے کارخانے ترائی اور گنگا جمنا دوآبہ میں ریلوے اسٹیشن کے نزدیک قائم ہیں۔ مہاراشٹر میں چینی کے ۵۴ کارخانے، بہار میں ۳۰ کارخانے آندھرا پردیش میں ۱۸ کارخانے، تامل ناڈو میں ۱۶ کارخانے اور کرناٹک میں ۱۵ کارخانے قائم ہیں۔

ہندوستان میں ۱۹۳۲ء میں صرف ۳۱ چینی کے کارخانے تھے۔ جن سے کُل ۵ء۱ ملین ٹن چینی کی پیداوار ہوتی تھی اب ان کارخانوں کی تعداد بڑھ کر ۳۳۹ ہو گئی ہے۔ ۱۹۸۱-۸۲ء میں ۸ء۴۲ ملین ٹن چینی کی ریکارڈ پیداوار ہوئی لیکن ۱۹۸۳-۸۴ء میں یہ پیداوار گھٹ کر ۵ء۹۱ ملین ٹن رہ گئی۔ جبکہ ۱۹۸۴-۸۵ء میں چینی کی پیداوار ۶ء۱۴ ملین ٹن تھی۔ امید ہے کہ ۱۹۸۵-۸۶ء میں چینی کی پیداوار میں مزید اضافہ ہوگا۔ چینی کی صنعت کو وقتی طور پر کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جس کو جلد از جلد حل کرنا بہت ضروری ہے ہمارے ملک سے ۱۹۷۵-۷۶ء میں تقریباً ۸۰۰ کروڑ روپے کی چینی برآمد کی گئی تھی لیکن ۱۹۸۴-۸۵ء میں تقریباً ۲۰۰ کروڑ روپے کی چینی درآمد کی گئی۔ اتنا زیادہ زرِ مبادلہ ہم ایک ایسی چیز کے لیے خرچ کر رہے ہیں جس کو آسانی سے اپنے ملک میں پیدا کر سکتے ہیں پچھلے تین سالوں میں ملک کے تینوں سیکٹر کے تحت چینی کے کارخانوں کو خسارے سے گزرنا پڑا ہے۔ ان تمام کارخانوں کو تقریباً ۸۰۰ کروڑ روپے کا خسارہ ہوا ہے۔ اس خسارے کو پورا کرنے کے لیے چینی ملوں کو بینکوں اور صوبائی حکومتوں سے قرض لینا پڑ رہا ہے۔ جس کی وجہ سے کسانوں کو معاوضہ ادا کرنے میں تاخیر ہوتی ہے۔ یہ صورتِ حال کافی تشویشناک ہے کیوں کہ گنّا پیدا کرنے والے کسانوں پر اس کا بہت خراب اثر ہوتا ہے اور کاشتکار دوسری فصلوں کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ کسانوں کو گنّے کی قیمت کے طور پر اچھا اور جلد معاوضہ دیا جائے۔

اس وقت جبکہ عالمی منڈیوں میں چینی دو روپیہ فی کلوگرام کی در سے فروخت ہو رہی ہے ہمارے ملک میں قیمت فروخت تقریباً ۵ روپیہ فی کلوگرام ہے۔ مقامی صنعتکار کے مصارف پیدائش عالمی منڈیوں کے صنعت کاروں سے دو گنے ہیں۔ اس کی وجہ شاید ہمارے ملک میں گنّے کی پیداوار میں ٹیکنالوجی کا بہتر نہ ہونا اور چینی کی صنعت میں کارکردگی کا فقدان ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چینی کی پیداوار کے ساتھ جو ضمنی پیداوار حاصل ہوتی ہے اس کو بجا طور پر استعمال نہیں کیا جا رہا ہے اس کی کچھ دوسری وجوہات بھی ہو سکتی ہیں مثلاً چینی کے کارخانوں کو گنّے کے کھیتوں سے دور واقع ہونا، مزدوروں کو مستقل طور پر کارخانوں میں نہ رکھا جانا، کسانوں کو گنّے کا صحیح معاوضہ وقت پر نہ مل پانا اور کارخانوں میں زیادہ تر مشینوں کا پُرانا ہونا وغیرہ وغیرہ۔

ملک میں چینی کی صنعت کی کارکردگی بہتر کرنے اور اس کو خسارے سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ گنّے کی فی ہیکٹیر پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔ چینی کے کارخانوں کی پُرانی مشینوں کو جدید ڈھنگ سے آراستہ کیا جائے، مستقبل میں قائم کئے جانے والے نئے کارخانوں کو گنّا پیدا کرنے والے علاقوں میں ریلوے لائن کے نزدیک ہی لگایا جائے جس سے کہ ٹرانسپورٹ خرچ کم آئے۔ چینی کی پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ چینی کی قیمت میں کمی ہونا بھی ضروری ہے یہ اُسی وقت ممکن ہے جبکہ اس صنعت کی ضمنی پیداوار کو صحیح طور پر استعمال میں لایا جائے اس سے نہ صرف چینی کے مصارف پیدائش میں کمی واقع ہو سکے گی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ کیمیکلس، کاغذ اور گتے کی پیداوار میں بھی اضافہ ہو سکے گا۔ ضمنی پیداواروں سے

(باقی صـ۹ پر)

اقبال قدوائی

ہیرے کی کان کی مخفی دولت

"ہیرے کی کان" ـ یہ الفاظ اپنی جگہ خود ایک قیمتی دولت کی علامت ہیں۔ کیوں کہ ہیرا جیسا بیش قیمت پتھر اور پھر اس کی بھی کان ۔ چنانچہ ان الفاظ کو سنتے ہی کوئی بھی شخص ان کا مطلب سمجھ جائے گا۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ محض اس کے ظاہری مطلب سے اس کا پورا مطلب ادا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ان الفاظ سے ہم صرف اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہیرے کی کان وہ جگہ ہے جہاں کافی مقدار میں ہیرا مل سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ جو ایک اور دولت اس میں موجود ہے اس تک ہمارا ذہن نہیں پہنچتا۔ محض الفاظ سننے والے کا ذہن اس تک کیا پہنچے گا ـ یہ دولت تو اب تک ان تمام ماہرین کی پہونچ سے دور رہی جو ان کانوں کا پتہ لگاتے ہیں، ان کی کھدائی کراتے ہیں، ان سے وہ پتھر نکالتے ہیں جس میں سے ہیرا حاصل ہوگا۔ اور پھر اس پتھر میں سے ہیرا نکلواتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اب تک دنیا کو اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ یہ پتھر جس کا نام کمبرلائٹ ہے، ہمیں ہیرے کے علاوہ ایک اور قیمتی شئے دے سکتا ہے اور وہ ہے معدنی کھاد ـ جی ہاں! کمبرلائٹ سے ہمیں بہت بڑی مقدار میں کھاد حاصل ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ حال ہی میں اس کے کیمیاوی تجزیہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس میں فاسفورس اور پوٹاش خاصی بڑی مقدار میں موجود ہیں ، جو کہ نباتات کی غذا کے دو انتہائی اہم عناصر ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں تانبہ، جست اور مینگنیز وغیرہ جیسے عناصر بھی پائے جاتے ہیں، جن کی کچھ نہ کچھ مقدار پودوں کے لیے ضروری ہے۔

اس دریافت کا سہرا ڈاکٹر برمود الکساندر کے سر ہے ، جو کہ مدھیہ پردیش میں واقع ساگر یونیورسٹی کے شعبۂ اطلاقی علم الارضیات (اپلائیڈ جیالوجی ـــ (Applied Geology) میں ریڈر ہیں۔ انھوں نے وسطی ہندوستان میں واقع پنہ ضلع میں پائے جانے والے کمبرلائٹ کا وسیع کیمیاوی تجزیہ کیا ہے ۔ انھوں نے اپنی اس تحقیق کا انکشاف " انجنیرنگ اور ماحولیات " سے متعلق دوسری عالمی کانگریس میں کیا جو نئی دہلی میں منعقد ہوئی ـ ڈاکٹر الکساندر نے دریافت کیا ہے کہ کمبرلائٹ کی کیمیاوی ترکیب بلور کی عام چٹانوں سے قطعیً طور پر مختلف ہے۔

ڈاکٹر الکساندر نے دنیا کے مختلف حصوں میں واقع کمبرلائٹ کے علاقوں میں باتات کی نشو و نما کا گہرا جائزہ لیا ہے نیز تجربہ گاہ میں مختلف قسم کے تجربات بھی کئے ہیں اور اس کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کمبرلائٹ دراصل ایک قدرتی کھاد کا کام کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر الکساندر نے ضلع پنہ کے کمبرلائٹ پائے جانے والے علاقو

سے حاصل ہوئی مٹی میں طرح طرح کے پودے اگائے ہیں اور ریتیلی مٹی میں اُگائے گئے پودوں کا ان سے موازنہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو پودے کمبرلائٹ کی مٹی میں اگائے گئے ہیں وہ سب کے سب ریتیلی مٹی میں اگائے گئے پودوں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے بہتر اور صحت مند پائے گئے۔

ڈاکٹر الکسانڈر نے کہا کہ اس امر پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ جب مغربی آسٹریلیا کی ریتیلی زمین کے ایک حصّہ میں پسا ہوا کمبرلائٹ بکھیر دیا گیا تو اس جگہ ایک سرسبز وشاداب لان تیار ہوا جو کہ دوسری صورت میں اس زمین پر ناممکن تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہی بات ہنوٹا کے نزدیک بھی پائی جاتی ہے۔ یہ مقام پنّہ ضلع میں واقع ہیرے کی مشہور کان مزگاواں کان کے علاقے میں واقع ہے۔ یہاں کمبرلائٹ کی سرنگوں میں جو نیچے دب گئی ہیں، کافی گھنا اور بھرپور سبزہ موجود ہے اس کے برخلاف چاروں طرف کی ریتیلی زمین میں بہت ہی کم سبزہ ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مٹی ریتیلے پتھر سینڈ اسٹون — (Sand Stone) کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔ ڈاکٹر الکسانڈر کا کہنا ہے کہ اس نمایاں فرق کی وجہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی سوائے اس کے کہ کمبرلائٹ میں پوٹاش اور فاسفورس کافی اچھی مقدار میں پائے جاتے ہیں یعنی اس میں ان مادّوں کا فیصد تناسب بالترتیب ۱٫۶۵ اور ۲٫۶۹ ہے جب کہ اطراف کے سینڈ اسٹون علاقے میں یہ تناسب بالترتیب ۰٫۱۹ فیصد اور ۰٫۰۱ فیصد ہے اور ان کے علاوہ دوسرے مفید مادّے مثلاً لوہا، تانبہ، مینگنیز، جست، کیلشیم، میگنیشیم اور گندھک بھی اس میں موجود ہیں۔ ایک تیسری وجہ یہ ہے کہ کمبرلائٹ میں ایسے ریڈیو تابکار عناصر کی مقدار سینڈ اسٹون اور دوسری چٹانوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے، جو درختوں اور فصلوں کی نشو ونما کے لیے مفید بتائے جاتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے، کمبرلائٹ دنیا کے غالباً انتہائی بیش قیمت پتھر ہیرے کا ایک اہم منبع ہے۔ ہیرا دراصل کمبرلائٹ کو توڑ کر اس میں سے نکالا جاتا ہے۔ لیکن کمبرلائٹ میں اس کا تناسب بہت ہی کم ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اوسطاً ایک سو ٹن کمبرلائٹ میں سے صرف چار گرام ہیرا حاصل ہوتا ہے اور کافی حد تک یہی وجہ ہے کہ ہیرا اس قدر قیمتی ہوتا ہے، ورنہ کیمیاوی لحاظ سے تو یہ محض کاربن کی ایک شکل ہے۔ اسی کاربن کی جو کہ دوسری کئی شکلوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ مثلاً گریفائٹ (جس سے پنسل کی تیلی بنتی ہے)، پتھر کا کوئلہ، لکڑی کا کوئلہ، ہڈیوں کا کوئلہ اور پٹرولیم کا کول تار وغیرہ۔

ہیرے کے اس اہم وسیلے کا نام کمبرلائٹ اس لیے پڑا کہ یہ سب سے پہلے جنوبی افریقہ کے مقام کمبرلی میں دریافت ہوا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بوتسوانہ کے نیم ریگستانی علاقوں سوویت یونین کے یاقوتیائی علاقے اور لیسوتھو کے مالوتی پہاڑ پر بھی پایا جاتا ہے۔ ان تمام جگہوں پر وہی بات پائی گئی جو مغربی آسٹریلیا اور مزگاواں کے علاقوں میں محسوس کی گئی تھی یعنی سب جگہ اطراف کے دیگر علاقوں کے مقابلے میں زیادہ لمبے اور گھنے درخت اُگے ہیں۔

کمبرلائٹ نیلگوں مائل پتھر ہے جو دوسری چٹانوں کے درمیان ۷۰۰ میٹر سے زیادہ کی گہرائی میں پتلی سرنگوں کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اس کی بہت بڑی مقدار میں سے انتہائی قلیل مقدار میں ہیرا نکلتا ہے اور باقی بچے تمام مادّے کو بیکار سمجھ کر ضائع کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں مزگاواں کے مقام پر ۱۹۴۲ء میں کمبرلائٹ کی کان وجود میں آئی اور اس کے بعد سے اب تک اس میں سے لگاتار ہیرے کی نکاسی ہو رہی ہے اور روزانہ تقریباً ۴۵۰ ٹن کمبرلائٹ پتھر نکلتا ہے۔

ڈاکٹر الکسانڈر کو یقین ہے کہ مٹی میں تھوڑا سا پسا ہوا کمبرلائٹ ملا دینے سے زراعت کو اسی طرح فائدہ پہنچے گا جس طرح اس میں کیمیاوی کھاد ملا دینے سے ہوتا ہے یہی نہیں بلکہ یہ ایک قسم کی قدرتی کھاد کی طرح ہے لہٰذا مصنوعی کھاد کے مقابلے میں زیادہ فائدہ پہنچائے گا۔ چنانچہ ڈاکٹر الکسانڈر کا کہنا ہے کہ اب کمبرلائٹ کے معدنی ذخیروں کو صرف ہیرے کا وسیلہ نہ سمجھا جائے بلکہ اسے ہیرے کے ساتھ ساتھ کیمیاوی کھاد کا بھی وسیلہ سمجھا جائے۔ البتہ ابھی ہمیں تجربات اور آزمائشوں کے کئی مراحل سے گزرنا پڑے گا تب جاکر ہم یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ مختلف فصلوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کے لیے کس قسم کی مٹی میں کمبرلائٹ کا کیا تناسب رکھا جائے۔

اس کے ساتھ ہی ہمیں مزگاواں کان کے پاس ایک اور کرشر (Crusher) لگانا پڑے گا جو کمبرلائٹ کے فضلے کو زیادہ مہین پیس سکے۔ لیکن اس کے بعد اس سے ملک کو روزانہ تقریباً ساڑھے چار سو ٹن قدرتی

کھاد حاصل ہوگی۔ اس طرح اس زرِمبادلہ کا کچھ حصہ بچ جائے گا، جو کیمیاوی کھاد کی درآمد پر صَرف ہوتا ہے۔ اس وقت ہمارا ملک ۱۵۰۰ کروڑ روپے سالانہ کی کیمیاوی کھاد درآمد کر رہا ہے۔

ڈاکٹر الکساندر کی اس دریافت سے اور بھی فائدے ہوں گے۔ مثلاً اس سے ماحول کی کثافت دُور کرنے میں مدد ملے گی۔ کمبرلائٹ کا جو فضلہ کثیر مقدار میں اکٹھا ہوتا رہتا ہے اور دریاؤں میں جا کر ان کی تہ کو اونچا کرتا رہتا ہے نیز ان کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے، اس سے بھی ہم آسانی سے نجات پا سکیں گے۔

واضح رہے کہ ہمارے ملک میں ایک مزگاواں ہی نہیں بلکہ تیرہ ۱۳ ایسے علاقے ہیں جہاں کمبرلائٹ موجود ہے لیکن اب تک انھیں اس لیے اچھوتا چھوڑ دیا گیا تھا کہ ان سے بہت کم ہیرے حاصل ہونے کی توقع تھی۔ اب ہم ان وسیلوں کو بھی بروئے کار لا سکیں گے کیونکہ اب ہمیں اطمینان ہے کہ ان سے ہیرے ملیں یا نہ ملیں کھاد تو ملے گی! بلکہ بہتر تو یہ ہوگا کہ انھیں ہیرے کے بجائے کیمیاوی کھاد کا وسیلہ تصور کیا جائے اور اگر ان سے کچھ ہیرے بھی حاصل ہو جاتے ہیں تو انھیں اضافی فائدہ سمجھا جائے۔

یہ تو وہ علاقے ہیں جن کے بارے میں پہلے سے معلوم ہے کہ ان کے علاوہ کمبرلائٹ کے اور بھی کئی علاقے ملک میں یقیناً موجود ہوں گے جنھیں ماہرینِ ارضیات مستقبل میں رفتہ رفتہ دریافت کریں گے۔

درحقیقت دنیا بھر میں ہیرے کی سالانہ پیداوار ایک کروڑ بیس لاکھ گرام ہے — یہ پیداوار دس کروڑ ٹن سے زیادہ کمبرلائٹ سے حاصل ہوتی ہے۔ دنیا میں اب تک کمبرلائٹ کے ۵۲۰۰ معدنی ذخیرے دریافت ہو چکے ہیں۔ لیکن ان میں سے صرف پانچ فیصد کو بروئے کار لانے سے مذکورہ بالا مقدار میں ہیرے حاصل ہوئے، بقیہ کو بے کار سمجھ کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اب ان سب کو کیمیاوی کھاد کا امکانی وسیلہ مانا جائے گا۔ اس طرح ایک ہندوستانی سائنس داں کی دریافت سے نہ صرف اس کے اپنے ملک کو بلکہ پوری دنیا کو فائدہ پہنچے گا۔ ●

بقیہ، ہندوستان میں گنّے کی کاشت اور چینی کی صنعت

کم سے کم ۲۲ کیمیکلس بنائے جا سکتے ہیں۔ دُنیا کے بڑے بڑے چینی پیدا کرنے والے ممالک جو چینی کی کافی مقدار برآمد بھی کرتے ہیں، ضمنی پیداواروں کو بہتر طور پر استعمال کرتے ہیں جس سے وہاں چینی کے مصارفِ پیدائش بھی کم آتے ہیں۔

ہمارے ملک میں چینی کے کارخانوں سے ہر سال ۵ء۵ لاکھ میٹرک ٹن شیرا نکلتا ہے جس کا استعمال کھاد، اسپرٹ اور شراب وغیرہ میں ہوتا ہے۔ گنّے کی چھوئی سے پلاسٹک، گتّا اور کاغذ بھی بنایا جاتا ہے لیکن یہاں ان ضمنی پیداواروں کا استعمال کم ہو رہا ہے جس کی وجہ سے چینی کی تیاری کے اخراجات زیادہ ہوتے ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ گنّے اور چینی کی پیداوار میں اضافے اور کم لاگت کے لیے جدید ٹکنالوجی کا استعمال کیا جائے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے کسان گنّے کی کاشت میں دلچسپی لیں گے اور ہمارے زرعی سائنسداں اور انجنیئر حضرات اپنی فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے گنّے کی کاشت اور چینی کی صنعت میں درپیش مسائل کو جلد از جلد حل کریں گے۔ ●

بقیہ، اداریہ

ساتویں منصوبے میں ماہی گیری

بھارت میں ماہی گیری کے امکانات بہت روشن ہیں۔ اندرونِ ملک نہروں، آبی چشموں اور ساحل سمندر سے مچھلی پکڑنے کا کام اور آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ بھارت کی حدود میں ۲۰ لاکھ مربع کلومیٹر سے زیادہ خالص اقتصادی خطّہ ہے۔ بھارت کا ساحل ۱۷،۵۰۰ کلومیٹر سے زیادہ ہے۔ بھارت میں ذخیرہ آب کا رقبہ ساڑھے سترہ لاکھ ہیکٹیئر سے زیادہ ہے۔ چھٹے منصوبے میں مچھلی کی پیداوار میں ۱ء۳ فیصد سالانہ کے حساب سے اضافہ ہوا۔ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ اندرونِ ملک پانی میں مچھلی کی نسل بڑھانے اور اسے پکڑنے پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ ان کوششوں سے ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۱۱۰۰ ہزار ٹن مچھلی پکڑی جا سکی۔ جبکہ ۸۰-۱۹۷۹ میں صرف ۸۴۸ ٹن مچھلی پکڑی گئی تھی۔ چھٹے منصوبے میں سمندر سے مچھلی پکڑنے کا کام مقابلتہً سُست رہا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ گہرے سمندر سے مچھلی پکڑنے کے لیے ۲۰۰ کشتیاں لگانی تھیں مگر صرف ۵۰ کشتیاں ہی لگائی جا سکیں۔ ساتویں منصوبے میں خالص اقتصادی خطّے میں مچھلی پکڑنے کا کام زوروں پر رہے گا۔ ساحلی سمندر سے مچھلی پکڑنے کے کام کو مختلف طرح سے آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ ●

(ایڈیٹر)

کامتا پرشاد

دیہی امیروں پر ٹیکس لگانے کی ضرورت

مصنف کی رائے میں زرعی آمدنیوں پر براہِ راست ٹیکسوں کے لگانے کی گنجائش بہت زیادہ نہیں ہے۔ یہ اقدام آبرسانی کی بہتر سہولتوں سے جڑا ہوا ہے۔ چنانچہ ان کے خیال میں کھیتوں کی وسعت کے پیشِ نظر آبرسانی پر بتدریج اور مرحلہ وار ٹیکسوں کے عائد کئے جانے پر غور و خوض ہو سکتا ہے۔ وہ رعائتی نرخ پر آبرسانی کے موجودہ نظام کو نظرثانی کا محتاج سمجھتے ہیں تاکہ بڑے کھیتوں پر آبرسانی کی سہولتیں رعائتی نرخ پر نہ دی جائیں۔ چونکہ آبرسانی اور ٹیکسوں کا نظام مربوط ڈھنگ سے آگے بڑھیگا لہٰذا شروع میں ان علاقوں میں جہاں کہ آبرسانی کی یقینی سہولتیں موجود ہیں، زرعی آمدنیوں پر ٹیکس کا نظام لاگو کیا جا سکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ زراعت سے متعلق دیہی سیکٹر پر ٹیکس کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی، یہ اس لیے کہ سرکاری آمدنی کے وسائل میں اضافہ کی ضرورت ہے تاکہ بڑھتے ہوئے ترقیاتی اور غیر ترقیاتی اخراجات پورے کیے جا سکیں۔ اور اس کے ساتھ ہی آمدنیوں کی تقسیم معقول بنیادوں پر ہو سکے۔ اب تک زرعی سیکٹر کو ٹیکسوں سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ البتہ طویل المدتی اقتصادی پالیسی میں اس کا ذکر ضرور ہے۔ اس پر ٹیکس لگانے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ملک کے سامنے ہمیشہ سے دو مقاصد رہے ہیں۔ ایک ترقی اور دوسرے آمدنیوں کی ازسرِ نو تقسیم۔ چنانچہ ہر وہ قدم قوم اور ملک کے مفاد میں ہوگا جس کی رُو سے ٹیکسوں کے ڈھانچے کو وُسعت دیکر سماج کی اقتصادی نابرابریوں کو دُور کیا جا سکے۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح کے اقدامات کے امکانات اور گنجائشیں کیا کیا ہیں۔ آج کے دَور میں دیہی حقیقتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جانا ضروری ہے۔

ملک میں محنت کش طبقے کے ساٹھ فیصد ارکان زراعت سے روزگار پاتے ہیں۔ لیکن زراعت سے براہِ راست ٹیکسوں کی مدات میں ناقابل ذکر حصے کا ہی اضافہ ہوتا ہے۔ اراضی سے حاصل ہونے والے لگان کی صورت میں ہونے والی آمدنی کا سلسلہ ایک عرصہ سے منقطع ہو چکا ہے۔ یہی ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے زراعت پر براہِ راست ٹیکس لگتا تھا۔ اگر انکم ٹیکس کے طرز کا کوئی براہِ راست ٹیکس لگایا بھی جائے تو اس سے ٹیکسوں کا ڈھانچہ اس قدر وسعت پذیر نہیں ہوگا جس سے مذکورہ تناسب میں زراعت پیشہ لوگوں کا احاطہ کیا جا سکے۔ زراعت میں مصروف ساٹھ فیصد محنت کش ملک کی قومی آمدنی میں صرف ۴۰ فیصد حصہ ہی اضافہ کرتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زرعی سیکٹر میں فی کس اوسط آمدنی غیر زرعی سیکٹر کی فی کس اوسط آمدنی کے آدھے

ں کم ہے۔ مزید برآں زرعی آمدنی کا بڑا حصہ
کسانوں کی بڑی تعداد ادا کرتی ہے، جن
رنیاں انکم ٹیکس مقاصد کے لیے آمدنیوں
استثنیٰ سے نیچے ہے۔ اس لیے ان کسانوں
.نی کا قومی آمدنی سے تناسب معلوم کرنا
ہے جن کی آمدنی حدِ استثنیٰ سے اوپر
س طرح کے کسانوں کی تعداد کتنی ہوگی بحسا
مختلف طبقوں اور مختلف خطوں میں اس
ے کسانوں کی تقسیم کو سمجھنا بھی ضروری ہے
ن کو سمجھنے کے لیے قابلِ بھروسہ اعداد و
رکار ہیں۔ زراعت پیشہ لوگوں میں آمدنی
یم کے بارے میں مصدقہ اعداد و شمار
یا۔ زرعی شماریات میں کھیتوں کے رقبے

کی تقسیم کے بارے میں اطلاعات ملتی ہیں۔
اس بارے میں بھی ۷۷-۱۹۷۶ء کی بنیاد پر
یہ اطلاعات دستیاب ہیں۔ زرعی آب دہوا
اور آب رسانی کی سہولتوں سے متعلق ایک خاص
حالت میں فی ایکڑ زمین سے حاصل ہونے والی
پیداوار تقریباً یکساں ہی مانتے ہوئے، زرعی
آمدنی کا وہ تناسب معلوم کیا جا سکتا ہے
جو مختلف سائز کے گروپوں کے کسانوں سے
حاصل ہوتا ہے۔ ۷۱-۱۹۷۰ء اور ۷۷-۱۹۷۶
میں کسانوں کے مختلف زمروں کے قطعات
اراضی سے متعلق اطلاعات گوشوارہ نمبر ایک
سے ملتی ہیں۔ اس سے قطعاتِ اراضی کی
نابرابریوں کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

آگے بڑھنے سے قبل ایسے کسانوں کی تعداد کا
اندازہ لگانا ضروری ہے جو براہِ راست ٹیکسوں کی
ادائیگی والے زمرے میں آتے ہیں۔ انکم ٹیکس
کی موجودہ دفعات کی رُو سے جس کی آمدنی
اٹھارہ ہزار روپے سالانہ سے زیادہ ہوگی، اس
کو براہِ راست ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔ لیکن سیکشن
۱۶(۱) اور ۸۰ (سی) کے تحت کچھ رعائتیں
بھی دی جاتی ہیں، اس وجہ سے وہ شخص جس
کی آمدنی تقریباً ۲۷ ہزار روپے ماہانہ کے
قریب ہوتی ہے، ٹیکس ادا کرتا ہے، ایکویٹی کے
تقاضوں کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ
دیہی علاقوں میں استثنیٰ کی حد شہری علاقوں کے مقابلے
میں اور زیادہ ہونی چاہیئے کیوں کہ وہاں تعلیم،
صحت، تفریح، مارکیٹنگ، بنکنگ اور نقل و حمل
کے ذرائع کی سہولت آسانی سے دستیاب نہیں،
دیہی علاقوں میں ان مدات پر خرچ شہروں کے
مقابلے زیادہ ہیں۔ لہٰذا دیہات کے عوام کو اپنا
معیارِ زندگی بنانے کے لیے زیادہ رقم خرچ کرنی
پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر ہر سال ان مدات کے
لیے کم سے کم تین ہزار روپے اور خرچ کرنے ہونگے
اس طرح دیہی عوام کی حدِ استثنیٰ ۳۰ ہزار روپے
سالانہ تک پہنچ جاتی ہے، دیہی علاقوں میں
ایسے کسانوں کی تعداد کا پتہ چلانا دشوار ہے
جن کی آمدنی اس استثنیٰ کی حد سے زیادہ ہے۔
۷۶-۱۹۷۵ء میں آمدنیوں کا جو سروے کیا گیا
تھا، اس کی روشنی میں، مدت زیرِ تبصرہ میں
دیہی عوام کو دس مختلف زمروں میں بلحاظ آمدنی
تقسیم کرکے، اس میں سے بالائی طبقے کی آمدنی
کا سالانہ اوسط فی گھر ۱۲۲۷۸ روپے ہے،
آج کی قیمتوں کی سطح پر یہ آمدنی بڑھ کر ۲۴۵۵۶
روپے ہے۔ اس کے بعد کے زمرے کی آمدنی
۷۶-۱۹۷۵ء کی قیمتوں پر ۵۹۰۳ تھی، جو

گوشوارہ نمبر ایک

...ات اراضی کی تعداد کی تقسیم کا تناسب اور مختلف زمروں کے
...سانوں کی طرف سے کاشت کیا جانے والا مجموعی رقبہ

...کے زمرے	قطعاتِ اراضی کی تعداد ۱۹۷۱-۱۹۷۰	قطعاتِ اراضی کی تعداد ۷۷-۱۹۷۶	کل زیرِ کاشت رقبہ ۷۱-۱۹۷۰	کل زیرِ کاشت رقبہ ۷۷-۱۹۷۶ء
...ل کسان یعنی وہ کسان جن کے ...ہیکٹیر اراضی سے کم اراضی ہے	۵۰٫۹	۵۴٫۷	۸٫۹	۱۰٫۷
...ٹے کسان یعنی وہ کسان جو ایک تا ...یڑ اراضی کے مالک ہیں	۱۸٫۹	۱۸٫۰	۱۱٫۸	۱۲٫۸
...متوسط (۲ تا ۴ ہیکٹیر کے مالک)	۱۵٫	۱۴٫۲	۱۸٫۴	۱۹٫۸
...سط (۴ تا ۱۰ ہیکٹیر کے مالک)	۱۱٫۲	۱۰٫۱	۲۹٫۷	۳۰٫۰
...ے کسان (دس ہیکٹیر اور اس ... زیادہ آمدنی کے مالک	۴٫۰	۳٫۰	۳۱٫۲	۲۶٫۳
میزان	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰

...ماخذ:- زرعی شماریات ۷۷-۱۹۷۶ء۔

۸۶-۱۹۸۵ء کی قیمتوں کی سطح پر ۱۱۸۰۶ روپے ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صرف بالائی سطح کے عوام ہی وہ ہیں جو قابلِ ٹیکس آمدنی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اگر آمدنی کی یکساں تقسیم کا تصور سامنے رکھا جائے تو گاؤں کے ۵ فیصد سے بھی کم گھرانے ایسے ہوں گے جن کی آمدنی پر ٹیکس لگ سکتا ہے، باقی ۹۵ فیصد آبادی پر ٹیکس نہیں ہوگا۔ اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ دیہی علاقوں میں فی گھر بالعموم اور بڑے کسانوں میں بالخصوص کمانے والے دو سے زیادہ ہیں۔ ہریانہ، مغربی بنگال اور جموں و کشمیر کے خشک سالی کی زد میں آئے ہوئے اضلاع کا سروے کیا گیا تو ان سے درج ذیل حقائق سامنے آئے۔ ہریانہ میں دیہی کنبے میں فی کنبہ کمانے والوں کا اوسط ۲۰۰۹ ہے۔ بڑے کسان گھرانوں میں یہ ۱۹۱ ۲ ہے۔ مغربی بنگال میں یہ تعداد اوسطاً ۲٫۰۵ اور ۲٫۱۸ نیز جموں و کشمیر میں یہ اوسطاً ۲٫۶۲ اور ۲٫۲۹ ہے۔ اس کا خاص سبب عرصۂ دراز سے چلا آرہا مشترکہ کنبہ کا طریقہ ہے۔ راجستھان میں بھی اس طرح کا ایک سروے کیا گیا ہے، اکثر کمانے والوں کا رجحان یہی ہے کہ وہ ایک ہی کنبہ میں رہیں اور مل جل کر اپنی اراضی کی کاشت کریں، حالانکہ قانونی حیثیت سے انھیں آزادانہ طور پر رہنے کا حق حاصل ہے۔ موجودہ قانون کے تحت انکم ٹیکس کے لیے فی شخص آمدن کا تعین ضروری ہے۔ اس خامی کے سبب کسانوں کی نصف سے کم تعداد اس قانون کی گرفت میں آسکے گی۔ اس لیے ٹیکسوں کی ادائیگی کرنے والوں کی تعداد کم رہ جائیگی۔

ریاستوں میں ایسے کم ہی مطالعے کیے گئے ہیں جن کی بنیاد پر کھیتوں کی آمدن اور کھیتوں کے کاروبار کا اندازہ لگایا جاسکے۔ اس طرح کے دو مطالعے پنجاب میں کیے گئے ہیں۔ لیکن ان کی تحقیقات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ۲۷ اپریل ۱۹۸۵ء کے اکونومک ٹائمز میں مسٹر پی. ایل سنکھیان کا ایک مطالعہ شائع ہوا ہے جس کی رُو سے کاروبار کی آمدن کا فی گھر اوسط ۲۵ ایکڑ سے زیادہ اراضی کے مالک کسانوں کے لیے ۲۰۱ ۶۹ روپے ہے جبکہ ۲۰ تا ۲۵، ایکڑ اراضی والوں کے لیے یہ ۴۶۸ ۲۵ روپے ہے، یہ اوسط ۸۳-۱۹۸۲ء کی قیمتوں کی بنیاد پر ہے جبکہ آج یہ آمدنی بالترتیب ۸۳۰۴۱ روپے اور ۶۲ ۹۶۲ روپے ہے۔ ۱۵ تا ۲۰، ایکڑ اراضی والوں کی آمدنی ۶۳۶۸ ۴ روپے، دس تا پندرہ ایکڑ اراضی والوں کے لیے ۲۷۳۶۲ روپے اور دس تا دس ایکڑ اراضی والوں کے لیے یہ آمدنی ۲۹۰۴۷ روپے ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ صرف ۵، ایکڑ سے زیادہ اراضی والے کسان ہی ٹیکس کی زد میں آتے ہیں۔

جی ایس بھلّا اور جی. کے چڈھا نے بھی ایک مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ کا عنوان تھا اقتصادی انقلاب اور چھوٹے کسان۔ پنجاب میں زرعی آمدن کی تقسیم اور اس کا مطالعہ"۔ یہ مضمون اکونومک اینڈ پولٹیکل ویکلی" میں شائع ہوا۔ یہ مضمون ۱۵ اور ۲۲ مئی ۱۹۸۲ء کے شمارہ میں ہے۔

اس میں دیئے گئے اعداد و شمار گزشتہ مضمون میں دیئے گئے اعداد و شمار سے آدھے ہیں۔ اس مطالعے کی روشنی میں ۲۵، ایکڑ سے زیادہ قطعات اراضی والے کسانوں کی فی کنبہ آمدنی ۷۵-۱۹۷۴ء میں ۲۸۳ ۲۴ ۲ روپے تھی، موجودہ قیمتوں کی شرحوں پر یہ آمدنی ۴۷۰۹ ۳۴ روپے ہوگی۔ جو سابقہ مطالعے کی روشنی میں دی گئی ۸۳۰۴۱ روپے سے کہیں زیادہ کم ہے۔ ۱۲٫۵ سے لے کر ۲۵، ایکڑ اراضی والوں کی آمدنی ۲۴۴۵۳ روپے ہے۔ یہ اندازہ ۸۶-۱۹۸۵ء کی قیمتوں کی بنیاد پر لگایا گیا ہے۔

اس سے پچھلے مطالعے میں ۲۰ تا ۲۵، ایکڑ ارا[illegible] والوں کی آمدنی اور پھر ۱۵ تا ۲۰، ایکڑ ارا[illegible] والوں کی آمدنی بالترتیب ۶۲۹۶۲ روپے، ۵۳۶۸ ۴ روپے تھی۔ گھر میں کمانے والے [illegible] سے زیادہ ہوتے ہیں، لہذا فی کس اوسطاً [illegible] (جبکہ ہر کنبہ میں ۵، افراد کا اوسط مان لیا [illegible]) ۱۲٫۵ تا ۲۵، ایکڑ اراضی والے کنبوں میں ز[illegible] اور غیر زرعی وسائل سے ہونے والی آمدنی، [illegible] روپے ہے جبکہ ۲۵، ایکڑ سے زیادہ اراضی و[illegible] کنبوں کی آمدنی ۴۱ ۴۷ ۲ روپے ہے۔

پنجاب میں زراعت اچھی ہے، آبر[illegible] کی وافر سہولتیں ہیں، ملک میں بحیثیت [illegible] فصلوں کی جو پیداوار ہے، اس کا اوسط [illegible] کے مقابلے نصف ہے۔ خشک علاقوں، [illegible] کھیتی کے علاقوں اور خشک سالی کی ز[illegible] آنے والے علاقوں میں یہ اور بھی کم ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بحیثیت [illegible] ملک کو سامنے رکھا جائے تو صرف وہ کسا[illegible] ٹیکس کی زد میں آتے ہیں جن کے پاس ۱۰ [illegible] زیادہ زمین ہے۔ پنجاب، ہریانہ اور را[illegible] کے دوسرے رقبوں میں ۵ ہیکٹیئر زمین وا[illegible] اس کی زد میں آتے ہیں، البتہ خشک سالی آنے والے علاقے یا بارانی کھیتی والے عا[illegible] دس ہیکٹیئر سے بھی اوپر کے کسان انکم ٹیکس قوانین کی زد میں آئیں گے۔

ملک میں دس ہیکٹیئر سے زیادہ [illegible] قطعات اراضی کی تعداد ۲۴ لاکھ ۴۰ ہز[illegible] لگ بھگ ہے جو ملک میں کل زرعی ق[illegible] اراضی کے ۳ فیصد کے بقدر ہیں۔ ۷۰-[illegible] کے بعد سے آبادی میں اضافے کی رفتار کم [illegible] یکساں رہی، اس وجہ سے بڑے بڑے قا[illegible] چھوٹے قطعاتِ اراضی میں تبدیل ہو[illegible] تبدیلی کی رفتار وہی رہی جو ۱۷-۷۰ء [illegible]

ا ہ تھی۔ ۱۹۷۰-۷۱ء میں بڑے قطعات
۲ لاکھ ۷۰ ہزار تھی جو گھٹ کر ۷۷-۱۹۷۶
کھ ۴۰ ہزار رہ گئی تھی۔ اور اب یہ مزید
۲ لاکھ ہی رہ گئی ہوگی۔ ہر بلاک میں
ے ۴۰۰ بلاک ہوں گے۔ ٹیکسوں کے کسی
کے سامنے اس طرح کی معلومات کا پاس
ںا ہے۔ ٹیکسوں کی وصولی کا کام کافی
، سوائے ان چند بلاکوں کو چھوڑ کر جہاں
ے فارموں کی بہتات ہے۔
ا ہیکٹر اراضی سے زیادہ کھیتوں کا حصہ
اشت رقبے میں ۱۹۷۰-۷۱ء میں
مدھا جو گھٹ کر ۷۷-۱۹۷۶ء میں ۲۶٫۳
یا، گویا چھ سال میں یہ ۴٫۹ فیصد گھٹا،
کا اوسط اعشاریہ ۸ فیصد رہا۔ ۷۷-۱۹۷۶ء
ے بھی اگر کمی کا یہی تناسب سامنے رہے
آٹھ برسوں میں کمی کا تناسب ۶٫۴ فیصد
ے۔ اس طرح اب بڑے کھیتوں کا حصہ
شت رقبے میں ۲۰ فیصد کے لگ بھگ
قومی آمدنی کا ۸ فیصد ان کسانوں سے
جو کہ انکم ٹیکس ادا کرنے کی پوزیشن میں
بل میں ان میں کمی آنے کا اندازہ ہے
ر کے رقبہ کا اوسط ۱۹۷۰-۷۱ء میں
یکٹر تھا جو گھٹ کر ۷۷-۱۹۷۶ء میں
ہیکٹر رہا۔ اس میں مزید کمی کے امکانات ہیں
لہ اب تک یہ اوسط گھٹ کر ۱٫۷ ہیکٹر
ہو گیا ہوگا۔ مختصر یہ کہ بڑے کسانوں پر
ت ٹیکس سے ٹیکسوں کی آمدنی میں بڑھوتری
ت نہیں ہیں۔ البتہ آبرسانی کی سہولتوں
ے اور پیداواری صلاحیت میں اضافے
ت سے یہ صورت حال قدرے بہتر

ج ذیل گوشوارے اس صورتِ حال کو
ملا دیں گے :۔

زیرِ کاشت رقبے کی درجہ بندی — تعداد اور رقبہ ۷۷-۱۹۷۶ء

رقبہ	زیر کاشت قطعات اراضی کی تعداد	کُل سے نسبت	رقبہ (ہزار ہیکٹر میں)	کُل کے مقابلے تناسب
۵ تا ۱۰	۵۳۸۱	۶٫۶	۳۷٫۰۶۷	۲۲٫۷
۱۰ تا ۲۰	۱۹۴۳	۲٫۴	۲۶٫۰۳۵	۱۵٫۹
۲۰ تا ۳۰	۳۲۳	۰٫۴	۷٫۶۴۸	۴٫۷
۳۰ تا ۴۰	۹۱	۰٫۱	۳٫۰۹۰	۱٫۹
۴۰ تا ۵۰	۳۶		۱٫۵۷۲	۰٫۹
۵۰ سے اُوپر	۴۷	۰٫۱	۴٫۵۲۸	۲٫۸

ماخذ : زرعی شماریات ۷۷-۱۹۷۶ء

بڑے کھیتوں کی ریاست وار تقسیم

(دس ہیکٹر سے زیادہ رقبے والے)

	کھیتوں کی تعداد	زیر کاشت رقبہ
راجستھان	۲۰٫۷۵	۲۴٫۷۴
مدھیہ پردیش	۱۸٫۶۸	۱۸٫۱۷
مہاراشٹر	۱۷٫۴۲	۱۵٫۳۰
آندھرا پردیش	۸٫۵۸	۸٫۳۳
کرناٹک	۸٫۱۶	۷٫۶۰
گجرات	۷٫۹۶	۶٫۸۳
اُتر پردیش	۳٫۵۱	۳٫۰۸
بہار	۳٫۴۲	۳٫۴۳
ہریانہ	۲٫۹۷	۲٫۸۱
پنجاب	۲٫۵۲	۲٫۵۳
دیگر	۵٫۹۹	۷٫۱۸
میزان	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰

ماخذ : زرعی شماریات ۷۷-۱۹۷۶ء

اس سے ایک یہ بات واضح ہوتی ہے
زیادہ تر بڑے کھیت آبرسانی کا فائدہ نہیں
اٹھا پاتے۔ ۷۷-۱۹۷۶ء میں آبرسانی کے فائدوں
سے متعلق جو گوشوارہ مرتب کیا گیا تھا، اُس
سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

زرعی آمدن پر براہِ راست ٹیکس لگانے کی کم ہی گنجائش ہے۔ صرف دس ہیکٹر سے زیادہ رقبے والے کھیتوں کی آمدنی پر ٹیکس لگ سکتا ہے۔ یہ وہ کھیت ہیں جہاں بارشوں کی غیر یقینی حالت رہتی ہے، البتہ آبرسانی کے جزوی فائدے حاصل رہتے ہیں۔ خشک کھیتی یا بارانی کھیتی یا خشک سالی کی زد میں آنیوالے علاقوں میں بیس ہیکٹر سے زیادہ اراضی پر ہی یہ ٹیکس لگنے کا امکان ہے۔ البتہ پنجاب، ہریانہ، مغربی اُتر پردیش جہاں کہ سال بھر آبرسانی کی یقینی سہولتیں میسر ہیں، انکم ٹیکس کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ٹیکسوں کا نظام آبرسانی کے نظام سے جڑا ہوا ہے۔ چنانچہ یہ اسکیم ابتدا میں صرف ایسے علاقوں میں شروع کی جا سکتی ہے۔ جہاں آبرسانی کی سہولتیں یقینی ہیں۔ بڑے کسان اب غیر زرعی آمدنیوں کے حصول کے لیے بھی کوشاں رہتے ہیں۔ مثلاً پٹرول پمپ، سینما ہاؤس، بس، سرکاری ٹھیکے وغیرہ۔ اس طرح کے افراد کو یقیناً ٹیکسوں کی گرفت میں لایا جا سکتا ہے۔ ●

بی. بی. بھٹاچاریہ

زرعی آمدنی پر ٹیکس پیچیدہ مسئلہ

خالص اقتصادی نقطۂ نظر سے زرعی سیکٹر سے سرکار کو ٹیکس کی صورت میں اتنی آمدنی نہیں ہوتی جتنی کہ ہونی چاہیئے۔ زرعی پیداوار کے لیے سرکار جو سبسڈی یا امدادی رقوم دیتی ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے یہ حقیقت اور بھی زیادہ واضح صورت میں سامنے آتی ہے۔ مصنف کی رائے میں ایکوئٹی کے نقطۂ نظر سے امیر کسانوں سے کمتر ٹیکس کے لیے کوئی وجہ جواز نظر نہیں آتی۔ ان کی رائے میں زرعی سیکٹر سے براہِ راست ٹیکسوں کی صورت میں آمدنی بڑھ سکتی ہے۔ اس کے لیے لگان اراضی کی شرحوں میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

بھارت کی اقتصادی پالیسی میں زراعت پر ٹیکس ایک پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔ اگرچہ غیر زرعی آمدنی پر ٹیکس بنیادی طور پر اس کے اقتصادی اثرات کو سامنے رکھ کر آنکا جاتا ہے، لیکن جب اسی نقطۂ نظر سے زراعت پر ٹیکس کا سوال آتا ہے تو یہ ایک سیاسی مسئلہ بن جاتا ہے۔ اقتصادی نقطۂ نظر سے زرعی سیکٹر سے سرکار کو ٹیکس کی صورت میں وہ آمدنی نہیں ہوتی جو ہونی چاہیئے تھی، یہ بات اُس سبسڈی سے اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جو سرکار زرعی پیداوار کے لیے دیتی ہے۔ اس ضمن میں دو مسئلے بہت زیادہ اہم ہیں۔ ایک یہ کہ زراعت پر کس قدر ٹیکس لگایا جا سکتا ہے، دوسرے یہ کہ زرعی سیکٹر کی ترقیاتی ضرورتیں کیا کیا ہیں۔

زرعی سیکٹر سے براہِ راست اور بالواسطہ ہر دو قسم کے ٹیکس وصول کئے جاتے ہیں۔ لگان اراضی ایک طرح سے براہِ راست ٹیکس کی صورت میں لیا جاتا ہے۔ زرعی آمدنی ٹیکس کی صورت میں زرعی سیکٹر سے بہت معمولی رقم وصول ہوتی ہے جو براہِ راست ٹیکسوں سے ہونے والی آمدنی کا ایک بہت مختصر حصہ ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۸۴-۸۵ء میں زرعی سیکٹر سے کُل براہِ راست ٹیکس کی صورت میں جمع شدہ رقوم میں زرعی آمدنی ٹیکس کا حصہ ـ یعنی لگان اراضی معہ زرعی آمدنی ٹیکس صرف ۱۵ فیصد تھا۔ مرکز، ریاستوں، اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں سے براہِ راست ٹیکس آمدنی میں زرعی سیکٹر کا حصہ اس عرصے میں برابر کم ہوتا گیا ہے۔

۱۹۵۰-۵۱ء میں یہ ۲۳ فیصد تھا، ۱۹۶۰-۶۱ء میں یہ ۲۸ فیصد تھا، مگر اس کے بعد ۱۹۷۰-۷۱ء میں یہ ۱۸ فیصد رہ گیا۔ ۱۹۸۰-۸۱ء میں سات فیصد اور ۱۹۸۴-۸۵ء میں ۵ فیصد رہ گیا۔ اس عرصے میں زرعی اور دیہی ترقی پر جو سرکاری اخراجات ہوئے، اس سلسلے کی مالیات کی فراہمی میں زرعی سیکٹر کا حصہ بھی کم رہا۔ اگلے صفحہ کے گوشوارے سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

گوشوارہ اگلے صفحہ پر دیکھیں :-

زرعی سیکٹر سے براہِ راست ٹیکسوں کی صورت میں ہونے والی آمدنی اور زرعی و دیہی ترقی پر سرکاری اخراجات کا تناسب

سال	زراعت سے براہِ راست ٹیکس کی صورت میں ہونیوالی آمدنی اور قومی آمدنی سے اس کا تناسب۔	زرعی و دیہی ترقی پر سرکاری اخراجات اور قومی آمدنی سے ان کا تناسب۔	زراعت سے براہِ راست ٹیکس کی صورت میں ہونیوالی آمدنی اور زرعی و دیہی ترقی پر سرکاری اخراجات کا تناسب
۱۹۵۰-۵۱	۰٫۶	۰٫۴	۱۵۰
۱۹۶۰-۶۱	۰٫۳	۱٫۱	۷۳
۱۹۷۰-۷۱	۰٫۴	۱٫۰	۴۰
۱۹۷۵-۷۶	۰٫۴	۱٫۹	۲۱
۱۹۸۰-۸۱	۰٫۲	۲٫۵	۸
۱۹۸۲-۸۳	۰٫۲	۲٫۸	۷

ماخذ:۔ وزارتِ مالیات کی طرف سے شائع کردہ انڈین اکونومک اسٹیٹسٹکس پبلک فائنینس دسمبر ۱۹۸۴ء صفحہ ۳۹ - ۳۸۔

اس گوشوارے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ۱۹۵۰-۵۱ء اور ۱۹۸۲-۸۳ء کے درمیان قومی آمدنی کے تناسب سے زرعی اور دیہی ترقی پر سرکاری اخراجات بڑھ کر سات گنا ہو گئے ہیں مگر زرعی سیکٹر سے براہِ راست ٹیکس گھٹ کر تین گنا کم ہو گیا ہے۔ اسی طرح سرکار نے زراعت اور دیہی ترقی پر جو اخراجات کئے ان میں زرعی سیکٹر سے براہِ راست ٹیکسوں کی صورت میں ہونے والی آمدنی کا حصہ ۱۹۵۰-۵۱ء کے ۱۵۰ فیصد سے کم ہو کر ۱۹۷۰-۷۱ء میں ۴۰ فیصد رہ گیا ہے۔ ۱۹۸۲-۸۳ء میں یہ اور کم ہو کر صرف ۷ فیصدی رہ گیا ہے۔ زرعی سیکٹر سے براہِ راست ٹیکس کی صورت میں ہونیوالی آمدنی سرکار کے اُن اخراجات میں جو کہ وہ زراعت اور دیہی ترقی پر کرتی ہے، بہت ہی کم حصہ ڈالتی ہے۔

سرکار کو بالواسطہ ٹیکسوں سے جو آمدنی ہوتی ہے، اس میں زرعی سیکٹر کا حصہ کتنا ہے اور غیر زرعی سیکٹر کا کتنا، اس کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ غیر زرعی سامان اور اشیاء پر زیادہ تر بالواسطہ ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ سرکار کی طرف سے پیداوار میں معاونت کے لیے جو امدادی رقوم یا سبسڈی دی جاتی ہے، اس کا زیادہ تر حصہ زرعی سیکٹر میں ہی لگتا ہے۔ مختصر یہ کہ زرعی سیکٹر سے بالواسطہ ٹیکسوں کی آمدنی میں بہت کم اضافہ ہوتا ہے اور یہ غیر زرعی سیکٹر کے مقابلے بہت کم ہے۔

کاشتکاروں پر ٹیکس لگانے کا سوال ایک سیاسی مسئلہ بن جاتا ہے، اس کے علاوہ زرعی آمدنی پر ٹیکس کی مخالفت میں دو باتیں کہی جاتی ہیں۔ پہلی یہ کہ امیر کسان بہت کم تعداد میں ہیں اس لیے براہِ راست ٹیکسوں کے عائد کرنے کی گنجائش بہت کم ہے۔ دوسری بات یہ کہ براہِ راست ٹیکسوں کی وصولی پر اخراجات بہت زیادہ آئیں گے نیز کھیت کی سطح پر زرعی آمدنی کا اندازہ لگانا ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اس لیے یہ نفع بخش نہیں ہے۔

سبز انقلاب آنے سے پیشتر امیر کسانوں کی تعداد شاید بہت کم تھی۔ لیکن اس کے بعد ان کی تعداد بڑھی اور خاص کر پنجاب، ہریانہ، مغربی اُتر پردیش، گجرات، آندھرا پردیش کے ساحلی علاقے میں ان کی کافی تعداد بڑھی ہے۔ زیادہ تر کسان سرکار کی سبسڈی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ سرکار نے خوراک اور کیمیاوی کھادوں پر جو سبسڈی دی ہے، اس کا فائدہ انھیں ملا ہے۔ ایکوٹی کے نقطۂ نظر سے امیر کسانوں پر ٹیکس کم لگانے کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

گوشوارہ نمبر ۲ سے یہ اندازہ ہوگا کہ دیہات کے امیر گھرانوں میں روزمرہ کی چیزوں کے اخراجات اور ان کی کھپت اب پہلے سے مقابلے کہیں زیادہ ہے۔ کسانوں میں اوپر کے طبقہ یعنی امیر ترین دس فیصد کسانوں اور دیہی عوام میں ۴۰ فیصد سے زیادہ اشیاء کی کھپت ہے۔

گوشوارہ نمبر ۲

دیہی علاقوں میں بالاترین تین زمروں کے عوام میں آمدنی اور کھپت کا فی کس سالانہ اوسط (۸۲-۱۹۸۱ء)

(نوٹ: ہم یہاں سماج کو دس زمروں میں تقسیم کرتے ہیں تو بالائی تین طبقے آٹھ، نو اور دس ہوئے)۔

بالائی طبقے میں فی کس اوسط آمدنی	کھپت	اخراجات	میزان	آمدنی	آمدنی کے تناسب سے بچت
	خوراک	خوراک کے علاوہ دیگر			
		روپیے			
۸	۷۶۶	۵۲۲	۱۲۸۸	۱۵۳۴	۱۶
۹	۹۰۷	۶۰۱	۱۵۰۸	۱۸۹۹	۲۱
۱۰	۱۳۲۰	۹۰۴	۲۲۲۴	۳۳۱۷	۳۳
بحیثیت مجموعی:	۲۳۲	۳۹۰	۱۰۲۲	۱۱۴۲	۱۰

ماخذ: ہندوستان کے دیہات میں ۷۱-۱۹۷۰ء اور ۸۴-۱۹۸۱ء کے مابین غریبی اور اشیاء کی کھپت کے نمونوں میں تبدیلیاں، شائع شدہ ۱۹۸۶ء

اس گوشوارے سے دیہی خوشحالی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ دیہات کے اوپری طبقے کے ۳۰ فیصد گھرانوں میں آمدنی اور کھپت کی شرحیں وہی ہیں جو کہ شہر کے مماثل گھرانوں کی ہیں۔ یہ گھرانے بھی اپنی آمدنی کا بڑا حصہ غیر خوراکی مدات پر خرچ کرتے ہیں جس سے ان کے طرز زندگی اور بود و باش کی بہتری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۸۲-۱۹۸۱ء میں دیہی گھرانوں کے سب سے اوپر کے دس فیصد گھرانوں کی اوسط فی کس آمدنی ۳۳۱۷ روپیے سالانہ تھی۔ مثال کے طور پر ایک گھر میں ۶ افراد ہیں، اس طرح ان کی آمدنی کی میزان ۲۰ ہزار روپیے بنتی ہے۔ چوں کہ دیہی آمدنی کی تعیین ایک پیچیدہ عمل ہے لہٰذا یہ بات غیر معقول نہ ہوگی کہ دیہات کے سب سے اوپر کے ۵ فیصد گھرانوں کی آمدنی اور بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آمدنی پر ٹیکس لگانے کی بڑی گنجائش ہے خاص کر دیہات کے بالکل اوپر کے ۵ فیصد گھرانوں پر۔ امیر کسانوں سے زرعی آمدنی ٹیکس وصول کرنا دشوار ہو سکتا ہے۔ اوّل تو کھیت کی سطح پر زرعی آمدنی کا باقاعدہ حساب کتاب نہیں ہے، دوسرے ہر سال خالص زرعی آمدنی کا اندازہ لگانا عملاً ممکن نہ ہوگا۔ البتہ لگان اراضی کی شرحوں میں اضافے سے زرعی سیکٹر سے براہِ راست ٹیکسوں کی وصولی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ لگان اراضی کی وصولی آسان ہے اور بہت سی ریاستوں میں قطعاتِ اراضی کا باقاعدہ ریکارڈ ہوتا ہے۔ لگان اراضی کی شرحیں قومی آمدنی کی شرحوں اور حتیٰ کہ زرعی آمدنی کی شرحوں کے برابر نہیں بڑھی ہیں۔ اور ۱۹۵۰ء کے بعد سے زیادہ تر ریاستوں میں لگان اراضی میں عملاً جمود ہی پایا جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال آبپاشی والے اور غیر آبپاشی والے رقبے میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ حالاں کہ آبپاشی والا رقبہ ہو یا غیر آبپاشی والا، ہر دو جگہ زمین کی پیداواری صلاحیت بڑھی ہے۔

لگان اراضی میں اضافے کے لیے تین وجوہات ہیں۔ اوّل تو زمین کی پیداواری صلاحیت بڑھی ہے اور یہ آبپاشی والے رقبے میں زیادہ ہی بڑھی ہے، دوسرے افراطِ زر نے لگان اراضی کی حقیقی مالیت گھٹا دی ہے، تیسرے دیہی اور شہری نقطۂ نگاہ سے معیشت کی ترقیاتی ضرورتیں بڑھتی جا رہی ہیں چوں کہ اقتصادی اور سماجی ذمہ داریوں کا بوجھ پبلک سیکٹر نے اُٹھا رکھا ہے۔ لہٰذا پبلک سیکٹر کی ٹیکسوں سے ہونے والی آمدنی، اقتصادی ترقی کی وسعتوں کے ساتھ بڑھنی چاہیئے۔ اس طرح ایکوٹی سرمایہ اور وسائل کو حرکت میں لانے کے نقطۂ نظر سے زرعی سیکٹر سے براہِ راست ٹیکس، خاص کر لگان اراضی کی صورت میں آمدنی میں اضافہ ضروری ہے۔ تاکہ قومی آمدنی میں اضافے کے تناسب سے وہ بھی اپنا حصہ ادا کر سکے۔

اکثر ہندوستانی معیشت میں شہری اور دیہی علاقوں کے بڑھتے ہوئے فرق کو دیکھا جاتا ہے۔ دیہی علاقوں میں زیادہ تر چھوٹے کسان یا ایسے غریب کسان آباد ہیں جو محض پیٹ پال کر ہی اپنا گزارہ کرتے ہیں جب کہ شہری علاقوں میں صنعت کاری کے پروگرام بڑھتے جا رہے ہیں اور اس وجہ سے یہ علاقے

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

محمد جنید عباسی

لچھمن پور گاؤں بھی ہندوستان کے ہزاروں پچھڑے ہوئے گاؤں میں سے ایک گاؤں تھا۔ یہ ایسی جگہ آباد ہے جہاں پہونچنے کے لیے سب سے پہلے ایک دریا پار کرنا پڑتا ہے جس پر پہلے کوئی پل نہیں تھا اس کو کشتی سے پار کرنے کے بعد کئی میل پیدل چلنا پڑتا تھا۔ کچھ لوگ اس راستے پر گھوڑوں، بیل گاڑیوں سے سفر کرتے تھے لیکن یہ راستہ اتنا ناہموار اور نیچا اونچا تھا کہ سواری سے چلنے سے بہتر پیدل ہی چلنا تھا۔ شہری علاقے سے دور ہونے کی وجہ سے یہ ہر طرح کی شہری سہولیات سے محروم تھا۔ لچھمن پور سے ملے ہوئے اور بھی چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں لیکن سب کی حالت ایک سی تھی۔ یہاں زمینیں تو بہت ہے لیکن زیادہ تر بنجر تھی۔ ڈھاک کے جنگل افراط سے نظر آتے تھے یہاں سینچائی کے ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے اکثر زمینیں بےکار پڑی تھیں۔ یہاں زراعت کا انحصار آسمانی پانی اور کنوئیں تھے جن سے ظاہر ہے بہت اچھی آبیاری نہیں ہو سکتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ یہاں کے اکثر لوگ محنت مزدوری کے لیے کلکتہ، بمبئی یا قریب کے شہروں میں چلے جاتے تھے اور اس سے کچھ ان کی روزی چل جاتی تھی۔ ہمارے آباؤ اجداد بھی اسی گاؤں کے رہنے والے تھے شاید انھیں سب وجہوں سے اکثر دوسرے شہروں میں آکر آباد ہو گئے لیکن اب بھی ہم لوگوں کا اس علاقے سے ایک تعلق باقی ہے اور کچھ خاندان کے لوگ بھی ابھی تک یہاں آباد ہیں اور ہم لوگوں کی زمینیں بھی ہیں جس کی وجہ سے ہم لوگ اکثر یہاں پہونچ جاتے ہیں۔ ہمارے اس گاؤں میں اچھی خاصی آبادی ہے۔ مختلف قوم اور برادری کے لوگ یہاں آباد ہیں اور ایک دوسرے سے تعلقات بھی ہیں لیکن اسی آبادی سے ملا ہوا ایک پُروا ہے جس میں ہریجن لوگ آباد ہیں۔ یہ لوگ بیچارے عام لوگوں کے مقابلے میں کم تر سمجھے جاتے تھے اور شاید وہ بھی دوسروں کو اپنے سے برتر مانتے تھے۔ کیوں کہ ان کا رہن سہن طور طریقہ سب ہی خادمانہ تھا۔ لوگ ان کو گالیاں دیتے تھے، جھڑکتے تھے، بیدردی کے ساتھ کام لیتے تھے لیکن وہ خاموشی کے ساتھ ان سب چیزوں کو برداشت کر لیتے تھے اور ان کا کام کرتے رہتے تھے۔

لچھمن پور کے متموّل لوگوں کے یہاں اکثر یہیں کے لوگ کام کرتے تھے لیکن ان لوگوں کے ساتھ بہت خراب برتاؤ ہوتا تھا ان کو کام کرنے کے بعد پوری مزدوری بھی نہیں ملتی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کو پیٹ بھر روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ ان کی بستی میں اکثر گیا ہوں اور کیونکہ گاؤں میں داخلے کا راستہ ہی اُن کی بستی کے اندر ہو کر جاتا ہے اس لیے ان لوگوں سے مجھ سے جان پہچان بھی تھی ان کے بچوں اور عورتوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے پاس ڈھنگ سے تن ڈھکنے کو کپڑے تک نہیں ہیں۔ ان کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید ان کی انسانوں میں گنتی ہی نہیں ہے ان کی حالت جانوروں سے بھی بدتر تھی لوگ ان کے سائے سے بچنے کی کوشش کرتے ان کی چھوئی ہوئی چیز نجس مانی جاتی تھی۔ اکثر لوگ ان کو اپنے قریب

بیٹھنے بھی نہیں دیتے تھے ان کی عزت و آبرو ان کی جان ان کا مال کسی چیز کی بھی ان لوگوں کے نزدیک کوئی قیمت نہیں تھی۔ اِدھر عرصے سے میں اپنے گاؤں یعنی پھمن پور نہیں جا سکا تھا لیکن ریڈیو پر اور اخباروں سے برابر معلوم ہوتا تھا کہ سرکار ان ان علاقوں میں جہاں لوگ انتہائی پستی اور غریبی کی زندگی بسر کر رہے ہیں خاص طور پر ان کو اٹھانے اور سماج میں برابری کا درجہ دلانے کی کوشش کر رہی ہے لوگوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ علاقہ بھی خاص طور پر توجہ کا مرکز ہے اس لیے ایک دن میں نے طے کیا کہ میں چل کر اپنے یہاں بھی دیکھوں کہ اس ترقی کی دوڑ میں ہمارا علاقہ کتنا آگے بڑھا ہے۔ میں نے ضروری سامان جھولے میں رکھا اور بس کے ذریعے اپنے گاؤں کی طرف چل دیا جب میں بس سے اترا اور دریا کی طرف بڑھا جہاں سے کشتی کے ذریعہ پار جانا ہوتا تھا تو میں تعجب اور خوشی سے دنگ رہ گیا کیا دیکھتا ہوں کہ اب دریا بہت ہی شاندار پل کھڑا ہے اور پاس ہی یکہ و رکشہ بھی موجود ہے۔ اب پل پار کرنے کے بعد ایک صاف ستھری پختہ سڑک بھی نظر آئی معلوم ہوا کہ یہ سڑک ہمارے گاؤں کے قریب سے ہو کر گزری ہے، اس لیے اب مجھ کو پیدل نہیں جانا پڑے گا۔ میں یہاں سے ایک رکشہ پر بیٹھ گیا اور گاؤں کی طرف چلا اب میں جدھر دیکھتا ہوں ایک عجیب اور انوکھا منظر نظر آ رہا ہے سڑک کے کنارے کنارے پہلے جو چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے اور ان میں نیچے اور کچے مکانات و جھونپڑیاں تھیں اب قریب قریب سب ہی پختہ ہو گئے تھے۔ میں نے رکشہ والے سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ سب بستیاں حال ہی میں بنی ہیں اور یہاں ترقی کا کوئی نہ کوئی پروگرام روز شروع ہوتا رہتا ہے۔ اور اب یہاں قریب ہی سے ایک نہر بھی نکل گئی ہے جس کی وجہ سے وہ زمینیں جو بنجر پڑی رہتی تھیں اب ان پر کھیتی ہونے لگی ہے۔

اسی طرح میں دیکھتا ہوا اپنے گاؤں کے قریب اس پُروا میں پہونچ گیا جہاں ہمارے گاؤں میں کام کرنے والے ہریجن لوگ آباد ہیں میں نے دیکھا اب یہاں ترتیب کے ساتھ چھوٹے چھوٹے پختہ مکانات بنے ہوئے ہیں سامنے کھلا ہوا میدان ہے اس کے پاس ایک کنارے پر ایک اسکول کی عمارت ہے اور دوسری طرف ایک اسپتال ہے، جہاں پر ڈھاک کا جنگل تھا اب وہاں پر کھیتیاں لہلہا رہی تھیں۔

میں نے اسی جگہ رکشہ والے کو رخصت کر دیا اور اس بستی میں داخل ہوا۔ اس بستی کے اکثر لوگ مجھ کو جانتے تھے مجھ کو دیکھ کر اکثر لوگ میرے قریب آ گئے اور سلام دعا کے بعد ان لوگوں سے بات چیت ہونے لگی اسی میں ہمارے یہاں کا پرانا نوکر رگھو بھی تھا جو ان لوگوں میں کچھ مخصوص حیثیت کا معلوم ہوا میں نے رگھو بھیا سے پوچھا بھائی کیا حال چال ہے؟ اس نے کہا بابو بھگوان کی کرپا ہے اب تو بھگوان نے ہم لوگوں کے دن پھیر دئے ہیں سرکار نے یہ مکان بنوا دئے ہیں اور اب میں اس گاؤں کی گرام سبھا کا پردھان ہوں کچھ زمین بھی سرکار سے مل گئی ہے، ہمارے لڑکے اب اسکول میں پڑھنے لگے ہیں۔ جن لوگوں کی نظروں میں ہم لوگوں کی کوئی حیثیت نہیں تھی ان لوگوں سے بھی اب ہم لوگ بہت حد تک قریب آ گئے ہیں وہ لوگ اب ہم لوگوں سے اتنی نفرت بھی نہیں کرتے آجکل کی بہ نسبت ہم لوگ ہر حالت میں بہتر ہیں۔ اس بھیڑ بھاڑ میں مجھ کو کچھ نوجوان لڑکے بھی نظر آئے جو صاف ستھرے اور سلیقے کے معلوم ہوئے میں نے ان لوگوں کے متعلق پوچھا تو رگھو بھیا نے بتانا شروع کیا کہ یہ لڑکا پرکھو کا ہے اس کا نام ماتا دین ہے اس نے درجہ آٹھ پاس کیا ہے اس کے آگے یہ نہیں پڑھ سکا۔ بیکار گھوم رہا ہے اس کو ایک دن وکاس ادھیکاری ملے اور انھوں نے اس کو بلاک پر لے جا کر اس سے فارم بھروا دیا اور اس کو موم بتی بنانے کی ٹریننگ میں بھیج دیا اسی طرح کئی لڑکے مختلف کام سیکھ رہے ہیں۔ بھیکو کا لڑکا رام تہور ویلڈنگ کی ٹریننگ لے رہا ہے۔ مہیش کا لڑکا جگدیو سلائی کا کام سیکھ رہا ہے قریب ہی سرکاری ایک قالین کا کارخانہ کھلا ہے جس میں ہمارے گاؤں کے بہت سے لڑکے کام سیکھتے ہیں ان سب کو قریب سو روپے مہینے وظیفے کے طور پر ملتے ہیں۔ ٹریننگ پوری ہو جانے کے بعد ان کو سرکار معمولی سود پر چھوٹ کے ساتھ قرضہ بھی ملے گا تاکہ یہ اپنے کام میں آسانی کے ساتھ لگ کر اپنی روزی روٹی کا بندوبست کر سکیں۔

یہ سب جان کر مجھ کو بے انتہا خوشی ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ اگر اسی طرح کام ہوتا رہا اور لوگ اپنی روزی روٹی سے لگ گئے تو جلد ہی ہمارا یہ ملک جنت کا نمونہ ہو جائے گا۔ اور جلد ہی اونچ نیچ کا فرق مٹ کر سب لوگ برابر ہو جائیں گے اس سے پہلے جو سماج واد کا نعرہ سننے میں آتا تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سماج واد ہے آج میں اپنی آنکھوں سے اس کی عملی شکل و صورت دیکھ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ کتنی جلدی ان لوگوں میں سدھار پیدا ہوا ہے اور سماجی و طبقاتی فرق تھا کتنی تیزی کے ساتھ مٹ رہا ہے اور خلیج جو اونچی نیچی ذات میں صدیوں سے چلی آ رہی تھی اور جس کے متعلق عام خیال تھا کہ اس کا جلد پٹ جانا بہت مشکل ہے غیر معمولی تیزی کے ساتھ پٹتی نظر آ رہی تھی اور تمام لوگوں کے لیے ایک خوشگوار اور خوش آئند مستقبل کی نشاندہی کر رہی تھی۔

رگھو بھیا سے معلوم ہوا کہ کل اسی بستی۔

مر صاحب اور ان کے ساتھ دوسرے افسران
ٹ گئے اور اس بستی کے ان لوگوں کو جو غریبی
انتہائی سطح پر پہونچ گئے ہیں اور ان کے لیے
وزی روٹی کا کوئی سہارا نہیں ہے ان کو مدد دی گ
ی کا میلہ ہونے والا ہے۔ آپ بھی اس میں ضرور
ئے گا۔ میں نے خوشی خوشی اس دعوت کو منظور کر
یا اور پھر ان لوگوں سے اجازت لے کر ٹہلتا ہوا
نے گاؤں آگیا یہاں بھی اپنے عزیزوں اور گاؤں
وں سے اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ قریب
ریب سب ہی لوگ اس میلے میں جانے کے لیے
یار ملے۔

دوسرے دن ہم گاؤں کے لوگوں کے ساتھ
ہرجن نواس پہونچے یہاں رگھو بھیا نے بستی کے
امنے میدان میں کئی تخت بچھا کر ڈائس بنا دیا تھا
ور اسکول سے کرسیاں و بنچیں منگوا کر ڈائس کے
ریب ہم لوگوں کو کرسیوں پر بٹھایا۔ آس پاس
ے گاؤں کے بہت سے لوگ یہاں موجود تھے۔
ریہرپور کے ٹھاکر ہر بھجن سنگھ، پنڈت دوارکا ناتھ،
ہن سیٹھ، رام چندر یادو وغیرہ بڑے لوگ بھی
ں میلے میں موجود تھے۔ اس میلے میں ایسا معلوم ہوتا
ھا کہ یہ میلہ کوئی قومی میلہ ہے اس کے اندر کوئی
بید بھاؤ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس بستی کے نوجوان
ن کو پانی، چائے، سگرٹ، بیڑی پیش کر رہے
ے اور لوگ بغیر کسی نفرت اور چھوت چھات
ے خوشی خوشی اپنی ضرورت کی چیزیں استعمال
ر رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں کئی موٹریں آتی نظر
ئیں۔ کلکٹر صاحب، حاکم پرگنہ تحصیلدار صاحب،
ی۔ڈی۔او اور گرام وکاس ادھیکاری وغیرہ گو
ب آگئے۔ کلکٹر صاحب کا گاؤں کے پردھان
ور دوسرے لوگوں نے استقبال کیا۔ رگھو بھیا نے
لکٹر صاحب کے گلے میں ایک ہار ڈالا اور ہاتھ جوڑ
ر سلام کیا۔ کلکٹر صاحب نے مسکراہٹ کے
ساتھ جواب دیا۔

اب سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے
اور پروگرام شروع ہوا سب سے پہلے بی۔
ڈی۔ او صاحب نے کلکٹر صاحب کی تشریف
آوری کا شکریہ ادا کیا اور اس میلے کا مقصد
بتایا اور اس کے بعد مختلف لوگوں نے اپنے
اپنے خیالات کا اظہار کیا سب سے آخر میں
کلکٹر صاحب کو ایک فہرست دی گئی جس میں
ایسے لوگوں کے نام تھے جو غریبی کی انتہائی سطح
پر پہنچ چکے تھے اور ان کی روزی روٹی کا
کوئی سہارا نہیں تھا ان میں ایک نام ایک
بیوہ عورت شریمتی رجونتی کا تھا جو بیوہ تھی اور
اس کے دو چھوٹے بچے ہیں اس کو کلکٹر صاحب
نے ایک سلائی مشین دی جس سے کہ یہ سلائی
کر کے اپنی روزی روٹی کا بندوبست کر سکے
اسی طرح کئی آدمیوں کو یکہ گھوڑا، رکشہ، بیل
گاڑی اور اونٹ دیا گیا تاکہ یہ لوگ فوراً
اپنی روزی روٹی کا انتظام کر سکیں۔ کچھ ایسے
لوگ تھے جن کو صابن، جوتا، موم بتی وغیرہ کے
کارخانے کھولنے کے لیے بینک کے ذریعے
آسان قسطوں پر قرض دیا گیا۔ ایک آدمی کو مرغی
خانہ کھولنے کے لیے قرض دیا گیا۔

اسی طرح یہ میلہ بہت ہی کامیابی کے
ساتھ قریب چار بجے ختم ہوا اور لوگ ہنسی
خوشی اپنے اپنے گھروں کو واپس گئے۔ میں یہاں
بہت دنوں کے بعد آیا تھا اس لیے یہ بدلی ہوئی
صورت حال دیکھ کر مجھ کو بڑی حیرانی ہوئی ایسا
محسوس ہوا کہ یہاں تھوڑے ہی دنوں میں ترقی
کے پروگراموں نے کایا پلٹ کر دی۔

بقیہ: زرعی آمدنی پر ٹیکس پیچیدہ مسئلہ

زیادہ تیزی سے ترقی کرتے جا رہے ہیں، یہ بھی
کہا جاتا ہے کہ چوں کہ سرکار کے اخراجات
زیادہ تر شہری ترقی کے لیے ہیں، لہٰذا دیہات
کے غریب کسانوں پر ٹیکسوں کے لیے کوئی وجہ
جواز نہیں رہ جاتی۔ لیکن اس طرح کے
دلائل حقیقت سے دور ہیں، یہ سچ ہے کہ
زیادہ تر دیہی علاقے اقتصادی طور پر پسماندہ
چلے آرہے ہیں لیکن کچھ دیہی علاقوں نے
تیزی سے ترقی کی ہے، ملک میں سبز انقلاب
آجانے کے بعد کچھ دیہی علاقے کافی سرسبز
شاداب ہوئے ہیں، اگر زرعی آمدنی پر ٹیکس
تدریجی طور پر عائد کیا جائے تو اس سے غریب
کسان متاثر نہ ہوں گے۔ لگان اراضی کی تدریجی
شرحیں عائد کرنے سے سیاسی مسئلہ بھی ابھر کر
سامنے نہیں آئے گا۔

یہ کوئی سیاسی مسئلہ نہیں ہے

پانچویں اور چھٹے منصوبے میں زرعی سیکٹر
کی کارگزاری غیر زرعی سیکٹر کے مقابلے بہتر
رہی ہے۔ اس عرصے میں معیشت میں بچتوں کی
شرحیں کافی بڑھی ہیں! البتہ پبلک سیکٹر کے لیے مالیاتی
وسائل جٹانے کی صورت حال کافی کمزور ہوئی
ہے۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ زراعت
اور دیہی ترقی پر سرکاری اخراجات کافی بڑھے
ہیں۔ زیادہ تر علاقوں کی پسماندگی کے سبب ابھی
ان اخراجات میں کمی آنے کا امکان نہیں ہے،
اس لیے ضروری ہے کہ مالدار اور امیر کسان
ٹیکسوں سے ہونے والی آمدنی کے اضافے
میں اپنا حصہ ڈالیں۔ پبلک سیکٹر کے وسیلے
جمع کرنے کا نظام پہلے ہی کمزور ہو چکا ہے،
ایسا نہ کیا گیا تو اس میں مزید کمی آسکتی ہے۔ ●

بس ہندوستاں

محسن رضا رضوی

یہ اخوت کا پیامی، ایکتا کا ترجماں
امن کا پیغامبر، انسانیت کا پاسباں
روزِ اول ہی سے ہے یہ مسکنِ امن و اماں
مختلف مذہب کی ہیں اس سرزمیں پہ بستیاں
ناز ہے قدرت کو جس پر وہ ہے بس ہندوستاں

ہے بہت اونچا یہاں مہر و محبت کا علم
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی مل کے رہتے ہیں بہم
ہے یہاں قرآن و گیتا بھی برابر محترم
اک طرف ناقوس کی آواز اک جانب اذاں
ناز ہے قدرت کو جس پر وہ ہے بس ہندوستاں

یہ دیارِ چشتی و نانک، یہ گوتم کا وطن
یہ رشی منیوں کا گھر، یہ صوفیوں کی انجمن
یہ زمیں ہے جس سے نکلے کیسے کیسے اہلِ فن
ہو چکے ہیں اولیا اللہ تک پیدا یہاں
ناز ہے قدرت کو جس پر وہ ہے بس ہندوستاں

اک طرف کوہ ہمالہ آسماں سے ہمکنار
اک طرف کشمیر کی رعنائیاں ہیں آشکار
اک طرف کاشی تو اک جانب اودھ کی ہے بہار
تاج بھی ہے اس زمیں پر اور اجنتا بھی یہاں
ناز ہے قدرت کو جس پر وہ ہے بس ہندوستاں

میری اس دھرتی کی شہرت انجمن در انجمن
شان سے اس سرزمیں پر ہیں رواں گنگ و جمن
قابلِ صد رشک اس دنیا میں ہے میرا وطن
بلبلیں اس گلستاں کی شاخ پر ہیں نغمہ خواں
ناز ہے قدرت کو جس پر وہ ہے بس ہندوستاں

غزلیں

قاضی انصار

اک کہانی اک فسانہ چاہیئے
چند لوگوں کو بہانا چاہیئے

شرم آتی ہے اندھیروں کو اگر
روشنی میں ڈوب جانا چاہیئے

عقل کی تو آزمائش کر چکے
آج دل کو آزمانا چاہیئے

ہو نہ اس تحریک پر طاری جمود
کیا کسی کا گھر جلانا چاہیئے

مرحلے دشوار نا ممکن نہیں
حوصلوں کو آزمانا چاہیئے

فیصلہ انصار مجھ پر چھوڑ دو
سر جھکانا یا کٹانا چاہیئے

روشن لال روشن

چاند سورج نہیں گلاب نہیں
آپ کے حسن کا جواب نہیں

یہ سراپا تو اور ہی کچھ ہے
یہ جوانی نہیں شباب نہیں

آپ کی نیم باز آنکھوں میں
اور کچھ ہے مگر شراب نہیں

آپ کا حسن اس مقام پہ ہے
جس جگہ کوئی باریاب نہیں

آپ کا عکس کھینچ کر رکھ دے
وہ مصور بھی کامیاب نہیں

یہ غزل ہے حقیر روشن کی
آپ کے حسن کا جواب نہیں

سب سے بڑی جمہوری طاقت

عظیم الرحمٰن عظیم

میں وہ کتابِ دل ہوں کہ جس کو
ورق ورق پڑھتی ہے دنیا
طرزِ جہاں بانی جمہوری
میری نظر میں سارے انساں بھائی بھائی، شیر و شکر
مکتب، دفتر کا کام گھروں اور کھیتوں میں
زینہ زینہ، قدم قدم خوشحالی
جنگل، صحرا، باغ بغیچے
روشن روشن جیسے ہوں دریچے
علم کی دیوی مندر، مسجد جوت جگائے
دین دھرم پھیلائے
گیانی اپنے دھیان گیان سے بھارت کو اونچا
لے جائے
دھرتی سے آکاش پہ پہنچے اور اپنا پرچم لہرا دے
یہ سب کیا ہیں؟ میری کتابِ دل کے ورق ہیں
جن کے پیچھے گوتم، گاندھی، نہرو اور آزاد چھپے ہیں
گنگا، جمنا، تاج، ایلورا، چار مینارا
مسجد، مندر اور کلیسا سب کی دعا ہے
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب میرے ہیں
میں سب کا ہوں
میں وہ کتابِ دل ہوں جس کو ورق ورق دنیا
پڑھتی ہے
میں ہندی ہوں، ہندوستانی: بھارت نام
ہے میرا
دنیا کے پھیلے نقشے میں اک شاداب جزیرہ ہوں
سب سے بڑی جمہوری طاقت اور انمول سا
ہیرا ہوں

خورجہ پوٹری کے مسائل

آخر ایسا کیوں ہے جبکہ حکومت نے چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی امداد کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے؟ خورجہ کی پوٹری صنعت کو "چھوٹی صنعت" کے زمرے میں لایا گیا ہے۔ دراصل یہ گھریلو صنعت ہے کیونکہ کسی بھی یونٹ میں سات لاکھ روپے سے زیادہ سرمایہ نہیں لگا ہوا ہے۔ جبکہ چھوٹی صنعت ۲۵ لاکھ روپے کے سرمایہ کے دائرہ میں آتی ہے۔ خورجہ میں اس صنعت سے وابستہ افراد کو کوئلہ کی کمی کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اکثر کوٹہ ناکافی رہتا ہے۔ موسم گرما میں یہ صنعت اپنی بنائی ہوئی اشیا سکھانے کے لیے دھوپ کا زیادہ سے زیادہ استعمال کر سکتی ہے۔ اتفاق سے انھیں دنوں کوئلہ بھی کافی مل جاتا ہے مگر اکثر ایسے موقعوں پر کوئلہ کی کمی ہو جاتی ہے جب کہ اس کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ اس صنعت والوں کے لیے ایک اور دشواری یہ ہے کہ انھیں یہ کوئلہ بلند شہر میں ملتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں بلند شہر سے خورجہ تک کوئلہ لانے کے لیے فاضل خرچ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس صنعت کے ذمہ داروں کو بکری ٹیکس اور دیگر ترقیاتی محکموں سے بھی بہت سی شکایتیں ہیں۔

اس خوابیدہ قصبہ پر حسرت برستی نظر آتی ہے۔ اس کے پاس باہر والوں کو دکھانے کے لیے اپنی صنعت کے سوائے کچھ نہیں اور اس کے بھی ہر جگہ انبار لگے ہیں۔ قصبہ میں جن کے ایمپوریم ہیں انھیں کچھ خوردہ بکری کی امید ہو جاتی ہے لیکن وہ مایوسی کا شکار ہیں کیوں کہ اُن کی اپنی مصنوعات دلی میں ارزاں تر فروخت ہوتی ہیں۔ خورجہ میں بکری ٹیکس ساڑھے ۱۳ فیصد ہے جو دلی کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ جس یونٹ نے محض چند لاکھ روپے کی سرمایہ کاری کی ہے اُس کا بکری ٹیکس سال میں ۱۰ ہزار روپے کے لگ بھگ ہو سکتا ہے۔ اس سے مالک بمشکل ہی کچھ بچا پاتا ہے۔

خورجہ میں کوئی ۵۰۰ یونٹ ہیں۔ ان میں سے ۲۰۰ درمیانہ درجے کے ہیں۔ ۱۵۰ چھوٹے اور ۱۵۰ دوسروں پر انحصار رکھنے والے یونٹ ہیں۔ یہ کوئی بہت اچھی حالت نہیں ہے۔ دست کار اور فن کار یہاں رہنے پر اس لیے مجبور ہیں کیونکہ کسی دوسری جگہ انھیں ایسا کام نہیں مل سکتا۔ اُن کے آبا و اجداد تیمور کے ہمراہ بھارت آئے تھے وہ خورجہ میں بس گئے جہاں وہ بادشاہوں اور شاہی خاندانوں کے لیے برتن وغیرہ بناتے تھے۔ وہ آج بھی یہی کام کر رہے ہیں اور امیروں اور عام لوگوں کے لیے برتن وغیرہ تیار کر رہے ہیں۔ اس قصبہ کو اپنی صنعت کے لیے پدم شری اور ماسٹر کرافٹس مین کا اعزاز پانے کا شرف حاصل ہے۔ یہاں یہ صنعت زائد المیعاد ہو چکی ہے اور اُس کی طرف سے پرانی قسم کی بھٹیاں استعمال کی جا رہی ہیں جن سے یہ مصنوعات میں یکسانیت نہیں رہتی اور وہ حرارت کو بمشکل قابو کر پاتی ہیں۔ نئی اور جدید بھٹیاں وقت کی ضرورت ہیں۔ لیکن چھوٹے یونٹ ان کی استطاعت نہیں رکھتے۔ درحقیقت زیادہ موزوں اقدام یہ ہوگا کہ قصبے کو متھرا ریفائنری سے پائپ کے ذریعے گیس سپلائی کی جائے حکومت پرانی وضع کی بھٹیوں کو گیس سے چلنے والی بھٹیوں میں بدلنے میں مدد کر سکتی ہے۔

اس صنعت کا ایک اور مسئلہ ہے مارکیٹنگ، یونٹوں کے پاس نہ تو وقت ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں جانکاری ہے۔

حکومت یا جہاں تک اس معاملے کا تعلق ہے اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن کسی طرح اُن کی مدد کرنے کے لیے تیار نہیں۔ قرضے کے بارے میں بھی ایسی ہی بات ہے صنعت کو اونچی شرح سود پر پرائیویٹ حلقوں سے قرض لینا ہوتا ہے تو میاں ہوئے بینک یا ریاست کے دیگر مالی ادارے بھی خورجہ کی اس صنعت کو خاطر خواہ قرض نہیں دے پائے ہیں۔

خورجہ کی نیلی پوٹری ملک کی کسی بھی دوسری نیلی پوٹری کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ خورجہ کو ایک صنعتی مرکز بنانے میں اس قصبہ کے عوام کی پُرمشقت مساعی کو بڑا دخل حاصل ہے۔ یہاں مزدور سب کے سب مقامی ہیں۔ یہاں خام مال کی فراہمی میں دشواری سے بہت سے مسائل کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہ فرقہ وارانہ آلائش سے پاک ہے۔ لوگ اپنے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ لوگ کام سے محبت کرتے ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے۔ اس صنعت کو جدید ترین لائنوں پر لانے سے خورجہ کو ظروف سازی میں دنیا میں پہلا مقام مل سکتا ہے۔ یہ پہلے اپنی امکانی قوت کا مظاہرہ کر چکا ہے۔ یہاں مٹی کے برتنوں سے کام شروع ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے چینی مٹی کو استعمال کیا اور نیلی پوٹری بنانا شروع کر دی۔ ممکن ہے کہ یہ کسی اور فنی جدت کا مظاہرہ کرے۔ اس کی حوصلہ افزائی اور اس کی صلاحیتوں اور مساعی کو آگے بڑھانے سے یہ چھوٹا سا قصبہ پوری دنیا میں ہندوستان کا نام روشن کر سکتا ہے۔

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U 'DN) 65 to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi.

Vol. 6 No. 11 YOJANA (URDU) 1-15th September 1986

ڈاکٹر غلام شرف الحق

بچّوں کی صحت کا خیال رکھیے

بچّوں کی قوتِ مدافعت جوانوں کے مقابلے میں ایسے ہی کم ہوتی ہے اور خصوصی طور پر وہ بچّے جو جسمانی طور پر کمزور ہوتے ہیں ان کی طاقتِ مدافعت اور بھی کم ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اِنسے بچّوں کو اگر موسم سرما میں فضا کی جان لیوا ٹھنڈک سے محفوظ نہیں رکھا جاتا تو یہ مجبور اور نادار بچّے خطرناک بیماریوں کے آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ملک میں موسم سرما میں بچّوں کی بیماریاں سے جان جانیوالوں کی اچھی خاصی تعداد ہے جن کو ہم موثر اور کار آمد طریقوں پر عمل کرکے بچانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ موسم سرما میں بچّوں میں خصوصی طور پر ہونیوالی بیماریوں میں سردی، بخار، کھانسی اور نمونیا کا اہم مقام ہے۔ یہ بیماریاں عام طور پر کئی قسم کے virus اور Bacteria سے ہوا کرتی ہیں۔

Virus سے ہونیوالی بیماریوں میں سردی یا انفلیوئنزا یا Flu اور نمونیا وغیرہ اہم ہیں۔

اسی طرح Bacteria سے ہونے والی بیماریوں کی ایک لمبی فہرست ہے جن میں کھانسی یا Bronchitis گلے کی مختلف بیماریاں یعنی ٹانسلس Pharyngitis اور نمونیا وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے علاوہ اس موسم میں بہت سے بچّے ٹھنڈک سے الرجی کے شکار بھی ہوا کرتے ہیں جن کو ہم Cold Allergy کہتے ہیں۔ ایسے بچوں کے جسمانی عضو ٹھنڈک کو برداشت کرنے میں معذور ہوتے ہیں جیسے ہی ان بچّوں کو ٹھنڈک لگی ویسے ہی یہ بچّے شدید طور پر سردی، کھانسی اور نمونیا جیسے خطرناک امراض کے فوراً شکار ہو جاتے ہیں۔ سردی، کھانسی، بخار اور نمونیا خصوصی طور پر کم عمر کے بچّے کے لیے زیادہ مہلک ثابت ہوتے ہیں۔

ان بیماریوں کے اوائل میں ان کے اثرات کم ہوتے ہیں جیسے ناک سے پانی چلنا، ہلکی سردی اور کھانسی ہوتی ہے جیسے جیسے مرض کا حملہ شدید ہوتا ہے۔ بچّے تیز بخار، شدید کھانسی اور سانس کی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے سانس کی رفتار کافی تیز ہو جاتی ہے اور تکلیف بڑھنے لگتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر وقت پر صحیح علاج نہ کیا گیا تو ان بچّوں کی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

صحت کی عالمی تنظیم کے مطابق بچّوں کے چھ دشمن مہلک امراض خسرہ، پولیو، تپ دق، کُکر کھانسی اور ٹیٹنس کا حملہ بھی اس موسم میں شدید ہو جاتا ہے۔

ان امراض سے دنیا میں ہر سال مرنے والے بچّوں کی تعداد قریب ۵۰ لاکھ ہے۔ موسم سرما میں اگر بچّوں کو کُکر کھانسی، خسرہ یا ڈپتھیریا ہو جاتا ہے تو ان امراض کے اثرات نہایت ہی خطرناک ہوتے ہیں۔ اگر بچّہ کسی طرح ان امراض سے بچ بھی گیا تو آئندہ دوسری خطرناک بیماریوں کے ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

موسم سرما میں جلدی بیماریوں کے ہونے کے بھی اچھے خاصے امکانات رہتے ہیں۔ اس موسم میں عمومی طور پر لوگ ٹھنڈک کی وجہ سے جسمانی صفائی پر دھیان کم کر دیتے ہیں اس لیے بچّے جلدی بیماریاں جیسے کھجلی وغیرہ کے آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔ موسم سرما میں تمام بیماریوں پر قابو پانے اور ان سے حتی الامکان بچنے کیلئے ہمیں ان طریقوں پر عمل کرنا ہوگا۔

ہم لوگ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مرض کا انسداد مرض کے علاج سے بہتر ہے۔

سب سے پہلے ہمیں اس بات پر پابندی سے دھیان دینا ہوگا کہ جن بیماریوں کے خلاف ٹیکے موجود ہیں اُن کو ہم وقت سے بچّوں کو دلوادیں۔ بچّوں کی مذکورہ بالا چھ بیماریوں کے خلاف موثر ٹیکے موجود ہیں۔

تپ دق کے خلاف B.C.G کا ٹیکہ بچّہ کو پیدا ہوتے ہی دلوا دینا چاہیئے اس ٹیکے کی دوسری ڈوز پانچ سال کی عمر میں دلوا دینا ضروری ہے۔

دو ماہ کے عمر کے بعد بچّوں کو Triple Antigen اور Poliomyelitis کا ٹیکہ دلوانا شروع کر دینا چاہیئے Triple Antigen میں تین بیماریوں کے خلاف ٹیکے موجود رہتے ہیں یہ بیماریاں ہیں ڈپتھیریا، کُکر کھانسی اور ٹیٹنس Triple Antingen کا ٹیکہ انجکشن کی شکل میں ایک ایک ماہ کے وقفہ پر تین بار دئے جاتے ہیں۔ پولیو کا ٹیکہ کھانیوالے قطرہ کے شکل میں کھلایا جاتا ہے اس ٹیکے کے موثر ہونے کے لیے ایک ایک ماہ کے وقفہ پر پانچ خوراک کھلانی چاہیئے۔ Triple Antigen اور پولیو کے ٹیکے کی آخری خوراک کے ایک سال بعد اور پھر اسکے تین سال بعد Booster dose دینا ضروری ہے۔

ہمیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ہمارے ملک میں خسرہ کے خلاف بھی اب ٹیکہ دستیاب ہونے لگا ہے۔ اس ٹیکہ کا صرف ایک انجکشن بچّے کو ۱۵ ماہ کی عمر میں دلوانے سے اس مرض سے مدافعت حاصل کی جا سکتی ہے۔

عمومی طور پر ان ٹیکوں کے دلوا دینے سے یہ امراض نہیں ہوتے ہیں اگر خدانخواستہ یہ مرض اس کے بعد بھی ہوتا ہے تو ان کے اثرات بہت معمولی ہوتے ہیں۔

Cold Allergy سے محفوظ رکھنے کیلئے بچّوں کو ٹھنڈک سے محفوظ رکھنا ہوگا۔ جو کپڑے بھی میسر ہوں ان کو ڈھک کر رکھنا ہوگا۔ ان کو بار بار پانی کے استعمال سے الگ رکھنا ہوگا۔ جہاں یہ رہتے ہیں ان کے کمروں کو گرم رکھنا ہوگا۔ ان کو کھانے کی ٹھنڈی چیزوں سے محفوظ رکھنا ہوگا۔

جلدی بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ان بچّوں کی جسمانی صفائی پر دھیان دینا ضروری ہے۔ ان بچّوں کے ناخن اور بال اور کپڑوں کی صفائی ضروری ہے۔ جب یہ بچّے شدید طور پر علیل ہوں اور بخار بہت تیز ہو تو انجکشن دلوانے سے پرہیز کرنا چاہیئے اس لیے کہ بچہ اگر خدانخواستہ پولیو جیسی مہلک مرض میں مبتلا ہے تو یہ انجکشن اس بچّے کو مفلوج کر سکتا ہے۔ یہ انجکشن اس بچّہ کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

اس طرح ہم بچّوں کو ٹیکے دلوا کر ان کی صفائی پر دھیان دیکر ان کے کپڑوں پر خیال کرکے کافی بیماریوں سے ان کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ ●

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.
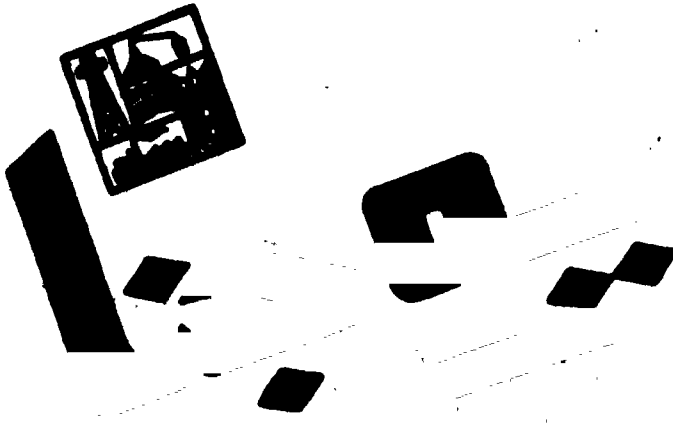
۱۶ تا ۳۰ ستمبر ۱۹۸۶

آبی نظام سے متعلق قومی پالیسی

(گوپال اروڑہ)

ایک روپیہ ۵۰ پیسے

رام پرساد بسمل

(رفعت سروش)

پروگراموں پر عمل درآمد کے وزیر شری اے۔ بی غنی خان چودھری نے پارلیمنٹ میں نیا بیس نکاتی پروگرام پیش کیا۔ اس پروگرام کی آئٹم وار وضاحت اس طرح سے ہے:-

۱۔ دیہی غریبی کے خلاف جنگ :- اس سلسلے کے پروگراموں کے ذریعے ہر گاؤں میں غریبی دور کرنے کے اقدامات کئے جائیں گے۔ با اُجرت روزگار کے پروگراموں کو علاقے کی ترقی کے پروگراموں کے ساتھ جوڑا جائے گا انسانی وسائل کے بھرپور استفادے کے پروگراموں کے ذریعے قومی اور اجتماعی نوعیت کے اثاثہ جات تیار کئے جائیں گے۔ اس طرح کے پروگراموں میں اسکولی عمارتوں کی تعمیر، سڑکوں کی تعمیر، تالابوں کی مرمت اور چارے اور ایندھن کی فراہمی کو اولیت دی جائے گی۔ دیہی ترقی کے مختلف پروگراموں کو آپس میں جوڑا جائے گا جس سے پیداواری صلاحیت بڑھے اور دیہات میں روزگار کے مواقع کی توسیع ہو سکے۔ ہینڈلوم کی ترقی و توسیع، دیہی دستکاریوں، دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے فروغ پر زور دیا جائے گا۔ ان کے ذریعے خود روزگار کے پروگراموں کو موثر بنایا جائے گا۔ پنچایتی اور کوآپریٹو نظاموں نیز لوکل باڈیز کے استحکام پر زور رہے گا۔

۲۔ بارشوں پر انحصار رکھنے والے علاقوں میں زراعت کی ترقی :- نمی کو محفوظ کرنے کے اقدامات، اراضی اور آبی وسائل سے بہتر استفادہ، بہتر قسم کے بیجوں کی فراہمی، خشک سالی کی زد میں آنے والے علاقوں کے تحفظ کی حکمت عملی، اس پروگرام کے اہم جزو ہیں۔

۳۔ آبرسانی کے وسائل کا بہتر استعمال :- دریائی طاس کے علاقوں کا فروغ، پانی کے نکاس کا بہتر انتظام خاص کر ڈیلٹا وغیرہ کے علاقوں میں، کمانڈ ایریا (بھرپور کاشت کے لیے منتخبہ علاقوں) میں آبرسانی کے نظم و نسق میں بہتری، پانی کے بہاؤ کو ٹھیک کرنا، زمین کو شور (نمکین) ہونے سے بچانا، پانی کو ضائع ہونے سے روکنا، سطح زمین اور زیر زمین پانی سے استفادہ کرنے میں تال میل قائم کرنا، اس پروگرام میں شامل ہیں۔

۴۔ مقابلتاً بڑی فصل :- مشرقی خطے میں چاول کی پیداوار بڑھانے پر زور، کم صلاحیت والے دیگر علاقوں میں چاول کی فصل بہتر بنانے کی کوشش، خوردنی تیلوں کی افزائش، دالوں کی فصلوں کی بہتری، پھلوں اور سبزیوں کی کاشت میں اضافہ، اشیا کی ذخیرہ بندی کے نظام کو بہتر بنانے کی کوشش، زرعی اشیا کی فروخت کے نظام کا استحکام، مویشیوں کی نسل سدھارنے کے پروگرام، ماہی گیری کا فروغ وغیرہ اس سلسلے کی اہم کڑی ہیں۔

۵۔ اصلاحات اراضی کا نفاذ :- اراضی کے ریکارڈ کی مکمل ترتیب، زرعی اراضی کی بالائی حد کے قانون پر عمل درآمد، فاضل اراضی کی بے زمین کسانوں میں تقسیم کے پروگرام اس سلسلے کے تحت آئیں گے۔

۶۔ دیہی مزدوروں کے لیے خصوصی پروگرام :- زراعت اور صنعت میں غیر منظم محنت کش طبقے کے لیے کم سے کم اُجرتوں کی ادائیگی کو یقینی بنانے، بندھوا مزدوروں کے خاتمے پر موثر عمل درآمد اور ان مزدوروں کی بحالی میں رضاکار اداروں کے تعاون کے پروگرام اس مد میں شامل کئے گئے ہیں۔

۷۔ پینے کا صاف پانی :- اس پروگرام کے تحت شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کے لیے پینے کے صاف پانی کی فراہمی پر خصوصی توجہ کی جائے گی۔ تمام دیہات میں پینے کا صاف پانی مہیا کرانے کی کوشش ہوگی۔ پانی کے وسائل کو ٹھیک ڈھنگ سے برقرار رکھنے میں مقامی برادریوں کو مدد دی جائے گی۔

(باقی کور صفحہ ۳ پر)

• منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر: سید ظفیر الحسن

ایڈیٹر: جگندر سنگھ

اسسٹنٹ ایڈیٹر: محمد عادل صدیقی

جلد ۶، ۱۶ تا ۳۰ ستمبر ۱۹۸۶ شمارہ ۱۲

۲۵ بھادر تا ۸ آشون، شک ۱۹۰۸ ۔ فون ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۳۰ روپے۔ ۲ سالہ ۵۴ روپے۔ سہ سالہ ۷۲ روپے

• فی کاپی: ایک روپیہ پچاس پیسے

طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۲۵ فیصد کی رعایت

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین)
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

اسسٹنٹ ڈائرکٹر پروڈکشن: آر۔ ایس۔ منچال

ترسیل زر کا پتہ: بزنس مینیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

غریبی کے خلاف جنگ کا اعلان

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے چالیسویں یوم آزادی پر لال قلعے کی فصیل سے قوم کے نام خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بیس نکاتی پروگرام اور زرعی پروگرام کے ذریعے غریبی دور کرنے پر پوری طاقت لگائی گئی ہے چنانچہ اس قول کی تکمیل کے لیے حال ہی میں پارلی منٹ میں نظر ثانی شدہ بیس[۲۰] نکاتی پروگرام پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک طرح سے غریبی ہٹانے کے پروگراموں کو موثر ڈھنگ سے آگے بڑھانے کے لیے سرکار کی طرف سے کئے گئے وعدے کی تکمیل ہے۔ اس کا مقصد غریبی کے خلاف بڑے پیمانے پر جنگ کرنا اور سرزمین بھارت پر بسنے والے عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنا ہے۔ اس میں شامل بہت سے پروگراموں کے ذریعے خطِ افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والے اوپر اٹھ سکیں گے۔ یہ سبھی نکات ساتویں منصوبے کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ یہ کام ساتویں منصوبے میں پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے، پسماندگی اور غریبی کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ انھیں اکھاڑنے کے لیے مسلسل کام کرنا ہوگا۔ بقول شاعر ؎ اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق۔

البتہ یہ نیا بیس[۲۰] نکاتی پروگرام ایک ایسی ٹھوس بنیاد فراہم کرتا ہے جس پر چل کر یقیناً ملک کے غریب عوام بہت جلد راحت محسوس کریں گے۔ اس کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں شہری اور دیہی مسائل کو حل کرنے کی یکساں طور پر ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ دیہات سے غریبی دور کرنے کے پروگراموں کے ساتھ ساتھ شہر کی گندی بستیوں کی صفائی کی ضرورت بھی پوری طرح محسوس کی گئی ہے، صارفین کے مفادات، ماحول کا تحفظ اور شجر کاری وغیرہ کے پروگراموں کے ذریعے دیہی اور شہری علاقے یکساں طور پر فائدہ اٹھائیں گے۔ اس نئے منشور کی رو سے دیہی علاقوں میں غریبی دور کرنے کے پروگراموں کو بھرپور قوت سے چلایا جائے گا اور اس کے ساتھ ہی عورتوں کے لیے مساوی مواقع نکالنے پر زور رہے گا۔ نوجوانوں کی بہبود اور ان کی بھلائی کے لیے چند نئے پروگرام شروع کئے جائیں گے۔ اس نئے بیس نکاتی پروگرام میں ان کوششوں پر زیادہ زور دیا گیا جو آج کے دور میں توجہ کے مستحق ہیں۔ اس طرح سے صنعت کاری کے ساتھ ساتھ زراعت پر زور رہے گا۔ نیا بیس نکاتی پروگرام پرانے پروگرام کو اکھاڑنے یا ختم کرنے کے لیے نہیں بلکہ اسے زیادہ موثر بنانے کے لیے لاگو کیا جا رہا ہے۔ اس پر نظر ثانی کا مطلب یہی ہے کہ اسے زیادہ عملی اور مؤثر بنایا جائے۔ یہ پروگرام مختلف وزارتوں کے ساتھ تبادلۂ خیال کر کے مرتب کیا گیا ہے، اسے مرکزی کابینہ کی منظوری حاصل ہے۔ اسے پروگراموں پر عمل درآمد کے محکمہ کے وزیر شری اے بی غنی خاں چودھری نے پارلی منٹ میں پیش کیا۔ یہ پروگرام ابھی محض خاکہ کی صورت میں ہے۔ ریاستی حکومتیں اس کی تفاصیل مرتب کرنے میں مصروف ہیں، البتہ اس کے خاکے میں جن موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے، ان میں درج ذیل باتیں شامل ہیں :۔

نئے بیس[۲۰] نکاتی پروگرام کے تحت دیہات سے غریبی دور کرنے پر خاص زور دیا جائے گا۔ بارش پر انحصار رکھنے والے علاقوں میں زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے خصوصی حکمتِ عملی بروئے کار لائی جائیگی۔ آبرسانی کے پانی سے بہتر طریقے پر کام لینے کی کوشش کی جائے گی فصلوں کو توسیع دے کر ان سے بڑے پیمانے پر پیداوار حاصل کی جائے گی۔ اصلاحات اراضی کے قوانین کو موثر ڈھنگ سے نافذ کیا جائے گا۔ دیہی مزدوروں کو روزگار دلانے کے لیے خصوصی پروگرام شروع کئے جائیں گے۔ پینے کا صاف پانی سب کے لیے مہیا کیا جائے گا اور چونکہ یہ پروگرام صحت بنانے میں معاون ہے اس لیے سب کے لیے صحت کے پروگرام کو بحیثیت مجموعی مؤثر بنایا جائے گا۔ ہر کنبے میں دو[۲] بچوں کے تصور کو عام کیا جائے گا۔ تعلیم کے مواقع میں توسیع لائی جائیگی۔ شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کو انصاف دلایا جائے گا۔ عورتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک پر زور دیا جائے گا اور ان کو مردوں کے مساوی مواقع دئے جائیں گے۔ نوجوانوں کے لیے مواقع کھوجنے پر زور دیا جائے گا۔ عوام کے لیے مکانات کی فراہمی کی کوشش کی جائے گی۔ گندی بستیوں کی اصلاح و صفائی کی جائے گی۔ جنگل بانی اور شجر کاری کے لیے نئی حکمتِ عملی بنائی جائے گی۔ ماحول کے تحفظ کے لیے اقدامات کئے جائیں گے۔ صارفین کے مفادات کا تحفظ کیا جائے گا۔ دیہات میں بجلی پہونچائی جائے گی اور انتظامیہ میں ایسی اصلاحات کی جائیں گی جن سے وہ عوامی شکایات کو دور کرنے کا اہل بن سکے۔

مختصر یہ کہ یہ ایک ایسا منشور ہے جس سے ملک کے غریب عوام کو راحت مل سکے گی۔

(ایڈیٹر)

گوپال اروڑہ

آبی نظام سے متعلق قومی پالیسی کی ضرورت

بھارتی زراعت کو متعدد پیچیدہ مسائل کا سلسلہ درپیش ہے۔ ملک میں کہیں سیلاب آتے ہیں۔ کہیں خشک سالی تباہی لاتی ہے۔ کہیں زمینوں پر پانی جمع ہو جاتا ہے اور کہیں کھاری زمینی پانی فصلوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ غیر بارانی زمینوں کا بھی مسئلہ ہے جہاں آبپاشی کے پراجیکٹوں کی اشد ضرورت ہے۔ ان کے علاوہ پانی سے کٹاؤ کا بھی مسئلہ ہے جس سے زیر کاشت رقبے میں کمی ہو رہی ہے۔

ان تمام مسائل کا حل پانی کے عمل پر قابو پانے میں ہے جس کے فقدان سے ملک کو بھاری نقصان پہنچ رہا ہے۔ سیلاب سے متعلق قومی کمیشن کی رپورٹ ۱۹۸۰ء کے مطابق تقریباً ۴ کروڑ ہیکٹیر زمین وقتاً فوقتاً سیلابوں کی زد میں آ جاتی ہے۔ ۱۹۸۳ء کے دوران ملک میں زبردست بارشوں، سیلابوں اور طوفانوں سے مجموعی طور پر جو نقصان ہوا ریاستی حکومتوں کی رپورٹ اور تخمینے کے مطابق وہ ۲۵ ارب ۸ کروڑ ۱۰ لاکھ ۸ ہزار روپے کا تھا۔ سیلابوں سے زمینوں پر پانی جمع ہو جاتا ہے۔ زمین میں نمکینیت کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ تالابوں اور پانی کے ذخائر کی تہہ پر مٹی جمع ہو جاتی ہے۔ جنگلوں کو نقصان پہنچتا ہے، مچھروں کی افزائش ہوتی ہے، مچھلیاں مرنے لگتی ہیں اور جنگل زندگی کو بھاری نقصان پہنچتا ہے۔

سیم کا مسئلہ

جب زمین پانی سے پورے طور پر بھر جاتی ہے تو زائد پانی سطح کے اوپر سے بہنے لگتا ہے اور وہ اپنے ساتھ زمینی ذرات اور عناصر بھی بہا لے جاتا ہے۔ اندازہ ہے کہ ہر ملی میٹر کاشت شدہ زمین کی مٹی بہہ جانے سے فی ہیکٹیر کل ۱۰ کلوگرام نائٹروجن اور ۲ کلوگرام فاسفورس کا نقصان ہوتا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں کئے گئے ایک مطالعہ کے مطابق بھارت، پانی سے ہونے والے کٹاؤ کے باعث ہر سال تقریباً ۶ ارب ٹن بالائی مٹی سے محروم ہو رہا ہے۔

زمینی سطح پر محدود وقت سے زیادہ عرصے تک پانی رہنے سے بیشتر فصلوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھا گیا ہے ایک دن سے زیادہ وقت تک زیر آب رہنے سے ارہر کی فصل ۳۰ فیصد تک کم ہو گئی جب ۵ روز تک زیر آب رہنے سے اس کی پیداوار میں ۶۰ فیصد تک کمی ہو گئی۔ بیشتر نشیبی یا ہموار سطح والے زیر آب علاقوں میں دسمبر تک پانی رہتا ہے جس کے نتیجے میں فصلیں تاخیر سے بوئی جاتی ہیں یا بالکل نہیں بوئی جاتیں۔ پانی جمع ہونے سے ایک اور نقصان یہ ہوتا ہے کہ جب کہ پانی سوکھ جاتا ہے تو کافی مقدار میں نمکیات زمین کی سطح پر آ کر جمع ہو جاتے ہیں۔ جس سے زمین میں شوریت بڑھ جاتی ہے۔

بنجر زمین

پنجاب، ہریانہ، اتر پردیش، راجستھان اور گجرات کے بنجر اور نیم بنجر علاقوں کے زیادہ تر زمینی پانی میں سوڈیم اور بائی کاربونیٹ کا تناسب بہت زیادہ ہے اور اس لیے یہ کھارا زمینی پانی کہلاتا ہے۔ یہ پانی قریب قریب طور پر ذائقے میں شیریں مگر آبپاشی کے مقاصد کے لیے خطرناک

ہوتا ہے۔ ایسے پانی کے مسلسل استعمال سے زمین میں شوریت بڑھ جاتی ہے۔ یہ زمین سوکھنے پر بہت سخت ہو جاتی ہے اور جب اُسے سیراب کیا جاتا ہے تو اس کے اندر بہت کم پانی داخل ہوتا ہے۔

جن علاقوں میں پانی کا قدرتی نکاس نہ ہو، وہاں نہری اور زمینی پانی کی ملی جلی آبپاشی، شگاف جراحت کا کما حقہ استعمال، نمک کی مزاحم فصلوں کی بوائی اور جڑوں کے خطے کے نزدیک جمع نمک کو کم مقدار تک رکھنے کے لیے فصلیں اُگانے کا خصوصی طریقہ ان مسائل کے ممکن حل ہیں۔

ایسے ہی علاقوں میں کھاری پانی کی جھیلوں کو پاٹنا زمینی کھاری پانی کے استعمال کا ایک اور متبادل ہو سکتا ہے۔ بنجر زمینوں میں مون سون کی بارش پر قابو پانا بھی ایک مسئلہ ہے۔ چونکہ بارش کا پانی زمین کی گہرائی میں نہیں جاتا اس لیے بارش ہونے کے تھوڑے عرصے بعد ہی سیم کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جس کے بعد بارشوں میں طویل وقفہ ہونے کی صورت میں سوکھا پڑنے لگتا ہے۔ اس مسئلہ پر قابو پانے اور بارش کے پانی کو محفوظ رکھنے کے لیے پانی کے بندوبست کے لیے فصلوں کی زمین میں برساتی پانی کو جمع کیا جانا چاہیے۔ کم گہرے تالاب کھودے جانے چاہئیں۔ اور سطحی نالیوں کا اہتمام کیا جانا چاہیے۔

بارش کی کمی

بنجر زمین جو بارش پر انحصار رکھتی ہے یا جہاں آبپاشی نہیں ہوتی۔ ۴ کروڑ ہیکٹیئر ہے۔ وہاں سال میں ۵۰۰ ملی میٹر سے کم بارش ہوتی ہے اور آبپاشی کی مروجہ فصلیں نادارد ہیں۔ ان علاقوں میں فصلوں کے موسم کے دوران پانی محدود ہوتا ہے جس سے سوکھے کے برسوں میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

علاوہ ازیں ایسے بھی بڑے بڑے علاقے ہیں جہاں ۷۵۰ ملی میٹر سے زیادہ بارش ہونے کے باوجود فصلوں کی پیداوار کے لیے پانی کم دستیاب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بارشوں میں یکسانیت نہیں ہوتی، پانی بخارات بن کر اُڑ جاتا ہے اور فصلوں سے بھی نمی کی صورت میں اُڑ جاتا ہے۔ پانی کو محفوظ رکھنے کے اقدامات نہیں کئے جاتے۔ ۷۳-۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۴ء میں زبردست سوکھا پڑا۔ ازاں بعد ۱۹۷۹-۸۰ء میں جو سوکھا پڑا اُس نے تو بڑی تباہی مچا دی۔ اُس کا اثر ۱۱ ریاستوں کے ۱۹۷ اضلاع میں ۳ کروڑ ۸۰ لاکھ ہیکٹیئر فصلوں ۲۲ کروڑ افراد اور ۱۳ کروڑ ۳۰ لاکھ مویشیوں پر پڑا۔ ایسے حالات پر قابو پانے کے لیے متعدد اقدامات کئے جا سکتے ہیں:-

۱۔ سطحی پانی کے مزید وسائل کو فروغ دیا جائے۔ اس میں آبپاشی کی چھوٹی چھوٹی اسکیمیں شامل ہو سکتی ہیں۔ ان کے سلسلے میں ندی نالوں کا رُخ بدلا جا سکتا ہے۔ ندیوں، نالوں، دریاؤں اور کھلے پانی کے ذخائر سے براہ راست پمپ سیٹوں کے ذریعہ پانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تالابوں اور جوہڑوں کی وقت پر مرمت کی جا سکتی ہے اور اُن میں دستیاب پانی کو منضبط کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ زمینی پانی کے وسائل کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔ اس کے لیے آبپاشی کے غیر استعمال شدہ کنوؤں کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جن کنوؤں کا زیادہ استعمال نہیں ہوتا اُن سے پمپوں کے ذریعے پانی حاصل کیا جائے اور زمینی پانی کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں نکالا جائے۔

۳۔ فارموں پر پانی کو محفوظ کیا جائے۔

۴۔ نہری پانی کی تقسیم موزوں طور پر ہونی چاہیے۔ نہری پانی کی تقسیم سے کبھی کبھی ایک بڑا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ آئندہ آبپاشی کے لیے نہری پانی کی غیر یقینی دستیابی کے باعث زیادہ آبپاشی کی جاتی ہے اور کسان جان بوجھ کر نہروں میں شگاف کر دیتے ہیں۔ دونوں باتوں سے پانی ضائع ہوتا ہے اور آخری سرے والوں کو پانی نہیں ملتا۔ اس معاملے کی طرف خاص توجہ دی جانی چاہیے۔

۵۔ فصلوں کی ضرورت کے مطابق آبپاشی کا پروگرام تیار کیا جائے۔

قومی پالیسی کی ضرورت

نیشنل واٹر ڈویلپمنٹ ایجنسی کی چوتھی سالانہ میٹنگ امسال کے ابتدائی دنوں میں نئی دلّی میں منعقد ہوئی تاکہ ساتویں پانچسالہ پلان کے دوران ایجنسی کی طرف سے کئے جانیوالے کام پر غور کیا جا سکے۔ نیشنل واٹر ڈویلپمنٹ ایجنسی آبی وسائل کے فروغ سے متعلق قومی تناظر کے خدوخال کو صورت دینے کے لیے ۱۹۸۲ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس کا مقصد آبی وسائل کے زیادہ سے زیادہ استعمال کے لیے کام کرنا ہے۔ مروجہ طور پر زمین اور پانی کے درمیان گہرا تعلق ہے۔ اگرچہ زمین سے متعلق پالیسی سال بہ سال بخوبی وضع اور منصوبہ بند کی گئی ہے تاہم پانی کے بارے میں ابھی تک ایسا نہیں کیا گیا۔ لیکن زمین کے برعکس پانی کی دستیابی مقرر نہیں ہے۔ یہ ایک مقام سے دوسرے مقام میں مختلف مقداروں میں ملتا ہے اور اس کا اظہار علاقے کے موسم اور زمینی حالات پر ہے چونکہ اس کی تقسیم ایک دُہرایا جانے والا عمل ہے اس لیے اس کی موزوں تقسیم کے لیے درست ترین پالیسیوں کی اشد ضرورت ہے۔

آبی وسائل :-

بھارت کو قدرت نے وافر آبی وسائل عطا

کئے ہیں جن کی قابلِ استعمال مقدار سطحی پانی کے لیے ۱۰ لاکھ ہیکٹیئر میٹر ہے اور زمینی پانی کے لیے ۴ کروڑ ۲۵ لاکھ ہیکٹیئر میٹر ہے۔

سردست ہمیں دونوں قسم کے آبی وسائل کا سامنا ہے، زمینی پانی جو دھرتی پر میٹھے پانی کا ۹۰ فیصد سے زائد ہے۔ جزوی طور پر آسام، بہار، مدھیہ پردیش، اڑیسہ اور مغربی بنگال میں موجود ہے جہاں زمینی پانی کے استعمال کی موجودہ سطح بہار میں ۳۵ فیصد اور آسام میں ۴٫۵ فیصد ہے۔ دریا جو سطحی پانی کا اہم ترین ذریعہ ہیں۔ ان کے پانی کی مقدار اور اس کے بہاؤ کا انحصار موسمیاتی و جغرافیائی حالات پر ہے۔ وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی نے گذشتہ برس اکتوبر میں آبی وسائل کی قومی کونسل کا افتتاح کرتے ہوئے بجا طور پر کہا تھا کہ "یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے کہ ایک طرف پانی ضائع ہو رہا ہے جبکہ دوسری ریاستوں میں اس کی سخت قلت ہے"۔ زمینی اور سطحی آبی وسائل میں یہ قدرتی اور انسان کے بنائے عدم توازن پانی کے استعمال سے متعلق ایک قومی پالیسی کا تقاضا کرتے ہیں۔ سطحی پانی کی مساوی تقسیم کے لیے ایک قومی واٹر گرڈ واحد حل معلوم ہوتا ہے تاکہ مختلف طاسوں کے پانی کو کمی والے علاقوں میں سپلائی بڑھانے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔

آبی وسائل سے فائدہ اٹھانے سے متعلق ایک قومی پالیسی کی تشکیل و تعمیل کرتے ہوئے حکومت کو ان وسائل کے بندوبست کی جانب بخوبی چوکس رہنا ہوگا جو فوری طور پر دستیاب ہیں۔ صنعتوں سے کہا جانا چاہیئے کہ وہ اپنے فاضلات کو دوبارہ قابلِ استعمال بنائے۔ اس سے نہ صرف آلودگی کم ہوگی بلکہ میٹھے پانی سے متعلق ان کی مانگ بھی کم ہوگی۔ اس کے علاوہ گھروں کو سپلائی کئے جانے والے پانی کے بندوبست میں بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ نیشنل اینوائرنمینٹل انجینئرنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سروے کے مطابق ملک کے مختلف شہروں میں فی کس پینے لائق پانی کا نقصان ۱۱ ہزار لیٹر سالانہ سے ۳۱ ہزار لیٹر سالانہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پائپوں اور نالیوں میں رساؤ ہونے کے باعث ۲۰ سے ۳۵ فیصد تک پانی ضائع ہو جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ جہاں واٹر ورکس محکمے اس سلسلے میں ضروری دیکھ بھال کریں وہاں لوگوں کو بھی سمجھایا جائے کہ وہ پانی کا کفایت سے استعمال کریں کیوں کہ گھروں کو سپلائی کئے جانے والا ۶۰ فیصد سے زیادہ پانی ضائع ہو کر سیوروں میں بہہ جاتا ہے۔ انجام کار سیور کے اس پانی کو بھی تب تک صاف کر کے قابلِ استعمال بناتے رہنا چاہیئے جب تک کہ وہ بہت زیادہ آلودہ نہ ہو جائے۔

نیا پراجیکٹ

آبپاشی کے پراجیکٹوں میں پانی بھاری مقدار میں ضائع ہو رہا ہے کیوں کہ آبی نظام میں کمانڈ ایریا ڈویلپمنٹ حکام کو زیادہ تر نالیوں میں بہنے والے پانی پر عمل دخل حاصل ہے اور نہروں اور نہروں کی شاخوں کے پانی کی تقسیم پر نہیں۔ اس صورتِ حال کا مداوا مربوط آبی نظام ہے۔ اس مربوط آبی نظام کے متعلق ایک نئی پیشروایانہ اسکیم ناگارجن ساگر پراجیکٹ (آندھرا پردیش) میں عالمی بنک کی امداد کے ساتھ ۸۵-۱۹۸۴ء میں شروع کی گئی ہے جو حسبِ ذیل امور انجام دیگی۔

نہری پانی کی باقاعدگی تقسیم۔ جس سے تمام زمینوں کو جن میں آخری سرے کے کھیت بھی ہیں پانی کی فراہمی ہو۔

پانی کی باری باری تقسیم تاکہ ہر کسان کو اس کی زمین پر پلان کے مطابق پیدا کی جانے والی فصلوں کے لیے وقت پر پانی ملے۔

آبپاشی کے نظام میں پانی کو جلد چھوڑا جائے۔ اس سے پیداوار میں اضافہ ہوگا کیوں کہ خریف میں پانی کو تاخیر سے چھوڑنے اور تاخیر سے بوائی کرنے سے پیداواری قوت کم ہو جاتی ہے جیسا کہ کھیتوں میں دیکھا گیا ہے۔

کم اور میانہ عرصوں میں اُگنے والے بیجوں کا چناؤ اور استعمال تاکہ فصلوں کی پیداوار اور پیداواری قوت میں اضافہ ہو۔

زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں فرٹیلائزر اور پودوں والے زرعی طریقوں کا استعمال جن سے پیداوار اور پیداواری قوت بڑھ جائے۔

اس سے دھان کی پیداوار میں فی ہیکٹیئر ۵۳۹ کلو کا اضافہ ہوا ہے۔

آندھرا پردیش میں عالمی بینک کی امداد کے ساتھ جو اسکیم زیرِ عمل ہے اس کا مربوط آبی نظام اور زیادہ پیداواری قوت میں مجموعی طور پر ملک کے لیے ایک نقیب بننے کا امکان ہے۔

●

قارئین سے گزارش

اس ماہ سے ہم نے "یوجنا" کے اندر چند تبدیلیاں لانے کی کوشش کی ہے تاکہ یہ زیادہ سے زیادہ قارئین کے لیے دلچسپی کا مواد فراہم کر سکے، اس خیال کے پیشِ نظر اس میں کہانی، غزلیں، تبصرہ وغیرہ کا اضافہ کیا گیا ہے ان تبدیلیوں کے بارے میں ہمیں آپ کے تاثرات جاننے کا اشتیاق رہے گا۔ آپ زحمت فرما کر اپنی رائے، گراں قدر مشوروں اور اسے مزید جلا دینے کے لیے ضروری باتوں سے مطلع فرمائیں اور ممنون کریں۔ (ایڈیٹر)

ایم. ایل. بجاج

بھارتی معاشیات میں اسٹاک ایکسچینج کا کردار

اسٹاک ایکسچینج بھارتی معاشیات میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں. جہاں وہ عوام کو ترغیب دے رہا ہے کہ وہ ملکی صنعتوں میں اپنی بچت کا روپیہ لگائیے وہاں وہ عوام کو ڈیویڈنڈوں اور سُود کی صورت میں ضمنی آمدنی کا ایک وسیلہ بھی فراہم کر رہا ہے تاکہ وہ اپنی اقتصادی حالت کو استوار کر سکیں بلکہ اب تو پبلک سیکٹر کے ادارے بھی اس کی خدمات سے استفادہ کرنے لگے ہیں۔ (ایڈیٹر)

اسٹاک ایکسچینج کے نام سے بدکنے کی ضرورت نہیں۔ اب اس کی ہیئت اور ماہیئت دونوں بدل گئی ہیں اور یہ وہ اسٹاک ایکسچینج نہیں رہا جو محض اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی اجارہ داری تھا۔ حصولِ آزادی کے بعد اور خصوصاً گذشتہ دو تین دہائیوں کے دوران اس کے ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ اب یہ "کاخِ امرا" سے اُتر کر جمہوری صورت اختیار کر کے عوامی سطح پر آگیا ہے اور تقریباً تمام طبقوں کے لوگ جن میں تاجر، افسر، کلرک، ٹیچر، انجینئر اور دیگر پیشہ ور لوگ اور چھوٹے چھوٹے دکاندار اور حتیٰ کہ چپراسی تک شامل ہیں اس کی خدمات سے استفادہ کر رہے ہیں۔ گو اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ بڑے بڑے سرمایہ دار اپنے وسیع تجربے اور بھاری سرمائے کی بدولت منافع کا بہت بڑا حصہ دبوچ لیتے ہیں جو پرائیویٹ سیکٹر میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اسٹاک ایکسچینج پرائیویٹ سیکٹر کا اہم جزو ہے۔ چونکہ ہمارے ملک نے مِلی جُلی معیشت کی راہ اختیار کی ہے اس لیے اسٹاک ایکسچینج بھی پرائیویٹ سیکٹر کا اہم ادارہ ہونے کے باعث ہماری معیشت میں تعمیری اور مفید رول ادا کر رہا ہے۔ یہ مُلکی معیشت کی ترقی نیز بڑے بڑے صنعتی اور تجارتی اداروں کے فروغ کا ایک بڑا وسیلہ ہے۔ اب تو پبلک سیکٹر کے ادارے بھی اس زُمرے میں آگئے ہیں۔ چنانچہ سرمایہ سے متعلق ضروریات پوری کرنے میں اسٹاک ایکسچینج اہم حصہ لے رہا ہے۔ یہ بڑے بڑے ادارے جہاں بینکوں اور دیگر مالی و ترقیاتی اداروں سے کاروبار چلانے کے لیے بڑے بڑے قرضے لیتے ہیں وہاں وہ شیئروں، ڈبینچروں اور بانڈوں کے ذریعے عوام سے بھی روپیہ فراہم کرتے ہیں جن پر وہ انھیں ڈیویڈنڈ (DIVI-DEND) یعنی منافع کا حصہ اور سُود وغیرہ دیتے ہیں۔ جہاں ۵۰ کی دہائی میں سرمایہ کی فراہمی کی سالانہ اوسط تقریباً ۴۰ کروڑ روپے تھی جو ۶۰ کی دہائی میں ۷۰ کروڑ روپے ہوگئی وہاں وہ ۷۰ کی دہائی میں بڑھ کر ۹۰ کروڑ روپے تک پہنچ گئی۔ لیکن سرمایہ کی فراہمی میں غیر معمولی تیزی ۸۰ کی دہائی میں آئی جب کہ ۱۹۸۵ء-۸۶ میں ۲۳ ارب روپے کا سرمایہ فراہم کیا گیا۔ اندازہ ہے کہ موجودہ رواں مالی سال میں فراہم کیا جانے والا سرمایہ ۳۰ ارب

روپے سے ۳۵، ارب روپے کے درمیان ہوسکتا ہے جس میں بہت زیادہ حصہ چھوٹے چھوٹے سرمایہ کاروں اور شیئر ہولڈروں کا ہوگا۔

پہلا اسٹاک ایکسچینج

پہلا اسٹاک ایکسچینج ۱۸۷۵ء میں بمبئی میں قائم کیا گیا تھا کیوں کہ یہ ملک کا سب سے بڑا تجارتی و صنعتی مرکز ہے۔ ازاں بعد برسوں تک چار اسٹاک ایکسچینج ملک کے چار تجارتی و صنعتی مرکزوں میں کام کرتے رہے جو بمبئی کے علاوہ کلکتہ، مدراس اور دلّی میں تھے۔ حصولِ آزادی کے بعد جوں جوں تجارتی و صنعتی سرگرمیوں کی توسیع ہوتی رہی، نئے نئے کارخانے اور پلانٹ قائم ہوتے گئے اور کاروبار کے حجم اور جسامت میں بھاری اضافہ ہوتا گیا اور اسٹاک ایکسچینجوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ اب ملک میں کوئی ۱۵ اسٹاک ایکسچینج ہیں جن میں اہم ایکسچینج بمبئی، کلکتہ، دلّی، مدراس، حیدرآباد، بنگلور، پونے، احمدآباد، کانپور، لدھیانہ اور ناگپور میں واقع ہیں۔ مزید پانچ یا چھ ایکسچینج ایک دو برس میں قائم ہو جائیں گے جبکہ ۱۹۹۰ء تک اُن کی تعداد ۲۵ تک پہونچ سکتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان اسٹاک ایکسچینجوں کا وجود ضروری ہے؟ جواب اثبات میں ہے۔ جب تجارتی و صنعتی اداروں کا قیام کیا جاتا ہے تو انھیں اپنا کاروبار چلانے کے لیے سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ اس کے لیے وہ لمیٹڈ کمپنیوں کا قیام کرتے ہیں اور اپنی دین داریوں (LIABILITIES) کو محدود رکھتے ہیں۔ کمپنی کے ڈائریکٹر اور فروغ کنندگان کچھ شیئر خرید لیتے ہیں۔ کچھ سرمایہ بنکوں اور سرکاری مالی اداروں سے بطور قرض لیا جاتا ہے جس کے لیے وہ کارخانوں کے پلانٹ، مشینری عمارتیں و دیگر اثاثہ جات گروی رکھتے ہیں۔ اس کے عوض حکومت اپنے افسران کمپنیوں کے ڈائرکٹروں کے بورڈ میں بھی شامل کرتی ہے اور ان قرضوں کی وصولی کے لیے سرکاری ادارے چاہیں تو شیئر بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ باقیماندہ سرمایہ عوام کے شیئروں اور ڈبینچروں کی صورت میں اکٹھا کیا جاتا ہے۔ کمپنی کے لیے جتنا سرمایہ منظور شدہ ہوتا ہے وہ عموماً یکدم اُتنے ہی سرمائے کے شیئر جاری نہیں کرتے بلکہ اُن کا کچھ حصہ محفوظ رکھ لیتے ہیں جس کے لیے وہ کاروبار کی توسیع ہونے اور سرمایہ کی ضرورت پڑنے پر شیئر جاری کرتے ہیں۔ ان شیئروں کا اپنے علاقے کے اسٹاک ایکسچینجوں پر اندراج کرانا ضروری ہے۔ یہ اندراج ایک یا زائد اسٹاک ایکسچینجوں پر بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے بغیر اُن شیئروں کا کاروبار نہیں ہو سکتا۔ جو بھی شیئر خرید یا فروخت کیا جاتا ہے، وہ اسٹاک ایکسچینج کے جاری کردہ ٹرانسفر ڈیڈ، (TRANSFER DEED) پر ہی ایک دوسرے کو منتقل کئے جا سکتے ہیں۔ یہ ٹرانسفر ڈیڈ شیئر سرٹیفکٹ کے ہمراہ متعلقہ کمپنی کو ارسال کئے جاتے ہیں۔ جو خریدار کے نام پر اندراج کرکے اُسے واپس بھیج دیتی ہے۔

شیئروں کی اقسام

شیئر "ایکوٹی" اور پری فرنس (ترجیحی) قسم کے ہوتے ہیں۔ کمپنی کو منافع ہونے کی صورت میں مقررہ "ڈیونڈنڈ" (منافع) شیئر ہولڈر کو دیا جاتا ہے۔ جن ابتدائی برسوں میں منافع نہیں ہوتا، منافع ہونے کی صورت میں اُن تمام برسوں کا منافع پری فرنس شیئر ہولڈروں کو دیا جاتا ہے جبکہ ایکوٹی شیئر ہولڈروں کو منافع کے تناسب سے ڈیویڈنڈ دیا جاتا ہے۔ اگرچہ "بانڈ" اور "ڈبینچر" بھی جاری کئے جاتے ہیں جن پر مقررہ سود ملتا ہے، تاہم زیادہ تر لوگ ایکوٹی شیئر خریدنا ہی پسند کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان میں ڈیویڈنڈ کے علاوہ ـــ اگر وہ بڑھتا چلا جائے ـــ شیئروں کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ شیئر کی قیمت مارکیٹ کی قوتوں کے تابع ہوتی ہے۔ کئی ایسی کمپنیاں ہیں جن کے دس دس روپے کے شیئر چار سو اور سو سو روپے کے شیئر چودہ سو روپے میں جائز طور پر اسٹاک ایکسچینج کی وساطت سے فروخت ہو رہے ہیں جو ملک کی بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی اور خوشحالی کی علامت ہیں ـــ زیادہ منافع ہونے کی صورت میں کمپنیاں منافع کا ایک حصہ ریزرو فنڈ کے لیے بھی مخصوص کر لیتی ہیں۔ جب یہ ریزرو فنڈ جاری شدہ سرمائے کے آس پاس پہونچ جاتے ہیں تو انھیں سرمایہ کاری کے طور پر استعمال کرنے کے لیے کمپنی کی طرف سے بونس شیئر تناسب کے ساتھ جاری کئے جاتے ہیں۔ جو شیئر ہولڈروں کو مُفت دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح منافع بڑھنے پر بعض اوقات رائٹ شیئر (RIGHT SHARES) کچھ پریمیم (زائد رقم) کے ساتھ جاری کئے جاتے ہیں۔ ان منافع جات کو دیکھتے ہوئے یا ان کے امکانی منافع پر شیئر کی قیمت چڑھ جاتی ہے۔ کئی بار بڑے بڑے سرکاری اداروں جیسے یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا اور لائف انشورنس وغیرہ کی طرف سے بھاری خرید پر بھی شیئروں کے دام چڑھ جاتے ہیں۔ اگر اسٹاک ایکسچینج نہ ہوں تو لوگوں کے لیے کمپنیوں میں سرمایہ لگانے کے لیے کوئی کشش نہیں رہے گی۔ کمپنیوں پر کنٹرولر آف کیپٹل اشوز (CAPITAL ISSUES) کی نگرانی رہتی ہے۔

شیئر جاری کرنے پر درخواستیں مطلوبہ رقم کے ساتھ جو عموماً شیئر کی قیمت کا نصف ہوتی ہے، کمپنی کے بینک میں جمع کرائی جاتی ہیں۔ چونکہ امکانی منافع کے پیشِ نظر یا غیر سرکاری طور پر بڑھے ہوئے پریمیم کو دیکھتے ہوئے لوگ بھاری تعداد میں فارم

بھرتے ہیں — اور ان کی تعداد میں متواتر اضافہ ہو رہا ہے — اس لیے شیروں کی الاٹمنٹ کا کام اسٹاک ایکسچینج کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ بلکہ آج کل تو اسے زیادہ مستعدی اور غیر جانبداری کے ساتھ انجام دینے کے لیے کمپیوٹروں کا استعمال ہونے لگا ہے۔ تاہم الاٹمنٹ میں دو تین ہفتے لگ جانا معمولی بات ہے۔

شیئر ہولڈروں کی تعداد

ابتدائی مارکیٹ میں ترقی کے ساتھ ساتھ گذشتہ چند برسوں میں ملک میں شیئر ہولڈروں کی تعداد میں بھاری اضافہ ہوا ہے۔ اگرچہ ۷۰ کی ابتدائی دہائی میں شیئر ہولڈر بمشکل ۳۰ لاکھ اور ڈبینچر ہولڈر ایک لاکھ سے بھی کم تھے۔ تاہم اندازہ کیا جاتا ہے کہ آج ملک میں شیئر ہولڈروں کی تعداد ایک کروڑ اور سوا کروڑ کے درمیان ہے اور اتنی ہی تعداد ڈبینچر ہولڈروں کی ہے۔ توقع ہے کہ اس رفتار سے ۱۹۹۰ء تک شیئر ہولڈروں کی تعداد کوئی ۵ کروڑ تک پہونچ جائے گی اور تقریباً اتنی ہی تعداد ڈبینچر ہولڈروں کی ہو جائے گی۔ جو کہ بھارت جیسے بھاری آبادی والے ترقی پذیر ملکوں کے لیے کافی حد تک موزوں معلوم ہوتی ہے۔

پبلک سیکٹر بھی

اب بازار حصص محض پرائیویٹ کمپنیوں کے لیے ہی سرمایہ کی فراہمی کا ذریعہ نہیں رہے بلکہ اب حکومت کو احساس ہو گیا ہے کہ پبلک سیکٹر گھریلو بچتوں سے استفادہ کرنے کے لیے جو کل بچتوں کا ۵۰ فیصد ہیں، اسٹاک ایکسچینج کو بروئے کار لا سکتا ہے۔ گذشتہ برس پبلک سیکٹر کے یونٹوں کی طرف سے بانڈوں کے ذریعے ۳ ارب ۵۰ کروڑ روپے کے فنڈ اکٹھے کئے گئے اور توقع ہے کہ سال رواں میں ۱،۵ ارب روپے اس مقصد کے لیے فراہم کئے جائیں گے بلکہ اب تو حکومت نے پبلک سیکٹر کے اداروں اور یونٹوں کو اجازت دیدی ہے کہ وہ بانڈوں کے ذریعے عوام سے سرمایہ فراہم کر سکتے ہیں اور اس کے لیے اسٹاک ایکسچینجوں کی خدمات سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ ان بانڈوں پر حکومت کی طرف سے متعدد مراعات دی گئی ہیں (جیسے کہ انھیں دولت ٹیکس سے مکمل طور سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اور ۱۴ فیصد تک سود کی رقم کو انکم ٹیکس قانون کی دفعہ ۸۰-ایل کے تحت چھوٹ دی گئی ہے) ان بانڈوں کی کامیابی میں اُن کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس مقصد کے لیے اسٹاک ایکسچینجوں اور متعلقہ سروسوں نے جو بنیادی ڈھانچہ مُہیا کیا ہے اُن سے ان وسائل کی شیرازہ بندی میں بڑی مدد ملی ہے۔

شیئر بازار کو فروغ دینے کے لیے حکومت کی طرف سے بالواسطہ طور پر بھی دیگر کئی اقدامات کئے گئے ہیں جیسے صنعتی پالیسی کو زیادہ سہل بنایا جا رہا ہے۔ صنعتی لائسنسوں کے اجرا میں نرمی برتی جا رہی ہے اور غیر ضروری تاخیر اور دیگر مشکلات کو ختم کیا جا رہا ہے۔ کارپوریٹ ٹیکس، انکم ٹیکس اور ایکسائز ڈیوٹی میں کمی کی جا رہی ہے۔ صنعتی خام مال کی درآمد کے لیے لائسنس جاری کئے جا رہے ہیں ان سب سے مُراد ہے پیداوار کو بڑھانا اور لاگت پیداوار میں کمی کرنا۔ اس سے صنعتی اداروں کے منافعے بڑھتے ہیں جن سے ٹیکسوں کی وصولی میں اضافے کے ساتھ ساتھ شیئر بازار میں تیزی آتی ہے۔ علاوہ ازیں چند دیگر سہولیات بھی دی گئی ہیں جیسے ڈیویڈنڈ کی ۱۰۰۰ روپے تک کی رقم پر ٹیکس منبع (SOURCE) پر نہیں کٹتا اور شیئروں کی فروخت پر ہونے والے ۱۰ ہزار روپے تک کے منافعے پر ٹیکس نہیں لگتا۔ بشرطیکہ وہ خریدے جانے کے تین سال کے بعد فروخت کئے جائیں۔ ان اقدامات سے لوگوں کو شیئر خریدنے کی ترغیب ملتی ہے، جس سے شیئر بازار میں رونق آتی ہے۔

کثیر الملکی کمپنیوں کے شیئر

ملک میں جو کثیر الملکی (غیر ملکی) کمپنیاں کام کرتی ہیں انھیں ہدایت دی گئی ہے کہ وہ فارن ایکسچینج ریگولیشن ایکٹ (FERA) کے تحت غیر ملکیوں کے شیئروں کی ملکیت میں کمی کر کے اُسے ۴۰ فیصد تک کر دیں اور اپنے فاضل شیئر یہاں کے عوام کے ہاتھوں فروخت کر دیں تاکہ ان کمپنیوں پر غیر ملکیوں کا غلبہ ختم کیا جا سکے۔ بیشتر کمپنیوں نے اس سلسلے میں مطلوبہ اقدامات کئے ہیں۔ اور غیر ملکیوں کے شیئروں میں کافی حد تک کمی کر دی ہے۔ چنانچہ ۱۱۰ سے زیادہ کمپنیوں نے تقریباً ۹۰ کروڑ روپے کی اصل قیمت کے شیئروں کو لگ بھگ ۴۰ کروڑ روپے کے پریمیم (زائد رقم) پر فروخت کر دیا۔ ان شیئروں کی خرید کے لیے کوئی ۱۲ گنا درخواستیں موصول ہوئیں اور جنھیں شیئر الاٹ ہوئے اُنھیں بھاری فائدہ ہوا۔ بعض بڑی بڑی کمپنیوں کی طرف سے ایسے ڈبینچر جاری کئے جاتے ہیں جو کچھ عرصہ کے بعد ایکوئٹی شیئروں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ ان سے بھی شیئر ہولڈروں کو کافی فائدہ پہونچتا ہے کیونکہ منتقل کئے جانے والے شیئروں کی قیمت اُن کی بازاری قیمت سے عموماً بہت کم ہوتی ہے۔

سرکاری نگرانی

جہاں کنٹرولر آف کیپٹل اِشوز شیئر جاری کرنے والے اداروں پر کنٹرول رکھتا ہے، وہاں

اسٹاک ایکسچینج پر بھی سرکار نگرانی رکھتی ہے۔ جب بھی کسی ہلچل کی وجہ سے شیئروں کی قیمتوں میں بھاری اُتار چڑھاؤ آتا ہے اور [illegible] کے معاملے میں مالی بحران کا خطرہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ تو اس تیزی کو "مارجن" (MARGIN) کی بریک لگا دی جاتی ہے۔ بازاری قیمت کے علاوہ خریدار کو شیئر پر کچھ زائد قیمت دینا پڑتی ہے جس سے قیمت موزوں سطح پر رہتی ہے۔ حکومت شیئروں میں سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کرتی ہے تاکہ لوگ ڈیویڈنڈ، سُود اور سرمایہ جاتی منافع CAPITAL GAIN سے استفادہ کریں لیکن وہ اُن کی سٹہ بازی کے خلاف ہے۔ جب شری مرارجی ڈیسائی، اندرا گاندھی کابینہ میں نائب وزیراعظم اور وزیر خزانہ تھے تو انھوں نے شیئروں کی سٹہ بازی پر قانوناً پابندی عائد کردی تھی۔ لیکن اس کے باوجود دلال لوگ مخصوص فہرست کے شیئروں کے نام پر اُن کی سٹہ بازی کا راستہ نکال لیتے ہیں۔ سٹہ بازی کو روکنے کے سلسلے میں بینکوں کو یہ ہدایت بھی دی جاچکی ہے کہ وہ شیئروں کو رہن رکھ کر روپیہ نہ دیں اور نہ ہی اُن کے لیے کوئی "اوور ڈرافٹ" دیں۔

بلاشبہ اسٹاک ایکسچینج ان سب دشواریوں کے باوجود بھارتی معاشیات میں اہم رول ادا کر رہا ہے اور جہاں وہ عوام کو ترغیب دے رہا ہے کہ وہ ملکی صنعتوں میں اپنی بچت کا روپیہ لگائیں وہاں وہ عوام کو ڈیویڈنڈوں اور سُود کی صورت میں ضمنی آمدنی کا ایک وسیلہ بھی فراہم کر رہا ہے تاکہ وہ اپنی اقتصادی حالت کو استوار کرسکیں۔

بقیہ: خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت

شروع کی جائے گی۔ یہ اشیاء ضرورتمندوں کو بلا وقت اور بآسانی بہم پہنچانے کے لیے تمام عوامی ذرائع تقسیم کا استعمال کیا جائے گا۔ خاندانی منصوبہ بندی کی تعلیم دینے اور عوامی صحتی مراکز اور ذیلی مراکز کو تکنیکی مہارت فراہم کرنے کی بھی کوشش کی جائے گی۔

اعزازی کارڈ

آزادی کے چالیسویں سال میں وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی کے زیر رہنمائی ایک اسکیم بنائی جارہی ہے جس کے تحت خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرنے والے، اولاد پیدا کرنے کے قابل جوڑوں کو ایک ایسا اعزاز دیا جائے گا جو ان کے لیے نہ صرف قابلِ فخر ہوگا بلکہ جس کی بدولت انھیں زندگی بھر بہت سی سہولیات حاصل ہونگی۔ اس اسکیم کے تحت آزادی کے چالیسویں سال میں دو یا دو سے کم بچے رکھنے والے ۱۵ کروڑ جوڑوں کو معزز شہری ہونے کا ایک کارڈ جاری کیا جائے گا جس کی بنا پر انھیں تمام زندگی متعدد سہولیات اور رعایات حاصل ہوں گی۔ یہ اسکیم، جس کے تفصیلات ابھی مرتب کی جارہی ہیں، بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کی ایک اہم کوشش ہوگی۔ اس سے خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کو مزید تقویت حاصل ہوگی۔

اس کے لیے حکومت یہ ارادہ بھی رکھتی ہے کہ مُلک بھر میں اولاد پیدا کرنے کے قابل ہر ساٹھ جوڑوں پر ایک خاتون والنٹیر کو مامور کیا جائے جو انھیں کنبہ چھوٹا رکھنے کی ترغیب دے اور ضروری معلومات فراہم کرے۔

اگر یہ کوششیں کامیاب ثابت ہوئیں تو خوراک روزگار اور رہائش گاہوں کی [illegible] میں کمی لائی جاسکے گی۔ وسائل کو بچایا جاسکے گا اور ہندوستان اقتصادی آزادی کا نصب العین حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکے گا۔

بقیہ: نظرثانی شدہ بیس نکاتی پروگرام

۱۸۔ صارفین کا تحفظ :۔

غریبوں کے لیے روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کی فراہمی کو یقینی بنانا، صارفین کے تحفظ کی تحریک کو مستحکم بنانا، اشیاء کی تقسیم کے نظام کی از سر نو ترتیب جس سے سامان ضرورت مندوں تک یقینی طور پر پہنچ سکے، اور اشیاء کی تقسیم کے سرکاری نظام کو مستحکم بنانا، اسی مد کے تحت آتے ہیں۔

۱۹۔ دیہات کے لیے انرجی :۔

دیہات میں پیداواری مقاصد کے لیے بجلی کی فراہمی کو یقینی بنانے پر زور دیا جائے گا۔ انرجی کے متبادل ذرائع کی تلاش، حیاتیاتی گیس کے استعمال پر زور، دیہات میں علاقے وار انرجی کی تیاری کے پروگرام اس سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

۲۰۔ حساس انتظامیہ :۔

طریقِ کار کو سہل بنا کر، اختیارات کی منتقلی کر کے، حکام میں یہ احساس پیدا کرا کر انھیں کسی کے سامنے جوابدہ ہونا ہے، خواتین کے نفاذ پر نگرانی کر کے، عوامی شکایات پر توجہ دے کر بہتر سے بہتر انتظامی صلاحیت کو اُجاگر کیا جائے گا۔

بھرت ڈوگرہ

فاضل اراضی کی ازسرنو تقسیم

ہندوستان میں قطعاتِ اراضی کی تقسیم میں بہت زیادہ نابرابری ہے، یہ ایک ایسی صورتِ حال ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ غریبی دور کرنے کے لیے اس نابرابری کو کم کر کے مبنی برانصاف سماج کی بنیادوں کو استوار کرنا ہے۔ ساتواں منصوبہ اس بات کو واضح نہیں کرتا کہ جو فاضل اراضی سامنے آچکی ہے اس کو تقسیم کرنے اور اراضی کا ازسرنو اندازہ لگانے کے ضمن میں کچھ کیا جاتا ہے، مصنف کی رائے میں سرکار کو ساتویں منصوبے میں فاضل اراضی کی تقسیم کے نشانوں کو بڑھانا چاہیے اس کام میں دیہات کے غریب عوام کا تعاون درکار ہے۔

ہندوستان میں غریبی دور کرنے کے موضوع پر کسی بھی طرح کی بات چیت کیوں نہ کی جائے، اس میں زرعی اراضی کی ازسرنو تقسیم کا سوال ضرور آئے گا۔ اس کی وجوہات ظاہر ہیں۔ ہندوستان کی ۷۰ فیصد آبادی گویا کہ تقریباً ۵۴ کروڑ، مرد، عورتیں اور بچے، زراعت کو ہی خاص پیشہ بنائے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں میں سے زیادہ تر وہ ہیں جو محض زراعت پر ہی گزارہ کرتے ہیں، سرکاری اعداد و شمار کی روشنی میں ۳۰ فیصد ہندوستانی کسان مجموعی طور پر ملک میں قابلِ کاشت اراضی کا صرف ۲۳ فیصد حصے پر ہی کاشت کرتے ہیں۔

قطعاتِ اراضی کی تقسیم میں نابرابری:۔

بھارت ایک بڑا ملک ہے۔ یہاں اراضی کے ریکارڈ کی مناسب ڈھنگ سے ترتیب آسان کام نہیں۔ یہ پتہ لگانا بھی آسان نہیں کہ کتنی اراضی بڑے کسانوں کے پاس ہے اور کتنی چھوٹے کسانوں کے پاس۔ بڑے کسان کی تعریف کیا ہو اور چھوٹے کی کیا، اس بارے میں کوئی بات طے کرنا بھی آسان نہیں۔ ان دشواریوں کے باوجود ماہرینِ اقتصادیات نے اراضی کی غیر مساوی تقسیم کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر چار ماہرینِ اقتصادیات کی طرف سے لگائے گئے اندازوں کی روشنی میں ہندوستان میں ۶۵ فیصد کے لگ بھگ کسان بے زمین ہیں، ان کے پاس اپنی کوئی اراضی نہیں یا ہے تو وہ ۲ ہیکٹیئر سے کم کم ہے۔ یہی وہ زمرہ ہے جو چھوٹا یا مارجنل کسان کہلاتا ہے۔ یہ مجموعی طور پر کُل قابلِ کاشت اراضی کے ۱۹ فیصد حصے پر کاشت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ۱۰۸ ہیکٹیئر یا اس سے زیادہ اراضی رکھنے والے کسان، بڑے کسان کہلاتے ہیں ان کی تعداد کسانوں کی کُل تعداد کے صرف نو فی صد کے برابر ہے۔ لیکن وہ قابلِ کاشت اراضی کے ۴۰ فیصد حصے پر کاشت کرتے ہیں، یہ تحقیق جن ماہرینِ اقتصادیات نے کی ہے ان کے نام یہ ہیں:۔

آئی علی، بی۔ ایم۔ ڈیسائی، آر۔ رادھا کرشنن اور وی ایس ویاس (اکونومک اینڈ پولیٹیکل ویکلی، سالانہ نمبر مارچ ۱۹۸۱)۔

ہندوستان میں قطعاتِ اراضی کی تقسیم میں یہ نابرابری بڑی ہے۔ ہندوستان میں ۳۵ کروڑ ایکڑ اراضی ہے اور ۵۴ کروڑ افراد جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں،

زراعت پر ہی انحصار رکھتے ہیں۔ اس صورت میں اس طرح کی نابرابری کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

مساوی تقسیم ۔ بے حد ضروری

ہندوستان میں ترقی کے لیے کوئی بھی لائحہ عمل کیوں نہ مرتب کیا جائے اور اس کے لیے پہلے ہی صنعت کاری پر زیادہ زور دیا جائے اور یہاں بے زمین کسانوں، مارجنل اور چھوٹے کسانوں کے لیے دیگر معاشی شعبوں میں روزگار کے کتنے ہی موقع کیوں نہ فراہم کردیے جائیں، قطعاتِ اراضی کی تقسیم کے سلسلے میں موجودہ نابرابری دور کرنی ضروری ہے۔ اس کے بغیر ملک سے غریبی دور نہیں کی جاسکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اراضی کی موجودہ غیرمساوی تقسیم کے سبب معیشت کے دیگر شعبوں میں اجرتیں کم ہیں، اسی وجہ سے گاؤں سے غریب لوگ شہروں کی طرف جاتے ہیں تاکہ کسی نہ کسی طرح روزی روٹی کمائیں، اس کا فائدہ صنعت کار اٹھاتے ہیں اور ان کو کم اجرتوں پر محنت کش مل جاتے ہیں۔

زمین کی بالائی حد

بھارت سرکار اصولی طور پر زرعی اراضی کی تقسیم کو نئے سرے سے کرنے کی ضرورت تسلیم کرتی ہے، گزشتہ دہے میں مختلف موقعوں پر زمین کی بالائی حد کے قوانین بنائے گئے۔ یہ کام قریب قریب سبھی ریاستوں میں ہوا۔ اور زراعت کی زمین کی زیادہ سے زیادہ حد کا تعین کیا گیا۔ اس طرح سے جو اراضی فالتو قرار دی گئی، اس کی تقسیم کا مسئلہ سامنے آیا۔ ان قوانین میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں اور ترامیم کی گئیں مگر پھر بھی یہ غیر متحرک رہے۔

مثال کے طور پر اترپردیش کی ریاست میں آبپاشی والی زمین کی بالائی حد ۷ء۳۰ ہیکٹیر قائم کی گئی۔ جب کہ غیر آبپاشی والے رقبے کی زیادہ سے زیادہ حد ۱۰ء۹ ہیکٹیر رکھی گئی ہے۔ قانون بننے کے بعد انتظامیہ سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ فالتو اراضی لے لے گا اور اسے بے زمین کسانوں اور کمزور طبقوں کو بانٹ دے گا۔ وقتاً فوقتاً ریاستی سرکاروں نے اراضی کی دوبارہ سے تقسیم کے کام کو تیزتر کرنے کی ہدایات بھی جاری کردیں۔ اس سلسلے میں خصوصی مہمات بھی چلائی گئیں۔

اس طرح کی کوششوں کے پچھلے تیس برسوں میں کیا اثرات ظاہر ہوئے؟ اکتوبر ۱۹۸۵ء میں منصوبہ بندی کمیشن کے اعداد و شمار کی روشنی میں ملک میں ۳۵ کروڑ ایکڑ قابلِ کاشت اراضی تھی لیکن صرف ۷۲ لاکھ ایکڑ اراضی فالتو قرار دی گئی اور اس میں سے صرف ۴۴ لاکھ ایکڑ اراضی دوبارہ سے تقسیم عمل میں آسکی۔ اس طرح کی تقسیم پوری طرح عمل میں نہ آنے کی ایک وجہ انتظامی نااہلی بھی ہے۔ اس کے علاوہ بڑے کسانوں نے اس طرح فالتو اراضی قرار دیے جانے کے خلاف اپیلیں کی ہیں، اس وجہ سے بھی اس کام میں تاخیر ہوئی ہے۔ ۴۴ لاکھ ایکڑ اراضی کی اگرچہ تقسیم عمل میں آچکی ہے، لیکن یہ بھی ایک کاغذی کارروائی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ بڑے کسان، کاشتکاروں کو دھمکی دیتے ہیں اور اس نئی اراضی پر کاشت کرتے ہوئے لوگ گھبراتے ہیں۔ اکثر و بیشتر جو زمین فالتو قرار دی گئی ہے، وہ گھٹیا قسم کی ہے، اس پر کاشت اچھی نہیں ہوسکتی۔ بڑے کسان اگر زمین دینے پر مجبور ہی ہوتے ہیں تو وہ گھٹیا قسم کی اراضی دیتے ہیں۔

اگر زمین کی بالائی حد کے قوانین نافذ کرنے سے متعلق انتظامیہ کی حالت میں سدھار بھی آجائے تو بھی اس امر کو یقینی بنانا دشوار ہے کہ ۷۲ لاکھ ایکڑ اراضی پر بے زمین کسان کامیابی کے ساتھ کھیتی کر پائیں گے۔ اس کامیابی کو بہت زیادہ نہیں سراہا جاسکتا۔

بڑے کسانوں نے اپنی اراضی کے ریکارڈ بدل دیئے ہیں اور انھوں نے زمین کو اپنے رشتہ داروں کے نام منتقل کردیا ہے حالانکہ ان کے پاس اب بھی زمین کی بالائی حد سے زیادہ زمین ہے تاہم وہ قانون کی گرفت میں نہیں آتے کیوں کہ ریکارڈ میں ایسا نہیں ہے۔ زمین کی بالائی حد کے قوانین کے تحت دی گئی رعایتوں اور استثنیات سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے باوجود، ان بڑے کسانوں نے ریکارڈ بدلوا دیئے ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ ریاستوں میں زمین کی بالائی حد سے زیادہ اراضی پر باغات لگانے کی اجازت دی گئی ہے۔

اچاریہ ونوبا بھاوے نے بھودان کی جو تحریک شروع کی تھی، اس کے تحت بھی بہت سی اراضی فالتو قرار دی گئی۔ یہ تحریک حصولِ آزادی کے بعد شروع کی گئی۔ اس کے تحت کسان اپنی خوشی سے اراضی دے دیتے ہیں۔ گاندھی جی کے بہت سے چیلوں نے یہ تحریک آگے بڑھانے کی کوشش کی اور اسے سرکار کا تعاون حاصل رہا۔ بھودان تحریک کے تحت ۴۲ لاکھ ایکڑ اراضی حاصل کی گئی اس میں سے ۱۳ لاکھ ایکڑ اراضی کی دوبارہ سے تقسیم عمل میں آسکی۔ مگر یہاں بھی یہی شکایت ہے کہ گھٹیا قسم کی اراضی بھودان میں دی جاتی ہے۔ اور بڑے اور طاقتور کسانوں کی دھونس کے تحت چھوٹے کسان اس پر کاشت کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔

ساتواں منصوبہ اور زمین کی تقسیم

۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۰ء تک ساتواں منصوبہ

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

رفعت سروش

جب بیسویں صدی کا پہلا سورج اپنی انقلابی کرنیں بکھیرتا ہوا آسمانِ ایشیا پر نمودار ہوا اس وقت رام پرساد بسمل کی عمر صرف تین سال تھی۔ یہ بچہ شاہجہانپور کے ایک معمولی گھرانے میں اپنے ماں باپ اور دادا دادی کی خوشیوں کا مرکز تھا۔ ان کی اُمیدوں کا چراغ تھا۔ اس وقت اس کی ماں کو یہ کہاں معلوم تھا کہ وہ انقلاب کے ایک آفتابِ تازہ کو، بغاوت کے ایک شعلۂ جوالہ کو اور خود دار انسانیت کے ایک انمول رتن کو پروان چڑھا رہی ہے اور ان کی گود میں نئے ہندوستان کے نئے خواب انگڑائی لے رہے ہیں۔

رام پرساد کے دادا شری نرائن لال ریاست گوالیار کی چنبل گھاٹی کے ایسے گاؤں کے رہنے والے تھے جہاں کے لوگوں کی سرشت میں سرکشی اور بغاوت تھی۔ اگر وہ لگان نہ دینا چاہتے تو زمیندار کی مجال نہیں تھی کہ ان سے ایک پائی بھی وصول کر سکے۔

شری نرائن لال نے خانگی جھگڑوں کے باعث اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہا اور اپنے بال بچوں سمیت، چار افراد پر مشتمل خاندان کو لے کر نئے مسکن کی تلاش میں نکل پڑے۔ اور آخر کار نرائن لال کو پناہ ملی بھی تو کہاں۔ شاہجہاں پور میں، جہاں ان دنوں قحط پڑا ہوا تھا۔ ان کے بیٹے مُرلی دھر آٹھ سال کے تھے اور کلیان مل چھ سال کے۔

اس اجنبی دیار شاہجہاں پور میں جہاں ان دنوں لوگوں کو پیٹ بھر روٹی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔ نرائن لال کو مشکل سے تین روپے ماہوار کی نوکری ملی۔ رام پرساد کی دادی نے بھی گھریلو محنت مزدوری کی۔ اس عُسرت میں مُرلی دھر کی شادی ہوئی۔ انھوں نے پہلے میونسپلٹی میں نوکری کی۔ پھر کچہری میں اسٹامپ بیچنے لگے۔ اور سُود پر روپیہ چلانے لگے۔

جب رام پرساد سات سال کے ہوئے تو ان کے پتا شری مُرلی دھر انھیں ہندی خود پڑھانے لگے اور اُردو پڑھنے کے لیے ایک مکتب میں بٹھا دیا۔ تقریباً چودہ برس کی عمر میں درجہ چار پاس کیا۔ انھیں دنوں باپ کے صندوقچے سے روپے چُرانے، سگریٹ اور بھنگ پینے کی عادت پڑ گئی اور یہ نشہ چڑھتا ہی گیا۔ پچاس ساٹھ سگریٹ روز پینے لگے۔ دو بار اُردو مڈل کے امتحان میں فیل ہوئے۔ یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر ان کے پتا انھیں کسی کام میں ڈال دینا چاہتے تھے، مگر ماں کے لاڈلے رام پرساد کو ماں کے اصرار پر مشن اسکول کے پانچویں درجے میں داخل کر دیا گیا۔ اور پھر انھیں گویا اندھیرے میں ایک روشنی ملی۔

ان کے گھر کے قریب کے مندر میں ایک نئے پجاری آئے جن کی صحبت اور نصیحتوں کا رام پرساد پر اتنا زیادہ اثر ہوا کہ سب بُری عادتیں چھوٹ گئیں اور بھگتی مارگ میں آنند

آنے لگا۔ انھوں نے جسمانی ورزش بھی شروع کر دی۔

گھر، اسکول، مندر، اگر اسی مثلث میں رام پرساد بسمل کی زندگی گھری رہتی تو شاید وقت انھیں آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا اور کروڑوں عام لوگوں کی طرح بسمل بھی اچھے بُرے دن کاٹ کر اس دُنیا سے گذر جاتے اور کوئی ان کا ذکر بھی نہ کرتا ــــ مگر وہ اس مثلث میں محدود رہنے والے کب تھے۔ انھیں تو زندگی کی نئی رفعتیں فرازِ دار سے آواز دے رہی تھیں۔ انقلاب کا نیا آفتاب ان سے روشنی حاصل کرنے کے لیے ان کے قدم چوم رہا تھا۔ اور جوشیلے نوجوان غلامی کے اندھیرے میں آزادی کی منزل پانے کے لیے ان سے روشنی اور رہنمائی کے طالب تھے۔

ان دنوں ہندوستان کے بچے بچے کے دل میں آزادی کی تڑپ پیدا ہو چکی تھی۔ اور سرفروشی کی تمنّا انگڑائیاں لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ وطن کی محبت صرف سیاسی پارٹیوں کے نیتاؤں اور کارکنوں تک ہی محدود نہیں رہی تھی۔ بلکہ بے لوث اور پُرجوش نوجوانوں کے دلوں پر بھی اثر کر چکی تھی... نوجوانوں نے آریہ کمار سبھا بنائی تھی۔ چنانچہ جب لکھنؤ میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا تو کُل ہند کمار سبھا کا بھی وہیں سمّیلن ہوا اور لاہور اور شاہجہاں پور کی کمار سبھاؤں کے کاموں کو بیحد پسند کیا گیا۔ رام پرساد بسمل کمار سبھا کے سرگرم رُکن تھے اور ان کی ولولہ انگیز تقریریں مُردہ دلوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دیتی تھیں ... ...

گویا یہ اپنی قدر و قیمت سمجھنے اور اپنے آپ کو پہچاننے کی یہ پہلی کوشش تھی جس نے رام پرساد کو اپنے ساتھیوں اور ہم عمروں میں نمایاں مقام پر کھڑا کر دیا تھا۔

انھیں دنوں مشن اسکول کے ایک ایسے ساتھی سے ان کے تعلقات اُستوار ہوئے جس کے پاس ٹوپی دار پستول تھا۔ اس پستول کو دیکھ کر بسمل کے دل میں ایک انجانا شعلہ جاگا .... اگر میرے پاس پستول ہو تو میں اپنے پتا جی کے دُشمنوں سے بدلہ لے سکتا ہوں جنھوں نے ان پر لاٹھیوں سے حملہ کیا تھا..... اُٹھتی جوانی میں جب دل میں اُمنگوں اور ولولوں کا طوفان موجزن ہو اور پستول استعمال کرنے کا جذبہ بھی جاگ اُٹھے تو آگ پر تیل پڑ جانا قدرتی بات ہے۔ کچھ ایسا ہی رام پرساد بسمل کے ساتھ ہوا۔

انھوں نے اپنی ماتا جی سے روپے حاصل کیے اور بڑے جتن کرکے ریاست گوالیار سے ایک پستول خرید ہی لیا .... اور پھر تو انھیں ہتھیار اکٹھا کرنے کا چسکا پڑ گیا۔

۱۹۱۶ء میں ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے بسمل کے ارادوں کو اور پختہ اور مزاج کو بالکل انقلابی بنا دیا۔ اور یہ اندوہناک واقعہ تھا لاہور کیس میں بھائی پرمانند کو سزائے موت۔

بھائی پرمانند کی لکھی ہوئی تاریخ ہند کو بسمل نے بہت عقیدت سے پڑھا تھا۔ جب اخباروں میں ان کی سزائے موت کی خبر چھپی تو بسمل کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ انھوں نے سوچا کہ انگریز اس قدر ظالم ہیں کہ ایسے عظیم انسان کو بھی پھانسی پر لٹکا سکتے ہیں اور عہد کیا کہ میں اس ظلم کا بدلہ ضرور لوں گا اور زندگی بھر انگریزی سامراج کو تحس نحس کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ یہ عہد کرنے کے بعد وہ اخبار لے کر اپنے گرو شری ۱۰۸ سوامی سوم دیو جی برج لال چوپڑا کے پاس گئے۔

"سوامی جی یہ اخبار پڑھیے" بسمل نے اخبار ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہوں ــ بھائی پرمانند کو نرا" سوامی جی رنجیدہ ہو گئے۔

بسمل نے پُرجوش لہجے میں کہا... سوامی جی میں نے عہد کیا ہے کہ اس ظلم کا بدلہ ضرور لوں گا اور زندگی بھر انگریزی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔"

"عہد کرنا آسان ہے مگر اس پر قائم رہنا اور اسے نبھانا مشکل ہے۔" سوامی جی نے کہا۔

بسمل کے لہجے میں اور جوش آ گیا۔ بولے ...

" اگر آپ کی دُعا شاملِ حال رہی تو اپنے عہد کو پورا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ برتوں گا۔"

اور اسی دن سے رام پرساد بسمل کی انقلابی زندگی کا آغاز ہوا۔ اور ملک کے انقلابیوں کے گروہ کو ایک ایسا مخلص شخص ملا جس کی زندگی سراسر ایثار، سر بہ سر قربانی، بے لوث اور ہر طرح کے لالچ سے دُور تھی۔ اور جو وطن کی راہ میں اس طرح ہتھیلی پر سر رکھ کر چلا کہ آخرکار اپنی بھری جوانی کو مادرِ وطن کے قدموں میں بھینٹ کرکے امر شہید ہو گیا۔

رام پرساد بسمل گفتار کے نہیں، کردار کے غازی تھے ــ غازی بھی اور شہید بھی۔ وہ چھوت چھات، کینہ، مکر و فریب اور خود نمائی سے شدید نفرت کرتے تھے۔ اور نیتا گیری کو بھی عملی کام کے حق میں ایک رکاوٹ سمجھتے تھے۔ اس امر کا اظہار انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح میں جگہ جگہ کیا ہے۔

"کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ اپنی شان جتانا یا اپنے آپ کو بڑا دکھانا اپنا فرض

سمجھتے ہیں جس سے بہت نقصانات ہوتے ہیں۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :-

" نیتاگیری کا بھوت سب سے بھیانک ہوتا ہے۔ جس وقت یہ بھوت کھوپڑی پر سوار ہوتا ہے اس وقت سب کام چوپٹ ہو جاتے ہیں۔ صرف ایک دوسرے کی عیب جوئی میں وقت گزرتا ہے۔

ان کا دھرم تھا سیوا۔ وہ پنڈت شری رام باجپئی کی قائم کردہ سیوا سمیتی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

جو شخص حق بات پر پھانسی کے تختے پر بھی کہنے سے نہ چوکے وہ چھوٹی چھوٹی مصلحتوں کی بنا پر اپنے دل کی آواز کیسے دبا سکتا تھا۔

لکھنؤ میں کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں شرکت کرنے کے لیے آئے کچھ ساتھیوں کے ساتھ بسمل بھی شاہجہاں پور سے گئے۔ اجلاس میں لوک مانیہ تلک کے آنے کی خبر تھی اس لیے گرم دَل کے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ لیکن استقبالیہ کمیٹی میں ٹھنڈے دل کے لوگ زیادہ تھے۔

پہلے دن صدر کانگریس کا جلوس نہایت شان سے نکالا گیا۔

دوسرے دن جب لوک مانیہ تلک کو آنا تھا، استقبالیہ کمیٹی کے ممبران نے سوچا کہ لوک مانیہ کا اسٹیشن پر ہی استقبال کر کے موٹر میں بٹھا کر شہر کے باہر ہی سے انھیں پنڈال لے جایا جائے۔ دراصل انھیں خدشہ تھا کہ اگر لوک مانیہ تلک کا جلوس بھی شہر میں نکالا گیا تو ان کے استقبال میں صدر کانگریس سے زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ ہوگا — مگر یہ بات نوجوانوں کو پسند نہ آئی اور رام پرساد

بسمل اور ان کے چند ساتھیوں نے طے کیا کہ چاہے کچھ ہو جائے لوک مانیہ کا شایانِ شان استقبال ہونا چاہیئے اور طے کیا کہ جیسے ہی لوک مانیہ اسپیشل ٹرین سے اتریں، انھیں گھیر کر گاڑی میں بٹھا لیا جائے اور شان سے ان کی سواری نکالی جائے۔

آخر وہ دن آ گیا۔ لکھنؤ ریلوے اسٹیشن پر بہت بھیڑ تھی — ٹرین کے آنے کی سیٹی کے ساتھ ہی مجمع میں بے چینی بڑھ گئی۔ ٹرین آ گئی — ایک گرجدار آواز سنائی دی۔ ہٹو۔ ہٹو — سب لوگ پیچھے ہٹ جائیں — اور سویم سیوکوں، کو آگے آنے دیں "۔ پھر کچھ اور آوازیں بھیڑ کی جھنجھناہٹ کا سینہ چیرتی ہوئی ابھرتیں — ہٹو — ہٹو — اے لڑکو! پیچھے ہٹو — ہٹ جاؤ "۔

لوک مانیہ تلک کی جے — لوک مانیہ تلک کی جے — ہٹو — خبردار — کوئی سویم سیوکوں کا گھیرا نہ توڑے — خبردار — ہٹو — راستہ چھوڑ دو "۔ اور سویم سیوکوں کے گھیرے میں لوک مانیہ موٹر میں بیٹھ گئے۔ ایک نوجوان نے بسمل سے کہا —

" یہ تو بہت برا ہوا — استقبالیہ کمیٹی کے لوگ سویم سیوکوں کے گھیرے میں لے کر لوک مانیہ کو سیدھے اپنی موٹر میں لے گئے "۔

بسمل کی ہمت نے جواب نہیں دیا تھا بولے " کوئی بات نہیں، آج ہی اپنی قوت کو آزمانا چاہیئے۔ باتیں کرنے کا وقت نہیں، جلدی کرو۔ ہم لوگ موٹر کے آگے لیٹ جائیں گے۔ پھر دیکھیں گے کہ یہ لوگ کیسے لوک مانیہ کو سیدھے پنڈال میں لے جاتے ہیں "۔

کچھ جوشیلے نوجوانوں نے ہاں میں ہاں ملائی — لوک مانیہ تلک کی جے، کے نعروں کے

ساتھ موٹر کے ہارن کی آواز بھی گونجی۔

" ارے ارے لڑکو! یہ کیا کرتے ہو۔ ہٹو — موٹر کے سامنے سے۔

" نہیں ہٹیں گے — موٹر ہمارے اوپر سے نکال دیجیئے "۔

ہارن بجتا رہا مگر بسمل نہ ہٹے۔

ایک نیتا بولا — آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟

" ہم لوگ لوک مانیہ کی سواری شہر میں نکالیں گے "۔

" ہم اپنے نیتا کا شایانِ شان استقبال کریں گے "۔

نوجوانوں نے ایک آواز ہو کر جواب دیا۔

استقبالیہ کمیٹی کے ایک ممبر کی آواز اچانک گونجی —

" ارے یہ کیا — کسی نے موٹر کا ٹائر ہی کاٹ دیا۔"

اور نوجوانوں نے نعرہ لگایا۔ لوک مانیہ تلک کی جے۔ انقلاب زندہ باد "۔ بسمل نے کہا :-

" ہمیں لوک مانیہ کی سواری کے لیے وہ گاڑی چاہیئے جس میں کل صدر کانگریس کا جلوس نکالا گیا تھا "

" وہ گاڑی نہیں مل سکتی "۔ ایک نیتا نے جھلا کر جواب دیا۔

" تو کوئی طاقت نہیں جو ہمیں یہاں سے ہٹا سکے "۔ بسمل نے برجستہ جواب دیا، ایک نوجوان نے کہا —

وہ گاڑی نہیں مل سکتی تو ہم نوجوان گھوڑا گاڑی میں لوک مانیہ کا جلوس نکالیں گے "—

نوجوانوں نے ایک گھوڑا گاڑی والے سے کہا کہ ہم تمھیں منہ مانگا کرایہ دیں گے۔ تم اپنا گھوڑا کھول لو۔ ہم اس گاڑی میں لوک مانیہ کو بٹھا کر

کاریں خود کھینچیں گے اور شہر میں لوک مانیہ کا شاندار جلوس نکلے گا۔"

اور فضا لوک مانیہ تلک کی جے کے نعروں سے گونج اٹھی۔

اور اس طرح رام پرساد بسمل اور چند نوجوانوں کی دلیری کی وجہ سے لوک مانیہ تلک کا شاندار جلوس نکلا اور استقبالیہ کمیٹی کے نیتاؤں کی چال بیکار ہوگئی۔ لوک مانیہ کا اس طرح جلوس نکالنا نوجوانوں کی شاندار فتح تھی۔

کانگریس کے اس اجلاس کے موقع پر رام پرساد بسمل نے "کرانتی کاری سمتی" کا ذکر سنا اور وہ اس کے ممبر ہوگئے اور کچھ عرصہ بعد ان کو اس سمتی کی مجلس عاملہ کا ممبر بنا لیا گیا۔ گویا رام پرساد بسمل کے بیتاب ارادوں کو ایک سمت اور بیقرار قدموں کو ایک راستہ مل گیا۔ اب میدانِ عمل سامنے تھا۔ کرانتی کاری سمتی کا کام چلانے کے لیے روپیہ کی بھی ضرورت تھی اور ہتھیاروں کی بھی۔ یہیں رام پرساد بسمل کے جوہر کھلے۔

اس نوجوان کے ایک ہاتھ میں قلم تھا اور ایک ہاتھ میں پستول۔ اپنے قلم کی قوت کو انھوں نے پستول حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا اور پستول سے قلم کی آبرو بچائی۔ آزادی اور انقلاب کے لیے یہ دونوں ہتھیار انھوں نے ایک ساتھ استعمال کیے۔ اور دراصل علم اور دلیری کا امتزاج ہی انھیں انقلابیوں کی تاریخ میں ایک اہم مقام عطا کر گیا۔

ان کی پہلی کتاب ۔" امریکہ کو سوادھینتا کیسے ملی" ضبط ہوگئی۔ پھر "دیش واسیوں کے نام" ایک پرچہ چھپوایا۔ وہ بھی ضبط ہو گیا۔ اپنے بنگالی دوست سوشیل چندر کی یاد میں انھوں نے بنگالی پڑھی اور بنگال کے انقلابیوں کے متعلق ایک بنگالی کتاب کا ترجمہ کیا۔ یہ کتاب "بالشویکوں کی کرتوت" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب انھوں نے خود چھاپی ــــ ایک اور کتاب "من کی لہر" لکھ کر چھاپی۔ یہ اور بات ہے کہ ان دونوں کتابوں میں انھیں پانچ سو روپے کا نقصان ہوا ــ انھوں نے روسی انقلابی "کیتھرائن" کی زندگی پر ایک کتاب لکھی ــ 'سودیشی رنگ' اور 'کرانتی کاری جنون' نام کی دو اور کتابیں تخلیق کیں۔ اس کے علاوہ اروبند گھوش کی کتاب "یوگک سادھن" کا ترجمہ بھی کیا (جسے ایک پبلشر ہضم کر گیا)۔ انھوں نے "اگیات" اور "رام" کے نام سے کچھ مضامین بھی رسائل میں چھپوائے ــــ اور آخر میں پھانسی کی کوٹھری میں لکھی "آتم کتھا" جو اُن کے مرنے کے بعد چھپ کر آئی اور فوراً ہی ضبط ہوگئی۔ (اب پھر چھپی ہے)۔

رام پرساد بسمل کی یہ سب کتابیں ہندی ادب کا ہی نہیں، ہندوستان کے انقلابی ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں اور آزادی کے جواں سال امر شہید کے انقلابی خیالات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔

اگر ان کے کارنامے اور شہادت انھیں دیش کی آزادی کی راہ میں مرنے والوں میں ممتاز کرتی ہے تو ان کا ادب انھیں دیش کے انقلابی قلم کاروں میں نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔ انھیں شاعری کا بھی شوق تھا مگر ان کے قلم کے جوہر نثر میں ہی کھلے۔

"سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

یہ غزل چاہے رام پرساد بسمل کی ہو یا نہ ہو مگر اس جذبے کی غزل ضرور ہے جو بسمل کے دل میں تھا۔ ان کی خود نوشت سوانح عمری پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سپہ گری کے پیشے کو ہی اپنایا اور شاعری کو ذریعۂ عزت نہیں سمجھا۔ اور بازوئے قاتل کا زور دیکھنے کے لیے وہ ہمیشہ انگریزی حکومت کی جڑیں اکھاڑنے کے درپے رہے اور پولیس ان کے پیچھے لگی رہی۔

ایک واقعہ ایسا بھی ہوا جس نے ان کے قدم ڈگمگا دیے۔ وہ اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ ٹہلتے جا رہے تھے۔ راستہ میں الٰہ آباد کے شام کے وقت جب وہ تروینی پر دھیان مگن تھے، ان کے ساتھیوں نے ان پر گولی چلا دی ــــ وہ بچ گئے۔ مگر اس واقعہ نے ان کے جذبات میں ہیجان پیدا کر دیا۔ پہلے تو خیال آیا کہ سنیاس لے لیں ــ مگر پھر ــ انتقام ــ انتقام ــ انتقام۔

ان کا دل ہر وقت اپنے غدار دوستوں سے انتقام لینے کے لیے بے چین رہنے لگا، جنھوں نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی اور اسی اُدھیڑبُن میں وہ بیمار ہوگئے۔ ماں نے بیٹے کے درد کو سمجھا۔

" بیٹا! تم کب تک اس فراق میں رہوگے۔"

" ماں! میں عہد کر چکا ہوں کہ دشمن سے بدلہ ضرور لوں گا۔ ایک دن ریوالور لے کر اس کے گھر گیا بھی تھا مگر وہ گھر پر نہ ملا۔ مجھے اور کوئی بیماری نہیں۔ بس اسی اُلجھن کی وجہ سے بخار آنے لگا ہے۔"

" بیٹا! تم وعدہ کرو کہ تم ان لوگوں کو جان سے نہ مارو گے جنھوں نے تمھارا خون کرنے کی کوشش کی ہے۔" "ماں ۔ بات یہ ہے کہ ۔۔"

" میں ماں کے قرض کے بدلے یہ عہد کرانا چاہتی ہوں ۔ بولو کیا جواب ہے۔"

" مگر میں ان سے بدلہ لینے کا عہد کر چکا ہوں"۔

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

م۔م۔ راجندر

لال سویٹر والا لڑکا ہر دوپہر کو اسکول کی چھٹی کے بعد، طاقت اور جوش کی تصویر بنا ہوا، اپنی سائیکل پر تیزی سے پیڈل مارتا ہوا اس کے گھر کے سامنے سے گزرتا اور موہن کے دل میں اس کے ساتھ کھیلنے کے لیے ایک عجیب تڑپ پیدا ہوتی۔ مگر وہ اپنے پاؤں سے معذور تھا اور دوسروں کی طرح بھاگ دوڑ نہیں سکتا تھا۔ اس لیے وہ نہ اس لڑکے کو اور نہ کسی اور لڑکے کو اپنا دوست بنا سکتا تھا۔ چنانچہ موہن اپنے گھر کے لکڑی کے گیٹ پر، جو دراصل ٹوٹی پھوٹی لکڑیوں اور کھپچیوں کا بنا ہوا تھا کھڑا رہتا اور وہ لال سویٹر والا لڑکا تیزی سے اسے دیکھتا ہوا گزر جاتا۔

موہن کی ماں نے اسے بتایا تھا کہ وہ لڑکا تو عمر میں اس سے بڑا تھا۔ وہ تیرہ چودہ سال کا لڑکا تھا جبکہ موہن صرف آٹھ سال کا تھا۔ موہن نے ماں کی یہ بات مان لی تھی۔ وہ اپنے پاؤں کی وجہ سے ماں کی ایسی بہت سی باتیں مان لیتا تھا اگرچہ کئی دفعہ اُس نے اپنے دل میں سوچا تھا کہ بچے تو ایک دوسرے سے چھوٹے بڑے ہوتے ہی ہیں۔ لیکن آپس میں کھیلتے رہتے ہیں۔ ہاں وہ سب بھاگتے دوڑتے تھے مگر وہ تیزی سے بھاگ دوڑ نہیں سکتا تھا۔

لیکن موہن میں ہمت اور جوش کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور اس لیے کئی دفعہ دوڑنے کی کوشش بھی کی تھی مگر گر پڑا تھا۔ اس لیے چوٹ تو کھائی تھی مگر اُس چوٹ نے اس کی اندرونی ہمت کو کم نہیں کیا تھا۔ مگر ماں، ماں تھی اور وہ موہن کو ہر اُس کام سے روکتی جس میں اسے بھاگنا دوڑنا یا دُور تک چلنا بھی ہوتا۔ بہرحال موہن اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ وہ بڑا ذہین تھا، اور اس میں تجسس کا مادّہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے سوچتا تھا اور سامنے چلتی ہوئی جنگل کی تیز ہواؤں کے ساتھ اس کا تخیل بھی بھڑک اُٹھتا۔ وہ نہ صرف ان ہواؤں کی صدائیں چھپے ہوئے گیت کو سُنتا اور قدرت کے ساز پر کان لگاتا بلکہ اِدھر اُدھر ڈربوں سے نکلتی، اُن میں گھستی اور ہر وقت بولتی ہوئی مُرغیوں کی زندگی کے بارے میں بھی سوچتا رہتا۔

اور موہن کی اسی اُدھیڑ بُن میں لال سویٹر والا لڑکا تیزی سے آتا اور اس کی طرف مُسکرا کر دیکھتا ہوا گزر جاتا۔ موہن اس کی مسکراہٹ کا جواب کبھی مسکراہٹ سے اور کبھی ہاتھ ہلا کر دے دیتا اور اُسے دائیں ہاتھ کے چھوٹے سے ٹیلے پر چڑھتے ہوئے دیکھتا اور وہ لڑکا دوسری طرف نیچے اُترتے ہی ایسے غائب ہو جاتا جیسے ٹیلے پر سے نیچے گر پڑا ہو۔ موہن کو اس پر رشک آتا اور وہ اُس کی سی چمکدار نئی سائیکل کو پانے کی آرزو کرنے لگتا۔ اسے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ وہ سائیکل پر چڑھنا سیکھ لے گا۔ مگر اس کی ماں ہمیشہ ہی کہتی کہ اس کے لیے سائیکل پر چڑھنا اور پھر توازن رکھنا بڑا مشکل ہوگا۔ لیکن موہن کو پورا بھروسہ تھا کہ وہ سائیکل چلا سکے گا۔ اس نے سامنے نالے پر پڑے لمبے اور پتلے لکڑی کے تختے کو اپنی ہمت سے عبور کر لیا تھا اگرچہ اس کا ذکر اس نے کبھی اپنی ماں سے نہیں کیا تھا کیونکہ وہ غصہ ہو جاتی۔

موہن اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ اندر سے اس کی ماں نے آواز دی۔

"موہن اندر آجا۔ تیرا دودھ تیار ہے۔"

وہ لنگڑاتا ہوا آہستہ آہستہ اندر داخل ہوا مگر

حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اس وقت بھی اپنے تصور میں سائیکل پر چڑھا ہوا تھا تیزی سے پیڈل مار رہا تھا۔ اس کی ماں نے ہمیشہ کی طرح اسے فکر مندانہ نظروں سے دیکھا اور بولی۔

"جلدی سے اپنا منھ ہاتھ دھولے اور دودھ کے ساتھ پراٹھا کھالے۔"

"ماں کیا میں دودھ پینے کے بعد باہر جاکر کھیل سکتا ہوں؟" موہن نے پوچھا۔

"ہاں مگر زیادہ دور نہ جائیو۔"

موہن سوچنے لگا کہ اس کی ماں ہمیشہ پریشان رہتی ہے، اس کے بارے میں بھی اور دوسری چھوٹی چھوٹی باتوں کے بارے میں بھی۔ کبھی وہ کہتی کہ پراٹھا ٹھنڈا ہو رہا ہے، جلدی کھالے، کبھی کہتی کہ نالے کی طرف نہ جائیو۔ یہ شاید سب کچھ اس لیے تھا کہ موہن کا باپ نہیں تھا۔

دراصل موہن کا باپ سات سال ہوئے گھر سے ایسا گیا تھا کہ پھر کبھی نہیں آیا۔ وہ زندہ تھا یا نہیں، اس کا بھی کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ موہن کو اپنے باپ کا کوئی تصور نہیں تھا سوائے اس کے کہ کوئی ایک سال پہلے اس نے اپنی ماں کو کشن چند سے بات کرتے سنا تھا۔ کشن چند ایک ترکھان تھا جو ان کے گھر سے تھوڑی دور پر ہی رہتا تھا اور ماں کے کہنے سننے سے اس کے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا تھا۔ وہ خاص طور پر ماں کی رکھی ہوئی مرغیوں کی دیکھ بھال اور بازار میں ان کے انڈے کو بکوانے میں ماں کی مدد کر دیتا تھا اور اس کے عوض ماں اسے کبھی کبھی کوئی چیز یا کچھ پیسے دیدیا کرتی تھی۔ موہن کو جب یہ پتہ لگا تھا کہ اس کا باپ جب وہ بہت چھوٹا تھا تو گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا بڑا دکھ ہوا کیونکہ ماں بھی اکیلی رہ گئی تھی اور پھر اسے بھی تو باپ کی ضرورت تھی۔ جب وہ اپنا دودھ اور پراٹھا ختم کر چکا تو ماں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"اچھا تو ماں میں باہر جا رہا ہوں۔"

"چلے جاؤ مگر دور نہ جانا۔" ماں نے دہرایا۔

اگلے دن جب موہن کی ماں مرغیوں کے لیے دانہ لانے بازار چلی گئی اور اسے گھر کے باہر ہی کھیلنے کے لیے کہہ گئی تو موہن نے اپنے ایک ٹین کے ڈبے کو ڈھونڈنا شروع کر دیا جس میں اس کے کنچے اور گولیاں بھری ہوئی تھیں، اسے یہ ڈبہ کہیں نہیں ملا اور وہ پیچھے کی طرف اس کوٹھری میں گھس گیا جہاں ماں کا دنیا بھر کا کباڑ پڑا رہتا تھا۔ اسے اس کوٹھری میں کئی چھوٹی چھوٹی ٹوٹی پھوٹی چیزیں نظر آئیں جنھیں وہ کبھی اٹھاتا اور کبھی رکھ دیتا۔ موہن کا اس کباڑ میں بڑا جی لگا اور اس نے ٹوٹے ہوئے صندوق کے پیچھے کاٹھ کے کچھ ٹوٹے ہوئے سامان کو اٹھا کر بھی دیکھنا شروع کر دیا۔ ایک جگہ کچھ بوریاں پڑی ہوئی تھیں اور اس نے انھیں ہٹایا تو نیچے سے کئی سالوں کی رکھی ہوئی ایک ٹوٹی ہوئی سی تین پہیوں اور ٹھوس ٹائروں والی ایک زنگ آلود سائیکل نظر آگئی۔ یہ سائیکل موہن کی ماں نے تقریباً پانچ سال ہوتے موہن کے لیے کسی سے پانچ دس روپے میں پرانی لے لی تھی مگر موہن اپنے پاؤں کی وجہ سے اس وقت اسے کوئی خاص نہیں چلا سکا تھا اور جب سے یہ اسی کباڑ خانے میں پڑی تھی اور اسے موہن کی ماں بھول بھی گئی تھی۔

موہن کا دل اس سائیکل کو دیکھ کر خوشی سے دھڑکنے لگا، اگرچہ عمر کے لحاظ سے یہ سائیکل اب اس کے لیے موزوں نہیں تھی۔ اسے کباڑ میں سے نکالنے کے لیے موہن کی ساری طاقت لگ گئی۔ کسی اور کی نظروں میں یہ پرانی ٹوٹی پھوٹی سائیکل ایک کباڑ تھی مگر ہانپتے ہوئے موہن کی نظروں میں یہ سائیکل تھی اور ایک خوبصورت سائیکل!

جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا تھا وہ ایک نئی ہی دنیا میں پہنچ گیا اور سائیکل کو دھکیلتا ہوا پہلے اسے کوٹھری سے باہر اور پھر گھر کے باہر لے آیا۔ اس نے ایک پرانے کپڑے سے اسے صاف بھی کر لیا۔ سامنے وہ ڈھلوان راستہ تھا جس پر نیچے اتر کر اس مقام پر پہنچ جاتے تھے جہاں سے ٹیلے پر چڑھنے کا صاف مگر ٹیڑھا میڑھا راستہ تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ساری سائیکل زنگ آلود تھی اور پہیے مشکل سے چل رہے تھے۔ گھر سے تھوڑی دور تک لانا ہی موہن کے لیے بڑی جدوجہد تھی مگر کچھ دور چلنے کے بعد پہیے آرام سے چلنے لگے اور موہن اس پر سوار ہو کر اسے ڈھلوان راستے پر لے آیا۔

یہاں پہنچ کر اور سائیکل کو پاکر موہن اپنی ماں کو بھول گیا، کشن چند کو بھول گیا، اپنے کئے ہوئے وعدے کو بھول گیا اور ماں کی سڑک پر نہ کھیلنے کی تنبیہہ کو بھول گیا۔ اگرچہ وہ ایک ٹانگ سے پیڈل ٹھیک مار رہا تھا مگر دوسری ٹانگ کا پاؤں بے کار ہونے کے باعث وہ اس سے دوسرا پیڈل پوری طرح نہیں مار سکتا تھا۔ مگر وہ اپنی ہمت سے یہاں تک چلا آیا تھا۔ اب یہاں سے ڈھلوان شروع ہوتی تھی اور موہن تذبذب میں پڑ گیا۔ لیکن اس نے ہمت ہارنا نہیں سیکھا تھا اور وہ سائیکل پر سے نہیں اترا۔ اس نے پورا زور لگا کر پیڈل گھمائے اور سائیکل نیچے ڈھلوان پر اتر پڑی۔ موہن کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا اور وہ اپنے اچھے پاؤں سے پیڈل مارتا رہا۔

سائیکل ڈھلوان کی وجہ سے ہر لمحے زیادہ سے زیادہ تیزی سے نیچے اترنے لگی۔ یہ کافی لمبی ڈھلان تھی اور سائیکل بے پیڈل مارے بھی بہت تیز ہو گئی، مگر موہن بالکل پریشان نہیں ہوا۔ اس کا دل اچھل کر گویا اس کے منھ میں آگیا تھا اور جوش و مسرت میں اس کا ذہن ہوا میں اڑ رہا تھا۔ موڑ پر پہنچ کر اس نے سائیکل کا ہینڈل موڑنے کی کوشش کی لیکن سائیکل کی رفتار اتنی تیز تھی کہ نیچے موڑ پر الٹ گئی اور موہن سر کے بل جھاڑیوں

میں زور سے گرا۔

موہن گرتے ہی چیخا اور رویا۔ خوش قسمتی سے اسے زیادہ چوٹ نہیں لگی کیونکہ جھاڑیوں نے اسے تھام لیا تھا۔ وہ درد سے کراہتا ہوا کھڑا ہو گیا اور اپنی انگلیوں اور ٹخنوں پر خراشوں کے نشان دیکھ کر خوف و ہراس میں پھر رونے لگا۔ مگر اچانک اس نے دیکھا کہ کشن چند اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ اسے دیکھ کر فوراً چپ ہو گیا۔ کشن چند پاس ہی کام کر رہا تھا اور اس نے اسے ڈھلوان پر سے سائیکل پر اترنے اور پھر گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے موہن کا بازو پیار سے پکڑا اور بولا۔

"موہن تو یہاں کیوں آیا، اور یہ سائیکل کس کی ہے؟"

موہن نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ روتا رہا۔ کشن چند بولا۔

"چلو گھر چلو۔"

کشن چند نے ایک ہاتھ سے موہن کو سہارا دیا اور ایک ہاتھ سے سائیکل اٹھا کر کندھے پر رکھ لی۔ اب یہ چڑھائی کا راستہ نیچے کی اترائی سے اور وہ بھی سائیکل پر چڑھتے ہوئے، کہیں زیادہ دشوار تھا اور موہن کو کافی مشکل پیش آئی۔ ابھی وہ پوری طرح اوپر بھی نہیں پہنچے تھے کہ انھیں ماں نظر آ گئی جو گھبرائی ہوئی نظروں سے نیچے دیکھ رہی تھی۔ لیکن اب موہن کی مسرت اور جوش لوٹ آیا تھا اور ماں کی ناراضگی اور گھبراہٹ نے بھی انھیں کم نہیں کیا۔ نیچے ڈھلوان پر اتر کر اور سائیکل پر چڑھ کر جو مسرت وہ پا چکا تھا، اس کے مقابلے میں اس کی چوٹیں کچھ بھی نہیں تھیں۔ ماں نے اس کے اوپر آتے ہی غصے میں سوالوں کی بوچھاڑ کر دی مگر کشن چند نے موہن کا ساتھ دیا اور سب کچھ سن کر ماں کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ماں نے موہن کا ہاتھ پکڑا، اسے چلنے والی کھپچیاں دیں جو موہن گھر میں ہی چھوڑ آیا تھا اور جن کے بغیر وہ تقریباً گھسٹتا ہوا اوپر آیا تھا اور تینوں گھر آ گئے۔ گھر پہنچ کر ماں بولی۔

"آ میں تیری خراشوں پر تیل لگا دوں۔"

"موہن کی ماں، کشن چند بولا "موہن کے حوصلے کو کم نہ کر۔ یہ کوئی چوٹیں ہیں؟ موہن تو بڑا ہمت والا ہے۔ دیکھ پڑھائی میں کتنا ہوشیار ہے۔ چھٹیاں ہیں تو گھر پر کیسے بیٹھے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تو اگر اسے کوئی پرانی سائیکل دو پہیوں کی چھوٹی سی بھی خرید دیگی تو یہ اسے بھی چلا لے گا۔ ایک وقت آئے گا کہ یہ اس لال سویٹر والے لڑکے کی طرح ٹیلے کے اوپر بھی اپنی سائیکل پر چڑھ جائے گا۔ تو اس کی یہ چلنے والی لکڑیاں بھی پھینک دے اور اسے اپنے آپ چلنے دیا کر۔ اب بھی تو اوپر خود ہی آیا تھا۔ تھوڑی بہت تکلیف ہوئی تو کیا۔ یہ تو شیر بچہ ہے۔"

اور موہن نے وہیں اپنی کھپچیاں پھینک دیں۔ اور ماں کو دیکھ کر بولا۔

"ماں ٹھیک ہے، میں ان کے بغیر ہی چلنے کی کوشش کروں گا اور ہاں میں دو پہیوں کی سائیکل بھی چلا لوں گا۔ ماں بالکل مشکل نہیں ہے۔ میں ایک دن اپنی سائیکل پر ٹیلے کے اوپر بھی چڑھ جاؤنگا ماں دیکھ لینا۔"

اور موہن کی ماں نے آگے بڑھ کر اسے بار بار چوم لیا اور موہن اپنا سینہ پھلا کر حوصلے کی تصویر بنا اس طرح مسکرا رہا تھا جیسے اگر اسے ماں نے سائیکل لا دی تو وہ سب سے پہلے ٹیلے کے اوپر ہی چڑھے گا۔۔۔!۔ ●

بقیہ، فاضل اراضی کی از سرِ نو تقسیم۔ سب سے پہلا کام

زیرِ عمل ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن نے اس منصوبے کو حال ہی میں جاری کیا ہے۔ اس میں فاضل اراضی کی تقسیم کے لیے مناسب اقدامات پر زور دیا گیا ہے۔ اس دستاویز میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ فالتو اراضی کے تخمینوں کو دوبارہ سے آنکنا ہے، خاص کر آبپاشی والے رقبوں میں یہ کام ضرور کیا جائے گا۔ آبپاشی والے رقبے میں زمین کی بالائی حد مقابلتہً کم ہے۔ آیندہ پانچ برسوں میں اس محاذ پر کی جانے والی کوششوں کے بارے میں اس منصوبے میں کوئی زیادہ وضاحت نہیں ہے۔ درختوں کے لگانے یا گایوں کی مصنوعی تخم ریزی کے سلسلے میں جس طرح واضح نشانے متعین کئے گئے ہیں، اس طرح کے نشانے تقسیم اراضی کے لیے نہیں دیئے گئے۔

اگر سرکار غریبی دور کرنے کے لیے اپنے متعدد اعلانات کو معتبر بنانا چاہتی ہے تو اسے اراضی کی تقسیم نو کے سلسلے میں بڑھے ہوئے نشانوں کی کھل کر وضاحت کرنی ہوگی اور یہ کام ساتویں منصوبے میں کرنا ہوگا۔ اس کام میں دیہی عوام اور مختلف تنظیموں کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہوگا۔ ●

بقیہ، رام پرساد بسمل

"تمھیں اپنا یہ عہد میری خاطر توڑنا پڑیگا۔ یہ میرا اصرار ہے۔

۔۔ میں تمھاری ماں ہوں۔

"اچھا ماں! جیسا آپ کا حکم۔"

اور فرماں بردار بیٹا۔ رام پرساد بسمل سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چنبل گھاٹی میں واقع اپنے آبائی گاؤں میں ایک کسان کا سادہ جیون گذارنے لگا۔۔ اور بندوق اور ہل اور پھاوڑا سنبھال لیا۔ مگر قلم پھر بھی ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ انھوں نے "مالِ شنوکوں کی کرت" اور "من کی لہر" کتابیں اسی زمانے میں لکھیں۔ رام پرساد بسمل مویشیوں کو چرانے جنگل لے جاتے۔ اُدھر مویشی ادھر میں چرتے رہتے، اِدھر بسمل کاغذ پنسل لیے لکھتے رہے، جب مویشی کہیں دور نکل جاتے تو کاغذ پنسل چھوڑ کر اور لاٹھی لے کر انھیں ہنکانے چل دیتے لیکن بسمل کی زندگی کا یہ صفحہ جلد ہی الٹ گیا۔ ●

(باقی آیندہ)

شہپر رسول

انا کا سحر ٹوٹا اور حاجت کا سوال اٹھا
تو شاہِ وقت کے ہاتھوں پہ بیعت کا سوال اٹھا

مرا ہی نام ہم عصروں نے ہر فہرست سے کاٹا
مجھی سے روٹھ بیٹھے جب بھی قامت کا سوال اٹھا

مدینہ لکھ کے نیچے جال کے رکھا شکاری نے
کسی طائر کے سینے میں جو ہجرت کا سوال اٹھا

یہ کیا ساعت ہے صفحوں سے ہر اک تحریر غائب ہے
یہ کس بے نام لمحے میں محبت کا سوال اٹھا

جوابوں کے سبھی چہرے تشفی کر نہیں پائے
تخیل کے بدن پر ایسی صورت کا سوال اٹھا

میں کس آب و ہوا میں ہوں میں کس دنیا میں رہتا ہوں
مرے دل میں تو خود سے ہی عداوت کا سوال اٹھا

اسی نے ہجر کی وحشت بھی بخشی ہے مجھے شہپر
کیا زنجیر بھی اس نے جو رخصت کا سوال اٹھا

●

عمران عظیم

سلوٹ پڑی کچھ ایسی انا کے لباس میں
سب داستان آ گئی اک اقتباس میں

تاریک شب نگاہ کی دشمن تو تھی مگر
جگنو تلاش خوب کئے ہم نے گھاس میں

لفظوں کی خوشبوؤں میں کوئی بات ہے نئی
دل کی کھلی کتاب جو رکھی ہے پاس میں

پچھلے دنوں کی بات مجھے یاد آ گئی
خوش ہے اُدھر کوئی تو اِدھر ہوں اداس میں

ہوش و حواس بھی کسی کوچے میں گم ہوئے
آنکھیں بھی کھو گئیں کسی منظر کی آس میں

شاید عظیم پھول کوئی خوبرو ملے
صحرا نورد میں بھی رہا اس قیاس میں

●

فضا ابن فیضی

کیا ضروری، داستاں در داستاں لکھنا مجھے
ہو اگر لکھنا، سرِ اوراقِ جاں لکھنا مجھے

میں مکمل ہو گیا جس دن، تو پھر مر جاؤں گا
بس ادھورا ہی ذرا لکھنا، جہاں لکھنا مجھے

کیا کروں، چہرے بہت اور پہلوِ آئینہ تنگ
نام سے اپنے، حدیثِ دیگراں لکھنا مجھے

کوئی موجِ خوں اٹھی، تو بیکراں ہو جاؤں گا
تم نہ اپنے ساحلوں کے درمیاں لکھنا مجھے

میں کنارِ رہگزر، غربت کا مارا اک شجر
دھوپ میں جلتا ہوں، لیکن سائباں لکھنا مجھے

دو سروں کی نیند سے بوجھل ہیں کیوں پلکیں مری
اب یہ کرنا، محملِ خوابِ گراں لکھنا مجھے

تیرے شعلوں سے تو کچھ اونچا ہی نکلا قد مرا
کون سی اس میں قباحت ہے، دھواں لکھنا مجھے

کیا بدل سکتی ہے لفظوں سے کسی کی شخصیت
فرق کیا پڑتا ہے، تم نامہرباں لکھنا مجھے

باہمہ پیچیدگی، اسلوب ہے کتنا رواں
پتھروں کے منہ میں پانی کی زباں لکھنا مجھے

اے فضا کب تھا ادب سے رشتۂ کسبِ معاش
رائگاں در رائگاں در رائگاں لکھنا مجھے

●

راجیندر بہادر موج

کسی کو فکرِ تسخیرِ جہاں کی
کوئی کرتا ہے باتیں آسماں کی

نظر گلشن پہ ہے برقِ تپاں کی
کریں فکر اپنے اپنے آشیاں کی

ہوائیں گرم ہر سو چل رہی ہیں
یہ حالت ہے بہارِ گلستاں کی

کلی پژمردہ ہے گل سر خمیدہ
بہاروں میں بھی صورت ہے خزاں کی

کہیں مذہب کہیں بھاشا کے جھگڑے
یہ ہے بد قسمتی اپنے یہاں کی

جلا گلشن تو پھر کیا بچ سکے گا
تجھے تو فکر ہے سارے جہاں کی

دلوں پر آج طاری بے حسی ہے
یہ کیسی نیند ہے خوابِ گراں کی

بڑے کمزور ملکوں کو ستائیں
یہ کمزوری ہے تنظیمِ جہاں کی

مسافر توڑتے ہیں کشتیوں کو
بڑی مشکل ہے میرِ کارواں کی

اہنسا وادی دیشوں کو لڑائیں
سیاست ہے یہ اربابِ جہاں کی

جو چیخے گا سنی جائے گی اس کی
نہیں سنوائی کوئی بے زباں کی

مٹیں دیر و حرم کی دوریاں یوں
صدا ہو ایک ناقوس و اذاں کی

سبھی اہلِ مذاہب متحد ہوں
کہ قسمت جاگ اٹھے ہندوستاں کی

رہیں سرگرمِ کار اے موج ہر دم
نصیحت ہے یہی آبِ رواں کی

●

تبصرہ

واجد سحری کا شعری مجموعہ "سنہری آنچ"

ہر انسان اپنے عہد اور سماج سے اثر قبول کرتا ہے اور اگر وہ صاحب فکر انسان ہے تو اس تانے بانے میں اپنی انفرادیت کا اظہار بھی کر سکتا ہے۔ ادب سماجی عمل کا ہی پرتو ہوتا ہے۔ جہاں تک رام پور کے جناب واجد سحری کا تعلق ہے، انھوں نے ہندوستان کے ایک ایسے تاریخی اور انقلابی دور میں قدم رکھا جو سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے بےحد پیچیدہ ہے۔ چوں کہ انسان کی زندگی جذبات و احساسات سے مرکب ہے۔ اسی لیے ادب کا زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ حساس انسان کو مختلف کیفیتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ غمِ روزگار بھلانے کے لیے اکثر شاعری کا سہارا لیا کرتا ہے۔ ع

جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

شاعری کی حرارت اور چمک سے وہ حقیقتوں کے اظہار کا حسین تر راستہ تلاش کیا کرتا ہے۔ کچھ ایسا ہی تاثر مرتب ہوتا ہے جناب واجد سحری کی غزلیات کے مطالعے سے جو کہ "سنہری آنچ" کے نام سے کتابی صورت میں گزشتہ دنوں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ واجد سحری کو شاعری ورثہ میں ملی۔ کیونکہ وہ حضرت سحر رام پوری کے خواہرزادے ہیں۔ یہ کتاب حسنِ صوری و معنوی سے پوری طرح آراستہ ہے اور ایک عرصے کے بعد ایک حسین کتاب دیکھنے کو ملی ہے۔ اس کتاب پر پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر اجمل اجملی، جناب مخمور سعیدی اور جناب عشرت کرتپوری وغیرہ نے مہرِ تصدیق ثبت کی ہے۔ ڈاکٹر کشفی کا خیال ہے کہ واجد سحری صاحب کی غزل میں ان کے ذاتی واردات اور اس عصر کے مسائل کی جھلکیاں فنی اہتمام کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ اس کتاب کے نام پر آپ نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ سنہری کا ٹکڑا فنی آراستگی کا اشاریہ ہے اور آنچ اُن کے جذبات کی علامت۔ ڈاکٹر اجمل اجملی نے فرمایا کہ واجد سحری نے ابھی اپنا شعری سفر شروع کیا ہے اس لیے ان کی شاعری کے بارے میں کوئی حکم لگانا فی الحال قبل از وقت ہوگا۔۔۔ واجد سحری کے اندازِ غزل گوئی میں ہر سچے شاعر کی طرح اُن کی اپنی شخصیت کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کا خیال ہے کہ دورِ حاضر کا درد و کرب، اندوہ و ملال اور جور و ستم ان کے اشعار کے مختلف پیمانوں میں زہر گھول رہا ہے۔ جناب مخمور سعیدی نے لکھا کہ قدرت نے واجد سحری کو تخلیقی ذہن بھی عطا کیا ہے اور اس کے اظہار کے لیے انھیں شعر گوئی کی صلاحیت ودیعت کی ہے۔ جناب عشرت کرتپوری نے لکھا کہ ان کی غزلوں میں غزل کی تہذیب اور شائستگی کے ساتھ احساس کا نیا پن، عصری حسیت، ذات کا کرب اور خوب سے خوب تر کی تلاش ملتی ہے۔

بلاشبہ جناب واجد سحری کی شاعری کا مستقبل روشن ہے۔ ان کے اشعار اُن کی اُفتادِ طبع کے غماز ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم کے بقول واجد سحری ایک سچے اور کھرے فنکار کی طرح دولت اور اس کے حصول کے ذرائع سے بے نیاز اپنی دنیا میں گُم ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

ٹمٹماتے ہیں ابھی مسجد و مندر کے چراغ
اس سے پہلے کہ یہ بجھ جائیں، جلا لو مجھ کو

احساس کی دولت کو سونپیں میں کیسے واجد
اس دور کا سینہ تو چٹان کا سینہ ہے

جس نے دُشمن کو سمجھنے کا سلیقہ بخشا
کیسے اس دوست سے پھر آنکھ بچائی جائے

آنکھیں جو برستی ہیں موسم کی طرح واجد
ان کو بھی محبت سے ہم نے تو دُعا دی ہے

اے تقدیر کو رونے والو
دیپ جلاؤ عزم و عمل کے

اس کتاب کا سرورق مشہور و معروف خطاط جناب خلیق ٹونکی نے تیار کیا ہے۔ اس خوبصورت کتاب کی قیمت صرف بیس روپے ہے جو اُردو شاعری کے شوقین حضرات کے لیے اسے پڑھنے اور اپنی لائبریری کی کتابوں میں شامل کرنے کی کھُلی دعوت ہے۔

عادل صدیقی

غریبی دُور کرنے میں نئے بیس ۲۰ نکاتی پروگرام کی اہمیت

۸۔ سب کے لیے صحت :۔ صحت کی ابتدائی دیکھ بھال سے متعلق ضرورتوں کو پورا کیا جائے گا۔ کوڑھ، ٹی۔بی، ملیریا، گلہڑ، اندھے پن کی روک تھام کے اقدامات کئے جائیں گے۔ بچوں کے ٹیکہ لگانے کے پروگرام کو مؤثر ڈھنگ سے چلایا جائے گا۔ دیہی علاقوں میں صفائی ستھرائی کے پروگرام، عورتوں کی صحت کے پروگرام اور معذور افراد کی بحالی پر خاص زور دیا جائے گا۔

۹۔ دو بچوں کا تصوّر :۔ اس تصور کو رضاکارانہ طور پر مقبول بنایا جائے گا۔ والدین میں احساس ذمہ داری پیدا کیا جائے گا۔ بچوں کی شرح اموات کو گھٹانے کی کوشش کی جائے گی۔ زچہ بچہ کی دیکھ بھال کی خدمات کی توسیع عمل میں آئے گی۔

۱۰۔ تعلیم کی توسیع :۔ پرائمری تعلیم کو عام کرنا، لڑکیوں کی تعلیم پر زور دینا، تعلیمی رضابات کو ہر سطح پر بامقصد بنانا، غیر رسمی تعلیم کو عام کرنا، خواندگی کی توسیع کرنا، ہنر مندیوں کو فروغ دینا، تعلیم بالغان کے پروگراموں کو توسیع دینا، طلباء اور رضاکار اداروں کا اس سلسلے میں تعاون حاصل کرنا، قومی یک جہتی اور اتحاد پر زور دینا، سماجی اور اخلاقی اقدار کو پروان چڑھانا اور ملک کے ثقافتی ورثے سے باخبر کراکر نوجوانوں میں احساسِ خودی پیدا کرنا اس سلسلے کے تحت آتے ہیں۔

۱۱۔ شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کے ساتھ انصاف :۔ اس سلسلے میں آئین میں مندرج قوانین پر موثر عمل درآمد کے لیے اقدامات کئے جائیں گے۔ اراضی کی الاٹ منٹ کے پروگراموں کو موثر بنایا جائے گا۔ تعلیمی معیار بلند کرنے کے لیے خصوصی کوچنگ پروگرام شروع کئے جائیں گے۔ صفائی کرمچاریوں کے لیے خصوصی پروگرام شروع کرکے ان کی حالت سدھارنے اور جھاڑو دینے کے طریقوں کو بدلنے کی کوشش کی جائے گی۔ انھیں سماج میں شامل کرنے کے لیے بحالی کے بھرپور پروگرام شروع کئے جائیں گے۔ اپنے گھروں سے اُجڑنے والے قبائل کی بحالی کے لیے اقدامات کئے جائیں گے۔

۱۲۔ عورتوں کے لیے مساوات :۔ عورتوں کا سماجی رتبہ بلند کرنے، عورتوں کے مسائل اور حقوق کے تئیں عوامی شعور بیدار کرنے، ان کو روزگار دلانے کے واسطے تربیتی پروگرام شروع کرنے، سماجی اور اقتصادی معاملات میں ان کو شامل کرنے، جہیز کے خلاف عوامی شعور بیدار کرنے اور انسدادِ جہیز قانون پر مؤثر عمل درآمد کے لیے کوشش کرنے کے لیے خصوصی اقدامات کئے جائیں گے۔

۱۳۔ نوجوانوں کے لیے نئے مواقع :۔ نوجوانوں کے لیے کھیلوں کے نئے نئے مواقع پیدا کرنے، مہم جویانہ اور ثقافتی سرگرمیوں کو بڑھانے، جسمانی صحت کے پروگراموں کو توسیع دینے، نوجوانوں کو بڑے پیمانے پر قومی تعمیری پروگراموں میں شامل کرنے، مثلاً یہ کہ گنگا کی صفائی کے پروگرام میں ان کا تعاون حاصل کرنے، ماحول کا تحفظ کرنے، تعلیم کو عام کرنے کے پروگراموں سے انھیں جوڑنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہر شعبے میں نمایاں صلاحیت کے نوجوانوں کی نشاندہی کی جائے گی اور انکی صلاحیتوں کے فروغ کے لیے ضروری کوششیں کی جائیں گی۔ نوجوانوں کو قومی یک جہتی، ثقافتی اقدار، سیکولرزم اور سائنسی مزاج بنانے کے پروگراموں سے وابستہ کیا جائے گا۔ نہرو یووک کیندروں کا دائرہ کار بڑھایا جائے گا۔ نیشنل سروس اسکیم اور نیشنل کیڈٹ کور کو مستحکم بنایا جائے گا۔ دیہی نوجوانوں کی بہبود سے متعلق رضاکار اداروں کو مستحکم بنایا جائے گا۔

۱۴۔ تعمیر مکانات :۔ دیہی غریب عوام کے لیے مکانات بنانے کی جگہ فراہم کی جائے گی۔ تعمیر مکانات کے پروگراموں کی توسیع عمل میں آئے گی۔ غریب عوام اور شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کے لیے مکانات کی فراہمی پر خصوصی زور دیا جائے گا۔ کم لاگت پر تعمیری سامان فراہم کیا جائے گا۔

۱۵۔ گندی بستیوں کی اصلاح :۔

گندی بستیوں کی توسیع کو روکا جائے گا۔ اِن علاقوں میں بسنے والوں کو ضروریاتِ زندگی مہیا کی جائے گی۔ شہری علاقوں میں مکانات کی منصوبہ بندی اور باقاعدگی کے ساتھ اس کے فروغ پر زور دیا جائے گا۔

۱۶۔ جنگل بانی کی نئی حکمتِ عملی :۔

عوامی اشتراک سے شجر کاری کے پروگراموں کو تیز کیا جائے گا۔ قبائلی آبادی اور مقامی برادریوں کو جنگلاتی دولت اور ایندھن سے استفادہ حاصل کرنے کے حق کا تحفظ کیا جائے گا۔ بیکار پڑی اراضی کو دوبارہ سے قابلِ کاشت بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ پہاڑوں، ریگستانی علاقوں اور ساحلی علاقوں میں ہریالی اُگانے پر زور ہوگا۔

۱۷۔ ماحول کا تحفظ :۔

عوامی شعور کی بیداری، عوامی اشتراکِ عمل کا حصول، پراجیکٹوں کے انتخاب کے وقت اس پہلو کو سامنے رکھنا، اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔

(باقی صفحہ ۹ پر)

Licensed U (DN) 65 to post without prepayment at NDPSO, New Delhi.

Vol. 6, No. 12 YOJANA (URDU) 16-30th September, 1986

خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت

چھوٹا کنبہ رکھنے والوں کو اعزازی کارڈ دینے کی اسکیم

ملک کے گذشتہ چالیس پچاس برسوں کے حالات پر نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک طرف آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور دوسری طرف غریبی، بیکاری اور بھکمری بڑھتی رہی ہے۔ آبادی کے لحاظ سے ہندوستان دُنیا میں چین کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ ہندوستان کی آبادی دُنیا کی کل آبادی کے ساتویں حصّے کے برابر ہے۔ دوسرے الفاظ میں دُنیا کا ہر ساتواں آدمی ہندوستانی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہندوستان میں ہر پندرہ سیکنڈ بعد ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ حالات تشویشناک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ آبادی میں اضافے کا انحصار خاص کر شرحِ پیدائش اور شرحِ اموات پر ہے۔ جہاں ہماری شرح پیدائش میں کوئی نمایاں کمی دیکھنے میں نہیں آتی ہے وہاں شرح اموات میں، ترقیاتی سرگرمیوں کے نتیجے میں معیارِ زندگی بہتر ہونے نیز طبّی سہولیات اور حفظانِ صحت کے انتظامات میں اضافہ ہونے کی بدولت، تیزی سے کمی آئی ہے۔ شرح پیدائش اور شرح اموات کے مابین فرق کے بڑھنے کا نتیجہ آبادی میں سریع اضافہ ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے ہمیں ایک طرف تو شرح پیدائش کو گھٹانا اور آبادی پر کنٹرول رکھنا ہوگا اور دوسری طرف اقتصادی ترقّی کی مساعی کو تیز تر کرنا ہوگا۔ معاشی نظام کو بہتر بنانا ہوگا اور اس کے مختلف شعبوں میں توازن قائم کرنا ہوگا تاکہ ملک میں پیداوار بڑھے، لوگوں کو روزگار اور آمدنی کے زیادہ اور بہتر مواقع میسّر ہوں اور ان کا معیارِ زندگی بلند ہو سکے۔ آبادی جتنی زیادہ ہوگی اتنے ہی زیادہ مسائل کا سامنا کرنا ہوگا اور جتنی کم ہوگی اتنی ہی زیادہ سہولیات ہمیں میسّر ہوں گی اور ہم خوشحالی کی منزل کی طرف بڑھ سکیں گے۔

اضافۂ آبادی کو روکنے کی کوششیں

حکومت ان دونوں سمتوں میں تندہی سے کوشاں ہے۔ پنجسالہ منصوبوں، بیس نکاتی پروگرام نیز صنعتی و اقتصادی ترقی کے دیگر بہت سے پروگراموں کے ذریعے اقتصادی ترقی کی رفتار تیز کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں اور خوشگوار نتائج برآمد ہونے شروع ہو گئے ہیں اسی طرح آبادی پر کنٹرول کے لیے بھی خاندانی منصوبہ بندی کے پروگراموں کو تیزی سے آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ اشیائے منع تولید، نس بندی اور حمل بندی کے ساتھ ساتھ خواتین میں لُوپ اور "کاپرٹی" اور کھانے کی گولیوں کے استعمال کی تشہیر و اشاعت تمام ذرائع سے کی جا رہی ہے اور عوام کو کنبہ چھوٹا رکھنے کی تدابیر اختیار کرنے پر مائل کیا جا رہا ہے۔

وزیر ریاست برائے صحت و خاندانی منصوبہ بندی جناب ایس۔ کرشن کمار نے حال ہی میں بتایا ہے کہ کئی برسوں بعد پہلی بار ۸۶-۱۹۸۵ء میں حکومت نے آئی۔ یو۔ ڈی (لوپ یا کاپرٹی وغیرہ) اور دوسرے مانع حمل طریقوں کو مقبول بنانے کا نشانہ سو فیصد حاصل کر لیا ہے۔ مردانہ نس بندی یا (Sterilization) کا نشانہ نوّے فیصد حاصل کیا گیا۔ انھوں نے مزید بتایا ہے کہ ستمبر سے خاندانی منصوبہ بندی کے لیے ایک سہ سالہ سرگرم مہم شروع کی جا رہی ہے جس میں پردھان منتری شری راجیو گاندھی ذاتی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس پروگرام کو ایک وسیع عوامی تحریک کی شکل دی جائے گی۔ خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام آئندہ تین برسوں میں ایک نئی سمت اختیار کریگا۔ تمام سرکاری اور غیر سرکاری ایجنسیوں کو چھوٹے کنبے کے نظریے کی اشاعت کرنی چاہیئے اور اس پیغام کو نچلی سے نچلی سطح کے عوام تک پہنچانا چاہیئے۔

مانع حمل اشیاء کو مقبول بنانے کے لیے بڑے پیمانے پر ایک مارکیٹنگ حکمتِ عملی بھی

(باقی صفحہ ۹ پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یکم تا ۳۱ر اکتوبر ۱۹۸۶

دو روپے

ترپردیش میں تکنیکی تعلیم
ی ترقی

(ڈاکٹر محمد مزمل)

مہاتما گاندھی

(ڈاکٹر زرینہ عقیل احمد)

کے۔ بی۔ شرما

گلھڑ کا مرض

جسم میں آیوڈین کی قلّت کا شاخسانہ

جس طرح جسم میں آئرن (لوہا) کی کمی واقع ہونے سے اینیمیا۔ یعنی خون کی قلّت کا مرض لاحق ہو جاتا ہے اُسی طرح آیوڈین کی کمی واقع ہونے سے ایک اور مرض انسان کو آن پکڑتا ہے جس کے متعلق لوگوں کو زیادہ علم نہیں ہے۔ ہمیں اپنی ضرورت بھر آیوڈین پانی سے مل جاتی ہے۔ کیوں کہ یہ پانی میں حل ہوتی ہے لیکن بعض علاقوں میں خاص طور پر جہاں چونے کا پتھر بکثرت ہوتا ہے، وہاں کے پانی میں آیوڈین کی مقدار بہت قلیل ہوتی ہے اور وہیں کے لوگوں کو اکثر و بیشتر گلھڑ کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ یہ مرض ہندوستان کے شمالی پہاڑی علاقوں میں زیادہ دیکھنے میں آتا ہے۔ لیکن یہ بات نہیں کہ یہ بیماری صرف ہندوستان ہی میں پائی جاتی ہے انگلستان میں ڈربی شائر اور سوئٹزر لینڈ کی بعض وادیوں میں یہ مرض عام ہے۔ حالانکہ یہ ممالک بہت ترقی یافتہ ہیں۔ گلھڑ کئی قسم کا ہوتا ہے مگر جس گلھڑ کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ صرف آیوڈین کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ دراصل جسم کے اندر ایک خاص قسم کا غدود ہوتا ہے جسے تھائرائیڈ کہتے ہیں اسی غدود میں سے ایک خاص قسم کا مواد رِس کر خون میں شامل ہو جاتا ہے اور یہ رس جسم میں توازن پیدا کرتا ہے۔ اس رس کا ذخیرہ قائم کرنے میں آیوڈین کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اُن علاقوں میں جہاں پانی میں آیوڈین نہیں ہوتی اس کی کمی کے باعث بچے مرض میں مُبتلا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ پیدائش کے وقت وہ بالکل نارمل ہوتے ہیں تاہم بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کُند ذہن، ڈھیلے ڈھالے اور احمق ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ فاطر العقل بن کر رہ جاتے ہیں۔ بچوں میں ذہنی ناتمامی کی یہ ایک عام مثال ہے اور اگر بروقت پتہ چل جائے تو یہی بچے تھائرائیڈ کی گولیاں کھانے سے بالکل صحت یاب ہو جاتے ہیں۔

لیکن کہتے ہیں کہ بیماری کا علاج کرنے کی نسبت اس کی روک تھام کر لینا بہتر ہوتا ہے، اُسی مقولے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اب اس خوفناک مرض کی روک تھام یوں کی گئی ہے کہ جن علاقوں میں یہ عام طور سے پایا جاتا ہے وہاں کی آبادیوں یعنی گاؤں اور شہروں میں پینے کے پانی میں آیوڈین ملا دی جاتی ہے۔

اب حکومتِ ہند نے فیصلہ کیا ہے کہ ساتویں پانچسالہ پلان کے آخر تک کھانے کے کام آنے والا جس قدر نمک تیار ہوا کرے اس میں آیوڈین ملی ہوئی ہونی چاہیئے۔ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے مقصد سے جو مطالعاتی گروپ قائم کیا گیا تھا اُس نے سفارش کی کہ آیوڈین والا نمک تیار کرنے کا پروگرام بتدریج اختیار کیا جائے اور ابتدائی برسوں میں اُن کارخانہ داروں کو کچھ مالی امداد بھی دی جائے گی جو آیوڈین ملا ہوا نمک تیار کریں گے۔

بابائے قوم مہاتما گاندھی نے بھی نمک سازی کی مُہم چلائی تھی اور ان کی برابر یہ مانگ رہی کہ نمک پر سے محصول ہٹا لیا جائے۔ عام نمک جو ملک کے کندھوں پر سے برطانوی راج کا جوا اُتار پھینکنے میں ممد و معاون ثابت ہوا تھا، یقین ہے کہ اب وہی نمک ملک کو گلھڑ اور آیوڈین کی کمی والے امراض سے بھی چھٹکارا دلانے میں ویسا ہی مفید آلہ کار ثابت ہو گا۔

(باقی کور صہ ۳ پر)

● منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر ——— سیّد ظفیر الحسن

ایڈیٹر ——— جگندر سنگھ

اسسٹنٹ ایڈیٹر ——— محمد عادل صدیقی

یکم تا ۳۱ر اکتوبر ۱۹۸۶ء | ۹ر آشون تا ۹ر کارتک، شک ۱۹۰۸

جلد، ۶ | شمارہ، ۱۳، ۱۴ | قیمت: دو روپے | فون نمبر ۶۰۱۸۱۸

اِس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:۔

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مئین)،

نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن):۔ آر۔ ایس۔ منجال

ترسیل زر کا پتہ:۔ بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اِداریہ

فضائی آلودگی کی روک تھام

فضائی آلودگی کے مسئلے سے نپٹنے کی فوری ضرورت محسوس کی گئی ہے، تھرمل بجلی گھروں سے فضائی آلودگی کا مسئلہ اور بھی شدید ہوتا جا رہا ہے، بہت سے ترقی یافتہ ملکوں میں فضائی آلودگی کی سطح گھٹ رہی ہے تاہم ہندوستان میں یہ بڑھتی جا رہی ہے، سلفر ڈائی آکسائڈ اور دیگر مادّوں کی مقدار ہندوستانی شہروں میں تو حدود سے پہلے ہی تجاوز کر چکی ہے۔ صحت کے عالمی ادارے نے اس سلسلے میں جن حدود کا تعین کیا ہے، ہمارے شہروں میں یہ مادّے اُن سے کہیں زیادہ ہیں، مثال کے طور پر دلّی میں اندر پرستھ میں واقع بجلی کی تیاری کے اسٹیشنوں سے نکلنے والی کوئلے کی راکھ شہر کے مختلف حصوں میں جم جاتی ہے، ایک اندازے کے مطابق تقریباً ۵ ٹن راکھ روزانہ دلّی کے بجلی گھروں سے اُڑ کر شہر میں مختلف مقامات پر جم رہی ہے، یہ توجیہ ہے کہ انسدادِ آلودگی کے بہت سے اقدامات ان بجلی گھروں میں کئے جا چکے ہیں، ملک میں دستیاب کوئلے میں راکھ کا عنصر برابر بڑھتا جا رہا ہے، اس لیے اس کا فضائی آلودگی میں تبدیل ہونا قدرتی امر ہے جس کی روک تھام کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ ہے، ایندھن کے طور پر استعمال کی جانے والی گیسوں سے باہر آنے والے مادّوں کی روک تھام کے لیے متعدد طریقے اپنانے ضروری سمجھے گئے ہیں جن میں گیس کے زہریلے مادّوں کی روک تھام اور اخراج نیز فلٹر کرنے کا عمل وغیرہ شامل ہے، یہی نہیں بلکہ اس کے لیے جدید طریقوں کے استعمال کی ضرورت محسوس کر لی گئی ہے، اس کے لیے الیکٹرو اسٹیٹک پری سیپی ٹیٹر (electrostatic precipitator) کے جدید طریقوں کو کام میں لانے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ یہ طریقے انسدادِ آلودگی کے لیے موثر سمجھے گئے ہیں، انڈریو یولو (Andrew yulo) انسدادِ آلودگی سے متعلق ایسا بہت سا سامان تیار کر رہا ہے جس سے صنعتوں میں صفائی کی آلودگی کی روک تھام ہو سکے۔

شجر کاری

حال ہی میں جس نئے بیس نکاتی پروگرام کا اعلان کیا گیا ہے، اس میں شجر کاری کے پروگرام کو زبردست اہمیت حاصل ہے یہ پروگرام یوں تو ۸۳-۱۹۸۲ء سے تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا گیا ہے لیکن حال ہی میں اسے نئی نئی سمتیں دینے اور اُسے مزید تیز کرنے کی کوششیں شروع کی گئی ہیں، ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۲۱۱۷۲ لاکھ درخت لگائے گئے تھے، جبکہ اس سال کے لیے ۱۹۲۱۴ درخت لگانے کا نشانہ رکھا گیا تھا، ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۲۴۲۳۱ لاکھ پودے لگائے گئے اور ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۲۶۷۴۱ پودے لگائے گئے جبکہ اس عرصے کے لیے مقررہ نشانے بالترتیب ۲۲۲۴۰ لاکھ اور ۲۵۰۹۷ لاکھ پودے لگانا تھا، اس کامیابی سے اس پروگرام کی رفتارِ ترقی کا پتہ چلتا ہے، اس سلسلے میں آندھرا پردیش، آسام، بہار، ہماچل پردیش، جموں و کشمیر، کیرالہ، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، میگھالیہ، اڑیسہ، پنجاب، راجستھان، تمل ناڈو اور اُتر پردیش سے اعلیٰ کارگزاری کا ثبوت ملتا ہے، البتہ ہریانہ، کرناٹک، ناگالینڈ اور مغربی بنگال میں اس سلسلے کی کوششوں کو ابھی اور آگے بڑھانا ہے، اُمید ہے کہ نئے بیس نکاتی پروگرام کے اعلان کے بعد یہ سبھی ریاستیں پہلے سے زیادہ اعلیٰ کارگزاری کا ثبوت دے سکیں گی۔ (ایڈیٹر)

سید اطہر رضا بلگرامی

فروخت شدہ اور قابلِ فروخت زرعی اضافوں کی اقتصادی اہمیت اور تجزیہ

ماہرین اقتصادیات کا خیال ہے کہ ترقیاتی سرگرمیوں میں زرعی پیداوار کی سطح سے زیادہ زرعی اضافوں کی اہمیت ہوتی ہے۔ جس قدر یہ اضافے بڑھتے جائیں گے اُسی قدر جملہ تمام اقتصادی شعبہ جات کی ترقی بھی مستحکم ہوتی جائیگی۔ اس کے برعکس ان اضافوں میں متواتر تخفیف کُل شعبہ جات کی ترقی کو سست و مجہول کرے گی۔ ان اضافوں سے کیا مُراد ہے؟ یہ اضافے کس طرح رونما ہوتے ہیں اور بڑھتے ہیں؟ اُن کی پیمائش کس طرح کی جاتی ہے اور دیگر شعبہ جات کی ترقی پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے؟ یہ ایسے اہم سوالات ہیں جن کی وضاحت و تجزیہ اس مضمون میں پیش کیا جا رہا ہے۔

فروخت شدہ و قابلِ فروخت زرعی اضافے: معنی و فرق

کسان کی پیداوار ہی اُس کا سرمایہ ہوتی ہے۔ یہی اُس کا ذریعہ آمدنی ہے اور تمام تر خوشحالی کا مرکز بھی۔ یہ پیداوار تصرف کے نقطۂ نظر سے، دو حصّوں میں منقسم ہے۔ اوّل پیداوار کا وہ حصّہ جس کو کسان اپنے ذاتی تصرف کے لیے رکھتا ہے۔ اور دوسرا وہ حصہ جس کو وہ ساہوکار، بنیوں، منڈیوں اور بازاروں میں فروخت کرتا ہے اور حاصل شدہ رقوم سے اُن ضرورتوں کو پورا کرتا ہے جن کی تکمیل زرعی سیکٹر سے نہیں ہوتی۔ کپڑا، تعمیراتی سامان، آرائش اور زیبائش کی اشیاء، شکر، مٹی کا تیل، جوتے، سائیکل، ملبوسات، بجلی کا سامان، اس کی چند مثالیں ہیں۔ اسی نقد آمدنی سے وہ کاشتکاری کے متعلق چھوٹے موٹے اخراجات بھی برداشت کرتا ہے اور زرعی ترقی کے دیگر وسائل مہیا کرنے میں مدد بھی لیتا ہے۔ بیج اور کھاد کی خریداری، ادویات کے چھڑکاؤ کے اخراجات یا زیادہ پائیدار وسائل مثلاً ٹریکٹر، پمپ سٹ، ٹیوب ویل، تھریشر اور دیگر کل پرزے اس کی مثالیں ہیں۔ مزید پیداوار کو بطور زر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مزدوروں کی اُجرت، ساہوکاروں، بنیوں اور رشتہ داروں کے قرضے، مذہبی و سماجی رسومات کی ادائیگی اناج کے سہارے بھی کی جاتی ہے۔

پیداوار کے تصرف سے جس کا بیان اُوپر ہوا ہے، یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسان کی کُل پیداوار بازاروں، منڈیوں میں نہیں پہنچتی بلکہ اس کا صرف ایک حصہ ہی پہنچتا ہے۔ وہ حصّہ جو منڈیوں و بازاروں میں فروخت کے لیے پہونچتا ہے "فروخت شدہ اضافے" کہا جاتا ہے کہ یہاں لفظ "اضافے" کا استعمال اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ پیداوار کے اُس زائد حصہ کی طرف اشارہ ہے جو کسانوں کے ذاتی مصارف کے بعد

بچ رہتا ہے اور جس کو کسان اپنی دیگر ضروریات جن کو زرعی سیکٹر پورا نہیں کرتا، فروخت کر کے پورا کر لیتا ہے۔ اب چونکہ کسان سماج مختلف معاشی معیاروں میں تقسیم ہے اس لیے کسانوں کی ضرورتوں کے معیار بھی مختلف ہیں اور اسی کے بموجب بازاروں میں فروخت کی سطحیں جداگانہ ملتی ہیں۔ چھوٹا کسان جس کی ضرورتیں محدود اور ٹھہری ہوئی سی پائی جاتی ہیں اپنی چھوٹی پیداوار کا بیشتر حصہ فوری طور پر بازار میں فروخت کر دے گا۔ دوسری طرف بڑا کسان جس کی پیداوار کی سطح بلند، ضرورتیں وسیع، اور وسائل بھی پھیلے ہوئے ہیں، اپنی ضرورتوں کے بموجب روک روک کر فروخت کرنے کا حامل ہوتا ہے۔ اُس کے پاس پیداوار کو محفوظ رکھنے کی مناسب جگہ اور وسائل ہوتے ہیں اس لیے بازار کا بھاؤ دیکھ کر نفع اور نقصان پر نگاہ رکھ کر بازار میں فروخت کرے گا۔ چھوٹا کسان نہ تو اپنی پیداوار کو محفوظ رکھنے کا حامل ہوتا ہے اور نہ اُس کی ضرورتیں و قرضے اُس کو اس کی اجازت دیتے ہیں۔ اس لیے بازار بھاؤ کو سمجھتے بوجھتے بنیوں اور ساہوکاروں کے استحصال کا احساس کرتے، اپنی ضرورتوں و وسائل کی تنگی کا شکار چھوٹا کسان فوری طور پر پیداوار کو بازار میں فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کسان کے مختلف معاشی معیاروں نے یہ بات واضح کر دی کہ سبھی کسان اپنی پیداوار کا ایک طے شدہ حصہ فروخت کے لیے بازاروں منڈیوں میں نہیں بھیج سکتے۔ ایک کسان فروخت کے لیے اپنی پیداوار کا کون سا حصہ بھیجے گا، اس پر منحصر ہے کہ اُس کی پیداوار کی سطح کیا ہے، اُس کا کنبہ کتنا بڑا ہے، اس کے قرضے کس قدر ہیں، اس کے سماجی و مذہبی رسم و رواج کیا ہیں، عقائد کیا ہیں اور اُس کی مجموعی معاشی حیثیت کیسی ہے وغیرہ۔

چھوٹا کسان اپنے ذاتی مصارف نکال کر جو کچھ بھی پس انداز کر سکتا ہے وہ سب بازاروں میں پہونچا دیتا ہے جبکہ بڑا کسان جو ذاتی مصارف نکال کر بھی ایک بڑے اضافی حصہ کا حامل رہتا ہے روک روک کر، حسبِ ضرورت اور بازار بھاؤ پر نگاہ رکھ کر بازاروں میں پہونچاتا ہے۔ اس طرح "فروخت شدہ اضافے" کے رُخ سے اگر دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ چھوٹے کسان صد فیصد فروخت شدہ اضافے" رکھتے ہیں لیکن بڑے کسان نہیں رکھتے۔ لیکن اگر "قابلِ فروخت اضافوں" کی بات کی جائے تو اس مقام پر چھوٹے کسانوں کے پاس کوئی "قابلِ فروخت اضافوں کا ذخیرہ نہیں ہوتا جبکہ بڑے کسان ایسے بڑے ذخیروں کے حامل ہوتے ہیں جن کو وہ وقت وقت پر بازاروں میں بھیجتے رہتے ہیں۔ اس طرح سے "فروخت شدہ اضافے" کے مقابلہ میں "قابلِ فروخت اضافے"، ہمیشہ بڑے اور وسیع رہتے ہیں۔

لیکن ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ حالات سے مجبور ہو کر جبراً "فروخت شدہ اضافوں" کی سطح قابلِ فروخت اضافوں" سے بھی بلند ہو جائے اور یہ اُس وقت ممکن ہوتا ہے کہ جب کسان حالات سے دب کر نہ صرف اپنی کُل پیداوار کو فروخت کرنے پر مجبور ہو جائے بلکہ اپنے ذاتی تصرف کے لیے بازار سے بھی خریدے۔ ان حالات میں "فروخت شدہ اضافے" "قابلِ فروخت اضافوں" کے مقابلہ میں جبراً بلند نظر آئیں گے۔ بالعموم چھوٹے اور غریب کسانوں کی فصل خراب ہونے کی صورت میں یا فصل برباد ہو جانے کی وجہ سے اس کیفیت سے گزرنا پڑتا ہے۔

فروخت شدہ اور قابلِ فروخت زرعی اضافوں کا فرق جیسا بیان سے ظاہر ہے، پیداوار کا وہ حصہ جو فروخت کے لیے بازار اور منڈیوں میں پہونچتا ہے فروخت شدہ اضافہ کہلاتا ہے اور جو بازاروں میں نہیں پہونچتے لیکن ضرورت کے وقت اُن کو پہنچایا جا سکتا ہے اُن کو قابلِ فروخت اضافہ کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ کسانوں کی استعدادِ فروخت کا مظہر ہے جبکہ فروخت شدہ اضافے حقیقی فروخت کی سطح کے۔

یہاں زرعی اضافوں کے سلسلے میں ایک بات اور توجہ طلب ہے اور وہ یہ کہ جس وقت ہم زرعی اضافوں کی بات کرتے ہیں تو دراصل ان کا تعلق اجناس (غلّہ) سے ہوتا ہے اور نقد پیداوار (Cash Crops) جن کو "کمرشیل کراپس" کہا جاتا ہے، اس ضمن میں نہیں آتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نقد فصلوں کا ذاتی مصرف یا تو مطلق نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو انتہائی کم۔ اس لیے جو بھی پیداوار ہوگی وہ بازاروں اور منڈیوں میں پہونچ جائے گی۔ یعنی فروخت شدہ اضافے صد فیصد ہوتے ہیں۔ کپاس، گنّا، تمباکو، جوٹ، وغیرہ ایسی ہی فصلیں ہیں۔ زراعت میں اجناس (غلّہ) کی پیداوار ایسی ہے جس کا براہِ راست تعلق انسانی زندگی سے ہے۔ اس لیے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کسان اپنے ذاتی تصرف کو نکال کر کتنا حصہ بازاروں اور منڈیوں میں بھیج رہا ہے اور کتنا بھیجنے کی

استعداد رکھتا ہے اور بازاروں میں غلہ کی اسی آمد سے ہم مختلف اقتصادی اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔

زرعی اضافوں کی اہمیت

زرعی پیداوار کا کتنا حصہ بازاروں اور منڈیوں میں پہونچتا ہے اور کتنا پہنچایا جا سکتا ہے۔ دونوں باتیں مختلف سیکٹر کی اقتصادی ترقی و استحکام کے نقطۂ نظر سے بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس ضمن میں نقد فصلوں کا ذکر اس لیے نہیں کیا جا رہا ہے کہ ایسی تمام فصلیں کُل کی کُل بازاروں میں پہنچ جاتی ہیں۔ اس لیے اُن کے اثرات کا اندازہ لگانا اور تجزیہ کرنا آسان ہے۔ لیکن "اجناس" جو زندگی کی بنیادی ضرورت ہے وہ سب کی سب بازاروں میں نہیں پہنچ پاتے اس لیے دیگر شعبۂ جات کی ترقی کا تجزیہ کرتے وقت یہ دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ بازاروں میں اجناس کی آمد کی رفتار، رُخ اور ماہیئت کیسی ہے۔

اجناس کی بازاروں میں آمد بہت سے عوامل سے متاثر ہوتی ہے۔ اوّل پیداوار کی سطح ہے جو بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر اقتصادی سطح پر تقسیم شُدہ کسان سماج کے نجی تصرّف تقریباً طے شُدہ ہوں تو پیداوار کے بڑھنے و گھٹنے سے قابلِ فروخت اضافے بھی بڑھیں و گھٹیں گے۔ دوم، زرعی ترقیاتی پروگراموں کے نتیجے میں بڑھی ہوئی آمدنی، معیارِ زندگی و طلب کو بڑھانے کا باعث بنے گی اور اس کے نتیجے میں کسان زیادہ پیداوار کے حصّہ کو بازاروں میں فروخت کر کے غیر زرعی سیکٹر کے ذریعے پیدا شُدہ اشیاء و خدمات کو حاصل کرنے کی طرف مائل ہوگا۔ گویا کسانوں کا معیارِ زندگی بلند ہونا اور آمدنی کا بڑھنا، صنعتی و دیگر شعبۂ جات کی بازاروں میں وُسعت پیدا کرنے کا باعث ہوگی۔ اور یہ سب کچھ اُسی وقت ممکن ہوگا جب کسان اپنی بڑھی ہوئی پیداوار کا بیشتر حصہ بازاروں میں لائے اور اپنے گاؤں میں رہ کر نجی تصرّف کو نہ بڑھائے۔ سوم، غلّہ کی بازاروں میں آمد ٹرانسپورٹ کی مناسب سہولتوں سے بھی بہت متاثر ہوتی ہے۔ اگر ایک گاؤں سڑکوں، ریلوے لائن اور سڑکوں کی سہولتوں کے ساتھ کسی قریب و دُور کی منڈی سے جُڑا ہوا ہے تو فروخت شُدہ اور قابلِ فروخت اضافوں کی سطح بلند پائی جائے گی اور جہاں یہ سہولتیں مناسب طور پر مہیّا نہیں ہیں وہاں یہ سطح پست رہے گی۔ کنبہ کا سائز بھی بازاروں میں غلّہ کی آمد کو متاثر کرتا ہے۔ اگر کنبہ چھوٹا ہے تو اس کے نجی مصارف بھی کم ہوں اور نتیجتاً پیداوار کا بیشتر حصہ بازاروں میں پہونچ جائے گا۔ دوسری طرف اگر کنبہ بڑا ہے تو نجی تصرّف کی سطح بلند ہوگی اور بازاروں میں پہونچنے والا حصّہ پست رہے گا۔

کسان سماج کے رسم و رواج، مذہبی عقائد، اور بنیوں و ساہوکاروں کے قرضے بھی پیداوار کی بازاری آمد کو متاثر کرتے ہیں۔ چھوٹے کسانوں کو جو مذہبی و سماجی رسم و رواج کے سختی سے پابند نظر آتے ہیں اُن کو ان اخراجات کے لیے بیشتر حصّہ محفوظ رکھنا ہوتا ہے اور دیگر مصارف جو زرعی طبقہ پورا نہیں کر سکتا اس کے لیے بازاروں میں غلہ کو فروخت کر کے یہ رسم و رواج پُورے کئے جاتے ہیں۔ بڑے کسان بھی پابند ہیں لیکن اس سلسلے میں اُن کی نوعیت بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کی پیداوار کی سطح اتنی بلند ہوتی ہے کہ اس طرح کے اخراجات کے اثرات دیگر دُوسرے مصارف پر پڑتے نظر نہیں آتے۔ دوسری طرف چھوٹے کسان کی فرسودہ رسم و رواج اور ان کی پابندی اُن کے دُوسرے اخراجات کو متاثر کرتے نظر آتے ہیں۔

غلّہ و دیگر اجناس کی قیمتیں بھی غلّہ کی بازاری آمد کو متاثر کرتی نظر آتی ہیں۔ بڑے کسان جن کے پاس غلّہ کو محفوظ رکھنے کے معقول انتظامات ہیں، حکومت کی طرف سے مُہیا گوداموں کی سہولتوں کا استعمال بھی کرتے ہیں، اور اجناس کے ایک اچھے ذخیرہ کو ہر وقت برقرار رکھتے ہیں۔ بازار کی مروجہ قیمتوں پر نگاہ رکھ کر مال کو بازاروں میں بھیجتے ہیں۔ چھوٹے کسان ایسا نہیں کر سکتے۔ کچھ تو سہولتوں کی کمی اور کچھ تو نجی ضرورتوں کا دباؤ اُن کو مجبُور کرتا ہے کہ وہ اپنی پیداوار کا بیشتر حصہ بازاروں میں بھیج کر نقد ضرورت کو پورا کریں۔ اس لیے چھوٹے و درمیانی کسانوں کی طرف سے اجناس کی آمد بازاروں میں زیادہ ہوتی ہے۔

بازاروں، منڈیوں میں اجناس کی آمد کا اثر پوری معیشت پر پڑتا ہے۔ اشیاء کی قیمتیں غلّہ کی قیمتوں سے جُڑی ہوئی ہیں اور غلّہ کی قیمتیں جُڑی ہوئی ہیں نہ صرف پیداوار سے بلکہ بازاری آمد سے۔ اس لیے زندگی کی تمام ضروریات جن کی تکمیل کے لیے انسان آمدنی و قیمتوں پر نگاہ رکھتا ہے، غلّہ کی قیمتوں سے متاثر ہوتی رہتی ہیں۔ اگر غلّہ کی آمد برقرار رہے،

سے ضرورت ہو تو قیمتوں میں بھی ٹھہراؤ پایا جائے گا اور نتیجتاً دیگر اشیاء ضروری کی قیمتوں میں بھی۔ یہی ٹھہراؤ عوام کے معیارِ زیست کا تعین کرے گا۔ دوسری طرف غلہ کی بازاری آمد اگر غیر یقینی ہو، کم ہو یا رُک رُک کر ہو تو ان تمام کیفیات کا اثر غلہ کی قیمت پر پڑتا ہے۔ اور اس سے متاثر ہو کر دیگر اشیاء کی قیمت اور عوام کے معیارِ صرف پر پڑتا ہے۔ چوں کہ اجناس کی مانگ بے لوچ ہوتی ہے یعنی قیمتوں کے گھٹنے یا بڑھنے کا اثر زیادہ قبول نہیں کرتی اس لیے اگر اجناس کی قیمتیں بڑھتی ہیں تو اجناس پر ہونے والے مصارف بڑھ جائیں گے کیوں کہ اجناس کی مقدار صرف قیمتوں کے بڑھنے سے متاثر نہیں ہوگی نتیجتاً اگر آمدنی محدود ہو تو ایسی صورت میں دیگر اشیاء پر ہونے والا صرف گھٹ جائے گا۔ جو معیارِ زندگی کو متاثر کرے گا۔

پھر آبادی کے مسلسل بڑھتے رہنے کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ آبادی کا بڑھنا دراصل طلب کے بڑھنے کی غمازی کرتا ہے اور ایسی صورت میں اگر بازاری آمد نہ بڑھی تو قیمتوں کا مسلسل بڑھتے رہنا یقینی ہے۔ اس لیے صرف یہ اہم نہیں کہ زرعی پیداوار بڑھے۔ بلکہ اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ غلہ کی بازاری آمد بڑھے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب فروخت شدہ اور قابلِ فروخت اضافوں میں مسلسل توسیع ہوتی رہے۔ اس طرح بنیادی اقتصادی مسائل کا حل پیداوار کی سطح میں مضمر نہیں ہے بلکہ بازاری آمد کے بہاؤ میں مضمر ہے۔ یہی بازاری آمد کسانوں کی آمدنی کا پیمانہ اور اُن کی اقتصادی خوشحالی کا ذریعہ ہے۔ یہ خوشحالی اس بات سے جھلکتی ہے کہ وہ دیگر شعبہ جات کی پیداوار کو کس طرح طلب کر رہے ہیں۔ اگر موٹے سُوتی کپڑوں کی جگہ اچھے قیمتی ملبوسات کو طلب کر رہے ہیں، پکّے گھروں کی تعمیر کر رہے ہیں، گھروں میں عیش و آرام کی اشیاء فراہم کر رہے ہیں، اپنی کاشت کی ترقی کے لیے اچھے بیج، کھاد، ٹیوب ویل اور دیگر مشینیں خریدنے میں دلچسپی لے رہے ہیں تو یہ رُجحان اس بات کی دلیل ہے کہ اُن کی آمدنی بہتر ہو رہی ہے اور جس کو وہ اپنے معیارِ زندگی کو بہتر و بلند کرنے میں لگا رہے ہیں۔ ساتھ ہی یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ دُوسرے شعبے جو کسانوں کو یہ تمام اشیاء و سہولتیں فراہم کر رہے ہیں، اُن کی بازاروں میں وسعت پیدا ہو رہی ہے جس کی بدولت وہ بہتر سرمایہ کاری اور منافع حاصل کرنے کے اہل بن رہے ہیں۔ اس طرح بازاروں و منڈیوں میں اناج و دیگر اجناس کی آمد اور اُس کی نوعیت مختلف شعبہ کی اقتصادیات کو متاثر کرتی ہے۔

پھر اجناس کے فروخت شدہ و قابلِ فروخت اضافے صنعتی سیکٹر کی طرف منتقل ہونے والی اضافی زرعی محنت کشوں کی کفالت کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ گویا انھیں اضافوں کی بدولت وہ صنعتی سیکٹر میں پیدا آور محنت کشوں کی حیثیت سے کام کرتے رہنے کے قابل ہوتے ہیں اور انھیں اضافوں کی بدولت صنعتی سیکٹر کو ارزاں محنت کشوں کی مطلوبہ تعداد ملتی رہتی ہے اور وہ اپنی پیداوار و منافع کو بڑھاتے رہنے کا اہل بنتا ہے۔

اس طرح اگر غور کیا جائے تو زرعی سیکٹر کی پیداوار کی سطح سے زیادہ اہم دراصل زرعی سیکٹر کے فروخت شدہ اور قابلِ فروخت اضافے ہیں جو کسی نہ کسی طور پر پوری معیشت کو متاثر کرتے ہیں۔ قیمتوں کے ٹھہراؤ، بازاروں میں وُسعت، آمدنی و مصارف میں توسیع، روزگار، معیارِ صرف، سرمایہ کاری، درآمدات و برآمدات یہ ایسی نمایاں معاشی سرگرمیاں ہیں جہاں یہ زرعی اضافے اپنا بھرپور اثر رکھتے ہیں اور ایک طرح سے ان سرگرمیوں کے معیار، سمت، نوعیت و ماہیت کو طے کرتے ہیں۔

چند اہم مباحث

قابلِ فروخت اضافوں کو متعین کرنے والے عوامل کے سلسلے میں چند ایسے پہلو سامنے آئے ہیں جن پر اہلِ معاشیات کے درمیان اتفاقِ رائے نہیں ہے۔ قابلِ فروخت اضافوں کو متعین کرنے میں جو عنصر سب سے اہم ہے وہ پیداوار کی سطح ہے۔ پیداوار کو دو رُخ سے بڑھایا جا سکتا ہے اوّل قابلِ کاشت زمین کے رقبہ کو بڑھایا جائے یعنی فارم کا رقبہ بڑھایا جائے اور دوم رقبے کو بڑھانے پر زور نہ دیکر عمیق طرز کی کاشت پر زور دیا جائے، یعنی ایک ہی رقبہ پر کئی کئی فصلیں اُگائی جائیں، اسی رقبہ پر، اچھے بیج، اچھی کھاد، بہتر اوزار اور دیگر مشینوں کا استعمال بڑھایا جائے اور بہتر کارکردگی کو لایا جائے۔ ہندوستان میں ان دونوں پہلوؤں پر زور ملتا ہے۔ اس لیے پیداوار کی سطح کا بلند ہونا ایک یقینی امر بن چکا ہے۔

لیکن فارم کے سائز کے ساتھ قابلِ فروخت اضافوں کا جو رشتہ قائم کیا گیا ہے وہ بحث کا موضوع ہے۔ پروفیسر دھرم نرائن نے بتلایا کہ بیشتر زرعی اضافوں کی آمد بڑے و درمیانی فارموں کی طرف سے ہوتی ہے۔ چھوٹے فارم چونکہ انتہائی پست سطح کے ہوتے ہیں اس لیے فروخت کے لیے اضافے پیدا نہیں کر سکتے۔ ان کے ۵۱-۱۹۵۰ کے مطالعے و تخمینے کے بموجب فروخت شدہ اضافے ۱۰ تا ۱۵ ایکڑ سائز کے فارموں تک گرتے ہیں اور

اُس کے بعد متواتر بڑھتے ہیں۔ اس طرح فارم کے سائز اور قابلِ فروخت اضافوں کے درمیان ایک مضبوط مثبت رشتہ قائم ہے۔ جس قدر فارم کا سائز بڑا ہوگا اُسی قدر فروخت کے قابل اضافوں کے امکان وسیع ہوں گے اور اس کے برعکس فارم کا سائز جس قدر کم ہوگا قابلِ فروخت اضافوں کے رونما ہونے کے امکان کم ہوں گے۔

لیکن مدراس و کیرالہ (Madras and Kerala) صوبوں کے تجربات اس کے برعکس ہیں۔ یہاں کے مطالعوں سے پتہ چلا ہے کہ فارم کے سائز اور زرعی اضافوں کے درمیان ایک منفی رشتہ قائم ہے۔ یعنی چھوٹے فارموں سے زیادہ اور بڑے فارموں سے کم اضافوں کی آمد ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں زمین سدھار پروگرام کے تحت زمینوں کی دوبارہ تقسیم کا قابلِ فروخت اضافوں پر بڑا اثر پڑتا محسوس کیا گیا ہے۔ بڑے کسان جو اضافے دے رہے تھے اُن سے زائد زمین حاصل کرلینے کی صورت میں یہ اضافے پیدا نہیں کر پا رہے ہیں اور اس کے برعکس چھوٹے کسان جن کو یہ زائد زمین تقسیم ہو کر ملی ہے اب اضافوں کو پیدا کرنے کے قابل بنتے جا رہے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ فارم کا سائز اور زرعی اضافے ہمیشہ مثبت تعلق رکھتے ہیں۔

زرعی اضافوں کی سطح کو متعین کرنے میں، اجناس کی قیمتیں ایک اہم رول ادا کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں دو مختلف خیالات ملتے ہیں۔ ایک خیال ماتھر اور ازکائیل (Mathur and Ezekiel) کا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ چونکہ کسانوں کی نقد ضرورت طے شدہ اور تقریباً ایک سی ہوتی ہے اس لیے ایک مقررہ قیمتوں پر پیداوار کا فروخت شدہ حصہ بھی تقریباً طے شدہ رہتا ہے۔ اگر نقد ضرورت بے لوچ ہو تو قیمتوں کے گرنے پر کسان زیادہ اور قیمتوں کے چڑھنے پر کم پیداوار کو فروخت کریں گے۔

دوسرا خیال وزارتِ خوراک و زراعت (Ministry of Foods & Agriculture) نے پیش کیا۔ ان کا خیال یہ ہے کہ کسان قیمتوں کے سلسلے میں حساس بن چکے ہیں۔ بازاروں میں اجناس کی آمد قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ سے متاثر ہوتی ہے۔ آئندہ مہینوں میں اگر قیمتوں کے چڑھنے کی قوی اُمید نظر آتی ہے تو کسان بازاروں میں اجناس کا بھیجنا کم کر دیتا ہے اور اس کے برعکس قیمتوں کے گرنے کے ڈر سے بازاروں کی موجودہ آمد کو تیز کر دیتا ہے۔ اضافوں کے سلسلے میں دیگر مباحث "اضافوں کی پیمائش کے مسائل" کے عنوان کے تحت واضح کئے گئے ہیں۔

اضافوں کی پیمائش کے مسائل

ترقیاتی منصوبوں، پالیسیوں اور پروگراموں کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں زرعی اضافوں کی مستقل بڑھتی ہوئی دستیابی ایک اہم رول ادا کرتی ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے ان اضافوں کی مُہیا سطح سے باعلم رہنا ضروری ہے کیونکہ ہمارا مستقبل کا عمل اس بات پر منحصر ہے کہ حال میں دستیاب زرعی اضافوں کی سطح کیا ہے۔

ان زرعی اضافوں کو باضابطہ (Regulated) اور غیر باضابطہ (Unregulated) دونوں ہی بازاروں سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں باقاعدگی سے اُس کو ابھی ناپا نہیں گیا ہے اسی لیے جو بھی تخمینہ لگائے گئے ہیں اُن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کاشت کے مختلف رقبوں کے بموجب "دھرم نرائن" پٹنائک اور گلاٹھی نے کچھ تخمینے پیش کئے ہیں جو مندرجہ ذیل نقشہ میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

زرعی اضافوں کی پیمائش : زرعی اضافے کل پیداوار کی فی صد شکل میں

کاشت کا رقبہ (ایکڑ میں)	(۱۹۷۰-۷۱ء) دھرم نرائن کا تخمینہ (۱۹۵۰-۵۱)	(۱۹۵۰-۵۱ء) پٹنائک کا تخمینہ (۱۹۶۰-۶۱)	گلاٹھی کا تخمینہ (۱۹۷۰-۷۱)
۰ — ۵	۳۴ فیصد	۲۳ فیصد	۲۶ فیصد
۵ — ۱۰	۲۷ ″	۲۷ ″	۴۵ ″
۱۰ — ۱۵	۲۳ ″	۳۱ ″	۵۲ ″
۱۵ — ۲۰	۳۰ ″	۳۶ ″	۵۵ ″
۲۰ — ۲۵	۳۳ ″	۴۵ ″	۶۰ ″
۲۵ — ۳۰	۴۰ ″	۴۹ ″	۶۴ ″
۳۰ سے زائد	۴۷ ″	۵۸ ″	۶۸ ″

ان تخمینوں سے چند مندرجہ ذیل باتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ اوّل کاشت کے رقبہ کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ زرعی اضافوں میں بھی توسیع ہو رہی ہے۔ دوم ۵۱-۱۹۵۰ء کے بالمقابل ۶۱-۱۹۶۰ء میں اور ۶۱-۱۹۶۰ء کے بالمقابل ۷۱-۱۹۷۰ء میں رقبہ کے سائز کے اعتبار سے مسلسل توسیع ہوئی ہے۔ مثلاً ۵ تا ۱۰ ایکڑ کے رقبہ میں ۵۱-۱۹۵۰ء میں کل پیداوار کا ۲۷ فیصد زرعی اضافے ملے اور ۷۱-۱۹۷۰ء میں ۴۵ فیصد، ۱۰ تا ۱۵ ایکڑ کے رقبوں میں ۵۱، ۱۹۵۰ء میں یہ اضافے ۲۳ فیصد تھے، ۶۱-۱۹۶۰ء میں ۳۱ فیصد اور ۷۱-۱۹۷۰ء میں ۵۲ فیصد ملے۔ اسی طرح ۲۵ تا ۳۰ اور ۳۰ سے زائد ایکڑ کے رقبوں میں یہ اضافے ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۴۰ اور ۴۷ فیصد تھے جو ۶۱-۱۹۶۰ء میں ۴۹ اور ۵۸ فیصد اور ۷۱-۱۹۷۰ء میں ۶۴ اور ۷۸ فیصد ہو گئے۔ سوم، کاشت کے بڑے سائز کے رقبوں میں یہ زرعی اضافے، کل پیداوار کی فیصد کی شکل میں، زیادہ اور کاشت کے رقبوں کے چھوٹے سائز پر کم نظر آتے ہیں اس کے معنی یہ ہوئے کہ بڑے اور دولت مند کسانوں میں یہ اضافے کل پیداوار کے زیادہ فیصد کی شکل میں سامنے آتے ہیں اور درمیانی چھوٹے غریب کسانوں میں کم۔

چہارم :- دھرم نرائن کے تخمینہ سے ایک اہم بات ابھر کر جو سامنے آئی ہے وہ یہ کہ اگر ان اضافوں کی کیفیت کو کسی گراف کی شکل میں منتقل کیا جائے تو وہ انگریزی کا حرف "U" بن جائے گی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ زرعی اضافوں کا تناسب کاشت کے چھوٹے رقبے پر زیادہ ہے اور رقبے کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس تناسب میں گراوٹ آتی جاتی ہے اور گراوٹ کی کمترین سطح پر آکر جیسے جیسے رقبہ کا سائز بڑھتا ہے، یہ تناسب بھی بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اس پوری کیفیت کی شکل انگریزی حرف "U" جیسی ملتی ہے۔

کاشت کے چھوٹے سائز پر یہ تناسب (Ratio) کیوں زیادہ ہے اور سائز کے بڑھنے پر اس تناسب میں کیوں گراوٹ آجاتی ہے اور پھر سائز کے بڑھنے پر یہ تناسب کیوں بڑھتا ہے اس کا جواب پروفیسر وی۔ کے۔ آر۔ وی راؤ صاحب نے یہ دیا ہے کہ چھوٹے رقبہ والے کسانوں کے زرعی اضافے "جبریہ اضافے" (Distress Surplus) ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ضرورتوں کے تحت مجبور ہو کر پیداوار کا زیادہ سے زیادہ حصّہ فروخت کرتے ہیں لیکن کاشت کے رقبہ کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ جبریہ کیفیت کمزور پڑتی جاتی ہے اس لیے یہ تناسب گرتا ہوا ملتا ہے اور پھر بڑے سائز پر کسانوں کا تجارتی رجحان زیادہ سے زیادہ اضافوں کو بازار میں لے آتا ہے۔ پٹنائک اور گلاٹی کے تخمینوں میں یہ "U" شکل کی کیفیت نہیں ملتی۔ ان دونوں تخمینوں میں اضافوں کا تناسب کاشت کے سائز کے اعتبار سے مسلسل بڑھتا ہوا ملتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ کاشت کے رقبہ اور زرعی اضافوں کی سطح کے درمیان ایک مثبت رشتہ قائم ہے۔ کاشت کے رقبوں اور زرعی اضافوں کی سطح کو اگر مجموعی اوسط کی نظر سے دیکھا جائے تو اضافوں کے قلیل ہونے کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ مجموعی طور پر اوسطاً یہ اضافے کل پیداوار کا ۲۵ تا ۳۳ فیصد رہے ہیں۔ وزارت برائے خوراک و زراعت کی ایک رپورٹ کے بموجب ہندوستان کی اجناس کا تقریباً ۷۵ فیصد حصّہ بازاروں میں نہیں آپاتا۔ اوسطاً ہر سال اجناس کی پیداوار کا ۲۵ فیصد سے بھی کم حصّہ بازاروں میں پہنچ پاتا ہے۔

ان تخمینوں کی پیمائش کے سلسلے میں بھی بہت سے مسائل ہیں۔ ایک سنگین مسئلہ یہ ہے کہ فصل کی تیاری کے وقت، کسان اپنے حالات سے مجبور ہو کر اور فوری نقد کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے پیداوار کا بیشتر حصّہ فروخت کر دیتا ہے اور بعد میں جب اُس کو اناج کی کمی کا احساس ہوتا ہے تو دُوسری فصل کی تیاری کی مدت تک وہ اناج بازار سے خرید کر اپنی خوراک کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اس لیے فصل کی تیاری کے وقت کسانوں کے ذریعے فروخت شدہ اناج کو زرعی اضافے تسلیم کرنا غلط ہو جاتا ہے اور وہ تخمینہ دراصل گمراہ کرنے والے ثابت ہوتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ بہت سے کسان گاؤں اور آس پاس کے لوکل بازاروں میں ہی فروخت کر دیتے ہیں۔ اس طرح ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی مختلف نوعیت کے یہ غیر منظم بازار بیشتر زرعی اضافوں کو پوشیدہ رکھتے ہیں اور ان کی وجہ سے زرعی اضافوں کا صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا۔ پھر ایک مشکل یہ بھی ہے کہ بازاروں میں اناج کی آمد کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ حالیہ فصل کی ہے۔ بہت سے کسان اور بالعموم بڑے کسان حالیہ فصل کے اناج کو محفوظ رکھ کر پچھلی فصل کے اناج کو نکالتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ حالیہ فصل کا کتنا فیصد بازار میں فروخت کے لیے پہونچا۔

ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں اناج کے بازاروں کے معیار اور سطحیں مختلف

ہیں۔ مختلف معیار کے تھوک بازار ہیں، پھر چھوٹی و درمیانی منڈیاں ہیں جہاں تھوک اور خوردہ دونوں طرح کی کارروائیاں ہوتی ہیں اور پھر صرف خوردہ بازار ہیں۔ اب اناج مختلف بازاروں میں بار بار فروخت ہوتا ہے اس لیے زرعی اضافوں کو معلوم کرنے کے لیے یا تخمینہ لگانے کے لیے اس کا لحاظ رکھنا پڑے گا کہ جس زرعی اضافے کو معلوم کر رہے ہیں وہ ایک ہی بار فروخت ہوا ہو تاکہ اناج کی فروخت کی تکرار نہ ہو سکے جو صحیح تخمینہ کو غلط کر دے۔

ایک اہم مسئلہ یہ بھی سامنے ہے کہ پیداوار کا ایک حصہ بیج یا جانوروں کی خوراک کے طور پر رکھ لیا جاتا ہے اس کا صحیح اندازہ نہیں ہے اُن میں ہونے والی تبدیلیوں کا اندازہ نہیں ہے اس لیے زرعی اضافوں کا صحیح تخمینہ متاثر ہو سکتا ہے۔

اناج کی قیمتیں زرعی اضافوں کو متاثر کرتی ہیں۔ یہ مسئلہ بحث طلب ہے، جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ زرعی اضافوں کو بازار کی مروجہ قیمتیں متاثر ضرور کرتی ہیں۔ جس قدر قیمتوں میں ٹھہراؤ اور پُر اعتماد حرکت (Movement) ہوگی۔ زرعی اضافوں کے تخمینہ لگانا آسان ہوگا اور جس قدر قیمتیں غیر ذمہ دارانہ طور پر حرکت میں رہیں گی زرعی اضافوں کے تخمینوں میں غیر اعتمادی پائی جائے گی۔ ہندوستان میں اناج کی قیمتوں میں بے حد اُتار چڑھاؤ پایا جاتا ہے، اس لیے زرعی اضافوں کے تخمینے غیر یقینی بن جاتے ہیں۔

زراعت پر منحصر معیشتوں کی ترقی کا انحصار زرعی سیکٹر کی کارکردگی پر ہے۔ جس قدر زرعی سیکٹر مستحکم ہوگا دیگر شعبہ جات کی مجموعی ترقی بھی اُسی قدر مضبوط ہوگی۔ زرعی سیکٹر کے استحکام کا تعلق اُس کی پیداوار کی سطح سے ہی نہیں بلکہ اُس سے بھی اہم زرعی اضافوں کے نشو و نما اور اُس کی مسلسل توسیع سے ہے۔ اسی لیے ہر صوبے میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ اضافے مسلسل بڑھتے رہیں۔ کبھی قیمتوں میں مناسب استحکام لا کر، کبھی اجناس کے ذاتی مصارف میں کمی کا رُجحان پیدا کر کے اور زرعی سماج کی مانگ کو مصنوعات و دیگر صنعتی اشیاء کی طرف موڑ کر، منظم بازاروں، منڈیوں اور سرکاری خرید کو بڑھاوا دے کر، ایجنٹوں، دلالوں اور دیگر درمیانی لوگوں کی کارروائیوں پر کڑی نگاہ رکھ کر اور پھر پیداوار کو مسلسل بڑھاتے رہنے والے منصوبوں کو زیرِ عمل لا کر ان اضافوں کو بڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

یوجنا، نئی دہلی

بقیہ، دیہی بچوں کی تعلیم میں ٹی۔وی کی افادیت

نہیں ہے کہ بچے پہلے لکھ پڑھ جائیں۔ کوئی بھی اُن تک اپنی بات بلا واسطہ طور پر علاقوں، شہروں اور تصویروں کے ذریعے پہونچا سکتا ہے جنھیں وہ دیکھ سکتے ہیں۔ وہ سنائی جانے والی کہانیوں اور گیتوں کے ذریعہ بھی اپنا پیغام پہونچا سکتا ہے۔ دراصل اس طرح لفظوں کے ذریعہ علم سے پہلے وہ تصویروں کے ذریعے علم حاصل کر سکتے ہیں اور کتابوں وغیرہ کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ اگر ہمیں آج کے دیہی بچوں میں سے "صاحب اور" بابو "لوگوں" کے بجائے تعمیری اور پیداواری لوگ تیار کرنا مقصود ہے تو کمنوں کی تربیت، کردار سازی اور تشکیل کو کُتب بینی پر اولیت دی جانی چاہیئے۔ مزید برآں کمنوں کی یہ تربیت اور شعوری تشکیل تعلیمی عمل کا جانے پہچانے جغرافیائی عمرانی اور سماجی ماحول سے رشتہ جوڑ سکتی ہے، جس میں یہ بچے رہتے ہیں اور وہ جس تہذیبی روایات کی پیداوار ہیں۔

تفاوت

جسمانی مشقت کرنے والے کارکن جو روحانی اور ذہنی پیداواری نظام سے الگ تھلگ ہو گئے ہیں اور ذہنی کام کرنے والے کارکن جو مادی پیداواری نظام سے الگ تھلگ پڑ گئے ہیں، اُن کے درمیان خلیج، نو آبادیاتی نظام کی ایک نہایت خطرناک میراث ہے۔ اس کے علاوہ مروجہ سماج میں محنت کش عوام اور آسودہ حال طبقات کے درمیان تفاوت بھی پایا جاتا ہے۔ کیا نئی مواصلاتی ٹیکنالوجی اور اُس پر مبنی تعلیمی ٹیلی ویژن "ذہنی" کارکنوں اور جسمانی کارکنوں، محنت کش عوام اور آسودہ حال طبقات کے درمیان تفاوت کو بڑھائیں گے یا کم کریں گے؟

میری رائے میں ہمیں گاندھی جی کے نظریئے، فلسفے اور بصیرتوں کا جدید مواصلاتی ٹیکنالوجی کے وسیع تعلیمی امکانات کے ساتھ امتزاج کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہمیں جدید مواصلاتی ٹیکنالوجی کے ماہروں اور معلموں کے ایک ایسے طبقے کی ضرورت ہے جو گاندھی جی کے نظریوں کے رنگ میں رنگے ہوں اور اس کے ساتھ ہی جدید مواصلاتی ٹیکنالوجی کے تخلیقی استعمال کے ذریعے تعلیم کے شعبے میں اُنھیں عملی صورت دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے جن خطوط پر دیہی بچوں کو تعلیم دینے کا سُجھاؤ دیا ہے اُس میں ٹیچروں کی ایک نئی جماعت کو تربیت دینے کے لیے کہا گیا ہے جو دیہی حالات سے آگاہ ہو۔ اس سے پہلے کہ بچوں کو تعلیم دینے کے لیے ٹیلی ویژن کا استعمال کیا جائے، ٹیچروں کی تعلیم و تربیت ضروری ہے جو کہ از خود ایک بہت بڑا کام ہے

ڈاکٹر محمد مزمل

اُتر پردیش میں تکنیکی تعلیم کی ترقی

تکنیکی تعلیم پورے تعلیمی نظام کا وہ زمرہ ہے جس کا مُلک کی معاشی اور سائنسی ترقی سے براہِ راست تعلق ہے۔ دُنیا کے جن ممالک میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی ہوئی ہے وہی ممالک معاشی ترقی میں بھی آگے نکل سکے ہیں اور پھر اُن کی معاشی ترقی اُن کو مزید سائنسی اور تکنیکی عروج کی طرف لے جاتی ہے۔ تکنیکی روزگار دلانے میں معاون تعلیم سے انسان میں عمومی قابلیت، ہُنرمندی اور مخصوص کام کرنے کی بہتر صلاحیت پیدا ہوتی ہے جس سے وہ ملک کی معاشیات کے جس زُمرے میں بھی کام کرتا ہے وہاں اُس کی پیداواریت زیادہ ہوتی ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں تعلیم اور معاشی ترقی کے باہمی تعلقات پر جو تحقیقات کی گئی ہیں اُن سے صاف ظاہر ہے کہ مُلک کی معاشی ترقی میں تکنیکی تعلیم کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ خاص طور سے صنعتی زمرے کی ترقی کے لیے تکنیکی تعلیم کی فراہمی ایک لازمی شرط ہے۔ اسی لیے ہمارے ملک میں اور صوبہ اُتر پردیش میں منصوبہ بندی کے شروع سے ہی تکنیکی تعلیم کے فروغ پر سرکار نے دھیان دیا ہے اور ایسے اقدامات کئے ہیں جن سے تکنیکی تعلیم کو زیادہ وسیع اور اثر آفرین بنایا جاسکے۔

ریاست اُتر پردیش میں منصوبہ بند ترقی شروع ہوتے ہی یہ بات قبول کی گئی تھی کہ صوبے کی معاشی ترقی کے لیے تکنیکی تعلیم کا فروغ بہت اہم ہے مگر پہلے اور دوسرے پنج سالہ منصوبوں کے دَوران اس طرف کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ تیسرے پنج سالہ پلان کے شروع ہونے کے بعد اُتر پردیش میں تکنیکی تعلیم کی وُسعت اور فروغ کے لیے خاص اقدامات کئے گئے۔ نتیجے کے طور پر تکنیکی تعلیم یافتہ لوگوں کی جو کمی محسُوس کی جا رہی تھی اُسے بہت حد تک پُر کیا جاسکا۔ حتّیٰ کہ چوتھے منصوبے کے اختتام پر صوبے میں ٹکنیشینوں کی کچھ فاضل تعداد نظر آنے لگی لہٰذا چوتھے منصوبے کے آخری دنوں میں اور پانچویں منصوبے کے دَوران تکنیکی تعلیم کی وسعت پر زور دینے کے بجائے موجودہ سہولیات میں مزید پُختگی لانے کے اقدامات کئے گئے۔ چھٹے پنجسالہ پلان کے دَوران اعلیٰ تکنیکی تعلیم کے فروغ پر مخصوص دھیان دیا گیا جس سے صوبے کی بڑھتی ہوئی صنعتی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکے۔

اُتر پردیش میں تکنیکی تعلیم کی فراہمی کے نظام کو بہتر طور پر تین سطحوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ڈگری سطح کی تکنیکی تعلیم۔
۲۔ ڈپلومہ سطح کی تکنیکی تعلیم۔ اور
۳۔ سرٹیفکٹ سطح کی تکنیکی تعلیم۔

ان تینوں کی تفصیل نیچے درج کی جارہی ہے۔

ڈگری سطح کی تکنیکی تعلیم:

آزادی کے پہلے قائم کئے گئے ٹامسن کالج آف انجینئرنگ کو ۱۹۴۹ء میں رُڑکی یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل کیا گیا۔ اس طرح ہارکورٹ بٹلر ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ (ایچ۔ بی۔ ٹی۔ آئی) کانپور کو ملا کر پہلے منصوبے کے شروع میں ریاست میں ڈگری سطح کی تعلیم کے لیے دو ادارے تھے۔

پہلے پنجسالہ منصوبے کے دَوران ایک انجنیئرنگ کالیج دیال باغ، آگرہ میں قائم کیا گیا۔ دوسرے پلان کے دَوران گورنمنٹ سنٹرل ٹکسٹائل انسٹی ٹیوٹ (جی۔سی۔ٹی۔آئی) کانپور میں ٹکسٹائل ٹیکنالوجی اور ٹکسٹائل کیمسٹری کے کورس شروع کیۓ گئے۔ اس طرح دوسرے منصوبے کے اختتام پر ریاست میں ڈگری سطح کے چار ادارے قائم ہو گئے تھے۔ تیسرے منصوبے کے دَوران الہ آباد اور گورکھپور میں ایک ایک ریجنل انجنیئرنگ کالیج کھولے گئے اور پنت نگر زرعی یونیورسٹی میں پنت کالیج آف انجنیئرنگ اور ٹیکنالوجی کھولا گیا۔ چوتھے پنج سالہ منصوبے میں کوئی نیا ادارہ نہیں قائم کیا گیا۔ پانچویں پلان کے دَوران جی۔سی۔آئی۔ٹی کانپور میں مصنوعی ریشے اور چمڑے کی ٹیکنالوجی کے نئے کورس شروع کیۓ گئے۔ ایچ۔بی۔ٹی۔آئی۔کانپور میں بھی لیدر ٹیکنالوجی پر ایک ڈگری کورس شروع کیا گیا۔ انسٹی ٹیوٹ آف پیپر ٹیکنالوجی سہارنپور میں پیپر ٹیکنالوجی کا ڈگری کورس شروع کیا گیا۔ پانچویں پلان کی ہی مدت میں سُلطانپور میں کملا نہرو انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (کے۔این۔آئی) کا قیام عمل میں آیا۔

چھٹے پنجسالہ منصوبے کے دَوران لکھنؤ میں انسٹی ٹیوٹ آف انجنیئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی (آئی۔ای۔ٹی) قائم کیا گیا اور یہاں پر کالیج آف آرکیٹیکچر میں ۸۴-۱۹۸۳ء میں ڈگری کورس شروع کیا گیا۔ اس طرح چھٹے پنجسالہ پلان کے اختتام پر ریاست میں ڈگری سطح کے کُل دس ادارے تھے اور اُن میں داخلہ نشستوں کی مجموعی تعداد ۱۵۱۰ تھی۔

اُتر پردیش میں ڈگری سطح پر داخلہ نشستوں کی تعداد فی لاکھ آبادی پر صرف ۲٫۳۹ ہے جبکہ آندھرا پردیش میں یہ تعداد ۸٫۱۶، کرناٹک میں ۲۲٫۸۰ اور پورے ملک میں اوسطاً ۳٫۸ ہے۔ ظاہر ہے اُتر پردیش ابھی بھی بہت پیچھے ہے اس لیے ریاستی سرکار نے فیصلہ کیا ہے ساتویں پنجسالہ منصوبے میں ریاست میں تین اور انجنیئرنگ کالیج کھولے جائیں گے جن میں ایک بُندیل کھنڈ اور دو پہاڑی علاقوں میں ہوں گے۔ اس کے علاوہ اسی پلان میں صوبائی سرکار پردیش میں ایک مرکزی ٹیکنالوجیکل یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے جس سے ان تمام انجنیئرنگ کالجوں کو وابستہ کیا جا سکے۔

ریاست میں مرکزی سرکار کے زیرِانتظام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور بنارس ہندو یونیورسٹی میں بھی ڈگری سطح کی تکنیکی تعلیم کی فراہمی کا انتظام ہے۔ اُتر پردیش میں منصوبہ بندی کے دَوران تکنیکی تعلیم کی ترقی کو گوشوارہ نمبر ۱ میں درج کیا گیا ہے۔

ڈپلوما سطح کی تکنیکی تعلیم :

منصوبہ بندی کے شروع میں ریاست میں ڈپلوما سطح کے گیارہ تکنیکی تعلیمی ادارے موجود تھے۔ ان پالی ٹیکنک اداروں میں سِول انجنیئرنگ، الیکٹریکل، مکینیکل، ٹیکسٹائل کیمسٹری اور ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی کی تعلیم دستیاب تھی۔ ان میں کُل داخلہ نشستوں کی تعداد تقریباً ساڑھے چھ سو تھی۔ پہلے منصوبے کے دَوران اس میں کسی طرح کا کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ دوسرے پنجسالہ منصوبے کے دَوران بریلی، جھانسی اور خورجہ میں ایک ایک پالی ٹیکنک کا قیام عمل میں آیا۔ ان کے علاوہ چار سِول انجنیئرنگ اسکول چندولی (بنارس)، سنڈیلا (الہ آباد)، نینی تال اور ہاتھرس میں کھولے گئے۔ پرنٹنگ ٹیکنالوجی کا ایک علاقائی ادارہ الہ آباد میں کھولا گیا۔ اس طرح دوسرے پلان کے اختتام پر اداروں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا اور داخلہ نشستوں کی تعداد بڑھ کر تقریباً ۳۰۰۰ ہو گئی تھی۔ تیسرے پنجسالہ منصوبے کے دَوران بستی، گونڈہ، اعظم گڑھ اور مراد آباد میں ایک ایک پالی ٹیکنک قائم کیا گیا۔ لکھنؤ میں لڑکیوں کی تکنیکی تربیت کے لیے ایک گرلس پالی ٹیکنک کھولا گیا۔ چمڑے کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے ایک لیدر انسٹی ٹیوٹ آگرہ میں کھولا گیا۔ سویڈن کی سرکار کی مدد سے ایک انسٹی ٹیوٹ آف پیپر ٹیکنالوجی سہارنپور میں کھولا گیا۔ اس کے علاوہ اسی پنجسالہ مدت میں مختلف اداروں کی داخلہ نشستوں کی تعداد میں بھی اضافہ کیا گیا۔ ۶۹-۱۹۶۸ء میں شری نگر (گڑھوال) میں ایک پالی ٹیکنک کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح ۱۹۷۰-۷۱ء میں داخلہ نشستوں کی تعداد تقریباً پونے چھ ہزار ہو گئی۔

چوتھے منصوبے کے دَوران پہلے سے چلے آ رہے کورسوں کے علاوہ نئی نئی صنعتوں کے لیے نئے نئے کورس کھولنے پر زور دیا گیا۔ ان میں آٹوموبائل انجنیئرنگ، ریفریجریشن، ایرکنڈیشننگ، الیکٹرانکس اور زرعی انجنیئرنگ کی تعلیم اور تربیت اہم تھیں۔ داخلہ نشستوں کی تعداد چوتھے پلان کے آخر میں تقریباً سوا چھ ہزار ہو گئی۔ پانچویں منصوبے کے دوران اُس وقت کی موجودہ ضروریات کے لحاظ سے ڈپلوما کورس میں مزید ترمیم کی گئی اور تعلیمی نصاب میں نئے کورس شامل کیۓ گئے۔ اسی مدت میں ریاست کے پہاڑی علاقوں میں پانچ پالی ٹیکنک کھولے گئے۔ یہ ادارے کاشی پور (نینی تال) نرندر نگر (ٹہری)، اُتر کاشی، دواراہاٹ (الموڑہ) اور لوہاہاٹ (پتھورا گڑھ) میں کھولے گئے۔ ہمیرپور ضلعے میں ایک گورنمنٹ پالی ٹیکنک کا قیام عمل میں آیا۔ پردیش کے تمام اداروں میں داخلہ نشستوں کی تعداد بڑھ کر ۷۰۰۰ ہو گئی۔

چھٹے منصوبے کے دَوران ریاستی سرکار نے یہ فیصلہ کیا کہ پالی ٹیکنک اداروں میں داخلہ

نشستوں کی تعداد بڑھائی جائے جس سے زیادہ سے زیادہ طلبا کو تکنیکی تعلیم کی طرف موڑا جا سکے۔ اس لیے پورے صوبے میں ۳۷ نئے پالی ٹیکنک ادارے کھولے گئے جن کی کل داخلہ گنجائش تقریباً ۹۰۰۰ ہوگئی۔ اس طرح چھٹے پلان کے اختتام پر قریب قریب ہر ضلع میں ایک ایک پالی ٹیکنک قائم ہو چکا ہے۔ اب صوبے کی مختلف ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ٹیکنیشینوں کی تربیت کے لیے ایسے ۶۹ ادارے موجود ہیں جو اُتر پردیش ٹیکنیکل ایجوکیشن بورڈ کی نگرانی میں تکنیکی تعلیم و تربیت فراہم کرتے ہیں۔

حالانکہ اُتر پردیش میں اس وقت پالی ٹیکنک اداروں کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود ہے مگر اُن میں ابھی معقول تربیت کے واسطے سازوسامان مہیا نہیں کیا جا سکا ہے۔ سرکار نے فیصلہ کیا ہے کہ ساتویں پلان میں اس طرف خاص توجہ دی جائے گی اور ان سبھی اداروں کو مضبوط کیا جائے گا۔ ڈپلوما سطح کی تعلیم کو گوشوارہ نمبر ۲ میں درج کیا گیا ہے۔

سرٹیفکیٹ سطح کی تکنیکی تعلیم:

بھارت سرکار کی ایک کمیٹی کی سفارش پر اُتر پردیش میں صنعتی زُمرے میں تربیت یافتہ اور ہُنرمند کاریگروں کی فراہمی کے لیے ۶۰-۱۹۵۹ء میں سکنڈری ٹیکنیکل اسکول کھولے گئے جو سرٹیفکیٹ سطح کی تکنیکی تعلیم و تربیت فراہم کرتے ہیں۔ انھیں بعد میں گورنمنٹ سکنڈری ٹیکنیکل اسکول کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ان اسکولوں میں تین سال کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہوتا ہے اور یہاں درجہ آٹھ پاس طلبا داخلہ لے سکتے ہیں۔ شروع شروع میں صوبے میں پانچ ایسے اسکول تھے جو میرٹھ، جونپور، غازی پور، جھانسی اور الہ آباد میں قائم تھے۔ تیسرے پلان کے دوران آٹھ نئے سکنڈری ٹیکنیکل اسکول کھولے گئے جو لکھنؤ، بریلی، مرزا پور، اعظم گڑھ، فیض آباد، گورکھپور، گونڈہ اور مرادآباد میں قائم کیے گئے اور گورنمنٹ پالی ٹیکنک اداروں کے ماتحت ہیں۔ اس طرح تیسرے پلان میں ان اداروں کی کل تعداد ۱۳ ہوگئی۔ ان میں داخلہ نشستوں کی تعداد تقریباً ۸۰۰ تھی۔ چوتھے منصوبے کے دوران ان میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اُسی وقت ان اداروں سے فارغ طلبا کے سرٹیفکیٹ کو ہائی اسکول معیار کے برابر تسلیم نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے ان طلبا کو روزگار ملنے میں دقتیں پیش آئیں۔ اس لیے ان اداروں میں ۷۱-۱۹۷۰ء میں داخلے بند کر دیے گئے۔ بعد ازاں جب ان اداروں کے سرٹیفکیٹ کو ہائی اسکول کے برابر تسلیم کر لیا گیا تو ۷۳-۱۹۷۲ء میں ان میں سے بارہ گورنمنٹ سکنڈری ٹیکنیکل اسکولوں کو دوبارہ کھولا گیا۔ ان میں داخلہ نشستوں کی تعداد بڑھا کر تقریباً ایک ہزار کر دی گئی۔ پانچویں اور چھٹے پلان میں ان اسکولوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ پردیش کے سکنڈری ٹیکنیکل اسکولوں کو پھر سے منظم کرنے کا ایک پلان ریاستی سرکار کے زیرِ غور ہے۔ سرٹیفکیٹ سطح کی تکنیکی تعلیم کی ترقی کو گوشوارہ نمبر ۳ میں درج کیا گیا ہے۔

اس طرح اُتر پردیش میں ڈگری، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ سطح کی تکنیکی تعلیم کی ترقی کا جائزہ لینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ منصوبہ بندی کے دوران اس ضمن میں قابلِ ذکر پیش رفت ہوئی ہے۔ اور ہر شعبے میں تکنیکی تعلیم نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس سے نہ صرف ریاست کی معاشی ترقی میں مدد ملی ہے بلکہ تکنیکی تعلیم و تربیت یافتہ لوگ خود ذاتی طور پر اپنا کوئی روزگار چلا کر بہت مستفید ہوئے ہیں۔ ہر طرح کی ترقی کے لیے مثلاً آبپاشی، توانائی، نقل و حمل، رسل و رسائل، پانی کی فراہمی سرکاری اور غیر سرکاری صنعتی اداروں میں اور جدید زرعی ترقی کے لیے تکنیکی تعلیم یافتہ لوگوں کی خاص ضرورت ہے۔ کمپیوٹر اور الیکٹرانکس کے بڑھتے ہوئے استعمال سے تکنیکی تعلیم و تربیت کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ مرکزی سرکار نے بھی اپنی نئی تعلیمی پالیسی میں تکنیکی تعلیم کی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے اور اس کی وسعت و فروغ پر زور دیا ہے۔

چونکہ معاشی ترقی کے لیے انسانی وسائل کی فراہمی میں تکنیکی تعلیم بنیادی کردار ادا کرتی ہے اس لیے جدید ٹیکنالوجی کے زیرِ اثر معاشیات کی بدلتی ہوئی ضروریات کو مدِنظر رکھتے ہوئے تکنیکی تعلیمی نظام کو عصری معاشی تقاضوں کے موافق ڈھالنے کی سخت ضرورت ہے۔

گوشوارہ نمبر (۱)

اُتر پردیش میں ڈگری سطح کی تکنیکی تعلیم کی ترقی

سال	اداروں کی تعداد	اشاریہ	داخلہ نشستوں کی تعداد	اشاریہ
۵۱-۱۹۵۰	۲	۱۰۰	۱۸۰	۱۰۰
۵۶-۱۹۵۵	۳	۱۵۰	—	—
۶۱-۱۹۶۰	۴	۲۰۰	۴۲۸	۲۳۸

۱۹۶۵ — ۶۶	۶	۳۰۰	۱۱۰۵	۶۱۴
۱۹۶۷ — ۶۸	۷	۳۵۰	۱۹۲۵	۱۰۹۲
۱۹۷۷ — ۷۰	۷	۳۵۰	۱۱۳۸	۶۳۲
۱۹۷۹ — ۸۰	۸	۴۰۰	۱۱۲۰	۶۶۲
۱۹۸۴ — ۸۵	۱۰	۵۰۰	۱۵۱۰	۸۳۹

گوشوارہ نمبر(۲)

اُتّرپردیش میں ڈپلوما سطح کی تکنیکی تعلیم کی ترقی

سال	اداروں کی تعداد	اشاریہ	داخلہ نشستوں کی تعداد	اشاریہ
۱۹۵۰ — ۵۱	۱۱	۱۰۰	۶۵۵	۱۰۰
۱۹۵۵ — ۵۶	۱۱	۱۰۰	۶۵۵	۱۰۰
۱۹۶۰ — ۶۱	۲۷	۲۴۵	۲۹۳۰	۴۴۷
۱۹۶۵ — ۶۶	۳۴	۳۰۹	۴۸۶۰	۷۴۲
۱۹۷۰ — ۷۱	۳۵	۳۱۸	۵۷۵۰	۳۷۸
۱۹۷۳ — ۷۴	۳۵	۳۱۸	۶۲۴۰	۹۵۳
۱۹۷۷ — ۷۸	۴۳	۳۹۱	۷۷۲۳	۱۱۷۹
۱۹۸۱ — ۸۲	۵۰	۴۵۵	۸۵۷۰	۱۳۰۸
۱۹۸۴ — ۸۵	۶۹	۶۲۷	۹۰۰۰	۱۳۷۴

گوشوارہ نمبر(۳)

اُتّرپردیش میں سرٹیفکٹ سطح کی تکنیکی تعلیم کی ترقی

سال	اداروں کی تعداد	اشاریہ	داخلہ نشستوں کی تعداد	اشاریہ
۱۹۵۰ — ۵۱	ایسے ادارے نہیں تھے			
۱۹۵۵ — ۵۶	”	”		
۱۹۶۰ — ۶۱	۵	۱۰۰	۳۰۰	۱۰۰
۱۹۶۵ — ۶۶	۱۳	۲۶۰	۷۸۰	۲۶۰
۱۹۷۰ — ۷۱	سبھی اسکول بند کر دیے گئے تھے			
۱۹۷۲ — ۷۳	۱۲	۲۴۰	نامعلوم	—
۱۹۷۷ — ۷۸	۱۲	۲۴۰	۱۰۱۵	۳۳۸
۱۹۷۹ — ۸۰	۱۲	۲۴۰	۸۶۰	۲۸۷
۱۹۸۴ — ۸۵	۱۲	۲۴۰	۱۰۰۰	۳۳۳

بقیہ، ایڈز کی وجوہ

اور گھناؤنی بیماری سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے وائرس پر قابو پانے کا کوئی طویل المیعاد طریقہ اپنایا جائے تاکہ انسانی زندگیوں کو موت کے منھ سے بچایا جا سکے ۔ ! آج کے اس سائنسی دور میں وائرس کو ہلاک کر ڈالنے کا طریقہ تلاش کرنا چاہیئے اور ماہرینِ طب ایسا کرنے بھی لگے ہیں۔ لیکن اس قسم کی فعال کوشش کو برق رفتار کرنا پڑے گا۔

ایڈز کا علاج ناممکن نہیں ہے

اگر مریض کی کیس ہسٹری معلوم کر لی جائے، اس کی ذہنی وسماجی کیفیات کا پتہ لگا لیا جائے تو "ایڈز" کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ جہاں سائنسی ماہرین نے بے شمار خطرناک اور ہولناک جراثیم کو مار دینے کی دوائیں ایجاد کر لی ہوں، بھلا وہاں "ایڈز" کے وائرس کو ہلاک کر ڈالنے کی دوائیں کیوں کر تیار نہیں کی جا سکتیں؟ جب محققین برص جیسے لاعلاج مرض کی دوا تیار کر سکتے ہیں تو "ایڈز" کے لیے دوا بنا لینا کیسے ناممکن سمجھا جا سکتا ہے؟ بس ذرا کھوج بین، لگن اور خدمتِ خلق کا جذبہ درکار ہے۔

آخر میں میں یہ دُہرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کو اس مرض سے محفوظ رکھنے کے لیے مذکورہ اصولوں پر پابندی کے ساتھ ہر شہری کو عمل کرنا چاہیئے ! پاکیزگی کی زندگی گذارنے والا ہر فرد اس بیماری سے سَو فیصدی محفوظ رہ سکتا ہے ۔ بیماری میں مُبتلا ہو جانے کے بعد علاج معالجہ سے بہتر بیماری سے پہلے احتیاطی تدابیر اور با اصول رہنا ہی عقلمندی ہے۔

●

ڈاکٹر پی۔سی۔جوشی

دیہی بچّوں کی تعلیم میں ٹی۔وی کی افادیت

ذیل کے مضمون میں مصنف نے بچّوں اور خصوصاً دیہی بچّوں میں اشاعتِ تعلیم کے لیے ٹیلی ویژن کے کردار پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس سے بال مزدوروں کا مسئلہ حل کرنے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔

اس بات پر بحث کرنے میں اب کوئی فائدہ نہیں ہے کہ بچّوں اور خصوصاً دیہی بچّوں کی تعلیم کے شعبے میں اعلیٰ ٹیکنالوجی رائج ہونی چاہیے یا نہیں۔ مرحوم ڈاکٹر سارا بھائی نے ۱۹۶۹ء میں ایک مقالہ تیار کیا تھا جس کا عنوان تھا "ترقی کے لیے ٹیلی ویژن" جس میں ترقی پذیر ملکوں کی جانب سے افلاس، ناخواندگی اور سماجی پسماندگی کے خلاف اُن کی قومی جنگ میں اعلیٰ مواصلاتی ٹیکنالوجی سے فائدہ اُٹھانے کے لیے سفارش کی گئی تھی۔ سائٹ ایکسپریمنٹ جو بیشتر دیانہ طور پر چیدہ ریاستوں کے دیہی علاقوں میں شروع کیا گیا تھا وہ اُس دستور کار کا باعث بنا جو ڈاکٹر سارا بھائی کے مقالے میں اختیار کیا گیا تھا۔ میری رائے میں اس تجربے کے جائزے میں مجوزہ راہ سے ہٹنے پر نہیں بلکہ اُس پر پیش قدمی کرنے پر زور دیا گیا تھا۔

بھارت برصغیر کا ایک عظیم ملک ہے، اس میں سینکڑوں دیہات جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں، لہٰذا ان دیہات میں بچّوں اور بالغوں کو تعلیم دینے کے لیے ترقی یافتہ ٹیکنالوجی سے استفادہ وقت کی ضرورت ہے۔ بھارت میں دیہی بچّوں اور بالغوں کو ٹیلی ویژن کی تعلیم دینے کا جو تجربہ کیا گیا اس سے دیگر ترقی پذیر ملکوں نے بھی فائدہ اُٹھایا، اس سے قبل وہ تعلیم و ترقی میں جدید ٹیکنالوجی کے رول سے پوری طرح باخبر نہیں تھے، البتہ بھارت کے تجربات ان کے لیے مشعلِ راہ بن سکے۔

بھارت میں مارچ ۱۹۸۳ء میں وزارتِ نشر و اشاعت کی طرف سے "سافٹ ویر پلاننگ کمیٹی" بنائی گئی تھی جس کے ساتھ میں وابستہ تھا، اس نے بھی تعلیمی ٹیلی ویژن کا سوال اُٹھایا تھا۔ کمیٹی نے بھارت کے بیشتر حصّوں کا دورہ کیا اور عوام میں سے سب طرح کے لوگوں ـــ کسانوں، دستکاروں، دیہی مزدوروں، صنعتی کارکنوں اور شہری مرکزوں کے نچلے، متوسط طبقہ کے لوگوں کے ساتھ ملاقات کی تھی۔

ہمیں یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ دُور دراز کے علاقوں کے لوگ بھی ٹیلی ویژن کی موجودگی سے آگاہ ہیں۔ علاوہ ازیں شہروں کے اونچے طبقوں کی نسبت جو اکثر ٹیلی ویژن کو زیادہ تر تفریح طبع کا ذریعہ تصور کرتے ہیں وہ تعلیم و ترقی کے لیے ٹیلی ویژن کے استعمالات سے کہیں زیادہ آگاہ ہیں۔ اُنھوں نے ہمیں ایسے متعدد قسموں کے پروگراموں کا مشورہ بھی دیا جو اُن کے روزمرہ کے مسائل حل کرنے میں مفید ثابت ہوسکتے ہیں جن میں اُن کے بچّوں کی تعلیم کے مسائل بھی شامل ہیں۔ جنھیں ہمیشہ اسکول تک رسائی حاصل نہیں ہوتی۔

تیسری دُنیا کے بچّے

چونکہ یہ مقالہ بچّوں، خصوصاً دیہی بچّوں پر مرکوز ہے اس لیے میں اس امر پر زور دینا پسند

کروں گا کہ نادار اور مالدار ممالک کے درمیان بنیادی نوعیت کا بڑا فرق ہے جس کے بارے میں ہم کما حقہ طور پر آگاہ نہیں ہیں۔ مغرب کے ترقی یافتہ ممالک میں آبادی کی ہیئت بنیادی طور پر مختلف ہے اور ترقی یافتہ ملکوں میں بچوں کے مسائل اتنے شدید اور گمبھیر نہیں ہیں جیسا کہ ترقی پذیر ملکوں میں، ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک میں تو یہ بچے پوری آبادی کے سامنے تعلیم کے حصول کے ضمن میں ایک دشوار کن مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں بچے کُل آبادی کا ۴۰ فیصد تھے ان کی غالب اکثریت دیہی اور شہری علاقوں کے غریب کنبوں سے تعلق رکھتی ہے۔

زیادہ تر محنت کش بچے

ملک میں نادار کنبوں کے بچوں کی تعلیم ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ تعلیم اور اقتصادی حالت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بچوں کا بہت بڑا تناسب محنت کش بچوں پر مشتمل ہے۔ ایسے بچوں پر جو یا تو اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں اور مختلف قسم کے کم اجرت والے غیر ہنرمندانہ کاموں کے ذریعے اپنے والدین کی آمدنی میں اضافہ کر رہے ہیں یا کھیتی باڑی، پشو پالن، ماہی گیری، چھوٹے پیمانے کی دستکاریوں، تجارت اور دوسری سرگرمیوں جیسے کنبوں کے کاموں میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ کنبہ کی مالی ذمہ داریاں پہلے ہی عائد ہو چکی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں جن بچوں کو اپنے اسکولی تعلیم کے لیے اپنا تمام تر وقت صرف کرنا چاہیئے تھا یا بالغوں کے طور پر پیشہ ورانہ زندگی میں داخل ہونے کی تیاری کرنی چاہیئے تھی وہ پہلے ہی سال مزدوروں کے طور پر پورے وقت یا جزوی وقت کی پیشہ ورانہ زندگی میں داخل ہو چکے ہیں۔

ہمیں پہلے ہی تمام ملک میں ایسے ۵۰ فیصد بچوں کے مسئلے کا سامنا ہے جو اسکول جانے کی عمر میں پہنچنے کے باوجود واقعی اسکول سے باہر ہیں یا جو اسکول تک رسائی نہیں رکھتے اور ایسے بچوں کی ۸۰ فیصد تعداد پسماندہ ریاستوں میں ہے۔

بڑھتی ہوئی تعداد

بھارت یا دوسرے ترقی پذیر ملکوں میں بال مزدوروں کی تعداد کا کوئی قابلِ اعتبار تخمینہ نہیں ہے تاہم اس کے بارے میں کچھ اندازہ ایک سیمینار کی رپورٹ کے ایک حصے سے ہوتا ہے جو ایک غیر رسمی گروپ موسومہ بہ "محنت کش بچوں کے لیے تشویش" کی جانب سے نومبر ۱۹۸۵ء میں بنگلور میں منعقد ہوا تھا۔

"بال مزدور دیہی اور شہری معاشیات کے تمام شعبوں میں موجود ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں کئے گئے ایک نمونہ جاتی سروے کے مطابق ۱۵ برس سے کم عمر کے محنت کش بچوں کی تعداد ایک کروڑ ۳۰ لاکھ ۶۰ ہزار تھی۔ لیکن آپریشنز ریسرچ گروپ بڑودہ کے مطابق یہ تعداد اسی برس میں ۴ کروڑ ۴۰ لاکھ تھی۔ حساب کے ۸۰ فیصد کو بروئے کار لایا جائے تو ۱۹۸۵ء میں اُن کی تعداد ۵ کروڑ ۲ لاکھ ۲ ہزار ہو گئی ہوگی اس تنظیم کے فیصلے کے مطابق ۵ سے ۱۵ برس کی عمر کے گروپ کا فیصد تمام آبادی یا ۱۹ کروڑ ۶۵ لاکھ کا ۲۶،۲ فیصد ہے۔ کم از کم ۹ کروڑ ۸۲ لاکھ ۵۰ ہزار بچے زیادہ ممکن طور پر کنبوں کی آمدنی میں اضافہ کر رہے ہیں یا اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں۔ لہٰذا ۵ کروڑ ۲ لاکھ ۲۰ ہزار کی تعداد احتیاط پسندانہ تخمینہ ہے جبکہ بال مزدوروں کی کُل تعداد ۹ کروڑ اور ۱۰ کروڑ کے درمیان کہیں ہو سکتی ہے۔

تعلیم عیاشی کی چیز

جب ہم بچوں کی تعلیم اور خصوصاً دیہی بچوں کے لیے تعلیمی ٹیلی ویژن کی بات کریں تو ہمیں بہ ضرور دریافت کرنا چاہیئے کہ بچہ کون ہے یا اُس لڑکے یا لڑکی کو باقاعدہ اسکولی تعلیم دستیاب ہے؟ ہمیں معلوم ہوگا کہ بچوں کے بہت بھاری تناسب کے لیے تعلیم عیاشی کی چیز ہے جس کی وہ استطاعت نہیں رکھتے کیونکہ پہلے انھیں اپنی گزر اوقات اور بقاء کے لیے کنبے کی آمدنی میں ہاتھ بٹانے کے بارے میں سوچنا ہے۔ جس بنگلور سیمینار کا پہلے ذکر کیا گیا ہے اُس کی رپورٹ کا پھر حوالہ دیا جاتا ہے۔

۱۹۸۲ء میں ۴ برس سے ۱۸ برس کے نیچے کی عمروں کے ۲۲۲۲۴۰۰۰ بچوں میں اسکولوں میں کُل داخلے کی شرح ۴۲،۸ فیصد تھی۔ (چوتھا کُل بھارت تعلیمی سروے، این سی ای آر ٹی ۱۹۸۲ء) باقیماندہ بچے کہاں گئے؟

ایسے محنت کش بچوں کے لیے جو تعلیم کے باضابطہ نظام سے باہر ہیں اُن کے لیے کس طرح کی تعلیم ضروری ہوگی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا ضروری ہے۔ کیا اُن کارکن بچوں کی حالت میں ٹیلی ویژن کے ذریعے تعلیم کو کوئی رول ادا کرنا ہے۔ کیا ٹی۔وی کی تعلیم ایسے بچوں کے لیے کسی طرح مفید ہو سکتی ہے۔ جنھیں اپنے گزر اوقات کے لیے بچپن سے ہی کام میں لگ جانا ہوتا ہے۔

ٹیلی ویژن کے ذریعے تعلیم

جدید مواصلاتی ٹیکنالوجی جو کردار کے لحاظ سے سماعی و بصری ہے بچوں اور خصوصاً دیہی بچوں کی تعلیم کے لیے مثالی طور پر موزوں ہے۔ ایسا اس لیے ہے کیونکہ پیداوار بڑھانے میں معاون دھندوں کی تربیت کے لیے یہ ضروری

(باقی صفحہ ۹ پر)

ڈاکٹر غلام محمد یحییٰ خاں

اِنسانی ذہن کی نشو و نما اور ٹیلی ویژن

موجودہ دور ایک ترقی یافتہ دور سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ اس دور میں روز بروز نت نئی ایجادات وجود میں آرہی ہیں چنانچہ انسان کے ذہن کی نشو و نما کے بے شمار ذرائع بھی وجود میں آتے جارہے ہیں ان میں کچھ کے طفیل انسانوں کے ذہن کی نشو و نما ایک طے شدہ منصوبے کے تحت کی جارہی ہے اور کچھ ذرائع ایسے ہیں جو بالواسطہ انسانوں کے ذہن پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ یہ ذرائع اسکول، کالج، کتب خانے، کتابیں اخبارات، پریس، سینما، ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ ہیں۔ مذکورہ بالا ذرائع میں ٹیلی ویژن کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ ٹیلی ویژن کے سوا دیگر تمام ذرائع مثلاً اسکول کالج، کتب خانے، اخبارات و رسائل وغیرہ سے انسان کے ذہن کی نشو و نما صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے جب وہ پڑھے لکھے ہوں اور عوام و خواص، ہر طبقہ کے انسانوں کے ذہن کی نشو و نما میں بہت نمایاں رول ادا کرتا ہے۔ ٹیلی ویژن کو انسانی ذہن کی نشو و نما میں خاص اہمیت اس لئے بھی حاصل ہے کہ یہ دورِ حاضر کی ایک ایسی جدید ترین ایجاد ہے جو انسان کے ذہن کو دو طرح سے متاثر کرتی ہے۔ یعنی تصویروں کا تماشا کر کے اور پھر گفتگو اور مکالمے کو گوش گزار کر کے یعنی ٹیلی ویژن کے کسی فیچر کے اثرات ذہن کے لئے دو جہتی ہوتے ہیں۔ سینما کی طرح اس کے پروگرام بھی غیر مفید ہوتے ہیں۔ دراصل یہ پروگرام قومی، ملی، سیاسی، سماجی اور مذہبی، غرضیکہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہوتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کے پروگرام جب شہریت و قومیت کے تصور کی وضاحت کرتے ہیں تو انسان کا ذہن بیدار ہوتا ہے۔ جمہوریت کی بقا اور قیام امن کے لئے ضروری ہے کہ کسی آزاد ملک کے عوام کو شہریت و قومیت کے تصورات ذہن نشین کرائے جائیں۔ ہمارے ملک کی ایک طویل مدت کی غلامی نے ہم ہندوستانیوں کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کو کافی حد تک متاثر کر رکھا تھا۔ ہمارے عوام میں تنگ نظری اور فرقہ واریت جیسی برائیاں پیدا ہو گئی تھیں لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستانیوں نے دنیا کے سامنے ہمیشہ صداقت، محبت، اہنسا اور بھائی چارگی کا فلسفہ پیش کیا ہے اور ہندوستان مسلسل ان آدرشوں کو حاصل کرنے کا کوشاں رہا ہے۔ لیکن انسانو کے ذہن کی نشو و نما کے بغیر ان آدرشوں کو حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہم ہندوستانیوں کے لئے یہ ذہنی نشو و نما اور بھی ضروری ہے۔ اس کے بدولت ہمارے اندر یہ جذبہ بیدار ہوگا کہ ہم مذہب، نظریہ، اور رنگ و نسل کے اختلافات کے باوجود ایک اور متحد ہیں۔

اور عام طور پر بھی اس جذبے کے پیدا ہونے پر انسان عظیم اخلاقی قدروں کا مالک اور اعلیٰ کردار کا ایک مہذب شہری ہوگا۔ ملک کی سالمیت اور جمہوریت کی حفاظت کے لئے ایک بڑی فوج نہیں بلکہ مہذب شہری ضروری ہیں۔ اگر ٹیلی ویژن کے ذریعہ انسانی ذہن کی نشو و نما کا سلسلہ جاری رہے گا تو انسان تنگ نظری اور فرقہ واریت سے اوپر اٹھے گا۔ ملک و قوم کے تحفظ و ترقی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے گا اور اس سلسلے میں ہمیشہ اپنے معیار و مقام سے عمل کرے گا۔

ٹیلی ویژن کے ذریعے انسان کے ذہن کی نشو و نما کر کے قومی یکجہتی کے جذبے کو خصوصیت کے ساتھ فروغ دیا جا سکتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ملک کی سالمیت اور جمہوریت کے استحکام کے لئے قومی یکجہتی لازمی شرط ہے ہمارے ملکوں میں کئی فرقوں اور مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ عوام کی زبانوں، ان کے لباس اور رہن سہن میں نمایاں فرق ہے۔ اس لئے قومی یکجہتی ایک ضروری مسئلہ ہے۔ لہٰذا انسانوں کو یہ ذہن نشین کرانا ضروری ہے کہ اگر ہم اپنے فرقہ، اپنے مذہب اور اپنی زبان کو زیادہ اہمیت دیں گے اور ملک کی یک جہتی کو نظرانداز کر دیں گے تو ملک کی سالمیت اور جمہوریت کے استحکام کو خطرہ لاحق ہوگا۔ ایسی صورت میں ہر ہندوستانی کو قومی یکجہتی کا درس دینا ضروری ہے۔ ٹیلی ویژن اس سلسلہ میں نمایاں حصہ لیتا ہے اور لیتا رہے گا۔

امن اور محبت کا بین الاقوامی شعور بھی وقت کی مانگ ہے یہ شعور کسی قوم و ملت کی ترقی اور اس کے عوام کے فلاح و بہبود کی گارنٹی ہے۔ اگر دنیا کے ممالک کے درمیان باہمی دوستی اور بھائی چارہ نہ ہو اور ایک ملک دوسرے ملک کے مفاد سے بے نیاز رہے، اور اس میں صحت مند باہمی تعلقات کا فقدان ہو تو اس کے معنی تباہی و بربادی ہوں گے۔ دنیا ہر لمحہ بدلتی جارہی ہے اور تیزی کے ساتھ ایک نقطہ پر سمٹتی آرہی ہے۔ ان حالات میں ہماری زندگی کا چلن بھی رفتہ رفتہ بین الاقوامی ہوتا جارہا ہے چنانچہ اب انسان کو اس آزمائش میں اپنا خاص رول ادا کرنا ہے دنیا سے جنگ کے خطرات کو ختم کرنے اور انسانیت کی بقا کے لئے انسان کے ذہن کی صحتمند تعمیر و تشکیل ضروری ہے۔ جنگ ہمیشہ انسان کے ذہن سے شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ اسے سب سے پہلے انسان کے ذہن میں ہی ختم کرنا ہوگا۔ اس لئے انسانی ذہن کی نشو و نما کر کے ہی دائمی امن قائم ہو سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو خصوصیت کے ساتھ بین الاقوامی جذبہ کو فروغ دینے کے لئے ٹیلی ویژن کو ذہنی نشو و نما کا آلۂ کار بنانا ضروری ہے۔

●

ارشاد احمد صدیقی

بھارت میں شمسی توانائی

چاہے ریاست اُتر پردیش ضلع غازی آباد کا گاؤں "اچھیجا" ہو یا ریاست مدھیہ پردیش کا "اُنجورا" ہندوستان کی دُور دراز ریاست میزورم کا "رزکی" ان سب میں شمسی توانائی کے نئے نئے تجربات کئے جا رہے ہیں غیر روایتی توانائی کی پیداوار سے ایک قسم کا سبزانقلاب (Green Revolu...) آگیا ہے۔ آج ہندوستان کے ہزاروں دیہات اور شہر شمسی توانائی سے جگمگا رہے ہیں۔ پون چکیاں (ہوا سے چلنے والی چکی) یا گوبر گیس پلانٹ سے کھیتوں اور بڑے بڑے فارموں کو اچھی طرح سے سیراب کیا جا رہا ہے اور گھروں کو بجلی اور ایندھن مل رہے ہیں نئی ایٹمی توانائی (...ew Atomic ...ergy) پر تجربات کرنے والے سائنسداں سورج (شمسی توانائی) کو زمین پر لے آئے ہیں جو ہماری تعمیر و ترقی کا ایک زبردست کارنامہ ہے اور اس سے لاکھوں انسانوں کی زندگی میں ایک تبدیلی آئی ہے۔

شمسی توانائی چولہا

یہ ایک قسم کا بند ڈبّہ ہوتا ہے جس میں نہ ایندھن دکھائی دیتا ہے اور نہ آگ، اوپر ایک کانچ کی پلیٹ (دیوارنما) ہوتی ہے اور اندر کی طرف کالا روغن کر دیا جاتا ہے جس سے اس پر پڑنے والی سورج کی کرنیں یا شعاعیں جذب ہو جائیں اور وہ گرمی میں بدل کر ایندھن کا کام کریں۔ اب ہمارے دیس میں بہت سی مینوفیکچرس کمپنیاں شمسی توانائی چولہے بنانے میں مصروفِ عمل ہیں اور سولر ککر (Solar Cooker) کے نام سے یہ مارکیٹوں میں فروخت کرتے ہیں۔ سولر چولہوں (Solar Cooker) کا فائدہ یہ ہے کہ ان سے دس مہینے ایندھن کی بچت ہو سکتی ہے اور بڑے آرام سے دونوں وقت کا کھانا ان پر پکایا جا سکتا ہے۔

شمسی توانائی چولہوں اور نئے نئے قسم کے ماڈل والے چولہوں کی بدولت دیہات و شہر کی گھریلو عورتوں کو راحت ملی ہے اور انھیں دُھوئیں سے نجات ملی ہے۔ اس وقت بیس لاکھ خاندانوں میں یہ چولہے خوب کام کر رہے ہیں، ایک اندازے کے مطابق پندرہ لاکھ ٹن سالانہ لکڑی کی بچت ہو رہی ہے جس کی قیمت تقریباً ساٹھ ستّر کروڑ روپے ہوتی ہے جو ایک ریکارڈ ہے۔ یہ چولہے عوام میں اتنے مقبول ہو گئے ہیں کہ ۱۹۸۵ء سے ۱۹۸۶ء کے لیے ان کی مقرّرہ تعداد پانچ لاکھ سے دس لاکھ کرنی پڑی۔ اب تک کُل بیس لاکھ چولہے کام کر رہے ہیں جہاں تک چولہوں کا کام کرنے کا سوال ہے عام چولہوں کی بہ نسبت صرف چھ فیصدی تک کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جو ترمیم شدہ اور نئے نئے قسم کے ماڈل چولہوں میں بیس فیصدی تک ہے ابھی حال میں چولہوں کے ۲۳ نئے قسم کے ماڈل شامل کیے گئے ہیں۔ ریاست تامل ناڈو میں امدادِ باہمی سوسائٹی اشتراک سے بنے چولہوں کے منصوبے کو اسکولوں میں کھانا دینے کے منصوبے سے منسلک کیا جا رہا ہے۔

اصل میں آزمائشی مراحل طے کرنے کے بعد توانائی پروگرام نے اب کافی ترقی حاصل کر لی ہے۔ ہمارے ملک کا گوبر گیس پلانٹ عوام الناس میں دن بدن مقبولِ عام ہو رہا ہے اب اس قسم کے گوبر گیس پلانٹوں کی کھپت لاکھوں کی تعداد میں پہنچ گئی ہے۔ یہ پلانٹ گاؤں، دیہات، قصبوں و شہروں میں لگے ہوئے ہیں ان کی بدولت ہر سال بھارت سرکار کو لاکھوں روپے قیمت کی لکڑی ایندھن کھاد پیٹرولیم اور غیر ملکی زرِمبادلہ کی بچت ہو رہی ہے۔ ریاست میزورم میں سبھی خاندانوں میں نئے شمسی توانائی منصوبے کے لیے بڑا جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ میزورم کے ہر گاؤں کے پچاس گھروں میں گوبر گیس پلانٹوں سے توانائی کی صلاحیت حاصل ہو رہی ہے اُن سے جو کھاد حاصل ہوتی ہے وہ باغبانی اور کھیتی میں کام آ رہی ہے۔

ریاست میزورم کے ہزاروں خاندان جھوم کھیتی کرتے ہیں۔ جس میں انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ کھیتی کرنی پڑتی ہے۔ انھیں کھاد حاصل کرنے کے لیے درخت کاٹنے پڑتے ہیں لیکن اگر یہ لوگ نئی توانائی منصوبہ بندی سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھائیں تو ان کو مستقل روزگار مل سکتا ہے محکمہ توانائی اس سلسلے میں ایک منصوبہ بنا رہا ہے۔ بایو گیس پلانٹ (Bio Gas Plant) کی تکنیک نئی ہے اور اس میں برابر اصلاح کرنی پڑ رہی ہے۔

پھر بھی چھ لاکھ پلانٹوں میں سے پچاسی فی صد سے زیادہ کام کر رہے ہیں۔ اور انھیں کافی کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔

تخمینہ لگایا گیا ہے کہ گوبر گیس پلانٹوں کی بدولت بھارت سرکار کو سالانہ بائیس (۲۲) لاکھ ٹن لکڑی کی بچت ہو رہی ہے۔ ان سے مالی بچت پچاس کروڑ روپیہ ہے اور کھاد بونس (Bonus) کی شکل میں حاصل ہوتی ہے۔ ایندھن اور کھاد دونوں کا تخمینہ لگائیں تو ہمارے ملک کو ایک سو ستر کروڑ روپیہ کا فائدہ ہو رہا ہے۔ پھر دھواں نہیں ہوتا آب و ہوا (فضا) صاف ستھری رہتی ہے وقت کی بچت ہوتی ہے آمدنی میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔

اب گوبر گیس پلانٹ کہنا غلط ہوگا کیوں کہ ان میں میلا اور کچرہ اور ڈسٹلری سے کچرہ یا انڈسٹریل کچرہ نگر پالیکا یا مہاپالیکا یا نگر نگم حلقوں کا کچرہ و میلا بھی کام آسکتا ہے۔ بایو گیس ڈویلپمنٹ (Bio Gas Development) کی قومی منصوبہ بندی کے تحت ۱۹۸۵ء سے ۱۹۸۶ء میں مختلف ریاستوں کا نشانہ ڈیڑھ لاکھ پلانٹوں کا تھا لیکن اب مانگ ایک لاکھ پچاسی ہزار پلانٹوں کی ہو رہی ہے اس سے ان کی مانگ اور مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس وقت تین بایو گیس ٹریننگ سنٹر (Bio Gas Training Centre) یا ڈویلپمنٹ سنٹر (Development Centre) کام کر رہے ہیں جو سکھاڈیا یونیورسٹی ادے پور، تامل ناڈو کرشی یونیورسٹی کوئمبٹور یا راجندر یونیورسٹی پوسا (سمستی پور) میں ہیں۔ یہ سنٹر ریاستوں کو تکنیکی ٹریننگ میں تعاون دے رہے ہیں۔ کھادی گرام اُدیوگ کمیشن کو ناسک سنٹر کو بڑھاوا دینے کے لیے مالی امداد بدستور دی جا رہی ہے۔ اس طرح کے سات اور سنٹر کھولنے کی تجویز زیر غور ہے۔

چھوٹے یا درمیانی درجے کے کالونی کے لیے ایسے پروجیکٹوں کا خاکہ تیار کیا جا رہا ہے جن سے روزانہ ایک مکعب میٹر گیس مل سکے اور ایک گوبر گیس پلانٹ کے لیے دو جانوروں کا گوبر کافی ہے۔

گاندھی جی کا گرام سپنا پورا ہوا

دیکھتے ہی دیکھتے اب مہاتما گاندھی جی کا توانائی (Energy) کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو گیا ہے اس کا مقصد توانائی کے جدید نظام کو گاؤں و دیہات تک پہنچانا تھا یعنی یہ ایسا توانائی پروگرام تھا جس میں گاؤں اور دیہاتوں سے ہی توانائی حاصل کی جائے اور کسی کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ ایندھن بھی آسانی سے مل جائے۔ ایسا گاؤں ریاست گجرات کا "کھنڈیا" ہے اور اس کے بعد ریاست اُتر پردیش ضلع غازی آباد میں "اچھیجا" گاؤں کی باری آتی ہے جہاں پہلے ہی سے آزمائشی توانائی سنٹر کام کر رہے ہیں۔ اس وقت اس قسم کے اُنیس (۱۹) طریقوں پر کام ہو رہا ہے آئندہ اور بھی نئے پروجیکٹ کھولنے کا ارادہ ہے اس منصوبے کے تحت پانچ ہزار توانائی دیہات قائم کرنے کا عمل زیر تجویز ہے۔

زمین پر سورج

ہمارا ملک شمسی توانائی کے معاملے میں کافی آگے بڑھ گیا ہے۔ سورج کی کرنوں سے پانی گرم کرنے یا ٹھنڈا کرنے یا سردی کے موسم میں گھروں کو گرم کرنے کے لیے آلات بن گئے ہیں اور یہ ہوٹلوں فیکٹریوں دفاتر یا بڑے بڑے صنعتی کاروباری اداروں میں استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کی راجدھانی نئی دلی میں موریہ ہوٹل کا سارا نظام شمسی توانائی پر منحصر ہے۔ آج کل راجدھانی میں دلی انتظامیہ کے تحت منی بسیں شمسی توانائی کی مدد سے چل رہی ہیں۔ وہ دن دور نہیں کہ ہر کام شمسی توانائی کی مدد سے ہوا کریں گے۔

ریاست اُتر پردیش، میرٹھ کمشنری کے تحت مرادنگر کا تمام ریلوے نظام شمسی توانائی کی مدد سے چل رہا ہے۔ احمد آباد میں نیشنل ٹیکسٹائل کارپوریشن کی دو فیکٹریاں شمسی توانائی کی مدد سے جدید طریقوں سے استفادہ کر رہی ہیں۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ دو تین سال سے لے کر چھ آٹھ سال کے اندر تمام خرچہ واپس مل جاتا ہے۔ شمسی توانائی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایندھن پر مسلسل خرچ کی بچت کے علاوہ آب و ہوا (فضا) بھی صاف ستھری رہتی ہے جو صحتِ عامہ کے پیشِ نظر سے بھی بہت مناسب اور بہتر ہے۔

شمسی مینار اور تالاب

اب ہمارے سائنداں شمسی مینار (Solar Tower) اور شمسی تالاب (Solar Tank) جیسے نئے پروجیکٹ (Projects) بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ملک میں آزمائشی شمسی مینارے اور شمسی تالاب بن چکے ہیں۔ یہ کوئی ہوائی قلعہ نہیں ہیں بلکہ یہ ایک حقیقت بن چکے ہیں۔ شمسی توانائی کے ذریعے بڑے پیمانے پر بجلی حاصل کی جا سکتی ہے اور اس کے ذریعے کمپیوٹر سسٹم کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ شمسی مینار اور تالاب سے شمسی توانائی بجلی گھر (Solar Electric Power Station) بنانے کا پروگرام ہے ان کے ذریعے سے ہمارے ملک کے گاؤں و دیہات، قصبہ اور شہروں میں ترقی کے زیادہ مواقع حاصل ہو جائیں گے۔ اس کام کے لیے پانچ ریاستوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اور ہندوستان میں اپنی قسم کا سب سے پہلا اسٹیشن ریاست اُتر پردیش ضلع غازی آباد، گاؤں "اچھیجا" میں ہوگا۔

●

عبدالرؤف محبوب نگری

آزادی کے بعد سے منصوبہ بند سماجی تبدیلی ہندوستان کی معاشی پالیسی کا ایک اہم مقصد رہی ہے۔ ہمارے ملک میں سماجی و اقتصادی تغیّر اوپر سے تھوپا نہیں جا سکتا۔ یہ کوئی باہر کی چیز نہیں ہے۔ سماجی اور اقتصادی تبدیلی اندر سے آنی چاہیئے۔ اور اس کی شروعات نچلی سطح سے ہو۔ دوسرے الفاظ میں اگر ہم سماج میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو نچلی اور دیہی سطح پر ترقیاتی پروگرام اور پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانا ہوگا۔ کیوں کہ ہمارے ملک میں اسّی فیصد لوگ دیہاتوں اور گاؤں میں رہتے ہیں۔ گاؤں میں رہنے والے لوگوں کی معاشرتی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں سُدھار لانے کے لیے ایسے پروگرام اپنانے کی ضرورت ہے جو دیہی ماحول اور ضروریات سے ہم آہنگ ہوں۔ دیہاتوں کی ترقی کے لیے مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام اپنایا جا رہا ہے۔ جس کا مرکز و مبداء گاؤں میں بسنے والے غریب، پسماندہ اور اَن پڑھ لوگ ہیں۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ منصوبہ بند معاشرتی ترقی کی کوئی اسکیم خواہ کتنی ہی بہتر اور مؤثر کیوں نہ ہو کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اُس کے پیچھے دیہی عوام کی قوّتِ محرکہ کارفرما نہ ہو۔ اسی بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مختلف طبقوں کے لوگ اور ایجنسیوں پر مشتمل دیہی سُدھار کی متعدد اسکیمیں ملک کے مختلف حصّوں میں رُو بہ عمل لائی جاتی رہی ہیں اور ان تمام اسکیموں اور پروگرموں کا بنیادی مقصد دیہی عوام کی آمدنی کی سطح میں اضافہ کرنا اور اُن کے معیارِ زندگی کو اُونچا اُٹھانا ہے۔ اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے انفراسٹرکچر کی سہولتیں بشمول ٹرانسپورٹ سسٹم کی اہمیت اور افادیت محتاجِ بیان نہیں ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہمارے ملک کے پچاس فیصد گاؤں ضروری اور بُنیادی فلاحی خدمات سے محروم ہیں۔ ان گاؤں میں بسنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد گزارے کی حد تک پیداوار کرتی ہے اور ان کا رہن سہن معمولی اور گھٹیا ہوتا ہے۔ مقامی طور پر پیدا شُدہ اشیاء اور مال صَرف کرتے ہیں۔ ناکارہ ٹرانسپورٹ سسٹم کی وجہ سے پاس پڑوس گاؤں اور شہروں سے ان کا رشتہ ناتہ ٹوٹا ہوا ہوتا ہے اور یہ لوگ پڑوسی شہروں اور گاؤں میں رونما ہونے والے واقعات سے لاعلم اور بے بہرہ ہوتے ہیں۔

دیہی عوام کی زندگیوں میں سُدھار لانے کے لیے چھٹے پلان اور اس سے پہلے کے پلانوں میں جو اسکیمیں اور پروگرام رو بہ عمل لائے گئے تھے اُن کے نتائج حوصلہ افزا نہیں رہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ یہ پروگرام ناقص تھے یا اُن کی عمل آوری میں کوتاہی برتی گئی تھی بلکہ اصل وجہ دیہی ٹرانسپورٹ کا ناکارہ اور ناقص سسٹم ہے۔ کسی بھی پروگرام کی کامیابی کے لیے چاہے وہ چھوٹے کاشتکاروں کی ایجنسی کی ترقی ہو یا قحط و خشک سالی علاقہ پروگرام یا کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ پروگرام ہو یا پھر مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام ہو سبھی کے لیے ٹرانسپورٹ کی سہولتیں نہ صرف ضروری ہیں بلکہ مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ ٹرانسپورٹ کی سہولتوں کے فروغ کے بغیر دیہی ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر

ہو سکے گا۔ ترقی کے ثمرات کو دیہی سماج کے ہر طبقہ اور ہر فرد تک پہنچانے کے لیے بہتر اور مستحکم ٹرانسپورٹ سسٹم ناگزیر ہے۔ دیہی علاقوں کی ترقی کے لیے اپنائی جانے والی اسکیموں اور منصوبہ بندی کی ایک بڑی کمزوری ٹرانسپورٹ سہولتوں کی عدم میسری ہے اور اس بات کو دیہی منصوبہ بندی اور اسکیموں کی ترتیب کے وقت پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

دیہی ٹرانسپورٹ سسٹم کی ترقی سے دیہاتوں کی ایک دوسرے سے علیحدگی دور ہوگی۔ گاؤں نہ صرف ایک دوسرے سے مربوط اور منسلک ہوں گے بلکہ بڑے شہروں سے بھی ان کا ربط ضبط بڑھے گا نتیجتاً ترقی کے لیے راہ ہموار ہوگی۔ تجارت اور کاروبار کو فروغ حاصل ہوگا اور دیہی معیشت کے تمام شعبے جیسے زراعت، صنعت وغیرہ کو بڑھاوا ملے گا اس کے علاوہ ٹرانسپورٹ کی سہولتوں کی ترقی سے پیداوار اور پیداواری صلاحیت میں اضافہ، سائنس اور ٹیکنالوجی کی کھوج اور دریافت میں مدد ملے گی اور پیداوار کی فروخت وغیرہ میں بہتری پیدا ہوگی۔

چھوٹے اور حاشیائی کاشتکار

ایک اندازے کے مطابق گاؤں میں بسنے والے لوگوں کی تقریباً پچھتر فیصد تعداد غریبی کے خط سے نیچے کی سطح پر زندگی گزارتی ہے، ذیل کا جدول دیہی گھرانوں کی آمدنی کی سطحوں کو بتاتا ہے۔

جدول سے صاف ظاہر ہے کہ ۹۶ فیصد دیہی گھرانے ۵۰۰ روپیہ سے بھی کم ماہانہ آمدنی پاتے ہیں اور یہی کم آمدنی والے گھرانے ہیں جو دیہی ترقیاتی پروگراموں میں زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔ ماہانہ ۱۰۰ روپے سے بھی کم آمدنی پانے والے گھرانے عام طور پر زرعی مزدور اور ماہانہ ۱۰۰ روپیہ تا ۵۰۰ روپیہ آمدنی پانے والے گھرانوں کا تعلق چھوٹے اور حاشیائی کاشتکاروں اور دیہی کاریگروں سے ہے۔

چھوٹے اور حاشیائی کاشتکار چونکہ گزارے کی حد تک کاشت کرتے ہیں۔ ایسے کاشتکاروں کے پاس فروخت کے لیے فاضل پیداوار بہت کم ہوتی ہے۔ ایسے کاشتکار اپنی پیداوار کی فروخت اور دیگر ضروری سامان کی خریداری کے لیے معمولی ٹرانسپورٹ سہولتوں سے بھی استفادہ کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔

امیر اور بڑے کاشتکار جو وسیع و عریض اراضیات کے مالک ہیں۔ اپنی پیداوار کو شہروں میں فروخت کرنے کے لیے ٹرک، لاری اور دیگر ٹرانسپورٹ کے ذرائع استعمال کرتے ہیں، جب کہ چھوٹے اور حاشیائی کاشتکار اور دیہی کاریگر عوامی ٹرانسپورٹ پر تکیہ کرتے ہیں۔

دیہی علاقوں میں عوامی ٹرانسپورٹ کی سہولتیں نہ صرف ناکافی ہیں بلکہ ان بسوں ہمیشہ بھیڑ بھاڑ رہتی ہے اور ان کی آمد و رفت بھی وقت پر نہیں ہوتی۔ چھوٹے کاشتکار بسا اوقات اپنی پیداوار یا تو خود سروں پر اٹھا کر لے جاتے ہیں یا پھر تنگ اور بھیڑ بھری عوامی بسوں میں لے جاتے ہیں جن سے انھیں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اگر دیہی علاقوں میں ٹرانسپورٹ کی سہولتوں کو ترقی دی جائے اور انھیں بہتر بنایا گیا تو کاشتکار اور دیہی کاریگر بڑے شہروں میں اپنی پیداوار لے جاکر فروخت کرنے کے قابل ہوں گے جہاں انھیں اُن کی محنت کی معقول قیمت ملے گی۔ اس طرح زائد آمدنی سے کاشتکاروں کو پیداوار بڑھانے کی ترغیب بھی حاصل ہوگی۔

دیہات میں ٹرانسپورٹ سسٹم کو بہتر بنانے کے لیے حسب ذیل اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ اُن علاقوں اور دیہاتوں کی نشاندہی کی جائے جہاں خصوصی ٹرانسپورٹ کی سہولتیں درکار ہیں۔

۲۔ گاؤں اور دیہاتوں کو جہاں ٹرانسپورٹ کی سہولتیں درکار ہیں ایک واحد ٹرانسپورٹ سسٹم سے مربوط اور منسلک کیا جائے۔

۳۔ اُن ایجنسیوں اور اداروں کی نشاندہی اور انھیں ہر قسم کی سہولت مہیا کی جائے جو دیہی علاقوں میں ٹرانسپورٹ گاڑیاں چلانے کے کام کی ذمہ داری لینا چاہتے ہیں۔

۴۔ اُن مالی اداروں اور بینکوں کی نشاندہی کی جائے جو دیہی علاقوں میں ٹرانسپورٹ کی سہولتوں میں اضافہ کے پراجکٹ کو ضروری مالیہ فراہم کرتے ہیں۔ ۵۔ اور آخر میں حکومت کی امداد۔ حکومت کو چاہیے کہ دیہی علاقوں میں عوامی اور خانگی ٹرانسپورٹ سسٹم کی حوصلہ افزائی کرے۔ دیہاتوں میں چلائی جانے والی ٹرانسپورٹ گاڑیوں کو موٹر وہیکل ٹیکس سے مستثنا رکھا جائے اور ایسی گاڑیوں کے لیے شہروں میں مفت پارکنگ کی سہولتیں مہیا کی جائیں۔ ان اقدامات کے ذریعہ دیہی ٹرانسپورٹ سسٹم کو موثر اور مستحکم بنایا جا سکتا ہے۔ ●

دیہی گھرانوں کے اوسط ماہانہ آمدنی	فیصد
۱۰۰ روپیے سے کم آمدنی پانے والے	۴۶
۱۰۱ روپیہ تا ۲۰۰ روپیہ آمدنی پانے والے	۳۵
۲۰۱ روپیہ تا ۵۰۰ روپیہ آمدنی پانے والے	۱۵
۵۰۱ روپیہ تا ۱۰۰۰ روپیہ آمدنی پانے والے	۳
۱۰۰۰ روپیہ سے زیادہ آمدنی پانے والے	۱

م۔ فرقان خاں

ہندوستان میں چھوٹے پیمانے کی صنعتیں ایک جائزہ

۱۹۷۵ء میں جب شومیکر صاحب کی کتاب اسمال از بیوٹی فل (Small is Beautiful) شائع ہوئی تو پوری دنیا کا ذہن چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی طرف مبذول ہوا۔ اس کتاب میں شومیکر صاحب نے یہ نکتہ باور کرانے کی کامیاب کوشش کی کہ ترقی پذیر ممالک کی اقتصادی مشکلات کا ایک بڑا حل چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ان کے حساب سے تیسری دنیا کے زیادہ تر ممالک غریبی اور بیکاری سے لڑنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ اس محاذ پر اگر وہ اب تک ناکام ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ یہ ممالک ان مشکلات کا حل یوروپ کے انداز پر بڑے پیمانے کی صنعتوں میں تلاش کرتے ہیں لیکن یہ ممالک اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اس ماڈل پر چل کر یوروپ نے صدہا سال میں ترقی کی اس سطح کو پایا ہے جب کہ ایشیا کے ہی ملک جاپان نے اس کے بالکل برعکس اپنی ترقی کی راہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں تلاش کی۔ اس میں وہ نہ صرف چھوٹے سے عرصے میں کامیاب ہی رہا بلکہ اُن پریشانیوں سے بھی مُبرّا رہا جن سے یوروپ کے ملک آج کل دوچار ہیں جیسے انفلیشن (Inflation) بڑھتی ہوئی بے روزگاری، ماحول کا عدم تحفظ اور شہروں کی طرف ہجرت۔

جاپان نے دوسری عالمی جنگ کے بعد سے ہی اپنی ترقی کے لیے دیہاتی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو اپنی معیشت کا اہم حصّہ قرار دیا تھا۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ جاپان میں بنے الیکٹرانکس سامان (Electronic Goods) تمام دُنیا پر اس طرح چھا گئے ہیں کہ بڑے بڑے ممالک کو ان سے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہی نہیں جاپان کی بنائی ہوئی کاروں نے امریکہ کی کار صنعت کے لیے خطرہ پیدا کر دیا جس کی وجہ سے امریکہ کو جاپان سے کاروں کی درآمد پر روک لگانی پڑی۔ جاپانی سامان کی اچھی قسم اور کم قیمت کو دیکھتے ہوئے ہندوستان میں بھی مُاروتی سوزوکی بنائی گئی۔ جو کافی حد تک کامیاب رہی۔ جاپان کی اس شاندار کامیابی کے پیچھے اس کی چھوٹے پیمانے کی صنعتیں ہیں۔

ہندوستان میں بھی چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی اہمیت کو آزادی کے وقت سے ہی محسوس کیا گیا تھا اور ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی میں ان کے لیے اہم مقام رکھا گیا۔ کم پونجی کے ساتھ روزگار کے زیادہ مواقع فراہم کرنا اس کی اہم ذمہ داری تسلیم کی گئی تھی لیکن ۱۹۷۷ء کی پالیسی نے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو جو اہمیت دی وہ اس سے پہلے ان کو کبھی نہیں ملی۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتیں۔ تعریف؟

چھوٹے پیمانے کی صنعت کس کو کہا جائیگا اس امر پر اتفاق رائے ہونا آسان نہیں ہے۔ کیوں کہ ان صنعتوں کی تعریف مختلف مقاصد کے لیے مختلف کی گئی ہے اور یہ وقت وقت پر بدلتی رہتی ہے۔ ایک زمانے میں ۷.۵ لاکھ روپے کے سرمائے (Investment) والی یونٹ

Unit کو اس زمرے میں رکھا گیا اور اگر یہ
یونٹ ضمنی (Anciallary) ہے تو سرمائے
کی حد ۱۰ لاکھ روپے ہو سکتی تھی۔ ۱۹۷۵ء
میں یہ حد ۱۰ لاکھ اور ۱۵ لاکھ کر دی گئی۔ ۱۹۸۰ء
کے نئے پالیسی بیان میں بالکل ہی نئی تعریف
طے کی گئی۔ اس پالیسی میں چھوٹے پیمانے
کی صنعت اس کو کہا گیا جس میں ۲۰ لاکھ روپے
کا سرمایہ لگا ہوا ہو اور ضمنی یونٹ کی صورت
میں یہ رقم ۲۵ لاکھ روپے رکھی گئی۔ لیکن
چھوٹے پیمانے کی صنعت کی حقیقی تعریف
کے لیے صرف سرمائے کی رقم کو ہی ذہن میں
رکھنا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے انتظامی طریقے
(Management Pattern) کو بھی
دیکھنا ہوگا۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتیں۔ کیوں؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان صنعتوں
میں ایسی کونسی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے
ترقی پذیر ممالک میں ان صنعتوں کو بڑے
پیمانے کی صنعتوں پر ترجیح دینی چاہیئے۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی حمایت
میں سب سے وزنی جو دلیل پیش کی جاتی ہے
وہ ہے اس کے روزگار پیدا کرنے کی حیثیت۔
چھوٹی صنعتوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے
کہ یہ کم سے کم سرمائے میں زیادہ سے
زیادہ روزگار مہیا کرا سکتی ہے۔ ایک اندازے
کے مطابق ایک آدمی کو روزگار مہیا کرانے
کے لیے بڑی صنعتوں میں ۴۰ ہزار روپے کے
برابر سرمایہ درکار ہوتا ہے جبکہ چھوٹے
پیمانے کی صنعت میں یہی روزگار صرف
۸ ہزار روپے میں مہیا کیا جا سکتا ہے۔ اس
دلیل کی خاص اہمیت ہے۔ ہندوستان میں
جہاں ایک طرف سرمائے کی کمی محسوس کی
جاتی ہے، وہیں بڑے پیمانے پر روزگار مہیا
کرانا بھی آسان کام نہیں ہے لیکن روزگار
مہیا کرانے کا یہ کام چھوٹے پیمانے کی صنعتیں
بخوبی پورا کر سکتی ہیں۔ ۱۹۵۶ء کی پالیسی
میں اس ہی بات کو مدنظر رکھا گیا تھا۔ حال
ہی میں کچھ حلقوں نے اس کی مخالفت کرتے
ہوئے کہا ہے کہ جدیدیت (Moderni-
sation) کی وجہ سے چھوٹے پیمانے کی
صنعتوں کے لیے بھی زیادہ سرمایہ درکار ہونے
لگا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ بڑے
پیمانے کی صنعتوں کے مقابلے میں چھوٹے پیمانے
کی صنعتوں میں اس کی رقم کم ہوتی
ہے۔

۲۔ لامرکزیت (Decentralisation)

بڑے پیمانے کی صنعتوں میں ایک خاص
برائی یہ ہے کہ یہ بڑے بڑے شہروں کے
ارد گرد ہی لگائی جا سکتی ہیں۔ جس سے دیہاتی
علاقے ترقی سے تو محروم رہتے ہی ہیں ساتھ
ہی ان کے لیے بہت ساری پریشانیاں بھی
پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور یوں شہروں کی جانب
ہجرت کرنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہی
نہیں بڑی صنعتوں کا مالکانہ حق بھی کچھ ہی
ہاتھوں میں سمٹ جاتا ہے۔ اس سے مرکزیت
کو غیر ضروری طور پر تقویت ملتی ہے۔

جمہوریت کی کامیابی کے لیے یہ ضروری
ہے کہ سرمائے کا بٹوارہ سبھی سطحوں پر ہو۔
لیکن بڑے پیمانے کی صنعتوں کی وجہ سے
یہ ممکن نہیں ہو پاتا۔ ایک اندازے کے مطابق
ملک کے کل صنعتی سرمائے کا ۸۰ فیصد
ملک کے ۲۰ فیصد لوگوں کے پاس ہے۔ اس
طرح کی مرکزیت کی وجہ بڑے پیمانے کی صنعتوں
کا پھیلاؤ ہی ہے۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں سے نہ صرف سرمایہ
کا بٹوارہ ہی ہوتا ہے بلکہ ملک کے دور دراز
کے علاقوں تک بھی ترقی کی لہروں کو محسوس
کیا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں مقامی ذرائع
(Local Resources) جو کہ استعمال
میں نہیں آ پاتے۔ ان کا بھی بڑا اچھا استعمال
ہو سکتا ہے اور یونہی صحیح معنوں میں سماجواد
لایا جا سکتا ہے۔

۳۔ معاشیاتی مساوات
(Economic Equality)

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں سے جو منافع
ہوتا ہے اس کا بٹوارہ بھی کئی اکائیوں میں
ہوتا ہے جس سے اقتصادی مساوات حاصل
کرنے میں کامیابی ملتی ہے۔ اس کے برعکس
بڑی صنعتوں میں جو منافع ہوتا ہے وہ کچھ ہی
ہاتھوں میں جمع ہوتا رہتا ہے جو ملک کی معیشت
کے لیے تو خطرناک ہے ہی جمہوری اقدار کے
لیے بھی پریشان کن ہو سکتا ہے۔ چھوٹے
پیمانے کی صنعتوں میں مالک و مزدور کا رشتہ
بھی مساوات پر استوار ہوتا ہے۔ اُن کے
رشتوں میں زیر و بم کم ہی آتے ہیں جس سے
صنعتی ماحول میں امن قائم رہتا ہے۔

۴۔ اجارہ داری (Monopoly)
کا خاتمہ:۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں چونکہ کم
سرمایہ لگا ہوتا ہے اور یہ ملک کے دور دراز
علاقوں میں پھیلی ہوتی ہیں۔ اس لیے بازار
میں ان کی اجارہ داری قائم ہونے کے کم ہی
امکانات ہوتے ہیں۔ جب کہ بڑی صنعتوں
کی ایک اہم برائی یہ ہے کہ ان کی اجارہ داری
بازار میں آسانی سے قائم ہو جاتی ہے اور وہ
بلا کسی ڈر کے من پسند قیمتوں پر من پسند مال

پہنچنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ دوسری طرف چھوٹے پیمانے کی صنعتیں تجارتی مقابلے کو بڑھاوا دیتی ہیں جس سے نہ صرف مال کا معیار ہی اچھا ہوتا ہے بلکہ قیمتیں بھی واجب ہوتی ہیں۔ جاپان میں نئے سامان اس ہی وجہ سے اتنے اچھے اور اتنے سستے ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات ظاہر ہے کہ چھوٹے پیمانے کی صنعتیں ترقی پذیر ممالک کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہیں لیکن چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے مقابلے میں بڑی صنعتوں کو یکسر نظر انداز کرنا یہاں مقصود نہیں ہے۔ بڑے پیمانے کی صنعتوں کی اپنی خصوصیات ہیں اور ایک ملک کے اندرونی حالات اور اقتصادی ماحول کو ذہن میں رکھ کر ہی کسی نتیجے پر پہونچا جاسکتا ہے۔ کچھ فیلڈ (Field) صنعتیں تو ایسے ہیں جہاں صرف بڑے پیمانے کی صنعتیں ہی لگائی جاسکتی ہیں جیسے لوہا اور فولاد کی صنعت۔

مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک میں جہاں کہ بے روزگاری بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور آمدنی میں فرق بھی بڑھتا جارہا ہے چھوٹے پیمانے کی صنعت اقتصادی بیماری کے لیے تریاق کا کام دے سکتی ہے۔

آیئے دیکھیں کہ ہندوستان میں اصلی ترقی کی رفتار کیا ہے اور ان کی ترقی کے لیے کیا کیا اقدام کئے گئے ہیں؟۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ضرورت کو پہلے پنج سالہ منصوبے میں ہی محسوس کرلیا گیا تھا اور ان کی ترقی کے لیے ۴۲ کروڑ روپے رکھے گئے۔ دوسرے پلان میں یہ رقم بڑھ کر ۱۸۷ کروڑ روپے ہوگئی۔ اسی طرح تیسرے پلان میں ان پر خرچ کی گئی رقم ۲۴۱ کروڑ روپے تھی۔ چوتھے پلان میں اس بات پر خاص زور دیا گیا کہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو بڑے پیمانے کی صنعتوں کے مقابلے میں سرکاری سرپرستی میں رکھا جائے۔ اس پلان میں چھوٹی صنعتوں پر ۲۵۱ کروڑ روپے خرچ کئے گئے۔ پانچویں پلان میں اس کے لیے مخصوص کی گئی رقم ۵۱۰ کروڑ روپے تھی جو چھٹے پلان میں بڑھ کر ۱۷۸۰ کروڑ روپے ہوگئی۔ چھٹے پلان میں ہی ان صنعتوں کو ملک کی ترقی کا ایک اہم جزو (Factor) مانا گیا۔ بادی النظر سے دیکھئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان صنعتوں پر خرچ کی گئی رقم کا برابر اضافہ ہوتا رہا ہے لیکن اگر اضافی (Relative) اعتبار سے دیکھیں تو یہ رقم صرف ۱.۸ فیصد ہی ہوئی ہے جو کہ ضرورت کے پیش نظر بہت ہی کم ہے۔ پنج سالہ پلان کی شروعات سے لے کر اب تک سرکار نے جو دیگر قدم اٹھائے ہیں وہ اس طرح ہیں:۔

۱۔ قرضہ اور مالیہ (Credit and Finance)

چھوٹی صنعتیں چوں کہ چھوٹے بیوپاریوں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں اور انھیں بازار میں بڑی صنعتوں سے مقابلہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے انھیں سرمایہ درکار ہوتا ہے جو یہ بیوپاری اپنے خود کے ذرائع سے مہیا نہیں کرسکتے۔ سرکار اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے آسان شرائط پر مبنی قرضے کا انتظام کرتی ہے۔ کمرشیل (Commercial) بینکوں کے علاوہ دیگر مختلف انجنیئر اس کام میں پہلے ہی سے اہم رول ادا کررہی ہیں۔

حال ہی میں سرکار نے ۲۵۰ کروڑ روپے کے سرمائے سے ایک فنڈ قائم کیا ہے جو چھوٹی صنعتوں کو قرضہ مہیا کرانے کے ساتھ ساتھ ان کی دیگر پریشانیوں کو دور کرنے میں مدد کرے گا۔

۲۔ تکنیکی امداد (Technical Assistance)

چھوٹی صنعتوں کے پاس نہ تو خود کے اتنے ذرائع ہوتے ہیں کہ وہ خود ہی نئی تکنیک کی تحقیق کراسکیں اور نہ اونچے داموں پر تکنیک خریدنے کی قوت۔ اس کی وجہ سے ان کی ترقی میں رکاوٹ تو پیدا ہوتی ہی ہے۔ بازار میں بھی بڑی صنعتوں کے مقابلے میں پچھڑنا پڑتا ہے۔ مرکزی اور ریاستی سرکاروں نے چھوٹی صنعتوں کے لیے جو مرکز قائم کئے ہیں انھیں تکنیک کے سلسلے میں امداد کا کام بھی سونپا گیا ہے۔ کئی مقامات پر یہ مرکز اپنا کام بخوبی انجام دے رہے ہیں لیکن عام حالت اچھی نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سرکار ایک ایسی تنظیم قائم کرے جو جدید اور اونچی تکنیک کو چھوٹی صنعتوں کے لیے کارآمد بنا سکے۔

۳۔ محصول۔ پیداوار (Excise Duty) میں رعایت

چھوٹی صنعتوں کو امداد بہم پہونچانے کے لیے شروع سے ہی محصول پیداوار میں رعایت برتی جاتی رہی ہے۔ لیکن ۸۷-۱۹۸۶ء کے بجٹ میں وزیر خزانہ نے ان صنعتوں کے لیے کچھ خاص رعائتیں دی ہیں۔

۱۔ ۱۵ لاکھ روپے تک کے مال کی پیداوار پر محصول پیداوار کی پوری چھوٹ۔ اب تک یہ چھوٹ ۷.۵ لاکھ روپے تھی۔

۲۔ محصول پیداوار کے لائسنس کے لیے طریقہ بھی کافی آسان کر دیا ہے اور ۵۰ لاکھ روپے تک کی نکاسی کے لیے سیلف ریموول پروسیجر (Self Removal Procedure) کی اجازت دے دی گئی ہے۔

۳۔ ماڈویٹ MODVAT اسکیم کے تحت بھی کافی فائدہ پہونچایا گیا ہے۔

۴۔ مارکیٹنگ امداد (Marketing Assistance)

چھوٹی صنعتیں چونکہ چھوٹے پیمانے پر مال بناتی ہیں اس لیے بڑے پیمانے پر اپنے مال کو مشتہر (Advertisement) نہیں کر سکتیں جس کی وجہ سے ان کو مارکیٹنگ میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مرکزی سرکار نے اس کا حل نیشنل اسمال اسکیل انڈسٹریز کارپوریشن (National Small Scale Industries Corporation) کے قیام سے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تنظیم سرکاری اداروں اور خانگی تنظیم کی خریداری کے لیے چھوٹی صنعتوں کو ترجیح دیتی ہے۔ یہی نہیں اس تنظیم نے ۱۹۵۵ء میں اپنے قیام کے وقت سے لے کر اب تک چھوٹے پیمانے کی ۲۱۳۸۴ یونٹ قائم کرنے میں مدد کی ہے اور ہر سال ۱۵۰ کروڑ روپے سے زائد کی خرید کرلی یا کروائی ہے۔

۵۔ اجناس محفوظی

(Commodity Reservation)

۱۹۷۷ء کی صنعتی پالیسی میں یہ محسوس کیا گیا کہ اگر بڑی اور چھوٹی صنعتوں کو ایک ہی فیلڈ (FIELD) میں رکھا گیا تو بڑی صنعتیں چھوٹی صنعتوں کو بازار سے باہر کر دیں گی اس لیے چھوٹی صنعتوں کے لیے خاص اشیاء کو محفوظ کر دیا گیا اور نتیجے میں ۵۰۰ سے زیادہ اشیاء فہرست محفوظ میں مقام پا گئیں۔ اس فہرست میں اشیاء کا اضافہ برابر ہوتا رہا اور اب تک تقریباً ۸۴۶ اشیاء چھوٹی صنعتوں کے لیے محفوظ کر دی گئیں۔

چھوٹی صنعتوں کا ہندوستانی معیشت میں رول

(Role of Small Scale Industries in Indian Economy)

تفصیل مذکورہ سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ ہندوستان کی معیشت میں چھوٹی صنعتوں کے کردار کو شروع سے ہی محسوس کیا جا رہا ہے۔ حکومت اس کی ترقی کے لیے برابر کوشاں ہے اور کئی قابل ستائش کام بھی انجام دیئے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان صنعتوں کا ہندوستانی معیشت میں کیا کردار رہا ہے۔ مندرجہ ذیل اعداد کی مدد سے اسے سمجھا جا سکتا ہے۔

گیا اور ۸۵-۱۹۸۴ء میں یہ تعداد ۸۴ لاکھ ہو گئی۔ برآمدات میں بھی ان صنعتوں نے اپنی اہمیت واضح کر دی ہے۔ ۱۹۷۲ء میں برآمدات صرف ۱۵۰ کروڑ روپیوں کی تھی وہ ۱۹۸۱ء میں آٹھ گنی ہو کر ۱۰۵۰ کروڑ روپے ہو گئی — ۸۵-۱۹۸۴ء میں برآمدات ۲۳۵۰ کروڑ روپے کی تھی۔ ۱۹۸۱ء کی کل برآمد ہندوستان کی کل برآمد کا ۱۶ فیصد تھی اور غیر روایتی برآمد میں تو اس کا تناسب ۴۹ فیصد ہو جاتا ہے۔

یہ تفصیلات خاص طور پر بتاتی ہیں کہ ہندوستان میں چھوٹی صنعتوں کی خاص اہمیت ہے۔ شومیکر صاحب نے اپنی کتاب میں جو بات کہی باور کرانی چاہی ہے ان تفصیلات پر کھری اترتی ہے۔ لیکن چھوٹی صنعتوں کی ترقی کے لیے اقدام اٹھانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیئے کہ ترقی کبھی بھی یکطرفہ نہیں ہوتی۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی ضرور

	۱۹۷۲	۱۹۷۸	۱۹۸۱	۸۵-۱۹۸۴
یونٹ کی تعداد (لاکھوں میں)	۲.۶	۶.۷	۸.۰	۱۲.۰۵
روزگار (لاکھوں میں)	۳۵	۵۹	۵۷	۸۴
برآمد (کروڑ روپے میں)	۱۵۰	۸۴۵	۱۰۵۰	۲۳۵۰

ان اعداد سے یہ بات صاف ہے کہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں نے تیزی سے ترقی کی ہے۔ جہاں ۱۹۷۲ء میں کل یونٹ کی تعداد ۲.۰۶ لاکھ تھی وہیں ۱۹۸۱ء میں یہ تعداد آٹھ لاکھ ہو گئی اور ۸۵-۱۹۸۴ء میں بڑھ کر ۱۲.۰۵ لاکھ ہو گئی۔ روزگار کے نظریے سے بھی اس نے خاصا اچھا کام انجام دیا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں ان میں ۳۵ لاکھ لوگوں کو روزگار مل رہا تھا، وہیں ۱۹۸۱ء میں یہ بڑھ کر تقریباً دوگنا ہو

ہونی چاہیئے لیکن بڑے پیمانے کی صنعتوں کی قیمت پر نہیں۔ ان دونوں کا متوازن امتزاج ہی اچھے نتائج پیش کر سکتا ہے۔

اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ بڑی صنعتوں کے آس پاس ضمنی (Ancillary) یونٹ کی شکل میں چھوٹی صنعتیں قائم کی جائیں اور دونوں کے علیحدہ علیحدہ میدان (Field) مقرر کر دیئے جائیں تاکہ دونوں ایک دوسرے سے تجارتی مقابلہ نہ کر سکیں۔ ●

بھرت ڈوگرہ

پودے ہماری میراث ہیں

اِن کی حفاظت کیجئے

اب جبکہ زرعی انقلاب کا زور ٹوٹنے لگا ہے، بہت سارے کسانوں کو یہ جان کر دہشت ہو رہی ہے کہ روایتی اقسام کے اناج کو اُگانا قرینِ قیاس نہیں، اس لیے کہ اُن اقسام کے بیج نایاب ہو گئے ہیں۔ مصنف کا خیال ہے کہ اناج کی پیداوار میں اندھا دُھند اضافے کا جو جنون طاری ہوا تھا، اس کے نتیجے میں ہم اناج کی کچھ بیش بہا قسموں سے محروم ہو گئے ہیں۔ مصنف کا خیال ہے کہ روایتی بیجوں کے جو بنک بھارت جیسے تیسری دنیا کے ممالک میں قائم کئے گئے ہیں، اُن بنکوں میں موجود ذخیرہ ضرورت کے مطابق نہیں ہے۔ مصنف کے خیال میں اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے اناج کی روایتی قسموں کے بیج وقتاً فوقتاً کسانوں میں تقسیم کئے جانے چاہئیں، تاکہ ہم اس بیش قیمت زرعی دولت سے محروم نہ ہو جائیں۔ جو ان بیجوں کی صورت میں ہمیں نصیب ہوئی ہے۔"

بھارت اور دوسرے کئی ممالک سے موصول ہونے والی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ زرعی انقلاب کے مقاصد کے حصول کے لیے کسانوں نے زیادہ پیداواری صلاحیت رکھنے والے بیجوں کی کاشت کی، کیونکہ ان بیجوں میں زیادہ طاقتور کیمیائی کھاد کو برداشت کرنے کی قوت موجود تھی، لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اِن اجناس میں پیداواری صلاحیت بھی کم ہوتی گئی، اور زود اثر کیمیائی کھادوں کو برداشت کرنے کی قوت بھی سلب ہوتی جا رہی ہے، اس صورتِ حال کے پیشِ نظر کسانوں کو اناج کی اُن قسموں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، جو عہدِ قدیم سے یہاں کی زمین میں پرورش پاتی رہی ہیں۔ لیکن اس کام میں کسان کئی سخت قسم کی مشکلوں سے دوچار ہیں ۔۔ سب سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ اناج کے قدیم اور روایتی اقسام کے بیج دستیاب نہیں ہیں۔ زرعی انقلاب کے آغاز میں کسانوں نے زمین کے بیشتر رقبے پر زیادہ پیداوار دینے والے بیج کاشت کئے، اور روایتی اناج کے بیج کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

ناقابلِ تلافی نقصان

اناج کی روایتی قسموں کی نایابی کا پتہ تو چل جاتا ہے لیکن جنگلوں کی تباہی، تجارتی فوائد کے لیے درختوں کی بے دریغ کٹائی، پانی کے ڈیم اور دیگر پراجیکٹوں کی تعمیر کے لیے زمین حاصل کرنے سے ہم کچھ ایسے پودوں، جن سے میوہ، مویشیوں کے لیے چارہ، اناج، ادویات اور ریشے فراہم ہوتے تھے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ افسوس کہ کسی کو اتنی خوفناک تبدیلی کا علم بھی نہ ہو سکا۔

پودوں کی بیشتر قسموں کا نیست و نابود ہو جانا ایک بہت بڑا المیہ ہے، کیونکہ جو قسمیں تلف ہو جاتی ہیں، اُن کی ہی آمیزش یا پیوندکاری سے زیادہ پیداوار دینے والے پودے اُگائے جا سکتے تھے یا اِن پودوں میں بیماریوں کو برداشت کرنے کی قوت میں اضافہ کیا جا سکتا تھا۔ اتنا ہی نہیں،

بلکہ بہت سی غذائی اجناس کے معیار اور مقدار کو بڑھانے میں مدد مل سکتی تھی۔ یعنی اناج کی لذت اور خوشبو میں بھی تبدیلی لائی جا سکتی تھی۔ یہ بات صحیح ہے کہ ہر دور میں کئی قسم کے پودے، نایاب ہو جاتے ہیں، لیکن موجودہ دور میں یہ عمل کافی وسیع پیمانے پر ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ اور اس غیر معمولی تبدیلی کی بنیادی وجوہات ہیں۔ جنگلات کا بے دریغ صفایا — اور زیادہ پیداواری صلاحیت رکھنے والے اناج کی کاشت، جو وقتی طور پر فائدہ مند تو ہو سکتا ہے، لیکن اس اناج کا بیج دیر پا ثابت نہیں ہو سکتا۔

بیج رکھنے کے بنک

اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے، ساری دنیا میں نایاب بیجوں کو جمع رکھنے کے لیے بنک قائم کیے گئے ہیں۔ روم میں اس مقصد کے لیے ایک مرکزی ادارہ قائم کیا گیا ہے، جسے (IBr hn) کا نام دیا گیا ہے، یہ عالمی ادارہ پودوں کے بیج جمع کرنے کے ساتھ ان پر تحقیق کا کام کرتا ہے اور زراعت سے متعلق آٹھ بین الاقوامی تحقیقی اداروں کے درمیان تال میل کا کام کرتا ہے، روم کے اس ادارے کے ساتھ تقریباً ۶۰ ممالک کے ادارے وابستہ ہیں۔ ہم یہاں قارئین کی سہولت کے لیے روم کے ادارے کو پودوں کے تحفظ کے مرکزی ادارے کا نام دیتے ہیں۔ اس مرکزی ادارے کو امریکہ کی بیجوں کے تحفظ سے متعلق تحقیقی لیباریٹری کی معاونت حاصل ہے، امریکہ کی تحقیقی لیباریٹری ریاست ہائے متحدہ کے لیے بنیادی مواد جمع کرتی ہے، اس مواد کا استعمال عالمی پیمانے پر کام کرنے والے تحقیقی اداروں میں بھی ہوتا ہے، امریکہ کا یہ ادارہ بیجوں کے تحفظ سے متعلق روس کے فیفی لوف تحقیقی بنک کے عین مطابق ہے۔ ہمارے ملک بھارت میں پودوں کی نسلی تحقیق سے متعلق ایک نیشنل بیورو کا قیام عمل میں لایا گیا ہے، ساتویں پانچ سالہ منصوبے کے مسودے میں درج ہے کہ نباتات سے متعلق قومی ادارے کے تحت بیج محفوظ رکھنے کے چار ایسے بنک قائم ہوں گے، جہاں غیر زرعی مگر اقتصادی لحاظ سے ایسے اہم پودوں کے بیج رکھے جائیں گے، جن کے ختم ہو جانے کا احتمال ہو، ان تمام اقدامات کے باوجود محسوس کیا جا رہا ہے کہ اس سلسلے میں جو اقدامات بالخصوص تیسری دنیا کے ممالک میں کیے جا رہے ہیں، وہ معاملے کی نوعیت اور سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے ناکافی ہیں۔

اگرچہ ان بنکوں میں کافی مواد جمع کیا گیا ہے، لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے، ایک اہم اور متنازعہ سوال یہ بھی ہے کہ وہ بیج اور پودے جو اپنے فطری ماحول میں تباہ ہو گئے ہوں، اُن کو مصنوعی طریقوں سے کتنی مدت تک بچایا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ کچھ اور خدشات اور خطرات بھی لاحق ہیں۔ مثلاً حادثوں کی وجہ سے کچھ بیج تباہ ہو سکتے ہیں۔ یا اگر کچھ بیجوں اور ریشوں کے بارے میں کسی مرحلے پر غلط جانکاری کا اندراج ہوا، یا ان بیجوں کے بارے میں مسودات میں ادلا بدلی ہوئی، تو تباہ کن نتائج سے دوچار ہونا لازمی ہوگا، ایک ماہر کا خیال ہے کہ تمام تر مصنوعی طریقوں کا جائزہ لینے کے بعد اور ہر قسم کی پیش بندی کو عمل میں لا کر بھی ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ پودوں کی نسل کو محفوظ رکھنے کے لیے فطری ماحول سب سے زیادہ مفید اور سازگار ہے۔

ناقص اقدامات :۔ مرکزی حکومت کے حالیہ بیانات اور دعاوی کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ حکومتِ ہند اس معاملے میں اپنی ذمہ داری کو پوری طرح سے محسوس کرتی ہے، ساتویں پنج سالہ منصوبے کے مسودے میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ ملک کے چند مخصوص خطوں میں جہاں پودوں کی لاتعداد نسلیں موجود ہیں، ایک ایسی تجربہ گاہ قائم کی جائے گی، جہاں پودوں کی کم یاب نسلوں کا تحفظ ہو سکے، اس مقصد کو پانے کے لیے (Biosphere heserves) کا قیام عمل میں لایا جائے گا، چنانچہ نیل گری، نندپال اور نند دیوی کے علاقے اس کام کے لیے مختص کر دئے گئے ہیں۔ ماحولیات سے متعلق محکمہ (Bio sphere Reserves) کے پروگرام کو عملی جامہ پہنائے گا اور یہ ادارہ ایک ماڈل کے طور پر کام کرے گا۔

اس بات سے قطع نظر کہ حکومت بیرونی امداد سے عمل میں آنے والے پراجیکٹوں کی شد و مد سے تشہیر کرتی ہے، کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ حکومت سے وابستہ کئی ادارے ایک ایسی پالیسی پر عمل پیرا ہیں، جس سے روایتی نسل کے پودوں کو نقصان پہنچتا ہے اور بہت سے پودے ہمیشہ کے لیے تلف ہو رہے ہیں۔ زرعی انقلاب کی تشہیر کے سلسلے میں زیادہ پیداوار دینے والی اجناس کی کاشت پر زور دیا جاتا ہے، لیکن یہ بات نظر انداز کی جاتی ہے کہ ان اجناس کے بے تحاشا استعمال سے بیج کے زندہ رہنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ توسیعی کاموں سے وابستہ کرمچاریوں نے زیادہ پیداواری صلاحیت کے بیجوں کی مقبولیت بڑھانے کے لیے جہاں مبالغے سے کام لیا ہے، وہاں کسانوں کو اس بات سے آگاہ کرنے کی بھی کوشش نہیں کی کہ روایتی

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

راجیو کمار

قومی ترقی کے سنگِ میل

زراعت کی ترقی

ساتویں منصوبے کی دستاویز میں کہا گیا ہے کہ ہندوستانی معیشت میں زراعت ایک کلیدی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ ہماری آبادی کی اکثریت کا ذریعۂ معاش ہے۔ نیز خوراک اور خام مال کی سپلائی اور برآمدات کی بدولت ملک کی مجموعی اقتصادی ترقی میں اس کا اہم حصہ ہے۔

چھٹے منصوبے کی مدّت میں زرعی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہوا۔ ساتویں منصوبے میں زراعت کی ترقی کا نشانہ چار فیصد سالانہ اور غلّہ کی پیداوار کی ترقی کا نشانہ تین فیصد سالانہ مقرّر کیا گیا ہے۔ اس نشانے کو حاصل کرنے کے لیے ساتویں منصوبے کے دوران مزید ۱۱ ملین ہیکٹیر زمین کی آبپاشی کا انتظام کیا جائے گا۔ کیمیاوی کھاد کا استعمال ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۸،۴ ملین ٹن سے بڑھ کر ۹۰-۱۹۸۹ء تک ۱۳،۵-۱۴،۰ ملین ٹن کر دینے کی تجویز ہے۔

ساتویں منصوبے میں درجِ ذیل امور پر زیادہ زور دیا جائے گا:-

۱۔ مشرقی خطّے میں چاول کی پیداوار کا خاص پروگرام۔

۲۔ تلہن سے متعلق قومی ترقیاتی پراجیکٹ۔

۳۔ بارانی زراعت کے لیے نیشنل واٹر شیڈ ڈیولپمنٹ پروگرام۔

۴۔ چھوٹے اور کمترین کاشتکاروں کی ترقی اور

۵۔ جنگل بانی۔

اصلاحاتِ اراضی

ساتویں پنجسالہ منصوبے میں غریبی کے خاتمے اور زراعت میں جدید طریقوں کے استعمال اور زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے اصلاحاتِ اراضی کی اہمیت کو پوری طرح تسلیم کیا گیا ہے۔ زمین کی ازسرِ نو تقسیم دیہات کے بے زمین افراد کو زمین پر مبنی اور دیگر متعلقہ کاموں کے لیے ایک مستقل اثاثہ جاتی بنیاد فراہم کر سکتی ہے۔

چھٹے منصوبے میں بھی زمینی اصلاحات کی پالیسی رُوبہ عمل لائی گئی تھی جس کے پانچ مقاصد تھے۔

۱۔ درمیانی بیچوں کا خاتمہ۔

۲۔ پٹّہ داری کے نظام میں اصلاح اور پٹّے کا تحفّظ، لگان کی ضابطہ بندی اور مزارعوں کو مالکانہ حقوق دلانا۔

۳۔ ملکیت اراضی کی بالائی حد کا تعیّن اور فاضل زمین کی تقسیم۔

۴۔ چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی کی چک بندی اور

۵۔ زمین کے بارے میں پورا ریکارڈ رکھنا۔

اُمید تھی کہ مزارعوں کو مالکانہ حقوق دینے کے لیے تمام ریاستوں میں ۸۲-۱۹۸۱ء تک ضروری قانونی اقدامات کر لیے جائیں گے اور مقرّرہ حد سے زیادہ زمین کو حاصل کر کے ضرورتمندوں میں تقسیم کرنے کا کام ۸۳-۱۹۸۲ء تک پورا ہو جائے گا۔ یہ توقع بھی تھی کہ زمین کے بارے میں معلومات جمع کرنے اور ریکارڈ مرتّب کرنے کا کام مرحلہ وار ۱۹۸۵ء تک مکمل کر لیا جائے گا اور پھر زمین کی چک بندی تمام ریاستوں میں شروع کی جائے گی اور یہ کام دس برسوں کے اندر پورا کیا جائے گا لیکن

ملک کی ۲۲ ریاستوں میں سے صرف ۱۵ ریاستوں نے زمین کی چک بندی کے لیے قانون بنائے ہیں۔ چھٹے منصوبے کے دوران ۶،۵ ملین ہیکٹیئر زمین کی چک بندی کی گئی۔ اس طرح اس وقت تک کُل ۸،۱۵ ملین ہیکٹیئر زمین کی چک بندی کی جا چکی ہے۔

ساتویں منصوبے کے دوران اصلاحاتِ اراضی کو انسدادِ غربت کی حکمتِ عملی کا حصّہ تصور کیا جائے گا۔ جن ریاستوں میں مزارعوں کو ان کے حقوق دلانے اور لگان کی ضابطہ بندی کے لیے قانون نہیں بنائے گئے ہیں وہاں ریاستی حکومتیں ساتویں منصوبے کی مدت میں ایسے قانون بنانے کے لیے مناسب اقدام کریں گی۔

قبائل اور درجِ فہرست ذاتوں کا تحفظ کیا جائے گا۔ اس بات کے لیے موزوں قوانین بنائے جائیں گے کہ ان کی زمین بڑے زمیندار اور غیر قبائلی اشخاص ہڑپ نہ کر سکیں۔

خشک زمین پر کاشت

ملک کے کل زیر کاشت رقبے [illegible] ۰ فیصد حصہ خشک یا بارانی زمین پر مشتمل ہے اور موٹے اناج، دالوں، تلہن اور کپاس جیسی اہم فصلوں کے ایک بڑے حصے کی کاشت اسی پر ہوتی ہے۔ لیکن ملک میں غلّہ کی کُل پیداوار کا صرف ۴۲ فیصد حصہ خشک یا بارانی زمین پر کاشت سے حاصل ہوتا ہے۔ ایسی زمینوں سے کم پیداوار حاصل ہوتی ہے اور پیداوار میں کمی بیشی کا انحصار مون سون پر ہوتا ہے۔

پیداواری صلاحیت بڑھانے نیز غریبی، بے روزگاری اور علاقائی عدمِ توازن کو کم کرنے کے لیے ساتویں منصوبے میں خشک یا بارانی کھیتی کی ترقی کو اعلیٰ ترجیح دی گئی ہے۔ ترقیاتی حکمتِ عملی میں زور اس بات پر ہوگا کہ کاشتکاروں کو کم سے کم جوکھم کا سامنا کرنا پڑے اور انھیں ان کے علاقے کی ضرورت کے مطابق ٹیکنالوجی اور خدمات وغیرہ فراہم کی جائیں۔ تمام علاقے کی ترقی کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ ترقیاتی اقدامات میں مٹی اور نمی کا تحفظ، خشک سالی سے جلد متاثر نہ ہونے والے بیجوں، کیمیاوی کھاد اور بہتر آلات کی فراہمی وغیرہ شامل ہوں گے۔ ایسی فصلیں اُگانے کی کوشش کی جائے گی جن کے لیے بہت زیادہ پانی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ مثال کے طور پر موٹا اناج، دالیں، تلہن اور لال مرچ۔ اس کے علاوہ درختوں کی افزائش کے لیے، جنگل بانی، باغبانی اور چراگاہوں کی ترقی، خشک کھیتی کے پروگرام کا اہم حصّہ تصور کی جائیں گی۔

بہتر مویشی۔ زیادہ دودھ

ہندوستان بنیادی طور پر ایک زراعتی ملک ہے۔ زراعتی مقاصد کے لیے مویشیوں کی نسل بہتر بنانے اور ان کی تعداد بڑھانے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح عوام کی صحت کے لیے دودھ کی اہمیت بھی مسلّم ہے۔ ساتویں پنجسالہ منصوبے میں، ۸۴-۱۹۸۳ء کی ۸۰،۳۸ ملین ٹن کی سالانہ پیداوار کے مقابلے میں دودھ کی سالانہ پیداوار ۵۱ ملین تک بڑھانے کا مقصد سامنے رکھا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ۶،۵ فیصد کی سالانہ شرح ترقی حاصل کرنے کا نشانہ ہے۔

مویشیوں کی نسل بہتر بنانے کے لیے ۲۵ ملین گایوں کو بہتر قسم کے سانڈوں کے ذریعے نسل کشی کے پروگرام کے تحت لایا جائیگا گایوں اور بھینسوں کی مختلف نسلوں کو بہتر بنانے کے لیے مختلف اسکیمیں شروع کی جائیں گی۔ اعلیٰ قسم کے سانڈوں کی نسل بڑھائی جائے گی مویشیوں کی صحت بہتر بنانے اور انھیں سائنٹی فک انداز کا چارہ کافی مقدار میں بہم پہنچانے کے انتظامات کئے جائیں گے۔

مویشیوں کے توالد و تناسل کے انتظامات کو بہتر بنانے کے لیے ساتویں منصوبے کے دوران ملک میں پہلی بار جنین کو منتقل کرنے کی ٹیکنالوجی پر کام شروع کیا جائے گا۔ دوغلی نسل کے سانڈوں کی نسل کے پرکھنے کے پروگرام کو جاری رکھا اور بڑھایا جائے گا۔

منصوبے کی دستاویز کے مطابق دودھ کی پچاس فیصد سے زیادہ پیداوار بھینسوں سے حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا بھینسوں کی پرورش کے بڑے بڑے فارموں کے قیام کے ذریعے بہتر قسم کے بھینسوں کے انتخاب اور پھر ان کی نسل کشی پر توجہ دی جائے گی۔ زرعی تحقیق کی بھارتی کونسل ہریانہ میں حصار کے مقام پر بھینسوں کے بارے میں ایک تحقیقی انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کے سلسلے میں کارروائی شروع کر چکی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ انسٹی ٹیوٹ ساتویں منصوبے کے دوران مکمل ہو جائیگا۔

آپریشن فلڈ (دوئم)

آپریشن فلڈ (دوئم) پراجیکٹ حسبِ سابق ساتویں منصوبے کے تحت ڈیری فارمنگ کی ترقی کا خاص پروگرام رہے گا۔ یہ پروگرام قریب قریب تمام ریاستوں اور مرکزی نظم و نسق کے چار علاقوں۔ انڈمان، گوا، پانڈیچری اور میزورم میں زیرِ عمل لایا جائے گا۔ اس پروگرام کو ایک تین سطحی نظام کی صورت میں لاگو کیا جائے گا اور اس کا مرکز ایک فیڈریشن ہوگی۔ دودھ کے شیڈوں کی تعداد کو، جو ۸۵-۱۹۸۴ء میں

۱۱۶ تھی۔ ساتویں منصوبے کے اختتام تک ۵،۱ ستک بڑھانے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس پروگرام کا خاص مقصد ڈیری فارمنگ کی ترقی سے متعلق سرگرمیوں کو ملک میں ایک وسیع تر پیمانے پر پھیلانا ہے۔ دیہی علاقوں سے دودھ کی حصولی کو ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۵،۵۳ ملین لیٹر روزانہ کی سطح سے بڑھاکر ۹۰-۱۹۸۹ء تک ۱۱،۵۰ ملین لیٹر روزانہ تک پہنچانے کی تجویز ہے۔ پرائمری ملک پروڈیوسرز سوسائٹیوں کی تعداد ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۲۹ ہزار تھی۔ اس تعداد کو ۹۰-۱۹۸۹ء میں پچاس ہزار تک پہنچانے کا ارادہ ہے۔

ہر ضلع میں ایک ماڈل اسکول

مرکز نے ساتویں منصوبے کے دوران ملک کے ہر ضلع میں ایک ماڈل اسکول (نواودے ودھیالیہ) قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ریاستی حکومتوں اور مرکزی نظم ونسق کے علاقوں سے کہا گیا ہے کہ وہ ان اسکولوں کے لیے موزوں قطعۂ اراضی یا عمارت تجویز کریں۔

مساوات اور سماجی انصاف کے نصب العین کی تکمیل، قومی اتحاد و یک جہتی کا فروغ، ذہین اور لائق بچوں کو اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے موقعے فراہم کرنا، اور اسکولوں کو بہتر بنانے کے ملک گیر پروگرام میں مدد دینا۔

اِن اسکولوں میں داخلہ چھٹی جماعت سے کیا جائے گا۔ تعلیم کے ایک مناسب مرحلے پر اس بات کا اہتمام کرنے کا ارادہ ہے کہ ہر ماڈل اسکول میں کم از کم بیس فیصد طلبا ایسے ہوں جو ایک مختلف زبان بولنے والے علاقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس سے چھوٹی عمر میں ہی طلباء کو ملک کے دوسرے حصّوں کی زبان اور رسم و رواج وغیرہ کو سمجھنے کا موقع ملے گا۔ ان اسکولوں میں ہندی اور انگریزی دونوں زبانیں ذریعۂ تعلیم ہوں گی۔ لیکن جیسا کہ سہ لسانی فارمولے میں کہا گیا ہے، ایک جدید ہندوستانی زبان بھی پڑھائی جائے گی۔

ماڈل اسکولوں میں تعلیم سب کے لیے مُفت ہوگی۔ اس میں خوراک و رہائش، یونیفارم، نصابی کُتب، اسٹیشنری اور گھر سے اسکول تک آنے کا ریل پاس کا کرایہ وغیرہ سب شامل ہوگا۔

تمام ماڈل اسکول سنٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن سے وابستہ ہوں گے۔ ان میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم حاصل کریں گے اور ایک قومی بنیادی نصاب پڑھایا جائے گا جو ہنوز ترتیب دیا جارہا ہے۔ تمام بچّوں کو رہائش کے لیے ہوسٹل کی سہولیات فراہم کی جائیں گی۔ ان میں ضروری ساز و سامان سے لیس لیباریٹریاں اور جدید ذرائع تعلیم مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن اور مائکرو کمپیوٹر وغیرہ موجود ہوں گے۔

ان اسکولوں کے لیے اساتذہ کی بھرتی کُل ہندوستان پر کی جائے گی اور اساتذہ کو ایک اسکول سے دوسرے اسکول میں منتقل کیا جاسکے گا۔ اساتذہ کے لیے تربیت کا انتظام ریجنل کالج آف ایجوکیشن (جس کا انتظام این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی چلا رہی ہے) کی قسم کے اداروں میں کیا جائے گا۔ ●

بقیہ: مہاتما گاندھی

کے لیے مشعلِ راہ بن جائے۔ انھوں نے مادرِ وطن کو سنوارا، نکھارا، اُسے نیا شعور اور نئی زندگی دی۔ آج کا یہ آزاد ہندستان انھیں کے خوابوں کی حسین تعبیر ہے۔ یہاں کے چپّہ چپّہ کو ان سے نسبت ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ان کی تعلیمات کی روشنی موجود ہے اور ان کا ایک ایک قول مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے کہا تھا۔

"اگر ہمیں ترقی کرنا ہے تو تاریخ کو دُہرانا نہیں چاہیئے بلکہ ایک نئی تاریخ کو جنم دینا چاہیئے۔"

انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ:-

"میری زندگی ناقابلِ تقسیم ہے۔ اور میری تمام سرگرمیاں ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ان کا تمام تر تعلق میری اس کبھی سکون نہ پانے والی محبّت سے ہے جو میں نوعِ انسانی سے کرتا ہوں۔"

گاندھی جی کی خواہش تھی کہ ہندوستان امنِ عالم کے لیے راہ ہموار کرے چنانچہ انھوں نے کہا:-

"میں اپنے دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتا ہوں کہ دُنیا کُشت و خون میں مبتلا ہے اور اس سے نجات پانے کا راستہ تلاش کر رہی ہے اور امنِ عالم کے قیام کے لیے راستہ ہموار کرنے کا شرف شاید بھارت کو ہی حاصل ہوگا۔"

آج بھی امن اور عدمِ تشدّد کے سوا دنیا کے سامنے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ گاندھی جی کا یہ نعرہ کہ باہمی رواداری اور مُروّت کے ساتھ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو ایک ایسا پیغام ہے جو کسی خاص مقام یا کسی خاص زمانے کے لیے محدود نہ تھا۔ آج بھی گاندھی جی کا یہ پیغام سارے عالمِ انسانیت کو [illegible] رہا ہے کہ وہ تشدد اور نفرت اور خونریزی کو چھوڑ کر امن اور دوستی کا ہاتھ بڑھائے اور ایک ایسی دُنیا کی تشکیل کرے جس میں ہر شخص یہ محسوس کرے کہ اسے بھی زندہ رہنے کا اسی طرح حق ہے جس طرح دوسروں کو ہے۔ ●

کے۔ کے۔ کھلر

ٹیلیفون کی گھنٹی

ہو تو مشکل نہ ہو تو مشکل

جب گراہم بیل نے ۱۸۷۶ء میں ٹیلیفون ایجاد کیا تھا تو اس کے سان و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس کا یہ دلکش کھلونا ایک دن لوگوں کے لیے وبالِ جان بن کر رہ جائے گا اور لوگ اسے دیکھ کر اس طرح بدکنے لگ جائیں گے جس طرح گھوڑا چابک کو دیکھ کر بدکنے لگتا ہے۔ جب ہم نے ٹیلیفون اپنے گھر میں لگوایا تھا تو اس وقت ہماری مسرت کی انتہا نہ تھی۔ محض ٹیلیفون دکھانے کی غرض سے ہم نے کئی مرتبہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو کھانے پر مدعو کیا۔ گلی اور محلے کے لوگوں کو بُلا بُلا کر انھیں ٹیلیفون کرنے پر مجبور کیا اور گھنٹوں اُن کے ساتھ ٹیلیفون کے فوائد پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ فون کے صحیح اور بروقت استعمال کے لیے ہمارے ذہن میں نت نئی ترکیبیں سُوجھا کرتی تھیں۔ مثلاً کچھ نہیں تو فون پر ٹیلیفون والوں سے گھڑی کا وقت ہی ٹھیک کر لیا یا پھر اپنے گاؤں کو آنے والی بسوں کے اوقات ہی معلوم کر لیے یا بیٹھے بٹھائے یونہی کسی دوست کی خیریت ہی دریافت کر لی وغیرہ وغیرہ۔

الغرض، ہر صبح فون کو سجایا جاتا اور ہر کس و ناکس کو دکھایا جاتا، جیسے عموماً لوگ اپنی نئی دلہن یا فرج یا نئی کار راکشر لوگوں کو دکھا کر دادِ تحسین وصول کرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مقبول ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور یوں بھی ہمارا خیال ہے (چاہے آپ اس سے متفق ہوں یا نہ ہوں)، آج کے معاشرے میں شریف اور معزز لوگوں کی ہٹ لسٹ میں آنے کے لیے جہاں اور دیگر چیزیں ضروری ہیں مثلاً ٹی۔ وی اکار، فرج، صوفہ سیٹ، قالین وغیرہ وغیرہ وہاں ٹیلیفون کی بھی سخت ضرورت ہے۔ بلکہ اگر دیگر چیزیں نہ بھی ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں مگر سماج میں ہر دلعزیز ہونے کے لیے ٹیلیفون کا ہونا نہایت لازمی ہے۔

مگر بعض اوقات یہی شہرت، رُسوائی اور پریشانی کا سبب بھی بن جاتی ہے اور آپ کی تمام خوشیوں کے باغ غم کے ہولناک ویرانے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ آپ ہم سائے کی آہٹ سے بھی ڈرنے لگتے کہ کہیں کم بخت ٹیلیفون کرنے نہ آ رہا ہو، کہیں ٹرنک کال بُک کرنے کا فیصلہ نہ کر بیٹھا ہو اور سب سے زیادہ شدید ذہنی اور مالی جھٹکا آپ کو اس وقت لگتا ہے جب آپ اپنے پڑوسی کے لیے چائے بنوانے دوسرے کمرے میں جاتے ہیں اور وہ آپ کی غیر موجودگی کا فائدہ اُٹھا کر ایس۔ ٹی۔ ڈی پر کالی کٹ یا کلکتہ گھما جاتا ہے اور پھر اس کی معصوم بچی ہی کے ذریعے آپ پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ انکل جی کلکتہ سے ہماری آنٹی دلی آ رہی ہیں، پاپا نے ابھی ابھی آنٹی جی سے فون پر بات کی ہے۔

یہ سُنتے ہی آپ کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ پل پل ٹیلیفون کے بِل آنے کا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اب آیا اور اب آیا اور پھر جب ٹیلیفون کا بِل آپ کے سامنے آتا ہے تو اسے دیکھ کر آپ کے ہاتھوں کے طوطوں کے ساتھ سَر کے بال بھی اُڑ جاتے ہیں۔

پھر آپ ٹیلیفون پر تار لگانے کا ایک پنج سالہ منصوبہ تیار کرتے ہیں، ڈرائنگ روم میں نوٹس لگاتے ہیں کہ ٹیلیفون آؤٹ آف

آرڈر ہے۔ بغیر کسی ضروری کام کے ٹیلیفون کرنا
سخت منع ہے۔ براے مہربانی بغیر پوچھے
ہوئے ٹیلیفون کو ہاتھ نہ لگائیں کہ اس وقت
لائن ڈیڈ ہے۔ مگر اس کے باوجود آپ کا کوئی
حربہ کارگر ثابت نہیں ہوتا۔ بالآخر تنگ آکر
آپ فیصلہ کرتے ہیں کہ (STD) یعنی براہ راست فون
کرنیکی سہولت دی جائے مگر آپ کے اس فیصلے کو سب سے
پہلے گھر ہی میں چیلنج کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ بیوی یہ
نہیں مانتی کیوں کہ اسے بھی تو چنڈی گڑھ اور جالندھر
اپنے عزیزوں سے فون پر ہی باتیں کرنی ہیں۔ اب
یہ الگ بات ہے کہ اس کی یہ گفتگو ۴۰، ۵۰ منٹ سے
ہمیشہ کم نہیں ہوتی۔ اب آپ خود غور کر سکتے ہیں
کہ جب گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھائے تو باہر
والوں سے کیا شکایت۔

میرے گھر میں تین افراد ہیں۔ میں میری
بیوی اور میرا بیٹا۔ ٹیلیفون کے بارے میں
ہم تینوں کی پالیسیاں علیحدہ علیحدہ ہیں اور
اس حد تک علیحدہ ہیں کہ مصلحت کی حد تک بھی
ہم نے ایک دوسرے کی پالیسی کو قبول نہیں
کیا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہم تینوں دَل بدلنے
والے نظریہ کے سخت خلاف ہیں۔

میری بیوی کو رانگ نمبروں سے الرجی
(allergy) ہے، میرے لڑکے کو اُردو
دوستوں کے ٹیلیفون سے سخت چڑ ہے اور
مجھے دفتر کے فونوں سے سخت پریشانی ہے! اب
آپ دیکھئے کہ جب فون بجتا ہے تو عجیب اتفاق
ہے کہ یا تو آپ شیو کر رہے ہوتے ہیں یا غسل
خانے میں کوئی فلمی گیت یا غزل گنگنا رہے
ہوتے ہیں یا اپنے سفید بالوں میں خضاب
لگا رہے ہوتے ہیں یا پھر اس وقت آپ کے
دانتوں میں بِنا کا ٹوتھ برش ہوتا ہے۔ اب
آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ ایسے قیمتی اور نازک
لمحوں میں فون کی آواز آپ کے کانوں پر کتنی گراں
گزرتی ہوگی۔

میرا ایک دوست ہے اس کا کہنا ہے
کہ جب بھی میں پگڑی باندھنی شروع کرتا ہوں
فون بجنا شروع ہو جاتا ہے۔ فون اور پگڑی
کے درمیان یہ کشمکش کئی سالوں سے جاری ہے۔
میرے دوست کا یہ بھی کہنا ہے کہ فون میری
پگڑی کو للکارتا ہے۔ لہذا فون اور پگڑی کی
اس سرد جنگ میں جیت ہمیشہ پگڑی ہی کی
ہوتی ہے۔

میرا ایک اور مدراسی دوست ہے جو
صبح پورا ایک گھنٹہ بھگوان کی پوجا میں صرف
کرتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ فون بھی اسی دَوران
بجتا ہے اور وہ اپنے پوجا استھان سے نہیں اٹھتا
بقول اس کے فون وہ راکشس ہے جو اس کی
تپسیا کو بھنگ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس نے
بھی ہار نہیں مانی، وجے پوجا کی ہی ہوتی ہے۔
لیکن فون کو نہ اٹھانا بھی خطرے سے خالی نہیں،
کیونکہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جسے آپ رانگ
نمبر خیال کر رہے ہوں وہ آپ کی محبوبہ یا گرل
فرینڈ کا بھی ہو سکتا ہے۔ جس فون کو محض
آپ یہ سمجھ کر ہاتھ نہیں لگا رہے ہیں کہ دفتر
سے آیا ہوگا ممکن ہے وہی فون کسی پبلشر کا
ہو اور وہ آپ کو شاید رائلٹی دینے پر آمادہ
ہو گیا ہو، کسی پرانے دوست کا بھی تو ہو سکتا
ہے جس نے آج سے دس سال پہلے اپنی بے روزگاری
کے زمانے میں آپ سے ۲۰۰ روپے اُدھار لیے
تھے اور آج واپس کر رہا ہو۔ لیکن ایسے فونوں
کا زمانہ نہیں رہا۔

اب فون کے تعلق سے چند واقعات
سُن لیجئے:۔

ابھی ہفتہ بھر پہلے میں گھر پر ناشتہ کر رہا
تھا اس اثناء میں مجھے کسی کے فون کا سخت
انتظار بھی تھا۔ جب کافی وقت گذر گیا تو میں
مایوس ہو گیا اور سمجھ لیا کہ اب شاید فون نہ آئے
کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ میں نے جیسے
ہی رسیور اُٹھا کر کان سے لگایا اور ہلو کہا تو
دوسری جانب سے آواز آئی، صاحب مجھے یہ
چند ٹرینوں کے روانہ ہونے کے اوقات بتا
دیجئے۔

فلائنگ میل دلی سے کتنے بجے چھوٹتا
ہے۔ طوفان میل کی روانگی کتنے بجے ہوتی ہے
اور یہ کس نمبر کے پلیٹ فارم سے روانہ ہوتا
ہے۔ ڈی لکس کے کرایہ میں کتنا فرق ہے۔ چیئر
کار ملے گی۔ کیا فلم بھی دکھائی جائے گی۔

ایک دوسرا واقعہ ملاحظہ فرمائیے، رات
کے تقریباً دس گیارہ بج رہے تھے کہ اچانک
فون بج اُٹھا، سوچا اتنی رات گئے بھلا کون
فون کر سکتا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے جونہی فون
اُٹھایا اور ہلو کہا کہ دوسری جانب سے ایک
باریک سی نسوانی آواز آئی، جس میں کافی درد
بھی شامل تھا۔ ڈارلنگ مجھے معاف کر دینا
میں اپنے والد کا غصہ برداشت نہیں کر سکتی
انھوں نے میری ایک لکھ پتی آدمی سے شادی
کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تم یہ مت سمجھنا کہ میں
تمھیں غریب، نادار شاعر سمجھ کر ٹھکرا رہی
ہوں۔

اس سے پہلے کہ ہمیں کچھ سوچنے کا موقع
ملتا فون بند ہو گیا۔

ایک شاعر نے شاید فون کے ہی پس منظر
میں یہ شعر کہا تھا:۔

دردِ سر کے واسطے چندن لگانا ہے مفید
اِس کا گھِسنا اور لگانا دردِ سر یہ بھی تو ہے

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

کمال نشیط / آصفیہ انور صدیقی

اُردو دُنیا کے دو اہم ستون

مخدُوم

مخدُوم محی الدین ۱۹۰۸ء میں آندھرا پردیش کے ضلع میدک میں پیدا ہوئے چھوٹی عمر ہی کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ اُن کے چچا مولوی بشیرالدین مرحُوم نے اُن کی کفالت کی۔ ابتدائی تعلیم میدک ہائی اسکول میں حاصل کی۔ اور میٹرک میں کامیاب ہوئے۔ مولوی بشیرالدین باوجودیکہ کثیرالعیال تھے مگر انھوں نے مخدوم کو اعلیٰ تعلیم دلانے کی ہمت کی اور مخدوم نے ۱۹۳۶ء میں ایم۔ اے عثمانیہ یونیورسٹی سے پاس کیا۔ جامعہ کے دَورِ تعلیم میں مقرر، شاعر اور اداکار کی حیثیت سے بہت مقبول اور ممتاز طالب علم ثابت ہوئے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد دفتر دیوانی ومال وملکی میں ایک معمولی اسامی پر ملازم ہوئے۔ لیکن اُن کا مزاج دفتری کام و آداب کا متحمل نہ ہوسکا۔ چنانچہ مستعفی ہوگئے۔ اس کے بعد سٹی کالج ہائی اسکول میں مدرّس کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ مگر وہ کسی قسم کی نوکری کے لیے پیدا ہی نہیں کئے گئے تھے۔ سال ڈیڑھ سال مدرّسی کرکے یہاں بھی استعفیٰ دے دیا۔ اور کمیونسٹ پارٹی میں شریک ہوگئے۔ یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ کمیونسٹ متواتر گرفتار کئے جارہے تھے۔ مخدوم کی گرفتاری کا بھی وارنٹ جاری ہوچکا تھا۔ مگر وہ روپوش ہوگئے۔ اور کئی سالوں تک چھُپے رہے۔ پولیس ایکشن کے بعد باہر آئے اور مقننہ کے انتخاب میں حیدرآباد اسمبلی اور ہندپارلیمان کی رُکنیت کے لیے کھڑے ہوئے لیکن شکست کھائی۔ بعد میں ایک دوسرے حلقۂ انتخاب سے اسمبلی کی رُکنیت کے لیے منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۳ء اور ۱۹۵۲ء میں (INPUC) کی طرف سے روس، چین اور بعض یوروپی ممالک کا دَورہ کیا۔ جس کے تاثرات بڑے دلکش انداز میں قلمبند کئے۔ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے معتمد کی حیثیت سے اپنے فرائض بڑی سرگرمی سے انجام دئے۔ دہلی میں زیادہ رہا کرتے تھے۔ تعلیم کے زمانہ ہی میں ان کے چچا نے شادی کردی تھی۔

مخدوم بحیثیت شاعر طالب علمی ہی کے زمانے میں کافی شہرت حاصل کرچکے تھے اور ابتدا ہی سے ان کی شاعری اشتراکی تصوّرات سے اثرپذیر ہورہی تھی۔ اُن کا شمار اُن چند شعرا میں سے ہے جنھوں نے اُردو شاعری کو ترقی پسند رُجحانات سے روشناس کیا۔ لیکن جب سے سیاست میں حصّہ لینے لگے ان کا ذوقِ شعر گوئی کم ہوگیا۔ ان کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ "سُرخ سویرا" کے نام سے بہت پہلے شائع ہو چکا تھا۔ موصوف کی ایک کتاب "ٹیگور اور ان کی شاعری" ۱۹۴۵ء میں ادارہ ادبیات اُردو کی طرف سے شائع ہوچکی تھی۔

ریاست آندھرا پردیش کی سرزمینِ دکن میں کچھ ایسی بات ہے کہ یہاں کے بسنے والے ہر زمانہ میں اپنی انفرادیت قائم رکھنے اور منوانے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ یہاں شعر و سُخن کا غلغلہ رہا ہے۔ چنانچہ مخدوم بھی ایماںؔ، قیسؔ فیضؔ، تمیزؔ، عصرؔ، مائلؔ، توفیقؔ اور کیفیؔ جیسے قادرالکلام اساتذہ کی صف کے تھے۔

مخدوم شاعری میں عشوہ گری کے نہیں بلکہ بُت شکنی کے قائل تھے۔ اُن کے ڈراموں میں "ہوش کے ناخن" (یہ اشتراک میر حسن) اور "پھول بن" بھی شامل ہیں۔ مخدوم جامعہ عثمانیہ کے اُن سپوتوں میں سے ہیں جنھوں نے فکر و نظر کی کئی بستیاں آباد کیں اور ادب اور زندگی کے کاروان کو نئی راہیں دکھائیں۔ انھیں حیدرآباد (اور حیدرآباد سے باہر جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ اُن کے کسی ہم عصر کو نصیب نہ ہوئی۔ یہ مقبولیت اُن کے فن اور اُن کے بے پناہ خلوص اور شخصیت کے سحر کی وجہ سے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سیاسی معتقدات سے اختلاف کرنے والے بھی اُن سے اپنے پیار کا اظہار کرتے تھے۔ "بساطِ رقص" کے بعد کی نظموں میں "اپنا شہر" "جز تیری آنکھوں کے" "دردِ موت" (ویٹ نام کے پس منظر میں لکھی گئی) "مارٹن لوتھر کنگ" "رات کے بارہ بجے" "ملاقات" "غالب" "واسوخت" اور "رُت" وغیرہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ "ملاقات" ماسکو سے دلی آتے ہوئے کوہِ ہندوکش پر سے جب ہوائی جہاز تیس ہزار فٹ کی بلندی سے گذرتا ہے اور صبح کے تین چار بجے ایک جانب رات اور دوسری جانب صبح کی شفق بیک وقت دکھائی دیتی ہے اُس وقت لکھی گئی تھی۔ "غالب" ۱۹۶۹ء میں لال قلعہ کے مشاعرے میں پڑھی گئی۔

مخدوم کی حقیقی شخصیت کیا تھی وہ مندرجہ ذیل مضامین کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے۔

سی۔ راجیشور راؤ "ہمارا محبوب مخدوم"
نصرت محی الدین "میں جس کو یاد کرتا ہوں"
داؤد اشرف "مخدوم۔ ادھورا مطالعہ"
موہت سین "مخدوم جو زندہ ہے"
روی نارائن ریڈی "مخدوم یادوں کے جھروکوں سے"
امجد باغی "ایک شخصیت ایک انجمن"
کے۔ ایل مہندرا "کامریڈ مخدوم"

اس کے علاوہ اشفاق حسین، خواجہ مرزا شکور بیگ، یحییٰ صدیقی، جی۔ ایم عمر خاں، رزا حیدر حسین، رائے محبوب نارائن، سجاد ظہیر، کرشن چندر، زینت ساجدہ، عزیز قیسی، بھارت چند کھنہ، احسن علی مرزا، خواجہ احمد عباس، شبنم قیوم، فکر تونسوی، ابراہیم جلیس، آل احمد سرور، سلام شاہدی، اصغر وجاہت، عابد علی خاں، سید محمد مہدی، اعجاز قریشی، میر تجمل علی خاں، ادریش رانی، سائرہ ظہیر کے مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ مخدوم کی شخصیت اور فن کیا تھا۔ ان سبھی دانشوروں نے اپنے اپنے انداز سے ان کے فکر و فن اور شاعرانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالی ہے۔

شعراء کرام میں جنھوں نے مخدوم پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے وہ ہیں عرش ملسیانی، شاذ تمکنت، نیاز حیدرآبادی، باقر مہدی، شکیل بدایونی، حفیظ قتیل، بیکل اُتساہی، جاں نثار اختر، برق یوسفی، ڈاکٹر نوری، صلاح الدین نیر، شاکر، سیدہ حبیبہ، وقار خلیل، یوسف ناظم، غیاث متین، انتر غوری، نصرت یوسف زئی، انجم عارف، نصیر حیدرآبادی، ابوالخیر صبا، لیس علی خاں، امرت امروہوی، نامی انصاری اور علی الدین نوید وغیرہ۔ (کمال نشیط)

فراق اور اُن کی نظمیں

فراق کی جادو بیان غزلوں نے ہم کو اُن کی نظموں کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ اس میں شک نہیں کہ فراق غزل گو شعراء کے سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ اُردو شاعری کا وہ عہد جس نے آرزو، عزیز، ثاقب، صفی، جلیل، ریاض اور پھر بعد کے شاعروں میں حسرت، اصغر، فانی اور جگر کو پیدا کیا، نئی زندگی اور اُس کے بدلتے ہوئے مزاج کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر اب تک فراق میں زندہ رہا ہے اس حقیقت سے انحراف ممکن نہیں کہ شاعر کو کسی ایک خانے میں [illegible] سکتا۔ ہم کسی شاعر پر یہ قید نہیں لگا سکتے کہ وہ نظم ہی کہہ سکتا ہے غزل کو اظہارِ خیال کا ذریعہ نہیں بنا سکتا۔ یا وہ غزل ہی میں خیالات کو ادا کرنے پر قادر ہے نظم کہنے پر قدرت نہیں رکھتا یا شاعر صرف شاعری کر سکتا ہے نثر نگاری اُس کے بس کا روگ نہیں ہے ــــــ ایک شخص اعلےٰ درجہ کا شاعر بھی ہو سکتا ہے اور نثر نگار بھی حالی اور غالب اس کی روشن مثالیں ہیں دونوں ہی شاعری اور نثر نگاری پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ اقبال نظم بھی کہتے تھے اور غزلیں بھی۔ اسی طرح فراق کے اندر بھی وہ صلاحیت موجود تھی جو اُن کو نظم نگار شعراء کی صف میں لا کھڑی کرتی تھی جس طرح فراق کی شخصیت تہہ در تہہ ہے، اسی طرح اُن کی شاعری بھی 'ہزار شاعری' ہے۔ وہ قدیم ورثے سے بھی واقف ہیں اور جدیدیت کے بھی رمز شناس ہیں۔ اس لیے مطالعہ کے لیے محض اُن کی غزلوں تک محدود رہنا اُن کی شخصیت اور شاعری دونوں کے ساتھ بے انصافی ہے۔ اگر کوئی نقاد فراق کی نظموں ہی کو سامنے رکھ کر اُن کی شاعرانہ قدر و قیمت کا اندازہ لگانا چاہے تو شاید اُس کو تھوڑی سی مایوسی ہوگی۔ فراق کی نظموں پر تنقید کرتے وقت اُن کی غزل کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کیوں کہ فراق کی غزلیں اُن کی نظموں کا تکملہ ہیں۔

خود فراق کا خیال ہے کہ "اردو کی غزلیں غزلیت زدہ ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ زرد سودہ تھ

کیٹس، شیلے، ٹینی سن، میتھو آرنلڈ اور سون برن
وغیرہ شعرا کے اسلوب اور تکنیک میں جو خلاقانہ
صلاحیتیں ہیں اور گھلاوٹ و نغمگی کے ساتھ جو
سنجیدگی ملتی ہے اُس نمونے کی نظمیں کہہ
سکوں"۔ (خطوط نقوش، جولائی اگست ۱۹۵۷ء)۔

فراق نے نظم میں جو کوششیں کی ہیں اُن کی
اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے اُن کوششوں کو
اُس زمانے میں رکھ کر دیکھنا چاہیئے جب کہ اردو
نظم کا وہ تصور نہیں پیدا ہو سکا تھا جو آج
ہے۔ فراق پر نظم میں زیادہ اثر کسی ایک شاعر
کا نظر نہیں آتا۔ ویسے وہ نظم کے مشاہیر شعراء
میں نظیر، سودا، انیس، اکبر، چکبست، درگا سہائے
سرور، اقبال، حفیظ، حالی اور اختر شیرانی
کو شمار کرتے ہیں۔ اکبر پر فراق نے ایک نظم لکھی
ہے اور اُن کی وطن پرستی پر زور دیا ہے۔ اُن
کی قدامت پسندی کے باوجود اکبر کی اسی
خصوصیت نے اُن کو فراق کا محبوب شاعر بنا
دیا ہے۔ حالانکہ فراق اپنے مضامین میں چکبست
کا ذکر کرتے ہیں مگر میرا خیال یہ ہے کہ فراق شاعری
کے مزاج کے لحاظ سے سرور سے زیادہ قریب
ہیں۔ یوں فراق کی اُن نظموں میں جو انھوں نے
ہندوستان کی تعریف میں کہی ہیں چکبست کا
ہلکا ہلکا اثر ضرور ہے مگر اُسے چکبست کی بجائے
انیس کا اثر کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ چکبست
بذات خود انیس کی گرفت سے نہ نکل سکے۔
اقبال سے فراق کو یہ شکایت ہے کہ اُن کے لہجے
میں باوجود تفکر و فلسفے کے نرمی نہیں ہے بلکہ
جنگجویانہ رویہ ہے۔ حالانکہ اُن کا یہ خیال حقیقت
پر مبنی نہیں ہے۔ اقبال کی تقلید بہتوں نے کرنی
چاہی مگر گم کردہ راہ ہوتے۔ اپنے معاصرین میں
فراق جوش سے متاثر معلوم ہوتے ہیں وہ اُن
کے معترف ہیں۔ روح کائنات کے دیباچے
میں لکھتے ہیں :۔

"حضرتِ جوش سے پہلی ملاقات آٹھ برس
پہلے ہوئی۔ ہم دونوں جلد ہی ایک دوسرے کے
قریب آ گئے۔ مجھے اس طرح اپنی شاعری کی خصوصیت
قائم رکھتے ہوئے اس میں نئی وسعتیں اور نئے
امکانات پیدا ہونے کی ترغیب ہوئی"۔

وہ جوش کے اسالیب بیان، تشبیہوں اور
استعاروں اور تعبیرات کی کثرت کے معترف
ہیں اور اُن کو دوسرے شعراء پر فوقیت دیتے
ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جوش الفاظ کے
بادشاہ ہیں اور منظر کشی و محاکات کے بیان میں
اُن کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جس چیز کی جیسی
تصویر وہ چاہتے ہیں بے کم و کاست کھینچ کر رکھ
دیتے ہیں۔ اس کے برعکس فراق کے یہاں الفاظ
کبھی کبھی جذبے و خیال کا ساتھ دیتے ہوئے معلوم
نہیں ہوتے۔ جوش کے یہاں جو روانی، صفائی
اور تیزی ہے وہ فراق کی شاعری میں نہیں ہے۔
جوش کا انداز بیان تند و تیز اور سرمست ہے
فراق کے یہاں گہرے دریا کا دھیما پن، پرسکون
انداز اور نرم خرامی کی کیفیت نمایاں ہے۔
جوش کے یہاں حسن کی ایک ہی جھلک ہوش و
خرد لے اُڑتی ہے۔ فراق کے یہاں اُس کا اثر
دھیما دھیما ہوتا ہے۔ فراق کی شاعری میں
الفاظ محض پھول کی پتی پر شبنم کا کام دیتے
ہیں جیسے :۔

جیسے سکون تھرتھرائے، جیسے سکوت کچھ سنائے
جیسے سکندرہ مسکرائے حسن کی طرفگی تو دیکھ

اُردو کے اچھے اور بڑے نظم گو شعرا کے کارناموں
اور بہترین تخلیقوں سے فراق کی بہترین نظمیں
کسی طرح حیثیت میں کم نہیں ہیں یہ اور بات ہے
کہ اُن کی چار دہری غزلوں نے ہم کو اُنکی نظموں کی طرف
متوجہ نہیں ہونے دیا اور ہم اُن کی نظموں کی سحرکاری
سے واقف نہ ہو سکے۔ اُن کی بہترین نظمیں ہیں
"نغمۂ حقیقت"، "رقص شب تاب"، "پرچھائیاں"
"دھرتی کی کروٹ"، "داستانِ آدم"، "جگنو"،
"دھرتی کا سنگیت"، "انقلاب چین" اور "حسن
کی دیوی" وغیرہ۔ اُن کی دو نظمیں غیر مقفیٰ اور غیر
مردّف ہیں۔ "آدھی رات" اور "پرچھائیاں" اتنی
معرکۃ الآرا ہیں کہ ایک نقاد نے اُن کے متعلق
لکھا ہے کہ ان نظموں میں اردو شاعری اُن
مقامات تک پہونچ گئی ہے جہاں پہلے کبھی نہیں
پہونچی تھی۔ آپ بھی کچھ اشعار سن لیجئے۔

یہ شام اک آئینۂ نیلگوں، یہ نم، یہ کیف
یہ منظروں کی جھلک کھیت، باغ، دریا، گاؤں
وہ کچھ سلگتے ہوئے کچھ سلگنے والے الاؤ
سیاہیوں کا دبے پاؤں آسماں سے نزول
لٹوں کو کھول دے جس طرح شام کی دیوی
یہ کائنات کا ٹھہراؤ یہ اتھاہ سکوت
یہ نیم تیرہ فضا روز گرم کا تابوت
دھواں دھواں سی زمیں ہے گھلا گھلا سا فلک

(پرچھائیاں)

اسی طرح فراق کی نظم "جگنو" ایک بلند پایہ نظم
ہے جو اُردو کی بہترین نظموں میں شمار کی جا سکتی ہے
اس میں ایک بچّے کے جذبات کو دکھایا ہے جس کی
ماں بچپن میں ہی مر جاتی ہے۔ اس بچّے کو گھر کے
دوسرے لوگ پال لیتے ہیں بچّہ جب بڑا ہوتا ہے
تو جگنوؤں کو دیکھتا ہے۔ لوگ اُس کو بتلاتے ہیں کہ
دراصل جگنو بھولے ہوؤں کو راستہ بتاتے ہیں۔
ان جگنوؤں کو دیکھ کر بچّہ کچھ دن تک بے تاب
رہتا ہے کہ کاش وہ بھی جگنو ہوتا اور اپنی ماں کی
روح کو راستہ دکھاتا۔ سن شعور کو پہونچ کر بچّے
کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ خوشگوار اور رومانی
خیال محض خود فریبی ہے۔ مگر جب بھی وہ جگنو کو
اُڑتے دیکھتا ہے تو اُس کی آنکھ میں آنسو بھر آتے

ہیں۔ یہ نظم اتنی دردناک ہے کہ انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

سکوتِ رات کا جس وقت چھیڑتا ہے ستار
کبھی کبھی تیری پائل کی آتی ہے جھنکار
تو میری آنکھوں سے آنسو برسنے لگتے ہیں
اندھیری رات کی پرچھائیں ڈسنے لگتی ہے
میں جگنو بن کے تو تجھ تک پہونچ نہیں سکتا
جو تجھ سے ہو سکے اے ماں تو وہ طریقہ بتا
تو جس کو پالے وہ کاغذ اُچھال دوں کیسے
یہ نظم میں تیرے قدموں میں ڈال دوں کیسے
جب آسمان میں اُڑتے ہیں ہر طرف جگنو
شرابِ نور لیے سبز آب گینوں میں
کنول جلتے ہوئے ظلمتوں کے سینے میں
جب اُن کی تابشِ بے ساختہ سے پیپل کا
درخت سرو چراغاں کو مات کرتا ہے
نہ جانے کس لیے آنکھیں مری بھر آتی ہیں

اُن کی مشہور نظم "دھرتی کی کروٹ" کے بارے میں خواجہ احمد عباس نے لکھا تھا۔

"گذشتہ دس برسوں کے اندر اندر اُردو اور نہ ہندوستان کی کسی اور زبان میں اتنی بلند پایہ نظم کہی گئی ہے۔ یہ نظم کسانوں، مزدوروں اور عام انسانوں کا سب سے بڑا رزمیہ ہے" مزدوروں اور کسانوں کے کارنامے مندرجہ ذیل اقتباس میں سُنئیے:۔

چاند اور سورج کی کرنوں سے
چادر بُن کر رکھ دیتے ہیں
اس ہتھوڑے کی ضربوں سے
لوہا دُھن کر رکھ دیتے ہیں
کر کے برابر رکھ دیتے ہیں
اونچ کھابڑ پیچ و خم
کرّے کو سر نرما دیتے ہیں
اپنے دھرتی توڑ قدم

فراق کی ایک بصیرت افروز نظم کا عنوان ہے "داستانِ آدم" جس میں اُس وقت سے لے کر جب سے انسان نے اس کرۂ ارض پر قدم رکھا، انسانی ارتقا کے تمام مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس نظم کو سُن کر کہا تھا کہ اُردو کی کسی نظم کا (Canvas) کینواس اتنا بڑا نہیں ہے۔ پندرہ بیس لاکھ برسوں کی تاریخ کو فراق نے ڈھائی سو الفاظ میں سمیٹ لیا ہے۔ ایک آدھ بند سُنئیے ؎

کھیتوں کو سنوارا تو سنورتے گئے خود بھی
فصلوں کو اُبھارا تو اُبھرتے گئے خود بھی

فطرت کو نکھارا تو نکھرتے گئے خود بھی
نت اپنے بنائے ہوئے سانچے میں ڈھلیں گے

ہم زندہ تھے، ہم زندہ ہیں، ہم زندہ رہیں گے

ان نظموں کو پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ شاعر کا لہجہ، تشبیہات، استعارات اور تعبیرات اور شاعر کا اسلوبِ بیان مانوس ہوتے ہوئے بھی بہت بلند ہے اور منفرد ہے۔ اُردو نظم گوئی کے شعور کو فراق کی یہ نظمیں میلوں اوپر کی سطح سے روشناس کرا دیتی ہیں۔ حسن اظہار، حُسن بیان اور حسنِ معانی کی بالکل نئی مثالیں اور آفاقی ادب کی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ ان نظموں کو رسمیت چھو بھی نہیں گئی ہے اور اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا۔

(آصفیہ انور صدیقی)

●

قارئین سے گزارش

یوجنا کے لیے معیاری، اقتصادی، معاشی اور ادبی مضامین ارسال فرمائیے۔ مضامین خوشخط ہوں اور صفحہ کے ایک ہی جانب لکھے گئے ہوں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت ایڈیٹر کے پتے پر بھیجیں۔

یوجنا کے بارے میں

قارئینِ کرام کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ یوجنا، اُردو ایڈیشن میں چند تبدیلیاں لانے کی کوشش کی گئی ہے، اس سلسلے میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہر مہینے اس کے دونوں شماروں کو یکجا کر کے شائع کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے اور اس کے اندرونی صفحات ۴۰ کی بجائے ۴۸ کیے گئے ہیں، اس طرح کور کے چار صفحات کو شامل کر کے اس کے مجموعی صفحات کی تعداد ۵۲ ہو جاتی ہے، جس کی قیمت صرف دو روپے رکھی گئی ہے، اس سے قبل پندرہ روزہ یوجنا کے ہر شمارے کے بیس اندرونی صفحات کے لیے ڈیڑھ روپیہ قیمت ہو جانے سے قارئین پر غیر ضروری مالی بوجھ پڑنے کا اندیشہ ہو گیا تھا، یہی نہیں اس کے مشمولات کو بھی دلچسپ اور ہمہ گیر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ اس میں اقتصادی نوعیت کے مضامین کے علاوہ نظموں، غزلوں، تبصروں، انشائیے اور چند ادبی مضامین کی شمولیت سے اس کے پڑھنے والوں کا حلقہ اور وسیع ہو سکے، اس بارے میں ہمیں قارئین کے خیالات جاننے کا شوق رہے گا۔

●

غزلیں

• معصوم انصاری

خود اپنے تیر کا ہر آدمی نشانہ ہے
لہو لہو نئی تہذیب کا فسانہ ہے

کسے رفیق کہوں کس کو مہرباں سمجھوں
ہر ایک شخص کا انداز تاجرانہ ہے

یہ بات اپنے بزرگوں کو کیسے سمجھاؤں
وہ عہد اور تھا یہ اور ہی زمانہ ہے

وطن کی آب و ہوا سے بھی کٹ گیا رشتہ
تلاشِ رزق میں انسان بے ٹھکانہ ہے

نہ سر پہ چھت ہے نہ بادل نہ شاخِ سبز کوئی
ہمارے واسطے کرنوں کا شامیانہ ہے

خرابیوں میں بھی خوبی تلاش کرتا ہوں
مری نگاہ مری فکر شاعرانہ ہے

لپکتی رہتی ہیں ہر پل جو بجلیاں معصوم
انھیں کے دستِ تحفظ میں آشیانہ ہے

●

• قاضی انصار

روشنی کے فیض سے گھٹتا رہا
میل دل کا اس طرح کٹتا رہا

دشت و صحرا کا تصور اور میں
جسم میرا گرد سے اٹتا رہا

زندگی کیا ہے ہماری زندگی
آدمی ہر سانس میں مٹتا رہا

اپنے محور سے جدا ہو جائے گا
اپنے مرکز سے اگر ہٹتا رہا

شہر کی رنگینیوں کے باوجود
دل میرا انصار کیوں پھٹتا رہا

●

• سیفی سرونجی

غالب نہ تھا میں کوئی نہ حسرت نہ میر تھا
پھر بھی مری غزل کا زمانہ اسیر تھا

پتھر ہوا نصیب بس اک لفظ پر مجھے
بچہ تمھارے شہر کا کتنا شریر تھا

بچ کر میں کیسے رہتا بھلا اس کے وار سے
شعلہ تھا اس کا چہرہ نگاہوں میں تیر تھا

خاموش رہ کے سب کی جو سنتا تھا گالیاں
ہم نے سنا ہے وہ کوئی روشن ضمیر تھا

کل رات جس کا قتل ہوا تیرے شہر میں
آیا تھا چل کے دور سے وہ اک سفیر تھا

سیفی عجیب بات ہے دولت کے باوجود
مانگا تھا اس نے پیار، وہ کیسا فقیر تھا

●

• اُویس جمال

لے کے آ جائے چراغِ رُخِ زیبا کوئی
محفلِ زیست میں ممکن نہیں تم سا کوئی

ہوش اپنا ہے نہ پروائے زمانہ اُس کو
کاش اتنا بھی نہ ہو محوِ تماشا کوئی

حسرت و یاس کی اک بھیڑ لگی رہتی ہے
خلوتِ دل میں بھی ملتا نہیں تنہا کوئی

میں نے جلووں کو نگاہوں میں بسا رکھا ہے
اب کرے دیدۂ شوق سے پردہ کوئی

ہائے یہ شدتِ احساسِ محبت کہ جمال
دل میں بیٹھا ہوا ملتا ہے کلیجہ کوئی

●

• شاہد ساگری

تضمین برغزل ضیا فتح آبادی

کیوں غمِ ظلمت، شبِ دیجور کی باتیں کریں
قہقہہ زارِ دلِ مسرور کی باتیں کریں
انقلاب آیا، نئے دستور کی باتیں کریں
"ختم عہدِ قیصر و فغفور کی باتیں کریں
دورِ جمہوری ہے یہ جمہور کی باتیں کریں"

وقت کی رفتار کا ہم کو بدلنا ہے مزاج
پائے گیتی پر جھکا دینے ہیں سلطانوں کے تاج
راستی کی راہ پر لانا ہے یہ بھٹکا سماج
"حوصلوں کو ہے ابھی قربانیوں کی احتیاج
دار کا چرچا کریں منصور کی باتیں کریں"

کس قدر دلچسپ و دلکش ہے بیانِ حسن و عشق
لالہ و گل، ماہ و انجم، ترجمانِ حسن و عشق
گردشِ شام و سحر اک امتحانِ حسن و عشق
"ہم کو کرنی ہے مرتب داستانِ حسن و عشق
صبحِ دلی شامِ نیشاپور کی باتیں کریں"

●

• کشن دت طوفان

غموں سے پاک نفاست کی زندگی کر لیں
دلوں میں آؤ محبت کی روشنی کر لیں

سہارا غیر کا ڈھونڈھیں نہ ہم کسی صورت
جو کام سامنے آئے ہنسی خوشی کر لیں

ہمارے حوصلے اس درجہ ہوں بلند کہ ہم
فلک سے چھیڑ ستاروں سے دل لگی کر لیں

دکھائیں دل نہ کسی کا کبھی زمانے میں
بس اتنا عزم اب دنیا کے آدمی کر لیں

رہے نہ کوئی بھی تفریق ابنِ آدم میں
کچھ اس ادا سے ہم آپس میں دوستی کر لیں

سکون و امن زمانے کو بخش دیں طوفان
ہم اپنے آپ کو آلام سے بری کر لیں

●

م.ک. مہتاب

لال چند

ہمیں بنک کی طرف سے موضع کشن گنج کے ایک بُنکر بھگت رام کو جس کے دو ہتھ کرگھے تھے تین ہزار روپے قرض کے طور پر دینے کے لیے بھیجا گیا تھا ہم بہت خوش تھے اس لیے کہ ہم دیہات کے غریبوں کی حالت سُدھارنے کے عمل میں ایک قرض ادا کرنے کے لیے آئے تھے۔

بھگت رام نے ہمارے بنک میں قرضے کے لیے درخواست دی تھی جو منظور ہو گئی۔ اُسے اطلاع بھیجی گئی اور وہ منڈی ڈب والی میں جہاں کہ ہمارے بنک کی شاخ ہے، آیا لیکن اُس نے اتنی بڑی رقم ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا وہ منیجر سے کہہ رہا تھا

"سرکار آپ نے ہم غریبوں پر مہربانی کی ہے، لیکن اتنی بڑی رقم میرے لیے جان جوکھم کا کام ہے۔ کوئی راستے میں چھین لے۔ کوئی میرا گلا کاٹ دے گاؤں کی پگڈنڈی پر، تو میرے کُنبے کی حالت بہتر ہونے کی بجائے بدتر ہو جائے گی۔ مَیں قرض نہیں لے سکتا۔ مَیں نے ارادہ بدل دیا ہے۔"

منیجر نے اُسے سہارا دیا کہ "بھگت رام تم اس قرض سے سُوت اور کرگھے کا سامان خرید سکوگے۔ اچھا مال بنا کر اچھے دام لے سکو گے۔ سرکار نے قرضوں کی یہ اسکیم تم لوگوں کی غریبی دُور کرنے کے لیے ہی تو بنائی ہے۔ تمھاری درخواست منظور ہوئی ہے اور تم روپیہ لینے سے ہچکچا رہے ہو۔"

"سرکار مَیں اتنا روپیہ لے کر صحیح سلامت گھر نہیں پہونچ سکتا۔ تین میل پیدل چلنا پڑتا ہے۔"

اس پر منیجر صاحب نے ہمیں قرض کی رقم بھگت رام کے گاؤں میں جا کر ادا کرنے کی ہدائت کی تھی۔ ہم غریبوں کی مدد کا ایک بڑا اور فخر یہ تصور لے کر کشن گنج آئے تھے لیکن ہمارا وہاں شایانِ شان خیر مقدم نہیں ہوا تھا۔ بھگت رام کی بیوی بھاگو ہمارے لیے بسکٹوں کی ایک پلیٹ بھر کر لے آئی تھی۔ پُرانی قسم کے بسکٹ جن میں سے ایک ہیک سی اُٹھ رہی تھی، جیسے بارشوں کے دَوران کسی بند ڈبے میں پڑے رہے ہوں، وہ زور دے کر کہہ رہی تھی۔

" اور لو بیٹا اور لو۔" اور ہم بڑی مشکل سے ایک ایک بسکٹ ہی گلے سے اُتار پائے تھے۔ اس کے بعد وہ ایک گڑوا چائے کا اور پیتل کے دو گلاس لے آئی اور ہمارے سامنے گلاس رکھ کر چائے سے بھر دئے۔ چائے گاڑھی تھی مگر رنگ قدرے کالا تھا۔

" یہ کس چیز کی چائے پیتے ہو تم بھگت رام؟" خزانچی نرمل چند چائے کا گھونٹ حلق سے اُتارتے ہوئے بولا۔

" سرکار یہ چائے ہی ہے۔"

" یہ تو چمڑا رنگنے کا پانی معلوم ہوتا ہے۔"

" نہیں نہیں سرکار یہ چائے ہی ہے۔ بس اس میں گُڑ ڈالا ہوا ہے۔"

مَیں نے بھی چائے کے دو گھونٹ پیے تھے۔ اگر گُڑ بھی ڈالا تھا تو بہت پُرانا تھا اور چائے قدرے کڑوی ہو گئی تھی۔ مَیں نے بھگت رام سے پوچھا۔

" تم چائے میں چینی کیوں نہیں ڈالتے؟" تو بھاگو جس کا گڑوی پر رکھا ہاتھ کانپ رہا تھا، بولی۔

" بابوجی! چینی والی چائے تو شہر میں پی جاتی ہے۔ یہاں دس روپے کی ایک کلو چینی لے کر کون چائے پی سکتا ہے؟"

" لیکن سرکار نے تو ہر گاؤں میں چینی کی سستے داموں پر فروخت کی دُکانیں کھول رکھی ہیں۔ کیا تمھیں وہاں سے چینی نہیں ملتی؟"

" لال چند کی سرکاری دکان تو ہے۔ لیکن وہاں سے گیہوں اور مٹی کا تیل مل جائے تو وہی غنیمت ہے۔ ہم نے ڈرتے ہوئے کبھی چینی مانگی ہی نہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مٹی کا تیل بھی نہ ملے۔

" بھگت رام، سرکار تمھارے حصے کی چینی بھی یہاں بھیجتی ہے تم لیتے کیوں نہیں تمھیں پتہ نہیں؟"

" ہم جانتے ہیں سرکار کہ لال چند سب کے لیے چینی لاتا ہے لیکن وہ ہمیں جو غریب لوگ ہیں نہیں ملتی۔ لال چند کہتا ہے کہ تم گُڑ کھایا کرو۔"

" لیکن لال چند تمھاری چینی کیسے دیتا ہے؟"

" جب ہم گیہوں اور مٹی کا تیل لینے جاتے

ہیں تو وہ چینی کے رجسٹر پر بھی انگوٹھا لگوا لیتا ہے پھر تیل دیتا ہے۔"

"کیا وہ چینی بلیک میں مہنگے داموں پر فروخت کرتا ہے؟"

"یہ ہم نہیں جانتے سرکار۔ ایک بار چینی مانگی تھی تو وہ کہنے لگا تم نہیں جانتے نمبردار کی لڑکی کی شادی ہے، وہاں چینی چاہیئے اور اس کے بعد وہ تین ماہ رجسٹر پر انگوٹھے لگواتا رہا۔"

"اور تم گڑ کی چائے پیتے رہے۔"

"اور کیا کرتے جناب۔"

"لال چند کی دکان کا حساب کتاب دیکھنے تو کوئی انسپکٹر آتا ہوگا تم اُس کو کیوں نہیں بتاتے کہ وہ یہ دھاندلی کر رہا ہے۔؟"

"ہاں جناب۔ ایک آدمی کبھی کبھی راشن کارڈ بنانے آتا ہے لیکن وہ نمبردار کا رشتہ دار ہے اُس سے بات کرنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔ وہ ہمارا کارڈ کاٹ دے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ لال چند اُس کی خوب خدمت کر دیتا ہے۔" بھگت رام بڑے عاجزانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"تم یہ کڑوی کسیلی چائے پی سکتے ہو اس دھاندلی کے خلاف زبان نہیں کھول سکتے ہو؟" نرمل چند خزانچی نے چائے سے بھرا گلاس ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"زبان کھولیں بھی تو کون سُنے گا۔ لال چند تو گیہوں، چاول، تیل بھی اُس کو دیتا ہے جو سَو دَس لعف بھی اُس سے خرید کرے۔ اوپر اوپر سب لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ پٹواری، ماسٹر جی، ڈاکٹر، ملی جاٹ، زمیندار چینی چاول بنا سستی لے جاتے ہیں۔ ہمارے لیے لال چند کے پاس دس روپے کلو والی چینی ہی ہوتی ہے۔"

"کیا یہ لُوٹ کھسوٹ کشن گنج میں ہی ہوتی ہے؟"

"نہیں سرکار میرا بھائی جگت رام راجو کی گاؤں میں رہتا ہے وہ بھی گُڑ کی چائے پیتا ہے۔"

ہم سائیکلوں پر واپس ڈب وال آ رہے تھے۔ جاتے ہوئے ہمارے دماغ میں غریبوں کی فلاح کا جو فخر کا احساس موجود تھا وہ روپے کی ادائیگی کے بعد بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ ہم دونوں خاموش چلے آ رہے تھے۔ ایک بچہ نرمل چند کی سائیکل کی زد میں آتے آتے بچا۔ اُس نے زور سے سائیکل کی گھنٹی بجائی اور کہنے لگا۔

"جب تک لال چند بیٹھے ہیں نبک کچھ نہیں کر سکتا بال کشن" اور زور سے پیڈل گھمانے لگا۔ بھگت رام کی چائے کی کڑواہٹ حلق سے پیٹ کے ہر حصے میں پھیلتی جا رہی تھی۔ ●

بقیہ، پودے ہماری میراث ہیں

بیجوں کی کاشت زرعی ترقی کے لیے کتنی دُور رس اور مثبت نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔

جہاں تک جنگلات کا تعلق ہے، جنگلات میں قدیم ترین پودوں کا بیش بہا خزانہ پوشیدہ ہے۔ جنگلوں کی آغوش میں بیل بُوٹوں کی بے نظیر قسمیں سانس لیتی ہیں۔ بدقسمتی سے جنگل بھی ہماری دستبرد سے آزاد نہیں رہے، جہاں ہمیں پانی ذخیرہ کرنے کے لیے ڈیم بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی، وہاں ہم نے شاداب جنگلوں کو اُجاڑ کر رکھ دیا۔ جہاں ہمیں کسی بڑے پراجیکٹ کی تعمیر کے لیے زمین درکار تھی، وہاں ہم نے جنگلوں کے بہت بڑے حصے کو برباد کر کے رکھ دیا۔ ستم بالائے ستم اسمگلروں، راشی افسروں اور ملازموں کو درخت کاٹنے اور جنگلوں سے پیدا ہونے والی اشیا کو لے جانے کی کھُلی چھوٹ دی گئی۔ جنگلوں کی صفائی کا کام بے دریغ طریقے پر ہوا ہے۔ اور جہاں کہیں درختوں کی از سرِ نو کاشت کا کام ہاتھ میں لیا گیا، وہاں صرف وہ درخت لگائے گئے جو تجارتی اعتبار سے فائدہ مند تھے، چھٹے پانچ سالہ منصوبے کے مسودے میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ فطری ماحول کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لیے ہماری کوششیں صرف خوبصورت مناظر کی تشکیل و تعمیر تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ غرض کہ ہمالیہ کے کوہستانی سلسلے کے تباہ شدہ ڈھلانوں کو پھر سے سرسبز بنانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں میں شیشم، دیودار اور سفیدوں کی کاشت ایک محدود تجارتی نقطۂ نظر سے کی گئی ہے اور اُن پودوں کی از سرِ نو کاشت اور پرداخت کے لیے کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ جو جنگلات کی بنجی پیداوار کو بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

کسانوں کی امداد :- اگر ان رجحانات پر سختی سے روک نہ لگائی گئی تو بیج جمع کرنے کے بنک اور (Biosphere Reserves) کے قیام کا کام اور دیگر اقدامات بے معنی ثابت ہوں گے۔ کیونکہ جو نقصان بیجوں کی نسلوں کو پہنچا ہے اس کی تلافی کے لیے یہ اقدامات کافی نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ جو اقسام بنکوں میں جمع کر دی گئی ہیں، اگر وہ عام کسانوں کو وقت پر دستیاب نہ ہوں تو اُن کے جمع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

کسانوں نے اپنے تجربے کی بُنیاد پر کہا ہے کہ زراعت کی ترقی سے متعلق توسیعی کرمچاری، زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کی تشہیر تو کرتے ہیں لیکن روایتی بیج کہاں سے دستیاب ہوں، اس بارے میں کسانوں کو کوئی آگاہی نہیں دی جاتی۔ حکومت کو چاہیئے کہ زرعی انقلاب کی ضرورت، جدید طریقوں کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ روایتی بیجوں کی فراہمی کے بارے میں بھی کسانوں کو آگاہ کرتی رہے اگر ایسا نہ کیا گیا تو کسانوں کو اِن نایاب بیجوں کی فراہمی کے بارے میں کیسے پتہ چل سکتا ہے۔ ●

تبصرہ

(تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

نام کتاب :۔ **سرابوں کی فصل** شاعر :۔ **جمنا پرشاد راہی** قیمت :۔ چالیس روپے

رابطہ :۔ مکتبہ جامعہ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

سرابوں کی فصل کی شکل میں اُردو کے معزز اور معتبر شاعر جمنا پرشاد راہی نے اپنے شعری سرمایے کو نذرِ قارئین کیا ہے۔ ایک سو پچاس صفحات کی یہ کتاب اُن ضخیم کتابوں کو معیار، حسن اور صداقتِ فن کا آئینہ دکھاتی ہے جن میں شاعری کے نام پر کچھ اور چھاپ دیا جاتا ہے۔

جمنا پرشاد راہی نے دنیا کی اس "سراب سرائے" میں نئی فضا، نئی آب و ہوا اور نئی زندگی کو ذاتی طور پر جس انداز میں جیا ہے اور جس طرح اپنے روزمرہ سے تجربات اُٹھائے ہیں نیز اُن کو اپنے اور صرف اپنے ہندوستانی اسلوب میں جس تخلیقی اُپج کے ساتھ اشعار میں منتقل کیا ہے وہ ان کی فنی انفرادیت اور ذہنی ندرت کی پہچان کے لیے ایک معتبر وسیلہ ہے۔

راہی کے شعری اظہار پر روایتی اصطلاحاتِ عیوبِ شاعری مثلاً تقلید، ترسیل و ابلاغ کا المیہ اور اسلوب کے غیر جمالیاتی یا لہجہ کے کھردرے پن کا اطلاق نہیں ہوتا۔ "سرابوں کی فصل" کی ندرت اور انفرادیت اسکے معنوی اور خارجی حسن دونوں میں مضمر ہے۔ ترتیب و انتخاب میں جو چستی اور سلیقہ ہے، کتابت و طباعت میں جو سادہ سادہ پُر کاری ہے نیز مرصع کاری اور رنگینی سے جو دامن کشی کی گئی ہے وہ اس دور میں شاذ ہی نظر آتی ہے اور اس تمام شعوری و غیر اختیاری عمل سے جو ایک شاعرانہ استغنا کی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ نئے پن کے احساس اور انفرادی سوچ کی ضامن ہے۔ جمنا پرشاد راہی کے ذاتی لفظیاتی و علامتی نظام، تجربات کی وسعت و ندرت اور اُن کی خلاقانہ سکت و صلاحیت کا اندازہ اس کے ہر شعر سے کیا جا سکتا ہے ؎

تمام عمر سرابوں کی فصل کاٹی ہے
عجب زمین میں بویا تھا خواب دریا کا

یہ شعر "سرابوں کی فصل" کا سب سے پہلا شعر ہے۔ زمین میں دریا کا خواب بونا اور سرابوں کی فصل کاٹنا ایسے استعارات و پیکر وجود میں لاتا ہے جو اپنے حصار میں ایک جہانِ معنی سمیٹے ہوئے ہیں۔ ایک مکمل تخلیقی عمل، وسیع تجرباتی تناظر اور الفاظ کا مخصوص خلاقانہ استعمال اس شعر میں موجود ہے۔ اسی طرح راہی کے شعری اسلوب کی بُنت میں استعمال ہونے والے الفاظ معنی کی اتنی تہیں لیے ہوئے ہوتے ہیں کہ شعر کے پہلے تفہیمی پڑاؤ سے منزلِ مفہوم تک پہنچنے کے لیے مسافرِ قرأت و سماعت کو مسافتِ آگہی اور ادراکی تجربات کی جن پُرپیچ راہوں سے گزرنا ہوتا ہے وہ اس رائے پر مُہرِ تصدیق ثبت کرتی ہیں کہ راہی کی غزل کا اپنا ایک مزاج و معیار ہے اور اُس میں زندگی کی تمام تر تہ داریوں کو انگیز کرنے کی قوت و صلاحیت موجود ہے۔

جمنا پرشاد راہی ایک ایسا تجربہ کار جدید شاعر ہے جو زندگی کی ہمہ جہت، ہمہ رنگ اور مختلف الاقسام کانٹ میں دریا کا خواب بونے اور سرابوں کی فصل کاٹتے ہوئے عمر کے چھیالیسویں محاذ تک آ گیا ہے لیکن اُس کے یہاں زندگی سے اُکتاہٹ کا عمل مفقود ہے گو کہ محرومی اور زندگی کی طرف سے بے یقینی نئی نسل کا مقدر بن چکی ہے لیکن وہ متحرک انداز میں زندگی کرنے اور مصائبِ زیست سے مکمل ہوشمندی اور خنداں پیشانی کے ساتھ نبرد آزما رہنے کا قائل ہے۔ اسی لیے اس کے اشعار میں روایتی تہذیب کی پاسداری بھی ہے اور صحتمند اور توانا احتجاج بھی ہے ؎

حسنِ عجز اپنی جگہ، شانِ نیاز اپنی جگہ
جنگ لازم ہے تو پھر غیرتِ بازو جاگے

راہی نے جو کچھ دیکھا، سُنا یا پڑھا اور سیکھا ہے وہ سب کا سب اس کے شعور و تحت الشعور میں رچ بس کر شعری تجربات میں ظاہر ہوا ہے نیز زبان و عروض کی گہری واقفیت نے اس کی شاعری کے خمیر کو گاڑھا اور گندھا ہوا بنا دیا ہے۔ عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ عروض داں شعرا شاعری کی اُس بڑی خصوصیت کو کھو بیٹھتے ہیں جو شاعری کے سُلجھے ہوئے رواں اور سلیس اسلوب میں اور نادر و صاف زبان میں پنہاں ہوتی ہے لیکن جمنا پرشاد راہی نے عروضی آگہی کو اس تخلیقی قوت کے ساتھ اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے کہ وہ حسن کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ "سرابوں کی فصل" کی پہلی غزل میں ہی حسنِ عروض کی نیرنگیاں اہلِ نظر دیکھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ تین شعر ملاحظہ کیجئے ؎

ادراکِ خودی کا یہ اثر ہے آئینہ خود اپنی زد پر ہے
کیا دے کوئی زخموں کی داد اپنا دل اپنا خنجر ہے
آنکھوں میں ہے جشنِ بےخوابی گو گھر کی فضا خواب آور ہے

راہی نے اپنے پیرایۂ بیان کو یکسانیت سے بچانے کے لیے سماجی و انفرادی تجربات کی مختلف الرنگ کرنوں کو شعری دھاگوں میں یوں پرو دیا ہے کہ قاری و سامع ہر دوسری نگاہ میں نئے تجربے، نئی روشنی اور نئے ذائقے سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہ کبھی آنے والے خطروں سے آگاہ کرتا ہے تو یہ شعر کہتا ہے ؎

جہاں گرے ہو وہیں ٹوٹتے بکھرتے رہو
اگر اُٹھے تو ہواؤں کی زد میں ہو تم بھی

کبھی اُس نے مذہبی تلمیحات و تراکیب کو شعر میں استعمال کیا ہے اور کبھی دیومالائی و اساطیری استعارات اور اصطلاحات کے ذریعہ شعر کو پُراثر اور جاذبِ توجہ بنایا ہے۔

"سرابوں کی فصل" عصری کتابیات کا ایک اہم نام ہے۔ پروفیسر اختر انصاری نے اس کتاب کے بیک ٹائٹل کور پر بڑی سچی اور اہم رائے لکھی ہے اور "اُتر پردیش اُردو اکادمی" نے اس کو ایوارڈ کا مستحق بھی قرار دیا ہے۔ اُردو ادب کے قارئین کے لیے یہ ایک بہترین تحفہ ہے۔ (مشہیر رسول) ●

ڈاکٹر زرینہ عقیل احمد

مشہورِ آفاق سائنس داں ALBERT EINSTEIN نے مہاتما گاندھی کے بارے میں کہا تھا۔ "اپنی قوم کا ایسا رہنما جو اقتدار کی امداد سے محروم تھا۔ ایک سیاستداں جس کی کامیابی کا انحصار تدبیروں اور فنی حکمتوں پر نہ تھا بلکہ اپنی شخصیت کی یقین دلانے والی طاقت پر تھا، ایک کامیاب مردِ میدان جس نے ہمیشہ قوت کے استعمال کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ ایک انسان جو دانش و عجز سے معمور تھا، جس کا ہتھیار اس کا مضبوط ارادہ اور مستقل و پائدار خیالات تھے۔ جس نے اپنی تمام طاقت اپنی قوم کو اوپر اٹھانے اور ان کی قسمت کو بہتر بنانے میں صرف کی۔ ایک ایسا انسان جس نے یورپ کی اہمیت کے مقابلے میں ایک سادہ انسانی زندگی کو لاکھڑا کیا اور اس طرح تمام زمانوں کے لیے اپنے کو ممتاز اور بہتر ثابت کر دیا۔ آئندہ آنے والی نسلیں مشکل سے یقین کریں گی کہ ایک ایسا آدمی بھی کبھی زمین پر تھا۔"

گاندھی جی کی عظمت کا راز صرف اسی میں پنہاں نہیں ہے کہ انھوں نے ایک غیر ملکی حکومت کے خلاف لڑائی میں فتح حاصل کی بلکہ انھوں نے سیاسیات میں اخلاقیات کو داخل کر کے اور انسانیت کو مقدم مان کر سیاسیات کی سطح بلند کر دی اور اسے زمین کی پستیوں سے نکال کر آسمان کی بلندیوں تک پہونچا دیا۔ انھوں نے ساری زندگی ستیہ یعنی صداقت اور اہنسا یعنی عدم تشدد کی تلقین کی اور اپنے ان اصولوں پر سختی سے کاربند رہے۔ ستیہ یا صداقت کو انھوں نے خدا کا درجہ دیا اور جو بھی سیاسی قدم انھوں نے اٹھایا اس میں صداقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ گاندھی جی اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود سماجی اصلاح کے کاموں سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ انھوں نے ملکی اقتصادیات، تعلیم، اچھوتوں کے مسائل، قومی اتحاد، دیہات، کسان، مزدور، خواتین سبھی کی طرف توجہ کی اور ہر ایک کے بارے میں اہلِ وطن کو مفید مشورے بھی دئے اور سارے ملک میں ان مسائل سے دلچسپی پیدا کر دی۔ اسی بنا پر انھیں مصلحِ اعظم کہا گیا اور شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے انھیں "مردِ میدان گاندھی درویش خو" اور رشی جیسے لفظوں سے یاد کیا۔

گاندھی جی نے اگرچہ ملک کو ایک فلسفہ اتحاد دیا اور اس کی اقتصادی اور سماجی اصلاح کے اصول بتائے مگر وہ اس سے بھی کہیں زیادہ بلند تھے۔ وہ انسانیت کے خادم اور تمام بنی نوع انسان کے لیے ایک پیغام رکھتے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ "میں سوراجیہ کے لیے جھوٹ نہیں بولوں گا۔" گاندھی جی کی نگاہ میں انسانی قدریں ایک ملک کو زنجیر غلامی سے آزاد کرنے سے کہیں زیادہ قیمتی تھیں۔ چنانچہ وہ انسانی قدروں کو ابھارنا اور انسانیت کے اصولوں کو اجاگر کرنا چاہتے تھے۔ ۳۔ اپریل ۱۹۲۱ء کے ینگ انڈیا میں انھوں نے لکھا تھا۔

"میں نظارۂ جمالِ الٰہی کا طالب ہوں اور میں جانتا ہوں کہ خدا سچ ہے، میں ہندوستان کی خدمت کرتا ہوں کیوں کہ ہندوستان میں پیدا ہوا ہوں اور اس کا کلچر میرے ورثہ میں آیا ہے اس لیے میں سب سے زیادہ ہندوستان کی خدمت کے قابل ہوں اور ہندوستان کو مجھ سے خدمت لینے کا حق ہے لیکن میری حُبّ الوطنی محدود نہیں ہے۔ اس کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ میں دیگر اقوام کو نقصان پہونچاؤں بلکہ یہ ہے کہ میں صحیح معنوں میں سب کو فائدہ پہونچاؤں۔ وطنیت کوئی گناہ نہیں بلکہ وطنیت کی تنگ نظری خود غرضی اور عالمِ انسانیت سے علیحدگی گناہ ہے جس پر موجودہ قوموں کی بنیادیں کھڑی ہیں۔ ہندوستانی قومیت اور وطنیت نے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا ہے۔ یہ اپنے آپ کو اس لیے منظم کرنا چاہتی ہے کہ پوری آزادی حاصل کرنے کے بعد نوعِ انسانی کی خدمت کر سکے۔"

گاندھی جی کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ جو کچھ کہتے تھے اس پر سب سے پہلے خود عمل کرتے تھے پھر دوسروں کو سکھاتے تھے اس پر اسی کے ساتھ وہ یہ بھی تعلیم

دیتے تھے کہ مقصد کی پاکیزگی کے ساتھ ذریعہ بھی پاک ہونا چاہیئے۔ کسی ملک کو آزاد کرانا یا اس کو ترقی دینا ہی عام طور سے لیڈروں کا مقصد ہوتا ہے لیکن ہندوستان کو آزاد کرانا اس کو بامِ رفعت پر پہونچانا گاندھی جی کے مشن کا صرف ایک جز تھا۔ ان کا مشن کیا تھا؟ اس پر ان کے الفاظ سے روشنی پڑتی ہے" میں تم کو ایک جادو بتاتا ہوں۔ جب تم کو کوئی شک ہو یا جب تمھارا نفس تم پر حد سے زیادہ غالب آجائے تو یہ نسخہ آزماؤ۔ تم نے جتنے آدمیوں کو دیکھا ہے ان میں سب سے زیادہ غریب اور سب سے زیادہ بیکس شخص کا چہرہ اپنی یاد میں تازہ کرو اور تب اپنے آپ سے پوچھو کہ جو تم قدم اُٹھانے والے ہو وہ اس کے لیے کس طرح کارآمد ہوگا۔ کیا وہ اس سے کچھ فائدہ اُٹھا سکے گا؟ ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسائل کو بھی گاندھی جی نے انسانیت کی وسیع نگاہ سے دیکھا جس کے لیے انھیں عام لوگوں کی ناسمجھی کی بنا پر کئی مرتبہ مرن برت رکھنا پڑا اور آخر میں انھوں نے اپنی جان تک نچھاور کردی ان کی تعلیم کا نچوڑ انسان کو انسان بنانا تھا۔ وہ انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک جتنی آلودگیاں ہیں ان سے انسانوں کو پاک کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے بڑی خوبصورتی سے انسانیت اور سیاست کو ایک کردیا تھا اور تمام مذاہب کی مسلّمہ سچائیوں کی روشنی میں انھوں نے دُنیا کو راہِ نجات دکھائی اس طرح روحانی طاقت سے وہ کام ہوا جو حکومت اور فوج بھی نہ کر سکی تھی۔ گاندھی جی محض ایک مفکر، سیاست داں اور مصلحِ قوم ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک مذہب کے مبلغ بھی تھے لیکن انھوں نے جس مذہب کی تبلیغ کی وہ ہندو دھرم، اسلام یا عیسائیت نہ تھا بلکہ وہ مذہب تھا انسانیت۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

" انسان کا اصل مقصد خدا کی معرفت ہے اور اس کی ساری سماجی، سیاسی اور مذہبی جدوجہد اسی مقصد یعنی مشاہدۂ حق کو مدِنظر رکھ کر ہونا چاہیئے۔ سب انسانوں کی بلاواسطہ خدمت اس جدوجہد کا لازمی جز بن جاتی ہے اسی لیے خدا کو پانے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ہم اس کا جلوہ اس کی مخلوق میں دیکھیں اور اس مخلوق کے ساتھ گھل مل کر ایک ہو جائیں اور یہ نوعِ انسانی کی خدمت ہی کے ذریعے ممکن ہے۔"

گاندھی جی نے اپنے زرّیں اُصولوں اور عمل سے یہ ثابت کردیا کہ عدم تشدّد کے ذریعے اخلاقی اور روحانی قوت کے ذریعے، ذہن اور کردار کی پاکیزگی کے ذریعے ناانصافی اور بدنیتی پر حیوانیت اور بربریت پر فتح حاصل کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے اپنی خود نوشت کا نام بھی "تلاشِ حق" رکھا جس کے ذریعے انھوں نے انقلاب کا ایک نیا اسلوب اور جدوجہد کا ایک نیا راستہ دکھایا۔ انھوں نے کہا تھا کہ تشدّد کا جواب تشدّد نہیں ہوسکتا۔ باطل کو باطل سے شکست نہیں دی جاسکتی۔ تشدّد کو عدم تشدّد سے۔ باطل کو حق سے۔ اندھیرے کو روشنی سے اور بد اخلاقی کو اخلاق سے شکست دی جاسکتی ہے۔ اس طرح حق، عدم تشدّد اور اخلاق کی بنیاد پر وہ اس عظیم تحریک کو چلانے میں کامیاب ہوئے جس نے کچلی ہوئی، مصیبت زدہ ہندوستانی قوم کو جوش و انقلاب عطا کیا۔

گاندھی جی کا فلسفہ تاریخ کی مادّی نہیں، اخلاقی تعریف کرتا ہے اور حیات و کائنات کو ترقی پذیر متحرک مادیت کی روشنی میں نہیں دیکھتا بلکہ فلسفۂ حیات میں مادہ اور جوہر دونوں کا قائل ہے۔ جو یقیناً سماج اور کائنات کی اخلاقی تنقید ہے۔ اس طرح مہاتما جی نے ایک روشن اخلاقی راستہ دکھایا جو انسان کو حیوانیت کی طرف نہیں انسانیت کی سمت لے جاتا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ " میری پچھلے تیس سال کی زندگی کا تجربہ مجھے یہ اُمید دلاتا ہے کہ ہندوستان ہی کی نہیں بلکہ ساری دُنیا کی بھلائی اور مستقبل اہنسا کے سہارے ہی محفوظ ہے۔ اہنسا کا اصول لُوٹ کھسوٹ کے شکار اور دبے کچلے سماج کے سارے سیاسی اور سماجی سوالوں کو حل کرنے کا ایک نہ خطا کرنے والا حربہ ہے۔" وہ ایک نیا ہندوستان تعمیر کرنا چاہتے تھے جہاں اخلاقیات کا دَور دورہ ہو، جہاں آدمیوں میں آدمیت اور شرافت ہو، جہاں دیانت داری اور صداقت کی گرم بازاری ہو، جہاں اُونچ نیچ کا کوئی سوال نہ ہو، جہاں فرقہ وارانہ کشیدگی نہ ہو، جیسا کہ انھوں نے کہا تھا۔

" میں ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر کرنے کی کوشش کروں گا جس میں غریب سے غریب یہ محسوس کرسکے کہ یہ اس کا اپنا ملک ہے۔ جس کی تعمیر میں اس کی آواز کو ایک خاص وزن حاصل ہو۔ ایک ایسا ہندوستان جس کے باشندوں میں نہ اعلا طبقہ ہوگا نہ ادنیٰ طبقہ اور تمام فرقے مکمل امن اور اتحاد کی زندگی بسر کریں گے۔"

سوامی وویکانند کا قول ہے" اُٹھو جاگو اور جب تک منزل نہیں پا لیتے، چین سے نہ بیٹھو۔" ایک مفکر ایک معمار قوم کی یہی کیفیت رہتی ہے۔ وہ بطن گیتی سے آفتاب تازہ بن کر اُٹھتا ہے پھر گرد و پیش سے متاثر ہوکر جاگتا ہے اور جب تک منزل نہیں پا لیتا چین سے نہیں بیٹھتا۔ گاندھی جی کے ذہن میں کچھ سوالات اُبھرے۔ یہ بلندی و پستی کیسی؟ یہ بندھن یہ غلامی کیسی؟ تعصب اور تنگ نظری کیسی؟ اور پھر ان کے جواب حاصل کرنے کے لیے انھوں نے مصیبتیں برداشت کیں۔ انکی زندگی آزاد ہندوستان کا خواب دیکھتے کٹی۔ سوتے جاگتے ایک ہی تصور ایک ہی فکر، ایک ہی خیال تھا۔ آزاد ہندوستان جو صرف اپنی غلامی کی زنجیریں نہ توڑے بلکہ ساری انسانیت اور سارے غلام ملکوں

(باقی صفحہ [illegible] پر)

رفعت سروش

گذشتہ سے پیوستہ (دُوسری اور آخری قسط)

رام پرساد بسمل

۱۹۱۹ء میں جب سیاسی قیدیوں کو عام معافی دی گئی تو بسمل جن کا مَین پوری کیس کے سلسلے میں وارنٹ تھا، واپس شاہجہاں پور آگئے۔ یہاں انھوں نے زندگی کی نئی جدّوجہد شروع کی۔ کپڑا بُننا سیکھا، ریشمی کپڑے کے ایک کارخانے میں منیجری کی، کتابیں لکھیں اور چھپوائیں۔ ریشمی کپڑے کا بھی کارخانہ قائم کرلیا۔

مگر رام پرساد بسمل کی منزلِ اس سب سے کہیں آگے تھی۔ ان کو خبر دی گئی کہ کرانتی کاری دَل کی پھر تنظیم کی جارہی ہے، اور بسمل چند مہینوں میں ہی اپنا کام دھندا سمیٹ کر پھر انقلاب کی اسی آگ میں کُود پڑے جس میں تپ کر کندن بننا ان کی قسمت بن چکا تھا۔

انقلابیوں کی بُری حالت تھی۔ انھیں پیٹ بھر روٹی اور تن ڈھکنے کو کپڑا میسّر نہیں تھا۔ اور انقلاب کے لیے ضرورت تھی۔ مضبوط تنظیم کی۔ ہتھیاروں کی۔ اور ہتھیاروں کے لیے ضرورت تھی روپے کی۔ روپیہ کہاں سے آتے۔ دان کوئی دیتا نہیں تھا۔ قرض بھی نہ ملتا تھا۔ اور کوئی صورت نظر نہ آئی سوائے ڈاکے ڈالنے کے۔ مگر کسی کی ذاتی ملکیت کو لُوٹنا بسمل کو منظور نہ تھا۔ سوچا، اگر لُوٹنا ہی ہے تو سرکاری مال کیوں نہ لُوٹا جائے۔

اور ایک دن ریل کے سفر میں بسمل کی تیز نظروں نے دیکھا کہ کس طرح گارڈ کے ڈبے میں خزانے کا صندوق رکھا جاتا ہے۔ اور ہر اسٹیشن پر اس میں روپوں کی تھیلیاں جمع ہوتی جاتی ہیں۔ اندازہ کیا کہ سہارنپور سے لکھنؤ تک آتے آتے اس گاڑی میں کم سے کم دس ہزار روپے جمع ہو جاتے ہیں۔ اور طے کیا کہ اس پر ہاتھ صاف کروں گا۔

اسی طرح کاکوری ریل ڈکیتی کا پس منظر تیار تھا۔

رام پرساد بسمل، اشفاق اللہ خاں، راجندر ناتھ لاہری، چندر شیکھر آزاد، ششی چندر ناتھ بخشی، مکندی لال، کیشو چکرورتی، مراری لال، بنارسی لال اور من متھ ناتھ گپت — دس انقلابیوں کا یہ گروہ بسمل کی رہنمائی میں ۹ اگست ۱۹۲۵ء کو ریل میں سفر کر رہا تھا۔ جو رات کے اندھیرے کو چیرتی ہوئی لکھنؤ پہنچنے ہی والی تھی۔

اچانک ریل کی زنجیر کھینچی — اور گاڑی آہستہ آہستہ رُک گئی۔ لوگوں کی مختلف آوازیں گونجیں۔

"ریل کیوں رُک گئی؟"

"کس نے زنجیر کھینچی؟"

"زنجیر کس نے کھینچی؟" "کیا ہوا — کیا بات ہے؟"

اتنے میں گولی چلنے کی آواز آئی۔ لوگ سہم گئے۔ بسمل نے آگے بڑھ کر کہا۔ "سب مسافر اطمینان سے گاڑی میں چڑھ جائیں۔ ہم مسافروں کو کچھ نہیں کہیں گے۔ سرکاری خزانہ لُوٹیں گے۔"

اور اس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ گارڈ کے ڈبے میں سے خزانے کا صندوق کھینچ لو۔ صندوق کھینچ لایا گیا۔ گارڈ نے ڈبے میں چڑھنے کی کوشش کی تو اسے روک دیا گیا اور کہا گیا کہ جب تک ہم اپنا کام پورا کرلیں تم ڈبے میں نہیں چڑھ سکتے ہو۔ پلیٹ فارم پر چت لیٹ جاؤ۔ خبردار۔ ہلنے جلنے کی کوشش کی تو گولی ماردی جائے گی۔ اور صندوق توڑا جانے لگا۔ چھینیوں سے نہ ٹوٹا تو ہتھوڑا بجایا گیا۔ کلہاڑی

چلائی۔۔۔ خزانے کا صندوق ٹوٹ گیا تو روپوں کی تھیلیاں گٹھڑیوں میں باندھ لی گئیں۔ اور رات کے اندھیرے میں یہ لوگ لکھنؤ کی طرف چل پڑے۔

دس آدمیوں کے گروہ کا چلتی ٹرین کو روک کر اس طرح سرکاری خزانے کو لوٹ لینا انگریزی سرکار کے منہ پر کرارا طمانچا تھا۔ اور رام پرساد بسمل اور ان کے ساتھیوں کا بے مثال انقلابی کارنامہ، اس ڈکیتی نے کرانتی دل کی ہمتیں بڑھا دیں، سب قرضے چکا دیے گئے۔۔۔ نئے ہتھیار خریدے گئے اور ان نئی ڈکیتیوں کی اسکیمیں تیار کی جانے لگیں۔

ادھر پولیس نے نہایت سرگرمی سے ڈاکوؤں کا سراغ لگانے کی کوشش کی اور ہارٹن صاحب نے شدید دوڑ دھوپ اور جوڑ توڑ کرنے کے بعد پتہ لگا ہی لیا۔ بسمل کے بعض ساتھیوں نے غداری کی، پولیس کو مخبری کی اور آخر وہ پولیس کے پھیلائے ہوئے جال میں آ ہی گئے۔

صبح کا وقت تھا۔ رام پرساد بسمل اپنے گھر میں ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون؟" بسمل نے دروازہ کھول کر پوچھا۔

"پولیس ۔۔۔ آپ کی گرفتاری کا وارنٹ ہے۔"

"بہت اچھا۔ ابھی چلتا ہوں۔ ماتا جی سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"جو بات کرنی ہو یہیں کر لیجیے۔ ہم آپ کو ہتھکڑیاں نہیں لگائیں گے۔"

بسمل ماتا جی کے پاس گئے اور بولے۔

"ماتا جی میں آپ کی سیوا نہیں کر سکا۔ مگر ہمت رکھنا۔"

بھیا سشیل، میں تو جاتا ہوں۔ نہ جانے پھر آیا نہ آیا۔ دیش سیوا میں چاہے میرا بلیدان ہی کیوں نہ ہو جائے مگر میں یہ راستہ نہیں چھوڑوں گا۔ موت کا مجھے خوف نہیں۔ جیل کا مجھے ڈر نہیں۔ شیر ہی کٹہرے میں پھانسے جاتے ہیں نہ کہ گیدڑ۔۔۔

اچھا سب کو پرنام۔"

اور اس بہادرانہ شان سے رام پرساد بسمل گرفتار ہو کر جیل چلے گئے۔

کاکوری کیس کے سلسلے میں ۲۶ ستمبر ۱۹۲۵ء کو شمالی ہند میں جگہ جگہ خاص طور پر شاہجہاں پور، کانپور، بنارس اور الہ آباد میں گرفتاریاں ہوئیں۔ تقریباً چالیس آدمی پکڑے گئے۔

کاکوری کیس کے مقدمے کی داستان بہت طویل ہے، مگر مختصر یہ کہ ڈکیتی میں شریک بنارسی لال کے غداری کرنے اور سرکاری گواہ بن جانے سے مقدمہ بہت کمزور ہو گیا اور اس گھر کے بھیدی نے ایسے ایسے راز پولیس کو بتائے کہ جس سے سرکاری شکنجے بہت مضبوط ہو گئے۔

سرکار کی طرف سے پنڈت جگت نرائن مُلا اس مقدمے کی پیروی کر رہے تھے۔ آزادی کے ان جانبازوں کو بچانے میں قوم نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ان کی صفائی کے لیے پنڈت موتی لال نہرو کی قیادت میں ایک راشٹریہ سمتی بنی جسے پنڈت جواہر لال نہرو، گنیش شنکر ودیارتھی، شیو پرساد گپت، سری پرکاش اور آچاریہ نریندر دیو وغیرہ کا تعاون حاصل تھا۔ مقدمہ کی پیروی کرنے کے لیے بیرسٹر بی۔ این۔ چودھری مقرر ہوئے اور بعد میں پنڈت گووند ولبھ پنت، چندر بھان گپت، آر۔ ایف۔ بہادر اور موہن لال سکسینہ نے پیروی کی۔ مگر انقلابیوں کو لمبی لمبی سزائیں ہوئیں اور رام پرساد بسمل، اشفاق اللہ خاں، روشن سنگھ اور راجندر لاہری کو پھانسی۔

اس سزائے موت پر بسمل کو ناز تھا۔ انھوں نے اپنی سوانح میں لکھا ہے:-

"بڑی جدوجہد اور کوشش کے بعد یہ مبارک دن نصیب ہوا۔ صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ میں اس خاکسار کے جسم کو ہی یہ سعادت حاصل ہوئی کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے واقعات کے بعد انقلابی تحریک کے سلسلے میں اس صوبہ کے باشندے کا پہلا بلیدان مادرِ وطن کے قدموں میں ہوگا۔"

بسمل کے آخری دن گورکھپور جیل کی جس نو فیٹ لمبی اور نو فیٹ چوڑی کوٹھری میں گذرے اس کا نقشہ انھوں نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"یہ کوٹھری کسی پرندے کے پنجرے سے بھی خراب ہے۔ کھلے میدان میں بنی ہے، اوپر کسی طرح کا سایہ نہیں۔ صبح آٹھ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک سورج دیوتا کی مہربانی اور چاروں طرف ریتیلی زمین ہونے کی وجہ سے آگ برستی رہتی ہے، مچھر اپنی مدھر آواز رات بھر سناتے ہیں۔ رات کو مشکل سے تین چار گھنٹے نیند آتی ہے۔ مجھے تو اس کوٹھری میں بڑا لطف آ رہا ہے۔ میری خواہش تھی کہ کسی سادھو کی گپھا میں رہ کر یوگا کی مشق کرتا۔ آخری وقت میں یہ خواہش بھی پوری ہو گئی۔ سادھو کی گپھا نہ ملی تو کیا ہوا۔ سادھنا کی گپھا تو مل گئی۔ اس کوٹھری میں رہ کر یہ موقع مل گیا کہ اپنی کچھ آخری بات لکھ کر اہلِ وطن کی خدمت میں پیش کرتا جاؤں۔

اب تو یہی آرزو ہے ؎

جیسے بحرِ فنا میں جلد یا رب لاش بسمل کی
کہ بھوکی مچھلیاں ہیں جوہرِ شمشیر قاتل کی

—

محسوس ہو رہے ہیں بادِ فنا کے جھونکے
کھلنے لگے ہیں مجھ پر اسرار زندگی کے

اس کوٹھری میں بھی رام پرساد بسمل نے "آتم کتھا" لکھی ہے جس میں انھوں نے بادِ فنا کے جھونکوں سے مست ہو کر زندگی کے اسرار کھولے ہیں، بسمل کی یہ سوانح حیات ایک ایسی نادر کتاب ہے جس میں نہ صرف ان کے تجربات بکھرے پڑے ہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے ایسے جواہر ریزے بھی ہیں جن سے وہ اپنے کردار کو سجا اور سنوار سکتے ہیں، اپنی ماں کو انھوں نے جن الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے وہ انمول ہیں :۔

"اگر مجھے ایسی ماں نہ ملتی تو میں بھی نہایت معمولی لوگوں کی طرح سنسار کے چکّر میں پھنس کر زندگی گذارتا۔ تعلیم و تربیت کے علاوہ انقلابی زندگی میں بھی انھوں نے میری ایسی ہی مدد کی ہے جیسی میزنی کی ان کی ماں نے کی تھی۔"

پھانسی کی کوٹھری میں اپنی ماں کو یاد کرتے ہوئے ان کے قلم سے یہ الفاظ اُبل پڑے :۔

"تمھیں میری موت کی اندوہ ناک خبر سنائی جائے گی۔ ماں! مجھے یقین ہے کہ تم یہ سمجھ کر ضبط و تحمّل کا دامن تھام لوگی کہ تمھارا بیٹا ۔۔ ماتاؤں کی ماتا ۔۔ بھارت ماتا کی سیوا میں اپنا جیون بھینٹ کر گیا۔ اس نے تمھاری کوکھ کو کلنک نہیں لگایا۔ وہ اپنے عہد پر قائم رہا۔ جب آزاد ہندوستان کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس کے کسی صفحے پر نمایاں الفاظ میں تمھارا نام بھی رقم ہوگا۔"

رام پرساد بسمل کی آرزو تھی کہ پران تیاگنے سے پہلے ایک بار اپنی ماں کے درشن کر لیں۔ پھانسی سے ایک دن پہلے آخری ملاقات کا وقت تھا۔ ماں بیٹے کو آخری آشیرواد دینے کے لیے گورکھپور جیل پہونچ گئی۔ جذبات سے بے قابو ہو کر بسمل رو پڑے۔ ماں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ارے تو رو رہا ہے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ میرا بیٹا بہادر ہے، جس کے نام سے انگریز سرکار بھی کانپتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ موت سے ڈرتا ہے۔ اگر تمھیں رو کر ہی مرنا تھا تو اس کام کا بیڑا ہی کیوں اُٹھایا تھا۔"

بسمل اپنے آپ کو سنبھال کر بولے۔

"ماں! میں موت سے نہیں ڈرتا۔ تم یقین کرو ۔۔ ماں! مجھے آشیرواد دو کہ آخری وقت بھی میرے دل میں کوئی خوف و ہراس نہ پیدا ہو اور میں تمھارے چرنوں کو پرنام کر کے پرماتما کو یاد کرتے ہوئے اپنا شریر تیاگ دوں۔"

اس وقت ماں کا سروپ دیکھ کر جیل کے ملازمین بھی یہ کہنے کے لیے مجبور ہوئے کہ بہادر ماں کا بیٹا ہی بہادر ہو سکتا ہے۔"

بہادر ماں کے بہادر بیٹے کے دوست بھی بہادر تھے۔ اشفاق اللہ خاں وارثی کی دوستی پر رام پرساد بسمل کو بڑا ناز تھا۔۔ وہ دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ اکثر ایک تھالی میں کھانا کھاتے تھے، اُن کے دل سے یہ خیال ہی جاتا رہا تھا کہ ہندو مسلمان میں کوئی فرق ہے۔ اپنی سوانح حیات میں رام پرساد بسمل نے اشفاق اللہ خاں کو جگہ جگہ یاد کیا ہے، ایک جگہ رقم طراز ہیں :۔

پیارے بھائی تمھیں یہ سُن کر سکون ہوگا کہ جس نے ماں کے دھن دولت کو دیش سیوا میں صرف کر کے انھیں بھکاری بنا دیا۔ جس نے اپنا تن من دھن سب کچھ مادرِ وطن کے قدموں میں نچھاور کر کے آخری بلیدان بھی دے دیا اس نے اپنے پیارے دوست اشفاق اللہ کو بھی اس مادرِ وطن کی بھینٹ چڑھا دیا۔

"اصغرِ حریمِ حسن میں ہستی ہی جُرم ہے
رکھنا کبھی نہ پاؤں یہاں سر لیے ہوئے"

اپنی اور اشفاق اللہ خاں کی دوستی کو بسمل نے اہلِ وطن کے سامنے فخر سے پیش کیا ہے اور اسے ہندو مسلم اتحاد کی زرّیں مثال قرار دیا ہے، لکھتے ہیں :۔

"انگریز سرکار نے اشفاق اللہ کو رام پرساد کا داہنا ہاتھ قرار دیا۔ اشفاق اللہ کٹّر مسلمان ہو کر آریہ سماجی رام پرساد کا کرانتی کاری دَل کے سلسلے میں داہنا ہاتھ بن سکتے ہیں، تب کیا ہندوستان کی آزادی کے نام پر ہندو مسلمان اپنے نجی چھوٹے چھوٹے مفادات کو پسِ پُشت ڈال کر آپس میں ایک نہیں ہو سکتے۔"

اور یہ جملہ تو بسمل کی زندگی اور جدّ و جہد کا نچوڑ ہے۔

"ہندو مسلم اتحاد ہی ہم لوگوں کی یادگار اور آخری آرزو ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی دشواریوں سے حاصل ہو۔"

رام پرساد بسمل نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا اور اپنی روح کے نہاں خانے پر دستک دی تو انھیں محسوس ہوا کہ یہ تشدّد، یہ مار کاٹ اور یہ لُوٹ مار بیکار تھی ۔۔ انھوں نے لکھا۔

"میں اس وقت اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ اگر ہم نے دل و جان سے عوام کو پڑھانے لکھانے اور تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کی ہوتی تو ہمارا صنعتی انقلاب، اس انقلاب سے کہیں زیادہ مفید اور دیرپا ہوتا۔

گاؤں کی زندگی کے دُکھ درد کو انھوں نے جھیلا تھا اور دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا

تھا اس لیے انھیں ہندوستان کے گاؤں کی زندگی بہتر بنانے کی شدید خواہش تھی۔ کیتھرائن کی زندگی کو وہ مثالی مانتے تھے، جو گاؤں میں جاکر کپڑے سیتیں، جوتے بناتیں اور راتوں کو کسانوں کو نصیحت آمیز باتیں بتلاتیں تھیں، بسمل کس تڑپ کے ساتھ لکھتے ہیں۔

"میں بھی اس طرح کے کام کرنا چاہتا تھا۔ مگر بیچ میں کرانتی کاری دل میں پھنس گیا۔"

قوم کے نوجوانوں کے نام ان کا آخری پیغام وہی ہے جس کے ڈانڈے عدم تشدد کی اس تحریک سے مل جاتے ہیں جس پر چل کر بسمل کی شہادت کے بیس سال بعد ہندوستان آزاد ہوا۔

" نوجوانوں کے لیے آخری پیغام یہی ہے کہ وہ ریوالور یا پستول کو اپنے پاس رکھنے کی آرزو کو خیر باد کہہ کر سچے دیش سیوک بنیں۔ مکمل آزادی ان کا نصب العین ہو اور صحیح معنوں میں جمہوریت پسند بننے کی کوشش کرتے رہیں اور نتیجے کی فکر چھوڑ کر سچے پریم اور لگن سے کام کریں۔ پرماتما ان کا بھلا ہی کریگا۔"

انھیں پرماتما پر پورا بھروسہ تھا اور اس عظیم آرزو کو دل میں لیے ہوئے انھوں نے اپنے پران تیاگے کہ ان کو اگلے جنم میں بھی دیش سیوا اور انسانیت کی خدمت کا موقع ملیگا۔

"اپنے متعلق مجھے یقینِ کامل ہے کہ میں ایک بہتر جسم کے روپ میں کسی قریبی رشتہ دار یا گہرے دوست کے گھر میں جنم لونگا۔ کیونکہ میرا جنم اس مقصد سے ہوگا کہ ہر آدمی کو قدرت کی مخلوق سمجھا جائے اور کسی کو کسی پر فوقیت نہ ہو۔ سب کو مساوی حقوق حاصل ہوں، کوئی کسی پر حکومت نہ کرے۔ ساری دنیا میں بھائی چارے کی فضا قائم ہو۔"

اور آخر گورکھپور جیل کی اس "سادھنا گپھا" کے ویران ہونے کا دن آہی گیا۔ ۱۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کا سورج خون میں ڈوبا ہوا نکلا اور اس کی کرنیں آسمان سے زمین پر بسمل ہو ہوکر گرنے لگیں۔ بے قرار ہوکر تڑپنے لگیں۔ جیل کی کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ چاروں طرف سخت پہرہ۔ پھانسی کا تختہ امر شہید ہونیوالے رام پرساد بسمل کے قدم چومنے کو تیار تھا۔

پھانسی کا پھندا اپنی قسمت پر رشک کر رہا تھا کہ آج اسے امر شہید کے گلے کا ہار بننے کا موقع ملے گا۔

تیس سال کا گبرو جوان۔ جس کی رگوں میں فولاد پگھلا ہوا تھا۔ رام پرساد بسمل۔ ناز کرتا ہوا آگے بڑھا۔ وطن کے لیے سرفروشی کی تمنا بر آئی۔ اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے :-

"وندے ماترم۔ بھارت ماتا کی جے
مالک تری رضا رہے اور تو ہی تو رہے
باقی نہ میں رہوں نہ مری آرزو رہے
جب تک کہ تن میں جان رگوں میں لہو رہے
تیرا ہی ذکر، یا تری ہی جستجو رہے

(I wish the downfall of British empire)

اور اس مقدس خواہش کا اظہار کرنے کے بعد وہ وید منتروں کا جاپ کرتے ہوئے پھانسی کے پھندے پر جھول گئے۔

بسمل کی شو یاترا، گورکھپور میں اس شان اور دھوم دھام سے نکلی کہ عوام نے ان پر عطر اور پھولوں کی بارش کی اور جے جے کار کے نعروں سے اس امر شہید کو آخری نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ اور آج وہ تاریخ آزادی کا ایسا سنہرا ورق ہے جس کی آب کبھی ماند نہیں پڑ سکتی۔ ●

بقیہ، جنگل بانی ضروری

متبادل ذرائع کے استعمال سے دلچسپی لینے والوں کی تربیت اگرچہ ضروری ہے تاہم یہ کام وقت چاہتا ہے۔ گاؤں کی سطح کے بہت سے ادارے روایتی ایندھن کے موثر استعمال کے سلسلے میں بھی موزوں اقدامات کر سکتے ہیں۔ معمولی فائدے کے لیے طویل المدتی ماحولیاتی استحکام کو نقصان نہیں پہونچانا چاہیئے۔ یہ استحکام ملک کی اقتصادی ترقی سے جڑا ہوا ہے۔ مختصر یہ کہ کسی بھی حالت میں اس قومی وسیلے کو حد سے زیادہ استحصال کا شکار نہیں ہونا چاہیئے۔ ●

بقیہ، ٹیلیفون کی گھنٹی

انگریزی کے مشہور ناولسٹ سمرسٹ ماہم نے ایک بار کہا تھا کہ جب کبھی آپ کو کوئی یہ پیغام دے کہ فلاں صاحب نے فون کیا تھا، نہایت ضروری کام ہے اور آپ فوراً فون کریں تو ہمیشہ یاد رکھئے کہ ضروری کام فون کرنے والے کو ہے نہ کہ آپ کو، اس لیے وہ یقیناً آپ کو دوبارہ فون کرے گا۔ لہٰذا آپ فکر نہ کریں۔ لیکن اس کے باوجود کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھیں غمِ روزگار اور غمِ جاناں سے زیادہ غمِ فون کھائے جا رہا ہے۔

عزیز مرادآبادی

ایڈز کی وجوہ علامات اور تدابیر

آپ ایڈز (AIDS) نامی مرض کا تذکرہ جہاں تہاں ۔ اخباروں، رسالوں میں اور ریڈیو، ٹی وی پر پڑھتے، سننے اور دیکھتے ہوگا ہے۔ اس موذی مرض کی ہلاکت اور خطروں سے بھی لوگ واقف ہوتے جا رہے ہیں ۔ ! چونکہ یہ مرض بہت پہلے امریکہ، یوروپین ممالک اور افریقی ملکوں میں پنپ رہا تھا، اس لیے ایشیا والوں کو کوئی خاص فکر لاحق نہیں تھی۔ لیکن گزشتہ چند برسوں سے دُنیا کے سب سے بڑے برِاعظم ایشیا میں بھی یہ اپنے پنجے گاڑنے لگا ہے اور اس وَبا نے اب ہندوستان میں بھی اپنے قدم جمانے شروع کر دئیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مرض میں مُبتلا افراد کی اموات کی اطلاعات بھی رفتہ رفتہ عام انسانوں تک پہونچنے لگی ہیں ...! لہٰذا یہ ضروری ہے کہ عام فہم زبان میں "ایڈز" سے متعلق اہم معلومات فراہم کر کے عام لوگوں تک پہنچائی جائیں۔ تاکہ ہندوستان کا عام شہری بھی ایڈز کی علامات، اسباب اور احتیاطی تدابیر وغیرہ سے بخوبی واقف ہو جائے اور "ایڈز" کو بھارت سے بھگانے میں حتی الامکان اپنا تعاون پیش کر سکے ...!

مندرجہ ذیل مضمون میں ہم "ایڈز" کے متعلق مختصر مگر اہم معلومات سُرخیوں کی مدد سے پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ایڈز (AIDS) کیا ہے :-

اصلیت یہ ہے کہ "ایڈز" بذاتِ خود کوئی مرض نہیں ہے۔ بلکہ قوّتِ مدافعت ختم ہو جانے کے باعث معمولی سا مرض بھی سنگین اور مہلک شکل اختیار کر لیتا ہے، جس کے نتیجے میں مریض بے چارا موت کی آغوش میں جا سوتا ہے ... اسی صورتِ حال کو "ایڈز" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

ایڈز (AIDS) کیوں ہوتا ہے؟

انسانی جسم کو قوّتِ مدافعت۔ (Immunity Power) برقرار رکھنے کے لیے سفید خلیات (White cells) کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ انہی خلیات کے کم یا ختم ہو جانے پر دفاعی نظام مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ تب معمولی مرض کے حملے کو بھی روکنے کی جسم میں قوت باقی نہیں رہتی۔ اس طرح مریض "ایڈز" کا شکار ہو جاتا ہے اور اس مرض کے شکار کی منزلِ صرف موت ہے۔

سفید خلیات کیوں ختم ہو جاتے ہیں؟

"ایڈز" کے وائرس کسی طرح انسانی جسم میں داخل ہو کر سفید خلیات کو اپنی غذا بنا لیتے ہیں۔ اور انسانی وجود کے دفاعی نظام کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔

نئی تحقیق

نئی تحقیق کے بعد امریکی تحقیق نے ۱۹۸۱ء میں "ایڈز" کے وائرس کو (Human T-Cell Lymphotropic Virus III) کا نام دیا اور اسی وائرس کو فرانس کے محقق نے Lympha Denopathy Associated Virus نام سے جانا ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ "ایڈز" کی بیماری انسانی تاریخ کے برابر پُرانی ہے۔ لیکن امریکہ میں اس کی وبائی شکل اختیار کر لینے پر ۱۹۸۱ء میں اس کے وائرس کا پتہ (تحقیق کی گئی) لگایا گیا اور اس سے پیدا ہونے والی بیماری کا نام

"ایڈز" (AIDS) تجویز کیا گیا ۔ ایڈز مندرجہ ذیل مکمل نام کا مخفف (SHORT FORM) ہے:۔

"Required Immune Deficiency Syndrome"

اس وبا کے بھارت میں پھیلنے کی وجوہ

کچھ محققین کا خیال ہے کہ جن ممالک میں ایٹمی تجربات ہو رہے ہیں، وہاں کے انسانوں اور حیوانوں کے وہ خلیات (White cells) متاثر ہوئے ہیں جو قوتِ مدافعت کو برقرار رکھتے ہیں ۔ اس کے علاوہ "ایڈز" کے وائرس (Virus) کی بہتات جنسی بے راہ روی، ناپاک زندگی گذارنے کا ماحول اور نشہ آور اشیاء جیسے شراب، افیون، گانجہ، بھنگ، چرس ہیروئن ہیں ملتے ہیں! اسمیک وغیرہ کا کثرت استعمال، نیند آور ادویہ، بعض تیز اثر دوائیں، زود اثر انجیکشنز وغیرہ بھی "ایڈز" کا سبب بنتے ہیں ۔۔ ۔۔۔ یہاں یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ نشہ آور اشیاء، منوم اور جوہری ادویات کے استعمال، ماحولیاتی کثافت اور ریڈیائی تابکاری سے یہ مرض لاحق ہو جائے گا، ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ایڈز کے وائرس اس قسم کے حالات میں مریض کو تیزی سے اپنا شکار بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔

جس ملک میں مذکورہ بالا صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے اور سونے پر سہاگہ یہ کہ جہاں ہم جنسی کی لعنت بھی فیشن بنتی جا رہی ہو تو وہاں "ایڈز" کے وائرس جنسی آزادی کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچ کر اپنا کرشمہ دکھاتے ہیں ۔۔۔ کم و بیش یہی وہ وجوہ ہیں جن کی باعث یہ وبا بھارت جیسے ملک میں بھی اپنے پاؤں پھیلانے لگی ہے، جس سے نہ صرف ہماری حکومت بلکہ ہوش مند اور باخبر افراد بھی فکر مند ہیں ۔

ایڈز کی اہم علامات

اس مرض میں سب سے زیادہ اعصابی نظام متاثر ہوتا ہے ۔ زبان لڑکھڑانے لگتی ہے، یاد داشت کی قوت گھٹنے لگتی ہے، مریض روزمرہ کے معمولات، زندگی کی اہم باتوں کو بھی بھولنے لگتا ہے، ہاتھ پاؤں میں کپکپاہٹ یا رعشہ جیسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ مریض کو خصوصاً جسمانی تھکاوٹ محسوس ہونے لگتی ہے، ذرا سا کام یا چلنا پھرنا اس کو بے دم کر دیتا ہے ۔ کمزوری مریض کو نڈھال کر دیتی ہے، راتوں کو پسینے آنے لگتے ہیں ۔ بخار بھی ہو جاتا ہے، پتلے پاخانے (اسہال) آنے لگتے ہیں، بھوک غائب ہو جاتی ہے، دل کسی کام میں نہیں لگتا، ہر وقت سستی اور تساہل کا مریض پر تسلط قائم رہتا ہے ۔۔۔ ۔۔ ہم جنسی کے فعلِ بد میں مبتلا وہ شخص جسے مفعول کہا جا سکتا ہے، جب تک بدفعلی نہ کرالے اسے چین نہیں آتا ۔ فاعل کے اخراجِ منی (Semen) سے مفعول کے مبرز کے اندر سکون محسوس ہونا ایڈز کے وائرس کی موجودگی کی دلیل ہے ۔ مفعول کے لیے سکون کی وجہ یہ ہے کہ مبرز (Rectum) کے اندر منی کے جانے سے مبرز کی دیواروں پر چپٹے ایڈز کے وائرس کو ان کی خوراک (منی کی صورت میں) مل جاتی ہے ۔ جب تک وائرس کے لیے خوراک موجود رہتی ہے، مفعول کو چین رہتا ہے اور خوراک (مادہ منویہ) کے ختم ہوتے ہی مفعول کو ناقابلِ برداشت حد تک بے چینی ہونے لگتی ہے ۔ دراصل ان وائرس کی پیدائش و افزائش بمانز اور مادہ منویہ کے ملے جلے ردِّ عمل کا نتیجہ ہے ۔ جب یہ وائرس بہت بڑھ جاتے ہیں تو ان میں سے کچھ مراجعت کے لیے سفر کرتے ہیں اور کسی طرح جلد کے ذریعے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں! جسم کے اندر انھیں سفید خلیات کی شکل میں دوسری غذا میسّر آ جاتی ہے اور جب یہ غذا بھی ختم ہو جاتی ہے تو مریض کا کام تمام ہو جاتا ہے ۔

ہم جنسی کا بھوت

یوروپین ممالک میں خاص طور پر ہم جنسی کو جائز قرار دے دیا گیا تھا ۔ ایک عدالت کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے: "جنسی تسکین حاصل کرنے کے لیے ہم جنسی ہی کیا اگر کسی جانور سے بدفعلی کرنے سے جنسی آسودگی حاصل ہو جائے تو یہ ہمارا حق ہے اور اس حق سے کسی طور پر دست بردار نہیں ہوا جا سکتا ہے ۔" اس قول کو پڑھ لینے کے بعد ہم جنسی کے بھوت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ ہم جنسی کو فیشن کے طور پر بھی روبہ عمل لایا جا رہا ہے ۔۔۔۔۔! ایسے قانونی طور پر جائز بھی قرار دیا جا چکا تھا ۔ جائز قرار دینے کے سلسلے میں کتنی واویلا اور ہاہاکار مچی تھی؟ سب کو معلوم ہے ۔۔۔ لیکن اب مندرجہ بالا قول اور قانون دونوں کو ایڈز نے منسوخ کرا دیا ہے ۔ اس منسوخی کے باوجود آزادانہ جنسی اختلاط کی راہ میں کوئی بڑی رکاوٹ نہیں ہے ۔ اسلیے یہ آزادی "ایڈز" کا ذریعہ نہ بنے تو تعجب کی بات ہے ۔۔۔ ۔۔ پرانے زمانے سے اب تک کی وقتاً فوقتاً تحقیقات، تجربات اور امکانات کی روشنی میں یہی حقیقت پایۂ ثبوت کو پہونچی ہے کہ "ایڈز" کے وائرس خاص طور سے ہم جنسی کی پیداوار ہیں ۔

احتیاطی تدابیر

"ایڈز" سے محفوظ رہنے کے لیے سرکاری

طور پر بھی اقدامات کئے جا رہے ہیں اور نجی طور پر بھی، لیکن اس ضمن میں خاطر خواہ مشتہری اور ہوشمندی کی ابھی کمی ہے۔ ایسی صورت میں اگر کچھ احتیاطی تدابیر کی پبلسٹی کردی جائے تو یقیناً مفید ہوگا۔

تدابیر کے طور پر ہم اپنی زندگی میں چند باتوں کو اپنا لیں تو بلاشبہ "ایڈز" کی وبا سے بچا بھی جا سکتا ہے اور موت کے منہ سے نکلا بھی جا سکتا ہے۔ اور یہ تدابیر عین فطرت کے تقاضوں پر منحصر ہیں۔ آئیے دیکھیں:۔

۱۔ ہمیں ناپاکی کی حالت میں زیادہ دیر تک نہیں رہنا چاہیئے۔ یعنی خود کو گندگی سے بچانا چاہیئے ...... ہم بستری، احتلام وغیرہ فعلوں کے بعد جتنی جلد ممکن ہو سکے غسل کے ذریعے اپنے جسم اور خصوصی اعضاء کو اچھی طرح صاف کرلینا چاہیئے۔ اس پاکی اور صفائی کی حالت میں وائرس جسم کے اندر داخل نہیں ہو پاتے اور انسان ایڈز کی وبا سے بچا رہتا ہے۔

۲۔ زناکاری ہر مذہب اور سماج میں انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے۔ اس کے مرتکب کے لیے سخت ترین سزاؤں کا اہتمام بھی ہے ۔ طبی نقطۂ نگاہ سے یہ لعنت ایڈز کے وائرس کو ایک فرد سے دوسرے فرد تک منتقل کرنے کا انتہائی خطرناک کام کرتی ہے۔ لہذا ایڈز سے محفوظ رہنے کے لیے زناکاری جیسی بدفعلی سے توبہ کرنی ہوگی۔

۳۔ ناپاکی کی حالت میں دوبارہ مجامعت سے پرہیز کیا جائے۔ حیض اور نفاس کے دوران ہم بستری کو سخت ممنوع خیال کرنا چاہیئے۔ اس اصول کی خلاف ورزی کرنے والے ایڈز کے وائرس کو پیدا کرنے، بڑھانے اور پھیلانے کے ذمہ دار بنتے ہیں۔

۴۔ ہم جنسی یا اغلام بازی نہ صرف مذہباً اور سماجاً برا کام ہے، بلکہ امراض کو بڑھاوا دینے کا خطرناک ذریعہ بھی ہے۔ یہی لعنت فی الواقعی ایڈز کے وائرس کی جنم داتا اور پالن ہار ہے۔ اس لعنت سے دامن محفوظ رکھ کر خود بھی ایڈز کی وبا سے بچا جا سکتا ہے اور دوسروں کو بھی بچایا جا سکتا ہے۔

۵۔ پیشاب یا پاخانہ کرنے کے بعد مٹی کے ڈھیلے یا پانی سے اچھی طرح صفائی (استنجا) کرنے کی عادت ڈالنا خصوصاً موجودہ دور میں بیحد ضروری ہے۔ اس طرح اعضائے خاص پر وائرس کے چپکے رہنے اور جلد کے ذریعہ جسم میں داخل ہو جانے کا ڈر نہیں رہتا۔

۶۔ نشہ آور دواؤں سے اور نشیلی اشیاء سے ہر حال میں بچنا چاہیئے۔ کسی تیز اثر یا زہریلا خواص رکھنے والی دوا کا استعمال اندھا دھند اور بغیر معالج کی نگرانی کے نہیں کرنا چاہیئے ۔ آج کل طرح طرح کی نشیلی دواؤں کے عادی نوجوانوں کے لیے "ایڈز" اعلانِ موت سے کم نہیں ہے۔ لہذا نشے کے عادی افراد کو اس لعنت سے پیچھا چھڑانا ہی ہوگا۔ ورنہ وہ دیر یا سویر "ایڈز" کا نشانہ بننے کا انتظار کریں۔

۷۔ کوئی بھی شے کھانے سے پہلے ہاتھ اور منہ اچھی طرح صاف کرلینے چاہئیں۔ یہ طریقہ بھی کثافت، میل کچیل اور گندگی کے جراثیم سے محفوظ رکھتا ہے۔ جو جراثیم ہمارے ہاتھوں پر چپکے رہتے ہیں، ان کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ "ایڈز" کے وائرس سے قطعی لاتعلق ہیں۔

۸۔ اپنے جسم کی صفائی ستھرائی کے ساتھ ساتھ کپڑوں اور فرش وغیرہ کی صفائی بھی کی جانی چاہیئے۔ اپنے اردگرد کے ماحول کو بھی پاک صاف رکھنا بیحد ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ دماغی یا ذہنی صفائی بھی لازمی ہے۔ دماغ میں گندے خیالات کا جماؤ نہیں رہنا چاہیئے۔ ہر وقت دماغ صالح اور مستحسن خیالات کی آماجگاہ بنا رہنا چاہیئے۔ کیونکہ شیطانی وسوسے جنسی آسودگی کے لیے اکساتے ہیں اور جنسی پیاس غلط ذرائع کی مدد سے بھی بجھانے میں جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ حرام اور حلال کی تمیز اس شخص میں نہیں رہ پاتی جس پر جنسی بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ ایسا بھوت، ایڈز کی شکل میں بھی نمودار ہو سکتا ہے۔

۹۔ جس طرح امریکہ جیسے مالدار اور ترقی یافتہ ملک میں اس کی کثرت نے ریگن انتظامیہ کو "ایڈز" کی ہلاکت سے بچنے کے لیے کروڑوں ڈالر خرچ کرنے کی منظوری دینے پر مجبور کر دیا ہے اور جس طرح دیگر ممالک بھی اپنی استطاعت کے مطابق اس مہلک اور ہولناک مرض سے چھٹکارا پانے کی تدابیر کرنے کے لیے سرگرداں ہیں، اسی طرح بھارت سرکار کو بھی اس سلسلے کی حفاظتی تدابیر تیز کرنی چاہئیں۔

۱۰۔ یہ امرِ مسرت ہے کہ محکمۂ صحت نے بڑے پیمانے پر ریڈیو، ٹی وی اور اخباروں وغیرہ کے ذریعے اس مرض کی ہولناکی سے اور احتیاطی اقدامات سے روشناس کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومتِ ہند بھی اس مرض کے خطرناک نتائج سے بے خبر نہیں ہے۔ یقین ہے کہ رفتہ رفتہ ضرورت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق ہماری سرکار مزید بہتر اور مؤثر اقدامات کے لیے ہر وقت کوشاں رہے گی۔

وائرس کا خاتمہ:۔ "ایڈز" جیسی خبیث

(باقی صـ۱۳ پر)

نمک کی تیاری

نمک سازی کی صنعت کا فرض ہے کہ وہ خوردنی نمک کی تمام پیداوار میں ۱۹۹۰ء تک آیوڈین ملا دینے کے عظیم کام کا بیڑہ ایک چیلنج سمجھ کر اٹھائے۔ اس سلسلے میں حکومت ہند نے صنعت کی ہر ممکن مدد کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں نمک روزمرہ کے استعمال کی لازمی شے ہے۔ چنانچہ یہ ملک میں تمام جگہوں پر معقول قیمت پر دستیاب ہونا چاہیئے۔ نمک پر سے ایکسائز ڈیوٹی ہٹا لینے کا مقصد ہی یہ تھا کہ یہ لازمی شے ملک میں سب جگہ کم قیمت پر مل سکے۔ نمک کو دور دراز علاقوں تک ریل ہی پہنچاتی ہے اور اگر ریل کے نظام میں کوئی گڑبڑ ہو جائے تو دیکھنے میں آیا ہے کہ نمک کی پھٹکل قیمت فروخت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ خصوصاً دور دراز کے اور دشوار گذار علاقوں میں۔ آجکل ریلیں ہر سال پہلے سے زیادہ نمک ڈھو رہی ہیں۔ اس کے باوجود بعض اوقات شکایت رہتی ہے کہ دور دراز واقع علاقوں میں نمک کمیاب ہو جاتا ہے۔ اس خامی کو دور کرنے کے لیے محکمۂ ریل نے تجویز کیا ہے کہ اگر نمک ساز اور تاجران نمک تھوک کے آرڈر بک کیا کریں تو مال گاڑیاں اس ڈھنگ سے ترتیب دی جاسکیں گی کہ ان کی ضرورت کا تمام نمک ڈھو کر ایک یا دو مرکزوں تک پہنچا دیا جائے۔ اسی طرح نمک کی نقل و حمل کو بہتر بنایا جا سکے گا۔ محکمۂ ریل نے یہ بھی تجویز کیا تھا کہ نمک ساز، تاجر، مقامی نمائندے یا ریاستی سرکاریں اہم مقامات پر نمک کے گودام تیار کریں تاکہ وہاں ہر دم نمک کا ذخیرہ موجود رہے جو بوقت ضرورت کام آسکے۔

ملک کو تقریباً ۸ لاکھ ٹن نمک ایسا چاہیئے جسے گلھڑ والے علاقوں میں بھیجا اور تقسیم کیا جا سکے۔ آیوڈین ملانے کے لیے نمک عمدہ قسم کا اور ہر قسم کی آلائش سے پاک و صاف ہونا ضروری ہوتا ہے تاکہ اس میں شامل آیوڈین، ذخیرہ کرنے اور نقل و حمل کے دوران ضائع نہ ہو جائے۔

ملک میں نمک حاصل کرنے کے لیے قدرتی وسائل ہیں۔ ۱۔ سمندری پانی جسے سکھا کر گجرات، تامل ناڈو، آندھرا پردیش اور مہاراشٹر، اڑیسہ، مغربی بنگال اور کرناٹک میں نمک تیار کیا جاتا ہے، ۲۔ زمین کے اندر کا کھاری پانی جو تامل ناڈو، راجستھان میں دستیاب ہوتا ہے اور نمک کی چٹانیں جو ہماچل پردیش میں واقع ہیں۔ راجستھان میں سانبھر کی جھیل کا پانی سکھا کر بھی نمک حاصل کیا جاتا ہے اور سانبھر نمک کہلاتا ہے۔ چھ کیلوگرام نمک فی کس سالانہ کی ضرورت کی بنا پر انسان کے کھانے کے لیے ۱۹۸۶ء میں ۲۸،۵۴ لاکھ ٹن اور ۱۹۸۷ء میں ۴۱،۶۴ لاکھ ٹن سالانہ درکار ہوگا۔

گلھڑ کا خطرہ دلی تک بھی آن پہنچا ہے "ایمٹی ادویات اور متعلقہ علوم کے انسٹی ٹیوٹ" نے کہہ دیا ہے کہ دلی میں گلھڑ کا مرض پھیلتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں انسٹی ٹیوٹ پانچ سال تک سروے کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ دلی کے ۳۰ فیصدی اسکولی بچے اس مرض میں مبتلا ہیں جس کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر پچھڑ جائیں یا ان کے دماغ کو نقصان پہنچے۔ اس لیے بہتر ہو کہ دلی نظامت اس نتیجہ پر دھیان دیتے ہوئے دلی کو ایسا علاقہ قرار دے دے جہاں گلھڑ کا مرض بڑھ رہا ہے اور دلی ہی کیوں، باقی ریاستوں کو بھی بروقت ہوشیار ہو جانا چاہیئے۔

اگر دلی میں یہ مرض تیس فیصدی بچوں کو لاحق ہو سکتا ہے تو ملک کے دوسرے علاقوں کا کیا حال ہوگا۔ خصوصاً ان علاقوں کا جہاں یہ مرض پھیلا ہوا ہے۔ ان میں پنجاب اتر پردیش، بہار، مغربی بنگال، آسام، مہاراشٹر مدھیہ پردیش، گجرات، جموں و کشمیر کے بعض علاقے اور سارے کا سارا شمال مشرقی ہندوستان شامل ہے۔ یہ بیماری ۱۲ کروڑ نفوس پر محیط ہے۔ اتنے وسیع علاقے پر اس بیماری کا مسلط ہونا اس لیے اور بھی زیادہ شرمناک ہے کہ اس کا علاج آسان ہے یعنی آیوڈین ملا ہوا نمک استعمال کرنا۔ انسٹی ٹیوٹ کی یہ سفارش کوئی نئی نہیں کہ گلھڑ والے علاقوں میں آیوڈین ملے نمک کی فروخت قانوناً لازمی قرار دے دی جائے۔ اس سفارش کو فوراً عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے۔ نمک میں آیوڈین شامل کرنے کی لاگت صرف ۴ پیسے فی کیلوگرام بیٹھتی ہے لیکن سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ملک میں آیوڈین ملانے کے کارخانے صرف تیرہ ہیں اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کارخانوں کی تعداد بڑھ جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس خوفناک مرض کا قلع قمع کرنے کی زبردست مہم چلائی جانی چاہیئے۔ بعض قسم کی کیمیاوی کھادوں کے استعمال کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیئے۔ ان سے گلھڑ کا مرض بڑھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہی حال پھول گوبھی، بند گوبھی اور بھنڈی، توری کا ہے اور عوام کو بتایا جانا چاہیئے کہ ان سبزیوں کا استعمال کم کر دیں۔ ●

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi.

Vol. 6 No. 13 & 14 YOJANA (URDU) 1-31 October 1986

دیہی علاقوں میں ایندھن کی لکڑی کی کمی جنگلات کے روبہ تنزل ہونے کی وجہ ہے، مانگ اور سپلائی کے درمیان ۳ کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن کا فرق ہے جو کہ اس صدی کے خاتمے تک بڑھ کر ۱۳ کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن ہو جائے گا۔ معمولی عمارتی لکڑی اور ایندھن کی لکڑی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے تمام بنجر گھٹیا اور نیم گھٹیا زمین پر درخت اگانے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے، اس کے لیے مختلف بڑے بڑے پراجیکٹوں کی تیاری عمل میں آئی ہے۔ اور جنگل بانی کا نظریہ ملک بھر میں پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ چوں کہ زراعتی ملک ہے، لہٰذا معیشت حیوانات کے لیے جنگل بانی کے مختلف نظاموں کو فروغ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے، جنگل بانی کے پروگراموں میں مصروف مختلف اداروں کو اس کام کو سنجیدگی اور [illegible] آگے بڑھانا ہوگا۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ملک میں صرف کل ۱۰٫۹ فیصد علاقہ حقیقتاً گھنے جنگلوں کے تحت آتا ہے جب کہ ملک کی ۲۲٫۷ فیصد اراضی پر جنگل کے لیے اعلان کیا گیا ہے۔ گزشتہ چند دہوں میں جس رفتار سے جنگلوں میں کمی واقع ہوئی ہے اس سے بھارت کو بڑی تشویش ہے۔ جنگلات کا ایک وسیع حصہ تشویشناک حالت میں ہے اور گزشتہ تین دہوں میں جنگلات کا ایک بڑا حصہ غیر جنگلاتی مقصد کے لیے تبدیل کر دیا گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خشک سالی اور سیلابوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زرعی آبی ذخیرے اور اس سلسلے میں تدارکی اقدامات کی کمی ہے۔ زیادہ تیزی سے مٹی اور ریت سے بھر رہے ہیں۔ پہاڑوں کی معیشت حیوانات کا نازک نظام زبردست دباؤ میں ہے۔

حصولِ آزادی کے بعد کافی عرصے سے ہم سائنسی انتظامیہ کو بروئے کار لا رہے ہیں لیکن مسلسل روبہ تنزل صورتِ حال کو بدلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس مسئلے پر پھر سے بڑی سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔ ملک کے مختلف حصّوں میں جنگلات کی معیشت کا نظام جن بدعتوں کا شکار ہے ان کا علاج قلیل المدتی تدبیر نہیں ہو سکتی جبکہ اس کے لیے جنگلات کا حقیقی لائحہ عمل بنانا ہوگا اور اس کے طویل المدتی حل تلاش کرنے ہوں گے۔

آبادی کی مادی ضروریات پوری کرنے کے لیے جنگلات خام مال کے خزانے ہیں، عمارتی لکڑی، پلائی ووڈ، ریشہ دار بورڈ وغیرہ بھی ضروریات جنگلات سے پوری ہوتی ہیں۔ بھارت میں صنعتی لکڑی کی مانگ اور سپلائی کے درمیان ایک کروڑ ۲۰ لاکھ مکعب میٹر کا سالانہ فرق ہے اور یہ فرق اس صدی کے آخر تک ۲۰ کروڑ ۴۰ لاکھ سے بڑھ کر ۴ کروڑ ۱۰ لاکھ مکعب میٹر تک ہو جائے گا۔ فائدہ بخش جنگلات کو مناسب و موزوں ٹکنالوجی کے استعمال کے ذریعے مزید پیداواری بنانا ہوگا۔

ملک کی دیہی عورتیں اور نوجوان سماجی جنگل بانی کے پیغام کو زیادہ تیزی سے پھیلانے میں حصہ لے سکتے ہیں۔ غیر روایتی توانائی کے ذرائع مثلاً شمسی توانائی اور بائیو گیس کو مقبول بنانے ایندھن کی لکڑی کے متبادل تلاش کرنے اور مالی طور پر ان کی امداد کرنے کی ضرورت ہے خصوصاً دیہی اور نیم شہری علاقوں میں مٹی کے تیل اور گھریلو گیس کی پرچون دکانیں کھولنے کے سلسلے میں نرم پالیسی جنگلات کی سرحدوں کو استحکام بخشنے کی طرف ایک مثبت قدم ہوگا۔

متبادل ذرائع کو استعمال کرنے والوں کو تربیت دینے اور انھیں اس بات کا احساس کرانے کی ضرورت ہے کہ سبزہ زاروں کا ضرورت سے زیادہ استعمال بالآخر ان کے لیے نقصان دہ ہوگا

(باقی صفحہ ۲۵ پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.

نثار احمد زکی

فلمیں سماج کو کدھر لے جائیں گی؟

سماجی، ثقافتی، سائنسی تکنیکی ترقی کے دور میں سماج اور معاشرے پر فلم بینی کے اثرات کو کسی طرح کم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ یہ مسلم حقیقت ہے کہ جدید معاشرتی زندگی کے لیے فلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن لازمی ضرورت بن چکے ہیں۔

کسی ملک کی تیز رفتار ترقی کا پتہ اس کے ذرائع ابلاغ سے بھی چل جاتا ہے۔ چونکہ یہ ذرائع ابلاغ گھر بیٹھے ہی دنیا کے احوال و کوائف ناظرین و سامعین تک پہونچا دیتے ہیں۔ اس لیے ان میں زبردست کشش پیدا ہو چکی ہے ان کی علمی اور تعلیمی افادیت گھٹ گئی ہے۔ لیکن تفریحی اور عیش و عشرت کا پہلو نمایاں ہو کر ابھرا ہے۔ اسی کے نتیجہ میں ترقی یافتہ قوموں میں اخلاق و جنسی بے راہ روی اور مجرمانہ دہشت گردی و انتہا پسندی پر مبنی سرگرمی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ان اقوام میں معاشرتی رشتہ داریوں کا احترام اور چلن دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ کھلے عام جنسی اختلاط ترقی پسندی کی علامت بن چکا ہے۔

ہم مشرقی قوموں کے لیے بہر حال یہ اطلاع اب بھی رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہے کہ یوروپی امیر ملکوں اور نام نہاد ترقی یافتہ اقوام کی دوشیزاؤں اور نوجوان لڑکیوں میں "بن شادی" کے ماں بننے کا شیطانی شوق چرّایا ہے۔ اس شرمناک "ہابی" نے یورپ امریکہ اور یوروپی سوسائٹی کے استحکام کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ سماج میں تشنگی اور روحانی کرب بڑھتا جا رہا ہے۔ اس گھٹتے ہوئے ماحول سے نکل کر یہ دوسرے ملکوں میں پہونچ کر "برہنگی" یعنی ہپّی ازم کی زندگی گزارنی شروع کر دیتے ہیں۔

ہندوستان روحانی قدروں پر چل کر انسانی زندگی کے لیے منزل فلاح حاصل کرنے والا ملک ہے۔ ہماری اقدار و روایات میں احترام آدمیت اور تکریم انسانیت کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔ ہم ایک پاکیزہ معاشرتی زندگی کے حامل ہیں۔ ماں باپ، بہن بھائی، باپ بیٹی اور دیگر عزیزوں اور رشتہ داروں کے مابین دینی اور مذہبی تقدس اور پاکیزگی کا مضبوط بندھن ہے۔ ان رشتوں کو صرف موت ہی ہم سے چھین سکتی ہے۔ ہمارے نزدیک اس معاشرتی نظام میں جو فرائض منصبی ہیں ان میں ماں جیسی بے نظیر مقدس اور انمول ہستی کے پاؤں کے نیچے جنت اور باپ کے سایہ میں خالق کائنات کی رحمت ہے۔ بہن کی خاطر ہنستے ہنستے جان پر کھیل جانا شانِ مردانگی ہے۔ ایسی مقدس اور پاکیزہ معاشرت میں جب کوئی چیز چپکے سے دراندازی کر کے اس کے ملکوتی حسن کو داغدار بنانے کی کوشش کرے تو کیا ہمارا خاموش رہ جانا بھیانک بھول نہیں ہے۔

آج جن موضوعات کو لے کر محض نقرئی سکوں کی جمع خوری کے لیے جو فلمیں بنائی جا رہی ہیں وہ ہمارے سماجی نظام کے لیے خطرناک ثابت ہو رہی ہیں۔ یہ فلمیں سماجی تعمیر و ترقی کے بجائے سوسائٹی کی عمارت کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہیں۔

(باقی کور صـ۳ پر)

• منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : سید ظفیر الحسن
ایڈیٹر : جگندر سنگھ
اسسٹنٹ ایڈیٹر : محمد عادل صدیقی

جلد ۶ | یکم تا ۳۰ نومبر ۱۹۸۶ء | شمارہ ۱۵، ۱۶

قیمت : دو روپے | فون نمبر: ۶۰۱۸۱۸ | ۱۰ کارتک تا ۹ اگرہائن شک ۱۹۰۸

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں رہے۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :-
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین)
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶
اسسٹنٹ ڈائرکٹر پروڈکشن :- آر۔ ایس۔ منچال
ترسیل زر کا پتہ :- بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

خواتین — ملک کا

بیش قیمت اثاثہ

ہندوستان میں قدیم زمانے میں عورتیں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں، کچھ ہندی کتابوں میں تو یہاں تک درج ہے کہ جس سرزمین پر عورتوں کی پرستش ہوتی ہے، وہ دیوتاؤں کی سرزمین ہے۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ عورتوں کی قدر و منزلت میں کمی آتی رہی، ازمنۂ وسطیٰ میں عورتوں کی قدر و منزلت اس درجے میں نہ رہی جس کی وہ مستحق تھیں۔ یہ صورتِ حال بہت دنوں تک چلتی رہی، البتہ اُس دور میں بھی کہیں کہیں عورتیں بڑے بڑے منصب سنبھالے ہوئے تھیں۔

گذشتہ سو برسوں میں صورتِ حال یکسر بدل گئی، ہندوستان میں چند سماجی مصلح پیدا ہوئے مثلاً سوامی دویکانند، راجہ رام موہن رائے اور مہاتما گاندھی، ان سبھوں نے عورتوں کو سماج میں مناسب مرتبہ دلانے کے لیے بھرپور کوشش کی۔ ہندوستان کی خواتین نے ملک کی جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، انگریزی حکومت کا مقابلہ کرنے کے لیے انھیں قربانیاں دینی پڑیں، انھوں نے مردوں کے دوش بدوش کام کیا، ہندوستان کی آزادی کے معمار مہاتما گاندھی عورتوں کی قدر و منزلت اور اہمیت پر زور دیتے رہے، اُن کی آواز پر سینکڑوں عورتوں نے گھر کو خیرباد کہا، اور آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ ہندوستان آزاد ہوا اور ۱۹۵۰ء میں ہندوستانی آئین نافذ ہوا، چنانچہ ہندوستانی نظریات اور روایات کا احترام کرتے ہوئے آئین میں عورتوں کو مردوں کے مساوی رتبہ دیا گیا۔ ہندوستان کے آئین کی تمہید میں مذکور ہے کہ وہ اپنے تمام شہریوں کے لیے انصاف، آزادی اور مساوات کو یقینی بنائے گا۔ یہ دستاویز کہتی ہے کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ اور مذہب، رنگ و نسل، ذات پات، جائے پیدائش یا جنس کی بنیاد پر کسی طرح کا کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ ریاستی پالیسی کے رہنمایانہ اصولوں میں مذکور ہے کہ عورتوں اور مردوں کے لیے روزی، روزگار کے وافر ذرائع کے حق کو یقینی بنانا ریاست کا فرض بنتا ہے، اس میں مردوں اور عورتوں نیز بچوں کی صحت اور قوت کے تحفظ پر بھی زور دیا گیا ہے۔ بچوں سے ایسے کام لینے کو ممنوع قرار دیا گیا جو ان کی صحت کے لیے مُضر ہوں۔ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ عورتوں کیلئے کام کے دوران ایسے حالات فراہم کرنے ہوں گے جو اُن کی صحت کو نقصان نہ پہنچائیں نیز ان کو زچگی کے سلسلے کی تمام راحتیں دی جائیں گی۔ حصولِ آزادی کے بعد عورتوں کے حالاتِ کار بہتر بنانے کے سلسلے کے متعدد قوانین بھی وضع کئے جا چکے ہیں تاکہ آئین میں مندرج باتوں کی روح مجروح نہ ہونے پائے۔ چنانچہ ۱۹۷۶ء میں عورتوں کی اُجرتوں کو مردوں کے مساوی لانے اور اس امر کو یقینی بنانے کے لیے ایک قانون بنا دیا گیا۔ اس طرح سے عورتوں کو مساوی اُجرت دے کر ان کے ساتھ کئے جانے والے امتیاز کو ختم کر دیا گیا۔ اس سے قبل ۱۹۶۱ء میں زچہ بچہ کے تحفظ سے متعلق ایکٹ بنایا گیا جس کی رو سے خاتون کارکنوں کیلئے ۱۲ ہفتے کی چھٹی پوری تنخواہ کے ساتھ دینے کی بات کہی گئی، حصولِ آزادی کے فوراً بعد ۱۹۴۸ء میں فیکٹریز ایکٹ، ۱۹۵۱ء میں چائے، ربڑ وغیرہ کے باغات میں کام کرنے والے مزدوروں کے تحفظ کا ایکٹ، ۱۹۵۲ء میں کان کنی میں مصروف محنت کش طبقے کے تحفظ کا ایکٹ بنایا گیا۔ ان تمام قوانین میں ان شعبوں میں کام کرنے والے خواتین کی بہبود اور تحفظ کو یقینی بنایا گیا۔ فیکٹریز ایکٹ کی رُو سے ہر اُس فیکٹری کیلئے جہاں ۳۰ سے زیادہ عورتیں کام کرتی ہوں، ان کے ۶ سال سے کم عمر بچوں کے لیے پرورش گاہیں قائم کرنا ضروری ہے۔ اب عورتیں اپنی صحت کے تحفظ کی خاطر طبی، سماجی، اقتصادی یا نفسیاتی اسباب کی بنیاد پر شوہر کی مرضی کے بغیر اسقاطِ حمل کرا سکتی ہیں۔ ان تمام قوانین کا مقصد عورتوں کی اقتصادی حالت بہتر بنانا ہے، ان کے علاوہ ایسے بہت سے قوانین بھی وضع کئے گئے ہیں جن سے عورتوں کو سماجی انصاف یقینی طور پر دلایا جا سکے۔ اس سلسلے میں فیملی کورٹس ایکٹ ۱۹۸۴ء قابلِ ذکر ہے۔ اسکی رُو سے ایسے فیملی کورٹس قائم کئے جائیں گے جو شادی بیاہ کے مسائل، بچوں کی تولیت کے مسائل وغیرہ طے کریں گے۔ اب ۱۸ سال سے کم عمر لڑکیوں کی شادی ممنوع ہے۔ انسدادِ جہیز کا قانون مجریہ ۱۹۶۱ء لڑکے اور اس کے والدین کو لڑکی یا اسکے والدین سے نقد یا جنس میں اشیاء کا طلب کرنا ممنوع قرار دیتا ہے۔ گذشتہ دس برسوں میں ہندوستان میں عورتوں کی بہبود سے متعلق مختلف اقدامات کئے گئے تاکہ وہ سماج میں اپنا موثر رول ادا کر سکے۔ اس طرح سے عورتوں کو تعلیم، صحت، قانونی اصلاحات اور سیاسی حقوق وغیرہ کے ذریعے سے سماج کا موثر رکن بنانے کی کوشش کی گئی۔ آج ہندوستان اس بات پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے کہ یہاں دفاعی خدمات کی چند شاخوں کو چھوڑکر، عورتوں کی بہبود کو ملک کی منصوبہ بندی کا جزو لازم بنا دیا گیا ہے۔

حال ہی میں خاندانی بہبود کے پروگراموں کو عورتوں اور بچوں کی مربوط ترقی کے پروگرام کے طور پر تیزی سے آگے بڑھانے پر زور ہے۔ ملک میں خاندانی بہبود کے پروگراموں کا دائرہ کافی پھیلا ہوا ہے۔ ساتویں منصوبے میں اسے اور تیزی سے آگے بڑھانے کا پروگرام ہے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ عورتوں کی خواندگی کی شرح بڑھ رہی ہے۔ یہ کام رسمی اور غیر رسمی تعلیم کے ذریعے انجام دیا جا رہا ہے۔

(ایڈیٹر)

ڈاکٹر مسعود جعفری

تجربہ گاہ سے کھیت تک

ایک زراعتی اور معاشی ترقیاتی پروگرام

"ملک میں سائنس کی طلب دیہی ہندوستان ہونا چاہیئے"۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے سائنس اکادمی کی گولڈن جوبلی کی افتتاحی تقریر میں ان الفاظ کے ساتھ ملک کے سائنسدانوں کی توجہ سماج کی ضرورتوں اور قومی مسائل کو جلد از جلد حل کرنے پر دلائی تھی چونکہ ملک کی آبادی کا زیادہ حصہ دیہی علاقوں میں آباد ہے اور سماجی و معاشی اعتبار سے یہاں کے لوگ زیادہ پسماندہ ہیں لہذا ہماری توجہ قدرتی طور پر انھیں کے مسائل کو حل کرنے میں ہونی چاہیئے۔ یہ بات باعث فخر ہے کہ نوجوان اور معمر تجربہ کار سائنسدان اس منصوبے کے تحت جدوجہد کر رہے ہیں۔ ملک کی زرعی تحقیقی کونسل بھارتی کرشی انوسندھان پریشد۔

(Indian Council of Agricultural Research)

(آئی۔ سی۔ اے۔ آر) نے ۱۹۷۹ء میں اپنی گولڈن جوبلی کے موقع پر ایک دیہی ترقیاتی منصوبہ قومی سطح پر "تجربہ گاہ سے کھیت تک" (Lab to land) شروع کیا ہے۔ اس سلسلے میں جنوری ۱۹۷۹ء میں حیدرآباد میں ایک مشورہ کمیٹی منعقد ہوئی تھی۔ اس میں جو لائحہ عمل بنایا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

۱۔ ملک کے مختلف علاقوں سے پچاس ہزار چھوٹے کاشتکاروں اور معاشی اعتبار سے پسماندہ مزدور خاندانوں کا انتخاب ملک کے مختلف تحقیقی اداروں کے زیر نگرانی عمل میں لایا جائے۔

۲۔ اس پروگرام میں آئی۔ سی۔ اے۔ آر کے ماتحت تحقیقی ادارے و توسیعی و ترقیاتی محکمہ جات و مراکز جو جدید زرعی و تکنیکی جانکاری کے حصول میں منہمک ہوں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

۳۔ زرعی تحقیقی ادارے اور مختلف توسیعی اور ترقیاتی محکمہ جات دیہی علاقوں سے ایسے زراعت پیشہ خاندانوں کی تعداد مقرر کریں جن کو وہ اپنی جدید تکنیک سے مستفید کر سکتے ہوں۔ ایسے سبھی اداروں اور محکموں کو تکنیکل اور توسیعی مراکز تصور کیا جائے گا۔

۴۔ ایک طرف تو ملک کی زرعی یونیورسٹیاں ان کے ماتحت علاقائی مراکز خصوصی طور پر اس پروگرام میں سرگرم حصہ لیں گے اور دوسری طرف کچھ چیدہ خود امدادی ادارے اور زرعی کالج بھی پروگرام میں شرکت کے لیے مدعو کئے جائیں۔

۵۔ پروگرام کے تحت زرعی یونیورسٹیاں اور بھارتی کرشی انوسندھان پریشد کے تحت تحقیقی تجربہ گاہیں ان سبھی خود امدادی اداروں کو زرعی اور تکنیکی مشورہ دیں گی جو اس پروگرام سے مربوط ہیں۔

۶۔ دیہی خاندانوں کے انتخاب میں انھیں دیگر ذرائع سے ملنے والی ریاستی امداد کا لحاظ رکھا جائے گا۔

۷۔ اس قومی پروگرام کو موثر و متحرک بنانے کے لیے ملک کی زرعی یونیورسٹیاں اور بھارتی کرشی انوسندھان پریشد کے ماتحت

سبھی تحقیقی ادارے آپس میں ارتباط قائم رہیں گے۔

پروگرام کا آغاز:

پروگرام کی شروعات ۱۹۷۹ء کے وسط میں ہوئی۔ تقریباً پچاس ہزار معاشی لحاظ سے کمزور کاشتکاروں اور پسماندہ بے زمین مزدوروں کے گھرانوں کو منتخب کیا گیا۔ خصوصاً غریب، ہریجن، آدی واسی اور پسماندہ طبقے کے گھرانوں کا لحاظ رکھا گیا۔ تاکہ انھیں جدید زرعی اور تکنیکی مشورہ دے کر ان کے پیشے کو فروغ دیا جا سکے۔ اس طرح انھیں اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کا موقع فراہم ہوگا اور وہ سماجی و معاشی اعتبار سے خوشحال بن سکیں گے۔ اس منصوبہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ملک کے زرعی سائنسدانوں اور مختلف ماہروں کو پہلی بار ان پچاس ہزار پسماندہ گھرانوں سے ربط کا موقع فراہم ہوگا۔ اور یہ سائنسداں اور ماہرین ان خاندانوں کی دقتوں اور پریشانیوں کے بارے میں واقفیت حاصل کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے سائنسدانوں کو اپنے تحقیقی کاموں کو بامقصد بنانے میں مدد ملے گی۔ توسیعی اور ترقیاتی راہوں میں جو رکاوٹیں حائل ہیں ان کے بارے میں پتہ لگا کر تحقیقی کاموں کو نیا رُخ دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ملک کے پسماندہ لوگوں کی امداد کے ساتھ ساتھ ملکی ترقی کو پیش رفت ملے گی۔

۱۹۷۹ء میں یہ پروگرام صرف ایک سال کے لیے شروع کیا گیا تھا۔ لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر اس میں دو سال کے لیے توسیع کر دی گئی اور یہ پروگرام ۱۹۸۲ء تک چلتا رہا۔ دوسرا دور ۱۹۸۲ء سے شروع ہوا اور اس بار پچھتر ہزار نئے خاندانوں کے لیے کام شروع کیا گیا اور اس وقت ایک سو بیالیس تکنیکل مراکز کے ذریعے سارے ملک میں یہ پروگرام پھیلا ہوا ہے۔

پروگرام کے اُصول وضوابط

پروگرام کے تحت سب سے پہلے منتخب خاندانوں کی سماجی و معاشی حالت کا اچھی طرح مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ان کے زرعی وسائل کے پیشِ نظر ایک جامع پروگرام مرتب کرتے ہیں — کاشتکاروں کے ساتھ ساتھ دیگر چھوٹے موٹے کام دھندے جیسے مچھلی پالنا۔ مرغ بانی۔ گلہ بانی (جس میں دودھ دینے والے جانوروں کے علاوہ سور بھی شامل ہیں)۔ اور مگس بانی (شہد کی مکھیوں کا پالنا) وغیرہ کی ترغیب دی جاتی ہے۔ تاکہ وہ ان پیشوں کے ذریعہ اپنی آمدنی میں اضافہ کر سکیں۔ پروگرام میں پیش رفت لانے کے لیے ان پسماندہ خاندانوں کو نفع بخش ہُنر یا دستکاری کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ اس کے بعد انھیں مالی امداد کی شکل میں فی خاندان پانچ سو روپے کی رقم تقسیم ہوتی ہے۔ یہ رقم بھی انھیں غریب کاشتکاروں کے لیے مخصوص ہے جو اپنے محدود ذرائع سے اپنے ہُنر اور دستکاری کو بغیر مالی امداد ترقی نہیں دے سکتے۔ منتخب خاندانوں کے ہُنر یا دست کاری کا جائزہ لے کر صرف ایسے ہُنر اور دستکاروں کو فروغ دیا جاتا ہے جس میں مالی امداد کی ضرورت ہے۔ اصولی طور ہر ایک خاندان کے لیے صرف ایک ہی ہُنر یا دستکاری کو منتخب کرتے ہیں۔

تنظیم کا خاکہ

اس پروگرام کو مؤثر و متحرک بنانے کے لیے اسے تین سطح پر منظم کیا گیا ہے۔ بھارتی کرشی انوسندھان پریشد کے مرکزی دفتر میں ایک جگہ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل اور دوسری اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل کی مقرر کی گئی ہے۔ پورے دیش کو آٹھ منطقات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر ایک منطقہ میں ایک رابطہ آفیسر (Coordinator) اور دو پروگرام آفیسر مقرر ہوتے ہیں۔ رابطہ آفیسر کا رتبہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے برابر ہے۔ مختلف تکنیکی جانکاری کے لیے تکنیکی مراکز میں پروگرام آفیسران کا انتخاب مقامی سائنسدانوں میں سے کیا جاتا ہے اور انھیں سائنسی مشورہ کمیٹی کا نمائندہ تصور کرتے ہیں۔ قومی سطح پر پروگرام کی مشورہ کمیٹی کے صدر بھارتی کرشی انوسندھان پریشد کے ڈائریکٹر جنرل ہیں اور منطقاتی رابطہ آفیسران اس کمیٹی کے ممبران ہیں۔ کمیٹی سال میں دو بار اپنی نشست کا انعقاد کرتی ہے اور پروگرام کا مطالعہ کر کے آئندہ کے لیے لائحہ عمل تیار کرتی ہے۔ منطقاتی سطح پر مشیروں اور صلاح کاروں کی بھی ایک کمیٹی ہے جس کے صدر زرعی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور اس کے ممبران منطقاتی رابطہ آفیسران ہیں۔ یہ کمیٹی سال میں کئی بار اپنی نشست کا تعین کر کے پروگرام کے خاکے کو قطعی شکل دیتی ہے۔

ترقی کی پہلی منزل
کامیابی کی جھلکیاں

پہلے دو سال میں تقریباً تین ہزار تین سو مواضعات میں سینتالیس ہزار زراعت پیشہ خاندانوں کا انتخاب چھیاسی تکنیکی مراکز کے ذریعے عمل میں آیا۔ اس پروگرام میں بھارتی کرشی انوسندھان پریشد کے چونتیس ماتحت تحقیقی اداروں، اکیس زرعی یونیورسٹی اور چونتیس زرعی کالجوں اور مختلف ریاستوں کے

بلاک ڈیولپمنٹ نے حصہ لیا۔ پروگرام کے مطابق کل رقم ۱۹۵۰ ہزار سالانہ فی سیکٹر کے حساب سے منتخب کاشتکاروں میں خرچ کرنے کے لیے مقرر ہوئی۔ مالی امداد کے علاوہ دوسری مدوں میں صرف ہونے والی رقم بھی اس میں شامل ہے۔ جیسے زرعی میلہ اور کاشتکاروں کی ٹریننگ وغیرہ۔ منتخب خاندانوں کا علیحدہ علیحدہ ترقیاتی پروگرام مرتب کیا گیا جو کہ ان کی حیثیت کے مطابق تھا۔ مختلف ریاستوں میں ان خاندانوں کی تعداد حسب ذیل تھی۔

نام ریاست	پسماندہ خاندانوں کی تعداد
۱۔ اُترپردیش	۴۸۶۲
۲۔ آندھرا پردیش	۶۹۴۰
۳۔ تامل ناڈو	۴۲۰۳
۴۔ گجرات	۴۵۲۵
۵۔ مدھیہ پردیش	۳۵۷۷

باقی مرکزی حکومت کے ماتحت ریاستوں میں پھیلے تھے۔ ان خاندانوں کی ۷۲ فیصد تعداد زرعی یونیورسٹی کے ذریعے ۱۹ فیصد تعداد بھارتی کرشی انوسندھان پریشد کے تحقیقی اداروں کے ذریعہ اور صرف ۹ فیصد خود امدادی تنظیموں کے ذریعے منتخب ہوئی تھی۔ ان کاشتکار خاندانوں کی درجہ بندی بلحاظ زراعتی رقبہ اس طرح تھی:۔

۱۔ ۵ء۰ سے ۵ء۱ ہیکٹیئر زراعتی رقبہ والے خاندان = ۶۱ء۷۱ فیصد۔

۲۔ ۵ء۱ سے ۰ء۳ ہیکٹیئر زراعتی رقبہ والے خاندان = ۲۱ء۰ فیصد۔

۳۔ ۰ء۳ ہیکٹیئر سے زیادہ زراعتی رقبہ والے خاندان = ۸ء۰ فیصد۔

۴۔ بے زمین خاندان = ۰ء۱ فیصد۔

زراعت سے متعلق تکنیکی تربیت سب سے زیادہ منتخب خاندانوں کو ملی اور یہ تعداد تقریباً ۱۱ فیصد تھی۔ اس کے علاوہ گلہ بانی۔ ماہی گیری (مچھلی پالن)، مرغبانی اور مگس بانی (شہد کی مکھیاں پالنا) وغیرہ جیسے پیشوں کی تربیت بھی دی گئی تاکہ ان کے ذریعے غریب خاندانوں کی آمدنی میں اضافہ ہوسکے۔ بے زمین مزدوروں کو گلہ بانی سے مالی راحت ملی اور ان کی معاشی و اقتصادی حالت سدھارنے میں حوصلہ افزا کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

پروگرام کی مقبولیت اور عوامی دلچسپی کے لیے مختلف جگہوں پر منطقاتی تقریبات جیسے زرعی نمائش اور کسانی میلہ وغیرہ منعقد کی گئیں۔ ان کی تفصیل اس طرح ہے۔

چھیتر دوس (منطقاتی دن) = ۲۳۲۹۔

کسان میلہ = ۱۰۰۷۔

نمائش = ۵۱۶۔

اشاعتی پندرھواڑہ = ۱۳۰۲۔ اور تقریباً ۲۵۳ مختلف اشاعتی تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔ اس پروگرام کے تحت مختلف ماہرین و دیگر افراد کو بھی تربیت دی گئی جن کے اعداد یہ ہیں:۔

سائنس داں : ۱۵۵۰

تکنیکی ماہرین : ۳۷۸۵

پرسار آفیسران : ۵۷۷۹

اس کے علاوہ ۱۰۶۱۰۹ کسانوں ۲۱۶۹۸ خواتین اور ۱۶۱۳۹ نوجوانوں کو کاروباری تربیت بھی دی گئی۔ تقریباً ۴۹۸۹۹ خواندہ کسانی خاندانوں کو اشاعتی پمفلٹ و رسالے تقسیم کئے گئے۔ اس سلسلے میں بھارتی کرشی انوسندھان پریشد نے ۰۵ء۴ کروڑ روپے مالی امداد کے طور پر پروگرام کو چلانے والے اداروں کو دئے منطقاتی سطح پر جو کام ہوا ہے اسکی جھلکیاں مختصراً درج ذیل ہیں:۔

منطقہ نمبر ۱۔ اس میں پنجاب، ہریانہ، دلی، ہماچل پردیش اور جموں وکشمیر شامل ہیں۔ یہاں فصلوں کی پیداوار میں اضافہ کرنے پر زور دیا گیا۔ نیلی سبز کائی (Blue green Algae) کھیتوں میں لگائی گئی اور لیگیوم کلچر (Legume Culture) (دلہ دالوں والی فصل کے بیکٹیریا) کے فروغ کے ذریعہ تقریباً ۲۵۰ کاشتکاروں نے استفادہ حاصل کیا۔

منطقہ نمبر ۲۔ اس میں مغربی بنگال، اڑیسہ انڈمان نکوبار شامل ہیں۔ یہاں پروگرام اور زرعی تکنیک کی نشر و اشاعت کئی طریقوں سے کی گئی۔ اڑیسہ میں ۱۱ منتخب خاندانوں نے اوسطاً ۴۳ کوئنٹل فی ہیکٹیئر "جیا" قسم کے دھان کی پیداوار حاصل کی۔ مغربی بنگال میں بہت سے کسانوں نے پروگرام کے مطابق عمل کرکے اوسطاً ۳۰ سے ۴۰ کوئنٹل فی ہیکٹیئر گیہوں کی پیداوار حاصل کی۔ جبکہ دوسرے کسانوں کے یہاں صرف ۲۰ سے ۲۵ کوئنٹل فی ہیکٹیئر پیداوار ملی دوسری طرف پٹ سن (جوٹ) کی پالی جتم کی پیداوار ۲۰ سے ۲۵ کوئنٹل فی ہیکٹیئر حاصل ہوئی

اڑیسہ میں کٹک کے مضافاتی گاؤں میں دھان
کی پیداوار تقریباً ۴۴ کوئنٹل فی ہیکٹر اوسطاً
ملی ہے جہاں پروگرام سے قبل صرف ۲۵ کوئنٹل
فی ہیکٹر پیداوار ملتی تھی۔ اس ریاست
کے ساحلی علاقوں میں دھان کی پیداوار ۳۹٫۱۴
کوئنٹل فی ہیکٹر پہونچ گئی ہے جب کہ اسی
علاقہ میں پروگرام سے پیشتر صرف ۲۵ کوئنٹل
فی ہیکٹر پیداوار ملتی تھی۔

کیندریہ آلو انوسندھان سنستھان نے
(آلو کے مرکزی تحقیقی ادارہ) شملہ میں آلو
کی نئی قسم لگائی گئی جس کے ذریعے ۳۳۸
کوئنٹل فی ہیکٹر پیداوار حاصل ہوئی۔ کیندری
انتردیشی مچھلی انوسندھان سنستھان مغربی
بنگال کے ۱۲ مراکز نے مچھلی کی پیداوار میں اضافہ
کے لیے جدید تکنیک کی اشاعت کی اور منتخب
مچھیروں کے ذریعے تقریباً ۱۰۰ لاکھ مچھلی کا اسپاؤں
(Spawn) تیار کیا گیا۔ مخلوط مچھلیوں کی
افزائش کے طریقہ کو اختیار کر کے مغربی بنگال
اور اڑیسہ کے کاشتکاروں نے ۳۰ سے ۳۵
کوئنٹل فی ہیکٹر سالانہ پیداوار حاصل کی۔
دھان اور مچھلیوں کی مخلوط پیداوار کے حصول
کے طریقے سے تقریباً ۹٫۸۲ کوئنٹل مچھلی اور
۴۴٫۶۴ کوئنٹل فی ہیکٹر دھان کی پیداوار
حاصل کی گئی۔ اس طرح ان کاشتکاروں کی
آمدنی میں ۲ سے ۴ گنا اضافہ ہوا ہے۔

منطقہ نمبر ۳۔ آسام اور دوسری شمالی
مشرقی ریاستیں جو مرکزی حکومت کے زیر اثر
ہیں۔ اس منطقہ میں شامل ہیں۔ یہاں کھیتی کے
جدید طریقوں کی نشر و اشاعت کی گئی۔ اس کے
علاوہ مرغ بانی، بطخ بانی، سور بانی کے نئے
طریقوں کو توسیع دے کر منتخب کسانوں کی
آمدنی میں اضافہ کیا گیا۔

منطقہ نمبر ۴۔ اس منطقہ میں اتر پردیش
اور بہار شامل ہیں۔ یہاں پر بیجوں کی اچھی
قسم لے کر مونگ، گیہوں، مونگ پھلی، دھان،
چنا اور تلہن کی پیداوار میں ۴۸ سے ۱۱۲ فیصد
کا اضافہ کیا گیا۔ پائیرائٹ کا استعمال ۳۲
ہریجن کسانوں کے اوسر کھیتوں میں کیا گیا اور
کانپور کے مضافاتی دیہات میں دھان کی
پیداوار میں ۱۱۳، گیہوں میں ۱۰۰، اور چنے کی
پیداوار میں بھی ۱۰۰ فیصد اضافہ کیا گیا۔

آندھرا پردیش کے آبپاشی والے علاقوں
میں باری باری سے کھیتی (Rotational
Cropping) کے ذریعے کاشتکاروں
کو فائدہ پہونچایا گیا۔ اس کے علاوہ خشک
کھیتی (Dry Farming) اور مٹی کی اصلاح
کے طریقوں کو مقبولیت دے کر نفع بخش
نتائج حاصل کئے گئے۔

مدھیہ پردیش کے ادی واسی علاقہ
جھبوا میں تقریباً ۱۴۰۰ ادی واسی خاندانوں
نے چنے کی کاشتکاری کے جدید طریقوں کو
اختیار کر کے ۵۱۵ کلوگرام سے بڑھا کر ۹۴۲
کلوگرام فی ہیکٹر پیداوار حاصل کی۔ چھندواڑہ
ضلع میں پسماندہ اور معاشی اعتبار سے غریب
کسانوں نے خشک کھیتی کی تکنیک کو اختیار
کر کے ۱۰٫۶۳ کوئنٹل فی ہیکٹر گیہوں کی
اوسط پیداوار حاصل کی جبکہ اس سے قبل
صرف ۵٫۴۸ کوئنٹل فی ہیکٹر گیہوں کی پیداوار
ہوتی تھی۔ کرناٹک کے خشک علاقے میں مکا
کی نئی قسم کے ذریعہ ۳ سے ۶ گنا پیداوار حاصل
کی گئی۔ تامل ناڈو میں مروا کی پیداوار میں
۱۴ سے ۲۴ فیصد اضافہ صرف کھاد کے استعمال
سے کیا گیا۔ اس کے علاوہ ادی واسی خاندان
نے چنے کی پیداوار ۳٫۱۰ کوئنٹل فی ہیکٹر سے بڑھا کر
۶ کوئنٹل فی ہیکٹر پیداوار حاصل کی۔

دوسرے دور کے بڑھتے قدم

اس منصوبے کا دوسرا دور ۱۹۸۲ء
سے شروع ہوا۔ اس بار تقریباً ۷۵۰۰۰
ہزار چھوٹے پسماندہ کاشتکاروں اور بے
زمین مزدوروں کا انتخاب ۱۴۲ ٹیکنیکل مراکز
کے ذریعہ عمل میں آیا ہے۔ ان مراکز کے
اعداد اس طرح ہیں۔ بھارتی کرشی انوسندھان
پریشد کے تحقیقی ادارے ۴۵، زرعی
یونیورسٹی ۲۳، اور ۷۴ مراکز زرعی ڈگری
کالج۔ ریاستی حکومت کے محکموں اور خود امدادی
اداروں پر مشتمل ہیں۔ منتخب خاندانوں کے
۶٫۲۵ فیصد تعداد کرشی انوسندھان پریشد
کے تحقیقی اداروں، ۶۹٫۲ فیصد زرعی
یونیورسٹیوں اور صرف ۴٫۱۸ فیصد دیگر
اداروں کے زیر نگرانی ۲۲۹۳ مواضعات میں
پھیلے ہوئے ہیں۔ ان خاندانوں کی درجہ بندی
اس طرح ہے۔

چھوٹے کاشتکار ۲۵٫۳ فیصد۔
حاشیائی کسان ۱۵٫۲۰ فیصد، بے زمین زرعی
مزدور ۱۳٫۲۰ فیصد اور دیگر بھومی دھر صرف
۰٫۳۰ فیصد۔ بہ اعتبار ذات برادری و اقوام
ان خاندانوں میں ۹۶٫۲۱ فیصد ہریجن ۱۵٫۱۸
فیصد آدی واسی قبائل ۵۶٫۲۰ فیصد پسماندہ
اور ۳٫۳۰ فیصد دوسری ذات کے ہیں۔

مختلف ریاستوں میں ان خاندانوں کی
تعداد اس طرح ہے۔

۱۔ آندھرا پردیش: ۱۰۰۰
۲۔ اتر پردیش ۶۶۵۰
۳۔ آسام: ۲۴۵۰
۴۔ تامل ناڈو: ۵۰۰۰
۵۔ اڑیسہ: ۲۵۵۰

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

بھرت ڈوگرہ

تیسری دُنیا کو پودوں کی نسلوں کی تباہی سے بچانا چاہیئے

وہ بھی زمانہ تھا کہ تیسری دنیا کے ممالک مختلف پودوں کی دولت سے مالا مال تھے، یہ بھی زمانہ ہے کہ تیسری دُنیا کے ممالک کو زراعت کے فروغ کے لیے ترقی یافتہ ممالک کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتے ہیں۔ مضمون کے اس حصے میں مصنف نے اس حقیقت کی نقاب کُشائی کی ہے کہ کس طرح امیر ممالک غریب ملکوں سے کم یاب پودوں کی نسلوں کے نمونے جمع کرتے ہیں اور بیجوں کے بنکوں میں اُن بیجوں کو جمع کرنے کے نام پر غریب ملکوں کی رہی سہی دولت پر بھی ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ مصنف کا خیال ہے کہ زرعی انقلاب کا تصوّر بنیادی طور پر امیر ممالک کی ہی اغراض کو پورا کرتا ہے، کیوں کہ وہ ملک انقلاب کے نام پر کیمیائی کھاد، جراثیم کُش ادویات اور جدید مشینری کے لیے منڈی حاصل کر لیتے ہیں۔ مصنف نے اُن خطرات اور خدشات کی نشاندہی کی ہے، جو پودوں کی قدیم نسلوں کی تباہی سے لاحق ہو سکتے ہیں، اور تیسری دنیا کو مکمل طور پر ترقی یافتہ ممالک کا دستِ نگر بنا سکتے ہیں۔

جنگلوں کی بے تحاشا کٹائی اور زرعی انقلاب کی غلط تاویل کے نتیجے میں ہندوستان اور تیسری دنیا کے دیگر ممالک میں پودوں کی قدیم دولت کا جو خاتمہ ہو رہا ہے، اس کی سنجیدگی کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے، ظاہری طور پر تو ترقی یافتہ ممالک ترقی پذیر ملکوں کو اس مسئلے سے نپٹنے کے لیے مالی اور تکنیکی امداد فراہم کرتے ہیں۔ لیکن اس امداد کے پس منظر میں ان ممالک کی اپنی اغراض وابستہ ہیں اور وہ ان کے تحفظ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ ممالک مختلف ترقی پذیر ملکوں میں لگائے گئے اپنے کارخانوں کو بڑھاوا دیتے ہیں، اور تیسری دُنیا کے ملکوں میں پودوں کی بے نظیر نسلوں کے اتلاف کا عمل تیز ہوتا جا رہا ہے۔

آج کی دُنیا کے بہت سے ترقی یافتہ ممالک موسم کی تبدیلی، زمینی حالات اور زرعی طور طریقوں کی وجہ سے پودوں کی قدیم نسلوں کے معاملے میں ناداری کا شکار ہو گئے ہیں، پودوں کی نسلوں کی کہانی نئی نہیں ہے۔ جب زمین کا ایک حصہ یخ بستہ تھا، تو پودوں کے بنیادی بیج برف کی دبیز تہ کے نیچے جم کر رہ گئے تھے اور میدانی علاقوں میں پودوں کی لاتعداد قسمیں پھلتی اور پھولتی رہیں۔ قدرت کی اس دین کو قدیم زمانے سے کسانوں نے اپنی محنت اور مختلف حالات میں ان کی پرورش سے محفوظ بنا لیا۔ وہ پودوں کو آفاتِ سماوی اور بیماری سے محفوظ رکھنے کے لیے مختلف اوقات اور حالات میں مختلف بیج کاشت کرتے تھے۔ جوں جوں دنیا ترقی کی راہ پر آگے بڑھتی گئی، مختلف اقوام و ممالک کے مابین باہمی

رابطے قائم ہوئے، ایسے رابطہ کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ ترقی یافتہ ممالک نے غیر ترقی یافتہ ممالک سے پودوں اور بیجوں کی صورت میں اناج کی بہت سی اقسام کو حاصل کرلیا اور اس طرح سے پیداوار میں اضافے، پودوں کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے عمل اور دیگر فائدوں کے لیے ان اقسام سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ "کلیفورنیا ایگریکلچرل" نام کے رسالے میں ایک محقق جے بی بنڈرک جونیر لکھتا ہے کہ برآعظم ایشیا میں صرف یروشلم ہی اس بات کا دعویٰ کرسکتا ہے کہ شمالی امریکہ میں پیدا ہونے والی ایک ہزار غذائی اجناس میں سے تین قسمیں یروشلم میں اب بھی اپنی اصلی ہیئت میں موجود ہیں، اور وہ اجناس ہیں، گل آفتاب، شرغم بیر اور (Artichokes)

اب آئیے ایک اور اہم پہلو پر روشنی ڈالیں۔ دھرتی ماں کے جو حصے پودوں کی دولت سے مالا مال ہیں، اُن حصوں سے ہمیں اُن پودوں کے بیج حاصل کرکے اُن علاقوں میں کاشت کرنے چاہئیں، جو اِن علاقے ان پودوں کی دولت سے محروم ہیں۔ لیکن جس اہم پہلو کی میں نشاندہی کرنا چاہتا ہوں، وہ ایک اہم مسئلے کو جنم دیتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک تیسری دُنیا کے ملکوں سے پودوں کے بیش بہا نمونے یہ بہانہ بناکر حاصل کرتے ہیں کہ وہ اِن نمونوں کو بنکوں اور تجربہ گاہوں میں محفوظ کردیتے ہیں' اس طرح سے تیسری دُنیا کے ممالک پودوں کی اپنی دولت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم اس سوال کا جواب دیں کہ یہ سب کیسے ہوتا ہے، ہمیں اس سوال کا جواب دینا ہوگا، کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

زرعی انقلاب اور مفادِ خصوصی !

آج سے لگ بھگ دو یا تین دہائیاں پہلے ہندوستان جیسے زرعی ممالک ترقی یافتہ ملکوں سے زیادہ مقدار میں کیمیائی کھاد اور کھیتی کے جدید آلات نہیں خریدتے تھے، ظاہر ہے اس طرح کی چیزیں بنانے والے ملک تیسری دنیا کے ملکوں سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں کرتے تھے۔ زرعی انقلاب کی آمد کے ساتھ ہی یہ صورتِ حال تبدیل ہوگئی، پیداوار کو فروغ دینے کے لیے جدید ترین مشینوں اور کیمیائی کھاد کے استعمال پر زور دیا گیا، اس کام میں امداد دینے والے اداروں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ جس کا براہِ راست فائدہ نئی مشینیں اور کیمیائی کھاد بنانے والے ملکوں کو نصیب ہوا۔ تیسری دُنیا کے ملکوں میں اُن کو جدید زرعی آلات، کیمیائی کھاد، جراثیم کش ادویات وغیرہ فروخت کرنے کا موقع مل گیا اور اس موقع سے اُنھوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ یہاں ایک بات قابلِ غور ہے کہ ان ترقی یافتہ ملکوں نے تیسری دُنیا میں زرعی انقلاب کو فروغ دینے کے لیے غذائی اجناس کے نئے بیج استعمال کرنے اور اُن کو مقبول بنانے کی کامیاب کوشش کی، نتیجہ یہ ہوا کہ جو روائتی قسم کے بیج ہمارے ملکوں میں موجود تھے، اُن کی جگہ زیادہ پیداواری صلاحیت کے نئے بیج رائج کردئے گئے۔ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے زرعی تجارت سے وابستہ غیر ملکی ادارے اب ایسے بیج رائج کرنے کی سوچ رہے ہیں، جن کی نشوونما کے لیے انہی ممالک میں تیار کی گئی کیمیائی کھاد استعمال کی جاسکتی ہے۔ (I. Towels) اینڈ کمپنی نام کے ایک ادارے نے عالمی پیمانے پر بیجوں کے بارے میں ایک سروے کیا ہے۔ اس سروے کے مطابق بعض زرعی تجارتی ادارے اپنی تجربہ گاہوں میں اس طرح کے بیج پیدا کرنا چاہتے ہیں جن کی نشوونما کے لیے خاص قسم کی کیمیائی کھاد درکار ہوگی۔ یعنی مصنوعی طریقوں سے بنایا گیا بیج اور کیمیائی کھاد کا استعمال ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوگا۔ اس طرح سے وہ اپنی تجارت کو بڑھاوا دے پائیں گے۔ باورڈ کے ڈاکٹر ملے ون ٹن کا کہنا ہے کہ اس بات پر یقین کرنے کی معقول وجوہات ہیں کہ کیمیائی کھاد اور جراثیم کش ادویات بنانے والے ادارے، بیجوں پر کئے جانے والی تحقیق کو ایک دوسرے سے وابستہ کردیں گے۔ اس طرح کے کئی رُکھوائے زمانہ واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر فلورڈا یونیورسٹی میں ٹماٹر کی ایک ایسی قسم تیار کی گئی ہے، جو اس وقت تک پک نہیں سکتی، جب تک کہ اُس پر ایک خاص قسم کی دوا نہ چھڑکی جائے۔

اسی اندازِ فکر کو تقویت دینے کے لیے زرعی تجارت سے وابستہ ادارے زراعت کے مختلف پہلوؤں کو ایک دوسرے سے ساتھ جوڑنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ مثلاً وہ ایسے بیج تیار کریں گے، جن کی پرورش کے لیے کیمیائی کھاد اور دوسری مصنوعی ادویات ضروری ہوں گی، اس بیج سے جو فصل تیار ہوگی، اُس فصل کا رنگ اعلیٰ معیار کا ہو، اور پھر اس فصل سے تیار کی جانے والی غذا جب ڈبوں میں بند کردی جائے گی، تو سماج کے ایک خاص ترقی یافتہ طبقے میں مقبول ہو، اس کے علاوہ یہ ادارے دوغلی نسل کے بیجوں کی تجارت کو زیادہ آگے بڑھانے کے لیے کوشاں ہیں، تاکہ کسانوں کو بار بار یہ بیج خریدنے پڑیں اور اداروں کی تجارت میں اضافہ ہوتا رہے۔

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ

زراعت سے متعلق بہت سی دوا ساز کمپنیاں نئے بیجوں میں دلچسپی کا اظہار کر رہی ہیں تاکہ بیجوں کی تجارت سے فائدہ اٹھا سکیں، حال کے کئی برسوں میں مغربی ملکوں میں چھوٹی موٹی دوا ساز کمپنیاں امیر اور بڑے پیمانے کے کارخانہ داروں کے ہاتھوں تک جا چکی ہیں۔

کئی اداروں نے بیجوں کی اقسام جمع کرنے کا کام ہاتھ میں لیا ہے اور بیجوں کے نمونوں کا کافی بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ خوراک اور زراعت سے متعلق عالمی ادارے نے کچھ عرصہ پہلے اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ یونائیٹڈ برانڈز کمپنی کے پاس کیلے کی نسل کے تخم کا ایک تہائی حصہ موجود ہے، اس قسم کے ادارے مختلف افراد اور دانش گاہوں سے بھی اس قسم کا تخم حاصل کرتے ہیں۔ یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ یہ ادارے اپنے ان بیش بہا ذخائر کے بارے میں معلومات فراہم کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔

بہرحال، اناج کے بیجوں پر اقتصادی طور پر بالادستی حاصل کرنے کے عمل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس کے پردے میں تیسری دنیا کے ملکوں پر سیاسی بالادستی حاصل کرنے کی جو نیت پوشیدہ ہے وہ مقابلتاً زیادہ اہم ہے۔ آج جب کہ خوراک کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اگر بیجوں پر مکمل بالادستی حاصل کی گئی، تو اس سے کسی بھی خطے کی غذائی حالت تباہ ہو سکتی ہے اور طاقتور ملک اس کو اپنا دست نگر بنا سکتے ہیں۔

اس سوال کے مذکورہ پہلو کو نظرانداز کرتے ہوئے یہ جتانا ضروری ہے کہ بیجوں کی تجارت سے جو اقتصادی مفادات حاصل ہو سکتے ہیں وہیں اس بات کا کافی حد تک جواز پیش کرتے ہیں کہ بیجوں کی تیاری، ان کی نگرانی اور ان سے متعلقہ معلومات کو عام کیا جائے۔

از شاہی تا گدائی

ظاہری طور پر بیجوں کو جمع کرنے کا کام نہایت ہی نیک اور بے ضرر دکھائی دیتا ہے، یعنی تھوڑے بہت نمونے حاصل کئے جاتے ہیں اور کچھ دیر تک اسی ملک میں رکھے جاتے ہیں، جہاں کی زمین میں وہ پلتے رہے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد ان نمونوں کو لے جا کر بین الاقوامی اداروں میں رکھ دیا جاتا ہے۔ تیسری دنیا کے کئی ممالک کے لیے یہ بات کتنی رنج دہ ہے کہ اُن کے اپنے ملکوں میں جن پودوں کی اقسام ناپید ہو گئی ہیں، اُن پودوں کے بیج انھیں ترقی یافتہ ملکوں سے حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ Seeds of the Earth نام کی کتاب کے مصنف رائے مونی کا کہنا ہے کہ ۱۹۷۰ء میں امریکہ کے محکمہ زراعت نے دعویٰ کیا کہ تیسری "دنیا میں پائے جانے والی غذائی اجناس کی ۲۷، اقسام جو کہ مختلف ملکوں سے لائی گئی ہیں اُن کے پاس ہیں۔ البتہ ان میں سے صرف پانچ قسمیں تیسری دنیا میں نہیں پائی جاتیں۔ امریکہ کے زرعی اداروں میں بیجوں کی ایسی اقسام بھی موجود ہیں، جو ۲۷ ممالک کی ۱۶ نسلوں میں شامل نہیں ہیں، تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے ۱۳ ملکوں کے پاس اُن غذائی اجناس کے بیج نہیں ہیں جو غذائی اجناس ان ۱۳ ملکوں سے ہی دستیاب ہوتے تھے۔ وضاحت کے لیے یہ مثال ملاحظہ ہو، افغانستان مصر اور کوریا کے ملکوں میں زراعت میں گونا گونی تھی، وہ دھیرے دھیرے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ پیداواری اجناس کی مختلف قسمیں نابود ہوتی جا رہی ہیں۔ اور ایک ہی طرح کا اناج نظر آتا ہے۔ صورت یہ ہے کہ ان ممالک کو جب اُن روایتی بیجوں کی ضرورت پڑے گی جو ان ملکوں میں خصوصیت سے پائے جاتے تھے، تو انھیں امریکہ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ امریکہ کی قومی اکادمی کے مطابق بیجوں کو جمع کرنے کا موجودہ کام ترقی یافتہ ممالک کی ضروریات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہی ترتیب دیا گیا ہے۔

اب کینیا اور لیبیا کی مثال لیجیے، ترقی یافتہ ممالک نے ان ملکوں سے نایاب پودوں کے بیج حاصل کر لیے پھر سائنسی طریقوں پر ان کی کاشت کی، کینیا اور لیبیا میں جب ان بیجوں کا خاتمہ ہو گیا تو دونوں ملکوں کو ترقی یافتہ ممالک سے یہی بیج قیمت دے کر حاصل کرنا پڑا۔ غور کیجیے، کیا یہ سب محض ایک اتفاق ہو سکتا ہے؟ یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے جس کے تحت تیسری دنیا کے ملکوں کو بیجوں کی دولت سے محروم کرنا مقصود ہے۔ مونی رائے نے اپنی تحقیق میں اس صورت حال کا بغور جائزہ لیا ہے جو مختلف ملکوں میں بیجوں کی کمیابی کی ذمہ دار رہی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"بیجوں کی تیاری اور ان کو حفاظت سے رکھنے والے بینکوں کی اہمیت اور افادیت مُسلّم لیکن تمام انڈوں کو ایک ہی ٹوکری میں رکھنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ تمام ملکوں سے کہا جا رہا ہے کہ وہ پودوں کی دولت کو راضی خوشی دوسروں کے حوالے کر دیں۔"

ایک اور بے ہودگی

کہا جا سکتا ہے کہ ہم بلاوجہ اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہیں۔ اس صورت حال سے نپٹنے کا بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ تیسری دنیا کے سائنس داں اپنے ممالک سے بیجوں کی برآمد کو

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

پروفیسر آر سی بھٹناگر

بھارت میں کالا دھن

ایک جائزہ

مُلک میں بڑھتے ہوئے کالے دھن کا وجود پچھلے کچھ سالوں سے ہماری معاشی ترقی کے راستے میں بڑی اڑچن بن گیا ہے۔ امیر اور غریب کے بیچ کی کھائی کو بڑھانے کے علاوہ یہ کالا دھن غیر ضروری خرچے کی مقدار میں بھی اضافہ کر رہا ہے اور بڑھتی ہوئی قیمتوں کی آگ میں گھی کا کام کر رہا ہے۔ عوام کالے دھن کی اس آگ کو نہ دیکھ پاتے ہوئے بھی، اس کی تپش سے خود کو محفوظ رکھنے میں ناکامیاب ثابت ہو رہے ہیں۔ مُلک میں ایک طرف کروڑوں کی تعداد میں وہ لوگ ہیں جو کمر توڑ محنت کے باوجود دو وقت کی روٹی کا صحیح ڈھنگ سے انتظام نہیں کر پاتے مگر دوسری طرف غیر قانونی طریقوں کو اپنا کر کچھ لوگ اپنی آمدنی اور دولت میں دن بدن اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔

کالا دھن آمدنی کا وہ حصہ ہے جس پر ٹیکس کی چوری کی گئی ہو۔ یہ وہ آمدنی ہے جس کی اطلاع انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کو نہیں دی جاتی اور جسے چھپا لیا جاتا ہے تاکہ ٹیکس کی ادائیگی نہ کرنی پڑے۔ یہ کام نجی سطح پر اور تجارتی حلقوں میں مجموعی طور پر کیا جاتا ہے۔

ٹیکس کی چوری اور کالے دھن کی بڑھتی ہوئی مقدار کے سلسلے میں ڈاکٹر رانگنیکر کی تحقیقات اور تخمینے کے حساب سے ملک میں کالے دھن کی مقدار مُلک کی کُل پیداوار (Gross National Product) کا ۱۴½ فیصدی حصہ تھی۔ ڈاکٹر راجا چیلیا نے اپنی رپورٹ میں کالے دھن کی مندرجہ ذیل تفصیل دی ہے۔

سال	رقم (کروڑ روپے میں)			ملک کی کُل پیداوار کا فیصد
۱۹۷۵-۷۶ء	۹۹۵۸	سے	۱۱۸۷۰	۱۵ سے ۱۸ فیصد
۱۹۸۰-۸۱ء	۲۰۳۶۲	سے	۲۳۶۷۸	۱۵ سے ۱۸ فیصد
۱۹۸۳-۸۴ء	۳۱۵۸۴	سے	۳۶۷۸۶	۱۸ سے ۲۱ فیصد

انڈین مرچینٹ چیمبر (Indian Merchant Chamber) نے اپنی ایک رپورٹ میں دعویٰ کیا ہے کہ ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران مُلک میں کالے دھن کی مقدار ۴۰,۴۷۴۳ سے ۷۰۵۳۰ کروڑ روپوں کے بیچ تھی۔ دوسرے لفظوں میں کالے دھن کی مقدار ۴½ کروڑ روپے فی گھنٹہ کی رفتار سے بڑھ رہی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ کالے پیسے کا مسئلہ صرف ہمارے ملک تک ہی محدود نہیں۔ دُنیا کے سبھی ملکوں میں ٹیکسوں کی چوری اور کالے پیسے کا وجود قائم ہے۔ مگر جس تیزی سے اس کی مقدار ہمارے ملک میں بڑھی ہے وہ ضرور ہمارے معاشی معیار کو تحس نحس کر کے ہماری ترقی کے راستے میں مشکلیں پیدا کرے گی۔

کالے دھن کے وجود کو بڑھانے اور اسے ترقی دینے میں ٹیکسوں کی اُونچی شرح کا اہم رول رہا ہے۔ آج سے دس سال پہلے تک دو لاکھ روپوں سے اوپر کی آمدنیوں پر انکم ٹیکس کی شرح ۹۰ فیصد تھی۔ یہ اُونچی شرح ٹیکسوں کی چوری کا اچھا خاصا سبب بن گئی ہے۔ اسی طرح اقتصادی طبقوں میں غیر ضروری سرکاری کنٹرول

اور پرمٹوں کی بندشوں نے بے ایمانی اور چوری کو بڑھاوا دیا ہے۔ اسمگلنگ، نشہ بندی، چور بازاری نے بھی کالے دھن کی مقدار کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

سیاسی پارٹیوں کی دست اندازی اور ہر پانچ سال کے بعد ہونے والے الیکشن میں خرچوں پر لگی بندشوں کی وجہ سے بھی کالے دھن کی مقدار میں اضافہ ہوا ہے۔ ہر اُمیدوار صنعتی طبقوں سے مالی امداد لے کر اپنے اخراجات کو پورا کرتا ہے۔ یہ امداد کالے دھن کو جنم دیتی ہے کیونکہ اس امداد کی رقم کو وہ لوگ اپنے کھاتوں میں نہیں دکھا سکتے۔ پارلیمنٹ کے پچھلے اجلاس کے دوران شری راجیو گاندھی کی سرکار نے سیاسی پارٹیوں کو دی جانے والی اس طرح کی مالی امداد کو قانونی اجازت دے دی ہے۔ مستقبل میں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ کالے دھن کا یہ اہم ذریعہ خود بخود اپنی اہمیت کھو دے گا۔

کالے دھن کے وجود کا سب سے بڑا سبب ہماری اخلاقی گراوٹ اور ایمانداری کی کمی ہے۔ مُلک اور سرکار کی طرف اپنے فرض کو بھول کر ہم صرف دھن جمع کرنے کے لالچ میں گرفتار ہیں اور ہر ممکن طریقے سے اپنے چاروں طرف دولت کے انبار لگانے میں مُنہمک ہیں۔

کالے دھن کے اضافے میں زمین جائداد کی خرید فروخت، فلمی صنعت، رشوت خوری، برآمد اور درآمد کی تجارت، مذہبی ٹرسٹ، شیئر بازار کا لین دین وغیرہ بھی اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔

کالے دھن کی بڑھتی مقدار سے مُلک میں بہت سے بُرے نتائج بھی دیکھنے میں آئے ہیں؛ اور اگر اس کے وجود پر جلدی قابو نہ پایا گیا تو ملک میں عوام کی خوشحالی اور سرکاری پروگراموں پر اس کا گہرا اثر پڑے گا۔ کالے پیسے کی وجہ سے ملک کی کُل پیداوار اور آمدنی کا صحیح اندازہ نہیں لگ پاتا کیونکہ یہ آمدنی کسی ریکارڈ میں درج نہیں ہوتی۔ سرکار کو ٹیکسوں سے جو رقم ملنی چاہیئے اُس سے بھی وہ محروم رہ جاتی ہے۔ بجٹ کے خسارے میں اضافہ ہوتا ہے۔ قیمتیں اور بڑھتی ہیں اور عوام کی مشکلات میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف سماج کے کچھ لوگ اپنے کالے دھن اور دولت کا سہارا لے کر پانچ ستارہ تہذیب کے سرغنہ بنتے جا رہے ہیں۔ ملک کے کمزور اور غریب طبقوں پر ان لوگوں کے رہن سہن کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔

تجاویز:

ملک کی بھلائی کے لیے کالے دھن کے مسئلے کو فوری طور پر حل کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر ہم اس طرف متوجہ نہ ہوئے تو کالے دھن کی دیمک ملک کی ترقی کو بالکل چاٹ جائے گی اور اقتصادی ڈھانچے کو بھی کھوکھلا کر دے گی۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ شری راجیو گاندھی کے وزیر خزانہ شری وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے پچھلے کچھ سالوں میں ٹیکس کی چوری کرنے والے کئی صنعت کاروں اور کمپنیوں کے خلاف سخت کارروائی کی ہے جس کے اچھے نتائج نکلے ہیں اور ملک کا معاشی ماحول بہتر ہونے کے امکان نظر آ رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ٹیکس کی چوری کرنے والوں کے لیے جو قانون موجود ہیں اُن کی خامیوں کو دُور کیا جائے اور انکم ٹیکس محکمے کے افسران کے حقوق میں اضافہ کیا جائے مگر ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ یہ افسران اپنے حقوق کا استعمال ذمہ داری اور ایمانداری سے کریں۔

پچھلے بجٹ میں سرکار نے لوگوں کو یہ موقع دیا تھا کہ وہ اپنی آمدنی کی صحیح تفصیل ۳۰ ستمبر ۱۹۸۶ء تک پیش کریں۔ اپنی چھپائی گئی آمدنی کی تفصیل دینے پر نہ تو اُن کے پچھلے سالوں کے ٹیکسوں پر کوئی جانچ ہوگی اور نہ ہی اس آمدنی کے لیے اُن سے کوئی سوال پوچھے جائیں گے۔ لوگوں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس چھوٹ کا فائدہ اُٹھائیں۔ اب ٹیکس کی چوری کرنے والوں پر سرکار نے مقدمہ چلانے کے لیے خاص عدالتوں کے قیام کا فیصلہ بھی کیا ہے۔

ٹیکسوں کی شرح اور ڈھانچے میں کمی اور سُدھار کی تجویز بھی قابلِ غور ہے۔ سرکار نے پچھلے بجٹ میں انکم ٹیکس، ویلتھ ٹیکس (Wealth Tax) کارپوریٹ ٹیکس (Corporate Tax)، ایکسائز ڈیوٹی (Exoise Duty) اور کسٹم ڈیوٹی (Custom Duty) وغیرہ میں تبدیلیاں کی ہیں۔

سرکاری پرمٹ، لائسنس اور غیر ضروری کنٹرول بھی کالے دھن کو جنم دینے اور بڑھانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنی کارکردگی اور تجربہ کی بنا پر اُن پر نظرِ ثانی کر کے ضروری رد و بدل کریں تاکہ بے ایمانی اور رشوت خوری کو کم کیا جا سکے۔

اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم موجودہ نقطۂ نگاہ کو بدلیں اور اخلاقی گراوٹ سے پرہیز کریں۔ خود غرضی کے غلط راستے سے کنارہ کش ہوں۔ تب ہی ہم دیش اور قوم کی قسمت کو بدل سکتے ہیں۔ ●

مضمون نگار حضرات سے گذارش

اقتصادی اور ادبی نوعیت کے مختصر اور جامع مضامین ارسال کریں، کاغذ کے ایک طرف ہی خوشخط لکھیں، سطور کے درمیان کافی فاصلہ رہے۔

راجیش کمار

طاقت وطن کی ان سے ہے

نوجوانوں کی فلاح و بہبود کے پروگرام

نوجوان بھارت کی شان اور قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ آگے چل کر انھیں میں سے گاندھی، نہرو، پٹیل، آزاد، سبھاش اور شاستری جیسی عظیم شخصیتیں، انجینئر اور یہی "اہل استاد"، سائنسداں، اعلیٰ منتظم، بہادر جوان اور جرنیل بنیں گے۔ نوجوان طاقت کا عظیم سرچشمہ ہیں۔ انھیں صحیح سمت میں موڑنے اور تعمیری کاموں میں لگانے کی ضرورت ہے۔ حکومت کو اس کا پورا احساس ہے۔ مرکز میں نوجوانوں کی بہبود اور کھیلوں کے فروغ کے لیے ایک علیحدہ وزارت بنا دی گئی ہے۔ جو نوجوانوں کو صحیح تربیت دینے، ان کی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے، ان کے اندر قیادت کی قابلیت پیدا کرنے اور انھیں تعمیری کاموں میں لگانے کے لیے موزوں پروگرام وضع کرتی اور روبہ عمل لاتی ہے۔ لیکن ہمیں اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ حصول آزادی کے بعد سے ہی حکومت نوجوانوں کی بہبود و بہتری پر توجہ دیتی رہی ہے اور اس کے لیے مختلف اقدامات کرتی رہی ہے۔ ہم اس مضمون میں اس بات کا ایک مختصر جائزہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے کہ ملک میں نوجوانوں کی بہبود و بہتری کے لیے اب تک کیا اقدامات کئے گئے ہیں۔

نوجوانوں کا بین الاقوامی سال

اقوام متحدہ نے ۱۹۸۵ء کو نوجوانوں کا بین الاقوامی سال قرار دیا۔ اقوام متحدہ کے ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے حکومت ہند نے نوجوانوں کے بین الاقوامی سال کو بھارت میں نوجوانوں کے سال کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا۔ اس سے حکومت کو نوجوانوں سے متعلق تمام امور پر غور کرنے، ان کی بہبود و بہتری کے نئے پروگرام شروع کرنے اور ان کی طاقت کو قومی و تعمیری سرگرمیوں میں لگانے کا موقع ملا۔

یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ ہر سال ۱۲ جنوری کو سوامی دویکانند کا جنم دن نوجوانوں کے قومی دن کے روپ میں منایا جائے۔

قومی خدمت کی اسکیم : یہ اسکیم ۱۹۶۹ء میں شروع کی گئی تھی اور تقریباً چالیس ہزار طلبا کو اس کے تحت لایا گیا تھا۔ اب اس اسکیم میں حصہ لینے والے طلباء کی تعداد ساڑھے سات لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ یہ اسکیم ملک کی تمام ریاستوں، مرکزی نظم و نسق کے علاقوں اور سبھی یونیورسٹیوں کے ساڑھے تین ہزار سے زیادہ کالجوں میں چل رہی ہے۔ اس اسکیم کا مقصد اوّلین ڈگری کے طلباء کو رضاکارانہ بنیاد پر قومی تعمیر و ترقی کے کاموں میں شامل کرنا ہے۔ اب اس اسکیم کو آزمائشی طور پر کچھ ریاستوں اور مرکزی علاقوں کے "جمع دو" سطح کے طلباء پر بھی لاگو کر دیا گیا ہے۔

۷۷-۱۹۷۶ء کے بعد سے دیہی تعمیر نو کے پروگراموں اور ایسی سرگرمیوں پر زور دیا گیا جن کا مقصد سماجی و اقتصادی لحاظ سے کمزور طبقوں کی حالت بہتر بنانا ہے۔ قومی خدمت اسکیم میں حصہ لینے والے طلباء اور طالبات دیہات میں سڑکوں، اسکولی عمارتوں، تالابوں وغیرہ کی مرمت و تعمیر اور شجر کاری کے علاوہ دوسر

پروگراموں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ مثلاً ماحول کی بہتری و تحفظ، صحت، خاندانی بہبود اور غذائیت بخش خوراک کے پروگرام، سماج میں عورتوں کی سماجی حیثیت میں سدھار، فلاحی انجمنوں میں سماج سیوا، اور تعلیمی و تفریحی پروگرام جن میں تعلیم بالغان اور اسکول جانے سے پہلے کی تعلیم شامل ہیں۔ قومی خدمت کی اسکیم کے طلبا فراہمیٔ امداد اور بحالیاتی پروگراموں پر عمل درآمد میں مقامی حکام کی مدد بھی کرتے ہیں۔

چھٹیوں کے دوران طلبا کو تعمیری کاموں میں شریک کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر کیمپ لگانے کے پروگرام بنائے گئے ہیں۔ جن کے تحت دیہی آبادی کی ضرورتوں کے کچھ پہلوؤں پر کام کیا جاتا ہے۔ "دیہی ترقی کے لیے نوجوان" کے موضوع کے تحت قومی خدمت اسکیم کے رضا کاروں میں سے نصف تعداد کو منتخب گاؤں اور شہروں کی گندی بستیوں میں لگائے گئے خصوصی کیمپوں میں بھیجا جاتا ہے۔

قومی خدمت اسکیم کو "بہتر ماحول کے لیے نوجوان" نامی پروگرام کو شامل کرکے ایک نئی سمت دی گئی ہے۔ اس پروگرام کی کچھ اہم باتیں درجِ ذیل ہیں:۔

۱۔ جھیلوں اور تالابوں کو خود رَو سرکنڈوں سے پاک کرنا۔

۲۔ شجرکاری سے پہلے کئے جانے والے کام مثلاً زمین کی صفائی، قطار بندی، گڈھے کھودنا اور کھاد ڈالنا وغیرہ۔

۳۔ پہاڑوں اور اجتماعِ عام کی جگہوں پر درخت لگانا۔

۴۔ کمپوسٹ کھاد تیار کرنے کے لیے گڈھے کھودنا۔

۵۔ پارکوں کی تعمیر۔

۶۔ ماحول کو صاف ستھرا رکھنا۔ اور

۷۔ طلبا، اساتذہ اور سماج کے دیگر طبقوں میں ماحول سے متعلق مسائل کے بارے میں بیداری پیدا کرنا۔

قومی خدمت اسکیم کے باقاعدہ پروگراموں اور خصوصی کیمپوں کے دوران خاندانی منصوبہ بندی اور بیس نکاتی پروگرام کے علاوہ درجِ ذیل امور پر بھی توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔

۱۔ کردار بلند کرنے پر زور۔

۲۔ ماحول میں سدھار۔

۳۔ قومی اتحاد کے لیے حلف برداری۔

۴۔ اجتماعی گانا۔

۵۔ تہذیب و ثقافت کا فروغ۔

۶۔ جسمانی صلاحیت۔ اور

۷۔ درجِ فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے طلبا کو برابر کا شریک بنانا۔

قومی خدمت اسکیم کی اکائیوں کی سرگرمیوں میں تال میل قائم کرنے اور ریاستوں اور یونیورسٹیوں کی سطح پر رابطہ برقرار رکھنے کے لیے ملک میں قومی خدمت اسکیم کے پندرہ مراکز بنائے گئے ہیں۔

نہرو یووک کیندر

غیر طالب علموں اور دیہی نوجوانوں کی خدمت کے لیے ۱۹۷۲ء میں نہرو یووک کیندروں کی اسکیم شروع کی گئی۔ اس سال ملک میں ۴۰ نہرو یووک کیندر قائم کئے گئے۔ آج ملک بھر میں ۲۰۰ نہرو یووک کیندر کام کر رہے ہیں۔ ان کے فرائض حسب ذیل ہیں:۔

نوجوانوں میں قیادت کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے تربیتی کیمپ لگانا، قومی اتحاد اور یک جہتی کے کیمپ لگانا، سماج سیوا کے کام کرنا، بائیوگیس پلانٹوں کی تنصیب، پیشہ ورانہ تربیت کے کیمپ لگانا، نوجوانوں کے کلب قائم کرنا، تربیتی کیمپوں کے ذریعے دیسی اور دیہاتی کھیلوں کو فروغ دینا اور کھیلوں کے مقابلے منظم کرنا وغیرہ۔

نوجوانوں کو اپنا روزگار خود شروع کرنے کی تربیت دینے کی اسکیم (TRYSEM) بھی کچھ جگہوں پر نہرو یووک کیندروں کے ذریعے زیرِ عمل لائی جا رہی ہے۔

نہرو یووک کیندروں کو بائیوگیس پلانٹ بنانے کی تربیت دینے، شہد کی مکھیاں پالنے، نیم فوجی تربیت، بے دھواں چولہوں کو مضبوط بنانے اور راستوں اور چوپالوں وغیرہ کی تعمیر وغیرہ کے کاموں میں کافی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

اسکاؤٹس اور گائیڈس

"اسکاؤٹ اور گائیڈس" ایک بین الاقوامی تحریک ہے جس کا مقصد لڑکے اور لڑکیوں کا کردار بنانا ہے تاکہ وہ اچھے شہری بن سکیں اور ان میں خدمتِ خلق، اتحاد اور حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہو سکے۔ بھارت اسکاؤٹ اینڈ گائیڈس اس کام کو کرنے والی خصوصی تنظیم ہے جسے حکومت سے مالی امداد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک دو دیگر تنظیمیں بھی اس میدان میں کام کر رہی ہیں۔

یوتھ ہوسٹل

نوجوان لڑکے، لڑکیوں کو ملک کے تاریخی و ثقافتی اہمیت کے مقامات کا دورہ کرنے کی ترغیب دینے کے لیے سستے یوتھ ہوسٹل کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔ تفریحی و تعلیمی دوروں کے دوران طلبا ان میں قیام کر سکتے ہیں۔ مقصد ثقافتی رابطوں کے

ریلیے طلباء میں بہتر باہمی مفاہمت اور ذہنی یک جہتی کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ ان ہوسٹلوں کے لیے زمین کے ساتھ ساتھ پانی، بجلی وغیرہ کی سہولیات ریاستی حکومتیں مُفت فراہم کرتی ہیں اور مرکزی حکومت تعمیر کا خرچ برداشت کرتی ہے۔ امرتسر، اورنگ آباد، بھوپال، ڈلہوزی، دارجلنگ، گاندھی نگر، حیدرآباد، جے پور، مدراس، میسور، نینی تال، پناجی، پنچ سلا، پانڈیچری، ٹپنی ٹاپ، پورٹ بلیئر، پوری اور ترِوانت پورم میں ۱۸ یوتھ ہوسٹل بنائے جا چکے ہیں۔ اور مزید دس ہوسٹل دیگر مقامات پر زیرِ تعمیر ہیں۔

نوجوانوں کی بہبود اور کھیل کود سے متعلق محکمہ قومی یک جہتی کو فروغ دینے کی اسکیم کے تحت ملک کے ایک حصّے کے نوجوانوں کو دوسرے حصّے میں دَورے پر بھجوانا ہے۔ اس سے مختلف خطّوں کے نوجوانوں کو دوسرے خطّے کے رہن سہن، رسم و رواج، تہذیب و ثقافت اور زبان سے روشناس ہونے کا موقع ملتا ہے اور آپس میں بہتر مفاہمت پیدا ہوتی ہے اور کثرت میں وحدت کا احساس ہوتا ہے۔ نہرو یووک کیندروں، رضاکار ایجنسیوں اور تعلیمی اداروں کے ذریعے ملک کے مختلف حصوں میں قومی یک جہتی کیمپ لگائے جاتے ہیں جن میں طالب علم اور غیر طالب علم لڑکے، لڑکیاں حصہ لیتے ہیں۔ وہاں انھیں ملک کے مختلف حصوں کے رسم و رواج اور تہذیب و ثقافت اور ملک کی جدو جہد آزادی کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں اور چھوت چھات، ذات پات، جہیز جیسی لعنتوں کے خلاف بیدار کیا جاتا ہے۔

دلیرانہ کارناموں کی حوصلہ افزائی: ایک اور اسکیم کے تحت جوکھم سے بھری ہوئی مہمیں سر کرنے، مِل جُل کر اجتماعی طور پر کام کرنے، چیلنج سے بھرے ہوئے حالات میں فوری فیصلہ کرنے کے لیے نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ان کاموں کے لیے حکومت کی طرف سے مالی امداد فراہم کی جاتی ہے۔

دوسرے ممالک کے ساتھ میل جول اور مفاہمت کو بڑھانے کی غرض سے تبادلۂ وفود کے پروگرام کے تحت نوجوانوں کے وفود کو دوسرے ملکوں میں بھی بھیجا جاتا ہے۔ اس سے ان کا نقطۂ نگاہ وسیع ہوتا ہے اور انھیں نوجوانوں کے تعلق سے بدیش میں ہونے والی ترقیوں و سرگرمیوں سے روشناس ہونے کا موقع مِلتا ہے۔

ہندوستان میں کھیلوں کے فروغ کے لیے جو کوششیں کی گئیں، ان کے زیرِ اثر ہمارے ملک میں مختلف کھیلوں کو فروغ حاصل ہو سکا اور بین الاقوامی سطح پر اب ہمارے کھلاڑی ایک خاص مقام اور معیار رکھتے ہیں۔ ●

بقیہ، تیسری دُنیا کو پودوں کی نسلوں کی تباہی سے بچانا چاہیئے

روک دیں اور بیجوں کو حفاظت سے رکھنے کے لیے اقدامات شروع کریں۔ دلیل تو معقول نظر آتی ہے، لیکن تیسری دنیا میں ایسے سائنس دانوں، اعلیٰ افسروں اور تکنیکی ماہروں کی کمی نہیں، جو ترقی یافتہ ممالک سے وابستہ اداروں سے رشوت کھاکر، ان تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔

ہمارے ملک ہندوستان میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ چاول پر کام کرنے والے مشہور سائنسداں ڈاکٹر آر، ایچ، اچاریہ نے مدھیہ پردیش میں اپنے ریسرچ سنٹر میں چاول سے متعلق متعدد بیماریوں کا سراغ لگایا۔ اس کے علاوہ انھوں نے چاول کی ایسی چند اقسام کا پتہ لگایا۔ جن پر بیماریاں زیادہ جلدی اثر انداز نہیں ہوتی تھیں۔ جب یہ خبر پھیل گئی تو مفادِ خصوصی رکھنے والوں نے ڈاکٹر اچاریہ کی خدمت میں سائنسدانوں کی صورت میں اپنے قاصد روانہ کیئے تاکہ وہ کسی طرح سے ڈاکٹر اچاریہ کی جمع کی ہوئی اطلاعات کو حاصل کر سکیں۔ وہ کسی بھی طریقے سے ان اطلاعات کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔۔ ڈاکٹر اچاریہ نے اس طرزِ عمل کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور یہ بات واضح کردی کہ وہ جب تک ان معلومات کا استعمال کریں گے، اس وقت تک کسی اور کو اس کی اطلاع نہیں دیں گے، مفادِ خصوصی رکھنے والے بھلا کہاں پیچھے رہنے والے تھے، انھوں نے دوسرے حربے استعمال کیئے۔ چنانچہ امدادی کاموں سے تعلق رکھنے والی ایک بین الاقوامی ایجنسی کو میدان میں جھونک دیا گیا۔ یہ ایجنسی مغربی ممالک کے مفادات سے پورے طور پر وابستہ ہے۔ اس ایجنسی نے مدھیہ پردیش میں چاول کی پیداوار کو بڑھانے کے لیے ایک بہت بڑی اسکیم اس شرط پر شروع کردی کہ ڈاکٹر اچاریہ کی قیادت میں کام کرنے والا ادارہ بند کردیا جائے گا۔۔ اور یہی ہوا۔ چاول کی تحقیق سے متعلق ادارہ بند ہوا، ڈاکٹر اچاریہ کے ساتھیوں کو سبکدوش کیا گیا، ڈاکٹر اچاریہ نے جو کاغذات ترتیب دیئے تھے، وہ چھین لیے گئے اور مفادِ خصوصی رکھنے والوں کے ہاتھ میں آگئے۔ ●

گوپال اروڑہ

بچّوں کی نشو و نُما کا بے نظیر پروگرام

بھارت نے زچہ و بچّہ کی طبّی دیکھ بھال اور بچّوں کی نشو و نما سے متعلق ایک ایسا پروگرام نافذ کر رکھا ہے جو اپنے کئی پہلوؤں کے لحاظ سے دُنیا میں بے نظیر ہے۔ پسماندہ طبقوں کے ۴۰ لاکھ بچّے اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ ساتویں منصوبے کے آخر تک ایسے بچّوں کی تعداد ۶۶ لاکھ تک پہنچ جائے گی۔ (ایڈیٹر)

جب پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی جائے تو دیوار خواہ آسمان تک چڑھائی جائے وہ ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔ کسی بھی عمارت کو مضبوط بنانے کے لیے یہ پہلی شرط ہے کہ اُس کی بنیاد ٹھوس ہو، مضبوط ہو۔ چنانچہ اسی حقیقت کو مدِ نظر رکھ کر ملک و قوم کی بنیاد یعنی بچّوں کو تندرست و توانا بنانے کے لیے بھارت سرکار نے متعدد پروگرام شروع کر رکھے ہیں۔ انہی پروگراموں میں ایک بے نظیر پروگرام ہے — بچّوں کی نشو و نما سے متعلق مربوط سروسز کا پروگرام (ICDS)

یہ پروگرام ۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو شروع کیا گیا تھا۔ اور اسے نافذ ہوئے ۱۱ برس ہو چکے ہیں۔ چونکہ یہ پروگرام ۲ اکتوبر کو شروع کیا گیا تھا جو مہاتما گاندھی کا جنم دن ہے، اس لیے اسے باپو کے نام پر ملک کے بچّوں کے لیے تحفہ کہا جا سکتا ہے۔ اس پروگرام کے تحت آنگن واڑیوں میں غریب اور نادار کنبوں کے بچّوں کے لیے تغذیہ بخش غذائیں اور ادویات تقسیم کی جاتی ہیں اور حاملہ عورتوں کی طبّی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ بچّوں کو وٹامن اور دیگر ادویات فراہم کرنے کے علاوہ انھیں تپ دق، خناق، پولیو اور دیگر ایسے امراض کے ٹیکے لگائے جاتے ہیں جو اُن کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس پروگرام کا ایک بے نظیر پہلو یہ ہے کہ زچّہ اور بچّہ دونوں کی نگہداشت کے لیے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

ملک کے جن علاقوں میں یہ پروگرام جاری ہے وہاں اسے کامیاب بنانے کے لیے عوام کے جوش نے تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے، اور وہ عمارتی سامان، جسمانی مشقت اور خوراک وغیرہ فراہم کر کے اسے کامیاب بنانے کے لیے ہر ممکن اقدام کر رہے ہیں۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ ساتویں پانچسالہ منصوبے کے آخر تک ملک میں ۲ لاکھ ۲۰ ہزار آنگن واڑیاں کام کر رہی ہوں گی۔

گذشتہ ۱۱ برس سے اس پروگرام کے تحت ملک کے ۳۹۳۔ اضلاع میں ۱۳۴۶ پراجیکٹ عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ ابتدا میں جب یہ پروگرام نافذ کیا گیا تھا، تب ان پراجیکٹوں کی تعداد جو تجرباتی طور پر شروع کیے گئے تھے محض ۳۳ تھی۔ اب سب سے زیادہ پراجیکٹ اتر پردیش میں (۲۷۱) ہیں اور اس کے بعد بہار (۱۱۹) مغربی بنگال (۱۱۰) اور مہاراشٹر (۹۵) کا نمبر آتا ہے۔ سردست ۴۰ لاکھ سے زیادہ بچّے اس پروگرام سے مستفید ہو رہے ہیں جو اسکول جانے سے قبل کی عمر کے ہیں۔ توقع ہے کہ ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں ایسے بچّوں کی تعداد تقریباً ۶۶ لاکھ ہو جائے گی۔ ایسے بچّے کم آمدنی والے گروپوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی عمر ۳ سے ۵ سال تک ہوتی ہے۔

اس پروگرام کا مقصد ہے چھ برس تک کے بچّوں کی صحت اور غذائیت کے حالات کو بہتر بنانا اور اُن کی ماؤں کی استعداد کو بڑھانا تاکہ وہ صحت اور غذائیت کے معاملے میں مناسب تعلیم اور تربیت کے ذریعہ بچے کی عام ضروریات کو پورا کر سکیں۔ اس سلسلے میں انھیں جو سہولیات فراہم کی جاتی ہیں اُن میں ضمنی غذائیت کی فراہمی، ٹیکے لگانا، صحت کا معائنہ، چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا علاج معالجہ اور ۳ سے ۶ برس تک کے بچّوں کے لیے ایسی تعلیم کا بندوبست شامل ہے جو اسکول جانے سے قبل دی جاتی ہے۔

بچّوں کی نشو و نما سے متعلق مربوط سروسز کے پروگرام کی تعمیل پر سماج و خواتین کی بہبود کی وزارت کی طرف سے گہری نگرانی کی جاتی ہے۔ یہ کام وزارت ہذا خود اور صحت و غذائیت سے متعلق مرکزی سیل (CELL) کی وساطت

سے انجام دے رہی ہے ۔ پلاننگ کمیشن اور آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز نے آزادانہ طور پر اس کا جائزہ لیا ہے ۔ گو متعدد میڈیکل کالجوں اور "نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک کوآپریشن اینڈ چائلڈ ڈویلپمنٹ اینڈ ہیومن" نے اس کام میں اُن کا ہاتھ بٹایا ہے ۔

علاوہ ازیں متعدد سائینسی کالجوں اور اکادمیوں نے بھی اس پروگرام کے کئی حصوں کا آزادانہ سروے کیا ہے ۔ صرف صحت اور غذائیت کے شعبے میں ہی ۶۰۰ سے زیادہ سروے کئے گئے ہیں اور اس پروگرام کے تحت فراہم کی جانے والی سہولیات اور اس سے مستفید ہونے والوں پر اُن کے اثر کے بارے میں سائنسی معلومات اور اعداد جمع کئے گئے ہیں ۔ اس سلسلے میں کوئی ۹ تحقیقی مقالے ملکی اور غیر ملکی جرائد میں شائع ہوئے ہیں اور "ایم ڈی" اور "پی ایچ ڈی" سے متعلق ۰۰ تھیسس لکھے گئے ہیں اس سلسلے میں جو معلومات اور اعداد فراہم کئے گئے اُن کا خلاصہ درج ذیل ہے ۔

۱۹۷۶ء اور ۱۹۸۳ء کی سالانہ سروے رپورٹوں کے مطابق شدید طور پر پھیلی ہوئی کم غذائیت میں کافی اور بتدریج کمی ہوئی ہے ۔ ۱۹۷۶ء میں ۱۹ء۱ فیصد بچوں میں شدید کم غذائیت دیکھنے میں آئی ۔ لیکن سات برس کے عرصے میں ایسے بچوں کی تعداد کم ہو کر ۸ر۷ فیصد رہ گئی ۔ آنگن واڑی میں شدید کم غذائیت پر قابو پانے سے اس بیماری سے ہلاک ہونے والے بچوں کی تعداد کم ہو کر ۳ فیصد رہ گئی جبکہ سات برس پہلے وہ ۱۵ فیصد تھی ۔

مذکورہ بالا پراجیکٹوں میں فی ہزار زندہ پیدائشوں میں مرنے والے بچوں کی تعداد کم ہو کر ۸۸٫۳ رہ گئی ۔ جو سیمپل رجسٹریشن اسکیم کے مطابق ملکی سطح پر ۱۱۰ تھی ۔

اس پروگرام کے باعث شرح پیدائش پر بھی بڑا اثر پڑا جو ۱۹۸۲ء میں ۲ر۲۴ فی ہزار تک کم ہو گئی جبکہ ملکی سطح پر وہ ۳ر۳۳ فی ہزار تھی ۔

یہ امر بھی مشاہدے میں آیا کہ ان پراجیکٹوں کے علاقوں میں اسکول جانے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور ادھوری تعلیم چھوڑنے والے بچوں کی تعداد میں کمی ہوئی ۔

"بی سی جی" ۔ "ڈی پی ٹی" اور پولیو کے ٹیکے لگانے کا کام ۶۰ فیصد یا اُس سے زیادہ سطح پر پہونچ گیا جو کہ اُن علاقوں کے مقابلے پر بہت زیادہ ہے جہاں یہ پروگرام لاگو نہیں ہے ۔

ان سات برسوں میں اسکولی عمر کے قبل کے بچوں میں وٹامن "اے" ۔ "آئرن" اور "فولک ایسڈ" کی تقسیم میں بھی کافی اضافہ ہوا ۔ جب کہ اس کے مقابلے میں ان علاقوں میں جہاں یہ پروگرام نافذ نہیں تھے ان اشیاء کی تقسیم بہت کم ہوئی یہی بات بچوں کے صحتی معائنے میں دیکھنے میں آئی ۔

یہ امر بھی باعثِ مسرّت تھا کہ ان سات برسوں میں قبائلی علاقوں میں یہ سہولیات بڑے پیمانے پر بہم پہنچائی گئیں ۔ جہاں پہلے ہمارے کسی قومی پروگرام کا نفاذ کرنا آسان کام نہیں تھا ۔ اب جو کامیابی ہوئی ہے اُس کے پیشِ نظر مستقبل میں قبائلی علاقوں، درجِ فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے بلاکوں، پسماندہ اور خشک سالی کا شکار ہونے والے علاقوں میں اس پروگرام کے نفاذ پر زور دیا جائے گا ۔

ان علاقوں میں ان سہولیات کی بہتر بہم رسانی کا عورتوں پر اچھا اثر پڑا اور انھوں نے خاندانی بہبود کے پروگرام میں تعاون دیا جس کے نتیجے میں شرح پیدائش میں کمی ہوئی ۔

ان سات برسوں میں زچگی کے دوران اور بچہ ہونے کے بعد بھی کافی سہولیات بہم پہنچائی گئیں جو ان علاقوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھیں جہاں یہ پروگرام نافذ نہیں ہے ۔ یہ سہولیات تربیت یافتہ عملے کے ذریعے فراہم کی گئیں ۔

ایک حوصلہ افزا پہلو یہ تھا کہ ان پراجیکٹوں میں علاقوں کے لوگوں نے بھی حصہ لیا ۔ انھوں نے بعض حد تک عمارتی سامان، لیبر اور خوراک کی صورت میں تعاون دیا ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماؤں کو اس پروگرام کے بارے میں بھاری جانکاری اور صحت و غذائیت سے متعلق بچوں کی ضروریات کا احساس ہو گیا ہے ۔

اس پروگرام کا ایک اور مسرت انگیز پہلو یہ ہے کہ میڈیکل کالجوں کے معلّموں نے سروے اور تحقیق و تربیت کے پروگراموں میں سرگرمی سے شرکت کی ہے پتہ چلا ہے کہ آجکل ۲۰ میڈیکل کالجوں کے ۰ہ اعلیٰ معلّم "آئی سی ڈی ایس" کے سرگرم مشیروں کے طور پر کام کر رہے ہیں ۔ اس کے علاوہ ہوم سائنس کالجوں کے معلّم بھی زیادہ سے زیادہ تعاون دے رہے ہیں ۔

کوئی ۲ لاکھ ۲۰ ہزار خواتین جنھیں بچوں کی بہتر اور نگہداشت کا علم ہے ۔ جُزوی وقت کے لیے اعزازی کارکنوں کے طور پر کام کر رہی ہیں ۔ ان میں سے زیادہ تر کم آمدنی والے گروپوں سے تعلق رکھتی ہیں ۔

تجربوں سے پتہ چلا ہے کہ یہ پروگرام انسانی وسائل کو فروغ دینے کا بڑا ذریعہ ہے ۔ چند ماہ پہلے زچہ و بچہ کی صحتی سہولیات سے متعلق ایک بین الاقوامی کانفرنس ہوئی تھی جس میں ایشیا، چین، مشرقی یورپ، مغربی یورپ اور چند بین الاقوامی ایجنسیوں کے نمائندوں نے شرکت کی تھی ۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ بھارت واحد ملک ہے جس نے خواتین اور بچوں کی ترقی

(باقی صفحہ ۴۶ پر)

ایم ۔ کے ۔ رستوگی

ہندوستان میں کھیلوں کا فروغ

دسویں ایشیائی کھیل ستمبر میں سیول (جنوبی کوریا) میں منعقد ہوئے۔ بھارت نے ان میں شرکت کے لیے ۳۹۰ کھلاڑیوں کی ٹیم بھیجی تھی۔ بین الاقوامی میچوں اور کھیلوں میں حصہ لینے والے کھلاڑی اچھے کھیل کا مظاہرہ کرکے جہاں خود شہرت حاصل کرتے ہیں وہ اپنے ملک کے وقار کو بھی چار چاند لگاتے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں بتایا گیا ہے کہ اچھے کھلاڑی کیسے تیار ہوتے ہیں اور حکومت ملک میں کھیل کود کی حوصلہ افزائی کے لیے کیا اقدامات کر رہی ہے۔

زندگی میں کھیل کود کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کھیل کود نہ صرف تفریح کا ذریعہ ہیں بلکہ جسمانی و دماغی نشوونما کے لیے بہت ضروری ہیں۔ حصولِ آزادی کے بعد حکومت مالی امداد، تربیتی انتظامات وغیرہ کے ذریعے کھیل کود کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۸۴ء کو کھیل کود کے پرانے محکمے کو نوجوانوں اور کھیل کود سے متعلق محکمہ کا نام دیا گیا۔ لہٰذا اس محکمے کا کام کھیل کود کے فروغ کے علاوہ نوجوانوں کے لیے ایسے پروگرام مرتب کرنا اور زیر عمل لانا ہے جن سے نوجوانوں کی شخصیت کو بہتر بنایا جا سکے، ان کی صلاحیتوں کو جلا دی جا سکے اور انھیں قومی تعمیر کے عمل میں شریک ہونے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔

کھیل کود سے متعلق قومی پالیسی

حکومت نے کھیل کود کے فروغ کے لیے ایک قومی پالیسی مرتب کی ہے جس کی نقول ۲۱ اگست ۱۹۸۴ء کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں پیش کی گئیں۔ اس پالیسی کے اغراض و مقاصد درج ذیل ہیں:-

۱۔ گاؤں اور شہروں میں کھیل کود اور جسمانی تربیت کی بنیادی سہولیات کا اہتمام کرنے کے لیے ضروری اقدامات کی فہرست تیار کرنا۔

۲۔ کھیل کود کے میدانوں اور کھلی جگہوں کو درست حالت میں رکھنے کا انتظام کرنا۔

۳۔ کھلاڑیوں کے لیے (جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں) غذائیت بخش خوراک کی فراہمی کو یقینی بنانا۔

۴۔ چھوٹی عمر میں ہی ہونہار کھلاڑیوں کی شناخت اور پھر ان کی بہتر تربیت۔

۵۔ اسکولوں اور دیگر سرکاری اداروں میں کھیل کود اور جسمانی تعلیم و تربیت کو تعلیم کا ایک لازمی جزو بنانا۔

۶۔ کھیل کود میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والوں کی حوصلہ افزائی۔

۷۔ کھیل کود کی تنظیمیں قائم کرنا۔

۸۔ روزگار کے معاملے میں کھلاڑیوں کا خاص خیال رکھنا۔

۹۔ کھیل کود کی حوصلہ افزائی کے لیے رضاکار تنظیموں سے تعاون۔

۱۰۔ قومی کھیل فیڈریشن وغیرہ کے ذریعے

بین الاقوامی مقابلوں میں حصہ لینے والی قومی ٹیموں کی تیاری کے لیے مؤثر پروگرام روبہ عمل لانا۔

۱۱۔ ایسے کھیلوں کے مقابلوں کا اہتمام کرنا، جن کے لیے عالمی فیڈریشن بنے ہوئے ہیں اور جو اولمپک، ایشیائی اور کامن ویلتھ کھیلوں میں شامل کئے جاتے ہیں۔

۱۲۔ مرد اور عورت کھلاڑیوں کو کھیل کا سارا ساز و سامان مہیا کرنا۔

۱۳۔ کھیل کود کو بڑھاوا دینے والے غیر سرکاری تنظیموں کی حوصلہ افزائی کرنا۔

۱۴۔ کھیلوں اور جسمانی تعلیم کے بارے میں ریسرچ کی حوصلہ افزائی۔

۱۵۔ ملک میں کھیلوں کے بارے میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ذرائع تشہیر و اشاعت کا استعمال۔

دیہی کھیل کود اسکیم

حکومت نے ملک بھر میں کھیل کود کے دیہی مقابلے کروانے کی اسکیم ۷۱-۱۹۷۰ء میں شروع کی تھی۔ اس اسکیم کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو یہ کہ دیہی علاقوں کے نوجوانوں کو بڑی تعداد میں کھیل کود کے قومی دھارے میں شامل کرنا اور دوسرے اچھے کھلاڑیوں کو چننا اور انھیں تربیت دینا۔ آج کل اس پروگرام میں ہر سال ۱۱ لاکھ سے زیادہ نوجوان حصہ لیتے ہیں۔ کھیلوں کے مقابلے ریاستی حکومتیں اور مرکزی نظم و نسق کے علاقوں میں وہاں کے انتظامیہ، تعلقہ، بلاک اور ضلع کی سطح پر منعقد کرواتے ہیں۔ حکومت اس کے لیے ضروری مالی امداد فراہم کرتی ہیں۔

ہونہار کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی

ہونہار کھلاڑیوں کا پتہ لگانے اور انھیں وظیفے دینے کی ایک اسکیم ۷۱-۱۹۷۰ء میں شروع کی گئی تھی۔ اس کے تحت قومی اور ریاستی سطح کے مقابلوں کی بنیاد پر ہر سال ۴۰۰ قومی سطح کے اور ۸۰۰ ریاستی سطح کے وظائف دینے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

خواتین کے لیے کھیل کود کے مقابلے

خواتین کے قومی کھیل سب سے پہلے ۱۹۷۵ء میں منعقد کئے گئے۔ ان کا اہتمام نیتاجی سبھاش قومی کھیل کود تنظیم کرتی ہے۔ قومی کھیلوں سے قبل ریاستی حکومتیں بلاک، ضلع اور ریاست کی سطح پر کھیلوں کے مقابلے منعقد کرتی ہیں۔ ریاستی حکومتوں کو ان کے لیے ۲۰۰ روپے فی بلاک، ۳۰۰ روپے فی ضلع کی شرح سے امداد دی جاتی ہے۔ بڑی ریاستوں کے لیے امداد کی شرح دس ہزار روپے اور چھوٹی ریاستوں کے لیے پانچ ہزار روپے ہے۔ اس اسکیم کے تحت مرکزی حکومت ریاستی سرکاروں کو دیہی علاقوں میں کھیل کود کے مراکز کھولنے، ریاستی سطح کے سالانہ تربیتی کیمپ لگانے، مستقل نوعیت کا کھیلوں کا سامان خریدنے اور اسٹیڈیم وغیرہ تعمیر کرنے کے لیے مالی امداد فراہم کرتی ہے۔ یاد رہے کہ کھیلوں کا موضوع ایک ریاستی موضوع ہے مگر مرکزی حکومت کھیلوں کے فروغ کی مختلف اسکیموں کے لیے ریاستوں کو مالی امداد مہیا کرتی رہتی ہے اور مرکزی و ریاستی اقدامات میں تال میل قائم رکھتی ہے۔

کھیلوں کا معیار بہتر بنانے کے اقدامات

کھیلوں کا معیار بلند کرنے کے لیے اعلیٰ درجے کے کوچ (استاد) تیار کرنے کی ذمہ داری نیتاجی سبھاش کھیلوں کی قومی تنظیم کو سونپی گئی ہے۔ یہ تنظیم ریاستی حکومتوں اور ریاستی کھیل فیڈریشنوں کے تعاون سے ریاستی راجدھانیوں اور دوسرے شہروں میں کھیل کود کے علاقائی تربیتی مراکز کے ذریعے قومی تربیتی اسکیم بھی چلا رہی ہے۔ اس تنظیم کے کلکتہ، اور بنگلور میں واقع مراکز میں قابل تربیت کاروں کو مختلف کھیلوں کی تربیت کے لیے ایک باقاعدہ نصاب چلایا جاتا ہے۔ اس تنظیم میں ۸۰۰ کوچ (تربیت کار) ہیں۔

کوہ پیمائی

اگرچہ بھارت میں کھیل کے طور پر کوہ پیمائی اُنیسویں صدی میں شروع ہوئی تاہم ہمالیہ کلب کا قیام ۱۹۲۷ء میں عمل میں آیا لیکن بطور کھیل کوہ پیمائی کی اصل ابتدا اس وقت ہوئی جب ۱۹۵۳ء میں ایک ہندوستانی تینزنگ نارگے نے سر ایڈمنڈ ہلیری کے ساتھ ایورسٹ کی چوٹی سر کی۔ اس کے بعد ہی دار جلنگ میں ہمالیئن ماؤنٹیرنگ فاؤنڈیشن قائم کی گئی۔ اس فاؤنڈیشن کے اہم مقاصد ہیں کوہ پیمائی، اسکینگ، چٹانوں پر چڑھنے اور ٹریکنگ وغیرہ کی مہمیں منظم کرنا اور ان کے لیے امداد فراہم کرنا ہیں۔ یہ فاؤنڈیشن کوہ پیمائی کے لیے تربیت بھی دیتی ہے اور منتخب کوہ پیماؤں کے لیے خصوصی تربیت کے کیمپ لگاتی ہے۔ یہ غیر ملکی مہموں کی ٹیموں کے پہاڑی چوٹیوں پر چڑھنے کے پروگرام درج کرتی ہے۔ ان پر حکومت کی منظوری دلانے میں مدد دیتا ہے اور تال میل قائم رکھتی ہے۔ یہ فاؤنڈیشن اب تک ۳۶ قومی اور بین الاقوامی مہمیں منظم کر چکی ہے۔ اس کے علاوہ یہ ہندوستانی کوہ پیماؤں کو ان کی نمایاں کامیابیوں پر طلائی تمغے بھی عطا کرتی ہے۔ ۱۹۸۳ء تک ۱۲ کوہ پیما یہ تمغے حاصل کر چکے تھے۔

کھلاڑیوں کی بہبود کا قومی فنڈ

حکومت نے ۱۹۸۲ء میں کھلاڑیوں کے لیے ایک قومی ویلفیئر فنڈ قائم کیا جس کا

مقصد ایسے ممتاز کھلاڑیوں کو جواب کھیل کے
میدان میں سرگرم نہیں اور روزمرہ زندگی میں
مشکلات سے دوچار ہیں، مالی امداد فراہم
کرنا ہے۔

بھارتی اسپورٹس اتھارٹی

۱۶ر مارچ ۱۹۸۴ء کو بھارتی اسپورٹس
اتھارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے فرائض میں
کھیلوں کی ہمت افزائی کے علاوہ ایشیاڈ ۱۹۸۲ کے
لیے تعمیر کیے گئے ڈھانچے اور دیگر سہولیات
کی نگہداشت شامل ہے۔ یکم اپریل ۱۹۸۴ء کو
دہلی کے مندرجہ ذیل اسٹیڈیموں کے بندوبست
اور استعمال کی ذمہ داری اس اتھارٹی کو سونپی
گئی:۔

۱۔ جواہر لال نہرو اسٹیڈیم۔
۲۔ نیشنل اسٹیڈیم۔
۳۔ تغلق آباد شوٹنگ رینج۔
۴۔ تال کٹورہ سوئمنگ پول۔
۵۔ حوض خاص ٹینس اسٹیڈیم۔
۶۔ جمنا ویلوڈروم۔

یہ اتھارٹی میوزیم، آڈیٹوریم، لائبریری اور
کھلاڑیوں کے لیے رہائش کی سہولیات بھی فراہم
کرتی ہے۔

ارجن ایوارڈ

مختلف کھیلوں میں نمایاں کامیابی
حاصل کرنے والے ممتاز کھلاڑیوں (بشمول خواتین)
کی عزت افزائی کے لیے حکومت نے ۱۹۶۱ء میں
ارجن ایوارڈ دینے کی اسکیم شروع کی تھی۔
ارجن ایوارڈ پانے والے کھلاڑیوں کو راشٹرپتی
کانسے کا ایک مجسمہ اور تعریفی سرٹیفکیٹ عطا
کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر ایوارڈ پانے والے
کو ۸۴-۱۹۸۳ء سے پانچ ہزار روپے کی
یکمشت رقم بھی دی جاتی ہے۔ جو ایسے سابقہ
قواعد کے تحت ۲۴ مہینے تک دئے جانیوالے
۲۰۰ روپے ماہانہ کے وظیفے کی جگہ پر ہے۔
ستمبر ۱۹۸۶ء میں سال ۱۹۸۵ء کے
لیے ۱۹ نیشنل کھلاڑیوں کو (جن میں چھ عورتیں ہیں)
ارجن ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا ہے جنکے نام درج
ذیل ہیں:۔

ایتھلیٹکس: آر۔ ایس۔ بل، آشا اگروال،
اور عادل سُمری والا۔ "ہاکی" (مرد) ایم ایم سومیا
"ہاکی" (خواتین)۔ پریم مایا۔
بلیارڈز اور سوکر: گیت سیٹھی۔
ٹینس: آنند امرت راج۔
شوٹنگ: (مرد) اشوک جے پنڈت۔
(خواتین) سومادت۔
وزن اٹھانا: مہر چند بھاسکر۔
جمناسٹکس: سنیتا شرما۔
کشتی: مہاویر سنگھ۔
ٹیبل ٹینس: کملیش مہتہ۔
کرکٹ: (خواتین) شُبھانگی کُلکرنی۔
شطرنج: وشوا ناتھن آنند۔
کھو کھو: سُریکھا بھگوانی کُلکرنی۔
کوہ پیمائی: پھوڈورجی۔
تیراکی: تارا ناتھ نارائن شینوئے۔
ایڈوینچر اسپورٹس: گلشن رائے۔

راشٹرپتی یہ ایوارڈ بعد میں منعقد
کی جانے والی ایک خصوصی تقریب میں عطا
کریں گے۔

●

بقیہ تجربہ گاہ سے کھیت تک

۶۔ مغربی بنگال :	۳۴۰۰
۷۔ ہریانہ :	۴۰۰۰
۸۔ ہماچل پردیش :	۱۹۵۰
۹۔ بہار :	۴۰۰۰
۱۰۔ پنجاب :	۴۱۵۰
۱۱۔ راجستھان :	۵۹۰۰
۱۲۔ کرناٹک :	۴۱۵۰
۱۳۔ گجرات :	۴۴۰۰
۱۴۔ کیرالہ :	۱۹۰۰
۱۵۔ مدھیہ پردیش :	۵۰۰۰
۱۶۔ مہاراشٹر	۴۶۰۰

ان کے علاوہ بقیہ تمام ریاستوں
اور مرکزی حکومت کے زیر انتظام ریاستوں میں
ہیں۔ اس دور کے پروگرام کی خوبی یہ ہے کہ
اس میں بھارتی کرشی انوسندھان پریشد کے
ماتحت سبھی تحقیقی ادارے اور تجربہ گاہیں،
سبھی زرعی یونیورسٹیاں اور ان کے علاقوں کی
تجربہ گاہیں اور خود مختار ترقیاتی ادارے
متحد ہو کر اس منصوبے کو موثر اور کامیاب
بنانے میں منہمک ہیں۔ سبھی ثقافتی اور مفید
تکنیکی طریقوں کو منطقاتی رابطہ آفیسران کے ذریعہ
یکجا کیا گیا ہے۔ جن کی سفارش ملک کے سبھی
تحقیقی اداروں نے کی ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات
ہے کہ اس بار ملک کے چھوٹے اور حاشیائی
کسان اور بے زمین زرعی مزدور کشمیر سے لے کر
کنیا کماری تک زرعی سائنسداں اور تکنیکی آفیسران
سے مربوط ہو گئے ہیں۔ اس پروگرام کی کامیابیاں
ظاہر ہو رہی ہیں کیوں کہ اس پروگرام سے ایسے
کاشتکار بھی متاثر ہوئے ہیں جو اس کے احاطے
باہر ہیں۔ پروگرام میں منتخب خاندانوں کا پورا تعاون
مل رہا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی یہ غریب اور
پسماندہ کسانوں کے حق میں مفید ہوگا۔

●

سردار احمد (علیگ)

جواہر لال نہرو کی عظمت کا راز

بڑی شخصیات کی عظمت کا راز کسی ایک بات یا ایک پہلو میں پوشیدہ نہیں ہوتا بلکہ ان کے اپنے افکار و خیالات، تجربات و مشاہدات اور اخلاق و عمل کے تمام نظام اور عوامل ایک دوسرے میں مل جل کر اسے اپنے وقت کے انسانوں سے بلند اور عظیم بننے میں مدد دیتے ہیں پھر بھی کسی شخصیت اور ذات کے درون خانہ کے محرم ہونے کے دعویٰ کا صحیح ہونا ایک حد تک ناممکن ہے۔ جواہر لال نہرو نئے ہندوستان کے ولولوں، اُمنگوں، آرزوؤں اور جستجوؤں کے مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ گاندھی جی کے آدرشوں کے بہت بڑے رکھوالے تھے۔ انھوں نے نئے ہندوستان میں جمہوریت، سیکولرزم اور عدم تشدد کے جذبہ کو فروغ دینے کے لیے اپنی زندگی کی ساری توانائیاں صرف کر دیں۔

جواہر لال دنیا کو بہتر جگہ اور انسانوں کو بہتر انسان بنانا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جواہر لال نہرو کی عظمت کا راز ان کے دردمند دل، پُرخلوص انسانیت اور بے لوث خدمت میں پوشیدہ ہے۔ عام ہندوستانی کے نقطۂ نظر کو جاننے اور سمجھنے کے لیے جواہر لال نہرو ہمیشہ ان کی باتیں اور ان کی رائیں بڑے غور سے سُنتے تھے۔ نہرو جی کے بدن کی مالش کرنے کے لیے مسٹر اپچ۔ کچھوا ہا ہر صبح وزیر اعظم کی رہائش گاہ پر آتے تھے۔ ان کا یہی بیان ہے کہ تیس منٹ تک مالش کے وقفہ میں نہرو جی سُنتے زیادہ تھے اور خود انتہائی کم بولتے تھے۔ نہرو جی عوام کا ردِ عمل سرکاری پالیسیوں کے متعلق دریافت کرتے تھے۔ کبھی کبھی مسٹر کچھوا ہا بتلاتے ہوئے ہچکچاتے تھے، لیکن جواہر لال نہرو اپنے تئیں بہت سے سوالات کا روزانہ جواب معلوم کرنے کے متمنی رہتے تھے۔ مسٹر کچھوا ہا نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ صبح وہ پانچ بجکر تیس منٹ پر آجاتے تھے کیونکہ وقت کی پابندی نہرو کی زندگی میں ایک قدر اوّل تھی۔ وہ نہرو جی کو ہمیشہ پہلے سلام کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن کبھی ایسا موقع نہ مل سکا کیونکہ نہرو جی ہی سلام میں سبقت لے جاتے تھے۔ ایک دن مالش کے دوران نہرو جی پر کچھ غنودگی طاری ہوگئی اور وہ سو گئے۔ دس منٹ کے اندر وہ نیند سے اچانک بیدار ہو کر اُٹھے اور وقت دریافت کیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ دس منٹ لیٹ ہوچکے ہیں تو انھیں اس قدر افسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی کوئی نہایت قیمتی شئے گُم ہوگئی ہو۔ فرمانے لگے کچھوا ہا! تم نے مجھے کیوں نہیں جگایا؟ اب آج دن بھر میرے ہر کام میں دس منٹ کی تاخیر ہو جائے گی۔"

جواہر لال سے قربت رکھنے والے خواہ غریب ہوں یا امیر ہمیشہ اس بات کے خواہش مند ہوتے کہ ان کے گھروں کی تقریبات میں نہرو جی ضرور موجود ہوں۔ وزیر اعظم کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل کام ہوتا ہے پھر بھی جواہر لال ہی دوسروں کا دل رکھنے کی خاطر ان کی اس خواہش کو ضرور پوری کرتے تھے۔ اسی قسم کی ایک تقریب جس میں نہرو جی شریک تھے، کا حال میرے علم میں ہے۔ مسلم گھرانہ تھا۔ اندر پردہ نشین عورتوں کا اصرار ہوا کہ جواہر لال جی اندر ان کے درمیان بھی تشریف لائیں۔ نہرو جی سفید شیروانی جس میں گلاب کا پھول کھلا ہوا تھا اور چوڑی دار پاجامہ میں اپنی شخصیت کی تابانی کے ساتھ چند بزرگ خاندان کے ہمراہ جب اندر جانے لگے تو گھر کے بہت سے نوجوان لڑکے بھی آگے چل پڑے۔ نور السلام نامی ایک طالب علم جو اندرونی دالان کے ستون کے پاس کھڑا تھا، اپنے کُرتے میں آستین کے پاس کا پھٹا ہوا حصّہ چُھپانے کی کوشش کر رہا تھا کہ نہرو جی کی نگاہ اس پر پڑی۔ نہرو جی اچانک مُڑتے ہوئے اس نوجوان طالب علم کے پاس پہنچے اور کُرتے کی اس چیر کو اپنی انگلی سے ذرا سا اور پھاڑ دیا اور بولے صاحبزادے طالب علمی کے دور میں پھٹے کپڑوں سے شرمایا نہیں کرتے۔"

جواہر لال جی کا دل درد کا خزانہ تھا۔ وہ کسی کی موت، کسی کے غم، کسی کے دکھ کی تاب نہ لا پاتے تھے۔ اور رو پڑتے تھے۔ میں بارہ بنکی میں انٹر کا طالب علم تھا جب رفیع احمد قدوائی صاحب کے گھر بغرض تعزیت جواہر لال جی مسولی تشریف لائے۔ قدوائی صاحب کے انتقال کے وقت نہرو جی چین کے دورہ پر تھے۔ وہیں انھوں نے اپنے عزیز ترین ساتھی کی وفات کی خبر سُنی اور اخبارات کی رپورٹ کے مطابق ان پر کئی منٹ تک سکتہ سا ہوگیا اور وہ غم کی شدّت سے کچھ بول نہ سکے۔ چین سے واپسی پر وہ مسولی (ضلع بارہ بنکی) بیگم قدوائی صاحبہ کے پاس تعزیت کو پہنچے۔

وہ منظر مجھے آج تک یاد ہے کہ جس طرح نہرو جی، قدوائی صاحب مرحوم کی قبر کو دیکھ کر رو پڑے تھے۔ اور آبدیدہ و غمگین حالت میں گھر کے اندر لے جائے گئے جہاں قدوائی صاحب مرحوم کی بیگم نے انھیں ان کے مرحوم دوست کا ایک فونٹین پین بطور یادگار دیا تھا۔ نہرو جی نے جن کلمات میں قدوائی صاحب کے متعلقین کو تعزیت پیش کی اور جس طرح تسلّی دی، اس کی تفصیل کی اس مختصر مقالہ میں گنجائش نہیں لیکن اتنا ضرور لکھوں گا کہ انھوں نے جو کچھ کہا تھا وہ سب کا سب عملی طور پر پورا کر دکھایا اور قدوائی صاحب کی بیگم صاحبہ کا بعد میں ہر طرح کا خیال رکھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جواہر لال جی کو ان حضرات کا بھی بہت خیال رہتا تھا جو ان کے والد محترم پنڈت موتی لال نہرو سے کسی نہ کسی طرح قریب رہ چکے تھے۔ اخلاق کی یہ خاص صفت بہت بڑی شخصیات میں ہی پائی جاتی ہے۔

جواہر لال نہرو کے بارے میں یہ سبھی کو معلوم ہے کہ وہ بڑے نظم و ضبط کے انسان تھے۔ اپنے اسٹاف کے لوگوں سے ان کی سختی سے تاکید تھی کہ وہ لوگ کسی کھیل تماشہ سرکس یا سینما کے پاس نہ منگوائیں اور بغیر ٹکٹ خریدے ہوئے نہ جائیں۔

جواہر لال نہرو جب بھی مُلکی یا غیر مُلکی دَورے سے واپس ہوتے۔ ان کے ساتھ تحائف اور کھانے پینے کی چیزیں کافی آتی تھیں لیکن وہ انھیں اپنے اسٹاف میں تقسیم کر دینے کے عادی تھے۔ ان کے ریسپشنسٹ ماسٹر مدن موہن نے بتایا کہ ایک بار ایسے ہی موقع پر ان کے حصّے میں دو انگور آئے تھے۔

نہرو جی نے ایک مفکّر کا دماغ ایک سنت کا دل پایا تھا۔ میرے نزدیک سیاست میں ان کو حالات اور ملکی تقاضے کھینچ لائے تھے لیکن وہ اپنی فطرت کی معصومیت اور بھولے پن سے بعض اوقات ان سیاسی جھمیلوں سے دُور رہنا پسند کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ضرورت مند غریب کا کام فوراً ہو جائے۔ اس سلسلے میں بہت سی مثالیں اور واقعات مختلف اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ انھیں لال فیتہ شاہی نظام سے سخت نفرت تھی۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ گاندھی جی کی یہ آرزو پوری ہو کر کسی ہندوستانی کی آنکھوں میں دُکھ کے آنسو نہ نظر آئیں۔ بعض اوقات وہ اپنے اہم اور ضروری کاموں کو چھوڑ کر غریب کی بات سُنتے اور اس پر فوری حکم دیتے تھے۔ مسٹر مکر جی جو ایسے لوگوں کو نہرو جی سے ملوانے پر مامور تھے، بتاتے ہیں کہ ایک بار ایک بوڑھی غریب عورت اپنی بپتا نہرو جی کو سُنا رہی تھی۔ اس کی بات اتنی طویل ہوئی کہ بیچ میں ایک افسر نے نہرو جی کو یاد دلایا کہ انھیں کسی جگہ پہنچنا ہے کہیں دیر نہ ہو جائے۔ نہرو جی فوراً بولے "تمھیں غریب کا احساس نہیں ہے"۔ انھوں نے پوری توجہ سے اس بوڑھی عورت کی بات سُنی۔ اسے تسلّی دی، اور وعدہ کیا کہ اس کی شکایت دُور کی جائیگی۔

کانپور میں ایک بار نہرو جی کے ایک جلسہ میں میں بھی موجود تھا جس میں دورانِ تقریر انھوں نے دو ایسی باتیں بھی کہی تھیں جو میرے ذہن میں اب بھی محفوظ ہیں اور جن سے نہرو جی کا مزاج سمجھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ آج کل ہندوستان میں مذہبی فرقوں میں لڑائی کا سبب روحانیت کا فقدان ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کانپور چھاؤنی میدان کے اس جلسۂ عام میں جب نہرو جی نے "روحانیت" کا لفظ اپنی زبان سے ادا کیا تو انھیں احساس ہوا کہ اس کے معنی شاید حاضرینِ جلسہ نہ سمجھ سکے ہوں اس لیے انھوں نے ڈائس پر پیچھے بیٹھے ہوئے حضرات سے اس کی ہندی دریافت کی۔ کسی نے کچھ بتایا جسے سُن کر نہرو جی نے فوراً مائک پر کہا کہ روحانیت کے معنی سب سمجھتے ہیں اس کے لیے بہت مشکل لفظ کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی تقریر میں نہرو جی نے کہا تھا کہ جہاں پیسہ کی فراوانی ہوتی ہے وہاں فنون اور اقدار کا زوال ہو جاتا ہے۔

نہرو جی کے باورچی مسٹر جیمس نے نہرو جی کے انتقال کے بعد انکشاف کیا کہ جواہر لال جی کو سادہ غذائیں بہت پسند تھیں۔ باجرہ، جوار اور جَو کی روٹی میں گُڑ ملا کر کھانا ان کی محبوب چیز تھی۔ وہ اپنے غیر مُلکی مہمانوں کے سامنے بھی یہ چیزیں کھاتے اور انھیں بھی ان کا مزہ چکھنے کے لیے کہتے تھے۔ صبح کے ناشتہ میں وہ صرف ایک سلائس، ایک انڈہ اور ایک پیالی کافی ہی پر اکتفا کرتے تھے۔ وہ اپنے کھانے کے اوقات کے سختی سے پابند تھے۔ اگر کسی وجہ سے کسی کھانے کا وقت نکل جاتا تو نہرو جی بے وقت کھانے پر نہ کھانے کو ترجیح دیتے تھے۔ جیمس کا بیان ہے کہ جب وہ بازار سے کوئی سامان لے کر واپس ہو رہا ہوتا تھا اور جواہر لال جی اپنی کار سے اسے دیکھ لیتے تھے تو فوراً کار رُکوا کر جیمس کو بٹھا ضرور لیتے تھے۔ ایک بار جیمس کو دل کے دَورہ میں مُبتلا ہونے پر رُخصت لینی پڑی۔ جب وہ اپنی رخصت کے خاتمہ پر واپس آیا نہرو جی نے اس کی بیماری کے پیشِ نظر زینہ چڑھنے کی ممانعت کر دی اور کہا کہ وہ اب آئندہ سے اس لفٹ کا استعمال اوپر جانے کے لیے کرے جو نہرو جی کے لیے مخصوص تھی۔ جیمس نے یہ بھی بتایا کہ نہرو جی نے کبھی اس کا نام لے کر نہ پکارا بلکہ ہمیشہ اسے بھائی کہتے تھے اور اس کی ماں کو ماں جی کہہ کر مخاطب ہوتے تھے۔ اس کے بچوں سے نہرو جی کھیلتے بھی تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں سے ان کو بے پناہ محبت تھی۔ ان کے لیے وہ بچوں کی سائیکل چلاتے اور انھیں کبھی اپنی پیٹھ پر بٹھا کر ان کے لیے گھوڑا بن کر چلتے۔ تین مورتی کا اسٹاف اپنی آنکھوں سے یہ مناظر دیکھتا کہ بچوں کے درمیان کتنا بڑا انسان بچہ بنا ہوا ہے۔

نہرو جی کے ڈرائیور رانا سنگھ چوہان اور دوسرے اسٹاف ممبر جو مختلف سفروں اور دَوروں میں وزیر اعظم کے ہمراہ ہوتے تھے، کا کہنا ہے کہ نہرو جی اپنے ناشتہ اور کھانے سے قبل یہ معلوم کر لیتے تھے کہ ان کے نوکروں اور اسٹاف ممبران کو بھی کھانا مل چکا ہے یا نہیں۔ بعض افسران جو اپنے نوکروں سے تُرشی اور سختی سے پیش آیا کرتے تھے اور انھیں کمتر مخلوق ہی سمجھتے تھے، نہرو جی کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے رویّہ میں بھی تبدیلی کیلئے آمادہ ہوتے تھے۔

عادل صدیقی

اندرا گاندھی
اپنی تقریروں کے آئینے میں

جو شخصیت ملک کے ۷۰ کروڑ عوام کی نیّا کی کھیون ہار تقریباً بیس برس تک بنی رہی ہو اس کے متعلق یہ سوچنا کہ آج وہ ہم میں نہیں، بہت مشکل ہے، ذہن کو اس بات کے لیے آمادہ کرنا بے حد دشوار ہے کہ یہ عظیم شخصیت ہم کو خیرباد کہہ چکی ہے۔ یہ خیال اور یہ تصور آنکھوں کے سامنے اندھیرا لے آتا ہے لیکن ہوش وحواس کو مجتمع کرکے جب ذرا غور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس تلخ حقیقت کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ مسز گاندھی نے زندگی کے ہر گوشے پر اپنی چھاپ چھوڑی ہے۔

مسز اندرا گاندھی محض ایک ذات کا ہی نام نہیں بلکہ وہ ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت تھیں جنھوں نے اپنے مقدس خون کے ایک ایک قطرے کو ملک و قوم کی خدمت کے لیے وقف کیا اور پوری نوعِ انسانی کو ایسے افکار و خیالات سے نوازا جو رہتی دنیا تک بھٹکے ہوؤں کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ انھوں نے زندگی بھر نفرت و تشدد کے خلاف جدوجہد کی۔ ان کے دل میں انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ شریمتی اندرا گاندھی نے نہ صرف سوامی وویکانند، مہاتما گاندھی، راجہ رام موہن رائے اور جواہر لال نہرو کے افکارِ عالیہ سے استفادہ کیا بلکہ اُنھوں نے مغربی مفکّرین کے خیالات سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔ ان کی شخصیت مشرق اور مغرب کا حسین امتزاج تھی۔ عالمی سطح پر ان کی برتری کا سبھی کو اعتراف تھا۔ انھوں نے نوعِ انسانی کی جس طرح خدمت کی آنے والی نسل اس پر فخر کیا کرے گی۔

ذیل میں چند اقوال ان کی تقریروں سے ماخوذ ہیں۔ جو اُن کی بلند و بالا شخصیت کا پرتو ہیں۔ اُن سے اُن کی وسیع النظری اور بین اقوامی نقطۂ نظر کی ایک جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔

رنجیت سنگھ

۱۷ دسمبر ۱۹۸۰ء کو شریمتی اندرا گاندھی نے نئی دہلی میں رنجیت سنگھ فنونِ لطیفہ کا مُربّی' نامی کتاب کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ :-

ہم یہاں اس لیے اکٹھا ہوئے ہیں تاکہ ہم اپنی قومی تاریخ کی ایک نمایاں اور اہم ترین شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرسکیں۔ وہ ایک سپاہی بھی تھے اور ایک سیاستداں بھی جنھوں نے ۲۰۰ سال قبل اس سرزمین پر جنم لیا۔ ان کی یاد مستقبل میں بدستور جاری رہے گی۔ وہ کوہِ نور ہیرا پہنتے تھے۔ اگرچہ یہ قیمتی ہیرا ہمارے ملک میں نہیں رہا لیکن رنجیت سنگھ ہماری تاریخ میں ایک چمکتے ہوئے ہیرے کے مانند ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ وہ اپنی ہمت، وسائل سے استفادے کی قوت، سوجھ بوجھ اور عوام کو ایک رشتہ میں منسلک کرنے کی صلاحیت کے لیے مشہور رہے ہیں۔

قومی یک جہتی

وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۳ نومبر ۱۹۸۰ء کو نیشنل انٹیگریشن کونسل کے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا :-

آج ہم ایک بُحرانی دَور میں زندگی گزار رہے ہیں۔ دُنیا کے مختلف حصوں میں اس بحران کی مختلف شکلیں ہیں۔ کہیں جنگ ہے، کہیں داخلی انتشار ہے، کہیں سیاسی و رُوحانی بے چینی ہے۔ آج کا دَور ایک ایسا دَور ہے جبکہ کھُلی جنگ کی بجائے سیاسی مداخلتیں ہوا کرتی ہیں۔ آج دنیا میں ایسی طاقتیں برسرِ کار ہیں جو ہماری کسی بھی کمزوری کا ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہیں گی۔ خاص کر موجودہ نازک دَور میں اسکا اور بھی خطرہ ہے۔ بہت سے ممالک میں انتشار پسندانہ قوّتوں کو باہری ایجنسیوں اور وسائل سے مدد ملتی ہے۔ اکثر مجھ سے کہا جاتا ہے کہ میں ان غیر ملکی مفادات کی نشاندہی کروں جو کہ مداخلت کر رہے ہیں۔ اس طرح کے افراد یا طبقات پر اُنگلی رکھنا ہمیشہ ممکن نہیں۔ یہاں یہ بتانا بہت دشوار ہے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ اَور مقامات پر یہ دشوار ہے لیکن متعدد بار وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسی شہادتیں مل جاتی ہیں کہ کس طرح کی مداخلت کی جاتی رہی ہے۔ میں یہاں یہ بات اس لیے نہیں کہہ رہی ہوں کہ ایسا کہنے سے میری مراد

ہے کہ ہمارے فرقہ وارانہ یا ذات پات کے جھگڑے
یا لسانی تحریکیں باہری طاقتوں کے اشارے پر
چل رہی ہیں ۔ نہ میں نے، نہ وزیر داخلہ نے مرادآباد،
علیگڑھ اور دیگر واقعات کے لیے بیرونی طاقتوں
کو الزام دیا ہے ۔ اگرچہ کچھ اخبارات اور کچھ طبقے
بار بار یہی کہتے ہیں کہ میں نے ایسا کہا ہے۔ لیکن اس
میں کوئی شبہ نہیں کہ کوئی بھی دنگا ہندوستان کو کمزور
کردے گا اور ایسے طبقے بھی ہوں گے جو ان جھگڑوں
کا فائدہ اٹھائیں گے اور ان سے اپنا اُلو سیدھا کریں گے
زیادہ تر جھگڑے معمولی بھڑا فزا دیا کبھی کبھی صرف ایک فرد واحد
کی دین ہوتی ہے لیکن عدم اعتمادی اور تنگ نظری
اور تعصب کی پھیلتی ہوئی فضا میں نیز ذات پات،
مذہب اور زبان کی حدود میں محصور ہونے کے سبب
شخصی جھگڑے، طبقاتی جنگ میں بدل جاتے ہیں۔
اور فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔

غیر معمولی اعزاز

۱۳ر نومبر ۱۹۸۱ء کو پیرس کی یونیورسٹی
نے شریمتی اندرا گاندھی کو ڈاکٹر آف لاز کی ڈگری
دی ۔ اس موقع پر انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ:
میرے لیے فرانس میں ہونا ایک فخر کی بات
ہے ۔ یہ وہ سرزمین ہے جو آزادی کا گھر ہے ۔ جو نوع
انسانی کی سائنسی، جمالیاتی اور فلسفیانہ تحقیق و
تجسس کا سرچشمہ ہے ۔ پیرس یونیورسٹی سے ڈگری
پانا ایک غیر معمولی اعزاز ہے ۔ کیوں کہ یہ یونیورسٹی
دانشورانہ مہم جوئی اور اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے
مترادف ہے ۔ اس اعزاز کو میں صرف ذاتی اعزاز
ہی نہیں سمجھتی بلکہ یہ اس ثقافت و تمدن کی عزت افزائی
ہے ۔ جس سے میرا تعلق ہے۔
...... تعلیم جس کا مقصد ابتدا میں یہ تھا کہ
فرد زندگی کی عملی ضرورتوں کو پورا کر سکے ۔ اکثر عدم توازن
کا سبب بنتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے صلاحیت پر
زیادہ زور ہوتا ہے، ہم آہنگی پر کم ۔ تعلیم یافتہ افراد
مذکورہ ہر دو صلاحیتوں کو حاصل کرنے میں ناکام رہتے
ہیں۔ ایک طرف سائنس کی ترقی ہے اور دوسری طرف
خدمتِ انسانی کی عظیم تر مُہم لیکن انسان کی شخصیت
میں ان دونوں کا حسین تر امتزاج نہیں ملتا ۔ جوں
جوں علم فروغ پاتا ہے، اسی سے انسان کو یہ واضح
ہوتا ہے کہ اس کے پاس سیکھنے کو بہت کچھ باقی
ہے اور وہ انتہائی کم علم ہے ۔ علم کی توسیع چھان
بین اور انتخاب کے عمل کا تقاضہ کرتی ہے مگر ہم
اس کوشش کے لیے وقت نہیں پاتے بلکہ ہم
صورتِ حالات کو آسان بنانے پر زور
دیتے ہیں۔ عوام افکار و آرا کو خانوں میں بانٹ
لیتے ہیں اور پھر لکیر کے فقیر بن جاتے ہیں۔ سائنس
اور ٹکنالوجی اسی وقت مفید ثابت ہو سکتی ہے
جبکہ اس پر لازمی نگرانی ہو اور اس کا سوچ سمجھ کر
اور سوجھ بوجھ کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ چنانچہ
مُہلک نیوکلیر ہتھیاروں کی ذخیرہ اندوزی اس کا
مناسب استعمال نہیں ہے اور اس سلسلے میں یورپ
کو جو تشویش ہے اس میں میں برابر کی شریک ہوں۔
نیوکلیر جنگ کا خطرہ بڑھ رہا ہے۔ اسی طرح ملکوں
کے درمیان بڑھتی ہوئی نابرابری سے بھی خطرہ لاحق
ہے ۔ اس کا مثبت پہلو یہی ہے کہ انسانی شخصیت
کو فروغ دیا جائے۔ انسان کے وجود کی کلیت
اور سالمیت سے ہی روئے زمین کی سالمیت کو
یقینی بنایا جا سکتا ہے ۔

انسانی بقا اور ترقی

۲۳ر جنوری ۱۹۸۲ء کو نئی دلی میں انسانی
بقا اور ترقی کے موضوع پر بین اقوامی یوتھ کانفرنس
سے خطاب کرتے ہوئے شریمتی اندرا گاندھی نے
کہا کہ :-
..... ہم ایک آزاد قوم ہیں۔ ہم تنازعات
کے پُرامن تصفیے میں یقین رکھتے ہیں ۔ اس
سلسلے میں ہم اپنا موقف کسی قیمت پر بدلنے کو
تیار نہیں ۔ البتہ جو لوگ اس کے برعکس نظریات
کے حامل ہیں، ان کے ذہن و افکار کو بدلنے
کے لیے ہم محض کوشش ہی کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے
میں یونیسکو کا منشور ہمارے سامنے ہے جس میں
کہا گیا ہے کہ جنگ انسان کے ذہنوں سے شروع
ہوتی ہے ۔ میرا اس سلسلے میں کہنا ہے کہ امن
انسان کے ذہن سے شروع ہوتا ہے ۔ اگر ہم بھرپور
کوشش سے قیام امن کی کوششوں میں سبھی عوام
کو شریک کریں تو امن کا حصول دشوار نہیں ہے
پوری دنیا میں امن کی تحریکیں چل رہی ہیں لیکن کوئی
بھی ان پر دھیان نہیں دیتا ۔ اس سلسلے کی خبر
اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ضرور ہوتی ہیں
لیکن اگلے ہی روز انھیں بھلا دیا جاتا ہے ۔ مجھے
یقین ہے کہ اس سلسلے میں اگر ایک متحد آواز اُٹھے
تو دنیا اُسے نظرانداز نہیں کر سکے گی اور کوئی
سرکار اس آواز سے صرفِ نظر نہیں کر سکتی۔ کیونکہ
زیادہ تر ممالک میں حکومتیں عوام کی آواز پر
منحصر ہیں ۔ ہم ان کے ووٹوں پر انحصار رکھتے
اگر ووٹ دینے والے چند امور کے بارے میں
کر ایک بات کہیں، تو ہمیں اس پر دھیان دینا
ہی ہوگا ۔ خواہ ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں۔
آج ہمارے سامنے کون سا چیلنج ہے۔
محض جنگ یا غریبی کا ہی چیلنج نہیں بلکہ یہ آج
کے دور کی بڑھتی ہوئی جانکاری اور پھیلتے ہوئے
علم کا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ ہم اس علم کو کس طرح
کارآمد بنائیں۔ اسی جدید علم و فن سے روئے
کو بدل سکتے ہیں۔ یہی سب سے بڑا چیلنج ہمارے
سامنے ہے ۔

مہدی عباس حسینی

اُردو کے فروغ میں

اُتر پردیش کا حصّہ

جب آریہ ہندوستان میں آئے تو گنگا جمنا کا دوآبہ ایک بہت خوبصورت اور زرخیز علاقہ تھا۔ اس لیے آریوں نے وہیں پر ڈیرے ڈال دیے اور نئی نئی بستیاں آباد کرنے لگے۔ ہندو دھرم اور ثقافت کے متعدد مراکز اُتر پردیش میں ہیں۔ شیو کی نگری وارانسی، رام کی جنم بھومی ایودھیا اور کرشن کی بانسری کی میٹھی تانوں سے گونجنے والی متھرا یہیں ہے۔ وارانسی کے پاس واقع سارناتھ میں گوتم بدھ نے دھرم چکر کا آغاز کیا۔ یہیں تلسی داس، سور داس اور کبیر داس کی مدھر آواز گونجی۔ یہیں مغل تہذیب و تمدن کی بیش قیمت یادگار تاج محل ہے اور یہیں ہندو مسلم گنگا جمنی تہذیب کی یادگار لکھنؤ ہے۔

یہ سب باتیں یاد دلانی ضروری ہیں کیونکہ زبانیں جس ماحول میں پیدا ہوتی اور پروان چڑھتی ہیں اور ثقافت جتنی شاندار ہوتی ہے زبانیں بھی اتنی ہی جاندار ہوتی ہیں۔ آج اگر اتر پردیش کی ہندی اور اردو سب سے افضل اور ٹکسالی مانی جاتی ہے تو یہ اُتر پردیش کی تاریخ و ثقافت کی دین ہے۔ اُردو دہلی اور ہریانہ کے میدانوں میں پیدا ہوئی۔ محمّد تغلق کے ساتھ دہلی سے دکن (دیوگری) پہونچی۔ وہاں اسے ایک ادبی شکل ملی۔ ازاں بعد یہ شاہجہاں کے عہد میں پروان چڑھی۔ جب دہلی میں مغل سلطنت کا زوال شروع ہوا تو اُردو کو رامپور، لکھنؤ اور علی گڑھ میں سہارا ملا۔

اُتر پردیش میں اُردو کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ اُردو اور ہندی کے اوّلین شاعر حضرت امیر خسرو (۱۲۵۵ تا ۱۳۲۵) اتر پردیش کے ایٹہ ضلع میں پٹیالی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کا کلام گیت، پہیلیاں اور مکرنیاں آج بھی ہمارے ادب کا سرمایہ ہیں۔ اسی اتر پردیش میں فیض آباد کے قریب کچھوچھا شریف میں شاہ اشرف سمنانی کا مزار ہے جنھوں نے ۱۳۰۸ء میں "رسالہ اخلاق و تصوّف" قلمبند کیا۔ جسے اُردو کا قدیم ترین رسالہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ محمد افضل جھنجھانوی (وفات ۱۶۲۵) نے ایک مثنوی اور ایک بارہ ماسہ چھوڑا ہے۔ آگرہ کے پنڈت چندر بھان براہمن اکبرآبادی (وفات ۱۶۶۲) کی اُردو غزل آج بھی ذوق و شوق سے پڑھی اور گائی جاتی ہے۔

دہلی کے سودا، میر حسن، میر تقی میر، انشاء، مصحفی، رنگین اور غالب جیسے مشہور و معروف شعراء کو دہلی کے تاخت و تاراج ہونے پر لکھنؤ اور رامپور میں پناہ لینے اور پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

اسی طرح اُردو نثر کے جدِّ امجد سر سید احمد خاں بھی دہلی کے رہنے والے تھے لیکن انھوں نے تحریر و تصنیف کا سارا کام بجنور، غازی پور اور علی گڑھ میں کیا۔ چندر بھان براہمن، نظیر اکبرآبادی اور غالب آگرہ میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں انیس، دبیر، آتش، ناسخ، دیا شنکر نسیم، چکبست، صفی، آرزو، عزیز، ظریف، جوش ملیح آبادی جیسے شاعر پیدا ہوئے اور صوبے کے دوسرے حصّوں میں اکبر الٰہ آبادی، حسرت موہانی، فانی، اصغر، جگر، سیماب، ساغر، فراق، روش اور مجاز جیسے شاعر ہوئے۔

نثر نگاروں میں رتن ناتھ سرشار، مولوی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، سجاد حسین، محمد علی، مرزا رسوا، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، قاضی عبدالغفار، پریم چند، علی عباس حسینی جیسے

صاحبِ قلم اور شبلی، سید علی بلگرامی، عبدالستار صدیقی، سید سلیمان ندوی، نیاز فتحپوری، رشید احمد صدیقی، ضیا احمد بدایونی، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، محمد مجیب، ایم با لوسکسینہ، احتشام حسین، اختر علی تلہری جیسے صاحبِ علم و فن اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔

اُردو ادب میں اس وقت تک پانچ اہم ادبی تحریکیں چلی ہیں یہ ہیں — لکھنؤ اسکول، علیگڑھ تحریک، ترقی پسند تحریک، رومانی اسلوب اور تجریدی تحریک۔ لکھنؤ اسکول کا زبان کو شستہ بنانے اور نکھارنے میں اہم کردار رہا ہے۔ جیسے لکھنؤ کی ثقافت میں ایک سلیقہ پایا جاتا ہے، اسی طرح لکھنؤ کی شاعری اور نثر نگاری میں خوش سلیقگی موجود ہے۔ لکھنؤ کے ادباء اور شعراء الفاظ کے صحیح استعمال، رعنایت اور تمثیل و استعارہ پر زیادہ زور دیتے تھے۔ نثر میں انشاء اللہ خاں انشاء کا مقام بہت بلند ہے۔ انھوں نے ایک کہانی ہندی میں لکھی جس کی خوبی یہ تھی کہ اس میں عربی، فارسی، ترکی یا کسی اور زبان کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ کبھی انھوں نے ایسی نثر اور ایسے اشعار لکھے جن میں ہر لفظ پر نقطہ تھا اور کبھی ایسے جن میں ہر لفظ کے نیچے نقطہ تھا۔ انھوں نے ایسی چیزیں بھی لکھیں کہ کسی لفظ کے اوپر نقطہ نہ نیچے۔ شاعری میں آتش و ناسخ، مرثیہ میں انیس و دبیر اور مثنوی میں دیا شنکر نسیم لکھنؤ کے شہرت یافتہ شاعر ہیں۔

علیگڑھ تحریک

سر سید احمد کو اُردو کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ ان سے پیشتر اُردو نثر میں لفاظی، تک بندی، اور تشبیہات و تلمیحات کی بھرمار تھی۔ انھوں نے اُردو نثر کو سادگی عطا کی تو اُردو شاعری کو بے ساختگی۔ سر سید کا مقصد اپنے قارئین کو تعلیم و معلومات فراہم کرنا ہوتا تھا اس لیے انھوں نے کام کی بات کم سے کم الفاظ میں سیدھے سادے ڈھنگ سے کہنے کا انداز اپنایا۔ ان کے طرزِ نگارش کو آگے بڑھانے والوں میں شبلی نعمانی، حالی پانی پتی، اور محمد حسین آزاد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے اخباروں "سائنٹی فِک گزٹ" اور "تہذیب الاخلاق" میں ان کے رفقاء محسن الملک، سلیم پانی پتی وغیرہ نے بھی سادہ اور عام فہم نثر لکھی۔ اسی اندازِ تحریر نے اُردو اخباروں کی زبان کو جنم دیا۔ اسی طرح شاعری میں معشوق کے حسن و جمال پر زورِ بیان صَرف کرنے کی قدیم روایت سے ہٹ کر انسان کی روزمرہ کی مشکلات اور اس کی نفسیات پر توجہ دی گئی۔ محمد حسین آزاد اور حالی نے معاشرہ کی اصلاح کے جذبہ سے آسان اور پُر اثر نظمیں لکھیں اس کے بعد اقبال اور چکبست نے قومی نظمیں لکھنا شروع کیا۔ اُتر پردیش کے قومی شاعروں میں برج نرائن چکبست، دُرگا سہائے سرور، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، جگر مرادآبادی، علی سردار جعفری، علی جواد زیدی، شمیم کرہانی اور نازش پرتاپ گڑھی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

لگ بھگ اسی زمانے میں اُردو ادب پر ٹیگور کا زبردست اثر پڑا۔ اس کے نتیجے میں بہت سے قلم کار شاعری آمیز نثر لکھنے لگے۔ اس تحریک نے بھی جسے ادبِ لطیف کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اتر پردیش ہی میں زیادہ رواج پایا۔ اس تحریک کے پیش روؤں میں ل۔ احمد اکبرآبادی، نیاز فتحپوری، قاضی عبدالغفار سلطان حیدر جوش اور مہدی الافادی سبھی اتر پردیش کے تھے۔

ترقی پسند تحریک

بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک کا دور بہت اہم رہا۔ اس کی ابتدا ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ہوئی جبکہ منشی پریم چند اس کے صدر اور سجاد ظہیر اس کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ منشی پریم چند بنارس ضلع کے تھے تو سجاد ظہیر جونپور کے۔ ترقی پسند مصنفین کا دوسرا اور تیسرا اجلاس الٰہ آباد میں ہوا۔ گو ترقی پسند مصنفین ملک کے گوشے گوشے میں پائے جاتے تھے تاہم پریم چند، سجاد ظہیر، ڈاکٹر علیم، احمد علی، فراق گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر عابد حسین، احتشام حسین وغیرہ نے ترقی پسند تحریک کو شروع کرنے اور آگے بڑھانے میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔

لکھنؤ ایک طرح سے ترقی پسند تحریک کا خاص مرکز تھا۔ یہیں سے سبطِ حسن، علی سردار جعفری اور مجاز نے ماہنامہ "نیا ادب" جاری کیا جس میں جوش ملیح آبادی نے اپنا رسالہ "کلیم" بھی شامل کر دیا۔ لکھنؤ سے ہی حیات اللہ انصاری نے ترقی پسند ہفت روزہ "ہندوستان" نکالا۔ ترقی پسند تحریک کا زور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۰ء تک رہا۔ اس نے اُردو کہانی اور اُردو شاعری کو اپنی معراج تک پہنچا دیا۔ اس سے متاثر ہونے والے مصنفین نے اپنے ذاتی دکھ درد کے دائرے سے نکل کر سماج سے رشتہ جوڑا۔ پُرانے فنکاروں میں پریم چند، سدرشن، اعظم کریوی اور علی عباس حسینی پہلے سے ہی اپنے افسانوں میں اتر پردیش کی دیہاتی زندگی کی تصویر کشی کر رہے تھے۔ ۱۹۳۶ء یا یوں کہیے کہ ترقی پسند تحریک کے پہلے اجلاس کے بعد اس قافلے میں عصمت چغتائی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو

خواجہ احمد عباس اور مجنوں گورکھپوری جیسے اہلِ قلم بھی شامل ہوگئے۔ انھوں نے صرف کسانوں کے استحصال کی ہی بات نہیں کی بلکہ ہر پسماندہ طبقے کے بارے میں لکھا ہے۔ مل کا مزدور، دفتر کا بابو اور سماج کی ٹھکرائی ہوئی عورت کی مشکلات کی بھی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے نہ صرف استحصال کے خلاف لوگوں کو بیدار کیا بلکہ انقلاب کا نعرہ بھی لگایا۔ کبھی کھلے طور پر تو کبھی اشارتاً اور اس طرح ان بے بس طبقات کو اُمید کی کرن دکھائی اور ان کی ہمت بندھائی۔

قریب قریب یہ تمام موضوع شعری تخلیقات میں بھی اٹھائے گئے۔ ترقی پسند شاعروں نے اگر سرمایہ دارانہ استحصال کو چُنوتی دی تو ہندوستانی سرمایہ داروں کو بھی للکارا جو محنت کشوں کی محنت سے نامناسب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ان ترقی پسند شعراء میں جوشؔ، مجازؔ، علی سردار جعفری، وامق جونپوری، معین احسن جذبی، مسعود اختر جمال، شمیم کرہانی، علی جواد زیدی پیش پیش تھے۔

ترقی پسند تحریک کے حامی قدرتاً کمیونزم اور سوشلزم سے ہمدردی رکھتے تھے۔ انھوں نے دوسری عالمی جنگ میں انگریزی حکومت کی مخالفت کی۔ لیکن ۱۹۴۱ء میں جیسے ہی جرمنی نے سوویت روس پر حملہ کیا، کمیونسٹ پارٹی نے کہا کہ اب جرمنی ساری دُنیا کے عوام کے خلاف برسرِ پیکار ہے اس لیے اس کے دُشمن انگریزوں کو جنگ میں مدد دینی چاہیے۔ ایسا ہونے پر کانگریسی خیالات کے لوگ ترقی پسند تحریک سے الگ ہوگئے۔ ایسے شاعروں میں جوشؔ، ساحرؔ، مجازؔ، علی جواد زیدی، شمیم کرہانی وغیرہ اور افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ شامل تھے۔

نتیجتاً ترقی پسند تحریک میں صرف کمیونسٹ پارٹی کے ممبر یا ان کے ہم خیال لوگ رہ گئے ان میں علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، ظ۔ انصاری وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی استحصال اور طبقاتی کشمکش کے بارے میں لکھا۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء تک ایک نیا دَور چلا جس میں بہت سے افسانہ نگار نفسیاتی افسانے لکھنے اور اپنی شخصیت کی تلاش کرنے لگے۔ ۱۹۷۰ء سے شروع ہونے والے اس دور میں اہلِ قلم یا تو واقعیت پسند ہوگئے یا انھوں نے روائتی انداز کو خیرباد کہہ دیا۔ اب کہانی کے لیے پلاٹ اور شعرگوئی کے لیے ردیف اور قافیے کی قید ضروری نہ رہی۔ بہ الفاظِ دیگر اُردو میں فری ورس (Free Verse) اور بلینک ورس (Blank Verse) کا استعمال ہونے لگا۔ کہانی میں یہ اندازِ نگارش سریندر پرکاش، بلراج مینرا، قمر احسان، غیاث احمد گدّی وغیرہ نے اور شاعری میں احمد ہمیش، وارث علوی، بلراج کومل، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی وغیرہ نے کیا۔

اُردو صحافت

اتر پردیش کی اُردو صحافت کا بھی اُردو ادب کی نشوونما میں اہم کردار رہا ہے۔ اُردو کا پہلا اخبار "جامِ جہاں نما" کلکتہ سے ۱۸۲۲ء میں جاری ہوا تھا۔ اس زمانے میں اُردو ٹائپ اور پریس کی سہولت صرف کلکتہ میں ہی دستیاب تھی۔ لیکن ۱۸۴۷ء میں اتر پردیش کا پہلا رسالہ "خیر خواہِ ہند" مرزاپور سے جاری کیا گیا جو اب بھی "مسلم یونیورسٹی گزٹ" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ "تہذیب الاخلاق" (۱۸۷۰ء) "مذاق رامپور" (۱۸۵۵ء) اور "اودھ پنچ" لکھنؤ (۱۸۷۷ء) نے اُردو صحافت میں نئے معیار قائم کیے۔ ادبی رسالوں میں مولوی عبدالحلیم شررؔ کا "دلگداز" (لکھنؤ)، منشی نوبت رائے نظرؔ کا "خدنگِ نظر" (لکھنؤ)، منشی دیا نرائن نگم کا "زمانہ" (کانپور)، ریاض خیرآبادی کا "فتنہ" (گورکھپور)، حسرت موہانی کا "اُردوئے معلّٰی" (کانپور) اور نیازؔ فتحپوری کا "نگار" (لکھنؤ) اپنے اپنے زمانے میں افضل ترین رہے۔

علاوہ ازیں آزادی سے قبل "الناظر" (لکھنؤ) اور "معارف" (اعظم گڈھ) اور آزادی کے بعد "کتاب" (لکھنؤ)، "شب خون" الٰہ آباد اور "نقد و نظر" (علیگڈھ) نے اعلیٰ صحافت کی مثال پیش کی۔ ہندوستان کے تمام رسالوں، بالخصوص اتر پردیش کے جرائد نے جدوجہد آزادی کے دوران اہم کردار ادا کیا۔ قدیم رسالوں میں "اودھ پنچ" اور اس کے مدیر منشی سجاد حسین نے کٹر محبِ وطن اور حکومت کے نڈر نکتہ چیں کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی۔ اس کے لکھنے والوں میں رتن ناتھ سرشارؔ، برج نرائن چکبستؔ، نواب محمد حسین آزاد اور مچھو بیر استم ظریف اپنی طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات میں انگریزی حکومت پر کڑی سے کڑی چوٹ کرتے تھے۔ جب انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا تو لکھنؤ سے شائع ہونے والے رسائل "اودھ پنچ"، "ہندوستانی" اور "ایڈووکیٹ" نے اور الٰہ آباد کے رسالہ "قیصر الملک" نے اس کا خیر مقدم کیا۔ جب آزادی کی جدوجہد زور پکڑنے لگی تو لکھنؤ کے "ہندوستانی"، "مسلم گزٹ" اور "ہمدم"، کانپور کے "اُردوئے معلّٰی"، بجنور کے "مدینہ" اور الٰہ آباد کے "سوراج" نے ڈٹ کر تحریکِ آزادی کی حمایت کی۔ اس سلسلے میں جہاں مولانا آزاد کے اخباروں کو دو بار ضبط کیا گیا تو مولانا حسرت موہانی کا "اُردوئے معلّٰی" بھی بار بار ضبط ہوا اور انھیں تین برس کی قید ہوئی۔ ۱۹۴۵ء میں جواہر لال نہرو نے کانگریسی نظریات و عقائد کی اشاعت کے لیے لکھنؤ سے "قومی آواز" نکالا۔ اس روزنامہ کے تین ایڈیشن لکھنؤ، دہلی

اور پٹنہ سے شائع ہو رہے ہیں۔

اس وقت اتر پردیش سے اُردو کے پندرہ روزنامے، ۱۳۶ ہفت نامے، ۳۶ پندرہ روزہ اخبار اور ۳۷ ماہنامے شائع ہو رہے ہیں۔ (رجسٹرار آف نیوز پیپر فار انڈیا ۱۹۸۳ء)۔

رجسٹرار کی ۱۹۷۲ء تک کی رپورٹ کے مطابق اُتر پردیش سے ۱۸ روزنامے، ۸۷ ہفت روزہ، ۱۹ پندرہ روزہ اخبار اور ۶۸ ماہنامے شائع ہوتے تھے۔ ان میں لکھنؤ کے قومی آواز کی اشاعت تقریباً نو ہزار اور پیغام کانپور کی اشاعت بھی نو ہزار کے لگ بھگ تھی۔

ہفت روزہ اخبارات ہندی کے بعد سب سے زیادہ اُردو میں شائع ہوتے ہیں اور ماہناموں میں ہندی اور انگریزی کے بعد اُردو کا ہی نمبر آتا ہے۔ اُردو ماہناموں میں الہ آباد کا "شب خون" (۸۵۰۰) اور رامپور کا "نور" (۵۴۰۰) سب سے زیادہ تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔

ادبی رسائل میں شب خون الہ آباد اور نیا دور (جو لکھنؤ سے اُردو پردیش سرکار کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے)، سب سے افضل مل جاتے ہیں۔ مذہبی رسائل میں تجلّی دیوبند، دارالعلوم، دیوبند خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ الحسنات رامپور، الفرقان، لکھنؤ اور انوارالاسلام وارانسی بھی بہت مشہور رہے ہیں۔ بچوں کے دو رسالے ہیں، ایک لکھنؤ سے کلیاں اور دوسرا رامپور سے نور، حریم لکھنؤ اور رضوان لکھنؤ خواتین کے رسالے ہیں۔ الہ آباد کے عباس حسینی صاحب پانچ پانچ رسالے نکہت، تاریخی داستان، روحانی دنیا، طلسمی دُنیا، اور جاسوسی دنیا نکالتے ہیں۔ ان میں جاسوسی دنیا اتنا مقبول ہوا کہ اس کا ہندی ایڈیشن بھی شائع ہونے لگا۔

اتر پردیش کے اُردو ادیب ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ آج بھی شعراء میں علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، آنند نرائن مُلّا، بشیر بدر، وامق جونپوری، شہریار، وحید اختر، صلاح الدین پرویز اور ہیکل اُتساہی؛ افسانہ اور ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، رام لعل، بلونت سنگھ، رتن سنگھ، قاضی عبدالستار اور قمر احسن، نقادوں میں آل احمد سرور، محمد حسن، شمس الرحمٰن فاروقی، گیان چند جین، قمر رئیس، اسلوب احمد انصاری، خورشید الاسلام شارب ردولوی، شمیم حنفی اور ماہرین لسانیات میں مسعود حسین خان، حکم چند نیّر، رشید حسن خاں؛ صحافیوں میں عشرت علی صدیقی، ظ۔ انصاری، عابد حسین اور حسن کمال اپنے اپنے مقام پر افضل مانے جاتے ہیں۔

اُردو پردیش کے اُردو بولنے والوں کو ایک زمانے میں حکومت سے کچھ شکائتیں تھیں۔ خاص کر یہ کہ وہ اُردو پڑھنے کی کافی سہولیات مُہیا نہیں کرتی اور سرکاری دفاتر میں اُردو کا استعمال نہیں ہوتا۔ ریاستی حکومت کا کہنا ہے کہ اُردو کی ترقی کے لیے سارے بھارت میں پہلی اُردو اکادمی اتر پردیش ہی میں قائم ہوئی۔ محکمۂ تعلیم میں اُردو کے لیے ایک جوائنٹ ڈائرکٹر مقرر ہے اور ہر علاقے میں اُردو ذریعۂ تعلیم کے اسکولوں کے لیے ایک ڈپٹی ڈائرکٹر موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہر علاقہ میں اُردو میڈیم کے اسکولوں کے لیے ایک خصوصی ڈپٹی ڈائرکٹر تعینات ہے۔ یہی نہیں بلکہ پانچویں سے آٹھویں درجے تک ۱۵ مضامین کی نصابی کتابیں حکومت نے اُردو میں تیار کروا دی ہیں۔

ریاستی حکومت نے ۸۷ - ۱۹۸۶ء کے بجٹ میں اُردو کی ترقی کے لیے مندرجہ ذیل رقوم عطا کی ہیں:۔

۱۔ اتر پردیش اردو اکادمی۔ ۳۴,۶۹,۰۰۰ روپے
۲۔ انجمن ترقی اُردو ہند اتر پردیش۔ ۹۵,۰۰۰ روپے
۳۔ فخرالدین علی احمد کمیٹی۔ ۵,۰۲,۰۰۰ روپے
۴۔ سرکار ملازمین کو اُردو سکھانے کے لیے انعامات کے واسطے۔ ۹۵,۰۰۰ روپے اور
۵۔ مولانا آزاد یادگار اکادمی۔ ۱,۰۰,۰۰۰ روپے

اس طرح بحیثیت مجموعی ۳۰,۳۱,۰۰۰ روپے اُردو کی ترقی کے لیے مخصوص کئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں عربی مدارس کو عطیات دینے کے لیے ۲,۳۳,۵۲,۰۰۰ روپے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ رقم بھی ایک لحاظ سے اُردو کو ہی فائدہ پہنچاتی ہے۔ کیونکہ ہر عربی مدرسے میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔

اُردو کو اتر پردیش کی دوسری زبان تسلیم کر لینے کی مانگ آل انڈیا کانگریس کمیٹی (آئی) نے اپنے انتخابی منشور میں تسلیم کرلی تھی لیکن یہ معاملہ ہنوز اُتر پردیش حکومت کے زیر غور ہے۔

اُردو ایک ایسی جاندار زبان ہے، جو بھارت میں ایک سے زیادہ ریاستوں اور دُنیا میں ایک سے زیادہ ملکوں میں بولی، سمجھی، لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔ دُنیا میں سب سے زیادہ لوگ جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ بھارت میں پائے جاتے ہیں۔ اور بھارت میں ایسے لوگ سب سے زیادہ ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ (پاکستان میں صرف ۳۳ لاکھ لوگ اُردو کو اپنی مادری زبان تسلیم کرتے ہیں)۔

آج اُردو بھارت میں بہت مقبول ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اُردو کے بہترین ادب کے تراجم ہندی میں ہو چکے ہیں یا اسے ہندی رسم الخط میں شائع کر دیا گیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فلموں میں اُردو زبان کے استعمال نے (اگرچہ اسے ہندی کہا جاتا ہے) غزل اور قوالی کو بہت مقبول بنا دیا ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ بھارت اور بالخصوص اتر پردیش میں اُردو کا مستقبل روشن ہے۔ ●

ڈاکٹر منظر عباس نقوی

سحر البیان کی عصرِ حاضر سے مطابقت

اُردو شاعری کا وہ شہ پارہ جو سحر البیان کے نام سے مشہور ہے۔ صنفی اعتبار سے ایک مثنوی ہے۔ مثنوی کے ہر شعر میں ردیف و قافیہ جداگانہ ہوتا ہے۔ البتہ شعر کے دونوں مصرعوں میں ردیف و قافیے کی پابندی کی جاتی ہے۔ اس طرح شاعر کو کسی مسلسل بیان کے لیے بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی چیز، مقام، شخص، واقعے، منظر یا قصے کے بیان کے لیے عام طور پر اسی صنف سے کام لیا گیا ہے۔

مثنوی اُردو کی ایک بہت قدیم صنفِ سخن ہے۔ اُردو شاعری کے ابتدائی نمونے بالعموم مثنوی ہی کی شکل میں ملتے ہیں۔ یہ مثنویاں چاہے دکن سے تعلق رکھنے والی ہوں یا شمالی ہند سے زیادہ تر عشقیہ واقعات پر مبنی ہوتی تھیں اور یہ واقعات بھی حقیقی زندگی سے زیادہ اس خیالی زندگی سے متعلق ہوتے تھے جن میں جن، دیو، پری، بھوت، پریت اور جادو وغیرہ جیسے ما فوق الفطرت عناصر کی بڑی کارفرمائی تھی۔ یہ کہنا بڑی حد تک درست ہوگا کہ ہماری بیشتر مثنویاں موضوع کے اعتبار سے بس منظوم داستانیں ہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ قدیم مثنویاں ہوں یا داستانیں انھوں نے ایک طرف تو ہماری زبان کو بڑی وسعت دی ہے اور دوسری جانب عصرِ جدید میں ان کی معنویت کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان میں سترہویں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی ہندوستانی تہذیب کی ایسی بھرپور تصویر کشی کی گئی ہے جس نے ان قدیم اصناف کو ایک اہم تاریخی دستاویز کا درجہ دے دیا ہے۔

میر حسن کی مثنوی سحر البیان بھی ہماری کلاسیکی شاعری کا ایک ایسا ہی لافانی شاہکار ہے جو گذشتہ دو سو برس سے ہر تذکرہ نگار اور ادبی نقاد سے خراجِ تحسین حاصل کرتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے سچ کہا تھا:

"زمانے نے اُس کی سحر البیانی پر تمام شعرا اور تذکرہ نویسوں سے محضرِ شہادت لکھوایا۔ اُس کی صفائیِ زبان اور لطفِ محاورہ اور شوخیِ مضمون اور طرزِ ادا اور ادا کی نزاکت اور جواب و سوال کی نوک جھونک حدِ توصیف سے باہر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کیا اُسے سو برس آگے والوں کی باتیں سنائی دیتی تھیں کہ جو کچھ اُس وقت کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے جو آج ہم تم بول رہے ہیں۔" (آبِ حیات)

مولانا نے اس مثنوی کی زبان کے بارے میں جو بات سو برس گذر جانے پر کہی تھی وہ آج ہم دو سو برس بیت جانے پر بھی پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ اس مثنوی کے کتنے ہی مصرعے اور اشعار آج زبان زدِ خاص و عام ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم میں سے بہت سوں کو چاہے یہ معلوم بھی نہ ہو کہ یہ اشعار کسی ادبی شہ پارے کا حصہ ہے۔ مثال کے طور پر صرف چند کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں:

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

سدا عیشِ دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل
کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

حقیقت یہ ہے کہ یہ شاعری نہیں، زبان و بیان کی ساحری ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ خود بقول شاعر

زبس عمر کی اس کہانی میں صرف
تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف
جوانی میں جب ہو گیا ہوں میں پیر
تب ایسے ہوئے ہیں سخن بے نظیر

یہی وجہ تو ہے کہ بقول خواجہ الطاف حسین حالیؔ، میر تقی میرؔ کے بعد میر حسنؔ کی مثنوی بدرِ منیر (یعنی سحر البیان) نے ہندوستان میں جو سچی شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے وہ نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد تک کسی مثنوی کو نصیب ہوئی۔

میر حسنؔ کا خاندان اُردو ادب کی تاریخ میں ایک نامور خاندان ہے جس کی نظیر ڈھونڈے نہیں مل سکتی۔ اُن کے عظیم پوتے میر انیسؔ نے اپنے خاندان پر فخر کرتے ہوئے سچ کہا تھا:

جو بھی افضالِ الٰہی سے ہوا نیک ہوا
نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا

میر حسنؔ کا پورا نام غلام حسن اور تخلص حسن تھا۔ وہ میرؔ و سوداؔ کے ہم عصر میر ضاحکؔ کے فرزند تھے۔ سنِ ولادت میں اختلاف ہے۔ تاہم قیاسِ غالب یہ ہے کہ وہ ۱۷۲۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔

۱۷۵۷ء میں جب احمد شاہ ابدالی نے دلی کو تاراج کیا تو میر حسن بھی اپنے کنبے کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے اور پھر کچھ دنوں بعد فیض آباد کو منتقل ہو گئے، جہاں وہ نواب سردار جنگ بہادر کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۷۷۵ء میں نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد جب نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اپنی راجدھانی بنایا تو میر حسن بھی لکھنؤ میں آ بسے۔ ۱۷۸۶ء میں یہیں اُن کا انتقال ہو گیا۔

مثنوی سحر البیان میر حسن کی آخری تصنیف ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۱۹۹ھ ہے۔ مثنوی کے ابتدائی حصے پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مثنوی نواب آصف الدولہ کی خدمت میں اُن کی خوشنودیٔ خاطر کی غرض سے پیش کی گئی تھی۔ سچ پوچھیے تو اس دور کی داستانیں ہوں یا قصائد یا مثنویاں، یہ تینوں ہی اصناف ادب درباروں کی پیداوار ہیں۔ داستانیں سلاطین و امرا کی تفریح طبع کا ذریعہ تھیں تو مثنوی اور قصیدوں سے شعرا کا مقصد عام طور پر شاہانِ وقت کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا تھا۔ مجھے تو اس دور کی مثنویاں بھی کچھ قصیدے ہی کی توسیع معلوم ہوتی ہیں، جن میں اصل قصہ شروع کرنے سے پہلے حمد، نعت، منقبت اور مناجات کے رسمی اشعار کے بعد تفصیل سے بادشاہِ وقت کی مدح کی جاتی تھی۔ خود مثنویٔ سحر البیان میں ۸۴، اشعار نواب آصف الدولہ کی شان و شوکت، عدل پروری، سخاوت اور شجاعت کی تعریف میں لکھے گئے ہیں گویا خود ایک مکمل قصیدہ بشکلِ مثنوی ہے۔ رہا مثنوی میں بیان ہونے والا قصہ، سو اسے قصیدے کا ضمیمہ سمجھنا چاہیے جس کا نصب العین بادشاہ کی تفریحِ طبع کا سامان فراہم کر کے اس کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا تھا۔

جہاں تک اس مثنوی کے پلاٹ کا تعلق ہے تو یہ بھی اُس عہد کے دوسرے قصوں کی طرح، چاہے وہ نثر میں ہوں یا نظم میں، روائتی انداز کا ایک مختصر سا قصہ ہے جس کا تانا بانا دیو، جن، پری جیسے مافوق الفطرت عناصر سے تیار ہوا ہے۔ کسی شہر میں ایک بادشاہ تھا بڑی شان و شوکت والا، اُسے دنیا کی ہر خوشی نصیب تھی، البتہ غم تھا تو اس بات کا اُس کے کوئی بیٹا نہ تھا جو تاج و تخت کا وارث بن سکتا۔ وزیروں کے مشورہ دینے پر بادشاہ نے نجومیوں پنڈتوں سے رجوع کیا تو انھوں نے پیشن گوئی کی کہ عنقریب بادشاہ کے محل میں چندر ما سا بالک جنم لیگا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ ؎

یہ لڑکا تو ہو گا و لے کیا کہیں
خطر ہے اسے بارہویں برس میں
نہ آئے یہ خورشید بالائے بام
بلندی سے خطرہ ہے اس کو تمام
کہا سُن کے شہ نے یہ اُن کے تئیں
کہو جی کا خطرہ تو اس کو نہیں
کہا جان کی سب طرح خیر ہے
مگر دشتِ غربت کی کچھ سیر ہے
کوئی اس پہ عاشق ہو جن و پری
کوئی اُس کی معشوق ہو استری
کچھ ایسا نکلتا ہے پوتھی میں اب
خرابی ہو اس پر کسی کے سبب

بہر طور پیشین گوئی کے مطابق بادشاہ کے یہاں لڑکا پیدا ہوتا ہے تو بڑی خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ جب شہزادہ عمر کی بارہ منزلیں طے کر لیتا ہے تو بادشاہ کے حکم سے ایک جشنِ شادمانی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بادشاہ اور ولی عہد کی شہر میں سواری نکلتی ہے۔ رعایا اپنے ولی عہد کو دیکھ کر دعائیں دیتی ہے۔ لیکن قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے، رات کو شہزادہ اصرار کر کے محل کی چھت پر سوتا ہے۔ لوگوں سے اُس کی عمر کے شمار میں غلطی ہوتی ہے۔ ابھی بارہ سال پورے ہونے میں ایک دو روز باقی رہ گئے تھے۔ آخر وہ خطرہ سامنے آتا ہے، جس کی نجومیوں نے پیشین گوئی کی تھی۔ شہزادہ چھت پر محوِ خواب تھا کہ ادھر سے ایک پری کی سواری گذری، وہ شہزادے کے چاند سے چہرے کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتی ہے اور اسے اُڑا کر پرستان لے جاتی ہے۔ پرستان میں اپنا کوئی ہم جنس نہ پا کر شہزادے کی طبیعت گھبراتی ہے تو پری اس کا دل بہلانے کے لیے ایک کل کا گھوڑا دیتی ہے۔ جو ایک کل موڑتے ہی ہوا سے باتیں کرنے لگتا تھا اور پھر خوبی یہ کہ جاندار گھوڑوں سے بالکل مختلف، ہر قسم کی ضرورت سے آزاد اور ہر طرح کے عیب سے پاک ہے۔

نہ کھاوے نہ پیوے نہ سووے کبھی
نہ ماپے نہ بیمار ہووے کبھی
نہ حشری، نہ کری، نہ شب کور وہ
نہ وہ کنہ لنگ اور نہ منہ زور وہ
نہ ساپن، نہ ناگن، نہ بھونری کا ڈر
ہر اک عیب سے وہ غرض بے خطر

غرض شہزادہ اس کل کے گھوڑے پر سوار ہو کر دنیا جہان کی سیر کرتا پھرتا تھا۔ اتفاق سے ایک روز اس کا گذر ایک شاندار محل کے پائیں باغ کی طرف سے ہوتا ہے۔ باغ کی رونق کو دیکھ کر شہزادہ اپنے کل کے گھوڑے کو محل کی چھت پر اُتار دیتا ہے۔ باغ میں اس کی نظر ایک حسین شہزادی سے چار ہوتی ہے جس کا نام بدرِ منیر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو دل دے بیٹھتے ہیں۔ شہزادہ سیر کے بہانے روزانہ کل کے گھوڑے پر سوار ہو کر شہزادی کے پاس آتا ہے۔ غرض کہ ان چاہنے والوں کی خفیہ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ پرستان کی پری کو شہزادے کے اس معاشقے کی اطلاع ایک دیو کی زبانی ملتی ہے تو مارے رشک اور

رقابت کے آگ بگولا ہو جاتی ہے اور شہزادے کو ایک تنگ و تاریک کنوئیں میں قید کر دیتی ہے۔
ادھر شہزادے کے فراق میں بدر منیر کا یہ حال ہوا کہ:

پھرا کی سی ہر طرف پھرنے لگی
درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب
لگی دیکھنے وحشت آلود خواب
خفا زندگانی سے ہونے لگی
بہانے سے جا جا کے رونے لگی
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا
نہ کھانا نہ پینا، نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے
محبت میں دن رات گھٹنا اسے

شہزادی کی یہ حالت اس کی بچپن کی سہیلی نجم النسار سے دیکھی نہیں جاتی اور وہ شہزادے کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہے۔ اسی تلاش و جستجو میں اس کی ملاقات جنوں کے ایک شہزادے سے ہوتی ہے جو نجم النساء کو دل دے بیٹھتا ہے۔ جنوں کے اس شہزادے کی مدد سے نجم النسار شہزادہ بے نظیر کو پری کی قید سے رہائی دلواتی ہے۔ آخر سب بچھڑے مل جاتے ہیں۔ شہزادہ بے نظیر کی شادی بدر منیر اور نجم النسار کی شادی جنوں کے شہزادے سے ہو جاتی ہے اور اس طرح یہ قصہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قصے میں آج کے انسان کے لیے دلچسپی کا کوئی سامان موجود نہیں ہے۔ وہ دن بیت گئے جب لوگ جن، دیو اور پری اور جادو میں یقین رکھتے تھے۔ ہمیں ان بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے معاشقوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں جنھیں شاید عشق و محبت کے سوا دنیا کا کوئی کام ہی نہ تھا۔ اس قصے میں بظاہر ایک چیز ایسی ہے جس سے ہم صرف نظر نہیں کر سکتے اور وہ ہے کَل کا وہ گھوڑا جسے پری نے شہزادہ بے نظیر کو سیر و تفریح کے لیے دیا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں کسی ایسی سواری کا تصور جس پر بیٹھ کر انسان زمان و مکان کے فاصلوں کو مختصر کر سکے، یقیناً ایک خواب تھا۔ مگر آج وہ خواب ہیلی کوپٹر اور ہوائی جہاز کی شکل میں ایک حقیقت بن چکا ہے۔ اگر آپ انسانی تہذیب کے ارتقار کا مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ فکشن (Fiction) اور سائنس میں بڑا قریبی تعلق ہے۔ فکشن پہلے کچھ خواب عطا کرتی ہے جنھیں سائنس اپنی جد و جہد سے بعد میں ایک حقیقت بنا دیتی ہے۔

لیکن یہ تو ہوئی سائنس والوں کی بات۔ ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ہمارے لیے اس مثنوی میں وہ سبھی کچھ موجود ہے جس کی ہم بیانیہ شاعری (Narrative poetry) سے توقع کرتے ہیں یعنی زبان کا لطف، بیان کا حسن، کردار نگاری، جذبات نگاری، مکالمے اور عصری تہذیب کی مرقع کشی۔ ادب میں اس کی چنداں اہمیت نہیں ہوتی کہ کہا کیا گیا ہے۔ یہاں ساری اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے کس ڈھنگ سے کہا گیا ہے۔ گویا ہماری دلچسپی کا محور قصے سے زیادہ اس کی زبان اور انداز بیان ہوتا ہے یا پھر یہ کہ اس میں جذبات انسانی اور عصری تہذیب کے جو مرقعے پیش کیے گئے ہیں ان میں شاعر کو کس حد تک کامیابی ہوئی ہے۔

اس مثنوی کی رواں، سلیس اور شگفتہ زبان اور جذبات نگاری کا تو کسی حد تک آپ کو ان اقتباسات سے اندازہ ہو ہی گیا ہوگا جو ابھی آپ کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ لیکن ان سے بھی زیادہ آج اس مثنوی کی ادبی اہمیت کا بڑا سبب وہ تہذیبی مرقعے ہیں جنھوں نے اس مثنوی کو بلاشبہ اٹھارہویں صدی کی مشترک ہندوستانی تہذیب کا ایسا رنگا رنگ میوزیم بنا دیا ہے جس کا عرفان حاصل کیے بغیر نہ ہم حال کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ مستقبل کی تعمیر کر سکتے ہیں۔

سحرالبیان کے اس تہذیبی نگار خانے میں وہ سبھی کچھ موجود ہے جس کی تلاش ہم تاریخ کے اوراق میں کرتے ہیں۔ محلوں کا طرز تعمیر، ان کا سامان آرائش اور زیبائش، باغات کی آراستگی، ان کے پھل پھول، محلوں میں بسنے والوں کا طرز معاشرت اس جاگیردارانہ دور کے کھانے، مشروبات، ملبوسات، سنگار کے طریقے، زیورات، ظروف، سواریاں، ہاتھی گھوڑے۔ اس دور کے عقائد، توہمات، دلچسپیاں، تفریحیں، عیش و نشاط کی محفلیں، رنگ رلیاں، کنیزیں، غلام، خدمتگار، شادی بیاہ کی رسمیں وغیرہ وغیرہ۔ محلوں کی یہ شان کہ دروں کے آگے زربفت کے سائبان لگے ہیں، چھتیں مُغرّق اور پردے زرنگار ہیں۔ محلوں کی سجاوٹ کو دیکھیے تو آئینہ بندی ہو رہی ہے۔ مخمل کا فرش بچھا ہے۔ لخلخے روشن ہیں، دالان عود و عنبر کی خوشبوؤں سے بسا ہوا ہے۔ چھپر کھٹ پر قیمتی بستر لگا ہوا ہے۔ راحت کے ہر سامان سے آراستہ اونچے، گاؤ تکیے، ہر چیز مغرق۔ سونے چاندی کے کام سے لیس۔ چھتوں میں بلوریں جھاڑ لٹکے ہیں۔ دیواروں پر فانوس جگمگا رہے ہیں۔ طاقوں اور چوکیوں پر عطر دان، خاصدان، گلاب پاش، صراحی، جام، قلمدان، گنجفہ، چوپڑ، غرض ہر چیز اپنی اپنی جگہ قرینے سے سجی ہوئی ہے۔ باغوں میں وہ رونق کہ قسم قسم کے پھولوں سے آراستہ، کون سا پھول ہے جس پر مثنوی نگار کی نظر نہ گئی ہو۔ جنبیلی، موتیا، رائے بیل، موگرا، شبّو، مدن بان، ارغوان، لالہ، جعفری، گیندا، داؤدی، نسرین، نسترن، غرض کہاں تک شمار کیا جائے۔ محل کے اندر اور محل کے باہر طرح طرح کے خدمت گار اپنے اپنے کاموں میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ نقارچی، نقیب، مالی، خانساماں، بھانڈ، دو ائیں، دائیاں، مغلانیاں، خواصیں، لونڈیاں، طرح دار کنیزیں جو سولہ سنگار کیے کھیلے مٹکاتی، انگلیاں نچاتی کڑے سے کڑا بجاتی ادھر سے ادھر آ جا رہی ہیں۔

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

مدن لعل منچندہ

اُردو شاعری اور برسات

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب
چار موج اُٹھتی ہیں طوفانِ طرب سے ہر سُو
موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

مرزا غالب نے غزل کے ان دو اشعار میں برسات کی ساری دل کشی اور رنگینی ہی نہیں، اس کی کیف انگیزی اور وجد آفرینی بھی سمودی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُردو شاعری کے پہلے دور میں غزل میں تصوف اور عشقیہ مضامین کی فراوانی رہی ہے اور مناظرِ قدرت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ لیکن مرزا غالب نے غزل میں موضوع کی اس خوشگوار تبدیلی سے کیف و مستی کی چار سُو وہ لہریں موجزن کی ہیں کہ خوشی اور نشاط کے اُمڈتے ہوئے طوفان میں وہ یاسیت اور قنوطیت جاتی رہی جو اس دور کی غزل پر چھائی ہوئی تھی۔

غزل ہی کی طرح قصیدہ کی تنگ دامانی کا یہ عالم ہے کہ ابرِ گوہر فشاں کو شاہ کے درِ دولت پر برسنے کو ہی کافی سمجھ لیا گیا۔ ابرِ نیساں کو کسی کھیت یا کھلیان کو سیراب کرنے یا کسی چوکھٹ پر جانے کا کوئی حق ہی نہیں تھا۔ لیکن ذوق نے اس صنف کی متعین حدوں سے تجاوز کر کے ابرِ و باراں کے بیان میں اپنی تخلیقی قوت کے جوہر دکھائے ہیں۔ اُن کے ایک قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ سلاست اور روانی کے علاوہ یہ حسین تشبیہ کی بھی نادر مثالیں ہیں ؎

سوار دوڑتا ہے اس طرح ابرِ سیاہ
کہ جیسے کوئی فیلِ مست بے زنجیر

ہوا میں یہ طراوت ہے کہ دورِ گلخن بھی
برستا اٹھتا ہے آتش سے مثلِ ابرِ مطیر

ہر ایک خار ہے گل ہر گل ساغرِ عیش
ہر ایک دشت چمن، ہر چمن بہشت نظیر
چمن میں یہ ہے درختانِ سرسبز پر جوبن
کہ زہر کھاتے ہیں سبزانِ خطۂ کشمیر

غزل اور قصیدے کے مقابلے میں مثنوی میں زیادہ وسعت اور تنوع کی گنجائش تھی۔ لیکن بیشتر صورتوں میں مظاہرِ قدرت مشاہدہ کی نسبت قوتِ متخیلہ کی پیداوار بن جانے سے فرضی نظر آتے ہیں۔ اور ان کا حقیقی حسن نکھرنے نہیں پاتا۔ تاہم میر نے موسمِ برشگال کی جو تصویر کشی کی ہے، اُس کی شاید ہی کوئی اور مثال کہیں ملے۔

بوند تھمتی نہیں اب کے سال
چرخ گویا ہے آب در غربال

لے زمین سے ہے تا فلک غرقاب
چشمۂ آفتاب میں گرداب
ابرِ رحمت ہے یا کہ زحمت ہے
ایک عالم غریقِ رحمت ہے

نظیر اکبرآبادی اُردو کے سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اُردو شاعری کی روایات پسندی کو ترک کیا۔ گو اُن کا تعلق میر اور سودا کے فوراً بعد کے دورِ شاعری سے تھا۔ جب روایت پسندی اپنے نقطۂ عروج پر تھی لیکن نظیر اکبرآبادی نے مروجہ ذوقِ شاعری کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک نئی راہ نکالی اور اُردو ادب کو نئے موضوعات اور اُن کی بے پایاں وسعت سے مالا مال کیا۔ اپنے ذاتی مشاہدہ اور فنِ شاعری کے حسین امتزاج سے کالی گھٹاؤں اور برسات کی وہ تصویر کشی کی ہے جس کی مثال اُردو شاعری میں نہیں ملتی۔ اُن کی تصویروں کے یہ لافانی مرقعے اُردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

اُن کی برسات کے موضوع پر متعدد نظمیں ہیں مثلاً برسات کا تماشا، برسات کی بہار، برسات اور پھسلن، برسات کی حبس (گرمی)

برسات کا لطف اور متعدد موضوعات لیے معلوم ہوتا ہے کہ وہ برسات کے بیان میں فرطِ انبساط سے جھوم اُٹھتے ہیں۔ اور سماں بندی اور کیف انگیزی میں اُنھیں وہ قدرت حاصل ہے کہ وہ سامعین کو بھی اُسی رو میں اپنے ساتھ بہا لے جاتے ہیں۔ اُنہی کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں
جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہی پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں
گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

چھت گرنے کا کسی جا غل شور ہو رہا ہے
دیوار کا بھی دھڑکا کچھ ہوش کھو رہا ہے
در در حویلی والا بھر آہ رو رہا ہے
مفلس ہو جو مرے میں دل شاد ہو رہا ہے

نظیر اکبر آبادی کی یہ نظمیں مفصّل تصویر کشی اور جزئیات کی نقاشی کی عظیم مثالیں ہیں اور اپنے قدرتی حسن اور بے ساختہ پن میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔

لیکن اردو ادب میں روایتی شاعری کا جادو بھی کبھی کسی طور کم نہیں ہوا۔ الفاظ کی صناعی، بیان کی رعنائی، اور رنگینی اور حسنِ ترتیب نے اردو شاعری خصوصاً غزل میں چار چاند لگا دئے۔ آتش کا حسن تغزّل ملاحظہ ہو کہ برسات کس طرح میکدے کو دوڑتی جاتی ہے اور اپنے مے خوار کے مُنہ میں مدھ بھری بوندیں ٹپکاتی ہے ؎

بادباں کا کام کرتی ہے گھٹا برسات کی
کشتیٔ مے سے موافق ہے ہوا برسات کی
جھومتی آتی ہے مستانہ ہوا برسات کی
ساتھ کیفیت کے چلتی ہے گھٹا برسات کی
سبزۂ مینا کا عالم دیدنی ہے آجکل
میکدے کو دوڑتی جاتی گھٹا برسات کی
اُڑ کے ٹپکائے گی مجھ مخمور کے مُنہ میں شراب
پَر لگائے گی بط مے کو ہوا برسات کی

انہی روایات کی دین اُردو شاعری میں نادر تشبیہوں، استعاروں، اور محاوروں کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ ابرو باراں ہی کے بیان میں ان کی چند اور خوبصورت مثالیں یہ ہیں۔

ہائے کیا فرطِ طرب سے جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اُڑا جاتا ہے ابر
اقبالؔ

دیکھنا ہمدم یہ بجلی ہے جو چمکاتی ہے تیغ
یا پری کوہسار سے کھینچے ہوئے آتی ہے تیغ
امیرؔ مینائی

ساون کی کالی راتیں اور برق کے اشارے
جگنو چمکتے پھرتے جوں آسماں پہ تارے

یہ بجلی ہے کہ اک مرمر کی ناگن
دھوئیں کی جھیل پہ لہرا رہی ہے
اخترؔ شیرانی

وہ دن ہیں فراقؔ کہ اُلٹی گنگا بہتی ہے
سیدھی راہ کون لگائے ان کافر برساتوں کو
فراقؔ گورکھپوری

اُردو شاعری میں کچھ نئے تجربات بھی ہوئے۔ دیکھئے حفیظ جالندھری نے چند ہی الفاظ میں بھرپور برسات کا منظر کھینچا ہے۔

دل کش فضائیں
ٹھنڈی ہوائیں
اُودی گھٹائیں لائی ہیں برسات
آئی ہے برسات چھائی ہے برسات
کوہ و دمن پر دشت و چمن پر شہر اور بن پر
دوشیزہ کا جوبن
بے ساختہ پن

اُردو شاعری میں اختصار کی اس خوبصورت مثال کے بعد اخترؔ شیرانی کی نظم کے چند اشعار جس میں الفاظ کی تکرار سے صدائے بازگشت پیدا کی گئی ہے، بھی ملاحظہ فرمائیے۔

ترنّم اور موسیقی کی لہریں فضا میں کیف اور سرمستی بکھیرتی ہیں، جن سے دل کے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔ الفاظ خوبصورت مجسّموں میں ڈھلتے ہیں اور ذہن کے پردوں پر دل کش تصویریں جھلملاتی ہیں۔

وادیٔ گنگا ہے کالی رات ہے کالی رات ہے
رات ہے برسات ہے

نیلگوں پریاں اُفق پر پر ہیں پھیلائے ہوئے   پَر ہیں پھیلائے ہوئے
بال بِکھرائے ہوئے

یا اُمڈ آیا ہے ساون کی گھٹاؤں کا ہجوم   بہاروں کا ہجوم
نوربازوں کا ہجوم

یہ گھٹائیں ہیں کہ خوابوں کے سفینے ہیں رواں   سفینے ہیں رواں
بے قرینے ہیں رواں

یہ بجلی ہے کہ نور کی زنجیر لہرائی ہوئی   زنجیر لہرائی ہوئی
پیچ وخم کھائی ہوئی

اُردو شاعری میں برسات کی دلکشی اور رعنائی کی دل پذیر تصویریں ہی نہیں، کالی گھٹاؤں کے دہشت انگیز اور بھیانک رُخ کی بھی بھرپور جھلک مِلتی ہے۔ ان اشعار کو پڑھ کر دل پر بلا کا خوف طاری ہونے لگتا ہے۔ یہ کیفیت نگاری اور سماں بندی کی بے نظیر مثالیں ہیں۔

رفتہ رفتہ رات آئی بڑھ گیا پُروا کا زور
بادلوں کی فوج نے مل کر مچایا ایک شور
پھر ذرا سی دیر میں جھکڑ چلا اک زور کا
پیش خیمہ بن کے اک طوفان کا آئی ہوا

دُور اُفق پر چھا گئی کالی گھٹا
مست ہاتھی کی طرح جھومی وہ متوالی گھٹا
کس قدر کالی، بھیانک، بدرنگ اور خوفناک
رستہ جنگل، تیرگی، وحشت، خموشی اور خاک
مل رہے تھے پٹ زمین و آسماں کے ہر طرف
بج رہا تھا ساحرِ شب کا ہراس انگیز دف

وقت کی رفتار نے جب سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف ہندوستانی قوم کی جنگِ آزادی کو تیز تر بنا دیا تو ان گھٹاؤں سے گرنے والی بوندوں نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ ساحر لدھیانوی کی نظم "کل اور آج" میں برسات کے اس خوبصورت پس منظر کو دیکھئے۔

بادل یہ آکاش کے سپنے اُن زلفوں کے سائے ہیں
دوش ہوا پہ مے خانے ہی میخانے گھر آئے ہیں
رُت بدلے گی پھول کھلیں گے جھونکے مدھ برسائیں گے
اُجلے اُجلے کھیتوں میں رنگین آنچل لہرائیں گے
چرواہے بنسی کی دُھن سے گیت فضا میں بوئیں گے
آموں کے جھنڈوں کے نیچے پردیسی دل کھولیں گے
پینگ بڑھاتی گوری کے ماتھے سے کوندے لپکیں گے
جوہڑ کے ٹھہرے پانی میں تارے آنکھیں جھپکیں گے
اُلجھی اُلجھی راہوں میں وہ آنچل تھامے آئیں گے
دھرتی، پھول، آکاش، ستارے، سپنا سا بن جائیں گے

⁂

آج بھی بادل چھائے ہیں
آج بھی بوندیں برسیں گی
اور کوی اس سوچ میں ہے

⁂

ہل جوتے گی کھیتوں میں الہڑ ٹولی دہقانوں کی
اور پھوٹے گی کھیتوں سے محنت فاقہ کش انسانوں کی
فصلیں کاٹ کے محنت کش غلّے کے ڈھیر لگائیں گے
اور جاگیروں کے مالک آ کر سب پونجی لے جائیں گے

⁂

غریب دہقانوں کے گھر بنیئے کی قُرقی آئے گی
اور قرضے کے سود میں کوئی گوری بیچی جائے گی

⁂

آج بھی رِم جھم برکھا ہوگی
آج بھی بادل چھائے ہیں
اور کوی اِس سوچ میں ہے

اُردو شاعری نے جو آندھیاں اُٹھائیں اور جن طوفانوں کو ہوا دی اُن سے جنگِ آزادی تیز تر ہوتی گئی اور بالآخر ہماری غلامی کی زنجیر کٹ گئی۔

برسات کی رنگ برنگی تصویریں جن کی دل کشی اور رعنائی کو شاعری کے نئے زاویوں نے اور بھی سنوارا ہے اس بات کی شاہد ہیں کہ کیف انگیزی اور منظر نگاری کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری کو پُرمعنی اور بامقصد ادب کا درجہ حاصل ہے اور دُنیا کے ادب میں بلاشبہ اس کا مقام نہایت بلند ہے۔

نصرت ظہیر

اُف

یہ تجارتی مارکے

آپ نے اس نوکر کا قصہ تو سُنا ہوگا جس نے ایک دن اپنے مالک سے کہا۔

"حضور۔ آج آپ کو میری ضمانت کا انتظام کرنا پڑے گا۔ میں آج ایک آدمی کی ہڈی پسلی توڑنے جا رہا ہوں۔"

مالک نے جو کہ پیشے سے وکیل تھا حیران ہو کر پوچھا۔

"ارے۔ خیریت تو ہے بھائی۔ کس کی ہڈی پسلی توڑ دینا چاہتے ہو؟"

"وہ ہے نا صاحب خدا بخش۔ اپنے ہی ہمسایہ ایک آدمی جو کبھی کبھی مجھ سے ملنے آتا رہتا ہے۔"

"وہ تمہارا بچپن کا دوست؟ مگر ایسی کیا بات ہو گئی بھئی جو اچانک اس بیچارے کی ہڈیوں اور پسلیوں کے دشمن بن گئے ہو؟"

"صاحب اس نے ایک دن مجھے گالی دی تھی!"

"گالی؟ ۔ کیسی گالی؟"

"اس نے مجھے گینڈا کہا تھا جناب۔"

"گینڈا؟ ۔ مگر کب دی تھی اس نے یہ گالی؟"

"یہی صاحب کوئی چار پانچ سال پہلے۔"

"ہائیں۔ چار پانچ سال پہلے اور غصہ تمھیں اب آ رہا ہے؟ لگتا ہے تمہارے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہو گیا ہے۔ آج پانچ سال بعد اس گالی کا جواب دینے چلے ہو۔ اُس وقت جواب کیوں نہیں دیا؟"

"بات دراصل یہ ہے جناب کہ گینڈا میں نے آج ہی پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔"

لگ بھگ کچھ ایسی بات امریکہ کی ایک کمپنی کے ساتھ پچھلے دنوں ہوئی۔ یہ کمپنی پچھلے ایک سو چار سال سے پورے امریکہ میں اپنی دھاک جمائے ہوئے ہے۔ صابن سے لے کر سویابین تک اس کمپنی کی بنائی ہوئی ہر چیز امریکہ میں بے حد مقبول ہے۔ اس کمپنی کا سو سال سے زیادہ پرانا ایک علامتی نشان بھی ہے، جس سے امریکہ کا بچہ بچہ واقف ہے۔ اس میں چاند کے اندر ستاروں کے بیچ ایک مونہ اور ایک آدمی کو دکھایا گیا ہے۔

پچھلے لگ بھگ سو سال تک تو اس تجارتی نشان یعنی ٹریڈ مارک کی کسی نے پروا نہیں کی لیکن تین چار سال پہلے اس پر اعتراضات شروع ہو گئے۔ کمپنی کے دفتروں میں شکایتی خطوں اور احتجاجی مراسلوں کا ڈھیر لگ گیا۔

خاص شکایت ان خطوں میں یہ تھی کہ کمپنی کا تجارتی نشان شیطانی قوت اور بدی کی علامت ہے اور یہ نشان صارفین کے لیے ذہنی پریشانی کا باعث ہے۔

چنانچہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ امریکی کمپنی نے اپنے ۱۰۴ سال پرانے نشان کو بدلنا منظور کر لیا اور اب وہ بڑے زور و شور سے یہ پبلسٹی کر رہی ہے کہ نشان بدل جانے سے اس کی مصنوعات کی خوبیوں میں کوئی فرق نہیں آئیگا۔ سوائے اس کے کہ امریکیوں کے جذبات کو اب یہ مصنوعات ٹھیس نہیں پہنچائیں گی۔ صابن کی مہک بھی وہی رہے گی اور سویابین کے ذائقے میں بھی تبدیلی نہیں آئے گی۔

ہیروشیما، ناگاساکی اور ویت نام کی بڑے اطمینان کے ساتھ اینٹ سے اینٹ بجا دینے والے ملک کے لوگ اس قدر ذکی الحس بھی ہو سکتے ہیں یہ ہمارے لیے سخت حیرت کا مقام ہے۔ کچھ حد تک شرم کا بھی!

شرم کا یوں کہ ایک طرف تو یہ امریکی ہیں، جن کی طبع نازک پر چاند ستارے بھی گراں گذرنے لگے ہیں اور دوسری طرف ہم ہندوستانی ہیں۔ ہماری بے حسی کا یہ عالم ہے کہ روز ہمیں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر کیا صبح کیا شام، شیر کے نشان والی چائے پینے کی صلاح دی جاتی ہے اور ہم میں کسی کو اس بات پر اعتراض کرنا تو دور رہا یہ سوچنے تک کی بھی توفیق نہ ہوئی کہ چائے جیسی لطیف شئے کا ایک خونخوار جانور سے رشتہ جوڑنے کے نتیجے میں ہماری نئی نسل سے نفسیات پر کس قدر تباہ کن اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

ہماری آنکھوں کے سامنے نہ جانے کتنے لوگ صبح شام شیر یا چمگادڑ کی تصویر والی سگریٹ کے کش لگاتے رہتے ہیں بلکہ بعض تو اس کو سلگاتے بھی ہاتھی یا گھوڑے کے نشان والی ماچس سے ہیں۔ مگر مجال ہے جو آج تک کسی نے چوں بھی کی ہو!۔

عورتوں کو ہی دیکھ لیجیے۔ بیچاری سانپ مارکہ صابن سے کپڑے دھوئے جا رہی ہیں اور مزے ہیں کہ جانور چھاپ منجن سے اپنے دانت چمکانے میں مصروف ہیں۔ مار آستین والی اصطلاح کو سامنے رکھ کر سانپ صابن اور کپڑے کا تو کوئی باہمی تعلق فرض بھی کیا جا سکتا ہے مگر جانور اور منجن کا کیا تعلق؟ جانور کے دانت تو منجن کے بغیر بھی چمکتے رہتے ہیں اور وہ ان کی نمائش بھی بار بار کرتا رہتا ہے۔

اوروں کی کیا کہیں خود ہم بھی کیا کسی سے کم ہیں۔ کتے کی ہی بات لے لیجیے۔ اللہ کی اس مخلوق سے ہمیں اس قدر للّٰہی بغض نفرت، کراہت اور کدورت وغیرہ ہے کہ جس گھر میں یہ ہو اس سے ہم نیکی کے فرشتے کی طرح واپس ہو لیتے ہیں۔ اپنے کئی دوستوں کے گھر دعوت پر بلائے جانے سے ہم اسی مخلوق کی وجہ سے محروم ہوتے آئے ہیں۔ لیکن اس بنک میں چیک بھناتے ہوئے ہمیں کسی قسم کی کراہت محسوس نہیں ہوتی جس کے ہر دروازے، ہر کاؤنٹر، ہر کھڑکی، ہر پاس بک اور ہر چیک بک پر ایک جفادری کتے کا خوفناک کلوز اپ لگا رہتا ہے۔ (شاید یہ ڈبل اسٹینڈرڈ ہماری قومی پہچان ہے)

جب کوئی بزرگ ہمارے سامنے اپنے زمانے کی لالٹین مارکہ چھتری اور چھتری چھاپ لالٹین کی پائیداری کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں تو ہم لالٹین اور چھتری کی باہمی بے تعلقی کے بے تکے پن پر دل ہی دل میں ہنستے رہتے ہیں۔ لیکن جب مچھروں سے نجات اور چین کی نیند سونے کے لیے ہم ایک خاص برانڈ کی کچھوے دار اگر بتی جلاتے ہیں تو ایک لمحے کو بھی اس بے تکے پن پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ اس کچھوے کو مچھروں سے کوئی نسبت نہیں جو اس کمپنی کا ٹریڈ مارک ہے۔ مچھر اور کچھوے میں کسی قسم کی دوستی یا دشمنی تو ایک طرف رہی بیچاروں کو شاید ایک دوسرے کے وجود کی بھی اطلاع نہ ہوگی۔

ثبوت اس کا یہ ہے کہ جہاں مچھر ہو وہاں کچھوا نہیں ملتا اور جہاں کچھوا ہو وہاں مچھر نہیں دیکھے گئے ہیں۔ لیکن اگر بتی بنانے والی کمپنی کی زبردست پبلسٹی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کچھوے کا ذکر آتے ہی کانوں میں مچھروں کی بھنبھناہٹ گونجنے لگتی ہے اور مچھروں کی بھنبھناہٹ سنتے ہی آنکھوں کے آگے کچھوے سرپٹ دوڑنے لگتے ہیں۔ اس سب کا ہمارے بچوں کی نفسیات پر آگے چل کر کیا اثر پڑے گا۔ یہ سوچ کر ہم اکثر فکرمند ہو جاتے ہیں۔

مصنوعات کے اول جلول مارکوں نے ہمارے جمالیاتی احساس پر اتنا بڑا اثر ڈالا ہے اور اس سے وہ وہ نقصانات ہوئے ہیں کہ ان کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اب ہمیں فنِ مصوری کے بارے میں بھی اندیشہ ہو چلا ہے کہ کہیں اس فن کا حلیہ نہ بگڑ جائے۔ وجہ اس اندیشے کی یہ ہے کہ آرٹ میں دلچسپی لینے والے بالغوں اور نابالغوں کو آج کل اونٹ مارکہ پنسل، اونٹ چھاپ رنگ اور اونٹ چھاپ برش سے کام کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔ یہ سمجھنے سے ہم قاصر ہیں کہ اونٹ سے مصوروں کی جمالیاتی حس کو کیا فائدہ پہنچے گا اور اس مارکے سے ان کی فنی صلاحیتوں پر کون سے مثبت اثرات مرتب ہوں گے جب کہ اونٹ قدیم زمانے سے مسلسل پوچھے جانے والے اس سوال کا جواب بھی آج تک نہیں دے سکا ہے کہ اس کی کون سی کل سیدھی ہے۔

کبھی کبھی تو ہم لرز جاتے ہیں، یہ سوچ کر کہ اگر یہی صورتِ حال رہی تو آگے چل کر کیا ہوگا۔ کوئی بیمہ کمپنی طوطے کو اپنا مارکہ بنا لے گی اور ہم سے مصیبت کے وقت میں کام آنے کا وعدہ کرتی رہے گی۔ کوئی فرم جوتا چھاپ ٹوپیاں چلا دے گی اور ایک دن اعلان کر دے گی کہ اپنی ٹوپیوں کے کے بعد وہ ٹوپی چھاپ جوتے بنانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ کوئی کمپنی چوہا مارکہ اچار کے ذائقہ کا قصیدہ پڑھنا شروع کر دے گی۔ کسی کو مینڈک چھاپ چٹنی اور چھپکلی مارکہ مربے کے چٹخارے پسند ہوں گے۔ کوئی بگلا برانڈ خضاب لگانے کی صلاح دے گا، کوئی گرگٹ مارکہ کاٹی ٹی۔ وی کے گن گائے گا، وعلیٰ ہٰذا القیاس!

سوچیے ـــ تب ہماری قومی نفسیات کا عالم کیا ہوگا۔ ہم یہی سوچ کر لرزتے ہیں اور کبھی کبھی کافی دیر تک لرزتے رہتے ہیں۔ ●

اُرملا دیوی

چھٹّن میاں اپنا نیا مکان بنوا رہے تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس کے مکمل ہونے پر گاؤں میں اس کی ٹکر کا کوئی مکان نہ ہوگا۔ چھٹّن میاں نے اس مکان پر جی کھول کر روپیہ خرچ کیا تھا۔ مال دار آدمی تو وہ تھا ہی۔ کافی زمین تھی جو لگان پر جوتی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ باپ بھی کافی رقم چھوڑ کر مرا تھا۔ مکان قریب قریب مکمل ہو چکا تھا صرف نل وغیرہ کی فٹنگ اور لکڑی کا کام باقی تھا۔ چھٹّن میاں نے لکڑی کا کام کرنے کے لیے ایک غریب بڑھئی کو چالیس روپے روز پر رکھ لیا تھا۔ یہ بڑھئی چوں کہ گاؤں میں نیا تھا اس لیے چھٹّن میاں نے اسے اپنے زیرِ تعمیر مکان میں ہی ایک کوٹھری اور دالان رہنے کو دے دیا تھا۔

فضلو نہایت تندہی سے کام کر رہا تھا۔ اس کی نئی بیاہی ہوئی دلہن بانو بھی اس کے کام میں ہاتھ بٹاتی تھی۔ بانو ایک خوبصورت اور باحیا لڑکی تھی۔ حسن و شباب اس کی گاڑھے کی شلوار اور قمیص سے پھٹا پڑتا تھا۔ ابھی پچھلے سال ہی تو فضلو سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ آبائی وطن میں بھر پیٹ روٹی میسّر نہ ہونے کی وجہ سے وہ کسبِ معاش کے لیے مراد آباد آگیا تھا اور پھر ایک نئے دوست کی سفارش پر شہر کے قریب ایک گاؤں میں چھٹّن میاں کے یہاں کام پر لگ گیا تھا۔ چھٹّن میاں اس کے کام سے خوش ہو کر کبھی کبھی روپے دو روپے فاضل دے دیا کرتے تھے۔ غریب میاں بیوی اس کی شرافت اور دریا دلی کے گُن گاتے نہ تھکتے۔

اُس روز سرِ شام سے ہی آسمان پر گہرے سُرمئی بادل گھِر آئے تھے۔ اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ اگرچہ دن بھر بادل سورج سے آنکھ مچولی کھیلتے رہے تھے مگر بارش نہ ہوئی تھی۔ شام ہوتے ہوتے گھنگھور گھٹا گھِر آئی اور گاہ بگاہ بجلی بھی چمکنے لگی۔ موسم بہت خوشگوار ہو گیا۔ بانو دالان میں کھانا پکا رہی تھی۔ اور فضلو ایک کونے میں بیٹھا بیڑی کے کش لے رہا تھا۔ گویا دن بھر کی تھکاوٹ کو بیڑی کے دھوئیں میں اُڑا رہا ہو۔ چولہے پر چڑھی ہوئی ہانڈی میں ارہر کی دال پک رہی تھی اور بھاپ کے ساتھ اُڑتی ہوئی اس کی سوندھی خوشبو دالان میں پھیل رہی تھی۔ فضلو سوچ رہا تھا کہ اس مہینے اس نے ابھی اپنے بوڑھے باپ اور بیمار ماں کو خرچ کے لیے روپے نہیں بھیجے ہیں۔ وہ بے چارے اسی کے آسرے تو ہیں۔ روز منی آرڈر کا انتظار کرتے ہوں گے۔ نہ ہوگا تو کل ہی میاں سے کہے گا کہ وہ اسے کچھ روپے پیشگی دے دیں تاکہ وہ اپنے ضعیف والدین کو بھیج سکے۔

بانو آٹا گوندھ رہی تھی۔ فضلو کو خیالات میں مستغرق دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔"

"کچھ تو۔"

"یہی اپنی غریبی و بے کسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ روٹی کے لیے اپنا دیس چھوڑ کر پردیس میں پڑا ہوں نہ جانے گھر پر اماں اور ابا کا کیا حال ہوگا۔ ابا کو تو بہت کم دکھائی دیتا ہے اماں ایک عرصے سے بیمار ہیں انھیں جلد ہی روپے بھیجنے ہوں گے۔ نہ بھیجوں گا تو

ان کی گذر کیسے ہوگی اور اماں کا علاج کیسے ہوگا۔ حکیم صاحب تو دوا اُدھار دیتے نہیں۔"

"روپے ملنے پر بھیج دینا۔" بانو بولی "زیادہ فکر کرنے سے تو کچھ ہوگا نہیں۔"

فضلو چُپ رہا۔

باہر چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔

اچانک فضلو نے دیکھا کہ اندھیرے کا سینہ چیرتا ہوا کوئی اسی کی کوٹھری کی طرف آ رہا تھا۔

وہ شخص قریب آیا تو طاق پر رکھی ہوئی مٹی کے تیل کی کُپی کی مدھم سی روشنی میں اس نے دیکھا کہ وہ چھٹن میاں ہی تھے کوئی اور نہیں۔

وہ کھڑا ہو گیا۔ "آیئے مالک۔"

"فضلو تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی اسی لیے چلا آیا۔ ذرا ادھر تو آؤ۔"

فضلو اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ چھٹن میاں ٹہلتے ہوئے اسے کچھ فاصلے پر لے گئے اور اس سے کافی دیر تک سرگوشیانہ انداز میں نہ جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ چلے گئے اور فضلو دالان میں واپس آ گیا۔

"کیا کہہ رہے تھے مالک؟" بانو نے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں۔ یونہی کل کے کام کے بارے میں بتانے آئے تھے۔ ہاں کھانا تیار ہے کیا؟"

"ہاں بس ابھی دال بگھار رہی ہوں۔"

وہ اُٹھی اور کوٹھری کے اندر کچھ لینے چلی گئی۔

فضلو آگے بڑھا اور ہانڈی کا ڈھکن کھول کر نہ جانے کیا چیز اس میں ڈالی اور پھر دبے پاؤں واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

واپس آنے پر بانو نے دال بگھاری اور بولی۔ "کھانا پروسوں؟"

"ہاں۔ لیکن مجھے زیادہ بھوک تو ہے نہیں، بس دو روٹیاں اور اچار دے دو۔ دال کھانے کو من نہیں ہو رہا ہے۔"

"لے لو نا تھوڑی سی۔ تمھیں تو ارہر کی دال پسند تھی۔"

"نہیں بھئی روز روز ارہر کی دال کھاتے کھاتے جی بھر گیا ہے سالن تو کبھی نصیب ہوتا نہیں۔"

کھانا کھانے کے بعد بانو نے برتن بھانڈے صاف کئے اور پھر دونوں میاں بیوی اندر جا کر بستر پر دراز ہو گئے۔ بانو تو جلد ہی باتیں کرتے کرتے سو گئی۔ آج نہ جانے کتنی غنودگی اس پر طاری ہو گئی تھی کہ اس کی آنکھیں جلد ہی بند ہو گئیں۔ لیکن فضلو کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ دس بج گئے مگر وہ جاگتا ہی رہا۔ لگتا تھا جیسے وہ کسی کشمکش میں گرفتار ہے اور اپنی سوچوں کے جال سے باہر نہیں نکل پا رہا ہے۔

اچانک باہر کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ فضلو فوراً اٹھا اور دھیرے سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

"بانو سو گئی؟" آنے والے نے پوچھا۔ "وہ نیند کی گولیاں تو تم نے اس کے کھانے میں ملا دی تھیں نا؟"

"ہاں مالک"۔ فضلو نے نہ جانے کیسی بے بسی و لاچارگی سے کہا۔ آواز اس کے حلق سے نکل نہ رہی تھی۔

"اچھا تو بات پکی ہے؟" میں اندر جاؤں؟"

فضلو خاموش رہا۔ اس کے لب ہلے، مگر وہ کچھ کہہ نہ سکا اندھیرے میں دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں کتنی بیچارگی تھی۔ شاید ویسی ہی بیچارگی جیسی ذبح ہونے سے پیشتر جانور کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔

چھٹن جوا[illegible] رکے بغیر اندر چلا گیا اور اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ وہ جا کر بانو کی بغل میں لیٹ گیا۔ اس کی نگاہ بہت دنوں سے بانو پر تھی۔ اس کے حسن نے اُسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ ہوس اس کے ہوش و حواس پر غالب آ چکی تھی۔ بانو کی قربت حاصل کرنے کے لیے ہی وہ کافی دنوں سے فضلو کو رحم دلی اور فیاضی کا برتاؤ کر کے رام کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اب جب چھٹن میاں کے بچے ننہال چلے گئے تو اس نے غریب فضلو کی مفلسی کا فائدہ اٹھانے کا پلان بنایا۔ اور لالچ دے کر فضلو کو اپنے سازش میں شریک کر لیا۔ روپے کا لالچ اور راتوں رات امیر بننے کی خواہش کمزور انسان سے کیا نہیں کرا لیتی۔ لالچ اس کے ضمیر کی آواز کو دبا دیتا ہے اور اس سے وہ کچھ کرا لیتا ہے جو شاید وہ ہوش و حواس کے رہتے ہوئے کرنا پسند نہ کرے۔

چھٹن میاں نے سوئی ہوئی بانو کے بدن پر دست درازی شروع کر دی۔ بانو کسمسائی اور نیند بھری آواز سے بولی "کیا کر رہے ہو؟"

چھٹن میاں خاموش رہے۔

بانو کو دفعتاً چھٹن میاں کے ہاتھوں سے غیریت کا احساس ہوا اور وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی ۔ "کون ہے؟"

چھٹن سرگوشیانہ انداز میں بولا ۔" میں ہوں تمھارا چھٹن۔"

"تمھاری یہاں آنے کی ہمت کیسے ہوئی؟" بانو نے پوچھا۔

"چُپ رہو۔ جیسا میں کہوں ویسے کرتی رہو۔ میں نے تمھارے شوہر سے اجازت

نے لی ہے۔"

"اجازت؟" بانو خشمگیں ہوکر بولی "شرم نہیں آتی ایسا کہتے ہوئے؟"

"بانو میں تمھیں پانے کی قیمت دوں گا۔ تمھارے شوہر سے سودا ہو چکا ہے۔ اب جھٹک پٹک بیکار ہے۔ خود کو میرے حوالے کر دو۔"

"نہیں" بانو چیخ اٹھی۔ اسے یقین نہ ہو رہا تھا کہ اس کا شوہر اس کا سودا کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے یقین کرنے نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ بے بس ہرنی شیر کی گرفت میں تھی اور شیر کا شکنجہ کستا ہی جا رہا تھا۔

باہر فضلو بیڑی پر بیڑی پھونکے جا رہا تھا۔ ایک عجیب سی بیزاری اور پشیمانی اس پر مسلط تھی۔ چیخ سنتے ہی وہ فوراً دروازے کے پاس گیا اور دروازہ کھٹکھٹانے لگا مگر بے سود، تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ چھیٹن پر ہوس کا بھوت سوار تھا۔ کنجشک ناتواں طاقتور باز کے پنجوں میں پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

فضلو نے دروازہ پھر کھٹکھٹایا۔ کھٹکھٹاتا چلا گیا، مگر کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ دور کہیں بجلی گری اور بارش ہونے لگی۔

پھر درویش برجان درویش کے مصداق وہ خاموش ہوکر بیٹھ گیا۔ پڑوسیوں کے ڈر اور بدنامی کے خوف سے وہ زور سے بھی نہ بول سکتا تھا۔ اور پھر آندھی پانی میں اس کی آواز کون سنتا۔ وہ خود کو کوس رہا تھا، نہ جانے وہ کون سا منحوس لمحہ تھا کہ وہ چھیٹن کے بہکاوے میں آ گیا۔ چھیٹن نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ "فضلو میری بات مان جاؤ، ایک بار ۔ صرف ایک بار کے لیے میں تمھیں پانسو روپے اور ایک چھوٹا سا قطعہ اراضی مکان بنانے کے لیے دوں گا۔ تمھارے دن پھر جائیں گے۔" فضلو شروع میں تو انکار کرتا رہا تھا۔ لیکن پھر نہ جانے کیسی کمزوری اس پر طاری ہوگئی، کیا لالچ اس پر غالب آ گیا کہ اس نے اپنے ضمیر کی آواز نہ سنی۔ وہ اپنا سر پیٹ پیٹ کر خود پر لعنتیں بھیج رہا تھا۔ لیکن اب پچھتائے ہوت کیا جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

وہ تھک کر گھٹنوں میں سر ڈال کر بیٹھ گیا اور رونے لگا۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب چھیٹن کوٹھری سے دبے پاؤں باہر نکلا اور سو روپے کا ایک نوٹ اس کے پاس پھینک کر چلا گیا۔ ندامت، گناہ اور بے وفائی کا احساس اس پر اس قدر غالب آ چکا تھا کہ اسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کرے۔

بارش تھم گئی تھی۔

آخر وہ اٹھا اور نو تعمیر شدہ مکان کے ایک کمرے میں پہونچ گیا۔ جہاں بجلی کی فٹنگ ہو چکی تھی۔

ادھر کافی دیر بعد جب بانو ہوش میں آئی تو وہ شرم اور غصہ کے ملے جلے احساس کے ساتھ کوٹھری سے باہر آئی۔ لیکن فضلو دالان میں نہیں تھا۔ وہ اندھیرے میں کہاں جائے، اسے کہاں تلاش کرے؟ پھر شرمندگی اور لٹ جانے کا احساس اس پر اتنا غالب آ چکا تھا کہ اس کے پیر نہ اٹھ رہے تھے۔

خدا خدا کرکے پو پھٹی اور مشرق سے روشنی کی کرنیں نمودار ہونا شروع ہوئیں، وہ اٹھی اور فضلو کو تلاش کرنے باہر نکلی۔ سب جگہ ڈھونڈنے کے بعد وہ اس کمرے کے پاس پہنچی جس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ روز تو یہ دروازہ کھلا رہتا ہے کیوں کہ مالک تو دوسرے مکان میں رہتا ہے۔ آج یہ بند کیسے ہے۔ کہیں فضلو اسی میں تو نہیں سو رہا۔

اس نے دروازہ کھٹکھٹایا، اور کھٹکھٹاتی گئی مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ ہاں پڑوس کے کچھ لوگ ضرور جمع ہو گئے۔ انھوں نے دریافت کیا تو بانو بولی "اپنے میاں کو ڈھونڈھ رہی ہوں۔ شاید وہ اسی کمرے میں سو رہے ہیں۔"

پڑوسیوں نے کوئی چارۂ کار نہ دیکھ کر دروازہ توڑ دیا تو اندر کا منظر دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ بانو نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "یا اللہ یہ کیا ہوگیا۔ میں بے سہارا ہوگئی۔" وہ زار و قطار رونے لگی۔ پڑوسی حیران تھے کہ کیا کریں۔ آخر یہ سب ہوا کیسے؟ اندر پنکھے سے فضلو کی لاش لٹکی ہوئی تھی۔ اس کی زبان اور آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ ●

بقیہ، فلمیں سماج کو کدھر لے جائیں گی؟

ہے۔ ایسی صورت میں نئی نسل سے اچھے شہری بننے کی توقع فضول ہے۔ یہ فلمیں حب الوطنی کے بجائے طبقاتی منافرت سکھاتی ہیں۔ نئی نسل کو انسانیت دشمن "سیناؤں" میں شمولیت اختیار کرنے کا ذہن بنا رہی ہیں۔

ملک کی تعمیر و ترقی کی راہ پر آگے بڑھنے اور نوجوان نسل کی تعمیری سرگرمیوں سے دلچسپی بڑھانے کے لیے تعمیری نقطۂ نظر سے فلموں کی تیاری وقت کی اشد ضرورت ہے۔ ●

نیّر قریشی

دیدہ وری کا خاص ہنر چھوڑ جاؤں گا
جرأت کی ہم مزاج نظر چھوڑ جاؤں گا

تاریک راستوں میں جلا کر چراغِ دل
ہر سمت اک "نمودِ سحر" چھوڑ جاؤں گا

ممکن کے حادثات سے مر بھی گیا تو کیا
زندہ دلی کے نقش مگر چھوڑ جاؤں گا

تنہائیوں سے چھین کے جینے کی ہر ادا
جس کی نہ شام ہو وہ سحر چھوڑ جاؤں گا

میرا مقام اور ہے تیرا مقام اور ہے
تہذیبِ نو میں تیرا نگر چھوڑ جاؤں گا

پوچھو نہ مجھ سے میری تلوّن مزاجیاں
بیباک زندگی کی ڈگر چھوڑ جاؤں گا

دنیا کرے گی یاد مجھے ہر برس کے بعد
تاریخ تو ادھوری اگر چھوڑ جاؤں گا

کرتے رہیں گے لوگ یہ تنقید و تبصرے
کچھ فکر و فن کے شمس و قمر چھوڑ جاؤں گا

نیّر جنونِ شوق میں منزل سے ماوریٰ
رہبر کو پیچھے حدِّ نظر چھوڑ جاؤں گا

●

ڈاکٹر ساغر اعظمی

سامان تو گیا تھا مگر گھر بھی لے گیا
اب کے فساد دل سے مرے ڈر بھی لے گیا

پہلے تو صرف خون میں ڈوبا ہوا تھا جسم
قاتل تو اب کے آکے مرا سر بھی لے گیا

تیور فضا کے، ہاتھ میں کاسہ تھما گئے
جھونکا ہوا کا جسم کی چادر بھی لے گیا

خیرات بٹ رہی تھی درِ شہر یار پر
سنتے ہیں اب کے بھیک سکندر بھی لے گیا

ماں نے بچا کے رکھا تھا بیٹی کے واسطے
بیٹا ہوا جواں تو وہ زیور بھی لے گیا

آخر سگانِ وقت کو آزاد چھوڑ کر
حاکم ہمارے ہاتھ کے پتھر بھی لے گیا

آیا تھا ہر کسی کو محبت سے جیتنے
کچھ زخم اپنے سینے پہ ساغر بھی لے گیا

●

بُشریٰ پروین

چُپ رہوں گی تو قلم [illegible]
برف پاروں کو وہ [illegible]

لب کُشائی کی ہے [illegible]
بے نوا تجھ کو ہر اک شخص [illegible]

خواب زاروں کے سفر میں بھی کھلی رکھنا آنکھیں
بند ہوں آنکھیں تو کیا [illegible] سجھائی دیگا

بے بصر ہے حقیقت کا [illegible]
ہاں خدا ہی مجھے عرفانِ خدا [illegible]

رامش و رنگِ زمانہ سے غرض کیا ہے مجھے
ربطِ ذات مجھے نغمہ سرائی دیگا

●

شمس غازی آبادی

جسم و جاں رکھتا ہوں دل رکھتا ہوں سر رکھتا ہوں میں
عشق میں اک زندگی معتبر رکھتا ہوں میں

رنج و راحت سے بہر صورت مفر رکھتا ہوں میں
سنگ دل تو ہے تو پتھر کا جگر رکھتا ہوں میں

مصلحت بیں ہوں کو اُفق پر نظر رکھتا ہوں میں
سوزِ دل اتنا ہے جلے چشمِ تر رکھتا ہوں میں

وصل کی خواہش سرشتِ عشق ٹھہری ہے مگر
کچھ تمنائیں باندازِ دگر رکھتا ہوں میں

غیر کے آگے کشاں ہے یار کے آگے نگوں
کونسا مصرف ہے آخر کیوں یہ سر رکھتا ہوں میں

جھوتا جاتا ہوں اُن کے ہر ستم کا سلسلہ
اللہ اللہ کیا مذاقِ در گذر رکھتا ہوں میں

میں طبیبِ عصر ہوں حاذق ہے میرا تجربہ
اُنگلیوں کی زد میں نبضِ بحر و بر رکھتا ہوں میں

ہائے کب جاگا ہے ظالم کا شعورِ بے رخی
عمر بھی اے شمس اب تو مختصر رکھتا ہوں میں

●

شفیق اعظمی

خوشی کا مژدہ سناؤ تو کوئی بات بنے
کنول دلوں کے کھلاؤ تو کوئی بات بنے

وہ بات جس کا اثر ناگوار تھا کل تک
اگر وہ بات بھلاؤ تو کوئی بات بنے

وہ ہندو ہو کہ مسلماں، امیر ہو کہ غریب
گلے سے سب کو لگاؤ تو کوئی بات بنے

قدم ملا کے ہی چلنے میں عافیت ہے مگر
دلوں کا فرق مٹاؤ تو کوئی بات بنے

ہر ایک سمت مسرت کا نور پھیلا کر
غموں کا رنگ مٹاؤ تو کوئی بات بنے

اندھیرا حد سے سوا ہے تو دیکھتے کیا ہو
اٹھو چراغ جلاؤ تو کوئی بات بنے

جو دل شکستہ و رنجور ہیں زمانے میں
ذرا انھیں بھی ہنساؤ تو کوئی بات بنے

کسی غریب کی کٹیا میں روشنی کے لیے
تم اپنے دل کو جلاؤ تو کوئی بات بنے

خدا کی بارگہہ ناز میں شفیق اگر
سر نیاز جھکاؤ تو کوئی بات بنے

ڈاکٹر آفاق فاخری

میں برف اور ترا جسم دھوپ جیسا ہے
یہ میری ذات سے تیرا عجیب رشتا ہے
یہ سچ ہے اس نے بھی سورج سے دوستی کر لی
جو شخص رات کے اندھے کنوئیں میں رہتا ہے
کسی سے کیوں ہے توقع مزاج پرسی کی
کبھی کسی کا بھی تم نے مزاج پوچھا ہے
چلو ہم اس سے بھی کچھ مسئلوں کا حل پوچھیں
وہ اک فقیر جو برگد کے نیچے بیٹھا ہے
کسی کی یاد بھی آئے تو کس طرح آئے
ہمارے دل کی فصیلوں پہ غم کا پہرا ہے
کوئی نظر ہی نہیں اٹھتی حادثوں کی طرف
ہمارے شہر میں ہر شخص جیسے اندھا ہے
چلو کہ دیکھ لیں آفاق شہر میں ہم بھی
جلوس خون کے قطروں کا آج نکلا ہے

نور محمد یاس

گھر سے نکلا ہوں تیز بارش میں
گھر نہ جاؤں حصار آتش میں
مطمئن سا ہے قتل پر میرے
خود نہ تھا وہ شریک سازش میں

دل جو وجدانیت سے ہے سرشار
اک نشہ سا ہے علم و دانش میں
شخصیت روشنی میں آئے نہ آئے
ہم تو ہیں محو اپنی کوشش میں
یوں نہ سورج سے منقسم ہوتی
تھا زمیں کا ستارہ گردش میں
نیکیوں کا حساب تو کم کم تھا
جنتیں مل رہی تھیں بخشش میں
کیوں کہے کوئی اس کو دانشور
چپ رہے جو ہجوم شورش میں
یاس فقروں میں تو نہ آجانا
طنز کا رنگ ہے ستائش میں

مختلف موضوعات پر

واحد پریمی

فصلِ گل

امن ہے ممکن جو اپناؤ اہنسا کے اصول
ورنہ یک جہتی کے دعوے ہیں حقیقت میں فضول
لطفِ فصلِ گل اٹھانا ہے تو پہلے ہمدمو
بات وہ پیدا کرو مل کر رہیں کانٹوں سے پھول

عظمتِ انسان

مرحبا یہ آدمی کا جذبہ و عزمِ صمیم
شادمان و کامراں بڑھتا ہے ہر اک راہ پر
ساری دنیا معترف ہے عظمتِ انسان کی
جس کے نقشِ پا ہوئے ہیں ثبت سطحِ ماہ پر

دیوانگانِ شوق

جو اہلِ دل ہیں بزم میں رہتے ہیں شان سے
اور دار پر بھی آتے ہیں اک آن بان سے
دیوانگانِ شوق کے امکاں میں کیا نہیں
چاہیں تو یہ نکال لیں پانی چٹان سے

محمد رضی الدین معظم

ہندو مسلم فنِ تعمیر و سنگتراشی

ھندوستان کی تاریخ کے ازمنۂ وسطیٰ میں مسلم حکومتوں کے قیام کے بعد سے فنونِ لطیفہ، فنِ تعمیر اور سنگتراشی میں بیشمار تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ مسلمانوں کا بہت قریبی تعلق عرب اور ایران سے تھا۔ چنانچہ ان کا اثر ہندوستان کے فنونِ لطیفہ میں بہت واضح ہے۔ ان کا طرزِ تعمیر ہندوستان کے طرزِ تعمیر سے بالکل مختلف تھا۔ لیکن جب یہ لوگ ہندوستان میں مسجد یا سرکاری عمارتیں بنوانا چاہتے تھے تو بعض ہندوستانی مزدوروں ہی کو کام پر لگانا پڑتا تھا۔ باوجود مسلمانوں کی ہدایت اور رہبری کے یہ لوگ ان کے طریقے پر پوری طرح کام نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح کی ملی جلی کوششوں سے ایک نیا طرزِ تعمیر پیدا ہوا جو کہ ہندوستانی طرزِ تعمیر اور اسلامی طرزِ تعمیر کا امتزاج تھا۔

مسلمانوں نے جو چیزیں زیادہ تر بنوائیں ان میں مساجد اور مقبرے ہیں۔ مساجد ان کی مذہبی عبادت گاہیں تھیں جیسے کہ ہندوؤں کے مندر، اور مقبرے یادگار کے طور پر تعمیر کئے جاتے تھے۔ مساجد بہت بڑے اور کھلے مقام پر بنائی جاتی تھیں۔ یہ مساجد ہندو مذہب کے مندروں سے مختلف تھیں۔

مساجد کی تعمیر میں نہایت سادگی سے کام لیا جاتا تھا جو اس فن کی خصوصیت ہے۔ کمانیں اور گنبد تمام مساجد میں عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ مساجد کی تعمیر کا مذہبی اصولوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ البتہ علم ہندسہ (Geometry) سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے ہندو مذہب کے مندروں پر رامائن اور مہابھارت کے کئی بہادروں کے کارنامے تراشے اور بنائے جاتے ہیں تاکہ ان کو دیکھتے ہی لوگوں کے دل میں دیوتا کی عظمت کا تصور پیدا ہو۔ مندر اس طرح سے انسانی خیالات کا مظہر ہیں۔

مساجد کے علاوہ مسلمانوں نے کئی بڑی بڑی عمارتیں اور قلعے بنائے ہیں۔ ان کی دیواریں پتھر اور چونے سے بنی ہوئی تھیں۔ ان میں علم ہندسہ کا جگہ جگہ استعمال نظر آتا ہے۔ دیواروں پر گل کاری کے لیے قیمتی پتھر بھی استعمال کئے ہیں۔ اس طرح ابتدا میں ہندو اور مسلم فنِ تعمیر میں بہت بڑا فرق تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ اختلاف کم ہوتا گیا۔ اور آہستہ آہستہ مسلمانوں کی طرزِ تعمیر کا اثر ہندوؤں کی عمارتوں میں اور ہندو طرزِ تعمیر کا مسلمانوں کے طرزِ تعمیر پر صاف صاف نظر آتا ہے۔ اس قسم کا ہندو مسلم طرزِ تعمیر یہاں کی عمارتوں میں واضح نظر آتا ہے۔ اس کو Indo-[illegible] ([illegible] یا [illegible]) [illegible] طرزِ تعمیر کہا جاتا ہے۔

پہلے مسلم بادشاہ جنھوں نے ہندوستان میں عمارات بنوانی شروع کیں، قطب الدین ایبک تھے جو خاندان غلامان کے پہلے بادشاہ ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے دہلی میں قوت الاسلام نامی ایک مسجد بنوائی۔

قطب مینار ہندوستان کی عمارتوں میں سب سے زیادہ بلند پتھر کا بنا ہوا مینار ہے۔ اس کی بلندی ۲۲۵ فٹ ہے۔ علاؤالدین خلجی بھی ایک اور مینار اس سے زیادہ بلند تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ خلجیوں کے بعد تغلق خاندان تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ خلجیوں کے بعد تغلق خاندان تعمیر کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ فیروز شاہ تغلق نے اپنا بہت سارا وقت اور مال و دولت مساجد بنانے اور شہروں کی تعمیر میں صرف کیا۔ اسی زمانے میں شمالی ہند کے مقامی بادشاہوں نے بھی فنِ تعمیر اور سنگتراشی کی سرپرستی کی۔ مالوہ اور کشمیر کے حکمران اس کام میں نمایاں اہمیت و شہرت رکھتے ہیں، مالوہ کے ایک بادشاہ نے جن کا نام حسین شاہ تھا۔ ایک بہت ہی خوبصورت

مقبرہ خالص سنگ مرمر سے تعمیر کروایا تھا۔
ہندوستان میں خالص سنگ مرمر کی یہ پہلی
تعمیر تھی۔ کشمیر میں لکڑی اور اینٹوں کا استعمال
کیا جاتا تھا۔ یہاں کی عمارتیں بُدھ مذہب
کے پگوڈہ کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔ دکن میں
بھی بہمنی بادشاہوں نے فنِ تعمیر کی ہمت
افزائی کی۔ انھوں نے ایک نیا طرزِ تعمیر
کا آغاز کیا۔ جو ہندو مسلم طرزِ تعمیر کا مجموعہ
تھا۔ گلبرگہ شریف کی جامع مسجد کی تعمیر میں
یہی نیا طرزِ تعمیر استعمال کیا گیا۔ بیدر شریف
میں محمود گاواں نے جو مدرسہ تعمیر کروایا تھا
وہ کالج کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ بہمنی
بادشاہوں نے اس عمارت کی تعمیر کے لیے
ایران، مصر اور مغربی ایشیا سے کاریگر بلوائے۔
ان کے ساتھ ساتھ انھوں نے ہندوستانی
مزدوروں کو بھی کام پر لگوایا۔ اس لیے ان کی
بنائی ہوئی عمارتوں میں کہیں کہیں ہندو طرزِ تعمیر
کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

سلطنت وجے نگر کے حکمراں عمارتیں بنوانے
میں خوب دلدادہ تھے۔ انھوں نے بڑے بڑے
مندر، محلات اور مضبوط قلعے تعمیر کروائے۔
دھانیشورا مندر اور ایسے ہی دوسرے کئی
مندر وجے نگر خاندان کے دلچسپ طرزِ تعمیر
کی نشانیاں ہیں۔ محلات پر رامائن کی پوری
کہانی تراشی گئی ہے۔

ہندو مسلم فنِ تعمیر مغلوں کے دور
میں عروج کو پہونچا۔ جس طرح اکبر نے
ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کی ایسے ہی انھوں نے
سیاسی، معاشی اور تہذیبی میدانوں میں بھی
کوشش کی۔ انھوں نے کئی قلعے، آگرہ، لاہور
اور دہلی میں بنوائے۔ ان عمارتوں کی تعمیر میں
جانوروں کے مجسمے، پرندے، ہاتھی، ببر شیر
وغیرہ نظر آتے ہیں۔ جو قدرتی خوبصورتی کی
اچھوتی یادگار ہیں۔ یہ بھی پچھلے بادشاہوں
کے طرزِ تعمیر سے مختلف ہیں۔ اکبر کے زمانے
میں عمارتوں میں اس قسم کی چیزیں عام طور پر نظر
آتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے
صرف گلکاری ہی سے کام نہیں لیا بلکہ ہندو فنِ
تعمیر کو بھی استعمال کیا۔ گویا اس نے ایک
ملا جلا نیا طرزِ تعمیر اختیار کیا۔

آگرہ سے چالیس کلو میٹر دور اکبر
نے ایک نیا شہر آباد کیا تھا جس کا نام فتحپور
سیکری تھا۔ اس شہر کا رقبہ دس مربع کلو میٹر
تھا۔ اس کا باب الداخلہ تقریباً چالیس میٹر
چوڑا اور اکتالیس میٹر اونچا تھا۔ دنیا میں اتنا
بڑا دروازہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا۔

مغلوں کا طرزِ تعمیر شاہجہاں کے
دور میں انتہائی عروج پر پہونچ چکا تھا۔ اسی
لیے شاہجہاں کے دورِ حکومت کو شاندار
زمانہ کہا جاتا ہے۔ شاہجہاں کو عمارتیں بنوانے
کا بیحد شوق تھا۔ ان کی بنوائی ہوئی عمارتیں
ان کی فنِ تعمیر سے دلچسپی کا کھلا ثبوت
ہیں۔ ان کی بنوائی ہوئی بعض عمارتیں اتنی
دیدہ زیب، خوبصورت ہیں کہ آج بھی ایسی
خوبصورت عمارتیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ بلکہ
عجائبات میں شمار ہیں۔ انھوں نے اکثر
عمارتیں خالص سنگ مرمر سے بنوائی تھیں۔
کمانیں اور گنبد ان کی بنوائی ہوئی عمارتوں
کی خصوصیت ہے۔ ان کی بنوائی ہوئی
عمارتوں میں موتی مسجد، جامع مسجد، دیوان
خاص، اور تاج محل بہت زیادہ اہمیت
رکھتے ہیں۔ انھوں نے دہلی میں ایک نیا قلعہ
بھی بنوایا جسے آج لال قلعہ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ
اس قلعے کی تعمیر کو تین سو سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے تاہم آج
بھی بالکلیہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بنایا
گیا ہو۔ ہمارا قومی جھنڈا ترنگا ۱۵ اگست
۱۹۴۷ء کو سب سے پہلے اسی مقام لال قلعہ
پر لہرایا تھا اور اس تاریخ سے آج تک
ہر سال یومِ جمہوریہ کو قومی جھنڈا اسی قلعہ پر لہرایا
جاتا ہے۔ دہلی کی جامع مسجد سب سے بڑی
اور ہندوستان میں سب سے خوبصورت
مسجد ہے۔

شاہجہاں کے عہدِ حکومت میں جو سب
سے زیادہ دیدہ زیب عجوبۂ روزگار عمارت
تعمیر کی گئی، وہ تاج محل ہے۔ تاج محل اپنی
خوبصورتی اور طرزِ تعمیر کی دلکشی کی وجہ سے
دنیا کی تاریخی عمارتوں میں بہت اہمیت رکھتا
ہے۔ اس کا شمار دنیا کے سات عجائبات میں
ہوتا ہے۔ ممتاز اور مفتخر مغل بادشاہ شاہجہاں
کو عمارتیں تعمیر کروانے اور باغ لگوانے کا بہت
شوق تھا۔ تاج محل اسی بادشاہ کی یادگار ہے۔
یہ خوبصورت عمارت آگرہ چھاؤنی سے اُتر (شمال)
کی جانب ایک میل کے فاصلے پر جمنا ندی کے
کنارے واقع ہے۔ یہ عمارت جسے پوری سنگِ مرمر
کے ایک اونچے چبوترے کے بیچوں بیچ بنائی
گئی ہے۔ چبوترے کے چاروں کونوں پر بلند اور
نازک مینار ہیں۔ گنبد کے نیچے انتہائی خوبصورت
پتھر کے جنگلے کے اندر شاہ جہاں اور اس
کی چہیتی ملکہ ممتاز محل کی قبریں ہیں۔ تاج محل
کا سہ منزلہ پھاٹک سنگ مرمر سے بنایا گیا ہے۔
جس کی بلندی ۷۰ فٹ ہے اس کے دونوں جانب
قرآن شریف کی آیاتِ مبارکہ کندہ ہیں۔ ان
آیاتِ مبارکہ کا کمال یہ ہے کہ اس میں لکھے
گئے حروف نیچے سے جتنے موٹے نظر آتے
ہیں اُتنے ہی ۷۰ فٹ کی بلندی پر بھی نیچے
سے اُتنے ہی سائز کے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ
ایسی صفت ہے جو دیکھنے والے کو حیران
کر دیتی ہے۔ اس پھاٹک میں ایک نہایت
خوبصورت اور شاندار دروازہ لگا ہوا ہے۔
صدر دروازہ سے تاج محل کی عمارت تک
پتھر کی دو خوشنما پٹریاں بنی ہوئی ہیں۔ ان
کے بیچ میں سُرخ رنگ کی ایک نہر ہے جو

بھاٹک سے تاج محل کی کرسی تک چلی گئی ہے۔ نہر کے دونوں جانب سرو کے درختوں کی قطاریں ہیں اور درمیان میں سنگِ مرمر کا ایک بڑا حوض بنا ہوا ہے جس میں فوارے اپنی بہار دکھاتے رہتے ہیں۔ تاج محل کے اندرونی حصے میں ایسے خوشنما و دلفریب بیل بوٹے اور پھول پتیاں بنی ہوئی ہیں کہ ساری دنیا میں ایسی بے نظیر اور اعلیٰ کاریگری دیکھنے والے کو ششدر کر دیتی ہے۔ یہ بیل بوٹے قیمتی پتھروں، سیپ وغیرہ سے بنائے گئے ہیں۔ سنگِ مرمر پر ایسی جلد دکھائی دیتی ہے کہ اس میں موتی کی آب و تاب کا گمان ہونے لگتا ہے۔ درمیان میں نازک اور باریک باریک جالیاں تراشی گئی ہیں انھیں دیکھ کر لوگ دنگ رہ جاتے ہیں۔ رنگین پتھروں کی پھول پتیاں جن کو تراش خراش کر سنگِ مرمر کی دیواروں میں جڑا گیا ہے ایسی ہیں کہ صناعی اپنے صناعوں پر ناز کر سکتی ہے۔ تاج محل کی تعمیر ۱۶۳۲ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس کی تعمیر اس عہد کے ۲۳ کروڑ روپے صرف ہوئے تھے اور شب و روز بیس ہزار سے زائد مزدور اپنے فن کا ماہرانہ کمال دکھاتے رہتے۔ تاج محل کی تعمیر کا کام ماہرین کے سپرد کیا گیا تھا جو مختلف ممالک سے بلوائے گئے تھے۔ تاج محل کا نقشہ استاد عیسیٰ لاہوری نے تیار کیا تھا۔ مولوی امانت اللہ خاں قرآن پاک کی آیات مبارکہ باوضو کندہ فرماتے تھے اور سنگ تراشی کے ممتاز و معظم ماہر محمد حنیف بغدادی قیمتی پتھروں اور سنگِ مرمر سے بے نظیر اور دلکش بیل بوٹے تیار کرتے۔ پچی کاری کا کام مرزا فتحو بیگ ترکی کے سپرد تھا اور اسمٰعیل خاں گنبد بنانے پر مامور تھے۔ جمنا کی لہروں میں تاج محل کا عکس ہمیشہ عجیب و غریب نظارہ پیش کرتا ہے۔

تو بیاہتا جوڑے اس دلفریب و دلکش عمارت سے اس قدر لطف اندوز ہوتے ہیں کہ انھیں اپنی ہنی مون پر ناز رہتا ہے ●

بقیہ، سحرالبیان کی عصرِ حاضر سے مطابقت

غرض سحرالبیان کے اس نگار خانے میں طرح طرح کا سامان دکھائی دیتا ہے۔ سواریوں میں پالکی، نالکی، میانہ، بینس، ہوادار، تختِ رواں، محافہ، چنڈول خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شہزادیوں کے حسن کا یہ عالم کہ پریاں دیکھیں تو شرما جائیں۔ کنگھی کیے، سرمہ، کاجل، مسی لگائے، لکھوٹا جمائے پشواز، اوڑھنی انگیا، کرتی میں ملبوس سر سے پیر تک سونے میں پیلی ہو رہی ہیں۔ کون سا زیور ہے جو ان کے پاس نہ ہو۔ جھومر، ٹیکا، بالے، جھلے، بندے، کرن پھول، مالا، ہیکل، دولڑا، ست لڑا، دھگدگی، آرسی، چنپا کلی، کڑے، چھڑے، دست بند، پہونچیاں، کنگن، بجوز، نورتن، جہانگیریاں، پازیب، چھن، رام جھول۔

اسی طرح وہ مرقعے بھی بہت دلچسپ ہیں جو مختلف قسم کی محفلوں اور تقریبات سے تعلق رکھتے ہیں جیسے ایک شادی کی تقریب میں شریک ہوں۔ برات کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

وہ دولہا کے اٹھتے ہی اک غل پڑا
لگا دیکھنے اُٹھ کے چھوٹا بڑا

اور پھر جب برات دلہن کے گھر پہنچتی ہے:۔

جب آئی وہ دلہن کے گھر پہ برات
کہوں واں کے عالم کی کیا تم سے بات

اور لیجئے صبح ہونے کو ہے، دلہن کی رخصتی کا وقت آ پہونچا:۔

سحر کا وہ ہونا وہ ٹونے کا وقت
وہ دلہن کی رخصت، وہ رونے کا وقت

غرض اس مثنوی کے صفحات میں ہندوستان کی صدیوں پرانی گنگا جمنی تہذیب کے ایسے کتنے ہی مرقعے پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ ●

رقیہ زیدی

سیول میں دسویں ایشیائی کھیل

ہندوستان نے ۵ طلائی تمغے حاصل کئے

سیول میں ۲۰ ستمبر ۱۹۸۶ء سے ۵ اکتوبر ۱۹۸۶ء تک دسویں ایشیائی کھیل کھیلے گئے۔ اس میں شریک ملکوں نے کون کون سے کتنے تمغے جیتے، اس کا مختصر خاکہ درج ذیل ہے:۔

ملک کا نام	طلائی تمغے	چاندی کے تمغے	کانسے کے تمغے
چین	۹۴	۸۲	۴۶
جنوبی کوریا	۹۳	۵۵	۷۶
جاپان	۵۸	۷۶	۷۷
ایران	۶	۶	۱۰
بھارت	۵	۹	۲۲
فلپائن	۴	۵	۹
تھائی لینڈ	۳	۱۰	۱۳
پاکستان	۲	۳	۴
انڈونیشیا	۱	۵	۱۴
ہانگ کانگ	۱	۱	۳
قطار	۱	۰	۳
لبنان	۱	۰	۱
بحرین	۱	۰	۱
ملائیشیا	۰	۵	۵
عراق	۰	۵	۲
جارڈن (اردن)	۰	۳	۱
کویت	۰	۱	۸
سنگاپور	۰	۱	۴
سعودی عرب	۰	۱	۰
نیپال	۰	۰	۸
بنگلہ دیش	۰	۰	۱
اومان	۰	۰	۱

ڈاکٹر ایس ایس یزدانی

شہد کے فائدے

زمانۂ قدیم سے ہی شہد کی نہ صرف غذائی اہمیت مسلّم ہے بلکہ یہ مختلف جسمانی علاج کا بیش بہا ذریعہ بھی رہا ہے. مصر میں پائے جانے والے ۱۵۵۳ء سے ۱۵۵۵ء قبل مسیح کے ایک صحیفہ (وہ کتاب جو حضرت ابراہیمؑ پر نازل ہوئی تھی) میں شہد کو پیشاب کی نلی اور معدہ کے امراض کے لیے بطورِ دوا استعمال کرنے کا ذکر ہے۔ ہندوستان میں جسمانی توانائی و قوت کو برقرار رکھنے والی ادویات میں شہد کا بکثرت استعمال ہوتا رہا ہے ۔ درازیٔ عمر کے لیے یونانی اور آیورویدک اطباء نے غذا کے ساتھ دودھ اور شہد کا استعمال بہت مفید بتایا ہے۔ جبکہ مشہور رومن معالج گیلن نے شہد کو ہر مرض کا علاج کہا ہے ۔ مشرقی عرب کے اطباء شہد کا استعمال بڑے پیمانے پر کیا کرتے تھے۔ اُس دور کے علم طب کے اُستاد ابنِ سینا نے متعدد نسخے علاج کے ایسے استعمال کیے جن میں شہد اور موم اہم جزو ہوا کرتے تھے۔ شہد کے فوائد ابن سینا نے بھی بیان کیے ہیں۔

"یہ زکام کو روکتا ہے اور ہاضمہ میں معاون ہے۔ ریاح دُور کرتا ہے جس سے بھوک لگتی ہے۔ قوتِ باہ اور یاد داشت کی صلاحیتوں کو جلا بخشتا ہے۔"

اُس نے زخم مندمل ہونے کے لیے آٹے میں شہد ملا کر اُس کا لیپ لگانے کے لیے بھی تجویز کیا تھا جسے ہر بارہ گھنٹے بعد بدلنے سے زخم جلد بھر جاتے تھے۔

موجودہ دور کے اطباء بھی شہد کے استعمال کو ایک کامیاب ذریعہ علاج تصور کرتے ہیں۔ اس میں خصوصاً گلوکوز ایک اہم جزو ہے۔ جس کا دل کے نسیجوں اور شریانوں پر بہت اچھا اثر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی اجزاء ہوتے ہیں جو انسان میں مرض کے لیے مزاحمت کی قوت پیدا کرتے ہیں۔

شہد کے ذریعے زخموں کا علاج

قدیم زمانہ میں مُنہ کے اندر اور جسم کے اُوپر نکلنے والی پھوڑے اور پھنسیوں کے علاج کے لیے مچھلی کے تیل میں شہد ملا کر اُن جگہوں پر لگایا کرتے تھے۔ رُوسی سرجن کرینِلکی نے ۱۹۳۸ء میں شہد اور مچھلی کی چربی کو ملا کر ایک مرہم تیار کیا تھا جسے ۸۴ مریضوں کے جلدی زخموں پر لگایا گیا۔ پانچ دنوں کے بعد زخم کے مردہ نسیجوں کی جگہ نئے نسیجوں نے لے لی۔ کرینلکی نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ شہد کی موجودگی میں گلوٹا تھیون کافی مقدار میں پیدا ہوا جس سے زخم مندمل ہو گئے۔ گلوٹا تھیون خلیوں کو بڑھنے اور تقسیم ہونے میں کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں ٹومسک میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے پروفیسر سمیرنو نے ۵۰ مریضوں کو بندوق کی گولی سے لگے زخموں کا علاج بھی شہد کے ذریعے کیا اور کرینلکی ہی کے نتیجہ پر پہونچے۔

اطباء کے تجربات کی ایسی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ڈاکٹر یزدانی نے دیر سے مندمل ہونے والے اور پیپ بھرے زخموں کا علاج ۸۰ گرام شہد، ۲۰ گرام مچھلی کا تیل اور ۳ گرام زیرو فارم ملے ہوئے ایک مرہم سے بڑی کامیابی سے کیا۔ مگر بہت سے لوگوں کو مچھلی کا تیل اور زیرو فارم کے استعمال سے الرجی ہونے کی بناء پر بعد ازاں ان دونوں اجزاء کی جگہ سیبک تھورن کے تیل کے ساتھ شہد کا استعمال کیا گیا۔

شہد کو سانس کے ذریعے اُوپر چڑھانے کا عمل: شہد کو

سانس کے ذریعے اوپر چڑھانے کا اثر سانس کی اوپری نلی پر بہت اچھا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر کیسلس ٹین نے جو تجربات ۱۹۳۸ء میں کئے وہ اس سلسلے میں اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے ایک عرق پاشی آلہ (آٹومائیزر) بنایا جو شہد کے آبی محلول کو بہت باریک ذرات میں منتقل کر سکتا تھا۔ اس آلہ میں شہد کا دس فیصد آبی محلول رکھ کر انھوں نے ایک ۳۲ سالہ مریض پر اس کا تجربہ کیا۔ جس کی کئی سال سے بالعموم (فیرنکس) خشک رہا کرتی تھی اور آواز کا نکلنا بند ہو گیا تھا۔ ناک کی جھلی اور فیرنکس کا پچھلا حصہ اپنی اصلی حالت میں ہونے کے باوجود اس کی حنجری جھلی اور ہوا کی نالی کا بالائی حصہ پیپ پڑے کھرنڈ سے بری طرح متاثر تھا۔ تجویز کردہ علاج کے تحت مریض نے ہر ۵ منٹ تک شہد کے آبی محلول کو سانس کے ذریعے چڑھایا اور اس طرح سات بار کرنے سے راحت محسوس کرنے لگا۔ اس کے کھرنڈ اور گلو گرفتگی یعنی آواز کا بھرا ہونا ختم ہو گئی۔ بیس مریضوں پر اس طریقۂ علاج کو آزمایا گیا تھا اور صرف دو ہی مریض صحت یاب نہیں ہو سکے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ سبھی مریضوں کا حسبِ معمول اطمینان بخش علاج پہلے ہو چکا تھا لیکن ان میں صحت بخش نتائج حاصل نہیں ہوئے۔

سانس کے ذریعے شہد کو اوپر چڑھانے سے نہ صرف گلے اور گلے کی لعاب دار جھلیوں بلکہ پھیپھڑوں کے جوف (اکولوبی) پر بھی (جس کے ذریعے یہ خون میں داخل ہوتا ہے) اثر ہوتا ہے۔ اس طرح یہ نہ صرف مقامی جراثیم کش کا کام کرتا ہے بلکہ (آرگینیزم) کے بننے میں بھی معاون ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کیسلس ٹین نے شہد کی دافع امراض خصوصیت کو اس میں موجود حیاتین (وٹامن) کی زائد مقدار سے منسوب کیا ہے۔ بعد کی تحقیقات نے اسے غلط ثابت کر دیا ہے۔ کیوں کہ شہد میں حیاتین کی مقدار بہت قلیل ہوتی ہے۔ شہد کے پانچ اور دس فیصد آبی محلول میں حیاتین 'سی'، 'بی'، 'وَن'، اور 'اے' کا جب اضافہ کر دیا گیا تو توقع سے زیادہ حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے۔ سانس کے ذریعے شہد کو اوپر چڑھانے کا عمل ڈاکٹر کی نگرانی میں بہ آسانی گھروں میں بھی کیا جا سکتا ہے۔

زمانہ قدیم سے ہی نزلہ و زکام کے دفع کے لیے صرف شہد یا مختلف ادویات اور غذا میں اس کا استعمال ہوا ہے۔ ایک گلاس دودھ میں ایک بڑا چمچہ شہد کا ڈال کر نزلہ و زکام سے متاثر لوگوں کو پلانا فائدہ مند ہے۔ ایک لیموں کے رس کے ساتھ ۱۰۰ گرام شہد ملا کر چاٹنے سے بھی نزلہ و زکام کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔ نزلہ و زکام کے مریضوں کو دفع مرض کے لیے شہد کا استعمال گھروں میں بند ہو کر کرنا چاہیئے کیوں کہ اس کے بعد کافی پسینہ نکلتا ہے۔

پھیپھڑوں کے امراض کے لیے بھی شہد کارآمد ہے۔ بلغم چھانٹ کر کھانسی کو کم کرتا ہے۔ ابن سینا نے تپِ دق (ٹیوبرکلوسیس) کے ابتدائی دور میں شہد اور گلاب کی پتیوں کے مرکب محلول کا دوپہر سے پہلے مریضوں کو کھلانا بہت فائدہ مند بتایا ہے۔ شہد تپِ دق کے جراثیم کو تو نہیں مارتا لیکن آرگینیزم کو توانائی دے کر اس قابل کر دیتا ہے کہ جراثیم کا آسانی مقابلہ کر سکے۔ کیو میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں کی جانے والی حالیہ تحقیق نے اس کی تصدیق کر دی ہے کہ ایسے مریضوں کو روزانہ ۱۰۰ سے ۱۵۰ گرام شہد دئے جانے پر ان کی حالت میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ وہ اپنے کو بہتر محسوس کرنے لگے، اور وزن میں اضافہ ہونے لگا۔ ان کے خون کے خلیوں کی تعداد بڑھ گئی۔ یہی نہیں بلکہ مریض کو کھانسی اور بلغم کا آنا بند ہو گیا۔ مریض رات کی نسبت دن میں زیادہ پیشاب کرنے لگے ان کی آنت اور شکم کا طریقۂ عمل بہتر ہو گیا۔

شہد اور دل کا طریقۂ عمل

دل کے عضلات (مسلس) مسلسل کام کرتے رہتے ہیں۔ جس کی بنا پر اس کی توانائی کو بحال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے لیے گلوکوز کی ضرورت پڑتی ہے۔ متحرک دل کو پہلو سے فوراً الگ کر کے اگر عضویاتی آب شور (فیزیولوجیکل سیلائن) جس میں تھوڑی مقدار (۱۰ فیصد) شہد کی ملا دی گئی ہو رکھ دیا جائے تو اس کی حرکت مزید چار دنوں تک قائم رہتی ہے شہد کا دل کے عضلات پر (چونکہ یہ آسانی جذب ہونے والے گلوکوز پر مشتمل ہے) بہت اچھا اثر ہوتا ہے۔ دل کے ہر مرض کے لیے شہد ناگزیر ہے۔ شہد کے استعمال سے ورید (وین) پھیل جاتے ہیں اور دل سے نکلنے والی شریانوں میں دورانِ خون کا عمل بہتر ہو جاتا ہے۔ قلبی امراض کے مریضوں کو اگر ۶۰ گرام شہد روزانہ دو تین ماہ تک دیا جائے تو ان کے خون میں موجود اجزا معمول پر آجاتے ہیں اور خون کے خلیوں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے۔

شہد اور ہاضمہ

شہد معدے کا بہترین دوست ہے۔ یہ ایک پرانی کہاوت ہے۔ طبی ادب میں بھی ایسے کئی اشارات ملتے ہیں۔ اسے اگر روزانہ استعمال میں لایا جائے تو شکم اور آنت کے خطے معمول کے مطابق کام کرنے لگتے ہیں۔ شہد ایک اچھے ملین (پاخانہ لانے والی) کی خصوصیت سے مالا مال ہے۔ عام طور پر کھانے کے بعد

غذا دو سے چار گھنٹوں تک معدہ میں رہتی ہے۔ غذا کے ساتھ اگر شہد استعمال کیا جائے تو معدہ کی تیزابی کیفیت میں کمی آجاتی ہے۔ شہد شکم اور آنت کی کئی بیماریاں مثلاً شکمی زخم (پیپٹک السر) اور گیسٹرائٹس (جن کا انحصار معدہ کی تیزابی کیفیت پر ہے) میں بہت ہی کارآمد ہے۔ روس میں شکمی زخموں کے ۵۰۵ مریضوں پر شہد کے استعمال کا یہ اثر ہوا کہ اُن کے معدہ کی تیزابی کیفیت اور رطوبتیں معمول پر آگئیں اور مریض کو کھٹی ڈکار کا آنا، معدہ کی جلن اور اینٹھن ختم ہوگئی۔ شکمی زخموں پر شہد کا دُہرا اثر ہوتا ہے۔ مثلاً

۱۔ یہ مقامی طور پر شکمی زخموں کو مندمل ہونے میں مدد کرتا ہے۔

۲۔ آرگینزم پر اس کا صحت کے نقطۂ نظر سے نفع بخش اثر ہوتا ہے خصوصاً اعصابی نظام (نروس سسٹم) خاص طور پر متاثر ہوتا ہے۔

شکم اور آنت کے زخم ان عضلات کے اعصابی نظام میں نتنّؤ پیدا ہونے کی بنا پر ہوتے ہیں۔

شکمی زخموں کے لیے شہد کا استعمال ناشتہ یا کھانے کے ڈیڑھ گھنٹہ یا دو گھنٹہ قبل یا تین گھنٹہ بعد نیم گرم پانی میں ملا کر کرنا چاہیئے۔ اس شکل میں یہ معدہ کی رطوبت کو پتلا کرکے تیزابیت کو کم کرتا ہے اور آنت میں بغیر سوزش پیدا کئے جلد جذب ہوجاتا ہے۔ یہ خیال رہے کہ شہد کے ٹھنڈے آبی محلول سے تیزابیت بڑھ جاتی ہے، معدہ میں ہاضمہ کی کمی آجاتی ہے جس سے آنت میں سوزش ہونے لگتی ہے۔ کھانا کھانے کے ٹھیک پہلے شہد کا استعمال معدہ کی رطوبت کے اخراج کو تیز کر دیتا ہے۔

جگر سارے حیاتی عمل مثلاً کاربوہائیڈریٹ لحمیہ، چربی، حیاتین اور ہارمونس کی تبدیلی میں کارہائے نمایاں انجام دیتا ہے۔ جگر کیروٹین کو حیاتین اے (وٹامن اے) میں تبدیل کر دیتا ہے۔ پروتھرومبن خون کا ایک اہم جزو ہے جس کی موجودگی میں خون جسم سے باہر آنے پر جم جاتا ہے۔ یہ بھی جگر میں حیاتین کے (وٹامن کے) کی مدد سے بنتا ہے۔ غدود سے نکلے اندرونی افراز جو خون میں مل کر تحریک اعضا کا باعث ہوتے ہیں۔ جب جگر میں پہونچتا ہے تو اُن میں نئی خصوصیات پیدا ہوجاتی ہیں۔ جگر کی مختلف شکایات کے لیے بھی شہد نہایت مُفید ہے۔

شہد میں پایا جانے والا گلوکوز جگر کے نسیجوں کے پُرانے خلیوں کو نہ صرف ختم کرتا ہے بلکہ اس کے اندر گلائیکوجن کے سرمایہ میں اضافہ کرکے پُرانے نسیجوں کے تبدیلیٔ عمل کو بہتر کرتا ہے۔ گلائیکوجن کی موجودگی میں جگر ایک چھلنی کا کام کرکے جراثیمی زہر کو بے ضرر کر دیتا ہے۔ اس طرح آرگینزم میں بیماریوں سے مزاحمت کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ جگر کی بیماری کے لیے شہد اور مُولی کے رَس کو ملا کر ۱۰۰ سے ۱۵۰ گرام روزانہ کھانا مفید ہے۔ جن لوگوں کے گُردوں میں پتھری ہو اُنھیں ایک چائے کا چمچہ شہد، زیتون کا تیل اور لیموں کا رَس ملا کر دن بھر میں تین بار کھانا چاہیئے۔ مگر اس نسخہ کا استعمال کسی ڈاکٹر کے زیر نگرانی ہی کریں۔

دانتوں کے امراض میں شہد کا استعمال

معالج دندان (ڈنٹسٹ)، اس بات پر متفق ہیں کہ چینی کا استعمال دانتوں کے لیے مُضر ہے۔ مُنھ کے اندر جراثیم (بیکٹریا) دانتوں کے درمیان لگی چینی کی مٹھاس کو کئی طرح کے تیزاب میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اُن میں لیکٹک ایسڈ اہم ہے۔ یہ تیزاب دانتوں پر جمی چُونے کی پَرت کو ختم کر دیتا ہے جس سے دانت سڑنے لگتے ہیں اور گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ شہد دانتوں کے لیے بھی مفید ہے کیوں کہ یہ عملی طور پر ایسی خصوصیات کا حامل ہے جو جراثیم کو رفع کرتے ہیں۔ شہد حقیقتاً مُنھ کے متعدی جراثیم کو دُور کرتا ہے۔ اس طرح ہماری زندگی میں ادویاتی نقطۂ نظر سے شہد کی بڑی اہمیت ہے۔ ●

بقیہ: بچّوں کی نشو و نما کا بے نظیر پروگرام

سے متعلق ایک جامع پروگرام قائم کیا ہے جس سے ملک کی تقریباً ۲۵ فیصد آبادی مستفید ہو رہی ہے اور جو ۱۱ برس سے متواتر کامیابی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ بیرونی ایجنسیوں نے اس کی کامیابیوں کا جائزہ لیا تھا۔ چین کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ اُس نے بھی بچّوں سے متعلق بڑے پیمانے پر ایک پروگرام جاری کر رکھا ہے لیکن اُس میں ماؤں کو شامل نہیں کیا گیا۔ پولینڈ میں بھی بچّوں کی صحتی دیکھ بھال کے بارے میں پروگرام زیر عمل ہے لیکن افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں بمشکل کوئی ایسا قومی پروگرام موجود ہے حالانکہ اُنھیں مالی اور تکنیکی وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ان میں سے بعض ممالک میں چھوٹے چھوٹے پروگرام ہیں جن کی کبھی توسیع نہیں کی گئی اور نہ کبھی جائزہ لیا گیا ہے۔ بھارت کو "آئی سی ڈی ایس" میں جو تھوڑا سا تجربہ حاصل ہوا ہے اُس سے افریقہ اور لاطینی امریکہ کی کروڑوں خواتین اور بچّوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

بھارت کو بھی اس امر کی ضرورت ہے کہ وہ اس پروگرام کی توسیع کرے تاکہ زچہ و بچّہ کی فلاح و ترقی سے متعلق سہولیات سے ہر وہ شخص استفادہ کر سکے جسے ان کی ضرورت ہے۔ ●

تبصرہ

کتاب کا نام : **آم کے آم** (رام لعل نابھوی کے انشائیوں کا مجموعہ)

ناشر: رام لعل نابھوی، محلہ دیوان ۔ نابھا ' ۲۰۱ ، ۱۴۷ (پنجاب)

انشائیہ کی موجودہ صنف انگریزی ادب کے زیرِ اثر اُردو میں رواج پاگئی ہے، یوں تو انشاء کا لفظ اُردو لغت میں موجود ہے جس کے معنی عبارت لکھنے، بات سے بات پیدا کرنے اور طرزِ تحریر کے ہیں، لیکن موجودہ حالت کی یہ صنف انگریزی کے لفظ (essay) سے ماخوذ ہے، انشائیہ کی ہیئت اور اسکی خصوصیات مضمون اور مقالے سے مختلف ہیں، مضمون کا لفظ اُردو میں وسیع مفہوم لیے ہوئے ہے، انشائیے، مقالے وغیرہ سب اس کے تحت آجاتے ہیں، مقالہ تحقیق و جستجو اور چھان بین کے بعد لکھا جاتا ہے، اس میں ٹھوس حوالے اور دلائل ہوتے ہیں۔ انشائیہ نہ تو مضمون ہوتا ہے نہ مقالہ، ڈاکٹر جانسن کے بقول یہ [illegible] گویا کہ ایک ذہن کی آزاد ترنگ کا نام ہے اور یہی ترنگ انشائیہ کہی جاتی ہے۔ اس کے ذریعے انسان بے تکلف اور بے جھجک ہو کر ہر طرح کی باتیں کرتا ہے، اس میں مصنف کی شخصیت بے نقاب ہوتی ہے، شخصیت کی یہی جلوہ گری انشائیہ کو مقبول بناتی ہے، یہ شخصی جذبات اور گہرے مشاہدات کی غمازی کرتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی اپنے انشائیوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :۔

"مضامین میں جو باتیں غیر متعارف اور ہلکی ہلکی معلوم ہوتی ہیں، وہ میرے فن کی شریعت کے عین مطابق تھیں، میں خود نہیں بہکتا تھا، دوسروں کو بہکنے اور بہلنے کی فرصت دیتا تھا۔ عقل کی باتیں دیر تک سُنی جا سکتی ہیں، نہ سُنائی جا سکتی ہیں، انشائیہ اپنے اندر بڑی وسعتیں رکھتا ہے، اس سلسلے میں خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، پطرس بخاری، کنہیا لال کپور، فرحت اللہ بیگ اور دوسرے بہت سے اسمائے گرامی پہلے ہی سے سند کا درجہ رکھتے ہیں، حال ہی میں جناب رام لعل نابھوی نے بھی اس صنف کو اپنے عزیز ترین سرمائے کی صورت میں پیش کیا ہے، ان کے انشائیوں کے مجموعے کا نام ہے" آم کے آم"۔

یہ کتاب ہریانہ ساہتیہ اکیڈمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے، اس کا انتساب ڈاکٹر وزیر آغا کے نام ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ایک اچھے انشائیہ کی پہچان یہ بتائی ہے کہ آپ اس کے مطالعے کے بعد انشائیہ میں الجھے ہوئے بہت سے اشارات کا سہارا لے کر خود ہی سوچتے اور محظوظ ہوتے چلے جائیں گے۔

اس کتاب کے شروع میں انشائیہ کی تعریف اور اس کی وسعتوں کو جامع انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جن ناقدین اور ادب کی معروف شخصیتوں کی آراء شامل کی گئی ہیں، ان میں ڈاکٹر احتشام حسین، ڈاکٹر سید محمد حسنین، نظیر صدیقی، غلام جیلانی، جمیل آذر، مشتاق قمر، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر وحید قریشی، رب نواز مائل، شکور حسین یاد، سید شاہ احمد سعید رہبرانی، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور دیگر بہت سے دانشوروں کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس کتاب میں سولہ انشائیے ہیں، جن میں حیات و کائنات کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے، ان کے مطالعے سے مصنف کی ذہنی اُپج اور انسانی نفسیات پر ان کی گہری نظر کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے سلیس، شگفتہ زبان میں نہ صرف سامانِ انبساط فراہم کیا ہے بلکہ انشائیہ کے مزاج، موڈ اور ٹکنیک کو عوام کے سامنے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

پہلا انشائیہ 'فیشن' کے عنوان سے ہے، دیکھئے کہ وہ اسے کس نظر سے پیش کرتے ہیں، ' فیشن ' کی سحر انگیز آنکھوں میں ایک جادو ہے، اس کے گلے میں سوز و گداز ہے، اس کی ہر حرکت جان لیوا ہے، کتنا ہی کوئی دُنیا دار ہو، سوجھ بوجھ کا مالک ہو، چلتا پُرزہ ہو، خود کو عقلمند، دوسرے کو بیوقوف سمجھتا ہو، 'فیشن' سے ملاقات ہوتے ہی اس کے تابع ہو جائیگا بلکہ گرویدہ ہو جائیگا۔ فیشن، پہلے دل کو گرفت میں لیتا ہے، پھر دماغ کو قابو میں کرتا ہے، فیشن آپ سے کچھ نہیں مانگتا، آپ سے کچھ نہیں لیتا، بس آپ اس کا حکم مانتے رہیں۔ یہی اس کی کرامات ہے، یہی اس کا حسن ہے، یہی اس کی توانائی ہے، یہی اس کی شوخی ہے "۔ ہم روزمرہ کی زندگی میں پوسٹ کارڈ دیکھتے ہیں، ایک ادیب کی نظر سے پوسٹ کارڈ کا مطالعہ کیجئے۔ "پوسٹ کارڈ بہت مسکین طبیعت کا مالک ہے۔ لیکن کبھی کبھی اسے شرارت سوجھ جاتی ہے۔ پھر وہ سفر کرنے کی سوچتا ہے اور میز پر سے کھسک کر دوسرے تھیلے میں چلا جاتا ہے، ملکوں ملکوں نہ سہی، شہروں شہروں گھومتا ہے، مختلف ڈاکخانوں کی سیر کرتا ہے، ادھر وہ کھسکا، اُدھر انکوائری شروع ہو جاتی ہے۔ شرارت تو پوسٹ کارڈ کی ہوتی ہے، پھنس جاتے ہیں ڈاکخانے کے ملازم "۔ انتظار کے عنوان سے لکھتے ہیں "چھ حروف کے اس لفظ میں کیا کچھ نہیں، کرب، اُلجھن، بے چینی اور اضطراب مگر اس میں ایک عجیب قسم کا سرور بھی ہے۔ اس میں ایک ایسا نشہ ہے جو لفظ کی گرفت سے بالاتر ہے "۔ اس سلسلے میں کیا اچھی بات کہی ہے" انتظار زندگی کی علامت ہے، جو شخص انتظار میں نہیں، وہ مرنے سے پہلے مر چکا ہے۔ گالی کے عنوان سے لکھتے ہیں "گالیاں دینا آسان کام نہیں، ہمت اور طاقت کی ضرورت ہوتی ہے، مدِ مقابل کوئی مضبوط انسان ہو تب تو انسان گالیاں دینے کی بجائے خود کو ہی گالیاں دے کر اپنا غبار نکالتا ہے "۔

تصویر کے زیرِ عنوان رقم طراز ہیں" مصوری عمیق مطالعہ، گہرا مشاہدہ، غور و فکر، باریک بینی، فراست اور ذہانت، تاریخ سے شناسائی، سیر و سیاحت، شعر و شاعری سے رغبت، فنونِ لطیفہ اور قدرتی مناظر سے والہانہ اُنس چاہتی ہے، آخری انشائیہ آم کے آم گٹھلیوں کے دام کے عنوان سے ہے اور اسی کے نام پر انھوں نے اپنے اس مجموعے کا نام رکھا ہے۔ اس میں مختلف مثالوں سے اس محاورے کی وضاحت کی گئی ہے۔ آخر میں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے فاضل مصنف کا منظوم تعارف کرایا ہے۔ ۹۵ صفحات پر مشتمل یہ کتاب بہت اچھے کاغذ پر آفسیٹ پر چھاپی گئی ہے، اس کا حسین ٹائٹل مصنف کے ذوقِ جمال کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اس کی قیمت صرف ۲۰ روپے ہے، اُردو ادب میں اسے ایک بیش قیمت اضافہ کہا جا سکتا ہے۔

شِو ناتھ بیکہ

قارئین کی آرا اور مشورے

رسالہ ترقی کر رہا ہے

"یوجنا کے جو شمارے دیکھنے کو ملے، ان سے میں خاصا متاثر ہوا۔ رسالہ ترقی کر رہا ہے۔ ملک کے سماجی معاشی ڈھانچے اور سیاسی نصب العین کے بارے میں کوئی دوسرا رسالہ اس معیار کا نہیں۔ ادبی حصّے کا اضافہ بھی خوب ہے۔ اس کو جاری رکھیے۔" ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

گذشتہ کئی برسوں سے یوجنا کا مطالعہ کر رہا ہوں، اس میں کوئی شک نہیں کہ تقریباً ہر شمارہ اپنے گوناگوں معلوماتی مضامین کے اعتبار سے خاصہ یادگار ہوتا ہے، میری دلچسپی عہد حاضر کے اقتصادی اور سماجی مسائل و موضوعات میں گہری ہے، اکثر آپ کے پیش کردہ مضامین سے آپ کے حسن انتخاب کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔..... تحقیقی و معلوماتی مضامین کے لحاظ سے تو آپ کی مساعی لائق صد تحسین ہے، لیکن تخلیقی باب خاصہ کمزور رہے، یہ صورت اکثر سرکاری و نیم سرکاری رسائل میں دکھائی دیتی ہیں۔ سرکاری رسالے کا مطلب قطعی یہ نہیں ہے کہ میگزین کو از سرتا پا خشک بنا دیا جائے، آپ کی حدود اور مقاصد کا مجھے پوری طرح علم و احساس ہے لیکن آپ اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے کے باوجود ملک کے نامور افسانہ نگاروں اور شعراء کا تعاون حاصل کر سکتے ہیں، محض مقصدی نظمیں یا نثری شہ پارے قاری کو زیادہ راس نہیں آسکتے۔ آپ کے مقصدی موضوعات پر مبنی آرٹیکل اسی وقت بامعنی ہوں گے جب آپ قاری کے دیگر اذواق و دلچسپیوں کا بھی خیال رکھیں۔... مجھے یقین ہے کہ آپ اسے زیادہ وقیع، زیادہ معنی خیز، زیادہ معتبر بنائیں گے۔ کے۔کے۔ کھلر

یوجنا ہر اُردو داں کے لیے

۱۔ یوجنا میں فلمی دنیا سے متعلق احوال و کوائف کے لیے بھی صفحات شامل کیے جائیں۔ ۲۔ اقتصادی پسماندگی، معاشی بدحالی اور اخلاقی پستی کے پس منظر میں معاشرے میں پیدا ہونے والے جنسی اور دیگر جرائم کی کہانیاں دی جائیں۔ ۳۔ کھیل کود پر مبنی نظموں کی گنجائش رکھی جائے۔ ۴۔ قبائلی زندگی کے قدیم اور دلچسپ رسم و رواج، تاریخی عمارات و مقامات، مناور و مساجد اور تاریخی شخصیات کے بارے میں معلوماتی مضامین ہوں۔ ... اُردو داں افسران اور دیگر سرکاری ملازمین کے گھروں میں یوجنا ضرور پہنچے تاکہ لوگ اس کے ادبی، اقتصادی اور سماجی مضامین کے افادی پہلو سے بھی مستفیض ہو سکیں۔ نثار احمد زکی

معرفت بہار فارمیسی مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی ۶

اُردو داں طبقہ مستفید

یوجنا اُردو زبان میں بھی شائع ہونے لگا، میرے لیے یہ اُسی وقت بڑی خوشی کی بات تھی، جب اس کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس سے سماجی اور اقتصادی مسائل میں دلچسپی رکھنے والے اُردو داں حضرات کو بہت فائدہ حاصل ہوا ہے، میں ذاتی طور پر بھی اس سے بہت مستفید ہوا۔ ڈاکٹر محمد مزمّل لیکچرر شعبۂ معاشیات، لکھنؤ یونیورسٹی

ماہ ستمبر کا شمارہ یکم تا ۱۵ موصول ہوا۔ اس سے خوشی ہوئی کہ آپ نے اس رسالے کو نظموں، غزلوں اور آزاد غزلوں سے مزیّن کیا۔ اس میں اگر اسلامیات اور لطائف کی جگہ دیدیں تو رسالے میں چار چاند لگ جائیں گے۔

شکیل احمد بستوی

دار جدید، دارالعلوم دیوبند

یوجنا بہ اعتبار معیار پست قد نہیں کہلایا جا سکتا، ہاں اسے مزید پرکشش و دلچسپ بنانے کے لیے مزید اقدامات کیے جا سکتے ہیں، جو آپ کر بھی رہے ہیں، مثلاً غزلوں، نظموں، کہانی اور تبصروں کی اشاعت کا سلسلہ البتہ کبھی کبھار کسی ایسی گھریلو صنعت کی مکمل و مفصل معلومات فراہم کی جانی چاہئیں، جن کی مدد سے کوئی بھی بے روزگار فرد تھوڑی سی پونجی لگا کر اس صنعت کو اپنا سکے۔

غزلوں، نظموں اور کہانیوں کے ساتھ ساتھ کچھ مواد خواتین سے متعلق بھی ہو تو کیا مضائقہ ہے۔ یوجنا میں شامل کی جانے والی کہانی میں کہانی پن اور جاذبیت ضرور ہونی چاہیے۔ طنزیہ و مزاحیہ مضامین کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کر دیں تو بہتر ہے۔ عزیز مراد آبادی۔ ڈاکخانہ لسبی کرت پور، بجنور۔

یوجنا عام طریقے سے بک اسٹالوں پر دستیاب نہیں ہوتا۔ یوجنا کے صفحات میں بہت گنجائش و وسعت ہے۔ اس کے ذریعے اُردو حلقوں میں یگانگت اور محبت کے جذبات کی فراوانی ہو، اس کے مشمولات کے لیے غزل، نظم، مضمون، کہانی، تبصرہ وغیرہ اس کی کامیابی کے لیے مزید نیک فال ہوگا۔ اختر الاسلام

ایڈیٹر اُردو ویکلی، میرٹھ

یوجنا ایک معیاری پرچہ ہے، ترقیاتی کاموں کا جائزہ لیتا ہے، عوام مفید معلومات سے روشناس ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر مٹھے بھکتہ وتسل راؤ

ایم۔ ایس۔ سی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی حیدرآباد

یوجنا پہلے کی نسبت اب زیادہ دلکش اور دیدہ زیب ہو گیا ہے۔ روز افزوں اس کا معیار بھی بڑھتا جا رہا ہے، یوجنا میں شامل مضامین واقعی دلچسپ معلوماتی اور پُر مغز ہوتے ہیں، مختلف موقعوں پر اس کے خصوصی شماروں کی اشاعت ایک بڑا کارنامہ ہے

عبدالرؤف

لیکچرار معاشیات، گورنمنٹ کالج، بھونگر (اے۔ پی)

فلموں میں تشدد

تشدد، انتہا پسندی، دہشت گردی، جسمانی اذیت رسانی اور عریانیت و جسم فروشی کی کہانیاں ہماری فلم سازی کے بازار میں منافع بخش مال ہے۔ ان مجرمانہ اور غیر انسانی سرگرمیوں کی آمیزش سے بنائی گئی فلمیں عوامی مقبولیت حاصل کرتی رہی ہیں۔ اس سے اس بات کا اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں رہ جاتا کہ ہماری سوسائٹی کن خطوط پر بڑھنے کے لیے پر تول رہی ہے؟

یہ فلمیں اعلیٰ روایات اور اقدار سے میل نہیں کھاتی ہیں یہ "جیو اور جینے دو" کے ہمارے بے نظیر شہرۂ آفاق نعرے کے سراسر منافی ہیں۔ ہماری نئی نسل میں طبقاتی منافرت اور ایک دوسرے کے خلاف اجتماعی انتقام کا جذبہ بڑھ رہا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ فلمیں ہماری بے مثل انسانیت پسندی اور عدم تشدد کی قومی علامت کی عکاسی کرتیں۔ دورِ جدید میں تیز رفتار ترقی کے نتیجے میں مختلف دینی و لسانی طبقوں میں جو چھوٹے موٹے اختلافات رونما ہوئے ہیں، یہ ان کے انسداد و تدارک کا ذریعہ بنتیں لیکن اس کے برعکس فلمیں نئی اور نوجوان نسل کی مجرمانہ ذہن سازی کر رہی ہیں۔ اسے جنس زدہ بنایا جا رہا ہے۔ مرد اور عورت کے تعلق کا اختتام جنسی پیاس کے بجھانے اور باہم جنسی بھوک مٹانے پر ہوتا ہے۔ یہی فلمیں بتاتی اور دکھاتی ہیں۔ جبکہ انھیں فلموں سے نئی نسل کی کردار سازی کا کام لیا جا سکتا ہے۔ فلموں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ نوجوانوں اور طالب علموں کو درسِ حیات دیا جا سکتا ہے۔ ٹیلی ویژن نے اسکولوں اور کالجوں کے لیے طالب علموں کے لیے کچھ پروگراموں کا آغاز تو کیا ہے لیکن طلبا ابھی ان پروگراموں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے ذہنوں میں تو فلموں کی عیاریوں اور چالاکیوں کے دلکش مناظر چھائے رہتے ہیں۔

ایسی صورت میں حکومت پر سب سے بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ فلم انڈسٹری پر کڑی نگاہ رکھے۔ سینسر کا جو شعبہ قائم ہے اس کو مزید مضبوط و مستحکم بنائے۔ اس میں ایسے دانشور افراد ماہرین تعلیم و نفسیات، سائنس داں و انجینئر اور مشہور اسپورٹس مین کو شامل کرے۔ جن کی کوششوں سے ایسی فلمیں تیار ہوں جو آئندہ نسل میں تعمیر و ترقی کا جذبہ بیدار کر سکے۔ نئی نسل مضبوط اور پختہ کردار کی حامل ہو۔ ورنہ فلم انڈسٹری مجرمانہ زندگی کی رہنمائی کا ذریعہ اور جنس پرستی بہ زیادہ شدت سے عمل آوری کا وسیلہ بن جائے گی۔

ذرا غور فرمایئے کہ گزشتہ چار برسوں میں ہماری فلم صنعت نے کتنی سنجیدہ، سبق آموز اور کتنی عریاں فلمیں تیار کیں۔ اتنی بڑی تعداد میں گندی عریاں اور جرائم سے بھرپور فلموں سے کیا کوئی سنجیدہ انسان سماج کی بہتری اور نئی نسل کی بہبودی کی امید کر سکتا ہے۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق اس وقت ملک میں تیار ہونے والی ہر تین فلموں میں سے ایک بالغوں کے لیے ہوتی ہے۔

بالغوں کے لیے جنس پر مبنی فلموں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ملک کے دانشوروں کے لیے بالغ فلموں کی بڑھتی ہوئی تعداد غور و فکر کا موجب بن رہی ہے۔ وزارتِ تعلیم و ثقافت کے ذرائع کے مطابق اس سال بھی فلموں کو سرٹیفیکیٹ دینے میں سخت اصول اپنائے گئے ہیں۔ مئی تک کے پانچ مہینوں میں ۵۵۳ فلمیں بن چکی ہیں۔ ان میں سوا سو سے زیادہ بالغوں کے لیے تھیں۔ ان ذرائع کے مطابق فلم سینسر بورڈ کو گرچہ واضح ہدایات دی گئی ہیں کہ تشدد سے بھرپور، سماج مخالف سرگرمیوں کو بڑھانے والی اور اخلاق سوز و عریاں فلموں کی سختی سے جانچ کی جائے حالیہ برسوں میں ایسی فلموں کی بھرمار رہی ہے۔

فلم سازی کے متعلق موصولہ اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۶ء میں ہندی فلموں کی تعداد تیلگو اور تامل فلموں سے کم رہی ۱۹۸۵ء میں ۱۹۸ تیلگو فلموں اور ۱۹۰ تمل فلموں کو سینسر بورڈ نے منظوری دی۔ تیسرے مقام پر ۱۸۷ ہندی فلمیں رہیں۔ ملیالم میں ۱۳۷ فلمیں تیار کی گئیں۔ اس کے بعد کنڑا، بنگالی گجراتی اور مراٹھی وغیرہ فلمیں بنیں۔ ہریانوی کی چار اور پنجابی کی تین فلمیں مکمل ہوئیں فلم صنعت

	کل فلمیں	بالغوں کے لیے
سنہ ۱۹۸۳ء	۷۴۱	۲۱۸
سنہ ۱۹۸۴ء	۸۳۳	۳۰۱
سنہ ۱۹۸۵ء	۹۱۲	۲۸۳

مذکورہ بالا نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۵ء تک تین برسوں میں جہاں فلم انڈسٹری میں فلموں کی تعداد بڑھی وہاں میں اتنی تیزی سے جو ترقی ہو رہی ہے اس میں جرائم سے بھرپور مناظر اور سیکس کا بھرپور دخل

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi.

اِدھر اُدھر سے

بھارتی افواج کی 'کرشنا' نامی کشتی جو کہ دنیا کا دورہ کر رہی ہے، ۲۷ ستمبر کو آسٹریلیا کے شمال میں پہونچی، اسے سمندر پر چلتے چلتے ایک سال ہوگیا ہے۔ یہ ۲۸ ستمبر ۱۹۸۵ کو بمبئی سے روانہ ہوئی تھی۔ •

گوا شپ یارڈ میں متوسط اور چھوٹے جہازوں کی تیاری شروع ۔ یہ منجملہ دیگر کثیرالمقاصد جہازوں کے ایسے جہاز بھی تیار کرےگا جن سے ماہی گیری کے امکانات بڑھا سکیں سرکار نے ۶ء۷ کروڑ روپے کے پراجیکٹ کی منظوری دی ہے، اس سے جہاز سازی کے عمل کو جدید لائنوں پر لانے میں مدد ملے گی۔ •

بھارت ہیوی الیکٹریکلز لمیٹڈ کے چیئرمین مسٹر ڈی ایس سمت نے بتایا کہ اس ادارے نے اپنی کوششوں سے جو نظام بنائے اور جو مصنوعات تیار کیں، ان کے لیے اسے سو کروڑ روپے کے آرڈر ملے ۔ ان میں انرجی کے غیر روایتی نظام بھی شامل ہیں، اس ادارے نے ۸۶-۱۹۸۵ء میں [illegible] کا کاروبار کیا، جو اپنی [illegible] کا ٹیکسوں کی ادائیگی [illegible] ہیں، ۱۵ کروڑ روپے [illegible] قبل کے مقابلے ۱۲٫۶۵ فیصد زیادہ ہے۔ اسی طرح اس کے منافع میں ۳۲ فیصد اضافہ ہوا۔ •

وزیراعظم شری راجیو گاندھی نے فیڈریشن آف ایسوسی ایشنز آف اسمال انڈسٹریز آف انڈیا (ایف اے ایس آئی) کے نئی دلی میں منعقدہ حالیہ اجلاس میں کہا کہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو تحفظ کی پالیسی پر زیادہ انحصار نہ کرنا چاہیئے۔ ان کی ترقی میں تجارتی بنکوں کو خصوصی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اس کے لیے جدید ٹکنالوجی سے استفادے اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو بڑی اور متوسط صنعتوں سے جوڑنے کی پالیسی پر خصوصی زور ہے۔ ۳۵ لاکھ روپے تک کی سرمایہ کاری والی صنعتیں چھوٹے پیمانے کی صنعتیں ہیں۔ جبکہ ۴۵ لاکھ روپے تک کی سرمایہ کاری والی صنعتیں معاون صنعتوں کے زمرے میں آگئی ہیں۔ •

وزیراعظم شری راجیو گاندھی نے کان کنی سے متعلق قومی پالیسی وضع کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے فولاد ساز کارخانوں کو جدید بنانے کی اشد ضرورت بتائی۔ •

وزارت بہبود کی وزیر مملکت ڈاکٹر راجندر کماری باجپئی نے اپنی وزارت سے وابستہ ممبران پارلیمنٹ کی مشاورتی کمیٹی کے ممبروں کو بتایا کہ اقلیتی فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو بہتر تکنیکی اور پیشہ ورانہ تربیت دینے کے لیے ایسے مقامات پر جہاں ان فرقوں کی تعداد زیادہ ہے صنعتی تکنیکی انسٹیٹیوٹ اور پولی ٹیکنک کھولنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ •

چینی کی پیداوار میں اضافے کے اقدامات

پارلیمانی امور، خوراک اور شہری رسدات کے وزیر شری ایچ کے ایل بھگت نے کہا کہ حکومت چینی کی پیداوار بڑھانے کے لیے ایک طویل المدتی حکمتِ عملی مرتب کر رہی ہے۔ شری بھگت بھارتی چینی ملوں کی انجمن کے ۲۲ ویں سالانہ اجلاس سے خطاب کر رہے تھے۔ •

دیہات میں توانائی کے مربوط فروغ کی ضرورت

وزیر زراعت ڈاکٹر گوردیال سنگھ ڈھلوں نے نئی دلی میں توانائی کی منصوبہ بندی سے متعلق ایک تربیتی نصاب کا افتتاح کرتے ہوئے بتایا کہ ساتویں منصوبے میں ہم ایک بڑی کوشش عمل میں لا رہے ہیں جس کے تحت دیہی علاقوں میں بجلی لگائی جائے گی اور مختلف گاؤں کو بجلی فراہم کی جائے گی اور گاؤں کے پمپ سیٹوں کو بجلی سے چلایا [illegible] گا۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے چھٹے منصوبے کے اختتام تک ۶۴ فیصد گاؤں کو بجلی مہیا کر دی ہے، اور ساتویں منصوبے کا نشانہ ۱٫۱۸ لاکھ گاؤں ہیں۔ اس طرح کنبہ سائز بائیو گیس کے پلانٹوں کی ترقی کے لیے بھی ایک بڑا پروگرام شروع کر دیا گیا ہے، اور ۳۱ مارچ ۱۹۸۶ء تک ۶٫۵ لاکھ ایسے پلانٹ نصب کر دیئے گئے ہیں۔ •

بھارت کی زندگی بیمہ کارپوریشن نے ۸۷-۱۹۸۶ء کے مالی سال کے پہلے پانچ ماہ کے دوران یعنی ۳۱ اگست ۱۹۸۷ء تک افرادی بیموں کی ۹,۴۲,۵۶۷ پالیسیوں کے ذریعہ ۱۲۰۳٫۲۰ کروڑ روپے کا نیا کاروبار کیا۔ •

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یکم تا ۳۱ دسمبر ۱۹۸۶

دو روپے

بھارت، آزادی کے
۳۹ سال
(سی۔ پی۔ بھامبری)

طب یونانی کا فروغ

غزلیں، نظمیں، کہانی، تبصرہ
اور دیگر ادبی و معلوماتی
مضامین

دلّی کی ادبی سرگرمیاں

۸ر نومبر ۱۹۸۶ء، شام ۵ بجے :۔ غالب اکیڈمی حضرت نظام الدین، نئی دلی کے زیرِ اہتمام شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے ۱۰۹ ویں یومِ ولادت کے سلسلے میں ایک یادگار تقریب منعقد کی گئی۔ اس تقریب کی صدارت مشہور دانشور جناب سیّد مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ نے فرمائی اور معروف ادیب و ناقد جناب سیّد حامد، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اقبال کی اُردو اور فارسی شاعری پر "سرسری تقابلی نظر" کے عنوان سے پُرمغز مقالہ پڑھا۔ اس تقریب کا افتتاح ماہر غالبیات جناب مالک رام نے فرمایا۔ تصویر میں دائیں سے بائیں، جناب مالک رام، سیّد مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ۔ جناب سیّد حامد (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) اور پروفیسر ظہیر احمد صدیقی (صدر شعبۂ اُردو دلّی یونیورسٹی) دیکھے جا سکتے ہیں۔ (فوٹو سیّد فدا علی)

یوم اقبال

اقبال عہدِ حاضر کا سب سے عظیم شاعر ہے جس کا پیغام آفاقی اور دائمی ہے۔

- مظفر حسین برنی (گورنر ہریانہ)

اقبال کی شاعری ملٹن اور دانتے کی شاعری کے ہم پلّہ ہے۔

- سیّد حامد، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

نئی دہلی، ۸ر نومبر ۱۹۸۶ء غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی کے اہتمام میں اکیڈمی کے اپنے آڈیٹوریم میں اُردو کے عظیم آفاقی شاعر اور مفکر علامہ اقبال کے ایک سو نویں یومِ ولادت کے شایانِ شان ایک پُروقار جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت ممتاز اقبال شناس جناب سیّد مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ نے فرمائی۔

(آفاق کور ۳ یر)

۱۳ر اکتوبر کو نئی دلّی میں اُردو فاؤنڈیشن کا ماہانہ ادبی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت مشہور افسانہ نگار شری جوگندر پال نے کی۔ زیرِ نظر تصویر میں (بائیں سے دائیں) جناب رفعت سروش، جلسہ کے مہمانِ خصوصی جناب شاہین (مقیم کینڈا)، شری جوگندر پال، ظفر پیامی (افسانہ سُناتے ہوئے)، شری چر نجیت، بیگم ممتاز مرزا عقب میں جناب ناصر نذیر۔

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلکیاں پیش کرنے والا

چیف ایڈیٹر : سید ظفیر الحسن
ایڈیٹر : جگندر سنگھ
اسسٹنٹ ایڈیٹر : محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر : وسیم حیدر

شرح چندہ
سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سالہ ۳۶ روپے
سہ سالہ ۴۸ روپے۔ فی کاپی ۲ روپے
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے
لیے ۱۰ فیصد کی رعایت۔

جلد ۶ | شمارہ ۱۷، ۱۸ | یکم تا ۳۱ دسمبر ۱۹۸۶ء | ۱۰ اگرہائن تا ۱۰ پوش شک ۱۹۰۸ | قیمت : دو روپے | فون نمبر : ۶۰۱۸۱۸

اِس شمارے میں

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :-

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر. کے. پورم ملکن
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) :- آر. ایس. منجال

ترسیل زر کا پتہ :- بزنس مینجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

صنعتی ترقی اور اسکے مسائل

اس وقت ہمارے ملک میں صنعتی ترقی کے محاذ پر خصوصی زور دیا جارہا ہے، اس سلسلے میں بھارتی صنعت کو جمود کی حالت سے باہر نکالنے کی کوشش کی جارہی ہے، چنانچہ اکتوبر کے آخر میں بدلتی ٹکنالوجی کے دور میں عوام کے ذریعے پیداواریت بڑھانے کے موضوع پر قومی کانفرنس کے افتتاح کے موقع پر وزیراعظم شری راجیو گاندھی نے بجا طور پر فرمایا کہ ہم جس طرح سے زراعت کے شعبے میں ترقی کرکے ملک کو اناج کے معاملے میں خودکفیل کی طرف لے گئے ہیں، اسی طرح سے ہم کو صنعت کے شعبے میں بھی آگے بڑھنا ہے اور صنعت کو جمود کی اس حالت سے نکالنا ہے جس میں یہ پھنس کر رہ گئی ہے، بلاشبہ یہ ایک عظیم ذمہ داری ہے جسے پختہ ارادے اور عزم صمیم کے ساتھ نبھایا جاسکتا ہے۔ وزیراعظم نے کہا کہ زراعت میں ہمارے پاس اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اگر ہم نے دلیرانہ فیصلے نہ کئے ہوتے اور اناج کی پیداوار نہ بڑھائی ہوتی تو شاید ہماری آزادی خطرے میں پڑ جاتی۔ وزیراعظم نے متنبہ کیا کہ اگر بھارت میں صنعتی ترقی موقع کی مناسبت سے عصری تقاضوں کو پورا نہیں کرپاتی تو ہم مشکلات میں پھنس جائیں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں اپنی آزاد خارجہ پالیسی کو برقرار رکھنے اور بھارت کو آزاد اور جمہوری ملک کے طور پر قائم رکھنے کے لیے ان مشکلات پر قابو پانا ضروری ہے۔

بلاشبہ ہمارے ملک نے پچھلے چالیس برسوں میں نمایاں ترقی کی ہے، آزادی سے قبل ہمارے ملک میں سوئی تک نہ بنتی تھی لیکن آج ہمارے ملک میں اعلیٰ ٹکنالوجی والے شعبے فروغ پارہے ہیں۔ دفاعی سامان کی تیاری میں بھارت کا شمار دنیا کے دو یا تین ترقی یافتہ ملکوں میں ہوتا ہے۔ ملک میں پبلک سیکٹر مضبوط اور ٹھوس بنیادوں پر پروان چڑھ رہا ہے، اس کے ذریعے ملک کے پسماندہ علاقوں کی ترقی کو تیز کیا جاسکا ہے۔ ہمارے ملک میں چھوٹے پیمانے کی صنعتیں، متوسط پیمانے کی صنعتیں اور بڑے پیمانے کی صنعتیں دوش بدوش ترقی کررہی ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ یہ سب ترقی ملکی وسائل کے ذریعے ہی عمل میں آسکی ہے، صرف سات فیصد سرمایہ ادھار لیا گیا ہے۔ وزیراعظم نے قوم کو کڑی محنت کا نعرہ اپنانے کے لیے کہا اور چیتاونی دی کہ محض گفتار کے غازی بننے سے کام نہیں چلے گا، بلکہ کردار کا غازی بننا پڑے گا۔ ہم اپنے مقصد کو محنت شاقہ، صحیح نصب العین اور صحیح طریق کار کے ذریعے حاصل کرسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں صلاحیتِ پیداوار میں اضافہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ افرادی قوت اور توانائی کے صحیح استعمال سے پیداواریت میں اضافہ ہوسکے گا۔ وزیراعظم نے بجا طور پر کہا کہ ہماری صنعتوں نے بہت عرصے تک ایک محفوظ ماحول میں کام کیا، اس ماحول میں سستی، اشیاء کو مہنگی فروخت کرنے کا چلن، خریداروں اور ٹیکس وصول کرنے والوں سے دھوکہ دہی اور غیر معیاری مال کی تیاری کا رواج عام رہا ہے۔ صنعت کاروں نے اپنے نفع کو سب سے مقدم سمجھا ہے اور جلدی سے منافع کما لینا ہی ان کا مقصد رہا ہے مگر اب یہ صورتِ حال بہت دنوں تک نہیں چل سکتی۔ وزیراعظم نے محنت کشوں کی ذمہ داری واضح کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے محنت کشوں کی کارکردگی اچھی نہیں اس لیے کہ انھیں اُجرت کم ملتی ہے، اور کئی بار انھیں ضرورت سے زیادہ تحفظ ملتا ہے۔ ہندوستان اس لحاظ سے خوش نصیب ہے کہ اس نے محنت کشوں کے فائدے اور تحفظ کے تقریباً وہ سبھی معیار اپنائے ہیں جو محنت کی عالمی تنظیم کی طرف سے سفارش کردہ ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ محنت کشوں کو پیداواری عمل میں دلچسپی نہیں رہی وہ صرف خود کو منظم کرکے زیادہ اُجرتیں مانگتے ہیں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اُجرتوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ پیداوار میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہو۔

زراعت کے ساتھ اضافی روزگار کی اہمیت

ایک اندازے کے مطابق ملک کی ۷۰ کروڑ آبادی میں سے ۴۰ فیصد لوگ غریبی کے خط سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں اور یہ لوگ زیادہ تر شہری علاقوں میں بستے ہیں۔ ان میں سے ۳۵ کروڑ لوگ گاؤں میں زراعت، جنگل بانی اور دیگر پیشوں میں مصروف ہیں مگر ان کے پاس اپنی زمین نہیں ہے، ہمارے ملک میں تقریباً ۸ کروڑ کنبے زراعت پیشہ ہیں، اور ان میں سے ۷۰ فیصد کنبے مارجنل کسانوں یا چھوٹے کسانوں پر مشتمل ہیں، مارجنل کسان وہ ہیں جن کے پاس ایک ہیکٹیر اراضی سے بھی کم ہے، جبکہ ایک تا ۲ ہیکٹیر اراضی والے چھوٹے کسان کہلاتے ہیں۔ ہندوستان میں دیہات کی تعداد ۵۷۵۹۳۵ ہے، ان میں سے ۴۵۱۶۲۳ دیہات میں ایک ہزار سے بھی کم آبادی ہے، گاؤں کی اوسط آبادی ۹۵۲ ہے اور ہر گاؤں کا رقبہ اوسطاً ۸۰۰ر۶۰۰ ہیکٹیر ہے، کیرالہ کے گاؤں میں فی گاؤں اوسط آبادی سب سے زیادہ ہے، سب سے کم اوسط آبادی ہماچل پردیش کے دیہات میں ہے، ۷۰ فیصد آبادی زراعت اور متعلقہ شعبوں میں روزگار پائے ہوئے ہے، بہار میں زراعت پیشہ لوگوں کا اوسط سب سے زیادہ یعنی ۸۲ فیصد ہے، سب سے کم مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں میں ہے، دیگر ریاستوں میں یہ اوسط ۵۰ فیصد سے لے کر ۸۰ فیصد ہے۔ ۳۳ فیصد قطعات اراضی اعشاریہ ۵ ہیکٹیر سے لے کر ایک ہیکٹیر تک ہیں۔ اس طرح آدھے سے زیادہ کسان وہ ہیں جن کے پاس ایک ہیکٹیر سے کم اراضی ہے، اس پس منظر میں کسانوں کی حالت کو معاون پیشوں کے ذریعے ہی بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ (ایڈیٹر)

سعد خان*

اُتر پردیش میں جنگلات اور شجر کاری

جنگلات ہماری زمین کے قیمتی
...مایہ ہیں۔ ان سے لاکھوں افراد کو براہِ راست
...بالواسطہ طور پر روزگار فراہم ہوتا ہے۔ جنگلات
...ت اقتصادی لحاظ سے ہی اہمیت کے حامل
...ہیں ہوتے بلکہ ماحول کو صاف ستھرا رکھنے اور ملک
...حسن میں اضافے کا باعث بھی بنتے ہیں۔ قدرتی
...تات زمین کا لباس ہے زمین کی دلکشی اس کے
...تات کے بچھونے کی وجہ سے ہے۔ نظامِ قدرت
...ے زمین کو نباتات کا لباس پہنا رکھا ہے۔ نباتات
...ت کی ایک شاہکار پیداوار ہے انسانی اور
...یانی زندگی کا دارومدار اسی پر ہے۔ روئے
...ن کی ہر چیز پر اس کا گہرا اثر ہے۔ بارش اور
...سون کا دارومدار بھی جنگلات کی کثرت پر ہی
...م ہے اس کے علاوہ یہی جنگلات سیم و تھور اور زمین کو
...اؤ سے بھی بچاتے ہیں۔ ان سے مٹی کی زرخیزی
...اضافہ ہوتا ہے اور سیلابوں کو کنٹرول کرنے
...مدد کرتے ہیں۔ جنگلات سیر و تفریح اور جمالیاتی
...از کے بھی حامل ہیں۔ یہ ہمیں سیر و تفریح کے
...بیش بہا مواقع فراہم کراتے ہیں اور کرۂ ارض
...شاداب رکھتے ہیں۔

جنگل قدرت کا بیش بہا عطیہ ہے اور جانوران
جنگلوں کی زینت ہے۔ جنگل اور جانور کا آپس
میں بہت گہرا رشتہ ہے ایک کو دوسرے سے
جُدا کرنا ناممکن ہے۔ جنگلات خوبصورت اور
حسین پرندوں اور جنگلی جانوروں کی افزائش
اور ان کے تحفظ کا باعث بنتے ہیں جس سے
قومی ورثے میں اضافہ ہوتا ہے اور بحیثیت
مجموعی ملک کی اقتصادی حالت بہتر ہوتی ہے۔
اس سے نہ صرف ملک کی ضروریات پوری ہو سکتی
ہیں بلکہ جنگلات کی دولت برآمد کر کے بڑے
پیمانے پر زرِ مبادلہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

آج کے مشینی دور میں آلودگی پھیلانے
والی صنعتوں، پیٹرول سے چلنے والی موٹر گاڑیوں،
تھرمل بجلی گھروں، لوہے کے کارخانوں اور دیگر صنعتی
اداروں سے نکلنے والے دھوئیں اور گرد و غبار سے
ماحولیاتی نظام میں خرابیاں پیدا ہوئی ہیں اور فضا
میں زہریلی گیسوں کی مقدار میں اضافہ ہوا ہے انھیں
دور کرنے کے لیے پیڑ پودوں کا تحفظ بہت ضروری
ہے کیونکہ درخت زہریلی گیسوں کو جذب کرنے کی
پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ فضائی آلودگی سے
بیماریوں میں اضافہ ہوا ہے خاص طور سے صنعتی
علاقوں میں انسان کینسر، دل کی بیماریوں، بلڈ پریشر،
اندھاپن، السر، ٹی۔ بی اور خون کی کمی وغیرہ کا شکار
ہو رہا ہے۔

جنگلات فضائی آلودگی اور کثافت کو کم کرتے
ہیں۔ ہواؤں کو صاف ستھرا رکھتے ہیں، درخت
کاربن ڈائی آکسائڈ کو جذب کرتا ہے اور آکسیجن
خارج کرتا ہے جس سے ماحول میں کاربن ڈائی آکسائڈ
اور آکسیجن کا توازن قائم رہتا ہے۔ ایک پیپل کا
درخت اپنی زندگی میں تقریباً ۲ ہزار ۲۵۰ کلوگرام
کاربن ڈائی آکسائڈ گیس کرۂ ہوا سے کھینچتا ہے
اور بدلے میں ایک ہزار ۷۱۲ کلوگرام آکسیجن دیتا
ہے جو تقریباً ۶ لاکھ آدمیوں کے لیے کافی ہے۔

ایک روسی سائنسداں کے مطابق اگر کسی
صنعتی علاقے کے چاروں طرف ۵۰۰ میٹر چوڑی درختوں
کی قطار لگا دی جائے تو اس سے تقریباً ۷۰
فیصد سلفر ڈائی آکسائڈ اور ۶۶ فیصد نائٹروجن آکسائڈ
جیسی زہریلی گیسوں کی کمی ہو جائے گی۔ درخت دھول
کے ذرّوں کو کم کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوتے
ہیں۔ ان ذرّوں سے سانس لینے میں مشکل پیدا ہوتی
ہے۔ ایک ہیکٹیر جنگل تقریباً ۵۰ ٹن دھول اور گرد و
غبار کو روکنے میں مدد کرتے ہیں۔

جنگل کی بے پناہ اہمیت کے پیشِ نظر ...

* لیکچرار، شعبہ جغرافیہ، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج۔ کوٹ دوارا گڑھوال۔ (یو۔پی)

[کیا] زراعت سے متعلق تنظیم نے ۱۹۸۵ء [کو] جنگلات کی افزائش کا بین الاقوامی سال [منایا] تھا۔ تاکہ عالمی ادارے کے ممبر ممالک [جنگل]ات کی توسیع اور فروغ پر مکمل توجہ دیں۔ [اس کے علاوہ] جنگلات کے تحفظ اور اس کے رقبے [کو بڑھا]نے کے لیے ہر سال ۲۱ مارچ کو یوم عالمی [شجر]کاری منایا جاتا ہے۔ ۵ جون ۱۹۸۶ء کو ماحولیاتی [تحف]ظ کے عالمی دن پر وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی [نے کہا] کہ ماحول کو صاف ستھرا بنائے رکھنے کا [سب] سے اچھا اور سستا طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے [زیادہ] درخت لگائے جائیں اور ان کی نگہداشت [کا کام] پوری دلچسپی کے ساتھ کیا جائے۔ ہماری [س]ابق وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے اپنے مقبول [عا]م بیس نکاتی پروگرام میں درخت اگاؤ اور [ب]چاؤ مہم کو شامل کر کے ماحول کے تحفظ کو اہمیت [د]ی تھی۔ ۳۱ جولائی ۱۹۸۶ء کو بن مہوتسو کی ایک [تق]ریب میں لنکتی استھل پر ۵۰۰۰ سے زیادہ اسکولی [ب]چوں نے پودے لگا کر درخت اگانے کے زبردست [پرو]گرام کی شروعات کی۔ وزیر اعظم جناب راجیو [گان]دھی نے طالب علموں کے ساتھ شجرکاری میں [حص]ہ لیا۔ انھوں نے طالب علموں سے فرمایا کہ "قدرتی [وس]ائل کے تحفظ اور نگہداشت کا مکمل عزم کریں۔"

اتر پردیش رقبے کے اعتبار سے ہندوستان [میں] چوتھی اور آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑی [ریاس]ت ہے۔ یہاں کی آبادی تقریباً ۱۰٫۵ کروڑ [ہے۔ اس] طرح ہندوستان کا ہر چھٹا آدمی اسی صوبے [سے] تعلق رکھتا ہے اس لیے اس صوبہ میں جنگلات [کے] تحفظ اور شجرکاری پر خاص توجہ دینا اشد ضروری [ہے]۔ اتر پردیش میں جنگلات کا مجموعی رقبہ ۵۱۳۶۳ مربع کلومیٹر ہے یعنی کل جغرافیائی [ر]قبے کا محض ۱۷٫۴ فیصد رقبہ جنگلات پر مشتمل [ہے جس] میں محفوظ اور محفوظ نما جنگلات بھی شامل ہیں جبکہ قومی جنگلات پالیسی کے تحت جنگلات کا علاقہ ۳۳ فیصد ہونا لازمی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پہاڑی علاقوں میں ۶۵ فیصد اور میدانی علاقوں میں ۲۰ فیصد رقبے پر جنگل ضروری ہیں۔

اتر پردیش کے پہاڑی علاقوں میں ۴۱ فیصد زمین، پٹھاری علاقوں میں ۲۹ فیصد اور میدانوں میں صرف ۷ فیصد زمین پر جنگلات پائے جاتے ہیں۔ ان میں جنگلوں کے ساتھ ایسے علاقے بھی شامل ہیں جن میں صرف چٹانیں اور برف سے ڈھکی پہاڑیاں ہیں جو کہ بنجر ہیں یا پھر ان میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں پائی جاتی ہیں۔ صوبہ کے ۴۴ اضلاع میں جنگلات کی بہت زیادہ کمی ہے ان اضلاع میں جنگلات کل جغرافیائی رقبے کے ۲ فیصد سے بھی کم علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ ۱۵ اضلاع میں جنگلات کا رقبہ وہاں کے مجموعی رقبے کا تقریباً ۱۰ فیصد سے بھی کم ہے جبکہ جونپور، غازی پور اور بلیا میں جنگلات کا رقبہ وہاں کے مجموعی رقبے کا ۳۳ فیصد سے زیادہ ہے۔ یہ تمام اضلاع پہاڑی ہیں۔ نینی تال میں ۶۸ فیصد زمین، ٹہری گڑھوال میں ۶۵ فیصد، دہرہ دون میں ۶۳ فیصد، پوڑی گڑھوال میں ۵۴ فیصد، الموڑہ میں ۴۸ فیصد، اترکاشی میں ۴۴ فیصد پتھوراگڑھ میں ۴۰ فیصد، چمولی میں ۴۳ فیصد اور مرزاپور میں ۳۱٫۲ فیصد زمین پر جنگل پھیلے ہوتے ہیں۔ میدانی اضلاع میں پیلی بھیت ضلع میں وہاں کے مجموعی رقبے کا ۲۷٫۵ فیصد علاقہ، کھیری کا ۲۰٫۷ فیصد، وارانسی کا ۱۵ فیصد، سہارنپور کا ۱۴٫۵ فیصد، بہرائچ کا ۱۴٫۳ فیصد اور بجنور کا ۱۳٫۱ فیصد علاقہ جنگلات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ تمام میدانی ضلعوں میں جنگلات کا رقبہ وہاں کے مجموعی رقبے کا ۱۰ فیصد سے بھی کم ہے۔

اتر پردیش میں مختلف قسم کے درخت پائے جاتے ہیں۔ یہ درخت گنگا کے میدان سے لے کر ہمالیہ کے تقریباً ۲۶ سو میٹر اونچائی والے علاقوں تک پائے جاتے ہیں۔ صوبے کے مختلف النوع جنگلات کو مندرجہ ذیل چھ اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ الپائن اور نیم الپائن جنگلات

(Alpine & Sub-Alpine Forests)

ایسے جنگلات تقریباً ۲۹۰۰ میٹر سے ۳۶۰۰ میٹر کی اونچائی والے پہاڑی علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان جنگلوں میں مخروطی درخت اور جھاڑیاں ملتی ہیں۔ ایسے جنگلات تقریباً ۱۰ لاکھ ہیکٹیر زمین پر پھیلے ہوتے ہیں۔ ان جنگلوں میں جونی پر (Juniper)، برچ (Birch)، روڈو ڈینڈرنس (Rhododendrons) فر (Fir) ہنی سک (Honey Suck) وغیرہ مخروطی درخت اور جھاڑیاں پائی جاتی ہیں۔ مخروطی جنگلات کی لکڑی لگدی، اخباری کاغذ، رنگین عمارتوں کے سامان، پیکنگ کے لیے بکس بنانے اور دیاسلائی کی صنعت میں استعمال کی جاتی ہے۔

۲۔ ہمالیائی مرطوب معتدلاتی جنگلات

(Himalayan Moist Temperate Forests)

اتر پردیش میں ایسے جنگلات ۱۶۰۰ میٹر سے ۲۹۰۰ میٹر کی اونچائی والے علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان جنگلوں میں مخروطی اور چوڑی پتی والے سدا بہار درخت پائے جاتے ہیں۔ ان جنگلوں میں مخروطی اور چوڑی پتی والے سدا بہار درخت پائے جاتے ہیں۔ ان درختوں پر فرن (Fern) اور کائیاں اُگی ہوئی ہوتی ہیں۔ دیودار اسپروس (Spruce) سلور فر (Silver Fir) اوک (Oak) بیچ (Beech)

۔ چ (Birch) پاپلر، ایلم (Elm) چیسٹنٹ (Chest nuts) والنٹ (Walnut)
ورمیپل جیسے مخروطی اور چوڑی پتی والے درخت
ان جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔ گڑھوال اور
کماؤں ہمالیہ کے تقریباً ۳ لاکھ ہیکٹیر رقبے
پر ایسے جنگلات پائے جاتے ہیں۔

۳۔ نیم استوائی پائن جنگلات
(Sub Tropical Pine Forests)

ایسے جنگلات چھوٹے ہمالیہ (Lesser Himalayas) کے نچلے حصوں
میں ایک ہزار میٹر سے ۲۳۰۰ میٹر کی اونچائی
پر لگ بھگ ۳ لاکھ ہیکٹیر علاقوں میں پھیلے
ہوئے ہیں۔ ان جنگلوں میں زیادہ تر چیڑ
(Chirs) کے درخت ملتے ہیں۔

۴۔ استوائی مرطوب موسمی جنگلات
(Tropical Moist Bedidous Forest)

ایسے جنگلات اترپردیش کے
شیوالک، بھابھر اور ترائی علاقوں میں پائے
جاتے ہیں۔ ان علاقوں میں ۱۰۰ سے ۱۵۰ سینٹی
میٹر سالانہ بارش ہوتی ہے جبکہ اوسط سالانہ
درجۂ حرارت ۲۷ ڈگری سینٹی گریڈ رہتا ہے۔
ہوا میں نمی بھی معقول درجۂ حرارت تک ہوتی
ہے۔ ان جنگلوں میں مانسونی درخت زیادہ
پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ درختوں کی اور
بہت سی قسمیں جن میں سدا بہار درخت
بھی شامل ہیں، یہاں پائے جاتی ہیں۔ ان
جنگلوں میں مختلف قسم کے جھاڑی دار درخت
پودے، بانس اور بیل (Climbers)
بھی خوب اُگے ہوتے ہیں۔ سال (Sal)
پلاس (Palas) سیمل (Semul) ڈھاک
(Dhak) آملہ (Amla) ہلدو، کنجو (Kanju) پھولائی (Phulai) کھیر (Khair) کوکو
(Kokko) دھامن (Dhaman) عقور، تُون، شیشم، گمبھیر، املی، ساگون اور جھنگن
(Jhingam) وغیرہ ان جنگلوں کے اہم
درخت ہیں۔

۵۔ استوائی خشک موسمی جنگلات
(Tropical Dry Decidous Forests)

اترپردیش کے زیادہ تر میدانی
اضلاع میں ایسے جنگلات پائے جاتے ہیں
ان جنگلوں میں زیادہ تر مانسونی درخت،
جھاڑیاں اور گھاسیں ملتی ہیں۔ زراعتی مقاصد
کے تحت ان جنگلوں کے بیشتر حصے صاف کئے
جاچکے ہیں۔ یہ جنگل ندیوں کے کنارے اور
نشیبی علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان جنگلوں
میں شیشم، جامن، مہوا، پیپل، برگد، نیم، ببول،
املی، پلاس، سال اور بیل (Bal) وغیرہ کے درخت
ملتے ہیں۔

۶۔ استوائی خاردار جھاڑیوں والے جنگلات
(Tropical Serubs Thern Forests)

یہ جنگلات زیادہ تر جنوبی اور مغربی
اترپردیش کے وسیع رقبوں پر پھیلے ہوتے
ہیں۔ ایسے جنگلات انھیں علاقوں میں پائے
جاتے ہیں جہاں سالانہ بارش ۵۰ سے ۷۵
سینٹی میٹر کے بیچ رہتی ہے اور سالانہ درجۂ حرارت
۲۵ سے ۲۷ ڈگری سینٹی گریڈ تک رہتا ہے۔
ہواؤں میں نمی کی بھی بہت زیادہ کمی ہوتی ہے
ان جنگلوں کے درخت قامت میں کوتاہ اور
زیادہ تر خاردار ہوتے ہیں۔ درختوں کے درمیان
بہت زیادہ فاصلے ہوتے ہیں لیکن بارش کے
موسم میں ان فاصلوں پر بھی لمبی پتیوں کی گھاس
اُگ آتی ہے۔ بارش میں جھاڑیوں پر سبز پتے
اور پھول کھلتے ہیں۔ اہم درختوں میں ببول،
اور نیم وغیرہ شامل ہیں۔ مختلف قسم کی گوند اور
رال (Resin) ان درختوں سے حاصل
ہوتی ہیں۔ اترپردیش کے مرزا پور، جنوبی بنارس
اور الہ آباد کے علاقے، باندہ، ہمیر پور، للت پور
اور جھانسی وغیرہ اضلاع میں اس قسم کے
درخت بہت پائے جاتے ہیں۔

اترپردیش کے جنگلوں سے قسم قسم کی
لکڑیاں دستیاب ہوتی ہیں۔ سال، چیڑ، دیودار،
شیشم، ببول، ساگون، اسپروس، تون، ہلدو
اور کنجو وغیرہ درختوں سے عمارتی لکڑیاں حاصل
ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایندھن کی لکڑیاں،
چارکول، مالنس، لاکھ، گوند، کتھا، بیروزہ،
چلغوزہ، دال چینی، تیز پتا، سوائی گھاس،
بھابھر گھاس اور جڑی بوٹیاں بھی کافی مقدار
میں ملتی ہیں۔

اترپردیش میں لکڑی کی بڑھتی ہوئی
ضروریات کی تکمیل کے لیے جنگلات کی نہ صرف
حفاظت ضروری ہے بلکہ ہر سال ان میں
اضافہ کیا جانا بھی لازمی ہے۔ صنعت و حرفت
ادویہ سازی، عمارتی لکڑی، فرنیچر، تارپین کا
تیل، ریشم، بیروزہ، کاغذ سازی، کھیل کے
سامان کی تیاری اور سب سے بڑھ کر ایندھن
کے حصول کے لیے جنگلوں میں اضافہ اور ان کی
حفاظت نہایت ضروری ہے۔ ایک طرح سے
ہمارا وجود ہی انھیں کے سہارے قائم ہے۔
لہٰذا جنگلات کی اس اہمیت و افادیت کے پیش نظر
مرکزی اور ریاستی سرکاریں اپنے کئی تحقیقی
اداروں کے ذریعے سائنسی بنیادوں پر جنگلات
کی ترقی اور فروغ پر توجہ مرکوز کی ہے۔ جنگلات
کی حوصلہ افزائی کی خاطر ریاستی حکومت نے
عوام کو اس کی اہمیت سے روشناس کرایا
ہے اور ہر ممکن امداد کر رہی ہے۔

محکمۂ جنگلات، جنگلوں کے تحفظ، غور و پرداخت اور ہر سال ان کی توسیع پر زور دیتا ہے۔ صوبے میں ۱۹۵۱ء سے ۱۹۸۰ء تک مختلف یوجناؤں کے تحت ۵ لاکھ ۹۹ ہزار ۴۰ ہیکٹیر زمین پر شجرکاری کی گئی ہے جبکہ چھٹے پنچ سالہ منصوبے کے دوران ۸۵-۱۹۸۰ء کے بیچ تقریباً ۲ لاکھ ۲۲ ہزار ہیکٹیر زمین میں شجرکاری ہوئی۔ چھٹے پنجسالہ منصوبے کے دوران ماحولیاتی توازن اور فضائی آلودگی کو ذہن میں رکھتے ہوئے شجرکاری کی گئی۔ ایسے درخت زیادہ تعداد میں لگائے گئے ہیں جن سے ایندھن، فرنیچر اور عمارتی لکڑی حاصل ہو سکے۔ یوکلپٹس، پاپلر اور بانس جیسے جلدی بڑھنے والے پودوں کو بھی لگایا گیا ہے جس سے کاغذ کی صنعت کے لیے خام مال فراہم ہو سکے۔ ۸۴-۱۹۸۳ء میں پہاڑی اور میدانی علاقوں میں بانس کی شجرکاری پر ایک کروڑ ۵ لاکھ ۲۷ ہزار روپے خرچ کیے گئے تھے جبکہ یہ رقم ۸۵-۱۹۸۴ء میں بڑھ کر ایک کروڑ ۳۰ لاکھ ۹۰ ہزار روپے ہو گئی تھی۔ مسافروں کو سایہ مہیا کرانے، ماحول کو صاف ستھرا اور خوشگوار بنانے کے لیے ۸۵-۱۹۸۰ء کے دوران سڑکوں، نہروں اور ریلوے پٹریوں کے کنارے تقریباً ۵ ہزار ۳ سو مربع کلومیٹر علاقے کا نشانہ تھا۔ ریاست کے دیہی علاقوں میں روزگار مہیا کرانے کے لیے شجرکاری پر خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں محکمۂ جنگلات نے اپنے مقررکردہ نشانہ ۲۹ کروڑ ۷۴ لاکھ پودوں کے جواب میں ۳۳ کروڑ ۳ لاکھ پودوں کی شجرکاری کر کے ۱۱۲ فیصد کامیابی حاصل کی جو ایک ریکارڈ ہے۔

چھٹے پنچ سالہ منصوبے کے دوران کی گئی شجرکاری کی تفصیل مندرجہ جدول سے ظاہر ہے:

نمبر شمار	سال	شجرکاری (لاکھ درختوں میں)	زندہ درخت (فیصد میں)	کُل رقبہ جس میں شجرکاری کی گئی (ہیکٹیر میں)
۱-	۱۹۸۰-۸۱	۲۵۳٫۷	۸۳٫۶	۹۲۰۰
۲-	۱۹۸۱-۸۲	۴۱۴٫۶	۸۲٫۵	۳۴۴۴۲
۳-	۱۹۸۲-۸۳	۱۴۶۸٫۳	۸۰٫۷	۳۹۳۱۲
۴-	۱۹۸۳-۸۴	۲۵۰۱٫۰	۸۱٫۰	۴۵۵۰۰
۵-	۱۹۸۴-۸۵	۲۴۰۴٫۸	۸۴٫۰	۵۰۰۰۰

اترپردیش کے ۲۴ میدانی اضلاع میں عالمی بینک کی مدد سے دیہی علاقوں میں ایندھن، چارا پتی اور چھوٹی گھریلو صنعتوں کو خام مال مہیا کرانے کے لیے سماجی باغبانی یوجنا شروع کی گئی ہے۔ اس کا خاص مقصد یہ ہے کہ دیہاتوں میں کھانا پکانے کے لیے گوبر نہ جلانا پڑے کیونکہ کھیتوں کی زرخیزی بڑھانے میں گوبر بہت ہی مفید ہے۔ سماجی باغبانی اسکیم کے تحت کثیرالمقاصد درختوں کی شجرکاری خالی اور بنجر زمین، گرام سبھا کی زمین، سڑک، ریلوے اور نہروں کے کنارے کی جا رہی ہے۔ ۸۵-۱۹۸۰ء کے دوران سماجی باغبانی پر ۳، ارب ۱۵ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ اس بیچ تقریباً ۶۰ ہزار ہیکٹیر زمین سماجی جنگل بانی کے تحت لائی گئی۔ اترپردیش میں شجرکاری کی اسکیم کو فروغ دینے کے لیے عالمی بینک نے ایک ارب روپیہ صوبائی سرکار کو دیا ہے۔

ریاست کے وزیر جنگلات شری ظفر علی نقوی کے مطابق ساتویں پنجسالہ منصوبے کے دوران صوبے میں دو ارب ۱۰ کروڑ روپے کی لاگت سے ۳۷ کروڑ پودوں کی شجرکاری کا منصوبہ ہے۔

ساتویں پنجسالہ منصوبے کے تحت پورے صوبے میں جنگلوں کے تحفظ اور شجرکاری پر خاص توجہ دی جائے گی۔ ۵ جون ۱۹۸۶ء کو ماحولیاتی تحفظ کے عالمی دن پر محکمۂ جنگلات کی طرف سے کُکرَیل۔ لکھنؤ میں ایک جلسہ ہوا، جس کا افتتاح ریاست کے وزیراعلیٰ جناب ویر بہادر سنگھ نے کیا۔ وزیراعلیٰ نے اپنی افتتاحی تقریر میں فضائی آلودگی پر تشویش ظاہر کی۔ انھوں نے کہا کہ جیسے جیسے آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے، جنگلوں پر دباؤ بڑھتا جا رہا ہے اور جنگلوں کے علاقے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ جنگلوں پر دباؤ بڑھتا جا رہا ہے اور جنگلوں کے علاقے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ جنگلوں کی کمی سے لکڑی، ایندھن اور چارا پتی وغیرہ کی کمی ہو رہی ہے۔ ماحولیاتی توازن پر بھی بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ وزیراعلیٰ نے آگے فرمایا کہ ریاست میں شجرکاری کا جو پروگرام تیار کیا گیا ہے اس کے تحت موجودہ سال کے دوران ۵۴ کروڑ درخت لگانے کا منصوبہ ہے۔ اس کام کو پورا کرنے کے لیے ایک لاکھ کسانوں اور ۱۰ ہزار کرمچاریوں کو شجرکاری کی تربیت دی گئی ہے۔ وزیراعلیٰ نے "کُکرَیل بن بھومی" میں ماحولیاتی آلودگی کو کم کرنے، شانتی اور امن کی علامت کے طور پر ایک برگد کا درخت بھی لگایا۔

اُترپردیش میں محکمۂ جنگلات کی طرف

(باقی ص۴۵ پر)

سی۔ پی۔ بھامبری

بھارت
آزادی کے ۳۹ سال

گذشتہ ۳۹ برسوں میں بھارت انسانی حقوق، شہری آزادیوں، جمہوریت، سیکولرازم اور سماجی انصاف کی بنیاد پر ایک جدید ریاست قائم کرنے کے نہایت پیچیدہ کام میں مصروف رہا ہے۔ پسماندہ معیشت کی جدید کاری کے سیاسی بندوبست میں پالیسیاں وضع کرنے والوں کو بہت سی چنوتیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بہرحال ایک نئی قوم کی تعمیر کا عظیم کام بھارتی عوام کے جمہوری اشتراک سے کیا گیا ہے۔ بہت سے مغربی علماء نے تو بھارت جیسے غریب اور پسماندہ ملک میں بالغوں کے عام حق رائے دہندگی کی کامیابی کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا تھا۔ لیکن یہ شبہات غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ ملک میں کامیابی کے ساتھ ساتھ آٹھ قومی انتخابات منعقد کئے جا چکے ہیں۔ اور انتخابات میں اپنے حقِ رائے دہندگی کا استعمال کرنے والے ووٹروں کی تعداد ۱۹۵۲ء کے انتخابات میں ۴۵ فیصد سے بڑھ کر ۱۹۸۴ء میں منعقدہ آٹھویں لوک سبھا کے انتخابات میں ۶۰ فیصد سے زائد ہو گئی ہے۔ انتخابات کے دوران بھارتی ووٹر سیاسی طور بیدار پائے گئے ہیں اور انھوں نے اپنی اس بیداری کا ثبوت مختلف پارٹیوں اور رہنماؤں کو منتخب اور مسترد کر کے دیا ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ بھارت میں سیاسی رہنماؤں کے مقدّر کا فیصلہ جنتا نہایت سخت مقابلے والے انتخابات کے ذریعے کرتی ہے۔

جوابدہی کی ذمہ داری

جب عوام انتخابات میں حصہ لیتے ہیں تو ہر جمہوری معاشرے میں مثبت اور منفی دونوں ہی قسم کے پہلو دیکھنے میں آتے ہیں اور بھارت اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ بھارت میں جمہوری تجربے کا مثبت پہلو یہ ہے کہ ووٹر منتخب رہنماؤں کی کارکردگی کو جانچتا پرکھتا ہے۔ جب کارکردگی جانچی پرکھی جاتی ہے تو منتخب رہنماؤں کو ان کی غلطیوں اور فروگذاشتوں کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ گذشتہ چار دہائیوں میں بھارتی ووٹروں اور رہنماؤں کے درمیان ایک ایسا رشتہ قائم ہو گیا ہے جس میں ووٹر رہنماؤں کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہیں اور رہنما اپنی ذمہ داری اور جوابدہی کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں۔

بھارتی معاشرہ ایک قدیم اور مرکب معاشرہ ہے۔ یہاں کے لوگ مختلف مذہبوں اور عقیدوں کو ماننے والے ہیں۔ وہ ذات پات اور طبقات میں بھی بٹے ہوئے ہیں۔ لہٰذا بھارت میں جمہوری سلسلۂ عمل کو سماجی اور مذہبی اقتدار کے ڈھانچے کے قدیم زمروں کا مقابلہ کرنا ہے اور قدیم و جدید کے درمیان یہ جدوجہد ابھی جاری ہے۔ قدیم بھارت جدید کاری کے مراحل سے گذر رہا ہے اور اس گاڑی کا انجن بالغوں کا عام حقِ رائے دہندگی ہے۔

سیکولرازم

قدیم ہندوستان کی بنیاد مذہب تھی لیکن جدید بھارت معاشرے اور سیاسیات کو سیکولر بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بھارتی سیاسی نظام کے بانیوں نے واضح طور پر یہ سمجھ لیا تھا کہ سیاسی جمہوریت کو سیکولر بنانا لازمی ہے۔ بھارتی آئین میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ بھارتی اسٹیٹ کو نہ تو کسی مذہب کی سرپرستی کرنی چاہیے نہ مذہبی عقائد و طور طریقوں کی بنیاد پر سماج کے کسی طبقے کے خلاف امتیاز برتنا چاہیے۔ لہٰذا تمام مذاہب کو یکساں تحفظ عطا کیا گیا اور بھارت کے آئین میں کسی بھی مذہب کو کوئی ترجیح نہیں دی

گئی۔ لیکن کوئی بھی سماج یا معاشرہ محض تحریری حکم سے سیکولر نہیں بنتا۔ اس لیے بھارتی سیاسی نظام سیکولرازم کی حدوں کو وسیع کرنے کی جدوجہد کر رہا ہے۔ گذشتہ چار دہائیوں میں سیکولر سیاست کو کئی دھکے لگے ہیں لیکن ہر دھکے کے بعد سیکولرازم کے عہد کو نئی قوت حاصل ہوئی ہے۔

معیشت کی جدید کاری

بھارت میں جمہوری عمل اقتصادی ترقی و سماجی انقلاب کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بھارتی سیاسی نظام نے بھارتی معیشت میں ایک سرگرم رول ادا کیا ہے۔ بھارت میں سماجی انقلاب کے ستون ہیں پبلک سیکٹر کے کارخانے، حکومت کی قائم کردہ تحقیقی لیباریٹریز اور حکومت کے زیر سرپرستی لایا گیا۔ سبز انقلاب۔ گذشتہ چار دہائیوں میں حکومت نے اپنی پہل کاریوں اور مداخلت کے ذریعے بھارتی معاشرے کو جدید بنانے کی پُرزور کوشش کی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بھارت میں غربت اور پسماندگی کو مکمل طور پر ختم کیا جا چکا ہے۔ ملک میں غریبی کا قلع قمع کرنے کے لیے ایک طویل جدوجہد کی ضرورت ہے اور حکومت کی پہل کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

بھارتی سیاسی عمل منصوبہ بندی کے عمل سے نہایت قریبی انداز میں وابستہ ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں۔ اگر منصوبہ بند ترقی کی کوششوں سے ملک آگے بڑھتا ہے تو اس سے بھارتی سیاسی نظام کی قوت و استحکام میں بھی اضافہ ہوگا۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہوتا تو سخت مشکلات پیدا ہو جائیں گی بھارت میں جمہوریت کے معنی و مطالب کا انحصار عوام کے منتخب کئے ہوئے نمائندوں کے قیادتی کردار پر ہے اور یہ کام سات پنجسالہ منصوبوں کے ذریعے پوری سنجیدگی سے انجام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

زرعی اصلاحات

سات پنجسالہ منصوبوں کی حصولیابیوں سے دیہی اور شہری بھارت کے درمیان ارتباط میں اضافہ ہو رہا ہے اور زراعت و صنعت کے درمیان رشتے قائم ہو رہے ہیں۔ لیکن ترقی کی سیاست ہموار نہیں رہی ہے کیونکہ بہت سے سماجی عناصر اس کے خلاف ہیں۔ گذشتہ چار دہائیوں میں ملک میں زرعی تنظیم نو کی رفتار قدرے سست رہی ہے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک جمہوریت میں زرعی تبدیلی سست ہوتی ہے۔ مگر مطلوبہ سیاسی و انتظامیہ عزم کے ساتھ ملکیت اراضی کی بالائی حد سے متعلق قوانین نافذ کئے جا سکتے ہیں۔ لگان داروں کے تحفظ کو یقینی بنایا جا سکتا ہے اور فاضل اراضی بے زمین کسانوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ بہت سے طاقتور مفادات اصلاحات اراضی کے نفاذ میں رخنے ڈالتے ہیں لیکن یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اصلاحات اراضی کے موزوں نفاذ کے بغیر بھارتی جمہوریت کے سماجی اور اقتصادی پہلو کمزور رہیں گے۔ دیہی بھارت میں کافی زیادہ تشدد دیکھنے میں آیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غریب لوگ اپنے جمہوری حقوق پر اصرار کر رہے ہیں اور زمیندار بے زمین زرعی مزدوروں کو جتنی مزدوری انھیں واجب طور پر ملنی چاہیئے، اسے دینے سے احتراز کرتے ہیں۔ یہی بات وجہ کشمکش بن جاتی ہے۔ اگرچہ بالغوں کے حق رائے دہندگی سے عوام میں اپنے حقوق کے تئیں بیداری پیدا ہو گئی ہے لیکن دیہی علاقوں کے کچھ طاقتور سماجی عناصر اس نئی بیداری کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں دیہی علاقوں میں تشدد بڑھ رہا ہے۔

دیہی افراد کی غریبی

یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ بھارت میں جمہوری سیاسی نظام اپنی بنیادی لڑائی گاؤں میں لڑ رہا ہے جہاں جمہوری طور پر باشعور غریب عوام اپنے قانونی حقوق کے دئے جانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ دیہات میں غریبی کی کمر توڑی جا سکتی ہے اگر غریبوں کے پاس بھی کچھ اثاثہ ہو۔ حکومت کے زیر اہتمام چلائے جانے والے مربوط دیہی ترقی کے پروگرام، دیہی علاقوں میں روزگار کی گارنٹی کی اسکیم، کام کے بدلے اناج دینے کے پروگرام، پبلک اداروں کے ذریعے غریبوں کو قرضوں کی فراہمی کچھ ایسے پروگرام ہیں جن سے دیہات میں غریبی پر وار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ پروگرام کے نفاذ کے دوران کافی روپیہ اور وسائل ادھر سے ادھر چلے جاتے ہیں۔ اس لیے جب تک مصمم سیاسی ارادہ نہ ہو حکومت کے زیر سرپرستی چلنے والی بہت سی اسکیموں کو پوری کامیابی کے ساتھ عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا اور اگر ایسا ہو تو جمہوری عمل سے عوام کا اعتقاد اٹھ جائے گا۔ بھارتی جمہوریت کو قوت و استحکام اقتصادی ترقی سے حاصل ہوا ہے اور اسے مزید مستحکم بنانے کا انحصار اقتصادی پروگراموں اور سماجی اصلاحات کی اسکیموں کو تیزی سے بروئے کار لانے پر ہے۔

چنوتیاں

گذشتہ چار دہائیوں کی سماجی و اقتصادی

تنظیم نو کی کہانی صاف طور پر یہ بتاتی ہے کہ جمہوری سیاسی نظام کو مضبوط بنانے میں بہت سی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ بہت سے مذہبی اور ذات پات پر مبنی اختلافات ابھرے ہیں جو بھارتی جمہوریت کے لیے خطرہ ہیں۔ گذشتہ چار دہائیوں میں ہم جس راہ پر چل رہے ہیں اس سے یہ عیاں ہے کہ سیکولر پالیٹکس کے لیے جنگ اور زیادہ جوش و خروش اور عزم صمیم کے ساتھ لڑی جانی ہے۔ اسی طرح بالغوں کے حق رائے دہندگی کو صحیح معنی عطا کرنے کے لیے سماجی حدود کو بھی مزید وسعت دینی ہوگی بھارت میں جمہوری تجربے نے بہت سے یاسیت پسندوں کے اندیشوں کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ لیکن اطمینان سے بیٹھ رہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اقتصادی ترقی اور سیکولرازم ہندوستانی جمہوریت کے ستون ہیں۔ اگر ہم اقتصادی تبدیلی کی رفتار تیز کر دیں تو ملک میں جمہوریت کی بنیادیں اور مضبوط ہوں گی۔ نیز اگر سیکولرازم کو مضبوط کرنا ہے تو بھارت پھوٹ ڈالنے والے عناصر کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ مذہبی جنون بھارتی جمہوریت کے لیے بہت بڑا چیلنج بن سکتا ہے۔ لہٰذا بھارت کے تمام جمہوریت پسندوں کا فرض ہے کہ وہ بڑھتے ہوئے مذہبی تعصب کے خلاف لڑیں۔

اداروں کا کردار

گذشتہ چار دہائیوں میں کیے گئے قومی تعمیر کے کاموں سے واضح ہے کہ مضبوط سیاسی و انتظامی ادارے ملک کو آگے لے جانے اور بحرانی حالات کا مقابلہ کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پارلیمنٹ، کابینہ، سول سروس، عدلیہ، سیاسی جماعتیں اور منصوبہ بندی کمیشن ملک کے اہم ترین ادارے ہیں اور ان کی طاقت اور کمزوریاں پچھلے ۳۹ برسوں میں ظاہر ہو چکی ہیں۔ ایک ترقی پذیر ملک سماجی انقلاب لانے کے چیلنج کا سامنا اختراعی حکمت عملی کے ذریعے نئی راہیں نکال کر کر سکتا ہے۔ اداروں کی ایسی کوششیں ہی تو ترقی کا نچوڑ ہیں۔ جب کبھی کسی سرکاری ادارے میں کوئی کمزوری ہو تو اس کے ازالہ کے لیے فوری اصلاح کی جانی چاہیئے۔ پارلیمنٹ اپنے جانچ پرکھ کے اختیار کو پارلیمنٹری کمیٹیوں کے استعمال کے ذریعے بڑھا سکتی ہے۔ اگر کابینہ سول سروسوں کی مہارت کا استعمال کر سکے تو وہ زیادہ موثر ثابت ہو سکتی ہے سول سروس مفید ثابت ہو سکتی ہے اگر وہ دیانتدار ہو۔ اور منصوبہ بندی کمیشن زیادہ کامیابی سے اپنا کام کر سکتا ہے اگر وہ ریاستی حکومت کے ساتھ اچھے مراسم پیدا کر سکے۔ اس کے علاوہ حکومتی اداروں کو بھی اپنی بھرپور صلاحیت استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

گذشتہ چار دہائیوں کا پیغام یہی ہے کہ حکومت بھارتی ترقی کے لیے ایک مرکز کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی قابلیت اور صلاحیت پر ہی ترقی کا مستقبل منحصر ہے۔ چونکہ ترقی کے عمل میں نئے نئے چیلنج درپیش ہوتے ہیں اس لیے ذمہ دار حکومتی اداروں کو ایسے چیلنجوں کا سامنا کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔

آخر میں ہم یہی کہیں گے کہ بھارت کو اور تیزی سے آگے بڑھنا ہے۔ جمہوری ترقی کی رفتار تیز تر کرنے کے لیے ہمارے انتظامیہ اداروں کو درپیش مسائل کے حل کی نئی نئی راہیں نکالنی ہیں۔ ●

بقیہ: سکندر علی وجد

اپنی نظم مزدوروں کے پیغام میں انھوں نے آرٹس کالج کی خوبصورت اور جاذب نظر عمارت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اسے فنکاری کا ایک عظیم نمونہ قرار دیا ہے۔ مزدوروں نے جو محبت اور محنت سے اس عمارت کی تعمیر میں اپنی فنکاری کے جوہر دکھائے ہیں اس کو سراہتے ہوئے وجد نے یہ فکر انگیز شعر نذر کیا ہے ؎

ہم نے نقشِ ہوسِ خام نہیں چھوڑا ہے
کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے

وجد اردو زبان کے عظیم المرتبت شاعر تھے جو ارضِ دکن سے جھوم کے اٹھے تھے اور پوری ادبی دنیا پر محیط ہو گئے انھیں دکن کی سرزمین پر بڑا ناز تھا۔ چنانچہ اس کا اظہار اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے۔

الفت کی جنت گر کہیں ہے
تو بیتنک یہیں ہے یہیں ہے

'الفت کی جنت' کا یہ دلنواز ادر قادر الکلام شاعر ۱۶ مئی ۱۹۸۳ء کو اردو کے لاکھوں پرستاروں کو داغِ مفارقت دے گیا، لیکن اس کی شخصیت کے اَن مٹ نقوش ہمیشہ ہمیشہ ہمارے ذہن و دل کی دنیا پر مرتسم رہیں گے۔ جب تک انسانیت، دوستی، شرافت، اخلاص اور وضعداری کی اعلیٰ قدریں موجود ہیں وجد کا نام تابندہ رہے گا۔

'آفتاب تازہ'، 'بیاضِ مریم'، 'لہو ترنگ' اور 'اوراقِ مصور' ہمارے ادب و شاعری کے وہ صحیفے ہیں جو شعرا کی آنیوالی نسلوں کے لیے چراغِ راہ کا کام کریں گے، اور بقول وجد ؎

ہنس کے شاعر نے موت سے یہ کہا
اے سبک دست، زندگی دشمن
وقت کی فصل کاٹنے والے
ایک زندہ خیال کی دھن میں
گنگناتے ہوئے مسرت سے
ایسے الفاظ میں نے لکھے ہیں
جن کو تو بھی مٹا نہیں سکتی ●

فاروق نازکیؔ

قسط: ۵

قومی ترقّی کے سنگِ میل

ساتویں پانچسالہ منصوبے کا مسودہ ملک کی تعمیرِ ترقی کا وہ خاکہ ہے، جس میں نئے مستقبل کی اُمیدوں اور آرزوؤں کے رنگ بھر دیئے گئے ہیں، یہ مسودہ ایک ایسا عہد نامہ ہے جس کی ترتیب آزادی کے چند ہی برسوں کے بعد عمل میں آئی، پانچسالہ منصوبوں کے مسودات کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے، تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ہمارے منصوبوں کی بنیاد الیقین محکم اور عملِ پیہم کے زرّیں اصولوں پر رکھی گئی ہے، ہمارے ملک میں جس طرح جمہوری نظامِ حکومت استوار بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے ایک ارتقائی عمل سے گذرتا گیا، اُسی طرح طرح سماج وادی طرز کا اقتصادی نظام بھی ارتقاء پذیر ہوا۔ سماجی اور معاشی آزادی کے حصول کے لیے تبدیلی کے عمل کو ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے، ہمارے ملک کے سیاسی مفکّروں اور معاشیات کے ماہروں نے ایک سائنسی انقلاب کے ذریعے سماجی اور معاشی حالات کو سُدھارنے کی کوشش پر زور دیا۔ دراصل ہماری معاشی زندگی میں سائنسی اندازِ فکر کا دخل شری جواہر لال نہرو کی سیاسی اور سماجی بصیرت کا مرہونِ منّت ہے، انھوں نے نئے ہندوستان کی تعمیر کے لیے ترقی اور فلاح کی نئی عبادت گاہوں کی بُنیاد ڈالی۔ آزاد ہندوستان کے ہر نئے پراجیکٹ کو انھوں نے جدید ہندوستان کی نئی خانقاہوں اور عبادت گاہوں کا نام دیا۔ پانچ سالہ منصوبوں میں اس بات کا خیال رکھا گیا کہ ہندوستان ایک ایسے اقتصادی ڈھانچے کو تشکیل و ترتیب دے جو ہمہ جہتی کردار کا مالک ہو، اسی وجہ سے زراعت، صنعت و حرفت، تعلیم، سائنسی تحقیق، کانکنی اور دیگر اقتصادی امور کو اوّلیت دی گئی۔ ان شعبوں کا براہِ راست تعلق عوام کی خوشحالی اور بہبودی سے تھا، اور ہر شعبے کی ترقی عوام کے کمزور سے کمزور طبقے کے لیے مددگار اور فائدہ مند ثابت ہوتی رہی۔ روزگار کے وسائل بڑھ گئے، فی کس آمدنی میں اضافہ ہوا طبی سہولیات سے شرحِ اموات کم ہوئی، جس سے آبادی میں اضافہ ہوا، لیکن خاندانی بہبودی کے تصوّر کو عملی جامہ پہنانے سے اُس مسئلے کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی، آج ہمارا ملک دُنیا کے دس عظیم صنعتی ممالک میں شمار ہوتا ہے آج سے ۲۰ سال پہلے عام آدمی کے لیے ایسا تصور کرنا بھی قرینِ قیاس نہ تھا۔ لیکن یہ خواب محض منصوبہ بند طریقوں کو عمل میں لانے سے ہی حقیقت کا روپ اختیار کر سکا ہے۔

منصوبہ بند ترقی کے اجزاء ترکیبی ہر چند یکساں ہوتے ہوئے بھی مختلف ہوتے ہیں کسی بھی ملک کی ترقی کا منصوبہ تیار کرتے وقت سیاسی، جغرافیائی، سماجی اور معاشی حالات کو زیرِ نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ اُس ملک کے تمدّنی اور سیاسی مزاج کو بھی ذہن میں رکھنا پڑتا ہے، اقتصادیات کے ماہرین نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ بھارت کی منصوبہ سازی میں مُلک کے تمدّنی اور تہذیبی مزاج کو نظرانداز نہیں کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایک ایسے اقتصادی نظام کی تشکیل کے کام میں شروع

۵۵۔ ... ہاسٹل روڈ، نئی دہلی
... نئی دہلی

ہوئے ہیں جو سماج وادی طرزِ نظام کا حصہ ہوتے ہوئے بھی پرائیویٹ سیکٹر کو بے پناہ وسعت دینے میں کامیاب و کامراں ہوا ہے۔ آئیے ان تمام شعبوں پر ایک نظر ڈالیں، جو جمہوریت کے قیام کے بعد اس کی بقاء اور اقتصادی پیش رفت کے لیے قائم کیے گئے۔ اس سے پہلے کہ میں ان شعبوں پر جستہ جستہ بات کروں، یہاں اس بات کی مزید وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ تمدنی، سیاسی اور تہذیبی مزاج سے میری کیا مراد ہے؟ ہندوستان انسانی تہذیب کا وہ گہوارہ ہے جہاں ہزاروں بولیاں بولی جاتی ہیں۔ درجنوں زبانوں میں تحریر و تقریر کے پھول کھلائے جاتے ہیں۔ مختلف لباس، مختلف علاقوں کے لوگوں کی شناخت کرتے ہیں، مختلف جغرافیائی حالات ایک حصے کے خاص اقتصادی اور زرعی پیش منظر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ گل ہائے رنگ رنگ کی دولت نے چمن کی زینت بڑھادی ہے، اور اس کے ساتھ ہی منصوبہ سازوں کی ذمہ داریوں میں غیر معمولی اضافہ بھی کیا ہے۔ منصوبہ بندی کے وقت کثرت میں وحدت کے اصول کو کلیدی حیثیت دی گئی اور ہر علاقے کی ضروریات کے مطابق منصوبوں کی ترتیب ہوئی۔ حصولِ آزادی کے وقت ہندوستان کے لوگوں میں بلا امتیاز ایک ہی قدر مشترک تھی۔ اور وہ تھی غریبی، مفلسی اور ناداری۔ منصوبہ سازی کا اولین مقصد لوگوں کو ناداری کے قعرِ مذلت سے اوپر اٹھانا تھا۔ چنانچہ پہلے تین پانچ سالہ منصوبوں میں ہمارے ماہرین نے عوام کے لیے کم از کم ضروریات کو پورا کرنے کے نشانے تاک کے تھے۔ اندازہ کیجیے جہاں صرف کم از کم ضروریاتِ زندگی کے لیے ملکی سطح پر جدت و تغیر کرنی پڑے، وہاں کی منصوبہ سازی کے بارے میں کسی خوش آئند مستقبل کی توقع رکھنا غیر حقیقی نظر نہ آئے تو کیا آئے مگر وہ صورتِ حال بدل گئی اور پچھلے ۲۰ سال سے ہم اپنے منصوبوں میں بے روزگاری کے خاتمے کے لیے نشانے مقرر کرتے ہیں۔ لوگوں کو طبی سہولیات اور تعلیمی سہولیات دینے کے لیے حد مقرر کرتے ہیں اور ایک مستحکم اقتصادی ڈھانچے کے پھیلاؤ اور توسیعی امکانات کا خاکہ تیار کرتے ہیں۔ منصوبہ بندی کا ایک اور مقصد ہے ملک میں قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کو استوار کرنا۔ ایسا کرنے کے لیے اقتصادی نابرابری کا خاتمہ ایک عملِ ناگزیر ہے۔ آئیے اس پس منظر میں ساتویں منصوبے کے خدوخال کو اُجاگر کرنے کی ایک کوشش کریں۔

قومی یک جہتی کیلئے مرکزی امداد

قومی یک جہتی ہمارے طویل و عریض ملک کی ایک عظیم میراث ہے۔ کنیا کماری سے کشمیر تک طرح طرح کی تہذیبی اور تمدنی روایات کے باوجود، ہندوستان کے عوام تاریخ کے ہر مشکل مرحلے پر اپنے اتحاد اور بھائی چارے سے ہی پہچانے گئے ہیں۔ جب بھی ملک کی یک جہتی اور سالمیت کو خطرہ لاحق ہوا ہے تو ہمارے ملک کے عوام بلا لحاظ مذہب و ملت سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح دشمن کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جب بھی شرپسندوں نے ملک کے لوگوں کی صفوں میں انتشار پھیلانے کی کوشش کی ہے تو ترقی پسند اور ذی شعور عوام نے اُن کے ناپاک عزائم کو مٹی میں ملا دیا ہے۔ ترقی اور خوشحالی کے لیے باہمی اتحاد اور اتفاق سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ گذشتہ کئی برسوں سے عالمی پیمانے پر تشدد کی جو کارروائیاں ہو رہی ہیں، اُن کے اثرات سبھی ممالک پر پڑ رہے ہیں۔ بدقسمتی سے اغراضِ خصوصی کے حصول کے لیے کچھ استحصالی عناصر نے ہمارے ملک میں بھی تشدد پسندوں کی پُشت پناہی کا بہیمانہ عمل اختیار کیا ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ جمہوری ڈھانچہ اتنا مضبوط و مستحکم ہو چکا ہے کہ وہ کسی بھی دباؤ سے متاثر نہیں ہو سکتا اور شر پسندی کی کوئی کارروائی ہماری رفتارِ ترقی کو کم نہیں کر سکتی ہے۔ اس کے باوجود ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم قومی یک جہتی کو قائم و دائم رکھنے کے لیے ہر وقت کوشاں رہیں، اسی میں ہماری خوشحالی اور سلامتی کا راز مضمر ہے۔ مرکزی وزارتِ داخلہ نے اسی سلسلے میں ایک اسکیم شروع کی ہے جس کے تحت ملک کی تمام ریاستوں میں رضا کارانہ طور پر قومی یک جہتی کو فروغ دینے کے لیے کام کرنے والے اداروں کو امداد دی جائے گی۔ اس کام میں یونیورسٹیاں اور دیگر تعلیمی ادارے شامل ہیں۔

اس اسکیم کا بنیادی مقصد ملک کی سیکولر اور ترقی پسند قوتوں کو فروغ دینا ہے، اور مختلف تعلیمی ادارے، ایسی رضا کارانہ تنظیموں کے ساتھ تعاون کریں گے جو یک جہتی کو بڑھاوا دینے کے کام میں پیش پیش ہوں گی۔ جو رضا کارانہ تنظیمیں اس اسکیم سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہوں۔ اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ مقررہ ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہوں اور ان تنظیموں کا اپنا ایک چھپا ہوا منشور ہو جس میں اس بات کا صریحاً اظہار [illegible] کے اغراض و مقاصد مرکزی قومی یک جہتی [illegible] کے عین مطابق ہیں۔ سال [illegible]

میں مرکزی قومی یک جہتی کا جو اجلاس منعقد ہوا تھا اس میں جو فیصلے کیے گئے اور قومی یک جہتی کے کاز کو آگے بڑھانے کے لیے جو تجاویز منظور کی گئیں ان کو عملی جامہ پہنانے کے کام کے سلسلے میں رضاکارانہ تنظیمیں جو بھی کارروائی کریں گی اس کے لیے مرکزی امداد فراہم کی جائے گی۔ رضاکارانہ تنظیموں کے لیے جو لائحہ عمل مرتب کیا گیا ہے وہ یوں ہے۔

۱۔ فرقہ وارانہ منافرت، علاقائی تعصب اور تشدد کو پھیلانے والے عناصر کا مستعدی سے مقابلہ کرنا۔

۲۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور باہمی اتفاق و اتحاد کے زریں اصولوں کی ترویج و اشاعت جس کے تحفظ کے لیے ہمارے ملک نے ہمیشہ فعال کوشش کی ہے۔

۳۔ تعمیری قوتوں کو استحکام دیا جائے تاکہ ملی سالمیت اور آپسی بھائی چارے کی فضا خوشگوار سے خوشگوار تر بنتی جائے۔

۴۔ ایسی کارروائیاں منظم کرنا، جس میں ہر طبقے کے لوگ شریک ہوں اور جذباتی ہم آہنگی کی منزل کے حصول کے لیے راہ ہموار ہو۔ مشترکہ شہریت کے تصور کو اس طرح اجاگر کیا جائے تاکہ قومی زندگی کے معیار کو اعلیٰ ترین درجہ حاصل ہو سکے۔

مرکزی اسکیم، قومی یک جہتی کی اہمیت اور افادیت کو سمجھتے ہوئے نیز مندرجہ بالا اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے لائحہ عمل کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مندرجہ ذیل باتوں پر زور دیتی ہے:

(الف) بحث و مباحثوں کا انتظام (ب) قومی تہواروں کو مشترکہ طور پر منانے کا انتظام (ج) تمدنی سرگرمیاں۔ (د) ایسے تحریری مواد کی کثیر اشاعت جس کے ذریعے قومی اقدار کو فروغ ملے اور قومی یک جہتی کی اہمیت واضح ہو جائے۔ (س) آپسی بھائی چارے کی فضا کو قائم رکھنے کے لیے شہریوں کی کمیٹیوں کا قیام۔ (ل) مقامی حالات اور مسائل کا تجزیہ۔ جن کا تعلق امنِ عامہ کے قیام، نیک نیتی اور باہمی رواداری کے ساتھ ہو۔ (م) ملک کے سیکولر اور قومی آدرشوں کو بڑھاوا دینے کے لیے جلسوں اور نمائشوں کا اہتمام۔ (ح) ایسی تنظیموں کے لیے مالی وسائل تلاش کرنا جو تنظیمیں سیکولرازم اور قومی یک جہتی کے آدرشوں کے لیے سرگرم کار ہوں۔

ان اقدامات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہماری منصوبہ ساز ترقی جہاں اقتصادی اور معاشی استحکام کے لیے اقدامات کرتی ہے، وہاں ذہنی، جذباتی اور فکری سطح پر بھی قوم کی نشو و نما کے کام میں جُٹی ہوئی ہے تاکہ کل کا شہری اُن تمام ذہنی آلودگیوں سے آزاد ہو جو تنگ نظری، علاقائی، لسانی اور طبقاتی تعصب کو پیدا کر کے ترقی کی رفتار کو کم کرتی ہوں۔

دیہی خواتین کی فلاح و بہبود اور ساتواں منصوبہ

ہمارے ساتویں پانچسالہ منصوبے کی ایک اہم بات یہ ہے کہ منصوبے کے پہلے سال میں دیہی ترقیاتی پروگرام کے تحت آبادی کے جس ۴۰ فیصدی حصے کو اقتصادی اور معاشی فائدہ ملے گا وہ دیہی خواتین پر مشتمل ہے۔

منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی کارروائی کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہے گا، اور دائرہ کار اُن کنبوں تک پھیلے گا جن کی سرپرستی کے فرائض خواتین کے ہاتھ میں ہیں۔ اس طرح سے خواتین کی ترقی ایک نئے مرحلے میں داخل ہوگی۔ جہاں بھی کنبوں کو دیہی ترقی کے پروگرام کے دائرہ کار میں شامل کیا گیا ہو وہاں گھر کی جائداد مرد اور عورت کی مشترکہ جائداد کے طور پر رجسٹر کی جائے گی، اس طرح سے خواتین خود مختار طریقوں پر بنکوں یا دوسرے مالی اداروں سے قرضہ وصول کر سکتی ہیں۔ مربوط دیہی پروگرام کے تحت رواں مالی سال یعنی (۸۶-۸۵) کے دَوران (۲۱۴-۵۰) کروڑ روپے کی حد مقرر کی گئی ہے۔

یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ خواتین کو غیر آباد زمین کو زیرِ کاشت لانے کے کام میں پہل کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ یہ بنجر اور بے آباد زمینیں خواتین کو پٹّے پر دی جائیں گی۔ اُس پر جو لاگت آئے گی اس کے لیے اُس کا انتظام مربوط ترقیاتی پروگرام (NERP) کے ذریعے سے کیا جائے گا۔ خواتین ان زمینوں میں ایندھن کے لیے پیڑ اور مال مویشیوں کے لیے دانا چارا اگائیں گی، جس سے اُن کی معیشت پر براہِ راست مثبت اثر پڑے گا۔ خواتین کے لیے خصوصی اور موزوں اسکیموں کی نشاندہی کی جائے گی جن سے روایتی دستکاریوں کے کام کو فروغ ملے گا۔ زرعی اور ثمراتی پیداوار کو بڑھا کر اُس کو بازار میں فروخت کرنے کا مناسب انتظام ہوگا اور ان کے لیے سرکاری دفاتر اور اسکول منڈی کا کام دیں گے۔ قومی دیہی روزگار پروگرام کے دائرے میں آنے والوں کی ۵۰ فیصدی تعداد خواتین کی ہے۔ اس لیے اُن کو امدادی خدمات کے دائرے میں لانا لازمی سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح خواتین کو دیہی بے زمین کسانوں کو روزگار فراہم کرنے کے پروگرام سے بھی مستفید ہو جانا چاہیے۔ سیلف ایمپلائمنٹ اسکیم کے تحت جو لوگ آتے ہیں اُن میں ایک تہائی حصہ

خواتین کا ہوتا ہے، یہ طریقہ کار قائم رہے گا۔

ان تمام اسکیموں پر رواں مالی سال میں ۵۰ء ۶۳۲ کروڑ کی لاگت مختص کی گئی ہے۔ خواتین اور سماجی بہبود سے متعلق وزارت اور دیہی ترقیاتی محکمے انتظامی ڈھانچے کو ازسرِنو ترتیب دے رہے ہیں تاکہ مربوط دیہی ترقی کے پروگرام کا انتظام و انصرام خواتین کے سپرد ہو سکے۔

مرکزی وزارت محنت نے ریاستوں کو خواتین کے واسطے صنعتی تربیتی اداروں کے لیے ۵۰ فیصد امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے، اس کے علاوہ مختلف دستکاریوں کی تربیت دینے کے لیے یہ وزارت چھ مزید علاقائی مراکز قائم کرے گی۔ اس کے علاوہ زچگی کے ایام میں خواتین کو خاص سہولتیں دی جائیں گی، تاکہ کارخانہ داران کے ساتھ کسی قسم کا امتیازی سلوک روا نہ رکھ سکے۔

کالے دھن کا مسئلہ

دُنیا کا کوئی بھی ملک ہو، ترقی پذیر یا ترقی یافتہ۔ اگر وہاں کے نظام میں آزاد تجارت کی ضمانت ہے، تو جان لینا چاہیئے کہ آزادی کی بے پناہ نعمتوں کے دوش بدوش ایسی سماجی بُرائیاں بھی سر اٹھا لیتی ہیں جو اقتصادی، معاشی، اور اخلاقی اقدار پر مہلک اثرات ڈال دیتی ہیں۔ سب سے پہلے ان برائیوں کی زد میں اقتصادی اور معاشی نظام آجاتا ہے۔ کساد بازاری، ذخیرہ اندوزی اور استحصال انسانیت دشمن اور شر پسند عناصر کے قدیم ترین ہتھکنڈے ہیں جن کی مدد سے وہ معاشرے کو اپنا دست نگر بنانے کے درپے ہوتے ہیں ان ہی ہتھکنڈوں میں سے کالا دھن وہ خوفناک ترین حربہ ہے جس کے استعمال سے چور بازاری اور دیگر سماج دشمن ایک متوازی اقتصادی نظام کو جنم دیتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کساد بازاریوں کے یہاں اتنا کالا دھن کہاں سے آتا ہے کہ وہ ایک متوازی اقتصادی نظام پیدا کرتے ہیں۔ اس سوال کا جواب بالکل آسان ہے۔ حکومت نے ٹیکس وصول کرنے کے ضابطے مقرر کیئے ہیں، اور آمدنی پر ٹیکس کی سالانہ شرح مقرر کر رکھی ہے، جو سرمایہ دار ٹیکس دیتے وقت غلط اندراجات کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ ٹیکس کی چوری کے مرتکب ہوتے ہیں اور اپنے سرمایے کو من مانے طریقوں پر صرف کرتے ہیں، یہ کالا دھن خونِ فاسد کی طرح سماج کی رگوں میں دوڑتا ہے اور اسمگلنگ اور دیگر ذریعوں سے سماج میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہمارے ملک میں اربوں روپے کا کالا دھن پوشیدہ ہے۔ اس پر جو ٹیکس وصول ہو سکتا ہے اس سے ہم سماج کی فلاح و بہبود کے کام میں کئی گنا اضافہ کر سکتے ہیں۔ ٹیکس کی وصولیابی کا براہِ راست تعلق ملک کے ترقیاتی کاموں پر عملدرآمد سے ہے۔ ٹیکس وصول ہونے میں جو دقتیں پیش آتی ہیں اُس سے حکومت ہی نہیں بلکہ تمام لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ قیمتیں بڑھتی ہیں۔ چیزیں مصنوعی طریقے پر نایاب ہوتی ہیں۔ خزانۂ عامرہ میں دولت کی کمی ہو جانے سے ذرائع محدود ہوتے ہیں۔ اور ترقی کے کام رُک جاتے ہیں۔ اس تجزیہ سے ثابت ہوا کہ کالے دھن کے مالک ملک و قوم کے ذلیل ترین دشمن ہیں۔ جن کا قلع قمع کرنے میں حکومت ہمیشہ سے کوشاں رہی ہے۔ مختلف قوانین کو رُوبہ عمل لایا گیا ہے۔ ٹیکس کی شرحوں میں وقتاً فوقتاً تبدیلی آجاتی ہے۔ اور کالے دھن کو حاصل کرنے کے لیے سخت سے سخت قدم اٹھائے جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کالے دھن کے جو ذخائر ہمارے ملک میں پوشیدہ ہیں ابھی تک پوری طرح حکومت کی دسترس میں نہیں ہیں، لیکن ٹیکس کی وصولیابی کے ضوابط میں ترمیم و تبدیلی سے کالے دھن کا کافی حصہ ملکی دولت کا حصہ بن چکا ہے۔

اس بات کا اندازہ لگانے کے لیے ہمیں پچھلے منصوبوں کی کامیابی کے بارے میں جاننا ہوگا پچھلے منصوبوں کی کامیابی اس بات سے ثابت ہو جاتی ہے کہ مجموعی قومی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ اور مجموعی قومی پیداوار یعنی (GNP) میں اضافہ ہو وہاں ملک کی دولت اور وسائل کا اندازہ لگانا ممکن بن جاتا ہے۔ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے اسی سال اپریل کے مہینے میں یورپا انتظامی فاؤنڈیشن کی میٹنگ میں تقریر کرتے ہوئے بجا طور پر فرمایا۔ "چھٹے پانچسالہ منصوبے کی کامیابی ایک روشن حقیقت ہے — ہماری اوسط آمدنی میں ۵ فیصدی سے کچھ زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ سال ۸۰ - ۱۹۷۹ء میں اناج کی پیداوار ۱۰ کروڑ ۹۰ لاکھ ٹن تھی اور اس برس یعنی ۱۹۸۶ء میں پیداوار ایک کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن تک پہونچ گئی — یعنی جو اضافہ ہوا ہے وہ ۴۰ فیصدی کے قریب ہے۔ یہاں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ غذائی اجناس میں ایسی بیشتر چیزوں کو ہم اناج کے زمرے میں شامل نہیں کرتے، جن کو دیگر ممالک میں اناج کے ہی زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ بہرحال وزیر اعظم نے منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات کا بھی اظہار کیا ہے کہ "ہمارے ملک میں سرمایہ کاری (Inve- stment) کی شرح ۲۵ فیصدی تک پہونچ گئی ہے —" ظاہر ہے سرمایہ جن میدانوں میں لگایا گیا ہے وہ زراعت، رسل و رسائل، آبپاشی وغیرہ کے شعبے ہیں۔ اور ان شعبوں کو مزید فروغ دینے کے لیے ہمیں اپنے وسائل میں بھی مزید اضافہ کرنا ہوگا۔ ●

ایم۔ ایل۔ بجاج

بھارت میں پنچایت راج

"پنچوں میں پرمیشور ہے" اس مثل سے جہاں پنچایتی نظام کی تقدیس و اہمیت کا اظہار ہوتا ہے وہاں اس سے اس امر کا بھی ٹھوس ثبوت ملتا ہے کہ بھارت میں پنچایتی نظام خصوصاً دیہات میں ہزاروں برس تک مروّج رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بھارت کافی عرصے تک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا رہا لیکن راجہ یا مملکت عوامی امور میں بہت کم مداخلت کرتی تھی۔ اس ملک پر بیشتر غیر ملکی حملے ہوئے لیکن انگریزوں کی آمد تک دیہی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور نہ ہی کسی نے ایسا کرنے کی کبھی کوشش کی۔ مورخ لکھتے ہیں کہ افواج آمنے سامنے لڑتی تھیں لیکن کسان باقاعدہ کھیتوں میں ہل چلاتے رہتے تھے۔ اور لوگ اپنے روزمرہ کے امور انجام دیتے رہتے تھے۔

دراصل دیہی ڈھانچہ انگریزی سامراج کی آمد کے ساتھ درہم برہم ہوا جبکہ انھوں نے بڑی بڑی زمینداریاں قائم کیں اور یہ عمل سب سے پہلے بنگال میں شروع ہوا۔ انگریزوں نے انتظامی ڈھانچے کو اس قدر مضبوط کیا اور شکنجہ اس قدر کسا کہ* پنچائتوں سے تمام انتظامی امور چھین لیے گئے اور انھیں بے دست و پا کر دیا۔

مقامی حکومتیں

دیہات میں پنچائتیں مقامی حکومت کے فرائض انجام دیتی تھیں اور ایسے اقدام کرتی تھیں جن سے پیداوار اور روزگار میں اضافہ ہوتا تھا۔ لیکن انگریزی حکومت اور صنعتی انقلاب کے باعث یہ ڈھانچہ درہم برہم ہو گیا اور زمینداروں اور ساہوکاروں کے ہتھکنڈوں سے کسان اپنی زمینوں سے محروم ہونے لگے۔ دیہات میں بیروزگاری بڑھنے لگی۔ لوگوں نے روزگار کی تلاش میں شہروں کا رُخ شروع کر دیا۔

اس مرض کی نبض شناسی کی مہاتما گاندھی نے، جنھوں نے کہا کہ حقیقی ہندوستان دیہات میں آباد ہے۔ اگر ہندوستان کو اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی طور پر ایک مضبوط ملک بنانا مقصود ہے تو دیہات کی کایا پلٹ کی جائے۔ دیہات کو خودکفیل بنایا جائے۔ دیہات کو محض سیاسی آزادی ہی نہیں بلکہ اقتصادی آزادی کی بھی ضرورت ہے۔ اسی لیے انھوں نے چرخہ کاتنے اور کھادی کو مقبولِ عام بنانے اور دیہی صنعتوں کو فروغ دینے کا پروگرام شروع کیا تاکہ دیہات کو اپنی ضروریات کے لیے شہروں کا محتاج نہ ہونا پڑے اور ان دونوں کے مابین تعلقات باہمی انحصار پر مبنی رہنے چاہئیں۔

انسدادِ زمینداری

حصولِ آزادی کے بعد قومی حکومت نے دیہات کی حالت سدھارنے کی طرف خاص طور پر توجہ کی اور اس سلسلے میں انسداد زمینداری اور اصلاحاتِ اراضی سے متعلق قوانین منظور کیے گئے اور دیہی کوآپریٹواداروں کے ذریعہ دیہی قرضے سے متعلق مربوط اسکیم کا بھی اجرا کیا گیا تاکہ دیہاتیوں کو زمینداروں اور مہاجنوں کے شکنجے سے آزاد کرایا جا سکے۔ اور دیہات کی اقتصادی ترقی کے عمل میں امداد دی جا سکے۔

حلقہ جاتی ترقیاتی پروگرام

چنانچہ پہلے پانچسالہ منصوبے (۵۶-۱۹۵۱ء) میں دیہات میں پنچایتی نظام کو فروغ دینے پر زور دیا گیا۔ دیہات میں کسانوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے ۲ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو مہاتما گاندھی کے

---

* ۴۳۰ ملک بلڈنگ، چونا منڈی۔ پہاڑ گنج۔ نئی دہلی
یوجنا، نئی دہلی

جنم دن پر کمیونٹی ڈویلپمنٹ پروگرام شروع کیا گیا۔ اور اس کے ایک برس بعد ۲؍ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو "زیادہ اناج اُگاؤ کمیٹی" (۱۹۵۲ء) کی سفارش پر اس پروگرام کو تقویت دینے کے لیے قومی توسیعی سروس (نیشنل ایکسٹینشن سروس) کا اجرا کیا گیا۔ کمیونٹی ڈویلپمنٹ بلاک کے سپرد منصوبہ بندی اور ترقی کا کام کیا گیا اور بلاک ڈویلپمنٹ افسر کو بلاک سطح پر تمام دیہی ترقیاتی پروگراموں میں تال میل کی ذمہ داری سونپی گئی اور اس کام میں اُسے متعدد تکنیکی افسروں اور دیہی سطح کے کارکنوں کی امداد مہیا کی گئی۔

پنچائت راج

لیکن جب دونوں اداروں کے کام کاج کے بارے میں شکایات موصول ہوئیں تو کمیونٹی ڈویلپمنٹ پروگرام اور قومی توسیعی سروس کی کارکردگی کا جائزہ لینے اور اُن کے امور کی پڑتال کرنے کے لیے جنوری ۱۹۵۷ء میں شری بلونت رائے مہتہ کی زیر سرکردگی ایک تحقیقاتی کمیٹی بٹھادی گئی۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ ان کے کام کاج کا عوام پر اچھا اثر نہیں پڑا ہے۔ اخراجات میں بہت سا روپیہ برباد ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عوام کمیونٹی ترقیاتی کام کو اپنا کام تصور نہیں کرتے اور اس کے نتیجے میں وہ خود کو اُس سے وابستہ نہیں کرتے۔ ان خامیوں کو دُور کرنے کے لیے اور آئین کے آرٹیکل ۴۰ سے مطابقت پیدا کرتے ہوئے کمیٹی نے سفارش کی کہ گاؤں، بلاک اور ضلع کی سطحوں پر انتظامی مشینری میں جمہوری لامرکزیت لائی جائے اور اس سلسلے میں بالترتیب دیہی پنچائتوں، پنچایت سمیتیوں اور ضلع پریشدوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس تین حصوں والے سسٹم پر جسے قومی ترقیاتی کونسل نے قبول کرلیا تھا پارلیمنٹ میں بحث ہوئی۔ اس جمہوری "لامرکزیت" کے تئیں عوام میں کشش پیدا کرنے کے لیے اس کا نام "پنچائت راج" رکھا گیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے ۲؍ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو مہاتما گاندھی کے جنم دن پر راجستھان میں پنچائتی راج کا افتتاح کیا۔ رفتہ رفتہ تمام ریاستوں اور مرکزی منتظمہ علاقوں میں میگھالیہ اور ناگالینڈ کی ریاستوں اور لکش دیپ اور میزورم کے مرکزی منتظمہ علاقوں کے سوائے اس کا قیام عمل میں آگیا۔ چنانچہ ۳۱؍ مارچ ۱۹۸۴ء تک ۲۱۷،۳۱۹ گرام پنچائتیں کام کررہی تھیں جو ۵،۶۱،۱۳۵ دیہات اور تقریباً ۹۵ فیصد دیہی آبادی کو محیط کئے ہوئے تھیں۔ اور ان کے علاوہ ۴۵۲۶ پنچایت سمیتیاں اور ۲۹۷ ضلع پریشدیں اپنی سرگرمیاں انجام دے رہی تھیں۔

گرام سبھا

پنچائت راج کے تمام تر ڈھانچے کی بنیاد گرام سبھا پر رکھی گئی ہے جو ایک گرام پنچایت کے حلقے میں رہنے والی تمام تر بالغ آبادی پر مشتمل ہے۔ اس گرام پنچایت میں ایک یا زیادہ دیہات جن کی اوسط آبادی ۱۵۰۰ ہو، اور اوسط رقبہ تقریباً ۷ مربع میل ہو شامل ہوتی ہیں۔ بعض ریاستوں میں گرام سبھا کو قانونی حیثیت حاصل ہے جبکہ دوسری ریاستوں میں اُسے یہ حیثیت حاصل نہیں۔ گرام سبھا کو جو امور سونپے گئے ہیں وہ ہیں — گرام پنچایت کے نظم ونسق سے متعلق آڈٹ رپورٹ اور حسابات کی سالانہ رپورٹ، آنے والے سال کے لیے کام کے پروگرام ٹیکسوں کی تجاویز اور ترقیاتی اسکیموں پر بحث۔ گرام سبھا بنیادی حلقہ جاتی (کمیونٹی) سطح پر براہ راست جمہوریت کے طور پر کام کرتی ہے۔

گرام پنچایت

یہ پنچائت راج کا پہلا جزو ہے اور یہ گرام سبھا کی انتظامیہ جماعت ہے۔ اس کے ممبروں کی تعداد ۵ سے ۳۱ تک ہوتی ہے۔ جموں و کشمیر کے سوائے تمام ریاستوں میں پنچ تمام بالغ ووٹروں کی جانب سے منتخب کئے جاتے ہیں، لیکن سرپنچ کا انتخاب بلاواسطہ اور بالواسطہ چناؤ سے کیا جاتا ہے۔ گرام پنچائتوں کو دیہی ترقی اور دیہات کی بہبود سے متعلق بیشتر امور سونپے گئے ہیں۔ جن میں زراعت اور دیہی صنعتوں کا فروغ، صحت وصفائی کا اہتمام، طبی امداد اور بچوں کی بہبود، عام چراگاہوں، دیہی سڑکوں، تالابوں اور کنوؤں کی دیکھ بھال شامل ہے۔ بعض مقامات میں وہ ابتدائی تعلیم کی بھی دیکھ بھال کرتی ہے۔ دیہی ریکارڈوں کو برقرار رکھتی ہے اور مالیہ وصول کرتی ہے۔ گرام پنچایت اپنے نمائندے پنچایت سمیتی کے لیے منتخب کرتی ہے اور دیہی سطح پر ترقیاتی پروگراموں کی تعمیل کے لیے ذمہ دار ہے۔

پنچایت سمیتی

یہ پنچایت راج کا درمیانی جزو ہے۔ اس میں بلاک کے پنچوں کی طرف سے چُنے ہوئے ممبروں کے علاوہ بلاک کی ہر میونسپلٹی کی طرف سے منتخبہ ممبر شامل ہوتا ہے اور درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں اور خواتین کے نمائندے اور کوآپریٹو اداروں کے ڈائریکٹر بھی ہوتے ہیں۔ اور ان کے علاوہ سماجی زندگی اور دیہی ترقی کا تجربہ رکھنے والے مقامی لوگوں کو بھی اس سمیتی میں لیا جاتا ہے۔ سمیتی ریاستوں میں مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے جیسے مدھیہ پردیش میں "جن پد پنچایت" گجرات میں "تعلقہ پنچایت" اور اتر پردیش میں "کشیتر سمیتی"۔ سمیتی کے ذمہ بلاک سطح پر ترقی کا کام ہوتا ہے۔

ضلع پریشد

یہ پنچایت راج کا بالائی جزو ہے۔ اس میں عموماً پنچایت سمیتیوں کے صدر ([illegible])

(۲) مقامی ممبر پارلیمنٹ - ایم - ایل - اے اور ایم - ایل سی (ووٹ کے حق کے ساتھ یا اُسکے بغیر)

(۳) خواتین اور درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے نمائندے اور (۴) کوآپریٹو سوسائٹیوں اور میونسپلٹیوں وغیرہ کے نمائندے شامل ہوتے ہیں۔ ضلع کلکٹر سرکاری نمائندہ ہوتاہے۔ ضلع پریشد کی میعاد مختلف ریاستوں میں ۳ سے ۵ برس تک ہوتی ہے۔

خرابیاں

پنچایت راج کی کارکردگی میں کئی خرابیاں آگئی ہیں۔ پنچایت راج اداروں پر سماج کے ایسے طبقوں کا غلبہ ہوگیاہے جو اقتصادی اور سماجی طور پر بلند مقام رکھتے ہیں جس سے کمزور طبقوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا۔ ان اداروں میں سیاسی گٹھ جوڑ، بدعنوانیاں، نااہلیت، سیاسی مداخلت اور علاقائی وفاداریاں چھا گئی ہیں۔ ضابطوں کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی اور خدمت کے جذبہ کے بجائے طاقت کے اجتماع پر زور دیا جاتاہے۔

دوسری خرابی بنیادی نوعیت کی ہے۔ پنچایت راج کو آئینی رُتبہ حاصل نہیں ہے بموجودہ آئینی ڈھانچے میں یہ وفاقی سیاسی نظام کا آزاد ادارہ نہیں ہے۔ یہ محض ریاست کے ایک محکمے کے طور پر کام کررہاہے اور ریاست جب بھی مناسب خیال کرے اس کے عطیات روک سکتی ہے۔ اختیارات اور استحقاق سلب کرسکتی ہے۔ بعض ریاستی حکومتوں کی طرف سے اس کے سسٹم میں بنیادی تبدیلیاں کرنے کے لیے حال میں جو اقدامات کئے گئے ہیں اُن سے بلاشبہ پنچایت راج ادارے ریاستی حکومتوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں بن گئے ہیں۔ ان کے فرائض مختلف سرکاری محکموں کو منتقل کردیئے گئے ہیں۔

ایک اور خرابی یہ ہے کہ سیاسی پارٹیاں پنچایت راج میں شمولیت کررہی ہیں۔ پنچایت راج اداروں کے سرکاری اور غیرسرکاری افسران کی طرف سے وسیع طور پر یہ خیال کیا جاتاہے کہ پنچایت انتخابات میں سیاسی پارٹیوں کی در اندازی سے سماج پر جو پہلے ہی بکھرا ہوا ہے، نہ صرف غیرصحتمندانہ اثر پڑتاہے بلکہ اس سے اتحاد کی اسپرٹ اور علاقے کے امن و ہم آہنگی پر بھی بُرا اثر پڑتاہے۔ اگر ایک دیہی پنچایت کا سرپنچ حکمراں پارٹی کا نہ ہو تو گرام پنچایت کی طرف سے خواہ کیسی بھی ترقیاتی اسکیمیں پیش کی جائیں مختلف پالیسیوں پر چلنے والی اعلیٰ تر سطح کی جماعتوں کی طرف سے وہ منظور نہیں کی جاسکتیں۔

ایک نہایت پریشان کن امر جو اس سسٹم کے فروغ پر بُرا اثر ڈال رہاہے وہ ہے پنچایت راج اداروں کے سرکاری اور غیرسرکاری افسران کے باہمی تعلقات۔ انھیں اچھے کام کاجی تعلقات برقرار رکھنے میں مشکل پیش آرہی ہے۔ ان اداروں کی کامیابی کے لیے دونوں گروپوں میں اتحاد اور ہم آہنگی کا ہونا ضروری ہے۔ ان کے تعلقات میں بگاڑ کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دائرہ عمل اور اختیارات و فرائض کی واضح حدبندی نہیں کی گئی، غیرسرکاری افسران نظم و نسق میں مداخلت کرتے ہیں اور سرکاری افسران کو منتخبہ نمائندوں کی صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں اور ان میں اُن کے تئیں نفرت و غصہ پایا جاتاہے۔

فنڈ کی کمی

ان اداروں کو جو مسائل درپیش ہیں اُن میں سب سے نازک مسئلہ ہے فنڈوں کی کمی۔ ان اداروں کو زیادہ اختیارات اور فرائض سونپنا محض ایک خوبصورت نعرہ ہوگا اور یہ کام بے معنی ہوگا اگر انھیں کافی فنڈوں کا یقین نہ دلایا جائے۔ ریاستی حکومتوں کی طرف سے انھیں کام چلانے کے لیے مناسب مالی امداد نہیں دی جاتی۔ ان اداروں کی طرف سے ٹیکس لگانے کے لیے بھی کوشش نہیں کی جاتی۔ مبادا وہ عوام میں غیرمقبول ہوجائیں۔ حتیٰ کہ مہاراشٹرا اور گجرات میں بھی جہاں ضلع پریشدوں کا آغاز اچھی طرح سے ہواہے وہ اپنے وسائل میں سے سات فیصد سے زیادہ ضروری آمدنی فراہم نہیں کرسکے۔

حکومت کی طرف سے دیہات میں جو ترقیاتی پروگرام عمل میں لائے جارہے ہیں اُن سے دیہی آبادی کے بہت بڑے حصے جیسے بے زمین مزدور، دیہی دستکاروں اور چھوٹے اور حاشیائی کاشتکاروں کو جن کے پاس اثاثہ نہیں ہے، فائدہ نہیں پہنچا۔ چھٹے منصوبے (۸۳-۱۹۸۲ء) میں بھی بتایا گیا ہے کہ:

" ان ترقیاتی پروگراموں سے زیادہ تر فائدہ مقابلتہً خوشحال طبقوں کو پہونچاہے۔ ... ملک کے بیشتر علاقے بدستور پسماندہ ہیں اور زرعی ترقی میں علاقائی نابرابریاں بڑھ گئی گئی ہیں۔ آبادی کے بڑے حصّوں جیسے درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کو ترقی کے فوائد میں پورے طور پر شریک نہیں کیا گیا۔"

اگست ۱۹۸۵ء میں مدھیہ پردیش، راجستھان اور کیرل کے دیہات کا دورہ کرنے کے بعد پردھان منتری شری راجیو گاندھی کو یقین ہوگیا کہ افلاس کا انسداد کرنے کے لیے قرضے اور عطیات دینا ہی محض کافی نہیں ہے۔ زاں بعد دیہی ترقی کے مربوط پروگرام پر نظرثانی کی گئی ہے۔ پردھان منتری کا دفتر ریاستی حکومتوں اور مرکزی وزارتوں سے برابر رابطہ بنائے ہوئے ہے۔ اور اُس کی طرف سے مذکورہ پروگرام کی پڑتال

(باقی صفحہ ۲۵ پر)

شیام سُندر چاولہ*

دیہی ترقّی کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کی افادیت

حصولِ آزادی سے قبل بھارت وسیع پیمانے پر افلاس، ناخواندگی، بیروزگاری، جہالت، اور توہمات پرستی کا شکار تھا۔ سامراج نے اقتصادی لوٹ کھسوٹ سے بھارت کو اپاہج بنا دیا تھا۔ جو بچی کھچی کسر تھی وہ چند بڑے بڑے سرمایہ داروں اور زمینداروں نے پوری کر دی تھی۔ چنانچہ حصولِ آزادی کے بعد قومی حکومت نے جو پہلا بڑا کام کیا وہ تھا انسدادِ زمینداری۔ پہلا پانچسالہ پلان ۱۹۵۱ء میں شروع کیا گیا۔ جس میں ملک کو شاہراہ ترقی پر چلانے کے لیے کئی منصوبے بنائے گئے اور انھیں عملی صورت دی گئی۔

ملکی رہنماؤں نے بھانپ لیا تھا کہ اگر انھیں صدیوں پرانی افلاس اور جہالت کی زنجیروں کو توڑنا ہے تو انھیں سائنس اور ٹیکنالوجی کا سہارا لینا ہوگا۔ اسی ضمن میں مارچ ۱۹۵۸ء میں سائنس سے متعلق پالیسی کا ریزولیشن مرتب کیا گیا۔ اس قرارداد کا مقصد ملک کے لیے سائنسی علم اور اُس کے اطلاق سے ہونے والے فوائد کا حصول کرنا تھا۔ اس قرارداد کے دیگر مقاصد بھی تھے، جیسے حصولِ علم کے لیے افرادی پہلکاری کی حوصلہ افزائی کرنا، سائنس، تعلیم، زراعت، صنعت اور دفاع کے شعبوں میں ضروریات پوری کرنے کے لیے سائنس اور تکنیکی عملے کو تربیت دینے سے متعلق پروگرام جاری کرنا اور کافی تعداد میں سائنسدان تیار کرنا اور اُن کے کام کو تسلیم کرنا۔

اس وقت سائنسی میدان میں کوئی ۱۵۰ ریسرچ لیباریٹریاں ہیں جو مختلف شعبوں میں تحقیق و مطالعہ انجام دے رہی ہیں۔ ان کے علاوہ دسمبر ۱۹۸۰ء تک ۶۲۹ صنعتی ادارے ایسے تھے جن کے اپنے تحقیقی اور ترقیاتی یونٹ سائنس و ٹیکنالوجی کی وزارت میں مندرج تھے۔ ان سب نے بھارت کے دیہی منظر کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آج امریکہ اور روس کے بعد بھارت میں سب سے زیادہ سائنسدان اور ٹیکنیشن ہیں۔ لیکن بھارت اپنی کُل مُلکی پیداوار کا محض ۶۔۰ فیصد سائنس اور ٹیکنالوجی پر خرچ کرتا ہے جو کہ ترقی پذیر ممالک کے مقابلے پر بہت کم ہے جو اپنی کُل پیداوار کا ۲ سے ۳ فیصد تک خرچ کر رہے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سائنس اور ٹیکنالوجی نے بھارت کو اپنے مقاصد اور اُمنگوں، نئے سماجی نظام اور اعلیٰ قسم کی زندگی کے حصول میں مدد دی ہے؟ کیا انھوں نے افلاس، ناخواندگی، لاعلمی، توہمات پرستی، مذہبی تعصب اور تساہل کو کم کیا ہے اور ملک میں سماجی شعور، رواداری، خود کفالت اور تعاون کے جذبے کو فروغ دیا ہے؟

سائنس اور ٹیکنالوجی کا اثر

اس میں کلام نہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے بھارتی سماج کے تمام شعبوں کی کایا پلٹ کی ہے۔ بھارت کی ۶۸ کروڑ ۳۸ لاکھ آبادی میں سے ۵۰ کروڑ ۱۹ لاکھ لوگ یعنی ۷۶.۲۷ فیصد لوگ ۱ لاکھ ۳۰ ہزار دیہات میں بود و باش رکھتے ہیں جس رقبے میں فصلیں پیدا کی جاتی ہیں۔ وہ ۱۴ کروڑ ۱ لاکھ ۰۷ ہزار ہیکٹر ہے۔ زرعی زمین میں زیادہ تر خوراکی فصلیں (۵۵ء۷۱ فیصد) بوئی جاتی ہیں۔ ملک میں بجلی کی جتنی پیداوار ہوتی ہے اُس کا محض [illegible] فیصد حصہ دیہات میں استعمال ہوتا ہے۔ [illegible] فی صد دیہات میں بجلی پہنچائی گئی ہے جن میں پنجاب، ہریانہ، تامل ناڈو اور کیرل ہیں۔ بجلی کی فراہمی [illegible]

---

* ۱۴۴۴، ڈی۔ ایس۔ ایف۔ ایس، گلابی باغ، نئی دہلی
پیلو جیتا، نئی دہلی

ہے جبکہ منی پور میں (۲۲ فیصد) میگھالیہ میں ۲۱ فیصد) اور اترپردیش میں (۴۷ فیصد) بجلی کی فراہمی ہوتی ہے۔ جوکہ قومی اوسط شرح سے کم ہے۔ دیہات میں بجلی کی سپلائی زیادہ تر زرعی مقاصد کے لیے کی جاتی ہے۔ تقریباً ۶ کروڑ ۴۳ لاکھ ۹۰ ہزار ہیکٹیئر زمین پر آبپاشی کی جاتی ہے جس کے لیے آبپاشی کی زیادہ تر سہولیات بارانی رقبوں میں دی جاتی ہیں۔ آبپاشی کے وسائل ہیں۔ نہریں (۹٫۸ فیصد) ٹیوب ویل (۲۱٫۵ فیصد) کوئیں (۲۱٫۷ فیصد) اور دیگر وسائل (۶٫۷ فیصد)۔ آبپاشی کی سہولیات کو مختلف علاقوں میں فروغ دیا گیا ہے۔ پنجاب میں زیادہ تر (۸۳ فیصد) ہریانہ (۵۴ فیصد) اترپردیش (۴۳٫۵ فیصد) اور کم از کم سہولیات ان ریاستوں میں ہیں۔ آسام (۱۷٫۳ فیصد) مدھیہ پردیش (۱۱٫۱ فیصد) اور تریپورہ (۷٫۵ فیصد)۔

اناج کی پیداوار

۱۹۵۱ء میں پہلے پانچسالہ پلان کے شروع ہونے سے قبل ملک میں اناج کی پیداوار محض ۵ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن تھی۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں یہ ۱۳ کروڑ ۳۰ لاکھ ٹن ہوگئی ہے۔ زراعت کی ترقی انتہائی لازمی ہے کیونکہ ۴۰٫۳۶ فیصد قومی آمدنی زراعت سے ہوتی ہے اور ۶۳٫۲ فیصد کام کرنے والے لوگ زراعت میں لگے ہوئے ہیں۔

دیہی بھارت میں ابھی تک ۶ لاکھ ۳۰ ہزار دیہات میں سے ایک لاکھ ۵۵ ہزار دیہات میں ایسی سڑکیں ہیں جو تمام موسموں میں قابلِ استعمال ہیں اور ۹۲ ہزار ۸ سو دیہات ایسے ہیں جہاں کی سڑکیں اچھے موسموں میں قابلِ استعمال ہوتی ہیں۔ سب کہ باقیماندہ دیہات میں سڑکیں نہیں ہیں۔ اسی طرح ۲۹۰۰۰ دیہات میں پینے لائق پانی کی موزوں سہولیات ہیں اور ۳ لاکھ دیہات میں پانی کی فراہمی تو ہے لیکن وہ صحت کے نقطۂ نگاہ سے ناقص ہے اور ایک لاکھ ۳۰ ہزار دیہات میں تو پینے لائق پانی دستیاب نہیں ہے۔

آبپاشی کے ذخائر میں بڑھتی ہوئی ریت اور گاد

آبپاشی کے بڑے اور درمیانہ ذخائر میں مٹی اور ریت کے جمع ہونے سے ایک سنگین مسئلہ پیدا ہوگیا ہے۔ ہر برس ۲۰ لاکھ ایکڑ فٹ پانی جمع کرنے کی صلاحیت برباد ہو رہی ہے جو سات لاکھ ایکڑ زمین پر امکانی آبپاشی کے برابر ہے۔ بھاکراہ ڈیم میں ۱۹۵۹ء میں پانی جمع کیا گیا تھا اور یہ ۴۰۳ برس کے لیے قابلِ کار بنایا گیا تھا۔ لیکن اب خیال کیا جاتا ہے کہ بھاری مٹی اور ریت کے جمع ہو جانے سے وہ صرف ۲۹۱ برس تک کام کر سکے گا۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ وزارتِ آبپاشی کی طرف سے مقررہ (Reservoir Sede-mentation Committee) کی رپورٹ پر ابھی تک عمل نہیں ہوا۔ رپورٹ میں کئی خامیوں کا ذکر کیا گیا تھا اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ۱۱۵۰ مقامات میں سے لگ بھگ ۴۶۰ مقامات کا معائنہ کیا گیا ہے۔ اس سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اطلاق کے وقت ہم نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہونے والی تبدیلیوں کی طرف توجہ نہیں دی۔ کمیٹی نے ایک سفارش یہ بھی کی تھی کہ ملک بھر میں رات کے وقت آبپاشی کو لازمی بنایا جائے۔ ایک کھیت کے بعد دوسرے کھیت میں پانی دینے کے بجائے نالیاں بنا کر کھیتوں میں آبپاشی کی جائے۔

جدید ٹیکنالوجی تمام تر بنیادی ڈھانچے کا زیادہ متحرک جُزو ہے جو ہر وقت ترقی کی راہ پر گامزن رہتی ہے۔ خواہ یہ موٹر کار ہو، ہوائی جہاز ہو، ٹیکسٹائل مل ہو یا فاؤنٹین پین ہو، نئے اور جدید ماڈل اور اسٹائل آتے رہتے ہیں لیکن مُلکی دیہی ٹیکنالوجی میں اُسی سطح پر جمود طاری ہے اور جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے مقابلے کے باعث اُس میں مزید بربادی آئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جدید ٹیکنالوجی پر مبنی مروجہ صنعتیں رفتہ رفتہ تباہ ہو رہی ہیں۔ پہلے وقتوں میں سائنس دیہی صنعتوں کے لیے نئی نئی مصنوعات اور نئے نئے ڈیزائنوں کو فروغ دینے کے لیے آہستہ آہستہ مدد کرتی تھی، لیکن صنعتی انقلاب کے بعد یہ کام بالکل ہی بند ہو گیا۔

ٹیکنالوجی کے فروغ کے مرکز

اب حکومت کی طرف سے دیہی ٹیکنالوجی کو فروغ دینے کے لیے متعدد اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ ملک میں دیہی ٹیکنالوجی کے فروغ سے متعلق ۱۱ مرکز (CDRT) قائم کئے جا چکے ہیں۔ یہ مرکز ان مقاصد کی تکمیل کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ٹیکنالوجی کا فروغ، معلومات کی اشاعت اور انسانی وسائل کا فروغ۔ چنانچہ الہ آباد پالی ٹیکنک توانائی کے وسائل کو نئے سرے سے قابلِ کار بنانے، حفظانِ صحت، اور کچرے سے کام لینے، زمین سے پانی نکالنے کے طریقوں، گھریلو آلات اور زرعی اوزاروں کے شعبوں میں سرگرمی سے کام کر رہا ہے اور اُس نے "سولر ہیٹر" شمسی چولہے، کمیونٹی طرز کے بائیو گیس پلانٹ، پون چکی اور دستی پمپ کو بھی فروغ دیا ہے۔ چونکہ انھیں بڑی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے اس لیے شہری علاقوں میں بھی انھیں بڑے پیمانے پر پبلسٹی دی جانی چاہیئے۔

دیہات میں نئی ٹیکنالوجی کو بروئے کار لا کر گوبر سے بائیو گیس بھی تیار کی جا سکتی ہے۔ گو اس معاملے میں ابھی محدود پیمانے پر کام ہوا ہے۔ ملک میں کوئی ۲۳ کروڑ ۷۰ لاکھ مویشی ہیں۔ یہ خیال کرکے کہ ہر روز ایک جانور سے ۱۰ کلوگرام گیلا گوبر اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ ملک میں سال میں

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

لکشمی چندر پاسؔ*

ذرائع نشر و اشاعت کی ترقّی و توسیع

(قسط اوّل)

حصُولِ آزادی کے بعد جہاں ملک کے دوسرے شعبوں میں عظیم توسیع ہوئی ہے وہاں ذرائع نشر و اشاعت میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ آج کے زمانے میں جبکہ ریڈیو گھر گھر پہونچ چکا ہے اور ٹیلی ویژن بھی کافی مقبول ہو چکا ہے۔ نشر و اشاعت کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا یہ ذرائع نشر و اشاعت ہی کا کمال ہے کہ اگر کسی ایک شہر یا ملک میں کوئی اہم واقعہ رونما ہوتا ہے تو اس کی خبر آناً فاناً میں دوسرے شہروں اور ملکوں میں پہونچ جاتی ہے۔ لہٰذا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ہمیں ہر صبح اخبار یا ریڈیو کی خبروں کا انتظار رہتا ہے۔

حکومت کی پالیسیوں اور پروگرام سے عوام کو روشناس کرانے، ان کے اندر بیداری پیدا کرنے اور تعمیری سرگرمیوں میں ان کا تعاون و اشتراکِ عمل حاصل کرنے میں ذرائع نشر و اشاعت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ مرکز میں نشر و اشاعت کا کام مختلف محکمے وزارتِ اطلاعات و نشریات کے تحت سرانجام دیتے ہیں۔ یہ محکمے ہیں:

۱۔ آل انڈیا ریڈیو (آکاشوانی)
۲۔ دوردرشن۔
۳۔ پریس انفارمیشن بیورو۔
۴۔ رجسٹرار فار نیوز پیپرز آف انڈیا۔
۵۔ پبلی کیشنز ڈویژن۔
۶۔ ڈائرکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ وژوول پبلسٹی۔
۷۔ ڈائرکٹوریٹ آف فیلڈ پبلسٹی۔
۸۔ گیت اور ناٹک ڈویژن۔ اور
۹۔ فلمز ڈویژن۔

آزادی کے بعد ان محکموں کی عظیم ترقی و توسیع کا مختصر جائزہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو (آکاشوانی)

ہندوستان میں ریڈیو کی نشریات کا آغاز ۱۹۲۷ء میں بمبئی اور کلکتہ میں دو غیر سرکاری ٹرانسمیٹروں کی تنصیب سے ہوا تھا۔ حکومتِ ہند نے انھیں ۱۹۳۰ء میں اپنے انتظام میں لے لیا اور انڈین براڈکاسٹنگ سروس کے نام سے نشریات شروع کیں۔ ازاں بعد ۱۹۳۶ء میں اسے آل انڈیا ریڈیو کا نام دیا گیا۔ ۱۹۵۷ء میں اسے "آکاشوانی" کہا جانے لگا۔ یہ وزارتِ اطلاعات و نشریات کے تمام محکموں میں سب سے بڑا محکمہ ہے۔ یہ نہ صرف عوام کو اطلاعات اور خبریں مہیا کرتا ہے بلکہ صحتمند تفریحی پروگرام بھی نشر کرتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں حصولِ آزادی کے بعد اس کے صرف چھ اسٹیشن (مراکز) تھے۔ لیکن اب ۸۹ اسٹیشن کھولے جا چکے ہیں اور مزید کھولے جانے والے ہیں۔ تین مراکز صرف "وِوِدھ بھارتی" کے اشتہاراتی سروس کے لیے وقف ہیں جو چنڈی گڑھ، کانپور اور بڑودہ میں واقع ہیں۔ ملک کے تمام ثقافتی و لسانی علاقوں میں آکاشوانی کے مراکز موجود ہیں اور کل ۱۶۷ ٹرانسمیٹروں سے پروگرام نشر کئے جاتے ہیں جن میں سے ۱۲۸ میڈیم ویو کے ٹرانسمیٹر ہیں۔ ان کی نشریات سے ملک کا ۸۷٫۹ فیصد رقبہ اور ۹۰٫۲۷ فیصد آبادی مستفید ہوتی ہے۔

موسیقی کے پروگرام

آزادی سے قبل موسیقی کی محفلیں صرف راجاؤں، مہاراجوں، رئیسوں اور امیروں کے یہاں منعقد ہوتی تھیں۔ لیکن آکاشوانی نے اسے قبولیتِ عام بخشی۔ آج آکاشوانی کی نشریات میں تقریباً ۳۸ فیصد موسیقی کے پروگرام ہوتے

* چھتہ بھوانی شنکر، فتحپوری۔ دہلی

ہیں۔ ان میں کلاسیکی، نیم کلاسیکی، ہلکی پھلکی موسیقی کے علاوہ بھگتی سنگیت، لوک سنگیت اور مغربی موسیقی کے پروگرام بھی شامل ہیں۔ موسیقی کے فروغ کے لیے آکاشوانی نے موسیقی کے قومی پروگرام اور ریڈیو سنگیت سمیلن جیسے پروگرام بھی شروع کئے ہیں۔ عوام میں موسیقی کا ذوق پیدا کرنے کے لیے آکاشوانی سنگیت کی تعلیم کے پروگرام بھی نشر کرتا ہے اور نوجوان فنکاروں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

۱۹۵۲ء میں "آکاشوانی وادیہ ورندا" کے نام سے ایک قومی آرکسٹرا شروع کیا گیا اور بعد میں مدراس میں اس کا ایک اور یونٹ کھولا گیا۔ ان یونٹوں میں ہندوستانی اور کرناٹک موسیقی کے ممتاز فنکار شامل ہیں۔

آکاشوانی لوک سنگیت کی بھی حوصلہ افزائی کر رہا ہے اس کے موسیقی کے پروگراموں میں گیارہ فیصد پروگرام لوک سنگیت کے ہوتے ہیں۔ آکاشوانی کے ریکارڈنگ یونٹ دُور دراز علاقوں میں جاکر لوک سنگیت کی ریکارڈنگ کرتے ہیں۔ بیشتر اسٹیشنوں پر لوک سنگیت کے مراکز قائم کئے گئے ہیں جو جگہ جگہ سے لوک سنگیت کو اکٹھا کرکے محفوظ رکھتے ہیں۔

وِوِدھ بھارتی

آکاشوانی کے وِوِدھ بھارتی پروگرام میں فلمی اور غیر فلمی گانے، لوک گیت، کورس، بھجن، قوالی اور دیش بھگتی کے گیت نشر کئے جاتے ہیں۔ یہ پروگرام ۳۱ مراکز سے نشر کئے جاتے ہیں۔ ان کی نشریات میں مختصر ناٹک اور "جھلکیاں" (طنز و مزاح) کے پروگرام بھی شامل ہوتے ہیں۔

وِوِدھ بھارتی سے اشتہارات نشر کرنے کی سروس یکم نومبر ۱۹۶۷ء کو بمبئی اور ناگپور اسٹیشنوں سے شروع کی گئی تھی۔ اور اب یہ سروس ۲۹ مراکز سے نشر کی جاتی ہے۔ اس میں ۷، ۱۰، ۱۵، ۲۰، اور ۳۰ سیکنڈ کے اشتہارات نشر کئے جاتے ہیں۔ مئی ۱۹۷۰ء میں اسپانسرڈ پروگراموں کی نشریات بھی شروع کی جا چکی ہیں۔

ناٹک اور فیچر

آکاشوانی کے ہر مرکز سے ہر ہفتے کم از کم دو ناٹک نشر کئے جاتے ہیں۔ ناٹکوں کے قومی پروگرام کے تحت ہندوستان کی مختلف زبانوں کے عمدہ ناٹکوں کی نشریات ۱۹۵۶ء سے شروع ہوئیں۔ یہ ناٹک تاریخی واقعات اور سماجی و معاشی مسائل پر ہوتے ہیں۔

۱۹۵۶ء سے "نیشنل پروگرام آف فیچرز" کے نام سے ایک نیا پروگرام شروع کیا گیا۔ اس کے تحت اصل تحریر خواہ انگریزی میں ہو یا ہندی میں، اُسے مختلف علاقائی زبانوں میں ترجمہ کرکے مختلف علاقائی مرکزوں سے نشر کیا جاتا ہے۔

خبریں اور حالاتِ حاضرہ

آکاشوانی کا "نیوز سروسز ڈویژن" عوام کی معلومات کے لیے روزانہ خبریں، حالاتِ حاضرہ پر تبصرے اور تقریریں نشر کرتا ہے۔ اور سیاسی، سماجی، معاشی، سائنسی اور ثقافتی موضوعات کے ساتھ ساتھ زراعت کی ترقی اور کھیلوں وغیرہ کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ ملکی نیوز سروس میں آکاشوانی روزانہ ۱۸ زبانوں میں ۶۸ قومی نیوز بلیٹن نشر کرتا ہے۔ مختلف مراکز سے ۱۴۲ علاقائی بلیٹن ۶۰ زبانوں اور بولیوں میں نشر کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آکاشوانی غیر ممالک میں اپنے سننے والوں کے لیے ۶۴ بلیٹن ۲۴ زبانوں میں دہلی، بمبئی، کلکتہ اور مدراس سے نشر کرتا ہے۔

آکاشوانی آہستہ آہستہ پڑھے جانے والے ہندی اور انگریزی بلیٹن بھی نشر کرتا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں میں عوامی ذوق کی خبروں کا ہفتہ وار بلیٹن اور انگریزی اور ہندی میں ایک اور پروگرام بعنوان "اخبارات سے" بھی شروع کیا گیا۔ زائرین حج کے لیے بھی خصوصی بلیٹن نشر کئے جاتے ہیں۔ ملک اور بیرون ملک کے شائقین اردو کے لیے "آل انڈیا کی اُردو سروس" کے نام سے تقریباً دس گیارہ گھنٹے روزانہ پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔

پارلیمنٹ کے اجلاس کے دنوں میں روزانہ اجلاس کی کارروائی کی رپورٹ بھی ہندی، انگریزی اور علاقائی زبانوں میں براڈ کاسٹ کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۷ء سے "اس ہفتے پارلیمنٹ میں" کے عنوان سے ایک ہفتہ وار پروگرام ہندی اور انگریزی میں شروع کیا گیا۔ انگریزی کے "اسپاٹ لائٹ" ہندی کی "سامپتا ہکی" اور اُردو کے "تبصرہ" پروگراموں میں سرکردہ صحافیوں اور آکاشوانی کے نامہ نگاروں کے تبصرے نشر کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ "ریڈیو نیوز ریل" میں اہم شخصیتوں سے مختصر انٹرویو، روزانہ کے واقعات اور ان پر عوام کا ردِ عمل بھی نشر کیا جاتا ہے۔

ایکسٹرنل سروسز

دوسرے ممالک کے عوام اور وہاں آباد ہندوستانیوں کے سامنے ہندوستان کی صحیح تصویر پیش کرنے، قومی و بین الاقوامی مسائل پر اپنے ملک کے نظریات سے آگاہ کرنے اور انھیں ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور رفتارِ ترقی سے روشناس کرنے کے لیے روزانہ ۲۵ پروگرام نشر کئے جاتے ہیں جن میں سے ۸ ہندوستانی اور ۱۷ غیر ملکی زبانوں میں ہوتے ہیں۔

مخصوص پروگرام

آکاشوانی فوجی بھائیوں، دیہاتی بھائیوں، بچوں، طلباء اور خواتین وغیرہ کے لیے بھی پروگرام

پیش کرتا ہے ۔ صحت اور خاندانی بہبود کے پروگرام بھی نشر کئے جاتے ہیں ۔ نوجوانوں کے لیے دہلی، کلکتہ، حیدرآباد، جموں اور سری نگر سے ایک علیحدہ ٹرانسمیٹر پر "یووانی" پروگرام نشر کیا جاتا ہے ۔ یہ پروگرام نوجوانوں کے لیے نوجوانوں کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ آکاش وانی کے بیشتر مراکز اسکولی بچوں کے لیے نصابی کتابوں پر مبنی پروگرام بھی پیش کرتے ہیں ۔

ریڈیو پروگراموں کے رسالے

آکاشوانی ریڈیو پروگراموں کی پیشگی تفاصیل دینے کے لیے آٹھ زبانوں میں پندرہ روزہ رسالے شائع کرتا ہے ۔ انگریزی اور ہندی میں "آکاشوانی" اور اردو میں آواز کے نام سے اور دیگر زبانوں میں علاقائی ناموں سے یہ رسالے شائع ہوتے ہیں ۔

دُور درشن

بھارت میں دُور درشن ۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء کو دہلی میں تجرباتی طور پر شروع کیا گیا تھا ۔ لیکن اب یہ قومی پیمانے کا ادارہ بن چکا ہے ۔ ملک بھر میں دُور درشن کی نشریات کے لیے ۱۸۰ ٹرانسمیٹر نصب کرنے کا نشانہ قریب قریب پورا ہو چکا ہے جس سے ملک کی ۷۰ فیصد آبادی مستفید ہو رہی ہے ۔ چونکہ یہ الیکٹرانک میڈیم ایک طاقتور ذریعہ تشہیر و اشاعت ہے اس لیے اس کی مزید ترقی کے پروگرام بنائے جا رہے ہیں ۔ اس وقت ملک میں دس مکمل مراکز (جن میں سے پانچ کے ریلے مراکز (Relay Centres) بھی ہیں) پانچ (SITE) سینٹر اور چھ INSAT سینٹر کام کر رہے ہیں ۔ باقی ماندہ ۷۴ مراکز کم طاقت کے ٹرانسمیٹروں سے پروگرام نشر کرتے ہیں اور وہ دہلی سے منسلک ہیں ۔ ۱۵ اگست ۱۹۸۲ء سے دُور درشن نے اپنا قومی پروگرام بھی شروع کیا جو آجکل رات کو ساڑھے آٹھ بجے سے ساڑھے دس بجے تک سبھی مراکز سے ایک ساتھ نشر کیا جاتا ہے ۔

۱۹۷۲ء میں بمبئی میں دوسرے دُور درشن مرکز کے قائم ہونے سے پہلے ٹیلی ویژن نے کوئی قابلِ ذکر ترقی نہیں کی تھی ۔ بمبئی کے بعد سری نگر، امرتسر، کلکتہ، مدراس اور لکھنؤ کے مراکز کھولے گئے ۔ ۱۵ اگست ۱۹۸۲ء سے چھ ریاستوں، آندھرا پردیش، اڑیسہ، مہاراشٹرا، گجرات، بہار اور اُتر پردیش میں مصنوعی سیارہ INSAT کی باقاعدہ سروس کا آغاز ہوا اور ان ریاستوں کے دُور دراز علاقوں کے لوگوں تک دُور درشن کے پروگرام پہونچنے لگے یہ دن دور درشن کی تاریخ میں ایک سنہری دن تھا کیوں کہ اسی روز ملک میں رنگین ٹی وی کا آغاز ہوا ۔

دُور درشن کی اسکول ٹیلی ویژن سروس کا آغاز ۱۹۶۹ء میں ہوا تھا ۔ اس وقت متعدد دُور درشن مراکز تعلیمی پروگرام نشر کر رہے ہیں ۔ اگست ۱۹۸۴ء سے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے تعاون سے یونیورسٹیوں کے لیے بھی پروگرام نشر ہونے لگے ہیں ۔ مالی وسائل میں اضافے کی غرض سے دُور درشن نے یکم جنوری ۱۹۷۶ء سے اشتہارات نشر کرنے شروع کر دئے اور اب کچھ عرصے سے اسپانسرڈ پروگرام بھی نشر کئے جا رہے ہیں ۔ ۱۹۸۲ء میں نویں ایشیائی کھیل اور ۱۹۸۳ء میں ناوابستہ ممالک کی کانفرنس اور کامن ویلتھ کے رکن ملکوں کے سربراہوں کی کانفرنس کی اہم کارروائی دُور درشن سے نشر کی گئی ۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی ۔ آجکل دُور درشن سے تفریحی و تعلیمی سیریل پروگراموں کے علاوہ "جن وانی"، فوکس، اور روونگ آئی (Roving Eye) جیسے اہم پروگرام نشر کئے جا رہے ہیں ۔ "جن وانی" پروگرام میں عوام میں سے بارہ تیرہ چُنے ہوئے نمائندوں کے سوالات کا جواب ہر مرتبہ متعلقہ وزارت کا وزیر دیتا ہے جس سے عوام کو حکومت کے قریب تر آنے اور اپنی شکایات کا ازالہ کرانے میں مدد ملتی ہے ۔

دُور درشن برابر آگے بڑھ رہا ہے جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ۱۷ ستمبر ۱۹۸۴ء سے دہلی میں اور یکم مئی ۱۹۸۵ء سے بمبئی میں دُور درشن کے دوسرے چینل سے بھی پروگرام نشر ہونے لگے ہیں ۔ اس چینل سے عموماً مقامی دلچسپی کے پروگرام پیش کئے جاتے ہیں ۔ کچھ اور بڑے شہروں میں بھی دوسرا چینل شروع کرنے کا منصوبہ ہے ۔

پریس انفارمیشن بیورو

یہ ادارہ حکومت کی پالیسیوں اور پروگراموں کے بارے میں ملکی و غیر ملکی روزناموں، ہفت روزہ، ماہناموں، خبر ایجنسیوں، ریڈیو اور دُور درشن کو مستند اطلاعات فراہم کرتا ہے ۔ تمام بڑے بڑے شہروں میں اس کے علاقائی دفاتر شاخیں موجود ہیں ۔ جن میں ٹیلی پرنٹروں کی سہولیات دستیاب ہیں ۔ اس طرح تمام سرکاری اطلاعات نہ صرف دہلی، بلکہ دوسرے شہروں کے اخبارات وغیرہ کو فوری طور پر بہم پہنچائی جاتی ہیں جن سے حکومت کے اقدامات اور سرگرمیوں کی تشہیر و اشاعت میں بڑی مدد ملتی ہے ۔ پریس انفارمیشن بیورو تقریباً سات ہزار اخباروں کو اشاعتی مواد مفت فراہم کرتا ہے ۔ جس کا مقصد عوام کو حکومت کی سرگرمیوں اور پالیسیوں سے متعارف کرانا ہے اس کے علاوہ یہ مختلف پالیسیوں اور اقدامات پر عوام کے ردعمل سے حکومت کو بھی آگاہ کرتا ہے ۔ اس ادارے کے اعلیٰ افسران تمام وزارتوں کے ساتھ، مستند اطلاعات حاصل کرنے کے لیے، رابطہ قائم رکھتے ہیں اور پھر انھیں اخباری نمائندوں کو فراہم کرتے ہیں ۔

پریس انفارمیشن بیورو انگریزی، ہندی اور اُردو کے علاوہ پندرہ دیگر زبانوں میں اشاعتی

مواد جاری کرتا ہے جس میں سرکاری بیانات و اعلانات، پریس ریلیزیں، پریس نوٹ، واقعات کا پس منظر، مضامین اور خبری تصاویر شامل ہوتی ہیں۔ یہ ادارہ سرکاری پریس کانفرنس اور بریفنگ وغیرہ کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ جن سے اخباری نمائندوں کو تازہ ترین اطلاعات فوراً مل جاتی ہیں۔ پریس پارٹیوں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے جن میں منتخب اخباری نمائندوں کو مقامی مسائل سے آگاہی کے لیے پسماندہ قبائلی علاقوں میں لے جایا جاتا ہے۔

چھوٹے اخبارات کو یہ ادارہ خبری تصاویر کے بلاک اور لیتھو پر چھپنے والے اُردو اخبارات کو چربے بھیجتا ہے جنھیں بلاخرچ فوراً چھاپا جا سکتا ہے۔

علاقائی دفاتر اور انفارمیشن سینٹر

پریس انفارمیشن کے چار ریجنل آفس اور ۲۹ برانچ آفس ہیں۔ ان کے علاوہ نئی دہلی، جالندھر، شملہ، سری نگر، جبلپور، کانپور، گوہاٹی، کوہیما، امپھال، آیزل، پورٹ بلیئر، رانچی اور جودھپور میں تیرہ انفارمیشن سینٹر بھی کام کر رہے ہیں۔

کمپیوٹر کا استعمال

پریس انفارمیشن بیورو نے اپنے کچھ کاموں کے لیے کمپیوٹر کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں لوک سبھا کے عام انتخابات اور ۱۹۸۵ء میں بہت سی ریاستوں کی ودھان سبھاؤں کے انتخابات میں کمپیوٹر کے ذریعے اہم اطلاعات فراہم کیں۔ مستقبل میں کچھ اور کاموں کے لیے کمپیوٹر کا استعمال شروع کرنے کی تجویز ہے۔

فوٹو ڈویژن

وزارتِ اطلاعات و نشریات کا فوٹو ڈویژن ملک میں اپنی قسم کا پہلا فوٹو یونٹ ہے۔ اس کا صدر دفتر نئی دہلی میں ہے اور بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں اس کا ایک ایک علاقائی دفتر ہے۔ لکھنؤ میں ایک چلتا پھرتا یونٹ قائم کیا گیا ہے۔ اس میں قومی اور بین الاقوامی تقاریب اور اخباری نوعیت کے چھ لاکھ فوٹو پرنٹ سالانہ تیار کیے جاتے ہیں جنھیں اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک پرچار کے لیے پریس انفارمیشن بیورو سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ تمام نگیٹیوز محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ اخبارات کو فوٹو مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ دیگر سرکاری محکموں اور غیر سرکاری تنظیموں وغیرہ کو فوٹو قیمتاً فراہم کیے جاتے ہیں۔ پریس انفارمیشن بیورو میں علیحدہ ایک فوٹو لائبریری ہے جہاں سے حسبِ ضرورت تصاویر کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔

ناوابستہ نیوز ایجنسی پُول

۱۹۷۶ء میں نئی دہلی میں منعقدہ ناوابستہ ممالک کے وزرائے اطلاعات کی کانفرنس کی سفارش پر اطلاعات کو سامراجی اثر سے محفوظ رکھنے کے لیے ۱۳ر جولائی ۱۹۷۶ء کو ناوابستہ نیوز ایجنسی پُول کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ ایجنسی پیشہ ورانہ تعاون اور رکن ممالک کے درمیان رابطے کی بنیاد پر خبروں کے تبادلے کا ایک ذریعہ ہے۔ ہندوستان کو ۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۹ء تک اس کی رابطہ کمیٹی کا پہلا صدر چُنا گیا۔ نومبر ۱۹۸۲ء میں تیونس میں منعقدہ کانفرنس میں اسے پُول کی رابطہ کمیٹی کا رکن منتخب کیا گیا۔ پریس ٹرسٹ آف انڈیا اس پُول کے ہندوستان ڈیسک (Desk) کو چلاتا ہے۔

پریس کمیشن

۱۹۷۸ء میں دوسرا پریس کمیشن قائم کیا گیا، جس نے ۱۹۸۲ء میں اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کی۔ کمیشن نے اخبارات کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ۲۷۸ سفارشات پیش کیں۔

پریس کونسل : ملک میں پہلی پریس کونسل ۱۹۷۹ء میں، دوسری ۱۹۸۲ء میں اور تیسری ۱۹۸۵ء میں قائم کی گئی۔ اس کا کام اخبارات کی آزادی کی حفاظت کرنا اور اخبارات اور خبر ایجنسیوں کے معیار کارکردگی کو بہتر بنانا ہے۔ یہ کونسل زیادہ تر اخبارات کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ کونسل کے سامنے جو شکایات پیش کی جاتی ہیں ان پر تو وہ غور کرتی ہی ہے اس کے علاوہ خود اپنی طرف سے اسے جو شکایتیں ہوں ان پر بھی غور کرنے کا حق اسے حاصل ہے۔

ریسرچ اینڈ ریفرینس ڈویژن

یہ ڈویژن ایک انفارمیشن سروس ایجنسی کے طور پر کام کرتا ہے اور وزارتِ اطلاعات و نشریات کی تشہیر و اشاعت کی مختلف اکائیوں کو اہم پس منظری مواد فراہم کرتا اور ان کی پرچار مہموں کی تیاری میں مدد کرتا ہے۔ یہ ایک انفارمیشن بینک کے طور پر کام کرتا ہے۔ یہ ڈویژن ۱۹۴۵ء میں قائم کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں اسے ختم کر دیا گیا۔ ۸ر اگست ۱۹۵۰ء کو اسے پھر شروع کیا گیا اور اسے درج ذیل فرائض سونپے گئے۔

۱۔ تشہیر و اشاعت سے متعلق مواد پر ریسرچ کرنا۔ ۲۔ حالات حاضرہ اور دیگر موضوعات کے پس منظر تیار کرنا، ۳۔ اہم موضوعات پر معلومات جمع کرنا اور ۴۔ وزارتِ اطلاعات و نشریات کے مختلف میڈیا کے استعمال کے لیے اشاعتی مواد تیار کرنا۔ اس کے علاوہ رہنماؤں اور سرکردہ شخصیات کے مختصر سوانحی خاکے بھی یہاں تیار کیے جاتے ہیں۔

یہ ادارہ ہندوستان کے بارے میں ہر سال ایک جامع معلوماتی کتاب "انڈیا" بھی مرتب کرتا ہے۔ ۱۹۵۳ء سے یہ کتاب ہر سال باقاعدہ طور پر شائع کی جا رہی ہے اور اس کی افادیت مسلّم ہے۔

ڈاکٹر وی۔ کے۔ اگروال

بھارت میں پبلک سیکٹر کا حوصلہ افزا کردار

> پبلک سیکٹر سوشلسٹ سماج کے قیام کی جانب ایک پُرجوش قدم ہے۔ اس سیکٹر کو ترقی کرنا ہے اور یہ پالیسی کے نقطۂ نگاہ سے اہم ہے۔
> (پنڈت جواہر لال نہرو)

دُنیا کے تقریباً تمام ممالک میں ملک کی تیز رفتار اقتصادی ترقی کے لیے مملکت کی دراندازی لازمی ہو گئی ہے۔ آج کوئی بھی مملکت اقتصادی عمل کی محض غیر فعال مشاہد نہیں رہ گئی بلکہ شہریوں اور صنعتوں کی محافظ، نگراں اور سرپرست کی صورت میں شریک کار بن گئی ہے۔ بھارت میں حکومت پبلک سیکٹر کی توسیع کو بھاری اہمیت دے رہی ہے جس سے کہ علاقائی عدم توازن کو دُور کیا جاسکے۔ صنعتی اور تجارتی سرگرمیوں میں حکومت کی بڑھتی ہوئی شراکت نہایت ضروری اور لازمی ہو گئی ہے۔ اور اسے روکا نہیں جاسکتا۔ یہ مناسب ہی کہا گیا ہے کہ منصوبوں کے بغیر پبلک سیکٹر کچھ حاصل کرسکتے ہیں لیکن پبلک سیکٹر کی صنعتوں کے بغیر منصوبے اغلباً کاغذی کارروائی ہی رہ جائیں گے۔

پبلک سیکٹر کا مطلب مملکت کی ملکیت ہے اور مملکت کی جانب سے صنعتی، زرعی، مالی اور تجارتی اداروں کو چلایا جاتا ہے۔ پبلک سیکٹر کے بڑے بڑے پہلو درج ذیل ہیں۔

۱۔ محکمہ جاتی تنظیم۔
۲۔ سرکاری ملکیت کے ادارے جن کا انتظام پرائیویٹ اداروں کی طرف سے کیا جاتا ہے۔
۳۔ سرکاری کمپنیاں۔
۴۔ کمپنی اور بورڈ کی طرف سے منتظمہ پبلک ادارے۔
۵۔ پبلک کارپوریشن۔
۶۔ ملی جلی ملکیت کے کارپوریشن، اور
۷۔ پبلک ٹرسٹ۔

پبلک سیکٹر کی صنعتوں کے مقاصد

بھارت کے پبلک سیکٹر کے عام مقاصد درج ذیل ہیں:۔

۱۔ ملک کی تیز رفتار اقتصادی ترقی۔
۲۔ متوازن ترقی کے لیے بنیادی ڈھانچے کی تعمیر۔
۳۔ اقتصادی طاقت اور دولت کو مجتمع کرنے پر روک۔
۴۔ متوازن علاقائی ترقی اور اقتصادی عدم توازن کو دُور کرنا۔
۵۔ پبلک مالی اداروں کی امداد سے طویل المدتی سرمایہ پر سماجی کنٹرول۔
۶۔ بیمار یونٹوں کے انتظام کو بہتر بنانا۔
۷۔ ترقیاتی پروگراموں اور قومی تعمیری سرگرمیوں کے لیے کافی سرمائے کا اہتمام کرنا۔
۸۔ روزگار کے وافر مواقع کی توسیع۔
۹۔ پرائیویٹ سیکٹر کی موزوں ترقی و توسیع اور
۱۰۔ درآمدات میں کمی کرنا اور برآمدات کو فروغ دینا۔

پبلک سیکٹر کا فروغ

بھارت میں حصولِ آزادی سے قبل پبلک سیکٹر

رداریہت ہی محدود تھا۔ لیکن حصولِ آزادی
بعد منصوبہ بندی کے نتیجے میں پبلک سیکٹر
خاص اہمیت حاصل ہوئی اور اب یہ بھارت
معاشی نظام میں اہم رول ادا کر رہا ہے۔ مندرجہ
اعداد پبلک سیکٹر کے اداروں کے رول کا اظہار
یتے ہیں۔

ک سیکٹر اور سرمایہ کاری

حصولِ آزادی کے بعد ہی پبلک ادارں
تعداد اور سرمایہ کاری میں متواتر اضافہ ہوا
ہ۔ پبلک اداروں کی تعداد جو ۱۹۵۱ء میں محض
(سرمایہ کاری ۲۹ کروڑ روپے تھی) ۱۹۶۱ء میں
کر ۸۴ (سرمایہ کاری ۹۵۳ کروڑ روپے)
۱ء میں ۱۲۲ (سرمایہ کاری ۲۶۵۹۰ کروڑ
پے) ہوگئی۔ مرکزی سرمایہ کاری ۵۶۰۲ اکروڑ
پے اور ۸۲-۱۹۸۲ء میں بڑھ کر ۱۹۳ (سرمایہ
ری ۹۰۵۴ کروڑ روپے) ہوگئی۔ مرکزی پبلک
اروں میں مالی سال ۸۴-۱۹۸۳ء میں
۲۰۱ اداروں میں سرمایہ کاری ۲۵۳۹۴
وڑ روپے سے بڑھ کر ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۲۲۱
اروں میں ۳۸۱۱۴ کروڑ روپے ہوگئی۔ یہ ۴۱۴۷ کروڑ
روپے کا اضافہ ۱۲ فیصد اضافے کا مظہر ہے۔ چوٹی
کے دس اداروں میں اس کل سرمایہ کاری کا ۸۰ء۵
صد لگا ہوا ہے۔

پبلک سیکٹر کے اداروں کے منافع میں اضافہ

مرکزی سرکار کے اداروں کو
۸-۱۹۸۳ء میں ۳۵۶۵ کروڑ روپے کے
مقابلے میں ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۴۶۳۷ کروڑ
روپے کا کل منافع ہوا جو ۳۰ فیصد اضافے کا
مظہر ہے۔ گذشتہ برس کے مقابلے میں سرمایہ
ری کی لاگت، تنخواہوں اور مزدوری میں
۹ کروڑ روپے کے اضافے کے باوجود یہ
منافع ہوا ہے۔ ٹیکسوں کی ادائیگی سے قبل

بھی منافع ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۱۴۸۰ کروڑ روپے
کے مقابلے میں ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۲۱۱۹ کروڑ
ہوگیا۔ یہ اضافہ ۶۳۹ کروڑ روپے ہے، جو
۴۳،۳ فیصد کا مظہر ہے۔ ان اداروں نے
۸۴-۱۹۸۳ء میں ۲۴۰ کروڑ روپے اور ۸۳-۱۹۸۲ء
میں ۱۴۶ کروڑ روپے کے مقابلے میں ۸۵-۱۹۸۴ء
میں ۹۲۹ کروڑ روپے کا خالص منافع پیدا
کر کے ایک ریکارڈ قائم کیا۔ زیرِ تبصرہ سال
میں ۶۰ اداروں نے (گذشتہ برسوں میں ۵۵
اداروں کے ۱۳۳ کروڑ روپے کے مقابلے میں)
کل ۵،۱۷۶ کروڑ روپے کے ڈیویڈنڈ کا
اعلان کیا۔

۸۵-۱۹۸۴ء کے دَوران نقصانات
اٹھانے والے ۹۰، اداروں میں سے ۲۰ نے گذشتہ
برس کے مقابلے میں اپنے نقصان میں کمی کی ہے۔
سالِ رواں میں نقصان اٹھانے والے سات
اداروں نے گذشتہ برس کے دَوران منافع
کمایا تھا۔

چھٹے پانچسالہ منصوبے کے دَوران (۸۵-۱۹۸۰ء)
پبلک سیکٹر کے اداروں نے ۱۱۶۵۳ کروڑ روپے
کے اندرونی وسائل فراہم کئے۔ اندرونی وسائل
پیدا کرنے والے اداروں کی تعداد ۸۱-۱۹۸۰ء
میں ۱۰۲ سے بڑھ کر ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۱۲۴ ہو
گئی۔

تجارت برآمد سے آمدنی

۸۵-۱۹۸۴ء میں پبلک سیکٹر کے
اداروں کی طرف سے تجارت برآمد میں بھاری
اضافہ ہوا جو گذشتہ برس میں ۵۵۳۲ کروڑ
روپے سے بڑھ کر ۵۸۲۷ کروڑ روپے ہوگئی۔

سروے کے مطابق پبلک سیکٹر کے اداروں
نے چھٹے پانچسالہ منصوبے (۸۵-۱۹۸۴) کے
دَوران کارپوریشن ٹیکسوں، پیداواری ٹیکس،

کسٹم ڈیوٹی اور دوسرے ٹیکسوں اور ڈیویڈنڈوں
کی صورت میں سرکاری خزانہ میں ۷۵۵۷ کروڑ
روپے اپنے حصّے کے طور پر دیئے۔ یہ رقم
۸۴-۱۹۸۳ء میں ۴۶۵۵ کروڑ روپے بڑھی تھی۔
اور وہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں مزید بڑھ کر ۷۵۹۷
کروڑ روپے ہوگئی۔ ۳۴۲ ۱۵ کروڑ روپے کا یہ
اضافہ ۱۵،۹ فیصد کا مظہر ہے۔

تحقیق و ترقی

سروے سے پتہ چلتا ہے کہ اپنی تیکنکی
بنیاد کو مضبوط بنانے کی طرف مرکزی پبلک سیکٹر
اب زیادہ توجہ دینے لگا ہے۔ تحقیق و ترقی پر
گذشتہ برس ۱۰۲ کروڑ روپے کے مقابلے میں
۸۵-۱۹۸۴ء میں ۱۲۷ کروڑ روپے کے اخراجات
کئے گئے جو ۳۴ فیصد اضافے کے مظہر ہیں۔
درآمدات میں کمی کی مساعی کے نتیجے میں
مرکزی پبلک سیکٹر کے اداروں نے زرمبادلہ میں
۱۰۴ کروڑ روپے کی بچت کی۔

فلاحی پروگرام

اس برس کے دَوران سماجی بہبود کے
پروگرام پر ۶۲۲ کروڑ روپے خرچ کیے گئے۔
جبکہ ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۴۹۲ کروڑ روپے خرچ
کیے گئے تھے۔ یہ گذشتہ برس کے مقابلے میں
۱۳۰ کروڑ روپے کا اضافہ تھا۔ ملازمین کے
لیے بننے والے مکانوں کی تعداد جو ۸۴-۱۹۸۳ء
میں ۵ لاکھ ۹۰ ہزار تھی وہ بڑھ کر ۶ لاکھ ۲۸ ہزار
ہوگئی۔

فروختگی میں اضافہ

پبلک سیکٹر کے اداروں کی فروختگی کا ٹرن
۷۶-۱۹۷۵ء میں ۱۱۶۸۸ کروڑ روپے سے
بڑھ کر ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۴۶۶۸ ۵ کروڑ روپے
ہوگیا۔ جو تقریباً ۳۸ فیصد کے اوسط سالانہ
اضافے کا مظہر ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں کُل

فروغ تنگی میں اضافہ گذشتہ برس کے مقابلے میں ۱۵ر۶ فیصد تھا۔

پبلک سیکٹر کے اداروں کی کامیابیاں

بھارت کے معاشی نظام میں پبلک سیکٹر نے اہم حصہ ادا کیا ہے۔ اور کئی طریقوں سے اس میں اپنا تعاون دیا ہے جیسے اُس نے ملک کی قومی آمدنی میں بھاری اضافہ کیا ہے۔ کافی زرِ مبادلہ کمایا ہے۔ بنیادی اور سرمایہ جاتی صنعتوں کو فروغ دیا ہے۔ غیر ترقی یافتہ اور پسماندہ علاقوں کی ترقی میں مدد دی ہے۔ خود کفالت میں مدد دی ہے، بیماریوں کی نو آبادکاری میں بڑا حصہ ادا کیا ہے اور اُن کے فضول اخراجات کو ختم کیا ہے۔

مختصر طور پر بھارت میں پبلک سیکٹر کے اداروں کی کامیابیاں درجِ ذیل ہیں۔

۱۔ پبلک سیکٹر کے ادارے بھارت میں صنعتی ڈھانچے کی لامرکزیت میں مدد دے رہے ہیں۔

۲۔ پبلک سیکٹر نے بھارت میں بیشتر بنیادی صنعتوں کا قیام کیا ہے جو پرائیویٹ سیکٹر کی طرف سے ممکن نہیں تھیں۔

۳۔ ان اداروں نے درآمدات میں کمی کر کے اور برآمدی تجارت بڑھا کر زرِ مبادلہ میں بھاری اضافہ کیا ہے۔

۴۔ ان اداروں نے ملک کی متوازن اقتصادی ترقی میں اہم حصہ لیا ہے۔ اسی مقصد کو مدِنظر رکھ کر تمام اسٹیل پلانٹ مختلف ریاستوں میں قائم کیے گئے ہیں۔

۵۔ انہی اداروں نے ملک میں روزگار کے مواقع میں اضافہ کیا ہے۔

۶۔ پبلک سیکٹر کے ادارے اندرونِ ملک کے وسائل کے فروغ میں مدد دے رہے ہیں۔ اندرونی وسائل کی رقم جو ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۹۰۶ کروڑ روپے تھی وہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۳۵۵ کروڑ روپے ہو گئی تھی۔

۷۔ بڑے بڑے کمرشل بینکوں، زندگی بیمہ اور عام بیمہ کاروبار کے قومیائے جانے سے پبلک سیکٹر کے صنعتی و تجارتی اداروں کو مالی شعبے میں رہنمایانہ رول ادا کرنا ہے۔ اب اندرون وسائل اور ادارتی مالیات کا استعمال ترجیحی اور غیر بنکنگ شعبوں میں کیا جا رہا ہے۔ ●

بقیہ، شہروں کے غریب افراد کی امداد کی اسکیم

سے ایک شخص کو، جو امداد کا سب سے زیادہ مستحق ہوگا، قرضہ دینے کے لیے چُنا جائے گا۔ اندازہ ہے کہ اسکیم کے تحت تقریباً ۳ لاکھ افراد بنکوں سے قرض لینے کے حقدار ہوں گے لیکن کوئی خاص تعداد مقرر نہیں کی گئی ہے۔ اگر حکومت دیکھے گی کہ مانگ زیادہ اور برحق ہے تو اور زیادہ افراد قرضے حاصل کر سکیں گے۔ یہ اسکیم پبلک سیکٹر کے بنکوں کی منتخب شاخوں کے ذریعے زیرِ عمل لائی جائے گی۔

مرکزی وزیرِ مالیات شری وی۔ پی سنگھ کے الفاظ میں یہ اسکیم شہری غرباء کے مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں ایک معمولی سی ابتدا ہے۔ ہر چھ ماہ بعد اس پر عملدرآمد کا جائزہ لیا جائے گا۔ ●

بقیہ، بھارت میں پنچایت راج

کی جا رہی ہے۔ انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت ایسے پروگرام شروع کر رہی ہے جن سے اقتصادی سرگرمیوں میں شرکت کے لیے عوام کی اہلیت کو بہتر بنایا جا سکے۔ اگست ۱۹۸۵ء میں شری راجیو گاندھی نے تمام ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کی میٹنگ بُلائی تھی۔ جس میں اُن سے کہا گیا تھا کہ وہ پنچایتوں کی ترقی اور اُن کے بروقت انتخابات کی جانب توجہ دیں۔ اس کے بعد پلاننگ کمیشن نے ریاستوں سے تلقین کی کہ وہ پلان کے دو مقاصد، دیہی علاقوں میں افلاس کے انسداد اور روزگار کی افزائش کی تکمیل کے لیے موثر ذرائع کے طور پر پنچایت راج اداروں اور ڈسٹرکٹ پلاننگ مشینری کو تقویت دیں۔

لہٰذا توقع کی جاتی ہے کہ ان ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ریاستی حکومتیں تمام خامیوں کو دُور کرنے کی جانب توجہ دیں گی۔ اس سلسلے میں ضروری ہوگا کہ سرکاری افسران کو ہدایت دی جائے کہ وہ دیہی آبادی کی ترقی کے کاز کے لیے خود کو وقف کریں۔ مفادِ عامہ کی خاطر انھیں زیادہ رواداری اور تحمل سے کام لینا ہوگا اور دیہی مسائل کو سمجھنا ہوگا۔ انھیں اپنے دماغ سے اس جھوٹے احساس کو نکالنا ہوگا کہ وہ عام دیہاتیوں سے برتر ہیں۔ اس کے ساتھ ہی حکومت کو بھی دیکھنا ہوگا کہ منتخبہ نمائندے مقررہ ضابطوں اور قواعد کی تعمیل کرتے ہیں۔ اور جو اُن کی خلاف ورزی کریں اُن کے خلاف تعزیری کارروائی کی جائے۔ ●

دسویں ایشیائی کھیل سیول

شاہین پروین جالوی*

دسویں ایشیائی کھیل ۲۰ ستمبر سے ۵ اکتوبر ۱۹۸۶ء تک جنوبی کوریا کی راجدھانی سیول میں منعقد ہوئے۔

دسویں ایشیائی کھیلوں کا افتتاح ۲۰ ستمبر کو سیول میں ہوا۔ افتتاحی تقریب کے موقع پر اسٹیڈیم میں ایک لاکھ افراد موجود تھے۔ اسی اسٹیڈیم میں ۲ سال بعد اولمپک کھیل منعقد ہوں گے۔ ایشیائی کھیلوں کی افتتاحی تقریب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلا حصہ سیول میں آئے مہمانوں کے استقبال، دوسرا حصہ باضابطہ طور پر افتتاحی تقریب کی شروعات اور تیسرا حصہ افتتاح کے بعد کا تھا۔ جسے ایک تماشے کی شکل میں پیش کیا گیا اور اسے "Land of morning Calm" کا نام دیا گیا۔ اس میں لوک ناچ اور موسیقی کا پروگرام پیش کیا گیا۔

کوریا کے قومی ترانہ کے بعد ۲۷ ملکوں کے کھلاڑیوں کی ٹکڑیوں کا مارچ پاسٹ شروع ہوا۔ ایشیائی کھیلوں کا جھنڈا نئی دہلی کی طرف سے واپس کیا گیا۔ اس لیے کہ اس سے قبل یہ کھیل نئی دلی میں منعقد ہوئے تھے۔ اس کے بعد جنوبی کوریا کے صدر نے دسویں ایشیائی کھیل کی شروعات کا اعلان کیا اور جھنڈا بلند کیا۔ پھر چانگ گے گن (Chang Gae - Gun) اور پارک می سن (Park Mi Sun) نے مشعل لے کر اسٹیڈیم میں دوڑ لگائی۔

سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ ۱۹۵۱ء کا اصل جھنڈا اور مشعل میزبان ملک کو پیش کی گئی۔ ہندوستان کی طرف سے ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے کپتان محمد شاہد اور شہسوار ٹیم کے رگھوبیر سنگھ نے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر ایچ۔ ایل۔ کپور کو مشعل اور جھنڈا دیا جنھوں نے مشعل اور جھنڈا ایشیائی اولمپک کونسل کے صدر جناب شیخ احمد الصباح کو دی۔

۳۶ ملکوں میں سے ۲۷ ملکوں نے دسویں ایشیائی کھیل میں حصہ لیا۔ جبکہ نئی دہلی میں ۱۹۸۲ء میں ۳۳ ملکوں نے حصہ لیا تھا۔ سیول ایشیائی کھیلوں میں مندرجہ ذیل ملکوں نے حصہ نہیں لیا۔ افغانستان، برما، بروئی، لاؤس، منگولیا، سیریا، ویت نام، شمالی کوریا اور یمن۔

نویں ایشیائی کھیلوں میں ۲۱ کھیلوں کا مقابلہ ہوا تھا جبکہ دسویں ایشیائی کھیلوں میں ۲۵ کھیلوں کا مقابلہ ہوا۔

دسویں ایشیائی کھیل جو ۵ اکتوبر ۸۶ء کو اختتام پذیر ہوئے، ان میں چین کا مقام پیشہ ور کھلاڑی کے ملکوں میں سب سے اوّل رہا۔ جنوبی کوریا نے ۹۳ طلائی تمغے حاصل کئے جو چین سے صرف ایک کم تھا۔ جنوبی کوریا نے کل ۲۲۴ تمغے حاصل کئے جن میں طلائی، چاندی اور کانسے کے تمغے شامل تھے۔ اس کھیل کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ جنوبی کوریا ایشیا کے پیشہ ور کھلاڑیوں کے ملک کی شکل میں اُبھر کر سامنے آیا۔

سیول کھیل میں یہ ظاہر ہو گیا کہ کثیر آبادی والے براعظم میں چین، جنوبی کوریا اور جاپان کا کھیلوں پر تسلط رہا۔ چین، جنوبی کوریا اور جاپان نے مل کر کل طلائی تمغوں کا ۹۱ فیصد، چاندی کے تمغوں کا ۸۹ فیصد اور ۶۴ فیصد کانسے کا تمغہ حاصل کیا۔

نویں ایشیائی کھیلوں میں ہندوستان نے ۱۳ طلائی تمغے، ۱۹ چاندی کے تمغے اور ۲۵ کانسے کے تمغے حاصل کئے جبکہ دسویں ایشیائی کھیلوں میں ۵ طلائی تمغے، ۹ چاندی کے تمغے اور ۲۳ کانسے کے تمغے حاصل کئے۔

ہندوستان کی ۴۰۰ افراد پر مشتمل (بشمول افسران) مختلف کھیلوں کی ٹیم نے دسویں ایشیائی کھیلوں میں جس کارگزاری کا مظاہرہ کیا، وہ تسلی بخش نہ سمجھی گئی، یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ جنوبی ہند کی حسیناؤں، پی۔ ٹی۔ اوشا، شاینی ابراہیم، وندنا راؤ اور والسما نے ہندوستان کا نام اونچا کیا۔ ۲۲ سالہ پی۔ ٹی۔ اوشا نے چار طلائی تمغے حاصل کئے۔ صحیح معنوں میں وہ ٹریک اور میدان کے مقابلے کی سنہری لڑکی ہے۔

اولمپک اسٹیڈیم کی رانی ہندوستان کی ۲۲ سالہ پی۔ ٹی۔ اوشا تھی۔ سیول میں وہ یہ اُمید لے کر آئی تھی کہ انھیں ۶ طلائی تمغے ملیں گے۔ لیکن انھیں صرف چار طلائی تمغے اور ایک چاندی کے تمغے پر قناعت کرنا پڑا۔ پی۔ ٹی۔ اوشا نے طلائی تمغے ۴۰۰ میٹر رکاوٹی دوڑ، ۴۰۰ میٹر دوڑ، ۲۰۰ میٹر دوڑ اور ۴۰۰×۴ میٹر ریلے دوڑ میں اپنی ٹیم کو طلائی تمغہ دلایا۔

---

* قاضی محلہ، جالہ، دربھنگہ۔ (بہار)
بہ وجہ جامعہ ملیہ دہلی

ہندوستان کے کرتار سنگھ ڈھلوں نے پاکستان کے شاہد بٹ کو ۱۰۰ کیلو ہیوی ویٹ میں ہرا کر طلائی تمغہ جیتا۔

چین کا جمناسٹ لی ننگ (Li Ning) تمغوں کی انفرادی فہرست میں اوّل رہا۔ لی ننگ نے ۴ طلائی تمغے نیز ایک چاندی کا تمغہ حاصل کیا۔ جاپان کے کتسو نوری فوجیوارا (Katsunori Fujiwara) نے ۴ طلائی اور ایک چاندی کا تمغہ حاصل کیا۔

اختتامی تقریب

دسویں ایشیائی کھیلوں کا اختتام ۵ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو ہوا۔ یہ تقریب افتتاحی تقریب سے بھی زیادہ پُر اثر تھی۔ مقامی وقت کے مطابق ۸ بجے شب میں ایشیائی اولمپک کونسل کے صدر جناب شیخ فہد احمد الصباح (کویت) نے اولمپک اسٹیڈیم کے بیچ میں آکر سرکاری طور پر کھیل کے اختتام کا اعلان کیا۔

شیخ فہد نے کہا " میں کھیل کے ختم ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔ روایت کے مطابق ایشیا کے نوجوانوں کو ۴ سالوں بعد بیجنگ (چین) میں یکجا ہونے کی دعوت دیتا ہوں "۔

انھوں نے کہا " ہمسامدا " (Hamsamida) کوریائی زبان میں ہمسامدا کا مطلب " آپ کا شکریہ " ہوتا ہے۔ اس موقع پر رقص اور موسیقی کا پروگرام پیش کیا گیا۔

لی سانگ بیک (Li Sang Baik) ٹرافی کوریائی اولمپک کمیٹی کے سابق صدر کی عزت افزائی کے لیے منفرد کھلاڑی کو دی جاتی ہے، یہ ٹرافی دسویں ایشیائی کھیل میں کوریا کے ممتاز ٹیبل ٹینس کھلاڑی یونام کیو (Yoo Nam Kue) کو دی گئی جنھوں نے چین کے ورلڈ چیمپین جیان جیا لیان (Jian Jia Lian) کو شکست دی۔

سیول ایشیائی کھیل آرگنائزیشن کمیٹی کے صدر مسٹر پارک سیہ جک (Park Seh Jik) نے اختتامی تقریر کی۔

ایشیائی کھیلوں میں ہندوستان کی کارکردگی

ہندوستان نے ایشیائی کھیلوں میں مندرجہ ذیل تمغے حاصل کیے :۔

سال	مقام	طلائی تمغے	چاندی کے تمغے	کانسے کے تمغے	میزان
۱۹۵۱	نئی دہلی	۱۵	۱۶	۲۱	۵۲
۱۹۵۴	منیلا	۵	۴	۹	۱۸
۱۹۵۸	ٹوکیو	۵	۴	۴	۱۳
۱۹۶۲	جکارتہ	۱۰	۱۳	۱۱	۳۴
۱۹۶۶	بنکاک	۷	۳	۱۱	۲۱
۱۹۷۰	بنکاک	۶	۹	۱۰	۲۵
۱۹۷۴	تہران	۴	۱۲	۱۲	۲۸
۱۹۷۸	بنکاک	۱۱	۱۱	۶	۲۸
۱۹۸۲	نئی دہلی	۱۳	۱۹	۲۵	۵۷
۱۹۸۶	سیول (ساؤتھ کوریا)	۵	۹	۲۳	۳۷

بقیہ طب یونانی کا فروغ مواقع و امکانات

کے بارے میں بھی جانچ کی جا رہی ہے۔ ریسرچ کونسل کی ڈپٹی ڈائریکٹر مسز اُمت الفضل کا بیان ہے " ہمیں اس امر میں دلچسپی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو یہ طریقِ علاج بڑے پیمانے پر عمل میں لایا جائے اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے فیضیاب ہوں "۔

کونسل کے ڈائریکٹر حکیم محمد عبدالرزاق جو بھارت کے راشٹرپتی کے اعزازی معالج بھی ہیں، عالمی ادارہ صحت کے اُس شعبے سے قریبی طور پر وابستہ ہیں جو روایاتی طب کی ترقی سے تعلق رکھتا ہے اور سمندر پار ممالک میں یونانی طب کے فروغ کے لیے ذمہ دار ہے، حکیم صاحب کا بیان ہے کہ روایاتی طب ترقی پذیر ممالک کی صحتی ضروریات کو پورا کرنے کا بڑا امکان رکھتی ہے۔ ایلوپیتھک ادویات کے ردِ عمل کی بڑھتی ہوئی رپورٹوں اور ان کے نتیجے میں (یورپ اور امریکہ میں بھی) ان دواؤں کو معالجاتی شعبے سے خارج کیے جانے کے باعث کہ یہ بُرے اثرات اور نئی نئی ناقابلِ علاج بیماریاں پیدا کرتی ہیں روایاتی طب جدید طب کی ہمنوا بن سکتی ہے۔

بھارت کو طب یونانی کا پہلا بین الاقوامی سیمینار بُلانے کا اعزاز حاصل ہوگا جو ۱۳ سے ۱۵ فروری ۱۹۸۷ء کو نئی دلی میں منعقد ہوگا۔ توقع ہے کہ اس میں افریقہ، روس، یورپ، مشرقِ وسطیٰ اور امریکہ کے ممالک شرکت کریں گے۔ اس کانفرنس میں اس امر پر غور کیا جائے گا کہ صحت کی نشوونما میں طب یونانی کا کیونکر بہتر استعمال کیا جا سکتا ہے اور ابتدائی صحت کی نگہبانی کو کیونکر پیشِ نظر رکھا جا سکتا ہے۔ ●

محمد ابو صالح*

سرسیّد کی وسیع المشربی

سرسیّد دلّی کے بہت ہی شریف اور دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔ والدہ عزیزالنساء بیگم نہایت ہی پاک طینت نیک اور دردمند خاتون تھیں۔ سرسیّد کی ابتدائی تعلیم خالص مذہبی انداز میں سرانجام ہوئی تھی۔ ان کی سیرت و شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں ان کی والدہ کا زبردست ہاتھ تھا۔ والدہ کو اپنے ہونہار فرزند اور قوم کے مایہ ناز سپوت کی تعلیم و تربیت کا بڑا خیال رہتا تھا۔ وہ سرسیّد کو محلّے کے عام بچّوں کے ساتھ کھیلنے کودنے اور ان کی بیہودہ صحبتوں سے دُور رکھنے کی کوشش کرتیں۔ ہوش سنبھالتے ہی ایک پردہ نشین خاتون کو انھیں قرآن پڑھانے پر مامور کر دیا گیا اور بسم اللہ کی رسم دلّی کے ایک بہت بڑے بزرگ حضرت شاہ غلام علی کی ذات بابرکات کے ذریعے انجام دی گئی۔ بوستاں کا درس خود ان کی والدہ دیا کرتی تھیں۔ تعلیم کے ساتھ ان کی تربیت بھی نہایت ہی اچھے انداز میں کی گئی۔ لہٰذا حق گوئی، صلہ رحمی، نیک خوئی اور خداترسی کے ابتدائی نقوش ان پر خود ان کی والدہ کی فیضانِ تربیت سے قائم ہوئے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ دنیا کی عظیم ترین شخصیتوں کی عظمت کے پیچھے ان کی ماؤں کے فیض تربیت کا زبردست ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ بات سرسیّد پر بھی صادق آتی ہے۔ سرسیّد کی والدہ اپنے پڑوسیوں، قرابت داروں، یتیموں اور بیواؤں کی امداد میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتیں۔ موصوفہ کے جذبۂ ایثار کے ضمن میں مولانا حالیؔ سرسیّد کا بیان نقل کرتے ہیں کہ ان کے بڑے بھائی کے مرض الموت میں والدہ ہر وقت ان کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ ایک مہینے تک یہی حال رہا، جب ان کا انتقال ہو گیا سب لوگ گریہ وزاری کرنے لگے۔ والدہ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ اتنے میں صبح کی نماز کا وقت آ گیا۔ انھوں نے وضو کر کے نماز پڑھی اور اشراق تک مُصلّے پر ہی بیٹھی رہیں انھیں دنوں میں ایک رشتہ دار کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ تمام سامان شادی کا ہو چکا تھا۔ صرف چار دن تاریخ عقد میں باقی رہے تھے۔ جب یہ حادثہ ہم پر گذرا تو انھوں نے دستور کے موافق شادی ملتوی کرنی چاہی۔ میری والدہ نے جب یہ سُنا تو اس واقعہ کے تیسرے دن ان کے گھر گئیں اور کہا میں شادی میں آئی ہوں، ماتم تین دن سے زیادہ نہیں ہوتا اور شادی ملتوی کرنے سے تمھارا بڑا نقصان ہوگا۔ جو خدا کو منظور تھا وہ ہو چکا۔ تم شادی کو ہرگز ملتوی مت کرو۔ جب کہ میں خود تمھارے گھر آئی ہوں، اور شادی کی اجازت دیتی ہوں تو اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے[1]۔ ایامِ طفولیت میں سرسیّد نے بوڑھے ملازم کو کسی بات پر ناراض ہو کر تھپڑ مار دیا تھا۔ جب ان کی والدہ کو اس بات کی خبر ہوئی تو بہت ناراض ہوئیں اور ماما سے کہا کہ اسے گھر سے باہر نکال دو، جہاں چاہے چلا جائے اب یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ پھر ایک ماما انھیں ان کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئیں اور سڑک پر لے جا کر چھوڑ دیا۔ اسی وقت ان کی خالہ کے گھر سے ایک ماما نکلیں اور انھیں ان کی خالہ کے پاس لے گئیں۔ تین دن تک سرسیّد خالہ کے گھر روپوش رہے۔ چوتھے دن خالہ نے ان کی والدہ سے بچّے کا قصور معاف کرنے کی سفارش کی۔ والدہ نے یہ شرط رکھی کہ جب تک وہ بوڑھا ملازم معاف نہ کر دے، میں بھی معاف نہیں کروں گی لہٰذا سرسیّد نے اپنے بوڑھے ملازم سے معافی مانگی اور اس طرح ان کا قصور معاف ہوا۔ یہ واقعہ سرسیّد کی زندگی کا اہم اخلاقی تجربہ ثابت ہوا اور یہ اخلاقی درس سرسیّد تک ہی محدود نہ رہا بلکہ ان کے بیٹے میں بھی منعکس ہوا۔ سر راس مسعود نے نہایت تیز دھوپ اور گرمی کے عالم میں اپنے ملازم کو بغیر چھتری کے پوسٹ آفس بھیجا تھا۔ جب جسٹس محمود کو پتہ چلا تو بطور سزا راس محمود کو بھی دھوپ کا مزہ چکھنے کے لیے پیدل اور بغیر چھتری کے چلچلاتی ہوئی دھوپ میں پوسٹ آفس بھیجا تاکہ انھیں یہ احساس ہو کہ غریب اور امیر حاکم و محکوم سبھی تکلیف کے احساس سے یکساں طور پر دوچار

---

[1] حیاتِ جاوید۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ۔ مطبوعہ ترقی اُردو بورڈ ۱۹۸۲ء۔ صفحہ ۴۱۔

* ریسرچ اسکالر، مولانا حالی۔ ہاسٹل، علیگڈھ۔ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ۔

ہوتے ہیں ۔ اسی طرح ایک دفعہ سر راس مسعود نے اپنے ایک ملازم کو جو عمر میں ان سے بڑا تھا کسی بات پر ناراض ہوکر پٹائی کردی تھی ۔ جب جسٹس محمود تک یہ بات پہونچی تو انھوں نے اپنے سامنے دونوں کو کشتی لڑنے کے لیے کہا۔ کشتی میں راس محمود کی شکست ہوئی ۔ جسٹس محمود اس پر خوب ہنسے ۔ اور راس محمود احساسِ شکست سے پانی پانی ہوگئے ۔ اس اقدام میں یہ نصیحت مضمر تھی کہ حاکم و محکوم کے رشتوں کے علاوہ اللہ کے بندوں کے درمیان انسانی رشتہ بھی ہوتا ہے ۔ سر سید اس رشتے کا بڑا احترام کرتے تھے اور یہی سبب ہے کہ ان کی اولاد نے بھی اس اخلاقی نقطے کو کبھی فراموش نہیں کیا۔

سر سید کے مزاج، عقائد، اخلاق اور معاملات پر ان کی والدہ کی شخصیت کی گہری چھاپ تھی ۔ والدہ کی قابلِ رشک شفقتوں کے زیرِ سایہ سر سید کی شخصیت کی بھرپور نشو و نما ہوئی ۔ اور آنیوالے دنوں میں ایک باکردار اور عملی انسان بننے کے لیے نہایت ہی مضبوط بنیاد پر بچپن میں ہی انھیں تیار کردیا گیا تھا۔ سر سید کی والدہ شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان والوں سے عقیدت رکھتی تھیں ۔ اور والد شاہ غلام علی سے بیعت تھے ۔ شاہ غلام علی کی خانقاہ میں نذر و نیاز، تعویذ گنڈے اور منّت وغیرہ کا کوئی رواج نہیں تھا۔ جب کوئی حاجت مند ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو حاضرین سے کہتے کہ " دعا کرو خدا اس کی حاجت پوری کرے"۔ یہی عقیدہ سر سید کی والدہ کا تھا۔ بقول سر سید: " انھوں نے خود کوئی منّت و نیاز کبھی نہیں مانی، تعویذ یا گنڈے پر اور تاریخوں یا دنوں کی سعادت و نحوست پر ان کو مطلق اعتقاد نہ تھا اور اگر کوئی کرتا تو اس کو منع بھی نہ کرتیں اور یہ کہتیں اگر ان کو منع کیا جائے اور اتفاق سے وہی امر پیش آجائے جس کے خوف سے وہ ایسا کرتے ہیں تو ان کو یقین ہو جائے گا کہ ایسا نہ کرنے سے یہ ہوا" والدہ کی عقائد و خیالات، نظریات و افکار اور کردار و عمل سر سید کے دل پر نقش کالحجر ثابت ہوئے ۔

ان حقائق کا اعتراف کرتے ہوئے سر سید خود کہا کرتے تھے عبادت بدنی میں تو میں نیابت کا مطلق قائل نہیں اور عبادت مالی میں سوا اس کے کہ متوفیٰ اپنی زندگی میں کچھ مال کارِ خیر کے لیے کسی کے سپرد کرجائے اور کسی صورت میں نیابت کا قائل نہیں ہوں ۔

سر سید کی والدہ کے عقائد سے آج بھی مسلمانوں کا بڑا طبقہ متفق ہے اور اسی تناسب میں سر سید کے خیالات و عقائد کا منکر بھی۔ سر سید کے ذاتی عقائد و خیالات پر ولی اللّٰہی طرزِ فکر کا گہرا اثر تھا۔ شاہ ولی اللہ کے بیٹے شاہ عبدالعزیز کے مواعظ میں جو زیادہ ترک بدعات وغیرہ پر مشتمل ہوتے تھے، سر سید پابندی سے شریک ہوتے تھے ۔ جوں جوں مذہبیات کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا۔ سر سید کے خیالات و عقائد میں بھی وسعت و ترقی ہوتی گئی ۔ سر سید نے عباسی عہد کے علمائی تحریروں کا بڑی دلچسپی اور انہماک کے ساتھ مطالعہ کیا ۔ اس انہماک اور دلچسپی کا سبب یہ تھا کہ عباسی دور میں جب یونانِ قدیم کی علمی اور فلسفیانہ کتابوں کے تراجم کا رواج عام ہوا تو ایک طرف سائنس اور سائنسی ایجادات کو فروغ ملا تو دوسری طرف مذہب کے معاملے میں عقلی مباحث نے بھی زور پکڑا ۔ تشکیک کا رجحان عام ہونے لگا۔ اور اسلامی عقائد و خیالات پر اعتراضات بھی شروع ہوئے۔ چنانچہ حالات کے پیشِ نظر اس دور کے علما نے مذہب سے متعلق عقلی توجیہات پیش کیں اور مذہب اور سائنس میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے علم کلام کی بنیاد ڈالی ۔ سر سید نے انھیں علما، متکلمین سے متاثر ہوکر اپنی مذہبی تحریروں کے ذریعے نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی ۔ سر سید تقلید میں یقین نہیں رکھتے تھے اور قرآن احادیث کی تفہیم میں مفسّرین و محدثین کی رائے سے زیادہ اپنی صوابِ رائے اور اپنے عقل و ضمیر پر بھروسہ رکھتے تھے ثانوی ماخذوں میں سر سید نے کسی ایک دبستان یا مکتبِ فکر سے استفادہ نہیں کیا بلکہ انھوں نے شاہ ولی اللہ، امام غزالی، اربابِ معتزلہ اور امام شافعیؒ کے اقوال و فرمودات کے علاوہ مغربی مفکرین سے بھی لبا اوقات استفادہ کیا۔

سر سید اسلام کو دینِ فطرت سمجھتے تھے، اور دین و شریعت میں فرق کرتے ہوئے وحدتِ ادیان کی حمایت کرتے تھے ۔ ان کے خیال میں "مذہب انسان کا امرِ طبیعی ہے"۔ اور نبی کریمؐ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ تمام ہادیان دین کا دین ایک ہی تھا، صرف شریعت جو انسان کے حالات کی تبدیلی سے تبدیل ہوتی ہے جدا جدا تھی ۔ یہی سبب ہے کہ سر سید مذہب کو انسان کا ذاتی معاملہ قرار دیتے اور ایک دوسرے کے مذہبی معاملے میں مداخلت کو نہایت ہی برا جانتے تھے ۔ عملی طور پر سر سید تمام مذاہب کا احترام کرتے تھے ۔ ان روحانی پیشواؤں اور رہنماؤں کا نام عزت سے لیا کرتے تھے اور یہ عقیدت و احترام کسی سیاسی غرض یا ذاتی مصلحت کی بنا پر نہ تھی، بلکہ وہ عقیدتاً اور مذہباً ایسا کرتے تھے ۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی بھی مذہب کی بنیاد پر کسی سے تفریق نہیں برتی ۔ غدر کے بعد سر سید نے مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور طرح طرح کی اسکیمیں اور پروگرام لے کر میدانِ عمل میں آئے تو ابتداءً لوگوں کو دھوکہ ہوا کہ سر سید تعصب پسند ہیں اور ایک فرقے کی حمایت کرتے ہیں ۔ ان لوگوں میں راجہ جے کشن داس بھی ایک تھے ۔ اختتامِ غدر کے دو سال بعد ۱۸۶۰ء میں مراد آباد میں زبردست قحط پڑا تو سر جان اسٹریچی نے سر سید کو قحط کے انتظام پر مامور کیا۔ سر سید نے اسی زمانے میں اپنا رسالہ " ... محمڈنز

آف انڈیا" شائع کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ غدر نے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا کردی ہیں انھیں مٹایا جائے خاص طور پر یہ غلط فہمی کہ از روئے ایمان مسلمان انگریزوں کے خلاف جنگ جائز سمجھتے ہیں اور اسی سبب سے مسلمانوں نے اس جنگ کا آغاز کیا۔ سرسید نے اپنے رسالوں کے ذریعے غدر میں مسلمانوں کی قربانیوں کو منظر عام پر لانا چاہا۔ مختصر یہ کہ اس رسالے کو پڑھ کر راجہ جے کشن داس نے سرسید کو متعصب سمجھا لیکن ان کی غلط فہمی اس طرح ختم ہوئی کہ راجہ صاحب جب مرادآباد پہونچے، محتاج خانہ ان کے راستے میں پڑا، دیکھتے کیا ہیں کہ سرسید ایک بوڑھے آدمی کے گندے کپڑے اتار کر صاف کپڑے پہنا رہے ہیں اور غلاظت سے آلودہ کپڑوں کو اپنے ہاتھوں سے دھو رہے ہیں۔ راجہ صاحب نے اس مرد پیر سے اس کا نام دریافت کیا تو پتہ چلا کہ وہ ہندو تھا۔ اس واقعے کا ان پر ایسا اثر ہوا کہ وہ ساری عمر کے لیے سرسید کے دوست ہو گئے۔ اور ان کے اصلاحی کاموں میں قدم قدم پر شریک رہے۔

سرسید نے عملاً ثابت کر دیا تھا کہ اپنے مذہب پر مکمل ایمان رکھنے اور سختی سے کاربند رہنے کے باوجود آدمی تعصب سے کتنا پاک اور دیگر مذاہب کا کس قدر احترام کرسکتا ہے۔ سفر انگلستان کے دوران بڑودہ جہاز میں اتوار کے دن انگریزوں کی سروس ہو رہی تھی۔ جہاز کی ڈیک پر انگریز اپنی عبادت میں مصروف تھے۔ سرسید خاموش اور مؤدب کھڑے تھے۔ انگریزوں کی عبادت پر نیاز مندی اور عقیدت کا یہ اظہار اس لیے تھا کہ وہاں خدا کا نام لیا جا رہا تھا اور "خدا کا نام ہر طرح ادب کے لائق ہے۔" سرسید انگریزوں کی عبادت کا ڈھنگ دیکھ رہے تھے۔ اور دل میں خدا کی شان بے نیازی پر متحیر تھے کہ "اگر ڈنڈوت کرے تو اس کی کچھ پرواہ نہیں اور اگر کوئی ٹوپی اتار کر کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھے تو پرواہ نہیں۔ اگر کوئی جُبّہ اور عمامہ پہن کر اور تسبیح گلے میں ڈال کر کھڑا ہو کر ہاتھ باندھ کر ناک رگڑے تو کچھ پرواہ نہیں اور اگر کوئی برا کہے، گالی دے، شرک کرے تو بھی کچھ پرواہ نہیں۔ بلاشبہ صفتِ استغناء اسی پر ختم ہے۔" سروس ختم ہوئی تو ایک بے تکلف دوست نے ان سے پوچھا کہ وہ "نماز (سروس) میں کیوں شریک نہیں ہوئے۔" جبکہ خدا ایک تھا۔ سرسید نے جواب دیا "یہی تو وہاں نہ تھا۔" انگریز دوست خاموش ہو گیا۔

سرسید مذہبی مغائرت (بھید بھاؤ) کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان کے خیال میں آسمانی کتابیں ایک دوسرے کی تکذیب کی بجائے ایک دوسرے کے سچی ہونے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیے جانے کی توثیق کرتی ہیں۔ انگریزوں اور مسلمانوں کی آپس میں مناظرہ بازی سے اسلام اور عیسائیت سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں تھیں۔ اسلام اور عیسائیت کو اجتماع الضدین سمجھا جانے لگا تھا۔ سرسید غلط فہمیوں کو دور کرنا بہت ضروری سمجھتے تھے اس لیے ضروری تھا کہ لوگ ایکدوسرے کے کلچر کا مطالعہ کریں ایکدوسرے کے قریب آئیں۔ آپس میں میل جول بڑھائیں، اور تعصب سے بالاتر ہو کر خالص انسانی سطح پر ایک دوسرے کے ساتھ پیش آئیں تاکہ ایک پُرامن اور صحتمند معاشرہ وجود میں آئے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں مضامین بھی لکھے۔ تبئین الکلام کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا۔

سرسید تعصب کو ایک اخلاقی برائی سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں مذہب کا تعصب کی آلودگیوں سے پاک ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اپنے مذہب پر پختہ تر ہونا۔

ہر ایک کے اپنے مذہب میں پختہ ہونے کو نہایت عمدہ جانتا ہوں مگر تعصب کو نہایت برا اور ایک بڑا نقص اخلاقِ انسانی اور نیچر یعنی حکمتِ الٰہی کے برخلاف سمجھتا ہوں۔"

سطور بالا سے یہ صاف ظاہر ہے کہ سرسید جہاں حقوق اللہ کے پابند تھے وہیں حقوق العباد کے قائل بھی تھے۔ سرسید کی ساری عمر کی جانفشانیوں کا ثمرہ ان کا قائم کردہ کالج محمڈن اینگلو اورینٹل کالج تھا جسے انھوں نے اگرچہ صرف مسلمانوں کے لیے قائم کیا تھا لیکن ان کے کالج کا دروازہ مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کے لیے بھی کھلا رہا جہاں انھیں ہر طرح کی آزادی اور سہولیات میسر تھیں۔

سرسید نے جو کچھ کہا اسے کر دکھایا اور اپنے افکار و خیالات کا عملی نمونہ بھی پیش کیا۔ اللہ کے بندوں سے بے غرض محبت کرنا، انسانی رشتوں اور انسانی قدروں کا احترام کرنا، ذاتی اخلاق کو مذہبی عقائد سے بالاتر رکھنا ادیان عالم کی وحدت میں یقین رکھنا، خالق و مخلوق کے درمیان حائل حجابات کا پردہ چاک کرنا، خدا کی یکتائی اور بے نیازی پر کامل یقین رکھنا، اگر اجزائے تصوف ہیں تو بلاشبہ سرسید بھی صوفی تھے اور ان کا تصوف خالص ارضی تصوف تھا اور ان کی وسیع المشربی اسی صوفیانہ رویے کی مظہر تھی۔ ●

بقیہ: دلّی کی ادبی سرگرمیاں

تک پہونچا

اس خوبصورت افسانے پر شاہین صاحب نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ بہت دنوں بعد اتنی اچھی کہانی سننے کو ملی۔ واقعہ یہ ہے کہ دروان ذات کے سفر کی کوشش میں یا نعرے بازی کے شور میں کہانی کی موت ہو گئی تھی۔ یہ اچھی اور بامقصد کہانی کی بازیافت ہے اور طنز

کی قابلِ مبارکباد ہیں۔

مشہور ڈرامہ نگار شری چترنجیت نے کہا کہ پنجاب کے پس منظر میں یہ بہت حقیقت پسند کہانی ہے اور نعرہ بازی سے پاک ہے۔ محترم ممتاز مرزا نے کہا کہ اس خوبصورت کہانی کو سن کر مجھے منٹو کے ٹوبہ ٹیک سنگھ افسانے کی یاد آ گئی۔

ڈاکٹر نزہت اور شبانہ نذیر کا خیال تھا کہ افسانہ ابتدا میں مزاحیہ معلوم ہو رہا تھا لیکن پھر ایک سنجیدہ فضا میں پہونچ گیا اور نہایت خوبصورت ہے۔ رفعت سروش نے کہا کہ یہ کہانی محض آج کی کہانی نہیں ہے بلکہ اس میں ایک پوری نسل کو پیش کیا گیا ہے اور عمل اور ردِّ عمل کو نہایت چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ کہانی کردار نگاری کا خوبصورت نمونہ ہے۔

صدرِ جلسہ جناب جوگندر پال نے افسانے کے موضوع اور تکنیک دونوں کی تعریف کی اور فرمایا کہ ظفر پیامی نے ایک عرصہ بعد ادھر جو کہانیاں لکھی ہیں وہ ان کے فن کا ایک نیا نقطۂ معراج ہیں۔

افسانہ پر بحث و مباحثہ کے بعد ممتاز مرزا نے اپنے مخصوص مترنم لہجے میں دو غزلیں سنائیں جن کو بیحد پسند کیا گیا ؎

لائی بہار شوق کے ساماں نئے نئے
دُنیا نئی نئی سی، دل و جاں نئے نئے

اور آخر میں مہمانِ خصوصی جناب شاہین نے کئی نظمیں اور غزلیں سنائیں اور فضا ان کے کلام کی تازگی سے معمور ہو گئی ؎

یوں تو ہے اس کا مقدر کُو بہ کُو آوارگی
مل گیا گر آشنا کوئی ٹھہر جائے گی شام

آخر میں جناب رفعت سروش نے جملہ حاضرینِ بزم کا شکریہ ادا کیا اور یہ خوشگوار ادبی شام اپنے اختتام کو پہونچی۔

●

یوجنا، نئی دہلی

بقیہ، ضبطِ تولید کی اہمیت

یقینی اور تاریک ہو جائے گا۔ آزادی سے اب تک مُلک کی آبادی دوگنی ہو گئی ہے۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہا تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ ہر طرف لوگ ہی لوگ ہوں گے اور کاشت کرنے کے لیے زمین سُکڑتی جائے گی۔ قدرتی وسائل محدود ہو جائیں گے۔ اور ہمارا ملک کنگالوں اور قلاشوں کا دیس بن کر رہ جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ آبادی کے مسئلے کو انسانی سماج کے دوسرے مسائل سے الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ انسانی سماج کی اقتصادی، تہذیبی، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کا تعلق براہِ راست آبادی سے ہے۔ آبادی میں توازن پیدا ہونے سے ترقیاتی سرگرمیوں کے نتائج اور نقوش نمایاں ہو جائیں گے اور آبادی گر بے تحاشا بڑھتی گئی تو تیز رفتار ترقی کے باوصف بھی سماج پچھڑا اور پسماندہ رہیگا، کیونکہ حاصل شدہ نتائج بڑھتی آبادی کے سیلاب میں اسی طرح بہہ جائیں گے جس طرح طوفان بڑے بڑے پیڑوں کو اُکھاڑ کر اپنی رَو کے ساتھ بہا لے جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انسانی سماج خطرناک مسائل سے دوچار ہو جائے گا۔ آبادی میں دھماکہ خیز اضافہ سے سماجی اور اقتصادی نابرابری کو لازمی طور پر بڑھاوا ملیگا جس کے نتیجے میں جرائم میں اضافہ ہو جائیگا، بھیک مانگنے والوں کی تعداد بڑھے گی، بدکاری جڑ پکڑے گی اور ایک صاف ستھرا اور صحتمند سماج تعمیر کرنے کا خواب مٹی میں مل کر رہ جائے گا۔ اس طرح آبادی میں اضافے کا مسئلہ جہاں انسانی سماج کو اقتصادی پستی کی دلدل میں دھکیل دیگا وہاں سماج میں ایسے ناسور پنپتے رہیں گے جس کا مداوا کرنا کسی بھی حکومت کے لیے ناممکن ہو گا۔

آبادی میں روزافزوں اضافہ ہم سب کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ یہ مسئلہ کسی فردِ واحد، حکومت یا تنظیم کا مسئلہ نہیں بلکہ ہم سب کا مسئلہ ہے۔ آپ کا اور میرا مسئلہ ہے۔ اس کے ساتھ ہماری آنے والی نسلوں کا مستقبل بھی وابستہ ہے۔ کیا ہم سب مستقبل کو ایک عذاب، ایک دوزخ دیکھنا چاہتے ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ ہم سب ایک خوش آئند اور تابناک مستقبل کے متمنی ہیں۔ ہم سب کل کے دن کو مسرت اور شادمانی کے دن کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنے خوابوں کی تعبیر اپنے اور اپنے بچوں کے شاداں و خنداں مستقبل کو بنانے اور سنوارنے کے لیے ہم اپنی ذمہ داریوں سے ہرگز کوتاہی نہیں برتیں گے۔ انسانیت سے پیار کرنے والے ہر ذی شعور شخص کا یہی خیال بھی ہے اور ارادہ بھی۔ اب خاندانی بہبود کا پروگرام کہئے یا کنبہ بندی کا پروگرام، گھوم پھر کر ہم سب کی توجہ ایک ہی نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہے اور یہ نقطہ ہے آبادی کو قابو میں رکھنا اور پیدائش و اموات میں توازن پیدا کرنا۔ اس بات کو دُہرانے کی ضرورت نہیں کہ طبی علوم میں ترقی کی بدولت اوسط عمر میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ اب اوسط عمر ۳۵ سال سے بڑھ کر ۵۵ سال ہو گئی ہے۔ مُہلک اور وبائی بیماریوں کو تقریباً مکمل طور پر قابو میں لایا جا چکا ہے اور دوسری جانب آبادی میں اضافے کی رفتار میں اس حد تک کمی واقع نہیں ہوئی ہے جس حد تک شرحِ اموات میں کمی ہوئی ہے۔ اسی طرح سے آبادی میں ایک عدم توازن پیدا ہو گیا ہے جو کسی بھی وقت انسانی سماج کے شیرازے کو منتشر کر کے رکھ سکتا ہے۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر شرحِ اموات اور شرحِ پیدائش میں یکسانیت یا توازن پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارا سماج ایک منصوبہ بند طریقے پر آگے بڑھ کر فلاحی ریاست کے خواب کو بارآور بنا سکے۔

ہمارے رہنماؤں اور منصوبہ سازوں نے کنبہ بندی یا خاندانی فلاح و بہبود کی ضرورت کو پہلے سے بھانپ لیا اور آزادی حاصل کرنے کے چند سال بعد ہی فیملی ویلفیئر پروگرام کو منظم کر کے ملک بھر میں شروع کیا۔ پروگرام کے نتائج سامنے آنا اب شروع ہو گئے ہیں۔ مگر جس قدر حوصلہ افزا نتائج کی ہم اُمید کرتے تھے وہ نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ ● موتی لال ساقی

یکم تا ۳۱ دسمبر ۱۹۸۶

ضبطِ تولید یا پیدائش پر قابو اور روک لگانے کا طریقہ کوئی نیا طریقہ نہیں ہے بلکہ زمانۂ قدیم سے رائج ہے۔ چنانچہ یونان کے مشہور فلاسفر مقیوا وگنس (THEOGUONS) نے چھ سو قبل مسیح اپنی ایک نظم میں لکھا تھا:۔

"مویشیوں اور حیوانوں کے بچے انسان سے بہتر اور طاقتور ہوتے ہیں۔ انسان اپنے لیے گدھا اور گھوڑا نیز بھیڑ بکری، کتا بلا وغیرہ خریدتے ہیں انکو خریدتے وقت اسکی نسل اور جسمانی طاقت پر گہری نظر ڈالی جاتی ہے۔ مگر افسوس کہ یہی انسان اپنی ازدواجی زندگی کے متعلق کوئی احتیاط نہیں کرتا ہے بلکہ مال و دولت، اور جاہ و حشمت سے مرعوب ہوکر انسانی نسل کو نقصان پہنچا رہا ہے"۔

مصر کے قدیم مسودوں جنھیں پیپائیرس کہا جاتا ہے ان میں بھی درج نسخوں میں ضبط تولید کے متعلق ہدایات اور نسخے ہیں جو آج بھی استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح اسلام نے بھی "عزل" کے طریقہ کو مسنون قرار دیا ہے۔ مقصد و مدعا یہی ہے کہ کثرتِ اولاد کی ذمہ داریوں سے نجات ملے اور زچہ و بچہ دونوں کی صحت اچھی اور توانا ہے۔ فقہانے بھی ۱۲۰ دنوں تک حمل گرانے کو جائز قرار دیا ہے۔ اسی طرح ضبط تولید یا اصلاحِ نسل کے حق میں علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد اور علمائے جامعہ ازہر مصر وغیرہ نے بھی فتاوے دئے ہیں اور عصرِ حاضرہ میں لگ بھگ چار درجن مسلمان ملکوں میں بھی ضبطِ تولید یا اصلاحِ نسل کی تحریک پوری سرگرمیوں کے ساتھ جاری ہے۔

جو علماء بچوں کو غربت کی وجہ قتل کرنے سے منع کرنے کی قرآن پاک کی آیت سے یہ استدلال کرتے تھے کہ ضبطِ تولید جائز نہیں ہے اُن کو دوسرے علماء ہی نے یہ کہہ کر خاموش کردیا کہ بچوں کو قتل کرنے کا مطلب انھیں مناسب تعلیم و تربیت اور پرورش سے عاری رکھنا ہوتا ہے اور جو نفس وجود ہی میں نہ آیا ہو اُس کا قتل کوئی معنی نہیں رکھتا ہے کیونکہ ہر جماع کے وقت لاکھوں کیڑے مرجاتے ہیں اور ہر مہینے ایام حیض میں ہزاروں بیضۂ انثیٰ برباد ہوجاتے ہیں۔

سماج کو تندرست و توانا رکھنے اور فضول خرچیوں سے بچانے کے لیے مشہور حکیم افلاطون نے مشورہ دیا ہے کہ کمزور اور دائم المرض بچوں کو تلف کردیا جائے۔ منو سمرتی میں قریبی رشتہ داروں کے مابین شادیاں کو ممنوع قرار دیا گیا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے کمزور بچے پیدا ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح مشہور ہندوستانی حکیم سشرت نے کم عمری کی شادی کی مذمت کی ہے اور سارے حکما و فلاسفروں کی تان اسی ایک امر پر ٹوٹتی ہے کہ شادی پختہ عمر میں کی جائے۔ کم سے کم اولاد پیدا کی جائے جن کی تعلیم و تربیت بہتر طور کی جاسکے تاکہ وہ سماج پر بوجھ نہ بن جائیں اور کمزور اور غیر تندرست مرد و عورت کو بچے پیدا کرنے سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہیے۔

مقامِ مسرت ہے کہ پورے ملک میں سرگرمی کے ساتھ لوگوں کو ضبطِ تولید کے فوائد سے روشناس کرنے کا کام جاری ہے اور خواہش مند جوڑوں کو کنبہ محدود رکھنے کے سلسلے میں مختلف آسان طریقوں سے متعلق جانکاری کرائی جاتی ہے بلکہ آپریشن کرانے کی بھی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔

ہر نیک اور اچھی تحریک کی شروع شروع میں زبردست مخالفت کی جاتی ہے۔ ضبطِ تولید کی تحریک کی بھی شروع میں زبردست مخالفت کی گئی۔ اوہام پرست اس کے بارے میں قسم قسم کی غلط فہمیاں پھیلاتے رہے اور لوگوں کو اس پر عمل درآمد کرنے سے باز رکھنے کی خاطر دوڑ دھوپ کرتے رہے۔ لیکن جب اس کی تائید میں ٹھوس اور وزن دار دلائل منظرِ عام پر آگئے تو مخالفت کرنے والے خود بھی فیملی پلاننگ پر عمل درآمد کرنے لگے اور اس طرح اپنا معیارِ زندگی بڑھانے لگے کیونکہ کم اولاد اور مختصر کنبہ کی صورت میں اخراجات میں حیرت انگیز کمی واقع ہوجاتی ہے اور معیارِ حیات بڑھنے کے علاوہ انسان کو غم و افکار سے بھی نجات ملتی ہے اور وہ امن و سکون فارغ البالی اور خوشحالی کے ساتھ زندگی کے ایام گزارنے لگتے ہیں جو حقیقی معنوں میں بہشت کی زندگی کہلاتی ہے۔

عزیز کشمیری
ایڈیٹر روزنامہ "روشنی" سری نگر۔

●

مشہور ماہر زراعت ڈاکٹر بارلوگ نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ ترقی پذیر اور کم ترقی یافتہ ممالک میں اگر آبادی موجودہ شرح کے مطابق بڑھتی رہی تو رواں صدی کے خاتمے پر ان ملکوں میں ایسے لوگوں کی تعداد ۶۰ کروڑ تک پہنچ جائے گی جن کو پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوگا۔ ایتھوپیا اور سوکھے سے متاثرہ دوسرے افریقی ممالک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جہاں لوگ آج بھی مٹھی بھر اناج اور دو گھونٹ پانی کے لیے بلکتے ہیں اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتے ہیں۔ اگر ہمارا ملک آبادی کے بارے میں ایک قومی پالیسی ترتیب دے کر آبادی پر روک لگانے کے لیے ضروری اقدامات نہیں کرتا تو آنے والی نسلوں کا مستقبل غیر

(باقی ص۳۱ پر)

غزلیں

رفعت سروش ڈی، ۲ اے ۔ ڈی۔ ڈی۔ اے فلیٹ
منیرکا۔ نئی دہلی۔

گلی گلی مری وحشت لیے پھرے ہے مجھے
کہ سنگ و خشت کی لذت لیے پھرے ہے مجھے
نہ کوئی منزلِ مقصود ہے نہ راہِ طلب
بھٹکتے رہنے کی عادت لیے پھرے ہے مجھے
نہ مال و زر کی تمنا نہ زندگی کی ہوس
نہ جانے کون سی قوت لیے پھرے ہے مجھے
حرم سے دیر تلک، دیر سے حرم کی طرف
نہ جانے کس کی عقیدت لیے پھرے ہے مجھے
یہ مفسدوں کا جہاں، یہ تضاد کی دنیا
بس ایک حرفِ محبت لیے پھرے ہے مجھے
مجھے کیا مری فکرِ رسا نے آوارہ
کہ دربدر مری شہرت لیے پھرے ہے مجھے
جو بس چلے نہ اٹھوں ترے آستانے سے
یہ سر پھرا جو ہے رفعت، لیے پھرے ہے مجھے

●

دھرم پال عاقل پائن ۔ ۸ ڈی گورنمنٹ کوارٹرز، شملہ

دل پہ چھا جاؤ بہاروں کی طرح
جاں فزا رنگیں نظاروں کی طرح
انجمن کا اور ہی نقشہ ہے کیوں!
کون آیا چاند تاروں کی طرح
سج گئی ہے دل میں یادوں کی برات
جل میں ہنسوں کی قطاروں کی طرح
ان کی یادیں جگمگاتی ہے رہیں
دل کی دنیا میں ستاروں کی طرح
دل میں کھل اٹھتے ہیں غنچے بےشمار
آپ آتے ہیں بہاروں کی طرح
کھو گئے ہیں کس جگہ عاقل وہ لوگ
ساتھ دیں جو غم گساروں کی طرح ●

ڈاکٹر کمار پانی پتی ۔ ۵/۱۳۰، ایم۔ آئی۔ جی
بی سیکٹر ۱۱، ۱۲ نیو ہاؤسنگ بورڈ کالونی۔
پانی پت ۱۳۲۱۰۲ (ہریانہ)

لب پہ پھولوں کے بات کانٹوں کی
کتنی اونچی ہے ذات کانٹوں کی
ذکر کرتے ہیں ہونٹ پھولوں کا
بات کہتے ہیں ہاتھ کانٹوں کی
کتنی دلکش تھی وہ کہانی بھی
جو کہی تو نے رات کانٹوں کی
خواب میں بھی کہا یہ پھولوں نے
درحقیقت ہے رات کانٹوں کی
سر پہ سہرے سجائے پھولوں کے
چڑھ رہی ہے برات کانٹوں کی
بات کرتے رہے وہ پھولوں کی
کہہ گئے ساتھ ساتھ کانٹوں کی
لب پہ ہے تجزیہ گلابوں کا
ہاتھ میں ہے لغات کانٹوں کی

●

ظفر اقبال ۱/۷۰ ۔ حیلدار، فتحپور ۲۱۲۶۰۱ (یو پی)

ہم کو منزل کی طلب جانے کہاں لے جائیگی
کہکشاں کی راہ سے تا آسماں لے جائے گی
دے کے مجھ کو ہجر کا موسم اندھیرے کی فضا
رات میری زندگی سے کہکشاں لے جائے گی
ہے بھنور دریا میں اور پتوار ہیں ٹوٹے ہوئے
دیکھنا ہے اب کدھر موجِ رواں لے جائے گی
بزمِ مے کی طلب میں آج پھر نکلے ہیں ہم
دیکھئے یہ آرزو ہم کو کہاں لے جائے گی
کیا سوا سوغات مجھ کو دیگی یہ دنیا نظیر
دھوپ رکھ کر سر پہ میرے سائباں لے جائیگی

●

کالے لوگوں کی کالی کویتا

چندر بھان خیال ۵/۷، بھائی پرمانند کالونی۔ دلی

وہ لاکھ صلیب سجائے، ہماری بلا سے
لیکن وہ سوچتا کیوں نہیں ہے؟
کہ سگریٹ کی صورت دم بدم سلگتا اس کا جسم
چپہ چپہ سوچ کی سلگتی شعاعیں بکھیر سکتا ہے
ان گنت ہڈیوں کے ڈھانچوں میں حرارت اور اعتماد کا
تازگی بخش دھواں بھر کر، ماحول کی
بیداری اور بیقراری کا حسین سبب بن سکتا ہے
کہ آسماں کی عظمت سے خوفزدہ
معصوم اور بےہنر جانداروں کی کھال پر
بےباک اور تندرست روئیں جما کر
دھرتی اور اس کی تہہ میں مضبوط اور بےچین
کیڑے نما ہنرمندوں کو سربلند کر سکتا ہے
مخلوق کو تخلیق کی تحریک
اور خود کو نیا نام دے سکتا ہے
لیکن وہ سوچتا کیوں نہیں ہے؟
کہ سوکھے بانسوں کے ٹکرانے سے آگ اور
احتجاج ہی نہیں
فضاؤں میں جیوں سنگیت بھی بج سکتا ہے
کہ کالے پہاڑوں کے پسینوں سے ہی
شفاف میدانوں کی پیاس بجھتی ہے
اور چہروں سے وصال کی ہری بھری بہار چھو
اٹھتی ہے
کہ نامیبیا کے کالے لوگوں کی آزادی کا خواب بھی
چیتا اور اجلا ہے، سفید فام حسیناؤں کی
دودھ جیسی دمکتی سربلند چھاتیوں سا
لیکن وہ سوچتا کیوں نہیں ہے؟

●

غزلیں

باواکرشن گوپال مغموم ۱۳۱۷، سیکٹر نمبر ۸ ۱ ۔ سی، چنڈی گڑھ۔

کیوں نہ دیوار اندھیرے کی گرادی جائے
پیار کی شمع بجھی ہے تو جلا دی جائے

کرتی رہتی ہے یہ انسان کو انساں سے جدا
حرم و دیر کی تفریق مٹا دی جائے

جو تشدد سے کسی طور نہیں باز آتے
ہو کے مجبور، انھیں سخت سزا دی جائے

خاک کر دیتے ہیں جو لاکھ کے گھر لمحوں میں
ایسے شعلوں کو نہ بھولے سے ہوا دی جائے

اور دُنیا کے گناہوں میں اضافہ ہوگا
عمرِ انساں کی اگر ڈور بڑھا دی جائے!

کہنہ تہذیب کی اقدار جو ہم کھو بیٹھے
عینِ برحق، جو انھیں پھر سے صدا دی جائے

دین و ایماں ہیں دل و جان سے بھی بڑھ کر لیکن
حرمتِ قوم و وطن اِن سے بڑھا دی جائے

غمِ جاناں، غمِ دوراں کا بہت ذکر ہوا
لبِ اظہار پہ اب مُہر لگا دی جائے!

رُوحِ فن جس پہ ہو سو جان سے صدقے مغموم
فن کی اِک ایسی بھی تصویر بنا دی جائے

●

ظاہر جھٹرگانوی جمعدار محلہ بھڑ گاؤں ضلع جلگاؤں، ۴۲۴۱۰۵

دی وہ حیات درد کا عنواں کہیں جسے
بخشا وہ درد حاصلِ درماں کہیں جسے

تسکین و اضطراب کا ساماں کہیں جسے
وہ اِک اداکہ جنبشِ مژگاں کہیں جسے

دونوں جہاں کی فکر سے آزاد کر دیا
کیا چیز ہے تصورِ جاناں کہیں جسے

ہے اُن کی بے رُخی میں بھی وہ شانِ التفات
اک دلنواز پرسشِ پنہاں کہیں جسے

آئی تو ہے بہار مگر اس کا کیا علاج
ایسا نہیں ہے کوئی غزلخواں کہیں جسے

منصور بھی ہیں دار و رسن بھی ہیں سینکڑوں
لیکن کہاں وہ شبلیٔ دوراں کہیں جسے

اللہ رے انقلاب کہ اب نہیں کوئی
شائستۂ بہارِ گلستاں کہیں جسے

اہلِ خرد سمجھ نہیں سکتے جنوں کا راز
ہے اُس کی ایک جست بیاباں کہیں جسے

ظاہر یہ ہے حقیقتِ دُنیائے بے ثبات
اک مستقل سا خوابِ پریشاں کہیں جسے

●

دو نظمیں

سبطین اخگر آفتاب ہال، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

بہت دنوں کی بات ہے
وہ میری یادداشت میں
ہرے بھرے درخت سا
بدن کی دھوپ چھاؤں میں
مرے دماغ کی تہوں میں تھا
عجیب سا
غموں کے روزگار میں
کہ شہرِ نامراد میں
جو سوچتا تھا رات دن
وہ ایک تھا
عجب نہیں کہ مر گیا!

●

(۲)

یہ زندگی کے فاصلے
مجھے پکارتے ہیں
روز و شب
کسی سفر کے واسطے
جو دیکھنا محال ہے
سوال ہے
[illegible]دروں میں قید ہوں
[illegible]ہ کیا ہوا مرا جنوں
وہ راستوں کی خاک میں
یہ مٹھیوں کی راکھ میں
نشان اپنے چھوڑ کر چلا گیا
وہ کون تھا

●

مبین صدیقی محلہ قلعہ گھاٹ کالونی، دربھنگہ۔ (بہار)

راحت کسے نصیب ہے آلام کے بغیر
کیسے تمیز صبح کی ہو شام کے بغیر

ہم انتہائے عشق سے آگے ہیں دوستو!
شاداب ہے یہ دل کسی گلفام کے بغیر

صبحِ ازل سے تا بہ ابد وقت ہے گواہ
پھیلا نہیں یہ کارواں الزام کے بغیر

یوں جذبۂ انا میں وہ اُلجھے ہوئے ہیں کہ
محسوس کر رہے ہیں تھکن کام کے بغیر

●

عابد صدیقی*

سکندر علی وجد

ارضِ دکن کے جن شعراء نے دُنیائے ادب کو اپنے شعری اور فکری سرمایہ سے مالا مال کیا ہے، اُن میں حضرت سکندر علی وجد نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ وجد کا شمار اُردو شاعری کے باکمال اور قادر الکلام شاعروں میں ہوتا ہے وہ گنگا جمنی تہذیب اور سیکولر روایات کے علمبردار اور عظیم محب وطن تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ اس ملک کی عظمتوں سے اہلِ جہاں کو واقف کرایا اور ہمارے تہذیبی آثار ان کی شاعری کے پیکر میں ڈھل کر زیادہ حسین اور لافانی بن گئے چنانچہ وجد کے کلام میں اجنتا کا حُسن، ایلورہ کا جمال، تاج کی رعنائیاں، جامعہ عثمانیہ کا وقار اور ہندوستان کے عظیم تہذیبی ورثے کی جھلکیاں ان کے مخصوص شعری اظہار کے ساتھ ملتی ہیں۔ انھوں نے ہمارے ادبی اور تہذیبی سرمایہ کو اپنے فکر وفن کی عظمتوں سے مالا مال کیا، ان کی شخصیت اور شاعری نے شعری رویوں اور تہذیبی قدروں کو مثبت راہیں دکھائی ہیں۔

سکندر علی وجد ۲۲ فروری ۱۹۱۴ء کو ویجاپور ضلع اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ انٹر تک اورنگ آباد میں ہی تعلیم پائی اور پھر جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور حیدرآباد سول سروس کے مسابقتی کے امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ انھیں بابائے اُردو مولوی عبدالحق اور وحیدالدین سلیم جیسے اساتذہ کے آگے زانوئے ادب تہ کرنے کا موقع ملا۔ سی۔ ایس میں کامیابی کے بعد جج کے عہدہ پر فائز ہوئے اور حیدرآباد ہی میں رہنے لگے۔ ۱۹۵۶ء میں ریاستوں کی تنظیم جدید نے کئی ایک شعبوں کو متاثر کیا۔ وجد بھی اس فیصلے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ان کی خدمات ریاست مہاراشٹر کو تفویض کی گئیں وہاں وہ سشن جج کی حیثیت سے قانون کی گتھیوں کو سلجھاتے رہے اس دوران بھی ان کی شاعری کی شمع روشن رہی۔ اگرچہ کہ ۱۹۳۰ء سے ہی وجد نے شاعری کا آغاز کر دیا تھا اور ۱۹۴۴ء میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام "لہو ترنگ" شائع ہوا۔ ۱۹۶۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کی علمی و ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کو نئے امکانات اور نئی جہتیں ملیں۔ وہ مہاراشٹر انجمن ترقی اُردو کے صدر رہے اور زبان کی نمایاں علمی خدمات اور ان کے شاعرانہ کمال کے اعتراف میں حکومتِ ہند نے انھیں "پدم شری" کا اعزاز عطا کیا۔ اس وقت تک وجد کی شاعری کی مہک ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں پھیل گئی۔ وہ سیاسی اعتبار سے کانگریسی ذہن کے حامل تھے۔ چنانچہ ۱۹۷۲ء میں انھیں ہندوستانی پارلیمان کے دیوان بالا یعنی راجیہ سبھا کا رُکن نامزد کیا گیا۔ ۱۹۷۵ء میں وہ مہاراشٹر اُردو اکیڈیمی کے نائب صدر ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں انھیں غالب ایوارڈ دیا گیا۔ اس دوران ان کے دو مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آئے۔ جواہر لال نہرو نے "اوراقِ مصور" اور وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے بیاضِ مریم کی رسمِ اجرا انجام دی یہ دونوں شاعری کے مجموعے ہمارے ادبی سرمایہ میں ایک گراں قدر اور لازوال اضافہ بن گئے۔ ۱۹۸۱ء میں وجد ترقی اُردو بورڈ کے صدر بنائے گئے۔ اس کے علاوہ ملک کی تنظیموں سے وابستگی اور سیاسی و ادبی شخصیتوں سے ان کے گہرے مراسم رہے۔

وجد کی شخصیت اور شاعری بڑی دلآویز تھی گویا ان کی شخصیت ان کی شاعری کا آئینہ اور شاعری شخصیت کا پرتو تھی۔ ان کی شاعری میں روحِ عصر کی ترجمانی ملتی ہے۔ انھوں نے غزل کی کلاسیکی شعری روایات کو نیا حُسن اور فطری بانکپن دیا اور نظم کو جمالیاتی احساس اور فکر و نظر کی وسعتوں سے مالا مال کیا ان کی شاعری میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے احساس کی شدت نمایاں ہے۔ وجد نے اُردو شاعری میں مناظرِ قدرت اور مظاہرِ فطرت کو نظم کا آشنا خوبصورت اور لطیف

---

* اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر پی۔ آئی۔ بی۔ حیدرآباد۔

پیرائے بیان دیا کہ ان کی نظمیں ہمارے کلاسیکی
ادب کا انمول سرمایہ بن گئیں۔ چنانچہ ان کی شاہکار
نظم "اجنتا"، اُردو کی بلند پایہ نظم کہی جا سکتی
ہے۔ اس نظم میں اجنتا کے نقوش کو لفظوں کا
پیرہن دیا گیا ہے اور تخیل و معنی آفرینی اپنی
بلندیوں کو چھو رہے ہیں۔ پھر لفظوں کی تراش
خراش، لہجہ کا بانکپن، شعریت اور طرزِ اظہار
کی نیرنگی، اجنتا کے حسن کو اور بھی دل کش بنا
دیتی ہے۔

چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں
یہ تصویریں بظاہر ساکت و خموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں
زمانے کی جبیں پہ عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

اس کے علاوہ ان کی نظم "رقاصہ"
بھی ان کے احساسِ جمال اور فنی عظمتوں کی
دلیل ہے۔

تحریکِ آزادی، ملک کے سیاسی نشیب و
فراز اور بدلتی ہوئی سماجی قدریں وحیدؔ کی شاعری
میں بڑی عمدگی سے جذب ہو گئی ہیں۔ کاروانِ
زندگی، مزدوری کا پیغام، تاج محل، مہاتما گاندھی
اور پیغامِ اقبال جیسی نظمیں ان کے کامیاب
ذہنی سفر اور فنی ارتقاء کی منزلِ عروج کا پتہ
دیتی ہیں۔ وحیدؔ نے محمد قلی، ولی دکھنی، سراجؔ،
امجدؔ اور مخدومؔ کے بعد اُردو شاعری کو حرکت و
انقلاب سے روشناس کیا۔ چنانچہ نہایت
فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ ؎

دو سو برس میں وحیدؔ سراجؔ و ولیؔ کے بعد
اُٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاکِ وطن سے ہم

ان کے کلام میں زندگی کا حسن اپنی پوری آب و
تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے، زندگی کی صداقتوں
سے معمور ان کے اشعار فکر و احساس کی قندیلیں کو
جلائے رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ہمارے
عہد کے تصورات اور شعری رویوں کی تصویر
ملتی ہے۔ وحیدؔ نے اپنی شاعری کو اصطلاحات
اور گروہ بندیوں سے محفوظ رکھا، یہ احتیاط
پسندی ان کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ چنانچہ انھوں
نے اپنی شاعری کو ترقی پسند، رجعت پسند
اور جدیدیت کے خانوں میں تقسیم کرنے سے
احتراز کیا تھا وہ صرف اچھی شاعری اور بُری
شاعری سے واقف تھے جو شعر دل کو چھو لے
اور فکر و احساس کو جھنجھوڑ دے، وحیدؔ اُسے
اچھا شعر سمجھتے اور ایسی شاعری جو زندگی کے سوز و
ساز سے محروم ہے وہ شاعری نہیں لفاظی ہے۔ وہ
شاعری کو زندگی کا آئینہ سمجھتے اس لیے ان کے
افکار پر مخدومؔ کا گہرا اثر موجود ہے۔ چنانچہ ان کی
بعض نظمیں مخدومؔ کے لہجے کے لاشعوری اثر
کو ظاہر کرتی ہیں۔

وحیدؔ نے جس دور میں شاعری کی تھی، وہ
ہماری ملکی تاریخ کا ایک صبر آزما دور تھا۔ اس
لیے اس دور کی شاعری میں یکساں طرزِ اظہار کی
روایت چل پڑی تھی لیکن وحیدؔ نے اپنے جذبات و
احساسات کے اظہار کے لیے منفرد انداز اختیار
کیا۔ شعرا کے اس ہجوم میں وحیدؔ کی منفرد اور
چونکا دینے والی آواز جب یہ کہہ کر ارضِ دکن
سے گونجی کہ ؎

پیغمبرِ برحق ہوں جمالِ ازلی کا
ہر شعر میں ایک معجزۂ خوش نظری ہے

تو ادبی حلقوں میں حیرت اور مسرت کی لہر دوڑ
گئی۔ ان کا کلام احساسِ زمانہ سے عبارت ہے
وہ ایک مسافر کی طرح راہ کے ہر تجربے اور حادثے
کو زندگی کی سچائی سمجھ کر پیش کرتے ہیں انھوں نے
زندگی کے ظاہری و معنوی حسن کو شعر کی زبان
دی ہے۔ ان کی زبان بڑی شگفتہ، صاف
اور نکھری ستھری ہے، الفاظ کی خوبصورت
رنگا رنگی اور لب و لہجہ کی نرم و شگفتہ لطافتیں
فکر و احساس کو مسرت اور بصیرت سے
روشن رکھتی ہے۔ ان کے شعروں میں وہم و
خیال کے لامتناہی سلسلے نہیں بلکہ حقیقت
اور سچائی کی روشن منزلیں مسکراتی ہوئی
دکھائی دیتی ہیں۔ وحیدؔ کا قوتِ مشاہدہ بڑا
تیز تھا انھوں نے تہذیب کے آثار اور
عمارتوں میں قدرت کے حسین جلووں کو فرطِ
انبساط سے جھومتے دیکھا۔ انسان کی بے
بسی اور چارہ گری دیکھی۔ ان کا ذہن انسانی
شعور کی تاریخ کا ایک بیکراں پس منظر سموئے
ہوئے تھا۔ وحیدؔ نے زندگی کی کشاکش اور
محرومیوں کی کہانیاں نہیں سنائیں بلکہ تسخیر
کائنات کی آرزو لیے زمین سے اٹھتے ہوئے
اُس انسانی ہاتھ کی طرف اشارے بھی کیے
جو فلک کو چھو رہا ہے اور نئے جہانوں کی
یافت میں سرگرداں ہے۔

وحیدؔ کی شاعری نہ تو احتجاج ہے اور نہ
ہی پروپگنڈہ، بلکہ ان کا جذبۂ تشکیک اور
تذبذب انھیں اَن گنت آسمانوں کی تلاش
پر اُکساتا ہے اس لیے ان کی شاعری کی معطر
ہوائیں روایتوں کے اسیر ذہنوں کے دریچوں
کو کھول دیتی ہیں تاکہ بدلتی ہوئی دنیا کی روشنی
اور تازہ ہوا ملے۔ وحیدؔ نے اپنی شاعری کو
ایک تہذیب عطا کی ہے۔ یہ انفرادیت بہت
کم شاعروں میں ملتی ہے۔

وحیدؔ مادرِ جامعہ کے سپوت تھے اور
انھوں نے اسی جامعہ سے شعور و فکر کی روشنی
حاصل کی۔ ان کے ساتھیوں میں مخدومؔ، اشفاق
حسین، میر حسن، راج بہادر گوڑ اور شہاب
جیسی شخصیتیں شامل تھیں جنھوں نے اپنے اپنے
شعبوں میں کمال حاصل کیا۔ وحیدؔ جامعہ عثمانیہ
سے بے پناہ محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔

(باقی صفحہ ۹ پر)

تسنیم فاطمہ*

نثری نظم کیا ہے؟

تقریباً گذشتہ تیس برسوں سے مختلف رسائل اور جرائد میں نثری نظموں کی شمولیت نے اسے ایک مستقل صنف کی صورت میں ہمارے سامنے لاکھڑا کیا ہے۔ بے شمار شاعر اس نئے تجربے سے دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مستقبل روشن ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا خیال ہے کہ جسے آپ نثری نظم کہتے ہیں، اس کے نمونے ازمنۂ قدیم ہی سے سامنے آرہے ہیں، قدیم الہامی کتابوں سے لے کر قدیم حکایتوں اور تازہ افسانوی تحریروں تک میں نثری نظم کے ٹکڑے عام طور پر مل جاتے ہیں، مگر انھیں آج کے دور سے پہلے شاعری کے زمرے میں شامل نہیں سمجھا گیا تھا۔ بہرصورت اُردو ادب میں یہ ایک نیا تجربہ ہے۔ اس کے بارے میں اُردو ادب کے نقادوں نے کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے، ذیل میں چند ایک ایسے اقتباسات دیئے جارہے ہیں جن سے عام قاری کو یہ معلوم ہوسکے کہ نثری نظم کیا ہے۔

اُردو میں نثری نظم کا نقطۂ آغاز میراجی کو ماننا چاہیئے، اس سلسلے میں دو اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"میراجی کی نظم "جاتری" میں نثری نظم کی طرف چلنے کا اشارہ ملتا ہے، اور ایک معنی میں یہ نظم آنے والے تجربہ کا اعلانیہ بھی معلوم ہوتی ہے۔"
(باقر مہدی)

۴۹ ــــــ ۱۹۴۸ء میں بمبئی سے ایک رسالہ نکلتا تھا۔ "خیال" جو میراجی اور الاختر الایمان وغیرہ نکالتے تھے۔ اس میں کچھ نظمیں چھپا کرتی تھیں۔ اس پر عنوان ہوتا تھا، نثری نظمیں اور شاعر کا نام ہوتا تھا۔ بسنت سہائے۔ اس نام کے آدمی کا غالباً کوئی وجود نہیں تھا۔ نہ اب تک سنا گیا کہ ایسا کوئی آدمی تھا۔ میرا ذاتی قیاس ہے کہ یہ نظمیں خود میراجی لکھ رہے تھے اور انھوں نے اس طرح کا ایک تجربہ کرنے کی کوشش کی تھی جس کو آزاد تلازمۂ خیال کہتے ہیں اور ہر نظم میں تو نہیں، لیکن بعض نظموں میں یہ چیز دیکھی جاسکتی ہے جیسے ان کی نظم ہے "جاتری"۔
(خلیل الرحمن اعظمی)

ان اقتباسات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ میراجی اُردو نثری نظم کے پہلے شاعر ہیں۔ میراجی کے بعد جن حضرات نے نثری نظم کی طرف توجہ کی، ان میں باقر مہدی، بلراج کومل، شہریار، قاضی سلیم، اعجاز احمد، احمد ہمیش، کشور ناہید، انیس ناگی، خورشید الاسلام، ندا فاضلی، صفیہ ادیب، مخمور سعیدی، صادق، عادل منصوری، عتیق اللہ، عبداللہ کمال، یمن رشید، فضل تابش، علی ظہیر، حمید سہروردی، اقبال مسعود، آشفتہ چنگیزی، رشید افروز، شاہد ماہلی، انوار رضوی، پرتپال سنگھ بیتاب، مصحف اقبال توصیفی، مشتاق علی شاہد، چندر بھان خیال، شکیب نیازی، نعیم اشتیاق، سرشار بلند شہری، احتشام اختر، شاہد عزیز، ویریندر، ظفر احمد خلیل، مامون، یعقوب راہی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

"ہمارے یہاں اُردو نثری نظم ایک متنازعہ صنف ہے۔ کوئی اسے نظم کے اصول و ضوابط سے جانچنا چاہتا ہے۔ تو کوئی نثر کے پیمانوں سے، کچھ اک یہ دلیل دیتے ہیں کہ جب مغرب میں نثری نظم مقبول و مروج ہوسکتی ہے تب مشرقی زبانوں خصوصاً اُردو میں کیوں نہیں ہوسکتی۔ کچھ یہ کہتے ہیں کہ اُردو میں نثری نظم اس لیے نہیں چل سکتی کہ سانیٹ اور ترائلے

---

* لیکچرار جے۔ بی۔ ایس کالج، سہارنپور۔ یوجنا اشتی دہلی

نہیں چل سکے، اول الذکر حضرات سے تو یہی پوچھا جا سکتا ہے کہ جب مغرب میں سانیٹ تورترائیلے مقبول و مروج ہو سکتے ہیں تو پھر آپ کے یہاں کیوں نہیں ہو سکتے۔ موخرالذکر اصحاب سے یہ دریافت کیا جا سکتا ہے کہ پھر آزاد نظم آپ کے یہاں کیوں مروج و مقبول صنف ہو گئی؟ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا کوئی کلیہ بنایا ہی نہیں جا سکتا۔"

(شمیم۔ کاف۔ نظام)

"نصف صدی پہلے بھی نثری نظم اس حد تک متعارف ہو چکی تھی کہ مولوی عبدالرحمٰن جیسے قدامت پسند شخص کو بھی اس کا تذکرہ کرنا پڑا۔ نیاز فتحپوری "گیتانجلی" کا نثری ترجمہ "عرض نغمہ" کے نام سے ۱۹۱۲ء میں کر چکے تھے۔ میر ناصر علی "خیالات پریشان" کے عنوان سے ایسی تحریریں ۱۹۱۲ء سے بھی پہلے شائع کرا چکے تھے۔ جن پر نثری نظم کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ جوش صاحب کے پہلے مجموعے "روح ادب" (۱۹۲۰) میں نثری نظمیں شامل ہیں، اس طرح کی چھوٹی بڑی مثالیں بہت ہیں، اس طرز کے مختلف نام بھی رکھے گئے۔ ادبی شہپارے، نثر، شعر منثور وغیرہ۔ وزیر آغا نے جو نام تجویز کیا ہے یعنی نثر لطیف، اس میں کوئی نظریاتی بحث نہیں اگر ادب لطیف اور انشائے لطیف یا نثر لطیف کوئی چیز ہے تو ادب کثیف، انشائے کثیف اور نثر کثیف بھی کوئی چیز ہوگی۔ ادب یا انشا کی حد تک تو کثیف کا تصور پھر بھی سمجھ میں آتا ہے، لیکن نثر کیوں کر "کثیف" ہو سکتی ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ہر چیز سے ہم پچھلی چھ سات دہائیوں سے آشنا ہیں...... نثری نظم بہرحال ایک تجربہ ہے، اس کا خیر مقدم کرنا اور ممکن ہو تو اس تجربے میں مصروف لوگوں کو تعمیری مشورے دینا میرا فرض اور میری داخلی ضرورت ہے۔ میں ہر تجربے کو بہرحال مستحسن سمجھتا ہوں، اور اس کا تجزیہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور اس کا خیر مقدم کرتا ہوں، چاہے اس کے امکانات فوراً ظاہر ہوں یا نہ ہوں۔"

(شمس الرحمٰن فاروقی)

"نثری نظم عروضی آہنگ (رکن کے آہنگ) سے عاری ہے۔ اس کا آہنگ محض لسانی آہنگ ہے، لسانی آہنگ نثر و نظم دونوں میں (جن کا ذریعہ اظہار زبان ہے)۔ قدر مشترک ہے۔ اس لیے نثری نظم کے انفرادی آہنگ کے وجود کا سوال ہی نہیں اٹھتا، اس لیے خارجی آہنگ کی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ نثری نظم محض "نثر" ہے، نظم نہیں۔ جب تک نثری شاعر، نثری نظموں میں "لسانی آہنگ" کے علاوہ کوئی اور آہنگ تخلیق نہیں کرتے، تب تک نثری نظم، شاعری کے خارجی معیاروں کی روشنی میں نظم نہیں کہلائی جا سکتی، نثر ہی کہلائیگی۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس کو نثر لطیف کا نام دیا ہے اور بعض لوگ اسے "شعر منثور" کہتے ہیں......الفاظ کے اعتبار سے نثر کی اقسام پر غور کرنا بھی مناسب ہے، اس سے نثری نظم کے آہنگ پر ایک اور رخ سے روشنی پڑ سکتی ہے۔ الفاظ کے اعتبار سے نثر کی چار قسمیں کی گئی ہیں۔

۱۔ مرجز۔ ۲۔ مقفیٰ۔ ۳۔ مسجع۔ ۴۔ عاری۔ مرجز وہ نثر ہے جس کے دو فقروں کے کلمات متقابل باہم ہم وزن ہوں اور قافیہ نہ رکھتے ہوں، مقفیٰ وہ نثر ہے جس کے دو فقروں کے آخری الفاظ یا درمیان میں متقابل الفاظ ہم قافیہ ہوں، مسجع وہ نثر ہے جس کے دو فقروں کے آخری الفاظ برابر ہوتے ہیں۔ ان تینوں اقسام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم محض الفاظ پر منحصر نہیں بلکہ صوتیات پر ہے۔ ان تینوں قسموں کی نثر میں نثر عاری سے زیادہ نمایاں اور متعین لسانی آہنگ ہوتا ہے۔ مگر یہ نثر کی قسمیں ہیں، شاعری کی نہیں، اس لیے ان میں عروضی آہنگ نہیں ہوتا۔ نثری نظم کا آہنگ ان تینوں سے بھی کمزور ہے۔"

(ڈاکٹر عنوان چشتی)

"نثری نظم اپنی تکمیلی شکل میں نثر اور شاعری دونوں کا تخالف پیدا کر کے بذات خود ایک اسلوب بن جاتی ہے۔ یہ (اینٹی پوئٹری) تخالف شعر ہے۔ یہ نہ صرف شاعری کے مستند لوازمات سے گریز کرتی ہے بلکہ نثر کے تمام تر سانچے کو بھی قبول نہیں کرتی۔

۱۔ یہ مروجہ شاعری کے عروضی پیرائے کو قبول نہیں کرتی۔

۲۔ یہ مروجہ شاعری کے قافیوں اور ردیفوں کو بروئے کار نہیں لاتی۔

۳۔ یہ کسی خارجی رسمی شعری ہیئت کی متابعت نہیں کرتی۔

۴۔ اس میں مصرعوں کی تقسیم، غزل، نظم، یا آزاد نظم یا کسی اور مروّج صنف شعر کے مطابق نہیں ہوتی۔

۵۔ یہ بے ہیئتی کی ہیئت ہے۔

۶۔ یہ منطقی بیانیہ اور تجزیاتی نثر کے اسلوب سے گریز کرتی ہے۔

۷۔ اس میں مصرعہ کی صوریات (Mor-phology) افادی نثر سے مختلف ہوتی ہے۔

۸۔ اس میں نثر کا غیر استعاراتی پیرایہ نہیں ہوتا۔

۹۔ یہ نثر کے تفصیلی انداز سے گریز کرتی ہے۔

۱۰۔ یہ زبان کے بہاؤ کی ایک شکل ہے۔"

(جبتی ناگی)

"ہر نئی شاعری کو نئی زبان چاہیئے، نئی زبان وضع نہیں کی جا سکتی، وہ پرانی زبان کی وراثت

سے تراشی اور نکھاری جاتی ہے۔ اُردو شاعری کی وراثت اسلوب اور کلاسیکیت ہے۔ جو اس قدر گہرائی میں جڑ پکڑی ہوئی ہے کہ اُردو شاعری کو غزل کی مخصوص لفظیات اور اس کے مخصوص پیرائے سے نکلنے میں ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ پُرانی علامتوں کو یا تو نئے معنی دے دیئے گئے ہیں۔ یا انھیں کے طرز پر نئی علامتیں ڈھالی گئی ہیں۔ ریت کا درد، وغیرہ جدیدیت کی اصطلاحیں اور علامتیں اسی قبیل کی ہیں۔ سوال یہ ہے نثری شاعری صرف بحروں کو رد کر دینے کا نام نہیں ہے، نہ وہ محض نثری ترتیب کی بازیافت کا نام ہے، اس کی کامیابی ان دونوں شرائط کو پُورا کرنے کے بعد اپنی شعری اور جمالیاتی استناد کو ثابت کرنے میں مضمر ہے۔ کیا وہ دل کی بات کو بے محابا براہِ راست، جوں کا توں بے کم و کاست بیان کر سکتی ہے، کیا وہ آرائشی کرتبوں سے خود کو بے نیاز کر سکتی ہے کہ اس کے پیرائے پر تصنع یا فیشن کا گمان نہ ہو، مثال کے طور پر نثری شاعری کھڑکی کو دریچہ کہے بغیر کھڑکی ہی لکھ سکتی ہے یا نہیں اور لکھ کر قاری کے اندر حسیاتی بیداری اور تازگی کا احساس پیدا کر سکتی ہے یا نہیں یہ اس پر منحصر ہوگا کہ نثری نظم کے پاس جو کچھ کہنے کو ہے، اس میں کس قدر استناد ہے اور کس قدر تہ داری اور وبازت ہے۔"

(ڈاکٹر محمد حسن)

نثری نظم کے چند نمونے

کندن

کالی، نیلی زرد مٹی
بے بسی سے، خامشی سے
کیسی لیٹی ہے زمین پر
اس کو اک ٹھوکر تو مارو
تاکہ
یہ پتھریلی مٹی
زہریلی، نوکیلی مٹی
آندھی بن کر آسمان پر چھائے
کچھ تو کندن بن کے دمکے
درد بن کر
دھرتی کے دل میں سمائے

(محمد حسن)

بیرونِ دریا

پانی
روشنی
بخارات
ہوا
پانی
یوں زمین حاملہ ہوئی
اور زمیں کی حیثیت باقی نہ رہی
اکلوتی خواہش نے
ان گنت خواہشوں کے جال میں
پھنس کر
دم توڑ دیا

(حمید الماس)

جھوٹ مت بولو
اتنا بڑا جھوٹ مت بولو
جاگتی آنکھوں سے خواب کیسے دیکھے جا سکتے ہیں
تم کو کسی نے سوتے ہوئے نہیں دیکھا
تمھارے خوابوں پر ہم کو یقین کیونکر آسکتا ہے
اور پھر جب ہم ہر حقیقت کو جان گئے
تو خواب کیوں دیکھیں
خواب کبھی حقیقت کو نہیں بدل سکتے
مگر تم شاید کبھی نہیں سنبھل سکتے۔

(شہریار)

بقیہ: دیہی ترقی کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کی افادیت

کل ۰ ۵ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن گوبر کی فراہمی ہو سکتی ہے، اس سے ۲۲۴۲۵ کیوبک ملی میٹر بائیو گیس تیار ہو سکتی ہے جس سے سال میں ۹۰.۴۰ ملین لیٹر مٹی کے تیل کی بچت ہو سکتی ہے۔ گوبر گیس پلانٹوں کے قیام سے متعلق ٹیکنالوجی پہلے ہی دستیاب ہے اور اسے وسیع پیمانے پر عمل میں لانے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ دیہی بھارت میں توانائی کے وسیلے کے طور پر بائیسکل کو استعمال کیا جا سکتا ہے جو کہ ایک عام آدمی کی سواری ہے۔ اسے پیڈی تھریشر، مونگ پھلی کو فصلوں سے الگ کرنے والی مشینوں، پسٹن پمپوں، لکڑی یا دھات پر کام کرنے والی خراد، یا گرائنڈر کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں مدراس کے رُورل اپپروپرئیٹ ٹیکنالوجی سینٹر (Rural Appropriate Technology Centre) نے جس بائیسکل پیڈل پاور کو فروغ دیا ہے اسے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔

۷۵ ارب روپے کی سرمایہ کاری

حکومت نے دیہی ترقی کے لیے بیشتر پروگرام جاری کئے ہیں اور ایک اندازے کے مطابق مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی طرف سے اس مقصد کے لیے ۷۵ ارب روپے خرچ کئے جا چکے ہیں۔ اگر یہ مقصد ابھی تک پُورا نہیں ہوا تو اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ تمام پروگرام الگ الگ شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے نشانے بھی الگ الگ ہیں، اور یہ ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں اور کسی بھی مرحلے پر فیصلہ سازی میں متعلقہ لوگوں کو شامل کئے بغیر فیصلے باہر سے تھوپے گئے ہیں۔ اگر ان میں تال میل ہو تو زیادہ پیداواریت اور آمدنی ہو سکتی ہے۔ کم از کم ہر دس دیہات کے لیے ایک ابتدائی دیہی مارکیٹ، ایک بنک، ایک ڈیمانسٹریشن اور تربیتی مرکز اور ایک ہائی اسکول ہونا چاہیے۔

ایک بات بڑی اہمیت رکھتی ہے، وہ یہ کہ کروڑوں افراد آنے والی کئی دہائیوں تک دیہات میں ہی رہیں گے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دیہات کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا جائے۔ وہاں غذائی پیداوار کے امکانات بڑھیں، دیہی صنعتوں، دیہی دستکاروں اور دیگر دستکاریوں کا تحفظ ہو، پینے کے پانی کی سپلائی بہتر ہو، روزگار کے مواقع بڑھیں اور صحت و صفائی کے حالات سدھار ہو۔

محمد طارق

وفا بالجبر

مجھے اپنے اطراف کا ماحول کیسا اُداس اُداس لگ رہا ہے ... ...

کیاریوں میں لگے ہوئے مختلف پھولوں کے پودے جن میں طرح طرح کے خوشنما پھول اپنی مہک سے فضا کو معطر کر دیتے تھے اُن کی تازگی، جیسے ختم ہو گئی تھی۔ پھولوں کی مہک اُڑ گئی تھی۔

آج جب میں صبح آنگن میں یونہی ٹہل رہا تھا۔ بالکل ایسا ہی محسوس کیا تھا۔ خوشگوار ہوا کے جھونکے مجھے فرحت بخش رہے تھے نہ میں سورج کی کرنوں میں ملائمت محسوس کر رہا تھا۔ ... کچھ بھی تو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ آج۔ کچھ بھی تو نہیں !۔

یہ گھر : جو اب پہلا سا گھر نہیں رہا — مٹی کی دیواروں والا سیدھا سادھا مکان ہے، اب مٹی کی دیواروں کی جگہ سمنٹ اور چونے کی مضبوط دیواروں والی دو منزلہ خوشنما عمارت میں تبدیل ہو چکا ہے جس میں آرام و آسائش کے سارے لوازمات موجود ہیں، لیکن آج ... ...

آج میں اس آرام، سکھ و چین کے لیے ترس رہا ہوں۔ جی چاہ رہا ہے ان پختہ دیواروں کو ڈھا دوں۔ مسمار کر دوں اس خوشنما عمارت کو اور وہ پہلا سا مٹی کا گھر بنوا لوں — جی یہ بھی چاہ رہا ہے کہ ان دیواروں سے چمٹ چمٹ کر ایک بچے کی طرح روؤں — یہاں کی ہر شے کو اپنی باہنوں میں اس زور سے دبوچوں کہ میرا سینہ شق ہو جائے — یہ کیسے متضاد جذبے بیک وقت جنم لے رہے ہیں ...

وہ سوچ رہا تھا۔ چھپر کھٹ پر بچھے ہوئے نرم مخملی بستر پر چت لیٹے، ہتھیلیوں کو سر کے نیچے رکھے —

"کیا سوچ رہے ہیں آپ ؟!" وہ اپنی بیوی کی آواز پر چونکا جو اس کے بازو میں نجانے کب سے بیٹھی اُسے خموش تک رہی تھی۔

"کہاں —، کچھ تو نہیں، کچھ بھی تو نہیں !!"

اُسے اپنی ہی آواز بالکل اجنبی آواز سی لگی جیسے کوئی بہت بیمار اور لاغر آدمی کی آواز۔

یہ جھوٹ میرے لبوں سے کیسا نکلا — جی چاہ رہا تھا کہ بیوی پر اپنے دلی جذبات کا اظہار کر کے اُسے اور رنجیدہ اور افسردہ بنا دوں۔ جی یہ بھی چاہ رہا تھا کہ اپنے دل کے سمندر میں طوفانی لہروں کی طرح اُٹھتے ہوئے غمگین جذبات کے جوار بھاٹا میں تنہا ہی بہتا رہوں — تنہا، نہ کوئی غم کا شریک ہو، نہ کوئی دردِ دل کا آشنا۔

... ... حالانکہ میں خوب جانتا ہوں کہ میری بیوی میرے غم سے واقف ہے۔ وہ سب کچھ جانتی ہے کہ میں کیا سوچ رہا ہوں — میں اُداس کیوں ہوں، پھر بھی مجھ سے پوچھا ہے۔ "کیا سوچ رہے ہیں آپ"

وہ شاید میرے غم میں پوری طرح سے شریک ہو جانا چاہتی ہے۔ مگر میں اُسے بچانا چاہتا ہوں، اُسے بہلانا چاہتا ہوں، اسی لیے میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ "کہاں —، کچھ تو نہیں، کچھ بھی تو نہیں !!"

"اچھا —، تم کیا سوچ رہی ہو !"

"وہی — جو آپ سوچ رہے ہیں !!"

"بتاؤ تو بھلا — میں کیا سوچ رہا تھا !!"

اُس نے اپنی بیوی کے جسم میں ہلکی سی چٹکی لے کر لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر کہا۔

وہ بڑی عمیق تنقیدی نگاہوں سے اُس کے متبسم لبوں کو دیکھ کر کہنے لگی "آج کہہ کر بتانے کا نہیں، صرف محسوس کرنے کا وقت ہے، خاموش محسوس کرنے کا۔ اُس نے اپنے گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نازک لب شوہر کے مسکراتے لبوں پر رکھ دیے اور اپنی باہنیں اُس کی گردن میں حمائل کر دیں۔

شوہر کے کانوں پر اپنی بیوی کے دل کی دھڑکنوں کی آواز ہولے ہولے دستک دے

---

* پوسٹ کھولاپور، ضلع امراوتی (مہاراشٹر)
[illegible]

ہی تھی . . . . . .

اُسے بیوی کے دل کی دھک دھک اپنے دل کی دھڑکنوں کی سی لگ رہی تھی۔

—"ہمیشہ اسی طرح لپٹ کر رہنے کو جی چاہتا ہے۔ اس نرم گرم مخملی رضائی کے اندر سرد رات کی ٹھٹھرتی تنہائیوں میں . . . . . . برسات کی بھیگی راتوں میں تمھارے چوڑے چکلے بھرے بھرے سینے پر سر رکھ کر تمھاری باہوں کی گرفت میں اپنا سارا وجود سونپ کر بے خبر بے فکر سونے کو جی چاہتا ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ وہ اپنے شوہر کے لبوں کا ایک طویل بوسہ لیتے وقت سوچ رہی تھی۔

شوہر کا سارا بدن بیوی کے بوسے کی لذّت سے محروم رہا تھا۔ اُس کی شریانوں میں لہُو کی رفتار تیز ہوئی تھی۔ نہ دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوا تھا نہ اُس کے جسم کا کوئی رُواں چیونٹی کی طرح سرکا تھا۔ بس ایک سناٹا—ایک خموشی، جمود کا تسلّط اُس کے بدن کے سارے کُروں پر چھایا ہوا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے دل کے قبرستانوں میں اپنی ہی تمناؤں کی لاشوں کے کفن نوچ رہا تھا۔

کاش! یہاں کلرکی میں جو مجھے آٹھ نو سو روپے مل رہے تھے اس پر قناعت کر کے زندگی بسر کر لیتا تو شاید مجھے اس قدر روحانی اذیت نہ ہوتی— مگر میرے بھائی، بہنوں کا کیا بنتا۔؟!

ایک بھائی کو انجینئرنگ میں داخلہ کے لیے چار ہزار روپے ڈونیشن مَیں کہاں سے لاتا۔ والدین کی خواہش کے مطابق دوسرے بھائی کو ڈاکٹری پڑھانے کے لیے پیسے کہاں سے آتے۔ بہنوں کے بیاہ کے لیے جہیز اور شادی کرنے کے لیے کثیر رقم کی بھی تو ضرورت ہے۔

والدہ جن پر نجانے کتنے امراض کا حملہ ہو گیا ہے، وہ اپنا علاج کہاں اور کیسے کرواتی تھیں . . . . . . والد صاحب کا بلڈ پریشر نارمل کیسے ہوتا۔

اگر مَیں پردیس نہ جاتا اور نو سو روپے کی بجائے نو ہزار نہ کماتا تو سارے کام دھرے کے دھرے رہ جاتے تھے۔

گھر بھی مٹّی کا ہی رہتا تھا— سیدھا سادھا سا جھونپڑا اور سب کی زندگیاں کس قدر بے کیف، بے رنگ ہو کر رہ جاتی تھیں، مگر کتنی اذیت ہو رہی ہے مجھے، زندگی کا ہر لمحہ درد بھرا ہو گیا ہے۔ اپنوں سے جُدائی کتنی اذیت ناک ہوتی ہے۔ رہ رہ کر تڑپاتی ہے۔ رُلاتی ہے— خموش سسکیوں سے بھری جُدائی— کاش! مَیں یہیں رہتا۔ ہمیشہ میرے اپنوں کے ہمراہ۔

مجھ سے اچھے میرے وطن کے مزدور ہیں۔ دن بھر کڑی محنت کرنے والے، گرمیوں کی دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں تپنے والے، شدید سردیوں میں ننگے بدن ٹھٹھرنے والے، موسلا دھار برسات میں بھیگنے والے مزدور۔ اپنے جھونپڑوں میں ماں باپ، بیوی بچوں، بھائی بہنوں کے ہمراہ رہتے ہیں، اُن کے ساتھ روکھی سوکھی کھا کر چین کی بانسری بجاتے ہیں۔

مَیں وہاں کڑی محنت نہیں کرتا۔ ایئر کنڈیشن آفس میں کُرسی پر بیٹھے بیٹھے فائل کالے کرتا ہوں، لیکن کتنا تھک جاتا ہوں مَیں، جب اپنے فلیٹ میں آتا ہوں تو نڈھال ہو کر نرم بستر پر پڑ جاتا ہوں۔ بدن کا عضو عضو ٹوٹنے لگتا ہے۔ بیوی کے نرم نرم ہاتھوں کی یاد آتی ہے۔ اُس کا چہرہ نگاہوں میں ڈولنے لگتا ہے۔ اُس کی آواز کے فوارے میرے ذہن سے نکل پڑتے ہیں۔ "کیوں—؟ آج آپ بہت تھکے تھکے سے لگ رہے ہیں۔ میں ہاتھ پیر دبا دیتی ہوں۔ لائیے، مَیں سر میں آنولے کا تیل ڈال کر مالش کر دیتی ہوں— اُس کی آواز پے بہ پے رگ رگ میں سماتی چلی جاتی ہے اور میرے اندر جیسے زلزلہ سا آ جاتا ہے مَیں ٹوٹ کر بکھرتا چلا جاتا ہوں . . . پھر بہت سی آوازوں کے ہتھوڑے میرے ٹوٹے پھوٹے وجود کو کوٹ پیٹ کر اور ریزہ ریزہ بنا دیتے ہیں . . . . میرے بچوں کی آوازیں، اُن کی معصوم ہنسی، اُن کی پیاری پیاری باتیں . . . میرے والدین کی شفقت و ممتا سے بھری باتیں— بھائی بہنوں کی محبت بھری آوازیں— لیکن دھماکہ خیز . . . مَیں چور چور ہو جاتا ہوں، عالیشان فلیٹ میں بہترین قسم کے بستر پر اپنے ریزہ ریزہ بدن کو سمیٹنے کی ناکام کوشش میں ایک سرد آہ کھینچ کر رہ جاتا ہوں۔ کچھ نہیں ہوتا صرف میرا سینہ یکدم پھول کر ہولے سے پچک جاتا ہے۔ اُس گیس بھرے غبارے کی طرح جس میں باریک سی کیل سے معمولی سوراخ ہو گیا ہو اور نتھنے پھڑک کر خاموش رہ جاتے ہیں۔ بالکل بے آب مچھلی کے گلپھڑوں کی طرح! آنکھیں آنسوؤں سے چھلک پڑتی ہیں۔ بس اور ظاہر میں کچھ نہیں ہوتا، پھر مَیں جیسے مر جاتا ہوں— لیکن پھر صبح زندہ ہو جاتا ہوں۔ مرنے کے لیے— یہ بار بار مرنا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے"۔

وہ خموش اپنی بیوی کے افسردہ چہرے کو تکتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ جو نا معلوم کب تک اپنے لب اُس کے لبوں پر رکھے سینے سے چمٹی رہتی تھی . . . . . نجانے کب تک— اس کا اُسے احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ جیسے اُس کا سارا بدن اندر سے مر چکا تھا۔ اُس کی حِس مفلوج ہو گئی تھی۔ یہ کیسی قابلِ رحم بے حسی اُس پر چھا گئی تھی۔ کس قدر المناک بے حسی، محرومی، صرف اس کا شعور زندہ تھا جو اُس کی بیوی سے مخاطب تھا۔ ایک کربناک احساس کے ساتھ خموش مخاطب۔

کاش! مَیں تمھیں اور دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لے جا سکتا۔

لیکن [illegible] ــ معلوم ہے کیوں؟

اپنے بچوں سے میرے والدین کو بیحد پیار ہے وہ تمھیں بھی بہت چاہتے ہیں، اور میری بہنیں بھی کتنا دَم چھڑکتی ہیں میرے بیٹوں پر اور تم پر! ان سب کی بیتاب محبتیں اور پیار کی گہرائی دیکھ کر میں تمھیں اُن سے دُور کیسے کر پاتا تھا۔

اُن کے کھِلے ہوئے چہرے مرجھا نہیں جاتے تھے۔!

آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ نہیں جاتی تھیں!؟

لب سِسکیوں سے تھرّا نہیں اُٹھتے تھے۔

اور میں یہ سب کیسے نظر انداز کر سکتا تھا۔ مجھ میں اتنی شکتی نہیں ــ اتنا ضبط نہیں۔ اسی لیے میں تمھیں نہیں لے جا پاتا تھا۔

مجھے احساس ہے کہ میرے بغیر تمھاری زندگی کتنی ادھوری اور کس قدر سونی رہتی ہوگی۔ زندگی کے اس جان لیوا سناٹے میں تم اکثر میری یادوں میں کھو جاتی ہوگی۔ میری یادیں تمھیں اتنی ہی تڑپاتی ہوگی جتنی تمھاری یاد مجھے تڑپاتی ہے۔

مجھے احساس ہے اس اذیت کا جو میرے خاندان کی تعمیر کے لیے تم خاموش سہے جا رہی ہو۔ تم کتنی عظیم ہو، کتنی مقدّس!! فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر وہ اپنی بیوی سے لپٹ گیا اور اس کی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیئے ــ بیوی نے چہرہ اُٹھا کر اپنی آنکھیں مُوند لیں۔ اُس کی پلکوں سے آنسوؤں کے قطرے لُوٹ پڑے......

"کیوں؟ تم رو رہی ہو؟!" وہ اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کی لہروں میں لے کر کہنے لگا۔

"یونہی آنسو نکل گئے، آپ کل صبح جا رہے ہیں نا، اسی لیے..."

"میں نہ جاؤں ــ؟"

"نہیں ــ نہیں، میں نے ایسا کب کہا، آپ جائیے، آپ کے کندھوں پر بہت ساری ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ جنھیں پورا کرنا آپ کا فرض ہے، آپ بالکل رنجیدہ مت ہوئیے... یہ آنسو تو یونہی....."

اُس نے بے اختیار اپنی بیوی کو سینے سے چمٹا لیا' تم ایک عظیم عورت ہو، مقدّس دیوی!'

نہیں ــ نہیں، صرف آپ کی شریکِ حیات"

اس کی بیوی کی بات نے اُس کے کانوں میں جیسے آبِ حیات ٹپکا دیا ہو، وہ اپنے بدن میں تازگی سی محسوس کرنے لگا ــ ایک عجیب قسم کی فرحت' دفعتاً اُس کا جی چاہا کہ وہ اپنی بیوی کو اتنا پیار کرے کہ آج تک کسی مرد نے کسی عورت سے نہیں کیا۔ اسی چاہت کے زیرِ احساس وہ اپنی بیوی کو دیوانہ وار چُومنے لگا...

رات ہولے ہولے ڈھل رہی تھی.....

اُس کے کمرے کے سامنے دالان میں آویزاں پنجرے میں بند طوطا تھوڑی دیر کے لیے پھڑپھڑا کر خاموش رہ گیا تھا۔ شاید وہ نیند سے کچھ دیر کے لیے بیدار ہوا ہوگا۔

کچھ عرصہ پہلے طوطا بِن بلائے مہمان کی طرح اُس کے گھر کی دیوار پر آیا تھا۔ اور اُس کے بھائیوں بہنوں اور بیوی نے اُسے پکڑ کر پنجرے میں بند کر دیا تھا۔ اُس کی "ٹیں، ٹیں" سے اپنا دل بہلانے کے لیے، اور کچھ جملے انھوں نے طوطے کو رٹا دئے تھے۔ جس کا وہ دن بھر اعادہ کرتے رہتا تھا۔ سب اُس کی بولی سُن کر خوش ہوتے تھے، صرف وہی ایک تھا جسے پنجرے میں بند طوطا دیکھ کر دُکھ ہوا کرتا تھا۔ اس لیے اُس نے بارہا پنجرے کے پٹ کھولے تھے۔ لیکن طوطا جیسے اُڑنا بھول گیا تھا۔ بالکل اس طرح جس طرح وہ رات میں اپنی بیوی کا ایک شہد بھرا جملہ سُن کر یہ بھول گیا تھا کہ اُسے صبح جانا ہے...

علی الصبح وہ پردیس چلا گیا۔ اپنے دونوں بیٹوں کو بے انتہا پیار کر کے، اپنی بیوی کو نظر بھر دیکھ کر...... اپنے والدین بھائی بہنوں سے مل کر ــ اُن کی آنکھوں میں آنسوؤں کے اُمڈتے ہوئے طوفان پر ایک اُچٹتی نگاہ ڈال کر اپنی پلکوں میں آنسوؤں کا ٹھاٹیں مارتا سمندر سنبھالے وہ چلا گیا۔ حسبِ معمول سال میں ایک بار دو ماہ کی چھٹی لے کر آنے کے لیے.....

...

وہ برسوں سے سال میں ایک بار دو ماہ کی تعطیل لے کر آتا رہا۔ لیکن وہ اپنی ماں کے انتقال پر نہ آسکا، نہ اپنے باپ کی وفات پر! اُس کا اسے بیحد قلق تھا۔

آج ــ

جب اُس کی بہنوں کی اچھے گھرانوں میں شادیاں ہو چکی تھیں۔ تمام بھائی برسرِ روزگار ہو گئے تھے اور اپنی اپنی شادیاں کر کے الگ الگ گھر بسا چکے تھے اور اُس کے دونوں بیٹے ڈاکٹر بن گئے تھے۔ تب وہ ملازمت سے استعفیٰ دے کر ہمیشہ کے لیے اپنے وطن واپس آگیا تھا۔

اپنی جوانی پردیس میں بِتا کر وہ بوڑھا آنگن میں ایزی چیئر پر بیٹھا تھا ــ سامنے دالان میں آویزاں طوطے کے پنجرے کو چشمے کی اوٹ سے گھور رہا تھا۔

پنجرہ خالی تھا کیوں کہ طوطا مر چکا تھا۔

سامنے دوسری آرام دہ کرسی پر اُس کی بوڑھی بیوی چشمہ لگائے بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔

اسی اثناء میں ان کا بڑا بیٹا آیا۔

"ابو ــ! دیکھئے میں نے پاسپورٹ بنا لیا ہے۔"

"کیوں؟" باپ سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

(باقی ص ۴۵ پر)

تبصرہ (تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

کتاب کا نام: **"خونِ جگر"**

(دھرم پال عاقل کا مجموعۂ کلام)

"خونِ جگر" جناب دھرم پال عاقل کا مجموعۂ کلام ہے جس کا دوسرا ایڈیشن اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن چند برس قبل چھپا تھا۔ جس کے متعلق جناب عاقل لکھتے ہیں: "خونِ جگر" کے پہلے ایڈیشن کی کاپیاں ہاتھوں ہاتھ نکل گئی تھیں مگر میری عدیم الفرصتی کے باعث اس کتاب کی دوسری اشاعت کا انتظام جلد نہیں ہو پایا تھا۔ اور سیکڑوں مزید کاپیوں کی مانگ پوری نہیں کی جا سکتی تھی۔ بدیں وجہ بہت سے تعلیمی اداروں اور اصحاب ذوق کو قدرے مایوسی ہوئی جس کا مجھے افسوس ہے۔" عاقل صاحب کے یہ چند جملے پڑھ کر انھیں دلی مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے کیونکہ آج ہندوستان میں اردو کی جو حالت ہے اس کے پیشِ نظر کسی شاعر کے مجموعۂ کلام کا ایک بار چھپ جانا بھی بہت بڑی بات ہے۔ چہ جائیکہ اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل جائے۔ اور مصنف کو دوسرے ایڈیشن کا اہتمام کرنا پڑے۔ اس نا قدر دانی کے دور میں عاقل صاحب کی مقبولیت اور اردو دنیا کی جانب سے ان کی قدر دانی کی یہ ایک ایسی دلیل ہے جس پر عاقل صاحب جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ اور اس قدر دانی کی ٹھوس بنیادیں ہیں اور وہ ہیں عاقل صاحب کے کلام کی دلآویزی، دلکشی، پختگی اور رعنائی۔ ان خوبیوں نے دھرم پال عاقل کی شاعری کو قبولِ عام کی سند عطا کی ہے۔

"خونِ جگر" غزلوں، قطعوں، نظموں اور رباعیوں پر مشتمل ہے۔ ترتیب میں غزلیں سب سے پہلے ہیں اور نظمیں آخر میں۔ اس سے مختلف اصنافِ سخن کی جانب عاقل صاحب کے رویے کا بھی تھوڑا بہت علم ہوتا ہے۔ دراصل غزل میرے نزدیک محض فارم یا ہیئت کا نام نہیں ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ غزل کے معنی ہیں تغزل یا زیادہ واضح الفاظ میں "روحِ تغزل" اور تغزل ایسی کیفیت ہے جو صرف غزل کے لیے ہی ضروری نہیں ہے بلکہ وہ ہر صنفِ شاعری کی جان ہے خواہ وہ قطعہ ہو، رباعی ہو، مثنوی ہو، ترکیب بند ہو، مخمس ہو یا مسدس ہو۔

عاقل صاحب کی غزلوں کے ساتھ ہی اُن کے قطعوں، نظموں اور رباعیوں کو ایک نظر دیکھنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی غزلیں تو تغزل کی کیفیت سے لبریز ہیں ہی، ان کے قطعات، رباعیات اور ان کی نظمیں بھی تغزل ہی کے کیف و کم میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ سب سے پہلی نظم "مناجات" ہی دیکھئے۔ یہ ایک مناجات ہے۔ اس میں طلبِ فیضان کا طلسمی رنگ نظر آتا ہے۔

دے مرے نطق کو وہ شیرینی
جس سے بڑھ جائے میرا حسنِ کلام
ہو کچھ ایسا سرور شعروں میں
جھوم جھوم اٹھیں شاعرانِ کرام
کوئی پیاسا رہے نہ محفل میں
یوں پلاؤں مئے سخن کے جام

عاقل صاحب جب یہ مناجات کہہ رہے ہونگے تو یقیناً وہ کوئی قبولِ دعا کا لمحہ ہوگا کیوں کہ جس شیرینیٔ نطق اور حسنِ کلام کے لیے انھوں نے دعا کی ہے وہ متاعِ گراں بہا انھیں حاصل ہو گئی ہے۔

"خونِ جگر" کی پہلی غزل:

کہتے ہیں خدا کس کو کون اُس کے سوا جانے

بہت خوبصورت مترنم بحر میں ہے۔ اس بحر کے متعلق اتنا عرض کر دوں کہ علامہ اقبال ایسے کہنہ مشق و قادر الکلام شاعر نے سالہا سال کی مشقِ سخن کے بعد اس بحر میں نظم کہی تھی اور انھوں نے خاص طور سے یہ بات عطیہ فیضی کے نام خط میں لکھی تھی کہ میں نے آج تک اس بحر میں شعر نہیں کہا۔ پہلی بار یہ نظم کہی ہے۔ عاقل صاحب کا اس بحر میں کامیاب غزل کہنا بہت بڑی بات ہے۔

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ابھی میں نے جس مناجات کا ذکر کیا ہے شاید اُسی کا فیض ہے کہ عاقل صاحب کی شاعری اوّل سے آخر تک یقین اور اعتماد سے لبریز ہے۔ بے یقینی اور بے اعتمادی کی شاعری میں بھی ایک حسن ہے اور جوش ملیح آبادی کی شاعری اور اقبال کی شاعری کے بعض حصے اس کا بہت بڑا ثبوت ہیں لیکن یقین، اعتماد اور عقیدت اگر سچ مچ شاعری بن جائیں تو اس شاعری کا بھی جواب نہیں۔ اقبال نے "یقین کم کن گرفتارِ شکے باش" کا درس بھی دیا ہے اور جب امیر مینائی کی غزل سے مسحور ہوئے تو یہاں تک کہہ گئے۔

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیر اقبال!
میں بت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں میں نے

اور گویا اس شعر کے ذریعے سے انھوں نے اپنا سارا یقین اور اعتماد اپنے قاری کے دل میں انڈیل دیا۔

دھرم پال عاقل کے یہاں اسی یقینِ محکم اور عقیدتِ دل کی فراوانی ہے اور انہی خصوصیات کی بدولت ان کی شاعری کے چہرے پر ایک نہ مٹنے والی تابانی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد
شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں
(۳۱ر جولائی ۱۹۸۶ء)

پریم پال اشک

ننھا مُنّا راہی ہوں، دیش کا سپاہی ہوں

بیشتر دانشوروں کی رائے میں ماں کی گود ہی بچے کا پہلا مکتب ہوتا ہے۔ ہمیں بھی اس رائے سے پورا اتفاق ہے۔ ایک بچے کو مہذب، شائستہ اور ذمّے دار شہری بنانے اور اُس میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے گھر سے بہتر کوئی اور مدرسہ نہیں ہو سکتا۔

ہم اب تک یہی سمجھتے آئے ہیں کہ ہمارے فلمی گیتوں میں محض عاشق اور محبوب کی آہ و زاری اور وصال و ہجر کی کیفیات کے بیان اور حسن و عشق کے جذبات کے والہانہ اظہار کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر تعصب کی عینک اُتار کر دیکھیں تو عشق و محبت کے اس گلشن میں ایسے گیتوں کے پھول بھی کھلتے نظر آئیں گے کہ جن میں بچوں میں دیش اور سماج اور قوم کے تئیں ذمّے داری کے احساس کو نہایت خوش اسلوبی اور سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔

ایک بچے کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ وہ زیورِ علم سے آراستہ ہو تاکہ وہ اپنے ملک کا ایک ذمّہ دار شہری بن سکے۔

اگر ہم ساحرؔ مرحوم کا لکھا فلم "چاندی کی دیوار" کا گیت دیکھیں تو ہمیں تو اُس میں ایک نئی ہی مہک محسوس ہوگی، اس میں ساحرؔ نے حروفِ تہجی کے ذریعے تمام حروف کو ایک قومی گیت کے سانچے میں ڈھالا ہے اور اُس کا انداز بھی اتنا موثر ہے کہ وہ بچے کو حفظ ہی نہیں ہو جاتا بلکہ اُسے اس عظیم دیش بھارت کی عظمت کا احساس بھی دلاتا ہے۔

ہمارے والدین کے ساتھ ساتھ اساتذہ کا بھی فرض ہے کہ وہ بچوں کے علم میں اضافے کے ساتھ ساتھ انھیں انصاف کی راہ پر چلنا بھی سکھائیں تاکہ وہ ظلم و تشدّد اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے بھی تیار رہیں۔ غالباً شکیلؔ بدایونی نے اس کی ضرورت شدت سے محسوس کی، اسی لیے فلم "گنگا جمنا" میں انھوں نے ایک اُستاد کی زبان سے کہلوایا:

"انصاف کی ڈگر پہ بچّو دکھاؤ چل کے
یہ دیش ہے تمھارا، نیتا تمھیں ہو کل کے"

ایک اُستاد اپنے شاگرد سے یہی توقع رکھتا ہے کہ وہ پڑھ لکھ کر اُس سے بھی زیادہ علم حاصل کرے اور دُنیا میں شہرت پائے۔ سماج میں اُس کی عزت ہو۔ وہ اپنے والدین کا نام روشن کرے۔ فلم "دیوی" میں ساحرؔ نے ایک اُستاد کی اُمنگوں اور آرزوؤں کو اس طرح سے پیش کیا ہے:

"بچّو! تم تقدیر ہو کل کے ہندوستان کی
باپو کے وردان کی نہرو کے ارمان کی"

اس گیت میں ساحرؔ نے بچّوں کو بھارت ماتا کا سچّا خادم، اور نفرت اور نفاق کے زہر کو محبت اور اتحاد کے امرت میں بدل دینے کی تلقین کی ہے۔ اس کے علاوہ اس گیت میں سماج میں عورت کو ایک اعلیٰ مقام دلانے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا ہے۔

ایک استاد ہی قوم کی تقدیر پلٹ سکتا ہے۔ فلم جاگرتی میں کوی پردیپ نے یہ انقلاب آفریں گیت لکھا۔

"ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے
اس دیش کو رکھنا میرے بچّو سنبھال کے"

اس گیت میں کوی پردیپ نے بچّوں کو قوم کے

۹۳- ایم۔ بنگلہ صاحب روڈ، نئی دہلی
یوجنا، نئی دہلی

انھیں اُن کی ذمے داری کا احساس بھی دلایا ہے
اور یہ تلقین کی ہے۔

" آرام کی تم بھول بھلیّوں میں نہ بھولو
سپنوں کے ہنڈولے میں مگن ہو کے نہ جھولو
اب وقت آ گیا ہے مرے ہنستے ہوئے پھولو
بڑھ کر ہمالہ ناگ مار کر آکاش کو چھولو
تم گاڑ دو گگن پہ ترنگا اُچھال کے

یوں تو ہر سچے دیش بھگت کو اپنے وطنِ عزیز سے بے پناہ محبت ہوتی ہے لیکن بچّوں کو خاص طور پر اپنے ملک سے عقیدت ہوا کرتی ہے۔ اسی لیے شیلیندر مرحوم نے فلم "اب دلّی دُور نہیں" میں بچّوں کی زبان سے یہ کہلوایا ہے :۔

" یہ چمن ہمارا اپنا ہے' اس دیش پہ اپنا راج ہے
مت کہو کہ سر پہ ٹوپی ہے' کہو سر پہ ہمارے تاج ہے
آتی تھی اک دیوالی' برسوں میں کبھی خوشحالی
اب تو ہر ایک دن ایک تہوار ہے"

شیلیندر نے انھیں جذبات کی عکاسی فلم "بوٹ پالش" میں نہایت موثر انداز سے کی ہے۔ ڈیوڈ مرحوم گیت کا ٹکڑا اُٹھاتے ہیں۔

" ننھے مُنّے بچّے تیری مُٹھی میں کیا ہے"
... بچّے گاتے ہیں۔
مُٹھی میں ہے تقدیر ہماری' ہم نے قسمت کو
بس میں کیا ہے"
بھیک میں جو موتی ہے وہ بھی ہم نہ لیں گے
زندگی میں آنسوؤں کی مالا پہنیں گے
مشکلوں سے لڑتے بھڑتے جینے میں مزا ہے

پڑھ لکھ کر ایک مہذب اور شائستہ شہری بننے کی بات' فلم "آدھی روٹی" میں بھرت ویاس نے اس طرح کی ہے :

" جو کچھ بھی مانگیں ہم کو ملے پورے ہونگے ہمارے سوال
ہمارے چاچا جواہر لال
پڑھ لکھ کر ہم سب ہونگے بڑے تو کر دیں گے ہم بھی کمال
ہمارے چاچا جواہر لال
ہر ایک ہم دیش کا سپاہی ہے اور وہ بھارت

ماتا کی عزت و ناموس کے لیے ایک فوجی افسر بننے کا نصب العین ہمیشہ اپنے سامنے رکھتا ہے۔ فلم "جوہرانِ کشمیر" میں بچّہ کہتا ہے :

" ممی میں تو سیکھوں گا گولی چلانا
لیڈر نہ بنوں گا' لیڈر نہ بنوں گا

آگے چل کر بچّہ کہتا ہے :

مجھ کو فوجی آفیسر بنانا
بڑے بڑے یہ باندھ ہمارے
یہ سب کی محنت کے پھل
سبھی ہیں کل کے مندر مسجد'
ہمیں ہیں کل کے تاج محل
دیکھ دیکھ جلتا ہے دشمن' ان کو ہے بچانا۔

جس بچّے کے دل میں ایسا ولولہ ہو' ایسی اُمنگیں ہوں اُس کے والدین اُس پر کیوں نہ نثار ہونے کو تیار رہیں گے۔ اُستاد خود کو کیوں نہ خوش قسمت سمجھتے ہوئے اپنا سر فخر سے اُونچا کریں گے۔

●

بقیہ، اُتر پردیش میں جنگلات اور شجرکاری

سے زمین اور پانی کے کنزرویشن کی ۶ یوجنائیں شروع کی گئی ہیں۔ ان یوجناؤں کے تحت چراگاہوں کی ترقی اور اس میں شجرکاری' زرعی زمینوں کا تحفّظ' پھل دار درختوں کا سروے اور پانی کے تیز بہاؤ کو کم کرنے کے لیے انجنیئرنگ کا استعمال شامل ہے۔ ان یوجناؤں کے علاوہ محکمۂ جنگلات نے پہاڑی علاقوں میں 'انٹیگریٹیڈ واٹر شیڈ مینجمنٹ' کی ایک اسکیم بھی تیار کر رکھی ہے۔ اس اسکیم کو عالمی بینک اور کئی غیر ممالک سے امداد حاصل ہو رہی ہے اس یوجنا کی دیکھ بھال 'پہاڑی ویکاس نگم' کر رہا ہے۔ صوبہ میں جنگلی جانوروں اور پرندوں کے تحفّظ کی یوجناؤں پر بھی عمل درآمد ہو رہا ہے۔ یہاں پر ۴ قومی پارک اور ۱۲ سنکچوریاں ہیں۔ کاربٹ نیشنل پارک اور دھوا نیشنل پارک کی شہرت پورے ملک میں ہے۔

اُتر پردیش میں جنگلوں کی اہمیت کے پیشِ نظر ۲۰ نکاتی پروگرام پر عمل کرتے ہوئے شجرکاری اور زمین سدھار جیسی قومی اسکیموں پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ریاست میں ابھی تک جو کوششیں ہوئی ہیں، وہ قابلِ تعریف ہیں۔ پھر بھی ہمیں اپنا کام جاری رکھنا ہے۔ اور جنگلات کو تحفّظ و ترقّی دینے میں حکومت کو مکمّل اشتراک دے کر شجرکاری کے پروگرام کو کامیاب بنانا ہے۔ درختوں کی نگہداشت کے سلسلے میں ہمارا مقولہ یہ ہونا چاہیے کہ "درختوں کو بچاؤ، یہ تمھیں بچائیں گے۔" ●

بقیہ، وفا بالجبر

" ابّو! میں باہر کسی دوسرے ملک میں سروس کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں کیا ہے' آپ تو جانتے ہیں' وہاں کچھ سال میں آدمی اتنا کما لیتا ہے کہ یہاں ساری زندگی بھی ایڑیاں رگڑ کے تو نہیں کما سکتا!!"

باپ کچھ دیر خموش اپنے بیٹے کو دیکھنے لگا' پھر بولا۔

" بیٹا! پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا' میں خوب جانتا ہوں' پردیس کے کیک سے وطن کی سوکھی روٹی بہتر ہوتی ہے۔"

اُس نے فوراً اپنے بیٹے سے پاسپورٹ لے کر اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ بیوی بُری طرح چونک کر چشمے کی اوٹ سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی... ..

— بیوی کے لبوں پر ایک عجیب تبسم کی معنی خیز مُسکراہٹ تھی۔ ●

طبِ یونانی کا فروغ

مواقع و امکانات

طب یونانی نے جس کا ماخذ یونان ہے عرب ممالک میں بڑا فروغ حاصل کیا تھا ــ یہ روائتی طب کا ایک مقبول عام طریق علاج ہے اور آج بھارت دُنیا کا ایک ایسا ملک ہے جسے اس طریق علاج کو اپنانے میں سبقت حاصل ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یونان میں "ہپوکریٹس" نے اس تصور کو عملی جامہ پہنایا تھا اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کیا تھا لیکن عربوں نے اسے فروغ دے کر ایک جامع طبی سسٹم کی صورت دی تھی۔ جن ممالک میں اس طب نے جنم لیا تھا وہاں وہ بھارت کے مقابلے میں نہایت پسماندہ ہے۔ یہ بات بلاشبہ کہی جاسکتی ہے کہ آج بھارت اس پوزیشن میں ہے کہ اُس نے جو کچھ محض اتفاق سے حاصل کیا تھا اُسے وہ لوٹا سکتا ہے۔ اور اس شعبے میں اپنے وسیع تجربے اور علم میں اس کے باقی ممالک کو شریک کر سکتا ہے۔

جونکہ شاہپور ایشیائے کوچک کے خطے میں ایران کی سرحدوں پر ایک چھوٹا سا علاقہ ہے۔ طلوعِ اسلام کے ساتھ یہ علاقہ عرب سلطنت کے تحت آگیا۔ جب خلفائے عباسیہ ۷۵۰ء میں برسر اقتدار آئے تو انھوں نے علم و سائنس کو فروغ دینے کے لیے متعدد اقدامات کئے۔ یونان کی طبی کتابوں کے عربی اور فارسی میں تراجم کئے گئے اور نئی کتابیں لکھی گئیں جنھیں عرب معالجوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات سے طبی مخزن بنالیا۔ رازی اور ابنِ سینا اُن نامور مصنفوں اور معالجوں میں چند ہستیاں ہیں جنھوں نے اس شعبے میں رہنمایانہ مثالی کام کیا۔ ابنِ سینا کی کتاب "القانون" طب یونانی کی بائیبل تصور کی جاتی ہے۔

جب منگولوں نے ایران اور وسط مشرق کے شہروں ــ شیراز، تبریز اور گیلان کو تاراج کردیا تو علماء اور معالج بھاگ کر بھارت میں پناہ گزیں ہوئے جس کے ساتھ اُن کے ممالک کے اچھے تعلقات تھے.... سلاطینِ دہلی، خلجیوں، تغلقوں اور مغل شہنشاہوں نے تو ان علماء کو سرکاری سرپرستی میں لے لیا اور انھیں اچھے اچھے عہدوں پر فائز کیا اور اکثر کو تو شاہی معالج بھی مقرر کیا جو یونانی معالج بھارت میں آباد ہوگئے تھے۔ انھوں نے دریافت کیا کہ تمام یونانی ادویات بھارت کے مزاج اور آب و ہوا کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ لہٰذا انھوں نے بھارتی ادویات کا استعمال بھی شروع کردیا۔ اُن کے تجربوں کی بدولت نئے ملکی ادویات کو اُن کے اپنے طریق علاج میں شامل کرلیا گیا۔

طب یونانی جس صورت میں بھارت میں رائج ہے وہ اصل یونانی صورت سے کافی حد تک مختلف ہے۔ یہ اس کے وسیع علم اور تجربات کا نتیجہ تھا۔ کہ یہ طریقِ علاج فوراً ہی عوام میں مقبول ہوگیا اور تمام ملک میں پھیل گیا اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد بھی اُس نے صدیوں تک بلاشرکت غیرے اپنا غلبہ جمائے رکھا۔ سمرقند کے محمد شریف اس دَور کے نامور معالج تھے۔ جن کے جانشین حکیم اجمل خاں کا نام نامی بھارت کی طب یونانی میں لازوال شہرت حاصل کرچکا ہے۔

طب یونانی کے نزدیک صحت چار خلطوں یا جسمانی مزاجوں کے توازن کی مرہونِ منت ہے۔ یہ ہیں ــ خون، بلغم، صفرا زرد اور صفرا سیاہ۔ مزاج کو طب یونانی میں اہم ترین مقام حاصل ہے اور اس کی بنا پر ہی تشخیص، معائنہ اور علاج کیا جاتا ہے۔ اِن خلطوں میں کسی بھی تبدیلی سے صحت میں خرابی آجاتی ہے۔

غذا کو اہمیت

جسم انسانی کے یہ عناصر ہضم شدہ خوراک سے بنتے ہیں۔ لہٰذا یونانی اطباء موزوں غذا اور نظامِ ہضم کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور ان عناصر میں بے ترتیبی کو دُور کرنے کے لیے دُرست غذا کے علاوہ ادویات بھی تجویز کرتے ہیں طب یونانی میں ابتدائی طور پر قدرتی ادویات استعمال کی جاتی ہیں۔ جن میں ۲۵۰۰ اقسام کی جڑی بوٹیاں شامل ہیں۔ اور ان میں سے کوئی ۱۵۰۰ بھارت میں ہی پائی جاتی ہیں۔ ادرک، لہسن، سونا، چاندی، موتی اور دیگر دھاتوں کے کُشتے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔

یونانی ادویات مفردات یا مرکبات کی صورت میں دستیاب ہیں۔ عموماً مفردات ہی استعمال کیے جاتے ہیں۔ کیوں کہ اُنھیں زیادہ مؤثر خیال کیا جاتا ہے۔ تاہم یونانی ادویات کسی بھی صورت میں ایلوپیتھی کی مصنوعی ادویات کی مانند ضمنی اثرات پیدا نہیں کرتیں اور نہ ان کے کھانے کے بعد کوئی خرابی ہوتی ہے۔

ادویات اُس وقت دی جاتی ہیں جب طبعیاتی ذرائع اور غذائیں مرض کا علاج کرنے میں قاصر رہتی ہیں۔ دوائی کی مقدار کس قدر ہو اس کا تعین اس امر سے کیا جاتا ہے کہ مریض کا مزاج کیسا ہے۔ اور عمر کتنی ہے۔ اور مرض کی نوعیت کیا ہے، مرض کی شدّت اور دوائی کا اثر ذہن میں رکھا جاتا ہے۔

یونانی ادویات کا میٹریا میڈیکا بہت وسیع ہے اور اس کی ادویات آسانی سے دستیاب ہیں کیوں کہ وہ مقامی طور پر مل جاتی ہیں۔ عرب معالج بعض خصوصی اور پیچیدہ امراض کے لیے خصوصی تکنیکوں کا استعمال کرتے تھے جن میں سے بیشتر اب مستعمل نہیں ہیں۔ صرف اُن میں سے ایک "محجم" کا دلی کے ایک شفا خانے میں احیاء کیا گیا ہے۔ اس تکنیک میں جوڑوں کے درد میں ایک پیالہ خاص ڈھنگ سے متاثرہ جگہ کے پاس رکھا جاتا ہے جو تمام درد کھینچ لیتا ہے اور وہ دوبارہ نہیں ہوتا۔ اس طریقے سے شیٹیکا (ٹانگ کا تڑپا دینے والا مرض) امراضِ جگر، تلّی کی خرابیوں، بواسیر، فوطوں میں سوزش، پھوڑوں، کثرتِ حیض کا بھی علاج کیا جاتا ہے۔

طب یونانی غذا کی مقدار اور نوعیت کو منضبط کر کے بعض عوارض کے علاج پر زور دیتی ہے۔ اُس کا عقیدہ ہے کہ غذائیں معالجاتی اثر پیدا کرنے کی استعداد رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر بعض غذائیں ملیّن، پیشاب آور اور پسینہ آور اوصاف رکھتی ہیں۔ انڈے توانائی کے لیے غذا کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں اور ہڈیاں ٹوٹنے پر درد کو دُور کرنے اور گنجے پن کے علاج کے لیے بیرونی طور پر بھی انڈوں کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ سابودانہ اسہال کے لیے اچھا ہے۔ بعض اعضا کی کمزوری کو دُور کرنے کے لیے جانور کے اُن ہی اعضا کو غذا کی صورت میں کھلایا جاتا ہے مثال کے طور پر جگر کی کمزوری اور بیماریوں کے لیے مریض کو جانور کا جگر کھلایا جانا چاہیئے۔ اسی طرح دل، گُردے اور مغز انہی حصّوں کے امراض کے لیے کھلائے جانے چاہئیں۔

بھارت میں طب یونانی کے ۱۴ کالج ہیں جو مختلف یونیورسٹیوں سے ملحق ہیں۔ "بی۔ یو۔ ایم۔ ایس" (بیچولر آف یونانی میڈیسن اینڈ سرجری) کی ڈگری دی جاتی ہے۔ جدید مغربی طب اور روایاتی یونانی طب کی ملی جلی تعلیم سے یونانی اطباء کو اپنے جدید مد مقابلوں پر سبقت حاصل ہے۔ طبیبوں کی انڈین میڈیسن سنٹرل کونسل میں رجسٹریشن کی جاتی ہے۔ مختلف مضامین میں ۳ برس کی پوسٹ گریجویٹ تربیت سے ایم ڈی کی ڈگری دی جاتی ہے۔ بھارت سرکار "نیشنل انسٹی ٹیوٹ فار یونانی میڈیسن" کے قیام پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔ جو اعلیٰ تعلیم کا ایک مرکز ہوگا۔ دلّی میں دو کالج ہیں ۔۔ ایک طبیہ کالج قرول باغ میں ہے جو حکیم اجمل خاں نے جاری کیا تھا۔ یہ دونوں میں پُرانا ہے۔ دوسرا ہمدرد نگر کے احاطے میں واقع ہے جسے حکیم عبدالحمید نے کھولا تھا۔ وہ ایک نامور یونانی معالج ہیں اور ۱۹۶۵ء میں پدم شری اور ابنِ سینا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔

یونانی طریقِ علاج کا تحقیق اور کھوج کے بارے میں ریکارڈ نہایت شاندار رہا ہے۔ حکیم اجمل خاں نے اس سلسلے میں ۲۰ ویں صدی کے اوائل میں بہت اچھا کام کیا تھا۔ لیکن باقاعدہ تحقیق و مطالعہ بھارت سرکار کی زیرِ سرپرستی ۱۹۶۹ء سے شروع ہوا جبکہ اس کی طرف سے "بھارتی طب اور ہومیوپیتھی میں تحقیق سے متعلق مرکزی کونسل" کا قیام عمل میں لایا گیا۔ بعد ازاں یونانی طب میں تحقیق سے متعلق مرکزی کونسل کی صورت میں ایک خود مختار ادارہ صحت و خاندانی بہبود کی وزارت کے تحت قائم کیا گیا تاکہ طب یونانی کے متعدد پہلوؤں میں مربوط سائنسی تحقیق و مطالعہ کو شروع کیا جائے اور اُسے فروغ دیا جائے۔ اس پروگرام میں معالجاتی تحقیق اور یونانی ادویات کی معیار بندی شامل ہے۔

سرِدست ملک بھر میں پھیلے ہوئے اس ادارہ کے ۲۹ مختلف یونٹوں میں ۱۹۔ امراض کے بارے میں تحقیق کی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں پھلبہری، آشوبِ چشم، ایگزیما، جوڑوں کے درد وغیرہ کے علاج میں نمایاں کامیابی ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ بچوں کے اسہال، السر، پیچش، ذیابیطس، سیلانِ الرحم، گُردے اور مثانے کے امراض میں تحقیق و مطالعہ کیا جا رہا ہے اور ضبطِ تولید کے لیے خوردنی ادویات

(باقی صفحہ ۲۷ پر)

قارئین کی آراء اور مشورے

بامقصد صحافت: آپ نے تو بامقصد صحافت اور ادب کے ڈانڈے اس طرح ملا دیئے کہ 'نیا یوجنا' دیکھ کر بے اختیار منہ سے داد نکل گئی۔ عمدہ ادبی مضامین، افسانے اور انشائیے اور معیاری غزلوں اور نظموں کے دوش بدوش ایسے مضامین آپ نے اس شمارے میں شامل کئے ہیں جن سے اُردو کا دامن تقریباً خالی ہے۔ مثلاً انسانی ذہن کی نشوونما اور ٹیلی ویژن۔ دیہی بچوں کی تعلیم میں ٹی۔وی کی افادیت۔

عام طور پر ایسے معلوماتی مضامین خشک رسائل میں شائع ہوتے ہیں۔ تو سر سے گزر جاتے ہیں اور لوگوں کے مطالعہ میں نہیں آتے۔

آپ سے اتنی گزارش اور ہے کہ اس کی ضخامت اور بڑھا دیں تو اس پرچے میں مزید مضامین آ سکیں کیونکہ یہ پرچہ اب پندرہ روزہ سے ماہنامہ ہو گیا ہے۔

تبصرہ آپ بہت اچھا کرتے ہیں۔ اور آپ کے حسن ادارت کا تو میں پہلے سے قائل ہوں۔

ایک بات اور۔ ادبی خبروں کا بھی ایک آدھ کالم شروع کر دیجئے۔

رفعت سروش۔ ڈی ۲۔ اے، ڈی ڈی اے فلیٹ منیرکا نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷ ●

ملک کی اقتصادی اور سماجی منصوبہ بندی سے متعلق یوجنا (اُردو) نے جو معیار قائم کیا ہے، وہ قابل تحسین ہے۔ مختلف شعبوں جیسے زراعت، صنعت [illegible] سے تعلق رکھنے والے مضامین جو [illegible] ہوتے ہیں وہ کافی معلوماتی و [illegible] مزید دلچسپ و مفید بنانے [illegible] مختصر اور معیاری [illegible]

[illegible]

لیے ملک کی مختلف زبانوں کی کہانیاں (اُردو ترجمہ) بھی شائع کئے جائیں۔ مسعود جعفری

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف شوگر کین ریسرچ لکھنؤ ●

سب سے پہلے تو میں آپ کو اس بات کی مبارکباد دوں گا کہ آپ نے اُردو زبان میں یوجنا کی اشاعت کا کام شروع کیا اور اسے معتبر اور قابلِ ذکر رسالہ بنایا۔ بحیثیت یونیورسٹی لائبریرین مجھے اکثر و بیشتر ایسے طلباء سے سابقہ پڑتا رہتا ہے جو اعلیٰ تعلیم کیلئے اُردو کو ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی دشواری اُردو زبان میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی موضوعات پر معیاری مواد کی دستیابی ہے۔ آپ کا رسالہ اس طرح کے مضامین چھاپ کر ملک کے ایک بڑے طبقہ کی ضرورت پوری کر رہا ہے۔ شہاب الدین انصاری

ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ ●

یوجنا اُردو اور غیر اُردو حلقے دونوں میں بیحد مقبول ہے۔ سماجی اور معاشرتی اور سائنسی عنوانات سے یوجنا پوری طرح مرصع ہے۔ جو بھی آپ نے اپنے طور پر کاوشیں کی ہیں وہ بہت عمدہ ہیں۔ میں صرف دو باتوں کی طرف آپ کا دھیان دلانا چاہوں گا:

۱۔ یوجنا کا (Cover Page) بہت دلکش ہونا چاہئے اور اس میں دئے گئے سب سے عمدہ مضمون کو لے کر کور پیج پر تصویر دینا چاہئے۔ مثلاً میں نے انٹارکٹیکا پر کئی مضامین لکھے جو یوجنا (اُردو) میں چھپے اگر (Cover Page) پر انٹارکٹیکا کا نقشہ دے دیا جاتا یا اُن لوگوں کی تصاویر دی جاتیں جو سربراہ و مہم انٹارکٹیکا گئے اور بڑا عظم پر گئے تھے تو وہ بیحد دلکش بھی ہوتے اور جاذب نظر بھی ہوتے۔

[illegible] طور پر یوجنا (اُردو) ایک بہترین رسالہ ہے

جو بہت مستعدی اور پابندی سے ہر ماہ دو شمارے کی شکل میں آتا رہتا ہے۔ اردو ادب کی خدمت اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے؟ ڈاکٹر اقبال محی الدین

این۔سی۔ای۔آر۔ٹی، نئی دہلی ●

یوجنا کی نئی سیٹنگ قابلِ تعریف ہے، اس کو دلچسپ اور زیادہ مفید بنانے کے لیے اٹھایا گیا یہ پہلا قدم ہے۔ اُمید ہے یوجنا میں غزلوں، نظموں، کہانی اور اور کتابوں پر تبصروں کی شمولیت سے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ میری حقیر رائے یہ ہے کہ یوجنا (اُردو) میں ملک کی نامور شخصیتوں کے انٹرویو بھی شامل کئے جائیں۔ رفعت سروش کا مضمون "رام پرساد بسمل" پسند آیا۔ ابو سعد۔ لیکچرار شعبۂ جغرافیہ

گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج

کوٹ دوار، پوڑی گڑھوال (یو۔پی) ●

آپ کا پرچہ مجموعی طور پر دوسرے اردو پرچوں کے مقابلے میں کاغذ، طباعت، گیٹ اَپ اور مضامین کے اعتبار سے کافی بہتر ہے اس کے باوجود اسے مزید مفید بنایا جا سکتا ہے۔

میں نے جس قدر بھی پرچے دیکھے ان سے میں اسی نتیجے پر پہونچا کہ معاشی زندگی سے متعلق مضامین پر زیادہ زور ہے جبکہ تعلیم اور پُرسکون سماجی زندگی حقیقی معاشی ترقی کے لیے بنیادی رول ادا کرتی ہے۔ میری رائے ہے کہ سماجی مسائل اور ترقی کے لیے تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر بھی مضامین شامل کئے جائیں کہیں ایسا نہ ہو کہ فکر معاش کے چکر میں ہم زندگی کے حقیقی حسن سے ہی محروم ہو جائیں۔

ڈاکٹر قمر الدین، این۔سی۔ای۔آر۔ٹی، نئی دہلی ●

بامقصد کہانیوں کو آپ 'یوجنا' میں شائع کریں۔ بیکاری کی وجہ سے بہتیرے حضرات اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور اُن کا حوصلہ پست ہو رہا ہے۔ براہ کرم مضامین اور افسانوں کے ذریعے پست حوصلہ رکھنے والوں کا ارادہ مستحکم اور مضبوط بنائیں۔ یہ قوم کی بڑی خدمت ہوگی۔

[illegible] ●

اقبال کی اُردو فارسی شاعری

مشہور دانشور جناب سید حامد، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے "اقبال کی اُردو اور فارسی شاعری پر سرسری تقابلی نظر" کے زیرِ عنوان نہایت پُرمغز مقالہ پڑھا۔

غالب اکیڈمی کے سکریٹری جناب زہین نقوی نے تقریب کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال اُردو شاعری کی آبرو ہیں۔ انھوں نے انسانی اقدار کو جو عظمت بخشی ہے وہ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں کم نظر آتی ہے۔ علامہ اقبال کا پیغام عالمگیر ہے وہ نہایت اثر آفریں طریقہ سے بیداری اور عمل کی تعلیم دیتے ہیں انھوں نے اس موقع پر فرمایا کہ یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ ایران کی جدید نسل اقبال کو فارسی کا عظیم شاعر تسلیم کرتی ہے۔ آپ نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ غالب اکیڈمی نے اقبالیات پر بھی اہم مطبوعات شائع کی تھیں۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، صدر شعبۂ اُردو دلی یونیورسٹی نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اقبال نے اپنی بلند آہنگ فکر سے ملکی وغیرِ ملکی، جماعتی اور گروہی حدوں کو توڑا۔ آپ نے مزید فرمایا کہ اگرچہ اقبال کے فکر وفن پر بہت کام ہوا ہے مگر اقبال کی شعریات کا مطالعہ ابھی تک تشنہ ہے۔

ممتاز ماہرِ غالبیات جناب مالک رام نے تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ اقبال کے مفسرین وشارحین نے اقبال کے کلام اور اس کی فکر کو سمجھنے کے بجائے اپنے اخذ کردہ مفاہیم پر زیادہ زور دیا ہے۔

جناب سید حامد نے اپنے اہم مقالہ میں اقبال کی اُردو اور فارسی منظومات کا فکری اور فنی اساس پر مختصر تقابلی جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ اقبال نے ایک ایسے وقت فارسی شاعری شروع کی جبکہ فارسی دانی کا سلسلہ اُٹھ چکا تھا اس کے باوجود فارسی میں ایسی برگزیدہ شاعری کی کہ آج ایران کے بیشتر دانشور اقبال کو دورِ جدید کا عظیم شاعر مانتے ہیں آپ نے مزید فرمایا کہ اقبال کی فارسی نثر ان کی شاعری کی زبان اسلوب و آہنگ کے مقابلے میں کمزور ہے مگر ان کے شاعرانہ الہامی وصف نے ان کے فارسی کلام کو اس قدر بلند آہنگ بنا دیا کہ اسے پیغمبرانہ درجہ نصیب ہوا۔ اقبال کی شاعری ملٹن اور دانتے کی شاعری کی ہم پلہ ہے۔

جناب سید مظفر حسین برنی صدرِ جلسہ نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ اقبال عظیم بلند پایہ مفکر اور خلاق شاعر تھے۔ موصوف نے ایرانی دانشوروں کی رائے کے حوالہ سے فرمایا کہ اقبال نے فارسی شعریات میں اپنا ایک نیا اسلوب و آہنگ ایجاد کیا تھا اور آج ایران کی نئی نسل ان کے اسٹائل کو اپنا رہی ہے۔ اقبال عہدِ حاضر کا سب سے عظیم شاعر ہے جس کا پیغام آفاقی اور دائمی ہے۔ غالب اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ کے فاضل رُکن جناب خواجہ حسن ثانی نظامی نے مقررین اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

آخر میں مشہور گلوکار جناب صاحب سنگھ نے اقبال کا کلام پوری نغمگی کے ساتھ ساز اور لحن کے ساتھ پیش کیا۔ علامہ اقبال کی یاد سے وابستہ اس یادگار تقریب میں دلی اور بیرونی دلی کے ادیبوں اور دانشوروں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

●

اُردو فاؤنڈیشن کا جلسہ

اُردو فاؤنڈیشن کے ماہانہ ادبی جلسے کا انعقاد ۳۰ راکتوبر کو منیر کا میں عمل میں آیا۔ اس ادبی نشست میں کناڈا سے آئے ہوئے مشہور شاعر اور نقاد جناب شاہین نے بحیثیت مہمان خصوصی کے شرکت فرمائی۔ اس جلسے کی صدارت مشہور افسانہ نگار جوگندر پال نے کی۔ صاحب طرز افسانہ نگار جناب ظفر پیامی نے اپنا تازہ افسانہ سُنایا۔ ممتاز مرزا صاحب نے اپنے کلام اور اطہر فاروقی نے ایک مقالہ سے نوازا جلسے کے آغاز میں اُردو فاؤنڈیشن کے روحِ رواں جناب رفعت سروش نے کناڈا سے آئے ہوئے مہمانِ خصوصی جناب شاہین صاحب کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ شاہین صاحب نہ صرف ایک اعلیٰ پائے کے شاعر ہیں بلکہ کناڈا جیسے دُور دراز علاقے سے اُردو ادبیات سے متعلق ایک انگریزی جریدہ نکال رہے ہیں جو اُردو کا بین الاقوامی وقار بڑھانے میں بڑا کام کر رہا ہے۔

سب سے پہلے نوجوان نقاد جناب اطہر فاروقی نے رفعت سروش کی کتاب "مری صدا کا غبار" پر ایک مختصر مضمون پڑھا۔ جسے مجموعی طور پر پسند کیا گیا۔

مقالہ پر اظہار فرماتے ہوئے جناب ظفر پیامی نے کہا کہ قابلِ تعریف بات مقالہ نگار کی زبان ہے۔ صاف لب و لہجے میں بات کہی گئی ہے، پیشہ ور نقادوں کی طرح اُلجھی ہوئی زبان اور طرزِ تحریر سے گریز کیا گیا ہے اور رفعت صاحب کی شاعری کے محاسن پر کتاب کے حوالے سے خوب روشنی ڈالی گئی ہے۔ انھوں نے مقالہ نگار کی اس رائے سے اختلاف کیا کہ رفعت صاحب نے ترقی پسند تحریک اور ادب کو کوئی فائدہ نہیں پہونچایا اور کہا کہ ان کا کلام ترقی پسند ادب کا قابلِ قدر حصہ ہے۔

شاہین صاحب نے کہا کہ یہ مقالہ نوجوان مقالہ نگار کی قابلِ تعریف کوشش ہے اور انھوں نے رفعت صاحب کے کلام پر کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے اور محاسن کا بجا طور پر اعتراف کیا ہے۔

جوگندر پال صاحب نے کہا کہ فاروقی صاحب ابھی نوجوان ہیں اور انھیں یہ بتلانا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ یہ مقالہ بے سمتی کا شکار ہے اور مقالہ نگار کسی ایک بات کو واضح کرتے تو زیادہ اچھا تھا۔

اطہر فاروقی صاحب کے مقالہ کے بعد جناب ظفر پیامی نے اپنا تازہ افسانہ "بجائی سلیٹوں والے" پڑھا۔ پنجاب کے پس منظر پر مشتمل یہ افسانہ نہایت دلچسپ پیرائے میں شروع ہوا، اور حاضرینِ بزم نے پوری توجہ اور انہماک سے اس طویل افسانے کو سُنا اور بعض بعض جگہ بے ساختہ واہ نکل گئی۔ اس افسانے میں پنجاب کی ہریالی، خوشحالی اور زندہ دلی کے رقصوں کے ساتھ موجودہ بے اطمینانی اور قتل وغارت کو بھی نہایت چابکدستی سے پیش کیا گیا۔ اور افسانہ نہایت فنکارانہ طریقے سے انسانیت کی اعلیٰ اقدار کے فروغ کے لیے کام کرنے کے جذبات کو اُجاگر کر کے اپنے کلائمکس

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi.

Vol. 6 No. 17-18 YOJANA (URDU) 1-31 December 1986

برج کشور ایڈوکیٹ

شہروں کے غریب افراد کی امداد کی اسکیم

غریبی ہٹانے کا نعرہ سابق وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے دیا تھا۔ لیکن انھوں نے واضح الفاظ میں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ہمارے پاس کوئی جادو کی چھڑی نہیں ہے جس سے یہ مقصود آناً فاناً میں حاصل ہو جائے۔ اس کے لیے ہر سطح پر پُرزور کوششیں کرنی ہوں گی ۔ حکومت کی سطح پر ان کی سرکردگی میں ایک بیس نکاتی پروگرام شروع کیا گیا جس کا مقصد ملک کی ہمہ جہت ترقی تھا۔ اس کے علاوہ زرعی و صنعتی ترقی، اشاعتِ تعلیم، فراہمیٔ روزگار وغیرہ کے بہت سے پروگرام بھی شروع کئے گئے تاکہ جو لوگ غریبی کی سطح سے نیچے اپنی گذر بسر کر رہے ہیں ان کی حالت کو بہتر بنایا جائے اور ملک کے عوام کا معیارِ زندگی بلند کیا جائے۔

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے نہ صرف ان پروگراموں کو جاری رکھا ہے بلکہ ان میں حسبِ ضرورت توسیع و اضافہ کیا ہے۔ گذشتہ دنوں ان کا ایک نظرِ ثانی شدہ بیس نکاتی پروگرام پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا۔ جس میں منجملہ دیگر امور کے، غریبی ہٹانے، زیادہ روزگار پیدا کرنے، آمدنیوں کے فرق کو کم کرنے، پیداواریت اور پیداوار بڑھانے، سماج میں عورتوں کو مساوی درجہ دینے، نوجوانوں کے لیے تعلیم و روزگار کے بہتر مواقع فراہم کرنے وغیرہ پر زور دیا گیا۔ غریبی ہٹانے کے ضمن میں واضح طور پر کہا گیا کہ یہ پروگرام ہر گاؤں کے غریبوں تک پہونچنا چاہیئے۔ اور انھیں روزگار کے زیادہ مواقع فراہم کئے جانے چاہئیں۔ اس کے لیے دیہی صنعتوں، ہتھ کرگھوں اور گھریلو دستکاریوں کی توسیع کی جانی چاہیئے نیز اپنا روزگار آپ شروع کرنے کے لیے تربیت اور مالی امداد دی جانی چاہیئے۔

غریبی جہاں دیہات میں اپنی بدترین شکل میں موجود ہے وہاں یہ شہری علاقوں میں بھی بے شمار لوگوں کو مفلسی اور لاچاری میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ حکومت اس سلسلے میں بھی موزوں اقدامات کر رہی ہے۔ چنانچہ یکم ستمبر سے شہری علاقوں میں اپنا روزگار آپ چلانے والے غریب افراد کے لیے ایک اسکیم شروع کی گئی ہے۔ یہ اسکیم ان تمام قصبوں اور شہروں میں نافذ کی جائے گی جن پر مربوط دیہی ترقی کا پروگرام لاگو نہیں ہے۔ اس کے تحت رکشا والوں، کپڑا بُننے والوں، جوتے مرمّت کرنیوالوں، فرنیچر سازوں، کمہاروں، سبزی فروشوں، دھوبیوں، چھاپہ خانوں کے کارکنوں، مونگ پھلی بیچنے والوں، نل کی مرمّت کرنے والوں، کرسیاں بُننے والوں، پان بیڑی بیچنے والوں، کاغذ کے لفافے اور پولی تھین کی تھیلیاں بنانے والوں، دودھ والوں، مچھلی فروشوں اور بیڑیاں بنانے والوں اور ایسے ہی دوسرے چھوٹے چھوٹے کاموں سے روزی کمانے والے غریب طبقے کے افراد کی مدد کی جائے گی۔

اسکیم کے تحت قرضہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوگا کہ درخواست دہندہ اس شہر یا قصبے کا مستقل باشندہ ہو اور وہاں کم سے کم تین برس سے رہ رہا ہو، اس کے نام کا راشن کارڈ موجود ہو اور اس کے کنبے کی آمدنی چھ سو روپے ماہوار سے زیادہ نہ ہو نیز اس نے کسی اور اسکیم کے تحت کسی بنک سے قرضہ نہ لے رکھا ہو۔ نئی اسکیم کے تحت قرض لینے والوں کو صرف ۷۵ء۹ فیصد رقم واپس ادا کرنی ہوگی۔ بقیہ رقم سرکاری امداد شمار کی جائے گی۔ اسکیم کے تحت امداد کا مستحق کوئی بھی شخص پانچ ہزار روپے تک کا قرضہ لے سکیگا جس پر اسے دس فیصد سالانہ کی شرح سے سود ادا کرنا ہوگا۔ مرکزی حکومت بنکوں کو ۲۵ فیصد سرمایہ جاتی امداد فراہم کرے گی۔ قرض لینے والوں کو قرضوں کی بازادائیگی تین ماہ کی رعایتی مدّت کے بعد ۳۳ ماہانہ مساوی قسطوں میں کرنی ہوگی۔

شروع میں ہر پانچ سو شہری افراد میں

(باقی صفحہ ۲۵ پر)

* عیش باغ گیٹ ہشنکر ریال روڈ، لکھنؤ۔

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یکم تا ۳۱ جنوری ۱۹۸۷

اتر پردیش ترقی کی راہ
پر تیزی سے گامزن
(ہرش اروڑہ)

دو روپے

نئی غزل کی نمائندہ
آوازیں
(آل احمد سرور)

غزلیں، نظمیں، انشائیہ

آئندہ شمارہ قومی یکجہتی کے
موضوع پر، اس کے چند مشہور قلمکار
۱۔ پروفیسر این۔ جی۔ رنگا ۲۔ پروفیسر رئیس احمد
۳۔ سید مظفر حسین برنی ۴۔ مالکم ایس ادی سیشیہ
۵۔ چتا بسو ۶۔ پروفیسر بشیر الدین، ۷۔ ایس ایم
جوشی ۸۔ کے۔ ایم۔ پانیکر اور متعدد دیگر دانشور۔

راشٹرپتی کے ہاتھوں اُردو کتاب کا اجرا

زبان کا تعلق مذہب سے نہیں جوڑنا چاہیئے

کیونکہ یہ اپنے علاقے کے لوگوں کا ذریعۂ اظہار ہوتی ہے اور انھیں کی دسترس میں رہتی ہے۔ جو لوگ اِسے مذہب سے منسلک کرتے ہیں وہ یا تو کم عقل ہوتے ہیں یا ان کے مقاصد درپردہ کچھ اور ہوتے ہیں۔ زبان کسی مذہب کی پابند ہو ہی نہیں سکتی۔ مثلاً اگر اُردو مسلمانوں کی زبان ہوتی تو دنیا کے تمام مسلمان اسی ایک زبان کو اپناتے لیکن ایسا نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہندی کو کسی مذہب سے جوڑنا اس سے سراسر ناانصافی ہوگی۔

ان خیالات کا اظہار راشٹرپتی گیانی ذیل سنگھ صاحب نے گیارہ دسمبر کو اُردو کی ایک کتاب کی رونمائی کرتے ہوئے کیا:

اس کتاب کا عنوان "مالک رام ۔ ایک مطالعہ" ہے اور اس میں ہندوستان اور پاکستان کے دو درجن ادیبوں نے اُردو کے بزرگ محقق اور مصنف جناب مالک رام کے ادبی کام کا جائزہ لیا ہے۔ موصوف جن کی عمر ۲۲ دسمبر کو اسی سال کی ہوگئی ہے، پچھلے ساٹھ سال سے اُردو زبان اور ادب کی خدمت کر رہے ہیں اور اب تک تقریباً ۵۵ کتابیں اور خیالات سے بھرے ہوئے تقریباً دو سو مضامین چھاپ چکے ہیں اور ابھی مزید لکھے جا رہے ہیں۔

کتاب کے مرتب جناب علی جواد زیدی ہیں جو خود بھی اُردو کے ممتاز ادیب اور شاعر ہیں، تقریباً ۵۰ کتابیں لکھ چکے ہیں۔

کتاب کی رونمائی راشٹرپتی بھون کے بسنتی ڈرائنگ روم میں ہوئی اور اس خصوصی تقریب میں دہلی کے ممتاز ادیبوں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ اس تقریب میں کنور مہندر سنگھ بیدی، کرنل بشیر حسین زیدی، جناب علی جواد زیدی اور جی۔ ڈی چندن نے مختصر تقریریں بھی کیں۔

راشٹرپتی نے کہا کہ کسی بھی زبان کے ہر پرستار کی عزت کرنی چاہیئے خواہ اس کی علمیت کا درجہ کچھ بھی کیوں نہ ہو، مقصد اپنے ملک کی ہر زبان کی ترقی ہونا چاہیئے کیوں کہ وہ ہماری اپنی ہے۔ انھوں نے کہا کہ غیر ملکی حکومت کے زمانے میں گاندھی جی نے سودیشی کا استعمال بڑھایا جو ایک نہایت مشکل کام تھا لیکن آج آزادی کے دور میں ہم اس سے غافل ہو رہے ہیں۔ ہمیں اپنی زبانوں کے بارے میں سودیشی کے جذبے سے کام لینا چاہیئے۔

راشٹرپتی نے جناب مالک رام کے ادبی کام کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے کئی موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ غالب ان کا خاص موضوع ہے جس کے وہ ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ پھر انھوں نے ہر فرقے کے اُردو ادیبوں، شاعروں اور اخبار نویسوں کی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ انھوں نے مختلف مذاہب کا اچھا

(باقی کور ۳ پر)

راشٹرپتی گیانی ذیل سنگھ نے گیارہ دسمبر ۱۹۸۶ کو راشٹرپتی بھون میں "مالک رام ۔ ایک مطالعہ" نامی کتاب کا اجرا فرمایا۔ اس کتاب کے مرتب مشہور ادیب جناب علی جواد زیدی ہیں۔
تصویر میں راشٹرپتی گیانی ذیل سنگھ کے دائیں طرف جناب مالک رام صاحب، بائیں جانب جناب علی جواد زیدی تشریف رکھتے ہیں۔ اسٹیج سکریٹری کے فرائض اُردو کے مشہور صحافی جناب جی ڈی چندن انجام دے رہے ہیں۔

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

یوجنا

چیف ایڈیٹر : سید ظفیر الحسن
ایڈیٹر : جگندر سنگھ
اسسٹنٹ ایڈیٹر : محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر : وسیم حیدر

شرح چندہ
سالانہ ۲۰ روپے۔ دو سال ۳۶ روپے
سہ سالہ ۴۸ روپے۔ فی کاپی ۲ روپے
طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے
لیے ۱۰ فیصد کی رعایت۔

جلد ۶ | شمارہ ۲۰، ۱۹ | یکم تا ۳۱ جنوری ۱۹۸۷ | ۱۱ پوش تا ۱۱ ماگھ شک ۱۹۰۸ | قیمت : ۲ روپے، ٹیلیفون ۶۰۱۸۱۸

اس شمارے میں

یوجنا، منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :۔
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶
اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منجال
ترسیلِ زر کا پتہ :۔ بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

تلہنوں کی پیداوار میں اضافہ

وقت کی ضرورت

خوردنی تیلوں کی بہت زیادہ مانگ ہے۔ کسی باورچی خانے کا کام ان کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اگلے وقتوں میں یہ تیل بڑی مقدار میں مل جاتے تھے لیکن ہماری آبادی میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے کی وجہ سے ان کی دستیابی قدرے محدود سی ہوگئی ہے اور یہ تلخ حقیقت ہے کہ خوردنی تیلوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو یا تو درآمدات سے یا ملک میں پیداوار بڑھانے سے ہی پورا کیا جاسکتا ہے۔

خوردنی تیلوں کا ذکر آتے ہی غذائیت کے پہلو بھی ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ طبی تحقیق کی بھارتی کونسل کے مطابق غذائیت کے لیے ظاہری اور غیر ظاہری دونوں قسم کی چربی کو ملاکر چربی کی کم سے کم ضرورت فی سال ۲۰ کلو گرام ہے۔ اس کے برخلاف تیلوں کی موجودہ فی کس کھپت تقریباً تین کلوگرام فی کس فی سال ہے۔

خوردنی تیلوں کی مانگ اور فراہمی کے درمیان فرق گذشتہ کئی برسوں میں تقریباً ۳۳ فیصد رہا ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ساتویں منصوبے کے اختتام تک خوردنی تیلوں کی مانگ ۲ء۶۰ لاکھ ٹن تک پہونچ جائے گی اور فراہمی صرف ۴۹ء۹ لاکھ ٹن ہوگی جس میں غیر روائتی وسائل جیسے چاول کے بھوسے، درختوں اور جنگلات سے حاصل ہونے والے بیز بنولوں اور کھلی سے حاصل ہونے والے تیل بھی شامل ہیں۔

اس طرح توقع ہے کہ تقریباً دس لاکھ ٹن کا یہ فرق جاری رہے گا۔ اس صدی کے آخر تک ملکی ضرورتوں کو پورا کرنے میں تقریباً ۶۶ لاکھ ٹن تیل کی کمی رہے گی۔ زرعی تحقیق کی بھارتی کونسل نے ۲۰۰۱ء تک دو کروڑ ۶۰ لاکھ ٹن تلہنوں کی مانگ کا اندازہ لگایا ہے۔ چونکہ درآمدات، زرمبادلہ کے ہمارے محدود وسائل پر ایک بھاری بوجھ بن جاتی ہیں۔ لہٰذا ہمارے پاس صرف دو متبادل ذریعے ہیں۔ ایک تلہنوں کی پیداوار میں اضافہ کرنا اور دوسرا غیر روائتی وسائل سے تیل حاصل کرنا۔ چنانچہ تلہنوں کی پیداوار اور پیداواریت میں اضافہ کرنے کی پالیسی اپنائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ زیادہ تیل دینے والے نئے تلہنوں کو فروغ دینے، تیل کی پیداوار زیادہ سے زیادہ کرنے کے لیے ٹیکنالوجی کا استعمال کرنے اور دیگر بہت سے اقدامات سے تلہنوں کی پیداوار بڑھانے پر زور ہے۔ تلہنوں سے متعلق ٹکنالوجی کا ایک مشن بھی تشکیل دیا گیا ہے تاکہ تیلوں میں خودکفالت جہاں تک ممکن ہو جلد از جلد حاصل کرلی جائے۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا لوگ غیر روائتی وسائل سے ہونے والے تلہنوں کو استعمال کے لیے قبول کریں گے۔ اس قسم کے تیلوں کے براہ راست استعمال کو مقبول بنانے کے لیے سرکار تیلوں کی آمیزش کی اجازت دے رہی ہے۔ مثال کے طور پر سویابین کے ریفائنڈ تیل کو جوکہ ایک غیر روائتی تیل ہے، مونگ پھلی کے تیل میں ملانے کی اجازت دے دی ہے۔

خوراک اور شہری رسدات کی وزارت کا شہری رسدات کا محکمہ خوردنی تیلوں کے چار دیگر مرکبات کی تیاری اور مارکیٹنگ کی اجازت دینے کے امکانات پر غور کر رہا ہے۔

شہری رسدات کے محکمہ نے درختوں وغیرہ سے حاصل ہونیوالے تلہنوں کے فروغ کے لیے ایک منصوبہ جاتی اسکیم تیار کی تھی جس کے تحت چھٹے پنجسالہ منصوبے میں قبائلی علاقوں پر توجہ مرکوز کی گئی تھی۔ اس اسکیم کو ۳۰ء۳۳ لاکھ روپے کے کل اخراجات سے ساتویں منصوبے میں زیادہ مستحکم اور موثر بنایا جارہا ہے۔

اس اسکیم میں ذخیرہ کرنے کے لیے مناسب گوداموں کی کمی اور نقل و حمل کی سہولتوں کی کمی جیسی کچھ بڑی رکاوٹوں کو دور کرنے کا کام بھی شامل ہے۔ اس اسکیم کے تحت ذخیرہ کرنے کے لیے گوداموں کی تعمیر، موٹر گاڑیوں کی خرید اور کچھ کارآمد سازوسامان کی حصولی کے لیے مالی امداد بھی فراہم کی جاتی ہے۔ بلاشبہ یہ چیلنج بڑا ہے اور مسئلہ پیچیدہ ہے لیکن حکومت اندرون ملک پیداوار میں اضافہ کرنے اور درآمدات پر انحصار کو کم کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ تیل کی آمیزش اور نئے وسائل کی تلاش کے سلسلے میں طویل المدتی کوششوں سے یقیناً مطلوبہ نتائج برآمد ہوں گے۔

(ایڈیٹر)

اندرا گاندھی

قومی اتحاد

مشترکہ ذمہ داری

شریمتی اندرا گاندھی کو اپنی زندگی میں قومی یک جہتی کے موضوع سے سب سے زیادہ دلچسپی رہی ہے۔ زیر نظر مضمون اُن کی ایک تقریر سے ماخوذ ہے۔ یہ میٹنگ مختلف پارٹیوں پر مشتمل تھی اور سماج میں قدیم آہنگی کے موضوع پر غور و خوض کے لیے بلائی گئی تھی۔ آج کے حالات میں موصوفہ کے خیالات اتنے ہی اہم ہیں جتنے کہ یہ اُن کے اپنے دور میں تھے۔

(ایڈیٹر)

تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے ملکوں میں، جہاں کہ آبادی زیادہ ہے اور وہ مختلف طرح کی ہے۔ وہاں قومی یک جہتی ایک بڑا مسئلہ بنا رہا ہے، مثال کے طور پر چند بڑے ممالک جیسا کہ روس اور چین جنھوں نے مشترکہ سیاسی آئیڈیالوجی کی بنیاد پر قومی اتحاد اور قومی یک جہتی حاصل کی ہے۔

بھارت میں ہم نے کثیرالجماعتی جمہوریت کی تشکیل کی کوشش کی ہے۔ ہمارے یہاں قومی یکجہتی سے مُراد زبان، آئیڈیالوجی یا مذہب کے یکساں ہونے سے نہیں ہے بلکہ جیسا کہ متعدد بار کہا جا چکا ہے کہ یہاں کثرت میں وحدت ہے۔ قومی یکجہتی کی حقیقی بنیاد ایسے مقاصد اور اقدار پر ہونی چاہیئے جن میں زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہوں اور ذیلی ثقافتوں کی شناخت کھوئے بغیر ہندوستانیت کے جذبہ کے تئیں خود کو ہندوستانیت کا پابند سمجھیں۔ یہاں اس اظہار کے لیے ہندوستانیت سے بہتر کوئی متبادل لفظ نہیں ملتا۔

غیر ممالک میں ہمارے جذبۂ رواداری کے سبب ہی ہندوستان کا اس قدر احترام کیا جاتا ہے۔ مقابلے والی سیاست کے سبب جن اقدار کو نقصان پہونچا ہے۔ ان میں سے جذبۂ رواداری بھی ایک ہے۔ ہمارے مذہبی تہوار جنھیں سبھی عوام منایا کرتے ہیں اور جنھیں سبھی فرقوں کے لوگ مانتے ہیں، اکثر علاقوں میں تناؤ اور تشویش کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ میرا خیال ہے جس کا کہ میں نے متعدد بار اظہار کیا ہے کہ ملک کے کسی بھی حصے میں کسی بھی بھارتی باشندے کو غیر ضروری اور ناپسندیدہ نہیں سمجھا جانا چاہیئے اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ بات ہمارے آئین میں واضح کر دی گئی ہے۔ ہر ایک بھارتی ذات پات، مذہب، زبان یا خطے کے کسی بھی امتیاز کے بغیر ملک کے ہر ایک حصے میں سبھی قومی سرگرمیوں میں شریک ہو سکتا ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے ہمیں کام کرنا ہے۔ قومی یکجہتی ایک تاریخی عمل ہے۔ بھارت میں قومی ریاست کا تصور جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، مذہب، علاقہ اور دیگر وابستگیوں سے بالاتر ہے۔ یہ ہماری جدوجہد آزادی کی دین ہے جس میں کہ تمام فرقوں، مذاہب اور تمام لوگوں نے حصہ لیا ہے۔ حصول آزادی کے بعد اس قومی اتحاد کا استحکام ایک بڑا کارنامہ ہے۔ تاریخی پس منظر میں مختلف فرقوں اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کی طرف سے سیاسی جدوجہد میں شرکت کے سبب آپسی رشتے مضبوط ہوتے ہیں۔ یہ بدقسمتی ہے کہ تنگ نظری کے سبب تشدد اور تناؤ وغیرہ کے واقعات پر توجہ مبذول رہتی ہے اور قومی یکجہتی اور ساتھ ہونے کا جذبہ جو کہ ایک طویل المدتی عمل ہے، بھلا دیا جاتا ہے۔ میں سمجھ

ہوں کہ آپ سب جانتے ہیں کہ ایسے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی جن کے پس پُشت آزاد قومیت کی طویل تاریخ ہے، قومی یک جہتی ایک مسلسل عمل ہے۔

ہمیں ایسی ہر بات سے چوکنا رہنا ہے جس سے ہمارے اتحاد کو نقصان پہونچے۔ بھارت ایسے وسیع و عریض اور گوناگونی والے ملک میں اس پر قومی سطح پر کسی طرح اتفاق رائے ہو، اس سلسلے میں غور و خوض بے حد ضروری ہے۔ کسی بھی محدود فائدے کے لیے ایسے خیالات، عوامل اور اقدامات کی جن سے انتشار پسندانہ جذبات کی حوصلہ افزائی ہوتی ہو، حوصلہ شکنی کرنی چاہیئے اور ان سے گریز کرنا چاہیئے یہ محض ایک قانونی عمل بھی نہیں ہے۔ قانون ہمارے یہاں بہت ہیں، مگر ہم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہم قانون چاہے کتنے بھی کیوں نہ بنا لیں لیکن ان میں کوئی نہ کوئی خامی رہنے کا امکان ہر وقت رہتا ہے۔ یہ وسیع تر پس منظر میں سیاسی عقائد اور رجحانات کا سوال ہے۔ ان سے بھی زیادہ ان اقدامات کی اہمیت ہے جو مختلف شعبوں میں کئے جاتے ہیں۔ اس طرح کے شعبوں میں سیاسی، سماجی، تعلیمی اور نشر و اشاعت وغیرہ کے شعبے شامل ہیں۔

کون کون سے خطرات اتحاد کو در پیش ہیں۔ فرقہ واریت، ذات پات، علاقیت، لسانی عصبیت ہمارے قدیم دشمن ہیں۔ ہم میں بھارتی ہونے کا جذبہ فروغ پائے اور ہندوستان کے بارے میں صحیح تصور ہمارے پیشِ نظر ہو۔ اس کی خاطر ہم مذکورہ بالا خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے دانشورانہ اور اخلاقی سطح پر شدید قسم کی تحریک میں لگے رہے لیکن اب یہ واضح ہے کہ اس محاذ پر جوشِ عمل سرد پڑ گیا ہے۔ میں یقیناً محسوس کرتی ہوں کہ ملک گیر سطح پر اس تحریک کو دوبارہ زندہ کرنے کی سرکار کی ذمہ داری ضرور ہے۔ مگر سرکار کی طرح یہ ہر شخص کی ذمہ داری ہے۔ یہ ذمہ داری ہر ایک شہری، ہر ایک سیاسی پارٹی یا گروپ کی ہے۔ ہمارے خیال میں جدوجہد آزادی کے ورثے پر زور دینا بہت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں میں نے وزرائے اعلیٰ کو لکھا ہے۔ وزارتِ تعلیم بھی اس کے لیے کام کر رہی ہے۔ جدوجہد آزادی کی رُوح کی بیداری آپس میں ایک دوسرے کو ملانے میں معاون ہے اور یہ ایسا ورثہ ہے جس پر ہماری نوجوان نسل فخر کر سکتی ہے اور جس کے بل بُوتے پر ان کی جڑیں مضبوط ہو سکتی ہیں۔

لیکن بین الاقوامی فضا اور اس کی قوتوں کو بڑے محتاط طریقے پر سمجھنا چاہیئے۔ خارجی وسعتوں میں ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہمیں شخصیتوں میں خود کو گم نہیں کرنا چاہیئے۔ کسی نظام کو کمزور کرنے کی کوششیں ہندوستان کے لیے پہلی بار نہیں ہیں۔ یہ کسی ایک سیاسی پارٹی یا کسی ایک شخص کو نہیں بلکہ پورے نظام کو کمزور کرنے کے لیے ہیں، تاکہ اتحاد پارہ پارہ ہو جائے اور ہمارا ملک ہر طرح کے دباؤ کے آگے جھک سکے۔ اسے جنگ کی نفسیات سے تعبیر کرنا غلط ہوگا۔ اگرچہ ایسا ہے تو پوری دُنیا میں اس طرح کی جنگی نفسیات سرایت کئے ہوئے ہے یا پوری دُنیا اس طرح کی نفسیات میں مُبتلا ہے جیسا کہ یہ ان بہت سے وفود اور اہم شخصیتوں کے خیالات سے واضح ہوتا ہے جو ہمارے یہاں پورے سال آتے رہتے ہیں۔

ہمارے سامنے جو چیلنج ہیں، وہ ڈھکے چُھپے نہیں۔ یہ بات صاف ہے کہ ہمیں زبردست اتحاد کی ضرورت ہے۔ ہمیں داخلی طور پر سماجی اور اقتصادی تانے بانے کو مضبوط کرنا ہے۔ خود کفیلی اور خود اعتمادی قومی یک جہتی کے عمل کا اٹوٹ انگ ہے۔ اس سے ہمیں مُضرت رساں خارجی اثرات کا مقابلہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔

یک جہتی کے مسئلے کو سماجی اور اقتصادی پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ تناؤ اور کشیدگی کو دُور کرنے اور اسے محدُود رکھنے کے لیے ترقی اور نمو کی شرح کو زیادہ تیزی سے بڑھانا ضروری ہے۔ بلا شبہ اس عمل کے تحت اقتصادی یا سماجی طور پر مقابلتہً زیادہ کمزور طبقوں کی مدد کی جاتی ہے اور ایسے طبقات کی مدد کرنی ہے۔ جنھیں ان کے جائز حق سے کم ملا ہے۔

ہماری دفاعی ذمہ داریوں میں اضافے کے سبب ہمارا کام کہیں زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ دفاعی ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ ترقیاتی عمل میں پیش رفت کے لیے نظم و ضبط کے ساتھ کڑی محنت درکار ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ قومی مقاصد کے تئیں پابند ہو جانا ہی اس کا حل ہے۔

قومی یک جہتی سے متعلق پالیسیاں اور پروگرام سیاسی سطح پر ایسے متنازعہ اُمور سے بالاتر رہنے چاہئیں، جہاں صرف کوری حمایت یا طرفداری کے اصول کار فرما ہوں۔ سیاسی پارٹیوں کے لیے ضابطۂ اخلاق زیرِ بحث رہا ہے۔ یقیناً ہمیں ایسے ضابطے کی ضرورت ہے اور ہمیں اس پر کاربند ہونا چاہیئے۔ میں یہاں یہ دُہرانا چاہوں گی کہ ہم عدم تشدّد کے اُصولوں پر سختی سے کاربند ہیں۔ ہم کسی بھی طرح کے تشدّد کی اجازت نہیں دے سکتے اور جب کبھی بھی تشدّد کا مظاہرہ ہوا۔ خواہ یہ کسی بھی طرف سے ہوا ہو اور خواہ اس میں ہمارے اپنے ہی لوگ کیوں نہ شامل رہے ہوں۔ ہم نے سختی سے اس کی مخالفت کی ہے۔

بہر صورت ہمیں اصل کی طرف لوٹنا ہے۔ بھارت کی پائیدار قوّت اس کی وہ صلاحیت ہے جو اس میں مختلف ثقافتوں، مذہبی اور مختلف روایات اور مختلف طرزہائے زندگی اور مختلف طرح کے

ایم۔ ایل۔ بجاج٭

قومی یک جہتی تاریخ کے آئینے میں

بھارت کی تاریخ میں ایسے سینکڑوں واقعات ہیں جو جواہر پاروں کی مانند چمک رہے ہیں لیکن جن کی تابانی صدیوں کے بوجھ تلے دب کر ماند پڑ گئی ہے یا جنھیں مفاد پرستوں نے توڑ مروڑ کر گرد آلود کر دیا ہے۔ جدید حالات کا تقاضا ہے کہ ان واقعات کو تاریخی تناظر میں ہی دیکھا جائے اور ان کی گرد جھاڑ کر ان کی تابانی کو بحال کیا جائے۔

تاریخ کے جس حصے کو مسخ کیا گیا ہے خصوصاً افغانوں اور ترکوں کی آمد کے بعد کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس ملک کے باشندوں کے ساتھ اُن کی لڑائیاں ہوئیں لیکن اُن کا مقصد زیادہ تر سیاسی طاقت کا حصول تھا۔ ان حملوں اور لڑائیوں کی نوعیت زیادہ تر سیاسی تھی لیکن انھیں مفاد پرستوں کی طرف سے مذہبی رنگ دیا گیا۔ یہ لڑائیاں مذہبی تبلیغ یا مذہبی بالا دستی کا قیام کرنے کے لیے نہیں لڑی گئیں۔ گو یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بعض حکمرانوں نے اپنی سیاسی اغراض یا مفاد کے لیے مذہب کو آلۂ کار بنایا، لیکن برطانوی سامراجیوں نے اس تاریخ کو قلم سے نہیں بلکہ نشتر سے لکھا، جس سے بھارت کے سینے میں ایسے گہرے زخم ہوئے جو ابھی تک مندمل ہونے میں نہیں آ رہے ہیں۔

ایسی لڑائیوں کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں جن میں ہندو، مسلمانوں کے دوش بدوش ہندو راجاؤں کے خلاف اور مسلمان ہندوؤں کے دوش بدوش مسلمان حکمرانوں کے خلاف لڑے۔

مُغلوں اور راجپوتوں کے تعلقات مجموعی طور پر دوستانہ تھے اور اُن کے تعلقات میں اُن کے مذاہب حارج نہیں تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ مغل راجپوتوں کی دوستی کی بڑی قدر کرتے تھے اور وہ راجپوتوں کو افغانوں اور دیگر مسلمانوں پر ترجیح دیتے تھے۔ کیوں کہ راجپوتوں میں سپاہیانہ اوصاف بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے۔ ان کی جانبازانہ ہمت، آن پر مر مٹنے کی ادا، اور بے مثال شجاعت نے مغلوں کو اُن کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اُن میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ قول کے صادق تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ راجہ مان سنگھ کو اکبر کے دربار میں بلند مرتبہ حاصل تھا۔ اُسے گجرات، کابل اور کئی دیگر مقامات پر سرکش باجگذاروں کی سرکوبی اور فتوحات کی مہموں پر بھیجا گیا اور اُس نے ان تمام مہموں کو کامیابی سے سر کیا۔ اسی طرح اورنگ زیب کو ایک اور راجپوت سردار مہاراجہ جے سنگھ پر جس قدر اعتماد تھا، اُس قدر کسی دوسرے پر نہیں تھا۔

پنڈت نہرو کے مطابق، مغلوں کے عہدِ حکومت میں بہت سے ہندوؤں نے فارسی میں کتابیں تصنیف کیں، جو اُس وقت کی درباری زبان تھی۔ ان میں سے کئی کتابوں کا شمار تو کلاسیکی ادب میں ہو رہا ہے، اس کے ساتھ ہی مسلمان عُلماء نے سنسکرت کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا اور ہندی میں کتابوں کی تصنیف کی۔ (فیضی نے تو گیتا کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا جسے عالمگیر شہرت حاصل ہوئی)۔ اسی طرح دربارِ اکبری کا ایک اور رتن، عبدالرحیم خانخاناں تھا، وہ عربی، فارسی اور سنسکرت کا عالم تھا اور اُس کا شمار ہندی کے ۹ چوٹی کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ کچھ عرصہ تک شاہی فوج کا سپہ سالار بھی رہا۔ اُس نے میواڑ کے رانا پرتاپ کی تعریف میں چند شعر لکھے ہیں جو تمام عمر اکبر کے ساتھ برسرِ پیکار رہا اور اُس کے سامنے کبھی سر نہیں جھکایا۔

٭ ۲۰۔ ملک بلڈنگ، چونا منڈی، پہاڑ گنج دہلی

خانخاناں نے میدانِ جنگ میں اپنے دشمن کی شجاعت، وضعداری اور حُب الوطنی کی دل کھول کر داد دی ہے۔

خانخاناں نے رانا پرتاپ کی عدیم المثال بہادری سے متاثر ہو کر اُسے ایک مراسلہ لکھا جس میں شاعری کی زبان میں لکھا "اس جہاں میں سب کچھ فانی ہے۔ جاہ و اقتدار کا ایک روز نام و نشان مِٹ جائے گا، لیکن ایک عظیم انسان کے اوصافِ حمیدہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہیں گے۔"

ہلدی گھاٹی

اکبر اور رانا پرتاپ کی لڑائیوں کا ہم ایک اور پہلو دیکھتے ہیں جو غیر فرقہ وارانہ ہے۔ یوں تو دونوں کے مابین کئی جنگیں ہوئیں لیکن ان میں سب سے زیادہ خونی اور خوفناک لڑائی ہلدی گھاٹی میں ہوئی۔ یہ اتنی بہادری اور دلیری سے لڑی گئی کہ اس نے تاریخ میں اپنے گہرے نقش چھوڑے ہیں۔

راجہ مان سنگھ نے اکبر کے احکام کے تحت بہت سے مسلمان اور راجپوت سرداروں اور پانچ ہزار سپاہ لے کر اپریل ۱۵۷۶ء میں میواڑ کو کوچ کیا۔ رانا کمبھل گڑھ سے منڈل گڑھ کی طرف بڑھا۔ وہ منڈل گڑھ میں ہی لڑنا چاہتا تھا لیکن اُس کے سرداروں نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ کچھ عرصہ انتظار کرے اور پہاڑوں میں سے دشمن پر دھاوا بولے۔ شاہی فوج ہلدی گھاٹی کے نزدیک دریائے بانس پر خیمہ زن ہوا۔ اُدھر رانا بھی اسی جانب بڑھا اور دونوں فوجوں کے درمیان محض چھ میل کا فاصلہ رہ گیا۔ رانا کے ساتھ بھی متعدد راجپوت سردار تھے، لیکن ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ رانا کی صفوں میں ایک مسلمان سردار حاکم خاں سوری بھی اپنے لشکر کے ساتھ شامل ہو گیا تھا جو بڑی بہادری سے لڑا۔

یہ جون کا گرم ترین مہینہ تھا۔ سورج اس قدر آگ برسا رہا تھا کہ بقول مُلّا عبدالقادر بدایونی جو اس لڑائی میں مغل سپہ سالار آصف خاں کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ سپاہیوں کے مغز، اُن کی کھوپڑیوں میں اُبل رہے تھے۔ راجہ مان سنگھ ہاتھی پر سوار تھا اور اُس کے ساتھ اعلیٰ پایہ کے سالارِ جنگ خواجہ محمد رفیع بدخشانی علی مراد بیگ، راجہ لون کرن وغیرہ موجود تھے۔ رانا درّے کے پیچھے سے تین ہزار سپاہ کے ساتھ بڑھا۔ جب رانا سب سے آگے آیا تو حاکم خاں سوُر نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ پیچھے رہے کیونکہ اگر رانا کو کوئی جسمانی نقصان پہونچا تو یہ راجپوت فوج کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ چنانچہ رانا کی سپاہ دو لشکروں میں تقسیم ہوئی۔ حاکم خاں اپنے لشکر کے ساتھ آگے بڑھا اور اُس نے شاہی فوج کے ہراول دستوں پر اتنی خونخواری سے حملہ کیا کہ مغل سپاہ میں اُتھل پُتھل مچ گئی۔ حملہ کی تاب نہ لا کر راجہ لون کرن کی سپاہ بھاگ کھڑی ہوئی۔

رانا پرتاپ دوسرے لشکر کے ساتھ درّے کے دہانے پر آصف جاہ پر ٹوٹ پڑا اور اُس کے لشکر کو کھدیڑ دیا۔ گو اس لڑائی میں بالآخر رانا پرتاپ کو شکست ہوئی تاہم وہ جس دلیری اور جانبازی کے ساتھ لڑا اُس سے رانا پرتاپ اور ہلدی گھاٹی کا نام تاریخ میں لافانی ہو گیا ہے۔

رانا پرتاپ نے لڑائی ہارنے کے بعد بھی جنگ جاری رکھی۔ شاہی فوج چھ ماہ تک رانا کے علاقے میں رہی۔ اور وہ اُس پر حملے کرتا رہا۔ ایک موقع پر تو مرزا خانخاناں کا حرم رانا کے ولی عہد کے ہاتھ میں آگیا، لیکن رانا نے اُن خواتین کو اپنی بیٹیوں کی طرح اپنے پاس رکھا اور پھر اُن کے شوہر کے پاس عزت کے ساتھ بھجوا دیا۔

اکبر ہندوؤں اور مسلمانوں کو رشتۂ اتحاد میں جوڑنا چاہتا تھا۔ وہ ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے عالموں کی صحبت میں بیٹھتا اور اپنی رُوحانی تشنگی کو مٹانے اور ازلی صداقت کے بارے میں علم حاصل کرنے کے لیے طرح طرح سے استفسارات کرتا۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کی خاطر بہت آگے جانے کو تیار تھا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ اُس نے اپنی والدہ کے انتقال پر ہندوؤں کی مانند اپنا سَر مُنڈوا لیا تھا۔

اکبر کی پیدائش بھی ایک ہندو کی پناہ میں امرکوٹ میں ہوئی تھی جبکہ اُس کا باپ ہمایوں دَر دَر بھٹک رہا تھا۔ مصیبت زدہ باپ نے بچے کا جشنِ ولادت منانے کے لیے اپنے ساتھی سرداروں میں مُشک (کستوری) تقسیم کی تھی، جو دراصل ہندو مسلم اتحاد کی مُشک ثابت ہوئی، جس کی بُو تمام ہندوستان میں پھیل گئی۔

شواجی اور اُردو

مرہٹہ سردار شواجی نے مغلوں کی زبردست مزاحمت کے باوجود اپنی سلطنت کی بُنیاد رکھنے میں کامیابی حاصل کی اور ۵ جون ۱۶۷۴ء کو اُس کی تاجپوشی ہوئی۔ شواجی کو اپنے مشن میں کس قدر کامیابی ہوئی تھی، اس کا اندازہ اُس خراجِ تحسین سے کیا جا سکتا ہے جو اورنگ زیب نے اُس کے انتقال پر مرہٹہ سردار کو دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا "شواجی ایک عظیم فوجی سالار تھا۔ اور وہ واحد شخص تھا جس میں ایک نئی سلطنت قائم کرنے کے تمام اوصاف تھے۔ میں بھارت کی قدیم سلطنتوں کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں میری فوجیں ۱۹ برس (۱۶۶۰-۷۹) تک اُس سے نبرد آزما رہیں لیکن اس کے باوجود اسکی سلطنت وسیع ہو رہی ہے[1] (ملاحظہ کیجئے آر۔سی۔ مازمدار کی ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا)۔

شواجی کا مسلمانوں کے ساتھ کیسا سلوک تھا؟ اس کے بارے میں مورخ خافی خان لکھتا ہے "شواجی نے اپنے علاقوں میں عوام کی عزت و آبرو برقرار رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی تھی۔ اُس نے

---

[1] (An Advanced History of India by R.C. Mazamdar)

بغاوت کی راہ اختیار کی۔ کارروانوں کو لوٹا اور لوگوں کو پریشان کیا۔ لیکن اُس نے ہمیشہ ذلت آمیز اقدامات سے احتراز کیا۔ وہ اس امر کی کڑی نگرانی کرتا تھا کہ جب مسلمان بچے اور عورتیں اُس کے ہاتھ میں آئیں تو اُن کی عزت و آبرو پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ اس معاملے پر اُس کے احکام نہایت سخت تھے اور جو کوئی ان کی خلاف ورزی کرتا تھا اُسے عبرت ناک سزا دی جاتی تھی۔

اسی طرح شواجی کے ہمعصر انگریز تاجروں نے جو سُورت میں مُقیم تھے، لکھا ہے "شواجی نہایت کارساز دوست، نیک ترین دشمن تھا اور انتہائی زیرک شہزادہ ہے۔ اُس کی فتوحات معجزوں سے کم نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے ملک سے محبت کرتا ہے اور کسی کے تئیں جانبداری سے کام نہیں لیتا۔ اُس کی ملازمت میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ہے اور اُس کی بحری فوج کا سربراہ ایک مسلمان ہے۔"۔

اورنگ زیب شواجی سے دوستی کرنا چاہتا تھا کیوں کہ دکن میں شواجی کی طاقت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ قلعوں پر قلعے فتح کرتا جا رہا تھا۔ اُس نے کئی مُغل سرداروں کو لڑائی میں شکست دی، جو اُس کی سرکوبی کے لیے بھیجے گئے تھے۔ اِدھر بیجاپور کا شیعہ سُلطان بھی اورنگ زیب کی نیند حرام کیے ہوئے تھا۔ اورنگ زیب بیجاپور کو اپنی سلطنت میں مِلانے کے لیے شواجی کی مدد لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ مُغل شہنشاہ نے اپنے معتمد جے سنگھ کو دکن میں بھیجا، تاکہ وہ شواجی کو سمجھائے کہ وہ مُغل سلطنت کے قلعے لَوٹا دے اور دیگر راجپوت سرداروں کی طرح شاہی منصب قبول کرے اور بیجاپور کی بغاوت کو کچلنے میں تعاون کرے۔ چنانچہ شواجی نے اپنی ۹ ہزار سپاہ کے ساتھ بیجاپور کے خلاف یورش میں مدد دی اور مُغل فوج کو فتح دلائی۔

جے سنگھ کو اپنے مشن میں کامیابی ہوئی۔ شیوا جی نے کچھ قلعے لوٹا دیے اور کچھ اپنے قبضے میں رہنے دیے۔ وہ اپنے قافلے کے ساتھ آگرہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ اورنگ زیب نے زادِ راہ کے طور پر اُسے ایک لاکھ روپے بھجوائے اور دکن سے آگرہ کے درمیان جتنے صوبیدار اور جاگیردار تھے، سب کو ہدایت دی کہ وہ شواجی راجہ کا ہر جگہ بڑے احترام سے خیر مقدم کریں۔

شواجی نے اورنگ زیب کے تئیں احترام کا اظہار کیا۔ دکن میں روانگی سے قبل اورنگ زیب کا فرمان پہونچا تو اُس نے چھ میل پیدل چل کر فرمان کو قبول کیا۔

شواجی کے ساتھ دوستی کا پلان سرے نہیں چڑھ سکا۔ اُس نے محسوس کیا کہ شاہی دربار میں اُس سے اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ اُس نے اورنگ زیب کی خلعت لوٹا دی۔ جس پر اُسے نظر بند کر دیا گیا۔ وہاں سے وہ فرار ہو گیا اور دکن جاکر دوبارہ فوجی مُہم شروع کر کے اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس امر کے باوجود کہ شواجی نے ہندو سلطنت کی بنیاد رکھی، اُس نے غیر ہندوؤں سے کبھی بُرا سلوک نہیں کیا۔ ایک بار فوجی مُہم میں قرآن پاک ہاتھ لگا تو اُسے ادب کے ساتھ قریبی مسجد میں بھجوا دیا۔ فوجی ایک خوبصورت مسلم لڑکی کو لے آئے، اور اُس سے شادی کرنے کو کہا گیا، تو شواجی نے کہا کہ "یہ عورت واقعی بڑی خوبصورت ہے، کاش میری ماں بھی ایسی ہی ہوتی۔ چنانچہ اُس عورت کو اُس کے رشتہ داروں کے ہاں بھجوا دیا۔

شواجی کے ۱۴ روحانی گورو تھے جن سے وہ ہمیشہ دُعائیں مانگتا تھا، ان میں ایک مُسلم پیر "بابا یاقوت" (کیلسی والے) بھی تھے، اور تو اور اُس نے اُردو زبان کو بھی اپنایا تھا۔

اس سلسلے میں اطالوی سیّاح "نکولوس منوکی" نے جو کچھ لکھا ہے اُس کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے گا۔

"شواجی کے چند اہلکار جے سنگھ سے ملے تو جے سنگھ نے کہلا بھیجا کہ اگر تم مجھ پر پُورا اعتماد کرو اور میرا مشورہ قبول کرو تو میں دیکھونگا کہ شہنشاہ (اورنگ زیب) سے تمھیں بہت زیادہ فائدہ پہونچے گا۔ شواجی نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور بے خوفی کے ساتھ نہتا جے سنگھ کے خیمے میں پہونچا۔ خیمے کے تمام لوگ گھبرا اُٹھے کہ کہیں اُن کے ساتھ کوئی شرارت نہ ہو جائے۔ لیکن جب معلوم ہو کہ وہ اکیلا آیا ہے تو اُن لوگوں کی جان میں جان آئی۔ جے سنگھ نے اپنے خیمے کے ساتھ ہی شواجی کا خیمہ لگوا دیا۔ ایک شام کو "منوکی" اور جے سنگھ تاش کھیل رہے تھے، شواجی اچانک وہاں آ گیا۔ تمام لوگ اُس کے استقبال کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور جب سب بیٹھ گئے تو شواجی نے منوکی کی جانب جو اُس وقت ۲۵ برس کا تھا، اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ یہ کون ہے تو جے سنگھ نے جواب دیا کہ یہ فرنگیوں کا سردار ہے۔ اس کے بعد منوکی اور شواجی کے درمیان طویل بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا اور شواجی نے یورپ کے ملکوں، اُن کی برّی اور بحری فوجوں اور اُن کے فنِ حرب کے بارے میں بہت سے سوالات دریافت کیے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ تمام بات چیت دونوں کے درمیان اُردو میں ہوئی۔ دونوں نے بڑی روانی کے ساتھ اُردو بولی اور اُنھوں نے کسی ترجمان کے بغیر دوبدو بات چیت کی ۔۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو سلطنت کے بانی ہوتے ہوئے بھی شواجی کو اُردو سے کوئی عناد نہیں تھا بلکہ وہ موزوں موقعوں پر اظہارِ خیالات کے لیے بڑے اعتماد اور فخر کے ساتھ اس کا استعمال کرتا تھا۔ ●

ہرش اروڑہ

اتر پردیش ترقی کی راہ پر تیزی سے گامزن

اُتر پردیش بھارت کا عصبی مرکز ہے۔ یہاں جو بھی تحریک اُٹھتی ہے اس کی ترنگیں سارے ملک میں پھیل جاتی ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں برطانوی حکومت کے خلاف علم بغاوت یہیں سے اُٹھا۔ کانگریس کی تحریک نے یہیں سے زور پکڑا، تہذیب و تمدن کا یہ شروع سے ہی گہوارہ رہا ہے۔ لیکن اقتصادی شعبے میں یہ نہایت پسماندہ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہاں بڑی بڑی زمینداریوں کی موجودگی رہی ہے، جن کے شکنجے میں کروڑوں کسان صدیوں تک جکڑے رہے اور استحصال پسندی کا شکار ہوتے رہے۔

اقتصادی آزادی کے بغیر سیاسی آزادی کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ حصولِ آزادی کے بعد غربت اور افلاس میں پسے ہوئے عوام کی جانب ملکی رہنماؤں کی نظرِ قدرتاً گئی۔ انھوں نے افلاس کو کپڑوں کی گرد کی مانند جھاڑنے کا عزم کیا اور اس سلسلے میں سب سے پہلے انسدادِ زمینداری کا اعلان کیا۔

غربت و افلاس کا عظیم مسئلہ محض بے زمین کسانوں کو زمینداروں کی فاضل زمین بانٹ کر یا زرعی سرگرمیوں کو فروغ دے کر حل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے بہت بڑے پیمانے پر صنعتی سرگرمیوں کو بڑھاوا دینے کی ضرورت ہے۔ بیروزگاری اور افلاس کا مسئلہ کس قدر عظیم ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ صنعتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کی مہم کے سلسلے میں ۴۲ پسماندہ اضلاع کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ۱۱ اضلاع تو ایسے تھے جن میں نام کو بھی کوئی صنعت نہیں تھی۔

چونکہ افلاس اور بیروزگاری کا مسئلہ عظیم ترین ہے اور خوشحالی کی منزل نہایت دور ہے۔ اس لیے وہاں تک پہونچنے کے لیے رفتار نہایت تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی امر کو مدنظر رکھتے ہوئے ریاست کی صنعت کاری کے لیے ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُتر پردیش ملک کی اُن اوّلین ریاستوں میں سے ایک ہے جنھوں نے صحیح سمت میں چلنے کے لیے واضح صنعتی پالیسی کا اعلان کیا ہے۔

پسماندہ علاقوں کی ترقی

ریاست کے پسماندہ اضلاع کی ترقی پر زیادہ زور دیا جارہا ہے۔ ان اضلاع میں صنعتوں کے بنیادی ڈھانچے کے قیام کو بڑی ترجیح دی جارہی ہے۔ ریاست میں سرمایہ کاری کو بہت بڑے پیمانے پر مدعو کرنے کے لیے تمام اقدامات کیے جارہے ہیں اور صنعتی شعبے کے لیے مراعات اور محرکات کا اعلان کیا جارہا ہے۔ ریاستی حکومت کی کوشش ہے کہ ان تمام تر مسائل کے نتیجے میں جہاں ریاست میں خوشحالی آئے وہاں روزگار کے مواقع پیدا ہوں۔ حکومت کی تجویز ہے کہ موجودہ پلان کے عرصے میں کم از کم دس لاکھ کنبوں کو زراعتی شعبے سے نکال کر صنعتی شعبے میں لایا جائے۔

حکومت کی طرف سے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے بھاری، درمیانہ اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے۔ جن علاقوں میں کوئی صنعت نہیں ہے وہاں کارخانے لگانے کا مقصد یہ ہے کہ تمام ریاست کی متوازن ترقی ہو۔ کوشش یہ ہے کہ صنعتکاری کے فوائد دیہی عوام تک بھی پہونچ جائیں، اس سلسلے میں دیہات پر مبنی صنعتوں، ریشم کے کیڑے پالنے کی صنعتوں اور متعلقہ سروسوں اور تجارتی سرگرمیوں کو بڑھاوا دیا جارہا ہے۔ اقتصادی طاقت چند ہاتھوں میں مجتمع نہ ہوجائے اس کے لیے "ایم۔آر۔ٹی۔پی" اور

• بی [illegible]، پچھم وہار، نئی دہلی

دیگر قوانین کو عمل میں لایا جا رہا ہے۔ ان قوانین کا مقصد تجارتی اجارہ داری کو ختم کرنا ہے۔

۱۹۸۵ء کے آخر تک ۹۰۴ بڑے اور درمیانے صنعتی یونٹوں کا قیام کیا جا چکا تھا اور ان کے علاوہ چھٹے پانچسالہ پلان کے آخر تک ایک لاکھ ۱۰ ہزار چھوٹے صنعتی یونٹوں کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ حکومت کی طرف سے ساتویں پلان میں مزید ایک لاکھ چھوٹے یونٹوں کے قیام کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۶۵۸۴ چھوٹے صنعتی یونٹوں کا قیام کر کے نشانے کو بھی پس پشت ڈال دیا گیا۔

صنعتی سرمایہ کاری

جہاں تک صنعتی سرمایہ کاری کا تعلق ہے بڑے اور درمیانہ درجے کے صنعتی یونٹوں پر تقریباً ۲۷ ارب روپے کا سرمایہ لگایا جا چکا ہے! اس میں سے ۷ ارب ۲ کروڑ ۳۸ لاکھ روپے کا سرمایہ مرکزی پبلک سیکٹر کے یونٹوں میں لگا ہوا ہے' اور ۱۲ ارب ۵ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری پرائیویٹ سیکٹر کے ۳۰۵ یونٹوں میں ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ کوآپریٹو سیکٹر کے ۳۶ یونٹوں میں ۳ ارب ۵۰ کروڑ ۴۳ لاکھ روپے کی سرمایہ کاری ہوئی ہے جبکہ باقیماندہ سرمایہ ریاست کے پبلک سیکٹر یا ملے جلے سیکٹر کے یونٹوں میں لگا ہوا ہے۔
۱۹۸۴ء کے آخر تک جو ایک لاکھ ۱۰ ہزار چھوٹے یونٹ قائم کئے گئے تھے۔ ان میں ۶ ارب ۸۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری ہوئی تھی اور ان کی بدولت ۹ لاکھ ۲۰ ہزار افراد کو روزگار ملا تھا۔ اسی طرح ۸۵-۱۹۸۴ء تک کھادی و دیہی صنعتوں میں ۶۶ ہزار یونٹ قائم ہو چکے تھے جن میں ۲۵ کروڑ ۲۵ لاکھ روپے کی سرمایہ کاری ہو چکی تھی اور کوئی ۲ لاکھ ۴۳ ہزار افراد کو روزگار مل چکا تھا۔
توقع ہے کہ ساتویں پانچسالہ پلان کے دوران جدید ٹیکنالوجی کے اجرا، پراجیکٹوں کی لاگت میں اضافے اور بڑے بڑے تکنیکی پراجیکٹوں میں سرمایہ کاری بڑھنے سے کوئی ۴ لاکھ اشخاص کے لیے مزید روزگار پیدا ہوگا۔ اسی عرصے کے دوران بڑی اور درمیانہ صنعتوں میں ۷ ارب روپے کی سرمایہ کاری کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ حکومت نے صنعتوں کو فروغ دینے کے لیے جو پالیسی وضع کی ہے اس کے بڑے بڑے پہلو درج ذیل ہیں۔

۱۔ مرکزی سیکٹر میں بعض بڑے صنعتی پراجیکٹوں کا قیام۔

۲۔ پرائیویٹ سیکٹر سے بھاری اور درمیانہ پراجیکٹوں میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کرانا جیسے پبلک اور ملے جلے سیکٹروں کی طرف سے تقویت دی جائے گی' اس سے ریاست کی اقتصادی سرگرمیوں میں اضافہ ہوگا۔

۳۔ موزوں پالیسیوں کے ذریعے اور ضروری امداد اور بنیادی ڈھانچہ مہیا کر کے چھوٹے پیمانے اور کھادی و دیہی صنعتوں کو فروغ دینا۔

۴۔ ہینڈ لوم اور پاور لوم سیکٹروں کی جدید کاری کے لیے ادارتی انتظامات کرنا تاکہ اُن کی پیداوار اور آمدنی میں اضافہ ہو۔

۵۔ اقلیتوں اور اقتصادی طور پر پسماندہ طبقات کے فائدے کے لیے دستکاریوں کو فروغ دینا۔ اور موثر مشینری کا قیام کرنا۔

۶۔ ریاست کی فاضل زرعی اور غذائی پیداوار سے استفادہ کرنے کے لیے ایسی صنعتوں کو فروغ دینا جو زراعت و غذا پر مبنی ہوں۔

۷۔ الیکٹرانکس یعنی برقیات کی صنعت کی ترقی میں تیزی لانا۔

۸۔ صنعتی ترقی کے لیے ضروری بنیادی سہولیات فراہم کرنا ہیں جیسے پلاٹ، بجلی، پانی اور دُور مواصلات کی سہولیات۔

۹۔ خام مال کی تسلی بخش سپلائی اور پیداوار کی فروختگی کا بندوبست کرنا۔

۱۰۔ صنعتیں لگانے والوں کو تکنیکی مشورہ دینا اور اُن کے لیے تربیتی پروگراموں کا اہتمام کرنا۔

مراعات

ریاست میں صنعتوں کے قیام کے لیے ریاستی حکومت کی طرف سے متعدد مراعات و محرکات کا بھی اعلان کیا گیا ہے۔ ان میں بعض اہم ترین محرکات درج ذیل ہیں:۔

۱۔ مالی اداروں کی طرف سے پسماندہ اضلاع کے لیے رعائتی سرمایہ کی دستیابی۔

۲۔ ۳۱ مارچ ۱۹۹۰ء تک قائم ہونے والے نئے یونٹوں کو پانچ سے سات برس کے لیے بکری ٹیکس کی چھوٹ، درمیانہ اور بڑے پیمانے کے پراجیکٹ چھوٹ کے بجائے بکری ٹیکس کے التوا کے لیے درخواست دے سکتے ہیں۔

۳۔ مشینوں اور عمارتی سامان پر پانچ برس تک چُنگی محصول سے چھوٹ۔

۴۔ چھوٹے یونٹوں کو میعادی قرضے رعائتی سُود پر۔

۵۔ بجلی کے جنریٹروں کی خرید رعائتی داموں۔

۶۔ "یو پی ایس آئی سی" نے قسطوں پر مشینوں کی سپلائی کے لیے اسکیم شروع کی ہے۔

علاوہ ازیں صنعت کاری کے عمل سے قریبی طور پر وابستہ اداروں کی سرگرمیوں میں بڑی تیزی آئی ہے جیسے یو پی اسٹیٹ انڈسٹریل ڈویلپمنٹ کارپوریشن (یو۔ پی۔ ایس آئی ڈی سی) یو پی فنانشل کارپوریشن (یو پی ایف سی) اینڈ پردیش انڈسٹریل اینڈ انویسٹمنٹ کارپوریشن آف یو پی (پی آئی سی یو پی) ان کی جانب سے صنعتکاروں کو کئی طرح کی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ سرمایہ کی فراہم

اور مشترکہ پراجیکٹوں کو فروغ دینے کے لیے "یو پی ایس آئی ڈی سی" ریاست میں فروغ شدہ پلاٹ اور صنعتی بستیاں بھی فراہم کرتی ہے۔ اس کی سرگرمیوں میں جو تیزی آئی ہے اُس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے ۲۵ برس کے عرصہ قیام کے دوران کوئی ۲۰ ہزار ایکڑ زمین پر صنعتی پلاٹوں کو فروغ دیا ہے اور اب اس کی طرف سے صرف ساتویں پانچسالہ منصوبے کے دوران ہی صنعتی رقبوں کے لیے ۲۰ ہزار ایکڑ زمین حاصل کر کے اُسے فروغ دیا جا رہا ہے۔

"یو پی ایف سی" نے ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۳۸۹۷ یونٹوں کے لیے ۹۵ کروڑ روپے کے قرضے منظور کیے اور ۵۴ کروڑ روپیہ تقسیم کیا۔ ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران ایک ارب ۵۶ کروڑ ۲۲ لاکھ روپے کے قرضے ۲۷۴۶ یونٹوں کے لیے منظور کیے گئے اور ۸۷ کروڑ روپے تقسیم کیے گئے۔ کل منظور شدہ قرضوں کا ۲۸ر۱۷ فیصد پسماندہ اضلاع میں بانٹا گیا۔ بجلی جنریٹروں کی خرید پر ۳ کروڑ ۶۹ لاکھ روپے کی ریکارڈ امداد دی گئی۔

"پی آئی سی یو پی" ۷۰ کروڑ ۱۱ لاکھ روپے کی منظوری دے کر اور ۳۳ کروڑ ۴ لاکھ روپے کی تقسیم کر کے ملک میں چوٹی کی صنعتی سرمایہ کار کارپوریشن بن گئی ہے۔ اس امداد کا ۷۰ فیصد حصہ پسماندہ اضلاع میں جائے گا۔ علاوہ ازیں "پی آئی سی یو پی" صنعتیں لگانے کے لیے ۳۲ اجازت ناموں کو عملی صورت دے گی جس سے ان کارخانوں میں ۲۶ ارب روپے کی سرمایہ کاری ہوگی۔

الیکٹرانک صنعت

ریاست کی صنعتی پالیسی کا ایک بڑا جز الیکٹرانک صنعت کا فروغ ہے۔ جس کے ساتھ اعلیٰ ٹیکنالوجی اور ماحولیاتی تحفظ وابستہ ہے۔ حکومت کی طرف سے تجویز کیا گیا ہے کہ الیکٹرانک سیکٹر کی موجودہ پیداوار ساتویں پلان کے آخر تک ۵ر ارب روپے سے بڑھا کر ۷۱ ارب روپے کر دی جائے۔

فونڈری اور انجینئرنگ اور کھیل کے سامان کی صنعتوں کو بھی بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔ ان کے یونٹ آگرہ اور میرٹھ میں لگائے جا رہے ہیں۔ ان سے صنعتوں کو بڑا فائدہ پہنچے گا۔ ان اداروں کے مال کی کوالٹی کو بہتر بنانے اور دستکاروں اور صنعت کاروں کی مہارت کو بلند کرنے میں مدد ملے گی۔

ریشم کی صنعت کو بھی بڑا فروغ دیا جا رہا ہے۔ اس سے غریب ترین دیہی عوام کے لیے روزگار کے مواقع پیدا ہوتے ہیں ۸۶-۱۹۸۵ء میں ریشم کے کیڑے پالنے والوں کی تعداد ۳۱۳ دس تھی جن میں سے ۲۴۷۶ درج فہرست ذاتوں، ۶۱۹ درج فہرست قبائل اور باقیماندہ ۲۳۱۸ دیگر طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ترائی علاقے میں "کوبیا" کی پیداوار ۸۰ ہزار کلوگرام اور "ادک لٹس" "کوبیا" کی تعداد ۶۱ ہزار تھی۔ اسی طرح بڑا بیکل لٹس کوبیا کی تعداد ۲۲ لاکھ ۴۸ ہزار تک پہونچ گئی۔ غریب ریشم کے کیڑے پالنے والوں کو ترغیب دی گئی کہ وہ اپنے مکانوں اور اُن کے گرد ۲۰ سے ۲۵ پیڑ لگائیں، چنانچہ ۵۰۰۰ اشخاص نے ۸۶-۸۵ء میں یو پی میں پہلی بار ۲۱۳۸۴ شاخیں لگائی گئیں، ان کے علاوہ ۱۲۵ ہیکٹر میں ارجن کے پیڑ لگائے گئے۔ (واضح رہے کہ ارجن کے طبی فوائد بھی ہیں اور اس کی چھال امراضِ دل کے علاج میں استعمال ہوئی ہے)۔ دھاگہ تیار کرنے کے دو پلانٹ نصب کیے گئے ہیں۔ ایک بہرائچ اور دوسرا بیلی بھیت میں۔ شہتوت کے درختوں اور ریشم کے کیڑوں کی مختلف اقسام کی تحقیق و ارتقا کے لیے ریسرچ اور ڈویلپمنٹ سیل بہرائچ میں قائم کیا گیا ہے۔

کھادی اور دستکاریوں کو فروغ دینے کے لیے بھی متعدد اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ریاستی کھادی اور دیہی صنعتی بورڈ کو تقویت دی گئی ہے تاکہ ریاست کے مختلف حصوں میں دیہی صنعتوں کا اہتمام کیا جا سکے۔ چنانچہ ۸۶-۱۹۸۵ء میں تقریباً ۱۴ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کے ۱۴۵۰۷ دیہی صنعتی یونٹ قائم کیے گئے۔ دیہی صنعتوں کی پیداوار ایک ارب ۲۳ کروڑ روپے کی ہوئی اور اُن کی بکری ایک ارب ۴۶ کروڑ روپے کی ہوئی۔ ۸۷-۱۹۸۶ء میں ۲۲ کروڑ روپے کی لاگت سے ۳۰۶۴۸ یونٹوں کے قیام کی تجویز کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں چمڑے، ریشے ہاتھ سے بنے کاغذ، شہد کی مکھیوں کو پالنے، جڑی بوٹیوں، طبی اہمیت کے پودوں کو فراہم کرنے، دیہی برتن سازی، بڑھئی کے کام، لوہار کے کام اور چرخے کے نئے ماڈل تیار کرنے پر زور دیا جائے گا۔ ہنر، مہارت اور کوالٹی کو بہتر بنانے کے لیے ۱۲ تربیتی و پیداواری مرکز اور ایک ریاستی سطح کا "آر اینڈ ڈی" (تحقیقی و ترقیاتی) یونٹ قائم کیا جائے گا۔ ریاستی سطح کا ادارہ جگدیش پور میں اور ہر ڈویژن میں ایک ایک تربیتی و پیداواری مرکز قائم کیا جائے گا۔ بورڈ بڑا اکئی اسکیموں کو بھی عمل میں لا رہا ہے۔ جیسے ہاتھ کا بنا کاغذ، کھادی، تیل اور پہاڑی اُون کی اشیاء۔

ہینڈلوم صنعت

ہینڈلوم صنعت کو فروغ دینے سے متعلق سرگرمیوں میں بھی تیزی لائی جا رہی ہے۔ اس سے زراعت کے بعد دیہی عوام کو روزگار کے

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

عزیز مراد آبادی

ساتویں پنجسالہ منصوبے میں پیداوار کے نشانے اور بنیادی ضرورتوں کی تکمیل

ہمارے ملک میں پنجسالہ منصوبوں کے آغاز سے ہی منصوبہ بندی کا اہم ترین مقصد اقتصادی ترقی کی اونچی شرح حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ خود کفالت اور سماجی انصاف حاصل کرنا بھی ہے۔ گزشتہ منصوبوں نے مذکورہ قومی مقاصد کے حصول میں بہت معاونت کی ہے — ۸۵ – ۱۹۸۰ء کے بعد تو بھارت کی اقتصادی صورتِ حال میں نمایاں سدھار رہا ہے۔ چھٹے منصوبے کے شروع میں (۱۹۷۹ء میں) ہی منصوبے کو بھیانک سوکھے اور ۸۰ – ۱۹۷۹ء میں درآمد ہونے والے معدنی تیل کی بڑھی ہوئی قیمت کا سامنا تھا۔ لیکن کامیابی اور مہارت کے ساتھ چھٹے منصوبے پر عمل درآمد کے نتیجے میں بہتری کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔

ساتویں پنجسالہ منصوبے کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں موجودہ مقاصد کے ساتھ ساتھ مستقبل کے نشانوں کو بھی شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جاری منصوبہ (۹۰ – ۱۹۸۵ء) میں مختلف پیداواری شعبہ جات کی ترقی اور فروغ کے لیے بڑی امید افزا یوجنائیں تیار کی گئی ہیں۔ زراعت اور صنعت ... وغیرہ کی پیداوار بڑھانے کے تئیں جو نشانے مقرر کئے گئے ہیں اور بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے بارے میں ہم مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت قدرے تفصیل سے تذکرہ کرنا پسند کریں گے، تاکہ عام قاری بھی ساتویں منصوبے کی روشنی میں پیداواری صلاحیت کو فروغ دینے کے سلسلے میں واضح طور پر اندازہ لگا کر ملک کی مجموعی ترقی میں اپنا بساط بھر تعاون دے سکے!

شعبۂ زراعت میں پیداواری نشانے

زرعی پیداوار کے اضافے پر اس منصوبے میں بہت توجہ دی گئی ہے۔ ملک کے کم پیداوار والے علاقوں میں پیداوار بڑھانے کی تجاویز پیش کی گئی ہیں تاکہ دھان اور گندم کی پیداوار کو مزید بڑھایا جا سکے!

ساتویں منصوبے کے دوران مجموعی زرعی پیداوار چار فیصد سالانہ کے حساب سے بڑھے گی۔ اندازہ ہے کہ منصوبے کے آخر تک غذائی اجناس کی کل پیداوار جو ۸۵ – ۱۹۸۴ء میں ۱۵۰ ملین ٹن تھی، ۹۰ – ۱۹۸۹ء میں ۸۳ – ۱۷۸ ملین ٹن ہو جائے گی۔ خاص طور پر یہ اضافہ دھان اور گندم کی فصلوں میں ہوگا۔ ان کے ساتھ ساتھ دالوں، جو سارے سبزی خور عوام کے لیے پروٹین مہیا کرتی ہیں، کی پیداوار ۸۵ – ۱۹۸۴ء کی ۱۳ ملین ٹن سے بڑھا کر ۹۰ – ۱۹۸۹ء تک ۱۶ ملین ٹن کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے — بھارت میں اب زیرِ کاشت رقبہ کو بڑھا کر پیداوار بڑھانے کی گنجائش محدود ہے۔ اس لیے موجودہ منصوبے میں زیرِ کاشت لایا گیا رقبہ تو لگ بھگ ۱۴۳ ملین ہیکٹیئر ہی رہے گا۔ لیکن یوجنا میں ۱۳ ملین ہیکٹیئر اضافی رقبہ سینچائی کے تحت لایا جائے گا۔ کوشش یہ رہے گی کہ کم رقبۂ اراضی میں زیادہ سے زیادہ فصلیں اگا کر پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کیا جائے! اور ۸۵ – ۱۹۸۴ء میں جو رقبہ ۱۸۰ مربع ملین ہیکٹیئر تھا، اسے بڑھا کر ۹۰ – ۱۹۸۹ء میں ۱۹۰ مربع ملین ہیکٹیئر کر دیا جائے گا۔

زرعی پیداوار میں اضافے سے متعلق کچھ خاص اور اہم فصلوں کی پیداواری صلاحیت اور پیداوار کے نشانے (جو ساتویں منصوبے میں

• محلہ قاضیان، بستی کرت پور، بجنور
یوجنا، نئی دہلی

مقرر کیے گئے ہیں) درج ذیل جدول میں دیے گئے ہیں:۔

مد	اکائی	۸۵-۱۹۸۴	۹۰-۱۹۸۹	سالانہ اضافے کی شرح
چاول	ملین ٹن	۶۰٫۰	۸۰٫۰-۷۵٫۰	۴٫۰ – ۴٫۶
گندم	"	۴۵٫۰	۵۶٫۰-۵۷٫۰	۴٫۵ – ۴٫۸
موٹے اناج	"	۳۲٫۰	۳۴٫۰-۳۶٫۰	۱٫۲ – ۱٫۸
دالیں	"	۱۳٫۰	۱۵٫۰ – ۱۶٫۰	۲٫۹ – ۴٫۲
جملہ غذائی اجناس	"	۱۵۰٫۰	۱۷۸٫۰ – ۱۸۳٫۰	۳٫۵ – ۴٫۱
تلہن	"	۱۳٫۰	۱۸٫۰	۶٫۷
چینی	"	۶٫۲	۱۰٫۲	۱۰٫۵

دوران منصوبہ مختلف تجارتی فصلوں اور تلہن، گنا، چائے، تمباکو، ربر اور پٹ سن وغیرہ کی توسیع و ترقی پر بھی خصوصی توجہ دی جائے گی۔ متوازن اور صحت بخش غذا حاصل کرنے کے لیے دودھ اور انڈوں کی پیداواری صلاحیت کو بھی مزید بڑھایا جائے گا۔

زرعی ترقی کے ضمن میں سینچائی کو بہت ترجیح اور اولیت دی گئی ہے۔ سینچائی کے جو کام ادھورے رہ گئے تھے انھیں تکمیل کو پہونچایا جائے گا اور مستقبل میں مزید سینچائی کے پراجکٹ پر عمل کیا جائے گا۔ خصوصاً جو علاقے سوکھے کی لپیٹ میں آتے رہتے ہیں، وہاں سینچائی کے چھوٹے بڑے منصوبوں کو تیزی کے ساتھ ترجیحی بنیادوں پر روبہ عمل لایا جائے گا تاکہ ہر قابلِ کاشت زمین سے اچھی اور زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے نشانے کو حاصل کیا جا سکے۔

صنعتی پیداوار کے نشانے

صنعتی پیداوار میں سات فیصد سالانہ اضافہ کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن یہ اضافہ صرف ۵٫۵ فیصد سالانہ ہی ہو سکا تھا۔ اب میں اسے ۶٫۲ فیصد سالانہ کر دینے کا پروگرام ہے۔

صنعتی پیداوار کے سلسلے میں ۸۵-۱۹۸۴ء کے حوالے سے اضافہ کی ایک جھلک اور ساتویں پنجسالہ منصوبے کے تحت صنعتی پیداواروں میں اضافے کے مقرر کردہ نشانے مندرجہ ذیل جدول میں نظر آرہے ہیں۔

مد	۸۵-۱۹۸۴ء	۹۰-۱۹۸۹ء	سالانہ اضافہ کی شرح
اخباری کاغذ	۱۹۷٫۰ ہزار ٹن	۳۴۰٫۰ ہزار ٹن	۱۱٫۵
بجلی کی پیداوار	۱۶۷٫۰ ارب کلوواٹ گھنٹے	۲۹۵٫۰ ارب کلوواٹ گھنٹے	۲۱٫۱
مشینی اوزار	۳۰۳٫۰ کروڑ روپے	۵۰۰٫۰ کروڑ روپے	۱۰٫۵
نائٹروجن کھاد	۳۹٫۲	۶۵٫۶	۱۰٫۹
کل زرعی پیداوار	—	—	۴٫۰
معدنیات سے تیار شدہ اشیاء	—	—	۸٫۳
ذرائع آمد و رفت یا ذرائع نقل و حمل	—	—	۸٫۰

ساتویں منصوبے میں جملہ معدنیات اور تیار شدہ اشیا کی پیداوار میں ۸٫۳ فیصد سالانہ اضافہ کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ کوشش یہ رہے گی کہ مختلف النوع طریقوں اور حکمتِ عملی سے صنعتی پیداوار کو بڑھایا جائے۔

چھٹی یوجنا میں توانائی کی فراہمی یا دستیابی جملہ صنعتی پیداواروں کے لیے ایک حد تک محدود رہی ہے۔ یعنی توانائی کی فراہمی صرف ۸٫۱ فیصد سالانہ رہی۔ لیکن ساتویں یوجنا

بنیادی ضرورتوں کی تکمیل

ساتویں پنجسالہ منصوبے میں دیہی اور شہری علاقوں میں بنیادی ضروریات کی بآسانی پورا کرنے پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔ ان دونوں علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے لیے پینے کے پانی اور صحت و تندرستی کے جملہ امور کو انجام تک پہونچایا جائے گا۔ اسی طرح اشاعتِ تعلیم اور تعلیم حاصل کرنے کے مواقع کی فراہمی کے ذریعے سارے بھارت واسیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا جائے گا۔

ساتواں منصوبہ اخراجات کے لیے کیے گئے مختص روپیوں کے پیشِ نظر بہت بڑا اور امید افزا پلان ہے۔ اس منصوبے میں ۸۵-۱۹۸۴ء کی قیمتوں پر ۱،۸۰،۰۰۰ کروڑ روپے خرچ کرنے کا اہتمام ہے۔ پبلک سیکٹر کے اس خرچ

میں دورانِ منصوبہ بندی مختلف اقدامات پر ہونے والے خرچ بھی شامل ہے، جسے تکنیکی اصطلاح میں "چالو خرچ" کہا جاتا ہے۔ منصوبہ بندی میں اس کے لیے ۲۵۸۷۲ کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔ اس طرح تعمیری کاموں کے لیے پبلک سیکٹر میں کُل ۱۵۴۲۱۸ کروڑ روپے خرچ ہوں گے اور غیر سرکاری یا نجی سیکٹر کا کُل خرچ ۱۶۸۱۴۸ روپے کا ہوگا۔ لہٰذا دونوں سیکٹروں کے خرچ مِلاکر کُل اخراجات ۳۲۲۳۶۶ کروڑ روپے کے ہوں گے۔

دورانِ منصوبہ بندی مختلف اقتصادی شعبۂ جات کی ترقی کے لیے پبلک سیکٹر مجوزہ خرچ مندرجہ ذیل جدول میں دکھایا گیا ہے:۔

مَد	کروڑ روپے	کُل خرچ کا فیصد
زرعی اور دیہی ترقی	۲۲۷۹۲٫۰	۱۲٫۷
سینچائی اور سیلابوں کی روک تھام	۱۶۹۷۹٫۰	۹٫۴
توانائی	۵۴۸۲۱٫۱	۳۰٫۵
صنعت اور معدنیات	۲۲۴۶۱٫۰	۱۲٫۵
نقل و حمل کے ذرائع	۲۲۹۷۱٫۰	۱۲٫۷
نشر و اشاعت کے ذرائع	۶۴۷۲٫۰	۳٫۶
سائنس اور ٹیکنالوجی	۲۴۶۶٫۰	۱٫۴
سماجی امور	۲۹۳۵۰٫۰	۱۶٫۳
دیگر	۱۶۸۷٫۰	۰٫۹
کُل میزان	۱۸۰۰۰۰٫۰	۱۰۰٫۰

ساتویں پانچسالہ منصوبے میں پبلک سیکٹر کے کُل اخراجات میں مرکزی سرکار کا خرچ ۹۵۵۳۴ کروڑ روپے، صوبائی سرکاروں کا خرچ ۸۰۶۹۸ کروڑ روپے اور مرکز کے تحت صوبوں کا خرچ ۳۷۶۸ کروڑ روپے ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس منصوبہ میں توانائی کی توسیع و پیداوار کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس مَد پر کُل خرچ کا ۳۰٫۵ فیصد حصہ خرچ کیا جائے گا۔ دھیان رکھا گیا ہے کہ توانائی کے فقدان کے باعث اقتصادی امور اور تکنیکی ترقی میں کسی طرح کی رکاوٹ نہ پڑے۔ اس طرح اہمیت کے پیشِ نظر ساتویں منصوبے میں پبلک سیکٹر کے حوالے سے، پہلا مقام توانائی کی پیداوار اور فروغ کو دیا گیا ہے اور دوسرے نمبر پر سماج کے فلاحی کاموں کو رکھا گیا ہے۔ جس میں درجِ فہرست ذاتوں، جن جاتیوں اور سماج کے دیگر کمزور طبقوں کی ترقی و خوش حالی شامل ہے۔ سماجی سیواؤں کی مَد پر ۲۹۳۵۰ کروڑ روپے، یعنی کُل خرچ کا ۱۶٫۳ فیصد حصہ خرچ کیا جائے گا۔ اقتصادی ترقی کے لیے ذرائعُ نقل و حمل کی توسیع و ترقی کو ترجیحی فہرست میں تیسرے نمبر پر رکھا گیا ہے۔ ساتویں یوجنا میں ریلوے، سڑک اور نقل و حمل کے ذرائع کو توسیع و ترقی دینے کے لیے ۲۲۹۷۱ کروڑ روپے کے خرچ کا بندوبست ہے۔ لگ بھگ اتنی ہی اہمیت زراعت اور صنعت کے فروغ کو بھی دی گئی ہے (جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے) ان پر منصوبے کے کُل خرچ کا بتدریج ۱۲٫۷ اور ۱۲٫۵ فیصد حصہ خرچ ہوگا۔ سماجی امور میں تعلیم، صحت، خاندانی بہبود، صفائی اور پینے کے صاف پانی کا انتظام وغیرہ بھی شامل ہیں۔

ہم نے دیکھا کہ مندرجہ بالا سطور سے کافی حد تک واضح ہو گیا ہے کہ موجودہ ساتواں پنجسالہ منصوبہ اپنے سابقہ منصوبوں سے زیادہ پُرکشش، اُمید افزا اور خوشحالی کے لیے نوید ثابت ہو سکتا ہے۔ کسی بھی ملک کی ترقی اور خوشحالی اس بات پر منحصر ہے کہ وہاں کے شہریوں کی بنیادی ضرورتیں کس حد تک پوری ہوتی ہیں؟ اور کتنی آسانی سے تکمیل پاتی ہیں؟ اور اسی مقصد کے لیے ہمارا ساتواں منصوبہ قدم بہ قدم آگے بڑھنے لگا ہے۔

ساتویں منصوبے پر شکوک و شبہات کے سائے

ساتواں پنجسالہ منصوبہ کئی پہلوؤں سے گزشتہ منصوبوں کی نسبت زیادہ امید افزا اور پُر از امکانات ہے۔ منصوبہ کی شروعات کافی مضبوط بنیاد پر کی گئی ہے۔ اس منصوبے کے لیے اضافہ کی مقرر کردہ — پانچ فیصد سالانہ اضافہ کی شرح چھٹے منصوبے کی اس بات پر منحصر ہے کہ اس منصوبے میں ۵٫۲ فیصد سالانہ کے حساب سے اضافے کی شرح حاصل کر لی گئی ہے۔ لیکن ۸۰-۱۹۷۹ء میں پیداوار کی حد بہت کم رہی۔ اگر کچھ ماہرین کے مطابق ۸۰-۱۹۷۹ء کے آس پاس کے تین سالہ اوسط کو چھٹے منصوبے کے لیے بنیاد کے طور پر مان بھی لیا جائے تو چھٹے منصوبے کے پہلے تین سال (۸۱-۱۹۸۰ء، ۸۲-۱۹۸۱ء، ۸۳-۱۹۸۲ء) کی اوسطاً اضافے کی شرح ساڑھے تین فیصد ہوتی ہے۔ اگر ۸۴-۱۹۸۳ء میں محصلہ پانچ فیصد اضافہ کی

شرح کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو پہلے چار سالوں کی اضافی شرح چار فیصد سے زیادہ نہیں ہو پاتی ہے۔ اس طرح فی الواقع چھٹے منصوبے کے نشانے پورے نہیں کیے جا سکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چھٹے منصوبے کی اضافی شرح پر مشتمل ساتویں یوجنا کے اضافہ کی شرح شکوک و شبہات کو جنم دیتی ہے۔

ساتویں منصوبے میں اس بات پر خاص زور دیا گیا ہے کہ پہلے سے چل رہی یوجناؤں کو پورا کیا جائے۔ اس کے علاوہ یہ یوجنا نئی یوجناؤں کو شروع کرنے کے مقابلے چالو یوجناؤں کو زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنانے پر زور دیتی ہے۔ مثلاً، سینچائی سے متعلق کہا گیا ہے کہ نئے ضمنی منصوبوں کو ممکنہ حد تک چھوٹی سینچائی، قحط زدہ علاقوں، آدی واسی اور پسماندہ علاقوں تک ہی محدود رکھا جائے گا۔ لیکن اس کی کامیابی بھی مشکوک ہے۔

پلاننگ کمیشن کا یہ اندازہ ہے کہ ساتویں منصوبے میں کل ۱۴۰۰۰ کروڑ روپے گھاٹے کے نظام کے ذریعے حاصل کئے جائیں گے۔ یہ کوئی اچھی علامت نہیں، اس سے انفلیشن (افراطِ زر) کے رجحان کو بڑھاوا ملنے کا اندیشہ ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ اب تک قیمتوں کا اضافہ ہی اس مقام تک پہونچ چکا ہے کہ عام آدمی کے لیے زندگی بسر کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

دورانِ منصوبہ، مقرر کردہ کئی نشانوں کو پورا کرنا یقینی نہیں لگتا۔ موجودہ منصوبے میں یہ توقع کی گئی ہے کہ ۱۳۰ لاکھ ہیکٹر اضافی رقبے پر سینچائی کی سہولت مہیا کی جائے گی۔ اس کے علاوہ ۱۱۰ لاکھ ہیکٹر رقبے پر موجودہ سینچائی کے نظام کو مزید بہتر بنا کر پیداوار بڑھانے کی کوشش کی جائے گی۔ لیکن سابقہ تجربوں کو بنیاد پر کچھ باخبر لوگوں کا اعتراض ہے کہ دیش بھر میں سینچائی کے نظام کی غیر تسلی بخش کارکردگی سے کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ پیداوار بڑھانے کے لیے جملہ مساعی خاطر خواہ بہتر نتائج کی نوید سنا سکتی ہیں؟ تقریباً ایسی ہی صورتِ حال غریبی دور کرنے اور روزگار کی فراہمی کی ہے۔

اس سب کے باوجود ساتویں پنجسالہ منصوبے سے اچھی ہی توقعات وابستہ کی جانی چاہئیں کیونکہ جب بامقصد، مفید، کارآمد کام انجام پاتے ہیں تو اُن پر تنقید کرنے والوں کا ظہور فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے اور اصلاح و بہتری کے لیے ایسا ہونا ضروری بھی ہے۔ ●

بقیہ، تعلیم اور ثقافت

ہمیشہ وہ نتائج برآمد نہیں ہوئے جن کی توقع کی گئی تھی۔

ایک زیادہ اہم مسئلہ نصابی کتب پر نظرِ ثانی کا ہے جو طلباء میں صحیح اندازِ نظر پیدا کرنے کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ قومی اتحاد اور یک جہتی کے جذبے کو قوی تر بنانے کے لیے اشد ضروری ہے۔

آزادی کے بعد لوگوں میں سیکولرزم اور سوشلزم کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے بے شمار کوشش کی گئی ہیں۔ لیکن آجکل ملک کے اتحاد و سالمیت کو جو چنوتیاں درپیش ہیں ان کی موجودگی میں اس جذبے کو مزید مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔ واقعات و حقائق کی قیمت پر قصے کہانیوں کو تاریخ میں شامل ہونے دیا گیا ہے۔ اس خرابی کو دور کرنا ہوگا۔ اور تاریخ کو حقائق پر مبنی بنانا پڑے گا۔ تشریحوں کی اپنی اہمیت ہے لیکن انھیں بلا تعصب سائنٹفک انداز پر لانا ہوگا۔ ہم اختلافات اور پھوٹ پیدا کرنے والے عناصر کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔

آج کی دنیا میں قدرتاً سائنس اور ٹکنالوجی پر زور دینا ہوگا لیکن اس کے لیے عوام میں سائنسی مزاج پیدا کرنا اور بڑھانا ہوگا۔ موجودہ لیڈر شپ نے تعلیمی نظام کو نئی وسعتیں عطا کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔ یہ اس امر کی ضمانت ہے کہ اندازِ فکر میں تبدیلی آئے گی اور ذہن بدلیں گے۔ اگر یہ ہو جائے تو سمجھئے آدھی لڑائی جیت لی۔ یہ ذہنی تعصبات ہی جو معاشرے کے مختلف طبقوں کے درمیان بداعتمادی پیدا کرتے ہیں اور انھیں رجعت پسندی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس قسم کی رکاوٹوں اور دشواریوں کو دور کرنے اور جدیدیت پسند ذہنوں کی تعمیر کے لیے دلیرانہ قیادت کی ضرورت ہے تاکہ قوم آگے بڑھ سکے اور مستقبل کو بہتر بنایا جا سکے۔ ●

بقیہ، اتر پردیش ترقی کی راہ پر تیزی سے گامزن

زیادہ مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ یو پی میں ۱۵ لاکھ سے زیادہ بنکر ہیں جو تقریباً ۵ لاکھ ہتھ کرگھوں پر کام کر رہے ہیں۔ حکومت یو پی کی طرف سے ایک کارپوریشن بنام یو پی اسٹیٹ ہینڈ لوم کارپوریشن اور ایک ادارہ "یو پی آئی سی اے" (یوپیکا) کے نام سے قائم کیا گیا ہے جو کئی طریقوں سے بنکروں کی مدد کر رہا ہے۔ سرکاری اسکیموں کو عمل میں لانے کے لیے ہینڈ لوم اور ٹیکسٹائلز کا ایک الگ ڈائریکٹوریٹ بھی قائم کیا گیا ہے۔

آج تمام ریاست میں صنعتوں کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ آگرہ، میرٹھ، مراد آباد، فیروز آباد، کانپور، مرزا پور اور وارانسی کے علاوہ جہاں روایتی اور درمیانہ درجے کی صنعتیں ترقی کر رہی ہیں، صنعتی سرگرمیوں کے نئے مرکز غازی آباد، اناؤ، لکھنؤ، دہرہ دون، کاشی پور، بریلی، رائے بریلی، گورکھپور، کانپور اور وارانسی میں بھی وجود میں آ چکے ہیں اور وہ روبہ ترقی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اتر پردیش اپنی منزل پر پہونچنے کے لیے زبردست جدوجہد کر رہا ہے۔ ●

لکشمی چندر یاسن*

ذرائع نشر و اشاعت کی ترقی و توسیع

(دوسری اور آخری قسط)

رجسٹرار فار نیوز پیپرز آف انڈیا

یہ محکمہ جسے پریس رجسٹرار کا دفتر بھی کہا جاتا ہے، جولائی ۱۹۵۶ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کی سرگرمیاں پریس اینڈ رجسٹریشن آف بکس ایکٹ مجریہ ۱۸۶۷ء کے تحت آتی ہیں۔ جن میں وقتاً فوقتاً ترمیم کی جاتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ پریس رجسٹرار کا اہم کام اخباری کاغذ کی تقسیم اور اخبارات کو ممالک غیر سے چھپائی کی مشینیں درآمد کرنے کی اجازت دینا ہے۔ یہ محکمہ ہر سال ایک جامع رپورٹ شائع کرتا ہے جس میں ریاست اور زبان کے اخبارات و رسائل کی مالکیت، تعداد اشاعت، سنِ اجرا وغیرہ کے بارے میں مفصل معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔

۱۹۸۳ء کے آخر میں ملک میں اخبارات کی کل تعداد ۲۰۷۵۸ تھی جبکہ ۱۹۸۲ء میں یہ ۱۹۹۳۷ تھی۔ اس میں ۱۴۲۳ روزنامے، ۱۰۸ ہفتے میں دو یا تین بار نکلنے والے اخبار، ۶۱۲۲ ہفت نامے اور ۱۳۱۰۵ طویل تر مقررہ مدت کے بعد شائع ہونے والے رسالے شامل تھے۔

آج اروناچل پردیش اور لکش دیپ کو چھوڑ کر باقی تمام ریاستوں اور مرکزی نظم و نسق کے علاقوں سے اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ ۱۹۸۵ء کی آر، این، آئی کی رپورٹ کے مطابق اتر پردیش سے سب سے زیادہ اخبار نکل رہے تھے۔ باقی ریاستوں کے اخبارات کی تعداد حسبِ ذیل تھی۔ مہاراشٹر ۲۶۵۴، دہلی ۲۶۳۷، مغربی بنگال ۲۲۷۴، تمل ناڈو ۱۲۸۹، راجستھان ۱۱۴۲، آندھرا پردیش ۱۱۲۳ اور کیرل ۱۰۸۵۔

اتر پردیش سے سب سے زیادہ روزانہ اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ (یعنی ۱۹۲) مہاراشٹر دوسرے نمبر پر ہے۔ جہاں سے ۱۷۷ روزنامے نکلتے ہیں۔

تعداد اشاعت (سرکولیشن)

۳۱ دسمبر ۱۹۸۵ء کو تمام اخباروں کی کُل تعداد اشاعت ۵۵۳۹۱۰۰۰ تھی جبکہ ۱۹۸۲ء میں یہ ۵۰۰۹۴۰۰۰ تھی۔ یہ اعداد ۱۰.۶۶ فیصد کا اضافہ ظاہر کرتے ہیں۔

پبلی کیشنز ڈویژن

پبلی کیشنز ڈویژن سرکاری شعبے میں سب سے بڑا دارالاشاعت ہے۔ ابتدا میں اسے محکمۂ اطلاعاتِ عامہ کی غیر ملکی شاخ کی صورت میں قائم کیا گیا تھا۔ لیکن اسے ایک علیحدہ شعبے کی حیثیت اور موجودہ نام ۱۹۴۴ء میں ملا۔ یہ آرٹ، تہذیب و ثقافت، تاریخ و روایات، اہم سیاسی واقعات، جمہوری طرزِ عمل، اقتصادی ترقی، سماجی اصلاح وغیرہ موضوعات پر ہندی، انگریزی اور دیگر علاقائی زبانوں میں کتابیں اور رسالے شائع کرتا ہے۔ ایک سال میں تقریباً ایک سو کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔

پبلی کیشنز ڈویژن سات بڑے سلسلہ ہائے کتب کے تحت کتابیں شائع کرتا ہے:

۱۔ مہاتما گاندھی کی مکمل تصنیفات۔
۲۔ بچوں کا ادب۔
۳۔ جدید ہندوستان کے معمار۔
۴۔ ہندوستان کے ثقافتی رہنما۔
۵۔ ہماری ریاستیں۔
۶۔ سرکردہ رہنماؤں کی تقاریر، اور
۷۔ حوالہ جاتی مواد۔

اس کے علاوہ اس سال سے بچوں کے لیے ممتاز شخصیتوں کے سوانح حیات پر مبنی باتصویر کتابیں چھاپنے کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے اور جدوجہد آزادی کے بارے میں ہندی انگریزی اور

* ۱۰۱، چھتہ بھوانی شنکر، فتح پوری، دہلی

دوسری اہم ہندوستانی زبانوں میں کئی کتابیں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔

"مہاتما گاندھی کی مکمل تصانیف" کے سلسلے کے تحت انگریزی اور ہندی میں علی الترتیب ۹۰ اور ۸۰ جلدیں شائع کی جا چکی ہیں۔ ان میں مہاتما گاندھی کی تقاریر، مضامین، انٹرویو اور خطوط کو شامل کیا گیا ہے۔

"جدید ہندوستان کے معمار" سلسلے کے تحت اُن عظیم شخصیتوں کے سوانح حیات شائع کئے جا رہے ہیں جنھوں نے جدوجہد آزادی اور قومی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس سلسلے کے تحت اب تک ۶۴ کتابیں شائع کی جا چکی ہیں۔

"بھارت کے ثقافتی رہنما" سلسلے کے تحت شائع ہونے والی کتابوں میں ایسی ممتاز شخصیتوں کی زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ جن کا بھارت کی تہذیب و ثقافت اور طرز فکر کو بنانے میں بڑا حصہ ہے۔ اس سلسلے کے تحت ۱۲، اور "ہماری ریاستیں" سلسلے کے تحت ۲۲ کتابیں شائع کی جا چکی ہیں۔

ڈویژن راشٹرپتی، اُپ راشٹرپتی، پردھان منتری اور دیگر سرکردہ رہنماؤں کی تقاریر کے مجموعے بھی شائع کرتا ہے۔ اس کے علاوہ "ہم سب کی پستک مالا" سلسلے کے تحت جنگِ آزادی کے بارے میں چھوٹے سائز اور کم قیمت کی بیس کتابیں شائع کی جا رہی ہیں۔

رسائل

پبلی کیشنز ڈویژن ۲۱ رسالے بھی شائع کرتا ہے۔ پنچسالہ منصوبے سے متعلق رسالہ "یوجنا" آسامی، بنگلہ، انگریزی، گجراتی، ہندی، ملیالم، مراٹھی، تمل، تیلگو، پنجابی، کنڑ، اُردو زبانوں میں شائع کیا جاتا ہے۔

بچوں کے لیے ہندی رسالہ "بال بھارتی" اور عوام کے ادبی و ثقافتی ذوق و شوق کی تسکین کے لیے ہندی اور اُردو زبانوں میں رسالہ "آجکل" شائع ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ چند اور رسالے۔ "انڈین اینڈ فارن ریویو" (انگریزی) نیز "کورکشیتر" اور "بھاگیرتھ"، ہندی اور انگریزی میں ڈویژن کے زیر اہتمام شائع ہوتے ہیں۔ بے روزگار افراد کو خالی اسامیوں کی اطلاع دینے کی غرض سے ایک ہفت روزہ "روزگار سماچار" کے نام سے انگریزی، ہندی اور اُردو میں شائع کیا جاتا ہے جس کی تقریباً تین لاکھ کاپیاں چھاپی جاتی ہیں۔

ڈویژن کی شائع کردہ کتابیں اور رسائل تین ہزار سے زیادہ کتب فروشوں اور ڈویژن کے اپنے مراکز فروخت کرتے ہیں۔ یہ مراکز فروخت نئی دہلی، بمبئی، کلکتہ، مدراس، حیدرآباد، ترِوانت پورم، پٹنہ اور لکھنؤ میں واقع ہیں۔

ڈائرکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ وژول پبلسٹی

یہ محکمہ مرکزی حکومت کی تمام وزارتوں (وزارت ریلوے کو چھوڑ کر) کی پالیسیوں اور پروگراموں کی تشہیر اخباروں میں اشتہارات چھپوا کر اور پوسٹروں، ہینڈ بلوں، پمفلٹوں، فولڈروں، کتابچوں، وال ہینگروں، کلینڈروں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر مختصر اشتہاروں، سینما سلائیڈوں اور مختصر ترین فلموں کے ذریعے کرتا ہے۔ اس کے علاوہ دیواروں، چوراہوں، بجلی کے کھمبوں، بسوں، ٹراموں اور ریل کے ڈبوں میں اشتہاری بورڈ لگا کر بھی یہ کام سرانجام دیا جاتا ہے۔ اس کے پاس ایک بڑا آرٹ اسٹوڈیو ہے جہاں تمام اشتہاری مواد اور پمفلٹوں اور کتابچوں وغیرہ کے ڈیزائن تیار کئے جاتے ہیں۔

اخباری اشتہارات

یہ ملک کی سب سے بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے جو تین ہزار اخبارات و رسائل کو اشتہارات جاری کرتی ہے۔ ایڈورٹائزنگ پالیسی تشہیر اشاعت کی ضرورتوں اور بجٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے تیار کی جاتی ہے۔ اشتہارات جاری کرنے میں چھوٹے اور درمیانی اخبارات و رسائل، سائنسی تکنیکی اور فنی جرائد، پسماندہ یا دُور دراز علاقوں سے نکلنے والے اخبارات پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔

شعبۂ نمائش

ڈائرکٹوریٹ کے ۳۴ ایگزیبیشن یونٹ ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں نو چلتی پھرتی گاڑیاں اور دو ریل کے ڈبے بھی شامل ہیں۔ یہ یونٹ اہم موضوعات پر نمائشیں منعقد کرتی ہیں جنھیں باری باری سے مختلف مقامات پر دکھایا جاتا ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۶۵۳ نمائشوں کا اہتمام کیا گیا۔ کچھ قابلِ ذکر موضوعات جن پر نمائشیں لگائی گئیں یہ ہیں:

قومی یک جہتی، فرقہ وارانہ اتحاد و خیرسگالی

بیس نکاتی پروگرام اور خاندانی منصوبہ بندی۔

سابق وزیر اعظم مرحومہ شریمتی اندرا گاندھی کے یوم ولادت ۱۹ نومبر ۱۹۸۴ء کو تین مورتی بھون نئی دہلی میں "پریہ درشنی" کے نام سے ایک خاص نمائش لگائی گئی۔ بھارت کے پہلے راشٹرپتی ڈاکٹر راجیندر پرساد کی جنم صدی کے موقع پر "ڈاکٹر راجیندر پرساد — ایک جھانکی" کے عنوان سے بیک وقت دہلی اور پٹنہ میں ایک نمائش لگائی گئی۔

پرچار مہمیں

ڈائرکٹوریٹ خاص خاص موضوعات پر ملٹی میڈیا تشہیری مہمیں چلاتا ہے جن میں اخباروں میں اشتہارات کے علاوہ، پمفلٹوں، پوسٹروں، سینما سلائیڈوں اور ریڈیو اور ٹی وی اسپاٹس کا بیک وقت استعمال کیا جاتا ہے۔ کچھ قابلِ ذکر تشہیری مہمیں حسب ذیل ہیں:۔ بیس نکاتی

پروگرام، قومی اتحاد و خیرسگالی، صحت اور خاندانی بہبود، پسماندہ طبقات کی بہبود، چھوت چھات، جہیز کی لعنت، متوازن غذا، قومی بچت وغیرہ۔

میلنگ سروس

ڈائرکٹوریٹ کے پاس ۱۶٫۵ لاکھ سے زائد ڈاک پتوں کا بنک ہے۔ انھیں اشاعتی مواد مفت بھیجا جاتا ہے۔ زیادہ تر لوگ جنھیں اشاعتی مواد بھیجا جاتا ہے، گرام پنچایتوں، پرائمری اور ہائی اسکولوں، زرعی منڈیوں، دیہی ڈاک خانوں اور لائبریریوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

پرنٹنگ اینڈ ڈیزائننگ ایوارڈ

ڈائرکٹوریٹ اعلیٰ طباعت و ڈیزائن سازی کے فروغ کے لیے ہر سال پرنٹنگ اینڈ ڈیزائننگ ایوارڈ دیتا ہے۔ یہ ایوارڈ ایسی کتابوں، رسالوں اور اخبارات کے لیے دئے جاتے ہیں جن کی طباعت بہترین سمجھی جاتی ہے۔ ایوارڈوں کا فیصلہ ججوں کی ایک کمیٹی کرتی ہے۔

ڈائرکٹوریٹ آف فیلڈ پبلسٹی

یہ ڈائرکٹوریٹ ذاتی رابطے کے ذریعے پرچار کا سب سے بڑا محکمہ ہے۔ یہ ایک سال میں تقریباً سات لاکھ لوگوں سے رابطہ قائم کرتا ہے جس کا مقصد ان کو حکومت کی پالیسیوں، پروگراموں اور اہم سرگرمیوں سے روشناس کرانا، ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنا اور قومی تعمیر و ترقی کے کاموں میں ان کا تعاون اور اشتراک عمل حاصل کرنا ہے۔

اس ڈائرکٹوریٹ کے یونٹ ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں جو فلموں، گیتوں، ناٹکوں اور نوٹنکیوں کے پروگراموں، بحثوں، مذاکروں، کوی سمیلنوں، نمائشوں وغیرہ کے ذریعے عوام کو حکومت کی پالیسیوں اور پروگراموں سے متعارف کراتے ہیں۔ ان کی ضرورت خاص کر دیہی اور دور دراز علاقوں میں ہوتی ہے جہاں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی۔ پڑھے لکھے لوگوں میں یہ چھپا ہوا اشاعتی مواد تقسیم کرتے ہیں اور مختلف پالیسیوں اور پروگراموں پر عوام کا ردّ عمل معلوم کرکے حکومت کو بھیجتے ہیں۔

اس ڈائرکٹوریٹ کا صدر دفتر نئی دہلی میں ہے اور اس کے علاقائی دفاتر تمام ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں کے راجدھانیوں میں واقع ہیں۔ اس وقت ۲۲ علاقائی دفاتر اور ۲۵۷ علاقائی یونٹ کام کر رہے ہیں۔

۱۹۸۴ء میں ان یونٹوں نے ۳۷ ہزار فلم شو دکھلائے اور ۸۵۰۰ گیت اور ناٹک اسٹیج پر پیش کئے۔ ذاتی رابطہ اور زبانی پرچار کے لیے ۵،۵۰۰ پروگراموں کا اہتمام کیا گیا۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچنے کے لیے بڑے بڑے میلوں، تہواروں پر پبلسٹی پروگراموں کا انتظام کیا گیا۔

گیت اور ناٹک ڈویژن

گیت اور ناٹکوں کے زندہ پروگراموں کے ذریعے عوام کو حکومت کی پالیسیوں اور پروگراموں سے متعارف کرانے کے لیے یہ ڈویژن ۱۹۵۴ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کے لیے کٹھ پتلی کے تماشوں، نوٹنکیوں، ناچ گانوں، ہری کتھا وغیرہ پروگراموں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ پروگرام ڈویژن کی ۱۵ منڈلیاں اور ڈویژن کی فہرست میں درج ۵۰۰ نجی منڈلیوں کے ذریعے پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے لیے کئی مرکزی، ریاستی و مقامی ایجنسیوں کا تعاون حاصل کیا جاتا ہے۔ ڈویژن میں فوجی بھائیوں کی تفریح کے لیے ایک یونٹ ۱۹۶۷ء میں قائم کیا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں ڈویژن نے "لائٹ اینڈ ساؤنڈ" پروگراموں کا آغاز کیا۔ اس کے تحت جلیاں والا باغ کے دلدوز واقعہ نیز گرو نانک، سبرامنیم بھارتی، امیر خسرو، ودیاپتی، اکبر، کرشن دیورائے جیسی عظیم شخصیتوں کے اہم واقعات زندگی اور رام چرت مانس کی کتھا نہایت پُر اثر انداز میں پیش کی گئی۔ جنھیں بیک وقت ہزارہا اشخاص نے دیکھا۔ ڈویژن کا خاندانی بہبود پر مبنی ایک مختصر پروگرام بھی کافی مقبول ہوا۔

فلمز ڈویژن

یہ محسوس کرتے ہوئے کہ فلم پبلسٹی کا پُر اثر میڈیم ہے۔ فلمز ڈویژن کا قیام ۱۹۴۸ء میں بمبئی میں عمل میں لایا گیا۔ نئی دہلی، بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں اس کے یونٹ قائم ہیں۔ یہ ڈویژن نیوز ریلیں اور ڈاکومینٹری دستاویزی فلموں کے ذریعے عوام کو حکومت کی پالیسیوں، پروگراموں، ترقیاتی سرگرمیوں، سماجی اصلاح کے اقدامات اور اہم ملکی و غیر ملکی واقعات سے روشناس کراتا ہے۔ ۱۹۴۹-۵۰ء میں اس نے صرف ۳۳ دستاویزی فلمیں، ۲۵ نیوز ریلیں اور ۱۲ دیگر مختصر فلمیں تیار کی تھیں۔ لیکن ۱۹۸۲-۸۳ء میں اس نے ۵۰ قومی، ۴۰ علاقائی اور آٹھ خصوصی نیوز ریلیں، تین رنگین نیوز ریلیں، تین بھارتیہ سماچار چتر اور نئی دہلی کے نویں ایشیائی کھیلوں کے بارے میں پانچ رنگین نیوز ریلیں بنائیں جو اس کی ترقی کا واضح ثبوت پیش کرتی ہیں۔ زیادہ تر فلمیں انگریزی میں بنائی جاتی ہیں اور بعد میں انھیں ۱۵ علاقائی زبانوں میں ڈب (DUB) کیا جاتا ہے۔

فلمز ڈویژن نے یکم فروری ۱۹۸۴ء سے ہفتہ وار نیوز ریلیں بنانا بند کر دیا تھا۔ اب پندرہ روزہ نیوز ریلیں بنائی جاتی ہیں۔ ہر سال ۲۶ نیوز ریلیں تیار کی جاتی ہیں جو زیادہ تر رنگین ہوتی ہیں۔ ڈویژن کے آٹھ افسران دور درشن کے لیے بھی فلم کی صورت میں خبریں جمع کرتے ہیں۔ ڈویژن نے بیس نکاتی پروگرام کے ہر نکتے پر بیس مختصر فلمیں تیار کی ہیں اور ملک کی جد و جہد آزادی کے بارے میں معلوماتی فلمیں بنانا شروع کیا ہے۔ اسی سلسلے کے تحت اب تک ۱۲ فلمیں برائے نمائش جاری کی جا چکی ہیں۔ ان میں سے کچھ فلمیں ڈویژن نے خود بنائی ہیں اور کچھ باہر سے بنوائی ہیں۔

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

فاروق نازکی

(قسط: ۶)

ترقی کے سنگِ میل

آلودگی سے پاک ماحول

ماحول چاہے کسی بھی طرح کا ہو، آلودگی سے اُس کا پاک رہنا شرطِ اوّل ہے، سائنس کی لگاتار ترقی نے صنعتوں میں بے تحاشا اضافہ کردیا ہے، کارخانوں کے قیام سے جہاں پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے، وہاں کارخانوں میں کام آنے والے ایندھن سے جو بخارات اور دھواں نکلتا ہے، وہ ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے کر ہوا کو آلودہ کردیتا ہے، اس کے علاوہ کارخانوں میں پیداوار کی رفتار میں اضافے کے ساتھ ساتھ کارخانوں سے غلاظت کا بھی اخراج ہوتا ہے، جو گرد و پیش کو آلودہ کردیتا ہے'۔ یہی وجہ ہے کہ صنعتی ترقی کے دوش بدوش گرد و پیش اور ماحول کو آلودگی سے بچانے کی تدابیر پر بھی زور دیا جاتا ہے، بہت سے ترقی یافتہ ممالک میں ماحول کی آلودگی نے ایک گمبھیر صورت اختیار کرلی تھی۔ جہاں جہاں گیس تیار کرنے کے کارخانے ہیں، وہاں وہاں ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے غیر معمولی اقدامات کرنے کے لیے اور ترقی یافتہ ممالک میں اب ہوا کی آلودگی کا مسئلہ حل ہوتا جا رہا ہے۔

صنعتی ترقی کے لیے انرجی بنیادی صلاحیت رکھتی ہے، روائتی ذرائع سے حاصل شدہ انرجی ترقی کی رفتار سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتی، اور نہ وقت کے تقاضوں کو پورا کرسکتی ہے۔ اسلئے انرجی کے جدید ذرائع کو کام میں لایا جاتا ہے۔ بجلی نہ ہو تو جدید صنعتی کلچر کا تصوّر ہی نہیں کیا جاسکتا، اور آبی وسائل سے اتنی بجلی پیدا کرنا ممکن نہیں، کہ صنعتی ضرورتوں کو پورا کرسکے، یہی وجہ ہے کہ برق آبی پروجیکٹوں کے ساتھ تھرمل پاور پروجیکٹ زیادہ تعداد میں قائم کئے جارہے ہیں۔ تھرمل پاور پراجیکٹوں میں ہوا کو آلودگی سے پاک و صاف رکھنے کا معاملہ خصوصی توجہ کا طالب ہے'۔ ہمارے ملک میں ہوا میں آلودگی کی شرح بڑھتی جارہی ہے صحت سے متعلق عالمی تنظیم نے تھرمل اسٹیشنوں سے پیدا ہونے والے برقی اثرات کی ایک خاص حد مقرر کررکھی ہے۔ جو برقرار رہے تو صحت پر مُضر اثرات پڑھنے کا احتمال نہیں ہوگا۔ لیکن ہمارے یہاں وہ حد پار ہوچکی ہے۔ ظاہر ہے اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے فوری اور خصوصی اقدامات کرنے میں کسی تاخیر سے کام نہیں لیا جاسکتا۔

دہلی کے اندر پرستھ علاقے میں واقع پاور اسٹیشن میں جو کوئلہ جلایا جاتا ہے اس سے پیدا ہونے والی راکھ ۵۰ ٹن کی مقدار میں دہلی کے مختلف علاقوں میں جاگزیں ہوتی ہے، حالاں کہ اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے کئی قدم اٹھائے بھی گئے ہیں۔

ہمارے ملک میں دستیاب کوئلے میں راکھ کی مقدار میں روزافزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے، اس سے ماحول پر جن مُضر اثرات کا امکان ہے، اُن سے نمٹنے کے معاملہ اب اور بھی اہم ہوگیا ہے' کوئلہ سے پیدا ہونے والے ذرّات کو بکھرنے سے روکنے کے لیے اگرچہ فلٹریشن (Filtration) وغیرہ کی جاتی ہے، لیکن اس مسئلے کا مؤثر تدارک کرنے کے لیے برقی طریقوں کا اپنانا لازمی ہوگیا ہے۔ کوئلہ سے پیدا ہونے والے ذرات اور اس سے خارج ہونے والی گیس کو ایک خاص برقی طریقہ کار یعنی Electro Precipitate کے ذریعے ہوا میں پھیلنے سے روکا جاسکتا ہے۔ اس کام کی تکمیل کے لیے آلات کے صحیح استعمال سے کوئلہ میں پیدا ہونے والے ذرات کی صحیح مقدار

• اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر، آل انڈیا ریڈیو، سری نگر

کا تعین اور اخراجات کے بارے میں جانچ کرنے کا کام بہت اہمیت رکھتا ہے۔

آلودگی کو دُور رکھنے کے لیے Electro static Precipitator کافی مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اینڈر یو یلو نام کی کمپنی جو ان آلات کو تیار کرتی تھی، اب بھاری پیمانے پر، زیادہ طاقت والے آلات تیار کرے گی، جس سے تھرمل پاور اسٹیشنوں میں کام کا معیار بلند ہوگا۔ یہ آلات کام کا معیار بڑھانے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے موجودہ کوئلہ میں پیدا ہونے والے ذرات کو تحلیل کرنے کے کام میں کافی مدد و معاون ثابت ہوں گے۔

کھادی پر مزید رعایت

کھادی کا نام آتے ہی سودیشی کا تصوّر ذہن میں آتا ہے، کھادی کے ذریعے گاندھی جی نے دیہی اقتصادی نظام کے بارے میں اپنے آدرش کو عوام کے سامنے رکھا، کھادی کی بُنائی اور کتائی کی مدد سے وہ ترقی کے کاموں میں تمام لوگوں کے عملی اشتراک کے فلسفے کی ترویج کرنا چاہتے تھے، کھادی کے ذریعے گاندھی جی نے خود کفالت کے اپنے خواب کو اظہار کا پیکر دیا۔

مرکزی وزارت خزانہ نے ۸۶-۱۹۸۵ء کے لیے کھادی بلک، سوتی کھادی اور اونی کھادی یعنی کمبل وغیرہ کی قیمتوں میں چھوٹ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

کھادی سے بنائے گئے سوتی کپڑوں پر اب سال بھر کے لیے ۱۵ فیصدی کی چھوٹ ہوگی۔ یہ اُس دس فیصدی کے علاوہ ہوگی، جو ہر سال ۹۰ روز کے لیے دی جاتی ہے۔ چھوٹ دینے کی مدّت مختلف پردیشوں میں مختلف اوقات پر متعین کی گئی ہے تاکہ اُسی مدّت میں مقامی تہوار بھی پڑتے ہوں۔

موجودہ مالی سال کے دوران، سوتی کھادی، اونی کھادی اور کمبلوں پر ۹۰ روز کے لیے ۱۰ فیصدی چھوٹ دی گئی ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران ۳۰ دن کے لیے ۵ فیصدی، ۵۰ دنوں کے لیے ۱۰ فیصدی اور ۹۰ فیصدی کے لیے ۱۰ فیصدی چھوٹ دی جاتی تھی۔ اسی طرح تیار کپڑوں پر ۲۰ فیصدی کی چھوٹ ۹۰ دن تک منظور کی گئی ہے حالانکہ گذشتہ برسوں میں ۳۰ روز کے لیے صرف ۲۰ فیصدی کی رعایت دی جاتی تھی۔

ان اقدامات کے نتیجے میں کھادی کی فروخت ایک کروڑ ۶۶ لاکھ روپے سے بڑھ کر ۲ کروڑ آٹھ لاکھ روپے تک پہونچ جائے گی۔

کھادی کی فروخت پر اتنی رعایت دینے سے لازمی طور پر پیداوار میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔ کھادی کی پیداوار میں اضافے اور فروخت میں ترقی سے دس لاکھ لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہوگا، جو اس صنعت کے ساتھ وابستہ ہیں۔

پردیشوں میں درختوں کی پیداوار

جنگلوں کا بے دریغ صفایا ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس سے جہاں ملک کے آمدنی کے ذرائع محدود ہو کر رہ جانے کا احتمال ہوتا ہے، وہاں موسم کی تبدیلی پر بُرے اثرات بھی مثبت ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ملک کے لوگ جنگلوں کی اہمیت اور افادیت سے واقف ہو گئے ہیں۔ اگرچہ بہت سے خود غرض عناصر اپنی جیبیں بھرنے کے لیے جنگلوں کی دولت بے تحاشا لُوٹ رہے ہیں۔ پھر بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو فطرت کے اس گنج گرانمایہ کی حفاظت کے لیے پیش پیش ہیں۔ کئی رضا کارانہ تنظیمیں مثلاً مشہور چپکو تحریک درختوں کے بچاؤ کے کام میں آگے آگئی ہے۔ اس تحریک کا ہر جگہ خیر مقدم ہوتا رہا ہے اور یہ تحریک عوام میں درختوں کے تئیں ذمہ داری کو بیدار کرنے میں کارگر ثابت ہو رہی ہے۔

اس سال درخت اُگانے کی مُہم کا آغاز کرتے ہوئے وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے درخت اُگانے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ انسانیت کے تحفظ کے لیے حُسنِ فطرت کا تحفظ ضروری ہے۔ سرسبز و شاداب درخت جہاں ہماری آنکھوں کو خیرہ کرتے ہیں، وہاں اُن سے ہماری آمدنی کے وسائل پر بھی اثر پڑتا ہے۔

۸۳-۱۹۸۲ء سے ملک میں درخت اگانے کا کام تسلی بخش طریقے پر جاری ہے۔ اس مہم کے آغاز میں جو نشانے مقرر کیے گئے تھے، وہ خاطر خواہ طریقے پر پورے ہو رہے ہیں۔ ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران ۱۹ لاکھ پودوں کے بجائے لگ بھگ ۲۲ لاکھ پودے کاشت کیے گئے۔ ۸۴-۱۹۸۳ء اور ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران بالترتیب لگ بھگ ۲۷ ہزار اور ۲۵ ہزار درخت کاشت ہوئے، جبکہ ۸۳-۱۹۸۲ء اور ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۲۴ ہزار اور ۱۲ ہزار درخت لگائے گئے تھے۔

مختلف ریاستوں جن میں آندھرا، آسام، بہار، ہماچل، جموں و کشمیر، کیرلا، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، میگھالیہ، اُڑیسہ، پنجاب، راجستھان، تامل ناڈو، تری پورہ اور اُتر پردیش، درخت لگانے کے کام میں مستعدی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ درخت اُگانے کی مُہم کی مقررہ مدّت میں ان ریاستوں نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے۔ البتہ ہریانہ، کرناٹک، ناگالینڈ اور مغربی بنگال کی ریاستیں درخت لگانے کے کام میں ابھی پیچھے ہیں۔

ساتویں منصوبے میں تیل کی پیداوار میں اضافے کی توقع

انرجی کا اہم ترین ذریعہ تیل یا عرف عام

،پٹرول کو مانا جاتا ہے، عہدِ حاضر میں تیل کی
قوں سے ہی عالمی اقتصادیات کے اُتار اور
ڈھاؤ کو محسوس کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک
، جس طرح زمین بہت سی معدنیات سے
لا مال ہے، وہاں تیل کی دولت بھی زمین کے
ہ وں اور پانی کی نقاب کے نیچے پوشیدہ
ہے، بمبئی کے نزدیک بحرِ ہند میں تیل کے
خائر موجود ہیں، جن کو نکالنے کے لیے اعلیٰ پیمانے
مشینیں نصب کی گئی ہیں۔ اس وقت ملک
تیل کی جو ضرورت محسوس ہوتی ہے، اس کا
یک ٹھوس حصہ ملک میں ہی دستیاب ہے۔ ساتویں
منصوبے میں تیل نکالنے کے کام کو خاص اہمیت
ی گئی ہے اور اُمید ہے کہ ۹۰-۱۹۸۹ء کے
دران ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ ٹن خام تیل دستیاب ہوگا۔
ب کہ اس وقت ۳ کروڑ ٹن تیل دستیاب
ہوتا ہے، سال ۸۶-۱۹۸۵ء کے پہلے نصف
ں ۱۴ کروڑ تین لاکھ ٹن تیل نکالا گیا۔ تیل اور
یس سے متعلق کمیشن سے کہا گیا ہے کہ وہ شمال
نوبی حصے پیداوار کو مزید بڑھاوا دینے کے
یے فوری اقدامات کرے، کیونکہ اس علاقے
ں تیل کی پیداوار میں چنداں کمی واقع ہوئی تھی۔

تیل صاف کرنے کے کام کے لیے منصوبہ
ندی کمیشن نے ۱۲ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کر
ی ہے۔ اس میں سے ساڑھے پانچ کروڑ سے
یادہ کی رقم ہائیڈرو کاربنا کی پیداوار کے لیے
راہم کی گئی ہے، اُمید ہے کہ اس اسکیم کا خاکہ
عنقریب ہی منظور کر دیا جائے گا، تاکہ اسے
لی صورت دی جا سکے۔

تیل کی صنعت کے لیے منصوبے کا خاکہ
ن بھگ ۱۳ کروڑ روپے کی مالیت کا ہے۔ تیل
ی پیداوار میں اضافہ کے علاوہ کئی خاص اسکیمیں
ھی تیار کی گئی ہیں۔ جن کو ساتویں منصوبے میں

عملی صورت دی جائے گی، اس میں ہازیرا،
بیجا پور، جگدیش پور کی گیس پہنچانے والی
لائن اور احمد آباد میں تیل صاف کرنے کے کارخانے
میں سہولیات کا اضافہ شامل ہے۔

غریبی کو ختم کرنے کا عہد

آزادی سے پہلے ملک کی اقتصادیات
نوآبادیاتی نظام کے ماتحت تھی، عام انسان کی
مشکلوں اور مصیبتوں کی نہ کسی کو فکر تھی اور نہ پڑا۔
حصولِ آزادی کے وقت ہندوستان میں رہنے
والے مختلف فرقوں، مذہبوں اور علاقوں کے
لوگوں کے درمیان بھوک ہی ایک قدرِ مشترک تھی
آزادی کے بعد اس بات کو محسوس کیا گیا کہ اگر ہم
بھوک میں ایک دوسرے کے ساجھے دار تھے، تو
خوشحالی میں ایک دوسرے کے ساجھے دار کیوں نہ
بنیں۔ یہی وجہ ہے کہ غریبی کی سطح سے عوام کو
اوپر اٹھانے کے کام کو ہمارے منصوبوں میں کلیدی
اہمیت حاصل ہوئی۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے
کہ اب سوال دو وقت کی روٹی فراہم کرنے کا
نہیں، بلکہ بہتر رہائشی سہولیات، پینے کے لیے
صاف پانی، حفظانِ صحت کی تدابیر، طبی سہولیات
فراہم کرنے کا ہے۔ اس کے باوجود آفاتِ سماوی
کی وجہ سے ہمارے منصوبوں کے تحت کیا گیا
کام نفی کے برابر ہو جاتا ہے، سیلاب، خشک
سالی اور اسی طرح کی دوسری سماوی آفات،
سارے کیے دھرے پر پانی پھیر دیتی ہیں۔
ساتویں منصوبے میں اس بات کا خیال رکھا
گیا ہے کہ دُور دراز اور دشوار گذار علاقوں
میں رہنے والے لوگوں تک منصوبہ بندی کے
فوائد پہونچ سکیں، خشک سالی سے متاثر
ہونے والے علاقوں، ریگستانی علاقوں اور قبائلی
علاقوں سے غریبی کو ہٹانے کے لیے خاص اقدامات
تجویز ہوئے ہیں۔

اس سلسلے میں کچھ پائلٹ پروجیکٹوں کو ہاتھ
میں لینے کا فیصلہ کیا گیا ہے تاکہ وہ ایک نمونے
کے طور پر عمل پذیر ہوں۔ ضلع کی سطح پر انجام
پانے والے پراجیکٹوں کو سامنے رکھتے ہوئے
دیہی سطح کے ترقیاتی پروگراموں کو شروع کیا
جائے گا۔ دیہات کے پراجیکٹ زرعی اقتصادیات
پر مبنی ہوں گے۔ یہ پراجیکٹ ایک خاص
انداز سے تشکیل دیے گئے ہیں۔ ضلع سطح پر ان
پراجیکٹوں کو مختلف خانوں میں تقسیم کر دیا جائیگا،
اور پھر چند دیہات پر مشتمل الگ الگ پراجیکٹ
ترتیب پائیں گے، جن کی تکمیل سے عام آدمی تک
ترقی اور فلاح و بہبود کا فائدہ پہونچ سکے گا،
دوسرے لفظوں میں یہ پراجیکٹ ان دیہات میں
رہنے والے لوگوں کے عملی تعاون سے انجام پذیر
ہوں گے، اور ان پراجیکٹوں کا براہِ راست
فائدہ انہی لوگوں کو پہونچے گا۔

مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کے تحت ترقی
کا وقتاً فوقتاً جائزہ لینے کے لیے ایک نئی اسکیم کی
بنیاد ڈالی گئی ہے، جس کے تحت نئے مفاد پانے
والوں اور پرانے مفاد پانے والے دس دیہاتوں
کے نمونے جمع کیے جائیں گے، یہ کام ۲۰ بلاکوں
میں کیا جائے گا، جس کے لیے ۳۶ ضلعے منتخب
کیے جائیں گے۔ بلاکوں اور ضلعوں کا انتخاب
مرکزی حکومت کرے گی اور نتائج کا جائزہ لینے
کا کام تحقیقی اداروں کے سپرد کر دیا جائے گا،
یہ ادارے اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے کام کا
بغور جائزہ لیں گے اور جہاں کہیں انھیں کسی
خامی کا علم ہو جائے، اس کی نشاندہی کریں گے۔

اس کے علاوہ قومی پیداوار بڑھانے کے
پروگرام کے تحت حکومت نے دس لاکھ ٹن گیہوں
فراہم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ گیہوں کی یہ مقدار
۸۶-۱۹۸۵ء میں فراہم کرنیکی کوشش کی گئی۔ اس گیہوں

یہ جو لاگت آئی ہے وہ مرکزی سرکار نے برداشت کی ہے۔

جو پردیش گیہوں کی زائد مقدار قبول کریں گے، اُن کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اُجرت کا ۴۰ فیصدی حصہ گیہوں کی شکل میں مزدوروں کو فراہم کریں۔ اس گیہوں کی رعایتی قیمت ایک روپے ۵۰ پیسہ مقرر کی گئی ہے۔ دیہی روزگار فراہم کرنے سے متعلق تنظیم نے ایک اسکیم تیار کی ہے جس کے تحت درجِ فہرست ذاتوں اور بندھوا مزدوری سے تعلق رکھنے والوں کے لیے مکان تعمیر کئے جائیں گے۔ اس سلسلے میں کیرلا اور تامل ناڈو کے لیے بالترتیب ساڑھے چار کروڑ اور لگ بھگ نو کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔

جہاں تک دیہات میں پانی کے وسائل بڑھانے کا سوال ہے، ۳۸ ہزار ایسے دیہات کو فوری طور پر پینے کے پانی کی سہولیات فراہم کی جائیں گی، جن کی مشکلات کے بارے میں پہلے ہی جانچ ہو چکی ہے۔ دوسرے مرحلے پر ۱۹۹۱ء تک ملک کے ہر دیہات میں پینے کے پانی کی سہولت میسر ہوگی۔

کئی جائزوں اور تحقیقوں سے پتہ چلا ہے کہ ۴۰ فیصدی لوگ غریبی کی سطح سے اوپر اُٹھ گئے ہیں۔ وزیراعظم شری راجیو گاندھی نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ ہم نے چھوٹے کسانوں اور غریب دیہی باشندوں کی طرف خاص توجہ دی ہے، ہمارے دیہی ترقیاتی پروگرام اور غریبی ہٹاؤ پروگرام کافی موثر ثابت ہوئے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ ہم ان پروگراموں کو زیادہ مفید اور موثر کیسے بنا سکیں۔"

چھٹے پانچسالہ منصوبے کی تسلی بخش کامیابی

گذشتہ منصوبوں میں ملک کی مجموعی ترقی کا کام تسلی بخش رہا ہے، فی کس آمدن میں روز افزوں اضافے کی وجہ سے پیداواری صلاحیت میں بھی اضافہ ہوا۔ ۱۹۷۹-۸۰ء اور ۱۹۸۲-۸۳ء کے دوران سیلابوں کی تباہ کاری کے باوجود قومی اور بین الاقوامی سطح پر قومی آمدنی میں ۵٫۲ فیصدی کا اضافہ ہمارے دعوے کی تصدیق کرتا ہے، اس وقت خوراک کی صورتِ حال غیر معمولی طور پر قابلِ ستائش ہے اور ہمارے اناج کے ذخیرے میں اس وقت ۲ لاکھ ۶۰ ہزار ٹن موجود ہے، امید ہے کہ ۱۹۸۶ء کے آخر تک ملک کے اناج کے ذخیرے میں تین لاکھ ۴۰ ہزار ٹن موجود ہوگا جس کا مطلب یہ ہوا کہ اناج کے ذخیرے میں ایک لاکھ ۳۰ ہزار ٹن کا اضافہ ہو جائے گا۔

زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی چھٹے منصوبے کے دوران ہم نے نمایاں ترقی کی ہے۔ تھرمل پاور کی پیداوار میں قابلِ دید اضافہ ہوا، لوہے اور فولاد کی پیداوار بڑھ گئی۔ اسی طرح سیمنٹ اور دیگر بنیادی صنعتیں بھی مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئیں، اس طرح سے سرمایہ کے پیداواری اوسط میں بھی نمایاں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔

چھٹے منصوبے کی دیگر نمایاں باتوں میں درآمدی تجارت کے ذریعے اقتصادی معیشت کو مستحکم بنانے کا کام بھی شامل ہے۔ انرجی کو بڑھاوا دینے کے لیے خاطر خواہ کوشش ہوئی ہے۔ درآمدی اور برآمدی تجارت میں توازن قائم کرکے بیرونی منڈیوں میں اپنے مال کی کھپت کے لیے جو قدم اُٹھائے گئے کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ موجودہ مالی خسارے کی شرح ۵ بلین سے ۲٫۹ بلین تک لائی گئی ہے۔

جہاں تک صنعتوں کے فروغ کا تعلق ہے چھٹے منصوبے کے دوران صنعتوں کے پھیلاؤ اور اُن کی بہتری میں کوئی قابلِ قدر اضافہ نہ ہوا۔ برآمدی تجارت میں جو دھچکا لگا، اس کی وجہ عالمی پیمانے پر پایا جانے والا مندا اور عالمی تجارت میں جمود ذمہ دار ہے، اس کے علاوہ ایک افراطِ زر کی وجہ سے بھی برآمدی تجارت کو کافی نقصان پہونچا۔ پبلک سیکٹر میں بھی تجارت تسلی بخش نہیں رہی۔ حق تو یہ ہے پبلک سیکٹر میں شامل بہت سے ادارے سرکاری خزانے پر بوجھ بنے ہوئے ہیں۔ البتہ خوراک پیداوار اور اس میں خود کفالت کا کام تسلی بخش رہا ہے۔ مجموعی طور پر صنعتی ترقی، سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی، مع نیوکلیائی قوت، خلائی سائنس اور ٹیلی کمیونکیشنز میں قابلِ داد ترقی ہوئی ہے۔

دیہی صحت و صفائی کے لیے بڑے پیمانے پر اقدامات

وزیراعظم نے اس بات کی منظوری دی ہے کہ تمام دیہی علاقوں میں ایک مربوط طریقہ پر صحت و صفائی کا کام ہاتھ میں لیا جائے اور جگہ جگہ لوگوں کی سہولیت کے پاخانے وغیرہ تعمیر کئے جائیں۔ یہ کام ساتویں منصوبے کے دوران پایۂ تکمیل پذیر ہوگا۔

اس وقت دیہی علاقوں میں رہنے والے صرف ایک فیصد لوگوں کو ایسے پاخانوں کی سہولت حاصل ہے، جو حفظانِ صحت کے اصولوں کے تحت تعمیر کئے جاتے ہیں۔ اس طرح کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے صحت و صفائی کے کئی مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں خواتین کو بڑی دُشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پینے کا پانی ابھی تک بیشتر علاقوں میں ایک بہت بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے، وزیراعظم نے حکم دیا ہے کہ ملک میں تیار کی گئی مشینوں کو کام میں لا کر اس مسئلے کو سائنسی طریقوں سے حل کیا جانا چاہیے۔ وزیراعظم چاہتے ہیں کہ سائنسی ایجادات کی برکتوں سے دیہات میں رہنے والے پسماندہ طبقہ کے لوگ پوری طرح سے بہرہ ور ہو جائیں۔ دیہی علاقوں میں اسکولوں، طبی مرکزوں

ٹکن واڑی مرکزوں کی تعمیر کے وقت نئی طرز کے پاخانوں کا خاطرخواہ انتظام کرنے کی تجویز بسس ہوئی ہے اور پردیش سرکاروں کی طرف سے جو مکانات تعمیر کئے جائیں گے، اُن میں بھی نسل خانوں اور پاخانوں کو جدید طریقوں سے نایا جائے گا۔

زمین سے محروم درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے لوگوں کے لیے روزگار فراہم کرنے ی جو اسکیم تیار کی گئی ہے اس کے تحت تعمیر ہونے الے مکانات میں بھی پانی کے نکاس کا خاطرخواہ نتظام ہوگا۔ اس پروگرام کے دائرے میں ۱۰ لاکھ گ آئیں گے۔

ساتویں منصوبے کے دوران ۵ لاکھ جدید رنے کے پاخانے تعمیر کرنے کے ۳۰ کروڑ روپے ، رقم مخصوص کی گئی ہے جو کہ RLEGP اور NREP کے ذریعے فراہم کی جائے گی۔ صحت و خائی کے اس نئے پروگرام کے تحت ہر اُس گاؤں ں جدید طرز کے غسل خانے اور پانی کے نکاس انتظام ہوگا، جس کی ۲۵ فیصد آبادی درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں پر مشتمل ہو۔

اس پروگرام میں اس بات کا خاص خیال کھا گیا ہے کہ ذرائع ابلاغ اور رضا کارانہ تنظیمیں ہی علاقوں کے باشندوں کو حفظان صحت تعلیم دیں اور انھیں اس بات کی اہمیت اور ادیت سے واقف کریں کہ گھروں سے پانی کے اسس اور صفائی میں کمی سے کتنی بیماریاں بجود ہو سکتی ہیں۔ علاوہ ازیں دیہی گل کاروں لم قیمت پر جدید طرز کے غسل خانے وغیرہ تعمیر نے کی تربیت بھی دی جائے گی۔

۱۹۹۰ء تک تمام دیہی علاقوں میں پینے کا اف پانی فراہم ہوگا۔ ٹکنالوجی مشن کے قیام سے ات یقینی بن جانی چاہیے کہ موجودہ وسائل کی مدد سے لوگوں کو پینے کے پانی کی سہولت فراہم ہو۔

چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں ۵۲ لاکھ ۳۱ ہزار دیہات میں سے ایک لاکھ ۹۲ ہزار دیہات کو پینے کا پانی فراہم کیا گیا۔ اگرچہ یہ پانی نلوں کے ذریعہ گھر گھر نہیں پہونچایا جا سکا، لیکن ایک مرکزی جگہ پر پانی کی تلاش ہوئی اور وہیں سے آبادی کو پانی فراہم کیا گیا، اس طریقے سے ۵۴ فیصد دیہی آبادی کو یہ سہولت میسر ہوئی۔

یہ کام منصوبے میں رکھے گئے ۲۵ کروڑ کے قریب زرِ کثیر کی مدد سے انجام پذیر ہوا، جو اس مَد میں رکھا گیا تھا۔ پانچ سالہ منصوبوں کے آغاز سے لے کر چھٹے پلان تک اس مَد میں جو رقم صرف کی گئی ہے، یہ رقم اُس سے کئی گنا زیادہ ہے سائنس اور صنعت سے متعلق ترقیاتی کونسل نے جو مارک ہینڈ پمپ ایجاد کیا ہے وہ اس پروگرام میں ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوا ہے۔

زرعی پیداوار کا نیا ریکارڈ

زرعی پیداوار میں ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۴ء تک نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ طویل مدتی منصوبہ سازی میں غذائی پیداوار ۵۹ء۲ فیصدی مقرر کی گئی تھی۔ لیکن اس وقفے میں پیداوار کی شرح ۹۴ء۳ فیصد ہوئی ہے، یعنی کل پیداوار ایک کروڑ ۵۳ لاکھ ٹن تک پہونچ گئی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید ٹکنالوجی سائنسی تحقیق اور اُن کے استعمال میں لانے سے غذائی اجناس کی پیداوار مستحکم بنیادوں پر قائم ہوئی ہے اور خوراک کے معاملے میں خودکفالت کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا ہے۔

کھانے کا تیل فراہم کرنے والی اجناس کی پیداوار ایک کروڑ تیس لاکھ ٹن تک پہونچ گئی ہے اور اس طرح سے ۸۵-۱۹۸۴ء میں چھٹے منصوبے کا ایک لاکھ تیس ہزار ٹن کا نشانہ پورا ہوا ہے۔ ساتویں منصوبے کے آخر تک ایک کروڑ ۸ لاکھ ٹن کا نشانہ پورا ہونے کی توقع ہے۔

اشیائے ضروریہ کی فراہمی میں بھی ۸۶-۸۵ء کے دوران اضافے کا رجحان دکھائی دیا ہے۔ جہاں تک کیمیائی کھادوں کے استعمال کا تعلق ہے، توقع ہے کہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۸۲ لاکھ ٹن کی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ ۸۶-۱۹۸۵ء میں یہ پیداوار ۹۳ لاکھ ٹن تک پہونچ جائے گی۔ اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ اعلیٰ قسم کے بیجوں کا استعمال سات لاکھ کوئنٹل کی حد پوری کرے گا جب کہ ۸۶-۱۹۸۵ء میں صرف ۸۲ کوئنٹل بیج کا استعمال ہوا تھا۔

جہاں تک مچھلی کی پیداوار کا تعلق ہے ۸۵-۱۹۸۴ء میں اس کی پیداوار ۲۸ لاکھ ٹن سے تجاوز کر گئی جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ مارچ ۱۹۸۵ء میں ساڑھے پانچ لاکھ ٹن کے قریب مچھلی کا بیج تیار کیا گیا جو ایک ریکارڈ ہے۔ مارچ ۱۹۸۵ء میں ساڑھے پانچ لاکھ ٹن کے قریب مچھلی کا بیج تیار کیا گیا جو چھٹے منصوبے میں رکھے گئے نشانے سے ۲۶ء۱ فیصدی زیادہ تھا۔ چھٹے منصوبے میں دو لاکھ بیس ہزار ٹن بیج کی پیداوار ہوئی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں رنگین ٹروٹ مچھلی پہلی مرتبہ مہاراشٹر کے مچھلی گھر میں تجارتی بنیادوں پر تیار کی گئی۔

ریاست جموں و کشمیر میں ٹروٹ مچھلی کی پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ یہ مچھلی پہلگام، بانڈی پور اور کوکرناگ کے صحت افزا مقامات پر سیاحوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہے۔ حکومت جموں و کشمیر نے ٹروٹ کو فروغ دینے کے سلسلے میں پچھلے کئی برسوں سے ایک الگ محکمہ قائم کیا ہے جس کی سربراہی ڈاکٹر شار جان کے سپرد ہے جنھوں نے مغربی ممالک

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

دھرمیندر کمار*

سماجی بہبود کے پروگرام

ملک میں حصولِ آزادی کے بعد سماجی بہبود کی سرگرمیوں میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ بچوں، عورتوں، درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں، پسماندہ طبقات وغیرہ کی فلاح و بہبود کے لیے موثر اقدامات کیے گئے ہیں نیز نئی نئی اسکیمیں بنائی اور زیر عمل لائی گئی ہیں جن کے نتیجے میں متذکرہ بالا طبقات کی حالت میں نمایاں بہتری آئی ہے۔

سماجی بہبود کی تمام تر سرگرمیوں کا منبع و ماخذ ہمارا آئین ہے جس کا نصب العین ایک فلاحی ریاست یا ویلفیئر اسٹیٹ کا قیام ہے۔ جس میں سب کے لیے سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف کو یقینی بنایا جائے گا۔ آئین میں واضح الفاظ میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ مرد اور عورت محنت کشوں کا اور بچوں کا ان کی نازک عمر میں بے جا استعمال نہ ہو اور شہریوں کی اقتصادی ضرورتیں انھیں ایسے پیشے اختیار کرنے پر مجبور نہ کریں جو ان کی عمر اور صلاحیت کے اعتبار سے ان کے لیے موزوں نہ ہوں۔

ابتدا میں سماجی بہبود کے پروگرام امراض کی روک تھام اور بحالیاتی خدمات تک ہی محدود تھے۔ لیکن خاص کر گزشتہ دس برسوں کے دوران سماجی بہبود کے پروگراموں کو نئی سمتیں عطا کی گئی ہیں۔

سماجی بہبود کے کاموں کو کس طرح روز افزوں اہمیت دی جارہی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ چھٹے پنجسالہ منصوبے میں سماجی بہبود کے لیے مرکز نے ۲۵۸،۸۷ کروڑ روپے، ریاستوں نے ۱۵۰،۵۲ کروڑ روپے اور مرکزی نظم و نسق والے علاقوں نے ۱۴،۸۵ کروڑ روپے مخصوص کیے تھے۔ یعنی کل ملاکر ۴۲۴،۲۴ کروڑ روپے اور سماجی بہبود کے پروگراموں کے لیے مخصوص کیے گئے جبکہ پہلے پنجسالہ منصوبے میں صرف ۱۶۰ کروڑ روپے اس مقصد کے لیے رکھے گئے تھے اور ریاستیں اور مرکزی نظم و نسق کے علاقے کوئی رقم اس کے لیے مختص نہ کر سکے تھے۔

سماجی بہبود کے پروگراموں کو زیر عمل لانے کی ذمہ داری مرکزی اور ریاستی حکومتیں مشترکہ طور پر سنبھالتی ہیں۔ پالیسیاں اور پروگرام وضع کرنے کے علاوہ مرکزی حکومت ریاستوں میں چلائی جارہی اسکیموں کے درمیان تال میل قائم رکھتی ہے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ یہ ذمہ داری سماجی بہبود سے متعلق مرکزی وزارت انجام دیتی ہے۔ اس وزارت کے تین محکمے ہیں :۔

۱۔ تغذیہ اور بچوں کی ترقی و نشو و نما سے متعلق محکمہ۔

۲۔ جسمانی طور پر معذور افراد کی بہبود کا محکمہ

۳۔ بہبود خواتین، ترقی اور سماجی تحفظ کا محکمہ۔ وزارت کی سرگرمیوں میں تکنیکی امداد دینے کا کام منصوبہ سازی، تحقیق اور تعینِ افادیت کا محکمہ کرتا ہے۔ پانچ قومی ادارے اور کچھ رضاکار انجمنیں وزارت کے کاموں میں مدد دیتی ہیں۔

بچوں کی فلاح و بہبود

سماجی بہبود کے کاموں میں بچوں کی نشو و نما کو اوّلین ترجیح دی جاتی ہے۔ کیوں کہ "بچے" ملک کا اہم ترین سرمایہ ہیں۔ بچوں کے لیے تمام ضروری خدمات پر توجہ مرکوز کرنے اور ان کے لیے اسکیموں کی تشکیل و عملدرآمد اور تمام اسکیموں میں تال میل قائم رکھنے کی غرض سے نیشنل چائلڈ ویلفیئر بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اس قسم کے بورڈ تمام ریاستوں میں بھی قائم کیے گئے ہیں۔ بچوں کے لیے سب سے اہم اسکیم چھ برس تک کے بچوں، حاملہ اور زچہ

---

* فتح پوری، دہلی

یوجنا، نئی دہلی

عورتوں کے لیے مربوط خدمات کی فراہمی کی ہے جس کے تحت غذائیت بخش اضافی خوراک، امراض سے تحفظ، تندرستی کی جانچ پڑتال، تعلیم، صحت اور مشاورتی خدمات نیز اسکول جانے سے پہلے کے مرحلے کی تعلیم وغیرہ کا انتظام کیا جاتا ہے۔ چھٹے منصوبے کے اختتام تک مرکز کی سرپرستی میں ۱۰۱۹، ایسی اسکیمیں منظور کی جا چکی ہیں۔ ان کے علاوہ مزید ۲۰۶ اسکیمیں ۱۹۸۵ء ـ ۸۶ میں منظور کی گئی ہیں۔

ملازمت پیشہ یا بیمار خواتین کے پانچ برس تک کے بچوں کی دن کے وقت دیکھ بھال کے لیے بال واڑیاں بنائی گئی ہیں۔ آج ملک میں بال واڑیوں کی تعداد سات ہزار ہے جن سے پونے دو لاکھ بچے مستفید ہو رہے ہیں۔ یہ اسکیم رضاکار اداروں کے ذریعے زیر عمل میں لائی جا رہی ہے۔ بہبود بچگان کے کاموں میں مصروف رضاکار انجمنوں کو مالی امداد دی جاتی ہے۔ اس کے لیے ۱۹۷۹ء میں ایک نیشنل چائلڈ فنڈ قائم کیا گیا تھا۔ بچوں کی نشو و نما کے پروگراموں کے لیے تربیت یافتہ کارکن فراہم کرنے کے لیے ۳۲۴ آنگن واڑیوں، بیس تربیتی اداروں اور دیگر مرکزی تنظیموں میں تربیت کا انتظام کیا گیا ہے۔

بھارت ۱۹۴۹ء سے اقوام متحدہ کے بچوں سے متعلق ہنگامی فنڈ کا رکن ہے جو اسے بچوں سے متعلق پروگراموں کے لیے امداد دیتا ہے۔

بہبود خواتین

عورتوں کے لیے ملک میں ۱۹۷۶ء میں ایک قومی اسکیم شروع کی گئی تھی جو عورتوں کی ترقی و بہبود کی پالیسیوں اور پروگراموں کی تشکیل کے لیے رہنمایانہ خطوط فراہم کرتی ہے ان پالیسیوں اور پروگراموں پر عمل درآمد پر نگاہ رکھنے کے لیے ایک قومی کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔

کم آمدنی والے طبقوں کی ملازمت پیشہ عورتوں کو سستی اور محفوظ جائے رہائش فراہم کرنے اور ہوسٹل تعمیر کرنے کے لیے رضاکار اداروں کو امدادی گرانٹ دینے کی ایک اسکیم ۱۹۷۲ء میں شروع کی گئی تھی۔ ۱۹۸۲ـ۸۳ میں اس اسکیم میں ترمیم کی گئی۔ آٹھ برس تک کی عمر کے بچوں والی ملازمت پیشہ خواتین کے الگ ہوسٹلوں کے لیے دی جانے والی امداد کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا۔ ۱۹۷۲ـ۷۳ء میں شروع کی گئی اس اسکیم کے تحت ۲۲۱۵۱ ملازمت پیشہ خواتین کو رہائش کی سہولیات بہم پہنچانے کے لیے ۴۴۳ ہوسٹلوں کی تعمیر کی منظوری دی جا چکی ہے۔

۱۸ سے ۵۰ برس تک کی بے سہارا عورتوں کے لیے ایک اسکیم ۱۹۷۷ء میں شروع کی گئی تھی۔ جس کا مقصد انھیں دستکاریوں کی تربیت دینا تھا جس سے وہ قابل فروخت چیزیں تیار کر سکیں۔ یہ اسکیم رضاکار اداروں کے ذریعے زیر عمل لائی جا رہی ہے جس کے لیے انھیں ۹۰ فیصد امداد دی جاتی ہے۔

سینٹرل سوشل ویلفیئر بورڈ آمدنی کا ذریعہ بننے والی سرگرمیاں منظم کرنے کے لیے رضاکار انجمنوں اور ضرورتمند اور جسمانی طور پر مجبور عورتوں کو کام اور مزدوری کے مواقع بہم پہنچانے کے لیے مالی امداد دیتا ہے۔ ہتھ کرگھا، دستکاریوں اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے ساتھ ڈیری فارمنگ، سوٗر، بھیڑ، بکری اور مرغیاں پالنے کی اکائیوں کو بھی اس پروگرام میں شامل کر لیا گیا ہے۔ خود اپنا روزگار چلانے کے لیے بھی امداد دی جا رہی ہے۔ بورڈ نے مارچ ۱۹۸۵ء تک ۳۰۶۵، اکائیاں منظم کرنے کے لیے عطیات دیئے ہیں۔ جن سے ۸۲ ہزار افراد کو فائدہ پہنچے گا۔

۱۹۵۸ء میں بورڈ نے دیہی علاقوں کے پرائمری اسکول ٹیچروں، بال سیوکاؤں، نرسوں، مڈ وائفوں اور خاندانی منصوبہ بندی کے کارکنان کے لیے ایک خصوصی تعلیمی نصاب کی اسکیم بھی شروع کی تھی۔ ۱۹۷۵ء میں پیشہ ورانہ تربیت کو بھی اس پروگرام میں شامل کر لیا گیا تاکہ ۱۸ سے ۳۰ برس تک کی عمر کی عورتوں کو مختلف کام دھندوں کی تربیت دی جا سکے۔ مارچ ۱۹۸۴ء تک ۵۷۰۰ نصاب منظور کئے گئے جن سے ۱۲۶۰۰۰ خواتین کو فائدہ پہنچا۔

بورڈ نے مرکزی اور ریاستی سطح پر ایسے رضاکار ادارے بھی منظم کئے ہیں جن کا کام عورتوں اور بچوں پر ہونے والے مظالم اور استحصال کو روکنا اور مظلومین کو تدارکی تحفظی اور بحالیاتی خدمات بہم پہنچانا ہے۔ جہیز کے خلاف قانون کو سخت بنا دیا گیا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ اگر کوئی سرکاری ملازم جہیز لینے یا دینے کے جرم کا ارتکاب کرے گا تو اسے ملازمت کے قوانین و ضوابط کی خلاف ورزی تصور کیا جائے گا۔

مساوی اجرت قانون ۱۹۷۶ء میں مرد اور عورت محنت کشوں کو برابر مزدوری دینے اور روزگار کے معاملے میں عورتوں کے خلاف امتیاز کو روکنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

بچوں کی شادی سے متعلق (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۷۸ء کے تحت لڑکیوں کے لیے شادی کی عمر ۱۵ سے بڑھا کر ۱۸ سال اور لڑکوں کے لیے ۱۸ سے بڑھا کر ۲۱ سال مقرر کر دی گئی ہے کارخانوں سے متعلق ترمیمی قانون ۱۹۷۶ء میں اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ جس فیکٹری میں تیس عورتیں کام کر رہی ہوں وہاں بال واڑی قائم کی جائیں۔ متعلقہ قوانین میں ترمیم کر کے عصمت دری اور عورتوں کے خلاف ایسے ہی دیگر جرائم کے لیے زیادہ سخت سزا

دینے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ایک اور قانونی اقدام کے ذریعے عورتوں پر ان کے شوہروں اور دیگر رشتہ داروں کے مظالم کو قابل تعزیر بنا دیا گیا ہے۔

جسمانی طور پر معذور افراد کی بہبود

سماجی بہبود سے متعلق وزارت نابینا اور سماعت سے محروم نیز دماغی طور پر کمزور اور جسمانی طور پر معذور افراد اور برص کے مریضوں کا جلد پتہ لگانے، ان کا علاج کروانے اور انھیں تعلیم و تربیت دے کر ان کی بحالیات کے لیے پروگرام وضع کرتی ہے۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ فار دی بلائنڈ نابینا افراد کی فلاح و بہبود کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ جس کے تحت نابینا افراد کے لیے ایک آدرش ودیالیہ، جزوی طور پر نابینا بچوں کا اسکول، نابینا بالغوں کے لیے ایک تربیتی مرکز، ایک بریل ورکشاپ اور ایک بریل پریس چلایا جا رہا ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ دہلی، بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں واقع، اپنے چار علاقائی مراکز پر نابینا افراد کے استادوں کے لیے تربیتی نصابات کا اہتمام کرتا ہے۔

سماعت سے محروم افراد کے لیے قومی سطح پر تعلیم، تربیت اور تحقیق کے لیے بمبئی میں نیشنل علی یاور جنگ انسٹی ٹیوٹ فار دی ڈیف قائم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ حیدر آباد میں جزوی طور پر بہرے بچوں کے لیے ایک اسکول چلایا جا رہا ہے، بالغ بہروں کے تربیتی مرکز میں جزوی یا مکمل طور پر سماعت سے محروم بچوں کو تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت دی جاتی ہے۔ دماغی طور پر پچھڑے ہوئے بچوں کے ماڈل اسکول واقع نئی دہلی میں چھ سے پندرہ برس تک کی عمر کے بچوں کی تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت کا انتظام ہے۔

جسمانی طور پر معذور بچوں کے لیے کلکتہ میں ایک قومی انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا ہے، جس کا مقصد جسمانی طور پر معذور افراد کو تربیت دینا اور ان کی بحالی کا انتظام کرنا ہے۔ دہلی میں بھی ایک انسٹی ٹیوٹ معذور افراد کے لیے ایک خاص اسکول اور ورکشاپ چلا رہا ہے۔

نابینا، سماعت سے محروم اور جسمانی طور پر معذور طلبا کو تعلیم اور پیشہ ورانہ اور تکنیکی تربیت دینے کے لیے ہر سال تقریباً سولہ ہزار وظائف دئے جاتے ہیں۔

معذور افراد کی بہبود کا کام کرنے والے رضا کار اداروں کو کل لاگت کے نوّے فیصد کے برابر مالی امداد دی جاتی ہے۔ اس اسکیم کے تحت ۱۵۰ ادارے امداد پا رہے ہیں۔

۸۳ - ۱۹۸۲ء میں حکومت نے تجرباتی طور پر ضلعی بحالیاتی مراکز قائم کرنے کی اسکیم شروع کی جس کے تحت شروع میں ہی معذوری کا پتہ لگا کر اس کی روک تھام کی کوشش کی جاتی ہے اور سماج میں ان کی اقتصادی بحالی کا بندوبست کیا جاتا ہے۔

دفاتر روزگار میں خصوصی کاؤنٹروں کے قیام سے معذور افراد کو روزگار مہیا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں تقریباً ۵٫۳۰ افراد کو ۲۲ روزگار دفتروں کے ذریعے روزگار دلایا جا چکا ہے۔

حکومت نے معذور افراد کے لیے ایک قومی ویلفیئر فنڈ قائم کیا ہے جس میں پبلک سیکٹر، پرائیویٹ سیکٹر اور عوام سے عطیات قبول کئے جاتے ہیں۔ اس فنڈ کا استعمال معذور افراد کی بھلائی کا کام کرنے والے رضا کار اداروں کی سرگرمیوں کو بڑھانے کے لیے کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ معذور افراد کے لیے پروگرام اور پالیسیاں وضع کرنے کے لیے ایک قومی کونسل بھی قائم کی گئی ہے۔

راشٹرپتی ہر سال معذور افراد کو روزگار مہیا کرنے والے کارخانوں اور معذور لیکن قابل کارکنوں کو قومی انعامات عطا کرتے ہیں۔

سماجی بہبود کے دیگر اقدامات

جیل سدھار: سماجی تحفظ کے پروگراموں میں جیل سدھار اور انتظامیہ خدمات سب سے اہم ہیں۔ جیلوں وغیرہ کی ذمہ داری ریاستی حکومتوں پر ہے۔ دوسرے پنجسالہ منصوبے کے دوران ویلفیئر افسروں کے تقرر اور قیدی عورتوں کے بچوں کے لیے "بچہ گھروں" کے قیام کی جو اسکیم شروع کی گئی تھی اس پر عمل جاری ہے۔ ویلفیئر افسروں کا کام قیدیوں کے ذاتی مسائل پر توجہ دینا اور سماج میں ان کی دوبارہ بحالی کے لیے وسائل مجتمع کرنا ہے۔

غیر اخلاقی تجارت

بھارتی آئین میں انسانوں کی تجارت پر مکمل پابندی کی ہدایت ہے۔ عورتوں اور لڑکیوں کی غیر اخلاقی تجارت پر پابندی سے متعلق قانون ۱۹۵۶ء میں نوٹیفائیڈ علاقوں میں پیشہ کرنے کی قطعی ممانعت ہے۔ ریاستی حکومتوں کو اس ضمن میں ضروری قاعدے قانون بنانے کا اختیار دیا گیا ہے۔ بدنام بازاروں سے برآمد کی گئی عورتوں اور لڑکیوں کو ان کے علاج، دیکھ بھال اور باز آبادکاری کے لیے سرکاری پناہ گاہوں یا سدھار گھروں میں بھیجا جاتا ہے۔ تجربے کی روشنی میں اس قانون میں ۱۹۷۸ء میں مناسب ترامیم کی گئیں۔

بھیک مانگنے کی روک تھام

بھیک منگوانے کے لیے بچوں کا اغوا کرنے اور انھیں اپاہج بنانے کی مجرمانہ کارروائیوں کو روکنے کے لیے "قانون موجود ہے" پندرہ ریاستوں اور مرکزی انتظام کے زیر

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

ساجد علی ٹونکی

ہندوستان میں شکر کی صنعت

چینی کی صنعت ہندوستان کی ایک اہم ترین صنعت ہے۔ بغیر چینی کے ہمارے ملک میں دعوت بے رونق اور کھانے بدمزہ تصور کئے جاتے ہیں۔ جہاں تک بے روزگاری کا مسئلہ ہے۔ اس صنعت سے تقریباً ساڑھے تین لاکھ لوگوں کو روزگار فراہم ہے۔ اس کے علاوہ کاشت کاروں کی تقریباً بیس لاکھ آبادی گنے کی پیداوار کے سبب اپنی روزی روٹی حاصل کرتی ہے۔ چینی کی صنعت سے حکومت کو ٹیکس کے علاوہ غیر ملکی کرنسی بھی وافر مقدار میں حاصل ہوتی ہے۔

چینی کی صنعت بھارت کی قدیم ترین صنعتوں میں تصور کی جاتی ہے۔ ابتدا میں یہ گھریلو صنعت کی شکل میں کھانڈ تیار کرتی تھی جو غیر ملکوں کو بھی برآمد کی جاتی تھی۔ جہاں تک موجودہ طرز کی شکر فیکٹری کا تعلق ہے اس کا سب سے پہلا کارخانہ ۱۹۰۳ء میں بہار صوبے میں قائم ہوا تھا۔ بعد میں یو پی وغیرہ میں بھی کچھ کارخانے قائم ہوئے پھر بھی ان کی ترقی کی رفتار ۱۹۳۰ء تک سست ہی کہی جاسکتی ہے۔ ۱۹۳۰ء کی عالمی مندی کے دوران دیگر تمام صنعتوں کے ساتھ چینی کی صنعت بھی بری طرح سے متاثر ہوئی۔ لہٰذا ۱۹۳۲ء میں چینی کی صنعت کو پندرہ سال کے لیے سرکاری تحفظ میں لینے کا اعلان کیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں ملک میں چینی ملوں کی تعداد اس وقت ۳۲ تھی جن کی پیداواری صلاحیت ۱٫۷ لاکھ ٹن تھی وہ بڑھ کر ۳۹-۱۹۳۸ء میں چھ لاکھ ٹن ہو گئی اور ملوں کی تعداد بھی بڑھ کر ۱۳۲ ہو گئی۔ ملک کی درآمدات پر بھی کافی اثر پڑا جو درآمد پہلے ۶٫۷ لاکھ ٹن تھی وہ گھٹ کر ۲۳ ہزار ٹن رہ گئی۔ پیداوار میں یہ اضافہ یہاں تک جاری رہا کہ ۱۹۳۹ء میں ملک کے ۱۴۵ کارخانوں کے سامنے زائد پیداوار کا مسئلہ پیدا ہو گیا جس سے مجبوراً پیداوار پر پابندی لگانا پڑی۔ اس کے علاوہ چینی کی تقسیم کو کنٹرول کرنے کے لیے بہار اور یو پی میں شوگر سنڈیکیٹ (Sugar Syndicate) قائم کیا گیا۔ دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے چینی کی صنعت میں کافی ترقی ہوئی۔ قیمتوں میں اضافہ ہونے سے منافع بھی بڑھا۔ قیمتوں پر پابندی رکھنے کے لیے سرکار کو ۱۹۴۲ء میں پہلے ہی راشننگ کا طریقہ اختیار کرنا پڑا تھا۔ جنگِ عظیم کی وجہ سے ۴۶-۱۹۴۵ء میں چینی کی ملوں کی تعداد بڑھ کر ۱۳۸ ہو گئی تھی اور کل پیداوار بھی بڑھ کر ۹ لاکھ ٹن ہو گئی تھی۔

۱۹۴۷ء میں آزادی اور ملک کی تقسیم کے بعد چینی کی صنعت پر کوئی خاص منفی اثر مرتب نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گنے کی کاشت اور چینی ملوں کا زیادہ تر حصہ بھارت ہی میں تھا۔ ۱۹۴۸ء میں مہاتما گاندھی کے کہنے پر چینی کی فروخت پر سے پابندی کو ہٹا لیا گیا تھا لیکن چینی کی قیمتوں پر اضافے کو دیکھتے ہوئے پھر سے ۱۹۴۹ء میں اس پابندی کو لگا دیا گیا۔

پہلے پنجسالہ منصوبے کے شروع ہونے سے قبل تک ہمارے ملک میں ۱۳۸ چینی کی ملیں موجود تھیں جن کی پیداوار کل ۱۱ لاکھ ٹن تھی۔ پنجسالہ منصوبوں کے تحت اس صنعت نے جس طرح ترقی کی اس کی تفصیل مندرجہ ذیل فہرست سے واضح ہے ملاحظہ فرمائیں:۔

منصوبہ کا آخری سال	چینی ملوں کی تعداد	پیداوار (لاکھ ٹن میں)	برآمد شدہ چینی (کروڑ روپے)
۱۔ پہلے پنجسالہ منصوبہ کی ابتدا ۵۱-۱۹۵۰ء	۱۲۸	۱۱٫۰۰	۰٫۵۰
۲۔ پہلا منصوبہ (آخری سال) ۵۶-۱۹۵۵ء	۱۴۳	۱۸٫۹	۰٫۹۶
۳۔ دوسرا منصوبہ " " ۶۱-۱۹۶۰ء	۱۷۵	۳۰٫۳	۰٫۲۸

محلہ رجبن، ٹونک (راجستھان)

منصوبہ کا آخری سال	چینی ملوں کی تعداد	پیداوار کروڑوں میں	برآمد شدہ چینی کروڑ روپے
۴۔ تیسرا منصوبہ ″ ″ ۶۶ — ۱۹۶۵ء	۲۰۰	۳۵٫۱	۱۱٫۳۴
۵۔ تین سالہ منصوبے ″ ″ ۶۹ — ۱۹۶۸ء	۲۱۵	۲۵٫۶	۱۰٫۳۴
۶۔ چوتھا منصوبہ ″ ″ ۷۴ — ۱۹۷۳ء	۲۲۹	۴۵٫۰	۴۲٫۹۰
۷۔ پانچواں منصوبہ ″ ″ ۸۰ — ۱۹۷۹ء	۳۱۰	۳۸٫۶	۱۲۸٫۹
۸۔ چھٹا منصوبہ ″ ″ ۸۵ — ۱۹۸۴ء	۳۳۹	۶۱٫۵	۳۲٫۰۰

موجودہ دَور میں اس صنعت نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے۔ اس وقت ملک میں تقریباً ۳۴۵ چینی ملیں ہیں جن کی پیداوار کی صلاحیت ۸۰ لاکھ ٹن سے بھی زیادہ ہے، چینی کی صنعت میں کُل ۱۶۶ ملیں صرف حکومت کے کنٹرول میں ہیں اور ملک کی کُل پیداوار کا نصف حصہ ان ملوں میں پیدا ہوتا ہے۔ بھارت کی کُل ۳۴۵ ملوں میں سے تقریباً ایک سو پانچ تو صرف یوپی میں واقع ہیں جب کہ پینسٹھ مہاراشٹر میں پینتیس بہار میں اور تین راجستھان میں موجود ہیں۔

حالانکہ بھارت میں اتنی کثیر التعداد ملیں اور کثیر المقدار چینی کی پیداوار ہے، پھر بھی بین الاقوامی اعتبار سے ہماری چینی صنعت اتنی ترقی یافتہ نہیں کہی جا سکتی جتنی کہ کہی جانا چاہیئے۔ اس کی مختلف وجوہات ہیں۔ ہماری چینی صنعت کے سامنے کچھ بنیادی مسائل ہیں۔ بغیر انھیں حل کئے عالمگیر منڈیوں میں کامیابی حاصل کرنا مشکل ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ ہمارے کسانوں کے سامنے فی ایکڑ پیداوار کا ہے۔ بھارت میں گنّے کی فی ایکڑ پیداوار تقریباً ۱۵ ٹن ہے جب کہ دیگر ممالک مثلاً جاوا میں ۵۶ اور جزیرہ ہوائی میں یہ شرح ۵۲ ٹن فی ایکڑ ہے۔ اس کے علاوہ گنّے کی فصل بھی ہمارے ملک میں ہلکی قسم کی کاشت کی جاتی ہے جس میں چینی کی مقدار ۹ سے ۱۰ فیصد ہی پائی جاتی ہے۔ جبکہ دیگر چینی پیدا کرنے والے ممالک مثلاً جاوا، سماترا، کیوبا، ماریشس وغیرہ میں یہ مقدار تقریباً ۱۲ سے ۱۴ فیصد ہے، اس کے لیے ایک تو ہمارے کسانوں کی لاعلمی دوسرے انھیں مہیا ہونے والی سہولیات نیز تکنیکی تربیت وغیرہ کی کمی بھی ذمّے دار کہی جا سکتی ہے۔

چوں کہ بھارت میں کافی حد تک گنّے کا استعمال گڑ بنانے میں کیا جاتا ہے اس لیے چینی ملوں کو پوری طرح سے گنّا نہیں مل پاتا۔ اس لیے لازمی ہے کہ دونوں صنعتوں میں آپسی تال میل ہو تاکہ ذرائع کا پورا پورا استعمال ہو سکے۔ بدقسمتی سے ہماری بہت سی ملوں میں آج بھی پُرانی تکنیک اور قدیمی یونٹ کام کر رہے ہیں جس کی وجہ سے پیداوار کی لاگت زیادہ اور نفع کم ہوتا ہے لہٰذا انھیں بھی جدید ٹیکنالوجی سے تبدیل کیا جانا ضروری ہے۔ لیکن اس کام کو ایک ساتھ کرنے میں مزدوروں میں بے چینی اور انتشار پھیلنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ لہٰذا چھوٹے یونٹوں کو ملا کر بڑے یونٹوں میں تبدیل کر کے اس مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے جس یونٹ کی گنّا پیلنے کی صلاحیت ۸۰۰ — ۷۰۰ ٹن ہے تو اسے بڑھا کر ۲۰۰۰ ٹن کیا جائے۔ حالاں کہ اب بھارت میں چینی صنعت میں کام آنے والی مشینیں بھی تیار ہونے لگی ہیں۔ یہ اس صنعت کے روشن مستقبل کی ایک علامت ہے۔ ان مسائل کے علاوہ مال کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کرنے کا مسئلہ بھی اہم ترین مسئلہ ہے۔ اس کے علاوہ یہاں صنعتی اور تحقیقی علوم کی کمی بھی اس صنعت کے ارتقا میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ موجودہ دَور میں چینی کی جگہ دیگر کیمیاوی اشیاء مثلاً اسکرین وغیرہ کا استعمال بھی بڑھنے لگا ہے۔ جس سے چینی کی صنعت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔

۱۶ اگست ۱۹۷۸ء کو جنتا حکومت نے چینی کی فروخت سے کنٹرول ہٹا دیا تھا جس سے سستی چینی بازار میں فروخت ہونے لگی۔ حکومت نے عوام کی سہولت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے قیمت ۲٫۷۵ روپے فی کلو رکھنے کی کوشش کی تھی اس کا اثر چینی صنعت پر بُرا ہی پڑا۔ گنّے کی خرید قیمت گرنے سے گنّے کی کاشت پر کسانوں کو بجائے نفع کے نقصان ہونے لگا۔ کئی مقام پر تو گنّے کی کٹائی کر کے فروخت کرنے سے بہتر کھڑی فصل میں آگ لگا دینا سمجھا گیا۔ ایسی صورت میں سرکار کو پھر سے چینی کی فروخت پر کنٹرول کرنا پڑا۔ جس سے چینی ملوں کا نفع بھی بڑھا۔ فروخت پر پابندی لگا دینے سے چینی کے بازار بھاؤ کافی حد تک بڑھ گئے تھے۔

۸۱ — ۱۹۸۰ء سے سرکار نے چینی پر دوہری پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ اس کے مطابق ایک جانب لیوی کی چینی سستے داموں پر فروخت کی گئی ہے جبکہ کھُلے بازار میں چینی کی قیمتوں میں پوری چھوٹ دی گئی ہے۔ ۸۶ — ۱۹۸۵ء میں چینی کی بڑھتی ہوئی قیمتوں پر قابو پانے کے لیے حکومت نے چینی غیر ملکوں سے بھی درآمد کر کے چھ روپے فی کلو فروخت کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کنٹرول سے بیچی جانے والی چینی کا کوٹہ بھی بڑھا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قیمتیں بھی قابو میں آگئیں، چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی پر خود بخود قابو ہو گیا۔ کسانوں کو ان کی پیداوار کے واجب دام ملنے لگے۔ اس طرح چینی کی صنعت مختلف ادوار سے گذرتی ہوئی آج بھی اپنی منزلِ مقصود کی جانب گامزن ہے۔ ●

سنجے بیجل

بیمار صنعتی یونٹوں کا بڑھتا ہوا مسئلہ

ہمارے ملک میں بیمار صنعتی یونٹوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہے۔ حکومت نے اس مسئلہ پر قابو پانے کے لیے ۱۹۸۵ء میں ایک قانون منظور کیا ہے۔ لیکن مصنف کے بیان کے مطابق اس میں بعض خامیاں ہیں۔ جن کا دُور کیا جانا نہایت ضروری ہے۔

"بیمار" صنعتی یونٹوں کا مسئلہ اُن پریشان کُن مسائل میں سے ایک ہے جو ملک کو درپیش ہیں۔ یہ مسئلہ تیزی سے بڑھ رہا ہے اور معیشت پر اس کے دُور رس اثرات مرتب ہو رہے ہیں جس کے ساتھ اُن مزدوروں کی بحالی کا مسئلہ بھی پیدا ہو گیا ہے جو متواتر خسارے کے باعث بیروزگار ہوتے جا رہے ہیں۔ بیمار یونٹوں میں بھاری رقموں کے پھنس جانے کے باعث ملک اور حکومت دونوں کو بھاری تشویش ہو گئی ہے۔ اس سے بنکوں اور مالی اداروں کے منافعوں پر بہت بڑا اثر پڑ رہا ہے۔

اس صورتِ حال کا مداوا کرنے کے لیے ۱۹۸۵ء میں بیمار صنعتی کمپنی کا قانون (Sick Industrial Companies Act) منظور کیا گیا ہے۔

اس قانون کی دفعات کے تحت ایک بیمار صنعتی ادارہ کو اب اُس صورت میں ایک بیمار ادارہ قرار دیا جاتا ہے (جسے رجسٹرڈ ہوئے سات برس ہو چکے ہیں) جس صورت میں کسی مالی سال کے آخر میں اُس کے جمع شدہ خسارہ جات اُس کی تمام تر خالص قیمت کے برابر ہو گئے ہوں یا اُس سے بڑھ گئے ہوں اور اُسی مالی سال میں اور اس سے فوری قبل کے مالی سال میں بھی اُسے نقد نقصانات اٹھانے پڑے ہوں۔ خالص قیمت کا مطلب ہے کُل اداشدہ سرمایہ اور آزاد ریزرو رقومات یعنی وہ ریزرو رقومات جو منافع جات اور شیئروں کے پریمیم کھاتوں میں سے جمع کی گئی ہوں اور جن میں وہ ریزرو شامل نہیں ہوتے جو اثاثہ جات کی از سرِ نو تشخیص اور گھسائی کی رقومات کو کالعدم کر کے جمع کیے گئے ہوں۔ ایک صنعتی یونٹ عام طور پر اس لیے بیمار ہوتا ہے کیوں کہ اُس کے نقدی میں منتقل ہونے والے اثاثہ جات رفتہ رفتہ کم ہو جاتے ہیں اور مشینوں وغیرہ کی دیکھ بھال کرنے کے معیار میں گراوٹ آ جاتی ہے جس سے اثاثہ جات کا گھساؤ بڑھ جاتا ہے اور یونٹ کے کام میں رکاوٹ آ جاتی ہے۔ اور اگر یہ صورتِ حال جاری رہے تو دیوالیہ پن کی نوبت آ جاتی ہے۔

بڑھتی ہوئی صنعتی بیماری

صنعتی بیماری نے وبائی صورت اختیار کر لی ہے اور بڑے، درمیانہ اور چھوٹے سائز کے یونٹوں کی بھاری تعداد اس کی زد میں آ گئی ہے۔ فیڈریشن آف انڈسٹریز اینڈ کامرس آف انڈیا کی طرف سے صنعتی بیماری سے متعلق مُرتبہ ایک رپورٹ کے مطابق ۴۱۹ بڑے، ۱۲۵۶ درمیانہ اور ۸۳۶، چھوٹے پیمانے کے یونٹ ۱۹۸۳ء کے آخر میں بیمار تھے۔ بنکوں اور مالی اداروں کی طرف سے دیا گیا قرضہ جو ان بیمار یونٹوں میں پھنسا ہوا تھا، اُس کی کُل رقم ۳، ارب ۸۰، کروڑ ۳۰، لاکھ روپے تھی۔

اگلے صفحے کے گوشوارے سے بڑے یونٹوں کی صنعتی بیماری کا پتہ چلتا ہے جو ملک کے مختلف حصوں میں واقع ہیں۔

گوشوارہ: بڑے بیمار صنعتی یونٹوں کی خطہ وار پوزیشن

(دسمبر ۱۹۸۳ء کے آخر میں)

ریاست/مرکزی منتظم علاقے	یونٹوں کی تعداد	واجب الادا روپیہ (کروڑوں میں)
۱	۲	۳
مغربی بنگال	۱۱۲	۴۶۷٫۰۶
مہاراشٹر	۱۰۹	۴۶۱٫۴۸
کرناٹک	۲۹	۱۷۶٫۴۷
تامل ناڈو	۴۴	۱۸۳٫۳۱
آندھر پردیش	۱۹	۴۰٫۹۸
بہار	۱۳	۴۲٫۰۲
ہریانہ	۱۲	۳۰٫۱۴
راجستھان	۷	۳۹٫۶۲
مدھیہ پردیش	۲۰	۶۲٫۹۸
اڑیسہ	۴	۲۳٫۱۵
اُترپردیش	۵۴	۲۰۲٫۱۹
کیرل	۱۶	۸۱٫۷۹
پنجاب	۵	۸٫۷۲
آسام	۲	۲٫۰۲
دہلی	۱	۰٫۸۸
پانڈیچری	۳	۸٫۲۳
گوآ	۵	۱۲٫۳۷
گجرات	۴۵	۱۷۰٫۸۲
کل	۴۹۱	۲۰۱۴٫۳۳

مندرجہ بالا گوشوارے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ صنعتی بیماری مغربی بنگال میں پھیلی ہوئی ہے، جس کے بعد مہاراشٹر، تامل ناڈو، یوپی، کرناٹک اور گجرات کا نمبر آتا ہے۔ ان چھ ریاستوں میں ۳۱ دسمبر ۱۹۸۳ء کو کل یونٹوں کی تعداد ۴۹۱ تھی جن میں سے ۴۰۸ یونٹ بیمار تھے۔ ان یونٹوں میں واجب الادا قرضہ کی رقم جو پھنسی ہوئی تھی وہ ۱۳۱ء۶۶۱ کروڑ روپے تھی جو ۴۹۱ یونٹوں کی واجب الادا رقم کا ۸۲٫۵ فیصد تھی۔ صنعتوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ صنعتی بیماری ٹیکسٹائلز (۱۲۸ یونٹوں) میں تھی جس کے بعد انجینیرنگ اور الیکٹریکلز (۱۱۳ یونٹوں) اور آئرن اور اسٹیل (۲۹ یونٹوں) چینی (۴۴ یونٹوں) اور پٹ سن (۳۷ یونٹوں) کا نمبر آتا ہے۔

صنعتی بیماری کے اسباب

صنعتی یونٹ متعدد اسباب سے بیمار ہو جاتے ہیں جیسے لاپرواہی، لاعلمی، نااہلیت اور مقابلے کے غیر یقینی ماحول کا سامنا کرنے کے لیے انتظامیہ کی کمزوری۔ صنعتی بیماری کے بڑے اندرونی اسباب درج ذیل ہیں۔

۱۔ غلط جگہ کا انتخاب۔
۲۔ سرمایہ جاتی لاگت کا کم اندازہ کرنا۔
۳۔ مانگ کے بارے میں غلط اندازہ کرنا۔
۴۔ پروجیکٹ کی تعمیل میں تاخیر اور اس کے نتیجے میں لاگت کا بڑھ جانا۔
۵۔ موزوں مالی اور لاگتی کنٹرول کا فقدان۔
۶۔ انتظامیہ کی کمزوری اور اس کی طرف سے اچھی اور موثر منصوبہ بندی کا فقدان۔
۷۔ بہتر اور ارزاں تر متبادلوں کی آمد سے مانگ کا اچانک ختم ہو جانا۔
۸۔ عسکریت پسند مزدور قیادت۔
۹۔ اثاثہ جات کا نقدی میں منتقل ہونے کا مسئلہ
۱۰۔ خلافِ توقع مقابلہ آرائی۔
۱۱۔ موزوں وسائل کے انتظام کی کمی۔
۱۲۔ قرضہ کی وصولی میں تساہل۔
۱۳۔ مصنوعات میں غیر موزوں میلاوٹ اور
۱۴۔ مصنوعات کا زائدالمیعاد ہو جانا۔

صنعتی بیماری کے بیرونی اسباب میں حسب ذیل امور شامل ہیں:۔

۱۔ پیداوار، قیمتوں اور تقسیم کے بارے میں حکومت کی ناقص پالیسیاں۔
۲۔ موزوں لازمی اشیا یعنی خام مال، برقی قوت اور ٹرانسپورٹ کی کمی۔
۳۔ پبلک سیکٹر کی سرمایہ کاریوں میں کمی۔
۴۔ مانگ کا کم ہونا۔

۵۔ کاروباری سرمایہ کا فقدان۔

۶۔ فامینل لیبر۔

۷۔ مزدوروں کے ساتھ اچھے تعلقات نہ ہونا۔

۸۔ قدرتی آفات۔

تدارکی اقدامات

بھارت سرکار نے صنعتی بیماری کے بڑھتے ہوئے خطرے پر قابو پانے کے لیے وقتاً فوقتاً متعدد اقدامات کئے ہیں۔ ستر کی دہائی کی ابتدا میں حکومت نے یہ تجویز پیش کی کہ طاقتور یونٹ بعض شرائط پر بیمار یونٹوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ لیکن اس اسکیم کا خاطرخواہ نتیجہ نہ نکلا۔ اس کے فوراً بعد یہ احساس کیا گیا کہ جو بنک اور مالی ادارے قرضہ دیتے ہیں اُنھیں یہ جاننے کی پوزیشن میں ہونا چاہیئے کہ کوئی یونٹ کب بیمار ہونے والا ہے لیکن وہ بھی صنعتی بیماری کی روک تھام کرنے میں کافی کمی نہیں کرسکے۔ اس کے بعد ریزرو بنک آف انڈیا میں بیمار صنعتی یونٹوں کا ایک سیل (Cell) قائم کیا گیا تاکہ وہ بیمار یونٹوں سے متعلق معلومات کے لیے ایک کلیرنگ ہاؤس کا کام کرسکے اور اس واحد مقصد کے ساتھ حکومت اور مالی اداروں کے درمیان تال میل پیدا کرسکے، تاکہ سیل صنعتی بیماری سے متعلق مسائل کو حل کر سکے۔ حکومت کی طرف سے وعدہ کیا گیا ہے کہ سیل بیمار یونٹوں کی نشاندہی کرنے اور تدارکی اقدامات کرنے میں بینک کی کارکردگی کی قریبی طور پر نگرانی کر رہا ہے۔ لیکن یہ اقدامات بھی کامیاب نہیں ہوئے کیوں کہ صنعت میں بیماری گہرائی کے ساتھ وسیع طور پر بڑھ گئی ہے۔ بعدازاں ریزرو بنک آف انڈیا کی طرف سے ایک مستقل رابطہ کمیٹی قائم کی گئی تاکہ کمرشل بنکوں اور معیاری قرضہ دینے والے اداروں کے درمیان تال میل سے متعلق معاملے پر غور کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بنک آف انڈیا کے بحالیاتی مالی شعبے کے اندر ایک خاص سیل بھی قائم کیا گیا تاکہ صنعتی بیماری کے سلسلے میں بنکوں کی رپورٹوں کی طرف توجہ دی جاسکے۔ ریزرو بنک کی طرف سے صحتمند ہو سکنے والے بیمار یونٹوں اور چھوٹے پیمانے کے صنعتی یونٹوں کی جانب توجہ دینے اور بروقت امداد کرنے کے لیے متعدد رہبرانہ خطوط بھی جاری کیے گئے۔ حکومت کی طرف سے "انڈسٹریل ری کنسٹرکشن کارپوریشن آف انڈیا" ۱۹۷۱ء (Industrial Reconstruction Corporation of India) کا بھی اہتمام کیا گیا، تاکہ وہ بیمار اور بند صنعتی یونٹوں کے صنعتی احیا اور بحالی کے لیے ایک قرضہ جاتی اور تعمیری ادارہ کے طور پر کام کرسکے۔ بعد میں اسے ۲۰ر مارچ ۸۵ء کو "انڈسٹریل ری کنسٹرکشن بنک آف انڈیا" میں منتقل کرلیا گیا جو بیمار صنعتی یونٹوں کے احیا اور بحالی کے لیے ایک بڑے قرضہ جاتی اور نوتعمیراتی ادارہ کے طور پر کام کر رہا ہے۔ حال ہی میں حکومت نے سِک انڈسٹریل کمپنیز ایکٹ (Sick Industrial Companies (Special Provision) منظور کیا ہے جس کا مقصد ابتدائی مرحلے میں صنعتی بیماری کی علامتوں کی نشاندہی کرنا ہے اور موزوں ڈھنگ سے اُن کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے موزوں مشینری بھی فراہم کرنا ہے۔

بلاشبہ یہ قانون صنعتی بیماری کے مسئلوں کو حل کرنے کے سلسلے میں پہلا سنجیدہ قدم ہے لیکن اپنی موجودہ صلاحیت اور مشمولات کے لحاظ سے اس میں کئی خامیاں ہیں۔ اوّل، اس کا دائرہ محض بڑی بڑی کمپنیوں تک محدود ہے کیوں کہ یہ امدادی اور چھوٹی صنعتی کمپنیوں پر لاگو نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ایسے صنعتی یونٹ بھی اس قانون کے عمل دخل سے باہر ہیں جو واحد ملکیتی یا شراکتی فرموں کی ملکیت ہیں۔ صنعتی بیماری کا خطرہ محض کارپوریٹ سیکٹر سے ہی تعلق نہیں رکھتا اور اس لحاظ سے مناسب یہی ہوتا کہ حکومت ایک ایسا جامع قانون بناتی جو اپنی تنظیم اور ملکیت کے ڈھانچے کے درکنار تمام صنعتی یونٹوں پر لاگو ہوتا۔

مختصر طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے ملک میں صنعتی بیمار یونٹوں کی جسامت اور اُن میں کی گئی سرمایہ کاری کے لحاظ سے غیر متناسب طور پر بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ حکومت کی طرف سے حال میں جو قانون لاگو کیا گیا ہے۔ وہ باقاعدہ ڈھنگ سے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے حکومت کی تشویش اور سنجیدگی کا مظہر ہے لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے "سِک انڈسٹریل کمپنیز ایکٹ" ۱۹۸۵ اپنی محدود وسعت اور ناقص دفعات کے باعث قطعی درست اقدام نہیں ہے۔ یہ وقت ہے کہ حکومت موجودہ قانون کے دائرہ اثر کو بڑھائے تاکہ اس کا اطلاق تمام امدادی اور چھوٹے صنعتی یونٹوں پر کیا جاسکے۔ ●

یوجنا کا خصوصی شمارہ قومی یک جہتی کے موضوع پر

ہر سال کی طرح اس سال بھی چھبیس جنوری کے موقع پر یوجنا ایک خصوصی شمارہ پیش کرے گا۔ اس کا موضوع ہے "قومی یک جہتی" اس میں سید مظفر حسین برنی، پروفیسر این۔ جی۔ رنگا، پروفیسر رئیس احمد، مالکم ایس ادی سیشیہ، چتا بسو، پروفیسر بشیرالدین، کے۔ ایم پانیکر، پی۔ این سریواستو، ایس۔ سی۔ بھٹ، راموجی راؤ، ڈاکٹر گوپال سنگھ، پروفیسر پی۔ جے۔ کورین اور دیگر دانشوروں کے اعلیٰ پائے کے مضامین شامل ہوں گے، اس کی ضخامت عام شماروں سے زیادہ ہوگی مگر اس کی قیمت میں کوئی اضافہ نہیں۔ ایجنٹ حضرات متوجہ ہوں۔

آر۔ جے۔ وینکٹیشورن

ثقافتی اتحاد کے لیے علاقائی مرکزوں کا قیام

ساتویں پانچسالہ منصوبے کا ایک منفرد پہلو یہ ہے کہ اس میں ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ پر زور دیا گیا ہے۔ منصوبے کی دستاویز میں ثقافتی سرگرمیوں کو تیزی سے عمل میں لانے کے لیے ایک پُر جوش پروگرام کی بالتفصیل وضاحت کی گئی ہے۔ تاکہ ملک کے مختلف حصوں کے عوام میں بہتر مفاہمت پیدا کرنے اور قومی یک جہتی کو مؤثر طور پر عمل میں لانے میں مدد دی جا سکے۔

ساتویں منصوبے میں علاقائی ثقافتی مرکزوں کے قیام، مختلف سطحوں پر نظام تعلیم میں ثقافتی سرگرمیوں کی شمولیت، عوام میں ثقافت کی تشہیر کے لیے ذرائع اطلاعات کے استعمال اور قومی ثقافتی اداروں اور ریاستی تنظیموں کے درمیان مؤثر تال میل کے لیے کہا گیا ہے۔

مرکز

علاقائی ثقافتی مرکز خصوصی تذکرے کے مستحق ہیں۔ منصوبہ بندی کمیشن کے مطابق اُن کا مقصد "مختلف علاقوں کی منفرد ثقافتی وابستگیوں" کو فروغ دینا، بھارت کی تمام تر ملی جُلی ثقافت سے اُن کے ثقافتی تعلق کی کھوج کرنا اور بھارت کی ثقافتی وراثت کے تنوع میں بنیادی اتحاد کو نمایاں کرنا ہے۔ ان مرکزوں میں فنون کی تخلیقی ترقی خصوصاً اُن عوامی فنون (لوک کلاؤں) کے احیاء کے لیے ضروری سہولیات ہوں گی جو موزوں سرکاری سرپرستی کی عدم دستیابی سے دم توڑے جا رہے ہیں۔ علاقائی مرکز پہلے ہی قائم ہو چکے ہیں۔ مشرقی خطّے کے لیے شانتی نکیتن، شمال کے لیے پٹیالہ اور جنوب کے لیے تھنجاور میں علاقائی مرکزوں کا قیام ہو چکا ہے۔ چار مزید ایسے مرکز ناگپور، اُدے پور، الہ آباد اور دیناپور میں قائم کیے جائیں گے۔ پردھان منتری شری راجیو گاندھی کا بیان ہے کہ علاقائی مرکز ایک نئی ثقافتی بیداری پیدا کرنے اور بھارت کی ملی جُلی ثقافت کی بہتر جانکاری دینے میں مدد دیں گے۔ ثقافتی فروغ کے لیے حکومت کا دستورکار بلاشبہ سوچ سمجھ کر تیار کیا گیا ہے، لیکن اس امر پر زور دینا ضروری ہے کہ ملک کے اندر عوام کی نقل و حرکت کو سہل بنانے کے لیے موزوں اقدامات کیے جائیں۔

بھاری رقومات

حصولِ آزادی کے بعد سے حکومت تعلیم کے پھیلاؤ کے لیے بھاری رقومات خرچ کر رہی ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں تعلیم پر ایک ارب ۱۴ کروڑ روپے، ۷۷-۱۹۷۶ء میں ۲۲ ارب ۴ کروڑ روپے اور ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۵۱ ارب ۸۶ کروڑ روپے خرچ کیے گئے۔ بعد کے برسوں میں ان اخراجات میں بھاری اضافہ ہوا ہے۔

سرکاری اندازوں کے مطابق درحقیقت ڈیفنس کے بعد تعلیم دوسرا سیکٹر ہے جس پر بجٹ میں سے سب سے زیادہ خرچ کیا جاتا ہے۔ لیکن نظام تعلیم میں نہایت سنگین نقائص اور خامیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ جن کا اُس دستاویز "تعلیم کا چیلنج - ایک حکمت عملی کا تناظر" میں واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے جو گذشتہ برس بھارت سرکار کی طرف سے شائع کی گئی تھی۔ مزید برآں تعلیم یافتہ اشخاص کا فیصد کم ہے اور تعلیم یافتہ مردوں اور تعلیم یافتہ عورتوں کے درمیان بھی بہت عددی فرق ہے۔ ۱۹۸۱ء میں تعلیم یافتہ مردوں کا فیصد ۴۶٫۹ اور عورتوں کا فیصد ۲۴٫۸ تھا۔

لہٰذا نظام تعلیم کو مضبوط خطوط پر چلانے کی ضرورت ہے۔ محض ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے نہیں بلکہ ثقافتی یک جہتی کے لیے بھی معیاری تعلیم

افسوسناک ہے کہ اگرچہ ملک کی ثقافتی ترقی پر بڑا زور دیا جارہا ہے تاہم کاغذ کی صنعت جو اشاعت تعلیم کے لیے نہایت ضروری ہے۔ کئی برسوں سے جمود کا شکار ہے اور اس کے کئی یونٹ خسارے کے باعث بند پڑے ہیں۔ اس صنعت کی پیداواری صلاحیت کا استعمال محض ۶۰ فیصد رہ گیا ہے۔ کاغذ کی فی کس کھپت کا اندازہ محض تقریباً دو کلوگرام سالانہ لگایا گیا ہے جو کہ چین، تھائی لینڈ اور برازیل جیسے ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں بھی بہت کم ہے جہاں یہ بالترتیب تقریباً چھ کلوگرام، گیارہ کلوگرام اور ۲۹ کلوگرام ہے۔

اس صنعت کی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ پیپر کنٹرول آرڈر کا نفاذ اور سرمایہ، بجلی، کوئلے، خام مال اور تکنیکی ماہروں کی کمی ہے۔ صنعت ہٰذا نے سمجھا دیا ہے کہ اس کی صحتمندانہ ترقی کو یقینی بنانے کے لیے ایک طویل پالیسی ہونی چاہیئے اور اس تجویز پر ہمدردانہ غور کی ضرورت ہے۔

اتحاد

ثقافتی اتحاد کے فروغ میں بڑی تیزی آئے گی اگر ٹرانسپورٹ کے تمام ذرائع سے سفر و سیاحت کو ارزاں تر، محفوظ تر اور زیادہ تر آرام دہ بنایا جائے۔ برطانوی مدبر بینجمین ڈزریلی نے کہا تھا کہ سفر و سیاحت سے رواداری پیدا ہوتی ہے جب کہ ایک فرانسیسی مصنف کا کہنا ہے کہ "میں جتنا زیادہ دوسرے ملکوں کو دیکھتا ہوں، اتنا ہی زیادہ پیار مجھے اپنے ملک کے تئیں ہوتا ہے۔ ایک جرمن ضرب المثل ہے کہ ایک سیاح کا بستر جتنا زیادہ بھاری ہوگا اتنا ہی زیادہ خالی اس کا بٹوا ہو جائے گا۔"

لہٰذا مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو ایک حقیقتاً مربوط پالیسی اختیار کرنی چاہیئے اگر ثقافت کو قومی یک جہتی کو تقویت دینے کے لیے مؤثر کردار ادا کرنا ہے۔ ●

بقیہ، سماجی بہبود کے پروگرام

علاقوں میں اس سلسلے میں خاص قانون نافذ کیئے گئے ہیں۔ حکومت مرکزی انتظام کے علاقوں میں اس ضمن میں یکساں قانون بنانے کے سوال پر غور کر رہی ہے۔

نشہ بندی

نشہ بندی لاگو کرنے کی ذمہ داری ریاستی حکومتوں کی ہے۔ مرکزی نشہ بندی کمیٹیاں ریاستوں میں نشہ بندی کی رفتار ترقی کا جائزہ لیتی ہیں۔ اور نصب العین کے حصول کے لیے وسائل فراہم کرتی ہیں۔ حکومت نے نشہ بندی کی پالیسیوں پر عمل درآمد کے لیے ہدایات جاری کردی ہیں۔

سماجی تحفظ

سماجی تحفظ کا قومی ادارہ ملک میں سماجی تحفظ کے پروگراموں کی ترقی، معیار بندی اور تال میل برقرار رکھنے کے لیے مرکزی مشاورتی ادارے کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اعداد و شمار جمع کرتا ہے اور تربیت وغیرہ کے کاموں کے لیے ضروری قانون بنانے میں مدد کرتا ہے۔

بے سہارا ضعیفوں کی امداد

بے سہارا اور کمزور و ناتواں ضعیفوں کے لیے تقریباً سبھی ریاستوں میں نقد امداد دینے کی اسکیم شروع کی گئی ہے۔ حکومت اور رضا کار انجمنوں نے ضعیفوں کے لیے پناہ گاہوں کے قیام اور ان کے اپنے گھروں میں انھیں مدد دینے کی خدمات شروع کی ہیں۔ ●

بقیہ، ذرائع نشر و اشاعت کی ترقی و توسیع

ڈویژن میں کارٹون فلمیں بنانے کے لیے ایک علیحدہ یونٹ قائم کیا گیا ہے جس میں ہر سال چار کارٹون فلمیں تیار کی جا سکتی ہیں۔

ملک میں دستاویزی فلمیں بنانے کی حوصلہ افزائی کے لیے ہر سال چالیس پچاس فلمیں دوسرے فلم سازوں سے بھی تیار کروائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ دستاویزی فلمیں خریدی اور کچھ مفت حاصل کی جاتی ہیں۔

فلمز ڈویژن کی دستاویزی فلمیں اور نیوز ریلیں، ملک بھر کے سینماؤں میں دکھائی جاتی ہیں۔ ۶۰۸۹ میٹر لمبائی کی فلمیں دکھانے سینماؤں کے لیے لازمی ہے۔ ہر ہفتے انگریزی اور ۱۴ علاقائی زبانوں میں ایک نیوز ریل جاری کی جاتی ہے۔ ۱۹۸۴-۸۵ء میں ۱۲۳۸۸ سینماؤں کو منظور شدہ فلموں کے ۳۶۹۹۲ پرنٹ دیئے گئے۔ ڈویژن کے علاقائی دفتروں میں دستاویزی فلموں اور نیوز ریلوں کے ۱۶ ایم۔ ایم کے پرنٹوں کا ذخیرہ موجود ہے۔

ڈویژن نے ۲۱ بین الاقوامی نیوز ریل تنظیموں کے ساتھ خبری فلموں کے تبادلے کا انتظام بھی کیا ہوا ہے۔ فلمز ڈویژن غیر ملکی ناظرین کے لیے بھی فلمیں بناتا ہے جن میں دیش کی شبیہہ کو صحیح انداز میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ دوسرے ملکوں کے لوگ ہمارے ملک کی تہذیب و ثقافت، تاریخی روایات سے واقف ہو سکیں اور ہمارے طرز زندگی، طرز فکر اور رسم و رواج کو سمجھ سکیں۔ ●

ڈاکٹر بی. ایس. آنند

ملیریا ـ یُگوں پُرانا آزار

ھمارے ملک میں کروڑوں اشخاص ہر برس ملیریا میں مبتلا ہوتے ہیں۔ دُنیا بھر میں ہر برس کوئی ۲۰ کروڑ اشخاص اس مرض کا شکار ہوتے ہیں جن میں سے تقریباً ۱۰ لاکھ افراد جاں بحق ہو جاتے ہیں۔

ملیریا کیوں ہوتا ہے؟

ملیریا ایک ملیریائی جرثومہ (GENUS PLASMODIUM) سے ہوتا ہے۔ اس جرثومہ کی چار اقسام ہیں اور ان میں سے ایک (PLASMODIUM FALCIPARUM) شدید ترین مرض پیدا کرتا ہے جو بیشتر پیچیدگیوں اور ملیریا سے ہونے والی اموات کے لیے ذمہ دار ہے۔

انسانوں میں ملیریا مادہ "اینو فیلیس" مچھر کے کاٹنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ مچھر خون میں نومولود جرثومے (SPOROZOITES) داخل کرتا ہے۔ یہ جگر تک پہونچ جاتے ہیں اور جگر کے خلیوں پر حملہ کرتے ہیں جہاں وہ کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔ ہر جرثومہ ۲۰۰۰ سے ۴۰۰۰ تک دختر جرثومے پیدا کرتا ہے۔ یہ دختر جرثومے خون میں دوبارہ داخل ہوتے ہیں اور پہلے وہ سُرخ خون کے خلیوں کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں اور بعد میں جگر کے خلیوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک بار سُرخ خون کے خلیوں میں داخل ہو جائیں تو وہ کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔ حتّیٰ کہ خلیے پھٹ جاتے ہیں اور وہ ان جرثوموں کو پھر خون میں چھوڑ دیتے ہیں۔ وہاں وہ تازہ سُرخ خلیوں پر حملہ کرتے ہیں اور یہ سلسلہ ہر ۴۸ سے ۷۲ گھنٹے میں دُہرایا جاتا ہے۔ مریض کو بُخار اور کپکپی ہوتی ہے اور وہ شدید سردی محسوس کرتا ہے۔ یہ علامتیں خون کے خلیوں کے پھٹنے کے ساتھ شروع ہو جاتی ہیں۔

علامتیں اور پیچیدگیاں

سردی، بُخار اور پسینے کی مثالی علامتیں ہر ۴۸ گھنٹے سے ۷۲ گھنٹے میں ہونے لگتی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ سر درد، عضلاتی درد اور کمزوری ہونے لگتی ہے۔ اگر مریض کا علاج نہ کیا جائے تو بُخار کے حملے بے قاعدگی کے ساتھ ہونے لگتے ہیں، اور مریض کمیٔ خون کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کی تِلّی اور جگر بڑھ جاتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ تمام مریضوں میں بُخار کچھ وقفے کے بعد نہیں ہوتا۔ بعض میں بُخار متواتر رہتا ہے اور درد تیزی کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ ملیریا کے مریضوں میں پیچیدگیاں اور اس کے نتیجے میں اکثر اموات جرثومہ کی (FALCIPARUM) انواع سے ہوتی ہے۔ یہ بیماری دماغ پر اثر کر سکتی ہے جس کے نتیجے میں مریض بے تُکی باتیں کرنے لگتا ہے۔ اُسے فالج ہو سکتا ہے اور اُس پر بے ہوشی طاری ہو سکتی ہے۔ پھیپھڑے بھی متاثر ہو سکتے ہیں جس کے نتیجے میں کھانسی ہو سکتی ہے۔ تھوک میں خون آنے لگتا ہے اور سانس میں رکاوٹ آ سکتی ہے۔ گُردوں کا فعل رُک سکتا ہے اور پھیلی ہوئی تِلّی پھٹ سکتی ہے۔ یہ تمام پیچیدگیاں نہایت سنگین ہیں اور اس کے نتیجے میں مریض کی موت واقع ہو سکتی ہے۔

تشخیص

ملیریا کی آسانی سے تشخیص ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے مریض کی اُنگلی کے پورے سے تھوڑا سا خون لیا جاتا ہے اور اُسے خوردبین کے نیچے رکھا جاتا ہے۔ ملیریائی جرثومہ سُرخ خون کے اندر دیکھا جاتا ہے۔ اور اُس کی شکل دیکھ کر یہ شناخت کرنا ممکن ہو جاتا ہے کہ چار انواع میں سے اس کی نوع کونسی ہے۔

اکثر حالتوں میں خون کا فوری معائنہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اگر علامتیں ملیریا کی سی ہوں تو علاج شروع کر دینا چاہیئے۔ زیادہ تر مریضوں پر علاج کا فوری اثر ہوتا ہے اور اس سے تشخیص کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

علاج

اس کے لیے "کلوروکوئن" کا انتخاب کیا گیا ہے۔ چار گولیاں فوری طور پر دی جاتی ہیں اور اس کے چھ گھنٹے بعد مزید دو گولیاں اور پھر تین روز تک ہر روز ایک گولی دو بار (کُل بارہ گولیاں)، جو مریض (FALCIPARUM) چھوت کا شکار ہوں اُن پر "کلوروکوئن" کا اثر نہیں ہوسکتا اور انھیں اکثر "کونین" اور "پائی ری میتھین" جیسی دیگر ادویات درکار ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ مریض کو زیادہ آرام پہنچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیئے۔ بخار پر (PARACETAMOL) جیسی ادویات سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ ان گولیوں سے سر درد اور عضلاتی درد بھی کافور ہوجاتا ہے جو اس مرض میں عام طور پر ہوتے ہیں۔ بھارت میں جہاں ملیریا خصوصاً موسم گرما میں بہت زیادہ پھیلتا ہے یہ بات بہت ضروری ہے کہ کلوروکوئن گھر میں تیار رہنی چاہیئے تاکہ علاج بلا تاخیر شروع کیا جاسکے۔

حفاظتی تدابیر

حتمی مقصد ہے ملیریا کا ایسے ڈھنگ سے قطعاً انسداد کرنا جس ڈھنگ سے چیچک کے بارے میں کیا گیا ہے۔ اس کے لیے تدبیر یہ ہونی چاہیئے کہ ایسے مچھروں کا انسداد کیا جاسکے جو بیماری پھیلاتے ہیں اور ملیریائی جرثوموں سے تحفظ کیا جائے۔

ذاتی سطح پر مچھروں سے رابطہ کم از کم کیا جائے۔ اس کے لیے مکانوں میں پردے لگائے جائیں، بستروں پر مچھردانیاں لگائی جائیں۔ اور کیڑے مار دوائیوں کا استعمال کیا جائے۔

حلقہ جاتی سطح پر ہر وہ کوشش کی جائے جس سے مچھر دوبارہ پیدا نہ ہوں۔ یہ کیڑے گرم مرطوب ماحول میں خصوصاً کھڑے پانی کی سطح پر پنپتے ہیں اور اُن کی تعداد کئی گنا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا تالابوں اور جھیلوں پر "ڈی ڈی ٹی" جیسی کیڑے مار دوائیوں کا مسلسل چھڑکاؤ کیا جانا چاہیئے۔

بھارت جیسے وبائی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو ہر ہفتے "کلوروکوئن" کی دو گولیاں کھلا کر اس مرض سے بچایا جاسکتا ہے لیکن اس پر بہت زیادہ لاگت آئے گی لہٰذا یہ بہتر ہوگا کہ اس دوائی کا استعمال حاملہ عورتوں اور بچوں تک محدود کیا جائے جو اس مرض کا جلد شکار ہوسکتے ہیں۔

ملیریا کا ٹیکہ تیار کرنے کے لیے بڑا تحقیقی مطالعہ کیا جارہا ہے۔ تحقیقی رپورٹوں سے پتہ چلا ہے کہ (SPOROZOITE) کی بیرونی سطح پر جلد اثر ہوسکتا ہے اس لیے اُمید کی جاتی ہے کہ اس کی سطح کے پروٹین سے ٹیکہ تیار کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ بات سچ ثابت ہوئی تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہماری زندگی کے اندر ہی انسان کی اس میگوں پرانی وبا کا انسداد ہوجائے گا۔

●

بقیہ، قومی اتحاد، مشترکہ ذمہ داری

اظہارِ خیال کو اپنے اندر سما لینے کی ہے۔ کسی بھی طرح کی الگ تھلگ رہنے کی خواہش بھارت کی رُوح سے میل نہیں کھاتی۔

یہ کونسل کئی لحاظ سے ایک اچھی مثال ہے کیونکہ اس میں مختلف طرزِ فکر کے حامل افراد ایک مشترکہ مقصد کی خاطر ایک جگہ اکٹھا ہوتے ہیں۔ ہمیں طرزِ فکر کی ہر تنگی یا جذبات و احساسات کی وارفتگی سے بچنا ہے کیونکہ ان کا اشتعال پانا تو آسان ہے مگر ایک دفعہ اُبھر کر قابو میں آنا دشوار ہوجاتا ہے اور اس طرح سے ہماری صلاحیتیں پوری طرح بروئے کار آنے سے قاصر رہ جاتی ہیں اور ہم ملک کی بھرپور طرح سے خدمت کرنے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح امتزاج اور میل جول کا یہ پیغام سوجھ بُوجھ کے ساتھ پھیلانا ہے۔ عوام میں ہم آہنگی اور جذبۂ رواداری کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہماری قومیت کے وجود کی یہی بنیاد ہے۔

آپ سب نے یہاں آنے اور اس میٹنگ میں شریک ہونے کی زحمت گوارا کی۔ اس کے لیے آپ سب کا شکریہ۔ مجھے اُمید ہے کہ ہمارے تبادلۂ خیال سے ان فیصلوں کو عملی شکل دی جاسکے گی جو سابق میں کئے جاچکے ہیں اور اگر ممکن ہو تو کچھ ایسے نئے اقدامات کئے جائیں جن سے اتحاد کے جذبے کو تقویت ملے اور ہمارے عوام میں یہ زندہ حقیقت کی صورت میں فروغ پا سکے۔ کسی بھی طبقے کو یہ احساس نہ ہونا چاہیئے کہ اس کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جارہا ہے۔ کسی بھی طبقے کو یہ نہ محسوس ہونا چاہیئے کہ وہ کسی بھی طرح دوسروں سے کمتر ہے۔ آج کی دُنیا میں جو کہ بحران اور پیچیدہ صورتِ حالات سے دوچار ہے، یہ ایک مشکل کام ہے اور ہم ایک بہت بڑی ساجھے داری میں ایک ساتھ ہیں۔

(وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کی تقریر کا اقتباس۔ یہ تقریر موصوفہ نے ۲۲ر جنوری ۱۹۸۷ء کو نئی دلی میں قومی یک جہتی کونسل کی میٹنگ میں کی تھی۔)

●

آل احمد سرور

نئی غزل کی نمائندہ آوازیں

نئی غزل سے مراد وہ غزل ہے جو آزادی کے بعد وجود میں آئی اور جس کی سب سے اچھی نمائندگی ناصر کاظمی، ابن انشا اور خلیل الرحمٰن اعظمی کے یہاں ہے۔ لیکن ۱۹۶۰ء سے اس نئی غزل میں کچھ اور ابعاد پیدا ہوئے ہیں جن کی وجہ سے یہ اس سے پہلے کے رنگ سے خاصی مختلف ہوگئی ہے۔ ناصر کاظمی، ابن انشا اور خلیل الرحمٰن اعظمی، میر کی زبان اور ان کے اسلوب میں اپنے دور کا سوز وگداز شامل کر دیتے ہیں۔ واقعات سے زیادہ تاثرات سے کام لیتے ہیں۔ بلند آہنگی کے بجائے دھیمی سوچ کا ثبوت دیتے ہیں، خواب اور حقیقت کے تصادم سے زخمی روح پر جو بیت جاتی ہے اس کا المیہ خاصی مردانگی سے بیان کرتے ہیں، مگر ان کا رشتہ ہمارے کلاسیکی شعرا سے پھر بھی استوار رہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد جو نئی غزل سامنے آتی ہے اس میں فکر اور فن دونوں میں ایسی تبدیلی ہوئی ہے کہ غزل کا نیا پن اور واضح ہوگیا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ غزل نے اس نئی غزل کے روپ میں زندگی کے سارے تضادات اور عجائبات کو آئینہ دکھانے کا مشن اپنے ذمے لے لیا ہے اور تنگنائے غزل کا شکوہ کرنے والوں کو بھی یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ غزل کا نگار خانہ اپنی بلاغت اور تہہ داری، اپنی رمزیت اور خود بینی کے باوجود، زندگی کی تمام حقیقتوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس نئی غزل میں پہلی چیز جو نئی ہے وہ ذات اور کائنات کے متعلق اس کا تصور ہے۔ کائنات کی بات اب ذات کے حوالے سے ہوتی ہے اور ذات بھی کائنات کی طرح پھیلی ہوئی ہے کیونکہ دنیا اب سمٹ کر ایک گاؤں ہوگئی ہے۔ بشیر بدر نے ایک شعر میں اس کیفیت کو بیان کیا ہے ؎

خوبصورت، اداس، خوف زدہ
وہ بھی ہے بیسویں صدی کی طرح

اور باقر مہدی نے اس جدید آہنگ کی ترجمانی اس طرح کی ہے ؎

مرے نالے کی کوئی لے نہیں ہے
مشینی دور کی اک نغمگی ہے

بیسویں صدی کی اداسی، خوفزدگی اور خوبصورتی اور اس میں مشینی آہنگ کی نغمگی نے ایک نئی حقیقت پسندی کو جنم دیا ہے، جو اخلاق کے مفروضوں کی پٹری پر چلنے کے بجائے، آج کل کی ٹیڑھی میڑھی پگ ڈنڈیوں، نامانوس پستیوں اور عام کمزوریوں کے اظہار سے شرماتی نہیں اور اس طرح ایک نئی ایمانداری یا اپنے مشغلے سے وفاداری کا ثبوت دیتی ہے۔ ظفر اقبال اس رنگ کی اچھی نمائندگی کرتے ہیں، گو یہ لے دوسروں کے یہاں بھی اپنی بہار دکھاتی ہے۔

جا بجا ہیں دھول کے دھبے، دھوئیں کی دھاریاں
آسمان کا آئینہ کس نے مکدر کر دیا

ظفر اقبال نے کھُردرے پن کو نئی غزل کہا ہے مگر یہ نئی حقیقت پسندی غزل کے آداب کے ساتھ مظہر امام کے یہاں اس طرح ظاہر ہوتی ہے ؎

جانے کس راہ چلوں، کون سے رُخ مُڑ جاؤں
مجھ سے مت مِل کہ زمانے کی ہوا ہوں میں بھی

زبیر رضوی اس کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

اپنے سب خواب نہ یوں ہاتھ میں لے کر نکلو
دھوپ ہوگی تو کسی ہاتھ میں پتھر ہوگا

اور کشور ناہید کہتی ہیں ؎

اب تو ہر تازہ ستم ہے تسلیم
حادثے دل پہ گراں تھے پہلے

سلیم احمد نے اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

اس پہ کیا پگھلیں کہ دل پتھر ہوا
اس پہ کیا روئیں کہ رونا بند ہے

ساقی فاروقی کہتے ہیں ؎

جسم کی سطح پہ کاغذ کی طرح زندہ ہیں
تو سمندر ہے تو میں ڈوبنے والا ایسا

علوی اپنے سادہ اور پُر وقار انداز میں کہتے ہیں ؎

ہمیں کیا گھاس ڈالے گی بھلا وہ
خوشی، اُنہ پیچھے گھرانے کی بہو ہے

شہریار نے جبر و اختیار کا نیا مسلک اس طرح بیان کیا ہے ؎

وقت کی ڈور کو تھامے رہے مضبوطی سے
اور جب چھوٹی تو افسوس بھی اسکا نہ ہوا

اس نئی حقیقت پسندی کی وجہ سے ظلم پر غیض و غضب، بدی پر چیخ و پکار، پستی پر زہر میں بجھی ہوئی طنز کے بجائے نئی غزل میں دھیمے لہجے میں بڑے سے بڑے کرب کا بیان، ایک سرگوشی کا لہجہ، ایک IRONY یا ہجو ملیح یا لطیف طنز، جو بڑی مردانگی اور تاثر رکھتی ہے، کئی شاعروں کے یہاں بڑے بھرپور اور جاندار انداز سے آئی ہے، شہریار فسادات پر چیختے چلاتے نہیں، بلکہ ایک گمبھیر سادگی کے ساتھ کہتے ہیں ؎

آگ کے شعلوں سے سارا شہر روشن ہو گیا
ہو مبارک آرزوئے خار و خس پوری ہوئی

ظفر اقبال اس نئی حقیقت پسندی کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں ؎

آس کے گلاب، آس کے چاند جس کی بھی قسمت میں ہیں
آپ ظفر کس لیے اتنی مصیبت میں ہیں

ندا فاضلی بڑے شہر کی یکسانیت اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

نقشہ اُٹھا کے اور کوئی شہر ڈھونڈیے
اس شہر میں تو سب سے ملاقات ہو گئی

اور اس دور کے کاروباری اور مشینی ذہن کی محرومی کا ذکر ساقی فاروقی کس جذبۂ ترحم سے بیان کرتے ہیں ؎

یہ لوگ خواب میں بھی برہنہ نہیں ہوتے
یہ بدنصیب تو کبھی تنہا نہیں ہوتے

جو لوگ براہِ راست شاعری خطابت اور سیاسی واقعات سے غزل کو گراں بار کرنے کے عادی ہیں، ان کا شکوہ یہ ہے کہ نئی غزل سماجی اور سیاسی حقائق کی چشم پوشی کر کے ذات کے نہاں خانے میں پناہ گزیں ہو گئی ہے، یہ الزام سراسر غلط ہے۔ اوّل تو غزل براہِ راست بیان یا خطابت کو مُنہ ہی نہیں لگاتی، دوسرے اس نے یہ گُر پا لیا ہے کہ سیاسی شعور یا سماجی حقائق کے اشارے داستانوں پر بھاری ہوتے ہیں۔ نیا غزل گو سماجی شعور رکھتا ہے مگر وہ تلقین کی سنگلاخ راہوں کے بجائے اشاروں کی دَم بَدم کُھلتی اور بند ہوتی کھڑکیوں اور علامات کے جادو کے دریچوں سے زیادہ شغف رکھتا ہے۔ اس لیے میرے نزدیک اس کی بات دلوں میں اُترتی اور انھیں محشرِ خیال بنا دیتی ہے۔ احمد فراز کہتے ہیں ؎

اب روشنی ہوتی ہے کہ گھر جلتا ہے دیکھیں
شعلہ سا طوافِ در و دیوار کرے ہے

انہی کا شعر ہے ؎

مَیں شب کا بھی مجرم تھا سحر کا بھی گنہگار
یارو مجھے اس شہر کے آداب سکھا دو

مُنیر نیازی جن کا رنگ ایک خواب آلود سحر رکھتا ہے، یہ کہنے پر بھی مجبور ہوتے ہیں ؎

کسی کو اپنے عمل کا حساب کیا دیتے
سوال سارے غلط تھے جواب کیا دیتے

خورشید الاسلام کہتے ہیں ؎

کھائیں فریبِ روز، اُٹھائیں نقابِ روز
ہر شخص کیا ہے اور کہاں دیکھتے چلیں

مظہر امام کا یہ تبصرہ کتنا بلیغ ہے ؎

بلائے شام کے سائے تھے اور وادیٔ دل
اگرچہ جسم کا چہرہ دُھلا دُھلا سا تھا

میرا ایک شعر ہے ؎

رات بھاری تھی تو تھے اسکے ستم سے بیزار
صبح آئی ہے تو وہ اور بُری لگتی ہے

نئی غزل الفاظ کے برتنے میں پچھلی غزل کے مقابلے میں زیادہ جرأت رکھتی ہے وہ کبھی انگریزی کے رائج الفاظ سے بھی کام لیتی ہے کبھی الفاظ کے جدلیاتی پہلو پر زور دیتی ہے اور کبھی قوافی کے برتنے میں صوتی مناسبت کو قواعد سے زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ اس آزادی سے ایک خوشگوار تازگی کا احساس ہوتا ہے جو پرانی غزل کی شائستہ لے اور مانوس چال کے مقابلے میں زیادہ مزا دیتا ہے۔ جاں نثار اختر کہتے ہیں ؎

ہائے یہ انتظار کے لمحے
جیسے سگنل پہ رک گئی ہو ریل

ندا فاضلی کا شعر ہے ؎

سورج کو لے کے چونچ میں مُرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیئے رات ہو گئی

علوی کہتے ہیں ؎

کبھی بھی ہونٹ پہ جا بیٹھتی ہے
ہنسی سچ پوچھئے تو فالتو ہے

علوی کے یہاں رنگ خاصا چوکھا ہے۔ اس کے علاوہ ظفر اقبال، عادل منصوری اور باقر مہدی بھی اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں۔

نئی غزل میں ایک خاص آواز شاعرات کی ہے جنھوں نے حقیقت پسندی کا ایک سانحی انداز میں عکس پیش کیا ہے۔ اس لحاظ سے پروین شاکر کا ایک خاص مقام ہے۔ ان کے ان اشعار کی لے نئی بھی ہے اور لذیذ بھی۔ یہ نئی غزل میں ایک دلکش اضافہ ہے ؎

مَیں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

بڑھے چلو بڑھے چلو

مختار ٹونکی، کالی پلٹن روڈ، پیل محمد خاں، ٹونک (راجستھان)

رُکے نہیں، یہ کارواں، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرو! رواں دواں، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بڑھوگے آگے تم اگر
سپاہیانہ شان سے
کروگے طے جو مرحلے
ہیں منزلیں دھواں دھواں، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرو! رواں دواں، بڑھے چلو، بڑھے چلو
اِدھر اُدھر یہاں وہاں
زمین کو کھنگال دو
آئیں پہاڑ سامنے
تو گیند سا اُچھال دو
جُھکا دو بڑھ کے آسماں، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرو! رواں دواں، بڑھے چلو، بڑھے چلو
یہ وقت کا تقاضا ہے
پُرانی راہیں چھوڑ دو
کہ زندگی کا قافلہ
نئی دِشا میں موڑ دو
قدم اُٹھاؤ بے گماں، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرو! رواں دواں، بڑھے چلو، بڑھے چلو

ترقیاتی دَوڑ میں
تمھارے ساتھی بڑھ گئے
پڑے ہو تم تو نیند میں
وہ چاند پہ بھی چڑھ گئے
پُکارتی ہے کہکشاں، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرو! رواں دواں، بڑھے چلو، بڑھے چلو
گذرنا ہے ستاروں سے
رُکو نہیں! دِلاورو!
رکھو بلند ہمتیں
تھکن کی بات مت کرو
مثلِ سیلِ بے کراں، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرو! رواں دواں، بڑھے چلو، بڑھے چلو
تمھارا عزم آہنی
شجاع ہو، تم دلیر ہو
وطن کو تم پہ ناز ہے
وطن کے تم ہی شیر ہو
تمھیں وطن کے پاسباں، بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرو! رواں دواں، بڑھے چلو، بڑھے چلو

●

چھبیس ۲۶ جنوری

مشتاق الملحوی
کائٹ مرچنٹ، بھارت ٹاکیز، بھوپال

چھبیس ۲۶ جنوری کی خوشی یوں منائیں ہم
ہر سمت اتحاد کے دیپک جلائیں ہم

●

گاندھی نے شانِ ہند بڑھائی کچھ اسطرح
جانِ عزیز اپنی گنوائی کچھ اِس طرح
جنگ و جدل میں سینہ سپر ہو کے دوستو
آزادی اس وطن کو دلائی کچھ اس طرح

●

چھبیس ۲۶ جنوری کی خوشی یوں منائیں ہم
ہر سمت اتحاد کے دیپک جلائیں ہم

●

کردار ہم کو دے گیا وہ آن بان سے
خوش تھا ہر ایک شہر میں پیر و جوان سے
تاریخ لکھ چُکی ہے کتابوں میں اس کا نام
آواز آرہی ہے یہ ہندوستان سے

●

چھبیس ۲۶ جنوری کی خوشی یوں منائیں ہم
ہر سمت اتحاد کے دیپک جلائیں ہم

●

شہیدِ وطن

قاضی حسن رضا۔ قاضی پورا، کھنڈوا (ایم۔پی) ۴۵۰۰۰۱

قبرستان میں ہُو کا عالم
مَیں نے دیکھا ایک لحد پر
نُور کی بارش
دکھا دالیسے
پھول لے کر خوشبو والے
باغیچے سے
دوبارہ پھر پہنچا لحد پر
سناٹے کو چیر کے ایسی
بارعب، سحرکُن، آواز یوں آئی

پھولوں کی خواہش،
نہ خوشبو کی ہے
خاکِ وطن کا ہر اک ذرّہ
پیارا تھا تب، پیارا ہے اب
مجھ کو خواہش شمشیر و سناں کی
تحفہ مجھ کو
تلوار کا دے دو، ڈھال کا دے دو
زندہ رہا ہوں وطن کی خاطر
اور مرا ہوں وطن کی خاطر!

●

غزلیں

سیّد حیات وارثی

باغ انور، لکھنؤ، ۲۲۶۰۰۳ -

زندگی ایک طلسمات کا آئینہ ہے
دن جسے کہتے ہیں وہ رات کا آئینہ ہے

تیرے رُخسار کا غازہ ہیں بدلتے موسم
زُلفِ برہم تری برسات کا آئینہ ہے

عہدِ نو لفظوں کے مفہوم سے واقف ہی نہیں
کتنا بے عکس خیالات کا آئینہ ہے

شخصیت میں تری اُتنی ہی چمک بھی ہوگی
جتنا روشن تری خدمات کا آئینہ ہے

جو بھی کہنا ہو تجھے میری طرف دیکھ کے کہہ
میرا چہرہ ترے جذبات کا آئینہ ہے

اب بزرگوں کی وراثت بھی نہیں ہے محفوظ
دُھندلا دُھندلا سا روایات کا آئینہ ہے

●

روشن لال روشن بنارسی

ڈی ۴۷/۱۱۰، اے۔ رام پورہ، وارانسی۔

کدُورتوں سے کہیں دُور تیرگی ہوگی؟
جلے گی شمعِ محبت تو روشنی ہوگی

خلوصِ دل سے ملو جس سے بھی ملو یارو
خدا بھی کہتا ہے یہ عین بندگی ہوگی

جھلک رہی ہے جو تنہا سرِ دیارِ وفا
وہ کوئی اور نہ ہوگی، وہ زندگی ہوگی

اُسی کے شعر ہوا گنگنائے گی یارو
کہ جس کے شعر میں پھولوں سی تازگی ہوگی

یہی اُصول گلستانِ دل کا ہے روشن
جو شاخ سوکھ گئی پھر نہ وہ ہری ہوگی

●

عزیز بگھروی

۲۵۰۳، بارہ دری شیر افگن۔ بلیماران
دہلی ۶، ۱۱۰۰۰۶

کام سب کسرِ شان والے ہیں
نام کے خاندان والے ہیں

مطمئن ہیں اگر تو روشن دل
مضطرب سب گمان والے ہیں

جنسِ کم مایہ کے ہیں سوداگر
جتنے اُونچی دکان والے ہیں

آپ کو بھی زمانہ ڈس لے گا
آپ بھی جسم و جان والے ہیں

پستیوں سے ہیں کس قدر خائف
وہ جو اُونچی اُڑان والے ہیں

تلخیوں سے بچائے ان کی خدا
کیسے شیریں زبان والے ہیں

سرکشی پر زمین والوں کی
دم بخود آسمان والے ہیں

ہیں بہ باطن وہ انکسار پسند
ظاہرا آن بان والے ہیں

لفظ و معنی کا پاس رکھئے عزیز
آپ اُردو زبان والے ہیں

●

پروفیسر کلیم ضیاء

پلاٹ نمبر ۲۲/کوارٹر ۵، شواجی نگر گوونڈی
بمبئی، ۴۰۰۰۴۳ -

یہ کس نے مرے جسم کو چپکے سے چھُوا ہے
تو ہے تری آواز ہے، یا لمسِ ہوا ہے

آئینۂ احساس سے دل پوچھ رہا ہے
وہ شخص تجھے دیکھ کے کیوں آج ہنسا ہے

یہ کس کے لیے شہر میں کہرام مچا ہے
کس شخص نے فٹ پاتھ پہ دم توڑ دیا ہے

ہر لفظ لپکتے ہوئے شعلوں کی ردا ہے
یہ میری غزل میری امیدوں کی چِتا ہے

احساس کی گرمی سے ہر انسان ہے زندہ
یہ آگ جو بجھ جائے تو انسان میں کیا ہے

سب لوگ ضیا فن کو مرے دیکھ رہے ہیں
شاید مرے اشعار میں فنکار چھُپا ہے

●

شفیع اللہ خاں راز

ایس۔ این کالج، کٹرہ پُردل خاں۔ اٹاوہ یو۔پی

جو اپنے قیمتی لمحات کو گنوا دے گا
تمام عمر زمانہ اسے سزا دے گا

یہ زندگی کے اندھیرے اسی کو ڈس لیں گے
جو اپنے خانۂ دل کے دیے بجھا دے گا

بھڑک اُٹھا جو کبھی ایک ذرّۂ ناچیز
غرورِ کوہِ گراں خاک میں ملا دے گا

تو آ گیا ہے محبت کی روشنی کے قریب
ہر اک چراغ تری روح جگمگا دے گا

یہ امتحان کی راتیں ہیں جاگتے رہنا
تھپک کے ورنہ زمانہ تمھیں سُلا دیگا

بہت حسین غمِ زندگی کے نشتر ہیں
جو زخم دل پہ لگے گا وہی مزا دے گا

مَیں جانتا ہوں کہ رازِ درونِ میخانہ
ہر ایک رند کو اے راز تو بتا دے گا ●

خواجہ عبدالغفور

نہیں نہیں نہیں !

کبھی آپ نے اِتنی بار "نہیں" کہا ہے، شاید ایک آدھ بار دبی زبان سے کہا بھی ہو تو دوسری سانس میں فوراً "ہاں" کہہ دیا ہوگا۔ سوال کچھ روپیوں کے قرضہ کا ہو، آپ کی موٹر کار مستعار مانگی جا رہی ہو۔ ویڈیو کیسیٹ یا کتابوں کی طلب ہو، کچھ بھی ہو "نہ" کہنا ناممکن سا لگتا ہے۔ اور پھر دو نفی از خود مثبت ہو جاتے ہیں۔ تیسری نفی تک بات پہونچتی بھی نہیں۔

کہتے ہیں کہ ڈپلومیٹ کبھی نہ کہتا ہوا پکڑا نہیں جاتا۔ وہ ہاں اور بری دل سے سہی ضرور کہے گا خواہ اس کا مطلب 'نہ' ہی ہو لیکن حاکم مجاز اور سیاسی رہبر کو اس ہاں کو نبھانے کے گُر آتے ہیں۔

کوئی خاتون ہر بات پر ہاں کہے تو اس کی شرافت مشکوک ہو جاتی ہے۔

وہیدر فورکاسٹ (موسمی پیشین گوئی) تھا کہ کسی شہر میں زلزلہ آنے والا ہے۔ وہاں کے رہنے والے والدین نے اپنے چار بچوں کو ایک قریبی محفوظ شہر کے رشتہ دار کے پاس پہونچا دیا جو نہ کہہ سکے یہ اس قدر شریر اور چنچل ثابت ہوئے کہ کچھ ہی دیر میں دو چار کھڑکیوں کے کانچ ٹوٹ گئے۔ فرنیچر تتر بتر ہو گیا۔ برتن کوڑا کرکٹ میں بدل گئے۔ ان بے چاروں نے جو کسی حال میں نہ کہہ نہ سکتے تھے ان لڑکوں کے والدین کو فون کیا:

"آپ براہِ مہربانی اپنے بچوں کو واپس لے جائیں اور زلزلہ کو ہمارے شہر بھیج دیں۔"

کسی شہر یا کسی گاؤں کی صنعتی یا زرعی ترقی کے لیے بڑی سے بڑی اسکیم پیش کیجئے جو تکنیکی اعتبار سے یا مالیاتی نقطۂ نظر سے کبھی بھی روبہ عمل نہیں لائی جا سکتی مگر کیا مجال کہ درخواست گذاروں کو کسی نوبت پر بھی ٹکا سا جواب 'نہ' کا مل جائے۔ اُلٹے پلٹے سوال جواب ہوں گے، مباحثے ہوں گے۔ بال کی کھال نکالی جائے گی اور ہر مرحلے پر لگے گا کہ حسب دلخواہ تصفیہ ہو رہا ہے۔ نہ کہے بغیر یہ اتنے لمبے عرصے تک چلے گا کہ لوگ از خود بھول بھلا جائیں گے۔

اسی طرح کسی بھی دفتر سے معقول، غیر معقول ممکن یا ناممکن العمل درخواست پر جواب ملے گا آپ کی عرضی زیرِ غور ہے۔ مدتوں بعد یاد دہانی پر پھر اسی طرح کا جواب وصول ہوگا، کبھی یہ بھی کہا ہوگا اس کارروائی کی یکسوئی بہت جلد کی جائے گی۔ آپ کی درخواست متعلقہ کمیٹی کے پیشِ نظر ہے۔ پھر یہ کہ کمیٹی کی سفارش زیرِ غور ہے اور کبھی یہ کہ تصفیہ کے آخری مراحل پہ ہے۔ اس سوال جواب میں مرورِ مدت کے ساتھ وہ بات خود بخود ٹھکانے لگ جائے گی یا درخواست گذار از خود۔

اگر معاملہ نوکری کا ہو، مدرسہ یا کالج میں داخلہ کا یا اسی طرح کی کوئی بات ہو اور گنجائش نہ ہو آسامی خالی نہ ہو، سیٹیں بھر چکی ہوں۔ اُمیدوار میں وہ قابلیت یا صلاحیت نہ ہو جس کے لیے اس نے عرضی دی ہو تو بجائے سیدھے سادے 'نہ' کے جواب ملے گا۔

"آپ کی درخواست درج رجسٹر کر لی گئی ہے، آپ کے نام پر عندالموقعہ غور کیا جائے گا۔"

اور وہ دن آتا ہی نہیں کہ جب آپ محتاجِ توجہ

قرار دیئے جائیں، یہ سب "نہ" کہنے سے گریز کا نتیجہ ہے۔

روزمرہ کی گھریلو زندگی میں کیا یہ ممکن ہے کہ بیوی اور بچوں کی فرمائشوں کو پورا کیا جائے، اور جب یہ ممکن نہیں تو اس سے بڑھ کر یہ ناممکن ہے کہ سیدھا سادا "نہیں" کہہ کر بات ختم کردی جائے آج اتنی ہمت اور اتنا بڑا حوصلہ کس میں ہے۔ بیشک ہمارے بزرگ صاف صاف نہ کہنا جانتے تھے اور نہ کہتے تھے تو ان کا مطلب بھی نہ ہوتا تھا اور ہم اس کی تمام باریکیوں کو سمجھ کر قبول کر لیتے تھے لیکن آج ہم اپنے بچوں کو اس طرح کا جواب نفی میں دیں تو سوال ہوگا، کیوں نہیں، آخر بتلایئے تو کس لیے آپ ہماری بات کو رد کر رہے ہیں۔ آپ نے سوچا کیا ہے؟ اس تنک مزاجی سے بچنے کے لیے ہم اکثر و بیشتر اگر مگر لیکن وغیرہ کا سہارا لے کر نہ کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہیں گے "ہاں اگر اور بھی کوئی ہو، ورنہ نہیں۔ مگر یہ دیکھ بھال کرکے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس کا حاصل بھی کچھ ہے" وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ ساری پیش بندی بیکار ہی جاتی ہے اور ہماری نہ کسی نہ کسی طرح ہاں میں بدل کر ہی رہتی ہے۔

نہ کرنے کے لیے کچھ بہانے تراشے جاتے ہیں کچھ مزاحیہ انداز میں بات کو ٹالا جاتا ہے۔

ایک لڑکی نے کسی رسالہ کو مضمون بھیجا تو ایڈیٹر صاحب نے اس کو معیاری نہ سمجھ کر صاف و صریح نہ کے بجائے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ آپ کی تحریر پڑھی نہیں جا رہی ہے۔ براہِ کرم "ٹائپ کرکے بھجوایئے"۔ لڑکی نے جواب دیا "اگر مجھے ٹائپ کرنا آتا تو میں یہ مضمون نویسی میں اپنا وقت ضائع کیوں کرتی"۔

کسی خاتون نے پکوان کے کچھ رسے پی بغرضِ اشاعت کسی رسالے کو بھیجے۔ مدیر صاحب نے اس کو قابلِ اشاعت نہ سمجھ کر ٹالتے ہوئے کہا:

"آپ کے پکوان کچھ چٹخارے دار نہیں لگتے۔ ان کو ذائقہ دار بنا کر بھیجیے"۔ خاتون نے اشارہ سمجھ کر لکھ دیا "بے شک ان میں زبان کا چٹخارہ نہیں ورنہ ہم خود اس سے شکم سیر ہوتے اور آپ کو زحمت نہ دیتے۔ نہیں کا جواب نہیں اور کس عمدگی سے۔

بہت سارے کام جن کو نہ کہہ کر ٹالنا پڑتا ہے "حکمتِ عملی" سے بنائے بگاڑے جاتے ہیں۔ انتظامیہ اور ایڈمنسٹریشن میں یہ لفظ حکمتِ عملی کہیں نہیں ملے گا اور نہ اس کا ہم معنی کسی اور زبان میں ہے۔ اس کا ترجمہ ہوا ہے اور نہ ممکن ہے۔ یہ اپنی جگہ ایک جوہر ہے ایک صلاحیت ہے، ایک مشین ہے کہ جو کامن سنس کی طرح مفقود ہے لیکن اس کا استعمال جس کو آجائے وہ شخص ہر طرح کامیاب ہے۔

چھوٹی صنعت کے لیے شیڈ ڈالا گیا اور اس کی حسبِ ضابطہ منظوری کی درخواست بھی دی گئی۔ تنقیح کنندہ افسرانِ متعلقہ نے معائنہ موقع کیا اور ان کی درخواست نامنظور کر دی کہ چھت کی اونچائی صرف ۹ فیٹ ہے اور قاعدہ کے لحاظ سے وہ ۱۱ فیٹ ہونی چاہیئے۔ یہ نفی کی ایک زاہد مثال تھی اور سب ہی حیران پریشان تھے۔ عمارت باندھنے میں کافی سرمایہ لگا چکے تھے اور اب اگر نہ ہو جائے تو ساری اسکیم ٹھپ ہو جاتی۔ کئی دن تگ و دو اور سوچ بچار میں گزر گئے کہ اس نہ کو کس طرح ہاں پر لایا جائے۔ جب انجینئر اور بڑے کارکن منتظم و مہتمم ناکام ہو گئے تو کسی معمولی دماغ والے نے عملی حل تجویز کیا کہ چھت کی اونچائی تو نہیں بڑھائی جا سکتی لہٰذا فرش کو دو فیٹ کھود کر نیچے کر دیا جائے تاکہ چھت خود بخود نچلی سطح سے ۹ فیٹ کے بجائے ۱۱ فیٹ ہو جائے۔ اس میں کوئی خاص خرچہ بھی نہیں ہوگا اور قاعدہ قانون کی پابندی بھی ہو جائے گی۔ یہ حکمتِ عملی کی مثال ہے کہ جہاں نہ کو ہاں میں بدل دیا گیا۔

ایک اور افسر ہیں کہ جن کے مزاج میں نہ کرنے کی صلاحیت ہے اور نہ وہ اس طرح کی ہمت رکھتے ہیں کہ کسی کارروائی یا تجویز کو براہِ راست نفی کرکے ذمہ داری اپنے سر لے لیں۔ یا کسی کا دل توڑ دیں اس لیے وہ حکمتِ عملی کی ایک ایسی چال چلتے ہیں کہ جو بہت مؤثر ہوتی ہے وہ یہ کہ تنصیفیہ طلب امور پر وہ کچھ نہ کچھ وضاحت طلب کرکے مثل لوٹا دیتے ہیں۔ مثلاً کسی کی معطلی کا حکم نامہ ہو تو اس پر تجویز کریں گے کہ اس کو ملازمت سے سبکدوش کیوں نہ کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس قدر سنگین سزا کا مستحق نہیں لیکن وہ کارروائی اب اُلٹے طریقہ پر چل پڑتی ہے اور وضاحت در وضاحت طلبی پر مدت دراز تک گردش میں رہتی ہے اور یہ سزا سے محفوظ۔

ایک اور ایک ہی مثال ہے کہ جہاں زندگی میں پہلی بار ہاں کہہ دینے کے بعد عمر تمام نہ کہتے کہتے زندگی بیت جاتی ہے اور وہ ہے شادی بیاہ اور عقدِ نکاح کے موقع پر ایجاب و قبول، جب مرد اور عورت دونوں کہتے ہیں "ہاں قبول کیا میں نے" پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی گھر میں دو کیمپ بن جاتے ہیں۔ بچے یہ سمجھ جاتے ہیں کہ ماں اور باپ میں سے کون ان کی فرمائشوں اور خواہشوں کو مان لیتا ہے اور کون نفی کر دیتا ہے اور جس پر وہ ان دونوں میں سے اُس کے پاس رجوع کرتے ہیں کہ جہاں ان کا کام بن جاتا ہے بلکہ انھیں یہ بھی آتا ہے کہ ایک حکم کی اپیل دوسرے کے پاس کرکے اپنا اُلو سیدھا کر لیں۔ اس میں چاہے والدین میں کسی حد تک اَن بن ہی ہو جائے۔

جب حتمی طور پر نہ کرنا ہی مقصود ہو تو اس کا ایک اور کارگر طریقہ ہے کہ سنی اَن سنی کر دی جائے۔ اور وہ بھی حکمتِ عملی ہے۔

ایک دوست ٹرنک کال پر کہیں دور سے بات کر رہے تھے۔ اچھا خاصہ مکالمہ ہو رہا تھا کہ انھوں نے اپنے دوست سے کہا "یار آج کل کچھ مالی حالت خراب ہے تم فی الفور ایک ہزار روپیہ کا

بندوبست کرکے مجھے بطور قرضہ روانہ کردو، جیسے ہی روپیہ پیسہ اور قرضہ کی بات ہوئی۔ یہ صاحب کترا گئے۔ بجائے صاف صاف انکار کے یہ لگے چلا چلا کر کہنے "سنائی نہیں دے رہا ہے۔ ٹیلی فون میں بڑی گڑبڑ ہے۔ کیا کہا یار تم نے۔ ہاں پھر سے بولو۔ بالکل آواز نہیں آرہی۔ جب یہ خوب چلانے لگے تو ایکسچینج کی آپریٹر لڑکی نے کہا "ارے صاحب، صاف تو سنائی دے رہا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں انھیں دو ہزار روپیہ قرض چاہیے۔" اس پر یہ بہت سٹ پٹائے اور بھنائے۔ تندی سے کہا: "میں نے تو کچھ نہیں سنا، تم نے اگر ان کی بات سنی ہو تو تم ہی ان کو دو ہزار روپیہ قرضہ کیوں نہیں دے ڈالتیں اور ٹیلیفون رکھ دیا۔ یہ سنی ان سنی اور انکار ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا ثقل سماعت کی وجہ سے کچھ لوگ کان میں آلہ لگا لیتے ہیں جس سے اوروں کی بات صاف سنائی دیتی ہے۔ ان کو سنی ان سنی کرنے کا بڑا اچھا بہانہ اور موقع رہتا ہے۔ چنانچہ جب بھی انھیں کسی کی بات کو انجان بن کر ٹالنا ہوتا ہے یہ اپنے کان کے آلہ کے کھٹکے کو دبا کر بند کر دیتے ہیں اور پھر اس طرح منہ بناتے ہیں کہ جیسے اس آلہ کے باوجود سنائی نہیں دے رہا ہے۔ کہنے والا، مانگنے والا، پوچھنے والا چلا چلا کر تھک جاتا ہے، ہار جاتا ہے اور نہ کہے بغیر بھی بات نفی ہو جاتی ہے۔

حضرت غالب نے بھی اس 'نہ' سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ شہنشاہ نے رمضان کے ختم ہونے پر پوچھا "مرزا غالب، آپ نے کتنے روزے رکھے"۔ انھوں نے جواب دیا: "ایک نہیں رکھا" جیسے کہ پورے روزے رکھے اور صرف ایک نہیں رکھا۔ حالانکہ انھوں نے ایک بھی روزہ نہیں رکھا تھا۔

ہاں یا نہ کرنے کا اور کر سکنے کا ایک بہت بڑا حربہ بڑے بڑے اداروں، اجتماعوں، عالمگیر کانفرنسوں وغیرہ کے صدر نشینوں کے پاس ہوتا ہے کہ جس کو VETO کا اختیار کہا جاتا ہے۔ اس کو جب نہ کرنا ہوتا ہے تو برابر برابر کے ووٹوں پر ادھر یا ادھر اپنی ہاں یا نہ کر دیتے ہیں۔ یہ سب سے آسان طریقہ ہے کسی اہم ترین تجویز کو، نفی کرنے اور اس کو رد کر ڈالنے کا اس کو پھر کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔

جس طرح ڈپلومیسی کا فن کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح نہ کہنے کا آرٹ بھی تکمیل کی حدود تک نہیں پہونچ سکتا۔ بالخصوص جب آپ فی الحقیقت محسوس کرتے ہیں کہ نہ کہہ دینا زیادتی کی حدود تک پہونچ جائے گا اور آپ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کی ہمدردی بھی شریکِ حال ہے۔

کسی کارخانہ میں احدی اور نااہل کاریگر کو برطرف کرنا تھا، بجائے اس کے کہ صاف و صریح الفاظ میں کہہ دیا جائے کہ آپ کی خدمات کی ضرورت نہیں اس کو نوٹس دی گئی۔ "ہمیں یقین ہے کہ آپ کے بغیر ہمارا کارخانہ اس طرح نہیں چل سکے گا لیکن بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے ہم آپ کو موقع دیتے ہیں کہ کسی اور جگہ آپ اپنا مستقبل بنائیے۔

●

بقیہ: قومی ترقی کے سنگِ میل

میں اپنے پیشہ میں غیر معمولی مہارت حاصل کی ہے اور کشمیر میں کرکرناگ، واچھی گام اور دیگر مقامات پر ٹروٹ مچھلی کے افزائشی گھر قائم کیے ہیں۔ ان افزائشی مرکزوں میں ٹروٹ کافی تعداد میں پیدا ہوتی ہے اور تجارتی بنیادوں پر فروخت ہوتی ہے۔ اس سے پہلے ٹروٹ صرف صاف شفاف ندیوں میں ہی پروان چڑھتی تھی — مصنوعی طریقوں پر ٹروٹ کو پالنے کا تجربہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ جو مچھلی افزائشی مرکزوں میں پیدا ہوتی ہے، اُس کا وزن عام ٹروٹ مچھلی سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔

چاول ہماری بیشتر آبادی کی مرغوب غذا ہے۔ آسام، بہار، مغربی بنگال، مشرقی مدھیہ پردیش، مشرقی اُتر پردیش وغیرہ میں ۱۹۸۵ء کے دوران دھان کی پیداوار بڑھانے کے لیے ایک خاص پروگرام شروع کیا گیا۔ جس کے تحت ان میں سے ہر ایک پردیش کے ۲۰ بلاکوں میں چاول کی نئی قسم اُگائی گئی، اس کام کے لیے ۲۶ کروڑ روپے مخصوص کر دیے گئے تھے۔

زراعت اور روزگار کے وسائل

بے روزگاری کو دور کرنے کے لیے طریقہ کار کی تشکیل کے سلسلہ میں اس بات کو مدِنظر رکھا گیا ہے، کہ زراعت کو اس طرح سے فروغ دیا جائے کہ روزگار کے مواقع فراہم ہوں۔ ساتویں پانچسالہ منصوبے میں اس کام کے لیے ایک خصوصی اسکیم رکھی گئی ہے۔ آبپاشی، بیج، توسیع کے ذریعے زرعی پیداوار کو فروغ دیا جائے گا اور زیادہ پیداوار دینے والی اجناس کی کاشت سے کھیتی کے کام میں اضافہ ہوگا۔ اس طرح سے روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے۔ منصوبے کے مسودے میں اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ محض زراعت کی توسیع سے ہی بیروزگاری کے مسائل کا خاتمہ ممکن نہیں ہے۔ بلکہ صنعتی ترقی کی رفتار کو بھی تیز کرنا ہوگا، بہرحال تجربے کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ صنعتوں کے پھیلاؤ سے بھی مربوط صنعتی سیکٹر میں بے روزگاروں کا ایک معمولی سا حصہ ہی کھپ سکتا ہے۔ اس لیے دیہی علاقوں کی ترقی اور تعمیری کاموں کے ذریعے دیہی سرمایہ کاری میں اضافہ ناگزیر بن جاتا ہے۔

●

غیاث الدین

اُمراؤ جان ادا اور اس کے دو کردار

"ناول اُمراؤ جانِ ادا" غدر ۱۸۵۷ء کے بعد لکھا گیا، یہ مرزا رُسوا کا شاہکار ہے۔ اس ناول سے مرزا رسوا کو شہرتِ عظیم اور لازوال زندگی مل گئی۔ امراؤ جان میں مصنّف نے حقیقت نگاری کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ رُسوا نے اپنے ناول کا چربہ شاہد رعنا سے لیا۔ یہ ایک الگ تفصیل طلب بحث ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ رُسوا نے بہت سارے مواد شاہد رعنا سے ضرور لیے۔ ناول کی تمام شرائط کو مدِ نظر رکھتے ہوئے رُسوا نے اپنے قلم کو آگے بڑھایا ہے اور اسے ہر لحاظ سے بروئے کار لانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ اس لیے یہ ناول اُردو ادب میں ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔

ناول کے مخصوص کردار مرزا رُسوا، امراؤ جان ادا، خانم، بسم اللہ، خورشید، سلطان مرزا، فیضو، دلاور خاں، میر بخش، چھبّن نواب، فیض علی، محمد علی، اکبر علی، گوہر مرزا وغیرہ ہیں۔

اُمراؤ جان ادا

امراؤ کا کردار پورے ناول میں شروع تا آخر جلوہ فرما ہے۔ وہ ناول کے دوسرے ہر کردار سے عظیم تر ہے۔ امراؤ کے چاروں طرف کرداروں کی بھیڑ ہے لیکن ان کی وقعت چاند کے اردگرد ستاروں جیسی ہے۔ وہ ٹمٹماتے ہیں پھر بجھ جاتے ہیں۔ امراؤ لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرہ کی مکمل عکاس اور نباض ہے اس کی زندگی سے ہم لکھنؤ کے بگڑے ہوئے ماحول لوگوں کے ذہن، ان کی تہذیب اور تمدن کا پورا حُلیہ دیکھ سکتے ہیں۔

امراؤ ایک ہوشمند، دانشمند تجربہ کار اور زمانہ شناس طوائف ہے اسے زندگی کا گہرا تجربہ ہے۔ وہ جانتی ہے مرد کس قسم کے ہوتے ہیں اور عشق کے کیا معنی ہیں۔ طوائف کی محبت مردوں سے کیسی ہوتی ہے اور مرد کیسے طوائف سے عشق فرماتے ہیں۔ اُمراؤ کے کردار سے زندگی، سماج اور معاشرے کے تمام پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس کا بچپن کیسا تھا اس کے ابّو اور امّی کیسے تھے وہ اپنے ماحول میں کتنی خوش تھی۔ اُمراؤ ایک آگ کا دریا ہے جس کی موجوں میں لکھنؤ کی تہذیب بہتی ہوئی نظر آتی ہے اس کے نورانی چہرے پر فریب کا گمان ہوتا ہے جس کے بطون سے جہنّم کے شعلے لپکتے ہیں۔ اور اس میں فرزندانِ لکھنؤ کشاں کشاں کھنچے چلے آتے ہیں۔ اُمراؤ کو شعر و شاعری سے شوق ہے۔ مشاعرہ میں شرکت کرتی ہے اس کے اشعار نہایت ہی دلکش اور پُرکشش ہیں۔ امراؤ ایک عورت ہے، ایک انسان ہے اور ایک طوائف ہے وہ گھریلو زندگی کو طوائف کی زندگی سے بہتر سمجھتی ہے جب وہ اپنی ایک ساتھی طوائف کو گھریلو زندگی گزارتے دیکھتی ہے تو کہتی ہے "واہ ری قسمت" جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی کی بیگم ہونا طوائف سے خوب تر جانتی ہے۔

امراؤ پیشے کے اعتبار سے یقیناً طوائف ہے، لیکن ذہن و دماغ کے لحاظ سے وہ ایک عورت ہے۔ وہ دردمند دل رکھتی ہے اس کی خواہش ہے کہ وہ کسی کی بیوی بنے کسی سے محبت کرے اپنا گھر اور خاندان بنائے اس لیے کئی بار وہ سعی کرتی ہے کہ فرار ہو جائے۔ فیضو کے ساتھ بھاگتی ہے لیکن پھر وہیں پہنچ جاتی ہے۔ اس کا زندگی کے بارے میں یہ خیال ہے کہ اس میں ہونے والے واقعات کے پس منظر میں سماج آدمی کی غفلت اور تقدیر کا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو مانتی ہے وہ کسی واقعہ کو آدمی کی کوتاہی پر منطبق کرتی ہے اور قسمت کے اُلٹ پھیر پر بھی! امراؤ کے مطابق مرد محبت کے معاملے میں زیادہ جذباتی ہوتے ہیں۔ اور عورتیں کم۔ عورتیں مفاد پرست اور مرد عجلت پسند۔ امراؤ میں سنجیدگی، متانت، علمیت، وقار، جذبات و احساسات کی پرکھ، شرم و حیا، پاسداری، رکھ رکھاؤ یہ ساری خوبیاں موجود ہیں۔ وہ حالات اور ماحول سے سمجھوتہ کرنا چاہتی ہے۔ جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اسے پوری زندگی یہیں چکلے میں گذارنی ہے تو اپنے ذہن کو اس مُہم کے لیے آمادہ کر لیتی ہے۔

امراؤ انسان کا نفسیاتی مطالعہ بھی کرتی ہے، میلے میں لوگوں کے عادت و اطوار اور حرکات و سکنات سے وہ ایک منطقیانہ اور فلسفیانہ بحث کرتی ہے کہ انسان

کیسے ہوتے ہیں اور کس وقت کیسا سوچتے ہیں۔ اُمراؤ حالات سے مقابلہ کرنے کے لیے کانپور، فیض آباد اور لکھنؤ کا دورہ کرتی ہے وہ مسجد کے امام سے سلیقہ سے بات کرتی ہے۔ نواب اور اپنے عاشقوں سے مہذب طور پر خلوص و اخلاق کو برتتی ہے۔ وہ زندگی کا ایک سلجھا ہوا نظریہ رکھتی ہے۔ اس کے جذبات و احساسات قابلِ غور ہیں جن سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ فیض آباد میں اپنی ممّی اور ابّو سے ملنے کے بعد وہ اپنی زندگی پر افسوس کرتی ہے کہ کاش میں طوائف نہ ہوتی۔ وہ اپنے بھائی سے کہتی ہے کہ میں زندہ ہوں جس کا مجھے یہی غم ہے۔ وہ طوائف کے پیشے سے عمر کے آخری حصہ میں آ کر توبہ کرتی ہے اور خلوت نشین ہو جاتی ہے۔ امراؤ سنجیدہ اور منکسر المزاج ہے۔ وہ کسی گاہک سے کچھ فرمائش کرتے ہوئے اس لیے شرماتی ہے کہ کہیں ناں نہ کرے۔ امراؤ لکھنؤ کی ایک زندہ کتاب ہے جسے ہر کوئی پڑھ سکتا ہے۔

بسم اللہ جان

بسم اللہ نہایت ہی شوخ اور بے باک ہے، وہ خانم کی بیٹی ہے۔ اس میں شرم و حیا نام کی ادنیٰ سی تمیز بھی نہیں ہے۔ نواب چھبن کو خودکشی کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور اس کے نوکر سے سونے کے کڑے ہڑپ کر لیتی ہے۔ بسم اللہ خانم کی لڑکی ہونے کی بنا پر ایک طرح کی انا اور خودداری کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ حویلی میں خود کو سب سے برتر سمجھتی ہے۔ اپنی ماں کے اشارے پر ہر کام کرتی ہے۔ وہ عشق کے لیے کمر باندھتی ہے لیکن ماں کے سمجھانے پر سنبھل جاتی ہے۔ وہ امراؤ کے بالکل ہی برعکس شخصیت رکھتی ہے۔ محض ایک بندر کے لیے ایک مولوی صاحب کو پیڑ پر چڑھواتی ہے۔ ایک طوائف کی بے باکی بسم اللہ میں پائی جاتی ہے۔ اسے زمانے کی پرکھ اور انسان کے نفسیات کا مطالعہ نہیں، وہ صرف اپنے پیشے سے محبت کرتی ہے کہ کس طرح روپے حاصل ہوں بسم اللہ کو پڑھ کر عام طور پر "طوائف جیسی ہوتی ہے" اُس کی مکمل جانکاری مل جاتی ہے۔ بسم اللہ کی کردار نگاری اتنی پُر مفہوم نہیں جس کی وضاحت تفصیل میں ہو۔ دراصل امراؤ جان ہی اس ناول کی جان ہے۔

امراؤ کے کردار میں عافیت ہے۔ اس میں ایسی خوبیاں ہیں جو ہر زمانے میں پڑھنے اور سننے کے لائق ہیں۔ وہ ایک طوائف ہے لیکن اس پر زبردستی چکلے کا ماحول طاری کر دیا گیا ہے۔ بسم اللہ بھی ایک طوائف ہے لیکن وہ ان حالات میں خوش ہے۔ ایک ہی جگہ میں دو مختلف الخیال شخص کیسے اور کس طرح رہتے ہیں۔ رسوا نے اس کی عکاسی امراؤ اور بسم اللہ کے ذریعے پیش کر دی ہے۔ امراؤ کے افکار و اعمال سے قاری کو ہمدردی ہوتی ہے، لیکن بسم اللہ سے نہیں۔ امراؤ کی کردار نگاری افضل ترین ہے۔ وہ اپنی زندگی کی کہانی دورِ جدید کی تکنیک، شعور کی رو کے انداز میں سناتی ہے۔ وہ ماضی میں کھو جاتی ہے وہ زندگی کے آلام پر مسکراتی ہے اور ہمیشہ متبسم رہتی ہے۔ یہ اس کے بڑے پن اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ زندگی کو اپنے ماتحت گردانتی ہے زندگی سے اس نے جنگ کی ہے۔ امراؤ اُردو ناول کے کرداروں میں ایک اہم کردار ہے۔ اس میں آفاقیت ہے اور لامحدودیت ہے، بسم اللہ کی ایک چھوٹی سی دنیا ہے۔

●

بقیہ: نئی غزل کی نمائندہ آوازیں

بس یہ ہوا کہ اس نے تکلف سے بات کی
اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لیے

حسن کے سمجھنے کو عمر چاہیئے جاناں
دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں

وہ شہر میں ہے یہی بہت ہے
کس نے کہا میرے گھر میں ٹھہرے

ہیں تیز بہت ہوا کے ناخن
خوشبو سے کہو کہ گھر میں ٹھہرے

نئی غزل کی نمائندہ آوازوں میں ذات کے حوالے سے بات اور اس ذات میں کائناتی احساس، سماجی شعور مگر اشاروں، کنایوں میں نئی حقیقت پسندی جو زندگی کے تضادات اور پست و بلند کا مردانہ وار جائزہ لیتی ہے اور مذہب و اخلاق کی تیور سے بلند ہو کر بھی چیزوں کو دیکھ سکتی ہے۔ ایک تمثیلی جہت جو رومانی بھی ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی رومان شکن بھی۔ الفاظ کے استعمال میں زیادہ آزادی اور دوسری زبانوں سے الفاظ لینے میں زیادہ فراخدلی، جسم کی آنچ اور اس میں روح کے شعلے کا احساس، موڈ کی ترجمان زمینیں، افعال سے زیادہ کام لینے والی ردیفیں، بہکنے اور بہکنے میں سنبھلنے کی کیفیت، سبھی کا احساس ہوتا ہے۔ ہند و پاکستان میں اس وقت نئی غزل نئی بلندیوں کو چھو رہی ہے اور اس کی تخلیقی توانائی حیرت انگیز ہے۔ علامات سے بھی اس نے بڑا کام لیا ہے اور بعض اوقات علامات کے شوق میں چیستاں سی بھی بن گئی ہے پھر بھی اس دور کی سوچ اس کے موڈ، اس کی محرومی اور سرشاری، اس کی کمزوری اور طاقت اور اس کے ساتھ اپنی تہذیبی دولت کے سارے سرمائے پر دسترس، کلاسیکی دور سے الگ ہو کر بھی اپنے رنگ محل کو جاذبِ نظر بنانے کی صلاحیت اس کی وہ خصوصیات ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، نئی غزل گردن زدنی نہیں، گلے سے لگانے کے قابل ہے اور سلیم احمد کی زبان میں ہم سے کہہ رہی ہے ؎

مجھے حرفِ غلط سمجھا تھا تم نے
سو میں معنی کا دفتر ہو گیا ہوں

نئی غزل کی یہ خصوصیت بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ یہ نظم اور غزل کی خلیج کو کم کر رہی ہے اور غزل کی نئی آوازیں اکثر وہی ہیں جو نظم کی نئی آوازیں بھی ہیں صرف غزل ہی کہنے والے نسبتاً کم ہیں۔

●

شاہین حمزہ پوری

ملکہ اپنے خاندان اور گھر والوں کی شدید مخالفت کے باوجود اپنے عاشقِ زار سے شادی کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ یہ شادی اس کی اپنی پسند کی شادی تھی۔ سینکڑوں نوجوانوں کو مایوس کر کے اُس نے اپنے جیون ساتھی کو چُنا تھا۔ اُس کا محبوب ایک غریب نوجوان تھا..... صحت، خوبصورتی، مردانہ وقار میں یکتا، جوانی اور انسانی رعنائی کا مجسمہ۔ صرف غربت اس کے وجود کا ایک کمزور پہلو تھا۔ مگر عشق غریب امیر، اونچ نیچ اور ذات برادری کچھ نہیں دیکھتا، وہ اندھا ہوتا ہے اور عظیم بھی... گہرا جیسے بحرِ بیکراں اور بحرِ بے پایاں، بلند جیسے آسمان کی اونچائی... اور وسیع جیسے کائنات کا خلائی نظام! ملکہ نے اپنی کروڑوں کی متروکہ اور موروثی جائداد کی پروا کئے بغیر ایک غریب عاشقِ نامراد کے دل کو رکھ کر مسجد تعمیر کرنے کا ثواب کما لیا تھا.....

اب وہ اپنے محبوب کے ساتھ دُور بہت دُور اپنے خوابوں کی دنیا کو حقیقت کے روپ میں ڈھالنے کے لیے شملہ چلی آئی تھی.....! وہ اپنے محبوب کو انتہائی دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی۔ وہ ایک پل بھی اس کو اپنی نظروں سے اوجھل ہونے دینا نہیں چاہتی تھی۔ محبوب کی خاطر دنیا تو دنیا وہ اپنی زندگی کو بھی چھوڑنے اور تج دینے کے لیے تیار تھی۔ محبوب کے لیے ملکہ کا پیار آخری حدود بھی پار کر چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شدید ترین مخالفت کے باوجود ساری دنیا کو انگشت بدنداں کر کے وہ اُسے پانے میں کامیاب ہو گئی.....! جن نوجوانوں کی ملکہ پر نہیں بلکہ ملکہ کی بے پناہ دولت پر نظر تھی، اس طرح سے حرص و طمع کے پجاریوں کو بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

شملہ میں ملکہ کی سیر و تفریح اپنے محبوب کے ساتھ لاجواب اور بے مثال رہی... گھٹی گھٹی محبت اور آنکھ مچولیاں کھیلنے والے لرزہ براندام عشق کو اب پُر بہار آزاد فضا میں آزادانہ کھُل کر کھیلنے اور پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ وہ حسین ترین پُر فضا اور خوشگوار مقاموں کی سیر میں صبح و شام مشغول رہنے لگی۔ پل پل ملکہ کے دل کی دھڑکن اس کے ساتھ تھی۔ حسین ترین نظارے اور مسحور کن پُر فضا مقامات عشق و محبت کے ترانے لہرانے لگے.... وہ ایک پل بھی اپنے محبوب کو چھوڑنا گوارہ نہیں کرتی! محبوب کے لیے بھی ملکہ کی موجودگی ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھی.... اس کے لیے کائنات کا سارا حسن سمٹ کر ملکہ میں جمع ہو گیا تھا۔ وہ خود کو دُنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا تھا۔ بات بھی دراصل صحیح تھی۔ ملکہ جیسی حسین و جمیل تعلیم یافتہ اور دولت مند لڑکی کو درجنوں دولت مند دل پھینک نوجوانوں نے اپنا بنانے کی کوشش کی مگر واہ ری قسمت کہ ملکہ کی صرف ایک "نا" نے سبھوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور محبوب کو اپنی پسند کا شریکِ حیات چُن لیا۔ سنجوگتا صفت ملکہ بھی اپنی پسند اور قسمت پر نازاں تھی اور وہ اپنے پیار کو خدا کی دین اور نعمت سمجھتی تھی!

محبوب کو اب اور کیا چاہیئے.....اُسے ایک اٹوٹ محبت اور بے پناہ پیار نچھاور کرنے والی پری جمال شریکِ حیات مل گئی۔ جس کے پیار میں دنیا کی ساری مٹھاس گھُلی ہوئی تھی اور جس کے ملکوتی حُسن میں دنیا کی ساری رنگینی سمائی ہوئی تھی۔ وہ شملہ میں ملکہ کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی دھڑکن بن گیا۔ اس کی نظر میں شملہ کے حسین مناظر، پہاڑی مقاموں کی ساری رعنائیاں اور دل فریبیاں ملکہ کے ملکوتی حُسن کے سامنے بے معنی تھیں... وہ چوبیس

• عزیز بکڈپو، باری روڈ، گیا (بہار)

گھنٹے ملکہ کے حسن وجمال میں کھویا کھویا اور ڈوبا ڈوبا رہتا۔ ملکہ بھی انتہا پسندی کی آخری بلندی پر تھی، جہاں اُسے ایسا لگتا کہ ہمارے عشق اور پیار میں ہمارا محبوب ہمیشہ ڈوبا رہے ..... اور یہی وہ ادا تھی کہ جس نے رغبت کی خانہ پُری کے لیے محبوب کو اس سے قریب تر کردیا۔ یہی وہ جادو تھا جس نے ملکہ کے دل کو فتح کرلیا۔ نوجوان بے پناہ حُسن و شباب کے سمندر میں غوطہ لگانے والی دوشیزہ کی دُوربین اور دُور رَس نگاہ ہمیشہ اسی تلاش و جستجو میں رہتی ہے کہ کوئی خوبصورت من پسند نوجوان دُنیا کے سارے حسن وجمال اور لذتوں سے بے نیاز اور لاتعلق ہوکر اس کے حُسن وجمال میں کھوجائے اور اُس کے طلاطم خیز طوفان شباب کے دریا میں غوطے اور ہچکولے کھاتا رہے...!

شملہ میں ملکہ اپنی ساری تمناؤں اور خوشیوں کے ساتھ اپنے محبوب کی صحبت میں ایک خوبصورت سے فلیٹ کے کنارے جوانی کے امنگ اور ترنگ بھرے دن گذار رہی تھی۔ وہ ماضی اور حال اور مستقبل سے بے خبر حُسن و عشق کی بے مثال کہانی کی تخلیق کر رہی تھی۔ شملہ ان دونوں عاشق و معشوق کے لیے جنتِ ارضی ثابت ہو رہا تھا.... اور یہ زمین اپنے سینہ پر نیلے آسمان کے نیچے بے پناہ عشق و محبت کی کہانی کو دُہرا رہی تھی...!

جانِ من، کبھی کبھی تم جھیل کے اُس پار ایک فلیٹ پر نظر ڈالتے ہی اُداس اور غمگین ہوجاتی ہو۔ آخر بات کیا ہے؟ یہ حُسنِ فطرت کی شہزادی ملول کیوں ہوجاتی ہے...! کیا راز مضمر ہے اس میں...... میری عقل حیران ہے! قدرت کی ساری رعنائیاں اور فطرت کے سارے حُسن تمھاری خوشیوں میں بے انتہا اضافہ کرنے کے باعث بنتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جب تم جھیل کی اُس طرف اُس فلیٹ پر نظر ڈالتی ہو تو دیکھتے ہی مرجھا کر یک بیک اُداس اور خاموش ہوجاتی ہو.....! میں برداشت نہیں کر سکتا! بتاؤ کیا بات ہے؟ محبوب نے ملتجانہ انداز میں کہا اور ملکہ کے دونوں شانوں پر پیار سے ہاتھ رکھ دیے۔ نہیں کوئی بات نہیں۔ کسی تردد اور اُلجھن کی بات میں اپنے محبوب کو بتا کر مغموم نہیں کرسکتی...! یہ کہہ کر وہ پلٹی اور اپنے محبوب سے لپٹ گئی! پھر گویا ہوئی ــــ چھوڑو یہ سب جھٹکے ہیں، آتے ہیں اور پار ہوجاتے ہیں۔ یہ دیرپا نہیں ہوتے۔ میں خود ہی سمجھ لوں گی! تمھیں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں! ملکہ نے کہا اور آکر دوبارہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی۔ ملکہ کے پیچھے اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ دھرے، اس کا محبوب بھی ساتھ ساتھ کھڑا ہوگیا ــــ جھیل کے اس پار اس فلیٹ کے سامنے والے کمرے کی کھڑکی پھر کھلی.....

پھر وہی دو نگاہیں.... دو آنکھیں..... ملکہ کو نہارنے لگیں! دیکھا تم نے...! وہ دیکھو..... وہ دیکھو، جب سے میں شملہ آئی ہوں تب سے یہ دو آنکھیں تیزی سے میرا پیچھا کر رہی ہیں.....! یہ دو آنکھیں ہمیشہ میرا تعاقب کرتی چلی آرہی ہیں۔ شاید تم نے غور نہ کیا اور دھیان نہ دیا ہو، مگر میں ہمیشہ ان دو آنکھوں کو اپنا تعاقب ہر جگہ کرتی ہوئی پاتی ہوں..... یہ دو آنکھیں، جو غور سے ہمیشہ مجھے دیکھتی رہتی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں؟ یہ مجھے گھورتی اور غور کرتی رہتی ہیں۔ کبھی میں ان کو جھپکتے یا مُڑتے نہیں دیکھتی۔! یہ دو آنکھیں معمہ بنتی جارہی ہیں۔ میں شدت سے خطرہ محسوس کرنے لگتی ہوں۔ جلد ہی میں ان سے نپٹ لوں گی، انہیں سمجھ لوں گی۔ اب اور زیادہ لیفٹ اور مہلت نہ دوں گی، ان تجسس کے آنکھوں کو...! ملکہ نے دل میں فیصلہ کر لیا۔

•

آخر یہ دو آنکھیں ہیں کس کی؟ کون ہے وہ جو اس طرح گھورتا رہتا ہے؟ محبوب نے بے چین کردینے والا سوال کر دیا۔ میں اس کی تحقیق کرتا ہوں، وہ کون ہے اور ایسی جسارت کیوں کرتا ہے۔ محبوب زیرِ لب بڑبڑایا۔ نہیں تمھیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمھیں کسی خطرے سے ٹکرانے نہیں دوں گی۔ وہ تمھاری طرح ایک نوجوان ہے جو بار بار اور مسلسل مجھے دیکھتا رہتا ہے۔ دیکھتے نہیں تھکتا، پلک نہیں جھپکاتا.... میں مہینوں سے اس چکر اور موقع کی تلاش میں ہوں کہ موقع ملے تو اُسے سبق سکھادوں کہ آئندہ وہ ایسی جسارت اور حماقت نہ کرے۔

ملکہ نے غصے سے بپھرتے ہوئے کہا۔ چھوڑو بھی جانِ من ان خیالوں کو... کیوں کسی بیچارے کے پیچھے پڑی ہو! تمھارا حُسن ہی ایسا پُرفریب اور قاتل ہے کہ ہر کسی کو بسمل ہی بنا کر چھوڑتا ہے۔ تمھارے مسحور کُن حُسن کا جادو ہر کسی پر اثر انداز ہوجاتا ہے...

یہ قدرت کی دین اور حُسنِ عطیہ ہے۔ اگر کوئی ایک نظر دیکھ کر ہی تسکین کرلیتا ہے تو اس میں تمھارا کیا نقصان! دلفریب حُسن اور حسین ترین منظر تو دعوتِ نظارہ دیتے ہیں ــ بھلا اس میں اس بیچارے کا کیا قصور جو اُسے سبق سکھانے کا عزم رکھتی ہو۔ تم نے شاید سُنا نہیں کہ حسین مناظر اور پُرسحر حُسن کو دیکھ کر خدا کی قدرت اور انوکھی تخلیق یاد آتی ہے۔ انسان کو..... شاعر نے بھی کیا خوب کہا ہے ؎

بے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
عالم کو دیکھ قدرتِ پروردگار دیکھ

وہ دیکھو! وہ دیکھو! ارے وہ تو اسی طرف آرہا ہے...... ذرا ہم دونوں چھپ جائیں اور دیکھیں وہ کیا کرتا ہے؟۔ ملکہ نے کہا اور کھڑکی کے پلّوں کو ادھ کھلا چھوڑ دیا۔ پردے کی اوٹ سے دونوں اس نوجوان کو غور سے دیکھنے لگے۔ دیکھو وہ قریب آگیا... دیکھو دیکھو وہ ایک لفافہ دروازے کے اندر ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے...ارے وہ دیکھو، اس نے لفافہ کو کواڑ کی پھانک کے اندر

ڈال دیا... تم اس جنگلے کو اب کھول دو اور ظاہر ہو کر اُسے آواز دو، اور میں باہر جا کر اس سے نپٹتی ہوں... یقیناً اس کی نیت میں کچھ کھوٹ ہے.... ملکہ نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی...!

او مسٹر ذرا ٹھہرئیے...! محبوب نے آواز دی۔ جی... جی... اچھی بات ہے...!

نوجوان نے کہا اور سکتہ کے عالم میں کھڑا رہ گیا! آپ کون ہیں اور یہاں کیا لینے آئے ہیں..؟ ملکہ نے گرج کر پوچھا... جی... جی.... جی.... اور نوجوان ہکلا کر ہکا بکا رہ گیا...! ملکہ نے دو زناٹے دار طمانچے بغیر کچھ وجہ پوچھے اس نوجوان کے گالوں پر تابڑ توڑ جڑ دئیے...! نوجوان سکتہ میں اب بھی خاموش کھڑا تھا... اسکی آنکھوں میں مطلق آنسو نہیں آئے، پر خشک آنکھوں میں بلا کی چمک تیرنے لگی...! ہاں ہاں کا شور بلند کرتا ہوا محبوب بھی باہر نکل آیا۔ وہ دروازے کے اندر پھینکا خط بھی ہاتھ میں اُٹھا کر لیتا آیا۔ ایک لمحہ کے اندر یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ کیوں تم نے اس نوجوان کو طمانچے رسید کر دئیے...! محبوب نے دریافت کیا... ملکہ خاموش اور سکتہ میں جیسے لرز رہی ہو... یہ کیا ہو گیا۔ اُسے خود حیرت تھی اب اس نوجوان کی آنکھیں بھی اشکبار ہو اُٹھیں.... وہ حسرت و یاس بھری نگاہوں سے ملکہ کو ٹکٹکی باندھے تکتا رہ گیا... میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ہمیشہ مجھے نظر بد سے گھورا کرتے ہو اور دیکھتے رہتے ہو... کیا تمھیں شملہ میں دیکھنے اور دلچسپی لینے کو کچھ میسّر نہیں...! کیا فطرت کا سارا حُسن ہمارے ہی چہرے میں سمٹ آیا ہے جو تم مجھے دیکھتے رہتے ہو... کون سی ایسی کشش اور جاذبیت ہے ہمارے چہرے میں جو تم ایسا کرتے ہو ملکہ نے کہا اور غصّے میں تلملاتی رہی۔ کشش اور جاذبیت کی بات پوچھتی ہو... اس حُسن میں صرف حُسن ہی نہیں بلکہ آسمان اور زمین کا سارا پیار بھی تمھاری تصویر میں اُتر آیا ہے...! جب تمھاری کھڑکیاں اور دروازے بھی بند رہتے ہیں اور تم اندر رہتی ہو تو میں تمھارے فلیٹ کو حسرت و یاس کی نظروں سے دیکھتا رہتا ہوں... اس وقت تک جب تک کہ خود تھک کر میں سو نہ جاؤں...! نوجوان نے کہا۔ اس کے ان الفاظ میں عزم بھی تھا اور غم بھی۔ آخر کیوں، کیا وجہ ہے جو تم ایسا کرتے ہو؟ ملکہ نے پھر پوچھا۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں... یہ جذبۂ دل ہے اسے میں کیا کروں...! اب جبکہ تمھارے طمانچے کھا چکا تو اس کا مزید انکشاف کر کے تمھیں اور دُکھ پہونچانا نہیں چاہتا....! اس بھید کو رازہی رہنے دو! اور وہ آنکھوں کے آنسو پونچھتا ہوا اپنے فلیٹ کی طرف قدم بڑھانے لگا...! ملکہ تم نے بیکار اُسے دو طمانچے جڑ دئیے۔ تمھیں ایسا کرنا نہیں چاہیئے تھا محبوب نے کہا۔ ارے ہاں پڑھو تو کیا لکھا ہے اس کے خط میں.... ملکہ نے کہا۔ آں..... ہاں، تم نے ٹھیک کہا۔ یہ کہہ کر محبوب نے خط پڑھنا شروع کیا.....!

سراپا پیار!

جب سے میں نے تمھیں دیکھا ہے میرے دل کا صبر و قرار چھن چکا ہے..... میں اپنا ہوش و حواس کھو چکا ہوں...! دل نہیں چاہتا کہ ایک پل بھی تمھیں اپنی نظروں سے اوجھل ہونے دوں یا ایک لمحہ بھی تم سے اپنی نظریں ہٹاؤں۔ پر کیا کروں تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہوں.... چاہتا ہوں کچھ کہوں پر ہمت نہیں پڑتی! برسوں بعد یادوں کے شعلوں میں بیٹی اور جلتی ہوئی تم میں ہاں.... ہاں تم میں اپنی اکلوتی مرحومہ بہن کی ہو بہو تصویر دیکھی ہے...! ایک بار پھر بھائی کا سویا ہوا پیار جاگ اُٹھا ہے... فیصلہ تمھارے ہاتھ ہے! خدا کے لیے مجھے ایک بار، صرف ایک بار اپنی معصوم اور مبارک زبان سے "بھیّا" کہہ دو! اور مجھے شفقت اور محبت سے اپنے مقدس سر پر ہاتھ رکھ لینے دو...! مجھے دنیا کا اور اپنی زندگی کا سارا سرمایہ مل جائے گا! مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے اللہ نے میری رُومی کو تمھاری شکل میں دوبارہ جنّت سے اُتار کر اپنے بھائی کے پاس بھیج دیا ہے... کیا یہ سچ ہے...؟

تمھارا بدنصیب بھائی "نظر"

ملکہ کی آنکھوں سے بے ساختہ ساون اور بھادوں کی جھڑی برسنے لگی۔ وہ بے تحاشا بھیّا..... بھیّا... میرے پیارے بھیّا کہتی ہوئی اس نوجوان کی طرف دوڑ پڑی.... بھائی جان! رُکئے... رُکئے بھیّا...! یہ سچ ہے بالکل سچ ہے... میں ہی آپ کی بہن رُومی ہوں!... اور ادھر نوجوان آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب لیے پلٹ کر ملکہ کی طرف دیکھنے لگا...! مجھ سے بھول ہو گئی بھیّا...! میں غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی بھیّا...! یہ بالکل بھول گئی تھی کہ ایک فرشتوں جیسا مقدس پیار بھائی بہن کا پیار بھی ہوتا ہے! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں ابھاگن اور پاپن ہوں... بھائی جان! میں غلط فہمی میں جلد بازی کر گئی اور بلا سوچے سمجھے میرے ہاتھ اُٹھ گئے... آہ اللہ اب میں کیا کروں! کاٹ دو میرے ان ہاتھوں کو... کاٹ دو میرے دونوں ہاتھ! میں اب ان ہاتھوں کو کیا کروں گی جو بھائی پر اُٹھ گئے.... اور وہ پتھر کی چٹان پر لگاتار اپنے ہاتھوں کو پٹخنے لگی۔ نوجوان نے بڑھ کر ملکہ کا ہاتھ پکڑ لیا.. نہیں نہیں نہیں! غلطی ہماری بھی ہے۔ مجھے پہلے ہی صاف صاف بتا دینا چاہیئے تھا، مگر مصلحت پیش پیش رہی۔ خیر جانے بھی دو، یہ سب غلط فہمیوں کے باعث ہو گیا۔ نوجوان نے کہا۔ "بھیّا" کہہ کر ملکہ اس نوجوان کے سینہ سے لگ گئی! نوجوان نے دستِ شفقت بہن کے سر پر رکھ دیا۔ ●

تبصرے

نام کتاب : **ایک معرکہ لہو کا**

مصنف : **قمر الہدیٰ فریدی**

ضخامت : ایک سو گیارہ صفحات

قیمت : چھ روپے

ملنے کا پتہ :۔ سی ۹، ایس۔ ایس ہال، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

تبصرہ نگار :۔ شہپر رسول

قمر الہدیٰ فریدی نئے ادب کا ایک نمایاں اور معتبر نام ہے۔ ادب کے قارئین، قمر الہدیٰ کو تنقید نگار، افسانہ نگار، انشائیہ نگار اور خاکہ نگار کی حیثیتوں سے جانتے ہیں۔ گزشتہ کتنے ہی برسوں سے یہ نام اپنی فنکارانہ صلاحیتوں اور اسلوبیاتی خصوصیتوں کے ساتھ، معیاری ادبی رسائل و جرائد کے صفحات پر قلمکاری کے جوہر دکھا رہا ہے۔

"ایک معرکہ لہو کا" قمر الہدیٰ فریدی کے ذہن و قلم کے فنی رشتے کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ صرف ایک سو گیارہ صفحات میں معرکہ کربلا کو مفصل اور مدلل حوالوں کے ساتھ اس قدر سلیقے سے پیش کر دینا مصنف کی ذہنی پختگی اور فنی دسترس کا مظہر ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب بیس ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب "آغازِ داستان" اور آخری باب "قاتلانِ حسین کا انجام" کے عنوان کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

واقعہ کربلا پر لاتعداد کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو مستند روایات کے حوالوں کے ساتھ، سطحی جذباتیت سے دور رہ کر لکھا گیا ہے نیز واقعہ کربلا سے متعلق اہم تفصیل اور واقعات کے تجزیے اسی خیال سے پیش کئے گئے ہیں کہ شہادتِ حسین کا صحیح رُخ سامنے آسکے،

حضرت امام حسینؓ کے اسی ایثارِ عظیم سے متعلق کہیں کہیں اس قسم کے شکوک کا اظہار بھی کیا جاتا ہے کہ امام عالی مقام کی شہادت کوئی قربانی نہیں بلکہ ان کی مجبوری تھی یا یہ کہ مذہب و ملت اور حق و باطل سے زیادہ اہمیت اس سلسلے میں خلافت کی تھی۔

قمر الہدیٰ فریدی نے مندرجہ بالا شکوک کو مکمل طور پر رفع کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ موصوف نے اس کے تعلق سے واقعات کے تنقیدی تجزیوں اور ٹھوس روایات کو اپنے دلائل کی بنیاد بنایا ہے۔ نیز آخری باب میں قاتلانِ حسینؓ کا عبرت ناک انجام اُٹھا کر بحث کو قطعی آخری پڑاؤ تک پہنچا دیا ہے۔ آخری دونوں ابواب" واقعہ کربلا کے بعد اور قاتلانِ حسینؓ کا انجام" نے اس کتاب کو مزید وقیع بنا دیا ہے۔

دوسری اہم خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ اس طرح کے موضوعات سے متعلق کتابیں عام طور پر بیانیہ اسلوب میں تحریر ہوتی ہیں، مگر قمر الہدیٰ فریدی زبان کا تخلیقی استعمال بھی جانتے ہیں اور موضوع کی Demand کے ساتھ واقعات کے افسانوی اور ڈرامائی اظہار پر بھی قدرت رکھتے ہیں اور صداقت پر اسلوب نگارش کی آنچ نہ آنے دینا بھی ان کا کمالِ فن ہے۔

ادبی حلقوں میں اسی ادبی خصوصیت کی وجہ سے دوسری مجلسی کتابوں کی نسبت" ایک معرکہ لہو کا" خاصی مقبول ہوئی ہے۔

لیتھو کی صاف طباعت اور معقول کتابت کے ساتھ صاف ستھرا کاغذ استعمال کیا گیا ہے اور قیمت واجب ہے۔ ●

نام مجلہ : **محسن**

مدیرِ اعلیٰ : **عمران عظیم**

صفحات : ۲۲۴

پبلشر :۔ محسن الملک ہال، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔

تبصرہ نگار : ریحانہ پروین، ایم۔ اے

محسن 'بزمِ محسن'، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا سالانہ علمی و ادبی مجلہ ہے، جو نہایت خوبصورت گیٹ اپ اور معیاری طباعت کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ مدیرِ اعلیٰ عمران عظیم نے تخلیقات کی فراہمی کے سلسلے میں جس قدر تندہی اور ذاتی ادبی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے اس کا اندازہ مندرجات کو پڑھ کر ہو سکتا ہے۔

۲۲۴ صفحات کی اس کتاب میں ادب کی تمام مقبول اصناف کا احاطہ کیا گیا ہے۔ افسانہ، انشائیہ، تنقید، غزل اور نظم کے ساتھ ہی خاکہ بھی شائع کیا گیا ہے۔

آغاز میں مدیرِ اعلیٰ اور مدیر کی ادارتی تحریریں ہیں اور بعدازاں وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر کے پیغامات اور تصاویر شائع کی گئی ہیں۔

پروفیسر عنوان چشتی، پروفیسر منظر عباس نقوی، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، ابوصالح، ابوسفیان اصلاحی اور سرفراز خاں کی تنقیدی تحریریں قابلِ مطالعہ ہیں۔ فیض الحسن کا خاکہ، قمر الہدیٰ فریدی کا انشائیہ اور سبطین نگہ اور ریشماں سُہیل کے افسانے بھی خاصے کی چیزیں ہیں۔

حصۂ نظم کو اختر انصاری، معین احسن جذبی، نشتر خانقاہی، وزیر آغا، شہریار، پروفیسر زاہدہ زیدی، ڈاکٹر آدرین شایاں، اظہر عنایتی، جمنا پرشاد راہی، شہپر رسول اسعد بدایونی، نیر قریشی اور صابر ظفر کی تخلیقات سے وقیع بنایا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "محسن" کا شمارہ گذشتہ تمام شماروں سے بہتر ہے اور ادبی سطح پر اس کی پذیرائی خوب ہوگی۔ ●

قارئین کی آراء اور مشورے

صحت مند فیصلہ

• ابھی لائبریری میں اکتوبر کا 'یوجنا' دیکھا۔ بہت پسند آیا۔ یہ اچھا اور صحت مند فیصلہ ہے کہ 'یوجنا' کو ماہ بہ ماہ نکالیں۔ مضامین میں گوناگوں دلچسپیوں کو سمیٹ لیا ہے۔ بس اسی طرح نکالیے۔ اس میں زیادہ سنجیدہ اور اچھے مضامین پڑھنے کو ملیں۔ لائبریری سے جاری نہیں کراسکتا تھا۔ اس لیے وہیں بیٹھ کر سارے مضامین پڑھے۔ ابتدا میں لائبریری میں پرچہ زیادہ مصروف رہتا ہے۔ کل ختم کیا تو آپکو جواب دے رہا ہوں۔

اطہر رضا بلگرامی — ریڈر شعبہ معاشیات
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

یوجنا کو تعمیری بنانے کی تجاویز

• ۱۔ 'یوجنا' Uninspiring نام ہے۔ کوئی ایسا نام حکومت کو تجویز کریں جو ہمارے منصوبوں کے پیچھے ہمارے ولولوں، ترقی اور ارادوں کا آئینہ دار ہو۔ یوجنا نام سے یہ ایک خشک تکنیکی رسالہ بن جاتا ہے۔

۲۔ سرکاری اداروں، لائبریریوں اور Aided اداروں کے لیے اس کی خریداری لازمی قرار دی جائے۔

۳۔ رسالے کی ضخامت بڑھائی جائے۔ اسکی کتابت اور چھپائی کی طرف زیادہ توجہ دی جائے۔

۴۔ رسالہ جگہ جگہ تصاویر سے مزین ہو۔

۵۔ منصوبوں سے متعلق مضامین کا ترجمہ سلیس اور آسان فہم ہونا چاہیئے۔ ان میں بھی تصاویر کو استعمال کیا جائے۔

۶۔ جہاں ادب کو پیش کرنا یوجنا کا کام نہیں ہر پرچے میں تعمیری افسانہ اور ایسی نظمیں اور مضامین دیجیے جو ملک کی ترقی، ہمارے عزائم اور قومی یک جہتی کو جھلکائیں۔ ایسے مضمون کو معقول معاوضہ بھجوائیں۔ آپ کی موجودہ معاوضے کی شرح بڑی کم ہے۔ ایسے افسانوں اور مضامین میں بھی Illustrations استعمال کریں۔"

م م۔ راجندر — چیف ایڈیٹر
۶۸ — چترا وِہار، دلی ۹۲

• اس سے قبل بھی یوجنا کے شمارے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، لیکن اس بار دیکھا تو نظریں ٹھہر گئیں۔ آپ نے تو اسے دولہن کی طرح سجا دیا ہے۔

تقریباً ہر موضوع ہے۔ قاری کو اور کیا چاہیئے۔ معلوماتی منیچر، ادب، فلم، اسپورٹس، غزلیں اور نظمیں، اتنی عمدہ ترتیب کے لیے میری دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

سرور یوسف — فلم جرنلسٹ، ذاکر نگر
اوکھلا، نئی دہلی

قابلِ قدر تبدیلیاں

• یوجنا (اُردو) کا یکم تا ۳۰ نومبر کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ بڑھی ہوئی ضخامت اور مندرجات دیکھ کر خوشی ہوئی۔ سبھی مضامین اپنی جگہ خوب ہیں۔ لیکن 'اُردو کے فروغ میں اتر پردیش کا حصہ'، 'سحرالبیان کی عصرِ حاضر سے مطابقت'، 'فلمیں سماج کو کدھر لے جا رہی ہیں'، اور افسانہ "وہ لمحہ" خاص طور سے پسند آئے۔

آپ نے گذشتہ چند ماہ میں رسالے میں قابلِ قدر تبدیلی کی ہے۔ اب یہ رسالہ جہاں قارئین کو ملک کی معاشی ترقی اور ترقیاتی منصوبوں کے بارے میں معلومات بہم پہونچاتا ہے وہاں ان کے ادبی ذوق کی تسکین بھی کرتا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رکھئے لیکن اس کے سرورق کو متنوع اور پُرکشش بنانے کی ضرورت پر بھی توجہ دینا ضروری ہے۔ ایک بات کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ یوجنا نیوز ایجنٹوں کے پاس دستیاب نہیں ہوتا۔ کچھ ایسا کیجئے کہ یہ لوگوں کو بآسانی مل سکے۔

راجیو کمار — ۱۰۱ فتحپوری، دہلی

دو آتشہ

• 'یوجنا'، شمارہ ۱۳۔۱۴، اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ آپ نے اسے 'دو آتشہ' بنا دیا ہے۔

اس شمارہ میں خاص طور سے اقتصادیات، تعلیم، صنعت و زراعت کے عنوانات کے تحت بیحد کارآمد، پُر از معلومات اور قابلِ قدر مضامین شائع کیے گئے ہیں۔ دیگر مضامین بھی خاصے کی چیز ہیں۔ اُردو کا ادبی ذوق رکھنے والوں کے تسکینِ دل و نظر کو بھی ملحوظ رکھ کر آپنے بڑا کام کیا ہے۔ 'انشائیہ'، مخدوم اور فراق پر مضمون، غزلیں نظمیں اور کہانیاں اور دو تاریخ ساز شخصیتوں پر مضمون۔ کس کس چیز کی تعریف کی جائے۔ اگر یوں کہہ دیا جائے کہ آپ نے "یوجنا" کو اس نئے رنگ میں پیش کرکے کارہائے نمایاں انجام دیا ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

جمال ہاشمی — ۵۶۲ دویکانت نگر
غازی آباد (یو۔ پی)

• یوجنا (اُردو) کا بندۂ عاجز ۱۹۸۱ء سے نہ صرف مستقل خریدار ہے بلکہ اس کا مطالعہ میرے لیے اور میرے اہلِ خاندان کے لیے نعمتِ عظمیٰ ہے۔ بیسویں صدی کے اس پُرآشوب دور میں اُردو زبان و ادب کی وہ خدمت انجام دے رہا ہے جو اسکی بقا کی ضامن ہے۔ حالیہ عرصہ میں اس کے جاری کردہ خصوصی شمارے "نئی تعلیمی پالیسی"، "۱۵ اگست ۱۹۸۶ء کا خصوصی شمارہ ۲۰۰۱ء" قوم کے لیے باعث فخر، تقدیس آفریں ہیں... ہر شمارہ اتنا خوبصورت، اتنا پیارا پرچہ کوئی دشمن بھی ہو تو آپ کی جرأت، خوش سلیقگی اور حُسنِ انتظام کی داد دئے بغیر نہ رہے گا۔ سرورق کو دیدہ زیب بنایئے جیساکہ ماضی میں ہوا کرتا تھا۔

محمد رضی الدین معظم — ۸۸۶-۳-۲۰،
رحیم منزل، شاہ گنج۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲ (آندھرا پردیش)

●

شام کوثر چاند پوری کے نام

۱۶ دسمبر کو اُردو اکادمی کی جانب سے غالب اکادمی، نئی دہلی میں مشہور ادیب، ناول نگار اور طبیب جناب کوثر چاند پوری کے ساتھ ایک شام کا اہتمام کیا گیا۔
تصویر میں (دائیں سے) حکیم عبدالحمید، کوثر چاند پوری، انور دہلوی اور پروفیسر عنوان چشتی نظر آرہے ہیں (فوٹو سید فدا علی)

ایک شام کوثر چاند پوری کے نام

• اردو اکادمی، دہلی کی جانب سے ۱۶ دسمبر ۱۹۸۶ء کو غالب اکیڈمی میں مشہور اردو ادیب، ناول نگار اور طبیب حاذق جناب حکیم کوثر چاند پوری صاحب کے ساتھ ایک شام کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر جناب کوثر چاند پوری کی تصنیفات و تحریرات کی ایک نمائش بھی منعقد کی گئی۔

جلسے کی صدارت اردو اکادمی کی تعلیمی کمیٹی کے چیرمین جناب انور علی دہلوی نے فرمائی۔ جناب حکیم عبدالحمید صاحب بانی "ہمدرد" رکن اردو اکادمی نے مہمانِ خصوصی کے فرائض انجام دیئے۔ تقریب کے آغاز میں سکریٹری اردو اکادمی، سید شریف الحسن نقوی نے اس جلسے کی ضرورت، اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب کوثر چاند پوری کی ادبی خدمات کو سراہا۔ اس کے بعد اکادمی کی جانب سے جناب عبدالحمید صاحب نے کوثر چاند پوری کی خدمت میں ایک شال پیش کی۔

جناب ظفر احمد نظامی نے کوثر صاحب کی سوانح اور شخصیت پر بھرپور مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر عنوان چشتی نے کوثر صاحب کے فن اور ادبی خدمات پر ایک گرانقدر مقالہ پیش کیا۔ دونوں مقالے سیر حاصل اور جامع تھے۔ غالب اکادمی کا ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔

کوثر صاحب نے اپنی تقریر میں اکادمی اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا اور اپنی زندگی کے چند واقعات بیان کئے۔

صدر نے اپنی تقریر میں کوثر چاند پوری کو چاند پور کا نہیں خالص "دلی والا" بتایا آپ نے بھی ان کی ادبی خدمات اور اُردو سے محبت کی تعریف کی۔ •

بقیہ: کتاب کا اجرا

مطالعہ کیا ہے۔

راشٹرپتی نے کتاب کے مرتب جناب علی جواد زیدی کی بھی ستائش کی اور کہا کہ انھوں نے مالک رام کی تحقیق پر درجنوں مزید قلم کاروں سے تحقیق کرائی ہے اور اس طرح علم و ادب میں بیحد اضافہ کیا ہے۔

راشٹرپتی نے کتاب کے ناشر مکتبہ جامعہ کی بھی تعریف کی اور کہا کہ انھیں اس کی کتابت اور طباعت بہت پسند آئی۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس کی صرف پانچ سو کاپیاں شائع ہوئی ہیں۔ علمی طور پر ایسی مفید کتاب کی تو کم از کم پانچ ہزار کاپیاں چھپنی چاہئیں۔ انھوں نے کہا کہ اتر پردیش اور بہار ایسی ریاستوں کی حکومتوں کو اُردو کتابوں کی طباعت میں مدد دینی چاہیئے اور ملک کی تمام اہم لائبریریوں کو اپنے ہاں اُردو کتب کے گوشے کھول کر اُردو کتابیں خریدنی چاہئیں۔

جناب مالک رام اُردو کے غالباً واحد ادیب ہیں جنھیں جمہوریہ ہند کے دو صدور نے ان پر شائع ہونے والی کتب کی رونمائی کا اعزاز بخشا ہے۔ اس سے قبل ۱۹۷۲ء میں اُس وقت کے راشٹرپتی شری وی۔ وی۔ گری نے ان پر دو یادگاری صحیفے جاری کئے تھے، جن میں سے ایک اُردو اور دوسرا انگریزی میں تھا۔

نئی کتاب کے ۴۳۶ صفحات ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے ۴۲ مصنفین کے مضامین رقم ہیں۔ ان میں پروفیسر گیان چند، شمس الرحمان فاروقی، کالی داس گپتا رضا، پروفیسر مختارالدین احمد، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جسٹس محمد ہدایت اللہ، پروفیسر شمیم حنفی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی (مرحوم)، مولانا اسلم جیراج پوری (مرحوم)، سید صباح الدین عبدالرحمان، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، مولانا ضیاالدین اصلاحی، مولانا عبدالسلام خاں، اوم پرکاش بجاج، ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی (کراچی)، ڈاکٹر اختر الواسع، پروفیسر عبدالقوی دسنوی، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری (کراچی)، سید محمد مشتاق شارق، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر نورالحسن نقوی، ضیا فتح آبادی (مرحوم) اور حبیبہ بانو شامل ہیں۔

ان کے علاوہ "تحدیث نعمت" کے عنوان سے خود مالک رام صاحب کی ایک قلمی تحریر ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ "میں اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہوں۔ جس نے اتنے ڈھیر سے علوم سے میری علمی پیاس بجھانے کا سامان پیدا کر دیا۔ میں نے اپنی بساط بھر اس کے حکم کی تعمیل میں اس علم کی نشر و اشاعت میں کوتاہی نہیں کی لیکن حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔" •

(جی۔ ڈی۔ چندن)

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi.

Vol. 6 No. 19-20 YOJANA (URDU) 1-31 January, 1987

انصر قدوائی

تعلیم اور ثقافت

ہمارے نئے تعلیمی تجربے کی کامیابی روایت سے تعلق منقطع کئے بغیر ہندوستان کی ثقافتی خصوصیات کی ضرورتوں کے مطابق متعین کئے گئے تعلیمی نصب العینوں کی تکمیل میں مضمر ہوگی۔ یہ ایک دلچسپ تجربہ ہے کیوں کہ اس کے ذریعہ اکیسویں صدی کی ضروریات کے لیے نئی روشنی کے ذہنوں کی تشکیل عمل میں آئے گی۔ اس کے لیے ماضی کی سست روی اور بے عملی کو چھوڑنا ہوگا اور یہ ضروری ہوگا کہ ہندوستان کی "کثرت میں وحدت" کے سماجی و سیاسی پس منظر میں قدم بہ قدم اور منزل بہ منزل آگے بڑھا جائے۔

اس سلسلے میں کثیر جہتی اندازِ نظر اختیار کرنا ہوگا اور آغازِ تعلیم کے ابتدائی اور ثانوی مرحلوں سے کرنا ہوگا۔ اگرچہ سائنس اور ٹکنالوجی تعلیم کے بہت سے پہلوؤں میں سخت تبدیلیوں کی متقاضی ہوں گی تاہم اس کا کافی زیادہ حصہ بنیادی طور پر ایک انسانی مسئلہ رہے گا۔

تعلیم آزادی کے پہلے سے ہمارے قومی رہنماؤں کی توجہ کا موضوع رہی ہے جس کا واضح ثبوت واردھا اسکیم ہے جس کے خالق مہاتما گاندھی تھے۔ تعلیمی اصلاح کے میدان میں پیش پیش رہنے والے سرکردہ رہنماؤں میں گوپال کرشن گوکھلے بھی شامل تھے۔ اس اسکیم میں "ہاتھ، دل اور دماغ" تینوں کو مدنظر رکھا گیا تھا۔ اس کا مقصد ذہنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ دست کاری کو برابر کی اہمیت دینا تھا۔ آج کی دنیا میں دست کاری پر زور کو وسیع تر معنی میں دیکھنا ہوگا اور آرٹ اور ثقافت میں ذہنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی پر بھی زور دینا ہوگا۔

موجودہ مسئلہ نوآبادیاتی ماضی کا پیدا کردہ ہے جس نے قدیم نظریات اور جدید اُمنگوں، جو قدیم اور جدید کے ادغام کی مقتضی ہیں، کے درمیان ایک خلیج پیدا کر دی ہے۔ (یہ مسئلہ اتنا ہی بڑا ہے جتنا کہ آزادی سے پہلے کے نظریۂ منصوبہ بندی اور نیوکلیائی عہد کی منصوبہ بندی کے پہلوؤں اور ضرورتوں کے درمیان فرق ہے) البتہ ماضی کے تجربے سے کارآمد رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے خواہ محدود معنوں میں ہی سہی۔ گذشتہ تیس برسوں میں تعلیمی سرگرمیوں میں عظیم توسیع دیکھنے میں آئی ہے۔ یہ ایک اچھی بات تھی جو تعلیم کے لیے عوام کے جذبے اور اشتیاق کو ظاہر کرتی تھی۔ بہرحال اب ہمارے پالیسی سازوں کو تعلیم اور سائنس کے میدان میں کچھ اہم مسائل کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہاں ایک مثال تو پبلک اسکولوں کے لیے بڑھتے ہوئے ذوق و شوق کی دی جا سکتی ہے جو بڑے شہروں میں دیکھنے میں آتا ہے اور جس طرح سے درسی دکانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے وہ ایک مسئلہ ہی نہیں بیماری کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ یہ مغرب کی ایک افسوسناک نقل ہے۔ اور حیثیت یا مرتبے کے بارے میں غلط نقطۂ نگاہ کا نتیجہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آج کا مسئلہ اس صدی کے آغاز کے وقت درپیش مسئلے سے بہت ہی زیادہ مختلف ہے۔ آج شرحِ خواندگی ۴۰ فیصد کے لگ بھگ ہے جبکہ ۱۹۶۱ء میں یہ ۳۴ فیصد تھی۔ اگرچہ یہ کوئی بہت بڑی کامیابی نہیں ہے لیکن اس سے اتنا تو ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ کافی پیش رفت ہوئی ہے۔ آزادی سے پہلے ملک میں بیس یونیورسٹیاں تھیں۔ لیکن ۱۹۶۰ء میں ان کی تعداد ۴۷ اور ۱۹۸۰ء میں ۱۱۸ ہو گئی۔ لیکن مسئلہ نچلی سطح کے لوگوں کی قدروں اور نظریات کا ہے۔

حکومت کا ملازمتوں سے ڈگریوں کا تعلق ختم کر دینے کا ارادہ ہر لحاظ سے اچھا اور دانشمندانہ ہے۔ چنانچہ تعلیم کا سارا ڈھانچہ بدلا جانا ہے۔ اور پیشہ ورانہ تربیت کو اعلیٰ ترجیح دی جانی ہے۔ گو پہلے بھی اس سمت میں کچھ اقدامات کئے جا چکے ہیں لیکن ان سے

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یوم جمہوریہ کے موقع پر خصوصی پیش کش

جلد ۹
شمارہ ۲۱-۲۲
قیمت دو روپے

کیا گوناگونی اور رنگارنگی ہماری قوت ہے؟

آج جب کہ مختلف طرح کے اختلافات ہمارے سامنے آرہے ہیں، اور جب کہ ہم کبھی کبھی بنیادی وحدت سے صرفِ نظر کرکے بظاہر تنوع اور رنگا رنگی کو اہمیت دینے لگتے ہیں، ہمیں یہ بخوبی یاد رکھنا ہے کہ بالآخر بنیادی وحدت ہی پائیدار ثابت ہوگی کیوں کہ ہماری سرشت اور ہماری تار و پود میں اہنسا پیوست ہے اور ہماری پوری زندگی، ہماری روایت اور ہماری ثقافت کا اسی پر انحصار ہے، اس وقت سے جب سے کہ دیگر ملکوں میں اختلافِ رائے کو ممنوع اور ناجائز قرار دیا جا چکا تھا، ہمارے ملک میں جذبۂ رواداری اور اختلافِ رائے کی اہمیت رہی ہے اور آج جب کہ ہمارا آئین ہمیں تقریر اور اظہارِ رائے کی آزادی دیتا ہے، خیال و فکر کی آزادی دیتا ہے، ہر شخص کو مذہب کی آزادی دیتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے ملک میں ایک ایسی قوم فروغ نہ پائے جو اختلافِ رائے رکھتی ہو، اور مختلف نظریات کو سمیٹے ہوئے ہو۔ چنانچہ بھارت قوم کو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرکے سبھی کی بھلائی کے لیے کام کرنا ہے۔ یہی ہمارے آئین کا منشاء ہے، بلکہ اس میں توان تمام گنجائشوں کو سمیٹ لیا گیا ہے، اسی وجہ سے فیڈرلزم پر اصرار کے ذریعے ملک کی وحدت اور اتحاد کو قائم رکھا گیا ہے، ریاستوں کی خودمختاری کو یقینی بنایا گیا ہے، چنانچہ بھلے ہی مرکز میں ایک پارٹی کی حکومت ہو اور ریاست میں دوسری پارٹی کی، مگر اس سے ہمارے تعلقات پر کوئی برا اثر نہیں پڑا ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔

چوں کہ ہمارے ملک کے عوام نے زمانۂ قدیم سے ہی "جیو اور جینے دو" کا اصول اپنایا ہے، لہٰذا اسی کے سبب ملک کا یہ عظیم اتحاد ممکن ہو سکا ہے، اسی سے ملک میں باہمی رواداری اور ایک دوسرے کے احترام کی فضا بن سکی ہے، اسی کا نام آج کی زبان میں باہمی احترام ہے، اور یہی بقائے باہم ہے۔ اسی کے سبب صدیوں سے ہم زندہ اور پائندہ رہے ہیں اور آج جب کہ ہم نے ثقافتی اتحاد کو بڑھاوا دیا ہے تو اس سے بحیثیت مجموعی ملک کے سیاسی اتحاد کو بھی بڑھاوا ملا ہے، لہٰذا ان حالات اور اصولوں کی روشنی میں ملک کو قومی خوشحالی کی بلندیاں چھو لیتی ہیں، اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ نوعِ انسانی کی خدمت کے عصری تقاضوں کو پورا نہ کر سکے۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد
(نریونڈرم، ۱۴ر اگست ۱۹۵۷ء)

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی حلقہ بیں کرنے والا

خصوصی شمارہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر: سید ظفیر الحسن
ایڈیٹر: جگندر سنگھ
اسسٹنٹ ایڈیٹر: محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر: وسیم حیدر

شرح چندہ
سالانہ ۲۰ روپے۔ ۲ سال ۳۶ روپے
سہ سالہ ۴۸ روپے۔ فی کاپی ۲ روپے
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے
۱۰ فیصد کی رعایت

جلد ۲۱ | شمارہ ۲۲، ۲۱ | یکم تا ۲۸ فروری ۱۹۸۷ء | ۱۲ ماگھ تا ۹ پھاگن، شاک ۱۹۰۸ | قیمت: ۲ روپے | فون نمبر ۶۰۱۸۱۸

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مینے)
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منہاس

ترسیل زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

جی ہاں! تنوع اور

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے کیونکہ قومیں ایک ہی طرح کی غلطیوں کا بار بار اعادہ کرتی ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ قوم کے وہ افراد جو اس طرح کی غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں، تاریخ کے اس اصول کے مطابق مجروح ہو جاتے ہیں اور پھر انھیں اس عذاب سے نجات پانے اور ان زخموں کے اندمال کے لیے مقابلتہً زیادہ وقت درکار ہوتا ہے، بقول شاعر:

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بدقسمتی سے ہم بحیثیت ایک قوم اُن باتوں اور اُن سبقوں کو بھلا چکے ہیں، جو تاریخ نے صدہا سال کے اندر ہمیں بار بار سکھائے یا سکھائے ہیں، پنجاب، کرناٹک اور گوا کے حالیہ واقعات اس حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں کہ ہم ایک ایسے آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہیں، جہاں ہر وقت یہ خدشہ رہتا ہے کہ ذرا سی چنگاری بھی جلا کر ہم کو خاکستر نہ کر دے۔

ہم اپنے اُن مسائل کے حل کے لیے جو کہ باہمی گفت و شنید سے حل ہو سکتے ہیں، اور جنھیں قانون سازی کے ایوانوں میں بیٹھ کر غور و خوض سے حل کیا جا سکتا ہے، جن پر آپس میں بات چیت ہو سکتی ہے، تبادلۂ خیال ہو سکتا ہے، ایک دوسرے کے نقطۂ نظر سے واقفیت اور جانکاری حاصل کی جا سکتی ہے، سڑکوں پر نکل آتے ہیں، اور ان کا حل لبوں کو نذرِ آتش کرنے، عوامی سہولتوں کو تباہ و برباد کرنے اور روزمرّہ کی ضرورتوں اور آسائشوں کو تاراج کرنے کے ذریعے تلاش کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں بیش قیمت جانوں کا اتلاف ہوتا ہے، متاثرہ علاقوں میں امن تباہ ہوتا ہے، زندگی کے معمولات اور عام کاروبار میں تعطّل واقع ہوتا ہے مگر ان سب کا نتیجہ کیا ہے؟ یہ مسئلے کا حل نہیں ہے بلکہ اس سے تو صورتِ حال بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے، یہی کچھ ہو رہا ہے اور بار بار ہو رہا ہے۔ منظر نامہ کہیں کا بھی ہو، ہر جگہ اِکّا دُکّا تبدیلی کو چھوڑ کر ایک ہی سی صورتِ حال پیش آتی ہے۔

اس طرح کے واقعات کا سلسلہ اگر اس لیے بھی ہو کہ غیر ملکی عناصر کے ملوث ہونے کے باعث یہ سب ہو رہا ہے، تو اس بات سے بھی ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس پس منظر کا حتمی تجزیہ یہی بتاتا ہے کہ اس کے قصوروار کوئی دوسرا نہیں بلکہ ہم خود ہیں۔ ہمیں یہ بات یقین سے معلوم ہے کہ ہماری سرزمین پر انتشار پسندانہ سرگرمیوں کو ہوا دینے کے واسطے دہشت پسندوں کی تربیت کے لیے کیمپ قائم کئے گئے ہیں، لیکن یہ کون لوگ ہیں جن کو تربیت دی جا رہی ہے؟ یہ دہشت پسند خود ہمارے اپنے آدمی ہی تو ہیں، یہ ہمارے بھائی ہیں، ہمارے سماج کا ایک اٹوٹ حصّہ ہیں۔ یہی لوگ، اُن لوگوں کے مقابلے ہمارے دوش بدوش لڑے ہیں، جن کے ساتھ آج وہ گٹھ جوڑ کئے ہوئے ہیں۔ ان کے اس رویّے کی منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایسے بھی ہمارے دوست بنے ہیں، جو ہمیشہ ہی ہم کو کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار دیکھنا چاہتے ہیں، ان پیدا کردہ مشکلات پر وہ جھوٹی ہمدردی واضح کرنے کے واسطے موقع پاتے ہیں اور اس طرح ترقی اور خوش حالی کی راہ پر آگے بڑھنے کی ہماری کوششیں اور ہمارا عزمِ صمیم کمزور پڑ جاتا ہے، لیکن کیا ہم ایک سمجھدار، شعور یافتہ اور منجھی ہوئی قوم نہیں ہیں؟ کیا ہمارے ملک میں مشترکہ ثقافت اور اتحاد کی بے مثال روایات نہیں ہیں، کیا ہمارے پاس سیاستدانی اور دانشوری کی اعلیٰ روایات نہیں ہیں؟ ہمارا شمار دُنیا کی صاحب الرائے قوموں میں ہوتا ہے، اور بین الاقوامی مجلسوں اور فورموں

گوناگونی ہی ہماری طاقت کا سرچشمہ ہے

ہیں ہماری آواز عزت و احترام سے سنی جاتی ہے۔

ہم کثرت میں وحدت کے اصول سے بندھے ہوئے ہیں۔ ہمارے قومی رہنماؤں نے یقین، اعتماد اور ایمان بھرا لیا۔ طاقت سے اس اصول کو کبھی بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا، لیکن حصولِ آزادی کے بعد کی تاریخ کے واقعات ظاہر ہیں کہ مذہب اور زبان اگرچہ عوام کو ایک دوسرے سے جوڑنے اور ملانے کا زبردست ذریعہ مانے جاتے ہیں، مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ یہی دونوں تمام تشدد آمیز سرگرمیوں کے پسِ پشت کارفرما نظر آتے ہیں۔ آج کی دنیا پر نظر دوڑانے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے اور یہ نتیجہ دو ٹوک انداز میں سامنے آتا ہے کہ اب مذہب قومی اتحاد یا افراد کو ملانے کا ذریعہ نہیں رہا۔ اگر ایسا ہوتا تو ایشیا میں ہم مذہب ممالک اتنے طویل عرصے تک لاحاصل اور بے نتیجہ لڑائی نہ لڑتے رہتے۔ اسی طرح پڑوسی ملک میں حالیہ نسلی جھگڑا ہیں بھی مذکورہ اصول کی صحت کی نشاندہی کرتی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح زبان بھی آپس میں ملانے اور استحکام لانے کا جو رول ادا کرتی رہی، اب وہ رول ادا کرتی نظر نہیں آتی۔

ملک میں پنجاب میں جو المناک حادثات ہو رہے ہیں اور جن ناخوشگوار واقعات کا بار بار اعادہ ہو رہا ہے، وہ بھی اس نقطہ کی وضاحت کے لیے کافی ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ہمیں خود کو درحقیقت خوش نصیب سمجھنا چاہیئے کہ ہمارے ملک میں کثرت میں وحدت ہماری طاقت کا سبب بنی ہے، نہ کہ کمزوری کا۔ ہمارا ملک مختلف مذاہب کا گہوارہ رہا ہے اور یہاں کے لوگ متعدد زبانیں بولتے ہیں۔ لیکن اس گوناگونی اور بوقلمونی کے باوجود ہم متحد رہے ہیں۔ دنیا میں شاید ہی کوئی دوسرا ملک ہو جہاں خیالات و افکار کے اتنے مختلف دھارے ایسا خوش کن منظر پیش کرتے ہوں۔ یہ دھارے ایک دوسرے میں ملتے ہیں مگر اس طرح سے کہ ہر ایک کی اپنی ادا اور ہر ایک کا اپنا انداز عرصۂ دراز کے اس اختلاط و ارتباط کے باوجود اپنی انفرادیت اور اپنی شان برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ہندوستان کے سماجی تانے بانے کی یہ ایک منفرد خصوصیت ہے اور اس کو تباہ و برباد کرنے کی کوئی بھی کوشش ناکام بنا دی جائے گی کیونکہ یہ مشترکہ قومیت وہ بیش قیمت اثاثہ ہے جو ہندوستان کی موجودہ نسل کو وراثت میں ملا ہے۔ ہمارے ملک کے عوام سیکولرازم کی حقیقت کو اگرچہ ایک عرصۂ دراز سے جانتے ہیں لیکن یہ اصطلاح مقابلتاً ایک نیا تصور ہے۔

ہمارے ملک میں آج کل جو حالات چل رہے ہیں ان سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اگر ہمیں لڑنا ہی ہے تو ہماری لڑائی غریبی، ناخواندگی، اقتصادی نابرابری کے خلاف ہونی چاہیئے۔ یہ لڑائی بھیانک ڈھنگ سے بگڑتے ہوئے اقداری نظام کی بحالی کے لیے ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ وہ بھیانک اور خوفناک مسائل ہیں کہ اگر ہم ان کے خلاف لڑائی لڑنا چاہتے ہیں اور ان پر قابو پانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمارا متحد رہنا اور ایکتا کے ساتھ آگے بڑھنا بنیادی شرط ہے۔ ترقی کی راہ پر آگے بڑھنے کی ضرورت سے کچھ دنوں تک صرف نظر کیا جا سکتا ہے لیکن اتحاد و اتفاق وہ بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر ہمارا وجود ممکن نہیں، اس کے بغیر ہماری بقا ممکن نہیں۔ متحد رہتے ہوئے ہی ہمارے ترقیاتی منصوبے، ہمارے ترقیاتی پراجیکٹ اور اقتصادی خوشحالی کی ہماری اسکیمیں کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہیں اور انھیں عملی شکل دی جا سکتی ہے۔ اس بات کو دہرانے کی ضرورت نہیں کہ افتراق و انتشار نے ہمیں ماضی میں کیا نقصانات پہونچائے ہیں۔ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ ترقی اتحاد کے نتیجے میں ہی وجود میں آ سکتی ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ترقی اور اتحاد کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ممکن نہیں۔

(چیف ایڈیٹر)

اس شمارے میں اظہارِ خیال کرنیوالی شخصیتیں

اور ان کا مختصر تعارف

اندر کمار گجرال ———— سابق مرکزی وزیر اور روس میں ہندوستان کے سابق سفیر۔

ایس۔ ایم۔ جوشی ———— کار آزمودہ سوشلسٹ لیڈر۔

پروفیسر این۔ جی۔ رنگا ———— امور پارلیمانی کے ماہر۔

ڈاکٹر مالکم ایس ادی سیشیہ ———— چیئرمین، مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اسٹڈیز، مدراس۔

سید مظفر حسین برنی ———— ہریانہ کے گورنر۔

ڈاکٹر گوپال سنگھ ———— گوا، دمن اور دیو کے لیفٹیننٹ گورنر۔

چِتا بسو ———— رکن پارلیمنٹ

پروفیسر پی۔ جے۔ کورین ———— رکن پارلیمنٹ

پروفیسر پی این سری واستو ———— وائس چانسلر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔

پروفیسر رئیس احمد ———— سابق نائب صدر، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، نئی دہلی۔

ایس۔ سی۔ بھٹ ———— سابق ڈائرکٹر، نیوز سروسز ڈویژن آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی۔

کے۔ ایم۔ پانیکر ———— اسسٹنٹ ایڈیٹر، پیٹریاٹ، نئی دہلی۔

پروفیسر ایس بشیر الدین ———— صدر، ڈپارٹمنٹ آف کمیونیکیشن اور جرنلزم، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد۔

چودھری راموجی راؤ ———— چیف ایڈیٹر، نیوز ٹائم، حیدرآباد۔

اندر کمار گجرال

فرقہ وارانہ نظامِ سیاست ختم ہونا چاہیئے

فاضل مصنف نے رائج الوقت سیاسی منظر نامے کے اُفق پر جلوہ گر ہونے والے عناصر کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ اس کے ذریعے انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ملک و قوم کے استحکام کے لیے ایک ایسا سیکولر سیاسی نظام درکار ہے جس میں کسی بھی طرح کی فرقہ وارانہ کھینچا تانی نہ ہو اور جو تعصب سے بھری احیاء پسندی کے جذبات سے یکسر عاری ہو۔ فاضل مصنف ایک لائق ایڈمنسٹریٹر ہیں اور تجربہ کار ڈپلومیٹ بھی۔ ان کا خیال ہے کہ اگر اکثریتی فرقے کی فرقہ واریت خطرناک ہے، تو اقلیتی فرقوں کی طرف سے چلائے جانے والے ادارے علیحدگی پسندی کو بھڑکانے والے اڈّے ہیں۔ موصوف نے مہاتما گاندھی کی طرف سے دی گئی اخلاقی تعلیم کو ایک عظیم قوت سے تعبیر کیا ہے، انھوں نے اس بات کو زور دے کر بیان کیا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کی خونی وارداتوں کی موجودگی میں بھی قوم نے اگر ایک ایسا آئین اپنایا جس میں سیکولرازم کو ہندوستانی قومیت کی بنیاد بتایا گیا ہو، تو یہ بات مہاتما گاندھی کے ترکہ کے لیے کوئی معمولی خراجِ عقیدت نہیں ہے۔

ہمارے ملک میں سیکولرازم کی بگڑی ہوئی شکل اور سیاسی مصلحتیں، وہ دو خاص اسباب ہیں جن کے باعث آج زہر آلود فرقہ پرستی اور ظلمت پسندی پر مبنی علیحدگی پسندی کا ماحول بنا ہوا ہے۔

ایک ایسا وقت تھا جبکہ انتہاپسندی، فرقہ پرستی اور احیاء پسندی میں زبردست یقین رکھنے والے بھی خود کو فرقہ پرست کہلانے کے لیے تیار نہ تھے، یہاں کے عوام تو ہم پرستی پر مبنی اصولوں کو اپناتے ہوئے بھی اپنی کوششوں اور اپنے شغل کو چھپانا چاہتے تھے۔

آج کے دور میں جو اقداری نظام رائج ہے، اس کا بڑا حصہ گاندھی جی کی تعلیمات کے زیرِ اثر پروان چڑھا ہے۔ اکثر مہاتما گاندھی کا رول صرف آزادی کے حصول تک محدود کر کے سمجھنے یا دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے جو کہ غلطی ہے، ان کی تعلیمات کا سب سے بڑا حصہ وہ ہے جو انھوں نے قوم کی صلاحیت اور قومی کردار بنانے کے لیے ادا کیا، انھوں نے ہماری عزتِ نفس کو بہتر بنانے اور اس کے زخموں کا اندمال کرنے کے لیے جدوجہد کی، انھوں نے ہم میں ہمت پیدا کی اور ہمارے نظریات کو

بدلا۔ انھوں نے سماج کے گوناگوں حصوں سے نئی چھاپ کے رہنماؤں کو ساتھ لیا اور اس طرح قومی زندگی کو نیا اندازِ فکر اور نئے معنی دیئے۔

مہاتما گاندھی ۔ جدیدیت کے علمبردار

مہاتما گاندھی کے فلسفۂ حیات میں روایت کا بڑا حصّہ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے ظلمت پسندی اور توہم پرستی کو اپنی زندگی میں جگہ نہیں دی۔ وہ فرسودہ عقائد سے بھی دُور رہے، اس کے برعکس وہ عہدِ حاضر کے سب سے زیادہ جدیدیت پسند تھے۔ کسی نے یہ نہیں سُنا کہ گاندھی جی رسمی پوجا پاٹ کے لیے کسی بھی عبادت گاہ میں جا رہے ہیں یا تانترک میں یقین رکھنے والوں یا بھگتوں وغیرہ سے مل رہے ہیں یا نجومیوں سے یا جوتش ودیا کے ماہروں سے ملاقاتیں کر رہے ہیں یا کسی ذات پات یا فرقہ وارانہ میٹنگ میں شرکت کر رہے ہیں، ان کا نظریۂ حیات قومی تشخص، سیکولرازم اور غیر فرقہ وارانہ سیاسی نظام کے درمیان گہرے تعلق کی تعمیر میں یقین رکھتا تھا۔

گاندھی جی کا اس بات میں یقین تھا کہ نجی زندگی اور عوامی زندگی میں گہرا تعلق ہے، اور دونوں میں یکسانیت لانی ضروری ہے، چنانچہ قیادت کے مختلف مناصب پر فائز سبھی حضرات سے وہ یہی توقع رکھتے تھے کہ ان کی ظاہری اور باطنی زندگی یکساں ہو۔ انھوں نے ستیہ گرہ کا نظریہ دیا، جو کہ ایک مکمل ضابطۂ حیات اور جامع طرزِ زندگی پر دلالت کرتا ہے، چنانچہ ان سے تحریکِ عمل لینے والے افراد میں مختلف طرح کی تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ مثلاً یہ کہ ذات پات میں یقین نہ رکھنا، عورتوں کے سماجی مرتبہ کو بلند کرنا وغیرہ۔ اس کے علاوہ رسومات کی پابندی، فرقہ وارانہ گٹھ جوڑ دیہی غریب عوام وغیرہ کے سلسلے میں بھی روایتی عقائد میں زبردست تبدیلی آئی۔

مہاتما گاندھی کی تعلیمات کے زیرِ اثر ایسا نفسیاتی دباؤ پڑا جس سے پوری قوم کے اندازِ فکر میں ایک نمایاں تبدیلی آئی۔ ملک میں ثقافتی تنوع کو متحد کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی تاکہ قوم کو متحرک اور فعال بنایا جا سکے، انھوں نے نہ تو کسی مذہب کو پیش کرنے کی کوشش کی، نہ ہی کسی خیال کو تھوپنے کی کوشش کی، بلکہ انھوں نے ایک طرزِ حیات پیش کیا جس سے پوری قوم عزتِ نفس

> ایک ایسا وقت تھا جب کہ انتہاپسندی، فرقہ پرستی اور احیاء پسندی میں زبردست یقین رکھنے والے بھی خود کو فرقہ پرست کہلانے کے لیے تیار نہ تھے، یہاں تک کہ عوام توہم پرستی پر مبنی اُصولوں کو اپناتے ہوئے بھی اپنی کوششوں اور اپنے شغل کو چھپانا چاہتے تھے۔

کے احساس سے بہرہ ور ہو سکے۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا، انھوں نے سماجی جمود اور صدیوں پرانی پستی کو ۔۔ اُس پستی کو جو کہ مذہب اور روایات کے نام پر چلی آ رہی تھی، توڑنے کے لیے مختلف تحریکوں کی سرپرستی کی، ہندوستانی عوام کی بڑی تعداد نے ان کی دُور اندیشی اور ان کے دُور رس پیغام کو سمجھ لیا۔ چنانچہ ان کے نظریات کو آگے بڑھانے کے خیال سے ان کے پیروکاروں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔

کانگریسیوں کی بڑی تعداد سامراجی نظامِ حکومت کے خلاف لڑنے کے لیے اپنی قوتوں کو مجتمع کرتی رہی لیکن تعمیری اندازِ نظر سے کام کو آگے بڑھانے والوں کی ٹولیاں لگن کے ساتھ کام کرتی رہیں اور انھوں نے ہریجنوں کو اوپر اُٹھانے، دیہات میں صحت اور صنعت کو تقویت دینے اور سامراجیت پسند قوتوں کی طرف سے پھوٹ ڈالنے کی کوششوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے اپنی پوری قوت لگا دی، اگرچہ اس موقعہ پر ہندو، مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی سامراجی کوششوں کو بھی کبھی کہیں کہیں کامیابی حاصل ہو سکی، لیکن ثقافتی انقلاب کی ایک طاقتور لہر کسانوں میں عزتِ نفس کو جگانے میں موثر کردار ادا کر رہی تھی، تہذیبی اتحاد کے احیاء کے ذریعے سے ہی کسانوں میں اپنی عزت کا احساس جگایا گیا، بدقسمتی سے قومی جدوجہد آزادی کو جزوی کامیابی ملی، نوآبادیاتی نظام کی ریشہ دوانیاں ثقافتی اتحاد کو توڑنے کی کوششیں کرتی رہیں، وہ مذہب کے نام پر ملک کا بٹوارہ کرنے کے درپے تھیں۔

ملک تقسیم ہوا لیکن اس تباہی کے زمانے میں بھی گاندھی جی کے نظریات میں کوئی فرق نہیں آیا، انھوں نے فساد زدہ علاقوں میں پدیاترا

ل، تاکہ عوام کے اتحاد اور اعتماد کو بحال کیا جائے
ور انھیں ان وحشیانہ حرکتوں سے روکا جا سکے،
ملک میں خونی فسادات کی موجودگی میں بھی ملک
، جو آئین بنا، وہ سیکولرازم کے اصولوں پر مبنی

تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی، ان کی دُور اندیشی
اور بصیرت ان کے ساتھ تھی، چنانچہ ان خوبیوں
اور صفات کے بدولت انھوں نے روایتوں کی ایسی
تبدیلی کی حمایت کی جو نہ صرف معقول پسندانہ معیار
پر پوری اُترتی تھی بلکہ جو ملک و قوم کو متحد کرنے

پاسکتی ہے جبکہ یہاں کا سیکولر نظام فرقہ وارانہ کشیدگیوں
سے پاک ہو، اور اس میں تعصبات پر مبنی احیا پسندی
کا جذبہ نہ ہو، ایک فراخدلانہ سماج اور کثرت میں
وحدت کا حامی سماج مختلف ثقافتوں اور اس
سلسلے کے تنوع کو ایک دھاگے میں پرو کر ہی زندہ و
پائندہ بن سکتا ہے، وہ سمجھتے تھے کہ یکسانیت کے لیے

کانگریسیوں کی بڑی تعداد سامراجی نظامِ حکومت کے خلاف لڑنے کے لیے اپنی قوتوں کو مجتمع کرتی رہی لیکن تعمیری اندازِ نظر سے کام کو آگے بڑھانے والوں کی ٹولیاں لگن کے ساتھ کام کرتی رہیں اور انھوں نے ہریجنوں کو اُوپر اٹھانے، دیہات میں صحت اور صنعت کو تقویت دینے اور سامراجیت پسند قوتوں کی طرف سے پھوٹ ڈالنے کی کوششوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے اپنی پوری قوّت لگا دی۔

ہے اور اسے ہندوستانی
میت کی بنیاد بنایا گیا ہے، چنانچہ
عمل جن پریشان کن اور خوفناک
ں میں انجام پا سکا، وہ خود اپنی جگہ
ندھی جی کے ترکہ کے لیے زبردست
ج عقیدت تھا۔

سیکولرازم

نہرو جی اور ان کے رفقائے کار
سے محب وطن تھے جو وقت کی کسوٹی
پورے اور کھرے اُتر چکے تھے، ان

جارحیت پسندی پر مبنی اپیل محض ایک
نعرہ ہوگی جس کا مقصد اقلیتی ثقافتوں کا
صفایا کرنا اور ان کے طرز زندگی اور طرز حیات
کو نیست و نابود کرنا ہو سکتا ہے۔
گاندھی جی یا نہرو جی کسی نے بھی
دھرم کے بلند آدرشوں اور اس کی روحانیت
سے انکار نہیں کیا ہے، انھیں مذہب کے
ان اعلیٰ نظریات سے کوئی چڑ نہیں تھی،
لیکن مذہبی عقائد کے نام پر مذہب کی
جو شکل بگاڑی گئی ہے اور اس کے نتیجے

گاندھی جی یا نہرو جی کسی نے بھی دھرم کے بلند آدرشوں اور اس کی روحانیت سے انکار نہیں کیا ہے،

انھیں مذہب کے ان اعلیٰ نظریات سے کوئی چڑ نہیں تھی، لیکن مذہبی عقائد کے نام پر مذہب کی جو شکل بگاڑی گئی ہے اور اس کے نتیجے میں جو ظلمت پسندی اور تعصّب چمکا ہے، اس کے سبب اس طرح کی غلط فہمیوں کا ظہور ہوا۔

خدمات اور قربانیوں کا پلڑا بہت بھاری
، انھوں نے ایسی روایتیں قائم کیں، ایسی
یاں بنائیں جن سے ملک و قوم مستحکم بن سکے،

کا ذریعہ بھی تھی۔
وہ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے
کہ ہمارا ملک اور ہماری قوم اس وقت استحکام

میں جو ظلمت پسندی اور تعصب چمکا ہے، اس کے
سبب اس طرح کی غلط فہمیوں کا ظہور ہوا۔

نہرو جی سے ایک بار پوچھا گیا — کیا آپ
دھارمک ہیں یعنی کہ کیا آپ دھرم میں یقین رکھتے
ہیں ؟۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ جی ہاں، لیکن
ایسے دھرم میں نہیں جو مندر جانے جیسے طرز کا ہو۔
نئے بھارت میں جبکہ استحکام کے لیے جدوجہد
کرنی پڑ رہی تھی، اس وقت کانگریس کلچر کا پرانا عزم
کمزور پڑ رہا تھا، یہ کلچر اپنے نظریاتی اصولوں اور اپنے

مفید نظر آتی ہے اور ذات پات کے نظام اور طریقوں
پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔
پارٹیوں کی بنیادی سطح شکوک گئی اور جوں کر
اصل سیاسی پارٹی کی تنظیم نو انفرادی وفاداریوں کی
بنیاد پر ہوئی، اس لیے انتشار پسند احیا پسندوں نے
میدان سنبھال لیا۔ کانگریس کے قدیمی کلچر میں یقین
رکھنے والوں نے کسی قسم کی سماجی تبدیلی لانے کے لیے
نہیں سوچا اور نہ اس کے تئیں کسی قسم کی کوئی پابندی

وہ اپنی پسند کی کسی بھی پارٹی سے گٹھ جوڑ کر لیتے۔
ہے موجودہ سیکولر سماج کی تمام مستحکم عمارت کھوکھ
ہو گئی، حتیٰ کہ سیکولرازم کے مفاہیم پر نظر ثانی کرنی
اس کا مفہوم یہ بتایا گیا کہ تمام مذاہب کا یکساں
اور سبھی مذہبوں سے یکساں محبت۔ انتظامیہ
سربراہ کافی وقت مذہبی عبادت گاہوں میں
پر صرف کرتے ہیں، اللہ والوں اور سادھو سنتوں
سامنے ماتھا ٹیکاتے ہیں، ان سے وہ تاریخیں دریا
کی جاتی ہیں جبکہ وزارتیں حلف اٹھائیں، یہ کام تانت

> **کانگریس کے قدیمی کلچر میں یقین رکھنے والوں نے کسی قسم کی سماجی تبدیلی لانے کے لیے نہیں سوچا اور نہ اس کے تئیں کسی قسم کی کوئی پابندی لگائی اور نہ ہی ان کے پاس اس کے لیے کوئی وقت تھا، ایسا کرنے سے انھوں نے اس لیے بھی گریز کیا کہ کہیں ان کے نئے دوستوں اور ساتھیوں کے انفرادی اور فرقہ سے متعلق مفادات کو گزند نہ پہونچے۔**

عزم و ارادے کے محاذ پر کمزور پڑ گیا۔ اقتدار کے
نئے مراکز اپنے نظریات کے اعتبار سے موقع پرست
تھے، انھوں نے ہر طرز کے افراد اور ہر طرح کی آئیڈیالوجی
میں یقین رکھنے والوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا تاکہ اقتدار
ان کے ہاتھ سے نہ جائے اور ان کی ہوس اقتدار پوری
ہوتی رہے۔ یہ ملک کی سماجی و سیاسی زندگی میں ایک موڑ
تھا جس میں ہال طرز پر مبنی (یعنی اعلیٰ اقداری نظام سے عاری
سیاست) قیادت اُبھری، یہ نہ صرف کانگریس میں اُبھری بلکہ
دیگر ایسی چھوٹی موٹی پارٹیوں میں اُبھری جن کی سابق میں
سیکولر اور سماج واد نظریات سے وابستگی تھی۔
جہاں سیاست میں جوڑ توڑ آ جائے اور ساز باز
ہونے لگے، وہاں اقدار کی شکست و ریخت لازمی
ہے۔ ایسے موقعوں پر فرقہ پرستوں کے ساتھ وابستگی

لگائی اور نہ ہی ان کے پاس اس کے لیے کوئی وقت
تھا، ایسا کرنے سے انھوں نے اس لیے بھی گریز کیا کہ
کہیں ان کے نئے دوستوں اور ساتھیوں کے انفرادی
اور فرقہ سے متعلق مفادات کو گزند نہ پہونچے۔
بدقسمتی سے یہ المیہ محض کانگریس کا ہی نہیں،
جو کہ اس وقت ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی، بلکہ یہی
بات بائیں بازو والی پارٹیوں کو بھی متاثر کیے ہوئے
تھی، انھوں نے فرقہ وارانہ گروپوں اور پارٹیوں کے
ساتھ گٹھ جوڑ کر کے اپنی نیک نامی کو داغدار بنا لیا۔
سرکار کا بننا اور اس کا ٹوٹنا، ایک ایسا عمل
رہا جس نے چھوٹی فرقہ وارانہ پارٹیوں کی اہمیت
بڑھا دی، اس کے بُرے نتائج سے بے پروا ہو کر،

جاننے والوں کے مشورے پر انجام پاتے ہیں اور نا
جیوتشی یہ سب کام کراتے ہیں۔
سیکولرازم اب سماج کو جدید بنانے کا ذ
نہیں سمجھا جاتا، اس کے ذریعے سائنسی مزاج کی
نہیں ہوتی، سرکاری ذرائع ابلاغ گویا کہ ٹی۔ وی
ریڈیو وغیرہ سے گوربز کو مندر میں جھاڑو دیتے ہو
دکھایا اور بتایا جاتا ہے، یا کسی وزیر کو کسی جعلی
نہاد کرامات دکھانے والے شخص کے پیر چھوتے
دکھایا اور بتایا جاتا ہے۔
ان سرگرمیوں اور کاموں کو محض ذاتی مع
کہہ کر بات ختم نہیں کی جا سکتی۔ ملک کے ناخواندہ

کے سامنے یہ عمل ایک نمونہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ اور سماجی طور و طریق اور گزار پر یہ سب عمل بے حد اثر انداز ہوتے ہیں، اس سے احیا پسندوں کو سماج میں عزت و رتبہ ملتا ہے اور ظلمت پسندی کا نیز توہم پرستی پر مبنی رسم و رواج سے قدامت پسندی کو ہوا ملتی ہے؛ ان سب باتوں سے فرقہ داریت کو تقویت ملتی ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی کے بارے میں بہت کچھ بڑھ چڑھ کر کہا جارہا ہے، یہ ثقافت اور اطلاعات کے نظام کو مستحکم کرنے والی نئی پالیسی سے تعبیر کی گئی ہے، سیکولرازم اور قومی اتحاد کی باتیں زبانوں پر بہت کچھ لائی جاتی ہیں لیکن ان شعبوں میں فرقہ داریت کو ختم کرنے اور اس پر براہِ راست حملہ کرنے والی کوئی سنجیدہ کوشش کا اس سے ثبوت نہیں ملتا۔

ظلمت پسندی کے سامنے سر جھکانا

سوال یہ ہے کہ سرکار تعلیمی اداروں سے فرقہ پرستوں کا شکنجہ کیوں نہیں ڈھیلا کرتی، ان کی بالا دستی کو کیوں ختم نہیں کیا جاتا، جبکہ اسکولوں اور کالجوں کو سرکار کی طرف سے مالی امداد ملتی ہے، مگر ان اسکولوں اور کالجوں میں بچوں اور طلباء کے نرم و نازک اور صاف شفاف ذہنوں کو ہر طرح کی فرقہ پرستی، ظلمت پسندی کی تعلیم سے آلودہ کر دیا جاتا ہے، یہ سب کام مذہب کے نام پر ہوتا ہے، اور یہیں پہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر افتراق و انتشار کی جڑیں مضبوط اور گہری ہوتی ہیں، ان اسکولوں میں پڑھائی جانے والی درسی کتب اور ان اسکولوں میں کرایا جانے والا تاریخی مطالعہ، ان سب سے سماج کو زبردست نقصان پہنچتا ہے، اکثریتی فرقے کا بالادستی کا جذبہ اگر اپنی جگہ خطرناک ہے تو اقلیتی اداروں اور اقلیتوں کی طرف سے چلائے جانے والے اسکولوں اور کالجوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ یہ ادارے بھی احیاء پرستی اور علیحدگی پسندانہ نفسیات پیدا کرنے کے اڈے ہیں۔ سیکولرازم کے لیے بڑے بڑے چیلنج اکثریت اور اقلیت دونوں طرف سے ہی پیش کئے جارہے ہیں، اور پھر ہندو راشٹر کے حامی یکسانیت اور یک رنگی پر زور دیتے ہیں اور اسے ہندوستانیت کا اونچا نام دیتے ہیں، ایکطرف وہ سبھی طرح کے تنوع کو یک رنگ بنانے کے حامی نظر آتے ہیں۔ تو دوسری طرف سکھ اور مسلمان احیاء پسند مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بلکہ وہ سیکولرازم کی یکسر نفی کرتے ہیں۔

اکثریتی فرقے کا بالا دستی کا جذبہ اگر اپنی جگہ خطرناک ہے تو اقلیتی اداروں اور اقلیتوں کی طرف سے چلائے جانے والے اسکولوں اور کالجوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ یہ ادارے بھی احیاء پرستی اور علیحدگی پسندانہ نفسیات پیدا کرنے کے اڈے ہیں۔ سیکولرازم کے لیے بڑے بڑے چیلنج اکثریت اور اقلیت دونوں طرف سے ہی پیش کئے جا رہے ہیں، اور پھر ہندو راشٹر کے حامی یکسانیت اور یک رنگی پر زور دیتے ہیں اور اسے ہندوستانیت کا اونچا نام دیتے ہیں، ایکطرف وہ سبھی طرح کے تنوع کو یک رنگ بنانے کے حامی نظر آتے ہیں، تو دوسری طرف سکھ اور مسلمان احیاء پسند مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ وہ سیکولر نظام کی یکسر نفی کرتے ہیں۔

ہندوستان حقیقی طور پر ایک متنوع اور گوناگوں ملک ہے، یہاں مختلف طرح کی رنگا رنگ پائی جاتی ہے، لیکن یہ آپس میں نفاق کا ذریعہ نہیں ہے۔ یہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، یہاں کی

ثقافتیں مختلف ہیں۔ اور یہاں کا طرزِ زندگی مختلف ہے، لیکن اس سب گوناگونی اور تنوع سے ایک متحدہ تہذیب کی تعمیر میں مدد ملی ہے، ہندوستان کی تاریخ میں ہم ہمیشہ ہی ہندوستانی قومیت کے بارے میں باشعور رہے ہیں اور اسی کے باعث ہماری جدوجہد آزادی آسانی سے آگے بڑھ سکی ہے۔ یہ صرف تقریباً ۴۰ سال پرانا عمل ہے کہ ریاستوں پر مبنی ایک راشٹر تعمیر ہو رہا ہے، اس کے ذریعے تمام طرح کی ثقافتوں کو پروان چڑھانا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا ہے، ہر طرح کی لسانی پیش رفتوں کو ساتھ لے کر چلنا ہے اس کے ذریعے متحدہ تہذیب کے عنصر کو بھی اُجاگر کرنا ہے، اور ملک کی شاندار روایتوں کو آگے پہونچانا ہے، اس کے ساتھ ہی انتظامیہ اور سیاسی زندگی میں ذات پات یا فرقے کی بنیاد پر مبنی تنگ نظری سے دُور رہنا ہے تاکہ سبھی کو منصفانہ بنیادی سماجی انصاف مل سکے۔

ترقی پذیر ملک میں کوئی بھی سیکولر ریاست سماجی، ثقافتی یا اقتصادی پسماندگی سے صرفِ نظر نہیں کر سکتی۔ روایتوں اور عمل کو جدید رُخ دینے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ لیکن جدیدیت اور مغربیت ان دونوں کے درمیان (خاص کر ہمارے روایتی ڈھانچے اور اقدار کے نظام کے سبب) واضح امتیاز ہے۔

اقداری نظام پر مبنی سیاست

گاندھی جی اس بات کو سمجھتے تھے، انھوں نے جدید امور کی انجام دہی کے لیے چند روایتوں کو نئے معنی پہنا کر اُن کو کام میں لانے کی کوشش کی، مثلاً انھوں نے رام راجیہ کے تصوّر کو سماجی انصاف لانے کے لیے ایک علامت کے طور پر پیش کیا، انھوں نے زندگی بھر حق کی وکالت کی اور اُسی کو اپنانے پر زور دیا۔ ستیہ گرہ کے دھرم کی بنیاد سچائی کی قوت پر تھی، انھوں نے ہاتھ پر ہاتھ دھرنے اور محض تقدیر پر انحصار کرنے نیز دھرم کو محض رسم و رواج کی صورت میں اپنانے کے نظریے کو مسترد کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ اسی طرح کے فرسودہ خیالات کے باعث ہریجن سماجی غلامی میں صدیوں تک بندھے رہے۔

گاندھی جی نے ایک ایسے نئے سماجی اور اقتصادی ماحول بنانے کی حمایت کی جو ہماری قومی ضرورتیں پوری کر سکے اور ہمارے مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔ گاندھی جی نے کہا کہ "میں مذہب اور سیاست میں کوئی امتیاز نہیں کرتا" مگر اس قول کا مطلب یہ تھا کہ وہ دھرم کے بارے میں ایک نیا نظریہ اور حقیقت پسندانہ خیالات پیش کر رہے ہیں، اس طرح انھوں نے مذہب یا دھرم کو ایک نئے معنی پہنائے، مگر اس سے ان کی مراد کسی ایسے مذہب سے نہ تھی جسے ہم ایک ادارے کی صورت میں یا سنستھا کے طور پر دیکھتے ہیں۔ وہ تو صرف انسانی خصائل، انسانی صفات، انسانی کردار کی خوبیوں پر ہی زور دیتے تھے، انھوں نے دھرم کے نظریے کو ہر طرح کی تنگ نظری اور انتشار پسندی سے دور کرنا چاہا۔ انھوں نے ایک ایسے سیاسی نظام پر زور دیا جو کہ اعلیٰ اقدار پر مبنی ہو اور جس میں عوامی کردار اہم پارٹ ادا کرتا ہو، ان کے اس نظریئے کے مطابق ریاست کو مذہبی ٹھیکیداروں سے اور مذہب کا سودا کرنے والوں سے نجات دلانا اور ریاست کو اس طرح کے لوگوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھنا ضروری تھا، وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم دھرم اور فرقہ واریت کے درمیان فرق کو سمجھیں، ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ فرقہ پرست مذہبی لوگ نہیں ہوتے بلکہ وہ تو مذہب کو ذاتی اور سیاسی مقاصد کے لیے کام میں لاکر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ ●

> فرقہ پرستوں کی تنظیمیں درحقیقت مذہب کو، مذہب، روحانیت یا نوعِ انسانی سے محبّت کے لیے استعمال نہیں کرتیں اور نہ اس سے انھیں کوئی دلچسپی ہوتی ہے بلکہ اس کے برعکس وہ اسے ایسے غیر مذہبی مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے کام میں لانا چاہتی ہیں جن کا مقصد طاقت، اقتدار اور دولت کا حصول ہے گویا کہ وہ مذہب کو ریاستی امور کے معنی میں "سیکولر" مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

کچھ لوگ سیاسی اور مذہبی دونوں ہی ہوتے ہیں لیکن وہ بالعموم سیاست میں فرقہ پرستی پھیلاتے ہیں اور ان کا زور اس بات پر ہوتا ہے کہ صرف ان کا دھرم ہی زندگی کے لیے ضابطۂ حیات ہے، اور مذہب اُن کو عقیدے اور شہری اور مُلکی امور کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس طرح کے دلائل لازمًا تعصب اور تنگ نظری کا پرچار کرتے ہیں، یہ دوسروں کے تئیں رواداری کے منافی ہیں۔ فرقہ پرستوں کی نعنیات، اخلاقی تعلیمات اور عالمگیر مذہبِ انسانیت کے تئیں نامانعیت کے سبب اُبھرتی ہے، حتیٰ کہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ تو اپنا مذہب بھی نہیں جانتے تو بے جا نہ ہوگا۔

فرقہ پرستوں کی تنظیمیں درحقیقت مذہب کو، مذہب، روحانیت یا نوعِ انسانی سے محبت کے لیے استعمال نہیں کرتیں اور نہ اس سے انھیں کوئی دلچسپی ہوتی ہے بلکہ اس کے برعکس وہ اسے ایسے غیر مذہبی مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے کام میں لانا چاہتی ہیں جس کا مقصد طاقت، اقتدار اور دولت کا حصول ہے گویا کہ وہ مذہب کو ریاستی امور کے معنی میں، سیکولر مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

اسی مقصد سے فرقہ واریت مذہب کو مسخ کردیتی ہے اور اسے سیاسی حلقۂ انتخاب میں بدل دیتی ہے۔ لہٰذا اخلاقی اصولوں پر مبنی ضابطۂ حیات کی جگہ جارحانہ سیاست کا دور دورہ ہوتا ہے اور اس سیاست سے ایسے ایسے مقاصد حاصل کرنے پر زور ہوتا ہے جن کا حصول بصورتِ دیگر ممکن ہی نہیں۔ لیکن فرقہ واریت کی تعریف کرتے کرتے اس بحث میں ہی اُلجھ کر نہ رہ جانا چاہیے، حالانکہ اس کی اپنی افادیت ہے۔

ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ فرقہ واریت ایک حالیہ نظریہ ہے جسے چالاک برطانوی حکمرانوں نے پھیلایا اور اسے سامراج مخالف دانشوروں کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے استعمال کیا گیا کیونکہ وہ مشترکہ اور متحدہ بھارتی ثقافت کے مضمرات سے بخوبی واقف تھے۔

لارڈ میکالے نے اُنیسویں صدی میں حقارت کے ساتھ تمام بھارتی زبانوں کو یہ کہہ کر مسترد کردیا تھا کہ ان کے ذریعے سے جدید علوم و فنون اور ان کا رکو آگے بڑھانا ممکن نہیں، مگر ایک طرح سے وہ اپنے ڈھنگ سے ہندوستان کی متحدہ اور مشترکہ تہذیب کو پاش پاش کررہا تھا، ماضی میں کسی بھی غیر ملکی حکمراں نے ایسا نہیں کیا تھا، اس کے برعکس شمال کی طرف سے آنے والی زبانیں اور ثقافتیں ایک دوسرے میں گھُل مل گئیں اور ان میں آزادانہ آپسی تبادلہ دیکھنے کو ملا، اور اس ارتباط اور اختلاط سے ہندی اور اُردو جیسی زبانوں نے جنم لیا اور مشترکہ کلچر معرضِ وجود میں آیا۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد، برطانیہ نے ایک ایسا دُوررس سیاسی نظامِ کار وضع کیا جس کے ذریعے ہندوستانی وحدت کی اس اعلیٰ صفت اور اس اعلیٰ صلاحیت کو ختم کیا جاسکے جو ثقافتی تنوع کی مظہر تھی، کیوں کہ یہی وحدت تو سامراج دشمن متحدہ محاذ بنانے کے لیے اہل تھی، اور اس ضمن میں درکار داخلی صلاحیتوں سے مزیّن تھی۔ ان غیر ملکی اور بدیشی حکمرانوں نے سرکاری ملازمتوں میں مذہب، ذات پات، فرقہ بندی پر زور دیا اور اس کے ساتھ ہی زبانوں کو بھی آلۂ کار بنایا پھر یہی طریقہ اور ترکیب ووٹ دینے کے لیے بھی کام میں لایا گیا، رائے دہندگان میں اسی طرح کے نظریات کو پھیلایا گیا۔ ان طریقوں سے مُلکی اتحاد کو زبردست نقصان پہونچا۔ ووٹ دینے کے جُداگانہ طریقِ کار کے نظام اور ملازمتوں میں مذہب کی بنیاد پر نشستوں کے تحفظ سے مذہبی اور فرقہ وارانہ جذبات کو اہمیت حاصل ہوگئی۔ اب ملک عوام خود کو بھارتی باشندے کے روپ میں نہیں

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد، برطانیہ نے ایک ایسا دُوررس سیاسی نظامِ کار وضع کیا جس کے ذریعے ہندوستانی وحدت کی اس اعلیٰ صفت اور اس اعلیٰ صلاحیت کو ختم کیا جاسکے جو ثقافتی تنوع کی مظہر تھی، کیوں کہ یہی وحدت تو سامراج دشمن متحدہ محاذ بنانے کے لیے اہل تھی، اور اس ضمن میں درکار داخلی صلاحیتوں سے مزیّن تھی۔

ایس۔ ایم۔ جوشی

علیحدگی پسند عناصر کو شکست دیجئے

مصنّف جو گاندھی جی کے عقیدت مند مقلّد اور اعلیٰ سطح کے مجاہد آزادی ہیں' اُن کا بیان ہے کہ نفرت سے نفرت اور محبت سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ فرقہ پرستی کی موجودہ لہر کا تجزیہ کرتے ہوئے اُنھوں نے مشورہ دیا ہے کہ اگر ہمیں تیز رفتاری سے ترقی کرنا ہے تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم انتشار پسندانہ قوتوں کے ہاتھوں میں نہ کھیلیں۔

قومی یک جہتی کے عمل کی رفتار میں کیونکر تیزی لائی جائے' یہ ایک بہت بڑا سوال بن گیا ہے۔ اس امر کے پیش نظر کہ افراتفری اور انتشار پسندی کی قوتیں فرقہ پرستی اور علاقہ پرستی کی صورت میں اپنا ناپاک سر اٹھا رہی ہیں' اس سوال کا شدید صورت اختیار کرنا قدرتی ہے۔ صرف اس سوال کا دُرست جواب ہی ملک کی سالمیت اور یک جہتی کو بچا سکتا ہے اور اس کی بلا روک ٹوک ترقی کو یقینی بنا سکتا ہے۔

اس مشکل سوال کا حل تب تک تلاش نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس لفظ کو موزوں طور پر سمجھ نہ لیا جائے۔ یہ لفظ ہمارے عوامی رہنماؤں اور کارکنوں کی طرف سے آزادانہ طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ پردھان منتری سے لے کر گاؤں کے سرپنچ یا گرام پردھان تک ہر ایک قومی یک جہتی کے لیے کام کرنے کی ضرورت پر زور دے رہا ہے۔ مجموعی طور پر اس کا مطلب بھارتی قوم پرستی ہے۔ بھارتی قوم پرستی کے تصور نے غیر مُلکی غُلامی سے ہماری جدوجہد آزادی کے دوران فروغ پایا تھا۔

قوم کا تصوّر

لفظ قوم صدیوں سے مستعمل ہے۔ یہ یورپی تصوّر ہے۔ یہ اُس وقت وجود میں آیا تھا جب یورپ میں متعدد قومی مملکتوں نے جنم لیا تھا جن پر بادشاہ حکومت کرتے تھے۔ اُن کی حکومت ایک ایسے علاقے تک محدود تھی جو ایک خاص زبان بولتے تھے جیسے کہ انگریزی' فرانسیسی اور جرمن وغیرہ۔ اس سے پہلے اس بات سے قطع نظر کہ وہ کونسی زبان بولتے تھے اُن پر مذہبی پیشوا کو فرماں روائی حاصل تھی۔ روحانی اور دُنیاوی معاملوں میں پوپ کی فرماں روائی سب سے برتر تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ جوں جوں سماج سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کرتا گیا سماجی تبدیلی کے عمل کی رفتار تیز ہوتی گئی جس سے پوپ کی قطعی فرماں روائی چیلنج سے اچھوتی نہیں رہ سکی۔ دُنیاوی معاملوں میں بادشاہوں نے اُسے چُنوتی دی اور خاص ہم آہنگ لسانی علاقوں میں اپنا اقتدار قائم کر لیا گیا جس سے بادشاہت کا ادارہ وجود میں آیا۔ اس کا حصول ایک دن میں نہیں ہوا۔ دونوں کے درمیان برسوں تک اقتدار کی جدوجہد جاری رہی جس کے بعد ہی پوپ نے بادشاہوں کے سامنے ہتھیار ڈال دئے اور یہ کہاوت مشہور ہو گئی کہ "جو کچھ بادشاہ کا ہے وہ بادشاہ کو دیدو"۔

لیکن بھارت میں حالات مختلف تھے۔ اوّل تو تمام دنیاوی معاملوں میں کوئی مذہبی پیشوا حکومت نہیں کرتا تھا۔ یہ کام بادشاہوں کو سونپا گیا تھا جو عوام پر حکومت کرتے تھے۔ وہ بھی عوام کے

رسم و رواج اور روایات سے بندھے ہوئے تھے۔ دوئم تمام برِصغیر کا کوئی واحد سیاسی وجود نہیں تھا۔ یہاں کئی بادشاہ اور راجے تھے جو اپنے متعلقہ علاقوں پر حکومت کرتے تھے، گو کبھی کبھی اُن میں سے بعض دوسرے حکمرانوں پر اپنی بالادستی قائم کرلیتے تھے اور خود کو شہنشاہ کہلاتے تھے۔

اس کے باوجود کبھی کوئی ایسا وقت نہیں آیا جب کسی واحد شہنشاہ نے تمام برصغیر پر حکومت کی ہو۔ بلاشبہ متعدد زبانوں، مذہبوں اور نسلوں کے باوجود جہاں تک بھارتی ثقافت کا تعلق ہے، یہ ایک واحد اکائی تھا۔ یہ ثقافتی اتحاد اور تسلسل اس لیے ممکن ہوا کیونکہ بھارتی سماج نئے خیالات اور تصورات کو قبول کرلیتا تھا خواہ وہ کسی بھی سرچشمہ سے آئے ہوں۔ جب بھی نئے خیالات اور تصورات آئے انھوں نے کشمکش اور تضاد پیدا کیے۔ لیکن عوام میں دونوں کے درمیان امتزاج پیدا کرنے کا جوہر تھا، یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ بھارتی سماج کیوں تمام ادوار میں بقاء حاصل کرسکا جبکہ دوسرے لوگوں کو زوال آیا اور وہ بعد میں ختم ہو گئے۔

بُنیادی اتحاد

جب برہمن واد اپنے ذات پات کے نظام کے ساتھ کٹر ہو گیا اور اُس نے سماجی نابرابری کے نظام کو نہیں بدلا تو گوتم بُدھ اپنے دھرم کے ساتھ جلوہ گر ہوئے۔ اس سے کشمکش پیدا ہوئی جو انجام کار حل ہو گئی۔ گو اس حل سے پسماندہ طبقوں کو پورا انصاف نہیں ملا لیکن اس ٹکراؤ سے بھارتی عوام کا بُنیادی اتحاد ختم نہیں ہوا کیوں کہ برابری کے مخالفوں نے کم از کم سطحی طور پر اُن کی تعلیمات کے ایک حصّے کو ضم کر لیا۔ اسلامی فاتح باہر سے آئے، وہ ہماری سماجی نابرابری کے باعث اپنے اقتدار کے لیے ایک سماجی بُنیاد قائم کرسکے۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کے درمیان امتیازات نے پسماندہ طبقوں کے دلوں میں اُن کے لیے دوستی اور پیار پیدا کرنے کے لیے سازگار ماحول پیدا کیا۔ ہمارے ملک میں اسلام کے موجودہ پیروکار باہر سے نہیں آئے۔ ہمارے اپنے عوام نے اسلام قبول کیا کیونکہ اس نے مساوات کی اُمید دلائی، اُن میں سے بلاشبہ طاقت کے زور سے بعض کا مذہب تبدیل کیا گیا لیکن اُن کی تعداد بہت کم تھی۔ یہ بات زیادہ تر لوگوں کے بارے میں سچ نہیں ہے۔ ہمارے کچھ طبقے ہمارے اپنے عمل کے باعث اسلام میں جانے پر مجبور ہوئے، وہ عمل آج بھی جاری ہے۔ جس کا اظہار میناکشی پورم کے واقعات سے ہوا ہے۔

اکبر جیسے شہنشاہوں نے دونوں میں امتزاج پیدا کرنے کے لیے کوششیں کیں، لیکن انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ جب اورنگ زیب نے مذہبی تعصب سے کام لیا تو اُس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ٹکراؤ پیدا کیا اور اُنھیں بھڑکایا۔ چھترپتی شواجی نے اُس کی متعصبانہ مطلق العنانیت کے سامنے جُھکنے سے انکار کیا۔ اُس کا مقصد اس کشمکش کو دُور کرنا اور ہم آہنگی کو عمل میں لانا تھا۔ اُسے کامیابی

ہمارے ملک میں اسلام کے موجودہ پیروکار باہر سے نہیں آئے۔ ہمارے اپنے عوام نے اسلام قبول کیا کیونکہ اس نے مساوات کی اُمید دلائی اُن میں سے بلاشبہ طاقت کے زور سے بعض کا مذہب تبدیل کیا گیا لیکن اُن کی تعداد بہت کم تھی۔ یہ بات زیادہ تر لوگوں کے بارے میں سچ نہیں ہے۔

ہندو سماج غیر استدلالی نہیں ہے۔ اُس کے دروازے عقل و استدلال کے لیے کُھلے ہیں۔ وہ سماج کے بُنیادی اتحاد اور انسان دوستانہ دستورِ کار کو خطرے میں ڈالے بغیر نئے خیالات کا خیر مقدم کرنے کو ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کے تنوع میں اتحاد پایا جاتا ہے۔

ہوجاتی لیکن اُس کی بے وقت موت سے یہ کام
سرے نہیں چڑھ سکا۔ ہندو سماج غیر استدلال پسند نہیں
ہے۔ اُس کے دروازے عقل واستدلال کے
لیے کھلے ہیں۔ وہ سماج کے بنیادی اتحاد اور
انسان دوستانہ دستورِ کار کو خطرے میں ڈالے
بغیر نئے خیالات کا خیر مقدم کرنے کو ہمیشہ تیار
رہتا تھا، یہی وجہ ہے کہ بھارت کے تنوع میں
اتحاد پایا جاتا ہے۔

باوجود لوکمانیہ تلک اور مہاتما گاندھی کی طرف سے
کی گئی خصوصی کوششوں کے نتیجے میں مسلمان
قومی تحریک میں شامل ہوگئے۔ لیکن جب آزادی
کی منزل قریب آئی تو علیحدگی پسندانہ رجحانات نے
زور پکڑا اور وہ اُس پر چھاگئے۔ انتقالِ اقتدار
کے موقع پر جناح کی قیادت کے تحت مسلم لیگ کا
رویّہ سخت ہوگیا اور فرقہ پرستی کی متشددانہ لہر ملک
پر چھاگئی۔ اس کے نتیجے میں ملک تقسیم ہوگیا اور
پاکستان وجود میں آگیا۔
تلک اور مہاتما گاندھی کی عظیم اتحاد

سکتی ہے اور ترقی و پیش قدمی کرسکتی ہے۔ جدوجہد
آزادی کے دوران پسماندہ لوگوں سے جو وعدہ کیا
گیا تھا، اُسے پورا کرنا تھا۔ یہ صرف اُس صورت
میں ممکن ہے اگر ہم اپنے بھارتی سماج کی شاندار
میراث کا تحفظ کریں۔ ہندو دھرم دیگر مذاہب
سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ یہ ایک طرزِ زندگی
ہے اور ہندو کسی ایک واحد کتاب سے وابستہ
نہیں ہیں جو اُن کے لیے آخری ثبوت ہو۔ ہندو طرزِ
زندگی میں دوسرے مذاہب کی نسبت جو کسی
واحد کتاب سے وابستہ ہیں پُرانے نظام کو تبدیل
کرنا آسان تر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

ہمارے سماج کی خصوصیت ہے تنوع میں اتحاد۔ ہم اسے ادّعا پسندی کی نشوونما کے لیے ترک نہیں کرسکتے جو زیادہ عرصہ تک نہیں سکے گی۔ ہمیں ماضی کی اس بیش قیمت میراث کی حفاظت و تحفظ کرنا ہے۔ اس مقصد کے تحت اُن لوگوں کو جو اس میں یقین رکھتے ہیں، خود کو ہمت و استقلال کے ساتھ قومی یک جہتی کے کاز کے تئیں وقف کردینا چاہیئے۔

تحریکِ آزادی

جب انگریز آئے تو بھارت ایک سیاسی
اکائی نہیں تھا۔ ملک میں کئی حکمران اور راجے
تھے۔ وہ اکثر آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ انگریز
زیادہ تر نفاق، غیر استدلالی رویّہ اور سائنسی دستورِ
کار کے فقدان کے باعث اُن پر اپنا غلبہ جمانے میں
کامیاب ہوگئے۔ کچھ وقت کے اندر تمام برِّصغیر
انگریزی حکومت کے تحت آگیا۔
انگریز اپنے ہمراہ آزاد خیالی لائے۔ ہندوؤں
کے اعلیٰ طبقے نے جدید خیال و فکر کا خیر مقدم کیا اور
جب انڈین نیشنل کانگریس کے جھنڈے تلے تحریکِ
آزادی کا آغاز ہوا تو اس طبقے نے اُسے خوب پھیلایا۔
مسلمان نئے خیالات کو جذب کرنے میں قدرے
سُست رو تھے۔ سرسید احمد نے اس عمل کا آغاز کیا،
اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے

بدور مساعی کم از کم عارضی طور پر ناکام ہوگئیں۔
گئیں۔ جونہی پاکستان کی اسلامی مملکت کا قیام ہوا
ہندوؤں میں اس کا شدید ردِّ عمل ہوا اور باقیماندہ
ملک کے لیے ایک ہندو اسٹیٹ کی مانگ زور پکڑ
گئی جو مہاتما گاندھی کے قتل میں جاکر ختم ہوئی، جنھیں
اس مانگ میں رکاوٹ تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن اُن کی
شہادت رنگ لائی اور عوام کے دل و دماغ بھڑکنے
کے بجائے ٹھنڈے پڑگئے اور قتل و غارت کا
سلسلہ ختم ہوگیا۔ آئین ساز اسمبلی نے سیکولر قوم پرستی
میں اپنے اعتقاد کا اعادہ کیا اور ایک جمہوری آئین
منظور کرلیا جس میں تمام شہریوں کو مذہب،
ذات، نسل یا زبان کے امتیاز سے ماورا ہوکر مساوی حقوق عطا
کیے گئے۔ ہمارے قومی رہنماؤں کا یقین تھا کہ
نئے ماحول میں صرف ایک سیکولر اسٹیٹ ہی ایک

ہماری تہذیب اور ہمارا سماج صدیوں سے زندہ
رہتا چلا آرہا ہے جبکہ دوسرے سماج آئے اور
ختم ہوگئے ہمارے سماج کی خصوصیت ہے تنوع
میں اتحاد۔ ہم اسے ادّعا پسندی کی نشوونما کے لیے
ترک نہیں کرسکتے جو زیادہ عرصہ تک نہیں سکے گی۔
ہمیں ماضی کی اس بیش قیمت میراث کی حفاظت و
تحفظ کرنا ہے۔ اس مقصد کے تحت اُن لوگوں کو
جو اس میں یقین رکھتے ہیں خود کو ہمت و استقلال
کے ساتھ قومی یک جہتی کے کاز کے تئیں وقف کر
دینا چاہیئے۔
نئے آئین کے تحت ہمارے وسیع خیال
لیڈروں کی بدولت ہمارے ملک نے قابلِ تعریف
ترقی کی ہے۔ دُنیا کے اس حصے میں متعدد ممالک

آزاد ہوئے ہیں، لیکن ہمارا ملک واحد ملک ہے جس نے جمہوریت کے لیے لڑائی کی ہے اور اس کا تحفظ کیا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں اب دوسرے ملکوں میں ڈکٹیٹر شپ چھائی ہوئی ہے۔

علیحدگی پسند قوتوں کو شکست دو

ہماری ترقی اور کامیابی کی جانب دُنیا کی توجہ مبذول ہوئی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری ترقی اور کامیابی بعض طاقتوں کے لیے حسد کا باعث بن گئی ہے اور وہ ہمیں کمزور بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ ایک بار پھر فرقہ پرست طاقتوں کو بھڑکانے اور ہماری ترقی میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں احتیاط سے کام لینا ہے کہ ہم ان کے ہاتھوں میں نہ کھیلیں۔ سر دست فرقہ پرست قوتوں نے سر اٹھایا ہوا ہے۔ اگر ہم تیز رفتاری سے ترقی کرنے کا عزم کئے ہوئے ہیں تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اُن کے ہاتھوں میں نہ کھیلیں۔ پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس پر متشددانہ ردِعمل سے کوئی بات نہیں بنے گی، اس کے لیے کسی ایک خاص فرقہ کے خلاف غصّے اور تشدد کے اظہار سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہمیں یہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ آج بھارت میں جتنے مسلمان آباد ہیں اتنے افراد خود پاکستان میں نہیں۔ انھیں بھارت کے شہریوں کی مانند مساوی حقوق حاصل ہیں۔ کسی ایک گروپ یا فرقہ کے خلاف نفرت پیدا کرنا ہمارے ملک کے مفاد کے منافی ہے۔ یہ قوم دُشمنانہ فعل ہے۔ اس سے علیحدگی پسندانہ جذبات پیدا ہوں گے۔ یہ ٹھیک وہی کام ہے جو ہمارے دُشمن چاہتے ہیں کہ ہم کریں۔ فرقہ پرستی کا زہر ہمیں تباہ کردے گا۔

لہٰذا ہمارے تنوع میں اتحاد کے نظریے کو جس کی بنا پر گاندھی جی نے بھارتی قوم پرستی کی تشریح کی تھی۔ ہماری قومی زندگی میں ہم میں سے ہر ایک کو عمل میں لانا ہوگا۔ فرقہ پرستی اور تعصب پسندی کی قوتوں سے لڑنا اور انھیں شکست دینا ہوگی اور اس کے لیے جوڑنے والی قوتوں کی افزائش میں مدد دینا ہوگی۔ جو لوگ ذات، عقیدے یا مذہب کی بنا پر کسی طبقے کے خلاف نفرت پھیلاتے ہیں اُن سے لڑنا ہوگا اور انھیں شکست دینا ہوگی۔

> **کسی ایک گروپ یا فرقہ کیخلاف نفرت پیدا کرنا ہمارے ملک کے مفاد کے منافی ہے۔ یہ قوم دُشمنانہ فعل ہے۔ اس سے علیحدگی پسندانہ جذبات پیدا ہوں گے۔ یہ ٹھیک وہی کام ہے جو ہمارے دُشمن چاہتے ہیں کہ ہم کریں۔ فرقہ پرستی کا زہر ہمیں تباہ کردے گا۔**

حکومت اپنی پوری طاقت کے ساتھ بیرونی جارحیت اور اندرونی انتشار پسندی کیخلاف لڑے گی۔ غصّے میں آکر اپنے ہاتھوں میں قانون لینے سے قومی یک جہتی کے کاز کو نقصان پہنچے گا۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم عوام میں "انسانی بھائی چارے" کے جذبات پیدا کرکے اُنھیں متحد کریں۔ ہمارے قوم پرستی کے تصور کی جڑیں انسان دوستی میں سمائی ہوئی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض نہایت ترقی یافتہ ممالک بھی اُس راہ کے پاس آرہے ہیں جو گوتم بدھ اور مہاتما گاندھی نے دکھائی تھی۔

کرنے لائق کام

فرقہ پرستی اور علاقہ پرستی کی بڑھتی ہوئی قوتوں کے نتیجے میں بھارتی سماج کو چنوتی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ سر دست پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس کی وجہ سے دونوں فرقوں میں غصّہ اور نفرت پیدا کی جا رہی ہے۔ اس فرقہ پرستی اور تعصب پسندی کی لہر کے پیشِ نظر ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنا دماغی توازن نہ کھوئیں اور اپنے عوام کو سمجھائیں بُجھائیں اور انھیں صحیح سمت میں لے جانے کی کوشش کریں۔ یہ سچ ہے کہ موجودہ وقت میں جبکہ ماحول غصّے اور نفرت سے بھرا جا رہا ہے، ہماری بات کو کوئی نہیں سُنے گا، لیکن مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ ایک عارضی مرحلہ ہے اور حالات بہت جلد بدل جائیں گے۔ صرف بھارتی عوام ہی نہیں بلکہ تمام نسل انسانی گاندھی جی کی تعلیمات کو لبیک کہے گی اور اُن پر عمل کرے گی اور قومی یک جہتی کی راہ کا رُخ اختیار کرے گی۔ اس سے انجام کار مجموعی طور پر نوعِ انسانی کی یک جہتی عمل میں آئے گی۔ ہمارے سامنے یہ جو کام ہے اُسے صبر و استقلال اور پختہ ارادے سے انجام دینا ہوگا۔ ●

پروفیسر این۔ جی۔ رنگا

سیکولرازم اور مذہبی کٹّرپن

حصولِ آزادی کے بعد کے واقعات کا دلیری کے ساتھ بیباکانہ تجزیہ کرتے ہوئے پارلیمنٹ کے برگزیدہ رکن پروفیسر این۔ جی رنگا نے ملک میں انتشار پسند طاقتوں کے ساتھ لڑنے کے لیے بیش قیمت تجاویز پیش کی ہیں۔ انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ جب تک ہم ایک پارٹی کی حکومت سے متعلق برطانوی طریقِ کار پر عمل پیرا رہیں گے مکمل قومی یک جہتی کے مقصد کو حاصل کرنا مشکل ہوگا۔

بھارت میں سیکولرازم کو اس لیے قبول کیا گیا تھا کہ وہ جمہوریت کی نشو ونما کے لیے ایک بنیاد کا کام دے گا۔ ہمارے آئین کے بانی بزرگوں نے اس امر کو پہلے سے ہی طے شدہ تصور کر لیا تھا کہ ایک بار مسلم کٹرپن پر مبنی پاکستان کے معرضِ وجود میں آجانے سے اور بھارت ورش یا بھارت بھومی کے تئیں عقیدت کے قدیمی تصور اور نظریئے کی جگہ تمام مذاہب کے تئیں اقوام کے نظریے کے فروغ سے، ہمارے ملک میں مروجہ مذاہب کے درمیان رواداری پیدا ہو سکے گی اور قومی زندگی کے ہر پہلو پر اس کے اثرات کو محسوس کیا جا سکے گا۔ اُن کی یہ کبھی خواہش نہیں تھی کہ سیکولر بھارت مذہب سے یا خدا کی عبادت کے اُن متعدد طریقوں سے مُنہ موڑ لے جنھیں مختلف مذاہب کے پیرو کار نے اپنا رکھا ہے لیکن وہ نسبتاً اس امر کے خلاف تھے کہ کسی ایک مذہب کے لوگ بھارت کے کسی حصے کو اپنے ہم مذہبوں کی اجارہ داری بنا لیں، اور تمام دوسرے لوگوں کو اپنے الگ علاقے کی شہریت کی حدود سے نکال باہر کریں۔

قوم پرست یہ جان کر رنجیدہ خاطر ہوئے کہ ہندوؤں، عیسائیوں، سکھوں اور مسلمانوں کی صفوں میں ایسے سماجی عناصر موجود ہیں جو انتشار پسند اور پھوٹ ڈالنے کی غرض سے ذات پات پر مبنی نظام سے تعلق رکھتے ہیں۔ قوم پرستوں کو اس بات پر بھی شبہ تھا کہ مغربی طرز کے انتخابات سے، جن کے تحت ووٹ دینے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے، کم سے کم ایک مذہب کے پیرو کار بھی آپس میں متحد رہ سکیں گے۔ گویا کہ اُبھرتے ہوئے قوم پرورانہ رُجحانات کی صلاحیت بھی مشتبہ ہوگئی کیونکہ کانگریس پارٹی اپنے اُمیدوار کھڑے کرنے کے معاملے میں اپنی پارٹی کے لوگوں اور بیشتر طبقوں کی ابتدائی وفاداری کے لیے مراعات دینے پر مجبور ہو گئی۔ جو وہ اپنی ذات کے بارے میں رکھتے تھے۔ بلاشبہ بالغوں کے حقِ رائے دہندگی کی بنا پر لڑے جانے والے انتخابات کے دوران اور وزارتوں کی تشکیل میں بھی کانگریس لیڈروں پر زیادہ سے زیادہ الزامات لگائے گئے کہ وہ ذات پات کے نظام کو مراعات دے رہے ہیں۔ کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کو بھی کانگریس سے الگ ہونے کے بعد ذات پات کی وفاداریوں کے بڑھتے ہوئے زور کے سامنے اسی طرح جھکنا پڑا جس طرح کانگریس جھک رہی تھی۔

ذات پات اور مذہبی تعلق: درحقیقت

ذات پات اکثر اتنا ہی بڑا انتشار پسندانہ عنصر
ثابت ہوتی ہے جتنا بڑا مذہبی ناروا داری —
انتخابی مہم، اقتدار کی بھوک اور جمہوری طرز حکومت
سے اٹھائے جانے والے ناجائز فوائد سے ذات
پات کے غلبے، ذاتوں کی باہمی رقابت اور باہمی

اور مذہب کو کوئی دخل حاصل نہیں تھا۔
کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں؟ ہم چالیس برس
سے ذات پات اور مذہبی سیاست بازی کی جس
بدعت کو اپنائے ہوئے ہیں اس پر کیوں کر قابو
پا سکتے ہیں؟۔
مجھے خدشہ ہے کہ ہم دہائیوں پرانے علیحدگی
پسندانہ ذات پات کے
قبیلہ جاتی نظام اور مذہبی
غلبے کی بالادستی کے عظیم
اور مہیب کام کے خلاف
کوئی بھی کامیابی تب تک
حاصل نہیں کر سکتے جب

یک ایک پارٹی کی حکومت، یا وزارتوں یا قیادت
کے برطانوی طریق کار کی پیروی کرتے رہیں گے اور،
سیاسی اقلیت کو حکومتی امور میں شریک نہیں
کریں گے۔ ایسا اس لیے ہے کیوں کہ میں محسوس کرتا
ہوں کہ یہ ایک ووٹ کی اکثریت کی حکومت یا اس
کے استبداد کی بیہودگی اور پھوٹ پرست رجحانات
کا نتیجہ ہے۔ میں اس امر کی حمایت کرتا رہا ہوں کہ:
۱۔ سوئٹزرلینڈ کی مانند تمام پارٹیوں کی حکومتیں
قائم کی جائیں یا ۲۔ ایسی ملی جلی حکومتوں کا قیام کیا
جائے جو تمام نسلوں یا عقیدوں کے یکساں خیالات
والے جمہوریت پسندوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوں۔
بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت میں متناسب
نمائندگی دینا مناسب ہوگا لیکن مجھے خدشہ ہے کہ اس
سے ذات پات کو مزید تقویت مل سکے گی۔ ایک
یہ بھی تجویز ہے کہ مختلف پارٹیاں تمام تر متعلقہ
ریاستوں یا کافی بڑے حلقوں یا خطوں میں جو
سماجی، ذاتی، یا مذہبی عناصر کی بھی کافی نمائندگی
کرتے ہیں۔ کل جتنے ووٹ حاصل کر لیں ان کے
تناسب سے انھیں قانون ساز اداروں میں
نشستیں الاٹ کی جائیں۔
بعض ایسے خطوط پر تجربے کرنے کی ضرورت
ہے تاکہ غیر ذات والی پارٹیوں کو ہمارے قانون ساز

درحقیقت ذات پات اکثر اتنا
ہی بڑا انتشار پسندانہ عنصر
ثابت ہوتی ہے جتنا بڑا مذہبی
ناروا داری۔ انتخابی مہم،
اقتدار کی بھوک اور جمہوری طرز حکومت سے اٹھائے
جانے والے ناجائز فوائد سے ذات پات کے غلبے، ذاتوں
کی باہمی رقابت اور باہمی ناروا داری کو بہت
زیادہ بڑھاوا مل رہا ہے۔

ناروا داری کو ہمیشہ ہی بہت زیادہ بڑھاوا ملا ہے
تقریباً تمام سیاسی پارٹیاں جنھوں نے طاقت
اور پارلیمانی اہمیت حاصل کی ہے وہ زیادہ تر
ذاتوں کے گٹھ جوڑ کے گروہ بن گئی ہے۔ انتخابی
مہم کی رقابت کے جدید عنصر نے جمہوری سیاست
کو تباہ کرنے کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ لہٰذا
ہمیں اپنے ذہنوں کو صاف کرنا ہوگا کہ اگر سیکولرازم
کو جمہوریت پسندوں کو سیاسی طور طریقوں کی راہ دکھانی
ہے تو سیاسی پارٹیوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ
ذات پات اور مذہبی تعلیم جتانے سے احتراز
کریں —— ہمیں ۲۳-۱۹۲۰ء کے عدم
تعاون کے دور کی طرف توجہ دینی ہوگی۔ جب گاندھی ازم
کے ان طور طریقوں کو اپنایا گیا تھا جس میں ذات پات

مذہب یا ذات کے لحاظ سے کٹر پن قومی اتحاد کا
عظیم ترین دشمن ہے۔ کسی بھی مذہب کے غلبے
کی بالادستی عوام کی آزادی کی نفی ہے جو ایک
جمہوری نظام میں رہنا چاہتے ہیں۔ ذات اور مذہب
کا کٹر پن مدتوں سے بھارت کی سماجی ترقی کا دشمن
رہا ہے۔

بکم تا ۲۸ فروری ۱۹۸۷

اداروں میں کافی نمائندگی حاصل کرنے کا زیادہ موقع ملے۔

مذہب بالذات کے لحاظ سے کٹرپن قومی اتحاد کا عظیم ترین دشمن ہے۔ کسی بھی مذہب کے غلبے کی بالادستی عوام کی آزادی کی نفی ہے جو ایک جمہوری نظام میں رہنا چاہتے ہیں۔ ذات اور مذہب کا کٹرپن صدیوں سے بھارت کی سماجی ترقی کا دشمن رہا ہے۔ یہ خیال کرنا غلط ہے کہ اسلام جس صورت میں کہ وہ مولویوں کی طرف سے عقیدے کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور جس صورت میں کہ وہ اورنگ زیب جیسے مسلم حکمرانوں کی طرف سے عمل میں لایا گیا ہے انتشار پسندانہ قوت تھی جس نے قومی اتحاد کے ظہور میں رکاوٹ پیدا کی۔ بلکہ اُن حکمرانوں نے بھی جو مختلف اوقات پر خونی جنگوں میں اُلجھے رہے اور "بدھ ازم" اور "برہمن ازم" کے پیرو کار روکر (اشوک اور اکبر کے زمانے کو چھوڑ کر) ایک دوسرے کے خلاف لڑاتے رہے، ہمارے بھارت درش کو منقسم رکھا۔ اس طرح ہندوؤں نے عوام کی بہت بھاری تعداد کو قومی اتحاد، سماجی برابری اور ثقافتی جمہوریت کی اسپرٹ سے باہر رکھ کر قومی شیرازے کو منتشر رکھا۔

لسانی عصبیت بھی

لسانی عصبیت ہماری جمہوریت کا ایک اور انتشار پسند عنصر بن گئی ہے۔ اگر رابطے، بحث مباحثے، تبادلۂ خیال اور مفاہمت کے لیے صرف ایک ہی زبان ہو تو وہ حکومت کو جمہوری انداز پر لانے، آپس میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور باہمی تعاون کو بڑھانے میں انتظامیہ اور عوام کی مدد کر سکتی ہے لیکن بدقسمتی سے کٹرپنتھی اور نوآبادیاتی نظام سے متاثر ذہن رکھنے والے مقامی رہنما لسانی عصبیت کو ہوا دیکر اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس لیے وہ عوام کو زبان کے نام پر گمراہ کرتے ہیں اور زبان کی برتری اور ادّعائی رشتوں کو واضح کر کے قومی انتشار کو ہوا دیتے ہیں۔

موقع شناس اور جاگیردارانہ ذہن رکھنے والے مقامی لیڈر جو لسانی تعصب بھڑکا کر اقتدار حاصل کرنے کے درپے ہیں۔ عوام کو تعصب پسندی اختیار کرنے کے لیے گمراہ کر رہے ہیں اور ملک کو قومی انتشار کی طرف لے جا رہے ہیں۔ وہ اصرار کرتے ہیں کہ نواحی ریاستوں کی چھوٹی چھوٹی لسانی اقلیتوں کو صرف اُن کی زبان کے ذریعے ہی تعلیم دی جائے جبکہ متعلقہ اکثریتی ریاستوں کے لسانی تعصب پسند مطالبہ کرتے ہیں کہ اقلیتوں کی زبان کو نہیں بلکہ اُن کی اپنی زبان کو ترجیح دی جائے۔ اس طرح دونوں اطراف کے موقع شناس زبان کو قوم دشمن، تعصب پسندانہ اور انتشار پسندانہ قوت بنا رہے ہیں۔ حقیقی حل اس امر میں ہے کہ بچوں کو تین زبانیں سکھائی جائیں، مادری زبان کو پہلی ترجیح دی جائے، مقامی زبان کو دوسرا مقام دیا جائے اور مشترکہ قومی زبان کو تیسرا مقام دیا جائے اور اُسے ترجیحی طور پر اعلیٰ ثانوی تعلیم کے مرحلے میں پڑھایا جائے۔ ہمیں عہدِ ماضی کے راجاؤں کے زمانے کی اس جاگیردارانہ ہوس سے خبردار رہتے ہوئے زبان کے نام پر بعض مزید دیہات، تعلقوں یا ضلعوں پر "قبضہ" کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے۔ یہ اپنی مقامی زبان کے لیے وسیع تر علاقوں کے حصول سے متعلق قرونِ وسطیٰ کا جذبہ ہے جس پر قابو پانے کے لیے مقامی زبانوں کے شیدائی ناکام رہے ہیں اور اس کے نتیجے میں کرناٹک، مہاراشٹر، پنجاب، ہریانہ اور دارجلنگ میں فسادات ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ سے

لیکن موقع شناس اور جاگیردارانہ ذہن رکھنے والے مقامی لیڈر جو لسانی تعصب بھڑکا کر اقتدار حاصل کرنے کے درپے ہیں عوام کو تعصب پسندی اختیار کرنے کے لیے گمراہ کر رہے ہیں اور ملک کو قومی انتشار کی طرف لے جا رہے ہیں۔ وہ اصرار کرتے ہیں کہ نواحی ریاستوں کی چھوٹے چھوٹے لسانی اقلیتوں کو صرف اُن کی زبان کے ذریعے ہی تعلیم دی جائے، جبکہ متعلقہ اکثریتی ریاستوں کے لسانی تعصب پسند مطالبہ کرتے ہیں کہ اقلیتوں کی زبان کو نہیں بلکہ اُن کی اپنی زبان کو ترجیح دی جائے۔

ہمارے پردھان منتری کو اعلان کرنا پڑا ہے کہ ہم
اب زبان کی بنا پر مزید انتظامیہ تقسیم عمل میں
نہیں لاسکتے۔

مقامی علاقہ مقامی لوگوں کے لیے ہے
کیوں ؟ :- علاقے کے لوگوں

علاقوں سے آئے، جہاں قبائلی غالب اکثریت
میں آباد ہیں تو اسے سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان
علاقوں کے قبائلی بہت زیادہ پسماندہ ہیں اور
انھیں قومی زندگی کے بڑے دھارے میں لایا
جانا ضروری ہے۔

نام نہاد مقامی لوگوں کو زیادہ روزگار فراہم

زیادہ ریاستوں میں ممکن ہو، وہاں بڑے پیمانے
پر صنعتی، تجارتی اور سروس ادارے قائم کیے جائیں
جو روزگار کے زیادہ سے زیادہ امکانات پیش
کریں۔ اس طرح بیشتر لسانی اور ثقافتی علاقوں
کے بھارتی شہریوں کو مقامی آبادی میں کھپایا جا
سکتا ہے۔ ایسے کُل بھارت کی طرز کے چھوٹے
ثقافتی اور سماجی گروہوں کی موجودگی سے مقامی

> **نام نہاد مقامی لوگوں کو زیادہ روزگار فراہم کرنے کے لیے ملک کے اندر ہی پیدا ہونے اور پرورش پانے والے مساوی طور پر مستحق بھارتی شہریوں کو نظر انداز کرکے روزگار سے متعلق اُن کے مطالبے کو تقویت دینا بہت بڑی کوتاہ بینی ہے۔ خوش قسمتی سے میونسپلٹی میں تھوڑی سی عارضی تحسین حاصل کرنے کے باوجود اس قوم دشمنانہ مطالبے نے زور نہیں پکڑا۔**

> **"مقامی علاقہ مقامی لوگوں کا ہے" اور "انھیں روزگار میں ترجیح دی جائے"، ایسے گمراہ کُن نعروں سے لوگ قومی اتحاد، یک جہتی اور سیکولرازم کو برقرار رکھنے سے متعلق اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہوسکتے ہیں۔**

کو ہی روزگار وغیرہ میں پہلی ترجیح دینے کی مانگ
بمبئی شہر اور کرناٹک میں بعض لوگوں کی طرف
سے اٹھائی گئی تھی۔ ان میں کانگریسی اور غیر کانگریسی
لوگ شامل تھے جو مجموعی طور پر ملک کے تئیں
اپنی ذمہ داری سے قطعاً بے بہرہ تھے۔ یقیناً اسے
اور ایسے کسی بھی نعرے کو قبول کرنے سے قومی
یک جہتی کو جتنا نقصان پہونچ سکتا ہے اتنا اور
کسی شے سے نہیں پہونچ سکتا۔ اگر ایسا کوئی
مطالبہ دور افتادہ جنگلاتی خطوں میں ایسے

کرنے کے لیے ملک کے اندر ہی پیدا ہونے
اور پرورش پانے والے مساوی طور پر مستحق
بھارتی شہریوں کو نظر انداز کرکے روزگار سے
متعلق اُن کے مطالبے کو تقویت دینا بہت بڑی
کوتاہ بینی ہے۔ خوش قسمتی سے میونسپلٹی میں
تھوڑی سی عارضی تحسین حاصل کرنے کے باوجود اس
قوم دشمنانہ مطالبے نے زور نہیں پکڑا۔
اس کے برعکس اس تجویز کے بارے میں
بہت زیادہ کہا جا رہا ہے کہ جتنی زیادہ سے

لوگوں کو گوناگوں لیکن مربوط بھارتی سماج کا
رکن بننے میں مدد مل سکتی ہے۔ چنانچہ ہمیں اس
سمت میں احتیاط سے قدم بڑھانا ہوگا۔ "مقامی
علاقہ مقامی لوگوں کا ہے"۔ اور "انھیں روزگار
میں ترجیح دی جائے"۔ ایسے گمراہ کُن نعروں سے لوگ
قومی اتحاد، یک جہتی اور سیکولرازم کو برقرار رکھنے سے
متعلق اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہوسکتے ہیں۔
اس ضمن میں ہندی کو قومی زبان کے طور پر

مقبول عام بنانے سے متعلق اپنے جوش میں ہمیں احتیاط سے قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اُن غیر ہندی بھاشی عوام کے صحیح خدشات کا کم اندازہ نہیں کرنا چاہیئے جن کی مادری زبانیں مساوی طور پر ترقی یافتہ ہیں اور جن سے وہ والہانہ طور پر وابستہ ہیں جیسا کہ خاص طور پر تاملوں، تیلگوؤں، کنڑیوں، ملیالیوں اوڑیہ عوام اور حتیٰ کہ بنگالیوں کے معاملے میں ہے جن کے اپنے رسم الخط ہندی رسم الخط سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ اُن کے خدشات دُور کرنے اور اُنھیں ہندی قبول کرانے کے لیے جواہر لال جی اور اندرا جی نے سہ لسانی فارمولا کو مقبولِ عام بنانے کی کوشش کی۔ بدقسمتی سے ہندی کے پُرجوش حامی ہندی کے پھیلاؤ سے متعلق اپنی تحریک کے بارے میں علاقہ پرست، تنگ نظر اور بے صبر ہوتے جا رہے ہیں۔

ہندی کے مصنفوں، شاعروں اور عوامی لیڈروں کو دوسری زبانوں کے اپنے مدمقابلوں کو یقین دلانے کے لیے پوری پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ اُن کے علم و ادب کا احترام اور قدر افزائی کرتے ہیں۔ دونوں گروپوں نے قومی یکجہتی اور سیکولرازم کی اسپرٹ کی نشوونما کو بھاری نقصان پہونچایا ہے۔ ہم اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتے کہ ہماری ثقافتی اور مذہبی زندگی کے بیشتر شعبوں میں زبان نے تحریک، بصیرت اور روحانی طاقت عطا کی ہے۔

> **ہندی کے مصنفوں، شاعروں اور عوامی لیڈروں کو دوسری زبانوں کے اپنے مدمقابلوں کو یقین دلانے کے لیے پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ اُن کے علم و ادب کا احترام اور قدر افزائی کرتے ہیں۔ دونوں گروپوں نے قومی یکجہتی اور سیکولرازم کی اسپرٹ کے نشوونما کو بھاری نقصان پہنچایا ہے۔ ہم اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتے کہ ہماری ثقافتی اور مذہبی زندگی کے بیشتر شعبوں میں زبان نے تحریک بصیرت اور روحانی طاقت عطا کی ہے۔**

لہٰذا قومی اور ریاستی سطح کی ثقافتوں، وزارتوں، اور ثقافتی برگزیدہ ہستیوں کے لیئے یہ بڑی ضرورت ہے کہ وہ مزید وقت اور موقعہ ضائع کئے بغیر ہمارے اسکولوں، یونیورسٹیوں اور اُن کے ٹیچروں کی خدمات کو بروئے کار لائیں اور ثقافتی اور قومی یکجہتی، لسانی اور مذہبی اسپرٹ اور باہمی رواداری کے عمل سے متعلق فوری قومی ضرورت کے لیے طلبا کے دل و دماغ کو جیتیں۔ اس کے لیے درسی کتابوں کو از سرِ نو لکھنا ہوگا تاکہ بھارت کے تمام عوام کے مذاہب، زبانوں، داستانوں اور ثقافتی پہلوؤں کی اس ضرورت کو تقویت دے جائے جو وہ مشترکہ شہریت میں ایک ساتھ ترقی کرنے کے لیے رکھتے ہیں۔

ہمیں بھارت کے تمام مذاہب کے بچوں کے دل و دماغ کو ایسی تربیت دینی ہوگی جس سے اُن میں قومی یکجہتی اور اتحاد کا جذبہ پیدا ہو۔ ہمیں اپنے تمام قومی وسائل کو بروئے کار لاکر دل و دماغ، ثقافتی سرگرمیوں اور روزمرہ کی زندگی کو اتحاد کے لیے قومی ضرورت، بھارتی بھائی چارے کی حب الوطنی اور مجموعی طور پر دنیا سے متعلق مشترکہ قومی دستور کار کے ساتھ جوڑنا ہوگا۔

مجھے خوشی ہے کہ انسان دوستی میں یقین رکھنے والے ہمارے زیادہ سے زیادہ نوجوان منصوبہ ساز اور قانون ساز اُن بنیادی حقوق اور ہدایتی اصولوں میں اپنے اعتقاد کا اظہار کر رہے ہیں جنھیں ہمارے آئین میں مندرج کیا گیا ہے۔ آؤ ہم اقوام متحدہ، یونیسکو، NAM (غیر وابستہ ممالک کی تحریک) جیسی تمام تنظیموں کے ساتھ تعاون کریں جو انسان دوستی کو پیش آنے والی ان قومی اور بین الاقوامی چنوتیوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ آؤ ہم سیکولرازم اور رواداری کی جمہوری اسپرٹ میں ہاتھ بٹائیں جس کا پرچار وویکانند اور مہاتما گاندھی جیسے سنتوں نے کیا ہے۔ ●

مالکم ایس ادی سیشیہ

ہم آہنگی کے لیے نابرابریوں کو کم کیا جائے

انگریزی کے لفظ کمیونل نے ایک خاص معنی دینے شروع کئے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس سے خاص اور ایک دلچسپ مفہوم اخذ کیا جاتا ہے۔ فاضل مصنف نے اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے طبقاتی ٹکراؤ اور پُرتشدد واقعات کا تجزیہ کیا ہے، غریبی ہو یا اقتصادی نابرابری، دونوں ہی اسباب قومی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ ان کی رائے میں قومی یک جہتی کا مسئلہ، غریبی اور اقتصادی خوشحالی سے جڑا ہوا ہے، جس قدر غریب اور امیر کا فرق کم ہوگا اور نابرابریوں پر روک لگائی جاسکے گی، اسی قدر تناؤ کم ہو سکے گا۔ مصنف کی رائے میں ہر تعلیم یافتہ شخص کو اپنی عمر انسانی گروہوں کے تعلقات کو قریب لانے میں صرف کرنی چاہیئے تاکہ زبان، مذہب، اور دیگر وجوہ کی بنا پر رونما ہونے والے پرتشدد واقعات کا سدِ باب ہو سکے۔

قومی یک جہتی سے مراد قومی سطح پر یکسانیت لانے سے نہیں ہے۔ قومی یک جہتی قومی اتحاد بھی نہیں ہے، بلکہ وہ تو اس کا ایک نتیجہ ہے۔ قومی یک جہتی محض ایک ہندوستان کا ہی مسئلہ نہیں ہے۔ روس میں لسانی بنیادوں پر اتنی ہی ریاستیں ہیں جس قدر کہ ہندوستان میں، امریکہ میں مذاہب اور پھر ان کی شاخیں ہندوستان سے بھی زیادہ ہیں۔ ملائشیا اور سنگاپور میں تین ممتاز اور نمایاں نسلی طبقات ہیں جیسا کہ ہندوستان میں نہیں۔ کچھ افریقی ملکوں مثلاً کیمرون میں ہندستان کی بہ نسبت زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ فرانس میں ۱۹۶۲ء تک سیاسی پارٹیوں کی تعداد آج کی ہندوستانی سیاسی پارٹیوں سے بھی زیادہ تھی۔ لہذا بیشتر ملکوں میں یہ مسئلہ ہے کہ آبادی مشترک ہے، ان کے مقاصد مشترک ہیں، ان کے نظریات مشترک ہیں اور ان کی ذمہ داریاں اور درپیش مسائل مشترک ہیں۔

بھارت ایک بڑا اور وسیع و عریض ملک ہے۔ آبادی کے اعتبار سے چین کے بعد اسی کا نمبر آتا ہے، یہاں بہت سے مذاہب ہیں جو اختلافات کا موقع فراہم کرتے ہیں، کبھی کبھی یہ اختلافات پُرتشدد ہو جاتے ہیں۔ ہندو، مسلمانوں میں جھگڑے، ہندوؤں اور سکھوں کے جھگڑے اس کی واضح مثالیں ہیں۔ ان کو ہم بھارت میں فرقہ وارانہ تشدد یا جھگڑوں یا اختلافات کا نام دیتے ہیں۔ یہ ہندوستان کی ایک خاص بات ہے۔ انگریزی کا لفظ کمیونل کمیونٹی سے بنا ہے، جس کا مفہوم کسی ایک مذہب یا پیشے والوں کے طبقے یا فرقے سے ہے۔ دیگر ملکوں میں کمیونل کا لفظ ہندوستانی مفہوم سے مختلف ہے، وہاں اسے اجتماعیت کے معنوں میں استعمال کیا

...تا ہے، جیساکہ اجتماعی کارروائی، کسی فرقے یا طبقے کی میٹنگ (کمیونل میٹنگ)، یا ذات برادری یا طبقے کا فیصلہ۔ اس سے مراد وہ سبھی لوگ ہوتے ہیں جو کسی کام یا فیصلے میں شریک ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں زبانیں پُرتشدد اختلافات کا ذریعہ بنی ہیں، جیساکہ ہندی بولنے والی آبادی اور غیر ہندی علاقوں کی آبادی۔ یا کنڑ اور مراٹھی بولنے والوں کے درمیان اختلافات۔ یا گوا میں مراٹھی اور کونکنی زبانوں کے بولنے والوں کے درمیان اختلافات۔

مسئلہ یہ درپیش ہے کہ ہم بحیثیت قوم چند ظاہری اور خارجی بنیادوں پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، مثلاً ہمارا قومی ترانہ ایک ہے، ہم سب "جن گن من" پڑھتے ہیں، ہمارا ترنگا جھنڈا ہے۔ ہم سب یومِ آزادی، گاندھی جینتی، مل جل کر مناتے ہیں، ہم سب مل کر پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات لڑتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ سب ظاہری احوال ہیں۔ ان کے پسِ پردہ کوئی مشترکہ مقصد اور کوئی عظیم اور بھرپور ذمہ داری نہیں ہے۔

عظیم مقصد

میرے نزدیک قومی مقصد سے مراد یہ کی طرف لڑھک جائے۔ اس طرح سے دو قومی نظریہ باقی رہتا ہے۔ اس صورتِ حال سے قومی یک جہتی کے مسائل رونما ہوتے ہیں اور پھر مذہب، ذات پات، زبان، ثقافت یا سیاسی توڑ جوڑ کو کام میں لایا جاتا ہے جس سے مشترک زندگی ٹوٹ جائے اور لوگ ایک دوسرے کے خلاف آمادۂ پیکار ہوں۔ ایک گاؤں دوسرے کے خلاف ہو، ایک مذہب دوسرے کے خلاف ہو، ایک ذات دوسری ذات کے خلاف ہو، زبانوں کا ٹکراؤ ہو اور پارٹیوں کے درمیان اختلافات کو ہوا دی جائے۔ اس حقیقت کو جاننا ضروری ہے کہ ہم ایک قوم کے طور پر نہیں بلکہ دو قوم کے طرز پر جی رہے ہیں۔

قومی یک جہتی ایک ایسا نظام ہے جو مختلف طرح کے اختلافات کی موجودگی میں ملک کو ایک رشتہ میں منسلک رکھتا ہے۔ اور بحیثیت ایک قوم ہمارے فروغ میں معاون ثابت ہوتا ہے —— ایک ایسی قوم جس کا نصب العین اور جس کی ذمّہ داریاں مشترک ہیں۔

زبان، مذہب اور ثقافت کی بنیادوں پر اختلافات بھارت ایسے وسیع و عریض ملک میں غیر معمولی نوعیت نہیں رکھتے۔ اس کی آبادی ایک ارب سے تجاوز کرنے جا رہی ہے۔ ہندوستان میں ذات پات کا نظام یہاں کی ایک خصوصیت ہے، اس نے مختلف طبقات کو آپس میں بانٹا ہے یہ مذہب اور عقائد کی بنیاد پر بٹے ہوئے ہیں۔ چنانچہ قومی یک جہتی ایک ایسا نظام ہے جو مختلف طرح کے اختلافات کی موجودگی میں ملک کو ایک رشتہ میں منسلک رکھتا ہے۔ اور بحیثیت ایک قوم ہمارے فروغ میں معاون ثابت ہوتا ہے — ایک ایسی قوم جس کا نصب العین اور جس کی ذمہ داریاں مشترک ہیں۔

قومی یک جہتی کے ضمن میں سب سے بڑا ہے کہ ہم ایسی دوئیت (دو ہونے کے تصور) کو ختم کر دیں جس میں ہمارا ملک اور ہمارے عوام رہتے ہیں۔ یہ کام جس قدر جلد ممکن ہو کیا جانا چاہیئے۔ ہم سب بحیثیت ایک قوم کے ہوں، ہم سب اپنی مذہبی خصوصیات، اپنی اپنی ذات، زبان اور ثقافت کی موجودگی میں مربوط انداز میں مشترکہ اور ساجھے داری کی زندگی گذاریں۔

یہ دوئیت اس لحاظ سے ہمارے سماج میں خاص مقام رکھتی ہے کہ سماج کا ایک طبقہ اقتصادی طور پر خوشحال ہے اور دوسرا بدحال۔ ایک تیسرا طبقہ وہ ہے جو کسی وقت میں نہ تو اقتصادی طور پر خوشحال ہے اور نہ بدحال۔ اس کو ہر وقت یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ نہ معلوم کس وقت وہ بدحالی نام ہمارا مشترک ہے یعنی بھارت۔ ہمیں کسی ایک ایسے پروگرام کی تیاری کرنی چاہیئے جس سے یہ دوئی دور ہو سکے اور ملک کے سبھی عوام قومی زندگی کے اصل دھارے میں زندگی گذار سکیں۔ یہ تصورات محض خواب نہ رہیں، بلکہ حقیقت بن سکیں، ہمیں اس کے لیے مل جل کر کوششیں کرنی ہیں۔

اس دوئی کے دو رُخ ہیں، اسی لیے ہم ایک قوم نہیں بلکہ دو قومیں ہیں۔

ہمارے ملک کے عوام کی کثیر تعداد غریبوں پر مشتمل ہے، ہر رات اُن کو بھوکا سونا پڑتا ہے، وہ ناخواندہ، ان کے لیے طبّی علاج معالجے کی

سہولتیں نہیں ہیں، ان کے پاس رہنے کو مکان نہیں ہے۔ ہمارے موجودہ سماجی ڈھانچے نے دو قِسم کے مناظر پیش کر رکھے ہیں۔ ایک طبقہ امیروں کا ہے جو اقلیت میں ہے، وسائل پر اسے گرفت حاصل ہے، دوسرا بڑا طبقہ غریب ہے، اس کی اکثریت ہے، اس کے پاس بنیادی ضروریات زندگی بھی نہیں ہیں۔ اثاثہ جات کی غیر مساوی تقسیم نے یہ دُوری پیدا کی ہے، اس فرق کو روز بروز ہوا مل رہی ہے، جس سے صورتِ حال خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اقتصادی محاذ پر ہماری کامیابیوں کے باوجود یہ فرق بڑھ رہا ہے۔

غربت

تخمینہ جات مختلف ہیں، غریبی کے بارے میں مختلف طرح کے اندازے ہیں، غریبی کے ناپنے کے پیمانے چونکہ مختلف ہیں، اس لیے اندازے بھی مختلف ہیں۔ اقتصادی ترقی اور غریبی دُور کرنے کی سرکاری پالیسی کو آنکنے سے مختلف نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ غریبی ناپنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ان کو کیلوری کتنی مقدار میں ملتی ہے، ہر شخص کو ۲۱۰۰ سے لے کر ۲۴۰۰ کیلوری یومیہ درکار ہے، اس سے فی کس اوسط اخراجات ۱۰۷ روپے ماہانہ سے لے کر ۱۲۲ روپے ماہانہ تک ہیں۔ دوسرا طریقہ ہے پروٹین کی فی کس یافت۔ ایک اور بھی طریقہ ہے جس کے تحت کیلوری کے ساتھ ساتھ کچھ اور آئٹم مثلاً کپڑے اور مکان کی ضرورتوں کو بھی ناپا جاتا ہے۔ ساتویں منصوبے میں پہلے طریقے کے حساب سے ہمارے ملک کی ایک تہائی آبادی (۳۶٫۹ فیصد لوگ) غریبی کی زندگی گزار رہی ہے، پروٹین والے طریقے کی روشنی میں ۲۵ فیصد آبادی غریبی میں رہ رہی ہے، کیلوری اور دیگر آئٹموں والے طریقے کی بنیاد پر ملک کی ۶۰ فیصد سے زیادہ آبادی غریبی میں رہ رہی ہے۔ سرکار نے غریبی دُور کرنے کی جو پالیسی چلائی ہے اور اس کے لیے جو ترقیاتی پروگرام شروع کیے، ان کے تجزیے سے بھی یہ اختلاف سامنے آتا ہے کہ ہمارے ملک میں کتنے لوگ غریبی کی زندگی گزار رہے ہیں، ساتویں منصوبے میں کہا گیا ہے کہ ترقی کے پروگراموں اور سرکاری پالیسی کے نتیجے میں غریبوں کی تعداد نصف سے کم ہو کر ایک تہائی رہ گئی ہے، یعنی ۴۸٫۳ فیصد سے کم ہو کر ۳۷٫۴ فیصد رہ گئی ہے، ۷۸-۱۹۷۷ء میں کیے گئے نیشنل سیمپل سروے کی رُو سے یہ تعداد ۴۸٫۱۳ فیصد تھی، جو ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۳۷٫۴ رہ گئی تھی۔ دیگر طرح سے ان تجزیوں کی روشنی میں غریبوں کی تعداد میں اتنی کمی دکھائی نہیں دیتی، بلکہ آج بھی ملک میں ۴۵ فیصد آبادی غریب ہے۔

اِن اختلافات سے قطع نظر کرتے ہوئے ساتویں منصوبے کے اعداد و شمار کی روشنی میں ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۷۶ کروڑ ۵۰ لاکھ کی آبادی میں سے ۲۷ کروڑ ۲۲ لاکھ آبادی غریبی کے خط سے نیچے زندگی گزار رہی تھی، یہ اندازہ کیلوری کی بنیاد پر لگایا گیا ہے۔

نابرابری

دیہات میں اثاثہ جات کی ملکیت اور اراضی کی ملکیت کی نابرابری نیز شہری علاقوں میں حقیقی اسٹیٹ ملکیت اور کارپوریٹ نجی املاک کے درمیان فرق کا اندازہ درج ذیل اطلاعات سے لگایا جا سکتا ہے:-

ریزرو بنک آف انڈیا نے ۶۲-۱۹۶۱ء میں کُل ہند قرضہ اور سرمایہ کاری کا ایک سروے کیا، اس کے بعد ۷۲-۱۹۷۱ء میں کُل ہند قرضہ اور سرمایہ کاری کا دوبارہ سروے کیا، اس سے (تامل ناڈو کو چھوڑ کر) اثاثہ جات کی مالیت کی بنیاد پر دیہی گھرانوں کی تقسیم کا تناسب درج ذیل ہے:-

اس گوشوارے سے واضح ہوتا ہے کہ ۶۲-۱۹۶۱ء میں ایسے گھرانے جو ۵۰۰ روپے سے کم آمدنی رکھتے تھے، ۲۹٫۵ فیصد تھے۔ ان کے پاس دیہی اثاثہ جات کا ۱٫۲ فیصد تھا۔ ۷۲-۱۹۷۱ء تک وہ ۲۵٫۵۴ فیصد ہو گئے، لیکن دیہی اثاثہ جات میں ان کا حصّہ گھٹ کر ۰٫۸۶ فیصد رہ گیا۔ اس کے برعکس ۲۰ ہزار روپے اور اس سے زیادہ آمدنی والے گھرانوں کی تعداد

اثاثہ جات کی بنیاد پر زمرہ بندی	دیہی گھرانوں کا کُل اثاثہ جات میں فیصد حصّہ — گھرانے		کُل اثاثہ جات	
	۶۲-۱۹۶۱	۷۲-۱۹۷۱	۶۲-۱۹۶۱	۷۲-۱۹۷۱
۵۰۰ روپے سے کم	۲۹٫۵	۲۵٫۵۴	۱٫۲	۰٫۸۶
۵۰۰ روپے سے لیکر ۱۰۰۰ تک	۱۱٫۸	۱۲٫۵۹	۱٫۶	۱٫۳۰
۱۰۰۰ روپے سے لیکر ۲۵۰۰ روپے تک	۱۷٫۸	۱۶٫۰۱	۵٫۶	۳٫۹
۲۵۰۰ " " ۵۰۰۰ " "	۱۵٫۰	۱۳٫۵۹	۱۰٫۴	۷٫۲۲
۵۰۰۰ " " ۱۰,۰۰۰ " "	۱۲٫۱	۱۵٫۷۰	۱۷٫۷	۱۳٫۴۰
۱۰,۰۰۰ " " ۲۰,۰۰۰ " "	۷٫۵	۱۰٫۴۰	۲۰٫۲	۱۱٫۸۶
۲۰,۰۰۰ " " اور اس سے اوپر	۵٫۳	۸٫۱۵	۴۳٫۳	۶۰٫۴۴

۶۲-۱۹۶۱ء میں ۵۱٫۳ فیصد تھی جو بڑھ کر ۷۲-۱۹۷۱ء میں ۵۱٫۸ فیصد ہو گئی اور ان کے اثاثہ جات ۴۳٫۳ فیصد سے بڑھ کر ۶۰٫۴۷ دس فیصد ۱۹۶۱ء میں ۱۰ فیصد اثاثہ جات رکھتے تھے، اور ۱۹۷۱ء میں بھی یہی تناسب تھا۔ نچلی سطح کے ۳۰ فیصد گھرانے گرتے گئے، اور ان کے فیصد ہو جاتا ہے۔ ۲ ہیکٹیر سے کم اراضی والے جنھیں ہم چھوٹا کسان کہتے ہیں، کل کسانوں کی تعداد

اثاثہ جات کی غیر مساوی تقسیم نے دُوری پیدا کی ہے، اس فرق کو روز بروز ہوا مل رہی ہے، جس سے صورتِ حال خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اقتصادی محاذ پر ہماری کامیابیوں کے باوجود یہ فرق بڑھ رہا ہے۔

فیصد ہو گئے۔ اثاثہ جات کی ملکیت میں اتنا بڑا فرق نچلے تینوں زمروں میں دیکھنے کو ملتا ہے، یعنی ۵ ہزار روپے سے لے کر ۲۰ ہزار روپے اور اس سے اوپر تک۔ ان کے اثاثہ جات کا حصّہ ۲۱٫۸ فیصد سے بڑھ کر ۲۶٫۴۷ فیصد ہو گیا۔ کُل ہند بنیاد پر یہ دو سروے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ دیہی گھرانوں کے سب سے کم اثاثہ جات کے حصے ۱۹۶۱ء میں ۲٫۵ فیصد سے گھٹ کر ۱۹۷۱ء میں ۲ فیصد رہ گئے۔ اوپری سطح پر ۳۰ فیصد گھرانوں کا حصہ ۷۹ فیصد سے بڑھ کر ۸۱٫۹ فیصد ہو گیا۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ایک ہزار روپے سے کم اثاثہ جات والوں کو اگر غریب مان لیا جائے، تو ان گھرانوں کا تناسب ۱۹۶۱ء کے ۳۰ فیصد سے بڑھ کر ۱۹۷۱ء میں ۳۵ کے مقابلے ۷۲٫۶ فیصد ہیں مگر ان کے پاس کُل اراضی کا صرف ۲۳٫۵ فیصد ہے۔ قطعاتِ اراضی کی ملکیت کی تقسیم کے بارے میں بھی رجحان کا اندازہ لگانا چاہیئے۔ نیشنل سمپل سروے کے سولہویں اور چھبیسویں جائزے کی روشنی میں درجِ ذیل نقشہ سامنے آتا ہے:۔

زمین کی تقسیم اور اس کا رقبہ		گھرانوں کی تعداد کا تناسب		
ایکڑ	۱۹۵۹-۶۰	۱۹۷۱-۷۲	۱۹۵۹-۶۰	۱۹۷۱-۷۲
۰٫۹۹ ایکڑ تک	۶۰٫۴۲	۶۶٫۵۳	۳٫۴۳	۴٫۴۵
ایک تا ۲٫۴۹ ایکڑ تک	۱۷٫۰۹	۱۷٫۸۷	۱۳٫۷۶	۱۵٫۷۶
۲٫۵۰ – ۴٫۹۹ ایکڑ تک	۱۱٫۳۰	۱۱٫۳۹	۱۹٫۷۳	۲۱٫۸۴
۵٫۰۰ – ۷٫۴۹ ایکڑ تک	۴٫۵۴	۴٫۷۴	۱۳٫۵۰	۱۵٫۹۵
۷٫۵۰ – ۹٫۹۹ ایکڑ تک	۲٫۵۶	۱٫۹۹	۱۰٫۷۳	۹٫۲۶
۱۰٫۰۰ – ۱۴٫۹۹ ایکڑ تک	۱٫۸۸	۲٫۰۱	۱۱٫۰۹	۱۲٫۹۹
۱۵٫۰۰ – ۱۹٫۹۹ ایکڑ تک	۱٫۲۰	۰٫۷۲	۹٫۶۴	۶٫۷۳
۲۰٫۰۰ – ۲۴٫۹۹ ایکڑ تک	۰٫۳۴	۰٫۲۷	۳٫۵۶	۳٫۲۳
۲۵٫۰۰ – ۲۹٫۹۹ ایکڑ تک	۰٫۲۰	۰٫۱۵	۲٫۷۱	۲٫۲۴
۳۰٫۰۰ – ۴۹٫۹۹ ایکڑ تک	۰٫۲۷	۰٫۲۲	۵٫۲۱	۴٫۴۶
۵۰٫۰۰	۰٫۰۷	۰٫۰۹	۶٫۵۸	۳٫۰۵

اس نقشے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بارہ سال میں قطعاتِ اراضی کی ملکیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس عرصے میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ایک ایکڑ سے کم قطعاتِ اراضی والے کنبوں کی ۶۰ فیصد سے زیادہ تعداد اراضی کے صرف ۴ فیصد پر قابض تھی جبکہ ۵ تا ۲۰ ایکڑ اور اس سے بھی زیادہ قطعاتِ اراضی رکھنے والے گھرانوں کا ایک فیصد سے بھی کم تعداد قطعاتِ اراضی کے بارہ فیصد کی مالک رہی۔

مینوفیکچرنگ صنعتوں میں پبلک سیکٹر کو کارپوریٹ پراپرٹی اور دولت میں نابرابریوں کو دور کرنے کا ذریعہ تصور کیا گیا۔ اس کے پیچھے یہ فلسفہ کارفرما رہا کہ معیشت چند ہاتھوں میں مرکوز نہ رہے اور پرائیویٹ سیکٹر میں سرمایہ دار کا نفع دولت کے ارتکاز کا سبب نہ بنے، جس سے کہ آمدنی اور دولت میں فرق بڑھ جائے، اس لیے نفع کو سماج کے مفاد کے لیے کام میں لانے پر زور دیا گیا اور اسے آمدنی اور دولت کے فرق کو گھٹانے کا ذریعہ تصور کیا گیا۔

اس کے پیچھے یہ فلسفہ کارفرما رہا کہ معیشت چند ہاتھوں میں مرکوز نہ رہے اور پرائیویٹ سیکٹر میں سرمایہ دار کا نفع دولت کے ارتکاز کا سبب نہ بنے، جس سے کہ آمدنی اور دولت میں فرق بڑھ جائے، اس لیے نفع کو سماج کے مفاد کے لیے کام میں لانے پر زور دیا گیا اور اسے آمدنی اور دولت کے فرق کو گھٹانے کا ذریعہ تصوّر کیا گیا۔

مزید برآں پرائیویٹ سیکٹر پر صنعتوں کی ترقی اور ضابطہ بندی سے متعلق ایکٹ ۵۷-۱۹۵۶ کی رُو سے پابندیاں لگا دی گئی تھیں، یہ پابندیاں لائسنسوں کے اجرا کے نظام کے تحت تھیں، تجارت کو محدود کر دینے اور ان کی اجارہ داری کی روک تھام سے متعلق ایکٹ کے ذریعے انکو اور سخت کر دیا گیا تھا۔ ان کے ذریعے بڑے صنعتی گھرانوں کو قابو میں رکھا گیا۔ قیمتوں اور اشیاء کی تقسیم سے متعلق ضابطہ بندیاں بھی تھیں، اور مالی اور زر سے متعلق پالیسیوں کو آمدنی اور اثاثہ جات کی نابرابری کم کرنے کے لیے استعمال میں لایا گیا۔

اس نظام نے ۳۰ برس سے زیادہ عرصے تک کام کیا، اس عرصے میں یہ بات سامنے آئی کہ پبلک سیکٹر منافعوں کی تقسیم کو عوام تک پہونچانے کا ذریعہ نہ رہ سکا۔ کیوں کہ خام تیل اور پیٹرولیم کے سیکٹر کو چھوڑ کر باقی جگہ نفع ہی نہیں ہو سکا جسے عوام کی خدمت پر لگایا جا سکتا۔ پبلک سیکٹر خسارہ میں چلنے والی پرائیویٹ صنعتوں کے لیے ایک ہسپتال بن گیا۔ کیرالہ اور مغربی بنگال کو چھوڑ کر اشیاء کی تقسیم کے سرکاری نظام سے دیہی علاقوں کو فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ لائسنسوں کا اجرا سرکاری حکام اور بیوپاریوں میں بڑے پیمانے پر بدعنوانیوں کا اڈہ بن گیا ہے۔ تجارت کو محدود کر دینے اور اس کی اجارہ داری کی روک تھام سے متعلق کمیشن جسے مختصراً ایم آر ٹی پی کمیشن

پبلک سیکٹر خسارے میں چلنے والی پرائیویٹ صنعتوں کے لیے ایک ہسپتال بن گیا۔ کیرالہ اور مغربی بنگال کو چھوڑ کر اشیاء کی تقسیم کے سرکاری نظام سے دیہی علاقوں کو فائدہ نہیں ہو رہا ہے، لائسنسوں کا اجرا سرکاری حکام اور بیوپاریوں میں بڑے پیمانے پر بدعنوانیوں کا اڈہ بن گیا ہے۔

کے نام سے ب[illegible] اثر ہو کر رہ گیا ہے،
زر کی فراہمی اور قرض [illegible]یاں زیادہ تر بڑے
اور متوسط کارپوریٹ اداروں کی ضرورتوں کو
پورا کرتی ہیں، سوائے اس ۳۰ فیصد کے جو کہ
ترجیحی زمروں کو دیئے جاتے ہیں۔ گزشتہ ۳۰
برسوں میں افراط زر کی شرح ۷ فیصد رہی

مذکورہ بالا قول کی صداقت پرکھی جا سکتی ہے۔ اس
سے امیر زیادہ امیر ہو گئے اور غریب اپنی جگہ رہے:
دونوں کے درمیان فرق بڑھ رہا ہے۔
شہری اراضی اور املاک کی ملکیت کے بارے
میں چھٹے منصوبے میں مذکور ہے کہ اس بارے
میں اعداد و شمار کی فراہمی دشوار ہے، شہری
املاک کی ملکیت جاننے کے دو وسیلے ہیں۔

روپے اور اس سے اوپر کی ملکیت والوں کی اکثریت
ہے۔ یہ از خود روزگار والے گھرانوں کے زمرے
کے علاوہ ہیں۔ بالواسطہ اطلاع کا دوسرا
وسیلہ ہے "ہندوستان میں کالے دھن کے پہلو"
نامی رپورٹ۔ یہ پبلک فائننس اور پالیسی
سے متعلق ادارے نے مرتب کی ہے۔ اس کی رو
سے (۱) دلی میں ۵۲۰۲ گھرانوں کی فروخت سے
کالے دھن میں اضافہ ہوا جو ۱۱۹ کروڑ روپے سے

مینوفیکچرنگ صنعت اور تجارت کے فروغ کے ڈھانچے نے نابرابریاں بڑھائی ہیں، ریزرو بنک آف انڈیا ہر سال جو اعداد و شمار مرتب کرتا ہے، اور پرائیویٹ کارپوریٹ سیکٹر کی فرمیں جس طرح منافعوں کا اعلان کرتی ہیں اور سالانہ کاروبار کی جو نہج ہے، اسے دیکھ کر مذکورہ بالا قول کی صداقت پرکھی جا سکتی ہے۔ اس سے امیر زیادہ امیر ہو گئے اور غریب اپنی جگہ رہے۔

ہمیں سماج میں بڑھتی ہوئی نابرابری کو کم کرنا ہے، غریبی دور کرنے کے لیے یہ قدم اٹھانا ضروری ہے، یہ کام فاضل اراضی کی تقسیم کے ذریعے انجام پا سکے گا۔

ہے، اس سے بڑے بڑے مینوفیکچرروں کو فائدہ
پہونچا ہے اور غریب صارفین کا خون نچوڑا گیا
ہے۔ اس صنعتی منظرنامے کو دیکھتے ہوئے سرکار
نے رخ بدلا اور فراخدلانہ لائسنسوں کے اجرا کی
پالیسی اپنائی لیکن اس سے نابرابری کم نہ ہوگی۔
اس سے ظاہر ہوا کہ مینوفیکچرنگ صنعت
اور تجارت کے فروغ کے ڈھانچے نے نابرابریاں
بڑھائی ہیں، ریزرو بنک آف انڈیا ہر سال جو
اعداد و شمار مرتب کرتا ہے، اور پرائیویٹ کارپوریٹ
سیکٹر کی فرمیں جس طرح منافعوں کا اعلان کرتی ہیں
اور سالانہ کاروبار کی جو نہج ہے، اسے دیکھ کر

جنوری تا دسمبر ۱۹۸۲ء کے دوران نیشنل سیمپل
سروے کا ۳۷واں دور جس میں کہا گیا ہے کہ
(الف) ۹٫۶۰ فیصد گھرانے ایک لاکھ اور اس
سے اوپر کی املاک رکھتے ہیں۔ (ب) ۳۶ فیصد
پیداواری کاموں میں مصروف کارکن اور ۳۴ فیصد
سروس وغیرہ میں مصروف کارکن ۵ ہزار روپیہ
سے کم کی املاک رکھتے ہیں۔ (ج) از خود روزگار
والے گھرانوں میں فی گھرانہ قرضے کا اوسط (ان میں
جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، کارکنوں کی اکثریت ہے) دیگر
گھرانوں کے مقابلے دوگنا ہے۔ ان میں ایک لاکھ

لے کر ۲۴۵ کروڑ روپے تک ہے۔
بمبئی کی ۵۴۹ گھرانوں کی فروخت سے
۱۲٫۵ کروڑ روپے سے لے کر ۳۶٫۳ کروڑ
روپے تک کالا دھن بڑھا۔
۳۔ مدراس میں ۱۳۵۵۰ گھرانوں کی فروخت
سے ۳٫۷ کروڑ روپے سے لے کر ۶۷۸ کروڑ روپے
تک کا کالا دھن بڑھا۔ اس کے علاوہ سرکاری
شہری املاک کے ارتکاز کی مختصر تعداد کا گویا کہ
شہری گھرانوں کے دس فیصد سے بھی کم اور اکثریت

کی املاک کی عدم موجودگی (تقریباً ۰ء فیصد لوگوں کے پاس کے نہ ہونے) کا بھی اس رپورٹ میں ذکر ہے۔

پروگرام :-

اس طرح سے یہ دونوں صورتِ حال کو ہم کس طرح کم کر سکتے ہیں، ہمارا سماج جس طرح کی دوئی کا شکار ہے، اسے ہم کس طرح کم کر سکتے ہیں اور اسے مربوط انداز پر کیسے

ان کی قوتِ خرید بڑھانی ہے۔ منظم سیکٹر کے مزدوروں کی اجرتیں جس طرح سے مہنگائی کے سبب بڑھتی رہتی ہیں، اس طرح سے کھیت مزدوروں کی اُجرتوں میں اضافے کو یقینی بنانا ہے۔ اگر کھیت مزدور کی اُجرت اتنی ہو جس سے اس کا رہن سہن ٹھیک ہو جائے تو روزگار سے متعلق مختلف پروگرام مثلاً چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کا پروگرام دیہات میں تعلیم یافتہ افراد کے لیے روزگار کا قومی پروگرام، دیہات کے بے زمین افراد

ہزار ہیکٹر اراضی ہوئی، زراعت کی نئی ٹکنالوجی کی مدد سے پیداوار میں اضافے کے جو امکانات ہیں ان کو دیکھتے ہوئے کسی کے پاس ۸ تا ۱۰ ہیکٹر اراضی سے زیادہ ہونے کے لیے جواز نہیں بنتا۔

سرکاری بیان ہے کہ فاضل اراضی ۴ کروڑ ۲۸ لاکھ ہیکٹر ہے لیکن (۸۳-۱۹۷۸ء) کے پنجسالہ منصوبے کے مسودے میں مذکور ہے اور اس سے میں متفق ہوں کہ حقیقی طور پر فاضل اراضی ۱۲ کروڑ ہیکٹر اراضی ہے اس کی تقسیم کے ذریعے نابرابری کو کم کیا جا سکتا ہے اور غریبی دور کی جا سکتی

غریبی دور کرنے کے پروگرام کا تقاضہ ہے کہ ملک کے غریب عوام کی قوتِ خرید بڑھائی جائے، ہمارے پاس اس وقت ۳ کروڑ ٹن اناج کے فاضل ذخیرے ہیں، جو منصوبے کے آخر تک ۵ کروڑ ٹن ہو جائیں گے۔ لہٰذا ملک کے اُن غریبوں تک اناج پہونچنا ضروری ہے، جو رات کو بھوکے سوتے ہیں۔

یہ صرف تعلیم یافتہ طبقہ ہے جو تشدد کو ہوا دیتا ہے۔ یہ کام غریب نہیں کرتے۔

آگے بڑھا سکتے ہیں۔

سب سے پہلے غریبی دور کرنے کے پروگرام کو سنجیدگی سے آگے بڑھانے کی ضرورت ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک ایسے سماج کی طرف بڑھیں جہاں نابرابری کم سے کم ہو، غریبی دور کرنے کے پروگرام کا تقاضہ ہے کہ ملک کے غریب عوام کی قوتِ خرید بڑھائی جائے، ہمارے پاس اس وقت ۳ کروڑ ٹن کے فاضل ذخیرے ہیں، جو منصوبے کے آخر تک ۵ کروڑ ٹن ہو جائیں گے۔ لہٰذا ملک کے اُن غریبوں تک اناج پہونچنا ضروری ہے، جو رات کو بھوکے سوتے ہیں، اس کے لیے کھیت مزدوروں کی اُجرتوں کے کاموں کے ذریعے

کا پروگرام، دیہی نوجوانوں کی تربیت کا پروگرام مؤثر ثابت ہوں گے۔ اور دیہات کے عوام اور کارکنوں کی قوتِ خرید بڑھے گی۔

ہمیں سماج میں بڑھتی ہوئی نابرابری کو کم کرنا ہے، غریبی دور کرنے کے لیے یہ قدم اُٹھانا ضروری ہے۔ یہ کام فاضل اراضی کی تقسیم کے ذریعے انجام پا سکے گا۔ سب سے پہلے حقیقی طور پر فاضل زمین کی نشاندہی کرنی ہوگی، زمین کی بالائی حد کے قوانین کی موجودگی میں ۴۲ لاکھ مالکانِ اراضی ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک کے پاس دس ہیکٹر سے زیادہ اراضی ہے، جو کل اراضی کا ۲۶ء۳۷ فیصد ہوتے ہیں۔ اوسطاً یہ ایک کروڑ ۷۰ لاکھ ۴۰

ہے، دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام اسٹھہری غریبوں کے لیے از خود روزگار کے پروگرام وغیرہ کے ذریعے کوشش کی جا رہی ہے کہ مختلف اثاثہ جات مثلاً مویشی، ہینڈلوم، سلائی کی مشینیں، بائیسکل رکشا وغیرہ غریب اور محروم افراد کے ہاتھوں میں آ سکیں، اگر ان پروگراموں کو مقامی ضلع اور بلاک ترقیاتی منصوبوں میں شامل کر لیا جائے، اور ان کی رفتارِ ترقی پر برابر نظر رکھی جائے، ان پر مؤثر عمل درآمد ہو اور اس کے عمل درآمد میں سیاسی مداخلت نہ ہو، (جس سے یہ غریبوں کے پروگرام ہٹ کر خوشحال لوگوں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں)۔

تو ان کے ذریعے [illegible] نابرابری دُور ہوسکتی ہے اور بے سہارا لوگوں کے لیے اثاثہ جات مُہیّا کیے جاسکتے ہیں۔

اسی طرح سے شہری اراضی پر نگرانی اور اس کی ازسرِ نَو تقسیم ضروری ہے، شہری اثاثہ جات کی ملکیت کا جہاں تک سوال ہے، چھٹے منصوبے میں مذکور ہے کہ شہری اثاثہ جات میں نابرابری کم کرنے کے لیے استعمال میں لائے گئے مالی اقدامات اپنا اثر محدود طریقے پر ہی دکھا سکے۔ جس کے نتیجے میں کالا دھن پیدا ہوا۔ امید کہ ۸۷ ۔ ۱۹۸۶ء کے مالی بِل کی دفعات زیادہ مؤثر ثابت ہوں گی ان کے تحت شہری املاک کی خرید کے سلسلے میں ٹیکسوں سے بچت کے لیے اس کو کم قیمت پر ظاہر کرنے کے طریقوں کا سدِباب ہو سکے گا۔ ان تمام برسوں میں اب تک صرف ۳ قطعاتِ اراضی کو حاصل کیا جاسکا ہے، اس کے ساتھ ہی مینو فیکچرنگ اور تجارتی سیکٹر میں عملی پروگراموں کو بروئے کار لانا ہوگا۔

ہمارے یہاں مینوفیکچرنگ اور تجارتی سیکٹر میں ضابطہ پرستی اور کنٹرول وغیرہ کو نرم کرنے کے پروگراموں پر زور دیا جارہا ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں یہ بات سمجھنی ہوگی کہ ہماری اس ملی جُلی معیشت میں مینو فیکچرنگ صنعت اور تجارت نابرابریوں کو بڑھائے گی، اس رُجحان پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ چھوٹے پیمانے کے صنعتی سیکٹر کو زیادہ سرگرمی سے بڑھاوا دیا جائے۔ اس کام کو ایمانداری سے کرنا ہے کیوں کہ بے شمار یونٹ ایسے ہیں جو بڑی فرموں کی شاخیں ہیں۔ جو بے نامی ہیں۔ ترجیحی زُمرے کے لیے جو رقم قرض کے واسطے رکھی جاتی ہے، اس کا ۷۰ فیصد انھیں یونٹوں میں کھپ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ازخود روزگار والے ٹیکنوکریٹوں کی ہمت افزائی کرکے، اس بُرائی کو کم کیا جاسکتا ہے، یہ عجیب اتفاق ہے کہ چھوٹے پیمانے کے صنعتی سیکٹر کی ترقی کی شرح منظم بڑے اور متوسط سیکٹر کے مقابلے زیادہ ہے مجموعی قومی پیداوار میں اس کا حصہ ۳۰ فیصد ہے، ہماری برآمداتی آمدنی میں اس کا خصوصی حصہ ہے، چنانچہ پبلک سیکٹر کو ازسرِ نَو منظم کرنے کی ضرورت ہے جس میں انتظامی قوتوں اور اختیارات میں لامرکزیت لائی جاسکے، اس میں سول سروس حکام اور سیاسی افراد کی کم سے کم دخل اندازی ہو، اقتصادی طور پر نقصان میں چلنے والے اداروں کو سرکاری تحویل میں لیے جانے کا عمل بند ہونا چاہیئے تاکہ وہ اپنا منافع بڑھا سکیں۔ مالی پالیسیوں، دولت ٹیکس اور کارپوریشن ٹیکس، تحفہ ٹیکس، سرمایہ کے منافعوں کے ٹیکس، شہری اراضی پر ٹیکس وغیرہ کے ذریعے آمدنی، دولت اور املاک کی نابرابری کو کم کیا جانا چاہیئے۔ کم سے کم ضرورتوں کی تکمیل والے پروگراموں کو عملی شکل میں بڑھانا ضروری ہے تاکہ بنیادی نوعیت کی اشیاء کم آمدنی والے طبقات کو یقینی طور پر میسّر آسکیں۔

ہمارے سماج کے ڈھانچے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس سے غریبی دُور کرنا ضروری ہے، اور نابرابری کو کم سے کم کیا جانا ہے۔ اس وجہ سے منصوبے کی ترجیحات میں تبدیلی ضروری ہوگی۔

غریب اور خوشحال لوگوں کے درمیان تعلقات اور رابطے کو بڑھانا ہے، میرا یقین ہے کہ ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اس سمت میں کام کرنا چاہیئے یہ کام عمر بھر کرنا ہے، ایسا کرتے وقت مذہب، زبان وغیرہ کے نام پر تشدّد سے گریز کرنا ہوگا۔ یہ صرف تعلیم یافتہ طبقہ ہے جو تشدّد کو ہوا دیتا ہے۔ یہ کام غریب نہیں کرتے۔ قومی یک جہتی لانا اور غریب کی خدمت نیز نابرابری کو کم کرنا، یہ سب کام ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں۔

●

بقیہ: فرقہ وارانہ نظامِ سیاست ختم ہونا چاہیئے

بلکہ مذہب اور ذات پات کی بنیاد پر گننے اور سمجھنے لگے، چنانچہ جب محدود پیمانے پر میونسپل اور صوبائی خود مختاری ملی اس وقت علیحدگی پسندی اور انتشار پسندی کی نفسیات نے ملک کو متحد رکھنے کی کوششوں اور قوم پرورانہ جذبات کو زبردست نقصان پہنچایا۔ جداگانہ انتخابات نے سیاست اور فرقہ واریت میں گٹھ جوڑ قائم کیا، اس سے ملکی عوام کے مفادات میں ٹکراؤ ہوا۔ اس سے فسادات ہوئے، نوآبادیاتی نظام نے گاندھیائی فلسفۂ حیات اور سیاست کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کی، اس کے بدلے ہر طرح کے فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا ملی اور ان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

یہی نفسیات بدستور کام کرتی آرہی ہے۔ ہمارے دل و دماغ میں اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیئے کہ برطانوی حکمرانوں نے فرقہ وارانہ تنظیموں اور پارٹیوں کو قومی تحریک کے خلاف پوری طرح استعمال کیا۔ فرقہ واریت نے انتشار پسندانہ رول ادا کیا، یہ سب کچھ مذہب کے نام پر ہوتا چلا آیا ہے، اور ان پارٹیوں کی ریشہ دوانیاں آج بھی ہمارے قومی مقاصد کو نقصان پہونچا رہی ہیں۔

برطانوی حکمرانوں نے اگر فرقہ وارانہ سیاست کو جائز قرار دیا تو یہ اُن کی ضرورت تھی اور انھوں نے ایسا ایک مقصد کے تحت کیا لیکن آج کے دَور میں اس کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے، یہ تو سراسر نقصان کا سودا ہے اور اسے ہر قیمت پر ختم کیا جانا چاہیئے۔

●

سید مظفر حسین برنی

اقتصادی نابرابریاں ہی انتشار پسندانہ قوّتوں کو ہوا دیتی ہیں

فاضل مصنف کے خیال میں معاشرہ میں تمام تر اصلاحات کی کلید تعلیم ہے۔ وہ نہ صرف ایک قابل اور نامور منتظم ہیں بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے تاریخ کی مناسب اور غیر فرقہ وارانہ تشریح پر زور دیا ہے۔ ان کی رائے میں ماضی کی سماجی و معاشی صورتِ حالات اور نازک پہلوؤں پر اچھی طرح سے غور کئے بغیر تاریخ کا مسخ کیا جانا ہنوز جاری ہے کیونکہ اسے روکنے میں سُستی برتی جا رہی ہے۔ صاحبِ مضمون نے یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ سیکولرازم کے معنی نہ تو یہ ہیں نہ ہونے چاہئیں کہ ریاست کی جانب سے مختلف مذہبی گروہوں کی حوصلہ افزائی یا سرپرستی کی جائے۔ ان کا خیال ہے کہ انتشار پسند عناصر کا مقابلہ اُن معاشی نابرابریوں پر بھرپور حملہ کر کے کیا جانا چاہیئے، جو انسانی سماج کو کمزور کرتی ہیں اور فرقہ پرستی اور ظلمت پسندی یا اصلاح و ترقی کی مخالفت جیسی سماجی بُرائیوں کو پنپنے کا موقع دیتی ہیں۔

آج ملک ایک بحران سے گذر رہا ہے۔ انتشار پسند عناصر اپنا کام کر رہے ہیں اور ہم ہر چہار سمت خطرناک آثار دیکھ سکتے ہیں۔ دراصل ہم اس وقت تاریخ کے ایک نازک موڑ پر کھڑے ہیں اور ہمارے مستقبل کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم کیا راستہ اختیار کرتے ہیں اور کیسے اس چیلنج کا مقابلہ کرتے ہیں۔

جواہر لال نہرو کو اپنی غیر معمولی فہم و فراست اور دُور اندیشی کی بدولت پہلے ہی سے اُن مشکلات اور چیلنجوں کا علم ہو گیا تھا جو آج اتنے بڑے اور خوفناک بن گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خود کو قوم کی بہبود و بہتری کے ساتھ اس قدر وابستہ کر دیا تھا کہ ان کی دور اندیش نگاہیں یہ دیکھ سکتی تھیں کہ مستقبل میں کیا ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے سیکولرازم کے آدرشوں کے لیے وقف ایک سوشلسٹ اور جمہوری ری پبلک کی حیثیت سے بھارت کی ترقی اور عوام میں ایک ایسا سائنسی مزاج پیدا کرنے کے لیے منصوبے بنائے جن کے ذریعے اُن کمزوریوں کو رفتہ رفتہ دُور کیا جا سکے جو اندر سے قوم کی سالمیت کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔ وہ ہندوستانی معاشرہ کی مختلف برائیوں — مثلاً قدامت پسندانہ اعتقادات اور رسم و رواج، اصلاح و ترقی کی مخالفت، مذہبی جنون اور ذات پات، طبقاتی یا گروہی سیاست کے احکام کی آنکھ موند کر تعمیل وغیرہ کو جدید افکار و خیالات کی مدد سے دُور کرنے پر زور دیتے رہے۔ آج یک جہتی کا مسئلہ سخت تشویش کا موضوع بن گیا ہے اور یہی وہ عناصر ہیں جو اتنے سنگین مسائل پیدا ہونے کے لیے ذمہ دار ہیں۔ اگر نہرو کے ترقی کے پروگرام پر باقاعدہ عمل کیا جاتا

اس وقت تک بیشتر بدعتوں کا قلع قمع ہو چکا ہوتا اور ہماری قوم کو اپنی ترقی کے لیے ایک مضبوط اور ٹھوس بنیاد حاصل ہو گئی ہوتی۔ نہرو کے بعد بہت وقت گذر چکا ہے، اور

تعلق سے تمام عوام کے اندر ایک باہمی رشتہ پیدا کیا جا سکے اور انھیں ایک ایسے بھائی چارے کے بندھن میں باندھا جا سکے جس سے وہ ایک دوسرے کے رنج و غم میں شریک ہوں، اور مل کر ایک مضبوط سیکولر اور جمہوری سیاسی

قدامت پسندی اور آن از کار رفتہ اور معقولیت سے عاری اعتقادات کے بچے کھچے آثار کو جو ہمارے درمیان احیاء پرستی کے ذریعے خفیہ طور پر نئی زندگی حاصل کرتے جا رہے ہیں، دور کرنا ہونا چاہیئے۔ احیاء پرستی کے ذریعے لوگ قدیم مذہبی عقائد کو مذہبی جنون کی شکل میں نئی زندگی عطا کرتے ہیں۔ گو یہ کہا جا سکتا ہے

> ہمارے منصوبہ سازوں کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ تعلیم محض تکنیکی اہلیت یا فنی قابلیت پیدا کرنے یا سماج میں ترقی کے مواقع فراہم کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد ایسے بالغ النظر روشن خیال شہری بنانا ہے جن میں تنگ نظری و تنگ خیالی کا شائبہ تک موجود نہ ہو۔ جب ایسا ہوگا تبھی تعلیم سماجی تبدیلی کا ذریعہ بن سکے گی۔

ملک کے اتحاد کو نقصان پہونچانے والے عناصر خطرناک صورت اختیار کر گئے ہیں۔

معقولیت پسندی کا جذبہ

آج کے سماجی و معاشی بحران کے پس منظر میں انسان کی نیکی میں یقین نہ رکھنے والا کوئی بھی شخص قومی یک جہتی جیسے مسائل پر بحث کے خیال کا مذاق اُڑا سکتا ہے۔ وہ اسے محض ایک بے سود علمی مشق قرار دے گا جس کا اس کے نزدیک کوئی عملی نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں۔ لہٰذا ہمیں لوگوں کے دل و دماغ میں گھس کر لڑنا ہوگا تاکہ ان کے اندر اخوت و خیر سگالی کا جذبہ پیدا کیا جا سکے، روایتی اقدار کو جو کثرت میں ثقافتی وحدت کی علامات کی حامل ہیں جگایا اور اُن کا بہترین استعمال کیا جا سکے۔ ہندوستان کے حسن و دولت اور کثیر النوع وسائل سے مستفید ہونے کی مشترکہ خواہش کے

نظام کی تعمیر کریں۔ قومی یک جہتی کا مسئلہ ایک کٹھن مسئلہ ہے جسے سہل فارمولوں کی مدد سے حل نہیں کیا جا سکتا۔

ایک طویل المدت نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عوام کی ذہنیت کو بدلنے میں تعلیم بہت اہم رول ادا کرتی ہے۔ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ معاشرے میں تمام ترقی اور اصلاحات کی کلید تعلیم ہے۔ یاد رہے بات ہے کہ اس سے فوری نتائج برآمد نہ ہوں کیونکہ یہ تو ایک طویل اور آہستہ آہستہ چلنے والا سلسلۂ عمل ہے جو انسان کے خیالات و نظریات کو بنانے میں حیرت انگیز رول ادا کر سکتا ہے۔

قومی یک جہتی کے فروغ کے لیے جو بھی تعلیمی پروگرام بنایا جائے اس کا اولین کام

کہ ہماری قومی جدوجہد آزادی میں احیائے مذہب نے ایک محدود معنی میں کچھ رول ادا کیا تھا۔ لیکن آج کے حالات میں ہمیں ماننا چاہیئے کہ ایک وسیع تر تناظر میں احیائے مذہب کے رجحانات جنھیں مفاد پرست لوگ قوی تر بنا دیتے ہیں عوام کے اندر تنگ خیالی اور تنگ نظری پیدا کرتے ہیں اور قومی اتحاد کے جذبے کو کمزور کرتے ہیں۔ نہرو نے اپنے دوست ڈاکٹر سید محمود کے نام کے ایک خط میں احیاء پرستی کے منفی رول کے بارے میں ان الفاظ میں واضح تنبیہہ کی تھی:

> "کوئی بھی ملک یا قوم جو غیر استدلالی اور غیر معقولیت پسندانہ طرزِ فکر اور ذہنیت کی غلام ہے، ترقی نہیں کر سکتی۔ بدقسمتی سے ہمارا ملک اور ہمارے عوام غیر معمولی طور پر غیر استدلالی عقیدہ پرست اور تنگ نظر ہیں، فراخدلی اچھی چیز ہے لیکن جس بات کی ضرورت ہے وہ محض فراخدلی کا جذباتی اظہار نہیں ہے بلکہ ٹھنڈے دماغ سے معقولیت پسندی پر مبنی طرزِ فکر اور

رواداری ہے ـــــ ہندوستان
میں جس طرح مذہب پر چلا جاتا ہے
جس طرح اس پر عمل کیا جاتا ہے اس
نے نہ صرف ہماری کمر توڑ دی ہے بلکہ
دماغ کی ندرت خیال کو قریب قریب
ختم کر دیا ہے۔ ہمیں سند باد
جہازی کی طرح اس بار گراں سے
چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔ تبھی ہم پوری
طرح سانس لے سکیں گے اور کوئی
مفید کام کر سکیں گے"[1]

ہمارے تعلیمی نظام میں بڑے پیمانے پہ اصلاحات
لانے کا ایک ٹھوس پروگرام شروع کیا ہے۔ سماجی
تبدیلی کے معنی ہیں ہمارے تعلیمی نظام میں تبدیلی
اور تعلیمی نظام میں تبدیلی کا مطلب ہے سماج میں
تبدیلی۔

ہمارا موجودہ تعلیمی نظام اسی
پڑا رہتا ہے۔
سلسلے کو جاری رکھتا ہے۔ ابھی تک اسکولوں اور
کالجوں میں ہندوستانی تاریخ کی ہندو مسلم اور
انگریزی ادوار میں تقسیم موجود ہے۔ اگرچہ یہ غیر
سائنٹفک اور غیر تاریخی ہے۔ تاریخ کی ہندو مسلم

یہ امر افسوسناک ہے کہ ابھی تک لوگ
بے سوچے سمجھے اس بات پر یقین کرتے
ہیں کہ وسطی عہد میں ہندوستانی ریاست
مذہبی ریاست تھی اور ہندو اور مسلمان
ہمیشہ مذہبی بنا پر ایک دوسرے سے لڑتے
رہتے تھے۔ اس قسم کے نامناسب اور گمراہ کن نظریے نے ہی دو قومی نظریے
کی بنیاد ڈالی تھی جس نے ہندوستانی ثقافت کے تار و پود کو منتشر کر دیا۔

احیاء پرستی کا مقابلہ کرنے کے لیے نہرو نے
عوام میں معقولیت پسندی کا جذبہ پیدا کرنے
کی ضرورت پر زور دیا اور اپنے دوستوں کو
برٹرینڈ رسل کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیا، بالخصوص
تعلیم کے موضوع پر لکھی گئی کتاب کا۔ فرقہ پرستی
نیز ترقی و اصلاح کی مخالف اندھی مذہبی تقلید اور
اس کی مزاحمانہ اور دقیانوسی قوتوں کا زوردار توڑ
سیکولرازم کی اصطلاح کی وہ تشریح ہے جو نہرو نے
کی۔ ضرورت ہے کہ یہی سیکولرازم تعلیم کے ذریعے
عوام میں پیدا کیا جائے۔ یہ امر موجب مسرت و
اطمینان ہے کہ وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی ہمارے
عوام کے طرز فکر کو بنانے اور ان کے احساسات
کو نفاست عطا کرنے میں تعلیم کی اہمیت کو پوری
طرح محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے

ہمارے منصوبہ سازوں کو یہ بات ذہن
میں رکھنی چاہیے کہ تعلیم محض تکنیکی اہلیت یا فنی
قابلیت پیدا کرنے یا سماج میں ترقی کے مواقع فراہم
کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد ایسے
بالغ النظر روشن خیال شہری بنانا ہے جن میں تنگ
نظری و تنگ خیالی کا شائبہ تک موجود نہ ہو۔ جب
ایسا ہوگا تبھی تعلیم سماجی تبدیلی کا ذریعہ بن سکیگی۔
تعلیمی نظام کی اصلاح و تنظیم نو کا جو پروگرام
شروع کیا گیا ہے اس میں ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ کیسے تعلیم
دی جاتی ہے اور کیسے۔ ہم نے ایک خاص سانچے
میں ڈھلے ہوئے متعدد تصورات ورثے میں پائے
ہیں اور انھیں بلا تنقید و تبصرہ اپنے ذہنوں میں لیے
پھرتے ہیں، ایسے ہی جیسے مکانوں میں پرانا کاٹھ کباڑ

اور انگریزی ادوار حکومت میں یہ تقسیم انیسویں
صدی کے آغاز میں جیمز مل نے کی تھی۔ ہمارے
سرکردہ مورخین نے دکھلایا ہے کہ ہندوستانی تاریخ
کو زیادہ فائدہ مند طریقے سے سمجھنے کا طریقہ یہ
ہے کہ اسے قدیم، وسطی اور جدید ادوار میں تقسیم
کیا جائے۔ لیکن یہ نظریہ ابھی اسکولوں اور کالجوں
میں نہیں اپنایا گیا ہے اور ان میں ابھی تک پرانا
نصاب ہی جاری ہے۔ تعلیم کی از سر نو تنظیم کا
مطلب ہے ہمارے نصابات اور نصابی کتب پر
نظرثانی کرنا۔ تاریخ کی فرقہ وارانہ تشریح سے
متواتر جو نقصان ہوتا رہا ہے اسے مد نظر رکھتے
زیادہ اہم کوئی اور بات نہیں ہے۔

تاریخ کی تشریح و توضیح

گاندھی جی کو بھی اس عظیم نقصان کا پتہ

یکم تا ۱۵ فروری ۱۹۸۶

---

[1] ڈی۔ این۔ دتا اور بی کلیفورن کی کتاب "اے نیشنلسٹ مسلم اینڈ انڈین پالیٹکس" صفحہ ۲۵۔ مطبوعہ ۱۹۷۴ء
نئی دہلی۔

احساس تھا جو تاریخ کی کتابوں نے نوجوانوں کے ذہنوں کو، ماضی کو فرقہ وارانہ خطوط پر مسخ کرکے پہونچایا ہے۔ انھوں نے کہا تھا:

ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ اتحاد مستقل طور پر اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسکولوں اور کالجوں میں تاریخی کتابوں کے ذریعے حد سے زیادہ مسخ شدہ مواد کا پڑھایا جانا بند نہیں کیا جاتا۔

لالہ لاجپت رائے نے تسلیم کیا تھا کہ تاریخی کتابوں کے زیر اثر ہی اسلام کے تئیں اُن کے تاثرات ماند پڑ گئے تھے۔

چوں کہ تاریخ کی فرقہ وارانہ تشریح و توضیح سے ہمارے ملک کو بہت زیادہ نقصان پہونچا ہے اس لیے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ بہت سے تاریخ داں ہماری تاریخ کے وسطی عہد کو بنیادی طور پر دو بڑے مذہبی فرقوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تلخی اور دشمنی کے دور کی شکل میں دیکھتے ہیں اور اس اہم حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ان دونوں فرقوں کے درمیان سماجی اور ثقافتی شعبے میں سرگرم اشتراکِ عمل اور رشتۂ یگانگت موجود تھا جس سے ہماری قومی زندگی مالا مال ہوئی۔ کاش ہم اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ ہماری سماجی و ثقافتی زندگی میں بہت سے عناصر مثلاً موسیقی، مصوری، فنِ تعمیر اور ادب میں جو ترقی اور اضافہ ہوا ہے وہ دونوں فرقوں کی صدیوں کی مشترکہ کوششوں کی دین ہے۔ فرقہ پرست تو یہی چاہیں گے کہ ہم اس حقیقت کو فراموش کردیں۔

فرقہ پرست مورخ ہم سے چاہتے ہیں کہ ہم اس بات پر یقین کرلیں کہ وسطی عہد میں جو لڑائیاں ہوئیں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی بنا پر دشمنی یا مخاصمت کی وجہ سے ہوئیں۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ ابھی تک لوگ بے سوچے سمجھے اس بات پر یقین کرتے ہیں کہ وسطی عہد میں ہندوستانی ریاست مذہبی ریاست تھی اور ہندو اور مسلمان ہمیشہ مذہبی بنا پر ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔ اس قسم کے نامناسب اور گمراہ کُن نظریے نے ہی دو قومی نظریے کی بنیاد ڈالی تھی جس نے ہندوستانی ثقافت کے تار و پود کو منتشر کردیا۔ اس قسم کے اُلٹے اندازِ فکر سے متاثر ہونے والے مسلمانوں نے ایک علیحدہ اسٹیٹ کا مطالبہ کیا اور ہندو مسلمانوں کو غیر مُلکی سمجھنے اور یہ مطالبہ کرنے لگے کہ انھیں ملک سے نکال دیا جائے۔ تہذیب و ثقافت کی تشریح مذہبی بنیادوں پر کرنے کی عادت اور اپنے اپنے فرقے سے تعلق رکھنے والے حکمراں کی بلاوجہ تعریف و توصیف سے دونوں فرقوں کے درمیان ایک دیوار سی کھڑی ہوگئی اور ان کے دلوں میں نفرت اور شکوک و شبہات نے گھر کرلیا۔ لیکن ہمارے تعلیمی نظام کی ایک افسوسناک بات یہ ہے کہ ماضی کی سماجی و معاشی صورتِ حالات اور نازک نستوں پر اچھی طرح سے غور کئے بغیر فرقہ وارانہ بنیاد پر تاریخ کا مسخ کیا جانا ہنوز جاری ہے کیوں کہ اسے روکنے میں سُستی برتی جا رہی ہے۔ یہ گمراہ کُن اور تنگ دِلانہ رُجحان تاریخِ پنجاب کی اُس تشریح میں دکھائی دیتا ہے جس میں مورخین ماضی کو حال کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہندوؤں اور سکھوں کے سماجی و مذہبی اختلافات کو نمایاں کرکے پیش کرتے ہیں۔

سیکولرازم کا نظریہ

ایک نہایت اہم سوال جس کے بارے میں ہمارا ذہن پوری طرح صاف نہیں ہے، یہ ہے کہ بطور ایک قوم کے، ہماری زندگی میں مذہب کا کیا مقام ہونا چاہیئے۔ ہندوستان میں بہت سے مذہب ہیں اور یہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں معاشرہ میں بہت سے طبقے ہیں۔ لہٰذا مذہبی عقائد کی کثرت ہماری سماجی زندگی کی ایک قدرتی حقیقت ہے۔ مذہبی ناروا داری اور جُنون کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے دُور اندیش پیش رووں نے سیکولرازم کا نظریہ نکالا۔ سیکولرازم کا تعلق دُنیاوی معاملات سے ہے۔ اس کا میدانِ عمل دُنیاوی معاملات ہے۔ اُس کا میدانِ عمل یہی دُنیا ہے، اس کو مذہبی رنگ اور مذہبی تقدس کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا لیکن سیکولرازم کا مغربی نظریہ جس میں مذہب مخالف فکر کو دخل ہے، ہندوستان میں کبھی کا کوئی اختیار نہیں کیا

قومی یک جہتی کے ماہرین نے تحقیق و ریسرچ کے ذریعے یہ دکھایا ہے کہ قومی یک جہتی کو فروغ دینے کے لیے تعلیمی عمل، ثقافتی امتزاج و ہم آہنگی کے ذریعے لوگوں کے دل و دماغ کو منوّر کرنے سے بھی زیادہ مقدّم بات عوام کے بنیادی مفادات کا تحفّظ ہے، ان کے مفادات کا تحفّظ ہی ملک کے تئیں ان کی وفاداری کو استوار کرتا ہے۔

جا سکتا۔ ہندوستان میں کوئی بھی شخص جتنا مذہب پرست ہونا چاہیئے اتنا ہو سکتا ہے لیکن اس کا مذہب صرف اس کا ذاتی معاملہ ہوگا۔

اس طرح ہندوستان میں سیکولرازم کا مفہوم یہ ہے کہ مختلف مذاہب و عقائد سے تعلق رکھنے والے تمام شہری ایک دوسرے کے تئیں رواداری اور پُرامن بقائے باہم کا طرزِ عمل اختیار کریں اور ریاست تمام مذہبی فرقوں کو برابر سمجھے اور مکمل غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل پیرا ہو۔ یہی وہ آدرش تھا جس کی حمایت اکبر نے کی۔ اس کی پالیسی کا منشا تمام لوگوں کے مذہبی عقائد کا تحفظ تھا۔ اس سیکولر نظریے کی تفسیر فلسفی شاعر اقبال نے کتنی سادگی اور خوبی کے ساتھ اپنے اس شعر میں کی ہے :۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

سیکولرازم کے معنی نہ تو یہ ہیں نہ ہونے چاہئیں کہ ریاست کی جانب سے مختلف مذہبی گروہوں کی حوصلہ افزائی یا سرپرستی کی جائے۔ بقائے باہم اور باہمی رواداری کی روایت صدیوں سے ہماری تہذیب و ثقافت کا جزوِ لازم رہی ہے۔ راجہ رام موہن رائے، مہاتما گاندھی، مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو جیسے ہمارے صاحبِ فکر رہنماؤں نے یہ ترکہ ورثے میں پایا اور اُن کی زندگی اس روایت کے حسن اور طاقت کی مظہر ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ روایت آسانی سے ورثے میں نہیں ملتی۔ اسے سخت محنت سے حاصل کرنا ہوتا ہے۔ آج سیکولرازم پر عمل پیرا ہونے کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ بُدھ، اشوک اور اکبر سے لے کر گاندھی جی تک، اتحاد و خیرسگالی کی جو روایت ایک مشترکہ نظام کی صورت میں موجود تھی اور جس کے ہم وارث ہیں، اسے اپنے اندر جذب کریں۔

تعلیمی مساعی کے ساتھ ساتھ صبر و تحمل کے ساتھ اس بات کی روز افزوں کوشش کی جانی چاہیئے کہ مختلف فرقوں کے لوگ روزمرہ زندگی میں ایکدوسرے سے ملیں جس سے ان کے اندر محبت اور باہمی رواداری کا جذبہ پیدا ہو۔ علم و ادب، فنونِ لطیفہ، اور دیگر سماجی پروگراموں کے ذریعے ایک ایسا ثقافتی امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی جانی چاہیئے جو قومی سالمیت کے لیے ایک مضبوط بنیاد کا کام دے سکے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ یہ سب باتیں دھیرے دھیرے اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ لہٰذا اس ضمن میں سعیٔ مسلسل کی ضرورت ہے۔

علاقائی عدم توازن کو دُور کرنے کی ضرورت :۔

قومی یک جہتی کے ماہرین نے تحقیق و ریسرچ کے ذریعے یہ دکھایا ہے کہ قومی یک جہتی کو فروغ دینے کے لیے تعلیمی عمل، ثقافتی امتزاج و ہم آہنگی کے ذریعے لوگوں کے دل و دماغ کو منوّر کرنے سے بھی زیادہ مقدّم بات عوام کے بنیادی مفادات کا تحفّظ ہے۔ ان کے مفادات کا تحفظ ہی ملک کے تئیں ان کی وفاداری کو استوار کرتا ہے۔ یہ قدرتی امر ہے کہ لوگ اُن اداروں کے وفادار رہتے ہیں جو اُن کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں اور سیاسی وفاداری کو بھی عوام کے مفادات کے تحفّظ کے بدلے میں عوام کی طرف سے ایک طرح کا صِلہ سمجھا جاتا ہے۔ قومی جذبے کے مشترک رشتوں کو اُس وقت تک استوار کرنا ممکن نہیں ہے جب تک اُس کی نشوونما کے لیے مناسب حالات کی ایک بنیاد تیار نہ ہو جائے۔

ایک سرکردہ ماہرِ قومیت کارل ڈیوِٹش نے کہا ہے کہ وہ مختلف النوع گروہوں کو کامیابی کے ساتھ ایک واحد قوم کی شکل میں مدغم کرنے کے بارے میں اپنی تحقیقات کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ "واحد قوم میں شریک علاقوں اور آبادیوں کے لیے ضروری ہے کہ انھیں کچھ قیمتی خدمات اور مواقع میسر ہوں[1]"۔ قومی سالمیت کے مقاصد

> ہماری
> بقا کے لیے لازم ہے
> کہ اقتصادی ترقی کا ایک
> بڑا پروگرام شروع کیا جائے جو
> سماج کے زیادہ کمزور اور حسّاس طبقوں
> کی ضروریات کی تکمیل کر سکے۔ اس سے
> علاقائی عدم توازن دُور ہوگا، جو ملک کی کچھ ریاستوں
> میں ایک مستقل شکایت کا موضوع بن گیا ہے۔

[1] Alexander V. Riasanovshky and Bernes Riznik (ed.). Generalisations in Historical Writing. University of Pennsylvania Press.

کے لیے مختلف [illegible]وں اور طبقوں کے عوام کی اقتصادی فلاح و بہبود بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اقتصادی مفاد اور قومیت کے درمیان گہرا تعلق ہے۔ جب تک کوئی جمہوریت اپنے عوام کے مفادات کا تحفظ نہیں کرتی، اس وقت تک عوام میں قوم پرستی نہیں آسکتی۔

انتشار پسندانہ چیلنجوں کا سامنا کرنے اور قومی یک جہتی کو مستحکم بنانے کے لیے ہمیں اقتصادی نابرابریوں پر بھرپور حملہ کرنا ہوگا کیوں کہ یہ اقتصادی نابرابریاں انسانی سماج کو کمزور کرتی ہیں اور فرقہ پرستی، اصلاح و ترقی کی مخالفت یا ظلمت پسندی جیسی سماجی برائیوں اور انتشار پسند عناصر کو پنپنے کا موقع دیتی ہیں۔ میں تو ہمیشہ اس خیال کا حامی رہا ہوں کہ جب عوام کی زندگی اقتصادی لحاظ سے بہتر ہوگی تو اُن کے انتشار پسندانہ سرگرمیوں میں اُلجھنے کا امکان کم ہوگا۔

ہماری بقا کے لیے لازم ہے کہ اقتصادی ترقی کا ایک بڑا پروگرام شروع کیا جائے جو سماج کے زیادہ کمزور اور حساس طبقوں کی ضروریات کی تکمیل کرسکے۔ اس سے علاقائی عدم توازن دُور ہوگا، جو ملک کی کچھ ریاستوں میں ایک مستقل شکایت کا موضوع بن گیا ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے ظاہر ہے کہ قومی یک جہتی کے جذبے کو، جسے حال میں کافی نقصان پہونچا ہے، پھر سے بیدار اور مستحکم کرنے کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ اقتصادی ترقی کا ایک انقلابی پروگرام ایک موثر ذریعہ ثابت ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کی سلامتی اور سالمیت کو نقصان پہونچانے والے عناصر سے سختی سے نپٹنے کے لیے آئین کے تحت سخت اقدامات کئے جائیں۔ اس مقصد کے لیے ہمارے آئین میں کافی تحفظات موجود ہیں۔

ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہر قوم کو مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کوئی بھی قوم ہو، مشکل کا وقت ہمیشہ نہیں رہتا، گذر جاتا ہے۔ قوموں میں آگے بڑھانے کی طاقت ہوتی ہے۔ ہمیں تکلیفوں سے گذرنا، تحمل و برداشت سے کام لینا اور مشکلوں سے لڑنا ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مَردوں کی شمشیریں

بقیہ، قومی یک جہتی مشاہیر کی نظر میں

کو بیدار کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ وہ "بھارت جوڑو" مشن کے لیے کام کر رہے ہیں۔ بابا آمٹے نے بجا طور پر کہا کہ قومی یک جہتی قانون کے ذریعے حاصل نہیں ہوسکتی اور یہ ہمارے اندر کا دُشمن ہے، جس پر قابو پانا ہے۔ "بھارت چھوڑو" اندولن میں دشمن کے بارے میں سب کو معلوم تھا لیکن "بھارت جوڑو" اندولن میں دشمن نہ تو نظر آتا ہے اور نہ ہی کوئی اُس کے بارے میں جانتا ہے۔ یہ ہمارے اندر ہے۔ بلاشبہ ملک سے ذات پات اور فرقہ واریت کی بُرائیوں کو دُور کرنے کے لیے عوامی شعور بیدار کرنا بہت ضروری ہے۔ مرض ہی کا پتہ نہ ہوگا تو علاج کیا خاک ہوگا۔ نوجوان اس سلسلے میں تعمیری رول ادا کرسکتے ہیں، وہ ان برائیوں کے خلاف جہاد کرسکتے ہیں۔ قومی سطح پر اندازِ فکر میں بنیادی تبدیلی لائے بغیر اور نظامِ تعلیم کو اس ضرورت کی تکمیل کا اہل بنائے بغیر قومی یک جہتی کا تصور محض ایک خواب ہی رہے گا۔ بابا آمٹے کی تحریک سیاسی نہیں ہے یہ ہندوستان کی تعمیرِ نو کی متمنی ہے۔ عوام

جملے میں جتنی سچائی ہے اتنی ہی سچائی اس بات میں ہے کہ ہندوستان میں فرقہ واریت، صوبہ پرستی اور ذات پات کے جھگڑے بھی عملی جامہ پہننے سے قبل ہمارے ذہنوں میں پنپتے ہیں۔ ان انتشار پسندانہ رجحانات کو دُور کرنے، عقلیت اور روشن خیالی کی فضا کو برقرار رکھنے کا اگر کوئی مؤثر علاج ہے تو وہ ہے تعلیم۔ تعلیم کے ذریعے ہی ذہنوں میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ لڑائی جھگڑوں کے بجائے نہ تو جھگڑا چاہتے ہیں اور نہ ہی نفاق۔ بابا آمٹے کو ملک کے چند حصوں میں پھیلی افراتفری سے بے حد رنج ہے۔ وہ حیران ہیں کہ ہر ریاست میں عوام کے نمائندوں کی حکومت ہوتے ہوئے بھی لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ کیوں بھیانک شکل اختیار کرتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تشدد کے ذریعے کسی برائی سے کسی کو نہیں روکا جاسکتا۔ آپس میں اعتماد کی بحالی اور ایک دوسرے کے زخموں کی اندمال کے لیے کھُل کر صاف دلی اور خدمتِ انسانی کے جذبے سے کام کرنا ہوگا۔ اس کے لیے گاندھی جی اور ونوبا جی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ہوگا۔ بابا آمٹے انھیں روایات کو لے کر آگے بڑھے ہیں۔

قومی یک جہتی خواجہ احمد عبّاس کی نظر میں :-

"جنگیں سب سے پہلے انسانوں کے ذہنوں میں جنم پاتی ہیں۔" یونسکو کے چارٹر میں درج اس باہمی تحفظ، نفرت کے بجائے محبت، تنگ نظری کے بجائے روشن خیالی تعلیم کے ذریعے لائی جاسکتی ہیں۔

مذہبی رواداری کو بڑھاوا دینا اور فرقہ واریت کو کم کرنا آسان بات نہیں۔

ڈاکٹر گوپال سنگھ

بھارت کو طاقتور بنانے کیلئے

دس نکاتی فارمولا

فاضل مصنف ڈاکٹر گوپال سنگھ نے جو ایک تجربہ کار ایڈمنسٹریٹر اور نامور عالم ہیں۔ اس بات پر زور دیا ہے کہ بھارت کی وحدت کو ہماری مذہبی کتب اور ہمارے مشترکہ روحانی تمدن سے تقدس حاصل ہوا ہے۔ جن اسباب سے ملک کا بٹوارہ ہوا ہے اُن کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اس امر پر اظہار افسوس کیا ہے کہ ہم نے آسان طریقِ کار کا انتخاب کیا ہے جو ایک پیچیدہ سیاسی صورتِ حال میں کبھی بھی نہیں کیا جانا چاہیئے تھا۔ انھوں نے ایک ناقابلِ تقسیم بھارت کے امن و ترقی کے لیے ایک دس نکاتی پروگرام بھی پیش کیا ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ دُکھ کی بات ہے کہ ۱۹۸۶ء کے سال میں اور حصولِ آزادی کے چالیس برس بعد بھی ہم ابھی تک ایک ایسے بھارت کے حق میں آواز اُٹھا رہے ہیں اور جدوجہد کر رہے ہیں جسے تقسیم نہ کیا جاسکے۔ کیا خرابی پیدا ہوگئی ہے؟ چند دیگر ممالک کو بھی ایسے ہی مسئلے کا سامنا ہے جو اُن کے لیے بھاری تشویش کا باعث بنا ہوا ہے۔ ان ممالک میں اسپین، سائپرس، سری لنکا، پاکستان، عراق، فلپائن، یوگوسلاویہ، متعدد افریقی اور لاطینی امریکہ ممالک اور حتیٰ کہ برطانیہ کلاں بھی شامل ہیں۔ لیکن اُن کا معاملہ ہم سے بہت مختلف ہے۔

بھارت کی وحدت کو ہماری مذہبی کتب اور ہمارے مشترکہ روحانی تمدن نے تقدس دیا ہے۔ حتیٰ کہ جب ہمارا ملک بیسیوں آزاد ریاستوں اور رجواڑوں میں بٹا ہوا تھا، ایک بھارت کا تصور ہماری روحانی اور ذہنی نفسیات، ہماری کلاسیکی موسیقی، اور زندگی (بشمول فطرت) کے تمام مظاہرات سے متعلق ہمارے استعجاب و احترام کے مشترکہ جذبات میں سمایا ہوا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شری آدی شنکر آچاریہ کنیا کماری سے لے کر کشمیر تک اور مشرق سے لے کر مغرب تک اپنے روحانی مٹھ (راہب خانے) کبھی بھی قائم نہ کرسکتے۔ بابر کے حملے کے وقت گورو نانک نے محض پنجاب نہیں بلکہ سارے بھارت کے دُکھڑے کا بکھان کیا تھا۔ درحقیقت سکھوں کی تمام مذہبی کتابوں میں لفظ پنجاب کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

مُغلوں نے انگریزوں سے بہت پہلے ہی تقریباً سے بیشتر بھارت کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا۔ انھوں نے تو کابل کو بھی اپنی سلطنت کا جزو لاینفک بنا دیا تھا۔

ہم نے مِل کر لڑائی لڑی ہے

چکرورتی راج ہمیشہ ہندو سیاسی فکر کو تحریک دیتا رہا ہے۔ مرہٹوں نے مغل ...

افغان لٹیروں کے ساتھ سخت لڑائیاں لڑنے کے بعد، انجام کار دلی میں مغل شہنشاہیت کی حمایت کی، اور انگریزوں کے ہاتھوں اس کی قطعی بربادی کے کم از کم ۱۰۰ برس پہلے اُس کی حمایت شروع کردی۔ مُغلوں نے اس کے برعکس ہندو راجپوت راجاؤں کی حمایت پر بھارتی مسلمانوں کی نسبت زیادہ انحصار رکھا اور شاہی دربار میں انھیں زیادہ فیاضی سے منصب دئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سِکھ گوروؤں کی پیروی کرتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں کو قومی اور روحانی مساعی کے واحد پلیٹ فارم پر یکجا کیا۔ گاندھی جی نے خلافت اور سِکھ گوردوارہ سُدھار تحریکوں کی حمایت کی۔ صوبہ سرحد کے پٹھانوں، دیوبند کے سُنّی مسلمانوں، احرار، شیعہ کانفرنس، انصار اور دیگر اہم مسلم جماعتوں نے ہماری جدوجہد آزادی میں اُسی طرح بھارا رانہ حصّہ لیا جس طرح سِکھوں نے لیا تھا، جن کا شہیدوں اور انڈیمان میں عمر قید کی سزا پانے والوں میں ۸۰ فیصد حصّہ ہے۔

بدقسمتی سے غیر ملکیوں نے گذشتہ ایک صدی اور اُس سے زائد عرصے میں جو تاریخ لکھی ہے اور بھارتی مورخوں نے آنکھیں بند کرکے اُس کی جو نقل کی ہے اُس نے ہمارے جذبات سے کھلواڑ کیا ہے اور ہندوؤں کے دِلوں میں مسلمانوں کے خلاف اور سِکھوں کے دِلوں میں دونوں کے خلاف زہر بھر دیا ہے۔ الگ حق نیابت کو بدقسمتی سے تمام بڑی سیاسی پارٹیوں نے قبول کرلیا تھا جس کے نتیجے میں مذہب کی بنا پر ہمارے مادرِ وطن کا بٹوارہ ہوا۔ اس سے بھارت کے دو بڑے فرقوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان گہری نفسیاتی رکاوٹیں پیدا ہو گئی ہیں۔ لیکن یہ میرا پختہ یقین ہے کہ بھارت کے بٹوارے سے پہلو تہی ہوسکتی تھی اگر ہم قدرے زیادہ فراخدلی اور قدرے زیادہ دُور اندیشی سے کام لیتے۔ مَیں ایک مورخ اور اس المیٰ ڈراما کے ایک شریکِ کار کے طور پر ایسا کہتا ہوں۔ ہم نے آسان راہ کا انتخاب کیا اور ہمیں اس امر کا علم نہیں تھا کہ پیچیدہ سیاسی مسائل کو حل کرنے میں کوئی آسان راستہ انتخاب میں نہیں آتا۔ یہ دُکھ کی بات ہے کہ آخر میں گاندھی جی کو بھی جو تشدد کی لہر کے زور پکڑنے اور ایک دوسرے کے عزائم کے بارے میں بدا عتمادی کے لامتناہی سلسلے سے متزلزل ہو گئے تھے، بٹوارے کو تسلیم کرنا پڑا، اور اس کے نتیجے میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔ راجہ جی نے گاندھی جی سے بھی بہت پہلے اسے منظور کر لیا تھا۔ ہم نے ۱۹۳۵ء کی وفاقی اسکیم اور کرپس تجاویز کو قطعاً مسترد کر دیا تھا جس سے بٹوارے کے سوائے دیگر اختیار کی جانے والی تمام راہیں پہلے سے بند ہوچکی تھیں۔

اس ناپاک کھیل میں برطانیہ نے جو رول ادا کیا تھا ہم نے اُسے تو فراموش کردیا اور کامن ویلتھ میں شرکت کرلی لیکن ہم نے مسلمانوں حتیٰ کہ اُن کی موجودہ نسل کو بھی معاف نہیں کیا جو ہمارے مادرِ وطن کے بٹوارے کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ بلاشبہ چند جنونی مسلم بادشاہوں نے کچھ صدیاں پہلے جو گناہ کئے تھے ہم اب اُن کی پاداش کے لیے اُن کے ہم مذہبوں کی گردن ناپنا چاہتے ہیں۔ اسے نہ ہی شجاعت اور نہ ہی عقلِ سلیم کہا جا سکتا ہے۔ یورپی قومیں جو جنگ و جدل کی تاریخ، زبان، نسل، رواج اور اقتصادی رقابتوں سے منقسم ہیں وہ تو اب مشترکہ منڈیاں، مشترکہ دفاعی پالیسیاں اور حتیٰ کہ ایک واحد پارلیمنٹ کا قیام کر رہی ہیں لیکن ہم جو پہلے ہی سیاسی اور اقتصادی طور پر ایک ہیں، ایک دوسرے کو شک، نفرت اور دُشمنی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کیا ہماری تمام عقل جاتی رہی ہے؟ ہم یوں تو عدم تشدد کا حلف لیے ہیں لیکن ذرا سی بھی انگیخت پر تشدد کا بازار گرم کر دیتے ہیں۔ ہم اپنی برادری، ذات اور حتیٰ کہ اپنی جغرافیائی گندی بستیوں کے باہر کے لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے اور شادی کرنے سے بھی انکار کر دیتے ہیں اور پھر ہم چلاتے ہیں: "آہ! ہم نے ابھی تک سماجی یکجہتی کیوں حاصل نہیں کی؟" حتیٰ کہ ایک ساتھی بھارتی کا سایہ بھی اگر اُس کا تعلق چھوٹی ذات سے ہے ہمیں ناپاک کر دیتا ہے۔

بَد شگونی کی علامتیں

گویا یہیں پر بس نہیں ہوئی۔ حصولِ آزادی کے بعد تو ہم نے زبان کی بنا پر بھارتی مملکت کی از سرِ نو تقسیم کردی۔ یہ لسانی ریاستیں اب ذیلی

حتیٰ کہ جب ہمارا ملک بیسیوں آزاد ریاستوں اور رجواڑوں میں بٹا ہوا تھا، ایک بھارت کا تصوّر ہماری روحانی اور ذہنی نفسیات، ہماری کلاسیکی موسیقی اور زندگی (بشمولہ فطرت) کے تمام مظاہرات سے متعلق ہمارے استعجاب و احترام کے مشترک جذبات میں سمایا ہوا تھا۔

ملک بنتی جارہی ہیں۔ "دھرتی کے سپوتوں" کا نظریۂ نام نہاد "غیر باشندوں" کے خلاف مختلف سیناؤں کا ڈٹ جانا، ایک واحد زبان کو رابطے کی زبان کے طور پر تسلیم کرنے سے متعلق ہماری نا اہلیت، سرحدی دیہات اور دریائی پانیوں کی تقسیم پر ہماری لڑائیاں ریاستی ملازمتوں اور اسکولوں اور خصوصاً ٹیکنیکل کالجوں میں داخلوں کے لیے علاقائی لوگوں پر اصرار کرنا، صدیوں پرانی مسجدوں اور مندروں پر قبضہ

پھر یہ سوچنا بھی غلط ہے کہ اکثریت کی قیمت پر اقلیتوں کو خوش کیا جارہا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کونسی اقلیتیں؟" ہمارا آئین کسی سیاسی اقلیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ مذہبی اقلیتوں کو موقعہ دیا گیا ہے کہ اگر وہ پسند کریں تو وہ اپنے اسکول کھول کر چلا سکتی ہیں۔ لیکن انھیں اسکول بورڈوں یا یونیورسٹیوں کی طرف سے مجوزہ مشترکہ نصاب کو تسلیم کرنا ہوگا۔ وہ اپنے عقائد پر عمل کرسکتی ہیں اور اُن کی تشہیر کرسکتی ہیں، لیکن دوسرے لوگ بھی ایسا کرسکتے

بھی منظور نہیں کیا اور محض FIRST-PAST-THE-POST سسٹم کو اختیار کیا ہے جس سے اقلیتی ووٹ سے بھی اکثریتی حکومت کو ہٹایا جاسکتا ہے۔ رائے دہندگی کے موجودہ نظام کے تحت مذہبی اقلیتوں کے لیے اپنے طور پر کہیں بھی جیتنے کا کوئی موقع نہیں ہے اور تمام اقلیتوں نے خلوص دل سے اس نظام کو قبول کیا ہے۔

یہ ہماری ایک واحد نا قابلِ تقسیم قوم ہونے کا پہلا سبب ہے کہ اُن کے مشترکہ الیکٹورل

یورپی قومیں جو جنگ وجدل کی تاریخ، زبان، نسل، رواج اور اقتصادی رقابتوں سے منقسم ہیں وہ تو اب مشترکہ منڈیاں، مشترکہ دفاعی پالیسیاں اور حتیٰ کہ ایک واحد پارلیمنٹ کا قیام کر رہی ہیں لیکن ہم جو پہلے ہی سیاسی اور اقتصادی طور پر ایک ہیں ایک دوسرے کو شک، نفرت اور دشمنی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

جلنے کے لیے ہمارا نرا پاگل پن، حساس علاقوں میں سے جلوس گذارنے سے متعلق ہمارا جنون، کسی دوسری جگہ پر نامعلوم غنڈوں اور بدمعاشوں کی طرف سے کئے گئے جرائم کے لیے ہمارے درمیان رہنے والے معصوم لوگوں سے وحشیانہ بدلہ لینا اور ان سب سے زیادہ ہماری سیاست اور سرکاری ملازمتوں کی بھرتی میں علاقہ پرستی، مذہب اور ذات پات نے جو طوفان کھڑا کر رکھا ہے ــ یہ تمام باتیں اس امر کا اشارہ کررہی ہیں کہ ہم قصداً اپنے ہاتھوں اپنی قوم کا شیرازہ منتشر کررہے ہیں۔ یہ ہم ہی ہیں جو اپنے ملک کے دشمن ہیں اور کوئی باہر والا نہیں۔ باہر والے اسی لیے مداخلت کرتے ہیں کیونکہ اندر والے اپنی جان بوجھ کر کی جانے والی بیوقوفیوں کے باعث اُن کے آلۂ کار بننے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

ہیں۔ مسلمانوں، پارسیوں اور عیسائیوں کے معاملے میں شادی اور وراثت سے متعلقہ بعض مروجہ قوانین کا تحفظ کیا گیا ہے۔ لیکن وہ تمام بھارت کے دیوانی و فوجداری ضابطوں کو تسلیم کرتے ہیں، کیا یہ کسی کو خیال نہیں آیا کہ ہندوؤں اور سکھوں کی درجِ فہرست ذاتوں کو جو بعض خصوصی حقوق و مراعات حاصل ہیں وہ عیسائیت یا اسلام قبول کرنے والوں کو حاصل نہیں ہیں؟۔ اس سے بھی زیادہ بات یہ ہے کہ ریاستی ملازمتوں یا قانون ساز اداروں میں کسی بھی اقلیت کے لیے نشستوں کی تخصیص نہیں ہے۔ ہمارے ہاں واحد رکنی مشترکہ انتخابی حلقے ہیں اور اب کوئی الگ حق نیابت نہیں ہے۔ ہم نے واحد قابلِ انتقال ووٹ کے مطالبے کو

کالج ہیں۔ دوئم)۔ جب کبھی جنگ چھڑتی ہے تمام اقلیتیں مثل چٹان قوم کی پشت پر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ یہ دوسرا اور شاید سب سے بڑا سبب ہے ــ سوئم، تمام مذہبی اقلیتوں نے بلا ہچکچاہٹ ہماری مملکت کی سیکولر بنیاد کو قبول کرلیا ہے اور زیادہ تر (پنجاب اور کیرل میں خاص حالات کے سوائے) محض سیکولر پارٹیوں کے حق میں ووٹ دیئے ہیں۔ یہ بڑے دھارے میں اُن کے رہنے کا تیسرا اور بڑا اہم ثبوت ہے اور آخر میں محض اُن لوگوں کے ناموں کو پڑھیئے جو گذشتہ چار دہائیوں کے دوران جاسوسی اور خفیہ سرکاری راز فروخت کرنے کے الزام میں گرفتار کیے گئے ہیں اور

ناموں کو بھی دیکھیے جو چور بازاری، اسمگلنگ، [illegible]
متی ہیرا پھیری، بلیک [illegible] چوری اور بینکوں میں گڑبڑ
مرتکب ہوئے۔ ذرا چمبل کے سفاک ڈاکوؤں
اُن لوگوں پر بھی نگاہ ڈالیے جنھوں نے
بھاگلپور میں قیدیوں کی آنکھیں نکال دیے اور

چاہیئے۔ بدقسمتی سے سیاست کھیل بن جاتی ہے۔
یا وہ ذاتی انا یا غم و غصّے میں بدل جاتی ہے۔
جس سے تمام معاملات کا نتیجہ تشدد کے سوائے
کسی دوسری بات میں نہیں نکلتا۔ اگر بعض صنعتی طور
پر کم ترقی یافتہ ریاستیں زیادہ کارخانے یا ملازمت
کے زیادہ مواقع یا زیادہ بجلی چاہتی ہیں تو انھیں

مطالبہ کیا جا سکتا ہے اور جب کہ ریاستی یا مرکزی
حکومت کے پاس روپیہ دستیاب ہوتا ہے یا روپیہ
مقامی مارکیٹ میں یا سمندر پار رہنے والے بھارتیوں
سے اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ ریاستوں کو زیادہ مالی اختیارات
کی ضرورت ہے لیکن یہ دُکھ کی بات ہوتی اگر اس
قدر ریاستیں روزگار یا نئا خطے کے متلاشیوں یا
صنعتیں شروع کرنے والوں پر اپنے دروازے اس
لیے بند کر دیں کہ وہ اُن کے علاقے میں رہنے والے لوگ
نہیں رہے۔

ایک ریاست اُنہی معاملوں پر خود لڑتی ہے جن
کے لیے وہ دوسروں پر بد اعتمادی کا الزام لگاتی
ہے۔ کیا آپ نے کبھی سُنا ہے کہ امریکہ میں لوگوں کو
کسی قانون کے ذریعہ اُس ملک کے اندر ایک جگہ سے
دوسری جگہ آباد ہونے یا مکانات، زمین یا تجارتی ادارے
خریدنے سے روکا جا رہا ہے؟ یا کوئی انگریزی سیکھنے
سے انکار کر رہا ہے — خواہ وہ ایک بھارتی،
چینی، روسی یا ہسپانوی نسل کا ہو؟ اور یہاں کون
ایک کمزور مرکز کے لیے لڑ رہا ہے اور ایک رابطے
کی زبان کے طور پر ہندی کے نفاذ کی سر توڑ مخالفت
کر رہا ہے؟ یہ کام مذہبی اقلیتوں کا نہیں۔

کیا یہ کسی کو خیال نہیں آیا کہ ہندوؤں اور سکھوں کی درج فہرست ذاتوں کو جو بعض خصوصی حقوق و مراعات حاصل ہیں وہ عیسائیت یا اسلام قبول کرنے والوں کو حاصل نہیں ہیں؟ اس سے بھی زیادہ بات یہ ہے کہ ریاستی ملازمتوں یا قانون ساز اداروں میں کسی بھی اقلیت کے لیے نشستوں کی تخصیص نہیں ہے۔

سیاستدانوں کے چہروں کو بھی دیکھیے جو مختلف
ستوں میں ہتھیاروں کی اسمگلنگ
تے ہیں اور اطمینان کر لیجیے کہ ان میں
ب اکثریت کس کی ہے؟ چنانچہ ایک
م، مجرم ہے اُس کی شناخت مذہبی
سے جُرم سے کی جانی چاہیئے۔ اُس
مذہب سے نہیں۔

اگر کسی جگہ بعض لوگوں کو علاقائی،
، یا آبی تنازعات وغیرہ جیسے سیکولر
ملوں پر اضطراب ہے یا وہ ریاستوں
زیادہ اختیارات دینے کے لیے غوغا
یا کرتے ہیں تو ہمیں وقت رہتے
ان مسئلوں کو حل کرنا چاہیئے اور جہاں
ت کرنا ضروری ہو وہاں ضرور التفات کرنا

اگر بعض صنعتی طور پر کم ترقی یافتہ ریاستیں زیادہ کارخانے یا ملازمت کے زیادہ مواقع یا زیادہ بجلی چاہتی ہیں تو اُنھیں یہ چیزیں کیوں نہ دی جائیں، جب کہ ان کا بجا طور پر مطالبہ کیا جا سکتا ہے اور جب کہ ریاستی یا مرکزی حکومت کے پاس روپیہ دستیاب ہوتا ہے یا روپیہ مقامی مارکیٹ میں یا سمندر پار رہنے والے بھارتیوں سے اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔

یہ چیزیں کیوں نہ دی جائیں جب کہ ان کا بجا طور پر

دہشت گردی نے اب عالمگیر صورت اختیار کرلی ہے۔ انفرادی دہشت گردی سے لڑنا آسان نہیں ہے۔ لیکن میرا یقین ہے کہ ہمارے معاملے میں اس کا مقابلہ سیاسی اور نفسیاتی دونوں سطح پر کیا جاسکتا ہے جس طرح سے کہ پردھان منتری نے دانائی اور کامیابی سے مشکل حالات کو سلجھانے کے لیے کیا ہے ـــ یہ محض امن و قانون کا مسئلہ نہیں ہے۔

پنجاب کی صورتِ حال اس قدر خطرناک یا ناقابلِ حل نہیں ہے جیسا کہ پریس اور دیگر ذرائع اطلاعات کی طرف سے ظاہر کیا جا رہا ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ ہم جلد ہی اس پر قابو پا لیں گے۔ ہماری طرف سے محض بندوقوں کی نہیں بلکہ انصاف اور معقولیت کی ضرورت ہے۔ یہ ہندو، سکھ لڑائی نہیں ہے۔ یہ سیاسی یا انفرادی شکایات کا معاملہ ہے جسے درست کیا جاسکتا ہے۔ کسی بھی ہوشمند سکھ نے جس میں اکالی شامل ہیں، بھارت سے علیحدگی کی مانگ نہیں کی۔ تب یہ ڈر کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ اور وہ کون ہے جو دل سے معصوم لوگوں کے قتل کی مذمت نہیں کرتا خواہ وہ قتل پنجاب یا دلی، احمدآباد یا مرادآباد میں ہوں؟ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ دوسرے مذمت کریں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمیں محض ہماری اپنی فروگذاشتوں کی یاد دلائی جائے۔

دہشت گردی نے اب عالمگیر صورت اختیار کرلی ہے۔ انفرادی دہشت گردی سے لڑنا آسان نہیں ہے۔ لیکن میرا یقین ہے کہ ہمارے معاملے میں اس کا مقابلہ سیاسی اور نفسیاتی دونوں سطح پر کیا جاسکتا ہے جس طرح سے کہ پردھان منتری نے دانائی اور کامیابی سے مشکل حالات کو سلجھانے کے لیے کیا ہے۔ یہ محض امن و قانون کا مسئلہ نہیں ہے۔

امن و ترقی کا پروگرام

لہٰذا اگر ہم حقیقتاً چاہتے ہیں کہ بھارت دباؤ یا جبر سے نہیں بلکہ مرضی سے ایک اور ناقابلِ تقسیم ملک رہے تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم خلوص دلی اور ایمانداری کے ساتھ مندرجہ ذیل دس نکاتی پروگرام کو عمل میں لائیں۔

۱۔ ہمارا اقتصادی نظام بہت زیادہ اعلیٰ طبقاتی، تحفظ پسندانہ، اجارہ دارانہ، زیادہ لاگتی اور غیر منصفانہ ثابت ہوا ہے، اس کی اصلاح کرنی ہوگی یا اسے ختم کرنا ہوگا۔ خواہ یہ پبلک سیکٹر ہو یا پرائیویٹ سیکٹر۔ ہم دنیا کے کسی بھی حصے میں ایسا گندا، سڑا، ملاوٹی، جلدی خراب ہو جانے والا، غیر یقینی مال اتنی اونچی قیمتوں پر نہیں خریدتے جیسا کہ بھارت میں خریدتے ہیں۔ کہیں بھی ایسی لاگت پر فی کس لیبر اتنی کم پیداوار نہیں ہوتی اور نہ ہی کارخانوں میں ان کی نصف سے بھی کم صلاحیت پر کام ہوتا ہے۔ کسی بھی دوسری جگہ سرکاری سطح پر تاخیر یا سرکاری مداخلت کے سبب کام کی انجام دہی میں اتنی دیری نہیں ہوتی یہ مختلف سطحوں پر رکاوٹوں کے سبب ہوتی ہے۔ اسی باعث بدعنوانیاں ظہور میں آتی ہیں۔

۲۔ نہ مذہب، نہ زبان، نہ علاقہ، نہ ذات کسی بھی سیاسی پارٹی یا اس کی سیاسی سرگرمیوں کی بنیاد بنے گی۔ عبادت گاہوں کو کسی سیاسی مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جائے گا۔ مذہبی مقامات کے برسراقتدار لوگوں کو سیاسی عہدے حاصل کرنے کی ممانعت ہوگی۔

۳۔ آبی وسائل کو تمام بھارت کے لیے مشترکہ طور پر جمع کرکے استعمال کیا جائے گا۔ ہم ہر برس سیلاب پر قابو پانے کے بجائے سیلاب زدگان کی امداد پر زیادہ خرچ کرتے ہیں۔

۴۔ روزگار اور ٹیکنیکل اداروں میں داخلے کے بارے میں علاقائی باشندہ ہونے یا مقامی زبان میں مہارت حاصل رکھنے سے متعلق تمام قوانین منسوخ کیے جائیں گے۔

۵۔ ہم سب ہندی (یعنی آسان ہندوستانی) ترجیحی طور پر رومن رسم الخط میں سیکھیں گے اور اسے اپنی قومی زبان کے طور پر قبول کریں گے۔ اس کے علاوہ، بیرونی دنیا کے ساتھ رابطے کی زبان کے طور پر انگریزی کو تسلیم کریں گے۔ دراصل یہ انگریزی زبان یا ہندوستانی سینما ہے جو ایک واحد قوم کے طور پر ہماری بقا کا ایک بڑا عنصر ہے۔ بلاشبہ اس کے علاوہ بھارت کی مسلح فوج ہے جس میں بھرتی اور ترقی کے لیے اب تک صرف لیاقت ہی معیار ہے۔

۶۔ کام کے حق کی ضمانت آئین کے ذریعہ دی جائے گی۔ کم از کم شروع میں ایک کنبے کے ایک شخص کے لیے سرکاری عہدوں پر تقرری اور فوجی اداروں میں بھرتی میں صرف لیاقت کو ہی بنیادی شرط تسلیم کیا جائے گا۔

یتے وقت ذیت پاٹ آبادی کسی خاص خطّے یا مذہب
ہبیت کو سامنے نہیں رکھا جائے گا۔

۷۔ تاریخی کتب پر نظرِ ثانی کی جائے گی تاکہ محض اپنی پھوٹ، شکست اور ذلت کے بارے مطالعہ نہ کریں بلکہ یہ معلوم کریں کہ ہمارے مذہب قے یا ذات کے علاوہ کونسی چیزیں ہمیں ایک کے طور پر جوڑتی اور متحد کرتی ہیں۔

۸۔ کسی بھی ایسی مسجد یا مندر پر قبضہ نہ کیا ئے جو کسی نہ کسی سبب سے طویل عرصے تک کسی دوسرے مذہبی فرقہ کی تحویل میں ہے۔

۹۔ کسی کو بھی کسی ایسے قسم کے مذہبی جلوس نکالنے کی اجازت نہ دی جائے اور نہ ہی پریس ں کچھ ایسا لکھنے دیا جائے جس سے ذات پات پر مبنی یا علاقائی دشمنیاں بھڑک اُٹھیں۔ کسی بھی فرقہ دارانہ سینا کو منظم کرنے اور پبلک میں پریڈ کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ تشدد سے حکومت نپٹے ور اُس پر قابو پائے اور یہ کام پرائیویٹ فوجوں یا بھاڑے کے غنڈوں کو نہ کرنے دیا جائے۔

۱۰۔ مختلف ریاستوں کے درمیان علاقے، زبان اور پانی کے بارے میں جو تنازعات ہیں اُن کا فیصلہ سپریم کورٹ کا ایک خصوصی بینچ کریگا، اور ہر ایک کو اُس کے فیصلوں کو تسلیم کرنا ہوگا۔

ان امور پر قومی اتفاق رائے ہونا چاہیئے۔ اور پوری سنجیدگی کے ساتھ ان پر عمل ہونا چاہیئے تب ہر ایک کا یہ مفادِ خصوصی ہوگا کہ وہ نہ صرف نام سے بھارتی ہو بلکہ ماں کی صورت میں بھارت سے محبت کرے جس کا انصاف مساویانہ اور غیر جانبدارانہ ہے، مادرِ وطن کے استحکام اور قوتِ حیات کو برقرار رکھنا اُس کے تمام بچّوں کا اخلاقی فرض ہو جاتا ہے۔

بھارت کو تمام تر مہذب دُنیا کو بہت کچھ دینا ہے اور اُس نے ٹیگوں تک انڈونیشیا اور ایسٹ انڈیز سے ویسٹ انڈیز تک اس قدر دیا ہے کہ غیر ملکیوں کی طرف سے بھی اُس کے مقدس نام کے ساتھ وابستہ ہونے کی آرزو کی جاتی ہے۔ اس کی قدیم زبان سنسکرت اور اُس کی روحانی تہذیب تمام تر نوعِ انسانی کی میراث بن گئی ~~ہے صنعت علوم~~ پر ترقی یافتہ مغرب نے صرف آلودگی اور جنگ کو جنم دیا ہے یا فرد کا سماج کے ساتھ ٹکراؤ کرا دیا ہے۔ کیا بھارت دُنیا میں وہ توازن بحال نہیں کرے گا جو وہ زمانۂ قدیم سے کرتا آ رہا ہے؟ لیکن پہلے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم خود بھارتی بنیں اور مہذّب اور معقولیت پسند انسانوں کی مانند سوچیں اور عمل کریں۔ کیا ہم ایسا کریں گے؟ ●

> بھارت کو تمام تر مہذّب دُنیا کو بہت کچھ دینا ہے اور اُس نے ٹیگوں سے تک انڈونیشیا اور ایسٹ انڈیز سے ویسٹ انڈیز تک اس قدر دیا ہے کہ غیر ملکیوں کی طرف سے بھی اُس کے مقدس نام کے ساتھ وابستہ ہونے کی آرزو کی جاتی ہے۔

بقیہ، علاقائی عدم توازن دور کیا جائے

نہیں کی گئی۔ اگر اس فارمولے کو عمل میں لایا جائے تو ہندی کو واقعی جنوب میں زیادہ قبولیت حاصل ہو جائے گی۔ ہندی کو تمام علاقوں پر ٹھونسنا مناسب نہیں ہوگا کیوں کہ اس سے فائدہ کے بجائے نقصان پہنچے گا۔ شائد ہمیں صبر و تحمل سے کام لینا اور انتظار کرنا ہوگا۔

مختلف ثقافتوں کی یک جہتی ایک نہایت مشکل اور نازک مسئلہ بھی ہے۔ پھر وقت ہمارے حق میں نہیں ہے، اور شائد چالیس برس کا وقت اتنا نہیں ہے، جو بھارتی قوم پرستی کو وجود میں لا سکتا۔ ہم نے اپنی آزادی حاصل کی ہے لیکن بھارتی قوم پرستی کے حصول کے لیے مزید طویل تر عرصہ درکار ہے۔

چین میں شہری علاقوں کو ہجرت زیادہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دیہات اور چھوٹے قصبات کو ترقیاتی منصوبوں میں واجبی اہمیت دی گئی ہے جو ہمارے ملک کے بالکل برعکس ہے۔ بھارت میں شہری اور دیہی ثقافتوں میں بہت زیادہ اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور اُن کا فرق بڑی سست رفتاری سے کم ہو رہا ہے۔ اس سے شہری علاقوں اور قومی یک جہتی کے لیے مزید مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ تحریکِ آزادی کے وقت ہمارے قومی رہنماؤں نے دیہات پر بہت زیادہ ~~زور دیا تھا اور یہ نعرہ دیا تھا~~ "دیہات کو واپس چلو"۔ حصولِ آزادی کے بعد ہمارا نظریہ کسی نہ کسی طرح مسخ ہو گیا ہے۔ ہمارے سامنے بڑا کام یہ ہے کہ ہمارے دیہات اور قصبات میں ترقیات کو مزید بڑھاوا دیا جائے اور یہ کام شہری علاقوں کی ترقی کو بھی پس پشت ڈال کر زیادہ تیز رفتاری سے کیا جائے تاکہ "شہری" اور "دیہی" علاقوں میں فرق کم ہو جائے۔ اس سے قومی یک جہتی کو بڑی مدد ملیگی۔ ●

چتّا بسو

اقتصادی پسماندگی

کی راہ میں حائل

مصنف کی رائے میں ملک کی یک جہتی اور یہاں کے اتحاد و اتفاق کو ختم کرنے کے لیے بہت سے سماج دشمن عناصر نے سر اٹھایا ہے، یہ ہیں فرقہ واریت، ذات پات کی بنیاد پر فرق، لسانی جھگڑے دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کی خواہش، علاقائیت، اور علیحدگی پسندانہ عناصر کی ریشہ دوانیاں۔ مصنف ایک تجربہ کار ماہر امور پارلیمان ہیں۔ وہ ایک ایسے سماج کے قیام کے حق میں ہیں جہاں طبقہ جاتی بنیادوں پر انسانوں کے درمیان فرق نہ ہو، چنانچہ وہ ملک کے سیاسی اور اقتصادی مسائل کے حل کے لیے اس طبقہ جاتی فرق کو دُور کرنے کی مہم کو تیزی سے آگے بڑھانا چاہتے ہیں کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ملک کی انتشار پسندانہ قوّتوں کو ختم کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ وہ علاقائی اقتصادی نابرابری کو دُور کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور اسے قومی یک جہتی لانے کے لیے معاون سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں اقتصادی پسماندگی تناؤ کا سبب بھی ہے اور یہی وہ بُرائی ہے جس سے انتشار پسندانہ رجحانات تقویت پاتے ہیں۔

قومی یک جہتی ایک بہت وسیع موضوع ہے، اس کے گوناگوں پہلو ہیں، اس کی صحیح صحیح وضاحت اور تعریف مشکل ہے۔ البتہ اس کے مفاہیم اور مطالب جاننے کی کوشش کرنا بھی ضروری ہے۔ قومی یک جہتی کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ مذہب، ذات پات، چھوت چھات، زبان، قبائلی آبادی کی تشکیل اور علاقائی اقتصادی عدم مساوات کے بارے میں عوام الناس کے دلوں میں مشترک، جمہوری اور حُب الوطنی پر مبنی شعور بیدار کیا جائے، ان کے دلوں میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ یہ ملک بنیادی طور پر ایک ہے اور یہ رنگارنگی کا حامل ہے یہاں کا قانون اور یہاں کی حقیقی زندگی اس بات کی مظہر ہو کہ مختلف طرح کے مذکورہ امتیازات کے باوجود یہ ملک ایک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اظہار اور یہ وضاحت ایک جامع اور مکمل تعریف کی صورت میں قبول نہیں کی جا سکتی۔

اگر ایک سماج طبقاتی بنیادوں پر [illegible] ہو، اور جہاں عوام الناس کا استحصال [illegible] استحقاق کی بنیاد پر مختلف طرح کے امتیازات [illegible] یقینی طور پر دیکھنے کو ملیں گے۔ یہ فرق [illegible] دُور ہو گئے جبکہ سائنسی شعور پر [illegible]

...وں کی کارفرمائی ہو، سماج وادی طرزِ حکومت
...بھی ان امتیازات کو خود بخود دُور نہیں کیا جا
...سکتا۔ چنانچہ بنیادی نوعیت کی کایا پلٹ اور تبدیلی
...لیے طویل المدتی بنیادوں پر کوششیں کرنی
...ہوں گی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے چند ایسے
...سماجی و اقتصادی بہتری کے پروگراموں کو بروئے
...کار لانا ہوگا جو اسی مقصد کے پیش نظر وضع کیے
...گئے ہوں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اس طرح کے
امتیازات اور اس طرح کے استحقاق کا ہونا لازمی

کو مدِ نظر رکھ کر قومی زندگی کی ایکتا اور تاریخی وحدت
کے بارے میں شعور کو تقویت دی جا سکے اور
قومی ایک جہتی کے عمل کو مضبوط کیا جا سکے۔
آج کے دَور میں قومی ایک جہتی کی مخالفت
مختلف طرح سے کی جا رہی ہے۔ اس کے دشمن
مختلف طرح سے سر اُٹھا رہے ہیں، مثلاً فرقہ
واریت، ذات پات کا فرق، ہریجنوں سے نفرت،
لسانی بالادستی، علیحدگی پسندانہ رجحانات، علاقائیت
اس کے لیے مختلف طرح کے انتشار پسندانہ نعرے

اکثریتی طبقوں کی فرقہ واریت ایک ہی سکّے کے دو
رُخ ہیں۔ ہندو۔ مسلمانوں اور سکھوں کے تعلقات
کے ضمن میں فرقہ واریت نے ان فرقوں کے عوام
کے درمیان منافرت پھیلائی ہے، اس کے باعث
ان میں بڑے پیمانے پر تشدّد کو ہوا ملی ہے، یہ
فرقہ واریت اس لیے اُبھاری گئی ہے تاکہ سیاسی
اقتدار حاصل کیا جائے۔ یا اُسے اس کے بہانے
برقرار رکھا جائے۔ دَورِ حاضر میں ہندوؤں، سکھوں
اور مسلمانوں میں گویا کہ سبھی مکتبہ ہائے خیال کے
ماننے والوں میں قدامت پرستی اور کٹر پنتھی تصورات
کو فروغ مل رہا ہے۔ اگرچہ فرقہ واریت کی
مکروہ قوتوں کے خلاف نظریاتی طور
پر صف آرا ہونا ضروری ہے تاہم
اقلیتوں کی حفاظت کا کام اہم
بن چکا ہے۔ فرقہ واریت
کے خلاف لڑائی لڑنے
کے عظیم کام کی تکمیل
کے لیے نیز

ہے۔ ہندستان
میں آج جو صورت
حال ہے، اس سے اندازہ ہوتا
ہے کہ یہ امتیازات انتہائی شدّت

اقلیتی طبقوں کی فرقہ واریت اور اکثریتی طبقوں کی فرقہ واریت ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ ہندو، مسلمانوں اور سکھوں کے تعلقات کے ضمن میں فرقہ واریت نے ان فرقوں کے عوام کے درمیان منافرت پھیلائی ہے، اس کے باعث ان میں بڑے پیمانے پر تشدّد کو ہوا ملی ہے، یہ فرقہ واریت اس لیے اُبھاری گئی ہے تاکہ سیاسی اقتدار حاصل کیا جائے یا اُسے اس کے بہانے برقرار رکھا جائے۔

اختیار کر چکے ہیں۔ اس کی کچھ تاریخی وجوہ ہیں۔
ان کے علاوہ کچھ سماجی، معاشرتی اور اقتصادی
اسباب بھی ہیں۔
اگرچہ ہمارا یقین ہے کہ ان بُرائیوں سے
مکمل طور پر نجات حاصل نہیں کی جا سکتی، البتہ ایک
سماج وادی طرزِ حکومت میں اور حتّٰی کہ موجودہ نظامِ
حکومت میں بھی اس طرح کے امتیازات، اور
استحقاق کو اگر یکسر ختم کرنے کے لیے عملی اقدامات
نہیں کیے جا سکتے تو کم سے کم ان کو گھٹانے کے لیے
ضروری عملی قدم اُٹھائے جا سکتے ہیں تاکہ سبھی پہلوؤں

گھڑ لیے گئے ہیں، یہ تو چند وہ واضح دشمن ہیں جو
کھلے طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں، یہ ہمارے ملکی اتحاد
کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہیں، یہ جمہوریت
کے دشمن ہیں، قومی آزادی اور ملکی سالمیت کے
کھلے دشمن ہیں۔ ان انتشار پسندانہ عناصر کی پُشت
پناہی ملکی اور بیرونی عناصر کر رہے ہیں اور آگ پر
تیل چھڑکنے کا کام کر رہے ہیں۔
قومی ایک جہتی کا سب سے بڑا دشمن فرقہ
واریت ہے۔ اقلیتی طبقوں کی فرقہ واریت اور

اقلیتی مفادات کے تحفظ کے لیے ایک ایسی مربوط
پالیسی کی ضرورت ہے جو تعلیم، روزگار، اصلاحات
اراضی، اقتصادی اور سماجی بہبود نیز انتظامی
اصلاحات وغیرہ کا احاطہ کرتی ہو، ایسا کرنا اس لیے
ضروری ہے کہ فرقہ واریت کے مسئلے کا حل موجودہ
سماجی و اقتصادی ماحول کے سبھی پہلوؤں کو سامنے
رکھ کر تلاش کرنا ہے۔ بلاشبہ ان پہلوؤں کو نظرانداز
کر کے ان مسائل کا حل تلاش نہیں کیا جا سکتا۔

یکم تا ۲۸ فروری ۱۹۸۷ء

سیکولرازم

ہم سیکولرازم میں یقین رکھتے ہیں، سیکولرازم
سے مراد یہ ہے کہ ریاست تمام مذاہب کے تئیں
یکساں احترام کرے گی۔ لیکن سائنسی اندازِ نظر
سے اس کے مفہوم پر نظر دوڑائی جائے تو معلوم
ہوگا کہ سیکولرازم کے معنی یہ ہیں کہ ریاست اور اس
کے فرائض سے مذہب علیحدہ رہے گا۔ ہمارے
سامنے مشترکہ مقصد یہی رہا ہے کہ ہم فرقہ واریت

کے نظام نے آج کے حالات میں نئی نئی سمتیں
اختیار کی ہیں، یہ نظام آج کے حالات میں باعثِ
تشویش ہے۔ ذات پات کے نظام کی جڑیں
ہندوستانی سماج میں بہت گہری ہیں۔ یہ تاریخی
عوامل کے خصوصی کردار سے ابھرنے والا ایک سماجی
اندازِ نظر ہے۔ جو اپنے اندر عجیب و غریب خصوصیات
رکھتا ہے۔ غالباً اس صورتِ حال کا ایک سبب
منجملہ دیگر اس بات پر ہے کہ پیداواری ذرائع کی
ترقی کا عمل غیر معمولی طور پر آہستہ رہا ہے۔ اس

سیاسی اور سماجی زندگی پر حاوی ہیں۔ ذات پات
کی بنیاد پر آج بھی امتیازات ہیں اور الگ الگ
استحقاق ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر استحصال
پسندی کا عمل آج بھی جاری ہے۔ اس وجہ سے
ستائے ہوئے اور دبائے گئے سبھی ذاتوں اور ذیلی
ذاتوں کے ماننے والوں کے درمیان اتحاد قائم نہیں
ہو پاتا۔ یہ بات قومی یک جہتی کی راہ میں رکاوٹ
ہے۔ ذات پات کا نظام سورن ذاتوں اور کمتر ذاتوں
پر مبنی ہے۔ گویا کہ اعلیٰ ذات والے اور کمتر ذات

ذات پات کے نظام کی جڑیں ہندوستانی سماج میں بہت گہری ہیں۔ یہ تاریخی عوامل کے خصوصی کردار سے ابھرنے والا ایک سماجی اندازِ نظر ہے جو اپنے اندر عجیب و غریب خصوصیات رکھتا ہے۔ غالباً اس صورتِ حال کا ایک سبب منجملہ دیگر اسباب کے یہ ہے کہ پیداواری ذرائع کی ترقی کا عمل غیر معمولی طور پر آہستہ رہا ہے، اس کے علاوہ ہندوستان میں ذات پات کے نظام پر چلنے والی اور اسی تصوّر سے خود کفیل رہنے والی دیہی برادریاں ہیں جو برابر چلی آ رہی ہیں۔ یہ برادریاں دو ہزار سے زیادہ برسوں سے قائم ہیں، گویا کہ انگریزوں کی آمد سے بھی قبل سے۔

کی مخالفت کریں اور سیکولرازم کی حمایت کریں،
ہمارے لیے اسے بہت آسان شکل میں پیش کر دیا
جاتا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ فرقہ واریت
اور سیکولرازم کی سائنسی انداز پر جامع تعریف
وضع کی جائے، اور یہ سبھی مفاہیم ہندوستان
کے حالات اور یہاں کی بود و باش کو مدِنظر رکھ کر
مرتب کیے جائیں۔ ریاست سیکولرازم کو کس طرح
عملی جامہ پہنائے۔ اس کے لیے رہنمایانہ خطوط مرتب
کیے جاتے۔

ذات پات کی بنیاد پر فرق:- ذات پات

کے علاوہ ہندوستان میں ذات پات کے نظام پہ
چلنے والی اور اسی تصور کی بنیاد پر خود کفیل بننے کی کوشش کرنے والی
دیہی برادریاں ہیں جو برابر چلی آ رہی ہیں۔ یہ برادریاں
دو ہزار سے زیادہ برسوں سے قائم ہیں، گویا کہ
انگریزوں کی آمد سے بھی قبل سے۔ آج بھی ذات
پات پر مبنی درجہ بندی اور طبقاتی حد بندی کا عمل
آ رہا ہے۔ اور اس نظام اور طرزِ بود و باش میں کم
ہی تبدیلی دیکھنے کو ملی ہے۔ اس کے نتیجے میں ذات
پات پر مبنی ایسے طبقاتی درجے قائم ہیں جو ہماری

والے۔ یہ پیدائشی حق کے طور پر رائج ہے۔ اس
سے یہ نمایاں ہوتا ہے کہ کچھ ذاتیں پیدائشی طور پر
سورن ہیں اور کچھ کمتر ہیں۔ چنانچہ اعلیٰ اور ادنیٰ
کا یہ تصور ایک ایسی نفسیاتی کیفیت ہے جس
سے نفرت، تناؤ، تنازعات، رقابتیں وغیرہ
پیدا ہوتی ہیں اور یہ برائیاں زندگی کے سبھی شعبوں
میں مختلف ذات پات کے ماننے والوں کے درمیان
جنم لیتی ہیں۔ اکثر موقعوں پر یہ نفرت اتنی شدید

ہوتا ہے کہ بھائی، بھائی کا دشمن نظر آتا ہے۔ بدقسمتی سے کچھ سیاسی پارٹیاں اس طرح کی جدوجہد اور تنازعے کو طبقاتی جدوجہد کا نام دیتی ہیں اور اس کے مترادف سمجھتی ہیں۔ یہ بنیادی طور پر غلط ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ یہ طبقاتی اتحاد کے لیے مضر ہے، یہ طبقاتی بھائی چارے اور طبقاتی جدوجہد کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس کا مستقل حل یہ ہے کہ سیاسی اور اقتصادی بنیادوں پر طبقاتی جدوجہد کو تیز کیا جائے۔ یہ کام ایسے سیاسی اور اقتصادی پروگراموں کے ذریعے انجام پا سکتا ہے جو ایک ایسے سماج کی تشکیل میں معاون ہوں جہاں طبقاتی منافرت اور اونچ نیچ کا تصور نہ ہو۔ اس کے لیے کچھ مختصر المدتی پروگرام شروع کیے جا سکتے ہیں اور انتظامی اقدامات کے ذریعے تنازعات کے امکانات کو ختم کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے لیکن اس مسئلے کا بنیادی حل سماج کی از سر نو تشکیل ہے ـــ اس کے لیے ایک ایسے سماج کے قیام کی کوشش درکار ہے جو نئی اقتصادی اور سماجی پالیسیوں اور پروگراموں کو لے کر آگے بڑھے۔

تجربہ شاہد ہے کہ ہریجن غریب کسانوں اور بے زمین مزدوروں میں اپنے حقوق کے تئیں شعور بیدار ہو رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں حصولِ اراضی یا اُجرتوں کی مناسب ادائیگی وغیرہ مانگوں کی تکمیل کے لیے ان میں تشدد کا جذبہ اُبھرتا ہے۔ اور پھر زمیندار اور سورن ذات کے کسان وغیرہ نیز متوسط ذاتوں کے لوگ ان کے خلاف منظم تشدد کراتے ہیں۔ اس طرح سے ہریجنوں کے اراضی کے مطالبے یا اُجرتوں میں اضافے کی جدوجہد کو کچلنے کے لیے ذات پات کو بنیاد بنا لیا جاتا ہے۔

ہریجن

پچھلے کچھ برسوں میں ہریجنوں کے خلاف بھیانک صورت میں مختلف مہمات شروع کی گئیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں سورن ذات کے لوگوں نے ہریجنوں کے خلاف یہ مہم شروع کی۔ اس سلسلے میں بہار، اُتر پردیش، مدھیہ پردیش اور گجرات کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اکثر یہ عوامی تشدد کی صورت میں اُبھری جس کے نتیجے میں لوٹ مار، اور ہریجن خواتین کی عصمت دری کی گئی۔ ذات پات کی بنیاد پر منافرت کا سب سے زیادہ شکار ہریجن اور آدی واسی ہیں۔ اس کے لیے اقتصادی وجوہ بھی ہیں۔

تجربہ شاہد ہے کہ ہریجن غریب کسانوں اور بے زمین مزدوروں میں اپنے حقوق کے تئیں شعور بیدار ہو رہا ہے اس کے نتیجے میں حصولِ اراضی یا اُجرتوں کی مناسب ادائیگی وغیرہ مانگوں کی تکمیل کے لیے ان میں تشدد کا جذبہ اُبھرتا ہے۔ اور پھر زمیندار اور سورن ذات کے کسان وغیرہ نیز متوسط ذاتوں کے لوگ ان کے خلاف منظم تشدد کراتے ہیں۔ اس طرح سے ہریجنوں کے اراضی کے مطالبے یا اُجرتوں میں اضافے کی جدوجہد کو کچلنے کے لیے ذات پات کو بنیاد بنا لیا جاتا ہے۔ دیہاتی علاقوں میں جو نئے امیر بن رہے ہیں، ان کے لیے ذات پات کا نظام دو مقاصد حل کرتا ہے، ایک تو اس کو بہانہ بنا کر اور اس کی آڑ لے کر اُن سورن ذاتوں کے لوگوں کے اقتدار کے خلاف جنگ کی جاتی ہے جن کی جڑیں سیاسی نظام میں پیوست ہیں۔ دوسرے یہ کہ سماج کے نچلے طبقوں کی بڑھتی ہوئی اقتصادی اور سیاسی جدوجہد پر روک لگانے کے لیے بھی ایسا کیا جاتا ہے، گویا کہ شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب پر روک لگانے کے لیے ایسا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کی حفاظت کے لیے موزوں انتظامی اقدامات ضروری ہیں، اس کے علاوہ اُن آئینی اور قانونی

ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جو کہ آئین نے دی ہیں، مربوط پالیسی والے اقدامات ضروری ہیں تاکہ سماج کے کمزور طبقات کا تحفظ ہو سکے۔ ان کے خلاف جو منظم تحریک شروع کی جائے، اس کے مقابلے کے لیے سماج کے کمزور طبقوں میں اقتصادی قوت کا ہونا ضروری ہے۔

لسانی مسئلہ

ہندوستان میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہ ایک کثیر اللسانی ملک ہے، لسانی برتری کا احساس، قوم کے اتحاد کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔ یہ احساس برتری قومی یکجہتی کے تانے بانے کو تحس نحس کر دیتا ہے۔

ہندوستانی جمہوریت ریاستوں کی وفاقی یونین ہے۔ ریاستوں کو لسانی بنیادوں پر دوبارہ سے تشکیل دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ بات قومی یک جہتی کے مفاد میں ہوگی کہ زبان سے متعلق پالیسی کو دوبارہ تشکیل دیا جائے اور یہ اس طرح سے متشکل ہو کہ اس سے سبھی زبانوں کو فروغ کا موقع ملے۔

ہندوستانی جمہوریت ریاستوں کی وفاقی یونین ہے۔ ریاستوں کو لسانی بنیادوں پر دوبارہ سے تشکیل دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ بات قومی یک جہتی کے مفاد میں ہوگی کہ زبان سے متعلق پالیسی کو دوبارہ تشکیل دیا جائے اور یہ اس طرح سے متشکل ہو کہ اس سے سبھی زبانوں کو فروغ کا موقع ملے۔

درحقیقت آئین میں سبھی زبانوں کے فروغ کی بات کہی گئی ہے، البتہ اس پالیسی پر عمل درآمد صحیح ڈھنگ سے نہیں ہو پایا ہے، اس میں اکثر جگہ انحراف دیکھنے کو ملتا ہے، ماضی قریب میں اکثر جگہ زبان کی بنیاد پر دنگے فساد ہوئے۔ ان تنازعات کے دوبارہ سے رونما ہونے کے امکانات باقی ہیں۔ یہ پہلو فوری توجہ کا طالب ہے۔ قومی سطح پر زبان کے لیے تسلیم شدہ پالیسی پر عمل درآمد پر فوراً نظر ڈالنی چاہیے۔ اس سلسلے میں فوری اقدامات درکار ہیں۔

علاقائی اقتصادی نابرابری

علاقائی اقتصادی نابرابری نے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے، اس سے قومی یک جہتی کو خطرہ لاحق ہے۔ آسام اور شمال مشرقی ریاستوں کے حالیہ حالات اس خطرے کی نشاندہی کرتے ہیں، خالصتان کی حمایت سے وابستہ سرگرمیوں سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

علیحدگی پسندی کے رجحانات، جیسا کہ دیکھنے کو ملتے ہیں، عوام کی دل شکستگی سے پیدا ہوتے ہیں، خاص کر نوجوانوں کی مایوسی سے۔ یہ شکستگی عرصہ دراز سے چلی آرہی علاقائی اقتصادی نابرابری کے سبب پیدا ہوئی ہے۔ تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ علاقائی اقتصادی نابرابری سے پیدا شدہ مسائل اکثر و بیشتر خطے کے عوام کی لسانی اور ثقافتی وابستگیوں سے جڑ جاتے ہیں۔ اقتصادی پسماندگی، لسانی اور ثقافتی امیدیں اور خطے کے عوام کی امنگیں اور آرزوئیں، سب ایک ساتھ مل کر ایسا تناؤ پیدا کرتی ہیں جس کے نتیجے میں علیحدگی پسندی کے رجحانات کو تقویت ملتی ہے۔

علیحدگی پسندی کے رُجحانات، جیسا کہ دیکھنے کو ملتے ہیں، عوام کی دل شکستگی سے پیدا ہوتے ہیں، خاص کر نوجوانوں کی مایوسی سے۔ یہ شکستگی عرصۂ دراز سے چلی آرہی علاقائی اقتصادی نابرابری کے سبب پیدا ہوئی ہے۔

غیر ملکی ایجنسیاں ہمارے ملک کو کمزور بنانے سے دلچسپی رکھتی ہیں، چنانچہ وہ اس طرح کے ہر

مرکز علاحدہ اٹھاتی ہیں، وہ اس طرح کے رجحانات کی ہمت افزائی اور سرپرستی میں لگی رہتی ہیں۔ اس طرح سے صورتِ حال بھیانک بن جاتی ہے، جیساکہ آسام اور پنجاب کے حالات مظہر ہیں۔ یہ وقت اس بات کا متقاضی ہے کہ سرکار ان امور پر نگاہ رکھے۔ سرکار کی پالیسی اور اس کے اقدامات علاقائی نابرابریوں کو کم کرنے میں اب تک ناکام رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ان سے یہ خلیج اور بڑھی ہے۔ اگر سرکار اس مسئلے کو خاموشی سے یوں ہی دیکھتی رہے گی تو ملک کی سالمیت اور اس کا اتحاد و استحکام خطرے میں پڑ جائے گا۔ صورتِ حال کا تقاضہ ہے کہ ایسے پروگرام وضع کیے جائیں جس سے یہ بگڑتی ہوئی صورتِ حال اور نہ بگڑنے پائے۔

مرکز۔ ریاستوں کے درمیان تعلقات

مرکز اور ریاست کے تعلقات کا قومی یک جہتی پر براہِ راست اثر پڑتا ہے، ہمارا ملک وفاقی ہے، اس لیے مرکز۔ ریاست کے تعلقات کو نئی شکل دینے کے مطالبے کو عوامی سطح پر اٹھایا گیا ہے، یہ بحث دیگر فورموں میں بھی ہوئی ہے۔ یعنی پارلیمنٹ، ریاست کی اسمبلیاں، وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس اور قومی یک جہتی کونسل کی نشستیں۔

سرکار نے سکاریہ کمیشن مقرر کیا ہے جو مرکز۔ ریاست کے تعلقات پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالے گا، یہ ایک خوش آئند اور اچھا قدم ہے، البتہ کمیشن نے ابھی اپنی رپورٹ نہیں دی ہے۔

اس کمیشن کی مدتِ کار میں توسیع نہیں کی جانی چاہیئے۔ اس کی رپورٹ پر قومی سطح پر بحث کا آغاز ہونا چاہیئے۔ جس سے عوام میں نئی بیداری آئے گی اور قومی یک جہتی کو فروغ ملے گا۔

آج قومی یک جہتی اور قومی سلامتی دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں، سلامتی کے ماحول میں برابر گراوٹ کو دیکھتے ہوئے ان دونوں کو مربوط سطح پر رکھنا ضروری ہوگیا ہے۔ حال ہی میں پنجاب میں دہشت پسندوں کی سرگرمیاں بڑھی ہیں، یہ کام برابر کے ملک کی شہ پر ہو رہا ہے، غیر ملکی ہاتھ اسے مدد دے رہے ہیں، اس لیے قومی یک جہتی کے تحفظ کا کام ہر ہندوستانی کے لیے پاکیزہ، مقدس اور حب الوطنی پر مبنی عظیم کام کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ ●

سرکار کی پالیسی اور اس کے اقدامات علاقائی نابرابریوں کو کم کرنے میں اب تک ناکام رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ان سے یہ خلیج اور بڑھی ہے۔ اگر سرکار اس مسئلے کو خاموشی سے یوں ہی دیکھتی رہے گی تو ملک کی سالمیت اور اس کا اتحاد و استحکام خطرے میں پڑ جائے گا۔

حال ہی میں پنجاب میں دہشت پسندوں کی سرگرمیاں بڑھی ہیں، یہ کام برابر کے ملک کی شہ پر ہو رہا ہے، غیر ملکی ہاتھ اسے مدد دے رہے ہیں، اس سے قومی یک جہتی کے تحفظ کا کام ہر ہندوستانی کے لیے ایک پاکیزہ، مقدس اور حب الوطنی پر مبنی عظیم کام کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

پروفیسر پی۔ جے۔ گرئیٹ

مذہبی قدامت پرستی قومی یکجہتی کے لیے ایک خطرہ

پروفیسر گرئیٹ نے جو پارلیمانی امور کے ایک مشہور ماہر ہیں، اس مضمون میں، ملک میں مذہبی قدامت پرستی اور کٹر پن کے بڑھنے کی وجوہات کا تجزیہ کرنے کی سنجیدہ کوشش کی ہے۔

ان کا خیال ہے کہ ملک میں جمہوری نظام کی موجودگی اور اتحاد و ہم آہنگی کی ایک طویل تاریخ کے باوجود یہ امر واقعہ ہے کہ گزشتہ چالیس برسوں سے جس طرح یہ نظام چل رہا ہے، اس کی بدولت ہی ہماری کچھ اندرونی کمزوریاں اُبھر کر سامنے آئی ہیں۔

گروہ بندی کی سیاست کی مذمت کرتے ہوئے صاحبِ مضمون نے تنبیہ کی ہے کہ اگر اس قسم کے رُجحانات کو بروقت نہیں روکا گیا تو سیکولرازم کے لیے خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ ان کا پختہ یقین ہے کہ فرقہ پرستی خواہ وہ اقلیت کی ہو یا اکثریت کی، ایک ایسا زہر ہے جو معاشرے کے قویٰ کو متاثر کر رہا ہے۔ دونوں طرح کی فرقہ پرستی خطرناک ہے اور اس کا مقابلہ سختی کے ساتھ کیا جانا چاہیئے۔

یہ تاریخ کی ایک بڑی ستم ظریفی ہے کہ آج جب دُنیا سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں حیرت انگیز کامیابیوں کے ساتھ اکیسویں صدی کی جانب بڑھ رہی ہے، دُنیا کے بہت سے حصوں میں مذہبی کٹر پن اور قدامت پرستی اتنی شدت سے اُبھر رہی ہے کہ اس بات کا ڈر پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں راہِ ترقی پر بڑھتے ہوئے قدم پھر پیچھے کی جانب نہ مُڑ جائیں اور ہم کئی صدیاں پہلے کے ماحول میں نہ پہونچ جائیں۔ یہ صورتِ حال اور کہیں اتنی واضح نہیں ہے جتنی کہ ایشیائی برِّاعظم میں ہے۔ دراصل اس برّاعظم کے بہت سے ملک ایسے قدامت پرستوں کی گرفت میں آچکے ہیں جو عہدِ جدید کی ریاست کا نظام حکومت چلانے کے لیے مقدس کتابوں کی آڑ لینا چاہتے ہیں بہت سے دوسرے ملکوں میں قدامت پرست عناصر اقتدار ہتھیانے کی کوششوں میں مصروف ہیں، اگر یہ عناصر کامیاب ہو گئے تو سیکولر نظام ختم ہو جائے گا اور سماج کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

سیکولر پالیسی

اس ایشیائی تناظر میں اگر ہم ہندوستان کی طرف دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہاں بھی

مذہبی قدامت پرستی روزمرہ کی زندگی میں ایک طاقتور عنصر بن گئی ہے۔

ہندوستانی معاشرہ نوعیت کے اعتبار سے مختلف النوع ہے اور اس میں الگ الگ ٹکڑوں میں بٹنے کا رجحان تیزی سے پنپ رہا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ ہندوستان بہت سی نسلوں اور بہت سے مذہبوں والا ملک ہے۔ اگرچہ ہمارے مشترک سماج میں نسلی عنصر زیادہ نمایاں نہیں ہے تاہم مذہبی شناخت بہت قوی اور ادعائی ہے۔ ایک نیم جاگیردارانہ سماجی ڈھانچے میں، جیساکہ ہمارے یہاں ہے، مذہبی شناخت کی تلاش کی جارحانہ کوشش سماج کو منتشر کرنے کا یقینی طریقہ ہے اور اگر ایسا ہوا تو عوام کی سیاسی زندگی پر اس کے نتائج بہت خوفناک ہوں گے۔ ہماری جمہوریہ کے بانیوں نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا۔ تبھی تو انھیں اس بات کا پورا یقین تھا کہ قومی تعمیرِ نو کا کام صرف سیکولر سیاسی نظام کی بنیاد پر ہی ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے آئین میں واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ ہندوستان ایک سیکولر جمہوریہ ہے۔ اس میں مختلف النوع اکائیوں والے اس ملک کو حقیقی معنوں میں متحد کرنے کی ایک اسکیم بھی شامل ہے۔ سیکولر ہندوستانی جمہوریہ کے قیام کے چھتیسویں سال میں، مذہبی کٹرپن اور قدامت پرستی کے اس طرح ابھرنے کی وجوہات کا تجزیہ کرنا سودمند ہوگا کیونکہ ہماری جمہوریت کے وجود کے لیے ایک سنگین خطرہ بنتی نظر آرہی ہے۔

آج ہمارا ملک ایک نازک دور سے گذر رہا ہے۔ ہمارے اردگرد ایسے واقعات رونما ہو رہے ہیں جو ہمارے سماج کے ٹکڑے کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کی حکومت کو اس سے پہلے کبھی اتنے منظم چیلنج کا سامنا نہیں کرنا پڑا جتنا کہ آج کرنا پڑ رہا ہے۔ اس چیلنج کی سب سے بڑی مثال پنجاب کا مسئلہ ہے۔ پنجاب کے واقعات سے واضح ہے کہ مذہبی کٹرپن یا قدامت پسندی کتنی وُسعت اختیار کر سکتی ہے۔ وہاں جو قتل وخون ہو رہا ہے وہ مذہب کے نام پر کیا جا رہا ہے، اور قاتلوں کو سرحد پار کے قدامت پسندوں کی، جن کی پُشت پر حکومت کی طاقت ہے، مدد و حمایت حاصل ہے۔ یہ مذہبی کٹرپن کا پُرتشدد اظہار ہے لیکن مذہبی کٹرپن سیاسی میدان میں خفیہ اور غیر محسوس طور پر بھی اپنا کام کر رہا ہے۔ ہندوستانی سیاسیات کے ایک صاحبِ نظر مبصر کے لیے یہ دیکھنا مشکل نہیں ہے کہ ہندوستان کا سیاسی ڈھانچہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر منقسم ہو رہا ہے۔

ہندوستانی معاشرہ نوعیت کے اعتبار سے مختلف النوع ہے اور اس میں الگ الگ ٹکڑوں میں بٹنے کا رجحان تیزی سے پنپ رہا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ ہندوستان بہت سی نسلوں اور بہت سے مذہبوں والا ملک ہے۔ اگرچہ ہمارے مشترک سماج میں نسلی عنصر زیادہ نمایاں نہیں ہے تاہم مذہبی شناخت بہت قوی اور ادعائی ہے۔

فرقہ پرستی کیا ہے؟ میرے نزدیک یہ کٹرپن، قدامت پرستی اور ظلمت پسندی کے سبب ہے۔ ہندوستان جیسی مختلف ثقافتیں رکھنے والی کوئی قوم آسانی سے ان قوتوں کے حملے کو برداشت نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے صحیح انداز میں سوچنے والے ہندوستانی موجودہ صورتِ حال پر سخت متفکر ہیں کیوں کہ ان عناصر کی جدت سیکولر ہندوستانی جمہوریہ کے وجود کو ختم کر دے گی۔

جبلّی کمزوریاں

اس صورتِ حال کے پیدا ہونے کی وجوہات ہم کہاں تلاش کریں۔ میرا خیال ہے ہمیں اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھنا اور پوچھنا چاہیئے کیا غلطی ہوئی ہے اور کیوں ہوئی ہے۔ جن عظیم شخصیتوں نے ہماری جدوجہد آزادی کی قیادت کی ان کی نگاہیں بہت دُور اندیش تھیں۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان کے لیے ایک جمہوری نظام موزوں رہیگا اسی نظام کے تحت یہاں کے عوام میں جذباتی ہم آہنگی اور قومی یک جہتی پیدا ہوگی اور انھیں ثقافتی اور اقتصادی نشو ونما کے لامحدود مواقع میسّر ہونگے۔ لیکن گذشتہ چالیس برسوں میں اس نظام کی کارکردگی کچھ ایسی رہی ہے کہ ہمارے اندر چھپی ہوئی بعض کمزوریاں اُبھر کر سامنے آگئی ہیں۔ اگر آج انتشار پسندانہ رجحانات یا مذہبی کٹرپن سر اُٹھا رہا ہے تو اس کی وجہ تلاش

کرنا مشکل نہیں ہے۔

ہمارے سیاسی نظام میں چھوٹے چھوٹے سیاسی گروہ جن کی تشکیل ذات، فرقے، علاقے یا مذہب کی تنگ بنیادوں پر ہوئی، ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔ ان گروہوں نے اپنے محدود نظریے کے ساتھ سیاسی زندگی میں حصہ لینے کا اپنا حق جتانے اور اپنی ایک علیحدہ شناخت پیدا کرنے کے لیے لوگوں کے سفلہ جذبات کو بھڑکایا ہے۔ چوں کہ قومی سیاسی اسٹیج پر ان کا کوئی رول نہیں ہے اس لیے انھوں نے اپنے علاقائی دائرے میں اپنا ایک اہم مقام بنانے کی کوشش کی۔ ایسے گروہوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے فرقہ پرستی کو ہوا ملی اور وہ باعثِ تشویش بن گئی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک کے مختلف حصوں میں ان گروہوں کی اجتماعی سرگرمیوں سے سیکولرازم کو مضبوط بنانے کی کوششوں کو سخت دھکا لگا ہے۔ ان گروہوں کی سرگرمیوں کا سب سے تشویشناک پہلو یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ ملک کے سماجی ڈھانچے کو کمزور کر رہے ہیں اور دوسری طرف ملک کے دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں جو ہندوستان کے استحکام کو ٹھیس پہونچانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ایسا کہنے سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ لوگ دیش بھگت نہیں ہیں یا وہ جان بوجھ کر ملک کے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔ وہ نادانستہ طور پر یا اپنی ناسمجھی کے باعث دشمنانِ ملک کا آلۂ کار بن رہے ہیں۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر دونوں ہی جگہ۔ گذشتہ پانچ چھ برسوں میں جو کچھ ہوا ہے اس سے یہ بات پوری طرح ثابت ہوگئی ہے۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو جو قومی المیہ وقوع پذیر ہوا وہ ہمیں فرقہ واریت اور مذہبی کٹر پن میں چھپے ہوئے خطرات سے آگاہ کرتا ہے۔ شریمتی اندرا گاندھی نے اپنی جان کی عظیم قربانی ملک کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے دی۔ ہم اس بات کو فراموش نہیں کر سکتے اور اگر کریں گے تو خود کو خطرے میں ڈالیں گے۔

مذہب اور مذہبی کٹر پن کے بارے میں لوگوں میں کافی ابہام پایا جاتا ہے۔ سطحی طور پر دیکھا جائے تو مذہبی قدامت پرستی یا کٹر پن سے مراد یہ نظریہ ہے کہ مقدس کتابوں میں مذکور دینی قانون قطعی، حکمی اور تغیر و تبدل سے بالاتر ہے۔ اور دنیوی قانون کے تابع نہیں ہے۔ بلکہ دنیوی قانون کو دینی قانون کے تابع ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ اپنے مذہب کے تقدس اور برتری کا دعویٰ کرنے کی ایک کوشش ہے جس کا مقصد ایک ایسی ریاست قائم کرنا ہے جو ان اصولوں کے مطابق ہو جو قدامت پرستوں کے نزدیک اُن کے مذہب کے بنیادی اصول ہیں۔ لیکن مذہب اور مذہبی قدامت پرستی کے درمیان اس طرح خطِ امتیاز کھینچنا چاہوں گا۔ میرے نزدیک مذہب کو صحیح معنوں میں مذہبی قدامت پرستی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ تمام مذاہب ایک ہی سچائی یا حقیقت کا اعلان کرتے ہیں اور سچائی ناقابلِ تقسیم ہے۔ اس لیے تمام مذہب بنیادی طور پر ایک ہیں۔ چونکہ مذہبی قدامت پرستی اپنے اپنے مذہب کی فوقیت و برتری کا دعویٰ کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے یہ اس بنیادی سچائی کی نفی کرتی ہے جو تمام مذاہب میں بیان کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے یہ سیکولرازم کے خلاف ہے کیوں کہ ہم ہندوستان میں سیکولرازم کے معنی یہی سمجھتے ہیں کہ تمام مذہبوں کا یکساں احترام کیا جائے۔ ہمارے آئین میں مذہب اور اس کے اداروں کے آزادانہ فروغ کا تصور موجود ہے اور ہمارا آئین ہر شخص کو بے روک ٹوک اپنے مذہب یا عقیدے پر چلنے کی پوری آزادی دیتا ہے۔ تاریخی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو کھلے گا کہ رواداری کا مسلک ہمیشہ ہندوستانی

> ہمارے سیاسی نظام میں چھوٹے چھوٹے سیاسی گروہ جن کی تشکیل ذات، فرقے، علاقے یا مذہب کی تنگ بنیادوں پر ہوئی، ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔ ان گروہوں نے اپنے محدود نظریے کے ساتھ سیاسی زندگی میں حصہ لینے کا اپنا حق جتانے اور اپنی ایک علیحدہ شناخت پیدا کرنے کے لیے لوگوں کے سفلہ جذبات کو بھڑکایا ہے۔

تہذیب کا ایک اہم جزو رہا ہے۔ حقیقت تو یہ
ہے کہ ہندو دھرم مختلف اور متضاد طرز ہائے فکر
کا امتزاج پیش کرتا ہے اور اس امتزاج نے

فرقہ پرستی کا زہر

ہمارے سامنے ایک مسئلہ اکثریت کی فرقہ
پرستی اور اقلیت کی فرقہ پرستی کا ہے۔ کچھ لوگ یہ
دلیل پیش کرتے ہیں کہ اکثریت کی فرقہ پرستی اقلیت

پیدا کرتی ہے جو انجام کار خود اقلیتوں کے مفاد کے
لیے نقصان دہ ہوگا۔ اس طرح اقلیت کی فرقہ پرستی
نہ صرف اکثریت کی فرقہ پرستی کو جنم دیتی ہے بلکہ
اقلیتوں کے بنیادی مفادات کے خلاف جاتی ہے۔
دراصل اکثریت اور اقلیت دونوں کی فرقہ پرستی
عوام کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے اور
انھیں بہتر زندگی کے لیے مل کر جدوجہد
کرنے کے راستے سے بھٹکانے کی کوشش
کرکے سماج کے ٹکڑے کر رہی ہے۔
ایسی صورت حال میں ہمیں کیا کرنا
چاہیے۔ ہمیں ہندوستانی ڈھانچے کو
تباہ ہونے سے بچانا ہے۔ ریاست کو
اپنی اصلاحی مشنری اور اخلاقی اختیارات کو
قدامت پرستی اور کٹر پن کے رجحان کو
روکنے کے لیے استعمال کرنا ہوگا۔ لوگوں
کے ضمیر کو بیدار کرنا اور انھیں اس رجحان
کے خطرات سے آگاہ کیا جانا چاہیے۔
ہندوستان کے عوام کا "مقدر و مستقبل مشترک ہے"
خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا عیسائی۔

**لیکن مذہب اور مذہبی قدامت پرستی کے
درمیان اس طرح خطِ امتیاز کھینچنا چاہوں گا
میرے نزدیک مذہب کو صحیح معنوں میں مذہبی
قدامت پرستی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔
تمام مذاہب ایک ہی سچائی یا حقیقت کا
اعلان کرتے ہیں اور سچائی ناقابلِ تقسیم
ہے۔ اس لیے تمام مذہب بنیادی طور پر ایک ہیں۔**

اس کے اس نظریے کی تشکیل کی ہے جو سنسکرت
زبان کے شلوکوں میں نہایت خوبصورتی
کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، مثلاً:
"لوک سمست سکھین بھونتو"
(یعنی ساری دنیا سکھی اور خوشحال ہو)
ایک اور شلوک کہتا ہے
"ادار چرتم تو وسودیو کٹمبکم"
(یعنی وسیع نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو ساری
دنیا ایک خاندان ہے)۔
اگر ہم ان پیغامات کی روح کو
اپنے اندر جذب کریں تو اس سے ایک دوسرے
کے مذہب کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہونا لازمی
ہے۔ یہی سچے سیکولرازم کی بنیاد ہے۔ قدامت
پرست اس اصول کے خلاف جاکر بے اعتمادی،
مناقشات و تنازعات پیدا کر رہے ہیں اور سماجی
ہم آہنگی کو برباد کر رہے ہیں۔

**دراصل اکثریت اور اقلیت دونوں کی فرقہ پرستی
عوام کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے اور انھیں
بہتر زندگی کے لیے مل کر جدوجہد کرنے کے راستے
سے بھٹکانے کی کوشش کرکے سماج کے ٹکڑے
کر رہی ہے۔**

کی فرقہ پرستی سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس خیال
کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ میری رائے میں یہ دونوں
طرح کی فرقہ پرستیاں ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی
ہیں اور یکساں طور پر خطرناک ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ
اقلیت کی فرقہ پرستی اکثریتی فرقے میں ایک ایسا ردِعمل

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی آدھی رات کو پنڈت جواہر
لال نہرو نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ آج

(باقی صفحہ ... پر)

پی۔ این۔ سریواستوا

علاقائی عدم توازن دُور کیا جائے

قومی یک جہتی کے پہلو پر غور کرتے ہوئے فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ بھارت جیسے ایک بہت بڑے ملک میں اقتصادی نابرابری اور علاقائی عدم توازن سے انتشار پسندانہ تناؤ پیدا ہوتا ہے۔ اُن کی رائے ہے کہ اگرچہ ہم نے اپنی آزادی حاصل کرلی ہے۔ تاہم بھارتی قوم پرستی کے حصول کے لیے طویل وقت درکار ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی کی تشکیل پر کافی وقت صرف کیا گیا ہے اور اس پر کما حقہ غور بھی کیا گیا ہے۔ اس پالیسی کو قطعی صورت دینے میں ڈیڑھ برس سے زیادہ عرصہ لگ گیا ہے اور ملک کے تمام حصوں کے لوگوں نے اس عمل میں حصہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں تقریباً ہر شخص کے ذہن میں جو مسائل اُٹھے، اُن میں ایک تھا انسانی اقدار کا بتدریج زوال اور اس کے نتیجے میں عوامی زندگی میں گراوٹ آنا۔ یہ صورت حال اچانک پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اقدار کے زوال سے قومی یک جہتی کے لیے بھی تشویش پیدا ہوگئی ہے۔ ہمارے آئین میں ایک ایسے بھارتی سماج کا تصوّر دیا گیا ہے جو سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف اور رُتبے و مواقع کی مساوات پر مبنی ہو اور اس نے ریاستوں کو بھائی چارے کو فروغ دینے کی ذمہ داری سونپی ہے اور اس کے ساتھ ہی فرد کے وقار اور قوم کے اتحاد و یکجہتی کی یقین دہانی کرائی ہے۔" مرکز بھی اس ذمہ داری سے خود کو مبرّا نہیں کرسکتا۔ اس سلسلے میں تعلیم کو ایک نہایت اہم اور بڑا کردار ادا کرنا ہے، اور یہ امر باعث مسرت ہے کہ نئی پالیسی نے اس سمت میں بڑی توجہ دی ہے۔

ہماری آزادی، ہمارے قومی رہنماؤں کی طویل جدوجہد کی بدولت حاصل ہوئی ہے انھوں نے اپنی دُور بین نگاہوں کے ذریعے حصولِ آزادی کے بعد سماجی و اقتصادی مقاصد کو عملی صورت دینا چاہی تھی اور اُن کی تمنا تھی کہ ملک میں ایسے سماج کی تعمیر ہو جو مساوات اور رواداری پر مبنی ہو۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ جو لوگ اقتصادی ترقی کی مختلف سطحوں پر رہ رہے ہیں۔ اُن کی تعلیم سے متعلق مربوط پروگرام کا موزوں اہتمام کرنے کے لیے اب کوششوں کو تیز کردیا جائے۔ (اس معاملے میں پہلے ہی تاخیر ہوچکی ہے)۔ ہمیں تعلیم کے ایک قومی نظام کو فروغ دینا ہوگا۔ کسی کو اس امر سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں کہ اس سے مُراد ایک قطعاً یکساں نصاب ہے۔ ۰۰ فیصد سے زیادہ طلبا آج کالجوں میں زیرِ تعلیم ہیں اور بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بیشتر کالجوں میں جو ماحول چھایا ہوا ہے وہ ذات پات اور علاقہ پرستی کی تنگ نظری سے سرشار ہے۔ اس صورت حال کا مداوا کرنا ہوگا۔ یہ وقت طلب معاملہ ہے اور اسے دُرست کرنے کے لیے ہمیں صبر و تحمل سے کام لینا ہوگا۔

ثقافتی تنوع

ہمیں علم ہے کہ بھارت ایک بہت بڑا ملک ہے اور اسے ایک بر صغیر کہنا موزوں ہوسکتا

ہے۔ اگر بھارت کا نقشہ مغربی یورپ کے نقشے پر رکھا جائے تو اس کے نیچے شاید اس علاقے کے چھ یا سات ملک آجائیں گے۔ اس میں مختلف لسانی، سماجی اور ثقافتی رشتوں سے وابستہ لوگ بود و باش رکھتے ہیں۔ اقتصادی نابرابری، علاقائی عدم توازن اور سماجی ناانصافی کے باعث ایسے وسیع و عریض ملک میں اکثر انتشار پسندانہ تناؤ پیدا ہو جاتے ہیں۔ بھارت خود کو ایک نہایت مشکل حالت میں پا رہا ہے اور شاید کسی دوسرے ملک کو مختلف سطحوں پر اتنے بڑے پیمانے پر پائے جانے والے نسلی اور دیگر اختلافات سے نپٹنا نہیں پڑتا۔ جغرافیائی و علاقائی خود مختاری کے لحاظ سے بھارت ایک ملک ہے۔ سیاسی انفرادیت سے قطع نظر یہاں کی ثقافت میں بہت بڑی گوناگونی پائی جاتی

سے زیادہ پرانی ہے۔ اور ہماری گوناگوں ثقافت مختلف ثقافتی گروہوں پر مشتمل ہے۔ قومی یکجہتی کی خاطر عوام، ثقافتوں اور گوناگوں معاشروں کو یکجا کرنا ہوگا اور انھیں ایک بھارتی قوم میں مدغم کرنا ہوگا۔ مرکز اور ریاستوں کے درمیان کشمکش کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ بیشتر صدیوں کی تاریخی سچائی ہے لیکن اسے قومی یکجہتی کی راہ میں نہیں آنا چاہیئے۔

سوویت یونین ایک اور ملک ہے جو بھارت کی طرح بہت بڑا ہے۔ اور وہاں بیشتر ثقافتی، نسلی اور مذہبی گروہ بود و باش رکھتے ہیں۔ اس ملک میں بہت سے دیگر امور کے علاوہ (طرز حکومت سمیت) زبان نے اس کی یکجہتی میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ سوویت یونین اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ جب وہاں یکجہتی لائی گئی

کو مساوی رتبہ اور اہمیت حاصل ہوگی۔ خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو، بھارت میں ایسے حالات نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں نصف درجن سے زیادہ زبانیں ایسی ہیں جو نہایت قدیمی ہیں اور ادبی سرمائے سے مالا مال ہیں اور اس لیے ہندی کو قومی زبان کے طور پر قبول کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ ہماری کوئی ایک زبان ایسی نہیں ہے جو قومی یکجہتی پیدا کر سکے یا اسے پیدا کرنے میں مدد دے۔ کچھ برس پہلے ایک بہت اچھی اسکیم پیش کی گئی تھی۔ سہ لسانی فارمولا، گو جنوبی

جغرافیائی و علاقائی خود مختاری کے لحاظ سے بھارت ایک ملک ہے۔ سیاسی انفرادیت سے قطع نظر یہاں کی ثقافت میں بہت بڑی گوناگونی پائی جاتی ہے۔ دراصل ان مسائل کو حل کرتے ہوئے اسے ہماری طاقت ہی تصوّر کیا جانا چاہیئے۔

گو جنوبی بھارت کی ریاستوں نے اپنے طور پر ہندی کی تعلیم دینا شروع کیا تاہم شمالی بھارت میں جنوبی بھارت کی زبانوں کی تعلیم دینے کے لیے کوئی مخلصانہ کوشش نہیں کی گئی۔ اگر اس فارمولے کو عمل میں لایا جائے تو ہندی کو واقعی جنوب میں زیادہ مقبولیت حاصل ہوگی۔

ہے۔ دراصل ان مسائل کو حل کرتے ہوئے اسے ہماری طاقت ہی تصور کیا جانا چاہیئے۔ ہماری سیاسی انفرادیت کا انحصار ثقافتی، مذہبی یا نسلی انفرادیت پر نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر ایسا کیا گیا تو ہماری طاقت ہماری کمزوری میں منتقل ہو جائے گی۔ ملک کے طور پر ہم ایک ہیں اور سماج کے طور پر ہمارے سماج میں گوناگونی ہو سکتی ہے۔ ہماری تاریخ ۴ ہزار برس

تو وہاں روسی زبان کے سوائے دوسری ایسی کوئی زبان نہیں تھی جو غالباً زیادہ ترقی یافتہ ہو اور اس میں زیادہ ادبی سرمایہ ہو، لہٰذا وہاں روسی کو قومی زبان کے طور پر قبول کرنے میں کوئی مشکل نہیں آئی۔ روسی کو سرکاری زبان کے طور پر منظور کرتے ہوئے یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ دوسری تمام زبانوں اور علاقوں

بھارت کی ریاستوں نے اپنے طور پر ہندی کی تعلیم دینا شروع کیا، تاہم شمالی بھارت میں جنوبی بھارت کی زبانوں کی تعلیم دینے کے لیے کوئی مخلصانہ کوشش

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

پروفیسر رئیس احمد

مسئلے کی اصل علامات کی تشخیص اور علاج کی ضرورت

قوم کو ایک دھاگے میں منسلک کرنے کا مسئلہ محض مذہبی فرقوں کے درمیان ہم آہنگی لانے کا مسئلہ ہی نہیں ہے، یہ محض لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ بھی نہیں۔ یہ سیاسی مسئلہ بھی نہیں۔ مصنف کی رائے میں یہ سماجی و اقتصادی مسئلہ ہے۔ فاضل مصنف نے رائج الوقت صورتِ حالات کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ ہم سب پر یہ بات واضح ہونی چاہیئے کہ ایسے بہت سے سماجی، اقتصادی، اور ترقیاتی مسائل ہیں جہاں فیصلہ سازی میں زبان، مذہب اور حتیٰ کہ ثقافت تک کا کوئی اہم رول نہیں ہے۔ ان کے نزدیک میڈیا اور تعلیم وہ دو اہم ذرائع ہیں جن سے عوام الناس کے اندازِ فکر میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے، چنانچہ قوم کو متحد و مربوط بنانے کے لیے ان ذرائع کا بھرپور استعمال کیا جانا چاہیئے اور اس سلسلے میں کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں دیا جانا چاہیئے۔

میرے نزدیک قومی یک جہتی کے لیے ہر طرح کی سینہ کوبی کے باوجود اس بارے میں کوئی بڑی تبدیلی یا کوئی نیا امکان متوقع نہیں۔ قوم کو ایک دھاگے میں پرونے کا مسئلہ، جس سے وہ مضبوط و مستحکم اور فعال بن سکے نیز نئی توانائی اور قوت کے ساتھ کام کر سکے، محض مذہبی فرقوں کے درمیان ہم آہنگی لانے کا مسئلہ نہیں، یہ محض لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ بھی نہیں، یہ سیاسی مسئلہ بھی نہیں، میرے نزدیک یہ ایک سماجی و اقتصادی مسئلہ ہے اور اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ پوری دنیا سے متعلق ہماری آئیڈیالوجی، ہمارے نظریات، ہمارا اندازِ فکر کیا ہے۔ جب تک دنیا میں اقتصادی استحصال اور سماجی ناانصافی چلتی رہے گی، اس وقت تک غریبی، ناخواندگی، جہالت اور شکست خوردگی بڑھتی رہے گی، یا کم سے کم وہ گھٹے گی نہیں اور صاحبِ اقتدار لوگ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو کسی نہ کسی بہانے آپس میں لڑاتے رہیں گے تاکہ اس پھوٹ کا فائدہ ان برسرِ اقتدار لوگوں کو ملتا رہے، ورنہ اتنا اس بگڑتی ہوئی صورتِ حال پر جو کہ زندگی کا حصہ بن چکی ہو گی، زیادہ تر حقیقی صورت میں اور کبھی کبھی مصنوعی طور پر تشویش کا اظہار ہوتا رہے گا۔

آئینی تقاضوں سے روگردانی

ہمارے آئین کے تین بنیادی ستون ہیں یعنی جمہوریت، سوشلزم گویا کہ سماج وادا اور سیکولرازم۔ یہ تینوں وہ اصول ہیں جو وقت کی کسوٹی پر پورے اُترے ہیں۔ عالمی تاریخ میں جن مفاہیم کے ساتھ ان تصورات و نظریات کو فروغ حاصل ہوا ہے اس لحاظ سے یہ ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ ایک ایسا سماج جہاں مٹھی بھر لوگ طاقت اور دولت کا ارتکاز کیے ہوئے ہوں، وہاں انسانی زندگی کے تمام معقول ذرائع اور وسیلے چند لوگوں کے پاس جمع ہوتے ہیں

جمہوریت اُن لوگوں کی ہوتی ہے جو مختلف
قسم کی مجبوریوں کا شکار ہوتے ہیں، ان
میں سے کچھ لوگ بالکل غریب ہوتے ہیں، جب
تک ایسی صورت حال کو بدلنے پر ایک مضبوط
رائے عامہ وجود میں نہیں آتی، اس
وقت تک قومی اتحاد اور استحکام کی ساری
گفتگو سراب ثابت ہوگی۔ ملک میں قومی
اتحاد لانے کی کسی بھی کوشش کے لیے سماجی
انصاف اور نابرابری کم کرنے کی مہم کو تیز
کرنے کی ضرورت ہوگی۔ پیداوار کے بڑے
اور اہم وسیلوں کو سماجی ملکیت کی گرفت میں
اگر نہ بھی لایا جا سکے تو کم از کم مذکورہ مہم کو تیز
کرنا ضروری ہے۔ سماج کی بقاء کے لیے جو بھی
حکمت عملی اپنائی جائے، اس میں اس بات کو
دھیان میں رکھنا بیحد ضروری ہوگا۔ اگر صورت
حال کو جوں کا توں رہنے دیا گیا اور اس میں
نابرابری اور عدم مساوات کو یوں ہی بڑھنے
کے لیے چھوڑ دیا گیا، تو اس سے بے تحاشہ
بے اطمینانی بڑھ جائے گی۔ اقتصادی ترقی کا وہ
عمل جہاں سماجی اثرات کا خیال کیے بغیر
ترقی کے عمل کو آزادانہ طور پر کھلا چھوڑ دیا
جائے، خالصتاً سرمایہ داری نظام کے ارتقاء
کے مرحلے کو ظاہر کرتا ہے۔ آج سرمایہ داری
نظام والے ممالک
بھی آزادانہ مہم جوئی
اور آزادانہ کاروبار
والی صورت حال
کو بالکل پہلے کی
طرح سے نہیں چلا
پا رہے ہیں، تاہم ہم
دیکھ رہے ہیں کہ آئینی دفعات
کے ہوتے ہوئے نیز بحیثیت مجموعی عوام کے حقیقی

مفادات کے باوجود ہمارے سیاسی نظام پر
غیر سرکاری سیکٹر کے فروغ کے لیے زور دیا جا رہا
ہے۔ یہ کام جدید کاری کے نام پر ہو رہا ہے
بیوپاری برادری کی پیش قدمیوں کی بناء پر
ذرائع پیداوار کو جدید بنانے اور پابندیوں
اور کنٹرول کو ہٹا دیئے جانے کے بہانے
نجی سیکٹر کے کاروبار کو بڑھانے پر زور
ہے۔ ہندوستان کی بقاء اور اس کے فروغ
کے لیے ایک طرف تو سماج وادی نظام کی
ضرورت کا احساس دلایا جاتا ہے، سماج وادی
انصاف کے نقطۂ نظر سے مقاصد کا تعین
کیا جاتا ہے، اس کے لیے باقاعدہ نظریاتی
مہم چلانے کے لیے سرگرمی کے ساتھ کوششوں
کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے، جبکہ دوسری
طرف ذرائع پیداوار کو غیر سرکاری سیکٹر میں
دھکیلنے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا ہے، چنانچہ
ان دونوں میں کوئی میل نہیں ہے۔
اگر ہندوستان میں استحصال کے خاتمے
اور سماج وادی نظام کے قیام کا تصور اسکول
کی نصابی کتاب کا ایک حصہ ہوتا، تو اس کی
مخالفت میں شور بلند ہو گیا ہوتا، اور اُسے
ہمارے تعلیمی مقاصد کے منافی سیاسی اور
فرقہ پرستانہ پراپگنڈہ کہہ کر اسے مذموم قرار
دیا جاتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے مجاہدینِ
آزادی اور قومی رہنماؤں کی دُور اندیشی
برطرف، ہم اسی
جگہ پر ہیں جہاں کہ
پہلے تھے۔ نابرابری
اور ناانصافی نہ صرف
سماج وادی مخالفت
میں جاتی ہے، بلکہ
یہ جمہوریت کو

آئینی دفعات کے ہوتے ہوئے
نیز بحیثیت مجموعی عوام کے حقیقی
مفادات کے باوجود ہمارے سیاسی
نظام پر سرکاری سیکٹر کے فروغ
کے لیے زور دیا جا رہا ہے۔ یہ کام
جدید کاری کے نام پر ہو رہا ہے۔
بیوپاری برادری کی پیشقدمیوں
کی بناء پر ذرائع پیداوار کو جدید
بنانے اور پابندیوں اور کنٹرول
کو ہٹا دیئے جانے کے بہانے نجی
سیکٹر کے کاروبار کو بڑھانے پر زور
ہے، ہندوستان کی بقا اور اس
کے فروغ کے لیے ایک طرف تو
سماج وادی نظام کی ضرورت
کا احساس دلایا جاتا ہے، سماج
وادی انصاف کے نقطۂ نظر سے مقاصد
کا تعین کیا جاتا ہے، اس کے لیے
باقاعدہ نظریاتی مہم چلانے کے لیے سرگرمی کے ساتھ کوششوں کی
ضرورت محسوس کی جاتی ہے، جبکہ دوسری طرف ذرائع پیداوار
کو غیر سرکاری سیکٹر میں دھکیلنے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا ہے، چنانچہ ان
دونوں میں کوئی میل نہیں ہے۔

محدود کردیتی ہے اور اس کے حصے بخرے کر دیتی ہے۔ آزادی ملے چالیس سال ہو چکے، اس عرصے میں آئینی تقاضوں اور خوش کن وعدوں کی موجودگی میں مکمل پرائمری تعلیم آبادی کے تہائی حصے تک پہونچ سکی ہے، ان میں سے ۵۰ فیصد وہ ہیں جن کی پرائمری تعلیم کا معیار بھی مساوی درجہ کا نہیں ہے، اس طرح سے وہ عمر بھر نقصان میں رہتے ہیں، روزگار پانے کے لیے وہ مقابلے کے امتحانات میں کامیاب نہیں ہو پاتے، جوں جوں اعلیٰ ترین عہدوں کی طرف ہم بڑھتے ہیں، اتنے ہی ہم اس کثیر طبقے کے افراد کو وہاں سے غائب پاتے ہیں، گویا ملک کی دس فیصد آبادی کے ہاتھ میں طاقت اور اقتدار ہے، جبکہ باقی ۹۰ فیصد آبادی مختلف درجوں کی غریبی اور محرومیوں کا شکار رہے، اس سے دل شکستگی، مایوسی اور بے اطمینانی بڑے پیمانے پر بڑھی ہے۔ یہی مایوس طبقہ وہ ہے جسے جان بوجھ کر سماج دشمن سرگرمیوں کے لیے اکسایا جاتا ہے۔ محرومیوں کے شکار یہی افراد طاقتور اور صاحب اقتدار لوگوں کے ہاتھوں میں رہن رکھے ہوئے ہوتے ہیں — جو ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے ہیں گویا ان لوگوں سے کام نکالنے والا طبقہ ان کو آلۂ کار بنا کر ان کو آپس میں لڑاتا رہتا ہے۔

ہندوستانی سماج میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، یہاں مختلف مذاہب پروان چڑھے ہیں، یہاں مختلف ذات پات کے لوگ بستے ہیں، یہاں کی ثقافت متنوع ہے۔ چنانچہ اتحاد و اتفاق، اور آپسی اشتراکِ عمل کی خاطر آپسی رواداری نیز اختلافات کو نہ صرف برداشت کرنے بلکہ سمجھ داری کے ساتھ ان کی خوبیوں کو جانچنے کی صلاحیت ایک بنیادی شرط ہے۔ اس کے علاوہ یہ حقیقت سمجھ لینی اور بھی ضروری ہے کہ اہم سماجی، اقتصادی اور ترقیاتی مسائل کا ایک پورا سلسلہ ایسا ہے جہاں فیصلہ سازی میں زبان، مذہب یا ثقافت کوئی اہم رول ادا نہیں کرتی۔ قدرتی وسائل کا استعمال، ماحول کا تحفظ، صنعتی ترقی کے سلسلے کی پسندیدگیاں، ٹرانسپورٹ، مواصلات، خود کفیلی کی طرف بڑھنے کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی کا استعمال، دفاعی امور وغیرہ وہ شعبے ہیں جہاں مذہب سے کوئی رہنمائی نہیں ملتی۔ یہ غیر مذہبی یا سیکولر پالیسی اور کارروائی والے شعبے ہیں۔
اس طرح سے سیکولرازم ایک جمہوری اور سماج وادی نظام والی ریاست کے لیے بنیادی اور ناگزیر شرط ہے — ایک ایسی ریاست کے لیے جہاں کہ انسانی بہبود کے عمل کو تیز تر بنانے کے لیے معقولیت پسندانہ اور معروضی نوعیت کے فیصلے کئے جاتے ہوں۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو سیکولرازم کو محض یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا مفہوم سبھی مذاہب کے تئیں یکساں احترام ہے۔ ایسے بھی لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ وسائل کا استعمال اس طرح نہیں ہونا چاہیئے جس سے طرزِ بود و باش تباہ ہو جائے یا جس سے ثقافت کو نقصان پہونچے (مثال کے طور پر قبائلی علاقوں میں)، یا چونکہ صنعتی ترقی کے جو بھی راستے اپنائے جائیں گے، وہ انسانی ضرورتوں سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے اور جمالیاتی احساس سے روگردانی نہیں کر سکتے یا چونکہ سائنس اور ٹکنالوجی کا استعمال محض میکانکی خودکار عمل نہیں ہو سکتا — یہ ایسا عمل نہیں ہو سکتا جو انسانی اقدار سے خالی ہو، یہ سب باتیں گڈمڈ ہو گئی ہیں، اور مذہب، زبان اور ثقافت کا معاملہ ہر فیصلے اور ہر موضوع بحث میں کلیدی اہمیت اختیار کر چکا ہے، یہ بلا شبہ ایک ایسا راستہ ہے جہاں عقلی دلائل اور معروضیت کو سیاسی اور اقتصادی فیصلہ سازی سے خارج کر دیا جاتا ہے اور مذہبی اقدار اور اس کے رول کو بیچ میں لے آیا جاتا ہے جبکہ ان معاملات میں مذہب قطعی ناکافی ہے، مذہب کو درمیان میں لانے سے تفریق اور انتشار پیدا ہوگا اور کسی بھی مذہبی فرقے کے لیے مثبت نتائج سامنے نہیں آسکیں گے۔ جمہوریت اور سوشلزم کے لیے سیکولرازم خشتِ اول ہے۔ جمہوریت کی تعمیر و تشکیل میں ہر مذہب کے ماننے والوں، سبھی زبانوں کے بولنے والوں، سبھی خطوں کے بسنے والوں اور سبھی ثقافتوں کے علمبرداروں کی برابر کی ساجھے داری ہے۔ ایسا نہیں کہ کوئی بھی فرقہ یا گروہ کسی دوسرے کے رحم و کرم کے باعث زندہ ہو۔ عددی حیثیت سے یا اپنی طاقت کے اعتبار سے

قدرتی وسائل کا استعمال، ماحول کا تحفظ، صنعتی ترقی کے سلسلے کی پسندیدگیاں، ٹرانسپورٹ، مواصلات، خود کفیلی کی طرف بڑھنے کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی کا استعمال، دفاعی امور وغیرہ وہ شعبے ہیں جہاں مذہب سے کوئی رہنمائی نہیں ملتی، یہ غیر مذہبی یا سیکولر پالیسی اور کارروائی والے شعبے ہیں۔

کوئی فرقہ کتنا ہی مضبوط ہو لیکن دوسرے فرقے کے رحم وکرم پر نہیں۔ بلاشبہ کوئی فرقہ، دوسرے فرقے کے مفادات غصب کرکے، نہیں پل سکتا۔ بے اطمینانیوں اور مصائب کا سلسلہ قومی قوت کو اسی طرح سے گھٹا دے گا جس طرح سے کہ کسی کپڑے کے تانے بانے سے چند تار نکل جائیں یا ٹوٹ جائیں تو وہ کپڑا کمزور ہو جائے گا۔ لہٰذا ایسی آئیڈیالوجی یا سرگرمیاں جو دیگر ذات پات کے لوگوں، دیگر مذہبی فرقے کے افراد یا دیگر لسانی یا علاقائی گروہوں کو دبانے کے لیے انجام دی جائیں، یا جن سرگرمیوں کے ذریعے کسی خاص ثقافت، روایت، عقائد کے نظام کی شان و شوکت کو دوبالا کرنے کی کوشش کی جائے گی، اور اس کی برتری پر زور دیا جائے، وہ سب کی سب اصل میں قوم دشمن سرگرمیاں ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہی کچھ روزانہ ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی یہ کوشش بے ڈھنگے پن سے اور کبھی کبھی سنجیدہ انداز سے کی جاتی ہیں۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ یہ عمل ان لوگوں اور گروہوں کی طرف سے انجام دیا جا رہا ہے جو کہ بانگِ دہل قومی یکجہتی کی حفاظت کا نعرہ لگاتے ہیں اور خود کو قومی یکجہتی کا حامی و مددگار کہتے ہیں۔ عدم سنگالی اور عدم آہنگی سے خاموش انحراف، بیزاریت، دل شکستگی یا غصہ کے جذبات

کے تحت نہیں دیئے جا رہے ہیں بلکہ یہ گہری تکلیف کی غمازی کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ قومی یکجہتی کا عمل کیوں ترقی نہ پا سکا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسے روز بروز سنگین سے سنگین تر خطرات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ حالانکہ قومی رہنما اس رجحان کے توڑ کے لیے بھرپور کوشش کر رہے ہیں، کیا یہ عمل اس لیے ترقی نہ کر سکا کیوں کہ قومی یکجہتی کا حصول بہترین ارادوں اور پوری نیک نیتی کے باوجود بنیادی طور پر مشکل ہے۔

آج کے حالات میں جو تنا ڈ پایا جاتا ہے،

جو تعصب و تنگ نظری کارفرما نظر آتی ہے، جو عقائد سننے اور دیکھنے کو ملتے ہیں، مخصوص مفادات اس صورتِ حال سے اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں، کہیں وہ جائداد بنا لیتے ہیں، کہیں ٹریڈ یونینوں میں نفاق کرا دیتے ہیں اور ان کو تڑوا دیتے ہیں اور کہیں وہ جذبات کو ابھار کر الیکشن جیتتے ہیں۔ یا ایسے لکھوکھا افراد کی بھی کمی نہیں جو انتہائی خلوص اور ایمانداری سے روایتی اور دیرینہ عقائد پر

جمے ہوئے ہیں، وہ لمحہ بھر کے لیے بھی انسان انسان کے درمیان برابری کو نہیں دیکھ سکتے۔ وہ اس بات پر بھرپور یقین رکھتے ہیں کہ ان کا مذہب ہی من کی شانتی اور موکش اور نجات دلانے کا واحد راستہ ہے۔ وہ اپنی زبان و ثقافت کو دیگر زبانوں اور ثقافتوں سے بالاتر سمجھتے ہیں، یا وہ مانتے ہیں کہ تاریخی اعتبار سے بھارت کے طرزِ زندگی کو مالا مال کرنے میں ان کی خدمات اور بھارت کی سرزمین پر ان کا استحقاق دوسروں کے مقابلے زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں مختلف مکاتیبِ فکر کے ماننے والوں کے اپنے اپنے افکار و نظریات ہیں۔ ان میں مذہبی روایتوں کے ماننے والے قدامت پرست بھی ہیں، اور تاریخ داں، ماہرینِ عمرانیات، فلسفی اور سائنسداں نیز سبھی طرح کے لوگ بھی ہیں۔

جمہوریۂ ہند کی تعمیر و تشکیل میں ہر مذہب کے ماننے والوں، سبھی زبانوں کے بولنے والوں، سبھی خطوں کے رہنے والوں اور سبھی ثقافتوں کے علمبرداروں کی برابر کی ساجھے داری ہے۔ ایسا نہیں کہ کوئی بھی فرقہ یا گروہ کسی دوسرے کے رحم وکرم کے باعث زندہ ہو، عددی حیثیت سے یا اپنی طاقت کے اعتبار سے کوئی فرقہ کتنا ہی مضبوط ہو لیکن دوسرے فرقے اس کے رحم وکرم پر نہیں۔ بلاشبہ کوئی فرقہ، دوسرے فرقے کے مفادات غصب کرکے، نہیں پل سکتا۔ بے اطمینانیوں اور مصائب کا سلسلہ قومی قوت کو اسی طرح سے گھٹا دے گا جس طرح سے کہ کپڑے کے تانے بانے سے چند تار نکل جائیں یا ٹوٹ جائیں تو وہ کپڑا کمزور ہو جائے گا۔

"تاریخ دانوں کی کوشش یہ رہتی ہے کہ وہ "تنازعات، مخالفتوں، لڑائیوں اور فتوحات نیز ظلم و ستم کی ایسی ایسی داستانیں تاریخ کے صفحات سے نکال کر لائیں، جن کا تعلق جاگیردارانہ نظام والے دور سے ہے وہ دورِ حاضر میں جنگجویانہ رجحانات اور رویّوں کے جواز کے لیے ماضی کی تاریخ سے ایسے گڑے مردے اکھاڑنے میں اپنی جولانیٔ طبع دکھاتے ہیں، جو

صرف آپسی مخالفتوں اور باہمی نزاع کو ہوا دیتے ہیں۔
وہ سابق حکمرانوں کے خلاف مشترکہ جدوجہد کی داستانوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں آپسی بھائی چارے

آتا ہے۔ اس طبقے کے نزدیک جدید نظریات کے حامل افراد باطل قرار پاتے ہیں، یہ طبقہ جدید خیالات رکھنے والوں کو ہندوستانی روایتوں کے تئیں لاپروا سمجھتا ہے۔ ایسے بھی لوگ ہیں جو سائنس کا سہارا

کے رحم و کرم پر تھا سائنسی ایجادات اور تحقیقات کے وجود میں آنے سے پہلے انسان قدرتی طاقتوں کے رحم و کرم پر ہی زندہ رہتا تھا، البتہ سائنس کی ایجادات نے اسے پہلے کے مقابلے زیادہ محفوظ زندگی عطا کی۔ یہ رجعت پسند لوگ سائنس کے مختلف

ماہر عمرانیات اور فلسفی بھی منفی رول ادا کرتے ہیں۔ وہ اپنے خیال کے مطابق ماضی کی شاندار داستانوں کو پیش کرتے ہیں۔ یہ حصے وہ دلیل اور کسی حجت کا سہارا لیے بغیر کہتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح سے وہ قومی جذبات کو ابھارا کرتے ہیں۔ اس طرح کی داستانیں ایسے لوگوں کو اپنے دامن میں

محبت والفت کے رشتوں، باہمی احترام کے واقعات سے نظریں چرا لیتے ہیں۔ ماہر عمرانیات اور فلسفی بھی منفی رول ادا کرتے ہیں۔ وہ اپنے خیال کے مطابق ماضی کی شاندار داستانوں کو پیش کرتے ہیں یہ حصے وہ دلیل اور کسی حجت کا سہارا

ڈھانپ لیتی ہیں جو طبعاً اور مزاجاً فرقہ پرست ہیں کسی ایک مذہب زبان یا ثقافت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے اور اس کی جارحانہ حمایت کرنے والوں کے لیے زیب

اصولوں، مثلاً ارتقاء، ارضی "خلا" و زمانہ، نظریۂ اضافیت اور حتیٰ کہ بہت سے جدید ترین اصولوں کو مذہب کے حوالے سے بیان کرتے ہیں گویا وہ بتانا چاہتے ہیں کہ سائنس کے یہ سبھی نظریات اور خود سائنس کا وجود مذہب کا مرہون منت ہے اور اس مذہب

داستان کے طور پر بیان کئے جانے والے اس طرح کے واقعات بہترین پناہ گاہ ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ماضی مستقبل کا دشمن بن کر سامنے آتا ہے۔ اس طبقے کے نزدیک جدید نظریات کے حامل افراد باطل قرار پاتے ہیں، یہ طبقہ جدید خیالات رکھنے والوں کو ہندوستانی روایتوں کے تئیں لاپروا سمجھتا ہے۔

لیے بغیر کہتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح سے وہ قومی جذبات کو ابھارا کرتے ہیں۔ اس طرح کی داستانیں ایسے لوگوں کو اپنے دامن میں ڈھانپ لیتی ہیں جو طبعاً اور مزاجاً فرقہ پرست ہیں، کسی ایک مذہب، زبان یا ثقافت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے اور اس کی جارحانہ حمایت کرنے والوں کے لیے زیب داستان کے طور پر بیان کئے جانے والے اس طرح کے واقعات بہترین پناہ گاہ ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ماضی مستقبل کا دشمن بن کر سامنے

لے کر رجعت پسندی کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ وہ پیچھے کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں، چنانچہ وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ ماضی میں پودوں اور حیوانات کی پوجا ہوتی تھی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس دور کے لوگ ماحول کی حفاظت میں اور اس کے بچاؤ میں پیش پیش تھے۔ وہ اس حقیقت پر کم ہی نظر دوڑاتے ہیں کہ ابتدائی دور کا سماج دنیا میں ہر جگہ قدرت سے بے حد قریب تھا۔ انسان کا وجود قدرت

سے روشنی اور معلومات حاصل کر کے یہ سائنسی ایجادات اور ماحول و ضوابط مرتب کئے جا سکے ہیں، اس طرح سے مذہب اور سائنس کے اصولوں کے درمیان توافق اور توازن قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طریقے سے سائنس سے عوام کے اعتماد کو متزلزل کیا جاتا ہے۔ ماقبل سائنس کے دور کی باتوں کو زندہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

سائنسی بحث والا ماحول کو زندہ کرنے کی کوشش
جاتی ہے۔ ایسے ایسے موضوعات بحث میں زندہ
نے کی کوشش کی جاتی ہے جن کے بارے میں
مدتوں پہلے فیصلہ کن باتیں ہو چکی ہیں۔ سچ اور
حقیقت کی تلاش سائنسی سرگرمی کا حصہ ہے۔
یہ کھوج، تلاش اور جستجو، تفتیش کا ایک حصہ
تحقیقی صلاحیتوں سے متعلق ہے، یہ مشاہدہ اور
ادراک سے بھی متعلق ہے۔ لیکن یہ کھوج دلیل کے
ساتھ، معقولیت پسندانہ اندازِ نظر

تنگ نظری پر مبنی اندازِ نظر کے ساتھ پیش کرتے
ہیں، ان کی مذمت کی جائے اور ان کو قومی یک جہتی
کا مخالف کہہ دیا جائے۔ ان کو غلط ہونے کا حق
پہونچتا ہے، البتہ ایسے لوگوں سے محتاط رہنے کی
ضرورت ضرور ہے جو قومی یک جہتی کی وکالت تو
کرتے ہیں لیکن اس کی نفی کے لیے ہر دانشورانہ رُخ
یا طریقِ کار اپناتے ہیں۔ اسی طرح اُن لوگوں سے محتاط
رہنے کی ضرورت ہے جو تاریخ کی وضاحتیں عوام
کو جوڑنے کے خیال سے نہیں بلکہ اُن کو لڑانے کے
خیال سے کیا کرتے ہیں۔ ہمیں ایسے لوگوں سے

کہ وہ سائنس کی نئی جہات کو سامنے لا رہے ہیں،
اس طرح کے اندازِ فکر اور طریقِ کار سے ہوشیار
رہنا چاہیئے کیوں کہ یہ ایسی کوششیں ہیں جن سے
ان نظریات کو پیش کرنے والوں کے تعصبات،
ان کے جذبۂ برتری اور اُن کے میلانات وہ رجحانات
کا پتہ نہیں چل پاتا بلکہ یہ رجعت پسندی پردۂ
راز میں چھپا کرتی ہے۔

طریقِ کار

سوال یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے، کیا قومی
یک جہتی ایک ایسی منزل ہوگی جو ہمیشہ عقل کو
چکراتی رہے گی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ ایک پیچیدہ
عمل ہے۔ اس کے لیے کی جانے والی جدوجہد
آئین میں واضح کردہ مقاصد یعنی جمہوریت، سماج واد
اور سیکولرازم کے فروغ کے لیے کی جانے والی
کوششوں کا ہی ایک حصہ ہوگی۔ یہ بات ذہن میں
رہنی ضروری ہے کہ یہ وہ پہلو ہیں، جو قومی ترقی

غیر مساوی تعلیم، غیر مساوی روزگار اور غربت کی فراوانی جمہوریت کا مذاق اُڑائے گی۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنا اقتصادی ڈھانچہ اس انداز سے وضع کریں جس میں سب کے لیے یکساں مواقع ہوں، جس میں استحصال نہ ہو، جس میں زرعی قوت گھٹائی جاسکے، یہ سب کام محدود وقت کے اندر اندر انجام پانے ہیں۔

کے ساتھ، استدلال کے ساتھ اور
منطقی حیثیت سے گویا کہ وجہ کے ساتھ آگے بڑھتی
ہے۔ سائنس علم کا انبار سامنے ڈال دیتی ہے اور
کائنات کے نادیدہ گوشوں کی نقاب کشائی کرتی
ہے۔ سائنس مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی، یا مکمل
ہے، اس کے باعث سائنسداں سائنس کے ذریعے
عجز و انکسار کا نمونہ دکھائی پڑے گا، ہر طرح کے
تجربے کو جانچنے پرکھنے کا راستہ اس کے سامنے
کھلا رہے گا۔ وہ اپنی تلاش، کھوج اور کوشش میں
دل و جان سے مصروف ملے گا۔ روحانیت کا
یہ انداز سائنس کے مزاج کے مطابق ہے۔ سائنس
مافوق الفطرت عقائد کو نہیں مانتی، وہ ضعیف الاعتقاد
کو قریب نہیں آنے دیتی۔ سائنس میں علم کے موجودہ
ذخیرے یا اس کے حصول کے طریقِ کار میں اعتماد کی
کمی کی گنجائش نہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ جو لوگ مذہب
میں، یا جو سماجی اور ثقافتی نظریات اور اصولوں کو

بھی ہوشیار رہنا ہے جو روایت کی تعریف
میں پُل باندھتے ہیں اور ایسی ایسی علامات کو تعریفی
کلمات کے ساتھ بیان کرتے ہیں جو ہندوستان
کے تنوع اور اُس کی گوناگونی کے کسی واحد جزو
سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہمیں ایسے لوگوں سے چوکس
رہنا ہے جو سائنس کو پُراسرار بناکر اُس سے
ضعیف الاعتقادوں کو دھوکہ میں ڈالتے ہیں اور
سائنسی اصطلاحات کو غیر سائنسی شعبوں میں استعمال
کرکے، سائنس پر عوام کے اعتماد کو تذبذب میں
ڈالتے ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں

کی سمت جانے والے پہلوؤں سے الگ نہیں ہیں۔
بلکہ یہ ایک دوسرے پر منحصر ہیں، سوشلزم یا سماج
واد کے راستے سے انحراف کرکے، بھارتی ثقافت،
روایت یا بھارتی طرزِ حیات وغیرہ کے نام پر کوششوں
کو آگے بڑھانے کے اقدام سے جمہوریت کو نقصان
پہونچے گا اور قومی اتحاد کی راہ میں مسائل آجائیں گے۔
غیر مساوی تعلیم، غیر مساوی روزگار اور غربت کی
فراوانی جمہوریت کا مذاق اُڑائے گی۔ ہمارے لیے
ضروری ہے کہ ہم اپنا اقتصادی ڈھانچہ اس انداز سے

دمنع کریں جس میں سب کے لیے یکساں مواقع ہوں جس میں استحصال نہ ہو، جس میں زر کی قوت گھٹائی جاسکے، یہ سب کام محدود وقت کے اندر اندر انجام پانے ہیں۔

سیکولرازم کی تعریف کیا ہو؟ اگر اسے ایک ایسا اجازت نامہ تصور کر لیا جائے جس کی رُو سے بھارت میں پھیلے ہوئے مختلف مذاہب اسی کے دامن میں سما لیے جائیں، گویا کہ اسے ایک ایسا مسکن سمجھ لیا جائے جہاں سبھی مذاہب کو دخل حاصل ہو اور سیکولرازم خود ایک اجتماعی مذہب کی صورت اختیار کر لے تو ایسی صورت میں ہم سماجی اور اقتصادی وسائل کے تئیں معقولیت پسندی اور متحرک اندازِ نظر سے دُور ہو جائیں گے اور قسمت پرست کر رہنے کے عناصر تقویت پائیں گے، لوگ فرار کی راہ سے وابستہ رہیں گے۔ اور سبھی کوششوں میں ابہام، ضعیف الاعتقادی وغیرہ کی کارفرمائی نظر آئے گی۔ یہی نہیں بلکہ مختلف مذہبوں کے ماننے والوں کے درمیان تناؤ اور جھگڑے بڑھیں گے اور ایک فرقہ دوسرے پر اخلاقی برتری کے نام پر غالب آنے کی کوشش کرے گا۔ اس سے ظلم و تعدی، تشدد اور انتشار کو تقویت ملے گی۔ مذہب کو ذاتی معاملہ تصور کرنا چاہیئے۔ متمدن اور مہذب زندگی کے ارتقائی عمل میں وجود میں آنے والی اخلاقی، روحانی اور سماجی اقدار کو سنجیدگی سے پھیلانا ضروری ہے۔ یہ کام تعلیم کے ذریعے انجام پائے گا۔ اس کے علاوہ ذرائع ابلاغ اور ذرائع نشر و اشاعت چونکہ رابطۂ عام کا موثر وسیلہ ہیں، لہٰذا ان کے ذریعے بھی یہ کام آگے بڑھے گا۔ یہ بات پھر ذہن نشین کرانی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ سیکولرازم کی ہندوستانی صورت اور شکل پر بے جا اصرار سے ایسے نظریے اور اصول کو تقویت ملے گی جس کی بنا، پر مذہب ہندوستان کا مقدر بن کر رہ جائے گا اور پھر یہ سیکولرازم ملک کو متحد رکھنے اور اس کو ترقی کی طرف لے جانے میں مؤثر عنصر ثابت نہ ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ اس صورتِ حال کو مزید بگڑنے سے بچانے کے لیے کیا کیا جائے۔ ملک کو یہاں کے معاملات سے دلچسپی لینے والی اُن غیر ملکی طاقتوں سے بچانے کے لیے جو کہ اس صورتِ حال کا فائدہ اُٹھا رہی ہیں، ضروری ہے کہ ہندوستان میں عوامی جدوجہد مستحکم بنیادوں پر چلائی جائے، ایسے نمائندے منتخب کر کے بھیجے جائیں جو بنیادی پالیسی کو مستحکم بنانے کے لیے ٹھوس کام کریں اور کھلے عام اس پالیسی پر کاربند رہنے کا اعلان کریں اور سرکار کی طرف سے واضح صورت میں مرتب کردہ پالیسی کو اختیار کریں۔

کسی بھی قوم کے اندازِ فکر کو بدلنے اور اس میں ضروری تبدیلیاں لانے کے لیے ذرائع نشر و اشاعت، ذرائع ابلاغ اور تعلیم سب سے زیادہ موثر وسیلے ثابت ہو سکتے ہیں، بھارت میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر سرکار کی نگرانی ہے، اخبارات بھی سرکاری اثر کے دائرے سے خارج نہیں۔ میڈیا کے ذریعے جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرازم جیسے آئینی مقاصد کو بروئے کار لانے اور اس ضمن میں پالیسی کو نئی نئی سمتیں دینے کے لیے سرکار کی طرف سے آہنی عزم کی ضرورت ہے۔ جب تک سرکار واضح انداز کی پالیسیوں کے ساتھ اس راہ پر آگے بڑھنے کا عزم نہیں کرے گی، یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ تعلیم کے شعبے میں صورت

> سوال یہ ہے کہ اس صورتِ حال کو مزید بگڑنے سے بچانے کے لیے کیا کیا جائے۔ ملک کو یہاں کے معاملات سے دلچسپی لینے والی اُن غیر ملکی طاقتوں سے بچانے کے لیے جو کہ اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھا رہی ہیں، ضروری ہے کہ ہندوستان میں عوامی جدوجہد مستحکم بنیادوں پر چلائی جائے، ایسے نمائندے منتخب کر کے بھیجے جائیں جو بنیادی پالیسی کو مستحکم بنانے کے لیے ٹھوس کام کریں اور کھلے عام اس پالیسی پر کاربند رہنے کا اعلان کریں اور سرکار کی طرف سے واضح صورت میں مرتب کردہ پالیسی کو اختیار کریں۔

حالات اس سے مختلف ہے، لیکن یہاں بھی سرکار کو کلیدی رول ادا کرنا ہے کیوں کہ اس طرح کی پالیسی کو بروئے کار لانے کے لیے جیسا کہ یہاں بیان کی گئی ہے، مخصوص مفادات کی طرف سے زبردست مخالفت کا خطرہ ہے۔ قدامت پرست اور روایت پسند اس کی شدید مخالفت کریں گے۔ سرکار کو عزم صمیم کے ساتھ ایک موقف اپنانا ہوگا۔ مزید برآں تعلیم کو بہترین طور پر کام میں لانے کے لیے محض یہ کافی نہیں کہ خیالات کے ایک سلسلے کو الگ کر کے، دوسرے سلسلے کو اس کی جگہ نافذ کر دیا جائے، خواہ نافذ کئے جانے والے خیالات کتنے ہی قابلِ بھروسہ اور قابلِ یقین کیوں نہ ہوں۔ آج کے طریقِ تعلیم میں طلبا، استادوں کے اسباق اور ان کے فرمودات کو بلا چوں وچرا تسلیم کر لیتے ہیں، یا کتابوں میں لکھی گئی باتوں کو بلا حجت اور بلا دلیل مانتے چلے جاتے ہیں، اس سے طلبا محض خاموش تماشائی اور سادہ لوح دکھائی پڑتے ہیں۔ بچوں اور بالغوں کے سامنے جو خیالات بھی رکھے جائیں، ان پر اُن کو غور وفکر کی دعوت دی جائے۔ اُن میں از خود غور وفکر کی عادت پڑے۔ وہ از خود ان کا تجزیہ کریں اور ان کے بارے میں اپنے خیالات اور اندازوں کو سامنے لائیں۔ یہی عمل تسلسل کے ساتھ آیڈیالوجی بن سکتی ہے، تعلیمی عمل اور اس کے ردِّ عمل کو جاننے اور پرکھنے کے لیے ایک خصوصی طریقِ کار کی ضرورت ہے۔ مگر بہت سے تعلیمی نظام جن میں خود ہمارا تعلیمی نظام بھی شامل ہے، ناکام رہے ہیں۔ لہٰذا سیاسی ماحول خواہ کسی قدر بھی عمدہ ہو، عوام الناس کو کھلے دل سے سوچنے کا عادی بنانا، تعصبات اور تنگ نظری کی گلیوں سے انھیں باہر نکالنا، پیشہ ور نعرہ لگانے والوں اور بازاری مقرروں نیز پامال نظریات کی نشاندہی کا اہل بنانا، معقولیت پسندانہ انداز فکر سے لیس کرنا نیز نوعِ انسانی کی وسیع تر بہبود کے نظریات اور تخلیقی عمل کے لائق بنانا، یہ سب کام بلاشبہ بہت مشکل ہیں، چنانچہ انھیں کم سے کم وقت میں انجام دینا ممکن نظر نہیں آتا۔ لیکن کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں۔ ہمارے ملک میں مختلف طرح کے جو تناؤ پائے جاتے ہیں، وہ اپنی جگہ ایک شدید مسئلہ ہیں۔ انتظامی کارروائیاں اور سیاسی اعلانات بذاتِ خود اس مسئلے کے حل پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ اب یہ مسئلہ اُن ماہرینِ تعلیم کا ہے جو صحیح اندازِ فکر رکھتے ہیں، انھیں آئین کے مطابق زندگی گزارنے کے مشترکہ مقصد کے لیے، مناسب دانشورانہ اندازِ نظر اور طریقِ کار کے فروغ کے لیے، نیز جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرازم کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے تعلیم کی مدد سے قوم کو متحد بنانے کے چیلنج سے نبرد آزما ہونا ہے۔ ●

بقیہ، رنگارنگ ثقافت ہی آپسی اتحاد کا سرچشمہ ہے

یہ بات فراموش نہیں کی جانی چاہیئے کہ طاقت کی لامرکزیت، حکومت کو عوام کے قریب تر لانے سے احساسِ شرکت میں مدد دیتی ہے اور جو لوگ محسوس کرتے ہیں کہ وہ فیصلہ سازی میں شرکت کر رہے ہیں اور پالیسی پر اثر ڈالنے کی پوزیشن رکھتے ہیں، وہ علیحدگی کے بارے میں نہیں سوچتے۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایسا کیوں سوچیں۔ وہ اپنے امور خود انجام دیتے ہیں اور مرکزی فیصلہ سازی میں حصہ لیتے ہیں۔ لہٰذا لسانی ریاستوں نے قومی یکجہتی کے عمل میں مدد دی ہے اور اس کے لیے انھوں نے ثقافتی اور لسانی قوم پرستی پر زور دیا ہے جس سے بصورتِ دیگر علیحدگی پسندانہ رجحانات کی حوصلہ افزائی ہوگی۔

بھارت کثیر روائتی ملک ہے۔ اس میں بیشتر زبانیں، بیشتر ثقافتیں اور مختلف پس منظر رکھنے والے بیشتر لوگ ہیں۔ لیکن اس سے اس امر کو تسلیم کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی کہ بھارت ایک واحد اکائی یعنی بھارت ورش ہے جس کی ثقافتی روایات میں بنیادی اتحاد ہے ثقافتوں اور زبانوں کے تنوع سے ہمیں خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔ اتحاد کا دھاگہ ان کی مالاؤں سے گذر رہا ہے۔ کتھا کہانیوں کی روایات اور مشترکہ مصائب مختلف گروہوں کو یکجا کرتے ہیں۔ بھارت اپنے تنوع پر ناز کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا تنوع ہے جو اتحاد کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کیوں کہ یہ ثقافتی اور لسانی خود مختاری کی بہت حد تک اجازت دیتا ہے۔ یہ غلطی ہوگی اگر ایک ثقافتی مملکت کی تلاش ہمیں جبری یکجہتی کی جانب لے جائے کیونکہ اس سے محض کشمکش اور تقسیم عمل میں آئے گی۔ تنوع میں اتحاد یعنی حقیقی یک جہتی کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ اتحاد کو تقویت ملے گی اور اس سے ہماری کثیر روایات کا حسن کسی بھی طرح مسخ نہیں ہوگا۔ ●

بقیہ، مذہبی قدامت پرستی، قومی یک جہتی کے لیے ایک خطرہ

ایک شُدنی ہونے جا رہی ہے۔ اس شُدنی کو پورا کرنے کا مقدس فرض ہم پر آن پڑا ہے۔ اس فرض کو ہم قدامت پرست قوتوں کو شکست دے کر ہی انجام دے سکتے ہیں۔

بابائے قوم اور شریمتی اندرا گاندھی کو ملک کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی جانِ عزیز تک قربان کرنی پڑی۔ ہم نے قدامت پرستوں کے بھرپور حملے سے قومی یک جہتی کو بچانے کے لیے اتنی بڑی قیمت چکائی ہے کہ اس سے زیادہ بڑی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم اب بھی حرکت میں نہیں آئیں گے، کچھ کریں گے نہیں، تو تاریخ کا فیصلہ ہمارے خلاف ہو سکتا ہے۔ ●

ایس۔ سی۔ بھٹ

مُلکی اتحاد کے لیے ناخواندگی کے خلاف جنگ

فاضل مضمون نگار کو اس ملک کے پرچار وسائل سے ایک لمبے عرصے تک وابستہ رہنے کے باعث اِن کا بیش قیمت تجربہ ہے۔ موصوف کی رائے میں ایک دوسرے کے بارے میں لاعلمی جذبۂ ہندوستانیت کی زبردست دُشمن ہے۔ اور کہ اگر ہمیں قومی یک جہتی کے حصول کی جانب ایک بڑی پیش قدمی کرنا ہے، تو یہ بہت ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کے پیغام کو عام کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں، تاکہ ہمارے ملک کے سبھی طبقے ایک دوسرے کو بہتر طور پر جان سکیں۔ کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر مصنف نے ملک کی موجودہ صورتِ حال کے لیے سیاستدانوں کو قصور وار ٹھہرایا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے چُناؤ جیتنے کی نیت سے ایک آسان طریقے کے طور پر بیجا خوش رکھنے کی پالیسی کو اپنایا ہے۔ موصوف اس سلسلے میں پرچار وسائل کے کام سے بھی خوش نہیں ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اِن وسائل میں قابلِ لحاظ توسیع کے باوجود آج یہ حالت ہے کہ مُلک کے مختلف طبقوں کے افراد اور ایک دوسرے خطّے کے مابین عدم واقفیت کی ایک خلیج حائل ہے۔

۱۹۷۹ء میں جب کہ میں ڈائرکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ ویژول پبلسٹی (ڈی اے وی پی) سے وابستہ تھا، اس محکمے نے بھارت واسیوں کی "بنیادی وحدت" پر ایک نمائش لگائی تھی جس کا موضوع اور عنوان تھا "ہم ایک ہیں"۔ پہلے یہ نمائش اُتر پردیش میں واقع علیگڑھ میں لگائی گئی، جہاں اُس سال بار بار فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے تھے۔ بعد میں اس نمائش کو لال قلعہ کے سامنے کھُلے میدان میں منتقل کیا گیا۔ دونوں شہروں میں، بلکہ بعد میں جہاں کہیں بھی یہ نمائش لگائی گئی، ہر طبقے اور فرقے کے لوگوں کے ایک بے پناہ اور قدردان ہجوم نے اسے دیکھا، جس میں پاکستان سے آئے ہوئے لوگ بھی شامل تھے۔ اُن میں سے ایک نے تو اسے کم از کم علیگڑھ اور دہلی دونوں جگہ پر دیکھا۔

نمائشیں ایک ایسا وسیلہ ہوتی ہیں، جہاں تماشائیوں کے ردِّ عمل کا فوری پتہ چلتا ہے اور جس چیز نے مجھے انتہائی متاثر کیا وہ تھی اُس نمائش کے موضوع اور اُس کی جھلکیوں کے ساتھ ناظرین کی اُونچے درجے کی ہم آہنگی، دلچسپی اور وابستگی۔ یُوں تو اس نمائش کو سبھی نے دیکھا مگر خاص طور پر مسلمان اسے دیکھ کر بہت زیادہ متاثر ہوئے اُس

لیکن جب یہ محض سرسری طور پر لگائی گئی، حقیقت میں ان کے قومی ورثے کو جائز مقام دیا تھا۔ اگرچہ ہم نے یہ کوشش کی تھی کہ اس نمائش کے ذریعے ہم سبھی مذاہب میں ہم آہنگی اور ہندوستان کی مخلوط ثقافت کو اجاگر کریں۔ یہ کوشش حقیقت پر مبنی تھی کہ دیگر باتوں کے علاوہ ہندوستان زمانۂ قدیم سے دنیا کے تمام مذاہب کا گہوارہ رہا ہے۔ چند مقامات پر جہاں کو عام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔ حال میں دہلی میں منعقدہ "اپنا اتسو" میں شمال مشرقی خطے سے دہلی میں لائے گئے فنکاروں میں سے متعدد نے یہ شکایت کی کہ یہاں کتنے ہی لوگوں نے انھیں غیر ملکوں سے آئے ہوئے برمی یا چینی سمجھا۔

باہمی واقفیت کا یہ عمل مدرسے سے شروع ہونا چاہیے اور بعد میں پرچار وسائل کی وساطت سے مسلسل طور پر جاری رکھا جانا چاہیے۔ اسی مطلب کے لیے کھیل تماشے اور تعلیمی پروگرام، ہیں، اور "کثرت میں وحدت" کے گھسے پٹے موضوع پر قومی ایکتا کی فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ زیادہ تر سرسری طور پر کیا گیا ہے۔ نہ تو اس کی احتیاط سے منصوبہ بندی کی گئی ہے اور نہ ہی اسے ایک مہم کے طور پر چلایا گیا، کسی بھی نوع سے اسے پُرتخیل انداز میں نہیں کیا گیا۔ مگر مذکورہ بیان اس حد تک اور بنیادی طور پر یوں غلط ہے کہ جبکہ اس نوعیت کی کچھ کوشش واقعی پہلے کی جا چکی ہے، مخالف رجحانات اس سے کہیں زیادہ طاقت اور بے رحمی کے ساتھ جاری رکھے

اقلیتوں کو خاص کر ہمیشہ ووٹ بینک ہی سمجھا گیا ہے، جنھیں چناؤ کے دِنوں کچھ مراعات دینے کے سوائے، انھیں بدستور اُن کی اصلی زبوں حالی ہی میں رکھا گیا ہے، نیز آئندہ انتخابات تک اُن کے خوف اور خدشات کو برقرار رکھ کر اُن کا استحصال کیا گیا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی عبادت گاہیں ساتھ ساتھ واقع ہیں، انھیں موزوں عنوانات کے تحت بڑی بڑی تصویروں میں دکھایا گیا تھا۔

ایک دوسرے سے عدم واقفیت ایک دشمن

اس تجربے سے میرے یقین کو پختگی ملی کہ ایک دوسرے کے بارے میں ہماری لاعلمی جذبۂ ہندوستانیت کی زبردست دشمن ہے۔ اگر ہمیں قومی یک جہتی کی جانب ایک بڑی پیش قدمی کے لیے اس قوت کو مستحکم کرنا ہے تو یہ ضروری ہے کہ ہم ہندوؤں کے بارے میں مسلمانوں میں اور اسی طرح مسلمانوں کے بارے میں ہندوؤں میں نیز دیگر مذہبی فرقوں، مختلف صوبوں اور خطوں، اور بھارت کے شمال مشرق اور وسط میں بسنے والی آبادی میں، نیز دُور افتادہ پہاڑی علاقوں میں بسنے والے قبائلیوں میں آپسی واقفیت بار بار دکھائی جانے والی فلمیں، نیز ریڈیو اور ٹی۔ وی پر دکھائے جانے والے پُرتخیل پروگراموں کو وسیلہ بنانا چاہیے۔ جن کا اصل مقصد بھارت کی وحدت ہو اور ذہن میں یہ ہو کہ اس ملک میں بسنے والوں کی ایک دوسرے کے بارے میں عدم واقفیت کی خلیج، ایک فرقے کو دوسرے فرقے سے اور ایک خطے کو دوسرے خطے سے الگ کرتی ہے۔

البتہ ایسا کہنا آسان ہے، کرنا مشکل۔ انسان کی نیکی میں یقین نہ رکھنے والا کوئی بھی شخص اس کے جواب میں یہ کہہ سکتا ہے کہ "یہ سب پہلے آزمایا جا چکا ہے اور ناکام رہا ہے"۔ ایسے لوگ غلط بھی ہیں اور صحیح بھی۔ صحیح یہاں تک کہ اس طرح کی کچھ باتیں پہلے کی جا چکی ہیں اور اب بھی کی جا رہی ہیں، یہی نہیں بلکہ قومی اتحاد پر چند اسباق درسی کتب میں بھی شامل گئے ہیں۔ اور اس مسئلے کو فقط اوپری طور پر ہی سلجھایا گیا ہے، جبکہ اس ضمن میں کی جانے والی محدود کوششوں کے مقابلے میں پھوٹ ڈالنے والی طاقتوں نے بہت زیادہ کام کیا ہے۔

ووٹوں پر انحصار کرنا

انتخابی سیاست کے دباؤ کے تحت، عوام کو لگاتار یہ یاددہانی کرائی گئی ہے کہ وہ مسلمان ہیں، ہندو ہیں، بلکہ وہ براہمن ہیں یا راجپوت، پسماندہ طبقے، ہریجن، قبائلی و دیگر جماعتیں ہیں۔ اقلیتوں کو خاص کر ہمیشہ ووٹ بینک ہی سمجھا گیا ہے، جنھیں چناؤ کے دِنوں کچھ مراعات دینے کے سوائے، انھیں بدستور اُن کی اصلی زبوں حالی ہی میں رکھا گیا ہے، نیز آئندہ انتخابات تک اُن کے خوف اور خدشات کو برقرار رکھ کر اُن کا استحصال

شعبۂ شائع کردہ بوجھا نئی دہلی۔

کیا گیا ہے۔ عوام کو مذہبی، علاقائی، لسانی اور ایک دوسرے سے الگ کرنے والے دیگر خانوں میں بٹے ہوئے دیکھنے کا رجحان غالب رہا ہے۔ اُنھیں محض ووٹروں کے طور پر دیکھنے کا میلان رہا ہے۔ اُنھیں ملک کے ایسے شہریوں کی حیثیت سے نہیں دیکھا گیا، جو افلاس اور جہالت کی بیڑیوں کو توڑنے اور اُن رُکاوٹوں کو پھلانگنے کے آرزو مند ہیں، جو اُنھیں جدیدیت اور اقتصادی فلاح سے دُور رکھتی ہیں۔

بلاشک کسی بھی نظامِ حکومت کی طرح جمہوریت میں عوام کے جذبات کو لازمی طور پر اہمیت دی جانی چاہیئے اور دُنیا میں ہر کہیں، ہر سیاستدان کو آئندہ انتخابات میں اپنی پارٹی اور اپنے انتخابی امکانات پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ لیکن میلان یہ رہا ہے کہ ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے عوام میں پھوٹ ڈال دی جائے اور پھر اس کا فائدہ اُٹھا کر ووٹ حاصل کیے جائیں۔ اس طرح کی کوششوں نے قومی اتحاد نیز مختلف فرقوں اور طبقوں کو قومی یک جہتی کے اُستوار رشتوں میں باندھنے کے کام کو تہس نہس کر دیا ہے۔

ووٹ حاصل کرنے کی چالیں، پھوٹ اور انتشار پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں اس طرح کی تنگ نظری برتی جاتی ہے کہ مختلف انتخابی حلقوں میں ایک خاص طبقے کی ایک فیصلہ کن تعداد، مثلاً ۲۰ یا ۲۵ فیصد ہے اور اگر اُن کے ووٹ ایک ساتھ مل جائیں تو یا تیمانده عام رائے دہندگان کے ۲۰ یا ۲۵ فیصد مزید ووٹوں سے ایک پارٹی کی جیت یقینی ہو سکتی ہے۔ چناؤ جیتنے کے اس آسان طریقے نے آگے چل کر سیاسی پارٹیوں کو اپنی انتخابی التجائیں، پروگرام، یہاں تک کہ اُن کے روزمرہ کے کام کو خواہ وہ اقتدار میں ہوں یا نہ ہوں، کچھ اس طرح مرتب کرنے پر آمادہ کیا، جس سے ایک مربوط اندازِ نظر اور قومی مسائل کو ایک قومی سیاق و سباق میں حل کرنے کے بجائے محض مختلف فرقوں ہی کی خوشنودی حاصل ہو سکے۔

سیکولرازم اور قومی اتحاد کے نصب العین کے تئیں ہمیشہ زبانی ہمدردی جتائی جاتی ہے۔ سیکولر ہونے کا لبادہ اوڑھنا ایک فیشن ہو گیا ہے، پس ایسے لوگوں کی منطق یہ لگتی ہے کہ جب تک انتخابی فتوحات کے اس آسان طریقے پر عمل پیرا ہونے سے کوئی نہیں روکتا، ہمیں یہ لبادہ اوڑھے رہنا چاہیئے۔ لہٰذا اِن فرضی سیکولر جماعتوں کے نو عمر رُکن آپ کو فرقہ پرست، بنیاد پرست، فرسودہ خیال اور متعصب عناصر کے ساتھ اخوت پیدا کرتے ہوئے ملیں گے۔

سیکولر ہونے کا لبادہ اوڑھنا ایک فیشن ہو گیا ہے۔ پس ایسے لوگوں کی منطق یہ لگتی ہے کہ جب تک انتخابی فتوحات کے اس آسان طریقہ پر عمل پیرا ہونے سے کوئی نہیں روکتا، ہمیں یہ لبادہ اوڑھے رہنا چاہیئے۔ لہٰذا اِن فرضی سیکولر جماعتوں کے نو عمر رُکن آپ کو فرقہ پرست، بنیاد پرست، فرسودہ خیال اور متعصب عناصر کے ساتھ اخوت پیدا کرتے ہوئے ملیں گے۔

ایک عصری، جدید اور ترقی پسند قوم بننے کے لیے ہمارا عہد افسوسناک حد تک ناکام رہا ہے۔ ایک ایسی عصری اور ترقی پسند قوم، جس میں مذہب فرد کی نجی زندگی کا معاملہ ہو اور جہاں مذہب کو لوگوں میں ایک آزار، انتشار نہ بناتے ہوئے، ایک دوسرے کے مذہبی رواجوں اور عقائد کا احترام اور لحاظ کیا جائے۔ ایک طرح سے یہ اُن متضاد کششوں کا اعادہ ہے، جو بھارتی نظامِ سیاست اور معاشرے میں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔ ہماری تاریخ میں اول سے آخر تک اتفاق اور اتحاد کی طاقتوں پر ہمیشہ نفاق اور تفرقے کی قوتوں کی یورش رہی ہے، اور یہ جنگ آج بھی جاری ہے۔

عوام کو لازماً آگاہ کیا جائے

لہٰذا ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم ووٹ پھانسنے والوں کو کھُل کر کھیلنے دیں۔ خوش قسمتی سے، اِن لوگوں کی صف میں بھی سمجھدار مرد و زن موجود ہیں، اور اُن میں سے متعدد یہ محسوس کرتے ہیں کہ قلیل المدت فائدے کے لیے ملک کے طویل المدت مفاد اور بھارتی عوام کے بہتر مستقبل کے حق میں اُنھیں ناعاقبت اندیش نہیں بننا چاہیئے

ے ہاتھ مضبوط کرنے، نیز انتشار پسند
عناصر کو پسپا کرنے کی غرض سے، عوام کو سیاستدانوں
کی رہنمائی کرنا ہوگی۔

عوام اور اُن کے علاوہ پرچار وسائل میں
لگے ہوئے صحیح الخیال مرد و زن، دانشور، علما، ماہرین

مجموعی طور پر مسلم حضرات ہندو ورثے، اُن کی عظیم
مذہبی کتابوں یعنی رامائن اور مہابھارت، ویدانت
کے وحدت الوجود کے عقیدے، نیز سبھی ہندو رسومات
اور عقائد کی تہہ میں زندگی کے لیے احترام کے جذبے
کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اسی طرح ہندو صاحبان
زیادہ تر اسلام کے بنیادی اصولوں، نیز اس میں
امن و اخوت
اور ایثار قربانی پہ
دیئے گئے زور سے
بے بہرہ ہیں۔ یہ ایک
معرکے کی بات
لگے گی کہ دُنیا کے
سب سے بڑے
اسلامی ملک،
انڈونیشیا کی
بنیادی ثقافت

تقلید کے نمونے ہوتے ہیں اور جو بات یہاں ثابت
کی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ مذہب اپنے اُن پیروؤں
کی راہ میں حائل نہیں ہوتا جو کہ اپنے ساتھی انسانوں
کی ثقافت اور طرزِ حیات کو سمجھنے اور سراہنے کی
کوشش کرتے ہیں۔ اگر اصل میں دیکھا جائے تو ہندوؤں
کے سب سے زیادہ تہوار غیر مذہبی ہیں، یعنی وہ کسی
مذہبی واقعے کے ساتھ جُڑے ہوئے نہیں ہیں۔ دیوالی
اور ہولی فصل کاٹنے کے زمانے کے تہوار ہیں، تامل ناڈو
کا پونگل اور شمالی ہند کی بیساکھی بھی ایسے ہی بڑے
علاقائی تہوار ہیں۔ مذہبی معانی تو انھیں بعد میں
پہنائے گئے۔

اگر بیداری عام ہو جائے اور ایک دوسرے
کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش
تیز ہو تو، آپ کے طبقہ جاتی جذبات کا استعمال
کرنے والی سیاستدانوں کی کوششیں تار تار ہو جائیں
گی۔ نیز کٹر پنتھیوں اور بنیاد پرستوں کے لیے آپ
کے مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھانا مشکل ہو

> ہماری تاریخ میں اوّل سے
> آخر تک اتفاق اور اتحاد کی
> طاقتوں پر ہمیشہ نفاق اور تفرقے
> کی قوتوں کی یورش رہی
> ہے، اور یہ جنگ آج بھی جاری ہے۔

تعلیم، نیز اُن تمام لوگوں کو، جو رائے عامہ
کو متاثر کر سکتے ہیں اور اتحاد مخالف
قوتوں سے لاحق خطرے کو روک سکتے ہیں،
اپنی بات پر اصرار کرنا ہوگا۔ علم و آگہی کی مزید
اشاعت سے جہالت کی رکاوٹوں کو مسمار کرنا
ہوگا۔ فقط علم و آگہی ہی رواداری کی طرف
لے جاتے ہیں، نہ کہ جہالت اور مذہبی و علاقائی
افتراق۔

> علم و آگہی کی مزید اشاعت سے جہالت کی
> رکاوٹوں کو مسمار کرنا ہوگا۔ فقط علم اور آگہی ہی
> رواداری کی طرف لے جاتے ہیں، نہ کہ جہالت
> اور مذہبی و علاقائی افتراق۔

مختلف طبقوں کے باہمی میل جول، نیز
اُس دُور دراز کی سیاحت، جو کہ آج کل لوگ کرتے
ہیں، پرچار وسائل اور معلومات عام کرنے والے
دیگر عوامل کے باوجود، ہندوؤں اور مسلمانوں میں
ایک دوسرے کی بابت، اور جنوب کے لوگوں کے
بارے میں شمال میں، جہاں جنوبی ہند کا ہر باشندہ
"مدراسی" ہوتا ہے، لاعلمی اور عدم واقفیت کا ایک
سمندر حائل ہے۔ ایک طبقے کے دقیانوسی لوگ دوسرے
طبقے کے لوگوں کے بارے میں اچھا نہیں کہتے۔

نے صدیوں سے رامائن اور مہابھارت کے تصرف
اور اپنائے جانے سے ترکیب پائی ہے۔ انڈونیشیا
اور ملائیشیا، جو کہ ایک بہت بڑی مسلم آبادی والا
ایک دوسرا ملک ہے، دونوں میں، سب کو "اگما"
کے نام سے پکارا جاتا ہے، جس سے مراد ہے،
"ویدک دھرم"۔
ہر ملک کے اپنے اپنے مروّجہ خیالات اور

جائے گا۔ لیکن اس کے حصول کے لیے ٹیلی ویژن پہ
محض ایک سکھوں کے مذہبی اجتماع کو، رمضان المبارک
میں مسلمانوں کو نماز ادا کرتے اور ایک دھارمک موقع
پہ ہندوؤں کو کسی پوتر ندی میں اشنان کرتے ہوئے
دکھا دینا کافی نہیں ہے۔ پہ واضح فکر کو یہاں پا بہ ٹ
ادا کرنا ہے اور پُر یقین انداز میں ان کے گہرے معانی

ذہن نشین کراتے ہیں۔

آیئے، ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانیے

اور کتنے ہی شعبے ایسے ہیں، جن میں آپسی واقفیت کو فروغ دینے اور لاعلمی کی دیواریں ڈھانے کے لیے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اس بڑہ سرائی کو کہ بھارت کبھی ایک قوم نہیں رہا اور نہ ہی آئندہ رہے گا، تاریخی حقائق سے جھٹلانا ہوگا۔ ہمالیہ سے کنیا

مراکز قائم کرنے میں مانع نہیں ہوئی۔ پندرہویں صدی میں چیتنیہ مہاپربھو نے پریم اور بھگتی کے اپنے پیغام کو عام کرنے کی غرض سے جنوب بعید تک، مشرق میں آسام تک اور مغرب میں گجرات تک پورے

ہم اس حقیقت سے بھی اپنی کچھ دلجوئی کر سکتے ہیں کہ وہ مسائل جو ہمیں درپیش ہیں اُن ممالک کے بھی سامنے رہے ہیں، بلکہ آج بھی موجود ہیں، جن میں مذاہب، لسانیات اور نسلی گروہوں کا تنوع ہے۔ ریاستہائے متحدہ میں ہمیشہ "واسپ" یعنی وہائٹ اینگلو۔سیکسن پروٹسٹنٹ کا غلبہ رہا ہے، جو اس ملک کے معاشرے اور نظامِ سیاست میں ایک غالب گروہ پر مشتمل ہے۔ شمالی آئرلینڈ کے رومن کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں نے ابھی تک

ہر ملک کے اپنے اپنے مروّجہ خیالات اور تقلید کے نمونے ہوتے ہیں اور جو بات یہاں ثابت کی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ مذہب اپنے اُن پیروؤں کی راہ میں حائل نہیں ہوتا جو کہ اپنے ساتھی انسانوں کی ثقافت اور طرزِ حیات کو سمجھنے اور سراہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کماری تک ایک بھارت کا تصور لگ بھگ اتنا ہی پُرانا ہے، جتنی کہ خود بھارتی تہذیب۔ غیر ملکیوں نے ہمارے دیس کو دریائے "سندھ" یا "انڈس" کے نام پر "ہند" کے نام سے پکارا۔ وجہ یہ کہ ہمارے پڑوسی یعنی قدیم ایرانی "س" کا تلفظ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے "سندھ" کو "ہند" میں بدل دیا۔ یونانیوں کو "ہ" کا تلفظ کرنے میں دشواری تھی، لہٰذا انھوں نے اس میں مزید ترمیم کرکے "انڈ" کر دیا، جس سے "انڈیا" کا نام وجود میں آیا۔ عربی اور فارسی کی دستاویزات اور کاغذات میں اس ملک کو ہمیشہ "ہند" اور یہاں کے باشندوں کو "ہندی" کہا گیا ہے۔

اس ملک میں وقتاً فوقتاً ایک مرکزی حکومت رہی ہے، جس کی عملداری پورے ملک یا اس کے سب سے زیادہ حصے پر تھی۔ لیکن اس کی عدم موجودگی "مثال کے طور پر" آدی شنکراچاریہ کو ملک کے چار گوشوں میں مذہبی اقتدار کے چار

ہم اس حقیقت سے بھی اپنی کچھ دلجوئی کر سکتے ہیں کہ وہ مسائل جو ہمیں درپیش ہیں اُن ممالک کے بھی سامنے رہے ہیں، بلکہ آج بھی موجود ہیں، جن میں مذاہب، لسانیات اور نسلی گروہوں کا تنوع ہے۔

ملک کا دورہ کیا۔ گرو نانک نے مکہ شریف اور عراق تک کا دورہ کیا۔

ایک ساتھ مل کر رہنا نہیں سیکھا۔ ان کے علاوہ اور بھی کتنی ہی مثالیں ہیں۔

جہالت، افلاس، اور عام بیروزگاری کے مسائل ایک ساتھ سامنے آ جانے سے مسئلہ کچھ اور بھی پیچیدہ ہو گیا ہے، کیونکہ ایسے حالات تنگدل سیاست دانوں اور بدنیت مفاد پرستوں کو استحصال کرنے کے لیے خوب موقع دیتے ہیں۔

بھارت کا ریکارڈ بالکل بھی خراب نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ جان کر، مل جل کر رہنا سیکھ لیں، تو بہت کچھ اور کیا جا سکتا ہے۔

کے۔ ایم پانیکر

رنگارنگ ثقافت ہی آپسی اتحاد کا سرچشمہ ہے

قومی یک جہتی ایک طویل عمل ہے جس میں ہر گروہ نہ صرف مشترکہ مفاد بلکہ مفادات کی یکسانیت کا احساس کرتا ہے۔ فاضل مصنف کی رائے ہے کہ مذہبی فرقہ پرستی اُس وقت عنقا ہو جائے گی جب ملک کی معیشت ترقی کی راہ پر بڑھتی چلی جائے گی۔ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ لسانی ریاستوں کی تخلیق نے صحیح قوم پرستی کی راہ ہموار ہوئی ہے، اور اپنے اس دعوے کے حق میں ٹھوس دلائل دئے ہیں۔

جب ہم قومی یک جہتی کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے صحیح طور پر ہماری مُراد کیا ہوتی ہے؟ بھارت ایک بہت بڑا ملک ہے، اپنی ثقافتوں اور زبانوں کے تنوع کے اعتبار سے یہ ایک برّاعظم کے برابر ہے۔ ایک لحاظ سے اس کا موازنہ یورپ سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب کہ یورپ بنیادی طور پر عیسائیوں یعنی کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں کا مسکن ہے یہاں بھارت میں ہندو، مسلمان اور دیگر مذاہب کے لوگ ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ یہ امر قومی یک جہتی کے مسئلہ کو پیچیدہ بنا دیتا ہے۔ مذہبی، ثقافتی اور لسانی گروہوں کے مفادات متصادم ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ جن میں قومی یک جہتی لانے سے پہلے مصالحت پیدا کرنا ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں قومی یک جہتی کا منشا یہ ہے کہ ہر گروہ کو یقین دلایا جائے کہ اختلافات کے باوجود وہ ایک بڑی برادری کا حصہ بنے ہیں۔ اور اگر اس برادری کا ڈھانچہ ٹوٹ گیا تو اُس کے عوض میں وہ سب ختم ہو جائیں گے۔

قومی تصوّر کی نشو و نما

اس سے پہلے کہ ہم اس مسئلہ پر مزید بحث کریں یہ دیکھنا سُودمند ہوگا کہ کیا یورپ کی قومی مملکت کی طرز پر یک جہتی مناسب ہوگی۔ یورپ میں قومی مملکت ایک طویل تاریخی عمل کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ وہاں مملکت کی تخلیق بادشاہ کے اردگرد ہوئی اور لہٰذا یہ ناگزیر تھا کہ مملکت مطلق العنان ہوتی۔ ایک قومی مملکت زبان یا مذہب میں علیحدگی کو گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ بادشاہ کا مذہب عوام کا مذہب ہوتا تھا۔ کیتھولک ممالک میں پروٹسٹنٹوں پر اگر جبر نہیں کیا جاتا تھا تو انھیں دوسرے درجے کا شہری تصوّر کیا جاتا تھا اور یہی حال پروٹسٹنٹ ممالک میں کیتھولکوں کا ہوتا تھا۔ ان مملکتوں میں صرف ایک زبان رائج تھی جہاں ایک سے زیادہ زبانیں رائج تھیں، وہاں جس زبان کو غلبہ حاصل تھا اُس کے سوائے تمام زبانوں کا درجہ ایک بولی تک گھٹانے کے لیے باقاعدہ طور پر تمام اقدامات کئے گئے۔ ایسی بات محض چند

علاقوں میں بھی ہوئی۔ اُن کی زبان ختم ہو جانے سے ان علاقوں کے فرقوں کے لیے قومی دھارے میں ملنا آسان تر ثابت ہوا لیکن اس سے اُن کی قوم پرستی ختم ہونے کے بجائے پسِ پردہ چلی جاتی ہے۔

مملکتیں محدود جغرافیائی علاقے میں کام کرتی تھیں اس لیے بقاء کے لیے دباؤ سے یک جہتی خود بخود عمل میں آئی۔ یہ بات یورپ کے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی لیکن اس کا یہ مطلب بھی تھا کہ جب ایک وسیع تر سیاسی اکائی یعنی یورپی برادری کی تخلیق ہوئی اور نواحی مملکتوں سے خطرہ کم ہو گیا تو

ہو کر ماتحت مملکتوں کا رہ جائے گا اور اس سے اُن میں یک جہتی پیدا ہوئی۔

جبری یک جہتی کا خطرہ

لہٰذا یہ واضح ہے کہ یک جہتی کے لیے موثر ہونا ایک طویل عمل ہے۔ جس میں ہر گروہ نہ صرف مشترکہ مفاد بلکہ مفادات کی یکسانیت کو بھی تسلیم کرتا ہے بیرونی خطرے جوڑنے والی قوت کے طور پر کام

اقلیتوں پر غالب اکثریت گروہ کی زبان اور ثقافت کو ٹھونسنے کی کوشش قومی اتحاد کے لیے عظیم ترین خطرے کا باعث بنتی ہے۔ ایک جبری یکجہتی کے قطعاً نہ ہونے سے بھی بدتر ہے۔ ایسی یک جہتی جوڑتی نہیں بلکہ توڑتی ہے۔ اقلیت محسوس کرتی ہے کہ وہ الگ تھلگ پڑ گئے ہے اور وہ پہلا مناسب وقت ملتے ہی بغاوت کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔

ایک بار اقلیتوں کا یہ خدشہ اور ہو جائے کہ اُن کی ثقافت اور زبان غالب اکثریت گروہ کی ثقافت اور زبان سے حقیر تر ہے تو سیاسی یکجہتی آسان تر ہو جائے گی اور وہ حقیقی صورت اختیار کر لے گی۔

انگلینڈ، آئرلینڈ کو ملانے میں قطعاً ناکام رہا۔ اور گو اُسے ویلز اور اسکاٹ عوام کو مدغم کرنے میں کامیابی ہوئی تاہم بیسویں صدی میں اُن کی قوم پرستی کا از سرِ نو اُبھرنا اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ کثیر ثقافتی اور لسانی گروہوں سے یک جہتی کو حقیقتاً کوئی خطرہ نہیں ہے بشرطیکہ عوام مشترکہ مقصد سے آگاہ ہوں اور اُسے تسلیم کریں۔

قومی یک جہتی کا عمل آسان تر ہو جاتا ہے اگر باہر سے دباؤ پڑے۔ بیرونی خطرے کا احساس یک جہتی کو فروغ دیتا ہے۔ اور چوں کہ یورپ

مقامی زبانوں اور ثقافتوں نے ایک بار پھر سر اُٹھانا شروع کر دیا۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یورپی برادری اس لیے وجود میں آئی کیوں کہ دو عظیم تر طاقتیں انفرادی اکائیوں کے طور پر مجبر مملکتوں کے لیے خطرہ پیدا کرنے کی حالت میں آگئی تھیں۔ روسی اور کمیونسٹ خطرے پر بہت زیادہ زور دیا گیا تھا۔ اور یہ بیرونی دباؤ اور خوف تھا کہ اگر وہ متحد نہ ہوئیں تو اُن کا درجہ کم

کرتے ہیں لیکن اگر ابتدائی مرحلوں میں ہی یہ خطرہ دور ہو جائے تو انتشار کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف اُس خطرے کو واضح کرنا بھی ضروری ہے جو یک جہتی کو ٹھونسنے کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک ایسی قوم کو جس کی اپنی ثقافت اور زبان ہو اور جس نے ماضی میں ایک سیاسی اکائی کے طور پر اپنا وجود رکھا ہو اُس میں یک جہتی لانا مشکل ہے [illegible] وسطی یورپ کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ [illegible] پر جرمن ثقافت و زبان ٹھونسنے کی ناکام [illegible]

سے پیرگ سلطنت کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔

اقلیتوں پر غالب اکثریتی گروہ کی زبان اور ثقافت کو ٹھونسنے کی کوشش قومی اتحاد کے لیے عظیم ترین خطرے کا باعث بنتی ہے۔ ایک جبری یک جہتی تو یک جہتی کے قطعاً نہ ہونے سے بھی بدتر ہے۔ ایسی یک جہتی جوڑتی نہیں بلکہ توڑتی ہے۔ اقلیت محسوس کرتی ہے کہ وہ الگ تھلگ پڑگئی ہے اور وہ پہلا مناسب وقت ملتے ہی بغاوت کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ کثیر ثقافتی اور لسانی گروہوں کو تسلیم کرنے سے انکار اور یک رنگی ثقافت پر زور قومی اتحاد کے لیے عظیم ترین خطرہ پیدا کرتا ہے۔

اس سے ہمارے سامنے یہ بنیادی سوال اٹھتا ہے کہ کیا یکساں ثقافتی قومی مملکت ایک ایسا کارآمد مقصد ہے جس کو حاصل کیا جائے خواہ اس کے لیے کتنی بھی قیمت ادا کی جائے؟

لکھوکھا عوام کی مملکت ہے جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مستقبل میں بڑھتا ہوا کردار ادا کرے گی۔ ان میں سے کوئی بھی یکساں ثقافتی قومی مملکت نہیں ہے۔

اب اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ اگر سیاسی نہیں تو کم از کم عظیم تر اقتصادی اکائیوں کی تخلیق کی جانب رجحان اس امید کے ساتھ پیدا ہو رہا ہے کہ اقتصادی اتحاد سے سیاسی تعاون اور انجام کار سیاسی اتحاد عمل میں آئے گا۔ خواہ یورپ ہو یا جنوب مشرقی ایشیا ظاہراً ان نئی سیاسی اکائیوں کو اُن مسائل سے نپٹنا ہوگا جو آج ہمیں درپیش ہیں۔ یورپ کو پہلے ہی اُن کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جیسا کہ میں

کو یا ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب تر لایا جائے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حل مقامی سطح پر تلاش کیا جانا ہے۔ کیوں کہ میرا یقین ہے کہ ایک بہاری مسلمان اور ایک بہاری ہندو کا ساجھا مقصد اور ساجھا تناظر ہے۔ ایک بہاری مسلمان تامل ناڈو کیرل کے اپنے ہم مذہب کے مقابلے میں اپنے ہندو ہمسایہ کے زیادہ نزدیک ہے۔

مذہب از خود کسی فرقہ کو بڑے دھارے سے الگ نہیں کرتا اگر وہ خود افلاس کی غار میں نہیں جانا چاہتا یا دوسرے اُسے اُس غار میں دھکیلنا نہیں چاہتے۔ مقامی سطح پر بیشتر ایسی سرگرمیاں اور پیشے ہیں جو مختلف مذہبی فرقوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتے ہیں۔ طلبا، کارکن، کسان، بیورو کریٹ اور دوسرے منظم اور غیر منظم گروہ، گروپ کے ممبروں کے طور پر عمل اور ردّعمل کا اظہار

> یہ امر عجیب دکھائی دے سکتا ہے کہ ہر فرقہ کے اندر ابھرتے ہوئے طبقے بھی سیاسی فائدہ حاصل کرنے کے لیے مذہب کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ وہ قدامت پسندی کے محافظ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ہر واردات سے خواہ وہ کتنی چھوٹی کیوں نہ ہو کوئی نہ کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک یکساں و ثقافتی قومی مملکت کو بالذات ایک اچھی مملکت تصور کرنا غلط ہے۔ یہ شاید کسی خاص تاریخی دور میں بہترین قسم کی سیاسی تنظیم تھی۔ وہ دور جب یورپ میں سرمایہ داری کی ابتدا اور نشو و نما ہوئی تھی لیکن وہ دور اب ختم ہو چکا ہے۔ ٹیکنالوجی کی غیر معمولی ترقی ہونے سے اب بڑی بڑی اکائیوں کو منظم کرنا ممکن ہوگیا ہے اور یہ چین، سوویت یونین، امریکہ اور بھارت میں

خیال کرتا ہوں، یہ قومی یک جہتی کا حقیقی مسئلہ ہے (ایک بار اقلیتوں کا یہ خدشہ دور ہو جائے کہ اُن کی ثقافت اور زبان غالب اکثریتی گروہ کی ثقافت اور زبان کے تابع رہے گی تو سیاسی یکجہتی آسان تر ہو جائے گی اور وہ حقیقی صورت اختیار کرلے گی۔

اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ قومی یک جہتی کا حقیقی مسئلہ یہ نہیں ہے کہ سکھوں اور ہندوؤں

کرتے ہیں۔

شکایات کے ناجائز فائدے اُٹھانا

میرا خیال ہے کہ قومی یک جہتی کو اس صورت میں دیکھنا ایک بنیادی غلطی ہے کہ وہ مختلف مذہبی فرقوں کو یکجا کرے گی۔ یہ تقسیم وطن کے قبل کے دنوں کی فرقہ وارانہ سیاست کی تلچھٹ ہے۔ ہمارے سیاسی کلچر میں فرقہ پرستی کی علامتیں اور جڑیں موجود ہیں

جب تک روزگار کے مواقع محدود ہیں اور اُن کے لیے مقابلہ جاری ہے۔ ایسے عناصر موجود رہیں گے جو شکایات سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کے لیے بیتاب رہیں گے۔ یہ امر عجیب دکھائی دے سکتا ہے کہ ہر فرقہ کے اندر اُبھرتے ہوئے طبقے بھی سیاسی فائدہ حاصل کرنے کے لیے مذہب کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ وہ قدامت پسندی کے محافظ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ہر واردات سے خواہ وہ کتنی چھوٹی کیوں نہ ہو کوئی نہ کوئی فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا جب تک یکساں مفاد رکھنے والے گروہ جو مختلف فرقوں کے افراد کو یکجا کر سکتے ہیں، آگے نہیں آئیں گے۔ فرقہ وارانہ سیاست کا ایک بڑا خطرہ بنا رہتا ہے۔ لیکن مذہبی فرقہ پرستی اُس وقت اختتامی مرحلے میں پہونچ جائے گی جب معیشت عوام کے تناظر کو فروغ دے گی جس سے ایجی ٹیشن کا رُخ بدل جائے گا اور احتجاجوں اور مظاہروں پر یکساں مفاد رکھنے والے گروہوں کا غلبہ ہو جائے گا۔ ایک قوم کے طور پر ہم میں یہ افسوسناک رُجحان پایا جاتا ہے کہ ہم اپنی کامیابیوں کو حقیر تصوّر کرتے ہیں۔ تاہم اگر مناسب تناظر میں دیکھا جائے تو ہماری کامیابیاں واقعی شاندار ہیں۔ ایک غیر جانبدار مشاہد کو معاف کیا جا سکتا ہے۔ اگر حصولِ آزادی کے وقت اُس نے یہ خیال کیا ہو کہ بھارت کا شیرازہ منتشر ہو جائیگا اور یہ کہ مختلف لسانی گروہ، جن میں بعض بیشتر یورپی قومی مملکتوں سے بڑے تھے، الگ ہو جائیں گے۔ بعض لوگوں کی رائے میں حقیقی مسئلہ یہ تھا کہ کیا علیحدگی پسندانہ رُجحانات کو روکا جا سکے گا اور اتحاد کو برقرار رکھا جا سکے گا؟ یہ بھارتی عوام کے لیے قابلِ تعریف بات ہے کہ تمام مشکلات کے باوجود اُنہوں نے اتحاد کو برقرار رکھا اور یہ کام کسی قسم کی طاقت کا استعمال کیے بغیر انجام دیا گیا۔ شاید ایک مطلق العنان حکومت فوج پر انحصار رکھتے ہوئے اقتصادی ترقی کی رفتار میں تیزی کو یقینی بنا سکتی تھی لیکن اُسے عوامی بے چینی کا سامنا کرنا پڑتا۔ یہ آبادی بے چینی کے سبب دُور اُفتادی راجدھانی میں مطلق العنان حکومت کا جُوا اُتار پھینکنے کے لیے آمادہ ہو جاتی۔

اس امر پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ ایک سیاسی نظام کے طور پر جمہوریت نے قومی یکجہتی کے عمل میں بڑا حصہ ادا کیا ہے۔ سماج کا ہر غیر مطمئن عنصر اپنا نظریہ پیش کر سکا، سماجی اور مذہبی اقلیتیں کسی رکاوٹ کے بغیر اپنے کاز کو آگے بڑھانے کے لیے ایجی ٹیشن اور مظاہرے کر سکتی ہیں اور پارلیمنٹ میں حزبِ مخالف اور حتیٰ کہ حکمراں پارٹی کے ممبران بھی زور و شور سے حکومت پر نکتہ چینی کر سکے۔ سب نے سمجھ لیا کہ اُن کے جائز مطالبات پورے ہو جائیں گے اور اس سے اس نظام کو تقویت دینے میں مدد ملی۔

ثقافتوں اور زبان کے تنوع سے ہمیں خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔ اتحاد کا دھاگہ ان کی مالا میں سے گذر رہا ہے۔ کتھا کہانیوں کی روایات اور مشترکہ مصائب مختلف گروہوں کو یکجا کرتے ہیں۔

لسانی ریاستیں

لیکن یہ لسانی ریاستوں کی تخلیق تھی جس نے قومی یکجہتی کی راہ ہموار کی۔ یہ بات متضاد معلوم ہو سکتی ہے۔ بعض لوگ یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ لسانی ریاستیں رکاوٹ ثابت ہوئی ہیں۔ لیکن ذرا تصور کیجیے کہ اس صورت میں کیا ہوتا اگر نظم و نسق کا پرانا نوآبادیاتی نظام جاری رہتا۔ مدراس پریذیڈنسی جیسی ایک ریاست میں جہاں چار بڑے لسانی گروہ ساتھ ساتھ رہ رہے تھے کسی بھی حکومت کے لیے عوام کے ساتھ اُن کی مادری زبان میں نامہ و پیام کرنا انتہائی مشکل ہو جاتا۔ لیکن اس امر کا اضافہ کیا جانا ضروری ہے کہ عوام کی بھاری تعداد کے لیے سچی آزادی محض سیاسی شرکت سے نہیں بلکہ ثقافتی اور لسانی خود مختاری سے وابستہ ہے۔ یقیناً لسانی ریاستوں نے ثقافت کی بقاء، رسالوں اور کتابوں کی تعداد بڑھانے، تھیٹر کی ترقی اور علاقائی فلموں کی تیاری میں بڑا حصہ ادا کیا ہے۔ یہ تمام باتیں ثقافت کی طاقت کا ثبوت ہیں۔ مزید برآں چونکہ سیاست اب عوام کی زبان میں آگئی ہے، اس لیے زیادہ سے زیادہ لوگ سیاسی عمل میں شرکت کر رہے ہیں۔ اب ریاستی اسمبلیاں زیادہ سے زیادہ اُن سیاست دانوں کے قبضے میں آگئی ہیں جو محض اپنی ریاست کی زبان میں اظہارِ خیال کر سکتے ہیں۔ اسمبلیاں ان موضوعات پر بحث کرتی ہیں جو عوام کی روزمرّہ کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ ریاستی حکومت ہے جو ذمہ دار ٹھہرائی جاتی ہے۔ لہٰذا بنگال کی ایک کمیونسٹ حکومت اور آندھرا پردیش کی ایک تیلگو دیشم حکومت کے لیے مرکز میں ایک کانگریس حکومت کے ساتھ ساتھ خوشی سے کام کرنا ممکن ہو گیا ہے۔

(باقی صفحہ پر)

پروفیسر ایس۔ بشیرالدین

ملکی اتحاد لانے میں

میڈیا کا کردار

پروفیسر ایس۔ بشیرالدین نے جو ایک نامور صحافی اور عالم ہیں، زیرِ نظر مضمون میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ہندوستانی فکر و فلسفہ میں عالمی ہم آہنگی کے تصور اور فرد و معاشرے کی سالمیت کے تحفظ کو ہمیشہ مدِنظر رکھا گیا ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے لیے کوئی اور طرزِ حکومت موزوں نہیں ہو سکتا، سوائے ایک ایسی حکومت کے جو قومی یک جہتی کی مثبت توثیق میں پختہ یقین رکھتی ہو کیوں کہ اتحاد ہمارے لیے ایک تاریخی ضرورت ہے، کوئی سیاسی مصلحت نہیں۔

ان کی رائے میں ہم سب لوگوں کا فرض ہے کہ ہم ملک میں سیکولرازم کو مستحکم تر بنانے کی کوشش کریں اور ایک زبان ہو کر فرقہ پرستی کی مذمت کریں۔ ان کی تجویز ہے کہ تشہیر و اشاعت کے تمام ذرائع کو ایک متحد ہندوستان کے تصور کی اشاعت و استحکام میں ایک مثبت رول ادا کرنا چاہیے۔

نسلِ نوعِ انسان کے خاندان کے بارے میں ہندوستانی نظریئے کو خوبصورتی اور اختصار کے ساتھ صرف دو الفاظ "وسودیو یہ کٹمبکم" میں بیان کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں کہ تمام دنیا انسان کا خاندان ہے۔ کائنات ہمیں اس بات کے ایک سے زیادہ ثبوت فراہم کرتی ہے کہ سبھی ذی حیات کی بنیاد انحصارِ باہم ہے۔ جاندار عناصر اور بے جان مادہ کے درمیان جو تعلق ہے وہ کائنات کی وحدت کی دلالت کرتا ہے۔ مشاہدۂ کائنات یا مطالعۂ حیات کا سائنٹی فِک تجزیہ کرنے کے بعد کوئی بھی شخص اس نتیجے پر پہونچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کل حیات باہمی تعلق پر مبنی اور متحد ہے اور یہ باہمی تعلق ہی قدرت کا خاصہ اور سائنٹی فِک عمل کا موضوع ہے۔

تمام عظیم دانشوروں، پیغمبروں، علماء اور فاضلان متبحر نے زندگی کی وحدت اور انسانی بھائی چارے کی تلقین کی۔ پیغمبرِ اسلام نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "تمام دنیا ایک خوبصورت مسجد ہے جہاں عوام ایک ہی مقصد کو لے کر جمع ہوتے ہیں۔" قرآنِ حکیم کی آیت میں مذکور ہے کہ "آپ مشرق کی جانب اپنا منہ کریں یا مغرب کی جانب، ہر طرف خدا موجود ہے۔" مسیحی روایات اس بات پر زور دیتی ہے کہ ہر وہ شہر یا گھر جو منقسم ہے، قائم نہیں رہ سکتا۔

زندگی کی اس شاندار وحدت میں یہ انسان کی تنگ نظری و کم ظرفی بلکہ بدطینتی ہے جو اسے مختلف رنگوں کے ایک شاندار قالی بافت اور

ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

تاریخی ورثہ

قومی سطح پر وحدت کا نظریہ روحانی توافق و
مناسبتِ باہمی کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ وحدت
ایک تاریخی ورثہ ہے، کوئی سیاسی مصلحت نہیں۔
کیونکہ ہندوستان ہمیشہ سے ہی کثرت میں وحدت
کی تصویر پیش کرتا آیا ہے۔

ہندوستانی فکر و فلسفہ میں عالمی ہم آہنگی
کے تصور اور فرد و معاشرے کی سالمیت کے تحفظ
کو ہمیشہ مدِنظر رکھا گیا ہے۔ ہماری میراث ایک
ایسی فلاحی ریاست کے تصور سے، جس میں فرد اور
معاشرے دونوں کی ترقی کا یقین دلایا گیا ہو،
پوری مطابقت رکھتی ہے۔ سمجھ داری اور
معقولیت پسندانہ مفاہمت کا بھی تقاضا ہے

مثال نہیں ملتی۔ اگرچہ ہندوستان میں ۵ کروڑ افراد
ہیں تاہم ہماری ثقافتی بیداری کے سبب ہمیں یہ
محسوس ہونا چاہیے کہ ہم ایک قوم ہیں۔ اشوک اعظم
اکبر، بدھ، شنکراچاریہ، گورو نانک اور دیگر دانشور
جو حق کی تلاش میں محو رہے، انھوں نے ہمیشہ
ہندوستان کے ڈھانچے میں امن اور ہم آہنگی کا نظریہ
پایا۔ ہندوستان ہی وہ سرزمین ہے جہاں سے خواجہ
معین الدین چشتی نے انسان کے لیے خدا کی محبت
کی تبلیغ کے پیغام اور سینٹ تھامس نے محبت،
اخوت اور بھائی چارے کے اصولوں کی اشاعت
کی۔ مہاویر نے اہنسا کا درس دیا اور کبیر نے بنی نوع

لیے مرتب کیا اور شریمتی اندرا گاندھی نے ملک کی
وحدت کو برقرار رکھنے کے لیے آگے بڑھایا، اسی
نظریے پر مبنی ہے۔ جیسا کہ موجودہ وزیر اعظم
شری راجیو گاندھی بارہا کہہ چکے ہیں۔ ہندوستان کے
لیے کوئی اور طرزِ حکومت موزوں نہیں ہو سکتا سوائے
ایک ایسی حکومت کے جو قومی یک جہتی کی مثبت توضیح
میں پختہ یقین رکھتا ہو۔

ہندوستان بہت سی ثقافتوں کا ایک عظیم
دھارا ہے اور اس میں مختلف اثرات کو اپنے اندر
جذب کرنے کی طاقت ہے۔ ہندوستانی روایت
کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں مختلف قسم
کے افکار اور مختلف قسم کی ثقافتوں میں
ہم آہنگی پیدا کرنے اور انھیں ملا کر ایک رنگا
رنگ گلدستہ تیار کرنے کی غیر معمولی صلاحیت
ہے۔ ہندوستان جبراً پیدا کی گئی یکسانیت
میں یقین نہیں رکھتا۔ ہمارا جمعیت بندیوں،

قومی سطح پر وحدت کا نظریہ روحانی توافق و مناسبتِ باہمی کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ وحدت ایک تاریخی ورثہ ہے، کوئی سیاسی مصلحت نہیں کیونکہ ہندوستان ہمیشہ سے ہی کثرت میں وحدت کی تصویر پیش کرتا آیا ہے۔

کہ انفرادی شناخت کو قربان کئے بغیر تمام
فرقوں کے درمیان خیر سگالی کا جذبہ موجود ہو۔ ہندوستان
کی طاقت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ یہاں
مختلف غیر یکساں علاقے ہیں، یہاں مختلف نسلیں
اور مذہب ہیں، یہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں
اور یہاں کی ثقافتیں بھی گوناگوں ہیں۔ لیکن اس
بوقلمونی سے یک جہتی کے وسیع تر نظریے اور افراد،
خاندان، معاشرے اور پوری قوم میں اتحاد کے
نیک آدرشوں کو کوئی زک نہیں پہونچنی چاہیے۔
یہ ہندوستان کی متحدہ کوشش تھی جو غیر
متشددانہ جدوجہد آزادی میں مضبوط ترین ہتھیار
ثابت ہوئی، جس کی آزاد قوم کی حالیہ تاریخ میں کوئی

انسان سے محبت کی تلقین کی۔

تمام مذاہب کیلئے یکساں احترام

ہمارے آئین بنانے والے اس قدر دوراندیش
تھے کہ انھیں یہ احساس ہوگیا تھا کہ ہندوستانی
حقیقت کی واحد بنیاد سیکولرازم ہی ہو سکتا تھا کیونکہ
ہمیں تمام مذاہب کے تئیں یکساں احترام رکھنا ہے۔
سیکولرازم کو صحیح طور پر سمجھا جائے تو اس کے معنی
ہیں "سمان بھاؤ" یعنی سب کے ساتھ یکساں سلوک
اور یکساں احترام جو مختصر الفاظ میں قومی یک جہتی
کی بنیاد ہے۔
ہماری حکومت کی پالیسی جسے جواہر لال نہرو

اور صف آرائیوں میں کوئی اعتقاد نہیں ہے۔ ہم تو
ایک روشن خیال اور وسیع النظری پر مبنی رضاکارانہ
تعاون اور وفاق میں یقین رکھتے ہیں۔
مختلف طرزہائے فکر جن کے امتزاج سے ہندوستان
کی تشکیل ہوئی ہے ان میں ہندو دھرم کے علاوہ اسلامی
روایات، بدھ مت، جین مت، مسیحی ورثہ، سکھوں
کی تعلیمات، پارسی عقائد اور کچھ یہودی اثرات
بھی شامل ہیں۔

ذہنی اتحاد

جیسا کہ عظیم فلسفہ داں صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے

ﺍﮨﺎﺗﻤﺎ گاندھی نے کہا ہے "قوم افراد کے پہلو بہ پہلو جمع ہونے کا نام نہیں ہے۔ یہ تو ایک ایسے معاشرے کا نام ہے جو ذہنوں کے اتحاد اور دلوں کے ملاپ پر مبنی ہو۔"

ہم اوّل اور آخر ہندوستانی ہیں، ہم بلا تفریق و امتیاز ایک مادرِ وطن کے بچے ہیں۔ سچا مذہب لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ انھیں جدا نہیں کرتا۔ لفظ "مذہب" لاطینی لفظ "ریلی گیر" (Religare) سے مشتق ہے۔

کی مسخ شدہ تاویلیں عوام کو اس درجہ مشتعل کر دیتی ہیں کہ وہ خدا اور مذہب کے صحیح راستے سے بھٹک کر ایک دوسرے کا خون بہانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

مل کر رہنا ہندوستان کے لیے کوئی نئی

ہندوستان کی طاقت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ یہاں مختلف غیر یکساں علاقے ہیں، یہاں مختلف نسلیں اور مذہب ہیں، یہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اور یہاں کی ثقافتیں بھی گوناگوں ہیں۔ لیکن اس بوقلمونی سے یک جہتی کے وسیع تر نظریے اور افراد، خاندان، معاشرے اور پوری قوم میں اتحاد کے نیک آدرشوں کو کوئی زک نہیں پہونچنی چاہیئے۔

ہندوستانی روایت کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں مختلف قسم کے افکار اور مختلف قسم کی ثقافتوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور انھیں ملا کر ایک رنگا رنگ گلدستہ تیار کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ ہندوستان جبراً پیدا کی گئی یکسانیت میں یقین نہیں رکھتا۔ ہمارا جمعیت بندیوں، اور صف آرائیوں میں کوئی اعتقاد نہیں ہے۔ ہم تو ایک روشن خیال اور وسیع النظری پر مبنی رضاکارانہ تعاون اور وفاق میں یقین رکھتے ہیں۔

سیکولرازم کے معنی تمام ریاستوں کے عوام کو بلا لحاظ مذہب، ذات اور زبان یکجا اور متحد کرنا اور ان کے اندر قربت کا جذبہ پیدا کرنا ہیں۔ مہاتما گاندھی نے ایک بار کہا تھا کہ

جس کے معنی ہیں یوگ (Yoga) کی طرح باندھنا۔ مذہب عربی کا لفظ ہے اس کے معنی بھی یکجا کرنا اور ملانا ہیں۔ لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب

یا انوکھی بات نہیں ہے۔ ہندوستان کی عظمت اس کی عقائد و ثقافتوں کا امتزاج تیار کرنے

کی اہلیت میں پنہاں ہے۔ ہمارے قوانین و روایات نے ہمیشہ مختلف تہذیبوں کا خیر مقدم کیا ہے اور اُن لوگوں کو پناہ دی ہے جنھوں نے جبر و استبداد

سیاسی و اقتصادی لحاظ سے مستحکم اور اخلاقی طور پر مضبوط ہندوستان کا تصور محال ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ حکومت اور عوام دونوں مل کر

کے بارے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہیئے۔ لہذا ہمارے تعلیمی اداروں، فیکٹریوں، حکومت، نجی سیکٹر کے ملازمین اور زندگی کے تمام شعبوں کے پیشہ ور ماہرین کو اپنے عمل سے رواداری اور یک جہتی کی مثال قائم کرنی چاہیئے۔

مل کر رہنا ہندوستان کے لیے کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں ہے۔ ہندوستان کی عظمت اُس کی عقائد و ثقافتوں کا امتزاج تیار کرنے کی اہلیت میں پنہاں ہے۔ ہمارے قوانین و روایات نے ہمیشہ مختلف تہذیبوں کا خیر مقدم کیا ہے اور اُن لوگوں کو پناہ دی ہے جنھوں نے جبر و استبداد سے بچنے کے لیے یہاں پناہ مانگی ہے۔

سب کی ذمہ داری

آزاد ہندوستان کی بنیاد سیکولرازم کے اصول پر رکھی گئی تھی جس کے معنی ہیں تمام مذہبوں کے لیے یکساں احترام اور تمام لسانی و ثقافتی گروہوں کو برابر کی آزادی۔ اس حق کے بدلے میں ہماری کچھ ذمہ داری بھی ہے۔ ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ اتحاد و یک جہتی کو قائم رکھے اور اس میں

ہر شخص کو محسوس کرنا چاہیئے کہ جب ہندوستان کی سلامتی و استحکام خطرے میں ہو تو سب کو یک زبان ہو کر فرقہ پرستی اور دیگر انتشار پسندانہ رجحانات کی مذمت کرنی چاہیئے کیونکہ یہ رجحانات قوم کو کمزور کرتے ہیں اور اُس کی طاقت گھٹاتے ہیں۔

سے بچنے کے لیے یہاں پناہ مانگی ہے۔ ہم نے نئے افکار اور نئے دھاروں کے راستے میں رکاوٹیں نہیں کھڑی کیں، ان سے وسیع تر ربط پیدا کئے ان کا خیر مقدم کیا اور اسی طرح ہماری ترقی و نشو و نما ہوئی اور ہم توازن کے ساتھ جینا سیکھ سکے۔

قومی ڈھانچے میں شگاف

ہندوستان کا بنیادی ڈھانچہ اتحاد کی اینٹوں سے بنا ہے لیکن حال ہی میں اس میں کچھ شگاف نظر آنے لگے ہیں۔ یہ جو کہیں کہیں تشدد اور دہشت گردی کے واقعات ہو رہے ہیں، ایک بنیادی سوال ہیں جس پر تمام صاحب فکر شہریوں کو غور کرنا چاہیئے۔ اتحاد و یک جہتی کے بغیر ایک

ملک کے تمام حصوں کے لوگوں کے سبھی طبقوں کو ملک کے اتحاد و سالمیت کی ضرورت و اہمیت کا احساس کرانے کے لیے تمام دستیاب وسائل کو بروئے کار لائیں۔ ملک کا اتحاد و سالمیت سب سے اہم چیز ہے۔ ہمیں اس بنیادی اصول

کوئی فرق نہ آنے دے۔ یہ امر موجب اطمینان ہے کہ ہمارے عظیم قومی دھارے میں اکثریت کا رویہ روادارانہ رہا ہے اور یہ بات ہندوستان جیسی بڑی قوم کے شایانِ شان ہے۔ ہر شخص کو محسوس کرنا چاہیئے کہ جب ہندوستان کی سلامتی و استحکام

خطرے میں ہو تو سب کو یک زبان ہو کر فرقہ پرستی اور دیگر انتشار پسندانہ رجحانات کی مذمت کرنی چاہیے کیوں کہ یہ رجحانات قوم کو کمزور کرتے ہیں اور اس کی طاقت گھٹاتے ہیں۔

تشدد اور دہشت گردی کے دیو کا مقابلہ جمہوری نظام کو مضبوط تر بنا کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ ایک جمہوریت میں تشدد اور دہشت گردی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

ہمیں قومی ہم آہنگی کو مضبوط بنانے اور فرد و معاشرے کی خود مختاری کو یقینی بنانے کے لیے نوجوانوں میں بیداری کی سطح کو بلند کرنا چاہیے۔ سب کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ اگرچہ ہندوستانی قوم مختلف فرقوں پر مشتمل ہے اور ان میں سے ہر فرقے کی ایک ممیز وراثت ہے لیکن اس کے باوجود ان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں اور ان کے اندر توافق و مطابقت ہے۔ ہمارا ملک بہت سی سیاسی پارٹیوں والی جمہوریت ہے اور ہم نے اپنے لیے خود اپنی مرضی سے وفاقی نظام چنا ہے جس سے کوئی انحراف نہیں کر سکتا۔ ہم روحانی سیاق و سباق میں دیکھیں یا معاشی و سیاسی حقیقت کے زاویۂ نگاہ سے، ہمارے سامنے ایک راستہ کھلا ہے اور وہ سیکولرازم کا راستہ ہے۔ اگر ہم مجنونوں اور دہشت گردوں کی ہلاکت خیزیوں کو خاموش تماشائیوں کی طرح دیکھتے رہے تو یہ بات اکثریت اور اقلیتوں دونوں کے لیے باعثِ شرم ہوگی۔ رضاکارانہ تنظیموں، تعلیمی اداروں، ڈاکٹروں، انجینیروں، وکیلوں، دانشوروں، ماہرینِ تعلیم کی انجمنوں اور عوام کو اپنی رائے اور عقیدے کا اظہار تقریر و تحریر اور تشہیر و اشاعت کے ہر ادارے کے ذریعے کرنا چاہیے۔ یہ کام چھوٹے چھوٹے گروپوں سے تبادلۂ خیالات اور لوگوں سے ذاتی بات چیت کے ذریعے بھی انجام دیا جا سکتا ہے۔ ہماری یہ قومی ذمہ داری ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ روزمرہ کے روابط کے دوران جو کچھ کہیں اس پر عمل بھی کریں۔

ذرائع تشہیر و اشاعت کا مثبت رول

ذرائع تشہیر و اشاعت کا فرض ہے کہ وہ انتشار پسندانہ رجحانات یا دہشت گردوں کی سرگرمیوں کو نہ اچھالیں۔ خواہ یہ اخبارات ہوں یا ریڈیو یا ٹیلی ویژن، سب کو چاہیے کہ وہ مثبت قوتوں پر روشنی ڈالیں اور ایک متحدہ ہندوستان کے نظریے کو مضبوط بنانے میں اُن کے کردار کو نمایاں اہمیت دیں۔

ہندوستان میں ایک جاندار جمہوری نظام برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہر طرح کے خوف کو چھوڑ دیں، خاص کر فرقہ وارانہ ہلاکت خیزیوں کے خوف کو جس نے مادرِ وطن کی شبیہہ کو داغ دار بنا دیا ہے۔ گاندھی جی نے ہمیں بے خوف رہنا اور روحانی قوت سے مسائل کا سامنا کرنا سکھایا۔ انھوں نے ہمیں امن و بھائی چارے کے ساتھ رہنے اور عوام کو بلا لحاظ مذہب، زبان، ذات پات اور معاشی اختلافات کے، یکجا اور متحد کرنے اور انھیں اتفاق اور اتحاد کی اہمیت محسوس کرانے کا درس دیا۔ انھوں نے ہمیں بلا تفریق و امتیاز، ایک ہی مادرِ وطن کے بچوں کی طرح رہنے کا مشورہ دیا۔

ہندوستان میں ایک جاندار جمہوری نظام برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہر طرح کے خوف کو چھوڑ دیں، خاص کر فرقہ وارانہ ہلاکت خیزیوں کے خوف کو جس نے مادرِ وطن کی شبیہہ کو داغ دار بنا دیا ہے۔ گاندھی جی نے ہمیں بے خوف رہنا اور روحانی قوت سے مسائل کا سامنا کرنا سکھایا۔

جواہر لال نہرو نے ہمارے اندر سیکولرازم کا جذبہ پیدا کیا اور کثرت میں وحدت کے نظریے کو جو ان کا محبوب نظریہ تھا قوی تر بنایا۔ اس کے برعکس برطانوی حکومت کی پالیسی "پھوٹ ڈالنے اور حکومت کرنے" کی تھی۔ مغل دورِ حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جو ایک دوسرے کی روایات کا احترام کرتا تھا اور جس کی بدولت آرٹ، کلچر، موسیقی اور فنِ طباخی کی خوبصورت مرکب شکلیں ظہور میں آئیں۔

صحت مند رجحانات کی تشکیل

کوئی قوم صرف مسلح افواج کے بل بوتے پر خود کو سیاسی عدم استحکام، لسانی جارحیت ا

مذہبی کٹرپن سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ عوام میں صحتمند رُجحانات و نظریات پیدا کرنے کے لیے ہندوستان کی رائے عامہ بنانے والے رہنماؤں کو ذاتی مثالیں قائم کرنی ہوں گی اسی سے آنے والی نسلوں میں صحتمند اندازِ نظر پیدا ہو سکے گا۔ یہ ہندوستانیوں کی خوش قسمتی ہے کہ آزادی کے بعد سے انھیں ایسے رہنما حاصل رہے ہیں جن کا اندازِ فکر نہ صرف یہ کہ تفریق پسندانہ یا تنگ دِلانہ نہیں تھا بلکہ جنھوں نے قومی معاملات میں ضبط و تحمّل، کشادہ ذہنی اور رواداری کا ثبوت دیا۔ اس لیے عوام کو اس بات کا احساس کرانا ضروری ہے کہ اتحاد و فرقہ وارانہ میل ملاپ ہندوستانی قوم کی تعمیر میں بنیاد کے پتھر کی سی اہمیت رکھتا ہے۔

خاص طور پر سیاسی جماعتوں کو اپنی حکمتِ عملی پر نظرثانی کرنی چاہیئے تاکہ ذات پات یا لسانی تفریق کو ہوا نہ ملے۔ ہم نے اپنی آزادی ایک بھاری قیمت چُکا کر حاصل کی ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ آزادی کی قیمت ہمیشہ ہُشیار و خبردار رہنا ہے۔

آج ہر سیاست داں کو حرکت میں آنا اور ذات پات، مذہب، خطّے اور علاقے کی تنگ حدود سے اوپر اٹھنا چاہیئے۔ اقلیت کے ذہنوں میں عدمِ سلامتی کا کوئی احساس پیدا نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ غصّے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیئے کیوں کہ اکثریت کی نفسیات میں غصّہ ہی خوف کا دوسرا پہلو ہے۔

ہم سب کو مل کر ایک مضبوط ہندوستان کی ترقی کا منصوبہ بنانا چاہیئے۔ ایک ایسے ہندوستان کی ترقی کا منصوبہ جس میں ایک دوسرے کے لیے احترام کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہو اور ہر سمت امن و شانتی کا بول بالا ہو۔ نوجوانوں کو ہندوستان کے اتحاد و استحکام کا راستہ دکھایا جانا چاہیئے۔ جیسا کہ پنڈت نہرو نے بہت پہلے کہا تھا "ہندوستان کی تعمیر میں پہلی ضروری چیز ملک کے اتحاد کو — صرف سیاسی اتحاد کو ہی نہیں بلکہ ذہنوں کے اتحاد کو بھی قائم و برقرار رکھنا ہے"۔

●

> خاص طور پر سیاسی جماعتوں کو اپنی حکمتِ عملی پر نظرثانی کرنی چاہیئے تاکہ ذات پات یا لسانی تفریق کو ہوا نہ ملے۔ ہم نے اپنی آزادی ایک بھاری قیمت چُکا کر حاصل کی ہے، ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ آزادی کی قیمت ہمیشہ ہُشیار و خبردار رہنا ہے۔

قارئین یوجنا کی خدمت میں

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ یوجنا اُردو زبان میں اپریل ۱۹۸۱ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ آجکل اسے ایک ماہانہ رسالے کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے، جس کے ہر شمارے میں ترقیاتی مضامین کے علاوہ ادبی اور سماجی نوعیت کے متعدد مضامین بھی شامل کئے جاتے ہیں۔ گذشتہ برسوں میں اس رسالے کے بہت سے خصوصی نمبر شائع کئے گئے، مثلاً :-

۱۔ یہ گندے لوگ یہ گندہ کھیل۔
۲۔ سائنسی مزاج اور روایات کی بندشیں۔
۳۔ رضاکار اداروں پر گہری نظر۔
۴۔ ۲۰۰۱ء — بھارت اکیسویں صدی کی جانب۔
۵۔ معذور افراد کا بین الاقوامی سال۔
۶۔ نئی تعلیمی پالیسی۔
۷۔ ساتواں منصوبہ وغیرہ۔

ان تمام خصوصی شماروں کو عوام نے بیحد پسند کیا اور متعدد تعریفی خطوط ان کے بارے میں موصول ہوتے رہے، دورِ حاضر میں جیسا کہ آپ واقف ہی ہیں، قومی اتحاد وقت کی اہم ترین ضرورت سمجھی جا رہی ہے، لہذا اس خصوصی شمارے میں قومی اتحاد اور اس سلسلے کے مسائل پر ملک کے دانشوروں نے کھُل کر اظہارِ خیال کیا ہے، زیرِ نظر شمارہ ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے جو آپ کے پیشِ نظر ہے، اس کے بارے میں بھی آپ کے "تاثرات" جاننے کا اشتیاق ہے، ہمیں اُمید ہے کہ یہ شمارہ بھی سابق خصوصی شماروں کی طرح سے ہی قارئین میں مقبول ہوگا اور اس اہم موضوع پر یہ ایک اہم دستاویز ثابت ہوگا۔

قارئین یوجنا سے التماس ہے کہ وہ اس کے لیے برابر قلمی تعاون دیتے رہیں، اور اس کے مزاج کے مطابق معیاری مضامین ارسال فرمائیں جو خوشخط ہوں، ہر مضمون کو تحریر کرتے وقت درمیان میں کافی فاصلہ رکھیں، کٹے پھٹے مسودات بھیجنے سے گریز فرمائیں، ادارہ ہذا معیاری تخلیقات پر حقیر معاوضہ بھی پیش کرتا ہے۔

چودھری راموجی راؤ

ہماری توجہ اصل مسئلہ کے حل پر مرکوز ہونی چاہیئے

اس مضمون کے فاضل مصنف اور دورِ حاضر کے مشہور صحافی راموجی راؤ کے خیال میں بھارت واسیوں نے ہمیشہ ہی سماجی اتحاد کے جذبے کا ثبوت دیا ہے اور یہ جذبۂ اتحاد ذات پات، رنگ ونسل، زبان وخطے وغیرہ کے سبب رونما ہونے والے اختلافات پر غالب آیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات سے لیکر بھوپال گیس المیے تک کی تاریخ کا مطالعہ ہندوستانی عوام کی وحدت کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بھارت میں جو رنگارنگی اور تنوع ہے اُسے اختلاف نہیں کہا جانا چاہیئے۔ ان کے نزدیک قومی اتحاد کے تانے بانے کو کمزور کرنے میں ناخواندگی، سماجی اور اقتصادی نابرابری اور مرکز، ریاست تعلقات میں خامیوں کا ہاتھ ہے۔ انھیں تعلیمی اداروں کی کارکردگی سے بھی شکایت ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تعلیم کو بامقصد بنانے کے لیے اُنھیں سماجی تبدیلی لانے کا مؤثر ذریعہ بننا چاہیئے۔

بھارت ایک ایسا ملک ہے جہاں ہرطرح کا تنوع دیکھنے کو ملتا ہے، یہاں کی رنگارنگی اور یہاں کی گوناگونی مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہے، یہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے، مختلف عقائد کے پیروکار، مختلف زبانوں کے بولنے والے اور مختلف خطوں کے بسنے والے یہاں کی کثرت کو وحدت کی شکل دیتے ہیں۔ ہم میں سے ہرایک اپنے کلچر اور اپنی ثقافت کا محافظ رہا ہے۔ ہمارا طرزِ حیات ہی ہماری بنیادی خصوصیات کا مظہر ہے۔ ان تمام جلوہ سامانیوں کے باوجود ایک درپردہ احساس جو ہمارے ملکی عوام کے دلوں میں ہروقت موجزن ہے، وہ یہ کہ وہ سب ایک ہیں۔ ہرفرد پھولوں کے ہار کی ایک لڑی ہے۔ مادرِ وطن کے یہ سب کے سب سپوت اسی ہار کے موتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ہماری سرحدوں پر جارحیت کی گئی تو اس کے خلاف جذباتی طور پر ایک ردِّ عمل ہوگا۔ کشمیر پر جارحیت ہندوستان کے انتہائی جنوب تک بسنے والے ہندوستانی عوام کو متحرک بنادے گی۔

تجربہ شاہد ہے کہ ہمارے ملک پر ۱۹۶۲ء، ۱۹۶۵ء، اور ۱۹۷۱ء میں تین بار حملہ ہوا مگر ہر موقع پر پوری قوم سیسہ پلائی ہوئی ایک دیوار کے مانند یکجا ہوکر مقابل آگئی۔ اسی طرح جب بھوپال گیس کے اخراج سے تباہی آئی، تو پوری قوم حرکت میں آگئی، انھوں نے ایسا محسوس کیا کہ یہ المیہ ان کا اپنا المیہ ہے، مختصر یہ کہ ذات پات، فرقہ، زبان، خطہ غرضیکہ کسی بھی طرح کے اختلاف کے باوجود ہمارے عوام نے ایک ہونے اور متحد رہنے کا ثبوت دیا ہے۔

تاریخی تناظر: اب سے ایک سو تیس برس

> اب سے ایک سو تئیس ۱۲۳ برس پہلے ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں لڑی گئی تھی، اس موقع پر بھی ہندو مسلمان، شاہ و گدا سبھی نے اپنے اختلافات مٹا دیے تھے اور سبھی نے برطانوی سامراجیت کے خلاف کندھے سے کندھا ملا کر لڑائی لڑی تھی، یہ شورش یا یہ جنگِ آزادی ابھی تک ہمارے دل و دماغ پر طاری ہے۔

پہلے ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں لڑی گئی تھی، اُس موقع پر بھی ہندو، مسلمان، شاہ و گدا سبھی نے اپنے اختلافات مٹادیے تھے اور سبھی نے برطانوی سامراجیت کے خلاف کندھے سے کندھا مِلاکر لڑائی لڑی تھی، یہ شورش یا جنگِ آزادی ابھی تک ہمارے دل و دماغ پر طاری ہے۔ ہم اس سے اب بھی تحریکِ عمل لیتے ہیں۔ یہ آئندہ بھی ہمارے دلوں کو گرماتی رہے گی۔ ملک کی جدو جہد آزادی کے درمیان پوری قوم نے اپنی اندرونی تنگ دیواروں اور اختلافات کو بھُلا دیا تھا، اور ذات پات، فرقہ، زبان، مذہب وغیرہ کے نام پر جو دوریاں پائی جاتی تھیں، ان سب کو بھُلا دیا تھا، ان سب نے دوش بدوش ملک کی جدو جہد آزادی میں حصہ لیا تھا، یہ اسی تحریک اور جوش و خروش کا نتیجہ تھا کہ ہم مُلکی عوام کو آزادی دلانے میں کامیاب ہو سکے۔

یہ سچ ہے کہ حصولِ آزادی کے ۴۰ برس بعد ہمارا جذبہ اتحاد سرد پڑ رہا ہے۔ اس میں آہستہ آہستہ کمی آ رہی ہے۔ بہت سے لوگوں کی رائے میں مذہب، زبان، خطہ وغیرہ اس راستے کی رکاوٹیں ہیں۔ حتیٰ کہ لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تقسیم کو بھی اس کے لیے ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہے۔

ریاستوں کی تنظیمِ نو

ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ علاقائی زبانیں ملک کی جدوجہد آزادی میں عوام کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں بے حد مددگار ثابت ہوئیں۔ اُن دنوں میں تمام لسانی علاقوں کے عوام نے پُر زور طور پر اس بات کی حمایت کی کہ روزمرہ کے انتظامی امور عوام الناس کی زبان میں ہی انجام دئے جائیں اور زبان کی بنیاد پر ان ریاستوں کی تشکیل تو عمل میں لائی جائے۔ نیشنل کانگریس نے عوام کی اس خواہش کو بھانپا اور اس سلسلے میں ایک قرارداد پاس کی۔ لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیل کا عمل ملک کی جدو جہد آزادی کا ہی ایک حصہ ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔

اب اکثر کہا جانے لگا کہ لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیل سے علاقائیت اور علاقہ پرستی کو فروغ ملا۔ لیکن لسانی گروہوں کی اُمنگوں، آرزوؤں اور ثقافتی تشخص کے تحفظ کی خواہشوں کو یا اقتصادی ترقی کی آرزوؤں کو علاقہ پرستی یا علاقائیت کی اصطلاح سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مرکزی حکومت نے علاقائی ضرورتوں پر پوری طرح توجہ نہ دی، اور اس سلسلے میں عوام کی طرف سے تکالیف کا اظہار ہوا تو اسے علاقہ پرستی سے تعبیر کرنا منطقی طرزِ استدلال نہیں کہا جا سکتا۔ قانون سازی، انتظامی اور مالی امور میں ریاستوں کی خود مختاری کو کم کرنا اور اسی طرح ترقیاتی منصوبوں کی تشکیل اور اُن پر عمل درآمد میں اُن کے اختیارات میں کٹوتی کرنا پسندیدہ امر نہیں کہا جا سکتا۔ آندھرا پردیش اور دیگر ریاستوں میں قدرتی آفات کے سبب اُن کو جس نازک صورتِ حال سے گزرنا پڑا اور جس کے لیے انھیں وسائل کی کمی کا سامنا کرنا پڑا، اس کے باعث ان کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ مرکزی حکومت اقتصادی اور سماجی ترقی میں علاقائی نابرابریوں کو کم کرنے کے لیے پوری طرح کوشش نہیں کر رہی ہے، چنانچہ ایسی صورت میں اگر بے اطمینانی کا سیلاب آئے اور اسے علاقہ پرستی کا نام دیا جائے تو یہ مناسب نہ ہوگا۔

ایک سے زیادہ زبانوں کا ہونا راستہ کی رُکاوٹ نہیں

اسی طرح سے یہ اصول بھی وقت کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترا کہ صرف ایک زبان عوام الناس کو جوڑ سکتی ہے اور ایک سے زیادہ زبانوں کی موجودگی، ان کو آپس میں بانٹ دیتی ہے۔ عرب ممالک کی مثال اس سلسلے میں ہمارے سامنے ہے۔ عرب قوم نے ترکوں کا مل کر مقابلہ کیا اور جب وہ آزاد ہو گئے تو وہ مختلف ریاستوں میں بٹ گئے۔ اگر زبان جوڑنے کا وسیلہ [illegible]

عرب برادری ایک متحدہ جمہوریہ ہوتی، مصر، سوڈان تجربے کی ناکامی ہم سب پر واضح ہے۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کی مثال یہ واضح کرتی ہے کہ محض مذہب کی بنیاد پر مختلف خطوں کے لوگ آپس میں متحد نہیں رہ سکتے۔ فرقہ واریت مخصوص مفادات کی دین ہے۔ یہ ظلمت پسندی کا عملیہ ہے۔ زبان اور مذہب کا اس میں کوئی رول نہیں ہے۔ رامائن اور مہابھارت کے تراجم علاقائی سرحدوں کو پار کر گئے اور ہندوستانی قومیت کا درس دیا۔ بنگالی میں ٹیگور کی تحریریں، تمل میں سبرامنیم بھارتی کی تحریریں، اُردو میں اقبال اور اسی طرح کی مختلف مثالیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اُن سے پوری قوم نے تحریک عمل لی۔ ملک نے انھیں ہندوستان کی آزادی کا نقیب کہا اور ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کو عزت دی۔ اس سے یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے کہ زبان فرقہ پرستی اور تنگ نظری کو ہوا دیتی ہے اور انتشار پسندی کی طرف لے جاتی ہے۔

کی جاتی ہے جو اس علاقے کی ذات برادری سے تعلق رکھتا ہو اور اُس ذات برادری کا اس حلقہ میں اثر ہو۔ یہ ایک ایسی برائی ہے کہ سیکولر پارٹیاں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ووٹ حاصل کرنے کے لیے ذات پات اور مذہب کے نام پر عوام الناس کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے جو یقیناً قومی سالمیت کے لیے نقصان دہ ہے۔

کمانے کے چکر میں رہتے ہیں۔ یہ امید کرنا بے سود ہوگا کہ جسم و جان کا تعلق باقی رکھنے کے خیال سے ضرورتوں کی تکمیل میں مصروف انسان، قومی اتحاد کے تحفظ کے لیے کوشش کریں گے۔ ہمیں ایسے حالات پیدا کرنے ہوں گے جس سے ان کو یہ احساس پیدا ہو کہ سماج میں ان کا رول ہے اور انھیں ایک مقام حاصل ہے۔ ایسے اقتصادی نظام میں جہاں امیر اور غریب کا فرق بڑھ رہا ہے، یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ اتحاد کا احساس کمزور پڑ جائے گا۔

سماجی اور اقتصادی نابرابریوں کو دور کرنے کی کوشش قومی یک جہتی کے نظریے کو آگے بڑھا سکتی ہے۔

اب اکثر کہا جانے لگا ہے کہ لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیل سے علاقائیت اور علاقہ پرستی کو فروغ ملا۔ لیکن لسانی گروہوں کی اُمنگوں، آرزوؤں اور ثقافتی تشخص کے تحفظ کی خواہشوں کو یا اقتصادی ترقی کی آرزوؤں کو علاقہ پرستی یا علاقائیت کی اصطلاح سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مرکزی حکومت نے علاقائی ضرورتوں پر پوری طرح توجہ نہ دی اور اس سلسلے میں عوام کی طرف سے تکالیف کا اظہار ہوا تو اسے علاقہ پرستی سے تعبیر کرنا منطقی طرز استدلال نہیں کہا جا سکتا۔

تعلیمی اصلاحات سے لاپروائی

حصولِ آزادی کے بعد عوامی حکومت نے تعلیم کی اہمیت نہیں پہچانی۔ چالیس سال گزر جانے پر بھی پرائمری تعلیم کے جن مقاصد کو آئین میں بیان کیا گیا ہے، وہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچ سکے۔ موجودہ تعلیمی نظام، لیاقت، تکمیلِ کام کو جذبہ کے ساتھ کرنے کی صفات پیدا کرنے سے قاصر ہے اور اس طرح وہ ہماری زندگی اور ہمارے ملک کے لیے بے کار ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ نہ تو فرد کی مدد کر سکتا ہے، نہ سماج کی۔ اس سے ناپسندیدہ نتائج سامنے آئے ہیں۔ تعلیمی ادارے ایسی تعلیم دینے سے قاصر رہے ہیں جس کے ذریعے اقدار کی لگن پیدا ہو اور انھیں طلبا اپنی زندگی میں سمو سکیں۔ تعلیمی

مذہب میں ہم نے کس مقام پر غلطی کی

مذہب میں بھی سیاست کے رول کو نظر انداز کر کے محض سنگین الزامات لگانا حقائق سے رُوگردانی ہوگی۔ ہم سب اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ سیاسی پارٹیاں کس طرح سے فرقہ وارانہ پارٹیوں کو تھپتھپاتی ہیں، مختلف حلقہ ہائے انتخاب میں ایسا امیدوار کو کھڑا کرنے کی کوشش

دیگر اسباب

ان سب باتوں سے بھی زیادہ ناخواندگی، سماجی و اقتصادی نابرابریوں اور مرکز نیز ریاستوں کے تعلقات کی خرابی سے قومی اتحاد پر مضر اثرات پڑ رہے ہیں، ملک میں زیادہ تر لوگ روزی روٹی

ملاحات کو بروئے کار نہ لانے کے غیر صحت مند
بخ ہمارے سامنے ہیں، یہ تعلیمی اصلاحات
ناپذیر ملکوں کی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا
بنے سے قاصر رہی ہیں، چنانچہ تعلیم کو بامقصد
نے اور اس سے سماجی تبدیلی کا کام لینے کی
رورت ہے۔ ملک کے ۸۰ فی صد عوام اگر
خواندہ ہوں تو قومی یک جہتی کا پیغام کس طرح
پھیلایا جا سکے گا۔

مرکز۔ ریاست تعلقات

مرکز اور ریاست کے تعلقات
ا اتنا ہی اہم مسئلہ ہے۔
ئین ایک ایسا آلۂ کار
یں جس سے
یاستداں

اور اقتدار کے ایک ہی مرکز پر حصول کا رجحان
ترقی پاتا گیا۔ آئین سازوں نے جو مقاصد سامنے
رکھے، یونین سرکار نے ان کی خلاف ورزی کی،
جس سے ریاستوں کی خود مختاری متاثر ہوئی۔ یہ
بات قابلِ مذمت ہے کہ حکمراں پارٹی کی قیادت
اس غلط تصور کے تحت کام کرے کہ مضبوط
ریاستیں مرکز کو کمزور کر دیں گی، اس سے ملکی

ایسا کرنا ضروری ہو گیا تھا، مرکز ریاستوں
کے تعلقات کو فیڈرل نظام کے اصولوں کے
مطابق لانے کے لیے ایسا کرنا ضروری سمجھا گیا۔
اس کمیشن کی رپورٹ جنوری ۱۹۸۷ء
میں متوقع ہے۔ اُمید ہے کہ عوام کی اس شدید
خواہش کے پیشِ نظر کہ اقتدار کی تقسیم میں ریاستوں
کو واجب حصہ ملے، ان کو مناسب فنڈ ملیں،
انتظامیہ میں ان کو مناسب مقام ملے، ترقیاتی پروگراموں
کی تشکیل میں ان کا مناسب رول ہو، سرکار یہ کمیشن
کی سفارشات کو عملی جامہ پہنایا جا سکے گا نیز اور

اگر زبان جوڑنے کا وسیلہ
ہوتی تو پوری عرب برادری ایک
متحدہ جمہوریہ ہوتی، مصر، سوڈان تجربے کی ناکامی
ہم سب پر واضح ہے، پاکستان اور بنگلہ دیش کی مثال یہ
واضح کرتی ہے کہ محض مذہب کی بنیاد پر مختلف خطوں کے لوگ
آپس میں متحد نہیں رہ سکتے۔

موجودہ تعلیمی نظام لیاقت، تکمیل، کام کو جذبے کے ساتھ کرنے کی صفات
پیدا کرنے سے قاصر ہے اور اس طرح وہ ہماری زندگی اور ہمارے ملک
کے لیے بے کار ہو کر رہ گیا ہے یہ نہ تو فرد کی مدد کر سکتا ہے، نہ سماج کی۔
اس سے ناپسندیدہ نتائج سامنے آئے ہیں۔

نا اقتدار مضبوط بنا سکیں۔ یہ شعور بیدار
نا ضروری ہے کہ آئین کے ذریعے ملک کی
لمیت کا تحفظ عمل میں آسکتا ہے، آزادی کے
مدہ ۳۵ برسوں میں وفاقی نظام کمزور ہوتا چلا گیا،

اتحاد اور مفاد کو نقصان پہونچے گا۔ یونین
سرکار کو یہ کمیشن مقرر کرنا پڑا۔ مرکز۔ ریاستوں
کے تعلقات میں تطبیق لانے کے دباؤ کے تحت

فی الواقعی وفاقی نظام کے قیام سے ملک کے اتحاد اور
اس کی سالمیت کو بچایا جا سکے گا۔ ●

عادل صدیقی

قومی یکجہتی مشاہیر کی نظر میں

وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی کی صدارت میں قومی یکجہتی کونسل کی از سر نو تشکیل کی گئی۔ اس کے ارکان کی تعداد ۳۰۹ ہے۔ اس میں مرکزی وزیر داخلہ، مرکزی وزیر خزانہ، انسانی وسائل کے فروغ کے مرکزی وزیر کے ساتھ ساتھ چناؤ کمیشن کی طرف سے تسلیم شدہ قومی پارٹیوں کے لیڈر، علاقائی پارٹیوں کے لیڈر، اور مسٹر پی این ہکسر، مسٹر ایف ایم حسین، مسٹر خشونت سنگھ اور بابا آمٹے جیسی بڑی ہستیوں کو شامل کیا گیا ہے۔ قومی یکجہتی کے بارے میں ملک کے دانشوروں، رہنماؤں اور مفکروں نے حصولِ آزادی کے بعد اب تک جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان میں چند ایک کے خیالات ہدیۂ ناظرین ہیں۔

ہندوستان کے شہریوں کا یہ سمجھنا کہ حصولِ آزادی کے لیے قربانیاں دے کر وہ ملک کے تئیں اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے، ایک زبردست غلطی ہے۔ آزادی کو مستحکم بنانے، اسے استوار بنیادوں پر آگے لے جانے نیز اسے عوام کے حق میں سود مند بنانے کے لیے مزید قربانیوں کی ضرورت ہے۔ ملک کے تمام شہریوں کو اس سلسلے میں قربانیاں دینی ہیں۔ پنڈت نہرو اور مسز اندرا گاندھی کی رہنمائی میں ملک میں جمہوریت اور سماج واد کا راستہ اپنایا گیا ہے۔ جدید علوم کی ترویج و اشاعت کے ذریعے ملک کو اکیسویں صدی میں لے جانا ہے۔ ہندوستان نے کامیابی کی بہت سی منزلیں طے کر لی ہیں۔ پھر بھی بہت کچھ منزلیں طے کرنی ہیں۔ حصولِ آزادی کے وقت ہمارا ملک پچھڑا ہوا تھا، صنعتی طور پر انتہائی پسماندہ تھا لیکن آج یہ زیادہ تر شعبوں میں خود کفیل ہے۔ پہلے ہر چیز باہر سے درآمد کرتے تھے۔ اب ہم ایسا نہیں کرتے بلکہ ہم اندرونِ ملک تیار کردہ اشیاء باہر ملکوں میں بھیجتے ہیں۔ ایک طرف ملک کی خوشحالی کے لیے مختلف منصوبے چلائے جا رہے ہیں اور دوسری طرف ایسے واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں جن سے ملکی اتحاد کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ ملک میں جگہ جگہ فرقہ وارانہ تناؤ اور فسادات کی خبریں انتہائی پریشان کن ہیں۔ آزادی کے ۳۹ برس بعد بھی ہم اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ اہلِ وطن اگر آپس میں اعتماد کی دولت سے محروم ہو گئے اور آپسی بھائی چارہ کھو بیٹھے تو یہ ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔

قومی یکجہتی۔ مہاتما گاندھی کی نظر میں:- "ہم اپنے طور پر عیسائی، ہندو یا مسلمان ہو سکتے ہیں۔ ہمارا مذہب چاہے جو بھی ہو، اس تضاد کی تہہ میں ہمارے یہاں وحدت پائی جاتی ہے جو شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

آج وقت کی ضرورت ایک مذہب نہیں بلکہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں باہمی رواداری اور ایک دوسرے کے مذہب کے احترام کے جذبے کا فروغ ہے۔ ہمارا مدعا اتحاد نہیں۔ ہم تضاد کے ساتھ وحدت کے خواہشمند ہیں، روایات اور موروثی باتوں کو جڑ سے ختم کرنے نیز آب و ہوا اور ماحول میں تبدیلی لانے کی کوششیں نہ صرف قطعی طور پر ناکام ثابت ہوں گی بلکہ انھیں ایک مذموم فعل سے تعبیر کیا جائے گا۔ تمام مذاہب کی روح ایک ہے۔ لیکن یہ روح الگ الگ شکلوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ روح ابد تک برقرار رہے گی۔ اہلِ دانش اس کے ظاہری رنگ و روپ کو نظر انداز کرتے ہوئے داخلی یکسانیت ہی کو خاطر میں لائیں گے۔

آیئے، ہم سب ایسے خیالات بھلا دیں کہ "میں ہندو ہوں، تم مسلمان ہو" یا "میں گجراتی ہوں اور تم مدراسی ہو" ہم سب کو چاہیے کہ

"میں اور میرا" کو ہندوستان کی مشترکہ قومیت میں تحلیل کردیں۔ ہم اسی وقت آزاد ہوں گے جب ہماری ایک بڑی تعداد یہ تہیہ کرلیتی ہے کہ چاہے ڈوبیں یا تیریں، ہم ایک ساتھ رہیں گے"۔

قومی یک جہتی ۔ صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ کی نظر میں :۔

"انسان کو چاہیئے کہ وہ جہاں کام کرتا ہے اس جگہ کی بہتری کے لیے کوشاں رہے۔ جب میں ایک چھوٹے سے صُوبے میں کام کرتا تھا تو میں اس کے حقوق کی حصولیابی کے لیے برسرپیکار رہتا تھا۔ پھر میں پنجاب کا وزیراعلیٰ بنا تو ریاست کی فلاح اور بہبود کو اپنا نصب العین بنالیا۔ ایک ہی خاندان کے بچّے آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں، الگ ہو جاتے ہیں مگر خاندان اپنی جگہ جوں کا توں قائم رہتا ہے۔ اسی طرح ہریانہ، ہماچل پردیش اور پنجاب کے رہنماؤں کو چاہیئے کہ نڈر ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کریں مگر اس بات کو نہ بھولیں کہ ان کی جداگانہ ریاستیں ایک ہی ملک کا حصہ ہیں۔ لہٰذا اوقات، تقسیم سہولت کے پیشِ نظر کی جاتی ہے مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ملک کی سالمیت پر حرف آئے۔ جب میں وزیر داخلہ بنا تو میں نے اپنے کمرے میں پنجاب کے نقشے کی جگہ بھارت کا نقشہ آویزاں کیا۔ چاہے ہریانہ ہو یا پنجاب، راجستھان ہو یا ناگالینڈ یا تامل ناڈو، میری نظر میں سب برابر ہیں۔ میں نے تمام شہریوں کے حقوق کے احترام کی قسم کھائی تھی، چاہے وہ کہیں بھی رہتے ہوں، کسی بھی مذہب کے پیروکار ہوں اور میں نے اس بات کا بھی عہد کیا کہ میں کسی خاص مذہب کے لیے جانب داری نہیں برتوں گا۔ اور کبھی ایک مذہب کو دوسرے پر فوقیت دوں گا۔

اگر ہمارا طرزِ عمل اس طرح کا نہ ہو تو ہم صحیح معنوں میں مسلمان، سکھ یا ہندو کہلائے جانے کے اہل نہیں، مذہب ہر انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ ہندوستانی ہونے کے ناطے ہمیں تمام مذاہب کا احترام کرنا چاہیئے۔ میں تمام مذاہب کے مقدس مقامات کی زیارت کرتا ہوں۔ چاہے مسجد ہو یا مندر، کلیسا ہو یا گوردوارہ۔ میرا عقیدہ ہے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے۔ اسے انسانوں میں بھی کھوجا جاسکتا ہے۔ میرے نزدیک انسانیت افضل ترین مذہب ہے۔

سائنس کے معجزوں سے بھی ہم ان تمام ہستیوں کو واپس نہیں لاسکتے جو ہمیں اس دنیا سے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ بھگوان کرشن اور بھگوان رام کی تواریخ کا ہمیں علم نہیں۔ بھگوان مہاویر اور مہاتما بدھ بالترتیب ۲۵۸۲ اور ۲۵۲۷ برس قبل اس دنیا میں موجود تھے۔ یسوع مسیح کو ۲۰۰۰ سال ہو جائیں گے۔ حضرت محمدؐ تقریباً ۱۴۰۰ سال قبل پیدا ہوئے۔ گرونانک کا عہد ۵۰۰ سال قبل کا ہے۔ یہ تمام عظیم ہستیاں مختلف مقامات پہ پیدا ہوئیں مگر ان تمام مذاہب کے ماننے والے ہندوستان میں موجود تھے اور اس کے باوجود انھوں نے اپنی تہذیب اور قومی ورثے کو بچا کر رکھا ہے۔ کثرت میں وحدت کی مثال یہاں ملتی ہے۔

پوری دنیا مل کر کسی ایک مذہب کو نہیں مان سکتی۔ البتہ ہر مذہب کا احترام ضروری ہے۔ اس سے اتحاد کی فضا قائم ہو گی۔ ہمیں ملک میں اتحاد کو قائم رکھنا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد یا ہندو سکھ اتحاد کا نعرہ کہیں یہ تاثر پیدا کرے کہ ہم الگ الگ قومیت کے ہیں۔ کیونکہ سب سے پہلے ہم ہندوستانی ہیں، ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی بعد میں۔ ہم سب ایک ملک کی ایک قوم ہیں"۔

قومی یک جہتی ۔ پنڈت نہرو کی نظر میں :۔

"آزادی کے حصول کے بعد بھارت کا بنیادی مسئلہ کلی طور پر یک جہتی اور باہمی اتحاد کا ہے۔ سیاسی یک جہتی کسی حد تک حاصل ہو چکی ہے، مگر یہ ناکافی ہے۔ ہمیں سیاسی یک جہتی سے کچھ زیادہ درکار ہے۔ اس کے لیے یقیناً وقت چاہیئے کیونکہ احساسات اور عمل کا اتحاد قانون بنا کر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو دل و دماغ میں پیدا ہونے والی چیز ہے۔ ہاں اس کے لیے سازگار ماحول اور فضا ضرور پیدا کی جاسکتی ہے۔ آج بھارت کا اہم ترین مسئلہ سیاسی یک جہتی کا نہیں بلکہ نفسیاتی طور پر ایک قوم بن کر رہنے کا ہے۔ صوبہ جاتی اور فرقہ وارانہ تعصبات کے خاتمے کے لیے نیز ان تمام اختلافات کو دُور کرنے کے لیے جو تخریب اور علاحدگی کی جانب لے جاتے ہیں، ہمیں مشترکہ قومیت کے ماحول کو پروان چڑھانا ہے تاکہ تضاد کے باوجود ہم قومی وحدت کی کڑی میں جُڑ جائیں اور جس میں محض ظاہری جذباتیت شامل نہ ہو، البتہ میں یہ ہرگز نہ چاہوں گا کہ تضاد یکسر ختم ہو جائیں۔ کثرت میں وحدت ہمارا ورثہ ہے مگر اس کے لیے ہم آپسی جھگڑوں میں اُلجھ کر نہ رہ جائیں۔ اکثر ہمیں دوسروں کے نظریات سے اتفاق کرنا پڑتا ہے، چاہے وہ قابلِ قبول ہوں یا نہ ہوں۔ اسی پر جمہوریت کا دار و مدار ہے اور اسی کی بنیاد پر ہم نے کانگریس کی تحریک ۶۰ سال تک چلائی۔

یک جہتی سے میری مراد دستوری اور سیاسی یک جہتی نہیں بلکہ احساسات اور عمل کے مشترکہ اتحاد سے ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں پیدا ہونے والی یک جہتی ہے"۔

سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے قومی یک جہتی سے متعلق افکار

قومی یک جہتی ملک کے دفاع کی داخلی لائن ہے ـــ جو ہماری قومی سرحد کی حفاظت کا فریضہ خانگی اور شہری امور میں ڈیفینس سروسز کے جزوِ ثانی کے طور پر انجام دیتی ہے۔

کوئی ملک دفاع کو نظرانداز نہیں کرسکتا،

ییا سوچا جانا خام خیالی ہوگی کہ وہ ایک خود مختار زاد ملک ہے اس لیے اس کے پڑوسی اس پر حملہ آور نہیں ہوں گے۔ اس کے لیے ہمیشہ چوکنا رہنا ہوگا۔ یہاں تک کہ کہیں وہ ٹکنالوجی میں بھی پیچھے نہ رہ جائے۔ اسی طرح ہمیں یہ باور نہیں کر لینا چاہیئے کہ صرف اس لیے کہ ہم آزاد ہیں اور ہمارا ایک دستور بھی ہے، ہماری سماجی ہم آہنگی قائم و دائم رہے گی، اس کی حفاظت کرنی ہوگی۔ البتہ ایک معاملے میں ہم دفاعی فوج رکھتے ہیں، جو حفاظت کا فرض انجام دے گی لیکن دوسری طرف قومی محاذ پر یہ کام پوری طرح کل شہریوں کو انجام دینا ہوگا۔

اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک بہت سی طاقتیں مصروفِ کار ہیں جو ہمیں کمزور بنانے کے درپے ہیں ــ جو مختلف مذہبوں، زبانوں، علاقوں اور جاتیوں کے درمیان شکوک کے بیج بونے کا کام کرتی ہیں۔ کرۂ ارض پر نظر ڈالئے۔ کیا ترقی پذیر ملکوں میں سے سب نہیں تو اکثر ایک ہی جیسے خطروں اور دشواریوں سے دوچار نہیں ہیں!۔

ہم ہندوستان کے رہنے والے ایک قدیم قوم ہیں۔ دنیا نے ہمیشہ تسلیم کیا ہے کہ ہمارا ملک انڈیا، ہندوستان یا بھارت ورش کے نام سے معروف ہے لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ایک جدید قوم کی حیثیت سے ہم اب بھی بہت کم عمر ہیں۔

ہمیں اپنی طویل تاریخ میں بڑی اور چھوٹی یا مختصر وفاداریوں سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ ہم اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ہمارے بہت بڑے بڑے سنتوں اور حکمرانوں نے ہمیشہ اس پورے ملک کو ایک ہی تسلیم کیا تھا۔ ہمارے پاس اس کی مثال دینے کے لیے ایسی چمکدار اور روشن ہستیاں ہیں جیسے شنکراچاریہ، گورو نانک جی، گورو گوبند سنگھ جی، وغیرہ۔ اکثر ہم سیاسی طور پر بھی ایک ہی رہے ہیں۔ چنانچہ یہ صورتِ حال اشوک، سمدر گپت، اور اکبر کے زمانے میں ایک روشن سچائی تھی۔ ان سب حکمرانوں نے رواداری اور باہمی میل جول پر بہت زیادہ زور دیا تھا۔

اس وقت بھی جب ہم مختلف سیاسی سلطنتوں میں تقسیم ہو چکے تھے، ہمارے ذہنوں میں یہ اعتقاد جاگزیں تھا کہ ہم ہندوستانی ہیں۔ جب کبھی ہمارے اتحاد میں پھوٹ پڑی تو وہ معاشی اور سیاسی حیثیت سے ہمارے لیے نہایت گراں ثابت ہوا۔ جب جب تنگ ذہنی کا مظاہرہ کیا گیا تو اس کا نتیجہ باہمی جھگڑے کی شکل میں نمودار ہوا اور جب کبھی ہم نے نئے تصورات سے چشم پوشی کی تو اس سے ہماری کوتاہی سامنے آئی۔ نتیجتاً ہم پر غیر ملکی تسلط قائم ہو گیا۔ تاریخ کے اسباق اور زندگی کے ہم عصر ادوار کا تقاضا ہے کہ سیاسی اتحاد پر انتہائی زور دیا جائے۔ ہم سب کسی نہ کسی مذہب کے پیروکار ہیں۔ ہندوستان کے کسی نہ کسی علاقے میں ہماری پیدائش ہوئی۔ ہماری کوئی خاص مادری زبان بھی ہے لیکن ان میں سے کوئی ایک بات بھی ہماری ہندوستانیت اور ہمارے ہندوستانی ہونے میں رکاوٹ نہیں بننی چاہیئے۔

جسٹس بیگ نے ایک شہری مذہب کی ضرورت کے بارے میں کہا تھا۔ میں ان کے خیال سے متفق ہوں لیکن اس بات کو کچھ مختلف انداز میں بیان کرنا چاہتی ہوں۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ کوئی شخص یہ بھی سوچے کہ ہم اسے دو مذہبوں کو اپنانے کا مشورہ دے رہے ہیں۔

ہم ہندو، مسلم، عیسائی، سکھ یا اور کسی مذہب کے اچھے پیروکار ہوتے ہوئے بھی ایک اچھے ہندوستانی ہو سکتے ہیں، بلکہ ہیں۔ ہمارا شہری ہونا ہم سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ ہم اپنے مذہب اور اعتقاد کے ساتھ اپنی وفاداریاں ترک کر دیں۔ ہم اپنی پسند کے مذہب پر عمل کر سکتے اور ساتھ ہی اپنے شہری فرائض یکساں تندہی سے انجام دے سکتے ہیں۔ ہم صحیح طور پر اپنے مذہب کے ماننے والے تب ہی ہو سکتے ہیں جب ہم دوسروں کے اس حق کو تسلیم کریں کہ انھیں بھی اپنے اپنے مذہبوں کا صحیح پیروکار ہونا چاہیئے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ کسی امر میں ہر ایک کو اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا کہ کسی دوسرے کو حاصل ہے۔

جسٹس بیگ نے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ قومی یک جہتی کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا احساس دوسروں کے احساس کے ساتھ اتفاق رکھتا ہو۔ لیکن یہ ہی بس نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم ایک ملک کے تو ہیں، باہمی جھگڑے اور تنازعہ ہوا ہی کرتے ہیں۔ درحقیقت ہمارا خیال تھا کہ ان میں سے بعض باتیں آزادی ملنے کے بعد بالکل ختم نہ ہو جائیں گی تو کم ضرور ہو جائیں گی لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ فرقہ پرستی، ذات پرستی، اور کئی طرح کی جہالتیں سر اٹھا رہی ہیں۔ سر ملانا اور مضبوط بنانا تو الگ رہا، تقسیم اور پھوٹ کی طرف لے جا رہی ہیں۔ یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن سے تشدد اور جرم کو بڑھاوا مل رہا ہے۔ تشدد انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ چاہے وہ بین الاقوامی تعلقات میں نیوکلیائی بم کی صورت میں ہو یا شہری یا ذاتی معاملات میں استعمال کیا جائے۔

پُرتشدد واقعات ملک کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ یہ واقعات کہیں بھی ہوں چاہے دلی میں یا کہیں اور ان سے نہ صرف ہمارے ملک کا وقار ختم ہوتا ہے بلکہ اس قسم کے رجحانات اتحاد کے بخیئے اُدھیڑنے لگتے ہیں۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم قومی یک جہتی کا پرچار تو ضرور کرتے ہیں مگر دل سے اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ شک و شبہات اور غلط فہمیاں پیدا ہونے میں چنداں دیر نہیں لگتی لیکن ان کو ختم کرنا جوئے شیر لاناہے۔

قومی یک جہتی بابا آمٹے کی نظر میں:۔

بابا آمٹے نے اس مشن پر دلی کے راستے کشمیر تک کا دورہ کیا تھا۔ انھوں نے ملک کے نوجوانوں

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

نذرِ وطن

پروفیسر ایم۔ اے حفیظ بنارسی
صدر شعبۂ انگریزی، مہاراجہ کالج، آرہ (بہار)

دیارِ لالہ و سرو سمن سلام تجھے
حریم لیلیٔ شعر و سخن سلام تجھے
مہ و نجوم کی بزمِ کہن سلام تجھے
مئے حیات کی بزم کہن سلام تجھے
مرے وطن مرے پیارے وطن سلام تجھے

پیام گاندھی و گوتم دیا زمانے کو
ہر ایک زخم کا مرہم دیا زمانے کو
سکون و امن کا پرچم دیا زمانے کو
سلام وادیٔ گنگ و جمن سلام تجھے
مرے وطن مرے پیارے وطن سلام تجھے

ترے جمال کا شیدائی اک زمانہ ہے
لبِ جہاں پہ ترے پیار کا فسانہ ہے
ترے چمن میں بہاروں کا آشیانہ ہے
علاجِ فتنۂ چرخِ کہن سلام تجھے
مرے وطن مرے پیارے وطن سلام تجھے

فضائے بزمِ جہاں خوشگوار تجھ سے ہے
فروغِ گلکدۂ روزگار ہے تجھ سے
چراغِ علم و ادب نور بار ہے تجھ سے
تری زمین ہے رشکِ زمن سلام تجھے
مرے وطن مرے پیارے وطن سلام تجھے

تری گھٹاؤں میں اندازِ گیسوئے جاناں
تری فضاؤں میں تسکینِ روح کا ساماں
تری ہواؤں میں دردِ حیات کا درماں
بڑی حسین ہے تری انجمن سلام تجھے
مرے وطن مرے پیارے وطن سلام تجھے

ہر امتحاں سے گذرنا ہے اے وطن تجھکو
دلہن کی طرح سنورنا ہے اے وطن تجھکو
ابھی تو اور نکھرنا ہے اے وطن تجھکو
انیسِ کشتۂ رنج و محن سلام تجھے
مرے وطن مرے پیارے وطن سلام تجھے

دکھائی راہ زمانے کو مہر و الفت کی
ہمیشہ تو نے اٹھائی صدا صداقت کی
گواہی دیتی ہے تاریخ تری عظمت کی
سلام جلوہ گہہ فکر و فن سلام تجھے
مرے وطن مرے پیارے وطن سلام تجھے

●

غزل

خلیل الرحمٰن صدیقی
معرفت محمد قاسم صدیقی، جیل روڈ، مظفر پور (بہار)

اب کسی شہر نہ کوچے سے صدا آئے گی
خون میں لپٹی ہوئی بادِ وفا آئے گی

عہدِ رفتہ کی پھر اک بات کا چرچا کیوں ہے
ظلم کی اینٹ ہٹا دو کہ ہوا آئے گی

جب سے دیکھا ہے تجھے دل بھی یہی کہتا ہے
ہے یقیں مجھ کو ہر اک شے کو قضا آئے گی

دھوپ آنگن میں کھلے یا نہ کھلے پھر بھی خلیلؔ
فکر و احساس کے دامن سے ضیاء آئے گی

بس ہندوستاں

محسن رضا رضوی
محلہ، رحم خاں، ضلع دربھنگہ۔ ۸۴۶۰۰۴ (بہار)

یہ اخوت کا پیامی، ایکتا کا ترجماں
امن کا پیغامبر، انسانیت کا پاسباں
روزِ اوّل ہی سے ہے یہ مسکنِ امن و اماں
مختلف مذہب کی ہیں اس سرزمیں پر بستیاں
ناز ہے قدرت کو جس پر وہ ہے بس ہندوستاں

ہے بہت اونچا یہاں مہر و محبت کا علم
ہندو، مسلم، سکھ، برہمن مل کے رہتے ہیں بہم
ہے یہاں قرآن و گیتا سبھی برابر محترم
اک طرف ناقوس کی آواز، اک جانب اذاں
ناز ہے قدرت کو جس پر وہ ہے بس ہندوستاں

یہ دیارِ چشتیؒ و نانکؒ، یہ گوتم کا وطن
یہ رشی منیوں کا گھر، یہ صوفیوں کی انجمن
یہ زمیں ہے جس سے نکلے کیسے کیسے اہلِ فن
ہو چکے ہیں اولیا اللہ تک پیدا یہاں
ناز ہے قدرت کو جس پر وہ ہے بس ہندوستاں

اک طرف کوہ ہمالہ آسماں سے ہمکنار
اک طرف کشمیر کی رعنائیاں ہیں آشکار
اک طرف کاشی تو اک جانب اودھ کی ہے بہار
تاج بھی ہے اس زمیں پر اور اجنتا بھی یہاں
ناز ہے قدرت کو جس پر وہ ہے بس ہندوستاں

میری اس دھرتی کی شہرت انجمن در انجمن
شان سے اس سرزمیں پر ہیں رواں گنگ و جمن
قابلِ صد رشک اس دنیا میں ہے میرا وطن
بلبلیں اس گلستاں کی شاخ پر ہیں نغمہ خواں
ناز ہے قدرت کو جس پر وہ ہے بس ہندوستاں

●

انسان ہوں

شاھد ساگری
مڈیم اسٹورس، تاڑی کیمپ، بھوپال۔

میں نہ ہندو ہوں نہ مسلمان ہوں
سکھ، عیسائی بھی نہیں ہوں میں
پھر بھی
مجھ کو عزیز ہے گیتا
اور قرآن میرا ایمان ہے
بائبل سے بھی
درس لیتا ہوں
شوق سے میں گرنتھ پڑھتا ہوں
مجھ کو
ہر دھرم سے محبت ہے
فتنۂ شر سے
سخت نفرت ہے
باہمی اتحاد کی خاطر
جان اپنی نثار کرتا ہوں
کیوں کہ انسان ہوں
صرف انسان ہوں

پیامِ اتّحاد

عتیق الرّحمٰن ظفر بی کام (عثمانیہ)
حیدرآباد۔ اے۔پی

بدلتے موسموں میں
پیار اور اخلاص بھی تو ایک موسم ہے
دکن کے لوگ اہلِ آندھرا اپنی روایت بھی تو رکھتے ہیں
رفیقوں دوستوں اور ساکنیوں سے میں مخاطب ہوں
ہمیں مل جُل کے رہنا ہے۔
تو پھر یہ نفرتیں یہ دُشمنی کیسی ؟
ہم انساں ہیں، ہمیں انسانیت کا کام کرنا ہے
وطن والوں سے اتنی سی گذارش ہے
محبّت کی مہکتی چاندنی سے ایسا منظر ہو
ہر اک گھر پیار کی دولت سے مالامال ہو
کتابیں، مدرسے گلدستۂ اخلاص بن جائیں
نئی نسلوں کو یہ احساس ہو جائے
کہ ہم سب بھائی بھائی ہیں
ہمیں مل جُل کے رہنا ہے
تو پھر یہ نفرتیں یہ دُشمنی کیسی ؟

●

صرف دو پھول بہت ہیں ترے گلشن کے لیے

عالم فتحپوری
اختر منزل، کشمیری بازار، آگرہ ۔ ۳۔

زلفِ شب رنگ سے گھنگھور گھٹاؤں کو نہ چھین
شاخِ گُل سے تو لچکنے کی اداؤں کو نہ چھین
حُسنِ دل کش ہے ضروری رُخِ روشن کے لیے
صرف دو پھول بہت ہیں ترے گلشن کے لیے

⁂

اور پھولوں کو مہکنے کا بھی تو حق ہے یہاں
اور کلیوں کو چٹکنے کا بھی تو حق ہے یہاں
دے جگہ۔ نسترن و سُنبل و سوسن کے لیے
صرف دو پھول بہت ہیں ترے گلشن کے لیے

⁂

اک چمیلی ہو تو ایک مہکتا سا گلاب
پھر بڑھاپے میں بھی ہوگا ترے چہرے پہ شباب
اس سے بڑھ کر نہیں دولت ترے دامن کے لیے
صرف دو پھول بہت ہیں ترے گلشن کے لیے

⁂

غنچے آسودگیٔ آب و ہوا کو ترسیں
تیرے آگے ترے معصوم غذا کو ترسیں
آگ بن جائیگا ماحول یہ تن من کے لیے
صرف دو پھول بہت ہیں ترے گلشن کے لیے

⁂

اتنی کلیوں سے تو سُوکھے ہوئے پتّے اچھے
اتنی تعداد میں پھولوں سے تو کانٹے اچھے
بار بن جائیں جو اک شاخِ نشیمن کے لیے
صرف دو پھول بہت ہیں ترے گلشن کے لیے

●

غزل

رئیس الدین رئیس
۲۵/۱ شمالی دہلی گیٹ، علی گڑھ

کہیں یہ قحط کہیں سیلِ آب جاگتے ہیں
کہ اس زمیں پہ بلا کے عذاب جاگتے ہیں

عجیب بات کہ تعبیریں سوتی رہتی ہیں
ہماری آنکھوں میں ہر چند خواب جاگتے ہیں

تم اپنی پیاس کو رہنے دو محوِ خواب یونہی
کہ بحر بحرا ابھی تو سراب جاگتے ہیں

ضعیف جسموں کے سائے بھی دُھندلے ہونے لگے
مگر دلوں میں غموں کے شباب جاگتے ہیں

تھپک رہی ہیں انھیں وصل کی رُتیں لیکن
ہوائے ہجر میں خانہ خراب جاگتے ہیں

یہ بختِ خفتہ الگ ایک مسئلہ ہے رئیس
کہ جاگنے کو تو ہم بے حساب جاگتے ہیں

●

"قومی یک جہتی" محض سرکاری تحریک کے طور پر بہت آگے نہیں بڑھ سکتی، بلکہ اسے ایک ایسی عوامی تحریک کی صورت میں آگے بڑھنا ہے جس میں ملک کے سبھی عوام اور طبقات کا تعاون حاصل ہو، اس تحریک کو آگے لے جانے میں سبھی ذاتوں کے عوام، سبھی مذاہب کے ماننے والوں اور سبھی خطوں کے لوگوں کی شرکت ضروری ہے، ملک کی تعمیر و تشکیل میں ہم سب شریک ہیں اور ہمیں یہ کوشش کرنی ہے کہ ہر شخص کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لیے ضروری مواقع کی بہم رسانی کو یقینی بنایا جائے تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں اور ذہنی قوتوں کے استعمال کے ذریعے اپنی شخصیت کو مکمل طور پر فروغ دے سکے، ہمیں عوام الناس کو ان کمزوریوں اور خامیوں پر قابو پانے کا اہل بنانا ہوگا جن کے باعث انھوں نے زندگی بھر نقصانات اُٹھایا ہے، ہمیں انھیں اس قابل بنانا ہے کہ وہ ہر طرح کی محرومیوں، ذلتوں کے خلاف صف آرا ہو سکیں۔ ہمیں ان میں صلاحیت پیدا کرنی ہے کہ وہ آئین کی طرف سے ملے ہوئے حقوق سے فائدہ اُٹھا سکیں اور اس سلسلے میں راہ کی دشواریوں کو دُور کر سکیں۔ اگر ہم اس طرح کے کاز کے لیے کام کرتے ہیں تو گویا ہم اپنا وہ قرض چکاتے ہیں جو ملک کے عظیم رہنماؤں مثلاً مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد نے ہم پر چھوڑا ہے اور جس کی ادائیگی کے لیے ہم پابند ہیں۔

اندرا گاندھی

(ترپونڈرم، ۱۰ نومبر ۱۹۸۰ء)

Regd. No. D (DN) 284
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi.

Vol. 6 No. 21-22 YOJANA (URDU) Special issue 1-28 February, 1987

"ہندوستان کی حدود میں بسنے والے تمام باشندے بھارتی ہیں، خواہ وہ کسی بھی ذات پات، کسی بھی فرقے یا کسی بھی نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ خیالات و افکار، عقائد اور رسم و رواج نیز طور طریقوں کی دنیا میں عملاً آزاد تجارت ہوتی آرہی ہے اور ان کے لین دین پر کسی بھی طرح کی کوئی پابندی نہیں، لیکن بدقسمتی سے ہم بھارتیوں نے ایسا رنگ ڈھنگ نہیں اپنایا جسے کُل ہند نظریہ کہہ سکیں، ہم معمولی معمولی باتوں اور علاقائی مفادات کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوتے ہیں، اس طرح کے غیر اہم مفادات کو ملک کے وسیع تر مفادات کے تابع بنانا ہوگا۔ ہم جس سرزمین پر بستے ہیں، اور جن روایتوں سے بندھے ہوئے ہیں، وہی تو ہمارے دیش کے کردار کی تشکیل کرتی ہے۔"

ڈاکٹر ایس رادھاکرشنن

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadurshah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یکم تا ۳۱ مارچ ۱۹۸۷ء

انٹارکٹیکا کے برفیلے ویرانے میں
چھٹی ہندوستانی سائنسی مہم
(ڈاکٹر اقبال محی الدین)

دو روپے

اردو کی وسعت
(پروفیسر سید بشیر علی کاظمی)

کہانی: (ام م۔ راجندر)
دہلی میں انجمن ترقی پسند مصنفین
بھاکرا۔ ننگل (پروفیسر جگن ناتھ آزاد)
غزلیں: محمد علی موج، شاہین اور دیگر شعراء۔

غالب اکیڈمی میں غالب کے

یومِ ولادت کی تقریب

اُردو کے آفاق شاعر مرزا غالب کے ۱۸۹ ویں یومِ ولادت کی تقاریب ۲۷ دسمبر ۱۹۸۶ء کو شام پانچ بجے غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی کے اہتمام میں، اکیڈمی کے اپنے آڈیٹوریم میں منعقد کی گئیں، جن میں ادیبوں، شاعروں، دانشوروں، اُردو کے اساتذہ اور معززینِ شہر نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

اُردو کے ممتاز ادیب، محقق اور ماہرِ غالبیات جناب مالک رام نے صدارت فرمائی۔ اس موقع پر بمبئی سے آئے ہوئے مہمان شاعر، ادیب اور محققِ غالب جناب کالیداس گپتا رضا نے ایک مقالہ بعنوان "دیوانِ غالب کامل — تاریخی ترتیب سے" پیش کیا۔

بعد ازاں مذاکرہ کی ابتدا جناب ذہین نقوی، سکریٹری غالب اکیڈمی کی تعارفی تقریر سے ہوئی۔ آپ نے غالب کو اُردو شعر و ادب کی آبرو قرار دیتے ہوئے کہا کہ غالب نہ صرف ہمارے ملک کے قومی شاعر ہیں بلکہ اپنی شاعرانہ عظمت کی بدولت انھیں عالمی سطح پر ایک قابلِ قدر مقام حاصل ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری آفاقی قدروں، انسان دوستی، اتحاد اور صلحِ کل کی حامل ہے۔

اس موقع پر آپ نے صدرِ جلسہ جناب مالک رام صاحب کو ان کی ۸۰ ویں سالگرہ پر دلی مبارکباد پیش کی۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی صدر شعبۂ اُردو دلی یونیورسٹی نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ غالب اکیڈمی ہر سال ۲۷ دسمبر کو مرزا غالب کے یومِ ولادت پر اور ۲۲ فروری کو اپنے یومِ تاسیس پر مرزا غالب کی یاد میں مذاکروں اور محفلوں کا انعقاد کرتی ہے۔ یہ مذاکرے اور محفلیں ادبی معیار کے حسن کے ساتھ انسانی اقدار کو نرم و معتدل انداز میں تقویت دینے کے لیے ہر اعتبار سے کامیاب رہتی ہیں۔ یہ تقاریب دل افروز، ہم آہنگی، خوش نظم رجحانات اور فرحت و انبساط کے احساسات کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔

اس مذاکرہ میں سوویت یونین سے آئی ہوئی اسکالرز ڈاکٹر اناسوو روسووا اور ڈاکٹر میلا واسی لیوا نے مرزا غالب کو خراجِ تحسین و محبت پیش کیا۔ اور ڈاکٹر میلا نے غالب دوستی اور غالب شناسی سے متعلق سوویت یونین کے رجحانات پر روشنی ڈالی۔

بمبئی سے آئے ہوئے مذاکرہ کے خصوصی مقرر جناب کالیداس گپتا رضا نے اپنا مقالہ بعنوان "دیوانِ غالب کامل، تاریخی ترتیب سے" پیش کیا جو باعتبارِ تحقیق اور ترتیب کے طور پر ایک گرانقدر مقالہ ہے اور جسے انھوں نے تحقیقی معیار اور زبان و بیان کی دلچسپی کے ساتھ پیش کیا۔ اس مقالہ کو مذاکرہ کا حاصل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ رضا صاحب کے پاس دنیا کا سب سے بڑا غالب ذخیرہ ہے۔ اس سے اُن کی غالب دوستی اور غالب شناسی کا پتہ چلتا ہے۔

مذاکرہ کے آخر میں صدرِ جلسہ جناب مالک رام نے مرزا غالب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے رضا صاحب کو اُن کے مقالہ پر داد دی اور اپنے جذباتِ تحسین و تکریم پیش کئے۔

شمیم حیدر
غالب نیوز سروس، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی ۱۳

تصویر میں بائیں سے جناب حکیم عبد الحمید صاحب (صدر غالب اکیڈمی)، جناب شمس الرحمٰن فاروقی، جناب مالک رام (صدرِ جلسہ)، محترمہ نسیم کاظمی، ڈاکٹر میلا واسی لیوا اور ڈاکٹر انارواسو وروا دیکھی جا سکتی ہیں۔
(فوٹو سید فدا علی)

نئی دہلی یوجنا

چیف ایڈیٹر: [illegible] الحسن
ایڈیٹر: جگندر سنگھ
اسسٹنٹ ایڈیٹر: محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر: وسیم حیدر

شرح چندہ
سالانہ ۲۰ روپے، دو سالہ ۳۶ روپے
سہ سالہ ۴۸ روپے، فی کاپی دو روپے
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں
کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت۔

جلد ۶ | شمارہ ۲۲، ۲۳، ۲۴ | یکم تا ۳۱ مارچ ۱۹۸۷ء | ۱۰ پھالگن تا ۱۰ چیتر، شک ۱۹۰۸ | قیمت: ۲ روپے، ٹیلیفون ۲۰۱۸۱۸

اِس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے صفحات صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

ادارت سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر یوجنا (اردو)، پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر کے پورم (سیکٹر ۱)
نئی دہلی ۲۲ ۰۰۶۶

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر. ایس. سنگھال

چندہ بھیجنے کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

اقتصادی حالات کا مختصر جائزہ

ہر سال یوم جمہوریہ ہمیں اُن بلند نظریات کی یاد دہانی کراتا ہے جو ہمارے آئین میں شامل ہیں۔ اس کے ذریعے خاص کر سماج وادی نظام حیات سیکولرازم اور جمہوریت پسندانہ طریقوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، چنانچہ ہم اس موقعے پر یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم انصاف، آزادی اور مساوات کی اعلیٰ اقدار کو نئے جوش و خروش سے اپنائیں گے تاکہ ہمارے ملک میں عوام کی بحیثیت مجموعی ترقی اور خوشحالی عمل میں آسکے، یہ وہ موقع ہوتا ہے کہ اپنی کامیابیوں اور خامیوں کا اندازہ لگاتے ہیں، ہمیں یہ عہد بھی کرنا ہوتا ہے کہ ہم مادر وطن کی آزادی کی ہر قیمت پر حفاظت کریں گے۔ اس مقصد کی خاطر ہم اپنے ملکی اتحاد کو دیگر تمام مفادات پر ترجیح دیں گے۔ ملک میں انتشار پسندانہ قوتوں کو شکست دے کر ملک کی خوشحالی اور ترقی کے لیے راستہ آسان بنائیں گے۔ یہ امر خوش آیند ہے کہ گزشتہ چھ برسوں میں ہماری معیشت میں ۵ فیصد بلکہ اس سے بھی زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ مسلسل خشک سالی کا سامنا کرنے کے باوجود زراعت کی ترقی کی رفتار برقرار رکھی جا سکی ہے، ہمارے ملک میں خوراکی اجناس کی پیداوار ۱۵ کروڑ ٹن کے نشانے سے بھی تجاوز کر گئی ہے، ملک میں خوراکی اجناس کے ذخیرے وافر ہیں۔ اس سے ملک میں خوراکی قلت کا کوئی مسئلہ نہیں، صنعتی رفتار ترقی میں بھی تیزی آئی ہے اور نئی نئی صنعتوں سے ملک کی خوشحالی میں اضافہ ہوا ہے، البتہ ملک میں کچھ مسائل تشویشناک بھی ہیں۔ مثلاً اضافہ آبادی، بے روزگاری، اشیاء کی قیمتوں میں اُتار چڑھاو، اس کے علاوہ سماجی نوعیت کی بہت سی بُرائیاں، ان سب پر فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ یہ مسائل نہ تو محض سرکاری سطح پر، نہ محض عوامی سطح پر بلکہ دونوں کے موثر اشتراک عمل سے ہی حل ہو سکتے ہیں۔ اگر اضافہ آبادی کے مسئلے کا موثر حل تلاش کر لیا جائے اور ہمارے عوام ملک کی ترقی کی خاطر رضاکارانہ طور پر اس کی ترویج و اشاعت میں دل کھول کر حصہ لیں تو ترقی کے نتیجے میں ہونے والے فائدوں سے عوام کو بحیثیت مجموعی فائدہ پہونچ سکتا ہے، یہ کام عوام کے اشتراک کے بغیر انجام پانا دشوار ہے۔ یہ خاندانی بہبود کی تحریک ہے جسے عوامی تحریک کی صورت میں آگے بڑھانا ہے۔ اس کے لیے سماجی شعور میں تبدیلی لانا ضروری ہے، اس سلسلے میں رضاکارانہ تنظیمیں موثر رول ادا کر سکتی ہیں، ملک کو آج بیروزگاری کے مسئلے کا سامنا ہے، سرکار نے متعدد اقدامات کے ذریعے سے روزگار کے مواقع بڑھانے کی کوشش کی ہے، یہ اقدامات شہری اور دیہی ترقی دونوں جگہ عمل میں آئے ہیں لیکن یہ کام اپنی جگہ اتنا بڑا ہے اور یہ مسئلہ اتنا بھیانک ہے کہ یہ سب اقدامات ابھی ناکافی ثابت ہو رہے ہیں اور ان کے لیے ہر دم مزید کوششیں درکار ہیں۔ گزشتہ چند برسوں میں ملک کے غریب عوام کی خوشحالی اور بہتری اور اس کی زندگی میں تبدیلی لانے کی غرض سے بھی بہت سے اقدامات کیے گئے ہیں، ان سب اقدامات سے خاطر خواہ نتائج سامنے آسکے ہیں، اب ملک میں غریبی کے خط سے نیچے زندگی گذارنے والے افراد دیہی آبادی میں لگ بھگ ۳۶ فیصد ہیں۔ ہمارے دیہات میں سماجی ڈھانچہ کچھ اس طرح کا ہے کہ غریب عوام کو اوپر اُٹھانے کا معاملہ آسان نہیں معلوم ہوتا۔ کوشش یہی ہے کہ ان کو استحصال سے بچایا جا سکے، غریبی دُور کرنے کے سبھی پروگراموں کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ملک کے غریب عوام کو استحصالی طریقوں سے نجات دلائی جا سکے، اس بات پر خاص نظر ہے کہ اس سلسلے کی مدات پر خرچ کی جانے والی رقومات اپنے مقصد کو کامیاب بنا سکیں۔ چنانچہ اشیاء کی قیمتوں پر نظر رکھنے کا جو سلسلہ ہے وہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ صنعتی ترقی، اقتصادی ترقی کے نقطۂ نظر سے ضروری ہے، چنانچہ خاص زور اس بات پر ہے کہ روزمرہ کے استعمال میں آنے والی اشیاء کی تیاری بڑھے اور وہ معقول قیمتوں پر عوام کو دستیاب ہو سکیں۔

یوم جمہوریہ پر تقریر میں صدر جمہوریہ نے اس بات پر بجا طور پر تشویش ظاہر کی ہے کہ پچھلے سال تجارتی خسارہ ۵۳۱۸ کروڑ روپے تھا جو بڑھ کر ۸۷-۱۹۸۸ء میں ۸۶۱۶ کروڑ روپے تک پہونچ گیا، مگر اب بر آمدات میں اضافے کا رجحان ہے اس لیے اس کو کم کرنے کی مسلسل کوششیں جاری ہیں۔

ایڈیٹر

ڈاکٹر اقبال محی الدین

انٹارکٹیکا کے برفیلے ویرانے میں چھٹی ہندوستانی سائنسی مہم

چھٹی ہندوستانی سائنسی مہم جو ۹۰ ممبران پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر اروِن پارولیکر کے زیرِ قیادت ۲۶ر نومبر ۱۹۸۶ء کو گوا سے انٹارکٹیکا کے لیے روانہ ہو کر ۱۲ر دسمبر کو انٹارکٹیکا پہنچی تھی۔ ڈاکٹر پارولیکر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشنوگرافی میں میرین بائیولوجسٹ ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم اس چھٹی مہم کی تفصیل میں جائیں، یہ مناسب ہوگا کہ انٹارکٹیکا کا جغرافیہ و تاریخ اور منجمد معدنیاتی دولت اور وہاں کے برفیلے ویرانے میں اس سے پہلے جانے والی پانچ ہندوستانی سائنسی مہموں کے بارے میں قارئین کو کچھ حقائق سے آگاہ کر دیں۔

انٹارکٹیکا کا جغرافیہ

برِاعظم انٹارکٹیکا دُنیا کے جنوب ترین حصے کے بالکل وسط میں واقع ہے جس کا رقبہ تقریباً ۱۴ ملین مربع کلومیٹر ہے۔ یعنی یہ برِاعظم زمین کا دسواں حصہ گھیرے ہوئے ہے۔ یہ برِاعظم یورپ سے بڑا ہے اور آسٹریلیا سے بھی بڑا ہے۔ امریکہ (U.S.A.) اور میکسیکو کو ملا دیا جائے تو اس سے بھی بڑا ہے۔ اسی طرح اگر ہندوستان اور چین کو ملا دیا جائے تو اس سے بھی بڑا ہے۔ یہ دُنیا کا سب سے ٹھنڈا، سب سے زیادہ خشک، سب سے زیادہ تیز ٹھنڈی ہواؤں کا برفیلا ریگستان ہے، اور ساتوں برِاعظموں میں سب سے زیادہ مشکل پہونچ کا برِاعظم ہے۔

برِاعظم انٹارکٹیکا چاروں طرف سمندروں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے شمال مشرق میں بحرِ ہند پھیلا ہوا ہے۔ شمال میں بحرِ اوقیانوس ہے اور مغرب اور جنوب میں بحرالکاہل اس کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ (نقشہ دیکھئے)

انٹارکٹیکا کے ساحلی علاقے بحرِ جنوبی سے گھرے ہوئے ہیں۔ شمال مغرب کا حصہ ویڈل سی سے گھرا ہوا ہے۔ ویڈل سی کے شمال مغرب میں بحرِ اسکوشیا ہے جس میں فاک لینڈ آئی لینڈ اور ساؤتھ سینڈویچ آئی لینڈ ہیں۔ انٹارکٹیکا کا جنوبی ساحلی علاقہ روس سی (ROSS SEA) سے گھرا ہوا ہے۔ انٹارکٹیکا کے شمالی حصے کو کوئین موڈ لینڈ کہتے ہیں۔ یہ ناروے کی املاک ہے۔ گراہم لینڈ برطانیہ کی املاک میں آتا ہے۔ اس میں ویڈل سی اور الگزینڈر آئی لینڈ شامل ہیں۔ جنوبی علاقہ ایلسورتھ ہائی لینڈ ہے جس میں بائرڈ لینڈ اور روک فیلر پلیٹو شامل ہیں۔ یہ امریکہ کی املاک میں ہے۔ وکٹوریہ لینڈ اور ولکیز لینڈ آسٹریلیا کی املاک میں شامل ہیں۔ جنوب مشرق کا تھوڑا سا حصہ فرانس کی املاک ہے۔ سارے برِاعظم انٹارکٹیکا کو مختلف ملکوں نے اپنی املاک میں شامل کیا تھا مگر ۱۹۵۹ء کے بین الاقوامی معاہدے میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ مستقبل میں انٹارکٹیکا کسی ملک کی ملکیت نہیں ہوگا بلکہ اس کو صرف سائنسی تجربات اور پُرامن مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ اس پر کوئی دعویٰ بھی نہیں کیا جائے گا۔

ہندوستان اور انٹارکٹیکا کے درمیان فاصلہ [illegible] کی ایک چادر ہے جس کو بحرِ [illegible] اسی لیے ہندوستان سے انٹارکٹیکا [illegible] پہنچنے کے لیے صرف [illegible] انٹارکٹیکا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

انٹارکٹیکا کا نقشہ

جنوبی امریکہ کے برازیل کے حصے کو افریقہ
نیوگنی میں سمونے کی کوشش کی
دونوں جگہوں کی نباتات
اور جاندار زندگیوں
کا مطالعہ کیا اور
کہا کہ دونوں
جگہ تقریباً

جنوب تک پہنچنے کے لیے امنڈسین پہلے
سیاح تھے جو دسمبر ۱۹۱۱ء میں پہنچے
تھے۔ ان کے بعد اسکاٹ
جنوری ۱۹۱۲ء میں قطب
جنوبی تک پہنچے۔
ہلیری اور فکس
بالترتیب

بحر اٹلانٹک
جزائر ساؤتھ سینڈوچ
بحر جنوبی
جنوبی جیورجیا
جزائر فاک لینڈ
بحر اسکوٹیا
بحر ویڈل
جنوبی شیٹ لینڈ
برٹش انٹارکٹک ٹیری ٹری
کوئین موڈ لینڈ
کوٹس لینڈ
نورویجین ٹیری ٹری
میک روبرٹسن لینڈ
کوٹس آئی لینڈ
الکزینڈر آئی لینڈ
پرنسیس الیزبتھ لینڈ
قطب جنوبی
بحر بیلنگ شاسن
بحر ہند
پیٹر آئی لینڈ
آسٹریلین ٹیری ٹری
کوئین میری لینڈ
ولکیز لینڈ
بائرڈ لینڈ
ایڈورڈ لینڈ
بحر روس
روس ڈی پن ڈنسی
بحر جنوبی
بحر الکاہل

۲۴ جنوری اور
۱۹ جنوری ۱۹۵۸ء
کو قطب جنوبی پر
پہنچے تھے۔

ایک سی حیواناتی
اور نباتاتی
زندگی پائی جاتی ہے۔
اس مشابہت سے
ویگینر نے یہ کہا کہ کسی زمانے
میں افریقہ اور امریکہ ایک ساتھ
جُڑے رہے ہوں گے۔

بحر الکاہل

انٹارکٹیکا کی تاریخ

انٹارکٹیکا کی قدیم تاریخ پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے کیوں کہ سائنسی اور تاریخی ثبوت اس بات کے ملتے ہیں کہ کسی زمانے میں سب برِاعظم ایک دوسرے کے ساتھ ایسے ملے ہوئے تھے گویا یہ آپس میں ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آج سے تقریباً بیس کروڑ سال پہلے دُنیا کے سارے برِاعظم ایک ساتھ جُڑے ہوئے تھے انٹارکٹیکا سے ہندوستان اور آسٹریلیا جڑے ہوئے تھے۔ اور افریقہ سے دونوں امریکہ وست... گریاں تھے۔ برِاعظموں کے اس گٹھ جوڑ کو پنگیا (PANGEA) کہتے ہیں۔ زمین کے اندر کچھ ایسی قدرتی ہلچلیں پیدا ہوئیں جن کی وجہ سے یہ سارے برِاعظم یا تو شمال کی طرف کھسک گئے یا پھر مغرب کی طرف کھسکتے چلے گئے۔ اُن کے درمیان جو خلیج پیدا ہو گئی ان کو سمندروں نے پُر کر دیا۔ کچھ اس طرح کا خیال سائنس داں ویگینر (WEGENER) نے ظاہر کیا اور اُس نے

موجودہ صورتِ حال کچھ اس طرح کی ہوئی کہ ایشیا، افریقہ، ہندوستان اور یورپ کے سارے ممالک شمال کی طرف کھسک گئے اور دونوں امریکہ مغرب کی جانب بڑھ گئے مگر انٹارکٹیکا جُوں کا تُوں دُنیا کا آخری حصہ بن کر رہ گیا۔

انٹارکٹیکا کی منجمد معدنیاتی دولت

انٹارکٹیکا کی منجمد معدنیاتی دولت کا ذکر کرنا

بھی موجود ہے۔ اس برِاعظم پر زمین کے ساتھ پہاڑ بھی ہیں جن کی اونچائی ۵۰۰۰ میٹر تک ہے۔ ان کوہستانی دامنوں اور میدانی علاقوں کی گہرائی میں مدفون ہے انٹارکٹیکا کی بیش بہا دولت۔ جب سے دنیا کو یہ معلوم ہوا ہے کہ انٹارکٹیکا میں کوئلہ، تیل اور گیس کے ذخیرے ہیں اور یورینیم جیسی بیش قیمت دولت چھپی ہوئی ہے اپنا قبضہ جمانے کی دوڑ شروع ہو گئی۔ مگر ۱۹۵۹ء میں جب بین الاقوامی انٹارکٹک معاہدہ نامہ ہوا اور اس پر ۱۲ ملکوں نے دستخط کئے، اس وقت سے یہ برِاعظم صرف سائنسی تجربہ گاہ کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔

انٹارکٹیکا کی زمین پر آبادی بالکل نہیں ہے۔ سوائے برف کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مگر انٹارکٹیکا کے چاروں طرف جو سمندر ہیں اُن میں بحری جانداروں کی کمی نہیں ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ساری دُنیا کے سمندر بحری جانداروں سے اتنے زیادہ مالا مال نہیں ہیں جتنا کہ انٹارکٹیکا کے سمندر۔ چونکہ ابھی تک اُن میں سے مچھلیاں، کرل اور دوسرے پودے نہیں نکالے گئے لہٰذا وہ دن بہ دن بڑھتے ہی چلے گئے۔ پن گوئن اور سیل انٹارکٹیکا کے برف پر انڈے دیتے ہیں، اور اُن کی آبادی بھی بڑھتی جاتی ہے۔

انٹارکٹیکا کی ۹۰ فیصد زمین کا حصہ برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ بعض اوقات برف کے پہاڑ دو سے چار کلومیٹر کی اونچائی تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس طرح انٹارکٹیکا دُنیا کے تازہ پانی کا بہترین ذخیرہ رکھتا ہے۔ یہ انٹارکٹیکا کی بیش بہا دولت ہے جس سے "پیاسی دُنیا" فیضیاب ہو سکتی ہے۔ کچھ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اگر کسی طرح یہ ساری برف انٹارکٹیکا کی پگھلا دی جائے تو اُس کا پانی دنیا بھر کے سطحِ سمندر کو ۶۰ میٹر اونچا کر دے گا، جس سے بہت سے ممالک ڈوب جائیں گے۔ مستقبل میں سائنس داں اس منجمد تازہ پانی کے ذخیرے کو پُرامن مقاصد کے لیے ضرور استعمال کریں گے جس سے ساری دنیا میں زرخیزی و خوشحالی کے شادیانے بجنے لگیں گے۔

چھٹی ہندوستانی سائنسی مُہم

شعبۂ بحری ترقیات، حکومتِ ہند نے یہ مطلع کیا کہ چھٹی ہندوستانی سائنسی مُہم ۱۸ دسمبر ۱۹۸۶ء کو انٹارکٹیکا کے برفیلے برِاعظم پر پہونچی۔ اس سائنسی مُہم کو ہندوستان سے انٹارکٹیکا تک پہونچنے میں ۲۶ روز لگے۔ ۹۰ ممبران پر مشتمل یہ مُہم ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ پارولیکر کے زیرِ قیادت انٹارکٹیکا میں سائنسی تجربات کرتی رہیگی۔ یہ مُہم دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک گرمیوں کی ٹیم اور دوسری سردیوں کی ٹیم۔ ۷۰ ممبروں پر مشتمل گرمیوں کی مُہم جس میں دو عورتیں بھی شامل ہیں۔ تین ماہ تک اپنے سائنسی تجربات جیوفزکس، جیو میگنیٹزم، موسمیات، جیولوجی، بائیولوجیکل سائنس اور نون کنونشنل انرجی کے میدان میں کرتی رہیں گی۔ بقیہ ۲۰ ممبران جو سردیوں کی ٹیم کے ممبران ہیں وہ "دکھشن گنگوتری" پر ۱۶ ماہ تک رہیں گے اور سائنسی تجربات کرتے رہیں گے۔

۹۰ ممبران پر مشتمل یہ مُہم ایم۔ وی۔ تھولے لینڈ برف توڑنے والے خاص جہاز کے ذریعہ انٹارکٹیکا پہونچے۔ یہ جہاز جرمن لینڈ سے چارٹر کیا گیا تھا جس پر چار ہیلی کوپٹر رکھے گئے تھے جن کا مقصد برفیلے برِاعظم پر سامان اور ممبران کو متعینہ جگہ پہونچانا تھا۔ چونکہ انٹارکٹیکا پر ۹۰ سے ۹۵ فیصدی زمین برف سے ڈھکی ہوئی ہے اور صرف ۵ فیصدی جگہ ہی برف سے خالی ہے، لہٰذا اسی کھلی جگہ پر ہی سارے سائنسی تجربات ہوا کرتے ہیں۔ انٹارکٹیکا میں ٹرانس انٹارکٹک ہے جو برِاعظم کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔

اب تک جانے والی سائنسی پانچوں مُہموں میں یہ مُہم سب سے بڑی ہے۔ اس میں ۲۴ ممبران سائنس داں ہیں اور دوسرے ممبران اُن کی ہر طرح مدد کرنے کے لیے ہیں۔ ۲۰ ممبران دکھشن گنگوتری کے سائنسی تجربہ گاہ میں پورے جاڑے بھر تک کہ سائنس کے مختلف پہلوؤں پر تجربہ کرتے رہیں گے۔ زیادہ تر تجربات موسمیات پر ہوتے رہیں گے تاکہ معلوم ہو سکے کہ انٹارکٹیکا میں ہر روز درجۂ حرارت کے گھٹنے اور بڑھنے کی کیا رفتار ہے؟ ایروسول کے ناپنے کا تجربہ، ریڈیائی لہروں اور مقناطیسی کشش پر سائنسی تجربات ہوتے رہیں گے۔

پہلی ہندوستانی سائنسی مُہم انٹارکٹیکا ۱۹۸۱ء میں نورویجین آرکٹک شپ پولرسرکل کے ذریعہ وہاں پہونچی تھی۔ انھوں نے "دکھشن گنگوتری" کی جگہ کو سائنسی تجربات کرنے کے لیے موزوں سمجھ کر وہاں اپنا سائنسی تجربہ گاہ قائم کر دیا تھا اور خود بخود ریکارڈ کرنے والے سائنسی مشینیں لگا دی تھیں تاکہ وہاں کے درجۂ حرارت، فضا کی نمی و آلودگی، آواز کی رفتار اور مختلف اسی طرح کے تجربات کے لیے ریکارڈ حاصل ہو سکے۔ پہلی سائنسی آلات انٹارکٹیکا میں پہلی ہندوستانی سائنسی مُہم چھوڑ آئی تھی تاکہ دوسری اور آئندہ آنے والی مہموں کو اعداد و شمار حاصل ہو جائیں جس سے اُن کو آگے سائنسی تجربات کرنے میں مدد ملتی رہے۔ پہلی مُہم کے ممبران کی تعداد صرف ۲۱ تھی، دوسری مُہم کے ممبران کی تعداد ۲۸ تھی، تیسری مُہم کے ممبران کی تعداد ۸۰ تھی، چوتھی مُہم میں ۸۳ ممبران تھے اور پانچویں مُہم میں ۸۸ ممبران کی ٹیم تھی۔ اس چھٹی مُہم

کے ممبران کی تعداد ۹۰ ہے۔ اس طرح چھٹی ہندوستانی سائنسی ٹیم کی پچھلی مہموں کے مقابلہ میں تعداد میں سب سے بڑی ہے۔

ایم۔وی۔ تھلے لینڈ جہاز پانچویں مہم کو بھی لے کر انٹارکٹیکا گیا تھا۔ اس میں زیادہ جگہ اور آسانیاں ہونے کی وجہ سے اس مرتبہ یعنی چھٹی مہم کے لیے بھی یہی جہاز استعمال میں لایا گیا۔ اب یہ جہاز مارچ ۱۹۸۷ء میں برِاعظم انٹارکٹیکا سے چھٹی سائنسی مہم کو لے کر واپس آئے گا۔

اس مہم میں زیادہ تر ممبران ہندوستانی فوج اور ہوائی فوج سے لیے گئے ہیں اور اُن کو خاص طور پر انتہائی ٹھنڈے ماحول میں کام کرنے کی تربیت دی گئی ہے۔ گرمی والی ٹیم مارچ میں واپس آجائے گی، مگر سردی والی ٹیم وہیں دکھشن گنگوتری میں رُک کر سائنسی تجربات کرتی رہے گی اور ۱۶ ماہ بعد واپس آئے گی۔ مارچ ۱۹۸۷ء میں پانچویں ہندوستانی سائنسی مہم کے جاڑے والی مہم کے ممبران بھی واپس آجائیں گے اور ان کی جگہ چھٹی مہم کے جاڑے والی ٹیم وہاں رُک کر تجربات میں مشغول رہے گی۔ واپس آنے والی جاڑے کی پانچویں مہم کی ٹیم کے تین سائنس داں ہوں گے، ایک موسمیات کا ماہر ہوگا اور دس کمیونی کیشن اور لوجسٹک پرسنل ہوں گے جن کو ہندوستانی فوج اور ہوائی فوج سے لیا گیا تھا۔

برف پر چلنے والی گاڑی اسنو کیٹ (SNOW CAT) اس مرتبہ ممبران ٹیم اپنے ساتھ انٹارکٹیکا لے کر گئے ہیں۔ یہ گاڑی ماڈرن تکنیک سے پوری طرح آراستہ ہے۔ تلاش میں مدد کرنے کے لیے اسنو کیٹ بہترین ساتھی رہے گا جس سے چھٹی مہم کو معدنیات یا جیولوجیکل تلاش میں آسانی ہوگی۔ اس سے پہلے چار اسنو اسکوٹر اور چار لیپٹن بگی ٹریک وہیکل کا استعمال کیا گیا تھا۔ مگر وہ اتنے مفید ثابت نہیں ہوئے تھے جتنی کہ اسنو کیٹ رہے گی۔

توہی اُمید ہے کہ یہ چھٹی ہندوستانی سائنسی مہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوکر ہندوستان لوٹے گی۔ پچھلی پانچ مہموں نے انٹارکٹیکا پر کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ چھٹی ہندوستانی مہم کی کامیابی سے ایک مرتبہ پھر ہندوستان کا سَر فخر سے دُنیا کے سامنے اُٹھے گا۔

انٹارکٹیکا پر پانچ ہندوستانی سائنسی مہمیں ایک نظر میں

پہلی مہم : ڈاکٹر ظہور قاسم۔ سکریٹری، بحری ترقیات، حکومتِ ہند۔

برِاعظم انٹارکٹیکا پر: ۹ جنوری ۱۹۸۲ء کو پہلی ہندوستانی سائنسی مہم پہونچی جس میں ۲۲ ممبران شامل تھے۔

کارہائے نمایاں اور مقاصد : (۱) "دکھشن گنگوتری" کی تلاش اور وہاں ہندوستانی سائنسی تجربہ گاہ کا قیام۔

(۲) علمِ بحریات کا حاصل کرنا اور بحریاتی نباتات وحیوانات کا علم حاصل کرنا۔

(۳) انٹارکٹیکا کے برف کا کیمیائی تجزیہ اور گلیشیر کا علم حاصل کرنا۔

(۴) جیولوجیکل تجربات کرنا یا علمِ ارضیات حاصل کرنا۔

(۵) موسمیات کا علم حاصل کرنا۔

(۶) انٹارکٹیکا کی پہاڑیوں پر پائے جانے والے نباتات اور جانداروں کی زندگی پر تجربہ کرنا۔

(۷) ایروسول کے ناپنے کا تجربہ کرنا تاکہ فضا میں کثافت کی مقدار معلوم ہوسکے۔

(۸) ریڈیائی لہروں کی رفتار پر تجربہ کرنا۔ اور ریڈیو پروپیگیشن کا مطالعہ۔

(۹) مقناطیسی کشش پر تجربہ کرنا۔

(۱۰) انٹارکٹیکا کی روشنی اور گرمی کے بجٹ پر تجربہ کرنا۔

(۱۱) اِندرا ماؤنٹین کو تلاش کیا۔

دوسری مہم :

سربراہِ مہم : ڈاکٹر وی کے رینا۔ ڈائرکٹر جیولوجیکل سروے آف انڈیا۔

برِاعظم انٹارکٹیکا پر: ۸ دسمبر ۱۹۸۲ء کو دوسری ہندوستانی سائنسی مہم پہونچی جس میں ۲۸ ممبران شامل تھے۔

کارہائے نمایاں اور مقاصد : (۱) پہلی ہندوستانی سائنسی مہم نے جو سامان اور سائنسی آلات وہاں چھوڑے تھے اُس کے جمع شدہ اعداد و شمار کے ریکارڈ کو پوری طرح استعمال کیا۔

(۲) دوسری مہم کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو زیادہ دنوں تک برفیلے ریگستان میں رکھ کر اُن پر وہاں کی فضا کا ردِعمل دیکھا جائے۔

(۳) موسم، برف، حیوانی و نباتاتی زندگی پر تجربات کرنا۔

(۴) چٹانوں کے نمونے حاصل کرنا اور کافی بڑے علاقہ کی پیمائش کرنا۔

(۵) برف پر ہوائی پٹی بنانا تاکہ ہیلی کوپٹر اور سلیج گاڑیاں اس کو استعمال کر سکیں۔

(۶) آب وہوا درج کرنے کے آلات نصب کرنا۔

(۷) درجۂ حرارت کے کم و بیش ہونے کی وجہ کا معلوم کرنا اور اس مقصد کے لیے ایک چھوٹا سا تجرباتی اسٹیشن کا قیام۔

(۸) دوسرے ملکوں سے موسم کی بار بار نشر ہونے والی خبروں کا ریکارڈ رکھنا۔

(۹) برف کی دراروں پر سائنسی تجربات کرنا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان دراروں سے نکلی آواز فضا کو کیسے متاثر کرتی ہے۔ اس تجربہ سے ہمالیہ میں آنے والے طوفان کو سمجھنے اور اُن کی پیشگوئی کرنے میں مدد ملتی رہے گی۔

(۱۰) دکھن گنگوتری میں قدرتی دولت کا پتہ لگانا۔

(۱۱) زمین کا مقناطیسی کشش اور اُس کی ہلچلوں کا پتہ لگانا اور اُن پر سائنسی تجربات کرنا۔ ان مقناطیسی ہلچلوں کی وجہ سے ریڈیو مواصلات کا سلسلہ انٹارکٹیکا میں اکثر ٹوٹ جاتا ہے۔ سائنسی تجربات اس سلسلہ میں کرنا تاکہ وہاں رہنے والوں کا رابطہ ہمیشہ اپنے ملک سے قائم رہے۔

تیسری مہم:

سربراہِ مہم: ڈاکٹر ایچ۔ کے۔ گپتا۔

برِاعظم انٹارکٹیکا پر: ۲۷ دسمبر ۱۹۸۳ء کو تیسری ہندوستانی سائنسی مہم پہونچی جس میں ۸۲ ممبران شامل تھے۔

کارہائے نمایاں اور مقاصد: (۱) انٹارکٹیکا میں ایک مُستقل دو منزلہ سائنسی تجربہ گاہ کا قیام۔ دکھن گنگوتری میں کرنا۔

(۲) دوسری سائنسی مہم نے جو سائنسی آلات انٹارکٹیکا میں چھوڑے تھے اُن کی جانچ پڑتال کرنا، موسمی اعداد و شمار حاصل کرنا، فضا میں موسم کے اعتبار سے جو تبدیلیاں رُونما ہوئیں اُن کے اعداد و شمار حاصل کرنا۔

(۳) پہلا سیٹلائٹ کمیونی کیشن ٹرمنل کا قیام۔

(۴) انٹارکٹیکا کی سخت سردیوں میں اور اندھیرے میں رہ کر سائنسی تجربات کرنا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہاں کی نباتاتی اور حیوانی زندگی کس حد تک اندھیرے اور سردی میں اثر انداز ہوتی ہے۔ ایسے سخت ٹھنڈے موسم میں فضا کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ زمین کی مقناطیسی ہلچل کس حد تک ریڈیو پروپیگیشن پر اثر انداز ہوتی ہے۔

(۵) علم بحریات، علم ارضیات، مقناطیسی علم، نباتاتی زندگی کا مطالعہ، آرگنک میٹر انٹارکٹک پہاڑیوں سے کیمیائی اور حیاتیاتی معلومات انٹارکٹک برف کے تجزیہ سے، فضا میں کثافت کی مقدار اور ریڈیو پروپیگیشن کا مطالعہ۔

(۶) میگنیٹک اور سِسمِک لہروں کا سائنسی مطالعہ۔

(۷) گلیشیر کا علم حاصل کرنا۔

چوتھی مہم:

سربراہِ مہم: ڈاکٹر بی۔ بی۔ بھٹّاچاریہ۔

برِاعظم انٹارکٹیکا پر: ۲۴ دسمبر ۱۹۸۴ء کو چوتھی ہندوستانی سائنسی مہم پہونچی جس میں ۸۳ ممبران شامل تھے۔

کارہائے نمایاں اور مقاصد:

(۱) علم ارضیات اور علم حیوانات کا حصول۔

(۲) دکھن گنگوتری اور ہندوستان کا رابطہ بذریعہ انسیٹ وَن بی قائم رکھنا۔

(۳) سمندر کے طبعی حالات کا علم حاصل کرنا، سمندر کے اندر کی زندگی کا مطالعہ۔

(۴) میگنیٹک اور سِسمِک لہروں کا ریکارڈ رکھنا۔

(۵) گلیشیر کے متعلق علم حاصل کرنا۔

(۶) علم موسمیات حاصل کرنا۔

(۷) برف کے تجزیہ سے حیاتیاتی معلومات کرنا۔

(۸) زمین کا مقناطیسی علم حاصل کرنا۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ جنوبی قطب پر زمین کی مقناطیسی کشش بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ یہ کشش اتنی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ "مقناطیسی طوفان" کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

(۹) ہیڈرولوجیکل اور جیولوجیکل تجربات کرنا۔

(۱۰) فضا میں کثافت معلوم کرنے کے لیے (AEROSOL MEASUREMENT) نصب کئے گئے جس سے معلوم ہوا کہ انٹارکٹیکا کی فضا میں کثافت بالکل نہیں ہے۔

(۱۱) کرل مچھلی کو کھانے کے لائق بنانے کے لیے سائنسی تجربہ کرنا۔

(۱۲) ریڈیو پروپیگیشن کا مطالعہ کرنا۔

(۱۳) انٹارکٹیکا کی روشنی اور گرمی کے بجٹ اور اُس کے صنعتی، زراعتی اور سینچائی کے استعمال پر بھی چوتھی مہم نے تجربات کئے۔

(۱۴) معدنیات کے تلاش کرنا مثلاً کوئلہ، گیس، پیٹرول اور یورینیم وغیرہ۔

(۱۵) پچھلی مہم کے چھوڑے ہوئے سائنسی آلات سے اعداد و شمار اکٹھا کر کے ریکارڈ کرنا۔ آنے والی مہموں کے لیے آلات نصب کرنا۔

پانچویں مہم:

سربراہِ مہم: ڈاکٹر ایم۔ کے۔ کول، ڈائرکٹر جیولوجیکل سروے آف انڈیا۔

برِاعظم انٹارکٹیکا پر: ۲۵ دسمبر ۱۹۸۵ء کو پانچواں

(باقی صـ۲۲ـ پر)

ارملا دیوی

دیہات ترقی کی جانب گامزن

دیہی ترقیاتی اسکیموں کا مختصر جائزہ

بھارت دیہات میں بستا ہے۔ مہاتما گاندھی نے جدوجہد آزادی کی قیادت سنبھالنے سے پہلے ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ ملک کی آزادی کے لیے دیہات میں رہنے والے کروڑوں افراد کی حالت بہتر بنانا اور اُن کا تعاون و اشتراکِ عمل حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ اسی لیے انھوں نے چرخے کو اپنایا اور دیہی اور گھریلو دستکاریوں کے فروغ پر زور دیا۔ حصولِ آزادی کے بعد ہماری قومی حکومت نے دیہات کی ترقی پر خاطر خواہ توجہ مبذول کی۔ چنانچہ دیہی ترقی ہمارے تمام پنجسالہ منصوبوں کے اہم ترین نصب العینوں میں شامل رہی ہے۔ چھٹی دہائی کے ابتدائی سالوں میں اجتماعی ترقی کے پروگرام کے تحت گاؤں میں ترقیاتی و توسیعی خدمات شروع کی گئیں۔ ان سے دیہی آبادی میں گاؤں کی ترقی کے وسیع امکانات کے بارے میں بیداری پیدا ہوئی۔ زمینداری کے خاتمے اور پٹہ داری کے نظام میں اصلاحات کے ساتھ ساتھ پنجسالہ منصوبوں کے تحت روبہ عمل لائی گئی اسکیموں کی بدولت دیہی علاقوں کی سماجی و معاشی ترقی کے لیے بنیادی ڈھانچہ تیار ہو گیا۔

آج ملک کے دیہات مسلسل ترقی کی جانب گامزن ہیں۔ گاؤں گاؤں میں بجلی پہونچ گئی ہے۔ زراعت کو بہتر بنایا جا رہا ہے، اس کے لیے ضروری سہولیات اور قرضے مہیا کیے جا رہے ہیں، پینے کے پانی کی سہولیات بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔ صحت و تعلیم کی اشاعت کے لیے بنیادی خدمات فراہم کی جا رہی ہیں۔ دیہی علاقوں کے بے روزگار افراد کو روزگار دلانے کے لیے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ ذیل میں کچھ اہم اسکیموں کی تفاصیل پیش کی جا رہی ہیں جو دیہی ترقی کے لیے ملک بھر میں چلائی جا رہی ہیں:-

مربوط دیہی ترقی کا پروگرام

مربوط دیہی ترقی کا پروگرام دیہات کے لوگوں کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے اور انھیں خطِ غریبی سے اوپر اٹھانے کے لیے ۷۹-۱۹۷۸ء میں شروع کیا گیا تھا۔ اب یہ پروگرام بیس نکاتی پروگرام کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ اس کا مقصد غریبوں میں بھی سب سے غریب لوگوں کی حالت بہتر بنانا ہے۔ اس میں چھوٹے اور ان سے بھی کمتر کسان، کھیت مزدور، دیگر مزدور، دستکار وغیرہ آ جاتے ہیں جو خطِ غریبی سے نیچے گزر بسر کر رہے ہیں۔ ان میں درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے لوگ بھی شامل ہیں، یعنی لگ بھگ پانچ افراد پر مشتمل ایسے کنبے جن کی سالانہ آمدنی ۳۵۰۰ روپے سے کم ہے۔ پروگرام کے تحت زراعت اور اس سے متعلق کاموں، گھریلو دستکاریوں اور ایسے تمام دھندوں میں روپیہ لگایا جاتا ہے جو ایسے کنبوں کو پسند ہوں تاکہ ان کے لیے روزگار پیدا کیا جا سکے اور ان کی آمدنی کو بڑھایا جا سکے۔ پروگرام کے تحت چلائی جانے والی اسکیموں کی منظوری ریاستی حکومتیں دیتی ہیں۔ بلاک کی سطح کی اسکیموں کو ریاستی سطح کی ایک رابطہ کمیٹی منظوری عطا کرتی ہے۔ رابطہ کمیٹیوں کی میٹنگیں مقررہ وقفے کے بعد ہوتی ہیں جن میں اسکیم پر عمل درآمد کا جائزہ لیا جاتا ہے اور رفتارِ عمل کو تیز کرنے کی ہدایات دی جاتی ہیں۔ بلاک کی سطح پر پروگرام پر عمل درآمد کی ذمہ داری ضلع گرام وکاس ایجنسی کو سونپی جاتی ہے۔ ایسی ایجنسیاں تقریباً تمام ضلعوں میں قائم کی جا چکی ہیں۔

چھٹے پنجسالہ منصوبے کے دوران ۱۶۵۶ لاکھ

○ چھتہ بھوانی شنکر، فتح پوری، دہلی

یوجنا، نئی دہلی

کنبوں کو اس پروگرام کے تحت لایا گیا جب کہ نشانہ ۱۵۰ لاکھ کنبوں کو امداد بہم پہنچانے کا تھا۔ یہ کارگذاری ۱۱۰٫۴ فیصد ہے۔ منصوبے میں درجِ فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے ۴۵ لاکھ کنبوں کو امداد دینے کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا، یعنی پروگرام سے مستفید ہونے والے کنبوں کی کل تعداد کے تیس فیصد حصے کو۔ یہاں بھی تیس فیصد سے زیادہ کنبے پروگرام سے مستفید ہوئے۔ یہ کامیابی یقیناً قابلِ تعریف ہے۔

چھٹے منصوبے میں پروگرام کے تحت اسکیموں پر عمل درآمد کے لیے ۱۵۰۰ کروڑ روپے مختص کیے گئے تھے، لیکن نشانے کے ۱۱۰ فیصد حصول کی وجہ سے کل ۱۶۵۰٫۲۷ کروڑ روپے خرچ ہوئے۔ منصوبے کی مدت کے دوران بنکوں کے ذریعے دئے گئے قرضوں کی کل رقم ۳۰۸۰ کروڑ روپے تک تھی جو مقررہ نشانے کا ۱۰۳ فیصد ہے۔

مربوط دیہی ترقی کے پروگرام میں چھٹے منصوبے کے دوران واضح تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ ۸۱-۱۹۸۰ء میں امداد کی رقم فی کس ۵۸۲ روپے تھی۔ لیکن ۸۵-۱۹۸۴ء میں یہ ۱۱۹۰ روپے فی کس ہو گئی۔ اسی طرح قرضہ جات کی فی کس رقم میں ۱۰۳٫۲ فیصد کا اضافہ ہوا۔ چنانچہ یہ رقم ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۱۰۶۰ روپے سے بڑھ کر ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۲۱۵۴ روپے فی کس ہو گئی۔

قومی دیہی روزگار پروگرام

سبھی پنجسالہ منصوبوں کا ایک بڑا مقصد روزگار کے مواقع میں خاطر خواہ اضافہ کرکے غریبی، بے روزگاری و کم روزگاری میں قابلِ لحاظ کمی لانا رہا ہے۔ ماضی میں دیہی آزادی قوت پروگرام، پُرزور دیہی روزگار پروگرام اور "کام کے بدلے اناج" جیسے روزگار بڑھانے والے پروگراموں سے جو تجربہ حاصل ہوا اسی کی بنیاد پر قومی دیہی روزگار پروگرام کی تشکیل کی گئی۔ یہ پروگرام مرکز کی سرپرستی میں اکتوبر ۱۹۸۰ء میں شروع ہوا۔ اس کے اخراجات مرکزی اور ریاستی حکومتیں آدھے آدھے کی نسبت سے برداشت کرتی ہیں۔ اس کے تین اہم مقاصد ہیں:- منفعت بخش روزگار کے مزید مواقع کی فراہمی، مستقل نوعیت کے اثاثہ جات کی تشکیل اور گاؤں کے غریب افراد کی خوراک میں غذائیت بخش اجزا کا اضافہ۔

اس پروگرام کے تحت ایسے سب کام شروع کیے جا سکتے ہیں جن سے مستقل اجتماعی اثاثہ جات کی تشکیل ہوتی ہو لیکن درجِ فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے لوگوں کی بہبود کے لیے ایسے کام بھی شروع کرنے کی اجازت ہے جن سے انفرادی طور پر کسی کو فائدہ پہونچتا ہو۔ اس کے تحت شروع کی جانے والی اسکیموں کی فہرست دیہی افراد کی ضرورتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے تیار کی جاتی ہے۔ یہ سبھی اسکیمیں گرام سبھاؤں کی بیٹھکوں میں طے کی جاتی ہیں اور انھیں ضلعی گرام وکاس ایجنسیوں کے ذریعے عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ اس پروگرام کے لیے ریاستوں کو رقوم ایک مقررہ فارمولے کی بنیاد پر فراہم کی جاتی ہیں۔

پروگرام کے تحت کام پر لگائے گئے مزدوروں کو مزدوری کم از کم مناسب اُجرت کے قوانین کے مطابق دی جاتی ہے۔ مزدوری کا کچھ حصہ نقد اور کچھ اجناس کی شکل میں دیا جاتا ہے۔ مزدوری کے ایک حصے کے طور پر سستے داموں پر ایک کلو اناج بھی دیا جاتا ہے۔ سارے پروگرام میں جتنی بھی رعایت دی جاتی ہے وہ مرکز کی طرف سے ہوتی ہے۔

چھٹے منصوبے میں اس پروگرام کے لیے ۱۶۲۰ کروڑ روپے مختص کیے گئے تھے لیکن منصوبے کی مدت میں اصل خرچ ۱۸۱۹ کروڑ روپے ہوا۔ ہر سال ۳۰۰ تا ۴۰۰ ایام کار کا روزگار فراہم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا جو منصوبے کے سبھی سالوں میں پورا ہوتا رہا۔ اس پروگرام کی بدولت روزگار کے فاضل مواقع تو فراہم ہوئے ہی، مستقل اجتماعی اثاثہ جات بھی بنے، جن کی وجہ سے مزدوروں کو کم از کم مناسب اُجرت مل رہی ہے۔ اور ان کی خوراک میں غذائیت بخش اجزا کا اضافہ ہوا ہے۔ اس سے کچھ حد تک گاؤں سے لوگوں کی شہروں کو منتقلی کو روکنے میں مدد ملی ہے۔ غریبوں کو کافی راحت ملی ہے اور سڑکوں کی تعمیر سے تجارت کی سہولیات میں اضافہ ہوا ہے۔

بے زمین افراد کے لیے روزگار کی گارنٹی کا پروگرام

گاؤں میں جب کھیتی باڑی کا کام کاج کم ہو جاتا ہے تو بے زمین مزدوروں کے لیے روزگار کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے ۸۴-۱۹۸۳ء سے بے زمین دیہی افراد کے لیے روزگار کی گارنٹی کی ایک اسکیم شروع کی گئی ہے جس کے دو بنیادی مقاصد ہیں:-

۱۔ دیہات کے بے زمین افراد کے لیے روزگار کے مواقع بہتر بنانا اور بڑھانا جس سے ہر بے زمین مزدور کے خاندان کے کم سے کم ایک رکن کو سال میں سو دن ضرور کام مل سکے۔

۲۔ گاؤں میں بنیادی ڈھانچہ مستحکم بنانے کے لیے مستقل اثاثے بنانا، جس سے گاؤں کے اقتصادی نظام کی ترقی میں مدد ملے۔

چھٹے منصوبے میں اس پروگرام کے لیے ۶۰۰ کروڑ روپے رکھے گئے تھے۔ ۸۴-۱۹۸۳ء میں اس پروگرام پر عمل درآمد کے لیے ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں کو ۱۰۰ کروڑ روپے دئے گئے اور ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۴۰۰ کروڑ روپے۔ پروگرام کا پورا خرچ مرکزی حکومت برداشت کر رہی ہے۔ ریاستوں کو جو رقوم ملتی ہیں انھیں کے

مطابق دیہی اسکیمیں بناتی ہیں۔ ۳۱ مارچ ۸۵ء تک مختلف ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں میں اس پروگرام کے تحت ۳۲۷،۹۰۶ کروڑ روپے کی لاگت کی ۳۱۸ اسکیمیں منظور کی گئیں۔

دیہی نوجوانوں کو اپنا روزگار شروع کرنے کی تربیت دینے کی اسکیم

یہ اسکیم جسے انگریزی میں (TRYSEM) کہا جاتا ہے ۱۵ اگست ۱۹۷۹ء کو شروع کی گئی تھی۔ اس کا مقصد دیہی علاقوں کے ایسے خاندانوں کے، جن کی سالانہ آمدنی ۳۵۰۰ روپے سے کم ہے، ۱۸ سے ۳۵ برس تک کی عمر کے نوجوانوں کو خود اپنا روزگار شروع کرنے کے لیے تربیت دیکر انھیں تکنیکی جانکاری فراہم کرنا ہے۔ منتخب خاندانوں کے صرف ایک ایک فرد کو ہی یہ تربیت دی جائے گی۔ اس تربیت میں زراعت اور صنعت اور مختلف کام دھندوں کی تربیت شامل ہوتی ہے۔

اس پروگرام کی اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ ہر سال ہر بلاک کے ۴۰ نوجوانوں کو تربیت دی جاتی ہے۔

۲۔ تربیت پانے والوں کو حسب ضرورت ماہانہ یا روزانہ بھتہ دیا جائے گا۔ مقررہ شرح پر کچا مال خریدنے کے لیے مقررہ بھتہ اور ضروری اوزار دئے جائیں گے۔

۳۔ ماہر کاریگروں اور تربیت کاروں کو آنریریم بھی دیا جائے گا۔

۴۔ جو تربیت یافتگان خود کچھ کرنا چاہتے ہیں انھیں ۳۳ۄ۱ فیصد کی شرح سے مالی امداد مہیا کی جائے گی۔ یہ امداد جہاں خشک سالی کا خطرہ نہ ہو وہاں فی خاندان تین ہزار روپے، خشک سالی کے امکان والے علاقوں میں چار ہزار روپے اور آدی باسی خاندانوں کے لیے پانچ ہزار روپے مقرر کی گئی ہے۔

۵۔ بینکوں اور دیگر اداروں سے ملنے والی مالی امداد کے ذریعے اسے چھ ہزار، آٹھ ہزار اور پانچ ہزار روپے تک بڑھایا جا سکتا ہے۔

(۶) مرکز اور ریاستی حکومتوں اور رضاکار اداروں کے ذریعے چلائی جانے والی تربیتی تنظیموں کے بنیادی ڈھانچے کو مستحکم بنانا۔

چھٹے منصوبے کے دوران اس پروگرام کے تحت ۹ء۴۰ لاکھ نوجوانوں کو تربیت دی گئی، جن میں ۲ء۹۶ لاکھ آدی باسی اور ۳ء۲۶ لاکھ عورتیں تھیں۔ اپنے روزگار کے لیے ۴ء۶۴ لاکھ نوجوانوں کو تربیت دی گئی۔

مویشیوں سے متعلق خصوصی پروگرام

یہ پروگرام زراعت سے متعلق قومی کمشنر کی سفارشوں کی بنیاد پر ۷۶۔۱۹۷۵ء میں شروع کیا گیا تھا۔ اس کے خاص مقصد یہ ہیں:۔

۱۔ گاؤوں کے کمزور طبقوں کے افراد کو روزگار کے مزید مواقع فراہم کرنا اور ان کی آمدنی میں اضافے کو ممکن بنانا۔

۲۔ مویشیوں سے حاصل ہونے والی چیزوں، جیسے دودھ، اون، انڈوں وغیرہ کی پیداوار بڑھانے، (۳) مخلوط نسل کے بہتر بچھڑوں کی پرورش کے یونٹ قائم کرنا۔

(۴) بھیڑ، مرغ مرغیاں اور سؤر پالنے کے یونٹوں کا قیام۔

یہ پروگرام ۲۱ ریاستوں اور مرکزی انتظام کے چار علاقوں کے ۱۸۳ ضلعوں میں نافذ العمل ہے۔ اس کے تحت ۲۶۸ اسکیمیں چلائی جا رہی ہیں جن میں سے ۹۹ اسکیموں کا تعلق مخلوط نسل کے بچھڑے پالنے، ۲۸ کا مرغ مرغیاں پالنے، ۵۱ کا بھیڑ پروری اور ۵۰ کا سؤر پالنے سے ہے۔

اس پروگرام کے اخراجات مرکز اور ریاستی حکومتیں نصف، نصف کی نسبت سے برداشت کرتی ہیں۔ مرکزی انتظام کے علاقوں کے پروگرام پر ہونے والا سارا خرچ مرکزی سرکار اٹھاتی ہے۔ اس پروگرام کے تحت فائدہ اٹھانے کے لیے چنے گئے افراد میں سے تیس فیصد درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ پروگرام میں مویشیوں کی صحت، ان سے حاصل ہونے والی اشیاء کی فروخت کا انتظام اور ان کے بیمہ وغیرہ سے متعلق اسکیمیں بھی شامل ہیں۔

ممکنہ خشک سالی والے علاقوں کے لیے پروگرام

پہلے خشک سالی کے امکان والے علاقوں کے لیے پروگرام دیہی ترقی کے پروگرام کی شکل میں جانا جاتا تھا۔ اس کا آغاز چوتھے منصوبے کے دوسرے سال ۷۱۔۱۹۷۰ء میں کیا گیا تھا۔ اس کے تحت خشک سالی کا اکثر شکار بننے والے علاقوں کے ابتدائی مسائل کو منصوبہ بند طریق پر زراعتی پروگراموں اور شجرکاری، سڑکوں کی تعمیر، زرخیز مٹی کی حفاظت پینے کے پانی کی فراہمی سے متعلق اسکیموں کے ذریعے حل کیا جاتا ہے۔

اس پروگرام کے خاص مقاصد یہ ہیں:۔

۱۔ خشک سالی کے مضر اثرات کو کم کرنے کی کوشش کرنا (۲) عوام اور خاص کر کمزور طبقات کی آمدنی میں استحکام لانا اور (۳) ماحول کا تحفظ اور توازن۔

یہ پروگرام ۱۳ ریاستوں کے ۸۸ ضلعوں کے ۵۱۰ ترقیاتی بلاکوں میں نافذ العمل ہے۔

ریگستانی علاقوں کی ترقی کا پروگرام

یہ پروگرام ۷۸۔۱۹۷۷ء میں شروع کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد ریگستان کے پھیلاؤ کو روکنا اور ریگستانی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی آمدنی اور روزگار

اور پیداوار بڑھانے کے لیے سہولیات مہیا کرنا ہے۔
پروگرام کی کچھ اہم سرگرمیاں درج ذیل ہیں :۔

۱۔ زیرِ زمین پانی کی تلاش اور استعمال۔
۲۔ پانی کی فراہمی کا بندوبست۔
۳۔ نل کنووں کے لیے بجلی مہیا کرنے کے لیے دیہات میں بجلی پہونچانا اور
(۴) زراعت، باغبانی اور مویشی پروری کی حوصلہ افزائی۔

یہ پروگرام ملک کے گرم اور سرد دونوں طرح کے ریگستانی علاقوں میں چلایا گیا ہے۔ اس کے تحت گرم ریگستانی علاقے کے ۱۸ ضلعوں اور سرد ریگستانی علاقے کے تین اضلاع میں کام ہو رہا ہے۔ چھٹے منصوبے کی مدت میں اس پروگرام پر ۱۳۱٫۶۹ کروڑ روپے صرف کئے گئے۔

سڑکوں کی تعمیر

محکمۂ دیہی ترقی گاؤں تک پکی سڑکیں بنانے کے کام کو اولین ترجیح دیتا ہے کیونکہ سڑکیں دیہی ترقی میں کافی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ گاؤں میں سڑکوں کی تعمیر ریاستوں کے کم از کم بنیادی ضروریات کے پروگرام، ایک اہم حصہ ہے۔ ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں کے منصوبوں میں اس کے لیے رقوم مختص کی جاتی ہیں۔ چھٹے منصوبے میں ریاستوں میں کم از کم ضروریات کے پروگرام کے تحت ۱۶۴۴٫۹۰ کروڑ روپے مخصوص کئے گئے تھے۔ چھٹے منصوبے کی دستاویز میں ۱۹۹۰ء تک ۱۵۰۰ سے زیادہ کی آبادی والے سبھی گاؤں میں اور ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار تک کی آبادی والے پچاس فیصد گاؤں کو پکی سڑکوں سے ملانے کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ ان گاؤں کی نصف تعداد میں چھٹے منصوبے کے اختتام تک سڑکیں بنانے کا پروگرام تھا۔

پنچایتی راج

اگرچہ کئی ریاستوں میں پنچایتیں ۱۹۴۷ء کے بعد کے برسوں میں قائم ہو چکی تھیں، تاہم پنچایتی راج کا سہ سطحی نظام ۱۹۵۹ء میں لاگو کیا گیا۔ ہر ریاست اپنے یہاں کے حالات کے مطابق پنچایتوں کا ڈھانچہ تیار کرتی ہے۔ اس وقت میگھالیہ اور ناگالینڈ کو چھوڑ کر باقی تمام ریاستوں میں پنچایتی راج لاگو ہے۔ اسی طرح لکش دیپ اور میزورم کے سوا مرکزی انتظام کے تمام علاقوں میں بھی پنچایتیں بن چکی ہیں۔ چنانچہ اس وقت ملک بھر میں ۲۱۷٫۳۱۹ گاؤں پنچایتیں، ۴۵۲۶ پنچایت سمیتیاں اور ۲۹۷ ضلع پریشدیں سرگرم عمل ہیں۔

پنچایتی راج کے مختلف ادارے تنظیمی نقطۂ نگاہ سے ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں۔ ان میں پسماندہ طبقات، خواتین اور کوآپریٹو تنظیموں کو خاص نمائندگی دی جاتی ہے۔ گاؤں کے لوگ تمام گاؤں کے لوگوں میں سے پنچایت کے اراکین کا انتخاب کرتے ہیں۔ پنچایتیں زراعت اور دیہی دستکاریوں کی حوصلہ افزائی، طبی سہولیات اور زچہ و بچہ کی دیکھ بھال، بہبود بچگان کی سہولیات کی فراہمی، مشترکہ چراگاہوں، سڑکوں اور کنووں کے رکھ رکھاؤ اور صفائی کا انتظام رکھتی ہیں۔ کچھ مقامات پر پنچایتیں ابتدائی تعلیم کا بندوبست بھی کرتی ہیں۔ اور مالگذاری وصول کرنے کا کام کرتی ہیں۔

گاؤں کی ترقی کے پروگرام بنیادی طور پر پنچایتوں، کوآپریٹو تنظیموں اور اسکولوں کے ذریعے روبہ عمل لائے جاتے ہیں۔ عوام کی منتخب کردہ پنچایتوں پر سبھی ترقیاتی پروگرام چلانے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ گاؤں کا اسکول، جو لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ بھی ہوتا ہے، تعلیم و تفریح اور ثقافتی امور کا انتظام کرتا ہے۔ نوجوانوں اور خواتین کی تنظیمیں، کسانوں اور دستکاروں کی سوسائٹیاں مختلف ترقیاتی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے میں پنچایتوں کے ساتھ پورا تال میل رکھتی ہیں۔

پنچایتی راج کے اداروں کو چنگی اور محصول وغیرہ جمع کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے۔ وہ کچھ خاص قسموں کی زمین، میلوں اور اشیاء کی بکری پر ٹیکس لگاتی ہیں اور چنگی وصول کرتی ہیں، وہ ایسے اجتماعی اثاثے بھی بناتی ہیں جن سے پنچایت کو آمدنی ہوتی رہے۔ انھیں ریاستی حکومت سے عطیات بھی ملتے ہیں۔

چک بندی

چھوٹے چھوٹے قطعاتِ اراضی پر کھیتی باڑی فائدہ مند نہیں ہوتی۔ اس میں جدید تکنیکوں کا استعمال اور زیادہ سرمایہ لگانا بھی کاشتکاروں کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے اس لیے چھوٹی چھوٹی کھیتیوں کی چک بندی پیداوار بڑھانے اور زراعتی ڈھانچے کی معاشیات کو بہتر بنانے کا واحد ذریعہ ہے۔ اس سے گاؤں کی منصوبہ بند ترقی میں بھی کافی مدد ملتی ہے۔ چک بندی کی اسکیم لاگو کرنے کے لیے بیشتر ریاستوں میں قانونی انتظامات کئے جا چکے ہیں۔ اور ۳۵٫۵۱۹ ہیکٹیئر زمین کی چک بندی کی جا چکی ہے۔ یہ کام زیادہ تر اترپردیش، پنجاب، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، گجرات، راجستھان اور کرناٹک میں ہوا ہے۔

مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی یہ متفقہ پالیسی ہے کہ زراعت کے شعبے بہتری لانے کے لیے اصلاحاتِ اراضی کے قانونوں کو سختی سے نافذ کیا جائے۔ مرکزی حکومت ریاستوں پر اس بات کے لیے زور دیتی رہی ہے کہ عدالتی کارروائی کے معاملوں کو جلد از جلد نپٹایا جائے اور اصلاحاتِ اراضی

کے قوانین کی خلاف ورزی کے معاملات کا پتہ لگایا جائے۔ ریاستی حکومتوں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ پیپرے داروں اور بٹائی داروں کے مفاد کے تحفظ کے لیے اقدامات کریں، جو دیہات کے غریب طبقوں میں سب سے غریب ہیں۔

بچولیوں کا خاتمہ اور مالکانہ حقوق کی تفویض

زراعت کے میدان میں بچولیوں کے خاتمے سے تقریباً دو کروڑ کاشتکاروں کا رابطہ براہ راست حکومت سے ہو گیا ہے۔ بچولیوں سے ۷۰ لاکھ ہیکٹیئر بنجر، پڑتی یا دوسری قسم کی زمین حاصل کی گئی ہے جو کھیتی کرنے والے مزدوروں اور بہت چھوٹے کاشتکاروں میں تقسیم کی گئی ہے۔ زیادہ تر ریاستوں میں پٹہ داروں کو مالکانہ حقوق عطا کئے گئے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ۸۰ لاکھ پٹے داروں کو مالکانہ حقوق حاصل ہو چکے ہیں۔

زمین کی حد بندی اور فاضل زمین کی تقسیم

۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں میں کئی ریاستوں میں زمین کی حد بندی کے قانون بنائے گئے۔ اس کے نتیجے میں ۲۶ء۸۰ لاکھ ایکڑ زمین سرکار نے حاصل کی اور اس میں سے ۲۲ء۲۲ لاکھ ایکڑ اراضی بے زمین لوگوں میں بانٹ دی گئی۔ ۱۹۷۲ء میں جاری کی گئی قومی ہدایات کے مطابق ریاستوں نے زمین کی حد بندی کے قانون پھر سے بنائے جن پر تیزی سے عمل کیا جا رہا ہے۔ اب تک ۴۳ء۲۲ لاکھ ایکڑ زمین فاضل قرار دی جا چکی ہے۔ اس میں سے ۲۹ء۹۶ لاکھ ایکڑ زمین کو سرکاری قبضے میں لیا گیا ہے اور ۲۲ء۴۴ ایکڑ زمین بے زمین کھیت مزدوروں اور امداد کے مستحق دیگر طبقات کے ۱۹ء۸۲ لاکھ خاندانوں میں تقسیم کی جا چکی ہے۔ کل ملا کر ۷۵ء۰۵ لاکھ ایکڑ زمین حاصل کی گئی ہے اور ۴۳ء۷۳ لاکھ ایکڑ زمین ۳۲ء۹۰ لاکھ ضرورت مند خاندانوں میں تقسیم کر دی گئی ہے۔ چونکہ حد بندی کے قانون کو لاگو کرنے میں کافی مشکلات پیش آتی ہیں اس لیے ۱۶ لاکھ ایکڑ زمین مقدمہ بازی میں پھنسی ہوئی ہے۔ لہٰذا اسے تقسیم نہیں کیا جا سکا ہے۔

مالی امداد

چونکہ حد بندی قانون کے تحت تقسیم کی جانے والی زمین زیادہ تر گھٹیا قسم کی ہوتی ہے۔ اس لیے اسے حاصل کرنے والوں کو اچھی کاشت کے لیے کافی روپیہ لگانا پڑتا ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے مرکز نے ۷۶-۱۹۷۵ء میں ایک امدادی اسکیم شروع کی جس کے تحت مالی امداد بھی فراہم کی جا رہی ہے۔ ان لوگوں کو مربوط دیہی ترقی کے پروگرام، قومی دیہی روزگار پروگرام وغیرہ کا فائدہ دینے کے معاملے میں بھی ترجیح دی جاتی ہے اب تک دیہی ترقی کا محکمہ ریاستوں اور مرکز کے انتظام کے علاقوں کو ۲۵۰٫۰۷ کروڑ روپے دے چکا ہے۔ مستحق افراد کو مالی امداد ۲۵۰۰ روپے فی ہیکٹیئر کے حساب سے دی جا رہی ہے۔

محکمۂ دیہی ترقی کی قرضہ جات سے متعلق شاخ دیہی ترقی کے پروگرام کو روبہ عمل لانے کے واسطے قرضوں کا بندوبست کرنے کے لیے وزارت مالیات کے بنکنگ ڈپارٹمنٹ، ریزرو بنک اور زراعت و دیہی ترقی کے قومی بنک سے رابطہ رکھتی ہے۔

علاقائی دیہی بنک کمزور طبقوں کے لوگوں کو قرضے دینے میں ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ دسمبر ۱۹۸۴ء میں ۱۶۲ علاقائی دیہی بنکوں کے تحت ۲۳ ریاستوں کے ۲۸۶ اضلاع تھے۔ چھٹے منصوبے میں ۱۷۰ اضلاع کے لیے مزید ۱۷۰ علاقائی دیہی بنک کھولنے کا ارادہ تھا۔

زرعی اجناس کا ذخیرہ درجہ بندی اور مارکیٹنگ :- ۸۰-۱۹۷۹ء سے ملک بھر کے دیہات میں اناج اور دیگر زرعی پیداوار کو رکھنے کے لیے گودام بنانے کا ایک خاص پروگرام زیر عمل ہے۔ اسے کوآپریٹو تنظیموں، بازار کمیٹیوں اور ریاستی ویئر ہاؤسنگ کارپوریشنوں کی وساطت سے عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ ان گوداموں کی صلاحیت ۲۰۰ ٹن سے ۱۰۰۰ ٹن ہے۔ ۸۵-۱۹۸۴ء کے آخر تک گاؤوں میں ۳۲۳۹ گودام بنانے کا پروگرام تھا۔

جلد خراب ہو جانے والی اشیا کو محفوظ رکھنے کے لیے کولڈ اسٹوریج بنائے جا رہے ہیں۔ کولڈ اسٹوریج آرڈر ۱۹۸۰ء کے تحت ۳۰ ستمبر ۱۹۸۴ء تک ۱۱۵۵ کولڈ اسٹوریجوں کو لائسنس دیا گیا۔ اس کے لیے ریاستی حکومتوں نے بھی اپنے قوانین و ضوابط کے تحت کئی لائسنس جاری کئے۔

زرعی اجناس کی درجہ بندی کی جاتی ہے تاکہ گاہکوں کو اچھی قسم کی چیزیں مل سکیں۔ "ایگ مارک" کے تحت اب تک جن اشیا کی درجہ بندی کی جا چکی ہے ان میں کپاس، بناسپتی، تیل، گھی، کریم، مکھن، انڈے، چاول، گیہوں، آٹا، اگرا، بورا، سپاری، زیرہ، کانگڑہ کی چائے، دالیں، شہد، پسے ہوئے مصالحہ جات، آلو اور پھل شامل ہیں۔

بازاروں کو قوانین و ضوابط کے تحت لانے کا کام ریاستی حکومتیں کرتی ہیں۔ ڈائرکٹوریٹ آف مارکیٹنگ اینڈ انسپیکشن مارکیٹنگ کے لیے قانون سازی اور قوانین کے نفاذ کے بارے میں انھیں مشورہ دیتا ہے۔ مارچ ۱۹۸۴ء کے آخر تک ملک میں منضبط بازاروں کی تعداد ۵۶۷۹ تھی۔ بازاروں اور منڈیوں کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے اور جو مسائل سامنے آتے ہیں، انھیں حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر مذکورہ بالا پروگراموں پر صدق دلی سے عمل ہوتا رہا اور عوام بھی اس میں پورا تعاون دیتے رہے تو دیہات میں غریبی، جہالت اور بیروزگاری کو کم کرنے میں سال بہ سال زیادہ کامیابی حاصل ہوگی اور اس صدی کے اختتام تک ہمارے گاؤوں کی کایا پلٹ جائے گی۔ ●

فاروق نازکی٥

ترقی کے سنگِ میل

قسط : ۷

مسلسل ترقی کے لیے مالی پالیسی

دسمبر ۱۹۸۵ء میں طویل مدتی مالی پالیسی کا اعلان کیا گیا۔ اس پالیسی کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ سالانہ بجٹ کے مختلف حصوں کو ایک مقررہ سمت اور ربط دیا جائے۔ یہ پالیسی اس طرح سے ترتیب دی گئی ہے کہ دیہی مالیات کا باضابطہ ارتقا ہو، اور مالی معاملات میں ایک اہم کردار ادا کر سکے، اس کے علاوہ اس پالیسی کے تحت اقتصادی پالیسی اور انتظام و انصرام کے تئیں بھی ایک مربوط اپروچ کو اپنانے میں مدد ملے گی۔ اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ عمل درآمد کرنے والی ایجنسی ساتویں منصوبے کے مالی مقاصد کے درمیان گہرا رابطہ پیدا ہو، سالانہ جائزہ بھی اس کے ساتھ منسلک ہو جائے۔ اس کے علاوہ یہ طریقۂ کار ساتویں منصوبے کے مالی نشانوں اور سالانہ اخراجات کے درمیان اس طرح سے ایک پل کا کام دے گا، کہ سالانہ مالی پالیسی کے ڈھانچے کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

چھٹے منصوبے کے دوران اور ساتویں منصوبے کے اخراجات کا تعین کرتے وقت جو رجحانات سامنے آئے، ان سے پتہ چلتا ہے کہ مزید ذرائع کو حرکت میں لانے کے باوجود پبلک سیکٹر میں وسائل کو زبردست آزمائش کا سامنا کرنا پڑا، خیال ہے کہ اس صورتِ حال میں فی الحال کسی تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے پبلک سیکٹر میں مالی انتظام اور پیداوار میں بہتری لانے کا قدم اٹھایا گیا ہے۔

نئی مالی پالیسی یعنی (Fiscal Policy) کا دائرہ کار صرف سرکاری سیکٹر میں ذرائع کو فروغ دینے تک ہی محدود نہیں ہے۔ سماج میں رہنے والے افراد تک اقتصادی فائدہ پہونچانے کے لیے اس اسکیم میں کافی گنجائش موجود ہے۔ یعنی بچت کرنا، سرمایہ لگانا، قیمتوں کو ایک سطح پر برقرار رکھنا، اور ذرائع کی صحیح بنیادوں پر تقسیم اسی پالیسی کے مختلف حصے ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کو مکمل طور پر استعمال کرنا ضروری ہے۔ ایک مناسب پالیسی، پیداوار اور بچت کو تحریک دیتی ہے، جس سے سرکار کے مالی وسائل میں اضافہ ہوتا ہے۔

جہاں تک صنعت کا تعلق ہے، اس مالی پالیسی کا بنیادی کام یہ ہے کہ صنعتیں اپنے ذرائع میں اضافہ کریں۔ تاکہ صنعتی بنیاد استوار ہو، اور صنعتوں کی پیداوار میں بڑھوتری ہو۔ اس کے علاوہ یہ بات کافی اہم ہے کہ صنعتوں کے پھیلاؤ کو یقینی بنانے کے لیے کارخانوں میں خوشگوار فضا پیدا کی جائے۔ ٹیکس کے ڈھانچے اس طرح سے ترتیب دئے جائیں کہ کارخانوں میں کام کرنے والوں کو کسی طرح کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے، اور کارخانہ بلاوجہ، مقدمہ بازی، تنازعات کے فیصلوں اور اس طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہو کر پیداوار پر اثر انداز نہ ہو۔

مالی پالیسی کا ایک اور مدعا ہے کہ گھریلو سیکٹر میں بچت میں اضافہ ہو، اور کالے دھندے کا پھیلاؤ روک دیا جائے، بالواسطہ ٹیکس پالیسی کو معقول بنیادوں پر لانے سے بین الاقوامی سطح پر تجارتی مقابلے کا معیار بلند ہوگا، جس سے صنعتوں کو وسعت ملے گی، اور آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔

ساتویں منصوبے میں آب رسانی کا انتظام

آبپاشی کے کمانڈ علاقوں میں آب رسانی کو

٥ اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر، آل انڈیا ریڈیو، سری نگر۔

بہتر بنانے کے لیے خاص طور پر زور دیا گیا ہے تاکہ منصوبے کے دوران زرعی پیداوار کے بڑھانے میں مدد مل سکے۔ منصوبے میں اشتمال اراضی اور پانی کے ذخیروں کو بڑھاوا دینے کے کام پر خاص توجہ ہوگی تاکہ زمین کو کٹاؤ سے محفوظ رکھا جائے اور دستیاب زمین کی پیداواری صلاحیت کو بڑھایا جا سکے۔ جو پراجیکٹ چھٹے منصوبے کے دوران شروع کئے گئے ہیں، ساتویں منصوبے میں اُن کی دیکھ بھال کے کام پر توجہ دی جائے گی۔

چھٹے منصوبے کے دوران لگ بھگ چھ لاکھ ہیکٹیر زمین کو اشتمالِ اراضی اور آب رسانی کے دائرے میں لایا گیا تھا۔ اس طرح سے منصوبے کے شروع تک ۲۹ لاکھ ہیکٹر زمین ان اقدامات کے دائرے میں آ گئی۔

اس وقت واٹر شیڈوں کے انتظام سے متعلق مربوط پروگرام سیلاب کی زد میں آنے والے دریاؤں کے علاقے میں دو ہزار واٹر شیڈوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ یہ شیڈ ۸ دریائی طاسوں میں ہیں۔

یہ اسکیم بدستور جاری رہے گی اور اس پر کام تیز کر دیا جائے گا۔ آب رسانی کے انتظام کو بہتر بنانے کے لیے زراعت، آبپاشی اور دیگر متعلقہ اداروں کے درمیان تال میل پیدا کرنے پر زور دیا جائے گا، تاکہ ان ماہرین کے باہمی تعاون سے آب رسانی کا کام کامیابی سے مکمل کیا جا سکے۔

آب رسانی کے انتظام میں کسانوں کا تعاون

ملک میں آب رسانی کے نظام کو سائنسی بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے کسانوں سے تعاون حاصل کرنا ضروری ہے، آبی ذخیروں سے متعلق وزارت نے ایک منصوبہ تیار کیا ہے، جس کے تحت کسانوں پر مشتمل انجمنیں قائم کی جائیں گی جو آب پاشی کے کام اور کھیتوں میں پانی پہونچانے والی نہروں کی دیکھ ریکھ کے فرائض انجام دیں گی۔ اس سے آبی ذخائر کے بھرپور استعمال، اور آبپاشی کے ذریعے کسانوں کو مکمل فائدہ پہونچانے کا عمل یقینی بن جائے گا۔

پردیش سرکاروں سے کہا گیا ہے کہ وہ تجرباتی طور پر ایک کمانڈ ایریا میں ایک پائیلٹ اسکیم کو اپنائیں۔ اس اسکیم کے تحت کسانوں کو کمیٹیوں کا ممبر بنایا جائے گا، اس کے بعد کمیٹیاں چھوٹی چھوٹی معاون تنظیموں کا قیام عمل میں لائیں گی۔ پانی کی تقسیم کا کام تجارتی بنیادوں پر ہوگا، اور پانی کا کاروبار کسانوں کی نکاسی کمیٹیوں اور معاون تنظیموں کے سپرد ہوگا، پانی کی فروخت پانی کی مقدار کی بنیاد پر ہوگی، نہ کہ اس بنیاد پر کہ پانی سے کتنی زمین یا علاقہ سیراب ہوا ہو، اس حکمت عملی سے تقسیم کا کام یکساں بنیادوں پر قایم ہوگا۔ اناج کے بیج فراہم کرنے کے لیے ابتدائی سرمایہ اور انتظامی تعاون گرانٹ کی صورت میں مرکزی سرکار اور پردیش سرکار کی طرف سے فراہم کیا جائے گا۔

مہاراشٹر اور آندھرا پردیش میں اس طرح کی تنظیموں کو بنانے کے لیے قانون موجود ہیں۔ یہ سجھاؤ بھی دیا گیا ہے کہ آب پاشی سے متعلق ایکٹ میں جس میں اس طرح کی مدیں شامل نہیں ہیں، مناسب ترمیم کی جائے۔

اس وقت پانی کی تقسیم کے معاملے میں صارفین سے کوئی صلاح مشورہ نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ پانی کی تقسیم کا بنیادی مقصد صارفین کو فائدہ پہنچانا ہے۔ اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ کسانوں کی طرف سے کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ پراجیکٹ کے تئیں سرد مہری پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے پانی کے ذخائر کا بھرپور استعمال نہیں ہو رہا ہے۔

موجودہ اسکیم کا بنیادی مقصد کسانوں سے بھرپور تعاون حاصل کرنا، تقسیم کے کام کو منظم کرنا، اور پانی کے محصول کی بلا تاخیر ادائیگی ہے۔ اس سے پانی کی تقسیم کاری موثر ہوگی، اور پانی کے موجودہ ذخیروں کا صحیح استعمال یقینی بن جائے گا۔

ساتویں منصوبے میں مزدوروں سے متعلق پالیسی

ساتویں منصوبے میں مزدوروں کی فلاح و بہبود اور مزدوری سے متعلق پالیسی کے لیے ۳۴۴ کروڑ روپے مخصوص رکھے گئے ہیں۔ اس رقم میں سے مرکز کے تحت ۹۴ کروڑ روپے۔ پردیشوں کے تحت ۲۱۹ کروڑ روپے اور مرکزی انتظام کے تحت کام کرنے والے علاقوں کے لیے ۱۸ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

یہ رقم مرکز کے تحت چلائی جانے والی اسکیموں کو عمل میں لائے گی۔ جس کی مدد سے پردیشوں میں کام کرنے والے صنعتی تربیتی اداروں کو بڑھاوا دیا جائے گا تاکہ تربیت کا معیار بڑھ سکے، اور پرانی مشینوں کے بدلے نئی مشینری نصب کر دی جائے گی، پردیش سرکار کو خواتین کے لیے صنعتی تربیتی مراکز قائم کرنے کے لیے گرانٹ ان ایڈ بھی فراہم کی جائیگی۔ جہاں جہاں اقلیت سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد ہوں، وہاں بھی صنعتی تربیت کے مرکز قائم کرنے کے لیے مرکز سے امداد بہم کی جائے گی۔ اس کے علاوہ کیمیائی کارخانوں سے پیدا ہونے والے ماحول میں آلودگی کا سدباب کرنے کے لیے بھی اقدامات ہوں گے۔ ایسی رضا کارانہ تنظیموں کو بھی امداد فراہم کی جائے گی، جو بندھوا مزدوروں کی نشاندہی کریں گے، اور نابالغ مزدوروں یعنی Child Labour کے خاتمے کے لیے غیر رسمی تعلیم، حفظانِ صحت سے متعلق تعلیم مناسب اور مقوی غذا اور بچوں کی تفریح کے لیے اقدامات کرتی رہی ہوں۔

نئی لیبر پالیسی کے تحت پیداوار میں ترقی، کام کے معیار کی بلندی، اور اس سے وابستہ معاملوں پر

زور دیا جائے گا، لیبر پالیسی کی کامیابی کا تعین پیداواری صلاحیت میں اضافے کو دیکھ کر کیا جائے گا، تاکہ ملکی معیشت پر خوشگوار اثر مرتسم ہو، تکنیکی معاملات سے قطع نظر، مزدوروں میں نظم و ضبط، بہتر ماہرانہ صلاحیت، صنعتی تعلقات، مزدوروں کے درمیان موثر تعاون، کام کے ماحول، اور مزدوروں کے لیے احتیاطی تدابیر کو ساتویں منصوبے میں خاص اہمیت حاصل رہے گی۔

ساتویں منصوبے میں ۴ کروڑ لوگوں کو روزگار فراہم کرنے کی حد پوری کی جائے گی، جب کہ اس دوران بے روزگار مزدوروں کی تعداد ۳ کروڑ ۹۰ لاکھ ہوگی۔ مزدوروں کے لیے روزگار کے مزید امکانات پیدا کرنے کے لیے تکنیکی سہولیات میں اضافہ ہوگا۔ اور جو صنعتیں بے کار Sick ہوگئی ہوں، ان کو ازسرِ نو شروع کیا جائے گا۔

بیمار صنعتوں کے معاملے کو نپٹاتے وقت جہاں مزدوروں کے مفادات کا خاص خیال رکھا جائے گا، وہاں اس بات کو بھی واضح کر دیا جائے گا کہ حکومت ہمیشہ کے لیے بیمار صنعتوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔

اس بات کی بھی کوشش کی جائے گی، کہ صنعتوں میں ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ ہڑتال اور تالہ بندی کی نوبت نہ آنے پائے۔ صنعتی اداروں میں تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے تنظیموں کے مابین ٹکراؤ اور نفاق کو کم کرنے کے لیے تمام شعبوں کی ذمہ داریوں کی نشاندہی کی جائے۔

ساتویں منصوبے میں رہائشی سہولیات کے لیے مزید سرمایہ کی فراہمی

ساتویں منصوبے میں پبلک اور پرائیویٹ سیکٹروں میں رہائشی مکانات کی تعمیر کے لیے ۳ کروڑ ساڑھے چار لاکھ روپے مقرر کئے گئے ہیں جبکہ اس سے پہلے یہ رقم صرف ایک کروڑ ۳ لاکھ روپے کے برابر تھی۔ رقم میں اضافہ ملک میں مکانوں کی کمی کے پیش نظر کیا گیا ہے۔

نیشنل زکاتی پروگرام کے تحت بھی بے زمین کارکنوں کو دیہی علاقوں میں مکان تعمیر کرنے کی اسکیم پر بھی نظر ثانی کی گئی ہے اور ساتویں منصوبے میں اس کام کے لیے ۵ کروڑ ، ، لاکھ روپے رکھے گئے ہیں۔ اس میں سے ۳۶ کروڑ روپے کی رقم مکانوں کی تعمیر کے لیے زمین مہیا کرنے کے لیے رکھی گئی ہے اور ۵ کروڑ ۴۱ لاکھ کی رقم تعمیراتی کاموں میں امداد کے طور پر صرف کی جائے گی۔ اس طرح سے زمین خریدنے کے لیے ۲۵۰ روپے کی رقم بڑھا کر ۵۰۰ روپے کر دی گئی ہے، اور مکانوں کی تعمیر کے لیے ۵۰۰ روپے کی حد بڑھا کر ۲ ہزار روپے کر دی گئی ہے۔

پبلک سیکٹر میں قومی ہاؤسنگ بینک کے قیام کی تجویزیں زیرِ غور ہے تاکہ حکومت کی طرف سے مکانوں کی تعمیر کے لیے دی جانے والی رقم زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچ سکے۔ مکانوں اور شہری علاقوں کی ترقی سے متعلق کارپوریشن یعنی ہڈکو جو پبلک سیکٹر میں شامل ہے، نے ۱۹۸۵ء کے آخر تک ۴ ہزار نوّے اسکیمیں منظور کی تھیں۔ جس کے تحت مختلف طبقوں کے لوگوں کو مکانات فراہم کئے گئے۔

Sunrise انڈسٹریز کی تعمیر کے لیے مہارت کی فراہمی

ساتویں منصوبے کے مسودے کے مطابق پبلک سیکٹر میں، اعلیٰ پیمانے کی صنعتوں کے لیے ڈیزائین، طریقۂ کار تعمیر کے لئے ماہرانہ صلاحیت حاصل کی گئی ہے۔ مسودے کے مطابق، صنعتوں سے متعلق پالیسی اس بات کو یقینی بنائے گی کہ پبلک سیکٹر اس مہارت کا فائدہ اٹھائے گا، اور ساتھ ہی پرائیویٹ سیکٹر میں بھی اس ماہرانہ طریقہ کار کا استعمال ہو جانا چاہیے، تاکہ نئی صنعتی ترقی کا آغاز نئی روشنی کی علامت بن کر نئے حوصلوں اور نئے ولولوں کو بیدار کر سکے۔ اس طرح کی نئی کوششوں میں ٹیلی کمیونیکیشنز، کمپیوٹر، مائکرو الیکٹرانکس اور بایو ٹکنالوجی جیسے اہم اور نئے شعبے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ صنعتوں میں فائبر اوپٹیکس، لیسرز روباٹیکس وغیرہ کے استعمال کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے، تاکہ صنعتی پیداوار کا معیار بلند ہو سکے۔ دستاویز میں بتایا گیا ہے کہ پبلک سیکٹر میں شامل صنعتوں کو جدید ترین ٹکنالوجی کو اپنانا پڑے گا اور سامان کی تیاری میں بھی جدید ترین طریقۂ کار کو اپنانا ہوگا۔

بہرحال جو کارخانے اس وقت کام کرتے ہیں، اُن کے موجودہ طریقہ کار کو مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر لانا ضروری ہے اور نئے آلات اور جانکاری کو نصب کرنے میں انتخاب کرنا ضروری ہوگا۔ کیونکہ اس معاملے میں جو بھی پہل کی جائے گی اس سے کئی مسئلے پیدا ہوں گے۔ مثلاً صنعتوں کے انتظام میں خود مختاری کے ساتھ ساتھ احتساب کی کارروائی۔ ایسے کارخانوں کو بند کرنا، جو مرمت، تبدیلی یا جدید سامان سے آراستہ ہونے کے لائق نہ ہوں۔ پبلک سیکٹر پروجیکٹوں میں ترمیم اور کارکردگی کی بہتری، اور نئے طریقہ کار کی ترتیب وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی واضح کرنی ہوگی کہ پبلک سیکٹر، بیمار اور ناکارہ کارخانوں کے دفنانے کی جگہ نہیں ہے۔

ہینڈلوم سیکٹر کے لیے کم قیمت کا تانا بانا

اس بات کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ نیشنل ٹیکسٹائل مل ہینڈلوم کے لیے پولسٹر کا ریشہ تیار کرے گی، اس اسکیم کو سُلبھ کپڑا اسکیم کا نام دیا گیا ہے۔ اس اسکیم کے تحت پولسٹر کا جو ریشہ فراہم کیا جائے گا"

(باقی ص۴۲ پر)

نزہت اقبال○

مزدور بچّوں کے مسائل اور اُن کا حل

ہندوستان اکیسویں صدی میں داخل ہونے جارہا ہے جس میں ہر میدان میں ترقی ہوگی اور کمپیوٹر کے ذریعے جدید مشینی دَور ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کو بالکل الگ طرح کے کام کرنے والوں کی ضرورت ہوگی جن کو تکنیکی تربیت سے مرصّع کیا گیا ہو۔ آج کے کام کرنے والے مزدُور بچّے کل کے مزدُور جوانوں کی پوری فوج ہو جائے گی لیکن اِن بچّوں کو یہ موقعہ ہی نہیں مل پاتا کہ وہ تکنیکی تربیت حاصل کرکے کل کے اچھے شہری بن سکیں۔ عام طور پر یہ بچّے ایسے کام کرتے ہیں جن میں یا تو تکنیکی کام کم سے کم ہوتا ہے یا بالکل نہیں ہوتا۔

سماج کے مختلف حصّوں اور مختلف آمدنیوں سے جُڑے، بچّوں کے درمیان زندگی گزارنے کے طور طریقوں میں بہت فرق ہے۔ کہیں بچّے پھولوں کی سیج پر پلتے ہیں تو کہیں بھوک سے بلکتے بیماری اور موت کی طرف بڑھتے ہیں۔ کہیں بچّے جدید دَور کے الیکٹرانک کھلونوں اور تفریحی ساز و سامان کے درمیان بڑے ہو رہے ہیں تو کہیں بچّوں کو پیٹ بھرنے کے بھی لالے پڑے رہتے ہیں۔ دیش میں ایسے بچّوں کی تعداد کم نہیں ہے جو مزدور بچّوں کی بہبودی و ترقی سے متعلق قوانین کے ہوتے ہوئے بھی خطرناک حالات میں مشکل جسمانی محنت کرکے نہ صرف خود کے بلکہ اپنے خاندان کے لیے بھی دو وقت کی روٹی کمانے کے چکّر میں پھنسے ہوئے ہیں۔

امیر گھرانوں کے بچّے اچھے اسکولوں میں، کالجوں اور بعد میں یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے سنہرے مستقبل کی طرف بڑھتے جاتے ہیں لیکن ملک میں لاتعداد بچّے ایسے ہیں جن کو خاندانی مالی کس مپُرسی کی وجہ سے ابتدائی تعلیم کے مواقع تک میسّر نہیں ہوتے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بجائے وہ اپنی اور اپنے خاندان کی روٹی مہیا کرنے کے چکّر میں کچّی عمر سے ہی الگ جاتے ہیں۔ ان بچّوں کو اپنی روزی روٹی کمانے کے علاوہ یہ تک نہیں معلوم کہ ملک کے کس حصّے میں کیا کیا ترقیاتی منصوبے چل رہے ہیں۔ ایسے زیادہ تر بچّے یا تو یتیم ہیں یا غریبی کی چکّی میں پِسے ہوئے، اپنے معصوم و ملائم کندھوں پر خاندان کی روزی روٹی کمانے کا بوجھ ڈھو رہے ہیں۔

مزدُور بچّے اور اُنکے مسائل: مزدُور بچّے کون لوگ ہیں؟ اور ہندوستان میں اُن کی کیا حالت ہے، اُن کے کیا کیا مسائل ہیں اور اُن کے لیے حکومتِ ہند نے کیا کیا قانونی اقدام اٹھائے ہیں اور کیا کیا منصوبے اُن کی ترقی و بہبودی کے لیے بنائے ہیں تاکہ اُن کے مسائل کا حل ہو سکے، اس مضمون میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے۔

حکومتِ ہند نے چائلڈ لیبر بل (۱۹۸۵ء) بنایا ہے جس کے مطابق مزدور بچّے وہ لوگ ہیں جو پندرہ سال سے عمر میں کم ہیں اور وہ مزدوری یا بغیر مزدوری کے تھوڑے وقت یا پورے وقت تک کام کرتے ہیں۔ ان میں وہ بچّے بھی شامل ہیں جن کی عمر چار یا پانچ سال کی بھی ہوتی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں وہ بچّے جو چلنا، دوڑنا شروع ہی کرتے ہیں کہ اُن کے نرم و نازک کندھوں پر کام کا بوجھ لاد دیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں مزدُور بچوںکی حالت

ہندوستان میں مزدُور بچّوں کی کیا حالت ہے؟ اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ چھیالیس افریقی ممالک میں کُل ملا کر جتنے بچّے ہیں، ہندوستان میں اُس سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔

○ ۲۲ بی، ڈی ایل آئی جی فلیٹ، قطب اینکلیو، نئی دہلی۔

۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں ۲۶۳ ملین بچے تھے۔ اُن میں سے تخمیناً ۱۴ ملین بچے مزدور ہیں۔ ان میں آدھے سے کچھ ہی کم لڑکیاں ہیں۔

معاشی مجبوریوں کے تحت کام کرنے کے لیے مجبور ان بچوں اور بچیوں میں سے ۸۷ فیصدی دیہاتوں میں رہتے ہیں جبکہ بقیہ ۱۳ فیصدی شہروں میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس طرح دُنیا کے کسی بھی ملک کی سب سے بڑی مزدور بچوں کی طاقت ہندوستان میں ہے۔

ہندوستان کے شہروں میں مزدور بچے عام طور پر گھریلو نوکر، ہوٹل بوائے، اور سڑک کے کنارے بنے ڈھابوں، ٹی اسٹالوں، مٹھائی کی دوکانوں میں بیرے کی شکل میں، قُلی، ٹرانسپورٹ ہیلپر، کار کلینر، اخبار ہاکر، بس اسٹاپوں پر بوجھ چڑھانے اتارنے، سبزی منڈیوں میں، صنعتی اداروں میں، آٹو موبائل مرمت، پیٹرول پمپوں پر اور گندے کاموں میں صفائی بوائے کی شکل میں کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیہاتوں میں بھی کم عمر بچے کھیتی و سینچائی، بوجھ ڈھونے یا گاؤں کی دوسری صنعت و حرفت کے دھندوں میں لگ جاتے ہیں۔ معاشی مشکلات یا سماجی برائیوں کی وجہ سے یہ کم عمر بچے اسکولوں میں پڑھنے کے بجائے اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالنے یا اُن کی آمدنی میں مزید اضافہ کرنے کے لیے اپنی چھوٹی سی عمر میں روزی روٹی کمانے نکل جاتے ہیں۔

مزدور بچوں کی برائی کا یہ دُکھ بھرا پہلو اُن کے ماں باپ یا خاندان کی کھٹور غربت کو ظاہر کرتا ہے۔ خاندان کی آمدنی کے بجٹ میں راحت کے لیے یہ بچے مجبوراً کام پر لگ جاتے ہیں۔ یا لگا دئے جاتے ہیں۔

غریبی اور افزائشِ نسل میں اضافہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ زیادہ بچے پیدا کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ آمدنی کے ذرائع پیدا ہو سکیں۔ دراصل یہی بات مزدور بچوں کے لیے مسائل بن جاتی ہے۔

مزدور بچوں کے مسائل کا حل قانون کے ذریعے

کچھ ملازمتوں میں چودہ سال سے کم عمر کے بچوں کو نوکری دینے سے انکار کرنے کے لیے ۵ نومبر ۱۹۸۶ء کو راجیہ سبھا نے Child Labour Prohibition and Regulation Bill 1986 پاس کیا۔ جن ملازمتوں میں مزدور بچوں کو نوکری دینے کی بات کہی گئی ہے اُن میں کام کی شرطوں کو بھی بتایا گیا ہے۔

مزدور بچوں پر پہلا قانون ۱۹۳۸ء میں Employment of Children Act بنا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں دو اور قانون بنائے گئے۔ وہ تھے Coal Mines Labour Welfare Fund Act اور Mica Mines Labour Welfare Act۔ آزادی کے بعد مزدور بچوں اور اُن کے روزگار کے سلسلہ میں کئی قانون پاس کیے گئے۔ ۱۹۴۸ء کے فیکٹری قانون میں چودہ سال سے کم عمر کے بچوں کو کسی فیکٹری میں کام نہ دینے کو کہا گیا ہے۔ اس کے باوجود بھی ۱۴ سال سے کم عمر کے بچوں کو مختلف فیکٹریوں میں خطرناک قسم کا کام دیا جاتا ہے جس سے اُن کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔

صحت کے معاملے میں یہ مزدور بچے اتنے بدقسمت ہوتے ہیں کہ معمولی بیماریوں سے بھی اُن کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ایک میڈیکل سروے کے مطابق ہندوستان میں ہر دو منٹ پر ایک بچہ خسرہ کی بیماری سے ہی مر جاتا ہے۔ اوسطاً سال میں ۲ لاکھ ۸۰ ہزار بچے ٹٹنیس سے، ایک لاکھ ۸۱ ہزار کالی کھانسی سے، ۳ لاکھ ۶۴ ہزار تپِ دق سے، ۲ لاکھ پولیو سے اور کئی ہزار ڈپتھیریا کی وجہ سے موت کے مُنہ میں چلے جاتے ہیں۔

یونی سیف کے ذریعہ بچوں کی دیکھ بھال و امداد

حال ہی میں یونی سیف کی مدد سے جنوبی ایشیا کی منعقدہ سارک کانفرنس نے سارے ممالک میں بچوں کی تشویشناک حالت پر دھیان دلایا ہے۔ یونی سیف جہاں ساری دُنیا میں بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری لیے ہوئے ہے اُس نے ہندوستان کے بچوں پر دھیان دیا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے نتیجہ کے طور پر یورپ اور چین میں لاکھوں بچے بھوک، بے گھر اور بیماریوں کا شکار ہو گئے۔ دنیا کے اچھے مستقبل کی اُمیدیں آنے والی نسلوں پر تھیں۔ اس کو مدِّنظر رکھتے ہوئے محسوس کیا گیا کہ بچوں کی ترقی اور انہیں راحت پہنچانے کا کام عالمی ذمّہ داری ہے۔ اس طرح ۱۱ دسمبر ۱۹۴۶ء کو یونائیٹڈ نیشن آرگنائزیشن نے یونی سیف کی بُنیاد رکھی۔ اُس کا کام تھا بچوں کی جان بچانے کے لیے فوراً ضروری غذا، دوا، دُودھ، کمبل اور کپڑے وغیرہ کا انتظام کرنا۔

یورپ کے حالات بہتر ہونے کے بعد کچھ لوگوں نے سوچا کہ یونی سیف کا کام پُورا ہو گیا ہے لہٰذا اُس کو ایشیائی ملکوں کے بچوں کی ترقی کے لیے کام کرنا چاہیئے۔ یونی سیف ۱۹۴۹ء میں ہندوستان میں آیا جس کا مقصد بچوں کی صحت کی نگرانی، اچھی غذائیت، ابتدائی تعلیم، پینے کا صاف پانی اور ماحول کی صفائی، رہنے کی جگہ کا اچھا انتظام اور بچوں کی ہر طرح کی ضرورتوں کی نگہبانی کرنا ہے۔ یونی سیف ہمیشہ اس اُصول پر کام کرتا رہا ہے کہ بچے خواہ کسی بھی مُلک کے ہوں وہ اُس ملک کے اور دُنیا کے لیے بہت کارآمد شے ہے۔ ۱۹۸۶ء میں یونی سیف کے وجود کو پورے چالیس سال ہو گئے۔ بچوں کی ترقی، تعلیم و روزگار کے سلسلہ میں یونی سیف مالی

معلا اور ہر طرح سے مدد کر رہا ہے۔

مزدور بچوں کی ترقی میں حکومتِ ہند کا منصوبہ

مزدور بچوں کے مسائل زیادہ تر معاشی اور سماجی ہیں جن کی وجہ سے ۱۴ سال سے کم عمر بچوں مزدوری کرنی پڑتی ہے۔ ان مزدور بچوں کی ملتہ حالت دیکھ کر حکومتِ ہند نے اُن کے مسائل حل کرنے کے لیے منصوبے بنائے ہیں جن پر تفصیل سے روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

حکومتِ ہند نے بیس نکاتی پروگرام میں بھی مزدور بچوں کی ترقی کے لیے یقین دلایا ہے۔ کھیتی اور صنعت و حرفت میں کام کرنے والے مزدوروں کی کم سے کم مزدوری بھی طے کر دی ہے۔ مزدور بچوں کو رسمی و غیر رسمی تعلیم دینے کی بھی یقین دہانی کرائی ہے، اور اُن کی صحت برقرار رکھنے کے لیے بھی سرکار نے یقین دلایا ہے۔

چائیلڈ لیبر بل (۱۹۸۵) ہندوستانی مزدور بچوں کے مسائل کو حل کرانے میں مدد کرتا ہے تاکہ اُن کی معاشی اور سماجی حالات کو سدھارا جا سکے۔ سب سے پہلے تو یہ قانون مزدور بچوں کو جو ۱۵ سال سے کم عمر کے ہیں اُن کو کسی بھی خطرے والے کام سے روکتا ہے۔ اُن کو ایسی جگہوں پر نوکری دینے پر پابندی لگاتا ہے جہاں اُن کو جسمانی یا ذہنی طور سے کوئی خطرہ ہو۔

حکومتِ ہند نے چائیلڈ لیبر بورڈ کا بھی قیام کیا جو یہ دیکھے گا کہ مزدور بچوں کو نوکری کرنے میں کسی طرح کی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے یا اُن کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی نہ کی جائے۔ بغیر خطرے والے کام کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت مزدور بچوں کو اُن کی تعلیم، دستکاری کی تربیت، اچھی خوراک اور اچھی صحت کی دیکھ بھال کا دھیان دیتی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت نے ایسے بھی قوانین مرتب کئے ہیں جن سے مزدور بچوں کو نوکری دینے والے کو اُن سے کم فائدہ پہونچے۔ اگر وہ مزدور بچوں کو نوکری دیں گے تو قانون کے تحت بچوں کو پڑھنے کے لیے وقت دینا ہوگا۔ اُن کی تعلیم پر جو بھی خرچ آئے گا اُس کی کفالت بھی اُن کو ہی کرنی ہوگی۔ بچوں کی صحت کا خیال، مناسب مزدوری اور اُن کو کام کے بعد چھٹی بھی دینا ہوگا۔ ہفتہ میں ۵ روز وہ کام کریں گے اور کل ملاکر ۳۰ گھنٹے سے زیادہ کام اُن سے نہیں لینا ہوگا۔ یعنی دن میں صرف چھ گھنٹے وہ کام لے سکتا ہے۔ یہ سب اس لیے کیا گیا تاکہ نوکری دینے والا بچوں کو ملازم نہ رکھے بلکہ اُن کی جگہ بڑی عمر کے لوگوں کو ملازمت دے۔

اس کے علاوہ نیشنل چائیلڈ لیبر ایڈوائزری بورڈ کا بھی حکومت نے قیام کیا ہے جو مزدور بچوں کی پالیسی مرتب کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ بورڈ یہ بھی دیکھے گا کہ مزدور بچوں کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی یا نا انصافی تو نہیں ہو رہی ہے۔ ریاستی حکومتیں اپنے اپنے صوبوں میں Child Labour Tribunals کا بھی قیام کرتی ہیں جو مزدور بچوں کے قانونی مسائل کے معاملات کو دیکھتی ہیں۔

چائیلڈ لیبر ایکٹ کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ مزدور بچوں کے لیے حکومت اُن کی تعلیم و ترقی اور بہبودی کے لیے نئے نئے منصوبے و اسکیمیں بنائے گی۔ اُن کے لیے رسمی و غیر رسمی تعلیم کا انتظام ہوگا ــــ پیشہ ورانہ یا دستکاری کی تربیت مزدور بچوں کو دی جائے گی۔ اور اُن کی زندگی بہتر بنانے اور انھیں استحصال سے نجات دلانے پر خاص طور سے دھیان دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ایسے بچوں کے لیے تفریحی و کلچرل پروگرام کا بھی تعین کیا جائے گا۔ دیہاتی مزدور بچوں کو اسکول میں رہنے کا بھی انتظام کیا جائے گا تاکہ وہاں رہ کر تعلیم حاصل کرنے میں اُن کو آسانی ہو۔

صنعت و حرفت کے مالکان کو مزدور بچوں کو ملازمت کے ساتھ ساتھ ٹریننگ بھی دینا ہوگا۔ Adult and Continuing Education Board اس بات کی ذمہ داری لیں گے کہ اُن کی ترقی و بہبودی و تعلیم کے لیے اچھے تعلیمی پروگرام بنائیں اور اُن کے لیے نصاب تیار کریں۔

Nutrition and Health Programme کے تحت مزدور بچوں کو دن میں کم سے کم ایک وقت اُن کے آجر یعنی Employers اچھا کھانا دیں گے، اُن کی جسمانی طور سے ڈاکٹری جانچ ہوتی رہے گی تاکہ اُن کی صحت کی طرف سے بورڈ مطمئن رہے۔ مزدور بچوں کو بغیر پیسہ دئے صحت انشورنس اسکیم بھی دی جائے گی۔ ان کو بیماری کی چھٹی پوری تنخواہ کے ساتھ دی جائے گی۔ اُن کے اسپتال میں داخلہ اور علاج کا سارا خرچ اُن کے employers کو اٹھانا ہوگا۔ کارخانوں میں کام کرتے وقت اگر مزدور بچے کا ایکسیڈنٹ ہو جائے تو کارخانے کے مالک کو ہرجانہ دینا ہوگا، اس کا پورا علاج کرانا ہوگا اور اُس کے مکمل طور سے ٹھیک ہونے تک پوری تنخواہ دینی ہوگی۔

اگر کوئی والنٹری آرگنائزیشن مزدور بچوں کی مدد کرنا چاہے تو ایسی صورت میں Child Development Board اُس آرگنائزیشن کی معاشی طور سے مدد کریگا۔

مزدور بچوں کے لیے انسانی سماج کی ذمہ داری

مزدور بچوں کی ترقی اور فلاح کے لیے انسانی سماج پر ایک بہت بڑی ذمہ داری آتی ہے۔ بچے اپنی اور اپنے خاندان کی غریبی سے تنگ آکر

مجبوراً نوکری کرتے ہیں۔ جو اُن کے اسکول جانے، کھیلنے کودنے اور موج مستی کے دن ہوتے ہیں۔ اس عمر میں اُن کو زبردستی کام پر لگا دیا جاتا ہے۔ زیادہ تر بچے دیہاتوں میں کھیتی اور دوسرے دھندوں میں لگ جاتے ہیں۔ مالکوں کو بھی اُن کی ملازمت دینے میں کئی فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو اُن کو بہت کم مزدوری دے کر زیادہ سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ دوسرے یہ بچے جوانوں کے مقابلے میں زیادہ پھرتیلے ہوتے ہیں اور کام جلدی کر لیتے ہیں۔ ان مزدور بچوں کے ماں باپ خوشامد درآمد کر کے مالکان کے پاس اپنے بچوں کو کام پر لگا دیتے ہیں۔ اِن حالات کا فائدہ ملازمت دینے والا خوب اُٹھاتا ہے اور نہ صرف یہ کہ ایسے بچوں کو کم مزدوری دے کر زیادہ کام لیتے ہیں بلکہ ان کو معاشی، سماجی اور بعض اوقات جنسی طور سے بھی غلط استعمال کرتے ہیں۔ اس غلط طور سے استعمال شدہ مزدور بچے ذہنی طور سے بالکل مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اُن کی آگے بڑھنے کی صلاحیت رُک جاتی ہے اور وہ اپنے کو بالکل مجبور پاتے ہیں اور ایسے جال سے بہت کم نکل پاتے ہیں۔ سرکاری قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھی ان مزدور بچوں کو زری کے کام، شیشہ پگھلانے کے کام، قالین بُننے کے کام، کپڑا بُننے کے کام اور آتش بازی جیسے خطرناک کام کرنے پڑتے ہیں جس سے اُن کی دن بہ دن صحت خراب ہوتی چلی جاتی ہے۔ کبھی کبھی وہ ایسے خطرناک بیماری سے دوچار ہو جاتے ہیں جس سے اُن کا نکلنا بہت مشکل ہوتا ہے اور موت کے سوائے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔

مزدور بچوں کو نہ تو مالک تعلیم حاصل کرنے کے لیے موقع ہی دیتا ہے اور نہ ہی اُن کو کسی ماہر کاریگری کا کام سکھاتا ہے۔ بس ہر طرح سے اُن کو نچوڑتا ہی رہتا ہے۔ اِن حالات میں جسمانی و ذہنی طور سے مزدور بچہ اپاہج ہو کر رہ جاتا ہے۔

حکومت ہند نے اس کے خلاف قوانین بنائے ہیں جس کے تحت مزدور بچوں کو کسی بھی خطرناک کام پر نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ مگر اس قانون کی پرواہ کیے بغیر مالکان مزدور بچوں کو Exploit کرتے رہتے ہیں۔

انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن بھی پندرہ سال سے کم کے بچوں کو نوکری نہ کرنے کی صلاح دیتا ہے۔ اُس نے ایسے بچوں کی ترقی کے لیے کئی طرح کی معاشی، تعلیمی اور کلچرل اسکیمیں بنائی ہیں۔ گرو پد سوامی کمیٹی نے حکومت ہند کو اپنی سفارش میں یہی کہا ہے کہ مزدور بچوں کی ترقی کے لیے اُن کے مالکان اُن کے پڑھنے کی ہر آسانی فراہم کریں اور اُن کو رسمی یا غیر رسمی تعلیم دلائیں۔ اُن کا ڈاکٹری معائنہ کراتے رہیں، اور اُن کی صحت کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔ اس کے علاوہ اُن کے دل بہلانے کے لیے تفریحی و کلچرل پروگراموں کو منعقد کراتے رہیں اور ہر طرح کی مالی امداد سے اُن کو نوازتے رہیں۔

حکومت ہند قانون کے ذریعے مزدور بچوں کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے قومی مقصد اس طرح حاصل کر سکتی ہے کہ کسی بھی مزدور بچے کو جوکھم اور خطرے کے کام میں نہ لگائے۔ اُن کی معاشی اور سماجی حالت کو سُدھارے، اُن کی صحت کا خیال رکھے، اُن کو دستکاری کی تربیت اور عام تعلیم دے۔ اُن کو مزدوری سے قطعی طور سے روکنے کے بجائے اُن کو تکنیکی تعلیم دے تاکہ وہ خود اس قابل بن سکیں کہ اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے معاشی مفاد کا ذریعہ بن سکیں۔ اُن کی سروس کی شرطوں میں سُدھار کرے، اُن کی مزدوری کی دَر مقرر کرے، اُن کے علاج اور ڈاکٹری معائنہ کراتی رہے اور اُن کی شخصیت کی بحیثیت مجموعی تعمیر (Career Development) پر دھیان دے۔ Child Labour Law اور Child Labour Development Fund

کا مقصد یہی ہے کہ مزدور بچوں کے جسمانی، ذہنی، معاشی اور سماجی سُدھار ہوں۔ اسی مقصد کو لے کر حکومت ہند کام کر رہی ہے جس سے اُمید ہے کہ مستقبل قریب میں مزدور بچوں کو ہر طرح کی راحت ملیگی اور اُن کے مسائل کا حل بخوبی نکل سکے گا۔

بقیہ: بھارت کا گیارہواں بین الاقوامی فلمی میلہ

اس بار ایک پہلو ضرور اُبھر کر سامنے آتا رہا کہ جیوری کے اراکین فلم بینوں سے الگ تھلگ رہے۔ اس میں صرف یہی پہلو نکالا جا سکتا ہے، مبادا جیوری کے اراکین پر کسی کی رائے اثر انداز ہو۔

یہی نہیں بلکہ اس مرتبہ عوام کو ہر انداز کی فلمیں بھی دکھائی گئیں۔ اُن میں کاسٹیوم فلمیں بھی تھیں، مذہبی فلمیں بھی۔ اور سوشل فلمیں بھی۔ البتہ سیاسی نوعیت کی فلموں کی لہر کچھ ہلکی رہی لیکن عوام پر جنسی اشتعال کی فلمیں ہی غالب رہیں۔

اس مرتبہ بھی خوش آئند کیفیت برقرار رہی۔ پچھلے بین الاقوامی فلمی میلے میں اعزازات مختلف فلمی ہستیوں نے بھی عطا کیے۔ اس سے فلمی میلے کا موڈ اور مزاج واقعی فلمی میلے کا سا ہو گیا۔ یہ امور اس کے ترجمان ہیں کہ ہمارا گیارہواں بین الاقوامی فلمی میلہ پہلے سے بیحد کامیاب رہا۔ اُمید ہے ہمارا بارہواں بین الاقوامی فلمی میلہ ہمارے لیے نئی چُنوتیاں لے کر آئے گا۔ جنھیں ہم خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرتے ہوئے کامیاب و کامراں ہوں گے، اگر اس گیارہویں فلمی میلے سے کم از کم اعزاز یافتہ غیر مُلکی فلمیں بھی ٹی۔ وی پر دکھائے جانے کے لیے خرید لی جائیں۔

ایس۔ ڈی۔ ٹوپے٭

غریبی کی بیخ کنی میں تعلیمی اداروں کا کردار

ہماری حکومت نے چوتھے پنجسالہ منصوبے سے ملک میں غریبی کی بیخ کنی کے پروگرام پر سختی سے عمل درآمد کرنا شروع کیا ہے۔ یہ کام خاص کر سرکاری ایجنسیوں کے ذریعے کیا جا رہا ہے۔ تاہم کچھ سماجی ادارے بھی اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں بالواسطہ طور پر شرکت کر رہے ہیں۔ بہتر ہوگا اگر ان اداروں کو پروگرام پر عمل درآمد میں کسی حد تک براہ راست شامل کیا جائے۔ تعلیمی اداروں کی اپنی مشکلات اور غریبی کی بیخ کنی کے پروگرام میں شامل کی گئی اسکیموں کی نوعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تعلیمی ادارے بہت کم رول ادا کر سکتے ہیں، لیکن ان اداروں کی شمولیت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

ہندوستان میں غریبی کی بے شمار وجوہ ہیں مثلاً قلیل قومی آمدنی، دولت اور آمدنیوں میں نابرابری، پیداوار کے کم ترقی یافتہ وسائل اور کم پیداواریت، جہالت و ناخواندگی، بڑے پیمانے پر بدعنوانیاں وغیرہ۔

اگر موجودہ اسکیموں کو موزوں طور پر روبہ عمل لانا ہے تو پیداوار کی موجودہ تکنیکوں کی مدد سے قومی آمدنی کو بڑھانا ممکن ہے۔ آمدنیوں اور دولت کی نابرابریوں کو ایک موزوں مالی پالیسی اختیار کر کے ختم کیا جا سکتا ہے۔ تعلیمی ادارے اس کام میں کوئی رول ادا نہیں کر سکتے۔ البتہ وہ غریبی کے دیگر بنیادی وجوہ پر قابو پانے میں مدد دے سکتے ہیں۔

نیشنل سروس اسکیم

اس اسکیم کے تحت، جسے قومی خدمت کی اسکیم بھی کہا جا سکتا ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا سے یہ اُمید کی جاتی ہے کہ وہ جس سماج میں رہتے ہیں اس کے مسائل کو سمجھیں اور ان مسائل کو حل کرنے میں اپنی خدمات پیش کریں۔ اس کے معنی صاف ہیں اور وہ یہ کہ اجتماعی ترقی میں اور قوم کی غریبی ختم کرنے میں تعلیمی ادارے بالواسطہ خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ لہٰذا ہمیشہ یہ اُمید کی جاتی ہے کہ کالجوں کی قومی خدمت کی اسکیموں میں ایسے پراجیکٹوں پر عمل کرنا چاہیے جن سے ان کے اپنے اپنے علاقے کی ترقی کو فروغ حاصل ہو۔

اس وقت ہر تعلقے میں کم از کم ایک کالج موجود ہے، اور ان تمام کالجوں میں قومی خدمت کی اسکیم چلائی جا رہی ہے۔ اس اسکیم میں شامل طلبا کو دو قسموں کی سرگرمیاں انجام دینا پڑتی ہیں۔ ایک تو باقاعدہ سرگرمیاں اور دوسرے کیمپ لگانے کے پروگرام پر عمل۔ ایک کالج کو باقاعدہ سرگرمیوں کے لیے ایک تعلیمی سال میں ۸۰ روپے فی طالب علم اور کیمپ لگانے کے پروگرام پر ایک سَو روپے فی طالب علم خرچ کرنے کی اجازت ہے۔ کُل خرچ پر کالج کو ۵۸ء۳۳ فیصد گرانٹ (عطیہ) مرکزی حکومت سے اور ۶۷ء۴۱ فیصد گرانٹ ریاستی حکومت سے ملتی ہے۔

اسکیم پر عمل درآمد

گو حکومت قومی خدمت کی اسکیم پر کروڑوں روپے خرچ کر رہی ہے تاہم اس اسکیم سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے ہیں۔ پھر بھی کچھ فائدے تو ضرور ہوئے ہیں جن کا ذکر ذیل میں کیا جا رہا ہے:۔

ہم جانتے ہیں کہ ہر معاشی منصوبے کے لیے اعداد و شمار اور تفصیلات وغیرہ سرکاری ایجنسیاں جمع کرتی ہیں لیکن یہ اعداد و شمار اور تفصیلات ہمیشہ کافی اور مستند نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ایسے اعداد و شمار وغیرہ کی بنا پر مرتب کیا ہوا منصوبہ مفید

٭ ریڈر شعبۂ معاشیات، مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد۔

نتائج کا حامل نہیں ہوسکتا۔ میں یہ تجویز کروں گا کہ تعلیمی اداروں کو قدرتی وسائل، آبادی، اُجرتوں، قیمتوں اور سرکاری ایجنسیوں وغیرہ کے کئے ہوئے کام وغیرہ کے بارے میں تفصیلات اکٹھا کرنی چاہئیں۔ اس طرح جمع کی ہوئی تفصیلات سے کالجوں کو قومی خدمت کی اسکیم کے لیے ترجیحی بنیاد پر پراجیکٹوں کا انتخاب کرنے میں مدد ملے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ دوہرا کام نہ ہونے پائے، اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کالج وہی کام ہاتھ میں لے لیتے ہیں جو سرکاری ایجنسیاں اُس علاقے میں کر رہی ہوتی ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر کسی علاقے میں ایک سے زیادہ کالج ہوں تو انھیں اپنے قومی خدمت کے کیمپ لگانے میں ایک ہی پراجیکٹ پر اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیئے۔ لیکن اس کے لیے ان کالجوں کے درمیان رابطہ ضروری ہوگا۔

چوتھے یہ کہ قومی خدمت کی اسکیم کے رہناؤں اور دیہی و سرکاری ایجنسیوں کے درمیان بھی مناسب رابطہ ضروری ہے تاکہ ادھورے پراجیکٹ مکمل کئے جاسکیں اور مکمل شدہ پراجیکٹوں پر بعد کی دیکھ بھال کا کام کیا جاسکے۔

کالج جب گاؤں میں کیمپ لگاتے ہیں تو بہت سے چھوٹے چھوٹے پراجیکٹوں پر کام شروع کرتے ہیں لیکن یہ پراجیکٹ کوئی مستقل شکل اختیار نہیں کرپاتے۔ مثال کے طور پر شجر کاری اور سڑکوں کی تعمیر ہی کو لیجیے۔ کیمپ کی مدّت کے دَوران طلبا پیڑ پودے لگاتے ہیں لیکن کیمپ ختم ہونے کے بعد ان پیڑ پودوں کی مناسب نشوونما پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ یہی بات تعمیر شدہ نامکمل سڑکوں کے ضمن میں بھی صادق آتی ہے۔ نامکمل سڑکیں برسات کے موسم میں بہت ہی زیادہ خراب ہوجاتی ہیں۔ لہٰذا جو کام ہوچکا ہے، بعد میں اس کی دیکھ بھال ایک ضروری امر ہے۔ اس کے لیے قومی حکومت کی اسکیم کے رہناؤں، گاؤں والوں اور سرکاری ایجنسیوں کے درمیان مناسب رابطہ ہونا ضروری ہے۔

دیہی اور کم بارش والے علاقوں میں کام کرنے والے کالجوں کو درخت لگانے اور چھوٹے چھوٹے تالاب بنانے کے کام کو ترجیح دینی چاہیئے کافی مقدار میں بارش ہونے کے لیے ضروری ہے کہ کسی خطّے کے کُل جغرافیائی رقبے کے ایک تہائی حصّے میں جنگلات ہوں۔ لیکن اس وقت ہندوستان میں جنگلات صرف ۲۱ فیصد رقبۂ اراضی پر ہی ہیں، اور مہاراشٹر میں تو یہ تناسب اور بھی کم، یعنی ۱۷ فیصد ہے۔ مراٹھ واڑہ میں تو جنگلات صرف تین فیصد رقبۂ اراضی پر ہی ہیں۔ ایسے علاقوں میں پیڑ پودے لگانے کا کام ترجیحی بنیاد پر کیا جانا چاہیئے۔

قومی خدمت کی اسکیم کے تحت کام کرنے والے طلبا کو چاہیئے کہ وہ گاؤں والوں کو اپنے علاقے میں صرف وہی پیڑ پودے لگانے کا مشورہ دیں جو وہاں کے حالات میں موزوں ہوں اور جن سے انھیں کچھ آمدنی بھی ہوسکے۔ چوں کہ پہاڑی علاقوں میں نقل و حمل اور مواصلات کی سہولیات بہم پہنچانے کے لیے سڑکیں بنانا ضروری ہے اس لیے وہاں سڑکیں بنانے کے کام کو زیادہ اہمیت دی جانی چاہیئے۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ قومی خدمت کی اسکیم کے تحت کام کرنے والے طلبا کو شجر کاری، سڑکوں اور تالابوں کی تعمیر، کنویں کھودنے، کنووں کی مرمّت کرنے، بالغوں کو تعلیم دینے اور دیہات میں ایسی فلمیں دکھانے کا کام کرسکتے ہیں جن میں شراب نوشی کے مُضر اثرات، گندگی اور گندے ماحول کے نقصانات اور خاندانی منصوبہ بندی وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ کچھ کالجوں کے طلبا تو پہلے ہی سے یہ سب کام کر رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کاموں میں باقاعدگی کی ضرورت ہے۔

قومی خدمت کی اسکیم کے تحت، شہری کالجوں کے طلبا بھی دیہی و شہری علاقوں میں کام کر رہے ہیں لیکن ان کے کام میں بھی باقاعدگی، مناسب تال میل اور سائنٹفک نقطۂ نگاہ کی ضرورت ہے۔ بہرکیف کچھ کالجوں نے گندی بستیوں اور گاؤں میں ضرور اچھا کام کیا ہے لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے، مَیں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان طلبا کو مناسب رہنمائی حاصل ہو تو وہ غریبی دُور کرنے کے کام میں کافی مدد کرسکتے ہیں۔

ہندوستان میں کچھ یونیورسٹیوں نے پیشہ ورانہ تعلیم کے نصابات شروع کئے ہیں جن کا مقصد طلبا کو اپنا روزگار خود شروع کرنے کے قابل بنانا ہے۔ مہاراشٹر میں اوسطاً ستّر اسّی آرٹس، کامرس اور سائنس کالج ایک یونیورسٹی سے ملحق ہیں۔ یہ کالج پانچ یا چھ اضلاع میں کام کرتے ہیں۔ چونکہ یہ ضروری نہیں کہ ان سب اضلاع میں جغرافیائی حالات اور قدرتی وسائل ایک ہی جیسے ہوں اس لیے مناسب یہ ہے کہ یونیورسٹی ہر ضلع کے مقامی حالات اور وسائل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ملحقہ کالجوں کو ایسی پیشہ ورانہ تعلیم کے نصابات شروع کرنے کا مشورہ دیں جو متعلقہ علاقے کے لیے فائدہ مند ہو۔ اس قسم کی پیشہ ورانہ تعلیم سے طلبا کو اپنی روزی روٹی کے مسائل حل کرنے میں مدد ملے گی۔

دیہی و نیم شہری کالج بلکہ کچھ شہری کالج بھی اپنے تحت ایک کھُلا رقبۂ اراضی رکھ سکتے ہیں، جسے مذہب اور ضرورتمند طالب علموں کی مدد سے مختلف کاموں کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جن کالجوں میں "کماؤ اور پڑھو" اسکیم چلائی جارہی ہے وہ اس کھُلے رقبۂ اراضی کو آم، املی، ناریل، نیبو، نارنگی اور انار وغیرہ کے درخت لگانے کے کام میں

لا سکتے ہیں۔ اس اسکیم کو کچھ خاص مقاصد کے
تحت زیرِ عمل لانا چاہیئے۔ مثال کے طور پر یہ کہ
طلباء میں محنت کی عظمت کا احساس پیدا کیا جانا
چاہیئے۔ اسکیم پر اس طرح عمل درآمد کیا جانا چاہیئے
کہ کالجوں کو کچھ آمدنی بھی ہو اور ان کے احاطے
کی خوبصورتی میں اضافہ بھی ہو سکے۔ اگر اس اسکیم کے
تحت غریب طلباء کو کام مہیا کیا جائے تو اس سے
انھیں اپنی تعلیم مکمل کرنے میں مدد ملے گی جو ان
کے کنبوں کی غریبی دُور کرنے میں معاون بن
سکے گی۔

یہاں مجھے رعیت شکشن سنستھان ستارہ کے
کچھ کالجوں کی اشتال پیش کرتے ہوئے فخر محسوس ہو رہا
ہے۔ یہ کالج ہیں:-

اناصاحب اداتے کالج منچھر (ضلع: پُونے)،
چھتر پتی کالج ستارہ، بورولے کالج شری رام پور
(ضلع: احمدنگر)، رعیت شکشن سنستھان ستارہ کے
کچھ ہائی اسکول اور قریب قریب سبھی سب کالج
"کماؤ اور پڑھو" اسکیم چلا رہے ہیں جس سے ہر سال
سینکڑوں غریب طالب علموں کو اپنی تعلیم مکمل کرنے میں مدد
مل رہی ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ خاندانی منصوبہ بندی
کا پروگرام غریبی دُور کرنے کے پروگرام کا ایک لازمی
جزو ہے۔

اگر آبادی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے تو محض
قومی آمدنی میں اضافہ کرکے غریبی کی بیخ کنی نہیں کی جا سکتی
ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے اور یہاں مختلف
مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ سب کو اپنے اپنے مذہب کے
اصولوں پر چلنے کی آزادی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمام
مذاہب کا ایک مقصد فرد (انسان) کی ترقی، معاشرے
کی ترقی اور اس کے ذریعے قوم کی ترقی ہے۔

اس ضمن میں تعلیمی ادارے ایک اہم رول ادا
کر سکتے ہیں۔ انھیں مختلف مذاہب کے اصولوں اور قومی
تعمیر میں ان اصولوں کے اطلاق کے بارے میں مذاکرے
اور کانفرنسیں منعقد کرنی چاہئیں۔ اس سے پہلے اپنے
مذہب اور دوسروں کے مذہب کے بارے میں عوام
کی غلط فہمیوں کو دُور کرنے میں مدد ملے گی۔ فرقہ وارانہ
تنازعات کم ہو جائیں گے اور خاندانی منصوبہ بندی
کے پروگرام کو زیادہ اچھی طرح عملی جامہ پہنایا جا سکے گا۔

●

بقیہ، انٹارکٹیکا کے برفیلے ویرانے میں چھٹی ہندوستانی سائنسی مہم

ہندوستانی سائنسی مہم پہونچا جس
میں ۸۵ ممبران شامل تھے۔ اس میں
دو عورتیں بھی شامل تھیں۔

کارہائے نمایاں اور مقاصد:-

(۱) اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ انٹارکٹیکا میں رہ کر مختلف چیزوں پر سائنسی تجربہ کرنا تھا۔

(۲) پچھلی مہم کے چھوڑے ہوئے سائنسی آلات کے ذریعہ اعداد و شمار جمع کرنا۔

(۳) انٹارکٹیکا کی برف میں ڈھکے چھپے معدنیات کو تلاش کرنا۔

(۴) علم ارضیات، ابر و سول کا ناپنا، موسمیات کا علم حاصل کرنا، علم بحریات اور نباتات و حیوانات کا علم حاصل کرنا۔

(۵) دکھچن گنگوتری کے مستقل سائنسی تجربہ گاہ کو اور زیادہ سہولتیں مہیا کرنا۔

(۶) مقناطیسی کشش، ریڈیو پروپیگیشن اور گرمی کے بجٹ پر سائنسی تجربہ کرنا۔

(۷) مچھلیوں، کرل اور پن گوئن پر تجربات۔ ہندوستان کو مچھلیاں بھیجنے اور ان کو پروسیس کرنے پر تجربات کرنا۔

(۸) ٹکنیک کا علم حاصل کرنا اور پیاسی دنیا کو انٹارکٹیکا کا تازہ پانی مہیا کرنے کی تجویز پر مزید تجربہ۔

انٹارکٹیکا کے اس تفصیلی مطالعہ سے ہندوستان
تیسری دُنیا کے ملکوں سے بہت آگے بڑھ گیا ہے
اور دُنیا میں اُس کی اس سائنسی کاوش سے بیحد
عزت بڑھ گئی ہے۔ یہ بات قابل فخر ہے کہ دُنیا کے
ترقی پذیر ممالک کے سائنسی ترقیاتی میدان
میں ہندوستان بھی اُن کے شانہ بہ شانہ ہے اور
جب سے انٹارکٹیکا میں ایک مستقل ہندوستانی
سائنسی تجربہ گاہ "دکھچن گنگوتری" میں قائم کر دی گئی
ہے۔ ہمارے سائنس داں وہاں پر رہ کر تجربات
کر رہے ہیں جس سے نہ صرف مستقبل میں مفید
معلومات میں اضافہ ہوتا رہے گا بلکہ معاشی طور
سے بھی ہندوستان کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

اب گنگوتری صرف ہمالیہ ہی میں نہیں بلکہ
زمین کے آخری سرے والے برّاعظم میں بھی ہے
جس کا نام ہے دکھچن گنگوتری۔ گنگوتری سے
پھوٹتی ہے۔ گنگا کی شفاف دھارا اور اس
دکھچن گنگوتری سے بہہ رہی ہے۔ سائنسی جوش
کی گنگا جس نے ہندوستان کا سر دُنیا کے سامنے
فخر سے بہت اوپر اٹھا دیا ہے۔ ●

بھارت کا گیارہواں بین الاقوامی فلمی میلہ

پریم پال اشک ○

سینما اس عہد کا سب سے صحت مند ہی نہیں بلکہ مقبول ترین ذریعۂ اظہار بھی ہے اور پھر ٹیلی ویژن کے نزول سے اس کی اہمیت اور افادیت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ سینما جہاں سماجی انقلاب کا پیش خیمہ ہے وہاں ہمارے ادبی اور فنی شعور کو بھی بیدار کرتا ہے۔ سینما کے ذریعے ہم دوسری اقوام کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل کے ساتھ اُن کے سُکھ دُکھ بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی وہاں کی مختلف فنی اور تکنیکی تحریکات کا جائزہ بھی لے سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم بھی مختلف ممالک کے عوام کو اپنے سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل سے روشناس کرا سکتے ہیں۔ اپنے یہاں کی مختلف تحریکات انھیں سمجھا سکتے ہیں۔ اپنی تہذیبی اور تمدنی زندگی کی جھلک انھیں دکھا سکتے ہیں اور اُن کی تہذیبی و تمدنی زندگی کی جھلک ہم دیکھ سکتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یوں کہیے کہ سینما ساری دنیا کے مختلف ممالک اور اقوام کے درمیان ایک ثقافتی پُل کا کام کرتا ہے۔ انھیں مقاصد کے پیشِ نظر ہم ۱۹۵۲ء سے بین الاقوامی فلمی میلوں کا اہتمام کر رہے ہیں۔ ایسا ہی ہمارا گیارہواں بین الاقوامی فلمی میلہ حال ہی میں نئی دلّی میں منعقد ہوا، اس مرتبہ یہ فلمی میلہ ۳ر جنوری کے بجائے ۱۰ر جنوری سے شروع ہوا، ان فلمی میلوں کا بنیادی مقصد دُنیا کے مختلف ممالک کے فلم سازوں، ہدایت کاروں اور فنکاروں کی فلموں کی نمائش کے ساتھ ساتھ وہاں کی صنعتِ فلم سازی کے ترقیاتی اقدامات اور تکنیکی شعور کا جائزہ لینا ہی نہیں بلکہ فنی نظریات کی نشاندہی بھی کرنا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہاں کے فنکاروں، ناقدوں، ہدایت کاروں اور فلم سازوں کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر یکجا ہو کر تبادلۂ خیال بھی ہو جاتا ہے اور اس طرح ہم واسو دھیو کٹم مبکم یعنی "دنیا ایک کُنبہ" کے ایک بنیادی نعرے کو عملی جامہ پہنا کر دُنیا کے تمام عوام کے سُکھ دُکھ میں شریک ہو کر ان کے غم اپنی جھولی میں ڈالتے اور مسرتیں سب میں تقسیم کر دیتے ہیں۔

یُوں تو دنیا میں پہلا بین الاقوامی فلمی میلہ وینس میں ۱۹۳۲ء میں منعقد ہوا تھا۔ البتہ بھارت میں پہلا بین الاقوامی فلمی میلہ ۱۹۵۲ء میں بمبئی میں منعقد ہوا۔ یہ غیر مقابلہ جاتی تھا، اس کے بعد ۱۹۶۱ء میں دوسرا، ۱۹۶۵ء میں تیسرا، ۱۹۶۹ء میں چوتھا، ۱۹۷۵ء میں پانچواں، ۱۹۷۷ء میں چھٹا، ۱۹۷۹ء میں ساتواں، ۱۹۸۱ء میں آٹھواں، ۱۹۸۳ء میں نواں اور ۱۹۸۵ء میں دسواں بین الاقوامی فلمی میلہ منعقد ہوا۔ مقابلہ جاتی سیکشن ۱۹۶۵ء سے شروع ہوا تھا۔ اس سے قبل دو میلے غیر مقابلہ جاتی تھے۔ ۱۹۶۵ء میں ہمارے بین الاقوامی فلمی میلے کو پیرس کی انٹرنیشنل فیڈریشن آف فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشنز نے اے کلاس بین الاقوامی فلمی میلے کا درجہ عطا کر دیا اور اس طرح ہمارا فلمی میلہ برلن BERLIN کانز۔CAN- وینس VENICE NEC، کارلو ویری CARLOVARY اور ماسکو کے بین الاقوامی فلمی میلوں کی صف میں شامل ہو گیا۔

اس مرتبہ اس گیارہویں بین الاقوامی فلمی میلے کا افتتاح مرکزی حکومت کے وزیر توانائی جناب وسنت ساٹھے کے دستِ مبارک سے ہوا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں صنعتِ فلم سازی کے اراکین کو ویڈیو فلم ٹکنالوجی سے خوفزدہ ہونے کے بجائے اس سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیا کیوں کہ اسی ٹکنالوجی کے ذریعے اُن کی اس وسیع و عریض

○ ۶۳، ایم، بنگلہ صاحب موڑ، نئی دہلی۔

ہندوستان کے ۷۰، ۸۰ فیصد عوام تک بخوبی رسائی ہو سکتی ہے۔

اس مرتبہ اس فلمی میلے میں ۳۰۰ سے زائد فلمیں دکھائی گئیں۔ ان میں ۲۰۰ سے زائد فیچر فلمیں، ۵۰ سے زائد دستاویزی اور شارٹ فلمیں اور ۷۰ سے زائد ہندوستانی فلمیں شامل تھیں۔

اس بار پاکستان، ایران، افغانستان، عراق، منگولیا، تنزانیہ اور مصر نے شرکت نہیں کی۔

پچھلے بین الاقوامی فلمی میلے کے مقابلے میں اس

مرکزی وزیر توانائی شری وسنت ساٹھے، شری ستیہ جیت رے اور نامور ایکٹریس جے پردا، گیارہویں بین الاقوامی فلمی میلے کی رسم افتتاح پر۔

بار دو زائد سیکشن کھولے گئے، پچھلی بار ۵ سیکشن کھولے گئے تھے۔ اس بار سپر ہٹ ہندوستانی فلموں کا سیکشن مین اسٹریم اور میوزیکل فلموں کا سیکشن الگ کھولا گیا۔ اس کے علاوہ ایشیائی ممالک خصوصاً بحرالکاہل کے ممالک اور آسٹریلیا، نیوزی لینڈ کی نمائندگی کے لیے پہلی بار سیکشن کھولا گیا۔ اس کے علاوہ جنگلی جانوروں کی فلموں پر مبنی نیا مقابلہ جاتی وائلڈ لائف سیکشن بھی کھولا گیا۔ یہی نہیں بلکہ ممتاز اداکارہ مرحومہ سمتا پاٹل کو ان کی چھ فلموں کی نمائش کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اور اسکے ساتھ ہی اس فلمی میلے میں غیر ملکی ہدایت کاروں اسپین کے لوئی بونیل LUIS BONUEL برطانیہ کے مائیکل پاویل MICHAEL POWEL اور ایمرک پرلیس برگر EMERIC PRESSBURGER اور جاپان سے کے مائیکو نارو سے MIKIO NARUSE اور ورنر ہارزوگ WERNERHARZOG کی فلموں کے ذریعے انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ پیسفیک اور ایشیائی ممالک کے مسائل پر ایک دو روزہ سیمینار کا انعقاد بھی عمل میں آیا۔ اسی دوران نئی دلی میں ایشیائی فلم سنٹر قائم کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا تاکہ ایشیائی ممالک کے فلمی مسائل پر توجہ دی جا سکے۔ اور ایشیائی ممالک کے فلم ساز اور ہدایت کار باہمی طور پر تال میل پیدا کر سکیں۔

اس مرتبہ کے مارکیٹنگ سیکشن میں ۶۰ ہندوستانی فلموں کے معاہدے ہوئے یہ معاہدے بلغاریہ، فرانس، کینیا، گریس اور ویت نام کے ساتھ ہوئے۔ وہ یہ فلمیں ٹیلی ویژن پر دکھائیں گے۔ اس طرح اس بار مارکیٹنگ سیکشن میں ۷۰ لاکھ روپے کا بزنس ہوا۔

اس فلمی میلے کا افتتاح عالمگیر شہرت یافتہ فلم ساز، ہدایت کار ستیہ جیت رے نے چراغ جلا کر کیا۔ ان کی معاونت نامور اداکارہ جے پردا نے کی۔

بھارت کے گیارہویں بین الاقوامی فلمی میلے میں نیشنل فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کی طرف سے ایک انگریزی سہ ماہی فلمی جریدے سینما ان انڈیا کی رسم رونمائی بھی عمل میں آئی۔ اس کے علاوہ آئی۔ کے۔ گجرال نے صفِ اوّل کے بنگالی فلم ساز اور ہدایت کار رتوک گھٹک کی ایک کتاب کی رونمائی کی رسم بھی ادا کی۔ جہاں تک جریدے کا تعلق ہے۔ اس کی افادیت اس اعتبار سے مسلم نہیں ہو سکتی کہ اسکا انداز عام فلمی جریدوں جیسا ہے۔ انفرادیت کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ ہندوستان میں ۶۲۰ فلمی جریدوں میں ایک جریدے کا مزید اضافہ ہو گیا ہے اور بس۔

بھارت کے اس گیارہویں بین الاقوامی فلمی میلے میں روس کے ہدایت کار ایلیور الیشمو خامادوف

TO ... KHAMISKY کو اُن کی فلم گڈ بائی گرین سمر GOOD BYE GREEN SUMMER کو طلائی مور عطا کیا گیا۔ بہترین ہدایت کاری کے لیے کیوبا کے ہدایت کار جیسس ڈیاز DIAZ ( ) کو اُن کی فلم لے جانیا LEJANIA پر نقرئی مور عطا کیے جانے کا اعلان کیا گیا۔ بہترین اداکاری کے لیے بھارت کے نوجوان اداکار اور نیشنل اسکول آف ڈرامہ سے تربیت یافتہ رگھوویر یادو RAGHUVEER ... DAV کو اُن کی فلم مسیسی صاحب

ہندوستانی فلم مسیسی صاحب کے ہیرو رگھوبیر یادو، جنھیں بہترین اداکاری پر نقرئی مور عطا کیا گیا۔

... پر نقرئی مور سے سرفراز کیا گیا۔ یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ رگھوویر یادو کی یہ پہلی فلم ہے اور بہترین ایکٹریس کے لیے سری لنکا کی ایکٹرس انوجا ویراسنگھے ANOJA ... کو اُن کی فلم مالڈ تائے سائیمین (MALDENIYE SIMEON) پر نقرئی مور دیے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ انوجا نے اس فلم میں ماں اور بیٹی کا ڈبل رول ادا کیا تھا۔ علاوہ ازیں اس مرتبہ جیوری کا خصوصی اعزاز نقرئی مور چین کی فلم آؤٹ کاسٹ OUTCAST کو دیا گیا۔ اس فلم کے ہدایت کار یاؤ شانگ گینگ (YOU SHUGANG) ہیں۔ چین کی اسی فلم کو آل انڈیا فلم کرٹیک ایسوسی ایشن کا خصوصی انعام دیا گیا۔ اس ایسوسی ایشن نے اسے بہترین فلم قرار دیا تھا۔

بھارت کے اس گیارہویں بین الاقوامی فلمی میلے میں کسی بھی مختصر یعنی شارٹ فلم کو کسی بھی اعزاز کے اہل قرار نہیں دیا گیا۔ البتہ جنگلاتی فلموں کے سلسلے میں گولڈن انٹیلر GOLDEN ANTELOPE کا اعزاز لیپرڈ۔ اے ڈارک نیس ان دی گراس LEOPARD-A DARKNESS IN THE GRASS کو دیا گیا۔ اسی کے ہدایت کار ہگ مائلز HUGH MILES ہیں۔ اس زمرے میں بہترین ہدایت کاری کے لیے سلور انٹیلر SILVER ANTELOPE اعزاز نیدرلینڈ NETHERLAND کے نامور فلم ساز ہدایت کار برٹ ہنسٹرا (BERT HANSTRA) کو اُن کی فلم فیملی آف چمپس FAMILY OF CHIMPS پر دیا گیا۔ اس کے علاوہ جیوری کے دو خصوصی اعزازات چیکوسلوواکیہ کے ہدایت کار میکولیس ری کوٹے MIKULAS RICOTTI کو اُن کی فلم ماؤنٹین مارموٹ MOUNTAIN MARMOT اور آسٹریلیا کے ہدایت کار ڈیوڈ مور DAVID MOOR کو اُن کی فلم دی لٹل مارسوپلز THE LITTLE [illegible] پر سلور انٹیلر کے اعزازات دیے گئے۔

یوں تو مجموعی طور پر یہ فلمی میلہ کامیاب رہا۔ لیکن ایک کونے سے بار بار اس کے غیر معیاری ہونے کی آوازیں آتی رہیں۔ اگر ہم اپنے یہاں ہی منعقد ہونے والی تقریبات کو غیر معیاری قرار دیتے رہیں تو لوگ تو اُسے غیر اہم تصور ہی کریں گے۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ہمارے فلم ساز اور ہدایت کار خصوصاً صفِ اوّل کے ہدایت کار بھی اپنی فلمیں مقابلے کے لیے بھیجیں۔ جہاں تک مقابلے کی فلموں کے غیر معیاری ہونے کا سوال ہے۔ اس فلمی میلے کے جیوری کے ممبران نے واضح طور پر اعتراف کیا ہے کہ پوری دُنیا میں آج اسی نوعیت اور معیار کی فلمیں آ رہی ہیں۔ کانز کے فلمی میلے میں بھی فلموں کا یہی معیار رہا۔ اس کے علاوہ ایک امر اور بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس سال پلے بیک گلوکاری کی گولڈن جوبلی منائی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں ایک خصوصی سیکشن اس فلمی میلے میں کھولا گیا تھا۔ راج کپور کی فلم 'برسات'، 'بھگوان کی البیلا'، بمل رائے کی 'مدھومتی'، وشوناتھ کی تیلگو فلم 'شنکر بھرنم' اور جی۔ وی۔ ایر کی کنڑ فلم ہم ساگتھے دکھائی گئی، جب کہ اس کے لیے علیحدہ سیکشن میں کم از کم ۲۵ فلمیں دکھائی جانی چاہیے تھیں۔ اس کے علاوہ مین اسٹریم میں اہم کمرشل فلمیں دکھائی جانی چاہیے تھیں۔ البتہ مین اسٹریم کا سلسلہ لازماً جاری رہنا چاہیے۔

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

ایم۔ آئی۔ حبیب اللہ٭

جسمانی طور پر معذور افراد کو سماجی دھارے میں شریک کیا جائے

جسمانی طور پر معذور افراد درحقیقت کون ہیں؟ کیا ہم کسی ایسے شخص کو معذوروں کی فہرست میں شامل کرسکتے ہیں جو جسمانی حیثیت سے کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، مگر سماج میں انتشار پیدا کر رہا ہو، جو سماج پر بوجھ بن کر رہنا چاہتا ہو، یا پھر وہ لوگ جسمانی طور پر معذور سمجھے جائیں جو جسمانی کمزوری یا خامی کے باوجود ایمانداری سے محنت کرنے میں یقین رکھتے ہوں اور جنھوں نے خلوص دل سے اور پوری لگن سے کسی کام کو سیکھنے کی کوشش کی ہو اور اس کے سہارے اپنی زندگی گزارنے کا عہد کیا ہو۔

زیر نظر مضمون ایک ایسے شخص نے لکھا ہے جو خود جسمانی طور پر معذور ہیں۔ انھوں نے اس مضمون میں ان سرکاری اقدامات پر روشنی ڈالی ہے جو مختلف زمروں کے جسمانی طور پر معذور افراد کی بہتری و بحالی کے لیے اٹھائے گئے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ معذور افراد سماج کی ہمدردی کے مستحق ہیں کیونکہ اگر ان کا مستقبل کسی طرح سے روشن ہوا تو اس سے پورے سماج کا بھلا ہے۔

قوم کی تعمیر ایک اجتماعی عمل ہے اس کے لیے ملک کے سبھی طبقوں، امیر، غریب، معذور اور تندرست سبھی کو کمربستہ ہونا پڑتا ہے۔ قوم کی تعمیر و تشکیل کے عمل میں ملک کے سبھی طبقوں کا تعاون حاصل کیے بغیر کامیابی مشکل ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو حصول آزادی کے وقت ہی پہچان لیا گیا تھا اور ملک کے کمزور طبقوں کی بہبود پر حصول آزادی کے بعد روز اول سے ہی توجہ دی گئی۔ معذور افراد بھی سماج کے کمزور طبقوں میں شمار کیے گئے، ملک میں منصوبہ بند ترقی کا عمل شروع ہوا اور اس میں سماج کے کمزور طبقات کی بہبود پر پوری توجہ کی جاسکی، اس زمرے میں معذور افراد کی بہبود کا عمل بھی شامل کرلیا گیا ہر منصوبے میں اس مد کے اخراجات میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا جس سے اس کام کی روز افزوں اہمیت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے، ہندوستانی آئین کے آرٹیکل ۴۱ اور ۴۶ میں معذور افراد کی بہبود کے کام کو قابل توجہ بتایا گیا ہے، ساتویں منصوبے میں معذور افراد کی بہبود کے لیے ۱۲۴ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے جو چھٹے منصوبے میں مختص کردہ رقم سے چار گنا ہے دسمبر ۱۹۸۶ء تک کے اعداد و شمار کی روشنی میں ہندوستان میں معذور افراد کی تعداد ۷ کروڑ ۸۵ لاکھ ہے، جسمانی طور پر معذور افراد کو پانچ زمروں میں بانٹا گیا ہے۔ اس سے قبل ان کو صرف تین زمروں میں ہی بانٹا گیا تھا۔ یہ زمرے اس طرح سے ہیں:۔

بصارت سے محروم افراد

اس زمرے میں اس طرح سے تخصیص کی گئی ہے۔

۱۔ وہ لوگ جو بصارت سے قطعی محروم ہیں۔

۲۔ کمزور بینائی جو ۶/۶۰ یا ۲۰/۲۰۰ اسنی لن سے زیادہ نہ ہو۔

٭ اے/۵۹ ریڈ، جہانگیر پوری، دہلی

۴۔ دُور کی نظر کمزور۔

ہڈی وغیرہ ٹوٹ جانے سے معذوری

ایسے لوگ جن کے جسم میں کسی طرح کی خرابی بسبب ہڈی ٹوٹنے سے آئی ہے اور جس سے معذوری واقع ہوجاتی ہے، مثلاً لنگڑا، لولا وغیرہ جن کے سبب ان کے جسم کی ہڈیاں، پٹھے یا جوڑ کام نہ کرسکتے ہوں، اور ان کو عام حیثیت سے کام کرنے میں خلل واقع ہوتا ہو۔

بہرے، گونگے

جن کی قوتِ سماعت کام نہ کرتی ہو۔ ان کو کوئی آواز مطلق سُنائی نہ دیتی ہو، جو زور سے بولنے کو بھی نہ سُن سکتے ہوں، جن کے کان میں ۷۰ ڈیسیبلز سے زیادہ نقصان ہو یا دونوں کانوں سے سُنائی نہ دیتا ہو۔

ذہنی کمزوری

جو شخص عام انداز پر بات سمجھنے سے قاصر ہو، یہ کمزوری بلوغیت پکڑنے کے زمانے میں لاحق ہو جاتی ہے، اسی کمزوری کے سبب بچہ عمومی انداز کا رویہ نہیں اپناتا۔

کوڑھ سے متاثر

یہ وہ لوگ ہیں جو متعدی مرض سے پوری طرح صحت یاب ہوچکے ہیں۔

روزگار اور بحالی

پہلے قدم کے طور پر بھارت سرکار نے جسمانی طور پر معذور افراد کے لیے ایک دفتر روزگار قائم کیا۔ یہ دفتر ۱۹۵۹ء میں بمبئی میں قائم کیا گیا تھا۔ اب اس طرح کے دفاتر روزگار کی تعداد بڑھ کر ۲۲ ہوگئی ہے، یہ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں قائم کئے گئے ہیں۔ دُور دراز مقامات پر رہنے والے دیہی معذور افراد کی بھلائی کے لیے ان دفاتر روزگار کے اہم سیل کھولے گئے ہیں۔ دفاتر روزگار میں ان کا نام رجسٹرڈ کرلیا جاتا ہے اور ان کی تعلیمی و تکنیکی صلاحیتوں کے بموجب اُن کو مختلف مقامات پر بھیجا جاتا ہے، وزارت امور محنت میں تربیت و روزگار کے ڈائرکٹوریٹ جنرل نے دو پیشہ ورانہ بحالیاتی مرکز کھولے ہیں جن میں جسمانی طور پر معذور افراد کو تربیت دی جاتی ہے، ان میں سے ایک مرکز بمبئی میں ہے اور دوسرا حیدرآباد میں یہ مرکز جو سنہ ۱۹۶۸ء میں کھولے گئے تاکہ معذور افراد کو تربیت دے کر انھیں ضروری کاموں پر لگایا جاسکے۔ اب سرکار نے اس طرح کے بحالیاتی مراکز کی تعداد بڑھادی ہے، اور یہ بڑھ کر ۱۴ تک پہونچ گئی۔ یہ مراکز بمبئی، کلکتہ، دلی، مدراس کے ساتھ ساتھ دیگر اہم مقامات پر بھی کھولے گئے ہیں۔ وزارت امور محنت نے دیہات میں بحالیات کے مراکز بھی کھولے ہیں۔ اس طرح کے مراکز بمبئی، کلکتہ، کانپور، لدھیانہ اور مدراس کے دیہات میں کھولے گئے۔ ان کے علاوہ احمدآباد، بمبئی، بنگلور، حیدرآباد، مدراس اور تریونڈرم میں بھی بحالیاتی ورکشاپ قائم کی گئیں تاکہ معذور افراد کو کام پر لگایا جاسکے۔ ان مقامات پر کسی نہ کسی کام میں تربیت دینے کے لیے ورکشاپوں کا قیام عمل میں لاکر اس ذمہ داری کو نبھایا جارہا ہے۔

بھارت و امریکی دیہی بحالیاتی پراجیکٹ

ہندوستان کے دیہی معذور افراد کے مسائل پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد امریکہ کے معذور افراد کے تحقیقی قومی ادارے نے بھی معذور افراد کی بحالی کے کام میں مدد دی، اس ادارے نے ۱۲۹۱۰۰۰ روپے کی رقم عطیہ کے طور پر دی، یہ رقم ۵ سال کے پراجیکٹ کے لیے دی گئی، اس سے معذور افراد کی بحالی کے کام میں مدد لی جائے گی۔ اس پراجیکٹ کے تحت اس ادارے نے اور سماجی بہبود کی وزارت نے مل کر چھ ماڈل ڈسٹرکٹ سنٹر کھولے جن کا کام معذور افراد کی بحالی ہے۔ یہ مرکز بمبئی، کلکتہ، کٹک، لکھنؤ، میسور اور مدراس میں کھولے گئے۔ ان کے ذریعے بحالیات کا ایک جامع پروگرام بنایا گیا۔ اس سلسلے میں ادارۂ ہٰذا نے چھ ماہرین کو اس کام پر مامور کیا جو اس پراجیکٹ کو اپنی نگرانی میں چلائیں گے۔ یہ پراجیکٹ ہسپتالوں اور پرائمری ہیلتھ سنٹر کے ساتھ مل کر کام کررہے ہیں۔ اس پراجیکٹ کا نعرہ ہے کہ دیہی معذور افراد کو مفت خدمات ان کے گھر پر ملیں گی۔ اس کے تحت ہر سطح پر خاص کر نچلی سطح پر تربیت کی سہولتیں دی جائیں گی۔ امریکہ کے تعاون سے چلنے والا پانچ سالہ پراجیکٹ مارچ ۱۹۸۵ء میں شروع کیا گیا تھا۔

معذور افراد کے لیے قومی ادارہ

بھارت سرکار نے معذور افراد کے ہر زمرے کے لیے قومی ادارہ قائم کیا ہے، اس کے ذریعے قومی سطح پر تحقیق، تربیت، اندراج، مشاورت وغیرہ کی سہولتیں فراہم کی جارہی ہیں۔ معذور افراد کی خدمت کے لیے درج ذیل ادارے کام کررہے ہیں:

(الف) بینائی سے معذور افراد کا قومی ادارہ

(National Institute for the Visually Blind)

یہ ادارہ دہرہ دون (اترپردیش) میں ہے، یہ مربوط نوعیت کی خدمات فراہم کرتا ہے، یہ ایک ماڈل سیکنڈری اسکول چلاتا ہے جہاں اندھوں کی تعلیم کا انتظام ہے، اس میں نوجوان اندھوں کے لیے تربیتی مرکز بھی قائم ہے، جن کی بصارت کمزور ہے ان کے لیے بھی اسکول ہے، اندھوں کی تعلیم میں معاون سامان اور متعدد آلات تیار کرنے کی ایک ورکشاپ بھی ہے، ایک ایسی ورکشاپ بھی ہے جہاں اندھے تربیت حاصل کرتے ہیں، ایک سنٹرل بریل پریس بھی ہے، اندھوں کے لیے ایک لائبریری بھی ہے، اس کے ذریعے

اندھوں کی تعلیم سے متعلق بریل لٹریچر ملک بھر میں بھیجا جاتا ہے۔

علی یاور جنگ نیشنل انسٹی ٹیوٹ جس کا کام بہروں کی خدمت ہے

یہ ادارہ بمبئی میں ہے۔ یہ قومی سطح پر بہروں کی تعلیم وتربیت اور ان کے لیے تحقیقی کام کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہے۔ حیدرآباد میں بالغ بہروں کے لیے تربیتی مرکز ہے۔ جن کی سماعت کمزور ہے ان کی تربیت کے لیے متعدد انتظامات ہیں۔ حیدرآباد کا یہ ادارہ ان لوگوں کو درزی کا کام، شیٹ میٹل ورک، الیکٹریکل وائریس شپ فٹنگ اور ویلڈنگ وغیرہ کا کام سکھاتا ہے۔

جسمانی طور پر معذور افراد کے لیے نیشنل انسٹی ٹیوٹ

(National Institute for the Orthopaedically Handicapped)

کلکتہ کا یہ ادارہ جسمانی طور پر معذور افراد کی تربیت وتحقیق کے مسائل کو حل کرتا ہے تاکہ ایسے لوگوں کو زندگی بحال کیا جا سکے، دلی میں جسمانی طور پر معذور افراد کی فزیوتھریپی کی ٹریننگ کا بندوبست ہے، یہاں ایک ایسا ادارہ بھی ہے، جو جسمانی طور پر معذور بچوں کی دیکھ بھال سے متعلق ہے۔

ذہنی طور پر معذور افراد کا قومی ادارہ

(National Institute for the mentally Handicapped)

حیدرآباد میں یہ ادارہ ذہنی طور پر معذور افراد کو تربیت دیتا ہے، یہ ۵ سال سے ۱۴ سال تک کی عمر کے ذہنی طور پر معذور بچوں کو تربیت دیتا ہے۔ بولنے سے متعلق پیتھالوجی اور سماعت سے متعلق سروس بھی یہاں دستیاب ہے۔ دیہی علاقوں میں ورکروں کے تربیتی مواد کی تیاری کا پراجیکٹ اس غرض سے شروع کیا گیا تھا کہ دیہی علاقوں میں ذہنی طور پر معذور بچوں کو تربیت دی جا سکے۔ اور ان کی شناخت اور اُن کے مرض کی تشخیص کی جا سکے۔ اس ادارے نے ۸۷-۱۹۸۶ء کے تعلیمی سال میں ذہنی طور پر معذور طالب علموں کے لیے سہ سالہ ڈگری کورس شروع کیا۔ ہر نصاب کے لیے ۱۵ طالب علم داخل کئے جاتے ہیں، جولائی ۱۹۸۷ء کے تعلیمی سال سے ذہنی معذوری پر پیشہ ورانہ نصاب اور اُستادوں کی اس سلسلے کی تربیت کا ایک پروگرام شروع کیا جائے گا۔ اس سے دفاتر روزگار کا عملہ اور پیشہ ورانہ رہنمائی دینے والے انسٹرکٹر بھی فائدہ اُٹھائیں گے۔

انسداد کوڑھ کا قومی کمیشن

(National Leprosy Control Commission)

یہ کمیشن نئی دہلی میں وزیراعظم کی صدارت میں قائم کیا گیا تھا، اس کا مقصد انسداد کوڑھ اور اس مرض کے علاج کو موثر بنانا تھا، اس وقت اس کمیشن کے ماتحت انسداد کوڑھ کے ۴۰۳ یونٹ، ۶۶۱ شہری مراکز، ۶۹۸۵ سروے ایجوکیشن ٹریٹمنٹ مراکز، ۲۵۳ عارضی ہسپتال وارڈز، ۱۹۰ ضلع افسر انسداد کوڑھ کی تربیت دینے والے ۴۳ مراکز کام کر رہے ہیں، تمل ناڈو میں چینگل پیٹ میں کوڑھ کے مرض کی روک تھام اور اس سے متعلق تحقیق وتربیت کا مرکزی ادارہ کام کر رہا ہے، اُڑیسہ میں اسکا میں، مدھیہ پردیش میں رائے پور میں، مغربی بنگال میں گوری پور میں تربیت وتجدید کے علاقائی ادارے سماجی کارکنوں کو تربیت دے رہے ہیں تاکہ کوڑھ کا انسداد ہو سکے۔

تعلیم وتربیت

تیسرے منصوبے میں ایک پروگرام شروع کیا گیا تھا جس سے بصارت سے محروم افراد کی تربیت کے لیے علاقائی مراکز کھولے گئے، چنانچہ، دلّی، بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں چار علاقائی مراکز کھولے گئے۔ ان مراکز پر ایک سال کی تربیت دی جاتی ہے۔ اندھوں کو تعلیم دینے والے اُستادوں کو ان مراکز پر تربیت دی جاتی ہے، ہر مرکز پر ۱۵ اُستادوں کو تربیت دی جاتی ہے۔ ان مراکز پر نصاب کی تیاری پروف ریڈروں کے پروگرام اور بریل کے ذریعے پڑھائی کے انتظامات مکمل کئے جا چکے ہیں، یہاں برسرکار استادوں کو تجدیدی نصابات کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ یہ علاقائی مراکز دیگر طرح سے بھی اپنی افادیت رکھتے ہیں، تعلیم کے مربوط نظام، ٹیچنگ ایڈز، نئے طریقوں کے آلات کی تیاری جو بصارت سے محروم افراد کی تعلیم میں معاون ہوں، ان آلات کی پیشہ ورانہ مراکز پر فراہمی، اور دیگر طرح سے ان کی تعلیم کی کوششوں میں بھی ان مراکز نے مفید خدمات انجام دی ہیں، اکتوبر ۱۹۷۱ء میں دہرہ دون میں بصارت سے محروم افراد کی تعلیم کے قومی ادارے میں تجدیدی پروگرام شروع کیا گیا تاکہ اس تربیت کے زیر اثر اندھے از خود ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جا سکیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر رچرڈ ہوور کے طریق کار اور ہدایت کا فائدہ اٹھایا گیا، انھوں نے ان اندھوں کے لیے ایک لمبی بید ایجاد کی تھی۔ معذور افراد کی مربوط تعلیم کے لیے مرکزی حکومت نے ملک کی چھ بڑی یونی ورسٹیوں میں چھ مراکز کھولے ہیں، معذور افراد کی تربیت کے ذریعے ملک میں سماجی اور اقتصادی انقلاب آ سکتا ہے، چنانچہ بہبودی امور کی وزارت کی طرف سے نویں کلاس سے اوپر کی تعلیم کے لیے معذور افراد کو وظائف دئے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنی پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم وتربیت حاصل کر سکیں، اگر کوئی معذور فرد کسی ادارے وغیرہ میں برسرکار ہو، تو دورانِ ملازمت اس کو وظیفہ دیا جاتا ہے، ریاستی سرکاریں پانچویں کلاس سے اوپر کی تعلیم کے لیے معذور افراد کو وظائف دیتی ہیں۔

معاون سامان (ایڈز) اور آلات: سال ۱۹۸۱ء معذور

افراد کے سال کے طور پر بین الاقوامی سطح پر منایا گیا تھا، بھارت سرکار نے غریبوں کی مدد کے لیے ایک اسکیم شروع کی تھی، اس اسکیم کے تحت ۴۲ ایجنسیوں کے توسط سے یہ سامان فراہم کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے معاون سامان میں کوچز، مصنوعی اعضا، وغیرہ شامل ہیں، یہ آلات ۱۵۰۰ روپے فی سامان سے زیادہ لاگت کے نہیں ہوتے ہیں۔ کم سے کم ایک آلہ ۲۵ روپے کا ہوتا ہے۔ یہ آلات مُفت دینے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ معذور فرد کی آمدنی ۲۸۸ روپے ماہانہ سے زیادہ نہ ہو، البتہ اگر اس کی آمدنی ۲۵۰۰ روپے تک ہے تو اسے اس کی قیمت میں ۵۰ فیصد کی تخفیف دی جاتی ہے۔

نیشنل ایوارڈز

معذور ملازمین کی ہمت افزائی کے لیے اور معذور افراد کو ملازم رکھنے والوں کی ہمت افزائی کے لیے حکومتِ ہند کی سماجی بہبود کی وزارت نے قومی سطح پر ایوارڈز دینے کی اسکیم شروع کی ہے۔ یہ اسکیم ۱۹۶۹ء سے جاری ہے۔ چنانچہ معذور افراد کو ملازم رکھنے والا انعام کا مستحق ہوگا، اگر اس کے یہاں معذور افراد کے پانچ زمروں میں سے ہر زمرے کا آدمی ملازم ہوگا۔ اپنی خدمات کے لیے مشہور دس افراد کو دس ایوارڈ ملیں گے۔ گویا ہر زمرے کے معذور افراد کے لیے ۲ ایوارڈ ہیں، ملازم رکھنے والے دو ایسے افسروں کو بھی جنھوں نے سب سے زیادہ معذور افراد کو ملازم رکھا ہو، انعامات ملیں گے۔ ایسے دو اداروں کو جنھوں نے معذور افراد کی بحالی کے لیے سب سے زیادہ کام کیا ہو، انعامات ملیں گے۔ جس شخص نے سال کے دوران معذور افراد کی خدمت کے لیے سب سے اچھا کام کیا تو اسے بھی انعام ملے گا۔

دستیاب سہولتیں

بھارت سرکار نے اپنی مختلف وزارتوں کے توسط سے معذور افراد کی بہبود کے لیے درج ذیل سہولتیں بہم پہونچائی ہیں۔

۱۔ سرکار نے گروپ سی اور ڈی (دوم سوم و چہارم) میں ۳ فیصد ملازمتیں معذور افراد کے لیے مختص کردی ہیں، یہ سلسلہ ۱۹۷۷ء سے جاری ہے، ایک فیصد بصارت سے محروم افراد کے لیے، ایک فیصد جسمانی طور پر معذور افراد کے لیے اور ایک فیصد بہرے یا گونگے کے لیے۔ تمام ریاستی سرکاریں اور مرکز کے زیر انتظام علاقے اسی پالیسی پر کاربند ہیں۔ اُتر پردیش میں یہ تخصیص صرف ۲ فیصد ہے۔

۲۔ عمر میں دس سال تک کی رعایت ہے۔ یہ عمر کی قید جو بالعموم ۲۶ سال ہے، معذور افراد کے لیے دس سال کی رعایت کے ساتھ ہے۔ شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کے لیے عمر کی یہ رعایت مزید ۵ سال ہے۔

۳۔ سرکاری دفاتر میں کرسیل کو بید سے بُننے کا کام صرف اندھوں کے لیے ہی مخصوص ہے۔

۴۔ معذور افراد کو ٹائپ کرنے کی شرط سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

۵۔ وزارت مواصلات میں ڈاک اور تار کا محکمہ جو پبلک ٹیلی فون بوتھ کھولتا ہے، وہ از خود روزگار اسکیم کے تحت معذور افراد کے لیے ہی ہوتا ہے۔ ان سے ۵۰ پیسے فی کال کی بجائے ۳۰ پیسے فی کال چارج کیا جاتا ہے۔ اس اسکیم کے تحت بہت سے معذور افراد ٹیلی فون بوتھ سنبھالے ہوئے ہیں۔ اور اس اسکیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ "بریل اسکرپٹ" پر ڈاک ٹکٹ بھی نہیں لگانے پڑتے۔

ریلوے کی وزارت نے معذور افراد کے تمام زمروں کے لیے ریلوے کرایہ میں رعایت دی ہے۔ یہ رعایت ۲۵ فیصد کے بقدر ہے۔ ان میں ٹی۔بی کے مریض اور کینسر کے مریض بھی شامل ہیں، البتہ ان کو سرکاری ڈاکٹر یا ہڈیوں کے سرجن سے اس سلسلے میں ایک سرٹی فکیٹ دکھانا ہوگا۔ انکو ساتھ لے کر چلنے والے کے لیے بھی یہی رعایت ہوگی۔

ریلوے کی وزارت نے پہلے اور دوسرے درجے کے ماہانہ سیزن ٹکٹ میں ۵۰ فیصد کی رعایت دے دی ہے۔ یہ رعایت معذور افراد، ذہنی معذوری رکھنے والے افراد اور ان کو ساتھ لے کر چلنے والوں، تیمارداروں کے لیے بھی ہے۔ اس طرح کے طلبا، کو پہلے اور دوسرے درجے کے ریلوے کرایہ میں ۵۰ فیصد کی رعایت ملتی ہے۔ تاکہ وہ اپنی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اسکولوں وغیرہ میں جا سکیں۔ ذہنی طور پر معذور افراد کے لیے (کم سے کم اگر وہ چار ہوں) ساتھ میں چلنے والے کو کوئی کرایہ نہیں دینا پڑے گا۔ یہ رعایت یکم جنوری ۱۹۸۷ء سے دی گئی ہے۔

کُلّی طور پر بصارت سے محروم یا مستقل طور پر جسمانی معذوری رکھنے والے افراد کو انکم ٹیکس لگاتے وقت دس ہزار روپے کی چھوٹ دی جاتی ہے۔ دراصل یہ رعایت ایک طرح سے اسے کام کی صلاحیت پیدا کرنے سے روکنے والی ہے۔ یہ رعایت ڈاکٹر سے معذوری کا ثبوت دکھانے پر ہی دی جاتی ہے۔

مرکزی ملازمین کو ان کی بنیادی تنخواہ کا دس فیصد سفری الاؤنس کے طور پر ملتا ہے — یہ رعایت اُسے ملے گی جس کے جسم کا کم سے کم ۴۰ فیصد حصہ معذوری کی زد میں آتا ہے۔

۱۹۷۷ء میں ایک اسکیم کی رُو سے پٹرول اور ڈیزل رعایتی نرخ پر فراہم ہوتا ہے، کسی موٹر گاڑی کو چلانے والا اگر معذور ہوگا تو اُسے پٹرول اور ڈیزل رعایتی نرخ پر ملے گا۔ اس سے روڈ ٹیکس بھی نہیں لیا جائے گا۔ ڈیزل/پٹرول پر وہ جو رقم خرچ کریں گے، اس کی نصف رقم وہ کلیم کر سکیں گے اس سلسلے میں درج ذیل بالائی حد ملحوظ رکھی جائیگی۔

دو ہارس پاور سے کم گاڑی ۱۵ لیٹر فی ماہ

دو پارس پاور کی گاڑی ۲۵ لڑائی ماہ

کیمیکلز اور پیٹرولیم کی وزارت نے پبلک سیکٹر میں واقع تیل کمپنیوں کی ڈیلرشپ یا ایجنسیوں کا ۵ فیصد معذور افراد کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔

قومی ملکیت کے تمام بنک معذور افراد کو از خود روزگار حاصل کرنے کے لیے ساڑھے چھ ہزار روپے تک کا قرض برعایتی شرح سود پر دیتے ہیں اس کے لیے وہ ضمانت بھی نہیں لیتے۔

پنجاب، ہریانہ، اڑلیسہ، راجستھان، ہماچل پردیش، مہاراشٹر اور بہت سی دیگر ریاستوں میں بے روزگار معذور افراد کو بے روزگاری کا بھتہ ملتا ہے، کیرالہ اور آندھرا پردیش میں معذور افراد کی بہبود کی کارپوریشنیں قائم کی ہیں، جو معذور افراد کی بہبود سے متعلق اسکیموں کو چلاتی ہیں، تمل ناڈو سرکار نے ایسے معذور افراد کے لیے جو کہ ملازمت کے خواہاں ہیں، عمر میں رعایت دی ہے، ان کے لیے تعلیمی کوالی فیکیشن میں بھی رعایت ہے۔ ملازمت چاہنے والے معذور افراد سے درخواست دینے کی کوئی فیس نہیں لی جاتی۔

معذور افراد کے لیے سرکاری مکان نمبر کے بغیر بھی مل سکتا ہے، شہری ترقی کی وزارت نے ۵ فیصد کائنیں، ایک فیصد رہائشی پلاٹ، ایک فیصد فلیٹس معذور افراد کے لیے مخصوص کئے ہیں۔ مزید برآں ریاستوں میں ڈیولپمنٹ اتھارٹیز امپروومنٹ ٹرسٹوں نے بھی معذور افراد کے لیے ۱،۵ فیصد کوٹہ الاٹ کرنے کی تخصیص کی ہے۔

شہری ہوا بازی کی وزارت نے ایرانڈیا، انڈین ایرلائنز کی پروازوں میں سفر کرنے والوں کو کرایہ میں ۵۰ فیصد تک کی رعایت دی ہے۔ دلی میں مرکزی سرکار کے ادارے دلی ٹرانسپورٹ کارپوریشن نے دلی کی حدود میں بس سے سفر کرنے والے دلی کے معذور افراد کے لیے کرایہ معاف کر رکھا ہے۔ بہت سی دیگر ریاستی ٹرانسپورٹ کارپوریشنوں نے بھی روزانہ بس سے سفر کرنے والوں کو بس کرایے میں ۵۰ فیصد کی رعایت دے دی ہے۔ یہ رعایت انٹراسٹیٹ بسوں میں بھی حاصل ہے۔

سماجی بہبود کی وزارت معذور افراد کی بہبود کے لیے نمایاں کام کرنے والی رضاکارانہ تنظیموں کو گرانٹ دیتی ہیں۔

معذور افراد کے ادارے، جو کہ سوسائٹیز ایکٹ کے تحت درج ذیل ہیں، معذور افراد کی تعلیم و تربیت کے لیے درکار ساز و سامان باہر ملکوں سے منگا سکتے ہیں۔ اس سامان پر کوئی ڈیوٹی نہ لگے گی، اگر یہ تحفہ کے طور پر بھی آئیں تو بھی اُن پر ڈیوٹی نہ ہوگی، اس کے لیے متعلقہ ادارے کو چیف کنٹرولر آف امپورٹس اینڈ ایکسپورٹس سے کسٹم اجازت نامہ حاصل کرنا ہوگا۔

انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت سے وابستہ محکمہ تعلیم نے بصارت سے محروم اسکالروں کے لیے خصوصی گرانٹ دی ہے تاکہ وہ ریڈر رکھ سکیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے معذور طلباء کو نمبروں میں دس فیصد کی رعایت دی جاتی ہے۔

گڑگاؤں میں واقع ماروتی اُدیوگ لمیٹڈ، معذور افراد کے لیے خصوصی قسم کی ماروتی گاڑیاں بنا رہی ہے۔ یہ کام مئی ۱۹۸۶ء سے شروع ہوا ہے، یہ معذوری کو دیکھتے ہوئے اور اس کا لحاظ رکھتے ہوئے تیار کی گئی ہے، اس سے معذور افراد کی نقل و حرکت کی صلاحیت بڑھ گئی ہے۔

مزید ترقی کے لیے مشورے

سرکار نے ۳۰ فیصد ملازمتیں معذور افراد کے لیے مخصوص ضرور کی ہیں تاہم اس پر مناسب عمل درآمد نہیں ہو رہا ہے، اس کا طریق کار لمبا ہے۔ حالانکہ سورگیہ سابق وزیراعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۴ر جون ۱۹۸۰ء کو اپنے خط نمبر 976-PMO/80 میں واضح کیا تھا کہ ریزرویشن کی پالیسی پر موثر عمل درآمد ہونا چاہیئے۔ ملک میں معذور افراد کی تعداد ۵ء۸۷ ملین (۸ کروڑ ۸۵ لاکھ) ہے، اس بڑی تعداد کو دیکھتے ہوئے ۳ فیصد کا ریزرویشن کم ہے، یہ کم سے کم دس فیصد ہونا چاہیئے، اس پر موثر عمل درآمد ہونا چاہیئے۔ اس پالیسی کا اطلاق پرائیویٹ سیکٹر پر بھی ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ جاپان اور امریکہ میں ہے۔

معذور افراد کی مالی حالت کمزور ہے سرکاری ملازمتوں کے لیے درخواست دینے کی فیس نہیں لی جانی چاہیئے۔ سٹینڈرڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کے امیدواروں سے تین چوتھائی فیس نہیں لی جاتی، شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب امیدواروں کے لیے جس طرح سے مقابلے کے امتحانات کی تیاری کرانے کی سہولت فراہم کی جاتی ہے، اسی طرح سے یہ سہولت معذور افراد کو بھی ملنی چاہیئے۔

معذور افراد کے لیے ڈی۔ آر۔ آئی اسکیم کے تحت جو رعایت حاصل ہے، وہ انھیں حاصل نہیں ہے، یعنی کہ وہ اگر ۶۵۰۰ روپے تک کا قرض روزگار کے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو وہ بغیر سود کے نہیں ملتا، دوسرے یہ رقم بہت کم ہے، قیمتوں میں اضافے کے پیش نظر اس میں اضافہ ضروری ہے کم سے کم یہ رقم ۳۵ ہزار روپے ہونی چاہیئے اور اس کے لیے کوئی ضمانت نہ لی جائے تاکہ معذور افراد کسی نہ کسی قسم کا روزگار شروع کر سکیں، جو صحتمند لوگ معذور افراد سے شادی کے متمنی ہوں ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے۔ اس طرح سے معذور افراد اور صحتمند افراد کے درمیان دُوری دُور ہو سکے گی۔

اس وقت ملک میں پیشہ ورانہ بحالی کے ۱۴ مرکز اور خصوصی روزگار دفاتر کے ۲۳ دفتر ملک بھر

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

شاہین پروین جالوی

ہلدی اور لیمو کے فوائد

• سوکھی کھانسی ہونے پر ہلدی کا سفوف شہد کے ساتھ ملا کر چاٹنا چاہیئے۔ اس سے کھانسی کم ہو جاتی ہے۔

• کھانسی اور گلا خراب ہونے پر ہلدی کی گانٹھ مُنھ میں رکھ کر چوسنا چاہیئے۔

• آنکھ لال ہو جانے پر ہلدی، پھٹکری، املی کی پتی کو پیس کر پوٹلی بنا کر اسے توے کی آنچ پر گرم کرنے کے بعد آنکھ کی سِکائی کرنے سے فائدہ پہونچتا ہے۔

• آنکھوں پر ہلدی کا لیپ کرنے سے آنکھوں کی لالی صاف ہو جاتی ہے۔

• زیادہ ہچکی آنے پر تھوڑی سی ہلدی زبان پر رکھ کر پانی کے ساتھ نگل لیں، ہچکی فوراً بند ہو جاتی ہے۔

• اگر دانت زیادہ پیلے ہو گئے ہوں تو تھوڑی سی ہلدی، نمک اور تھوڑا سا سرسوں کا تیل ملا کر کچھ دنوں تک صبح اور شام کھانا کھانے سے قبل، دانت پر گھسنے سے کچھ ہی دنوں میں دانت چمکنے لگتے ہیں

• زُکام تیز ہونے پر چُٹکی بھر ہلدی گرم دودھ کے ساتھ کھانے سے آرام ملتا ہے۔

• اگر جسم کے کسی حصے پر بچھو نے کاٹ لیا ہو تو وہاں پر ہلدی کا لیپ کرنے سے فائدہ پہنچتا ہے۔

• ہڈی ٹوٹ جانے پر گھی میں تھوڑا سا لہسن بھون کر اور ہلدی ملا کر دودھ کے ساتھ پینے سے ہڈی جڑ جاتی ہے۔

• کمر یا سر میں درد ہو رہا ہو تو تھوڑی سی ہلدی چائے میں اُبال کر پینے سے درد میں آرام ہوتا ہے۔

• زخم پر ہلدی کا لیپ کرنے سے زخم کے کیڑے مر جاتے ہیں اور زخم پر ہلدی کا سفوف ڈالنے سے زخم جلدی بھر جاتا ہے۔

• ہلدی کی گانٹھ کو پتھر پر پانی کے ساتھ گھس کر اور گرم کرنے کے بعد آنکھوں کے اوپر لیپ لگانے سے آنکھوں کا زخم ٹھیک ہو جاتا ہے۔

• جسم پر چوٹ یا سوجن آ گئی ہو تو ہلدی، چونا ملا کر لیپ کرنے سے درد ٹھیک ہو جاتا ہے۔

• اندرونی چوٹ لگنے پر گنگنے دودھ میں ایک چمچہ ہلدی کا سفوف ملا کر پینے سے فائدہ ہوتا ہے۔

●

لیمو ہر عمر کے بچوں اور بالغوں کے لیے فائدہ مند ہوتا ہے۔ لیمو میں پائے جانے والے وصفِ مشترک کی فیصد مقدار مندرجہ ذیل ہے:

وصفِ مشترک کی مقدار (فی سو گرام)	
پروٹین	۱،۵
کاربوز	۱۱،۹
چکنائی	۳،۱
وٹامن	۱،۶
وٹامن	۱،۱
وٹامن	۶۳ ملی گرام

اس کے علاوہ لیمو میں لوہا، کلورین، کیلشیم، پوٹیشیم بھی کافی مقدار میں ہوتا ہے۔ لیمو کے کیمیاوی جز جسم سے زہریلی چیزوں کو باہر کر کے خون کو صاف کرتا ہے اور کھال کو نئی جلا دیتا ہے۔ روزانہ صبح میں ایک گلاس گنگنے پانی میں ایک لیمو نچوڑ کر پینے سے قبض دُور ہو جاتا ہے۔

اگر بالوں کی جڑیں کمزور ہوں، بال زیادہ جھڑتے ہوں یا ان میں خشکی ہو تو سر دھونے سے قبل اس میں لیمو کی تیل کے ساتھ ملا کر مالش کرنے سے سر کی بیماری جیسے بال جھڑنا، خشکی وغیرہ دُور ہو جاتی ہے۔

اگر سردیوں میں ہاتھ پیر پھٹ گئے ہوں تو گلیسرین میں گلاب کا پانی اور لیمو ملا کر لگائیں اور صبح جھاویں سے رگڑ کر ہاتھ پیر دھوئیں، جسم چمک اُٹھے گا۔

زکام کی شکایت ہونے پر دن بھر فاقہ کریں اور گنگنے پانی میں کئی بار لیمو کا رس لیں، زکام ٹھیک ہو جائے گا۔ تیز سردی زکام میں لیمو کو آگ پر گرم کر کے اس کا رس مریض کو پلائیں، فوراً آرام ملے گا۔ دانتوں کو سفید رنگت دینے اور چمکیلا بنانے کے لیے لیمو کے چھلکوں کو سُکھا کر اور پیس کر نمک ملا کر منجن کرنے سے دانت موتی کی طرح چمک اُٹھیں گے۔

اجوائن کو لیمو کے پانی میں بھگو کر سُکھا لیں، اور کھانا کھانے کے بعد گرم پانی کے ساتھ اسے کھانے سے پیٹ کا مرض دُور ہو جائے گا۔

اگر مُنھ کا مزہ بخار کی وجہ سے کسیلا ہو تو لیمو کو آگ پر گرم کر کے کالا نمک کے ساتھ چُوسنے سے مُنھ کا مزہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

لیمو کے مختلف طرح کے اچار، شکنجبی اور جوس وغیرہ تیار کئے جاتے ہیں جو گرمی کے دنوں میں بہت فائدہ مند ہوتا ہے۔

ہر موسم میں بچوں اور بالغوں کو لیمو استعمال کرنا چاہیئے۔

●

---

۵ حالہ، دربھنگہ (بہار)

منوج داس

شری اربندو اور ہندوستان کی جدّوجہد آزادی

"۱۵ اگست ۱۹۴۷ء آزاد بھارت کا یوم پیدائش ہے۔ یہ ایک پرانے دور کے خاتمے اور ایک نئے عہد کے آغاز کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کی اہمیت نہ صرف ہمارے لیے بلکہ ایشیا اور تمام دنیا کے لیے ہے کیوں کہ یہ قوموں کی برادری میں ایک نئی طاقت کے داخلے کا مظہر ہے، جو عظیم صلاحیتوں کی مالک ہے اور جسے بنی نوع انسان کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور روحانی مستقبل کے تعین میں ایک اہم پارٹ ادا کرنا ہے۔"
(شری اربندو)

شری اربندو، جو ۱۵ اگست ۱۸۷۲ء کو پیدا ہوئے تھے، پہلے دارجلنگ میں واقع ایک آئرش کنوینٹ میں داخل کیا گیا اور اس کے بعد نو برس کی عمر میں لندن لے جایا گیا۔ ان کے والد بزرگوار نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ ان پر کوئی ہندوستانی اثر نہ پڑے۔ لیکن مقدر میں تو یہ لکھا تھا کہ وہ ایک روز اتنی بلند شخصیت بن کر ابھریںگے کہ انھیں ٹیگور نے "ہندوستان کی آتما کی آواز" قرار دیا۔ سی۔ آر۔ داس نے انھیں "ہندوستانی قوم پرستی کا پیامبر" بتایا۔ ہماری جدّوجہد آزادی میں شری اربندو کے کردار کے بارے میں لوگوں کی ایک کثیر تعداد کو زیادہ علم نہیں ہے۔ چنانچہ قارئین کے استفادہ کے لیے ذیل میں ایک کتاب سے چند اقتباسات پیش کئے جارہے ہیں جو انڈین نیشنل کانگریس کی سو سالہ تقریبات سے متعلق کمیٹی کے زیر اہتمام شائع کی جارہی ہے۔

عظیم فرانسیسی مصنف نے کہا تھا کہ "جب کسی نظریے کی قبولیت کا زمانہ آجاتا ہے تو اس نظریے سے زیادہ طاقتور کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔"

قوم پرستی کوئی نیا نظریہ نہیں تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب اس کا زمانہ آگیا ہے۔ یہ نظریہ ایک عظیم قوت اور ہندوستان کے انگریز حکمرانوں کے لیے وجۂ تشویش بن گیا۔

نہیں قوم پرستی کے جذبے کو مقامی باشندوں کے دل و دماغ پر حاوی نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ ہندوستان میں برطانوی تاج کے اعلیٰ ترین نمائندے نے سوچا۔ یہ تھے لارڈ کرزن جو وائسرائے اور گورنر جنرل تھے۔

انھوں نے اس جذبے کو شروع میں ہی کچل دینا چاہا۔ یہ جذبہ بنگال میں زیادہ نمایاں انداز میں ابھر رہا تھا۔ اس لیے وائسرائے نے تقسیم بنگال کا منصوبہ بنایا کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ ایک منقسم صوبے کے لوگ اپنے فکر و عمل میں متحد نہیں رہ سکتے۔

لیکن ان کی اس کوشش کا نتیجہ الٹا نکلا۔ لوگ پہلے سے زیادہ متحد ہوگئے اور انھوں نے کرزن کی کوشش کو ناکام بنانے کا تہیہ کرلیا۔

یہ ۱۹۰۵ء کی بات ہے۔ سارا بنگال ایک جان ہوکر اٹھ کھڑا ہوا اور باقی ہندوستان نے اس کی حمایت کی۔ شری اربندو جو اس وقت بڑودہ میں پروفیسر تھے، بنگال تشریف لائے اور انھوں نے اس نئے جذبے کو مزید تقویت عطا کی۔

تقسیم مخالف تحریک کے رہنماؤں نے سوچا کہ ایک ایسا کالج ہونا چاہیئے جس میں طلباء کے اندر

قوم پرستی کا سچا جذبہ پیدا کیا جا سکے اور انھیں بے خوف بنایا جا سکے۔ لیکن اس کالج کے لیے روپیہ کہاں سے آئے اور کون اسے عملی شکل دے؟ یہ ایک بڑا سوال تھا۔

ایک روز شام کو کلکتہ کے ایک عظیم الشان جلسے میں ایک دولت مند مگر نیک دل محبِ وطن سُبودھ مَلِک نے اعلان کیا کہ وہ ایک قومی کالج کے قیام کے لیے ایک لاکھ روپے دیں گے۔ لیکن انھوں نے ایک شرط بھی رکھی اور وہ یہ کہ بطور پرنسپل اس کالج کی سربراہی شری اربندو گھوش کریں۔

اس پیش کش اور شرط دونوں ہی کا پرجوش تالیوں سے خیر مقدم کیا گیا۔ اجتماع نے سبودھ ملک کو راجہ کہہ کر ان کی جے کے نعرے لگائے۔ اس کے بعد جب بھی ان کا نام لیا گیا راجہ سبودھ ملک کہہ کر لیا گیا۔ عوام کی طرف سے کسی کو راجہ کا خطاب دئے جانے کی یہ ایک انوکھی مثال تھی۔

شری اربندو نے محسوس کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ وہ اپنی بڑودہ کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیں۔ چنانچہ وہ ۷۵۰ روپے کی ماہانہ تنخواہ اور دیگر آسائشیں چھوڑ کر صرف ۱۵۰ روپے ماہوار کی تنخواہ پر کلکتہ نیشنل کالج کے پرنسپل ہو گئے۔ بعد میں یہ تنخواہ صرف ۵۰ روپے رہ گئی اور پھر صفر پر آگئی۔

شری اربندو کے کلکتہ آنے پر ان کے مدّاحوں کے جوش و خروش کا اندازہ اس خراجِ تحسین سے لگایا جا سکتا ہے جو انقلابی خیالات کے ایک بنگالی جریدہ "سندھیا" کے ایڈیٹر برہم باندھو اُپادھیائے نے ۱۹۰۶ء میں اخبار "بندے ماترم" کے اجراء سے قبل کی شام اپنے اخبار میں انھیں پیش کیا۔

"کیا آپ نے بے داغ سفید لباس میں ملبوس اربندو ___ ایک سو پنکھڑیوں والے کنول (اربندو) کو ہندوستان کے مانسروَر میں پوری بہار پر دیکھا ہے ... ہمارے اربندو دنیا میں ایک نادر اور نایاب شخصیت ہیں ..... وہ ایک پاک اور صاف اور مکمل انسان ہیں۔ ان کے اندر آگ اور بجلی بھری ہوئی ہے پھر بھی ان کا دل کنول کی پنکھڑی کی طرح نازک ہے۔ وہ علم کا ذخیرہ ہیں۔ انھوں نے گیان دھیان میں خود کو فراموش کر دیا ہے۔ آپ تینوں لوکوں میں ان کے جیسا دوسرا آدمی نہیں پا سکتے۔ اربندو نے مادرِ وطن کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے دنیاوی عیش و آرام کو خیرباد کہہ دیا ہے اور بھارت ماں کے ایک سپوت کے طور پر بندے ماترم کی ذمہ داری سنبھالی ہے۔ وہ اپنی ذات میں رشی بنکم کے (امر کرداروں) بھاوانند، جیوانند اور دھیرانند کا امتزاج ہیں۔"

نیشنل کالج نے شری اربندو کی سربراہی میں ترقی کی منازل طے کیں۔ شری اربندو اس کالج کے طلباء کو ہندوستان کے قابلِ فخر سپوت بنانا چاہتے تھے۔ لیکن شری اربندو زیادہ عرصہ تک کالج کی خدمت نہیں کر سکے کیوں کہ زیادہ اہم ضرورتیں ان کی توجہ کی محتاج تھیں۔

ہندوستان کے مایۂ ناز سپوتوں میں سے ایک بپن چندر پال تھے جو ایک فلسفی اور مقرر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بے لوث کارکن تھے۔ وہ ایک اخبار نکالنا چاہتے تھے جو ملک کے سیاسی کارکنان کے درمیان رابطہ برقرار رکھے اور عوام کے دلوں میں جذبۂ حُب الوطنی کو بیدار کرے۔ بپن چندر نے شری اربندو سے مدد کی درخواست کی جسے انھوں نے بخوشی منظور کر لیا۔

بندے ماترم

چنانچہ اخبار "بندے ماترم" کا اجراء عمل میں آیا۔ یہ اخبار ایک مختصر مدت میں ہی بہت مقبول ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اس اخبار کی تمام ذمہ داری شری اربندو کے کاندھوں پر آپڑی۔

اور یہ اخبار انقلاب کا نقیب بن گیا۔ (اس کی عوام سے اُٹھنے اور مادرِ وطن کی خدمت کرنے کی اپیل، حکمرانوں پر اس کا گہرا طنز اور ملکی مسائل پر اظہارِ خیال کا اس کا مخصوص انداز ہندوستانی صحافت میں ایک نئے دَور کے آغاز کا پیش خیمہ بنے) انھوں نے عوام میں ہمّت اور خود داری پیدا کی۔ دی اسٹیٹس مین (The Statesman) کے اُس وقت کے ایڈیٹر مسٹر ایس۔ کے۔ ریٹ کلف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "بندے ماترم" نہایت عمدہ انگریزی اور تیز اور تیکھے انداز میں لکھے ہوئے اداریوں اور خصوصی مضامین سے پُر ہوتا تھا جن سے ہندوستانی اخبارات آشنا نہیں تھے ..... ایک نہایت پُراثر آواز جسے ہم اس زمانے میں قوم پرستانہ انتہا پسندی کہتے تھے۔"

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے جب شری اربندو کلکتہ پہنچے تو اس وقت کانگریس کی باگ ڈور نرم اور آہستہ رَو رہنماؤں کے ہاتھوں میں تھی لیکن اب ایک نئی لیڈرشپ تیار ہو چکی تھی۔ اور عوام رفتہ رفتہ ان کے پیچھے آرہے تھے جس سے انھیں تیزی سے تقویت حاصل ہو رہی تھی۔

اس قسم کے رہنماؤں میں لوک مانیہ بال گنگا دھر تلک تھے جو ہر لحاظ سے ایک عظیم انسان تھے۔ شری اربندو اور تلک نے مل کر کانگریس میں نئے نظریات اور نئے آدرشوں کی حمایت کی۔

۱۹۰۶ء میں کلکتہ میں نیشنل کانگریس کا اجلاس ہوا۔ شری اربندو اور لوک مانیہ تلک کے زیرِ اثر اجلاس میں ایسے ریزولیوشن پاس کئے گئے جن میں پہلی مرتبہ سودیشی، قومی تعلیم وغیرہ قومی آدرشوں کا کھل کر ذکر کیا گیا۔ شری اربندو نے "بندے ماترم" میں لکھا:

"ہماری توقعات پوری ہو گئی ہیں۔ ہمارے

موقف کو تسلیم کیا گیا ہے، خواہ یہ ٹھیک اس
طرح نہیں ہوا جس طرح ہم چاہتے یا جس صفائی
اور درستی کے ساتھ ہم کرتے۔ پھر بھی تمام
عملی مقاصد کے لیے یہ یقیناً کافی ہے (۳۱ دسمبر ۱۹۰۷ء)

بندے ماترم کے صفحات، اور پبلک پلیٹ
فارموں سے شری اربندو نے ہندوستان کی جد و جہد
آزادی کے مشہور اُصولوں پر روشنی ڈالی۔ اور یہ
اُصول اس وقت تک جاری و ساری رہے۔ جب
تک کہ مقصد حاصل نہ ہو گیا اگرچہ یہ اور بات ہے
کہ یہ اس طرح حاصل نہ ہوا جس طرح کہ شری اربندو
چاہتے تھے۔ یہ اصول تھے انگریز حکمرانوں سے عدم
تعاون، برطانوی مال اور برطانوی عدالتوں کا بائیکاٹ
۔ سودیشی صنعتوں کا فروغ، سودیشی طرزِ زندگی
اختیار کرنا، تعلیم کے لیے قومی ادارے قائم کرنا
اور ایک مضبوط اور منضبط والنٹیر کور منظم کرنا۔

اس کے علاوہ شری اربندو نے ہندوستان
کے لیے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا اور کھلے طور پر
یہ مطالبہ کرنے والے مادرِ وطن کے پہلے سپوت تھے۔

کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس سے غیر
ملکی حکمران گھبرا گئے اور انھوں نے شری اربندو کے
خلاف ایک مقدمہ دائر کر دیا جس میں ان پر بندے
ماترم کے ذریعے بغاوت پھیلانے کا الزام لگایا
گیا۔ ملک کا یہ پہلا اخبار تھا جس پر یہ الزام عائد
کیا گیا۔

اس سے کافی سنسنی پیدا ہوئی۔ بپن چندر
پال کو عدالت میں حاضر ہونے پر مجبور کیا گیا، لیکن
انھوں نے شری اربندو کے خلاف شہادت دینے
سے انکار کر دیا۔ برطانوی قوانین سے اس قسم کے عدم
تعاون کے "جرم" میں انھیں چھ ماہ کی قید کی سزا
ہوئی۔

یہی وہ وقت تھا جب رابندر ناتھ ٹیگور
نے شری اربندو پر اپنی مشہور نظم لکھی، جس کی چند
سطور درج ذیل ہیں:۔

اے اربندو!
رابندر ناتھ تیرے آگے سر جھکاتا ہے۔
اے دوست!
میرے ملک کے دوست، ہندوستان کی آتما کی آواز!
تجھے سلام۔

شری اربندو کے خلاف الزام ثابت نہیں ہو سکا
نہ ہی یہ ثابت کیا جا سکا کہ وہ اس اخبار کے
ایڈیٹر ہیں۔ لہٰذا انھیں رہا کر دیا گیا اور اس پر
تمام ملک میں خوشیاں منائی گئیں۔

سورت اجلاس

۱۹۰۷ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا ۲۳واں
اجلاس سورت میں ہوا۔ اس وقت کانگریس دو
دھڑوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک دھڑا ان لوگوں کا
تھا جو آہستہ روی میں یقین رکھتے تھے، اتنی زیادہ
آہستہ روی میں کہ وہ انگریز سے آزادی حاصل کرنے
کی بات نہ کہتے تھے۔ انھیں اعتدال پسند کہا جاتا تھا۔
اس کے برعکس جو لوگ آزادی کے لیے واضح اور غیر مبہم
اقدامات کرنا چاہتے تھے انھیں نیشنلسٹ کے نام سے
موسوم کیا جاتا تھا۔

سورت کانگریس میں نیشنلسٹ گروپ
سودیشی، عدم تعاون اور بائیکاٹ کے اُصولوں کی
حمایت میں ریزولیوشن پاس کرنا چاہتا تھا، لیکن
اعتدال پسند، جو استقبالیہ کمیٹی کے عہدوں پر فائز تھے،
اس قسم کی تجاویز منظور کرنے کو تیار نہ تھے۔ اجلاس
شروع ہونے سے پہلے ہی صورتِ حال میں کشیدگی
پیدا ہو چکی تھی۔

اعتدال پسندوں نے اجلاس کی صدارت
کے لیے ڈاکٹر راس بہاری گھوش کو منتخب کیا،
لیکن نیشنلسٹوں نے اس انتخاب کی مخالفت
کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایسا انھوں نے اُس وقت کیا
جب ان کی اپنی سب نہیں تو کچھ تجویزیں اعتدال
پسندوں سے منوانے کی کوششیں بھی ناکام ہو گئیں۔
بالآخر دس ہزار سے زیادہ حاضرین کی موجودگی
میں اجلاس شروع ہوا لیکن اس روز بڑا ہنگامہ
ہوا ... لیکن کانگریس ٹوٹی نہیں کیوں کہ یہ تو
محض اعتدال پسندانہ پالیسی کے خاتمے کا آغاز تھا۔

نئے دور کے نقیب

سورت کانگریس نے آزادی کی جانب ملک
کی پیش قدمی کی رفتار میں بے مثال اضافہ کیا۔ شری
اربندو اور تلک کا ایک نئے دور کے نقیبوں اور
ایسے بہادر دیش بھگتوں کی حیثیت سے خیر مقدم کیا
گیا جنھوں نے ملک کے سامنے وہ نظریات پیش
کیے جن کے لیے لڑنا درست تھا۔

شری اربندو لوگوں کے دل و دماغ پر چھا گئے
اور ان کی مدح و ستائش کا موضوع بن گئے۔ جہاں
کہیں وہ گئے، ان کا پُرجوش استقبال ہوا۔ کانگریس
کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ ہی سنہرے حرفوں میں لکھا جائیگا۔
ایک سال بعد جب ان پر علی پور سازش کیس کا
مقدمہ چلایا جا رہا تھا تو سرکاری وکیل مسٹر ایرڈلے نارٹن
نے جو شری اربندو کو قصوروار ثابت کرنے کے لیے
ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے، دُکھ بھرے انداز
میں کہا:

"اربندو جہاں بھی گئے ان کا ایک راجہ اور بادشاہ
کی طرح استقبال کیا گیا اور حقیقت تو یہ ہے کہ انھیں
نہ صرف بنگال بلکہ سارا ملک کا لیڈر سمجھا گیا۔"

۱۹۰۸ء میں کلکتہ میں نہ اتنی زیادہ بھیڑ بھاڑ تھی
نہ اتنی عمارتیں جتنی کہ آج ہیں۔ شہر میں بہت سے
پُرسکون مقامات موجود تھے۔ ایک ایسا ہی مقام
مانک تلہ گارڈن تھا۔ اس میں ایک مکان تھا جو
درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ مکان کے قریب ایک تالاب
تھا جس کے چاروں طرف جھاڑیاں تھیں۔

۲۲ مئی ۱۹۰۸ء کو جب کہ ابھی اندھیرا ہی تھا
پولیس مینوں کی ایک بڑی تعداد نے گارڈن پر حملہ

بول دیا۔ مکان میں رہنے والوں کو جگاکر پولیس تھانے لے جایا گیا۔ انھیں گرفتار کر لیا گیا تھا۔

پولیس نے کہا کہ اس نے مکان سے بہت سی قابلِ اعتراض چیزیں برآمد کی ہیں، مثلاً بم بنانے کا سامان اور نوٹ بکیں جن میں بم بنانے کے طریقے لکھے ہوئے ہیں۔

جب گارڈن پر ہلّہ بولا گیا تو اسی وقت ایک اور پولیس پارٹی نے گرے اسٹریٹ میں ایک مکان کا محاصرہ کیا۔ یہ مکان شری اربندو کے چھوٹے بھائی شری اربندو برندرا کمار کا تھا۔ انھیں بھی گارڈن میں ان کے رفقاء کے ساتھ ہی گرفتار کر لیا گیا۔ یہاں بھی پولیس نے یہ دعویٰ کیا کہ اس نے بہت سے "خطرناک" سامان برآمد کیے ہیں۔ لیکن کچھ عرصے بعد پتہ چلا کہ یہ خطرناک سامان اپنی بیوی کے نام لکھے گئے شری اربندو کے چند خطوط اور خشک کیچڑ کے ایک تودے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ خشک مٹی یا کیچڑ کوئی صاحب دکشنیشور کی گنگا سے جہاں شری رام کرشن پرم ہنس رہتے تھے متبرک سمجھ کر لے آئے ہوں گے۔

شری اربندو گرفتار کیے گئے نوجوانوں میں سے زیادہ تر کو نہیں جانتے تھے اس لیے یہ کہنا دشوار ہے کہ انھیں ان لوگوں کی سرگرمیوں کے بارے میں کتنا علم تھا۔ حکومت بھی ان نوجوانوں کے ساتھ شری اربندو کے رابطے یا تعلق کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی لیکن حکمرانوں کا مقصد تو انھیں کسی نہ کسی طرح کسی بھی قیمت پر پھنسانا تھا۔

حکومت شری اربندو کی روز افزوں مقبولیت سے خائف تھی۔ ان کی شاندار، روحانی شخصیت بے شمار نوجوانوں کو بے ساختہ اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ وہ کبھی زیادہ نہیں بولتے تھے۔ لیکن جو کچھ بھی وہ کہتے، ان کے پیرو اسے مقدس اور حرفِ آخر سمجھ کر قبول کرتے۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس اس وقت کلکتہ آئے۔ جب شری اربندو سیاسی منظر سے الگ ہو چکے تھے۔ نیتاجی نے شری اربندو کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

"جب میں ۱۹۱۳ء میں کلکتہ آیا تو اربندو ایک افسانوی شخصیت بن چکے تھے۔ میں نے ایک رہنما کے بارے میں لوگوں کو اتنے پرجوش انداز میں بات کرتے ہوئے بہت کم دیکھا ہے۔ اس عظیم انسان کے بارے میں بہت سی کہانیاں زبان زدِ عام تھیں جن میں سے کچھ شائد سچ تھیں۔"

لہٰذا حکام شری اربندو کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ گرفتاری کے بعد شری اربندو اور دیگر افراد کو پہلے علی پور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس کے بعد مقدمہ علی پور کی سیشن عدالت میں منتقل کر دیا گیا۔

جج مسٹر بیچ کرافٹ تھے جو کیمبرج میں شری اربندو کے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ وہ ایک ذہین طالب علم تھے مگر شری اربندو کے بعد۔

مقدمے کے دوران یکے بعد دیگرے کئی ڈرامائی واقعات رونما ہوئے۔ ایک ملزم سرکاری گواہ بن گیا تھا۔ اسے دو نوجوانوں نے دن دہاڑے جیل میں گولی مار کر ہلاک کر دیا، گو وہ یہ جانتے تھے کہ اس کی پاداش میں انھیں پھانسی کی سزا ہوگی۔ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ انھیں ریوالور کہاں سے ملے تو انھوں نے جواب دیا" خودی رام کے جذبے سے" وہ افسر جس نے پرفُل چاکی کو گرفتار کیا تھا، موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور قاتل کا پتہ نہ چل سکا۔ سرکاری وکیل بسو اس کو جو کراؤن بیرسٹر نارٹن کے اسسٹنٹ تھے۔ عدالت کی سیڑھیوں پر ایک نوجوان نے گولی مار دی۔ بعد میں اس نوجوان کو پھانسی دے دی گئی۔

نارٹن لکھتا ہے "سیشن کورٹ میں ملزمان کو تاروں کے ایک جال کے پیچھے رکھا گیا تھا اور کمرہ عدالت میں پولیس بندوقیں تانے ہوئے کھڑی تھی اور مقدمات کی سماعت کے دوران میرے پاس پانچ چیمبروں والا ایک بھرا ہوا پستول موجود تھا۔ حکومت نے جو فیس مجھے ادا کی تھی اسے مدنظر رکھتے ہوئے اس نے مجھے ایک بیش قیمت سرمایہ سمجھا۔ اسی لیے اس نے اس بات پر زور دیا کہ میری پوری حفاظت کی جائے۔ میرے گھر کے ارد گرد بھی سی آئی ڈی کے قابل افسران تعینات تھے اور جب میں موٹر میں عدالت جاتا تھا تو بھی سی آئی ڈی کے افسران حفاظت کے لیے میرے ساتھ ہوتے تھے۔ کسی کی بھی نگاہ میں یہ سب اپنے بھرے ہوئے ریوالوروں کے ساتھ میرے لیے زیادہ خطرناک تھے بہ نسبت میرے ممکنہ قاتلوں کے۔"

شری اربندو کے خلاف استغاثہ کا مقدمہ فیل ہو گیا۔ اپنی رہائی کے بعد انھوں نے دو مقالات جاری کیے۔ دھرم اور کرم یوگی۔ مگر حاکم انھیں ملک بدر کرنا چاہتے تھے۔ جب تک وہ شری اربندو کے خلاف اور ایک اور مقدمہ تیار کریں اور انھیں گرفتار کریں، شری اربندو لاپتہ ہو گئے۔ اس پر ہاؤس آف کامنز میں گرما گرم بحث ہوئی اور سر رامسے میکڈانلڈ اور کیر ہارڈی نے لارڈ ایسکویتھ کی وزارت پر شری اربندو کو پریشان کرنے کا الزام لگایا۔ گورنر جنرل لارڈ منٹو اب بھی شری اربندو کو ملک بدر کرنے پر زور دے رہے تھے اور سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا لارڈ مورلے انھیں ایسا کرنے سے باز رہنے کی ترغیب دے رہے تھے کہ اچانک یہ خبر آئی کہ شری اربندو فرانسیسی نوآبادی پانڈیچری پہنچ گئے ہیں — چوں کہ انھیں اپنے فہم و ادراک اور دُور اندیشی کی بنا پر یہ احساس ہو گیا تھا کہ اب ہندوستان کی آزادی امرِ یقینی بن چکی ہے، اس لیے وہ روحانیت کی تلاش میں نئے سبزہ زاروں پر نکل پڑے تاکہ انسانیت کو روحانیت سے مستفید کر سکیں۔

●

پروفیسر سید بشیر علی کاظمی

اُردو کی وُسعت

قسط : ۱

اُردو زبان کا ارتقاء اور اس کی عہد بہ عہد ترقی کو سمجھنے کے لیے اس کے مختلف ناموں سے واقفیت ضروری ہے کیونکہ دراصل یہ نام اس کی راہِ ترقی کے سنگِ میل ہیں۔ لسانی دریافت ہماری زبان کے ڈانڈے آریوں کی آمد اور اس عہد کی زبان سے ملا دیتی ہے۔ شمالی ہندوستان میں مختلف بولیاں اپنی اپنی صورتوں میں پروان چڑھتی رہیں، مسلمانوں کی آمد کے بعد ان کی لائی ہوئی زبان کی چھاپ مقامی زبانوں پر کس طرح پڑی، اب یہ بتانا ذرا مشکل ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغربی ہندی وہ زبان تھی جس نے مسلمانوں کی زبان کو اپنانے میں نہایت فراخ دلی سے کام لیا۔ بالآخر مقامی زبانوں کی ایک ہونہار بیٹی زمانے کے گرم و سرد سہتی اُردو کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کو اپنے ارتقار کے لیے جہاں تہاں نت نئے چولے بدلنے اور طرح طرح کے روپ دھارنے پڑے مگر ہر رنگ گزشتہ سے چوکھا رہا اور اب نوبت یہاں تک پہونچی ہے کہ وہ جدید زبانوں میں اپنا سر اونچا کر کے کسی جھجک کے بغیر بات کر سکتی ہے۔

قبل اس کے کہ اُردو کے مختلف نام گنائے جائیں۔ ایک بات کے حسب و نسب کے متعلق بھی عرض کر دوں جو اس کے نجیب الطرفین ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ زبانیں عموماً مادری کہلاتی ہیں مگر اس زبان کو پدری کہلانے کا بھی شرف حاصل ہے منشی اقبال ورما سحر بحوالہ اپنے اُستاد مولوی ضیار احمد صاحب فرماتے ہیں "ہماری مادری زبان ہندی ہے، ہمارے ملک کا نام ہندوستان ہے کیونکہ ہم اس نام سے عرب و فارس اور مصر میں یاد کیے جاتے ہیں"۔ شاہی دربار سے تعلق رکھنے والوں میں ایک پدری زبان مستعمل ہونے لگی جس کو اُردو نام بعد کو دیا گیا۔ کنہیا لال کپور اپنے انسانے "برج بانو" میں اسی خیال کے حامی نظر آتے ہیں۔ اس درباری تعلق کی بنار پر اس کو "شاہی زبان" بھی کہا گیا ہے۔ مگر ہندی کے اکثر ادیبوں کا خیال ہے کہ اُردو کا دراصل حکومت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اُردو تو دربار کے ایرانی تورانی امیروں سے متعلق تھی۔ اب اُردو کے نام سنئے۔ ہندی، ہندوی، بھاکا، بھاشا، نبی جی کی بھاشا، مسلمانی بولی، ترکوں کی زبان، ناگری، کھڑی بولی، زبانِ اورنگ آبادی، زبانِ گجراتی، دکھنی زبان، ریختہ (ریختی)، زبانِ ہندوستانی، زبانِ دہلوی، زبان پنجابی، انڈوستان، زبان مور، آردا، ہندوستانی، انڈین ورناکیولر، اردو۔

ان ناموں میں کچھ ایسے ہیں جو لفظ ہند سے ماخوذ ہیں۔ جو خود لفظ "سندھ" کی معرب صورت ہے۔ مگر یہی لفظ یونان پہونچ کر "اند" ہو جاتا ہے۔ شمالی ہندوستان میں عوام کی زبان ہمیشہ ہندی رہی ہے خواہ وہ مشرقی ہندی ہو یا مغربی ہندی۔ مسلمان بادشاہوں نے اس میں شاعری کی ہے اور اس کے ادیبوں کو نوازا ہے۔ مغل عہد تو خیر ہندی کا عہدِ زرّیں کہلاتا ہے۔ مسلمانوں کی زبانیں عربی، فارسی اور ترکی تھیں۔ لہٰذا انھوں نے ہمیشہ مقامی زبان کو ہند کی مناسبت سے ہندی کہا۔ لیکن جہاں پرانی ہندی اور نوزائیدہ اُردو زبان میں امتیاز منظور ہوتا تھا تو ہندیٔ محض کو زبانِ اہلِ ہنود کہتے تھے۔ اس لفظ کی اشاعت میں علاقائی عصبیت بھی کارفرما رہی ہے۔ صوبوں اور علاقوں کے نام سے زبان کو پکارنا وطن پرستی کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اس ذہنیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ رہا ہے کہ پورے ہندوستان کو سکیڑ کر یوپی میں محدود کر دیا جاتا تھا۔ پنجاب، بنگال

اور دکن کے رہنے والے آج تک یوپی کے باشندوں
کو ہندوستانی اور ان کی زبان کو ہندی کہتے ہیں ۔

مسلمان ادیبوں نے اُردو کے لیے ہندی کا
لفظ استعمال کیا ہے ۔ حکیم یوسفی اپنے قصیدہ در لغات
ہندی میں جو دسویں صدی ہجری کی تصنیف ہے ۔ فرماتے
ہیں " نام ہر چیزے بہ ہندی بشنو از من اے پسر " مولانا
قطب الدین دہلوی کی اُردو کتاب احکام العیدین جو
نول کشور پریس لکھنؤ میں چھپی ہے، اس کے دیباچے کی
عبارت میں لکھا ہے " اگرچہ یہ شرح زبان ہندی میں اہل
علم جس کی طرف التفات نہیں کرتے لکھی گئی ہے "۔ دکن
میں بھی اُردو کو ہندی کہا گیا ہے ۔ ملا محمد کاظم اورنگزیب
کے متعلق عالمگیر نامے میں لکھتے ہیں " بہ جمع از اہل سنہ ر
کو فارسی نمی دانند یا نیکو نمی توانند گفت بہ ضرورت بہ
لغت ہندی زبان می کشایند " مولانا باقر سنہ ۱۸۰۵ ء
میں اپنے ایک رسالے کی زبان کو "ہندی" کہتے ہیں ۔
(تو ہندی زبان یہ رسالہ ہوا) ۔

حاتم اپنے " دیوان زادہ " مرتبہ ۱۷۵۵ء میں لکھتے
ہیں " میں نے تحریر کے لیے وہ زبان اختیار کی ہے جو
ہندوستان کے تمام صوبوں میں مستعمل ہے یعنی جس کو
بھاکا بھی کہتے ہیں کیونکہ عوام اس کو سمجھتے ہیں اور ساتھ
ہی ساتھ خواص میں بھی مقبول ہے "۔ یہاں بھاکا اور
ہندی ہم معنی استعمال ہوئے ہیں اور یہ حقیقت بھی
ہے کہ بھاکا اس زبان کے لیے مستعمل تھا جس کا تعلق
سنسکرت سے کم ہوتا تھا ۔ بھاشا سے بھاکا بنا "ش" کو "ک"
سے تبدیل کیا گیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اصل بھاشا
سے " شی بھاکا " میں بھی یقیناً تبدیلیاں کی گئیں ۔ بھاشا
دراصل ہندی شاعری کی زبان کو کہتے ہیں اور اسی وجہ سے
اُردو شاعری کی زبان کو بھی "بھاشا" کہا گیا ہے ۔ جہاں
تک حاتم کے " دیوان زادہ " کا تعلق ہے ، یہ کوشش
اُردو ادب میں سب سے پہلی بغاوت تھی جس کے
علمبردار گلشن اور شاہ حاتم تھے ۔

امیر مینائی اپنے ایک شاگرد کو لکھتے ہیں " میاں
اصل میں بھاکا ہے، ہندی میں "کھا" اور "شا" کا بدلنا
ہے ۔ اُردو میں فصحا کی زبان پر بھاکا اور اکثر بھاشا مستعمل
ہے "۔ میر غلام علی آزاد کا خیال ہے کہ " بھاکا کی نثر اچھی
نہیں ہوتی "۔ اکبر الہ آبادی فرماتے ہیں ۵

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی
لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے

کرنل ٹاڈ نے اپنی تاریخ راجستھان میں لکھا ہے ۔
" اس وقت ملک بھر کی زبان بھاشا تھی ۔ راجپوتانہ
میں بھی یہی بولی جاتی تھی ۔ گھروں میں بھی ، بازاروں
میں بھی ، سرکاروں میں بھی اور درباروں میں بھی اس کا
رواج تھا ، رنواسوں میں جہاں تک مسلمانوں کی ہندو
رانیوں اور محلات شاہی کی راجپوت شہزادی بیگمات کا
تعلق ہے بھاشا ہر طرف چھائی ہوئی تھی جو سنسکرت
الفاظ کی آمیزش سے خالی تھی ، اسی کے متعلق پنڈت
برج موہن دتاتریہ کیفی نے اپنے لیکچر موسوم " ناگزیر قیل و
قال " میں یہ صراحت تحریر فرمایا ہے " بڑے اور اونچے
خاندان کی عورتوں کی جو زبان تھی وہ اور بھی آسان
تھی ۔ بے تکلف ذرا سی کوشش سے سمجھ میں آجاتی ہے "۔
موصوف نے اس کی نظیر میں ایک خط جنوری ۱۱۹۳ ء
کا تحریر شدہ نقل کیا ہے ۔ سال مذکور میں سلطان محمد
شاہ غوری اور مہاراج پرتھوی راج میں ترائن کے مقام
پر آخری فیصلہ کن جنگ ہوئی ۔ پرتھوی راج کا داماد یعنی
پرتھا بائی کا شوہر چتوڑ کا راول سمیر سنگھ بھی اس میں
شریک تھا ، وہ بھی کام آیا ۔ رانی پرتھا نے ستی ہونے
سے پہلے اپنے بیٹے کو یہ خط لکھ کر چتوڑ بھیجا تھا ۔ " سری
حضور سمر (جنگ) میں مارے گئے اور ان سنگ رشی کیش
سبھی دے کنٹھ کو سدھارے ، رشی کیش جی ان چار
لوگوں میں سے ہیں جو لڑائی سے میرے سنگ دہلی میں
آئے تھے ، اس لیے ان کی خاطر رکھنا ہے ۔ دونے (اور)
باچھے پیاری گران (جاگیری گران) کی منشا کی خاطر راکھو "

خواجہ عشرت لکھنوی کی تحقیق یہ ہے کہ برج بھاشا
یعنی بھاکا جو کسی وقت عام زبان ہند تھی اور جس میں
عربی ، فارسی الفاظ کی کثرت سے شامل تھے ۔ اسی سبب
سے متعصب پنڈتوں نے اس زبان یعنی بھاکا کو " ملیچھ
زبان " کا لقب دیا تھا ۔ "امرائے ہنود" "دولت مغلیہ"
میں لکھا ہے کہ ہندو مدتوں تک مسلمانوں کی زبان کو ملیچھ
بھاشا کہہ کر نفرت کرتے تھے ۔ بحث اس کی یہ ہے کہ
اس وقت شمالی ہندوستان میں عام طور سے دو زبانیں
مستعمل تھیں ۔ ایک جس میں سنسکرت کا ترجمہ ہوتا تھا یا
شاعری کی زبان تھی ، بھاشا کہلاتی تھی اور دوسری زبان جو
فاتح اور مفتوح کے درمیان تبادلۂ خیالات کا ذریعہ بنی
ہوئی تھی ۔ ہندی یا ہندوی کہلاتی تھی اور یہ نام مسلمانوں
کا ہی دیا ہوا تھا ۔ ملک محمد جائسی کا ایک شعر ہے ۔

ترکی عربی ہندوی بھاشا جیتی آہی
جامیں مارگ پریم کا سبھی سراہیں تاہی

ان اقوال کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بھاشا اور بھاکا
میں ضروری امتیاز تھا لیکن " بھاشا " " بھاکا " اور
" ہندی " نزاع یدہ زبان کے لیے بھی مستعمل تھے ۔ بے جا نہ
ہوگا اگر ہم یہاں کچھ برج بھاشا اور کھڑی بولی کے متعلق
عرض کر دیں ۔ برج بھاشا سے مراد ہے وہ زبان جو برج
کے علاقے میں بولی جاتی تھی ۔ برج کا علاقہ دراصل میرٹھ
اور متھرا کے آس پاس کا تھا لیکن اس علاقے کی زبان
یعنی برج بھاشا اس وقت آگرہ ، متھرا ، گوالیار ، جے پور ،
گڑگانواں ، بلند شہر ، علی گڑھ ، ایٹہ ، مین پوری ،
بدایوں ، بریلی ، مراد آباد ، اور پرگنہ نینی تال وغیرہ میں
بولی جاتی تھی ۔ یعنی شمالی اور درمیانی دوآب علاقے
کی بھی زبان تھی ۔ شیرانی صاحب کا خیال تھا کہ مسلمانی
عہد میں اس زبان میں موسیقی اور شعر کا بہت رواج
رہا ہے ۔ ابتداً اس زبان کو محض مقامی حیثیت حاصل
تھی ۔ لیکن نویں صدی ہجری کے نصف دوم میں موسیقی کی
بنا پر اس زبان نے ادبی امتیاز حاصل کر لیا ۔ اس سلسلے میں
راجہ مان سنگھ گوالیاری کا نام ہمیشہ یاد رہے گا ۔ راجہ مان
سنگھ کے تعلق سے یہ زبان گوالیاری کہلانے لگی اور ایک
زمانے تک اس میں راگ راگنیوں کی ایجاد ہوتی رہی ۔

دربار شاہی میں بھی موسیقی کے ذریعے اس کی رسائی تھی، چونکہ ہندو مسلم دونوں اس میں حصے لیتے رہے ہیں اس لیے یہ وہی مشترک زبان ہے جو آگے چل کر اُردو کہلائی۔

مسلمانوں کی آمد سے بہت قبل ہندوستانی پراکرتوں کا زمانہ قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ مسلمان اپنی آمد پر ہندی یا ہندوی زبان کو مختلف صورتوں میں دیکھتے ہیں اور یہ اختلاف علاقائی پراکرتوں کی وجہ سے تھا۔ سب سے پرانی پراکرت کا نام "آرشا" تھا، کیونکہ ہیم چندر نے اپنی کتاب "پراکرشٹ ادھیائے" میں اس کو رشیوں کی زبان بتایا ہے۔

اس کا دوسرا نام "رشی بھاشا" بھی ہے۔ عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ارش بھاشا بھی ویدک زبان کے ساتھ ساتھ وجود میں آئی تھی۔ لیکن جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ بہت سی علاقائی پراکرتیں وجود میں آتی گئیں۔ ایک زمانے کے بعد ایک ملی جلی زبان سے وجود میں آئی جو اردھ ماگدھی کہلائی کیونکہ اس میں شورشینی اور ماگدھی کی آمیزش تھی اور اب یہ مہاراشٹری کی جانشین بن بیٹھی۔ مہاراشٹری بھی مخلوط پراکرتوں کا نتیجہ تھی جس کو محض پراکرت بھی کہا جاتا تھا۔ اب آگے چل کر اس پراکرت کی جگہ بھاشا نے لے لی۔ مسلمانوں کو یقیناً مقامی زبانوں کے اختلاف سے ایک گونہ دشواری ہوتی ہوگی اور ان کو فیصلہ کرنا پڑا ہوگا کہ وہ کس بولی کو اپنی ضروریات کے لیے منتخب کریں، لہٰذا انھوں نے ان بولیوں میں سے اس بولی کو منتخب کیا جو ان میں سب سے زیادہ بہتر اور صاف تھی اور اس کا نام ریختہ رکھا۔ کچھ عرصے بعد ہندوؤں نے اس پرانی ہندی کی اس جدید شاخ کو ناگری کہا۔ ناگری سے مراد نگر یعنی شہر کی بولی ہے۔ یہ بات بھی نہ بھولنی چاہیئے کہ مخلوط پراکرتوں کے سبب جو ایک زبان اردھ ماگدھی کہلاتی تھی۔ اس کو بھی ناگر کہتے تھے کیونکہ وہ بھی قصبات اور شہروں میں بولی جاتی تھی، اس کو ناگری کھڑی بولی بھی کہا گیا ہے۔

کھڑی یا کھری، ہندی زبان میں صاف اور پاک کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا تلفظ دونوں طرح صحیح ہے لہٰذا کھری یا کھڑی بولی سے مراد وہی ہے جو مخلوط زبان ہے جو آہستہ آہستہ ادبیت کی طرف گامزن تھی۔ آگے چل کر ریختہ، کھڑی بولی یا کھری بولی اور ناگری ہم معنی الفاظ ہو گئے اور شمالی ہندوستان کے لوگوں کے ذریعۂ اظہار کے لیے بھی زبان مخصوص ہو گئی۔ کھڑی بولی کا علاقہ مراد آباد، رام پور، بجنور اور سہارن پور کا علاقہ تھا۔ چنانچہ آج کل بھی مراد آباد اور اس کے قریب وجوار کی زبان صرف ونحو کے اعتبار سے کتابی اُردو ہے اور یہ برج بھاشا کی ترقی یافتہ صورت اور اس کی جانشین بھی ہے اور اسی پر اُردو کی بنیاد ہے۔

ریختہ عام طور پر شعر کی زبان کو کہتے تھے۔ گو اس لفظ سے ایک ذم کا پہلو بھی نکلتا ہے کیونکہ درباری زبان سے اس نوخیز چھوکری کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ فارسی کا اس کو منہ لگانا کسرِ شان تھا۔ ریختہ زبان کے علاوہ ایک بحر کا نام بھی ہے جس میں کبیر نے طبع آزمائی کی ہے۔ اس کو ریختہ دراصل اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں طرح طرح کے الفاظ اور رنگ برنگ کی ترکیبیں موجود ہیں۔ فیض صاحب کا خیال ہے کہ ریختہ "مردوں کی زبان" تھی اس کا ہندوانی نام انتراویدی ناگری تھا کیونکہ یہ گنگا و جمنا کے دوآب میں بولی جاتی تھی۔ ہندو اس کا ادبی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے، لیکن ہندو مسلم دونوں اس کو بولتے تھے۔ مسلمانوں کی حکومت کے استحکام اور ہندوؤں کی فارسی دانی کی وجہ سے روز بروز فارسی عربی کے الفاظ بڑھتے گئے تو ہندی شاعری کو بھی فارسی رسم الخط میں لکھا جانے لگا۔ اُردو کا موجودہ رسم الخط پنڈت تلک کاشمیری ہی کی ایجاد ہے۔ اہلِ کشمیر فارسی ادب سے خاص لگاؤ رکھتے تھے اور مسلمانوں کے عہد میں انھوں نے اسلامی تہذیب کو اس طور سے اپنایا تھا کہ آج تک ان کی زبان ولباس اور رہن سہن اس گزشتہ تعلق کا آئینہ دار ہے۔ اسی لیے "اہلِ خطہ" اپنے آپ کو اہلِ زبان کہتے ہیں۔

میر تقی کے پیرو تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ریختہ نام ایرانی شاعروں نے شاہ جہاں کے عہد میں اس مقامی زبان کو دیا تھا۔ لیکن امیر خسرو کی زبان جو مغلیہ دور سے پہلے کی ہے ریختہ سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ لیکن امیر خسرو نے اسے خود ہندی یا ہندوی کہا۔ کبیر، خسرو کے بعد ۱۳۵۸ء میں پیدا ہوئے یعنی خسرو سے ۳۰ سال بعد اور انھوں نے ریختہ میں شاعری کی ہے ؎

سوانگ تو ساہو کا کام ہے چور کا
بات بہت کہے جھوٹے چھوٹے نہیں
کپٹ کی چھٹ میں بہت دھائے
مکھ کے کہے کھا کھا نڈ کھاوتے

کبیر کے بعد نانک ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے اور انھوں نے ایسی زبان میں شاعری کی ہے جو ریختہ یا کھڑی بولی سے مشابہت رکھتی ہے گو اس میں پنجابی زبان کی آمیزش ضرور ہے جیسے :-

یا سنسار رینداسپنا کہیں دیکھا کہیں نہیں دکھایا
سوچ بچار کرے مت من میں جس نے ڈھونڈا اسی نے پایا

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مغربی ہندی کی ترقی یافتہ شاخ ریختہ کہلاتی تھی۔ ممکن ہے یہ نام فارسی شعرا نے بھی رکھا ہو لیکن یہ بات ہرگز مغل دور کی نہیں۔ اغلب ہے کہ سکندر لودھی کے عہد میں ایسا ہوا جب کہ کائستھوں نے فارسی زبان کا پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ مسلمان ریختہ کو فارسی رسم الخط میں لکھتے اور ہندو ناگری رسم الخط استعمال کرتے تھے۔ مولانا باقر آغا کا خیال ہے کہ "جب سے ہندی میں عربی فارسی کا میل ہوا تب ہی سے اس کا نام ریختہ ہوا اور شعر کی زبان کے لیے مخصوص ہو گیا کیونکہ مسلمان فارسی داں ہوتے لیکن مطالبہ وقت کے تحت یا خوش گپی کے لیے فارسی ہندی ملا کر شعر کہتے اور اس مخلوط زبان کو ریختہ کہتے تھے۔"

اب یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دہلی جو شاہی پایۂ تخت تھا وہاں دو جماعتیں تھیں۔ ایک تو وہ جماعت

جس کے شاعر و ادیب نووارد ایرانی تورانی تھے، اور دوسری جماعت میں وہ ہندوستانی نوجوان شامل تھے جن کے باپ دادا تو ایرانی تورانی تھے لیکن وہ اب خود ہندوستانی تھے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے ایرانی ہمیشہ ہندوستان والوں کو بنظر تحقیر دیکھتے تھے جس کے نتیجے کے طور پر ہندوستان میں بھی وطن پرستی کا زور ہوا۔ ہندی ایرانی کا جھگڑا عام ہوا۔ ایرانی تورانی شاعروں اور فارسی گویوں کے توڑ پر ریختہ گویوں نے مجلس مراختہ کی بنا ڈالی اور اب یہ لفظ رفتہ رفتہ نثر کی زبان کے لیے بھی مستعمل ہونے لگا۔ ادھر ایک نیا گل کھلا۔ ہندی فضا میں دستور عشق ایران سے بالکل مختلف ہے، ریختہ والوں نے اپنے ایرانی مذاق کو خیرباد نہیں کہا بلکہ زبان کی تانیث کرڈالی یعنی ریختہ سے ریختی بھی پیدا ہوگئی۔

ہندی ادب کی تاریخ میں کھڑی بولی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ اپ بھرنش بھاشاؤں میں صرف ایک کا ذکر کیا جائے گا۔ پہلے یہ زبان میرٹھ سے آگے نہیں بڑھی مگر مسلمان فاتح اس کو ہندوستان کے کونے کونے میں لے گئے اور اس کو اپنا کر ملک بھر میں پھیلا دیا۔ (باقی آئندہ) ●

بقیہ، دہلی میں انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کی گولڈن جوبلی کانفرنس

۱۔ ہم ترقی پسند ادیب فرقہ داریت، احیاء پرستی، اور دہشت پسندی کی پُرزور مذمت کرتے ہیں۔

۲۔ ہم اپنی تحریروں سے اور جمہوری رائے عامہ کے ذریعہ بین الاقوامی سطح پر پھیلے ہوئے نیوکلیائی خطرے کا مقابلہ کرنے اور امن عالم کے تحفظ کے لیے فضا ہموار کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

۳۔ ہم ترقی پسند ادیب، ملک میں اور ملک کے باہر جہاں بھی جبر و استبداد اور استحصال ہو رہا ہے اور جہاں بھی نسلی امتیاز اور عدم مساوات موجود ہے اس کے خلاف آواز بلند کرنے اور جدوجہد کرنے کا عہد کرتے ہیں۔

۴۔ ہم اپنے ہمعصر ادیبوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ عوام سے گہرا ربط قائم کریں اور خاص کر عوامی ادب کی روایات اور جمالیات سے قریب تر ہوں اور ایسا ادب پیش کریں جس میں ہمارے مسائل ہی نہیں ہمارے لوک کلچر اور اعلیٰ انسانی اقدار کی ترجمانی ہو۔

اس اجلاس میں علی سردار جعفری کو نئی مجلس صدارت کا چیئرمین اور ڈاکٹر قمر رئیس کو کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کا جنرل سیکریٹری چنا گیا۔ کانفرنس کے انعقاد میں دہلی کی اردو اکیڈمی نے ہر ممکن تعاون کیا۔ اس کے علاوہ ہریانہ اردو اکیڈمی اور جناب شاہد صدیقی (اڈیٹر نئی دنیا) کی طرف سے کانفرنس کے مندوبین کو ضیافت دی گئی۔ کانفرنس کے اجلاسوں کے علاوہ بزم مشاعرہ اور شام افسانہ بھی ہوئی جس میں باہر سے آئے ہوئے فنکاروں نے حصہ لیا۔ ●

بقیہ، یادِ ذوق سیمنار

ادیبوں نے اپنے گرانقدر خیالات سے مستفید فرمایا۔ شام کو ہریانہ اردو اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر جاوید وششٹ کی صدارت میں ایک محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ دوسرا اجلاس ڈاکٹر شارب ردولوی کی صدارت میں ہوا۔ شام کو محفل مقاصدہ منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر قیصر زیدی نے کی۔ چوتھا اجلاس یکم فروری کو پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی صدارت میں اور پانچواں اجلاس پروفیسر محمد حسن کی صدارت میں ہوا۔ ان تینوں روز دلی اور بیرون دلی کے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں نے شرکت فرمائی۔ مقالہ نگاروں میں جناب ابوالفیض سحر، جناب محمود نقوی، ڈاکٹر نفیسہ بیگم، ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین، جناب عظیم امروہوی، محترمہ قمر سلطانہ، جناب راحت عظمی، جناب رفعت سروش، ڈاکٹر جلال انجم، اور دیگر بہت سے حضرات شامل تھے۔ ●

بقیہ، جسمانی طور پر معذور افراد کو سماجی دھارے میں شریک کیا جائے

میں کام کر رہے ہیں، ان دفاتر میں زیادہ سے زیادہ معذور افراد کو جگہ ملنی چاہیئے۔ معذور افراد کی ناخواندگی دور کرنے کی بھرپور کوششیں کرنی ہونگی، غیر ملکی مطالعوں کی حوصلہ افزائی کی بھی ضرورت ہے، غیر ملکی مطالعاتی سفر کے جملہ اخراجات سرکار کو اٹھانے چاہئیں۔

بے روزگار معذور افراد کو بے روزگاری کا بھتہ ملنا چاہیئے، یہ اسکیم ملک بھر میں لاگو کی جانی چاہیئے۔ معذور افراد کو ہر جگہ سفر کرنے اور ان کے ہمراہ جانے والوں کے لیے مفت سفر ہونا چاہیئے۔ یہ رعایتیں 'معذور افراد کے دہے' کے دوران ان کو مل جانی چاہئیں۔ یہ دہا ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۲ء کے درمیان ہے، اسے اقوام متحدہ دنیا کے معذور افراد کی بحالی کے لیے منا رہی ہے۔

سورگیہ سابق وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے غریب اور وسائل سے محروم افراد کی بہبود کے لیے ایک بیس نکاتی پروگرام وضع کیا تھا۔ اس میں ایک نکتہ ہے 'بصارت سے محرومی کی روک تھام' لیکن ملک میں بینائی کی کمزوری عام ہو رہی ہے! اس کے بارے میں شعور اتنا بیدار نہیں ہو پایا ہے جتنا کہ ضرورت تھی، ڈاکٹر آنکھوں کے جو آپریشن کرتے ہیں، وہ اکثر ناکام رہتے ہیں، جس سے لوگ کلی طور پر اندھے ہو جاتے ہیں، کبھی کبھی عوام کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ نہیں کیا جاتا، معذور افراد کی بحالی اور ان کی تعداد کو کم کرنے کے لیے اس پہلو پر زور دینا ضروری ہے۔ ●

ارتضیٰ کریم٭

دہلی میں انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کی گولڈن جوبلی کانفرنس

ترقی پسند تحریک کے جشن طلائی کے سال میں ۲۶ تا ۲۸ دسمبر ۱۹۸۶ء دہلی میں کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں سوویت یونین، پاکستان، فرانس، اور مشرقی

دائیں سے بائیں: ڈاکٹر دتا، مجروح سلطانپوری، وامق جونپوری، کیفی اعظمی، غلام ربانی تاباں، اندر کمار گجرال، آنند نرائن ملّا، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، علی سردار جعفری، ڈاکٹر قمر رئیس۔

جرمنی سے آئے ہوئے ادیبوں نے بھی حصہ لیا۔ ہندوستان کے جو ممتاز ادیب اس یادگار اجتماع میں شریک ہوئے ان میں خواجہ احمد عباس، آنند نرائن ملّا، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، وامق جونپوری، غلام ربانی تاباں، مجروح سلطانپوری، قرۃ العین حیدر، کیفی اعظمی، پروفیسر محمد حسن، ریوتی سرن شرما، اختر سعید خاں، جوگیندر پال، اصغر علی انجینئر، رام لعل، سید عقیل رضوی، کمال احمد صدیقی، پروفیسر وہاب اشرفی، رضی الدین، منظر شہاب، عابد سہیل، ڈاکٹر نریش، رتن سنگھ، اقبال مجید، ڈاکٹر مش۔ اختر، سلام بن رزاق، اجمل اجملی، احسن رضوی، عشرت قادری، قدوس جاوید، علی احمد اعظمی کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ دوسرے نوجوان ادیبوں نے بھی کانفرنس کے اجلاس میں حصہ لیا۔

۲۶ دسمبر کی شام کو افتتاحی اجلاس میں جنرل سیکریٹری ڈاکٹر قمر رئیس نے کانفرنس کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اس عظیم تحریک کو ملک میں مقبول بنانے میں اردو کے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس پچاس سالہ تقریب کے موقع پر ہم "نشانِ سجاد ظہیر" نام کے پچاس ممتاز ترقی پسند ادیبوں کو پیش کریں گے۔ ہم چاہیں گے کہ کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں ترقی پسند ادبی سرمایہ اور موجودہ مسائل پر کھل کر اظہارِ خیال کیا جائے۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر جناب اندر کمار گجرال نے اپنے خطبہ میں ترقی پسند تحریک کی عہد ساز خدمات کو سراہا۔ انھوں نے کہا کہ تحریکِ آزادی کو ایک نیا رخ

٭ شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

دینے میں ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں نے بہت اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں اور میری پیڑھی کے بہتیرے لوگ اسی تحریک کے زیرِ سایہ پروان چڑھے ہیں۔ ملک کی موجودہ صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ترقی پسند ادیب آج بھی قومی آہنگی اور قومی اتحاد کی طاقتوں کو مضبوط بنانے میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ آنند نرائن مُلّاؔ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میرے نزدیک ترقی پسند ادب وہ ہے جو آنے والے کل کا ادب ہو، جس کی معنویت مستقبل میں بھی قائم رہے۔ علی سردار جعفریؔ نے اپنے صدارتی خطبے میں ملک میں سیکولر جمہوری قدروں کو فروغ دینے میں ترقی پسند ادیبوں کی خدمات کا ذکر کیا۔ انھوں نے قومی زبانوں اور ملک کی مشترک تہذیب کے بارے میں ترقی پسند ادیبوں کے موقف کی وضاحت کی اور کہا کہ اُردو زبان ہر دور میں اس تہذیب کی علامت رہی ہے۔ ان کے خطبے کی بنیاد پر ہی کانفرنس کا اعلان نامہ ترتیب دیا گیا۔ پاکستانی ادیب" عابد حسن منٹوؔ " اور سوویت اسکالر "میلا وسیلکووا" نے بھی اجلاس کو خطاب کیا۔ عابد حسن منٹوؔ نے اپنی تقریر میں زور دے کر کہا کہ ہند و پاک دونوں ملکوں کے مسائل مشترک ہیں، سامراج کی گرفت دونوں ملکوں پر بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ دونوں ملکوں کے ترقی پسند ادیب اور دانشور ان مسائل پر مل کر سوچیں اور ان کا مقابلہ کریں۔

۲۷ اور ۲۸ر دسمبر کو آندھرا بھون کے ہال میں کانفرنس کے ادبی اور کاروباری اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کا موضوع تھا "ادب نظریہ اور وابستگی"۔ اس میں اصغر علی انجینیرؔ اور ڈاکٹر اناسو وا آرو وا اور ڈاکٹر ش۔ اختر نے مقالے پڑھے۔ اسی اجلاس کی بحث میں وہاب اشرفیؔ، کمال احمد صدیقیؔ، ریوتی سرن شرما، احمد رشید شیروانی، اشتیاق عابدی اور رضی الدین نے حصّہ لیا۔ اس میں موضوع کے مختلف پہلو سامنے آئے۔ بیشتر ادیبوں نے اس خیال سے اتفاق کیا کہ موجودہ حالات میں ادیب انسانی مقدر سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ لیکن اسے کسی سیاسی جماعت کے بجائے اپنے ضمیر کا اور انسانیت کا وفادار ہونا چاہیئے۔ ڈاکٹر اناؔ نے سوویت یونین میں ترقی پسند ادب کی مقبولیت کا جائزہ لیا۔ دوسرے اجلاس کا موضوع تھا "ترقی پسند ادب اور ادبی روایت" اس میں پروفیسر سید عقیل رضوی، ڈاکٹر صادق اور سوویت اسکالر میلا وسیلکووا نے مقالے پڑھے۔ ڈاکٹر میلکووا نے ترقی پسند شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے فیض احمد فیضؔ کی شاعری پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا۔ پروفیسر عقیل اور ڈاکٹر صادق نے اپنے مقالوں میں وضاحت کے ساتھ ترقی پسند ناول اور افسانہ کی روایت کا جائزہ لیا۔ اور اسے اُردو افسانوی ادب کی بنیادی روایت قرار دیا۔ اس اجلاس کی بحث میں قدوس جاوید، علی احمد فاطمی، وہاب اشرفیؔ، وامق جونپوری اور دوسرے ادیبوں نے حصّہ لیا۔ تیسرے اجلاس کا موضوع تھا "ہم عصر ادب اور نئی ترقی پسندی" اس میں بحث کا آغاز ڈاکٹر محمد حسن، اور ڈاکٹر علی احمد فاطمی کے مقالوں سے ہوا۔ ڈاکٹر محمد حسنؔ نے کئی اہم سوال اٹھائے۔ انھوں نے کہا کہ جہاں تک سماج سے ادب کی وابستگی اور ادب کے ذریعے زندگی کو بدلنے کا سوال ہے ترقی پسند تحریک سے بہت پہلے یہ باتیں کہی اور مانی جا چکی تھیں۔ ڈاکٹر فاطمی نے عصرِ حاضر کے اُردو افسانہ کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا اور کہا کہ اُردو افسانہ نگاروں کی زندگی سے منقطع ہو چکا ہے۔ اس اجلاس کی بحث میں عابد سہیل، ریوتی سرن شرما، مجروحؔ سلطانپوری اور دوسرے ادیبوں نے حصّہ لیا۔

آخری اجلاس میں قراردادیں اور اعلان نامہ منظور ہوا۔ ایک قرارداد میں ملک کی موجودہ فرقہ وارانہ فضا کے بارے میں ادیبوں نے اپنی گہری تشویش کا اظہار کیا اور تمام ادیبوں سے اپیل کی کہ وہ ڈٹ کر فرقہ پرستی کا مقابلہ کریں۔ ایک دوسری تجویز میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ یو۔پی اور دوسری ہندی ریاستوں میں اُردو کو ثانوی زبان کا درجہ دیا جائے۔ کانفرنس کے اعلان نامہ میں بھی اُردو کے ساتھ ہونے والی بے انصافیوں کا ذکر کرتے ہوئے اسے ہندی ریاستوں میں دوسری زبان کا درجہ دئے جانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اعلان نامہ میں کہا گیا ہے۔

(باقی ص۳۹ پر)

عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس

م.م. راجندر

آدھی رات گزر گئی تھی۔ ساری کائنات خاموش تھی جیسے زمین کا ذرہ ذرہ سو گیا ہو۔ ایسے گہرے سکوت میں دو میل پرے بھی کوئی آواز پیدا ہوتی تو یہاں تک صاف سنائی دے جاتی۔ کافی دوری پر اورنگ آباد جانے والی بڑی سڑک پر کبھی کبھی کوئی گاڑی یا ٹرک گزرتا تو اس کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ یہاں تک سنائی دیتی۔ اسی طرح دور کسی سڑک یا گلی میں کوئی کتا بھونکتا تو ایسا لگتا کہ پاس ہی بھونک رہا ہے۔ اور تو اور رات کے اس سناٹے میں، دیوار پر کیل سے لٹکی ہوئی اس کی چالیس سال سے پرانی جیبی گھڑی کی ٹک ٹک بھی کمرے میں صاف سنائی دے رہی تھی۔!

دراصل دنیا کی کوئی بھی حرکت کسی وقت نہیں رکتی۔ یہ صدائیں دن میں بھی ہوتی ہیں لیکن کوئی اس طرح سنائی نہیں دیتا۔ دن کے وقت زندگی کی گاڑی کے پہیے اتنی تیزی سے گھومتے، اتنی گرد و دھول اڑتی، اتنا شور و غل پیدا ہوتا کہ کوئی بھی آواز کانوں سے ٹکرا کر دل میں نہ اترتی۔ بس جیسے یہ شور، اس بظاہر بے مقصد زندگی کا ایک حصہ ہو۔ کسی بھی تنہا اور مدھم آواز کی اس شور کے مقابلے میں کیا قیمت تھی؟۔

رام سرن اب پینسٹھ سال کا ہو گیا تھا اور اس کا جسم اس سوئے ہوئے خاموش کرتے کی مانند تھا جس کی حرارت ختم سی ہو گئی تھی اور جس کا شور ماند پڑ چکا تھا۔ اور اب اس خاموشی کی کوکھ میں سے ابھر کر ایک آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی جیسے کسی ٹوٹے ہوئے گنبد کی صدا ہو۔ یہ آواز رام سرن کی روح کی تھی۔ اس کے ضمیر کی آواز جو اس سے پہلے اس تیزی سے سنائی نہ دی تھی۔ اب یہ آواز اتنی تیزی سے آ رہی تھی اور اتنی مسلسل تھی جیسے کوئی تیز و تند پہاڑی ندی شور مچاتی ہوئی بہہ رہی ہو۔ یہ ایک عجیب تبدیلی تھی جو اس کے دل کو دہلا رہی تھی۔ جب وہ جوان تھا اسے اس آنے والی تبدیلی کا احساس بھی نہیں تھا۔ اس نے ذہن پر زور ڈال کر سوچا، مگر نہیں یہ آواز اتنی صاف اور اتنی تیزی سے اس سے پہلے اسے سنائی نہیں دی تھی۔

ہاں، رام سرن کو یاد آیا، ایام جوانی میں بعض مرتبہ جب اس کا دل کسی گناہ کی طرف راغب ہوتا، وہ کوئی جرم کرنے کی سوچتا یا جان بوجھ کر کوئی غلط کام کرتا یا کوئی ایسا قدم اٹھاتا جس سے کسی دوسرے کا نقصان اور اس کا فائدہ ہوتا تو اس کے دل کے نہاں خانے میں سے کوئی آواز اٹھتی تھی اور اسے منع کرتی تھی۔ لیکن یہ آواز اتنی مدھم اور ہلکی ہوتی تھی کہ وہ سنی ان سنی کر دیتا تھا اور ایک اور طاقتور آواز اور شور اسے اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ وہ بے بس ہو کر وہ کام کر جاتا۔ ایک آدھ بار تو ایسا بھی ہوا کہ کسی نے ضمیر کی اجازت اور ضمیر کی آواز کی بات کی لیکن اسے یہ اختیار اتنا کمزور اور یہ آواز اتنی مدھم لگی کہ اس نے پرواہ نہیں کی۔ دراصل کئی مرتبہ تو وہ اپنی دولت اور طاقت کے نشے میں اس صدا کو سن کر کھل کھلا کر ہنس پڑا تھا کہ خدا نے انسانی گناہوں پر ضمیر کا یہ پہرہ لگایا بھی تو کتنا کمزور کہ کوئی خیال بھی نہ کرے اور اسے توڑ کر آگے بڑھ جائے!۔

لیکن آج اس منزل پر، جب وہ بوڑھا ہو گیا تھا، تو یہ صدا اتنی بلند اور طاقتور کیوں ہو گئی تھی؟ بالکل اسی طرح جیسے رات کے سناٹے میں کوئی لاری سڑک کو روندتی ہوئی جا رہی ہو، جیسے کوئی دریا امڈ امڈ کر بہہ رہا ہو، جیسے سمندر کی مضطرب لہریں کسی چٹان سے ٹکرا رہی ہوں۔ رام سرن گھبرا کر اپنی چارپائی سے اٹھ گیا اور کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگا۔ اس نے سردی کے باوجود اپنے اندر ایک جلن اور بے چینی اور گھبراہٹ کا احساس کیا۔ وہ لوٹ گیا اور دروازے کی طرف بڑھا اور اسے کھول کر باہر جانا ہی چاہتا تھا کہ دور سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آئی اور عین اسی وقت ایک اور ٹرک دہاڑتا ہوا سڑک پر سے گزرا اور وہ خوف زدہ ہو کر واپس ہو گیا۔

تو کیا، رام سرن چارپائی پر لیٹ کر سوچنے لگا، مجھے اس سناٹے میں ہر آواز ہیبت ناک لگے گی؟ — اور کیا میرے ضمیر کی آواز اس خاموشی میں آنے والی ہر صدا سے ٹکرا کر ایک دلدوز چیخ بن جائیگی، جو ساری دھرتی پر گونج اٹھے گی؟ — وہ گھبرا کر پھر بیٹھ گیا اور اس نے کمرے میں روشنی کی اور اٹھ کر دروازے کی چٹخنی لگا دی۔ اس نے کھڑکی بھی اندر سے بند

۵۱ / ۶۸، چترا وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۹۲

کرلی اور کرتے میں کھڑے ہوئے بالش کو تھام کر روشندان بھی بند کر لیا۔ باہر سے آنے والی صداؤں کا گلا سا گھٹ گیا۔ وہ اطمینان سے چارپائی پر بیٹھ گیا اور دیوار پر لٹکی ہوئی اپنی جیبی گھڑی کو دیکھنے لگا۔ نہ جانے روشنی میں ایسا کیا جادو تھا یا کمرے میں کون سی پُراسرار آوازیں اُبھر آئیں تھیں کہ اب تو رام سرن کو اپنی گھڑی کی ٹِک ٹِک بھی صاف سُنائی نہیں دے رہی تھی۔

رام سرن لیٹ گیا اور اس نے سونے کی کوشش کی لیکن بے سُود۔ کئی سالوں سے اس کی نیند کا یہی حال تھا۔ سو گیا تو ایک آدھ گھنٹہ نیند آ گئی ورنہ رات رات بھر جاگتا رہتا۔ کئی دنوں سے اسے اپنے بھائی درگا داس کی بیوہ کا ہی خیال آ رہا تھا حالانکہ اسے مرے ہوئے بھی کئی برس ہو گئے تھے۔ جس وقت درگا داس فوت ہوا تھا تو دوسرے رشتے داروں کے کہنے سُننے سے اس نے اس کی بیوہ کو باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد کا نصف حصّہ دینا منظور کر لیا تھا لیکن بعد میں دل نے بے ایمانی پر راغب کیا اور اس نے حساب کتاب میں گڑبڑ کر کے بہت ہی کم حصّہ دیا۔ وہ بیچاری صرف چند سال ہی آرام سے رہ سکی اور اس کے لڑکے کی اچھی طرح پڑھائی لکھائی بھی نہ ہو سکی۔ رام سرن نے اپنے ہوشیار بھتیجے کو آگے بڑھانے میں بالکل مدد نہ کی۔ اور اپنے نالائق لڑکے پر روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ وہ لڑکا عیاش بھی تھا اور اس نے نہ صرف باپ کی دولت کو بے دریغ خرچ کیا بلکہ خاندان کی بڑی بدنامی بھی کروائی۔ رام سرن اب سوچ رہا تھا کہ اس نے ایک گناہ کیا تھا۔ پھر وہ روپیہ پیسہ اور جائداد بھی اُس کے پاس نہ رہی تھی۔ لیکن اُس وقت اُس کے ضمیر کی آواز کتنی کمزور تھی کہ وہ حقارت سے اسے کچلتا ہوا اپنی من مانی کر گیا تھا۔

یہ بات تو نہیں تھی کہ زندگی میں کبھی رام سرن کسی گناہ یا جرم کی طرف مائل ہوا ہو تو اُس کے ضمیر نے اُسے ٹوکا نہ ہو۔ مثلاً جب کبھی وہ بزنس میں ہزاروں کے بے ایمانی کرتا، کوئی اسے کسی قسم کا لالچ دیتا یا وہ کسی کو رشوت دیتا اور یا کوئی ناجائز منافع کماتا تو اسے ایک دفعہ یہ ضرور خیال آتا کہ وہ ٹھیک نہیں کر رہا ہے۔ یہی اس کے ضمیر کی آواز تھی، اس کی ایک ہلکی سی دستک۔ مگر ضمیر کے اس طرح ٹوکنے کے باوجود وہ غلط کام کر بیٹھتا کیوں کہ اس کا نتیجہ کسی بُری شکل میں فوراً سامنے نہ آتا اور جوانی اور طاقت کے دنوں میں مستقبل کی پرواہ کسے ہوتی ہے۔ زندگی کی ریل پیل، گہما گہمی اور چکا چوند میں ضمیر جیسے درویش کی کون سُنتا۔ وہ حیران تھا کہ جوانی میں آدمی جان بوجھ کر گناہ اور جرم کا ارتکاب کرتا ہے اور دل کے مراقبے میں سے اُٹھنے والی حقیر سی آواز کو وہ آسانی سے نظر انداز کر دیتا ہے۔

رام سرن نے اُٹھ کر بتی بجھا دی اور منہ ڈھانپ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن زندگی کے واقعات سلسلے وار اس کے ذہن پر منڈلانے لگے۔ اور وہ سو نہ سکا۔ اس نے زندگی میں بڑے گناہ کیے تھے، بڑی غلطیاں کی تھیں، مگر وہ دولت اور طاقت کے نشے میں رہا تھا۔ لوگوں نے ہمیشہ اس کی عزت کی تھی، کچھ ڈر سے اور کچھ اس کی ظاہری شان و شوکت کی بنا پر۔ لیکن جس طرح شام ہوتے ہی درختوں کے سائے سمٹ جاتے ہیں، دولت اور طاقت کی وہ سُہانی دھوپ بھی سمٹ گئی تھی اور وہ آج بے سہارا اور ناطاقتی کا ڈھانچہ بنا اس کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔

کوئی تین بجے کے قریب رام سرن کی آنکھ لگی مگر وہ مشکل سے آدھ گھنٹہ سویا ہو گا کہ پھر آنکھ کھل گئی۔ باہر سڑک پر کسی بیل گاڑی کے گزرنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر دُور اور تنگ آباد جانے والی سڑک پر کوئی لاری شور مچاتی ہوئی گزری۔ رام سرن سوچنے لگا کہ اس دھرتی پر زندگی کا یہ بے ہنگم شور کبھی بند نہیں ہوتا۔ سوئی ہوئی کائنات کو بھی انسانی زندگی کا یہ شور و غل اتھل پتھل کرتا ہی رہتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ پھر اپنی زندگی کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ جان لیوا تنہائی اور یہ بڑھاپا، یہ بے چارگی اور یہ خوف و ہراس، ایک گناہگار زندگی کا انجام یہی تو ہو سکتا ہے۔ اس کے یہ سوچتے ہی اس کے دل میں سے کچھ صدائیں پھر اُبھر ہیں اور وہ پڑا پڑا اُن آوازوں کو سُنتا رہا۔ یہ صدائیں آ رہی تھیں اور وہ بار بار خلا میں گھور رہا تھا۔ معاً ایک خوف نے اُسے جکڑ لیا اور اس نے اُٹھ کر پھر روشنی کر دی اور آگے بڑھ کر کھڑکی کو کھول دیا۔ ٹھنڈی اور صاف ہوا کے بہت سے جھونکے اس کے بوڑھے جسم پر سرسراہٹ پیدا کرتے ہوئے اندر گھس آئے۔ باہر ابھی تک تاریکی اور گہری خاموشی مسلط تھی اور کسی بھی زندگی کا ثبوت صرف کتوں کے کبھی کبھی بھونکنے کی آوازوں اور دُور سڑک پر گزرتی ہوئی موٹر کاروں اور ٹرکوں کے شور کی صورت میں تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس ہی کھڑا رہا اور اچانک اپنے آپ سے بولا ―

"اب اس منزل پر ان آوازوں کا کیا فائدہ؟ قدرت کی یہ بات بھی کتنی عجیب ہے کہ یہ صدائیں جوانی کے ایام میں کتنی کمزور اور آہستہ اور اب اس کھوکھلے جسم میں کتنی طاقتور اور پُرشور!"

لیکن دراصل تو یہ صدائیں کبھی بھی کمزور نہیں تھیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس نے انھیں کبھی نہیں سُنا یا سُنا تو ان کی پرواہ نہیں کی۔ لیکن اسی وقت ہوا کا ایک جھونکا چیختا ہوا اندر گھسا اور کھڑکی زور سے کھٹ کی آواز کے ساتھ بند ہو گئی۔ وہ خوف زدہ سا ہو گیا مگر اس نے ہمت کی اور چارپائی پر لیٹنے کی بجائے دروازہ کھول کر باہر کھلی ہوا میں آ گیا۔ کائنات بدستور خنکی اور سکوت میں لپٹی ہوئی پڑی تھی۔ لیکن درختوں پر پتے اچانک ہوا کے جھونکوں سے کھڑکنے لگتے۔ بیل گاڑی کو یہاں سے گزرے ہوئے بڑی دیر ہو گئی تھی اور وہ دُور نکل گئی ہو گی لیکن بیلوں کے گلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آواز اس فاصلے سے بھی یہاں تک آ رہی تھی ― صاف اور مسلسل جیسے جب سے اس بیل گاڑی کا سفر شروع ہوا یہ گھنٹیاں بجتی رہی تھیں اور جب تک سفر ختم نہیں ہو گا بجتی رہیں گی۔ ضمیر کی اس آواز کو کوئی سُنے یا نہ سُنے!

پروفیسر جگن ناتھ آزاد : اے ۲۵، گورنمنٹ کوارٹرز، گاندھی نگر، جموں۔

یہ دور! نگاہوں میں جو ہے خطۂ ننگل — کل تک تھا یہ خطہ کہیں صحرا کہیں جنگل
ہمت کے طفیل آج اسی جنگل میں ہے منگل

صحرا کو جو تھے کشتۂ اندوہ نہانی — پھلی ہوئی اب ان میں ہے کھیتوں کی جوانی
یوں علم کے ہاتھوں میں ہے دریا کی روانی

نظروں میں ابھی تک کوئی نقشہ نہ بنا تھا — انسان کا تھا عزم پہاڑوں کا انا تھا
یہ عزم انا کے لیے پیغام فنا تھا

کب کا تھا یہ ارمان کہ انساں نے نکالا — اس طرح چٹانوں کو فضاؤں میں اُچھالا
لرزے میں ہے بنیادِ کہستانِ ہمالہ

مٹی کی چٹانیں[1] تھیں کہ پتھر کی چٹانیں — جب ان پہ ترازو ہوئیں ہمت کی سنانیں
کچھ ایسا ہی نقشہ تھا یہ مانیں کہ نہ مانیے

پہلے تو کیا سینۂ دریا کو دو پارا — دونوں کو پھر اس طرح سرنگوں سے گزارا
ہر دیدۂ مشتاق تھا قربانِ نظارا

امواج[2] کو اوپر سے بھی نیچے سے بھی گھیرا — زیرِ تہِ دریا کیا آدم نے بسیرا
شوقِ عمل امروز بھی، فردا بھی ہے تیرا

دریا کا جگر چیر گئی عقلِ بشر کی — تفصیل کہے کون اب اِس راہگذر کی
ظلمت پہ مسلط ہوئی تنویر سحر کی[3]

پھر آج ہویدا ہوا اک رازِ قدیمی — پھر آج نمایاں ہوا اک سرِّ حکیمی
اس دَور میں پھر زندہ ہوئی ضربِ کلیمی

فولاد ہے یا ریت ہے، پتھر ہے کہ پانی — ساحل کا بڑھاپا ہے کہ موجوں کی جوانی
اِن سب کی زبانوں پہ ہے فردا کی کہانی

اس خاک کا جو ذرّہ ہے گوہر سے گراں ہے — ہر لمحہ یہاں وقت کا اک قلبِ تپاں ہے
اے منزلِ مقصود کہاں ہے تو کہاں ہے

یہ خاکِ وطن دامنِ کہسارِ دُلارا — یہ خاکِ دلآویز یہ دریا کا کنارا
اس خاک نے دیکھا ہے قیامت کا نظارا

ادراک کے انوار سے تاباں ہے یہی خاک — تنویرِ عزائم سے فروزاں ہے یہی خاک
اے دردِ وطن! حاصلِ درماں ہے یہی خاک

یہ خاک کہ انسان کی ہمت کی ہے روداد — یہ خاک کہ اک کیفِ محبت کی ہے روداد
ساتھ اس کے یہی خاک شہادت کی ہے روداد

دی اس کو حیات اپنی عزیزانِ وطن نے — جاں اس پہ فدا کی ہے محبانِ وطن نے
سینچا ہے اسے خونِ شہیدانِ وطن[4] نے

یہ خونِ شہیداں ہی اِسے زندہ رکھے گا — پائندہ وطن میں اِسے پائندہ رکھے گا
رخشندہ رکھے گا، اِسے تابندہ رکھے گا

اے سجدہ گہِ قلب و نظر، منزلِ ادراک — تو میری نگاہوں میں ہے اک جلوہ گہِ پاک
اے خاکِ دلارا تو بلندی میں ہے افلاک

سبزہ ترے ماحول کا ہے مخمل و بانات — ہیروں سے فزوں تر ترے پہلو کے ہیں ذرّات
قطرے ترے دامن کے درخشندہ فلزات

تعمیر تری کعبۂ اربابِ نظر ہے — تصویر تری جلوۂ انوارِ سحر ہے
تو شب کے اندھیرے میں تجلیِ قمر ہے

قائم ہے تری جذبۂ اخلاص پہ بنیاد — سرگرمِ عمل تجھ پہ تھے اس دور کے زہاد
تیرے لیے آئی ہے دعائے دلِ آزاد

پیدا ہو تری خاک میں خاصیتِ اکسیر — کردار ترا مہر منور کی ہو تنویر
دنیا میں ہو اک مایۂ رحمت تری تعمیر

---

[1] جہاں بھاکرہ ڈیم بنایا گیا ہے وہاں پہاڑ کی خاصیت یہ ہے کہ دو قسم کی چٹانیں ہیں۔ ایک خالص پتھریلی جو نہایت مضبوط اور پختہ ہیں اور دوسری مٹی کی جو بہت خام ہیں۔ اس تمام مٹی کو پہاڑوں سے نکال کر خلاء کو سیمنٹ سے پُر کیا گیا ہے تاکہ سات سو چالیس فٹ اونچے بند کو پختہ بنیادوں پر تعمیر کیا جا سکے۔ (آزاد)

[2، 3] ننگل کے مقام پہ دریائے ستلج پر ایک بند باندھا گیا ہے۔ یہاں دریا کے اوپر پل ہے اور نیچے سرنگ یا گیلری۔ یہ گیلری زمین کے اندر سطح دریا سے پچھتر فٹ نیچے اور تہ دریا (Bed of the River) سے پچاس فٹ نیچے ہے۔ یہ راستہ جس میں سیڑھیوں کے علاوہ لفٹ بھی لگی ہے بجلی کی روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ (آزاد)

[4] بھاکرہ بند کی عظیم الشان تعمیر میں دو سو سے زائد افراد نے جن میں مزدور بھی شامل ہیں اور افسر بھی اپنی جانیں نذر کی ہیں۔ یہ لوگ پہاڑ کی جس اونچائی اور جس خطرناک ڈھال پر سرگرم عمل رہے اسے دیکھ کر ان کارکنوں کے جذبۂ اخلاص کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ (آزاد)۔

غزلیں

محمد علی موج : اُردو سروس،
اے، آئی، آر۔ نئی دہلی۔

جاگ اُٹھا جب بھی شعورِ ذات بستر چھوڑ کے
خود الگ ہو جائیں گے قطرے سمندر چھوڑ کے

ایک ہی مرکز پہ لوٹ آتے ہیں سارے راستے
ہم کدھر جائیں ترا کوچہ، ترا در چھوڑ کے

ٹوٹنے تک جسم سے، بے ربط سانسوں کا طلسم
میری تنہائی کہاں جائے مرا گھر چھوڑ کے !!

عشق کو تحریک بخشے پھر ادائے سادگی
پھر کوئی مہرالنساء دیکھے کبوتر چھوڑ کے

موسموں کی گرد بھی حبس کو نہ دھندلا کر سکی
عکس وہ دل پر گیا ہے آئینہ گر چھوڑ کے

پے بہ پے ہر ایک چال اُلٹی ہی وہ چلتا رہا
شہہ کبھی ہم نے اُسے پھر بھی کئی گھر چھوڑ کے

ہر طرف اے موج آنگن میں در و دیوار سے
دھوپ اُتر آئی تو ہم اُٹھے ہیں بستر چھوڑ کے

●

بلقیس ظفیر الحسن
۳۰۴ ٹیگور ہاسٹل، ٹیگور روڈ، نئی دہلی۔

نازک جذبوں سے عاری، احساس سے یہ بے بہرا لوگ
دل کی باتیں کیا کرنی ان سے یہ ٹھہرے دانا لوگ

جیسا جہاں پر مجمع دیکھا، شکل بنالی ویسی ہی
کتنے چہرے ساتھ لیے پھرتے ہیں ہم بے چہرا لوگ

آج کی ٹوٹی کرچیں اپنی زخمی پلکوں میں اٹکائے
لہو لہان آنکھوں سے دیکھے جائیں کل کا سپنا لوگ

جس بستی سے ہم آئے ہیں کیسے اس کا حال کہیں
برف ڈھکی گلیاں، سڑکیں تھیں نیاری کھرا کھرا لوگ

چٹانیں تو خیر ہوا کرتی ہیں ریزہ، ہم نے یہاں
چوٹیں کھا کے پتھر بنتے دیکھے شیشہ شیشہ لوگ

سب نظروں کی بات ہے بھائی، اُجلا کیسا میلا کیا
میل بھرا ہو آنکھوں میں تو دیکھیں چاند بھی دھندلا لوگ

کیسے کیسے ویرانے آباد گھروں میں بستے ہیں
محفل محفل ہنگاموں میں دیکھے بالکل تنہا لوگ

روئیں چیخیں، سر پھوڑیں اب پوچھنے والا کوئی نہیں
سمجھانے آ جاتے کچھ دن پہلے کیسا کیسا لوگ

بی بلقیس یہ روگ نہ پالو ناحق ہی کیوں جان جلاؤ
دل سے درد کا رشتہ کر کے پچھتائے ہیں کیا کیا لوگ

●

شاہین : ایڈیٹر "اردو کناڈا"
پوسٹ باکس ۲۲۷۶۔ اسٹیشن ڈی اڈاوہ (کناڈا)

اس سے اب نامہ و پیغام میں کیا رکھا ہے
وہ بڑا نام سہی نام میں کیا رکھا ہے

اس کے ہر وار سے ظاہر ہیں شکستیں اس کی
کھوکھلے شخص کی دشنام میں کیا رکھا ہے

ربط میرا ہے مکینوں سے مکانوں سے نہیں
حسنِ محراب و در و بام میں کیا رکھا ہے!

یوجینا، نئی دہلی

تعظیم احمد گوہر ۔ معرفت محمد ایوب
محلہ کچی سرائے، نزد مسلم کلب، مظفر پور بہار

ڈرتا ہوں کھو نہ ڈالوں خود کو ہی شہرتوں میں
مقبول یوں ہوا ہوں دشمن میں، دوستوں میں

میں حرفِ ناگزیر اوراقِ آب و گِل ہوں
مجھ سے ہی زندگی ہے اس کی عبارتوں میں

جیسے گزر چکا ہوں پہلے بھی میں یہاں سے
ملتے ہیں دھندلے دھندلے کچھ نقش راستوں میں

کچھ لمحے یوں بھی گزرے بھاری لگے صدی پر
طے ہو گئیں کبھی تو صدیاں بھی ساعتوں میں

میں گونجتا رہا ہوں، میں گونجتا رہوں گا
اندھی سماعتوں میں، بہری بصارتوں میں

●

طاہر لائل پوری

دل اس کا پرستار ہے معلوم نہیں کیوں
اور دل سے وہ بیزار ہے معلوم نہیں کیوں

ایسی تو کچھ ارزاں بھی نہیں جنسِ محبت
ہر ایک خریدار ہے معلوم نہیں کیوں

خود شوق سے اس نے مری ہستی کو مٹایا
خود غم میں گرفتار ہے معلوم نہیں کیوں

وہ چشمِ مسیحا کہ ہزاروں کو شفا دے
کہتے ہیں کہ بیمار ہے معلوم نہیں کیوں

جو حسن کہ رازِ پسِ دیوارِ حرم تھا
رسوا سرِ بازار ہے معلوم نہیں کیوں

ہر شخص سمجھتے ہوئے دُنیا کو فنا میں
دُنیا کا طلبگار ہے معلوم نہیں کیوں

تقدیسِ بُتاں مجھ کو کبھی راس نہ آئی
اوروں کو سزاوار ہے معلوم نہیں کیوں

طاہر کہ جسے لوگ سمجھتے ہیں مسلماں
پہنے ہوئے زنار ہے معلوم نہیں کیوں

●

مولانا محمد عثمان نمبر

صفحات : ۲۸۴
قیمت : ۲۵ روپے
شائع کردہ : دفتر دیوبند ٹائمز، دیوبند۔

کون نہیں جانتا کہ دارالعلوم دیوبند کے اکابر و اسلاف کی روایت یہ رہی ہے کہ ہمارا ملک عوام کی بحیثیت مجموعی ترقی کی خاطر دن دُونی رات چوگنی ترقی کرے، ان اکابرین نے ملک کی جدوجہد آزادی کو آگے بڑھانے میں دل کھول کر اور نڈر ہو کر حصّہ لیا۔ انھوں نے قیدِ فرنگ کی صعوبتوں کو برداشت کیا، ان کو عوام میں بدنام کیا گیا مگر وہ اپنے عزم سے پیچھے نہیں ہٹے، انھوں نے ہر قیمت پر ملک کے خوابیدہ لوگوں کو بیدار کیا، جو لوگ آزادی کی نعمت سے ناواقف تھے، ان کو سمجھاتے رہے اس سلسلے کے اوّلین معماروں میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن کا نام نامی آتا ہے۔ شیخ الہند کون تھے؟ شاملی کے مجاہد عظیم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے رازداروں سے واقف اور شاگردِ عزیز تھے۔ شیخ الہند میں وطن کی آزادی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اس مردِ مجاہد نے ایسے ایسے سالاروں کو پیدا کیا جنھوں نے ملک کی جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا، ابتداً جب شیخ الہند نے میدانِ سیاست میں قدم رکھا تو اس وقت کی فضا ناسازگار تھی، لوگ ۱۸۵۷ء کے خوفناک مظالم کے تصوّر سے کانپتے تھے۔ انگریزوں کے خلاف آواز اٹھانا یا انقلاب کا نعرہ لگانا بہت مشکل تھا۔ پورے ملک میں سی آئی ڈی کا جال بچھا تھا۔ البتہ شیخ الہند ہی کی ذاتِ گرامی تھی کہ انھوں نے اپنے دُنیاوی خطروں کو دل میں جگہ نہ دی اور اس طوفانِ بلاخیز میں کود پڑے۔ شیخ الہند اور ان کے جانباز لایق تلامذہ میں مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا عزیر گل اور اس کے بعد خود حضرت کے نواسے مجاہدِ آزادی مولانا محمد عثمان صاحب کا نام نامی آتا ہے۔ گذشتہ دنوں دیوبند سے دیوبند ٹائمز کے ایڈیٹر مولانا اعجاز احمد قاسمی نے مولانا محمد عثمان پر ایک خصوصی نمبر شائع کیا جو انتہائی وقیع اور معتبر ہے، اس کا اجراء اُس وقت کی وزیرِ صحت و خاندانی فلاح و بہبود، حکومتِ ہند محترمہ محسنہ قدوائی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ محترمہ نے ارشاد فرمایا کہ میں محسوس کرتی ہوں کہ مولانا محمد عثمان صاحب نے جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہو کر زندگی بھر مُلکی و ملّی خدمات کا جو نمونہ پیش کیا ہے، وہ نہ صرف قابلِ تحسین ہے بلکہ حد درجہ قابلِ تقلید بھی، عزت مآب جناب ضیاالرحمٰن انصاری نے فرمایا کہ ہماری تاریخ کو عظمت عطا کرنے میں اسیرِ مالٹا حضرت شیخ الہند، مولانا محمود الحسن اور اُن کے رفقاء کی بے مثال قربانیاں شامل ہیں۔ ہمارے دور میں حضرت مولانا محمد عثمان صاحب نے اپنے بزرگوں کے شاندار ماضی کی روایات کو حال سے مربوط کر کے ایماندارانہ اور بے لوث خدمات کا جو نمونہ پیش کیا ہے وہ قابلِ تقلید ہے، دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن نے فرمایا کہ "ان کی ذات ایسے کمالات کی حامل تھی جو کم لوگوں کے حصے میں آتے ہیں۔"

اس خصوصی شمارے میں جس کی ضخامت ۲۸۴ صفحات ہے، سبھی دانشوروں اور اہلِ قلم کے مضامین شامل ہیں۔ مولانا سید انظر شاہ، ڈاکٹر رشید الوحیدی، مولانا عزیز احمد قاسمی، شیخ سلیم احمد، مولانا سید منت اللہ رحمانی، جمیل مہدی، حکیم عبدالقدوس وغیرہ شخصیتوں نے مولانا کو نہ صرف خراجِ عقیدت پیش کیا بلکہ ان کی زندگی کے اہم گوشوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے، اس نمبر میں خاصے کی چیز مولانا اعجاز احمد قاسمی کی وہ طویل روداد ہے جو انھوں نے حیات اور کارنامے کے عنوان سے مرتب کی ہے، آنے والے دور میں اس سے مولانا کی شخصیت کے بہت سے پہلو اُبھر کر سامنے آئیں گے، اچھا ہو کہ وہ اسے کتابی شکل میں بھی شائع فرمادیں۔

اس نمبر کو وقیع بنانے کے لیے مختلف رسائل و جرائد کے صفحات سے مولانا کے بارے میں بہت سی اہم تحریریں بھی جمع کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اہم شخصیتوں کے خطوط اور منظوم خراجِ عقیدت بھی اس میں شامل کیا گیا ہے، مختصر یہ کہ دیوبند کی تاریخ مرتب کرتے وقت اور ہندوستان کی جنگِ آزادی کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے وقت اس کا پیشِ نظر رہنا ضروری ہے۔

اس قدر ضخامت کے باوجود اس کی قیمت صرف ۲۵ روپے ہے جو موجودہ مہنگائی کو دیکھتے ہوئے معمولی کہی جا سکتی ہے۔

وسیم حیدر

عکس در عکس

اُردو کے معروف شاعر جناب شاہد ساگری کی تضمینات کا مجموعہ "عکس در عکس" زیرِ نظر ہے، جس سے متعلق کتابی معلومات یہ ہیں :۔

نام کتاب : عکس در عکس (تضمینات)
مصنف و ناشر : محمد حنیف شاہد ساگری
طابع : نشاط آفسیٹ پریس، ٹانڈہ ضلع فیض آباد (یوپی)
سنہ اشاعت : ۱۹۸۶ء۔ صفحات ایک سو چالیس
قیمت : چالیس روپے۔
ملنے کا پتہ : بھوپال بک ہاؤس، بدھوارہ بھوپال

اس مجموعہ میں مشہور و معروف اکتالیس شعراء کے

منتخب کلام پر کہی گئی تضمینیں ۴۹ صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان شعراء میں یوں تو سبھی اہم ہیں لیکن یہ لحاظ امتیاز میر انیس، امیر مینائی، شاد عظیم آبادی، آرزو لکھنوی، جوش ملسیانی، احسان دانش، ساغر نظامی، عبدالحمید عدم، روش صدیقی، بسمل سعیدی، شمیم کرہانی، ابر احسنی گنوری، انور وامدی، فیض احمد فیض، کیفی اعظمی، احمد ندیم قاسمی اور غلام ربانی تاباں قابلِ ذکر ہیں۔

چھیالیس صفحات میں رسمیات، کتابیات، تعارف اور مصنف کی تخلیقی صلاحیت سے متعلق چالیس اربابِ فکر و نظر کے تاثرات شامل ہیں جن میں بہ اعتبار انتقاد، وامق جونپوری، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر عنوان چشتی، ڈاکٹر ابن فرید، ڈاکٹر سلمان اطہر جاوید اور ڈاکٹر امیراللہ خاں شاہین خاص ہیں۔

جہاں تک تضمین نگاری کا تعلق ہے ماضی میں تو شعرا کی توجہ اس طرف رہی ہے لیکن آج اس صنف سے دلچسپی شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک بہت مشکل اور نازک صنف ہے۔ اس کے لیے ذوق و شوق، طباعی، تفہیم و تحسین، فکر و احساس کی ترجمانی، فنکارانہ خلاقیت اور قادرالکلامی اور ایک خاص اُفتادِ طبع درکار ہے نیز تخیل و تفکر کے ساتھ زبان و بیان میں ہم آہنگ دلکشی بھی ضروری ہے۔

سہولت پسندی کے اس دور میں اسے متروک صنفِ سخن قرار دیا جاتا ہے۔ اور آج تو زندگی کے ہر شعبے میں سہولت پسندی کا غلبہ ہے۔ ان حالات میں جب ہم جناب شاہد ساگری کے اس مجموعہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ورطۂ حیرت میں پڑ جاتے ہیں اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ کام تو پختہ کارِ شعر و ادب ہی انجام دے سکتے ہیں اور پھر خاص طور سے غزل پر تضمین جس کی زبان ہی استعارے اور کنائے کی زبان ہوتی ہے اور جس کی تفہیم میں اکثر اختلافات اُبھر کر سامنے آتے ہیں، یقیناً ایک بہت دشوار کام ہے۔ اس دشواری پر فنکارانہ انداز میں عمدگی کے ساتھ قابو پانے اور انہماک و شیفتگی کے ساتھ اس صنفِ سخن کی تجدید و تخلیق کے لیے جناب شاہد ساگری کی کوشش قابلِ قدر ہے۔

بحیثیت مجموعی "عکس در عکس" میں شامل تضمینیں تخلیقی شعور، تضمینی مزاج، جدت پسند طبیعت اور سلیقہ و ہنرمندی کی آئینہ دار ہیں جن کو پڑھ کر اس صنف کی اہمیت اور قدر و قیمت کا ادراک ہو سکتا ہے۔

ذہین نقوی

بقیہ، ترقی کے سنگِ میل

اُس میں محصول کی چھوٹ دی جائے گی۔ تاکہ ہینڈلوم کی صنعت کو راحت مل سکے۔

اس اسکیم کا مقصد ملے جلے ریشے کے کارخانوں میں پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ کپڑا بُننے والوں کو فائدہ پہنچانا ہے — اس بات کا بھی فیصلہ کیا گیا کہ پولسٹر کا جو ریشہ محصول کے بغیر فراہم کیا جائے گا وہ صرف قومی ٹیکسٹائل کارپوریشن کے تحت کام کرنے والی ملوں کے ذریعے ہی کیا جائیگا جس میں کوآپریٹو اسپننگ ملیں بھی شامل ہیں۔ اس اسکیم کے سربراہ ہینڈلوم سے متعلق ڈویلپمنٹ کمشنر ہوں گے۔

صنعتوں میں ۸ فیصدی کا اضافہ

ساتویں پلان میں صنعتی پیداوار میں مجموعی طور پر ۸ فیصدی اضافے کی حد مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جبکہ چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں پیداوار کی شرح صرف ۵ فیصدی تھی۔ منصوبے کی دستاویز کے مطابق ملکی صنعتوں میں پیداوار میں اضافہ کیا جائے گا۔

دستاویز میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ صنعتی پالیسی کو عمل میں لانے کے لیے یہ اقدامات کیے جائیں گے:

۱۔ کام کے معیار کو بڑھاوا دینے کے لیے بنیادی سیکٹروں، پاور، ریلوے، فولاد اور کوئلے کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے گا۔

۲۔ مجموعی اقتصادی ترقی کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کرکے اور غریبی ہٹانے کے اقدامات کرکے لوگوں کی قوتِ خرید میں اضافہ کیا جائے گا۔

صنعتی سیکٹر میں جن اہم باتوں کا خیال رکھا جائے گا یہ ہیں۔ صنعتوں کے ڈھانچوں میں تبدیلی۔ سرمائے میں اضافہ۔ کارخانوں کی تنظیم۔ تکنیکی تعاون۔ پیداوار میں اضافہ اور بیرونی تجارت کو فروغ۔ سماجی انصاف کی بنیادوں پر پیداوار میں اضافے کی منزل کو پانے کے لیے ساتویں منصوبے میں مندرجہ ذیل رہنما اُصول اپنائے گئے ہیں:۔

۱۔ صارفین کو ضروریات کی چیزیں ہر وقت میسر رہیں۔

۲۔ موجودہ سہولیات کا بھرپور استعمال کیا جا سکے۔ ان میں تکنیکی تعاون، کارخانوں میں توسیع اور پیداواری صلاحیت کو فروغ دینے پر توجہ دی جائے۔

۳۔ اُن صنعتوں پر توجہ دی جائے۔ جن کی پیداوار کی کھپت ملک میں ہو اور بیرونی ممالک میں اُن اشیاء میں ہمیں امتیاز حاصل ہو۔

۴۔ (Sunrise) انڈسٹریز کو اس طرح بڑھاوا دیا جائے کہ وہ ہمارے لیے مفید اور کارگر ثابت ہوں۔

۵۔ صنعتوں میں خود کفالت حاصل کرکے روزگار کے مواقع پیدا کیے جا سکیں تاکہ تربیت یافتہ اور ماہرانہ صلاحیت رکھنے والے مزدوروں کو کام مہیا ہو سکے۔

●

قارئین کی آراء اور مشورے

"یوجنا" برابر نظر سے گزرتا رہتاہے۔ لیکن بعض تمارے
رست مضامین پر نظر ڈالنے کے بعد بغیر پڑھے ہی رکھ دیے
تے ہیں۔ کیونکہ اپنی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ اُردو
لے اہلِ دل ہیں۔ جن موضوعات کی طرف آپ توجہ مبذول
رانا چاہتے ہیں انھیں زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ صرف
اُردو ادب کے شعری و نثری موضوعات پر ہی نظر رکھتے ہیں۔
اہلِ اُردو کا مزاج ہی کچھ ایسا بن گیاہے۔

یوجنا کے موضوعات کی اہمیت مسلّم، مگر اُردو والا
آہستہ آہستہ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہی دوسرے موضوع
سے متعلق پڑھے گا۔ اس ذہنیت کو پیشِ نظر رکھ کر ہی یوجنا
کو مرتب کرنا چاہیئے۔ یعنی یوجنا میں غزلیں، نظمیں، افسانے
اور ادبی موضوعات پر مضامین کی تعداد خاصی ہونی چاہیئے۔
ان کے بیچ بیچ میں کوئی سائنسی، معاشی، سماجی مضمون آنا
چاہیئے۔ تو کچھ عرصے میں اس کا امکان ہے کہ اُردو کا قاری
ان مضامین کی طرف متوجہ ہو جائے۔

اہلِ اُردو کا مزاج بدلنا خاصہ دشوار مرحلہ ہے، مگر
ناممکن نہیں ــــ یوجنا کے قارئین کرام کی تعداد میں اضافہ
ہونا چاہیئے، اس وقت یوجنا کو کامیاب سمجھا جائے گا۔

گاؤں میں بیلوں کو جو چارا ڈالا جاتاہے، اس کی
مثال یوجنا کے قارئین پر پوری اُترتی ہے۔ بیلوں کے سامنے
اگر خالص بھوسا ڈال دیا جائے تو وہ من مار کر ہی اس میں منھ
مارتے ہیں لیکن اگر بھوسے میں سبز چارا ملا دیا جائے تو وہ
بھوسے کو چٹ کر جاتے ہیں۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ یوجنا
کے بھوسے میں ادب کا سبز چارا وافر مقدار میں ملایئے تو
آپ کا مقصد پورا ہو سکتاہے۔

جاوید دسشنٹ سکریٹری، ہریانہ اُردو اکاڈمی، فریدآباد۔

● یوجنا میں غزلیں، نظمیں، کہانیاں، کارآمد مضامین اور
کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ خاصا علمی اور ادبی
یوجنا انئی دہلی

موضوعات پر بے شمار سرکاری و غیر سرکاری رسائل اور بھی ہیں
مگر یوجنا کا مقصد ملک میں منصوبہ بندی اور ترقیاتی
پروگراموں کو فروغ دینا اور ساتھ ساتھ ادبی معیار کو بھی قائم
رکھناہے۔ اس نقطۂ نظر سے یوجنا میں محض رومانی کہانیوں
غزلوں اور نظموں کو جگہ نہیں دی جانا چاہیئے۔ اُن ہی غزلوں
کو شائع کرنا زیادہ مناسب ہوگا جن میں عشقِ مجازی اور واردات
قلبی کی داستان کے علاوہ ملک و قوم کی فلاح کے لیے دعوت
غور و فکر ہو، تعمیری مشورہ ہو یا کچھ حالاتِ حاضرہ پر عقلمندانہ
تبصرہ ہو اور ترقیاتی سجھاؤ ہوں۔ میری رائے میں غزلیں ایسے
مضامین کی متحمل ہیں۔ یوجنا کے حالیہ ۱۶ ستمبر سے ۳۰ ستمبر ۸۶ء
کے شمارے میں صفحہ ۱۶ پر م۔م۔ راجندر کی "ٹیلے کے اوپر" کی
کہانی میں ایک معذور بچے کے عزم اور ہمت کو اُجاگر کیا گیا
ہے، ایسی کہانیوں کی ہمت افزائی کی ضرورت ہے۔ یوجنا
میں ویسے ہی ان باتوں کا خیال رکھا جاتاہے ـــ یوجنا اپنے
ملک کا ایک اعلیٰ معیاری رسالہ ہے جس کے اداریہ و ترتیب
مضامین کی مناسبت و خوبصورتی کے لیے یوجنا کا ادارہ
مبارکباد کا مستحق ہے۔ راجندر بہادر موتح
فتح گڑھ، ضلع فرخ آباد۔ (یو۔پی)

● نومبر ۱۹۸۶ء کا یوجنا واقعی گزشتہ شماروں سے
مختلف و منفرد ہے۔ اس شمارے کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ
بخوبی لگایا جا سکتاہے کہ اسے متنوع اور رنگارنگ بنانے
کے لیے آپ نے انتہائی محنت کی ہے۔ آپ کی یہ کاوش
واقعی قابلِ ستائش ہے۔ یوجنا کو نئی شکل دے کر آپ نے
اسے نئی زندگی بخش دی ہے۔ اب یوجنا حددرجہ معلوماتی،
دلچسپ اور متنوع ہو گیاہے۔ یقیناً یوجنا کے قاری کو اب
کسی بھی قسم کی تشنگی کا احساس نہیں ہوگا۔
ڈاکٹر شفیق اعظمی
معرفت پرنس میڈیکل ہال، سرائے میر۔ اعظم گڑھ (یو۔پی)

● اکتوبر اور نومبر ۸۶ء کا یوجنا (اُردو) نظر نواز ہوا،
یہ رسالہ پندرہ روزہ سے ماہانہ ہو گیا یہ دیکھ کر بہت خوشی
ہوئی۔ آپ کا ادارہ مبارکباد کا مستحق ہے۔ میں تقریباً پانچ
سالوں سے یوجنا پابندی سے پڑھتی ہوں۔ یوجنا (اُردو) کا
ادبی گوشہ اُردو داں حلقے میں ضرور مقبول ہوگا۔ اُردو کا
یہ واحد رسالہ ہے جس میں زندگی کے ہر شعبے سے متعلق
معلوماتی مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ جیسے زراعت،
اقتصادیات، صنعت، کھیل، شخصیات، ادب، طب وغیرہ
رسالہ کو مزید جاذب بنانے کے لیے چند مشورے:
۱۔ مضمون نگاروں کی تصویریں ضرور شائع کریں۔
۲۔ مضمون سے متعلق تصویریں بھی شائع کریں تاکہ مضمون
کی افادیت بڑھ جائے۔ ۳۔ خواتین اور طالب علموں کے لیے چند صفحات
مخصوص کر دیں تاکہ وہ اپنے مسائل یوجنا کے توسط سے
منظرِ عام پر لا سکیں۔

نومبر کے شمارے کی کہانی "وہ لمحہ" بار بار پڑھنے کو دل
چاہتاہے۔ ارملا دیوی صاحبہ قابلِ مبارکباد ہیں۔ کہانی
معیاری ہے اور پڑھنے والوں کے دل پر اپنا اثر چھوڑتی
ہے۔ ڈاکٹر ساغر اعظمی، بشریٰ پروین اور شمس غازی آبادی
کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ شاہین پروین جاوی
قاضی محلہ، جالہ، دربھنگہ (بہار)۔

● ماہنامہ یوجنا (اُردو) نومبر ۱۹۸۶ء باصرہ
نواز ہوا، شکریہ۔

ظاہری و معنوی دونوں اعتبار سے بہت خوب
ہے۔ البتہ ادبی حصے میں مزید اضافے کے ساتھ ساتھ
نئے قلم کاروں کو بھی مناسب نمائندگی دینے کی ضرورت
ہے۔ طنزیہ مضامین، غیر ملکی ادب اور دیگر ہندوستانی
زبانوں کے شاہکاروں کے تراجم سے یوجنا کی افادیت
میں غیر معمولی اضافہ کیا جا سکتاہے۔ خدا کرے یوجنا
دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے۔
نیاز سلطان پوری
سکریٹری عوامی، اُردو لائبریری۔ بھبھی جرولی کتوان
سلطان پور۔ (یو۔پی)

غالب اکیڈمی
GHALIB ACADEMY

تصویر میں دائیں سے بائیں صدر جلسہ جناب سید شریف الحسن نقوی، جناب مجروح سلطانپوری، جناب سید سبط رضوی (وزیر تعلیم (یو۔پی)، جناب خواجہ حسن ثانی نظامی، جناب ڈاکٹر شہاب جعفری، انیس العصر جناب مہدی نظمی، زہین نقوی سکریٹری غالب اکیڈمی، استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے۔
(فوٹو سید فدا علی)

مجروح سلطان پوری کے اعزاز میں جلسہ

پچھلے دنوں غالب اکیڈمی، حضرت نظام الدین نئی دہلی میں اردو کے ممتاز شاعر جناب مجروح سلطان پوری کے اعزاز میں ایک پُر وقار ادبی استقبالیہ منعقد کیا گیا، جس کی صدارت اردو اکیڈمی دلی کے سکریٹری سید شریف الحسن نقوی نے فرمائی اور حکومت اُتر پردیش کے وزیر تعلیم جناب سید سبط رضوی اور آندھرا ہائی کورٹ کے جسٹس سردار علی خان نے بطور خصوصی مہمان شرکت فرمائی۔ جناب خواجہ حسن ثانی نظامی، ڈاکٹر شہاب جعفری، جناب شمس الرحمٰن اور زہین نقوی نے اظہار خیال فرمایا۔ اس موقع پر اکیڈمی کی مطبوعات کے سیٹ مہمانان گرامی کو پیش کئے گئے۔ جناب مجروح سلطان پوری نے اپنی نظمیں اور کئی غزلیں سنائیں اور جلسہ میں شریک ارباب علم و ادب سے داد تحسین حاصل کی۔

یادِ ذوق

ہفتہ، اتوار ۳۰، ۳۱ر جنوری و یکم فروری ۱۹۸۷ء

ذوق فن اور شخصیت (۲) اردو رثائی ادب مرثیے کے علاوہ

غالب اکیڈمی ... نئی دہلی ۱۳

زیر نظر تصویر میں دائیں سے بائیں کرنل بشیر حسین زیدی، جناب مالک رام، جناب راحت اعظمی اور جناب خورشید عالم خاں صاحب تشریف فرما ہیں۔
(فوٹو سید فدا علی)

یادِ ذوق سیمنار

علی میموریل چیریٹیبل سوسائٹی نئی دہلی کے زیر اہتمام "یادِ ذوق" اور اُردو رثائی ادب کے موضوع پر ۳۰، ۳۱ر جنوری ۸۷ء اور یکم فروری ۸۷ء کو غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں ایک سہ روزہ سیمنار منعقد کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت عالی جناب خورشید عالم خاں صاحب، چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے فرمائی۔ اس موقع پر مثنوی اور بیانیہ شاعری نامی کتاب کا رسم اجرا بھی عمل میں آیا۔ مشہور محقق جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور دیگر

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed (DN) 65 to post without pre-payment at DPSO, New Delhi.

Vol. 6 No. 23-24

1-31 March, 1987

دلی کی ایک یادگار محفل

زیر نظر تصویر میں (دائیں سے بائیں)
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جناب شمس الرحمٰن فاروقی، جناب احمد رشید شیروانی
اور دیوان بریندر ناتھ

پریس ایشیا انٹرنیشنل نے کچھ عرصہ سے ایک سلسلہ شروع کیا ہے کہ دنیا ادب میں کسی ممتاز شخصیت، شاعر یا علمی دنیا کی شخصیت کو دعوت دی جاکر اس کے ساتھ بے تکلف محفل گفتگو آراستہ کی جاتی ہے۔ ۳۱ جنوری کو مشہور دانشور شاعر جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے اعزاز میں ایسی ہی ایک محفل کا اہتمام کیا گیا۔ اور فاروقی صاحب کے نظریۂ فکر و فن پر کھل کر گفتگو ہوئی۔ محفل کے آغاز میں جناب سید حامد، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور جناب بلراج کومل نے فاروقی صاحب کے فکر و فن پر مختصر مقالے پڑھے۔ اس محفل میں دہلی کے مقتدر اہل علم حضرات نے حصہ لیا اور نہ صرف یہ کہ فاروقی صاحب کی ادبی خدمات کو سراہا بلکہ ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے ان سے کچھ اہم استفسارات بھی کیے گئے جن کا فاضل نقاد نے اپنے زاویۂ نظر سے جواب دیا۔ یہ ادبی محفل تقریباً ۲ گھنٹے چلی۔

شرکائے محفل میں پریس ایشیا انٹرنیشنل کے روح و رواں جناب ظفر پیامی، بیگم منورما دیوان جناب احمد رشید شیروانی کے علاوہ جناب کمال احمد صدیقی، جناب رفعت سروش، جناب زبیر رضوی، جناب جوگندر پال، بیگم فاروقی، مجتبیٰ حسین، رشید حسن خاں اور دیگر اہلِ ذوق حضرات شامل تھے۔

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadurshah Zafar Marg, New Delhi-110002